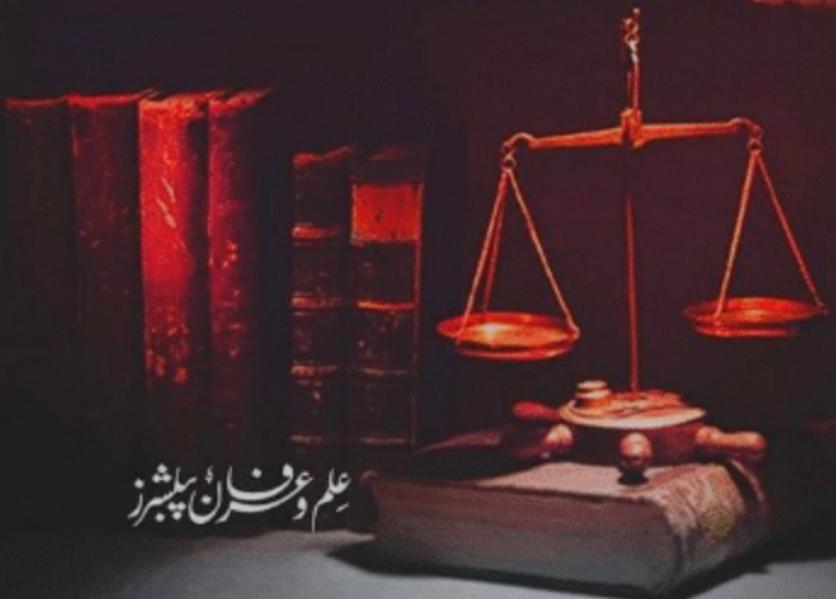


نمایل

نرگا احمد



علم و فنا پاپیور

## انسیاچے!

مجھے قرآن پڑھانے، تفسیر سمجھانے اور تدبیر سکھانے والی  
میری استاذہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے نام !  
جو آج بھی مجھے بار بار قرآن کی طرف واپس لے آتی ہیں ...

## پیش لفظ

سب تعریف اور سارہ شکر اللہ کے لیے ہے۔

شاہ زیب خان قتل کیس اور نیب آفیسر کا مران فیصل قتل کیس سے متاثر ہو کر لکھے جانے والا ناول ”نمل“ جو تین سال پہلے ایک ایک حرف کا غذہ پر اتنا نے سے شروع ہوا تھا، آج ایک بجم حقیقت بن کے آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ”خون“ اور ”دل“ سے جڑے نور اور انہی دونوں سے جڑے گناہوں کی کہانی ہے۔ نمل میں آپ کو مختلف اقسام کے لوگ ایک جگہ جمع نظر آئیں گے اور وہ سب ہماری زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے کی ترجیحی کرتے ہیں۔ ان سب میں برائیاں اور اچھائیاں دونوں موجود ہیں۔ نمل کے اچھے کردار اتنے اچھے نہیں ہیں اور برے مکمل طور پر بے نہیں ہیں۔ آپ نے ان سرمی کرداروں کی اچھائیوں کو اپنانا ہے اور ان کی برائیوں سے سبق سیکھنا ہے۔ ان کے دھوں سے اپنا کتحارس کرنا ہے اور ان کی کامیابیوں سے اپنے لیے راہ تعین کرنی ہے۔ کہانیوں میں دل دکھادینے والے واقعات کی منظر کشی اس لیے کی جاتی ہے تاکہ زندگی میں آگے بڑھتے قاری کے سینے میں جودل برف بنتا جا رہا ہے، اس کو لکھاڑا مار کے توڑا جاسکے۔ وہ ٹوٹے گا تو اندر روشنی اور چشم داخل ہو گی، پھر یہ وہ پکھل کے زم پڑے گا اور جذبوں کو پرانی شدت سے محوس کرے گا۔ اگر ہم ایسا نہ لکھیں اور ایسا نہ پڑھیں تو دنیا کے دھکے دکھ اور تکالیف ہمیں سردمہ رہے جس بنا تی چلی جائیں گی۔ نمل کو بھی میں نے اسی لیے لکھا ہے تاکہ آپ اپنے دل کے مرائض کی شفا بھی پچانیں اور اپنے خون کے رشتہوں کے ساتھ واپس بھی جڑ جائیں۔

اس کتاب کو لکھنے کے لیے مجھے بہت سے پیارے لوگوں کا بھرپور ساتھ حاصل رہا۔

میری ڈا جسٹ ایڈیٹر امت الصبور جن کی راہنمائی اور تعاون کے بغیر کوئی بھی قطع مکمل کرنا مشکل تھا۔ امتل نے میری پہلی کہانی قابل اشاعت قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ دس سال بعد وہ میری تھاریر کو ستاروں کی طرح چکتے ہوئے دیکھیں گی۔ آج اس بات کو پورے دس سال ہو چکے ہیں۔ دسمبر 2006 سے دسمبر 2016 کی یہ لمبی مسافت میں کبھی بھی نہ کاٹ سکتی اگر امتل ہر قدم پر میرے ساتھ نہ ہوتی۔ انسان صرف کوشش کر سکتا ہے۔ اس کی تحریر کی خامیوں کا پردہ رکھ کے اسے کامیابی اللہ دیتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ناکامیوں سے سبق سکینے اور کامیابیوں پر غور نہ کرنے کی توفیق دے۔

لیل خان.... نمل اس کا بھی ناول ہے۔ وہ نمل کی پہلی قاری، پہلی مراح اور پہلی نقاد ہے۔ ہر ماہ سب سے پہلے وہی نمل پڑھتی اور

اسے کپوز کرتی، اور اس کے ایک ایک زاویے سے مجھے اس کی خامیاں اور خوبیوں بتاتی۔ خلوص والے لوگ تو بہت مل جاتے ہیں مگر لمبی جیسا خلوص اور سادگی بہت کم کم ملتی ہے۔ تمہارا شکر یہ لیلی... تم نہ ہوتیں تو میں کیا کرتی؟

اور یہی خلوص اور سادگی میری ٹیم کے دوسرا دو موتوپیوں میں بھی ویسی ہی موجود ہے۔ عاصمہ احمد... جنمیں کی "کائیر نیز" رہی ہیں۔

چھوٹی سے چھوٹی بات اور بڑے سے بڑے کام کے لیے وہ ہر وقت حاظر ہوتیں۔ مجھے علم بھی نہ ہو پاتا اور وہ میرے کندھوں سے نامحسوس انداز میں اتنا ڈھیر سارا بوجھا اخھا کے جاتیں۔ آپ کا شکر یہ عاصمہ!

اور پھر ہم سب کی پیاری... اقراب بنت سلیم... نمل کی کتاب کا تائیکل ڈیزائن کرنا ایک طرف... اقراء کا ساتھ جو اس عرصے میں مجھے حاصل رہا وہ خوش نصیبی ہے میری۔ وہ لیلی اور عاصمہ کے ساتھ مل کئے نمل کی ایک ایسی مضبوط ٹیم بنی رہی جس نے مجھے کسی موقعے پر اکیلانہیں رہنے دیا، اس کا احسان میں بھی نہیں اتارتے۔

عائشہ ثاقب اور میرے فیض بک بچ کے تمام ممبر زکا شکر یہ جو مجھے شاعری کے چنانہ میں میری مدد کرتے رہے۔ یہ میرا شعبہ بکھی نہیں رہتا ہماگر آپ سب کی اور بالخصوص عائشہ کے بغیر یہ اتنے اچھے طریقے سے میں شاید کبھی سرانجام نہ دے پاتی۔

ایڈو و کیٹ سامعا قبال اور ایڈو و کیٹ آمنڈ آفتاب کا بے حد شکر یہ جن کی راہنمائی میرے ساتھ ہر وقت رہی۔ اور ان تمام لوگوں کا بھی شکر یہ جن کی جانب کی حساسیت کی وجہ سے میں ان کا نام نہیں لکھ سکتی لیکن ان کے بغیر میں نمل شروع بھی نہ کر پاتی شاید۔

اپنے ناشر محترم گل فراز صاحب (علم و عرفان پبلیشورز) کی میں بے حد منون ہوں جنہوں نے نہ صرف میری اس کتاب کو اشاعت کا شرف بخشا بلکہ ہر مرحلے پر میری رائے اور پسند، ناپسند کو ترجیح دی۔ بہت کم پبلیشورز اتنی پروفیشنل سوچ رکھتے ہیں اور میں گل فراز صاحب کی دل سے بہت منون ہوں کہ انہوں کسی بھی موقعے پر چاہے وہ تائیکل کا معاملہ ہو یا کتاب کو ایک جلد میں لانے کا مسئلہ، ہمیشہ میری رائے کا احترام کیا۔

یہاں میں بک پائی ریسی کا بھی ذکر کرنا چاہوں گی کہ کس طرح وہ ہمارے ادارے اور رائٹرز کے لیے زہر قاتل ثابت ہو رہی ہے۔ خاص طور پر کراچی اور حیدر آباد کے قارئین سے گذارش ہے کہ وہ کتاب اپنے مستند بک سیلر سے خریدیں اور اس بات کی تصدیق کر لیں کہ کتاب اصل ہو۔

نمرہ احمد

2017 فروری 6

## اٹیپہ

|     |   |         |
|-----|---|---------|
| 11  | ہمار اسعدی  | باب: 1  |
| 59  | فریب کار  | باب: 2  |
| 108 | پہلا ناشر، پہلا تعارف                             | باب: 3  |
| 152 | انسان دوست  | باب: 4  |
| 195 | بیماری میں اور صحت میں                            | باب: 5  |
| 229 | پانی سے گاڑھا (حصہ اول)                           | باب: 6  |
| 270 | پانی سے گاڑھا (حصہ دوم)                           | باب: 7  |
| 315 | میں غارت گر (حصہ اول)                             | باب: 8  |
| 366 | میں غارت گر (حصہ دوم)                             | باب: 9  |
| 414 | عقد   | باب: 10 |
| 466 | کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھو والا؟              | باب: 11 |
| 517 | یا صاحبی اُبجن                                    | باب: 12 |
| 570 | مَنْ الْمَالُ رَبُّهُ مَلْكُهُ دَادُمْ! (حصہ اول) | باب: 13 |
| 616 | مَنْ الْمَالُ رَبُّهُ مَلْكُهُ دَادُمْ! (حصہ دوم) | باب: 14 |

|      |   |         |
|------|---|---------|
| 665  | اور جو کی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کی طرف! | باب: 15 |
| 710  | میرا مرضِ مُستَقر!                        | باب: 16 |
| 756  | آدمی کے دو دل                             | باب: 17 |
| 806  | بھاری ہے وہ سر..... جو پہنتا ہے تاج!      | باب: 18 |
| 860  | حق دفاع از خویشتن                         | باب: 19 |
| 908  | لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے               | باب: 20 |
| 964  | کافر، ماکر، کاذب، قاتل (حصہ اول)          | باب: 21 |
| 1010 | کافر، ماکر، کاذب، قاتل (حصہ دوم)          | باب: 22 |
| 1062 | مورچاں                                    | باب: 23 |
| 1111 | ٹوٹے تارے جیسا دل                         | باب: 24 |
| 1162 | اک مسافت عالمِ تنویم میں.....!            | باب: 25 |
| 1211 | فرزندِ ناز نہیں!                          | باب: 26 |
| 1262 | میں حنین ہوں اور میں عام ہوں!             | باب: 27 |
| 1318 | آبزیدان(The Aquarium) (حصہ اول)           | باب: 28 |
| 1363 | آبزیدان(The Aquarium) (حصہ دوم)           |         |
| 1383 | شممات                                     | باب: 29 |
| 1425 | ایڈس مار زی یے ابھی بیتے نہیں!            | باب: 30 |

## کتاب اول

ندمِ عیٰ نہ شہادت حساب پا ک ہوا

باب 1:

## ہمارا سعدی

اور خدا نے انعام کیا  
نوح علیہ السلام پر  
اور ان کے بیٹوں پر  
اور ان سے فرمایا  
آپا در ہوا اور پھلتے جاؤ  
اور زمین کو بھر دو  
تمہارا خوف اور تمہاری ہبیت  
ہو گی زمین کے ہر درندے پر  
آسمانوں کے ہر پرندے پر  
مٹی پر گنگے والی ہرشے پر  
اور سمندر کی تمام مچھلیوں پر  
تمہارے ہاتھوں میں وہ پہنچائی جائیں گی  
ہر زندہ محرك شے تمہاری غذا ہو گی  
اور جیسے میں نے تمہیں عطا کیے ہیں  
سر بزر پودے  
دیے ہی میں تمہیں ہرشے عطا کروں گا  
مگر....!  
تم ماس کو اس کی جان کے ساتھ نہیں کھاؤ گے

اور اس کی جان اس کا خون ہے  
اور تمہاری جان کے خون کا  
میں حساب لوں گا

ہر درندے اور ہر انسان سے  
اور میں یقیناً حساب لوں گا ہر انسان سے  
اس کے ساتھی انسان کی  
جان کا!

(عہد نامہ قدیم۔ تورات)

ندیعی نہ شہادت حساب پاک ہوا  
صحن تاریک تھا اور طویل برآمدہ نیم روشن۔ فجر کی دواڑا نیں دی جا چکی تھیں اور آسمان گہرا جامنی تھا۔ برآمدے کے آگے  
کوٹھریاں درکوٹھریاں تھیں جن کے دروازے سلاخ دار تھے اور جن کی میلی دیواروں پر لکیریں، نشان، نام سے لکھتے تھے۔ کچھ قیدی سور ہے  
تھے۔ کچھ جاگ رہے تھے۔

بیہاں زندگی دوانہتاوں کے درمیان لکھتی تھی۔  
سیاہ دھاری، سفید دھاری سے مکمل الگ ہو چکی تو فجر کی تیسری اذان گونجئی۔ ہواں نے موذن کی آواز کو اپنے پروں پر انھایا اور  
صحن میں پھیلا دیا۔

”اللہ سب سے بڑا ہے... اللہ سب سے بڑا ہے۔“

ایسے میں برآمدے میں دو پہرے دار شہلتے شہلتے ایک ستون کے ساتھ آکھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے بیڑی سلگائی اور دوسرے کو  
پیکش کی جسے دوسرے نے مسترد کر کے پھر سے اس حوالاتی قیدی کی کوٹھری کو دیکھا۔ جس کے سامنے وہ کھڑے تھے۔  
پہلے ساپاہی عبدالشکور نے بھی اگر دن موڑی پھر استہزا یہ مکا کر سر جھکا۔

”محمد دین! بار بار اس بد مزاج آدمی کو نہ دیکھا کر۔ اس کا دماغ پہلے ہی خراب رہتا ہے۔ تیری ہمدردی سے وہ اور شیر ہو جائے گا۔“  
لبوں سے دھواں چھوڑتے اس نے تنبیہ کی۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سو اکوئی ایسا نہیں جس کی عبادت کرنی چاہیے۔“ موذن کی صدابر ابر آری تھی۔

محمد دین تاسف سے اسی کوٹھری کو دیکھتا رہا۔ جس میں سفید لباس میں ملبوس قیدی نماز کا کپڑا بچھا تا نظر آ رہا تھا۔

”کیا یوں نماز پڑھنے سے اللہ معاف کر دیتا ہے؟“ محمد دین نے ماہیں آواز میں پوچھا۔

قیدی اب آستینیں کلاں یوں تک برا بر کر رہا تھا جو اس نے وضو کے لیے اوپر چڑھائی تھیں۔ اس کی پشت ان دونوں کی جانب تھی۔

”وقل کبھی معاف نہیں ہوتا اور جو اس کی طرح اپنی بیوی اور سگے بھائی کو قتل کر دے۔ وہ تو کبھی معاف نہیں ہو گا۔“ بیڑی کا بڑا سانس

اندر کھینچنے عبدالشکور نے فتویٰ دیا۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔“

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔“

”مگر اس کی بیوی اور اس کے بھائی کے تعلقات تھے۔ اس نے غیرت میں قتل کیا تھا۔ یہی سننے میں آیا ہے۔ تب ہی تو چار سال سے جیل میں ہے۔“

محمد دین ستون سے بیک لگائے ترمیم سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”نماز کی طرف آؤ، نماز کی طرف آؤ۔“

قیدی اب کپڑے کے سرے پر کھڑا تکبیرات پڑھتا رفع یہ دین کر رہا تھا۔ برآمدے کی مدھم روشنی میں اس کا نیم رخ واضح تھا۔ سفید شلوار، سفید کرتا، بالکل کفن جیسا۔ اب گردن بھی تھی۔ ہاتھ سینے پر تھے۔ قدرے لمبے بال دوائج کی پونی میں بندھے تھے۔ اس کا عمومی تاثر صاف تھرے، اونچے مضبوط جسم اور خوبصورت نقوش والے مرد کا پڑتا تھا۔

”فلاح کی طرف آؤ، فلاح کی طرف آؤ۔“

اذان ہواں میں ترجمہ گھولتی سنائی دے رہی تھی۔

”تو بیوی کو طلاق دے دیتا، بھائی سے تعلق توڑ لیتا، قتل کرنا ضروری تھا؟ اور لوگ نماز توبہ و دبہ کے لیے نہیں پڑھتے، ان کو رہائی چاہیے ہوتی ہے۔“ تینی سے کہہ کر اس نے ایک اور کش کھینچا۔

”مگر ایک بات ماننے کی ہے۔ اس کے غصے کے علاوہ یہ بندہ برائیں تھا۔ تجھے پتا ہے۔ اس کا انتیل جنس میں اوپنچا عہدہ تھا۔ اچھا خوبصورت جوان تھا۔ مگر بیوی ایسی نکلی کر... پچ پچ... زندگی بر باد ہو گئی فارس غازی کی۔“

اندر فارس غازی اب رکوع میں جھک رہا تھا۔

”نماز نیند سے بہتر ہے۔ نماز نیند سے بہتر ہے۔“

فضامیں تیرتی آواز ملائمت سے ستونوں سے ٹکرائی تھی۔

”ہاں تو اپنا کیا سامنے آتا ہے۔ اب یہ پچھا گا تھوڑی ہونہہ...“ لاپرواں واستہزا سے سر جھک کر عبدالشکور جانے کو پلتا۔ تب ہی محمد دین کی سحر کے زیر اثر بولا۔

”مگر وہ کہہ رہا تھا، یہ رہا ہو جائے گا۔“

عبدالشکور نے حیرت سے رُک کر اپنے ساتھی کو دیکھا۔

”یہ... فارس غازی رہا ہو جائے گا؟ یہ کس نے کہا؟“

وہی... وہ لمبا... خوبصورت... گھنٹہ یا لے بالوں والا لڑکا جو اس سے ملنے ہر ہفتے آتا ہے۔ ”محمد دین کی نگاہیں ہنوز اس پر مرکوز ہیں۔ فارس غازی اب سجدے میں سر رکھے ہوئے تھا۔

”وہ اس کا بھانجایا؟ کیا نام ہے اس کا؟ اور اس کے لگنے سے کیا ہوتا ہے؟“

”اس کی بات ہمیشہ سچ ہو جاتی ہے۔ پہلے اس نے کہا تھا ہفتہ وار پیشی ہوا کرے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ پھر اس روز وہ کہہ گریا کہ اس ہفتے یہ رہا ہو جائے گا۔“

”نا تو اس کا بھانجایا سب تجھے کیوں بتاتا رہا ہے؟“

عبدالشکور بیڑی لبوں سے ہٹائے مشکوک نظروں میں محمد دین کو دیکھ رہا تھا۔

”ابے مجھے کہاں... اسی کو بتاتا رہا تھا“ میں نے یوں ہی سن لیا۔“

”اللہ سب سے بڑا ہے... اللہ سب سے بڑا ہے۔“

اڑان اب دیگی پڑ رہی تھی۔

"چھوڑ یار... یہ بیکس رہا ہوتے والا۔" اس نے بیکی سے کہہ کر جیزی پیچکی اور پھر ملکتے بھجتے انکارے کو دیکھنے لگا۔

"اللہ کے سوا کوئی اپا نہیں جس کی عبادت کرنی چاہیے۔"

آزادم تو زگی۔ فھماں سکوت چھا کیا۔ پھر بیبل نے صد الکاٹی اور ختوں نے پتے جھکائے اور ساری مخلوق اپنی عبادت میں مشغول ہو گئی۔

قیدی سلام پھیر کر اخوا۔ جائے نماز کا کوئا مودا اکف کلاٹی پر مولا۔ اور پھتا ہوا مسلمانوں سبک آیا۔ اس کا چہرہ نسبت لائک کی روشنی میں واضح ہوا۔ اس کی آنکھیں سبزی تھیں۔ انہیں سیکر کر جیسی نظر دیں سے ان دونوں کو دیکھتے اس نے بیکی سے اپنی طرف آئے کا اشارہ کیا۔ محمد دین میکا کی اندراز میں قرب آیا۔ عبد المکور اتنا حد تذبذب۔ مگر اس نے بھی چوڑی کی۔

"اپنے کان صاف کر کے وہ صحن سے سنو۔" وہ حیث کا ہوں سے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیکلی بات وہ میرا سگانکیں سوچتا بھائی تھا۔ دوسروی بات میرے بھائی کا نام سعدی یعنی سعف ہے اور آخری بات اگر آنکہ تم مجھے میری ملاقات کے اوقات میں اپنے قرب پکتے لفڑاے تو اگلے دن یہاں پہنچوں۔ میکل پیچ پوچ ڈالے۔ کچھ میں آیا؟"

"تجھے تو میں ابھی...." عبد المکور غصے سے آگے بڑھا۔ مگر محمد دین نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بیچھے دھکھلئے۔ "چھوڑ جانے والے" کہ کرائے رہ کا اور واپس لے گیا۔

"کیا... ہاں؟ ابھی کیا؟" سلانجیں تھائے فارس نے بیچھے جیزے اور غصیل آنکھوں سے پکارا۔ مگر محمد دین بیٹھکل سمجھا بھاکر اسے دو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

فارس نے سر جھکا اور داہش ہولیا۔ سچ کی منیدی آہستہ ہستہ بیکل رہی تھی۔



میں زخم زخم ہوں پھر بھی دکھائی نہ دوں

تمیک اسی وقت اسلام آباد کے دوسرے حصوں پر بھی پھر ایسے ہی طریقہ ہو رہی تھی۔ اس اپر مدل کا اونٹی میں ایک گرفگی کمزی کیاں نیلے اندر ہیرے میں رہن تھیں۔

چھوٹے سے ایک سانچے لاؤچ کی کمزی کی لفڑاٹی۔ مگر گرفگی بھی کلی سے اندر چاؤ تو پہلے پکن کا بند دروازہ آتا اور پھر ایک پیور دوم کی کمزی جس سے پھرہ لگا کر دیکھو تو اندر لیپ پہل رہا تھا اور کارپت پاکیلہ لازمی کی نماز پڑھ کر سلام پھیر رہی تھی۔

بیکل کی سایہ نیل کے جلنے لیپ کے ساتھ موبائل پانی اور چند دو ایساں رکھی تھیں۔ ایسی دو ایساں ہو گردے کا وہ مریض استعمال کرتا ہے جس کو ذوزگاروہ (کسی دوسرے کا) لگا ہو۔

وہ نمازِ ختم کر کے بیان دعا مانگے اُنھیں جائے نماز اسی میز کے خانے میں رکھ دی۔ دو پنچ اتار کر بال آزاد کیے۔ پھر پلت کر اسٹھنی نیل کی آٹی تو اس کا پھرہ ساختے آیا۔

وہ صاف گرفگرے زر دنگت کی دراز قدمہ دلی پتلی تھی۔ نتوش تھا اسکی آنکھیں باداہی رنگ کی۔ گہری بھوری پلکیں مزی ہوئی اور ہاک میں بیڑے کی نیکی ہی لوگ بیکل ہو گئے ہاتے تھی۔ وہ بہت خوبصورت نہیں تھی۔ مگر اس کے ہال خوبصورت تھے۔ گہرے بھورے سر سے کان نیک سیدھے اور پھر موٹے مولے curlis کی صورت تھیں جسے یا لے ہو جاتے۔ وہ اٹھیں میں تھے۔ ساختے سے نہوڑی تک پھر کندھوں تک اور بیچھے کر رکھ آتے۔

اس نے الہدی کھول کر ایک مکان تھا لیکن بے چالی میں ایک اپنے کام ملایا۔ جس سے انہوں کے پورے ائمہ اس کی کامیابی کرنے کے لئے مدد کر رہے گئے۔

"زی خداون کے بہن کو فروگ کے نئے نئے ملٹی اسٹریچے جی تباخ"۔  
"ایپے داون بکٹر کے آں کا سوچن یہ پس نے اس پھر بھل ورسی عادی کو گلہ کر لایا جس کے سلاں اپنی یونیورسٹی میں  
جائز فروگ کے نئے نئے اسٹریچے جی تباخ"۔

”بُوچھیں بیٹھے ہوئے تھے سڑک پر اپنے بیٹے کی باری پیش کرنے والے اور اپنے بیٹے کی باری پیش کرنے والے اس کی کمزوری کے برعکس اگلی میں دلخیل پڑھنے 1971ء میں کامیابی کا حیران جاتی ہے اسی کی آغازیں دوستتے کی خدمت عظیم، اس طبقہ کا نسبتاً زیاد تر تکمیل اس ساقی کی کامیابی کے بعد اس کی باری کی تائید کی جاتی۔

”رسانه ای از اینها که در آنها می خواهیم کاری انجام دادیم“ گفت احمدی و میرزا میرزا

کی روئے میں ہائیڈنگ کے لیے ساری جو یہی کے چکرات پر ہے۔  
”یہ اپنی ایک کاٹھوڈری ہے؟“ اس نے پھر کہا۔ اخلاق ایک  
”اپنے صاحب کا بھی۔ اپنی کے لئے۔“ اسکے پیش گئے۔  
”اپنے جو ہی کلی کی خاتمی ہوئی تھیں جسے اسیں“

”سائب لے چکا ہے پلے۔“ ایسا کہا گیا تھا کہ ”کوئی بھائی“  
”کوئی بھائی“ کی وجہ سے اپنے بھائی کو اپنے بھائی کے نام سے کہا گیا تھا۔

“**ప్రాణికి మరియు విషితులకి కొన్ని విషయాలు అందుల్లాయి**”

- فی کے ہر کو مر جانے سے خوب نہیں سُل کا کچھ  
اڑاکل میں بیجے بچے ہے۔

”مریم کی سارکوئے پاگل چاہئے، میرزا مکر پسندی کا نہ اور بھول گئے ہے۔“  
”سدی بھال کون؟“

”لے... مجھے سعدی بھائی کا نہیں پتا؟“ صداقت نے اٹلا پلتے ملامتی نظروں سے چاپی کو دیکھا۔ ”باجی کا بھتija ہے۔ ہرے صاحب کا پوتا۔“

”دیکھ... ایسے ہوتے ہیں بھتija اور تو گرامیں آتا ہے تو مجال نہیں کہ چاپے، چاپی کو شکل بھی دکھادے۔“ ساتھ ہی لڑکے کی پشت پر دھمو کا جزا وہ بلبا کر رہا گیا۔ ”اسی لئے تو باجی اپنے بھتija سے براپیار کرتی ہو گی۔“

”کہاں؟“ برانہ بنا کے صداقت نے اسی انداز میں کہا۔ ”وہ تو سعدی بھائی سے بات بھی نہیں کرتی، ملتی بھی نہیں ہے، وہ تب ہی گھر آتا ہے جب وہ نہیں ہوتی۔ وہ اس سے ناراض ہے۔“

”آئے ہائے کیوں؟“

”پرانی ناراضی ہے، باجی کو جو گولی لگی تھی، وہ سعدی بھائی کے ماموں نے ماری تھی۔ بس تب سے ان کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔“ وہ سر جھکائے کام کرتے ہوئے تصریح کیے جا رہا تھا۔ چاپی نے پرسوچ ہنکار ابھر۔

”تو اسی لیے باجی کے بھائی کا خاندان ان کے ساتھ نہیں رہتا۔“

”اوہ نہیں چاپی! وہ تو ہمیشہ سے الگ رہتے تھے۔ پھر خاندان میں اور ہے بھی کون؟ باجی کے ایک ہی بھائی تھے۔ سعدی کے ابو عرصہ ہو انوٹ ہو چکے۔ ان کی وفات سے بھی سالوں پہلے سے انہوں نے گھر الگ کر لیا تھا۔ ان کی بیوی کی اپنی ساس، مطلب باجی کی مرخومہ امی سے نہیں بنتی تھی، پھر بھی باجی برا خیال کیا کرتی تھیں اپنے بھتijوں کا سعدی بھائی لوگ تین بہن بھائی ہیں یہ تو بس اب کچھ سالوں سے ان کی بول چال...“

”صداقت! اگر آپ ہمارے شجرہ نسب پر روشنی ڈال چکے ہو تو ناشتہ نیبل پر لگادو گے؟“

صداقت کے ہاتھ سے چننا گرتے گرتے بچا۔ پچھی، بھتija گھبرا کر پلے۔ وہ کوٹ بازو پر ڈالے دوسرا ہاتھ میں پرس لیے چوکھ پر کھڑی تھی اور یہ فقرہ اس نے بنا کی غصے یا اطفر کے بہت سادگی و نرمی سے ادا کیا تھا۔

”لایا باجی بس.....“ وہ جیسے کرنٹ کھا کر ایک دم تیز تیز کام کرنے لگا۔ چاپی نے بھی خفیف ساسلام کیا۔ وہ اسی نرمی مگر سمجھدگی سے جواب دے کر راہداری میں آگے چلتی گئی اور ہمیں کی فرش سے نکراتی آواز گونجتی گئی۔

راہداری کے سامنے برا سالوںگ روم تھا۔ اس کا آدھا حصہ صوفوں سے آراستہ تھی وی لاوٹھ تھا۔ باقی نصف میں ڈائینگ نیبل بچھی تھی۔ سر برائی کری کی جگہ پر ایک معمر صاحب ہمیں چیر پر میٹھے عینک ناک پر جمائے اخبار دیکھ رہے تھے۔

وہ دائیں ہاتھ کی پہلی کری پر آئی تھی، چیزیں ایک طرف رکھیں، پلیٹ اٹھائی، کانتا اس میں رکھا۔

”آن گھر کب آؤ گی؟“

”جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔“

وہ بہت ٹھہرے ہوئے نرم انداز میں بیٹی تھی اور اس کے فقرے ایک روانی میں بیوی سے ادا ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ بات ختم کر کے سانس لیا کرتی تھی۔ اس کے باوجود ہر لفظ واضح اور کلیز ہوتا تھا۔

”زمر!“ انہوں نے پکارا۔ زمر نے جواب میں صرف ”ہوں“ کہا۔

”کل کی تاریخ یاد ہے؟ کیا تھا؟“

”کوئی کرکٹ بیچ تھا؟“ زمر نے اسی اطمینان سے پوچھتے ہوئے نیپکن گود میں بچھایا۔

”سعدی کی ساگرہ تھی۔ وہ پچیس سال کا ہو گیا ہے۔“

اس کے ہاتھوں کی حرکت سست ہوئی، بھوری آنکھوں میں سایہ سالہ ریا۔ وہ ایک دم چہرہ موڑ کر صداقت کی طرف متوجہ ہو گئی جو لوازمات میز پر کھڑا تھا اور زمر سے نظریں بھی نہیں ملا پارتا تھا۔ بڑے ابا بھی اخبار کوہی دیکھ رہے تھے۔ صداقت اندر چلا گیا تو انہوں نے کہا۔ ”کیا تمہیں یہ یاد ہے کہ تم کیا کیا بھونے لگی ہو؟ چار سال سے اس کے گھر جانا بھول گئی ہو، ڈیڑھ سال سے اس کی شکل دیکھنا بھول چکی ہو۔“

زمر نے میز کے وسط میں رکھے گلدن کو دیکھتے ہوئے کپ لبوں سے لگایا، بولی کچھ نہیں۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

”وہ تمہاری کوئی سالگرد نہیں بھوتا۔“

”میں اسے کال کروں گی۔“

”کال کرنا، پرواکرنے کے مترادف نہیں ہوتا۔“

زمر نے سنجیدگی سے بڑے ابوکا چہرہ دیکھا جواب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”وہ میرا بھتیجا ہے، میں اس کی پرواکیوں نہیں کروں گی؟“

”تو پھر اس سے ناراضی ختم کیوں نہیں کرتی ہو؟“

”میں اس سے ناراض نہیں ہوں، سعدی میرے لیے کیا ہے، آپ جانتے ہیں اور کوئی بھی چیز اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔“

”تو پھر اس سے ملتی کیوں نہیں ہو؟“

”ٹھیک ہے، آپ ہمارا ناشہ spoil (خراب) کرنا چاہتے ہیں تو ایسے ہی سہی۔“ پیالی پرچ پر رکھ کر وہ مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”وہ مجھ سے کیوں نہیں ملا جب میں بیمار تھی؟ ابا! میرے گردے ضائع ہو گئے تھے۔ ایک اجنبی عورت مجھے گردہ دے سکتی ہے، مگر میرا بھتیجا مجھ سے ملنے نہیں آ سکتا کیونکہ اس کی پڑھائی زیادہ ضروری تھی۔ ابا! وہ میرا ایسا تھا۔ میرا بھائی تھا۔ میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ مگر وہ میرے پاس نہیں تھا، جب مجھے اس کی ضرورت تھی۔ وہ انگلینڈ چلا گیا اور ہاں وہ ہاں سے مجھے کال کر لیتا تھا۔ مگر کال کرنا پرواکرنے کے مترادف تو نہیں ہوتا۔“

”تم اس کی یہ بات درگزر کر دیتیں۔ اگر اس نے یہ نہ کہا ہوتا کہ فارس بے گناہ ہے اور...“

زمر رک گئی۔ اس کے ناثرات بد لے آنکھوں میں گہرا کرب، تکلیف، غصہ ابھرا۔

”فارس غازی کا نام میرے سامنے مت لیا کریں، اس شخص نے میرے ساتھ کیا کیا۔ آپ بھول گئے ہیں تو میں یاد کر دیتی ہوں۔“

اس کا جیسے ناشتہ حرام ہو چکا تھا۔ لبوں کو نیکپن سے چھپتھا کر بال کان کے پیچھے اڑ سے اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر سپاٹ لجھ میں بولی۔

”وہ... آپ کی بہو کا بھائی.... اس نے چار سال پہلے میری زندگی بر باد کر دی تھی۔ اس نے اپنی بیوی اور مجھے ایک جگہ بلا کر ہم دونوں کو شوٹ کر دیا تاکہ میں اصل نارگست سمجھی جاؤ۔ ان تین گولیوں نے جو مجھے کر میں گئی تھیں کہ اس شخص نے میری پشت پر ہی تو حملہ کیا تھا۔ میرے صرف گردے نہیں چھینے، ہر چیز چھینی اور سعدی.... اس نے بت بھی کہا تھا، اب بھی کہے گا کہ اس کاماموں بے گناہ ہے، گریٹ!“

دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نے جیسے کسی نادیدہ ہستی کو شاباش دی۔ اس کا رنگ خپڑا چکا تھا اور وہ شدید سر شرب نظر آ رہی تھی۔

”اس نے سعدی کے بڑے ماموں اور اپنی بیوی کو مارا۔ یہ ان کا اپنا معاملہ ہے، مگر اس نے مجھے بھی مارنا چاہتا اور یہ میرا معاملہ ہے۔ مگر ابا! اس کے باوجود میں فارس غازی کے کیس کو فالوں بیس کرتی، میں خود کو ڈیڑھ سال سے اس کیس سے الگ کر پچھی ہوں، اپنابیان بھی واپس لے پچھی ہوں، کیونکہ جب اس واقعے کا ذکر کیا جاتا ہے، مجھے نئے سرے سے تکلیف ہوتی ہے۔ پلیز مجھے کم از کم ناشتے کی میز پر یہ تکلیف مت دیا کریں۔“

بہت دکھ سے کہتے ہوئے اپنی چیزیں سینتی وہ انٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑے ابا نے خاموش تاسف سے اسے جاتے دیکھا۔ پھر اس کی آدھی چائے کی پیاں کو۔  
ہر ”سعدی...“ سے شروع ہو کر ”فارس“ پختم ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں چائے ناشتے اور کھانے یوں ہی ادھورے رہ جاتے تھے۔

❖❖❖

پھر حشر کے سامان ہوئے ہیں  
فجر کو قضا ہوئے کئی ساعتیں بیت چکی تھیں اور سورج ابھی تک ٹھنڈا تھا۔ شہر کے مضافات میں ایک پوش علاقے میں زندگی اتنی صبح  
بھی یوں بیدار اور چاق و چوبنچی ہیے کبھی سوئی نہ ہو۔  
واہ ایک بلند اور عالیشان محل نما گھر تھا۔ باہر سیکورٹی چیک پاؤنس، مسلح گاردز، کرنٹ سے لبریز تاریں تھیں۔ اندر عمارت سبزہ زار  
کے درمیان میں کھڑی تھی اور آگے پیچھے اونچی پیچی بیٹھا ہوا یوں کی ماندلاں کہیں نشیب میں جاتا، کہیں اور پر اٹھ جاتا۔  
لان میں باوردی ملازم چوک کی سے کام نپشار ہے تھے۔ کسی بڑے ایونٹ سے پہلے ہونے والی پلانگ۔  
ایک شہر سے باب کٹ والی لڑکی جودو دھیار گنت اور دلکش نقوش کی ما لک تھیں ہاتھ سے مختلف جگبُون پا اشارہ کرتی، ایونٹ آر گناہ نزد  
کوہدیاں دے رہی تھی۔ جسے آر گناہ نزد مستعدی سے سر ہلاتا ڈا ری پنوت کرتا جا رہا تھا۔  
دور سے ایک فلپینو ملازم جو خوش شکل اور با اعتماد تھی اور سفید بلا ڈا ز اسکرٹ اور نائمش میں ملبوس تھی، چلتی ہوئی آئی اور اس لڑکی کے  
سامنے مسکرا کر سر کو خدمتے کر پوچھا۔

”کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے مس شہرین؟“

شہرین آر گناہ نزد کو بتا رہی تھی کہ اسے پھول کیسے اور کدھر چاہیں، اس نے رک کر بیزار نظر اس پر ڈالی۔

”صرف اتفاقیوں ناکہ تم ہر دو منٹ بعد آ کر مجھ سے یہ سوال مت پوچھو۔“ اور ناک سکوڑ کر مڑ گئی۔

قیونا کی مسکراہٹ پھر بھی برقرار رہی۔ سر کو خدمتے کر وہ وہاں سے چلی آئی۔ یقیناً وہ عملے کی سپر واہر تھی، تبھی بہت تمکنت سے تھوڑی  
دور ایجنسی کی طرف سے آئی فاضل میڈیز کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔  
”سب ٹھیک جا رہا ہے؟“ اس نے تحکم سے جائزہ لیا۔

”پرفیکٹ.... دیے ابھی پارٹی میں ایک ہفتہ ہے۔ ہم کچھ جلدی تیار نہیں کر رہے؟“

”اونہوں.... یہاں ہر کوئی وقت سے پہلے کام کرنے کا عادی ہے اور یہ ہاشم کاردار کی بیٹی کی سالگرد ہے۔ کوئی عام بات نہیں۔“ قیونا

نے قدرے فخر سے جتای۔ ملازم نے مڑ کر بے اختیار شہرین کی سمت دیکھا۔

”یہ ہاشم کاردار کی بیوی ہے نا؟ ان ہی کی بیٹی کی سالگرد ہے۔“

”ہاں مگر ان کی علیحدگی ہو چکی ہے، یہ یہاں نہیں رہتیں، پارٹی کے لیے آئی ہیں۔“

”اور ادھر کون رہتا ہے؟“ ملازم کو دلچسپی ہوئی تو اس طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں لان ڈھلوان میں جا کر ختم ہوتا تھا، پوچھا۔

وہاں ایک چھوٹی سی عام سی عمارت تھی ہیے ایکسی ہو۔

”وہ.... وہ تو فارس غازی کا پورشن ہے۔“ قیونا نے بر اسمانہ بنایا۔

”وہ کون ہے؟“

”ہاشم صاحب کی پھپھو کا بیٹا ہے، مگر وہ گھر متقل ہوتا ہے۔ کیونکہ فارس جیل میں ہے۔“ پھر ہیمی آواز کی۔ ”اس نے اپنے سوتیلے بھائی مطلب اپنے باپ کی پہلی بیوی کے بنیے کو قتل کر دیا تھا اور اپنی بیوی کو بھی۔“

”اوہ!“ ملاز مہ کی آنکھیں حیرت و تحسیں سے پھیلیں۔ ”تو اس کے مقتول بھائی کا خاندان یہاں نہیں رہتا؟“

”بنا یا تو ہے، وہ اس کے باپ کا بیٹا تھا۔ ہاشم صاحب اس کی ماں کی طرف سے کزن ہوئے تو ان سوتیلے رشتہ داروں کا یہاں سے کیا تعلق؟“ گوپ کا لطف ختم ہوا تو وہ منہ بنا کر اندر مڑ گئی۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی کروفر بھری چال میں عاجزی آگئی۔ اس نے لوگ روم پار کیا، جس میں سیرھیاں اور جاتی دکھائی دیتیں اور گھر کی چار منزیلیں ختم ہونے کے بعد چھپت آتی۔ یوں لوگ روم بہت عالی شان تاثر ڈالتا۔ پھر وہ ڈائینگ روم میں آئی اور سربراہی کریں ادب سے کھینچی۔ یہاں سے لوگ روم نظر آتا تھا اور اسے اپنی بالکل بھی آتی نظر آ رہی تھی۔

وہ مسکراتی ہوئی باریک ہیل سے تیز تیز چلتی آ رہی تھی۔ نائٹس پا انگریزی طرز کا بغیر آستین کے گھنٹوں سے اوپر آتا لباس پہن رکھا تھا۔ بلکہ بھورے ڈائی بال سید ہے اور کرپہ تھا اور شیرنی جیسی آنکھیں تھیں، چہرہ خوبصورت و ملام۔ وہ یقیناً کافی عمر کی تھی، مگر بے حد اسارت اور تروتازہ۔

”گڈمارنگ سمز جواہرات!“

”مارنگ.....!“

مسکرا کر جواب دیتی وہ سربراہی کریں پہلکہ کی شان سے بیٹھی۔ نیکپن گود میں بچایا اور با ادب کھڑی فیونا کو شیریں لجھ میں مخاطب کیا۔

”میرے بیٹے کدھر ہیں؟“

”ہاشم تیار ہو رہے ہیں اور نوشیر واد ابھی نہیں اٹھے۔“

جوہرات نے جواب دیے ہنا پلیٹ اپنے قریب کی۔

”میم... آپ کی فلرڑی بیٹت کی اپانگٹھ آج شام کی ہے۔ آپ نے ریما سنڈ کروانے کو کہا تھا۔“

”اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ایسی باتیں آواز مضم رکھ کر کیا کرو۔“ اسی شیریں مسکراہٹ سے اس نے فیونا کو دیکھ کر کہا ”اور اپنا میک اپ کم کر، مجھے اضاف کی بے رو بٹکی بالکل پسند نہیں۔“

”سوری میم!“ فیونا کی مسکراہٹ اڑن جھوہوئی۔ اس نے جلدی سے روماں سے لپ اسٹک رگڑی جواہرات اب ناشتہ پلیٹ میں نکال رہی تھی۔

سیڑھیوں کے اوپر پہلے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر اسے سی کی خنکی اور مردانہ پر فیوم کی مہک نے نضا کو معطر کر رکھا تھا۔ وہ ڈرینگ نیبل کے ششیے کے سامنے کھڑا تائی کی ناث باندھ رہا تھا۔ کوٹ قریب ہی نیٹا تھا۔ بال ماتھے پہ چیچے کویٹ کیے و جیہہ نقوش، شاندار شخصیت اور پکش سیاہ آنکھیں بالکل جواہرات کے جیسی۔

دفتہ تائی درمیان میں چھوڑ کر اس نے وقت دیکھا اور مو باٹل اٹھا کر چند میٹن دبائے، پھر ایک کال ملائی۔

”باجوہ صاحب! ابھی آپ کو ایک ای میل بیجھی ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد آپ مجھ سے یقیناً بات کرنا چاہیں گے۔“ اگلے کی بات سے بغیر مسکرا کر فون بند کیا اور رکھ دیا۔ تائی کی ناث باندھ چکا تو فون بجا اور پھر بیٹا گیا۔ چھ سات کا لڑ آئیں۔ مگر اس نے نہیں اٹھایا۔ ذرا غاموشی ہوئی تو اس نے ایک اور نمبر ملایا۔

”خاور.... کام ہو گیا ہے۔ اس لڑکی جو بھی نام ہے اس کا.... اس کو غائب ہونے کو کہہ دو.... اب وہ باجوہ سے نہیں ملے گی اور دوپھر تک میری سیکرٹری اس کی پے منٹ کلیئر کر دے گی۔“ کال کالی ہی تھی کہ پھر سے باجوہ صاحب کی کال آنے لگی۔ اس نے مسکرا کر ایس کیا اور آئینے میں دیکھتے ہوئے خود پر فیوم چھڑ کتے ہوئے بولا۔

”کیسا لگا میرا تھکھہ؟ اگر تم نہیں چاہتے کہ میں اس پر تمہاری بیٹیوں کی رائے لوں تو آج بورڈ کے اجلاس میں تم میری قرارداد کے حق میں ووٹ دو گے۔ ورنہ میں لکھتا بے رحم ہوں، تم جانتے ہو۔“ دوسرا کاغذ، احتجاج، درخواست پکھ بھی سنے بغیر اس نے فون رکھ دیا۔ خود پر دو تین اسپرے مزید کیے۔ کاف نکس لگائے، کوٹ پہننا اور باہر نکلا۔ راہداری میں موجود باوردی ملازم نے فوراً اندر جا کر اس کا بریف کیس اٹھا لیا۔

وہ میری ہیاں اتر کر نیچے آیا تو جواہرات جوں گھونٹ گھونٹ بیٹی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے قریب آ کر اس کا اتھا چوما، پھر دائیں ہاتھ کی کرسی چھپتے ہوئے بیٹھا۔

”میرا خیال تھا مسز کار دار اب تک آفس جا چکی ہوں گی۔“ ساتھ ہی ہاشم نے ابرو سے فیونا کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً غائب ہو گئی۔

”تمہاری ایکس والف صح سویرے آگئی تو میں کیسے جاتی؟“

”شیری کیوں آئی ہے؟“ ہاشم نے توں پا اسپریڈ لگاتے ہوئے غیر دلچسپی سے پوچھا۔ جواہرات نے زناکت سے شانے اچکائے۔

”سو نیا کی سالگرد ہم نے اسے اس کے گھر نہیں کرنے دی، تو وہ ہفتہ پہلے سے تیاری شروع کر کے انتقام لے رہی ہے۔“

”سو نیا کو ساتھ لائی ہے؟“

جواہرات نے فنگی میں گردن ہلائی۔

”اینی دیز بآجوجہ کا ووٹ میرے پاس ہے۔ یوں آج عبدالصمد کو ہم ووٹ آؤٹ کر دیں گے۔“

جواہرات کھلے دل سے مسکرائی۔

”تم نے کیسے کیا؟“

ہاشم مسکراتے ہوئے شانے اچکا کر بولا۔ ”ہاشم سب سنبھال سکتا ہے۔“

”سوائے اس گھر کے اسٹاف کے۔ مطلب کوئی کام کا بندہ ہے یہاں؟ کبھی کوئی میری کار مار دیتا ہے۔ کبھی میرا سوت بر باد ہو جاتا ہے، حد ہو گئی۔“

آواز پدونوں نے اس طرف دیکھا۔ ٹراؤز اور شرٹ میں نوشیر وال بستر سے اٹھ کر آیا تھا اور بہت بگڑے موڈ میں آیا تھا۔

”اور اب کیا ہوا ہے؟“ ہاشم نے چھری کائی سے ٹکڑا توڑتے ہوئے مسکرا کر اس کو دیکھا۔

”میرا سوت بر باد کر دیا اس جاہل ریاض نے۔ آپ اس کی پے سلپ اس کے حوالے کر دیں گی..... میں نے اسے فارغ کر دیا ہے۔“ سب اٹھا کر اس میں دانت گاڑتے ہوئے دھخانخسا بولا۔ وہ چوئیں پھیس سال کا خوش شکل نوجوان تھا۔ ہاشم جتنا نہیں مگر اچھا تھا۔ فرنچ کٹ اور بالوں کی الجھی بکھری اس پاگس.... آنکھوں میں بیزاری اور لاپرواںی.... جواہرات نے ناپسندیدگی سے اس کی بات سنی۔

”تم کب بڑے ہو گے؟ جب ہاشم تمہاری عمر کا تھا تو وہ اتنا چھوٹا ہرگز نہیں تھا۔“

ہاشم نے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور زمزی سے ٹوکا۔ ”میں سمجھا دوں گانا۔“ اور پھر نوشیر وال کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آج تمہیں آفس

میں نظر آنا چاہیے۔“

”آؤں گا بھائی! مگر اپنے وقت پر۔“ اس نے اب مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ہاشم نے بمشکل مشکرا ہٹ رکی۔ اسے نوشیر وال پر بہت کم غصہ آتا تھا۔

”صحیح ہو چکی ہے شیر والا تم بالکل نہیں سوو گے اور تیار ہو کر آفس آؤ گے۔“

”اوے!“ وہ لاپرواں سے کہہ کر سیب کھانے لگا۔ ہاشم کا فون پھر سے بختے لگا۔ اس نے جوس کا گھونٹ بھرا اور موبائل کان سے لگایا۔

”ہاشم کا رد دار؟“ نسوالی آواز نے استفسار کیا۔

”آگے بولو۔“ اس کا لہجہ بے چک اور سپاٹ ہو گیا۔

”میں کامران حیات کے آفس سے بات کر رہی ہوں۔ پلیز لائن پر ہی گا، کامران صاحب بات کریں گے۔“

”اپنے بارے کو بولو کہ میں سیکریٹریز سے بات نہیں کرتا۔ اسے مجھ سے کام ہوتا مجھے خود کال کیا کرے۔“ بے نیازی سے کہہ کر اس نے موبائل بند کر دیا۔

جو اہرات اور نوشیر وال نے اپنی خفیٰ بھلا کر مسکراتی، مگر خریز گا ہوں کا تباولہ کیا۔ ہاشم کا موبائل پھر سے بار بار بختے لگا تو شیر والا کہنا

پڑا۔

”اٹھا لیں بھائی! بے چارے کی کال۔“

”شام کو اٹھاؤں گا۔ اسے پورا دن خوار ہونے دو۔ کام ہوتا ہشام کا رد دار یاد آ جاتا ہے۔“ وہ ناشتہ ختم کر کے اب انٹھر رہا تھا۔ جو اہرات نے گردان اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کورٹ جارہے ہو؟“

”پہلے آفس پھر کورٹ.... جزل نوید کے بیٹے والا مسئلہ، وقت پر نہ گیا تو زمر سینٹل منٹ سے انکار ہی نہ کر دے۔ اس مغروہ عورت کا کوئی بھروسہ نہیں۔“

”زمر کو میر اسلام کہہ دینا۔“ جو اہرات نے دلچسپی سے کہا۔

”شیور...“ ہاتھ حصاف کر کے اس نے موبائل اٹھایا ہی تھا کہ وہ پھر سے بجا۔ ہاشم نے ”ہاں خاور بولو“ کہہ کر عجلت میں کال ریسیو کی تھی۔ مگر دوسرا طرف جو کہا جا رہا تھا، اسے سن کر وہ بالکل رک گیا۔ آنکھیں سیکیز لیں اور آہستہ آہستہ واپس میٹھ گیا۔

”ہوں.... اچھا... خیر... بچھلے دو مہینے میں وہ کس کس سے ملا ہے، اپنے وکیل کے علاوہ، مجھے ایک ایک ملاقات کی تفصیل دو۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔“ سرد لمحہ میں کہہ کر اس نے فون بند کیا تو وہ دونوں اسی کا چھروہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے صرف ایک لفظ کہا۔ ”فارس!“ جو اہرات کے ہاتھ سے سیب کی قاش پھسلی۔ آنکھوں میں الجھن ابھری۔

”فارس.... کا کیا ذکر؟“

”اس کا کیس.... آج اس کا فیصلہ متوقع ہے۔“ وہ ڈسٹریب لگ رہا تھا۔

جو اہرات سانس لینا بھول گئی۔

”اور تمہیں اب پتا چل رہا ہے؟“

ہاشم کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔

”میں اراضی کے مقدمات میں پھنسا تھا۔ اس طرف دھیان نہیں گیا۔ مجھے عجیب لگ رہا ہے کہ اس کا فیصلہ اچانک سے آنے والا ہے۔“

ڈانگ بال میں خاموشی چھائی۔ جواہرات کی مسکراہٹ اب غائب تھی۔ وہ بالکل یک تک ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔

”ڈونٹ دری! وہ رہا نہیں ہو گا۔“ ہاشم کو کہنا پڑا۔

”اسے رہا ہونا بھی نہیں چاہیے اور تم اس بات کو قینی بناؤ گے ہاشم!“ وہ بے حد مضطرب لگ رہی تھی۔

”میں سنبھال لوں گا میں!“

”ہمارے اس کرزاں کے رہا ہونے کا مطلب ہے کہ عدالت کے نزدیک وہ قاتل نہیں ہے۔ یقیناً اگلا سوال یہ ہو گا کہ پھر قاتل کون ہے؟“ نوشری والے سیب کھاتے ہوئے کہا۔ دونوں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اس کا ہلتا مندر کیا۔

”یوں ہی کہہ رہا تھا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”یہ بات میں دوبارہ تمہارے منہ سے نہ سنوں شیرو!“ جواہرات نے بمشکل غصہ ضبط کیا، پھر ہاشم کو دیکھا۔ جیسے خود بھی وہی سوال پوچھ رہی ہو۔ اس کی شیرنی جیسی آنکھوں میں تیش تھی۔

ہاشم نے ذرا سے کندھے اچکائے۔ ”فیصلہ اس کے خلاف ہی آئے گا،“ ڈونٹ دری۔ وہ باہر نہیں آئے گا۔ اور آبھی جائے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ تب ہی اس کا فون پھر بجا۔ اس نے فوراً کال وصول کی۔

”ہاں خاور... ہوں.... اچھا....“ سمجھیدہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ وہ ستارہ پا پھر فون رکھ دیا۔

”سعدی! سعدی یوسف!“ اس نے ہولے سے کہا۔ ”سعدی ہے اصل مسئلہ۔“

نوشری وال کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے اس نے زہر بیا سیب نگل لیا ہو۔

.....❖❖❖.....

### مت چھیڑو ہم اہل جنوں کو

زمر نے جب گاڑی گنگل سے تیزی سے گزاری تو بتی زرد تھی اور اس کے نکتے ہی وہ سرخ ہو گئی۔ اس نے بے اختیار سائیڈ مرر میں دیکھا۔ ٹریک سار جنث اس کو اشارہ کر رہا تھا۔ گہری سانس لے کر سمجھتے اس نے کار سائیڈ پر کی۔ انہیں بند نہیں کیا۔ بُن دبایا، شیشہ پیچ گرتا گیا۔ اس نے سن گلا سزا اوپر کر کے گھنٹھریا لے بالوں پر لگائے اور اسٹریٹ نگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر منتظری نظر آنے لگی۔

”لبی... آپ نے گنگل توڑا ہے۔“ وہ کھڑکی تک آیا اور کھر درے لبھے میں بولا۔

”گنگل میرے گزرنے کے بعد یہ ہوا تھا۔“ اس نے گردن ذرا اٹھا کر بے نیازی سے جواب دیا۔

”نہیں جی.... آپ نے لال بتی کراس کی ہے چالان بنتا ہے۔“ وہ بک کے صفحے پلٹتے معمول کے مطابق کہہ رہا تھا۔

”آپ اسے سنبھال کر رکھیں۔ کیونکہ ہم دونوں کو پتا ہے کہ میں نے گنگل نہیں توڑا۔“

” بتی زرد تھی۔“

”تو آپ کو معلوم ہو گا کہ زرد کے بعد بتی لال ہوتی ہے۔ آپ کو نہیں گزرنا چاہیے تھا۔“ وہ قلم کھول رہا تھا۔

”پھر آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ آپ کے گنگل کا نام ترخاب پڑا ہے۔“ اس نے گنگل کی جانب اشارہ کیا۔ ”تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کتنے سیکنڈ بعد بتی سرخ ہوئی ہے۔“

”لبی! آپ بحث کیوں کر رہی ہیں؟ چالان دیں اور جائیں۔“ وہ اکتا کر بولا۔

زمر نے اثبات میں گردن ہلائی، چابی گھمائی اور کار بند کر دی۔ پھر سراٹھا کرایے دیکھا۔

”میں تو چالان نہیں دوں گی، کیونکہ میری غلطی نہیں ہے۔ اور آفیسر آپ مجھ سے اوپنجی آواز میں کافی بد تیزی سے بات کر رہے ہیں۔ اس لیے میں کروں گی یہ کہ میں کار ادھر سائیڈ پر لگاؤں گی، پھر ڈسٹرکٹ بار فون کروں گی۔ آدھے گھنٹے میں یہاں بار کے نمائندے اور دو مختلف میڈیا چینلز کے کیسے ہوں گے۔ اور میں اسی جگہ پر یہ کانفرنس کر کے ان کو تباوں گی کس طرح ناہل ٹریفک پولیس اپنے نائمنر ٹھیک کروانے کی بجائے خواتین کو روک کر ان سے بد تیزی کر رہی ہے۔ اور جب سارا میڈیا یا آئی جی ٹریفک کو لائی پر لے کر ان کی کار کر دی گی پہ سوال اٹھائے گا تو وہ میقیناً سب سے پہلے اس آفیسر کا نام جانا چاہیں گے جس نے ایک خاتون کو غلط روک کر نہ صرف اسے ساعت پر وقت پکنچنے سے بھی روکا، کیونکہ میں ڈسٹرکٹ پر ایکیو ٹریز مریوسف ہوں اور اگر میں پانچ منٹ بھی لیٹ ہوئی اور اس سے کیس پر ذرا سا بھی اش پڑا تو میں اس امر کو یقینی بناؤں گی کہ آپ اپنی زندگی کے اگلے پانچ سال عدالت کے دھکے کھاتے ہوئے گزاریں گے۔ میں جن لوگوں سے روزانہ ڈیل کرتی ہوں وہ قاتل، چور اور rapists ہوتے ہیں۔ اس لیے میری کار سے ہاتھ ہٹائیں۔ جا کر اپنی ڈیوٹی کریں اور مجھے میری ڈیوٹی کرنے دیں۔“ اس نے گلاسز واپس آنکھوں پر لگائے۔ چابی گھمائی، ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھایا۔ آفیسر بے اختیار پیچھے ہٹا اور وہ زن سے کار آگے لے گئی۔

”اللہ ان عورتوں کو زبان نہ دے، ہا پھر دکیل نہ بنائے۔“ وہ غصے اور بے نی سے بڑھاتے ہوئے اپنی جگہ پر واپس جا رہا تھا۔ ۲

❖❖❖

اس شہر دل نواز کے آداب دیکھنا

”سعدی؟ فارس کا بھانجا؟“ جواہرات نے اچھبی سے ابر و اخفا کیں۔ نوشیروان نے پیزاری سے سیب رکھ دیا۔ اس کا کھانا حرام ہو چکا تھا۔

”وہ ہر ہفتے فارس سے ملنے آتا ہے۔“ ہاشم گھری سوچ میں ڈوب آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہا تھا۔

”اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔“

”مگر..... وہ مجھے بھی اپنے آس پاس نظر آیا ہے۔ ایک دو دفعہ بالکل رینڈم جگہوں پر۔ جہاں اس کا کوئی کام نہیں تھا۔ یہ لڑکا کچھ گز بڑھا۔“ ہاشم پہلے سے زیادہ ڈسٹرپ لگ رہا تھا۔

”ہاشم.... مجھے اس سارے مسئلے کا حل تباو۔“ وہ مضطرب اور بے چینی بولی۔

”میں ابھائی سن جال لے گانا۔“

ہاشم نے سنا ہی نہیں۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے فیونا کو آواز دی اور اسے دو دعوت نامے لانے کو کہا۔

”بہت عرصہ ہوا، میں اس سے نہیں ملا۔ شاید ڈیڑہ سال ہو گیا ہے۔ اب اسے میری پارٹی میں آنا چاہیے۔“ وہ جیسے کوئی لائچ عمل ترتیب دے کر بولا تھا۔

”اوہ پلیز.... اگر وہ آئے گا تو میں پارٹی میں نہیں ہوں گا۔ میں اسے اپنے گھر میں نہیں برداشت کر سکتا۔“ نوشیروان کا مود گز پچکا تھا۔ ”یونورٹی کے پانچ سال میں نے اسے برداشت کیا ہے۔ اب اور نہیں۔“ پھر یہاں کیس کے تاثرات بد لے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ جواہرات نے لاوائچ کی سمت دیکھا۔ شہرین ادھر ہی آرہی تھی۔ نوشیروان کا چہرہ ایک دم چکنے لگا۔ جواہرات نے مسکرا کر گھری سر نظر وہی سے باری باری دنوں کو دیکھا۔

”آپ کب آئیں؟ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ نوشیروان کو اپنے رفحلیے پر جیسے شرمندگی ہوئی تھی۔

”بُقْسِتی سے شہری میری بیٹی کی ماں ہے اور اس کی سالگرہ کی تیاری کے لیے یہ بقیناً ارملی مارنگ، ہی آئی ہو گی۔“ ہاشم مسکرا کر کہتے ہوئے اٹھا اور مژہ کر سے دیکھا۔ وہ بیزاری سے نظر انداز کر کے جواب دیے بنا جواہرات کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں نے سینگ ارتجمخت فائل کر دی ہے۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔“ پھر نو شیر وال کو دیکھ کر تکلفاً مسکرائی۔ ہاشم تب تک باہر نکل پڑا تھا۔ ”لست میں دوناں اور بھی ایڈ کرنے ہیں۔ سعدی یوسف اور زمر یوسف۔“ جواہرات نے اسی سرد مسکراہٹ کے ساتھ نشاندہی کی۔

شہرین ذرا چوکی۔

”سعدی؟ وہ....فارس کا بھانجا؟“

”آپ اسے جانتی ہیں؟“ نو شیر وال کو برا لگا۔ وہ بھی تک کھڑا تھا۔

”ہوں۔ کچھ زیادہ نہیں۔“ وہ سنبھل کر بے نیاز نظر آنے لگی۔ پھر جب جانے کے لیے پڑھی تو جواہرات نے آواز دی۔

”کیا تم شام میں آؤ گی؟“

”نہیں....“ وہ باہر جا چکی تھی۔ جواہرات نے مسکرا کر نو شیر وال کو دیکھا اور نزاکت سے ایرنگ پہ انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

”وہ ایک دن میں بھی دوسرا دفعا سگھر میں آنا پسند نہیں کرتی۔“

نو شیر وال چونکا پھر خفیف سا سر جھٹکا اور کھڑا ہو گیا۔

”یہ سعدی لوگوں کا ریسٹورنٹ وہیں ہے نا؟“ بات بدلنے کو اس نے پوچھایا پھر وہ واقعی اسی نکح پر سوچ رہا تھا۔ جواہرات نے شانے اپکا کر گلاس لبوں سے لگالیا۔

.....

ہوا کی زد پہ بھی دوا کچ راغ روشن ہیں

صحبی تازہ تھی اور سفیدی سنہرے پن میں نہیں بدلتی تھی۔ کاردارز کے گھر گوکہ ناشستہ ختم ہو چکا تھا، فجر کی آئی شہرین والیں، نو شیر وال دوبارہ سونے اور ہاشم کو رٹ کے لیے نکل چکا تھا۔ مگر آکثر گھروں میں ناشستہ اسکول، کامیکھی کی تیاری بھی چل رہی تھی۔ اس سکھر کے درمیانے درجے کے گھروں میں ایک وہ چھوٹے بائیچے والا گھر بھی تھا جس کی یہر و نیتی تختی پر ذوالفقار یوسف (مرحوم) لکھا تھا۔ گھر کے اندر جاؤ تو کھروں سے کمرے نکلتے تھے۔ دمنزلہ گھر چھوٹا سا تھا۔ اسی لیے کچن میں پکتے ناشستہ کی مہک اور دھواں سارے میں پھیلا تھا۔ ایک فربہ مائل خاتون پر اٹھلتوے پہ پلتے ہوئے غصے سے زور زور سے آوازیں بھی دیے جا رہی تھیں۔

”اسامہ... حنین... اٹھ جاؤ... وین آنے والی ہے۔“

”کیا ای..... میں کب کا تیار بھی ہو چکا ہوں۔“ ایک تیرہ برس کے لڑکے نے ناراضی سے کہتے کچن میں جھاناک۔ وہ یونیفارم میں بلبوں تھا اور برش سے گیلے بال سنوار رہا تھا۔ اس کے بال گھرے بھورے اور گھنگھریا لے تھے۔ اپنی زمر پھوکی طرح۔ ندرت نے عجلت میں مڑ کے اسے دیکھا۔ ”اچھا شاباش.... اور حنین کہہ رہے؟“

”کوئی گما بھی تک سورہ ہی ہے۔“

”کتنی دفعہ کہا ہے سیم کہ بڑی بہن کو ان ناموں سے مت پکارا کرو۔“

”گن کر بیتاوں کتنی دفعہ ای؟“

اس سے پہلے کہ وہ جوتا اتارتیں وہ بھاگ چکا تھا۔

ایک کمرے میں آ کر وہ رکا۔ وہاں دو پینگ مخالف دیواروں سے لگے تھے۔ ایک کی سائیڈ پہ اسامہ کا بیگ رکھا تھا۔ دوسرے پہلے

منہ تک لیے وہ سورہ ہی تھی۔

”خین... جسی یہی ان...“ اس کے نام کو لبایا چھینج کر پکارا۔ ”کنو بیگم، اٹھ جاؤ۔“ پھر غصے سے اس کا لحاف میں دبکا بازو ہلایا۔ اندر کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اسامہ کے تاثرات بدلتے آنکھوں میں شراتِ جمکی... وہ پاکتی کی طرف آیا۔ وہاں ایک نسوانی پیر لحاف سے باہر تھا۔ اس نے دو انگلیوں سے پیر کے نیچے گدگدی کی۔

پیر تیزی سے اندر کھینچا گیا۔ ساتھ ہی لحاف اتنا کروہ دھاڑی۔

”بد تیز... الو... میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔“

جھک کر بیڈ کے آس پاس جوتا تلاش کیا، مگر وہ بھاگ کر چوکھت کے باہر چھپ گیا تھا۔ پھر بچھوے کی طرح گردن اندر کر کے بولا۔

”وین آنے والی ہے۔ آج میں تمہیں چھٹی نہیں کرنے دوں گا کنو بیگم۔“ جوتا اڑتا ہوا اس تک آیا۔ مگر اسامہ اڑن چھوہو چکا تھا۔

”میں چھٹی کر بھی نہیں رہی، پیپر ہے میرا۔ مگر مجال ہے جو یہ دس منٹ زیادہ سونے دے۔“ وہ منہ بسوتی، پیر فرش پر مارتی اٹھی۔ ”کیا یار... روز صبح صبح اٹھنا پڑتا ہے۔“ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔ لپک کر راہداری میں آئی اور زور سے چلائی۔

”موئے آلواب آناتم میرے پاس کا پی پور چڑھوانے یا نڈڑہ بنانے۔“

غصہ زکال کر اندر آئی۔ گھڑی دیکھی۔ ”اوہ نو...“ وہ بھاگ بھاگ کر تیار ہونے لگی۔ الماری کھولی تو کپڑوں کا ڈھیر باہر کو گرا۔ مشکل

اس ڈھیر کو ہاتھ سے روک کر اندر سے ایک سوت کھینچا۔ ڈھیر کو واپس دھکیلا اور با تھر روم میں گھسنے۔

باہر آئی تو جلدی جلدی جوتے پالش کیے، کپڑے کوئی خاص استری نہ تھے۔ ساتھ ساتھ امی کی صلواتیں۔

”لکنی دفعہ کہا ہے کہ رات کو کام کر کے رکھا کرو۔ جس دن میں نہ کروں، تم دونوں کوئی کام نہیں کرو گے۔“ وہ راہداری کے سرے پر

گول میز پر ناشتر رکھتے افراتغیری میں ڈانت بھی رہی تھیں۔ ”ایک میرا سعدی ہے۔ کبھی مجھے تنگ نہیں کیا۔ بغیر کہے ہر کام کرتا ہے۔“

وہ جوز میں پہنچی جوتے پالش کر رہی تھی، ایک دم رکی۔ ”امی... بھائی کہاں ہے؟“

”ریسورٹ پر ہے۔ آج کل آفس سے چھٹی لے رکھی ہے۔ مگر فخر کے بعد آفس کا کام لے کر ریسورٹ چلا جاتا ہے۔ کالونی کی مسجد میں فخر بھی آج اسی نے پڑھائی تھی۔ امام صاحب یہاں نا اور ایک تم دونوں ہو، جس دن جوتے نہیں کھاؤ گے، نماز کے لیے نہیں اٹھو گے۔“

”اللہ... بھائی بھی نا، چھٹی لے کر بھی کام کرنا نہیں چھوڑے گا۔“ وہ جوتے پہن کر اٹھی۔ یہ بات کہتے ہوئے انداز میں فخر در آیا

تھا۔

تب ہی وین کا ہارن سنائی دینے لگا۔

”جااؤ موئے، جا کر بیٹھو۔ انکل کو تلی ہو۔“ اسامہ نے فوراً ہدایت پُعل کیا اور ”اچھا کنو بیگم“ کہتا باہر بھاگا۔ خین نے تو جنہیں دی۔

وہ رش لیے جلدی سے ماں کے قدموں میں آبیٹھی اور گردن اوپھی کی۔ وہ تیز تیز اس کی فرخچ چوٹی بنانے لگیں۔

”امی دعا کیجھے گا۔ بس آج کا پیپر اچھا ہو جائے۔ پھر تین رہ جائیں گے، جان چھٹے گی۔“ وہ سرو نچا کیے کھر رہی تھی۔ وہ میں اکیس

سال کی دلی پتلی سی لڑکی تھی۔ رنگت گندی تھی اور نقوش معمولی۔ خوبصورت تو بالکل نہیں تھی، مگر اچھی لگتی تھی۔ درمیانی سی بال سیاہ اور سیدھے تھے۔

کندھوں سے ذرا نیچے آتے اور ماتھے پر رابر کئے تھے۔ امی نے فرخچ چوٹی بناتے ہوئے ماتھے والے چھوڑ دیے تھے اور پچھلوں کو گوندھ کر بر بینڈ

لگادیا۔

بیگ اٹھا کر دوپٹا کندھے پر برابر کر کے باہر نکلتے نکلتے خین نے ایک دم مرکرندرت کو پکارا۔

"امی.... بھائی نے وعدہ کیا تھا کہ آج فارس ماموں رہا ہو کر گھر آ جائیں گے۔ امی! کیا وہ واقعی آ جائیں گے؟" اس کی آواز میں امید بھی تھی اور اس ٹوٹنے کا خوف بھی۔

"تمہارے بھائی نے کب اپنا وعدہ پورا نہیں کیا؟" ندرت نم آنکھوں سے مکرا میں تو وہ بھی مسکرا دی۔ وین کا ہارن پھر بجا تو وہ بوکھلا کر باہر بھاگی۔

اسامد اگلی سیٹ پر انکل کے ساتھ بیٹھا تھا اور پچھلی نشتوں پر لکیاں بیٹھی تھیں۔ حین کے بیٹھتے ہی دین چل پڑی۔ اس کی کلاس فیلو رافعہ نے ذرا منہ بنا کر کہا۔ "حین! جلدی آیا کرو۔"

اسامد نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"رافعہ بآجی.... جب آپ لوگ تھری ون اسٹریٹ میں رہتے تھے اور آپ کو ہم سے بعد میں انکل پک کرتے تھے تو ہم بھی آپ کا اسی طرح انتظار کرتے تھے۔"

رافعہ ہونٹ سکیڑ کر خاموش رہی۔ حین نے فتحانہ نظرؤں سے اسے دیکھا اور اپنا بیگ آگے اسامد کی طرف بڑھایا جسے اس نے اپنے قدموں میں رکھ لیا۔ رافعہ اور بھل نے بھی اپنے اپنے بیگ اسی نیت سے اخھائے کہ ذرا زیادہ آہرام سے بیٹھ کیں۔ اس سے قبل کوہا پنے بیگ آگے پاس کرتیں، حین نے بازو پر ہما کر اسامد کی گردن کی بخش محسوس کی۔ پھر لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے ایکسا یئنڈسی بولی۔

"ابھی سانس لے رہا ہے۔ ایسا کرم سب اپنے بیگزدے دوتا کر بچے کا سانس صحیح سے تو بند ہو۔"

بیگزد آگے بڑھاتے ہاتھ فوراً کے اور منہ بنا کر واپس ہو گئے۔ حین کے چہرے کے تاثرات بدلتے اور وہ تنہیہ نظرؤں سے ان سب کو دیکھ کر بیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ اسامد نے گردن ذرا موڑ کر مسکرا ہٹ چھپاتے اسے دیکھا اور ایک آنکھ دبائی۔ حین نے بھی بے ساختہ امڈ کر آتی مسکرا ہٹ روک لی۔

گھر کی مرغی اور باہر کی دال میں واضح فرق تھا۔



اسلام آباد پیغمبر کا دودھیا پن زرد ہو کر خستہ پڑ گیا اور سورج سوانیزیرے پر پہنچا تو سارے درخت پسینے میں نہا گئے۔ مگر لندن میں ابھی صبح تازہ تھی۔ تھنڈی سی چھایا میں گھرے بلشن ہوٹل کے اندر لالبی میں معمول کی گہما گہما تھی۔

ایک کارزی میں ایک فربی مائل سونڈ بونڈ صاحب کے ساتھ ایک سوت میں ملبوس نوجوان کھڑا تھا۔ وہ صاحب جیسے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دعائی نوجوان نے گھری دیکھتے ہوئے ان کو مخاطب کیا۔

"کافرنس شروع ہونے میں خاصا وقت ہے۔ ڈاکٹر عطا! کیوں نہ ہم اندر چل کر بیٹھیں؟"

"بس تھوڑی دیر اور خضر۔"

"آپ کی واپسی کب ہے اسلام آباد کی؟"

"کافرنس ایئنڈ کر کے نکل جاؤں گا شام کو۔ تم لوگ کب تک ہو؟" مگر پھر خضر کا جواب سنے بغیر ہی وہ جیسے دور کسی کو دیکھ کر شناسا سا مسکرانے تو خضر نے اس جانب دیکھا۔

"آپ ڈاکٹر سارہ کا انتظار کر رہے تھے؟"

آؤ۔... تھیں ملوتا ہوں۔" وہ اسے لیے انہنس تک چلے آئے۔ جہاں سے وہ چلتی آ رہی تھی۔ وہ گوری گلابی، نیلی سبز آنکھوں والی تھی۔ عمر تیس سے پہنچتیں کے درمیان، مگر کافی دبلي پتلی۔ خوبصورت نہیں تھی، پیاری تھی۔ مسکراتی تو آنکھوں کے گرد لکیریں پڑتیں۔ بال فرنچ

ناث میں باندھ رکھے تھے۔ مجموعی طور پر اس کے چہرے پر ایک سادہ اور پر خلوص ساتا تھا۔ وہ ان کو دیکھ کر شناسائی سے سر کو ختم دیتی قریب آئی۔ ہاتھ میں فائل فولڈر زیگ، بہت کچھ اٹھا رکھا تھا۔

”سوری ڈاکٹر عطا۔۔۔ مجھے دیر تو نہیں ہو گئی؟ بنیوں کو اسلام آباد چھوڑ کر آئی ہوں۔ آپ کو پتا ہے نا ان سے تفصیلی بات نہ کروں تو مجھے تسلی نہیں ہوتی۔۔۔“ بہت سادہ اور معدتر بھرے انداز میں بولی۔

”بالکل ایسا ہی ہے۔ اچھا ان سے ملو۔ یہ خضر ہیں۔ پلانگ کمیشن میں شایتم نے کہی ان کو دیکھا ہو۔ اور خضر! یہ ڈاکٹر سارہ غازی ہیں۔ کیمیکل انجینئر ہیں۔ تھرکوں پاور پرو جیکٹ کی پرو جیکٹ ڈائریکٹر۔ پراس ڈیزائن میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی پاکستانی اور آج کی انٹریشنل انجینئری کے اس سینیٹر میں ہمارے ملک کی نمائندگی کریں گی۔ مختصر ایک راکٹ سائنسٹ ہیں۔“ بات ختم کر کے انہوں نے فخر سے اس عہدیدار کے تاثرات دیکھے۔

”سر مجھے میڈم کے کریڈنیشنلر سننا اچھا لگ رہا تھا، ورنہ ہماری بہت اچھی ملاقات ہے۔ میڈم کا پلانگ کمیشن میں روز کا آنا جانا ہے۔“ خضر نے تباہی جب وہ سب کہہ چکے۔ سارہ نے مسکرا کر سرا ثابت میں بلایا۔ ڈاکٹر عطا بے حد محظوظ نظر آنے لگے۔

”میں بڑوں کو نہیں ٹوکتی ورنہ مجھے اپنے کریڈنیشنلر سننا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔“ پھر خضر کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”اور سنائیں خضر! پلانگ کمیشن والے لڑکی ہیں؟“

”سنائیں گی تو آپ میم.... آپ لوگوں نے انٹریشنل کورٹ میں آئی ایم ایف کے خلاف کیس جیتا ہے۔ جتنی مبارک دوں، کم ہے۔“

”بھی خضر صاحب.... اس کا تو گورنر صاحب کو کریڈٹ جاتا ہے جنہوں نے اپنے خرچ پر کیس لڑا تھا۔“ وہ ابر و اٹھا کر سادگی اور خوشی سے کہہ رہی تھی۔

”کوئی شک نہیں۔“ ڈاکٹر عطا نے تائید کی۔ پھر جیسے کچھ یاد آنے پہنچنے لگے۔ ”ڈاکٹر سارہ... بالکل ہی کسی نے مجھ سے پوچھا تو سوچا آپ سے معلوم کروں گا۔ آپ کے ہر بینڈ کے مرڈر کیس کا کیا ہنا؟“ سارہ کی مسکراہٹ پھیکلی پڑی۔ آنکھوں میں سائے لہرائے۔ اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ پلانگ کمیشن کے عہدیدار نے سوالیہ ڈاکٹر عطا کو دیکھا۔

”سارہ کے ہر بینڈ.... وارث غازی نیب آفیسر تھے۔ تین چار سال پہلے ان کا مرڈر ہوا تھا۔ ان کے بھائی نے ہی کیا تھا۔ سارہ! کیا اسے سزا ہوئی؟“ وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اوہ.... بہت افسوس ہوا۔“ خضر کو جیسے شرم دیگی ہوئی۔

”میں نہیں جانتی کہ ان کے بھائی نے قتل کیا بھی تھا یا نہیں، ڈاکٹر عطا! سب کہتے تھے، کیا تھا تو شاید کیا ہو۔ مگر میں اس کیس کو فال نہیں کرتی۔ انتقام، قصاص، بدله، ان سب سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میراکل اشائش میری بیٹیاں ہیں۔ اور وہ ابھی بہت چھوٹی ہیں۔ سو میں کسی ایسے معاملے میں نہیں ان لوگوں ناچاہتی جو ان کی سیفی کو خطرے میں ڈالے۔“ بھری محفل میں کسی کے دکھا کا ذکر چھیڑ دینا، بری نیت سے ہو یا اچھی نیت سے دل ہمیشہ ایک طرح سے ہی دکھاتا ہے۔ وہ بھی افسردہ ہو گئی تھی۔

”میم.... آپ سے کچھ ڈاکٹر منش مانگے تھے میں نے۔ آپ نے کہا تھا میں کروادیں گی، مگر مجھے ملنہیں ابھی تک۔“ خضر نے جیسے بات بدلتی۔ وہ ابھی تک لابی میں کھڑے تھے اور ماحول خاصا سوگوار ہو گیا تھا۔ لمحے بھر میں وہ تینوں ارڈر گرد سے کٹ گئے تھے۔ سارہ زبردستی مسکرائی۔ ”آئی ایم سوری خضر! میرا سینٹر انجینئر چھٹپتی ہے ہے کچھ دنوں کی۔ میں شام میں اسلام آباد واپس جا رہی ہوں۔ جاتے ہی اس کو

یاد کرواؤں گی۔ وہ آپ کو میل کر دے گا۔“

”اوہ ہاں.... میں پوچھنے لگا تھا۔ آپ کائینٹر انجینئر آپ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے ہمیشہ، آج نظر نہیں آ رہا۔“

”وہ کسی ذاتی کام میں مصروف ہے۔“ کہتے ہوئے اس کی زبردستی کی مسکراہٹ قدرتی مسکان میں بد لے گی۔ خضرنے ماتھے کو چھووا۔

”میں اس کا نام ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ میں اس کی میل مس کر دوں۔“

”سعدی... سعدی یوسف!“ سارہ نے یاد دلایا۔ پھر چہرے پر دوبارہ بثاشت لاتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا۔ ”اندر چلتے ہیں۔“

آج ہمارے پاس قوانینی کی دنیا کو دکھانے اور بتانے کے لیے بہت کچھ ہے۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھی تو دونوں اس کے ساتھ ہوئے۔ البتہ ڈاکٹر عطا بھی تک یہ موضوع چھیڑنے پر پیشی انی محوس کر رہے تھے۔ اور خضریا دکرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بالکل... سعدی یوسف... بہت ہی competent لڑکا ہے۔ میں ایک دفعہ ملا تھا،“ وہ دور ہوتے گئے اور لابی کی گہما گہمی میں ان کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔

.....❖❖❖.....

### گرفتہ دل تھے مگر حوصلہ نہ ہا را تھا

اسلام آباد میں دو پھر تیز شعاعوں کے ساتھ گویا برس رہی تھی۔ ایسے میں شہری روشنی میں نہائے چھوٹے باغیچے والے گھر سے آگے میں روڑ پڑکیں تو مرکز شروع ہو جاتا، جہاں ایک قطار میں دکانیں تھیں اور قطار کے کونے پر آخری دکان میں ایک چھوٹا سارا یسٹورنٹ تھا۔ اور پر بڑے سے بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔“Foodily Everafter”

بلکہ یہ پریوں کی کہانیوں کے اختتامی happily everafter کی اشتہانی ٹھکل تھی۔

ریسٹورنٹ کے برآمدے میں بچھی کر سیاں خالی تھیں۔ قریب ہی پھولوں کا اشغال لگائے کم عمر پڑھان بچ م وجود تھا۔ ریسٹورنٹ کی سڑک کے سامنے کی دیوار شیشے کی تھی۔ جس سے اندر جھانکو تو سب سونا پڑا تھا۔ ابھی لنج نام نہیں ہوا تھا۔ سو سوائے ویٹرز کے جو کام پنپاتے پھر رہے تھے وہاں کوئی گاہک موجود نہ تھا۔ سب میزیں خالی تھیں۔ سوائے شیشے کی دیوار سے لگی میز کے۔ اس پر لیپ ناپ رکھا تھا۔ ایک کھلی فائل اور دو مو بالنز۔ ساتھ کافی کامگ جس سے وہ قتفے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ جبکہ اس کی لگا ہیں لیپ ناپ اسکرین پر جھی تھیں۔ وہ کافی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ جیز پہنؤں والی شرٹ جس کی آستینیں پیچھے موڑ رکھی تھیں۔ اسکرین پر جمی آنکھیں گھری بھوری اور پرکشش تھیں۔ رنگت بہت صاف اور نقوش کافی ہینڈم.... بال پیچھے کی طرف برٹ کر رکھے تھے۔ سامنے سے دیکھو تو سیدھے لگتے۔ پیچھے سے دیکھو تو گھنگھریا لے تھے۔ بالکل زمر جیسے۔ اس کی مجموعی شخصیت ذہن پر ایک صاف سترہ، خوشگوار ساتھ چھوڑتی تھی۔

لیپ ناپ کی طرف دیکھتے ہوئے وہ گاہے بگاہے ایک نظر ان فونز پر بھی ڈال لیتا۔ قریب سے گزرتا دیہ بھی ان ہی فونز کو دیکھ رہا تھا۔

”سعدی ہماں؟“ ویٹرنے رک کر اسے خاطب کیا۔

”ہوں؟“ وہ مصروف سا پڑھتا رہا۔

”اس موبائل کا مالک ابھی تک نہیں آیا؟“

”اس کے ابوکو اطلاع تو کر دی ہے، آجائے گا۔“ وہ پڑھتے پڑھتے نچالا بدبائے بولا۔ اس کی آواز بھاری اور صاف تھی۔ اردو کا الجہ کسی بھی علاقائی زبان کے اثر میں نہیں تھا۔

”بڑا کوئی لا پروا لڑکا تھا۔ اتنا قیمتی موبائل میز پر چھوڑ گیا۔ آپ نہ دیکھتے تو کوئی چڑا کر لے جا چکا ہوتا۔“

سعدی کے لبوں پر بلکل سی مسکراہٹ آئی۔ گردن ہلائے بغیر صرف نگاہیں اٹھا کر ویڑو دیکھا۔

”کشمیر تو اس کے بعد آئے ہی نہیں۔ میں نہ ہوتا تب بھی تم دونوں پھر تو رہے ہو۔ پھر کون چڑا کر لے جاتا؟“

ویڑ جھینپ گیا۔ ”مطلوب.... گم سکتا تھا... گر سکتا تھا۔ شکر آپ نے دیکھ لیا۔ میڈم کی طرح آپ بھی بہت دیانت دار ہیں بھائی۔“

”تو ہوا سامنہ کھن کر ریم سوپ کے لیے بچا رکھو جنید!“ بلکل سی مسکراہٹ کے ساتھ زرمی تنبہہ کرتا وہ اب کچھ ناپ کر رہا تھا۔ جنید

گڑ بڑا کروہاں سے اٹھ گیا۔

وفتا اس نے موبائل اٹھایا اور کال ملائی۔ یہ اس کا اپنا موبائل تھا۔

”سعدی یوسف بات کر رہا ہوں، تھرکوں سے۔ جی..... جی.....“ اس نے رُک کر سنا۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر بولा۔

”جی میں بنے وہ روپرٹ دیکھ لی ہے۔ مگر جو چیز میں نے آپ سے مانگی تھی وہ مکمل نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنی ڈیمانڈ لکھ کر میں کر رہا ہوں۔ اگلے ہفتے ہمیں فیلڈ پر جانا ہے، تب تک...“ وہ دھیمے گر قطعی سمجھ میں بات کرتا رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے پھولوں والا پھان لڑکا آ کر

اس کے سامنے کری کھنچ کر بیٹھ گیا۔

”ہاں..... گل خان..... کیسے ہو؟“ فون بند کر کے اس نے پھر سے ناپ کرتے ہوئے اس کو خاطب کیا۔

”یار سعدی بھائی! تمہارے شہر کا لوگ بڑا خراب ہے۔“ بڑے ہی گزرے موڑ میں کہتے ہوئے ناگ پر ناگ رکھی اور ناک سے کھسی

اڑائی۔

”اچھا.... اب کیا کر دیا ہے میرے شہر کے لوگوں نے؟“

”وہ جو سر ہر کے دوسرا طرف بیٹھا ہے نا۔“ اشارے پر سعدی نے اس طرف دیکھا۔ جہاں دور پھولوں کا ایک اور امثال لگا تھا۔

جس کو گل خان سے ذرا بڑا اچھے چلا رہا تھا۔

”وہ خانہ خراب کا بچہ ہمارا پھول چرانے کے پیچھے ہوتا ہے۔“

”اچھا۔ تم اسی لیے یہاں آ کر بیٹھ گئے ہو تو کام سے چانے میں مشکل نہ ہو۔“ سعدی نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا کیا۔

”یار سعدی بھائی! مذاق نہ کیا کرو ہمارے ساتھ۔ وہ ہماری نظر کے نشانے پر ہے۔“ پھر آگے ہو کر بولा۔ ”بھائی.... تمہارا نام سعد

ہے نا؟ مطلب پیار سے سعدی کہتے ہیں؟“

”نہیں.... مجھے غصے سے بھی سب سعدی ہی کہتے ہیں۔ سعد نہیں ہے یہ۔ سعدی ہی ہے۔“ شیخ سعدی سے۔ وہ بچہ کو دیکھے بغیر کام

کرتے ہوئے کھر رہا تھا۔

”تمہارا ابو کیسا ہے؟ صح نماز پنیس ہے؟“

”بس اب بہاہری طرح تھوڑی ہے کہ پہلی اذان پا اٹھ جائے۔“ اس نے گردن آکر کر کھا۔

”ہاں اور پھر مسجد میں آ کر بحدے میں سو جائے۔ دیکھ رہا تھا میں تمہیں آج....“

گل خان بر اس منہ بنا کر سیدھا ہوا۔ ”یار! تمہارا ایک آنکھ پیچھے بھی لگا ہوا ہے۔ کبھی تو معاف کر دیا کرو۔ تم اتنا بسا سوت پڑھتا ہے،“

ہمیں نیندا جاتا ہے۔“ پھر کچھ یاد آنے پتاثرات بد لے۔ دلچسپی سے مزید آگے کو ہوا۔ ”بھائی! تم نے اتنا اچھا قرآن پڑھنا کہھ سے سیکھا؟“

”میرے اسکوں کے ایک قاری....“ وہ بتاتے بتاتے رکا۔ جیسے کچھ یاد آیا۔ سر اٹھا کر جنید کو پکارا۔ ”اسکوں کا آرڈر تیار ہو گیا؟“

ساتھ ہی وال کلاک دیکھا۔

”کون سا آرڈر بھائی؟“ جنید سفیان دنوں بھاگے آئے۔

سعدی نے اچنچے سے دنوں کو دیکھا۔ ”کیا مطلب... فہیم نے نہیں بتایا؟ کل میں ادھر تھا جب فون آیا تھا۔ پنک کا آرڈر تھا۔ فہیم کو بتا کر گیا تھا میں۔“ وہ کہتے ہی کھڑا ہوا تھا، جیسے الارم سان رہا ہو کیں۔

”فہیم تو بیمار تھا۔ آج آیا ہی نہیں ہے۔ اس نے تو کوئی ذکر نہیں کیا بھائی۔“

”یا اللہ... دو گھنٹے تک ڈلیوری کرنی ہے اور یہاں کام بھی نہیں شروع ہوا۔“ وہ اٹھتے ہوئے چیزیں سینٹے لگا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر دنوں بوکھلا گئے۔

”بھائی! آپ رہنے دیں۔ ہم کر لیں گے۔“

”ان کی کال میں نے اٹھائی تھی۔ آرڈر میں نے نوٹ کیا تھا۔ جب انہوں نے نام پوچھا تو میں نے سعدی یوسف بتا ہوا۔ میں نے ان کو زبان دی ہے کہ آج سہ پہر تک آرڈر تیار ہو گا تواب وہ میرے بھروسے آئیں گے۔ سو آرڈر بھی مجھے ہی پورا کرنا ہے۔“ قطعیت سے کہتا وہ لیپ ٹاپ بند کر کے میز کے پیچھے سے نکلا۔ گل خان نے اس کا کپ اٹھا کر کافی چکھی۔ سعدی کے خود کو دیکھنے پر مسکرا یا۔

”ہم پر تو پرانے گھر کا پانی بھی حرام ہے۔ مگر تم تو اپنا بھائی ہے۔“ دو گھونٹ اور بھرے۔ سعدی اس کا کندھا تھپک کر ریسیپشن تک آیا۔ ایک دم گل خان ”اوہ خانہ خراب“ کہتا کپ چھوڑ کر بھاگا۔ ان تینوں نے مڑ کر دیکھا۔

سرٹک پر مقابل والائٹ کا پھول اٹھائے بھاگ رہا تھا۔ گل خان اس کے پیچھے لپک رہا تھا۔ ایک سفید گاڑی قریب آتی دکھائی دے رہی تھی۔

سعدی واپس رجسٹر کی طرف متوجہ ہوا، مگرذہ ہن میں جیسے کچھ املاک۔ سفید گاڑی؟ اس نے تیزی سے گردان موڑی۔

وہ سفید روزرائی اور اس کے مالک کو تو وہ لاکھوں میں پہچانتا تھا۔

”نوشیر وال کاردار!“ وہ بے اختیار گلاں ڈور کے قریب آ کھڑا ہوا۔

”تو ٹھہر تو سہی....“ دنوں لڑ کے آگے پیچھے بھاگتے سرٹک پر آئے۔ روزرائی نے ایک دم بریک لگائے۔ تاریچہ چڑائے۔ دوسرا تو بھاگ گیا تھا، گل خان دبک کر سرپر ہاتھ رکھے سرٹک پر بیٹھ گیا۔

گاڑی کا دروازہ کھول کر سرخ چہرہ لیے نوشیر وال تیزی سے باہر نکلا۔

”اندھے.... ایڈیٹ.... تمہارے باپ کی سرٹک ہے؟ چلنے کی تمیز نہیں ہے۔ ابھی میری گاڑی کہیں لگ جاتی تو کیسے نقصان پورا کرتے؟ اپنے ماں باپ کو بیچ کر؟“ اس کا جیسے بس نہیں چل رہا تھا۔ لڑ کے کوڈ تھپڑا گادے۔ ڈریس پینٹ، شرٹ، اوپرہنا آستین کے دیست میں ملبوس، وہ آفس کی تیاری میں لگ رہا تھا۔

سعدی جیز کی حیبوں میں ہاتھ ڈالے قدم چلتا باہر آیا اور ریسٹورنٹ کا سبزہ عبور کر کے سرٹک کے کنارے آ رکا۔

”اورا گر تھماری گاڑی سے اس بچے کو چوٹ لگ جاتی تو تم کس کو بیچ کر نقصان پورا کرتے؟“

نوشیر وال جو بگڑے تیروں کے ساتھ گاڑی کی طرف پلٹ رہا تھا، بے اختیار پلٹا۔ سعدی کو دیکھ کر غصہ جیسے کم ہوا، مگر آنکھوں میں تپش اور لینہ بڑھ گیا۔ گل خان لپک کر سعدی کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

”اچھا.... میں سمجھ گیا۔“ نوشیر وال نے طیش کو دبا کر ظریحہ مسکرانے کی کوشش کی۔ ”یہ شاید تمہارا مین بزنس ہے۔ ان آوارہ لڑکوں کو چوٹیں لگاؤ اور پھر گاڑیوں کے مالکان سے رقم وصول کرو۔ گذگذ۔ کیا یہ کرنے سے ریسٹورنٹ کا کرایہ پورا ہو جاتا ہے؟“

سعدی آنکھیں سکیڑے ٹھنڈے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتا ہا۔

”میرا اصل برقس تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر تمہارا مود خراب نہ ہو تو میں دہرا دوں کہ میں کس پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں؟“

نوشیر وال کے چہرے پر پھر سے سرفی بڑھنے لگی۔ لب بھینچ کر بمشکل بخطب کیا۔

”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے سعدی کہ میں تمہارے آفس کی رو داد سن سکوں۔ میرے پاس میری ایک کمپنی ہے جہاں جانے کے لیے میں اس تمہارے اسٹنٹ کی وجہ سے لیت ہو رہا ہوں۔“ اس نے حقارت سے بچ کی طرف اشارہ کیا جو سعدی کے بازو کی اوث سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اچھا۔ تم آفس جا رہے ہو۔ ویری گذ... لیکن میرا جفرا فیڈ اگر درست ہے تو میرا یعنی نور نٹ تمہارے گھر سے آفس کے راستے میں نہیں پڑتا۔ سو میری چھٹی صس مجھے یہ بتاتی ہے کہ یقیناً تمہارے ارد گرو آج کسی حوالے سے میرا ذکر ہوا ہو گا اور تم حسب معمول غصے میں بے قابو ہو کر مجھے چیک کرنے آئے ہو۔ سو.... اب تم دیکھ ہی چکے ہو کہ میں وہی سعدی ہوں۔“

کندھے ذرا سے اپکا کر سعدی نے بہت آرام سے کہا۔ ویژہ، جنید، سفیان، گل خان کا باپ اور ایک راہگیر اب جمع ہوئے کھڑے تما شاد کیھر ہے تھے۔ بخطب کی شدت سے نوشیر وال کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔

”میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کون ہو؟“

”میں بھی جانتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ میں ایک تیکی میں بڑا ہونے والا مل کلاس لڑکا ہوں۔ میری ماں یہ چھوٹا سار یعنی نور نٹ چلاتی ہے اور میرا اگھر اس سے بھی چھوٹا ہے۔ میں انگلینڈ پر ہنے بھی اسکا لر شپ پر گیا تھا اور میں نے زندگی میں وہ دن بھی دیکھے ہیں جب پیسے نہ ہونے کے باعث میں چنی سے روٹی کھانی پڑتی تھی۔ آج میں ایک یکمیکل انھیں ہوں۔ ایک سائنسدان۔ اور آج بھی میری تشوہ ابھت زیادہ نہیں ہے۔ اپنے خاندان اپنے گھر، اپنی مالی حیثیت، مجھے کسی چیز کے بارے میں بچ سچ بتانے سے کوئی جھگ محسوس نہیں ہوتی۔ میں سعدی یوسف خان ہوں اور یہاں سب مجھے جانتے ہیں۔ کیا بتم بھرے مجھ میں اپنا تعارف کرو سکتے ہو؟“

نوشیر وال کا غصہ ٹھٹھدا اور انکھوں کی پیش مزید بھڑک چکی تھی۔ وہ خاموش رہا تو سعدی نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

”اگر نہیں.... تو بہتر ہے کہ تم اپنی قیمتی کار کو ٹھیک سے ڈرائیور کرنا سیکھ لو.... کیونکہ یہ پہلی دفعہ نہیں ہے جب تم غلط ڈرائیور کر رہے ہو۔ اور اگر تمہارا بیہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے تو پھر گاڑی آگے پیچھے کر لوتا کہ ہمارے کمرز کو تکلیف نہ ہو۔“ اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ واپس پلت گیا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا تاہو اندرا آیا تو باہر نوشیر وال گاڑی میں بیٹھ کر اسے استارٹ کر رہا تھا۔

گل خان بھی اس کے ساتھ اندر آیا تھا اور اب خاصی مضبوطی سے کھڑا تھا۔

”نا تو سعدی بھائی.... کتنے کی ہو گی اس کی ڈی گاڑی جس پر اتنا اکثر رہا تھا؟“

سعدی نے ہلکا سامسکرا کر اسے دیکھا۔ ”زیادہ نہیں.... بس چار... ساڑھے چار کروڑ روپے کی۔“

گل خان کا منہ مارے شاک کے کھل گیا۔ سعدی آستینش فولڈ کرتا کا ڈنٹریک آیا۔ مگر اس کا فون نج اٹھا۔ نمبر دیکھ کر اس نے تیزی سے کال لی۔ ایڈو ویکٹ خلخالی کا لانگ۔

”بھی خلخالی.... کیا بنا؟ سماعت ہو گئی؟“ پوچھتے ہوئے اس کے چہرے پر لمحے بھر کوڈ را درا میڈ کا ملا جلا تاشا بھرا۔ پھر جواب سن کر وہ تاش مسکراہٹ میں ڈھلتا گیا۔

”ریلی....! آپ کو یقین ہے ناموں بری ہو جائیں گے؟ او کے میں دعا کر رہا ہوں!“ فون رکھ کر اس نے فوراً باہر دیکھا۔

نوشیر وال کا رجا چکی تھی۔ اس کی دھول تک وہاں نہیں تھی۔

سعدی نے پر عزم مسکراہٹ کے ساتھ دور آسمان کو دیکھا۔

”یہ بخشن کر آپ کی شکل کیسی ہوگی، میں دیکھنا چاہتا ہوں ہاشم بھائی...!“ اور پھر عملے کی طرف مر گیا۔  
”کم آن بوائز.... ہمارے پاس ابھی دو گھنے ہیں۔“

.....♦♦♦.....

کمرہ عدالت میں غیر معمولی سانا تھا۔ گرمی اپنے جوبن پتھی۔ اونچی کھڑکیوں سے گرم ہوا کے تھیزے اندر آ رہے تھے۔ ایسے میں استغاش اور دفاع کے بغیر پتاؤ زدہ سی خاموشی تھی۔ نجح صاحب کاغذ سے پڑھ کر اپنا طویل فیصلہ سنارہے تھے اور سب متوجہ ہو کر سن رہے تھے۔ ایسے میں صرف دفاع کی کرسیوں پر بیٹھا وہ سفید کرتے اور کسی ہوئی پونی والا مرد تھا جو ہر ایک سے لاپرواہ اور بے نیاز بھی ایکسر سائیز کے انداز میں گردن کو دا کیں اور باہمیں کندھے کی طرف جھکاتا۔ کبھی انگلیاں چھٹاتا۔ کبھی کان کی لوملنے لگتا۔ کبھی بلکل بھی سی شیوے سے بال نوچتا۔ غرض وہ بور ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ منہ میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔ اس کے اپنے کیل خلیجی صاحب بھی وقہ و قتنے سے اس کو دیکھتے تھے۔ ان کو اپنی طرف نگاہیں پھیرتے دیکھ کر وہ ملکا سما کر اتا اور پھر چہرہ کسی اور طرف موز کر بالکل سپاٹ سے تاثرات بنا لیتا۔ خلیجی صاحب سر جھٹک کر رہا جاتے۔ فارس غازی ان کو اسی طرح بھی بھی عاجز کر دیتا تھا۔

”عدالت نے سرکار بنام فارس غازی میں تمام گواہوں، پولیس اور مقتول کے اہل خانہ سب کے بیانات اور دیگر شواہد کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ہم نے فارزک رپورٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ اور پولیس کی تفہیش کو بھی بہت توجہ سے دیکھا ہے۔“  
نجح صاحب کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ ایسے میں فارس خلیجی صاحب کی طرف جھکا اور سر گوشی کی۔  
”یعنی دریک اور بولے گا؟“

خلیجی صاحب نے ایک برہم نگاہ اس پڑالی۔ ”غازی، تھوڑا صبر کرو۔ یہ تمہاری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ چار سال سے تم قید میں پڑے ہو۔ آج تم یا تو رہا ہو جاؤ گے یا پھانسی چڑھو گے۔ اس لیے فی الوقت دعا کرو۔“  
”اچھا!“ اس نے تابعداری سے سرہلا یا۔ ”لیکن یہ ابھی کتنی دریک اور بولے گا؟“  
خلیجی صاحب نے گھری سانس لی۔ ”جنہی دریکی بولے گا، تمہیں اس کو سنسنا ہو گا۔“ فارس گھری سانس لے کر پیچھے ہو گیا۔  
”گواہوں کے اپنے ہی بیانات سے پھر جانے اور بہت سے گواہاں کے پیش نہ ہونے کے باعث عدالت کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا ہے۔“ نجح صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ عینک ناک پر دھرے جہرہ جھکائے نکات پڑھ کر سنارہے تھے۔ ”نا کافی گواہوں اور عدم ثبوت کے باعث فارس غازی پر لگے الزامات میں شک پیدا ہو گیا ہے۔ استغاش کے ثبوت گو کے اپنی جگہ ٹھوس ہیں لیکن وہ کسی بھی صورت reasonable doubt سے مستثنی نہیں ہیں۔ اس لیے عدالت ہمیشہ کی طرح شک کا فائدہ ملزم فارس طبیر غازی کو ہی دینے جا رہی ہے۔“

فارس اب منه میں مسلسل کچھ چباتا کھڑکی سے چھن کر آتی دھوپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سہری آنکھیں روشنی کی کرنوں کے باعث جلتے بھختے دیوں جیسی لگ رہی تھیں۔

”اس ضمن میں فارس غازی ولد طبیر غازی، اپنی بیوی زرتاش غازی اور سوتیلے بھائی وارث غازی کے قتل کے کیس میں مجرم ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے معزز عدالت فارس غازی کے اوپر لگے تمام چار جز مسٹر دکر کے پولیس کو ان کی باعثت رہائی کا حکم جاری کرتی ہے۔ نیز اس کیس سے اور ان الزامات سے ہمیشہ کے لیے ملزم کو بری کرتی ہے۔“  
خلیجی صاحب اور ان کے ساتھی وکلاء بے اختیار کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ استغاش کے نجف پر ایک بے زاری تھی۔ وہ حیران بھی تھے اور بدلت بھی۔ خاموشی م Jord و ہوئی تھی۔ نجح صاحب فیصلہ سن کر انھے کے جارہے تھے۔ آوازیں بلند ہو

رہی تھیں۔ ایسے میں خلیجی صاحب نے ایک دم اسے ڈھونڈنا چاہا تو دیکھا، وہ چپ چاپ کر رہا عدالت سے باہر جا رہا تھا۔ وہ اس کے پیچے لپکے۔ ان کا چہرہ فرط جذبات سے تمثیر رہا تھا۔

راہداری میں انہوں نے اسے جالیا۔ وہ سپاہیوں کی معیت میں جا رہا تھا مگر اس کو جھکڑی نہیں لگائی گئی تھی۔

”غازی۔ مبارک ہو۔“ وہ اس سے گلے ملے۔ پھر الگ ہوئے۔ ”سعدی نے بہت محنت کی تمہارے کیس کے لیے۔ تمہیں بہت مبارک ہو کہ تم رہا ہو گئے ہو۔“ مل جیو پر ڈی کے قانون کے تحت اب کبھی بھی ان دوقتوں کا مقدمہ تمہارے اوپر نہیں چلا�ا جائے گا۔“

”افسوس۔“ فارس نے ہولے سے سر جھکا۔ اس کے چہرے پر سادگی سی تھی۔ ”صحیح دوپلیس والوں سے جھکڑا ہوا میرا۔ ابھی ان کو سبق سکھانا تھا۔ لیکن اب رہا ہو گیا ہوں۔ یہ نہیں ہو سکے گا۔ کچھ دن مل جاتے تو ان کی طبیعت اپنھے سے صاف کرتا۔“

خلیجی صاحب نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں جیل نے کیا بنا دیا ہے فارس غازی۔ سوائے لڑائی جھکڑے کے تم ہر چیز بھولتے جا رہے ہو۔ تمہاری زبان بھی سی کلاس قید یوں والی ہو گئی ہے۔“

”لے! اسی بلاک میں ہی تو تھا۔“ اس نے شانے اچکائے۔ خلیجی صاحب نے بہت سے سخت الفاظ اندر رکے۔

”لیکن اب تم رہا ہو گئے ہو۔ اب تم نے اپنی زندگی میں کوئی جلد بازی اور بے وقوفی نہیں کرنی۔ اب یہ بدمعاشوں والے کام چھوڑ دو۔ شریف آدمی بن کر رہو۔ جیسے سو سائی ٹی میں رہا جاتا ہے۔ تمہارے خاندان نے بہت بھاگ دوڑ کی ہے تمہارے لیے۔ اب ان کو اپنی طرف سے پریشان نہ کرنا۔“

”اچھا۔“ وہ لا پرواہی سے ادھر ادھر کیھر رہا تھا۔ چہرہ بے تاثر سا تھا۔

”اب یہاں سے نکل کر کوشش کرنا کہ اچھی جا ب ڈھونڈو۔ اچھی سی لڑکی سے شادی کرو۔ اور ایک پرسکون زندگی گزارو۔ اپنے غصے کو کنڑوں کرنا سکھو۔ باہر کی دنیا جیل جیسی نہیں ہے غازی۔ اس میں تم بات بات پر لوگوں کی ہڈی پسلی نہیں توڑ سکتے۔ اب تمہیں اپنی زندگی کو سنجیدہ لینا ہو گا۔“ پھر رک کر اسے دیکھا۔ ”کچھ پوچھو گئے نہیں اپنے کیس کے بارے میں؟“ فارس نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

”فیس مل گئی آپ کو ابھی یا نہیں؟“

خلیجی صاحب نے گویا بامان کر اس کا چہرہ دیکھا جو بالکل سپاٹ تھا، جیسی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے انہوں نے یہاں کیک پکجھ محسوس کیا۔ جیسے ایک لمحے کے لیے کچھ بدلا تھا۔ فارس کی نگاہوں کا رخ۔ وہ ان کے کندھے کے پیچھے کسی کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کی ساری کیفیت بدل گئی تھی۔ خلیجی صاحب نے پلٹ کر دیکھا۔ راہداری میں بہت سے لوگ چلتے جا رہے تھے۔ ان میں وہ بھی تھی۔ گھنگھریا لے بالوں والی پر اسکیو ٹرجنگ کی ناک میں ہیرے کی ایک لوگ دمک رہی تھی۔ وہ دو عورتوں کے ہمراہ چلتی سیدھے میں دیکھتی آگے جا رہی تھی۔ فارس کے قریب سے گزری تو نگاہ اٹھی۔ اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ ایک ثانیئے کو بھوری آنکھیں سنہری آنکھوں سے ملیں؛ پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ فارس غازی کا چہرہ اس ایک پل میں بالکل بدل گیا تھا۔ جیسے وہ کوئی اور انسان ہو۔ لیکن اگلے ہی پل وہ واپس ویسا ہی ہو گیا، اور سر جھک کر دوسرا سمیت میں ہو لیا۔

خلیجی صاحب نے بہت دفعہ ان دونوں کو راہداریوں اور برآمدوں میں ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔ ہر دفعہ یہ ایک لمحہ ضرور آتا تھا۔

اس کی رہائی کی خبر ہاشم کو جب ملی تو وہ کوریڈور میں کھڑا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے کمال ضبط سے اپنے کڑوے ہوتے تاثرات چھپا لیے۔ وہ ابھی اتنا مصروف تھا کہ ایک دم ری ایکٹ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اس نے خود سے عہد کیا کہ اگر اس میں سعدی کا ہاتھ ہے تو اسے حساب دینا ہو گا۔ اور تو چجز مرکی طرف مبذول کر دی جو سامنے سے فالل کے صفحے سرسری انداز میں پلتی تیز تیز اس طرف آ رہی تھی۔ ایک

محرم خاتون اور ایک دوپٹھے اور ہن نوجوان لڑکی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ ہاشم کو یڈور کے سرے پر اسے ملا تھا۔ زمر اس کے سلام کا محض جواب دے کر آگئے ہوئی۔ وہ بنا کچھ کہنے ساتھ چلنے لگا۔ ایک کریوکٹ والا نوجوان اس کی بائیں جانب تھا۔

کورٹ روم تک کی یہ داک خاموشی سے کث جاتی۔ اگر ہاشم کی کسی بات کے جواب میں وہ نوجوان بگڑتے تاثرات سے یہ نہ کہتا۔ ”انہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں رقم ادا کر رہا ہوں۔“ ورنہ کورٹ میں یہ مجھے (عزت لوٹنے والا) ثابت نہیں کر سکتے۔ ”ساتھ ہی دبے دبے غصے سے اس لڑکی کو دیکھا۔“ ہاشم نے نظروں سے تنیہہ کی، مگر زمر کے قدم ایک دم رکے تھے۔ وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی اور سنجیدہ مگر تیکھی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔

”آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے آپ کو سیٹل منٹ دی ہے۔ ورنہ اگر ہم ٹرائل پر جاتے تو آپ کو علوم ہے کیا ہوتا؟“ ہاشم نے ابر و اٹھا کر لڑکے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ جو پہلے ہی بہت بڑے موڈ میں تھا، اکھڑا اکھڑا اسے بولا۔

”میں باعزت بری ہو جاتا اور مجھے یہ پسیے نہ دینے پڑتے اور میری جاب....“ مدعا لڑکی کی ماں تلخی سے کچھ بڑھ رہی تھی۔ ہاشم نے لڑکے کو ہاتھا کر خاموش کیا اور زمر کو دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

”میدم پر اسکیوٹر.... میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ٹرائل پر جانے کے بعد کیا ہو گا؟“

الفاظ کی سنجیدگی کے باوجود ہاشم کی مسکراہست برقراری۔ ”بارہ سال... کم سے کم بھی بارہ سال کیس عدالت میں چلے گا اور کچھ ثابت نہیں ہو گا۔“ شانے فرید کو خود وہاں بلا یا تھا۔ میرے پاس ان کے نیکست میتھر کا ریکارڈ ہے۔ اور اس بات سے شانا نکار نہیں کر رہی کہ ان کا چھوٹا موناکسی، مگر افیئر تھا تو۔ نہ صرف میں عدالت میں اس افیئر کے ثبوت پیش کروں گا بلکہ وہ اس ایسے لوگوں کو بھی لاوں گا جن کو اس لڑکی نے زندگی میں کبھی دیکھا بھی نہیں ہو گا اور وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ یہ ان کے ساتھ بھی یہی کرچکی ہے۔ میں اس کو عدالت میں پیشہ دو، عورت ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ اس کا خاندان اور محلہ اس کو ڈس اون کر دے گا۔ کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا اور بارہ سال بعد آخری پیشی پر جب یہ ہار جائے گی تو اس کے پاس نہ شوہر ہو گا اور نہ بچے۔ اس لیے آپ کو اتفاقی ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے آپ کو سیٹل منٹ دی ہے۔“ فرید نے فخر یہ مسکرا کر ہاشم کو دیکھا۔ شنا کی ماں نے لبوں میں کوئی بد دعا بڑھ رہی تھی۔ شنا کے چہرے کا رنگ بدلتا تھا۔ زمر ہلاکا سماں کرائی اور نہیں میں سر ہلا دیا۔

”اصل میں ہو گا یہ ہاشم! کہ جب کیس ٹرائل پر جائے گا تو میں اسے ٹرائل تک نہیں رکھوں گی۔ پہلے مینے میں ہی میں پوری اسٹوری میڈیا پر لیک کر دوں گی۔“ یہ شام کے اخبار کی سرفی جتنا کیس نو بجے کی بخروں میں آئے گا۔ آٹھ اور دس بجے والے ٹاک شو زاس پر بات کریں گے۔ شنا کو مارنگ شوز پر بلا یا جائے گا جہاں یہ میں شاؤ نسٹ قسم کی خواتین کے ساتھ بیٹھ کر ظلم کی پوری داستان سنائے گی۔ این جی او زاس کے لیے واک کریں گی۔ یہ انٹریشنل سیمنارز پر مدعا ہو گی۔ اینٹی آری طبقہ اس کو فرید کی شنا کے ساتھ نہیں بلکہ ایک جرنیل کے بیٹے کی ایک مظلوم لڑکی کے ساتھ زیادتی بنا دے گا اور تمہارا۔“ فرید کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی۔ ”سوش سرکل تمہیں آؤٹ کر دے گا۔ تمہارا باس تمہاری روپوٹ پر مشکوک الفاظ لکھے گا۔ کوئی بھی لڑکی تم سے شادی کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچے گی، کیونکہ قاتل کو لوگ قبول کر لیتے ہیں، پس تمہاری روپوٹ پر مشکوک الفاظ لکھے گا۔“ میں شنا کو ایک اشارہ بنادوں گی اور بارہ سال بعد تم کیس جیت بھی جاؤ تو تم بہت کچھ ہار چکے ہو گے۔ اور وہ ہارے ہوئے رشتے تمہیں یہ تمہارا پچاس ہزار کے ہمہ کٹ اور ڈھانی لاکھ کے سوٹ پینے کھڑا اکیل والائیں نہیں لا کر دے گا۔ سو اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو پر اسکیوٹر کے سامنے اپنے منڈ سے نکلنے والے الگ الفاظ کو روک لیتی۔“

مسکراہست معدوم تھی اور ایک کشیل نظر ان دونوں پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گئی۔ فرید کا چہرہ اب شنا سے مختلف نہ تھا۔ ہاشم پا البتہ کوئی اثر

نہ ہوا تھا۔ وہ کندھے زر اسے اچکا کر اس کے پیچھے ہولیا۔

❖❖❖

اس نے پیپر مکمل کر لیا تھا اور ابھی امتحانی دورانیہ ختم ہونے میں پندرہ منٹ تھے۔ تب تک ممتحن ٹھپر زنے اسے دیں بیٹھے رہنے کو کہا تھا۔ حینہن پر چھالتا کھل کر دھکتی الگیوں پر جن کہیں کہیں انک لگ گئی تھی، کوسہلا رہی تھی۔ اسے پیپر کر کے پڑھنے کی عادت نہیں تھی اور بعد میں باہر لڑکیوں کے گروپ میں کھڑے ہو کر ایک ایک جواب ملانے سے تو وہ بھاگتی تھی۔ آدھے جواب تو وہ میں غلط نکل آتے تھے۔

”بس تین پر پچھے مزید اور پھر بی اے ختم۔ شکر...“، اس نے خود کو تسلی دی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ لڑکیاں سر جھکائے دھر ادھر لکھے جا رہی تھیں۔ امتحانی عملے کی خواتین کڑی نظر وہن سے دیکھتی ہل رہی تھیں۔ حینہن کی نظر میں روشن دان تک گئیں۔ تین، تین ایک، ٹوٹل ہوئے دس.... وہ اسی طرح لکھ رکھ کر کیاں، دروازے نرٹک کنارے درخت گنا کرتی تھی اور وہ بھی دس کے گروپ بن کر پھر سے شروع کرتی۔

سارے دروازے گرن کر اس نے ایک خشک سیاہی والا قلم نکالا اور اس کی نب کو کرسی کے بازو پر رکڑ کر ان دیکھے الفاظ لکھنے لگی۔ وہ عموماً پھول بناتی تھی یا تکون۔ اور پھر اپنا نام لکھنا شروع ہو جاتی۔ Haneen Yousuf حینہن یوسف.... حینہن.... اور لاشعوری طور پر اس کے بنایا ہی کے قلم نے لکھنا شروع کر دیا۔

”ہاشم کاردار.... ہاشم.... ہاشم۔“

وہ ایک دم بجکنی۔ پھر قدرے گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھا۔ چہرے کارنگ تھوڑا سرخ ہوا۔ بے چینی سے ماتھے پر گرے بال ٹھیک کیے۔ جوبات کبھی کسی سے نہ کہی ہو وہ اچانک باہر نکل آئے، جیسے بھرا ہوا گلاس چھلک جاتا ہے تو انسان اپنے ہی ہاتھوں سے ڈرانے لگتا ہے۔ اس نے قلم رکھ دیا۔ پھر آنکھیں بند کیں۔

نظر وہ کے سامنے وہ چند لمحات، چند گھنٹیاں گزریں.... جب اس نے کبھی ہاشم کو دیکھا تھا یا اس سے ملی تھی۔ خاندانی دعوتیں.... تھوار.... وہ ان کی ماں کے سوتیلے بھائی کا فرست کزن تھا۔ ہر وقت مسکراتا ہوا.... بہت شاندار اور متاثر کن.... مگر ایک دور کا رشتہ دار.... اس کے قریب کھڑے ہو کر اس کو دیکھنا ایسے تھا جیسے بندہ آنفل ناوار کے نیچے بجوم میں کھڑا ہو۔

مگر اب آنفل ناوار نکل گئے بھی کتنا عرصہ ہو گیا تھا۔ خاندان میں دور.... دور تک کوئی ایسی تقریب ہی نہیں ہوئی جس میں اس کی ایک جھلک بھی نظر آ جاتی۔ پتا نہیں کہ دوبارہ وہ اسے دیکھے گی؟

اس نے بے دلی سے سوچا اور خشک نب سے پھر سے تکونیں بنانے لگی.... پھر پھول.... پھر حینہن.... اور پھر سے ہاشم....

❖❖❖

ہاشم نے دروازے پر دستک دی اور پھر بینڈل پکڑ کر دھکیلا۔

اندر آفس میں پر سکون خاموش تھی۔ وہ اپنی کری پیٹھی تھر ماس سے پیالی میں چائے انڈیل رہی تھی۔ قریب ہی فائلز اور موٹی سیاہ جلد والی کتابیں کھلی تھیں۔ زمر نے بس ایک نظر اسے دیکھا، پھر خاموشی سے چینی دان اٹھایا۔

”اوہوں.... مجھے پچھلی چائے پسند ہے۔“ ہاشم نے مسکرا کر کہنے منع کیا.... دروازہ بند کر کے اندر آیا.... کری ٹھیکی.... ناگ پٹاگ رکھ رکھنیا.... کوٹ کا بٹن کھولا اور اس کے آگے سے پیالی اٹھا کر بوس سے لگائی۔

زمر نے ابراؤ چکا کر چینی دان واپس رکھ دیا اور فائل کے صفحے پلنے لگی۔

دو تین گھونٹ بھر کر ہاشم نے پیالی میز پر رکھی.... پھر خوشنگوار مسکراہٹ سے اس کو دیکھ کر بولا۔ ”سو.... ہم اب ٹھیک ہیں آپ میں؟“

”آپ کو کیا لگتا ہے؟“ وہ فائل پر چہرہ جھکائے سنبھالی سے بولی۔

”شاید نہیں... کیونکہ جس طرح ابھی باہر آپ میرے ہمیر کرت اور سوت کو درمیان میں لائیں...“ ہاشم نے ذرا سے شانے اپکائے۔ ”اس پر میں صرف اتنا کہوں گا کہ آپ ایک مقتنم مزاج خاتون ہیں۔“

اس نے نگاہیں اٹھا کر سنجیدگی سے ہاشم کو دیکھا۔ ”اگر اگلی دفعہ آپ نے کسی کو یوں میرے سامنے ہر اس کرنے کی کوشش کی... تو ہم اس کے بعد تھیک نہیں ہوں گے، از ڈیٹ کلیسر؟“

”کر مثل!“ ہاشم نے پیالی سے دوبارہ گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے گھنگھریا لے بال کچھ میں آدھے بند ہے تھے۔ ناک کی لوگ چک رہی تھی اور سکیڑی ہوئی آنکھوں میں ٹھنڈی سی بے رحمی تھی۔

”میں اپنی جا ب کر رہا تھا، پھر بھی معافی مانگتا ہوں۔“

”آپ کو مانگنی بھی چاہیے۔“ وہ پھر سے فائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ چند لمحے کے لیے ہاشم کچھ نہ بولا تو زمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مجھے یقین ہے آپ صرف سوری کرنے نہیں آئے۔ آپ کو کوئی فیور چاہیے۔“ فائل بند کر کے وہ پیچھے ہو کر بیٹھی۔ ”کہیے! میں سن رہی ہوں۔“

ہاشم نے مسکرا کر ایک پیپر بیگ سامنے رکھا۔ زمر نے اسے کھولا۔ اندر سے ایک کارڈ نکلا۔

”کیا آپ دوبارہ شادی کر رہے ہیں؟“ اسی سرد انداز میں مسکرا کر زمر نے کارڈ سامنے کیا۔ وہ ہلکا سا ہنسا۔

”اوہ ہوں... میری بیٹی سونیا کی چھٹی سالگرہ ہے اور آپ انوائیں ہیں۔“

زمر نے کارڈ دیکھا۔ وہ مستطیل ڈبے میں رکھا تھا۔ کسی شیلد کی طرح۔ سب سیاہ تھا اور سامنے نہرے ربن سے وہ بناڑھکن کا ڈبہ بند ہوتا تھا۔ اندر ایک چھوٹا آرائیں وی پی کارڈ بھی رکھا تھا۔ جس کی ایک سطر میں شرکت کرنے کی ہامی اور دوسرا میں مذکور تھی اور دونوں کے آگے خالی خانے بننے تھے۔

”تھیں کیو ہاشم... میں کوشش کروں گی وعده نہیں کرتی۔ مگر انویشن اور فیور میں فرق ہوتا ہے۔“ اس نے کارڈ بے نیاز سے میز پڑال کر اسی ٹھنڈے پر سکون انداز میں پوچھا۔

ہاشم نے ابرو سے پیپر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ زمر نے دیکھا اس میں ایک اور کارڈ بھی تھا۔ اس نے وہ نکلا۔ اس پر درج تھا۔ ”سعدی یوسف اینڈ فیملی۔“

ہاشم نے غور سے زمر کے بدلتے تاثرات دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف ابھری۔ چھرے پر مضطرب سا احساس نمایاں ہوا۔ پھر وہی خاموشی چھاگئی۔ اس نے بے تاثر آنکھوں سے ہاشم کو سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”آپ اسے کوئی زر کر دیں یا ہینڈ ڈلور؟“

”نہ وہ میرے کو زیر کرنے سے آئے گا نہ خود بلاںے سے۔ مگر آپ کہیں گی تو وہ آئے گا۔“

زمر نے دھیرے سے شانے اپکائے۔ ”میں اسے بھجوادوں گی۔ کھلو بھی دوں گی۔ مگر وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ آپ کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتے نا۔“ وہ پہلے جیسے انداز میں بول رہی تھی۔ مگر سمندر میں پتھر چھیننے کے بعد کے بننے والے ابھی تک پھیل رہے تھے۔

”نہ میں آج پیدا ہوا ہوں نہ آپ۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ آپ کا کہا نہیں نالے گا۔“ ہاشم ذرا آگے ہوا۔ اس کی آنکھوں میں گھری سنجیدگی تھی۔ ”سعدی کو میری پارٹی میں ہونا چاہیے۔ کسی بھی طرح۔ آپ اسے وہاں لا میں گی۔“

زمر نے جواب نہیں دیا۔ وہ بس کارڈ زکودی چھتی رہی۔ ہاشم کپڑ کرو واپس پیچھے ہوا اور اس کے چھرے کو مسکرا کر پڑھتے ہوئے نزی

بے پوچھا۔ ”وہ کیا کر رہا ہے آج کل؟“

ہوں... جاب۔ ”وہ کسی سوچ میں تھی۔

ہاشم خاموش رہا۔ چائے مخفی ہو چکی تھی۔ اس نے پھر بھی آخری گھونٹ اندر انڈیا اور ذرا آواز سے پیالی رکھی۔

زمرنے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور لکھے سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”آپ ابھی تک یہیں ہیں، یعنی آپ کوئی اور بھی فیور چاہیے۔“

ہاشم نے مسکرا کر سر کو ختم دیا اور بولنے کے لیے لب کھولے کہ....

”میرا جواب انکار ہے۔“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”ابھی میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔“

”میں جانتی ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ دائرے اب پھیل پھیل کر مت چکے تھے اور وہ سنبھل چکی تھی۔ ”آپ کو سر کار بنا میں۔

عبد الغفور حیدر میں سیطامٹ چاہیے۔ مگر نہیں.... ہم ٹرائل پر جار ہے ہیں۔“

ہاشم کی مسکرا ہست غائب ہوئی۔ اس نے واقعی حرمت سے ابر و اٹھائی۔ ”لیکن یہ ایک ایکیڈنٹ تھا۔ علطی ڈرائیور کی نہیں تھی۔ پھر بھی

وہ دیت دینے کو تیار ہے۔“

”وہ ایک سوالہ سال کی لڑکی تھی جو اس ایکیڈنٹ میں مر گئی ہے ہاشم۔ ہم ٹرائل پر جار ہے ہیں۔“

اگر لڑکی کا خاندان دیت لینے پر راضی ہو گیا تب پر ایکیڈنٹ کا خیال ہو گا؟“

”تب پر ایکیڈنٹ اپنی جیب سے دیت۔ جتنی رقم ادا کر کے متاثرہ خاندان کو مجبور کر دے گا کہ وہ ٹرائل پر جائیں۔“

اوہ.... آپ خود یہ رقم ادا کریں گی ان کو؟“ اس نے مصنوعی حرمت سے ابر و اٹھائی۔

زمرہ پہلی دفعہ پورے دل سے مسکراتی۔

”میں نے کہا، ہم ٹرائل پر جار ہے ہیں، میں نہیں۔ سوری مگر آپ کو شاید معلوم نہیں یہ کیس میں پلین نہیں کر رہی۔ یہ پر ایکیڈنٹ بصیرت کا کیس ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش رہ گیا۔ ہنوزیں سکیڈ کراس نے واقعتاً اچنہ بھے سے زمر کو دیکھا اور پھر سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

”پچاس ہزار کا ہیٹر کٹ اور ڈھائی لاکھ کا سوت۔ آپ واقعی ایک منقسم مزاد خاتون ہیں۔“ بظاہر مسکراتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

”آپ نے جان بوجھ کر یہ کیس انہیں دے دیا کیونکہ جب انہیں معلوم ہو گا کہ ڈنیس میں ہاشم کا کردار ہے تو وہ کبھی اسے سیٹل نہیں کریں گے۔

”گذرویری گذ۔“ زمر نے مسکرا کر ابر و اچکائے۔

”میں معاف نہیں کیا کرتی ہاشم! یونو ڈیٹ۔ کیا میں اب بھی آپ کی پارٹی میں انوائندہ ہوں؟“

”بالکل! اور آپ سعدی کو بھی لا میں گی۔ ہمارے ذاتی تعلقات اس سب کی وجہ سے متاثر نہیں ہو سکتے۔“ وہ مسکرا کر اٹھا۔ کوٹ کا

ہن بند کیا۔ بار بار بجتا موبائل سائلنٹ کیا۔ پھر اسی رسان سے بولا۔ ”میں اس کیس کو سیٹل کروالوں گا۔ ہاشم سب سنبھال لیتا ہے، یونو ڈیٹ۔

ہا جو داس کے کہ بصیرت صاحب کے پاس آج کے بعد بہت وقت ہو گا۔“ اس نے سمندر میں دوسرا پھر پھینکا۔

”کیوں؟ آج کیا ہوا ہے؟“ اس نے دوبارہ سے فائلز کھول لیں۔

”ان کے کیس کا فیصلہ جو آگئی ہے۔“

”کس کیس کا؟“ وہ اب ایک سٹرکوانڈر لائنس کر رہی تھی۔ ہاشم نے جواب نہیں دیا۔ زمر نے دوسری سٹرکوانڈر لائنس کی۔ پھر ایک دم

اس نے پچونک کر سراخھا یا۔

”کس.... کس کیس کا؟“ اب کے سوال کی نوعیت مختلف تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ شاک اور اضطراب تھا اور چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ جیسے نہرے صحرائیں اچانک سے برف باری ہو جائے۔

”اوہ.... آپ کو نہیں معلوم تھا؟ مجھے بھی ابھی پتا چلا۔“ ہاشم کو جیسے بہت افسوس ہوا تھا۔

”کیا فصلہ آیا؟“ اس نے اگلی سانس میں پوچھا۔ وہ جگدے سے بھی نہیں اٹھی۔ گردن اٹھا کر ہاشم کو دیکھتی وہ بالکل ساکن تھی۔

”نات گلٹی۔ ہر لازام سے بری۔“ ہاشم نے ہمدردی سے سر جھکا۔ ”آئی ایم سوری۔“ پھر دوبارہ سے بجتے موبائل کی طرف متوجہ ہوتا ہر نکل گیا۔ کوریڈور میں آکر اس نے تلخ مسکراہست کے ساتھ اس کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔

”میں بھی معاف نہیں کرتا یو لعل نج!“ اور سر جھک کر آگے بڑھ گیا۔

اندر زمرا بھی تک اسی طرح بیٹھی تھی۔ صحرائیں برف باری ہنوز جاری تھی۔

..... ♦♦♦ .....

### یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم

دو پھر سے پھر میں بدل گئی۔ مگر اس جیل کا آہنی گیٹ دیساہی تپ رہا تھا۔ باہر نکل کر اس نے شہری آنکھوں کی پتلیاں سکیزیرے ادھر اُدھر کسی کوتلاش کیا اور پھر وہ اسے نظر آ گیا۔ دوڑ گاڑی کے دروازے سے نیک لگائے کھڑا سعدی۔ اسے آتا دیکھ کر سعدی بھی مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔ دونوں نے قدم قدم فاصلہ عبور کیا اور آئنے سامنے آئے۔ فارس اپنے بھانجے سے دو انچ لہا تھا۔

اس نے مصانغہ کے لیے ہاتھ یوں بڑھایا جیسے آرم ریسلنگ کے لیے پنجہ بڑھاتے ہیں۔ سعدی نے جوابی پنجہ اس کے ہاتھ سے ملایا۔ فتح کا نشان، سعدی مسکراہاتھا۔ فارس سنجیدہ تھا۔

”کہاں چلیں؟“ کار میں بیٹھ کر پہلا سوال سعدی نے پوچھا۔ ”ہمارے گھر یا کاردار زکی طرف؟“

”قبرستان۔“

سعدی نے ہوں کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ فارس نے ایک نظر دونوں کی سیٹوں کے درمیان گیئر کے ساتھ خانے میں رکھے سعدی کے موبائل کو دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”میں آؤں؟“ قبرستان کے سرے پر گاڑی روک کر سعدی نے پوچھا۔

”مجھے تھائی کی عادت ہے، وقت لگے گا۔“ یہ واضح تھا۔ کہہ کر وہ نکل گیا۔

سعدی خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس نے یہیں دیکھا کہ اس کا موبائل اب خانے میں نہیں پڑا تھا۔

قبرستان میں ان دو قبروں پر فاتح پڑھ کر وہ اٹھ گیا۔ پھر ایک درخت کی اوٹ میں آیا جہاں سے سعدی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس کے موبائل پنپرڈا نکل کیا۔

”ہاں اٹھنی.... غازی بول رہا ہوں۔“ بات کرتے ہوئے عادتا کان کی توکو دو انگلیوں سے مسل رہا تھا۔ ”ہاں میں باہر آگیا ہوں۔“ بات سنو دھیان سے۔ مجھے کچھ چیزیں چاہیں۔ کل شام تک تیار ہوں۔ میری گن، میرا چاقو۔ ایک بلیو پا سپورٹ۔ دو مختلف شاخی کا رذ میری تصویر اور میرے نام کے ہوں مگر گورنمنٹ ایشوڈ ہوں اور اس کے علاوہ...“ وہ جدید اسلحے کے چند نام گزانتا گیا۔ پھر کر جیسے اکتا ہست سے اس کی بات سنی۔

”جو کہا ہے وہ کر کے دو۔ زیادہ سوال مت کرو۔“ کال بند کر کے ریکارڈ منیا اور ایک آخری نظر ان دو قبروں پر ڈالی۔ زرتاب شفارس

غازیٰ وارث غازی۔ چند لمحے وہ وہاں کھڑا رہا۔ پھر ان دونوں سے کچھ بھی کہے بغیر والپس آگیا۔  
کار میں سعدی ادھر ادھر ہاتھ مارتا پکھ تلاش کر رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”پانہیں موبائل کدھر کھدیا۔“

”یہ... تہاری سیت کے پیچھے گرا ہے۔“ سعدی نے چونک کر دیکھا۔ اس کا موبائل کچھلی نشست کے نیچے گرا تھا۔ جیسے اگلے خانے سے سلپ ہو کر پیچھے گر گیا ہو۔ سعدی نے شکر کرتے ہوئے فون انٹھایا اور گاڑی اشارت کر دی۔

”کیا نہیں حیرت نہیں ہوئی کہ مجھ نے مجھے رہا کر دیا؟“ فارس کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ سعدی نے شانے اچکائے۔

”آپ نے وہ قتل نہیں کیے، میں جانتا ہوں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے؟ پوری دنیا تو یہی سمجھتی ہے۔ اور وہ مجھ... وہ اتنی آسانی سے کیسے مانا... مجھے حیرت ہے۔“ کہتے ہوئے مذکور غور سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔

”اگر تہارا اس میں کوئی ہاتھ ہے سعدی تو کہہ دو۔ میں سن رہا ہوں۔“

”میرا ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے؟ میری بات مجھ سے اور مانے گا بھی کیوں؟“ اس نے لاپرواں سے پھر شانے اچکائے اور ڈرانجیوں کرتا رہا۔

فارس نے ابتداء میں سر بلایا۔ ”مگر تم نے میری بات کی تردید نہیں کی۔ ٹھیک ہے۔“ اور کھڑکی کے باہر بھاگتے درختوں کو دیکھنے لگا۔ سعدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموش رہا۔

”تم بولو گے یا میں کسی دوسرے طریقے سے تمہیں بلواؤں؟“ اب کے فارس نے ذرا دھیسے لبھ میں خست بات کی تو سعدی نے بے زاری سے موڑ کاٹا۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ جو ہوا ہے قدرت نے کیا ہے۔“

”اچھا اور تہاری قدرت نے کیا کیا ہے؟“

”وہی جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ہمان کو فرعون کے خلاف کھڑا کرنا۔“

”کیا؟“ فارس نے ابر و تان کراکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ سعدی نے گہری سانس لی۔

”میرے پسندیدہ قصوں میں سے ایک ہے فرعون اور مویٰ علیہ السلام کا قصہ۔ وہ پھر کبھی بتاؤں گا لیکن اگر آپ نے کبھی کوئی کتاب پڑھنے کی زحمت کی ہو؛ جو کہ جیل میں آپ نے نہیں کی ہوگی، دوسروں کی بڑیاں اور دانت توڑنے سے فرصت جو نہیں ملتی ہوگی، تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ہمان فرعون کا ایک وزیر تھا۔ بہت داتا، بہت زور آور۔ فرعون کا دایاں ہاتھ۔ اس کا ہر حکم بجالانے والا۔ یہ سارے فرعون اپنے اپنے ہمانوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر ہم ہمان کو اپنی مٹھی میں کر لیں تو بہت سے کام نکل آتے ہیں۔ میں نے بھی بس میکی کیا تھا۔“ وہ بہمی بات کر کے پھر سے خاموش ہو گیا تھا۔ فارس سر جھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں گہری سوچ کی پر چھائیاں رقم تھیں۔

.....❖❖❖.....

دل کو لہو کریں کہ گریاں روکریں

اس بلند و بالا عمارت کے ناپ فلور کا وہ کشادہ اور پر تیش انداز میں آرائستہ آفس مکمل روشن تھا۔ پاور سیت پہ جواہرات میک لگائے انہی قمی اور زرمی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کریں پہ بیٹھے ہاشم کو دیکھ رہی تھی جو سر جھکائے موبائل پکھ جاتا ہے پکھ جاتا ہے کر رہا تھا۔

پچھے نو شیر و اں مضر ب، جن جھلایا ہوا ساٹھل رہا تھا۔ کسی پنڈو مم کی طرح۔ دائیں سے بائیں اور واپس دائیں۔

”مجھے وضاحت چاہیے ہاشم!“ جواہرات نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”تم اتنے بے خبر کیے ہو سکتے ہو کہ اس کے رہا ہونے سے پہلے تمہیں معلوم بھی نہ ہو سکتے۔“

”میں اراضی کے مقدمات میں مصروف تھا اور یہ سب اچانک ہوا ہے۔“ ہاشم نے فون رکھ کر کندھے ذرا جھٹک کر کہا۔ ”جس اسکندر کے تاثرات میں نے دیکھے تھے۔ وہ ذہن بنا کر آیا تھا۔ یقیناً اسے اس کام کے لیے پہلے سے راضی کر لیا گیا تھا۔“

”ان لوگوں کی اتنی حیثیت نہیں کہ اس با اثر بچ کو خرید سکیں۔“

”بجز صرف خریدے نہیں جاتے، ان کو مجبور کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔“

نوشیر و اں گھوم کر ہاشم کے سامنے آیا۔ ”اور اگر کسی نے اس بچ کو بلیک میل کیا ہے بھائی! تو وہ اس سعدی کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”پلیز شیر و... کیا ہم سعدی سے ہٹ کر کوئی بات کر سکتے ہیں؟“ مسکراتی ہوئی جواہرات کی آنکھوں میں بخت تسمیہ ابھری۔

”اس نے وہاں دس لوگوں کے سامنے میری بے عزتی کی اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے بھول جاؤں؟“ حسب عادت نو شیر و اں بھڑک اٹھا۔

”تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔“ مگر وہ ہاشم کی بات نہیں سن رہا تھا۔

”وہ مجھے جتارہا تھا کہ وہ میرے چالان کے متعلق جانتا ہے جو انگلینڈ میں ہوا تھا۔ وہ خود کو سمجھتا کیا ہے؟ مجھی میں آپ کو بتا رہا ہوں، آپ اسے پارٹی میں انواعیت نہیں کر رہیں۔ میں اس کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کروں گا۔“

”میں کارڈ دے چکا ہوں.... سوری....!“ ہاشم نے دلوں ہاتھا ٹھاکر کر کہا۔

”شیر و...! سعدی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ پارٹی میں آئے گا تو میں اسے دیکھ لوں گی۔ اپنے بیٹے کی بے عزتی کا بدلہ کیسے لینا ہے، مجھے معلوم ہے۔“ کہتے ہوئے آگے ہو کر زمی سے اس نے شیر و کا ہاتھ دبایا۔ وہ ذرا دھیلا ڈا۔

”مسئلہ فارس ہے۔ میں اسے اپنے ارگرد برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے بتاو ہاشم! تم اس معاملے کو حل کرنے کے لیے کیا کر رہے ہو؟“

ہاشم اب کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ بھی ڈسٹریب تھا۔ مگر کپوڑہ نظر آ رہا تھا۔

”میں نے اسے ایک دفعہ اندر کروایا تھا۔ دوسری دفعہ بھی کرو سکتا ہوں۔“

”وہ ایک دفعہ باہر آ سکتا ہے تو دوسری دفعہ بھی آ جائے گا۔ سو بہتر ہے کہ تم اس کے ساتھ اچھا کھیلو۔ وہ نہیں جانتا کہ قتل کس نے کیے تھے اور اس کے نزدیک ہم اس کی واحد نیلی ہیں۔“ جواہرات مطمئن نہیں تھی۔

”وہ نہیں کبھی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔“ نو شیر و اں اسکتا کہ کہتا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”اس لیے بہتر ہے کہ وہ ہم سے دشمنی نہ رکھے۔ کیونکہ باہر آنے کے بعد وہ سب سے پہلے یہ جانے کی کوشش کرے گا کہ وہ سب کس نے کروایا تھا۔“

”ہاشم سنجال لے گا۔ آپ کیوں فلکر کرتی ہیں؟“ ہاشم بہت اعتماد اور اطمینان سے پیچھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تب بھی جو کچھ کیا، اپنی فیملی کے لیے کیا۔ اب بھی اپنی فیملی کو پر ویکٹ کرنے کے لیے مجھے جو بھی کرنا پڑا، میں کروں گا۔ اپنی فیملی کے لیے کچھ بھی کرنا جرم نہیں ہوتا۔ اگر میں وارث غازی کو رستے سے نہ ہٹاتا تو وہ ہمارے خلاف کیسی کھول کر نہیں بتاہ کر سکتا تھا۔ اور وہ زرتاشہ، میں اس کو نہ مردا تا تو

اس قتل کو کسی آز رکھ کی شکل نہ دے سکتا۔ مجھے اس کے لیے افسوس ہے مگر میرے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ پھر جب قتل ہوتا ہے تو کسی کو تو جیل جانا پڑتا ہے۔ مجھے فارس سے ہمدردی ہے۔ اس کے چار سال ضائع ہوئے، مگر وہ ایک انتیل جنس آفسر تھا۔ اگر وہ اندر نہ جاتا تو قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اپنے خاندان کو حفظ کرنے کے لیے میں نے اسے بڑی رکھا تو کیا غلط کیا؟ وہ زندہ سلامت ہے، اس کا تو کچھ بھی نہیں گیا۔ اپنوں کو تو سب کھوتے ہیں۔ ہم نے بھی ڈیپ کو کھوایا تھا۔ بے شک نیچرل ڈیٹھ سے ہی سکی۔ مگر ہماری زندگیوں میں بھی دکھ میں پریشانیاں ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔ ان سب کے لیے۔ مگر زمر کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے اسے گواہی کے لیے زندہ چھوڑ دیا۔ وہ ٹھیک ہے۔ زندگی گزار رہی ہے۔ پرفیکٹ تو نہیں ہو سکتی نااب زندگی۔“

ہاشم نے بات کرتے ہوئے ذرا سے شانے اچکائے۔

”بہت سے لوگوں کی زندگی اگر دو چار کی قربانی سے نجاتی ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ میں فارس کو سنبھال لوں گا۔ اسے آنے دیں۔ ممی۔۔۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔ اوکے۔ وہ ایک جذبائی، غصے میں پاگل ہو جانے والا آدمی ہے۔ نہ اس میں عقل ہے نہ اس میں کوئی دور اندر لیش ہے۔ جیل میں رہ کر وہ کتنا بدلا ہو گا؟ ویسا ہی بد ماغ ہو گا۔ ایسے دمکن کو تو انسان تھکا تھکا کے ہی مار دیتا ہے۔“

پھر سید حاہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اب ہم تمہارے پرو جیکٹ کے بارے میں بات کر لیتے ہیں شیر و!“

اور نو شیر و اس نے جیسے کڑوی گولی نگل لی۔ وہ بے دلی سے کری کھینچ کر بیٹھا۔

”اور میرے پرو جیکٹ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والے بھی کون ہیں بھائی؟ سعدی اور اس کی بات۔“

ہاشم بے اختیار نہیں دیتا۔ ”یار یہ تمہارا اور سعدی کا کسی لڑکی پر مھٹڑا تو نہیں ہے؟“

جو اہرات نے مسکرا کر سر جھینکا اور بغور شیر و کے تاثرات دیکھے جو مزید خفا لگنے لگا تھا۔

”شیری... سو نیا کوب گھر لائے گی؟“ جو اہرات نے اسی کو دیکھتے ہا شم کو مخاطب کیا۔ شیر و ایک دم کوئی فائل اٹھا کر دیکھنے لگا۔ البتہ اس کی گردن میں ابھر کر ڈو تی گلٹی واضح محسوس ہوئی تھی۔

”اس وقت اس کا کیا ذکر؟“ ہاشم نے گویا ناک سے کھی اڑائی اور کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

.....♦♦♦.....

جور مچشیں تھیں جودل میں غبار تھا، نہ گیا

اس درمیانے درجے کے بنگلے کے لاڈنخ کی بڑی سی کھڑکی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ شیشہ آئینہ بنا لان کا عکس دکھارتا تھا۔ کھڑکی سے چہرہ لگا کے دیکھو تو اندر وہ تھکنی سی چیزیں اٹھائے داخل ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ درمیان سے ماگ نکال کر گھنگھر یا لے بال کچر میں ہاں باندھے، وہ جھوٹی لٹ کان کے پیچھے اڑتی کپکن کے دروازے تک گئی۔

”صداقت! کھانا تیار ہے؟“

”جی باجی... بس روئی ڈال رہا ہوں۔“

”پھر کھانے کے بعد... سعدی کی طرف جانا، ایک کام ہے۔“

لاڈنخ میں وہیل چیز پر کتاب پڑھتے ہوئے ابا نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب واپس آ رہی تھی۔

”دن کیسا گزر اتمہارا؟“ انہوں نے معمول کا سوال کیا۔

”بس روزمرہ کے کام تھے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ کر جو توں کا اسٹریپ کھولتے ہوئے بولی۔

”ساعت کیسی رہی؟“

”ہاشم کاردار کا کلاں تھا۔ کیسی ہو سکتی تھی؟“ ابا کے کتاب پر بچھے چہرے پہ ناگواری ابھری۔

”ہر کرپٹ اور گناہ گارا دمی اسی کا کلاں تھا کیوں ہوتا ہے؟“

”وہ ایک اچھا ڈینس لائز ہے ابا! اسے گناہوں کی جستی فلکیش دینا آتی ہے۔“ وہ پھر اتار کر بال جوڑے میں باندھنے لگی۔

”مجھے وہ سخت ناپسند ہے۔ انہائی جھوٹا اور مکار آدمی ہے۔“

”سو تو ہے۔“ زمرنے تائید کی۔

بڑے ابا نے کتاب پرے کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”سعدی سے کیا کام ہے؟“

”ہاشم نے اپنی بیٹی کی سالگردہ کا کارڈ دیا تھا سعدی کے لیے۔ وہی دنیا ہے۔“ وہ سرسری ساتھا کر ریموت اٹھا کر چینل بدلنے لگی۔

”تو تم دے آؤ۔“ انہوں نے ایک دم اتنی امید اور اتنی منت سے کہا کہ زمرنے بے اختیار ان کو دیکھا۔

”میں نہ بھی جاؤں تو فرق نہیں پڑتا۔ میں اس سے ناراض نہیں ہوں ابا!“

”تو پھر چلی جاؤ۔ اس کی سالگردہ پر ہی وش کر دینا۔“

زمرنے ان کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ اس نظر آرہی تھیں۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

”وہ چھوٹا ہے۔ تم تو بڑی ہو۔ اگر اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو تم معاف کر دو۔ وہ تمہاری بیماری میں تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ واقعی یہ اس کی خط تھی۔“

”میں کب کا معاف کر چکی۔ میں اس کے خلاف بر انہیں سوچ سکتی۔ وہ میرا بیٹا ہے ابا۔“

”تو کا رذم خود دے آؤ۔ زندگی کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ کون کب چلا جائے اور دوسرا کوتا زندگی پچھتا وہی رہے۔“

وہ بنا کچھ کہے اٹھ گئی۔ اباد کھسے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ انہوں نے پھر کتاب نہیں اٹھائی۔ وہ کمرے میں جاتے صداقت کو آواز دیتی گئی۔ ”میری روٹی مت بنتا۔“ اور وہ مزید دلکھی ہو گئے۔ اب اس کا مہوذ بگڑ پکھا تھا اور وہ کھانا کھائے بغیر کمرے میں بندھو جائے گی۔

”سُندرہ منت بعد وہ کپڑے بدلت کر فریش ہو کر کمرے سے نکلی تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کھانا نہیں کھانا؟“

”کیا آپ کا پوتا مجھے کھانا بھی نہیں پوچھے گا؟“ عام سے انداز میں سنجیدگی سے کہہ کر اس نے میز سے کارڈ اٹھائے اور پرس کندھے پر

ڈالا۔

ابا جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ آنکھوں میں تحریر بے یقین ابھر کر معدوم ہوئی اور اس کی جگہ خوشنگوار تدبذب نے لے لی۔ جیسے کوئی خواب میں آنکھ کھلنے کے ذریعے صحیح سے خوش بھی نہ ہو پائے۔ ایک دم ان کا چہرہ بجھا۔

”کیا تمہیں پتا چل پکھا ہے کہ فارس رہا ہو چکا ہے؟“

وہ جیسے ٹھنڈی سانس لے کر دروازے سے پلٹی۔ ”اگر آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں سعدی سے یہ پوچھنے جا رہی ہوں کہ فارس کیسے رہا تو ایسا نہیں ہے۔ میں اتنی اشہریت فارود ہوں کہ اگر مجھے اس سے کچھ بھی پوچھنا ہو تو میں چار منت کی کال کر کے بغیر تمہید کے بھی پوچھ سکتی ہوں۔ ابھی مجھ سے ہاشم نے ایک فیور انگاہ ہے اور میں اسے وہی دینے جا رہی ہوں۔“ اسی سنجیدگی سے کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

ابا کے چہرے پر خوشنگوار حیرت ابھر آئی۔ صداقت بھی بھاگ کر چوکھت میں آکھڑا ہوا تھا اور اب ان ہی حیران مگر سرت آمیز نثارات کے ساتھ ان کو دیکھ رہا تھا۔

یہی ہے جب تک یہی ہے اختیار کا موم

خین اور اسماء تب سے فارس کے گرد بیٹھے تھے جب سے وہ آیا تھا۔ سعدی خاموشی سے گول میز پر ان کے مقابل بیٹھا تھا۔ ”ماموں....! کیا وہ دوبارہ تو آپ کو نہیں لے جائیں گے؟“ خین نے جھکتے ہوئے انجانے خوف کے زیر اثر سوال کیا۔ فرنچ چوٹی اور ماتھے پر کئے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ اب گھر کے لباس میں تھی۔

فارس ہلکا سامسکرا یا۔ ”نہیں۔“ ساتھ ہی سعدی کو دیکھا۔ سعدی نرمی سے مکرا دیا اور پھر دوسرا جانب دیکھنے لگا۔

”اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گے نا؟“ سیم نے اشتیاق سے پوچھا۔

”میرے لیے اچھا ہوگا اگر میں اپنا گھر کھلوں۔“

”کیوں جاتے ہو ادھر؟ میں رہوں۔“ ندرت نے ناراضی سے کہتے میز پر مژقہ کا ذونگار کھا کھانا بس لگ ہی چکا تھا۔

”مجھے بہت سے کام کرنے ہیں آپا! مگر آتا جاتا رہوں گا۔“ وہ سنجیدگی بھرے سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ عموماً دھیما بولتا تھا، چھوٹے چھوٹے فقرے، لیکن غصہ چڑھنے پا اواز بلند ہو جاتی تھی۔

ندرت نے تازہ چپاتی لا کر کھی ہی تھی کہ فارس ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ گیا۔ ویسے بھی وہ لباس تبدیل کر چکا تھا۔ جیز کے اوپر بُنؤں والی شرٹ بال اسی طرح پونی میں مقید۔ سعدی نے پیچے سے آواز لگائی۔

”ماموں! آپ کو ہمیر کث کی اشد ضرورت ہے۔“

”نہیں۔ ماموں اس ہمیر شائل میں زیادہ اچھے لگ رہے ہیں۔“ خین نے فوراً مخالفت کی۔ ساتھ ہی وہ پلیٹ سے کھیرے ٹو ٹوگ رہی تھی۔ اسماء نے اس کے ہاتھ کو پرے کیا۔ اس نے غصے سے اسماء کو دیکھا۔ ”کیا ہے؟“

”ابھی کھانا شروع نہیں ہوا۔ تم کیوں کھارہی ہو؟“

”تمہارے حصے کا تو نہیں کھارہی۔ زیادہ ٹوکا مت کرو ورنہ تمہاری دم باندھ دوں گی۔“

”میری کوئی دم نہیں ہے۔“ وہ غصے سے کھتا کھڑا ہوا۔

”بس!“ سعدی نے ایک دم سنجیدگی سے کہا۔ لیکن ایک لفظ اور وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

”کتنی دفعہ کہا ہے مرتلا کرو آپ میں، مگر جمال ہے جو۔“ ندرت کی بات گھنٹی کی آواز نے کاٹ دی۔ فارس اسی وقت واپس آتا دھکائی دیا تھا۔ اسماء بھاگ کر دروازے پر گیا اور اس کے ساتھ کھڑکی کا پردہ سر کا کردیکھا۔

”کون ہے اسماء؟“ سعدی نے بیٹھے بیٹھے پوچھا، مگر اسماء نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن وہیں کھڑا رہا۔

”اسماء! کون ہے؟“ ندرت نے سوال دھرا یا۔ فارس بھی اس طرف دیکھنے لگا۔ اسماء آہست سے ان کی طرف پلتا۔

”پھول لائی ہیں۔“

”کون؟“

”پھپھو۔ زمر پھپھو آئی ہیں اور پھول لائی ہیں۔“

چند لمحے کے لیے راہداری میں ستاتا چھا گیا۔ جیسے سانس آنا بھی بند ہو گیا ہو۔ ندرت پلٹیں لگاتی رک گئیں۔ خین کا کھیرا اٹھا تاہاتھ رک، پھرہ بالکل سپاٹ ہو گیا۔ البتہ سعدی تیزی سے دروازے کی طرف گیا۔ فارس نے باری باری سب کو دیکھا۔

”سعدی!“ اس نے بے اختیار اسے روکا۔ ”میں کمرے میں ہوں۔“ ساتھ ہی نگاہوں سے اشارہ کیا، جیسے نہ ملنا چاہتا ہے، نہ اس کی آمد کی خبر کی جائے۔ سعدی نے سمجھ کر سر ہلایا۔

خین پچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ ہننوں کھنگ کیں، چہرے پر خنکی چھا گئی۔

دروازہ ٹھلنے پر باہر کھڑی زمر نے سراخایا۔ ٹھنکریا لے بال ہاف باندھے وہ زرد چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ بازوں میں سون کے پھولوں کا بو کے تھا۔ بدقت مسکرائی۔ اسی پل ناک کی لوگ چمکی۔ آنکھیں بھی چمکیں۔

”سالگرہ مبارک ہو سعدی!“ پھول اس کی طرف بڑھائے۔ سعدی ابھی تک سکتے میں تھا۔ پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔ آنکھوں میں بے پناہ حیرت اتر آئی۔

”تھینک۔ تھینک یوچھو۔ آئیں نا اندر!“ کسی معصوم بچے کی طرح خوش ہوتا سعدی ہنا اور اسے راستہ دیا۔ زمر کی مسکراہٹ معدوم ہوئی۔ نرم تاثرات والے چہرے کے ساتھ متذبذب سی اندر واپس ہوئی۔ جس گھر میں چار سال تک قدم نہ رکھا تھا، وہاں چار قدم بھی مشکل سے پڑ رہے تھے۔

”زمر.... کیسی ہو؟“ ندرت فرط مسرت سے نہال اس سے آ کر ملیں۔ پھر ڈائنسنگ چیر پیش کی۔ زمر نے ایک لمحے کو گول میز کو دیکھا جہاں کھانا چنا تھا۔ گن کر پیشیں رکھی تھیں۔ ایک فیلمی کھانا کھانے ہی والی تھی۔ اس نے فنی میں سر ہلاایا۔

سعدی نے اصرار کیا۔ ”تھوڑا سا لے لیں۔“ مگر وہ وہاں نہیں بیٹھی۔

”میں کھانا کھا بچی ہوں۔“ شائستگی، نکف، تذبذب، خین کی آنکھوں میں ناراضی گھری ہوئی۔ بہر حال اس نے اٹھ کر ڈرائنسنگ روم کم لاڈنخ کا دروازہ کھولا۔

”کیسی ہو خین؟“

خین جیسے اس سوال پر ڈسرب ہوئی تھی مگر پھر سپاٹ چہرے کے ساتھ ”ٹھیک“ کہہ کر اندر صوفے کی طرف ہاتھ کیا۔ ”بینیں۔“ زمر اسی نکلف سے صوفے کے کنارے ناگ پٹا ناگ رکھے بیٹھ گئی تو اسامہ آ کر ملا۔ وہ جیسے اب ذرا کھل کر مسکرائی۔ اس کا گال چوما۔ پھر پیشانی سے ٹھنکریا لے بال زمی سے ہٹا کر بولی۔ ”کیسے ہو اسامہ؟“

چوکھٹ میں کھڑے سعدی کی مسکرائی آنکھوں میں تکلیف سی ابھری۔ ایک پرانا منظر ان میں جھملایا۔

اسکوں یونیفارم میں ٹھنکریا لے بالوں والا لڑکا بیٹھ کے پاس کھڑا تھا۔ اور گھننوں کے بل اس کے سامنے یونیفارم میں ایک لڑکی بیٹھی تھی اور اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”کس نے مارا ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں ابھی اس کو دیکھتی ہوں۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ ہمارے سعدی کو مارے؟ ادھر دیکھو۔ روؤ مٹ۔ میں ہوں ناقہ مارے ساتھ تھا۔ سپورٹ اور پر ٹیکشن کے لیے۔“ وہ فکر مندی اور غصے سے کہر رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ؟“ اسامہ کی شرماتی آواز پر وہ چونکا۔ پھر سامنے آ کر بیٹھ گیا اور پھولوں کو میز پر رکھ کر بولا۔

”آپ کو یاد تھا مجھے سون پسند ہیں۔“

زمر نے سر کو ختم دیا، بولی کچھ نہیں۔ ندرت کھانے پا اصرار کرنے لگیں، پھر چائے پر وہ بس ایک کپ کے لیے راضی ہوئی۔ خین سعدی کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی، شکوہ آ میز نظروں سے پچھوکو دیکھتی، مگر خاموش۔

”مجھے یہ کارڈ دینا تھا۔ ہاشم نے دیا ہے۔ تمہارے لیے۔“ کہتے ہوئے اس نے کارڈ سعدی کی طرف بڑھایا۔ سعدی تو چونکا ہی، خین زیادہ چوکی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

”ہاشم کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ اس نے بہت اصرار کیا تھا تو میں نے تمہاری طرف سے ہائی بھری۔ مجھے امید تھی کہ تم لوگ آؤ گے۔“

خین سعدی کے کندھے پر سے جھک کے کارڈ دیکھنے لگی۔ سعدی کے تاثرات وہ نہیں رہے تھے۔ اس نے بالکل خاموشی سے سیاہ

کارڈ پر سنہری عبارتیں پڑھیں۔ پھر کارڈ جنین کی طرف بڑھادیا۔

”ہاشم بھائی مجھے اپنی پارٹی میں کیوں دیکھنا چاہیں گے پھچھو؟“

”تم اس کے رشتہ دار ہو۔“

سعدی پھیکا سامسکرا یا۔ ”ہاشم بھائی کے ذہن میں ہر کام کی کوئی خاص وجہ ضرور ہوتی ہے۔ بہر حال آپ ان سے مغذرت کر لیجئے گا۔ ہم نہیں آسکیں گے۔“

کارڈ پر حصی جنین نے بے اختیار سعدی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دم بجا تھا۔

”گھر کی بات ہے سعدی! پہلے بھی تو جاتے رہے ہوان کے گھر تو....“

”گھر میں ہے فناشن؟“ سعدی نے چونا سا ہو کر بات کالی اور تیزی سے کارڈ لے کر جیسے قدم دین کی۔ آنکھوں میں کچھ چکا تھا۔ پھر وہ سنبھل گیا۔

”اوے کے.... ہم.... آئیں گے۔“ وہ نارمل انداز میں مسکرا یا۔

جنین ساری ناراضی بھول کر دوبارہ کارڈ دیکھنے لگی۔ اسماء بھی آکر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”بیک اور گولڈ تھیم ہے۔ مطلب ہم صرف سیاہ یا سنہری لمباں پہن سکتے ہیں۔“ وہ اسماء کو بتانے لگی۔ پھر ایک دم اس نے سعدی کے ساتھ کو دیکھا جس میں اس نے کی چین پکڑی ہوئی تھی۔ زمر بھی وہی دیکھنے لگی۔ اور سعدی نے بھی گردان جھکا کر اسے ہی دیکھا۔

دو تین چاپیوں کے ساتھ رنگ میں ایک تین انچ کا سیاہ مصنوعی ڈائمنڈ سا پرویا تھا۔ وہ دو انچ موٹا تھا اور اوپر سے گول نیچے سے تکون تھا۔ کسی ہیرے کی طرح وہ روشنی منعکس کرتا تھا۔ اس پر سنہری حروف میں لکھا تھا۔

#### Ants Everafter

(ہمیشہ کے لیے چیونیاں)

زمر کے بیوی پا دا اس مسکراہٹ ابھری۔

”تم ابھی تک چیونیوں پر یقین رکھتے ہو؟“

”میں انہی چیزوں کے لیے جیتا ہوں جن پر یقین رکھتا ہوں۔“ اسی اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہتے سعدی نے سیاہ ہیرے کو دیکھا۔

چائے آئی اور ساتھ کتاب، کیک اور دو ایک چیزیں۔ مگر ندرت کے اصرار کے باوجود زمر نے صرف پیالی انٹھائی اور گھونٹ گھونٹ پینے

کی۔

”یہ... کارڈ ارز کرتے کیا ہیں؟ ان کا بنس کس چیز کا ہے؟“ کارڈ میں جو جنین نے پوچھا۔ اس کی نظریں نیچے لکھے ہاشم کے نام اور ماتھ درج موبائل نمبر پر جھی تھیں۔

ایک دم سے بچلی چلی گئی اور ہر روشنی کے بچھ جانے کی خاموش آواز سنائی دی۔ پھر یوپی ایس پرستی حلی اور پنکھا گزگز کرتا گھونٹ منے لگا۔ عدی بلکہ سامسکرا یا اور سر جھٹکا۔

”وہ ایک آئکل کارٹیل کے سر برآ ہیں۔“

”کارٹیل کیا ہوتا ہے؟“ جنین نے بے اختیار پوچھا۔ پھر جیسے اپنی کم علمی پہچھو کے سامنے شرم مندہ ہوئی۔

”ایسے سمجھو جیسے مارکیٹ میں برگر کی تین دکانیں ہوں۔“ زمر نے نرمی سے کہنا شروع کیا۔ ”اور دو دکانیں پچاس کا برگر پیچیں اور ایک چالیس کا۔ تو زیادہ کس کے بکیں گے؟“

”چالیس والے کے۔“ خین کے لبوں سے پھسلا۔ وہ ساری ناراضی بھول گئی تھی۔

”ہالکل! مگر کم قیمت کے باعث چالیس والا بھی منافع زیادہ نہیں کہا سکے گا۔ اور باقی دونوں ویسے ہی نقصان میں رہیں گے۔ سو یہ تینوں یوں کریں گے کہ مل کر ایک گروپ یعنی ایک Cartel ہالیس گے اور یہ طے کر لیں گے کہ تینوں دکانیں ایک ہی قیمت پر برگری پیشیں گی۔ یوں تینوں کو کاروبار ملے گا۔“

”اور تینوں جب چاہے قیمت اکٹھی بڑھا دیں۔ لوگوں کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہو گا تو وہ مہنگا خریدنے پر بھی مجبور ہوں گے۔“ سعدی نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”اور ہاشم بھائی یہی کرتے ہیں۔ وہ ملک کی تمام آئنکمپنیز کے کارٹیل کو لید کرتے ہیں۔ اور یہ تیل سے بھلی بنا کر حکومت کو بیجتے ہیں۔ اور ان کا جب دل کرتا ہے، یہ بھلی کی قیمت بڑھادیتے ہیں۔ اور پھر یہ ہوتا ہے!“

اس نے ابرو سے عکھھے کی طرف اشارہ کیا جو یوپی ایس پر چل رہا تھا۔ زمر نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔

”میرا نہیں خیال کر ازر جی کر ائسر کی وجہ آئنکمپنیز ہیں۔“

”یہ تھرکوں پر اجیکٹ کے سامنے دنوں اور آئنکمپنیز کے مغرب اور امیرا گیز میکٹیوں کی جنگ نہیں ہے، پھر یہ کوئے اور تیل کی جنگ ہے۔ مجھے یقین ہے ہاشم پارٹی میں سنہری رنگ پہنچنے گا۔ ایک بھی کی سالگرہ کو بلیک اور گولڈ کا ٹچ دے کر وہ لوگ صرف دنیا کو اپنے مضبوط اعصاب دکھانا چاہتے ہیں۔ سیاہ اور سنہرہ ایعنی کولنہ اور تیل۔“

وہ زندگی سے ہبھر ہبھر کر بول رہا تھا۔

”اینی ویز، اب میں چلتی ہوں۔“ اس نے جیسے کسی بات میں دلچسپی نہیں لی۔ بس اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔ خین نے کارڈ چھوڑ دیا۔ چہرہ پھر سے بھج گیا۔ سعدی چپ ہو گیا۔ اسے لگا جیسے اس کی صاف گوئی نے اسے ناراض کر دیا تھا۔

”کچھ دری تو بیٹھو!“ ندرست اصرار کرنے لگیں مگر اس کا کہنا تھا کہ اگلے ہفتے تفصیل سے پارٹی پر ساتھ بیٹھیں گے۔ سعدی اسے دروازے تک چھوڑنے لگا۔ واپس آیا تو خین اکیلی لاونچ میں بیٹھی تھی۔

”چار سال بعد آئیں اور چالیس منٹ بھی نہیں بیٹھ سکیں!“ وہ بڑا بڑا۔

”ایسے نہیں سوچتے خین!“ وہ جیسے ہرست ہوا تھا۔

”مگر میں تو ایسے ہی سوچتی ہوں بھائی! آپ کا دل بہت بڑا ہے۔ آپ بھول سکتے ہیں مگر مجھے یاد ہے۔ پھر ہمیں تب چھوڑا جب ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ ہمارے ماںوں بے گناہ تھے، مگر پھر ہمیں ان کو گناہ کار مانا۔ اور اس لیے آپ بھی زیر عتاب آئے۔ مگر یہ زاری تو آپ کی ماںوں اور پھر کوئی تھی، میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ میرا کیا قصور تھا؟ مجھے کیوں چھوڑا؟“ بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سعدی کا دل بے حد دکھا۔

”انہوں نے بہت کچھ لوز کیا ہے اس سب میں۔ ان کی صحبت، ان کی شادی، ان کی زندگی، سب ختم ہو گیا۔“

”تو کیا میں نے کچھ لوز نہیں کیا؟ میں نے پھر کو لوز کیا ہے بھائی۔ ان چار سالوں میں کتنے ایسے دن آئے جب مجھے ان کی ضرورت تھی۔ پھر ہمہ ماں ہوتی ہے نہ بہن۔ وہ ان دونوں سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ میری تو کوئی بہن بھی نہیں تھی۔ میرا بھی دل چاہتا تھا میں ان سے بہت کچھ شیز کروں۔ وہ میری بات سنیں۔ مگر وہ اب ہماری پروانیں کرتیں۔ انہوں نے ہمیں تب چھوڑا جب ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ یونو واث بھائی! اب ہم بڑے ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہی۔ میں وہ خین نہیں ہوں جو ان کے جانے کے بعد دیر تک کھڑکی سے ان کی راہ نکلتی تھی کہ شاید وہ کچھ بھول گئی ہوں، تو واپس آئیں۔ میں بھی اب ان کی پروانیں کرتی۔“

اس نے رخ موڑ لیا۔ سعدی نے کچھ کہنا چاہا، پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ابھی بیچ راہداری میں تھا کہ کسی احساس کے تحت واپس آیا

اور دھیرے سے لاڈنچ کے اندر جھانکا۔

خین کھڑکی کا پردہ سر کائے باہر دیکھ رہی تھی، دور سڑک پر جیسے کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ کسی کے بھول کے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

جو۔

سعدی کی آنکھوں میں اداسی اور لمبیں پر مسکراہٹ در آئی۔ وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ راہداری میں واپس چلتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑے سیاہ اور سنہرے کارڈ کو دیکھا۔

ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے جھملایا۔

ہوٹل کی لامبی زرد روشنیوں میں چکر رہی تھی۔ چار پانچ سوٹ میں ملبوس افراد خوشنگوار انداز میں ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ ان میں ایک ہاشم کا ردار بھی تھا جو کسی سے مسکرا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ ہاشم کے پیچھے اس کی سیکریٹری کھڑی تھی جس نے ایک ہاتھ میں ہاشم کا لیپ ناپ اٹھا کر اٹھا اور وہ ہاتھ پہلو میں گرا ہوا تھا۔ وہ بھی سامنے مسکراتے ہوئے مینگ کے لیے آئے افراد کو دیکھ رہی تھی۔

دور سے جیز شرٹ اور پی کیپ میں ملبوس سعدی چلتا ہوا آیا۔ اس کا سر جھکا تھا۔ وہ اسی طرح سیکریٹری کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ سیکریٹری وہیں متوجہ رہی۔ اس نے نہیں دیکھا کہ لڑکے کے گزرنے کے بعد لیپ ناپ کے سایہ میں ایک فلیش ڈرائیوگ چکی تھی۔

سعدی ایک قریبی میز پر جایا۔ کندھے سے بیگ اتارا۔ اندر سے ٹیکٹ نکالا اور اس پر مختلف جگہیں انگلی سے پر لیں کرنے لگا۔ اسکرین پر پیغام آ رہا تھا۔

”آپ کی ڈیو اس کو ایک ہارڈ ڈرائیو میلی ہے۔ کیا آپ سارا ڈیٹا کا پی کرنا چاہیں گے؟“

سعدی نے مسکراتے ہوئے ”لیں“ دبایا۔ اگلے ہی لمحے اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اسکرین پر پیغام جل بجھ رہا تھا۔

”پاس ورڈ داخل کریں۔“

”اوہ نہیں یار...“ اس نے بے بی سے مڑ کر دیکھا جہاں وہ لوگ ابھی تک کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ اسے کیوں خیال نہیں آیا کہ ہاشم کے لیپ ناپ پر پاس ورڈ ہو سکتا ہے۔

وہ جلدی سے سب سمیٹ کر اٹھا اور سر جھکائے ان کے قریب سے گزر اور سیکریٹری سے ٹکرایا اور خفیف سا سوری کہتا آگے بڑھ گیا۔ ہاشم نے چونک کرائے دیکھا اور پھر دو تک سوچتی نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا۔

”چل گئیں؟“ فارس کی آواز پر سعدی چونکا۔ اس کے سامنے فارس کھڑا رہا۔

”ہوں!“ اس نے کارڈ بڑھایا، جیسے پھرپھو کے آنے کا مقصد بیان کیا ہو۔ فارس نے سرسری سادیکھا اور پھر گول میز تک آگیا۔ خین اسماں سب واپس آگئے۔ ذرا سی ہچل کے بعد زندگی جیسے پھر نارمل روئین پر آگئی تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

اب نہ فرستہ ہے نہ احساس ہے غم سے اپنے

آسمان پر سیاہی پھیل رہی تھی۔ وہ اسٹڈی نیبل پر فائلز پھیلائے بیٹھی تھی۔ بلکی سی آہٹ نے اسے سراٹھانے پر مجبور کیا۔ ابوہیل چیزِ محنتیہ اندر آ رہے تھے۔ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

”آپ کے بلا نے پنہ آتی جو آپ خود آگئے؟“ رسان سے شکوہ کر کے وہ وہیں چیز پیچھے سے تھامے سامنے لائی، اور پھر خود مقابلہ میں فپاؤں اور پکر کے بیٹھ گئی۔ بڑے ابا منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیا اس نے کھانا نہیں پوچھا جو شام میں تم نے واپس آ کر کھایا؟“

”میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں کھا کر آؤں گی۔ کھانا میز نہیں کرتا۔“ گھنگھر یا لٹ اٹ انگلی پر لپیٹتے اس نے جواب دیا۔

”کیا وہ خوش تھا؟“

”آپ کو دن میں دو دفعہ تو فون کرتا ہی ہے، پوچھ لیجیے گا۔“

پھر دونوں کے پتچ کھڑکی کے باہر پھیلی رات جیسی خاموشی چھا گئی۔ اباً فکر مندی و تاسف سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”پھر بات آپ نے شروع کرنی ہے یا میں نے؟ اور اگر آپ نے کی تو کتنے فردوں کی تہبید باندھیں گے؟“ اس نے اطمینان سے پوچھا۔

”زمر... شادی کرو۔“ وہ آزردہ سے بولے۔

”آج آپ نے تہبید ہی نہیں باندھی۔“ اس نے کشن اٹھا کر گود میں رکھا۔

”کب تک اس ٹوٹے رشتے کا سوگ مناؤ گی میری بیکی! میری موت آسان کر دو اب بس کر دو۔“

”آپ جانتے ہیں میں جذباتی بلیک میلنگ میں نہیں آیا کرتی۔ جب مجھے کرنا ہوگی، میں بتا دوں گی۔ ویسے بھی اب میں بوڑھی ہو رہی ہوں۔ کون کرے گا مجھ سے شادی؟“

”دو چار سال میں واقعی بوڑھی لگنے لگوگی۔ میں اس تکلیف کے ساتھ نہیں مرتنا چاہتا۔“

”اوکے اباً صاف بات کرتے ہیں۔“ اس نے کشن پرے رکھا، پیر نیچے کیے تا نگ پٹا نگ جمالی بال کا نوں کے پیچے اڑ سے اور گہری سانس لی۔ وہ واپس ڈسٹرکٹ پر اسکیوٹر کے روپ میں چل گئی تھی۔

”آپ میری شادی کسی بھی ایکس وائی زیڈ سے کراؤں گی، میں کرلوں گی۔“ پھر چند دن میں مزید بدول ہو جاؤں گی۔ زیادہ بیزار اور نیخ۔ وہ مجھ سے توقعات باندھے گا جو میں پوری نہیں کروں گی۔ میں ایسی ہی رہوں گی۔ وہ شروع میں برداشت کرے گا، کہے گا ماضی بھلا دو۔ میں کہوں گی شادی جب کی تباہی اس اس فیز سے نہیں نکلی تھی؛ بھی وقت لگے گا۔ وہ صبر کر لے گا۔ مگر پھر جلد ہی صبر کھو دے گا۔ غصہ کرے گا، ہاتھ اٹھائے گا، نفرت کرے گا، تین ماہ میں گھر سے نکال دے گا، اور میرے بیہن آکر بیٹھی ہوں گی۔ اب بتائیں آپ کے لیے کیا زیادہ تکلیف دہ ہو گا؟“

ابا نے دکھ سے اسے دیکھا۔ ”کیا تم اپنی شادی کو کامیاب بنانے کی کوئی کوشش نہیں کرو گی؟“

”اس فیز سے نکلی ہی نہیں تو کیسے کروں گی؟“

”کب نکلوگی اس فیز سے؟“

”آپ مجھے جانتے ہیں۔ جب میرے اوپر کچھ طاری ہو جائے تو میرے لیے اس کو جھکلتا ناممکن ہوتا ہے۔ میں اسی کو اپنی زندگی بنا لیتی ہوں۔ اور جب آخری دفعہ ہم نے یہی بحث کی تھی تو دو دن تک ایک دوسرے سے بات نہیں کی تھی۔ اس دفعہ کتنے دن کا ارادہ ہے؟“

ابا نے آہستہ سے اثبات میں سرہلا دیا۔ ”مگر تم کوشش تو کرو گی نا اس فیز سے نکلنے کی؟“

”میں چار سال سے کوشش کر رہی ہوں۔ میں بہت ٹراما سے گزر رہی ہوں۔ میرے گردے ضائع ہو گئے، تیار شادی کینسل ہو گئی، وہ حماد مجھے چھوڑ کر چلا گیا، یہماری کے عالم میں وہ وقت بہت برا تھا ابا! میں آگے بڑھنے کی تھی جب تک اس وقت کو بھلانہ دوں۔ مجھے کچھ نامم دیں۔“ وہ سرہلاتے ہوئے واپس پٹ گئے۔ زمر دکھ سے ان کو جاتتے ہوئے دیکھتی رہی گروہ خود بھی بے بس تھی۔

رات کا سیاہ پر دہ سارے گناہ سارے عیب ڈھانپ چکا تھا۔ ایسے میں کاردارز کے اوپر چھر کی ساری بیالی روشن تھیں۔ جواہرات باریک ہیل سے تیز تیر چلتی ڈائینگ ہال میں آئی تو قطار میں کھڑے ملازم جیسے اسی کے منتظر تھے۔

فیونا نے آنکھ سے ایک سر جھکائے کھڑی فلپائنی ملازمہ کی طرف اشارہ کیا۔ جواہرات مسکراتی ہوئی اس کے قریب گئی تو اس فلپائنی میری اینجو نے سراخایا۔ پھر ندامت سے جھکا لیا۔

”کیا تم اس جو ہری سے میرا نیکلس لے آئی ہو جس کو تم نے وہ بچا تھا؟“ سردی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پوچھا۔

میری نے سرخ مورم آنکھیں اٹھائیں۔ ”لیں میم!“ اور ڈب آگے کیا۔ پھر کھولا۔

جواہرات نے دو انگلیوں پوہ نیکلس اٹھا کر دیکھا۔ ہیرول کاناڑ نیکلس ویساہی تھا۔

”اور تمہاری چوری کا علم ہونے پر میں نے تم سے کیا کہا تھا؟“ وہ انگلیوں میں مسل کر نیکلس کو دیکھ رہی تھی۔

”یہی میم... کہ اگر میں نیکلس واپس لا دوں تو آپ میری ایجنٹی نہیں بتائیں گی اور میں باعزت طریقے سے اپنے ملک واپس جا سکوں گی۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

جواہرات نے شیرنی جیسی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تو پھر خوش ہو جاؤ۔ کیونکہ میں تمہاری ایجنٹی کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکی ہوں۔ کل تمہیں یہاں سے ڈی پورٹ کر دیا جائے گا اور تم دوبارہ زندگی بھری یا تو کری نہیں کر سکو گی۔ کیونکہ میرے نزدیک اس کی اہمیت یہ تھی۔“ کہتے ہوئے جواہرات نے نیکلس اچھال دیا۔ وہ اڑ کر ایک مصنوعی پودے کے گلے میں جا گرا۔

”وفاداری سے بڑھ کر کسی چیز کی اہمیت نہیں ہوتی میری! اب تم جاسکتی ہو۔“

اس نے تمکنت سے فیونا کو اشارہ کیا۔ جو شاکڈ اور صدمے سے چور میری کوہاں سے لے جانے لگی۔

کسی ملازم میں بہت نہیں تھی کہ گلے میں کرنے نیکلس کو دیکھ بھی لیتا۔ جواہرات اسی طرح چلتی ہوئی ہال کراس کر کے لاڈنگ میں آئی اور چہرے پر مخصوص معذرت خواہانہ مسکراہٹ سجائے فارس کو مخاطب کیا جو ایک پینٹنگ کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی آیا تھا۔

”تمہیں دیکھ کر بہت اچھا لگا فارس۔... تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ اس کی طرف پہنچا تو جواہرات نے اس کے کندھوں کو تھام کر کسی بیچ کی طرح اسے اپنے سامنے کیا۔

”اوہ... تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ اپنی رنگت تو دیکھو۔“

وہ جو بے نیازی سے اسے دیکھ رہا تھا ذرا سار جھکتا۔ ”ٹھیک ہوں۔ میرے پورشن کی چاپی...“

”آف ٹورس۔“ وہ میرے پاس ہے۔ میں اس کی صفائی کرواتی رہی ہوں۔ گرتم دیکھ رہے ہو پارٹی قریب ہے اور سارا اسٹاف مصروف ہے۔ مجھے جیسے ہی تمہاری آمد کا پاتا چلا، میں نے گیست روم سیٹ کروادیا۔“

”آنٹی... میں اپنے گھر میں جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے جیسے بیزاری کو ظاہر نہ کرتے ہوئے کہا۔ جواہرات مسکرا کر اس کو بازو سے تھامے آگے بڑھنے لگی۔ وہ خاموشی سے ساتھ چلتا آیا۔

”کیا تم مجھے صرف ایک ہفتے کے لیے اپنی مہمان داری کا حق بھی نہیں دو گے؟ تم جانتے ہو تمہاری رہائی کے لیے میں نے اور ہاشم نے بہت کوشش کی۔ مگر میری جان! ہم کیا کرتے۔ یہ عدالتی نظام بہت خراب ہے۔ آئی ہوپ تم ہم سے خفائنیں ہو گے۔“

”نہیں... ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ رواداری میں آکر کا۔ جواہرات نے مسکراتے ہوئے فیونا کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ اندر سجا سجا کرہ تیار تھا۔

”پارٹی کے بعد تمہارا پورشن تیار کروادوں گی۔ اب تم آرام کرو ہوں۔“ مسکرا کر کہتی وہ وہیں کھڑی رہی۔ فارس خاموشی سے اندر

چلا گیا۔ وہ شاید خود بھی اپنے گھر سے پختا چاہتا تھا۔ دروازہ بند کر دیا۔ جواہرات کی مسکراہٹ کمٹی۔ آنکھوں میں اضطراب ابھر اور کڑھن۔ وہ پہنچ تو پیر و نی دروازے سے ہاشم آ رہا تھا۔ پیچھے ایک سوت میں ملبوس ملازم بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ جواہرات تازگی سے مسکرا کر تیزی سے اس تک آئی۔ ہاشم نے دروازہ بند ہونے سے قبل فارس کو دیکھ لیا تھا۔ تبھی تاثرات برہم ہوئے۔ ماں کے قریب آ کر دبی دبی آواز میں غرایا۔

”یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“

”مجھے اسے پارٹی میں دیکھنا ہے اور تب تک اسے یہاں روک کر رکھنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے۔“ پھر مسکرا کر ہاشم کا شانہ تھپکا۔ ”اور مجھے اس کے یہاں ہونے سے کوئی ڈر نہیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں ہاشم سنبھال لے گا۔“ مگر ہاشم کو تسلی نہیں ہوئی۔ وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

”بابا....“ سیڑھیاں بھاگ کر اترتی فرماں میں ملبوس چھوٹی سی بچی ادھر آ رہی تھی۔ کوٹ کے بین کھوتا ہاشم بے اختیار مڑا۔ آنکھوں میں بے پناہ پیارا نہ آیا۔ وہ جھکا اور دوڑتی ہوئی بچی کو انٹھالیا۔

”بابا کی جان... کب آئی ہو؟“ باری باری اس کے گال چوتا وہ پوچھ رہا تھا۔ جواہرات نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔



تلخی کام وہ، ان کب سے عذاب جان ہے

رات ذرا گھری ہوئی تو اس چھوٹی سی مارکیٹ کی دکانیں بند ہونے لگیں۔ اب فقط چند بیان روش تھیں۔ دور ایک درخت کی اوٹ میں چھوٹی سی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈیش بورڈ پر ایک خاکی پھولہ ہوا لافافر رکھا تھا۔ ڈرائیور سیٹ پر بیٹھے سعدی نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر پیچپے دیکھا۔ اردو گرد کوئی نہیں تھا۔

تب ہی اس کا موبائل بجا۔ اس نے اسے سامنے کیا تو نیل روشنی چہرے پر پڑنے لگی۔ ”بلکہ نمبر کا لگ“ لکھا آ رہا تھا۔ سعدی نے انٹھا کر احتیاط سے ہیلو کہا۔ پھر دوسرا جانب سے آوازن کر جیسے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ ”جی باس.... کیسی رہی کافرنس؟“

”تم نے ایک بہت اچھی چیزیں کی ہے۔ اس سے زیادہ اہم کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا تمہارے لیے۔“ فون میں سے بلکی سی نسوں آواز سنائی دے رہی تھی۔ سعدی کا چہرہ تارکی میں نہم واضح تھا۔ اس نے زخمی سامسکراتے پھر پیچپے دیکھا۔

”کچھ بہت اہم تھا یہاں۔ خیر.... کافرنس کا نہیں۔“

”تم جانتے ہوآ دھاوقت تو ان کو یہ واضح کرنے میں گزر جاتا ہے کٹھیک ہے، ہمارا کوئی اپنے تھر اسائٹ نہیں ہے، مگر ہم کہہ بھی نہیں رہے کہ وہ اپنے تھر اسائٹ ہے۔ میں مان رہی ہوں کہ وہ لگناٹ ہے اور ہمارے علاقے میں صدیوں سے دبے fossils سے بہتر کوئے میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ ویسے بھی.... اور اگر....“ وہ روانی سے بولتے ہوئے رکی۔ ”پتا ہے سعدی! آج مجھ سے کسی نے وارث کے کیس کے بارے میں پوچھا۔ اس کا کیا بنا؟ فارس کو سزا ہو گئی؟ میں نے تو اتنے عرصے سے تم سے پوچھا ہی نہیں۔“

”آپ اتنی بہادر نہیں ہیں کہ اس کیس کو فالواپ کریں۔ سو جوچھ پچھوڑ دیں۔“

”مگر....“

”جو بھی بناؤ گا کیس کا، میں خود کیھ لوں گا غال! میں نے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ ماموں کو مارنے کے بعد ان کے لیپ ٹاپ

اور فاٹکر جس نے بھی چڑایا تھا، میں وہ آپ کو واپس لا دوں گا۔ بس میں اس بندے کے لیپ تاپ تک پہنچ جاؤں ایک دفعہ پھر میں آپ کے بتاؤں گا کہ ما ماموں کو کیوں قتل کیا گیا۔“

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟“

”ایک الزام نے فارس غازی کی زندگی کے چار سال لے لیے۔ میں بنا ثبوت کسی پا الزام نہیں لگانا چاہتا۔ ثبوت کے بعد بتاؤں گا۔“

”اتنے سال ہو گئے سعدی! کیوں پڑے ہو اس کیس کے پیچھے؟ ختم کرو۔ اللہ کے حوالے کر کے چھوڑ دو۔“

”اوہ ہوں..... کیسے چھوڑ دوں؟ میرے خاندان کے دلوگ مارے گئے۔ میری پھپھوکی زندگی بر باد ہوئی۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو قتل کو معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔ اور میرے خاندان کے باقی لوگوں کی زندگی قصاص میں ہی ہے۔ میں تو برابر کا بدلہ لوں گا۔ جس نے یہ کیا ہے وہ جان سے جائے گا۔ بس.....! اچھا مجھے جانا ہے بائے۔“

ایک دم سے اس نے فون بند کیا۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک فربی مائل ادھیز عمر شخص اندر بیٹھ رہا تھا۔ سعدی خاموشی اور سنجیدگی سے سامنے دیکھنے لگا۔ اس شخص نے تنخی سے سعدی کو دیکھا۔

”میں نے اسے بری کر دیا ہے۔ اب وہ دو جو قسم نے دینا تھا۔“

سعدی نے خاموشی سے ڈیش بورڈ سے خاکی لفافہ اٹھا کر انہیں تھمایا۔ جسٹس سکندر نے اندر جھانا کا۔ چہرے پر مزید کڑا وہ اٹھ پھیلی۔ کان کی لوئیں سرخ پڑیں۔ ”میرے بارے میں اگر یہ گند..... باہر نکلا تو.....“ غم و غصے سے آواز کا پنپنگی۔ سعدی نے گردن موڑ کر ان کو دیکھا۔

”اگر آپ مجھے جانتے ہوتے تو اندازہ لگا لیتے کہ میں ایک شخص کی زندگی بچانے کے لیے آپ کے خاندان کے پانچ افراد کی زندگی بر باد نہیں کروں گا۔ میں اس حد تک بھی نہ جانا اگر آپ میری بات سن لیتے۔ میں آیا تھا آپ کے پاس جسٹس صاحب۔ میں نے آپ کی منت کی تھی کہ فارس غازی بے قصور ہے۔ مگر آپ نے میری نہیں سنی تھی۔ ہاشم کا پیسہ ہر جگہ بول رہا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ سوری....!“ کندھے اچکا کر بے نیازی سے سوری کہا۔

”بکواس مت کرو۔ مجھے بتاؤ تمہارے پاس اس کی کوئی کاپی ہے یا نہیں؟“

”ہو سکتا ہے میرے پاس کاپی ہو۔ کیونکہ میں بھی نہیں چاہوں گا کہ فارس غازی کو دوبارہ اس کیس میں پھنسایا جائے۔ آپ اپنے اینڈ پر خیال رکھیے گا۔ میں اپنے اینڈ پر رکھوں گا۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔“

وہ تو جیسے رکنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ سر پٹوپی اور گردن کا مفلک درست کیا تاکہ شناخت نہ ہو پائے اور باہر نکل گئے۔ سعدی نے ہلکے کندھے اپکائے اور کار اسٹارٹ کر دی۔



قصیر کار دار پر رات کی تاریکی سیاہ بادلوں کی طرح اتری ہوئی تھی جو گہرے پر اسرار رازوں سے لدے ہوں۔ ایسے جیسے بس ابھی بر سے کو تیار ہوں۔ اور نہ برسیں تب بھی ان کی خوفناک گرج دور دور تک سنائی دیتی ہو۔ ایسے میں فارس غازی سبزہ زار پا اپنی ایکسی کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ جگہ ہاشم کے کمرے کی عقبی بالکوئی سے صاف دکھائی دیتی تھی۔ دو منزلہ ایکسی جو بالکل خاموش ویرانی کھڑی تھی۔ باہر سے ہر سال پینٹ ہوتی تھی۔ خوشنا اور نئی سی لگتی تھی۔ مگر اندر سے بخوبی ہو چکی ہوئی وہ جانتا تھا۔

چابی اس کے پاس نہیں تھی۔ اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ قدم قدم چلتا برآمدے میں آیا۔ داخلی دروازے پر رکا۔ مژکر ایک نظر ناموش اور اندر ہیر سبزہ زار پر ڈالی۔ کار دار زار وقت گھر پر نہ تھے۔ اور جو تھے وہ سور ہے تھے۔ وہ واپس گھوما اور جھک کر پہنچوں کے مل زمین پر

بیٹھا۔ جیب سے ہاتھ باہر نکلا تو اس میں تپلی ہی تار تھی۔ اس نے تار لاک کے اندر ڈالی اور اسے مختلف زاویوں پر گھما تارہا۔ وہ نو تھری فور فایروں سکس... ملک... آوازی آئی اور لاک کھل گیا۔ وہ تار جیب میں ڈال کر اٹھا اور دروازہ کھولا۔

انکسی اندر ہیر پڑی تھی۔ فارس اندر آیا۔ اس نے کوئی مقنی نہیں جلائی۔ قدم قدم چلتا آگے آتا گیا۔ درود یوار میلے سے لگتے تھے۔ دیران اور مکڑی کے جالوں سے پر۔ صوفوں پر چادریں پڑی تھیں۔ فضا میں گرد کی دیز تھی۔ وہ اندر ہیرے میں وہیں کھڑا رہا۔ یونہی گردن موڑ کر دیران نظر وہ سے بیر ونی برآمدے کو دیکھنے لگا جو کھلے دروازے کے باعث نظر آ رہا تھا۔

”فارس غازی آپ کو درہے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“ یہیں اسی برآمدے میں کھڑے انہوں نے اسے ہٹھلڑی لگائی تھی۔ اس نے گردن موڑی۔ یہیں اسی گھر میں وہ ہنس مکھی لڑکی بھائی نظر آتی تھی۔ زرتاشہ۔ اور یہیں اس گھر میں وہ اس رات ٹھلٹار ہاتھا بے چینی میں کرب سے جب وارث غازی کو مارا گیا تھا۔ تب ادھر۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ادھر قصر میں ایک تقریب جاری تھی۔ روشنیاں تلقنے رات کو منور کیے ہوئے تھے۔ وہ تکلیف دہ یادوں تھیں۔ فارس نے سر جھنکا۔ جیسے بہت کچھ ذہن سے بھی جھنکا ہو۔ اور پھر تیزی سے باہر نکل آیا۔ دروازہ زور سے بند کیا۔ لاک ملک ہو کر خود بخود مقتول ہو گیا۔ وہ اب لمبے لمبے ڈگ بھرتا دور جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

❖❖❖

نشتر چھپے ہوئے تھرگ جاں کے آس پاس  
صحیح جب سورج کی روشنی بادلوں کے کناروں کو سرخ اور جامنی رنگ میں دہکاری تھی تو شہر کے کاروباری علاقے میں اس نے سیاہ پینٹ پہ ٹھنڈوں والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال بہت چھوٹے کٹوا لیے تھے۔ فوجوں کی طرح۔ گویا استرا پھیرنے کے دو چار دن بعد کے اٹھ بھر بال ہوں۔ دو ہفتے قل رہا ہونے والے فارس سے وہ بہتر لگ رہا تھا۔

دھات کا ڈیمپلر داخلے کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ اس میں سے گزر کر اندر جا رہے تھے۔ وہ سائیڈ سے نکل کر چلا گیا تو گارڈز چونکے۔ کسی نے اسے آواز دی۔ فارس نے بغیر رسپشن پر لمحے بھر کر کا۔

”ہاشم کاردار کا آفس؟“ برواحٹا کر کھڑے انداز میں پوچھا۔

”پانچویں فلور پر۔ مگر آپ.... رسپشن کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ وہ آگے بڑھ چکا تھا۔ گارڈز بے اختیار بیچھے آئے۔ لفت میں داخل ہو کر اس نے ان کے آنے سے پہلے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ گارڈ گھبرا کر واٹر لیس پر اطلاع دیئے لگا۔ پانچویں فلور پر جب لفت کا دروازہ کھلا تو واٹر لیس پکڑے ایک گارڈ اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ فارس نظر انداز کر کے راہداری میں آگے بڑھ گیا۔ اسے غالباً آفس یادھا۔ فلور ہن سے نکل گیا تھا۔

”ہاشم اندر ہے؟“ یہیں ٹھری سے بس سرسری سا پوچھا۔ وہ ”جی“ کہتی جیران سی اٹھی۔ گارڈ دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ اسے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ”سر.... مسٹر کاردار مصروف ہیں۔ آپ اندر نہیں جا سکتے۔“ وہ دروازے کی طرف آیا تو گارڈ سامنے آ گیا۔

”سر.... آپ یوں اندر نہیں جا سکتے۔ آپ نے نیچے سیکورٹی کو....“

”میرے منہ نہ لگو!“ تیوری چڑھائے فارس نے ہاتھ سے اس کے کندھے کو بیچھے دھکلیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ گارڈ حواس باختہ سا بیچھے بھاگا۔

اندر ہاشم اپنی سیٹ پر بیک لگا کر بیٹھا سامنے موجود دو افراد سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس اچانک افتاد پر سرا اٹھا کر دیکھا۔ فارس سے گارڈ تک نظر وہ نے سفر کیا۔

”ان کو بھیجو۔ مجھے بات کرنی ہے۔“

فارس نے تیری کری گھنی اور ناگ پٹا نگ رکھ کر بیٹھا۔ ہاشم کے لب بھینچ گئے۔ آنکھوں میں ابھرتی ناگواری کو اس نے ضبط کر لیا۔

”سر! میں ان کو منع کر رہا تھا مگر یہ...“

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔ میں نے ہی بلا�ا ہے۔“ تازہ دم ہو کر مسکراتے ہاشم نے ان کو جانے کا اشارہ کیا۔

وہ نکلے تو ہاشم پیچھے ہو کر بیٹھا اور خاموشی سے فارس کو دیکھا۔

”کیوں بلا�ا ہے؟“ اس نے ابر و اٹھا کر اکھڑے اکھڑے انداز سے پوچھا۔

ہاشم اٹھا اور دیوار تک گیا۔ وسط دیوار میں ایک پینینگ لگی تھی۔ ہاشم نے پینینگ کو سلا بیٹنگ نگ ڈور کی طرح دائیں طرف سلا بیٹد کیا۔ اندر دیوار میں نصب سیف تھا۔ اس نے کچھ نمبر زدائل کر کے سیف کھولا۔ اس کی پشت اب فارس کے سامنے تھی اور وہ پاس درڈیا اندر سے سیف نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ہاشم سیف بند کر کے پلتا اور میز پر کچھ ڈاکو منش اور ایک پلاسٹک بیگ رکھا۔ شفاف بیگ کے اندر زیورات دکھائی دے رہے تھے۔

”تمہاری امانت... تمہارے گرفتار ہونے کے بعد پولیس بار بار گھر آتی رہی تھی۔ اس لیے می نے پہلے ہی تمہاری تمام قیمتی اشیاء وہاں سے نکال لی تھیں۔ چیک کرو۔“ واپس بیٹھنے ہوئے اس نے دوستانہ مگر ممتاز انداز میں کہا۔ فارس نے بس ایک نظر اس سب کو دیکھا اور پھر ابر و دیوان کر ہاشم کو۔

”ٹھیک... اور کچھ؟“

”تمہاری رہائی کے لیے میں نے بہت کوشش کی تھی۔ جس سکندر کو بہت فیورزد یہ ہیں اور اب جبکہ میں اس سے ماہیں ہو چکا تھا اس نے تمہیں رہا کر رہی دیا۔ بہر حال... تم اب باہر ہو۔ نئی زندگی شروع کرنے...“

”تمہید کاٹو اور مطلب کی بات پر آؤ۔“ فارس نے اس کی بات بیزاری سے کاٹی۔ ہاشم نے گھری سانس باہر کو خارج کی اور ذرا سے شانے اپکائے۔

”تمہیں جاب چاہیے ہوگی اور میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی پوسٹ ہے۔“

”نہیں چاہیے... اور کچھ؟“ وہ کھڑا ہوا اور اپنی چیزیں اکٹھی کیں۔ ہاشم نے سر اٹھا کر تاسف سے اسے دیکھا۔

”بھم کرزز ہیں یا رہ... تمہاری پر ابلم میری بھمی پر ابلم ہے۔“

”مگر میری بیوی تمہاری بیوی نہیں تھی۔“ فارس کی آواز بلند ہوئی، آنکھوں میں غصہ اترا، کان کی لوکیں سرخ پڑیں۔ ”تمہیں لگتا ہے میں بھول گیا ہوں کس طرح تم اس کو میرے خلاف اکسایا کرتے تھے۔“

”اوہ خدا...“ ہاشم نے جھکے ہوئے... انداز میں سر جھکا۔ ”تم اپنی اس غلط فہمی کو دور کیوں نہیں کر لیتے ایک دفعہ... وہ میری بہن کی طرح تھی۔ اس بات پر تم مجھ سے کوئی مقدس صیفہ اٹھوانا چاہتے ہو تو اٹھو والو۔ میں ایک ایماندار آدمی ہوں۔“

فارس شک و شبہ سے آنکھیں سکریں رہا تھا۔

”تمہارے اس روئیے کے باوجود میں نے تم پٹشک نہیں کیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ تم نے وہ قتل کیے ہوں گے۔ مجھے تمہاری بیگناہی پر یقین تھا۔ مگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے۔“ وہ ہرث نظر آرہا تھا۔

فارس کے تاثرات دھمکے پڑے۔ مگر وہ اسی طرح اسے دیکھا رہا۔ ہاشم اب اٹھا۔ دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔

”اور مجھے تمہاری فکر ہے۔ کیا کرنا چاہو گے اب؟“

”جس کے خاندان کے دو فردمارو دیے گئے ہوں اسے کیا کرنا چاہیے؟ سوائے ہر مددار شخص کا گریبان پکڑنے کے؟“

کمرے میں جیسے کاربن مونو آکسائیڈ بھر گئی تھی۔ ہاشم کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے بے اختیار ٹائی کی ناٹ ڈھینلی کی۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے سے اچھا کیل تھیں نہیں ملے گا جو اس کیس کو دوبارہ سے زندہ کر کے اصل قاتلوں کو سامنے لائے۔

اس لیے جاب نہیں کرنی یہاں، مت کرو۔ مگر جب اور جیسے تمہیں کچھ معلوم ہو، تم سب سے پہلے مجھے آ کر بتاؤ گے۔ راست؟!“

ہاشم نے مصافخہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ فارس اکھڑا اکھڑا سادِ یکھتر ہا۔ پھر متذبذب سا ہاتھ ملا لیا۔ ہاشم مسکرا دیا۔

فارس باہر نکلا تو جواہرات چوکھت پر دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا۔ تیزی سے ہاشم تک آتے اس نے پوچھا۔

”یہ کیوں آیا تھا؟“ ساتھ ہی دروازہ بند کیا۔ ”جب بھی اس کو آزاد دیکھتی ہوں تو مجھے تمہارے ہاتھوں میں ہتھڑی نظر آتی ہے۔“

ہاشم نے اس کی فکر پر پیشانی کو صاف نظر انداز کیا۔

”میں نے بلا یا تھا۔ جاب آفریکی مگر نہیں مانا۔“

”جب کیوں؟ اچھا۔ تاکہ وہ مصروف رہ کر کسی بھی انتقامی کارروائی سے باز رہے؟“

ہاشم نے اثبات میں سر ہلا کیا۔ جواہرات نے ٹھنڈی سانس اندر اتاری۔

”اسے تم پر شک تو نہیں ہے نا؟“ اس کے خدشے بڑھتے جارہے تھے۔

”اگر ہوتا تو اس طرح آرام سے نہ چلا جاتا۔ وہ ہاتھوں سے بات کرنے کا عادی ہے۔ اور ادا کار تو بالکل نہیں ہے۔“ اس کا فون پھر بجا تو اس نے جھੁঁਘلا کر کال ریسیوکی۔

”جی..... جی..... سر میں آپ کے آفس پہنچ گیا ہوں۔ بس لفٹ میں ہوں۔ آرہا ہوں۔“ بہت سرعت سے جھوٹ بول کر کال کاٹی۔

پھر بریف کیس میں ضروری چیزیں ڈالنے لگا۔ ”کام سے جا رہا ہوں۔ شام کو ملتے ہیں۔“

”ہوں....!“ جواہرات بدلت مسکرائی۔



وہ اس نفاست اور خوبصورتی سے آ راستہ بیٹھ کا اسٹنڈی روم تھا جہاں وہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی کام کر رہی تھی۔ بال جوڑے میں بند ہے تھے اور سبز آنکھیں سکیڑے لیوں سے بال چین کا کنارہ دبائے وہ اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ پھر سر جھکا کرفائل پر کچھ لکھنے لگی۔ دھنعتاً اس نے کھڑکی پنگاہ دوڑائی تو رک گئی۔ دوہرے وال بچیاں اپنے ہم عمر دو تین بچوں کے ہمراہ باہر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

سارہ پین چھوڑ کر بے اختیار باہر لپکی۔ لا دُنخ میں زرینہ بیگم بیٹھی سلانیوں پر کچھ بن رہی تھیں۔ گاہے بگاہے چلتے ہی وی پر بھی نظر ڈال لیتیں۔ ”سارہ یہ ترک ڈرائے دیکھ دیکھ کر ہم کچھ بے حیانیں ہوتے جا رہے؟“ انہوں نے تائید چاہی۔ مگر وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔

”ای..... آپ نے بچوں کو پھر پارک بھیج دیا۔ میں نے منع کیا تھا نا۔“ بھنوں سکیڑے وہ بے بسی سے کہتی ان کے سر پر کھڑی تھی۔ زرینہ بیگم نے ننگلی سے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔

”بس کرو بی بی... تم تو ایسے پریشان ہو رہی ہو جیسے اکیلا بھیج دیا ہو۔ آس پاس کے بچے بھی تھے اور کرٹل خورشید کی ملازمہ بھی۔ ابھی گھنٹے بھر میں آ جائیں گی۔“

”آپ بھی ناکمال کرتی ہیں۔“ وہ ناراضی سے کہتی ان کے ساتھ بیٹھی، مگر نشست کے بالکل کنارے پر۔ ”پتا ہے نا ای! حالات کتنے خراب ہیں، پھر بھی ان کو باہر بھیج دیتی ہیں۔“

”اچھا تمہاری بیٹیاں ہیں تو میری نواسیاں بھی ہیں۔ دشمن نہیں ہوں میں ان کی۔ گھر میں قید کر کے رکھوں تو بزدل اور ڈری آئی ہی بن جائیں گی۔ بالکل تمہاری طرح۔“ انہوں نے اسے ذرا خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی سلامی جاری رکھی۔

”میں نہیں ہوں بزدل۔ وہ سعدی بھی ہر وقت یہی کہتا تھا ہے۔“ وہ خفا بھی تھی اور پریشان بھی۔ ”وارث کی موت بھول گئی آپ کو؟ کیسے ان کو مار دیا گیا تھا۔ جب کسی خاندان میں کوئی قتل ہو جائے تو خاندان والے پہلے جیسے نہیں رہتے، وہ ہی نہیں سکتے۔“

”جس... تم نے بتایا ہی نہیں فارس کے رہا ہونے کا۔ مجھے عزیز بھائی کی بیوی نے بتایا۔“ وہ سلامی روک کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اس کی ساری باتیں نظر انداز کر دیں۔ سارہ کی آنکھیں حیرت سے چھلیں۔

”فارس... وہ تو رہا نہیں ہوا... وہ... کیا مطلب؟“

”تمہیں نہیں پتا؟“ وہ النما جیران ہوئیں۔ ”جب تم لندن میں تھیں، تب ہی تو رہا ہوا تھا۔“

”سعدی کو بھی پتا نہیں ہو گا پھر تو۔ ورنہ وہ ذکر تو کرتا۔“ وہ جیران سی بیٹھی تھی۔

”لو... وہ تو اسے لینے گیا تھا۔ اسے کب کسی بات کا نہیں پتا ہوتا؟“

”مگر... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اچانک سے؟“ وہ الجھی گئی۔ ”اور سعدی نے بھی نہیں بتایا۔“ پھر چونکہ کرماں کو دیکھا۔ ”اور کیا بتایا آئندے؟“

”یہی کہ اپنے ماموں کے گھر رہا ہے۔ جواہرات کے پاس۔ اپنا گھر نہیں کھولا۔ اور ندرت کے پاس بھی نہیں رہ رہا۔ مگر اچھا ہی ہوا۔ مجھے تو کبھی بھی وہ قصور و انسیں لگا تھا۔ شکر کر کے بچے کی جان بخیگی۔“ انہیں نے پھر سے سلامیاں اٹھالیں۔

”ہوں.... سعدی بھی یہی کہتا تھا۔ فارس ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ مگر ایک ہفتہ ہو گیا اور مجھے پتا ہی نہیں۔“ وہ اچنپھے میں تھی۔ پھر بے الگیار گھری دیکھی اور فون کی طرف بڑھی۔

”کس کو کرنے لگی ہو؟“

”کریل خوشید کی مید کا نمبر ہے میرے پاس۔ اس کو کہتی ہوں کہ انہیں جلدی گھر لائے۔ پورے پندرہ منٹ ہو گئے ہیں۔“

فکر مندی سے کہتی وہ کارڈ لیس اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ زرینہ بیگم ما تھا چھو کر بڑا ہیں۔ سارہ کا کوئی علاج نہ تھا۔

رات جب ان کے بنگلے پر اتر آئی تو دیواروں نے دیکھا، سارہ اپنے بیڈ میں لحاف تانے لیتی تھی، اور اس کے دامیں باہمیں دو ناخنی

پیاری ہی پچیاں لیتی تھیں۔ ایک چت ہو کر چھت کو سکلے جا رہی تھی دوسرا مان کے کانوں پر پھسلتی لٹوں پر انگلی پھیر رہی تھی۔

”اہ!... نور... مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ سارہ نے چھت کو دیکھتے ہوئے گم صم میں بات کا انداز میں باہمیں آغاز کیا۔

”کیا ہوا ماما؟“

”آپ لوگوں کو شاید یاد نہ ہو مگر آپ کے بابا کے ایک بھائی تھے۔“ رکی۔ ”ہیں۔“ گھری سانس لی۔ ”کچھ درجہ تھی وہ یہاں سے چلے گئے تھے مطلب کہ ان کو جیل ہو گئی تھی اس لیے...“

”مگر فارس چاچو تور ہا ہو گئے ہیں نا۔“ اہل ایک دم بولی۔ سارہ دنگ رہ گئی۔

”تمہیں وہ... یاد ہیں؟“

”جی ماما۔“ اہل نے النما سے جیران ہو کر دیکھا۔ ”میں نے خود سنابے نانی بتا ہی تھیں فون پر کسی کو کہا وہ اب باہر آگئے ہیں۔ تو اب ہم

اُن سے ملنے کب جائیں گے؟“

”نہیں اہل۔“ اس کے لبھے میں تختی آگئی۔ ”ہم نے ان سے دور رہنا ہے۔ ان کے ساتھ مسلکے ہیں بہت۔ ان کے پیچے برے لوگ

لگے ہیں۔ سو ہم ان کے قریب جائیں گے تو وہ بڑے لوگ ہمارے پیچھے بھی لگ جائیں گے۔ اس لیے اب ہم ان سے زیادہ قریب نہیں ہوں گے۔ ”نور نے سر بلاد دیا۔ وہ ماں کے بالوں سے مسلسل کھیل رہی تھی۔ مگر امل نے اتنی ہی سمجھداری سے پوچھا۔

”اوکے ماما لیکن ہم ان سے ملنے کب جائیں گے؟“

سارہ اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ ”میں نے کہا، ہم ان سے ملنے نہیں جائیں گے۔ بے شک وہ بہت اچھے ہیں لیکن ان کے ساتھ رہنے سے ہمیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اب میں تم دونوں کے مند سے ان کا ذکر نہ سنوں۔ اوکے!“ درشتی سے کہہ کر وہ ذرا فکر مندی اب لیپ پ بھار رہی تھی۔ نور نے بتی بھجتے ہی فوراً سے آنکھیں بند کر لیں مگر امل کی آنکھیں پوری کھلی تھیں۔

.....  
.....  
.....

سینورس مال میں رنگوں اور روشنیوں کا سیلا ب جگہ رہا تھا۔ تیرے فلور کے ایک بوتیک کی ساری تباشیاں روشن تھیں۔ وسط میں محملیں صوفے پیچے تھے۔ کپڑوں کے ریکس کونوں میں تھے۔ وہیں ایک قد آور آئینے کے سامنے شہرین کھڑی تقیدی نگاہوں سے اپنا پہننا ہوا گولڈن گاؤں دیکھ رہی تھی۔ جس کی ایک آستین نہیں تھی اور دوسرا کلائی تک آتی تھی۔ اس نے دائیں اور بائیں دونوں طرف سے ترپھی ہو کر عکس دیکھا۔ نہرے باب کث بالوں کو دو انگلیوں سے پیچھے کیا اور بیزاری سے مند بنا یا۔

”فال اتنی اچھی نہیں ہے جتنی میں نے کہی تھی۔“

قریب کھڑی لڑکی اسے جلدی جلدی وضاحت دینے لگی۔ جسے اس نے گویا ساہی نہیں۔ وہ خود کو ہرزاویے سے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے عکس میں پیچھے صوفے پیٹھی سو نیا اور ساتھ مستعد کھڑی ملازمہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ سو نیا بوری ہو کر بار بار پاؤں قائم سے رگڑ رہی تھی۔

عکس میں دکان کا دروازہ بھی نظر آ رہا تھا اور وہ جو گزرے موڑ سے بیٹھ کر نگلی تھی دروازے کو دیکھ کر بالکل ساکت ہو گئی۔ پھر اس نے تھوک لگا۔

چوکھٹ پر سعدی کھڑا تھا۔ جیہر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔  
شہری نے مڑکر صوفوں کی سمت دیکھا۔

”شمینہ... سو نیا کو لے کر اوپر فوڑ کو رٹ جاؤ۔ میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔“

پھر مینځر سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میں آپ سے ذرا ٹھہر کر بات کرتی ہوں۔“ وہ تو سر بلکر چلی گئی۔ البتہ شمینہ نے پچھی کا ہاتھ کپڑتے ہوئے پس دپیش کی تھی۔

”میم اوپر کس جگہ؟“

”شمینہ!“ اس نے تیز نظر وہ سے گھورا تو وہ فوراً سو نیا کی انگلی تھامے باہر نکل گئی۔

شہرین پھر سے آئینے میں دیکھتے ہوئے گاؤں کا فال والا گلا انگلیوں سے ادھر ادھر کرنے لگی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے کندھے کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

”تو آپ گولڈن پہن رہی ہیں۔ گذ! میں بلیک پہن رہا ہوں۔“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ مڑے بغیر آئینے میں اس کو دیکھتے ہوئے تیزی سے بولی۔ سعدی نے مصنوعی حیرت سے شانے اپکائے۔

”یا ایک مال ہے اور یہاں لوگ شانگ کرنے آتے ہیں۔“

”مجھے گھر سے فالوکر رہے تھے یا فون سے ٹریس کیا ہے؟“  
”کیا آپ نہیں مان سکتیں کہ ہم اتفاق سے ملے ہیں؟“  
”ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔“

سعدی نے جواباً اثبات میں سر ہلا�ا۔

”اوکے.... آپ کے فون سے ٹریس کیا ہے۔“  
شہرین اس کی طرف پڑھی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”ہمیں اس طرح ایک ساتھ نہیں نظر آنا چاہیے۔“  
”اسی لیے آپ نے ان کو بھیج دیا؟“

”وہ ہشم کو بتا دے گی۔“ اس نے گویا جھڑک دیا۔  
”اتنی ناقابل اعتبار ملانا مس؟“ وہ حیران ہوا۔

”وہ نہیں.... سونیا.... میری بیٹی.... وہ اپنے باپ کو ہربات بتاتی ہے۔“ تلمیز سے کہہ کر وہ کان میں پہنچنے سیاہ گلوں والے آویزے اتارنے

گئی۔

”آپ اتنا ڈرتی ہیں ہاشم بھائی سے؟“

”سعدی!“ شہرین نے دبے دبے غصے سے اسے دیکھا۔ ”میں اس سے نہیں ڈرتی۔ مگر وہ سونیا کو مجھ سے لے سکتا ہے اگر میں اس کے خلاف گئی۔ اور یونو واٹ، تمہارے یہاں آنے کا مطلب ہے کہ تمہیں ہاشم کے خلاف میری مدد چاہیے اور میں ایسا کچھ بھی نہیں کرنے والی۔“

”جب آپ نے مجھ سے مدد مانگی تھی تو میں نے بھی کیا ایسے ہی منع کیا تھا؟“ وہ اب بہت سنجیدہ تھا۔ شہری ایک ثانیہ کو خاموش رہ گئی۔

”وہ اور مسلسل تھا۔“ اس کی آواز دھیمی پڑی۔ سعدی جواب دیے بنا اس کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی اسے دیکھتی رہی، پھر سر جھٹکا۔  
”کیا چاہیے؟“

وہ ہلکا سامسکرا یا اور اندر ورنی جیب سے ٹبلٹ نکال کر میز پر رکھے شہرین کے پرس میں ڈال دیا۔ سب اتنی پھر تی سے کیا کہ وہ اب جھی سی کھڑی رہ گئی۔

”میرا شیب آپ کل مجھے پارٹی میں واپس کر دیں گی۔ اتنا سا کام۔“

”مگر تم یہ خود بھی لے کر جاسکتے ہو پارٹی میں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”سیکورٹی پر ڈوکول خخت ہے۔ موبائل وغیرہ کی اجازت نہیں ہے۔ مگر آپ تو نہیں ہیں نا۔“

”تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟“

”آپ دوسرا کام کرنے کی ہائی بھریں.... میں بتا دوں گا۔“

”اور کیا ہے وہ دوسرا کام؟“ اس نے بہت ضبط سے سینے پہ بازو لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے ہاشم بھائی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ چاہیے۔ ہر صورت میں۔“

”تم.... اف....“ اس کا صبر جواب دینے لگا۔ ”تم پارٹی میں نہ ہی آؤ سعدی! تم ہم دونوں کو مشکل میں ڈالو گے۔“

”میں ایک ہفتے سے جب سے ہاشم بھائی نے بالخصوص میرے لیے کارڈ بھجوایا تھا، اس پارٹی کی تیاری کر رہا ہوں۔ اور میں آپ پر اعتبار کر رہا ہوں۔ آپ کو ہاشم بھائی سے اپنے تمام دکھوں اور اڑیوں کا بدلہ لینا ہے نا؟ تو پھر آپ کو میرے ساتھ کھڑے ہونا ہوگا۔ چاہے آپ پسند کریں یا نہ کریں۔ آپ مجھے ہاشم بھائی کا پاس ورڈلا کر دیں گی۔“ اس نے سخیدگی اور مضبوطی سے ایک ایک لفظ ادا کیا۔

شہرین کے تاثرات دھکئے پڑے۔ اس نے تذبذب، امید اور خدشات سے بھری آنکھوں سے سعدی کو دیکھا۔

”تم کیا کرنے جا رہے ہو؟“

وہ ادا سی سے مسکرا یا۔ ایک زخمی مسکرا ہٹ۔

”جونہوں نے ہم سے چرایا تھا“ میں وہ واپس چرانے جا رہا ہوں۔“



اب 2:

## فریب کار

اور اعلیٰ کا ساتھی ہامون بھی تھا۔

جنت سے نکالے جانے والی ایک کمتر روح

کروہاں بھی اس کی نگاہ اور سوچ نیچے جھکی رہتی اور زیادہ سراہتی سونے کی بنی جنت کی روشن کو۔  
یہ مظراں سے کسی بھی دوسرے سے زیادہ مزادیتا ہے۔

اسی نے سکھایا بنی نوع انسان کو

اپنے ناپاک ہاتھوں سے دھرتی ماں کے طلن کو کھود کر لوٹا

ان خداونوں کو جو چھپے بہتر تھے

جلد ہی اس کی فوج نے جہنم کی پہاڑی میں ڈالا ایک وسیع چھید۔

اور کھودا الیں سونے کی پسلیاں

نہ کوئی حیران اس بات پر کہ سونا اگتا ہے اندھیر جہنم میں

کہ شاید مٹی ہی قابل ہے۔ اس تینی بلا کے ....

(ماخوذ از ملٹن۔ جنت گم شدہ)

حسن و عشق کا سوز تعلق سمتون کا پابند نہیں ..... اکثر تو خود شمع کا شعلہ بڑھ کے گیا پروانے تک

ہاشم کاردار کی بیٹی سونیا کی سیاہ نہری سالگرہ آج یعنی ہفتے کی شام کو تھی۔ شاید اسی لیے ہفتے کی صبح بھی چمکیلی نہری طلوع ہوئی تھی۔

۱۱۱۲ القاری یوسف کے گھر میں ناشتہ کا دھوان ندرت کی ڈاٹ بھری تاکید ہیں، خین کی بھاگ بھاگ تیاری، سب ایک ساتھ جل جل رہا تھا۔ سعدی آج  
میں میں سوریہ ریسٹورنٹ چلا گیا تھا۔

سمم اب یونیفارم میں تیار گول میو کے گرد بیٹھنا شستہ کر رہا تھا۔ خین اپنے سیاہ کوت شوز پاش کر کے جب آئی تو توں کی پلیٹ کو  
اپنے ارمنہ بن گیا۔

”ای..... میں نہیں کھانا ذہکن ٹوست۔ یہ موٹا آلو میرے لیے بریڈ کا پہلا اور آخری توں ہی بچاتا ہے ہمیشہ!“ وہ ماتھے کے

۱۱۱۳ الوں پر برش پھیرتی دیہن سے چلائی۔ پکن سے ندرت کا ڈپٹا ہوا جواب فوراً آیا۔

”ہزار دفعہ کہا ہے کھانے کی چیزوں کے نام مت رکھا کرو۔“

اس نے منہ میں بڑھاتے ہوئے آگے ہو کر سیم کا آدھا پار اٹھا توڑ لیا۔ خلاف معمول سیم نے کوئی رد عمل ظاہرنہ کیا۔ چپ چاپ کھا۔

رہا۔

وہ ناشتہ کر کے اٹھی تھی کہ سیم نے پکارا۔ ”حہ!“

”حن...نا؟“ اس نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”تاریخ گواہ ہے کہ تم نے مجھے بغیر کام کے حد کھی نہیں کہا۔“

”آج کا لئے میری طرف سے ہے۔“ ہاتھ جھاڑتے اس نے مزید نجیگی سے اطلاع دی۔

حنین نے بیک کندھے پر ڈالا، فائل اٹھائی اور استہزا سے انداز میں سر جھٹکا۔

”مجھے گیس کرنے والے کیا مانگ لیا ہوا تم نے ہاں ہوں گے سوسے ساتھ میں چرخ اور آلو کے چس۔“ اور جیسے ان سب اشیاء بے

لعنہ بھیج کر وہ دروازے کی طرف بڑھی جہاں باہر دین والا ہارن دیے جا رہا تھا۔

”اپر گرگ رو لزبہاری کباب اور بیکن ہوئے آلو،“ سیم نے عقب میں بڑے سکون سے کہا۔ حنین کے قدم زنجیر ہوئے، آنکھیں بے یقین سے پھیلیں۔ یکدم مزی، کہنی سے دبوچ کر اسے سامنے کھڑا کیا۔

”بھر ساتھ میں ہو گی پودنے کی چنی؟“ اور مشکوک نظر وہ سے گھورا۔

”اوہ ہوں۔ تمہاری فیورٹ مایونیز والی ساس!“

حنین کے لب بھر پور مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ آنکھوں میں شرارت چکی۔ بازو چھوڑ اور چلنے کا اشارہ کیا۔

”اب کام بتاؤ۔“

”رات ہاشم بھائی کی بیٹی کی سالگرہ میں میں نے بھی جانا ہے۔“ وہ دونوں ساتھ چلتے باہر آئے تو باعچے کراس کرتے ہوئے سیم نے کہا۔

”سعدی بھائی نے کہا تھا کہ امی نہیں جاری ہیں تو میں گھر میں رہوں۔“

”ہوں۔ تمہارے پاس بلیک سوت ہے؟“

”ہاں، وہی جو بھائی نے بر تھڈے پر دیا تھا۔“

”تو پھر اس کو دھوپ لگوں ہوا لگوں اور استری کروالو۔“ وہ گیٹ بند کر کے دین کی طرف بڑھتے ہوئے بڑے سکون سے بولی۔ سیم نے خوشگوار بے یقین سے اسے دیکھا۔

”مگر تم بھائی کو کیسے مناؤ کی کٹو... سوری.... حہ!“

”سیم یوسف! یہ جو آج تم مجھ پر اپنی پاکٹ منی جھوٹک رہے ہونا، یہ اس لیے ہے کہ تمہیں پتا ہے اس کام کے لیے صحیح بندی میں ہوں۔ اس لیے اپنے سوت کی فکر کرو بس!“ کہہ کر وہ دین میں چڑھ گئی۔

اندر رافعہ اور خدیجہ بری طرح دہرانی کرنے میں مگن تھیں۔ جبکہ نامعہ کتاب کھولے پچھلکھری تھی۔ آج ان کا آخری پیپر تھا۔

”کیسی تیاری ہے؟“ اس نے امتحان کی صحیح کا مخصوص سوال دہرا�ا۔

”یا! کچھ نہیں آتا۔ سمجھو سب مکس اپ ہو گیا۔“ رافعہ نے ہر اسال فی میں سر ہلاتے ہوئے مخصوص جواب دیا۔

حنین نے اپنی فائل کھولی اور سرسری سی نگاہ دوڑانے لگی۔ پھر کسی احساس کے تحت نامعہ کو دیکھا۔ وہ شوپ پر پکنی پنسل سے لکھے رہی تھی۔ نقل کے یہ طریقے ان کو جانے سوچتے کہاں سے تھے۔

”اگر پکڑوی گئیں تو؟“ حنین نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

”تو گری گرمی کرتے اس سے پسند پوچھلوں گی۔ سارے ثبوت ختم!“ اس نے شانے اپنادیتے تو جنین سر جھٹک کر انہا پڑھنے لگی۔ سیم کھڑکی سے باہر دیکھتا پہنچنے سے سوت اور ان دوستوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جن کو اس نے سموار کی پارٹی کی تفصیلات دینا ہیں۔ ذہن میں وہ فقرے ترتیب دے رہا تھا۔

”پتا ہے ہمارے ایک انکل ہیں.... اونہوں.... کزن ہیں ہاشم بھائی، ان کا گھر پتہ ہے کیا ہے...“ سیم کو یہ سوچ کر ہی مزہ آ رہا تھا کہ اکتنے مزے سے اپنے دوستوں کو سارے قصے سنائے گا۔

❖❖❖

تو نے کیا کیا اے زندگی دشت و در میں بھرایا مجھے ..... اب تو اپنے در و بام بھی جانتے ہیں پرایا مجھے کار دار خاندان کے قصر کے سبزہ زار میں ملازموں کا عملہ اور فاضل دیڑھ پارٹی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اندر لا و نج میں بھی صفائی سترہائی کا عمل جاری تھا۔ شہرین متوازن قدموں سے زینے چڑھتی اوپر جا رہی تھی۔

ہاشم کا کمرہ سنسان پڑا تھا۔ وہ آگے بڑھی۔ نوشیر وال کے کمرے کا داخلی دروازہ کھلا تھا اور آگے بالکونی کا بھی۔ وہ بالکونی میں بیٹھا۔ لیپٹاپ گود میں کانوں میں ایریونز۔ شہرین وہیں کھڑی رہی، یہاں تک کہ نوشیر وال نے چونک کراس طرف دیکھا تو وہ سر جھٹک کر جانے لگی۔

”آپ کب آئیں؟“ آئیے۔“شیر و جلدی سے ایریونز کا لئے ہوئے اٹھا۔ اس کا چھپر کھل اٹھا تھا۔ اس روز کی نسبت آج درست ملے میں تھا۔ وہ اسے پسند کرتا تھا، کوئی انداھا بھی بتا سکتا تھا۔ اور شہرین انہیں نہیں تھی۔ البتہ اسے معلوم تھا کہ وہ کہنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ شہرین نے پریشانی میں نفی میں سر ہلا کیا۔ ”نہیں تم بیٹھو...“ پھر رکی۔

”ہاشم.... ہے یا؟“ اس نے نوشیر وال کے بھائی کا نام لیا۔ وہی بھائی جس کے ڈر کے باعث شیر و کبھی نہیں کہہ سکے گا۔ ”بھائی کا آف تھا مگر وہ شاید شہلا آئنی کے کیس کے لیے کہیں گئے ہیں۔ ان کے ڈر ایکور نے ایکسٹرنٹ کر دیا تھا کسی کا۔“ وہ ابھی

ہم منتظر کھڑا تھا۔ شہرین کی آنکھوں میں مایوس ابھری۔

”خیر وہ ہوتا بھی تو میرا کام نہیں ہونا تھا۔ اس اور کے۔ جانے دو،“ وہ کہہ کر ملنے لگی۔

”کیا کام؟ مجھے بتا کیں۔“ وہ قدم قدم اٹھاتا اس تک آیا۔

”چھوڑ، تم سے نہیں ہو گا۔“

”ولی! اگر آپ نے اپنے کام کا ذکر مجھ سے کیا ہے تو یقیناً آپ کو لگتا ہو گا کہ میں کر سکتا ہوں، تو بتا کیں۔“ وہ اتنا یقوف بھی نہیں لے۔ شہرین تھکے انداز سے مسکرائی۔

”سو نیا.... وہی ہے اصل مسئلہ.... اس کو میری اور ہاشم کی پکپڑے چاہئیں ہیں مون کی۔“

”تو آپ کے پاس نہیں ہیں؟“ نوشیر وال کو اندر سے شاید خوشی ہوئی۔

”میں تکلیف دہیا دوں کو سنبھال کر نہیں رکھتی۔“ اس نے سنبھالے بالوں میں ہاتھ پھیر کر ان کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ہنوز ہمٹ پہ کھڑے تھے۔

”شادی کی تو میرے پاس بھی ہوں گی۔“

”مگر نہیں مون والی ہاشم کے لیپٹاپ میں ہوں گی اور میں تمہارے بھائی کے منہ نہیں گلنا چاہتی۔“ اس نے بہت ہی لاپرواں سے اپنے پا کا ذکر کیا۔

”نوپر ابلم۔ میں کاپی کر دیتا ہوں۔ بھائی آفس نہیں گئے تو لیپ ٹاپ گھر پر رکھ کے گئے ہوں گے۔“ وہ چلتا ہوا ساتھ والے کمر میں آیا۔ تھی آن کی۔

”جلدی کرنا۔ میں اس کمرے میں زیادہ دریں نہیں رکنا چاہتی۔“ اس نے فلیش ڈرائیور بڑھاتے ہوئے کہا۔ نوشیر وال نے ڈر پکڑتے ہوئے نظر بھر کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں۔“ وہ جواب اپنی سماں مکرائی۔

نوشیر وال نے ہاشم کی اسندی نیل سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور آن کیا۔ وہ اس کے ساتھ کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ ساتھ ہی وہ لب کاٹ رہی تھی اور انگلیاں بھی مرور رہی تھیں۔

”اوہ.... پاس ورڈ؟ اب یہ کیا ہے؟“ سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے جب پاس ورڈ مانگا گیا تو نوشیر وال کراہ کر رہا گیا۔ شہرین مانتھے پر بل پڑے۔

”میں نے کہا تھا نام سے نہیں ہو گا جانے دو۔“ وہ مڑنے لگی۔

”ایک منٹ... شہریں تو!“ اس نے موبائل نکال کر ہاشم کو کال ملائی۔

”میرا نام لے لینا تاکہ وہ بالکل بھی اپنا پاس ورڈ نہ دے۔“ وہ تینی سے بولی۔ نوشیر وال نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بہت اور سمجھدار نظر آنے کی سعی کر رہا تھا۔

”ہاں شیر و بولو۔“ وہ مصروف تھا۔

”بھائی یار! آپ کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ کیا ہے؟“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ اپنی تمام تر مصروفیت کے باوجود وہ چونکا تھا۔

”کچھ کچھ زچاہیں تھیں سو نیا کے لیے۔“

”کون سی کچپرز؟“ وہ ہاشم تھا، کھلک گیا۔

”بھائی دے رہے ہو یا میں کچھ اور کروں؟“ اس کا موڈ بگرنے لگا۔ پھر ”ہوں.... اچھا۔“ کہہ کر سر ہلا کر فون بند کیا اور مکرہ ہوئے کی بورڈ کے مٹن دبائے۔ اس کے کندھے سے جھاکتی شہرین نے ان کو حفظ کیا (گوکر اس کی ضرورت نہ تھی) اور پھر لاپرواپی سے اُدھردیکھنے لگی۔ (یلفظ تو اس کو از بر تھا۔ آنکھیں بند کر کے بھی ٹاپ کر سکتی تھی)

”آپ بتاتی جائیں، کون کون سی چاہیے۔“

ان کی ہنسی مون، شادی اور دیگر موقع کی تصاویر کھلتی جا رہی تھیں۔ مقصد پورا ہونے کے بعد شہرین کو جانے کی جلدی تھی اور وہ دیکھ کر سینے میں کچھ چھیننے لگا تھا۔ احساس زیاد، تھی دامنی۔

”یہ والی.... اور یہ تینوں....“ وہ انگلی سے اسکرین پا اشارہ کرتی بتانے لگی۔ نوشیر وال نے کاپی کرتے ہوئے اس کے چہرے دیکھا۔ وہ ضبط کرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے افسوس، ہمدردی، ترجم سب محبوس کیا تھا۔

سوائے فریب کی بوکے۔



میں تو لب کھول کے پابند سلاسل ٹھہرا..... تیری اور بات ہے تو صاحب محفل شہرہ  
کمرہ امتحان میں معمول کا سناٹا چھایا تھا۔ دمختن خواتین کر سیوں کی قطاروں کے بیچ ٹھہل رہی تھیں۔ لڑکیاں سر جھکائے دھڑا

لکھے جا رہی تھیں۔ خین نے دفتار درکرتی انگلیوں کو سہلا تے ہوئے سر اٹھایا اور پھر گردان کو روکیں کرتے ہوئے دائیں طرف دیکھا۔ کمرے کی ایک دیوار کھڑکی سے ڈھکی تھی۔ اور سامنے سڑک اور بگلوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ جس لاء کانچ کوان کا امتحانی مرکز بنایا گیا تھا، وہ دراصل ایک بڑا سائبنگ تھا۔ اور یہ کمرہ یقیناً ذرا انگل کے طور پر استعمال کے لیے بنا لیا گیا ہو گا۔ اس نے سوچا۔

نیچے لان تھا اور وہاں سے ان ادھیز مر و کیل صاحب کی کارنکتی دکھائی دے رہی تھی جو ہائی کورٹ کے وکیل تھے اس لاء کانچ کے مالک تھے اور ہر پیپر میں با بار امتحانی کروں کا پچکر لگا کر اپنی خراب انگریزی میں لڑکیوں کو نقل کرنے کے نتائج نے ذرا نے کی کوشش کرتے تھے۔ شکر کر کاب وہ کہنیں جا رہے تھے اور اگلے ڈیزی ہٹ گھنٹے سر پر سوانحیں ہوں گے۔ اس نے مکراہٹ دبا کر سوچا اور دوبارہ پر پھے پھجک گئی۔

”شش!“ ناعمہ نے پیچھے سے اسے ٹھوکا دیا۔ اس نے جھنچھلا کر متحن کو دیکھا جس کی ان کی طرف پشت تھی اور پھر پیچھے مڑی۔  
”کیا ہے؟“

”رافعہ کو دو!“ اس نے ٹشو آگے کیا۔ خین نے جلدی سے ٹشو پکڑا جیسے کوئی جلتا ہوا انگارہ ہوا اور رافعہ کی کمر پہ پین چھما کر اسے متوجہ کیا۔  
متحن اب چلتی ہوئی آگے جا رہی تھیں۔ قطار ختم کر کے ہی وہ مژتیں اور اس سے پہلے ہی اس نے رافعہ کو دو دے دینا تھا۔

مگر رافعہ یا تو ڈرگئی تھی یا اس سے سمجھنے میں غلطی ہوئی یا متحن غلط وقت پر مژیں اسے ٹھوکا دے کر ٹشو پکڑاتی خین کے ہاتھ سے ٹشو گرا۔ وہ فوراً پیپر پہ جھکی۔ اس کی گھبراہٹ نے سب واضح کر دیا۔ متحن خاتون تیز تیز اس طرف آئیں۔ جھک کر ٹشو اٹھایا۔ اسے کھولا۔ خین نے سر جھکائے اگلا لفظ لکھنے کی کوشش کی، مگر ہاتھ نہ ہو گئے پر چنم ہو گیا، سیاہی پھیلنے لگی۔

”آپ نقل استعمال کر رہی تھیں؟ کہاں سے آیا یا آپ کے پاس؟ چھوڑیں پیپر!“ دو ہاتھوں نے اس کا پر چہ کھینچا۔ دو پیپر زمزیداں طرف آئیں۔ وہ ہکابکا سی پیٹھی رہ گئی۔

”یہ میرا نہیں ہے میم! مجھے نہیں پتا اس میں کیا ہے؟“

”جبھوت مت بولو۔ میں نے خود تمہیں اسے پکڑ دیکھا ہے۔“

”یہ ناعمہ نے دیا تھا رافعہ کو دینے۔“ اس نے پچھلی اور اگلی دونوں کو گھسینا، کہ وہ کوئی اس کی اچھی دوستیں نہ تھیں جن کو دوہ بچاتی۔  
”میرا نام کیوں لے رہی ہو؟“

”مجھے نہیں پتا یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ دونوں لتعلق ہو گئیں۔ کمرے میں تماشا لگ گیا۔ سب سر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ٹیچر زا سے اٹھا رہی تھیں کہ وہ اپنی چیزیں لے کر آفس میں آجائے۔ اس کا پر چہ ختم۔

”آپ پر کیس بننے گا اور تھانے میں درج ہو گا۔ تین سال تک آپ پیپر زندہ دے سکتیں۔“ ان کے الفاظ خین یوسف کی روح قبض کر رہے تھے۔

زین و آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھونٹنے لگے۔ آج تو یہ بھی آخری پر چھتا۔ یا ایک دم سے سب کیسے غلط ہونے لگ گیا  
تھا؟

کچھ بڑا کیاں واپس لکھنے میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ اسے چیزیں سمجھنے دیکھ رہی تھیں۔

”میم! یہ میرا نہیں ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا اس میں کیا لکھا ہے۔“ وہ خشک حلق کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

کسی نے اسے ٹشو ”پاس“ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ پر یہ نہیں نے ٹشو اس کے ”پاس“ دیکھا تھا اور اگلی پچھلی نہیں ڈم کئی لو مری کا شکار لگی تھیں۔ صرف اسے اٹھایا گیا۔ وہ منت کرتی رہی۔ کبھی غصے سے زور سے بھی بوقتی مگر کوئی اثر نہیں۔ میدم اسے دو کروں سے گزار کر ایک آفس نما کمرے میں لے آئیں۔ اسے کری پہ بھادایا۔ پر چہ پیپر دیٹ تلے رکھ دیا۔ اور ایک دوسری ٹیچر کو یونیورسٹی کی انسپکشن ٹیم کو کمال کرنے کا

کہا۔ مقدمے کا پرچہ انہوں نے ہی آکر بنانا تھا۔ ٹیم شہر کے کسی دوسرے امتحانی مرکز کے دورے پتھی۔ ان کو آنے میں بچھو قوت لگنا تھا۔ گھڑی کی تک نکل جنین کے اعصاب پر ہتھوڑے بر سار ہی تھی۔ وہ سفید چہرہ لیے حواس باختہ پریشان ہی بیٹھی تھی۔ مگر خاموش نہیں تھی۔ وہ بار بار احتجاج کر رہی تھی۔

”میم! میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ چھپلی لڑکی کا تھا...“

اگر آپ نے ایک لفظ مزید بولا تو میں اس پر ابھی سرخ کاٹا پھیر دوں گی۔“ انہوں نے غصے سے جھڑکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سر جھکا دیا۔

مگر وہ ہار نہیں مان سکتی تھی۔ وہ سعدی یوسف کی بہن تھی۔ اور.... بھائی کو لقی شرمندگی ہو گی اس پر؟ جنین جیٹکر کرتے پکڑی گئی؟ تھانے میں مقدمہ؟ وہ لرز کر رہ گئی۔ بھائی کبھی اس پر دوبارہ اعتبار کر سکے گا کیا؟

سپریٹنڈنٹ کو ایک ٹیچر نے بلوایا۔ ایک دوسرے کمرے میں کچھ لڑکیاں کو حکم پیپر پر لکھ رہی تھیں۔ ان کی لاپرواہی نے ان کو بھی پھنسا دیا۔ ابھی چھپلے پیپر میں اسی جگہ ایک پوری قطار جو کوئی حکم پیپر پر پاؤ نہیں لکھ رہی تھی، اور اس قطار میں نہلکتی محکم دونوں پر چڑھا تھا انسپکٹر نے۔ اور ابھی وہی جلا دصفت انسپکٹر پھر آنے والا تھا۔ سپریٹنڈنٹ غصے سے باہر نکلیں۔ جنین کمرے میں تھا رہ گئی۔ گھڑی کی تک نکل ہر سو گونجے گئی۔

میز پر سپریٹنڈنٹ کے پرس کے ساتھ ان کا موبائل رکھا تھا۔ جنین نے ادھ کھلے دروازے کو دیکھا اور لمحے بھر میں فیصلہ کیا۔ اسے مدد مدد پکارنا تھا۔ مگر کون آئے گا؟

موبائل اچک کر اس نے دھڑکتے دل سے نمبر ملایا۔ پہلے سعدی کا، پھر مٹا دیا۔ بھائی کے سامنے شرمندگی؟ نہیں۔ پھر چھپھوکا.... وہ ہندسوں کے بعد ہی مٹا دیا۔ کبھی بھی نہیں، ہونہے۔ اور ماہوں کا تو کوئی نمبر نہ تھا۔ پھر کے کرے؟ وقت کی ریت ہاتھوں سے پھسلتے جا رہی تھی۔ وہ تاریک سرنگ میں کھڑی تھی۔ اور ایسے میں اچانک سے سہری رنگ سے لکھے گیارہ ہندسے جگانے لگے۔ بنا سوچے سمجھے اس نے نمبر ڈائل کیا۔ یہ پہلی دفعہ تو نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو فوراً زدے رہے تھے۔

”ہیلو؟“ ہاشم نے تیسرا گھنٹی پر فون اٹھایا۔ وہ گاڑی کی چھپلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور ایکسٹنڈ میں مرنے والی لڑکی کی نیمی سے مل کر واپس آ رہا تھا۔ گوک نمبر ان جان تھا، مگر ہاشم ہر ان جان کاں ان جان کاں اٹھایا کرتا تھا۔

”ہاشم بھائی؟ ہاشم بھائی میں جنین بول رہی ہوں۔“ منہ پر ہاتھ رکھے وہ دبی دبی سی آواز سے بولی۔ خوف زدہ نظریں دروازے پر کنی تھیں۔

”آ... کون... جنین؟“ وہ یاد کرنے لگا تھا۔ جنین کے گرد انہیں بڑھنے لگے۔ نقل کرنے پر ایک پرچہ امتحانی مرکز میں موبائل کے استعمال پر دوسرا پرچہ....

”میں... ندرت کی بیٹی، فارس کی بھانجی، زمری...“

”سعدی کی بہن؟“ ہاشم چونکا تھا۔ ”ہاں جنین! بولو میٹا، کیا ہوا؟ خیریت؟“ اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”ہاشم بھائی! انہوں نے مجھے جیٹکر کے جرم میں پکڑا ہے۔ پرچہ ہو گا۔ پلیز کچھ کریں، میں....“

”تم... کدھر ہو تم؟ مجھے ایڈریس بتاؤ اور فون کہاں سے کر رہی ہو؟“

اس نے جلدی جلدی ایڈریس بتایا تھا کہ باہر سے بولتی سپریٹنڈنٹ کی آواز قریب آنے لگی۔

”سپریٹنڈنٹ آگئیں۔ کال بیک مت کیجیگا۔“ گھبرا کر اس نے فون رکھا۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر آئیں۔

حنین نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ دونوں ٹھپر زاس کی طرف متوجہ ہیں تھیں۔ اسے تو وہ کنارے لگا ہی بچی تھیں۔ اب پوری پانچ لڑکیوں کے کوچھ پیپر کا معاملہ آگیا تھا۔ اسکشن میم آئے گی تو یہ پنڈورا بابا کس بھی کھلے گا۔ وہ لوگ سخت غصے میں تھیں۔ کسی نے بھی موبائل کی سمت نہ دیکھا کہ ان کو بلا اجازت خود بھی موبائل استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔

حنین اب بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ہاشم سے بات کر کے تسلی ہوئی تھی۔ یہ لا کائج تھا۔ ہو سکتا ہے ہاشم ان خراب انگریزی والے پنپل کو جانتا ہو۔ وہ انہیں فون کر دے اور معاملہ ختم ہو جائے۔ ہاشم تو سب کو جانتا ہے۔ اور یہ تو سب کو پتا تھا کہ کام کے وقت ہاشم کا ردار کو ہی پہلی کال کی جاتی ہے۔ اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔

وہ انگلیاں مردوزتی خود کو یلیکس کر رہی تھی۔ گھڑی کی سویاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ کھڑکی سے نیچے گیٹ کو دیکھنے لگی۔ یہاں سے گیٹ صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ کیل پر پنپل کب آئیں گے؟ اف۔

کتنا وقت گزر، پریمنڈنٹ کی کتنی کڑوی کیلی سی۔ کچھ پتا نہیں۔ پتا اس وقت چلا جب اس نے گیٹ کے پار سیاہ چکتی کا رکتی دیکھی۔ پچھلا دروازہ کھول کر وہ نکلا۔ سیاہ سوت، نائی، سن گلاسز، ہاتھ میں سرخ کور کی فائل۔ گلاسز اتارے ہوئے اس نے گیٹ پار کیا۔ حنین کا سانس رک گیا۔

بہت عرصے بعد دیکھا تھا مگر وہ پہچان گئی تھی۔ وہ ہاشم تھا۔ ہاشم خود آیا تھا؟ حنین کے لیے؟ وہ ساکت تھی۔ وہ کیل لگ رہا تھا یا اس کی شخصیت ایسی تھی، اسے کسی ملازم نہیں روکا۔ وہ کسی سے امتحانی کمرے کا پوچھ کر اور پر آیا، رہبری عبور کی اور پریمنڈنٹ کے آفس کے سامنے رکا۔

حنین بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں امید اور خوف دونوں سنتے تھے۔

”پریمنڈنٹ آپ ہیں؟“ ہاشم نے سنجیدگی سے پریمنڈنٹ کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں خواتین پرپل سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

”جی میں ہی ہوں۔ مگر یہ امتحانی مرکز ہے۔ یہاں غیر متعلقہ افراد کا داخلہ؟“ اس کی شخصیت کے رعب میں وہ ذرا دھیمی سی کہنے لگیں۔

”تو پھر آپ ان کو یہاں سے بھیج دیں کیونکہ مجھے اور آپ کو تھائی میں بات کرنی ہے۔“ ہاشم نے کری چکنچی، ناگ پٹاگ پٹاگ جما کر بیٹھا اور سنجیدگی سے دوسرا متحکم کی جانب اشارہ کیا۔

پریمنڈنٹ پریشان ہوئیں، مگر دوسرا ٹھپر خود ہی جلدی سے باہر نکل گئیں۔

”حنین! بیٹا دروازہ بند کرو۔“ اس نے اطمینان سے دوسرا حکم صادر کیا۔ پریمنڈنٹ چوکیں۔ وہ اس پچھی کا جانے والا تھا، مگر....؟“ حنین نے جلدی سے دروازہ بند کیا۔ پھر واپس آ کر کھڑی رہی۔ ناگوں سے جان نکلنے کو تھی مگر بیٹھی نہیں۔ ہاشم نے ابھی تک اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”دیکھیں! آپ اس طرح کیسے اندر آگئے ہیں؟ یہ کوئی طریقہ کار نہیں۔“ اب کے ان کو غصہ چڑھنے لگا تھا۔

”میں ہاشم کا ردار ہوں۔ حنین یوسف کا وکیل۔ اور طریقہ کار میں ابھی آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔“

مگر اس کے نام کا پریمنڈنٹ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے نہیں جانتی تھیں۔

”اس پچھی نے نقل کی ہے۔ نقل کی بوئی (شوپیپر برایا) ہم نے اس کے پاس سے پکڑی ہے اور ابھی اسکے آکر اس پر پرچہ کا منٹ لگے ہیں۔ اس لیے میں یہاں آپ کی کوئی سفارش نہیں سننے والی ہوں۔“

”جی.... نقل کی بوئی اس کے پاس تھی، بالکل تھی!“ ہاشم نے اثبات میں سرہلا یا تو حنین نے کرنٹ کھا کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”اور یہ بولی اسے آپ نے پہنچائی تھی میڈم پر یئنڈنٹ!“

میڈم کا منہ کھل گیا۔ آنکھوں میں حیرت اور پھر غصہ ملکورے لینے لگا۔ مگر اب ہاشم نے اسے بولنے کا موقع نہیں دینا تھا۔

”یہ آپ ہی نے پہنچائی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پچھلے چند سالوں میں آپ نے اپنی تین رشتہ دار بچیوں اور ایک دوست کی بھی کو نقل پہنچائی تھی۔ ان چاروں بڑیوں کے بیان حلی، نقل کے عمل کا طریقہ، ان امتحانی مرکز کی تفصیلات اور شناختی کاروباری کا پی، سب اس فائل میں موجود ہیں۔ اور جب میں یہ فائل یونیورسٹی انتظامیہ اور کنسٹرول امتحانات کو دکھاؤں گا اور جب وہ ان میں سے ایک بچی کے منہ سے سب نہیں گے، کیونکہ وہ بچی بعد میں مدرسے چل گئی تھی اور اب اسے اپنی نقل کی کمائی گئی ڈگری پہ بے حد نہ اامت ہے تو آپ کا کیا بنے گا؟“

سپر یئنڈنٹ کا ترک سفید پر اسی حینیں الگ منہ کھولے ہاشم کو دیکھ رہی تھی جو سرخ فائل لہرا کر سب کہہ رہا تھا۔

”یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کبھی کسی کو نقل نہیں کروائی۔“

”وہ میرا منہ نہیں ہے یہ بچی میرا منہ ہے۔ آپ اسے پہپا دا پس دیں اور اس کا جو نام... کتنا نام ضائع ہوا ہے؟“ رک رک حینیں کو دیکھا۔ وہ جو ہر کابکا اسے دیکھے جا رہی تھی، گڑ بڑا کر گھڑی دیکھی۔ ”چالیس منٹ۔“

”اس کے جو چالیس منٹ ضائع ہوئے ہیں، وہ اس کو ایکسٹرادیں۔ اس کا پہپر بغیر سرخ نشان کے لیا جائے اور اسے عزت سے جانے دیا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو آپ کی یونیورسٹی کے وہی سی کا نمبر میرے فون میں ”آر“ کی لست میں ہے (ساتھ ہی موبائل اسکرین دکھائی) کنسٹرول امتحانات کا ”الیس“ کی لست میں اور آئی جی کا ”ٹی“ میں۔ سو میرے آر ایس ٹی دبانے سے پہلے اس بچی کو اس کا پہپا دا پس مل جانا چاہیے۔“ وہ سپر یئنڈنٹ کی آنکھوں میں دیکھ کر بہت اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

”یہ سب بکواس ہے۔ اور ہم اسپکشن ٹائم کو کال کر بچے ہیں، وہ آتے ہی ہوں گے۔“ وہ بے چین، مضطرب، غصے میں تھیں۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ میں یہ فائل ان ہی کو پیش کر دوں گا اور مجھے لگتا ہے ابھی تک آپ کو ان بڑیوں کے بیانات کی زائد کت کی سمجھنہیں آئی۔ حینیں بیٹا! یہ لو اور پہلا بیان ان کو پڑھ کر سناؤ۔“ ہاشم نے سپر یئنڈنٹ کو ہدی دیکھتے ہوئے فائل اس کی طرف بڑھا۔ حینیں کو کچھ سمجھنہیں آرہا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہوئے باتھوں سے فائل کھولی اور پہلا صفحہ سامنے کیا۔

کاردار ایڈنسنر پریزنسپل ہاشم کاردار کے پاؤں۔ وہ اندھوں کی طرح صفحے کو اوپر نیچہ دیکھ رہی تھی۔ یہ ہاشم کے آفس کی کوئی فائل تھی۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ہاشم کا چھرہ دیکھا۔ (کیا وہ غلط فائل اٹھالا یا تھا؟)

”پڑھو حینیں!“ اب کے ہاشم نے اسے دیکھ کر کہا۔ پھر تو چھا ہو کر خود فائل کو دیکھا۔

”ہوں.... پہلا کیس تو آپ کی بہت قربی عزیز بچی کا ہے۔ اور یہ واقعہ بھی اسی سیکٹر کے ایک کالج میں پیش آیا۔“ وہ جیسے پڑھتے ہوئے اعتماد سے کہہ رہا تھا۔ وہ غلط فائل نہیں اٹھا کر لایا تھا۔ حینیں بے شکنی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاشم جھوٹ بول رہا تھا۔

”بس!“ سپر یئنڈنٹ کی برداشت کا پیانہ لبریز ہو گیا۔ باتھ اٹھا کر حقیقت سے روکا۔ ہاشم نے فائل لے کر بند کر دی۔ پہپر دیٹ ہٹا کر پہپر اٹھایا اور حینیں کو دیا۔

”جاوہ جا کر پہپر کرو،“ حینیں نے میڈم کو دیکھا۔ وہ ضبط سے لب کاٹتی اسے دیکھ رہی تھیں۔

اسی پل دروازہ کھول کر پنپل و کیل داخل ہوئے۔ ہاشم نے گردان ترچھی کر کے مسکرا کر دیکھا۔ پھر اٹھ کر ملا۔ وہ خوشنگوار حیرت سے اس سے ملے۔

”کاردار صاحب! آپ ادھر کیسے؟“ وہ اسے جانتے تھے۔ خراب تو سپر یئنڈنٹ بھی اسے جان گئی تھیں۔

”در اصل یہ میری کزن کی بیٹی ہیں۔ خاندان میں ایک بزرگ کی ڈیمچہ ہو گئی تھی۔ مجھے ان کو پک کرنا تھا۔ مگر یہ خبر سن کر پریشان ہو

گئیں اور آدھا پونا گھنٹہ صائم ہو گیا۔ بمشکل پیپر مکمل کرنے پر راضی کیا ہے میدم نے۔ اور ایک شراثا نام بھی دیں گی۔ ان کی مہربانی!“ کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر پریمنڈنٹ کو دیکھا جنہوں نے بمشکل اثبات میں سرہلا یا۔

”نبیں، بس تھوڑا اسارہ گیا تھا۔ میں پندرہ بیس منٹ میں کروں گی۔“ خین پیپر دبوچے کھڑی ہو گئی۔

”جی بالکل آپ آرام سے کریں۔“ پرپل صاحب نے گرم جوشی سے کہا۔ پھر ہاشم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”آئیے نیچے آفس میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ بڑا عرصہ ہوا ملاقات نہیں ہوئی تھی آپ سے۔“ ہاشم نے مسکرا کر سرکوم دیا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ اس کا وقت بہت قیمتی تھا۔ مگر پھر بھی اس نے خین سے کہا۔ ”پیپر دے کر آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”اوہ میدم! انکشش نیم پہنچنے والی ہے۔ آپ نے ان کو کس سلسلے میں بلا یا تھا؟“ پرپل صاحب نے جاتے جاتے ایک دم پوچھا۔ خین کی نانگوں سے جان نکلنے لگی۔ اس نے ہر اساتھی ہو کر ہاشم کو دیکھا جا گہری سر نظر وہ سے پریمنڈنٹ کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ ہال نمبر تھری میں لڑکیاں کو سمجھن پیپر پر لکھ رہی تھیں تو...“

”اوے اوے کے....“ وہ سرہلا کر ہاشم کو باہر لے گئے۔ خین بھی پیپر کی متاع عزیز کی طرح پکڑے وہاں سے نکل گئی۔

بیس نہیں اسے پچپس منٹ لگے۔ جلدی جلدی پیپر ختم کر کے وہ شعلہ بار نظر وہ سے خود کو گھوتی پریمنڈنٹ سے نگاہ ملائے بغیر نیچے آئی تو ہاشم پرپل کے آفس (جو پورچ کے ساتھ تھا) کو وہ کانج بچکا ہی تھا۔ سے نکل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر خونگووار مسکرا یا۔

”ہاشم بھائی... تھیں یو سوچ!“ وہ فریب آکر بولی تو اواز بھرا گئی۔ آنکھیں ختم ہو گئیں۔

”شکر کیس چیز کا؟ سعدی اور تم نے ہم پر ایک احسان کیا تھا، اس کو اسی کا بدل سمجھلو۔ خیر! میں نے پرپل سے کہہ دیا ہے۔ وہ اس امر کو قیمتی بنائے گا کہ تمہارا پیپر بغیر سرخ کانٹے کے سیل ہو جائے۔“

”ان کو... خوب نہیں ہوئی سارے معاملے کی؟“

”ضرور ہو گئی تک تمہارا پیپر جا چکا ہو گا۔ بے فکر ہو۔ میں نے سب سنبھال لیا ہے۔“ اس نے اعتقاد سے کندھے اچکائے۔

”مگر... وہ فالی... اس میں میدم کی تفصیلات تو نہیں تھیں؟“

ہاشم نے بہس کر سر جھٹکا۔

”محضہ تو اس عورت کا نام بھی نہیں معلوم!“

”مگر... وہ سب آپ نے کیسے کہا؟“

”میں نے اندازہ لگایا۔ کم از کم چار دفعہ تو اس نے یہ کام کیا ہو گا۔“

”لیکن اگر وہ ایماندار پیپر ہوتی تو؟“

”بہر حال وہ ایماندار نہیں تھی۔“

”اور اگر وہ فالی دیکھ لیتیں؟“

”مجھے پتا تھا وہ نہیں دیکھے گی۔ اپنا اعمال نامہ کوئی بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ اس نے کلائی پر گھڑی دیکھی۔ ”چلو تمہیں ڈر اپ کر دوں۔“

اور سعدی یوسف کی بہن بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔ ”نبیں وین آگئی ہو گی۔ اور اگر آپ نے چھوڑا تو سب کو پتا چل جائے گا۔

ہاشم بھائی! پلیز سعدی بھائی کو مت بتائیے گا۔“ وہ یکدم خوفزدہ اور شرمندہ نظر آنے لگی۔

”کیا یہ کہنے کی بات ہے؟“ اللادہ حیران ہوا۔ خین نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

”آج پھر پارٹی پا رہے ہو؟ زمر نے آرائیں وہی پیز نکلت کر کے بھج تو دیئے تھے۔“

”بھی، پھپھو خود کا رو دینے آئی تھیں۔ ہم سب آئیں گے۔“

”اچھا زمر خود گئی تھیں؟ گلڈ؟“ ہاشم مسکرا دیا۔ پھر دوبارہ گھڑی دیکھی۔ اس کو جانا تھا، سومہندب انداز میں اجازت چاہی۔ حنین کی نگاہوں نے اس کے کار میں بیٹھنے تک اس کا تعاقب کیا۔ اس کا پر فیوم، ہنوز اس کے ارد گرد پھیلا تھا۔ وہ جادو گرفقا۔

ساحر.....

وہ مرگی....ابھی اسے رافعہ اور ناعمہ کی بھی خبر لیتی تھی۔

❖❖❖

سارے گل بوئے مصنوعی.....رنگ ، نمٹ خوبصورت دھوکا ہے  
قصر کے بزرہ زار میں سیاہ شام نہرے تاروں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تھی۔ بھر پور سجادوں، سیاہ اور سنہری اسپرے پینٹ شدہ اصلی  
گلاب، روشنیاں تھیں۔

وہ سب گول میزوں کے گرد کھڑے تھے۔ وہ گول میزوں اتنی اوپھی تھیں کہ سینے تک آتیں۔ کرسیاں ندارد۔ ایک میز پر ٹیک لگا تھا  
”Yousufs“ اور اس کے گرد وہی چاروں تھے۔ صرف حنین کا فرماں سیاہ نہری تھا۔ باقی سعدی اور سیم سیاہ سوت میں تھے اور زمر کو تو سیاہ کی  
عادت تھی۔ وہ بے تاثر چہرہ لیے گھنگھریاں لٹ انگلی پر لپیٹتی سامنے دیکھ رہی تھی۔ سیاہ لبی قمیں، کندھوں پر سیاہ ہی دوپٹے۔ بال کھلے تھے۔ حنین  
کے بال مگر فریج چوٹی میں بند ہے تھے اور وہ مسلسل ارد گرد سے گزرتی لڑکوں کے پیر دیکھ رہی تھی۔ (امیر لڑکوں کی شکلیں جیسی بھی ہوں، پاؤں  
بلکے حسین ہوتے ہیں) وہ چہرہ رگڑ لے بہت ہے۔ پیروں کا خیال دعوتوں میں ہی آتا۔ اس نے اپنے پاؤں فرماں کے گھیر کے اندر سمنئے کی  
نام کو کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

سیم کافی پر جوش آیا تھا۔ حنین نے یہ کہہ کر کہ ”امی کو بڑے بابا کے پاس چھوڑ دیتے ہیں، کیوں پھپھو؟“ زمر کی تائیدی تو سعدی انکار نہ  
کر سکا۔ سیم کو سب سے زیادہ خوشی سمووار کو اپنے دوستوں کو اپنے امیر رشتہ داروں کی دعوت کی تفصیل بتانے کی تھی۔ اس لیے رستے میں بار بار وہ  
دلبی آواز میں اپنا اور کاردار زکار شستہ پوچھتا آیا تھا۔

”ہاشم بھائی، ہمارے کیا لگتے ہیں؟“

”دیکھو سیم! ہمارے ننانے دوشادیاں کی تھیں۔“ حنین نے پہلی دفعہ تفصیل سے سمجھایا۔ ”پہلی بیوی سے امی اور وارث ماموں تھے  
جن کی بیوی سارہ خالہ ہیں۔ پتا ہے نانا کا؟“ سیم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور دوسرا بیوی سے فارس ماموں تھے۔ اب یہ جو دوسرا نانی  
تحمیں نا، ان کے بھائی اور نگریب کاردار تھے۔ ہاشم بھائی کے ابو۔“

”یعنی فارس ماموں اور ہاشم بھائی فرست کرنا ہوئے؟“

”بالکل! مگر ہماری امی کے فرست کرن نہیں ہیں ہاشم بھائی۔ ہمارے وہ کچھ بھی نہیں لگتے ویسے۔“

”تو پھر وہ ہمیں کیسے جانتے ہیں؟“

”اف سیم....! خون کا رشتہ نہیں ہے مگر امی کی سوتیلی ماں کے سمجھے ہوئے تو رشتہ دار تو لگے نا۔ اب دوبارہ مت پوچھنا۔“

”مگر پھر وہ زمر پھپھو کیسے جانتے ہیں؟“

”ہاشم بھائی اور پھپھو کیل ہیں۔ ایک ساتھ کام کرتے رہے ہوں گے، اسی طرح شاید۔“

”تو ہاشم بھائی نے سارہ خالہ کو کیوں نہیں بلایا؟“

”اف مجھے کیا پتا؟ سارہ خالہ تو ویسے بھی اب کسی سے زیادہ ملتی جلتی نہیں ہیں اور نہیں بھی بھی بھی ہی بلاتے ہیں۔“

”پہلے کب بلا یا تھا؟ میں تو کبھی نہیں گیا۔“ سیم کو تو غم لگ گیا۔

”بس چند ایک بار گئے تھے، ہم ان کی طرف۔ بھائی اور میں۔ اب چپ کر کے بیٹھو!“ اس نے بات ٹال دی اور..... بمشکل سیم کو

خاموش کر دیا۔ مگر پارٹی میں آکر وہ واقعی خاموش ہو گیا تھا۔ یہ اس کی دنیا سے مختلف دنیا تھی اور اسے بالکل بھی مزہ نہیں آ رہا تھا۔

”کنو....“ اس نے خنین کے قریب سرگوشی کی۔ ”یہ ہاشم بھائی...“ درکسی سے ہنس کر باتیں کرتے ہاشم کی طرف اشارہ کیا۔ ”کتنے

آریفیشل لگتے ہیں نا؟“

”الو.... اشارے مت کرو!“ اس نے جلدی سے سیم کا ہاتھ دبايا۔ البتہ چہرے کے رنگ بدل گئے۔ وہ ہاشم کو دیکھی نہ پارہی تھی۔

دل میں خوف الگ۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟

قصیر کاردار کے باہر... چند کلومیٹر کے فاصلے پر... ایک دیران سڑک پر وہ کار رکی کھڑی تھی۔ چاند اور اسٹریٹ پول کی میلی مددھم روشنی

میں دیکھو تو ڈرائیور نگ ڈریسیک لگائے فارس غازی کھڑا تھا۔ سینے پر بازو لپیٹ رکھے تھے اور سر جھکائے جو گزر میں پر رکھ رہا تھا۔ دھنٹا اس نے

سر اٹھا کر دیکھا۔ اپنی نہری آنکھیں متلاشی انداز میں دامیں بامیں گھما رہیں۔ وہ گویا کسی کا منتظر لگتا تھا۔

اس نیم اندر ہیر جگہ پر بھی اس کا چہرہ شفاف سالگتا تھا۔ جیل والی پونی اب کٹ چکی تھی اور بال بہت چھوٹے ہو چکے تھے گویا استرا

پھیر دیا ہو۔ پوری آستین کی سرمی شرث پہن رکھی تھی۔ وجہہ چہرے پر بے زاری سی تھی۔ نہری آنکھیں اور ستواں مگر مغرونا ک اس کو مزید پر

کشش بناتی تھیں۔ وہ واقعی ایسا مرد تھا کہ جس کو راہ چلتے بھی لوگ مرزا کا ایک دو دفعہ تو ضرور دیکھتے تھے۔ مگر وہ عام خوبصورت مردوں کی طرح

اس بات سے لطف اندوں نہیں ہوتا تھا۔

شاید اب نہیں ہوتا تھا۔

اب اس کے چہرے پر ہم وقت ایک چڑچڑاپن چھایا رہتا تھا۔ بے زاری اور غصہ۔

بالا کر سامنے سے کار آتی دھائی دی۔ تیز ہیڈ لاینس کے باعث فارس نے آنکھیں چندھیا کر منہ پھیر لیا۔ ہیڈ لاینس مددھم

ہوئیں۔ انہم بند ہوا۔ بتیاں بھیں۔ سڑک پر پھر اندر ہیر اچھا گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان باہر لکا۔ یہاں سے اس کی پشت دکھائی دیتی تھی۔

سر کے بال سیاہ تھے اور نیچے ررف سی جیزز شرث پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں ایک بیگ پکڑ رکھتا تھا۔

”غازی!“ اس نے گلے ملنے کو باز و آگے بڑھایا اور فارس نے بیگ لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ وہ رک گیا۔

”مبارک تو دینے دے یار۔“

”میر اسامانِ اُٹپنی!“ وہ خشک لمحے میں بولا مگر آواز خشک نہیں تھی۔

نوجوان نے افسوس سے سر جھکا۔ ”میں تمہارا واحد دوست ہوں۔ جیل کا ساتھی رہا ہوں۔ اور تمہیں اچھی طرح پتہ ہے کہ اگر تمہیں

ہاہر لانے میں سعدی کا ہاتھ ہے تو دو چار انگلیاں میری بھی ہیں۔ بندہ دوستی کا ہی لحاظ کر لیتا ہے۔“ بیگ ساتھ دھرتے وہ بہت ناراضی سے بولا

تھا۔

”سامان پورا ہے؟“ اس نے زپ کھول کر دیکھا۔ تدقیقی مشکوک نگاہوں سے ایک ایک شے کو الٹ پلٹ کیا۔ اندر ہرے کے

باوجود وہ اتنا دیکھ سکتا تھا کہ سب پورا تھا۔

”جان پر کھیل کر لایا ہوں یہ سب۔ ویسے تم اس کا کیا کرو گے؟“

”اپنی حفاظت کے لیے ہے اور کیا کرنا ہے۔“ وہ اب بیگ کو کار کی بچھلی سیٹ پر کھر رہا تھا۔

”اسکا پنے لی بھی رکھو تو چلانا دوسرے پہی ہوتا ہے۔ اللہ کو مانو غازی۔ ابھی تم جیل سے نکلے ہوا بھی سے یہ کام...“

”تمہارا شکر یہ۔ میں چلتا ہوں۔“ وہ سپاٹ سا کھتا ڈرائیور کی طرف بڑھا۔ اٹھنی چند لمحے کے لیے ہبکا بکارہ گیا۔

”اور میرے پیسے؟ کیا تم بھول گئے کہ میں اس شہر کے سب سے مہنگے consultants میں سے ایک ہوں۔“

”اچھا؟ ابھی تو تم نے کہا کہ تم میرے دوست ہو۔“ اس نے تجھ سے کہا اور اندر بیٹھ گیا۔

”مگر میرے پیسے لگے ہیں یا۔ وہ کون ادا کرے گا۔“ وہ چیخنا تھا۔ فارس نے ہاتھ ماتھ تک لے جا کر اسے سلام کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر کار آگے بڑھا دی۔ وہ وہیں کھڑا ٹھکلی سے بربڑا تارہا۔

قصر کاردار کے اندر ورنی لان میں پارٹی کی رونق جاری اوساری تھی۔

سعدی جوں کے گلاں سے گھونٹ بھرتا گہری نظروں سے بائیں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں شہرین کھڑی کسی سے مل رہی تھی۔ اس نے وہی نہر اگاؤں پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں کلچ کے ساتھ ٹیب اٹھا رکھا تھا۔ پھر سعدی کو دیکھ کر ان کی طرف آئی۔

”بھیلوڑی اے!“ زمر کو وہ اسی طرح پکارتی تھی۔ ذہی اے یعنی ڈسٹرکٹ ائٹارنی۔ پھر سعدی پا یک سرسری نظر ڈالی۔

”بھیلوڑی! ٹھیک ہو تم؟“ رسمی ساحاں احوال پوچھا۔

زمر نے محض سر کے خم سے جواب دیا۔ وہ اسی طرح مڑ گئی، مگر سعدی کے قریب سے۔ اور سعدی نے بے حد ہمارت سے ٹیب پکڑ کر کوٹ کی اندر ورنی جیب میں رکھ لیا۔ شہرین مڑے بنا دوڑ ہوئی گئی۔ سعدی نے گہری سانس لی۔ آدھا کام ہو گیا تھا مگر پاس ورزد۔۔۔

”زمر نے وعدہ پورا کیا۔ سعدی بالآخر آگیا۔“

ہاشم نے مسکرا کر اس کے کندھے کو ٹھیک کر تو وہ سنبھل کر سیدھا ہوا۔ ہاشم ابھی ادھر آیا تھا۔ حنین اپنے جو توں کو دیکھنے لگی۔

زمر نے ذرا سے شانے اچکائے۔ اور خاموشی سے اسے سعدی سے بات کرتے دیکھتی رہی۔

”کیا کر رہے ہو آج کل؟“ وہ بالکل بڑے بھائیوں کے انداز میں پوچھنے لگا۔ سعدی سادگی سے مسکرا یا۔

”آپ کو علم نہ ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں یہ میں نہیں مان سکتا۔“

ہاشم نہ دیا مگر اس کی سردا رکھیں سعدی کے اندر نکل اتر رہی تھیں۔

”بھی تو جانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو؟“

”گڑے مردے اکھاڑ رہا ہوں۔“

ہاشم کی برف آنکھوں میں تپش ابھری، مگر مسکرا ہٹ پھیکلی نہ ہوئی۔

”کوئی مدفن ملے تو مجھے بھی خبر کرنا!“

”سب سے پہلے آپ ہی کے پاس آؤں گا، وعدہ رہا۔“ سعدی کے لمحے میں عزم تھا۔ ہاشم نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور سعدی کے کار سے نا دیدہ گرد جھاڑی۔

”میں انتظار کروں گا۔“ پھر دوسروں کی طرف پلتا۔ ”کیسی ہو حنین؟“

حنین نے چہرہ اٹھایا، پلکیں لرزیں۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ نرم مسکرا ہٹ سے اس کو دیکھتا۔ کیمل کلر کے سوت میں ملبوس، اندر سیاہ شرت۔ سب سے مختلف۔ حنین کا اعتماد بڑھا۔ کسی کو کچھ علم نہیں ہو گا۔ ہاشم کسی کو نہیں بتائے گا۔

”جی... ٹھیک!“

وہ سیم کو دیکھے بناز مرکی جانب متوجہ ہوا۔ ”کیا میں نے آپ کو بتایا کہ مجھے سر کار بنام عبدالغفور میں سیلمونٹ مل گئی ہے؟“

زمر کی گھنٹہ یا لٹ پیٹھی انگلی سا کت ہوئی۔ آنکھوں میں حیرت، شاک، کچھ بھی نہ ظاہر ہوا۔ بس سوالیہ ابرا و اٹھائی۔

”واقعی؟ پر اسکیو ٹر بصیرت کیسے مانے؟“

”جبیسا کہ میں کہتا ہوں پیسہ بولتا ہے۔“ وہ محظوظ ہوا تھا۔ ”ویسے آپ کو عالم دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا میری جیت کا آپ کو علم ہوگا!“

”مجھے واقعی علم نہیں تھا کہ آپ جیت گئے ہیں۔“ اس نے بے نیازی سے ابر واچکائے۔ ”اینی ویز مبارک ہو۔ آپ نے ایک قاتل کو اال سے محفوظ کرالیا۔“

”یہ صرف ایک ایکیڈنٹ تھا!“ ہاشم نے یاد کروایا۔ پھر انیٹرنیس کی طرف دیکھا اور ”میں آتا ہوں“ کہہ کر اپنے دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گیا۔

زمرا سے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر خ موڑ تو سعدی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”یہ کس جیت کی بات کر رہے تھے؟ اور یہ کار پوریت Litigation سے کریمنل کیسز کی طرف کیوں آ جاتے ہیں بار بار؟ ذرا ما انزکر کے بتائیں۔“ اس کی بات پر زمرنے کہنا شروع کیا۔

”ویل.... ہاشم کی ماں کی دوست مرز شہلا ارشاد کے ڈرائیور نے ایکیڈنٹ میں مین اٹج لڑکی مار دی اور ہاشم اپنا آفس چھوڑ کر مل عزیز دا قارب کو فیور زدی نے ڈی اے کے آفس آتا رہتا ہے۔ سودہ معاملہ سیٹل کرنا چاہتا تھا۔ مگر پر اسکیو ٹر بصیرت کے پاس کیس ہونے لے اجھے سے یہ مشکل تھا۔ بہر حال اس نے دیت کی رقم جتنا اماڈنٹ اوپر بھی خفیہ طور پر ورثا کو دے دیا اور معاملہ سیٹل۔“

سعدی نے اثبات میں سرہلایا۔ ”صرف نہیں منٹ۔“

زمرنے ناٹھکی سے اسے دیکھا۔

”ابا پہلی دفعہ جب مجھے آپ کے پاس لے کر گئے تھے، تب میری عمر بیس منٹ تھی۔ سوسوائے ان بیس منٹ کے باقی کے بچپن سال اس، مات دن میں آپ کے قریب رہا ہوں، اور ان بیس منٹ کی کی میری آپ کو سمجھنے کی صلاحیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آپ نے ہاشم لہما آپ اس کی جیت سے بے خبر تھیں۔ اور اس کوڈی کوڈ کروں تو آپ کو خبتر تھی۔ مگر جیت کی نہیں، کیونکہ وہ شاید جیتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے آپ نے ابھی سر انزکر کے بتایا ہے اسے زمرانزکر کے بتائیں۔“

”زمرانزکروں؟ اچھا...“ وہ لہکا سا بھی اور اتنے عرصے بعد یہ پہلی دفعہ ہوا۔ وہ مسکرا تھا اور خنین بے دلی سے سن ایقٹی۔ اس کا دھیان بار بار بھلک رہا تھا۔

”قانون اندر ہا ہوتا ہے مگر پر اسکیو ٹرکی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ مجھے کیس دیکھ کر پتا چل گیا تھا کہ ایکیڈنٹ مالک نے کیا ہے اور والا ادا رائیور قربانی کی بھیڑ ہے۔ مگر شوت تھانے گواہ تو میں نے ہاشم کو پر اسکیو ٹر بصیرت کا رستہ دکھایا۔ کیونکہ ہاشم اپنی اناکے لیے مرز شہلا سے ۱۰ رقم نکلا سکتا تھا۔ جب لڑکی کے باپ نے بتایا کہ دہری رقم مل گئی ہے تو میں نے بصیرت صاحب کو ڈیل کے لیے قائل کر لیا۔ بہر حال یہ ایکیڈنٹ تھا اور میں صرف اس فیملی کی مدد کرنا چاہتی تھی۔“

مسکرا کر بتاتے اس نے دور کی سے بات کرتے ہاشم کو دیکھا۔ خنین بے دلی سے ادھرا درد دیکھنے لگی۔ البتہ سعدی نے صحیح انبوخے ایجاد کیا۔

”آپ نے ہاشم کو کیوں نہیں بتایا کہ وہ نہیں جیتا؟“

زمرنے جو بآسعدی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہمارے اسکول میں ایک جادو گر شو کرتا تھا۔ کبھی ٹوپی سے کبوتر نکالتا، کبھی کان سے ملے۔ میں نے ایک دن پوچھا، اس ٹرک کا راز تو بتائیں۔“ وہ بولا جس دن بتا دیا وہ میرے شو کا تہارے اسکول میں آخری دن ہو گا۔“

”صحیح! اور یہ ذرا سیور کو قربان کرنے کا مشورہ بھی ہاشم بھائی کا ہوگا۔“

”کیا پتا انہیں معلوم نہ ہو کہ جرم مالکن نے لیا ہے۔“ خین کو برالگا تھا۔

”معلوم؟ ہاشم بھی بھی اپنے کلائیٹ سے نہیں پوچھتے کہ اس نے جرم کیا ہے یا نہیں۔ اس کا کام دفاع کرنا ہوتا وہ دفاع کرے گا۔“

پر اسکیوں کرنا ہوتا پر اسکیوں کرے گا۔“

خین زمر کو دیکھ کر رہ گئی۔ ہاشم نے اس سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس نے نقل کی تھی یا نہیں۔

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ وہ مکمل کا کام پوچھنا اور مولیٰ پر اعتبار کرنا نہیں ہوتا۔ اسے خود تقاضہ کر کے اپنے ڈھونڈنا اور اسے چھپانا یا بڑھانا ہوتا ہے۔“

”ہاشم بھائی کو لازمی پتا ہوگا کہ مالکن نے جرم کیا ہے۔ اپنے جیسے کہ منذر کو وہ اچھے سے جانتے ہیں۔“ سعدی نے اضافہ کیا تو زمر نے

ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔

”سعدی! میں ہاشم کو پسند نہیں کرتی اور قابل اعتبار تو قطعاً نہیں صحیح۔ مگر کہ منذر کا دفاع کرنے کے باعث ہم اس کو کر مثال نہیں کہہ

سکتے۔“

سعدی خاموش ہو گیا۔ بن ایک نظر زمر پڑا۔ اگر جو پچھوپو کوتا چل جائے کہ وہ ہاشم کو اتنا بھی نہیں جانتی تو؟“

جو اہرات جب ادھر آئی تو تہبا نہیں تھی۔ ساتھ دو تین خواتین بھی تھیں۔ تازہ بٹوں کس کا اثر تھا۔ وہ سیاہ نہبری دھاریوں والے گاؤں

میں دکھ رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے سعدی کا کالرز اکٹ سے جھاڑا۔

”کیا یہ دستی ہے تمہاری نظر میں کہ شکل بھی نہیں دکھاتے؟“ بڑی نزاکت اور ممان سے کہا۔

سعدی زمی سے مسکرا دیا۔

”اب آپ کے پاس خود پہلے جیسا وقت نہیں ہوتا ممزوج اہرات!“ جواہرات بن مسکرا کر اپنی فرینڈز سے زمر کا تعارف کروانے

لگی۔ ایک تو شاید زمر کو جانتی بھی تھی۔

”اوہ آپ زمر ہیں، مجھے یاد ہے۔ پہلے بھی ملاقات ہوئی تھی۔“ اس نے البتہ زمر کا نام غلط تلفظ سے بولا تھا۔ رے کے اوپر زبر کے ساتھ۔ ”اف“

”اُس زمر... زو... زر... زے کے اوپر پیش ہے۔“ اس نے توڑ توڑ کر بتایا۔ وہ خاتون ”اچھا اچھا“ کہہ کر سر ہلانے لگیں۔ قدرے

فاصلے پر کھڑا نو شیر والا تند نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے ماں کے وعدہ پورا کرنے کا انتظار تھا۔

اب جواہرات نے ساتھی خواتین سے سعدی کا تعارف کروایا۔

”یہ سعدی یوسف ہے، ہمارا رشتہ دار اور بہت اچھا دوست۔ اپنا مکمل تعارف اور شجرہ نسب بتانا سعدی کو پسند ہے۔ سوتاؤ نا سعدی!“

سعدی ذرا سا چونکا۔ پھر سنجل کر مسکرا دیا۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ (تو نو شیر والا کی بے عزتی کا بدلہ اتارا جا رہا تھا) اس نے

بس ایک نظر سامنے کھڑے شیر و پڑا۔ جس کے لبوب پہ فاتحانہ مسکرا ہٹتھی۔ سعدی کھٹکھڑا۔

”مز جواہرات نے چونکہ شجرہ نسب کا ذکر کیا ہے، تو ہم بیٹھان ہیں اور ہمارا قبیلہ بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے، یوسف علیہ السلام کی

اولاد سے۔ اسی لیے سعدی یوسف خان نام ہے میرا۔۔۔ یوں میں، میرے مل کلاس والدین، ہم سب بنی اسرائیل سے ہیں۔“

کہہ کر اس نے معصومیت سے جواہرات کو دیکھا۔ جہاں شیر و کاچہرہ سیاہ پڑا، ایس جواہرات بھی بھجھی۔ وہ یقیناً یہ سب اس انداز میں نہیں کھلوانا چاہتی تھی۔ اگر جو وہ اس روز نو شیر والا کے سامنے جھاڑی گئی تقریر یہاں دہراتا تو کتنا مزہ آتا۔ مگر اب وہ تینوں خواتین ستائشی

نظر دی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ نوشیر وال سر جھنک کر آگے بڑھ گیا۔ جواہرات نے ان میں سے ایک کو نحاط کیا۔ ”آسٹر لیلیا کب جا رہی ہو آمنہ؟“

”اسی بیفتہ حماد اور کرن کے ساتھ۔“

زمر چوکی۔ سعدی بھی خینہ تک نے ان کو دیکھا۔ جواہرات مسکراتے ہوئے نرمی سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے پاس بدل لینے کے بہت سے طریقے تھے۔

”کرن کیسی ہے؟“

”جزواں بیٹھے ہوئے ہیں اس کے خوش ہے۔“ وہ کرن کی خالہ تھیں۔ اور یہ تو سب کو علم تھا کہ زمر کے ملکیت کا رشتہ جواہرات کے جانے والوں میں ہی ہوا تھا۔

وہ خواتین وہاں سے نہیں تو جواہرات اس طرف مڑی۔ ایک معصوم نظر سعدی کے سنجیدہ چہرے پہ ڈالی۔ پھر زمر کو دیکھا جو سپاٹ کھڑی تھی۔ پھر ایک دم آنکھوں میں ملال ابھرا۔

”اوہ آئی! ایم سوری ہی! مجھے حماد کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے تمہیں ڈسٹرپ کر دیا تھا۔“ نرمی سے اس کا با تھہ تھام کروہ جیسے بے حد شرم دندھ تھی۔

خینہ نے اب کانتے ہوئے پھپھو کو ہمدردی سے دیکھا۔ اسے اپنے پچھلے رو یہ پہر مندگی ہوئی۔ بے چاری پھپھو۔

”مجھے فرق نہیں پڑتا۔“ اسے فرق پڑا تھا، مگر وہ رخ موڑ گئی۔ اور وہیں انٹرنس سے وہ چلا آ رہا تھا۔ سیاہ سنہرے لوگوں میں وہی منفرد تھا۔ نیلی چیز اور سفید شرت، چھوٹے کشے بال، کندھے پہ بیگ لٹکائے۔ ویٹرنے کچھ کہا۔ اس نے ”اوہہوں“ کرتے پیزاری سے اسے پرے کیا اور برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔

زمر کی آنکھوں میں کرب ابھرا۔ نفترت، غم، غصہ۔ لب بھنج گئے۔ جواہرات نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

”وہ رہا ہو گیا ہے اور یہ اس کے ماموں کا گھر ہے۔ اس کو رہنے سے روک نہیں سکتی۔ فارس کو کوئی بھی کچھ کرنے سے روک نہیں سکتا۔“ جواہرات نے زمر کا ہاتھ دبائے گویا مادرت کی، مگر دھیرے سے۔

”مجھے فرق نہیں پڑتا۔“

”آئی! ایم سوری! ریتلی!“

”یوٹھڈ بی!“ سعدی نے سرد لبجھ میں کہا۔ جواہرات نے نرمی سے اسے دیکھا۔ اس کی کہنی کو بچ کی طرح تھپکا اور ایک سکسیو زی کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

خینہ، سیم، سعدی تینوں خاموش تھے اور زمر کے رد عمل کے منتظر تھے۔ مگر وہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

”کیا آپ نے وہ کتاب پڑھی جو میں نے گفت کی تھی؟“ سعدی نے ہنکھا رک کھا۔

”کون سی کتاب؟“ زمر نے آنکھوں میں اتری نبی کو اندر اتار لیا مگر لبجھ میں رژش تھی۔ ”ہاں وہ.... تیر ہوں صدی کا مسلم اسکار نان فکشن؟ نہیں میں نہیں پڑھ سکی۔ میں آتی ہوں ابھی ہوں!“ وہ مادرت کر کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”پھپھو ہرث ہوئی ہیں۔“ سیم نے کہا۔ وہ دونوں چپ رہے۔

فارس اندر آیا اور سیدھا گیست روم کی طرف بڑھ گیا اس کے چہرے کے تاثرات سپاٹ تھے۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور بیک بیہ پر رکھا۔ پھر خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ سر ہاتھوں میں لیے کتنی ہی دری بیخمار ہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب ملال در آیا تھا۔ لوگوں میں گھری

کھڑی اس سیاہ لباس والی لڑکی کی بھوری آنکھوں کی تپش گویا اندر تک اتر گئی تھی۔ جیسے اس نے اس کے سارے اندر کو جلا ڈالا ہو۔ وہ بالکل خاموش بیخمار ہا۔ کمرے میں سنا تھا۔ مدھم زرد بیان جل رہی تھیں۔ باہر کے شور اور رونق سے بالکل کٹ کر یہ کھاموش ساتھا۔

پھر وہ انھا اور دھیرے دھیرے چلتا کھڑ کی تکم آیا۔ پر وہ ذرا سار کیا۔ سامنے ہی لان میں وہ کھڑی تھی۔ بدولی سے وہ سعدی سے کچھ کہر رہی تھی۔ اپنی تمام تر خشک مزاجی اور تنگی کے باوجود اس کی آنکھوں میں اتری گہری اداسی کو وہ بیہاں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ جیسے وہ اندر کی ساری دیرینوں کو چھپانے کے لیے خود پر خنتی کا ملٹج چڑھائے ہوئے تھی۔ اس پر نظریں جمائے وہ بونی کھڑا رہا۔ انگلیوں سے پردے کو اسی طرح تھا میر کھا۔ وہ منظر میں تھی اور فارس کی نگاہیں وہیں جی تھیں۔ ذہن میں بہت سے پرانے منظروں میں رہے تھے۔

”جی ہاں“ میں پورے وہ تو ق سے کہہ سکتے ہوں کہ ملزم فارس غازی نے مجھے ریستورانت بلا یا تھا اور پھر مجھ پر گولی چلانی تھی۔“ برسوں پہلے وہ عدالتی کٹھرے میں کھڑی تھی اور گردن انھائے سپاٹ انداز میں کہر رہی تھی۔ ”نبیں میں نے اسے گولی چلاتے نہیں دیکھا تھا مگر میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ میں گواہ ہوں اس بات کی کہ مجھ پر اور زرتاش غازی پر حملہ کرنے والا ملزم فارس غازی ہی تھا۔“

فارس نے پر وہ چھوڑ دیا۔ کپڑا ہمراکراپنی جگہ پر آن گرا۔ باہر کا منظر چھپ گیا۔ اس کا دل برا ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ناگواری ابھر آئی تھی۔ وہ سر جھٹک کروالپس بیڈ کی طرف آیا۔ تیز سفیدتی جلانی اور پھر بیگ کھولنے لگا۔ کچھ دیر پہلے کھڑ کی کے پاس کھڑے شخص والا کوئی تاثراں کے چہرے پر نہیں تھا۔ وہاں صرف سنجیدگی تھی اور سپاٹ پن۔

اب وہ بیگ کی تمام اشیاء کو ایک ایک کر کے دیکھ رہا تھا۔ چیک کر رہا تھا۔

باہر کیک کٹ رہا تھا۔ ہاشم اور شہرین بھی کے ارد گرد مسکراتے ہوئے موجود تھے۔ مصنوعی تیقہنے، کھوکھی خوشیاں۔ پھر شہرین نے کیک کے نکٹے کرنا شروع کیے۔ وہ فونڈنٹ کا تین منزلہ کیک تھا جیسے اصلی گڑیا پھولے فراک کے ساتھ کھڑی ہو۔ وہ فروزن کی ایسا تھی۔ مگر اس کا لباس نیلانہیں، بر فیلا گلبی تھا۔ چند کلکس اس کے علاوہ بھی مرکزی میز پر رکھے تھے جن کے اب فیونا نکٹے کر رہی تھی۔ ایسا دالے کیک پر ایسا نے ایک دل اٹھا کر کھا۔ جس پر Soniya لکھا تھا۔

شہرین نے وہ دل سونیا کی پلیٹ میں ڈالا۔ مگر جب کیک سرو کیا جانے لگا تو اس نے وہ دل ایک اور ڈش میں کیک کے اوپر کھکھر فیونا کو دیا۔

”یہ ڈی اے کی نیبل پر لے جاؤ۔“

فیونا اسے فوراً وہاں لے آئی۔ ڈی اے (زمر) تو نہیں تھی مگر سعدی نے یہ سب بہت غور سے دیکھا اور پھر شہرین کو۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کو دیکھتے پا کر مہمانوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔ یعنی سعدی خود سمجھ لے تو سمجھ لے وہ بس کنارے کنارے رہ کر ہی مدد کرے گی۔

زمر اندر آئی تو وہاں بھی مہمان کھڑے تھے۔ امیر دن کی دعویں، سارا گھر ہی کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

”گیست باتھ روم کس طرف ہے؟“ زمر نے گزرتے دیٹر کو روکا۔ وہ کسی کام سے آیا تھا سو باتھ کی بجائے گیست روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ سیدھی ادھر چلی آئی۔ وہ آنسو جو باہر مضبوطی کے خول نے بہنے نہیں دیے تھے وہ اندر اترنے کے باوجود آنکھوں کو سرخ کر گئے تھے۔ اس نے گیست روم کا دروازہ دھکیلا کر باتھ روم جا کر منہ دھوئے مگر....

بیڈ پر بیگ کھلا پڑا تھا۔ ایک مشین گن، دو پسقون، گولیاں اور خود وہ بیڈ کے کنارے پر جو گر کے پنڈل کے ساتھ چاقو باندھ رہا تھا۔

آہٹ پر چونک کر سراٹھا یا۔ پھر وہیں رک گیا۔ سیدھا بھی نہ ہوا۔

چوکھت پر کھڑی زمر کا سانس رک گیا تھا۔ اس کی نگاہیں اسلخ سے ہوتی فارس کے چہرے تک گئیں۔ پھر ان میں اتراغم غصے میں

بلا۔ جبڑے کی رگیں تن گئیں۔ وہ چیچھے ہوئی اور زور سے دروازہ بند کیا۔ اب اسے مزید فریش ہونے کی خواہش نہ تھی۔ وہ تیز تیز چلتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

خین کے کپڑوں پر کیک کاٹکر اگرا تھا۔ وہ سیم کو لیے اندر آگئی۔ کیک کے بعد سب پھر سے بکھر گئے تھے۔ کھانے میں ابھی وقت تھا۔ خین کو یاد تھا کہ گیست با تھر رومز کدھر ہیں۔ داخلی رستے میں سے دروازہ کھلتا اور اندر شیشے کی دیوار کے ساتھ قطار میں بیس تھے۔

”کچھ لوگوں کے چہرے کو دیکھ کر لگتا ہے ان کو بھزوں نے کہا ہے۔ مگر نو شیر وال بھائی کے بالوں کو دیکھ کر مجھے بھی لگتا ہے۔“ راہداری سے گزر کر اندر جاتے شیر کو دیکھ کر سیم نے تبصرہ کیا۔ خین کو شدید ہنسی آئی مگر اس نے زور سے سیم کے چکلی کاٹی۔

”اپنی کنٹری بندر کھو۔“ وہ نل پر پیچے ہاتھ مارنے لگی۔ وہ کھل نہیں رہا تھا۔

چونکہ دروازہ کھلا تھا اور ہرگز رات خصوص دکھائی دے رہا تھا، تب ہی ہاشم نے چوکھت پر کر پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے پچھو؟“

خین نے خوشگوار حیرت سے سر اٹھایا۔ وہ ان کو دیکھ کر بالخصوص رکھا۔ سب سے ہٹ کر بھی اس سے ملاقات ممکن تھی؟ پھر جھینپ میں۔

”یہل نہیں کھل رہا۔“

”آہستہ سے اس کے پیچے ہاتھ لے کر جاؤ۔“ ہاشم نے مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔ خین نے آہستہ سے ٹل ٹلے ہاتھ کیے۔ پانی کی دھار بہہ پڑی۔

”اوہ۔“ وہ جھینپ گئی۔ ہاتھ دھو کر ہٹائے۔ دھار غائب۔ آنونیک۔ اسے کیوں بھول گیا؟

سیم اندر با تھر روم کی طرف چلا گیا۔ خین بیپر ناول سے ہاتھ خشک کر کے چوکھت تک آئی۔

”تو کیا سمجھیکش ہیں تمہارے؟“ ہاشم نے بات کا آغاز کیا۔

”لڑپرگ!“ وہ نگاہیں جھکا کر جھینپ کر مسکرائی۔

”اوہ.... میں سمجھا شاید....“ وہ حیران ہوا تھا۔ خین کے چہرے پر سایہ گزرا۔ ہاشم نے اسے غور سے دیکھا اور بات بدل دی۔ ”تو کیا لاپپر میں بھی نقل ہو سکتی ہے؟“

”نقل ہر سمجھیکت میں ہو سکتی ہے مگر آپ نے یہیں پوچھا کہ میں نے نقل کی تھی یا نہیں؟“

”میں یہ کبھی نہیں پوچھتا۔“ وہ مسکرا یا۔ ”مگر یہ ضرور پوچھوں گا کہ تمہارے گلاسز کہاں گئے۔ تم تو پھش مش ہوتی تھیں نا۔“

”اتر گئے۔ بھائی نے لیزر کروادا تھا۔“ اس نے قدرے اعتاد سے ہاشم کو مسکرا کر دیکھا۔

”آپ کو میری عینک یاد ہے، مگر صبح آپ نے پوچھا کون خین؟“ وہ بہکا چھلکا سا شکوہ کر گئی۔

”کیونکہ میرے جانے والوں میں دو اور خین بھی ہیں۔ ایک اپنے نام کے دونوں N کے درمیان آئی لگاتی ہے اور دوسرا ہی بل ای۔ تم کیا لگاتی ہو؟“

”ڈبل ای۔“

”گذ! خیر آتی جاتی رہا کرو۔ سو نیا، مگر سب سے ملتی رہو۔ یا بھائی سختی کرتا ہے؟“ ہاشم نے مسکرا کر پوچھا مگر وہ بہت گہرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

”سو نیا اور آپ کی مگری عمر کی نہیں ہیں۔ اور بھائی سے اچھا میرے لیے دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“ وہ بھی مسکرا کر بولی مگر بھائی کا

”ال انداز میں ذکر اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہاشم مزید کچھ کہتا مگر کان میں کوئی آواز آئی۔ وہ مذعرت کرتا آگے بڑھ گیا۔ پھر کان میں موجود آل انگلی

سے دبا کر بولا۔

”ہاں خاور بولو!“

”سر! آپ وہیں رکیے۔ میں آرہا ہوں،“ خاور لان میں تھا اور ادھر آ رہا تھا۔ ہاشم وہیں رک گیا مگر پھر کوئی اور مل گیا تو وہ ان کا حال احوال پوچھنے کھڑا ہو گیا۔ خاور منتظر سا کھڑا رہا۔ وہ فارغ ہو کر اپنے چیف سائیورٹی آفیسر کی طرف مڑا۔

”کیا ہوا؟“ استفسار میں سخت تھی۔

”آپ کو یہ دیکھنا چاہیے۔“ خاور نے مٹپٹ آگے گیا۔ اس کی اسکرین پر پانچ کیسروں کی فوچ آ رہی تھی۔ خاور نے ایک پانگلی رکھ کر اسے برا کیا۔ ہاشم نے آنکھیں سیکھ کر دیکھا۔ وہ اس کے کمرے کے بندرووازے کا منظر تھا۔ خاور نے اسے تیزی سے روایتیں کیا اور پھر پلے کیا۔

سیر ہیوں سے دو چار لوگ اترتے چڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں ایک سیاہ سوت اور گھنٹھر یا لے بالوں والا لڑکا بھی تھا جو سر جھکائے زینے پھلا گئتا اور گیا۔ ہاشم کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جا کر دروازہ بند کیا۔

ہاشم کو لگا اس کے منہ پر کسی نے دروازہ دے مارا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی ابھری، مٹھیاں بھٹک گئیں۔

”یہ کتنی دیر پہلے کی ہے؟“

”تیرہ منٹ!“

اور تیرہ منٹ قبل جب وہ ہاشم کے کمرے میں آیا تو اس نے لیپ ٹاپ میں فلیش لگانے میں تین سینڈ بھی نہ لگائے تھے۔ لیپ ٹاپ بند رہا مگر فلیش کی تھی چکنے لگی۔ اس نے پنجوں کے بل کا رپٹ پہ بیٹھے تیزی سے ٹیب کھولا۔

”آپ کی ڈیو اس کا رابطہ ایک ہارڈ ڈرائیو سے ہو چکا ہے۔ کیا آپ تمام ڈیتا کاپی کرنا چاہیں گے؟“

”بہت خوشی کے ساتھ!“ دھڑکتے دل سے اس نے لیں دبایا۔ پاس درڈ اس نے ”سو نیا“ ناپ کیا۔ ہر اسکل، سعدی نے آنکھیں بند کر کے گھری سانس لی۔

ڈیتا کاپی ہونے لگا۔ وہ فیصد بیس فیصد.... چالیس.... وہ بار بار مضطرب نظروں سے بندرووازے کو دیکھتا۔ پچھن فیصد.... سانچھے....

نیچے کھڑے ہاشم نے شعلہ بار نظر وہ سے خاور کو دیکھا۔

”تیرہ منٹ سے وہ میرے کمرے میں ہے اور تم اب کو اس کر رہے ہو؟“ وہ باد بسا گرجا۔ خاور تھوک نگتے پیچھے ہوا۔

”سر! آپ کسی سے بات کر رہے...“

”دو بندوں کو لے کر میری بالکوئی پہ جاؤ۔ میں ادھر سے جاتا ہوں۔“ ساری شاستگی، مہمان نوازی دفعان کر کے وہ تیز تیز زینے تک آیا....

”ستر فیصد.... تہتر.... سختر۔“ سعدی بے چینی سے انگلیاں مردوز رہا تھا۔

ہاشم کوٹ کا ہٹن کھولتے زینے پھلا گئ رہا تھا۔ کسی آندھی طوفان کی طرح۔ وہ جیسے ابھی جا کر سعدی کو گریبان سے دبوچ لینا چاہتا تھا، اس الوکے پٹھنے نے ”ہاشم بھائی“ کو ابھی بہت اندر اسٹیم بیٹھ کیا تھا۔

”پچاسی.... نوے۔“ سعدی نے فلیش انگلیوں سے پکڑ کر کی تھی۔ گنتی ختم ہوا اور وہ اسے کھٹک لے۔ ماتھے پر پسینہ تھا۔

ہاشم نے دھاڑ سے دروازہ کھولا۔ غصے سے بھری اس کی نگاہیں آگے پیچھے دوڑیں۔

کر اخالی تھا۔ سعدی وہاں نہیں تھا۔ البتہ... ہلتا ہوا پوچھا تھا۔ بالکل کوئی کادر واڑہ پورا کھلا تھا۔ وہ اندر حادھند بابر ہجا گا۔ بالکل کوئی میں بھی وہ نہ تھا۔ وہ تیزی سے بیر و فی زینے اتھے لگا۔ اس طرف لان خالی اور نیم اندر ہیرا تھا۔ خاور اور دوسوٹ پہنچنے آدمی بھاگتے ہوئے ادھر آ رہے تھے۔ ہاشم کا ما تھا جھیلنے لگا۔ وہ کہاں گیا؟ اندر خالی کمرے میں حرکت ہوئی۔ با تھر و م کا دروازہ کھول کر سعدی آہستہ سے لکا اور اسی آہنگ سے کمرے سے باہر آ کر دروازہ بند کر دیا۔

”کیا ہے ہاشم بھائی! کہ آج کل کے بچھوڑے سے زیادہ اسماڑ ہیں۔“ کان کھجاتے ہوئے اس نے معصومیت سے خود کلائی کی اور اسی اعتماد سے میر ہیاں اترنے لگا۔

داخلی دروازے کے قریب دیوار پر بہت سے ڈیجیٹل فونوفریم آؤیزاں تھے۔ ان میں تصاویر سلا یزد شو کی صورت حرکت کر رہی تھیں۔ حنین اور سیم باتیں کرتے ہوئے کافی شوق سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ ہاشم، نو شیر و اس وغیرہ کی تصاویر۔ بچپن، یونیورسٹی۔ سعدی ابھی میر ہیاں اتر کر آیا ہی تھا کہ۔

”ہے سعدی!“ نو شیر و اس جو جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک مجسے سے نیک لگائے کھڑا تھا، پا کر کر بولا۔ سعدی گھوما۔ وہ عادتاً بغیر کوٹ کے سنبھری شرث پیساہ دیست میں ملبوس تھا اور استہرا سیئے مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”اپنے بہن بھائی کو لے آیا کرونا کبھی ادھر۔ دیکھو کتنا ایکسا سندھ ہور ہے ہیں۔ انہوں نے شاید ایسی چیزیں پہلے نہیں دیکھی ہیں۔“ سعدی نے ایک نظر دور کھڑے دونوں پہ ڈالی۔ ”ہاں! انہوں نے تم جیسی چیزیں کم ہی دیکھی ہیں۔“ مگر نو شیر و اس نے جیسے نہیں

نہا۔

”مگر ان کا قصور نہیں ہے۔ غربت اور چھوٹا خاندان بہت بڑی مصیبت ہے۔“ تاسف سے کہتے اس نے سر ہلا�ا۔

”اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھڑک کر تمہارے اوپر حملہ کروں اور تم سب میں میرا تماشا بناؤ تو ایسا نہیں ہو گا۔ میں مہمان ہوں۔ آدابِ نہماں مجھے آتے ہیں۔“ بجیدگی سے کہہ کر وہ مڑ گیا۔ اس کا رخ داخلی دروازے کی سمت تھا۔

”تمہاری بہن کافی بڑی ہو گئی ہے۔“ نو شیر و اس نے پھر پکارا۔ اب کے حملہ مختلف نوعیت کا تھا۔

سعدی کے قدم زنجیر ہوئے۔ اس نے گردن موڑی۔ آنکھوں میں سرخی ابھری، لب سمجھنے، مگر اس سے پہلے کہ وہ جھپٹ کر بچخنی ہوئی۔ مٹی کو نو شیر و اس کے چہرے تک لے کر جاتا۔

”اے... کیا بولا ہے؟ کس کی بہن کی بات کی ہے ہاں؟“ فارس بڑی سے بولتا تیز قدم اٹھاتا ادھر آ رہا تھا۔ ایسے کہ وہ جو سعدی تے دوائیں لبا تھا، سعدی کے آگے آ کر نو شیر و اس کی طرف بڑھا۔

نو شیر و اس واقعی گڑ بڑا یا تھا۔ اس نے فارس کو آستنیں دیکھا تھا۔ مگر لا پرواٹی سے شانے جھکلے۔

”ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟“ وہ دو قدم بیچھے ہٹا۔

”بکواس مت کرو... میری بہن کی بیٹی کا نام مت لینا آئندہ... ورنہ ہاتھ پاؤں سلامت نہیں رہیں گے تمہارے۔ بات سمجھ میں آئی نہیں ہاں؟“ گھورتے ہوئے انگلی سے اس کے سینے کو دھکیلنا۔ تب ہی ہاشم نے آکر تیزی سے دونوں ہاتھوں سے دونوں کو دور کیا۔ وہ ابھی اسی میر ہیاں اترتا ادھر آیا تھا۔

”کیا مستلہ ہے؟ کیا ہوا ہے؟“ صلح جواندہ میں اس نے فارس کا کندھا تھا۔ مگر فارس نے جھکلے سے چھڑایا اور طیش بھری نگاہوں تے ہاشم کو دیکھا۔

”اپنے بھائی کو سمجھا لو۔ اس طرح کی کواں آئندہ کی تو میں زبان سے جواب نہیں دوں گا۔“ ارڈگردموجو دلگ دیکھنے لگ گئے تھے۔ دور کھڑے خین اور سیم بھی متوجہ ہو گئے۔ ماموں اور نو شیر وال م مقابل تھے۔

”اچھا... ٹھیک ہے... میں معدورت کرتا ہوں... تم ٹھنڈے ہو جاؤ۔“

کہتے ہوئے وہ بار بار سردگاہوں سے سعدی کو بھی دیکھتا۔ فارس ”ہونہہ“ کہہ کر سر جھنک کر آگے بڑھ گیا۔ اور سعدی ہاشم سے نگاہ ملائے بغیر اپنے بہن بھائی کی طرف چل دیا۔

”میرا قصور نہیں تھا بھائی.... میں نے ....“

”تم دونوں میرے کمرے میں آؤ۔“ ہاشم نے اس سے اور خاور سے بختی سے کہا اور سیر ہیوں کی طرف بڑھ گیا۔

”وہ مجھے چکدے دے کر نکل گیا۔ میری ناک کے نیچے وہ میرے کمرے میں گھسا اور....“ اس نے غصے سے کہتے کاوش کو خوکر ماری۔ خاور کمرے کی ہر شے چیک کر رہا تھا۔ کمروں کے اندر کیسر نہیں تھے، سواس کے آنے کا مقصد واضح نہ تھا۔

”مگر وہ اندر کیوں آیا تھا؟“ نو شیر وال ہکابکارہ گیا۔ پھر حیرت کی جگہ طیش نے لے لی۔

”میں اس کو جھوٹوں گانہیں۔ اس کی اتنی ہست۔“ وہ غصے سے کھوتا دروازے کی طرف بڑھا۔ ہاشم نے بازو سے کپڑا رسے روکا۔

”چپ کرو.... فارس اور تم میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اس کی طرح ہر وقت ہاتھ کی زبان مت استعمال کیا کرو۔“

”مگر سر! وہ اندر کیوں آیا تھا؟“

”کچھ لینے آیا تھا یا کچھ رکھنے۔ پورے کمرے کوڑی بگ کرو۔ ماں گیر و فون، کیسرہ سب ڈھونڈو.... اگر وہ جا سوں ہے تو اب تھل سے تماشا دیکھے گا۔ اور اگر وہ چور ہے تو سب سے پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔“ ہاشم تیز تیز چیزیں الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ ڈسٹرپ تھا۔ غصے میں تھا۔ مگر ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ جیسے ہی ایگزٹ پہنچے، تم اسے روکو گے۔ مجھے ایسے مت دیکھو۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔“ خاور کو جھڑک کرو دہ کہنے لگا۔

”اوڑی اے؟“

”بھاڑ میں گئی ڈی اے۔“

وہ باہر آیا تو فینو ناٹرے اٹھاے جا رہی تھی۔

”میری اینجیو سے نیکل سے لے کرمی نے کہاں پھینکا تھا؟“ وہ اس کا راستہ روک کر بولا۔ فینو نا ایک دم رک گئی۔

”اسی گملے میں۔ کسی نوکر کی ہست نہیں ہوئی کہ....“

”میرا ایک کام کرو۔“ وہ جلدی جلدی اسے سمجھا رہا تھا۔ فینو نا سر ہلاتی الرٹ سی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جس پر پسند تھا اور نگ بھی زرد تھا۔ ہاشم ٹھیک نہیں تھا۔

.....♦♦♦.....

ہم گھوم پھر کے کوچ قاتل سے آئے ہیں

”بس اب گھر جا رہے ہیں۔“ دونوں کو ساتھ لے کر لان کی طرف جاتے سعدی نے بتایا۔ تب ہی پچھے سے آتی ملازمہ اس سے مکرا گئی۔ ترے گری برتن بکھر گئے۔

”آئی ایم سوری.... سوری.... پلیز۔“ فینو نا بکھلتے ہوئے معدورت کرتی برتن سمیٹنے لگی۔ سعدی نے ”اُس او کے“ کہہ کر کوٹ ذرا سا بھاڑا اور آگے بڑھ گیا۔

”اُبھی پلے جائیں؟ مگر اُبھی تو کھانا بھی نہیں لگا؟“ حین نے لان میں اپنی میز تک آ کر دبادبا سا احتجاج کیا۔ سیم خاموش رہا۔ وہ اس وجہ سے لعلم تھے۔ مگر لاوٹخ کا جھگڑا دیکھ کر تھے۔

”کھانا کسی اپنے ریسٹورنٹ سے کھائیں گے۔ بس چلو یہاں سے۔“ سعدی نے زمر کو دیکھا۔ وہ اکیلی کھڑی تھی اور وہ جلد بھلا ہے، الوں میں سے کبھی نہیں تھی۔ سو فوراً راضی ہو گئی۔ وہ اس ماحول سے فرار چاہتی تھی۔

”ہاں چلو۔۔۔ بڑے ابا نے بھی جلد آنے کو کہا تھا۔“

جو اہرات سے اسی نے اجازت لی۔ اس کے اصرار اور حرمت کے باوجود۔ وہ واپس آئی اور چلنے کا اشارہ کیا۔ برآمدے کی میڑھیوں پر لم، اہاشم ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔ کان کا آل انگلی سے دبایا۔ اس کو بغیر تلاشی کے مت جانے دیتا۔ وہ دھیرے سے بولا تھا۔

”راشت سرا!“ ایکزٹ پر سو مٹ بونڈ کھڑے ریٹاڑڈ کر قل خاور نے سن کر سر ہلایا۔ پھر ان کی طرف مڑا جوز مر کے پیچھے پلے آرہے۔ زمر بندیگی سے آگے بڑھ جاتی مگر خاور نے ہنکھا رکر متوجہ کیا۔

”میم۔۔۔ سر۔۔۔ ذرا زحمت ہو گی آپ کو۔۔۔ پلیز۔۔۔“ زمر نے چونک کرا سے دیکھا۔ سعدی کا حلق خشک ہوا۔ گڑ بڑ۔۔۔  
”کیا ہوا؟“

”دراصل۔۔۔ مزر جو اہرات کا نیکلکس چوری ہو گیا ہے اور۔۔۔“ خاور کی سمجھ میں نہیں آیا وہ ڈی اے (ڈسٹرکٹ اٹارنی) سے کیا کہے۔  
”ای اے کوادھورے فقرے سمجھنے میں دری نہیں لگتی تھی۔“

”اچھا۔۔۔ مزر جو اہرات کا نیکلکس چوری ہوا ہے اور اب آپ ہماری تلاشی لینا چاہتے ہیں؟“  
”نہیں میم۔۔۔ دراصل۔۔۔ جو لوگ گھر کے اندر گئے تھے ان کو۔۔۔“

”مگر ہم تو ہاتھ دھونے گئے تھے۔“ حین نے ایک دم روہانی ہو کر کہا۔ خاور نے بات سن چالنی چاہی مگر زمر کے تو سر پلگ پچھی تھی۔

”اچھا۔۔۔ آپ کا مطلب ہے کہ میرے پیچے چور ہیں؟“

”میم۔۔۔ سعدی صاحب اندر گئے تھے تو میرے پاس فونج۔۔۔“

”ایک منٹ پہلے حین اور سیم چور تھے۔ اب سعدی ہو گیا اور اگلے منٹ میں میں ہوں گی؟ اور اب آپ ہمیں چوروں کی طرح لائیں ہیں“ اکر کے ہماری تلاشی لینا چاہتے ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ آپ کی نہیں۔۔۔“

”میری فیملی کے پیچے ہیں یہ۔۔۔ ان کی تلاشی لینے سے پہلے آپ کو میری تلاشی لینا ہو گی۔ مگر اس اندر ہرے کونے میں نہیں، وہاں ان احوال مہماںوں کے سامنے دوں گی میں تلاشی۔ تاکہ ان کو بھی پتا چلے کہ آپ لوگ عزت سے بلا کر عزت سے کیسے رخصت کرتے ہیں۔۔۔“  
” تعالیٰ بکرائی تھی۔۔۔“

ہاشم اچنچھے سے ان کو دیکھتا اس طرف آ رہا تھا۔

”زمر۔۔۔ سعدی۔۔۔! کھانا لگنے والا ہے۔ آپ لوگ اتنی جلدی کیسے جا رہے ہیں؟“ زمر نے چہرہ گھما کر تیکھی نظر وہ سے ہاشم کو

اٹھا۔

”میں بہت زیادہ سرا ہوں گی اس بات کو ہاشم! اگر آپ اپنی ادا کاری پس پشت ڈال دیں۔ کیونکہ میں نہیں مان سکتی کہ آپ کا گارڈ اے کہے بغیر ہمیں یوں روک سکتا ہے۔“

”مگر۔۔۔ کیا ہوا ہے؟ خاور؟“ ہاشم نے حرمت اور الجھن سے خاور کو دیکھا جو نئی میں سر ہلاتا کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

”آپ کی ممی کا نیکلکس چوری ہوا ہے۔ ہماری تلاشی لینی ہے۔“ حینن نے بے بُسی سے کہا۔

”تلاشی.... واث؟“ ہاشم نے بے بُقینی سے خاور کو دیکھا۔ سعدی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اب قدرے اطمینان سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ خاور اس کے سکرنے کے لیے تیار رہ تھا۔ وہ گڑ بڑا گیا۔

”سر! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ جلدی سے سنپھل کر بولا۔

”یہ میرے مہمان ہیں خاورا!“ وہ باد بسا اس پر بر سار زمر نے سر جھکا۔

”اپنی وضاحتیں محفوظ رکھیں ہاشم! آپ میرے بھتیجے کو فارس کا بھاجنا ہونے کی سزا نہیں دے سکتے۔“ سعدی نے چونک کرا سے دیکھا اور ہاشم نے بھی۔ زمر نے اچھتی نگاہ اس پر ڈالی۔

”نہ میں آج پیدا ہوئی ہوں نہ آپ.... سعدی فارس کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ سو جب وہ رہا تو اتنے عرصے بعد آپ کو سعدی کو انوائش کرنے کا خیال آگیا۔ آپ کو جانتا تھا کہ فارس کیسے رہا ہوا یا پھر سعدی کو اس بات کی سزا دیتی تھی۔ مقصود جو بھی تھا، آپ میرے بھتیجے کو یوں بے عزت نہیں کر سکتے۔ آپ کے اور فارس کے خاندانی جھگڑوں سے ہمارا تعلق نہیں ہے۔“

”میری بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”میں کچھ نہیں سمجھ رہی ہوں، چلو۔“

زمر کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ حینن اور سیم جھٹ پچھے ہو لیے۔ سعدی آخر میں نکلا اور پھر مزکر ہاشم کو دیکھا۔ ہاشم بالکل بدی ہوئی نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ سعدی جلدی سے پلت گیا۔

”سر....!“ خاور نے بے بُسی سے اسے جاتے دیکھا جو یقیناً کچھ لے کر گیا تھا۔

”جانے دو اسے۔ آج جانے دو۔“ وہ کڑواہت سے کھتا پلت گیا۔ پیچھے کھڑے نو شیر وال نے تملہ اہت سے یہ سب دیکھا تھا۔

”آپ اس کی پھپھو سے ذرگئے؟ اس کو کیوں جانے دیا؟“

”میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ آگے موقع آئے گا۔“

”اور اس کو بتایا کیوں نہیں کہ اس کی بین نے صبح کیسے آپ سے مدد مانگی تھی؟“ نو شیر وال اس کے ساتھ چلتا کھلون سے کہہ رہا تھا۔ اس کے دل میں سعدی کی رقبات کے انگارے دکھنا کم نہیں ہوئے تھے۔

”تاؤں گا۔ جب اس کے منہ پہ چھر مارنا ہو گا تب تاؤں گا۔“ وہ تینی سے بڑ بڑا تا آگے بڑھ رہا تھا۔

”مگر بھائی...“

”مہماںوں سے بھرا پڑا ہے گھر۔ میں کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتا بھی۔“ اس نے ساری بات ہی ختم کر دی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

اپنے ہی ہوتے ہیں جو دل پر وار کرتے ہیں محسن غیروں کو کیا خبر دل کس بات پر دکھتا ہے سڑک تاریک تھی۔ مگر سنان نہیں۔ ٹریفک چل رہی تھی۔ سعدی خاموشی سے ڈرائیور کر رہا تھا اور سیم پچھلی سیٹ پر آنکھیں موندے۔

پڑا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ ہاشم اس حد تک جا سکتا ہے۔“ زمر و نڈا سکرین کے پار دیکھتی تلنی سے بولی تھی۔ یہ نویں ابھی تک ناراضی سے بچھی تھیں۔

”پھپھو... ان کے گارڈ کی غلطی پر ان کو بیم مت کریں۔ اس سب میں ہاشم بھائی کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ پچھے بیٹھی تین تیزی سے آگے ہوئی۔

”خین! ملازم مالک کے اشارے کے بغیر اتنا بڑا کام نہیں کیا کرتے اور ہاشم کے ملازم تو کبھی بھی نہیں۔“

”پھپھو ہیک کہہ رہی ہیں۔ ہاشم بھائی نہیں بے عزت کرنا چاہتے تھے۔“ سعدی نے کہتے ہوئے کارروکی۔

”میرا رسورنٹ جانے کا دل نہیں ہے سعدی! پچھے بیک اوسے کر لیتے ہیں۔“ زمرا کتابی ہوئی بول رہی تھی۔

سعدی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خین کو اشارہ کیا کہ وہ پچھلی سیٹ پر پڑے اس کے کوٹ سے والٹ نکال دے۔ ادھر خین نے کوٹ اٹھایا، ادھر زمر نے پرس کھولا۔

”پھپھو! میں دے رہا ہوں۔ حمدہ والٹ دو میرا۔“ اب کے سعدی کو درشتی سے کہنا پڑا کیونکہ خین والٹ نہیں دے رہی تھی۔ خین نے والٹ نکالا بھی نہیں تھا۔ اس نے کچھ اور نکلا لاتھا۔

کسی احساس کے تحت زمر اور سعدی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دوالگیوں میں جگہ کا تانیکلس اٹھائے حرمت سے دیکھ رہی تھی۔ زمر کی نگاہیں دیں تھیں گئیں۔ سانس رک گیا اور سعدی کو تو اپنے اردو گرد ہر آواز آتا بند ہو چکی تھی۔

”یہ... کوٹ میں تھا...“ خین نے الجھن و پریشانی سے ان دونوں کو دیکھا۔

”یہ مزر کاردار کا ہے۔ میں اسے پہچانتی ہوں۔“ سردا آواز میں وہ بولی اور انہی برفیلی نظروں سے سعدی کو دیکھا۔

”یہ ادھر کیسے...؟“ اور تب ہی حیران پریشان سعدی یوسف نے چونک کر زمر کے تاثرات دیکھے۔ ”نہیں پھپھو! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”سعدی! گاڑی چلاو۔“ وہ سیدھی ہو گئی۔ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

”پھپھو! آپ کو لگتا ہے کہ یہ میں نے چرایا ہے؟ میں چور ہوں؟“ ہکا بالا سعدی کا تو جیسے دل ہی ٹوٹ گیا۔

”سعدی! گاڑی چلاو۔“

”یہ ہاشم نے مجھ پر پلانٹ کیا ہے۔ اس نے مجھ پر سیٹ اپ کیا ہے۔ میں آپ کو سب بتاؤں گا مگر مجھ پر اعتبار تو کریں۔“

”اعتبار؟“ زمر نے دلکھی لگا ہوں سے اسے دیکھا۔ ”اورا گروہاں تمہاری تلاشی می جاتی اور یہ تمہارے پاس سے لکھتا تو کیا میں اس شہر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہتی سعدی؟ میں نے تمہیں یہ سب نہیں سکھایا تھا۔ تم وہ سعدی نہیں ہو جس کو میں جانتی تھی۔“

سعدی نے بے بسی سے اسٹیرنگ پر ماتھا مارا۔

”میں نے اگر یہ چرایا ہوتا تو کیا کوٹ اتنا کر کریوں پھینک دیتا؟ میں ایسا کر سکتا ہوں کیا؟“

”بھائی چوری نہیں کر سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ کسی نے بھائی کی حیب میں ڈالا ہوگا۔“ خین سے مزید برداشت نہیں ہوا تھا۔

”کسی نے نہیں ہاشم نے۔ یہ سب اس کا کیا دھرا ہے۔“

”سعدی! مجھے گھر ڈر اپ کر دو۔ ابھی اور اسی وقت۔“ وہ رخ موڑ کر شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب کہ آپ کو ڈر اپ کر دوں؟ آپ مجھے اتنے کر انسز میں یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں زمر۔“

جدبات کی انتہا تھی کہ اس کے لبوں سے ”زمر“ نکلا۔ وہ جو ایک برس ”زمر“ رہی تھی اور پچھلے چار سال کی سردی سرمهی کی دیوار کے بعد

”پھپھو، بی تھی، اس کو یہ لیظ چاک بک کی طرح لگا۔ بہت ترپ کر اس نے سلکتی نظروں سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔“

”اور میرے کر انسز میں تم میرے ساتھ تھے؟ یہ تو ایک چوری ہے۔ تم اچھا کیل کر لو تو دنیا کی کسی بھی عدالت میں خود کو بے گناہ

ثابت کروالو گے۔ یہ کامزور نہیں ہے۔ کرامزور وہ تھا جس میں تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ تمہیں پتا ہے سعدی! جب کسی کی کمر چیر کر گردہ نکلا جائے تو کسی تکلیف ہوتی ہے؟ تم کبھی بھی وہ تکلیف نہیں سمجھ سکتے اور بات کرتے ہو کرامزور کی۔“

سعدی بالکل ٹھٹھا پڑ گیا۔ حینہن کو لگا دہ نیلا پڑ جائے گا۔ مگر وہ نہیں پڑا۔ ہر زہر نیلا نہیں کرتا۔

”آپ نے آج کہہ ہی دیا۔“

زمر نے سر جھٹک کر رخ موڑ لیا۔ اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ پڑ رہی تھیں۔

”ڈر اپ می!“ اس کو دیکھئے بنا دلاظ بولے۔ حینہن اس اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سر ہلا کر کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔

”آئی ایم سوری! میں آپ کے پاس نہیں تھا۔ میرا میسٹ تھا پھچھو! اور میں فیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔“ حینہن کو لگا سعدی کی آنکھوں میں آنسو میں یا شاید اس کی اپنی آنکھیں نہ تھیں۔ وہ دل گرفتہ یہ پچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

”اُس او کے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

زمر نے بے تاثر بچے میں کہا۔ گھر آیا تو وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی اور ابی البتہ اتنی خاموشی سے آ کر نہیں بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس سوال تھے۔ کیا رہا؟ کون ملا؟ کھانے میں کیا تھا؟ مگر حینہن اور سعدی کے پاس ان کے جواب نہ تھے۔

سعدی نے حینہن کو پہلے ہی کچھ بتانے سے منع کر دیا تھا کہ امی دل کی مریض تھیں۔

سیم دنیا و ما فیہا سے بے خبر نیم دراز سور ہاتھا۔

❖❖❖

ان کے جلووں کو زندگی کہہ کر ..... اپنی نظر کا وقار کھو بیٹھے کثرول ردم میں اندھیرا تھا۔ صرف بڑی اسکر بنیز کی روشنیاں ان کے چہروں کو چمکا رہی تھیں۔ ہاشم ناگ پٹاگ جائے مٹھی لبوں پر کھے پارٹی کی فوج تھی دیکھ رہا تھا۔ نوشیر واں جیبوں میں ہاتھ دا لے دیوار کے ساتھ کھڑا تھا اور جواہرات بے چینی سے ادھر ادھر ہل رہی تھی۔

خاور کثرول پٹن دباتا وید یوز آگے پیچھے کر رہا تھا۔

”سارا گھر ڈی بگ کروالیا ہے۔ اس نے کچھ نہیں رکھا۔ میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تھاری پوری فوج کی موجودگی میں وہ ہاشم کے کمرے میں داخل کیے ہوا؟“ وہ ضبط کھو کر خاور پر برس پڑی۔

”اس نے کچھ نہیں رکھا۔ وہ کچھ لے کر گیا ہے۔“ ہاشم غور سے اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اور ڈی اے اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی؟“ نوشیر واں کو اپنے علاوہ ہر ایک پٹشک تھا۔

”ناممکن....“ پھر ایک دم ہاشم سیدھا ہوا۔ ”اے.... اے پیچھے کرو۔“

خاور نے ریواستہ کیا۔ کیک میبل پٹھرین کیک کاٹ رہی تھی۔ پھر اس نے سو نیا کی پلیٹ سے دل نکال کر ایک ڈش پر رکھا۔ اب وہ فیکونا سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر فیکونا ڈش اٹھائے سعدی کی میبل تک گئی۔ نظر وہ اس کے سامنے کئی دفعہ ملے تھے۔

”یہ ایک دسرے کو جانتے ہیں؟“ جواہرات کو حیرت ہوئی۔ حالانکہ وہ اس کے سامنے کئی دفعہ ملے تھے۔

”وہ اتنے سال میری بیوی رہی ہے اور سعدی فارس کا بھانجا ہے۔ وہ یقیناً ایک دسرے کو جانتے ہیں۔“ ہاشم اکتا کر بولا۔ نگاہیں ابھی تک ان پر تھیں۔

”اس دل پر سو نیا لکھا ہوا تھا نا؟ اس نے یہ سعدی کو کیوں بھجوایا؟“

”یوں ہی مہماں نوازی کر رہی ہوگی۔“ نوشیر وال نے حمایت کرنے کی سعی کی۔ جواہرات نے خاموشی سے اسے گھورا۔ وہ چپ ہو گیا۔

ہاشم ایک دم اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ بکشکل ایک منٹ بعد وہ اسی طرح واپس آیا۔

”خاور! باہر جاؤ۔“ تحکم سے کہا تو خاور فوراً باہر نکل گیا۔

”میرا لیپ ناپ باہر کیوں نکلا پڑا ہے؟ کس نے نکالا تھا؟“ بھراں نے چونکہ کرنوشیر وال کو دیکھا۔ ”تمہیں میرا پاس درڈ کیوں چاہیے تھا؟“

”وہ... شہری کو آپ کے ہنی مون کی کچھ رز....“

”تم نے اس کے سامنے میرا پاس درڈ ڈالا؟“ وہ غمیض و غضب سے غراتا ہوا اس کے سر پر پہنچا۔ نوشیر وال نے ناگھی سے اسے دیکھا۔

”بھی مگر...“

”اس مطلب پرست عورت کے پاس سب تصویریں ہیں۔ اس نے تمہیں استعمال کیا میرا پاس درڈ لینے کے لیے اور یہ... یہ تمہاری شہری نے اس گھٹیا آدمی کو میرا پاس درڈ دے دیا... یہ...“ وہ نہ یانی انداز میں چلاتا اسکرین کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

”نہیں... شہری ایسا نہیں کر سکتی۔“ نوشیر وال شاکر تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کیوں چھوڑا تھا میں نے اسے؟ وہ ایک مطلب پرست عورت ہے۔ مکار اور خود غرض... اس نے سعدی کے لیے تمہیں استعمال کیا اور اس نے پتا نہیں میرا کپیوٹر کھول کر کیا کیا دیکھا ہوگا۔“ ہاشم کا سر چکرا کر رہا گیا۔

”شہری ایسا نہیں کر سکتی بھائی! آپ کو...“

”بکواس بند کرو!“ ہاشم نے اسے گہریاں سے پکڑ کر دیوار سے لگایا اور سرخ پڑتی آنکھیں اس کی ششدراہنگوں میں گویا گاڑ کر بولا۔ ”میں نے اگر کسی پچھر کو انکو رکیا ہے تو اس لیے کہ شاید تمہیں خود ہی عقل آجائے۔ وہ تم سے شادی کرے یا کسی سے بھی، مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اچھا ہوگا اگر تم خود اس بے وقوفون کی جنت سے باہر نکل آؤ۔“

جھٹکے سے اس نے دم بخود کھڑے نوشیر وال کا گہریاں چھوڑا۔ بھراں لوں میں ہاتھ پھیرتا چلتا ہوا خود کو پر سکون کرنے لگا۔ جواہرات اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔

”وہ جانتی ہے تم اسے پسند کرتے ہو۔“ اب کے وہ بولا تو لمحہ نبتابراز م تھا۔ ”اوہ وہ اتنی خود غرض ہے کہ تمہیں دھوکا دینے میں اس نے لوٹنیں لگایا اور وہ بھی اس سعدی کے لیے۔ پتا نہیں اس نے تیرہ چودہ منٹ میں کیا کیا دیکھا ہوگا۔“ وہ تحکم ہار کر کری پہ میٹھ گیا۔

”تم نے... اتنے اہم ڈاکو منش لیپ ناپ میں کیوں رکھے تھے؟“

”اچھا اب میں اپنی رگوں سے خون بھی نکال لوں اس ڈر سے کوئی خبر نہ گھونپ دے؟ اور بہت کم ڈاکو منش ہیں لیپ ناپ میں اور وہ بھی سیکریٹی کی تھوں میں۔“

نوشیر وال نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ اسے یقین آگیا تھا اور اسی لیے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جواہرات نے اس کی کہنی کو زمی سے پھوا۔

”اس سب میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ وہ پندرہ منٹ میں وہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا۔“

ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”یہ تمہاری غلطی نہیں ہے شیر و جاؤ! جاؤ جا کر سو جاؤ۔ اور رہی شہریں تو تم اس سے کوئی رشتہ جوڑنا چاہتے

ہو تو جو زلو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس سوچ سمجھ کر کرنا جو بھی کرنا۔ جاؤ۔۔۔ شباش، آرام کرو۔۔۔

وہ بڑے بھائی سے باپ بننے میں دیر نہیں لگا تا تھا۔ ”سوری بھائی۔“ اس سے نگاہ ملائے بغیر شیر و نے، بہت سی باتوں کی مذہرات ایک ساتھ کی اور کرے سے نکل گیا۔ جواہرات حیران نظر وہ سے ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو کیا لگا تھا؟ میں نہیں جانتا؟“

”مجھے یہ لگ رہا ہے کہ شاید میں ہی تمہیں نہیں جانتی۔“ وہستے ہوئے چہرے کے ساتھ مسکرائی۔ پھر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر

دیبا۔۔۔

”وہ نکل کا بچ۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔۔۔ اور اگر کچھ کیا بھی تو میرے پاس اس کا حل ہے۔ جاؤ چینج کرو اور سو جاؤ۔“

ہاشم نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

”تم حساب دو گے سعدی۔“

❖❖❖

سب نے ملائے ہاتھ یہاں تیرگی کے ساتھ۔۔۔ کتنا برا مذاق ہوا روشنی کے ساتھ اتوار کو سوائے سورج کے سب کچھ ہی سکتی سے طلوع ہوا تھا۔ زمر فخر کے بعد سوئی تو پھر دیر سے انھیں۔ اور اس کی آنکھیں انھیں تک سرخ تھیں۔ گھنٹھریا لے بال ہاتھوں سے سینتے وہ سرہانے پڑے فون کی طرف متوجہ ہوئی جو بجے جا رہا تھا۔ گھری سانس لے کر اس نے کال لے لی۔

”کہیے ہاشم!“

وہ جو اپنے گھر کے اندر ونی جم میں ٹریڈل پہ بھاگ رہا تھا، بے اختیار رکا۔ ہینڈ زفری کان میں پکا کیا اور تو لیے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے بولا۔

”میں اپنے ملازم کی بے وقوفی پہ مذہرات کرنا چاہتا ہوں۔ جو ہواں میں میرا قصور نہیں تھا۔“

زمر کی آنکھیں پھر سے جلن گئیں۔ سعدی کا آخری چہرہ یاد آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کو پالا تھا، بڑا کیا تھا۔ اس کو دکھ میں دیکھ کر دکھ بڑھ جاتا تھا۔ ایک غلطی پہ اتنا تو نہ سناتی۔

وہ خاموش رہی۔

ہاشم نے تو لیے سے گردن کی پشت رکڑتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ”اور میں کسی بھی ایسے واقعے کی وجہ سے اپنے اور آپ کے درکنگ ریلیشن شپ کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔“

پھر جوس کی بوتل اٹھائی اور منہ سے لگائی۔ تختماتے چہرے پر تاؤ تھا، اختیاط تھی۔

زمر نے پیر بیڈ سے اتارے۔ فون کندھے اور کان کے درمیان رکھا۔ پونی میں بال جکڑے۔

”میرا اور آپ کا درکنگ ریلیشن شپ ون تو ہری پینی ہے ہاشم! وہ ہم ایک دوسرے کو اپنے سے جانتے ہیں۔ ٹو، ہم ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ اور ہر کریں کل کچھ بھی نہیں ہوا۔“ چل پہن کر دوہ کھڑی ہو گئی۔

”درست!“ وہ ذرا سما مسکرا یا۔

”مز جواہرات کا نیکلس مل گیا؟“ اس نے ذرا تھہر کر پوچھا۔

اور ہاشم کی آنکھوں میں بہت کچھ محنتی ہوئی مسکراہٹ اتری۔

”میری طرف سے وہ نیکلیں جہنم میں چلا جائے۔“

”گذ...“ زمر نے فون بند کیا تو وہ مسکراتے ہوئے مرا نوشیر وال جم میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ رات والے بس میں تھا۔ بھرا مصلح، جبکہ تی شرث اورڑاوزر میں ملبوس ہاشم کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ایک پر سکون نیند کے بعد جا گا ہے۔

”بھائی! مجھے معاف کر دیں۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔“ وہ قریب آیا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہاشم نے ہینڈ زفری کا ان سے نکلتے ہوئے نرمی سے دیکھا۔

”اس میں تمہارا کوئی تصور نہیں ہے۔ شہری نے تمہیں استعمال کیا ہے۔“

یہ نام سن کر نوشیر وال کی آنکھوں میں ملال ابھرا۔ اس کی چوت ”صد میں“ سے ”غم“ کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس سے اگلا مرحلہ غصہ اور پھر انتقام تھا۔

”وہ مجھے یوں ایکسپلائٹ کرے گی، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“ وہ ایک دن میں جمع تعظیم کے صینے سے واحد غیر تعظیم پر گردادی گئی تھی۔

”یہ بات تمہیں مجھ سے نہیں، اس سے کہنی چاہیے۔ میں سونیا کو ڈر اپ کرنے ادھر جا رہا ہوں۔ چیخ کرو اور میرے ساتھ آؤ۔“ ہاشم نے اس کا کندھا تھپکا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر بڑے بھائی کو شکوہ کنان نظروں سے دیکھا۔

”اور وہ سعدی، اس کی کیا سزا ہو گی؟“

”اس کی سزا شروع ہو چکی ہے۔ وہ پکڑا گیا ہے۔“ زمر نے نیکلیں اس کی جیب سے برآمد کر لیا ہے۔ ابھی کال کی تھی اس کو۔

”ڈی اے (ڈسٹرکٹ ائٹارنی) نے خود بتایا؟“ وہ حیران ہوا۔

”اس کے لمحے نے بتایا۔ اس نے خود نیکلیں کا پوچھا۔ اس کی آواز سے پہنچ پہنچا کر سعدی اپنا اعتماد کھو چکا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔“ نوشیر وال کے شانے کو تھپکا کرو وہ آگے بڑھ گیا۔

ادھر زمر کے گھر میں صداقت بڑے ابا کی چائے لیے ان کے کمرے تک آیا تو دیکھا وہ فون پر بات کر رہے تھے۔ چہرہ جھکا تھا اور آواز تھکی تھکی سی لگتی تھی۔ صداقت چائے رکھ کے خاموشی سے چلا گیا۔ ادھر وہ فون پر کہہ رہے تھے۔

”کیا واقعی ایسا ہوا؟“

تم لمحے بھر کے لیے یہاں سے دور دفعہ چھوٹے باعیچے والے گھر میں آ تو لا و نخ میں جنین صوف پہنچی فون کا ان سے لگائے برہمی سے کہر رہی تھی۔

”ابا زمر پھپھونے بھائی کی بہت انسلٹ کی۔ ان کو اس کا حق نہیں تھا۔“

”وہ نیکلیں آیا کہاں سے؟“

”کسی نے ڈال دیا ہو گا بھائی کی جیب میں۔ میرا بھائی کوئی چور تھوڑا ہی ہے۔“

”ہاشم۔“ ابا نے سر جھکا۔ ”مجھے وہ ہمیشہ ناپسند رہا ہے۔ مگر میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ گھر آئے مہمانوں کے ساتھ یہ کرے گا۔“

”ہاشم بھائی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ ترنٹ بولی تھی۔ ”زمر پھپھو کا قصور ہے۔“ وہ فارس ماموں کی رہائی کا بدلہ بھائی سے لے رہی ہیں۔ ان کو ماموں سے... بہت... بہت...“ دور اندر جنین کے اندر پچھڑوب کرا بھرا۔ سمجھنہیں آیا کون سالف اسستعمال کرے اور اسے کیا تعبیر دے۔ پھر دل کو سخت کر کے بولی۔ ”ان کو ماموں سے بہت نفرت ہے۔ اس لیے وہ ایسا کرتی ہیں۔“

”اس نے فارس کے خلاف گواہی تک واپس لے لی تھی جنیں۔ اور وہ کیا کرے؟“

”مگر کیا ایسے اموں کی زندگی کے چار سال واپس آجائیں گے؟ آپ ملے ان سے نہیں نا۔ دیکھا ہے کیسے اکھڑے اکھڑے زندگی سے بے زار لگتے ہیں۔ پہلے تو جو کس بھی کرتے تھے۔ مزے کی باتیں کرتے تھے۔ کم گو تھے مگر جب بھی بولتے مزا آتا تھا۔ اب صرف دل دکھتا ہے۔ وہ آز روگی سے کہہ رہی تھی۔

”زمر کی جگہ خود کو رکھو تو وہ حق بجانب ہے۔ اس کو جو جس طرح دکھایا گیا وہ کیسے یقین نہ کرتی؟“

”بات یہ ہے بڑے ابا کہ اموں ان سے زیادہ حق بجانب ہیں۔“ یہ آخری بات تھی جو جنین نے کہی تھی۔ ”اور آپ کب تک پچھوں کے گھصانے کا انتظار کریں گے؟ میرا بھائی کہتا ہے کہ ہاتھ پہ ہاتھ درھر کے بیٹھنا تو کل نہیں سستی ہوتا ہے۔ کچھ تو کرنا پڑتا ہے ابا۔ بھائی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے میں نے کل رات۔ کیا وہ اب بھی بھائی سے اچھے سے بات نہیں کریں گی؟ بہت محبت کرتا ہے... بھائی ان سے... صرف بھائی...“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس نے خود سے بھی نظریں چرانی تھیں۔ ابا نے خاموشی سے فون رکھ دیا تھا۔  
اب ان کو کچھ کرنا تھا۔

❖❖❖

خوشی کی بات نہیں ہے کوئی فسانے میں ..... وگرنہ عذر نہ تھا آپ کو سنانے میں زمر کا ختم کر کے باہر آئی تو بڑے ابالاؤخ میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سامنے والے صوفے پا آئیں۔ بڑے ابا نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک گلابی پڑھ رہی تھی۔ صداقت نے چائے لا کر کھی تو وہ سر جھکائے چینی ملانے لگی۔

”پارٹی کیسی رہی؟ تم رات بنا بات کیے اندر چلی گئی تھیں۔“

”کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کے پوتے یا پوتی نے سویرے ہی فون کر کے ساری باتیں بتائی؟“ اس کی آواز بھاری تھی۔ شاید وہ رات کو روئی تھی۔ وہ کسی کے سامنے نہیں روئی تھی۔ وہ مضبوط تھی۔ بڑے ابا کو ہر مضبوط انسان پا بترس آتا تھا۔

”جنین نے بتایا ہے سب۔ مگر میں تمہارے منہ سے سنا چاہتا ہوں۔“

زمر کپ لبوں سے لگا کرٹی وی کی سمت دیکھنے لگی۔ اس کا نگین شور جاری تھا۔ لاوونج میں پھر بھی خاموشی محسوس ہوتی تھی۔ دونوں منتظر تھے۔ پھر وہی بول آئی۔

”اس کو پیسے چاہیے تھے تو مجھ سے مانگتا۔ کوئی مسئلہ تھا تو مجھے بتاتا۔ مگر....“ شدت ضبط سے آنکھوں میں گلابی لکیریں ابھرنے لگیں۔

”تمہیں لگتا ہے اس نے چوری کی ہے؟“

”وہ نیکل اس کے پاس سے ملا ہے۔ وہ اندر کمروں میں بھی گیا تھا۔ وہ اسی لیے آنے پر اراضی ہوا تھا کہ پارٹی گھر پہ ہے۔ ورنہ پہلے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجھے اس کے بعد کیا لگنا چاہیے سوائے اس کے کہاں نے مجھے دھوکا دیا۔“

بڑے ابا تھک کر اثاثات میں سرہلانے لگے۔ ”ہاں وہ بڑا ہو گیا ہے۔ دھوکے دینے لگ گیا ہے۔ فریب کا رب بن گیا ہے۔ ایسا ہی ہے بالکل۔“

زمر کے دل پر کسی نے پیرو رکھ دیا۔ ”فریبی؟ اور سعدی؟“ کچھ اندر تڑپا تھا۔

”ایسے مت کہیں، ظفر میں بھی نہیں۔“

”نہیں.... ظفر نہیں، بچ ہے یہ۔ وہ کتنے آرام سے سب کو دھوکا دے دیتا ہے نا اور تمہیں تو پہلی دفعہ دھوکا نہیں دیا اس نے۔“

وہ جو دو انگلیوں سے کنپی مسل رہی تھی، چونکہ کران کو دیکھنے لگی۔

”کیا کہنا چاہرہ ہے ہیں آپ؟“

”وہ دھو کے باز ہے۔ اس سے فریب کی بی توقع کرو زمر!“ ان کی آواز بلند ہونے لگی۔ الفاظ کی نسبت ابھی مختلف تھا۔ عجیب تھا۔

”الا کادینے والا تھا۔“

”مت کہیں، کچھ مت کہیں۔“ اور وہ متھش ہو کر ان کو روکنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔

”تم نے اس سے کہا وہ تمہاری تکلیف نہیں سمجھ سکتا۔ ظاہر ہے وہ کیسے سمجھ سکتا ہے۔ اس نے تو توب بھی تمہیں دھو کا ہی دیا تھا۔“

زمر کے لب ادھ کھلے رہ گئے۔ ٹوٹے کا خی سے اس کا دل رُخی کیا جا رہا تھا۔ بڑے باپنی جگہ سے آگے ہوئے۔ ذرا بھکے۔ زمر کی آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگے۔

”یاد ہے وہ یورپیں عورت جس نے تمہیں گردہ دیا تھا؟“

زمر نے سر بھی اثبات میں نہ ہلایا۔ وہ بس ان کو دیکھ رہی تھی۔

”زمر! اس عورت نے گردہ نہیں دیا تھا۔ تمہیں وہ گردہ سعدی نے دیا تھا۔“

وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔ پھر مڑی۔ کھڑکی کے پٹ زور سے دھکیلے۔ تازہ ہوا میں دے کے مریض کی طرح منہ کھول کر آنکھیں بند رکے سانس لینے کی کوشش کی۔

”وہ لڑکا کتنا جھوٹا ہے۔ اس نے تم سے جھوٹ بولا۔ دھو کا دیا۔ سب اس نے پلان کیا تھا۔ اس کا خون، گردہ سب تمہارے جیسا۔“

مگر دل تم سے بڑا تھا۔ وہ کہتا تھا یہ میرا ایمیٹ ہے۔ میں تیارداری کر کے نمبر بنالوں یا پڑھائی کے بہانے نظریوں سے غائب ہو کر اپنا فرض ادا کر دوں۔ اور اگر بر انبتا ہوں تو بن جاؤں۔ مگر اس نیٹ میں فیل نہیں ہونا چاہیے مجھے۔ کمر کو کاث کر گردہ نکالنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے زمر اس کو ہتا ہے۔ وہ لڑکا آج ایک گردے پہ ہے۔ جب تم ہستیاں میں تھیں تو وہ بھی قریبی کمرے میں ایڈمٹ تھا۔ مگر اسے تو ہمدردی بھی نہیں ملی۔ وہ چار ماں سے خاموشی سے تمہاری سردمہری برداشت کرتا آرہا ہے۔ اور تم کہتی ہو وہ تمہاری تکلیف نہیں سمجھتا؟“

اس نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھو لیں۔ اس کا رنگ سفید پڑ رہا تھا۔ شاید اب وہ نیلی پڑنے والی تھی۔ صرف دمے سے ان رنگ نیلا نہیں پڑا کرتا۔

”مجھے... کیوں نہیں بتایا؟“ رک رک کر الفاظ نکلے۔ اس سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ وہ کھڑکی کو پکڑے کھڑی تھی۔ تھکن سے ۶ میں بند ہو رہی تھیں۔

”بہت خوددار ہے میرا بیٹا زمر! میں نے کتنی منت کی تھی اس کی۔ مگر وہ کہتا تھا، اگر پھر ہو کوپتا چلا کہ یہ میرا گردہ ہے تو وہ کبھی نہیں لیں گی۔ پھر ہو مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ میں ان کا بھائی بھی ہوں، دوست بھی بیٹا بھی۔ وہ مجھے تکلیف سے نہیں گزر سکتیں۔ ایسے وہ کبھی تمہیک لیں ہوں گی۔ میں آج بھی نہ بتاتا اگر تم رات اس کو یہ نہ جاتیں۔“

اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ گردہ کٹنے کی تکلیف زیادہ بڑی تھی یادل کئنے کی؟ اس سوال کو تو جواب کی ضرورت ہی نہ تھی۔

وہ پڑ مردہ نجیف چہرے کے ساتھ اس کی پشت دیکھ رہے تھے۔

”آگر آج تمہارے پاس ایک گردہ ہے تو اس کی وجہ سعدی ہے۔“

وہ دھیرے سے پلتی۔ اس کی آنکھوں کی گلابی لکیریں سرخ پڑ چکی تھیں۔ شاید ان میں نبھی تھی۔ بھلے وہ انہیں نہ گرنے دے، مگر وہ ہر حال آئسو تھے۔

”آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آج اس کے پاس ایک گردہ ہے تو اس کی وجہ میں ہوں؟“  
اور یہ سوال نہیں تھا۔ سواس کا کوئی جواب بھی نہ تھا۔ وہ نہ آنکھوں سے اس کو دیکھتے رہے۔ جواب کا انتظار اسے بھی نہ تھا۔ وہ تیزی  
سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔  
کھڑکی اب پوری کھل چکی تھی اور تازہ ہوا بہت امیدافرا تھی۔

الفت کے سودے کوں کرے، نفترت کی جھولی کون بھرے ..... ہم کاروباری دنیا میں بیگانے ہی بیگانے ہیں  
سیاہ بی ایم ڈبلیو اس بیگلے کے پورچ میں رکی۔ شوفر نے فوراً دروازہ کھولا۔ ہاشم باہر لکا اور سونیا کی انگلی بکڑے اسے بھی باہر لایا۔ پھر  
گلاس اتار کر گر بیان میں انکاتے ہوئے داخلی دروازے کو دیکھا جہاں شہرین کھڑی تھی۔ وہ ابھی اٹھی تھی مگر باب کٹ بال بالکل سیٹ تھے۔  
”بائے بابا!“ سونیا سے ملنے کوہ جھکا تو اس نے باپ کے دونوں گال چوے۔ پھر پیچھے اترنے نوشیر والا کو ہاتھ بھاگا۔  
”بائے شیرو!“ وہ جو خشگلکیں لگا ہوں سے صرف شہرین کو دیکھ رہا تھا، بدقت مسکرا کر سر کو خم دیا۔ سونیا بھاگتی ہوئی ماں کے گلے لگ گئی  
جو اس کے لیے بھلی تھی۔ ان دونوں سے قطعاً بے نیاز۔  
”میرا بے بی!“ آنکھیں موندے بھی کوسا تھا لگائے وہ بڑا بڑا۔ ہاشم ایک ہاتھ جیب میں ڈالے مسکرا کر دونوں کو دیکھ رہا تھا۔  
” بتایا ہے مجھے سونیا نے رستے میں کہ اسے کتنی خواہش تھی ہمارے ہنی مون کی تصاویر دیکھنے کی۔“  
شہرین بے اختیار سیدھی ہوئی۔ لگا ہیں پھسل کر خود کو چھپتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے شیر دپ گئیں۔ اس کی گردن میں گلٹی سی ابھر کر  
معدوم ہوئی۔

”تو....؟“ وہ بظاہر لاپروا تھی۔ سونیا کو سر کے اشارے سے اندر بھیجا۔  
”تو تمہیں لگتا تھا تم مجھے بے دوقوف بنالوگی؟“ وہ مسکراتے ہوئے آگے آیا۔ اس کے بالکل مقابل کھڑا ہوا اور آنکھوں میں دیکھ کر

بولا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ اکتائی۔  
”شہرین! انسان میں اتنے گلش ہونے چاہئیں کہ اپنے عمل کی ذمہ داری لے۔ تم سے اچھا تو سعدی لکلا۔ وہ ہاتھ لگائے میرے  
گارڈ نے تو سب بک دیا کہ کس طرح تم نے اسے پاس ورڈ دیا۔ اور ہاں وہ بھی میری ہی یہی کے کیک پ۔ تم اچھی جا سوں بن سکتی ہو دیے۔ تم  
نے آئیں آئی کے لیے اپلاٹی کیوں نہیں کیا؟“  
شہرین کے ابروجیرت سے اٹھے۔ ”سعدی نے....؟“  
”اوہ.... تمہیں لگتا تھا وہ نہیں بتائے گا۔“  
شہرین کی آنکھوں میں غصہ اور پیزاری ابھری۔ ”میں تم سے اتنی اکتا چکلی ہوں کہ تمہارے خلاف مدد مانگنے والے کو انکار نہیں کر سکتی  
اور کسی اچھے دوست کو تو بالکل نہیں۔“

”اوہ.... اچھا دوست.... کیا تم نے نوٹ کیا؟“ مڑے بغیر نوشیر والا سے سوال کیا۔  
اور اس کو دوسرا دفعہ صدمہ ہوا تھا۔ ابھی تک امید تھی کہ شاید... مگر اب نہیں۔ غم غصے میں بدلنے لگا۔ وہ بھائی کے عقب سے نکل کر آگے  
آیا۔  
”کیا تمہیں میں ہی ملا تھا استعمال کرنے کے لیے؟“ بھنوں بھینچے وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ ”وہ بھی اس لوزر سعدی کے لیے؟ اس کو تو

میں چھوڑوں گا نہیں اور پر لے تو میں تم سے بھی لوں گا۔“

گوکہ ہاشم یہی چاہتا تھا، مگر نوشیر وال کا پارہ کی طرح تیز چڑھتا غصہ قابو کرنے کے لیے اس کی کہنی تھا مناپڑی۔ نوشیر وال سر جھنک کر رخ موڑ گیا۔ شہرین بس ضبط سے ان دونوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

”آئندہ میرے خلاف کسی کی مدد کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ پھر تمہیں ساری زندگی اپنی بیٹی کی شکل نہیں دیکھنے دوں گا۔ اور اگر کوئی شک ہو تو پہلی قطع تم تین دن بعد تدبیک گی جب تم چھٹیوں پر دنی اکیلی جاؤ گی۔ سونیا کو اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ دون گزار لو اس کے ساتھ۔“

شہرین کے تاثرات بدلتے۔ بے چینی پریشانی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

”ہاشم! سونیا میرے ساتھ جائے گی۔ یہی طے ہوا تھا۔“

”ٹے کرنے والا میں منسون بھی میں کر رہا ہوں۔“ مسکراہت غائب تھی اور وہ درشتی سے چباچبا کر کہہ رہا تھا۔ ”خلع کے وقت اپنی بیٹی میں نے تمہارے حوالے کی کہ تم ماں تھیں۔ سو میں نے تم پا حسان کیا تھا۔ تب سے بفتے میں دونوں اپنی بیٹی کو لے کر جاتا ہوں۔ باقی وہ تمہارے ساتھ رہتی ہے۔ تمہیں میری طرف سے کوئی پریشانی نہیں ملتی۔ اور اس سب کا صد تم نے میری پشت پر دار کر کے دیا۔“ اس کی آواز اوپری ہو رہی تھی۔ نوشیر وال اب ذرا کم غصے سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ اندر سے پریشانی بھی تھی، شہری بیٹی کے بغیر کیسے رہے گی؟ ”میں سونیا کے بغیر کیسے رہوں گی؟ تم یہ نہیں کر سکتے۔“ اس کا سارا طفلہ جھاگ بن کر بیٹھ گیا۔

”یہ تو پہلے سوچنے والی بات تھی۔ دون گزار اور تیسرے دن میری بیٹی کو واپس چھوڑ جاؤ۔ اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میری بیٹی کو میری مرضی کے بغیر تم دنیا کے ملک لے جانا تو کیا، اس ملک سے بھی نہیں نکال سکتیں۔“

”اس نے صرف پاس درڈ مانگا تھا۔ اسے وہ واپس چاہیے تھا جو تم نے اس سے لیا تھا۔ مجھے نہیں پتا وہ کس چیز کی بات کر رہا تھا۔ تم میرے ساتھ یوں مت کرو ہاشم۔“

ہاشم چونکا۔ پھر سر جھنکا۔ ”نہیں پتا تھا تو اس کی مدد کیوں کی؟ تمہاری بیٹی کا باپ ہوں میں اور یہ تمہاری بیٹی کا پچاہ ہے جس کو تم نے یوز کیا۔ سواب تم سونیا کو نہیں لے کر جارہیں۔“ قطعی انداز میں کہہ کر وہ مڑ گیا۔ دونوں تیز تیز کارٹک واپس آئے۔ دروازے جھٹ کھولے گئے۔ شہری کھڑی رہی، بے بسی پریشانی سے لب کا نتی۔

”میں نے سعدی کو اندر رائی سیکھ کیا تھا۔“ ہاشم بیٹھتے ہوئے بڑا بڑا۔ نوشیر وال نے بے اختیار اسے دیکھا۔

”مطلب؟“

”کیا تم سن نہیں رہے تھے؟ اسے وہ چاہیے تھا جو میں نے اس سے لیا تھا۔ وارث کے لیپ ناپ کے ڈاکو منش۔ وہ میرے پاس تھے۔“ کہتے ہوئے شفروں کا شارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر ڈرائیور یونگ سیٹ کی طرف آیا۔

”مگر پندرہ منٹ میں وہ کتنے ڈاکو منش پڑھ سکتا ہے؟“

”شاید ایک بھی نہیں۔ مگر پندرہ منٹ میں وہ ان سب کو کاپی ضرور کر سکتا ہے۔“ کہہ کر ہاشم جیسے ساری دنیا پر لغت بھیج کر کھڑکی سے ہاہر دیکھنے لگا۔

نوشیر وال خاموش ہو گیا۔ اسے شہری کی حالت دیکھ کر خوش نہیں ہوئی تھی۔ شہری کا قصور نہیں تھا۔ یہ سعدی تھا جو ہر چیز کے درمیان آیا تھا۔ اس کا قصور وار ہمیشہ سعدی لکھتا تھا۔

ہی نہیں تھے ہماری طرح کے اور بھی لوگ ..... عذاب میں تھے جو دنیا سے سوچتے تھے الگ صبح کی نہری سفیدی میں گرمی کی حدت بڑھتی جا رہی تھی۔ مرحوم ذوالفقار یوسف کے گھر میں چلتے ایرکولرنے والی والے کمرے کو قدرے نہندا کر رکھا تھا۔ ندرت ادھر ادھر کھمری چیزیں سمیت رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ راہداری کی گول میز پر بیٹھے ہیں اور اسماء کو پکھر بھی جاری تھا۔

”انتانہیں ہوتا کہ جو چیز اٹھاؤ اسے جگہ پر کھو۔“

”ای! میں سب کچھ جگہ پر واپس رکھتا ہوں۔“ سیم نے احتجاج کیا۔

”جی۔ مگر کسی اور کی جگہ پر.....“ ہنین نے بات کامل کی۔ وہ ساتھ چائے بھی پی رہی تھی۔

”تم تو جیسے سب ٹھیک رکھتی ہوئی۔ ابھی تمہاری الماری کھلوں تو کپڑوں کا ماونٹ ایورست نیچے گرے گا۔“

”اور جیسے تم اس ماونٹ ایورست تلے دب کر رخی ہو جاؤ گے۔“ اس نے سکون سے دوسرا گھونٹ بھرا۔ آج فریض چوٹی بنانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ کھلے بال سیدھے مگر زرا بکھرے ہوئے تھے۔

ندرت مزید ان دونوں کو کچھ کہے بغیر راہداری سے گزر کر سعدی کے کمرے تک گئیں۔ اتنا تو وہ دیکھ چکی تھیں کہ وہ فخر تک کام کرتا رہا تھا۔ پھر سو کرنو بجے اٹھ بھی گیا۔ بیٹھ پر بیٹھا جو گرگز کے تھے باندھ رہا تھا۔ ندرت نے پیارے اسے دیکھا۔ وہ بڑا ہو گیا تھا اور لمبا بھی، مگر اس کے چہرے پر ایک نو عمر لڑکوں والی سادگی اور معصومیت اب بھی تھی۔ وہ سیدھا ہوا تو مان کو گھرے پایا۔ سی ہوئی آنکھوں سے مسکرا یا۔

”کیا باتیں ہوئیں بڑے ایو سے؟“ وہ اٹھ کر لیپ ناپ بیگ میں سینٹنے لگا۔

”وہی ان کی پرانی فکر۔ زمر کی شادی۔“ انہوں نے تھکل ہوئی سانس کھینچی۔ سعدی خاموشی سے چیزیں سیئتا رہا۔

”وہ اس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں مگر وہ نہیں مانتی۔ سعدی! تم سمجھاؤ نا۔ اب تو تمہاری بات چیت ہوتی ہے پھپھو سے۔ اور تمہاری بات تو وہ ہمیشہ مانتی ہے۔“

سعدی نے بیگ کا اسٹریپ کندھے پڑالا۔ چہرے پر چھپائے حزن کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کچھ کہنے لگا تھا کہ فون بخ اٹھا۔ جیسے جان بخ گئی۔ ندرت بات بھول کر واپس چلی گئیں اور اس نے ان جانا نمبر اٹھا لیا۔

”لمانا ہے مجھے اسی وقت۔ کہہ آؤ؟“ فارس کے الفاظ بھی اسی کی طرح ہوتے تھے۔ تھک تھک تھک۔

”میں تو نکل رہا تھا... آ... رسیشورنٹ آ جائیں۔“ اس نے درمیان کا راستہ نکلا۔

”آ، دھے گھنٹے تک۔“ اور فون بند۔

”یہ ماموں بھی نا.... آگے پیچھے کی بات نہیں کریں گے بھی۔“ اس نے مسکرا کر سر جھکا۔ پھر ندرت کی باتیں یاد آئیں۔ پھپھو کیا اب بھی اس کی مانتی تھیں؟ اوس ہوں۔

وہ باہر آیا تو ہنین ہاتھ بلا کر پر جوش سی سیم سے کہہ رہی تھی۔

”اور اتنے بڑے بڑے کھلے لائز... سیم! تمہارا دل نہیں چاہتا کہ ہمارا بھی اتنا... بڑا گھر ہوا اور خوب دولت ہو ہمارے پاس بھی۔“

نہیں، نہیں ہے کہ ہمارا چھوٹا گھر مجھے برالگتا ہے یہ سب بھی اچھا ہے۔ مگر زیادہ بڑا گھر... سوچو سیم!“

سیم نے پیچھے سے سعدی کو آتے دیکھ لیا تھا۔ سو جواب نہیں دیا۔ اس کو صحیح جواب معلوم ہی نہ تھا۔

”تم تو ہو ہی کنویں کے مینڈک۔ تمہیں کیا پتا۔ لیکن....“ وہ افسر دہ ہوئی۔ ”اگر میں یہ بات اپنی کسی دوست سے کرتی تو وہ کہتی کہ

لاچ بڑی بلا ہے۔ کیا زیادہ پیسے کی خواہش ہونا براری چیز ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ عقب سے آتے سعدی نے کہتے ہوئے اس کا کپ اٹھایا اور گھونٹ بھرا۔  
خین چوکی، مگر بھائی کو دیکھ کر مزید پر جوش سی پوچھنے لگی۔ ”مگر کیسے بھائی؟“

”ہر کسی کا دل چاہتا ہے کہ اس کے پاس بہت پیسہ ہو مگر لوگ یہ اعتراف کرنے سے ڈرتے ہیں، کہیں ان کو غلط یالا پنجی نہ سمجھا جائے۔  
ارند مال کی محبت بری بات نہیں ہے۔ زندگی میں اونچے گول ہونے چاہیں۔ یہ انسان کو تحرک رکھتے ہیں۔ بس ان کو حاصل کرنے کے لیے غلط  
میریقہ نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ سلیمان علیہ السلام نے بھی تو اللہ کی یاد کے لیے مال کی محبت اختیار کی تھی نا۔“  
خین کھلے دل سے مسکرا دی۔ وہ ایسا بھائی تھا جس سے با آسانی سب کہا جا سکتا تھا اور وہ آپ کو بالکل بچ نہیں کرتا تھا۔

❖❖❖

نہ تکلف نہ احتیاط نہ زعم ..... دوستی کی زبان سادہ تھی

ریشور نہ نیم دیران تھا۔ ان کا کاروبارو یہ بھی کوئی بہت فائدے میں نہیں تھا۔ پھر بھی گزارہ ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنی مخصوص میز  
ہیک رکھا ہی تھا کہ فون بنجنے لگا۔

”سنڈے کو بھی لوگوں کو چین نہیں آتا۔“ کہتے ہوئے جب نمبر دیکھا تو الٹ سا ہو گیا۔

”سعدی! شہرین بات کر رہی ہوں۔“ وہ بیز ار مگر ضبط سے بولی تھی۔

”جی.... میرے پاس ہے آپ کا نمبر۔ سوری میں آپ کا شکر یہ ادنیں کر سکا۔“

”اب اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہاشم ابھی ابھی یہاں سے نکلا ہے۔ وہ سو نیا کو میرے ساتھ چھینیوں پر نہیں  
ہانے دے رہا۔“

”مگر کیوں؟“

”یہ تو تم بتاؤ گے۔ کیا اس لیے مجھ سے مدد مانگی تھی کہ پکڑے جانے پر سارا لمبہ مجھ پر گرادو؟“ وہ تیزی سے بولی۔ سعدی کی آنکھوں  
میں بھجن ابھری۔

”کیا....؟“

”تم نے ہاشم کے سامنے میرا نام کیوں لیا؟“

”میں نے.... ہاشم کے سامنے.... کس نے کہا یا آپ کو؟“ وہ شاکڈ تھا۔ چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

”کیا ہاشم کے گارڈ نے جب تم پر تشدید کیا تو تم نے میرا نام نہیں اگل دیا؟“

”کیا؟ یہ ہاشم.... اف....“ وہ چکرا کر رہا گیا تھا۔ ”اس آدمی کو کوئے کیوں نہیں کاٹتے۔ اس کے جھوٹ پر یقین کر کے آپ نے  
اعتراف کر لیا؟ اف لکم (اف ہے آپ کے لیے)،“ اس کا مودہ سخت خراب ہو چکا تھا۔ ”میں نے کچھ بتایا نہ مجھے کسی نے چھووا۔ اس سے زیادہ  
میں اپنی صفائی نہیں دوں گا۔“

شہرین نے گہری سانس لی۔

”مجھے تم پر یقین ہے۔ وہ واقعی جھوٹ بول رہا تھا۔ بہر حال وہ جانتے ہیں کہ اس میں تھا راہا تھا ہے اور نو شیر و اس مجھے ٹکنیں بتائیں کی

”میں دے کر گیا ہے۔“

”نو شیر و اس کیوں؟“ وہ چونکا۔

”میں نے اس کے ذریعے پاس ورڈ لیا تھا۔“

سعدی چد لمحے کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ اسے کچھ برالگا تھا۔

”آپ کو نو شیر و اس کو یونہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”اوے.... ساری غلطی میری.... مجھے تمہاری مدد ہی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ایک تو میں نے اتنا خطرہ مول کے کر تمہارا کام کیا، صرف اس لیے کہ تم مجھے فیور دے پکے ہوا ر آگے سے تم مجھے اخلاقیات کی تلقین کر رہے ہو؟“ وہ تنی سے بلند آواز سے کہے جا رہی تھی۔

”میں نو شیر و اس کو پسند نہیں کرتا اور اس کی بالکل بھی عزت نہیں کرتا۔ مگر اس قصے میں وہ ڈائرکٹ انوالو ڈنہیں تھا۔ اس لیے اس استعمال کرنے پر مجھے افسوس ہوا ہے؛ بس یہی ساری بات ہے۔“

”اور یہ سارا قصہ ہے کیا؟“ شہرین نے پوچھا۔ سعدی خاموش ہو گیا۔

”خیر.... جو بھی ہے، مجھے میری بیٹی چاہیے سعدی۔ تمہاری وجہ سے وہ اسے میرے ساتھ نہیں جانے دے گا۔“

”آپ اس کی ماں ہیں۔ اسے خاموشی سے لے کر نکل جائیں۔“

”تاکہ وہ اگلے چوبیس گھنٹے میں میرے سر پر پہنچ کر میری بیٹی جھین لے اور کبھی مجھے اس کی شکل بھی نہ دیکھنے دے؟ میں اس کو لے کر دنیا کے کسی بھی حصے میں چل جاتی اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اور پھر میں کیوں بھاگوں؟ میری زندگی یہاں سیئٹل ہے۔ دوست، ماں باپ، سب یہاں ہیں۔ اور میں اس روٹین میں خوش تھی، مگر....“ اس کا گلا تھک گیا۔ وہ سانس لینے کو رکی۔

”آئی ایم سوری۔“

”سوری کافی نہیں ہے۔ تم ہاشم سے بات کرو۔ تم نے اس کا جو چایا ہے، اسے واپس کر دو۔“

”یہ تو میں کچھ نہیں کروں گا۔ لیکن اگر آپ نو شیر و اس سے ایکسکیو ڈر کر لیں تو شاید وہ کچھ کر سکے۔“

”تم کیوں کچھ نہیں کر سکتے؟“

”میں آپ کو جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا۔ ایمانداری سے بتا رہا ہوں۔ میری بات ہاشم نہیں مانے گا۔ آپ شیر نہیں تو سونیا کو راضی کریں۔ وہ ضد کرے گی تو ہاشم مان جائے گا۔“

وہ کرسی پر بیٹھا گلاس وال کو دیکھتے کہے جا رہا تھا۔ یکدم کوئی جھلک دکھائی دی۔ گھرے بھورے گھنگھریا لے بال۔ اس نے چونک کر گردن موڑی۔ پھر عجلت سے خدا حافظ کہہ کر گردن رکھتا کھڑا ہوا۔

وہ اس کو دیکھتی ہوئی آرہی تھی۔ آنکھوں کا گلابی پن اب مدھم تھا۔ سعدی سانس رو کے کھڑا تھا۔

وہ خوفزدہ تھا، پر امید تھا۔

وہ پریشان تھا، خوش تھا۔

زمر خاموشی سے کریا پہنچی۔ چہرہ بنا تاثر تھا۔ بال جزوے میں تھے۔ ایک لٹ گردن کو چھوڑی تھی۔

”بھائی نے بتایا تم ادھر ملو گے۔“ سعدی کو دیکھتے ہوئے وہ متوازن لجھے میں بولی۔

(تو زمر گھر گئی تھیں؟ ایک ہفتے میں دوسرا چکر؟) سعدی بھی سر ہلاتا بیٹھا۔

”چھٹی پر ہوں آج کل۔ کام وغیرہ ادھر لے آتا ہوں۔“

”آگے کا کیا ارادہ ہے؟“ زمر لکھتے بھر کو بھی اس سے نظریں نہیں ہماری ہی تھی۔

”کچھ عرصے بعد پی ایچ ڈی کے لیے جاؤں گا۔ مگر ابھی نہیں۔ خین کی کسی اچھی جگہ شادی ہو جائے، پھر امی اور سیم کو ساتھ لے جاؤں گا۔“ وہ احتیاط سے بول رہا تھا۔ زمر کا کوئی بھروسہ نہیں، کس بات سے رات والے واقعے کا ذکر چھیڑ دے۔

”اور تمہاری شادی؟“

سعدی نے مسکرانے کی سعی کی۔ مگر زمر کی خود کو اندر تک دیکھتی پر سکون نہ کاہیں ڈرار ہی تھیں۔

”وہ تو امی اور آپ ہی طے کریں گی، جس سے بھی کردیں۔“ سرجھنک کر سعدی اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ پھر چہرہ اٹھایا تو وہ ہنوز اتے دیکھ رہی تھی۔

”آپ کہہ دیں پھر چھو جو کہنے آئی ہیں۔“

”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ اس کی آنکھوں میں پھر سے گلابی لیکریں ابھرنے لگیں۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں چور نہیں ہوں۔ یوں دھوکا نہیں دے سکتا۔ ان کے گھر سے کچھ لیا ہے میں نے۔ اسی کو تلاش کرنے لے لیے وہ میری تلاشی لینا چاہتے تھے۔ مگر وہ مسز جواہرات کا نیکلس نہیں۔“

سعدی رک گیا۔ زمر کی بھیگی نگاہیں اس پر دیے ہی مرکوز تھیں۔ سعدی نے آنکھیں سکیڑیں۔ زمر کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، یہاں تک کہ الہام اس کو جیسے دھکالا گا۔ آنکھوں میں شاک سا پھیلا۔ زمر چوری کی بات نہیں کر رہی تھی۔

”امی نے... یا خیں؟“ وہ قصور دار کا نام جاننا چاہتا تھا۔

”بڑے ابا نے۔“ زمر نے بھیگے لمحے میں لمحج کی۔ سعدی کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا۔ لب بھینچ کر دوسرا سمٹ دیکھنے لگا۔ پھر سر

۱۷۸

”میں ان کو اس کے لیے معاف نہیں کروں گا۔“ وہ بری طرح ہرث ہوا تھا۔ زمر کی آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اندھیرے میں لڑے شخص پر کسی نے فلڈ لائنس روشن کر دی تھیں۔

”مجھے کیوں نہیں بتایا سعدی؟ مجھے کیوں دھوکے میں رکھا؟“ صرف سعدی کے سامنے وہ روکتی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اٹنے لگتے تھے۔ سعدی نے کاؤنٹر پکھڑے لڑکوں کو اشارہ کیا۔ ان سب نے فوراً شکلیں کچن میں گم کر لیں۔

”اگر مجھے پتا ہوتا تو تمہیں اپنے بھی نہ کرنے دیتی۔ کیوں نہیں بتایا؟ کیوں نہیں جلتای؟ ایک دفعہ تو کہا ہوتا۔ غصے سے کہہ دیتے۔ لڑکر ہوا یتے۔ ہمارے درمیان تو بہت دوستی تھی۔“

”میں جتنا والانہیں ہوں۔“ اس نے مجرم کی طرح سر جھکالایا۔

”اپنا کیوں نہیں سوچا؟ اس عمر میں کوئی گردوہ دیتا ہے کیا؟ آگے لمبی زندگی پڑی ہے تمہاری۔ شادی کر دے گے بچ ہوں گے۔ ایک اسے کے ساتھ کیسے رہو گے؟“ اس کا دل بری طرح دھکا ہوا تھا۔

”وہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ واک کرتا رہوں، شوگر و غیرہ نہ ہو تو سب ٹھیک رہے گا۔“ بھلکے ہوئے سر سے سادہ وضاحت دی۔

”مجھے کیوں نہیں بتایا؟ میں تمہیں یہ بھی نہ کرنے دیتی۔ یہ گردوہ تو کیا پتا اسی وقت ضائع ہو جاتا۔ کیا پتا کچھ سال بعد ضائع ہو جائے۔“ الہام اسی اٹھپا آجائوں گی۔ اپنے لیے تمہاری محنت کے ساتھ اتنا بڑا انقصان میں تمہیں بھی نہ کرنے دیتی سعدی۔

”اسی لیے نہیں بتایا۔“ اس نے گھری سانس لے کر سراٹھایا۔ زمر کا چہرہ آنسوؤں سے گیلا تھا۔ وہ چار سال پہلے والی زمر تھی۔ وہ ”۲۹“ سے واپس زمر بن گئی تھی۔

”میں ہم دونوں میں سے پہلا دھوکے بازنہیں ہوں زمر! کیا آپ نے کبھی مجھے دھوکے میں رکھ کر کچھ نہیں کیا؟ کیا میرے لیے“ الہام کے لیے آپ نے کچھ نہیں کیا؟ یاد ہے جب ہم اسکوں میں تھے، میں....“

”سعدی۔“ اس نے روکنا چاہا۔

"میں امت روکتیں۔ سیل... میں پھوٹھا تھا۔ آپ مجھ سے آنحضرتیں بڑی تھیں۔ آجھ کافاہر آئے تھیں۔ ہمارا ایک ہی اسکول تھا۔ ای اور دادی کی تھیں نہیں تھیں۔ ہم ایک رہتے تھے۔ ابو کے حالات اچھے تھیں تھے۔ مگر خود دار تھے۔ بڑے بڑے کوہوں کی تھیں لگتے رہتے تھے۔ بھر میں ان کی کامیابی تھی۔ ان سے اسکول لے جانے کو پہنچے تھیں مالکان تھا۔ ای اور اداپنے مالی مسائل میں اتنے اچھے ہوتے تھے کہ خود سے اپنے کا خیال بھی نہ آتا۔ میں مگر سے آدھی چیزوں کے بخیر آتا تھا۔ مگر ایکی سے کلاس میں وہ اپنے آتا تو یہی جیوبنگی باس میں خل ریڈ شارپنزر اور ووکی ٹیکا تھا۔ ای "ای" (پر وکٹر) وہ سب پورا ہوتا تھا۔ آپ بناتا تھے روشن سر ایک چیز کے پیش میں رکھ جاتی تھیں۔ اور آپ ایکی سے لیت بھی ہو جاتیں۔ ای کی لیے ذات بھی کھاتیں۔ مگر زمرہ آپ بہت سے بہت determined (ستقل مزان) رہیں ہیں۔ جو خان فی اسے کرو ہے۔"

وہ بھیل آنکھوں سے سکرا۔ اسے بیوی سر جھکا کر بول لئے سننا اچھا لگ رہا تھا۔

"اور ہر ہر یک میں بھی ساتھ لے جاتیں۔ تب وہ دوپے کا سوس اور ایک روپے کی نکلو ہوتی تھی۔ آپ کہتیں نہیں رہ پے لائی ہوں۔ میں "جیز" لے کر کھالوں گی، تم میرا لفڑی کھالو۔ ان دنوں میں نیچ لاما تھا نہ پیسے۔ آپ کہتیں ای کے جو کہاں دیا ہے وہ مجھے تھیں پہنچے تھے۔ اور میں یقین کر کے کھالیتا۔ بہت دن بعد خیال آیا کہ کہاں تو آپ کو بہت پسند تھے۔ بہت سالوں بعد خیال آیا کہ بھی آپ کو کہتیں سے کچھ فرمیجی کر کھائے تھیں دیکھا۔"

زم رہنے تھیلی سے آنسو گزے۔ پھر دادی سے سکرا۔ "ان دنوں بڑے ابا کی تو گردی پہلی بھی تھی۔ ہمارے حالات بھی اچھے تھیں۔ دنوں باپ بیٹے خود دار تھے۔ میں دلوں کا بھرمہ رکھنا پا ہتی تھی۔"

"ہاں... میں... بہت دیر سے سمجھا کہ آپ پہنچے تھیں۔ میرے لیے آپ مارا ان بھوگی رہتی تھیں۔ جب ای کے کارڈ بارہ سو پاٹیں نے کہا کہ ریسٹورنٹ گھولیں۔ کسی کو کہا؟ کھلانے سے پیارا حسان بھی کیا ہو گا؟"

"سب اپنے گر کے پھوپھو گے لیے یہ کرتے ہیں۔ اس میں کوئی بری بات تھیں ہے۔" مگر وہ تین سن رہا تھا۔

"میں پھر کے بعد کاس فلورز کے ساتھ "برف پانی" بھیل رہا تھا۔ جس لڑکے کی باری تھی اس نے مجھے برف گردی اور اس سے پہلے کر کوئی مجھے پانی کرتا۔ کسی بات پر دیکھنے لڑکوں نے مجھے بہت مارا۔ میں کمزور تھا۔ چھوٹا تھا۔ وہ بڑے تھے۔ مجھے مار کر گرا دیا۔ میرے من پر کچھ دل پخون اور سمنی بھی تھی۔ آپ پہنچیں کہاں سے آئیں۔ آپ نے مجھے اخیلیا میرا چھڑہ صاف کیا۔ اپنی جی خیفارم کی پنی سے خون صاف کیا۔ پھر پکڑ کر مجھ پر ساتھ بخایا اور پوچھا، "ان لڑکوں کا نام تماو۔ کلاس اور سکیشن۔" میں اور گلی۔ کہا کہ جانے دیں۔ مگر آپ تو ہاشم روٹ سے ہی پر اسکچھ فرمیں۔ آپ تو ازگیں۔ "وہ کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جن کے معدی کو کوئی مار جائے اور وہ چپ کر کے دینجا ہیں۔ میں تو غلط جنم ہے۔ چپ تھیں رہوں گی۔ ہمارے معدی کو کس نے مارا ہے؟" آپ مجھے اسی طرح کہا کرتی تھیں۔ "ہمارا سعدی۔" اور اس وقت آپ کے سینی تھیں افلاطا تھے۔ نام کلاس سکیشن۔ مجھے ہتاہ پڑے۔ جب مجھے پہاڑلا آپ سختی ستعل مزاج ہیں اور ہیئتہ اور امگ بھی۔ آپ ان لڑکوں کے پاس گئیں۔ ان کو کچھ نہیں کہا۔ صرف پیار سے ان کے ماں باپ کے پتے پوچھے۔ پھر انہوں جانے گئے آپ نے ان کے والدین کو اسکول باندیا۔ ۱۱ لڑکے مجھے نیچہ زپر پہل سب کو ایک کمرے میں اکٹھا کیا اور پھر آپ نے وہ لمبی تقریر کی۔ وہ شرمندہ کیا ان کو کہ مجھے یقین پے گھر جا کر ان لڑکوں کو مجھ سے زیادہ مار جانی ہو گی۔"

زمرہ زری سے فٹے جا رہی تھی۔ معدی نے مر سے بعد اسے بیوں بنتے دیکھا تھا۔

"میں دس سال کا تھا جب آپ کی ملکی ہوتی تھی۔ پہلی ملکی۔" اس کے لگے اخافا نے زمرہ بھی خیر ادی۔

وہ سر جھکا کر کہنے لگا۔ "ان کو شواری کی جلدی تھی۔ بڑے باتے سارے ہمیز جمع کر لیا تھا۔ آپ نے انتر کے بعد پہنچا بھی بس کر دی۔"

نہیں کی تھیں جو اپنے پیارے بھائی کا نام لے رکھا تھا۔ کیونکہ اس کے پیارے بھائی کا نام میں دو اپنے بھائی تھے ایسا اسے کہا جائے کہ وہ اپنے بھائی کا نام لے رکھا تھا۔

مکالمہ ایڈیشنز پرنسپل سٹرکچر

- 3 -

لے کر اپنی بھائیوں کی طرف پڑھا دیا۔ اسی طرح اپنے بھائیوں کی طرف پڑھا دیا۔ اسی طرح اپنے بھائیوں کی طرف پڑھا دیا۔

درستگی می‌مردید. کلیک تبدیل به سلسله موارد پیش‌بینی است که، می‌توان سلسله مقدارهای ممکن برای این داده‌ها را پیش‌بینی کرد.

"میں چاہتا تھا تم بڑا فیکٹری کے کام سارا کر لیں۔ لیکن تو ایک دن مددگاری میں آئی جاتے گی۔ فون کے شفاف میں سمجھوئی جائے۔ مگر میں وہیں کی تکلیف نہ پہنچ جائیں۔"

میراند اگر کسی سے ملے تو اس کا اپنے اپنے کام کے بارے میں باتیں کہیں تو اس کو پڑھ کر پہچان کر سکتا ہے۔

"*Florilegium*"

“...*وَمَا يُنْهَا بِأَيْمَانِهِ إِلَّا مُهْبَطٌ*”  
وَمَا يُنْهَا بِأَيْمَانِهِ إِلَّا مُهْبَطٌ

پس پرستی کے لئے اپنے اگر کو جاتے کہ فوت ہے اکبر، اور وہ اگر کوئی نہ ہے

10

”زمراں کے کیلئے اپنے اعلیٰ نکس لیتے۔ وہ اتم نے کہا یہ: ”گزمر جوں کام سے بگانہ جوئی  
بچا، پھر کل تراں کو بچائی۔

"اُنم کی ملکیت ہے تو اس پر ہم اپنی مانگاتے ہیں۔ ہم اسکی ملکیت اور بولگی اور ہم اسکی تحریکیں کر سکتے ہیں۔" اس کو چوتھا نمبر کی طبقہ میں ہے۔

2

”خود جاؤں گا اور دے کر آؤں گا۔ اور چونکہ وہ اتنے برے نہیں ہیں تو میرے اس عمل کی قدر کریں گے۔“ بظاہر سعدی نے زمی سے کہا کہ وہ تنازع موضوع کو زمر کے ساتھ چھپیز کرتا زہ تازہ مندل ہوتے زخم پھر سے نہیں کر پیدنا چاہتا تھا۔ ریسٹورنٹ کا دروازہ لکھنے کی آواز آئی۔ سعدی چونکا۔ پھر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ زمر نے گردن موڑی۔ فارس وہیں رک گیا تھا۔ زمر نے رخ واپس موڑ لیا تھا۔ لشو سے آنکھیں تھپٹا کر صاف کیں اور انھی۔ بو جمل سی خاموشی نے سب کو گھیرے میں لے لیا۔

”پھر ملیں گے۔“ زمی سے اس نے سعدی کا کندھا تھپکا اور مزگی۔ فارس نیکھی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے مرنے پر شمشے سے باہر دیکھنے لگا۔

وہ تناسب چال چلتی دروازے تک آئی۔ فارس ہٹ گیا۔ زمر نے بس ایک سرد نفترت آمیز گاہ اس پر ڈالی اور باہر نکل گئی۔ فارس کی پیشانی پر بل پڑے۔ اس نے اکھڑے تاثرات کے ساتھ اسے جاتے دیکھا اور سر جھٹک کر آگے آیا۔

”آئیں... بینچیں....“ سعدی نے احترام سے اشارہ کیا۔ مگر وہ اکھڑے کھڑے تھے ابرد کے ساتھ اسے گھوڑتا رہا۔

”ایک دفعہ پوچھوں گا۔ لیکن نہ بتایا تو اگلوانے کے سارے طریقے آتے ہیں مجھے۔“

”کیا ہوا؟“ سعدی حیران ہوا۔

”جس روز میں رہا ہوا تھا اس رات تم میرے کیس کے نجح سے کیوں ملے تھے؟“ سعدی نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ واقعی شاکر تھا۔ بے یقین تھا۔

”میں.... آپ کو کیسے پتا چلا میں اس سے ملا تھا؟“

فارس نے گہری سانس لی۔

”تو تم واقعی اس سے ملے تھے۔ میرا اندازہ تھیک تھا۔“

اور سعدی کو ایک دم اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا۔ ظاہر ہے اگر اس نے نجح کو مجبور کیا تھا تو فیصلے والی رات کو ہی ملا ہو گا۔ اف۔۔۔ انکار مت کرنا۔ اب دیر ہو چکی ہے۔“ فارس نے کری ٹھپنی۔ ناگنگ پٹا نگ رکھ کر بیٹھا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ افراتفری پھیلا کر اس نے سعدی کو گڑ بڑا دیا تھا۔

”کیا دیا ہے اس کو مجھے رہا کروانے کا؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”آپ بے گناہ تھے۔“

”میں نے پوچھا کیا دیا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں سخت بڑھی۔

”ان کے کچھ خفیر راز معلوم تھے مجھے۔ ان کو ایک سپوز کرنے کی دھمکی دی۔ وہ مان گئے۔“ فارس ان ہی سخت تیوروں سے اسے دیکھتا رہا۔

”تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔“

”مجھے بھی قانون سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ ایک بے گناہ کو چنانی تک دھکیلے گا۔ میرے پاس نجح کو دینے کے لیے لمبی چوڑی رقم نہیں تھی۔ یہ میرا واحد آپشن تھا۔ جو قانون روئی نہیں دے سکتا وہ ہاتھ بھی نہیں کاٹ سکتا۔ اور وہ نجح اتنا معصوم نہیں تھا۔ اس نے چنانی صادر کرنے کے لیے پیسے لے رکھے تھے۔ میں نے اس کو اسی شے سے روکا۔ کبھی کبھی اچھے کو برداشت کرنے پڑتا ہے تاکہ وہ برقے کو سزا دو سکے۔“ اس نے مشہور مقولہ دہرا یا۔ پھر اضطراب سے فارس کا چہرہ دیکھا۔

”کس نے پیسے دیے تھے جو؟“ وہ پتلیاں سکیز کر سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

سعدی نے سوچا کہ وہ بے ہاشم کا ردار نہیں۔ مگر اول تو اس کے پاس ثبوت نہ تھے۔ دوم فارس یقین کیونکر کرتا؟ کیونکہ گرفتاری کے بعد سے اب تک ہاشم نے منہ زبانی ہمیشہ ظاہر فارس کا ساتھ دیا تھا۔ اور فارس اسے جتنا ناپسند کرتا ہو وہ ہاشم کو اپنے بھائی اور بیوی کا قاتل نہ مانتا۔ اور اگر مان بھی لے تو اس کا غصہ جوانی میں جس کی نوکری نے دبادیا تھا، جیل کے چار سال واپس لے آئے تھے۔ ادھر فارس کو یقین آتا، ادھر جا کر وہ ہاشم کا گریباں پکڑ لیتا۔ کیا اتنی جلدی یوں اسے ہاشم کو خبر دار کر دینا چاہیے؟ یا سب تیاری کر کے ایک ہی دفعہ حملہ کرنا چاہیے؟ وہ فائلز ابھی تک ذی کوڈ نہیں ہوئی تھیں۔ سعدی نے فصلہ کرنے میں لمحے لگائے۔

”جج نے نہیں بتایا۔ مگر میں پتا کروالوں گا۔“ وہ نگاہ ملائے بغیر لڑکوں کو آوازیں دینے لگا۔ ”کیا لیں گے آپ؟“

”سنوسعدی۔“ پھر اسے سختی سے سمجھایا۔ ”یہ میرے مسلکے ہیں۔ میرے دشمن ہیں۔ ان کو میں خود ہینڈل کروں گا۔ آئندہ تم ان معاملوں سے خود کو دور رکھو گے۔ بات سمجھ میں آئی ہے یا نہیں؟“

”مگر کافی تو لیں گے نا آپ؟“ وہ اتنی ہی معمومیت سے بولا تھا۔

”لے چکا میں سب۔“ فارس نے ناک سے مکھی اڑائی اور انھے گیا۔

”ماموں.... رکیں.... بڑے ابائے آپ سے ملتا ہے۔“

فارس جاتے جاتے مڑا۔ ما تھے کے بل ڈھیلے ہوئے۔ شیشی کی دیوار پر نظر ڈالی۔ وہ کب کی جا چکی تھی۔

”کل ان کے گھر چلیں گے۔“

”گھر؟“ اس نے ناگواری سے ابر و اٹھائی اور دو بارہ شیشی کی دیوار کو دیکھا۔

”وہ اس وقت گھر پہنچنیں ہوں گی۔ ان کی ڈاکٹر سے اپا گٹھنگ ہے۔ آپ نے انکار کیا تو بڑے ابا کا دل ٹوٹ جائے گا۔“ فارس نے لب کھول کر بند کیے۔ متذبذب سا سر جھکتا۔ ”اچھا کل دیکھیں گے۔ اور ہاں وہ موضوع ابھی ختم نہیں ہوا۔“ تنبیہ کر کے اہلبے لجے ڈگ بھرتا بہر نکل گیا۔

سعدی نے گھری سانس لے کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

.....

پیر کی صبح ہر دوسرے آفس کی طرح وہاں بھی کاموں کی افراتفری پھیلی تھی۔ جواہرات باریک ہیل سے کوریڈور میں چلتی آ رہی تھی۔

نُزرتے لوگوں کے سلام کا مسکرا کر سر کے خم سے جواب دیتی وہ ہمیشہ کی طرح دمک رہی تھی۔ راہداری کے سرے پر اس نے دروازہ گھٹکھایا۔ بھر کھول کر اندر آئی تو راستے بھر کی مصنوعی مسکراہٹ غالب ہوئی اور اس کی جگہ تشویش نے لے لی۔

لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کرتے ہاشم نے ایک نظر اسے دیکھا۔ بھر واپس ٹائپ کرنے لگا۔ اس کا کوت اسٹینڈ پر لٹکا تھا اور وہ مصروف لگ رہا تھا۔

”خیر یہت؟“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ لڑکا دو دوں سے تمہارا سارا ڈیٹا لے کر بیٹھا ہے اور تم اتنے سکون سے کام کر رہے ہو۔“ میر پہ باتھر کھ رجھنے ہوئے وہ تشویش سے بولی۔ ”پہلی بات میرے ڈاکٹر میں سیکورٹی کی تھوں میں تھے جنہیں وہ نہیں تو ڈسکلٹا۔ میں ابھی چار بندوں کے ساتھ اس کے گھر پر دھا ابول سکتا ہوں۔ اس کے سارے کمپیوٹر اور فائلز نکال سکتا ہوں۔ مگر میں اس کو یہ تشریف نہیں دینا چاہتا کہ اس کے پاس میری اولیٰ کمزوری ہے۔“ کرسی گھما کر مان کو دیکھتے ہوئے ہاشم تخلی سے کہہ رہا تھا۔ ”اور مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ اتنی جلدی میر اتنا سارا ڈیٹا کا پی بھی کر

سکتا ہے۔ خیر جو بھی ہو وہ میرے پاس سب سے پہلے آئے گا۔ اور بالفرض اس کے پاس کچھ ہے بھی تو اس کو خاموش کروانے کے ایک سو ایک طریقے آتے ہیں مجھے۔ اب اپنی پریشانی کی دوسری وجہ بتائیں مجھے۔

جو اہرات نے گہری سانس لی۔ انگلی سے بال پیچھے کیے اور کرسی پہنچی۔

”تمہارا بھائی کہاں ہے؟“

”وہ آج پھر نہیں آیا؟ خیر! لگھ پر سور ہا ہو گا۔“

”وہ گھر پہنچیں ہے۔ دوستوں کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ مجھے اس کی فکر ہو رہی ہے۔“  
ہاشم نے موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملا یا۔

”ہاں.... شیر و کدر ہے؟ اسے ڈھونڈ کر خبر دو مجھے۔“ اور فون میز پر ڈال کر ماں کو دیکھا۔ ”مل جائے گا۔ آخر کہاں جانا ہے اس نے؟“

”وہ ڈسٹر ب ہے، شہری کی وجہ سے۔ اسے سمجھا وہاں میں!“

”میں سنچال لوں گا۔ کیوں فکر کرتی ہیں؟“

”سعدی کو بھی تمہیں سنچالنا ہو گا۔ کیونکہ جب تک سعدی کو سزا نہیں ملے گی، شیر و کاغذ کا غصہ ہلکا نہیں ہو گا۔ مجھے ذر ہے وہ کچھ غلط نہ کر بیٹھے۔“

”غمی! کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم شیر و کو اس کا غصہ نکالنے کی بجائے غصہ کم کرنا سکھائیں؟“

”میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ تم سعدی کا کچھ کرو۔ وہ ویسے بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ جتنا سعدی اس کا راستہ کاٹے گا، اتنا ہی شیر و ہاپر ہو گا۔“ ہاشم کچھ کہنے لگا تھا۔ مگر موبائل بجا۔ اس نے کال اٹھا لی۔ ”ہوں... ٹھیک ہے۔“ پھر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

”وہ شونگ کلب گیا ہے۔ اور وہ ٹھیک ہے۔ میں لوں گا اس سے۔ بے فکر رہیں۔“ زمی سے مسکرا کر وہ آگے جھکا اور جو اہرات کا ہاتھ دبایا۔ وہ بدقت مسکرا لی۔ ہاشم پھر سے کام کی جانب متوجہ ہو گیا۔

❖❖❖

دوست ہیں دل میں ذہن میں دشمن ..... کوئی بھی مجھ سے دور نہیں ہے  
سعدی نے گلاس ڈر کھولا۔ اندر آفس میں سارہ کرسی پر برا جمان گردن ترچھی کیے ایک فائل پر کچھ لکھ رہی تھی۔ بس نگاہیں اٹھا کر اسے آتے دیکھا اور واپس لکھنے لگی۔ بال جوڑے میں بند ہے تھے اور رخسار خ گلابی ہو رہے تھے۔

”ڈاکٹر سارہ! میں نے یہ کام مکمل کر لیا ہے۔ فیلڈر پورٹ تیار ہے۔“

اس نے سلام کے بعد کہتے ہوئے کاغذوں کا بندل میز پر رکھا۔

”آپ کی تعریف؟“ سارہ نے لکھتے ہوئے پوچھا۔ سعدی نے ”اچھا“ والے انداز میں ابر و اٹھا لی۔

”آپ اکٹھ کرتی رہتی ہیں۔“ کہہ کر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

سارہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر انگلی سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پہلے سیدھا ہوا، پھر کھڑا ہو گیا۔ سارہ نے قلم کی پشت لوں سے لگائے اسے دیکھ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

”آپ کی شکل دیکھی بھائی ہے۔ اوہ..... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ اس پر جیکٹ کے سینٹر انجینر ہیں۔“

”جی، میم! اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے ایک چھٹی کی درخواست دی تھی جو اپر و بھی ہوئی تھی۔“

”تو آپ نے چھٹی ختم ہونے سے پہلے آنے کی زحمت کیوں کی؟“

”پہلے میں بیٹھ جاؤ؟“ اس نے پوچھا۔ وہ اسی طرح خفگی سے اسے دیکھتی رہی۔ سعدی پھر سے بیٹھا اور بندل اس کی طرف

(دکھلایا۔)

”آپ کا کام وقت سے پہلے کر دیا ہے۔ فینڈ پہ جانے کی ساری تیاری بھی مکمل کر لی ہے۔ اب آپ وہ شکایت بتائیں جو آپ کو مجھ سے ہے۔“

سارہ نے فائل بند کی۔ بیک لگائی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”تمہیں بتا ہے سعدی! تھر کے اس فینڈ پہ ہزاروں لوگ کام کر رہے ہیں۔ اور ان سب کے اوپر اس عہدے پر پہنچنے والی میں واحد عورت ہوں۔ اور اس کی وجہ معلوم ہے کیا ہے؟“

”میرے جیسے ذہین اور قابل سینئر انجینئرنگ کا ساتھ ہونا؟“ سعدی کی زبان پھسلی۔

”اپنے کام سے کمیڈی ہو کر رہنا اور بلاوجہ کے ناغوں سے پر ہیز کرنا۔“

”آپ کو بتا ہے میں بلاوجہ چھپائیں نہیں کرتا۔ اب بھی کمی کام تھے تو....“ وہ خاموش ہو گیا اور سنجیدہ بھی۔

”انتہ اہم کام کہ تم نے مجھے فارس کے رہا ہونے کا نہیں بتایا؟“

”آپ نے پوچھا ہی نہیں۔“ اس نے سادگی سے شانے اپکائے۔

”پوچھا تھا میں نے تم نے توبات نال دی تھی۔“

”اچھا نا.... اب تو پتا چل گیا آپ کو۔“ وہ خونگوار انداز میں لفتگوکی نو عیت بد لئے لگا۔ سارہ اب فکر مندی سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

”تم بہت پراسرار ہوتے جا رہے ہو۔ اب تو کچھ بتاتے ہی نہیں ہو۔“

”ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ میں نے کہا تھا نا۔ اس بندے کے لیپ تاپ تک پہنچ جاؤ۔ پھر...“

”کون ہے وہ؟ کیا اسی نے وارث کو....“ سارے ٹکوے بھول کر سارہ نے آگے ہوتے اختیاط سے پوچھا۔ سعدی نے اثبات میں

مرہلا یا۔

”بس تھوڑا سا انتظار کر لیں اور یہ سب مجھے سن جھان لئے دیں۔“ مسکرا کر بیٹھت سے کہتا وہ انٹھ کھڑا ہوا۔ سارہ کی آنکھوں میں شکایت پھر سے عود کر آئی۔

”لڑ کے.... تم اگلے ماہ مجھے فینڈ پہ اپنے ساتھ چاہیے ہو۔ تیاری کرلو۔“

”راجر.... باس....“ مسکرا کر ما تھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور جانے کو مڑ گیا۔

سارہ نے بکشل مسکرا ہٹ دبائے سر جھکا۔ ”یہ سعدی بھی نا۔“

.....❖❖❖.....

یہ ہیں اہل دنیا کے دلچسپ دھوکے ..... کسی کو کسی سے محبت نہیں ہے  
نوشیر و ان شونگ پوائنٹ پر کھڑا تھا۔ اس کی لین میں ایک پتلا پھٹر پھٹر ارہتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پستول پکڑے بازو  
سیدھے کیے۔ ایک آنکھ بند کیے نہ تھا۔ کافی بندھا۔ کافیوں پہلے ہی بیہذ فون نائپ ایر پر ڈیکشن پہنچنے ہوئے تھا اور آنکھوں پر زر دگلاسز۔ تاک کرائیں  
نے فائز کیا۔ ایک دو تین چار.... سب دل کے آس پاس لگے۔ دل اٹھنے اور پھٹنے سے بچا رہا۔  
”باٹھ سیدھا حارکھو۔ کندھے مت جھکو۔ اس پوائنٹ کو دیکھو۔“ اپنے قریب ہاشم کی مدھم آوازن کروہ چونک کرمڑا۔ گلاسز گائے۔

کیپ پہنے ہاشم اس کو دیکھے بنا آگے ہو کر اس کے ہاتھ کو سیدھا کر رہا تھا۔ نوشیر وال نے ہولے سے سر جھٹکا۔ بیزاری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ مگر چونکہ وہ ہاشم کی آمد سے بیزار نہیں ہوا تھا، سونا کام رہا۔ اس کا بازو سیدھا کر کے ہاشم پیچھے ہٹا۔

”ہوں....اب نشانہ لو....پوری بیسوئی سے۔“ اس کے کندھے کے پیچھے کھڑے ہوئے وہ پتلے کو دیکھ کر بولا۔ نوشیر وال نے پتلے کو دیکھا۔ پلکیں سکیزیں۔ گہری سانس اندر پھنسنی اور فائز کیا۔

دل اب بھی نہیں پھٹتا۔

وہ اکتا کر سر جھٹکتا ایک طرف ہو گیا۔ مشین نے وہ پتلہ پیچھے کر کے فریش پتلا سامنے کیا۔ ہاشم اس کی جگہ پا آکھڑا ہوا۔ پستول کا اوپری حصہ پیچھے کر کے لوڈ کیا۔

”شہرین نہ اتنی خوبصورت ہے نہ اتنی متاثر کن کر تم ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں نکلے۔“ دونوں ہاتھوں میں پکڑا پستول تاک کر نشانے پر رکھتے وہ بولا۔

”وہ آپ کی بیوی رہی ہے۔“ شیر و سر جھکا کر جوتے سے فرش ملنے لگا۔ وہ اس موضوع سے پچنا چاہ رہا تھا۔

”مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ تم بتاؤ۔ تمہاری وہ پسند تھی محبت تھی یا عشق تھی؟“ سامنے دیکھتے ہوئے ہاشم نے فائز کیا۔ گولیوں کی تڑڑا ہٹ شونگ رٹچ کے اس اندر ورنی کمرے میں گنجی۔ یکے بعد دیگرے دو گولیاں پتلے کے دونوں ہاتھوں پلکیں۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ شیر نے بیزاری سے شانے اچکائے۔

”فرق پڑتا ہے۔ اگر یہ پسند یہ گئی تھی تو شام تک تمہیں ٹھیک ہو جانا چاہیے۔“ کہتے ہوئے اس نے پھر فائز کیا۔ دونوں آنکھوں کے تیچ گولی نے سوراخ کر دیا۔

”اگر محبت تھی تو کچھ دن لگیں گے۔“ زور دار گونج کے ساتھ اگلی گولی پیشانی پر ماری۔

”اور اگر عشق تھا تو...“ پتلے کا نشانہ لیے نظروں کے سامنے سرخ رو مال سالہر ایا۔ ریڈ۔ سرخ۔ ”تو پھر یہ لا علاج ہے۔“ آخری گولی پر ماری۔ دل پھٹ گیا۔ ہاشم نے گلاسرا تارے۔ آنکھیں سکیر کر تقدیم نگاہوں سے پتلے کا جائزہ لیا جسے اب پیچھے لے جایا جا رہا تھا۔

علماتی طور پر پستول کی نالی پر بھونک ماری۔ اسے پینٹ کی پچھلی جیب میں اڑسا اور پر سکون سانو شیر وال کی طرف مڑا۔

”پسند سے زیادہ محبت سے کم۔“ وہ جوتے سے مسلسل فرش مسل رہا تھا۔

”یا شاید شہرین کے تمہیں استعمال کرنے سے زیادہ صدمہ تمہیں سعدی کے کہنے پر استعمال کیے جانے پر ہوا ہے۔“

نو شیر وال کے بھکھے چہرے پر مارے ہاہانت کے سرخیاں دوڑ نے لگیں۔ مٹھیاں بھیخ لیں۔ ہاشم نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

”سعدی کو دنیا میں سب سے زیادہ محبت کس سے ہے،“ معلوم ہے؟“

نو شیر وال نے سلکتی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”ڈی اے زمرے؟“

ہاشم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اور اس کی نظر میں ہم اسے گراچکے ہیں۔ ان کے خراب تعلقات نیکل س برآمدگی کے بعد مزید خراب ہو جائیں گے۔ جلد سعدی میرے پاس آئے گا اور میں اپنے طریقے سے اس کو سنبھال لوں گا۔ اگر وہ میرے لیے کام کرنے لگ جائے تو سوچو ہمارا غلام بن کر تمہیں کلتا فائدہ دے گا۔“

”وہ کبھی ہمارا غلام نہیں بننے گا۔ ناممکن!“ اور اتنا تو نوشیر وال اسے جانتا ہی تھا۔

”میں اسے ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ لوں گا شیر و ایک دن وہ میرے لیے کام کرے گا۔ اس کا ٹیکٹھ ہمارے حق میں استعمال

۱۱ نامانجا ہے۔“

”مطلوب آپ کو بھی بھی سعدی کی فکر ہے؟“ نو شیر داں کے اندر غصے کی نی لہر دوڑی۔ ”وہ ساری زندگی مجھ سے مقابلہ کرتا آیا ہے۔ ہر جگہ مجھے پیچھے کر کے خود لوگوں کی تحسین بخورتا آیا ہے۔ اس کے سامنے کبھی میں بکھر نہیں ہوتا۔ ہر کوئی اس کا مفترف ہوتا ہے۔ آخر یوں؟“

”کیونکہ وہ ایک خوددار اور ذہین نوجوان ہے۔ اس میں وقار ہے اور وہ رشتوں کا پاس کرنا جانتا ہے۔ وہ لوگوں کے لیے اچھا سوچتا ہے اور مشکل میں ان کی مدد کرتا ہے۔ انسان کو عزت کرانی پڑتی ہے۔ اور یونواداٹ میں یہاں کھڑا ہو کر سعدی کی صلاحیتوں پر دو گھنٹے مزید بھی ہل سکتا ہوں۔ مگر مجھے تہاری فکر ہے۔ کیونکہ میرے بھائی تم ہو۔ اس لیے اس شہرین ترا مامے نکلو۔ آج پورا دن اس کا سوگ منا لو اور کل صبح تم مجھے مضبوط اعصاب کے ساتھ واپس آفیں میں نظر آؤ۔ اور اس بارے میں، میں مزید ایک لفظ نہیں سنوں گا۔“

حخت و درشتی سے اس نے کہا تو شیر و کاغذ صہجھاگ کی طرح بیٹھا۔ اس نے جی کہہ کر سر جھکایا۔ ہاشم اس کے برابر سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ نو شیر داں نے گلا سزا بہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔ دنیا بذراً واضح نظر آ رہی تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

اب تو سیل درد گھم جائے، سکون دل کو ملے ..... زخم دل میں آ جگی ہے اب تو گھر اُنی بہت لاڈنخ کی چوڑی کھڑکی کے باہر دھوپ پکھل رہی تھی۔ کچن میں تلتے کبابوں کی خوشبو یہاں تک آ رہی تھی۔ وہیل چیز پر بیٹھے بڑے باہت محبت و اپنائیت سے صوفے پر سر جھکائے فارس کو دیکھ رہے تھے۔ قریب ہی سعدی کھڑا فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ ”اونہوں....“ نفی میں سر ہلاتے سعدی نے ان کا دوا یوں کابا کس کھول کر دیکھا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے میں کتنی گولیاں چھوڑ کر گیا تھا۔ آپ نے دو ہفتے میں صرف گیارہ روز کی دوا لکھائی ہے۔“

فارس نے خاموشی سے بس نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ البتہ انہوں نے مسکراتے ہوئے تفتیش کرتے لڑکے پندرہ والی۔

”وہ ختم ہو گئی تھیں۔ یعنی مگنواری ہیں۔ صداقت سے پوچھ لو۔“

”بیٹے اور غلام کی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی۔“

”میرا پوتا آتا جاتا ہے اس سے اچھی دوا کیا ہو گی میرے لیے؟“ انہوں نے سعدی کا بازو چھوکر فارس سے تائید چاہی۔ فارس جو اُنے کوہو کر ارث سائبیخا تھا، زبردستی مسکرا یا۔ پھر وہی سنجیدگی طاری کر لی۔ وہ بے آرام سے بیٹھا تھا۔

”میں اس بات کو ابھی تال رہا ہوں، ختم نہیں کر رہا۔“ سعدی تسمیہ کرتے ہوئے کھڑکی تک آیا اور باہر دیکھنے لگا جہاں پورچ میں اس کی کارکھڑی تھی۔ دوسرا کوئی کار نہ تھی۔ زمر میڈ یکل چیک اپ کے لیے گئی تھی اور اس کو آتے آتے بھی دو تین گھنٹے لگ جانے تھے۔ سو وہ بے فکر تھا۔

”آگے کیا کرو گے فارس؟“ وہ اب نرمی سے اسے دیکھتے پوچھ رہے تھے۔

”پرانی نوکری واپس لینے کی کوشش کروں گا۔“ وہ رکی سے انداز میں بتانے لگا۔

”اگر کوئی مدد....“ فارس نے ہلکا سماہا تھا اٹھایا۔

”میرے پاس کچھ سیونگز ہیں۔ بہت ہے میرے لیے۔ آپ نے پہلے ہی بہت احسان کیے ہیں مجھ پر۔ مزید نہ لوں گا نہ لیتے اچھا لگوں گا۔“ بنائی تاثر کے وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”میں جانتا تھا تم رہا ہو جاؤ گے۔ نج کو تمہاری بے گناہی کا یقین آ جائے گا۔“

فارس نے ترچھی نظر وہن سے باہر دیکھتے سعدی کو دیکھا۔ ”جی! سعدی بھی جانتا تھا۔“  
جبوں میں ہاتھ دا لے چیوگم چباتے سعدی نے مڑے بنایا۔ ”میں نے سنائیں۔ کیا کسی نے میرا نام لیا؟“  
اور ”کسی“ نے سر جھٹک کر چہرہ واپس موڑ لیا۔

”مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ اچھا لگ رہا ہے تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر۔“

”اوہ!“ سعدی نے بے اختیار چیوگم الگی اور دوست بن میں چینکی۔ پھر گھبراہٹ سے باہر دیکھا۔ نیلی کار اس کی کار کے پیچھے رکی تھی۔ ڈرائیور گ سیٹ کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل رہی تھی۔ گھنٹہ یا لے بال ہاف بند ہے تھے اور اپنا پرس اٹھاتے ہوئے وہ ایک جھوٹی لس کو کان کے پیچھے اڑس رہی تھی۔

”آپ نے تو کہا تھا وہ دو بجے سے پہلے نہیں آئیں گی؟“ سعدی بلکا سابل پایا۔

فارس نے چونک کرا سے دیکھا۔ مگر اسے یہاں سے وہ نہیں نظر آ رہا تھا جو سعدی دیکھ رہا تھا۔

زمر اس کی گاڑی کے پاس رکی۔ پھر اچھبے سے لاڈنگ کی کھڑکی کو دیکھا۔ سعدی ادھر کھڑا نظر آیا کہ وہ ششے کے بہت قریب کھڑا تھا۔ زمر بلکا سامکرائی اور آگے بڑھ آئی۔ سعدی مسکرا بھی نہ سکا۔  
وہ راہداری میں داخل ہوئی تھی کہ ٹرالی لاتا صداقت اسے دیکھ کر بوکھلا گیا۔

”باجی! آپ اتنی جلدی؟“

”ہاں.... پانچھنٹ کی نسل ہو گئی۔ ڈاکٹر کو کہیں جانا تھا۔ سعدی آیا ہے؟“ وہ سیدھی ڈرانگ رومن کی طرف آ رہی تھی اور اس کی آواز پہلے ہی ادھر پہنچ گئی تھی۔ بڑے اپا نے بے اختیار سعدی کو دیکھا۔

فارس ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

”آج تو ہمارا سعدی اتنے عرصے بعد...“ چوکھت پر زمر کے الفاظ اٹوٹ گئے۔

فارس سامنے کھڑا تھا۔ باہمیل چیز پر سعدی کھڑکی کے ساتھ۔ فارس کو دیکھ کر اس کی بھوری آنکھوں میں پہلے بے یقینی ابھری، پھر صدمہ اور آخر میں شدید غصہ۔ اس کے لب بکھن گئے۔ اتنی بخوبی سے کہ گردن کی نیس ابھرنے لگیں۔ تیز نگاہوں سے سعدی کو دیکھ کر جیسے جواب مانگا۔

فارس تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر باہر کی طرف بڑھا۔

”یہ آدمی میرے گھر میں کیا کر رہا ہے؟“ وہ ابھی لکھا بھی نہ تھا جب وہ جواب طلب نظر وہن سے بڑے ابا کو دیکھ کر اوپری آواز میں بولی تھی۔

فارس لمحے بھر کو رکا، پھر تیزی سے نکلتا گیا۔

”اے میں نے بلا یا تھا زمر!“ بڑے اپا نے ملال سے اسے جاتے دیکھا۔

”آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ نہیں جانتے کہ وہ کون ہے؟“  
وہ بے یقین، حیرت و صدمے سے اتنا بلند بول رہی تھی کہ صداقت راہداری میں ہی تھم گیا۔

”وہ بے گناہ ہے۔“

”اور میں بے گناہ نہیں تھی؟ آپ کو اس سارے معاملے میں میں معصوم نہیں لگتی؟“

”زمر....“ سعدی نے پکھ کہنا چاہا۔

”تم تو بالکل خاموش رہو!“ انگلی اٹھا کر اسے چپ کرایا۔ سعدی نے سر جھکا لیا۔ مرکزی دروازہ کھول کر بند ہونے کی آواز آئی۔

”اگر آئندہ یہ آدمی میرے گھر میں داخل بھی ہو تو میں یہاں نہیں رہوں گی ابا۔“

فارس پورچ عبور کرتا دھائی دے رہا تھا۔ اہانت اور ضبط سے اس کے کان سرخ ہو گئے تھے۔ بڑے ابا کا دل بری طرح دکھا۔

”وہ میرے اصرار پر آیا تھا۔ اس کا کیا قصور؟“

”یہ..... یہ..... سب.....“ زمر نے پرس سے روپورٹ کے لفافے نکال کر زور سے میز پر اچھا لے۔ وہ سب بکھر کر نیچے لڑک گئے۔

”یہ سب اس کا قصور ہے۔ آپ کے دو بچے ایک ایک گردہ کھو چکے ہیں تو اس آدمی کی وجہ سے۔ اور آپ اسے اپنے لاوٹنے میں بھمار ہے تھے؟ ابا!“

”تم نے اسے یہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا... تم...“

”مجھے پتا ہے یہ، ہی تھا۔ مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ گلابی سرخ آنکھوں کے ساتھ پھٹے دل سے بولتی پلٹ گئی۔

صداقت سر جھکائے ٹرالی اندر لے آیا۔ سعدی نے گھری سانس بھری۔ آگے آیا، کباب اٹھایا، صوفے پر برا جمان ہوا اور اسے

ہلما۔

”مزے کا ہے۔ آپ بھی لیں نا۔“

وہ ابھی تک دل مسوں کر بیٹھے تھے۔ گردن دائیں طرف گرائے۔ زر در گفت کے ساتھ۔

”وہ کیا سوچتا ہو گا۔ اور تم بھی اسے لے کر نہیں گئے۔ بے چارہ نیکی پر گیا ہو گا۔“

”اوہ چھوڑ یہ۔ بڑے ابا! اوہ بہت رف اینڈ ٹھ فیں۔ چار سال جیل میں چکی پیس کر آئے ہیں۔ یہی پہ جا کر گھلنے نہیں جائیں گے۔“

”وہ میرا مہمان تھا۔ گھر آئے کے ساتھ کوئی ایسے کرتا ہے؟ اور وہ تو قابھی معصوم۔“

”آپ ایسا کریں۔“ اس نے کباب توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”پھپھو کی شادی کرادیں۔“

”بڑے ابا نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں کر اسکتا ہوں؟“

سعدی نے چباتے ہوئے آنکھیں سکیز کر سوچا۔ ”میکنیکی ہاں۔“ شاید اور پریکٹیکلی تو بالکل بھی نہیں۔“ امید

ٹھرڈ اور کی کیا بات کے آخر میں جھر جھری لے کر اس نے سر جھکا۔

”بڑے ابا! میں جیز کے پیسے چلاتے اس کے قریب آنے لگے۔

”پڑھی لکھی لڑکیاں جب تیس عبور کر جائیں اور ان کے پاس نہ ختم ہونے والے دلائل ہوں تو ان کو کوئی شادی کے لیے مجبور نہیں کر

سکتا اور....“ غم زدہ مسکراہٹ سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔ ”اور وہ تو اسے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی؛ زندگی میں کیسے کرے گی؟“

کباب میں کوئی ہڈی تھی شاید جو سعدی کے حلق میں پھنس گئی۔ وہ بے اختیار آگے بھک کر کھانا۔ پھر چہرہ اٹھا کر اڑی رنگت کے

مالک ان کو دیکھا۔

”میں نے..... یہ تو نہیں... کہا۔“

”چھٹ کا پوتا پچیس سال کا ہو کر باہر سے ڈگری لا کر سمجھتا ہے کہ وہ دادا کی دوائیوں کی پر پچی پڑھ سکتا ہے اور دادا اس کا ذہن نہیں پڑھ

سعدی نے بوکھلا کر دروازے کو دیکھا۔

”آہستہ بولیے۔ میں عاتق کر دیا جاؤں گا۔“

بڑے ابا ادا سی سے مسکرائے۔ ”یہ میری بھی خواہش ہے، ہمیشہ سے تھی۔ مگر وہ کبھی نہیں مانے گی۔“

سعدی بالکل چپ ہو گیا۔ تب ہی راہداری سے قدموں کی آواز آئی۔ سعدی نے جلدی سے کبابوں کی پلیٹ واپس رکھی اور سیدھا

ہو کر بیٹھا۔

”جب پہنچ جا رہے ہو آج کل؟“، ”زمر اندر آئی۔ سامنے نا نگ پٹا نگ رکھ کر بیٹھی۔ لباس بدل کر فریش اور سنبھلی ہوئی تھی۔“

”منڈے تک آف لیا ہے۔ کچھ کام نہیں تھا۔“ وہ بظاہر سری لبھ میں کہتے ہوئے گاہے بگاہے مختاط نظر اس پڑا۔

”اگر تمہیں میرا وہ رویہ برالگا ہے تو میں مذعرت کرتی ہوں۔ مگر مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ کیونکہ اگر تم خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو تو تمہیں میں حق بجانب نظر آؤں گی۔“ نہایت محنثے لبھ میں وہ شروع ہوئی۔ ”میری زندگی کے کچھ اصول ہیں۔ میں جن کو پسند نہیں کرتی، ان سے بھی مل لیتی ہوں۔ مگر جن سے نفرت کرتی ہوں بالخصوص کسی ایسے شخص سے جس نے مجھے نصان دیا ہو تو اس کو میں اپنے اردوگہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس بارے میں مجھے اپنے جذبات چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ آخر میں ہلکے سے شانے اچکائے۔

سعدی نے سر ہلایا۔ وہ جذبات نہیں، مگر ڈھیروں کرب چھپا کر آئی تھی۔

”آئندہ کچھ بھی ایسا نہیں ہو گا جو آپ کو تکلیف دے زمرا اور جو دے چکے ہیں، وہ ضرور بھگتیں گے۔“

”مجھے ان کے بھگتے سے غرض نہیں ہے۔“

”مگر آپ تو انصاف، قصاص پر یقین رکھتی ہیں۔“

”معاف میں نے ابھی بھی نہیں کیا سعدی! مگر میں زندگی میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ میں خود کو مزید تکلیف سے بچانا چاہتی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ”ابا آپ کو اس سے ملنا ہے تو ضرور ملیں۔ مگر میری موجودگی میں یہ مت کیا کیجیے۔“

”ہم نے تو یہی سمجھا تھا۔“ سعدی نے بمشکل خود کو کہنے سے روکا۔

”سعدی چاہتا ہے ہم کل رات اس کی طرف کھانا کھائیں۔“ بڑے ابا نے بات بدل دی۔ نہ تائید کی، نہ انکار کیا۔

زمر نے سعدی کو دیکھا جو منڈب سما سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا سما مسکرائی۔

”شیور! ہم ضرور آئیں گے۔“

سعدی کی رنگت واپس آئی۔ وہ مسکراتا ہوا المٹھا۔

”ہم سب انتفار کریں گے۔“

زمر کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہی تھی۔

❖❖❖

تم جسے نور صبح کہتے ہو ..... میں اسے گرد شام بھی نہ کہوں

رات کی سیاہ افشاں پورے شہر پر جگھا رہی تھی۔ کار دارز کے عظیم الشان قصر کے سامنے لان نشیب میں جاتا تو آگے انکسی تھی۔

فارس دروازے پر کھڑا چاہیوں کے گچھے سے ایک لگا رہا تھا۔ جیزز پہنچوں والی شرٹ پہنچے کف کلائی پر موڑے اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

دروازہ کھلا۔ اس نے اندر قدم رکھا۔ بناو کیھ دیوار پہ تھا مارا اور سیدھا دوسرا بٹن دبایا۔ داخلی حصے کی تی جل اٹھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندر آیا۔ گردن گھما کر چھپت، کھڑکیوں، دیواروں کو دیکھتا وہ راہداری سے گزر رہا تھا۔

گھر یا ہر سے پینٹ شدہ تھا، کہ کارو راز اپنا گھر پینٹ کرواتے تو اس کا بھی بیر و فی حصہ کروادیتے کہ ان کے لان سے وہ دکھائی دیتا تھا۔ البتہ اندر سے گھر معمولی تھا۔ ناریل فرنچیز، چپس کافر شش، دیوار اور چھپت کے ملنے کی جگہ پا کھڑا پینٹ۔

وہ آگے بڑھتا گیا۔ جواہرات نے یہاں کی صفائی کروادی تھی۔ آج وہ صاف سترہ اس پر اتھا۔ مگر پھر بھی پر انا اور معمولی لگتا تھا۔

لاؤخ چھوٹا سا تھا۔ اس کے ایک طرف کھانے کی گول میز رکھی تھی۔ ڈرائیگ روم الگ تھا۔ سیر ہیاں اور پر جاتیں۔ ایک طرف دروازہ تھا جہاں سے سیر ہیاں بیسمٹ میں جاتیں۔ بیسمٹ تھے خانے کی طرح تھی۔ پورے گھر کے رقبے پر پھیلا کرہ جس میں ستون تھے، مگر دیواریں ندارد... اس تھے خانے میں کاٹھ کبڑا تھا۔ فارس ادھر نہیں گیا۔ وہ اپری منزل پر آیا۔ آگے میں بھی تھا اور اندر دیوار پر ایک تصویر تھی۔ تصویر میں وہ بلکا سامسکرا رہا تھا۔ بالکل بلکا سا۔ ایش گرے ڈرسوت میں ملبوس تھا۔ بال اب جیسے تھے۔ ساتھ ایک ساڑھی میں ملبوس لڑکی کھڑی تھی۔ اسٹیپ میں کٹے بال، بڑے جھمکے جاذب نظر۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

فارس پلت گیا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ با تھر روم میں آ کر اس نے مل کھولا اور آستین موز کروضو کرنے لگا۔

ٹیکس سے باہر روشنی میں نہیا قصر دکھائی دے رہا تھا۔ اندر ملازموں کی چھل پہل جاری تھی۔ جواہرات سربراہی کری پر ارجمن زاکت سے چھپری کانے سے اسٹیک کا کٹرا توڑ رہی تھی۔ دائیں ہاتھ بیٹھا ہاشم پلیٹ پر جھکا کھانے میں مگن تھا۔ اس کے موبائل کی میتھ ٹون، قفقے و قفقے سے نج رہی تھی۔ جواہرات کے دوسرے ہاتھ بیٹھا نوشیر وال بے دلی سے کاناپلیٹ میں الٹ پلت کر رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔

”تم آج پھر آفس نہیں آئے۔“ جواہرات نے کاناچلاتے بس نگاہیں اٹھا کر شیر و کود دیکھا۔ اس نے بیزاری سے چہرہ اٹھایا۔

”آپ لوگ مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلانیں چھوڑ سکتے؟“

”مگی! ہاشم نے نگاہوں میں جواہرات کو تنبیہ کی۔ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

”میرا خیال تھا تم اب تک اپنے بھائی کو سمجھا چکے ہو گے۔ مگر یہ ہنوز اس عورت کے غم میں ہے جو اس کو گدھا سمجھ کر استعمال کر کے چلی

گئی۔“

”آپ چاہتی ہیں میں نہیں سے اٹھ جاؤں؟“ اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔

”شیر و بد تیزی مت کرو۔ وہ ہماری ماں ہیں۔“

اور جس طرح ہاشم نے صرف نگاہ اٹھا کر تھی سے کہا تھا، نوشیر وال نے گردن جھکا لی۔ جواہرات نے گھری سانس لے کر گلاس لبوں سے

اکالا۔

”میں اس دن کا انتظار کر رہی ہوں جب تمہیں احساس ہو گا کہ تمہاری ماں اور تمہارا بھائی تمہیں پر ٹیکٹ کرنے کے لیے کیا کیا کرتے ہیں۔ اور یہ پورا ہفتہ ہم نے تمہارا خونخواہ کا غصہ برداشت کیا ہے۔ تم ہمیں ہی موردا لزام خبرہار ہے ہو؟ اگر سعدی نے (اور اس نام پر نوشیر وال کی لپڑیاں پھٹنے کو تھیں) کچھ برکیا بھی ہے تو تمہارے بھائی کے ساتھ۔ اور جب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ اسے سنبھال لے گا تو تم کیوں اپنا خون جلا رہے ہیں؟“

نوشیر وال نے کانٹا رکھ دیا۔ بس کھاچا تھا وہ۔

”فارس چلا گیا؟“ ہاشم نے دانتہ ماں کو دیکھتے ہوئے موضوع بدلا۔ وہ بھی.... بھنڈے انداز میں شیر و کی مزید کلاس لے سکتی تھی مگر

ہاشم کے مسلسل نگاہوں سے تنبیہ کرنے پر گھری سانس لے کر بولی۔

”مہمان سے چار دن بعد بدبو آنے لگتی ہے۔ سو آج اس کا گھر تیار کروادیا تھا۔“

نوشیر وال اٹھنے کے لیے پرتوں رہا تھا مگر بہر حال اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ بڑے بھائی اور ماں کے سامنے سے یوں اٹھ جائے۔

ہاشم کا موبائل پھر بجا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کانٹالیوں تک لے جاتے، دوسرا سے فون کان سے لگایا۔ ”جی.....جی.....آپ کا کام ہو گیا تھا۔ میں صبح تک کیس فائل آپ کو بھجوادوں گا۔ جی بالکل۔“ اس نے پلیٹ پرے کی اور دوسرا نمبر ملانے لگا۔ ہاشم کے ہر وقت بجتے فون کے وہ عادی تھے۔

”جی زمر! کیسی ہیں آپ؟“

ان دونوں نے چونک کرائے فون پر کہتے سنے۔

”میں نے آپ کو ایک کیس فائل کا کہا تھا۔ او کے۔ وہ کاپی ہو گئی؟ اچھا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں۔ آپ کے گھر سے پک کر لے گا۔“ اس نے رک کرنا۔

”آپ کدھر ہیں؟ خیریت؟ سعدی کی طرف؟ اچھا۔“ ہاشم بات دہرانے کا عادی نہ تھا مگر چونکہ یہ اس کے لیے بھی غیر متوقع تھا، سو وہ دھراتا گیا۔ نگاہ اٹھا کر شیر کو دیکھا۔ وہ ہنوز ٹھیکپا سے ہی دیکھ رہا تھا۔

”چلیں جب آپ واپس آئیں۔ اچھا۔ صبح وہیں سے کوثر جائیں گی؟ او کے۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ آ..... سعدی قریب ہے تو میری بات کروادیں۔“ وہ کہتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ جواہرات بھی نیکپن سے لب ٹھیکپا ادھری متوجہ تھی۔

”کیا حال ہے سعدی؟“ وہ بولا تو آنکھوں میں سردمبری درآئی۔ نوشیر وال نے ”ہونہہ“ کہہ کر استہزا سے سر جھکا۔

”میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ ایسا ہے کہ صبح میری سیکڑی تمہیں کال کر کے کل کی اپائنٹمنٹ دے گی۔ ضرور آتا۔ میں انتظار کروں گا۔“ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

”یگر یا آپ نے اسے ذمی اے کی نظر دیں سے کہ وہ ایک دفعہ پھر فیملی بن گے؟“

”وہ کل آئے گا۔ میں اس سے بات کروں گا اور میں سب سنبھال لوں گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم سعدی یوسف (آسیب) سے نکل آؤ۔“ ہر فقرہ توڑ توڑ کر تخلی سے ادا کیا۔

”نوشیر وال....ریلیکس۔“ جواہرات نے اب کے زمی سے شیر و کاہاتھ دبایا۔ اس نے بظاہر خود کو نارمل کرتے ہوئے اثبات میں سر بلادیا۔ بہر حال تاثرات چھپانے میں ماں اور بھائی جیسا ماہر نہ تھا۔

”یکوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ بڑی بات تب ہوتی اگر سعدی کے ہاتھ کچھ ایسا لگتا جو ہمیں نقصان دے۔“

”میں سمجھ گیا۔ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اپنا موبائل نکالتے ہوئے اٹھ گیا۔ جواہرات نے قدرے تشویش سے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”سرمد وغیرہ نے باہر کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ پہلے انکار کر دیا، اب چلا ہی جاتا ہوں۔ موڑ اچھا ہو جائے گا۔ ورنہ جب تک یہ سعدی یوسف زندہ ہے، میری زندگی مسائل کا شکار ہی رہے گی۔“ سر جھک کر کہتا وہ نکلنے لگا۔ پھر جیسے اپنی ہی بات نے سوچ کا ایک نیا درد کھایا۔

”مرکیوں نہیں جاتا یہ سعدی آخر! اتنے تو بم بلاست ہوتے ہیں روز۔“ وہ تو کہہ کر نکل گیا مگر ہاشم بے اختیار سانس روکے اس کو دیکھنے لگا۔

”سوچ سمجھ کر بولا کرو!“ اس نے عقب سے قدرے برہمی سے پکارا۔ شیر و نے مڑے بغیر ”بائے“ کا ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھتا

”مجھے یقین نہیں ہے وہ دوستوں کے پاس جا رہا ہے۔“

”اگر آپ اسی طرح ہر وقت اس کو منی رخ دھاتی رہیں تو وہ واقعی کسی کے پاس جانے کے قابل نہیں رہے گا۔“

”تمہارے خیال میں میں اس کی بھلائی نہیں چاہتی؟“

”کیا ہم سکون سے کھانا کھا سکتے ہیں؟“ ہاشم واپس پلیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

”شیور!“ جواہرات نے نزاکت سے شانے اچکائے۔ انگلی سے سامنے گرے بال پیچھے کیے اور گھونٹ گھونٹ جوس پینے لگی۔



## باب 3: پہلا تاثر، پہلا تعارف

”پہلا تاثر۔ پہلا تعارف۔“

محبت صابر ہوتی ہے۔

محبت مہربان ہوتی ہے۔

یہ حسد نہیں کرتی، شنج نہیں بھارتی۔

مغروز نہیں ہوتی۔

یہ ترش نہیں ہوتی، خود شناس ہوتی ہے۔

جلد غصہ نہیں کرتی، غلطیوں کا حساب نہیں رکھتی۔

بدی میں خوش نہیں ہوتی، صرف جج میں تسلیم پاتی ہے۔

ہمیشہ حفاظت کرتی ہے، ہمیشہ بھروسہ کرتی ہے۔

ہمیشہ امید رکھتی ہے، ہمیشہ ثابت قدم رہتی ہے۔

محبت کبھی ناکام نہیں ہوتی۔

گل جو پیش گویاں ہیں۔

وہ ختم ہو جائیں گی۔

جوز بانیں ہیں۔

وہ خاموش کرادی جائیں گی۔

اور جو علم ہے....

وہ دم توڑ جائے گا....

(عہد نامہ جدید انجلی مقدس)

مرحوم ذوالقدر یوسف کے چھوٹے باغیچے والے گھر میں اس رات کسی تہوار کی طرح رونق بکھری تھی۔ گول میز کے گرد سعدی کی والدہ اور بہن بھائی کے علاوہ وحدے کے مطابق سچھپو اور دادا بھی تھے اور وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ بڑے ابا ندرت کو خاندان میں کسی ای قصہ سناتے ہوئے اس بات کو اپنے ماضی کی کسی یاد سے جوڑتے چھپے چلے گئے تھے اور اب کوئی بھی سی مثال دے رہے تھے۔

”بڑے ابا اصل میں امتکانی پر چوں میں دی گئی اس ہدایت پر عمل کرتے ہیں جو کہتی ہے مندرجہ بالا تصویر کو مثالوں سے

وہ ساتھ ساتھ ان کی ہربات پتھرہ بھی کر رہا تھا۔ بڑے ابا نے تو کوئی توجہ نہ دی۔ زمر البت مسکراہٹ دبائے کھانا کھاتی رہی۔ حینیں لدرے لتعلق بیٹھی (صرف زمر سے) کھاری تھی۔ (ہونہہ جب پتا چلا کہ بھائی نے گردہ دیا ہے تو آگئیں۔ اب بھائی اچھا ہو گیا) اور سیم اپنے بھائی کے کھانے اور بولنے کے انداز کی بھروسہ نقلی کی کوشش میں پر جوش سالگ رہا تھا۔

”پھپھوا! میں اس دفعہ یکند آیا تھا ایگزامز میں۔“ مہمان کے سامنے تو وہ آواز کو اتنا معمصوم اور شرمیلا بنالیتا تھا کہ حینیں نے تجھ سے گھورا۔ مگر وہ کہے جا رہا تھا۔ ”اور جو لڑکا تھرڈ آیا، وہ مجھ سے آگے بیٹھا تھا اور پر پچی بنا کر مجھ سے پچھلے والے کو نقش کروارہا تھا۔ اور میں نے اسے....“

”سیم یوسف!“ حینیں نے اضطراب سے پہلو بدلتے تو کا۔ ”اگر آپ ہمیں اپنی باتوں سے کچھ دیر مستفید نہ کریں تو کتنا اچھا ہو۔“ راز پرانے ہونے کے ساتھ وزنی ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے کندھوں پر دھرا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔

سیم نے ادای سے منہ لٹکایا۔ پھر زمر کو دیکھا۔ وہ کھانا ختم کر چکی تھی اور باوقار انداز میں پیچھے ہو کر بیٹھی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نہم کی آنکھوں میں اسید جھلکی۔

”پھپھو میں بولتا رہوں؟“

”ہاں تم بولتے رہو۔“ زمر نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔ وہ زیادہ پر جوش ہو کر وہی قصہ دہرانے لگا۔

حینیں سر جھٹک کر پانی پینے لگی۔ اس کا انداز کھنچا کھنچا ساتھا۔ یہ زمر نے پہلے بھی محسوں کیا تھا اور اب تو سب نے ہی کیا، مگر سعدی نے نظر انداز کر دیا۔ اور زمر تو ویسے بھی تمہل مزاج اور مپھور تھی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے محسوں ہی نہ کیا ہو۔ اور سیم کے ماتھے کے بال زمی سے ملواری مسکرا کر اس کو سنبھل لگی۔

سیم کو اب پچھلی بات بھول گئی تھی۔ اسے نئی فکر نے آن گھیرا تھا۔

”پھپھوا بھائی جب چھوٹا تھا تو کیسا تھا؟“

سعدی فرج کے دروازے کو کھو لے کھڑا پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ اس سوال پر فوراً پلٹا۔ ”سعدی جیسا کوئی نہیں ہے پھپھو کے لئے۔“ اس نے واضح سیم کو کوچھ دیا۔

”ہاں مگر سیم کی اپنی جگہ ہے۔“ زمر نے سیم کا ہاتھ تھام کر کھا۔

”بھائی جیسا کوئی کیوں نہیں ہے؟“

”اس لیے سیم کہ جب سعدی تم جتنا تھا تو میں حینیں جتنی تھی۔ اور ہم بہترین دوست تھے۔ ہمارا سکول بھی ایک تھا۔ اور اسکول جانے سے پہلے اپنے اپنے گھر سے ہم ایک، ہی کارٹون دیکھ کر نکلا کرتے تھے۔ ہمارے زمانے میں صبح سات بجے پیٹی وی پکارٹون لگا کرتے تھے۔“ سعدی بوتل ہاتھ میں لیے واپس کریں پا آبیٹھا۔ حینیں خاموشی سے ندرت کے ساتھ برتن اٹھوانے لگی۔ کھانا کھایا جا چکا تھا اور وہ مزید ام کے قریب نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔

”اور ہمیں گیمز بھی ایک، ہی طرح کی پنڈ تھیں زمر!“ سعدی یاد کر کے مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔ ”ہم ہرف پانی، اونج نچ، پکڑن ہلائی، ٹیلووا یک پرسریں کھیلا کرتے تھے۔ اور ہاں کنگ اور ڈارک روم اور کونا کونا بھی۔“

”اور وہ دیڈ یو گیم یاد ہے لطف دالی سعدی؟ ڈک ہوٹ؟ ہم پسول سے ٹی وی اسکرین پر فائز کیا کرتے اور اڑتی ہوئی بٹھیں گر ہائیں۔“ حینیں نے ایک دم سراٹھایا۔ میز صاف کرتے ہاتھ رکے۔

”وہ پستول ابھی بھی پڑی ہے ہمارے پاس!“ بے اختیار وہ کہہ اٹھی۔ اس پر زمر نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ ایک دم جلدی جلدی اپنا کام ختم کرنے لگی۔

”اور اس میں سپر مار یو بھی تھی اور نیکس والی ایک گیم بھی۔ اور پچھوپا یاد ہے ہم گھنٹوں پیٹھ کر monopoly کھیلا کرتے تھے۔ مگر میں مونو پلی میں ہمیشہ دیوالی یہ ہو جاتا تھا۔ کیونکہ پچھوپا تھی اچھی پلاز تھیں کہ ساری بہترین زمینیں خرید لیتیں اور میں نہ سب اجنبیاتی اور ناکام پلازا میری گوٹ جیل میں ہی پھنسی رہتی۔“

”اور سعدی! وہ ایک کارڈ گیم بھی تو ہم کھیلتے تھے۔ رنگ برلنگے کارڈ زجن پر نمبر لکھے ہوتے تھے۔“ زمر نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ حینیں جو واپس آئیں تھیں پھر سے خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ بنا سوچے سمجھے بولی۔

”وہ اونو (ONO) تھی۔ ہمارے پاس ابھی بھی پڑی ہے۔“

”اچھا واقعی؟ تمہیں وہ بہت پسند تھی حینیں مجھے یاد ہے۔ اور تمہیں یہو پنجوں اکڑ بکونا اپ کی گیمز بھی بہت پسند تھیں۔“ زمر ارب نے بالکل حینیں کی طرف موڑ کر بولی تو حینیں کے لیوں پر ایک بھولی بسری مسکرا ہٹ آٹھبری۔

”اور آپ کو عینک والا جن بہت پسند تھا۔“

”غیر مجھے تو نتھر پسند تھا۔ اور نتھر کے بارے میں میں اپنی فیلمگر چھانے کی بالکل قائل نہیں ہوں۔“ حینیں کی مسکرا ہٹ اور بھی بڑھی۔ ”اور آپ کو دھواں ڈرامہ بھی بہت پسند تھا۔ ہمارے پاس یکیش تھیں اس کی۔ اور آپ ہر دفعہ داؤ کے مرنے کے سین پر اٹھ کر چل جایا کرتی تھیں۔“

”اوہ حینیں میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ڈرامہ نگار اسی کردار کو کیوں مار دیتا ہے جس کو ہم بہت پسند کرتے ہیں۔“

”اوہ ہوں!“ حینیں نے لفگی میں سر ہلا کیا۔ ”انہیں جس کردار کو مارنا ہوتا ہے وہ آپ کو پسند کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“

”پچھو! مجھے بھی ONO کھیلانی آتی ہے۔ کیا ہم کھیلیں؟“ سیم سے زیادہ دیر نظر انداز ہونا برداشت نہیں ہوا۔ حینیں چونکی۔ پھر مسکرا ہٹ دھیکی ہوئی۔ ذرا پچھے ہو کر پیٹھی۔ وہ کس خوشی میں اتنا بولے جا رہی تھی بھلا؟ خود کو ڈانگا۔

”ہاں اونو کھیلتے ہیں۔“ سعدی نے اس کو بغور دیکھتے درمیان کاراستہ نکالا۔

”جاوہنڈ اونو لے آؤ۔ مگر کارڈ زجن میں shuffle کروں گا۔ یاد ہے پچھوواحدہ اپنے گھنٹے کے نیچے ڈرافر کے چاروں کارڈ پہلے ہی چھپا لتی تھی۔ اس لیے میں کبھی بھی نہیں جیتا تھا۔ مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ میں یہ سارے گیم ہمیشہ ہار جاتا ہوں۔ اس لیے حنیں اتم اپنی چینگ کرنے کی صلاحیتوں سے باز رہنا۔“ مصنوعی ناراضی سے اس نے حینیں کو دیکھتے ہوئے کہا مگر..... حینیں ذوالفقار یوسف خان۔ بالکل ساکت رہ گئی۔ سعدی کو بے یقینی سے دیکھتی اس کی نگاہیں پھر اگئیں۔ رنگت سفید پڑی جیسے وہ کوئی برف کا مجسم ہو۔

”میں.... چینگ نہیں کرتی بھائی۔“ اس نے اتنی بے یقینی سے اسے دیکھتے کہا تھا کہ سعدی کی مسکرا ہٹ غائب ہوئی۔ حینیں ایک دم کھڑی ہوئی۔ زمر نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں کارڈ زلانی ہوں۔“ وہ مڑگئی۔ سعدی فوراً اس کے پیچھے لپکا۔

”آئی ایک سوری۔ میں نے.... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ سعدی کے کمرے میں اسنڈی نیبل کے سامنے کھڑی تھی جب وہ اس کے سامنے آیا۔ حینیں سر ہلا کر جھک کر دراز کھولنے لگی۔

”مجھے پتا ہے تم کبھی چینگ نہیں کر سکتیں۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا۔“

”آئی نو۔“ اس نے کارڈ زنکا لے اور دراز بند کر کے سیدھی ہوئی۔ وہ اسی طرح مگر مندی سے اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا جس کی رنگت ہو زفید تھی۔

”خین! ہمارا مسیح صرف ایک شخص ہوتا ہے اور وہ ہم شخص ہم خود ہوتے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے بھائی!“ اس نے سر بلہ کر پھیکا سامسکرانے کی کوشش کی۔ پھر مژدی تو ایک دم قدم زنجیر ہوئے۔

سعدی کا لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ زمر کے آنے سے قبل وہ جو کام کر رہا تھا وہ یونہی رکھا تھا۔ اسکرین پر نمبر زچل رہے تھے۔ اور پیچے نہیں کی آنکھوں کی پتیاں سکریں۔ اس نے چڑہ ذرا آگے کیا۔

ایک ہاتھ نے دھپ سے لیپ ٹاپ اسکرین کو کی بورڈ پر گرا دیا۔ اس نے چونک کر بھائی کو دیکھا۔

”اوونو کو دیر نہیں کرتا تھا۔ گناہ ملتا ہے۔“ مگر وہ یونہی سعدی کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن، نہک، سب کچھ تھا۔

”بھائی! آپ کیا کر رہے ہیں؟“

مگر زمر ادھر ہی آرہی تھی۔

”سعدی.... باشم!“ کہتے اس نے فون پکڑا۔ سعدی نے گز بڑا کرفون تھاما۔ چہرے سے وہ خوشگوار تاثرات غائب ہوئے اور ان کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔

”جی.... او کے۔“ اس نے فون بند کیا تو خین تیزی سے بولی۔

”کیا کہہ رہے ہے تھے، مطلب اس دن کے لیے معذرت کر رہے تھے؟“

سعدی لمحہ بھر کو رکا۔ باشم نے کہا تھا کہ اس کی سیکری صبح کا ل کر کے اسے ملاقات کا وقت دے دے گی۔ مگر چونکہ اس کافی الحال اُم سے ملنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، اس لیے اس نے ہاں کہہ کر بات ختم کر دی۔

”آپ یگم شروع کریں۔ میں آتی ہوں۔“ وہ وہاں سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے اسے سعدی اور زمر باتیں کرتے راہداری میں آگے ہاتھ محسوس ہوئے۔ مگر وہ اپنے اور سیم کے مشترک کرے میں آتی (جہاں آج پچھو اور اسے رہنا تھا) دروازہ بند کیا۔ الماری کھولی۔ کپڑوں کا اُنٹ ایورست آج نہیں گرا کیونکہ صبح امی نے الماری جمالی تھی۔ وہ جو توں کے خانے پر جھکی۔ چند ڈبے باہر نکالے۔ پھر ہاتھ ڈال کر کونے میں ہمکا ایک سختاً محملیں ڈبا نکالا۔

سنہری مجمل کا وہ ڈبہ کھونے سے پہلے اس نے بہت دیر یوچا، اتنی دریکہ ہاتھ شل ہو گئے۔ اور پھر اس نے کھول ہی دیا۔

اندر سنہرے مجمل پر ایک سنہری چینی والا کٹ رکھا تھا۔ مگر کسی سونے چاندی کی جگہ اس زنجیر میں سیاہ ہیرے کی عکل کا اسٹون پروا یا لفابس کے اوپر سنہری حروف میں ”اسٹنس ایور آفتر“ کندہ تھا۔ یہ سعدی کے کی چینی کا جزو اس تھا۔

اس نے زنجیر کو ہولے سے چھووا۔ مگر پھر ہاتھ ہٹالیا، جیسے کرنٹ کے ننگے تار کو چھوپیا ہو۔ سر جھٹک کر ڈبے بند کیا۔ اسے پھینکنے والے انداز میں نچلے خانے میں ڈالا۔ جو توں کے ڈبے اندر رکھے اور زور سے الماری بند کی۔ گہری سانس لے کر وہ انھی تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھائی لوہا شم والی بات بتا دے گی۔ آخر ہاشم بھائی ہی تو تھے نا، کوئی غیر تو نہیں تھا۔ بھائی سمجھ جائے گا، اس لیے وہ بتا دے گی۔

مگر کب؟ یہ خین نے ابھی طہنیں کیا تھا۔



دشت طلب بھی کیا کوئی شہر طلسم ہے

جو اہرات کا اندازہ ہمیشہ کی طرح درست تھا۔ نو شیر وال دوستوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ وہ اس پر رونق مار کیت میں آگیا تھا جہاں

رات میں بھی دن کا سماں تھا۔ جو نینو کنٹریز آج کل لوئے جا رہے تھے، ان کا سامان یہاں کوڑیوں کے بھاؤ بک رہا تھا۔ پٹھان اور مقامی دکاندار اس بات سے قطعاً بے نیاز کوہ جو بیچ رہے ہیں وہ بے حد قیمتی، برائڈ اشیاء ہیں، بہت مزے سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھے۔

نوشیر وال نے کار کہیں دور کھڑی کی تھی اور اب وہ حبیبوں میں ہاتھ دا لے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی متلاشی نگاہیں آس پاس چہروں کو کھو ج رہی تھیں۔ اسی تلاش میں وہ آگے چلتا گیا۔ کافی دیر بعد رائی فروٹ کی ایک سامنے سے کھلی دکان کے سامنے وہ رکا۔ چند شانے پتیلیاں سکیز کر دکاندار کو دیکھا جھاڑ رہا تھا۔ اور پھر آگے آیا۔

”جب صاب! تازہ ڈرائی فروٹ ہے....“ دکاندار اس کو دیکھ کر کپڑا رکھتا جلدی جلدی اپنی اشیاء کی خصوصیات گنو ان لگا۔ نوشیر وال نے پہلے دو فقرے تو پیزاری سے سن لیے، پھر بات کاٹ کر بولا۔

”چالیس گرام چاہیے۔“

”بس؟ مگر کون سا....؟“

”تمہیں پتا ہے مجھے کیا چیز چالیس گرام چاہیے۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر درشتی سے بولا تو دکاندار کے الفاظ حلق میں انک گئے۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی مگر رنگت متغیر ہوتی گئی۔

”صاب! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم ایسے کام نہیں کرتا۔“

”میں پولیس والا نہیں ہوں۔ مال دو تو میں جاؤں۔“ وہ گزرے تاثرات سے بولا۔

”صاب! میں نے تایانا میں....“

”دیکھ بھائی! میری ایک جیب میں پستول ہے اور دوسری میں بخوہ۔ میں تجھے کون کی جیب دکھاؤں جو تو میری بات سنے گا؟“ کہتے ساتھ اس نے شرت کا کنارہ تر چھا کیا اور پہلی جیب میں اڑسا پستول ذرا سا جھلکا۔ دکاندار نے ہاتھ انھا کر سرا ثابت میں ہلا کیا۔

”گلابی والے قائد اعظم چلیں گے۔ اندر آؤ اور بتاؤ کون سا چاہیے۔“

نوشیر وال استہزا یہ مسکرا کیا اور اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔

جس وقت وہ گھر واپس آیا، ہاشم لاوٹخ میں نیم دراز تھا۔ یوں کہ پاؤں میز پر رکھے تھے اور سو نیا اس کے سینے پر رکھے ترچھی لینی ہاتھ میں آئی پیدا پکڑے گیم کھیل رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے سو نیا کے زم سیاہ بال سہلا تا دوسرے میں پکڑے گے مگ سے گھونٹ بھرتے ٹی وی دی کمک رہا تھا۔

”بابا! میرا گیم دیکھیں نا۔“ وہ خفا خفاسی بولی۔ ہاشم نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی۔

”اتنی دیر سے تو ان لمبی ناکوں والے پرندوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اب تو مجھے ان کی شکل بھی یاد ہو گئی ہے۔“ مسکراہٹ دبا کر کہتا وہ پھر سے ٹی وی دیکھنے لگا۔

”آپ کو میرا کوئی گیم سمجھ میں نہیں آتا۔“ وہ مسلسل اسکرین پر انگلیاں چلاتی کہہ رہی تھی۔

”میں اس طرح کے گیم نہیں کھیلا کرتا سونی! اور جو میں کھیلتا ہوں وہ میں ہمیشہ جیتتا ہوں۔“

”شیر و میرے ساتھ سب گیم کھیلتا ہے۔“

”ہاں، شیر وال تھا باری عمر میں زیادہ فرق ہے بھی نہیں۔“ ہاشم نے ٹی وی کوہی دیکھتے جھک کر اس کے بال چومنے۔

”کیا سونی کو پتا ہے وہ ماں کے ساتھ چھپھیوں پر نہیں جا رہی؟“

”ہوں!“ وہ گیم میں صرف تھی۔

”گذ! میرے دو ایک کام ختم ہو جائیں، پھر بابا اور سونی چھیوں پر جائیں گے۔ ملکیک؟“

”اور شیر و بھی جائے گا؟ اور ماں بھی؟ اور میں بھی؟“

”ماما کے علاوہ سب جائیں گے۔ ماما کے ساتھ سو نیا سرد یوں میں چلی جائے گی۔“

”اوکے،“ اس نے سر ہلا دیا۔ گیم مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تبھی ہاشم کی نگاہ اندر آتے شیر و پڑی جو نگاہ ملائے بغیر بیڑھیوں کی طرف ہو رہا تھا۔ ہاشم نے اسے پکارا۔

”ہو سکتا ہے کل سعدی آئے۔ میں چاہوں گا کہ تم میرے ساتھ ہو تو۔“

نوشیر و اس پہلے زینے پر کامٹا نہیں۔ آہستہ سے کہا۔

”اوکے۔“

”کیسا ہے سرمد؟ اور اس کے بھائی کے کیس کا کیا بنا؟“ بغور اسے دیکھتے ہوئے مگ سے گھونٹ بھرا۔ اسے بھی جواہرات کی طرح یقین تھا کہ شیر و دوست کے پاس نہیں گیا۔

”پتا نہیں۔ میں نے پوچھا نہیں۔“ وہ نگاہ ملائے بغیر بیڑھیاں چڑھتا گیا۔ ہاشم نے بھی بحث نہیں کی۔

اندر آ کر اس نے دروازہ لاک کیا اور اسٹڈی نیبل تک آیا۔ جیب سے پیکٹ نکال کر میز پر رکھا۔ اس میں عجیب سے ننھے ننھے کلوڑے تھے۔ کری ٹھیک کر بیٹھتے اس نے دراز سے خالی سگر بیٹ نکالا۔ اس میں پیکٹ میں رکھی منیات مسل کر بھرنے لگا۔ یہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ذرا سی لرزش تھی۔ بیٹھانی پر پسینہ بھی تھا۔

لاٹر جلا کر سگر بیٹ کے کنارے کو سلاکا یا اور دوسرا کنارہ ہوں سے لگایا۔ سانس اندر کھینچی۔ آنکھیں بند کیں۔ کڑ دامادہ اندر اترتا گیا۔

سانس باہر خارج کی تو دھوئیں کے مرغوں لے ہر طرف بکھر گئے۔ اس کا دماغ ہلکا ہوتا گیا۔ ہرشے سے ہلکا۔ ہوا سے بھی ہلکا۔

.....

ناشیتے کے بعد تیاری کی افراتفری پورے گھر میں پھیلی تھی۔ سیم بھاگ بھاگ کر اسکول کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ سعدی آفس اور زمر اورٹ کے لیے۔ واپسی پر اس نے بڑے ابا کو لے کر اپنے گھر جانا تھا۔ سو وہ سب سے زیادہ سکون سے بیٹھتے تھے۔ حنین ان کے قریب بیٹھی 11 ماہ میں سے کچھ سناتی ساتھ ساتھ تبرہ بھی کیے جا رہی تھی، جب ز مراد ہر آئی۔ حنین کی بولی زبان ذرا دھیمی ہوئی۔ الرٹ سی ہو کر بیٹھی۔ زمر بھی ماہ آگئی۔ حنین نے اسے نظر انداز کیا۔

”ماستر زکس سبیکٹ میں کرنے کا رادہ ہے حنین؟“ جھک کر جوتے کے اسٹریپ بند کرتی وہ ساتھ بیٹھی زمی سے پوچھنے لگی۔ حنین نے تھن تھرات قدرے نرم ہوئے۔

”لٹر پچر میں یا عربی میں۔ ابھی فیصلہ نہیں کیا۔“ پھر کی اور اضافہ کیا۔ ”بیچلر میں بھی لٹر پچر کر کھانا۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ تم اتنی ذہین ہوئے کچھ بھی کر لوگی۔“ وہ اب جھکی ہوئی دوسرا جوتا بند کر رہی تھی۔ حنین ذرا سامسکرائی۔ ساتھ ہی وہ کوئے کو عادتناخن کے اندر رگڑ رہی تھی۔

”مگر مجھے یاد ہے تم نے ایف ایس سی میں بورڈ میں پوزیشن لی تھی اور اینٹری میسٹ میں بھی بہت اچھے نمبر تھے۔ ناپ میرٹ بنتا تھا اپنارا۔ پھر انجینئرنگ میں کیوں نہیں لیا ایڈیمیشن؟“

”اپنارا۔ پھر انجینئرنگ میں کیوں نہیں لیا ایڈیمیشن؟“

حنین کی مسکراہٹ مضم ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر زمر کو دیکھا۔ وہ اسٹریپ بند کر کے اٹھ رہی تھی۔ لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا اور وہ

گردن دباجاتے ہیں۔

”اچانک سے دل پلٹ گیا تو بی اے میں داخلہ لے لیا۔ دل تو بھی بھی پلٹ جاتا ہے ناچھپو!“

اس کا خبار کا کنارہ رگڑتا انہی مزید تیز ہو گیا۔ سر جھکا کروہ بڑے بابا کوئی دوسرا خبر سنانے لگی۔ البتہ اب کے اندازست تھا۔

زمر نے جاتے جاتے مژ کرائے دیکھا۔ یہ آخری فقرہ کہتے اس کی آواز میں نہ طنز تھا نہیں۔ بس عجیب سی ادا تھی۔

وہ راہداری سے گزر کر سعدی کے کمرے کے دروازے تک آئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا نظر آ رہا تھا۔ کاراکڑے ہوئے اور کھڑے تھے اور وہ تالی کی گردہ لگا رہا تھا۔ زمزد را سما سکرائی۔ دروازہ ہولے سے بھایا۔

”تو تمہارا کوئی آفس بھی ہے؟“

گرہ کھینچ کر اوپر لے جاتے وہ خغلی سے پٹنا اور کارل درست کیے۔

”دو سال میں پہلی دفعہ چشمی لی وہ بھی صرف دو بیتے کی۔ اور باس سے چڑا سی تک ہر بندہ گزرتے گزرتے طعنہ دے جاتا ہے۔

آپ تو ایسے مت کریں۔“

”اوہ! اور اتنی لمبی چشمی کیوں لی؟“

سعدی چپ ہو گیا۔ (جچ پر آخری دنوں میں پریش ڈالنا تھا، ماموں کو نکلوانا تھا، ہاشم بھائی کا لیپ تاپ ہیک کرنا تھا، جس کا موقع آپ کے تو سط سے مل ہی گیا اور اب ان فائلز کو کھولنا ہے گرچھی ختم) یہ سب صرف سوچا۔ جب بولا تو محض اتنا۔

”کچھ ریسرچ ورک کر رہا تھا، اسی کو مکمل کرنا تھا۔“

”چلو پھر ویک اینڈ پیلے کا پلان کرتے ہیں۔“

”جی، آپ تو شادی میں نہیں آئیں گی نا؟“ اس نے سرسری ساز کر پھیڑا۔ وہ جو مژ نے لگی تھی، چونک گئی۔

”کس کی شادی؟“

”اب پورا رشیت معلوم نہیں۔ مگر جس لڑکے کی شادی ہے وہ ہمارا بھی رشنہ دار ہے اور اس حماد کا بھی۔ حماد اور کرن اس لیے تو آئے ہوئے ہیں آسٹریلیا سے۔ وہ بھی ہوں گے شادی پ۔ اور کرن کا درخانہ ان کو بالخصوص بلاؤئے گی۔ وہ سب بھی ہوں گے۔ سوادھر آپ حماد کا

سامنا نہیں کر سکیں گی، مجھے پتا ہے۔ اس لیے آپ کا کارڈ ادھر آیا تو میں نے اسی سے کہا کہ پھچو کونہ پھیجیں۔ وہ نہیں آئیں گی۔“

زمر کے لب بھنپے اور آنکھوں کی پتیاں سکڑیں۔ سینے پہ بازو لپیٹ کرائے تندی سے دیکھا۔ ”اور تمہیں کیوں لگا کہ میں اس کا سامنا نہیں کر سکتی؟“

”آپ نہیں کر سکتیں۔ تمہی تو خاندان میں کسی تقریب پر نہیں جاتیں۔ خیر آپ نے نہیں جانا تو کوئی بات نہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔“

بہت سمجھداری سے اس نے کہا۔

”میں اس لینے نہیں جاتی کیونکہ وقت نہیں ملتا اور....“

”ویک اینڈ پ وقت ہو گا پھر؟“ وہ تیزی سے بولا۔

زمر نے بے دھیانی سے ”ہاں“ کہا تو اس نے تیزی سے پوچھا۔ ”مطلوب آپ چلیں گی؟“

”میں.... دیکھوں گی۔“ وہ رک کر بولی۔ پھر گھری دیکھی۔ اسے اب چلنا تھا۔ وہ نکلی تو سعدی مکمل تیار ہو کر کھڑا نکھرا سا باہر نکلا۔

لاؤخ میں بس بڑے ابا تھے۔ حسین سونے چلی گئی تھی۔ انہوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”وہ تقریب پ جانے کے لیے مان گئی؟“

"بالکل؟" مسکرا کر کہتے اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور سامنے بیٹھا۔ بڑے اباۓ تعجب سے اسے دیکھا۔

"تم نے کیسے راضی کیا اسے؟ میں کہتا تو کبھی نہ مانتی۔"

"اب آپ کے پاس سعدی یوسف جیادا غرقوڑی ہے۔" گھوٹ بھرتے وہ مسکرا یا۔ پھر کچن کی طرف رخ کر کے آواز لگائی۔

"ای! آپ ناشتہ لا ہو رہے لارہی ہیں یا کچن سے؟"

"کچن سے میں نے جوتا پھینکنا ہے تمہارے قد کا لحاظ کیے بغیر۔" وہ ٹرے اٹھائے مصنوعی خفگی سے بوقتی آرہی تھیں۔ سعدی نے ۱۰۰ سے دادا کو دیکھا۔

"کوئی مانے گا کہ یہ خاتون میرے پیچھے میرے بہن بھائی کو میری مثالیں دیتی ہیں؟"

"مجھے پتا ہے اچھے سے۔ جلدی جلدی کا شور اس لیے چاتے ہو کر ناشتہ آدھا کرنا پڑے۔ اب اگر تم نے یہ تمہارے کیا نا سعدی تو مجھے ای نہ کہنا۔" وہ سامنے بیٹھتے ہوئے اس کی شکایت دادا سے لگا رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بس ان رہے تھے۔

سعدی نے حسب عادت بس تھوڑا سا کھایا۔ پھر ہاتھ صاف کرتا اٹھا رہت متنant سے ماں کو خاطب کیا۔

"اچھا نہ رہت، بہن! اللہ حافظ۔" اور اس سے پہلے کہ وہ واقعی اس کے قد کا لحاظ کیے بغیر ایک ہاتھ جڑ دیتیں وہ باہر نکل چکا تھا۔

.....❖❖❖

سارہ آفس کے لیے تیار کار کا دروازہ کھول رہی تھی جب گیٹ کی گھنٹی بجی۔ اس نے مزکر دیکھا۔ گیٹ اونچا تھا۔ یہاں سے معلوم ہیں ہوتا تھا کہ باہر کون ہے۔ وہ چاپی دروازے میں چھوڑ کر بیگ کار کی چھت پر رکھ کر گیٹ تک آئی اور اسے کھولا۔ آدھا دروازہ کھلتے ہی ہاتھ لمب کر کے۔

باہر فارس کھڑا تھا۔ ٹی شرٹ، جیزہ، چھوٹے کٹے بال، سنجیدہ گہری نظریں اور سپاٹ چہرہ۔ سارہ نے باقی دروازہ ست روی تھا۔

"فارس؟" کوئی نادیدہ لٹکان کے پیچھے اڑتی وہ ایک طرف ہی۔ چہرے پتندب سادر آیا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" سرسری سا سوال کیا۔ البتہ اس کو دیکھ گہری نظر سے رہا تھا۔ وہ "ہوں" میں سر زد راسا ہلا کر مزید ایک ہاب ہوئی۔

"میرا اتنی صبح آنا چھا نہیں لگایا آنا ہی؟" اس کی پچکچاہت کے باعث وہ ذرا سردا بولا۔ سارہ کے چہرے پر شرم دنگی ابھری۔

"ایسا نہیں ہے۔ آؤ۔"

"بچیوں سے ملنے آیا تھا میں۔" وہ وہیں کھڑا رہا۔ سارہ بھی ادھر ہی کھڑی رہی مگر اس سے نگاہ نہیں ملائی۔

"وہ اسکوں کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ بس، ہم نکلنے ہی والے تھے۔" ساتھ ہی اس نے گھری دیکھی جیسے جلدی میں ہو۔

"یعنی کسی اور وقت آؤں؟" اس کے چہرے کے بدلتے رنگ بغور دیکھتے وہ خشک انداز میں کہہ رہا تھا۔ سارہ نے اضطراب سے ہاتھ کر اسے دیکھا۔

"تم آسکتے ہو فارس۔"

"مگر... زیادہ نہیں ہوں؟" وہ اس کے تاثرات پڑھ رہا تھا۔ "تو آپ کے خیال میں وارث کو میں نے قتل کیا تھا؟"

"ایسا نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں پھنسایا گیا تھا۔ یقیناً تمہارے دشمن بہت ہوں گے اور...."

"اور میرا ادھر آنا آپ کے خاندان کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ آئندہ دور رہوں گا۔" سر ہلا کر وہ یوں کہہ رہا

تھا جیسے واقعی سمجھ گیا ہو۔ سارہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

”فارس! آئی ایم سوری۔ مگر میں پہلے ہی بہت مشکل زندگی گزار رہی ہوں۔ میرے پاس میری بیٹیوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ میں ان کو کسی بھی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ تم پلیز مجھے غلط مت لینا۔“

”کہاں سمجھ گیا۔ اب مل لوں یا جاؤ؟“

”نہیں۔ آؤ پلیز۔“ وہ اب کے واقعی پیچھے ہٹی اور اندر کی طرف بڑھی۔ وہ چند لمحے ضبط سے اسے آگے جاتے دیکھتا رہا، پھر سر جھک کر پیچھے ہولیا۔

فارس میں



ہر حقیقت فریب لگتی ہے..... جب کوئی اعتبار کھو بیٹھے

اسٹری روم میں خاموشی پھیلی تھی۔ نو شیر والی اسی خاموشی کا حصہ بنالیوں پہنچی رکھے میز کے اس طرف بیٹھے ہاشم کو دیکھ رہا تھا جو بہت انہاک سے فائل کے صفحے کو پڑھ رہا تھا۔ اسے آج آفس دیرے سے جانا تھا۔ اس لیے وہ رات والے لباس میں تھا۔ ”تیری دفعہ پوچھ رہا ہوں سعدی کب آئے گا؟“ وہ اب بیزار ہونے لگا تو مقدس خاموشی کو توڑا۔

”ہوں!“ ہاشم نے صفحہ پلتا۔ پھر زگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا اس کے انتظار میں تم تمام رات نہیں سوئے؟“

اس نے شیر و کی بلکی گلابی آنکھوں کو دیکھ کر کھا تھا۔ شیر و کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچرہ گیا۔ رنگت ذرا پیچکی ہوئی۔

”سویا تھا، مگر بہت دیرے سے۔“ اس نے گڑ بڑا کر کھا۔ پھر بغور ہاشم کے تاثرات دیکھے۔ وہ پھر سے فائل میں مصروف ہو گیا تھا۔ لا کھ شاطر سہی، اتنی جلدی ہاشم کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ پھر سے ڈرگز پہ آ گیا ہے۔ موبائل بجا۔ ہاشم نے انگلی سے مٹن دبایا اور بولو کہتے ہوئے فائل کا دوسرا صفحہ پلتا۔ اس کے پاس اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ موبائل کا ان لگاتا۔ اس کی سیکریٹری کی آواز گونجی۔

”سر! میں نے سعدی یوسف کو کال کی تھی۔“ وہ رک گئی۔ ہاشم نے پین سے اس صفحے میں پچھا اندر لائے کیا۔

”حیمه! میں اگلے کتنے منٹ تھمارے بولنے کا انتظار کروں گا؟“

”سوری سر! انہوں نے کہا کہ وہ مصروف ہیں۔ ان کو اپنا شیدول دیکھنا پڑے گا۔ آج تو نا ممکن ہے۔ اگلے ہفتے میں ان کو دوبارہ کال کر کے پوچھوں، اگر....“ وہ رکی مگر پھر جلدی سے بولی۔ ”اگر ہاشم بھائی کو مجھ سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے تو۔“

”اوکے۔“ ہاشم نے مٹن آف کیا اور صفحے پر الفاظ کے گرد دائرہ لگایا۔ وکالت سار الالفاظ کا کھیل ہی تھا۔

شیر و کے ماتھے پبل پڑ گئے تھے۔

”ایئی ٹیڈی دیکھا آپ نے اس کا؟ بد تیز انسان... خود کو سمجھتا کیا ہے؟“

ہاشم نے تھکاوت سے سرفی میں ہلا کر شیر و کو دیکھا۔ ”تم کب بین السطور با تین پڑھنا سیکھو گے نو شیر وال؟“

وہ جو پھر اہوا آگے ہو کر بیٹھا، کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا، حیرت سے رکا۔

”اس کی اس بات کا اور کیا مطلب؟“

”کیا تم سعدی کو نہیں جانتے؟ وہ بد تیزی نہیں کر رہا، وہ مجھ سے ملاقات کوٹال رہا ہے۔“

”مگر.... وہ کیوں نا لے گا؟“

”جب اس کو کوئی مخفی ثبوت ملے گا تو وہ سب سے پہلے میرے پاس آئے گا۔ صاف بات ہے اس سے میری فائلز نہیں کھلیں۔ بغیر ٹوٹ کے وہ میرا سامنا نہیں کرنا چاہے گا اور فائلز کو کھونے کے لیے اسے وقت چاہیے۔“

”اور اگر اس نے فائلز کھول لیں؟“

”نہیں کھلیں گی۔“ ہاشم نے اطمینان سے کہتے ہوئے وہ فائل اسٹینڈ پر کھے پنڈے پر ڈالی اور لیپ تاپ اپنے قریب کیا۔

”سعدی بھی بھی کمپیوٹر کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ میرے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈرائیو کو وہ اپنی کسی ڈیواس سے (access) Remotely ریموٹل ایکسس تو کر سکتا ہے، مگر فائلز پر لگتے لکھونے کے لیے وہ ایسے پروگرام استعمال کرے گا جو تالا توڑنیں سکتے، مگر اس میں باری باری ہزاروں چاپیاں لگا کر دیکھتے ہیں کہ شاید کوئی چاپی لگ جائے۔ اور جب آدھے سفر میں بھی تالا نہیں کھلتا تو فرسریش کا شکار غص زور سے چاپی گھما تاہے اور اس کے بعد پتا ہے کیا ہوتا ہے شیر؟“ وہ ہلاکا سماں کرایا۔ ”غلط چاپی تالے میں ٹوٹ جاتی ہے۔ اور نوئی ہاپی والا لاک پھر صحیح چاپی سے کھلنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اور اگر تمہاری گلستان سعدی ختم ہو پہچلی ہے تو میں کام کروں؟“

شیر و مانتھے پر بل لیے اٹھا۔ میز پر دھرا پناہ مہال بھی اٹھایا۔ ادھر اس نے اپنے موبائل کو دیکھا، ادھر ہاشم نے اس کی نگاہوں کو۔ پھر ہاشم نے سمجھی گی سے فون اسے پکڑا۔ ہاشم نے اسکرین کو چند فتح دبايا۔ ”یہ سعدی کا نمبر ہے۔“ اسکرین شیر کو دکھائی اور فون پھر اپنے سامنے کر لیا۔ ”اوہ یہ ہو گیا سعدی کا نمبر ڈیلیٹ۔“ دوبارہ اسکرین لہرائی۔ نوشیر وال کامنہ کھل گیا۔

”بھائی... مگر۔“

”تم میری اسٹڈی سے نکل کر اسے کال کرنے اور اس پر غصہ کرنے کا سوچ رہے تھے؟“ بالکل بھی انکار مت کرنا۔ اور مجھے معلوم ہے تم اس کا نمبر کہیں سے دوبارہ بھی لے سکتے ہو۔ مگر میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر تم نے سعدی کو چھیڑ کر میرے لیے کوئی مصیبت کمری کی تو میں تمہارے ساتھ کتنی تختی سے پیش آ سکتا ہوں۔“ اس کا فون اپنی دراز میں ڈالتے ہوئے وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا۔ شیر نے خفیل سے اسے دیکھا۔ پھر اوکے کہہ کر مڑ گیا۔

”اور ناشتے کے لیے جاتے ہوئے فیونا سے کہہ دینا کہ آج کے سارے کھانے تمہیں تمہارے کمرے میں پہنچائے۔ کیونکہ آج کے دن تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے۔“ وہ کوئی دوسرا کتاب کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شیر وہ کابا سا پلٹنا۔

”میں پہچس سال کا ہوں بھائی!“ اس نے احتجاجا دبادبا سا کہا۔

”اور میں سینتیس کا۔ کیا مجھے دوبارہ دہرانے کی ضرورت ہے کہ تم آج کے لیے (grounded) گراواؤ نہ ہو؟“ ابروالٹھا کر ایک نگاہ اس پر ڈالتے ہاشم نے پوچھا۔ شیر کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”سوری بھائی! میں اسے اپروچ نہیں کروں گا۔“

اور میں اس بات پر کل صبح یقین کروں گا۔ فیونا سے کہہ میرا ناشتے یہیں پہنچا دے۔ میں آفس دیر سے جاؤں گا۔“

شیر نے منہ بنا کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی ہاشم نے بند دروازے کو دیکھا اور ہلاکا سماں کر سر جھکا۔

”یہ کب بڑا ہو گا؟“

وہ پس کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ لمحے بھر کر کا۔ چہرہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسٹڈی کے ریکس، سکتا ہیں، لیپس۔ ایک یہب سے نو سلیجن جانے ہاشم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ کتاب پرے کر کے اس نے پچھے یہک لگائی اور قلم ہاتھوں میں گھاٹتے ان درود یوار کو

دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔

پھر اس نے اپنا موبائل نکالا اور جیسے ریت میں دباؤ کوئی گم گشیہ صندوق ڈھونڈ رہا ہو سعدی کا نمبر تلاش کیا۔ فون کان سے لگا کروہ گھنٹی جاتے سنتا رہا۔

”جی ہاشم بھائی؟“ وہ آج بھی اس کی کال ریجیکٹ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاشم کے لبوں پر مسکراہٹ در آئی۔

”تم نے آنے سے انکار کیوں کر دیا؟“ وہ دوستانتہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”آج آفس دوبارہ اسٹارٹ کیا ہے تو ابھی نکلنا مشکل ہو گا۔“

”تم چاہو تو میں تمہارے آفس آ جاتا ہوں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”آپ مجھ سے کیوں ملنے چاہتے ہیں ہاشم بھائی؟“

”کیونکہ مجھے لگتا ہے تم بدل گئے ہو۔“

”وقت بدل گیا ہے۔“ وہ مقاطسا بول رہا تھا۔ ہاشم نے دو انگلوں سے آنکھیں مسلیں۔ ناک کی ہڈی کو چکنی میں لیا۔ پھر گہری سانس لی۔

”وقت بھی وہی ہے میں بھی وہی ہوں اور تم بھی.... شاید ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی آگئی ہے۔ میں وہ دور کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔“ اسے تو یقین تھا۔ ہاشم خاموش ہو گیا۔ چند لمحے استڑی کی خاموشی ان دونوں کو بولنے پر مجرور کرتی

رہی، مگر دونوں چپ رہے۔

”سعدی! کیا ہم واپس جاسکتے ہیں؟ اچھے وقت میں واپس؟ جب ہمارے درمیان یہ ذمہ داری با میں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ تم رات

کے ایک بجی میری ایک کال پر چلے آتے تھے۔ جب تم مجھے ہاشم بھائی کہا کرتے تھے تو دل سے کہتے تھے۔ کیا کوئی راستہ بچا ہے سعدی؟“

”شاید نہیں۔“

ہاشم نے موبائل بند کر کے میز پر ڈال دیا۔ استڑی کے درود یوار پھر سے بولنے لگے۔ اس کی ساعتوں میں اچھے وقت کی بازگشت سنائی دیئے گئی۔ بمشکل ان سب کوڑہن سے جھکلتا ہاشم سیدھا ہوا اور کتاب پھر سے گھول لی۔

دوسری طرف اپنے آفس میں لیپ ٹاپ کے سامنے سوچ میں گم بیٹھا سعدی ابھی تک موبائل کو تک رہا تھا۔ پھر وہ بھی ہر چیز کوڑہن

سے جھکلتا سیدھا ہوا اور لیپ ٹاپ قریب کیا۔ گردن اوپنی کر کے آگے پیچھے کا جائزہ بھی لے لیا اور پھر اپنا پروگرام دیکھا جو ابھی تک چل رہا تھا۔

ناکامی درنا کامی۔ اسے شدید فرثہ شیش ہوئی۔ مضطرب سے انداز میں چند ایک کیز دبائیں۔ پروگرام سے ایک ساتھ دو تین کام کروانے کی کوشش کی اور.... اور.... اسکرین پر جلتا بھتناشان جگہ گانے لگا۔ اس نے دوبارہ چھیڑ پھاڑ کی اور.... پروگرام کر پٹ ہو گیا۔

پارٹی کی ساری محنت ضائع چلی گئی۔ چابی لاک میں ٹوٹ گئی تھی۔ سب بر باد ہو گیا۔

فالنڈر ڈیج ہو چکی تھیں اور اب کوئی بھی چیز ان کو روپیں کر سکتی تھی۔

اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ واقعی کمپیوٹر کے ساتھ اچھانہ تھا۔ اور وہ بغیر ثبوت کے کسی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔

اب وہ کیا کرے؟ اس نے سر اٹھا کر اپنے آفس کو جنی نظروں سے پھیکی پڑتی رنگت کے ساتھ دیکھا۔ دوبارہ سے ہاشم کا کمپیوٹر...؟

نمکن۔ اب تو ہاشم اس کو اپنے قریب بھی نہ پھکنے دے۔

”اور ایک وقت تھا جب.....“ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اچھے وقت کی ساری کہانیاں فضا میں آج بھی ان مست روشنائی سے لکھی تھیں۔

## سات سال پہلے

عشرت رفتہ کو آواز دیا کرتی ہیں ..... ہر نئے لمحے کی دلیل پر جا کر یادیں کافٹریکٹ لاء کی کلاس میں مخصوص خاموشی تھی۔ باہر اتنی شام کی سرسر اہٹوں میں اندر کاغذ پر قلم ٹھینے کی آواز مغم ہو رہی تھی۔ تمام طلباء نور سے سنتے یا سننے کی ادا کاری کرتے یکچھ کی جانب متوجہ تھے جو یکچھ کا اختتام کرتے ہوئے حسب عادت کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے میری اتنی لمبی تقریباً پ میں سے بہت سوں کی سمجھ میں آگئی ہو گی۔ اور اگر میرا خیال درست ہے تو چند ایک کی سمجھ میں نہیں بھی آئی ہو گی۔ اس لیے وہ چند ایک ابھی یا امتحانات سے قبل میرے پاس فارغ وقت میں آ کر اپنی کنفیوژن لیکر کر لیں۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اپنے رزلٹ کی خرابی کی تمام ترمذ مداری صرف آپ کے کندھوں پر ہو گی۔ راست؟“

زمی سے مسکرا کر ہتھی زمر یوسف کی آنکھیں پوری کلاس پر مرکوز تھیں۔ اور اس زمی میں بھی رعب پہنماں تھا۔ آدھے کچھ میں بندھے ممنون یا لے بال، شفاف جلد تاک میں سونے کی بالی کی طرح نتھ اور ہاں ابھی آنکھوں کے گرد ایک دو جھریاں بھی نہیں پڑی تھیں۔ چند ایک طلبہ و طالبات نے ہاتھ بلند کیے۔ کنفیوژن لیکر کی۔ وہ تھل سے جواب دیتی رہی اور ایسا کرتے ہوئے اس کی نگاہ ہاں کے ایک ایک چہرے سے گزرتی اس اجنبی شناساکے چہرے پہنھری گئی۔ لوگوں پر مہمی مسکراہٹ والا وہ شخص اس الینگ کلاس میں چار روز سے آ رہا تھا اور ہر دفعا سے دیکھ کر لا شعور میں کوئی احساس جاگزیں ہوتا جیسے وہ اسے نہیں دیکھ چکلی ہے۔ مگر وہ شعور اس چہرے کو کسی نام کے ساتھ فٹ لیں کر پا رہا تھا، سودہ نظر انداز کر کے کلاس برخاست کرنے لگی۔ اسٹوڈنٹس کیے بعد دیگرے اٹھ کر جانے لگے۔ زمر نے میز سے اپنی چیزوں میٹیں۔ ان کو ترتیب سے بیگ کے مختلف خانوں میں رکھا۔ نفاست سے فال اور کتابیں جوڑیں۔ بیگ کندھے سے لٹکایا اور سر اٹھایا تو وہ شخص سامنے کھڑا تھا۔

”کہیے میں آپ کی کیا مد کر سکتی ہوں؟“ وہ سر جھکا کر بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔ میرز کی چمکتی سطح میں اس کا عکس دکھائی اے رہا تھا۔ لباصوڑا کافی اسارت اٹھائیں انسیں سال کے لگ بھگ، ہلکی آنکھوں اور چھوٹے کٹے بالوں والا وہ شخص ....

”میں کروں آپ کی مدد؟“ اس نے زمی سے کہا مگر لا پرواہی کا عنصر غالب تھا۔ زمر نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔

”سوری؟“

”میں ماں لیگریت ہو کر ادھر آیا ہوں۔“ انگلی سے کان کی لو مسلتا وہ ادھر ادھر دیکھتا کہہ رہا تھا۔ اس کا انداز غصہ نہیں دلاتا تھا۔ ورنہ کوئی اپنے بات کرتا تو شاید اس کے سر پر لگ جاتی۔

”تو؟“

”تو چار دن سے آپ مجھے دیکھ کر ذرا...“ (ہاتھ سے اشارہ کیا) ”ذر کنفیوژن ڈیں۔ یونو vu dejavu فیلنگ۔“

زمر نے بمشکل تجھ چھپایا۔ ”آئی ایم سوری، مجھے یاد نہیں اگر ہم پہلے پچھے ہیں۔ ابھی تک میرے رجڑ میں آپ کا نام بھی نہیں لکھا۔“

”شاید کئی سال پہلے، اب تو یاد بھی نہیں....“ پھر ذرا سے شانے اچکائے۔ زمر ہنویں سکوڑے اس کو دیکھتی رہی تو وہ ذرا سامسکرایا۔

”میں فارس غازی ہوں۔ سعدی کاماموں!“

زمر کے بھیخے بروڈھیلے پڑے۔ لب ”اوہ“ میں سکڑے۔ چہرے پر پہلے حرمت اور پھر شرمندگی اکھری۔ ”اوہ.... آئی ایم سوری....“ میں نے واقعی نہیں پہچانا۔ میں شاید آپ سے مل بھی نہیں کہی۔ مگر آپ کو کیسے پتا میں سعدی کی.....؟“

”سکپل!“ اس نے کندھے جھکلے۔ ”سعدی نے بتایا تھا کہ آپ شام میں ادھر پڑھاتی ہیں اور صبح سعود را ناکے چیبہر میں ہوتی ہیں۔“

”اوہ... مگر اس نے مجھے نہیں بتایا۔ میرا مطلب ہے آپ سعدی کے وہی ماموں ہیں ناجو...“ وہ گز بڑا کر کی۔

”جی وہی جو سوتیلا ہے۔“ وہ پھر ذرا سما مسکرایا۔ زمر کے رخسار گلابی ہوئے۔

”نہیں، میرا مطلب تھا وہ جو آئی بی (انٹیلی جنس) میں ہوتے ہیں اور کہیں سندھ وغیرہ میں پوسٹ ہتھی۔ کیونکہ سعدی کے نیب والے ماموں سے تو اکثر ملاقات ہو جاتی ہے۔“

”جی میں کئی سال سے ادھر تھا۔ اسی ہفتے آیا ہوں۔“

کلاس قریباً خالی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ راہداری میں ایک ستون کے ساتھ کھڑے ہو کر زمر نے اس کی طرف رخ کرتے پوچھا۔

”تو آپ میری کلاس میں کیسے؟ ڈونٹ ٹیل می ہماری کلاس میں آپ کسی کی جاسوی و اسوسی کرنے آئے ہیں۔“  
اس بات پر فارس نہ سپڑا۔ پھر فری میں سر ہلا یا۔

”میں جاسوں نہیں ہوں۔ جاسوں کا ڈپارٹمنٹ الگ ہوتا ہے۔ میں یوں ہوں جیسے پولیس آفیسرز ہوتے ہیں۔ ہم مختلف کیسز پر کام کرتے ہیں۔ ہاں ادھر پڑھنے آیا ہوں میں۔“ وہ گردن ذرا جھکا کر عادتاً ناخن سے کان گڑھتا کہہ رہا تھا۔ ساتھ میں شاید وہ چیو گم بھی چبا رہا تھا۔

”تو کیا نوکری چھوڑ دی؟“

”نوکری کے لیے تو پڑھ رہا ہوں۔ پہلے زیادہ پڑھوڑھ نہیں سکا تھا۔ چھوٹی پوسٹ پر بھرتی ہوا تھا۔ اب ترقی تو ملتی رہی ہے مگر لاکی ڈگری ہمارے لیے بہت اچھی ہوتی ہے۔ ترقی کے چانسز بڑھتے ہیں۔“ پھر رک کر زمر کا چہرہ جیسے جانچا۔ ”کیا آپ کے والد نے نہیں بتایا کہ کس طرح وہ نوکری اور نوکری سے پہلے میری مدد کرتے رہے تھے؟“

”آ... نہیں بالکل نہیں۔ میرے اردوگرد کے لوگوں کو خاموش تھوڑی کی عادت ہے شاید۔“ زمر نے مسکرا کر گھری سانس لی۔

”برے و تتوں میں انہوں نے قرض دیا مجھے، احسان تھا ان کا۔“

”ان تینیک بھجے یاد آ رہا ہے۔ سعدی کے سوتیلے سوری چھوٹے ماموں، آپ کی ای تو کافی ویل آفسی تھیں۔ مجھے باقی آپ کا نیمیلی ٹری بالکل یاد نہیں۔ یہ بھی ندرت بھابی نے شاید بھی ذکر کیا تھا۔“

”جی! اور نگز یہ کاردار... میرے ماموں۔ وہ ویل آفس ہیں، میری ای نہیں۔ کچھ نہیں چھوڑا میرے لیے سوائے نصیحتوں کے۔“  
پھر سے بے نیازی سے شانے اپنکا کر کھسا۔ زمر بھی ساتھ ہی شش دی۔ پھر اس نے کلائی پر بندگی گھڑی دیکھی۔

”اوے کے فارس! اچھا گا آپ سے مل کر۔ آپ کو پڑھائی یا یونیورسٹی میں کسی بھی قسم کی مدد چاہیے ہو تو آپ مجھے ہمیشہ اپر وچ کر سکتے ہیں۔ اب تو ملاقات ہوتی رہے گی۔“ وہ اب رخصت چاہ رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے کوہاٹی فارس نے نجلت میں پکارا۔

”کیا آپ ہاشم کی شادی میں آئیں گی؟“ زمر جاتے جاتے واپس ہوئی۔ ناکبھی سے ابرداشتھے۔ ”سوری کون ہاشم؟“

”اوہ کیا ندرت آپا نہیں بتایا؟ میرا کزن ہاشم۔ اس کی اگلے ہفتے شادی ہے۔ انہوں نے سعدی لوگوں کی پوری نیمیلی کو بلا یا ہے۔ آپ سمیت۔“

زمر نے چند لمحے سوچا، پھر کندھے اپنکا دیے۔ ”میں بالکل بھی نہیں جانتی آپ کے کزن کو۔ لیکن اگر وہ بلا کمیں گے تو دیکھیں گے۔“

فارس نے سر ہلا کر گویا جانے کی اجازت دے دی۔ وہ ایک الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ مڑ گئی۔

فارس وہاں کھڑا تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ راہداری کے دوسرے سرے پکم نہ ہو گئی۔ پھر ایک دم چونکا اور خفیف سا ہوا

کسر جھنگا۔

”وہ خوبصورت تو نہیں تھی پھر بھی اچھی کیوں لگ رہی تھی؟ سعدی کی پھر پھوٹھی، اس لیے شاید۔“ وہ خود کو مطمئن کرتا ہاں سے پلٹ گیا۔

.....♦♦♦.....

خدا ہے محبت، محبت خدا ہے  
مرحوم ذوالقدر یوسف کے گھر میں باتوں کا شورائی وی کی آواز اور رات کے کھانے کی مہک ہر سوچیلی تھی۔ لاونچ کے قھری سیڑھوں کے ایک کنارے پہنچی زمر دمرے سرے پر موجود دمرت سے کھرائی تھی۔

”آپ مجھے بتا ہی دیتیں کہ آپ کا بھائی آرہا ہے۔ میں مائیگریشن اور دوسراے کاغذی معاملات میں اس کی مدد ہی کر دیتی۔ بہت مشکل ہوئی ہو گی اسے تو۔“

”بس اس کی اچانک پوسٹنگ ہوئی۔ ادھر آیا اور گھر کھولا۔ وہیں اپنے اور نگریب ماموں کی ایکسی میں رہتا ہے۔ وہ اس کی ماں کے ہمے میں تھی نا۔“

”آپ ذکر ہی کر دیتیں۔ اور تم تو ادھر آؤ ذرا۔ میر اسارا بائیوڈیٹا اپنے ماموں کو دے دیا اور مجھے آگاہ بھی نہیں کیا۔ کتنی شرمندگی ہوتی ہے اگر میں اس کو ڈانت دیتی۔“ کمرے سے نکلتے سعدی کو خفی سے پکارا۔ وہ سب کھارہاتھا۔ کھاتے کھاتے کندھے ذرا سے اچکائے اور مسکراتا ہوا سامنے کشنا پہ آبیٹھا۔

”سوری میں بھول گیا۔“

”اور ہاں اس نے کسی کزن کی شادی کا بھی ذکر کیا تھا۔“ زمر نے یاد کرتے ہوئے ندرت کو دیکھا۔ انہوں نے سر ہلا کیا۔ ”ہاں ہاشم کی شادی ہے اگلے ہفت۔“

”کون ہاشم؟“ سعدی نے سب پر دامت گاڑتے رک کر پوچھا۔

”فارس کے ماموں کا بڑا بیٹا ہے۔ تم لوگوں نہیں جانتے۔ میں نے بھی عرصہ پہلے دیکھا تھا۔ اصل میں زمر، فارس ادھر ہوتا جو نہیں تھا۔“ اس سے جڑے بہت سے لوگوں سے بچوں کا تعارف نہیں ہے۔ خیراب تو وہ آگیا ہے تو اس کی وجہ سے وہ ہمیں بھی بلا کیں گے۔“  
ندرت بات کرتے ہوئے مسلسل چھ سالہ سیم کے ہاتھ پکڑ کر اس کو میز کی چیزوں اٹھانے سے روک رہی تھیں۔ اور وہ عادتاً ہر شے الہا کر پھیکنا چاہتا تھا۔

”اس پر نظر کھو میں ذرا روثی اتار لوں۔ کھانا کھا کر جانا زمر!“ سعدی اور اسے ایک ساتھ مخاطب کرتے وہ انھیں تو زمر نے کلائی پہ  
لہمی گھری دیکھی۔

”اوہو۔ امی منتظر ہوں گی۔ دری ہو جائے گی۔ ویسے پکا کیا ہے؟“

”مژتیکہ۔“ ندرت بھی مسکرا کیں اور سعدی بھی۔

”اب پر گئیں نا پھر پھوسوچ میں۔“

”سوچنے والی بات ہی نہیں ہے۔ مجھے جلدی جانا ہے تو یہاں کھا نہیں سکتی، مگر پیک تو کرو سکتی ہوں۔“

ندرت مسکراتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئیں تو وہ سعدی کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”اس کا لارشپ کے لیے ناموں کا اعلان ہو گیا؟“  
”اونہوں۔ مگر اسی بختے ہونا ہے۔“ پھر وہ ذرا مایوس ہوا۔ ”مجھے نہیں لگتا مجھے اس کا لارشپ ملے گا۔ میں تو نارمل سا استوڈنٹ ہوں۔ مجھے

سے بہتر امیدوار ہوں گے وہاں۔“

”مگر مجھے یقین ہے کہ تمہیں اسکا رشپ مل جائے گا۔“

سعدی کا چہرہ امید سے چکا۔ ”اچھا، آپ کو کیسے یقین ہے؟“

”یہ یقین ہے ریاضی کا سوال نہیں جو اس کی کوئی لا جگ بھی ہو۔ بس ہے تو ہے۔“ اس نے ذرا سے کندھے اچکائے۔

”چلیں سب نام لکھوائیں۔ ہم پارٹی کر رہے ہیں۔“

اندر سے تیرہ سالہ خین بولتی ہوئی آئی۔ اس کے ماتھے پکٹے ہوئے بال گرے تھے ناک پر چشمہ تھا اور لبou پر شرگیں مسکراہٹ

جو صرف زمر کو دیکھ کر آتی تھی۔ زمر بھی اسے دیکھ کر مسکراہٹی خین نے ایک فہرست سامنے رکھی اور ہاتھ میں چین پکڑے بہت سمجھداری سے اعلان کیا۔

”سووار کی شام تم پارٹی کریں گے۔ میں وہی بھلے لاوں گی اور سیم! تم بر گرز لاوے گے۔“ تھکم سے سیم سے کہا۔ وہ جلدی سر

اثبات میں بلانے لگا۔ (سیم کی چیز ہمیشہ ای لاتی تھیں)

”اور پچھوآپ؟“ زمر کو دیکھ کر پوچھتے اس کی آنکھوں میں وہی شرگیں مسکان پھر سے جھملانے لگی۔

”میں لزانیہ لاوں گی۔“

”اور ای آپ؟“ خین نے زور سے آواز دی۔ کچن سے آواز واپس آئی۔ ”میں فروٹ چاٹ لاوں گی۔“

اب سب نے سوالیہ نظروں سے سعدی کو دیکھا تو وہ ایک گال کھجاتا ہوا بولا۔ ”میں برتن لاوں گا۔“

خین نے ہننوں ناراضی سے بھنجیں۔ فوراً پچھوکو کپکارا۔ ”پچھو! بھائی کو نہیں کہ یہ سمو سے لائیں گے۔“

”اتنا کچھ تو ہے۔ پہلے تم وہ تو کھاؤ کوٹو۔“

”کوئی بہانہ نہیں سعدی، تم سمو سے لاوے گے۔“ زمر نے مسکراہٹ دبا کر اسے تنبیہ کی۔ وہ منہ میں کچھ بڑا کسر جھٹک کر رہ گیا۔

خین کے ناراض تاثرات نارمل ہوئے۔ اس نے بڑے جوش سے سعدی کا نام است میں لکھ لیا۔ پھر باری باری سب سے سائنس کروائے۔ تب ہی ای بے پکار اتوہ پچھوکا بایکس لینے کچن میں بھاگی۔ زمر نے پانی مانگا تو سعدی بھی پیچھے ہی گیا۔

زمر نے پس سے سن گلاسز نکالے اور آہستہ سے صوفے کے نیچے کارپٹ پر رکھ دیے۔ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

ندرت ڈبائے آئیں تو وہ سب اسے چھوڑنے دروازے تک آئے۔ خین فوراً واپس آ کر لاؤخ کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھنے لگی۔

زمر اور سعدی کار کے پاس کھڑے تھے۔ زمر اندر بیٹھنے لگی؛ پھر کسی احساس کے تحت بیگ کھولا۔ ادھر ادھر دیکھا۔

خین چوکی، پھر فوراً صوفے تک آئی۔ چیزیں ادھر ادھر کیں، اور نیچے دیکھا۔ گلاسز نیچے گرے پڑے تھے۔

”اوہ پچھو پھر کچھ بھول گئیں۔“ فتحانہ غوشی سے کہتی وہ عینک اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگی۔ زمر واپس آ رہی تھی۔ ادھر اس نے

دروازہ کھولا، ادھر خین نے شریملی مسکراہٹ کے ساتھ گلاسز والا ہاتھ بڑھایا۔

”میں شاید اپنے گلا... اوہ...“ زمر کا سوال تکمیل بھی نہ ہوا تھا کہ خین کو دیکھ کر لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے عینک پکڑی اور

ہولے سے حنہ کا گال تھپتھیا۔

”میری زندگی میں ہونے کے لیے شکر یہ جدے۔“ اب کے وہ گئی تو خین واپس صوفے پر آیتھی۔ اسے دوبارہ کھڑکی میں نہیں کھڑے

ہونا تھا۔ کیونکہ زمر بھول صرف ایک دفعہ کرتی تھی۔ خین امید صرف ایک دفعہ لگاتی تھی۔

اس نے میز سے لست اٹھائی تو فوراً سے مسکراہٹ اڑن چھو ہوئی۔ وہاں سعدی کے نام کے آگے لکھا سمو سے کاٹ کر برتن لکھا

تم۔ اور بھائی خود غائب تھا۔ حسین نے غصے سے چلانے کے لیے منہ کھولا، مگر پھر خود ہی، نہ پڑی اور برتن کو دوبارہ سو سے کر کے لا دخن کے لونے میں رکھی کمپیوٹر نیبل پا گئی۔ ادھر اس نے کمپیوٹر آن کیا، ادھر سیم ساتھ دالی کری پا بیٹھا۔ وہ گیم کھیلے گی تو وہ دیکھے گا۔ یہی دستور تھا، یہی معمول تھا۔

❖❖❖

ڈائرنگ نیبل پر کر لیے گوشت کے قریب مزتر قیمہ بھی ایک چھوٹے ڈوٹے میں رکھا تھا اور فرحانہ بیگم اس میں سے بچ جسے سالن الٹی کہہ رہی تھیں۔

”مرچیں ندرت ہمیشہ سے تیز ڈالتی ہے۔ اب اگر تمہیں دینا ہی تھا تو وہ سالن دیتی جس میں مسالہ کم ہو، مگر نہ ہجی۔“ سربراہی کری پر ہاجان بڑے ابراوٹی کا نوالہ توڑ رہے تھے۔ اور دا کیس ہاتھ بیٹھی زمر پانی کا گھونٹ بھر رہی تھی۔ دونوں نے نہیں سنایا۔

”اصل میں پتا ہوتا ہے نا اس کو کہ ہم دونوں بوڑھوں نے بھی کھانا ہے اور مرچیں ہمیں کتنا نقصان کریں گی۔“ اب کی بار یوسف فان نے نیفلی سے ان کو دیکھا۔

”بوڑھوں کی فہرست آپ خود تک مدد و در کیہے بیگم! میں ابھی اس میں شامل نہیں ہوا ہوں۔“

زمر نے مسکراتے ہوئے منہ میں موجود قلمہ چبایا اور پھر ان کو متوجہ کیا۔

”پتا ہے آج کل میری کلاس میں کون آ رہا ہے؟“ کہہ کر اس نے دوسرالقلمہ منہ میں رکھا اور لب بند کیے، بہت نفاست سے اسے ہائل رہی اور وہ دونوں اس کو دیکھتے رہے۔ جب نگل چکی تو بولی۔

”فارس غازی... ندرت بھابی کا سوتیلا بھائی جو نسلی جنس میں ہوتا ہے۔“

فرحانہ حیران ہوئیں، پھر مغلکوں۔

”تمہاری کلاس میں وہ کیا کر رہا ہے؟“

”ہاں زمر! اس نے مجھے بتایا تھا کہ ایل ایل بی کر رہا ہے۔ اس سے اس کو ترقی کے چانس زیادہ ملیں گے۔ یہ لڑکے بھی نا پڑھائی سے بھاگنے کے لیے فورس میں جاتے ہیں اور پھر وہاں پڑھتے بھی ہیں اور بھاگتے بھی ہیں۔“

”کیا ندرت نے ذکر کیا تھا پہلے؟“ ان کو نظر انداز کیے فرحانہ تیزی سے بولیں۔

”کیا ہوتا تو میں تبادلے میں اس کی مددی کروادیتی۔“ وہ سلا دکی پلیٹ اٹھا کر کانے سے کچھ کھیرے اپنی پلیٹ میں نکال رہی تھی۔

”اب تم زیادہ اچھی نہ بننا کہ اس کے سوتیل بھائی کو فیور دینے لگ جاؤ۔“

زمر نے گلاس سے گھونٹ بھرا۔ گیلے لب نیکپن سے ٹھپٹھپائے اور سراٹھا کرامی کو سجدیدگی سے دیکھا۔

”ای! ایک چیز ابھی سے کلیر کر لیتے ہیں۔ یونیورسٹی مجھے الینگ کلاسز لینے کا ایک معقول معاوضہ دیتی ہے اور اس معاوضے کو حلال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میں یونیورسٹی کے ساتھ کیے گئے اپنے معاہدے کو پورا کروں، جس کے تحت میں ہر اسٹوڈنٹ کی غیر مشروط مدد کرنے کی پابند ہوں۔ اور اس لیے میں ذاتی تھسب کی بنا پر نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہوں اور نہ ہی ذاتی تعلق کی بنیا پر غیر ضروری فائدہ دے سکتی ہیں۔ پھر چاہے بھابی کا بھائی ہو یا سلیم درزی کا بھائی، جو بھی میرے پاس مسئلہ لے کر آئے گا، مجھے اسے حل کرنا ہوگا۔“

بہت زمی اور رسان سے اس نے کہا مگر عام حالات میں تکلفتہ رہنے والی فرحانہ ندرت کے ذکر پر خاسی ہو کر برتن اٹھانے لگیں۔

”ہاں ہاں“ میں تو کہہ کر پھنس جاتی ہوں۔

”پھنس تو آپ اچھا کھانا بنا کر بھی جاتی ہیں۔ کیونکہ ہم پیچر ز شاید اگلے ماہ ون ڈش رکھیں تو اس میں بھی مجھے ایسا ہی کر لیے گوشت بنا

کر دیکھے گا۔ کیونکہ ماڈل کے ہاتھ کے کر ملے کچھی کڑوے نہیں ہوتے۔“

”باں تو برا کھانا بنایا ہے میں نے کبھی؟“ اب کے ناراضی مصنوعی تھی۔ ان کے جاتے ہی یوسف صاحب فوراً زمرکی طرف مزے۔

”فارس کا ہر طرح سے خال رکھنا۔ کوئی بھی ضرورت ہو تو اس کی مدد ضرور کرنا۔“

"حسا کے میں نے ابھی کہا، ملاض ورست کوئی قائمہ دولانگا نہ رے جو کوئی نقصان۔" وہ کہنے والا حکا کر کر تو تھہ کے نکال رہی تھی۔

"و سے آپ کا ذکر کر رہا تھا وہ،" سے سے کیسا کہا۔ "ے ابا جو نکے پیچ کو دیکھا، پھر اس کو۔

”چھلکو کا چھپا دتا میں ساک دوسرا کو چھلکھلا میں اور کھنکھونتے ہیں۔“

آئیں کہ لستمہ انہیں سے ہے تاکہ آنکھیں اس کو بخوبی کرے۔

”تم سے کس نکاہ؟“

”جب آخری دفعہ میں نے چیک کیا تھا تو میرے اوپر وہی تو اترتی نہیں تھی۔“ وہ بہت اطمینان سے نیپکن سے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ ”پھر کیا مدد کی تھی آب نے ان کی؟“

”تم...“ تملک کر پھر سے کچن کو دیکھا۔ ”تم میرے گھر کا ماحول خراب کرنے سے تھی ہو۔“

"اگر آپ کے منہ سے نکلنے والے اگلے الفاظ میرے سوال کے جواب کے علاوہ ہوئے تو میں یہی سوال تھوڑی دیر بعد گرامکم چائے کے ساتھ دہرا دوں گی۔" اب وہ ہتھیلی پر چہرہ نکالنے مسکرا کر ان کو دیکھ رہی تھی۔

"انتبا بھی نہیں کیا کچھ خاص، جتنا وہ یاد رکھتا ہے۔ وہ زیادہ پڑھنیں سکا تھا۔ مال نے تھوڑا بہت روپیہ پیسہ چھوڑا۔ اس سے چھوٹی عمر میں کار و بار کرنے کی کوشش کی تو سب ڈوب گیا۔ اور پر سے قرضہ بھی چڑھ گیا۔ اس کے ماموں کافی امیر آدمی ہیں مگر ان سے مانگتے اس کی ناک آڑے آئی تھی۔ اس لیے میں نے اس کی مدد کی تھی قرضہ اتارنے میں۔ اور پھر ابھنی میں نوکری کے لیے بھی تھوڑی بہت کوشش کی۔ حالانکہ وہ میراث پر سلیکٹ ہوا مگر اس کو بھی نیمرے کھاتے میں ڈال دیتا ہے۔ اب تو سارا قرضہ لوٹا بھی چکا ہے، پھر بھی بھولنا نہیں ہے۔"

”تو اچھی ماتے نا۔ زندگی بن گئی اس کی، اس لئے مادر رکھتا ہے۔“

وہ کہیاں میز پر نکائے اب پھر سے پانی پی رہی تھی۔ بڑے ابا نیپکن ہٹا کر اٹھے اور کونے میں لگے سنک کے اوپر کھڑے ہاتھ دھونے لگے۔ زمر گھونٹ گھونٹ پانی پتی مسکرا کر اپنے ابا کو دیکھتی رہی جو واقعی ابھی بوڑھوں اور معذوروں کی فہرست میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

دروازہ زور زور سے بجا۔ ایک دو تین۔ سعدی نے ”آرہا ہوں“ کہتے راہداری پار کی۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ نیل بھی بھی۔ ”اوہ“ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے فارس کھڑا تھا۔

نہار ماموں! میں کھول ہی رہا تھا۔ آب....، گڑ پڑا کروہ حس ہوا۔ فارس نے آنکھ سے اشارہ کیا اور بچھے مڑ کر کہا۔

یہ پڑھ کر کوئی بھی اپنے بچہ کا سارے بھروسے کر دے گا۔

لگارہی تحریر)۔ وہ ادا کے سر سے چاہئے۔

”اوی... یاموں کے... یاموں آئے ہیں... مطلب، افوه۔“

”کیا؟“ پہلے تو اسی کو سمجھنیں آیا اور جب آیا تو جلدی سے باہر آئیں۔ فارس راہداری سے ہوتا ہوا ان کو لا رہا تھا۔ گرے سوٹ میں ملبوس، باریک تراشیدہ سفید سرمنی مونچھوں والے کافی بارع، مگر بینڈسم آدمی تھے۔ انکھوں میں ایک سخت ساتاڑھنا، گردن میں سریا۔ اسی کے

ملا کامر کے فم سے جواب دیا۔ تنے ابرو کے ساتھ کڑوفر سے بڑے صوفے پہنچ پہنگ رکھ کر بیٹھے۔

”بہت اچھا لگا کہ آپ آئے۔“ امی اپنی ابتدائی بوکھلا ہٹ پہ قابو پاتی، کہتے ہوئے صوفے کے کشن بر ابر کر رہی تھیں۔ شکر کے لاؤخ صاف پر اتحا۔ پھر بھی نظر گھما کر دیکھا اور جب فارس پہنگاہِ مُہبّری تو ندرت نے ” بتایا کیوں نہیں؟“ والے انداز میں اسے گھورا، گروہ ذرا سے ٹانے اپکا کرنگل صوفے پہ جائیٹھا۔

” یہ میرا بیٹا ہے سعدی۔“ امی سامنے کھڑی تعارف کروئے لگیں۔ سعدی نے مسکرا کر سلام کیا۔ انہوں نے بنا مسکرائے مگر شانگل تے جواب دیا۔ وہ کشن لے کر کارپٹ پہ بیٹھ گیا۔ لاؤخ کے کونے میں کپیوں نیبل پیٹھی خین مسلسل کی بورڈ پر کچھ تائپ کر رہی تھی۔ ندرت نے لالہ مسکراتے ہوئے مگر گھور کر کہا۔

” حنہ! سلام کرو۔“ تو وہ ذرا سی مڑی سلام کیا اور واپس۔ اور نگزیب کاردار نے تو شاید سننا ہی نہیں۔ پر ٹکف سے بیٹھے تھے۔ ” آپ اعزت بخشی ہے،“ والا انداز۔

راہداری کا دروازہ پھر بجا۔ دھیما سا جیسے کسی نے انگلی کی پشت سے ناک کیا ہو۔ سعدی فوراً اٹھا تو کاردار صاحب یوں۔

” میرا بیٹا ہو گا۔ کال سننے رک گیا تھا۔“ سعدی راہداری میں آیا تو وہ ادھر کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے تائی اور ویسٹ بھی مکن رکھی تھی، بس کوٹ نہیں تھا۔ تائی پن، کف لنس، جوتے، ہرشے اپنی قیمت آپ بتاتی تھی اور اس سے زیادہ بیش قیمت اس کی مسکرا ہٹتھی۔ ” میں ہاشم ہوں، ہاشم کاردار۔ میرے ذیم غلبًا اندر ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اپنا سیت سے بولتا تھا۔ سعدی جلدی سے اس تک آیا۔ ” جی، وہ اندر ہیں۔ میں سعدی یوسف ہوں۔“ اس نے بھی مسکرا کر بتایا۔ اندر آنے کا راستہ دیا۔

ہاشم ندرت سے بھی اسی مسکرا ہٹ کے ساتھ ملا۔ پھر اپنے باپ کے ساتھ صوفے کے دوسرے سرے پہ جائیٹھا۔ سعدی کو محسوس ہوا گا، وہ بہیشہ اپنی گہری آنکھوں سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے مسکراتے رہنے کا عادی تھا۔ جو بھی تھا، وہ اسے اچھا لگا تھا۔

” ہاشم کی شادی ہے اگلے ہفتے۔ ویسہ کا کارڈ مل گیا آپ کو؟“ اسی سخیدگی سے اور نگزیب کاردار نے ندرت کو مطابق کیا۔ وہ سامنے ٹھیک ہی مل صوفے پہنچی تھیں اور ہلانے لگیں۔

” جی، جی، ہم ضرور آئیں گے۔“ (حالانکہ اس سے پہلے آنے کا ارادہ نہ تھا)

” ہاشم اور میں آفس سے نکلے تھے تو فارس مل گیا۔“ ہاتھ سے ذرا سا اشارہ کیا اس کی طرف جو بے نیاز سا دوسرے ٹنگل صوفے پہ آہما موبائل پر کچھ کر رہا تھا۔ تو سوچا اس کے رشتہ داروں کو ذاتی طور پر مدعا کر دیں۔ باقی آپ کے دوسرے رشتہ دار....“ نظر بھر کر ہاشم کو ایسا۔ ” وہ سب ہاشم سنبھال لے گا۔“ ہاشم نے اثبات میں سر کو ختم دیا۔ اب اور نگزیب کاردار کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے خاموش بیٹھے تھے۔ ۱۰۰ مال ان کی مہربانی تھی کہ وہ چلے آئے۔ ورنہ مزاج کے تو وہ اسی طرح سخت اور غصہ و مشہور تھے، ندرت نے سوچا۔

خاموشی کا وقفہ ذرا بڑھا تو ہاشم نے دوستانہ انداز میں کارپٹ پر کشن کے سہارے بیٹھا اٹھا رہ سالاہ سعدی کو مطابق کیا۔

” کیا پڑھ رہے ہو تم؟“

” یونیورسٹی آف لیڈز میں کمکل انجینئرنگ کے لیے اپلائی کیا ہے مگر بھی اسکا لرشپ کا حصہ فیصلہ نہیں آیا۔“

” تو کتنی امید ہے کہ انجینئرنگ بن جاؤ گے؟“

سعدی ذرا جھینپ کرہنسا۔ ” میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

” پھر بھی، گھر میں ایک بچہ ایسا ہوتا ہے جس کے بارے میں ماں باپ کو بچپن سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ سب سنبھال سکتا ہے۔ (مسکرا کر) اپ کو دیکھا اور ندرت کی طرف متوجہ ہوا وہ جو ضرور کسی قابل بن جائے گا۔ تو آپ کے بچوں میں سے ایسا کون ہے؟“

پھر سعدی کو دیکھا۔

”کیا وہ تم ہو؟“

”ہم تینوں میں سے بھی ایک کا سب کو پتا ہے کہ اس نے انجینئر ضرور بنتا ہے۔ باقیوں کا کوئی پتا نہیں۔ اور وہ ایک میں نہیں ہوں بالکل بھی۔“

ہاشم نے شاید اس جواب کی توقع نہیں کی تھی تبھی تجب سے ابر و سوالیہ اٹھائی۔  
”تو؟“

کمپیوٹر چیز رکھوں۔ ماتھے پر کئے بالوں والی لڑکی سامنے ہوئی اور ہاشم کو دیکھتے ہوئے سخیدگی سے بولی۔ ”وہ میں ہوں، حسین ذوالفقار یوسف خان۔“

(عرف حد، عرف کٹو یگم) سعدی اتنا آہستہ بڑا بڑا کہ اپنے سوا کسی کو آوازنہیں آئی۔

”ہوں.... گلڈ!“ ہاشم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ بے نیازی سے واپس گھوم گئی۔

”حسین تو انجینئر بن، ہی جائے گی۔ یہ سارہ خالہ کی طرح پڑھائی میں بہت اچھی ہے۔“

”کیا.... فارس کی کوئی اور بہن بھی ہے؟“

اور انگریز یہب کاردار نے چونک کرفارس کو دیکھا۔ وہ موبائل سے نظریں ہٹائے بغیر ہاتھ مسلسل چلاتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔ وہ وارث کی بیوی ہے۔ اصل میں سارہ میری فرست کزن بھی ہے، تو بچے بچپن سے خالہ بولتے ہیں۔ بعد میں اس کی شادی میرے بھائی سے ہو گئی تو ان کی ممانی بھی بن گئی۔“ ندرت نے تفصیل سے بتایا۔ مگر سعدی کو اس نا مکمل تعارف پر بے چینی ہوئی۔

”وہ یوکے گئی ہیں پی ایچ ڈی کرنے۔ اور وہ پراس ک ڈیزائن میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔“ ہاشم نے مسکرا کر سر ہلا کیا۔ اور انگریز یہب پھر سے گھٹری کو دیکھنے لگے۔ سعدی کو لاگا کوئی متراث نہیں ہوا۔ اس نے ہاشم سے پوچھا۔

”آپ نے کہاں سے پڑھا ہے؟“

”اٹھین فورڈ سے۔ میں لا یئر ہوں۔“

سعدی کے لب ”اوہ“ میں سکڑے۔ ”تو آپ وکیل ہیں۔ میری پچھوٹھی وکیل ہیں۔“

”انہوں نے کہاں سے پڑھا ہے؟“ وہ اسی نزم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

”یہیں پاکستان سے۔“ سعدی کے لبھ میں فخر تھا۔

ندرت چائے کے لیے اٹھیں تو اور انگریز منع کرنے لگے۔ ان کو جانے کی عجلت تھی۔ ان کا وقت بے حد قیمتی تھا۔ مگر ندرت ہمہ اصرار چلی ہی گئیں۔

”تم میرے ساتھ رووف کی طرف آؤ گے؟“ انہوں نے ہاشم کو مخاطب کیا۔

”بھی۔ مگر میں وہاں سے جلدی اٹھ جاؤں گا۔ شہری نے کوئی نئی مودوی لی تھی۔ ہمارا ساتھ دیکھنے کا پروگرام تھا۔“ اور انگریز صاحب نے ہوں میں سر کو خم دیا۔ ایک دفعہ پھر گھٹری دیکھی۔ اس سے پہلے کہ وہ فارس سے کہتے کہ اپنی بہن کو غضول کی خاطر داری سے منع کرے، کہا چیز کے پیسے گھوئے۔ حسین سامنے ہوئی۔

”کون سی مودوی دیکھنے جا رہے ہیں آپ؟“ ہاشم نے بے اختیار اسے دیکھا۔

”ایک نئی امریکی مودوی آئی ہے۔“

”آپ نام بتائیں میں نے دیکھ رکھی ہوگی۔“

”یہ... وہ متذبذب ہوا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے رسلیز ہوئی ہے۔ بورن اٹھی میٹم۔“

”اوہ... بورن سیریز۔“ حین نے منہ بنایا۔ ”اس کا صرف پہلا پارٹ اچھا تھا۔ مگر یہ والا پارٹ کافی ڈریگ کیا گیا ہے۔ بورن آئی Identity Bourne والی بات نہیں ہے اس میں۔“

ہاشم نے مسکراتے ہوئے تیکھی نظر دوں سے اسے دیکھا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم بورن سیریز کے نالہ کی بات نہیں کر رہیں؟“

”آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں ہال پڑھ کر ظاہر کر رہی ہوں کہ میں نے موہی بھی دیکھ رکھی ہے؟ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ سیریز ان ناولز پر صرف Loosely Based ہے۔ اور جب آپ یہ نیا پارٹ دیکھیں اور اکثر جگہوں پر کسراہ بڑی طرح ہلتا ہو اس جھوں ہو اور لگے جیسے کسراہ میں کو رعشہ لاحق ہے تو جان لجیج گا کہ آپ سے پہلے یہ فلم دیکھنے والی حین یوسف سعی کہہ رہی تھی اور میں اس فلم کو مزید سکس کرتی، لیکن مجھے اس طرح کی فلمیں زیادہ پسند نہیں۔ سوبات ختم!“

ہاشم نے صرف مسکرا کر سر ہلا�ا مگر اور نگزیب کاردار آنکھیں سکیڑ کر اس کو دیکھنے لگے تھے۔

”تو تمہیں کس طرح کی فلمیں پسند ہیں؟“ وہ ابھی بھی پر تکلف اور سداواز میں پوچھ رہے تھے مگر توجہ پوری اس کی طرف تھی۔

حدی نے گھری سانس لے کر سر جھٹکا، جیسے کوٹوں سنتے کی تاب اس میں نہیں تھی۔ حین نے لاپرواں سے شانے اچکائے۔

”فلم کا اچھا ہونے کے لیے کسی خاص طرح کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پلاٹ اور کرداروں کا اچھا ہونا چاہیے۔ اور کسی بھی کہانی کے اپماہوںے کا مطلب حقیقت سے قریب ہونا نہیں کنوینٹ ہونا ہے۔ مجھے ایسی امر کی فلمیں نہیں پسند جن میں ہیر و مار کا کہا کر بھی نہیں مرتا۔ مگر اسی ہارڈ مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے ہار فلمیں بھی سخت ناپسند ہیں مگر ”دی رنگ“ بہت اچھی ہے۔ جادوئی فیلمیں تو مجھے زہر لگتی ہے مگر ہیری ہارڈ اور لارڈ آف دی رنگ کی کیا بات ہے۔ سانس بھی بہت بور کرتی ہیں مجھے مگر ”آئی رو بوٹ“ میں بار بار دیکھ سکتی ہوں۔ سائیکو تھریلوں سے تو لگتے چڑھتے ہیں، مگر سائلنس آف دی لیمب میری فیورٹ ہے۔ پیریڈ فلمیں بھی بعض اوقات بہت مصنوعی ہو جاتی ہیں مگر گلکیڈی ایٹر، پیریڈیاٹ اور ہمارٹ میں میری جان ہے۔“

وہ تباہ موش ہوئی جب چائے آئی اور اور نگزیب صاحب نے کپ پکڑ بھی لیا اور گھونٹ بھر بھی لیا۔ دیکھ ابھی تک وہ اسی کو رہے تھے۔

”تو پھر تمہیں آخر پسند کس طرح کی انگریزی فلمیں ہیں؟“

”کس نے کہا مجھے انگریزی فلمیں پسند ہیں؟ ہالی و دی کی ہر فلم اب ایک جیسی لگنے لگی ہے۔ میں تو ایرانی، کورین، چائینیز، تائیوانی اور ہناؤ فلمیں دیکھتی ہوں زیادہ شوق سے۔ اور ہناؤ بھی وہ جو اپنیں کی نہیں بلکہ کو لمبیا کی ہناؤ نوی زبان میں بنی فلمیں ہوں۔“

ہاشم نے باپ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”اور ایک لائق استوڈنٹ کو فلمیں دیکھنے کا فارغ وقت کیسے مل جاتا ہے؟“

”کس نے کہا کہ میں اپنا فارغ وقت صرف مودیز پر لگاتی ہوں؟ مجھے تو کمپیوٹر گیمز زیادہ پسند ہیں۔ میں نے اب تک کال آف ایٹلی میں پتا ہے کتنے...“

”حین اگر تم ابھی کے ابھی خاموش ہو کر ہمیں شکریے کا موقع دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کل تھارے لیے چھ عدو تنخ کتاب لاوں گا۔“

حدی نے بس ہاتھ نہیں جوڑے ابھی ورنہ ایسا ہی تھا۔ حین نے نجیگی سے ذرا مڑ کر اسے دیکھا۔

”چھ نہیں بارہ۔ اور ساتھ میں ما یونیورسیٹی سس بھی۔“ اور واپس گھوم گئی۔

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔“ سعدی نے جھلکا کر گویا جان چھڑائی۔ اور نگزیب صاحب آدمی چائے پی چکے تھے۔ باس آفس ختم ہوا تو

باتی چائے کی امید بھی دم توڑ گئی۔ وہ اٹھ گئے۔

”فتنش میں آنا اور اس پنجی کو بھی ساتھ لانا۔“ دروازے تک جاتے انہوں نے ندرت سے بس اتنا کہا۔ سعدی اور وہ اچھوڑنے باہر تک آئے۔ فارس وہیں بیٹھا تھا۔

”جب تک تمہارا سکالر شپ فائل نہیں ہوتا، تم میرے گھر آ جایا کرو۔ میری اسنڈی تمہیں ضرور متأثر کرے گی اور تم وہاں بیٹھ کر، کچھ پڑھ بھی سکو گے۔“ ہاشم نے کار کے ساتھ کھڑے سعدی کو جب یہ بات کہی تو اس نے اسے ازراہ مرمت کی جانے والی پیٹکش سمجھا۔ آخری خدا حافظ سے پہلے جب ہاشم نے یہ دھرا یا تو سعدی نے بھی مسکرا کر آئے کا وعدہ کر لیا۔ گوکار اسے بالکل بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ کار دراز کے جائے گا۔

اسے غلط لگتا تھا۔



زمرون کان سے لگائے لاڈنخ میں بے چینی سے ہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید اضطراب رقم تھا۔ دوسرا جانب گھنٹے رہی تھی۔

دفعتا وہ رکی۔ ”جی میں زمر بات کر رہی ہوں۔ جی بالکل۔ میں نے طباء کی فہرست معلوم کرنے کے لیے کال کی تھی جو سکالر شپ کے لیے نامزد ہوئے ہیں۔“

ایک گھنٹہ یا لٹ انگلی پیٹھتی بظہر ناصل انداز میں کہ رہی تھی۔

”آپ مجھے وہ پانچ نام پڑھ کر سنا سکتے ہیں؟ جی۔ جی۔ جی ہوں۔“ وہ لب آپس میں پیوست کیے ہلتی ہوئی سنتی گئی۔ چہرے پر تناول بر گیا۔ ایک دوپانچ۔

”لیا یہی تمام نام ہیں؟ آریو شیور؟“ آہ۔ آہ۔ آہ۔ آنکھوں میں امید کی جوت بھجتی گئی۔

”اوکے۔۔۔ مگر کیا آپ کا بیٹر چیک کر سکتے ہیں؟ اس فوت میں واقعی کسی سعدی یوسف کا نام نہیں ہے؟“ ایک آخری امید۔۔۔ جس پر سب کی دنیا قائم ہے۔ مگر جواب سن کر ساری دنیا دھمکی گئی۔

”اوکے۔۔۔ اسے اپنی آواز مدھم کی سنائی دی۔ آہستہ سے فون رکھا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ کمرے سے فرhan کے دروازہ کھولنے آواز آئی۔ لحاف کا بندل بن کر اٹھائے وہ اسشور و مک طرف جا رہی تھیں۔ اسے زردشل سائبیٹھ دیکھ کر رکیں۔

”کیا ہوا؟“ وہ چوکی۔ پھر پھیکا سامسکرائی۔

”کچھ نہیں ہوا۔“ اور یہی تو صدمہ تھا کہ کچھ نہیں ہوا۔



آن کمپیوٹر چیز خالی تھی کیونکہ خین صوفے پر بیٹھی تھی۔ گود میں پلیٹ تھی اور وہ ابھی تک کھار رہی تھی۔ ان کی ”وں ڈش“ پارٹی ہو چکی تھی۔

زمر بڑے صوفے پر بیٹھی ٹشو سے نفاست سے لب پھیپھار رہی تھی۔ سعدی امی کے ساتھ برتن اٹھوار ہاتھا۔ سیم باقی ماندہ پتھر پر رہا تھا۔

”ہاں میں نے پتا کیا تھا۔“ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے زمر نے سعدی کے سوال کا جواب دیا اور پھر اس کی طرف دیکھ کر سکون سے بولی۔ ”ناموں کا اعلان ابھی نہیں ہوا۔ شاید دو تین دن مزید لگیں۔“

”اوہ۔“ سعدی کا جوش، امید، خوف سب بخندنا ہوا۔ وہ آخری پلیٹ ندرت کے ہاتھ میں پکڑی ترے میں رکھ کر زمر کے ساتھ صونے آبیٹھا۔ گھنٹوں پر کہیاں رکھے آگے کو جھک کر بیٹھے وہ مایوس لگ رہا تھا۔

”سعدی! تمہیں اسکا لرشپ مل جائے گا۔ بعض دفعہ لوگ میرث پر اسکا لرشپ نہیں باشنتے، بلکہ نافضی کر جاتے ہیں۔ اس کے اچھوتو تھا رے ساتھ نافضی نہیں ہوگی۔“ اس نے سعدی کے کندھے کو تھکا۔

”وہ ہوں،“ کہہ کر مسکرا دیا۔ مگر وہ بدلت زیادہ تھا۔ تب ہی جب گھنٹی بجی تو اس نے کہا۔

”سیم موئے آلو! جاؤ جا کر دروازہ کھولو۔ بھی کوئی کام بھی کر لیا کرو۔“

سیم نے فوراً تعقیل کی۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے پیچھے فارس تھا۔ چوکھت پر وہ ذرا دیر کو جھوکا۔ زمر بھی اسے دیکھ کر ذرا زیادہ سیدھی ہوئی۔

”سوری میں غلط وقت پر آگیا۔ وہ جو چیزیں کہی تھیں آپا سے وہی لینے آیا تھا۔“ اور وہ بالکل بھی نادم نہیں نظر آ رہا تھا۔

”اُس اکے ماں، آئیں۔ ہم بس پارٹی ختم کر چکے تھے۔“ سعدی اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہوں.... میں بھی بس نکلنے والی تھی۔ اور آپ ٹھیک ہیں؟“ زمر اپنی چیزیں سمیٹنے ہوئے اسے دیکھ کر ذرا ساتکلفاً مسکرائی۔ فارس نے تھج بے اسے دیکھا، اور میز کی حالت کو۔ پارٹی واقعی ختم ہو چکی تھی۔

(صحن آپا نے تو کہا تھا کہ زمر اور بچوں نے شام کو پارٹی کرنی ہے۔ میں لیٹ ہو گیا یا ان کے چھ جلدی نک گئے؟) اس نے سوچا۔ پھر سر جھٹکا۔ اسے کیا، وہ تو اپنی چیزیں اٹھانے آیا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے، اسے کل صبح لینی تھیں وہ چیزیں، لیکن اگر جلدی آگیا تو کیا ہوا ہاں؟“

”یا... ایم فائن۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ پھر کچن کی طرف رخ کر کے آواز دی۔ ”آپا! میرا بیگ دے دیں تو میں جاؤں۔“

”اوہ، تم ابھی آگئے۔ میں سمجھی کل آؤ گے۔“ ندرت ہاتھ صاف کرتی جیرت سے ادھر آئیں۔ ”اچھا بیٹھو میں لا تی ہوں۔“

زمر نے اپنی چیزیں سمیٹ لی تھیں۔ صرف کارکی چاپیاں ہاتھ میں پکڑ رکھی تھیں۔ اب اسے اٹھنا تھا، مگر جنین سامنے بیٹھی، بہت ہی دل جمعی سے پنجرے سے بوئی الگ کرتی کھارہ ہی تھی۔ زمر نے اسے دیکھا تو وہ ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ مگر کاسب سے پُرانا دیکھو کے دیکھنے پر شرم جاتا تھا۔ مسکرا کر کھانے لگی۔ زمر بھی مسکرا دی اور فارس کو دیکھا جو ابھی تک کھڑا تھا۔ سعدی نے سنگل صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹھ جائیں۔ یہ کتنا نہیں ہے۔“

مگر وہ نظر انداز کر کے آپا کی طرف بڑھ گیا جو اندر سے اس کا بیگ لارہی تھیں۔

”کیا بس بھی بھجوایا ہے سیم انکل نے؟“ اس نے بیگ کو ہاتھوں میں لے کر نڈوائی جیسے وزن چیک کیا۔

”ہاں۔ ایک دفعہ دیکھ کر تسلی کرلو سب کچھ پورا ہے۔“ وہ بیٹھ گیا۔ بیگ کی زپ کھولی۔ زمر بھی بے اختیار دیکھنے لگی۔ باقی سب کو شاید پتا تھا کہ اندر لکیا ہے۔

فارس نے ہاتھ ڈال کر بندوق نکالی۔ لمی نالی والی antique گن۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اندر موجود گولیاں چیک کیں۔ ہوں، سب پورا تھا۔

”یہ ہمارے ابو کے ایک دوست تھے، ان کو شکار کا بہت شوق ہے۔ فارس کو ان کی کوئی گن اچھی لگی تو انہوں نے اس کے لیے بھجو دی۔ مگر اس کو ضد تھی کہ یہ خریدے گا، تھنہ نہیں لے گا۔ یوں کرتے کرتے ان کو باہر جانا پڑ گیا تو پے منٹ ملنے کے بعد میری طرف ڈر اپ کروا دی۔“ ندرت نے زمر کو دیکھتے ہوئے وضاحت دی۔ فارس نے زپ بند کر کے سراٹھا یا تو وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو گنر پنڈ ہیں؟“ تھج بے اس نے ابر و اٹھائی۔ فارس نے دو تین سینٹ اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر ابر و اچکا کر بولا۔

”بہت زیادہ۔ کیونکہ گزرا نسل کو نہیں مارتیں، انسان انسانوں کو مارتے ہیں۔“

”آ... میرا یہ مطلب نہیں تھا... اور آپ کی پڑھائی تھیک جا رہی ہے؟“ اس نے بات بدلتی۔ صوفے کے کنارے سُجی وہ بس جانے کی تیاری میں تھی۔

”ہوں۔ مگر...“ اسے دیکھتے ہوئے فارس تھہرا۔ ”آپ نے جو پچھلے ہفتہ ہینڈ آٹھ فوٹو کاپی کروا کر کلاس میں دیا تھا، وہ مجھے نہیں ملا۔“

”اوہ... مگر وہ تو آپ کے آنے کے بعد دیا گیا تھا۔“

”شاید ابھی میری کوئی اہمیت نہیں ہے وہاں۔“ اس نے شانے اچکا دیے۔ زمر فکر مند ہوئی۔

”پھر تو آپ کو وہ تینوں ناپکس سمجھ میں نہیں آئے ہوں گے۔“

”سب اوپر سے گزر گیا۔“ ہاتھ سے سر کے اوپر اشارہ کیا۔ ”اگر آپ کے پاس وقت ہوتا؟“

”جی، بالکل، میں کل، نہیں پرسوں۔“ ٹھوڑی پاٹگی رکھے اس نے سوچا۔ ”ہاں پرسوں آپ میرے پاس آئے گا کلاس سے پہلے۔ میں تب تک آپ کے لیے وہ نوٹس دوبارہ کاپی کروادوں گی۔“

”شیور! تھیں۔“ اس نے بس اتنا کہا۔ خین اب ہاتھ دھونے کپن میں جا چکی تھی۔

زمر جانے کے لیے انھیں۔ مگر انھی سے پہلے اس نے چاپیاں کشن کے پیچھے رکھیں اور ان کو دیکھنے بنا کھڑی ہوئی۔ فارس نے بیک کندھے پر ڈالنے ہوئے کن الکھیوں سے یہ دیکھا تھا۔ اسے چھوڑنے باہر گیا۔ خین و اپس آئی تو وہ جا چکی تھی۔ وہ ایک دم کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔

فارس پتلیاں سکیز کر اب بغور خین کو دیکھ رہا تھا۔ دھنعتا وہ چکی۔ چہرے پر سارے زمانے کی خوشی در آئی۔ ”پھپھو پھر بھول گئیں۔“ اور جلدی سے صوفے تک آئی۔ اور پر نیچے ہاتھ مارا۔ کشن پرے کیا۔ ”یرہا چاپیوں کا چھما۔“ اس نے فاتحانہ انداز میں وہ انھیا اور راہداری کی طرف لپکی۔ فارس کو یہاں تک آوازیں آرہی تھیں۔ زمر اور سعدی واپس آئے تھے۔

”پھپھو چاپی بھول گئیں۔“ سعدی نے پکارا۔

خین ان کو جابی دے رہی تھی۔ زمر کچھ کھر رہی تھی.... ہر دفعہ کا معمول.... سعدی ہر دفعہ جیران ہوتا۔ پھر کبھی نہس دیتا۔ اب بھی نہس دیا۔ وہ چل گئی اور کھر خاموش ہو گیا۔ حالانکہ وہ تو اتنا بولتی بھی نہیں تھی۔ خاموشی ساتھ لاتی تھی خاموشی چھوڑ جاتی تھی۔

خین و اپس آئی تو اس کا چھر یہ گلنا ہو رہا تھا۔ بڑی فرصت سے اس نے پلیٹ انھی اور کپن میں چل گئی۔

کچھ دیر بعد جب فارس ان کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلا تو گاڑی میں بیٹھتے ہی بیگ پچھلی سیٹ پر پھینکا۔ ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا۔ ادھر ادھر چیزیں پلیٹیں۔ پھر وہ مل گیا۔

فوٹو کاپی شدہ نوٹس۔

وہ اسے انھائے باہر نکلا۔ سڑک کنارے ایک کوڑے کے بڑے سے بڑے کے اوپر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں میں اسے پکڑتے اس کے چار ٹکڑے کیے اور اندر پھینک دیا۔ پھر دور آسمان کو دیکھتے ہوئے گھری سانس لی۔

”اب منہ سے نکل جائے کچھ تو بندہ کیا کرے؟“

شانے اچکا کرو وہ واپس ہو لیا۔

کاردار ز کا قصر اپنی پوری آب و تاب سے اس سبزہ زار پر کھڑا تھا۔ لان میں باور دی ملازموں کی آمد و رفت جاری تھی۔ سارے بقیہ ماہدہ کام جلدی جلدی نہ شائے جاری ہے تھے۔ شادی میں دن نہ ہونے کے برابر ہے گئے تھے۔

سعدی یوسف نے مین ڈور کے سامنے کھڑے ہو کر چند گھرے گھرے سانس لیے۔

”ایک آدمی... مرد میں پیش کرے اور میں فوراً سے پہنچ جاؤں، کیا یہ اچھا لگتا ہے؟“ ابھی جب وہ فارس سے ملا تھا تو اس نے

۴) پھاتھا۔

”اچھا لگتا ہو یا برا“ میں نکل رہا ہوں۔ اب تم ادھر بیٹھ کر ٹوپی دیکھو دیو اروں سے با تیں کرو یا ہاشم سے مل آؤ، تمہاری مرضی۔“ وہ ہالی اور والٹ اٹھاتے ہوئے بولا تو سعدی نے تندی سے اسے دیکھا۔

”ایسا سلوک کرتا ہے کوئی مہمان کے ساتھ؟“

”مہمان کون؟“ فارس نے سراٹھا کرواقی تعجب سے پوچھا۔

”چھوڑیں یا ریا... وہ بدول ہوا۔“ اچھا آپ جائیں۔ مگر... وہ جو مجھے پہچانے ہی نہ تو؟“

”لو... ہاشم کبھی کچھ بھولتا ہے؟“ فارس نے سر جھکا۔ اس کے انداز پر سعدی نے غور سے اسے دیکھا۔

”آپ کی اپنے کزن نے نہیں بنتی کیا؟ اس دن بھی آپ نے ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”دیکھو یا ریا...“ فارس نے ہاتھ اٹھا کر دوٹوک کہنا شروع کیا۔ ”وہ ہو گا اچھا آدمی۔ میر اسرا نہیاں ہو گا اچھا۔ مگر وہ میرے چیزے لوگ ہیں۔ ہم تم تو ڈرائیور ہو ٹل پہ ماش کی دال کھا کر میٹھی چائے پی کر دیں چار پائی پہ لبے لیٹ جانے والے بندے ہیں۔ مگر یہ اور طرح کے لوگ ہیں۔ مگر ڈیڑی ناٹپ۔ میں ان سے کبھی گھل مل نہیں سکتا نہ سکتا ہوں۔ اب تم جاری ہے ہو یا تمہیں اندر لا کر جاؤں؟“

اور وہ اب دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ بجا یا بھی نہیں تھا مگر اندر سے جیسے اسے دیکھ لیا گیا تھا۔ دروازہ کھلا اور فلپاٹی ملازمہ میری اپنے سکراتی ہوئی کھڑی تھی۔

”گذڑا یونگ!“

”تھیں کس.... میں آ... ہاشم گھر پہ ہیں؟“ ماموں کے کزن کو کیا کہہ کر پکارنا چاہیے، سمجھ میں نہیں آیا۔

”اور آپ کون؟“

”میں سعدی ہوں۔ اصل میں انہوں نے کہا تھا کہ۔“

”سعدی یوسف خان فارس صاحب کے بھائیجے؟ مسٹر کارڈار نے آپ کے بارے میں اطلاع کر دی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتے تو ان کے حکام کے مطابق میں آپ کو اسٹڈی میں لے جاتی۔ لیکن چونکہ وہ ہیں اس لیے آپ ادھر آ جائیے۔“

میری نے اتنی خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے ادب سے اندر آنے کا اشارہ کیا کہ وہ واقعی حیران ہوا۔ بہر حال اس کا اعتماد بڑھا۔ وہ اندر آیا۔ نگاہیں گھما کر اونچے اور عالیشان لوٹنگ روم کا جائزہ لیا۔ اور پھر جو کہتا ہے کہ اسے خوبصورتی متوجہ نہیں کرتی، وہ اس دنیا کا سب سے ہاچھوٹا ہے اور متاثر تودہ بھی ہوا۔ (کتاب پر اور پیارا گھر ہے) مگر اتنا ہی کہ اللہ ان کو نصیب کرے۔ آمین اور بس۔

میری کے عقب میں قدم اٹھاتا وہ لا ونچ کے وسط میں آیا۔ ایک لمبے سے چیز لوٹنگ کے کنارے پہنچا ٹانگ پہنچا جائے گے سے مکونٹ بھرتی وہ پیٹھی تھی جو بیہاں کی مالکن لگتی تھی۔ سید ہے بھورے بال، گوری نازک، ہاشمی سیاہ آنکھیں۔ دو انگلیوں سے لاکٹ میں پر دیا ہے پھر چھیڑتی۔ آہٹ پہ راٹھا یا۔ مسکراتی اور سوالیہ نظر وہ سے میری کو دیکھا۔

”ہاشم صاحب کے مہمان ہیں یہ۔ بیٹھیے میں ان کو اطلاع کرتی ہوں۔“ وہ سیر ہیوں کے لیے مڑی تو جواہرات نے مسکراتے ہوئے

سعدی کو دیکھا۔ البتہ آنکھیں بالکل سرد تھیں۔

”میں فارس کا بھانجنا ہوں، سعدی یوسف۔“ وہ ذرا سمجھیگی سے بولا۔ اپنے یہاں آنے کے فیصلے پر پھر سے سوچا، کہیں غلطی تو نہیں کی؟

”آئی سی!“ جواہرات نے اثبات میں سرہلایا۔ تاثرات نہیں بد لے۔  
میری انہی سیڑھیوں کے وسط میں تھی جب ہاشم کمرے سے نکلتا دکھائی دیا۔ عجلت میں کوٹ پہنتا، سعدی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے وہ زینے اترنے لگا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم آئے ہو۔“  
”آپ شاید جلدی میں ہیں ہاشم بھائی!“ بس یہی منہ سے نکلا اور یہی طے ہو گیا۔  
ہاشم اتر آیا تھا۔ مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا۔  
”میں واقعی جلدی میں ہوں اور مجھے واقعی بہت ضروری کام ہے۔ مگر تمہیں میں اپنی اسٹڈی دکھانا چاہوں گا اور یہ میں اپنی خوشی کے لیے کر رہا ہوں۔“ پھر ماں کو دیکھا۔

”کیا تعارف ہو چکے؟“ اپنے سوال کا جواب خود ہی سمجھ کر ”آؤ“ کہتا اسے اوپر لے آیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر پہنچ کر سعدی نے نگاہ موڑی۔

نیچے جواہرات ہنوز اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے آنے پر خوش ہے یا غصے میں ہے، اس کے تاثرات یہ بتانے سے قاصر تھے۔ وہ ر  
جهنم کر ہاشم کے پیچھے ہو لیا۔  
وہ وسیع اور طویل اسٹڈی تھی۔ کتابوں کے سلائیڈ نگ ریکس، ان کے پیچھے مزید ریکس، شیلیف، نیبلو، سعدی نے ستائش سے آگے پیچھے گردن گھمائی۔

”او۔ آپ تو واقعی پڑھنے والے آدمی لگتے ہیں۔“ ہاشم کا دوستانہ رویہ اس کو مزید پر اعتماد کر رہا تھا۔ اس کی بات پر ہاشم نہ دیا۔  
”تم آج کی شام میری کتابوں کے نام کرو۔ مجھے ایک کال کرنی ہے، پھر نکلنے سے قبل میں خدا حافظ کرنے آؤں گا۔ مگر تم کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گے۔“

”نہیں، اٹس اونکے میں....“ وہ شرمندہ ہوا۔ مگر ہاشم مسکرا تاہو اپلٹ چکا تھا۔ ساتھ ہی وہ موبائل پنبر بھی ڈائل کر رہا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بہت اعتماد سے ایک ہی وقت بہت سے مجازوں کو منٹانے والا۔

نیچے جواہرات گ کے آخری گھونٹ بھر رہی تھی۔ سر اٹھا کر اس نے ہاشم کو اسٹڈی سے نکل کر اپنے کمرے میں جاتے دیکھا تو گ  
ر کر کھڑی ہوئی۔ باریک ہیل سے چلتی دلاؤخ کے سرے پہنے اپنے کمرے تک آئی۔  
اندر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے اور نگزیب نائی کی ناث درست کر رہے تھے۔ ایک سوت میں ملبوس ملازم ان کے کوٹ کو کندھے سے ہلکا سارش کر کے پیچھے ہو کر تقدیمی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔

”کیا تم مجھے میرے شوہر کے ساتھ تھا چھوڑو گے؟“ مسکرا کر کہتی جواہرات آئینے کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ ملازم سرہلا کر فوراً ساتھ نکل گیا۔ کاف لکس اٹھاتے اور نگزیب نے ایک ناپسندیدہ نظر اس پر ڈالی۔

”کیا ہاشم تیار ہو گیا؟“  
”پہلے وہ تمہارے بھانجے کے رشتہ داروں کی خاطر مدارات تو کر لے۔ ویسے اس کام کے لیے کیا تم بہت نہیں تھے؟“ مسکراہت

۱۰ الہوں پتھی گمراہ کھیں سلگ رہی تھیں۔

”فارس کے رشتہ دار جب چاہیں ادھر آ سکتے ہیں۔ اس کو اس کی ماں کا جائز حصہ میں نے کبھی نہیں دیا تھا رے لیے۔ اب اور کیا ہاتھ ہو؟“

”اور انکسی؟“

”وہ اس کے حصے سے بہت کم ہے، تم جانتی ہو۔“ تھی سے کہتے وہ تائی پن لگا رہے تھے۔

”تمہارے بس میں ہوتا تو اسے اور بھی، بہت کچھ دے دیتے مگر وہ خود ہی کچھ لینے میں اندر سڈنیں۔“

”کتنا اچھا ہوا گر تم اپنی شکل مجھے کم سے کم دکھایا کرو۔“ وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ما تھے پہ مل لیے بولے تھے۔ جواہرات کی مکراہٹ ختم ہو چکی تھی۔ بمشکل اس نے ضبط کیا۔

”میں جا رہی تھی گر تم سے مخاطب ہونے کی تکلیف میں نے صرف اس لیے اٹھائی کہ اگر ہم تینوں جا رہے ہیں تو فارس کا رشتہ دار ہمارے گھر میں آکیا کیوں ہے؟“

”کیا تمہارا دوسرا بیٹا پنے کمرے میں اپنی نا کامی کا سوگ نہیں منا رہا؟“

وہ جو میر سے پرس اٹھانے آئی تھی رکی۔ چھپت کر پرس اٹھایا اور گھوم کر اس کے سامنے آئی۔

”اسے نا کام مت کھو اور انگریز ہے۔ وہ اگر پہلے نمبر پنیں آتا تو دوسرا نمبر سے نیچے بھی نہیں جاتا۔ اگر وہ اسین فورڈ یا ہارورڈ نہیں جا مکاپ بھی تین بھترین یونیورسٹیز اسے اپر وو کرچکی ہیں۔ اور ایک دفعہ تم اس کاڑی این اے میٹ کیوں نہیں کرایتے تاکہ تمہیں بھی معلوم ہو جائے کہ وہ تمہارا ہی بیٹا ہے اور شاید پھر تم اس کی قدر کرنا شروع کر دو۔“ شیرنی بپھر چکی تھی۔ او انگریز اب کا لرد رست کر رہے تھے۔

”وہ میرا بیٹا ہے۔ مجھے عزیز ہے۔ اس لیے جہاں اسے دیکھنا چاہتا ہوں وہ وہاں نہیں ہے۔ اچھا ہونا صرف ہاشم جیسا ہونا نہیں ۲۶۴۔“ د فارس کی بہن کے نیچے... وہ مجھے زیادہ قابل لگے تھے۔

جواہرات شعلہ بار آنکھوں سے انہیں گھورتی رہی۔ پھر تیزی سے پلٹ گئی۔ باہر آ کر اس نے منودب کھڑی میری کو روکا۔

”فارس کے رشتہ دار کو چائے وغیرہ بھجوادینا۔ پھر رات کا کھانا کھلائے بغیر مت جانے دینا۔ اور اس پر نظر بھی رکھنا۔“ گھری نظر وہ ۲۶۵۔ مدد کر کرہا۔ میری نے سر ہلایا۔

اوپر ہاشم اپنے کمرے سے نکل کر اسٹڈی میں جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

اندر سعدی ایک کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ وہ اتنا محظا کہ جب ہاشم اس کے قریب آیا تو بھی نہیں ہلا۔ بس پڑھتا ۲۶۶۔ ہاشم نے گردن ترچھی کر کے کتاب کا سرورق دیکھا۔

”یہ کہاں سے نکال لی تم نے؟ میں تو اسے بھول بھی چکا تھا۔“

سعدی چونکا۔ پھر اسے دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہوا۔

”اوہ.... میرا خیال تھا آپ جا چکے ہیں۔ بلکہ آپ جائیے ہاشم بھائی۔ ورنہ مجھے لگے گا کہ میں آپ کو ڈسٹر ب کر رہا ہوں۔“

ہاشم نے جواب دیے بنا کتاب اس کے ہاتھ سے لی۔ اٹی بھی۔ پہلے صفحے پر قلم سے لکھا تھا۔ ”ہاشم کاردار کے نام۔ شاید کبھی مدد اور پڑے۔ فقط محمد اولی۔“ وہ ہلکا سامسکرا یا۔

”محمد اولی اور محمد ثانی، یہ دو جزوں اس بھائی تھے میرے ساتھ لا سکوں میں۔ محمد اولی نے مجھے یہ کتاب دی تھی۔ وہ خود کسی فرماں سے گزرا ۲۶۷۔ اس کو شاید اس کتاب نے ٹھیک ہونے میں مدد کی تھی۔ واث ایور مجھے تو یاد بھی نہیں ٹھیک سے۔“ وہ اس کی پشت کو پڑھنے لگا۔ یہ تیرھوں

صدی کے کسی مسلمان عالم کی لکھی گئی کتاب ہے۔ میں نے تب پڑھی تھی۔ اچھی تھی مگر بھول چکا ہوں۔ کیا تمہیں پسند آئی؟“ اس نے چہرہ اٹھا کر سعدی کو دیکھا۔

”بہت زیادہ۔ عجیب چارم ہے اس میں۔ جیسے میں شیخ کے زمانے میں والپس چلا گیا ہوں۔“  
ہاشم نے کتاب میز پر رکھی۔ جھک کر کھڑے ہوئے، قلم نکال کر پہلے صفحے پر محمد اولی کے دستخط تسلیک کھا۔

”For the reading pleasure of Saadi Yousuf“

نیچے اپنے سائنس کیے۔ تاریخ ڈالی اور کتاب بند کر کے اسے تھامی۔

”پہلی دفعہ میرے پاس سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔“

”ارے.... تھینک یو... مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔“ وہ شرم مندہ ہوا۔

”ضرورت مجھے بھی نہیں تھی۔ مگر تم ذہین لڑکے ہو۔ اور میں ذہین لوگوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں صرف ذہین جمع مختی لی لوگوں سے متاثر ہوتا ہوں اور تم وہ بھی ہو۔ کھانا کھا کر جانا۔“ کندھا تھپک کر بالکل کسی بڑے بھائی کی طرح، وہ کوٹ کا بہن بند کرتا مڑ گیا اور تیز تیز باہر نکل گیا۔

”کیا بندہ ہے۔“ سعدی نے ستائش سے سوچا تھا۔



میڈم رمشہ کے آفس میں خاموشی چھائی تھی۔ میز کے دونوں سروں پر چائے کے کپ دھرے تھے۔ میڈم کی طرف والا تو آدھا خالی تھا۔ مگر زمر کی چائے بالائی کی تہہ تسلیک کی تھی۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے سمز رمشہ بلگرامی کا آپ نے میرٹ پر اسکالر شپ دینے کی بجائے ساتھ سامنے بیٹھی خاتون کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ کھل کر کہیں زمر۔“ انہوں نے بہت سکون سے کہا۔ زمر نے سر کو اثبات میں جبکش دی۔

”میں کھل کر بات کرنے ہی آئی تھی۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے سمز رمشہ بلگرامی کا آپ نے میرٹ پر اسکالر شپ دینے کی بجائے ساتھ سامنے بیٹھی ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ اور میں زمر یوسف ہوں۔ اس لیے میں کروں گی یہ کہ میں آپ کے ادارے کے خلاف ایک چارچ شیٹ تباہ کروں گی اور بچھلے دس سال کے رہنگیت ہوئے امیدواروں کو تلاش کر کے سامنے لاوں گی جن کا حق بالکل سعدی کی طرح مارا گیا تھا۔ اور میں ان کا موازنہ ان بچوں سے کروں گی جن کو آپ نے اسکالر شپ دیے ہیں۔ اور نہ صرف یہ موازنہ میڈیا پر آئے گا بلکہ آپ کے اٹاٹوں اور بینک بیلنਸ کی تمام تفصیل سمیت میں کوٹ میں جاؤں گی جس کے نتیجے میں آپ کو اپنی جاب چھوڑنی پڑے گی۔ آپ کا گھر بنپے سب متاثر ہو رہے گے۔ اس لیے آپ ہر اس بچے کا نام لست سے خارج کریں جس کو ناجائز اسکالر شپ دیا گیا ہے۔“

وہ خاموش ہو کر پیچھے ہوئی تو میڈم رمشہ نے سر ہلایا۔ تخلی سے جیسے ایک گہری سانس خارج کی اور اسی ٹھینکان سے اسے دیکھا۔

”آپ نے کہہ لیا زمر؟“

”اور اب میں آپ کے کہنے کی منتظر ہوں۔“ اس کا ہجہ بے چک تھا۔

میڈم رمشہ بھیکیں۔ دراز سے ایک فائل نکالی۔ سیدھی ہو کر اس کے آگے رکھی اور بولیں۔ ”اس کے پہلے صفحے پر سعدی کا اکیڈمی ریکارڈ اور تمام کوائف ہیں اور اگلے صفحوں پر ان پانچ بچوں کے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔ اس کے بعد آپ جس کا نام کہیں گی میں نکال کر سعدی کا ذوال دون گی۔“

زمر نے تندی سے ان کو دیکھتے فاکل اٹھائی، کھولی اور پہلا صفحہ سامنے کیا۔ سعدی کے کوائف پڑھتے گردان مزید اوپنی ہوئی۔ آنکھوں میں فخر در آیا۔ ابر و اٹھا کر ان کو جاتی نظروں سے دیکھا اور پھر زگا بیس جھکا کر صفحہ پلٹا۔

تنے ہوئے تاثرات کے ساتھ وہ پڑھتی گئی۔ صفحے الٹی گئی۔ آہستہ آہستہ نقش ڈھیلے ہوئے، کندھے ذرا ڈھلک بھنوں خنکی مگر پسپائی سے ہٹنیں۔ فاکل ختم کر کے وہ لکھتی ہی دیراں کو دیکھتی، لب کاٹتی رہی۔

”اب ان میں سے کس کا نام آپ نکلوانا چاہتی ہیں زمر؟“ انہوں نے زمی سے پوچھا۔ زمر نے خاموشی سے ان کو دیکھا اور فاکل آہستہ سے میز پڑا۔

”زم! اپنے بچے ہم سب کو پیارے ہوتے ہیں، چاہے وہ پیارے نہ بھی ہوں۔ وہ ہم سب کو قابل لگتے ہیں، چاہے وہ قابل نہ بھی ہوں۔“

”آپ یہ کہ رہی ہیں کہ سعدی مستحق نہیں تھا؟“

”میں یہ کہ رہی ہوں کہ کچھ بچے سعدی سے زیادہ مستحق تھے۔“

زمر نے آنکھیں بند کر کے کنٹی مسلی۔ وہ بے حد تھا واث کاشکار لگ رہی تھی۔

”آئی ایم سوری! مگر اس سے زیادہ قابل اور غریب بچے تھے وہ پانچ۔ میری جگہ آپ ہوتیں تو آپ بھی یہی فیصلہ کرتیں۔“

زمر نے بند آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ ابھی کچھ دیر وہ آنکھیں نہیں کھونا چاہتی تھی۔ خواب ٹوٹ چکا تھا۔ نیند کھل چکی۔ مگر وہ کچھ دیر اور اسی خواب میں رہنا چاہتی تھی۔

”کیا اس نے کسی اور اس کا لرشپ پر گرام میں اپلاٹی نہیں کیا؟“

زمر نے آنکھیں کھولیں۔ سارے خواب ہوا میں تخلیل ہو گئے۔ پھر کسی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے نفی میں گردان ہلائی۔ ”وہ کر چکا ہے۔ وہاں بھی نہیں ملا۔“

”آئی ایم سوری!“ وہ افسوس سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اور زمر بھی ان کو دیکھتی کچھ سوچ رہی تھی۔ ذہن منتشر تھا، سوچیں بھلک رہی تھیں مگر وہ نقطہ سامنے تھا جس پر اسے پہنچنا تھا۔ ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔

”مزرمش! کیا آپ مجھے ایک فیور دیں گی؟“



کتاب ہاتھ میں لیے وہ پڑھتے پڑھتے بالکلونی میں جا بیٹھا تھا۔ باہر شام بھی ہلکی نیلی تھی۔ دور تک پھیلا سائزہ زار اور وہاں سے نظر الی فارس کی انیکسی۔

لاہبری یہی کی بالکلونی کے دائیں طرف ہاشم کی بالکلونی تھی اور اس کے مزید پرے ایک اور بالکلونی۔ البتہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ کسی دوسری بالکلونی تک جانے کے لیے آپ کو اندر سے ہی جانا پڑتا۔ سعدی اس سب سے بے خبر رہتا اگر اسے وہ آواز نہ آتی۔ ایسی آواز کوئی دم گھٹنے کی کیفیت میں کھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ہاشم کی بالکلونی سے پرے ایک دوسری بالکلونی کے کمرے کے کھلتے دروازے پر وہ اٹھا تھا۔ گھنون میں تقریباً سر نبواڑے کھانتا تھا کرنے کی کوشش کرتا وہ کم عمر نوجوان لگتا تھا۔ نوہ کمرے کے اندر تھا نہ باہر۔ نہ ہوش میں؛ نہ بے ہوش۔ درمیان میں تھا کہیں۔

کتاب پھینک کر وہ اندر بھاگا۔ لاہبری سے نکل کر ریلیگ کے اوپر آیا۔ بد حواسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بچے جواہرات کے

صوف پاسی کے انداز میں میری بیٹھی گم سے کافی بی رہی تھی۔ باقی سب سنسان پڑا تھا۔  
”سنؤ اور آڈ جلدی۔“ اس نے پکارا۔ میری گڑ بڑا کراچی۔ پھر سنجل کر سیڑھیوں تک آئی۔ سعدی تب تک آگے جا کر ہاشم ساتھ دالے کمرے کا ہینڈل گھمانے لگا تھا۔ وہ لا کڈ تھا۔

”کھانا تیار ہے۔ میں آپ کو بلا نے ہی لگی تھی۔“ وہ زینہ بے زینہ چڑھتی اور پ آئی۔

”اس کمرے میں کون ہے؟“

”آ..... یونوشیر واں ہیں مگر۔“ وہ اسے دروازے سے زور آزمائی کرتے دیکھ کر رک گئی۔

”اے کھولو... وہ مھیک نہیں ہے۔“ وہ اب دروازے کو دھکا دے رہا تھا۔

میری کی حالت پ غصہ غالب آنے لگا۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے آگئی۔

”وہ آرام کر رہے ہیں اور ان کا حکم ہے کہ اس دوران انگر کسی نے ان کو نگ کیا تو وہ بہت برے پیش آئیں گے۔ اس لیے بہتر۔

کہ آپ میرے ساتھ ڈائینگ ہاں....“

”اگر وہ لڑکا مر گیا تو تمہارے مالک تمہاری جان لینے میں کتنے سیکنڈ لگا میں گے ہاں؟“ وہ اس کی طرف مڑ کراتے غصے میں بولا۔

میری چپ ہو گئی۔

”اوے۔ میں چابی لاتی ہوں۔ یہ ایسے نہیں کھلے گا۔“

وہ اب کے ذرا تیز رفتاری سے بیچ گئی۔ اس کے واپس آنے تک سعدی مسلسل دروازے کو زور زد رہے تھے مار رہا تھا۔ چابی تو وہ پیچھے ہوا۔ دروازہ کھلا تو بالکوئی کام منظر دوسراے زاویے سے سامنے آیا۔ چوکھت پ قریباً اونہاگرا لڑکا، منہ سے نکلتا جھاگ، حلقتے عجیب آوازیں.... سعدی تیزی سے اس کی طرف پکا۔ ”ہا۔“ میری کامنہ کھل گیا۔

”تم مھیک ہو؟ سنؤ اور دیکھو۔“ وہ جلدی جلدی لڑکے کو سیدھا کرتا اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔ آنکھیں کھل بند ہو رہی تھیں۔

”تم فکر مرت کرو۔ تم بالکل مھیک ہو جاؤ گے۔ ہم تمہیں ہامیل لے جارہے ہیں۔ تم سونا نہیں۔ جا گئے کی کوشش کرو۔“

اس کا چہرہ تھپتھا تا وہ پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ نوشیر واں نے ادھ کھلی آنکھوں سے دھنڈلا سامنظر دیکھا۔ اس پر جملہ چھوٹے گھنگھریا لے بال۔.... پریشان آواز.... اس کا ذہن تاریکی میں ڈوپتا گیا۔

”گاڑی پیار کروا او اور ملزا مون کو ادھر بیجو۔ اسے اٹھانا ہے۔ دیکھ کیا رہی ہو جلدی کرو۔“ وہ میری کو ہکا بکا کھڑے دیکھ کر چیختا ”میں مسز کار دار....“

”ان کو بعد میں اطلاع کرنا۔ پہلے گاڑی نکلواؤ۔ جاؤ۔“

میری پٹپٹا کر باہر بھاگی۔ یہ سب اس کے لیے بہت اچانک اور غیر متوقع تھا۔

.....❖❖❖.....

لاڈنگ میں ٹوی مددم آواز میں چل رہا تھا۔ بڑے اباعینک لگائے صوفے پہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ زمر نے چائے کے میز پر کھے اور خود سامنے جا بیٹھی۔ الا پچھی اور دارچینی کی مہک۔ انہوں نے عینک کے اوپر سے نگاہ تھا کر کپوں کو دیکھا اور پھر اسے۔ میز پر کھے اور خود سامنے جا بیٹھی۔ الا پچھی اور دارچینی کی مہک۔ انہوں نے عینک کے اوپر سے نگاہ تھا کر کپوں کو دیکھا اور پھر اسے۔

”میںے کا آخر چل رہا ہے اور تم خود کہاتی ہو۔ اس لیے دو تین ہزار سے اور ماٹنے کا سوچنا بھی مت۔“ دوبارہ سے پڑھتے پڑھتے

”میں کچھ اور مانگنے آئی ہوں۔“ اپنا کپ لے کر اس نے بیک لگائی۔ پھر گونٹ بھرتے ہوئے بڑے ابا کو دیکھنے لگی۔

”اور اس وقت آئی ہو جب تمہاری ماں گھر پہنیں ہے۔ اس لیے اگر موضوع گفتگو نورت کے رشتہ دار کی شادی میں جانا ہے تو بھی صاف انکار ہے۔“

”آپ نے نئے ایر پورٹ کے قریب جو عرصہ ہوا پلاٹ لے رکھا تھا میرے نام سے اس کے کاغذات آپ کے پاس ہیں؟“ جتنی ہمیگی سے اس نے پوچھا، وہ اتنا ہی چونکے۔ عینک اتاری، اخبار رکھا اور اچنబے سے اسے دیکھا۔

”کیوں نہیں ہوں گے؟ وہ پلاٹ میری ساری زندگی کی کمائی ہے۔ تمہارے اور زلفی کے نام جو خود ابہت جزو اتھا اس میں سے زلفی نے اپنا حصہ نوکری کے دوران ہی لے لیا تھا۔ کاروبار میں بھی لگایا اس نے۔ مگر کاروبار میں تو پیشانی کا لکھا چلتا ہے۔ اس کا پیسہ کم ہوا، بڑھا ہیں۔ تمہارے حصے سے یہ پلاٹ میں نے ان وقت میں خریدا تھا اور اب وہ اچھا خاصاً منگا ہو چکا ہے۔ اس کو نیچ کر میں تمہاری شادی کروں گا اور بہت دھوم دھام سے کروں گا۔“

”مگر فی الحال تو.... میری شادی کا کوئی سلسلہ نہیں چل رہا۔“

”مگر جلد چلے گا۔ کچھ تمہاری پڑھائی، کچھ اس کم عمری میں ٹوٹی مانگنی کے باعث ہم زیادہ ہی پروٹیکلو ہو گئے تھے۔ ورنہ تمہاری شادی میں کریں چکا ہوتا۔ اب بھی رشتہ دکھردا ہوں، مگر.... زمر! تم بے وجہ یا یہ ذکر نہیں چھیڑا کریں.... تو؟“ سوالیہ ابر و اٹھائی۔

زمر چند لمحے بالکل خاموشی سے ان کو دیکھتی رہی۔ خاموشی دینا کا سب سے بڑا اقرار، سب سے بڑی سزا۔

”ابا.... سعدی کو اسکا لرسپ نہیں ملا۔“

وہ بالکل چپ ہو گئے۔ آنکھوں میں رنج و ملال ابھرا۔

”اناللہ.... مگر شاید کسی اور جگہ سے۔“

”اب وقت نہیں ہے۔ وہ نہیں پڑھنے جا سکتا مساوائے اس کے...“ وہ رکی۔ ایک وقفہ دیا، مگر ابا کی آنکھوں سے نگاہ نہیں ہٹائی۔ ”کہ ہم اس کی فیس بھر دیں۔“

”مگر ہم اتنی مہنگی یو نیورسٹی افروز نہیں،“ الفاظ لبوں میں نوٹ گئے۔ وہ ایک دم شاکڈ سے اس کو دیکھنے لگے۔ ”ایک منٹ.... تم کہہ رہی ہو کر...“

”میں بالکل بھی کہہ رہی ہوں۔ ہم وہ پلاٹ بیچ دیتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔“ شاک کی جگہ غصے نے لے لی۔ ”وہ میری ساری زندگی کی کمائی ہے۔ وہ تمہارا حق ہے۔ تمہاری شادی، زیور، سب اس سے بنے گا۔ اور بقیہ رقم تمہارا یہیک بیٹش ہو گی۔ وہ تمہارا فیوج ہے۔“

”سعدی ہمارا فیوج ہے۔“

”پانچ سال کی پڑھائی، ہر سال کی لاکھوں روپے کی فیس.... نہیں زمر! میں یہ نہیں کر سکتا۔“

”یعنی آپ کو سعدی سے بالکل محبت نہیں ہے۔“

”مجھے ایکو ٹنل بلیک میل مت کرو۔ یہ حر بے مجھ پاڑنہیں کرتے۔“ تلخی سے اس کی بات کاٹ کر بولے۔ ”مجھے وہ بہت پیارا ہے۔ اصل سے سو دیا دہ پیارا ہوتا ہے۔ مگر مجھے خنین اور اسامد بھی پیارے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر مجھے تم پیاری ہو۔ میں ندرت کے گھر کا آدھے سے زیادہ خرچا تھا ہوں۔ کل کو خنین بڑی ہو گی اور پھر تمہاری شادی جس وجہ سے ایک دفعہ نوٹی، وہ دوبارہ نہیں دھرا سکتا میں۔“

”میری فکر مت کریں۔“

”تمہارے کہنے سے میں فکر کرنا چھوڑ تو نہیں سکتا۔ میں باقی سب کو نظر انداز کر کے سارا پیسہ سعدی پر خرچ نہیں کر سکتا۔“

”جب وہ پڑھ کر آئے گا تو اتنی اچھی جا ب ملے گی کہ چند سال میں سب بنائے گا۔ پھر میں بھی تو کہانی ہوں۔“ وہ بہت سکون سے

کہہ رہی تھی۔

”لغت ہے مجھ پر اگر میں اپنی بیٹی کو پیسہ کمانے کے لیے ضائع کر دوں۔“

”اور اگر پوتا ضائع کر دیا تو؟“ وہ لمحے بھر کو چپ ہوئے مگر دلائل ختم نہیں ہوئے تھے۔

”وہ پاکستان میں بھی تو پڑھ سکتا ہے۔“ زمرہ بہت بیزار ہوئی۔

”ابا! یہ بات مت سمجھی گا دوبارہ۔ کسی لوگل یوں نورشی اور یونورشی آف لیڈز سے پڑھنے میں کتنا فرق ہے، ہم دونوں جانتے ہیں۔“

”وہ پیسہ ہماری سیکورٹی ہے۔“

”سعدی ہماری سیکورٹی ہے۔“

بڑے بابے جنگ بھلاہٹ سے اسے دیکھا۔ اب کے ان کی آنکھوں میں گہر انخ تھا۔

”زمرہ! مت کرو اپنے ساتھ ہا۔ وہ پیسہ تمہارا حق ہے۔ میں تمہاری خوشیوں کا راستہ خراب کر کے سعدی کا کیرینیں بناسکتا۔“

”دولت کسی شادی کی صفات ہوتی تو سب سے زیادہ خوش بادشاہوں کی بیٹیاں ہوتیں۔ اور پتا ہے ابا! سب سے زیادہ ناخوش

شہزادیاں ہی رہتی ہیں۔“

بڑے بابے نے تحک کر کپ اٹھایا۔ ان کی چائے مختدی ہو چکی تھی۔ الا اچھی، دارچینی کی مہک سب زائل ہو چکا تھا۔

”میں نہیں چاہتا کل کو تم اس بات پر بچھتا وو۔“

”کیا آپ کبھی مجھ پر خرچ کر کے بچھتا ہیں؟“ وہ ادا کی سے مسکرائی۔ انہوں نے نفی میں گردان کو جنبش دی۔

”کبھی بھی نہیں۔ مگر میر ادل نہیں مانتا۔ اور سعدی بھی تو نہیں مانے گا۔“

”اے کون بتائے گا؟ میں نے میم رمشہ سے بات کر لی ہے۔ وہ یہی سمجھے گا کہ وہ اسکا لرسپ پر جا رہا ہے۔ کیونکہ اگر اسے پتا چلا ک

پیے آپ دے رہے ہیں تو وہ بھی نہیں لے گا۔“

”میں نہیں دے رہا، تم دینا چاہ رہی ہو۔ مگر میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ بالکل بھی نہیں۔“ وہ پھر سے مزاحمت کر۔

لگے تھے۔ زمرہ نے آخری گھونٹ پیا۔ کپ میز پر رکھا۔ ہاتھ گویا جھاڑ کر کھڑی ہوئی۔

”ایسا ہے یوراًز کہ بات شروع کرنے سے پہلے میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کاغذات ہیں یا نہیں۔ تو جناب وہ کاغذات

میرے پاس ہیں۔ اور میں پر اپرٹی ڈیلز سے پہلے ہی بات کر چکی ہوں۔ اس لیے اگر آپ نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں آپ پر مقدمہ کر کے

ہوں۔ اور کم از کم میرے حلقة احباب میں تو کوئی اچھا وکیل میرے خلاف آپ کا کیس لڑے گا نہیں۔ اور اگر کوئی مل بھی گیا آپ کو تو کم از

اگلے سات سال تو میں آپ کو کورٹ کے پکڑ ضرور لگاؤں گی۔ اس لیے فی الحال آپ کے پاس میری بات مانے کے سوا کوئی آپشن نہیں ہے۔

اور بہت ملال میں گھرے بڑے ابا ہولے سے ہنس دیے، مگر پھر ملال لوٹ آیا۔ وہ چائے کے برتنا اٹھا کر واپس جا رہی تھی۔ انہوں

نے اسے پکارا۔

”اس سے اتنی محبت نہ کیا کرو۔ اللہ ورنہ بہت آزمائشیں ڈال دیتا ہے۔“

زمرہ گھری سانس لے کر پلٹی اور ان کو دیکھتے ہوئے رسان سے بولی۔

”عمر بن خطاب“ نے فرمایا تھا۔ ”محبت پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔“ یہ میرے بس میں نہیں ہے ابا۔“ وہ آزر دگی سے مسکرا کر

دہل سے چلی گئی۔

وہ فکر مندا اور پریشان بیٹھے رہ گئے۔ ان کو آج احساس ہو رہا تھا کہ اس کی شادی میں غیر ضروری دیر کر کے انہوں نے غلطی کر دی۔ ان کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔



اپستال کی مرمریں راہداری میں ہیل سے بھاگتے قدموں کی آواز پر سعدی نے سراٹھایا۔ جواہرات اپنے شوہر کے آگے تیز تیز آرہی تھی۔ اپنے سارے میک اپ اور تیاری کے باوجود اس کا سفید پر اپریشان چہرہ کسی سے چھپا نہیں تھا۔ سعدی کے پاس وہ رکی۔ متوجہ نظروں سے بندرووازے کو دیکھا اور پھر اسے۔

”شیر و کیسا ہے؟“

”وہ ٹھیک ہے۔“

”ہاشم کہاں ہے؟“ اور نگزیب قرب آئے۔

سعدی نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ اندر ہیں۔ آپ کے چھوٹے بیٹے کوہوش آگیا ہے۔ اس کو فوڑ پوائز نگ ہو گئی تھی۔“

اور نگزیب آگے بڑھ گئے مگر جواہرات وہیں کھڑی مضطرب سلگتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا تھا شیر و کو؟“

سعدی نے ایک نظر اور نگزیب پڑا میں جو کمرے کا دروازہ کھول رہے تھے۔

”میرے سوال نظر انداز نہیں کیے جاتے جو بھی نام ہے تمہارا۔“ وہ دبی دبی سی غرامی تھی۔ ”میں اپنا کیلا گھر تمہارے اور پر چھوڑ کر گئی۔ اگر میرے بیٹے کی اسی حالت کے ذمہ دار تم ہوتے تو تم ہبھتو گے۔“

”مسز کاردار! آپ کے اکیلے گھر کے ڈھائی درجن ملازم میں اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کے بیٹے کی طبیعت خراب تھی اور میں اسے صرف اپستال لانے کا قصور دار ہوں۔“ وہ شام میں اسے ملنے والے لڑکے سے زیادہ سنجیدہ اور سمجھدار لگ رہا تھا۔ مگر جواہرات کے تنے تاثرات ہنزو دیے ہی تھے۔

”کس قسم کی چیز سے فوڑ پوائز نگ ہوئی اسے؟“ وہ مشتبہ غصے بھری نظروں سے اسے دیکھتے پھر سے غرامی۔ ”اس نے دو پہر کو وہی کھایا جو تم سب نے کھایا تھا۔“

”اسے فوڑ پوائز نگ نہیں ہوئی۔“

جوہرات کی آنکھیں تختیر سے پھیلیں۔ ”کیا مطلب؟ تم نے ابھی کہا...“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ کاردار صاحب کو یہ بات اس سے پہلی دفعہ ملنے سے پہلے پتا چلے۔“ جیب سے ایک پیکٹ نکال کر اس کے سامنے کیا۔ ”یہ ڈرگز مجھے اس کے پاس سے ملی تھیں اور خالی سگریٹ بھی۔ آپ کے بیٹے نے منتیات کی اور وہ دوز لے لی ہی جس سے اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔“

جوہرات کی حالت یوں ہو گئی جیسے سانپ نے ڈک مار دیا ہو۔ سفید چہرے اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نے سعدی کے چہرے سے ہاتھ میں پکڑے پیکٹ تک کا سفر کیا۔

”تم.... تم یہ کہہ رہے ہو کہ میرا بیٹا..... ایڈ کٹ ہے؟“

”صرف میں نہیں، ڈاکٹر نے بھی بھی بتایا ہے۔ یقیناً وہ کچھ عرصے سے ڈرگز لے رہا تھا۔“

جو اہرات نے بولنے کی کوشش کی مگر سارے الفاظ حلق میں کاٹنے بن کر اٹک گئے۔ اس کا اندر باہر زخمی ہو گیا۔ آنکھوں میں نبی اتری گروہ بے چینی سے نبی میں سر ہلا رہی تھی۔

”میرا بیٹا.... وہ چوپیں گھنٹے میرے سامنے رہتا ہے۔ مجھے بھی کیوں نہیں لگا کہ وہ ڈر گز لیتا ہے؟“

”آج کل کے لڑکوں کو پتا ہوتا ہے کہ انہیں کتنی مقدار لینی ہے۔ اور بہت ہمارت سے وہ یہ فیکھ جاتے ہیں کہ انہیں لوگوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی خود کو نارمل کیسے ظاہر کرنا ہے۔ اور پھر ساتھ بیٹھے شخص کو بھی علم نہیں ہو سکتا کہ یہ لڑکا منشیات کے زیر اثر بیٹھا ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر نے کہا ہے۔“

جو اہرات نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلا کیا۔ تنے تاثرات ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ کندھے بھی ڈھلک چکے تھے۔

”مگر وہ زندہ ہے مز کاردار اور زندگی سے اہم کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ اس کو جنت سے سمجھا ہے گا۔ وہ پلت آئے گا۔ آپ نے سناؤ ہو گا کہ amor vincit omnia (محبت فاتح عالم) مجھے گھر جانا ہے، چلتا ہوں۔“ وہ کہہ کر مژنے لگا تو جو اہرات تیزی سے اس کی طرف گھومی۔

”کیا تم... اس سے ملوگے نہیں؟“

”اس کی فیملی اس کے پاس ہے اور میری فیملی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔“

وہ ذرا سماں سکرا کر کھٹا پلت گیا۔ جو اہرات یک لگک اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظر وہ سے غائب ہو گیا تو وہ تیزی سے پرانیویٹ روم کے دروازے تک آئی۔

..... ♦ ♦ .....

شام کا آسمان بلکا سرمی تھا۔ سورج نے بادلوں کے نارنجی کناروں کو دھکا رکھا تھا اور لا بسیری کی کھڑکی اس منظر کو واضح دکھار رہی تھی۔ اندر ایک کونے میں بھی میز پھیلی تھی۔ ایک سرے پہ تین لڑکیاں بیٹھی کتابوں میں لگن تھیں۔ دوسرا سرے پہ متصل کر سیوں پوچھ دونوں بیٹھے تھے۔ زمر سر جھکائے گردن ترچھی کیے کاغذ پر کچھ لکھ رہی تھی اور فارس قریب بیٹھا بورسا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”چلیں یہ تا پک تو ختم ہوا۔ سب کیسے تھا نا؟“ آخری لفظ لکھ کر صفحہ اس کے سامنے کرتے ادھر زمر نے سراخایا، ادھر فارس نے فوراً سنجیدہ (اور سیدھے) ہوتے تھے سے اس کا غذکو پڑھا۔

”جبی بالکل!“

”اوکے۔ اب آگے چلتے ہیں۔“ وہ نوٹس کے صفحے پلت کر اگلے موضوع پر آئی۔ پھر قلم والے ہاتھ کو عادتاً ہلاتی روائی سے سمجھانے لگی۔ فارس نوٹس کو دیکھتا راڑا دیر بعد سرا ثابت میں ہلا دیتا۔ براہ راست اس کے چھرے پر صرف دو ایک بار نگاہ ڈال سکا، پھر سر جھکایا۔ زمر کافون بجا تو وہ رکی۔ نمبر دیکھا اور موبائل کان سے لگایا۔

”جبی سر ایں نے ہی وہ شیٹ آپ کو بھوائی تھی۔“ وہ رک کر منے لگی۔ ”جبی بالکل میں نے تمام استوڈنٹس کی حاضری درج کی ہے سوائے حبیبہ دقار کے۔ میں نے دانستہ طور پر اس کا خانہ خالی چھوڑا ہے۔“ وہ گھنگھر یا لٹ کو انگلی پر دول کرتی کھہ رہی تھی۔ فارس نے ترچھی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

”سر اضاف بات ہے، امتحان میں بیٹھنے کے لیے ساٹھ فیصلہ حاضری ضروری ہے اور اس پنچی کی حاضری چالیس فیصلہ ہے۔ مگر چونکہ وہ ڈاکٹر طاہر اکرم کی بھائی ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے مجھے کال کر کے اس چالیس کو ساٹھ بنانے کا کہا ہے۔ سو میں نے یہ خانہ خالی چھوڑ دیا ہے کیونکہ میرا قلم تو اس کو ساٹھ نہیں کرے گا۔ آگے آپ کی مرضی۔ آپ اس کو ساٹھ کریں یا تو۔ میں بری الذمہ ہوں۔“

سادگی سے ساری بات کہہ کرو وہ ان کی سننے لگی۔ پھر اولادی کلمات کہہ کرفون رکھا اور کتاب کی طرف متوجہ ہوئی۔  
”خیریت میم؟“

زمر نے بچکے چہرے کے ساتھ ذرا مسکرا کر سر جھکا۔ ”ہوں۔ یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ کوئی بھی نوکری پھولوں کی تیج نہیں ہوتی۔“ وہ اٹاپ دوبارہ کھو لئے گئی۔ فارس نے اب کے ذرا غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ زمر نے سوالیہ نظریں اٹھائیں تو وہ کندھے ذرا اچکا کر چھوڑی سے شیوا نگلی اور انگوٹھے میں عادتاً ذرا ذرا لٹپٹا ہوا۔

”یونہی خیال آگیا۔ اس دن جو آپ نے کیا سعدی کے گھر.... جان کر چاہیاں بھولنا۔....“

زمر کے لیے یہ جملہ غیر متوقع تھا۔ وہ لمحہ بھر کو بالکل دھک سے رہ گئی۔ پھر چہرے پر سرفی سست آئی۔ سر جھک کر اس نے کچھ کہنا چاہا۔  
”اوہ، رک گئی۔ چند ثانیے خاموشی میں گزر گئے۔ اگر وہ جان چکا تھا تو یہ زمر کی عادت نہیں تھی کہ وہ انکار کرتی۔“

”مجھے نہیں پتا آپ کو سعدی کتنا عزیز ہے،“ مگر ہمارے لیے وہ خاندان کا پہلا بچہ تھا۔ اور نپے برابر پیارے ہوتے ہیں مگر جو توجہ پہلے ہوتی ہے وہ دوسروں کے آنے تک ہم اس مقدار میں دینے سے قاصر ہو چکے ہوتے ہیں۔ اسماء چھوٹا ہے مگر حنین... وہ میرے ہر وقت صل مل ”ہمارا سعدی ہمارا سعدی“ کرتے رہنے سے مجھ سے کافی shy (شرمائی) رہنے لگی ہے۔ عرصہ پہلے میں واقعی کچھ بھول گئی تھی ایک دو اللہ یعنی بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ ہر دفعہ کھڑکی میں میرا انتظار کرنے لگی ہے۔ وہ بہت ذہین ہے اور دنیا زیین لوگوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسے بھے سے امید ہوتی ہے کہ میں اسے تھا نہیں چھوڑوں گی، سو میں خود اسے ہر دفعہ یہ امید نہیں سرے سے تھا آتی ہوں۔“

قدرے توقف سے وہ سنجیدگی سے بوی۔

”ہو سکتا ہے آپ کو یہ غلط لگے۔ مگر میرے نزدیک کسی عزیز شخص کو اپنے قریب رکھنے کے لیے کوئی بہانہ کرنے میں کوئی برائی نہیں۔“

فارس نے بے اختیار ان تازہ فوٹو کا پیشہ نوٹس کو دیکھا اور پھر زمر کو۔ ”بالکل! میرے نزدیک بھی نہیں۔“

وہ اسی سنجیدگی سے ادھورا چھوڑا موضوع واپس کھونے لگی۔ قدرے توقف کے بعد فارس ذرا کھنکھا را۔

” بتانے کا شکر یہ۔ حنین کو نہیں بتاؤں گا۔ سیر یسلی۔“

زمر نے صرف ایک کڑی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

” مجھے اس بات کی بالکل فکر نہیں۔ کیونکہ اتنا تو آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ میرا اعتبار تو ذکر آپ کبھی بھی نہیں سکتے۔“ پھر نوٹس اس ماننے کے اور سلسلہ کلام و ہیں سے جوڑ لیا جہاں سے توڑا تھا۔

فارس اپنے چہرے پر زمانے بھر کی بوریت سجائے خاموشی سے منtar ہا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

مسزرمش کے آفس میں ایک دفعہ پھر چائے کے دو کپ میز کے مقابلہ کناروں پر رکھے تھے۔ اس دفعہ سعدی کی طرف والا کپ اٹھا گا اور مسزرمش کا ان چھوا۔ وہ ساری بات سعدی کو بتا کر اب بالکل خاموشی سے اس کا رد عمل دیکھ رہی تھیں۔

وہ ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”آپ یہ کہہ رہی ہیں میم کہ آپ نے میرے ڈاؤنمنٹ ایک پرائیویٹ اسپانسر کو بھجوائے ہیں اور اس نے مجھے اسپانسر کرنے کی بھی بھرپولی ہے؟ اور وہ ہر سال میری فیس جمع کرواتے رہیں گے؟“ وہ واقعی بے یقین تھا۔

”فیں جمع اخراجات۔ جتنی رقم ہم دے رہے تھے وہی رقم وہ دیں گے۔“

”آ... تھیک یو... مجھے نہیں پتا مجھے کیا کہنا چاہیے۔“ وہ خوش تھا اور خوشی اتنی تھی کہ اس میں تھیک سے کوئی تاثر بھی نہیں دے پا رہا۔

تھا۔ ”مگر وہ ہیں کون؟“

میدم نے خاموشی سے سامنے رکھئیں تو یکور باسکٹ میں سے ایک کرٹل بال نکالی اور اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے نظریں سعدی کے چہرے سے ہٹائے بنابولیں۔

” ہے کوئی جس کا دل بہت امیر ہے اور آپ پر خرچ کرنے کو پیسہ بھی بہت ہے۔“ پھر ذرا سنبھل کر گویا ہوئیں۔ ”ایک چیریٰ بنس میں ہیں۔ بہت سے اسٹوڈنٹس کو پرائیویٹ طور پر اسپانسر کرتے ہیں۔ آپ کے کوائف ان کو اچھے لگے اور سب سے اچھی بات یہ گلی کہ آپ نے ترجیحات میں اپنے خاندان کو پہلے نمبر پر رکھا۔“

”جی مگر، کیا میں ان کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟ مطلب اگر میں ان سے ملنا چاہوں تو....“

کرٹل بال گھماتے ان کے ہاتھ رکے۔ وہنی میں سرہلاتی پیچھے ہو کر بیٹھیں۔

”بالکل بھی نہیں سعدی! امیرے کچھ اصول ہیں۔ میں اسپانسر کی کوئی تفصیل آپ کو فراہم نہیں کر سکتی۔“

”اگر میں اصرار کروں تو بھی نہیں؟ میں صرف ان کا شکریہ....“

”کچھ سوالوں کے جواب جانا ضروری نہیں ہوتا۔ میں آپ کا شکریہ پہنچادوں گی ان تک۔“

”اچھا...“ وہ اداس ہوا۔ ”آپ میری زمر پھچھوکو جانتی ہیں نا؟ آپ نے ان کو بتایا یہ سب؟“

ذر اپر جوش ہو کر وہ آگے ہوا۔ میدم نے جواب دینے سے پہلے بہت دیر تک اس کا تتمتا تاچہرہ دیکھا۔

”کیا آپ چاہتے ہو کہ میں ان کو ابھی خبر کر دوں؟“

”نہیں نہیں۔ پلیز آپ مت بتائیے گا۔ میں خود ان کو سر پر اائزدلوں گا۔ تھینک یوسوچ۔ میں چلتا ہوں۔“ جلدی جلدی اجازت مانگتا، شکریہ ادا کرتا دوبارہ آنے کا کھتاہ دروازے کی طرف لپکا۔

”سعدی! آپ کی پھچھواؤپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ان کے لیے کبھی کوئی قربانی دینی پڑے تو پیچھے مت ہٹنا۔“ وہ جاتے جاتے مڑا۔

”جی بالکل۔ اچھا آپ مت بتائیے گا۔ میں خود بتاؤں گا۔“ اور وہ باہر تھا۔ میدم نے سر جھٹک کر گھری سانس اندر

اتاری اور سوچا محبت ایک بہت سادہ اور بہت پیچیدہ شے ہے۔



خنیں سعدی کے ساتھ آئی تھی۔ اور جتنی دیر یہ مسلسل جوش سے بولتا، دادی اور پھچھوکو اپنے اسکارشپ کی تفصیل بتاتا رہا، خنیں اس کیک کے تین بلکلے کھا چکی تھی جو سعدی نے راستے سے لیا تھا۔

”یعنی کہ تمہاری ساری پڑھائی مفت؟ اور اخراجات بھی؟ واہ بھی۔ یہ تو کمال ہو گیا۔“

بڑی امی بہت خوش تھیں۔ بار بار سعدی کے سر اور کندھے پر ہاتھ پھیکر کر تھیں۔ پھر فرما اضافہ کرتیں۔

”ندرت سے امید نہیں تھی کہ بچوں کو پڑھا پائے گی۔ اصل میں تمہارا بابا پر بہت لائق تھا۔ تم اور حنة اسی پر گئے ہو۔“ اور سعدی اور حنة کے لیے یہ باتیں بے اثر تھیں۔ بڑی امی کے پاس ایک پوری فہرست تھی کہ فلاں صدی میں فلاں کے گھر ندرت نے مجھے یوں اور یوں کہا اور ندرت کے پاس بھی ایسی ہی ایک چارچین شیٹ ہے وہ وقت تیار ہتھ تھی۔ اور ان دونوں کی غیر موجودگی میں سعدی کہتا تھا۔

”ہر شخص کو اپنا کام کرنا چاہیے۔ اللہ نے مرد کو دو کان اس لیے دیے کہ ایک سے سن کر دوسرے سے نکال دے۔ اور عورتوں کو دو ام کرتا تھا۔“

اے یہ تاکہ دونوں سے سن کر منہ سے نکالیں۔“

اور زمزاموشی سے مسکراتی تیک لگا کر بیٹھی اسے سن رہی تھی جو تب سے بولے چارا تھا۔

”میم نے مجھے ان کا نام لئک نہیں بتایا۔ میرا بہت دل تھا کہ میں ان سے ایک دفعہ کران کا شکر یہ ہی ادا کر سکوں۔“ وہ یاد کر کے پھر ہے اس ہوا۔ خین نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس نے آگے ہو کر چوتھا نکلا، پیچھے ہوئی اور پوری دل جمعی سے لمانے لگی۔

”زمر!“ سعدی لخطہ بھر کو چونڈا۔ ”آپ تو میڈم کو جانتی ہیں نا؟ آپ ان سے پتا کروادیں تاکہ مجھے اپانے سرکس نے کیا ہے؟“ زمر ہنوز مسکراتی تھی۔ مطمئن اور ہر سکون۔ سعدی کی بات پر چند لمحے کے وقٹے سے وہ بولی۔

”ٹھیک ہے میں پتا کروادوں گی۔ اگر انہوں نے نہ بتایا تو میرے اتنے ذرا لائے ہیں کہ میں وہ نام ڈھونڈ لوں گی، لیکن.....“ وہ لخطہ بھر کو ملی۔ ”سعدی! احسان کا بدل کیا احسان کے سواب بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ اگر تم جاننا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے مگر تمہیں نہیں لگتا کہ اگر کوئی تم پر پیسہ لگا رہا ہے اور بد لے میں صرف اس کی اتنی خواہش ہے کہ وہ بے شاخت رہے تو تمہیں اس خواہش کا احترام کرنا چاہیے؟“

سعدی کے لب ”اوہ“ میں سکرے۔ خین نے اب پانچواں نکلا اٹھایا۔

”یہ تو.... میں نے سوچا ہی نہیں۔“

”ہاں زمر ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس آدمی کے پاس ہو گا فالتو کا پیسے۔ یہ نہ ہو کہ تمہارے ایسے قدم سے ناراض ہو کر فیض دینے سے اکار کر دے۔“ بڑی امی بہت سمجھداری سے کہنے لگیں۔ زمر کی مسکراہٹ ہنوز برقرار تھی۔ سعدی نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ پھر یاد آنے پر پوچھا۔

”جی جب ہم داخل ہوئے تو وہ حکومت صاحب باہر نکل رہے تھے۔ یہ وہ پا پر ٹیلی ڈیلر ہیں ناجن کے پاس آپ نے مجھے بھیجا تھا جب ام کمرید لئے کا سوچ رہے تھے؟“

زمر کی مسکراہٹ صرف لمحہ بھر کو بیکی ہوئی۔ پھر وہ دوبارہ مسکرا دی۔ بڑی امی نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں۔ ان کی جائیداد کا کیس میں ڈیل کر رہی تھی۔ اصل میں ان کی بھوکی اپنی ساس سے بالکل نہیں بنتی، تمہیں بیٹھا حصہ مانگ رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ بھوکانی سمجھدار لڑکی ہے اور سارا قصور ساس کا ہی ہو گا، مگر....“ کن اکھیوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے وہ سانس لپنے کو کی کہ بڑی امی کافی جوش میں آگے ہو کر کہنے لگیں۔

”کیوں؟ تمہیں کیا پتا دہ ساس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے جب....؟“

”چھوڑیں نا۔ ہمیں کیا بڑی امی! آئیے کیک کھاتے ہیں۔“ سعدی جلدی جلدی کہتا میز کی طرف رخ موڑ کر بیٹھا تو....

کیک نفاست سے کثا آؤ دھا بچا تھا اور دوسرا طرف صوفے پر خین یوسف بالکل صاف ہاتھ منہ کے ساتھ ہتھیلی پر ٹھوڑی بجائے ٹلاما اقبال کی طرح خلا میں گھور رہی تھی۔ سعدی نے اسے گھورا اور زمر نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ سعدی کو نظر انداز کر کے زمر کو دیکھ کر شرمیلا سا مسکرا دی۔

”میرا انداز تھا کہ آج تم لوگ آؤ گے۔ اس لیے میں نے بھاری کباب بھی منگوایا ہے تھے۔ پہلے وہ کھاتے ہیں پھر کیک۔“

زمر کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ سعدی بس سر جھنک کر رہ گیا۔ وہ اس نامعلوم شخص کی وجہ سے اتنا ہل قا کہ گھر جا کر امی کو خین کا بتانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اور چوکھت میں ذرا اوٹ میں کھڑے بڑے اپانے تاسف اور فکر مندی سے زمر کے چہرے کو دیکھا جو بہت طہانیت سے مسکراتی ہل کھن کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں کوئی چھقتاوا، کوئی ملاں نہیں تھا۔ ملاں تو ان کے دل میں بھی نہیں تھا، مگر زہن میں پریشانی ضرور تھی۔

سعدی اب بڑی امی سے پوچھ رہا تھا کہ وہ اس کے ماموں کے کزن کی شادی میں آئیں گی یا نہیں؟ اور بڑے ابا گہری سانس لیتے اندر چلے آئے۔ ابھی انہیں سعدی کا سر پر اائز پہلی دفعہ سن کر اس پر پہلا تاثر زندگی نہ تھا۔

❖❖❖

کاردار خاندان کا قصر موسمِ گرم میں بھی بہار کے پھولوں سے سجا تھا۔ ولیم کی دعوت کا قسم "پھول" تھے اور وہ جگہ جگہ کمپیرے گئے تھے۔ لان میں مستطیل میزوں کے گرد صوف تھے اور مہمان کہیں بیٹھے، کہیں چل پھر رہے تھے۔ ان سب میں مرکز نگاہ وہ جوڑا تھا جس کے اعزاز میں وہ سب جمع تھے۔ ہاشم کا سوت سیاہ تھا اور شہرین کا گاؤں متی جیسا سفید۔ سرپ پاریک کاردار دوپٹا کندھوں کے پیچھے گرتا تھا اور وہ ہاشم کی کہنی کو تھاے بہتی ہوئی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ کافی دری سے وہ دونوں آگے پیچھے مہماںوں میں گھوم رہے تھے۔ ان کو دیکھتی نگاہوں میں حسر رقبات، خوشی، غلوص، غرض ہر طرح کے لوگوں کا ہر طرح کا جذبہ موجود تھا۔ صرف ایک شخص کی نگاہ مختلف تھی۔

سعدی اور حسین کی میز پر موجود وارث بہت خاموش اور یقینی نظر وں سے ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خود فارس سے ذرا بڑا صاف رنگت اور گلاسز والاخوش شکل سامنہ رکھتا۔ اس کے انداز میں اس خاندان کے لیے قدر نے ناپسندیدگی تھی اور وہ شاید صرف فارس کے مدعا کرنے پر آیا تھا۔

"خالہ اور بچوں کے بغیر کیسی گزرہی ہے ماموں؟" ساتھ بیٹھے سعدی نے مخاطب کیا تو وارث نے ہاشم سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔ سعدی اپنے اکتوتے سوت میں جواس پر ذرا لکھا تھا، بڑا بڑا لگ رہا تھا۔

"بس اب تو صرف تین سال رہ گئے ہیں۔" وہ دھیما سما مسکرا یا۔

"آپ ہماری پارٹی میں کیوں نہیں آئے؟" سامنے ہتھیلی پر ٹھوڑی گرائے بوری پیشی حسین نے ناراضی سے پوچھا۔

"کیا اس کوئی گم کو کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا سعدی؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" رزی فلموں کے سارے با اعتماد اور ترنت جواب حسین کو یاد تھے۔

"میں مصروف تھا۔ اور پھر جس پارٹی پر تم لوگ اپنی پچھوکو ملاتے ہو اس پر میرا آنا نہیں بنتا۔ اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا۔" حسین چپ ہو گئی۔ پھر بورسی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تب، وہ اپنی دہن کے ہمراہ ان کی میز نکل آیا۔ وہ تینوں اس کے لیے کھڑے ہو گئے۔

"بس.... باقی سب کہاں ہیں؟" ہاشم نے شہرین سے تعارف کرو کر حیرت سے سعدی کو دیکھ کر پوچھا۔

"سیم کو بخار تھا تو امی اس کے پاس رک گئی۔ بڑے ابا کی فیملی کو بھیں اور جانا تھا اور فارس ماموں...." کہتے ہوئے سعدی نے لان کے داخلی چیک پوائنٹ کو دیکھا۔ مگر پھر وہ انپونگ کلاس کے لیے چلے گئے۔

(جبکہ فارس نے بس سرسری سا پوچھا تھا، تمہارے دادا کی فیملی نہیں آئے گی؟ سعدی نے بتایا "نہیں" تو وہ بس دس منٹ رکا اور پھر انٹھ گیا۔ وارث بھی زیادہ درینہیں بیٹھنا چاہتا تھا، مگر سعدی اور حسین کی وجہ سے وہ پابند ہو کر رہ گیا تھا۔)

"اس دن کے لیے دوبارہ شکریہ۔" اس نے پھر سے سعدی کا کندھا تھک کر کھا تو وہ شرمندہ ہو گیا اور بات بدلنے کو ماموں کی طرف مڑا۔

"میں اس دن جو سارا خالہ کے بارے میں بتا رہا تھا، وہ ان کی والائف ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" ہاشم نے مسکرا کر سرہلا یا۔ شہرین پلٹ کر کسی اور سے با تین کرنے میں محو تھی۔ "اور وارث! کیا کر رہے ہو آج کل؟"

جیبوں میں ہاتھڈا لے کھڑے وارث نے ذرا سے کندھے اچکائے۔

”کچھ گزرے مردے اکھاڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

ہاشم نے مسکراتے ہوئے گھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ”میری مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔“

”ہوں.... ضرور بتاؤں گا۔“

ہاشم مسکرا کر جانے کو مڑا، پھر حنہ کو دیکھ کر رکا۔

”میں نے اتنا shakly کیسرہ درک آج تک نہیں دیکھا۔“ اس کی تعریف کر کے وہ پلٹ گیا تو حنین نے شانے جھکلے۔

”پتا نہیں پہلی دفعہ میں کوئی میرا یقین کیوں نہیں کرتا۔“

”کیا شاندار بندے ہیں یہ ہاشم بھائی۔“ واپس بیٹھتے ہوئے سعدی نے بہت فخر سے کہا تو وارث نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ کون ہے؟“

”جی یہ بہت اچھے وکیل ہیں۔“

”بہت اچھے دفاعی وکیل ہیں وہ بھی کرمنڈ کے۔ اور کرمنڈ کے دفاعی شخص کو میں کرمنڈ سے الگ نہیں سمجھتا۔“

”ماموں!“ سعدی بہت سعیدگی سے اس کی طرف مڑا۔ ”ہو سکتا ہے آپ ان کو پسند نہ کرتے ہوں اور شاید ان کی عزت بھی نہ کرتے

اہ۔ اور ہو سکتا ہے ان کی کمپنی کرپشن میں بھی ملوث ہو، مگر اس سب کے باوجود ہم ان کو کرمنڈ نہیں کہہ سکتے۔ میں ان کو جانتا ہوں۔ وہ بہت  
الٹھے ہیں۔“

وارث چپ ہو گیا۔ اگر سعدی کو پتا چل جائے کہ وہ ہاشم کو اتنا نہیں جانتا تو...؟

میری اینجیو مسکراتے ہوئے آئی اور سعدی کے کان کے قریب بھکی۔

”مزکار دار آپ کا انتغفار کر رہی ہیں۔“

وہ چونکا۔ پھر ان سب سے مذدرت کرتا اٹھ آیا۔

باہر نیلی شام میں سیاہی گھلے گئی تھی مگر اندر رہ شنیوں کا سورج جوبن پتھا۔ پھول ہی پھول، روشنی ہی روشنی۔ لا و نج میں رک کر سعدی  
لے کر دن اٹھائی۔ سیرھیوں سے اوپر ہاشم کے کمرے کے سامنے ریلنگ پکھنی نکالے دسرے ہاتھ میں بنیکلس کا موٹی گھماٹی وہ کسی ملکہ کی  
ہمان تے کھڑی تھی۔ سرخ لمبا گاؤں سرخ لپ اسٹک کے ساتھ، آنکھوں میں گہرا کا جل اور گہرا اضطراب تھا۔

سعدی قدماً قدماً چڑھتا اور پر آیا۔ بالکل جواہرات کے مقابل۔

”آپ کا چھوٹا بیٹا کیسا ہے؟“ سعدی نے کھنکھار کر بات کا آغاز کیا۔ جواہرات مضطربی مسکرانے کی سعی کی مگر آنکھوں میں نبی

۴۱۔

”وہ تیار ہے۔ کمرے میں ہے۔ بھائی کے لیے دعوت میں شامل ہو بھی جائے گا مگر... خوش نہیں ہو گا۔“ مسکراتے ہوئے سرجھکئے  
ل میں میں ضبط سے آنکھیں گلابی ہوتی گئیں۔ سعدی نے پتیاں سکیز کر غور سے اس کا چھرہ دیکھا۔

”دیکھنے کا دار صاحب کو علم ہو گیا؟“ جواہرات نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اورنگزیب نے اسے بہت جھڑکا ہے۔ وہ اپ سیٹ ہے۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں مزکار دار؟“ وہ نرمی سے بولا۔

”ہر پریشانی میں ایک ہی خیال ہوتا ہے ہاشم سنچال لے گا۔ مگر آج ہاشم کا بڑا دن خراب نہیں کر سکتی، ورنہ سنچال تو وہ اب بھی لیتا۔“

اس نے فرمی سے سعدی کی کہنی پڑا تھر کھا۔ ”کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟“

سعدی نے گردن موڑ کر شیر و کمرے کو دیکھا۔

”مجھے کوشش کرنے دیں۔“ اس نے دروازے پر دستک دی۔ جواہرات ایک طرف ہٹ گئی۔ سعدی نے دروازہ دھکیلا۔

بیدھ کے کنارے وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سوت جوتے نئی، سب تیار تھا، مگر خود بجھا بجھا ساتھا۔ سعدی کو دیکھ کر وہ پھیکا سامسکرایا۔

”میں سعدی....فارس کا....“

”آئی نو....بھائی نے بتایا تھا۔ آؤ۔“

سعدی چند قدم اندر آیا۔ دروازہ واپس دھکیلا تو وہ چوکھت سے تین انچ کے فاصلے پر جا ٹھہرا۔ باہر کھڑی جواہرات کی مضطرب ماعتیں وہیں لگی تھیں۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ وہ سامنے کھڑے کھڑے احتیاط سے پوچھنے لگا۔ شیر و نے سر جھکا۔

”بتایا تھامی نے کہ تم نے مجھے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ٹھیکنس۔ مگر کاردار صاحب کو علم ہو گیا۔“

”میں نے تمہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ وہ فکر مند تھے۔ میں نے ان کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہا تھا۔“ جواہرات نے چونک کر دروازے کو دیکھا۔ شیر و بھی چونکا تھا۔

”وہ میرے لیے...کبھی پریشان نہیں ہو سکتے۔“ پھر رکا۔ ”کیا وہ واقعی پریشان تھے؟“

”بہت زیادہ۔ اس لیے تمہیں نیچے جا کر ان کو ان کے بیٹے کی شادی کی مبارک باد دینی چاہیے۔“

نوشیر وال کے ماتھے پر بل پڑے۔ آنکھوں میں خفی در آئی۔ ”کیا تمہیں لگتا ہے وہ مجھے معاف کر دیں گے؟“ آواز بلند ہونے لگی۔

”میں ہار دوڑ نہیں جاسکا۔ کولمیا نہیں جاسکا۔ میں ان کے آفس میں دلچسپی بھی نہیں رکھتا۔ میں ڈرگز لینے لگ گیا تھا، اور اس روز ڈرگز کے باعث میں نے خود کو اسپتال پہنچا دیا۔ ان کو اتنا مایوس کیا خود سے۔ اس سب کے بعد وہ مجھے کیا سمجھتے ہوں گے؟“

”صرف اپنائیا۔“

وہ جو غصے سے بولے جا رہا تھا، جھنکا کھا کر رکا۔ تنے تاڑڑھیلے پڑے۔ یک نک سعدی کو دیکھ گیا۔

”اوہ معافی، شکر یہ اور انہما محبت، ان تین چیزوں کی خون کے رشتتوں میں کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف رویہ درست کرنا ہوتا ہے اور سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”اوہ....اوہ اگر انہوں نے مجھے ڈاٹ دیا؟“ وہ اندر سے ڈراہوا تھا۔

”میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں نوشیر وال!“ سعدی نے سر جھکائے جوتے سے لکڑی کا فرش سلتے کہنا شروع کیا۔

”میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں جس کا باپ اسکول میچر تھا۔ تجوہ کم تھی اور گزارہ مشکل سے ہوتا۔ مگر وہ لڑکا کبھی بھی اپنے باپ کے سامنے خواہشات کی فہرست نہیں رکھتا تھا۔ اسکول لے جانے کو پیسے بھی نہ مانگتا۔ مگر جب وہ تیرہ سال کا تھا تو اسکول فنکشن کے لیے اسے نئے جوتوں کی ضرورت پڑی۔ بلکہ ضرورت نہیں، صرف خواہش تھی۔ کیونکہ اس کے دوستوں نے نئے جوتوں کی نمائش کی تھی وہ جن میں رنگ برگی لائیں گی ہوتی ہیں۔ اس روز اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اسے بھی وہی جوتے چاہیں۔ باپ کچھ دیر کوچپ ہوا تو وہ سمجھا کہ باپ نہیں لے کر دے گا۔ وہ باپ سے ناراض ہو گیا۔ اس نے باپ سے بات کرنا بھی ترک کر دی۔ رات اس کے سر ہانے اس کا باپ آیا اور کہا کہ وہ اسے کل جوتے لادے گا۔ بالکل وہی جوتے۔ مگر وہ لڑکا ناراض رہا اور آنکھیں بند کر کے سوتا بن گیا۔

صحیح اس کا باپ اسکول سے جلدی چھٹی لے کر جوتوں کی اس مہنگی دکان پر گیا۔ جانے کہاں سے پیسے جوڑ کر اس نے وہ جو تے

ٹریڈے۔ اور جب وہ سڑک عبور کر رہا تھا تو ایک بس سے اسے کلر مار دی۔ لمحے بھر کو نیچے دیکھتا سعدی خاموش ہوا۔

”جب لوگ اس کے باپ کی لالش کو گھر لائے تو ساتھ خون میں نہیا جو توں کاڈا بھی تھا۔ جوتے آگئے نو شیر وال! باپ چلا گیا۔ اگر تم اس لڑکے کو کہو کہ اس شرط پر کہ اس کی زندگی پانچ منٹ بعد لے لی جائے گی اس کا باپ اس کے سامنے آجائے اور ان پانچ منٹ میں صرف اس کو اٹھنے اور وہ ساری ڈانٹ سن کر صرف معافی مانگ سکے تو اس لڑکے کو وہ پانچ منٹ کی زندگی بھی قبول ہو گی۔ کیونکہ اپنی زندگی کے اگلے پانچ سال میں اس نے یہ بات اچھی طرح جان لی تھی کہ باپ کا کوئی replacement نہیں ہوتا۔“

نو شیر وال کی رنگت زرد پر چکی تھی۔ وہ ایک دم اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جواہرات پیچھے ہوئی، مگر اسے دیکھے بغیر وہ تیز قد موس سے بیڑھیاں اترنے لگا۔ نیچے لاوٹ میں اور نگزیب کھڑے کسی ملازم کو ہدایات جاری کر رہے تھے۔ شیر وال کے قریب رکا جھبجکا، پھر ان کو کچھ کہتے ہوئے ان کے لگے لگا۔ شاید وہ ہاشم کی شادی کی مبارک باد دے رہا تھا۔

اور نگزیب نے سن کر اسے خود سے الگ کیا۔ نھلکی سے کچھ کہتے کوٹ کا بازو جھاڑا جیسے شکن پڑائی ہو۔ مگر اب ان کے چہرے پر وہ بختن نہ تھی اور شیر وال کا پہرہ دمک رہا تھا۔ جواہرات نے آنکھیں بند کیں۔ ساری فنی اندراتاری اور پھر پلت کر کرے میں آئی۔

سعدی یونہی سر جھکائے کھڑا تھا۔ آہٹ پستے ہوئے چہرے کے ساتھ ہلاکا سما کرایا۔

”تھیں!“ وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”کیا واقعی.... اور نگزیب اس دن شیر و کے لیے پریشان ہوا تھا؟“

”اور کیسے پریشان ہوا جاتا ہے؟“ اسے الثابت ہو گا۔ جواہرات نے مسکرا کر سر برہلایا۔

”شاید میں بھی شیر وال کی طرح بھی بھی اس کو سمجھنیں پاتی۔ وہ ایک سخت گیر باپ ہے، مگر.... اسے صرف ہاشم سن بھال سکتا ہے۔ نہیں... کبھی بھی آجایا کرو۔ تم سے بات کر کے اچھا لگتا ہے۔“

”میں لیدز چلا جاؤں گا جلد۔ مجھے اسکا رشپ مل گیا ہے۔ کیمیکل انجینئرنگ۔“

”شیر وال بھی.... انجینئرنگ پڑھے گا۔“

”مگر وہ تو ماچھر سڑ جائے گا ہاشم بھائی نے بتایا تھا۔“

جواہرات نے ایک نظر سعدی پر ڈالی اور ایک شیر و کے کمرے پر۔

”نہیں، اس نے ابھی فیصلہ نہیں کیا۔“

(اچھا؟ سعدی کو حیرت ہوئی۔ ہاشم بھائی تو بالکل شیبور تھے۔)

”کیا تم مجھے اپنی فیملی سے نہیں ملواؤ گے؟“ وہ مسکرا کر خود کو کپوز کرتی اس کے ساتھ باہر آئی۔ سعدی نے بھی مسکرا کر سر برہلایا۔

وہ دونوں ہمراہ چلتے جب بیڑھیوں کے وسط میں تھے تو جواہرات نے رک کر اسے دیکھا۔

”اگر اس لڑکے کے والد آج زندہ ہوتے تو اس پر بہت فخر کرتے۔“

سعدی نے جواب نہیں دیا۔ بس ادای سے مسکرا کر زینے اترنے لگا۔

❖❖❖

شام مغرب میں ڈھل چکی تھی اور فارس لاہوری کے کونے والی میز پر بیٹھا بورسا ہو کر بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ سامنے نوٹس اور تباہی بھی منتظری پڑی تھیں۔ وقتاً وہ آتی دھائی دی۔ کندھے پر بیگ ہاتھوں میں کتابیں بال جوڑے میں بندھے۔ تھکے تھکے انداز میں کرسی پہنچنی۔ بیگ رکھا۔ فارس فوراً سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”مجھے نماز میں دیر ہو گئی۔“ اس کو دیکھے بنا وہ بیٹھ کر کتاب کھول رہی تھی۔ فارس نے سر کو خم دیا، پھر لگا کوئی اور بھی سامنے کھڑا ہے۔ چونکہ کرچہر اخھایا تو ساتھ والی کرسی پھینک کر جشید افضل بیٹھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ فارس ناگواری سے اسے روکتا کہ بھائی تم کدھر؟ زمر نے کہا۔

”جشید کو بھی یہی ناپک سمجھنا تھا۔ بیٹھے جشید۔ یا ج ہم کو رکلیں گے۔“ کتاب کے صفحے پلنٹے اشارہ کرتی وہ بہت مصروف لگ رہی تھی۔ تھکی ہوئی بھی۔

عینک لگانے والا وہ دبلا پلا تھیں اسٹوڈنٹ تابداری سے سامنے بیٹھا۔ فارس نے تند نگاہوں سے اسے گھورا اور ضبط سے رخ پھیر لیا۔ وہ شدید بد مزہ ہوا تھا۔ خودا سے بھی معلوم نہیں کہ کیوں۔

زمراب بال پین ہاتھ میں پکڑے باری باری دنوں کو دیکھتی سمجھا رہی تھی۔ جشید جلدی جلدی رجسٹر پونٹس لینے میں مگن تھا اور فارس گا گا ہے بگا ہے ایک اکھڑی اکھڑی سی نظر اس پہ ڈال لیتا۔ ”ہونہہ..... یہ بینیں گے وکیل۔ مجھ نے ایک پھونک مارنی ہے اور اس نے اڑ جانا ہے۔“

دس منٹ بعد وہ لڑکا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ کچھ پوچھ رہا تھا اور زمر دوبارہ اسے وہی بات سمجھا رہی تھی۔ فارس کی بیزاری بڑھنے لگی۔ تب ہی زمر کافون بجا کاں ضروری تھی وہ معذرت کرتی انھر کباہر چل گئی۔

اس نے اب بہت فرصت سے پتلیاں سکیڑ کر اس پھنس کو دیکھا۔ پھر اس کے سامنے انگلی سے میز بجائی۔ رجسٹر پکھتے لڑکے نے چونکہ کرا سے دیکھا۔

”وہ کتاب پکڑا۔“ تھکم سے میز کے دوسرے سرے پر کھکھ کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تابداری سے سرہلا تھیے ہی انھا، فارس نے اس کی کتابوں کے ساتھ رکھا اس کا موبائل اچک کراپنی جیب میں رکھا۔ لڑکا واپس آیا، کتاب سامنے رکھی اور رجسٹر پہر سے کھول لیا۔ فارس نے ہمچل اس کے سامنے کی۔

”ذرافون دینا اپنا۔ میرا کریڈٹ نہیں ہے۔ ایک کال کرنی ہے۔“

لڑکے نے مکرا کر اپنی کتاب ہٹائی، پھر رجسٹر ہٹایا، پھر نوٹس ایک طرف کیے۔ مکراہٹ غائب ہوئی۔ وہ پریشان سا چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ پھر جیب تھپٹھپتا۔

”نہیں! بھی تو میرے پاس تھا۔ آپ بیل دیں گے ذرا؟“

”لو..... میرا کریڈٹ ہوتا تو تم سے کیوں مانگتا۔“ اس نے ناک سے لکھی اڑائی۔ ”ویسے آخری دفعہ کہاں استعمال کیا تھا فون؟“

”وہ.... ہاں.... ڈاکٹر عبدالباری کے آفس کے سامنے۔“

”وہ تو دبلا کس دورے۔ راستے میں گرا ہو گا۔ اب تک تو کوئی لے اڑا ہو گا۔ یوں کرو، واپس جاؤ اور راستے کا ایک ایک پھر اٹھا کر دیکھو۔ شباباں۔“ ساتھ ہی اس کا شانہ تھپٹھپایا۔ وہ سنگل پسلی ہل کر رہ گیا۔ پھر جلدی جلدی چیزیں سمیتا ہاں سے بجا گا۔

زمر جب آئی تو جو گم چباتا فارس اکیلا وہاں بیٹھا تھا۔ اس نے تجھ سے خالی کری کو دیکھا۔

”یہ کہاں گیا؟“

”پتا نہیں۔ کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اتنی جلدی میں بھاگا کہ موبائل بھی چھوڑ گیا۔“ لاپرواں سے میز پر کہے موبائل کی طرف اشارہ کیا جس کو وہ آف کر چکا تھا۔ زمر ناگواری سے سر جھکتے واپس بیٹھی۔

”یہ نان سیر لیں اس توڈٹھی بھی نا۔“

”نہیں! آپ اصرار کرتی ہیں تو اس کا انتظار کر لیتے ہیں۔ آدھا پون گھنٹہ ہی لگے گا اسے۔“ بہت ہی خیر خواہی سے پوچھا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ درشتی سے کہتی کتاب کھونے لگی۔ وہ سر ہلا کر بہت انہاک سے اسے سننے لگا۔ اب وہ بہت موسوس کر رہا تھا۔

❖❖❖

اس اونچے اور نیس لاونچ میں نہ پھول تھے نہ اس دن کی رونق۔ ایک کنارے پر قد آور کھڑکی کے ساتھ دو کرسیاں ساتھ ساتھ رکھیں۔ ان کے درمیان چھوٹی میز پڑی تھی۔ ایک کرسی پر جواہرات ناگ پٹانگ جائے بیٹھی، گردن ذرا تر چھپی کے باہمیں ہاتھ پر بیٹھے سعدی اُملرا کرن رہی تھی جو آگے کوہ کر بیٹھا اپنے ہاتھوں کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔

”پھر ابو کے ایکیڈنٹ کے بعد ای نے یونگ شروع کر دی۔ اب تو وہ ریٹائر ہونے والی ہیں۔ صحت بہت اچھی نہیں ہے ان کی۔“  
وہ کافی دیر سے بولتا اب خاموش ہوا۔

جواہرات نے مسکرا کر ابراچکائے۔ ”اچھا گا تمہیں سن کر۔ اس سے بھی زیادہ اچھا یہ کہ تم میری ایک کال پر چلے آئے۔ آتے جاتے  
ہا مرلو۔“

”اب اگلے سال چھٹیوں پہ ہی آؤں گا۔ ہاں کوشش کروں گا کہ کبھی شیر دے مانچستر میں ملاقات ہو جائے۔“

”کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ وہ بھی تمہاری ہی یونیورسٹی میں جا رہا ہے؟“ سعدی نے چونک کرا سے دیکھا۔ وہ بدستور مسکرا ای قمی۔

”مگر.... وہ چپ ہو گیا۔“

”میں جس سعدی یوسف کو جانتی ہوں وہ کافی صاف گو ہے۔ تو تم بتا کیوں نہیں دیتے کہ تمہیں کیا برالگا ہے؟“

”آئی ایم سوری.... مگر.... آپ نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر کیوں مجبور کیا ہے؟“

”میں نے صرف خواہش کی اور وہ مان گیا۔“

”مگر.... کیوں؟“

”تم درست سوچ رہے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میرے بیٹے کے ساتھ رہو۔“

سعدی نے الجھ کر اسے دیکھا۔ ”مسنکاردار! اگر آپ چاہتی ہیں کہ اس کا خیال رکھوں تو میں بے بی سڑنہیں ہوں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ اس کو ہر وقت نصیحتیں کرتا رہوں تو میں مبلغ بھی نہیں ہوں۔ اور اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں اس کے پل پل کی خبر آپ کو دوں تو میں جاسوس بھی نہیں ہوں۔“

”میں بھی سب چاہتی ہوں مگر بے بی سڑ، مبلغ یا جاسوس کی حیثیت سے نہیں۔ ایک درست بن کر۔“

”ہماری پہلے ہی اچھی دوستی ہو چکی ہے اور درست بن کر میں یہ سب کر سکتا ہوں۔ لیکن جتنا میں آپ کے بیٹے کو سمجھا ہوں۔“ اس لئے میں گردن ہلائی۔ ”اگر اسے علم ہوا کہ آپ نے میری وجہ سے... اونھوں.... وہ بہت خفا ہو گا۔“

”سعدی! میرا بینا ڈرگز پڑھا، باپ سے نالاں تھا۔ اب وہ وعدہ کر چکا ہے خود کو بدلنے کا، مگر کیا مجھے اس کا یقین کر لینا چاہیے یا اس لی لہر کرنی چاہیے؟ مجھے اس کی صحت کی فکر اس کی یونیورسٹی سے زیادہ ہے۔ اور مجھے لگا کہ میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ کیا تم میرے ادست نہیں ہو؟“

سعدی نے گھری سانس لے کر اثبات میں سرہلایا۔  
”اوے۔ مگر میں اس کی پشت پر کبھی بھی کچھ ایسا نہیں کروں گا جس پر وہ مجھ سے خفا ہو۔ خیر! آپ بتائیں ہاشم بھائی کیسے ہیں؟ ان کے حق میں پڑھنے کے بعد آپ تو ان کو بہت مس کر رہی ہوں گی۔“

جو اہرات نے شانے اپکائے۔ ”اس کی غیر موجودگی میں تو یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔“

”وہ اپنی بیوی کے ساتھ واپس آئیں گے تو پھر دنق ہو جائے گی۔“

”محبت انہی ہوتی ہے۔ مگر امید ہے کہ شادی آنکھیں کھول دے گی۔ اسے جلد علم ہو جائے گا کہ اس لڑکی نے صرف اس کے اٹیش کی وجہ سے اس سے شادی کی ہے۔“

سعدی کو اس بات کی امید نہیں تھی۔

”اگر.... ایسا تھا تو آپ نے ان کو روکا کیوں نہیں؟“

”میں روکتی تو وہ نہ کرتا۔ زیادہ بہتر ہے کہ وہ تجربہ کر کے سکھے۔ پھر ہاتھ اٹھا کر پانچ انگلیاں اسے دکھائیں۔“ پانچ سال بھی نہیں

چلے گی اس کی یہ شادی۔ تم یہ بات کسی ڈائری میں لکھ کر رکھ لینا۔“

”اچھا۔ مجھے تو وہ اچھی لگ رہی تھی ان کے ساتھ۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”وہ اس لیے کہ تم اچھے ہو۔ اور تمہیں ایک بات کہوں؟“ پوچنکہ وہ اس کے با میں طرف بیٹھا تھا تو جواہرات ترچھی ہو کر اس کی طرف

مڑی۔ ”سعدی کا مطلب ہوتا ہے خوش قسمت۔ اور بہت اچھے لوگ کبھی بھی خوش قسمت نہیں ہوتے۔“

”یہ منحصر ہے کہ آپ خوش قسمت کے کہتی ہیں۔ غم کامنا بند قسمتی نہیں ہے۔ خوشی کامنا خوش قسمتی نہیں ہے۔“

جو اہرات نے مسکرا کر گلاس اٹھایا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

وہ جب اوپر شیر و کمرے میں آیا تو وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کوئی گیم کھیل رہا تھا۔

”آؤ بیٹھو۔“ اس نے اسکرین پر نظریں مرکوز کیے اپنے پیچھے سے ایک کشن نکال کر سعدی کی طرف اچھا۔ سعدی نے کشن اس کے

قریب رکھا اور وہیں بیٹھ گیا۔

”تمہاری می نے بتایا کہ تم بھی لیڈز جار ہے ہو۔“

”ہاں انہوں نے بتایا تھا کہ تمہارا بھی وہیں داخلہ ہوا ہے۔“ وہ بہت انہاک سے گیم کی طرف متوجہ تھا۔ ایک دم بر اسمانہ بنا کر کہا

کیز زور سے دبا تیں اور پھر ”اف“ کر کے میز پر مکارا۔ گیم اور۔

”تم ابھی اس کے چالیسویں راؤنڈ پر ہو؟“ سعدی نے تعجب سے اسکرین کو دیکھا۔ ”میری بہن تو ایک سو دس راؤنڈز کر چکی ہے۔“

شیر و بے نیچنی سے اس کی طرف مڑا۔ ”میں مان ہی نہیں سکتا۔ سو سے اوپر پوری دنیا میں صرف تین لوگ گئے ہیں اور ان کا نام الی

اسکورر کی فہرست میں ہے۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔“ اسے جیسے سعدی کی اس بڑھک کو جلد سے جلد غلط ثابت کرنا تھا۔ فوراً بہن دباتا کچھ سے

کھولتا گیا۔ بیہاں تک کہ ایک فہرست سامنے آئی۔ سعدی خاموشی سے دیکھتا رہا۔

”یہ دیکھو! اس گیم میں آج تک صرف بھی لوگ....“ نو شیر و اس بولتے بولتے ہکلا گیا۔

فہرست کا دوسرا نام جگہ گاتے ہوئے اس کے سامنے تھا۔ اُرجن یوسف۔

”یہ میری بہن ہے۔“ سعدی نے بنا کچھ جتنے اشارہ کیا۔ نو شیر و اس بالکل پھٹی پھٹی تھا ہوں سے اس دل افراد کی فہرست کو دکھا۔

تھا۔ باقی بہت سے لوگوں نے اپنے ناموں کی جگہ کم نیبر بھی رکھے ہوئے تھے۔ اگر جنین کا کوئی اور نک اور توتا تو وہ سعدی کو جھوٹا قرار دیتا۔ مگر....

”خیر اپنے پوہ پھر بھی نہیں ہے۔“ شیرونے بظاہر لاپرواں سے ناک سے کمھی اڑائی۔ سعدی کی نظریں فہرست کے سب سے اوپر اے نام تک اٹھ گئیں۔ اس نے ذرا آگے ہو کر پڑھا۔ وہ نک نیم تھا ”Ants Everafter“

”یہ کون ہے؟“ بہت دفعہ جنین نے اسے یہ فہرست دکھائی تھی، پھر بھی اس نے نوٹ شایداب کیا تھا۔ شیرونے مذکورہ شخص کی پروفائل پر لک کیا۔

”کوئی امریکن لڑکی ہے۔ اس سے زیادہ معلومات نہیں اپن کر رکھیں۔ کیا تم میرے ساتھ کھلینا چاہو گے؟“ وہ نی گیم شروع کرنے لگا۔

”نہیں۔“ سعدی بورسا ہو کر پیچے ہوا۔  
”میں ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں نوشیروان! کہ میں کوئی بھی گیم نہیں جیت سکتا۔ میرے پاس پھر جنین یا ہاشم بھائی جیسا اماں نہیں ہے۔“



باب: 4

## انسان دوست

اگر تم حوصلہ مجتمع رکھ سکو جب ارڈر گرد  
 سب حوصلہ کھور ہے ہوں اور تم کو موردا لازام ٹھہر ار ہے ہوں  
 اگر تم خود پر بھروسہ کر سکو جب سب تم پر شک کریں  
 مگر ان کو شک کی اجازت بھی دو  
 اگر تم انتظار کر سکوا اور انتظار سے تھکنہ بیس  
 یا تم سے جھوٹ بولا جائے مگر تم نہ بولو  
 یا تم سے نفرت کی جائے مگر تم نفرت کو راستہ نہ دو  
 اور پھر بھی نہ تم بہت اچھے لگوں، بہت عقائد  
 اگر تم خواب دیکھ سکوا اور خوابوں کو اپنا آفانہ بناؤ  
 اگر تم سوچ سکو مگر سوچوں کو اپنا مقصیدہ بناؤ  
 اگر تم ”فتح“ اور ”تباهی“ دونوں سے مل سکو  
 اور ان دونوں دھوکے بازوں سے ایک جیسا سلوک کر سکو  
 اگر تم اپنے بارے بولا گیا چیز سننے کی ہمت کر سکو جسے نادنوں کو بہکانے کے لیے توڑ مردڑ کر پیش کیا جائے  
 یا جن چیزوں کو تم نے اپنی زندگی دے ڈالی، ان کو نہ ٹاہواد کیجھ سکو  
 اور پھر جھک کر ان کو گھے پٹے اوزاروں سے دوبارہ تعمیر کر سکو  
 اگر تم ہجوم سے بات کرو اور اپنے اندر کی اچھائی بھی برقرار رکھو  
 یا بادشاہوں کے ساتھ چلو اور اپنا عام ہونے کا احساس بھی نہ کھو سکو  
 اگر نہ دشمن نہ دوست تم کو دکھ دے سکیں  
 اگر تم بے رحم منٹ کو بھر سکو سماٹھ سینڈ جتنے فاصلے کی دوڑ سے  
 تب.... ہاں تب  
 تمہاری ہوگی یہ زمین اور جو اس میں ہے

اور سب سے بڑھ کر  
تب تم بنو گے ایک "انسان" میرے بچے!

(کپلنگ کی نظم "اگر")

تم نا حق ملکزے چن چن کر دامن میں چھپائے بیٹھے ہو ..... شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کیا آس لگائے بیٹھے ہو  
گھر آ کر سعدی نے سب سے پہلے جنین کے کرے میں جھانا کا۔ پھر یاد آیا وہ اس وقت نیوشن اکیڈمی گئی ہوتی ہے۔ وہ اپنے سمرے  
میں آ کر پیٹنگ کرتا رہا۔ جب مغرب کے قریب لا و نج سے با توں اور لی وی کی آوازیں بلند ہوئیں تو وہ باہر آیا۔ جنین بیگ صونے پر رکھ کر  
(یعنی پھینک کر) پکن میں گھس گئی تھی۔ وہ چوکھت پجا کھڑا ہوا۔

"ایک بڑی خبر ہے۔" مسکراہت دبائے بات کا آغاز کیا۔ وہ فرج سے کھانا نکالنے میں مصروف تھی، مصروف ہی رہی۔

"میں نے آج نو شیر وال کے گھر تمہاری گیم کے ہائی اسکول رز کی فہرست دیکھی۔ معدتر کے ساتھ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اب  
آپ پہلے نمبر پر نہیں ہیں۔"  
"ڈزراب نہ کرو بھائی! مجھے پتا ہے میں ہی ثاب پہ ہوں۔" وہ خفگی سے اسے دیکھ کر پلیٹ لیے لا و نج میں چلی آئی۔ کپیوٹر چیز گھینچی،  
ہن دبایا، ساتھ ہی لقمہ توڑا۔

"آخری دفعہ کب چیک کیا تم نے؟" وہ بھی ساتھ آ کھڑا ہوا۔

"پرسوں۔ آپ کو پتا ہے میں دو دن نیسٹ کی تیاری میں رہی۔ اس لیے کھول نہیں سکی تو آپ مجھے بنا رہے ہیں۔" ایک ہاتھ سے  
کھاتے، دوسرا سے ماوس چلاتے وہ ای میں کھول رہی تھی۔ پھر بلوں پر مسکراہت آئی۔ انگل سے عینک پیچھے کی۔  
"کاردار صاحب کی ای میں آئی ہے۔" سعدی نے بھی آگے ہو کر بڑھا۔ جنین نے ان کو چار پانچ روز قبل مودیز کی ایک فہرست  
بھیجی تھی جوان کو دیکھنی چاہئیں جس کے جواب میں انہوں نے "ٹھینکس" لکھ کر بھیجا تھا۔ ساتھ ایک سائل بھی تھی۔  
جنین مسکرا کر اپنی گیم والی سائٹ کھولنے لگی۔ پھر سب سے پہلے فہرست سامنے لائی۔ اپنام ڈھونڈا، مسکراہت غائب ہوئی۔ وہ  
پلیٹ رکھ کے آگے ہوئی۔ وہ دوسرے نمبر پر تھی اور پہلے پر کوئی اور تھا۔  
"یہ کون ہے؟ اور اس نے کب؟" وہ حیران اور ذرا غصے میں اس کی پرووفائل کھول کر دیکھنے لگی۔ موٹھ اور علقت امر یک سے اس کے  
علاوہ کچھ نہیں تھا۔

"آنٹس ایور آفٹر Ants ever after" اس کا کیا مطلب ہوا؟"

بسکل مسکراہت رو کے سعدی نے شانے اچکا دیے۔ جنین اب خجالت دبائے بے چینی سے ادھرا در صفحے کھول رہی تھی۔ وہ بہت  
منظوظ ہو رہا تھا۔ ہنہوں کو تنگ کرنے سے زیادہ لطف بھی ہوتا ہے کسی چیز میں بھلا؟  
"آخر اس نے جیلی والا راؤ نڈ کیسے پا رکیا؟ اور ایک دم سے ثاب پر کیسے آگئی؟"  
سعدی اسے تنگ کر چکا تھا، سو مسکرا کر پکن میں اسی کے پاس چلا گیا۔ وہ اب بھی ویسے ہی لب کاٹ رہی تھی۔ پھر کچھ درسوجتی رہی  
اور اس کو پیغام بھیجا۔ کھانا و انساب بھول گیا تھا۔  
"ہے!"

”ہیلو!“ اگلے ہی منٹ جواب آیا۔ حسین کی بورڈ پر انگلیاں رکھے اسکرین کو دیکھتی تاپ کر رہی تھی۔

”آپ نے جیلی والا راؤنڈ کیسے پار کیا؟“

ذرائع و قلم سے جواب چکا۔ ”نارمی ہم بات کا آغاز حال احوال پوچھنے سے کرتے ہیں۔“

”میں نارمل نہیں ہوں۔ میں حسین ہوں۔ اب بتاؤ تم نے وہ راؤنڈ کیسے پار کیا؟“

”محنت کی بار بار کوشش اور ہو گیا۔ تو تم حسین ہو پا کتناں سے؟“

”ہاں! اور تم کون ہوا مریکہ سے؟“ وہ ابھی بھی متصرف انداز میں خفگی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں پہلے مسکراتا ہوا نشان ابھر اور پھر پیغام۔

”میں علیشا(Alicia) ورجینیا سے اور میرے آبا و اجداد فرانسیسی ہیں۔“

”فریچ امریکن؟“ حسین نے ملکوں نظرؤں سے اسکرین کو گھوڑا۔ ”میں کیسے یقین کرلوں کہ تم وہی ہو جو تم کہہ رہی ہو؟“

”اوکے، میں کیمروں آن کر دیتی ہوں۔ مجھے اس ہائی اسکو رو سے بات کر کے اچھا لگے گا۔ جس کاریکارڈ میں نے توڑا ہے۔“

اور اس نے کیمروں آن بھی کر دی۔ حسین کے لیے اتنی جلدی یہ غیر متوقع تھا پھر بھی اس نے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا لیے اپنا کیمروہ مگر آن نہیں کیا۔ (درنماں نے کچھ سے جوتا پھینکنا تھا) کانوں میں خوبصورت سی آواز گوئی۔ ”کیا تم مجھے دیکھتی ہو؟“

اسکرین پر چوکھتا بنا تھا جس میں ایک چھوٹا سا بیڈر و نظر آ رہا تھا۔ علیشا کی پیش پر دیوار پر شیشہ تھا جو کمپیوٹر میبل کا عکس دکھاتا تھا۔ وہ واقعی امریکی لڑکی تھی۔ سترہ اٹھا رہا برس کی۔ بال سیاہ تھے، شولڈر کٹ، بہت گوری بڑی بڑی آنکھیں کسی ہلکے رنگ کی اور بہت پیاری مسکراہٹ۔ اسکرین پر اس نے ہاتھ ہلا کیا۔ وہ بھی اتنا مسکرا کر کہ حسین کے ناراض اعصاب ڈھیلے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ذرا پُر جوش سی ہو کر آ گئے ہوئی بات کرنے لگی۔

”تو تم فریچ امریکن ہو؟“

”ہاں، مگر میں خود کو امریکن کہلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں۔“ وہ پھر بھی۔ اسے ہنسنے کی عادت تھی۔

”لیکن تم اپنے نام سے کیوں نہیں آتیں اور تمہارے اس نک نیم کا کیا مطلب ہوا؟“

”اوہ! اوہ....“ اس نے لاپرواٹی سے شانے اپکاتے ہوئے جھک کر دراز سے کچھ نکالا۔

”وہ تو ایک عبارت ہے جو میری کی چین پر لکھی ہوئی ہے۔“ ساتھ ہی سیاہ پچرواٹی کی چین لہرائی اور وہیں میز پر رکھ دی۔ ”مجھے خود بھی اس کا مفہوم نہیں پتا۔“

”اچھا وہ جیلی والا راؤنڈ۔“ حسین کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

”ایک دوپیس بتا سکتی ہوں میں۔“ علیشا دائیں ہتھیلی پر ٹھوڑی گرائے آگے ہو کر بیٹھی بولے لگی۔ حسین بہت غور سے سن رہی تھی۔ جب سعدی وہاں سے گزر کر کمرے میں جانے لگا، اسکرین دیکھ کرستے میں رکا۔ اشارے سے پوچھا کہ کون ہے؟ حسین نے مائیک پر ہاتھ رکھ کر بتایا ”میری تی دوست“ اور فراؤ دوبارہ وہیں متوجہ ہو گئی۔

وہ اپر واچ کا کمرے کی طرف چلا گیا۔

فون کی گھنٹی بجی تو سعدی چونکا اور ادھر ادھر جنہی نظرؤں سے دیکھا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ سات سال گزر چکے تھے اور سب کچھ بدل چکا تھا۔

ٹکان سے سر جھک کر اس نے فون اٹھایا جو ابھی تک ہاشم کی کال کے بعد سے گرم تھا۔

”جی میں آپ کو بھیجا ہوں۔“ آفس میں سے کسی کی کال تھی۔ وہ سر بلکہ کہتا لیپ تاپ اسکرین کو دیکھ رہا تھا جہاں اس نے غلط کمانہ

اے کارپنے ڈینا کو کر پٹ کر دیا تھا۔ اب دوبارہ سے ہاشم کی فائلز وہ کیسے لے گا؟ اف! اس نے فون رکھ کر سر دنوں ہاتھوں میں گرالیا۔ ڈہن خالی ساختا۔

❖❖❖

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناؤک دشام ..... چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت بینکوٹ ہال میں اندھیری شام اس پل خوب روشن تھی۔ موسيقی، قیچیے، رنگ، اسٹچ پ دہادہ بن کے ساتھ رش لگا تھا۔ تصویریں اتر والی ہاری تھیں۔ گروپ فونز پیسی اینڈ نگز، فیری ٹیبلز۔

دوسری جانب کھانا کھل چکا تھا۔ بو فے اسٹینڈ کی طرف جانے والوں میں جنین اور سیم بھی تھے۔ جنین ہلکی گلابی بی فریک اور چوزی ہا بجا میں مبوس تھی اور سیم کا کرتا شلوار تھا۔ وہ قد میں حصہ کے کان تک آتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے وہ ذرا آگے نکلنے لگا تو بہن نے ہل سے پکڑ کر قریب کیا اور تفتیشی انداز میں گھورا۔

”موٹے آلو... ایک منٹ۔ شادی میں کھانے کے تین اصول یاد ہیں نا؟“

”بالکل!“ وہ مڑا اور اس کو دیکھتے ہوئے انگلیوں پر گوانے لگا۔ ”پہلا اصول، وہ چیزیں نہیں کھانی جو صرف معدہ بھرتی ہیں جیسے وال زوٹی اور سلا د۔ دوسرا جو عام طور پر کھاتے رہتے ہیں جیسے مرغی اور بیف، ان پر زیادہ قیمتی گوشت کو ترجیح دینی ہے جیسے مٹن اور پراؤ نز۔ تیرا، اُخڑی اصول، یہ سب اپنا آخری کھانا سمجھ کر کھانا ہے۔“

”درست!“ اس نے رعب سے سر کو ختم دیا اور پھر دنوں ساتھ ساتھ آگے آئے۔ پلیٹ اٹھائیں۔ تقدیمی نگاہ سے دور تک بو فے الفزا جائزہ لیا۔ پھر بار بی کیو کوڈ کیچ کر جنین کی آنکھیں چکیں۔ دنوں پر اعتقاد چال چلتے اس طرف آئے۔

زمر بھی دیں کھڑی تھی۔ نفاست سے پلیٹ میں ذرا سا کھانا ڈالتی۔ آج بھی سیاہ رنگ پہننا تھا۔ گھنگھریا لے بال بھی دیسے ہی اسے بند ہے تھے۔ جنین اسے نظر انداز کر کے اپنی پلیٹ بھرنے لگی۔

زمر نے سراخایا تو وہ ساتھ کھڑی تھی۔ وہ لوگ اکٹھے ہی آئے تھے اور تب سے دنوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ زمر درا مازی اور میز پر کے مایونیز کے بھرے پیالوں میں سے ایک اٹھا کر جنین کی طرف بڑھایا۔

جنین نے یوں ظاہر کیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ کھانا ڈال کر اس میز کی طرف آئی۔ ایک اور پیالہ اٹھایا اور دوسری طرف مڑگی۔ زمر کی ٹراہٹ بھیکی پڑی۔ پیالہ ہاتھ میں رہ گیا۔

”پھپھوا یہ میں لے لوں۔“ سیم نے جلدی سے اس کو شرمندگی سے بچایا۔

جنین نے سن لیا تھا مگر سنجیدگی سے پلیٹ میں گریوی ڈالتی رہی۔ چچ رکھا تو ایک مہندی والے ہاتھ نے اسے اٹھایا۔ بے اختیار اس کا ہیں انھیں۔

وہ کرن تھی۔ کام ارلباس، زیور میک اپ، ذرا بھری بھری سی، بہتی مسکراتی۔ ساتھ میں اس کی کوئی کزن بھی تھی۔ وہ اس سے بات تے ہوئے کھانا ڈال رہی تھی۔ جنین کی نگاہ مزید پیچھے گئی۔ قریب ہی ایک میز پر اس کی ساس تھیں، نوکرانی تھی، دو جڑوں پچے تھے جن کو ہر لر کر کر جھک کر پیار کر رہا تھا۔

جنین نے بے اختیار مز کر زمز کر دیکھا۔ وہ دیکھ چکی تھی اور اب سنجیدگی سے رخ موزگی تھی۔ لتنا تکلیف دہ ہوتا ہے کسی کے پاس وہ نا جو آپ سے چھینا گیا ہو۔ جنین پیچھے مڑی کہ پھپھو کے ہاتھ سے مایونیز کا پیالہ قائم لے گردہ اب سیم کے پاس تھا۔ اب دیر ہو چکی تھی۔ ”حمداء!“ اس نے نام کی پکار پڑتی سنی تو ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اپنی ماں کی میز پر جھک کر کسی سے مل رہا تھا۔ گلاس لگائے ہوئے اچھی

شکل کا تھا مگر اس وقت وہ اسے زہر لگ رہا تھا۔ ذرا دبے دبے غصے سے وہ کھانا نکال کر زمر کے برابر آکھڑی ہوئی۔ امی اور بھائی دور کسی نیکل پر تھے مگر وہ تینوں بیٹیں کھڑے رہے۔

”یہ کریں بالوں والی پراسیکیو ٹرٹھی نامہاد بھائی کی ایکس فیانسی؟“ کرن کی کزن نے اوپنجی سی سرگوشی کی۔ ان دونوں کی طرف ان کی پشت تھی مگر آواز کار است کون روک سکا ہے بھلا۔

کرن نے ترچھے ہو کر دیکھا اور پھر شانے اچکا کر کھانا نکالتے ہوئے بولے۔

”تھی نہیں وہ اب بھی پراسیکیو ٹرٹھی ہے۔ کیریو یکن یونو۔“

”تو اس کی شادی نہیں ہوئی؟ سچ گردے ضائع ہو گے تھے نا؟“

”گردے کا کیا ہے؟ وہ تو مل گیا تھا۔ کوئی فریج عورت کسی آوارہ بھیکتی روح کی طرح اچاک سے آئی اور گردہ دے گئی۔ سولمنی ہے نا!“

خین کا رنگ سفید پڑا۔ پلیٹ پر جنے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوئی۔

”گردے کا بہانہ ہے۔ جو عورتیں کیریو کے پیچھے پڑ جاتی ہیں پھر ان کے گھر کہاں بنتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے دین میں بھی گھر اور خاندان کی کتنی اہمیت ہے۔“

بے نیازی سے لٹ پیچھے کرتے کرن کی آواز اتنی ”دھیمی“ تھی کہ آس پاس کے چند ایک لوگ تو سن ہی چکے تھے۔ خین نے کن اکھیوں سے زمر کو دیکھا۔ وہ کائنے میں مجھلی کا گلزار پھنساتی سنبھیدہ سپاٹ نظر آ رہی تھی۔

”کیا کہہ سکتے ہیں دہشت گردی اتنی بڑھ گئی ہے۔“

”یا! انسان کو خود سمجھتے ہوتی ہے ساری۔ اب کس نے کہا ہے کہ عورتیں قتل کے کیس میں پڑیں؟ اسی لیے ہمارے دین میں....“ یہاں سب کا اپنا اللہ اور اپنا دین تھا۔

”ہیلو کران!“ کسی نے کرن کو خدا طلب کیا تو اس کی مسلسل چلتی زبان رکی۔

زمراہ کسی دوسرے اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ آواز پر لمحے بھر کو رکی، پھر چلتی گئی۔ اور خین کی تو ساری دنیا ہی اس آواز پر رک جاتی تھی۔ وہ جو ذرا ترچھی ہوئی تھی، پوری پیچھے مر گئی۔

اور مری تو کرن بھی تھی، بہت خوشنگوار حیرت سے۔

”ارے ہاشم، آپ!“ وہ ایک ہاتھ میں کانٹا اور ایک میں پلیٹ لیے مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔ بناٹائی کے شرٹ، اوپر گرے کوٹ۔ مسکراتے ہوئے کرن کے رسی کلمات کا جواب دیا۔

”محظی خوشی ہوئی کہ آپ آئے۔ کیا آپ کی مگی بھی آئی ہیں؟“ اس نے ہاشم کے عقب میں دور مجھ میں تلاشنا چاہا۔ وہ ان کی کپنی کے ایک عہدے دار کی بیٹی تھی اور وہ لوگ اس کے باس تھے۔ چند لمحے پہلے کی رعونت، تمکنست، سب غائب ہو گیا۔ خوش اخلاقی عود کر آئی۔

”کیسی ہوتم؟ اور یہ تمہاری آنکھوں کے نیچے اتنے خلقتے کیوں پڑ گئے ہیں؟“ وہ مسکرا کر بہتھا مگر لہجہ اتنا مخفیا تھا کہ کرن کے ہاتھ نے بے اختیار اپنی آنکھوں کو چھوڑا۔

”اپنی صحت کا خیال رکھا کرو کرن! کیونکہ اگر کسی کار بیکارڈ ہو خرابی صحت کی بنا پر کسی عورت کو چھوڑ دینے کا، تو میں سوچتا ہوں اگر موجودہ عورت کی بھی ناگنگ، بازو کی بڑی بھی ٹوٹ گئی تو اس کا کیا ہو گا؟ ہیلو خین!“

وہ کہہ کر خین کو خدا طلب کرتا آگے بڑھ آیا۔ کرن بالکل ہکا ہکا سی کھڑی تھی مگر خین اب اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے لب

۱۱۰۸۔ اے لکھ تھے۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ سر کے خم سے جواب دیتی وہاں سے ذرا دور ہٹی، ایسے کہ ہاشم بھی ساتھ ہی چلا آیا۔ کرن

۱۱۰۹۔ امر، درنبل پہ سیکم سعدی اور مدرست کے ساتھ جانپنگی تھی۔

۱۱۱۰۔ یہ کرنے کی۔“ کہتے ہوئے حنین نے دور ز مر کو دیکھا۔“ کیا ضرورت تھی؟“

۱۱۱۱۔ میں نے زمر کے لئے نہیں کیا اور تمہیں یہ معلوم ہے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں شانے ذرا اچکا کر پلیٹ میں چاول ڈال رہا تھا۔

۱۱۱۲۔ آپ بس اتنا سالیں گے؟“ اس نے پہلے ہاشم کی پلیٹ کو دیکھا۔ پھر اپنی۔

۱۱۱۳۔ اس میں بھی بہت کیلو ریز ہیں جس کا مطلب ہے ایکشہ اور ک آٹ۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ سمجھا کرو۔“ حنین نہیں کر سمجھکلتی

۱۱۱۴۔ الہانے لگی۔ ہاشم نے کانٹے میں پھنسا بلکہ امنہ میں رکھتے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا۔

۱۱۱۵۔“ میرے حلقة احباب میں کوئی دوسرا حنین نہیں ہے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔“

۱۱۱۶۔“ وہ پونک کر اسے دیکھنے لگی۔“ یعنی آپ نے واقعی مجھے نہیں پہچانا تھا؟“

۱۱۱۷۔“ ہاں کیونکہ جس حنین کو میں جانتا تھا وہ اتنی گھبرائی ہوئی پر بیشان ہی نہیں ہوتی تھی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کچھ عرصے سے؟“

۱۱۱۸۔“ ہاں اکل ٹھہر گئی۔ کیا وہ واقعی اتنا تبدل گئی تھی کہ ہاشم تک نے محوس کر لیا؟

۱۱۱۹۔“ میں تو دیکھی ہی ہوں اور آپ سے قواب تقریبات میں ہی ملاقات ہوتی ہے۔ (ایفل ناور) آپ کو کیا پتا میں کیسی ہوں؟“

۱۱۲۰۔ منجل کر مسکرا دی مگر ہاشم نے گرد و دائیں سے با ٹائیں ہلائی۔

۱۱۲۱۔“ اور تم چاہتی ہو کہ میں اس وضاحت پر یقین کروں۔ اوکے کر لیا۔“

۱۱۲۲۔“ حنین ذرا سر جھکا کر کھانے لگی۔ دفعنا کسی احساس کے تحت اس نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ دور جواہرات کے ساتھ نو شیر وال کھڑا تھا اور اس، لیہر رہا تھا۔ بگڑے تاثر، پھنسی ہنڑوں کے ساتھ۔ وہ سیدھی ہوئی۔

۱۱۲۳۔“ ایسا کچھ نہیں ہے۔“ ہاشم نے گویا اسے تسلی دی۔ وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ اس نے اب واچکا دیے۔

۱۱۲۴۔“ آپ کا بھائی ابھی بھی مجھے اسی طرح دیکھ رہا ہے۔ اس دن آپ کے گھر بھی اس نے مجھے دیکھتے ہوئے بھائی اور ما موں سے کچھ

۱۱۲۵۔“ وہ ابھی تک مجھ سے عداوت رکھتا ہے۔“

۱۱۲۶۔“ آئی ایم سوری! میں اس کی طرف سے معدرت کرتا ہوں۔“ اس نے نرمی سے کہا اور پھر شیر و کو گھور کر تپہا دیکھا۔ وہ دوسرا

۱۱۲۷۔“ یہ میٹا کا۔ حنین اثبات میں سرہلا کر ڈش سے کتاب نکالنے لگی۔ اس کا چہرہ اب ذرا سخیدہ اور بھجا بھجا ساتھا۔ ہاشم معدرت کر کے آگے

۱۱۲۸۔“ ہر ایک دم رک کر اسے دیکھا۔ کچھ کلک ہوا تھا اچانک سے۔

۱۱۲۹۔“ ٹھہر گیا۔ لمحے بھر کو ساری دنیا ٹھہر گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی تکلیف ابھری۔ مشکل وہ چہرے پر مسکراہٹ لایا، سرا ثابت

۱۱۳۰۔

۱۱۳۱۔“ آئی ایم سوری حنین! آئی ریلی ایم! میں پہلے یہ نہیں کہہ سکا۔ تم سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ مجھے واقعی بہت... آئی ایم سوری!“

۱۱۳۲۔“ نہیں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں درد تھا، تکان تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر ایک بھولا بر الماحا بھرا۔ تب بھی اس

۱۱۳۳۔“ میں ایسا ہی درد تھا۔ حنین نے سر جھکا۔ وہ لمحے بھر میں شادی کی تقریب میں واپس آئی مگر اب ہاشم جاچا تھا۔

۱۱۳۴۔“ اپنی میرتک خالی الذہنی کے عالم میں واپس آئی۔ زمر کھا چکی تھی۔ نشو سے لب تھپتھاتی وہ سعدی سے آہستہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔

۱۱۳۵۔“ میں لے پئے دصیانی سے سن۔

”کیا تم نے وہ اسے واپس کر دیا؟“

”کر دوں گا جلد ہی۔“ سعدی نے مختصر آکھا۔ حنہ چونکی۔ بھائی نے کب نیکل سے واپس کرنا ہے آخر؟ مگر پھر اس کے ذہن کی رو بھک گئی۔ ہاشم کی معرفت.... ذیڑھ سال بعد اس نے وہ شکوہ دور کر دیا جو خین کو اس سے تھا ہی نہیں۔

”سیم! کپڑوں پر مت گراو۔“ ندرت کی توجہ ادھرنیں تھیں۔ وہ حسب معمول سیم کو لتاڑ رہی تھیں۔ وہ بھی آگے سے خین اور سعدی کا بھائی تھا۔

”ای! داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔“

حنہن و اپس آچکی تک مکمل طور پر۔ تنگ کر اسے دیکھا۔

”یہ خوبی ہمارے خاندان پر کسی داغ سے کم نہیں ہے۔“

”مت تنگ کرو اسے۔“ ندرت نے دباد باس گھورا۔ وہ فوراً چک کر بولی۔

”یہ شروع کرتا ہے ہمیشہ۔ تالی دوہاتھوں سے بجھتی ہے۔“

”مگر تھیر ایک ہی سے پڑتا ہے اور گھر جا کر پڑتا ہے۔“

اس دھمکی پر وہ بڑا کسر جھکائے کھانا کھانے لگی۔

سعدی اٹھ کر گیا تو ندرت نے زمر کے قریب ہو کر کہا۔ ”یہ جو نیلے کپڑوں والی جاری ہی ہے نا، یہ میرا کی بیٹی رانیہ ہے۔ ان جیسے ٹمپنی مکمل کی ہے اسی سال۔ مجھے یہ سعدی کے لیے پسند ہے۔“

زمر نے چونک کر اسے دیکھا اور کافی دلچسپی سے۔

”یہ تو بہت پیاری ہے۔ پھر کب مانگ رہی ہیں آپ رشتہ؟“ اس کے چہرے پر جو کرن کی باتوں سے ڈسٹرپ ساتاڑ چھایا تھا، وہ زائل ہو کر صرفت میں بدلنے لگا۔

حنہن نے ایک اچھتی نگاہ اس دراز قدڑ کی پڑاں جو لبے فرماں میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ اور چونکہ اس کے لیے یہ خبر نہیں تھی، اس لیے سر جھک کر کھانے لگی۔

”ابھی بڑے ابا سے مشورہ کرنا ہے پھر ہی کوئی بات شروع ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے بھی بلکہ صرف سوچتے ہوئے بھی ندرت کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔

”اوہ امی! اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟“ سیم نے اپنے تیس بہت بڑوں والا سوال پوچھا تھا اور ندرت کا ہاتھ بس جوتے تک جاتے رہ گیا۔

”کیوں انکار کریں گے وہ ہمارے سعدی کو؟ کوئی وجہ بنتی ہے کیا؟“ زمر نے مسکراہٹ دبائے اس سے پوچھا۔ وہ جواہا مسکرا کر رہ گیا مگر....

حنہن کا چیق بلوں تک لے جاتا ہاٹھ رکا۔ سراٹھیا، سنجیدگی سے زمر کو دیکھا اور پھر دیکھتی رہی یہاں تک کہ زمر نے بھی اس کو دیکھا۔ ندرت سویٹ ڈش لینے اٹھ گئیں تب حنہن بولی۔

”بغیر وجہ کے بھی انکار ہو جاتے ہیں پھر ہو! کسی اچھے بھلے آدمی کو بھی اپنے زعم میں جنگی، جاہل، غصہ و رکھہ کر د کر دیا جاتا ہے۔“

زمر کی آنکھوں میں اچھبا بھرا۔ ”سوری؟“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

”میں تو آپ کی میموری ری فریش کر رہی تھی۔ کیوں؟ کیا آپ نے یہی کہہ کر فارس ماموں کے رشتے کو انکار نہیں کیا تھا؟“ اور سر

ہم کا کر درمیان میں روکا تھجھ منہ میں ڈال لیا۔ پھر رخ پھیر کر سویٹ ڈش کے لیے انھیں۔

اوڑز مر... وہ جہاں تھی، وہیں رہ گئی۔ ساکت جامد۔ سانس تک بند ہو گیا۔ جیسے اندر ہیرے میں بیٹھ رہاں اترتے آخری زینے کے بعد یہ سمجھ کر پاؤں اتارا جائے کہ ابھی ایک زینہ اور باقی ہے اور وہ لمحہ پھر کو پاؤں کا ہوا میں معلق ہو کر زمین کو لگانا... وہ لمحہ بھرا کا شاک... وہ دل لی بے ترتیب دھڑکن... وہ وقت کی رفتار کو تھما دیتی ہے... بالکل خاموش... رکا ہوا وقت۔

❖❖❖

### وجودہ دن سے پانچ سال قبل

کچھ زخم صدیوں بعد بھی تازہ رہتے ہیں فراز ..... وقت کے پاس بھی ہر مرض کی دو انہیں ہوتی نہیں کے کمرے میں فل پنکھا چل رہا تھا۔ کارپٹ پر جائے نماز پچھائے زمر تشدید میں بیٹھی تھی۔ نظریں ہاتھوں پر مرکوز چہرے کے کرد و دوپٹہ لب ملتے ہوئے۔ پھر اس نے دائیں باکیں سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تب ہی زکاہ الماری سے کچھ نکالتی حنین پر پڑی۔ زمر مسکرائی اور وہ جو کسی بات پر جھنگلائی گھری تھی پھیکا سامسکرا دی اور پھر سے چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

زمر ہاتھوں میں دیکھی زیر لب دعائیگی رہی۔ پھر چہرے پر ہاتھ پھیر کر اٹھی تو حنین پنگ کے کنارے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پھر بھا جھاساً دماغ کہیں اور انکا ہوا لگ رہا تھا۔ کوئی پریشانی تھی شاید مگر کون پوچھے اور کون بتائے؟ ان کا رشتہ اتنا پر تکلف تھا کہ دوسال سے سعدی کی غیر موجودگی نے بھی ان کو قریب نہیں کیا تھا۔ بس سکراہٹ سے سکراہٹ تک کا رشتہ۔

”کیا میں اسے سینیں رہنے دوں ہے؟“ اس نے جائے نماز اٹھانے سے قبل پوچھا۔

حنین نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ابھی اسی دو چار صلوٰتیں مزید سنا میں گی تب وہ دسوکرنے جائے گی، زمر کو معلوم تھا۔ حنین چہرہ تھیلیوں پر گرائے بیٹھی رہی۔

”پوچھو! آپ تو ساری نمازیں پڑھتی ہیں نا؟ میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟“ وہ ابھن بھرے انداز میں اس طرح پوچھنے لگی جیسے ریاضی سائنس یا معاشرتی علوم کے سوال ڈسکس کرنے ہیشہ اس کے پاس آتی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کبھی کچھ نہیں ڈسکس کرتی تھی۔ ”پوچھو!“ وہ زمی سے کہتی والپس جائے نماز پر بیٹھ گئی۔

”کیا آپ کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے؟“

”ہاں ہے۔“ زمر کے لیے جواب آسان تھا۔

”کیسے؟ میرا مطلب ہے آپ اس محبت کی تعریف کیسے کریں گی؟“

زمر چند لمحے پر سوچ نگاہوں سے اس کا کم عمر چہرہ ملکتی رہی۔ پھر ذرا سے شانے اچکائے۔

”میرا نہیں خیال کر میں اس محبت کو دیکھائیں کر سکتی ہوں۔“

”اوکے۔ میری ایک کرپھن دوست نے پوچھا تھا، اسی لیے میں پوچھ رہی تھی۔“ وہ سر بلکا کر اٹھ گئی۔

زمر نے گردن موڑ کر اسے ہاتھ روم جاتے دیکھا۔ ماتھے پر کٹے بال اور باقی بال ہمیز بینڈ میں جکڑے کندھوں سے نیچے گرتے تھے۔ چہرے پر پھیل ابھن ابھی وہیں تھی۔ کوئی مسئلہ تھا۔ مگر خیر، اس نے گھری دیکھی۔ اب اسے گھر جانا تھا ورنہ اسی خفا ہوں گی۔

جب حنین نماز پڑھ کر آئی تو زمر جا پچلی تھی۔ چونکہ حنین سامنے نہیں تھی اس لیے وہ آج کچھ نہیں بھولی نہ ہو یاد رہا۔ وہ بس بیزاری سے کپیوڑ کے سامنے آئی تھی اور اسے آن کیا۔ ڈیکٹ ناپ کی گھری اس نے علیشا کی ریاست کے مقامی وقت کے مطابق سیٹ کر رکھی تھی۔ وہاں صبح ہو چکی تھی اور علیشا آن لائن تھی۔

چو کھئے میں علیشا صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ دوسال پہلے کی نسبت اب ذرا بڑی لگتی تھی، یہی کوئی بیس برس کی۔ دوسرے چو کھئے میں حنین تھی۔ اداس اور خفا خفا سی۔ اس کے گھر والوں کو علیشا کی اتنی عادت ہو چکی تھی کہ سارا وقت بھی حنین کا کیسرہ آن رہتا تو کسی کو مسئلہ نہ ہوتا۔ ”تم اداس لگ رہی ہو۔“ علیشا اس کا چہرہ دیکھتے ہی بو جھگی۔ حنین نے گردن دائیں باسیں ہلائی مگر آنکھوں میں وہی اداس چھائی رہی۔

”میں فورم پر تمہارے سوال کا جواب پوسٹ کرنے لگی تھی۔“ ساتھ ہی وہ کیزد بائے جا رہی تھی۔ علیشا نے چیک کیا۔ پھر اس کی آنکھیں اچنپھے سے سکڑیں۔

”حنین! مجھے لگتا ہے تم نے غلط جواب لکھ دیا ہے۔ میرا سوال تھا کیا آپ کو خدا سے محبت ہے؟ تم نے جواب میں پتا نہیں لکھ دیا ہے۔“

”یقین ہے۔ مجھے واقعی پتا نہیں ہے۔“

”مگر...“ علیشا چپ ہو گئی۔ حنین اب مٹھی پھوڑی گرائے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مگر تم اور میں ہم زیادہ تر دین کی بتائیں کرتے ہیں، ایک دوسرے کو اپنے اپنے دین کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اور تم بھی میری طرح اپنی کتاب بہت پڑھتی ہو پھر؟“

”بہت نہیں، میں بختے میں ایک دو فتحہ ہی پڑھ پاتی ہوں۔ جب بھائی تھا تو ہم روز پڑھتے تھے مگر اب مجھے وقت نہیں ملتا۔“ حنہ نے شانے اپنکا کاٹے۔

”دیکھو علیشا! میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں وہ نادنی اور ڈرائے جن میں ہیر دیا ہیر و نہ بہت ہی گناہ ہگار ہوتے ہیں اور پھر کسی بڑے دانتے کے بعد وہ بالکل مذہبی ہو کر اللہ کی محبت میں سب گناہ چھوڑ دیتے ہیں۔ میں ایسی کہانیوں کی بہت قدر کرتی ہوں مگر میں خود کو ان سے ریلیٹ نہیں کر سکی بھی۔ میں اس کا شکر ادا کرتی ہوں، احترام بھی کرتی ہوں، دعا بھی مانگتی ہوں۔ اسے معبد و شیم کرتی ہوں۔ میں ایسی اپنے بھائیوں، اب اوپر (مرڑ کے دیکھا، زمر جا چکی تھی کب کی) اور پکھو دوسرے رشتے داروں سے بہت محبت کرتی ہوں، اسی لیے میں کہہ سکتی ہوں۔“

ذر اتوقف کر کے وہ چہرہ ہتھیلی سے ہٹا کر پچھے ٹیک لگاتے ہوئے صاف گوئی سے کہنے لگی۔

”تمہاری ساری تقریر ایک طرف....ابھی تم کس بات پر پریشان ہو؟ میں صرف اتنا کہوں گی کہ جو بھی مسئلہ ہے اس کو حل کرنے کی کوشش کرو۔“

”ہاں ایک اسکول کا مسئلہ ہے۔ خود ہی حل ہو جائے گا۔“ وہ تئیں ہوئی۔ علیشا نے لب بھیجن کرنی میں گردن ہلائی۔ اس کی سرمنی آنکھوں میں فکر مندی تھی۔

”مسئلے خود حل نہیں ہوتے ہیں اور اس کے دو طریقے ہیں۔ یا تو خود میں ہمت تلاش کرو یا زیادہ ہمت والے کو تلاش کرو۔“ اور پھر وہ عادتاً بنسی۔ یہ اس کا انداز تھا۔

(زیادہ ہمت والا؟) حنین نے مزکر دروازے کو دیکھا۔ پھر فنی میں سر جھنک کر سیدھی ہوئی۔

”کیا تم نے پریزن بریک کا یہ بیزن ختم کر لیا؟“ ساتھ ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ حنین نے بیز اری سے دور پڑے فون کو بجتے دیکھا۔ اسی اور سیم زمر کے جاتے ہی سونے چلے گئے تھے۔ اسے ہی اٹھا پڑے گا۔

”نہیں، ابھی چھٹی قسط پہ ہوں۔ یار! اس بار مزانہبیں آ رہا۔ ویسے مجھے ماںکل سے زیادہ لنکن پسند ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ اس

الت میری ایک رشته دار آٹھی کا فون ہوتا ہے عموماً اور وہ بھی بات کرتی ہیں۔“  
وہ الوداعی کلمات کہتی سائنس آف کرنے لگی۔ پھر بھاگ کر مسلسل بجتا فون اخھایا۔ سی ایل آئی پ نمبر ان جانا تھا، مگر پھر بھی کہیں دیکھ لاماتھا۔

”بیلوب؟ جی جنین بات کر رہی ہوں۔ اوہ.... جی، جی شیور۔ بھی؟ ابھی نہیں مگر شام میں ماموس آئیں گے ہماری طرف تو میں ان کے ماتھا آ جاؤں گی۔ شیور اور نگریب انکل۔“ مسکرا کر اس نے فون رکھا۔ چھرے پر آئی ساری لکفت، یز اری زائل ہو گئی۔ وہ امی کو بتانے بھاگی۔  
اہ، نگریب صاحب کو کام تھا اور انہوں نے اسے بلا یا تھا۔ وہ۔

❖❖❖

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی ..... قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم لیڈز میں سرمی صبح اپنے اندر نی سوئے اتر رہی تھی۔ سارہ کے پکن کی کھڑکی سے بادلوں سے ڈھکا آسان صاف نظر آتا تھا۔ وہ نہ ہے ساس پیں اتار کر گرم دودھ کپ میں انڈیل رہی تھی۔ پیچھے کرسی پر ذکر یہ گیم پیٹھی پھل کاٹ کر سعدی کے سامنے رکھتی جا رہی تھیں۔ وہ ب سے آیا تھا خاموش بیٹھا تھا۔

”کتنے دنوں بعد آئے ہو۔ اتنا نہیں ہوتا کہ چکر لگا لو۔ وہ بھی میرے وارث کو شکایت کرنے پر کہ ندرت آپ سے کہیں سعدی کی خبر لیں تم آئے ہو۔ پی انجو ڈی میں کر رہی ہوں یا تم؟“

اپنے ازلی سادہ انداز میں ابر و سکیٹرے بولتی ہوئی وہ ادھر آئی۔ ٹرے میز پر رکھی۔ باری باری ہر گم میں چیخ ہلایا۔ پھر سب کے مانے مگ رکھے۔ ذکر یہ گیم نے مگ اٹھاتے ہوئے بغور سعدی کو دیکھا۔

”آج سعدی نے آتے ساتھ ہی بچیوں کا نہیں پوچھا۔“

وہ چوک کر سنبھلا۔ ذرا سماں مسکرایا۔ ”نہیں تو۔ میں بس۔“

”وہی تو امی! یہ آج بہت بجھا بجھا لگ رہا ہے۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔“ اپنا کپ لے کر سامنے ٹیکھتی وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔  
اوہ شرمندہ ہو گیا۔

”اصل میں... میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا ایک دوست ہے، اس کا مسئلہ ذرا پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔“

”اوے کے۔“ سارہ نے توجہ سے سنتے ہوئے کپ لبوں سے لگایا۔

”اس لڑکے کی می کافی.... کافی پوزیسیو ہیں اور کیسرنگ بھی۔ وہ ادھر آیا بھی اس لیے کہ اس کی می اس کو میرے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں  
تاکہ میں اس کا خیال رکھوں اور اس پر نظر بھی رکھوں۔ وہ ڈرگز پر چلا گیا تھا پہلے۔“

”اوہ.... تو کیا اس نے ڈرگز چھوڑ دیں؟“ ذکر یہ گیم نے ذرا فکر مندی سے پوچھا۔ سعدی کے چھرے پر بے بسی در آئی۔

”یہی تو مسئلہ ہے۔ میرے اور اس کے سمجھیک اگ ہیں ڈیپارٹمنٹ اگ ہیں۔ کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے۔ اس کی می کی ہر میل کے جواب میں، میں سب اچھا ہے کی رپورٹ دیتا تھا مگر ابھی کچھ دسی لڑکوں سے مجھے پتا چلا ہے کہ وہ پھر سے ڈرگز پر چلا گیا ہے۔ شاید کوئی لڑکی پہنچ گئی ہے اسے۔ ایک تو اسے بھی ہر میئنے پیچی محبت ہو جاتی ہے۔“ آخر میں وہ جمل کر بولا۔ ذکر یہ اور سارہ نہیں پڑیں۔

”اس دن اس نے گاڑی کہیں ماری ہے۔ جرمانہ بھی ہوا، مطلب چالان۔ شکر ہے وہ اس وقت ڈرگز پر نہیں تھا ورنہ معاملہ بگر جاتا۔

اہ کی می کو نہیں معلوم یہ بات۔ اب میں کیا کروں؟ دوست کی شکایت لگاؤ یا اس کے عیب چھپاؤں؟“

”دیکھو سعدی!“ سارہ کپ رکھ کر سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”ایک ماں ہونے کی حیثیت سے میرا حق ہے کہ مجھے اپنے

بچے کے ہر کام کی رپورٹ ملے۔ اگر تم اس کے بچے دوست ہو تو اس کی ماں کو ضرور بتاؤ تاکہ وہ اس کی اصلاح کر سکے۔ اگر اس کی جگہ یہم یہ کہا تو تم یہی چاہتے کہ تمہاری امی کو خبر دی جائے۔ ہے نا؟“

”اوہ!“ سعدی کے لب سکڑے۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سمجھ گیا تھا۔

”سارہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کی ماں کو بتاؤ تاکہ وہ جو تے لگائے وہ اس کو۔“ ذکیرہ یہم کی ساری ممتازاً جاگ انھی تھی۔ وہ مسکرا کر رہا گیا۔

”تھیک یا آپ دونوں کا۔“ پھر کپ اخھاتے ہوئے موضوع بدلنا۔ وارثِ ماں ماموں ٹھیک ہیں؟ صرف ایک سال رہ گیا ہے نا آپ کے پروگرام کا؟“

”صرف؟ پورا ایک سال پڑا ہے۔“ سارہ گھونٹ بھرتے ہوئے اداسی سے مسکرائی۔ ”اور پھر ہم بالآخر ایک فیملی ہوں گے اور فیملی کی طرح رہیں گے۔ بہت خوار کر دیا ہے ان پڑھائیوں نے۔“

”واقعی!“ ذکیرہ یہم بھی سارہ کو دیکھتے ہوئے معمومی مسکرا دیں۔ صرف ایک سال.... پورا ایک سال.... رہ گیا تھا۔

سعدی مسکرا کر گھونٹ بھرنے لگا۔

❖❖❖

ہمیں نے روک لیا پنجہ جنوں ورنہ..... ہمیں اسیر یہ کوتاہ کمند کیا کرتے لا دُخ کی قدر آدم کھڑکی کے ساتھ جواہرات کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی اور ہاتھ میں جذڑے موبائل پر سعدی کی تازہ ای میل کھلی تھی۔ موبائل اتنی دیر سے یوں پکڑ رکھا تھا کہ اسکرین پسینے سے نہ ہو گئی تھی۔ میری انتخیب قدم چلتی اس کے قریب آئی۔ مکو دب ساپکارا۔

”مسز کاردار! آپ کی تمام پیکنگ مکمل ہو گئی ہے۔ رات کے لیے لیڈز کی فلاٹیٹ بھی بک کر دادی ہے اور مسز شہرین نے کہا ہے کہ وہ بھی چلیں گی۔“

جو اہرات نے ابرو سے ”ہوں“ کا اشارہ کیا تو وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ تب ہی اور نگزیب سیر ہیاں اترتے دکھائی دیے۔ جواہرات آہٹ پر بھی بدستور باہر دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ بیچھے ایک صوفے پٹانگ پٹانگ جما کر بیٹھ گئے۔

”اچا کنک ہی تم نے انگلینڈ جانے کا پروگرام بنالیا؟“

”میں شیر و کوس کر رہی تھی اور اس بہانے شہرین اور سونیا کا بھی دل بھل جائے گا۔ ہاشم کے پاس تو اتنا وقت نہیں ہوتا۔“

”یعنی کہ تم نے اسے ایک کمبل فیملی ٹرپ کی شکل دے دی ہے۔ ویری گڈ! اور میرے ڈاکو منش؟“ وہ بہت ضبط سے اسے دکھا کر بولے۔ جواہرات نے مڑے بنا زر اسے کندھے اچکائے۔

”کیا میں دونوں سے کئی وفعہ بتانہیں بچکی کہ میرا لیپ ناپ خراب ہو گیا ہے اس لیے وہ فی اوقت ری کو رنہیں ہو سکتے، نہ ان کا ڈرافٹ تیار ہو سکتا ہے۔“

”اور چونکہ اب تم باہر جا رہی ہو تو ایک مہینے کے لیے یہ کام ملتوی ہو گیا۔ تب تک تو میری ساعت کی تاریخ بھی گزر جائے گی اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ تو تمہیں ہی ہو گا۔“

اس طنزیہ لمحے پر بھی جواہرات سکون سے کھڑی باہر دیکھتی رہی۔ دھنٹا خاور اندر آیا۔ سوت میں ملبوس تراشیدہ موچھوں والا چوتھیں پنچتیس برس کا آدمی تھا۔

”جی سر؟“

”آئے خاور صاحب! اور ذرا اوپر صاحت کیجیے کہ آپ جیسا ایک پرست میری بیوی کا ایک لیپ ناپ کیوں نہیں ٹھیک کر سکا؟“  
خاور نے ذرا کی ذرا جواہرات کو دیکھا اور پھر اور نگزیب کو۔ دوناحدا اوس کا ہونا بھی عذاب تھا۔

”سر! میں نے کوشش کی مگر مسئلہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر آپ کہیں تو کسی پروفیشنل کے پاس لے جاؤں؟ یا آفس سے کسی کو  
اکر....؟“

جوہرات تیزی سے اس کی طرف مڑی۔

”میرے لیپ ناپ میں ہماری کمپنی کے کتنے خفیہ ڈاکو منشیں ہیں، معلوم ہے تمہیں؟ میں کیسے اسے کسی دوسرے کے حوالے کر  
سکتی ہوں؟“

”میری بیوی کو بھی خوش فہمی ہے کہ میں کسی اور کو لیپ ناپ نہیں دے سکتا، جبکہ میں دے سکتا ہوں۔ میری!“ انہوں نے خشنگیں لگاہ  
دونوں پڑال کر میری کو آواز دی۔ جواہرات نے مضطرب تھی ہو کر خود رکود دیکھا اور خاور نے ذرا پریشانی سے اور نگزیب کو۔ ان دونوں کا خیال تھا  
کہ اور نگزیب یہ نہیں کرے گا مگر۔

”مگر سر....!“ اور نگزیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرایا۔ میری سامنے آئی تو انہوں نے اسے صرف اشارہ کیا۔ وہ پہلے سے مطلع  
کردی گئی تھی سو سر کو ختم دیتی باہر نکل گئی۔

جوہرات گویا سلگ کر واپس باہر دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر شدید اضطراب پھیلا تھا۔ یہ آدمی ناقابل برداشت تھا۔ شدید  
ناقابل برداشت۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

دلبری ٹھہرا زبان خلق کھلوانے کا نام ..... اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام  
انیکسی کے اندر چھوٹا سا لوگ روم تھا جس میں ٹو وی چل رہا تھا اور سامنے بیٹھی خیں چیل بدل رہی تھی۔ اس نے ماتھے والے بال  
مہوز کر باقی پوپی میں باندھ رکھتے تھے اور ذرا بے چینی کی لگ نہیں کر رہی تھی۔ ندرت اور فارس خاموش سے بیٹھے تھے۔  
”تم نے اور نگزیب انکل کی طرف نہیں جانا؟ انہوں نے بلا یا جو تھا۔“ ندرت نے اسے پکارا۔

”ان کی نوکرانی نے ہمیں آتے دیکھ لیا تھا۔ جب بلا نا ہو گا خود بلا لیں گے۔“

”اچھا اٹھ کر ہمارے لیے چائے تو بنادو۔ کوئی کام نہیں کرتیں تم۔“

”ای! آپ سید ہے سید ہے کہہ دیں کہ حتماہر چل جاؤ، ہمیں بات کرنی ہے تو میں چل جاؤں گی۔“ وہ ریموٹ رکھ کر برا سامنہ  
ہاتھ اٹھ گئی۔ فارس خاموشی سے دیکھتا رہا۔

”اب کہاں جا رہی ہو؟“ ندرت نے پھر پکارا۔

”وارث ماموں کے پاس۔ وہ کال سننے باہر گئے تھے وہیں رہ گئے۔“ وہ داخلی دروازے سے باہر نکل آئی اور دروازہ ذرا سا کھلا  
چھوڑ دیا۔ پھر باہر اس کے ساتھ کھڑے ہو کر کان لگا کر سننے لگی۔ آنکھوں میں شرات اور بلوں پر مسکراہٹ تھی۔

”جی کیا بات کرنی تھی آپ کو؟“ فارس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”ایسا ہے فارس کہ سلیم بھائی نے اپنی بیٹی زرتاش کے لیے اشاروں کتابیوں میں بات کی ہے۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا میں  
بات شروع کروں؟“ وہ اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گئیں اور بڑی آس سے اس کے گھنٹے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

”کیا زر تاشہ ہی ہے خاندان میں واحد لڑکی؟“ اس نے ناک سے کھٹکی اڑائی اور بیزاری سے ادھر ادھر دیکھا۔

”اچھا تم بتاؤ۔ جہاں کہو گے میں رشتہ لے کر چلی جاؤں گی۔“

خین خین دروازے پر جھکا کے لمب شرارت سے دبائے سن رہی تھی۔

فارس چند لمحے ندرت کو دیکھتا رہا۔

”آپ کی نند.... اس کا بھی تو ابھی کہیں رشتہ نہیں ہوا۔“ بہت ہی کوئی سرسری انداز میں کہا۔ ندرت چونکیں۔ پھر آنکھوں میں خوشگواری ابھری۔

”ہاں اس کا بھی....“ پھر رک گئیں۔ آنکھوں کی جوت بھگ گئی۔ فارس نے غور سے ان کے تاثرات دیکھے۔

”میں اس کے قابل نہیں یادہ میرے؟“

”نہیں، اصل میں میری ساس.... وہ اتنی آسانی سے نہیں مانیں گی۔“

”نہیں مانسیں تو نہ مانیں۔ ایک دفعہ بات کر لیجیے گا بس۔“ اس کے تاثرات ذرا سخت ہو گئے۔ ندرت نے جلدی سے بات سنبھالی۔

”نہیں میں پوری کوشش کروں گی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ اس کا ایک اور رشتہ بھی آیا ہوا ہے

آج کل۔ میں پھر اسی یفتے کا کربات کرتی ہوں۔“

اور باہر دل پر ہاتھر کے کھڑی خین خیزان، خوش، ایکسا ٹھنڈ، غرض ہر جذبے سے گزر رہی تھی۔ تب ہی کسی نے اس کو کان سے پکڑا

کر دوسرا طرف کھینچا۔ وہ گز بڑا کر گھومی۔ وارث سامنے کھڑا تھا۔

”ماموں.... میں آپ کی طرف ہی آ رہی تھی۔“

”مگر میں نے سوچا کہ.... کن سوئیاں لینے میں بھی ہر جن نہیں ہے۔“ اس نے خین کا فقرہ کمل کیا۔ وہ ابھی تک کان گڑ رہی تھی،

چھنجھلا کر اسے دیکھا۔

”آپ کدھر رہ گئے تھے؟ گرمی میں اتنی دیرے کھڑے ہیں۔“

”وہ گاڑی ہٹا کر اپنی سامنے کر رہا تھا۔“ اس نے فارس کی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ خین کا کان گڑتا ہاتھ رکا۔ آنکھوں میں کچھ

چکا۔ اس نے وارث کے ہاتھ سے چابی، چھپی اور گاڑی کی طرف بھاگی۔ جلدی سے دروازہ کھولا۔ فرنٹ سیٹ پیٹھی اور ڈش بورڈ کے خانے کو

الٹ پلت کرنے لگی۔ وارث ذرا حیران سا اس طرف آیا۔

”کیا کر رہی ہو؟“

”جب ماموں ہمیں پک کرنے آئے تھے تو.... مجھے دیکھ کر جلدی سے کچھ اس میں ڈالا تھا۔ مل گیا۔ بلکہ مل گئی۔“ سیاہ ٹھنڈیں ڈبی ہاتھ

میں لیے خین نے فاتحانہ نظرؤں سے اسے دیکھا اور پر جوش سی ہو کر ڈبی کھولی۔

”اوہ گاڑ! کٹو! اپس رکھو فراؤ۔ یہ فارس کی پرسنل چیزیں ہیں۔“

”دیکھنے تو دیں۔“ وارث نے ہاتھ بڑھا کر ڈبی لینی چاہی۔ مگر اس نے ہاتھ دور کر لیا۔ ڈبی کھل چکی تھی اور وہ جو ناپس یا انگوٹھی کی توقع

کر رہی تھی، خوب بھی خہبری گئی۔

سیاہ ٹھنڈیں پہ بیرے کی نیخی سی لوگ تھیں، بالکل موگ کی دال کے دانے جتنی۔

”واپس رکھو اسے۔“ دروازے کے ساتھ کھڑے وارث نے اب جتنی سے کہا تو اس نے ڈبی بند کر کے احتیاط سے واپس رکھ دی۔

پھر خود بھی باہر نکل آئی۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں چک۔

”یہ نوزپن (ناک کی لوگ) تھی۔“

”فارس نے ملی ہوگی کسی کے لیے۔ اب مت چھیننے اسے۔“

”آہا.... مجھے پتا ہے کس کے لیے۔ میری پچھوناک کی لوگ پہنچتی ہیں۔“

وارث کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ بے اختیار ادھر ادھر دیکھا۔

”عقل کدھر ہے تمہاری؟ دوبارہ یہ بات مت کرنا۔“

”کیوں؟ میں نے کیا کہا ہے؟“

”میری بات سننگور سے۔“ وہ سمجھیدگی سے اس کے سامنے کھڑا کہنے لگا۔ ”مجھے بھی پتا ہے کہ تمہاری پچھوناک میں لوگ پہنچتی ہیں۔ اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تم اندر سے کیا سن کر آ رہی ہو۔ فارس نے پہلا مشورہ مجھ سے کیا تھا۔ یہ باتیں خیں! ہمارے خاندانوں میں پسند نہیں کی جاتیں۔ ذریحہ دوسال پہلے تک وہ اس کا استوڈنٹ بھی رہا ہے۔ اگر اس نے تب یہ بات نہیں کی تو اس لیے کہ خاندان میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ان کا کوئی... افیسر رہا ہے۔ اب یہ واہی بات...“ سختی سے ڈلش بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کسی کے سامنے نہیں دھرانی تم نے۔ ندرت آپ کے مامنے بھی نہیں۔“

”اچھا۔“ خین نے منہ بنا کر گروں پھیر لی۔ سارے ایڈوچر کا ان احتیاط پسند ماموں نے بیڑا غرق کر دیا تھا۔ تب ہی میری اینجیئر اس طرف آتی دھکائی دی۔ خین بے اختیار سیدھی ہوئی۔

”کار وار صاحب آپ کو بلار ہے ہیں۔“

خین سر ہلا کر جانے لگی تو وارث کار لاؤک کر کے آگے آیا۔ ”مکھرو! اکیلی مت جاؤ۔ میں ساتھ آ رہا ہوں۔“ اس کے چہرے پر کافی سخت آئی تھی۔



اس راہ میں جو سب پر گزرتی ہے وہ گزری ..... تنہا پس زندگی رسوایا سر بازار ہاشم کے کمرے کی کھڑکی کارخانیسی کی طرف تھا۔ اس لیے وہاں سے یہ منظر صاف نظر آتا تھا۔ ہاشم ایک سرسری نظر ان پڑا۔ لے پڑا۔ سامنے بیڈ پکھا بیگ رکھا تھا اور شہرین الماری سے بینگر زنکال نکال کر ڈھیر کر رہی تھی۔ وہ بھنپنے ہوئے ابرو کے ساتھ اسے دیکھتا ہا۔

”کچھ عرصے سے تمہارے انگلینڈ کے چکر زیادہ نہیں لگ رہے؟“

بینگر سے شرٹ اتارتے شہرین کے ہاتھ تھے۔ پھر اسے تھیج کر اتاترا۔ تین تھیں لگائیں۔ بیگ میں رکھا اور شہری بال کان کے پیچے التی سیدھی ہوئی۔

”مسز کاردار نے پیش کی تھی اور وہاں میری خالہ بھی رہتی ہیں۔ اچھا ہے اس بہانے ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ تمہارے اس اقت ہوتا تو ہم ایک بیملی کی طرح جاتے۔“

”کوئی بات نہیں۔ تم شاید میرے بغیر وہاں زیادہ خوش رہتی ہو۔“ وہ سختی سے کہتا آنکھیں سکیڑ کر اسے کپڑے تھے کرتے دیکھ رہا تھا۔

”تم جھگڑے کے موڈ میں ہو؟“ اس نے بیزاری سے کہتے ہوئے ذریس سے ایک ڈالا ٹھیکایا اور اس میں چیزیں بھرنے لگی۔

”بھگڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہاں جا کر بھی تم نے میری بیٹی ملازموں پر چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا بخار پچھلے ہفتے تھیک ہوا ہے گر۔“

”میں اتمہارے پاس نہ ادھر اس کے لیے وقت ہوتا ہے نہ ادھر ہو گا۔“

”تم وقت کا لانا شروع کرو۔ میں پیر دی کروں گی۔“ وہ پاٹکس اٹھا اٹھا کر ڈبے میں ڈال رہی تھی۔ ہاشم سختی سے سر جھک کر باہر

دہلی کے اور رے پولے کر سکا۔ اس ازماں میں کافی تباہی۔ میری قبیلہ کے ساتھ اپنے دارالکنزی خداوی  
شیخ احمدی کی حسن میں بھس اگر پڑے لایک میں نظر پڑے کرے پہاڑی، جو جہاں اُنے لے۔  
قابوں کے درمیں کچھ بھی نہیں کے۔ اس بخوبی سے اتفاق ہے۔  
”کہا جعلہ تاکہ بھٹکے مال۔ کب ملک دب اگی پہاڑی اپنے بھوپال میں کھل کر آئے۔“ اگر کبھی سے پہاڑوں  
کو بھے۔ مانند اسے اسے کہے جائیں گی۔ مہدی کی ساری کوشش سے دارالکنزی میں کھو کر خداوی کے ساتھ پہاڑوں کی  
قبریں سے بھول جاؤں گے۔

”جھلی کھنڈاں جی جھانگی ہے۔ اس لئے۔“ اس اتفاق پر تعلقی۔ میری دارالکنزی کا کام۔ خاور اسے ہے۔  
لپٹ کھوئی سے سادے کیے جاؤں گی۔ اسے مہدی کے نیزے اور پیغمبل جی کی خداوی گی۔ اسی طبق ملک دب اگر کے جس کھوارے۔  
”وَلَمْ يَرْجِعْ“ اگر کبھی سے بھٹکی طرف اٹھا دیا۔ ”اگر لکھنؤ۔“ پہنچنے میں کسی کو بھی بھائیو کر۔ جس ایمان میں آنے  
سے بلکہ جو۔“

جسی نے اپنے میری دارالکنزی کی پارٹیوں پر نہیں کھلگی تھی اُنیں فوجی دارالکنزی کے نہیں کھلے۔  
کھلے۔ اُن کو دب اگر کے نہیں کھلے۔ پہنچنے کی خواہ کسراہے تے پولی اکھ پکھے۔  
اٹھ کی پوکھل کھل کھا ہے۔ جسی نے جس کہا ہے اسی۔ میری دارالکنزی اُنیں جیسی کھڑا خشم ہی اسے دی۔ کہہ ہے۔  
”لَمْ يَرْجِعْ“ کے طبق۔

کام کے پیوس کی کتابہ دارالکنزی سر جھاک کی سکھی کو کھلکھلی۔ جو دن جزو، دنے۔ ستم پچھا۔  
”۷۵۰۰ آن اکتوبر کی ہے۔“ اس کی سند اس میں ”میرے دب اگر کے اخواتیہ کسراہے تے پولی اکھ پکھے۔“  
”بید کھوئے پوچھا دیا۔“ اس سے ملک دب اگر کے سر جزو۔ ”کسی کھلکھل کے سر جزو۔“  
اس نے ملک دب اگر کے سر جزو۔ ”کسی کھلکھل کے سر جزو۔“ اس کے سر جزو میں کھلکھلی۔ جو دن جزو میں اسے۔ اسی سے۔  
ہلکی کھلکھلی۔ ”کسی کے سر جزو کو کہہ جاؤ گی۔“ ایک اپنے کار اس کی طرف پھر کھڑا کرے۔ جو دن جزو، کام کے اسی سے  
کھڑا جاؤ گی۔

”اس عین کلی اسی سند اس کے دب اگر کام کے اسی خداوی تھا۔“ اسے دیا کیا ہے۔ ”صوصھے سے سر جزو  
کی ایکس میں رکھ۔“ کلی خروت کی کھیس کے سامنے۔ ”کسی دب اگر کے طرف جزو۔“ سکھل۔ ”وہی سر کام کے اسی سے  
کھڑا۔“ اسے اسے آٹا۔ ”کر کوئی کھلکھل۔“ ”پیچے گی۔“

”سیں نے کھلکھل کھلکھل کی۔“ اگر کبھی نے کھلکھل کی کیا۔ جسی دارالکنزی کے پیوس۔  
”کسی کام کا کام کھلکھل کی۔“ ”کام کو دارالکنزی کر کر کھلکھل ساہے۔“ پکھے اسے۔  
”کھل۔“ پھر جلوی میں ہی۔ ”دارالکنزی کا کام۔“

”بھوڑھے سے جنمے ہے جس کی خروت میں گھلی۔“ اگر کبھی سے اسی خود، دب اگر کے میں ہے۔ جو اسی دارالکنزی  
بے سر جزو اسی کو۔ جسی نے اسے بنا دی سے۔  
”کسی دب اگر کی کھلکھل کی۔“ ”کام کو دارالکنزی کو دارالکنزی کے۔“ انکی سر سمجھی سونپوں کی۔ وہی ملے اسی

اپنی ہوئی تھیں ملتی۔ سو میں اب امریکی لی وی شورڈ بھیتی ہوں۔ لے لے لے ہر زیر... ہارہار کی انجوائے مت۔" یہ دو آخری بات تھی جو اس نے کی۔ پھر خدا حافظ کہ کر دہنکل آئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وارث نے ایک خاموش گھر گبری نظر ام پر ہڑو داں تھی۔

"میں تمہیں ایک شیخست کروں گا۔ کاروارز سے فاصلہ رکھنا۔ یہ اچھے لوگ تھیں ہیں۔" "وہ دونوں ساتھیوں ساتھ بزرگ زار بیویوں کو رکھتے تھے اس نے کہا۔ حسین نے اتنا توجہ سے اسے دیکھا۔

"میں تو دو سال سے ان کے گھر بھی تھیں آئی۔ کاروار صاحب کو آخری میل سال پہلے کی تھی شاید۔ بھی بھجوائے ہیں ہر ماہ باسکت۔ لیکن یہ بھی تھیں پہاڑ کا بزرگ کیا ہے؟"

"پاسکت؟" "اس سوال پر حسین دل کھول کر بھی۔

"ہاشم بھائی کی بیٹی چیخی کو پیدا ہوئی تھی۔ سو ہر ماہ کی چھتاری کو چالکھیں اور برانڈ سوپیں سے بھری ہاسکت سب رشتے داروں لے کر آتی ہے کہ بھی اب سوچتا ہے ماہ کی ہو گئی اب اتنے کی۔ جب تک وہ دو سال کی تھیں ہو جائے گی یہ ہوتا رہے گا۔ امیروں کے 4 پہنچ۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے دو رہوتے چار ہے تھے۔

ہاشم نے گھر کی سے ان کو جاتے دیکھا۔ آنکھوں میں گھری سونچ تھی گھر پھر باپ کی آواز نے پھونکایا۔

ہاشم ایجھے رافت نکال کر دہتا کہیں بھیڑ زہواؤں۔ اور یہ کام تمہاری ہاتھیں انتہاریاں کے جانے سے پہلے ہو جائے پا ہے۔"

ہاشم کے ابر و تن گئے۔ خاور کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلا گیا تو وہ سامنے آیا۔ سو نے پرہاہن باپ کے بالکل سامنے۔

"میری ماں گھوڑا زموں کے سامنے بے عزمت مت کیا گریں۔"

وہ کمزے ہوئے۔ ایک خشکیں لگاہ اس پر ڈال اور دوسرا جواہرات پر جس کے تھے اعصاب ڈھیلے چڑے تھے۔ آنکھوں میں امتحنگی۔

"جو کہا ہے اور کہ ایجھے مت سمجھایا کر دے۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کا دروازہ بند ہوتے ہی جواہرات تیزی سے اسے قریب آئی۔

"کیا تم نے دیکھا وہ بیٹھ کس ہنگ سے ملادیوں کے سامنے۔"

"میں ایسا سمجھے سمجھے بات کے مقابلہ بات مت کیا سکھیں۔" جواہرات رک گئی۔ لٹا جیں یک ہنگ ہاشم کے پھرے پر ٹھہر میں۔ وہ خصے میں لگ رہا تھا۔

"آنکھوں آپ ان سے ملادیوں کریں گی۔ زمین نہیں بیٹھی تو مجھے تھا گیں۔ ہاشم ہر سو سنبھال سکتا ہے۔ خود نکاح کے اقدام کر دیا گریں۔"

جواہرات نے اس کو دیکھتے ہوئے اثبات میں گردان بلائی۔ ہاشم ایک طرف سے گز دکر باہر نکل گیا۔

ہر آمدے کے اوپرچے ستونوں کے ساتھ خادر چوکس ہو دب گھر اتھا۔ وہ بڑی سے کہتا اس کے سامنے آیا۔

"تم میری ماں کے لیے کام نہیں کرتے۔ ہر سے باپ کے لیے بھی کام نہیں کرتے۔ تم ہر سے لیے کام کرتے ہو۔ آنکھوں ان ہاں کا کوئی بھی ایسا حکم نہیں کیا جو ان کے درمیان کسی جھلکے کا ہب ہے۔ کیا میں وہ راؤں یا تم کچھ گئے ہو؟" خارے سر جھکایا۔

"سوری سر اس زکار دار نے مجھے دھمکی... او کے۔ میں احتیاط کروں گا۔"

ہاشم نے گھری سانس لے کر گردن موڑی۔ یہاں سے انکسی نہیں نظر آتی تھی۔ وہ پچھلی طرف تھی مگر اسے کچھاں دیکھا نظر آتا تھا۔  
 ”یہ آدمی....فارس کا بھائی وارث غازی، اس پر نظر رکھو خاور! فون شپ کرو، آفس بگ کرو جو بھی کرو۔ میں نے سنا ہے یہ پڑو یلم  
 درآمدات کی ڈیلٹر کی روپورٹ تیار کر رہا ہے۔ بظاہر کوئی خطرے کی بات نہیں ہے مگر جس طرح یہ مجھے دیکھ رہا تھا بھی....مجھے گئے ہونا؟“، اس کا  
 کندھا تھپٹھپا کر پوچھا۔ خاور نے اثبات میں گردن ہلائی۔  
 ”گزر!“ ہاشم واپس مزگیا اور کاردار قصر پر اترتی نیلی شام آہستہ آہستہ سیاہی میں بدلتی رہی۔

❖❖❖

فرشته مجھ کو کہنے سے میری تحیر ہوتی ہے ..... میں مسحود ملائک ہوں، مجھے انسان رہنے دو  
 ذوالفقار یوسف کے گھر کا لاؤخ آج زیادہ ہی پر رونق لگ رہا تھا۔ زمرات ان کے پاس تھہر نے کو آئی تھی۔ ندرت خوشی خوشی  
 استور سے صاف تو لیے اور لحاف وغیرہ نکال رہی تھیں۔ حین البتہ قدرے مصلحی زمر کے سامنے والے صوفے پر پیرا دپر کر کے بیٹھی تھی۔ زمر  
 نے بہت دفعہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھا مگر پھر خاموش رہی۔  
 حین کا چہرہ اسکول سے آتے ساتھ ہی ایسا تھا۔ جس بات کو وہ اتنے دنوں سے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ آج زیادہ  
 بھی انک طریقے سے سامنے آگئی تھی۔ اس کی اس بد تیزی، مغرور اور نالائق کلاس فلیو برینہ جاوید کی والدہ یا میمن جاوید جو اسکول کی واں پرنسپل  
 بھی تھیں، نے اسے آج اپنے آفس میں بلا یا تھا۔

”آپ نے ناٹھ میں بورڈ ناپ کیا تھا حین! کیونکہ آپ کے نوٹس بہت اچھے ہوتے ہیں۔“

”جی....میم!“ اس نے مقاطع نظروں سے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ کری پہ بہت تمکنت اور رعب سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔

”اور بہرینہ کافی دن سے آپ سے نوٹس مانگ رہی ہے۔ نہ نوٹس آپ نے دیے نہ ہی اس کی پریکٹیکل نوٹ بک بنان کر دی۔“

”میم! وہ نوٹس میں بیکھر کے دوران میتی ہوں۔ انگریزی کے خط، مضمون وغیرہ میں جن کتابوں سے تیار کرتی ہوں وہ میرے بھائی  
 اور پچھوکی پرانی کتابیں ہیں۔ وہ میں کیسے کسی کو دے سکتی ہوں؟ اور میں اس کو کیوں نوٹ بک بنا کر دوں؟“  
 آپ کو تپا ہے ناٹھ کا بورڈ ناپ تب میٹر کرے گا جب آپ دسویں میں بھی ناپ کریں۔ ملا کر رزلٹ آئے گانا؟ سو آپ بہرینہ کی  
 مدد کریں۔ اگر نہیں کریں گی تو اس بات کو ہن میں رکھیے گا کہ واں پرنسپل چاہے تو آپ کا داخلہ بھی نہ سمجھ جا ہے تو ایسے کھٹس لکھ کر اسکول  
 سے خارج کر دے کے اگلے تین سال تک کوئی اسکول ایڈمیشن دینے کا اہل نہ رہے۔ منڈے تک بہرینہ کی نوٹ بک تیار ہونی چاہیے۔ آپ جا  
 سکتی ہیں۔“

اور وہ بے بسی، غصہ یہاں تک کہ ڈرہ جذبے میں گھری واپس آئی اور تب سے ایسے ہی تھی۔

”ایمی....میرے براون جوتے نہیں مل رہے لندے والے۔“ سیم کو پچھوکی موجودگی میں تازہ تازہ خریدے جو توں کو دکھانے کی  
 جلدی تھی، اس لیے کافی دیر سے آوازیں لگا رہا تھا۔ حین چوکی۔ پھر انھ کر اندر گئی جہاں وہ الماری کھو لے کھڑا تھا اور اسے زور کی چکلی کاٹی۔

”لکھنی دفعہ اسی نے بتایا ہے لندہ انہیں کہتے ایل شاپ کہتے ہیں۔“

”اچھا!“ اور پھر سے حلق پھاڑ کر چلایا۔ ”ایمی! میرے ایل شاپ والے جوتے نہیں مل رہے جو لندے والے لیے تھے۔“

”اف!“ وہ کراہ کر باہر نکل آئی۔ زمر بمشکل مسکراہٹ روک کر بیٹھی تھی۔ حین پھیکا سامسکر ائی۔

”باہر ہوا ہے۔ اور میرے پر بیٹھتے ہیں۔“ زمر انھ کھڑی ہوئی۔ سیم جوتے ڈھونڈ کر فوراً باہر آیا اور آنکھیں پھیلائے تجب سے  
 اسے دیکھا۔

”پھچھو! اس وقت باہر نہیں جائے گا۔ ہمارے لान کا درخت ٹیرس تک جاتا ہے۔ اس پر جم ہوتے ہیں۔“

زمر نے گہری سانس لی۔ جنات.... جن کے بارے میں سنانے کو ہر شخص کے پاس ایک کہانی ضرور ہوتی ہے۔

”اور پتا ہے پھچھو! میرے دوست کے گھر کے قریب ایک قبرستان ہے جہاں۔“ سیم پر جوش سانانے لگا۔ وہ اس عمر میں داخل ہو کیا تھا جب بچے اسکول سے آ کر ”میری ٹپچر اور میرا دوست“ کے اتوال زریں سارا وقت سناتے ہیں۔ زمر نے نری سے اس کے ماتھے سے ہال ہٹائے۔

”میں تمہیں اس سے بہتر کہانی سناتی ہوں۔ مگر پہلے اوپر چلو۔“ سیم کی پریشانی نظر انداز کر کے وہ اوپر آگئے۔ حینہ بھی بجھی بجھی سی

ان کے ساتھ تھی۔

اوپر والا پورشن کسی دوسری فیلی نے کرائے پلے رکھا تھا۔ البتہ ٹیرس کی طرف یہ ورنی لو ہے کا زینہ جاتا تھا اور وہاں یہ لوگ بھی بیٹھے ہایا کرتے تھے بھی بکھار۔ باخونچے کا درخت ٹیرس کے ایک حصے پر گھنسا یہ کرتا تھا۔ وہ درخت سے دور و سط میں بجھی کر سیبوں پر جائیتھے۔

”تو اسامہ یوسف خان جنات سے ڈرتا ہے؟“ سیم کو بازو کے حلقوں میں لے کر اپنے ساتھ بٹھائے وہ کن اکھیوں سے سامنے بنٹھی نہیں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ سیم نے تندب ب سے اثبات میں سرہلا یا۔

”وہ... ڈراونے ہوتے ہیں نا۔“

”اویہ تو تمہیں پتا ہے کہ انسان فرشتوں اور جنوں سے زیادہ اشرف ہے۔ یعنی کہ زیادہ نوبل ہے۔“

”مجھے پتا ہے۔“ اس نے دینیات میں پڑھ رکھا تھا۔ اشرف الخلقوت۔

”تو انسان زیادہ نوبل اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ ہم وہ بھی کر سکتے ہیں جو جن نہیں کر سکتے۔“

”جن غائب ہو سکتے ہیں پھچھو!“

”ہاں! اور ہمیں چھپنے کے لیے غائب ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ آرام سے پریشانی اور اندر کا خوف دوسروں سے چھپا کر خود کو نارمل ظاہر کر لیتے ہیں۔“ زمر نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ حینہ چوٹی تھی۔

”مگر وہ اڑ بھی سکتے ہیں۔“ سیم کو جنوں کی تحقیر پسند نہیں آ رہی تھی۔

”اویہ میں اوپر جانے کے لیے پیروں کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کرد اور ہمیں بلند کرتا ہے۔ ہم زیادہ مضبوط ہیں کیونکہ ہم اپنی فیلی کا مشکل اور پریشانی میں ہاتھ تھامتے ہیں۔“

”مگر...“ سیم ذرا کی ذرا درخت کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھنیں پار ہاتھا مگر زمر اسے سمجھا بھی نہیں رہی تھی۔

”میں تمہارے دوست سے زیادہ اچھی جنوں کی کہانی سناتی ہوں تمہیں۔“ وہ سیم کو مخاطب کر کے اس کے بال سہلاتی کہہ رہی تھی۔

”نین بھی ذرا آگے ہو کر غور سے سننے لگی۔“

”صد یوں سے جن آسمانوں کا سفر کرتے، فرشتوں کی باتیں سناتے تھے۔ پھر ایک دن اچانک انہوں نے آسمانوں کو ٹوٹا تو اسے منت پایا۔ وہ کان لگانے گئے تو ان پر شعلے برنسے گئے۔ وہ اس وقت نہیں جانتے تھے کہ ان کے رب نے انسان کے ساتھ تیکی کا ارادہ کیا ہے یا

؛ ای کا تو وہ زمین میں پھیل گئے تاکہ خر لیں کہ کیا غیر معمولی واقعی پیش آ رہا ہے جو آسمان پا اتنے پھرے لگ گئے ہیں۔“

کہتے ہوئے اس نے آسمان کو دیکھا۔ وہ تاریک تھا۔ چاند کے بغیر صرف تاروں سے ڈھکا۔ پر اسراز خاموش اور گہرا۔

”پھیلتے پھیلتے ان میں سے کچھ دادی خلہ پر جا پہنچے۔ وہاں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہؓ کو فخر کی نماز پڑھا رہے تھے تو قرآن اتر رہا تھا۔ نماز کا قرآن جب انہوں نے سناؤں کے دل بدل گئے۔ وہ فوراً اپنی قوم اپنے خامد انہوں کی طرف پلٹے اور ان کو بتایا کہ ہم نے ایک عجیب

قرآن سناتے ہے جو راہنمائی دیتا ہے۔ تو سیم یوسف... تمہارے دوست کا دوست جو بھی کہے، مجھے تو قرآن میں جنات کا ذکر بہت پیار سے بیان کیا ملا ہے۔ مجھے تو وہ بہت نوبل لگے۔ انہوں نے سچائی جان لی تو اسے چھپایا نہیں۔ اپنے لوگوں میں واپس جا کر ان تک حق پہنچایا۔ یہ تو انسانوں کی اچھائی ہے نا؟ سچ کے لیے اشیائیں لینا۔ کیا اب بھی تم جنوں سے ڈرتے ہو؟“

سیم جو بالکل مسحور ہو کر سن رہا تھا، استفسار پر چونکا۔ ذرا سے شانے گرائے۔

”دن... نہیں تو۔“

”جنوں سے نذر اکرو سیم! ایم بیم نہ انہوں نے بنائے تھے، نہ برسائے تھے۔ انسان زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔“

خین کیک بہوت سی سر ہی تھی۔ زمراب سیم کو نیچے سے کچھ لانے کے لیے سچ بھی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے زمر کو اپنی طرف رخ کرتے دیکھا۔

”اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم ڈرنا چھوڑ دو جہا! انسان کو انسان بننے کے لیے بہادر بننا ہوتا ہے۔“ زمی سے مسکرا کر کہا۔ تاریک رات، گھنادرخت، میرس کی تہائی، خین کے اندیشے خوف سب اس کی آنکھوں کی نرمی میں زائل ہوتا گیا۔ زمر نہیں پوچھ گئی یہ تو طے تھا۔ وہ صرف سوال کا اعتماد دے کر فیصلہ دوسرے پر چھوڑ دے گی۔

خین انھی اور سیم کی جگہ پر اس کے قریب آبیٹھی۔ اب سر جھکا کر الگلیاں مردڑتے ہوئے بات کا آغاز کرنا چاہا مگر الفاظ حلق میں پھنس گئے۔ زمر نے غور سے اس کا چھکا چھرہ دیکھا۔

”میں ایک بہت پر اعتماد لڑکی کو جانتی ہوں جو ہر بات کا ترنٹ جواب دے کر سب کو ہنسادیتی ہے۔ آج کیا وہ گھر پر نہیں ہے؟ میں جب سے آئی ہوں، مجھے نظر نہیں آئی۔“

خین ملکا ساہنس دی۔ سراہٹایا۔ بُنیٰ سُمٹی۔ آنکھوں میں اخطراب ابھرا۔

”علیشا کہتی ہے، میری امریکن دوست کے مسئللوں کے دو حل ہوتے ہیں۔ یا خود میں ہمت تلاش کرو یا زیادہ ہمت والے کو۔“

”اوہ....؟“

”میری کلاس فلیو ببرینہ...“ پہلا قدم مشکل ہوتا ہے۔ پھر اگلے قدم تو خود بخود اٹھنے لگ جاتے ہیں جیسے برسوں کی عادت ہو۔ ساری بات سن کر زمر نے سمجھیگی سے کہا۔

”پہلی بات تمہیں اسکول میں bully کیا جا رہا ہے، بلکہ یہ ہر اس منٹ ہے اور یہ جرم ہے۔ حمد! کبھی بھی زندگی میں ظلم کے اوپر خاموش نہیں رہنا۔ او کے؟“

خین نے فوراً اثبات میں گردن ہلائی۔

”دوسری بات، یہ مسئلہ تو میں دو دن میں حل کر سکتی ہوں۔ میرے پاس ایک ایسا پلان ہے جس کے بعد وہ ٹیکپرو ڈوبارہ تمہیں دھکانے کی جرأت نہیں کر سکیں گی۔“

”واقعی؟“ خین کی آنکھوں میں حیرت، خوشی، غرض ہر ثبت جذبہ چکنے لگا۔

”ہاں۔ تم دیکھتی جاؤ میں کیا کرتی ہوں۔“

خین کا چہرہ گویا دیکھنے لگا۔ الفاظ دنیا بکھیرتے ہیں۔ صرف الفاظ نے ہی اسے اتنا مطمئن کر دیا تھا۔ وہ پر سکون سی ہو کر بیٹھ گئی۔ پھر جلدی سے سیدھی ہوئی۔

”اوہ۔ ای نے ٹرانفل بنا کر کھا تھا فرنج میں۔ آئیں نیچے چلتے ہیں ورنہ موٹا آلو سب کھا جائے گا۔“

زمرہ کا سا بنس دی مگر وہ نیچے نہیں گئی۔ اس نے حند کے جانے کا انتظار کیا۔ ساتھ ہی چہرے کا پُر سکون تاثر غائب ہوا۔ اس کی جگہ صغرب سوچ نے لے لی۔ اس نے موبائل نکالا۔ فون بک اوپر نیچے کی۔ ایک نمبر پر رکی۔ اس نے چوتھی گھنٹی پر اخراجیا تھا۔

”فارس! میں نے آپ کو ڈسٹریب ٹونہیں کیا؟“

وہ جم سے آرہا تھا۔ سانس ابھی تک پھولہ ہوا تھا۔ ”نہیں میم! بتائیے۔“

”میری ایک فرینڈ کا کیس ہے۔ مقابل ایک اسکول کی واں پرپل ہیں۔“ تاریک رات میں سرگوشی نما آواز میں وہ کہہ رہی تھی۔ ”اور وہ خاتون ہاٹھ نہیں آریں۔ تو ان کو ڈیل کرنے کا کوئی پلان ہے آپ کے پاس؟“

زمرے گھری سانس لی۔ نیچے سے خینہ اور اسماء کے پھر کسی بات پڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ ساعت کی حد سے دور تھے۔

”نہیں۔ لیکن اگر میں یہ اس فرینڈ کو ابھی کہہ دیت تو وہ کبھی دوبارہ اپنا مسئلہ لے کر میرے پاس نہیں آئے گی۔ بجتا وہ تو مجھے نہیں ہٹا کر مجھے کیا کرنا ہے۔“

”اوکے۔ آپ ان خاتون کا کوئی نمبر پتا وغیرہ دے دیں۔ ان کی بیک گراؤنڈ قائم تیار کر کے آپ کو بھجوادوں گا۔ کچھ تو مل جائے گا ان کے خلاف استعمال کرنے کو۔“

”تحمیک یو سوچ فارس! بس یہ ہمارے درمیان رہے۔“

”ٹھیک! اور کوئی مسئلہ؟“ وہ ذرا رکا۔ مگر زمرے دوبارہ سے شکریہ کر کے فون رکھ دیا۔ اب وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

بے چارے پرانے اسٹوڈنٹس کتنی عزت کرتے ہیں۔ کاش میڈم یا سینیٹن بھی عزت کروانا جانتی ہوتیں۔ میرھیاں اترتے ہوئے وہ نظری تھی۔



کبھی کبھی آرزو کے صحراء میں آکے رکتے ہیں قافلے سے  
صح خین حسب عادت بھاگ بھاگ اسکول کے لیے تیار ہوئی تھی۔ زمر اور سیم بالکل تیار اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ ادھر وہ آئی ادھر کھنٹی بھی۔ زمر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک نوجوان باہر کھڑا تھا۔ سوٹ میں مبوس۔ سن گلاس ز لگائے۔ ہاتھ میں لمبا مالا۔

”خین یوسف؟“ وہ سوالیہ نظر وہ سے اسے دیکھتی ایک طرف ہوئی۔

”کاردار صاحب نے بھجوایا ہے۔“ وہ ان کا کوئی ملازم تھا۔ پیکٹ حوالے کر کے منودب سا پلٹ گیا۔ باہر اس کی کار کھڑی تھی۔

خین قدرے جیران قدرے ابھی ہوئی ڈبائے کر اندر آئی۔ گول میز پاسے رکھا۔ سب ار گرد اکٹھے ہو گئے۔ اس نے ذرات نہ بذبھا۔ مکن انٹھایا اور پھر۔۔۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔

نیا نکوری پٹاپ آئی پیدا آئی فون آئی پوڈ۔ ہر جدید آل الگ الگ ڈبے میں تھا۔ اور ان کے اوپر ایک نوٹ۔

”میں کسی کا احسان نہیں بھولتا۔ اور نگزیب۔“

زمر نے نوٹ پڑھا۔ ندرت نے آہستہ سے اسے بتایا کہ وہ کون ہیں۔ (فارس کا وہ کزن ہاشم جس کا سعدی اکثر ذکر کرتا ہے؟ اس کے!) وہ خین کے تاثرات دیکھنے لگی۔ جواب شاک سے نکل کر خوشی خوشی سب کھونے لگی۔ ندرت البتہ چپ ہو گئی۔

”اس تینے مہنے میں گئے تھے۔ یہ میں نہیں رکھنے چاہئیں۔“

زمر سیم کو لے کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ان کی اتنی ذاتی سی گفتگو میں نخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ نکتے ہوئے اس نے خین کی آواز سنی۔

”ای بیار! کیا ہے؟ میں نے ان کا لیپ ناپ ٹھیک کیا۔ وہ شکر یہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ ایسے کیسے واپس...“ وہ باہر آگئی۔

جب حنہ کار میں آ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو اپنی امی کا موبائل کان سے لگائے بات کر رہی تھی۔ زمر کو معلوم تھا کس کی کال ہو گی۔

”اس کی آدمی رات ہو گئی ہے!“ اس نے مسکرا کر کہتے کار اسٹارٹ کی گمراہ نے بغیر بُر جوشی تفصیلات بتا رہی تھی۔

”لیپ ناپ سلوک لکر کا ہے اور آئی پوڈ۔“

”بیری بات سنو ہے! تم یہ سب واپس کر دو۔“ وہ نیند سے انھوں نے اٹھ چکا تھا اور اب مکمل الرٹ تھا۔ وہ بولتے بولتے رک گئی۔ زمر نے

ڈرائیور کرتے ایک نظر اس پر ڈالی۔

”یہ سب میں تمہیں لے دوں گا۔“

”اور اگر قب میں آپ کو واپس کر دوں تو آپ کو کیا لے گے گا جھائی؟ انہوں نے کوئی غریب رشتے دار سمجھ کر ترس کھا کر نہیں دیا۔ میں

نے ان کا کام کیا تھا۔ انہوں نے شکر یہ ادا کیا ہے۔ اگر میں تھنوں کی لاچی ہوتی تو جب وہ کبھی کھمار پوچھتے ہیں کہ فلاں ملک جا رہا ہوں تمہیں کچھ چاہیے، تو ہر دفعہ یہ کہہ کر انکار نہ کرتی کہ سوری انکل! میں بغیر وجہ کے تھنہ نہیں لیتی۔“

”اوہ اچھا!“ وہ واقعی سمجھ گیا۔ ”اوے تم رکھلو۔ اب مجھ سونے دو۔“

خین نے فون رکھ دیا اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ بھر قدرے الجھتے ہوئے زمر کو دیکھا۔

”اگر آپ کو کوئی ایسے تھفہ دے تو آپ رکھ لیں گی؟“

وہ اپنے عمل کی صفائی چاہ رہی تھی۔ زمر کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ اس نے گیر سے پچھلا خانہ کھولا اور کچھ نکال کر اس کی گود میں رکھا۔ سیاہ مٹنیں ڈبی اور ایک تہہ شدہ کاغذ۔ خین یوسف سن رہ گئی۔

”کل صبح یہ کسی نے مجھے کوئی کیا تھا۔ پڑھو۔“

خین کا چہرہ فق ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے زمر کی شکل دیکھی۔ وہ پسکون ڈرائیور کر رہی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل سے کاغذ اٹھایا۔ جیولری تک ٹھیک تھا۔ ماموں سے لویٹر کی تو قع نہیں تھی۔ کاغذ کی تھیں کھولیں۔

”پہلے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کلاس میں کبھی۔ یہ آپ پا اس سے زیادہ سوٹ کرے گی جو آپ پہنتی ہیں۔“

(اسے لویٹر کہتے ہیں؟ اس سے اچھا لویٹر تو (لکن بروز لکھ لیتا) ماموں کی لکھائی وہ صاف بھپان گئی۔ خوف زائل ہوا۔ الجھن سے

سر اٹھایا۔

”کیا آپ یہ نوز پن رکھیں گی؟“

زمر نے چوہک کر اسے دیکھا۔ ”تم نے تو ابھی اسے کھولا ہی نہیں۔“

”اس میں.... لکھا ہے کہ یہ آپ پا سوٹ نہیں کرتا۔ ناک کو انگلی سے چھوا۔“ اگر کسی کا اتنا سنیں ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ نوز پن زیادہ اچھی لگے گی۔ اب دیکھیں میرا گیس ٹھیک نکلتا ہے یا....“ کہتے ساتھ ڈبی کھوئی۔ بیرونے کی لوگ سامنے تھی۔ خین نے فاتحانہ دیکھا، کہ کرشانے اچکائے۔

”کیا آپ کو معلوم ہے یہ کس نے بھیجا ہے؟“ ڈرائیور سے پوچھا۔

”انتے یہ جزو پڑھائے ہیں۔ سینکڑوں اسٹوڈنٹس گزرے۔ مگر بہت کم لڑکوں کو میرے گھر کا پتا معلوم ہے۔ انہی میں سے کوئی

”ہوگی؟“، خین کا حلقوں تک کڑوا ہو گیا۔

”تو... اب آپ کیا کریں گی؟“

”اس کو ریئر کپنی پر جا کر واپسی کا پاتا لینے کی کوشش کروں گی۔ آخر انہوں نے بھی کیسے ڈامنڈ جولری کو ریئر ہونے دی۔ پھر اس کو اپنے کروں گی۔ کیونکہ میں اسنٹوڈنٹس سے تخفہ نہیں لیتی۔ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔“

”تو پھر میں بھی کاردار صاحب کو یہ سب واپس کر دیتی ہوں۔ میرے بھی کچھ اصول ہونے چاہئیں۔ بات ختم۔“، خین نے ذرا خانگی سے کاغذ ذبی میں رکھا۔ ذبی واپس رکھی اور باہر دیکھنے لگی۔

زمر نے گھری سانس لی۔ خین اور اپنے درمیان تازہ تازہ تکلف کی خلیج میں آنے والی کمی کو ایک اصول کے پیچھے...؟ اونہوں۔ اصول میں ترمیم ہو سکتی ہے۔ اپنوں کے لیے سب ہو سکتا ہے۔

”اوے کے۔ میں اسے رکھ لیتی ہوں۔“، خین محض سر ہلا کر باہر دیکھتی رہی۔ زمر نے اچنپھے سے اسے دیکھا۔

”تم کیوں مسکرا رہی ہو؟“

اس نے گز بڑا کر جبڑا سیدھا کیا اور گردن دائیں بائیں گھامی۔ ”خیں تو۔“ اور مزید رخ پھیر لیا۔

اسکوں میں وہ دونوں ایک ستون کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔ نگاہیں گیٹ پر مركوز تھیں۔ ”ہمیں صرف ان کا ایڈریس چاہیے یا کوئی مری کانٹیکٹ انفار میشن۔“

”وہ رہی بہرینہ۔“، اس نے اندر آتی لڑکی کی طرف اشارہ کیا، پھر بے چینی سے زمر کو دیکھا۔

”مگر آپ اس کا نمبر پتا کیے حاصل کریں گی؟ اس کے لیے تو آپ کو ریکارڈ روم میں جانا ہو گایا اسکوں کے ڈیٹا میں سٹم... کہاں جا، ہی ہیں آپ؟“

وہ جو ستون کی اوٹ سے نکل کر جانے لگی تھی، خین کے ہڑبڑا نے پرک کر اسے دیکھا۔ ہلاکا سامسکرائی۔

”بہرینہ سے اس کا پتا لینے۔“ اور ہبکا کھڑی خین کو چھوڑ کر ذرا آگے آئی۔ تب تک بہرینہ برآمدے تک آچکی تھی۔ خین فوراً گھوم گل۔ سماعت دیہیں لگی تھی۔

زمر بہرینہ کے پاس سے گزرنے لگی، پھر اس کا چہرہ دیکھ کر رکی اور خونگوار حیرت سے اسے پکارا۔

”ارے بہرینہ... میڈم یا سین کی بیٹی ہونا آپ؟ کیسی ہو؟ میڈم کیسی ہیں؟“  
بہرینہ رکی۔ ذرا الجھا الجھا سامسکرائی۔

”جی میں بہرینہ... آپ؟“

”ڈونٹ ٹیل می! تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ بچپن میں تم کتنی ہمیل دی تھیں مگر اب زیادہ پیاری ہو گئی ہو۔ امی کدھر ہیں؟ ابھی جاب ارہی ہیں؟“

”آ..... جی ای وائس پرنسل۔“

”کتنی آؤٹ آف نچ ہو گئی ہوں۔ میں بھی دوئی چلی گئی تھی نا۔ ابھی بھتھی کے ایڈمیشن کے لیے آئی تھی۔ ایسا کرو مجھے اپنا نمبر دے۔“ کندھے پر نگہ پرس سے جلدی جلدی نوٹ بک اور قلم نکال کر اسے تھیا۔ ”لینڈ لائن بھی دینا اور ایڈریس بھی دے دو۔ میں میڈم سے ٹلاؤں گی کسی دن۔“ بہرینہ کو سوچنے کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ وہ کاغذ پر الفاظ لگھینے لگی۔

جب وہ دور چلی گئی تو زمرستون تک واپس آئی۔ کاغذ خین کے سامنے لہراتے ہوئے فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ واقعی تحریر کھڑی تھی۔

”تم نے ابھی میری یہ والی سائیڈ ڈیکھی نہیں تھی حدا۔“

”واقعی زبردست پر فارمیں تھی۔“ پھر وہ حیران پریشان اسمبلی کے لیے بھاگی۔ مگر ٹھہر کر مرٹی۔ ”یہ...“ ناک پہ انگلی رکھی۔ ”آپ پر واقعی اتنی سوت نہیں کرتی۔“ اور بھاگ گئی۔

زمر نے کار میں واپس بیٹھتے ہوئے لمحے بھر کو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سونے کی بالی جیسی نتھ کیا واقعی اس پر سوت نہیں کرتی؟ اونہوں....اس کو مایوسی ہوئی۔

❖❖❖

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا..... وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے شام کی محنتی ہوا میں درختوں کے پتے سرسراتے ہوئے موسمیتی کھیر ہے تھے۔ سعدی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس خوبصورت گھر کے سامنے رکا۔ جنگل کا چھوٹا سا گیٹ دھکیل کر کھولا اور سبزہ زار پر آگے چلتا آیا۔

کھلا سالان، اس طرف پورچ، وہاں سے دیوار خرم دار مرٹی۔ وہ موئڑ کر داخلی حصے کی طرف آیا تو ایک دمٹک کر رکا۔ ہاشم کی بیوی شہرین وہاں کھڑی تھی۔ سعدی کی طرف پشت، داخلی دروازے پر نگاہ رکھے وہ جھنجھلانی ہوئی موبائل پر بات کر رہی تھی۔

”ہاشم کو پہلے ہی مجھ پر شک ہے اور اب تو اس کی ماں بھی ادھر ہے۔ میں روز روزم سے ملنے نہیں آسکتی۔ کزن ہو تو کزن بن کر رہو۔ میں۔“

بس چند سینٹر ہی تھے۔ سعدی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مرٹے یا آگے چلتا جائے اور تب ہی شہرین کسی احساس کے تحت پلٹی۔ فرز چلتی زبان رکی۔ چھرہ فتن ہوا۔ ایک دمکان سے لگا ہاتھ فون سمیت پہلو میں گردادیا۔

”السلام علیکم۔“ وہ سر جھکا کر سرسری سلام کرتا دروازے کی طرف بڑھا۔

”علیکم.... میں بہن سے بات کر رہی تھی۔“ وہ مضطرب سی بولی۔ وہ انجنا بن کر سوری کہتا رکا۔ شہرین چپ ہو گئی۔

”مسز جواہرات اندر ہیں؟“

”ہاں۔“ جلدی سے آگے آئی، دروازہ کھولا اور حلق کے بل چلائی۔ ”میری... میری۔“

میری اس بھیو دوڑتی آئی۔ شہرین نے اشارہ کیا۔ وہ فوراً سعدی کو اندر لے گئی۔ شہرین ڈورا شیپ پر کھڑی اب بے چینی کی اس کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ سیاہ فام ہاؤس کی پر نکلتے دکھائی دی تو اس نے اسے روکا۔

”سنو! یہ لڑکا کون ہے؟“

”یہ سعدی ہے۔ نوشیر والا کا دوست۔“

اوہ۔ فارس کا بھانجنا۔ ہاشم ڈکر کرتا تھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر ادھر چکر کتا۔ جواہرات اسٹڈی میں ہیں۔ ۱۱ اسٹڈی میں تھی لاوائچ کی بجائے۔ یعنی اس لڑکے کو اسی نے بلوایا تھا۔ اوہ نو اگر اس نے کچھ بک دیا تو؟

وہ لکر مندی سے اسٹڈی کے دروازے تک آئی۔ لکری کا ساؤنڈ پروف دروازہ بند تھا۔ وہ دونوں اندر رہتے۔ اب؟ پھر ایک خیال ڈہن میں پکا۔ وہ گھر سے باہر آئی۔ عمارت کے اطراف سے گھوم کر اسٹڈی کی کھڑکی کے ساتھ رکی۔ لبوں

ملراہت آنھیری۔ اندازہ درست تھا۔ جواہرات کھڑکی کھول کر بیٹھنے کی عادی تھی اور اس وقت بھی وہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سعدی اس کے مقابل کری پڑھا۔ دونوں کے درمیان میز تھی جس پر تازہ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ جواہرات انگریزی طرز کے لباس میں بلبوس کہنی کری کے ہتھ پر اپنے دوالگیوں سے لاکٹ کاہیرا چھیڑتی مسکرا کر اس کوں رہی تھی۔

شہرین دیوار کے ساتھ لگی قریب سرک آئی۔ کان گفتگو پر لگے تھے۔ اپنا نام سننے کے خوف میں۔

”ہمارے ڈیپارٹمنٹس الگ ہیں۔ میں اس کا زیادہ دھیان نہیں رکھ پاتا۔ مگر پچھلے دونوں پچھے دستوں سے یہ سب پتا لگا تو میں نے ہا۔“ ساتھ ہی شانے اپکار دیے۔

”میں آگئی ہوں۔ سب سنبھال لوں گی۔“ جواہرات نے مسکرا کر سر کو غم دیا۔ ”میں صرف تمہارے منہ سے سب سننا چاہتی تھی۔ کیا ہیں یقین ہے کہ اس نے گھر میں بھی ڈرگز رکھی ہوں گی؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ شاید کمرے میں ہوں۔ میں یہاں کم ہی آتا ہوں۔ مگر... آپ اسے پیار سے سمجھا بیجے گا۔“ وہ فکر مند بھی تھا۔ جواہرات نے مسکرا کر سر جھکا۔

کہتے ہیں خدا نے آسمانوں سے چار کتا میں اتاریں اور پھر پانچواں ڈنڈا اتارا۔ جوان نے نہیں مانتا وہ اس سے مانے گا۔“

”پھر بھی... اچھا میں شیر و سل لوں۔“ وہ اجازت چاہتا انھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے اسی تمنکت سے ابتداء میں سر ہلا دیا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم اس کا خیال رکھتے ہو۔“

شہرین قدرے حیران کی دہاں سے ہٹی۔ چہرے پر الجھن تھی۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر سنائی دیے مگر اپنادا ذکر نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر و ہیں لمبی سوچتی رہی پھر اندر واپس آگئی۔

اب شیر و کمرے سے آوازیں آرہی تھیں۔ دروازہ آدھا کھلا تھا۔ قریب ایک شوکس دیوار سے لگا تھا۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر ایک ہنگزین بظاہر الٹ پلٹ کرنے لگی۔

وہ اندر کا وُجہ بیٹھا تھا۔ بار پار گھڑی دیکھتا۔ دونوں ابھی یونیورسٹی کی باتیں کر رہے تھے۔ نو شیر و ان گھر کے کپڑوں میں ہمیشہ کی طرح بے نیا سالگ رہا تھا۔

”کیا تم می سے ملے؟“ از لی لا پروائی سے کہتے شیر و نے روم فرنچ سے سافٹ ڈرینک کے دو کین نکالے۔ ایک اس کی طرف اپھما اور دوسرا میں خود دانت گاڑ دیے۔ سعدی نے کچ کر کے سائیڈ پر کھد دیا۔ اسے جلد واپس جانا تھا۔

”ہاں انہوں نے ہی بلا یا ہے۔ پچھلی دفعہ ان کے آنے پر میں ملنے نہیں آس کا تھا تو ان کا شکوہ بتا ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے تایا۔

”میں بھی نا، بڑی پوزیو ہیں۔“ شیر و نے گردن پیچھے پھینک کر گھونٹ بھرا۔ پھر سیدھا ہوا۔ ”لونا،“

”اوہ ہوں میں چلتا ہوں۔“ سعدی کی نظر کپیوڑا سکرین پر بڑی۔ ”اوہ شیر و! تم اور جنین اس گیم کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“

”ہفتے بعد لگائی ہے۔ سارا دن پڑھ پڑھ کر دماغ خالی ہو جاتا ہے۔“

سعدی نے مڑکر دروازے کو دیکھا۔ یہاں سے آدھالاؤج نظر آتا تھا۔ شہرین نہیں دکھائی دیتی تھی۔

”یہ تمہاری بھابی تھیں نا، بلونڈ بالوں والی؟“

باہر کھڑی شہرین کے اعصاب تن گئے ہنونی بھیج گئیں۔

”لو... کوئی بلونڈ نہیں ہے وہ۔ بال ڈائی کرواتی ہے۔ ہر تیرے مہینے یہاں سے پانچ سو پونڈ کا ہیٹر ڈوکرو اکر جاتی ہے۔“ وہ پھر

سے ہے۔

”کس طرح کی ہیں تمہاری بھائی؟“ سرسری سا پوچھا۔

”صحیح اتنا میک اپ کر کے کمرے سے نکلتی ہے۔ پھر سارا شہر گھومتی ہے۔ بھائی کا بیسے بے تحاشا جھونکتی ہے۔ سو نیا کا خیال بھی نہیں رکھتی۔ بھائی سے اکثر جھوٹا رہتا ہے۔ تمہیں کیسی لگی؟“ گردن پیچھے کر کے گھوٹ بھر کے وہ کھرد رہا تھا۔

”ہوں، اچھی ہیں۔“ وہ جانے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ تب تک شہرین اپنے کمرے میں غائب ہو چکی تھی۔ دروازہ بند کر کے وہ بستر کے کنارے آئی تھی۔ چہرہ احساس ہنگ سے سرخ پر رہا تھا۔ آنکھوں میں اضطراب پریشانی، غصہ سب تھا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں چکر کاٹتی رہی۔

پھر کافی دیر بعد باہر نکلی تو گھر میں خوب شور چاہتا۔

”میں نے تم پر اعتبار کیا مگر تم اس قابل نہیں تھے۔ بالکل اپنے باب پر گئے ہو۔ وہی مزاج، وہی غصہ، وہی عادتیں۔ ایک وہ فارس کم تھا تمہارے باب کی کاپی، اسے گزر کا شوق ہے اور تمہیں... تمہیں اس کا۔“

شہرین جیران مگر ممتازی قدم قدم چلتی شیر و کمرے کے دروازے تک آئی۔ وہ پورا کھلا رہا تھا۔ اندر شیر و شاکر، شرمندہ، بوکھلا یا سا کھڑا تھا اور بار بار ماں کو روک رہا تھا جو پھری ہوئی شیرنی کی طرح ایک ایک دراز کھول کر چیزیں باہر پھینک رہی تھی۔

شہرین نے بازو سینے پر لپیٹ لیا اور ذرا سکون سے دیکھنے لگی۔

”میں پلیز میں....“

”میرا دل چاہ رہا ہے ابھی پولیس کو فون کروں اور کہوں کہ اس ڈرگ ڈیلر کو آکر لے جائیں میرے گھر سے۔ یہ میرا گھر ہے ناتم نے؟ یہ میرا گھر ہے۔“ وہ چلاتی ہوئی وارڈ روپ سے کپڑے نکال کر فرش پر ڈال رہی تھی۔ دوسفید سرمنی بھیوں والے پیکٹ بھی باہر آ گرے۔ شیر و نے سر جھکا دیا۔

”میرے بغیر تم کیا ہو؟ میرے بغیر تمہارا باب کبا تھا؟ یہ اس کی ساری جائیداد... یہ میری عطا کی ہوئی ہے۔ یہ سب میرا باب پر چھوڑ کر مرا رکھا۔ تمہارا باب پر لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور تم...“ کسی دراز کی پشت پر بازو لمبا کر کے ہاتھ ڈالا اور دو پیکٹ باہر نکال کر زور سے شیر و کے پیچے پھینکے۔ ”تمہیں آج میں اس گھر سے باہر نکال دوں تو کہاں جاؤ گے؟ سڑکوں پر سوؤ گے اور وہیں بھیک مانگو گے۔ اور اگر تمہارے باب کو یہ سب بتا دیا تو وہ تمہارا کیا حال کرے گا معلوم ہے؟“

کمر اسرا بکھر چکا تھا۔ شیر و جزو سا کھڑا رکھا۔ غصہ، پیشمانی، بے بسی، سب جذبات مل گئے۔ میں کو ایک دم کیسے...“

”یہ اوقات ہے تمہاری؟“ جواہرات نے جھک کر سفید پیکٹ انھیا اور زور سے شیر و کو دے مارا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر پیروں میں جا گرا۔ یہ فوج ہے تمہارا؟“ وہ جھکی۔ میز سے اپنا موبائل انھیا۔ چھرے کے سامنے لائی۔ کیمرے کے ٹکلک ٹکلک پر نوشیروان نے ہر بڑا کر سر اٹھایا۔ وہ تصویریں اتار چکی تھی۔

”میں... آپ کیا...“

”می مت کہنا مجھے۔“ شیر و غرائی۔ ”اگلے آدھے گھنٹے میں بغیر کسی ملازم کی مدد کے تمہارے کمرے کی ایک ایک چیز درست جگد پہ نہ گئی اور یہ ساری ڈرگز تم نے آتش دان میں نہ جھوٹکیں تو میں یہ تصویریں تمہارے باب اور بھائی کو ای میں کر رہی ہوں۔ آدھا گھنٹہ ہے تمہارے پاس۔ ساتھ نے؟“ وہ بھیل والی سینٹھ سے گری چیزوں کو ٹھوک رکھا کر شعلہ بار نظر وہوں سے اسے گھوڑتی دروازے کی طرف بڑھی۔ شہرین فوراً پیچھے ہو گئی۔ اور نوشیروں پر چکرا گیا۔

”کیا آدھا گھنٹہ؟ میں اتنی جلدی...؟“

جو اہرات ایڑیوں پر واپس گھوئی۔ ”اب تمہارے پاس بیس منٹ ہیں۔ ایک لفظ مزید منہ سے نکالا اور یہ دس منٹ میں بدل جائیں گے۔“ بھتی سے گھور کروہ باہر نکلی اور ٹھہر سے دروازہ بند کیا۔  
نوشیر وال نے سر دنوں ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر بے اختیار چہرہ اٹھا کر گھر تی دیکھی۔ اونو۔ جلدی سے وہ زمین پر گردی چیزیں  
الانے لگا۔

مگر می کوشک کیسے ہوا؟ اتنی اچانک؟

❖❖❖

یوں بھار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا ..... پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں  
بڑے ابا کے لوگ روم میں خاموشی کا وقفہ بس چند لمحے کو آیا تھا۔ ندرت اپنا دعا بیان کر کے قدرے بے بُسی سے باری باری ساس  
بر کو دیکھنے لگیں۔ بڑے ابا چپ سے ہو گئے۔ پہلے فرخانہ بیگم کی طرف دیکھا جو بالکل ہی پل قطعیت سے نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔  
”یہ ناممکن ہے۔ ہماری طرف سے انکار سمجھوندہ!“

”فرخانہ!“ بڑے ابا نے تنہی انداز میں ان کو دیکھا مگر کچھ معاملات میں ان کا زور اپنے شوہر پر بہت چلتا تھا اور یہ انہی میں سے  
الہ تھا۔

”نہیں بھی، نہیں ہو سکتا۔ ہم تمہارے بھائی کو نہیں جانتے۔ ایسے کیسے کسی کو اپنی بیٹی دے دیں۔“ وہ اپنی ناگواری ضبط کر  
اپنی قصیں۔

”مگر بڑے ابا اس کو جانتے ہیں۔ اور آپ دارث سے پوچھ سکتی ہیں۔ وہ.....“

”لو.... وہ بھی تو تمہارا ہی بھائی ہے۔ طرف داری ہی کرے گا۔“

”ہم سوچ کر بتائیں گے ندرت!“ وہ ذرا بلند آواز میں بولے تو فرخانہ خاموش ہوئیں۔ ندرت پھیکا سامسکرا میں۔ قدرے  
والی سے ساس کی بڑبڑا ہٹ دیکھی اور اپنا پرس وغیرہ سئینے لگیں۔ وہ ماہیوں تھیں اور بڑی امی طیش میں۔ ان کے جانے کی دریتی کو وہ بڑے ابا  
اپل پڑیں۔

”ندرت کی ہمت کیسے ہوئی اپنے بھائی کا رشتہ زمر کے لیے مانگے۔“

”جیسے ہماری ہمت ہوئی تھی آپ کی بیٹی کے بھائی کا رشتہ ندرت کے لیے مانگنے کی۔“ وہ بھی بڑے ابا تھے۔ خل اور سکون سے جواب  
اپنے مزید تملک آگئیں۔

”تب مجھ نہیں پتا تھا کہ یا ایسی نکلے گی۔ بچوں کو بھی اپنی طرح کا بنادیا ہے، زبان دراز۔“

”وہ تیم بچے ہیں فرخانہ! تیموں کو نذر بنانا چاہیے۔ وہ بد تینزیں ہیں۔“

”بہر حال! ہم ندرت کے بھائی کی طرف رشتہ نہیں دیں گے۔ وہ فضیلہ کے بیٹی میں آخر کیا برائی ہے۔ ادھر ہاں کر دیتے ہیں۔  
اپ سے وہ جواب مانگ رہے ہیں۔“

”فضیلہ بھی تو ندرت کی رشتہ دار ہے۔ اس کا بیٹا فارس سے اچھا نہیں ہے۔“

”رہنے بھی دیں۔ فضیلہ میری امی کی طرف سے بھی رشتہ دار لگتی ہے ہاں۔“ وہ مزید بگڑا گئیں۔

”آپ زمر سے پوچھ لیجئے فرخانہ! دنوں رشتہ بتا دیجئے جو اس کا فیصلہ ہو۔“ خلاف معمول بڑی امی اس تجویز پر خاموش ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کچھ مت کہیے گا۔ میں خود زمر سے بات کر لوں گی۔ اگر اس نے فارس کے لیے انکار کر دیا تو پھر آپ حادثہ لیے انکار نہیں کریں گے۔“

بڑے ابا نے اثبات میں سر بلادیا۔ البتہ وہ متقلک اور متذبذب تھے۔ کیوں؟ ان کی خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔



جو فرق صبح پر چمکے گا تارا، ہم بھی دیکھیں گے

وہ شام بہت سہا نی اتر رہی تھی۔ زمر نے وسط کالوئی میں کارروائی اور گردن موڑ کر جنین کو دیکھا۔

”تمہیں یقین ہے تم میرے ساتھ آنا چاہتی ہو؟“ آج زمر کے دو دن کا وقت تمام ہوا تھا اور وہ تیار تھی۔

”پاڑیو!“ وہ گردن اکڑا کر بولی۔ ماتھے پر کئے بال چھوڑ کر باقی فرش چوٹی میں بند ہے تھے اور عینک کے پیچھے جھانکتی آنکھوں میں

بلکا اعتماد تھا اور مسکرا ہٹ بھی۔

”یہ لوگ اچھی لگ رہی ہے آپ پر۔“ ساتھ ہی اس نے جلدی سے جبڑا سیدھا کر لیا۔

زمر نے ”ٹھیکنس“ کہہ کر ڈیش بورڈ سے پھولا ہوا خاکی لفافہ اٹھایا۔ کار بند کی اور باہر نکل آئی۔

گھنٹی بجا کر دنوں منتظر ہی گیٹ پر کھڑی تھیں۔ زمر جنین سے دراز قد تھی۔ گھنٹہ ریالے بال جوڑے میں بند ہے اور سنجیدہ چڑھے۔ وہ لوگ واقعی اچھی لگ رہی تھی۔ پُر سکون، مختنڈے تاثرات۔ جنین البتہ پر جوش تھی۔

خراں خراماں چلتے وہ صاحب گیٹ تک آئے۔ ”جبی؟“

”میں ڈسٹرکٹ کورٹ سے آئی ہوں زمر یوسف۔ مزیماں کیمین سے ملنا ہے۔“

انہوں نے باہر جانا کا۔ ”کس سلسلے میں؟“

”اگر آپ اگلے تمیں سینڈ میں مجھے عزت سے اندر نہ لے کر گئے تو میں یہ کورٹ آرڈر (خاکی لفافہ لہرا لیا) واپس بچ کے پاس ہ جاؤں گی اور کہوں گی کہ آپ نے کوئتھا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ کل آپ کو جسٹس صدیقی کے پاس حاضر ہونا پڑے گا تو ہیں عدالت کے زمرے میں اور.... آپ دروازہ کھول رہے ہیں یا میں جاؤں؟“

صاحب کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ البتہ دروازہ انہوں نے پھر بھی قدرے تذبذب سے کھولا۔ اندر بیٹھ کنماؤڑ رانگ روم ا پر ہونی دروازے سے لے آئے۔ انہوں نے پاسیدان پر جوتے اتارے تھے۔ اندر نرم قالین تھا۔ زمر نے پاسیدان کو دیکھا اور پھر اپنے ہلا سمتی پتھر آئی۔ ناگ پر ناگ رکھ کر سنگل صوفے پہنچی۔ جنین بھی آنے لگی۔ پھر نگاہ ڈرانگ روم کی دیوار پر اعلیٰ اکیڈمک شیلہ پڑی۔ اس نے رک کر پاسیدان پر جوتے اتارے اور زمر کے قریب دوسرے صوفے پا آئی۔

”میرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔ مزیماں کیمین جلد ہی ان کے ہمراہ آئیں۔ زمر کو دیکھ کر کچھ ابھی ہوئی استقبالیہ مسکرا ہٹ کے ساتھ سلام کیا اور بیٹھتے۔ جنین پر نظر پڑی جوان کی آمد پر کھڑی ہو گئی تھی تو چونکیں۔ دوبارہ زمر کو دیکھا۔

”یہ میری بھتیجی ہے۔“ وہ سرداںکھوں کے ساتھ ان کو دیکھتے ہوئے ہوئے بولی۔ میڈم نے اب کے ذریں سنجیدگی سے جنین کو گھوکر دیا۔ اب گھنٹے مل کر بیٹھی تھی البتہ گردن ویسے ہی تھی ہوئی تھی۔

”آپ کس سلسلے میں....؟“

مگر زمر نے ان کو سوال پورا نہیں کرنے دیا۔ وہ صاحب واپس جا رہے تھے۔ اس نے ان کو پکارا۔

”آپ کدھر جا رہے ہیں محمود الرحمن جاوید صاحب! ساری بات آپ کے سامنے ہی ہوگی۔“ وہ متذبذب سے واپس آئی۔ یوں کو دیکھا۔ وہ مشتبہ نظروں سے زمر کو دیکھ رہی تھی۔  
”پاکستان پہل کوڈ پڑھا ہے، بھی آپ نے؟“  
”جی؟“

”ایک جرم ہے۔ آرنیکل 384،“ تین سال قید یا پھر جرمانہ یادوں۔ بلکہ میل کرنا بھی جرم ہے۔ آرنیکل 387،“ سات سال قید یا جرمانہ یادوں۔ اس وقت آپ یہ دنوں کر رہی ہیں اور بالکل بھی مجھے درمیان میں مت ٹوکیے گا کیونکہ میری بھتی کے ساتھ یہ دنوں جرائم کرنے پا آپ پر سزا واجب ہوئی ہے۔ آپ اس کو فورس کر رہی ہیں کہ یہ آپ کی بیٹی کے لیے نوش بنائے ورنہ آپ اسے اسکو سے نکال دیں گی.... اورہ شاید آپ نے اپنے شوہر کو نہیں بتایا۔“ محمود الرحمن صاحب اچھے سے باری باری دنوں کو دیکھتے۔

”یہ سارے جھوٹ ہے۔ آپ میرے ہی گھر میں آ کر مجھ پر ہی الزام کیسے لگا سکتی ہیں؟“

زمر نے خاکی لفاف اٹھایا۔ کاغذ کا لے شرپ سے سامنے رکھے۔

”محمود صاحب! آپ نے ہی الیوں میں ایک پلاٹ پنا جائز قبضہ کر رکھا ہے۔“ مزرا کیمین جو ضبط طیش میں ابھی بہت کچھ بولنے کا ارادہ رکھتی تھیں، ایک دم نٹے میں رہ گئیں۔ محمود صاحب چونک کراسے دیکھنے لگے۔

”آپ کے خلاف فیصلہ آیا تھا اور آپ نے فیصلے پر ائے آرڈر لے لیا تھا۔ اور یہ جو دوسرے کاغذات ہیں یہ میں کل عدالت میں جمع کرداوں گی جس کے بعد آپ کا ائے آرڈر کینسل ہو جائے گا۔ آگے جو ہو گا وہ آپ جانتے ہیں۔“

”یہ بھی جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ وہ پھر سے عالم طیش میں آکر بولنے لگیں۔ محمود صاحب یکے بعد دیگرے کاغذات کو دیکھ رہے تھے اور رنگت اڑتی جا رہی تھی۔

”کیا ثبوت ہے اس کے پاس کہ میں نے ایسا کہا ہے؟“

اپنے ہاتھوں کو دیکھتی ہیں نے سراخھا یا اور آئی فون کی سیاہ اسکرین ان کے سامنے کی۔

”میم.... اس دن کی ہماری اسٹاف رومن کی گفتگو میں نے اس میں ریکارڈ کر لی تھی۔“ بڑے ادب سے گزارش کی۔ میم کو ایک دم

سانپ سونگھ گیا۔ بالکل چپ ہو گئیں۔

”آپ بالکل بھی نہیں چاہیں گی کہ ہم یہ گفتگو پر نسل صلحہ کو سنوا میں۔ راست؟“ زمر نے سادگی سے سوال کیا۔ وہ دنوں خاموش تھے۔

”چاۓ تو نہیں پلوا کیس گے آپ؟“ اگلا سوال مزید سادگی سے پوچھا۔

”دیکھیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ...“ اگلے پانچ منٹ وہ ان کو ہاتھ اٹھا کر سمجھاتے رہے۔

مذکورہ یقین دہانی۔ مزرا کیمین بالکل خاموش بیٹھی رہیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر کے زمر نے سوچتی نظروں سے ہیں کو دیکھا جو سیٹ بیٹھ باندھ رہی تھی۔

”یون تو تمہیں کاردار صاحب نے میم سے آخری گفتگو کے بعد نہیں دیا تھا؟“

ہیں نے شرات سے لب دبائے نظریں اٹھائیں۔

”چھپھو! میری بھی ایک سائیڈ اسی ہے جسے آپ نہیں جانتیں۔“

وہ نہیں کر کارٹ اسٹارٹ کرنے لگی۔

”ویے آپ میری پرنسپل سے بھی توبات کر سکتی تھیں، ہے نا؟“ اسے ابھی خپال آپا۔

”میں نے مسئلہ حل کرنے کا وعدہ کیا تھا، مسز بائیکن کو تمہارا دشمن بنانے کا نہیں۔“

جنین کے لئے "اوہ" میں گول ہوئے۔ پھر مسکرا دی۔ "تھیںکس!"

تمہارے فارس ماموں کا آج شام تمہاری طرف آنا ہوگا؟ وہ عموماً یک اینڈز پر آتے ہیں نا۔ مجھے ان سے کچھ بات کرنی تھی۔ اسی لیے سوچا ملاقات ہو جائے تو اچھا ہے۔ ”خشن نے بری طرح چونک کراسے دیکھا۔ وہ پرسکون سی ڈرائیور کر رہی تھی۔

”وہ....شام میں آئیں گے، کہا تو تھا۔ آپ تھوڑا سا گھر چل کرو یہ کر لیں گی نا؟“

شیوه

جنیں سامنے وٹا اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ انگلیاں بھی مروڑتی رہی۔ پھر درا کی ذرا زمر کو دیکھا۔ ”یہاں روک دیں۔ پودینہ لے لوں میں۔“

”پوڈینہ کیوں؟“ وہ مارکیٹ کے قریب کار لے گئی۔

”جب چنی بناوں گی تو امی کولارزی پکوڑے بنانے پڑیں گے۔ سمجھا کریں نا۔“

وہ بزری کی دکان کی طرف آئی اور ذرا اوٹ میں کھڑی ہوئی کہ دور پارکنگ میں موجود زمراءں کونہ دیکھ پائے۔ جلدی سے موبائل پر (جس میں امی کی سم تھی) کال ملائی۔

”ماموں! آپ اسی وقت ہمارے گھر آ سکتے ہیں؟“

”نهیں۔“ وہ مصروف تھا۔

جنین نے فون کان سے ہٹا کر اسے گھورا۔

”امی پکوڑے بنارہسی ہے۔“

”میر اڈا منگ سے ہوا۔“

"اوفو! پچھواؤئی ہوئی ہیں۔ ان کو کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ آپ نے نہیں آنا تو نہ آئیں۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ وہ آپ سے فون سہی بات کر لیں۔" وہ جل کر بولی۔ امدادی کہ اب وہ فوراً ہایمی بھر لے گاگر.....

”شیور! ان کے ماس میر انہر سے۔ اب میں کام کر لوں؟“

بھر کا سے اب مجھے جھوٹا ناٹھا سیت کرنا ہے تو مرضی سے بائے۔ "جلدی سے فون بنے کر دہا اور سنس کے واٹکو میسے بنے گی۔

بماں جرم و فقا دیکھئے کس کس یہ سے ثابت ..... وہ سارے خطاکار سردار کھڑے ہیں

شہر سنانے دروازہ کھٹکا ہٹایا پھر دھکیلے ادھارا۔

شہر و کاؤنچ سے آڑا تر حوالہ لئا تھا۔ نگاہیں پھر کر بگزیر تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا جو حکم حکم مل کھڑا تھا۔ یہ کوشش نہیں ہے۔

۱۱) جو بچہ کا طریقہ دونوں اطراف میں آگ کو آتے آنکھوں میں بھس دی تھی

”مجمع افسوس سر جو تمہار سے اتنی بھا۔“

”سہ تیکرے“ اور ”نیکے“ سے کہ کہ جو بھیسا لائے جائے کہ مالک نہ کہا ”جہا کہتے نہیں۔ تا۔“

”میں بالکل بھی ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی کی پشت پاس کی شکایت لگاتے ہیں۔ مسز کاردار نے بتا دیا ہو تو وہ الگ بات ۱۰ یہے.... وہ انگلیاں بالوں میں اوپر سے نیچے لاتے ہوئے سوچ کر کہنے لگی۔ ”ان کو ایک دم کیسے پتا چل گیا کہ ڈرگز تھا رے کر کے میں ہی اس کی؟“

”لو... میں کے لیے چہرے پڑھنا کیا مشکل ہے۔“

”تمہارا چہرہ تو آتے ساتھ ہی پڑھ چکی تھیں کئی دفعہ۔ میں تو یہ سوچ کر جیراں ہوں کہ وہ ٹھیک بیٹھی تھیں اسٹڈی میں، پھر اچانک...“ ۱۱، ۱۲، ۱۳ دیا۔ ”تمہارے دوست کے جاتے ہی ان کو کیا ہو گیا۔“

نوشیر وال نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”سعدی کے جاتے ہی؟“

”ہاں وہی تھا را دوست۔ کافی دیر بیٹھا رہا می کے ساتھ۔ اچھی گپ شپ ہے اس کی تھا رہی می سے۔ وہاں بھی اس کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ می کا تو آنے کا پروگرام بھی نہیں تھا۔ یہ تو یہ شام کی چائے پی رہے تھے جب می کو کوئی سیف آیا۔ شاید اسی کا تھا۔ تو انہوں نے فوراً آنے کا ان ٹالا۔ شاید کوئی ضروری بات ہو گی جس سے می کو مطلع کرنا ضروری ہو گا۔“ بہت سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتی وہ واپس پہنچی۔ پھر ذرا سی ۱۴ ان موڑ کر اسے دیکھا۔ آنکھیں سکیز کر کافی ہمدردی سے۔ ”شیر و تمہیں نہیں لگتا کہ تمہیں اپنے جیسوں سے دوستی کرنی چاہیے۔ کہاں تم لہاں ہے؟“ اور ہاہر جلی گئی۔

نوشیر وال الجھا الجھا سا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم اٹھا۔

شہرین نے کچن سے جھاٹک کر دیکھا۔ وہ می کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ پر سکون سامکرا دی۔ شیر و کے دوست کا داخلہ تو اس کم میں بند ہوا کہ ہوا۔

نوشیر وال اندر آیا۔ جواہرات با تھر روم میں تھی۔ موبائل بیڈ سائیڈ پر ہاتھا۔ اس نے احتیاط سے با تھر روم کے دروازے کو دیکھتے ۱۵ میں الہایا اور پیغامات کھولے۔ سعدی کے نام سے اکا دکا پیغام تھے۔ وہ سمجھتا فون رکھنے لگا۔ پھر کسی خیال کے تحت رکا۔ با تھر روم کا دروازہ اب بھی بند تھا۔ وہ فون ہاتھ میں لیے چکتی اسکرین پر چند ٹین اور دبانتے لگا۔ جی میں کھولی۔ جواہرات کی میلو نانچیں۔ ذرا سا صفحہ اور کیا اور یہ رہا سعدی کی میلو کا قھری۔ اور نیچے تمام گفتگو۔ گویا مکالمہ تھا۔

”شیر و کیا کر رہا ہے آج کل؟ ڈرگز تو نہیں لے رہا؟ کس سے دوستی ہے؟ ڈرگز تو نہیں لے رہا؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ ڈرگز تو نہیں لے رہا؟“ جواہرات کے طویل سوال اور سعدی کے غصہ جواب۔ مگر جواب بہر حال جواب ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے پرانے پیغام کھلتے گئے اس کا ۱۶ اعلوں سٹ کر چہرے پا آتا گیا۔ لب سمجھنے کے۔

وہ تو لیے سے بال تھپتھاتی باہر نکلی تو ٹھیک کر رہ گئی۔ شیر و کا لال بھروسہ کا چہرہ موبائل کی لائٹ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ تو لیے پھینک کر ۱۷ آئی۔ زمی سے اسے پکارا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

اس نے شعلہ بار نکالیں اٹھائیں۔ اسکرین کو نہیں دیکھا۔ وہ جیسی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی ۱۸۔

”وہ میری جا سوئی کرتا تھا آپ کے لیے؟“

”شیر و تم دوبارہ ڈرگز نہیں لو گے۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔“ اس نے شیر و کا بازو تھاما۔

”نہیں لوں گا، نہیں لوں گا۔ کتنی دفعہ بتاؤ؟ مگر اسے میں نہیں چھوڑوں گا۔“ موبائل بیڈ پر پھیکا اور بازو غصے سے چھڑا تباہر

نکل گیا۔

جو اہرات نے فوراً فون اٹھایا اور سعدی کا نمبر نکالا۔ کال بُن پہ ہاتھ رکھا، پھر رک گئی۔ وہ ڈر گز نہیں لے گا، یہ تسلی تھی تو دوستوں کے آپ کے معاملے میں اسے پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ اونہوں۔  
شانے ذرا اچکا کراس نے فون پرے ڈال دیا۔

❖❖❖

اب نہ وہ میں ہوں، نہ تو ہے، نہ وہ ماضی ہے فراز ..... جیسے دو سائے تمنا کے سرابوں میں ملیں  
گرم گرم پکوڑوں کی مہک سارے میں پھیلی تھی۔ زمر اپنے مخصوص صوفے پتیجی تھی۔ سیم اس کے پیروں کے قریب کارپٹ پہ  
بلکس جوز تو زر ہاتھا۔ حنین کافی پر جوش سی برتن لگا رہی تھی۔ زمر کو دیکھتی تو شrama کر سکرادیتی۔ وہ بھی سکرادیتی۔  
فارس ابھی آیا تھا اور سوائے سلام کے کچھ نہیں بولا تھا۔ سلام میں بھی وقفہ دیا کہ زمر کی لوگ دلکھ کر وہ ذرا سار کا تھا، پھر یہ وہ  
اثھا کر چینل بدلنے لگا۔ آفس سے آیا تھا، کوت نائی سب ہٹ تھا۔

”یہ.... اچھی لگ رہی ہے۔“ ندرت کچن سے ادھر آئیں تو صوفے سے کچھ اٹھاتے ہوئے زمر کی بد لی ہوئی لوگ دیکھی۔ حنین نے  
ذرا بلند آواز میں تبصرہ کرتے پلٹیں لگائیں۔

”یہ پچھوکوان“ کی، ”کسی پرانی اسٹوڈنٹ نے گفت کی ہے۔ ساتھ میں ایک نوٹ بھی تھا۔ میں نے بھی پڑھا وہ نوٹ۔ ویسے....  
پچھو! آپ نے اس کی لکھائی نہیں پہچانی؟ ماموں لیں تا۔“ ساتھ ہی ماموں کو پلیٹ کپڑائی۔ اس نے بنا کسی تاثر کے سنجیدگی سے پلیٹ لے کر  
سائیڈ پر رکھ دی۔ پکوڑے ابھی کڑا ہی میں تھے۔  
”نہیں۔ اتنا پیپروک ہوتا ہے پہچانا مشکل ہوتا ہے۔“ زمر سادگی سے ندرت کو قدرے آہستہ آواز میں بتا رہی تھی۔ ندرت دوبارہ کچن  
میں آئیں تو حنین ساتھ چلی آئی اور کچن کا لاوَنچ میں کھلتا دروازہ بند کر دیا۔ کڑا ہی میں پکوڑا ذلتی ندرت نے مڑکرا سے دیکھا۔  
”دروازہ کیوں بند کیا؟“

(تاکہ ہیر و ہیر وئں سے اپنے پروپوزل پہ تبادلہ خیال کر لے اور آپ درمیان میں انحری نہ دیں۔)

”دھوان لاوَنچ میں جا رہا تھا۔“ ایگر است چلا کر آتیں موزتی وہ چنی بنانے کھڑی ہو گئی۔

”آج تم اس موئے کمپیوٹر اور علیشا کو چھوڑ کر کچن میں گھسی ہو جیرت ہے۔“ امی کی شکایت نظر انداز کر کے وہ سرجھکائے سکراتے  
ہوئے چنی کو مٹے گئی۔

لاوَنچ میں ٹی وی کا شور تھا یا سیم کی خود سے کی جانے والی باتیں۔

”محبے آپ سے کچھ بات کرنی تھی فارس!“ قدرے تذبذب سے اس نے آغاز کیا۔ ریوٹ رکھ کر رخ اس کی طرف کیا اور سمجھی گی  
سے اسے دیکھا۔

”کس سلسلے میں؟“

”ایک کیس کے سلسلے میں۔“

وہ ذرا چونکا۔ اس نے سمجھا تھا شاید.... اونہوں یہ کوئی اور معاملہ تھا۔

”آپ کو تو پتا ہے بعض دفعہ ایک وکیل استغاثہ میں ہوتا ہے اور جیسا فیصلہ منادیتا ہے جو دوسرے فریق کے لیے خوشنگوار نہیں ہوتا۔“

رک رک کر الفاظ ادا کیے۔ فارس نے سر ہلا کر ساری بات ڈی کوڈ کی۔

”یعنی آپ کی وجہ سے کسی کو سزا ہو جاتی ہے۔ ہوں، پھر؟“  
وہ ذرا دریکو چپ ہوئی۔ ”میرے ایک کیس کا فیصلہ اسی طرح ہوا تھا۔ مجرم کا بھائی اس سے خوش نہیں تھا اور وہ اس کا اظہار بھی کر

”یعنی اس نے آپ کو دھمکیاں وغیرہ دی ہیں۔ ہوں، آگے؟“

”آ.....جی..... آپ جانتے ہیں ہمارے خاندان میں....“

”آپ معاملہ گھر تک نہیں لے جانا چاہتیں، باہر ہی باہر حل کرنا چاہتی ہیں۔“ اس دفعہ فقرہ ہی نہیں پورا ہونے دیا۔ وہ گھری سانس  
لارہا گئی۔

”میں چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ میں.... وہ رک گئی۔ بات پیٹ کر کرنے کا فائدہ نہ تھا۔ وہ شخص اسکوں کی ٹیچر نہیں تھا جس سے وہ  
اپنا ہونس سے پچھا چھڑا سکتی تھی۔“

”اگر میں آپ کے ذیپا رٹمنٹ میں اس کی شکایت درج کرواؤ تو اس شخص کی ہراس منٹ روکنے کا طریقہ کا رکیا ہو گا؟“  
”کوئی مسئلہ نہیں۔“ وہ بیچھے ہو کر بیٹھا۔ کان کی لور گڑتے ہوئے لاپرواٹی سے شانے اچکائے۔ ”میں ڈائریکٹر سے بات کروں گا۔  
اپنا اسے پک کر لے گی۔ دوچار ہاتھ لگیں گے تو دماغ درست ہو جائے گا اس کا۔“

زمر کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ فوراً انfi میں سر ہلا یا۔

”نہیں پلیز میں تشدید پے یقین نہیں رکھتی۔ یہ مسئلہ بات چیت سے حل ہو سکتا ہے۔ سب کے اندر اچھائی کا عنصر ہوتا ہے۔ ہمیں صرف  
اپنا اسے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”آپ دو گھنٹے کے لیے اسے میرے لڑکوں کے حوالے کر دیں۔ ساری اندر کی اچھائی باہر آجائے گی۔“ پھر اس کے تاثرات دیکھ کر  
کلم آہا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے یہ ذکر ہی بھول جانے کا کہہ دیتی وہ قدرے نرمی سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ بات کر لیتے ہیں پھر۔ میں مل لوں گا اس سے۔ مرد کا بات کرنا اور ہوتا ہے۔“

”اوکے!“ اس نے سر ہلا یا۔ ذرائعی ہوئی۔ ”وہ آدمی آج کل کو رث آتا ہے روزِ اپل کے چکر میں۔ اگر آپ صبح آ جائیں تو میں  
اکھاں گی۔“

”شیورا!“ قدرے ٹھہر کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”کوئی اور مسئلہ؟“

”نہیں، بس یہی تھا۔ تھیں کسی!“ وہ ہلکا سامسکرانی۔ فارس نے گھری دیکھی اور آواز دی۔

”خین! لارہی ہو یا میں جاؤں؟“

”نہیں لارہی۔ آپ جائیں۔“ وہ دش اٹھا کر آتی ہوئی بڑے موڑ میں بولی۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

خالی ہاتھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز ..... کس طرح لوگ لکھروں سے نکل جاتے ہیں  
پکوڑے ختم ہو گئے۔ زمر چلی گئی۔ اسی نماز پڑھنے کمرے میں گئیں تو فارس ان کے پاس چلا گیا۔ اب خنی تھی اور آن لائن  
ہل ملیشا۔

”میرا مسئلہ حل ہو گیا۔“ اس نے چکتے ہوئے اطلاع دی۔ علیشا عادتاً نہیں۔

”بہت کی یا زیادہ بہت والا ڈھونڈا؟“

”زیادہ بہت والی کوڈھونڈ کر کچھ بہت کر لی۔“ پھر خیال آنے پہل فون اٹھا کر دکھایا۔  
”یدیکھو.... مجھے گفت ملا۔“

”واو۔ برینڈ نیور؟“ وہ بھی پر جوش سی آگے ہو کر دیکھنے لگی۔

”ہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ ایک امیر سے انکل ہیں ہمارے احباب میں۔“ وہ کار رجھاڑ کر بولی۔

”واقعی؟ اور وہ کون ہیں؟“

”میرے انکل کے انکل۔ یہ پیچیدہ رشتہ داریاں تم نہیں سمجھوگی۔ اچھا مجھے ایک بات بتاؤ، تم نے اس جیولز والی یگم میں...“ لینڈ لاکن فون کی گھنٹی پر وہ بد مرزا ہوئی۔ آگے بڑھ کر نمبر دیکھا۔ بڑے ابا کے گھر سے تھا۔ دوسرا گھنٹی پر فون خاموش ہو گیا۔ امی نے اندر سے اٹھا لیا ہو گا۔ وہ مطمئن سی ہو کر بات کرنے لگی۔ پھر ایک دم رکی۔ جلدی سے علیشا کو بائے کہا اور آہستہ سے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ حسب توقع بڑی امی ہی تھیں۔ وہ چیختکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سننے لگی۔

”میں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا زمر نہیں مانے گی۔ اس نے تو صاف انکار کر دیا ہے۔“

”مگر..... میں خود بات کر کے دیکھوں، شاید.....“ ندرت کواب بھی اس تھی۔

”بھتی جب اس نے انکار کر دیا تو کیا گنجائش رہ گئی۔ دیکھو برانہ مانا، مگر وہ اسے جانتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مزاج کا بہت خت اور غصے والا ہے، وائلڈ سا۔ اس کے ساتھ کیسے گزارہ کرے گی وہ؟“

خین نے رسیور کر دیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ بارہ نج گئے تھے اور سنڈریلا کی سواری جس پر وہ اڑتی جا رہی تھی، بد صورت کدو میں بدل کر زمین بوس ہوئی تھی۔ وہ بے دم سی ہو کر وہیں بیٹھی رہی۔

ندرت کو عموماً یکسینٹش سے دوسرا فون اٹھائے جانے کا پتا چل جاتا تھا کہ آواز ہلکی ہو جاتی، مگر آج نہیں چل سکا۔ انہوں نے بے بسی سامنے بیٹھے فارس کو دیکھا جو بغور ان کے تاثرات پڑھ رہا تھا اور رسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

”انکار کر دیا؟“

”میں زمر سے خود بات کروں گی۔ وہ اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتی۔ وہ...“

”کس طرح کی بات؟ کہہ دیں۔ میں بر انہیں مانوں گا۔“

”یہی غصہ اور مزاج کی گھنٹی۔ مگر تم اس بات کو اتنا کا مسئلہ نہ بنانا۔ مجھے ایک دفعہ مزید...“

”نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔ انکار ہو گیا، بات ختم۔“

”فارس! صرف ایک دفعہ مجھے...“ وہ نفی میں سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپا! بندہ عزت سے رشتہ مانگتا ہے اور عزت سے نہ ملے تو قصہ تمام۔ میں دس سال کا تھا جب میرا باپ فوت ہوا تھا۔ عمر گزر رچی ہے رشتہ داروں کی سیاستیں دیکھتے دیکھتے۔ یہ سوتیلے کا لفظ تب آ کر ختم ہوا جب ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنا شروع کیا، شاید دس بارہ سال پہلے۔ درمنہ اس سے قبل وارث ہو، آپ ہوں یا آپ لوگوں کے رشتہ دار میں سب کے لیے دوسرا بیوی سے ہونے والا سوتیلہ بیٹا ہی تھا اور آپ میں سے کوئی مجھے پسند نہیں کرتا تھا۔ میں یہ سب آپ کا دل دکھانے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ ان باتوں کی اب کوئی اہمیت نہیں۔ بس اتنا بتانا ہے کہ میں آپ کے رشتہ داروں میں اگر شادی کرتا تو عزت سے کرتا، ورنہ نہیں۔ اس لیے اب دوبارہ ان سے بات مت سمجھیں گا۔“

ندرت نے آہستہ سے سرا ثابت میں ہلایا۔ وہ اس کو سمجھ سکتی تھیں۔

ستم گر تم سے امید کرم ہو گی جنہیں ہو گی ..... ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے اسے سی کی ہوانے آفس میں خنک ساما حول پیدا کر دیا تھا۔ زمر نے بات کا آغاز کرنے سے پہلے تمام فائلز اور پر تلے کر کے ایک طرف رکھیں۔ پھر کرسی پر پیچھے ہو کر پیٹھی اور گہری سانس لے کر میز کی دوسری جانب موجود اس ہینڈ سم آدمی کو دیکھا جو ناٹگ پٹا نگ رکھ کر بیٹھا تھا، کروں ذرا جھکائے، ہاتھ میں پکڑے موبائل پر کچھ ناٹپ کرتا، جیل لگے بال پیچھے کویٹ کیتے تھے ابرو۔ سعدی نے جو اس کا ذکر کر کے تاثر ہوا تھا وہ کسی بہت خوش اخلاق اور عاجز آدمی کا تھا۔ یہ آدمی اس سے مختلف لگتا تھا زمر کو۔

”تو آپ سعدی کی پیچھوں ہیں؟“ بنا جذبات سر دسپاٹ سا پوچھا۔ ابھی تک ناٹپ کر رہا تھا۔

”جی کاردار صاحب!“ اس نے سر کو بلکا سامنہ دیا۔ اس لحاظ سے میں یہ بھتی ہوں کہ آپ کچھ پروفیشنل کرنسی کا مظاہرہ کریں گے۔“

”آپ کے کلاسٹ نے میرے ڈرائیور کو لوئے کی کوشش کی، پھر اسے گولی مار دی....“

”گولی چل گئی۔“ اس نے ضبط سے تصحیح کی۔

”اور پھر اس نے پولیس کے سامنے اعتراف بھی کر لیا۔“

”جی۔ جب اس نے خود پولیس کو بلایا تاکہ وہ زخمی ڈرائیور کو اسپتال لے جائیں، تب اس نے اعتراف کر لیا۔“

”آپ ایک چور اور قاتل کی حمایت کر رہی ہیں؟“ ہنوز گردن جھکا کے تیز تیز ناٹپ کر رہا تھا۔

”میں اپنے کلاسٹ کی حمایت کر رہی ہوں۔“ ”زادی کو روکی۔“ کیا ہم اس معاملے کو سیئل کر سکتے ہیں؟“

”ایک دفعہ غور سے مجھے دیکھیں اور بتائیں کیا مجھے آپ کی دیت چاہیے ہو گی؟“

زمر نے سر سے پاؤں تک اس کو دیکھا۔ ہزاروں روپے کا ہمیز کٹ، ڈھانی تین لاکھ کا سوت، اتنی ہی مالیت کے جو تے ادا اور

۴۷

”پروفیشنل کرنسی کا ردار صاحب!“ اس نے یاد دیا۔ ہاشم نے موبائل رکھا اور نظر اٹھا کر بے تاثر آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”لبی بی! میں آپ کو ایک فیور دوں گا۔ آپ اپنے کلاسٹ کو کٹھرے میں لے آئیں۔“

”سبھی بھی نہیں۔“

”آپ اس کو کٹھرے میں لا کر نجح کے سامنے testify کرنے دیں۔ مجھے اس کی دیت نہیں چاہیے، مجھے اس کی شرمندگی چاہیے۔“

۴۸ ایسا کر دیں، میں کم سے کم سزا کا مطالبہ کروں گا۔“

وہ چند لمحے پر سوچ نظر دوں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ سنجیدہ تھا۔

”کتنے سال؟“ ہاشم کے سناۓ گئے سال اسے قبول تھے۔

”اوکے!“ اس نے ہای بھر لی۔ وہ اٹھا کوٹ کا بن بند کیا۔ بلکا سامسکرایا، سر کو ختم دیا اور باہر لکل گیا۔

اس نے موبائل چیک کیا۔ فارس کی کوئی کال، کوئی پیغام نہ تھا۔ وہ درمے متذبذب سی پیٹھی رہی۔ پھر اسے فون کیا۔

”آپ نے کہا تھا کہ آپ صحن آئیں گے۔ میں انتظار کر رہی تھی۔“

وہ ایک لمحے کو بالکل خاموش ہو گیا۔ ”میں آرہا تھا۔“ زمر کو تسلی ہوئی۔ اس آدمی کو ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اس نے کاریڈور کے دوسرے

ہرے پر واقع ایڈوکیٹ مشہود کے چیمبرز میں گم ہوتے دیکھا تھا۔ روز ہی وہ آتا۔ ہر دفعہ اسے گزرتے گزرتے کوئی خخت بات کہہ جانا، کوئی فی خیز اشارہ... اف! وہ ناٹگ آگئی تھی۔

باہر جانے کے لیے دروازہ کھولا تو اسی وقت فارس نے اسے کھونے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس کا ہاتھ ہوا میں رہ گیا۔ پھر اس نے پیچھے کر

لیا۔ ایک پرسوچ نظر زمر پڑا۔ اس کے چہرے پاسے آتے دیکھ کر اٹھیاں آیا تھا۔ لوگ مزید دیکھنے لگی۔

”رانا صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔ آپ خود اس سے بات کر لیں گے نا؟“ وہ تسلی کرنا چاہ رہی تھی۔ دکلا کے چیمبرز کے آگے یہ راہداری تھی۔ بالکونی نما، جس کے دوسری طرف سے نیچے موجود مارکیٹ، گاڑیوں کا شور، نابائی کا تھیلا، سب نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ویس کھڑے تھے۔

”ہوں۔ کدھر ہے وہ؟“ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے فارس نے اوھرا دھر گردن گھمائی۔ آج وہ جیز پر راؤ نہ نیک والی شرٹ میں ملبوس تھا جس کی آستین کلائی سے باشت بھر پیچھے تک آتی تھی۔ وہ اپنے کزن سے بہت مختلف تھا۔

”یہ ارشد فیاض موچھوں والا۔“ زمر نے ابرو سے اشارہ کیا۔ وہ شخص اب چیمبر سے نکل رہا تھا۔ فارس نے چند لمحے غور سے اسے دیکھا۔ پھر بہت سکون سے زمر کی طرف گھوما۔

”آپ جائیں۔ میں نرمی سے سمجھادوں گا۔ وہ صبح آ کر آپ سے معافی مانگے گا۔“

اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری، پھر فکرمندی۔ ”مگر.... فارس آپ اسے....“

”ڈونٹ وری۔ میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔“ ہاتھ جیبوں سے نکال کر اٹھا دیے۔ وہ ذرا مسکرا کر سر ہلانی آگے بڑھ گئی۔ فارس وہیں کھڑا رہا جب تک کہ وہ چلنے لگئی۔ پھر وہ ارشد نامی اس شخص کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ دو پلازوں کے درمیان رش سے بھری جگہ میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ فارس فاصلہ کر کر اس کے عقب میں تھا۔ جب سڑک قریب آنے لگی تو وہ اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے منہ میں کچھ چباتا تیز چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔

”کیا حال ہیں ارشد صاحب! گھر میں سب ٹھیک ہے؟“

ارشد نے چونک کر گردن موڑی۔ وہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

”کون؟“

”مجھے بیچاں جاؤ گے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ آؤ اس طرف۔“ سڑک کنارے کھڑی وین کی طرف اشارہ کیا۔ ارشد نے بگڑے تیور سے اسے دیکھا۔

”اوکون ہوتم؟“

”آرام سے بھائی صاحب۔ اس طرف آئیے۔ آپ سے کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔“ وہ وین کے قریب تھے۔ ارشد نے وہیں سے گزر کر آگے جانا تھا اور وہ ابھی کچھ سخت کہنے کو منہ کھول ہی رہا تھا کہ وین کا دروازہ سلا مینڈ ہو کر کھلا۔ دونوں جوان باہر نکلے۔ ایک نے قریب آ کر اس کے کندھے پر بڑے جوش سے ”السلام علیکم“ کہتے ہاتھ رکھا۔ سرخ ہاتھ میں ہی تھی۔ سوئی اندر گئی۔ ارشد جو اس افتاد پہنچے میں اگلے کو ہٹانے لگا تھا، بالکل ساکت ہوتا گیا۔ دونوں نے بازوؤں سے کپڑا کر اس بے جان ہوتے وجود کو دین میں ڈالا۔ دروازہ بند کیا۔ سب کچھ اتنی پھرتی سے ہوا کہ آس پاس کسی نے نوٹس نہیں لیا۔

فارس گھوم کر فرنٹ سیٹ پر آبیٹھا اور جھک کر ایک خانہ کھولا۔

”غازی! چلیں؟“ ڈرائیور نو جوان نے پوچھا۔

”ہوں!“ اس نے اثاثت میں گردن ہلائی۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر اسے دیکھا۔ وہ اس خانے سے دستانے نکال رہا تھا۔

”یہ کیوں؟“

فارس نے چیئرمین چباتے پتلا سا وہ دستانہ ہاتھ پر چڑھایا اور بیچھے کو کھینچا۔  
”زبان کا پکا ہوں۔ وعدہ کیا تھا اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔“ اب وہ دوسرا دستانہ پہن رہا تھا۔ ڈرائیور نوجوان نے ہنس کر سر جھلکا اور  
۱۷۶ لہجہ مکمل نہ لگا۔

قریباً چار گھنٹے بعد ایک نبتاب سنان سڑک پر وہی وین رکی۔ دروازہ سلاسیڈ ہو کر کھلا۔ ارشد کو نیچے اتارا گیا۔ اس کے چہرے پر کسی  
۱۷۷ دستان نہ تھا اب تھا وہ سفید نقاہت زدہ ساتھا۔

فارس نے اترے بغیر ذرا جھک کر اس کا کالر پکڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چبا چبا کر بولا۔  
”تمہارا چہرہ اس لیے چھوڑا ہے تاکہ جس کو تم اذیت دے رہے تھے اسے علم نہ ہو سکے۔ صحیح جا کر تم اس سے معافی مان گو۔ اور  
۱۷۸ اس کو شکل مت دکھانا اپنی۔ اور ہاں اگر ہمارے ڈرائیور کی سیر کا سفر نامہ اسے بتایا یا دوبارہ اس کو ہر اس کرنے کی کوشش کی تو طالبان  
۱۷۹ نہیں اگاہوں گا تمہارے اوپر۔ امریکی اگلی فلاٹس سے لے جائیں گے اور ساری عمر تمہارا خاندان تمہاری شکل کوتے گا۔ بات آئی ہے  
موم ہی میں یا نہیں۔“ کالر کو جھکل کے چھوڑا۔

ارشد نے دونوں ہاتھ اٹھا کر گہرے سانس لیے۔ سر بار بار اثبات میں ہلایا۔ ابھی وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ فارس نے ایک  
۱۸۰ نظر اس پر ڈالی، پیچھے ہوا، دروازہ زور سے بند کیا اور وین زن سے آگے بڑھ گئی۔

❖❖❖

کوئی آج تک نہ سمجھ سکا یہ اصول گھشن زیست کا ..... وہی پھول نذر خزان ہوا جسے اعتبار بہار تھا  
آج بھی دروازہ میری نے کھولا۔ وہ مسکرائی بھی مگر پھر بھی نوشیروان کے گھر میں عجیب فضا چھائی تھی یا شاید سعدی کو ایسے محسوس ہو رہا  
۱۸۱ ہے مال اس نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا اور اندر آیا۔ مسکردار کا پوچھا۔ وہ گھر پہنچنے تھیں۔ چلو اچھا ہے۔ اس کا کل ایگر امام تھا۔ شیر و  
۱۸۲ بھی کام کے لیے بلا یا ہے، وہ نپنا کرو وہ جلدی سے واپس پہنچنے کی کرے گا۔

شیرو کے کمرے کا دروازہ کھونے سے قبل اس نے گردون موڑ کر دیکھا۔ شہرین شاہانہ انداز میں لوگ روم میں صوفے پر آتش دان کے  
۱۸۳ یعنی تھی۔ سنبھری لٹ انگلی پر لیٹتی وہ مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ فضائیں گھات لگائے جانے کا احساس بڑھ گیا۔

سعدی نے دروازہ کھولا۔ نوشیروان کری پر بیٹھا تھا۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ آنکھیں گلابی تھیں۔ ڈرگز سے نہیں غصے سے۔

”خیریت؟ تم نے اتنی جلدی میں بلا یا؟“ سعدی نے سرسری سا پوچھا۔ وہ کھڑا ہوا۔ کڑے تیوروں سے اسے گھوڑتا سامنے آیا۔  
”کب سے جاسوئی کر رہے ہو میری؟“ سعدی نے گھری سانس باہر کو خارج کی۔

”اگر تمہارا اشارہ میرے ....“

”بکواس مت کرو۔ میں نے تمہیں اس لینے نہیں بلا یا کہ تمہاری سنوں۔“

”ہاں، تم نے مجھے اس لیے بلا یا ہے تاکہ مجھے بے عزت کر کے گھر سے نکال سکو۔“

”تم ہوتے کون ہو میری ماں کے لیے میری جاسوئی کرنے والے؟ تم ہو کون جو ان کو میرے ڈرگز لینے کے بارے میں بتاتے  
۱۸۴ ہے اس کے چہرے کے نقش بگز گئے۔

”میں تمہارا دوست ہوتا ہوں۔“

”تم نے مجھے میری ماں کی نظروں سے گرانا چاہا۔ تم نے ....“

”اگر گرانا ہوتا تو میں ان کو تمہارے چالان کے بارے میں بھی بتاتا جو گاڑی غلط ڈرائیور کرنے پر ہوا تھا۔ میں ان کو تمہارے اس لڑکی

کے مگیت سے مار کھانے کا بھی بتاتا جس کو تم مسلسل کا لزکر رہے تھے۔ اور بھی بہت کچھ بتا سکتا تھا مگر میں نے تمہارا بھلا چاہا۔“

”اوہ شش اپ۔“ وہ غصے سے چلایا۔ ”تم مت چاہو میرا بھلا۔ جو تمہارا احسان تھا میرے اوپر آج وہ بھی ختم ہوا۔ آئندہ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کروں گا۔“

”میں جا رہا ہوں نوشیر وال! کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ہم ایک دوسرے کو ایسی باتیں کہہ دیں جن پر ہمیں پچھتا ناپڑے۔“ وہ مزید بے عزت نہیں ہو سکتا تھا۔ شیر و کوچھ تھا جلاتا چھوڑ کر دروازہ بند کرتا باہر کلا پھر ٹھنک کر رکا۔

شہرین اسی تمنگنت سے بیٹھی اس کو دیکھ رہی تھی۔

”تم اس دن میرے برادر ان لاءے سے پوچھ رہے تھے کہ میں کیسی عورت ہوں۔ اب پتا چل گیا میں کیسی عورت ہوں؟“ ہاتھ بالوں میں اوپر سے نیچے لے جاتے مخصوصیت سے پوچھا۔

سعدی تھی سے مسکرا یا۔ فنی میں گردن ہلائی سامنے آیا اور اس کے مقابل پڑی کرسی کی پشت پہاڑھر کھر کر رکا۔

”میں نے یہ سوال اس لیے نہیں پوچھا تھا کہ میں نے آپ کو پورچ میں ایسی باتیں کرتے سنا تھا جن کے حکلے کا آپ کو ڈر رہا۔ میں نے یہ سوال اس لیے پوچھا تھا کیونکہ میں نے آپ کو اسٹڈی کی کھڑکی کے باہر کھڑے ہو کر اپنی اور مسز کاردار کی وہ باتیں سنتے دیکھا تھا جن کے حکلے کا مجھے کوئی ڈر نہیں تھا۔“ چاچا کا ایک لفڑا دیکھا۔ شہرین کی مسکرا اہٹ غائب ہوئی۔ گردن میں ابھر کر معدوم ہوتی گلٹی دکھائی دی۔

”دوستی میرے نزدیک ایک ہی چیز ہے۔ وفاداری اور صرف غیر مشروط وفاداری۔ مسز ہاشم کاردار! وہ دوبارہ ڈرگز لے گا، میں دوبارہ اس کی ماں کو بتاؤں گا۔ کیونکہ میری آپ کے خاندان میں آمد و رفت کی وجہ صرف شیر و سے دوستی نہیں ہے۔ یقیناً اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کیسا دوست ہوں۔“ وہ کہہ کر ڈرگیا۔ شہرین تملا کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔

”ایڈی بیٹ۔“

.....  
ہاشم ایک ہاتھ میں بربیف کیس تھا میں دوسرے میں موبائل پر کچھ تاب پر کرتا اہدواری میں چلتا جا رہا تھا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ بھری ہوئی سی تیز تیز پیچھے آئی۔ دائیں طرف سے نکل کر گھوم کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ رکا۔ نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”یہ کیا کیا آپ نے؟“ زمرد بابا ساغر اپنی تھی۔ اس کو بھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

”کیا کیا میں نے؟“ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

”آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کم سے کم سزا کا مطالبہ کریں گے۔ اور ابھی آپ نے سزا نے موت کا مطالبہ کر دیا؟“

”میں نے وعدہ کیا تھا؟ کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟ کوئی کاغذ؟ کوئی دھخنڈ؟“ زمر کے اندر جو ار بھانا کرنے لگا۔ بکشل ضبط کر کے نفرت سے اس کو دیکھا۔

”آپ نے مجھے زبان دی تھی۔“

”نہیں“ میں نے آپ کو سبق دیا تھا کہ کبھی استغاثہ کے ساتھ بغیر تحریری کاغذ کے ڈیل نہیں کیا کرتے۔“ وہ پر سکون تھا۔ دوبارہ سے فون پٹا پ کرنے لگا۔

”میں۔ میں آپ کے کہنے پر۔۔۔ میں اس کو کٹھرے میں لے آئی اور آپ نے کیا کیا میرے ساتھ؟ آپ کو اندازہ ہے یہ کیس رانا صاحب کے لیے کتنا ہم تھا؟ ان کی ریپیٹیشن کا سوال تھا۔“

”اور شاید آپ کی ملازمت کا بھی۔ اس بے وقوفی کے بعد آپ ساقینا ان کے چیمبر میں دوبارہ داخل ہونے کی ہست نہیں کریں گی۔“

۴۶ recommendation کا خط چاہیے ہوتا میں لکھنے کو تیار ہوں۔ ”وہ محظوظ ہوا تھا۔

زمر نے کیہے تو زناظر وں سے اسے دیکھا۔

”میں بھی تھی آپ سعدی کے رشتہ دار ہیں تو...“

”میں جب صبح سات بجے گھر سے لکھتا ہوں تو ساری رشته داریاں پیچھے چھوڑ کر آتا ہوں۔ بُرنس از بُرنس۔“ اس کا فون بجھے ۱۰۰۱ کان سے لگتا ہو کہتا آگے بڑھ گیا۔ زمر وہیں کھڑی رہ گئی۔ ہاشم نے درجاتے ہوئے فون کان سے ہٹا کر مڑ کر اسے دیکھا اور ذرا ۱۰۱۱ اڑا دی۔

”اگلی دفعہ میرے ساتھ ڈیل کرتے وقت انہاد مانع حاضر رکھیے گا۔“ اور پلٹ گیا۔ وہ بے نی بھرے غصے میں کھلوتی خالف سمت میں ۱۰۲۰ کھے گئی۔ وہ کسی کے سامنے نہیں رویا کرتی تھی، سوائے سعدی کے۔ البتہ اس وقت دل کر رہا تھا کہ بھری کچھری میں زمین پر بیٹھ کر دو ناشر دع

فارس ادھر آیا تو وہ باہر سیر ہیوں پر بیٹھی تھی۔ بظاہر لگتا وہ کسی کی منتظر ہے، مگر اس کا چہرہ... زردیا سیت بھرا ساتھا۔ وہ آخری سیر ہی کے ۱۰۲۱ اکروں ترچھی کر کے اسے دیکھنے لگا۔

”میں گزر رہا تھا تو... آپ تھیک ہیں؟“

زمر نے نگاہیں اٹھائیں۔ پھر دھوپ کے باعث پلکیں سکیز کر اسے دیکھا۔ ہلاک سا اثاثات میں سرہلا یا۔ آس پاس ابھی بھی خاصاً

”کیا وہ صبح آیا تھا؟“ ذرا احتیاط سے پوچھا۔ وہ پھیکا سامسکرا دی۔

”جی۔ آپ نے اسے کیسے سمجھایا؟ وہ بہت دھیما ہو گیا تھا۔ معافی بھی ماگی اور یہ بھی کہا کہ واپس دوئی جارہا ہے۔ دوبارہ ہر اس ان ۱۰۲۲ رے گا۔“ وہ ابھی تک اس کا یا پلٹ پر جیران تھی۔

”اوہ بھی کچھ کہا؟“ وہ غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سرہلا یا۔ ”اس سب کا شکریہ فارس!“ پھیکی مسکراہٹ بالکل غائب ہو گئی۔ بجھا بجھا سا چہرہ جھک گیا۔

”کوئی اور مسئلہ ہے؟“

”میری جاب چلی گئی۔ چھوڑنی تو دیے بھی تھی، کہیں اور اپلائی کر رکھا تھا۔ مگر اس طرح چھوڑنے کا نہیں سوچا تھا۔“ نہ اس نے ہاشم کا ۱۰۲۳ اس نے وجہ پوچھی۔ دونوں کویی مناسب لگا۔

”کیا آپ کی امی آپ سے میرا ذکر کیا تھا پچھلے ہفتے؟“ ذرا اٹھر کر بولا۔ زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر نا سمجھی سے نفی میں ۱۰۲۴ اس ہلائی۔

”نہیں.... کیوں؟“ اور فارس بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر ہلاک سانگی میں سرہلا یا۔

”یونہی۔ آپ کے ابو سے ملنا تھا تو۔ میرا خیال ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتیں۔ خیر جانے دیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔“ فارس نے اس

۱۰۲۵ اٹھانے دیا اور زمر نے اسے۔ وہ مڑ گیا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالئے سر جھکائے دور ہوتا گیا۔ وہ نیچے سر جھکائے خالی خالی ناظر وں سے اپنے

۱۰۲۶ ایک مقبرہ تھی۔

ایک نگاہ بر فیلی، ایک بول پھر سا ..... آدمی نہیں مرتا صرف خون بننے سے کھانے کی میز پر روٹی کا ذبب ڈوٹکے سلاڈ سب حسب معمول سجا تھا اور وہ لفڑ توڑتے ہوئے کھر رہی تھی۔

”میں یقین نہیں کر سکتی اب اک سعدی جس آدمی کی اتنی تعریف کرتا تھا، وہ اتنی چھوٹی حرکت کر سکتا ہے۔“ لفڑ چبا کر گلاس لبوں مل گایا۔ پھر باری باری دونوں کو دیکھا۔ ”میں نے سعدی کو بھی فون کر کے کہہ دیا۔ دوبارہ اپنے ہاشم بھائی کا ذکر بھی مت کرنا میرے سامنے۔“

”اس نے کیا کہا آگے کے سے؟“ بڑے ابا سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

”وہ تو خود جیران تھا۔ مگر اسے لگا کہ یہ کوئی غلط فہمی ہے۔ میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اس کا دل کیوں خراب کروں اپنے ہائی کے لیے۔“

فرحانہ نے گھری سانس لے کر سلاڈ کی پلیٹ اٹھائی۔

”فارس کا کزن جو ہوا۔“

بڑے ابا نے ایک ملامتی نظر ان پڑالی اور ایسی ہی دوسرا نظر زمر پہ اور سر جھٹک کر کھانے لگے۔ زمر نوالہ سالن میں ڈبوری تھی۔ میں سر پلانے لگی۔

”نہیں ای! فارس تو بہت اچھا ہے۔ بہت ڈسینٹ اور میز ڈ۔ ہمیشہ ٹوڈی پوائنٹ بات کرے گا۔ کبھی آپ کو نقصان پہنچانے والی حرکت نہیں کرے گا۔“

بڑے ابا کا نوالہ حلق میں انک گیا۔ چونکہ کمزور دیکھا پھر فرحانہ کو۔ ان کی رنگت ذرا پھیکی پڑی۔ فوراً اڑکھوں کر رہیاں گما گیں۔

”یہ پوری ہو جائیں گی یا مزید بنا دوں؟“

”یونو اٹ ابا۔“ زمر کا ہاشم پر غصہ کم ہو چکا تھا اور اسے فارس اور اس کا فرق واضح نظر آ رہا تھا۔ ”صرف اس لیے کہ میں فارس کی رہی ہوں، اس نے پچھلے ایک ڈیڑھ بھنٹے میں مجھے دو تین فیورز اکٹھے دیے اور ایک دفعہ بھی نہیں بتایا۔ یہ سعدی لوگ اکثر کہتے ہیں ہمارہ ماموں بہت غصے والے ہیں، مگر میرا خیال ہے وہ بہت سوبر ہے۔ اور ہاشم.... اف۔“ جھر جھری لے کر سمجھنے والے اس نے اگلوں الہ توڑا۔

بڑے ابا کا کھانا حرام ہو چکا تھا۔ وہ نیکن سے ہاتھ رکھ کر صاف کرنے لگے۔ زمر نے کھانا ختم کیا اور پہنیں اکٹھی کر کے پکن! لے گئی تو فرحانہ بھی ساتھ ہی آگئیں۔ اس نے فرتح کھولا تو مٹھائی کاٹو کر اندر کھا تھا۔

”یہ کہاں سے آیا ای؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس جامن اٹھایا اور منہ سے بوڑا۔

”حمداد کے گھر سے۔ وہ لوگ آج آئے تھے۔ ہم نے ان کو ہاں کر دی ہے۔ بتایا تھا نا۔“ وہ سالن ڈبوں میں ڈالی فرتح میں رکھ رہی تھیں ”ہوں۔ اچھی ہے۔“ گلاس جامن اندر تک گھل گئی۔ وہ ہاتھ مند ڈھونکر ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چل گئی، فرحانہ باقی برتن اٹھانے والیں تو بڑے ابا ہنوز سربراہی کری پہ بیٹھنے تھے۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ افسوس ملامت، وہ ہرث ہوئے تھے۔

”آپ نے زمر سے نہیں پوچھا تھا؟“ وہ آہستہ سے بولے۔

”پوچھ بھی لیتی اور وہ مان بھی جاتی تب بھی میں ندرت کے بھائی کو اپنی بیٹی کا رشتہ نہ دیتی یوسف صاحب۔ کبھی بھی نہیں۔ ندرت چاہتی ہے کہ میں جھک کر رہوں تو ایسا نہیں ہو گا۔“ تیز لمحے میں کہتیں برتن اٹھا ٹھیک کرنے لگیں۔

”آپ نے زمر سے نہیں پوچھا تھا؟“ وہ کری دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرحانہ نے فکر مندی سے انہیں جاتے دیکھا۔ وہ زد

مل نہیں گئے تھے اپنے کمرے میں گئے تھے۔ ان کو یک گونہ طمیانہ ہوا۔ شکریہ معاملہ تو ختم ہوا۔ جیسے بھی ہی۔

❖❖❖

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہو گی ..... میں کہ واقع تھا ترے بھر کے آداب سے بھی وارث نے لاوٹ میں قدم رکھا۔ دوپہر کا اندر چھایا تھا۔ پنکھا نہ۔ صوفے پر آکر وہ بیٹھی خین جونا راضی سے خلائیں گھور رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”گری میں کیوں بیٹھی ہو؟“، احتیاط سے پکارتا قریب آیا۔ اگر دن ٹیڑھی کر کے اس کے تاثرات دیکھے۔ اس نے تلفی سے آنکھیں اٹھائیں۔

”بجلی نہیں ہے۔ ایک سے دو جاتی ہے۔ پھر شام کو چار سے پانچ جائے گی۔“ وارث ہنس پڑا۔

”پاکستان کا کوئی دماغ ایسا نہیں ہے جس میں بجلی کی آمدورفت کا حساب نہ ہو۔“، خین نہیں بخشی۔ اسی طرح سامنے دیکھتی رہی۔ وہ تقابل صوفے پر بیٹھا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”کیا ہوا ہے؟“

”ابھی پچھو آئی تھیں۔ ٹیلر سے اسی کچھ کپڑے پک کیے تھے وہی دینے۔ میں نے بھی آج ان کو کوئی موڈ نہیں دیا۔ سوچتی تو ہوں گی لیے نا راض ہے۔ ان کی مسکراہٹ بھی سمٹ گئی۔ شاید جیران ٹھیں۔ واث ایورا!“ اور وہ جیران نہیں تھی؛ بس ذرا پھیکل پڑ گئی تھی۔ آج ”بھول“ کر جانے والی چاہیاں خین اٹھا تو لائی، مسکرائی بھی، مگر وہ پچھلے دنوں کی تکلفی والا شگاف پھر سے بھر چکھا۔ فاصلہ پھر سے آگیا تھا۔

”اور تم نے یہ کیوں کیا؟“

”آپ کو نہیں معلوم؟ انہوں نے ماموروں کے رشتے سے انکار کر دیا۔“

”تو؟“

”تو؟“، خین نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”آپ کو افسوس نہیں ہوا؟“

”میرے افسوس سے کیا ہوتا ہے؟“ یہ ہر انسان کا حق ہے۔ انہوں نے کچھ سوچ کر فیصلہ کیا ہو گا۔“

”آپ جو بھی کہیں، میں ان سے بالکل بالکل بھی اب محبت نہیں کرتی۔ نہ کبھی کروں گی۔“ وہ بے بسی بھرے طیش سے وارث کو دیکھ کر بولی۔ وہ لبوں پر مٹھی رکھے خاموشی سے منتا گیا۔

”مجھے ابو سے بھی محبت نہیں ہے۔ وہ ہمیں اس وقت چھوڑ کر چلے گئے جب ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ ان کو چاہیے تھا وہ سڑک پر احتیاط سے چلیں۔ ان کو ہمارا سوچنا چاہیے تھا۔“ وہ سر جھکا کر کہہ رہی تھی اور اس کی آواز میں نبی تھی۔ ”میں پچھو کو جب بھی دیکھتی تھی مجھے ان میں ابو نظر آتے تھے۔ مجھے لگتا تھا ہم کبھی دوست نہیں بن سکتے۔ میں اور پچھو۔ کبھی بھی نہیں۔ اگر ہم قریب آئے تو وہ مجھ سے چھن جائیں گی۔ مگر پچھلے کچھ دنوں میں مجھے لگنے لگا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ پھر ایسا ہی ہو گیا۔ اب میرا کوئی بھی فریڈ نہیں ہے۔ میں دوبارہ کبھی ان کے پاس کوئی بھی مسئلہ لے کر نہیں جاؤں گی۔“ سر جھکائے اس کے آنسو پر پُر گر رہے تھے۔

”فارس کے رشتے کو انکار کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تم سے کم محبت کرنے لگی ہیں۔“

”آپ جو بھی کہیں۔ ہم کبھی دوست نہیں بن سکتے۔“

”اچھا۔ کہیں باہر چل کر کچھ کھاتے ہیں۔“ وہ چاہی اٹھا تا انٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے نہیں لکھانا کچھ۔“ غصے سے سر جھکا۔ ہنوز نا راض تھی، شاید ساری دنیا سے۔

”چلوخیر“ میں تو چاہ رہا تھا کہ اس بولان روئی نورت میں جا کر منن کڑا ہی بناتے ہیں (خین نے جھکلے سے گیلا چہرہ اٹھایا) ساتھ میں تندروالی روئی سلااد۔ مگر..... خیز چھوڑو تم نے تو کچھ نہیں کھانا۔“

”من کڑا ہی کچھ میں نہیں آتی اچھا!“ جلدی جلدی چہرہ و گزتی وہ پیروں میں چل گئی اٹھ کر اندر بھاگی۔ ساتھ ہی آوازیں بھی دے رہی تھیں۔

”ایم..... ایم..... ماموں کہہ رہے ہیں ہم کھانے پہ باہر.....“

وہ مسکرا کر کار اسٹارٹ کرنے باہر نکل گیا۔

❖❖❖

یہ سانپوں کی بستی ہے ذرا دیکھ کر چل وصی ..... یہاں کا ہر شخص بڑے پیار سے ڈستا ہے

ایرپورٹ سے گھر تک سارا راستہ دونوں خاموش رہتی تھیں۔ جب کار کار دار قصر کے سامنے رکی تو جواہرات نے ڈرانیور کو خاطب کیا۔

”تم باہر جاؤ۔“

شہرین نے جواترنے کی تیاری میں تھی چونکہ کراسے دیکھا۔ سن گلاسز اور پر کر کے بالوں پہ لکائے۔ ڈرانیور اتر گیا تو جواہرات نے مسکرا کر گردن اس کی طرف موڑی۔

”اگلی دفعہ نو شیروال کو مجھ پہ شک کروانے یا میرے کانٹیکش کے خلاف بھرنے سے پہلے ایک سو ایک دفعہ سو چنا۔ کیونکہ یہ آخری موقع ہے جب میں نے نظر انداز کیا ہے وہ بھی صرف اس لیے کہ تم دو ایک سال سے زیادہ اس گھر میں تھی مجھے نظر نہیں آ رہی ہو۔ سو یہ مختصر وقت میں تمہارے لیے ناخوشگوار نہیں بناوں گی نہ تم میرے لیے بناتا۔ میں چاہتی تو ہاشم کو بتا دیتی کہ تم اپنی خالہ کے گھر اتنا کیوں جاتی ہو۔ مگر میں اپنے بیٹے کی مختصری شادی شدہ زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے نہیں بتاؤں گی کہ تمہاری خالہ کے بیٹے کے ذکر پہ تمہارا نگ کس طرح سفید پڑتا ہے، جیسے ابھی پڑ رہا ہے۔ کلیسر؟“

مسکرا کر ٹھٹھے برف لجھ میں کہہ دروازے کی طرف مڑی۔ شہرین نے ٹھوک لگا، پھر گردن تان کر کہنے کی کوشش کی۔

”ہاشم جانتا ہے وہ میرا دوست تھا۔“

”بالکل! ہاشم یہی جانتا ہے کہ وہ تمہارا دوست.... تھا شہری!“ مسکرا کر کہتی وہ باہر نکل گئی۔ شہرین نے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ (بوٹوں کی ماری بڑھیا) اور خود بھی مسکرا ہٹ چھرے پہلاتی باہر آگئی۔

❖❖❖

بے اعتبار شخص تھا وہ وار کر گیا ..... لیکن میرے شعور کو بیدار کر گیا کچھری میں معقول کی چہل پہل تھی۔ ہاشم نے موبائل پہ بات کرتے ہوئے اس آفس کا دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ آس پاس کی میزوں کو نظر انداز کرتا آخری ڈیک کی طرف بڑھ گیا۔

”ہاں تم مجھے کام ختم کر کے اطلاع کر دو۔ دو گھنٹے تک۔ لازمی۔“ موبائل بند کر کے کرسی کھینچی سامنے دیکھا۔ اور... رک گیا۔ وہ کرسی پہ نیک لگائے بیٹھی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ گھنگریا لے بال جوڑے میں بند ہے تھے۔ صرف ایک لٹ گال کو چھوڑی تھی۔ ہاشم کی نظریں بے اختیار میز پر کھی نیم پلیٹ پہ جھکیں۔

”میں تعارف خود ہی کروادیتی ہوں۔ پیلک ڈسٹرکٹ پر اسکی پیوٹر زمر یوسف خان۔ دو ہفتے پہلے میری تقری ہوئی ہے۔ اور شاید ایک ماہ قبل آپ سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ بھولے تو نہیں ہوں گے آپ مجھے۔“

ہاشم بے اختیار نہیں دیا۔ ہنستے ہنستے نفی میں سر ہلا دیا اور بہت محظوظ ہونے والے انداز میں اسے دیکھا۔

”یعنی میری وجہ سے آپ کوئی جا بمل گئی۔ لگڑا!“

”تو پھر کس کیس کے سلسلے میں آپ آئے ہیں کاردار صاحب؟“ وہ مسکرا کر کہتی ہاتھ ملا کر میز پر کھکھے آگے ہوئی۔

”میرا خیال ہے مستقبل میں ہمیں بہت سے کیسریں بیٹھ کر طے کرنے ہوں گے۔ اس لیے... کیوں نہ پہلے آپ مجھے اچھی سی

۶۔ پڑائیں۔ بغیر شوگر کے۔“ وہ ابھی تک اطف اندوز ہورہا تھا۔ زمرہ سدا مسکرائی۔

”شیورا! میرے ڈیک پچائے کا سامان ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ آپ کو اب یہاں خود چائے بنانے کی عادت ڈالنی ہوگی، مگر

۱۔ وہ لے لیے۔ کیونکہ پہلی چائے میں آپ کے لیے بنادوں گی۔ بغیر شوگر کے۔“ کہہ کر وہ اٹھی اور کیتلی اٹھا۔ ہاشم کنی کرسی کے ہنچے پر کھکھے

۲۔ ان اٹھا کر اسے چائے بناتے دیکھتا رہا۔

”اب کیس پہ بات کر لیتے ہیں کاردار صاحب!“ کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے زمرہ نے چینی دان سے دو چیخ نکالے اس کو دکھا

۳۔ ہائے میں انڈ میلے اور چیخ پر چ پر کھ دیا۔ پھر کرسی پہ آپ بیٹھی اور بولی۔ ”یقین کیجیے میرا دماغ آج بالکل حاضر ہے۔“

۴۔ ہاشم پھر سے ہنس دیا۔ دل ہی دل میں تمللاتے ہوئے۔

پانچ سال بعد بھی وہ اسی طرح بونے نیبلو کے ساتھ کھڑا ہنس کر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اور بے خیال میں اس کو کیھتی زمرہ ذرا

۵۔ ایل ار در شادی کا فنکشن جو ماضی کی دھول میں دھنلا ہو گیا تھا، اب واضح ہونے لگا۔

اس نے ایک ہاتھ سے کپٹی مسلی اور کرب سے آنکھیں بند کیں۔ نہیں میٹھا لینے جا پچھی تھی، مگر جو کڑوا وہ کہہ کر گئی تھی، اس کا اڑا بھی

۶۔ ال تھا۔ یہ رشتہ کب مانگا گیا، کب انکار ہوا، اسے یہ نہیں معلوم تھا، مگر ایک بات صاف نظر آنے لگی تھی۔

وہ جو چار سال سے یہ سوچتی رہی کہ فارس نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا، تو اس کا جواب مل گیا تھا۔ اس نے انتقام لیا تھا۔ ٹھکرانے

۷۔ کا انتقام۔ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا، دل میں..... بیکی کہا تھا نا اس نے۔ اسے سب یاد تھا۔ انتقام تھا تو انتقام کی۔ (میں تمہیں

۸۔ ایک گولی ماروں گا زمر، صرف ایک گولی) ایک نجف پر پکنچ کراس نے موبائل پکال ملا کر اسے کان سے لگایا۔

” بصیرت صاحب! سوری میں آپ کو غلط وقت پر تنگ کر رہی ہوں۔ مجھے ایک کیس فائل چاہیے۔ جی.... پلک ریکارڈز کے علاوہ

۹۔ ہمچھا آپ کے پاس ہواں کیس سے متعلق، جی سارا باس بھجواد تیجے۔ میں اپنے ملازم کو کیھتی ہوں آپ کی طرف۔“

وہ پوچھ رہے تھے کہ اسے کون سا کیس چاہیے۔ زمر نے گھری سانس لی۔ دور کھڑے کرن اور حماد کو اپنے بڑوں پکوں اور دلہادہن

۱۰۔ ماتھ مسکرا کر فوٹو اترواتے دیکھا اور بولی تو آواز نہ ٹھنڈی تھی۔

”سرکار بنا مفارس عازی۔“

اس نے فون بند کیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ چہرہ اب سیاٹ تھا اور ذہن قدرے مجھ تھا۔

دور خین سویٹ ڈش ٹیبل پہ پلیٹ میں پکھنے کاں رہی تھی۔ کن اکھیوں سے وہ قریب کھڑے ہاشم کو کسی سے بات کرتے دیکھ رہی تھی۔

۱۱۔ اہستہ کا لتی رہی یہاں تک کہ ہاشم کا خاطبہ مڑ گیا تو وہ اس تک آئی۔ وہ اسے دیکھ کے بس ہلاک سا مسکرا ایا۔

”مجھے.... آپ سے یہ کہنا تھا کہ....“ اپنے پیالے میں بچن ہلاتے اور چیخ کو دیکھتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ ”کہ مجھے بھی، بہت افسوس ہے۔

۱۲۔ کے فادر کی ڈستھن کا۔ مجھے ان کے جنازے پہ آنا چاہیے تھا مگر میں نہیں آسکی۔ آئی ایم سوری ہاشم بھائی!“ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس

۱۳۔ مر کے خم سے تقریب وصول کی۔

”اُس اور کے۔ مگر تمہیں آنا چاہیے تھا خین! سعدی تو آیا تھا۔ اس وقت نہ کہی! بعد میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے بعد تم لوگوں نے

۱۴۔ ای طرف.... آنا چھوڑ دیا بالکل۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہاشم کے حلق میں کچھ انکا تھا۔ گردان میں ابھر کر معدوم ہوتی گلٹی، آنکھوں میں

چونک جانے کا احساس۔ حنین اگر متوجہ ہوتی تو محسوس کر لیتی۔

”آئی ایم سوری!“ وہ سر جھکائے کہہ کر مرٹگئی۔ واپس میٹھے کی جگہ پاؤں تو سعدی وہاں کھڑا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ ”ہاشم بھائی کیا کہہ رہے تھے؟“

اس نے اداس آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”میں ان سے مذدرت کر رہی تھی کہ میں ان کے والد کی وفات پنہیں آسکی۔ مجھے آنا

چاہیے تھا۔ اور اس سے پہلے انہوں نے بھی مذدرت کی۔ انہوں نے کہا کہ انہیں افسوس ہے۔“

سعدی نے پیالے میں سو فلے کا چچع الٹتے ہوئے تیلنگی سے سر جھکا۔

”لکنا آسان ہے حنین ڈیز ہسال بعد ایک شادی کی تقریب میں آ کر کہہ دینا کہ مجھے افسوس ہے۔ ہونہا۔“ حنین نے یادیت سے اسے دیکھا۔

”انہیں افسوس ہے۔ واقعی ہے۔“

”اگلی دفعہ جب وہ تمہیں کہیں کہ ان کو افسوس ہے تو ان سے کہنا افسوس کافی نہیں ہوتا۔“ وہ بخیدگی سے کہتا پلٹ گیا۔ وہ اب زمر کی نیبل کی طرف جا رہا تھا۔ حنین دل مسوس کرو ہیں کھڑی رہ گئی۔ کیا وہ ساری زندگی اسی نقطے پر کھڑی رہے گی؟ کیا وہ بھی پچھوکی طرح کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گی؟

اس کا ذہن پل بھر کواپنے ارڈر سے ہتا گیا۔ دل و دماغ پر کوئی دھنڈسی چھارہ تھی۔ سیاہ رات میں سنہری دھنڈ۔۔۔ اس کا ذہن اس دھنڈ میں ڈوبتا گیا۔۔۔ ڈوبتا گیا۔



ا ب نمبر: 5

## بیماری میں اور صحبت میں

اے گلاب۔

تم بیمار ہو۔

نادیدہ کیڑا اجورات میں اڑتا ہے۔

برستے طوفان میں۔

اس نے ڈھونڈ لیا ہے تمہارا بستر۔

سرخ لطف کا۔

اور اس کے گھرے خفیہ عشق نے

بر باد کر دی ہے

تمہاری زندگی

(ولیم بیک کی نظم "بیمار گلاب")

موجودہ دن سے چار سال پہلے

(وارث غازی قتل سے تین دن قبل)

ذوالفقار یوسف کے گھر کے چھوٹے سے کچن میں شرات بھری خاموشی چھائی تھی۔ کائنٹر پر دو ڈشز رکھی تھیں۔ ایک خالی۔ ایک میں تازہ بیک شدہ کیک جس کی لیر زکاث کر اندر کریم بھری گئی تھی۔ اب اس کیک کو دوسری صاف ڈش میں ڈالنا تھا۔ سعدی نے نچالہب دبائے۔ سلراست ہوئے خنین کو دیکھا جاؤ۔ سین چڑھا کر کیک کے قریب ہاتھ لے جاتی، پھر واپس کھینچ لیتی۔

"میں ڈال دوں جنے؟"

"خبردار۔ یہ نرم ہے۔ ٹوٹ جائے گا اور اسے ہاتھ بھی مت لگائیے گا۔" وہ غصے سے بولی۔

"انگلی لگاؤ۔" سعدی نے انگلی اس طرف بڑھائی۔ جنے زور سے اس کی انگلی پہ ہاتھ مار کر پیچھے ہٹایا۔

"میں جچت سے نیچے چینک دوں گی آپ کو۔ پچھوکی شادی میں پلائر چڑھا ہوگا۔" آج کل خنین کی ہربات میں دو ہفتے بعد ہونے والی پچھوکی شادی کا تذکرہ ضرور ہوتا تھا۔

"اویں فول نہ بولا کرو۔ ہر وقت۔" ندرت نے اسے گھوڑتے ہوئے کفگیر دکھایا۔ سعدی دل کھول کر ہنسا۔

"یار جنہ! ای کوا بھی تک ہمارے خلاف کفگیر جو تے اور ہنگر کے علاوہ کوئی تھیا رہیں ملا؟"

ندرت نہ چاہتے ہوئے بھی نہ دیں اور چوپائے کی طرف مڑ گئیں۔ حند کا کیک ابھی تک دیسے ہی پڑا تھا اور وہ ڈرتے ہارتے ہاتھ  
اس کی طرف بڑھا رہی تھی تب ہی فون کی گھنٹی بجی۔

ندرت نے سعدی کو پکارا اور سعدی نے جنین کو دیکھا۔ پھر نظروں سے اس کا دروازے سے فاصلہ ناپا۔ ”تم قریب ہو، تم اٹھاؤ۔“  
اور یہ تو ان کہا اصول تھا کہ جو قریب ہو گا وہی کام کرے گا۔ جنین اونہہ کر کے لاوٹھ میں گئی۔ جلد ہی واپس بھی آگئی۔ دوبارہ آستینیں  
چڑھا لیں۔

”زرتا شہ آنٹی کافون تھا۔“ خود سے دس گیارہ سال بڑی زرتا شہ کو آنٹی کہنا عجیب لگتا تھا مگر پانچ ماہ سے کہہ کر وہ عادی ہو گئی تھی۔  
”کیا کہہ رہی تھی؟“ اس نے ندرت کا سوال نظر انداز کیا۔ وہ چھٹے اٹھا کر احتیاط سے کیک تلے لائی۔ اسے اٹھایا اور آہستہ سے  
دوسری ڈش میں بچھایا۔ پھر ”شکر،“ کہتی سیدھی ہوئی۔ سعدی ہنوز مسکرا رہا تھا۔

”وہ پوچھ رہی تھیں کہ ہم پرسوں سو نیا کی سالگرہ میں آرہے ہیں یا نہیں؟“

”یہ سو نیا کی سالگرہ سال میں کتنی دفعہ ہوتی ہے؟“ سعدی کو جیرت ہوئی۔ ”میری سالگرہ سے چھوٹن بعد ہوتی ہے اس کی اور میری  
دو ماہ پہلے گزر چکی۔“

”مگر دو ماہ پہلے ہاشم بھائی باہر گئے ہوئے تھے۔ وہیں منا لی۔ پھر واپس آ کر یہاں کا فنکشن کرنے کا وقت اب ملا ہے۔ یہ بھی  
زرتا شہ آنٹی نے بتایا ہے۔ ہاں مگر میں نہیں جاؤں گی۔“

ندرت نے ہانڈی میں چیج ہلاتے ہوئے تعجب سے پلٹ کر اسے دیکھا جو اپنے کیک پر کافی بے ڈھنگے انداز میں کریم پھیلارہی تھی۔  
(کب سکھتے گی یہ لڑکی سلیقے؟)

”کیوں؟“

”کیا فائدہ امیروں کی دعوت میں جانے کا اگر وہ کیسرہ، موپائل ہی اندر نہ لے جانے دیں۔ بندہ پچھر زہی بنا لیتا ہے۔“

”یہ کوئی وجہ نہیں۔ تم نے جب یہی بات پچھلی دفعہ ہاشم بھائی سے کہی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ تم لے آیا کرو کیسرہ، تمہیں کوئی نہیں  
رو کے گا۔ اور پھر تمہیں پارٹی کی تصویریں بھی اسی میل کروادی تھیں۔“

”بس بھائی کو موقع ملنا چاہیے ان ہاشم بھائی کے دفاع کا۔ بالکل بھی نہیں پسند مجھے مصنوعی مسکراہٹوں والے ہاشم بھائی اور ان کی  
می۔ انکل اچھے ہیں اور وہ بم پھٹے بالوں والا نوشیر والا بھی بہتر ہے۔“

پھر چونک کر سعدی کو دیکھا۔ ذرا قریب کھسک آئی اور سر گوشی کی۔ ”آپ کی اس سے صلح ہوئی؟“

”صلح؟ بات تک نہیں ہوتی۔ جب سے ڈر گز والی بات اس کی مگری کو بتائی تھی تب سے مجھے بس غصے سے گھوڑ کر نکل جاتا ہے۔“

”کیا اب بھی ڈر گز لیتا ہے؟“ جنین کو تحسس ہوا۔

سعدی نے اسے گھورا۔ ”نہیں لیتا میرے خیال سے۔ مگر یہ بات دہرانا نہیں آگے پیچھے۔“

”اب رکھ بھی دو اس کیک کو فرج میں۔ کھانا بننے والا ہے۔ پہلے وہ تو کھاؤ۔“ اسی نے ڈانٹ کر کہا۔ وہ کریم لگاتے ہوئے بے  
نیازی سے بولی۔

”ای! میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ انسان کو خوب مزے سے ہر چیز کھانی چاہیے۔ اور جو منع کرے۔“ نظر اٹھا کر ندرت کو  
گھورا۔ ”اے بھی کھا جانا چاہیے۔“

ندرت کچھ کرا سنایا میں مگرڈ ورنیل بھی۔ اب کے سعدی قریب تھا۔

”جاوے سعدی! پچھو ہوں گی۔“ وہ مسکرا کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ پھر رکا۔ مسکرا ہٹ غائب ہوئی۔ چہرے پنگلی آئی بھنوں گیں اور سنجیدگی سے جا کر دروازہ کھولا۔ مگر یوں کہ ہینڈل پکڑے رکھا اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

باہر زمرتھی۔ کھڑی نگھری سی۔ سعدی کو دیکھ کر مسکرائی۔ وہ مشکوں نظروں سے اسے گھوتا رہا۔

”کون ہے سعدی؟“ کوئی آواز نہ آنے پر ندرت نے پکارا۔

”ایک خاتون ہیں۔ بال تھنگھری یا لے آئکھیں بھوری، عمر انیس سال اور چہرے پر خوشامدی مسکرا ہٹ۔“ پھر ذرا وقہ دے کر زمر کو غلامب کیا۔ ”جی فرمائیے؟“

وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولی۔ ”لارڈ وولٹہ بیمورٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

سعدی ناراضی سے پچھے ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔ ندرت نے پکن سے نکلتے ہوئے یہ منظر دیکھ لیا۔ ہکابکارہ گئیں۔ ”پچھو کو اندہ، بااؤ۔“

”رہنے دیں امی! یہ خاتون باہر کھڑی زیادہ اچھی لگ رہی ہیں۔“ منہ دروازے کے قریب کر کے اوپھی آواز میں کہا۔ زمر نے بڑاتے ہوئے انگلی سے دروازہ بجا یا۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھولا۔ اسی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”جی؟“

”پروفیسر اسپیپ ٹھیک ہے؟“

سعدی برا سامنہ بنا کر پھر سے دروازہ بند کرنے لگا۔ زمر نے اپنا پاؤں چوکھت پاڑا دیا اور مصالحانہ انداز میں بولی۔ ”اچھا چلو، تم وہ ویسلی کا کردار لے لو۔ اب خوش؟“

ساتھ ہی ہاتھ میں موجود کاغذوں کا پلندہ لہرایا۔ سعدی مشتبہ نظروں سے اسے گھوتا رہا۔ پھر راستہ چھوڑ دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ کاغذ کے پلندے سے اس کا شانہ تھپکا اور گول میز تک آئی۔

خین تب ہی باہر آئی۔ زمر کو دیکھ کر مسکرائی۔ سلام کیا۔ فارس کے رشتے کے انکار کو ایک سال بیت چکا تھا اور خین کی سرد مہری ختم تو لیں، مگر کم ضرور ہو گئی تھی۔

”آؤ بیٹھو۔ کیسی ہوتم؟“ ندرت ہاتھ پوچھتی اور ہر آئیں۔ ساتھ ہی سعدی کو تازا۔ ”یہ کیا طریقہ ہے؟ پچھو کو اندر کیوں نہیں آنے والے رہے تھے؟“

”یہ اس وقت بالکل بھی میری پچھو نہیں ہیں۔“ وہ جل کر بولا۔ ”یہ صرف پراسکیو ٹر ہیں جو ہیری پوٹر کو سزا دلوانا چاہتی ہیں۔“ (ایک تو یہ میری پوٹر بھی نا....) ندرت نے سوالیہ ان سب کو دیکھا۔ زمر مطمئن سی مسکراتی ہوئی کریں ٹھیک کر بیٹھی۔

”میرے پرانے کالج میں ایک موک ٹرائل ہے سرکار بنام ہیری پوٹر۔ مجھے پہلے بطور جج مدعو کیا گیا تھا مگر دفاع کے پاس ایک پرانا پیپر تھا اور میری پراسکیوشن کے اسٹوڈنٹس سے بنتی بہت ہے، سو میں نے بچ کے بجائے استغاشہ بننا بہتر سمجھا۔ اب اس کو دودن سے کہہ رہی ہوں کوئی کردار بن کر گواہی دینے کے لیے آجائے مگر نہیں۔“

”موک ٹرائل؟“ ندرت نے استغاشہ میں نظروں سے دیکھا۔

”موک ٹرائل جس میں کسی فیری میں، جنگلی واقعہ یا کسی بھی حقیقی یا فرضی کیس کو لے کر کارروائی کی جائے اور فیصلہ سنایا جائے۔ مقصد موہاٹلہ کو سکھانا ہوتا ہے۔“ زمر نے وضاحت کی۔

”سرکار بنام ہیری پوٹر؟“ خین کو دیکھی ہوئی مگر جھکتے ہوئے پوچھا۔ ”ہیری پہاڑام کس چیز کا ہے؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ سعدی جو دودن سے اس ”غیر انسانی“ کیس پر تپا ہوا تھا، بولنے لگا۔ ”یاد ہے فور تھے بک میں ٹورنامنٹ کے

انعتاًم پر ہیری کے ساتھ مقابلہ بائزٹ کے سیدرک کو وولڈ یورٹ نے مار دیا تھا؟“

خین نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مگر جب ہیری سیدرک کی لاش اور ٹورنامنٹ کے کپ کے ساتھ واپس آیا تو پویس نے اسے گرفتار کر لیا اور اس پر انعام لگایا کہ اس نے ہی سیدرک کو قتل کیا ہے۔ اور پچھواست عقاب میں ہیں۔ اور ہیری کو قاتل ثابت کرو اکر ہی دم لیں گی۔“

زمر نے شانے اپکائے۔ ”فیصلہ کرنے کا حجج کا کام ہے۔ میں تو صرف دلائل دوں گی۔ آخر ہیری اپنے حریف کی لاش کے ساتھ ملا تھا۔“

”مگر آپ کو رون کی گواہی کی ضرورت کیوں ہے؟“ سعدی الجھا۔ ”رون تو ہیری کا دوست ہے۔ وہ تو اس کے حق میں گواہی دے گا۔“

”ہاٹھیک ہے۔ دے دے حق میں گواہی۔“ وہ اب اسے وہ کاغذ نکال کر دے رہی تھی جن میں رون سے متعلق نوٹس تھے۔ چونکہ یہ نان اسکر پنڈڑڑاں تھا، اس لیے مشکل تھا۔ زمر عدالت میں کوئی بھی سوال کر سکتی تھی۔ وہ ذرا متوجہ ہو کر سننے لگا۔

خین خاموشی سے اٹھا آئی۔ امی کی ہانڈی دم پر تھی اور وہ سعدی کے کمرے میں اس کی چیزیں جوڑ رہی تھیں۔ وہ ہفتہ پہلے آیا تھا، ڈیڑھ ماہ کے لیے۔ ملنے میں ہی یہ دن گزر گئے۔ زمر کی شادی سر پر تھی۔ اس سے پہلے وہ کوئی چھ ماہ قبل آیا تھا، بھاگ بھاگ چار دن کے لیے۔ بڑی امی کی وفات پہ۔ سب نے منع کیا کہ ”مت آؤ“ ایگزا مرقریب ہیں۔ ”مگر وہ آگیا اور چلا بھی گیا۔

خین امی کو مصروف دیکھ کر پہنچنے لگی۔ پھر سعدی کی استدیٰ پنبل پر دھرا خالی مگ دیکھ کر سوچا، اگر اسے کچن میں لے جا کر رکھ دے تو امی پا احسان عظیم ہو جائے گا۔ ویری گند۔ وہ فریب آئی مگر اٹھانے سے پہلے سعدی کے بیگ سے نکلی کتابوں تک رک گئی جو اسی میز پر ڈھیر کر رہی تھیں۔ ان میں ایک کتاب کا نام منفرد ساتھا۔ اس نے وہ اٹھائی۔ صفحے الٹ پلٹ کیے۔ ہاشم کے دستخط، یعنی محمد اولی کے۔ بھائی کو غالباً ہاشم بھائی نے تھنخ میں دی تھی۔

خین کری پیٹھی اور مزید صفحے پلٹے۔ تیرھویں صدی کے کسی عالم کی کوئی عربی کتاب کا انگریزی ترجمہ۔ اس نے دیباچہ پلٹا، شاید کوئی ناول ہو۔ مگر نہیں۔ وہ نان فکشن تھا۔ وہ نہیں پڑھنا چاہتی تھی مگر پھر بھی پڑھنے لگی۔

کتاب کے صفحے کو رے تھے اور ان پر جلگگاٹے الفاظ سیاہ ہیروں جیسے۔ اور قلم سے لکھے الفاظ اگر اللہ چاہے تو صدیوں تک امر ہو جاتے ہیں۔ کتاب اور اس کے درمیان موجود سات سو سال کا فاصلہ ان الفاظ کی طاقت کو روکنے کے لیے ایسا تھا جیسے نور کے چشمے کی راہ میں رکھا کوئی لکڑی کا نکڑا، جیسے نہر پانی محسوس تک کیے بنا بہتا چلا جائے۔

سات صدیوں کا فاصلہ عبور کرنے کے لیے ایک دروازہ تھا اور خین اس دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ ایکویں صدی کی خین ٹراؤز را اور بی قمیض میں ملبوس، آنکھوں پر چشمے بال فرنچ چوٹی میں۔ وہ ادھرا دھردیکھ رہی تھی۔ اسے کتاب میں داخل ہونے کے لیے یہ دروازہ کھولنا تھا۔ سواس نے کھول دیا۔ پٹ وابو گئے۔ اندر روشی تھی۔ تیز روشنی۔ خین نے اندر قدوم رکھ۔ دروازہ پیچھے بند ہو گیا۔

وہ ایک پچھر راستے پر کھڑی تھی۔ یہ تیرھویں صدی عیسوی تھی۔ ہر شے زردا اور پھیکے رنگ کی تھی۔ دشمن کا بازار اور ارگر درسر ڈھانپے گزرتے لوگ۔

وہ احتیاط سے قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ لوگ گزرتے رہے۔ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایڈو پچھر اچھا تھا۔ وہ چلتی رہی۔

پھر وہ رکی۔ ایک مسجد نما عمارت کے سامنے مجع لگا تھا۔ وہ قدم قدم چلتی آگے آئی۔ پنجھے اٹھا کر گردن اوپنی کر کے کسی کے کندھے کے اوپر سے بھانکا۔

زمیں پر ایک آدمی اکڑوں بیٹھا تھا۔ مریل اتنا گویا بیڈیوں کا پنجھر ہو۔ سرخ متورم آنکھیں، ان میں چھپا کر ب۔ وہ خراب حالت میں

۱۱۱۔ نہ اس کا بابس بوسیدہ تھا، نہ کوئی زخم کا نشان تھا مگر مایوسی اور رازدیت نے اسے نہ حال کر رکھا تھا۔ آنکھ میں کوئی تھہر آنسو تھا جونہ وہ پیتا، اسے کیا ہوا تھا؟

میغی کیا کیک چھٹنے لگا۔ وہ بھی پیچھے ہٹ گئی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ وہ بھی پیچھے ہو لی۔ عمارت کی پیچی اسی کے پار دیکھا۔ کچھ لوگ اندر سے کسی کو اپنے ہمراہ لارہے تھے۔ نقیس، زم خود کھتے شیخ معلم۔ وہ لوگ اب شیخ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ سب اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو ان سے بیگانہ تھا۔ کیسے ریگا نہ۔ کسی صد الگانے والے نے صد الگانے۔

”کیا فرماتے ہیں آئندہ دین ایسے شخص کے بارے میں جس کا دین اور دنیا اس مہلک مرض نے جاہ کر دیا ہو؟ کیا ہے اس مرض کی کوئی نہیں (استاد)؟“

اماں شیخ نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور بولے تو جنین کو ان کی آواز صاف ننانی دی جیسے دل میں اتر گئی ہو۔

”اللہ نے اتاری ہے ہر مرض کی دوا۔ جو اسے جانتا ہے وہ اسے جانتا ہے۔ جو اسے نہیں جانتا، وہ اسے نہیں جانتا۔“

”مگر اسے ہوا کیا ہے؟“ جنین کے لہوں سے پھسلा۔ پھر زبان دانتوں تل دبائی۔ بھلا سات صدیاں پہلے گزرے شیخ اسے کیسے سمجھتا تھے؟ نہ اس کے سوال نہ اس کے جواب۔ مگر شیخ نے دیکھ لیا تھا، اسے بھی اور اس کی آنکھوں میں رقم سوال کو بھی۔ وہ مکرا کر بولے۔

”اسے مرض عشق ہے۔“

”مرض عشق؟“ اس نے تعجب سے دہرا�ا۔ ”عشق مرض ہے؟“

”بلکہ جان لیو امرض ہے!“

”تو....“ اس نے گردن موڑ کر اس اکڑوں بیٹھے شخص کو دیکھا اور پھر شیخ کو۔ ”تو کیا مرض عشق کی بھی کوئی دوا ہے؟“

”یہ مگر رکھ کر آؤ کچن میں!“ دروازے کی دوسری جانب امی آواز دے رہی تھیں۔ جنین نے شیخ کو دیکھا۔ وہ اس کے تھہرنے کے مگر وہ نہیں تھہری۔ دوڑ کر پیچھے گئی۔ سنہری دھوپ..... سے بھرے دروازے کو دھکیلا اور واپس۔

اس نے کتاب بند کی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ بھائی کی کرسی پہنچنی تھی اور نردست سر پر کھڑی ڈانٹ رہی تھیں۔ اس نے سر جھکھکا۔

اہل پرانی عادت۔ جو پڑھتی اس کو تصور کرنے لگ جاتی اور اس زمانے میں پہنچ جاتی۔ صرف ایک پیر اگراف نے اتنا متاثر کیا، پوری کتاب تو اکل کر دے گی۔ ہٹاؤ بھی، نہیں پڑھنی ایسی کلتا میں۔ وہ اٹھی۔ کتاب شیفیٹ میں رکھ دی۔ عنوان قدرے مزید واضح ہوا۔

”ایک مکمل جواب اس شخص کے لیے جس نے سوال کیا تھا، شفاد بینے والی دوا کے بارے میں!“

”اچھا ای! سن لیا ہے۔“ وہ ان کی بار بار کی ڈانٹ پر چڑ کر کہتی مگر اٹھائے باہر نکل آئی۔ گول میز کے گرد پھپھو، بھیجا بھی تک الجھا ہے تھے۔ آگے آگئی۔ زمر نے اسے دیکھا تو کوئی خیال آیا۔

”تمہاری امریکن دوست نے بھی آنا تھا شادی پر۔ کب آئے گی؟“

”پرسوں۔“ وہ لہکا سامسکرائی۔ ”اے پاکستان گھونمنے کا بہت شوق ہے۔ وہ آئے گی تو ہم سب اسکر دو جائیں گے۔“ اور مسکرا کر ہن لگانے لگی۔ (ای پر دوسرا احسان)



جگ ہاری نہ تھی ابھی کہ فراز ..... کر گئے دوست درمیان سے گریز  
آفس میں عجیب تناؤ کی کیفیت تھی۔ فاطمی صاحب فائل سامنے رکھے تھے جب سے ایک کے بعد ایک صفحہ پڑ رہے تھے۔ ستائش

سے نظر انہا کر سامنے بیٹھے وارث کو دیکھا۔

”ایمیز نگ ورک! میں نے تمہیں اس کیس کا آئی او بنا کر بہت اچھا کیا۔“

وارث ہلاکا سامسکرا یا۔ سرکو خم دیا۔ ”جھینکس سرا!“ قدرے تو قف سے اضافہ کیا۔ ”یہ فائلز کر پیش چار جز کے ثبوت اور شواہد کی ہے اور کر پیش کیس کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے۔ مگر یہ فائل۔“ اس نے الگ رکھی سیاہ کور والی فائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ چیزیں جو ہاشم کا ردادر کے خلاف مجھے ملی ہیں، یہ ہمارے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ ہم ان کو ایک دوسری ایجنسی میں بھیج سکتے ہیں۔“

”ہاں میں ایسا ہی کروں گا۔ گذجاب غازی!“ انہوں نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی اور اس کو دیکھا۔ وارث سرکو خم دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہمیں اریسٹ وارنٹ نکلاو لینے چاہیے۔“

”شیور! میں جلد از جلد یہ کام کروں گا۔“

یہ اختتامیہ جملہ تھا۔ وارث سرہلا کر دروازے کی طرف آیا۔ پھر باہر جانے سے قبل ایک سوچتی نظر اپنے بات پر ڈالی۔ ایک واہم۔ مگر سر جھٹک کر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی فاطمی صاحب اٹھے۔ دروازہ لاک کیا۔ موبائل نکالا۔ کال ملائی اور فون کان سے لگائے اس سیاہ فائل کے صفحے پلٹنے لگے۔

ہاشم اپنے آفس میں میز پر فائلز پھیلائے الجھا بیٹھا تھا۔ موبائل کسی فائل تلے رکھا تھا۔ وہ بیریشن کی زوں زوں پر اس نے ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ موبائل نکالا اور ہیلو کہا۔ قدرے اکتاہٹ سے کوٹ اشینڈ پر ڈنگا تھا اور وہ ویسٹ میں ملبوس تھا۔

”کیا حال ہیں کاردار صاحب؟“

”گذ! آپ سنائیے۔“ موبائل کان اور کندھے کے درمیان لگائے وہ فائل کے صفحے پلٹ رہاتا۔

”اللہ کا کرم۔“ وقفہ۔ ”سنائیے اور نگزیب کاردار صاحب بائی ایکشن میں حصہ لے رہے ہیں؟ اگلے ایکشن کی ریہرسل۔“

”جی! ان کے دوستوں نے ان کو سیاست میں دھکیل دیا ہے۔ خیز گذ فارہم۔“ وہ فون کان اور کندھے کے درمیان لگائے ٹیفٹ نک گیا اور وہاں رکھی فائلوں کو باری نکال کر چیک کرنے لگا۔ ”اور کوئی نئی بات؟“

”میری بیٹا مجھ سے ذرا خفا ہے۔ اس کے لیے کارا مپورٹ کروائی تھی۔ وہ کراچی پورٹ پر کھڑی ہے ابھی تک۔ میں صرف تھا۔ میرا ایک اے ڈی ایک کر پیش کیس پر کام۔“

”میں بالکل سمجھ گیا فاطمی صاحب!“ جھٹک کر ایک ڈب دنوں ہاتھوں میں الحایا اور چلتا ہوا میز تک آیا۔ ذرا سامسکرا یا بھی۔ ”ایک اچھے شہری ہونے کا ثبوت دیجیے۔ کشم ڈیوٹی ادا کیجیے اور کارکلیئر کر والیں۔ کیونکہ ہم کام کرتے ہیں آئل کا۔ اور تیل اور پانی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ تیل میں کوئی جاندار شے تیرنہیں سکتی۔ جو گرتا ہے وہ ڈوب جاتا ہے۔ آپ کے اے ڈی نے جو اسکینڈل بنانا ہے بنانا لے کیونکہ یہ امریکہ نہیں ہے۔ یہاں لوگوں کا اخلاقیات کا معیار امریکیوں جتنا بلند نہیں ہے۔ یہاں کوئی افیئر کوئی کر پیش چارچ کسی سیاستدان کا کیری خراب نہیں کر سکتا۔“

”میں بالکل سمجھتا ہوں یہ سب، اس لیے میں نے آپ کو فون کیا پہلے۔ آپ چاہیں تو میں کل ہی اپنے لڑکے سے استعفیٰ مانگ کر کیس بند کر سکتا ہوں۔“

”اے جاری رکھنے دیں۔ شوق پورا کر لے۔ میرے باپ کے ہاتھ صاف ہیں۔“

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر فاطمی صاحب نے سیاہ فائل کی جلد پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسری سا کہا۔

”آپ پچھلے مہینے کی دو تیرہ اور بائیس تاریخ کو پشاور میں ہونے والی میٹنگز میں شامل تھے ہاشم!“  
ہاشم کا ذہبہ کو ہوتا ہا تھر کا۔ بے یقینی سے اس نے سراہیا۔ رنگت پھیکی پڑی۔

”آپ نے درست کہا ہاشم! کہ پچھلے زورگزی پا کستان میں کسی کو تباہ نہیں کر سکتی، مگر ایک چیز کر سکتی ہے۔ علاقہ غیر کے دہشت آؤں کے لیے منی لانڈر انگ کرنا جس کے بد لے وہ آپ کو اپنے علاقوں میں کاروبار کرنے دیتے ہیں۔ اگر آپ ایک دفعہ ملٹری کی بیڈ بکس بنانے تو کوئی بھی چیز آپ کو نہیں بچا سکے گی۔“  
وہ خاموش بالکل ساکت کھڑا تھا۔ گردن میں بار بار ابھر کر معدوم ہوتی گلٹی دکھائی دیتی۔ پھر اس نے تیزی سے جھک کر قلم نکالا۔  
اوہ پیدا منے کیا۔

”کون سی گاڑی ہے؟ ماڈل اور میک؟ اور کس کے نام ہے؟“ وہ تیزی سے قلم کا فند پہ گھسیتا تفصیلات لکھتا گیا۔ دماغ میں آندھیاں ہل رہی تھیں۔

فون بند کر کے ذہبہ ہیں چھوڑے، کوٹ کھینچ کر اتنا تادہ باہر بھاگا۔ سیکڑی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تیز تیز کار یہود میں چلتا لفت لی طرف جا رہا تھا۔ ساتھ ہی موبائل پہ کال ملا رہا تھا۔  
”خاور! فوراً گھر پہنچو۔ ابھی۔“

❖❖❖

خواب تو روشنی ہیں، نوا ہیں، ہوا ہیں..... جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں  
کرہ عدالت میں کارروائی روانی سے جاری تھی۔ معزز نجح صاحبان توجہ اور خاموشی سے براجمان کٹھرے میں کھڑے گواہ (لارڈ لا یورٹ) کا بیان سن رہے تھے جس سے استغاش کی جانب سے زمر جرح کر رہی تھی۔ وہ سرکار بنا مہیری پوٹر کا عینی شاہد تھا۔ اور پچھے حاضرین لیٹھ توں میں روشن کے بائیں جانب بیٹھے لوگوں میں سے ایک سعدی بھی تھا جو خلکی سے اسے گھور رہا تھا۔  
”تو آپ یہ کہ رہے ہیں کہ جس وقت مقتول لڑکا قتل ہوا تب آپ قبرستان میں موجود تھے؟“ زمر قلم ہاتھوں میں گھماتی آہستہ آہستہ ہے کے سامنے دائیں بائیں بھل رہی تھی۔

”جی۔“ وولڈ یورٹ نے تابعداری سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ایک اسٹوڈنٹ تھا جو موقع کی مناسبت سے سیاہ چنے میں ہوں تھا۔

”اور جس وقت ملزم ہیری مقتول کے ساتھ ادھر آیا، آپ قبرستان میں کیا کر رہے تھے؟“  
”میں جی اپنے والد صاحب کی قبر پہ فاتح پڑھ رہا تھا۔“ وہ بڑی ہی مسکینیت سے کہہ رہا تھا۔ سعدی نے کلس کر پھلو بدلا۔ قریب نیٹھی ۷ یا ۸ کا ایک گروپ بمشکل ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آپ تو جانتی ہیں۔“ معمصون لارڈ کہہ رہا تھا۔ ”کہ ماشاء اللہ یہ ہیری بچپن سے ہی ماہر عملیات تھا۔ سال بھر کی عمر میں اس نے مجھے لمحہ کر کے آدمارڈا۔ میں تو توب سے جنگلوں میں در بدر بھکتا درویش کی زندگی گزار رہا تھا۔“

”آج بیکشن یور آز!“ دفاع کا وکیل کھڑا ہو کر چلا یا۔ نج نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”غیر متعلقہ۔“ اس نے وجہ بتائی۔

”منظور۔“ نج نے گواہ کو تنبیہ کی۔ ”غیر متعلقہ باتیں مت کریں۔“

زمرنے سر ہلا کر سنجیدگی سے سوال کیا۔ ”تو پھر عدالت کو بتائیے کہ اس راست کیا ہوا؟“

”ہاں جی! اس رات میں نے اسے اپنے حریف کھلاڑی کے ساتھ قبرستان میں آتے دیکھا تو میں نے پیارے کے کہا کہ بیٹا، اس وقت تمہیں بستر میں ہونا چاہیے۔ مگر اس نے کہا کہ انکل، ہمارے معاملے سے دور رہو۔ اور پھر آؤ دیکھانہ تاؤ، اپنے حریف کو قتل کر دیا۔ میں تو تب سے جی حالت سوگ میں ہوں۔“

اور سعدی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس ولڈ یمورٹ کا حشر کر دے۔ سب کو پتا تھا کہ وہی اصل قاتل ہے مگر یہ اہل قانون تو قانون سے زیادہ اندر ہے تھے۔

اسے بھی کٹھرے میں بلا لیا گیا۔ زمر نے سوالات کا آغاز کیا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ آپ ملزم ہیری کے بہترین دوستوں میں سے ہیں؟“

”جی یہ بات اتنی ہی درست ہے جتنی یہ کہ ہیری بے گناہ ہے۔“ وہ سامنے کھڑی زمر کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ زمر نے سادگی سے اسے واپس دیکھا۔

”یعنی کہ آپ وقوع کے وقت موجود تھے؟“

”آئندہ۔“ وہ گھر بڑایا۔ ”مگر ہیری نے مجھے خود بتایا کہ ولڈ یمورٹ نے قتل کیا ہے۔“

”آپ یہ اس بنیاد پر کہہ رہے ہیں جو ملزم نے آپ کو ” بتایا“ ہے؟“

”مجھے معلوم ہے وہ حق کہہ رہا تھا۔“

”یعنی کہ آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت میں کیا سوچ رہی ہوں؟“ وہ سخیدہ تھی۔ سعدی بالکل چپ ہو گیا۔

”اپنے جوابات میں رائے کا عنصر شامل کرنے سے گریز کیجیے۔“ مج نے تنیہہ کی۔

زمر داہیں سے باہمیں چلتی ہوئی کٹھرے کے سامنے آئی۔ سخیدگی سے سعدی کو دیکھا۔

”کیا آپ کسی چوچا گنگ نامی لڑکی کو جانتے ہیں؟“

”جی۔ وہ مقتول لڑکے کی گرف فریبڑ تھی اور۔“ وہ بے اختیار چپ ہوا۔

”اور ملزم اسی لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ اسی بنیاد پر مقتول سے رقبات بھی رکھتا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟“

”آپ اس بات کو غلط رکھ۔“

”ہاں یا نہیں مشررون!“ وہ زرمی تختی سے بولی۔ اس نے چاروں ناچار کہا۔

”جی ہاں۔“

”اوکیا یہ بھی درست ہے کہ مقتول اور ملزم ایک ہی ثورنا منٹ جیتنے کے لیے کوشش تھے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان معمولی ساحر یقان جذبہ بھی تھا؟“

”جی۔ مگر وہ اتنا کم تھا کہ اس کی بنیاد پر ہیری اسے قتل نہیں کر سکتا تھا۔“

”اوکیا یہ بھی درست ہے کہ جس دن ہیری کا نام مقابله کے لیے منتخب ہوا تھا اس رات آپ اس سے ناراض ہوئے تھے اور جیلیس بھی؟ کیونکہ ہیری کی وجہ سے آپ کی شخصیت بیشہ دب جاتی تھی۔“

سعدی کا منہ بے یقینی سے کھلاڑہ گیا۔ یہ سب واقعات زمر نے دہراتے تھے رات کو مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ یوں سوال کرے گی۔

”جی۔ میں صرف جیلیس ہو گیا تھا مگر بعد میں ہم ٹھیک ہو گئے اور مجھے اس ذرا سی خفگی کے لیے بھی افسوس ہے۔“

”اور اسی افسوس اور احساس جرم کے باعث آپ بار بار ہیری کی حمایت کر رہے ہیں۔“  
”نہیں تو میں۔“

”آپ ہیری کی حمایت نہیں کر رے؟“

"میں۔ اس وجہ سے نہیں کر رہا۔" مگر وہ نے بانچ کی طرف رخ کی کھڑی ہوئی۔ سر کو خم دے کر کہا۔ "اتا کافی ہے یور آز!" اور اماں ہی انہلیوشن کی میز کے پچھے جا کر تانگ پیناگ رکھنے میں لپٹ گئی۔

"میں یقین نہیں کر پا رہا۔ بھروسے کے پیش نے ہیری کو مجرم قرار دے دیا۔ حد سے۔"

فیصلہ آنے کے بعد کورٹ روم سے نکلتے ہوئے وہ خفیٰ سے زمر سے بولا تھا۔ زمر مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ چلتی ہاری تھی۔

او اری میں اوہ راہگزرتے استوڈنٹس کے سلام کا سر کے خم سے جواب دتی۔ مطمئن رہ کوئی۔

”بیوں اس کے خلاف جاتے تھے اور اس کا دفاع کمزور تھا۔“

سب کو یہ تھا کہ ہسپری گناہ سے زمر!“ گھنگھ مالے بالوں والا لڑکا ہنوز خفا تھا۔

”بُحْ فَصْلِيْهِ خَدْمَاتِ نَهْيِنْ كَرْتَا، شَبُوتَهِ كَرْتَا“۔

اور آپ نے کہا کیا؟ سلے مجھ سے وہ ما تیر کھلوائی جو ہے؟ کے خلاف جاتی تھیں۔ پھر جب دکھا کر میر کی احتجاجت کا بچھڑا کر دیا۔

"وہ عاً شاید تو میسے کی کرڈ پیشی میں مشکوں کردی، ابھر کی سے جیلیں، ادا ماتحت کر کے اتو دا یہ ٹوٹ گا۔"

م - نہ حلتے حلتے مسکرا کر آنکھوں گھما کر اسے دیکھا

تمانگینه حاکمیت را با شنبه بیو گردی، مخصوصاً خواسته ایله، اقتصاد زکانیا کار و نیازهای اکنون هم

مکتبہ مذکور

”میک ڈائل ختم ہو جکا حقیقت نہ گا کا طرف لو شاؤ“

۲۰۱۳ء میں دھنیں رہے تو، (دفعہ کم سے کم اونٹ کیاں کامیابی کی)

”آر کا چھٹے منظوں ہو گئے؟“

پ.ل. س. وریوں: اک یاد، مہاراہی، نگاہی، لستک، تھجک، قہ، اتن، لا کھنڈی، اے کار

بے ایسا مقصک نہیں رکھتا۔ وہ حصہ صدیوا کا تھکرے ساتھ رکھتا۔ کہا تو تھجھ میں بھی، اگر آفس پر ان کی شفیش کرنے والے

میں اس شہر کا ایک بھائی تھا جو بے عیش تھا، ”گلے“ کے تھے۔ اتنا نہ احمد خدا

مِنْ الْكَلَّ وَالْأَنْجَى إِنَّمَا يَعْلَمُ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ

یہ باس را ای راس دن

وئى حال پىدىيىن ايا-

دہ درایونک سین

1

میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن ..... زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے  
راہداری میں سعدی کے کمرے کا دروازہ کھلانظر آ رہا تھا۔ اندر وہ کھڑا جلدی جلدی نائی پہن رہا تھا۔ ابھی مکمل تیار نہیں ہوا تھا اور  
اول فروع ہونے میں کم وقت رہ گیا تھا۔ آگے چلتے جاؤ تو گول میز آتی۔ اندر مژہ جاؤ تو لا دخ میں اوئی خی آواز سے ٹی وی چل رہا تھا۔ ایک

صوفے ہی فارس ناگ پٹا نگ جائے، گرے کوٹ اور گول گلے کی سفید شرت میں ملبوس بیٹھا بار بار گھڑی دیکھتا، اور کبھی ندرت کو جو چیزوں پہنے کے ساتھ ساتھ سیم اور سعدی دونوں کوزور سے ڈاٹ کر جلدی لٹکنے کا کہہ رہی تھیں۔ پھر تو پوں کا رخ سامنے بیٹھی غافقاً گھر کے پڑوں میں ملبوس خنین کی طرف ہوا۔

”کب تیار ہو گئی تم؟ ماموں کب سے لینے آئے بیٹھے ہیں؟“

وہ سر جھٹک کر بڑا کر رہا تھا۔ ”نمیں جانا مجھے کسی پارٹی وارثی میں۔ بس اتنا کہا تھا کہ مجھے آج شام علیشا سے ملوانے کوئی اس کے

ہوٹل لے جائے، مگر نہیں۔“

ندرت نے اسے نظر انداز کیا اور لینڈ لائن فون اٹھا کر رسیور کان سے لگایا۔ سیٹ گھٹنے پر رکھا۔ نبرڈ اکل کرتے آواز لگائی۔

”سعدی! جلدی کرو۔ پچھلو لوگ پہنچ گئے ہوں گے۔“

فارس نے چونک کر ندرت کو دیکھا۔ ”وہ لوگ بھی مدعو ہیں؟“ سرسرا ساپو چھا۔

(خنین نے کن اکھیوں سے فارس کا بے تاثر چڑھ دیکھا) ”ہوں۔“ ندرت اب ہمسائی خاتون سے فون پر بات کرنے لگی تھیں۔

بیٹھے زم لجھے میں۔

”السلام علیکم بھابی! جی میں ٹھیک۔ آپ نے صبح کڑھی بھیجی تھی، میں شکر یہ ہی نہیں ادا کر سکی۔ جی۔ آپ نے اتنا تکلف کیا۔ ایک منٹ۔“ رسیور کے ماڈھپیں پر ہاتھ رکھا، غصے سے خنین کو دیکھ کر چلا میں۔ ”آہستہ کرو ٹی وی کی آواز۔ آگ لگے اس ٹی وی کو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں خنین؟ میں ایک دفعہ اٹھ گئی تھی نا، جوتے لگا کا کر حشر بگاڑ دینا ہے میں نے۔“

خنین نے تختی سے رسیور کا رکھا کر زور سے بٹن دبایا۔ آواز بند۔ سارے ادا کار گونگے ہو گئے۔ ندرت والپس نرمی سے فون پر بات کرنے لگیں۔ وہ ان بھولی ماؤں میں سے تھیں جن کو پورا یقین تھا کہ رسیور کے ماڈھپیں پر ہاتھ رکھ دینے سے آواز دوسرا طرف بالکل نہیں جاتی۔

فارس نے آنکھیں سکیڑ کر رکھنے کو دیکھا۔ ”تمہارا موڈ کیسے بہتر ہو گا؟ اتنا لین کھانے سے؟“

”اگر اب میں نے اتنا لین کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میرا نام خنین نہیں۔“ وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

”پھر؟“

”علیشا سے ملتا ہے۔ میری دوست۔ مگر سب مصروف ہیں۔“

ندرت نے بات کرتے کرتے جھک کر جوتا اتارنا چاہا مگر سینڈل کے اسٹریپ بند تھے۔ اب کون کھوئے وہ بھی اس ڈھیٹ اولاد کے لیے۔ والپس کڑھی نامہ سنانے لگیں۔

فارس نے موبائل نکالا، کال ملائی۔

”وارث! تم اور سارہ آر ہے ہونا؟ اوکے آپا کی طرف آکر ان سب کو لے جاؤ۔ میں خنین کو اس کی طرف لے کر جاؤ۔“

”موباہل بند کیا اور ہبکا بیٹھی خنین کو دیکھ کر ابراٹھائی۔“

”وہ منٹ میں تیار ہو کر آؤ ورنہ میں جارہا ہوں۔“

ندرت ”ہیں، ہیں،“ کرتی رہ گئیں اور وہ کرنٹ کھا کر اٹھی۔ بے یقین سے فارس کو دیکھا۔

”مگر آپ پارٹی میں کیوں نہیں جا رہے؟“

”کہنک میں تم اے۔ اتھر جا بھا۔“

وہ فوراً بھاگی، پھر اٹھے قدموں واپس آئی۔ فارس کے کان کے قریب جھک کر معمومیت سے پوچھا۔

”کیا جواب بھی انالین کے بارے میں ارادہ ظاہر کیا تھا، وہ واپس لے سکتی ہوں؟“

فارس نے صرف گھورا۔ وہ دونوں ہاتھ انھا کر سوری کہتی اندر بھاگ گئی۔

جلدی جلدی تیار ہوئی۔ عینک انداز کاراٹیکٹ لینز لگائے۔ (اف آنکھ میں ڈالنے نہیں جاتے تھے۔ بار بار پھر کر باہر نکل آتے۔

۱۰۱ اے کہ عادت نہ تھی۔ پھر ہم کی شادی کے لیے خریدے تھے۔) ماتھے پر کئے بال چھوڑ کر باقی ہے کہ اطراف میں پن لگا کر کھلے رہنے

۱۰۲۔ نیا پرس انھیا جوتیں ماہ قابل انگلینڈ سے واپسی پر سارہ لائی تھی۔ باہر آئی۔ وارث اور سارہ آپکے تھے۔

وارث کی گاڑی کے قریب فارس اور وہ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ فارس فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔

”تم استغفی نہیں دو گے۔ بھلے آج پہلی دفعہ ہی ماں گا ہے، مگر مت دینا۔“ ساتھ ہی حد کی طرف چابی اچھا۔ اس نے کنج کی۔ فارس

لگاڑی تک آئی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر شیشہ کھول دیا۔ ان دونوں کی باتوں کی آواز پہنچنے لگی۔

”میں جس کیس کا آئی اوہ ہوں، اس سے متعلقہ لوگوں کے تعلقات ہیں فاطمی سے۔ الیاس فاطمی، میر اباس۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھے بیچ آیا۔“

۱۰۳۔ وارث کے چہرے پر بظاہر سکون تھا، مگر وہ اضطراب چھپا رہا تھا۔

”تم کس کیس کے آئی اوہ ہو؟“

”ظاہر ہے یہ میں نہیں بتا سکتا۔ یہ کلاسیفا سائڈ انفارمیشن ہے۔“

”اوکے.... مگر.....“ ندرت سعدی، سیم باہر آرہے تھے۔ فارس نے رک کر پریشانی سے وارث کو دیکھا۔ ”تم بس ابھی کچھ بہت کرنا۔

۱۰۴ اس بارے میں بات کریں گے۔ ابھی مجھے نکلنا ہے۔ مگر تم استغفی نہیں دو گے۔ ٹھیک ہے ناوارث؟“ اس کو تنبیہ کرتا وہ بار بار دھرا تا

۱۰۵۔ گاڑی کی طرف آیا۔

وارث سر ہلا کر پھیکا سامسکرا یا اور گاڑی کی طرف مزگیا۔ فارس اندر بیٹھا، چابی گھمائی، کارر پورس کی۔ حنین نے دیکھا اس کا الجھا ہوا

۱۰۶۔ ہے مد فکر مند تھا۔ ایک لمحے کو اس نے ذہن میں دھرا یا۔

”الیاس فاطمی.... الیاس فاطمی۔“ پھر علیہا سے ملنے کا خیال ذہن پر چھاتا گیا۔ لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔

وہ مگن ہی وند اسکرین دیکھنے لگی۔ سڑک کو کاٹتی سفید دھاریاں وقفے ققفے سے گاڑی تلے آ کر غائب ہو جاتیں۔ اس نے گنا۔ تین

۱۰۷۔ تین ایک، ٹوٹل دس اور پھر سے کتنی شروع۔

❖❖❖

۱۰۸۔ سنبھلے ہیں ہیں اہل ہوں مدی بھی، منصف بھی ..... کے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں  
سو نیا کی دوسری سا لگرہ کی دعوت قصر کار دار کے لان کی بجائے لوگ روم اور تماحقد ڈانگ روم، ڈر انگ، سن روم وغیرہ میں  
اہلہ لی گئی تھی۔ سارے دروازے سلا نیڈنگ تھے۔ دیواروں میں گھسادیے گئے۔ گھر کا گراوڈنڈ فلور کھلا سا کرہ بن گیا۔ مہمان ادھر ادھر  
اہل ہے تھے۔

۱۰۹۔ شہریں داخلی دروازے پر مسکرا کر مہمانوں کو رسیو کر رہی تھی۔ فرشی جانمی میکسی میں ملبوس، اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کرتی،  
۱۱۰۔ اہر ہاشم کو تلاش کرتی، پھر مصروف ہو جاتی۔

۱۱۱۔ سیر ہمیوں کے اوپر کمروں کے آگے بی رینگ کے ساتھ سیاہ گاؤں میں ملبوس جواہرات کھڑی تھی۔ سڑ، گہری مسکراہٹ کے ساتھ  
۱۱۲۔ گاؤں سے بات کر رہی تھی۔ بال سمیٹ کر بائیں کندھے پر ڈالے تھے۔

دفعتاً ہاشم پیچھے سے چلتا آیا۔ کوٹ کا بُن کھلا تھا۔ لب پہنچنے ہوئے اور آنکھوں میں سختی تھی۔ اس نے ”مجھے اپنی ماں چاہیے کچھ دیر کی لیے“ کہہ کر جواہرات کی کہنی تھامی اور اپنے ہمراہ آگے لے گیا۔ وہ قدر رے حیران تدرے چونکتی ساتھ پھنجی چل آئی۔

”ہاشم..... یہ.....“

”دشش....“ وہ اسے اسٹڈی میں لا یا۔ خاور پہلے سے موجود تھا۔ جواہرات نے تشویش سے اس کے مقابل کھڑے اسے دیکھا۔

”تم ٹھیک ہو ہاشم؟“

”ابھی؟ بالکل نہیں۔“ بالوں میں ہاتھ پھیر کر، گھرے سانس لے کر خود کو ریلیکس کیا۔ بنکان سے ماں کو دیکھا۔

”ہم کس کے لیے منی لانڈرنگ کر رہے ہیں، وہ جانتے ہیں۔“

جوہرات کا سانس رک گیا۔ ”تمہارا باپ جانتا ہے؟“

”اگر وہ جانتے ہوتے تو کیا میں یہاں آپ کو زندہ کھڑا نظر آتا؟“ وہ تنی سے اسے دیکھ کر بولا۔ جواہرات کا سانس بحال ہوا۔

”نیب وائلے.... وہ ہماری کپینز کی تفتیش کر رہے تھے۔ مگر ان کو ہماری دہشت گردوں کے گرد پ کے لیے کی گئی منی لانڈرنگ کی معلومات مل گئیں۔ کیس کے سر برہنے کہا ہے کہ انویسٹی گیشن آفیسر سے استعفی لے لے گا۔ مگر معلوم ہے وہ کون ہے؟“

”کون؟“ وہ یک نک اسے دیکھتے بولی۔

”فارس کا سوتیلا بھائی وارث۔ آگے آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ڈیٹک میری اور آپ کی ان سرگرمیوں کو پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

جوہرات بڑھاں ہی ہو کر کری پر گرگئی۔ سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

”مسئلہ یہ ہے میم کہ وارث کا باس وہ کیس فائلز ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔“ خاور نے کہنا شروع کیا۔ ”وہ خود پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ ہمیں وارث کو خود چیک کرنا ہو گا۔“

جوہرات نے سراخا کر گالبی پڑتی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھا۔

”تو تم نے اسی لیے اپنے باپ سے فارس کے بھائی کو فون کروایا تاکہ وہ پارٹی میں ضرور آئے؟ اور ابھی میں نے دیکھا وہاں کھڑا ہے یعنی۔“

”ہم تین دن سے اس کو فالو کر رہے تھے میم! وہ ہائل میں رہ رہا ہے۔ یوں اپنی ماں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کا لیپ ناپ فائل“

سب ہائل کے کمرے میں ہوتا ہے۔ وہ ادھر ہے اور میں اس کے ہائل جا رہا ہوں۔ ہمیں چیک کرنا ہے کہ اس کے پاس کیا کیا ہے اور اس لے کس کو دکھایا ہے وہ سب۔“

”اور تم مجھے یہ سب اب بتا رہے ہو؟“ وہ پھٹ پڑی۔ غصے سے دونوں کو دیکھا۔

”کیونکہ کل آپ انگلینڈ سے واپس آئی ہیں اور آپ ابھی مجھے نظر آئی ہیں۔“

جوہرات بھر کر ہاشم کے سامنے کھڑی ہوئی اور غرائبی۔ ”تم نے کہا تھا کچھ نہیں ہو گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم سب سنjal لو گے۔ تو پھر یہ سب کیا ہے؟“

”میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں۔ دوسال بھی نہیں ہوئے مجھے یہ کام کرتے ہوئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنی جلدی نظر دوں میں آ جاؤں گا۔“

مگر جواہرات نقی میں سر ہلاتی اس کو نے بغیر مفترض بسی بو لے جا رہی تھی۔

”ہاشم.... ہاشم.... اس سب کو ختم کرو۔ اس کا منہ بند کرو۔ کچھ بھی کرہ مگر جلدی۔“ ایک سخت نظر ان دونوں پڑال کرو کرہ باہر نکل گئی۔  
اُم فہر اخادر کی طرف پلتا۔

”اس کو بالکل بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس کے باشل گئے ہو۔ اس کے جانے سے پہلے آ جانا۔ کیونکہ اگر اسے کچھ علم ہوا تو وہ  
اللام میں آ کر ایسی جنگ شروع کرے گا جو میں نہیں چاہتا۔“

”لیں سرا!“ خاور اس کے ساتھ باہر نکلا۔ دونوں بیٹھیوں کے اوپر یہاں تک آئے۔ ہاشم نے نیچے دیکھا۔ داخلی حصے پر شہریں سارہ  
مل رہی تھی۔ ساتھ میں دو چیزوں بھی تھیں۔ آٹھ سال کی جڑوں، کشمیری سیب جیسے گالوں والی شرمашر ماکر ماں کے پیچھے چھپتی۔ ہاشم نے  
نماہی سے ان کو دیکھا۔ گردن میں گلٹی اسی ابھر کر معدوم ہوئی۔ آہستہ سے بولا۔

”وارث کو ہرث مت کرنا خاور! اس کے نیچے چھوٹے ہیں۔“

خاور انبات میں سر بلاؤ کر سیرھیاں اترنے لگا۔ داخلی دروازے تک پہنچا تو وارث اندر آ رہا تھا۔ اس نے خاور کو روکا۔ وہ رکا، سانس  
ہی کو یار کیا۔

”میں سیل فون ساتھ لاسکتا ہوں؟ مجھے ضروری کا لزکی فکر ہے۔“ موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ نیپٹلا انداز غور سے خاور کا چہرہ دیکھتا  
اکیا تھا، مگر کھنچا کھنچا ساتھا۔

”شیور سرا!“ خاور سر کو ختم دے کر آگے بڑھ گیا تھا۔

ہاشم گھری سانس لے کر خود کو کمپوز کرتا مسکراتا ہوا نیچے آیا۔ وارث کو نظر انداز کیا۔ وہ تب تک چھپتا تھا جب تک مقابل شک میں ہو۔  
اپ مقیقت کھل جائے وہ چھپا نہیں کرتا تھا۔ اعتراض کر لیتا۔ اسی لیے وارث سے کوئی بات نہیں کی۔ سارہ کی طرف آیا۔ وہ زمر کے ساتھ  
لڑی تھی۔ ازی سادہ انداز میں کھڑی۔

”ڈڑھ ہفتہ رہ گیا ہے فناشز شروع ہونے میں۔ آپ کیا محسوس کر رہی ہو؟“

”بالکل پہلینک۔“ زمر نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔ وہ میرون لمبی قمیض پر پھول دار دوپٹہ کندھے پر ڈالے کھڑی تھی۔  
تمکھم یا لے بال کھلے تھے۔ ہاشم نے پشت سے اس کے بال دیکھے اور گھوم کر سامنے آیا۔

”ہیلو سارہ... اور ہیلوڈی اے!“

زمر راسا مڑی، مسکراتی، فرست سے اسے دیکھا۔ ”قیکن یو ہاشم! بہت عرصے سے آپ نے مجھ سے کوئی نیور نہیں مانگا۔“

”بہت عرصے سے میرے کسی عزیز کو کرمن Litigation کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ زمر نے سر جھٹک کر جوں کا گلاس ہونتوں  
تے لگایا۔ وہ سارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ کب آئیں انگلینڈ سے؟“

”مجھے تین ماہ ہوئے ہیں ہاشم بھائی۔ گھر وغیرہ لینے کے چکر میں سارا وقت گزر گیا۔ جاب ابھی اسی ماہ سے شروع کی ہے۔“ وہ  
ٹوٹکواری سے بتانے لگی۔

”تو گھر میں کب شفٹ ہوتا ہے؟“

”بس اگلے ہفتے۔ وہ خوش تھی۔“ اب ہم ایک فیملی ہوں گے۔“

ہاشم نے مسکرا کر بچیوں کو دیکھا۔ ایک کا گال زمی سے چھووا۔ ”ان کے نام؟“

”اہل اور نور۔“ سارہ نے اپنے پیچھے چھپتی تو کو سامنے کرنا چاہا مگر وہ راضی نہ تھی۔ ہاشم مسکرا کر رہ گیا۔ پھر کچھ دری بعد جو اہرات کو ادھر

لے آیا۔

”زمر! یہ میری بھی ہیں اور یہ ہماری پیک ڈسٹرکٹ پراسکیو ٹر زمر یوسف۔“ جواہرات مسکرا کر گال سے گال ملا کر اس سے ملی۔ پھر علیحدہ ہو کر بھر پور اندر تک اترنی نظر ڈالی۔

”سعدی کی آنٹی... ہوں۔“

پھر جواہرات کو ذرا فاصلے پر کھڑے بڑے ابا سے ملوانے لے آیا۔ وارث ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ہاشم بدستور اسے نظر انداز کرتا رہا۔ وہ اپنی عادت سے برخلاف نہیں جا سکتا تھا۔

❖❖❖

جاائز تھی یا نہیں، تیرے حق میں تھی ..... کرتا تھا جو کبھی وہ دکالت تمام شد لفت ہوں کے مطلوبہ فلور پر کی۔ دروازے کھلے۔ پر جوش سی خین اور منہ میں کچھ چباتا بے تاثر سافارس باہر نکلے۔ آگے کمروں کی راہداری تھی۔ دونوں طرف دروازے خوابیدہ بتیاں روشن تھیں۔ خین نے بڑے پیار سے ساتھ چلتے فارس کو دیکھا۔

”تھینک یوماموں! آپ مجھے میری بیست فرینڈ سے ملوانے لائے۔“

”اُس اور کے تو کیا کرتی ہے تمہاری فرینڈ؟“

خین چلتے چلتے رکی۔ قدرے چونکہ کرفارس کو دیکھا۔ ”سوری؟“

”مطلوب پڑھتی ہے یا جا ب دغیرہ؟“ وہ بھی ساتھ کھڑا ہو گیا۔ علیشا کے کمرے کا دروازہ چند قدم دور تھا۔

”پڑھائی تو چھوڑ دی۔ کان لج نہیں جاسکی۔ یوشن فیس افروہ نہیں کر سکتی تھی۔ اب پتا نہیں کیا کرتی ہے۔“

”اور اس کے پیر نہیں کیا کرتے ہیں؟“

”مجھے نہیں پتا۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ وہ اب کے الجھ تھی۔

”تم نے راستے میں کہا تم اسے تین سال سے جانتی ہو۔ مگر تمہیں اس کی بنیادی معلومات ہی نہیں معلوم۔“

”میں نے کبھی پوچھی نہیں۔“ وہ دوبارہ چلنے لگے۔ مگر اب کے فارس مضطرب ساتھا اور خین ابھی ہوئی تھی۔ روم کے باہر آ کر فارس نے کچھ سوچ کر اسے دیکھا۔

”میں اندر آنا چاہوں گا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہیں درست جگہ لا یا ہوں یا نہیں۔“

”شیبور!“ خین نے قدرے ناخوشی سے کہتے ہوئے دستک دی۔ دروازہ جلد ہی کھلا اور کھلتا چلا گیا۔ سیاہ شولڈر کٹ بالوں اور سر میں بزرگ گکھوں والی گوری سی علیشا سامنے ہوئی۔ مسکراہٹ لوں پر پھوٹتی تھی۔ سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس تھی جس کے بازوں کہنی تک تھے۔ کھلے سے۔ قدرے شرارت، قدرے شرم اہٹ سے وہ خین سے گلے گلی۔ الگ ہوئی۔ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ خین لب دبائے مسکراہی تھی۔

”تم بالکل اپنی ویڈیو جیسی ہو۔“ پھر اس نے فارس کو ہیلو کہا اور اندر آنے کی دعوت دی۔

”یہ میرے انکل۔“ خین نے تعارف کر دیا۔ پھر اندر آئے۔ فارس تکمیل نظر وں سے علیشا کو دیکھتا، پھر ادھر ادھر دیکھتا صونے پر آبیٹھا۔

خین گرم جوشی سے بیٹھی اور باتیں کرنے لگی۔ ابھی راہداری کی گفتگو بھول گئی۔ فارس خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کو تیز تیز انگریزی میں بولتے اور بہتے دیکھنے لگا۔ رات کی مناسبت سے کمرے کی ساری زرد بتیاں روشن تھیں۔ علیشا نے اس دوران انھوں کو روم سروس کاں کی

۱، ۱، ۱۔ واپس آ کر پیغمبھی تو شاہنشہ سے فارس سے پوچھا۔

”اور آپ کیا کرتے ہیں؟“

”عورمنٹ سیکھر میں جا ب۔“ وہ بغور اس کو دیکھتا بولا۔ ”اور آپ کی جا ب کیا ہے؟“

علیشا ذرا شکلی۔ خنین کو دیکھا، پھر فارس کو اور بولی۔ ”میں نیشنل جیوگرا فک کے لیے کام کرتی ہوں۔ ہم ایک ڈاکو منڑی بنانے اور  
اے میں۔“

”اور نیشنل جیوگرا فک نے آپ کو نوکری دے دی۔ حالانکہ آپ کبھی کالج نہیں گئیں؟“

علیشا نے چونک کر خنین کو دیکھا جس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا، پھر فارس کو۔ مسکراہٹ مدھم ہوئی۔

”اگر میں افروز کر سکتی تو ضرور کالج جاتی۔ مگر اس جا ب کے لیے ڈاگری سے زیادہ میری قابلیت اہم ہے۔“

”اور کیا ڈاکو منڑی بنارہے ہیں آپ لوگ؟“

”ہم اس شہر کے تاریخی مقامات کو کور کریں گے۔“ وہ گردان اوپھی کر کے مسکرا کر بولی۔ فارس نے ابر و اٹھا کر اسے سنجیدگی سے دیکھا۔

”اسلام آباد کے تاریخی مقامات کو؟“

”جی۔“

”وہ میں گریث! کیونکہ مجھے اپنی زندگی کے تینتیس سالوں میں اسلام آباد میں کوئی تاریخی مقام ملا ہی نہیں۔ کیا آپ کو نیٹ جیو دالوں

نہیں بتایا کہ یہ شہر، 60 کی دہائی میں بنایا گیا ایک مصنوعی شہر ہے؟“

علیشا نے تھوک لگلا۔ ”میرا مطلب تھا تاریخی اہمیت کی حامل عمارتیں، جیسے سپریم کورٹ، پارلیمنٹ، پرائم فنسٹر ہاؤس وغیرہ۔“

”تو آپ کون سا کیسرہ استعمال کرتی ہیں؟“ ہمیں اچھا لگئے گا اگر آپ ہمیں اپنے کیسرے دکھائیں۔“ فارس نے اور ہادردیکھا جیسے

غمہ تلاش ہو۔

خنین بالکل چپ سی ہو کر پیغمبھی پاری پاری دونوں کا چہرہ دیکھتی سمجھنہیں پارہی تھی کہ گفتگو کس سمت جا رہی ہے۔

”میں.... دراصل کیسرہ درک نہیں کرتی۔“ علیشا کی مسکراہٹ بالکل غائب تھی۔ وہ ذرا کی اور پھر روانی سے بولتی گئی۔ ”میں کمپیوٹر ز

میں اچھی ہوں۔ مجھے مختلف کمپیوٹر اپنی ویب سائٹ چیک کرنے کے لیے ہائز کرتی ہیں۔ یہ ایک فری لائس جا ب ہے۔“

”یہ نظرے مجھے آپ کا پہلا جمع معلوم ہوئے ہیں۔“ فارس کے کہنے پاں کی رنگت پھیکلی پڑتی گئی۔

”آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں یہ سب گھڑ رہی تھی؟“

”میں یہ کہہ رہوں کہ جو آپ گھڑ رہی تھیں، اس میں بہت جھوول ہیں۔“

خنین پر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ علیشا اور فارس نے بے اختیار اسے دیکھا۔ ”بیٹھو پلیز۔“

”نہیں.... ہمیں پارٹی پہ جانا ہے۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ چلیں ما مون!“ اور پھر وہ علیشا کے اصرار پر بھی نہیں رکی۔ علیشا نے ایک

کفت پیک اس کے ساتھ کر دیا۔ اس نے کھولا بھی نہیں۔ لب بھینچے تندی سے ابر و سیزیرے راہداری میں چلتی گئی۔

”وہ اچھی لڑکی ہے مگر وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ اور یہ نیٹ جیو دالی کہانی بالکل...“ فارس سنجیدگی سے ساتھ چلتا کہہ رہا تھا کہ وہ طیش سے اس کی طرف گھومی۔

”تحنیک یوسوچ ماموں! میری بیٹ فرینڈ کے ساتھ وہ کرنے کا جس کا آپ کو حق نہ تھا۔“ احساس تو ہیں سے اس کا چہرہ سرخ

، کہنے لگا۔

”میں نے صرف چند سوال کیے تھے۔ مجھے حق ہے کہ میں تمہاری انٹرنیٹ فرینڈ کو چیک کر سکوں۔“

”کیا ایسے کیا جاتا ہے مہانوں کے ساتھ؟ وہ لکھا ہرست ہوئی ہوگی۔ اس سے بہتر تھا کہ آپ مجھے لاتے ہی نہ۔“

”وہ جھوٹ بول رہی تھی اور میں اس کا جھوٹ پکڑ رہا تھا۔“

”کیا میں نے کبھی آپ کی باتیں پکڑ کر پھپھو کو بتایا کہ وہ نوز پن آپ نے ان کو سمجھی تھی؟“

شدت جذبات میں جو اس کے منہ میں آیا، بلوتی چل گئی اور حساس ہونے پا۔۔۔ ایک دم چپ ہوئی۔ سانس تک رک گیا۔ فارس نے بری طرح چونک کرا سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تعجب بے لینی، حتیٰ کہ صدمہ بھی تھا۔ وہ اسی طرح اسے دیکھتا رہا جواب بظاہر خود کو سنبھالے کھڑی اندر سے ڈر رہی تھی۔

”تم کون ہو جنین؟“

❖❖❖

ہاں تکنی ایام ابھی اور بڑھے گی۔۔۔ ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے ہاکا ہاکا میوزک پس منظر میں نک رہا تھا۔ ہاشم گلاس پکڑے مسکراتا ہوا لوگ روم کے اس کونے میں آیا جہاں زرتاشہ کھڑی تھی۔ فون پہ بار بار نمبر ملکار مایوسی سے بند کرتی، سیاہ سارہ میں ملبوس سیاہ بال باکل شہرین کے انداز میں کئے فون بند کرتے ہوئے گردن اخہانی تو ہاشم کو سامنے کھڑا دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ پچھیکا سامسکرا تی۔ اس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں اور نگت شہری۔

”پریشان ہو؟“

زرتاشہ نے اثبات میں گردن ہلانی۔ ”فارس معلوم نہیں کہ ہر رہ گئے۔“ پھر قریب کھڑے سعدی کو پکارا۔ ”سعدی!“

وہ جو بہتے ہوئے زمر سے کچھ کہردہ رہا تھا، پہنچا اور تابعداری سے چلتا دھر تک آیا۔ ”جی!“

”فارس؟“

”اوہ ہاں۔۔۔ وہ حنہ کو اس کی فرینڈ کی طرف لے گئے ہیں۔ اسی نے منع بھی کیا مگر۔۔۔“ تب ہی کسی نے سعدی کو پکارا۔ وہ مسکرا کر ہاشم بھائی کو دیکھتا اپس چلا گیا۔

”حنہ؟ اوہ۔۔۔ وہ سعدی کی چھوٹی چالاک بہن۔“ ہاشم کو یاد آیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گھری نظروں سے زرتاشہ کے چہرے پر چھاتا دبادبا غصہ دیکھا۔

”یعنی فارس ایک دفعہ پھر کسی اہم موقع سے غائب ہے؟“

”گھر سے پارٹی کے لیے تیار ہو کر نکلے تھے۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ وہ ہر قریب پر تو یوں نہیں کرتے۔“

”ہاں وہ صرف اس تقریب پر یوں کرتا ہے جہاں یہ ہوتی ہے۔“ دھمکے سے کہتے ہاشم نے ابرو سے اشارہ کیا۔ زرتاشہ نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ سعدی اور زمر جو اہرات کے ساتھ کھڑے تھے۔ زرتاشہ نے الجھ کرو اپس ہاشم کو دیکھا۔

”یہ تو سعدی کی پھپھو ہے۔“

”اور فارس کی پرانی نیچپر بھی۔ کیا تم ہی نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ زمر کے والد نے جو تمہاری شادی کی دعوت کی تھی، اس سے بھی فارس تھوڑی دریں بعد غائب ہو گیا تھا۔ اور جب میں نے تم سب کو زمر سیست انوائیت کرنا چاہا تھا، تو اس نے مجھ سے خود کہا کہ مجھے زمر کو نہیں بلوانا چاہیے، صرف گھر کے لوگ کافی ہیں۔“

”تو؟“

”اوہ! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ فارس نے زمر کا رشتہ مانگا تھا مگر کسی وجہ سے انکار ہو گیا۔ سعدی نے ایک دفعہ بھی کہتا یا تھا۔“ ہاشم نے ۱۱۔ مٹانے اچکائے۔ زرتاشہ حق دق شنی رہی۔

”میں نے تو یہ کبھی نہیں سنा۔“

”تمہاری شادی کو ہوئے بھی کتنے دن ہیں؟ صرف پانچ ماہ!“

زرتاشہ نے گردن پوری موڑ کر زمر کو دیکھا۔ زمر اب سارہ سے بات کر رہی تھی۔ نیم رخ دکھائی دیتا۔ گھنگھر یا لی لٹ گال پر گرتی۔

”امانہ!“ مسکراہٹ سے بھر پور۔ ہیرے کی لوگ اسی طرف تھی۔ زرتاشہ نے تندی اور غصے سے واپس رخ پھیرا۔

”اوکے۔ مجھے تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔ مجھے یقین ہے ان دونوں کے درمیان اب کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک پرانی بات تھی۔“ ذرا

الد، سے کر گلاس لبوں سے لگایا پھر بولا۔ ”یہ سازھی اچھی ہے۔ کیا اسی ڈیزائن کی ہے جہاں شہری تمہیں لے کر گئی تھی؟“

زرتاشہ کی آنکھوں میں اداسی چھائی۔ گردن دائیں سے باہیں ہلائی۔

”فارس نے کہا وہ افروذ نہیں کر سکتے تو میں نے آرڈر کیسل کروادیا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟ پے منٹ شہری کے بل میں ہو جاتی۔ تم نے مجھے بتایا ہوتا۔“

”فارس کو اچھا نہ لگتا۔ رہنے دیں ہاشم بھائی۔“ وہ اداسی سے رخ موڑ گئی۔

اور انگریز بکار دار گزرتے ہوئے سعدی کے پاس رکے (زمروڑ دیکھاتک نہیں) صرف تنے ابرو سے اس سے سوال کیا۔ ”تمہاری بہن

اہی آئی؟“ چھرے پختی اور سردمبری تھی۔ سعدی فوراً سے وجہ بتانے لگا۔ وہ ”ہوں“ کر کے آگے بڑھ گئے۔ سعدی واپس آیا تو زمر سارہ سے بات کر

اہی تھی۔ وہ بورسا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، تب ہی داخلی دروازے سے جگہ چھوڑ کر آتی شہریں پر نظر پڑی۔ اس نے بھی ایک تیز خست نظر سعدی پر ڈالی

اہی کے بڑھ گئی۔ وہ خاموش رہا۔ نوشیر وال انگلینڈ ہی تھا۔ اگر وہ ہوتا تو شاید سعدی پارٹی میں نہ آتا۔

لا دُنخ کے کونے میں خاموش کھڑے سب کو باریک بینی سے دیکھتے وارث کا موبائل بجا۔ اس نے فون نکالا اور پیغام دیکھا۔ سسٹم

آن کا الٹ آر ہاتھا۔ وارث اپنی جگہ مجدد ہو گیا۔ اس کا کمپیوٹر اس کے کمرے میں تھا اور اس کو پیغام بھیج کر بتا رہا تھا کہ کوئی اسے آن کر رہا ہے۔

لا اہا کوئی اس کے کمرے میں تھا؟

اس کا چہرہ سفید پڑتا گیا۔ وہ سارہ کے قریب آیا۔ بلکل یہ سرگوشی کی۔

”میں ایک کال کرنے لان میں جا رہا ہوں۔ زیادہ دیر ہو جائے تو کہہ دینا کہ میں کہیں آگے بیچھے ہوں۔ اگر جلدی نہ آؤں تو فارس

ہیں گھر لے جائے گا۔“

وہ حیران سی مڑی۔ سمجھ کر اچھا کہا اور وارث دھیمی رفتار سے چلتا ٹکل آیا۔ باہر آ کراس کی رفتار تیز ہو گئی۔ دل میں عجیب سے خیالات

اہی تھے۔

ڈانگنگ ہال کے کونے میں کھڑے بظاہر کسی سے مسکرا کر بات کرتے ہاشم کو علم تک نہیں ہو سکا کہ وہ کب وہاں سے نکلا ہے۔ یہ

بڑھتے سے خاور دیا کرتا تھا، اور خاور نہیں تھا۔ نہ اس کی کوئی کال آئی تھی۔

ہاشم کا بمشکل چھپایا اغطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

❖❖❖

جیسے کے فسانے رہنے والے ان میں الجھ کر کیا لیں گے

ہوٹل کے ریسٹورانٹ ایریا میں زردوشینیوں نے سحر اگیز سافروں طاری کر کھا تھا۔ حسین اور فارس آمنے سامنے بیٹھے تھے، یوں کہ حسین

کا سر جھکا تھا۔ وہ گھر نہیں گئے، یہیں آگئے تھے۔ اب اپنی زبان کی پھسلن پر خین شرمندہ تھی۔

”تمہیں کیسے پتا چلی نوز پن والی بات؟“ فارس نے سمجھی گی مگر زمی سے پوچھا۔ خین نے خفا خفاسا چھرا اٹھایا۔

”آپ کی گاڑی میں دیکھی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ وہ پھر چھوکو یوں“ بھیجیں گے۔“

”میں نے یوں“ نہیں بھیجی تھی۔“ فارس کے ماتھے پر عادتامل پڑے۔ ”صاف بات کرتا ہوں۔ اس وقت مجھے لگا میری ان سے شادی ہو جائے گی اور وہ میری لکھائی پہچان جائیں گی۔ نام اس لیے نہیں لکھا کہ کوئی اور دیکھ کر غلط نہ سمجھ لے۔“

”پھر آپ نے زرتاشہ آئنی سے شادی کیوں کر لی؟“

”کیونکہ تمہاری پھر سے رشتے کو انکار ہو گیا تھا۔ بات ختم۔ آپ کہہ رہی تھیں زرتاشہ سے کرو میں نے کر لی۔ میں اس شادی سے خوش ہوں۔“

”مگر میں خوش نہیں ہوں۔ مجھے غصہ ہے پھر سے پکار کیوں کیا؟“

”ان کی والدہ نے انکار کیا تھا۔ ان کو تو معلوم بھی نہیں ہو گا۔“

”میں نہیں مانتی۔“

”وات ایور حض۔ میں یہ صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ بات اپنے ذہن سے نکال دو۔ میرا ان سے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اب ان کی شادی ہو رہی ہے۔ کوئی بھی بات ہمارے منہ سے ایسی نہیں لکھنی جوان کو ہرث کرے۔“

”اوکے۔“ خین نے سرمزید جھکا لیا۔ فارس چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”ان کو کہنا یہ لوگ اب ان پر سوت نہیں کرتی۔ اس کو اتنا کر کوئی اور پہن لیں۔“

”میں نے کہا تھا، آپ کی شادی کے اگلے دن ہی کہا تھا مگر وہ کہتی ہیں مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے اور میں تبدیلیوں کے ساتھ بہت دریے ایڈ جست کرتی ہوں، سو اسی کو پہن رکھوں گی۔“

فارس نے سرہلا یا پیچھے ہو کر بیٹھا جوں کا گلاس لبوں سے لگایا اور مسکرا یا۔ ”تم سے تو ڈرنا چاہیے خین!“

ہلکا سامکرا کر خین نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اسی لیے آپ علیہا کی فکر نہ کریں۔ وہ کوئی جھوٹ نہیں بول رہی۔ اب ہم چلتے ہیں۔ پارٹی پہ بھی جانا چاہیے۔“ وہ اٹھ گئی تو فارس والٹ نکالتا کھڑا ہو گیا۔

.....❖❖❖.....

وہ آئیں تو سر مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے ..... یہ شب کی آخری ساعت گرائیں کیسی بھی ہو ہدم

دارث غازی کے ہائل کمرے میں اندر ہرا تھا۔ خاور ہاتھوں پر دستا نے چڑھائے کری پہ بیٹھا غور سے اسکرین کو دیکھتا لیپ ٹاپ پر ٹاپ کیے جا رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے ڈاکو منش کھلتے جا رہے تھے۔ ڈاکو منش *encrypted* تھے۔ ان کے تالے لوڑنے میں وقت لگتا اور ابھی تو بہت سا کام رہتا تھا۔ بار بار مختاط نظروں سے دروازے کو بھی دیکھتا جسے وہ اندر سے بند کر چکا تھا۔

یکا یک باہر جو توں کی آواز آئی۔ خاور پھر تی سے اٹھا لیپ ٹاپ آف کیا۔ جو کاپی کر رہا تھا، اس کی فلیش کھیج لی۔ کھڑکی کی طرف آیا، پھر واپس مڑا۔ انہوں۔ کھڑکی نہیں۔ وہ قدر آدم الماری میں آ کھڑا ہوا۔ پٹ بند کر دیئے۔ تیار چونا۔ ادھر کوئی الماری کھولتا، ادھر وہ اس پر حملہ کرتا۔

چابی گھمانے کی آواز اسے سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا۔ ڈیم اٹ! یہ وارث ہو گا۔ ہاشم صاحب نے اسے کیوں نہیں بتایا کہ وہ پارٹی

”اُل چکا ہے۔ اسے کوفت ہوئی۔

پٹ کی ذرا سی درز کھولے رکھی تھی۔ وارث اندر آیا، کوت صوفے پر پھینکا، جلدی سے کھڑکی چیک کی، وہ اندر سے بندھی۔ پھر لیپ ۱۷ لی طرف آیا۔ اس کی اسکرین اٹھائی۔ وہ بندھا۔ وارث نے اس پر ہاتھ رکھا۔ گرم تھا۔ یعنی کہ کوئی ادھر تھا۔

اس نے لیپ ناپ آن کیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ ساتھ ہی موبائل نکالا۔ کال ملا کر کان سے لگایا۔ خاور نے دروازے کو پکڑے ہلا کے آگے ہو کر درز سے جھانکا۔ وارث کی اس کی طرف پشت تھی۔ وہ اتنا قریب تھا کہ خاور اس کے سانس کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ اپنا سانس ال نے منہ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر گویا دبار کھاتھا۔

”سر امیں جانتا ہوں آپ نے مجھے ہاشم کے ہاتھوں تجھ دیا ہے۔“ وارث غصے سے فون پر کہہ رہا تھا۔ ”اس لیے اب آپ چاہیں تو مجھے“ مطل کر دیں، مگر وہ تمام ثبوت اور ریکارڈز میں ایک دوسری ایجنسی کو تجویز رہا ہوں۔ اب ہم دونوں یہ راز جانے والے واحد بندے نہیں رہیں گے۔ اب ہاشم اور اس کی ماں کے خلاف انسداد وہ شست گردی ایکٹ تلقیش ہونے سے آپ نہیں روک سکتے۔ کیا آپ نے سنا جو میں نے کہا سڑا؟“ اور غصے سے فون بند کر کے میز پر ڈالا۔ وہ گھرے گھرے سانس لے رہا تھا۔ غم، غصہ بے بی، اس کے وجود سے چھلتی تھی۔ اب آریا ہاڑیں اب وہ جو کرے گانا، ساری دنیا دیکھے گی۔

وہ ایک فیصلہ کر کے اب ای میل کھول رہا تھا۔ ای میل کا آپشن لک کیا۔ فارس کا ایڈریس ڈال۔ لب سینچنے سوچتے ہوئے وہ ڈاکو منش کھولنے لگا سے کیا کیا بھیجا تھا؟

خاور کی آنکھیں فکر مندی سے سکریں۔ اس نے فارس کے نام کے پہلے حروف پڑھ لیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس سب کیا مطلب ہے۔ بس ایک لمحہ لگایا اس نے فیصلہ کرنے میں اور آندھی طوفان کی طرح پٹ دھکلیے۔ وارث چونک کر پلنے لگا مگر اس سے پہلے ہی خاور نے ہاتھوں اس کے سر کی پشت پر دے مارا۔ وہ اوندھے منہ کپیوڑیبل پر جا گرا اور نیچے لڑھک گیا۔ لمحہ بھر کو سارے میں سکوت چھا گیا۔ خاور جھکا اور اسے سیدھا کیا۔ اس کی بندہ آنکھیں کھلیں۔ وہ کرایا بھی تھا، خاور کو بھی دیکھا۔ آنکھوں میں شدید طیش چھلنے لگا۔ اس نے خاور کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔

”تمہیں ہاشم نے بھیجا ہے تا۔“ مگر خاور نے تختی سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر مردڑے۔ اسے اوندھے منہ گرایا، کمر پر گھٹنے سے ہاؤ دے کر گئے رکھا اور ہاتھ پیچھے کر کے پکڑے۔ بمشکل قابو کیے، جیب سے رسی نکالی جو وہ کسی بھی ایسے موقعے کے لیے ساتھ لایا تھا۔ ہاتھ ہاندھے۔ وارث کی آنکھیں سر میں اٹھتے درد کی نیسوں کی شدت سے بند ہوئے جاری تھیں مگر وہ خود کو ہوش میں رکھنے اور مراحت کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ٹانگ موڑ کر خاور کو دھکلیتا چاہا مگر خاور اس سے زیادہ مضبوط اور ترینڈ تھا۔ اس نے تختی سے اسے نیچے دبائے رکھا اور اس کی ایڑیاں ایک ساتھ باندھ دیں۔ پھر کھڑا ہوا، کپڑے جھاڑے بُوث وارث کی کمر پر رکھ کر اسے کروٹ لینے سے روکے، اس نے موبائل نکالا۔ ہاشم ابھی تک مسکرا کر ہیں کھڑا کسی سے بات کر رہا تھا۔ جب موبائل بجا، اس نے خاور کا نام دیکھا، مسکراہٹ تھی۔ وہ معدتر کرتا تھیزی سے اوپر آیا۔ کمرے میں آکر دروازہ بند کیا اور موبائل کان سے لگایا۔

”ہاں بولو!“

”آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا کہ وہ ہاں سے نکل چکا ہے۔“

”وہ ہیاں سے نکل چکا ہے؟“ ہاشم نے بے یقینی سے دہرا دیا۔

”وہ میرے سر پر آ گیا۔ مجھے اس کو زیر کرنا پڑا۔ وہ فارس کو سارے ڈاکو منش ای میل کر رہا تھا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ اس نے تمہیں دیکھ لیا؟“ ہاشم دبادبا ساغریا۔ چھروں سفید پڑا تھا۔

”آپ نے یہ فائلز نہیں دیکھی ہیں۔ اس کے پاس سب ثبوت ہیں، گواہ ہیں، ریکارڈز ہیں۔ آپ کے سائنس شدہ کا مذہب۔ اور اگر میں اس کو نہ روکتا تو وہ یہ سب فارس کو بھیج دیتا۔“

”لخت ہے تمہارے اور خاور! ایک کام تم ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔“ ہاشم کمرے میں چکراتا غصے سے کھر رہا تھا۔  
وارث نے تقاضہ سے گردان موڑی، حلق سے پھنسی پھنسی ہی آواز نکلی۔

”ہاشم سے کہو وہ حساب دے گا۔“

خاور نے کوفت اور غصے میں زور سے اس کی پلی پٹ بوٹ کی ٹھوک مری۔ وہ ہلاکا سامسکرایا۔

”اب تما نیے میرے لیے کیا حکم ہے؟ اس کا قصد ختم ہو جائے تو کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔“

”نہیں ہرگز نہیں۔“ وہ بے چینی سے بولا۔ چہرے پ پسند آ رہا تھا۔ پیشانی پ ہاتھ رکھ کے وہ بیٹھا گیا۔ اردو گرد گویا  
دھماکے ہو رہے تھے۔

”سر؟ جلدی بتائیں کیا کروں؟“

”مٹھر و۔ مجھے چند لمحے دو۔ چند لمحے خاور۔“ اڑی رنگ اور ویران آنکھوں سے کہتے ہوئے ہاشم نے موبائل کان سے لگائے  
دروازہ کھولا۔ رینگ کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھا۔

لاؤنچ کے وسط میں سارہ کی بیٹیاں کھڑی تھیں۔ سارہ زمین پر جھک کر ان میں سے ایک کے جو تے کا اسٹریپ بند کر رہی تھی ساتھ  
ہی نرم خنگی سے اس کو کچھ کھڑا کر رہی تھی۔ میقیناً کوئی ایسی بات جو بچپن میں اس کی ماں اس سے کہا کرتی تھی۔ ”کھلتے تھے کے جو توں سے نہیں بھاگو۔  
تمہے جوتے تھے آتا تو اوندھے منہ گرو گے۔“

وہ یک نک کر در مقابلہ زدہ سا ان دو معصوم بچیوں کو دیکھتا رہا۔ گردن خود خود نافی میں بیل۔ کیا وہ ایسا کر سکتا تھا؟ کیا اس کے پاس  
یہ سب کرنے کی وجہ ان کی معمومیت سے بھی عظیم تھی؟

اس کی نگاہیں ان سے گزر کر فاصلے پر کھڑے اور نگزیب کاردار پر گئیں اور پھر ان ہی پر مٹھر گئیں۔ وہ ایک سیاست دان دوست کے  
ساتھ کھڑے میں کر کچھ کھڑا ہے تھے۔ وہ خوش تھے یا سیاست کی ریہسل کر رہے تھے۔ نیا کیرینا جواء۔ کیا وہ اس موقع پر ان کا کوئی اسکینڈل  
شائع ہونا اور ذکر سکتا تھا؟ کوئی افیز ہوتا، کوئی ناجائز اولاد تو بھی چل جاتا۔ مگر تکمیلی علاقوں کے دہشت گردوں سے تعلقات؟ کبھی بھی نہیں۔

ہاشم واپس کمرے میں آیا۔ فون ابھی تک کان سے لگا تھا۔ خاور منتظر تھا۔ ہاشم نے خود کو کہتے سن۔

”خاور! اسے خود کشی لگانا چاہیے۔“ اور موبائل بیڈ پر چینک دیا۔ کوٹ بھی اتار کر ساتھ رہی ڈالا۔

خاور نے حکم سن کر آنکھیں بند کیں، پھر چند گھنے سانس لیے۔ آنکھیں کھولیں۔ بوٹ وارث کی کمرے سے ہٹایا۔ جھک کر اسے اٹھایا۔  
وہ نیم جاں سا بُشکل کھڑا ہو پایا۔ آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں اور وہ ان کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم۔ کیا چاہتے۔“ خاور نے جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ میں ٹھونسا۔ میز قریب کی اور وارث کو اس پر بٹھایا۔ پھر گردن انھا  
کر ٹکھے کو دیکھا۔



اپنے کمرے میں چلتے ہاشم کے قدم من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ ہاتھ روم تک آیا۔ چوکھت کو ہاتھ سے تھام لیا۔ آنکھیں بند  
کیں۔ کرب در دم گھنٹے کی کیفیت۔ وہ چند لمحے یونہی کھڑا رہا۔



خاور نے بستر کی چادریں آکھی کیں۔ گرہیں لگائیں۔ پونچ کے گرد پھندا سالنکایا۔ وارث اس دوران بمشکل میز پر بیٹھا تھا، یوں لے کر دن باسیں طرف بار بار لڑکتی اور وہ بار بار اس کو سیدھا کرتا۔ سر کی چوت اس زاویے سے لگائی گئی تھی کہ اس کی ساری ملامت دم تو رُگنی تھی۔ خاور نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اوپر کھینچا، مگر وہ اپنا پورا ذرور لگانے لگا۔ خاور پنجا ہونٹ دانتوں سے دبائے مزید قوت سے کھینچنے لگا۔ وارث کا سر اوپر ہوا، آنکھوں کے سامنے پھندا ہبھایا۔ اس نے بے یقینی سے خاور کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں خوف نہیں تھا۔ صرف بے یقینی تھی۔ اور شاید کچھ بھی اور صدمہ بھی۔



ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ با تھر روم کا دروازہ دھکیلا۔ اندر قدم رکھے۔ گرماں بڑھی تو خود کار بیان خود بخود جعل انھیں۔ پورا باتھ روم روشن ہو گیا۔

واش بیک کی جگہ کھلی تھی۔ دوسنک لگے تھے۔ اوپر دیوار گیر شیشہ۔ وہ چوکھت چھوڑ کر سلیس تک آیا۔ دونوں ہاتھوں سے اسے تھاماً اور تھامے تھامے جھک گیا، جیسے کوئی اٹھی کرتے وقت جھکتا ہے۔



خاور نے اسے کھڑا کر لیا تھا۔ اس کی گردن کے گرد پھندا کستے ہوئے کافی وقت ہوئی کہ وہ مراجحت کر رہا تھا، خود کو چھڑانے کی کوشش۔ ایک آخری کوشش۔ آخری امید اود۔ زندگی کتنی عزیز ہوتی ہے۔ مگر پھندا اس کیں۔ پکا، زور کا۔ خاور نیچے اتر، ایک طویل اور خندی سانس اندر اتاری جو ہڈیوں تک میں گھس گئی اور پھر۔ زور سے میز کوٹھوکر ماری۔



ہاشم نے آنکھیں اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ وہ سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ جھکا، قل تلے ہاتھ لے گیا۔ پانی کی دھارا ملی۔ ہاتھوں کے کٹورے میں جھیل جمع کی، اسے منہ پر پھینکا۔ آنکھیں بند کیں۔ بوندیں چہرے سے لڑکتی گردن پر ملکنکے لگیں۔ شرٹ، کف، سب تکیلے ہو گئے۔

خاور ٹھوکر مار کر پیچھے ہٹا۔ وارث نے سرادھرا دھر مارتے خود کو چھڑانے کی کوشش کی، چند ایک جھٹکے اور۔ سانس حلق میں آپنچا۔ زندگی کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ پونچ کے پھنڈے سے جھوٹی لاش ساکت ہو گئی۔

خاور نے اس کے ہاتھ کھولے جلدی جلدی پیڑ بھی علیحدہ کیے۔ رسی کو پلاشک بیگ میں احتیاط سے ڈالا۔ منہ میں ٹھونسا کپڑا انکال کر اسے بیک میں ڈالا اسے سیل کیا۔ اور اس کے کاغذات، لیپ ناپ وغیرہ سمیئے گا۔



ہاشم سیدھا ہوا۔ تو لیے سے چہرہ تپھتیا۔ بال دبارہ برش کیے اور کوت سیدھا کرتا باہر نکل آیا۔ البتہ اس کے چہرے کا رنگ سفید تھا۔ نیپوں میں لپٹی بے جان گی جیسا سفید اور پُر شمردہ۔ آنکھیں گلابی تھیں۔ سیرھیاں اتر کروہ نیچے آیا۔ سارہ اور بچیوں کے قریب سے گزر گیا، لگاہ ملائے بغیر۔

خاور کی واپسی تک پارٹی جاری تھی۔ خاور پکنچ گیا اور اسے ترچھی نظر وہیں سے دیکھ کر اثبات میں سرہلایا۔ ہاشم نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ خاور کشرون روم کی طرف چلا گیا۔ وہ ہیں کھڑا رہا۔ اس کے اندر، بہت کچھ ٹوٹ جڑ رہا تھا۔ فارس اور حسین وہاں پکنچ گئے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ حسین آکر سعدی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ زمر نے نرمی سے اسے مطاب کیا۔ ”حسین! تمہاری دوست سے ملاقات ہو گئی؟“ حسین نے ایک خفا خفا سی نظر دوز رتاش سے کچھ کہتے فارس پر ڈالی اور ”جی“ کہہ کر

دوسرا طرف دیکھنے لگی۔ زمر خاموش ہو گئی۔ وہ اس کھنچ کھنچنے رویے کی عادی تھی، پھر بھی۔

زرتاشہ تندی سے فارس کو دیکھ رہی تھی۔

”عین پارٹی والے دن، ہی جن کوہیں جانا تھا اور آپ کو ہی لے جانا تھا؟“ وہ دبے دبے غصے سے فارس کو دیکھ کر بولی۔

”یہ پارٹیز تو ہر ہفتہ ہوتی ہیں۔“ اس نے حسب عادت شانے اچکائے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ جنین ذرا در تھی، زمر ساتھ تھی۔ اس لے

نگاہیں پھیر لیں۔

”اور آپ صرف ان ہی پارٹیز کو کیوں اشینہ نہیں کرتے جن میں پر اسکیوں ٹر صاحب ہوتی ہیں۔“

فارس نے بری طرح چونک کرائے دیکھا، پھر بے اختیار جنین کی طرف (کہیں جدے نے اس سے بھی تو کچھ نہیں کہہ دیا؟) پھر زرافٹے سے زرتاشہ کو۔ ”کیا مطلب ہے اس فضول بات کا؟“

”آپ نے اس کا رشتہ مانگا تھا، نہیں ملا۔ پھر بھی آپ کے دل میں کیا ہے جو آپ اس سے اعراض برتنے ہیں؟“ فارس کے ابر نا گواری سے سکڑے۔

”میں نے اس کا رشتہ؟ یہ کس نے کہا تم سے ہاں؟“

”آپ نے نہیں بتایا تو کیا کوئی اور نہیں بتا سکتا؟“

”تم سے کس نے کہا ہے؟“ وحثی اور طیش سے باد باسا گرایا۔ زرتاشہ ذرا ہیسمی ہوئی۔ شوہر کے موڈ کے اتار چڑھاوا۔ اف۔

”ہاشم بھائی نے اس اتنا...“

فارس نے بغیر پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھا تا اندر گیا، ڈائینگ ہال کی چوکھت عبور کر کے دائیں بائیں دیکھا۔ غصے سے کٹپٹی کی رگ ابھر آئی تھی۔

دائیں طرف ہاشم پشت کیے کھڑا کسی خاتون سے بات کر رہا تھا۔ فارس تیزی سے اوپر آیا۔ قریب آ کر اس کو مخاطب کیا۔ ”خاتون ادومنٹ دیں، مجھے بات کرنی ہے۔“

ساتھ ہی سخت نظر ہاشم پڑا۔ خاتون تو فوراً ہٹ گئیں مگر ہاشم نے چونک کرائے دیکھا۔ ”کیا ہوا؟“

”تمہیں لگتا ہے مجھے پتا نہیں چلے گا کہ تم کیا کرتے پھر تے ہو میری پیٹھے پیچھے؟“ ہاشم کے حلقوں میں پکھا انکا۔ ویران نگاہوں سے فارس کو دیکھا۔ گلاس پکڑے ہاتھ پنپنی ابھری۔ اسے کیسے پتا چلا؟

”میں واقعی نہیں سمجھا۔“

”میرے بارے میں میری بیوی سے کو اس مت کیا کرو ہاشم!“ وہ جتنے غصے سے بولا، ہاشم کے تنے اعصاب اتنی تیزی سے ڈھنے ہوئے، رکاس اس بحال ہوا۔ (اوہ تو یہ بات ہے)

”میں اب تک نظر انداز کرتا آیا ہوں جو ہر وقت تم اسے میری اور اپنی مالی حیثیت کا فرق جاتے رہتے ہو۔ کبھی میری کسی بات کو نشانہ تقدیم بنا کر کی کسی کو مگر اس سے میرا گھر ڈسٹر ب ہو رہا ہے۔ آئندہ،“ انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ”آئندہ میری بیوی سے دور ہنا ورنہ میں بہت براپیش آؤں گا۔“

کہہ کر وہ مڑ گیا۔ ہاشم خلاف معمول خاموشی مگر سکون سے اسے جاتے دیکھتا رہا، پھر واپس پلٹ گیا۔ اندر کا سارا اضطراب چھپائے۔

دامن پر کوئی چھینٹ نہ خفر پر کوئی داغ

تم قتل کرو ہو یا کرامات کرو ہو.....

اگلی بُجرا بھی تاریک تھی جب جواہرات کی آنکھ کھلی۔ وہ سیدھی اٹھ بیٹھی۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ اور نگزیب کروٹ لیے سور ہے تھے۔ الہوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ اس نے تلخی سے سر جھٹکا، جھک کر سلیپر پہنے اور کھڑکی تک گئی۔ باہر سیاہی تھی۔ روشنی سے ذرا پہلے کا اندر ہیرا۔ ہیب گھٹن تھی فضایا میں جیسے کوئی تعفن زدہ لاش کسی نے بچ چورا ہے پر کھی ہو اور اس کی بوئھنوں میں گھس رہی ہو۔ جواہرات کی خوبصورت آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ گاؤں پہننا اور ڈوری کو گردہ لگاتی باہر نکل آئی۔

لاوٹ خ تاریک تھا۔ بتیاں آٹو یونک تھیں۔ وہ جس جگہ داخل ہوتی وہاں تھی جمل اٹھتی۔ اس نے لاوٹ خ میں قدم رکھئے بتیاں جلتی تھیں۔ وہ ڈائینگ ہال تک آئی۔ آگے نکل گئی۔ بتیاں ساتھ ساتھ بھٹکی گئیں، اگلی جلتی گئیں۔ ڈائینگ ہال سے پرے ایک اور راہداری تھی۔ اس کے آگے ایک کمرے کا دروازہ بند تھا۔ یخچے درز سے روشنی آرہی تھی۔ وہ کنٹرول روم تھا۔ جواہرات اچھنجھے سے رکی، آہستہ سے قریب آئی۔ ماڈل پروف دروازوں سے سننا ممکن تھا۔ اس نے ہینڈل پکڑ کر گھمایا۔ دروازہ کھلتا گیا۔ ہاشم مضطرب سانہتا غصے سے کچھ کہہ رہا تھا اور خاور ماننے کھڑا سر جھکائے سن رہا تھا۔

”میں نے کیا بکواس کی تھی؟ اس کو خود کشی لگانا۔“ ماں کو دیکھ کر وہ رکا مگر تاثرات نہیں بد لے۔ قریب آیا۔ کہنی سے پکڑ کر جیلان و بیان جواہرات کو اندر کیا۔ دروازہ بند کر کے لاک کیا۔ کری ٹھیک کر کہا بیٹھیں۔

وہ نہیں بیٹھی۔ تینی محسوس کر کے بے چینی سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ ”ہاشم! کچھ غلط ہے ہے نا؟“

”ہمارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔“ وارث واحد شخص تھا جس کے پاس ہمارے خلاف ثبوت تھے۔ میں نے خادو کو اد کر دیا۔ مادر نے اسے مار دیا ہے۔ اور یہ رہے سارے ڈاکوٹس، اس کی فائلز اس کا لیپ ٹاپ۔“ اشارہ کیا ان پرزوں کی طرف۔ جواہرات بے دم سی ہو کر کری پر گرنگی۔ سر دنوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ خاور تفصیلات بتاتا رہا۔ آخر میں اس نے جھکے سر کو اٹھایا۔ گلابی ہلتی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھا۔

”کیا اس کی جان لیتا ضروری تھا؟ کیا اب ہم قاتل بھی ہو گئے ہیں؟“

”اپنے خاندان کی حفاظت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں میں۔ بہر حال اب یہ سوچنا ہے کہ آگے کیا کرنا ہے؟“

”کیا مطلب؟ اس نے خود کشی کر لی بات ختم۔ ثبوت ہمارے پاس ہیں۔“ اس کی جوانی پر ہاشم نے گھور کر خادو کو دیکھا۔ اس نے سر جھکایا۔

”خود کشی کب لگ گی وہ۔ اس نے اس کے ہاتھ پاندھے۔ اس کے سر پر چوت لگائی۔ کمرپہ جوتا کھا۔ مراجحت کے سارے رائی میسے نشان پوست مارٹم رپورٹ میں پہاڑ بن کر نظر آئیں گے۔“ تفتیشی افسر پوست مارٹم کرنے والے ڈاکٹر اور کلتوں کا منہ بند کرنا پڑے گا۔ یہ خود کشی نہیں لگے گی۔“ جواہرات اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے چینی سے پھرتی رہی۔ پھر چونک کرہاشم کو دیکھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ قیل بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکوا آئے سامان لوٹا اور بندے کو مار دیا۔“ اس نے چیزوں کی طرف اشارہ کیا جو خادو ساتھ لایا تھا۔

”آسان نہیں ہوگا۔ فارس کبھی بھی اتنے نہیں بیٹھے گا۔“ ہاشم بے چینی سے نفی میں سر بلار باتھا۔ سب خراب ہوتا نظر آ رہا تھا۔

”ہاشم! ڈونٹ وری۔ تم قتل کے وقت پارٹی میں تھے۔ تمہارے پاس alibi (ایلی بائی) ہے۔“ جواہرات اپنی بات پر خود ہی چوکی۔ ہاشم نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ خادر نے بھی بے اختیار سر اٹھایا۔

”ایلی بائی!“ ہاشم کسی سوچ میں بھٹک گیا۔ (یعنی کسی شخص کا جرم کے وقت کسی دوسرا جگہ پر موجود گئی کی شہادت ہونا)

”مگر۔“ جواہرات تیزی سے اس کے قریب آئی۔ اس کی آنکھیں امید سے چمکنے لگیں۔ ”فارس پارٹی میں نہیں تھا۔ وہ وارث کو واپسی کے بعد ہی آیا۔ اس دوران وہ جا کر قتل کر سکتا ہے اور واپس آ سکتا ہے۔ خاور کے یہاں ہونے کے گواہ ہم دونوں ہوں گے اور ہاشم کو گواہی تو سارے مہماں دیں گے۔“

”فارس.... وہ سوچتی نظر وہوں سے اسے دیکھنے لگا۔“ فارس پارٹی میں نہیں تھا۔ فارس سوتیلا بھائی ہے۔ فارس قاتل ہو سکتا ہے۔“

”ہمیں یہ سب فارس پر پلانٹ کرنا ہے۔“ جواہرات نے آگے آ کردا میں باکیں ترتیب سے لگی چیزوں کو دیکھا۔ رسیاں پلاسٹک بیگ میں تھیں۔ ”اس پر وارث کا ذمہ این اے ہو گا۔ یہ سب اگر پولیس کو فارس کے گھر سے ملے تو اسے اپنی پڑ جائے گی۔ وہ کیس کے پیچے ہی نہیں پڑے گا۔“

ہاشم تذبذب سے سنتا رہا جو اسے اس کی ماں چمکتی آنکھوں کے ساتھ بتا رہی تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

کہیں ہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ ..... نہ دست و ناخن قاتل نہ آستین پر داغ  
فخر قضا ہو چکی تھی۔ صبح طلوع ہونے لگی۔ فارس چاپی انگلی میں گھما تا ہوا بالش کی عمارت کے احاطے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ منہ میں گم چباتے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ آج اتوار کی صبح تھی۔ خاموشی چھوٹی تھی۔ وہ چلتا گیا چلتا گیا، پھر برآمدے میں رکا۔ وارث کے کمرے کا دروازہ کھلکھلایا۔ ایک دفعہ دو دفعہ سہ بار۔

پھر موبائل نکالا۔ کال ملائی۔ فون آف تھا۔ اس نے پھر ملایا۔ ساتھ والے کمرے سے ایک آفیسر نکل رہا تھا۔ فارس نے اسے روکا۔  
وارث کا پوچھا۔ وہ فارس کو جانتا تھا۔

”ہاں وہ اندر ہو گا۔ رات کو آگیا تھا۔ پھر باہر نہیں نکلا۔“ فارس نے اب کے ذرا زور سے دروازہ کھلکھلایا۔ وہ نوجوان بھی ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے وہ کھڑے رہے۔

”وارث۔ وارث۔ دروازہ کھلو۔“ وہ قدرے فکرمندی سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔ آہستہ آہستہ دو چار مزید لوگ اکٹھے ہو گئے۔  
فارس نے سارہ کو کال کی۔

”سارہ! وارث کہاں ہے؟“ اسے اپنی آواز گھبرائی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

”میری بات نہیں ہوئی رات سے۔ ابھی اٹھی ہوں۔ کال کرنے لگی تھی۔ آج ہم نے۔“ فارس نے بات سے بغیر فون جیب میں ڈالا اور زور زور سے دروازہ کھوکریں مارنے لگا۔ دو آدمی آگے بڑھے۔ زور سے دروازے کو خوکریں ماریں۔ لوگ اردو گرد اکٹھے ہو گئے۔ تماشا سا لگ گیا۔

تیسرے منٹ میں دروازے کالاک ٹوٹا اور وہ اڑتا ہوا دوسری طرف جا گا۔ پوری قوت سے فارس اندر گرتے گرتے بچا۔ پھر سیدھا ہوا، گردن اٹھائی۔ تب اسے لگا وہ کبھی اپنے بیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

عکھے کے ساتھ وارث کی لاش جھوول رہی تھی۔ اس نے چیخ دیکارسی مگر کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے بھاگ کر سب سے پہلے وارث کے پیر پکڑ کر ذرا اٹھائے۔ گردن کی رسی ڈھیلی ہوئی۔ مگر وہ محسوس کر سکتا تھا یہ ناٹکیں بہت سر تھیں۔ بے جان۔ فارس پیچھے ہٹا۔ ہاتھوں کا پھیلائے سب کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

”کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔ سب پیچھے۔“

اس کا رنگ سفید پڑ رہا تھا اور وہ اندر داخل ہونے سے سب کو روک رہا تھا۔ سارہ کافون ابھی تک ہولڈ تھا۔ اسے بہت سے لوگوں کا

ام ایسی تھی۔ کیسے وہ نہیں جانتا تھا۔

بس جانتا تھا تو ایک ہی بات... اسے اپنے جسم سے جان سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

سب ختم ہو گیا تھا۔

کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے

جوٹوٹ گیا سوچھوٹ گیا

تین دن بعد۔

سارہ کی والدہ کے گھر میں سو گواری چھائی ہوئی تھی۔ وارث کے جنازے کے آج تیراد ان گزر چکا تھا گمراہ بھیلی نادیدہ کافور کی مہک اور میت کے گھر کی ویرانی رقرار تھی۔ سعدی اندر داخل ہوا تو باہر برآمدے کی ایک کری پپر اور پر کھے خین بنیتھی تھی۔ گال ہتھیلی پہ جماں ای غیر مرمری نقطعے کو دیکھ رہی تھی۔ آنسو پٹ پٹ گر رہے تھے۔ سعدی کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ قریب آیا۔

وہ ہنوز سامنے دیکھنی رہی۔ آنسو گرتے رہے۔

”بھائی! وہ ماہوں تھے فور گراہن۔ پیار کرتے تھے خیال رکھتے تھے۔ سب فور گراہن تھا۔ ہمارا حق۔ ابھے لگتے تھے۔ عزت کرتی تھی۔ میں ان کی نہیں تھا کہ ہے بات ختم گکر۔... تین دن سے میں خود حیران ہوں۔ مجھے آج پتا چلا ہے کہ میں تو ماہوں سے بہت محبت کرتی تھی۔ مجھے تو پتا نہیں تھا کہ میں ان کو اتنا مس کروں گی۔ میرا دل ایسے دکھے گا۔ مجھے تو کبھی پتا ہی نہیں تھا بھائی۔ مجھے اتنے بیٹھے میٹھے ماہوں کی شکل دکھائی دیتی ہے۔ سوتے وقت آخری خیال۔ جاگتے وقت پہلا خیال۔ وارث ماہوں۔ بس۔“ اس نے بھیگی اجنبی لگا ہوں سے سعدی کو دیکھا۔ ”بس ایک ان چاہیے۔ صرف ایک دفعہ مجھے ماہوں سے دوبارہ ملتا ہے اور ان کو بتانا ہے کہ میں ان سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ صرف ایک گھنٹے کے لیے۔“

ہمالی کیا ہم صرف ایک گھنٹے کے لیے بھی اپنی زندگیوں کو یورس نہیں کر سکتے۔“

وہ خاموشی سے دیکھتا ہا پھر اٹھ گیا۔ دل ایسے اجز اتھا کر لگتا تھا آگے کچھ باقی ہی نہیں رہا دنیا میں۔

وہ اندر آیا۔ کچن میں ندرت کرتی پہنچی تھیں۔ ذکر یہ بیگم دور پہنچی آنسو پوچھتی تب پڑھ رہی تھیں۔ سعدی آکر مار کے ساتھ کھڑا ہوا۔ لندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ندرت نے سر اٹھا کر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ار ڈگر دھری رشتہ دار خواتین کو یکسر نظر انداز کیے اس سے پوچھا۔

”سعدی! لوگ اس ترتیب سے کیوں نہیں مرتے جس سے وہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے پہلے کیوں مر جاتے ہیں؟ کیسے واپس

ااؤں میں اسے؟“

سعدی کا دل بھر آیا۔ اس نے ماں کے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور مڑ گیا۔

اندر ایک کمرے میں بیٹھ پہ سارہ پہنچی تھی۔ اس کی سعدی کی طرف پشت تھی۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ چوکھت پر کچھ پھر دیکھا۔

بیڈ سائینڈ نیبل کے ساتھ وارث کی بیٹھیاں کھڑی تھیں۔ امل پچکے چپکے کہہ رہی تھی۔

”میرے بابا چلے گئے، اب میں اپنے بابا کو کیسے بلاوں گی؟ اب مجھے ناشتا کون کرائے گا؟“

نور فرش پہ چوکڑی مار کر کھیدیاں گھٹنوں پہ جماں گالوں پہ ہاتھ رکھے پہنچی تھی۔ ذرا سا سوچا پھر آنکھیں چمکیں۔ ہاتھ گال سے ہٹائے سر اٹھا کر بہن کو دیکھا اور چپک کر بولی۔

”کوئی بات نہیں۔ ہم بابا کو فون کر لیں گے۔ وہ ہمارا فون ہمیشہ اٹھاتے ہیں۔“ امل نے اداہی سے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ سمجھتی تھی اور سمجھتی تھی وہ چھوٹی بہن کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

نور اٹھی اور سارہ کا موبائل اٹھا کر جلدی بابا کا نمبر ملایا اور فون کان سے لگایا۔

”آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا۔ برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کریں۔“

”کتنی دیر بعد کروں دوبارہ سعدی بھائی؟“ اس نے چوکھت پر کھڑے سعدی کو پکارا۔ سارہ سب سن رہی تھی۔ اس کے نام پر گرلا

موڑ کر دیکھا۔ وہ سر جھکا کر آگے گئے۔

سارہ کے سامنے زمین پر پتوں کے بل بیٹھا۔ سارہ نے بھیگی ویران آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کی ناک اور گال لال

رہے تھے۔

”میرا دل چاہتا ہے سعدی! میں اپنی تمام ڈگریوں کو کہیں پھینک آؤں۔ اتنے سال جن کے لیے میں نے ضائع کر دیے۔ وہ سال

میں وارث کے ساتھ بھی گزار سکتی تھی۔ کیا ہم زندگی کو یا اسند نہیں کر سکتے؟ صرف ایک دن کے لیے۔ ایک سال کے لیے۔ تھوڑا سا زمانہ

وقت۔ تھوڑی سی زیادہ مہلت سعدی۔“ آنکھیں بند کیں۔ ٹپ ٹپ آنسو چہرے پر لڑکتے گئے۔

”خالا!“ اس نے جھکا سراخھایا۔ ”ہم ضرور ان کے قاتلوں کو ڈھونڈیں گے اور ان کو سزا دلوں میں گے۔“ اس کے دل کی یادیت اور

اجڑا پن بڑھ گیا تھا۔

”کیا اس سے وارث واپس آجائے گا؟“ پھر سارہ نے خود ہنفی میں سر ہلا�ا۔ سعدی لا جواب ہو گیا۔ اس سوال کا جواب اس کے

پاس تب نہیں تھا۔ یہ جواب اسے کئی سال بعد ملا تھا۔

..... ♦♦♦ .....

کون گواہی دے گا اٹھ کر جھوٹوں کی اس بستی میں ..... سچ کی قیمت دے سکنے کا تم میں یارا ہو تو کہو

بالکوئی میں جواہرات اور ہاشم کھڑے تھے۔ دونوں مضطرب مگر بظاہر سکون سے دور انگکسی کی طرف دیکھ رہے تھے جس کے

برآمدے میں پولیس کے چند اہلکاروں کے ساتھ فارس کھڑا کوئی کلیدے رہا تھا۔ وہ مسلسل ہننوں سکیرے کچھ کہے جا رہا تھا اور آفسر سن رہا تھا۔

”تمہیں وہ چیزیں اس کی گاڑی کے بجائے گھر میں پلانٹ کروانی چاہیے تھیں۔“ جواہرات ناگواری سے سامنے دیکھتی ہوئی۔ ہم

نے ہلاکا سانپی میں سر ہلا�ا۔

”کیوں بھول جاتی ہیں کہ اس کا گھر ہماری چار دیواری کے اندر آتا ہے۔ کیا سوچے گا کہ جب کوئی باہر سے اندر سیکورٹی سے

گزرے بغیر آنکھیں سکتا تو اس کے گھر تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ گاڑی تو پورے شہر میں گھومتی ہے۔“

مگر جواہرات کا اضطراب کم نہیں ہوا تھا۔

”کیا اب پولیس اسے گرفتار کر لے گی؟“

”نہیں۔ لیکن اگر اس نے ”خود کشی نہیں قتل، قتل“ کی رث نہ چھوڑی تو کرنا پڑے گا۔“

جواہرات تجب سے اس کی طرف گھومی۔ ”تو یہ سب کیا ہے؟ یہ تلاشی وغیرہ؟“

”صرف ایک وارنگ۔“ ہاشم ہلاکا سماں مسکرا دیا۔ پھیکی مسکراہٹ۔

جواہرات قدرے مضطرب سی واپس ادھر دیکھنے لگی جہاں فارس برآمدے میں کھڑا تھا۔ یہاں تک آواز نہیں آتی تھی۔ وہ صرف اس

کی حرکات و سکنات سے اندازہ کر رہی تھی۔

”جھوٹ بول رہی ہے وہ سایکاڑسٹ۔“ فارس بمشکل ضبط کر کے غرایا تھا۔ پولیس آفسر خاموشی سے سنتا گیا۔ ”وارث نہ کبھی اس

کے پاس گیا تھا، نہ وہ کبھی اپنی ڈپریشن دوائیں لیتا تھا۔ یہ سب کو اس ہے۔ یہ ایک قتل ہے اور آپ کو اس کی تفہیش کرنا ہوگی۔“

”پوسٹ مارٹم روپورٹ کے مطابق۔“

”میں نہیں مانتا اس روپوٹ کو وہ میرا بھائی تھا۔ میں نے اسے عسل دیا ہے۔ اس کے جسم پر تند کے نشان تھے۔“

”اور اس کی وضاحت کیسے کریں گے آپ؟“ اس نے شفاف پلاسٹک بیگ میں رکھا موبائل اور سی دکھائی۔ ”ہم نے موبائل کے لیے اس آپ کی گاڑی تک تریں کیا اور یہ رسی... یہ سب چیزیں آپ کی گاڑی سے ملی ہیں۔“ اس نے زور دے کر دھرا یا۔ فارس کے لب  
کا گھنکا۔

”تو؟ وہ اس رات ادھر ہی تھا۔ ہو سکتا ہے وہ انہا معمولیں میری گاڑی میں بھول گیا ہو یا کسی نے اس کو مجھ پر پلانٹ کیا ہو۔“

”تو پھر کیا ہی اچھا ہون عازی صاحب! کہ یہ ایک خود کشی ہی ہو۔ کیونکہ اگر یہ قتل نکلا تو یہ۔“ پیکٹ لہرایا۔ آپ کے پاس سے برآمد  
۱۶۔ ”فارس نے سمجھتے ہوئے اسے گھورتے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہا لکل! یعنی کہ میں اس کیس کو فالونہ کروں ورنہ یہ میرے اوپر ڈال دیا جائے گا۔ تو پھر جائیں، وہ کریں جو کرنا ہے کیونکہ میں تو اس  
اکاں لاہیں مپھوزوں گا۔“

ہا ہرجانے کا راستہ بازو سے دکھایا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے۔ فارس کھڑا سوچتا رہا۔ اس کا غم اب ”غصے“ کے مرحلے میں داخل  
۱۷۔

..... ♦♦♦ .....

سعدی سارہ کے کمرے سے باہر آیا تو پچھن کیں میں گھنگھریا لے بالوں کی جھلک دکھائی دی۔ زمر وہاں کھڑی تھی۔ اس وقت ندرت کو دو  
۱۸۔ ای تھی۔ وہ روز آجاتی پھر ان کے ساتھ رہتی۔ سعدی کو دیکھ کر زمی سے تسلی دینے کے انداز میں مسکرائی اور پھر باہر آگئی۔ وہ دونوں ساتھ  
مالکہ، آمدے میں آتے۔ وہاں اب خیں نہیں تھی۔ زمر اس کی جگہ پر بیٹھ گئی۔ سعدی ساتھ کھڑا ہو گیا۔  
مالپوس، ٹھکنائی پر بیٹھا۔

”ہم یعنی فارس ماموں اور میں پر اسکیوڑ آفس گئے تھے مگر وہاں کوئی بھی اس کیس کو شروع کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ کہتے  
۱۹۔“ ماثر مثر پورت اور سایکا ٹرست کی روپوٹ کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔“

زمر نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”سعدی! کیا یہ واقعی خود کشی تھی؟“

”زمر! یہ کسی خود کشی تھی جس میں ماموں کے ہاتھ پر رسی باندھنے کے نشان تھے؟ قتل تھا۔ ان کی فائلز غائب ہیں۔ لیپ ناپ  
۲۰۔“

”اوکے“ میں پر اسکیوڑ بصیرت سے بات کرتی ہوں۔ وہ بقینا یہ کیس....“

”وہ کیوں زمر؟“ وہ چڑھ گیا۔ نظری سے اسے دیکھا۔ ”آپ کیوں نہیں؟“

زمر ایک دم رک گئی۔ اچنچھے سے سرفی میں ہلایا۔ ”میں؟ میں تو چھٹی پر ہوں۔“

”چھٹی والے دن ہی میرے ماموں قتل ہوئے تھے۔“

”مگر۔ سعدی۔ دیکھو بیٹا۔“ وہ ذرا رسان سے کہتی آگے ہوئی۔ ”مجھے بہت افسوس ہے، وارث بھائی بہت اچھے انسان تھے۔ بہت  
۲۱۔ اس دار اور رکھر کھاؤ دا لے۔ جس دن سے یہ ہوا ہے، ہم سب اپ سیٹ ہیں۔ مگر میں نے اتنے سال بعد اب بریک لی ہے۔ سعدی! میرے  
اں، وزارت قتل کیس آتے ہیں، میں بہت سوں کو بھگتا چکلی ہوں۔ یہ کوئی بھی دوسرا پر اسکیوڑ لے سکتا ہے۔ میرا ہونا ضروری نہیں ہے۔“

”ہمیں آپ پا اعتبار ہے، باقیوں پر نہیں۔“ وہ ضد کر رہا تھا۔

”مگر میں ایک ہفتے میں کیا کرلوں گی؟ پھر شادی کے وقت تو مجھے لازمی چھٹی پہ جانا ہو گا اور....“ وہ سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور سعدی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے بے یقینی سے زمر کو دیکھا۔

”آپ.... آپ شادی کیسے کر سکتی ہیں؟“

زمر ایک دم سے رک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”کیا مطلب؟“

”ہمارا ماموں قتل ہو گیا اور آپ کو اپنی شادی کی پڑی ہے؟“

زمر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سعدی کے بالکل مقابل۔ وہ اب بھی ناٹھجی سے اسے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سعدی! میری شادی کل نہیں ہے۔ ابھی آٹھ دن تو پہلے سے طے تھا۔ کارڈ بٹ چکے ہیں۔ اب اس ٹریجینڈی کے بعد کوئی دھوم دھام نہیں ہو گی۔ شادی سادگی سے ہی ہو گی۔ مگر حماد کی فیملی میں کتنے لوگ باہر سے چھٹی لے کر آئے ہیں۔ سب تیار ہے۔ اب کینسل تو نہیں ہو گا نایبیا! جو ہوتا ہے وہ ہوتا ہے۔“

”اور ہماری فیملی زمر؟ ہم کتنے ثوٹ گئے ہیں۔ ہمارے اس غم میں آپ ہمیں یوں چھوڑ کر شادی کرنے جا رہی ہیں۔“ وہ بے یقین تھا اور زمر ابھی تک سمجھنے کیسے پار رہی تھی کہ وہ کیوں نہیں سمجھ رہا۔

”سعدی! امی نہیں رہیں، اب میری شادی کے بارے میں بہت وہی ہو گئے ہیں۔ میں 29 سال کی ہوں۔ میری ایک تیار شادی کینسل ہو گئی تھی۔ امی کی ڈسٹھنگ کی وجہ سے پہلے، ہم نے یہ شادی چھ ماہ آگے کی۔ اب دوبارہ تو آگے نہیں ہو گی نا۔“

”آپ اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہیں؟“ وہ صدمے میں تھا۔

زمر تحریرہ گئی۔ بنا پلک جھپکے اس نے سعدی کو دیکھا۔ ”خود غرض؟“ اسے اپنی آواز کسی کھاتی سے آتی سنائی دی۔

”میں خود غرض ہوں سعدی؟“

”کیا آپ ہمارے لیے اس شادی کو آگے نہیں کر سکتیں؟“

مگر وہ ابھی تک یک تک اسے دیکھ رہی تھی۔ خود غرض۔ خود غرض۔ خود غرض۔ پھر لب بھینچ لیے۔

”ہمیں کسی سے صرف اتنی قربانی مانگنی چاہیے جتنی وہ دے سکے۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ اسے غصہ آنے لگا۔ ”ہمارے خاندان میں ایک قتل ہوا ہے اور آپ پر اسکی ووٹر ہیں۔ کیا آپ ہمارے لیے اتنا سماں بھی نہیں کر سکتیں؟ ہمارے غموں کا کیا زمر؟“

اور میری خوشیوں کا کیا؟ وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی، کہہ نہ سکی۔ وہ غصے میں آگے بڑھ گیا۔ زمر نے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا اور پھر پرس لے کر باہر نکل آئی۔

گھر آئی تو بڑے ابا قیص کے کاف بند کرتے آئینے کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ کہیں جا رہے تھے۔ ساری دو پھر وہ بھی سارہ کی طرف تھے۔ شاید آرام کر کے ادھر ہی جا رہے تھے۔ امی کے جانے کے بعد ذرا کمزور ہو گئے تھے مگر مضبوط رہنے کی اداکاری اچھی کر لیتے تھے۔ اسے دیکھ کر مسکرائے، مڑے۔ وہ نہیں مسکرائی، نہ مڑی۔ ان کو دیکھتی رہی۔ ان کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ غور سے اس کو دیکھا۔

”تو پھر تم کتنی دیر کی تمهید باندھو گی؟“ معلوم تھا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

”آپ فضیلہ آنثی سے کہہ دیں کہ شادی دو ایک ماہ آگے کر دیں۔“

بڑے ابا کے ابر و سکڑے۔ مزید غور سے اسے دیکھا۔

کیوں؟“

”سعدی کے ماموں فوت ہوئے ہیں۔ جوان موت ہے۔ کتنی خود غرضی کی بات لگے گی اگر میں...“ الفاظ بھرا گئے۔ مگر اسے رونا ہوا۔

خود غرضی؟“ وہ اسے دیکھتے آگئے آئے۔ بالکل سامنے۔ ”اور کدھر سے آرہی ہیں یہ باتیں؟“ دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ آئیں۔ ”تم فتنی کے گھر سے آرہی ہو، مطلب سعدی نے کہا ہے یہ سب؟“

”اوفہ! اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں خود کہہ رہی ہوں۔ موت کی وجہ سے شادی آگئے کرنی چاہیے۔ نہیں کی تو خود غرضی ہو گی۔“

”اتا تیز رد عمل زمر، یعنی واقعی اسی نے کہا ہے تو پھر بالکل خاموش ہو کر میری بات سنو۔“ ذرا خختی سے ہاتھا کرا سے روکا۔ ”اگلی اللہ ۱۷ سعدی کہے کہ شادی آگئے کی جاسکتی ہے تو کہنا جب تھا ری دادی فوت ہوئیں تب میری تیار شادی چھ ماہ آگئے کردی تھی۔ اگر وہ کہے لیں، ہتھ دار کی موت پر کی جاسکتی ہے تو کہنا تمہاری دادی کی وفات کے صرف ایک ماہ بعد فارس نے شادی کی اور ہم نے کچھ نہیں کہا اور اگر وہ لے لیں اتم خود غرض ہو تو اسے بتانا کہ اس کی فیس کون دے رہا ہے۔“

”ابا!“ اس نے تڑپ کر غصے سے ان کو دیکھا۔

”وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ میں یہ کیس لے لوں۔“

”یہ تھا ری مرضی ہے مگر میں شادی آگئے نہیں کروں گا۔ ندرت سے بھی بات کر چکا ہوں۔ اس کو کوئی اعتراض نہیں۔ تمہاری شادی پہلی سعدی کی وجہ سے نہیں ہو سکی تھی اور....“

”وہ بچپن تھا۔ اس سے غلطی ہوئی تھی۔“

”وہ اب بھی بچہ ہے۔ اب بھی غلطی کر رہا ہے۔“ پھر ذرا دھمکتے ہوئے۔ ”وہ اپنی طرف سے خلوص نیت سے ہی کہہ رہا ہے مگر وہ بچہ۔ اس کو ان باریکیوں کی سمجھنیں۔ یہ موضوع ختم ہوا۔“ وہ کارٹھیک کرتے ہاہر نکل گئے۔

زمر ان کو دیکھتی رہ گئی۔ اُنی وی پر کوئی عورت کی ڈرامے میں کہہ رہی تھی۔

”جی کہتے تھے لوگ۔ بھانجوں تھیجوں کو پیار دو یا قربانی، وہ اپنی اولاد نہیں ہوتے۔“ اس نے کوفت سے ریبوث اٹھا کر ٹویں بند کا موبائل پر کال ملائی۔ پھر بولی تو لہجہ سردا۔

”سعدی! صبح مجھے آفس میں ملو۔ ہاں اپنے فارس ماموں یا جس کے ساتھ بھی آؤ، مستغاثت جو بھی ہے، تب تک میں کیس کی پیش پڑھلوں گی۔“ اور فون بند کر دیا۔ چہرے پر البتہ ناخوشی تھی۔

زمر خوش نہیں تھی۔ بالکل بھی نہیں۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا ..... یہ خون خاک نشیان تھا رزق خاک ہوا سامنے تین کریبوں پر وہ تینوں تھے۔ بے چین سا آگے کو ہو کر بیٹھا اکیس سالہ کم عمر سعدی، اس کے باکیں طرف ناگ پٹا نگ اُنکے سوت میں ملبوس موبائل پر ناپ کرتا تھا شم۔ تیسری کرسی پر جیز اور گول گلے کی شرٹ میں ملبوس پیچھے کو ہو کر بیٹھا فارس۔ ہاشم چونکہ ان سے مصلل تعاقون کر رہا تھا اور وہ ایک پر ٹیکش کرنے والا دیکھا تھا، اس لیے اور خود اس کی پیشکش پر اس کو ساتھ لائے تھے گو کہ وہ اور فارس آپس میں اٹھنیں کر رہے تھے۔

”یہ وہ تصاویر ہیں۔ کندھوں پر نشان، کمر پر جوتا یا کسی وزنی چیز سے مارنے کے سر پر چوتھا پاؤں پر رسی باندھنے کے نشان۔“ فارس ایک ایک چیز پر انگلی لگا کر تصاویر اسے دکھار رہا تھا۔ زمر خاموشی سے نیک لگائے بیٹھی اسے سن رہی تھی۔ بھنگر یا لے بال

جوڑے میں بند ہے تھے۔ لوگ چک رہی تھی۔

”اس کا بابس اس پر اس عینی کے لیے دباؤ دال رہا تھا۔ فاطمی۔“ ہاشم نے بنا چونکے سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھا۔

”میں نے اسے اس عینی دینے سے منع کیا تھا مگر وہ پریشان تھا۔ آپ کو اس کے باس سے تفتیش کرنا ہو گی۔ اس کا لیپ ٹاپ، فائلز سب غائب ہیں۔ وہ میغینا جس کیس پر تفتیش کر رہا تھا، اس میں ملوث لوگوں نے اسے مردا یا ہے۔“ فارس کہہ رہا تھا پورے دشوق سے۔

زمر آگئے ہوئی۔ سرا ثبات میں بلایا۔ ایک فائل نکال کر اس کے سامنے رکھی، کھوئی۔ انگلی سے صفحہ پر ایک جگہ دستک دی۔

”دور سیاں، ایک موبائل فون، ایک کپڑا جو داخل تفتیش ہیں، ثبوت نمبر بارہ، تیرہ، چودہ اور پندرہ..... جو کیس کا روکا رہے ہیں، آپ کی کاڑی سے برآمد ہوا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ سمجھیدہ تھا۔

”فارس! اس کیس کو شروع کرنے سے پہلے میں اس بات کا تعین کرنا چاہتی ہوں کہ میں استفادہ ہوں یا رد فاع۔ اس لیے فی الحال ایک اثاری کی حیثیت سے میں ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ کا جواب اثاری کلاسٹ پر یوں لمحے کے تحت محفوظ رہے گا۔“

(اثاری کلاسٹ پر یوں لمحے یعنی موکل کی بتائی گئی کوئی بات چاہے وہ اعتراف جرم ہی ہو، مکیل کسی کوحتی کہ پولیس کو بھی نہیں بتا سکتا۔ پر یوں توڑنے کی صورت میں وہ کالائنس منسوخ ہو جائے گا اور وہ ساری زندگی و کالٹ پر یکیش نہیں کر سکے گا۔)

”اوکے!“ فارس نے اچنپے سے اسے دیکھ کر سر ہلایا۔ ہاشم ہلکا سماں مسکرا یا۔ وہ جانتا تھا گفتگو کو دھر جا رہی ہے۔ اس نے سعدی کا کندھا تھپکا۔ ”ہم باہر چلے جاتے ہیں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ فارس نے زمر کو دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر روکا۔ سعدی نے تاہمی سے سب کو دیکھا۔ زمر آگئے ہوئی۔ سمجھدگی سے فارس کو دیکھا۔

”کیا آپ نے اپنے بھائی وارث غازی کا قتل کیا ہے؟ یا کسی بھی طرح آپ اس قتل میں ملوث ہیں؟“

سعدی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے بے یقینی سے زمر کو دیکھا۔ فارس کے جڑے ٹھیک گئے۔ ہاشم نے بکھل مکراہٹ روکی۔ (انٹریشنگ)

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ وہ رکا۔ اسے واقعی صدمہ ہوا تھا۔ ”آپ کیسے سوچ سکتی ہیں کہ میں اپنے بھائی کو مار سکتا ہوں؟“

”فارس! آپ قانون بھی جانتے ہیں اور تفتیش کا طریقہ کا رہی۔ آپ نے بھی بہت سی تفتیش اس طرح شروع کی ہوں گی اور آپ خاموش رہیں۔“ اس نے جذباتی ہو کر کچھ کہتے سعدی کوختی سے ہاتھ اٹھا کر خاموش کرایا مگر وہ چپ ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔

”پھپھو! آپ یہ کیا...؟“

”میں اس وقت آپ کی پھپھو نہیں ہوں سعدی! میں پر اسکیوڑ ہوں۔ میں بالکل بھی مداخلت برداشت نہیں کروں گی۔ اگر آپ نے دوبارہ ٹوکا تو میں آپ کو باہر جانے کا کہہ سکتی ہوں۔“ وہ خاموش ہو کر چیچھے ہو گیا البتہ بار بار فارس کو دیکھتا تھا۔ وہ فارس کی طرف متوجہ ہوئی۔ سمجھیدہ سپاٹ۔

”تو پھر یہ آپ کی کار سے کیوں برآمد ہوئے؟“

”کسی نے مجھے سیٹ اپ کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”اوکے۔“ زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”سو میں اس بات کوچ سمجھوں کہ آپ اس قتل میں ملوث نہیں ہیں۔“

”وہ میرا بھائی تھامیدم پر اسکیوڑ را میں اپنے بھائی کو قتل کیوں کروں گا؟“

”کیا اس یہی ڈینیش (دفاع) ہے آپ کا؟“ وہ سپاٹ لجھے میں بولی جیسے مایوس ہوئی ہو۔

فارس خاموش رہا۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ زمر اس کی طرف ہے خلاف نہیں۔ وہ دھیما پڑا۔

”نہیں۔ میرے پاس alibi (الی بائی) ہے۔ میں اس وقت اپنی بھائی کو اس کی دوست کی طرف لے کر گیا تھا ایک ہوٹل میں۔“

”ہم، ہم کے ہی ٹھیکی وی کیمروں میں میرے آئے اور جانے وغیرہ کا وقت ریکارڈ ہو گا۔ اور میں اس لڑکی کو گواہ کے طور پر بھی پیش کر سکتا ہوں۔“

”اب یہ ہے بہتر ڈینیش!“ زمر نے سر ہلاتے ہوئے نوٹس لیے۔ پھر اسے دیکھا۔ ”آپ کو مجھے اپنی الی بائی سے ملوانا ہو گا۔ میں انہیں ان کے بعد ہی کیس plead کروں گی۔“

”اوکے! کل تک اسے ادھر لے آؤں گا یا آپ کو ادھر لے جاؤں گا۔ ڈن!“

”شیور!“ زمر نے چند اور نوٹس لیے۔ پھر اس اٹھا کر سوچتی نظر وہ اسے دیکھا۔ پولیس نے آپ کو گرفتار نہیں کیا، گاڑی سے یہ

بٹکے باوجود بھی۔ ان چیزوں کی تصاویر کی طرف اشارہ کیا۔

”کیونکہ میرا خیال ہے یہ وارنگ تھی کہ میں اسے خود کشی کر سکھ کر بنڈ کر دوں ورنہ وہ اسے میرے اوپر ڈال دیں گے۔“

”ہوں، اب ہم کسی سمت بڑھ رہے ہیں۔“ تب ہمیں ہاشم کھنکھارا۔

”آئی ایک شیور فارس بے گناہ ہے۔“ ساتھ ہی فارس کے تاثرات دیکھے۔ وہ ذرا نرم ہوئے۔ سر کے اثبات سے ہاشم کی بات کی

ایل اور انھیں گیا۔

”ہر چیز کے لیے شکر یہ میڈم پر اسکیوڑ را!“ اور فارس باہر نکل گیا۔ سعدی قدرے بے چین، قدرے الجھا ہوا تھا۔ زمر سے بات

کے لیے بھولے مگر پھر عرب تھا یا کیا، وہ بغیر کچھ کہے باہر چلا گیا۔

ہاشم سب سے آخر میں اٹھا۔ مسکرا کر زمر کو دیکھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے، کیا فارس بے گناہ ہے؟“

وہ سامنے پھیلے صفحے سیٹھتے ہوئے ذرا شانے اچکا کر بولی۔ ”میری رائے میئنہیں کرتی۔“

”کم آن! اب تو ہم دوست ہیں۔“

”نہیں۔ ہم بالکل بھی دوست نہیں ہیں۔“ زمر نے سنجیدگی سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”بہر حال میرا خیال ہے کہ وہ بے

آنا ہے۔“

ہاشم کے گلے میں پھند اسالگا۔ بہر حال وہ مسکرا تارہا۔ ”اور کس بات سے آپ کو یہ لگا؟“

”قتل کیس میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ قاتل، مقتول اور وجہ قتل۔ اس تکون میں قاتل کی جگہ فارس فٹ نہیں آتا۔ کیونکہ اس کے

اپنے بھائی کو مارنے کے لیے کوئی وجہ کوئی مقصد نہیں ہے۔ وہ کیوں مارے گا وارث غازی کو؟“

”ہوں۔“ سرا ثابت میں ہلاتے ہاشم مزگیا۔ مرتے ساتھ ہی چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی اور اس کی جگہ ختنی نے لے لی۔ خود

ہم امانت صحیح کرو وہ باہر نکلا۔

”آخر تھی اہم بات وہ کیسے مس کر گیا؟“

فارس اور سعدی باہر کھڑے تھے۔ وہ کوٹ کا بٹن بند کرتا ان تک آیا۔ ہلکا سا مسکرا یا۔

”ذی اے کو تمہاری بات پر یقین ہے فارس۔ اب تمہیں اس کو اپنی الی بائی سے ملوانا ہے ہیں۔“ ذرا رک کر سوال کیا۔ ”تمہاری

بھائی کی روست کوں ہے اور کہاں رہتی ہے؟“ وہ ذہن میں ایک نیالاً جمع عمل ترتیب دیتے ہوئے پوچھنے لگا۔  
”وہ امریکن ہے۔ گوری۔ ہوٹل میں رہ رہی ہے۔ کل ملادوں گامیڈم سے اس کو۔“ وہ ناخوش لگ رہا تھا۔  
”کیا نام ہے اس کا؟“

”علیشا۔“ سعدی نے جواب دیا۔ وہ اب اداں اور مضمحل سافارس کے پیچے جا رہا تھا جو اس ساری کارروائی سے قطعاً خوش نہیں لگ رہا تھا۔

ہاشم لب بھینچے بے تاثر نگاہوں سے اسے جاتے دیکھے گیا۔ گردن میں گلٹی سی ابھر کر غائب ہوئی۔ اس نے ہکا سار جھکا، گوبا کے نظر انداز کرنے کی کوشش کی، مگر۔ ذہن میں کچھ کھٹک گیا تھا۔ ”علیشا۔ امریکن۔“

”ہے سعدی!“ اس نے اسے پکارا۔ دور جاتا سعدی پلٹا۔ دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

”فارس سے کہو مجھے اپنی ایلی بائی کا نام ہوٹل کا پتا وغیرہ میکست کرے۔ میں اس کی کریڈبلٹی چیک کر لیتا ہوں۔ کورٹ میں ہر زاویے سے اسے نج کیا جائے گا۔“

”اوے!“ سعدی مڑ گیا۔ فارس دور جا رہا تھا۔ وہ اس کے پیچے چلتا گیا۔

ہاشم وہیں کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ پھر موبائل نکالا، کال ملائی۔

”خاور! کچھ درپر میں ایک عورت کا نام اور ہوٹل کا پتا میکست کرتا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں اتنی معلومات چاہیں جتنی اس کی سگی ماں کو ہی نہ ہوں۔“ کرختی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

.....❖❖❖.....

### چار سال بعد

حباب اور سعدی کے مشترک رشتہ دار کی شادی کے فنکشن میں کھڑا ہاشم بنا کسی کرختی کے مسکرا کر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے مخاطب نے تھکہ لگایا تو ماضی میں کھوئی حین چوکی۔ اردو گرد دیکھا۔ وہ رنگوں اور روشنیوں سے بچ فنکشن میں کھڑی تھی۔ ہاتھ میں پکڑے پیالے کا ٹھنڈا ایٹھا، گرم ہو گیا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی واپس اپنی میز تک آئی۔ سست روی سے بیٹھی۔ زمراب وہاں نہیں تھی۔ حین نے ذرا کی ذرا اگردن موڑی۔ وہ قدرے فالصے پر جواہرات کے ساتھ کھڑی تھی۔ حین کی ”رشتے کو انکار کرنے والی بات“ پہ بھی تک اس کے وہی تاثرات تھے۔ شاکلہ سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ حین نے ہونہ کر کے رخ موڑ لیا اور سو فلہ کھانے لگی۔

”کیا تم یہ سوچ رہی ہو کہ بیہاں آکر تم نے غلطی کی؟“ جواہرات نے مسکرا کر نزاکت سے اپنے بال انگلی سے ہٹائے اور ساتھ کھڑی زمر کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ خود میں گلے والے لمبے آف و اسٹ گاؤں میں ملبوس تھی اور ہمیشہ کی طرح جوان اور تروتازہ لگ رہی تھی۔ زمر نے دلہن کو دیکھتے شانے اچکائے۔

”مجھے فرق نہیں پڑتا۔“

”آئی ایم سوری! اس دن سو نیا کی سا لگرہ پہنی میں نے ایسی ہی بات کر کے تمہیں دکھی کر دیا تھا۔“ جواہرات نے زمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ زمر پھیکا سا مسکرا کی بولی کچھ نہیں۔

”میں دانتہ طور پر تمہیں احساس دلانے کو ایسی باتیں کر جاتی ہوں۔ تم خود کیھو اپنے آپ کو۔ اس شخص کے پیچے تم خود کو ضائع کر رہی ہو۔ ڈپریشن ایک مرض ہے اور تم اس سے سخت یا ب نہیں ہو سکتیں۔“ وہ زمی سے کھد رہی تھی۔ زمر پھر سے سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں

اُس ایج سے تاثرات رقم تھے۔

”تم کبھی آگے نہیں بڑھ سکو گی اگر تم فارس سے انتقام نہ لو۔ وہ اس سب کا ذمہ دار ہے اور وہ آزاد گھوم رہا ہے۔“

"میں نے حارسال انتظار کیا کہ شاید کورٹ اس کو سزا دے، مگر وہ کل بھی سب کی نظر میں بے گناہ تھا، آج بھی وہ بے گناہ

۴۔ "اہ سامنے دیکھتے ہوئے تلخی سے بولی۔

”تو پھر اس کیا کرو گی؟ خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ گی؟“ وہ احتیاط سے زمر کے تاثرات دیکھتی ضربیں لگا رہی تھی۔

"اوپر، اب میں اتنا انقاوم خود لوں گی۔" وہ سداور ساتھی ہنوز دلماں کو دکھر رہی تھی۔ جواہرات کی آنکھیں چکیں، ہونٹ

۱۱۔ اس میں ڈھلتے گئے۔

"تم کچھ ملان کر پچھی ہو۔ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں اگر تم جا ہو تو۔ آخر فارس نے بے وجہ تم پر اتنا ظلم۔"

"وہ جو تم اس کے باس رکھ رہے ہیں، وہ اپنے بچوں کے لئے بخوبی کریں۔ اس کا سب سے بڑا میراث ہے۔" اس کا رشتہ میرے پیش نہ ٹھکرایا تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ میں نے

۱۱۔ نے سو اس نے مجھے اسا بنا دا کر میں ہمپشہ کے لئے ٹھکراؤ جاؤ۔“

جو اہات نے زمی سے اس کے کندھے سے با تھر کھا۔ ”آئی ایم سوری۔“

”میر، نے اس کی تمامیں فائزر راسیکو ٹر بصیرت سے مانگ لی ہیں۔“

جو اہرات کے حل میں کچھ انکا۔ ظاہر مسکرا کر اس نے حیرت سے کہا۔ ”مگر تم قانون سے ماپوس ہو، پھر اس کیس کو روی اوپن کرنے

"S" 10

"ہری اور بن نہیں کرنا، صرف بڑھنا سے اور دیکھنا کے کہ اس میں کوئی چیزگاری باقی ہے پا نہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ میرے دل کی

۱۔ پیر بھگی مردہ ہو جکا سے۔ لوں میری محنت تمام ہو جائے گی۔“

"اوه تم خود کو مطمئن کرنا چاہتی ہو کہ انصاف کا راستہ چھوڑ کر انتقام کا راستہ تم نے قانون سے مکمل مایوسی کے بعد اپنایا؟" جواہر لال

ل اولی سانس بحال ہوئی۔ دچکیسی بڑھ گئی۔

زمر نے اشات میں سر ہلاما۔ ارگرد کے لوگوں سے بے نیاز وہ دونوں مدھم آواز میں بات کر رہی تھیں۔

”تو اس کے بعد تم کہا کرو گی؟“

"مزن کاردار! جب سب ہو اتھا اور میں نے فارس کو اپنا ملزم نامزد کیا تھا، تب کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ اگر کوئٹہ اس کو

۱۰۔ بتات بھی سعدی اما، خنین سب کوہ ظلم لگتے۔ کوئی کبھی نہیں مانے گا کہ فارس نے یہ سب میرے ساتھ کیا۔ اس نے مجھے اس جرم کی سزا

اپنے بیوی کے لئے اپنے بیوی کے لئے

”اور اب تم کیا کرو گی؟“

زمر نے گال یہ آئی گھنگھ مایا لٹ انگلی پیٹی۔ زر امکرا کر جواہرات کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”میں اس کو ایک ایسے

اس نے نہیں کیا ہوگا۔ اور میں اس کو اس سب میں اس طرح پھنساؤں گی کہ سعدی بڑے با، سب اسے محروم مانیں گے۔“

”مگر زمر! کسی کو سیٹ اپ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ تمہیں اس کے لیے فارس کے پل پل کی روپورٹ چاہیے ہوگی۔ اس کے بینک

<sup>۱۰۱</sup> ان کریٹ کارڈ، کانیکش، کپیوڑز، ہرشے تک رسائی چاہیے ہوگی اور سب سے بڑھ کر آخر میں تمہیں خود اس سے نکلنے کا محفوظ راستہ

اتا کر کوئی تم پچک نہ کر سکے۔ یہ سب تم کیسے کرو گی؟ ”جو اہرات ذرا بھی تھی۔ زم ”ساکھ طلاق۔ مگر اس خود کو اپنے کرنے کے لئے مجھے کچھ وقت جائے۔“

جوہرات نے قدر سے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا طریقہ؟“  
وہ جواب میں اتنا آہستہ بولی کہ جواہرات کو بمشکل سنائی دیا۔

"In sickness and in health  
Till death do us apart"

(بیماری میں اور سُحت میں ہم ساتھ رہیں گے حتیٰ کہ موت ہمیں جدا کر دے)  
جوہرات بالکل سن رہ گئی۔ اس نے بے یقینی سے زمر کو دیکھا۔  
”تم۔ ایسا نہیں کر سکتیں۔“

”میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ اسے مجھ سے شادی کرنا تھی جو نہیں ہوئی۔ اور اس نے میرے ساتھ جو کیا وہ پوری دنیا نے دیکھا۔ بس  
کچھ دن لگیں گے، پھر میں خود کو اپنی کرلوں گی اس شادی پر۔ اور اس کے بعد جو میں اس کے ساتھ کروں گی وہ بھی پوری دنیا دیکھے گی۔“

”تم اپنی زندگی کے ساتھ اتنا برا جوا کیسے کھیل سکتی ہو؟“

”میری زندگی تھوڑی تھی رہ گئی ہے سز کاردار۔ چار سال تک تو یہ گردے چل گئے، مگر اب شاید ہی مزید چار سال چلیں۔ اس تھوڑی  
بہت زندگی میں مجھے بس ایک کام کرنا ہے۔ سعدی اور بابا کو دکھانا ہے کہ میں بچ بول رہی تھی۔ اور فارس کو اس کے کیے کی سزا دلوانی ہے بس۔“  
جوہرات نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”اوہ۔ اور تم یہ سب اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو مجھے نہیں بتا رہیں۔ تمہیں میری مدد چاہیے ہے  
نا۔“

زمر ہلکا سا مسکرائی۔

”میں آپ کے ساتھ اپنے دل کا بوجھ کیوں ہلکا کروں گی۔ آف کورس مجھے آپ کی مدد چاہیے۔“

.....❖❖❖.....

ا ب 6:

## پانی سے گاڑھا

اور دنیا کے پہلے قاتل کو سزا  
ستانی تھی خود منصف اعلیٰ نے  
کیا وہ موت تھی؟  
نہیں!

بلکہ وہ ”زندگی“ تھی.....  
اور کہہ دیا تھا خدا نے کہ....  
اے قاتل!

تم پھر و گے زمین میں  
مفرور بدنصیب نشان زدہ ہو کر  
اور تمہاری پیشانی کے نشان سے پچان لے گا تمہیں ہرملے والا  
اور یہ بھی فرمایا کہ  
(کوئی قتل نہ کرے قاتل کو کیونکہ)  
جو کوئی قتل کرے گا قاتل کو  
میں اسے خود سزا دوں گا  
سات گناہ زیادہ.....

(ہمی لاگک فیلو کی تحریر ”نمیل ناک“ سے ماخوذ)

جو اہرات بالکل سن سی ہوئی زمر کو دیکھ رہی تھی۔ گوکر وہ یہی چاہتی تھی کہ زمر فارس سے انتقام لے، مگر پھر بھی اتنی تیزی سے ہوتا سب کو اسے مضطرب کر رہا تھا۔ اس نے بظاہر مسکرا کر سامنے دیکھا جہاں شادی کا فتنش اور روشنیاں نظر آ رہی تھیں، اور حداد اور کرن بھی۔

”آف کورس! میں تمہاری مدد کروں گی، لیکن یا انتقام فارس سے ہے یا خود اپنے آپ سے؟“

”اگر پہلا پورا ہو جائے تو دوسرا بھی قول ہے مجھے۔“ زمر بھی سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

”کیا تم اس کا مقصد مدد ری اور پن نہیں کر سکتیں؟ اگر عدالت اس کو سزادے تو زیادہ بہتر....“

”آپ میری مدد کریں گی یا میں کسی اور کے پاس جاؤں؟ آپ کو یاد ہو گا آپ نے میرے پاس آ کر مجھے پیکش کی تھی کہ اگر کبھی میرا

ارادہ بدلاتا آپ میرے انتقام میں میری مدد کریں گی۔ ”اس نے سرد پاٹ سے انداز میں اسے دیکھا تو جواہرات فراز مسکرائی۔ آگے بڑھ کر نری سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”شیورا میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ یہ سب قدرتی طریقے سے ہوگا۔ وہ بہت جلد تمہارے گھر تمہارا رشتہ لینے آئے گا۔ اس تھم اس امر کو یقینی بنانا کہ تمہارے والد ان کا رنہ کریں۔“

”تھیکیں!“ زمر کا لمحہ بخشندا تھا۔ جواہرات خاموشی سے سامنے دیکھنے لگی۔ وہاں میں ایک نیالا بھائی عمل ترتیب دے رہی تھی۔ فتنش اب اپنے اختتام کی جانب رواں دوال تھا۔ سعدی خین کے ساتھ خاموشی سے بیٹھا گا ہے دو رکھڑی بلکی آواز میں با تین کرتی زمرا اور جواہرات پر نظر ڈال لیتا۔ جواہرات نے اسے خود کو دیکھتا پایا تو نزاکت میں مسکرائی۔ سعدی جبرا مسکرا یا اور رخ پھیرا تو خین پر نظر پڑی۔ وہ گردن ذرا موڑ کر دور ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ناپسندیدیگی ابھری۔ چہرہ خین کے قریب کیا۔

”آئندہ ان سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے، نہیں ہے ان کی کسی بات کا اعتبار کرنا۔“ خین نے چونک کر اسے دیکھا تدرے دل گرفتی سے۔ ”وہ جھوٹ نہیں کہ رہے تھے۔ ان کو واقعی افسوس ہے۔“ قدرے رکی۔ ”ان کو علیہا کے لیے واقعی افسوس ہے۔“

”جانے بھی دو خین!“ وہ بیزار سا پیچھے ہوا۔ پھر وہاں سے اٹھ آیا۔ ہال کے کونے میں کھلتے دروازے پر وہ رکا۔ وہ مردوں کے لئے مخفی ریست روم رہتے۔ اندر شیشے سے ڈھکی دیوار اور سامنے لگے بیس کی قطار اس کے آگے با تھر روم رہتے۔ سعدی ایک نیک کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ٹل کھولا چہرے پر چھینتے مارے ٹل بند کیا۔ ساتھ رکھے ٹشوٹھائے ہاتھ صاف کیے۔ ۴۸۰ اٹھایا تو نہ کر کر رکا۔

آئینے میں اپنے عقب میں ہاشم کھڑا نظر آ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے فنڈ کوٹ کا ہٹن بند نرمی سے (المیر مسکراہٹ کے) اسے دیکھتا۔

”تم میرے آفس نہیں آئے۔ میری سیکرٹری نے دوبارہ تمہیں فون کیا مگر تم نہیں اٹھایا۔“

”میں مصروف تھا۔“ وہ سر جھکائے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ہاشم سوچتی ہوئی نظر وہ اس کا چڑھہ دیکھتا رہا۔

”کیا اس ہفتے آؤ گے؟“

”جی آکوں گا۔ مجھے اور آپ کو بات کرنے کی واقعی ضرورت ہے۔“ ٹشوٹھ کری میں پھینک کر سعدی بخیگی سے کہتے ہوئے مزا۔

”تمہارے پاس کچھ ہے سعدی جو میرا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم مجھے وہ پر امن طریقے سے لوٹا دو۔“

”نہیں تو کیا کریں گے آپ؟“ سعدی قد مقدم چلتا اس کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

ہاشم یک نک اسے دیکھتا رہا۔ سات سال پہلے جس مخصوص لڑکے سے وہ ملا تھا وہ یہ نہیں تھا۔ ہاشم کے ماتھے پہل آئے۔

”میں کچھ بھی نہیں کروں گا بچے اسوانے ایک نفعیت کے۔ جس شخص کے خاندان کے خاندان کے دلوگ قتل ہو چکے ہوں اس کو احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ کہیں اگلے نمبر اسی کا نہ ہو۔“ سعدی کے چہرے پر عجیب سادھا بھرا ہنویں سکیز کر اس نے قدرے تجھ سے ہاشم کو دیکھا۔

”کیا آپ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں؟ کیا آپ میری جان لے سکتے ہیں؟“

ہاشم نے جیب سے ہاتھ نکال کر عادتاً سعدی کا شانہ تھپٹا نے کو آگے بڑھایا مگر جیسے ہی اس کا ہاتھ سعدی کے کندھے کو چھووا۔

کرنٹ کھا کر ایک قدم پیچھے ہوا۔ دونوں ہاتھ اٹھادیے اور بہت خطب سے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

”اپنے ان ہاتھوں سے مجھے مت چھوئے گا۔“

ہاشم کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ پھر اس نے سخت تاثرات کے ساتھ سر کو خم دیا۔ ہاتھ واپس نیچے کر لیا اور بہت کر کھڑا ہو گیا۔ سعدی

لڑی سے باہر نکل گیا۔

ہاشم نے ایک نظر اپنے خالی ہاتھ کو دیکھا۔ وہ سپید تھا۔ پتی الگیاں باقاعدگی سے میں کیوڑ شدہ۔ اس نے ہلکا سار جھٹکا۔ دل میں گھر اکرب اتر۔ کیا وہ دونوں واقعی واپس نہیں جاسکتے تھے؟ اچھے وقت میں واپس؟

وہ بارہ آیا تو نو شیر والا بیزار سا کھڑا اور کرسی پر بیٹھی خین اور سعدی کو گھوڑا پا تھا۔ جیسے لس نہ چلتا ہو دنوں بہن بھائی کو گولی مار دے۔

"کپا بکواس کی تھی میں نے؟ اس کی بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔" اس نے آکر ختنی سے کہا تو شرود نے گز بدا کر بھائی کو دیکھا۔ پھر لا بروائی

ہے شانے اپکار دیے۔

”مجھے کیا! ہونہہ!“ ہاشم نے گھور کر اسے دیکھا۔

”تم ابھی تک اس شہر بن مرام سے نہیں نکلے شیر و بہت ہو گا۔“

”اس کی وجہ سے میں شہریں کو بھی نہیں پاسکوں گا۔ پچھلے ایک ہفتے سے یہی سوچ سوچ کر میرا دماغ کھول رہا ہے۔ اور آپ کہتے ہیں بہت ہو گما۔“

”اوہ پلز!“ یا شم نے بیزارسا ہو کر سمجھ لگا۔ ”ہمارے ماں اس سے بڑے مسائل ہیں۔“

”اوہ کہا مسئلہ ہے؟ آپ نے کہا تھا وہ آپ کے ڈاکو منشی نہیں کھول سکے گا۔ پھر؟“ نوشہ والہ حیران ہوا۔

”مگر وہ جانتا ہے کہ میرے ہاتھ پہ کس کس کا خون ہے۔“ کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ نو شیر و ان کے ابو و تجہ سے تنے۔

”وہ وارث غازی کی فائلز وغیرہ کے پیچھے تھا، فارس کو باہر لانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اسے یہ کیسے پتا چل سکتا ہے کہ آپ کسی قتل میں ملوث ہیں؟“

"اے معلوم ہے شیر و اور فی الحال یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مگر ہاں تم اس کو نہیں چھیڑو گے۔ میں سب سنچال لوں گا۔ تم کچھ لہیں کرو گے۔" برہمی سے اس کو تینیہ کی۔ نوشیر وال نے لاپرواٹی سے شانے اچکائے۔ "اوکے۔" اور پھر سے ان ہی نظرلوں سے دور بیٹھنے مددی کو دیکھنے لگا۔

وہ لوگ اب گھر جانے کی تاری کر رہے تھے۔ نکش ڈھلتے جاندی کی طرح دم توڑ رہا تھا۔ آگے اندر ہیری رات تھی۔

کب سے ہیں ایک حرف پر نظریں جھی ہوئی ..... وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں  
زمر شادی کی تقریب سے لوٹی تو اس کی بہادیت کے مطابق صداقت پر ایک چھوڑ بصیرت سے کیس فائلز لے آیا تھا۔ وہ ایک بڑا سا  
لہجہ تھا جو اس کے کمرے کے فرش پر رکھا تھا۔ وہ ابا کو سلام اور شب بخیر ایک ہی سانس میں کہہ آئی۔ دروازہ مغلن لیا، پوس پرے پھینکا، پھر  
الماری کھوئی۔ نچلے خانے سے ایک چھپوٹا ڈبہ نکلا جس میں سے اخبار کے تراشے اس صحیح نکل کر باہر جا گئے تھے جب فارس بری ہوا تھا۔ وہ صحیح  
اہ سب کچھ بدل گیا تھا۔ ڈباؤس نے بڑے باکس کے قریب اونڈھا کر دیا۔ کاغذ تراشے، نوٹ کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر اس نے باکس کو بھی اتنا  
کاٹ پلٹ کرتی وہ کچھ تلاش کر رہی تھی۔ ابر و بھنپھے ہوئے، لب بختی سے پیوست، آنکھوں میں غصہ۔ پھر ڈھیر تلتے سے اس نے ایک تصویر یہ کالی  
اہ دوبارہ ماتھھ بارا۔

”سرہی دوسری تصور“، ضبط بھری سانس لی۔ تصاویر لے کر اٹھی۔ ننگے ماوس چلتی دیوار تک گئی چاہ، اونچا اور جوڑا سماگر سن بورڈ

آؤیزاں تھا۔

زمر نے ایک پن اتاری اور پہلی تصویر وہاں سامنے لگائی۔ پھر دوسرا بھی۔ قدرے پیچھے ہٹ کرتندی سے ان کو دیکھا۔ زرتاش غازی اور وارث غازی۔

یہاں کا بورڈ تھا اور ابھی اسے یہ بھرننا تھا۔

وہ واپس پلٹ آئی۔ نیچو ڈھیر گئی چیزوں کو اٹھا کر اسٹری نیبل پر کھا۔ ترتیب سے سلیقے سے۔ اندر اٹھتا ابال کچھ کم ہوا تھا۔ اس معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔ مگر پہلے جھٹ تمام کرنی تھی۔ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا تھا کہ ہاں واقعی ہر راستہ بند ہونے کے بعد میں نے یہ قدم اٹھایا۔ انصاف کے دروازے بند ہوئے تو میں انتقام کی طرف آئی۔

وہ سپاٹ سنجیدہ چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ کاغذات کا پلندہ سامنے رکھا۔ نیبل یہ پ آن کیا۔ پہلے صفحے کی پیشانی پر درج تھا۔

”سرکار بنام فارس غازی“

زمر کی نگاہیں لفظ لفظ عبور کرتی گئیں۔ کھڑکی کے باہر رات گھری تھی اور ہر گز رتائل اس کو مزید اندھیرا کرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹ تاریکی کی انہیں کہنے پہنچ گئی۔ اتنی سیاہ اتنی سیاہ کہ جیسے ساری روشنیاں دم توڑ گئی ہوں۔ اور پھر پوچھت گئی۔ صبح کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔ روشنی کو جیسے کوئی روزن مل گیا۔ وہ پھیلت گئی؛ قطرہ قطرہ کرن کرن اور پھر روشنی بھی خوب تیز ہو کر پرانی ہوتی گئی۔

سفیدی نی شرث اور نیلی جیز میں ملوس سعدی نے جب زمر کے کمرے کا دروازہ ہٹکھٹایا تو سورج سوانحیزے پر تھا۔ اتوار کی ست شمع آج بھی ست تھی۔ اس کو پچھلے اتوار کی صبح یاد آئی جب زمر اس کے ریشور نہ آئی تھی اور اس سے گردے کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وہ اداکی سے مسکرا یا، پھر سر جھکا۔ دروازہ دوبارہ بجا یا۔ کوئی جواب نہیں۔

سعدی نے آہستہ سے دروازہ دھکیلا تو وہ ہٹلتا چلا گیا۔ اندر کا منظر واضح ہوا۔ فرش پر بے شمار کاغذ کھڑے ہوئے تھے۔ تصاویرِ فلام اشیت۔ وہ آہنگی سے چلتا اندر آیا۔ تجھ سے سراخا کر دیوار کو دیکھا۔

بورڈ بھرا ہوا تھا۔ اور پردارث اور زرتاش کی تصاویر اور ان کے آگے پیچھے اور نیچے بے شمار تراشے کاغذات اور sticky notes چسپاں تھے۔ سرکار بنام فارس غازی سے متعلقہ شہادتیں، ثبوت ناتمام جوابات ناکافی گواہیاں، سب وہاں منتشر اسجا تھا۔ سعدی نے گردہ موڑ کر اسٹری نیبل کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی فائلز بکھری تھیں اور ایک کھلی فائل پر سر کھے وہ سورہ ہی تھی۔ آنکھیں بند ناک کی لوگ چمکتی ہوئیں اور ڈھیلا جوڑ اکھل کر بکھر چکا تھا۔ وہ لکا سماں سکرایا۔ پھر قریب آیا۔ میز کے کنارے ہاتھ رکھ کر جھکا۔

”پیچھو!“ سعدی نے زمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”آپ کی طبیعت نمیک ہے؟ میں آپ کا سردار ہا دوں؟“

”ہوں۔“ کہہ کر سراخا نے گی تو وہ سیدھا ہو گیا۔ بند آنکھوں سے چہرے سے بال بٹانی سیدھی ہو پیٹھی۔ لیں کان کے اڑسیں۔ آنکھوں کو پوروں سے ملا۔ پھر چہرہ موڑ کر گلابی خواہید آنکھوں سے اسے دیکھا۔ لکا سماں سکرائی۔

”تم کب آئے؟“

”ابھی۔ مجھے رات کو لگا تھا آپ نمیک نہیں ہیں۔ آپ کچھ پریشان لگ رہی تھیں۔“ ذہن کے پردے پر جواہرات سے بات کر لیں زمر ابھری۔ پھر ایک فلک منڈنگاہ بکھرے کاغذوں پر ڈالی۔

”آپ کیا کر رہی ہیں زمر؟“

”اوہ یا!“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”یہ پراسکیو ٹربصیرت نے بھجوائے ہیں۔“ وہ کسل مندی سے اٹھی اور چیزیں ست روی ہے۔

بھائی

”ڈیڑھ سال پہلے میں بھی یہی کر رہا تھا۔ مگر آپ کو یہاں کچھ بھی نہیں ملے گا۔“

"تم ٹھک کہ رہے ہو،" خلاف تو قزمر نے سچیدگی سے اسے دیکھ کر کہا۔ سعدی ایک دم چپ سا ہو کر اسی کو دیکھنے لگا۔

”واقعیت کیمیہ دوسرے کوئی بھی حنج سماں نہیں کرتی کہ فارس گلکی سے“، وہاں فائل میں صفحہ ترتیب سے لگا رہی تھی۔

"جیسا آ کی گواہی کر مطلک،" و احتساب سے اک اک لفڑی کھرا تھا۔ "مطلک جو آئے کورٹ میں کھا۔۔۔ یعنی

کوئے اپنی والی کے۔ سب .... وہ سیاہ تھے۔ ایسے۔ یہ ملے ہوئے تھے۔

بے پیچے پارس عاریے بے برقے دارس عاریے داریں اپے دوساریں۔

اور مے ..... رسرے پر سون صدی لکھوں کے ساہ پڑھا جھاتھ کڈاں کے نک کے نک اسٹھان ملائی گئی تھی۔ ”

”وی سافت ویریور رے فارس سے مسابہ اور بنای ہی۔“  
”کسکے حوالہ پر اسے انجمن اکنام کے اکنام“

بی۔ یوں لکھ دہ۔ ہی کی اور اسی بیان نے ماسکوں ورہا رہ دیا۔

”یوں سعدی! تم ھیک لہر رہے ہو۔ زمرے بھئے والے انداز میں ابات میں سر ہلایا۔ ہوسنا ہے جسے وہی میلت اپنیا کیا ہوا۔

۱۰ سب مجموعت ہو۔ میری غلط لواہی فارس (نام یعنی اذیت نال ٹھا) کے چار سال بیس میں ہے۔ یہ بیس سو روپ پر پڑے۔

کے بعد غیر جانب داری سے بچھے والی یہ لک رہا ہے کہ میں ہی غلط ہوں۔ بھے میں پا۔ مریم ایں جیاں لاب پیرے کے پاس وہی بجھ بائی رہی

لے تھارے ماموں کو موردا نہ امام ہھرائے ہی۔ اس یئے لوکہ میرا دل پوری طرح صاف ہیں ہوا میریں اپنے اڑمات سے چیچے ہی ہوں۔

سیدی کی سے ہی وہ اب فناٹ کرے لی چیزیں اپنی جکہ پاپس لارہی می۔ اگر میں غلط ہوں اور مم سب ھیک ہو اور سایدیاں ہی ہو تو میں ہار

ماں ہوں۔“

"میں یہ یہیں چاہتا کہ آپ ہار ما میں۔" اس لودکہ ہوا جھا۔

”لگا اپھر تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ فارس نے جو مجھے کال کی ہی جو تمہارے بقول بھلی آواز میں..... واث الیور..... اس لی ریکارڈ نہ

تمہیں کہاں سے ملی؟“

”ریکارڈنگ!“ سعدی کے حلق میں کچھ پھنسا۔

”ڈیڑھ سال پہلے تمہارے وکیل نے وہ ریکارڈنگ عدالت میں پیش کی تھی اور تمہارے ایک پرست گواہ نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس

۲۔ اوز کا واں پرنس فارس کی آواز کے واں پرنس سے مختلف ہے۔ اور اس ریکارڈ مگ کا سورس تم لوگوں نے بھی ظاہر ہیں کیا تھا۔ کیا تم مجھے بتاؤ

مے دے تمہیں کہاں سے ملی؟“ اس کی سمجھیدہ بھوری آنکھیں سعدی پر جمی تھیں۔

سعدی نے اس کو دیکھتے ہوئے لب کھو لے پھر بند کیے۔ ذرا سا سوچا، پھر تھیر تھیر کر بولا۔

”میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں۔ اس بنیاد پر کہ میرا جواب مجھے مر تکب جرم ظاہر کر سکتا ہے۔“

”قانون شہادت آرٹکل 15 کے تحت تمہیں یہ اشتبھ حاصل نہیں ہے کیونکہ یہے جواب پتہارے خلاف کارروائی کی جا سکتی ہے۔“

”جو نکہ ہم کو رٹ میں نہیں ہیں اس لئے میں جواب نہ دنے کا حق رکھتا ہوں۔“

”او کہ ”زمگہ“ کے انسانی رکھ مسکرا کر سوچ دیا اور ہمارا آکر صداقت کو جائے کے لئے آواز دی۔ سعدی الجھا ہوا کھڑا رہا۔ پھر

لٹ کر اسے دیکھا۔

”کیا آپ فارس غازی کو بے گناہ کھہ رہی ہیں؟“

”میر س کھری ہوں کہ میں دوبارہ اس سے الزام نہیں لگاؤں گی۔“ وہ مطمئن ہی کہتی راہداری میں چلتی گئی۔

سعدی نے نظریں موڑ کر بورڈ کو دیکھا جو مختلف کاغذات سے بھرا تھا۔ زمر نے کیس پڑھا، شہزادیں، ثبوت وہ سب دیکھا جس سے وہ ہمیشہ منہ پھیر کر چلی جاتی تھی اور اسے یقین آگیا کہ فارس بے گناہ ہے۔ سیدھی سی بات تھی۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ مگر پرzel کا کون سا نکلا غائب تھا؟ سادہ سی بات میں چھپی کون سی چیزیں اسے الجھاری تھیں۔

سعدی نے کئی سال اس لمحے کا انتظار کیا تھا جب پھر تسلیم کر لیں کہ فارس بے گناہ تھا۔

وہ لمحہ آیا اور گزر گیا مگر وہ مطمئن کیوں نہیں تھا؟

کیا اس لیے کہ وہ کئی سال پہلے والا معصوم سعدی نہیں تھا؟ اور آج کے سعدی کا دماغ اسے تارہاتھا کہ زمراتی آسانی سے مرنے والی ٹھنڈی نہیں تھی۔ پھر....؟

وہ خود سے الجھتا باہر آگیا۔ ابھی اسے ایک جگہ اور بھی جانا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی ..... ہم گھوم پھر کے کوچہ قاتل سے آئے ہیں  
کاردار قصر پر وہ اتوار معمول کی چستی اور گھما گھمی کے ساتھ طلوع ہوئی تھی۔ سعدی نے پتھی چار دیواری پر ہارن دیا۔ اسے دیکھ کر گارڈز نے دروازہ کھول دیا۔ کارخنسوں چیک پونش سے گزر کر آگئے آئی، ڈھلان عبور کی اور وہ رہا سامنے اونچا محل اور اس کے عقب میں چھوٹی سی ایکسی۔

وہ کاراں روشن پا آگے لے گیا جو اونچے نیچے بہرے کے درمیان سے گزر کر انیکسی تک جاتی تھی۔ دفترا اس نے رفتار آہستہ کر دی۔  
ہاشم کی عقبی بالکوئی کام منظر سامنے آیا۔ وہ نیچے بہرے پر کھڑا تھا۔ ٹراوڑ اور آدھی آستین کی فرشت میں پہنچتے ہوئے جھک کر اپنے پالتو لیبڑا اور کتے کے بالوں کو سہلارہاتھا۔ ساتھ بے اختیاراتنی پر جوش سی سو نیا کھڑی تھی۔ وہ دونوں مدھم آواز میں با تین کرتے ہنستے جا رہے تھے۔  
گاڑی کی آواز پہ ہاشم نے سر اٹھایا۔ ایک نظر ڈرائیور گ سیٹ پر نیٹھے سعدی کو دیکھا، دوسرا کار کے رخ پڑا۔ (مطلوب وہ انیکسی جا رہا تھا) پھر مسکرا کر سیدھا ہوا۔ بلکہ ساہاتھ بڑایا۔

سعدی نے جواب میں بنا مسکرائے دیاں ہاتھ اٹھایا۔ پیشانی کے قریب لے جا کر سر کو ختم دیا، خاموش سلام (ادب پہلا قرینہ ہے) شمنی کے قرینوں میں) اور کار آگے لے گیا۔ ہاشم سردی مسکرا ہٹ سے اسے درجاتے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھک کر سو نیا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسے کچھ کہرہ ہی تھی۔

سعدی نے کار انیکسی کے قریب کھڑی کی۔ پیچھے دیکھے بغیر برآمدے میں آیا۔ بیل دبائی۔ بلکل نہیں تھی گھنٹی نہیں بجی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب ندارد۔ اس نے انتظار نہیں کیا۔ چابی اس کے پاس تھی۔ فارس نے جبل کے زمانے سے اسے دے رکھی تھی۔  
اندر آیا تو گھر خاموش کھڑا تھا۔ وہ قدرے حیران سا ایک کمرے سے دوسرے تک گیا۔ باہر فارس کی کار تو کھڑی تھی۔ پھر؟  
”اوھر ہوں نیچے۔“ فارس کی آواز آئی تو وہ چونکا۔ پھر گھری سانس لے کر پیسعت کو جاتی سیر ہیں توک آیا۔ نیچے پورے گھر کے رقبے جتنا بڑا سا کمرہ تھا جس میں بڑے بڑے ستون تھے۔ اردوگ دکانٹھ کہاڑا پرانا فریز، گاڑی کا سامان وغیرہ رکھا تھا۔ ایک دیوار پر خالی ریکس تھے۔ یہاں کسی زمانے میں فارس کی پستوں اور بندوقوں کی کلکیش ہوتی تھی۔ جب پولیس نے اسے گرفتار کیا تو سب لے گئی۔ کچھ بھی واپس نہیں کیا۔

سعدی زینے اترتا تھے خانے کے فرش تک آیا۔ اندر سفید بلب جل رہے تھے۔ پھر بھی روشنی کم لگتی تھی۔ فارس دیوار سے لگی میز کے آگے کھڑا تھا۔ سعدی کی طرف پشت تھی۔ سر جھکا کر منہ میں کچھ چباتا کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ مگر سعدی نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ میز

لے پہنچے موجود دیوار کو دیکھا قدم آگے آیا۔

وہاں کوئی بورڈ وغیرہ نہ تھا۔ دیوار پر اسی تصاویر کاغذات، لکنڈ وغیرہ چسپاں تھیں۔ اور پہنچے دائیں باکیں یہ زمر کی دیوار سے زیادہ ۹ می ہوئی تھی۔ سعدی کے بر فکر مندی سے اکٹھے ہوئے۔ ذرا خفیٰ سے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔

”تو آپ دوستے سے یہ کہ رہے تھے؟“

”کوئی اعتراض؟“ وہ پیالے میں رکھی سونف کے دانے اٹھا کر منہ میں رکھتا مڑے بنا بولا۔ ابھی تک سعدی کو نہیں دیکھا تھا۔

”مگر آپ کر کیا رہے ہیں؟“ وہ اس کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ آنکھیں سکینہ کراس کا داہنارخ دیکھا۔ چھوٹے کٹے بال اور سنجیدگی سے ملزی شہری زرد آنکھیں جواب دیوار پر جھی تھیں۔

”جو ساری زندگی کیا ہے۔ تفتیش۔“ وہ سرخ مار کر لے کر دیوار تک گیا۔ ایک لکنگ چسپاں کی اور مار کر سے اوپر سوالیہ نشان بنایا۔ پھر اپس مڑ کر سعدی کو سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔

”تم کیسے آئے؟“

مگر وہ اب گردن موڑ کر میز کے کنارے پر کھے بیک کو دیکھ رہا تھا جس میں اس کی تازہ تازہ مغلوائی گئی گز تھیں اور گولیاں۔ اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے سعدی کو غصہ آنے لگا۔ وہ اس کی بے گناہی کے ثبوت دیتا تھک گیا اور ادھر آ کر کوئی یہ سب دیکھ لے تو....؟“

”کیا یہ آپ کے نام پلاسنس شدہ ہیں؟“ تاپنڈی دیگی سے گز کو دیکھ کر اس نے مغلوک نظرؤں سے فارس کا چہرہ دیکھا۔ ”نہیں۔ اگر گرفتار کرنا ہے تو کرو۔“ تختی سے کہتا وہ میز تک والپس آیا اور کاغذات اٹھا کر دوسری طرف رکھنے لگا۔ سعدی نے بے بس سے اسے دیکھا۔

”ڈیڑھ سال پہلے میں یہی کر رہا تھا۔ مگر یہ تفتیش آپ کو نہیں نہیں لے کر جائے گی۔ اس کے آگے بندگی ہے۔“

”تو پھر تم مجھے سکھا دو کہ تفتیش کیسے کرتے ہیں؟ میں ساری کلاس ائینڈ کروں گا۔“ ناک سے کمھی اڑاتا وہ اڑ لیے بنا بولا۔ سعدی اف کر کے رہ گیا۔ پھر گھوم کر اس کے سامنے آیا۔

”اگر آپ کو پتا چل بھی گیا کہ یہ سب کس نے کیا ہے تو آپ نے یہ اسلحہ اس لیے لیا ہے نا تا کہ اس کو جا کر گولی مار دیں۔“

”تم خون کے بد لے خون پر یقین نہیں رکھتے؟“

”بالکل رکھتا ہوں مگر انقاوم لینے کے بھی طریقے ہوتے ہیں۔ آپ اس کو مار دیں گے کل کو اس کے خاندان والے کسی اور کو مار دیں گے اور یہ سائیکل آف ریونچ (انقاوم کا چکر) بھی نہیں ختم ہو گا۔“ اس نے فکر مندی سے سمجھاتے ہوئے آہستہ سے فارس کی کہنی تھامی۔

”ماموں! ہم ان کو سزا ضرور دلوائیں گے مگر قانونی طریقے سے۔ اس طرح نہیں۔“

فارس تکمیلی آنکھیں کر کے اسے دیکھتا رہا۔

”اور اس ”ان“ میں کون کون شامل ہے وضاحت کرو گے؟“

سعدی نے کہنی چھوڑی ”یچھے ہوا تھوک لگا۔ ذرا سے شانے اچکائے۔“ مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟“

”یہی تو پوچھ رہا ہوں۔ جو تمہیں پتا ہے وہ کے پتا ہے؟“

سعدی نے ٹھہر ٹھہر کر نظر ملائے بناو دیوار کو دیکھتے ہوئے جو ابا کہا۔

”میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں۔ اس بنیاد پر کہ میرا جواب مجھے مر تک جرم ثابت کر سکتا ہے۔“

”اوہ کم آن، تمہیں یہ اتنی....“

"قاون شہادت آرٹیگل 15 کے تحت مواصل شہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے ہتا ہے: "وہ مسکرا لی۔ فارس نے واقعی ابرد افشا کر تجویب سے اسے دیکھا۔ سعدی نے کہدے چاکائے۔ "زمر پچھوڑا بھیجا ہوں آخر۔ انا قاون تو مجھے بھی آتا ہے۔"

فارس کے تاثرات قد رے پتھر اگئے۔ وہ خمیدہ ساواہیں مزراں۔ سعدی کی مسکراہت محمد ہوئی۔ "کیا ہوا؟"

"جو تمہاری پچھوڑے ہر مرے ساتھ کیا وہ میں نہیں بھولا۔ اس لیے بہتر ہے ہم اس طرف نہ جائیں۔ چائے پوچھے گے؟"

سعدی کا دل بڑی طرح دکھا گراں لے اب کھول کر بند کر لیے۔ پھر سر بدلایا۔ "میں ہوں گا۔" اور کریں سچنے لگا۔

"اوپر پہن میں سامان رکھا ہے ہالو۔ دو کپ۔ ہر مرے میں جعلیں ہوں۔"

وہ جو بینے کا قرار کا ہماری سے اسے دیکھا اور "بہت اپھا" کہہ کر بیرونیوں کی طرف بڑھ گیا۔ فارس بدستور گردن جھکائے کاغذات کھنکا رہا تھا۔

انہیکی کا پکن لاڈنگ سے ماحصل تھا۔ بالکل اوپن۔ اس نے سامان ڈھونڈا۔ چونجا جانا۔ پانی میں پن گویا جھوکی۔ پھر کھڑکی کو دیکھا۔ اس پر کوئی پر وغیرہ نہ تھا۔ کھڑکیوں کے شہنشاہ پنگت ہیپنگ کر بھونڈی کی بچت کی گئی تھی۔ اور یہ تو سب کو پتا تھا کہ زرداش ایک انجائی پھوپڑ لازی ہی۔

سعدی نے کھڑکی کھولی تو سامنے قمر کا عقیلی حصہ نمایاں ہوا۔ ہاشم ہال کئے کی طرف اچھا لانا وہ اسے منہ میں سچ کر کے ہونیا کی طرف بھاگتا۔ سونیا نہیں نہیں کے دو ہری ہوری تھی۔

سعدی کے پتھرے پڑھی سا ہاڑ آیا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ زور سے نکل۔

ایک پنچھہ ہو گیا تھا۔ ہاشم کی قاتڑوہ لے کر بھی بے بھی سے بیخا تھا۔ اسے جلد از جلد ثبوت اکٹھے کر کے ہاشم کے پاس جانا تھا کہ زمر اور فارس کی آپس کی للطیفی دوڑ ہو جائے۔ ذہن میں آگے کالا تجھیں ترتیب دیتا وہ چائے ہنا کر یقین کا لایا تو فارس اپنی بھری دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ لچڑا اب دانت سے دیا ہے؟ انہیں سکیز کر کچھ سوچتا۔

"یا آدمی! اس نے الیاس فاطمی کی تصویر پانگی سے دیکھ دی۔" یہ دارت کا پاس تھا اور اس نے دارت سے استھنی مانگا تھا۔ ہر بندگی کا سر اس غصہ تک جاتا ہے۔ یہ ہمیں کچھ کچھ جانتا ہے۔" اس نے تائیدی انظر دل سے سعدی کو دیکھا۔ اس نے شانے اچکائے اور کپ فارس کی طرف بڑھا دیا۔

فارس نے گھونٹ بھرا پھر بد مرگی سے اسے دیکھا۔

"اس میں جعلی ہے۔"

"اوہ میں بھول گیا۔ سوری۔" سعدی نے صھوپیت سے مدد رکھی۔ گری پہ بیٹھا اور اپنے کپ سے گھونٹ گھونٹ بھرنے لگا۔

فارس نے اسے گھوڑ کر سر جھنکا۔ بھر دوبارہ دیوار کو دیکھنے لگا۔ وہاں چپاں تصوریں ہیک ایڈو اسٹ تھیں۔ پھر کہ کی ان میں رنگ بھرنا گئے۔ کوئی قوس قزح چھائی اور زرد موسم میں بھارا تر آئی۔

فارس بالکل خاموش سا ان تصویروں کو دیکھتی گیا یہاں تک کہ وہ چلنے پھر نے لگیں۔ گویا چار سال پہلے کے منظر ابھی ان کے آس پاس چیل آرہے ہوں۔



شہر ہوا میں جلتے رہنا اندیشوں کی چوکھت پر — رات گئے تک الجھے رہنا بے مطیوم خیا لوں میں  
چار سال قبل (دارث نازی قتل کے سات دن بعد)

تمہارے لئے اپنے کو جو کرکے دیکھ لے جائیں۔ مگر اس کا سچا کام کیا جائے؟ اس کے ساتھ اپنے  
انداز کے بعد میرا بھائی بھی کے دادا جی کے ساتھ آپ کی آمدی تھی۔ میرا بھائی بھائیوں کے ساتھ  
میں بیٹا۔ میرا بھائی کی کھلکھلی تینی سالی بیٹی کے ساتھ اپنے پیارے بھائیوں کے ساتھ  
راہبی سے جو بڑی تباہی آتی تھی۔ تھی کہ سب سو ماہیں پہنچنے پڑیں اور اسی وجہ سے خوبصورتی  
میلی تھی۔ کیونکہ بھائیوں کے ساتھ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔

۳۰ جنگ اسلامیت کے نتیجے میں عرب اور اسلامی قومیت کے پہلوں کو بے کاری کر دی جائے۔

”پوکیں کے عالم کے لئے کامیاب ہے جو پس میرے تکریبی ابھی ہے۔“ وہ نتھ فروں سے سادہ کیا کریں پختے  
لے کر، امداد طلب ہے۔ تباہے۔ کامیاب کے اور نتھیں کامیاب ہے۔ تباہے۔ پھر تباہے۔ تکریبی ابھی میں کیوں آرہی ہے؟  
”جس سینے میں کامیابی کی دلچسپی میں مبتلا ہوئے۔“

"یادگاریت" اور "دینہ" میں سے فراہم گلریز چار صیغت تکیں۔ دینہ کی دو صیغہیں بھی تو ہیں۔

میراں بے کار فریضہ تھی مگر اس نے اپنے اکتوبر کرنے کا خاتمہ ہے اسکے بعد تھوڑی بے میراں بے کار لی۔ میراں اول اس کا دوسری صاحب کرنی پڑیں اگر ان سے مکریں ان کے مانٹالیں بے میراں بے کار لے گئیں۔ میراں اول اس کا دوسری صاحب کرنی پڑیں اگر ان سے مکریں ان کے مانٹالیں بے میراں بے کار لے گئیں۔

”کوئی پھر اس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اپنے بھائی کے لئے کام کیا ہے؟“  
”کوئی پھر اس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اپنے بھائی کے لئے کام کیا ہے؟“

سکھ لگی پا اپنی کوئی خداوند کے مہال کھڑا کھڑا ابھر جائے اسی لئے جو گمراہ یعنی طلبی کیں ۔۔۔

”امم جمال سے کہا پے کیں اکاری جی۔“  
”مظہر مسٹر کو کیا تے پیدا رہنے کی کوئی کے سامنے نہ کریں گے۔“

”آنہ تم صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے نبی مکہ فر کے اسی کی وجہ کا کام ہے۔“

۱۰۔ ملکیت کے لئے کافی انتہی ہے بلکہ اس کے بعد پرکشش ہے۔

کے کام سے ملے گئے پانچ دن بعد، سوچ کر کہا تھا: "ایسا یقین رکھو

اس کی طرف مڑا۔

”میں کار پوریٹ لا یئر ہوں، کرانے کا قاتل نہیں۔ اور میں نے کچھ بھی پلانگ سے نہیں کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے یہ ایک غلطی تھی اور مجھے اس کو فکر کرتا ہے۔“ رک کراس نے غصے سے ماں کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرا نیس لیں۔ ”اور یہ سب اتنے آرام سے فکر نہیں ہو گا۔ صرف فارس نہیں، خاور بھی قتل کے وقت پارٹی میں نہیں تھا۔“ اسی پل دروازہ رسی کی دستک کے ساتھ کھلا۔ ہاشم اور جواہرات کرنٹ کھا کر اس طرف گھوئے۔ خاور بھی بے اختیار کری سے انھوں کھڑا ہوا۔

”اوہ آئی ایک سوری میں.... انکل نے بلا یا تھا تو.... وہ زرتاش تھی۔ چوکھت پر رک کے والپس جانے لگی تھی۔“ آپ لوگ بڑی ہیں۔ اش اور کے۔ میں بعد میں آ جاؤں گی۔“ قدرے تدبذب سے معدتر کرتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ باری باری سب کے چہرے دیکھ جو سفید پر گئے تھے۔

”نہیں.... ہم بس.... بات کر رہے تھے۔“ ہاشم نے تھوک لگا تھا۔ چہرے پر زبردست مسکراہٹ لاتا آگے آیا، مگر اڑی رنگت اور آنکھوں میں آتی پریشانی دبا نہیں پا رہا تھا۔

”سوری میں ایسے ہی آگئی۔“ وہ ذرا شرمende، ذرا سوچتی، الجھنی لگا ہوں سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آپس میں اتنے الجھے ہوئے تھے کہ اسے آتے اسکریز کی فوج میں نہیں دیکھا۔ اف!

”کوئی بات نہیں۔ ہم ایک ہی خاندان ہیں۔“ جواہرات پھیکا سامسکراہی۔ اپنی جگہ سے وہ ایک انجوں بھی نہیں مل پا رہی تھی۔ کہیں اس نے کچھ سن تو نہیں لیا۔

”انکل فارس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وارث بھائی کے کیس کی پیش رفت وغیرہ۔ میں یہی آپ سے پوچھنے آئی تھی۔ مجھے تو کوئی کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔“ کہتے کہتے اس نے ترپھی نظر خاور پر ڈالی جو بالکل دم سادھے کھڑا تھا۔ ساہنہ پروف دروازے کو گھولتے وقت آخوند فقرہ کان میں پڑا تھا۔

”صرف فارس نہیں، خاور بھی اس وقت پارٹی میں نہیں تھا۔“

”آہم.... ہاشم کھنکھار کر گلا صاف کرتا بہر آیا۔ زرتاش بھی پوچھتے۔ سے ہٹ کر راہداری میں آکھڑی ہوئی۔ ہاشم نے بات شروع کرنے سے قبل ذرا احتیاط سے اسے دیکھا۔ وہ چوبیں چھپس برس کی خوش شکل نیاہ آنکھوں اور اسٹیپ میں کٹے بالوں والی لڑکی تھی۔ اس وقت ابرو ذرا الجھن سے سکوڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔“

”ہم سب کو پتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ اس کی گاڑی سے کچھ ملنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا زرتاش۔“ وہ کافی سنبھل کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کھڑا رہا تھا۔ ”رہی بات پر اسکیوں نرکی تو وہ خواہ نخواہ فارس پہنچ کر رہی ہے اور اس کو بار بار سوال جواب کے لیے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ پر اسکیوں نرزم یونو! سعدی کی پھپھو۔ ابھی دو پھر کو بھی فارس وہیں تھا۔“ زرتاش کی الجھن مدد ہوئی۔ اس کی جگہ ناگواری سی ابھری۔

”وہ فارس پہنچ کر رہی ہیں؟“

”اس نے فارس کو کہا ہے کہ وہ اسے اپنی alibi کی سے ملوائے۔ اس کو فارس کی بے گناہی کا ثبوت چاہیے۔ اب معلوم نہیں کتنے دن وہ بے چارہ اس کے آفس کے چکر لگاتا رہے گا۔ مگر نرزم کو کون سمجھائے؟“

”تجھے تک اس کو یقین نہیں آئے گا۔ وہ فارس کو اپنے پاس بلوائی رہے گی؟“ وہ تیزی سے اسے دیکھتی ہوئی۔

”اوہ کم آن!“ ہاشم نے بے پرواہی سے سر جھکا۔ ”روز کے چند گھنٹے اس کے ساتھ گزار لینے سے ان کے درمیان کوئی پرانی بات

۹ نہیں شروع ہو جائے گی۔ بھروسہ کرو اپنے شوہر پر۔“

اور ہاشم کے لیے الفاظ تاثش کے پتے تھے۔ آگے پیچھے الٹ پلٹ کر کے ان کو ترتیب دیا، مرضی کے سامنے لا، مرضی کے چھپا گیا، اور مرضی کا مطلب نکال لیا۔ زرتاش لب پیچھے ضبط سے واپس مرنگئی۔ وہ فوراً اس کے پیچھے آیا۔

”سنوا! تمہیں بھی فارس پہ شک ہے؟ بے شک وہ پارٹی میں اس وقت نہیں تھا مگر....“ وہ دونوں ساتھ ساتھ راہداری میں چل رہے تھے۔

”صرف فارس کیوں؟ خاور بھی تو پارٹی میں نہیں تھا۔ پھر پولیس صرف فارس کے پیچھے کیوں آ رہی ہے؟“ اس نے جو سناتھا، اگل ایسا۔

مگر ہاشم تیار تھا اور بظاہر حیرت سے سرا ثابت میں ہلا�ا۔

”واقعی عجیب بات ہے۔ میں بھی ابھی می سے بھی کہہ رہا تھا کہ خاور بھی اس وقت نہیں تھا اور بھی کچھ لوگ نہیں تھے، مگر....“

”اور کون؟“ اس نے اسی تیزی سے بات کاٹی۔

”یہی ہمارے کچھ دوست۔ مگر میری پارٹی کوئی ایسا پکانہ تو نہیں ہے کہ جو اس میں نہیں ہو گا، وہی قاتل ہے لہذا اسی پہ شک کیا ہے.... یعنو دوست یہ فارس پہ شک پر اسکیوں ٹرکی اس سے تقیش یہ سب جان بوجھ کے کیا جا رہا ہے۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ الجھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ہاشم کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

وہ واپس آیا تو دم سادھے کھڑی جواہرات تب تک اس نے دروازہ بند کر کے لاک نہ کر دیا۔ پھر گہری سانس لے لر ان دونوں کی طرف گھوما۔

”اس نے کوئی نقصان پہنچانے والی بات نہیں سنی۔“

”میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں ہاشم!“ جواہرات چیخ پڑی۔ ”اس سب کو ختم کرو۔ فارس پہ سب الزام ثابت کرواؤ۔“

۱ نے نیل بھجواؤ تاکہ میں سکون کی نیند سو سکوں۔“

”جانتا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا خاور کے لیپٹاپ تک آیا اور سوالیہ نظر وہ سے اسے دیکھا۔ ”کہاں تک پہنچا کام؟“

”ہو گیا ہے سر۔“ وہ تابعداری سے اسکرین پر اسے کچھ دکھانے لگا۔ جواہرات سامنے کھڑی تھی، مگر مندا بھی ہوئی سی ان کو ۱ میختے گئی۔

”تم لوگ کیا پلان کر رہے ہو؟“

باہر لان میں زرتاشہ سینے پہ بازو لپیٹے، سر جھکائے کسی عجیب کھنکش میں چلتی جا رہی تھی۔ دھنٹا آوازوں پر وہ رکی۔ گردن گھما لر کیجا۔

لان کے کنارے مصنوعی آبشار تھی۔ وہ اس وقت بند تھی اور اس کے اسٹیپ پر شہرین بیٹھی تھی۔ نائمش کے ساتھ سرخ کفتان نما ۹ ت پہنچنے والے جو گلم پچائی سر جھکائے موبائل پہن دبارہ تھی۔ زرتاشہ نے لمحہ بھر کو سوچا کہ اس کی شرٹ، گردن کی مالا کا کڑا اور اوہ! یہ اُمک شوز.... یہ کس برانڈ کے ہوں گے؟ مگر پھر.... اس نے سر جھکائا اور اس طرف آئی۔

”شہرین!“ شہرین نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھتے، چھرے پر سامنے کو آئے سنہری بال پیچھے ہٹائے۔

”ہیلو زرتاشہ!“ وہ کروف سے مسکرائی۔

”کیا تم مجھے سونی کی برتھڑے پارٹی کی ویڈیو دے سکتی ہو؟ مجھے اپنی کرزز کو تمہاری ساڑھی دکھانی ہے۔ ایکسٹرا کا پی ہو گی نا۔“

تمہارے پاس؟“

”شیور! خاور نے بہت سی ڈیزیں مجھے دی تھیں۔ میں میری اسنجیو کے ہاتھ بھواتی ہوں۔“ تفاخر انہ شانے اچکائے۔ زرتاشہ زمی سے ٹھیکنس کر کے آگے گے بڑھ گئی۔

.....♦♦♦

چلنے ہی کو ہے اک سوم ابھی ..... رقص فرماء ہے روح بر بادی

”تم ایک تیر سے کتنے شکار کرنا چاہ رہے ہو ہاشم؟ اگر کچھ غلط ہو گیا تو؟“

”پھر سے سن لیں پلان۔ کچھ غلط نہیں ہو گا۔ ہم زمر پر فارنگ کریں گے، گن فارس کی استعمال ہو گی۔ ہوٹل کے جس کمرے سے

گولی چلے گی وہ بھی اسی کے نام پر ہو گا۔ گن پر فارس کے فنگر پر منہ بھی ملیں گے۔“

”اورا گروہ مرگی تو؟“ جواہرات کو ہول انھر ہے تھے۔

”اس کو نہیں مارنا ہم نے مگی۔ وہ بظاہر فارس سے تفیش کر رہی ہے، اس پر شک کر رہی ہے۔ ایسے میں زمر کو یہ حملہ ایک مجرم کو خود کو چھپانے کا حر جب لے گے۔ وہ بھی سمجھے گی کہ گرفتاری کے خوف سے فارس نے یہ سب کیا ہے۔“

”اورا گرفتار کیا ہے؟“ اس نے اسے فارس کے خلاف سازش سمجھا تو؟“

”اونہوں....، ہاشم پہلی دفعہ کھل کر مسکرا یا اور خاور کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرا یا۔ جواہرات نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”کیا میں کچھ مس کر رہی ہوں؟“

”زمر بھی بھی نہیں سمجھے گی کہ یہ فارس کے خلاف سازش ہے۔ وہ فارس کو ہی قصور و اس سمجھے گی کیونکہ یہ بات اسے فارس خود کہے گا۔“

”اوکے۔ اور فارس اسے یہ بات کیوں کہے گا؟“ جواہرات اب ذرا اکٹانے لگی تھی۔

”وہ اس طرح می کہ ہم فارس کی طرف سے زمر کو یہی بات کہلوائیں گے۔“

”ہرگز نہیں ہاشم۔“ جواہرات نے کوفت سے سر جھکا۔

”زمر کو آج بھی فارس کی بے گناہی کا لیقین ہے، کل بھی ہو گا۔“

”ہم اس کو فارس کی طرف سے کال کریں گے۔“ کہتے ہوئے ہاشم نے خاور کی طرف اشارہ کیا۔ خاور نے لیپ ناپ اسکرین جواہرات کے سامنے کی۔ وہ مشتبہ نظروں سے اسے دیکھتی قریب آئی۔

”کیا تم دونوں وضاحت کرنا پسند کرو گے؟“ خاور نے سر کو اثبات میں ہلا کیا اور اسکرین کو دیکھتے ہوئے منودب انداز میں سمجھانے لگا۔

”میں نے اس سافٹ ویری میں فارس کی تمام ریکارڈنگز ڈال دی ہیں جو میرے پاس ہیں۔ ہم پچھلے ایک ہفتے سے اس کا فون ٹیپ کر رہے تھے۔ اب دیکھیے۔“

وہ چند بیٹن دبا کر مزید صفحے کھولنے لگا۔ جواہرات بدستور مخفوک ہی اسے دیکھے گئی۔

”میں جو بھی تائپ کروں گا، وہ فارس کی آواز میں ابھر کر سامنے آئے گا۔ ہم فارس کے فون سے پر اسکیوں نر کو کال کریں گے۔ اور ہمارا کہا ہوا اسکرپٹ اس کی آواز میں پڑھا جائے گا۔ وہ بھی سمجھے گی کہ یہ فارس ہے اور اس پر حملہ کرنے سے پہلے اس کے سامنے اعتراض جرم کر کے اپنے ضمیر کی آخری چھین نکال رہا ہے اور اس کو ختم کر کے آخری ثبوت بھی مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ زندہ نجج جائے گی، اس لیے وہ اسی کاں کو فارس کے خلاف استعمال کرے گی۔“

”آف کو رس زمر کے پاس یہ ریکارڈ نگہ نہیں ہو گی۔ لیکن اس کو فارس کے یہ الفاظ ساری زندگی یاد رہیں گے۔ اس بنیاد پر وہ اسے نیل بھی بھجوائے گی اور وہ اس کے خلاف سب سے بڑی گواہ ہو گی۔ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سب سے ہرے دشمن بن جائیں گے۔“

جو اہرات قدرے اچنپے سے دونوں کے چہرے دیکھنے لگی۔ لب دانت سے کاشتے ہوئے وہ کافی متکبر نظر آرہی تھی۔

”ہاشم! اگر کچھ غلط ہو گپا۔ اگر زمر ہماری چال میں نہ آئی، اگر اس نے اس سب کو ایک سوچا سمجھا پلان سمجھا تو؟“

”تو پھر ہماری قسمت کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہو گا۔ مگر میں اپنے خاندان کے لیے اچھی امید رکھتا چاہتا ہوں۔“ وہ شانے اچکا کر پاٹ سانظر آنے لگا۔

جو اہرات نے بدقت مسکرا کر سر ہلایا گکروہ۔ ابھی بھی خوش نہیں تھی۔ آنکھوں میں شدید اضطراب تھا، پھر لیکا یک کسی خیال کے تحت اس نے چونک کرہا شم کو دیکھا۔

”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر فارس نے واقعی وارث کا قتل کیا ہے اور وہ زمر کے سامنے اپنی کال میں اعتراض جرم بھی کر لے گا، تو بھی وجہ قتل کیا ہو گی؟ کم از کم اس سارے پلان میں مجھے وجہ قتل نظر نہیں آرہی۔“

ہاشم کے تاثرات قدرے سخت ہو گئے۔ اس کی آنکھیں سکر گئیں۔ اور ان میں ایک عجیب ساجدہ بلکورے لینے لگا۔ اس نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ابھی ابھی زرتاشہ والپس گئی تھی اور پھر دوبارہ ماں کی طرف رخ پھیرا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں رُشی پن سا تھا۔

”وجہ قتل سامنے ہے اور میں اس کو اس سب میں فٹ کر لوں گا۔ بھروسہ رکھیے۔ ہاشم ہر چیز سنبھال سکتا ہے۔“ جو اہرات بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ ہاشم سے پوچھ کر وہ جہل کیا بنا رہا ہے؟ لیکن پھر اس سے پوچھا نہیں گیا۔ دل پر پڑے بوجھ بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر دہاں سے آگئی۔

باہر آئی تو اور نگزیب لا اور نجی میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے جو اہرات نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ دیے ہیں سجائی اور بڑی تمکنت سے آکر بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ناگ پٹا ناگ رکھی۔ بازو صوفے کے ہتھے پر جمایا اور مسکرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

ان کے تین تاثرات مزیت گئے۔ قدرے مدافعانہ جارحیت سے وہ اس کو دیکھ کر بولے۔

”ہاشم سے کہو جلد از جلد یہ معاملہ ختم کرے۔ میں اس وقت اس طرح کا کوئی اسکینڈل افروذ نہیں کر سکتا۔“ جو اہرات نے مسکرا کر اثبات میں سر کشم دیا۔ کم از کم اس معاملے میں وہ دونوں متفق تھے۔



رستے دیار دل کے بھی کتنے عجیب تھے۔ سب راہرو تھے کوئی یہاں رہنما نہ تھا۔ انیکی کے باہر شام گھری ہو رہی تھی۔ بالائی منزل کے ماسٹر بیڈروم میں بیڈ کے کنارے بیٹھی زرتاشہ کے چہرے پر سوچوں کا جال تھا۔ وہ تھیلی پر نہوڑی گرائے انگلی پر سامنے کی لٹ لیٹیتی دور کسی غیر مرمنی نقطے کو دیکھ رہی تھی۔ باٹھروم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ کبھی کبھاروہ گردن موڑ کر اس طرف دیکھتی اور پھر دوبارہ سے خلامیں دیکھنے لگتی۔ اس کا ذہن منقسم تھا۔ ہاشم سے کی گئی باتیں زمر کا ذکر فارس کی غیر موجودگی، سب کچھ اسے بہت الجھار ہاتھا۔ اگر خاور کا پارٹی میں موجود نہ ہونا تناہم نہیں تھا تو پھر ہاشم نے بطور خاص اس بات کا ذکر کیوں کیا۔ پھر اس کو آتے دیکھ کر ان کے چہرے اتنے فن کیوں ہو گئے تھے؟ زرتاشہ کے پاس بہت سے سوال تھے جواب ایک کا بھی نہیں تھا۔ دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ وہ بیزاری سے اٹھی اور حکوم کر سائیڈ ٹیبل تک آئی۔ فارس کا موبائل نر رہا تھا۔ اور پکھا آرہا تھا ”میڈم زمر۔“

زرتاشہ کے لب بھیج گئے۔ آنکھوں میں عجیب سی ناگواری ابھری۔ چند لمحے وہ فون کو دیکھتی رہی، پھر جھپٹ کر اٹھایا۔ زور سے بٹن پر لیس کر کے کان سے لگایا۔

”جی فرمائیے؟“

”میں ڈسٹرکٹ پر اسکیو ٹرزر مریوسف بات کر رہی ہوں۔“ ”زمر کہتے ہوئے ذرا بھی۔“ ”مجھے فارس سے بات کرنی ہے۔“

”میں فارس کی بیوی بول رہی ہوں۔ آپ کو فارس سے کیا بات کرنی ہے؟“ ”زرتاشہ کا لہجہ تشك اور سرد تھا۔ زمر لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گئی۔

”فی الحال تو ٹھیک ہوں۔ لیکن جس طرح آپ میرے شوہر کے ساتھ بی ہیو کر رہی ہیں مجھے نہیں لگتا کہ اگلی دفعہ ہم اتنی ہی خوشنگواری سے بات کر سکیں گے۔“ لائن پر چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی۔ پھر زمر کی آواز ابھری تو اس میں گہرا تجویز تھا۔

”سوری۔ میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔“

”حال نکد آپ کو سمجھنا چاہیے تھا کہ میرا شوہر بے گناہ ہے۔ پھر بھی جس طرح آپ میرے شوہر کو بار بار مجرم ثابت کرنے پتلی ہیں، اس سب سے مجھے یہی لگتا ہے کہ آپ اس سے کوئی پرانا بدلا تار رہی ہیں۔ آخر میرے شوہرنے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟“ وہ بمشکل غصہ ضبط کر کے کہے جا رہی تھی۔ اتنے دنوں کا اندر ابلالا و کسی نہ کسی طرح پھٹھنا ہی تھا۔ دوسری جانب زمر چینبھے اور حیرت سے فون کو دیکھ کر رہا گئی۔ پھر اس کے تاثرات بھی خفت ہو گئے۔ آواز سپاٹ ہو گئی۔

”میں بالکل بھی نہیں سمجھ پار رہی آپ کس طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ میں صرف اور صرف فارس اور سعدی کی مدد کرنا چاہ رہی تھی۔ بہر حال جب فارس مجھ سے بات کرنے کے لیے فارغ ہو جائیں تو انہیں بتا دیجیے گا کہ انہوں نے کل مجھے اپنی ایلی بائی سے ملوانا ہے۔ اور ہاں ان سے کہیے گا کہ اگلی کال وہ ہی مجھے کریں گے کیونکہ میرے پاس فی الحال کرنے کا اور بہت سے کام پڑے ہیں۔“ کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ زرتاشہ طیش سے فون کو دیکھ کر رہا گئی۔ پھر زور سے واپس پھینکا۔ با تھر روم کا دروازہ کھلا تو وہ چونک کر مڑی۔ فارس باہر نکل رہا تھا، تو یہ سے گیئے بال رگڑتا، اس کی آنکھوں اور چہرے پر شدید اضطراب ساتھا۔ یقیناً اس نے یہ گفتگو نہیں سنی تھی۔ وہ قریب آیا تو زرتاشہ نے بمشکل چہرے کے تاثرات نارمل کیے۔ ہلاکا سامسکرائی۔

”میدم پر اسکیو ٹرکافون آیا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ آپ انہیں کال بیک کر لیں۔“ فارس نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ آنکھیں سیکنڈز کر اس کے تاثرات پر غور کیا۔

”اوکیا کہہ رہی تھیں؟“

”کچھ خاص نہیں۔“ وہ گھوم کر بیٹھ کے دوسری طرف چل گئی اور برش اٹھا کر بالوں میں اوپر سے نیچے پھیرنے لگی۔ البتہ چہرے پر ہلکی گھبرائی تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ فارس جیسے آدمی کو دھوکا دینا کم از کم زرتاشہ کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ رخ پھیر کر پیشی آئینے میں اس کو دیکھتی رہی۔ فارس اب فون ملا کر اسے کان سے لگا رہا تھا۔ پھر پلٹ کر وہ کمرے سے ملحقة بالکوئی میں جا کھڑا ہوا۔ زرتاشہ کی سماعتیں دیں گی تھیں۔ بالوں میں ہیر برش پھیرتا ہا تھر کر گیا۔

”جی السلام علیکم! میدم کیسی ہیں آپ؟ آپ کافون آیا تھا۔“ اسے فارس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہیر برش رکھ کے دبے قدموں انھی اور چوکھت میں جا کھڑی ہوئی۔ فارس کی اس کی طرف پشت تھی۔ سامنے لان نظر آتا تھا اور اس کے پار ہاشم کے کمرے کی بالکوئی۔ ہاشم کا کمرہ ہمیشہ ہی اوپنچائی پر ہوتا تھا اور ان کا کمرہ نشیب میں۔ یہ فرق زرتاشہ کو آج پہلے سے زیادہ محسوس ہوا تھا۔

”جی شیور میم! میں کل آپ کو اس سے ملوادوں گا۔ ناکم اور جگہ میں آپ کو نیکست کر دیتا ہوں۔“

”او کے“، فارس شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ مگر دوسری جانب سے غالباً خشک لمحے میں کی گئی بات کاٹ دی گئی تھی تبھی وہ خاموش ہوا، پھر فون بند کر دیا۔ جب وہ پلٹا تو زرتاشہ کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ اس نے بظاہر انجان سی بن کر پوچھا۔ دل البتہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ فارس فون بند کرتا آگے آیا، ذرا انہے چاک کئے خود بھی کچھ الجھا ہوا ساتھا۔

”کل مجھے انہیں اپنی ایلی بائی سے ملوانا ہے۔ اس کا بتار ہاتھا۔“ پھر خاموش ہو گیا، جیسے اسے بھی زمر کے خشک جواب پر پہلے سے ۱۰ نیزت ہوئی تھی، یا پھر شاید اسے برالگا تھا۔ کیا واقعی زمر اس کو مجرم سمجھ رہی تھی؟

”کیا آپ کو یہ لگتا ہے کہ ڈی اے آپ کو مجرم سمجھتی ہے؟“ زرتاشہ ذرا کی ذرا احتیاط سے اس کا پھرہ دیکھتی قریب آئی۔ وہ جو بیڈ کے انار سے بیٹھ گیا تھا، چونکہ کرس اٹھا کر اسے دیکھا۔ چہرے کے تاثرات ذرا نرم پڑے۔ آخر وہ اس کی یہی تھی، اس کی سوچ پڑھ سکتی تھی۔ اس نے، ہم سا ثابت میں سر ہلایا۔ ”شاید۔“

زرتاشہ کو ذرا تقویت ملی۔ گردن اٹھا کر پہلے سے زیادہ اعتماد سے وہ قریب آئی۔ اس کے کندھے پر نری سے ہاتھ رکھا۔

”زمر جو بھی کہے، میں جانتی ہوں آپ نے کچھ نہیں کیا اور میں جانتی ہوں کہ آپ مجرم نہیں ہیں۔ یقیناً کوئی اس میں آپ کو پھنسا رہا ہے۔“ فارس کے تاثرات کی نری بڑھتی تھی۔ اس نے ہلکا سامسکرا کر سر کو ختم دیا ایسی مسکراہٹ جس میں سوگواریت بھی تھی اور زخم پن بھی۔

”تھینک یوز رتاشہ! تمہاری سپورٹ میرے لیے بہت منی رکھتی ہے۔“ وہ بھی جو ایسا مسکرا دی۔ البتہ وہ پہلے سے زیادہ مضطرب تھی۔ اس کو کیا پیر ٹنگ کر رہی تھی؟ ہاشم کا ایک بے معنی بے سب ساجھل؟ کیا اسی یہی زرتاشہ کو ٹنگ کر رہا تھا؟

اس نے سر جھکنا چاہا مگر سوچوں کو جھکنا اتنا آسان نہ تھا۔

ڈریگ میل کی دراز میں میری ایجیو کے ہاتھ بھجوائی گئی ویڈیو سی ڈی رکھتی تھی۔ چونکہ شہریں نے بھجوائی تھی اس لیے خاور کو پتا نہیں پہل سکا، اور نہ ہاشم کو۔ اس نے سوچا کہ وہ کل اسے دیکھے گی۔ ہاں کل!

.....❖❖❖.....

لمحوں سے اب معاملہ کیا ہو ..... دل پر اب کچھ گزر رہا بھی نہیں

جس وقت زمر نے فارس کا فون بند کیا، وہ گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی بیزاری اور قدرے ناگواری تھی۔ موبائل پس میں رکھتے ہوئے وہ منہ میں کچھ بڑھا دی جیسے وہ اس سارے کھڑاک سے ٹنگ آ رہی تھی، مگر سعدی... صرف سعدی کے لیے اسے یہ سب کچھ عرصہ مزید برداشت کرنا تھا۔ پتا نہیں شادی کے بعد کیا ہو گا؟ اف.....!!

میں ڈور کھول کر وہ راہداری میں آئی۔ پھر ڈرائیگ روم کے قریب سے گزرتی وہ تھیری۔ جانی دار پردے کے پار مہمانوں کی باتیں اور چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ ذرا اوٹ میں ہو کر اس نے دیکھا۔ یہاں سے صرف سامنے صوفے پر بیٹھا حماد کھائی دے رہا تھا۔ خوش شکل سانو جوان جس کی آنکھوں پر گلاسز تھے مگر اس وقت وہ قدرے غیر مطمئن سی صورت حال میں بیٹھا ہوا تھا۔ باقی اس کی والدہ کا چہرہ تو یہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا، مگر ان کی آوازوہ بہر حال سن سکتی تھی۔ وہ بڑے ابا سے کہہ رہی تھیں۔

”ہمیں بخوبی احساس ہے کہ آپ کے خاندان کی بہت قربی وفات ہوئی ہے۔ لیکن آپ بھی خیال کیجیے کہ ہمارے کارڈ زبٹ چکے ہیں۔ ہمارے سارے مہمان آچکے ہیں۔ کتنے ہی لوگوں نے باہر سے آنا تھا، وہ چھٹی لے کر آئے ہیں۔ وہ اس سے زیادہ تھہر بھی نہیں سکتے۔ ایسے میں ہم بھی مجبور ہیں۔“

”میں بالکل سمجھ سکتا ہوں آپ کی ساری بات۔ میں آپ کو شادی آگے کرنے کا بھی نہیں کہ رہا۔ شادی اسی دن ہو گی جو کارڈ ز پکھا

”میں ایک ریسٹورنٹ کا ایڈر لیں ایس ایم ایس کر رہا ہوں جہاں پہاں وقت آپ کے شوہر ڈسٹرکٹ پر اسکیوٹر مزمر صاحب کے ساتھ لفج کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو خود آکر دیکھ لیں۔“

غیر شناس آواز میں کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ وہ ”ہیں ہیں“ کرتی رہ گئی۔ پہلے تو کچھ سمجھ دی نہ آیا اور پھر سمجھا نے پر وہ تیزی سے انھی۔ چھرے پہ شدید قسم کا طیش، غصہ اور ابھسن سی بکھر گئی۔ فارس نے اس سے ملنا ہی تھا یہ تو وہ جانتی ہی تھی، لیکن کسی ریسٹورنٹ میں لفج، یہ دو الفاظ اس کو بری طرح کھب گئے تھے۔ اور وہ زرتاش تھی۔ اس کو اپنے دل میں موجود شک کے کیڑے کو نکلنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔

اس نے موبائل اٹھایا اور فارس کو کال ملائی۔ ایک گھنٹی بجی، پھر دوسرا۔ اس نے فون اٹھایا۔

”ہاں زرتاشہ بولو؟“

”آپ کدھر ہیں؟“ قدرے پچکا ہٹ سے اس نے پوچھا۔ ساتھ میں اسے خود پر افسوس ہونے لگا، وہ کیسی کسی اجنبی کی کال پہ اعتبار کر سکتی تھی؟

”میں کام سے آیا ہوا ہوں باہر۔ کوئی کام ہے؟“

”نہیں۔ بس میں آپ کا پتا کرنا چاہ رہی تھی۔ آج آپ نے پر اسکیوٹر سے ملوانا تھا اس لڑکی کو وہ سب ہو گیا خیر سے؟“

”ہاں مگر میڈم ابھی تک نہیں آئیں۔ میں اور حسین علیشا کے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ہوٹل میں یعنی کہ.....؟“ اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فارس نے ”بائے“ کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ ایک دم کلس کر رہ گئی۔ پھر موبائل رکھ کر ایک نئے ارادے سے انھی۔

ہوٹل کے کمرے میں خادر تیار بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں گھڑی کی سو بیوں پہ تھیں۔ اپنے نارگٹ کے انتظار میں وہ لمحے گن رہا تھا۔ لیپ ٹاپ پہ ہاشم سے رابطہ میں الحال خاموش تھا۔ نہیں تھا کہ ہاشم دوسرا جانب موجود نہیں تھا، ہاشم بس چپ تھا۔ بالکل چپ۔ وہ دونوں منتظر تھے کی زندگی کی تحریر لکھنے کے لیے....

خادر کے ہوٹل کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں علیشا قدرے مضطربی کری پہنچی تھی۔ وہ دقتے دقتے سامنے خاموش بیٹھی حسین اور مقابل مضطرب سے ٹھیٹنے فارس کو دیکھتی۔ اس کے اپنے چھرے پہ بھی تفکر چھایا تھا۔

”میں عدالت نہیں جاؤں گی۔ میں خود کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔“ اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ فارس نے رک کر جیسے بہت ضبط سے اسے دیکھا۔

”کم از کم ابھی کے لیے تمہیں پر اسکیوٹر کے سامنے میری ایلی بائی مضمبوط کرنی ہے کیونکہ یہ سچ ہے، میں قتل کے وقت ادھر ہی تھا۔“

”لیکن میں عدالت نہیں جاؤں گی۔“

”وہ بعد کی بات ہے۔“

”مگر علیشا بے چین ہو رہی تھی۔“

حسین بھی تو تھی اس رات ہمارے ساتھ۔ کیا صرف حسین گواہی نہیں دے سکتی؟ اسے کوئی چیز بہت زیادہ پر یشان کر رہی تھی۔

”میں سولہ سال کی لڑکی ہوں، ان کی رشتہ دار ہوں۔ میں کریڈیبل (قابل اعتماد) گواہ نہیں ہوں۔“ حسین نے پہلی دفعہ گفتگو میں مداخلت کی اور وہ بھی کافی اعتماد سے۔ فارس اور علیشا دونوں نے اسے دیکھا۔ حسین نے شانے اپکائے۔

”ایلی مک بنیل، دی گذوانف، بوسٹن لیگل وغیرہ دیکھ کر اتنا تو پتا چل، ہی جاتا ہے۔“

”وہ سب ٹھیک ہے لیکن میں کہوں گی کیا؟ مجھے سب کچھ بہت عجیب سالگ رہا ہے۔ کہیں میں تو کسی مسئلے میں نہیں پڑوں گی؟“ علیشا اب بھی بچکار ہی تھی۔ ”کیونکہ اگر میں کسی مسئلے میں پڑی تو میں آپ کو ابھی سے بتا رہی ہوں میں اس سب سے نکل جاؤں گی۔“

”کم از کم آج کے لیے تم اس سب سے کہیں نہیں نکل رہیں۔“ فارس نے کافی خختی سے اس کا چہرہ دیکھ کر کہا جہاں ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ پھر گہری سانس لی۔ سامنے صوفے پر آ کر بیٹھا اور سمجھا نے والے مگردوں کے انداز میں بولا۔

”یہ نیت جیو والی کہانی پر اسکیوں ترکومت سنانا۔ تم اسکی نورست کے طور پر یہاں آئی ہو اپنی دوست سے ملنے بات ختم۔ سمجھ آئی؟“ علیشا کے چہرے پر ندامت سی پھیل گئی مگر اس نے سر ہلا دیا۔ ”اوکے۔“

فارس بے چینی سے اٹھ کر آگے پیچھے ٹھینٹنے لگا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ خین نے اس کی کیفیت دیکھ کر کہا۔

”آپ پھیپھو کو کال کر لیں۔“ فارس نے سر ہلا کر فون نکالا۔ کال ملا کر کان سے لگایا۔ گھنٹی جانے لگی۔

لمحتہ کمرے میں موجود خاور کے لیپ ناپ پر گسل آنے لگا۔ فارس کے نمبر سے کال جا رہی تھی۔ اس نے چند کیز دبائیں، کال کا روتہ کاٹا اور فارس کو فون بند ہونے کا پیغام ملے لگا۔ اس نے سر جھنک کر موبائل جیب میں ڈال لیا۔

”یقیناً وہ آرہی ہوں گی۔“ خین نے خاموشی سے سر کو ختم دیا۔ وہ اس کا روایتی میں فارس کا ساتھ ضرور دے رہی تھی، البتہ وہ خوش نہیں تھی۔ اسے زمر کا فارس کے اوپر شک کرنا علیشا کا اس سارے معاملے میں گھسیتا جانا، سعدی کی بے چینی، ہر چیز نا خوش کر رہی تھی۔ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر زمر صرف اس کی بات کا اعتبار کر لیتی مگر اس نے صاف بے رنجی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کیس میں کسی کی رشتہ دار نہیں ہے۔ خین نے یہ سب یاد کر کے ناگواری سے سر جھٹکا۔ آنکھیں ابھی تک سرخ، متورم تھیں۔ پہلے وارث ماموں کا غم، اور اس کے بعد شروع ہونے والا یہ عجیب سا پولیس، پچھری قانون کا چکر....

.....♦♦♦.....

مرحلے اور بھی تھے جاں سے گزرنے کے لیے ..... کربلا کس نے پس کرب و بلا بھیجی ہے زمر نے کار ریشورنٹ کے باہر روکی۔ موبائل اور پرس اٹھا کر باہر نکلی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ دروازے کے قریب میز پر ریزوڈ لکھا یہاں سے بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ ریشورنٹ کا گلاس ڈور کھول کر اندر آئی۔ ویژہ سے اس میز کے متعلق پوچھا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اسی کے نام ریزوڈ ہے وہ وہاں بیٹھ گئی۔ پھر گھڑی دیکھی۔ وہاں ابھی تک کوئی نہیں تھا۔ اس نے کافی آرڈر کی۔ اور پھر انگلیاں آپس میں مسلسل ہوئے انتظار کرنے لگی۔

کیا وہ واقعی ٹھیک کر رہی تھی؟ کیا واقعی اسے فارس کے ایلی بائی سے ملنے یہاں تک آنا چاہیے تھا؟ اصولاً تو فارس کو چاہیے تھا کہ وہ اس لڑکی کو اس سے ملوانے لے کر آتا۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ وہ اپنی جھت تمام کر لے۔ وہ سعدی کو دکھادے کہ وہ واقعی اس کے ماموں کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ لیکن کیا یہ سب دکھانے کا کوئی فائدہ ہو گا؟ کیا واقعی اس کے اوپر سے خود غرضی کا لیل اترے گا؟

ان تمام سوچوں سے سر جھنک کر زمر نے اپنی توجہ ویژہ کی طرف مبذول کی جواب کافی لا کر سامنے رکھ رہا تھا۔ جب تک اس نے کپ اٹھایا، سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ زمر نے چونکہ کرا دھر دیکھا۔ وہ زرتاش تھی۔ سیاہ لباس پر سرمی دو پتہ گردن میں لپیٹنے وہ خاموش نظروں سے دیکھتی قریب آئی۔ کری کھنچی، سامنے بیٹھی، کہیاں میز پر رکھیں، ہتھیلی پر ٹھوڑی نکائی۔ کافی کینے تو زن ظروں سے زمر کو دیکھنے لگی۔ زمر قدرے غیر مطمئن انداز میں کری کے کنارے پر آگے ہوئی۔ سر کے خم سے سلام کیا اور پوچھا۔

”فارس کہاں ہے؟“

زرتاش نے ہلکے سے شانے چکائے اور زمر کو پرستور ہنا پلک جھکے دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کیا آپ نے ابھی ان کے ساتھ لئے نہیں کیا؟“

”لئے؟ میں تو کافی دیر سے ان کا انتظار کر رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے یہاں بلوایا تھا، مجھے کسی سے ملوانا تھا۔“

”لیکن مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا۔ آخر کس سے ملوانا تھا ان کو؟“

”اپنی ایلی بائی سے قتل کے وقت وہ جس کے ساتھ تھے۔“ زمر کواب پکھ بہت برالگ رہا تھا مگر وہ اپنے محضوں سے بکھ پار رہی تھی۔

زرتاشہ کا روایہ جو عجیب نظر وہ اس کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کے لیے کچھ آڑ رکروں؟“ زمر نے کہتے ہوئے دیکھ کوا شارہ کیا۔ وہ قریب آیا تو زرتاشہ نے اس پر سے نگاہ ہٹائے بغیر محض جوں کا آڑ دیا۔ وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ زمر نے دوبارہ گھڑی دیکھی اور پھر موبائل کو۔ آخر فارس کہاں رہ گیا؟ اور آخر اس نے اپنی بیوی کو یہاں پر کیوں بلا لیا؟ اس کے دل میں تو کوئی گلست نہیں تھا، وہ تو اس کا پرانا استھوڈن تھا اور کچھ بھی نہیں۔ اور ہاں وہ سعدی کاماموں بھی تھا۔ مگر پھر بھی زرتاشہ کا انداز پکھ عجیب ساتھا جیسے وہ کوئی ”دوسرا“ نورت ہو۔

دوسری جانب زرتاشہ مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اندر کوئی لا اسا پک رہا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ فون زمر نے ہی اسے کروایا تھا۔ فارس پہ نکل، اور باقی سب وہ صرف فارس کی توجہ کے لیے اس کا گھر خراب کرنے کے لیے کر رہی تھی۔ اسے سامنے میٹھی گھنگھر یا لے بالوں والی کافی کامگ گھونٹ گھونٹ پیتی رہ کی بہت بڑی لگی۔

”آپ کی اور فارس کی منگنی ہوتے ہوئے رہ گئی تھی، یہ بچ ہے نا؟“ زرتاشہ نے اچانک سے سوال کیا تھا۔ زمر کو حیرت اور شاک کا ایک جھٹکا سالاگ۔ وہ یک نک اسے دیکھنے لگی۔ کپ میز پر آواز کے ساتھ رکھا۔

”زرتاشہ؟“ اندر ایک ابال ساتھا حیرت اور غصہ۔ بکشکل وہ ضبط کر پائی۔ ”آپ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔“

”آپ انکار کیوں کر رہی ہیں؟ فارس نے خود اس بات کی تصدیق کی تھی کہ وہ آپ سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن کسی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔“ ابڑا پچکا کروہ بولی۔ اس کے انداز میں جبلی تھی، معمصوم سی جبلی۔

زمر بالکل سن رہ گئی۔ اندر کوئی جوار بھانٹا سا پکنے لگا۔ اس نے ساتھا کہ کچھ مرد یو یوں پر دھاک بھانے کو کہتے ہیں کہ خاندان کی فلاں اور فلاں لڑکی مجھ پر مرتی تھی یا اور وہ۔ مگر فارس سے اس قسم کی بات کی توقع نہ تھی۔ اس کا دل مزید برا ہوا۔

”یہ انہائی احتمانہ بات ہے۔ ابھی فارس آنے ہی والا ہو گا۔ آپ میرے سامنے یہ بات ان سے پوچھ لجیجی گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری شادی تیار ہے۔ ایسے وقت میں اس قسم کی بات آپ کو کرنا اور مجھے سننا زیب نہیں دیتا۔“

وہ شدید برہمی سے بولتی رخ موز کر دوسرا جانب دیکھنے لگی۔ وہ دعویٰ تیں غلط وقت اور غلط موقع پر غلط موضوع چھیڑ بیٹھی تھیں۔

زرتاشہ نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

”جو آپ کہیں۔“

وقت گز زرتاشہ اور فارس کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ زمر نے کوئی دسویں دفعہ گھڑی دیکھی۔ پھر سرد لمحے میں زرتاشہ کو دیکھے بنابولی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ فارس وقت اور وعدے کا اتنا کچا ہے۔ اس وقت اس کو یہاں پر ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اور بھی بہت سارے کام کرنے ہیں۔“

”میں نہیں جانتی وہ کہہ رہیں۔“ زرتاشہ اب کے ذرا مادعا نہ انداز میں بولی۔ ”مجھے تو ان فیکٹ پتا بھی نہیں تھا کہ وہ ادھر آ رہے ہیں۔ میں تو یہاں شاپنگ کرنے آئی تھی۔ آپ کو دیکھا تو ادھر آ گئی۔“

وہ لمحے بھر کوئی۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ اگر فارس ادھر آ گیا اور اسے یہاں دیکھا تو پھر کس طرح وضاحت کر پائے گی؟ کیا پتا نے یہ سب اس کو فارس کی نظر وہن سے گرانے کے لیے کیا ہو۔ مجھے کوڈ را دھیما کر کے اس نے بات جاری رکھی۔

”کل انہوں نے ذکر کیا تھا کہ انہیں آج آپ سے ملنا ہے اسی لیے میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں آنے والے ہوں گے۔“ زمر نے اس لی ہات کو اہمیت نہیں دی۔ وہ اسی طرح نظر انداز کیے دوسرا جانب دیکھتی رہی۔ اس کی فضول اور احتمانہ با توں پا بھی تک اسے غصہ آ رہا تھا۔ اس کوئی مذاق تھا تو بہت برا مذاق تھا۔

اور تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ فارس کا نمبر آ رہا تھا۔ زمر نے کال انھائی اور خشک لمحے میں بولی۔

”آپ کدھر ہیں فارس؟ میں آپ کا کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔“ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر آواز ابھری۔

”زمر آئی ایم سوری۔“

ہاشم نے لیپٹاپ پہ ابھرتے الفاظ سے اور تھکے تھکے انداز میں سر کر سی کی پشت پر گردایا۔

”بھی؟ آپ نہیں آ رہے؟“ زمر نے کہا گر بیوں لگتا تھا وہ سن نہیں رہا۔ وہ کہہ رہا تھا جو اسے کہنا تھا۔ کچھ عجیب تھا اس کے انداز میں۔

اُر کر بولتا بے تاثر سانداز مشین، آٹو میک۔

”میں تمہارے قریب ہی ہوں زمر! لیکن میں یہاں پر آ نہیں سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ مجھے تمہیں اپنی ایلی بائی سے ملوانا تھا کیونکہ صفت ہی ہو جسے میرے قاتل ہونے پر شک ہے۔ مگر میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے۔“ زمر دھک سے رہ گئی۔ اس نے بے اختیار فون کو گھورا اور پھر دوبارہ کان سے لگایا۔

”فارس مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ (اسے کب شک تھا فارس پر؟ وہ سوال جواب تو تفییش کا حصہ تھے۔ وہ

ایسا بامان گیا تھا)

ہاشم میز کا سہارا لیے کر سی سے اٹھا اور پھر اسی کر سی کے قدموں میں اکڑوں بے دم سا بیٹھ گیا۔ میز کی اوٹ میں چھپ کر سر دنوں ہقصوں میں گرا لیا۔ مگر فارس زمر کی بات سننے کے لیے بھی نہیں رکا۔ وہ کہہ جا رہا تھا۔

”اور چونکہ میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وارث غازی کا قاتل میں ہی ہوں۔ اور میں اسے اپنی نیس مارنا چاہتا تھا لیکن مجھے ایسا کرنا پڑا کیونکہ وہ میری بیوی کے ساتھ مل کر مجھے دھوکا دے رہا تھا۔“ زمر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے پہلی سے سامنے بیٹھی زرتاش کو دیکھا جس کا جوں آ گیا تھا اور وہ اسٹر اس میں گھماتی کچھ مکس کر رہی تھی، مگنی سی۔ فارس کی بات پر اس سے ادا راجلن کا شکار، مگر پھر بھی اس کے چہرے پر ایک معصومیت تھی، بیکانہ انداز۔

”فارس آپ.... آپ کہاں ہیں؟“ اسے لگا وہ مذاق کر رہا ہے۔“

ہاشم اسی طرح بند آنکھوں کو انگلیوں سے مسلتا، سرخٹوں میں دیے بیٹھا رہا، کرب سا کرب تھا۔

”آئی ایم سوری زمر! مگر میں وہاں ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے۔ مجھے اپنی بیوی اور اپنے بھائی دونوں کو ختم کرنا تھا۔ ایسا کیے بغیر مجھے بھی سکون نہیں آئے گا۔ اور ہر چیز تجھ سچا جا رہی تھی۔ میں سارا شک وارث کے متعلقہ کیس پڑالنے میں کامیاب ہو رہا تھا مگر مجھے ایسا لگا کہ ہمیں مجھ پر شک ہے تو میں نے سوچا کہ میں شک کی تصدیق کروں۔ میں تمہیں بتا دوں کہ میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے۔ تم اس کیس کی ایسا بھی فرہو۔ سوائے تمہارے ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وارث غازی قتل کیس میں سب سے زیادہ بھاگ دوڑ میں کر رہا ہوں تو میں بے گناہ ہوں۔“ اسے تمہارے کوئی بھی مجھ پر شک نہیں کر رہا۔ اب ایسی صورت میں جبکہ تم وارث غازی کی متعلقہ فائلز نکلوانے کے لیے کورٹ سے آرڈر لینے چاہی ہو، اگر کوئی تمہیں گوئی مار دے تو سب کا شک اس متعلقہ کیس تک جائے گا۔ جس کی وارث تفییش کر رہا تھا۔ فارس غازی پر کبھی کوئی شک

نبیں کرے گا اور رہی زرتاش تو تم اصل نارگست سمجھی جاؤ گی اور وہ صرف کوئی تریل ڈیکھ۔“

”فارس آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے کچھ سمجھنیں آ رہا۔ فارس کیا آپ میری بات سن رہے ہیں؟“، زمر نے گھبرا کر بمشکل کہنا چاہا۔ اس کے ارد گرد جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔

ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ اسے میز کا اندر ورنی خلانظر آ رہا تھا۔ اندھیرا، گھنن۔ اس نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔ سرمزید اندر کر لیا۔ اوپر کے لیپٹاپ سے آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔

”زمر میں تمہیں کال کر کے صرف ایک بار مغدرت کرنا چاہتا ہوں۔ میں بالکل بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا مگر میں مجبور ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ لیکن تمہیں بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا، صرف ایک گولی۔ دل میں۔ اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

زمر کرنٹ کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فون کان سے لگائے اس نے بدھوای سے ادھرا دھر دیکھا۔ زرتاش بھی سراخا کر اچنچھے سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ ریسورٹ تقریباً دیران تھا۔ اس کے پار اوپری بلڈنگز تھیں، ہولڈنگز تھے۔ یہیں سامنے والے ہوٹل میں تو فارس نے اسے بلا یا تھا، پھر اچانک سے چیخ آف پلان.... اچانک سے سب کچھ..... وہ بالکل بھی سمجھنیں پا رہی تھی۔ اور فارس کے جارہا تھا۔

”میں یہ سب اس لیے تمارا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں یہ میری تم سے آخری گفتگو ہے۔ اور اس آخری گفتگو میں میں تمہیں اپنی حقیقت بتانا چاہتا تھا۔ زرتاش اور تمہارے مرنے کے بعد میں جانتا ہوں مجھے سکون نہیں ملے گا، لیکن کم از کم میں اس قانونی کارروائی سے نجی جاؤں گا۔ آئی ایم سوری زمر!“

”فارس تم کدھر ہو؟ پلیز مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ جس طرح بھی ہوا میں تمہاری مدد کروں گی۔“، زمر بے چینی سے جلدی جلدی کہے جا رہی تھی۔ حالات کی نزاکت بھانپ کر اسے جو بھی کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ ”میں تمہارا کیس لڑوں گی۔ تم نے جو بھی کیا، اس سب کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ میں کوئٹہ میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں گی۔ تم جو بھی مجھے کہہ رہے ہوئے یہ سب اثارنی کلاسٹ پر یونٹ کے تحت محفوظ رہے گا۔ میں تمہاری اثارنی ہوں فارس! میری بات سنو۔“، مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ اسی طرح باتیں کیے جا رہا تھا، بالکل کسی رو بوت کی طرح۔ جیسے اسے زمر کی کسی بات میں دلچسپی نہ ہو۔

”اپنی جگہ سے بہنا مت۔ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم بدھوای ہو، مگر بالکل بھی مت ہلناؤ رہنے تمہیں تکلیف ہوگی۔ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا، دل میں۔ باقی میری بے وفا یوئی کے لیے ہیں۔“، خاور نے M95 barrett کی نال میں سے ایک آنکھ بند کیے جھانکا۔ نشانہ سیٹ کیا۔

”فارس پلیز ایسا مت کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ میں تمہارا کیس لڑوں گی۔ پلیز میری بات سنو۔“، اسے لگا وہ منت کر رہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے ڈی اے؟“، اس نے پوچھا مگر زمر کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ اسی طرح کھڑی فون کان سے لگائے فارس کی منت کر رہی تھی۔

”پلیز فارس! میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایک اچھے انسان ہو۔ تمہارے اندر اچھائی ہے۔ ہر شخص کے اندر ہوتی ہے، ہمیں صرف اس کو باہر لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں یاد ہے یہ میں نے تم سے کہا تھا۔ پلیز میں تمہاری ٹیچر رہی ہوں۔ میری شادی ہونے والی ہے۔“، اس نے کبھی زندگی میں کسی کی اتنی منت نہیں کی تھی۔ ایسے کسی کے سامنے نہیں گزر گز اُنی تھی۔ مگر وہ اس کی سن ہی نہیں رہا تھا۔

آئی ایم سوری زمر! مگر مجھے ایسا کرنا ہے۔ یہ سب بتانے کے بعد میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ آئی ایم سوری...، اور وہ اس کے ماتھ بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر کاب کے زمراں نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسی طرح بھیتی آنکھوں کے ساتھ مسلسل اسے کہے جا رہی تھی۔

”فارس! میں تمہاری ٹیچر ہی ہوں۔ میں سعدی کی پچھو ہوں۔ میری شادی ہونے والی ہے۔ پلیز میرے ساتھ اس طریقے کرو۔ اپنی بیوی کے ساتھ اس طرح مت کرو۔“ زرتاشہ ہکابکا سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زمر فارس سے سب کیوں کہہ رہی ہے۔

”فارس! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ پلیز میری بات سنو۔ تم یاد کرو میں تمہاری ٹیچر ہوں۔ میں نے تمہیں پڑھایا ہے۔ میں سعدی کی پچھو ہوں۔ تم میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں کر سکتے۔ تم میرے پاس آؤ۔ ادھر آؤ۔ میں تمہارا دیت کر رہی ہوں۔ ہم اس بارے میں بات کریں گے۔ جو بھی بات تمہیں کرنی ہے، ہم کریں گے۔ میں تمہارا کیس بڑوں گی۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی فارس! تم صرف میری بات سنو۔“ لیکن اب فارس کی طرف سے خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ سانس لینے کی آواز تک نہ تھی۔

خاور نے انگلی ٹریگر پر رکھے، کان سے لگے ہینڈ زفری میں کہا۔ ”سر! آر یو شیور آپ اگلے الفاظ سننا چاہتے ہیں؟“ میز کی اوٹ میں زمین پر بیٹھے ہاشم نے اثبات میں سرہلا یا۔ ”ایک ایک لفظ۔“ اس کی تھنی سے بیچی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”کیا تم اس کو دیکھ سکتے ہو خاور؟“

”یہ سر۔ ابھی میں سینڈ ہیں۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ میں ہیں۔ ذی اے گھبرائی ہے۔ مگر وہ ایک بہادر عورت ہے، وہ بھاگے گی نہیں۔ وہ آخری سانس تک فارس کو کونیں کرنے کی کوشش کرے گی۔“

”اس کے چہرے پر اس وقت کیا ہے خاور؟“ وہ شدت سے کپٹی مسلسل رہا تھا۔ سر میں عجیب درد اٹھنے لگا تھا۔

”نہ خوف نہ پریشانی۔ صرف شاک اور بے یقینی۔“

”پیچے ریسٹورنٹ میں زمر کے سامنے کھڑی زرتاشہ کو اب فکر ہونے لگی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟ آپ فارس سے کیا کہہ رہی ہیں؟ وہ کھڑا ہے؟“ مگر زمر کو اس وقت کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ وہ فوراً زرتاشہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے بھاگ جائے مگر دل کو ابھی بھی یقین تھا کہ فارس ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے آخری کوشش کرنی چاہی۔

”فارس پلیز تم کچھ ایسا ملت کرنا جس پر تم پچھتا تو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہارا کیس بھی بڑوں گی اور میں تمہیں سپورٹ بھی کروں گی۔ پلیز فارس! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ فارس پلیز میری شادی ہونے والی ہے۔ میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔ اپنی بیوی کے ساتھ ایسے مت کرو۔ فارس.... فارس؟“

خاور نے ٹریگر بادیا۔ ایک دو تین، چار.... تاک تاک کر....

اور زمر نے محسوس کیا کہ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا ہے۔ وہ فرش پر جا گرا مگر آواز نہیں آئی۔ زمر کو اس وقت کسی بھی چیز کی آواز نہیں آئی۔

بس یوں لگا کر کو کچھ چیز کر لکا ہے۔ ایک دو تین... کوئی برچھی تھی جس پر آگ لگی تھی، کوئی عجیب سا حساس درد بے پناہ درد۔ اس نے جھک کر میز کے کنارے کو دونوں ہاتھوں سے تھامنا چاہا۔ مگر تو ازن برقرار نہیں رکھ پا رہی تھی۔ زرتاشہ کی آنکھیں جیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ زمر نے دیکھا وہ کھڑی تھی۔ زمر کو اب وہ اونچائی پر گل رہی تھی کیونکہ وہ خود گرتی ہی جا رہی تھی۔ اس نے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا، اس نے زرتاشہ کو گرتے دیکھا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر جا گری۔ اسے ماربل کا فرش اپنے گال سے نکلا تھا محسوس ہو رہا تھا۔ خندنا فرش، سخت سے سخت دل جیسا ٹھنڈا۔ اس کے علاوہ زندگی میں ہر احساس ختم ہو چکا تھا۔ ہاں شاید کوئی اس کے آس پاس تھا، کچھ سرخ مرخ ساختا،

کوئی سرخ سی شستھی جواس کی کمر سے نکل کر اس کے ارد گرد بکھر رہی تھی۔ سفید ماربل کے فرش پر اس کے ہاتھوں پر اس کے چہرے کے قریب وہ بہتی جا رہی تھی۔ وہ پانی نہیں تھا، وہ پانی سے گاڑھا تھا۔

ہاشم کے آفس میں اب خاموشی چھائی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں، شش تگی سے الھا، تھکا تھکا سا کری پر بیٹھا، لیپ ناپ بند کیا اور ست روی سے انٹر کام اٹھا کر بولا۔

”حیلہ! ایک کپ کافی لاوہ اور پھر جب تک میں باہر نہ نکلوں، کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ میں کچھ وقت تہارہنا چاہتا ہوں۔“ پھر آنکھیں بند کر کے سریٹ کی پشت سے نکادیا۔

سوگ کی ایک سپہر زمر یوسف کے نام از رتاشہ غازی کے نام!  
”تمہیں کسی جنت میں رہنے کا شوق تھا زرتاشہ! تمہاری یخواہش بھی فارس کی جگہ میں نے پوری کی۔“

❖❖❖

وقت کے کتنے ہی دھاروں سے گزرنا ہے ابھی..... زندگی ہے تو کئی رنگ سے مرنा ہے ابھی  
ہر شے اندھیرتھی۔ پلکوں پر بہت بوجھ تھا۔ بمشکل اس نے اس باڑ کو آنکھوں سے ہٹانا چاہا۔ سفید روشنیوں والی چھٹتھی۔ اردو گرد لوگ تھے۔ اپنے اوپر سفید چادر تھی۔ کیا یہ زندگی کا اختتام تھا یا پھر ایک نئی زندگی کا آغاز تھا؟

بازوؤں میں سویاں تھیں اور اس سے زیادہ چھبتا ہوا حساس دل میں تھا۔ زمر نے دو تین دفعہ پلکیں جھپکیں۔ کچھ دھنڈ لے دھنڈ لے سے وجود اپنے سرہانے کھڑے نظر آئے۔ ایک گھنگھریا لے بالوں والا لڑکا تھا، ایک عورت تھی فربی مائل۔ وہ رورہی تھی۔ اس کو جاگتے دیکھ کر روتے ہوئے وہ مسکرائی۔ زمر نے مسکرانا چاہا، کچھ کہنا چاہا۔ مگر بلوں سے بس یہی الفاظ لٹکے۔ ”فارس کہاں ہے؟“

گھنگھریا لے بالوں والا لڑکے نے سر جھکا دیا۔ اس کی آنکھیں بھی شاید گلابی تھیں جیسے وہ رویا ہو۔ ابھی نہیں، بہت پہلے رویا ہو۔ اب اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ وہ نرمی سے اس کے اوپر جھکا، اس کے ماتھے سے بال بلکے سے ہٹانے اور آہستہ سے بولا۔

”زمر! کیا آپ مجھے دیکھ سکتی ہیں؟“ اور وہ اس کو دیکھ رہی تھی بنا پلک جھپکے۔ اس نے ہمکی سی آواز میں صرف اتنا پوچھا۔ ”فارس کہاں ہے؟“ کسی نے جواب نہیں دیا۔ شاید آگے پیچھے کوئی اور لوگ بھی تھے۔ ہاں اس کی بائیں طرف ایک لڑکی بھی کھڑی تھی، ماتھے پر کے بال اور گلاسز والی۔ لیکن زمر اس کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ گھنگھریا لے بالوں والا لڑکے کے ہوتے ہوئے وہ اس لڑکی کو کم ہی دیکھا کرتی تھی۔ وہ دوبارہ اس کے اوپر جھکا۔

”آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ کیا آپ کوئی تکلیف ہو رہی ہے؟ کیا میں ڈاکٹر کو بلاوں؟“  
اس نے ہلکا سطہ پوچھا، اتنا ہلکا کڑکے کو سننے کے لیے کان اس کے چہرے کے قریب لے جانا پڑا۔  
”فارس کہاں... ہے؟“

پھر اندر ہیسا دوبارہ چھانے لگا۔ ساری دنیا کا نور چلا گیا۔ سیاہی پر سیاہی کے پردے تھے۔ اس کا دماغ پانی پر بہتے پر کی طرح ہلکا اوپر کھینص دو راٹتا گیا۔

دوبارہ آنکھ کھولی تو چہرے بدلتے تھے۔ اب صرف لڑکا کھڑا تھا۔ بائیں طرف شاید کوئی اور بھی تھا، مگر بائیں طرف والوں کو وہ کم دیکھا کرتی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ کھڑے لڑکے پر نگاہیں مرکوز کیے لب ہلائے تو وہ پھر سے جھکا۔ اب اس کا لباس بدلا ہوا تھا۔ شاید وہ کوئی اور دن تھا۔

”آپ کیسی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

اس کے لب ہلکے سے پھر پھڑا۔ ”فارس کہاں ہے؟“ لڑکے کے چہرے پر کرب سامنہ رہا۔ اس نے سر جھکا کر اٹھایا۔

”ان کی وائے...“ وہ رکا۔ زمریک نک اسے دیکھتی رہی۔ اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائے کو بھی گولی گئی تھی۔ وہ نہیں رہیں۔“ وہ بمشکل بول پایا۔ شاید اس کے لگلے میں کوئی چیز ایکجی تھی ایسا پانی یا کچھ ایسا جو پانی ہے جو اس کا زھا تھا۔

”زرتاشہ مرگئی؟“ اس کی آنکھوں میں استعجال ابھرا۔ یک نک وہ سعدی کو دیکھتی رہی۔ سعدی نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلا�ا۔ وہ اپنی نہ اس کو اس موقع پر بنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ پھر چھو سے جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔

”فارس کہاں ہے؟“ اس نے پھر پوچھا مگر انہیں ہیرے بڑھتے گے۔ عجیب سے انہیں ہیرے تھے۔ وہ نہ کچھ سننے دیتے نہ کچھ بولنے پڑتے۔ ملکیں بھی اٹھانے نہیں دیتے۔ وہ دوبارہ اسی کھائی میں ڈوبتی چلی گئی۔ پھر آنکھ حکلی تو منظر بدلا ہوا تھا۔ اب کے اس کا چہرہ باہمیں طرف لٹکنے لگا۔ بالوں والا لڑکا نجا نے کہاں تھا۔ باہمیں جانب لڑکی کھڑی تھی، گلاسز والی خاموش مگر روئی کوئی آنکھوں والی۔ وہ اس کو پہچانتی تھی۔ جانی تھی یا نہیں یہ اس کو ابھی نہیں معلوم تھا۔ اس نے انہی دیران آنکھوں سے اس کو دیکھا اور لوبوں پر صرف ایک ہی سوال تھا۔ ”فارس اہاں ہے؟“

”وہ آئے تھے آپ کو دیکھنے صبح۔ علیشا بھی آئی تھی۔ ہم اس دن آپ کا انتظار کرتے رہے۔ ہمیں نہیں پتا تھا یہ سب ہو جائے گا۔“ وہ دل ٹکرایا۔ اس کی آواز مدھم تھی۔ اس میں ہمدردی تھی، شاید کہیں پیار بھی تھا۔ زمر بس اس کو دیکھ رہی تھی۔ لڑکی قریب جھلکی۔

”پھر ہوا آپ...“ وہ رکی، پھلچائی۔ ”آپ نہیک ہیں؟ ڈاکٹر کو بلاوں؟“

”فارس کہاں ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔ اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے رہا تھا۔

”اکھی شاید وہ گھر پہ ہیں۔ وہ بہت اپ سیٹ ہیں۔ بہت زیادہ ٹوٹ گئے ہیں۔“ اور زمریک نک اسے دیکھتی رہی۔ اسے سب اتنا۔ انہیں کھائیوں میں یادداشت کی روشنی ہر شے از سرنو زندہ کر لائی تھی۔ اسے ایک ایک چیز یاد تھی۔ دل میں اٹھتا درد پہلے سے بڑھ گیا۔ اور پھر اس نے ملکی سی گاہ جھکائی۔ اسے اپنے اوپر سفید چادر پری دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے نگاہ پھر سے جنین کے چہرے پر کی۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ جنین خاموش رہی۔ اس نے نظر اٹھا کر سامنے کسی کو دیکھا جیسے کوئی سگنل مانگا ہو۔ شاید جواب نہیں میں تھا تبھی وہ زمر کو دیکھنے لگی۔

”میرے گردے ضائع ہو گئے ہیں، ہے نا؟“ شاید اس نے خود ہی کچھ سنا تھا، شاید نہیں بے ہوشی میں اس نے کچھ سنا تھا۔

”آپ کے گردے...“ وہ رکی ”متاثر ہوئے ہیں۔“

اس سے زیادہ مہذب الفاظ اس کو نہیں ملے تھے۔ زمر کے چہرے پر حیرت نہیں آئی۔ دکھ بھی نہیں ابھرا۔ شاید وہ اپنی حالت بے ہیں۔ ایسا کچھ سن چکی تھی، شاید وہ کئی دفعہ سن چکی تھی۔ سبقنا وہ جانتی تھی، وہ صرف تصدیق چاہ رہی تھی۔ اب کے اس نے ملکی سی گردن سیدھی ل۔ ہاں اتنا سے یاد تھا کہ دوبارہ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے گردن سیدھی کی تھی۔ اب نہ وہ داہمیں تھیں، نہ بامیں، درمیان میں تھی، معلق۔

سیاہ تار کوں جیسی چادر اب کے سر سے سرکی تو وہ پلکیں، بہتر طور پر جھپک پا رہی تھی۔ فربی مائل خاتون اس کے سر بانے اب کھڑی ہیں۔ اس نے ملکا سا ہاتھ اٹھانا چاہا تو انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بہت محبت سے اس سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ کیسی ہے؟ کیا کھانا پسند اے کی؟ کیا اسے کہیں تکلیف ہے؟ کیا وہ ڈاکٹر کو بلا کیں؟ کیا وہ اسے پانی دیں؟ وہ بس ان کو دیکھئے گئے اور جب بولی تو سر گوشی میں۔

”فارس کہاں ہے؟“ ندرت کی آنکھوں میں اچنچھا سا ابھرا۔ زمر کا اس سے ایسا کوئی تعلق تھا تو نہیں جو وہ بار بار پوچھتی۔ شاید

بہر حال زبردست مسکراتے ہوئے قریب آئیں۔

”وہ گھر پر سے۔ شام کو آئے گا ادھر تمہیں دیکھئے۔ وہ بھی بہت پریشان ہے اس سب سے۔ بلکہ پریشانی تو ایک بہت چھوٹا لفظ ہے۔“ زمریک نک ان کو دیکھتی رہی۔ ہربات ہر لفظ اسے یاد تھا اور پھر ایک دم سے وہ جو نکی۔ بدقت تمام اس نے گردن ادھر گھمائی۔ اس نے ان چند دنوں میں.... پتا نہیں کتنا دن تھے وہ سب کے چہرے دیکھے تھے۔ گھنگھر یا لے بالوں والا لڑکا، عینک والی لڑکی وہ فربی مائل خالتوں۔ صرف ایک چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ بے خوف اور وحشت سے اس نے رخ ندرت کی طرف پھیرا۔

”ابا، ابا کدھر ہیں؟“ ندرت کی آنکھوں سے آنسو بلنے کو بے تاب ہو گئے۔ اسے لگا کہ وہ کوئی اور خبر سننے جا رہی ہے، کوئی ایسی خبر جس کو سننے کے بعد اس کا دل بھی کام کرنا چھوڑ دے گا۔ اس نے کہنیوں کے بل انھنا چاہا مگر نہیں اٹھ سکی۔ جسم میں درد تھا، شدید درد۔ بے حد کرب سے اس نے دوبارہ پوچھا۔

” بتائیے ابا کہاں ہیں؟ جب تک آپ مجھے سچ نہیں بتائیں گی میرا دل انکار ہے گا۔“ مگر ندرت خاموش تھیں۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔ پھر چہرہ موڑا، شاید آنسو پوچھنے کی کوشش کی۔

”کیا ابا بھی مر گئے؟“ اس کے لبوں سے نکلا۔ ندرت نے تزپ کے رخ اس کی طرف پھیرا۔ آنسوؤں کو ابلنے دیا مگر انہیں میں سرہلایا۔

” نہیں۔“ وہ رکیں ”وہ اب ٹھیک ہیں۔“ پھر چپ ہو گئیں۔

” اب.... اب سے کیا مطلب؟ نہیں کیا ہوا تھا؟“ وہ انک کر بول رہی تھی۔ انھنا بھی چاہتی تھی مگر انھنہیں سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر ترپ تھی۔ ایسا لگتا تھا بس وہ کسی طرح سب کچھ چھوڑ کر اس کمرے سے بھاگ جائے، اس اپتال کے کمرے سے بھاگ جائے۔ مگر وہ جیسے مفلونج سی ہو کر رہ گئی تھی۔

” کدھر ہیں ابا؟“ الفاظ بمشکل حلق سے نکل رہے تھے۔

” ان کو فانچ کا ایک ہوا تھا مگر اب وہ ٹھیک ہیں۔ وہ گھر پر سے۔“ ہم انہیں اپتال نہیں لاسکتے۔ اب وہ ٹھیک ہیں زمراتم پریشان مت ہو۔“ ندرت نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو تسلی دی۔ وہ یک نک ان کو دیکھے گئی بالکل خاموشی سے، جیسے ساری دنیا ختم ہو گئی۔ اور انھنے کوشش ختم کر دی اور سر مذہل طریقے سے تیکے پر گردایا۔

” میرے ابا مفلونج ہو گئے؟ میرے حادثے کی وجہ سے؟ میرے ابا مفلونج ہو گئے؟“ اس نے ندرت سے سوال نہیں کیا تھا۔ خالی نگاہوں سے چھت کو دیکھتے خود کوتایا۔

ندرت کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔ زمرکی گردن اب سیدھی تھی۔ ایک دفعہ پھر وہ نہ دائیں تھی نہ باہیں۔ چند گھری سانسیں لیں، آنکھیں بند کر کے کھول لیں۔ اب چیزیں بہتر نظر آ رہی تھیں۔ ندرت نے آہستہ سے اس کے قریب ہو کر کھا۔

” پولیس والے کب سے چکر لگاتے رہے ہیں۔ باہر بھی موجود ہیں۔ انہیں تمہارا بیان لینا ہے۔“ زمر نے اثبات میں سرہلایا۔ وہ تیار تھی۔

” ان کو اندر بھیجیں۔ ایک بیان ہے جو مجھے دینا ہے۔“ اس کی آواز اب بھی درد سے بھر پور اور ہلکی تھی مگر اس کی نوعیت مختلف تھی۔ سخت، منقم، آگ سے بھر پور۔



جو تخت و تاج کے مالک ہیں کیا وہ معتبر ہی ہیں ..... شر انگیزی میں ڈوبی حکمرانی کا تماشا کر

آفس کار یڈور بیوں سے جگہا رہا تھا۔ علیشا فون کان سے لگائے سبک فناری سے چلتے ہوئے بلوتی جا رہی تھی۔

”ہاں حسین! تم بالکل بھی فخر مت کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا، بہتر کرے گا۔ میں آج ہی آؤں گی تمہاری آئندی سے ملنے۔

اے بھائی ہیں؟“ کار یڈور کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے فخر مندی سے پوچھا۔ پھر دوسرا طرف ملنے والا جواب سن کر اثبات میں سر ہلاتے ہے لفٹ کی طرف آئی۔

”تم بالکل پریشان مت ہونا۔ میں ضرور آؤں گی۔ خدا نے چاہا تو وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ کیا ان کی کذبیز کمکل طور پر فیل ہو چکی؟“ لفٹ کا بیٹن دباتے ہوئے اس کے چہرے پر سوگواریت اتری۔

”آئی ایم سوری حسین! چلو او کے شام کو ملتے ہیں۔“ موبائل بند کیا اور سامنے دیکھا۔ لفٹ کے دروازے کھل چکے تھے۔ وہ اندر ایں۔ مطلوبہ فلور پر انگلی رکھی اور گہری سانس لے کر گردن اکڑا کر خود کو جیسے کسی معرکے کے لیے تیار کیا۔ دروازے بند ہوئے۔ لفٹ اوپر کی ٹکڑے بڑھنے لگی۔ ہرگز رتی منزل علیشا کا اعتماد ڈگھا رہی تھی۔ اسے لگاں کا چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔ اس نے رخ پھیر کر لفٹ کی دھاتی دیوار میں اہم دیکھا۔ پھر سیاہ سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ سرمی آنکھوں کو سکیز کر تقدیمی نظروں سے دیکھا کہ کہیں وہ گہبرائی ہوئی تو نہیں لگ رہی؛ مگر ایں۔ بظاہر وہ پر اعتماد لگ رہی تھی۔ سرخ ثرت، سفید پینٹس اور لمبی ہیل کی سیندل میں مبوس، کہنی پر پرس نکائے وہ اندر سے جتنی ڈری سہی تھی؛ اُن لک نہیں رہی تھی۔

مطلوبہ فلور آن پہنچا تھا۔ دروازے کھلے۔ وہ اسی اعتماد سے چلتی ہوئی راہداری میں آگے بڑھتی گئی۔ کتنے ہی آفس کراس کیے۔ کتنے اکواں کے سامنے سے گزری، بغیر نظر ملائے۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کس آفس میں جانا ہے۔ سب سے بڑا آفس سب سے آخر میں تھا۔ علیشا اس کے قریب بس لجھے بھر کوٹھری۔ باہر موجود سیکرٹری نے سراغہ کراسے دیکھا۔

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“ اس نے پکارا۔ علیشا ذرا سماں مسکرائی۔

”اور انگریزیب کاردار نے مجھے بلا یا ہے۔ میری ان سے اپنکیٹھنٹ ہے۔“

اس کی بات پر سیکرٹری قدرے اچھبے سے اپنے نوٹس کھنگا لئے گئی۔ علیشا نے گردن پھیر کر بند دروازے کو دیکھا۔ یہاں سے وہ اندر اپنے انداز دیکھ کر کتھتی تھی۔

اندر آفس میں کشرول چیر پر انگریزیب کاردار اپنی مخصوص تمکنت کے ساتھ بیٹھے تھے اب وہ کے ساتھ اس نوجوان کو سن رہے تھے جو مانگھا ایک پریٹنیشن دکھار رہا تھا۔ وہ پی کیپ پہنے لا پروا سے ہلیے والا نوجوان ان کا اٹیچ کنسٹیٹ بھی تھا اور یکمیں نیجر بھی۔ وہ کافی ممتاز اور اپنی عمر سے زیادہ بححداری سے بولتا ایک ایک چیز سمجھا رہا تھا جسے میز کے مقابل کرسی پر بیٹھا، لیپ ٹاپ پر کام کرتا ہا شم بہت ہی بیزاری سے ان انداز اپنے جارہا تھا۔

”سر بظاہر ایسا لگتا ہے کہ آپ کے بھائیجے پر اپنے بھائی کے قتل کا آنے والا الزام آپ کے خلاف جائے گا لیکن....“ یکمیں نیجر لے ہیں انھا کر ڈرامائی انداز میں وقفہ دیا۔ ہاشم نے نگاہ پھیر کر مزید بیزاری سے اسے دیکھا۔ ہونہ کر کے سر جھٹکا۔ اور دوبارہ سے لیپ ٹاپ پر آپ کرنے لگا۔ ایک تو اس کنسٹیٹ سے اسے چڑھتی۔ وہ لڑکا وہ باتیں بتانے کے پیسے لیتا جا جو وہ اپنے باب کو مفت میں تا سکتا تھا۔

”لیکن سر! ہم اس موقعے کو اپنے مفاد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“ اور انگریزیب کاردار کے خفا چہرے پر شکنیں اپھریں۔

”اور وہ کیسے؟“

”آپ جانتے ہیں کہ اس وقت آپ نہیں انتخابات کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں کچھ کی پلیسیز اپنے مطلوبہ امیدواروں

کے بجائے آپ کو اٹھتے دیکھ کر آپ کے خلاف استعمال ہونے والا کوئی موقع ضائع نہیں کریں گے۔ اس لیے بجائے اس بات پر مدافعانہ ادا اختیار کرنے کے، ہم اس کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں جیسے... ”جو شہ میں کہتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے میڈٹ کو اور انگریزی صاحب کے پاس لایا اور ان کو کچھ دکھانے لگا۔“ یہ بیان ہے جو آپ پر یہیں کے سامنے دیں گے جس سے ایسا لگے گا کہ آپ کو کہاں پہنچا کے اس عمل سے خفایاں، لیکن اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کیے بغیر اس معاملے کو قانون پر چھوڑ رہے ہیں۔ آپ علی الاعلان یہ کہیں گے کہے شک ملزم میرا سماں کا بھانجنا ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ واقعی مجرم ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔ اور آپ اپنا کوئی بھی اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کو وہاں سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں آپ کو ایک انصاف پسند شخص کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔“ اور انگریزب نے گلہ کر اس کو دیکھا۔ ”یعنی کہ میں فارس کو اس معاملے سے نکالنے کی کوشش نہ کروں؟“ کیپن نیجر احمد شفیع مکرا اور چلتی بجا جائی۔

”یہی تو ساری گیم ہے سر! آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اس اسکینڈل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن آپ کے مخالفین کسی بھی صورت آپ کو اس اسکینڈل کو کور کرنے نہیں دیں گے، تو پھر کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی اسے کور کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ ہم انہی کا داؤ اُنہی پر چھیل جائیں۔ دیکھیں...“ وہ اب اپنی اس اسٹریٹیجی کی مزید میں تخت سمجھانے لگا۔ اور انگریزب اظاہر برے مودہ کے ساتھ لیکن توجہ سے سن رہے تھے۔ ہاشم نے نگاہ اٹھا کر دوبارہ بے حد بیزاری اور تلخی سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر کی بورڈ پٹائپ کرنے لگا۔ اس کو جس خبر کا انتظار تھا، زمر کے بیان کا، وہ آپ کے نہیں دے رہی تھی۔ پانچ دن ہو چکے تھے زمر کو گولی لگے۔ فارس آزاد گھوم رہا تھا، بیوی کی موت کا سوگ منا رہا تھا، اور فی الحال کوئی بھی نہیں تھا جو یہ کہے سکے کہ یہ قتل فارس نے کیا ہے۔ گوکہ ہوٹل کے کمرے سے مجری کے بعد گن برآمد کر لی گئی تھی، مگر فارنزک روپرٹ کو اس نے ابھی روک رکھا تھا۔ فارنزک اور فنگر پرنٹ روپرٹ زمر کے بیان کے بعد آئی چاہیئے یہ پلان تھا، مگر زمر... اگر زمر مر گئی... اف... اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک لاش کا مزید بوجھا اپنے کندھوں پر نہیں!

وہ سر جھٹک کر اپنی ای میل کھو لئے گا۔ خاور نے دو روز پہلے اس کو فارس کی ایلی بائی لڑکی کی تفصیلات بیچ دی تھیں۔ اس کے وابہ درست تھے۔ وہ علیشا ہی تھی۔ مگر اس نے ہاشم سے رابطہ کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسی سے ملنے اور ہر آئی تھی، ہاشم کو معلوم تھا، اسی لیے اس نے بھی علیشا کو نہیں چھیڑا۔ وہ خود چل کر اس کے آفس آئے گی۔ کب؟ وہ منتظر تھا۔ باہر کھڑی علیشا نے سیکرٹری کوئی میں سرہلاتے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”آپ کی کوئی اپنکیٹ ریکارڈ نہیں ہے۔ کیا آپ پھر سے اپنکیٹ لینا چاہیں گی؟“ مگر علیشا نے بغیر مڑی اور تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک پاتا، اس نے دروازہ کھول لیا۔ سب سے پہلے ہاشم نے چونکہ کردیکھا تھا اور پھر وہ ایک دم انٹھ کھڑا ہوا۔ بالکل ساٹ سر دس۔ اور انگریزب نے ہاتھ میں پکڑے ٹیب پا ہمدرشی کی پریزیٹیشن دیکھتے ہیے سر اٹھایا تو وہ بھی ایک دم بالکل شہر سے گئے۔

وہ دروازے میں کھڑی تھی اور سیکرٹری بیچھے سے آکر اسے روکتے ہوئے سخت سست سناری تھی۔ اور انگریزب صاحب کے ساتھ جھکے کنسٹیٹوٹ کے نے باری باری ان دونوں باپ بیٹی کے تاثرات دیکھے اور پھر سیدھا ہوا۔ سیکرٹری کو اشارہ کیا۔ وہ خاموش ہو کر بیچھے ہٹ گئی۔ علیشا دو قدم مزید اندر آئی۔ مسلسل اور انگریزب کا درا کوڈ کیھر ہی تھی، بناپک جسکے ساٹ پٹ چہرے کے ساتھ، جیسے تاثرات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہاشم ایک دم مڑا۔ تختی سے احمد کو دیکھا۔ ”باہر جاؤ، فوراً۔“

کنسٹیٹوٹ کا سراہب اٹھاتے میں ہلاتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا سمجھانے لگا۔

”سر! اگر تو یہ کوئی اسکینڈل ہے تو میرا خیال ہے میرا یہاں موجود ہونا سب سے ضروری ہے۔ کیونکہ میں ہی آگے پیش آنے والی

۱۰۰ عدھ مال کا تجزیہ کر سکتا ہوں اور میں ہی آپ کو بہتر طریقے سے گائیڈ کر سکتا ہوں کہ آپ کو اس پیشوایش کو کس طرح بینڈل کرنا ہے کیونکہ مل لے۔۔۔

ہاشم گھوم کر اس طرف آیا۔ باپ کے ہاتھ سے ٹیب لے کر کنسٹنٹ کو دے مارنے کے انداز میں تھا یا۔ اسے کہنی سے پکڑا، کھینچ کر ادا تک لے کے گیا اور ہر کاکا سے احمد کو باہر نکال، گویا دفعان کر کے دروازہ بند کیا۔ پھر واپس مژکر علیشا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ سخت شعلہ انہوں سے اسے گھوڑا۔

”کیا چاہیے؟ کس لیے آئی ہو؟“

اور انگریز یہ بھی اب سید ہے ہو کر بیٹھ گئے تھے اور تیکھی خاموش نظر وہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ علیشا نے نظروں کا رخ ہاشم کی مل پھیرا۔ پھر خود کو باعتماد ظاہر کرتے ہوئے بولے۔

”پسیے چاہیں۔“ ہاشم نے استہزا یہ سر جھلکا۔ گھوم کر آگے آیا اور باپ کی کرسی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اب وہ دونوں ایک سوت تھے اور ان کے مقابل علیشا میز کے دوسرا جانب کھڑی تھی۔ اپنے پرس کے بینڈل کو مضبوطی سے پکڑے خود کو مضبوط رکھتے ہوئے۔

”میں بہت پسیے دے چکا ہوں تم ماں بیٹی کو۔ اب کیا چاہیے؟“ اور انگریز یہ بولے تو انداز میں حقارت تھی۔

”جس پسیے کی بات آپ کر رہے ہیں میں آپ کو یادِ دلاتی چلوں وہ میری ماں کے اس علاج پر خرچ ہوئے تھے جو ان کو آپ کی ماں بیٹی کی وجہ سے کروانا پڑا۔“ وہ جذبات کو قابو میں رکھئے، ضبط سے ایک ایک حرفاً ادا کر رہی تھی۔ ”آپ کو شاید بھول گیا ہے کہ میری ماں کو ہوازت وقت آپ نے اسے بری طرح مارا پیٹھا جس کے باعث دئی ہفتہ ہسپتال میں رہی تھیں۔ ان کی بیک بون متاثر ہوئی تھی۔ اور انے میڈیکل بلز پے کرتے کرتے ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں چھسال پہلے تھے۔“

اور انگریز نے استہزا یہ انداز میں ناک سے مکھی اڑائی۔ ”تم میرے خلاف کہیں پہ کچھ ثابت نہیں کر سکتیں۔“

علیشا نے اثبات میں سرہلایا۔ ”یہ توبائل درست بات ہے۔ کیونکہ جب میں نے آپ پر سوکرنا چاہتا تھا تو آپ کے ماہروں کیل بیٹھے۔۔۔“ ایک رخنی نظر ہاشم پر ڈالی اور پھر انگریز یہ کو دیکھنے لگی۔ ”عدالت میں جیوری کے سامنے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ناصرف میری ماں یہ ہیوں سے اپنی غلطی کی وجہ سے گری تھی، بلکہ وہ دماغی توازن سے محروم عورت ہے۔ شاید اس میں سارا کمال آپ کے بیٹھے کا بھی نہیں ہے یونکہ جس لافرم نے میرا کیس Pro Bono لیا تھا، اگر وہ میرے دکیل کے طور پر ایک ناجبر کارفرست ایریسوی ایٹ کون مقرر کرتے تو شاید ہم عدالت میں اتنی بری طرح سے بے عزت نہ ہوتے۔ چاہے یہ ملک ہو یا میرا ملک، قانون وہاں بھی آپ کا تھا، یہاں بھی آپ کا ہے۔ اس لیے میں لبی بات نہیں کروں گی۔“ کہتے ہوئے وہ رکی۔ اندر سے دل بہت زور سے دھڑک رہتا۔ چند گھرے سانس لے کر اس نے خود کو دوبارہ بہادر ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ دونوں باپ بیٹا تندی سے اس کو گھوڑہ رہتے تھے۔ دو قدم آگے آئی، میز کے سامنے پڑی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا اور جی کڑا کر کے پھر سے بولے لگی۔

”میں ہاروڑ جانا چاہتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ میں سارے میسٹ کلیسٹر کراؤں گی۔ اگر مجھے صرف اتنی امید ہو کہ میری نیشن فیس پے کر دی جائے گی اور چونکہ آپ میرے والد ہیں اور ناجائز ہی سہی، مگر میں آپ کی بیٹی ہوں۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ مجھے سپورٹ کریں۔ میں آپ سے کہیں کچھ نہیں مانگوں گی۔ مجھے کوئی جذباتی اٹھوٹ ہے آپ سے نہ کوئی امید، صرف پیسے چاہیں۔ آپ کے پا کستانی روپوں میں چند میلن کی بات ہے۔ آپ کے لیے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف چند میلن۔“ اس نے رک کر موہومی امید سے دونوں باپ بیٹا کو دیکھا۔ پھر ایک کاغذ سامنے رکھا جس پاس کی تعلیم پاگلے چند سالوں میں خرچ آنے والی رقم کی تفصیل تھی۔

ان کے تاثرات ایک جیسے ہے۔ سخت سرد۔

”اور تم یہ سب کہنے اس وقت آئی ہو جب میرا باپ ایکشن میں حصہ لے رہا ہے۔ تمہارا خیال تھا کہ ایک اسکینڈل کے خوف سے ہم تمہیں پیسے دے دیں گے اور تم بھی خوشی رہو گی؟“ ہاشم نے یہ کہتے ہوئے مسکرا کر نفی میں سر ہلا�ا۔ ”تمہاری جیسی بہت سی لڑکیاں گزری ہیں جنہوں نے آکر عزت دار لوگوں پر الزام لگائے۔ مگر یونو و اٹ علیشا! وہ لڑکیاں وہ عورتیں وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔ آج کسی کو وہ یاد بھی نہیں ہیں۔ لیکن وہ مرد جن پر انہوں نے الزام لگائے چاہے سچ چاہے جھوٹے وہ مرد آج بھی خبروں میں ہیں۔ وہ مرد آج بھی طاقت میں ہیں۔ آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔ تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے علیشا۔ تم جہاں سے آئی ہو دہاں چلی جاؤ۔ کیونکہ اگر اس سے زیادہ تم ہمیں ڈسٹرپ کرو گی تو میں تمہارے ساتھ بہت براپیش آؤں گا اور تم یہ بات جانتی ہو۔“ اس کی مسکراہٹ اب عقین نتائج کی دھمکی میں بدل چکی تھی۔ علیشا کی آنکھوں میں سرخ سی نمیں ابھرنے لگی۔ اس کے لب کلپکاٹے۔

”میں آپ کی بہن ہوں۔“

”تم میرے لیے ایک ایسا مسئلہ ہو جس کو میں کبھی حل نہیں کرنا چاہوں گا۔ تم اور تمہاری ماں میرے باپ کے پیسے پر happily ever after رہنا چاہتے ہو جبکہ ایسا نہیں ہو گا۔“

”میں وہ بات ساری زندگی یاد رکھوں گی“ ہمیشہ کے لیے جیونیاں۔“ کیس جیتنے اور مجھے خیرات کی طرح ماں کے علاج کی رقم دینے کے بعد آپ نے مجھے یہ کہا تھا۔ میں جیونٹی ہی ہوں اور میں جانتی ہوں کہ جیونیاں کیا ہوتی ہیں مگر شاید آپ خود بھی نہیں جانتے ہاشم؟“ وہ تیکھی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ہاشم پہلی بار استھرا یہ مسکرا یا۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں اس بات سے بے خبر تھا کہ تم یہاں پر ہو تو تم غلط ہو۔“ یہ کہتے ہوئے ہاشم آگے آیا۔ اپنے لیپ ٹاپ پر جھکا، چند بیٹن دبائے اور اسکرین اس کی طرف کی۔ یہ خاور کی ای میل تھی جس میں اس نے علیشا کے نکلت کی کاپی اور اس کے ہوٹل میں ٹھہرنے کے دوران دیے گئے تمام کاغذات کی کاپی چند ایک دوسری معلومات کے ساتھ دو روز پہلے لے چکی تھی۔ علیشا نے پہلے اسکرین کو دیکھا پھر پوک کر ہاشم کو۔

”میں تمہارے یہاں آنے کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ تم یہاں پر کسی نیت جیوڑا کو منزدی کے لیے نہیں آئی تھیں جیسا کہ تم نے میرے کزن اور میری بھائی کو بتایا تھا۔ میں جانتا تھا تم یہاں پر ہمارے لیے آئی ہو۔ پیسے مانگنے یا ملکی میل کرنے یا دھمکی دینے، کیونکہ تم خود کو ہمارے خاندان کا حصہ سمجھتی ہو جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے میں تمہارا یہاں پا انتظار کیوں کر رہا تھا؟“ وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین فول لڈ کر کے سیدھا ہوا۔ دوبارہ اس کے سامنے آیا، قد میں اس سے کافی لمبا تھا، گردن جھکا کر سفید پر تی علیشا کو تندی سے گھوڑتے ہوئے ایک ایک لفڑا چبا چبا کر بولا۔

”اس لیے نہیں کہ مجھے تمہیں انکار کرنا تھا یا کوئی دھمکی دیتی تھی۔ صرف ایک سوال تھا۔ تم نے میرے خاندان کو تارگٹ کیوں کیا؟“ میں قطعاً نہیں مان سکتا کہ تم بالکل اتفاق سے میرے کزن کی ایلی بائی ہو۔ تم بالکل اتفاق سے اس کی بھائی کی دوست ہو۔ میں علیشا، اتفاقات پر یقین رکھنے والا آدمی بالکل نہیں ہوں۔ اس لیے تم ابھی مجھے بالکل سچ سچ بتاؤ گی کہ تم نے میری بھائی کو دوست کیسے بنایا؟“ یہ سب علیشا کی توقع سے زیادہ تھا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے خنک لبوں پر زبان پھیری۔ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ مدد طلب نظروں سے پادریست پر بیٹھے اور نگزیب کاردار کو دیکھا جو حقارت اور رعوبت سے اسے دیکھ رہے تھے پھر قدرے ہر اس انظروں سے ہاشم کو۔ اس کا سارا اعتماد ازاں کل ہو رہا تھا۔ اسے یادھا چند برس پہلے جب ہاشم اس کے گھر آیا تھا، چیک منہ پر مارنے کی خیرات کی طرح اورتب اس نے اسے کہا تھا۔

”تم Happily Ever After رہنا چاہتی ہو۔ ایسا نہیں ہو گا۔“ Ants Ever After ہو (ہمیشہ جیونیاں ہی) تم اور تمہاری ماں ایسے ہی رہو گے۔“ اور اس نے یہ بات لکھ کے رکھ لی تھی۔ اپنے کمرے میں ڈائری یعنی الماری کے اندر ورنی دروازوں پر فونو الہم

ہل کلی تصویر دن کے پیچھے اپنے کی چین پہ علیشا نے یہ بات ہر جگہ پہ لکھ کے رکھ لی تھی۔ سوائے اپنے دل کے۔ اور آج یہ الفاظ اس کے سیدھے ال آپ کے لگتے تھے۔

”خین میری دوست ہے۔ اس سے زیادہ میں کسی چیز کی وضاحت نہیں دینا چاہتی۔“ ہاشم چند لمحے کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔

”اگر تم چاہتی ہو کہ میں مستقبل میں کبھی تمہاری کوئی امید پوری کروں تو ہو سکتا ہے تمہارے بچتانا نے میں واقعی تمہاری کوئی امید ہی کرسکوں۔“ وہاب کے بولاتو بچھے میں ذرا فرمی تھی۔ اور انگریز بنتے ناگواری سے ہاشم کو دیکھا مگر بولے پکھنیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ہاشم یہ بس سے کچھ کھلانے کے لیے کہہ رہا ہے۔ علیشا کو حوصلہ ہوا۔

”شاید آپ بھول گئے میں کمپیوٹر میں اچھی ہوں۔ میں نے آپ کے والد (اس نے ”آپ کے“ پر زور دیا) کا ای میں ہیک کر کھا لے اور میں دیکھتی تھی کہ وہ کس طرح ایک چھوٹی لڑکی کو ای میلو بھی کرتے تھے، اس کی میلو کا جواب بھی دیتے تھے اور اس کو سراحتے بھی تھے۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر پر خون کو چھوڑ کر کسی اور کی میٹی سے اتنا پیار کوئی کیسے رکھ سکتا ہے؟“

”اور اب تم اس کی اور کی میٹی کو نقصان پہنچانا چاہتی ہو؟ راست؟“

ہاشم کے چہرے کی سختی لوٹ آئی۔ وہ ایک قدم مزید آگے بڑھا اور علیشا دو قدم پیچھے ہٹی۔ وہاب خوف زدہ نظر آرہی تھی، جیسے اسے لگ رہا ہو ہاشم ابھی اس پر بچھت پڑے گا۔

”تم نے اسے کیسے ٹریپ کیا؟ بالکل سچ بچتانا، درنے مجھے بچنے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔“ علیشا کی گردن خود بخوندنی میں مل۔ حلقوں کو کھکھلا دیا۔ لمحے بھر کی سریزی نے اسے دھوکا دیا تھا۔

”میں نے اسے ٹریپ نہیں کیا۔ میں وہ گیم کھیلنے لگی جو وہ کھیلتی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھے کا نیکٹ کرے گی اور پھر ہم دوست بن گئے۔“ پھر اس کے چہرے پر بچینی ابھری۔ ”ہم واقعی دوست ہیں۔ پلیز اس کو پچھھت کہنا، پلیز۔“

وہ کمزور پڑ گئی۔ وہ جانتی تھی وہ اس طاقتور اور عرب دار باب پ بیٹے کے سامنے کمزور پڑ جائے گی اور بالکل ایسا ہوا تھا۔ ایسا ہی ہونا تھا۔

”میں اس کو بہت پسند کرتی ہوں۔ وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ پلیز میری اور اس کی دوستی کو کسی اور نظر سے مت دیکھو۔“ ہاشم نے گہری سانس لی۔ اثبات میں سر ہلا کیا۔ اپنی سابقہ کری کھپنچی بیٹھا، تانگ پہ تانگ رکھی اور گردن اٹھا کر تمکنست اور عرونت سے علیشا کو دیکھا۔

”اب تمہیں جو کرنا ہے کرلو کیونکہ تمہیں میرے پاس سے ایک چھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ اپنے ملک و اپنی جاؤ، محنت مزدوری کرو اور پھر جس اسکوں میں جانا ہے جاؤ۔ اور نہیں تو کہیں اسکا لارٹ پ کے لیے اپلائی کر دو۔ کوئی نہ کوئی تم پر ترس کھا کے کچھ دے دے گا۔ لیکن وہ غصہ کم از کم میرا بابا پ نہیں ہو گا۔“ اس کے بعد سختی سے انگلی اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”آؤ۔“ علیشا کی آنکھوں میں ابھری نمی بڑھنے لگی۔ اس نے ترپ کر اپنے باب کو دیکھا۔

”خداوند تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ مڑی اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ اس کا یہاں آنا، اس کا یہاں ٹھہرنا، ان کے پاس آکے منت کرنا سب بیکار لگ رہا تھا۔

اس کے نکلتے ہی ہاشم کے تاثرات بد لے۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اور انگریز بکے چہرے پر بھی اب قدر تھے تلفر تھا۔ ”ہاشم!“ انہوں نے پکارا مگر اس سے پہلے ہی وہ ان کی طرف گھوما۔ میز پر ہاتھ رکھے ان کے سامنے جھکا اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر چاپا کر بولا۔ ”میں ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی آپ کا پھیلایا کچھ راصاف کر لوں گا کیونکہ ہاشم ہے ہی اس کام کے لیے۔ ہاشم ہر چیز سنبھال سکتا ہے یہ بھی سنبھال لے گا۔ لیکن میری بات یاد رکھیے گا۔ اگر میری ماں کو اس بارے میں کچھ بھی پتا چلا یا وہ ہرث ہو میں تو میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔“

پھر سیدھا ہوا۔ اپنالیپ ٹاپ اٹھایا اور انہیں گھور کر دیکھنا مژہ کر باہر نکل گیا۔ اور نگزیب غصے سے منہ میں کچھ بڑا کرس جھٹک کر رہ گئے۔ ابھی فارس کا مسئلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور مسئلہ آن پہنچا تھا۔ برے وقت کی ایک غلطی۔ اف!

❖❖❖

شیشه گروں نے اس کی بصیرت بھی چھین لی ..... آنکھیں تھیں اس کے پاس مگر دیکھنا نہ تھا اپستال کا وینگ روم نہ خمنڈا تھا۔ حینہ گھنٹے ملا کر سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھی۔ علیشا ساتھ کھڑی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ تملی دینے والے فکر مندا انداز میں کھردی تھی۔

”آئی ایم سوری، جو بھی تمہاری آئنی کے ساتھ ہوا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کے زخم اتنے گہرے ہوں گے۔ مجھے بتاؤ کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟“ وہ بے حد پر ملاں نظر آرہی تھی۔ چہرے پر چند گھنٹے پہلے کی ہاشم کے ساتھ کی گئی ملاقات کا اثر اور شکستگی ابھی تک برقرار تھی۔ اور وہ حینہ کے لیے فکر مند بھی تھی۔

حینہ نے سوگواریت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چہرہ اٹھایا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھوں میں بے حد دکھ تھا۔

”میرا نہیں خیال ہم پھپھو کے لیے اب کچھ کر سکتے ہیں۔ میں ان کے لیے پہلے بھی کچھ نہیں کر سکی تھی۔ اب مجھے ہر اس روایے پر شرمندگی ہے جو میں نے ان کے ساتھ رکھا۔“

علیشا اس کے کندھے کو تھپتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھی۔ پر اپنے قدموں کے قریب رکھا اور پھر سمجھا نے والے انداز میں کہنے لگی۔

”تم پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ دلوں کے سارے میل دھوڑا لو۔ جن رشتتوں کی مشترک شے ”خون“ ہوتی ہے وہ ایک دوسرے کی طرف پلٹ کے ضرور آتے ہیں۔“ حینہ بے دلی سے اس کی ساری باتیں سنتی گئی۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کی پریشان نگاہیں بار بار کوئی یہودی طرف اٹھتی تھیں جس کے پار کمرے میں زمر تھی۔ اس نے بیان دینے کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی اور ابھی پولیس آگئی تھی۔ تب سے سعدی اور پولیس آفیسرز باہر نہیں نکلے تھے۔

”تمہاری امی کدھر ہیں؟ میں ان سے افسوس ہی کر لیتی۔“ علیشا رکی پھر وضاحت دینے والے انداز میں بولی۔

”آئی ایم سوری۔ میں پچھلے کچھ دن بہت مصروف رہی، اپنی ڈاکومنٹری کے سلسلے میں۔“ کہتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ قدرے پھیکا پڑا اگر حینہ نے نوٹ نہیں کیا۔ علیشا نے شکر ادا کیا۔ اپنی دوستی کو کسی بھی قیمت پر وہ دادا نہیں لگانا چاہتی تھی۔

”وہ میرے دادا کے پاس ہیں۔ ان کو گھر شفت کر دیا گیا ہے۔ وہ بہت بیمار ہیں۔ پھپھو کے حادثے نے ان پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ پیش آنے والے تمام حالات بتانے لگی۔ علیشا سنتی گئی۔ ان سے ہٹ کر کوئی یہودی کے اس پار کمرے میں زمر بستر پر لیتھی تھی۔ چادر گردن تک ڈالے سر ہانے کی طرف سے بیٹا اور پر کو اٹھا تھا اور وہ نکلیوں سے میک لگائے سپاٹ چہرے اور خنک دیران آنکھوں کے ساتھ اپنے سینے پر رکھے باہم ملے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ سعدی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ بالکل ساتھ۔ دو پولیس والے سامنے موجود تھے۔ بیان قلم بند کیا جا رہا تھا۔

”پھر فارس غازی نے مجھے کال کر کے جگہ کی تبدیلی کا بتایا۔ اس کے کہنے پر میں اس ریسٹورنٹ گئی جہاں پر اس نے مجھے بلا یا تھا۔“ سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ یہ بات فارس یا حینہ نے اسے نہیں بتائی تھی۔

”ریسٹورنٹ میں جانے کے بعد کیا ہوا؟“ اے ایس پی سرمشاد پوچھ رہا تھا۔ زمر نے جواب دینے کے لیے نگاہیں اٹھائیں۔ پہلے اس کو دیکھا، پھر گردن پھیر کر سعدی کو اور ایک ہاتھ سعدی کی طرف بڑھایا۔ سعدی اس کا ہاتھ کپڑتے قریب ہوا۔ جیسے کوئی مورل سپورٹ تھی

سے مل اس کو ضرورت تھی۔ اب کے اس نے زیادہ اعتقاد سے پولیس آفیسر کو دیکھا اور بولی تو آواز ٹھنڈی تھی۔

”فارس نے مجھے کال کی اور اس نے مجھے کہا کہ اسی نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا۔ اور یہ کہ اس کے پاس کوئی ایلی بائی نہیں تھا۔“ مدی نے کرنٹ کھا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالا۔ بے حد بے یقین سے اس کا چہرہ دیکھا جو فارس کے کہے تمام الفاظ سن عن دہراتی تھی۔

”زمرا؟“ اس نے استجواب سے پکارا۔ زمر رکی۔ اپنے خالی رہ جانے والے ہاتھ کو دیکھا اور پھر سعدی کو۔ یہ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ آفیسر پوچھ رہا تھا کہ پھر کیا ہوا اور زمر سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل ٹکٹک تھا۔

”آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ماموں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”سعدی میں ادھر تھی۔ فارس نے مجھے کال کیا۔ اس نے یہ سب مجھے کہا۔ یہ سب جو میں نے ابھی لکھوایا ہے۔ اور پھر اس نے ہبہ کوہہ مجھے صرف ایک گولی مارے گا، وہ بھی دل میں۔ لیکن اس نے مجھے تین گولیاں ماریں۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی قتل کرنا ہاتھ تھا ہے اور مجھے بھی۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس نے شوت کیا۔ آپ اس کے گھر جائیں اس کی گزنتلاش کریں۔ اس کے پاس گنز کی ایک بڑی کلیکشن ہے۔ مجھے یقین ہے انہی میں سے کوئی گن اس نے ہمارے اوپر استعمال کی ہوگی۔ میں تو یہ سمجھ نہیں پا رہی کہ وہ ابھی تک آزاد کیوں گھوم رہا ہے۔ سعدی تم میری بات سن رہے ہو؟“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کا اعتقاد کم ہو رہا تھا۔ سعدی بے حد بے یقین سے الی میں سر ہلاتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹا۔

”زمرا! آپ کو کوئی غلط نہیں ہوئی ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔“ پھر تیزی سے وہ آفیسر زکی طرف مڑا۔

”آپ پلیز اس کو بند کر دیں۔ مجھے اپنی پھیپھو سے بات کرنی ہے۔ یہ بیان اس کے بعد بھی لیا جا سکتا ہے۔ پلیز آپ ابھی باہر ہا میں۔“ وہ ان کو باہر پھیجنا چاہتا تھا۔ زمر کے چہرے کار مگ بدلا بُل بُخج گئے۔ اس نے قدرے غصے سے سعدی کو دیکھا۔

”مجھے کوئی غلط نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے کانوں سے نہا ہے۔ اس نے کہا، اس نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔ اس نے کہا وہ اپنی ۱۱ کو اور مجھے قتل کرنے جا رہا ہے۔ اور اس نے ہم پوکوی چلائی۔ یہ گولی فارس نے چلائی۔ میں اس بات کی گواہ ہوں۔“

”زمرا پلیز خاموش ہو جائیں۔ کچھ بھی مت کہیں۔ یہ سب کوئی بہت بڑی غلط نہیں ہے۔ پلیز خاموش ہو جائیں۔“ وہ بے حد ارار مدد سا اور اس کو بازار کھنکی کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح پولیس والوں کو وہاں سے نکالے۔

”سعدی میری بات سنو۔ میں حق کہہ رہی ہوں۔ میرا داماغی تو ازن بھی بالکل برقرار ہے۔ میں کسی بھی بیان Duress میں آ کر رہی ہوں۔ میں ڈسٹرکٹ پر اسکیو نر زمر یوسف ہوں۔ میری ایک کریڈیت بیلٹی ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ یہ سب فارس نے کیا ہے۔“ اسی نے اپنے بھائی کو مارا۔ اسی نے بھی مارنا چاہا۔ آپ اس کو بلا بیس۔ آپ اس کو میرے سامنے لا کر یہ سب پوچھ سکتے ہیں۔“

”زمرا پلیز خاموش ہو جائیں۔“ وہ تڑپ کر اس کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن زمر نے دیکھا سعدی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہیں تھا۔ اس نے اپنا غالی ہاتھ پیچھے کھٹک لیا۔ چہرے بکے تاثرات مزید سرد ہو گئے۔ اے ایس پی سرمدا گے بڑا۔ سعدی کے کندھے پہ ہاتھ ملا اور تنہیں انداز میں اس کو دیکھا۔

”آپ باہر چلے جائیں۔ اور اگر آپ نے کال کر کے فارس غازی کو منتبہ کرنے کی کوشش کی تو میں آپ کو قانون کی راہ میں رکاوٹ لئے کے جرم میں گرفتار کر سکتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس کا نقصان صرف اور صرف آپ کے ماوں کو ہو گا۔“ دوسرے آفیسر نے دروازہ ٹھوکوا۔ وہ سعدی کو باہر جانے کا کہہ رہے تھے۔ وہ پھر بھی اس کو دیکھتے رہی بظاہر سپاٹ سر دنظر وہیں تھے، لیکن ان میں جیسے بے چینی تھی، امید تھی۔ وہ ابھی آئے گا اور اس کا ہاتھ تھام کر کہے گا، میری پھیپھوچ کہہ رہی ہیں، میری پھیپھوچ جھوٹ نہیں ہل عکتیں۔ مگر وہ بے یقین حق دق سالڑا کا مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ”یہ سب غلط ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ میرے ماموں ایسا نہیں کر سکتے۔“

میں سچ کہہ رہا ہوں میری بات سنیں۔ آپ پلیز یہ بیان روک دیں۔ ”مگر آفیسر نے اس کی اگلی بات نہیں سنی تھی۔ اس نے بہت عزت اور احترام سے اس کی کہنی کو تھا میں اس کو باہر کارستہ دکھایا اور دروازہ بند کر دیا۔ زمر نے آنکھیں بند کیں، چند گھرے سانس اندر اتارے۔ اور پھر کھولیں تو وہ پہلے سے زیادہ خود کو سمیٹ پکھی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ وہی سب جو اس کے نزدیک سچ تھا اور یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظر وہ کے سامنے اپستال کے بستر پر لیٹا اپنا وجہ تھا، نہ ہی ارڈر گردگی نالیاں تھیں، مشین اور فضا میں رچی بھی اسپرٹ کی عجیب سی بو۔ ناکارہ گردے۔ ڈالکیس والی زندگی۔۔۔ کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ صرف فالج زدہ بڑے ابا تھے۔۔۔ صرف وہی۔

بے حد مضخل اور پریشان سا سعدی باہر آیا۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے وہ وینگ روم کے سامنے رکا، پھر تیزی سے اندر آیا۔ حمہ اور علیشا وہاں پہنچیں با تیں کر رہی تھیں۔

”خین!“ اس کے انداز پتھر نے بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ متفکر نگاہوں سے اس کا چہرہ کھوجا۔ ”کیا ہوا بھائی؟“

”جب تم اور ما موس اور۔۔۔“ ایک نگاہ ساتھ کھڑی فارنزٹ کی پڑالی، پھر خین کو دیکھا۔ ”تمہاری فرینڈ زمر کا انتظار کر رہے تھے ہوٹ میں، کیا تب ما موس نے ان کو کوئی کاں کی تھی؟“ خین نے ناچھی سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟ کیسی کاں؟“

”خین! جب تم سب لوگ ساتھ تھے تو کیا ما موس نے زمر کو کسی ریشورت میں بلا یا تھا؟ انہوں نے انہیں کوئی کاں کی تھی؟ جس میں انہوں نے کہا کہ وہ۔“ وہ رکا۔ یہ الفاظ تو وہ خود بھی اونہیں کر پا رہا تھا۔ بکشل ہمت جمع کر کے بولا۔

”انہوں نے کہا کہ وہ، وہی وارث ما موس کے قاتل ہیں اور وہ زمر کو بھی مارنا چاہتے ہیں اور زرتاشہ آنٹی کو بھی۔“ خین کے چہرے پر پہلے حیرت ابھری اور پھر شدید شاک۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھنیں آ رہا۔“ پھر اس نے علیشا کو دیکھا۔ ”علیشا۔۔۔ ہم سب ساتھ تھے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ایک دو دفعہ کاں کی تھی مگر پچھوکا فون بند جا رہا تھا۔“ علیشا نے بھی اتنی ہی الجھن سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔

”میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی لیکن ہم لوگ کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ وہیں پر رہے۔ میرے ہوٹ کے کمرے میں۔ اور ہم با تیں کرتے رہے تھے یا زیادہ وقت خاموش رہے تھے۔ پھر فون آیا کہ زرتاشہ کو گولی لگی ہے جو خین کے انکل کی بیوی تھی۔ اس پر یہ دونوں اکٹھے وہاں سے نکل گئے۔“ سعدی اس کی طرف مڑا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر اس سے پوچھا۔

”کیا جب تم لوگ ساتھ تھے، تم تیوں، تو کسی ایک لمحے کے لیے بھی فارس ما موس تم لوگوں سے الگ ہوئے تھے؟“ خین اور علیشا دونوں نے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”نہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا بھائی۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

سعدی نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ کنپی دنوں ہاتھوں سے مسلی۔ وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔

”زمر کہہ رہی ہیں کہ ما موس نے انہیں کاں کیا اور ما موس نے انہیں کہا کہ وہ ان کو شوت کرنے لگے ہیں اور یہ کہ ما موس نے ان کے سامنے اعتراف جرم کیا۔“ خین کے چہرے کا شاک ایک دم ناگواری اور غصے میں ڈھلا۔ وہ تیزی سے آگے آئی۔

”کیا مطلب ما موس نے یہ سب کہا؟ پچھو جھوٹ بول رہی ہیں۔ ما موس ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ کیا مذاق ہے؟“ وہ طیش سے سپھر رہی تھی۔ زمر اس قسم کی حرکت کیونکر کر سکتی تھی؟ سعدی نے نفی میں گردن ہلائی اور تھکا تھکا سا کر سی پر بیٹھ گیا۔

”مجھے کچھ نہیں پتا کیا ہو رہا ہے؟ مگر زمر کو کوئی غلط بھی ہوئی ہے۔ وہ ما موس پر الزام لگا رہی ہیں۔ ما موس تو خود اتنے ٹوٹ گئے ہیں۔ انہوں نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سب ہو گا۔ ما موس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ہے نا خین؟“ اس نے تائید کے لیے سراٹھا کر خین کو دیکھا۔ وہ اس کی طرح پریشان نہیں تھی، وہ غصے میں تھی۔

”میری سمجھ میں آتی پچھو ما میں سے کون سا بدلہ اتنا رہی ہیں؟ یہ ایک دہشت گردی کی کارروائی تھی۔ وہ اس میں ما میں کو یہ میہیٹ رہی ہیں؟ انہیں ایسا کرنا بالکل زیب نہیں دیتا۔ مجھے ان سے اس چیز کی توقع نہیں تھی۔“ وہ غصے سے واپس بیٹھی۔ اب چہرے پر ہمہ دیر پہلے کی چھائی زمر کے لیے ہمدردی ختم ہو چکی تھی۔ وہاں صرف اور صرف ملاں بھری بی تھی۔ علیشا ان دونوں کے سامنے کھڑی لامندی سے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس مسئلے میں پھنستی جا رہی ہے۔

”بھائی آپ ما میں کو کال کریں۔ ان سے پوچھیں کہ پچھو کیا کہہ رہی ہیں؟“ سعدی نے تھکنی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”میں ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتا جو فارس غازی کو مزید مشتبہ بنائے۔ اس بیان کے بعد پولیس ان سے ضرور پوچھ گجھ کرے گی۔ شاید ان کو فرقاً بھی کر لے۔ مجھے واقع نہیں پتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

”اگر آپ نہیں بتائیں گے تو میں انہیں کال کرنے جا رہی ہوں۔ انہیں پتا ہونا چاہیے کہ پچھو ان پر کیا الزام لگا رہی ہیں، اور وہ بھی ہمیں کے سامنے ادا گا؟“ حینیں کا توبس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہر چیز کو تھس نہیں کر دا لے۔ وہ بے اختیار کھڑی ہوئی جیسے واقعی کال کرنے جا رہی ہو۔ سعدی نے اسے روکا۔

”نہیں۔ اس وقت چیزوں کو خراب کرنے کی نہیں، ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔“ حینیں نے سوالیے نظر وہ سے بھائی کا چہرہ تکا۔

”پھر ہم کیا کریں؟ کس کو بتائیں؟ کس سے مدد مانگیں؟“

سعدی نے موبائل نکالا۔ فون بک کھوئی، نمبرڈائل کیا اور فون کان سے لگاتے ہوئے حینیں سے بولا۔ ”تحیکنگ گاؤ“ ہمارے رشتہ

اروں میں کوئی ایک شخص تو ایسا ہے جس کے بارے میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہر مسئلہ سنبھال سکتا ہے۔“ دوسرا طرف گھنٹی جا رہی تھی۔

حینیں نے ہنونیں پلیز کراچنچے سے سوچا اور پھر تاثرات ڈھیلے پڑے۔

”اوہ ہاشم بھائی، آپ ہاشم بھائی کو بular ہے ہیں۔ اوکے!“ وہ غیر آرام دہ سی ہو کر کری کے کنارے بیٹھ گئی۔ البتہ وہ بھی بھی بے

پیش تھی اور ناخوش بھی۔ سامنے کھڑی علیشا کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ اس ساری گفتگو میں ہاشم کا نام سب سے واضح تھا۔ ہاشم۔ پھر بھی ہاشم....

اس نے گھنکھار کے ان دونوں کو متوجہ کیا۔ ”میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ میری می کی کال آنے والی ہے۔ وہ ہوٹل میں مجھے اس

وقت نہ پا کر پریشان ہو جائیں گی۔ میں رات کو پھر آؤں گی۔ تم پریشان مت ہونا۔“ قریب ہو کے حینیں کا کندھا تھام کر وہ کہہ رہی تھی۔ سعدی

نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس فارزی لڑکی کو دیکھا جو ان کے لیے بے حد فکر مند لگ رہی تھی۔ اور پھر دوسرا طرف جاتی گھنٹی سننے لگا۔

”جی ہاشم بھائی!“ رابطہ ملتے ہی وہ بچوں کی سی بے ساختگی سے بولا۔

”پلیز آپ ادھر آ جائیں۔ جی ادھر ہی اسپتال میں۔ مجھے نہیں پتا یہاں کیا ہو رہا ہے، لیکن پچھو کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو تفصیل

یہاں آنے پہناؤں گا، لیکن وہ بھی پولیس کو اپنا بیان دنے رہی ہیں۔ اور جو وہ یہاں دے رہی ہیں وہ ہمارے خاندان کے لیے جا کن ثابت ہو سکتا

ہے۔“ اور دوسرا طرف کارڈ رائیو کرتے ہوئے کافیوں میں پینڈز فری لگائے ہاشم نے تھک کر آئکھیں بند کیں۔ اور پھر گہری سانس لے کر

کھولیں۔ بالآخر وہ یہاں آئی گیا تھا جس کا وہ انتظار کر رہا تھا۔

”میں آرہا ہوں سعدی! تم بالکل نکرمت کرو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ ہاشم سب سنبھال سکتا ہے۔“ بلکی سی مسکراہٹ سے اس نے

پینڈز فری کافیوں سے اتنا رے اور اسکیلیٹر پر پاؤں کا دبا دبھادیا۔

❖❖❖

پولیس آفیسر زمر کے کمرے سے نکل رہے تھے جب کوریڈور کی دیوار کے ساتھ لگے مایوس اور فکرمند سے کھڑے سعدی نے کوئی

آہٹ سی محنوں کر کے گردن موڑی۔ ریسپشن کی طرف سے ہاشم چلتا ہوا آرہا تھا۔ بلیک سوٹ میں ملبوس، کلائی پنڈھی گھڑی دیکھتا، دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے وہ تیز قدم اٹھاتا قریب آیا۔ تحکم اور رعونت سے ان آفیسرز کو دیکھا۔ وہ فوراً سید ہے ہوئے تھے۔ اے ایں پی نے مود بانہ انداز میں سلام کیا۔ ہاشم نے محض سر کے خم سے جواب دیا اور ان کو نظر انداز کر کے سعدی کی طرف آیا۔

”مجھے مختصر بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟“ اور اسے تو جیسے ہاشم بھائی کے آنے سے بہت تقویت مل گئی تھی۔ وہ پریشانی سے تیز تیز بولتا اس کو ساری صورتحال سمجھانے لگا۔ ہاشم کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا مگر بظاہر پوری توجہ سے سن کر اس نے سر ہلا کیا اور اسے وہیں رکنے کا کہہ کر کمرے کی طرف بڑھا۔

”مجھے زمر سے اکینے میں بات کرنی ہے۔“ اندر موجود اکٹم کو اس نے بس ایک فقرے سے باہر بھجا، دروازہ بند کیا اور بیڈ کے سامنے آیا۔ قدرے نیک لگا کے لیٹھی زمر نے اکتا کر ہاشم کو دیکھا اور بیزاری سے منہ پھیر لیا۔

”آپ جس لیے بھی آئے ہیں، کتنا ہی اچھا ہو واپس چلے جائیں کیونکہ میں اس وقت کم از کم آپ سے بات کرنے کے موڑ میں نہیں ہوں۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے فارس کے خلاف بیان دیا ہے؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ زمر نے واپس منہ اس کی طرف کیا اور گھر سے تاثرات سے بولی۔

”آپ کو میرے بیان پر جو بھی اعتراض کرنا ہے جو بھی واپس کرنا ہے، آپ کو رث میں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ میں اپنی کسی بات سے اک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ ہاشم کے چہرے پہ ملال ابھرا اور بے لینی بھی۔ وہ قریب آیا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے کتنا تا قابل اعتبار سمجھتی ہیں۔ شوق سے سمجھیے مگر آپ کے بارے میں میں ایک بات جانتا ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتیں اور بلا وجہ کسی کے بارے میں اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتیں۔“ وہ جو یزاری سے اس کو دیکھ رہی تھی، قدرے چوکی۔ چہرے کے تاثرات ذرا نرم ہوئے۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ آواز میں البتہ وہی بے اعتمانی اور خشکی تھی، جیسے وہ جلد از جلد ہاشم کی کمپنی سے چھکارا پانا چاہتی تھی۔

”میں صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ کیا واقعی وہی ہوا تھا جو آپ نے پولیس سے کہا؟ کیا واقعی آپ نے فارس کو اعتراف جرم کرتے سن؟“ کافی توجہ اور دھیان سے اس کو دیکھتا پوچھ رہا تھا جیسے اس کا کہا گیا ایک ایک لفظ اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہو۔

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں نے سب سچ کہا ہے۔ ایک ایک حرف۔“ ہاشم نے سمجھنے والے انداز میں ”اوکے“ کہتے ہوئے کار سے نادیدہ گرد جھازی کوٹ کا ٹھنڈا بند کیا اور۔

”تو پھر آپ مجھے ہمیشہ اپنی حمایت میں پائیں گی۔“ کہہ کر مر گیا۔

زمر اس کو باہر جاتے دیکھتی رہی۔ اب بھی اس کی لگا ہوں میں بیزاری تھی مگر اس کی شدت کم تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو باہر کھڑا سعدی نظر آیا۔ زمر کی لگا ہوں میں امید سی جا گی۔ اس نے ذرا گردن اٹھا کے دیکھا مگر سعدی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً ہاشم کی طرف پر امید سا بڑھا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ درمیان کا رستہ رک گیا۔ زمر نے سربے دلی سے تکیے پڑاں دیا۔ آنکھ کے کنارے پہلکی سی نبی ابھی تھی مگر اس نے جلدی سے انگلی کی نوک سے اسے صاف کر لیا۔ وہ بیٹھ کے رو نے والوں میں سے بھی بھی نہیں تھی۔ تو پھر آج کیوں؟ اونہ۔

"کیا آپ نے زمر سے بات کی؟" باہر وہ بے قراری سے ہاشم سے پوچھنے لگا۔ ہاشم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا اہم ساقم پکا۔

"تم فکر نہ کرو۔ ہم پولیس ٹیشن چلتے ہیں۔ وہ فارس کو ایسٹ کر کے وہیں لا کیں گے۔" سعدی کو جھکا لگا تھا۔  
"کیا وہ ماموں کو ایسٹ کر لیں گے؟"

"وہ ڈسٹرکٹ پر اسکیوٹر ہے۔ اور وہ کہہ رہی ہے کہ اس کے اوپر فارس غازی نامی شخص نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ وہ اس کو ضرور ادا کریں گے اس لیے تم فارس کے لیے معاملات بگاؤ نے کے بجائے مختصر طریقے سے چیزوں کو حل کرنے کی کوشش کرو۔ آؤ۔" ہاشم اہل طرف بڑھا تو متذبذب سا کھڑا سعدی فوراً اس کے پیچھے پکا۔ خینی بھی اب کوئی یور کے سرے پہ آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ خینی تک رکا۔

"تم ای کوفون کر لینا اور ان سے کہنا دہ تھہارے پاس آ جائیں۔" خینی نے اثبات میں سر ہلایا۔ قدرے مشتبہ نظر وہ سے سامنے ہٹے ہاشم کو دیکھا جواب سعدی کے انتظار میں رک گیا تھا۔ نگاہیں ملیں۔ ہاشم نے "کیسے ہو بیٹا؟" کہہ کر گویا حال احوال کا فرض نبھایا اور اہل کا انتظار کیے بغیر سعدی کو چلنے کا اشارہ کرتا مزدرا اور پھر خینی کے سامنے وہ دونوں تیز تیز باہر نکل گئے۔

خینی اب کاثتی وہاں کھڑی سوچتی رہی۔ پھر زمر کے دروازے تک آئی۔ دستک دینے کو ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھ نے دروازے لاؤں چھو۔ اس نے ہاتھ گردایا۔ کسی بھی چیز کا کوئی بھی فائدہ نہیں تھا۔ کم از کم اس کی زمر سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ ایک بے فائدہ گفتگو اس لے ماتھ کر سکے۔ وہ برے دل کے ساتھ واپس پلٹ گئی۔



افکار پہ پھرا ہے، قانون یہ ٹھرا ہے..... جو صاحب عزت ہے، وہ شہر بدر ہو گا  
پولیس ٹیشن کے اس کمرے میں ایک خالی میز پھیلی تھی اور اس کے گرد تین کریساں۔ سعدی بے چینی سے کری کے کنارے نکا میز پہاڑا رکھے ہاتھوں میں گرائے بیٹھا تھا۔ ایک سال کم عمر چہرے پہ بے پناہ فکر مندی تھی۔ ساتھ والی کری پہ ہاشم ناگ پہنچ رکھے بیٹھا اہل پہنچ دبائے جا رہا تھا۔ وقفہ و قفے سے وہ نظر اٹھا کے سعدی کو بھی دیکھ لیتا۔ کبھی کبھی کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی آمیز انداز میں تھپکا۔

"میں سب سنبھال لوں گا۔ بے فکر ہو۔"

سعدی نے بدقت مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت کسی بھی چیز کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کتنی دیر سے فارس غازی سے ملاقات کے لئے بیٹھتے مگر کوئی اسے لاہی نہیں رہا تھا۔

باہر پھیلی سہ پہر رات میں ڈھلن چکی تھی۔ سعدی اٹھ کر کمرے میں مضطرب سا چکر کاٹنے لگا۔

یہ خیال کہ فارس ایک ناکرده جرم کی پاداش میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے حوالات میں بند ہے، اس کے لیے انتہائی تکیف دہ تھا۔ ہاشم اہل پہنچ دبائے جا رہا تھا۔

دفعتہ دروازہ ٹکلا۔ ہاشم نے کافی پر سکون انداز میں اور سعدی نے بے حد بے تابی سے اس طرف دیکھا۔ دو اہلکار فارس غازی کو لیے اہل ہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ سیاہ جیمز پر راؤ نڈیک والی گرے شرٹ میں ملبوس جس کی آستینیں کلامی تک آتی تھیں۔

اہل انتہائی غصے بھری بے کسی کی کیفیت میں تھا۔ ابر و سچنے تھے اور ہلکی شہری آنکھوں میں شدید ٹھنڈی تھی۔

ہاشم موبائل رکھ کر فوراً اٹھا۔ ایک کڑی نگاہ اہلکار پہ ڈالی۔

"جھکڑی کھولو۔" اس کا انداز اتنا سخت تھا کہ بنچوں چرخ فارس کی جھکڑی کھول دی گئی۔ فارس نے ہاتھ جھکئے، کری کھنچی اور ناگ پہ

ٹانگ رکھ کے بیٹھا۔ اس کے ماتھے پر ابھی تک بل تھے۔

”تم ٹھیک ہو؟“

ہاشم مصنوعی ہمدردی سے پوچھتے ہوئے کھڑا رہا جبکہ سعدی جلدی سے آ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا۔ فارس نے ایک تینجھی نظر ہاشم پر ڈالی اور استہرا سیئہ سر جھکنا جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے اس حالت میں دلکھ کر سب سے زیادہ خوش تمہیں ہی ہوئی ہو گی۔ ہاشم اس کی سرد مہربی محسوس کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

”میں اے ایسیں پی سے مل کر آتا ہوں۔ تم بات سن لو۔“ سعدی کو اشارہ کر کے وہ باہر نکل گیا۔ اب کے فارس نے ان ہی تاثرات سے اسے دیکھا۔

”کیا واقعی تمہاری پچھوئے مجھ پر یا الزام لگایا ہے؟“

اس کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا۔ سعدی نے بے بی سے نفی میں سر ہلاایا۔

”میں خود سمجھنہیں پار رہا یہ کیا ہوا ہے۔ کیا آپ نے انہیں کال کی تھی؟ کیا آپ نے ان کو ریسٹورنٹ میں بلا یا تھا؟“

”میں نے انہیں کسی ریسٹورنٹ میں نہیں بلا یا تھا، ہوٹل میں بلا یا تھا۔ خنی تھی، اس کی وہ دوست تھی۔ میں نے انہیں کوئی کال نہیں کی تھی۔ میں سمجھنہیں پار رہا میڈم میرے بارے میں ایسی باتیں کیوں کرو رہی ہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔“ اس نے طیش سے کہتے ہوئے میز پر مکارا۔

سعدی پچھے کوہوا۔ اب کاٹتے ہوئے سوچنے لگا۔ اب کچھ کچھ صورتحال سمجھ میں آ رہی تھی۔

”مگر انہوں نے کہا آپ نے انہیں کال کر کے کہا ہے کہ آپ نے ہی وارث غازی کا قتل کیا ہے اور یہ بھی کہ...“ سعدی رکا۔ اے وہ تمام تکلیف وہ الفاظ یاد تھے جو زمر نے اس کے سامنے آفیسر کو بتائے تھے۔

”اور یہ کہ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا ذمہ اور اس طرح کی بہت ساری باتیں۔“

وہ واقعی دہرانہیں پار رہا تھا۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ آخر زمر اس فرض کی بات کیسے کر سکتی تھیں۔

”میں میڈم سے ایسی بات کیوں کروں گا؟ میرے پاس دو گواہ ہیں۔ خنی اور علیشا۔ ہم سارا وقت ایک ساتھ رہے۔ میں نے کسی سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اور میں اس کو کیسے گولی مار سکتا ہوں؟ میرے پاس تو اس وقت کوئی گن بھی نہیں تھی۔“

”مگر جو گولی پچھوکو ماری گئی تھی وہ علیشا کے کمرے کے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی سے ماری گئی اور جب پولیس نے وہاں پر چھاپا مارا تو وہاں موجود گن آپ کی تھی۔ اس پر آپ کے فنگر پر نش تھے۔ یہ وہی امریکن گن تھی جو آپ نے بلیک میں پشاور سے خریدی تھی۔ اور آپ کے نشان لگے گلاس اور کلکٹری بھی وہاں سے قبضے میں لی گئی ہے۔ فنگر پر نش کے رزلٹ آگئے ہیں۔ وہ کمرہ بھی آپ کے نام بکھرا اور ہوٹل کے اس فلور کے سیٹی وی کیمراز بھی خراب تھے۔ سو آپ علیشا کے کمرے میں گئے یا دوسرے کمرے میں کوئی ثبوت نہیں ہے اور اس پر مسترز اذر کا یہ بیان۔ میں کچھ بھی سمجھنہیں پار رہا، آخر ہو کیا رہا ہے فارس ہاموں؟“

وہ ہاشم کی بتائی گئی معلومات جو عین زمر کے بیان کے بعد منظر عام پر لائی گئی تھیں دہراتا گیا۔ آخر میں اس کی بے بی بھی جیسے برہی میں بدلنے لگی۔ ہاشم واپس آگیا تھا اور اب خاموشی سے کرسی پر بیٹھا تھا۔

فارس نے اب کے غور سے اس کا چھرہ دیکھا۔ ”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، میں بکواس کر رہا ہوں، ہاں؟“

”میں صرف اتنا پوچھ رہا ہوں... کیا آپ نے پچھوکو کال کی تھی؟“

”میں نے کسی کو کوئی کال نہیں کی۔ میں میڈم سے ایسی بات کیسے کر سکتا ہوں کہ میں انہیں گولی مار نے والا ہوں؟ رہش! گولی مار نے

تے پہلے کون بتاتا ہے؟"

اس نے اشتعال سے سر جھکا، جیسے بس نہ چل رہا ہواں میز کو اٹھا کر سعدی کے اوپر دے مارے۔ سعدی ایک دم رک کر اسے دیکھنے لگا۔ انہیں عجیب نظر وں سے۔

"میڈم کون؟"

"تمہاری پھپھو اور کون؟" فارس اکھڑا اکھڑا سا بولا۔

"آپ زمر کو میڈم کہتے ہیں رائٹ؟" اس کے ذہن میں جیسے الارم نک رہا تھا۔ قدرے پر جوش سا ہو کروہ آگے کو ہوا۔

"لیکن زمر نے جو بیان دیا ہے اس میں انہوں نے تایا کہ آپ نے انہیں "زمر" کہ کر مخاطب کیا ہے۔ مگر آپ بھی پھپھو کا نام نہیں لیتے۔ مجھے یاد ہے آپ ہمیشہ ان کو میڈم کہتے تھے۔"

"اوہ ڈیم!" ہاشم نے کراہ کر گویا آنکھیں بند کیں۔ اسکر پٹ لکھنے میں ذرا سی غلطی لئنی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔

فارس نے ہلکے سے شانے اپکائے۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ بھی تک سعدی کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

سعدی تیزی سے کھڑا ہوا۔ "میں جانتا ہوں آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ حق کہہ رہے ہیں آپ نے واقعی انہیں کوئی کاں نہیں کی۔ آپ فرمات کریں۔"

اس نے تسلی دینے والے انداز میں فارس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہاشم بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں باہر انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔" اور ہر نکل گیا۔

"ہاشم بھائی بہت جلد آپ کو یہاں سے نکال لیں گے۔"

"ہاں" فارس نے استہزا یہ سر جھکا۔ "ہاشم اور میرے لیے کوشش کرے گا؟ بھی بھی نہیں۔ وہ جو کر رہا ہے وہ بھی صرف دکھاوے کے لیے ہے۔ میں اس کو جانتا ہوں۔ اپنا مطلب نہ ہو تو وہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔" سعدی نے متوجہ سا ہو کر اسے دیکھا۔

"وہ ان پہلے لوگوں میں تھے جنہوں نے آپ کی بے گناہی پر یقین کیا تھا۔ کم از کم ان کے بارے میں آپ کو اتنا منفی نہیں ہوتا چاہیے۔ آپ تسلی رکھیں۔ ہاشم بھائی آپ کو بہت جلد رہا کروالیں گے۔"

فارس شاکی سا کچھ بڑا کرچپ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بچھلے چند دن سے چھایا ملال اور کرب اب شدید غصے میں ڈھل رہا تھا۔ آخر زمر نے اس پر اتنا بڑا ازالہ کیا سوچ کر لگایا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ فارس قتل نہیں کر سکتا، یا شاید وہ کسی اور کی جگہ اس کا نام لے رہی تھی، شاید وہ کسی اور کو کو کر رہی تھی۔ پرانیں اس نے سر جھکا۔ سعدی اب باہر جا رہا تھا۔ اسے جلد اس جلد پھپھو سے ملتا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

جب رات کے پودے سے پھر رات نکل آئے ..... اس وقت کدھر جائے جو اہل نظر ہو گا ہسپتال کے کمرے میں وہی دوائیوں کی بوچھلی تھی۔ زمر بدستور اسی طرح لیتی تھی۔ اس کی ویران نگاہیں چھپتے پڑتیں۔ ذہن میں جانے کیا چل رہا تھا۔ سعدی جب اندر آیا تو دیکھا زمر کا چہرہ پہلے سے بہت زیادہ مر جھایا ہوا اور رنگت ہلدی کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل مزید ٹوٹ گیا۔ وہ قریب آیا۔ زمر کی آنکھوں میں کرب اترا اور ساتھ ہی گردن میں ابھر کر دوستی گلٹی سی نظر آئی۔ سعدی مزید قریب آیا۔ یہاں تک کہ اس کے کندھے کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ زمر اب نگاہیں پوری اٹھا کر اس کو دیکھ رہی تھی۔

"سعدی! اس نے مجھ پر گولی چلائی۔ میں نے خود سنایا۔ تمہیں مجھ پر یقین ہے نا؟"

چند گھنٹے پہلے پولیس آفیسرز کے سامنے سپاٹ سنجیدہ اور مضبوطی پر اسکیو ٹرائب بہت کمزور لگ رہی تھی۔ اس کے انداز میں بے بسی

بھی تھی، خوف بھی۔ مکڑی کے جالے کا سامان تھا، معلوم نہیں کب ٹوٹ جاتا۔ سعدی نے اسے سنجیدگی سے دیکھا۔

”فارس غازی نے آپ سے کیا کہا تھا فون پر؟“

”اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے صرف ایک گولی مارے گا۔“

”نہیں مجھے ان کے الفاظ بتائیے، ایک ایک لفظ۔“

زمر کی آنکھوں میں چمکتی امید مزید گھری ہوئی۔ مکڑی کے جالے کا سامان مضبوط ہوا۔ وہ پہلے سے زیادہ پر اعتماد ہو کر بولی۔

”اس نے کہا میں صرف تمہیں ایک گولی ماروں گا زمر دل میں اور...“

”مگر فارس غازی نے آپ کو کبھی آپ کے نام سے نہیں پکارا۔ وہ ہمیشہ آپ کو میڈم کہتے تھے۔“  
وہ ایک دم بالکل رک کر تجھ سے اسے دیکھنے لگی۔

”فارس غازی نے آپ کو کوئی کال نہیں کی تھی۔ آپ کو فارس نے گولی نہیں ماری تھی۔ ان کو سیٹ اپ کیا گیا ہے۔ کچھ تو ہے جو آپ چھپا رہی ہیں۔ پلیز مجھے سب کچھ بتائیے، ایک ایک بات۔“

زمر بالکل متغیری اس کو دیکھنے لگی، بنا پلک جھکے جیسے سانس تک رک گیا ہو۔

”سعدی! تم کہہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“

”میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔“

”صرف اس بنیاد پر کہ وہ مجھے میرے نام سے نہیں پکارتا تھا؟ اس نے گولی بھی تو مجھ پر پہلی دفعہ ہی چلائی تھی۔ بہت ساری چیزیں پہلی بار رہی ہوتی ہیں۔“

”وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ انہوں نے آپ کو کوئی کال نہیں کی۔ آپ بتائیں، کچھ ہے جو آپ چھپا رہی ہیں۔ آپ وارث مامور کے نارگٹ کیس کی فائلز نکلوارہی تھیں۔ کیا آپ کسی کو کوئی کر رہی ہیں؟ کیا کوئی آپ کو یہ سب کہنے پر مجبور کر رہا ہے؟“ یہ خدشہ ہاشم نے راستے میں ظاہر کیا تھا یونہی سرسری سا مگر سعدی کے ذہن میں اس نے جڑ پکڑ لی۔

زمر کے دل پر کسی نے پیر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گلابی سنی اتری۔ لب بھنج گئے۔

”تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“

”زمرا! آپ مجھے سب کچھ حق بچ کیوں نہیں بتاتیں؟“ اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے سعدی وہ کیا تکلیف ہے جو میں نے پچھلے کچھ دنوں میں کہی ہے؟ میرے گردے ضائع ہو گئے ہیں۔ میرا بابا مغلون ہو گیا ہے۔ میری زندگی کی ساری امیدیں ٹوٹ گئی ہیں۔ میں بھی نارمل نہیں ہو سکوں گی۔ ایسے وقت میں بھی تمہیں لگ رہا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں، تمہیں فارس زیادہ قابل اعتبار لگ رہا ہے! کیا تم مجھے نہیں جانتے؟“ وہ متغیر بے یقین تھی۔

”میں آپ کو جانتا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں آپ کوئی بات مجھے نہیں بتا رہیں۔ آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہے۔ علیشا کہہ رہی ہے، حنین کہہ رہی ہے مامور ان کے ساتھ تھے، انہوں نے کوئی کال نہیں کی۔ وہ تین لوگ جھوٹ نہیں بول رہے۔“ وہ ناراضی سے اسے دیکھ کر متغیری سے بولا۔

زمر کے ابر و غصے سے اکٹھے ہوئے۔ اس نے کہنی کے بل قدر اے اٹھنے کی کوشش کی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ وہ سب حق بول رہے ہیں۔ ایک میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ تمہیں نہیں کرنا میرا اعتبار ملت کرو۔ لیکن میں دنیا کی ہر عدالت میں جا کر اس کے خلاف گواہی دوں گی۔ میں پوری دنیا کو بتاؤں گی کہ کس طرح اس نے میرے اوپر گوئی چلائی اپنی یوں کو مارا،“

”ہمائی کو مارا، میری زندگی برباد کر دی۔“

سعدی نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

”آپ کو پتا ہے آپ کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے زمر؟ جب آپ کے دماغ کی سوئی ایک بات پا انک جاتی ہے تو پھر وہ وہاں سے نہیں اٹ لاتی۔ آپ اس کے آگے پیچھے بچتے تھے تم کی سوچ کا دروازہ خود پہنڈ کر لیتی ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ بالکل بچ کرہ رہی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے؟ تمہیں میرے بچ بولنے میں شک ہے؟“ وہ بے یقین سے غرائی تھی۔

”لیکن زمر! میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ کوئی تیرسی چیز بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کیوں منہذے دل سے اس بات پر نہیں سوچتیں۔ اب انہمارس غازی کو بے گناہ تصور کر کے سوچتیں۔ ہو سکتا ہے کسی نے انہیں پھنسایا ہو۔ یہ سب ایک سیٹ اپ ہوا رکھ بھی نہ ہو۔ آپ ایک ام۔ صرف ایک دفعہ اپنے مفروضات کو پیچھے کیوں نہیں کر لیتیں؟ اگر واقعی آپ کسی کے دباو میں نہیں ہیں تو...“

”مفروضات؟“ وہ چلائی تھی۔ ”میں لتنی دفعہ کہہ بھی ہوں میں نے اس کی آواز سنی ہے۔ اس کا فون آیا تھا مجھے۔ اس نے مجھ پر گولی ہالی۔ میں فارس کی آواز پہچانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ فارس ہی تھا۔ ہر چیز کی سینس بنتی ہے سوائے اس کے کہ تم میری بات سننا نہیں ہا تھے۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ ٹھیک ہے سعدی! امت کر و مجھ پر اعتبار۔ لیکن ایک وقت آئے گاجب عدالت اس کو سزا نہیں کی اور جب ۱۰ ہمدرم ثابت ہو گا اور وہ خود اعتراف جرم کرے گا۔ تب میں تم سب کے چہرے دیکھنا چاہوں گی۔ تم، تمہیں بھابی کوئی بھی میری بات پر یقین لاؤں کر رہا ہیں جانتی ہوں۔ لیکن تم لوگ دیکھو گے، ضرور دیکھو گے۔“

تیز تیز بول کر وہ ہانپنے لگی تھی۔ سر تکیہ پر گردایا۔ سعدی خنکی سے پیچھے ہوا۔

”ایک بھی سب سے بڑا مسئلہ ہے آپ کا۔ آپ کسی دوسرے کی کوئی بات سمجھتی نہیں ہیں۔ آپ سمجھنے کے لیے بات نہیں سنتیں، آپ اب دینے کے لیے بات سنتی ہیں۔ آپ اپنے خیالات میں اتنی فکر نہ ہو جاتی ہیں کہ آپ کسی نئے تصور کے لیے اپنا ذہن کھلانہیں رکھتیں۔ آپ ام، بھی پتا ہے کہ آپ غلط کہہ رہی ہیں مگر...“ اور زمر کے لیے یہ بہت تھا۔

”کل جاؤ میرے کمرے سے! ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ اس لے چلاتے ہوئے بازا رخا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ سعدی بھی غصے سے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ اتنی ضدی کیوں ہو رہی تھی۔ وہ اس کی اٹ لیوں نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

”آپ کو صرف اس بات کا غصہ ہے کہ میں نے آپ کو یہ کیس لینے کے لیے کیوں کہا۔ یہ کہ اس کیس کی وجہ سے آپ کی شادی اٹ لیئے ہو رہی تھی۔ آپ اس کیس کا غصہ فارس ماموں پر نکال رہی ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ایک دفعہ پھر وہی کر رہی ہیں۔ ان کی بیوی کا لہلہ ہے، ہمارا خاندان تباہ ہو چکا ہے اور آپ اپنی ضد کو لے کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ زمر آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟“

”کل جاؤ میرے کمرے سے اور دوبارہ مت آنا۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی اس وقت۔ جاؤ سعدی!“ وہ زور سے ہے چلائی۔

”پانی سے گاڑھا۔“

”کل جاؤ میرے کمرے سے اور دوبارہ مت آنا۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی اس وقت۔ جاؤ سعدی!!“ وہ زور سے

ہاال۔



وہ فوراً تیزی سے مڑا دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔

خین سامنے کھڑی تھی۔ ناکمل بند پٹ کی وجہ سے وہ سب سن چکی تھی۔

”آخروہ اتنی خود غرض کیسے ہو سکتیں ہیں کہ انہیں کسی کا بھی خیال نہ ہو! نہ مامور کا، نہ سارہ خالہ کا! ان کو صرف اپنا غم یاد ہے۔“ وہ

شاک سا کہتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ خین سمت قدموں سے چلتی اس کے قریب آئی۔

”آپ کو پھپو سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

وہ متوجہ سا اس کی طرف گھوما۔ ”ان کے اڑاکم کی وجہ سے فارس ماموروں کو پھانسی ہو جائے گی اور تم کہتی ہو کہ۔۔۔“

”جو بھی تھا آپ کو پھپو سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی، کم از کم آپ کو نہیں!“

وہ کہہ کر مڑ گئی۔ سعدی نے خنگلی سے سر جھکا۔ منہ میں پکھہ بڑا بڑا اور آگے بڑھ گیا۔

خین چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ ذرا سی درز سے اندر جھانا، زمرا سی طرح لیئے تھی۔ گردان سیدھی تھی، وہ اوپر دیکھ رہی تھی اور وہ رورہ تھی، بری طرح! کبھی وہ اپنے ساتھ گلی نالیوں کو دیکھتی، کبھی مشینز کو، کبھی سفید چارکو، کبھی ہاتھ میں لگے کینوں لا کو، اور آنسو میں ابل کر آنکھوں سے گرتے جا رہے تھے، کہیں کوئی ہلکی سی سکی بھی نکل جاتی تو وہ ہونتوں پہ ہاتھ رکھ کے اسے دبایتی، اس کے لئے یہ بہت شرمندگی کی بات تھی کہ کوئی اسے روتا دیکھے۔ وہ تو دادی کی ڈیتھ پہ بھی سب کے سامنے نہیں روئی تھی۔ اکیلی کمرہ بند کر کے روئی۔

خین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کافی دیر و ہیں کھڑی رہی۔ اس کو چھپ کر زمر کو دیکھنے کی عادت برسوں سے تھی۔ مگر روتے

ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔

### کوئی تدبیر نہیں آتی ..... کوئی صورت نظر نہیں آتی

ندرت اور بڑے ابا زمر کے کمرے میں تھے اور سعدی بابا ہر۔ وہ جان بو جھ کر زمر کے پاس اندر نہیں گیا تھا۔ وہ اس سے ناراض تھا مگر

زمر نے اسے اندر بلایا بھی نہیں۔ ایک دفعہ کسی سے پوچھوا یا بھی نہیں۔ منایا بھی نہیں۔ وہ خفا خناسا بابرہی بیخمار ہا۔

وہ آج پہلے سے بہتر لگ رہی تھی۔ صحت میں نہیں جذباتی کیفیت میں۔ یک لگا کر قدرے اٹھ کے بیٹھی۔ گھنگریا لے بال پونی میں

باند ہے، خاموش اور سنجیدہ۔

سامنے دہیل چیز پر موجود بڑے ابا کو اس کا ہر انداز اذیت دے رہا تھا۔ وہ دور کسی غیر مرائی نقطے کو دیکھتی بظاہر ان دونوں کو نظر انداز کر رہی تھی۔ ندرت خاموش سی سامنے کا وحچ پہنچی تھیں۔ زمر لا کھ عزیز صحیح، فارس ان کا بھائی تھا۔ اور وہ سعدی کی طرح زمر سے جھگڑا کر کے اس پر چیخ چلا کر ناراض نہیں ہو سکتی تھیں۔ ذہن میں بار بار خیال آرہا تھا آخروہ بھی تو فرحانہ کی بیٹی ہی نکلی مگر وہ ظاہر نہیں کر رہی تھیں، بالکل چپ کسی نہ کسی مصالحت کی امید لئے۔

بڑے ابا نے ہاتھ بڑھا کے بیٹی کے ہاتھ کو تھاما، وہ بیٹی کے قریب بیٹھے تھے، ان کی ضد پر آج انہیں یہاں آنے کی اجازت ملی تھی۔

اس بے بس سے لمس پر زمر نے چہرہ گھما کے ان کو دیکھا۔ وہ بہت کمزور اور بوزٹھے لگ رہے تھے، اداں بھی۔

”بیٹا، میں فارس کو جانتا ہوں وہ ایسا پکھنہیں کر سکتا، ضرور اس کو پھنسایا جا رہا ہے۔“

”انتمی جنس آفیسر کو کون پھنسا سکتا ہے ابا؟“ وہ بے زار ہوئی۔

”کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں ہوتے؟ ان کی کمزوریاں نہیں ہوتیں؟ ان انتمی جنس آفیسرز کی فاکلوں کے انبار ہیں جو بے گناہ ہوتے

ہوئے بھی نکالے گئے، پھنسائے گئے، یا پھانسی چڑھ گئے۔ وہ سب سے الگ ہے کیا؟“

”ٹھیک ہے۔ آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں، حالانکہ سب سے زیادہ نقصان میرا ہوا ہے، میں نے اس کے الملا اتنے تھے، میں نے اس کی منت کی تھی کہ وہ میرے اوپر گولی نہ چلائے، وہ میری زندگی خراب مت کرے۔“ درد سے پھٹی آواز میں کہتے تھے اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔ ”میں نے اباں کو اتنا تک کہا کہ میں اس کا کیس اڑوں گی، ہر عدالت میں اس کے ساتھ کھڑی ہوں گی، وہ میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرے۔ لیکن اس نے پھر بھی مجھ پر گولی چلائی۔ اگر اس نے میری کوئی خیر قبول نہیں کی تو آپ اس کے لئے مجھ سے دی خیر کی توقع مت رکھیں۔“

”میں جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بول رہی، لیکن یہ صرف اور صرف کوئی غلط نہیں۔۔۔“ زمر نے بے زاری سے اپنا باتھ ان کے ہاتھ پر نکال لیا۔ وہ دل مسوں کر بیٹھنے رہ گئے۔

”آپ لوگ پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ جس کو جرم سمجھنا چاہئے اس کے لئے آپ کے دل میں ہمدردی ہے تو ٹھیک ہے، ہمدردی یہ کام مجھے بھی شوق نہیں۔ میں جیسی ہوں ویسی ہی ٹھیک ہوں۔“

”ایسے کیوں سوچتی ہو؟ ہم انتظام کر رہے ہیں، بہت جلد کوئی کڈنی ڈریڈن جائے گا، تمہیں کبھی ڈائلیس پر نہیں آتا پڑے گا، تم اپنے سے صحت یاب ہو جاؤ گی۔“

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ گردن پھیر کر کھڑکی کی طرف دیکھتی رہی۔

ندرت آہنگی سے اٹھیں، اس کے قریب آئیں، اور بیڈ کی پائتی پر بیٹھیں۔ منت بھری بے بسی سے اس کو دیکھا۔

”زمر میرے لئے کیا تم اپنابیان واپس نہیں لے سکتیں؟ فارس جیل چلا جائے گا، اس کو سزا ہو جائے گی، وہ بر باد ہو جائے گا۔“

اس نے رُخی ٹکا ہوں سے ندرت کا چہرہ دیکھا۔

”اور میں بھالی! میری خوشیاں، میرے غم؟ ان کا کیا؟ آپ سب کو لگتا ہے کہ میں اپنی ضد پاڑی ہوئی ہوں؟“ شکایت آمیز نظر اپنے باپ پر ڈالی، لیکن آپ لوگ نہیں سوچتے کہ میرے پاس ضد کرنے کے لئے کچھ بچانیں ہے، میں تباہ ہو چکی ہوں! اب فارس بر باد ہو یا آباد، مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے! میں نے اس کی عزت کی ہمیشہ، کیونکہ مجھے انسان کے اندر کی اچھائی پر یقین ہوتا ہے، مگر میں غلط تھی، وہ دیسا ہی ہے جیسا لوگ اس کے بارے میں کہتے تھے۔ آپ اس کے لئے مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں۔ کیونکہ میں آپ سب کی نااعتباری سہہ ملت ہوں لیکن فارس کو معاف نہیں کر سکتی۔“

وہ گردن موڑ کر پھر سے کھڑکی کو دیکھنے لگی۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ اب وہ لوگ چلے جائیں۔

ندرت آہنگی سے اٹھیں، بڑے ابا کی وہیل چیز کے پیچے آئیں، اور انہیں لیے باہر نکل گئیں۔ دروازہ حسب معمول آدھا کھلا رہا ہے۔

کیا۔

دفعتاً راہداری سے آوازیں آئیں۔ ندرت کسی سے مخاطب تھیں۔۔۔ خاتون کی آواز۔۔۔ فضیلہ آئٹی۔۔۔ حماد کی امی، وہ پیچا تھی۔

تمی وہ آہنگ سے سیدھی لیشی، تکلیف چہرے پنودار ہوئی۔ اور آنکھیں بند کر لیں، بالکل ایسے جیسے وہ سورتی ہو۔

واقعی یہ وہ صحیح تھیں جن میں جا گئے ہوئے اسے آفس جانے کی کوئی ٹینش نہیں تھی۔ کون سی خواہش کہاں آکر پوری ہوئی تھی!

ندرت، فضیلہ آئٹی کو اندر لے آئیں تھیں۔ زمر کی آنکھوں میں فی الحال صرف اندر ہرا تھا، گروہ آوازیں سن سکتی تھیں۔ فضیلہ آئٹی۔

یقیناً اس کے بازو کے قریب بیڈ کے ساتھ کھڑی تھیں۔

”بہت زیادہ افسوس ہوا۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ کوئی یقین بھی نہیں کر سکتا کہ زمر کے ساتھ اس طرح ہو گا وہ بھی اتنے اہم موقع سے پہلے! ہمارے تو سارے رشتے دار بھی آچکے تھے۔ اب کچھ سمجھنے نہیں آ رہی کہ کیا کریں۔ حماد کے بہن بہنوئی۔۔۔ پتہ نہیں کتوں کی

فلائش ہیں۔۔ آگے کروانی پڑیں گی۔۔ یا شاید کینسل۔۔“

وہ کہہ ہمدردی سے ہی رہی تھیں، مگر انداز میں کوئی عجلت تھی۔ زمر بند آنکھوں سے بنے گئی۔

”دو شادیاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔۔ حماد کے تیا کے بیٹے کے نکاشہ بھی ساتھ ہی تھے۔ ویمہ تو ہم دے ہی اکٹھار ہے تھے۔ اب ظاہر ہے یہ شادی تو ابھی ہو ہی نہیں سکتی۔ سجاد کے فلکشنز تو کل سے شروع ہو جائیں گے۔ اب آپ تو جانتی ہیں ہماری بھی مجبوری ہے۔۔“

”سب کی مجبوریاں ہیں، میں جانتی ہوں۔۔“ ندرت بولیں تو آواز میں پسپا تھی۔۔

”زمر آنکھیں بند کئے لیتھی رہی۔۔ ندرت اب شاید ان کے لئے کوئی جوس نکالے گئی تھیں مگر وہ منع کرنے لگیں۔۔“

”حمد بابا ہر انتظار کر رہا ہے، ایسا کرتے ہیں ہم وہیں بیٹھتے ہیں، اس کمرے میں تو مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔۔ پتہ نہیں ہستالوں میں ایسی گھٹن کیوں ہوتی ہے؟“

اور ان کی آواز دور ہوتی گئی۔ شاید وہ کمرے سے جا رہی تھیں۔ اور پھر دروازہ بند ہو گیا، سناٹا چھا گیا، قبر کی پہلی رات کا ساسناٹا۔۔

زمر نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اب کمرے میں اکیلی تھی۔

کھڑکی کے باہر دوپھر پہلے ہی تازہ تھی مگر اب بادل اندک آرہے تھے، بارش جیسے بر سے کوئی تھی۔۔ وہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ چلتی چھٹ کو دیکھنے لگی۔ اب کوئی بھی چیز افسوس نہیں دلاتی تھی۔۔ سارے احساسات مر گئے تھے۔ اسے پتہ تھا اب کیا ہو گا۔ دوسری دفعہ اس کی ملکتی ٹوٹ جائے گی۔ پھر بھی ایک امید تھی، شاید ایسا نہ ہو۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے ..... کہیں آنکھیں، کہیں چہرہ نہیں ہے

دروازہ اک دم کھلا، وہ چونکی۔ سوتی نہیں بن سکتی تھی۔ مگر پھر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ آنے والی فضیلہ یا ندرت نہیں تھیں۔

اس کو زمر کے پاس اکیلا چھوڑ دینے کا بہت تحکم سے کہتی، جواہرات کا ردار نے اندر قدم رکھا۔

بند گلے کے سبز گاؤں، لمبی سفید نیل، بالوں کا نیس سا جوڑا بنائے، جوان، اور اسارت سی جواہرات مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

زمر اسی بُرنی اور ناپسندیدگی سے اسے دیکھتی رہی۔

”ہیلو زمر! کیسی ہو؟“

ایک فلپیو ملازم ایک سوت میں ملبوس ملازم پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے لئے پیچھے آئے اور ساری میزوں کو بھردیا۔ جواہرات نے آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گئے۔ ساتھ ہی شہرین کا ردار اندر آئی۔ اس نے لمبی قیص پہن رکھی تھی اور کندھے پہنچین کا پس تھا۔ سنہرے باب کٹ بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں پیچھے کرتی، مصنوعی تی مسکراہٹ لیئے وہ زمر کے فریب رکی اور جیسے تعارف کروایا، ”میں ممزہا شم کا ردار ہوں۔۔ ہم پارٹی میں ملے تھے۔۔“

زمر نے سر کے خم سے ان دونوں کے رسمی کلمات کا جواب دیا، جیسے وہ شدید کوفت میں بتتا ہو۔ جواہرات نے زمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیسے شہرین کو بتایا۔

”زمر یوسف پبلک پر ایک یونٹ ہے۔۔ ہاشم نے یقیناً تم سے ذکر کیا ہو گا۔۔“

شہرین نے منہ میں کچھ چباتے ہوئے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

”جی آئی نو۔۔ ڈی اے ہیں یہ یہاں کی۔۔“ وہ زمر کی طرف مڑی ”سوڈی اے، کیسی ہوتم؟“ اس کو جیسے اپنے انداز تھا طب پر خود ہی

لفظ آیا تھا۔

زمرنے رکھائی سے ”بہت اچھی“ کہہ کر نظر وں کا رخ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔ وہاں دو پہر بالوں سے سیاہ پرتنی جا رہی تھی۔

”آپ بیٹھیے مسز کار دار! میں باہر جاتی ہوں بور ہو جاؤں گی۔“

شہرین اپنے بالوں کو پھر سے پیچھے جھکتی، بے نیازی سے کہتی مڑکر باہر نکل گئی۔ جواہرات بس مسکرا کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر اہل رہی پٹا نگ پٹا نگ رکھ کے بیٹھی، کہدیاں کریں کہے تھے پا اور انگوٹھیوں والے ہاتھ باہم ملائے۔

”مجھے بہت افسوس ہے جو تمہارے ساتھ ہوا۔ جس نے مجھی کیا وہ۔۔۔“

اس نے نک کر جواہرات کو دیکھا،

”جس نے مجھی کیا، کیا مطلب؟ فارس نے کیا ہے یہ سب! اور اگر آپ اس کی وکالت کرنے آئی ہیں میرے سامنے تو پلیز اپنا

اٹ ضائع مت کیجئے گا۔“

”نہیں میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اس نے یہ کیوں کیا؟ کیا کوئی وجہ تباہی تھی اس نے؟“

اتی سادگی پر زمرنے آنکھیں سکیز کر مشتبہ نظر وں سے اسے دیکھا۔

”آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کویری بات کا یقین ہے؟“

جواہرات نے مسکرا کر شانے ذرا سے جھکلے۔

”میں جانتی ہوں تم سچ بول رہی ہو۔“

”اور آپ یہ کیسے جانتی ہیں؟ ہم دوسری دفعہ عمل رہے ہیں!“ وہ سرد سا گھور کر بولی۔ اگر یہ اس سے قریب ہونے کی کوئی کوشش تھی تو ۴۰۱ میں کو اس میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔

”کیونکہ میں اس اذیت کو بچانتی ہوں جو غلط سمجھے جانے والے صحیح لوگوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔“

زمرکی مشکوک انداز میں ابھری آنکھوں میں الجھن ابھری۔

”اور آپ مجھے سے دوسری دفعہ ملاقات میں میرا چہرہ کیسے پڑھ سکتی ہیں؟“

جواہرات انھی اور قدم قدم چلتے کھڑکی نکل گئی۔ باہر باڑش کی نئی نئی بوندیں زمین پر گردھی تھیں۔ وہ چند لمحے کھڑکی سے باہر دیکھتی، اس پر مڑی تو چہرے سے مسکرا ہٹ غائب تھی۔

اس کی جگہ افسوس تھا۔

”مجھے واقعی دکھ ہے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔ کیونکہ اس چیز نے تمہاری زندگی بر باد کر دی۔ اور زیادہ دکھ کی اعتماد یہ ہے کہ کوئی تمہاری بات پر یقین نہیں کر رہا۔ ہاشم کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ کہہ رہا ہے اسے تم پر یقین ہے تو یقیناً ایسا ہا۔ لیکن جہاں تک میری بات ہے، میں تمہیں نہیں جانتی۔ ہو سکتا ہے تم جھوٹ بول رہی ہو، ہو سکتا ہے سچ۔ لیکن میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ

۱ آپ کی کو درست ہوتے ہوئے ناقابل اعتبار سمجھا جائے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔“

زمر کے تین تاثرات قدرے ڈھیلے پڑے تھے مگر لجھ کی رکھائی برقرار تھی۔

”کم از کم میری فیلنگو آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ اپنی زندگی میں بہت عیش و آرام سے رہنے والی ایک ملکہ ہیں۔ آپ کی ایک سلطنت ہے۔ آپ کو ہم جیسے لوگوں اور ہمارے مسائل کی سمجھنیں آسکتیں۔“

جواہرات تلخی سے مسکرائی۔ اس کی پشت پر موجود کھڑکی کے شیشے پر پانی کی بوندیں تڑپڑگر نے گلی تھیں۔

”میں واقعی ایک ملکہ ہوں، اس میں کوئی نک نہیں۔ میں اور میرا شوہر اس شہر کے بہترین کمبو میں چوتھے نمبر پر شمار کئے جاتے

ہیں۔ لیکن کیا تم یہ جانتی ہو کہ میں اس کی دوسری بیوی ہوں؟“

زمر نے بُری طرح چونک کے اسے دیکھا۔ لب اُدھ میں سکڑے۔

”پہلی بیوی تو مرگی، اس کے بعد کتنی آئیں، میں نے حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ اب یاد ہے تو صرف نفرت جو میں اس سے کرتی ہوں۔ مگر ڈرتی بھی ہوں۔ ملکہ بننا بھی آسان نہیں ہوتا۔“

زمر کے چہرے کی ناگواری اب خاموشی میں بدل گئی تھی۔ وہ دھیان سے سُر رہی تھی۔

”ہم سب اندر سے چکنا چور ہوتے ہیں، میں بہت سی باتیں اپنے شوہر سے کہنے نہیں سکی۔ ایک دن آئے گا جب میں کہوں گی؛ جب میرے اندر کی شیرنی غزارے گی۔ لیکن تب تک....“ اس نے بارش سے بھیگتے شمشے سے ہاتھ اٹھایا، مڑی اور کرب سے مسکرائی۔

”تب تک مجھے مصنوعی مسکرا ہوں کے ساتھ کھلیتے رہنا ہو گا۔“ وہ واپس چلتی ہوئی آئی، کرسی پر پیٹھی اسی تمکنت اور رعوفت سے اور موٹی کے ائیرنگ پر انگلی پھیرنے لگی۔

”اور دوسری ملاقاتات میں تمہیں یہ سب میں کیوں بتا رہی تھی؟ تاکہ یہ سمجھا سکوں کہ اگر تم آج اپنے انتقام کے لیے کھڑی نہ ہوئیں تو کبھی نہیں ہو سکوگی۔ اور اگر تم اس سفر میں اکیلی بھری رہ جاؤ میں تب بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔“

زمر یک نک اسے دیکھے جا رہی تھی، چہرے کی ساری تلنگانی بے رخی بے زاری سب غائب تھا۔ جواہرات نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے جانا ہے ایک مینگ میں پھر ملاقات ہو گی۔“

”آپ بیٹھئے نا!“ وہ بے اختیار بولی، تو اپنی آواز میں زماہث محسوس ہوئی۔ جواہرات نے مسکرا کرنگی میں سر ہلا�ا۔

”کسی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کا ایک ٹکڑا توڑ کر اسے دکھانا ہوتا ہے، میں نے یہ کر لیا، مگر تکلیف مجھے بھی ہوئی ہے، اس لیے اب چلوں گی۔“ نرمی سے کہتی وہ مڑگی۔ آنکھ کا ایک کونہ بھیگ گیا تھا۔ اور انگریزیب، اس کی کی گئی تذمیل، دکھ، بے وفا، سب یاد آگیا تھا۔ مگر باہر نکلنے تک وہ خود کو سنبھال پہنچی تھی۔

وینگ روم میں خین اسی طرح پیٹھی تھی، بال پتا نہیں کب کے برش کئے ہوئے، بدول، مر جھائی ہوئی سی۔ سعدی اس کے مقابل ادا سا بیٹھا تھا۔ بار بار نگاہیں پھوپھو کے کمرے کی طرف جاتی رہا اس کی طرف اٹھتیں، پھر سر جھنک کر بڑپڑا کر خود کو روک لیتا۔

دفعتاً کسی آہست پر اس نے سراٹھایا، چوکھت میں شہرین کھڑی تھی۔ سعدی بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اشارہ کیا۔ باہر بلانے کا اشارہ۔ خین اپنی سوچ میں گم تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر شہرین کے پیچھے آیا۔

وہ رہا داری میں کھڑی تھی سینے پہ بازو لپیٹے، فرصت سے اس کو آتے دیکھتی رہی۔

”جی کہیے ممزکار دار؟“

”آئی ایم سوری، میں تم سے ایکسکیو ز کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کر دی تھی۔ شیر و اور تمہارے پیچ مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔“ سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر آنکھیں چند ہیا کر اس کی ڈھنی حالت جانچنا چاہی۔

”اُس اُو کے۔“ وہ بغور اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”گذ، یعنی کہ اب ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں؟ ہوں؟“ وہ ہلکا سامسکرائی۔ اس کی گال کی ہڈی اٹھی ہوئی تھی جب مسکراتی تو آنکھیں چھوٹی ہو جاتیں۔

”کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟“

”ابھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مستقبل میں ہو۔“ اس نے ابر واپکا کئے۔

”آپ بے فکر رہیے، نہ میں نے کچھ ساتھا نہ میں کسی کو کچھ بتاؤں گا۔“ اس نے پچھلے سال کی اس بھولی بسری بات کی جانب

اشارہ کیا۔

”تم بے فکر ہو کیونکہ ہاشم کو پتا چل گیا تھا۔“ سعدی نے چونک کرا سے دیکھا۔

”کیا؟“

”یہی کہ میرا اپنے کزن کے ساتھ افیر چل رہا ہے۔ اور دیکھو اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔“ اس نے کفتان شرت کا کھلا آتین اوپر اٹھایا، کندھے کے قریب بازو کی جلد سامنے آئی۔ اس پر جامنی سیاہ سے نیل تھے، کٹ بھی گئے تھے۔ سعدی بالکل ساکت سارہ گیا۔

”یہ؟“

”یہ میرے شوہرنے مجھے پیا تھا، اب اس بات کو کافی دن گزر چکے ہیں۔ یہ پارٹی کے بعد کی بات ہے۔ اس لئے مجھے بالکل بھی کوئی ڈر نہیں رہا کہ تم کسی کو کچھ بتاؤ گے، چونکہ مجھے کوئی ڈر نہیں ہے تو میرے خیال سے ہم اچھے دوست ہیں۔“ آتین نیچے کیا دوبارہ سے مسکرائی۔ اسکے کندھے کو ہلکا ساتھ پکا جیسے ہاشم تھکلتا تھا اور مڑ کر کر یہ دور میں آگے چلتی گئی۔ سعدی جز بزرگ اس کو جاتے دیکھتا رہا، عجیب سی تھی وہ۔ اس نے سوچا۔ اوس ہوں سر جھکا۔ اور آگے چلتا آیا۔

❖❖❖

کچھ حقیقت تو ہوا کرتی تھی انسانوں میں ..... وہ بھی باقی نہیں اس دور کے انسانوں میں زمر کے کمرے کے قریب سامنے نہ رت، فضیلہ اور حماد کے ساتھ کھڑی تھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ حماد اکھڑا اکھڑا سالگ رہا تھا۔ فضیلہ ہی ساری باتیں کر رہی تھیں۔ اور وہیل پھیر پہ بیٹھے بڑے ابا بس آس طلب نگاہوں سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ پتا نہیں اب آگے کیا ہو گا؟ پتا نہیں اب آگے کیا ہو گا؟ فضیلہ کی ہر بات میں پریشانی اور بھی رکھائی سے ایک ہی فقرہ بار بار آتا۔ ان کے تاثرات ہر شخص بمحروم رہا تھا، ان کا بھی قصور نہیں تھا۔

”ہم کوشش کر رہے ہیں بہت جلد اس کو کٹنی ڈر زم جائے گا۔ اور پھر وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“ بڑے ابا نے امید دلانے کی کوشش کی۔ حماد نے سمجھی گئی سے انھیں دیکھا۔

”ڈوبنیڈ کٹنی کتنا عرصہ چلتا ہے؟“ الفاظ تھے کہ چاک بک۔ بڑے ابا کے منہ پہ لگے۔ وہ بس اس کو دیکھ کر رہ گئے۔

پھر آہستہ سے بولے۔

”عیسائی جب شادی کرتے ہیں تو ایک حلف اٹھاتے ہیں، کہ غربتی میں اور محنت میں ہم ساتھ رہیں گے۔ تھی کہ ہمیں موت جدا کر دے۔ صد شکر کہ ہمارے یہاں یہ حلف نہیں اٹھایا جاتا اور نہ بہت سے لوگ مشکل میں پڑھ جاتے۔“

حمدابے زاری سے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ فضیلہ جلدی سے بات بد لے لگیں، تھی جواہرات کاردار باہر آئیں دھائی دی۔ سعدی کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ مسکرائی تو وہ بھی مسکرا یا۔ اس نیلی کو دیکھ کے لکن تسلی ملتی تھی۔ جیسے ہر مشکل میں ان کے ساتھ ہوں۔

”مجھے امید ہے کہ آپ کی بیٹی بہت جلد محنت یا بہت ہو جائے گی اور اگر نہ ہو بت بھی وہ اتنی فیضتی ہے کہ اس کے ساتھ پا اس کی زندگی کے ساتھی کو فخر ہو گا۔“ ساتھ ہی جواہرات نے حماد کو دیکھا، اس کا حماد سے تعارف نہیں تھا پھر بھی وہ سمجھ گئی تھی۔ یہی ہے بے چارہ ملکیت۔ سعدی ان کا تعارف کروانے لگا۔

”اور نگ ریب کاردار کی بیوی ہام کاردار کی بیوی۔“ فضیلہ اور حماد کے تاثرات فراہد لے۔ بہت خوشدی سے ان سے ملے۔ اس کے ملازم دور کھڑے تھے۔ اور پھر اس کا رعب، تمکنت سے انھی گردن، گھری آنکھیں اور ان کی مسکراہٹ۔ وہ تو تھی بھی ملکہ۔ سوائے بڑے ابا کے، اسکے آگے بچھے والوں کی کمی تھی۔

”تم پریشان مت ہو۔“ اس نے نرمی سے حماد کو خاطب کیا۔ ”وہ ٹھیک ہو جائے گی، اور تم لوگوں کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو گی۔ اور۔۔۔ کیا تم مجھے آفس تک کمپنی دو گے؟ زمرہ، ہماری فیلی ہے، اور اس کے فیانسی سے دوبارہ ملاقات کا وقت جانے ملے یا نہیں۔“ ساتھ ہی امید افزائنا گا ہوں سے سعدی کو دیکھا۔ وہ مسکرا دیا، یقیناً اب وہ اس کو سمجھائے گی، اور جواہرات تو جواہرات تھی۔ وہ کہے اور کوئی انکار کرے ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ حماد بے ساختہ ”جی بالکل شیور“ کہنے لگا۔ جواہرات آگے چلتی گئی۔ حماد فوراً بچھے پکا۔ فضیلہ بیگم نے تنذب بے ان دونوں کو جاتے دیکھا۔ مگر کچھ کہ نہیں سکتی تھیں۔

باہر بارش اب تھم چکی تھی۔ کار کے قریب آ کر جواہرات نے مسکرا کر ڈرائیور کو کہا۔ ”آفس سے دوسری گاڑی مغلوا کر شہرین کو لے جانا اور اب اپنی شکل گم کرو۔“ اور ہتھیلی پھیلائی۔ اس بے چارے نے جلدی سے چابی اس کے ہاتھ پر رکھی اور واقعی دہان سے گم ہو گیا۔ وہ حماد کی طرف مڑی۔

”آفس کا ایڈریس میں تمہیں سمجھا دوں گی۔ ایسی کار ڈرائیور کرنے کے موقع کو امید ہے تم ضائع نہیں کرو گے۔“ اور گھوم کر فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھ گئی، حماد نے چابی دیکھی اور پھر اس چیختی ہوئی کار کر، آنکھیں جیسے خیرہ ہو گئیں۔

جواہرات بچھلی نشست کیسا تھکھڑی ہو کر اس کو دیکھنے لگی۔ وہ جو پہلے اپناروازہ کھولنے لگا تھا، رکا۔ پھر تیزی سے ادھر آیا، اس کے لئے دروازہ کھولا۔ وہ تمکنت سے اندر بیٹھی۔ حماد نے دروازہ بند کیا اور واپس ڈرائیور گ سیٹ تک آیا۔

”یہاں سے سیدھا لے لو۔“ اس نے محض اتنا کہا۔ اور وہ خود کو بہت پر اعتماد طاہر کرتا ڈرائیور کرنے لگا۔

گاڑی سڑک پر روای دوال تھی۔ جواہرات سر جھکائے اپنے موبائل پفون بکھول رہی تھی۔ حماد مرغوب سا، خاموش سا، ڈرائیور کرتا جا رہا تھا۔

”بے فکر ہو، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے کانٹیکش کی فہرست آہستہ آہستہ نیچے کرتے ہوئے کہا۔ حماد نے بیک دیور میں سے دیکھا۔ اور پھر سامنے وڈا اسکرین کو۔

”جی۔“ بس وہ اتنا کہہ سکا۔

”امید ہے اسے ڈوز کلٹنی مل جائے گا۔ سال ڈیڑھ تو چل ہی جائے گا۔ بے کار ہو گیا تو کوئی بات نہیں ڈائیلیس پر آجائے گی۔“ ہفتہ میں دو دفعہ ہی تو کروانا پڑے گا۔ اتنی اچھی لڑکی کے لئے تو تم اتنی قربانی دے ہی سکتے ہو،“ وہ اے والے نمبر سے گزرتی بی پا آگئی تھی۔

”رہا بچوں کا سوال، تو وہ زندگی کا مقصد تو نہیں ہوتے۔ نہ بھی ہوسکیں تو کوئی بات نہیں، اڈا پت کر لیتا۔“ ہلکے سے شانے اچکاتے ہوئے اس کا انگوٹھا اسکرین کو مسلسل نیچے کئے جا رہا تھا۔ ڈی اور پھر ای، ابھی تک مطلوبہ شخص سامنے نہیں آیا تھا۔ حماد کے چہرے پر چھایا تھر بڑھتا گیا۔ البتہ وہ خاموشی سے محض جی، کر کے رہ گیا۔ جواہرات اسے زمر کے لیے قائل کر رہی تھی یا اس سے تغیر، وہ سمجھنہیں پا رہا تھا۔

”دیکھو زندگی میں ہر چیز پر فیکٹ تو نہیں ملتی۔ میرا خیال ہے وہ ایک اچھی لایر ہے، اور تمہارے ساتھ اس سریلیا جا کر بھی اپنی پڑھائی اور جا ب جاری رکھ سکے گی۔ نہ بھی رکھ سکی تو تم ایک کمانے والے بہت ہو نہیں؟“ حماد کی آنکھوں میں مزید تباہ آگیا۔ اس نے سر کو اپات میں خم دیا، اب کہ جی، تک نہیں بولا۔ جواہرات کا اسکرین پر چلتا انگوٹھا ایک دم رکا۔ لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ یہ جے کی فہرست تھی، جیلانی، رقیب جیلانی۔ اس نے اس نمبر پر ایک نیکست بھیجا۔

”میرے آفس کے باہر میرا انتظار کر ریں۔“ اور فون رکھ کے سراٹھا کرچکتی نگاہوں سے حما دکود یکھا۔ یہاں سے اس کے سر کی پشت، ان اور آدھے چہرے کے تنے تاثرات وہ دیکھتی تھی۔

”آگے کا کیا ارادہ ہے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا، قسم جس طرف لے جائے، وہ اختیاط سے قول قول کے اتنا ہی کہہ سکا۔۔۔“

آفس کے سامنے وہ اترے تو جواہرات تیز تیز چلتی آگے بڑھ گئی، جادتا بعداری سے اس کے پیچے تھا۔ مطلوب فلور پہ پہنچ کر بھی وہ اس لے آگے ہی چلتی جا رہی تھی۔ ارگرو مودب ہو کر رکتے اور سلام کرتے لوگوں کو مسکرا کر سر کے خم سے جواب دیتی وہ آگے بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ایک آفس کے سامنے آرکی۔ وہاں ایک سوت میں ملبوس ادھیز عمر صاحب بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتے متکفر سے نظر آرہے تھے۔ جواہرات کو آتے دیکھ کر چہرے پہ چمک آئی۔ آگے بڑھے۔

”میم میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“ جواہرات نے مسکراتے ہوئے ان سے حما دکا تعارف کروایا۔

”یہ ہمارے عزیز ہیں حماد۔ اور حماد یہ ہاشم کی ایک کمپنی کی طرف سے آسٹریلیا میں ہوتے ہیں، آدھا سال یہاں اور آدھا وہاں پہن کے پاس ادھر کی نیشنلی بھی ہے مگر رہتے ہیں۔“ پھر اسی شیریں مسکراہٹ کے ساتھ جیلانی صاحب کو دیکھ کر بولی۔

”حماد ایک انجینئر ہے اور آسٹریلیا میں جا ب کرتا ہے۔ آپ کو اس سے مل کر خوش ہو گی۔“ ساتھ ہی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

”ہاشم میرا انتظار کر رہا ہو گا میں چلتی ہوں۔“ وہ آگے بڑھی تو خوش دلی سے مصافی کرتے ہوئے جیلانی صاحب ایک میکروز کر کے دو قدم جواہرات کے پیچے آئے۔ حماد وہیں لے جلے تاثرات میں گھرا کھڑا رہ گیا۔ خوش ہونا چاہیے یا پریشان؟ وہ سمجھنہیں پار رہا تھا۔

”میں اس لڑکے کا کیا کروں؟ مجھے تو وہاں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“ جیلانی صاحب نے آگے بڑھتی جواہرات کے قریب آکر ہلکی سرگوشی کی۔ وہ مسکرا کر ان کی طرف پہنچ، چکدار آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

”کیا آپ کو اپنی بیٹی کے لئے ایک پڑھے لکھے، خاندانی، اور خوش شکل گدھے کی ضرورت نہیں تھی؟“ جیلانی صاحب کی آنکھیں جیہت سے پھیلیں، سرخود بخود دبات میں مل گیا۔

”گلڈ تو پھر میں نے اسے ڈھونڈ لیا۔ یو آر ولیم“ ان کے تھینکس کا انتظار کیے بغیر وہ مرکر آگے بڑھ گئی۔ جیلانی صاحب اب کے زیادہ گرم جوشی سے مژے، اور حماد کے کندھے پہاتھر کھٹے اسے اپنے ساتھ آگے لے گئے۔

وہ ہاشم کے آفس میں آئی تو وہ ریوالونگ چیسر پہ بیٹھا، کہنیاں میز پر رکھے انگلیوں کے پوروں سے آنکھیں مسل رہا تھا۔ کوٹ پیچے دنگا تھا اور شرٹ کے کف مژے ہوئے تھے۔

”تمہارے اور شہرین کے درمیان کوئی لڑائی ہوتی ہے؟“ آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر ہاشم نے چونک کرا سے دیکھا۔ چہرے پہ تجب ابھرا۔

”آپ کو کس نے کہا؟“

”شہرین کے موڈنے“ وہ کہنی پہ نکا پس بے نیازی سے میز پر رکھتی اس کے سامنے بیٹھی، تاگ پٹا نگ جمالی اور گلے میں پڑی چین انگلی پہ لپیٹ مسکرا کے گھری نظرلوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ہاشم نگاہیں چرا گیا۔

”اگر ہوئی بھی ہے تو کیا؟ میں ہمیشہ کی طرح اس کو معاف کو دوں گا۔ اور اگر معاف نہ کر سکا تو چھوڑ دوں گا۔“

”یعنی تمہیں معلوم ہو گیا کہ اس کا اپنے کزن سے افیس تھا۔“ اس نے ایک دم بری طرح چونک کر ماں کو دیکھا۔

”کیا آپ جانتی تھیں؟“

”بالکل“

”تو پھر مجھے کوئی کیوں نہیں بتایا؟“

”بتانے سے تم ناخوش ہو جاتے، اور میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ بہر حال...“ جواہرات نے بات بدلنے کے سے انداز میں سر جھٹکا۔

”فارس کے کیس کا کیا بنا؟“ ہاشم بے زاری سے کری پہ پیچھے کو ہوا۔ خود بھی شہرین نامے کو سکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قلم اٹھا کر انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔

”اگر زمر اپنے بیان پر قائم رہے تو کیس بہت مضبوط ہے۔“

”وہ رہے گی۔“ پھر آنھوں سے گلاں ڈور کے پار اشارہ کیا۔ ہاشم نے اس طرف دیکھا۔ جیلانی صاحب، حماد کے کندھے پہاڑتے رکھ کر اسے اپنے ہمراہ لئے آہستہ مختلف کپیز کی طرف اشارہ کرتے بتاتے جا رہے تھے۔ وہ کافی آرام دہ لگ رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟“

”زمر کا مغیث۔“ ہاشم نے ایک دم اکتا کر مان کو دیکھا۔

”میں آپ کیا کرتی پھر رہی ہیں؟ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ہر چیز سنبھال رہا ہوں تو پھر یہ سب کیا ہے؟“

”میں نے کچھ نہیں کیا، صرف ایک سیلیٹر پہ پاؤں رکھا ہے میں غنی و یہی ٹوٹ جانی تھی۔ جتنی جلدی ٹوٹے گی اتنا زیادہ زمر اپنے بیان پر قائم رہے گی۔ ورنہ تم اس کے خاندان کو جانتے ہوؤہ اسے بیان بدلنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔“ ہاشم کے لئے اتنا بہت تھا۔ اس نے موبائل انھیا اور کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے کھڑا ہوا۔

”رات کو کھانے پر ملتے ہیں۔“ کہتا ہوا ہر نکل گیا۔

کوریڈور سے گزرتے ہوئے جیلانی صاحب نے اسے دیکھ کر گرم جوشی سے حماد سے تعارف کروانے کی کوشش کی۔

”یہ ہاشم...“ مگر وہ ایک نظر بھی ڈالے بغیر سخت تاثرات کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ اور نگزیب کے آفس کا دروازہ زور سے کھولا۔ وہ اندر اپنی یمنہ کے لوگوں اور اس پی کیپ والے کنسٹلٹنٹ کے ساتھ مصروف نظر آرہے تھے۔ ہاشم نے سخت لگا ہوں سے صرف ایک اشارہ کیا اور وہ سب اپنی اپنی چیزیں انھائے باہر نکل گئے۔ اور نگزیب قدر تے تشویش سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ میز کے سامنے آیا اور بولا۔

”میں علیشا کے معاملے کو سنبھال لوں گا، لیکن پھر آپ کو ایک قربانی دینی پڑے گی۔“

”اور وہ کیا؟“

”وہ فارس کی ایلی بائی ہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ لڑکی چپ چاپ یہاں سے چلی جائے تو پھر وہ فارس کے حق میں بیان نہیں دے گی۔ علیشا کے جانے کا مطلب ہے فارس جیل سے نہیں نکلے گا۔“ اور نگزیب کا دردار ماتھے پہ بل لئے اس کو سنتے رہے۔ چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی۔

”عجیب اتفاق ہے، کہ دونوں کیسز میں وہی لڑکی اس کی ایلی بائی ہے۔“

”پھر میں علیشا کو یہاں سے بھیج دوں گا، لیکن آپ فارس کو نکلوانے کی بالکل کوشش نہیں کریں گے۔“ اور نگزیب کا دردار نے ہلکے سے شانے جھٹکے۔

”مجھے اس کی بے گناہی کا یقین نہیں ہے، میں اس نے علیشا کو کچھ دے کر اس گواہی پر مجبور کیا ہو گا۔ تو ٹھیک ہے وہ چلی جائے یہ زیادہ بہتر ہے۔“

ہاشم ان کو سمجھیدہ نظروں سے دیکھتا مڑ گیا۔ تیز تیر چلتا باہر آیا۔ باقی لوگ تو بکھر گئے تھے صرف کنسٹنٹ لڑکا جو وہاں کھڑا تھا، فوراً سے اسی طرف پکا۔

”اگر ان خفیہ مینگز کا تعلق اس لڑکی سے ہے جو اس دن آئی تھی تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں ہمیں اسے کس طرح ہینڈل کرنا ۴۔ ایک لڑکیاں.....“

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کر پاتا، ہاشم نے جھپٹ کر اسے گردان سے کپڑا، دیوار سے لگایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر انگلی الٹا، چباچا کر بولا۔

”آئندہ میرے مخاطب کے بغیر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو تمہیں بہت پہاڑوں گا۔ سمجھ آئی؟“ ہکا لڑکے کی گردان مکمل سے چھوڑی، اپنے کوٹ کی نادیدہ شکن درست کی اور اسے گھوڑا ہوا اپس مڑ گیا۔ منع کیا تھا اس نے اپنے باپ کو یہ سیاست اور اس کے ۷۔ اس میں پڑنے اور پھر اس جیسے تازہ گریجویٹ ہوئے خود کو ماہر ایسا سٹ سمجھنے والے لڑکوں کو بھاری تیخوں پر رکھنے سے، مگر نہیں اس کی ان سختا تھا ادھر۔ یا شاید اسے غصہ بہت آرہا تھا آج کل۔

وہ کہیں بھی نہیں گیا۔ گاڑی میں بے مقصد ڈرائیور کرتا رہا۔ اور پھر رکا تو سامنے ایک فلور مارکیٹ تھی۔ ہاشم اتنا ایک بڑا سا گلدستہ ۸۔ اسے فرنٹ سیٹ پر رکھا اور جب دوبارہ ڈرائیور کرنے لگا تو آنکھوں میں شدید کرب تھا۔

اب کہ وہ اتنا تو سامنے قبرستان تھا۔ وہ پھول ہاتھ میں پکڑے، چھوٹے چھوٹے قبروں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ زرتا شہ غازی، وارث غازی۔ یہ قبریں قریب تھیں۔ کہیں آس پاس زمرکی والدہ کی قبر بھی تھی۔ اور سعدی کے والد کی بھی۔ مگر وہ صل زرتا شہ کی قبر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جھک کر بہت ادب سے گلدستہ اس کے اوپر رکھا پھر سیدھا ہوا، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر ہماڑے۔ جوتے سے مٹی پر ڈاکوئی نکلنے ملے ہوئے وہ کتنی دیر کھڑا الپ کا شمار ہا۔

”آئی ایک سو سو روپی زرتا شہ، تم بہت پیاری بہت معصومی تھیں، میں واقعی ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میری مجبوری تھی۔ بہت سے لاگوں کی خوبیوں کے لئے کسی ایک کو قربانی تو دینی پڑتی ہے۔“ ہولے سے بڑا تھے ہوئے اس نے اس نے نظروں سے قبر کے قطبے کو پڑھا۔

”مگر شاید تمہارے لئے یہی بہتر تھا۔ تم فارس کے ساتھ خوش نہیں تھیں، تمہیں ایک جنت میں رہنے کی آرزو تھی۔ امید ہے اب وہ ہاری ہو گئی ہو گی۔ زیادہ امید ہے کہ فارس بھی جلد تھیں جو ان کر لے گا۔ تم دونوں ہم سے زیادہ خوش رہو گے۔ تمہارے لئے اچھا ہی ہوا۔“ سر اٹھات میں ہلاتے اسے جیسے تسلی ہوئی۔

پھر بھی وہ کافی دیر وہاں کھڑا رہا۔ بارش کے بعد کی گلی ہوئی مٹی کی سوندھی خوبیوں اور قبروں کا ساتا، آس پاس خاموشی سے تیرتا رہا۔

❖❖❖

ہم سے ہمارے حال کی تفصیل پوچھیے ..... ہمدردیوں کے نام پر سازش بہت ہوئی ماحول میں عجیب ساتنا تھا، سعدی مضطرب اور بے بس ساکھر اسلام خوں کے پار دیکھ رہا تھا۔ جہاں فارس نفی میں سر ہلاتا دائیں سے ۱۰۔ میں ہمیں رہا تھا اس کے چہرے پر شدید غصہ تھا جیسے بس نہ چلتا ہو وہ کسی کا گلدد بادے۔ پھر ایک دم وہ سامنے آیا دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو کپڑا کر اسی طیش سے سعدی کو دیکھا۔

”میں نے نہ کوئی کال کی تھی نہ میں اس دوہرے قتل میں ملوث ہوں۔ اگر تمہاری پھوپھو یہ بات بار بار کر رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے وہ جانتی ہیں یہ سب کس نے کیا۔ اور وہ کسی کو کور کر رہی ہیں۔“ گھنگھریاں بالوں والے لڑکے کے چہرے پر چھائی ندامت میں حزن بھر میا۔

”پھوپھو جھوٹ نہیں بولتیں، انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”کس قسم کی غلط فہمی؟ وہ کہہ رہی ہیں کہ میں نے یہ قتل کئے ہیں اور تم کہہ رہے ہے ہو غلط فہمی؟“ اس نے غصے سے سلاخ کو جھکھا دیا۔ مگر وہ سلاخیں بہت مضبوط تھیں پھر ان کو توڑنے کے لئے ناکافی تھے۔ فارس بے بی سے سلاخوں سے پشت نکالے کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرا اب سعدی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، اسی اپنے ماوں کا مجرم ہے کیونکہ وہ اس کے سامنے مسلسل زمری طرف داری کر رہا تھا۔

”کیا پاتا کسی نے پھوپھو کو مجبور کیا ہو؟ ذرا یا ہوڈھ کیا ہو؟ اتنا خوفزدہ کردیا ہو کہ وہ یہ سب کہنے پر مجبور ہو گئیں ہوں۔“ فارس نے اس کی طرف پشت کئے استہزا سے سر جھکتا۔

”میں نہیں مانتا، کس قسم کی خاتون ہیں وہ جانتا ہوں میں۔ انہیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی مرضی سے کسی کو کوڑ کر رہی ہیں۔“

”آپ فکر مت کریں، ہم اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔ پھوپھو پانی بیان واپس لے لیں گی۔ میں اور ہاشم بھائی آپ کو...“

فارس پھر کراس کی طرف مڑا۔ ”بھاڑ میں گیا ہاشم۔ مجھے اس کی کسی بات پر یقین نہیں ہے نہ اسکے کئے گئے دکیل پر نہ اس کے کسی وعدے پر۔ وہ تو سب سے زیادہ خوش ہو گا مجھے یہاں دیکھ کر۔“ سعدی کی آنکھوں میں گہرا دکھا بھرا۔

”آپ ان کے بارے میں ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ سب کنز کے درمیان رقبائیں بھگڑے چلتے ہیں لیکن اس یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ آپ کو یہاں دیکھ کر خوش ہوں۔ وہی آپ کے لئے سب سے زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔“

”میں ہاشم کو تم سے زیادہ جانتا ہوں وہ جان بوجھ کر یہاں آتا ہے، تاکہ مجھے یہاں دیکھ کر فاتحہ مسکرا سکے۔ اگر آج کوئی اٹھ کر یہ کہہ دے کہ میرے بیوی اور بھائی کا قتل بھی ہاشم نے کیا تھا تو میں مان لوں گا۔“ غصے میں وہ جانے کیا کیا بولے جا رہا تھا۔ سعدی بے یقین اور دکھ سے پیچھے ہٹتا۔ اسے اتنا گہرا صدمہ لگا تھا کہ وہ کچھ کہنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ مگر کہنے کی نوبت آئی بھی نہیں۔ کیونکہ چند منٹ کے لئے ان کو چھوڑ کر باہر گیا ہاشم واپس آگیا تھا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ آواز پہن سے کھڑے سعدی نے چونک کر سر موڑا اور غصے سے تیز تیز بولتے فارس نے رک کر ادھر دیکھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گرے سوٹ میں ملبوس ہاشم کے چہرے پنجیدگی تھی اور گہرا ملال بھی۔

”بالکل ٹھیک، میں ہی گدھاً لوكا پٹھا ہوں جو اپنے ہزار کام چھوڑ کر تمہارے لئے دن رات ایک کر رہا ہوں۔ میری ماں کبھی ڈی اے کے پاس جاتی ہے اور کبھی اس کے میگنیٹر کے پاس کہ کسی طرح اس کا یہ رشتہ نک جائے۔ تاکہ وہ اپنی زندگی میں پر سکون ہو کے اپنی محرومیوں کا بدلہ تم سے نہ لے۔ اپنی بیوی، اپنی بیوی، ان کو کتنے دن سے نظر انداز کر کے میں ادھر تمہارے لئے خوار ہو رہا ہوں اور تمہیں یہ لگاتا ہے کہ میں یہاں مزہ لینے آتا ہوں۔“ جیبوں میں ہاتھ ڈالے قدم قدم چلتا وہ سلاخوں کے قریب آیا۔ فارس ابھی تک انہیں بنجیدہ مشکوک نظر وہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سعدی نے پریشانی سے ہاشم کو دیکھا۔ وہ بہت ہرث لگ رہا تھا۔

”مجھے تمہاری کسی بات پر اعتبار نہیں ہے، سب یاد ہے مجھے کس طرح میری بیوی کو میرے خلاف بہکاتے تھے۔“ فارس جواباً غایا۔

”جبیسا کہ میں نے کہا، میں ہی بے وقوف تھا جو اتنے دن سے تمہارے لئے کوششیں کر رہا تھا۔ حلا نکہ میرا باب جس کا تم سے رشتہ مجھ سے زیادہ سے ہے۔ تم پہ لعنت بھیج کر اپنی سکمپیں میں معروف ہے، اس لئے یونو اسٹ فارس؟ تمہاری یہ بلیم گیم دیکھ کر مجھے بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ تم ہی اس دوہرے قتل کے پیچھے ہو۔ میری طرف سے تم سڑواں جیل میں ہیں جا رہا ہوں۔“ دکھ اور بر ہی بھری آنکھوں سے اس کو دیکھتا ہوا تیز تیز باہر لکل گیا۔ سعدی تیزی سے سلاخوں کے قریب آیا۔

”آپ کیوں اپنے غصے میں بے قابو ہو جاتے ہیں؟ وہ ہاشم بھائی ہیں۔ آپ کو پتا ہے وہ کتنے دن سے یہاں پر خوار ہو رہے ہیں۔“

وہ ساتھ۔ آپ کے وکیل کی فیس تمام اخراجات پولیس آفیسر سے سفارشیں ہر چیز وہی کر رہے ہیں۔ اور آپ پھر بھی انہی کو الزام دے رہے ہیں۔ مائی گاؤٹ۔ ” وہ بے حد بے یقین تھا، اور جیسے ہاشم سے زیادہ ہرث ہوا تھا۔ فارس نے غصے سے سر جھکا۔

”میں کسی پا لزاں نہیں دے رہا، میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کسی پا اعتبار نہیں ہے۔“

”آپ نے کہا کہ وہ اس قتل میں ملوث ہیں، آپ نے ان پر اتنا بڑا الزام لگا دیا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا، ظاہر ہے دہاں میں ملوث نہیں ہے۔ اس کا میرے بھائی یا بیوی سے کیا لیتا دیتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ مغلظ ہے۔ وہ ہاشم کاردار ہے، اگر وہ چاہتا تو میں دو منٹ میں باہر ہوتا، میں باہر اس لئے نہیں ہوں کیونکہ اس نے ہاہاں نہیں۔“ سعدی نے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے سرفی میں ہلا�ا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی، کہ میرے ارد گرد کے اتنے صحیح لوگ اتنی غلط باتوں پر کیوں اڑ چکے ہیں؟“ اور گلہ آمیر نظروں سے اسے دیکھتا ہاں کے پیچے باہر کو لپکا۔

وہ پولیس اشیش کے باہر پی کار کے ساتھ کھڑا تھا، جیبوں میں ہاتھ ڈالے دورافت کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کوئی سوچ تھی، ایسا بھی تھی۔ لب بچپن ہوئے تھے، سعدی کو بے بناہ شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ جلدی سے اس کے قریب آیا۔

”میں آپ سے معدالت کرتا ہوں ماموں کی طرف سے۔ وہ غصے میں کہہ گئے جو بھی کہا۔ لیکن آف کورس ان کا یہ مطلب نہیں تھا۔“

ہاشم نے انہی نظروں سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ کوئی آدمی اپنے بھائی کو قتل کیسے کر سکتا ہے، اسی لئے میں نے سوچا کہ فارس نے یہ نہیں کیا ہو گا۔ بالکل ایسے ہی میں یہ بھی نہیں سوچ سکتا کہ کوئی آدمی اپنے بھائیوں جیسے کزن پر یہ لزاں کیسے لگاتا ہے۔ مگر کو۔ کیا تمہیں بھی لگتا ہے کہ میں فارس کے ساتھ مغلظ نہیں ہوں؟ یا اس سب میں میرا ہاتھ ہو سکتا ہے؟؟“ سعدی نے جلدی سے نغمی میں سر ہلا�ا۔

”آف کورس نہیں، انہوں نے خود بھی کہا کہ ان کا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ غصے میں کہہ گئے۔ پلیز آپ دل پر مت لیں۔“ پھر فکر مندی سے متذبذب سا بولا۔

”ہمیں آج لا یئر کے پاس بھی جانا تھا، ہاشم بھائی آپ دہاں جا رہے ہیں نا؟“ اس کے دل کو دھڑکا لگ گیا تھا، ہاشم کے چہرے پر ڈھی مسکراہٹ ابھری۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ فارس کی باتوں کی وجہ سے میں اس کے لئے بہترین وکیل نہیں کروں گا یا وکیل کو فیس دینا یا اس کی سفارشیں کرنا، نہ کروں گا تو تم ہاشم کاردار کو نہیں جانتے۔ آف کورس، ہم ابھی وکیل کے پاس جائیں گے۔ ہم بہترین استریجی اپنائیں گے اور چند دن میں فارس باہر ہو گا۔ ڈونٹ وری۔“ تکان سے کہتے ہوئے اس کا شانہ تھپکا۔

”آپ خود بھی تو یہ کیس لڑ سکتے ہیں!“

”فارس اور میرا ایک رشتہ بھی ہے جو اتنا اچھا نہیں ہے۔ میں پیسے بچانے کو اس کے لیے شہر کا بہترین وکیل نہ کروں، تو یہ میرے نزدیک غلط ہے۔ میرے ساتھ وہ بکھی بھی آرام دہ ہو کر بات نہیں کرے گا۔ اپنے وکیل سے کر لے گا۔ میں لوگوں کے لئے بغیر کسی صلیٰ کی امید نہیں فیورز کرتا تھا ہوں، دکھ صرف اس بات کا ہے کہ جس کزن کے لئے میں اپنی بیوی کو بھی نائم نہیں دے پا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ مجھے سے لڑ بھی پڑی۔ اس کزن نے مجھے یوں کٹھرے میں لا کھڑا کیا۔“ سر جھکتے ہوئے چالی نکالتا وہ کارکارا ڈرائیور ڈرکھول رہا تھا۔ سعدی نے ایک دم پوک کے اسے دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے اپستال کا منظر گھوما، بازو سے آستین اور کر کے اپنے زخم دکھاتی شہریں، اسکی آنکھوں کا کرب اور اس کے راز محل جانے کے بعد کی بہادری۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی، ان کی واقعی لڑائی ہوئی تھی۔ مگر فارس کی وجہ سے نہیں، تو پھر۔۔۔ وہ ایک دم

ہاشم کو دیکھنے لگا۔ وہ بالکل مختلف بات کر رہا تھا۔

”چلو“ ہاشم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

خیال کی دھنڈہتی تو ہاشم کے چہرے کا مال نظر آیا وہ ابھی تک فارس کی باتوں پر افراد تھا۔ سعدی ذہن سے تمام سوچوں کو جھک کر گھوم کر فرنٹ سیٹ کی طرف آیا۔ وہ بھی پتا نہیں کیا سوچنے لگا تھا۔

❖❖❖

وہ کائنات ہے جو چھجھ کر ٹوٹ جائے ..... محبت کی بس اتنی داستان ہے  
خین بڑے اپا کی وہیل چیزِ حکیمتی اپستال کی راہداری میں آگے لارہی تھی۔ وہ افرادہ سے گردن ایک جانب جھکائے بیٹھتے تھے۔  
زمر کو سمجھایا، منت کی مان جتا یا، مگر وہ بہیشہ کی طرح ہٹ دھرم اپنی بات پر اڑ جگی تھی۔ چونکہ اس نے کہہ دیا، کہ وہ فارس تھا، تو اب قیامت تک وہ فارس ہی تھا جس نے اسے کال کی تھی۔ وہ ایک انجوں بھی اپنے موقف سے چھچھے ہنسنے کو تیار نہ تھی۔ چونکہ میدم رمذہ اس سے ملنے آئیں تھیں، اس لئے انہوں نے خین سے کہا کہ وہ انہیں باہر لے جائیں۔ اور اب وہ دونوں باہر جا رہے تھے۔ خین بھی خاموش تھی، اور بڑے ابا بھی۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”بڑے ابا! کیا بھی چیزیں ٹھیک ہوں گی؟“

انہوں نے گردن اٹھائے بغیر کہا۔ ”شاید۔“ وہ وہیل چیزِ حکیمتی آگے نکلتی گئی۔

راہداری میں بیٹھ پر ہاتھوں میں گرائے سعدی نے پہیوں کی آواز سنی مگر چہرہ نہیں اٹھایا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ اپ سیٹ تھا۔ ندرت اس کو پر امید نظروں سے دیکھتی تھیں کہ وہی پھوپھو کو سمجھائے۔ فارس کا رو یہ ہاشم کی تمام کوششیں، کچھ بھی ان کے حق میں جاتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ زمر کے بارہا اپنے بیان پڑھنے کے بعد ندرت اپستال نہیں آئی تھیں۔ بہانہ سارہ کا تھا۔ بھائی مرائے بھا بھی اکیلی ہے، اسکی بچیاں، ان کا خیال۔ وہ جانتا تھا کہ وہ فارس کی وجہ سے پھوپھو سے کھنگی گئیں ہیں۔ مگر اپنی جگہ وہ بھی ٹھیک تھیں۔ شاید اپنی جگہ زمر بھی ٹھیک تھی۔ مگر ٹھیک تودہ بھی تھا۔ صرف حالات غلط تھے۔

وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا، یہاں تک کہ میدم رمذہ باہر نکلیں۔ اس کے قریب آ کے رکیں، کسی احساس کے تحت سعدی نے سر اٹھایا۔ پھرستے ہوئے چہرے کے ساتھ مسکرا کر کھڑا ہو۔

”السلام علیکم میم!“ ادب سے سر کو خدمے کر سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بہت افسوس ہوا زمر کا اللہ اس کو صحت دے۔“ سعدی نے افرادگی سے ہاں میں گردن ہلائی۔

”پڑھائی کسی جارہی ہے؟ کتنے سال رہ گئے ہیں؟“

”بس دو۔“

”اور کتنے دن کی چھٹی پر آئے ہو؟“ وہ ساتھ ہی بیٹھ پیٹھ گئیں، سعدی دوسرے کنارے پر الٹ سا نکل گیا۔ اس بیٹھ کی تین ہی نشستیں تھیں، اب درمیان کی خالی تھی۔

”بس دو ہفتہ رہ گئے ہیں، پھر واپس جانا ہے۔“

”آپ کے ماموں کا بھی ابھی سننا بہت افسوس ہوا بیٹا۔“ وہ شاگردی اور لحاظ سے تعزیت کر رہی تھیں۔ سعدی سنتا گیا، چند ایک تفصیلات بتائیں، کس طرح ہوا؟ کیا ہوا؟ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی گفتگو کا رخ فارس کی طرف مڑ گیا۔

”کیا آپ زمر کو سمجھا نہیں سکتیں؟ کہ وہ ماموں کے خلاف دیا گیا بیان واپس لے لیں۔ وہ آپ کی بہت مانگتی ہیں۔“

تو ہوڑی دیر بعد سعدی نے قدرے امید و لجاجت سے آگے ہو کر کہا۔ میڈم رمشہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہیں، پھر ہلاکسا گا۔ لہاکر ابرا و اچکائے۔

”میرا نہیں خیال کر کی شخص کو اس کی اٹل رائے سے موڑنا آسان ہوتا ہے۔“ سعدی بدول سا ہو کر بیچھے ہو گیا۔ میڈم کی طرف کیا آہا، نہ بھی سامنے کو موڑ لیا۔ اب وہ گھنٹوں پر کہیاں رکھے سر ہاتھوں پر گرائے ان سے لائق ہو گیا تھا۔ میڈم رمشہ گہری نظروں سے اس لے ہاتھوں میں آدھے چھپے چھرے کے اتار چڑھا و دیکھتی رہیں۔ پھر خود بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں، گود میں رکھا پر سنج کی خالی نشست پر رکھا، ما منے دیوار کو دیکھتے ہوئے آہتہ سے بولیں۔

”میرا بڑا بھائی ایرینو میکل انجینئر ہے۔ ہم تین سال سے ایک دوسرے سے نہیں ملے، بات بھی نہیں کی نہ وہ ہمارے بچوں کی شادی، اما انہم اس کی پر گئے۔ میری فرست کزن میری بچپن کی دوست تھی۔ اوں کا لوجست ہے، اسی شہر میں رہتی ہے۔ ہم نے سات سال سے ایک ۱۱ سے کی شکل نہیں دیکھی، کوئی فونگی ہوئی تو چلے گئے۔ زندوں کے لئے نہیں گئے۔ میری سب سے چھوٹی بہن اور میرے دوسرے نمبر کے ہمالی لی آپس میں پچھلے ساڑھے پانچ سال سے ناراضگی ہے، دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ میری امی اس ساری صورت سے بہت غزدہ رہتی ہیں۔“

وہ سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے ہلکے ہلکے سے کہتی جا رہی تھیں۔ سعدی اسی طرح سر ہاتھوں میں لئے بے دھیانی سے سنتا گیا، اسے اکاٹا یا وہ خود سے بول رہی ہیں۔

”مگر مجھے امید ہے کہ میری ماں کے مر نے پر سارے بہن بھائی آ جائیں گے، مل بھی لیں گے۔ کیونکہ ناراض رشتہوں کو عموماً کسی نے کا انتظار ہوتا ہے۔ مگر کیا تم جانتے ہو؟ کہ یہ ساری لڑائیاں یہ ساری ناراضگیاں شروع کیے ہوئیں تھیں؟“ سعدی نے ہاتھ گرائے چہرہ اٹھایا، ذرا موڑ کر آنکھوں میں اکتاہٹ بھری پریشانی لئے میڈم کو دیکھا، ہلاکانقی میں سر ہلاایا۔ اسے کوئی آپسی نہیں تھی۔

وہ سامنے دیوار کو دیکھتے کہتی گئیں۔

”یہ سب تب شروع ہوا، جب ہر ایک فریق نے اپنی صحیح یا غلط بات کے لئے دلیلیں پیش کرنا شروع کیں۔ جب دوسرے کی اس بیٹھ کے لئے سن گئی، معاں مکو حل کرنے کے لئے نہیں تو پہلے کوئی نہیں چلاتا، پھر کوئی نہیں مارتا، با تین... صرف با تین، ہی گھروں میں ادازی ذاتی ہیں، ان کو توڑتی ہیں، رشتے کا تی ہیں، صرف با تین۔“ سعدی پھر سے سامنے دیکھنے لگا۔

”میں سمجھ رہا ہوں، اگر آپ کا اشارہ میری پھوپھو سے کی گئی بد تیزی یا بجٹ کی طرف ہے تو پلیز مجھے کلیر کرنے دیں، یہ کسی کی زندگی اور وقت کا معاملہ ہے، میں صرف.....“

”میری ایک دوست تھی، بہت اچھی، بہت قابل۔ عامہ شکل کی تھی۔ مگر اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش تھی، ایسا رعب تھا کہ آس اس سب مرعوب ہو جاتے۔“

وہ اس کی بات سے بغیر سامنے دیکھتے ہوئے گویا خود کلامی کے انداز میں کہتی جا رہی تھیں۔ سعدی کو اب بے زاری ہونے لگی۔ ”میں اس کے پاس ایک کیس کے سلسلے میں گئی تھی، وہ دیکھ لیتی تھی۔ بہت اچھی، بہت قابل۔ اس نے میرا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ اور تب کسی بھی قانونی مشاورت کے لئے میں اسی کے پاس جاتی ہوں۔ بہت بھاری فیس لیتی ہے، ایک پانی نہیں چھوڑتی۔ مگر اچھی لڑکی نہ۔ اپنے مسئللوں کے لئے کبھی میرے پاس نہیں آئی، سوائے ایک دفعہ کے جب اس کے سبقتیج کو اکار لشپ چاہئے تھا۔“

بے دھیانی سے سنتے سعدی نے ایک دم چونک کر گردن موزی اس تعجب سے آئیں سکیڑ کر میدم کو دیکھا۔ وہ بدستور سامنے دیوار کو دیکھتی کہہ جا رہی تھیں۔

”اس کے بھتیجے کو اسکا لارشپ نہیں مل سکا“ وہ اتنا لائق تھا، نہ اتنا غریب کے وہ ہمارے میعار پ پورا ارتتا، مگر وہ سمجھی کہ اس کا نام ان دس اشود نہیں کی لست میں اس لئے نہیں ہے کیونکہ یہ فہرست میں نے کمیش لے کر تیار کی ہے۔ وہ میرے پاس آئی، ایک لمبی تقریبی کی کہ کس کس طرح وہ مجھے برباد کر سکتی ہے، بدنام کر سکتی ہے، اور ہر قیمت پر اس بات کو قیمتی بنا سکتی ہے کہ اس کا بھتیجواہ اسکا لارشپ جیتے۔ میں ہر بات تحمل سے ستفتی گئی۔ آخر میں میں نے اسے بتایا، وہی جوچ تھا کہ یہ اسکا لارشپ اس کے بھتیجے کو کہی نہیں ملے گا۔“

سعدی یوسف بالکل سن، متیر سانتا جارہا تھا، اسے اپنے سانس لینے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

”وہ ستفتی گئی اور اس کے چہرے کا رنگ نچڑھتا گیا، ایسے جیسے کسی سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ وہ یہ مانے کو تیار نہیں تھی کہ اس کا بھتیجواہ کسی سے کم ہو سکتا ہے۔ بہت دریگی اس کو اپنی اٹل رائے سے بہتے میں۔ چاہے وہ غلط تھی مگر وہ کسی کی محبت میں ہی غلط تھی۔ کسی کی محبت میں غلطی کرنا پتا نہیں غلط ہوتا ہے یا نہیں۔ اور پھر زندگی میں پہلی دفعہ میری اس دوست نے مجھ سے ایک فیور مانگا۔ میں جھوٹ نہیں بولتی، بولنا بھی نہیں چاہیے، لیکن اس کے لئے میں نے بول دیا، اسی لڑکے سے۔ وہ میرے پاس آیا تو میں نے کہا اسے کسی دل کے امیر آدمی نے اسکا لارشپ کے لئے اپانسر کر دیا ہے۔ شاید یہ جھوٹ بھی نہیں تھا، مگر اس کی پھوپھو مجھے پابند کرچکی تھی کہ میں اسے نہیں بتاؤں گی کہ وہی اس کی فیس دے رہی ہے۔ بس ایک بات پر مجھے حیرت ہوئی۔“

وہ بولتی جا رہیں تھیں اور سعدی سانس رو کے ان کو دیکھ رہا تھا۔ ساری دنیا ختم ہو گئی تھی۔ بس با تین رہ گئی تھیں۔ جو وہ سن رہا تھا، اور جو وہ اس دن زمر سے کر آیا تھا۔

”بھی کہ وہ اتنی امیر نہیں ہے، پھر اتنی بھاری فیس کیسے ادا کرے گی؟۔ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایک پلاٹ ہے، جو اس کے والد نے اس کے نام کر رکھا ہے، اس کی شادی، اسکے فوج چکی ساری سیکیورٹی اس پلاٹ کے اوپر ہے۔ اس نے کہا، وہ اس پلاٹ کو بچ دے گی۔ نیچرل سی بات ہے، میں نے اسے منع کیا، کہ اگر ایک لڑکا اپنی ذہانت یا محنت کے بل بوتے پر ایک بڑی یونیورٹی نہیں جا سکتا، تو کیا ضروری ہے اس کے بیچھے اپنی آرام دہ زندگی کی سیکیورٹی کو دا ڈپ لگا دو؟۔ تب اس نے مجھے ایک بات کہی۔ ساری زندگی تو نہیں مگر چند سال تو میں ضرور یاد رکھوں گی۔ اس نے کہا“ میرے خاندان کی سیکیورٹی وہ پیسہ نہیں ہے۔ ہماری سیکیورٹی ہمارے خاندان کا وہ پہلا بچہ ہے، جس کو میں نے انگلی کپڑ کے چلنے سکھایا تھا۔ اب جب وہ بھائے کے قریب آیا ہے، تو مجھے اس کے لئے راستہ تو بنانے دیں۔“ اور پھر اس نے وہ پلاٹ بچ دیا۔ اب وہ مسلسل میرے پاس رقم مجمع کرواتی ہے۔ میں اس رقم کو ایک اسکا لارشپ ڈویشن فنڈ کے طور پر اس لڑکے کی فیس کے لئے اس کے حوالے کر دیتی ہوں۔ ذرا سا جھوٹ، اور کسی کی زندگی بن گئی، برآسودا نہیں تھا۔ مگر قربانی تھی۔ کیونکہ محبت ایک بہت سادہ اور ایک بہت پیچیدہ شے ہے۔“

سعدی کا رنگ ایسے سفید ہو رہا تھا، جیسے سانس تک نکل چکی ہو۔ وہ بنا پلک جھکپے بس ان کو دیکھ رہا تھا۔ شاکن، حیرت زده، متوجہ۔

”کیا یہ حق ہے؟ کیا پھوپھونے...“ اس کے الفاظ حلقوں میں ہی ثوٹ گئے۔ میدم رمش نے چونک کر اسے دیکھا اور حیرت سے پوچھتے ہوئے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔

”کیا؟ میں نے تو بچھے پانچ منٹ میں تم سے کوئی بات نہیں کی۔ میں تو کچھ سوچ رہی تھی۔ شاید میں اونچا سونچنے لگ گئی ہوں۔ بوڑھے ہونے والے لوگوں کو یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ کسی دماغی مرض کی وجہ سے کسی انسان کو کافی نہیں پہلی توڑنے پر موردا لازم ہے رہانا چاہیے، اور یہ اونچا بولنا ایک دماغی مرض ہی تو ہے۔ اونھوں،“ موبائل پرس میں ڈالتے ہوئے، سرفی میں ہلاتے، جیسے اپنے نکل

ہم اس کرتے ہوئے انہوں نے اس کو مسکرا کر خدا حافظ کہا، اور آگے بڑھ گئیں۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کاریڈور میں آگے بڑھتا گیا۔ سفید چہرہ، خالی ویران آنکھیں لئے وہ چلتا رہا، یہاں تک اے نہ پتال کے دروازے آگئے۔ باہر لان میں روشن پڑے اپا کی وہیل چیز و حکیمتی خنین نے چونک کرا سے یوں ڈھیلا ڈھیلا سا چلتے اٹھا اور پھر رک کر دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ مختلف سمت چلتا دور ہوتا گیا۔ کوئی موڑ آیا اور وہ نظروں سے او جھل تھا۔

خنین کے چہرے پر فکر مندی در آئی۔ وہ وہیل چیز کو موڑ کر اسی سمت لے گئی ساتھ میں بے دھیانی سے بڑے اپا کوں بھی رہی تھی۔

”اورنگ زیب کار دار کوفارس کے اوپر سے ہاتھ یوں کھینچنا نہیں چاہیے۔ ان کو ایک دفعہ ہم سے بات کرنی چاہیے تھی۔“

”وہ زمر پھپھو کے علاج کا سارا خرچ اخخار ہے ہیں، یہی بہت ہے۔“ وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی وہیل چیز آگے لا

لی تھی۔

”یعنی وہ فارس کو قصور دار سمجھتے ہیں، تبھی مداوا کر رہے ہیں۔“ بڑے اپا افسوس سے سر ہلاتے کہہ رہے تھے۔ خنین نے توجہ نہیں

لی۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔

یہاں درخت تھے، بیلوں کی باری تھی، اور کونے میں واٹر کولر لگا تھا۔ بزرے میں مخفذا، میٹھا پانی۔ خنین کے قدم رک نہیں، آہستہ ہو گئے۔ آنکھوں میں شدید صدمہ سا اترتا۔

کولر کے دائیں طرف درخت تھا، درمیان میں تھوڑی سی جگہ تھی، وہاں سکر کر رخ دیوار کی طرف کیسے سعدی دوز انبو بیٹھا تھا۔ سر گھٹنوں پر

لے، وہ آہستہ آہستہ رورہا تھا۔ ساتھ ہی بار بار ورثت کی آستین سے آنسو صاف کرتا، پھر سے چہرہ جھکائے رونے لگ جاتا۔

خنین کے دل پر کسی نے پیر رکھ دیا۔ وہ رکنا جا ہتی تھی، مگر بڑے اپا کے اسے یوں روتنے دیکھنے کا خوف تھا، یا سعدی کے خود کو اس، لیے جانے پر شرمندگی کا ڈر، وہ بھل قدموں سے آگے بڑھتی گئی۔ بڑے اپا گردان گرائے، افرادہ سے اپنی کہتے گئے۔ خنین کی عینک کے آنکھیں گلابی پڑتی گئیں۔ وہ رورہا ہے۔ بھائی رورہا ہے۔ مگر کیوں؟

”کیا پھپھوٹھیک ہو جائیں گی، بڑے اپا؟“ اس نے خود کو کہتے سن۔ ”بھائی ان کی بیماری پر بہت اپ سیت ہے۔“ وہیل چیز ٹھیک، اب کولر کو پیچھے چھوڑ کر وہ دور جا رہی تھی۔ ساتھ ہی آواز بھی مدھم پڑتی گئی۔ بڑے اپا نے جواب میں کیا کہا، درختوں تک آواز نہیں لالی۔ وہ دور ہوتے گئے۔

سعدی اکیلا بیٹھا بدستور رورہا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

لوگ نوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں ..... تم ترس نہیں کھاتے بتیاں جلانے میں وہ شام سعدی کے دل کی ساری سو گواریت اپنے اندر سمئے اتری تھی۔ وہ سارہ کے گھر کے پکن میں رکھی کری پر خاموش بیٹھا۔ ندرت منہ ہی منہ میں کچھ بڑا تیں، سامنے کھانا کھرہی تھی۔

”زمرو خیال کرنا چاہیے تھا۔ جب زرتابہ کے والد اور وارث کی بیوی، فارس کو بے گناہ سمجھتے ہیں، تو وہ کیوں ایسا کر رہی ہے؟“

مدی سر جھکائے سمجھیگی سے خالی پلیٹ کو دیکھتا رہا۔ ندرت نے اس کی پلیٹ میں سالن ڈالا روتی نکال کر دی۔

”کھاؤ بیٹا۔“ اس نے بے دلی سے روتی لی، لفڑ توڑا۔ پھر نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ وہ پرامیدی سی پریشان سی اس کو دیکھ رہی تھیں۔

”تم پھپھو سے بات کرونا، وہ اپنا بیان واپس لیں۔“ پھر نہیں، غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ”تمہیں کیا ہوا؟ آنکھیں

مر ج پڑ رہی ہیں۔“

”کچھ نہیں۔ فلو ہے۔“ وہ گلی آواز میں کہہ کر سر جھکتا، پلیٹ پہ جھک گیا۔

”میں جو شاندہ بنا دوں گی، اس کے بعد پی لینا۔ نھیک ہو جائے گا۔“

کاش دل کی بیماریوں کا بھی کوئی تریاق ہوتا، گھول کر پی لو اور سب خوش باش ہو جائے۔ اس نے تنگی سے سوچا تھا۔

”کیا تم نے دوبارہ پچھو سے بات کی؟“

”نہیں۔“

”کوشش تو کرو۔ فارس میرا بھائی ہے، سعدی، مجھے اس کی فکر ہے۔“

”زمر میری پچھو ہیں، اور مجھے ان کی فکر ہے۔“

”اس کا علاج ہو رہا ہے، وہ انشاء اللہ جلد صحت یاب...“

سعدی نے بدولی سے پلیٹ پر کے کردی۔ ”ان کے علاج پر ہو خرچ ہو رہا ہے، وہ اونگزیب کاردار اٹھا رہے ہیں ہے نا؟“ ندرت کو

تنگی سے دیکھ کر وہ ایک دم پوچھنے لگا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگیں۔

”ہاں، بڑے ابا چاہ کر بھی انکار نہیں کر سکے۔ کیسے کرتے؟ ان کا سب تو زمر کے جہیز اور زیور پر خرچ ہو گیا۔“

”اور وہ پلاٹ؟ پچھو کے پاس تھا نا ایک پلاٹ وہ کہاں گیا؟ شادی کا خرچ تو بڑے ابا نے میں مارکیٹ میں اپنے نام کی واحد کان

بنچ کر اٹھایا تھا، یہ بھی مجھے پتہ نہ چلتا اگر آپ نہ بتاتیں۔“

”ہاں، وہ زعیم بھائی (ندرت کے کزن) کو پتچی تھی، اس نے مجھے پتہ چل گیا۔ پلاٹ تو زمر نے پہلے ہی بنچ دیا تھا۔“ وہ اب اپنی

پلیٹ میں سالن ڈال رہی تھیں۔ ”کسی مقدمے وغیرہ کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی، تو بنچ دیا۔ بڑے ابا نے ایک دفعہ میرے پوچھنے پر بتایا تھا۔“

سعدی نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں، پھر ایک دم انٹھ کھڑا ہوا۔ ندرت نے روکا کہ کھانا تو کھا لے گردو لا دُنخ میں آ گیا۔

وہاں بڑے صوفے کے کنارے سارہ پیٹھی تھی۔ پیرو اور پر کیے بھورے رنگ کا دو پتہ سر پر پیٹے، وہ ہتھیلی پہ چہرہ جمائے دیوار کو دیکھ رہی

تھی یا شاید اس کے پار۔ اسے آتے دیکھ کر چہرہ سیدھا کیا، ادا سامسکرا ای۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ مسکرا بھی نہ سکا، بس سامنے کھڑا ہو گیا۔ سر جھکائے بے قصور مجرم۔

”بہتر ہوں۔ تم نھیک ہو؟“ اس نے اثبات میں سر ہلا کیا۔ چند لمحے خاموشی سے سرک گئے۔

”فارس کیسا ہے؟ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”ان کو ماموں کے قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہے، مگر ہم سب جانتے ہیں، یہ سب غلط ہے۔ آپ بھی ایسا ہی بھجھتی ہیں نا؟“ ذرا درکار

وہ ڈرا ہوا کا۔

”مجھے نہیں پتا سعدی۔ تم سب کہتے ہو تو ایسا ہی ہو گا۔ فارس اور قتل....“ اس نے سر جھک کر جھر جھری لی۔ سعدی کی انکی سانس

بحال ہوئی۔ پھر کاسا مسکرا یا۔

”ہم اصلی قاتلوں کو ضرور سن ادوا کیں گے خالا!“ اور سارہ کے چہرے کی اذیت بڑھ گئی۔

”اس سے کیا ہو گا؟ وارث والپس نہیں آئے گا۔“

آج پھر سعدی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ لان میں کیاری کے ساتھ اہل پیٹھی گھاس،

انگلیاں چلاتی کچھ لکھر رہی تھی۔ نادیدہ الفاظ اُن کی باتیں۔

سعدی قدم قدم چلتا اس تک آیا۔ جو گرزاں کے ہاتھوں کے قریب ہوئے تو اس نے سراخھایا، آنکھیں مسکراہٹ سے پالیں۔ ”سعدی بھائی!“

”کیا تم بابا کے لئے دعا کرتی ہو؟“ ہر دفعہ کی طرح آج پھر پوچھا۔ اہل نے جھٹ اثبات میں سر ہلا�ا۔ ”روز کرتی ہوں۔“

”گذ۔“ وہ مسکرا کر پلٹ گیا۔ گیراج کی طرف جاتے ہوئے اس کے دل سے بھی دعائیکی مغفرت کی جنت ملنے اور جہنم سے آزادی لی۔ ایک دم وہ رک گیا۔ اہل کو کیا پتا جنت اور جہنم کا؟ معافی اور بخشش کا؟

وہ ائے قدموں واپس آیا۔ اس کے مقابل بیجوں کے بل بیٹھا، آنکھیں سکیر کر اس کا پھرہ دیکھا۔

”تم کیا دعا کرتی ہو اہل بابا کے لئے؟“

وہ جو گھاس پہ پھر سے لکھ رہی تھی، نظریں اٹھا کر سادگی سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں کہ بابا واپس آجائیں۔“ رک کر پوچھا۔ ”وہ واپس آجائیں گے نا سعدی بھائی؟“

سعدی شل سا اسے دیکھنے لگا۔ ہمیر بینڈ میں جکڑے بالوں والی اہل امید سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے خود کہتے سنًا۔

”وہ کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے۔ تم دعا کیا کرو کہ وہ جہاں رہیں، خوش رہیں۔“ اہل چند بیجوں کے لئے بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر پھرہ رازداری سے قریب کیا۔

”اگر میں بابا کی قبر کھو دوں... تو کیا وہ نیچے... ہوں گے؟“ پھرچاتے ہوئے بولی۔

”ہاں، مگر ان کی جو روح تھی وہ اور پر چلی گئی ہے، آسمانوں میں۔ مگر وہ قبر میں بھی ہیں۔“ وہ سوچ کر الفاظ چین رہا تھا۔ اہل کے ابر و اچنپھے سے اکھٹے ہوئے۔

”بابا دو ہو گئے ہیں؟“ اس نے دو انگلیوں کی دوں کا رحیم سے پوچھا۔ سادہ سوال کے پیچیدہ جواب۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دعا کی پھر سے تاکید کی اور گیراج کی جانب بڑھ گیا۔

ایک قتل کتنے خاندان تباہ کر دیتا ہے، کتنی زندگیاں اجڑا دیتا ہے۔

ایک قتل سب بدل دیتا ہے۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

ہم بھی کن جنگلوں میں بستے ہیں ..... بند جن میں تمام رستے ہیں  
ہاپٹل میں وہی باری پھولوں کی مہک رچی بھی تھی۔ زمر تکیوں کے ہمارے قدرے تیک لگا کر لیٹی تھی، بال کچر میں اوپر بند ہے، اور چہرے پہ سنجیدگی چھائی تھی۔ خاموش نظروں سے کبھی سامنے دہیل چیزیں پہ موجوداً کو دیکھتی، اور کبھی ساتھ کری پا گے کوہ کر بیٹھے ہاشم کو جو ایک فائل کھولے، کہہ رہا تھا۔

”یہ صرف ایک رسمی کارروائی ہے، آپ کے کذنبی نہ انسپلائٹ اور اس کے بعد کے بھی تمام میڈیکل بلز اور نگزیب کاردار اٹھائیں گے، اور اگر کل کو فارس غازی بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے، تب بھی کوئی اس عمل کو پورا نہیں کر سکتا۔“ چیک، اور دوسرا کانڈا اسے اپر نیچے کر کے موٹی موٹی بات سمجھاتے ہوئے اس نے سراخھایا۔ بال جیل سے پیچھے کیے، گرے کوٹ، کف لنس، نائی پن، آنکھوں کی سنجیدگی، وہ ہمیشہ کی طرح اپتھے سے تیار رہا۔

”آف کورس ان کو میرے میڈیکل بلز پے کرنے چاہیے۔ ان کے بھانجے نے میری زندگی بر باد کی ہے!“ زمر کا انداز خشک تھا۔ ہاشم نے گہری سانس لے کر سر ہلا�ا۔

”اور جواب میں آپ اور نگزیر بکاردار کے بارے میں کسی قسم کا منفی بیان نہیں دیں گی۔“

”عدالت میں؟“

”پر لیں میں!“

بڑے ابا ناپسندیدگی سے گردن موڑ کر ہاشم کو بات کرتے دیکھتے رہے۔

”شیور مگر۔۔۔“ زمر نے آنکھوں کی پتلیاں سکیز کر تیکھی نظر وہ سے ہاشم کو دیکھا۔

”کیا اس کا غذ پر یہ لکھا ہے کہ یہ مداوا کاردار صاحب اس لئے کر رہے ہیں کیونکہ ان کے بھائی نے مجھے نقصان پہنچایا ہے؟“

”بالکل!“ اس نے اٹھ کر فائل اور پین زمر کے سامنے رکھا۔ وہ زرد کاغذ اٹھا کر باریک بینی سے ایک ایک شن پڑھنے لگی۔ پھر قلم کھولا۔ دستخط کیے۔ اور واپس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسی سپاٹ روکھے انداز میں بولی۔

”مجھے کاردار صاحب سے کوئی گلنہ نہیں، لیکن اگر آپ نے کبھی یہ معابدہ توڑا، اور میرا کوئی میڈی یکل بل پے نہ ہوا تو میں بھی ان تمام شفوف کو ردی میں ڈال دوں گی۔“

شیور میڈم پر اسکیوڑا! وہ بہت تخلی سے کاغذ واپس فائل میں لگاتے ہوئے بیٹھا، تانگ پٹانگ چڑھائی۔ بڑے ابا نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

”یہ مداوے سے زیادہ خود کو فارس پر لگے اڑامات کی گرد سے چانے کا معابدہ لگ رہا ہے مجھے۔“

”بالکل، ایسا ہی ہے۔“ کافی رکھائی سے کہتے ہوئے اس نے بریف کیس انخایا، کھولا، کاغذ اس میں ڈالے۔ بڑے ابا نے کڑواہٹ سے رخ پھیر لیا۔ ہاشم ان کو دیے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

”میں چلتا ہوں۔“ بریف کیس بند کر کے وہ اٹھا ایک رکھی مکراہٹ سے زمر کو دیکھ کر سر کو خم دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی بڑے ابا نے سنجیدگی سے زمر کو دیکھا۔

”ہمیں ان کے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔“

”مجھے تھی۔ باقی آپ کا بینک بیٹنس کنتارہ گیا ہے، میں جانتی ہوں۔“ وہ زیادہ کڑوی ہو رہی تھی۔

”اگر میں معذور نہ ہوا ہوتا تو میں یہ مداوا اقوال نہ کرتا۔“

”یہ ان کا فرض تھا، ان کے بھائی نے جو میرے ساتھ کیا ہے، اس کے بعد اس کے خاندان کو اس سے بھی زیادہ کرنا چاہیے۔“

”زمر!“ وہ جیسے تھک کر بولے۔ ”تم ایک دفعہ فارس کی بات سن لو۔“

”اس کی جو آخری بات سنی تھی، وہی کافی ہے میرے لئے تا عمر! موضوع ختم، ابا۔“

دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا حتمی فیصلہ نہادیا۔ وہ گردن جھکا کر خاموش ہو رہے۔ پھر جب جنین آئی تو ان کی وہیل چیز بہر لے آئی۔ نکتے وقت اس نے گردن موڑ کر زمر کو دیکھا۔ وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز، چہرہ موڑ کر کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں سوچ تھی، پیشانی پہ مل تھے۔ ایک دفعہ بھی حنین کو نہیں دیکھا۔ وہ یا سیت سے سر چکتی بڑے ابا کو بہر لے آئی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

رخت جاں کوئی لٹانے اور ہر آبھی نہ سکے..... اسے مشکل تو نہیں دشت وفا کے جاوے دینگ روم میں سعدی کری پہ بیٹھا تھا۔ سر جھکاۓ، اپنے ہاتھوں کو باہم ملتا۔ بڑے ابا کو آتے دیکھ کر وہ سیدھا ہوا اور سنجیدگی سے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں نے ٹیک کر دائے تھے۔ ابھی روپورٹ آ جائیں گی۔“

”کس چیز کا ٹیک؟“ خین چونکی بڑے ابا نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے، قریبی رشتہ داروں کا گردہ زیادہ بہتر ہے گا۔“

”بھائی!“ خین کا سانس آنکھ گیا۔

”سعدی!“ بڑے ابا مشیر رہ گئے، پھر وہ حشمت سے آگے ہوئے۔

”تم نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔“

”ڈاکٹر نے کہا ہے، میں ڈونیٹ کر سکتا ہوں۔ میرا دل بھی بیکی کہتا ہے۔“

وہ آنکھیں سکیز کرتیکھی نظر دوں سے دادا کو دیکھ کر چاچا کر کہہ رہا تھا۔ انہوں نے اچنپھے سے اسے دیکھا۔

”کیا تم کسی بات پر خفا ہو؟“

”اس کو چھوڑو یں۔ مجھے صرف ایک گارنی دیں۔ اگر میرا گردہ تیج کر گیا تو آپ زمر کو نہیں بتائیں گے کہ یہ میں دے رہا ہوں۔“

”بالکل نہیں۔ زمر کسی تم سے گردہ نہیں لے لے گی۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔“ وہ تڑپ گئے تھے۔ خین وہیل چیز رکھا ہے، ہنوڑا کڈی کھڑی تھی۔

”خین، کیا تم باہر جا کر سرستہ حیرا سے پوچھ سکتی ہو کہ روپورٹ آئی نہیں؟“ وہ سراخا کر سپاٹ انداز میں کہنے لگا۔ خین نے شل ڈھنڈ کر کھڑا کر رکھا۔

”لے ساتھ اثبات میں سر پلایا، اور باہر نکل گئی۔ سعدی نے دوبارہ انہی نظر دوں سے بڑے ابا کو دیکھا۔

”اس وقت ان کو کڈنی چاہیے، میں دے رہا ہوں، مگر آپ ان کو نہیں بتائیں گے۔“ اور ابا کو غصہ چڑھنے لگا۔

”میں تمہیں اذل تو ایسا کرنے ہی نہیں دوں گا، اور اگر تم نے ضد کی تو میں زمر کو یہ بات بتا دوں گا، پھر وہ ساری زندگی ڈائلیز

لے رہا گی، مگر تم سے گردہ نہیں لے لے گی۔ کوئی اپنے بچوں سے قربانی مانگتا ہے کیا؟“

سعدی نے لب بھینپے اثبات میں گردن ہلانی، پیچھے ہو کر بیٹھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ میری فیس وہی دیتی ہیں۔“

بڑے ابا کو جھٹکا لگا، بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیوں؟ کیا وہ نہیں دیتیں؟ کر دیں انکار۔“

وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔ صدمہ سا صدمہ تھا۔ اس کی آنکھیں گلابی پُر رہی تھیں۔

”دیتی ہیں نا؟“ ایک آس پھر سے جوڑی تدرے گیلی آواز میں ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ بڑے ابا نے ہلکا سا اثبات میں سر

ہالا یا۔ سعدی نے ناک سے گیلی سانس اندر کھینچی، سر سمجھنے والے انداز میں ہالا یا، نبھی اندر اتاری۔

”تھیں کیوں بڑے ابا، اب اگر آپ نے زمر کو کچھ بتایا تو میں بھی انہیں بتا دوں گا،“ کہ یہ فس والی بات آپ نے مجھے بتائی ہے۔

”وہ حق دق رہ گئے۔“ میں نے کہ...؟“

”ابھی بتایا ہے نا۔“ خود کو سنبھال کر، اطمینان بھری بے نیازی سے کہہ کر وہ پیچھے کو ہو گیا۔ وہ بالکل ہکا ہکا اسے دیکھ رہے تھے۔ آج گا،

مدی بڑا ہو گیا ہے۔ یعنی دوسرا بیک میلر اولاد؟ ایک زمر کم تھی کیا؟

خین وہیں اندر آئی، نبھی میں سر پلایا۔ کچھ کہنے سے فی الحال معدود تھی۔

”مجھے پتہ ہے میرا کڈنی تیج کر جائے گا۔ مگر آپ دونوں میں سے کوئی زمر کو نہیں بتائے گا۔“ وہ قطیت سے باری باری ان کا چہرہ

ا یلتا تسمیہ کر رہا تھا۔

”اور امی؟“ بالآخر وہ بولی۔

”ان کو میں سمجھا دوں گا، بے فکر رہو۔“

”مگر زمر کو کیا کہیں گے، کس کا گردہ ہے یہ؟“ بڑے ابا کا لہجہ اب کمزور تھا۔

”وہ کون ساد کیھر ہی ہیں؟ کسی سے ملوا دیں گے انہیں، کہیں گے کہ یہ اس کا گردہ ہے۔“

”یہ بات ہمیشہ نہیں چھپے گی سعدی۔ اسے بتانا پڑے گا۔ تم خود بتا دو۔ وہ تو اب تک تم سے خواہ ہے۔“

”اگر مان گئیں تو پوچھیں گی نہیں کہ میں کدھر ہوں؟ ملنے کیوں نہیں آتا؟ بس انہیں کہیے گا، میں واپس چلا گیا ہوں۔“ وہ سب طکر

چکا تھا۔ دو دون سے یہی سوچ رہا تھا۔ بڑے ابا کو افسوس سالکنے لگا۔

”ایسے وہ دل صاف نہیں کرے گی، میں اسے جانتا ہوں۔“

”میں بھی جانتا ہوں انہیں، وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“ مگر وہ غلط تھا۔

”اسے بتا دو سعدی۔ آپ ریشن کے بعد بتا دینا بے شک۔“ وہ اب نیم رضا مند لگ رہے تھے۔

”یہ میرا ثمیث ہے، میں تیجاداری کر کے نمبر بنا لوں یا پڑھائی کے بہانے نظر وہن سے غائب ہو کر اپنا فرض ادا کروں اور اگر برائنا ہوں تو بن جاؤں، مگر مجھے اس ثمیث میں فیلنہیں ہونا!“

”تم اس سے بات تو کر کے دیکھو!“

”نہیں نا! اگر پھپھو کو پتہ چلا کہ یہ میرا گردہ ہے تو وہ کبھی نہیں لیں گی۔ پھپھو مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ میں ان کا بھائی بھی ہوں، دوست بھی اور بیٹا بھی۔ وہ مجھے کبھی اس تکلیف سے نہیں گزارنا چاہیں گی۔“

”تو ہم پھپھو کو کیا کہیں گے؟“ سوئی سوئی سی حنین جیسے جاگی۔ دماغ کام کرنے لگا۔

”کسی سے ملوا دیں گے، کسی کو راضی کر لیں گے اس کام پ۔“ یہ سعدی کو مسئلہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بار بار بے چینی سے گھڑی دیکھتا۔

اسے روپریش کا انتظار تھا۔

”مگر کس سے؟“

سعدی نے اکتا کر حنین کو دیکھا۔ ”یہ بعد کی بات ہے۔“ بھی دروازہ ہلکا سا بجا۔

حنین چونک کرمڑی، چوکھت میں علیشا کھڑی تھی۔ مسکراتی ہوئی، سفید راوزہ اور بھوری شرٹ میں۔ کہنی پہ بیک ٹنگا تھا۔

”میں تھہاری آنٹی کو دیکھنے آئی تھی۔“ وہ نرمی سے کہتی آگئے آئی۔

حنین نے سعدی کو دیکھا، سعدی نے حنین کو۔ پھر دونوں نے علیشا کو دیکھا۔

”بھائی، کیا آپ بھی وہی سوچ رہے ہیں جو میں سوچ رہی ہوں؟“

”کیا یہ مان جائے گی، تھوڑی سی ادا کاری پ۔“ دونوں نے دبی دبی آواز میں فقر وہن کا تبادلہ کیا۔ علیشا نے باری باری ان کے

چہرے دیکھے۔

”کیا سب ٹھیک ہے؟“

”آف کرس۔“ حنین کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ جلدی سے ایک کری سے چیزیں ہٹا کر دی، سعدی اٹھ کر

چوکھت پہ جا کھڑا ہوا۔ نگاہیں راہداری میں لگے کلاک پکی تھیں، بڑے ابا اپنی سوچوں میں الجھتے تھے۔

علیشا نزاکت سے بیٹھنی، گھٹنے ملا کر، پس زمین پر رکھا۔ حنین ساتھ والی کری پا گئے ہو کر بے چینی بیٹھی۔

”مجھے تم سے ایک کام ہے علیشا، پچھر دیر میں بتاتی ہوں۔“ وہ بھی سعدی کی نظر وہ کے تعاقب میں دیکھ رہی تھی۔  
”اوے!“ علیشا نے شانے اچکا دیے۔  
”اگر کندنی مجھ نے کیا تو؟“ بڑے اپانے اپنی ہی سوچ میں سوال کیا۔  
”تو پھر کسی اور کو دینا پڑے گا۔“

”مگر کس کو؟“ وہ خین نے سوال کر کے خود ہی خاموش ہو گئے۔ خین نے نظریں جھکا کر خود کو دیکھا، پھر اپنے بازو کو۔ آستین ذرا تنگ تھا۔ اس نے دو انگلیاں ٹھج بٹھن پر رکھ لیں، جیسے اسے کھول کر آتیں اور پڑھانے پر تیار ہو۔ انگوٹھے سے بازو کے اوپر لکیر ٹھیچی۔ کون سی رگ نے بھلا جس سے میٹھ کے لئے خون نکالا جاتا ہے۔  
”تم نے بتایا نہیں میرا گفت کیسا لگا؟“ علیشا موبائل پر بٹھن دباتی پوچھ رہی تھی۔ خین نے خالی نظر وہ سے اسے دیکھا، پھر پھیکا مانگ رہی۔

”وہ لاکٹ، اس پر بھی تمہارے کی چینی والی عبارت درج تھی۔“ وارث کے قتل کی رات جب وہ اور فارس علیشا کے کمرے سے اٹکے تھے، تب اس نے خین کو جوڑ تھما یا تھا، اس میں سے سیاہ ہیرے کی شکل کا تنا پتھر جزا لاکٹ کلا تھا۔ اس نے بہت دن بعد کھولا۔  
”مجھے وہ بہت اچھا لگا۔ مگر اس کا کیا مطلب ہوا؟ ہمیشہ کے لئے چیوٹیاں؟ (Ants EverAfter)“ وہ انگلی ابھی تک بازو کی روک پر رکھے بیٹھی تھی۔

علیشا نے آہت سے موبائل رکھا، اسے دیکھ کر نکان سے مسکرائی۔ ”تم نے مجھ سے کوئی کام کہنا تھا؟“  
”ہاں... وہ کیا... تم میری آنٹی کو یہ کہہ سکتی ہو، کہ تم ان کو اپنی مرضی اور خوشی سے کندنی ڈنیت کر رہی ہو؟ دراصل جو رشتہ دار ڈونیٹ کر رہا ہے، وہ اس سے لیتا نہیں چاہیں گی اور...“ وہ جلدی جلدی ساری بات سمجھاتی گئی۔

”مگر میں توات کی فلاٹ سے واپس جا رہی ہوں۔“  
”اوہ... کیا تم رک نہیں سکتی؟ کیا تمہارا کام ہو گیا، جس کے لئے تم آئی تھی؟“  
”دنہیں... وہ تو نہیں ہوا۔ میں بھی کس امید پر چلی آئی۔“ تلخی سے مسکرا کر خود پر افسوس کیا۔ خین بے چینی سے آگے ہوئی۔  
”تم بس پانچ منٹ کے لئے آنٹی سے مل لو۔ بعد میں ہم کہہ دیں گے کہ تمہیں دوسرے ہپتال شفث کر دیا گیا ہے۔“  
”اوے!“ وہ متامل تھی مگر شانے اچکا دیے۔ خین پھر سے مضطرب سی دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

”ترانسپلانٹ پر کافی خرچ آ رہا ہوگا۔“ علیشا نے برائے بات پوچھا۔  
”پتہ نہیں وہ سب اور نگزیب انکل کا سر درد ہے۔“  
علیشا کا سانس رک گیا۔ بنا پلک جھکے وہ خین کو دیکھنے لگی۔  
”تمہارے وہی انکل، جن کا تم بہت ذکر کرتی ہو۔“  
”ہاں۔ پتہ نہیں، ہماری اکثر باتوں میں ان کا ذکر کیوں نکل آتا ہے؟“ یہ سوال سوچنے کا وقت، زہین خین کے دماغ کو بھی نہیں ملا تھا۔ اب بھی کہہ کر بھول گئی۔ ”وہی علاج کا خرچ اٹھا رہے ہیں۔“  
”مگر... کیوں؟“ حریت زدہ سی وہ بمشکل پوچھ پائی۔ خین نے شانے اچکائے۔ ابھی تک چوکھت کو دیکھ رہی تھی۔  
”وہ فارس ماموں کے باپ کی جگہ ہیں، اور پچھو مسلسل فارس ماموں کو اس سب کا ذمہ دار تھہرا رہی ہیں، تو اور نگزیب انکل اپنے بھائی کی طرف سے مدا کرنا چاہ رہے ہیں۔“

علیشا سے اگلا سانس نہیں لیا گیا۔ اس نے چہرہ سامنے کو پھیر لیا۔ تھوک لگی، آنکھوں میں آتی تھی اندراتاری۔

”ان سے کسی نے رقم نہیں مانگی وہ پھر بھی دے رہے ہیں، صرف اس لئے کہ وہ فارس کے باپ کی جگہ ہیں، حسین؟ کتنی رحمدی ہے ہے ہے؟“  
حسین نے اثبات میں سر بلاد دیا۔ علیشا زخمی سامسکرائی، سرجھ کا کراں لگیوں میں پکڑے کی چین کو دیکھا۔

”کیا تم جانتی ہو حشرات الارض میں سب سے زیادہ زہریلا کیڑا اکون سا ہوتا ہے؟“

حسین نے فی میں سر بلاد دیا۔ چوکھت میں کھڑا سعدی گردون موڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ حسین کے ساتھ بیٹھی سرجھ کائے کی چین پر انگلی پھیرتی کہے جا رہی تھی۔

”چیزوں۔ Maricopa Harvester Ant۔ دنیا کا سب سے زہریلا کیڑا ہے۔ اس کیڑے کو انتقام پہنیں اس کا ناچاہیے درند اس کے کاٹے سے طاق تو رے طاق تو را نبھی مر جائے۔ پتہ ہے ایک دفعہ کسی نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ کہ تم ساری عمر چیزوں رہو گی۔ مجھے وہ بات پہلے بہت بری لگی، پھر اچھی لگنے لگی، کیونکہ میں چیزوں ہی تو ہوں۔ سب کمزور اور بے بن لوگ چیزوں کی طرح ہوتے ہیں۔“ حسین بے دھیانی سے سن رہی تھی وہ خاموش ہوئی تو وہ جلدی سے بولی۔

”کیا تم میری آئٹی سے مل لوگی؟ اتنا وقت ہو گانا تمہارے پاس؟“

علیشا نے سر اٹھایا، مسکرا کر نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”شیور۔ میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ میں کچھ دن مزید ڈھنڈتے ہوں، اپنا کام بھی مکمل کرلوں گی۔“

حسین کا پھر فرط سمرت سے دکنے لگا۔ اس نے خوشی سے علیشا کا ہاتھ دبایا۔

”تھیک یو علیشا۔ تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔ کتنا عجیب اتفاق ہے نا کہ یعنی ان دونوں میں تم آئی ہو جب ہم اتنے کرائسر میں تھے، مگر تم ہمارے ساتھ رہی۔“

علیشا کا رنگ سفید پڑا۔ حلق میں کچھ انکا۔ وہ تو اور انگریزیب کاردار کے ایکشن کا سن کر آئی تھی، (اور وہ خود بھی بے خبر تھی کہ اگر یہ ایکشن نہ ہوتے تو وارث کو شاید مہلت دے دی جاتی) مگر یہاں کے ایکشن امر یہ کہ سے بہت مختلف تھے۔ اور حسین اس سب کو ایک اتفاق بھجو رہی تھی؟

”حسین، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“ مگر سعدی کسی کو آتے دیکھ کر فوراً آگے چلا گیا، تو حسین امید اور خوف کے ملے جلے تاثر سے کھڑی ہو گئی بازو کی رگ پہ پھر سے دوسرا ہاتھ رکھ لیا۔

”پھر بھی سہی!“ علیشا اس کا دھیان نہ پا کر ڈھیلی سی واپس بیٹھ گئی۔ حسین چوکھت تک آئی۔ فکر مندی سے سامنے دیکھا۔ سعدی چند کاغذ کھول کر پڑھتا ہوا نظر آرہا تھا۔ بازو پر کھا اس کا ہاتھ مضبوط ہوتا گیا۔ پیٹھ میں کھول لیا۔ اب بس آستین موڑنا تھا۔ پہلے بلڈ نیٹسٹ ہوتا ہے کیا؟ اسے علم بھی نہیں تھا!

سعدی نے گھری سانس لے کر صخفات نیچے کیے اور بی مسافت کی تھکن سے حصہ کا چہرہ دیکھا۔ پھر سرا ثبات میں ہلایا۔

”پازیو!“

حسین کا بازو پر کھا ہاتھ بے دم سا پہلو میں آگرا۔ اس نے زرد گفت کے ساتھ سر کو خم دیا۔ سعدی اب پلٹ کرتیزی سے آگے جا رہا تھا اسے بہت سے کام کرنے تھے۔

### السابقون السابقون - أولئك المقربون.

ہر قربانی کا ایک وقت ہوتا ہے اور اس وقت کی ایک ایکسپارٹی ذیث بھی ہوتی ہے۔

کیوں داد غم ہمی نے طلب کی، برا کیا ..... ہم سے جہاں میں کشتم غم اور کیا کیا نہ تھے اور ہسپتال کے کرے میں، کرسی پہنچی علیہا کو منکروں انداز میں گھوتی، تکیوں سے میک لگائے، وہ زمر یوسف تھی اور وہ اتنی جلدی مان جاتی ناممکن تھا۔

”اور آپ مجھے اپنا گردہ کیوں دینا چاہتی ہیں؟“ اس کو ہضم نہیں ہوا تھا اس لیے تفتیش شروع کر دی تھی۔

جواب میں علیہا نے کافی بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”میں اس واقعے کا ذمہ دار خود کو تھکنی ہوں۔ اگر میں آپ کے آفس آ جاتی تو نہ آپ ادھر جاتیں نہ دہشت گردی کا نشانہ بنتی۔ میں نہیں کروائے ہیں، گو کہ مجھے کم عمری سے دم کی شکایت ہے مگر اس کے علاوہ میں بالکل صحت مند ہوں، اور دو فنیت کر سکتی ہوں۔“

”اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اس وجہ پر یقین کروں؟“ زمر نے تیکھی نظروں سے مسلسل اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہ کریں آپ کی مرضی، مگر میں دوسری وجہ بھی ضرور بتانا چاہوں گی۔“ علیہا زرار کی سامنے بے چینی سی کھڑی حینیں اور قریب بیٹھے مضطرب سے بڑے ابا کو دیکھا پھر اسی اعتماد سے پر اسکیوں ٹرکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”مجھے اس قربانی کے عوض آپ کی فیملی ایک اچھی قیمت دے رہی ہے۔ جسے میں واپس جا کر یونیورسٹی فیس کے لیے استعمال کروں گی۔ اپنی زندگی بنانے کا اتنا اچھا موقع میں ضائع نہیں کروں گی۔ اگر مزید پیسے چاہیے ہوئے تو میں اس قربانی کو کسی ٹوی شو میں اپنی کہانی چلوا کر کیش کروں گی۔“ آخر میں اس نے بے فکری سے شانے اچکائے۔

حینیں کے لب کھل گئے وہ ہبکا باسی علیہا کو سن رہی تھی۔ (کیا اس نے فرض کر لیا تھا کہ ادا کاری صرف زمر پر ختم ہو جاتی ہے؟)

”مگر یہ ایگل ہے۔“ زمر کے فقرے پوہ سب چوکے۔

”قانون کے مطابق ڈاکٹر کبھی بھی ٹرانسپلانٹ نہیں کر سکتا، اگر گردہ خون کے رشتے دار کا نہ ہو تو۔ آپ سب لوگ مل کر ایک غیر قانونی کام کیسے کر سکتے ہیں؟“ ابرو فرخ کرتا دبی انداز میں اس نے باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے۔

اور بڑے ابا نے کئی دفعہ کی سوچی گئی خواہش دل میں دھرائی۔ کاش انہوں نے بھی اس لڑکی کو قانون نہ پڑھایا ہوتا۔

”یہ عورت تو غیر ملکی ہے گر آپ کو تو قانون کا علم ہونا چاہیے ابا۔“

”ہم نے اس کا حل بھی نکال لیا ہے۔“ حینیں ہست کر کے بولی تو زمر گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ ”ہم پیپر زپ سعدی بھائی کا نام لکھوائیں گے۔“

زمر کے تاثرات بدلتے۔ وہ دہل کر رہ گئی تھی۔

”سعدی کا کیوں؟“ وہ ایک دم تڑپ کر متوضہ سی بولی، پھر غصے سے ابا کو دیکھا۔ ”سعدی کا نام کذنبی ڈوز کے طور پر۔ بھی بھی نہیں لکھیں گے آپ لوگ۔“

”ٹھیک ہے نہیں لکھتے۔ لیکن اگر یہ فرخ امریکن عورت نہیں دے گی،“ بڑے ابا نے علیہا کی طرف اشارہ کر کے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ”تو کسی خون کے رشتے دار کو دینا پڑے گا۔ فہرست بنتے ہیں، پہلے نمبر پر میں ہوں، میرا فتح نے کیا تو پھر سعدی ہو گا، اور پھر حینیں، اگر اس کا بھی نہ لگ سکا تو اسامتہ ہے نا۔“

”ابا!“ اس کے دل پر کسی نے پیور کھدیا تھا۔ صدمے سے آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔

”بالکل بھی نہ کہنا زمر کہ تم تندرست نہیں ہونا چاہتی۔ ہر کوئی تندرست ہونا چاہتا ہے۔ تم الگ نہیں ہو۔ اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہے تمہارے پاس۔“ زمر بالکل چپ ہو گئی۔ بے بی سے سر جھکائے لب کاٹنے لگی۔ دل بہت بڑے انداز میں دکھایا تھا حینیں کی بات نے۔

”مگر.... یہ غیر قانونی ہے۔“ اس کی آواز اب کے کمزور تھی۔

”ہاں اور جو تمہارے ساتھ ہوا، وہ بھی غیر قانونی تھا۔“

زمر کی آنکھوں میں کرب کے ساتھ طیش ابھرا۔

”ہوانہ نہیں، جو میرے ساتھ فارس نے کیا، وہ غیر قانونی تھا!“

”پچھوئیں ادھر ہی تھی، ناموں نے آپ کو کوئی کال نہیں کی۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔“ اس کے بیٹھ کے دائیں طرف کھڑی خین بے بسی سے بولی۔ زمر نے گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرتے ہوئے، سر جھکا اور پیچھے ہوئی۔ اب کے بولی تو آواز سنبلی ہوئی تھی۔

”مجھے معلوم ہے تم جھوٹ نہیں بول رہی۔ فارس بہت اسماਰث ہے اسے تمہیں ذاح کرنے کے ہزار طریقے آتے ہیں۔“

خین کو دیکھ کا گا۔ بہت بے یقینی سے پھیلی آنکھوں سے اس نے زمر کو دیکھا، جواب اپنا الحاف درست کر رہی تھی۔

”یعنی آپ مجھے جھوٹ نہیں سمجھتیں؟ بلکہ آپ مجھے بے وقوف سمجھتی ہیں!“ یہ صدمہ زیادہ بڑا تھا۔ زمر ان شا کرتی لحاف ٹھیک کر کے پیچھے کو ہو گئی۔ خین کے لب پھیج گئے۔ بڑے ابا کی معدتر تی نظروں کو دیکھے بنا، وہ سرد لبجھ میں بولی۔

”اوے کے پچھوئیں سعدی بھائی کا نام لکھوا کر آپ کو ہرث نہیں کریں گے۔ ہم خین یوسف کا نام لکھوا دیں گے۔ اب ٹھیک ہے نا۔“ وہ کہہ کر ایک دم مڑی اور گوکہ اس نے دیکھا بھی کہ زمر بے ساختہ نرم پڑی تھی، اسے منع کرنے کو کچھ کہنے والی تھی، مگر خین ان تینوں کو دیہیں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ سعدی کا ریڈور میں کھڑا تھا۔ بے ساختہ سیدھا ہوا۔ امید سے اسے دیکھا۔

”کیا انہوں نے یقین کر لیا؟“

”کر لیں گی۔ اپنی صحت کے لئے سب کر لیتے ہیں۔“ وہ تختی سے بولی۔ سعدی کا دماغ کہیں اور الجھا تھا، غور کئے بناؤ زمر کے کمرے کا بند دروازہ دیکھنے لگا۔

وہ سر جھٹک کر آگے چلتی گئی۔ کار ریڈور عبور کر کے ریسپشن ڈیک کر اس کیا۔ پھر باہر آئی۔ لان میں مریضوں اور ان کے عزیزو اقارب کی چھل پہل دیکھی ہی تھی۔ خین خنگی سے منہ ہی منہ میں کچھ بڑھاتی، لگاس کے پیچ روشن پا گے چلتی جا رہی تھی۔ پھر یا کیک ٹھہری۔ کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر کون اور کدھر؟ وہ مڑی۔ گھوم کر ادھر ادھر دیکھا۔ اور تھی دو را یک پیٹھ پٹھ پٹھ ناگ پٹا نگ جائے، ایک بازو پیٹھ کی پشت کے پیچے پھیلائے، میٹھے ہاشم نے مسکرا کر اسے ہاتھ ہلاایا۔ خین کی آنکھیں اچنچھے سے سکڑیں۔ بہر حال وہ قدم قدم چلتی پیٹھ کے قریب آئی۔

”سعدی بھائی اندر ہیں۔“ اس نے اپنے تیس ہاشم کو درست سمت دکھائی۔ وہ بس مسکرا کر اسے دیکھ گیا۔

”ابھی مل کر آ رہا ہوں اس سے۔ اس نے بتایا کہ ڈونر کنٹنی مل گیا ہے، مگر جس شخص سے خریدا ہے، اس کے بارے میں زمر کو بتانے کی بجائے تمہاری کوئی فریzend...“ ہاشم نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔ یہ کوئا سٹوری صرف ہاشم کے لئے گھڑی تھی۔ سعدی اس پلاکھ اعتماد کرتا، مگر یہ اس کے خاندان کا اندر وہی معاملہ تھا۔ اور ہاشم کو بتانے کا مطلب تھا، زمر کو کہی نہ کہی وہ بتا دے گا۔ اس کو صرف ”خین کی درست گرددے رہی ہے،“ کہہ کر بھی نہیں ٹال سکتے تھے کہ علیہا اس ادا کاری کے لئے دوبارہ مہیا نہیں ہو گی، ہاشم آتا جاتا رہے گا، اگر کھٹک گیا تو کھون لگائے گا، اور پتہ چلنے پر سعدی سے بد اعتماد ہو جائے گا۔ سو پہلے ہی اسے مطمئن کر دیا۔ وہ ہو بھی گیا۔ اس کی بلا سے گردہ غیر قانونی طور سے ہی خریدا ہو۔ اس کا مسئلہ تو صرف علیہا تھی جس نے اپنی فلاٹ آگے کروالی تھی۔

”میری فرینڈ علیہا... اس نے پچھوئی کو نہیں کر لیا ہے، مگر آپ یہ بات پچھوئی کو مت بتائیے گا۔“ وہ سینے پر بازو پیٹھ اس کے سامنے کھڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”کیا یہ کہنے کی بات ہے؟“ ہاشم نے حیرت سے پوچھا پھر گردن پھیر کر، پتال کو دیکھنے لگا۔

”علیشا... ہوں... کیا تم مجھے اس سے ملو سکتی ہو؟ ابھی اسی وقت؟“

”آ... او کے!“ وہ متذبذب تھی۔

”اور ہاں تم بھی اس کو نہیں بتاؤ گی کہ تم اسے مجھے سے ملوانے باہر لارہی ہو۔“

”شیورا!“ پلکیں سکیز کر اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتی، وہ مڑی اور اندر چلی آئی۔ سعدی اب وہاں نہیں تھا۔ اس نے دروازے سے ان اندر زمر سے با تین کرتی علیشا کو اشارہ کیا۔ وہ معدترت کرتی اٹھ آئی۔

”آؤ باہر چلتے ہیں۔“ خین نے کہا تو وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ عینک اور فرنچ چوٹی والی سوچ میں گم خین، اور ساتھ دراز قد، ملے بالوں والی خوبصورت سی علیشا۔ انہوں نے راہداری عبور کی، تب علیشا نے پس سے ان ہیلر نکالا، بیوں میں رکھا، اور اسپر سے اندر کو ایسا۔ خین رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا وہ سب اداکاری نہیں تھی؟“

”سوائے ڈے کے سب فرضی تھا۔“ مسکرا کر اس نے کہتے، ان ہیلر والی پس رکھا۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے، تمہاری آنٹی نے میرا ایفین کر لیا ہو گا؟“

”ان کے پاس کوئی دوسرا آپشن ہے کیا؟“ وہ بھی ابھی سی سامنے متلاشی نظروں سے دیکھتی لان کو دیکھتی باہر آئی۔ ہاشم کدھر گیا؟

”مجھے بہت افسوس ہے جو ان کے ساتھ ہوا۔ کیا حملہ آرا بھی تک نہیں کپڑا گیا؟“

”کپڑا جائے گا۔“ وہ اب گردن پھیر کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اپنا آپ ایک دم بے قوف سا لگنے لگا۔ یہ ہاشم اسے بلا کر خود کدھر...؟

”ہیلو! گین علیشا!“ وہ دونوں ایک ساتھ گھومیں کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے ہاشم مسکرا تاہوا، ریسپشن ڈیک کی سمت سے چلتا آ رہا۔ خین نے گھری سانس لی۔

اور علیشا کا رنگ نچڑا گیا۔ وہ سفید سا کتھی سانس روکے کھڑی تھی۔

”علیشا، یہ میرے...“ خین نے تعارف کروانے کو الفاظ تلاشیے ہی تھے کہ وہ اسے نظر انداز کر کے، گھری سر دن نظروں سے علیشا کو ایسا، قریب آتے ہوئے بولا۔

”دوبارہ مل کر خوشی ہوئی علیشا۔“

علیشا کی خوف سے ساکت آنکھوں میں حرکت ہوئی، وہ جلدی سے خین کی طرف گھومی۔ ”حده، کیا تم اسکیلے میں میری بات سن سکتی“

”ہو۔“

”کیوں؟ مجھ سے کیا مسئلہ ہے؟ آخر ہم ایک فیملی ہیں علیشا۔“ وہ سر دسکراہٹ سے کہتا، خین کے الجھے الجھے چہرے کے تاثرات بغور نوٹ کر رہا تھا۔

”حده، پلیز، میری بات سن لو پہلے۔“ وہ بے چینی سے اس کا ہاتھ کپڑا کر اسے وہاں سے دور لے جانے لگی، مگر خین اپنی جگہ سے نہ ملی۔

”بس تجب سے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔

”فیملی؟“

”ہاں خین، علیشا میرے والد کی غیر قانونی امریکی بیٹی ہے۔ اسی لئے تو وہ تمہیں جانتی ہے اور تمہاری اتنی اچھی دوست ہے۔ ابھی اس دن جب علیشا مجھے اور میرے باپ کو دیکھ دینے ہمارے آفس آئی تھی، تب ہی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ کس طرح اس نے تمہارا اکاؤنٹ

ہیک کیا اور... وہ سوری... شاید یہ بات علیشا نے تمہیں نہیں بتائی تھی۔ ”آخر میں انہوں سے اضافہ کیا۔ وہ جو بھی تک الجھی کھڑی تھی لفظ ہیک پر کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔ بے لینی سے علیشا کو دیکھا۔ جانے کب ہاتھ سے ہاتھ چوٹا۔

”صل میں علیشا میرے ڈیڈ کے بارے میں کافی حساس ہے۔ چونکہ ڈیڈ اس سے مخاطب تک ہونا پسند نہیں کرتے تو یہ ہر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتی ہے، جس سے وہ بات کرتے ہوں جیسے کہ تم حسین۔“

”ہاشم، پلیز!“ وہ نم ہوتی آنکھوں سے منت کرنے لگی۔ ہاشم کے چہرے کی ختنی بڑھی، مسکراہت غائب ہوئی۔

”کیوں؟ کیا یہ جھوٹ ہے؟ کیا تم میکر نہیں ہو؟ کیا تم نے میرے ڈیڈ کا اکاؤنٹ ہیک نہیں کر رکھا تھا؟ کیا تم نے ان کی اور حسین کی میلو پڑھ کر حسین کا اکاؤنٹ بھی ہیک نہیں کیا تھا؟ کیا تم نے حسین کی توجہ لینے کے لئے وہی کیم نہیں کھلی شروع کر دی جو یہ کھلی تھی؟“

”ہاشم، بس کر دو۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ بے اختیار حسد کو دیکھا، جو بھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اردو گرد رسپشن پر گزرتے لوگ اس وقت ان تینوں کو نظر نہیں آ رہے تھے۔

”حسین، میں نے یہ سب صرف یہ دیکھنے کے لئے کیا تھا کہ تم کون ہو، ورنہ اس کے بعد ہم واقعی دوست تھے۔ وہ سب حقیقت تھا۔ میں نے تمہیں کبھی نقصان نہیں دیا۔“

”تم نے میرے باپ کے لئے میرے خاندان کی بچی کو نثار گست کیا، اور پھر بھی تم میں اتنے گلش ہیں علیشا کہ کہہ سکو کہ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

مگر وہ صرف حسین کو دیکھ رہی تھی۔ خوفزدہ، نم آنکھوں سے۔

”خد، میں تمہیں سب بتانے والی تھی۔ پلیز، وہ سب ریل تھا۔ وہ گھنٹوں کی باتیں، وہ ڈرائی ڈسکس کرنا، وہ گیمز، وہ سب ریل تھا۔“

”تم یہ کہ رہی ہو کہ تم نے میری بیٹی کی اس بچی سے میرے باپ کے بارے میں کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا؟“ علیشا بولتے بولتے لا جواب ہو گئی۔ حسین یک نک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ہاشم کو اب اس کی مسلسل خاموشی سے کوفت ہو رہی تھی۔ وہ نا محضوں انداز میں حسین کے ساتھ جا کھڑا ہوا اب وہ دونوں ایک طرف تھے، اور وہ لب آپس میں مس کرتی۔ پریشان، بھیک آنکھوں والی علیشا دوسروی طرف۔

”علیشا میرے ڈیڈ کو بلیک میل کر کے ان سے پیے لیئے آئی تھی، اس نے تم سے دوستی بھی ڈیڈ کے بارے میں خبریں حاصل کرنے کے لئے کی تھی۔ اپنے دماغ پر زور دیں، کتنی ہی دفعہ تم لوگوں نے بات بہ بات ان کا ذکر کیا ہو گا، ہے نا؟“ وہ کیلی نگاہوں سے علیشا کو دیکھتا، حسین کو بتا رہا تھا۔

مگر حسین... وہ بالکل چپ کھڑی تھی۔

”خد، پلیز، میری نیت بری نہیں تھی۔ پلیز، میری بات تو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

اور حسین کے پھر لب ہلے۔

”اس کیم کا کیا، علیشا؟“

”کیا؟“ علیشا کے بہتے آنسو رک گئے۔

”میں پانچ ماہ تک اس جیولز والی کیم میں پہلے نمبر پر آگئی۔ تم نے یہ کیسے کیا علیشا؟“

ہاشم نے بمشکل اکتا ہٹ پر قابو پایا۔ (وہ کہاں سیاست اسکینڈنیز بلیک میلگ کی بات کر رہا تھا، اور کہاں ان لڑکیوں کے دماغ سے

کیمر نہیں تھی تھیں۔)

علیشا نام است بھرے آنسوؤں سے اسے دیکھتی رہی۔

”وہ کچھ پوچھ رہی ہے.... جواب دو۔“

”میں نے....“ وہ رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی، امید اور خوف سے ملی جلی نظریں ہنوز حنہ کے چہرے پر تھیں۔ ”میں نے کچھ

استعمال کیے تھے اور....“ Cheat Codes

”اوہ... اوہ... اوہ...“ خین نے ایک دم غصے سے سر جھکا۔ ”تو تم چینگ کر کے جیتی تھیں! اوہ علیشا، مجھے بھی معلوم تھا کہ بے ایمانی یہ کرنی ہے، مگر میں نے نہیں کی۔ صرف محنت کی۔ تین سال میں لگی رہی، دوسرا سے پہلے نمبر پنہ آسکی گرچینگ نہیں کی، کیونکہ میں خین ہے۔ سف تھی بھائی نے مجھے قرآن کے آخری پارہ اور پانچ بڑی سورتیں حفظ کر کر کی تھیں، کیونکہ میں بنی اسرائیل میں سے تھی، آل یوسف۔ انہیاء کی ۱۱۱۰۔ میں نے بے ایمانی نہیں کی، اور تم... تم تین سال سے بھتی جسے کہتی غصے سے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلاتی وہ قدم قدام پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ”تم نے مجھے استعمال کیا۔ ہم اتفاق سے نہیں ملے۔ سب کچھ تم نے پلان کیا۔ فارس ماموں ٹھیک کہتے تھے تھا رے ۱۱۱۱۔ میں...“ وہ پیچھے ہٹی راہداری کے قریب ہو رہی تھی۔ علیشا نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ گرم آنسو بہتے رہے۔ اعمال کے متاثر ہوتے جیسا کہ میں نے بتا پڑتے ہیں۔

”لوگ کہتے ہیں علیشا کہ کوئی لڑکا کسی لڑکی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ آج دل چاہ رہا ہے ان سے پوچھنے کا، کہ کیا کوئی لڑکی بھی کسی لڑکی کا دوست بن سکتی ہے؟“ غنی میں سر ہلاتی، وہ مڑی اور تیز تیز اندر چلی گئی۔

مطمئن سے کھڑے ہام نے اب کے رخ پھیر کر فرصت سے علیشا کو دیکھا، جو آنکھیں بند کیے کھڑی تھی۔ پھر اسے کہنی سے تھاما، ۱۱۱۲۔ میرے دھیرے ساتھ لے کر باہر آیا۔ ایک کونے میں، نسبتاً سنسان جگہ پہ آکر اس نے علیشا کی کہنی چھوڑی۔

”آئی ایم ریلی سوری علیشا۔ لیکن اگر تم نے یہ سمجھا تھا کہ تم ہاشم کا ردار کو بلیک میں کر سکتی ہو، تو تم غلط تھیں۔“ علیشا نے بھیکی آنکھیں کھولیں۔ دکھ سے اسے دیکھا۔

”وہ میری دوست ہے۔“

”تھی۔ اب نہیں رہی۔ آئندہ...“ انگلی اٹھا کر تھتی سے تنبیہ کی۔ ”اگر تم نے اس سے کوئی بھی رابطہ کیا تو میں اس سے بھی زیادہ کر سکتا ۱۱۱۳۔ اس تھا رے ساتھ۔“

”تم شیطان ہو!“ وہ نفرت سے اسے دیکھتی رہی۔ آنسو بھر رہے تھے، غصہ اس کی جگہ لے رہا تھا۔

”تھیک یواس کا ملکیت کے لئے۔ اب تم آنسو صاف کر دو اور جاؤ۔ باہر نکل کر پہلی کالی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ وہ تمہیں ہوٹل لے ۱۱۱۴۔ گی سامان پیک کر اور ایسز پورٹ جاؤ اور نہ تھا ری آج رات کی فلاٹ کا وقت کل جائے گا، یہ کچھ رقم اس میں ہے یہ رکھو۔“ کوٹ کی المروجی جیب سے خاکی لفانہ کا کل کر بڑھایا۔ علیشا نے تفری سے اس لفانے کو دیکھا۔

”مجھے یہ خیرات نہیں چاہیے۔ یونورشی کی فیس نہیں دے سکتے تو اس کی بھی کیا ضرورت تھی؟“

”دراصل یہ خیرات نہیں ہے۔ یہ تھا ری ماں کے ہاسپٹل کے بلا جتنی رقم ہے۔ اوہ آئی ایم سوری، شاید آج تھا ری اپنی ماں سے ات نہیں ہوئی۔“ وہ ایک دم بہت ہی ہمدردی سے بولا۔ علیشا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ موپائل پہ کچھ کا لے لگا۔

”میں نے سنا ہے کہ چند گھنٹے قبل تھا ری ماں کو کسی نیم تاریک سڑک پا ایک کار نے مکار دی تھی۔ اتفاق سے اس گلی کے سی سی ٹی وی لیم راز خراب تھے اور موقعے کا کوئی گواہ بھی نہیں ہے۔ بہر حال جس ہسپٹال میں وہ داخل ہے، جہاں ابھی اس کی حالت خطرے سے مکمل طور پر

باہر نہیں ہے وہاں کام کرنے والے میرے ایک دوست نے یہ مجھے بھیجا تھا۔ ”ساتھ ہی نزدی سے مسکراتے ہوئے موبائل اسکرین سامنے کی۔ وہ جو دم بخودی سنتی جاری تھی، تیزی سے آگے ہوئی، اسکرین پر ہپٹال کے بستر پر اس کی ماں تھی۔ گردن میں کار، ایک بازو پلٹر میں۔ علیشا نے بے اختیار جیخ روکنے کو منہ پر ہاتھ رکھا۔

”سو علیشا یہ خیرات نہیں ہے، یہ تمہارے کام آئے گا۔“ موبائل والپس رکھا، اور وہ لفافہ اس کی کہنی پر لٹنے پر س میں گردادیا، پھر کوٹ کی اندر وہی جیب سے ایک کاغذ اور قلم نکال کر اس کے سامنے کیا۔

”تمہارا بیانِ حلقو ہے، جس کے تحت تم ماں کی بیماری کے باعث والپس جاری ہو، اور یہ کہ تمہارا فارس غازی کے کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ قتل کے وقت اس کے ساتھ تھی نہ، تم اس کو بے گناہ بھجتی ہو۔ اور اگر تم یہ سائنس نہیں کرو گئی تو..... میرا دوست جو اس ہپٹال میں تمہاری ماں کے ساتھ ہے..... وہ بہت کام کا بندہ ہے۔ تم جانتی ہو وہ کیا کیا کر سکتا ہے، مجھے ایسے الفاظ کہنے پر مجبور نہ کرو۔“ بے چک انداز میں کہتے ہوئے ہاشم نے قلم کھول کر اس کے ہاتھ میں تھما یا کاغذ سامنے کیا۔

علیشا کے بے بس آنسو بہرہ ہے تھے اور اتنی ہی نفرت سے ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔ ”میں امریکی شہری ہوں، میں ابھی اپنے سفارت خانے فون کر سکتی ہوں اور اس سب کے بارے میں بتا سکتی ہوں۔“

”بالکل، اسی طرح کرو۔ بلکہ یہ کرنے کے لئے میرا فون استعمال کر لو۔“ فوراً سے ہاشم نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ ”امریکن قونسلیٹ کی فرسٹ سیکرری کا نمبر میرے اپسیڈ ڈائل کے چیزوں کے نمبر پر محفوظ ہے۔ میری بہت اچھی جان پیچان ہے اس سے۔ اداہ شاید تم بھول گئی کہ میں میرا بھائی، میری ماں، ہم سب بھی امریکی شہری ہیں۔ یہاں کرنے ہیں دستخط!“ ساتھ ہی بہت سہولت سے کاغذ پاشارہ کیا۔

علیشا بے بس سے اسے دیکھتی رہی، پھر باس میں ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے، کاغذ دیوار سے لگایا، اور دستخط کرتی گئی۔

”یاد رکھنا ہاشم، تم بھگتو گے۔ خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

یہ کہہ کر وہ آنکھوں میں آنسو لئے پلت گئی۔ ہاشم نے قلم بند کیا، کاغذ سمیت جیب میں رکھا، اور اسے دور جاتے دیکھا رہا۔ پھر گہری سانس لی۔ چلو یہ باب تو ختم ہوا۔

❖❖❖

یہ کون لوگ ہیں جو روشنی پر ہیں مامور..... دیے بجھائے ہیں کتنے نئے جلائے نہیں  
اگلی صبح ہاشم اور جواہرات، ہشاش بشاش اور خونگوار موزہ میں با تیزی کرتے، ہپٹال کی راہداری میں چلتے ہوئے آرہے تھے۔ خین  
نے دینگ روم کے دروازے سے ان کو آتے دیکھا، اور پھر والپس اندر ہو گئی۔ ہاشم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا، تھمی جواہرات سے کہا۔

”آپ ٹھہریں، میں آتا ہوں۔“ وہ وہیں کھڑی ہو گئی، اور ہاشم متلاشی نظر وہ سے دیکھتا آگے بڑھتا آیا، یہاں تک کہ دینگ روم  
کے سامنے آ رکا۔ اندر کری پھین پیٹھی نظر آ رہی تھی۔ گھنٹے ملائے سر جھکا کر دیران نظر وہ سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی، وہ بالکل شل تھی۔ علیشا  
چھپلی رات کی فلاں کسے والپس جا چکی تھی، اور خین غالباً ابھی تک شاک میں تھی۔

”خین۔ بیٹا آپ ٹھیک ہو۔“ وہ نزدی سے پوچھتا وقدم اندر آیا۔ خین نے چہرہ اٹھا کر خالی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”آپ ایم سووری، مجھے پہلے پتہ ہوتا کہ وہ تمہاری دوست ہے، تو میں تمہیں خبر دار کر دیتا۔ مگر پریشان نہ ہو، وہ اب تمہیں ہرگز نہیں  
کرے گی۔“ تسلی دیتے ہوئے وہ مزید آ گیا۔

خین، بس آنکھوں میں خاموشی لئے اسے دیکھتی رہی۔

"وہ ایسی ہی لڑکی ہے۔ ہمیں کافی عرصے سے نگ کر رہی ہے۔ یقین کرو ڈیاں کو اتنے پیے دے چکے ہیں مگر اس کا دل نہیں بھرتا۔" ۱۱۰  
"مبت لینے ہمارے پاس آتی تو ہم اسے اپنے ساتھ رکھ لیتے، مگر وہ ہمیشہ پیسوں کے لیے آتی ہے۔"  
خنین بس اسے دیکھئے گئی۔ چپ چاپ۔

"اگر وہ دوبارہ تمہیں کوئی نقصان دینے کی کوشش کرے، تب تم سب سے پہلے مجھے بتاؤ گی، میں اسے سنبھال لوں گا، او کے بیٹا؟" وہ  
لے نہ دردی سے متاثرا جا رہا تھا، خنین اسی طرح اسے دیکھئے گئی۔ یہاں تک کہ ہاشم چپ ہو گیا۔  
تبھی جواہرات وہاں آتی دکھائی دی۔ ہاشم نے مسکرا کر ماں کو دیکھا اور گرد پھیر کر حمہ سے بولا۔ "یہ بات ہم دونوں کے درمیان  
ہے، او کے۔"

جواہرات اب قریب آچکی تھی۔ اس نے کچھ نہیں سنتا تھا۔ بس ہاشم کو سوالیہ نظر دوں سے دیکھا۔

"آؤ، زمانہ نظر کر رہی ہو گی۔"

"آپ جائیں، میں نے کمل لیا تھا۔ بس اسے کہیے گا کہ اپنا فون مجھے بھجوادے، پولیس ریکارڈ کے لیے دوبارہ سے چاہیے۔" وہ  
۱۱۱ اس بات کرتے کرتے باہر جانے کو پلٹے کرے۔

"کیا آپ کو معلوم ہے مسز کارڈار کا آپ کے شوہر کی دوسری بیٹی کل یہاں تھی؟"

ہاشم ایک جھٹکے سے مڑا اور بے یقینی سے خنین کو دیکھا جوتیز نظر دوں سے اسے گھورتی اٹھ کر ان دونوں کے مقابل آکھڑی ہوئی، یعنی  
۱۱۲ اپنے اور تیکھے انداز میں جواہرات کو خاطب کیا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ کل ہاشم بھائی نے اسے یہاں سے نکلا تھا۔ میں نے کھڑکی سے  
ایسا تھا، وہ روتے ہوئے جا رہی تھی۔" ہاشم کی معلومات میں اضافہ کیا۔

جواہرات کے تاثرات نہیں بد لے، وہ سر دس مسکراتی رہی۔ ہاشم نے پریشانی اور غصے سے خنین کو دیکھا اور پھر ماں کو۔

"خنین یہ کیا طریقہ ہے میری ماں سے بات کرنے کا..."

"مجھے سب پتہ ہے، پچ۔" جواہرات نے مسکرا کر اس کا گال تچپھایا، ایک کٹلی نظر ہاشم پر ڈالی اور باہر نکل گئی۔ وہ بے حد طیش سے  
اس کی طرف گھوما۔

"یہ کیا تھا؟" مگر وہ بے خوفی اور تندہ ہی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اگر آپ کو بھول گیا تھا تو یاد کروادوں ہاشم بھائی کہ میں زمر یوسف کی بھتیجی ہوں، خنین یوسف، اور میں بھی معاف نہیں کرتی۔ اور  
۱۱۳ میں ہاکل بھی سعدی بھائی جیسے لوگوں میں شامل نہیں ہوں جو آپ کی اچھی Looks اور اچھے میز زکی وجہ سے آپ سے متاثر ہتے ہیں۔ مجھے  
آپ پہلے بھی ناپسند تھے، اور جو کل جو آپ نے کیا، اس کے بعد تو میں آپ کو زیادہ ناپسند کرنے لگی ہوں۔" چاچا کر بولتی اس کی آواز اوپنی  
ہے لگتی۔ ہاشم غصہ ضبط کیے لب بھینچ کھڑا رہا۔ "آپ نے مجھے استعمال کیا، اپنا اور علیشا کا جو بھی جھگڑا تھا، اس میں سے اپنا مقصد نکالنے کے  
لئے۔ آپ کو پستہ تھا وہ میری دوست ہے، مگر آپ نے اس وقت نہیں بتایا جب اسے لانے کو مجھے اندر بھیجا تھا۔ میں سعدی بھائی نہیں ہوں جو  
آپ کی ہربات کو صحیح سمجھ لوں گی۔" پھر انگلی اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تندہ ہی سے وارنگ دی۔ "آنندہ مجھے کہیں کہیں استعمال کرنے  
کی کوشش کی آپ نے تو میں اس سے بھی برا کر سکتی ہوں کیونکہ مجھے اور آپ ابھی جانتے نہیں ہیں۔"

گھور کر اسے دیکھتی، وہ ساتھ سے نکل کر آگے بڑھ گئی اور ہاشم ضبط سے گھرے سانس لیتا، وہیں کھڑا کھولتا رہا۔ کچھ دریتک تو اسے  
بھین نہیں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ شاک کے عالم میں نہیں بیٹھی تھی کیا؟ وہ غصے میں بیٹھی تھی؟  
پھر تیزی سے اس نے فون نکلا۔ خاور نے پہلی گھنٹی پر کال اٹھا لی۔

”لیں سر؟“

”کیا علیشا کا دوبارہ رابطہ ہوا سعدی کی بہن سے؟“

”نہیں سر، میں مانیٹر کر رہا ہوں۔ وہ علیشا کے کسی مسیح کا جواب نہیں دے رہی۔“

”اوے!“ ایک تسلی بخش احساس ساندر آتی۔

جب وہ باہر آیا تو خمین بڑے ابا کی وجہ پر چیز زمر کے کمرے سے نکال رہی تھی۔ اس نے ایک تیز لگاہ حمدہ پڑائی، وہ بھی جواب میں اتنی ہی شعلہ بار نظر دوں سے اسے گھورتی پلٹ گئی، اور وجہ پر چیز زمر دوڑے جانے لگی۔ ول اس کا ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کیا اس نے رات سے سوچ گئے سارے پوانتش کہہ دیے تھے؟ کچھ رہ تو نہیں گیا؟ ہونہ، آئے تھے مجھے استعمال کرنے۔

ہاشم تیز تیر چلتا دوسرا جانب جانب مڑ گیا۔ اسے اب باہر کار میں بیٹھ کر جواہرات کے آنے کا انتظار کرنا تھا۔

جواہرات اندر زمر کے سامنے کری پہنچی، غصے سے کہہ رہی تھی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حماد ایسا کرے گا۔ میں نے تمہیں بتائے بغیر کہ تم اسے عزت نفس کا مسئلہ نہ بناؤ حماد کو آسٹریلیا میں اپنی کمپنی میں جا بھی آفریکی بیس شہر بدلنا پڑتا گرتیں گا ازیادہ کمالیتا، اور اس نے کیا کیا۔ جس منیجہ سے اسے ملوایا، اسی کی بیٹی کو پھانس لیا۔“ وہ گویا بھی تک در طبعہ حرمت میں تھی۔

ٹکیوں سے تیک لگائے نیم دراز زمر بس چپ سی اسے دیکھئے گئے۔

”تم کہو تو میں اس منیجہ کو کبھی فائز کیے دیتی ہوں۔ اس کو معلوم تھا کہ حماد کی شادی ہونے والی ہے، پھر بھی اس نے اپنی بیٹی کے آگے

بھیڑاں دیے دنیا کتنی خود غرض ہے!۔“ جواہرات نے جھر جھری لی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حماد نے درست فیصلہ کیا۔ اسے بھی کرنا چاہیے تھا۔“ وہ دیران آنکھوں سے کھڑکی کو دیکھنے لگی۔

”مگر تم کیسے اس زیادتی پر خاموش رہ سکتی ہو۔ وہ تمہارا ملکیت ہے، تمہیں اسٹینڈ لینا چاہیے۔“

”اس نے کچھ غلط نہیں کیا امسز کاردار۔ میں جانتی ہوں، میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی، میری بھی کوئی فیملی نہیں ہو سکے گی۔ ایسے میں

اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو بھی کرتا۔“

کرسی پہنچی جواہرات کے چہرے پر ہمدردی ابھری، ول میں درسا جا گا۔ ”آئی ایم ریلی سوری، ہر اس چیز کے لئے جو تمہارے ساتھ کی گئی۔“ ہاتھ بڑھا کر اس کے پیرو کوڑا سادا بیا۔ ”بس تم کسی کو بد دعا نہ دینا۔ کرنے والے کو کسی بات نے مجبور کر دیا ہوگا، ورنہ اندا ظلم کوئی ہنی خوشی نہیں کر سکتا۔“

زمر نے آنکھیں اٹھا کر تکان سے اسے دیکھا۔ ”بھی تو سمجھنے سے قاصر ہوں، اتنے دن سے یہی تو سوچ رہی ہوں کہ فارس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ نہ کوئی دشمنی تھی نہ پرانا بغض۔ میں تو اس کی تیچر تھی، میرے کتنے کام کر کے دیتا تھا۔ پھر ایک دم وہ کیسے بدل گیا؟“

جواہرات کی آنکھوں میں چھائی ہمدردی غالب ہوئی، اس کی جگہ بچینی نے لے لی۔ اس کے پاؤں سے ہاتھ ہٹالیا۔

”ہو سکتا ہے کوئی پرانا عناد ہو۔ کوئی رشتہ وغیرہ کا چکر۔“ وہ احتیاط سے لفظ لفظ ادا کر رہی تھی۔ زمر کی حمایت کی قیمت پر نہیں

کھوئی تھی۔

”ایسا کچھ بھی نہیں تھا، کبھی بھی نہیں۔“ وہ ناگواری سے ترخ کر بولی۔ ”وہ میرا سٹوڈنٹ تھا، بس!“ جواہرات جلدی سے مکرائی۔

”میں تو محض ایک خیال کا اظہار کر رہی تھی، عموماً قتل تین باتوں پر ہوتے ہیں۔ زن، زمزہ میں۔ یعنی، عشق، دولت، یا اپنی طاقت،“

غور... لیکن ہو سکتا ہے کہ وجہ وہی ہو جوہ کہہ رہا تھا۔ اپنے پہلے قتل کو چھپانا۔“

”نہیں۔“ وہ لب دانت سے کچلتی نفی میں گردن ہلانے لگی۔ ”صرف یہ بات نہیں تھی۔ اس روز وہ فارس لگ ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے ہمیں ایسے مجھ سے بات نہیں کی۔ پھر ایک دم سے... میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟“ وہ پلکیں سکیڑ کر کھڑکی کو دیکھتی سوچ گئی۔ پھر آنکھوں میں ۱ یہاں بھری۔ ”کیا معلوم واقعی وہ فارس نہ ہو کسی نے فارس بن کر مجھ سے بات کی ہو۔ شاید میں ہی...“

جو اہرات نے بے چینی سے پہلو بدل۔ ”اور اس کے فنگر پر نہیں؟ وارث کے ڈی این اے والی رسی کا اس کی کار سے ملتا؟ اس کی گن؟ ہوٹل میں اس کے نام کا کرہ۔ اس سب کیوضاحت کیسے کرو گی؟ اوہ شاید تم اپنے والد اور بھا بھی کی باتوں کا اثر لے کر کمزور پڑ رہی ۲۔ میں سمجھ سکتی ہوں، اپنوں کے لئے انسان کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔“ سمجھنے والے انداز میں جواہرات نے سر کو خم دیا۔

”میں نہ کمزور ہوں، اور نہ کسی کا اثر لے رہی ہوں۔“ وہ ناگواری سے تمیزی سے بولی۔ ”میں صرف ان کے مفروضے کو دھرا رہی ۳۔ وہ فارس ہی تھا، اس نے مجھے شوٹ کیا، میں آج بھی اپنے بیان پر قائم ہوں۔“ شانے اچکا کروہ خنگی سے رخ موڑ گئی۔

جو اہرات کے بیوی پر مسکرا ہٹا بھری، ستائش سے اسے دیکھا۔

”گذہ، تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ تمہیں خاندان والوں کا دباؤ نہیں لینا۔ تمہیں فارس سے اپنا انتقام لینا ہے۔“

”میں پر اسکیوں مڑ ہوں، انصاف پر یقین رکھتی ہوں، انتقام پر نہیں۔ کم از کم تک تک نہیں، جب تک انصاف کی امید باقی رہے۔ میں ۴۔ لے بیان دینا تھا دے دیا، اب اور کچھ نہیں کرنا مجھے۔“

جو اہرات کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”تم... تم کو کورٹ میں پر اسکیوں نہیں کرو گی کیا؟“

”نہیں۔ ایک دوسرے پر اسکیوں مڑ اس کیس کو plead کریں گے۔“

”مگر تمہیں فارس کو اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے تمہاری شادی...“

”میں اپنی مریضی کی مالک ہوں مسز کاردار۔ جیسے خاندان کا دباؤ نہیں لیا، ویسے ہی آپ کا بھی نہیں لوں گی۔ آپ چاہتی ہیں، میں لارس کو سزا دلواؤں کیونکہ اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے، میں جانتی ہوں آپ لوگوں کے جائیداد کے مسئلے ہیں۔ وشن کا دشمن دوست ہوتا ہے، سو ام اب دوست ہیں۔“ وہ کافی سنجیدگی سے جواہرات کو دیکھ کر کہہ رہی تھی، جو آگے سے پھیکا سامسکرا دی۔

”اور میں آپ کی جگہ ہوتی تو یہی کرتی۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ مجھے کیوں بار بار اس کے خلاف کارروائی پا کسارتی ہیں۔ مگر میرا اپ خاندان ہے۔ اور وہ شخص سعدی کا ماموں ہے۔ میں نے بیان دینا تھا دے دیا۔ اب آگے عدالت جانے اور پولیس۔ فارس کا مجھ سے کوئی الی جھکڑا نہیں تھا، اس نے یہ کسی اور وجہ سے کیا، مکنہ طور پر وہی جو اس نے بتائی تھی، اس لئے میں ذاتی طور پر اس کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔“

جو اہرات بمشکل مسکرا پائی۔ ”میں سمجھ سکتی ہوں۔ بہت سی چیزوں میں ہم ایک جیسے ہیں زمر۔ خیر تم نے درست فیصلہ کیا۔ اگر تم اس کے خلاف مجاز کھوں لیتیں، تو ندرت یا اس کے بچتے تمہاری شکل دیکھنے سے بھی رہ جاتے۔ مگر میں امید کرتی ہوں، کہ تم اس کیس کو خود لینے سے ام تم اس وجہ سے نہیں بر تر رہی کہ تم دور اندر کہیں اس کو بے گناہ سمجھتی ہو۔“

زمر لمحے بھر کو بالکل چپ سی ہو کر جواہرات کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیا تم اندر سے اپنے ہی بیان پر خود مغلکوں ہو چکی ہو، مگر چونکہ خود کو غلط مانے میں تمہاری ناک آڑے آتی ہے، سو تم اس پر ڈالی ہو؟“

”ایسا نہیں ہے۔“ وہ اب کے کافی مضبوطی سے بولی۔ ”کبھی کبھی مجھے متفاہ خیالات آتے ہیں، مگر میرا یقین ان کے مقابله میں الہاہ بچتے ہے۔ وہ فارس ہی تھا، کوئی بھی چیز مجھے اس بیان سے نہیں ہٹا سکتی۔ اپنی ناک آڑے آتی ہے مجھے، مگر بے انصافی کی حد تک نہیں۔ اگر مجھے

لگتا وہ بے گناہ ہے تو میں خاموش رہتی۔ وہ میرا استوڈٹ تھا۔ شاید اگر میرے ابا کو فالج نہ ہوا ہوتا تو بھی میں خاموش رہ جاتی، مگر اب نہیں۔“  
جو اہرات گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی، مسکرا کر اس کے شانے پر ایک ہاتھ رکھا، دوسرے سے اپنا بیگ اٹھایا۔“ دشمن کا دشمن  
دوست ہوتا ہے، سو تم مجھے ہمیشہ اپنا دوست پاؤ گی۔“

زمر نے سرا ثابت میں ہلا�ا۔ جواہرات بیگ کندھے پر لٹکاتی باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہوا تو زمر کے تاثرات بد لے۔ سپاٹ چہرے  
پر بے پناہ کرب المآیا۔

اس نے مٹھی ہونتوں پر رکھی، آنکھیں بند کر کے ضبط کرنا چاہا، مگر آنسو امداد آرہے تھے۔ وہ خبر جس پر وہ سارا وقت ضبط کر کے ہیٹھی  
رہی تھی، وہ پھر سے طمانچے کی طرح آن گئی تھی۔

حماد کی شادی ہو رہی تھی، حماد کبیس اور شادی کر رہا تھا۔ یہ سہنا اتنا آسان نہیں تھا، جتنا اس نے ابھی جواہرات کے سامنے ظاہر کیا  
تھا۔ گردن جھکائے، ہاتھ ہونتوں پر دبایا کر کر کے وہ مسلسل بند آنکھوں سے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تبھی دروازہ بجا۔ زمر نے تیزی سے  
چہرہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا، اور انگلی سے آنکھوں کے گیلے کنارے جلدی خشک کرنے لگی۔ ذرا کھکار کر رہنگی آواز کا گیلا پن دبایا چاہا اور  
بولی۔“ آ جائیے۔“

دروازہ کھلنے کی آواز آئی، حین میں بڑے ابا کی وہیل چیز اندر لا رہی تھی۔ زمر خ موڑے سائیڈ نیبل پر کچھ تلاش نہیں کی، ساتھ بارہ  
پلکیں جھپک کر ان کا گلابی پن دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

“کیا تم سر جری کے لئے تیار ہو؟“ پشت سے ابا کی آواز آئی۔ وہ ”بھی“ کہتی سنجیدگی سے سیدھی ہوئی۔ آنکھیں اب ہلکی گلابی تھیں۔  
حین میں خاموشی سے بڑے ابا کی کری کے عقب میں کھڑی رہی۔

“تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ انہوں نے تم آنکھوں سے مسکرا کر اسے تملی دینا چاہی۔ وہ پھیکا سامسکرائی۔“ مجھے پتہ ہے۔“ پھر قدرے  
بے چینی سے بند دروازے کو دیکھا۔“ سعدی کہاں ہے؟ اسے بھی بلا لیں۔“

بڑے ابا کی مسکرا ہٹ سکتی۔ اس کی ذرا ذرا گلی آنکھوں کو غور سے دیکھا، اور پھر ان سے چھلکتے بے تابی کو۔ لب کھولے، مگر بند کر  
دیے۔

(وہ آجائے تو میں اس کے سامنے حین کو بتا دوں گی کہ میں تمہارے ماں و ماموں کے خلاف کیس نہیں لڑوں گی، نہ اس کے کیس کو فالا  
کروں گی۔)

”بھائی انگلینڈ چلا گیا تھا۔ ان کا نیسٹ تھا ایک، پھپھوا!“ سنجیدگی سے حین نے بتایا۔

زمر اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ بالکل یہ نک سانس روکے۔

“سعدی..... چلا گیا؟“ لفظ لوث لوث کر نکلے۔ حلق میں کچھا نکلنے لگا۔

”ہم تو یہ نہ بیٹا! اس کی مجبوری تھی۔“

مگر وہ ہنوز ششدتری حین کو پکھ رہی تھی۔

”کیا اسے میرے آپریشن کا پتہ تھا؟“

(بھائی سے زیادہ کے پتہ ہو گا؟) اس نے اثبات میں سر بلادیا۔

زمر کے لب بھٹخ گئے۔ اب وہ کٹھے کیے وہ خٹگی سے دوسرا جانب دیکھنے لگی۔

”ندت بھی آنے والی ہے، ہم سب تمہارے ساتھ ہوں گے سر جری کے دوران۔ سعدی بھی کاں کرتا رہے گا۔“

(کال کرنا پراہ کرنے کے مترادف نہیں ہوتا، اب)۔ مگر وہ لب ہے، دوسری جانب دیکھتی رہی۔ خشن ناگواری سے پلٹ گئی۔ اس کا الہٹ سے اچاٹ ہو رہا تھا۔

وہ باہر آئی تو سعدی منتظر کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ دونوں کی پشت دیوار سے لگی تھی، اور نظریں اتنے قصیر۔

”کیا آپ ایک دفعہ ان کو خدا حافظ کہنے بھی نہیں جاسکتے تھے؟“

”میں نے ان سے بہت بد تمیزی کی تھی، اب نہیں سامنے جاؤں گا۔ وہ میری شکل دیکھ کر دل کی بات جان لیں گی۔“

”تو پھر زبان کی بات کا یقین کیوں نہیں کرتی؟“ پھر ذرا انری سے بولی۔

”صرف مل ہی لیں۔“ سعدی نے سر کو داکیں باکیں ہلا�ا۔

”اوہوں... مجھے ذر ہے، ان کے سامنے جا کر میں رو نے لگ جاؤں گا۔“

گویا خنین کا دل کسی نے دبادیا ہو۔ اس نے بے اختیار مرکر سعدی کا چھرہ دیکھا۔ وہ اداسی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ جیز پر آدھے

اٹیں کی میر دن شرث، چھوٹے کئے پال جو سامنے سے سیدھے اور سر کی پشت سے گھنگھریا لے تھے۔ چھرے پر چھایا ایک معصوم ساتاڑ۔

”آپ انگلینڈ جانے کے بعد پہلی دفعہ آئے گھر تو ہم سب نے کہا کہ آپ بدل گئے ہیں، پہلے سے زیادہ اسماڑ اور عقلمند۔ مگر....

آپ تو آج بھی دیے ہی ہیں۔“ سعدی نے نظریں پھیر کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

”معصوم!“ وہ اداسی سے مسکرائی تو وہ بھی مسکرا دیا۔

”معصوم! کیا یہ میرا دوسرا نام ہے؟“

”پہلا کیا تھا؟“

”ہمارا سعدی!“ اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ اداس سے ماحول میں زندگی کی کوئی تال کسی نے چھیڑی تھی۔

”علمیشا کا کچھ پتہ چلا؟“ اس سوال پر خنین کی فہری تھی۔ سرفی میں ہلا�ا۔

”میں نے اس کی ساری میلروں اور سیخ بغير پڑھے مٹا دیے۔ ہر جگہ سے اسے بلاک کر دیا۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ میں دوبارہ

اس سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”تم نے صحیح کیا۔“

”اور آپ نے دیکھا، کس طرح وہ اپنا بیان بدل کر چل گئی۔ اس نے میرا غصہ ماموں پر اتنا ردیا۔ شاید میں اس کی کال اٹھائیتی، اگر

مجھے یہ نہ پتہ چلتا کہ اس نے اپنی گواہی بدل دی ہے۔ اپنے باپ سے مسئلہ تھا تو ان تک ہی رکھتی۔ مجھے کیوں درمیان میں لا لی۔“ وہ خخت رنجیدہ لگ رہی تھی۔

”چلو اب تم دوبارہ ہاشم بھائی سے اس بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ ان کا اس سے خون کا رشتہ ہے، وہ لوگ ایک دن پھر اکٹھے ہو

جائیں گے، ہم درمیان میں کیوں آئیں۔“ وہ زمزی سے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ خنین بے دلی سے سرہاتی رہی۔

”اس نے کہا تھا، جیوئیاں انتقام لینے پر آئیں تو انہیں کوئی نہیں ہر اسکتا، مگر پھر وہ کیوں ہار گئی، بھائی؟ اس کو بغیر پیسے دیے ہاشم

بھائی نے کھینچ تو دیانا واپس!“ بس ایک بھی الحصہ تھی جو سے ستارہ ہی تھی۔

سعدی کچھ دیر کو بالکل خاموش ہو کر سوچتا رہا۔ خنین منتظر تھی۔

”کیا تم سارا وقت ڈرامے دیکھتی رہتی ہو؟ یا قرآن بھی پڑھتی ہو؟ مجھے انگلینڈ جانے سے پہلے، ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔“

”کیا بھائی پڑھتی ہوں نا۔“ ایک دم بہت سستی سے کہتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”اور کیا تمہیں وہ سورتیں یاد ہیں جو ہم نے حفظ کی تھیں؟“

حنین نے انگلی سے کان کے پیچے بال کھجائے۔

”جی... یاد ہیں میں ذرا سادہ را کرنا سکتی ہوں۔“ (کہیں وہ ابھی کے ابھی سن ہی نہ لے۔)

”بہت اچھا۔“ انگلی سے اس کو دیکھا، وہ ایک دم بہت معمومیت سے سر جھکائے اپنی عینک اتار کر شیشے سے کچھ صاف کرنے لگی تھی۔

”بہر حال، ہم نے ایک سورۃ حفظ کی تھی، سورۃ نمل، یاد ہے؟“

”جی، بالکل۔“ عینک صاف کر کے آنکھوں پہ لگاتے ہوئے اس نے ذہن پر زور دالا چاہا کہ پہلی آیت کہاں سے شروع ہوتی تھی؟ اُف.... یاد کیوں نہیں آرہا۔

”اور نمل کا مطلب کیا تھا؟“

حنین ایک دم کھل کر مسکرا دی۔ شکر بھائی نے سورۃ نہیں سنی تھی، یہ سوال تو بہت آسان تھا۔ ہسپتال کا کاریئور ایک دم خوشگوار لگنے لگا۔

”نمل یعنی چیونٹی!“ بہت اعتماد سے مسکرا کر بتایا۔

سعدی نے پہلے تجب اور پھر انگلی سے اسے دیکھا۔ ”یعنی کتم نے عرصے سے قرآن نہیں کھولا۔“

حنین ہنکا بکارہ گئی۔ ”مگر میں نے صحیح بتایا ہے۔“

”غلط بتایا ہے۔ نمل کا مطلب چیونٹی نہیں ہوتا۔“

”تو پھر کیا ہوتا ہے؟“

”چیونٹی کو ”نمملہ“ کہتے ہیں۔ نمل کا مطلب ہوتا ہے ”چیونٹیاں۔“

حنین کے تینے اعصاب ڈھیلے پڑے، نزوٹھے پن سے بھائی کو دیکھا۔ ”وہی نا، ایک ہی بات ہوئی۔“

”اگر ایک بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس سورۃ کا نام نملۃ رکھ دیتا۔ مگر نہیں.... چیونٹی اور چیونٹیوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دیکھو، باقی

جنہی سورتیں ہیں، حشرات الارض کے نام کی، وہ واحد ہیں۔ المثلوثت یعنی ایک لکڑی۔ نمل یعنی ایک شہد کی لمبھی۔ لیکن چیونٹیوں کی سورۃ

”جع“ کے صینے میں ہے۔ پتہ ہے کیوں؟ اس نے ابھی ابھی کی سوچی گئی بات بہت ایکسا مندرجہ ہو کر کی۔

وہ بہت دھیان سے سن رہی تھی، بے تابی سے بولی۔

”کیوں؟“

”کیونکہ اکیلی چیونٹی ہوتی ہی نہیں ہے۔ کبھی دیکھی ہے اکیلی چیونٹی؟ اونہوں۔ چیونٹیاں بیشہ اپنی قطار میں اپنے خاندان کے

ساتھ ہوتی ہیں۔ اکیلی ہار جاتی ہے، پیر تنے مسلی جاتی ہے۔ اور جو اکٹھی ہوتی ہیں، وہ کبھی نہیں ہارتیں۔ علیشا اکیلی تھی، اور تم نے بھی اس کی مدد

نہیں کی، تو وہ کیسے جیت سکتی تھی۔“

وہ خاموش ہوا تو حنین بالکل چپ سی ہو گئی۔

”اگر وہ مجھ پہ پہلے بھروسہ کرتی تو میں اس کی مدد کرتی۔ مگر اب میں اس سے لائق رہنا چاہتی ہوں۔“

”تمہیں ایسے ہی کرنا چاہیے۔“

دونوں پھر سے خاموش ہو گئے۔

”مگر وہ میری بیست فریضتی، اب وہ نہیں ہے پچھونے بھی مجھے اکیلا کر دیا۔“

”چلو! میں بھی تو ہوں ناتھما را بیست فریضت۔“ وہ نرمی سے مسکرا یا تو خین بھی مسکرا دی اور ذرا سی بھائی کے قریب کھٹک آئی۔ کندھے سے کندھا مالا، حدوں کی چھوٹی انگلی سے اس کی چھوٹی انگلی تک راتی۔ ایک تحفظ کا احساس کوئی نہیں ہو گا۔ تب بھی بھائی ہو گا۔ مرتبے دم تک۔ آخری سانس تک۔ بھائی ساتھ رہے گا۔

اب پھر سے راہداری میں سے لوگ گزرتے جا رہے تھے اور وہ دونوں دیوار سے نیک لگائے، خاموش کھڑے تھے۔

❖❖❖

اتار لیتے ہیں دنیا کو یوں تو شیشے میں..... اکیلے ہوں تو آئینے سے ڈرتے ہیں جواہرات کا رہا میں پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھی تو ہاشم ساتھ بر اجمان اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے موبائل تھامایا اور ڈرائیور کے آنے کا انتظار کیا مگر جب وہ باہر کھڑا رہا تو وہ ہاشم کو دیکھے بنے تاثر سا بولی۔

”اس کو چلنے کا کہو ہاشم!“

”می... آئی ایم سوری!“ اس نے جواہرات کے گھٹنے پر رکھے، انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ فکر مند نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

”میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے آنکھوں پر سیاہ گلائز لگا رہی تھی۔ ”ہم بہت دفعہ یہ بات کر چکے ہیں مگر تم آج بھی اپنے باپ کے گناہ مجھ سے چھپانے کی کوشش کرتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ مجھے اس کی بیٹی کے بارے میں سب علم ہے۔“

”می... آئی ایم سوری!“ اس کا دیاں ہاتھ ہنوز جواہرات کے گھٹنے ہاتھ پر تھا۔

”اور اس بڑی کی اتنی ہمت ہو گئی کہ وہ میرے شہر میرے گھر پہنچ جائے مگر تم نے مجھے خبردار نہ کیا۔ میں کیا کر لیتی؟ تماشا یا واڈیا؟ کیا پہلے کبھی کیا؟ ہونہہ۔“ تلخی سے اس نے سر جھکا۔ ”تمہارے باپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں اس کی بیٹی کے بارے میں جانتی ہوں۔“

”می... آئی ایم سوری!“ وہ مسلسل نگاہیں اس پر جمائے نرمی سے کہر رہا تھا۔

”مجھے ہاشم اس بڑی کیا اس کے کسی مسئلے سے فرق نہیں پڑتا، میں عمر کے اس حصے نکل چکی ہوں جب فرق پڑا کرتا ہے۔ مجھے کوئی پروا نہیں اگر وہ تمہارے باپ کے کار و بار یا عزت کے لئے خطرہ نہیں ہے۔۔۔ اگر ہوئی بھی تو تم سنبھال لو گے۔۔۔“

”می... آئی ایم سوری!“ وہ زیادہ نرمی اور زیادہ آہستہ سے بولا۔

جوہرات نے ایک ہاتھ سے گلائز اور سر پر چڑھائے اور آنکھیں گھما کر اسے خنگی اور دکھ کے ملے جلتا تھا سے دیکھا۔

”تم نے مجھے کیوں بتایا؟ کہ وہ ادھر آتی ہے؟ مجھے بے خبر کیوں رکھا؟ شاید میں جانتی ہوں کیوں۔ تم مجھے ہرث نہیں کرنا چاہتے تھے۔“ کہتے ہوئے آنکھوں میں کرب کی سرخی ابھری۔

”می... آئی ایم سوری!“ اس نے ذرا سامنے کا ہاتھ دبایا۔ جواہرات نہ آنکھوں سے مسکرا دی، اور دیاں ہاتھ ہاشم کے اسی ہاتھ پر دکھ دیا۔ آنکھوں کی خنگی، نرمی میں ڈھل گئی۔

”اُس اور کے۔ میں تم سے کبھی خنا نہیں ہو سکتی۔“

وہ بھی مسکرا دیا، پھر پیچھے ہوا، ڈرائیور کو داپس آنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے واقعی اس بڑکی سے فرق نہیں پڑتا۔ اس وقت تو صرف یہی خیال دل کاتا ہے کہ ہم دونوں نے زمر کی زندگی بر باد کر دی۔“

”مجھے اس کا افسوس ہے، مجبوری نہ ہوتی تو میں ایسا کبھی نہ کرتا۔“ وہ چہرے پر ایک دم اٹھ کر آتی تکلیف کو ضبط سے چھپا کر سیل

فون نکالنے لگا۔

”مجھے ہر رات سونے سے پہلے زمر کا خیال آتا ہے۔ وہ اس سب کی مستحق نہیں تھی ہاشم!“

”خیراً گر آپ کبھی عدالت میں اس کے مقابلے پر ڈینس اٹارنی کے طور پر پیش ہوتیں تو اپنی اس رائے پر نظر ثانی ضرور کر لیتیں۔“ وہ

بظاہر بثاشت سے کہتا مسکرا دیا۔ ڈرائیور دروازہ کھول رہا تھا۔ جواہر اس نے گلاسز پھر سے آنکھوں پر گرائے اور پسکون سی ہو کر بیک لگا لی۔

اب ساری دنیا اپنی مرضی کے رنگ میں نظر آ رہی تھی۔

❖❖❖

ظللم پر سہی ہوئی، دکھ سے مگر دہکی ہوئی ..... ایسی آنکھوں ہی سے طوفان اٹھا کرتے ہیں

(دو ماہ بعد)

بڑے ابا کے لا ون خ کم ڈائینگ روم میں دو پھر کے کھانے کی خوشبو پہلی تھی۔ صداقت جو موجودہ دن سے چار سال قل کافی دلا پڑا

اور کم عمر سال گلتا تھا، تازہ روٹی لا کر بہت پاٹ میں رکھ رہا تھا۔ سربراہی کی جگہ بڑے ابا وہیل چیز پر برا جمان تھے اور گاہے بگاہے دائیں ہاتھ

پہلی کرسی پر سرجھکا کر لقے توڑتی زمر کو دیکھتے تھے۔ کچھ کہنے کے لئے لب کھولتے پھر خاموش ہو جاتے۔ اس کے آپریشن کو دو ماہ بیت چکے تھے اور اس کی رنگت تب سے اتنی ہی زرد رہتی تھی۔

دفعہ نیز پر رکھا زمر کا موبائل تھر تھریا۔ اس نے آہستہ سے سراہما کر اسے دیکھا۔ ”سعدی انگلینڈ موبائل کا لگا،“ لکھا آ رہا

تھا۔ بڑے ابا نے اسکرین نہیں پڑھی، اس کا چہرہ پڑھا، اور کال آئی ڈی جان لی۔

وہ بے تاثر گاہوں سے موبائل کو دیکھتی رہی اور پھر دوبارہ لقے توڑنے لگی۔ ان کو بے چینی ہوئی۔

”فون نجگ رہا ہے۔“

”میں کھانا کھا رہی ہوں۔“ لقدمہ میں رکھ کر سرجھکا نے اگلا توڑ نے لگی۔ فون خاموش ہو گیا۔ ذرا سا وقفہ اور پھر بختے لگا۔ زمر نے پانی کا گھونٹ بھرا اور موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔ ”ہیلو؟“

”السلام علیکم زمر.....“ وہ رکا۔ منہ میں کچھ ہونے کے باعث آواز زر افرق لگی تھی۔ ”زمر بول رہی ہیں نا؟“

”جی زمر پھپھو بول رہی ہوں۔“ سنجیدگی سے کہتی فون کان سے لگائے وہ پانی گھونٹ گھونٹ پر رہی تھی۔ بھوری آنکھیں میز پر

رکھے گلداں پر جب تھیں۔ چہرہ زرد اور نقاب ہت زدہ لگتا تھا۔ بڑے ابا بس بے چینی سے اس کو دیکھے گئے۔

”اوہ او کے۔ کیسی ہیں آپ زمر؟“ وہ صح سویرے کی نیلے اندر ہیرے میں ڈوبی سڑک پر واک کرتے ہوئے موبائل کان سے لگائے

کافی لگا، اور اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟“

”میں .... بالکل ٹھیک۔ آپ کی درد کیسی ہے؟“ وہ سڑک کنارے ایک جگہ کھڑا ہو گیا کمرپہ ہاتھ رکھ کر کچھ محسوس کرنا چاہا۔

”ورنہیں ہے، یا پھر اب احساس نہیں ہوتا۔“ وہ گلاس رکھ کر روٹی کا نوالہ توڑ نے لگی۔

”نہیں، اتنی جلدی تو در ختم نہیں ہوتا۔“ وہ بے اختیار بول اٹھا۔ ”ابھی تو کچھ وقت مزید لگے گا ناخشم بھرنے میں۔ بہت سے کام

اپنے ڈین رکھتی ہوں گی۔“ سامنے تیز تیز بھاگ کر جا گنج کرتے ایک لڑکے کو دیکھ کر وہ بے خود سا بولا۔  
” ہوں۔“

” اور.... آپ.... کیسی ہیں؟“ اس کے سرخٹک رویے پوہلے بس اتنا پوچھ سکا۔  
” پہلے جیسی ہوں۔ ابھی کھانا کھا رہی تھی۔“

” اوہ ہاں، آپ کی تو دوپہر ہو گی۔ بڑے ابا جلدی کھانا کھا لیتے ہیں نا۔“ وہ خفیف ساہنسا۔ زمر خاموشی سے نوالہ منہ میں رکھ رہی  
میں مدی چپ ہو گیا۔ پھر دوبارہ کوشش کی۔

” میں... آج مال جارہا تھا دوست کے ساتھ۔ کچھ چاہیے آپ کو؟“  
” صرف سکون۔ اور وہ ادھر سے نہیں ملتا۔“

وہ پھر چپ ہو گیا، مر جھا گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ” چلیں آپ کھانا کھائیں میں میں فون رکھتا ہوں، زمر...“ قدرے و قلنے سے اضافہ کیا  
” ام پھپو!“ تب احساں ہوا کہ بات کے آغاز میں اس نے کیوں یاد کرایا تھا۔ اکیس سال ” زمر“ تھی، اب وہ پھپو بن گئی تھی۔ کہتے ہے نون  
ہے، ایسا۔ زمر نے بھی موبائل میز پر رکھ دیا۔

” اس سے کیوں ناراض ہو؟“ وہ غور سے اسے دیکھنے لگے۔

” میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ وہ میرا بچہ ہے، بچوں سے کون مقابلہ کرتا ہے؟“  
” پھر اس کو یہ کیوں کہا کہ زمر ” پھپو“ بول رہی ہوں؟“

” اوکے آپ ہمارا کھانا خراب کرنا چاہتے ہیں تو ایسے ہی کہی۔“ پلیٹ پر ہٹائی، اور سراخا کر سنجیدگی سے ان کو دیکھا۔ ” وہ اس  
اٹکا ہاں تھا جب میں پیما رہی؟ میرا آپ پریش تھا اپا۔ حاد نے ملکنی تو زدی تھی، ایک اچھی عورت مجھے گردہ تک دے سکتی ہے، مگر وہ سعدی جس کو  
ہیں نے انگلی پکڑ کر چلانا سکھایا تھا، وہ ایک دن بھی میرے لئے نہیں رک سکا۔ وہ میرے پاس کیوں نہیں تھا اس وقت جب مجھے اس کی ضرورت  
میں۔“

” یہ تب کیوں نہیں کہا جب اس نے فون کیا تھا؟“

اس نے گھری سانس لے کر سر جھٹکا۔ بولی کچھ نہیں۔

” تمہیں اصل غصہ اس بات پر ہے کہ سعدی نے تمہارے مقابلے میں فارس کا یقین کیا۔“ اور اس نام پر اس کی آنکھوں میں سرخی  
اگلی۔

” اگر آپ بھول گئے ہیں تو میں آپ کو یاد کروادوں کہ فارس کا نام میرے سامنے مت لیا کریں۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی، اس نے  
ہی زندگی بر باد کر دی، اور اب بھی وہ آپ سب کو معصوم لگتا ہے۔“ زور سے نیکھلیں پرے ہٹایا۔

” تو پھر تم اس کے خلاف کیس کو خود کیوں نہیں لیتی؟ اگر اتنا یقین ہے تمہیں اس کے مجرم ہونے کا؟“

” کیونکہ میں تکلیف میں ہوں اور میں اس تکلیف کو بڑھانا نہیں چاہتی۔ بیان دے دیا، گواہی بھی دوں گی، مگر آگے سر کار جانے اور  
لاس غازی۔“ تیلچی سے گویا سچھے دل سے کہتی اس نے آخر میں بہت دکھ سے اپا کو دیکھا۔ ” اور کیونکہ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ ندرت  
ہا، بھی کیوں آپ پریش کے دن سے آج تک مجھ سے ملنے نہیں آئیں۔ مجھے بار بار جھوٹا کھلوائے جانے کا شوق نہیں ہے۔“

موبائل اور پرس اٹھایا اور بڑا تی اٹھ کھڑی ہوئی۔

” بابا جی ساری عمر کہتے رہے کہ وہ نہیں رکھتا تعلق تو میں کیوں رکھوں، سوچ سوچ کر ایک دن ہم تمہاں ہو جائیں گے۔“

”میں تہا ہو جھی ہوں۔ تھینک یو اتا۔“ کاغذات سمیئے پس کندھے پر لٹکایا اور کرسی پیچھے دھکیلی۔ انہوں نے قدرے جرت سے اسے دیکھا۔

”اب کہاں جا رہی ہو؟“

”سعدی کی فیس جمع کروانی ہے۔“

اور وہ ایک دم لا جواب سے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

”مگر تم تو اس پر غصہ تھیں، زمر!“

”کیا مطلب؟ ہاں مجھے اس پر غصہ ہے، لیکن آپ نے کیا سمجھا تھا؟ میں اس کی فیس جمع کروانا چھوڑ دوں گی؟ اوہ اتا۔“ کراہ کر ناگواری سے ان کو دیکھا۔ وہ بچھے میں نہیں۔ اور چیزیں لئے باہر نکل گئی۔

بڑے ابا نے ایک نظر ادھورے کھانے پڑا۔ یہ اگلے چار سال تک کے اکثر ادھورے رہ جانے والے کھانوں کا آغاز تھا۔

کار میں بیٹھنے تک اس نے ایک دو مزید کا لائزنس جو آفس سے تھیں۔ اس کے بعد وہ ڈرائیور گ سیٹ پر بیٹھی اب کاشتے ہوئے پر سوچ نظر وہ سامنے دیکھتی رہی۔ چہرے پر اب جھن تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاشم کو کیسے میرے لیں میرے گواہ کی معلومات؟“ اچھبھے سے وہ بڑا۔ اپنے کچھ دریٹیشمی سوچتی رہی، پھر ایک دم چوکی۔ بے اختیار موبائل کو دیکھا۔ چہرے پر تجھ بھرا۔ پھر غصہ۔

ہاشم کا نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔ اب بختی سے بخیر کھے تھے۔

”ہیلو میڈم پر اسکیوٹر۔ مجھے کیسے یاد کیا اتنے دنوں بعد؟“ وہ ہمیشہ کی طرح خوشنگوار سا بولا تھا۔

”بہت مبارک ہو۔ آپ نے نہمان اکرم بنام افضل کا مھیاواری کر لیعنی میرے کیس کو خراب کر دیا، ہاشم!“

”اوکے؟ اور میں نے کیا کیا ہے؟“

”میری سرجری سے پہلے آپ نے مجھ سے میرافون لیا تھا، فارس کی کال ریکارڈز وغیرہ کے لئے، مگر درحقیقت آپ نے اس میں سے میرے گواہ کا نمبر اور پتہ نکالا، اسے ٹریس کیا، اس کا پیسے یا فیورز دے کر منہ بند کروایا اور گواہی بدلوادی۔ تھینک یو سوچ ہاشم!“ ضبط کرتے کرتے بھی آواز بلند ہو گئی۔

”آپ کو لگتا ہے کہ آپ اندر آپریشن میبل پر زندگی اور موت کی کشمش میں ہوں گی اور میں باہر آپ کے فون کا غلط استعمال کر رہا ہوں گا؟“

”آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے میرے فون سے اس کا نمبر نہیں لیا؟“

”نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے ڈاکمز کے باہر آجائے اور آپریشن کی کامیابی کی اطلاع ملنے کے بعد، آپ کا فون کھولا تھا۔“ وہ مزے سے بولا تھا۔

”آہ! آپ کی انسانی ہمدردی!“ تھک کر گھری سانس لی۔ اور جب آپ نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو میری بات پر یقین ہے تو مجھے لگا کہ آپ بدل گئے ہیں، مگر نہیں، آپ آج بھی دیے ہی ہیں۔“

”سو تو ہوں۔ سی یو ان کو رٹ۔ تب تک آپ کوئی نیا گواہ تیار کریں۔“ مخلوق طسا کہتے ہوئے اس نے کال بند کی اور زمر نے ”اف“ کر کے جھر جھری لی۔ ابھی فون رکھا ہی تھی کہ وہ دوبارہ نجاح اٹھا۔ نمبر دیکھ کر زمر کے ابروں میں گئے۔ ناگواری سے اس نے کال اٹھائی۔

”جی ایڈو کیسٹ محمود؟“

”میدم آپ سے ایک...“

میرا جواب نال میں ہے۔ اپنے کلائٹ فارس غازی سے کہیے کہ بار بار مجھ سے ملاقات کے لئے اصرار نہ کیا کرے۔“

”آپ صرف ایک دفعہ اس سے مل کر تسلی سے اس کی بات سن لیں۔ اس کا پوائنٹ آف دی بھی تو جانے کی کوشش کریں۔ ایک وکیل کی حیثیت سے آپ کو کیس کے دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالنی چاہیے۔“

”شاید آپ بھول رہے ہیں کہ میں اس کیس کی وکیل نہیں ہوں۔ نہ پر اسکی پورٹر نہ ڈینیڈر۔ میں اس کیس کی Victim ہوں اور وکٹم کے لئے کوئی دوسرا سائیڈ نہیں ہوتی۔“

”اوکے، لیکن ایک دفعہ اس کی بات سننے میں کیا حرج ہے؟“ وہ فرمی سے سمجھانے لگے۔ زمرنے بات کاٹ دی۔

”میں ضرور سنتی اگر وہ کہتا کہ کسی نے اس سے گن پوائنٹ پر کال کروائی ہے، تب میں اس کو بے گناہ بھی تصور کر لیتی، مگر جب وہ مرے سے ہر چیز سے انکاری ہے، جب وہ مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے، تو میں کیوں سنوں؟“

”مگر ایک وکیل کی حیثیت سے۔۔۔“

”کیا وکیل وکیل کی رٹ لگا رہے ہیں آپ؟ جب ایک وکیل کی حیثیت سے اس کی منت کی تھی کہ اس کا کیس لڑوں گی اور وہ مجھے نہ مارے، تب اس نے سئی تھی میری بات؟ آئینہ مجھے فون مت کیجے گا۔“

اور ٹھنک سے کال کاٹ دی۔

❖❖❖

نفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو ..... کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چکے جیل کے اس کمرے میں پچھی میز کے ایک طرف فارس تھا اور دوسری جانب خین اور ندرت۔ وہ خاموشی سے بیٹھا تھا۔ پہلے والا طفظہ، اکر، غصہ سب ندارد تھا اور وہ اس کے برکس کافی ڈھیلا لگ رہا تھا۔

”یہاں مت آیا کریں وہ بھی حد کو لے کر۔ کتنی دفعہ بتاؤں، یہ کوئی ماحول ہے آنے والا؟“ اس نے خنگی سے ندرت کو مخاطب کیا مگر انداز میں لکان تھی۔

”سعدی واپس جا چکا ہے۔ شوہر میرا مرچ کا ہے، دوسرا بھائی بھی قتل ہو چکا ہے، اور کیا کروں؟“ ندرت روہانی ہو گئیں۔

”امی آپ یہ میلود رامہ کافی دیر سے کر رہی ہیں، اب بس کر دیں۔“ وہ چڑکر بولی تو دونوں نے بے اختیار سے دیکھا۔

”اتنی دیر سے سن رہی ہوں میں یہ بتائیں۔ بس کر دیں آپ دونوں۔ اور امی کر لیں نا آپ نے جو بتائیں کرنی تھیں۔ اب باہر انتظار کریں۔ مجھے ما موم سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔۔۔“

”تمیز نام کی چیز میری اولاد کو چھوڑنے پر نہیں گزری، تم گھر پہنچو میں بتاتی ہوں۔“ آنکھ کا کنارہ صاف کرتیں، ندرت اس کو سخت سست نا کر چلی گئیں تو وہ اثر لئے بنا سجدیگی سے فارس کی طرف گھومنی۔ دو پسہ سر پہ لئے عینک لگائے وہ خفاظ آرہی تھی

”کیا آپ کی پھپھو سے بات ہوئی؟“

”نہیں۔ وہ ملنا نہیں چاہتیں۔“ وہ میزہ رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ خین اس کو دیکھتی رہی، یہاں تک کہ ایک پرانا منظر آنکھوں کے سامنے سے گزرا۔۔۔

چھوٹی خین۔۔۔ خفا اور خاموشی با غیچے کے کونے میں بیٹھی تھی، اور فارس اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

”اور پھر ایسی نے تمہیں ڈانتا؟“

”صرف ڈائٹا؟ وہ تب سے مجھے ڈائٹ رہی ہیں، جب سے میں نے گملہ توڑا ہے۔ میرا دل کر رہا ہے میں مر جاؤں۔“ (اس عمر میں اسے مر نے کی بڑی فینیشی ہوتی تھی۔)

”اور؟“

”اور کیا؟“

”اور کیا دل چاہ رہا ہے تمہارا؟“

”یہی کہ میں جنت میں چلی جاؤں، وہاں میرے پاس بڑا سا گھر ہو۔“

”اور؟“ وہ زمی سے پوچھتا جا رہا تھا اور وہ بتاتی جا رہی تھی۔۔۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس کی آواز پہ حض چوکی۔ وہ نکان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیوں نہیں کہتے جو کہنا چاہتے ہیں؟ کب تک اپنی فیلنگ اور سوچ کو اندر دبا کر رکھیں گیں؟ آپ کو پھر چھوپے غصہ ہے نا۔ تو کہہ دیں۔ جو بھی اندر ہے نکال دیں۔“

”ہاں مجھے غصہ ہے اس پر۔ اس نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا کہ.... کہ میں۔۔۔“ تلخی سے کہتے کہتے وہ رکا۔

”کہ میں؟“

”کہ میں کس تکلیف میں ہوں۔ جو مری ہے، وہ میری بیوی تھی اور مجھے وہ بہت پیاری تھی۔ مجاہے اس کے کہ وہ ہمارے ساتھ کھڑی ہوتی اور میری بیوی کے قاتلوں تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتی۔ وہ مجھ پر الزام لگا رہی ہے۔ ہونہہ۔“ مٹھیاں بھیجن کر کہتے اس نے سر جھکھلا۔

”اور؟“

”اور تمہیں پہتے ہے جیل کیسی ہوتی ہے؟ تاریک اور خالی۔“

”اور؟“ وہ سکون سے پوچھ گئی۔ فارس نے گھری سانس لی، اور پھر سے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔

”اور جب رات ہوتی ہے اور بیان بجھادی جاتی ہیں، میں تب بھی سلانوں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں، اس حصے میں جہاں روشنی کی کرن صبح سب سے پہلے گرتی ہو۔ اس اندر ہیرے میں سب سے زیادہ زر تاشہ یاد آتی ہے۔ اس کو اندر ہیرے سے ڈر لگتا تھا۔ وہ رات کو سوتے وقت بھی ڈرینگ روم اور میرس کی بیان جلا دیتی تھی۔“ کہتے ہوئے وہ رکا۔ اب اس کا سر جھکا تھا، اور کہیاں میز پر رکھی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیشانی مسلتا رہا۔ حنین بس اسے دیکھے گئی۔

”اور؟“ اس نے سر اٹھایا، تھکاوت سے چور آنکھوں سے باہمیں جانب دیوار کو دیکھنے لگا۔ کچھ یاد آیا، چہرے پر اداس سی مسکراہٹ ابھری۔ حنین نے عرصے بعد فارس کو مسکراتے دیکھا تھا۔

”وہ بہت پیاری تھی حض۔ جب شادی ہوئی، مجھے پسند نہیں تھی وہ۔ ایمپھور چکانہ اور بے وقوف لگتی تھی۔ مگر ایک دفعہ میں بیمار ہوا تو وہ فجر تک جا گی رہی۔ ہاں بُتی اس نے اس رات بجھادی۔ ساری بیان۔ کہیں میں ڈسٹرپ نہ ہوں۔ اس دن سے وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ حنین جب پولیس مجھ سے پوچھ گئے کرنے آ رہی تھی، تب بھی وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے یقین تھا میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

”اور؟“

”اور میں زمر سے مل کر اس سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ زر تاشہ کو وہاں کس نے بلا یا تھا؟ اور یہ کہ اس نے آخری باتیں کیا کہی تھیں؟ ریسٹورانٹ والے کہتے ہیں، وہ دونوں کافی دیر وہاں بیٹھی باتیں کرتی رہی تھیں۔ سی سی ٹی وی فوٹج میں صرف اس لئے نکلوانا چاہتا تھا کہ دیکھ

ملوں وہ ناراض تو نہیں لگ رہی تھی۔ میں کال پر اس سے ٹھیک سے بات نہیں کر سکتا تھا، مگر...“ اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔ ”مگر ہر وہ فونچ جو یہ سے لئے ضروری تھی وہ غائب ہے۔ ”

”نہ صرف ریسٹورانت کی فونچ بکھر دوارث ماموں کے قتل کی رات ہوئی اندری اور ایگزٹ کی فونچ بھی غائب ہیں۔ فائرنگ والے ان اتفاق سے اسی فلور کے کیمرے خراب تھے، کمرہ بھی آپ کے نام تھا، جو روپی پیشہ اس وقت ڈیک پتھی جب اس کرے کی چابی لی گئی وہ بھی غائب ہے۔ آپ کو بربی طرح پھنسایا گیا ہے ماموں اس سب میں۔“ وہ ہتھیلوں پر چہرہ گرانے ادا سی سے کھد رہی تھی۔

”مگر زمزمان تمام واقعات کو کیوں نہیں دیکھتیں؟ کیوں میری بات نہیں سنتیں؟ مجھے اس میں پھنسایا جا رہا ہے۔“

”وہ کہتی ہیں، ایک انتہی جس آفیسر کوون ٹریپ کر سکتا ہے؟“

”کیسے نہیں ٹریپ کر سکتا؟ یہ ہاشم کا سیکیورٹی آفیسر خاور یہ بھی پہلے ایک ایجنسی میں تھا، پھر کسی ناکرده جرم کی پاداش میں نکلا گیا۔

ہٹم نے اس کا کیس لڑا اور اس کو بربی کرو کر اپنے پاس لے آیا۔“

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ وہ کافی دیر سے بول رہا تھا، اس لئے اب تھک چکا تھا۔

”آپ کے ایجنسی کے دوست سینرزر... کوئی نہیں ہے جو ہماری مدد کر سکے؟“

”حنین یہ ایجنسیاں تب تک ساتھ دیتی ہیں جب تک آپ ان میں شامل ہیں۔ جب نکال دیے جاؤ تو سب ختم۔“

”مگر آپ کا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ کسی پر تو شک ہو گا آپ کو۔“

”دشمن تو بہت ہیں۔ کتنے کیسروں دیکھنے یاد بھی نہیں۔ مگر یہ میرے دشمن نے نہیں کیا۔ یہ دوارث کے قتل کو کور کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اور...“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ آنکھوں میں چھمٹنی ابھری۔

”اوڑ؟“ حنین نے بغور اس کو دیکھا۔

”مجھے ہاشم پر شک ہے۔“

”اوہ...“ حنہ گہری سانس لے کر پیچھے ہوئی۔ ”مجھے معلوم ہے جو آپ نے بھائی سے کہا اور ہاشم بھائی نے سن لیا، وغیرہ وغیرہ۔

ویسے آئیڈیا برائیں ہے۔ آپ کی جگہ یہاں ہاشم بھائی کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی۔ اس نے مسکرا کر آنکھیں بند کر کے جیسے مزہ لیا۔ ”مگر ابھی آپ نے کہا کہ یہ سب کرنے والا آپ کا نہیں دوارث ماموں کا دشمن ہے۔ تو ہاشم بھائی کی ان سے کیا دشمنی؟ اور ویسے وہ قاتل لگتے تو نہیں ہیں۔“

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہاشم نے قتل کروائے ہیں۔ مگر مجھے اس میں وہ پھنسا سکتا ہے۔ سب سے بڑی بات۔ میری کار میں جو بھی ڈالا گیا سوڑا الگیا، مگر جس صحیح میں اور تم علیشا کے پاس ہوئی گئے تھے، تب پیچھے سے میرے گھر کی پیسٹس سے میرے گن چراہی گئی۔ نہ کوئی لاک ٹوٹا، نہ دروازہ۔ اتنے گارڈ سیکیورٹی چیک پوائنٹس اور سی ای ڈی کیسروں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی کیسے میرے گھر میں داخل ہو سکتا ہے اگر ہاشم اس کی مدد نہ کرے تو؟“

”خیر جھوول تو ہر سیکیورٹی سسٹم میں ہوتے ہیں۔ جب لوگ پینا گون پہنچ سکتے ہیں، تو کار دارز کا قصر کیا چیز ہے؟“ حنین کو بات دل کو گئی ہوئی نہیں لگتی تھی۔

”اور ہاشم کی بہن؟ وہ کیوں چلی گئی؟“

” بتایا تو تھا، وہ میری وجہ سے گئی۔ میرے پر غصہ جو تھا، وہ ہی نکلا اس نے۔“

”اور اگر اس کو ہاشم نے ڈر ادھر کا کر بھیجا ہو تو؟“ حنین میں اس آدمی پر اعتبار نہیں کرتا۔ وہ صبح اٹھتے وقت آنکھ کھولنے سے پہلے جھوٹ

بُلاتا ہے۔ اب یہ مت کہنا وہ میرے لئے بہترین وکیل مقرر کر رہا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ بہت مخلص ہے۔ تمہیں پتہ ہے...” وہ بتاتے رکا۔

”کہہ دیں۔ میں سن رہی ہوں۔ میں ہمیشہ سنوں گی۔“ وہ ادای سے مسکرائی۔

فارس نے سرا اثبات میں ہالیا ایسا اور انگلیاں آپس میں مسلتے ہوئے کہناں گا۔ ”ہم چھوٹے تھے تو ما مون ہم سب کے لئے کھلو نے لائے۔ ہاشم کوٹواۓ پستول دیا، مجھے نواۓ رائفل۔ ہاشم میرے پاس آیا اور کہا، تمہاری رائفل تو بالکل اچھی نہیں، اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ڈیڈ کو یہ واپس کر کے اس سے بہتر لے لیتا۔ میں یہ سن کر فوراً گیا اور ما مون کو وہ واپس کر دی۔ ما مون کو میرے رو یے سے بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے ایک اور کھلو نا مجھے تھا دیا اور وہ رائفل کافی دکھ سے سامنے کر کے پوچھا، کیا کوئی یہ لے گا؟ ہاشم فوراً گیا اور بہت تابعداری سے وہ لے لی۔ بعد میں میں نے پوچھا کہ اگر خود لینے کا دل تھا تو مجھے وہ سب کیوں کہا؟ تو وہ بولا، میں نے تو صبح سے تم سے بات بھی نہیں کی۔ اور آگے بڑھ گیا۔ اس دن میں اپنے ما مون کے دل سے اتر گیا اور ہاشم میرے دل سے۔“

”مگر ہم یہاں اصلی گزni کی بات کر رہے ہیں ما مون۔ ہاشم بھائی برے ہوں گے، کرپٹ اور جھوٹے بھی، مگر ان کے پاس یہ سب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کوئی ایک بھی چیز آپ کے ما مون یا ان کے خاندان کو اس سب میں ملوث نہیں کرتی دھاندی دیتی۔ مجھے لگتا ہے اور نگزیب کاردار کے علی الاعلان آپ سے اظہارِ لائقی کے باعث آپ ان سے ناراضگی کی وجہ سے ایسا سوچ رہے ہیں۔“

”ہوں۔ شاید۔“ وہ پرسوچ نظر وہ سے دور دیوار کو دیکھتا نہیں قائل ہو گیا۔ یا پھر اب بھی مغلکوں تھا۔ اس کو خود نہیں معلوم تھا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ صدادینے والے نے صد الگائی تو وہ انٹھ کھڑی ہوئی۔ فارس نے نظریں انھا کر اسے دیکھا اور ستے چہرے کے ساتھ مسکرا دیا۔

”حینک یونہد۔ دوسری دفعہ میری بات سننے کے لئے۔“

(اور پہلی دفعہ کب تھا؟ حنہ کو یاد آیا۔ وارث ما مون کے قتل والی رات، ہوٹل میں جب اس نے ذکر کیا تھا۔ اس لوگ کا۔)

”میں ہمیشہ سنوں گی۔ چاہے پچھونہ بھی سنیں۔“ وہ رکی ذرا چکچکائی۔

”جب آپ ان سے ملناؤں پر غصہ نہ کرنا۔ وہ تکلیف سے گزری ہیں، اور شاید ایسی تکلیف سے گزرنے کے بعد میں بھی یہی کرتی۔“

”یہی مسئلہ ہے حنین۔ کہ صرف وہی تکلیف سے نہیں گزریں۔“

”اپنا خیال رکھیے گا۔“

”سنو۔“ وہ جارہی تھی جب فارس نے پکارا۔ وہ بے اختیار مری۔

”جی؟“

وہ چند لمحے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے بولا۔ ”میں یہاں سے نکلا چاہتا ہوں۔ کیا تم لوگ مجھے یہاں سے نکال لو گے؟“ اور بدقت یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں ڈھیروں بے نکی اور کرب در آیا تھا۔ حنین کو دھکا سارا گا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر.....

”کاش میں بخوبی ہوتی۔“ کہا اور باہر نکل آئی۔ فارس نے سر دنوں ہاتھوں میں گردادیا۔ وہ ایک سر نگ کے اندر کھڑا تھا جہاں دنوں طرف اندر ہیرا تھا۔ اور دنوں طرف کا منہ بند تھا۔

.....❖.....

زمر سے بات کر کے ہاشم نے موبائل جیب میں رکھا اور سامنے دیکھا۔ وہ اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا اور یہاں نشیب میں

۱۰۷۳۸، فاگھر نظر آتا تھا۔

۱۰۷۳۹، اس کا گھر نظر آتا تھا۔  
”اوسرے ہاتھ میں پکڑے گے کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ رینگ پہ جھک کر سوچتے ہوئے انیسی کو دیکھنے لگا،  
”تم پہلے سے زیادہ پر سکون نظر آ رہے ہو؟“ جواہرات عقب سے چلتی ہوئی آئی اور اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ ہاشم نے بدستور  
۱۰۷۴۰، ہستے ہوئے ذرا سے شانے اچکائے۔

”مجھ کوئی خوف نہیں ہے۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔“

”اور میرا خوف بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ سارا ڈرامہ اگر کھل گیا تو؟“

”کچھ نہیں ہو گا۔ صرف دلوگ ہمارے لئے خطرہ بن سکتے تھے۔ فارس اور زمر۔ اب دونوں مصروف ہیں۔ فارس کا دیکھ کیس کو  
۱۰۷۴۱، ہاتھے گا۔ پیشی پہ پیشی۔ کمزور دفاع۔ اور اگلے آٹھ دس سال تو فارس جیل سے نہیں نکلنے والا۔“ کہتے ہوئے رک کر، گھونٹ  
۱۰۷۴۲، ہواہرات مضطرب سی اس کو دیکھ جا رہی تھی۔

”رہی زمر۔ تو وہ اپنے علاج میں، مصروف رہے گی۔ ہو سکتا ہے جلد ہی اس کی شادی ہو جائے تو وہ منظر سے بالکل آٹھ ہو  
۱۰۷۴۳۔“

کافی ختم کر کے، گے پیچھے میز پہ دھرا، اور رینگ سے ٹیک لگا کر سینے پہ بازو لپیٹے ماں کو مسکرا کر دیکھا۔ ”اور زرتاب شہ کا خاندان تو وہ یہے  
۱۰۷۴۴، مارس کو بھرم گردانتا ہے۔ کوئی بھی میرے پیچھے نہیں آنے والا۔“  
تم سعدی کو بھول رہے ہو۔

”سعدی؟ وہ تو چھوٹا مخصوص سا بچہ ہے۔ اس نے فارس کو مجھ پہ چھوڑ دیا ہے، دو سال تک تو وہ پڑھائی کے لئے انگلینڈ رہے گا، پھر  
۱۰۷۴۵، اس ہاب کر گا، کیا پتہ فیملی کو بھی وہاں بلا لے۔ باہر جا کر کون والپس آتا ہے؟ اس کی کیا فکر کرنی؟“ لاپرواہی سے ابرداپ کا کروہ بولا تھا، جسے  
۱۰۷۴۶، اسات کے ان وہوں پہ تجب ہوا ہو۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ اس نے بھی امید کرنی چاہی۔ پھر دونوں ساتھ جا کھڑے ہوئے اور ویران انیسی کو دیکھنے لگے۔  
آن، چار سال بعد... وہ انیسی اتنی ویران نہیں تھی۔

اس کی پیسیست میں دیوار پہ لگی تصویریں اور تراشوں کے سامنے فارس کھڑا تھا، اور پیچھے کہیں سعدی بیٹھا چاہے پی رہا تھا۔  
تراشوں کے اوپر چلتی چار سال پر انی فلم ختم ہوئی تو فارس چونکا۔ پھر ہاتھ میں پکڑے کپ کو دیکھا۔ وہ ہنوز گرم تھا اور وہ اتنا پرانا سفر  
۱۰۷۴۷، والے والپس بھی آگیا تھا۔ ذہن کی رفتار روشنی کی رفتار سے کہیں زیادہ تھی۔

”کچھ کھلائیں گے یا میں جاؤں؟“ اپنا کپ خالی کر کے رکھتا سعدی اٹھا تو فارس چونک کر مڑا۔  
جیز، جو گزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس دراز قدڑا کا، چار سال قبل کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ، سخت مند، اور بڑا بلگ رہا تھا۔ قول قول  
۱۰۷۴۸، لئے والا، مگر اچھا بولنے والا۔

”مرضی تمہاری۔“ ایک گھونٹ بھر کر اس نے میٹھی چائے رکھ دی۔ پھر کچھ سوچ کر موبائل اور والٹ اٹھایا۔ ”چلو ساتھ چلتے ہیں، آپا  
۱۰۷۴۹، وہ چار دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”جی بگر گھر میں پہلے دن جیسی خاطر نہیں ہو گی۔ بھندی بنا رہی تھیں امی۔ اب آپ دو ہفتے پرانے ہو چکے ہیں۔“ سونف میٹھی میں بھر  
۱۰۷۵۰، پہنچتے ہوئے وہ محظوظ سا کہتا سیر ہیوں کی طرف چلا گیا۔ فارس تبرہ کیے بغیر پیچھے آیا۔  
جب کار والپس روشن پہ چلاتے ہوئے وہ کاردار قصر کے قریب ہونے لگا تو سعدی نے دیکھا۔

ہاشم اور سونیا اپنے کئے سمیت ابھی تک لان میں کھڑے تھے۔ اب گیم کی نویعت بدل گئی تھی۔

”میں ایک منٹ ہاشم بھائی سے بات کر کے آتا ہوں!“ وہ کار سائیڈ پر وک کر باہر نکلا تو فارس نے بے زاری سے پیچھے سے پکارا، ”جلدی آنا“

اسے آتا دیکھ کر ہاشم نے سونیا سے کچھ کہا، وہ سر ہلا کر ایک طرف کو چل گئی۔ سعدی قدم قدم چلتا قریب آیا۔

”ہیلو سعدی!“ ہاشم نے سرکار اسے دیکھا۔ دونوں میں سے کسی نے مصالحت کے لیے ہاتھ بیٹھا ہوا۔

”بن ایک بات کہنی تھی۔ ہاشم بھائی۔“ وہ سنجیدگی سے اس کو دیکھتا کہنے لگا۔ ”شہرین چاہتی ہے کہ میں آپ سے بات کروں، اس لیے کر رہا ہوں۔ آپ سونیا کو اس کے ساتھ جانے دیں۔ انہوں نے اپنی فلاہیت بھی آگے کروالی ہے۔“

”اوکے، میں اسے جانے دوں گا، ایک شرط پر۔“

سعدی کے ابر و تجرب سے اٹھ گیا۔

”اور وہ کیا ہے؟“

”جوم نے مجھ سے چایا تھا، وہ واپس کر دو، اور میں سونی کو شہرین کے ساتھ جانے دوں گا۔ ڈیل؟“ بیج سے دایاں ہاتھ کھال کر ہاشم نے اس کی طرف بڑھا ہوا۔ سعدی نے اس کی سر مسکراہٹ کو دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ کو۔ فیصلہ کرنے کے لیے بس چند سینٹ تھے۔



ہا ب: 8

## میں غارت گر

تم ملوگے بہت سے زبردست لوگوں سے .....  
 بیانگ ناقابل برداشت لوگ،  
 جوز و روشنور سے تمہاری زندگی میں  
 اپنا حق جاتے ہوئے داخل ہو جاتے ہیں۔  
 یہ ہے نشانی ایک غارت گر کی ....  
 غارت گر شکار کرتے ہیں نرمی، سکون، امن،  
 خوش خلقی، اور ہراس ثابت چیز کا،  
 جوان کو سوٹنے پر کمزوری لگے۔  
 ہر خوش باش، پر سکون شے کو وہ  
 غلطی سے کمزوری سمجھ لیتے ہیں۔  
 تمہارا کام ان کو بدلا نہیں۔  
 تمہارا کام ان کو دکھانا ہے کہ  
 تمہاری نرمی اور امن پسندی کمزوری نہیں ہے۔  
 میں ہمیشہ نازک اور کمزور لگتا ہوں،  
 مگر بات یہ ہے کہ  
 میں نازک اور کمزور ہوں نہیں۔  
 میں نرم ہوں، مگر میں تمہیں دکھا سکتا ہوں کہ  
 نرمی میں بھی ایک زہر چھپا ہوتا ہے۔  
 میں ریشم کی مانند ہوں۔  
 لوگ ریشم کو کمزور سمجھتے ہیں،  
 مگر ایک ریشمی رو مال بچالیتا ہے انسان کو

بندوق کی گولی لگنے سے۔

بہت سے لوگ تمہیں کمزور سمجھ کر  
تم سے دوستی کے خواہاں ہوں گے  
غارٹ گروں کو درکار ہوتے ہیں ایسے دوست  
جن پر وہ حادی ہو سکیں؛

تاکہ ان کو اپنا آپ مضبوط اور اہم لگے۔

جس تو یہ ہے کہ غارت گر میں نہ مضبوطی ہے نہ بہت۔  
یہ تم ہو جو مضبوط ہو اور بہت والے ہو۔

میں نے بہت سے دوست کھوئے۔

بوجہ اس کے کہ جب انہوں نے مجھے جیر پھاڑنا چاہا  
تو وہ ایسا نہیں کر سکے۔

اب وہ مجھے الزام دیتے ہیں دھوکہ دہی کا۔

میں دھوکہ نہیں دے رہا۔

میں تو بنا ہوں ریشم کا۔

وہی غلطی سے شرافت اور زی کو کمزوری گردان لیتے ہیں۔  
دنیا بھری پڑی ہے غارت گروں سے  
سو میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میری طرح  
بن جاؤ ریشم!  
(جوائے بیل)

اور وہ سعدی جو ڈیڑھ برس سے ریشم بن چکا تھا، اس نے اپنے اچھے وقتوں کے غارت گر دوست کے بڑھے ہاتھ پر چھپتی ہوئی نظر  
ڈالی اور فیصلہ کر لیا کہ اسے فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”اور میں نے آپ سے کیا چرا یا ہے بھلا؟“

”وہی جو تمہارے خیال میں پہلے میں نے تم سے چرا یا تھا۔“

سعدی کا جزء بھیج گیا، آنکھوں میں بختی ڈرائی۔

”آپ میرے خیالات کو نہیں جانتے۔ ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔“ کہتے ہوئے وہ مڑنے لگا، پھر شہر گیا۔ درکار  
میں بیٹھا فارس اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ سعدی نے واپس دیکھا۔ ہاشم نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بدستور بڑھا کر تھا۔

”جلد ملتے ہیں۔ آپ کے آفس میں۔“ اس نے ہاتھ ملا لیا، اور فوراً سے واپس کھینچ کر پلٹ گیا۔ کار میں بینتے ہی فارس نے  
سوال کیا۔

”کیا کہہ رہا تھا ہاشم؟“

اکنیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس نے سر جھکائے ذرا سے شانے اچکائے۔

”کچھ خاص نہیں۔ آفس کا ایک کام تھا۔ وہی پوچھ رہے تھے۔“ کار اسٹارٹ کر کے سر سیدھا کیا۔ فارس تو ہوں کہہ کر کھڑکی سے باہر

اپنے لگا مگر سائیڈ مرمر میں ہاشم دور کھڑا، مسکراتے ہوئے جیبوں میں ہاتھ دا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کار کی رفتار تیز کی تو ہاشم پیچھے رہ گیا۔

(وہی جو تہارے خیال میں میں نے تم سے چرا یا تھا۔ اف! اور یہ بات اسے کس نے بتائی ہو گی؟) ذرا سی کرتے ہوئے اس نے

انہیں مج پہ موبائل رکھا، اور شہرین کا نمبر نکالا۔ کچھ غصے بھرا تاپ کرنے لگا، پھر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ ٹیکست پہ کرنے والی بات نہیں تھی۔

برے موڈ کے ساتھ اس نے اسپیڈ تیز کر دی۔

کار اب دور جا چکی تھی۔ ہاشم آہستہ سے پٹ آیا۔

لاڈنگ میں مرکزی صوفے پہ جواہرات ناگ پٹا نگ جماں بیٹھی، موبائل پہ کچھ دیکھ رہی تھی۔ اتوار کے باعث اسے آفس نہیں جانا

قا۔ مگر وہ پھر بھی ہمیشہ کی طرح تروتازہ اور تیار تھی۔

وہ قریبی صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ پیر لبے کر کے میز پر رکھ لئے، اور انگلی سے ٹھوڑی مسٹا، پر سوچ نظر وہ سے سامنے دیکھنے لگا۔

جوہرات نے موبائل سے نگاہ انھائی۔

”پریشان لگ رہے ہو۔“

”نہیں تو۔“ وہ چونکا۔

”کچھ تو ہوا ہے۔“ وہ پھر سے موبائل پہ انگلی سے صفحہ اوپر کرنے لگی۔

”نہیں بس....ابھی سعدی سے ملاقات ہوئی۔ وہ فارس سے ملنے آیا تھا۔“

”اور تمہیں یہ بات ڈسٹرپ کر رہی ہے کہ سعدی سب جانتا ہے؟“

”کیا نہیں کرنی چاہیے؟“ اس کا موڈ بگڑا۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب ہمارا وہم ہو۔ فارس کے لئے کوشش کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ سب جانتا ہو۔“

مگر ہاشم نے سوچتے ہوئے لنگی میں سر ہلاایا۔ اونہوں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ میں نے کیا ہے، مگر چونکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے،

اس لئے وہ برلا اظہار نہیں کر پا رہا۔ وہ فارس تک کوچھ نہیں بتا رہا، اس کو دکھانے کے لیے اس نے مجھ سے ہاتھ بھی ملا لایا۔

جوہرات نے موبائل پرے ڈال دیا اور چھرہ انھا کر بے چینی سے ہاشم کو دیکھا۔

”تواب کیا ہو گا؟“

”سعدی کو میں سن بھال لوں گا۔ وہ ابھی بھی وہی معموم بچھے ہے، مگر سوال یہ ہے کہ جب اس کے ہاتھ ثبوت نہیں لگا، تو اسے کیسے علم

ہوا؟“ الجھ کر کہتے ہوئے اس نے ماں کو دیکھا۔ ”میں پچھلے ایک ہفتے سے جب سے دھمیری پارٹی پیرے کمپیوٹر سے ڈیٹا چاکر گیا ہے، یہی

سوچ رہا ہوں۔ میں نے بنا جھوول کے پلان کیا تھا سب ہر شے ٹھیک تھی، چار سال پہلے تک اسے نہیں پتہ تھا کچھ۔ پھر دو سال وہ انگلینڈ میں رہا،

واپس آیا تب بھی اسے کچھ نہیں پتہ تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ڈیڈی کی ڈیتھ کو؟“

”ایک سال پانچ ماہ۔“ جواہرات بے اختیار بولی، کرب ساہر جگہ پھیل گیا۔

”ہوں۔ کل رات جب میں سعدی کی بہن سے بات کر رہا تھا نکشن پہ، تو مجھے احساس ہوا کہ ڈیڈی کی ڈیتھ کے بعد سے وہ لوگ

ہمارے گھر نہیں آئے۔ سونیا کی بچھلی بر تھڑے پہ بھی نہیں آئے تھے۔ اگر میں اس دفعہ زمر سے نہ کہتا تو وہ اب بھی نہ آتے۔“ جواہرات نے بے

چینی سے پہلو بدلا۔

”تمہارے باپ کی ڈیتھ سے چند دن پہلے سعدی نے فارس کا مکمل بدل دیا تھا، اور بعد میں اس نے تمہارے باز پرس کرنے پر تم سے کافی بد تیزی بھی کی تھی، یاد ہے؟ ہو سکتا ہے وہ اس روئے پر شرمندگی کی وجہ سے نہ آیا ہو۔“

”یا پھر....“ ہاشم ایک دم سیدھا ہوا وہ بربی طرح چونکا تھا۔ ”یا پھر اس نے وکیل تب بدلا جب اسے ساری حقیقت کا علم ہو گیا تھا۔ کیا وہ... وہ ڈیڑھ سال سے جانتا ہے یہ سب؟“ اسے بے یقینی سی محسوس ہوئی۔

”اگر وہ اتنے عرصے سے جانتا ہے تو اب تک چپ کیوں تھا؟“

”وہ چاہتا تھا پہلے فارس باہر آجائے اور پھر وہ میرے پیچھے آئے۔ مگر.... اسے کیسے پتہ چلا می؟“ اور یہاں آ کر ہاشم کا سارا دماغ الجھ جاتا۔ وہ چاہ کر بھی اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پا رہا تھا۔ کب غلطی ہوئی؟ کدر غلطی ہوئی اور وہ ریشم بن گیا؟

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ اس نے گھری سانس لے کر شانے اچکائے اور پھر سے موبائل اٹھا لیا۔ ”کیا میں نے تمہیں نبی خبر دی؟ زمر فارس کے خلاف کچھ کرنے جا رہی ہے۔“

سونج میں الجھاہام چونکا۔ ”نبی پیش (مقدمے کی درخواست)؟“

”اونہوں۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیخنا۔

”اس کا دماغ درست ہے؟“

”وہ اس سے انتقام کے لئے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

اور یہ سب اس نے آپ کو کیوں بتایا؟“

”کیونکہ میں ہی اس کی مدد کر سکتی ہوں۔“ جواہرات نے مخطوط انداز میں شانے اچکائے۔ ہاشم کے تاثرات بگڑے۔

”انتقام کے بہت سے طریقے ہوتے ہیں، اسے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”شاید اس کے منصوبے کے مطابق ان کے درمیان میرن کا نتیجہ کیٹھ ہونا ضروری ہو۔ خیر میرے لئے یہ بات تشغیل کا باعث ہے۔ اب ہمیں فارس کی قلر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے زمر کافی ہے۔“

مگر ہاشم بے چینی سے آگے کوہوا۔

”اول تو فارس اس سے شادی نہیں کرے گا، اور اگر کر لی تو بھی کیا گارنٹی ہے کہ وہ اس سے انتقام لے گی؟ اگر اسے سب حقیقت معلوم ہو گئی اور وہ جان گئی کہ فارس بے گناہ ہے تو؟“

”وہ بھی نہیں جان پائے گی، وہ اس سے نفرت کرتی ہے!“

”اوہ اگر نفرت مر گئی تو؟... اگر انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی اور وہ مل کر ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے تو؟“

جوہرات نے سر دسانس خارج کر کے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ شادیاں محبت سے خالی ہو اکرتی ہیں۔“

ہاشم کی آنکھوں میں چھائی بے چینی، کرب میں بدل گئی۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ اس نے آہتہ سے سر ہلایا، اور انھوں کھڑا ہوا۔ جواہرات نے اسی جبری مسکراہٹ کے ساتھ اسے سیر ھیوں کی طرف جاتے دیکھا اور پھر ہلکا سار جھٹکا۔ آنکھ کا کونڈا، انگلی کی نوک سے پوچھا۔ موبائل پرے ڈال دیا اور گردن موڑ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

وہاں اتوار کی صبح اب باسی ہو کر دوپھر میں بدل رہی تھی۔ بزرہ اور ملازموں کی چھپل پہل، سب یہاں سے دکھائی دیتا تھا، مگر وہ یہ

بُنیں دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ اور یاد آ رہا تھا۔

ہاشم نے کہا، سعدی پچھلے ہفتے سو نیا کی سالگردہ سے پہلے، آخری دفعہ ان کے گھر ڈیڑھ سال قبل آیا تھا۔

ہاشم نہیں جانتا تھا کہ سعدی نے وہاں آنا کیوں چھوڑا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی اور یہ بھی کہ وہ ہاشم کو کبھی نہیں بتائے گی۔

جو اہرات نے سر جھٹکا۔ ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔ یادِ ماضی کسی اور وقت سہی۔

❖ ❖ ❖

وقت کے کتنے دھاروں سے گزرا ہے ابھی ..... زندگی ہے تو کئی رنگ سے مرنا ہے ابھی سعدی کے جانے کے بعد سے اتوار کے ناشتے کے برتن یونہی میز پر رکھے تھے۔ صداقت نجاتے کن کاموں میں مصروف تھا، زمر نے اُنہی دیکھتے ہوئے اسے آواز دی اور پھر چائے کا کپ اٹھالیا۔ دھلتا محسوس ہوا، بڑے اب اُسلل اسے دیکھ رہے ہیں۔ مگر وہ اُنہی کی ملفر دیکھتی رہی۔

”کیسی رہی شادی؟“

نگاہیں اسکرین پر جمائے، زمر نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

”یہ تو چند برس بعد پتہ چلے گا کہ کیسی رہی شادی!“

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ اس کی خوابیدہ آنکھوں کو نظر سے دیکھ رہے تھے۔

”ہمیشہ سے بہتر۔“ آخری گھونٹ کپ اوپنچا کر کے اندر انڈیلا اور پھر ان کو دیکھا، ہلکا سامسکرائی۔

”ایک بات پوچھوں، ابا؟“

”تم کب سے تمہید باندھنے لگیں؟“

”جب سے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بہت کچھ معلوم نہیں تھا۔“ مسکراتی آنکھوں میں کرچیاں ہی چھین گرروہ ضبط کر کے ان کی طرف پوری

گھوم گئی۔

”ابا کبھی فارس نے میراثتہ ما نگا تھا؟“

بڑے ابا کے لئے سوال غیر متوقع تھا۔ وہ چونک گئے، کچھ کہنے کی کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ پرانے سیکھوں کی سیکھی کی میر کر غور سے ان کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”آپ نے انکار کیوں کیا؟“

”بس یہی لگا کہ تمہارا اس کا کوئی جو زندگی ہے۔“

”کس کو لگا؟ آپ کو یا امی کو؟“

”هم دونوں کو۔“ احتیاط سے الفاظ کا چنان و کیا۔

”محجھے کیوں نہیں بتایا؟“

ہان کی آنکھوں میں دیکھتی سوال پر سوال کر رہی تھی

”جب رشتہ نہیں کرنا تھا تو بتانے کا فائدہ؟“

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے فارس کو گھر بلاؤ کرنا کیا تھا، اور بے عزتی بھی کی تھی؟“

”ہرگز نہیں، فرحان نے ندرت کو فون پر انکار کیا تھا، گھر بلانے والی بات کس نے کہی؟“ ان کو شدید حیرت اور صدمے کا جھٹکا لگا۔

زمر کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ آئی۔

”ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ دونوں نے انکار کیا تھا؟“

بڑے ابا لمحے بھر کو چپ رہ گئے۔ وہ اب تھوڑی ہمیل پر رکھے دلچسپی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی دفعہ کی کی گئی خوش انہوں نے دل میں دھرائی۔ کاش اس لڑکی کو دیکھ لندہ بنا لایا ہوتا۔

”اب دیر ہو گئی ہے انکار مت سمجھے گا۔ آپ کی مرنسی کے برخلاف انکار کیا امی نے آپ صرف ان کے لئے میرے دل میں کوئی برا خیال نہ لانے کو کہہ رہے تھے۔ کیونکہ آپ مجھ سے ڈسکس کیے بنا کبھی انکار نہ کرتے۔“

”تمہاری امی نے....“

”اچھا فیصلہ کیا میرے لئے مجھے پتہ ہے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ لب کی جانب اچاہ رہی تھی کہ کیا انہوں نے میرا نام لے کر انکار کیا تھا؟“ وہ ریورٹ اٹھا کر اب تی وی کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی۔ بڑے ابا ہنوز تفکر سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”خین نے۔ اس کے خیال میں انکار میں نے کیا تھا۔“

”تم نے صحیح نہیں کی؟“

”جب خیالات ذہن میں اتنے راخ ہو چکے ہوں تو محض الفاظ سے ان کی فنی کر دینے کا کیا فائدہ؟“ وہ ہمیل بدلتے ہوئے گھنکھریاں اس انگلی پر لپیٹ رہی تھیں۔ ”میں تو یہ سوق رہی ہوں کفار شاید اتنا بھی برائیں جتنا میں تھھتی تھی۔“

بڑے ابا نے چونکہ کراسے دیکھا۔

”کیا کوئی بات ہوئی ہے؟“

”کوئی خاص نہیں۔ میں فارس کی کیس مانگز پڑھ رہی تھی، یہ دیکھنے کے لئے کرچ نے کیوں اس کو بری کیا؟ مگر جو حق بجانب تھا کوئی بھی چیز اس کو مجرم ثابت نہیں کرتی۔“ سرسری سے انداز میں کہتی وہ رک کر کوئی ہیڈ لائن پڑھنے لگی۔

”اور تم پھر بھی اس کو مجرم گردانتی ہو؟“

”ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔ یہ سب ایک سیٹ اپ ہو۔ شاید۔“ اس نے ہلکے سے شانے اپکائے۔ بڑے ابا حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

”تمہارے خیالات اتنی جلدی نہیں بدل سکتے۔ کوئی اور بات ہے ہے نا؟“

”میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابا۔ وہ مجرم ہے یا نہیں، مجھے فرق نہیں پڑتا اب۔ میں مزید اپنے دکھوں اور محرومیوں کا قصور دار اسے نہیں نہیں بھرا دیں گی۔ میں سعدی سے دوبارہ ملنے لگی ہوں، خاندان کی تقریبات میں جانے لگی ہوں، آپ بھی چاہتے تھے۔ اور اگلا قدم...“ اس نے گردن پھیر کو ان کو سنجیدگی سے دیکھا۔ ”آپ بھیں گے کہ میں شادی کرلوں۔“

”میں چار سال سے یہ کہہ رہا ہوں۔“

وہ چند لمحے ان کو تیقی پھر سرا ثابت میں ہلا دیا۔ نری سے امن سے۔

”اوکے۔ میں کروں گی۔ جب آپ بھیں، جس سے آپ کہیں، لیکن اس دفعہ مجھ سے پوچھے بغیر آپ کسی کو انکار یا اقرار نہیں کریں گے۔“ اور یہ کہہ کر وہ پر سکون سی اٹھ آئی۔ بڑے ابا شل سے بیٹھ رہے گئے۔ کتنی دریتوں کا ضعیف دماغ اجھتار ہا پھر بالآخر حیرت کی دھنڈ چھمنی۔ امید کی کرن چکلی۔

زمر نے بہت لبے عرصے بعد سہی ان کی بات مان لی تھی۔ سعدی لوگوں سے ”صلی“، اس کے لئے خوش آئیندہ ثابت ہوئی تھی۔ وہ خوشگواری حیرت میں گھرے ہوئے تھے۔ سمجھنیں آرہی تھی اپنی خوشی کس سے شیئر کریں۔ پھر جلدی سے فون اٹھایا۔ انہیں ندرت کو بتانا تھا۔

❖❖❖

لفظوں کو اس نے جھوٹ سکھایا کچھ اس طرح ..... ساری علامتوں سے معنی بھی لے گیا اتوار کی دوپہر قطرہ قطرہ پکھل رہی تھی۔ سہری دھوپ نے ندرت کے ریسٹورانت کی ششی کی دیواروں کو چکار کھا تھا۔ ندرت کچن میں آستین چڑھائے، مصروف سی کھڑی اڑکوں کو بدایات دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی چولہوں پر کچھ پکوانوں کو دیکھ لیتیں۔ ان کاموں کے دران انہوں نے دوفون ائینڈ کیے تھے۔ ایک سعدی کا کوہ فارس کے ساتھ گھر پہنچ پڑکا ہے، جس پر ندرت نے کھانا بھجوادیا، خود وہ کشمکش کی ہبہ سے جانے سے قاصر تھیں۔ اور دوسرا بڑے ابا کا۔ وہی پرانی بات۔ زمر کی شادی۔ البتہ اب کے ایک شے کا اضافہ ہوا تھا۔ زمر مانگتی تھی اور اب وہ چاہتے تھے کہ ندرت اس سلسلے میں ان کی مدد کریں۔ ندرت تب سے یہی سوچ رہی تھیں۔ رشتہ داروں میں کون سی جگہ بات چلائی ہا سکتی ہے؟

”تبھی کا وزن والا جنید اندر آیا۔“

”آنٹی!“ (وہ سب ندرت کو آنٹی کہتے تھے) ”کوئی مسز کاردار آئی ہیں، آپ کا پوچھ رہی ہیں۔“

”مسز کاردار؟ ادھو۔“ وہ جلدی جلدی ہاتھ دھوکر، کیپ اتارتیں دوپہر درست کرتیں باہر آئیں تو ششی کی دیوار کے ساتھ ایک کرسی پر اماگ پہنائی گئی۔ سید ہے بھورے بالوں والی جواہرات بیٹھی ہی۔ وہ تیزی سے اس طرف آئیں،

”سوری“ میں بس کچن میں لگتی تھی، آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ وہ اس میں کرخواہ مخواہ شرمندہ ہو رہی تھیں۔ جواہرات اسی تمکنت سے ایمی مسکراتی رہی۔ نیوی بلیوبلی قیضیں، اور سفید پینٹ پہننے والے بغیر میک آپ کے بھی کافی تروتازہ اور جوان لگتی تھی۔

”کیا آپ گھر گئی تھیں؟ مجھے بتایا ہوتا میں ادھر رہی آجائی۔“ ندرت سامنے بیٹھنے ہوئے مزید فکر مند ہوئیں۔ مسز کاردار کی اب وہ کیا فاطمہ کریں، پہلی دفعہ جو آئی تھی۔

”مجھے کچھ بات کرنی تھی، اس کے لئے یہی جگہ درست تھی۔“ کہہ کر وہ پہلے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ سعدی کی جاب، ہمہورانٹ کا نفع نقصان مالی مسائل۔ تبھی جنید جو سز لے آیا۔ جواہرات نے اسڑا بولوں سے چھوکر گھونٹ بھرا، پھر سیدھی ہو کر مسکراتے ہوئے لہوت کو دیکھا۔

”فارس ہم سب کی کوششوں سے باہر آچکا ہے، آپ یقیناً بہت خوش ہوں گی۔“

بات میں صداقت تھی یا نہیں، اندراز ایسا تھا کہ ندرت نے احسان کے بوجھ تسلیم ختم کیا۔

”آپ کے ساتھ کاشکریہ!“

”اب آپ کو اسے نارمل زندگی کی طرف لانا ہوگا۔ دوبارہ شادی، نئی فیملی وغیرہ۔“

”اب بھی تو...، اپنکچا کیسیں۔“ ابھی دو ہفتے تو ہوئے ہیں اسے رہا ہوئے۔“

”ہاں مگر زرتابش کی ڈیتھ کو تو چار سال ہو چکے ہیں، فارس مضبوط اعصاب کا مالک ہے اب تک اس صدمے سے نکل چکا ہوگا۔“

”یہ تو ہے۔“

”آپ کو شاید اب سعدی کی شادی کی فکر ہوگی، اوہ اور ایسا کرتے ہوئے آپ اپنے بھائی کو بھول گئیں۔“ مسکرا کر اسڑا گلاس میں

ہلاتے ہوئے وہ نرمی سے توک گئی تو ندرت کوڈھیروں شرمندگی نے آن گھمرا۔

”نبیمیں نہیں، فارس کی شادی میرے ذہن میں تھی، میں بس چاہتی تھی کہ وہ ذرا سی مثل ہو جائے، اور پھر... وہ ماں بھی جائے۔“

”وہ تو مان جائے گا، کون اپنی زندگی کی نئی شروعات نہیں کرنا چاہتا؟ اور آئی سی۔ آپ کو یقیناً خاندان والوں کی پریشانی ہوگی۔“ سر ابٹات میں ہلاتے اس نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ ندرت کی آنکھیں اچھنہے سے سکڑیں۔

”خاندان والے...؟“

”وہ تو فارس کو قاتل سمجھتے ہیں نا۔ وائف کلر، پیچ چیج گرلوگوں کا کیا ہے، وہ تو زمرکی وجہ سے ایسا سمجھتے ہیں۔ زمرکی اہمیت ہے خاندان میں، اس نے کہا کہ ایسا ہے تو ایسا ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں، کسی زمر جیسی لڑکی سے فارس کی شادی کروادیں، سارا مسئلہ حل۔“ نزاکت سے شانے اچکا کر وہ اسٹرالگاس میں گول گول گھمارہ تھی۔ مسکارا لگی مسکراتی آنکھیں ندرت کے الجھے الجھے چہرے پہ جھی تھیں۔

”زمر جیسی لڑکی؟“

”سامنے کی بات ہے ندرت۔ لوگوں نے زمرکی بات زمرکی کریڈیبلٹی کی وجہ سے مانی۔ آپ کوئی اتنی ہی آن بان اور حیثیت والی لڑکی ڈھونڈیں، لوگوں کو فارس کی بے گناہی کا یقین آجائے گا۔ وہ کہیں گے کہ اگر فارس برا تھا تو یہ رشنہ اس کو کیوں ملتا؟ ایسا نہ کیا تو کل رات فکشن کی طرح آپ کئی سال لوگوں کو صرف جواب ہی دیتی رہیں گی۔“

ندرت کے چہرے پہ اسی بکھری۔ کل بھی کتنے لوگوں نے سوال کیا تھا۔ فارس کیا بھی دوبارہ خاندان میں سراخا کر جی سکے گا؟  
ٹھوڑی جھکا کر وہ دل گرفقی سے بوئیں۔

”پہنچیں لوگوں کو کب یقین آئے گا کہ فارس بے گناہ تھا۔“

”ایسی لئے تو کہہ رہی ہوں، اس کی شادی اور اس کی عزت دونوں کا سوچیں۔“ نرمی سے انگوٹھیوں والا ہاتھ ندرت کے فربہ کملائے ہوئے ہاتھ پر رکھا، ندرت نے آنکھیں اٹھا کر تنکر سے اس کو دیکھا۔

”میں بالکل ایسا ہی کروں گی۔ موقع دیکھ کر فارس سے بات کرتی ہوں۔“

”اب آپ کوہی کچھ کر کے اس کو خاندان والوں کی نظر میں دوبارہ سرخو کرنا ہے، کیونکہ اب زمر تو ایک ایک سے نہیں کہنے گی ناکہ اس کو فارس کی بے گناہی کا یقین آگیا ہے۔“ سرسری سا کہتے ہوئے وہ موبائل کرمسٹ کا لز چیک کرنے لگی۔ ندرت نے بے حد چونک کر اسے دیکھا۔

”زمر نے...؟ ایسا کب کہا؟“

”ایسا کیا مطلب؟“ جواہرات نے الثاہر ت سے ان کو دیکھا۔ ”جج نے اس کو بری کر دیا، زمر قانون سے واقف ہے، وہ بھی کنوں میں ہو گئی ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ میرے پوچھنے پا اس نے خود اعتراف کیا تھا۔ اب فارس پیش کرنے کی وجہ کیا رہ جاتی ہے۔“

ندرت نے آدمی بات سمجھتے ہوئے باقی آدمی پہ الجھتے سر ہلا دیا۔ ان کا خیال تھا زمر ابھی تک اپنے بیان پر قائم ہے مگر شاید وہ بدل رہی تھی۔ جواہرات نے کلامی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بمحظے دیر ہو رہی ہے۔“

”ارے، آپ بیٹھیں نا، جنید اسنیکس لاہی رہا تھا۔“ وہ جلدی سے مژکر جنید کو پکارنے لگیں، مگر جواہرات نے انہیں روک دیا۔

”میں ڈاکٹ پہ ہوں اور ریسٹورانٹ کے کھانے میں دیے بھی نہیں کھاتی۔ تکلف نہ کریں۔“

ندرت کا جوش ماند پڑ گیا خاموشی سے سر ہلا دیا۔

”اس بات کو میرے اور آپ کے درمیان رہنا چاہیے۔ اگر فارس کو علم ہو تو وہ میری ضد میں مانتے مانتے بھی انکار نہ کر دے۔“  
”جی، بالکل!“ ندرت سمجھ گئی تھیں اور اب وہ اسے کارنٹک چھوڑنے باہر جا رہی تھیں۔ ذہن میں بہت سے سوالیں شان ابھرا ہر کر آتے تھے۔

زمر جیسی لڑکی؟ زمر جیسی....؟



پتے کی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے ..... کبھی بھی کوئی جھوٹی خبر سناتے ہوئے  
دو پہر اب سہہ پہر میں بدلتی تھی۔ چھوٹے باغیچے والے گھر میں کھانا سیر ہو کر کھا جنے کے بعد کی غنودہ فضا چھائی تھی۔ تینیں لا دُنخ  
میں ڈا بجست لے کر صوفے پیڑا پر کر کے بیٹھ گئی تھی اور سیم گول میز سے برلن اٹھاتے ہوئے نگلی سے کہہ رہا تھا۔  
”کبھی کوئی کام بھی کر لیا کرو، کٹو۔“ مگر وہاں سن کون رہا تھا؟ فارس ہاتھ دھو کر ادھر آتا تھے ہنوز رسالہ پڑھنے میں مگن تھی۔  
”دروازہ لاک کر لو، میں جا رہا ہوں۔ امی کو بتا دیا، پھر آؤں گا۔“

حد نے رسالہ رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔ پورے آتسین کی شرت اور جیز میں ملبوس فارس، آنکھوں میں کافی اکتاہت لئے بات  
لرنے کے ساتھ کاں بھی ملا رہا تھا۔

”بھائی کہاں ہے، ما موس؟“

”اپنے کمرے میں۔“ وہ راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے موبائل کان سے لگا رہا تھا۔ جس وقت وہ باہر نکلا اور حینیں دروازہ بند  
لرنے لگی، فارس کے الفاظ سماعت میں پڑے۔

”یا رائٹنی، کدھر ہو؟ اچھا سنو، ایک بندے کو چیک کر کے ....“ دروازہ بند ہوا تو آواز کار استر رک گیا۔ وہ لاک کر کے واپس آئی  
اور بھائی کے پاس رکی۔ ذرا چمچا کر بند دروازے کو دیکھا۔ پھر دستک دی۔

وہ جو کمپیوٹر چیز پر بیٹھا موبائل پنجمبر ملار رہا تھا، چونکہ کسر اٹھایا، اور پھر موبائل رکھتے ہوئے مسکرا یا۔  
”آونھے“ میں تمہارے پاس ہی آنے لگا تھا۔

”مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا بھائی۔“ انگلیاں مردود تھیں نے خشک ہوتے گلے کے ساتھ الفاظ جمع کرنے چاہے۔ کیا گلے گا کہنا، میں  
ہیٹھ کرتے ہوئے کپڑی گئی تھی۔ اور پھر میں نے ہاشم بھائی کو بلالیا۔ دونوں فقردوں میں سے کس فقرے پر اس کا اعتبار ٹوٹے گا؟

ظاہر ہے پہلے پ۔ ہاشم کو کسی اور چیز کے لئے بلا یا ہوتا تو خیر تھی، مگر ہیٹھ ... وہ کیسے بتائے؟

”ہاں بولو۔“ وہ متوجہ ہو کر سن رہا تھا۔ تینیں نے لب کھولے پھر ایک دم خیال آیا۔

”آپ میرے پاس کیوں آنے لگے تھے؟“

”وہ... مجھے ایک کام تھا۔“ کہتے ہوئے اس نے لیپ ناپ کے ساتھ رکھی فلیش ڈرائیور اٹھائی، بیوں پر زبان پھیری اور بہت مجتمع  
کرتے ہوئے چڑھا اٹھایا، پھیکا سامسکرا یا۔

”یہ کچھ دا کومنٹس میں Decrypt کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر...“ احتیاط سے توں توں کر الفاظ ادا کیے۔ ”۔۔۔ یہ میری قابلیت  
سے اوپر کی چیز تھی۔ میں اس کوٹھیک سے آپریٹ نہیں کر پایا، اور فائل کر پڑت ہو گئی ہے۔ کیا تم کسی طرح اسے روکرنے میں میری مدد کر سکتے  
ہو؟“

تینیں بنا پاک جھپکے چند ثانیے فلیش کو دیکھتی رہی، پھر نظریں اٹھائیں۔ آنکھوں میں صدمہ اور نگلی در آئی تھی۔

”خنہ پلیز، صرف تھوڑی سی ہیلپ کر دو۔“

خین کی گرد نفی میں، بیلی وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ شکوہ کناں آنکھیں بدستور سعدی پہ جتی تھیں۔

”کسی کے ڈاکو منش کو آپ کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کا تعلق آپ کے آفس سے ہے یا نہیں، مجھے نہیں پتا، مگر یہ غلط ہے۔ غیر قانونی ہے۔ اور میں ایسے کام نہیں کرتی۔“

سعدی نے گہری سانس خارج کر کے آنکھیں بند کیں۔ پھر کھولیں تو وہ چوکھت تک پیچھے ہٹ جکی تھی۔

”ہمارا میجا صرف ایک شخص ہوتا ہے اور وہ ہم خود ہوتے ہیں۔ تم کبھی بھی اس فیز سے نہیں نکلو گی اگر تم اپنی خود مدنیں کرو گی۔“

”میں کسی فیز میں نہیں ہوں، میں ٹھیک ہوں، پہلے جیسی۔“

سعدی نے نفی میں سر ہلاایا۔ فلیش رکھی۔ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ ابھی تک ابر و بھینچے سے دیکھ رہی تھی۔

”تم بدل گئی ہو۔ ایک وقت تھا تم ہمارے خاندان کا سب سے پر اعتماد اور بولڈ بچتھیں۔ اب تو تم نے خود کو بالکل عام اڑکیوں جیسا بنالیا ہے۔“

خین کے چہرے پتار یک سایلہ رایا، مگر وہ گردن کڑا کر بولی۔

”میں نہیں بدلتی۔ اور میں اس سب میں آپ کی مدنیں کروں گی۔ یہ غیر قانونی ہے۔“

(ہاں سارے قانون دان میرے ہی خاندان میں پیدا ہونے تھے) وہ سوچ کر رہا گیا، کیونکہ حداد مرکر جارہی تھی۔ اس کے کان سرخ تھے اور آنکھوں میں شدید بی بھرا غصہ تھا۔ بھائی جانتا تھا وہ اب کمپیوٹر استعمال نہیں کرتی، اس نے ڈیزہنسال پہلے لا ون خ کی کمپیوٹر چیز بھائی کے کمرے میں شفت کر دی تھی۔ کمپیوٹر اچھے نہیں ہوتے، اور اس کے لئے تو بالکل بھی نہیں، سو وہ کس طرح ایسی بات کہہ سکتا تھا؟

”پتہ ہے آج مجھے زمر نے کیا کہا؟“

وہ جاتے جاتے رکی۔

”یہ کہ انہیں ماموں کی بے گناہی کا یقین آگیا ہے۔ وہ اپنے تمام اجزاء و اپس لیتی ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے خود بھی الجھا تھا۔ کچھ

کھنک رہا تھا۔

خین جھٹکے سے واپس پڑی۔

”یہ پچھوئے کہا؟“

سعدی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خین کے لب بھخ گئے۔ آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

”تو آپ نے آگے سے کیا کہا؟“

”میں کہا کہتا؟“

”کم از کم اتنا تو پوچھ سکتے تھے کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہی ہیں؟“

”جھوٹ؟“ سعدی کو دھکا لگا۔

”وہ جھوٹ بول رہی ہیں، وہ اتنی جلدی اور اتنے آرام سے اپناز ہن نہیں بدلتیں، میں ان کو جانتی ہوں۔“

”زمر جھوٹ نہیں بولتیں۔“

”اوے مگر وہ وکیل ہیں، انہوں نے الفاظ کا محتاط چنانہ کیا ہو گا یقیناً وہ ادا کاری کر رہی ہیں۔“

”تم اتنی جلدی ان کے بارے میں اتنی منفی کیوں ہو جاتی ہو وحدہ؟ کیا پسند ان کو واقعی....؟“ اسے دکھ رہا تھا۔

”میں ان کو جانتی ہوں۔ وہ بغیر کسی وجہ کے اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتیں۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی ہیں۔“ وہ ناگواری اور غصے سے لہتی باہر نکل گئی۔ سعدی نے افسوس سے سر جھٹکا۔ وہ دونوں اس کو جتنی پیاری تھیں، اتنی ہی وہ ایک دوسرے سے دور تھیں۔ وہ بے دلی سے اپس کری پڑھے سا گیا۔ دوالگیوں میں فلیش اٹھا کر دیکھی۔ آج آٹھواں دن تھا ناکامی کا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیسے ثبوت لے کر فارس اور زمر کے پاس جائے؟ اس کے پاس انتقام اور انصاف کا ایک منصوبہ تھا مگر اس کو فارس اور زمر کی مدد چاہئے تھی۔ اکیلی جیونٹی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ باہر نہیں بڑھ رہا تھا ہوئی واپس صوفے پر دھپ آئی۔

”ایسے بیٹھتی ہو؟ لگتا ہے زلزلہ آ رہا ہے۔“ قریب بیٹھے سیم نے رسالے سے سر زکال کرنا گواری سے تبرہ کیا۔ مگر اس نے نے بغیر (ہونہ) سر جھٹکا۔ پھر زہن کی رو بھٹک گئی۔ غصہ ادا سی میں بدل گیا۔

”سیم۔ ایک بات بتاؤ۔“ اس نے کھوئے کھوئے لمحے سے پکارا۔ ”کیا میں واقعی بدل گئی ہوں؟“  
”کب سے؟“ وہ حیران ہوا۔

(ڈیڑھ سال پہلے سے۔) اس نے سوچا مگر سیم کو کیا بتائے؟

”جب سے میں نے بی اے میں ایڈمیشن لیا ہے۔“

”آ.....“ وہ سوچنے لگا۔ ”نہیں تو... اب بھی تم اتنا ہی کھاتی ہو، وہ یہے ہی مذاق کرتی ہو۔ میرے ساتھ اسی طرح لڑتی ہو اور جب میرے دوست مجھے کچھ کہیں تو ان سے لڑنے بھی اسی طرح پہنچ جاتی ہو۔ تم تو ویسی ہی ہو۔“

”اچھا۔“ وہ ہلاکا سا بہنس دی۔ سیم پر تھوڑا سا پیار آیا، مگر ظاہر ہے کہ اس نے کشن اٹھا کر گود میں رکھا، اور ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ رسالہ غائب۔ وہ حیرت اور پریشانی سے اٹھ کر ڈھونڈنے لگی۔ پھر چوک کر سیم کو دیکھا۔

”تم ڈا ججست پڑھ رہے ہو؟ کس نے اجازت دی تھیں ہاں؟“ پک کر صوفے تلے سے جوتا اٹھایا۔ ”آنے دو آج امی کو میں نے تمہارا حشر نہ کروایا تو دیکھنا۔“ اس سے پہلے کہ وہ غصے سے اس پر چھپتی، سیم چھلانگ مار کر چوکھت تک گیا اور پھر آگے غائب۔ خین طیش سے لال سرخ ہوتی، جوتائے اس کے پیچھے بھاگی۔

”یہ موٹا آلوج بنچے گا نہیں۔“



لگا ہو دل تو خیالات کب بدلتے ہیں ..... یہ انقلاب تو ایک بے دلی میں ملتے ہیں  
شام ایک ٹھنڈی ہی چھالیا کے ساتھ قصر کاردار پا تر رہی تھی۔ لاونچ کی دیوار گیر فرانسیسی کھڑکیوں سے باہر کا بزرہ زار جھلک رہا تھا۔  
کونے میں دو کریساں ساتھ ساتھ رکھی تھیں، دونوں کے بازوؤں کے درمیان گلدستے والی چھوٹی میز تھی۔ ایک کری پر جواہرات تھی۔ بال جوڑے میں، کہنی کری کے ہتھ پر، اور چہرے پر مسکراہٹ لیے وہ اپنی مہماں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ مہماںوں کو سامنے بھانے کے بجائے برادر کری پر بھایا کرتی، اسے گردن باائیں طرف موڑ کر مہماں کو دیکھنا زیادہ پسند تھا۔ گئے برسوں میں اس کری پر سعدی اکثر آکر بیٹھتا تھا۔ اب کبھی کبھی ادھر زمر ہوتی، آج بھی وہی تھی۔

کپ کے منہ پر انگلی پھیرتی، وہ ناگ پناگ جمائے سنجیدگی سے بیٹھی تھی۔ بنا مسکراہٹ کے بھوری آنکھیں اور کپھر میں ہاف بند ہے گھنگریا لے بال جو سمیٹ کر ایک طرف کر دیے تھے دو پہنچ گردن میں لپیٹ کر دونوں پلوس میں کر رکھتے۔

”کیا تم پچھتارہی ہو؟“ جواہرات اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”ہر گز نہیں بلکہ میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔“

”یا ذیت ناک ہوگا۔ جس سے نفرت کی جائے اس سے شادی!“ جواہرات نے جھر جھری لے کر انگلی سے گال تک آئے بال ہٹائے۔ زمرنے کپ اٹھا کر گھوٹ بھرا۔

”میں بہت اذیت سے گزری ہوں۔ اور سب سے زیادہ تکلیف وہ بے اعتباری تھی۔“ کپ نیچے کر کے وہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ یہاں بزرہ زار دکھائی دیتا۔ انیکی عقی طرف تھی۔ ادھر سے دکھائی نہ دیتی۔

”اس وقت کسی نے بھی میرا اعتبار نہیں کیا۔ مگر اب کریں گے۔“

”تم اپنے رشتے داروں کے دباو کی وجہ سے اس کا کیس لینے سے انکار نہ کرتی تو آج وہ جیل میں ہوتا۔“

”بات رشتے داروں کی نہیں ہے۔ میں ایک پلک پر اسکیو شن میں ذاتی عناد کو نہیں لاسکتی تھی۔ یہ ذاتی جنگ نہیں تھی۔“ وہ کھڑکی سے نظریں ہٹا کر جواہرات کو دیکھتے ہوئے تھیں سے بولی۔ ”وہ ایک وائف کلر تھا، سیریل کلر۔ اس نے مجھے استعمال کیا، پہلی دفعہ تب جب مجھ پر گولی چلائی، دوسرا دفعہ ڈرہ سال پہلے جب اس نے میرے کندھے پر یہ کھڑک کر رہا تھا حاصل کرنا چاہی۔ یہ قانونی جنگ تھی۔ صرف ایک تسلی تھی مجھے کفارس کا میں نے کچھ نہیں بگاؤ تھا، میں بے گناہ تھی، مگر نہیں۔“ آخری تعلیم گھوٹ اندر اتر کر اس نے کپ پر بچ میں رکھا۔

”وہ مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔ یہ آغاز سے ہی ذاتی جنگ تھی۔ شروع اس نے کی، ختم میں کروں گی۔“ اس نے آگے ہو کر پیاں واپس بڑاں میں رکھ دی۔

”مگر تم کرو گی کیا؟ شادی کر کے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“

”نہیں مسز کاردار۔“ زمرنے گھری سانس خارج کی اور نی میں سر ہلا کیا۔ ”میں اور آپ محمر راز نہیں ہیں۔ میں نے مدد مانگی تھی لائچہ عمل بتانے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔“ جواہرات نے مسکرا کر سر جھکایا۔

”تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“

”مدد کی حد تک؟ جی ہے۔ مگر اپنے پلانز میں خود تک ہی محدود رکھتی ہوں۔“ وہ سر دسا مسکرائی۔ جواہرات نے اثبات میں گردن کو جبکش دی۔

”تمہاری مرضی۔ بہر حال، میں اپنے وعدہ پورا کروں گی۔ تم نے اس سے شادی کرنی ہے، میں کروادوں گی۔ اور کل میں تمہارے والد سے ملنے آؤں گی۔“

”شیورا!“ اس نے کندھے اچکا دیے۔

”کیا تم جانا چاہتی ہو کہ میں یہ کیسے کروں گی؟“

”نہیں۔ میں قدرتی طریقے سے حیران ہونا پسند کروں گی۔“ وہ رکی۔ ”آپ کو اس سے کیا ملے گا؟“

”کس سے؟“

”ہم دونوں جانتے ہیں کہ آپ میری مدد اپنے فائدے کے لیے کر رہی ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کبھی میرا ساتھ نہ دیتیں۔“ جواہرات ہلکا ساہنس دی۔ ”فارس کے قانونی شیئر ہیں ہماری جائیداد میں۔ جب تک وہ دوسرا چیزوں میں الجھا رہے، میرا کا رو با رخنوظ رہے گا۔ مگر تم یہ جانتی ہو کہ میں تمہیں استعمال کر رہی ہوں، تو میرا ساتھ کیوں دے رہی ہو!“

”تاکہ آپ کو واپس استعمال کر سکوں!“ وہ مسکرا کر اٹھی، پرس کی اسٹریپ کندھے پر لٹکائی۔ ”آخری بات جو مجھے کہنی تھی۔ میں تیار ہوں۔“

”میں بھی!“ ایمِ نگ پر انگلی پھیرتے ہوئے جواہرات مسکرائی۔

اس کے جانے کے بعد اسی کری پ بیٹھے جواہرات نے موبائل پ نمبرڈ آئل کیا۔ یوسف خان صاحب۔  
”السلام علیکم۔“ وہ کافی دیر بعد فون اٹھا پائے۔

”علیکم السلام یوسف صاحب۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔“  
”اللہ کا شکر ہے۔“ وہ چند رسمی فقرنوں کے بعد کہنے لگی۔

”آپ نے دوڑھائی ماہ قمل مجھے کال کر کے کہا تھا کہ میں زمر کو سمجھاؤں تاکہ وہ شادی کر لے۔“  
”جی۔ میں یہ ہر اس شخص سے کہتا ہوں جو زمر کے قریب ہو۔“ وہ سنجیدہ اور قدرے خشک تھے۔ جواہرات کا ناپس کو سلتا ہاتھ رکا،

ارادی رکاوے سے سوچا۔

”اگر آپ میرے گارڈ کی اس نیکلس کے لئے تلاشی والی بات پہ ہم سے خفا ہیں تو میں مذکورت کرتی ہوں۔ وہ سب ایک غلط  
ہی تھی۔“

”نہیں، کوئی بات نہیں۔“

”اوے کے۔ تو میں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ کل رات فنکشن میں میری زمر سے بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے۔ امید ہے  
وہ جلد مان جائے گی۔“

بڑے باپ چوکے۔ ”تو آپ نے بات کی تھی زمر سے؟“

”جی۔ میں نے آپ سے وعدہ کر کھا تھا۔ اس موقع کل رات ملا۔“

”اچھا۔“ ان کے لمحے کی سرد مہری زائل ہونے لگی۔ ”زمر نے مجھ سے منج بات کی تھی، وہ شادی کے لئے رضامند ہے۔“

”لگ۔ مگر مجھے حیرت نہیں ہے۔ میں نا کام نہیں ہوا کرتی۔“

”آپ کا... شکر یہ سمز کار دار۔“

”مائی ہلیور۔“ مسکراتے ہوئے بدستور ایرنگ پانگلی پھیرتے، وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی۔ ”کوئی رشتہ ڈھونڈا آپ نے؟“

”نہیں، ابھی تو نورت سے بات کی ہے۔ وہ شاید کوئی بتائے۔“

”اوے کے، میں نے بھی چند ایک لوگوں سے کہہ رکھا تھا۔ دور شستے ہیں جو دچپی رکھتے ہیں۔ آپ قصیلات جانا چاہیں گے؟“

”جی، بتائیے۔“ بڑے ابا بکشکل اپنی آواز کی ضعیف خوشی چھپا رہے تھے۔

”ایک سیشن کو رٹ کے نجح صاحب کا رشتہ ہے۔ بیوی سے علیحدگی ہو جگی ہے اور تینوں بیچے بورڈنگ میں پڑھتے ہیں۔“ ذرا دیر کو  
وقہ دیا۔ بڑے ابا کی لائن خاموش تھی۔ ”دوسرے رشتہ میری کمپنی کے ایک عہدیدار کا ہے۔ پہلی شادی کم عمری میں ہوئی تھی، وہ بیوی اور اس سے  
ہوئے دونوں بیٹے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ صاحب خود اسی شہر میں ہیں اکیلا اچھا گھر ہے، عمر ذرا زیادہ ہے، پچاس سے اوپر۔ آپ سن رہے  
ہیں؟“

”جی ہاں۔“ ان کی آواز بدققت نگلی تھی اور اس میں بھی تکلیف تھی۔

”یوسف صاحب، حقیقت پسندی سے کام لیجئے۔ آپ کی بیٹی تیس بیس سال کی ہے، اس کے گردے ضائع ہو چکے ہیں، بیمار ہے،  
ایسے میں کسی نوجوان خوبصورت لڑکے کا رشتہ ملنا تو مجھے ہو گا اور مجھے کم ہی ہوا کرتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں مگر....، وہ خود ہی رک گئے۔ کیا کہیں اب؟“

”ہاں، ایک شخص اور بھی ہے، ہاشم کی عمر کا ہے، پہنڈسیم بھی ہے، پہلی بیوی مر چکی ہے، مگر....“

”مگر کیا؟“ بڑے ابا تمیزی سے بولے۔ امید کی کرن پچکی تھی۔

”مگر آپ کی کیا کارنی؟ آپ اس سے شاید رشتہ نہ ہی کریں۔“ اس نے ذرا سا وقفہ دیا۔ بڑے ابا بے چینی سے منتظر تھے۔  
”میں فارس کی بات کر رہی ہوں۔“

اور بڑے ابا کو اتوار کے اس گرم دن میں لگنے والا یہ دوسرا جھٹکا تھا۔

”فاؤ... رس؟“ وہ انکلے آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ندرت آج کل فارس کے لئے بڑی ڈھونڈ رہی ہیں۔ تو آپ اس سے زمر کی بات کیوں نہیں کر لیتے؟ اس سے اچھا آپشن آپ کو نہیں ملنے والا۔“

”مگر.... فارس کے لئے زمر....“

”کیا زمر؟ اسے عدالت نے بری کیا ہے، اور اب زمر اس کو موردا لزاہم تھہرنا چھوڑ چکی ہے۔ پرانی باتوں کو بھول جائیے۔“ اس نے خنگی سے ٹوکا۔

”مسز کاردار آپ سمجھنیں رہیں۔ فارس کا... وہ ابھی ابھی رہا ہو کر آیا ہے وہ خود مسلموں میں گمراہے ایسے میں....“

”آپ نے پہلے بھی اس کے رشتے سے انکار کر دیا تھا، تب کیا وجہ تھی؟“

وہ چپ سے ہو گئے۔

”آپ شاید اس کو ہمیشہ سے اپنی بیٹی سے کم تر سمجھتے رہے ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے، مجھے وہ بہت پسند ہے۔ مگر وہ خود نہیں مانے گا، زمر بھی نہیں مانے گی۔“

”آپ مان جائیں تو وہ بھی مان جائیں گے۔“

”زمر بھی بھی نہیں مانے گی وہ تو اس کا ہمارے گھر آنا تک برداشت نہیں کر سکتی۔“

”وہ تو شادی کے لئے بھی نہیں مانتی تھی۔ میں نے منالیا۔ بہر حال، میں فارس کے ساتھ دو چار روز میں آپ کی طرف چکر لگاؤں گی۔ آپ تینوں رشتؤں کے بارے میں سوچ لیں۔ تین بچوں کا باپ نج، پچھپن سالہ کمپنی عہدیداریا فارس۔ اور اگر تینوں نہیں قبول تو اس دفعہ اپنی بیٹی کے مجرم آپ ہوں گے۔ میک کیسر۔“

مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا اور بہت طمانیت سے کھڑکی کے باہر بزرہ زار کو دیکھنے لگی، جہاں فیجو نا اپنی مگر انی میں ملازموں سے گلے رکھوار ہی تھی۔

جو اہرات کو موسیم زیادہ خوشنگوار لگنے لگا تھا۔

سب ٹھیک جا رہا تھا۔

.....❖❖❖.....

خدالیا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے ..... وگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں  
رات کھانے کے بعد وہ چپوٹے باغیچے والے گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک کنارے چلتے، کانوں میں سفید ہینڈ زفری لگا کروہ موبائل کو ہاتھوں میں پکڑنے نمبر ملارہا تھا۔

”سعدی.... تمہاری ہاشم سے بات ہوئی؟“ شہرین نے کال اٹھاتے ساتھ پوچھا۔ ایک فونز میں گونجتی اس کی آواز میں شدید اضطراب تھا۔

”کیوں ناپہلے آپ مجھے یہ بتا میں کہ آپ کی ہاشم بھائی سے کیا بات ہوئی؟“ وحشت اور رشتی سے کہتا قدم قدم چلتا جا رہا تھا۔

”میری بات کیا مطلب؟“

”آپ نے ان کو بتا دیا کہ میں نے ان سے وہ چرایا ہے، جو انہوں نے ہم سے چرایا تھا۔“

”میں نے..... ایسے نہیں....“ وہ اٹکی۔ ”وہ مجھ پر چلا رہا تھا، مجھ کے دمکی دے رہا تھا، مجھے معلوم بھی نہیں کہ میں کیا کہتی گئی..... بلکہ میں نے تو یہ کہا بھی نہیں کہ تم نے...“

”مگر آپ نے میری بات تو دھرا دی تا ان کے سامنے۔“ طیش سے اس کی آواز بلند تھی۔

”اس سے کیا ہوتا ہے؟“

”اس سے یہ ہوتا ہے کہ میں نے پہلی دفعہ آپ پر اعتبار کر کے غلطی کی۔ بلکہ نہیں، اعتبار تو اس دفعہ بھی نہیں کیا تھا، بس کام کہہ کر غلطی لی۔ اور اس سے یہ بھی ہوتا ہے کہ شہرین بیگم آج سے آپ اکیلی ہیں۔ مجھے رقی برابر بھی پرواہ نہیں ہے کہ سونیا آپ کے ساتھ جائے یا نہیں۔ اس لئے آپ اپنی تمام جنگیں اکیلے لڑیں گی۔“

”تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ تم نے مجھے اس کام میں پھنسایا اور.....“

”میں آپ کے اس سے بڑے کام کر چکا ہوں، اور یہ کام میں نے آپ کو اس لئے دیا کہ آپ بھی ہاشم بھائی سے انتقام لینا چاہتی تھیں؛ کم از کم کہتی تو بھی رہی ہیں آپ۔ لیکن آج سے ہم ایک بیٹھنہیں ہیں۔ اللہ حافظ۔“ زور سے سرخ بننے والے کارکال کاٹی۔

آنکھوں میں شدید خفگی اور غصہ لئے وہ واپس گمراہی طرف مڑ گیا۔

شہرین کی تین چار کالا آئیں، اس نے سب کاٹ دیں۔ پھر نگ آکر فون سائیٹ پر لگا دیا۔

واپس اندر آیا تو امی خاموشی سی لا دنخیں میں بیٹھی تھیں۔ اُٹی وی چل رہا تھا۔ خین پاؤں اوپر کر کے بیٹھی، ہتھیلیوں پر چہرہ گرائے شوق سے ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اب وہ صرف وہی ڈرائے دیکھتی تھی جوئی وی پلگ جاتے۔

امی البتہ کسی گھری سوچ میں تھیں۔

وہ ایکر فون زانتارتے ہوئے ندرت کے ساتھ دھپ سے صوفے پر گرا۔ وہ پھر بھی نہیں چوکیں۔ سعدی نے پلکیں سکیز کر غور سے ان کا دیکھا۔

”ندرت بہن، پریشان لگ رہی ہیں آپ؟“ مخصوصیت سے پوچھا۔ انہوں نے خفگی سے اس کو دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ تو ہوا ہے۔ بتا میں، میں حل کرتا ہوں ابھی آپ کا مسئلہ۔“ وہ سمجھیدہ ہوتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”میں سوچ رہی ہوں فارس کی شادی کروئیں چاہیے۔“

خین اور سعدی دوںوں نے چونک کران کو دیکھا۔ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔ حنے کے ماتھے پہل پرے۔

”ماموں کی شادی؟ مگر امی وہ ابھی تو باہر آئے ہیں، ان کو سانس تو لینے دیں۔“

”خین بھیک کہہ رہی ہے امی۔ وہ پہلے ہی دوسرے چکروں میں ہیں، ان کو بھی نگ نہ کریں۔“

”چپ کر قدم دوںوں۔ پتہ چلتا نہیں ہے کسی بات کا اور ماں کو مشورے دے رہے ہو۔“ وہ خفگی سے کہہ کر اٹھ گئیں اور میز پر رکھے، تن اٹھا کر کچک میں لے گئیں۔ جب واپس آئیں تو وہ دوںوں بھول بھال کرٹی وی دیکھ رہے تھے۔

”بڑے بابا کافون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے زمر شادی کے لئے مان گئی ہے۔ فنکشن میں جانے اور رشتے داروں سے ملنے کا اس پر ثابت

اڑھوا ہے۔“ وہ کشن ٹھیک کر کے رکھتی سرسری انداز میں بیماری تھیں۔ خین اور سعدی نے ایک دم ایک دوسرے کو دیکھا۔

”اچھی بات ہے نا۔“ ندرت نے فال تو کشن کش اٹھا کر بیدرود کی طرف جاتے پوچھا۔

”جی۔“ خین بے زاری سے کہہ کر واپس ٹی وی دیکھنے لگی۔

”جی۔“ سعدی البتہ دھیما سابو لا۔ چاہنے کے باوجود وہ خوش نہیں ہو سکا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

.....❖❖❖.....

میں دوستوں کے اک اک امتحان سے گزر ہوں ..... بکھر گیا ہوں ، کئی راستے بناتا ہوا

قصیر کاردار پہاڑی صبح پہلے سے بھی گرم طلوع ہوئی تھی۔ ہاشم برآمدے کے اسٹیپ اترتا، نیچے کھڑی کارکی طرف جا رہا تھا۔ شوفر کے سلام کا سپاٹ چھرے اور سر کے خم سے جواب دیتا وہ اندر بیٹھا تو شوفر نے دروازہ بند کر دیا۔ جواہرات نے ستون کے ساتھ کھڑے یہ منظر دیکھا، یہاں تک کہ اس کی کارروائی پہلے چلتی گیٹ کیس پار کر گئی۔

”میم“ کا رتیار ہے۔ فیجنونے سامنے کھڑی کار کے بارے میں یاد ہانی کرتے ہوئے اسے پکارا، جو گردن میں موتویوں کی لڑی پر انگلی بھیپر رہی تھی۔ بال جوڑے میں باندھے اور لمبی قیص پر سفید فندہ منی کوٹ پہننے والے سوچ میں گم کھڑی تھی۔ پھر یا کیک زینے اتنے لگی۔ فیجنونا پیچھے آئی تو جواہرات رکی، گھور کر اسے دیکھا۔ فیجنونا کے قدم نحمد ہو گئے، فوراً سر جھکا کر پیچھے ہو گئی۔

جواہرات زینے اتری۔ سبزہ زار عبور کیا۔ گھوم کر گھر کے عقب میں آئی۔ سبز پہاڑی یہاں نشیب میں ڈھل جاتی۔ وہ قدم قدم اترتی نیچے انیکیں تک آئی۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔

چند ہی لمحوں میں وہ کھلا تو فارس نظر آیا۔ وہ ٹراکز را اور پوری آسمین کی لی شرت میں ملبوس تھا۔ کافی پہلے کا اٹھا ہوا لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر آنکھیں سکیڑیں، اچنچھے سے پھر پیچھے ہوا۔ ”آئیے۔“

”صح بخیر۔“ وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ پاریک ہیل سے چلتی راہداری عبور کر کے لوگ روم میں آگئی جس کے ساتھ اوپن پکن تھا۔ گھوم کر اطراف کا جائزہ لیا۔

”گھر کو کافی رینوویشن کی ضرورت ہے۔ اور صفائی کی بھی۔ تم اجازت دو تو میں فیجنونا کو تھیج دیا کروں؟“ کچن کاؤنٹر کے ساتھ یہ لگا کر کھڑے اس نے فارس کو مخاطب کیا۔

”ضرورت نہیں!“ وہ آگے آیا، چائے تلے آنچ بند کی، اور اوپر کیبنٹ سے شیشے کا گلاس نکالا۔ زرتاش کے جہیز کے برتن جن میں سے اکثر ذہب پیک تھے۔

گلاس میں سے دھویا اور الٹا کر اسٹینڈ پر رکھا۔ پھر فرتنگ تک آیا۔ جواہرات سینے پہ بازو لپیٹی، ایک ہاتھ بدستور گردن کے موتویوں پر پھیرتی مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔

”ایک کام تھا تم سے۔ دو پھر کو مجھے زمر کے گھر لے جاؤ گے؟“

فرتنگ سے جوس کا ڈبہ نکالتا فارس لمحے بھر کر کا، پھر دروازہ بند کرتا کاؤنٹر تک آیا۔ چہرہ دیسے ہی سپاٹ رہا۔ ”کیوں؟ ڈرائیور کہاں گیا آپ کا؟“

”تمہیں میرا ڈرائیور بننے پر اعتراض ہے کیا؟“

”نہیں۔ مجھے کام سے جانا ہے دوپھر میں۔“ وہ شیشے کے گلاس میں جوس کا ڈبہ انڈیل رہا تھا۔ نارنجی رس سے گلاس بھرتا گیا۔

”کہہ جانا ہے؟“

”ایک دوست سے ملنے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے جاتے ہوئے مجھے ڈر اپ کر دینا اور واپسی پہ پک کر لینا۔“ فارس نے گلاس اسے پیش کیا تو اس نے لاتے ہوئے شانے اپکا کر گویا بات ختم کر دی۔

”بہت اچھا۔“ وہ مژکر چوہبے تک آیا اور مگ میں اپنی چائے انڈیلے لگا۔

”میں نے یوسف صاحب کو بتایا تھا کہ تم میرے ساتھ آؤ گے۔ وہ چاہتے ہیں تم اور میں کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ کافی خوش ہے تہاراں کر۔“

فارس نے چونک کر اسے دیکھا اور کیتلی واپس چوہبے پر کھی۔ ”آپ یوسف صاحب سے ملنے جا رہی ہیں؟“

”ہوں۔“ جوں کا گھونٹ بھر کر مسکرائی۔ ”زمر کے رشتے کے لئے انہوں نے مجھے کہہ رکھا تھا دو پروپوزل ہیں، وہی بتانے ہیں ان ہی۔“

وہ مقابل کا وزیر سے نیک لگا کر کھڑا تھا، نظریں چائے پہ جھکاتے ایک گھونٹ بھرا۔ بولا کچھ نہیں۔ انداز البتہ ست تھا۔ جواہرات اس کی آنکھوں پہ نگاہیں جھائے ہوئے تھیں۔

”ایک نج کا ہے، عمر پچاس سال سے اوپر پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے، تین بیوی ہیں۔ دوسرا میری کپنی میں ملازم ہے۔ عمر اس کی بھی اتنی ہی ہے، مگر پہلی بیوی اور بچ گاؤں میں رہتے ہیں۔“

کہہ کر اس نے اپنے حلق میں شیریں گھونٹ انڈیا اور فارس نے کڑا گھونٹ۔ دونوں نے اپنے اپنے جام نیچے کیے تو انکسی میں خاموشی چھاگئی۔

”تمہیں تو معلوم ہے، زمر کے والد بیمار رہتے ہیں، اپنی بیٹی کی بہت فکر ہے ان کو۔ وہ ہے بھی گردہ کی مریض۔ جانے کب تک یہ عطیہ شدہ گردہ چل پائے۔“

فارس نے کچھ نہیں کہا۔ ایک گھونٹ مزید بھرا۔ جواہرات نے قدرے بے چینی سے اس کی آنکھیں دیکھیں۔

”تمہیں شاید میری بات میں دلچسپی نہیں۔ اودہ یہ مت کہنا کہ تم ابھی تک زمر سے پرانا بغض پالے ہوئے ہو۔ اب تو وہ تہارے ظلاف بیان واپس لے چکی ہے، اب تو بھول جاؤ۔“

فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ جواہرات نے مصنوعی حیرت خود پہ طاری کی۔

”اوہ۔ تمہیں نہیں معلوم تھا؟ نج نے تمہیں بڑی کر دیا تو اس نے بھی تہارے بارے میں کہی ہر بات واپس لے لی۔ اس کے والد ندرت، سعدی، سب کے آگے کہی اس نے یہ بات، کہ وہ اب تم پہ کوئی الزام نہیں لگائے گی۔“

”اسی لئے اس نے پچھلے ہفتے مجھے اپنے گھر سے نکالا تھا؟“ وہ سخنیدہ تھی سے بولا تو جواہرات لمحہ بھر کو چپ ہو گئی۔ پھر لاپرواہی سے شانے اپکائے۔

”یہ انسانی نظرت ہے۔ یقین کے قریب تر ہو کر بھی شک آخری جھٹکا ضرور لگاتا ہے، پوری قوت سے، مگر اس کے بعد امن ہو جاتا ہے۔“

”وات اپورا!“

چند لمحہ مزید خاموشی سے گزر گئے۔ پھر وہ ذرا سا کھنکھا ری۔

”تمہارا آگے کا کیا ارادہ ہے؟“

”نہیں میں یہ گھنٹہ میں چھوڑ رہا، اگر آپ یہ پوچھتے آئیں ہیں تو۔“

”کیسی باتیں کرتے ہوئی؟ میں تمہیں یہاں دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہوں۔ تمہیں یہیں رہنا چاہئے، بلکہ جا ب اشارت کرو

کوئی، شادی کرو، زندگی کو سیل کرو۔ وہ ایک طوفان تھا، آیا اور گز ریگا۔ اس سب کو بھول جاؤ۔“

”مسز کاردار، طوفان کے گزر جانے سے جڑ سے اکھرے درخت واپس نہیں لگ جایا کرتے۔“

”تو نئے بیج بود۔ نئے رشتے بناؤ۔ شادی کرو فارس۔ ورنہ کبھی آگے گئے نہیں بڑھ سکو گے۔“

”میرے پاس اور بہت کام ہیں۔“ وہ تیخی سے کہتا آخری گھونٹ اندر انڈیلنا مڑ گیا۔

جو اہرات نے ذرا جوں بچا کر گلاں کا وظیر پر کھا، اس کا شانہ تھپکا اور ”دوپہر کو ملتے ہیں“ کہہ کر آگے نکل گئی۔ فارس آنکھوں میں ناپسندیدگی لئے اسے جاتے دیکھا رہا۔

❖❖❖

ہر سمت پیکرے ہیں جمائے ہوئے ڈیرے ..... اس شہر میں سانپوں کے خریدار بہت ہیں

دوپہر طلوع ہوئی تو اتنی سنبھلی کہ ہر چمکتی شے سونا دکھنے لگی۔ یوسف صاحب کا گھر بھی دھوپ میں جھلس رہا تھا جب زمر فانڈر اور پرس پکڑے اندر داخل ہوئی۔ راہداری سے گزرتے ہوئے وہ ڈرائیور کو روم کے جالی دار پردے کے پاس رکی۔ جالی کے پار صوفے پہ ناگ چ ناگ جمائے جو اہرات تکنست سے بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ انگلی پر مسلسل لاکٹ کی چین لپیٹتی، وہ مسکرا کر ابنا کو سن رہی تھی جو مقابلہ وہیں چیز پہ بیٹھے مددم آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ زمر نے سامنے سے آتے صداقت کو چیزیں تھماں میں اور رکھنا ہمارتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ جو اہرات نے مسکرا کر گردن اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے سلام کر کے سنگل صوفے پہ نکل گئی۔ عمر وہ کے فرق کے باوجود دونوں عورتوں میں کچھ بہت مشترک سا تھا۔ شاید تنقی ہوئی گردن۔ شاید گہری آنکھیں۔

”تمہارے والد نے مجھے اچھی خبر سنائی ہے۔ تم شادی کے لئے رضامند ہو۔“

زمر نے خاموش نگاہ بڑے ابا پڑا۔ وہ مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔

”اگر کوئی مجھ سے شادی پر رضامند ہو تو شیورا!“

”اور تم یہ فیصلہ اپنے والد پر چھوڑ چکی ہو؟“

”بالکل!“ اس نے شانے اچکائے۔

”واقعی زمر؟“ جو اہرات نے تیکھی، مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”وہ جس سے چاہیں تمہاری شادی کروادیں، یہ بات دل سے کہی یا اوپر اپر سے؟“

”جب کہہ دی ہے تو پورا کروں گی۔“ وہ بے تاثر تھی۔

”اورا گرتہمارے والد فارس کو منتخب کر لیں تھہارے لئے؟ کیا کرو لوگی اس سے شادی؟“

بڑے ابا نے ایک دم پر بیشان ہو کر جو اہرات کو دیکھا، گویا اسے روکنا چاہا، مگر وہ لاکٹ کی چین انگلی پر لپیٹتی زمر کو مسکرا کر دیکھے جا رہی تھی۔ بڑے ابا نے مجرمانہ انداز میں گردن موڑی۔ زمر لب بھینچ جو اہرات کو دیکھ رہی تھی۔ خلاف معمول اس نے اس بات پر کھڑے کھڑے جو اہرات کو گھر سے نہیں نکلا تھا۔

”تمہاری خاموشی سے میں کیا سمجھوں؟ یہی کہم نے رضامندی کا اظہار محض اور سے کیا تھا؟ درحقیقت تم اپنے والد کو یہ حق نہیں دے رہی۔ کیا یہ تمہارے والد کے ساتھ دھوکہ نہیں ہے؟“

”ایسا نہیں ہے۔“ وہ تیزی سے بولی پھر چپ ہو گئی۔

”میرا اور تمہارے اتا کا خیال ہے کہ فارس تمہارے لئے بہترین انتخاب ہے۔ پلیز وہ پرانی باتیں مت دہ رانا۔ تم خود بھی جانتی ہو۔“

۱۱۰۴ میں تھا۔ اب بتاؤ اپنی زبان پر قائم ہو؟“

بڑے ابا بے چارگی سے اسے تک رہے تھے۔ مگر خلافِ توقعِ زمر سپاٹ نظروں سے جواہرات کو دیکھتی رہی۔

”قائم ہوں۔ جانتی ہوں، ابا۔ میرے لئے غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔“ ضبط سے الفاظ ادا کئے۔

”تم سوچ لو یہ تو بس ہمارے یونہی خیال میں آیا تو...“ وہ شرمندہ سے وضاحت کر رہے تھے۔

”سوچ پچکی سب۔ جو مرضی آئے کریں۔“

”اور ہاں، فارس ابھی مجھے پک کرنے آئے گا۔ اگر تمہارا دوبارہ اس کو گھر سے نکالنے کا ارادہ ہے تو ابھی بتا دو تاکہ میں اسے منع“

۱۱۰۵۔“

زمر نے بہت ضبط سے خود کو بھڑکنے سے روکا۔ اور آہستہ سے بولی

”میں نے اس دن غلط کیا تھا، مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آئیں ایم سوری ابا۔“ وہ ایک دم اٹھی اور باہر نکل گئی۔ راہداری میں آکر گھر سے سانس لے کر خود کو نارمل کرنا چاہا۔ مگر پرانی باتیں یادیں سب ابل کر جیسے باہر آ رہا تھا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر، آنکھیں بند کیئے، اہاری کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

اندر جواہرات سہولت سے کہہ رہی تھی۔

”اسے منا نا مشکل نہیں تھا۔“

”اسے مانا نہیں کہتے۔ احتجاج کہتے ہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے افسوس کر رہے تھے۔ جواہرات نے بمشکل ناگواری چہرے سے

ہمہاں۔

”زمر کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ اپنا اچھا برا سوچ کر ہی جواب دے رہی تھی۔ اسے فارس سے شادی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

(ہمہلے ذیڑھ گھنٹے سے بول بول کروہ تھک گئی مگر یہ ابھی وہیں اگئے تھے۔)

”تھجی اس کا موبائل بجا۔ جواہرات نے نہیں اٹھایا، اسی طرح پیشی رہی۔“

”فارس باہر لینے آیا ہے مجھے۔ آپ یوں کیوں نہیں کرتے کہ باہر دروازے تک چلے جائیں اور اسے اندر لے آئیں؟ میرے کہنے تو وہ کبھی نہیں آئے گا۔“

بڑے ابا نے اثبات میں سر ہلا کیا، اور وہیل چیز کے پیسے چلاتے مڑ گئے۔ ساتھ میں صداقت کو آواز بھی دی۔ جب وہ واپس آئے تو فارس ان کے ساتھ تھا۔ (زمر اس دوران اندر جا چکی تھی)۔

وہ آرام دہ نہیں تھا، مگر مجبور تھا۔ خاموشی سے اس سنگھ صوفے پر پیٹھ گیا جہاں سے ابھی زمراٹھ کر گئی تھی۔

”طبعیت کیسی ہے آپ کی؟“ وہ مضم آواز میں پوچھ رہا تھا۔ دائیں ناگ بائیں گھنٹے پر کئے کہنی صوفے کے ہتھ پر۔ بس جلدی سے وہ یہاں سے نکل جائے۔

”اچھا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم آئے۔ تمہارا بہت شکر یہ فارس۔“

وہ دونوں چند رسمی کلمات کا تبادلہ کر رہے تھے۔ جواہرات نے بوری ہو کر آنکھیں گھما کیں۔ چند ثانیے مزید سر کے۔ صداقت چائے لائیں۔ سر دکر کے جا پکا تو جواہرات ذرا سا کھنکاری۔ دونوں نے اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا موقع ہے تم سے بات کرنے کا فارس!“  
بڑے اباہری طرح چونکے۔ فارس بھی دھیان سے سننے لگا۔

”یوسف صاحب کا تم کتنا احترام کرتے ہو، ان کے تم پر کتنے احسانات ہیں، کتنے برے وقت انہوں نے تمہاری مدد کی، ہم سب اس سے واقف ہیں۔“

زمر پھر سے راہداری میں آ کھڑی ہوئی۔ دھڑکتے دل سے وہ دیوار سے لگی سن رہی تھی۔

”جی!“ فارس نے اچنچھے سے جواہرات کو دیکھتے سر ہلاایا۔

”ایے میں یوسف صاحب کا حق ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی طرح سمجھ کر تم سے ایک سوال کر سکتیں۔“

بڑے ابا نے بے چینی سے جواہرات کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ بازر ہنسنے، خاموش رہنے کا اشارہ، یہ سب بہت جلدی ہو رہا تھا، مگر وہ ان کو دیکھے بنا، مسکراتے ہوئے فارس سے کہے جا رہی تھی۔

”میں سن رہا ہوں۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”میں تو...“ وہ جلدی سے کوئی بات بنا ناچاہتے تھے مگر...“

”وہ چاہتے ہیں کہ زمر کا جو رشتہ تم نے چند برس قبل مانگا تھا، اس کا جواب وہ آج دیں، کیونکہ اس وقت کا جواب ان سے پوچھنے بنا دیا گیا تھا،“ اگر ان سے پوچھا جاتا تو ان کا جواب مختلف ہوتا۔“

جوہرات کو روکتے بڑے ابا خاموش ہو گئے۔ باہر کھڑی زمر کے لب حیرت سے کھل گئے۔ یہ سب یوں نہیں ہونا تھا۔

فارس بالکل رک کر انہیں دیکھنے لگا، جیسے سمجھنے آ رہا ہو۔

”یوسف صاحب یہ چاہتے ہیں کہ تمہاری اور زمر کی شادی ہو جائے۔“

اس کا سانس واقع تھم گیا۔ بے اختیار اپا کو دیکھا۔ انہوں نے بے چارگی سے چہرہ جھکالایا۔

”کوئی جلدی نہیں ہے، تم سوچ سمجھ کر جواب دینا۔“ جواہرات نے تیزی سے کہا، مبادا وہ انکار ہی نہ کر دے۔ بڑے ابا نے سراخھایا۔

”اور کوئی زبردستی بھی نہیں ہے بیٹا۔ بس ایک خیال تھا کہہ دیا۔ تم ناں کہہ دو تب بھی ہمارے تعلقات و یہی ہی رہیں گے۔“

فارس نے بمشکل سر اشبات میں بلایا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

”یوسف صاحب بہت پریشان رہتے ہیں زمر کے لیے، ان کو اپنی زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں، وہ اپنے سامنے اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص کو سونپ کر جانا چاہتے ہیں جس پر وہ اعتبار کرتے ہوں، اور تم وہ واحد شخص ہو فارس۔“ جواہرات نزدی سے سمجھا رہی تھی۔

”میں.... مجھے کچھ وقت دیں۔“ بدقت وہ کہہ پایا، پھر ایک سلسلتی نظر جواہرات پر ڈالی۔

”میں باہر انتظار کر رہا ہوں آپ کا۔“ اور اٹھ کھڑا ہوا، جیسے مزیدہ ماں بیٹھنا دو بھر ہو۔ بڑے ابا نے یاسیت سے اسے جاتے دیکھا۔

وہ ان سے نگاہ ملانے بغیر دھیما ساسلام کہ کر باہر نکل آیا۔

راہداری میں وہ ٹھنکا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ زمر کھڑی تھی۔ ساکت، زرد سفید چہرہ لئے، ضبط کی انتہا پ۔ بس ایک لمحے کو رک کر

اس نے زمر کو دیکھا، مگر وہ چہرہ پھیر گئی، وہ بھی نہیں رکا۔ تیر تیز قدموں سے چلتا، بلیز پار کر گیا۔

جوہرات چند ثانیے مزیدہ اپا کو تلی دیتی رہی، اور جب لگی تو زمر ہنوز کھڑی تھی۔ اس کا سفید چہرہ اب اہانت سے گلبی پڑتا جا رہا تھا۔

”یہ کیا تھا؟“ وہ دبی دبی سی غرائی تھی۔ آواز بہت دھیکی رکھی۔ ابا نہیں سن سکتے تھے۔

”تمہارا پچاس فیصد کام ہو گیا۔“

”مگر اسے میرا رشتہ لے کر آنا چاہیے تھا، نہ کہ میرا باپ اس کی منت کرتا۔“ وہ ضبط کے مارے پھٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ ”یہ پلان کا حصہ نہیں تھا۔“

”تم نے پلان سنائی کب تھا؟“ وہ شانے اچکا کرمو بائل پہن دبانتے لگی۔ زمر آنکھوں میں تپش لئے اسے گھور رہی تھی۔ جواہرات نے تھکی ہوئی سانس اندر کھینچی۔

”تم کیوں فکر کرتی ہو؟ شادی کرنی ہے نا، ہو جائے گی۔ چاہے جیسے بھی ہو۔ دیکھو میں زیادہ قرآن نہیں پڑھتی مگر ایک آیت میں بت خوشی سے ہر جگہ کوٹ کرتی ہوں۔“ ذرا سما مسکرائی۔ ”اور وہ یہ کہ، عورتوں کی چالیں بہت عظیم ہوتی ہیں۔“ اس کے گال کو ہولے سے چھوکر، ”عکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ زمرا نہیں سلکتی نظرؤں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔“

فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر جیسے ہی جواہرات نے دروازہ بند کیا، فارس نے تیزی سے کار پیچھے کی، گیٹ سے نکالی اور سڑک پر ڈال دی۔ اس کا جہڑہ بھنجا ہوا تھا، و قفسے و قفعے سے ایک قہر با راظہ جواہرات پر ڈال دیتا۔

”یہ سب کیا تھا، مسز کار دار؟“

”ایک معدور اور بے بس آدمی تم سے درخواست کر رہا تھا اپنی بیٹی کے لئے۔“

”میں بچنہیں ہوں۔ آپ ان کے منہ میں الفاظ ڈال رہی تھیں۔“ اکتاہٹ سے اس نے سر جھکا۔ ”صح آپ میرے پاس آئیں، آپ کو میری شادی کی فکر ہونے لگی، اور اتفاق سے آج یہ یوسف صاحب نے یہ بات کہ دی۔“

”سامنے کی بات ہے، تم سے بہتر داما دا ان کو نہیں ملے گا۔“

”یہ خیال بھی آپ نے ہی ڈالا ہو گا ان کے ذہن میں۔ میں تو جیسے آپ کو جانتا ہی نہیں ہوں۔“ غصے سے بولتا، وہ ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔ کار کی رفتار تیز ہوتی گئی۔

”مجھے تمہاری فکر ہے فارس!“

”پہلے تو ساری زندگی آپ کو میری فکر نہیں ہوئی۔“

”یہ تو پرانک ہے فارس۔ میں نے یا اور گزیب نے ساری زندگی تمہاری فکر نہیں کی، مگر جس شخص نے کی، تم پاٹنے احسان کیے جو تمہیں اچھی نوکری دلوانے میں مدد نہ کرتا تو آج تم سڑکوں پر اوارہ پھر رہے ہوتے، اب وہ شخص معدور ہے اس کی بیٹی بیمار ہے اور وہ تم سے صرف ایک چیز مانگ رہا ہے، کہ اس کی بیٹی سے شادی کر لو تو تم اسے بھی انکار کر دو گے؟ کیا یہ ہوتا ہے احسان کا بدلہ؟“ تھی سے اسے دیکھ کر وہ کہہ رہتی تھی۔

فارس اسی طرح تیز ڈرائیو کی گیا۔ البتہ خاموشی کا لباس و قفہ دونوں کے بیچ حائل ہو گیا۔

”ان کی بیٹی کبھی نہیں مانے گی۔“ بہت دیر بعد وہ بولا۔

”مان جائے گی۔“

”کبھی نہیں۔“

وہ مان کچکی ہے یار۔ جواہرات نے بے زاری سے سر جھکا اور کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔

اور فارس غازی نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا، پھر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا غصہ ایک نئی سوچ میں ڈھلتا گیا۔ لب

کا نئے آنکھیں سکیرے وہ چند منٹ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

”آپ ان سے کہیے میں سوچ کر بتاؤں گا۔“ آپ کہ وہ بولا تو آواز مدھم تھی۔ جواہرات نے گھری مطمئن ہی سانس خارج کی۔ کام تقریباً ہو گیا تھا۔

فارس نے اسے گھر اتارا اور خود کار سے نکل کر انیکسی کی طرف ہولیا۔ قصر کی عقبی سمت میں فیجو ناٹرے میں کچھ چیزوں لادے ہاشم کی بالکونی کے بیرونی زینے سے نیچے اتر رہی تھی۔ فارس کار سے اترنا، اور وہیں کھڑا رہا۔ جب وہ قریب سے گزرنے لگی تو اسے روکا۔

”اے.... بات سنو!“ انگلی سے اشارہ کیا۔ وہ مودب گھر پر اعتمادی چلتی قریب آئی۔

”لیں سر؟“

”تمہاری اتنی ہست کب سے ہوئی کہ تم میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہو؟“  
فیجو ناکامنہ مارے شاک کے کھل گیا۔

”میں تو کبھی بھی نہیں..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”کیا جب پر اسکیو ٹر ز مر آئی تھی تو تم اسے میرے گھر نہیں لائی تھی، ہاں؟“ غصیلی آنکھوں سے وہ اسے گھور رہا تھا۔

”کل شام؟ نہیں تو۔ پر اسکیو ٹر تو آدھے گھنٹے کے لئے آئی تھیں، سارا وقت وہ مسز کاردار کے پاس بیٹھی رہیں، اور پھر واپس چل گئیں۔ وہ تو اس طرف آئی بھی نہیں۔“ وہ جیران پر بیشان ہی صفائی دے رہی تھی۔

”چج کہہ رہی ہو؟“

فیجو نے جلدی سے سرا ثابت میں ہلا کیا۔

”ہوں ٹھیک ہے۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔“ وہ مڑنے لگا، پھر رکا۔ ”یہاں پر میری اسنجیو ہوا کرتی تھی، کدھر گئی؟“

”وہ... اس نے مسز کاردار کا نیکلسن چڑایا تھا، سوا سے نکال دیا۔“

”اور تم نے اس کی جگہ لے لی۔ ہوں؟“

”جی“ میں اب یہاں کی ہیڈ اسٹاف ہوں۔“ گردن ذرا کڑا کر بولی۔

”ٹھیک ہے۔ آئندہ میرے گھر کے قریب مت پھکلنا۔“ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتا وہ آگے بڑھ گیا۔ چہرے کے تاثرات میں پھرے سے غصہ چمکلنے لگا۔

جو اگلوں تھا فیجو نے وہ اگلوں لیا تھا۔

”تو میدم پر اسکیو ٹر ادھر آئی تھیں اور سارا وقت جواہرات سے با تین کرتی رہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ فارس اور زمر کی شادی کا خیال کس نے کس کے ذہن میں ڈالا؟ جواہرات نے؟ یا زمر نے؟ یہ کچھ دی کس نے پکائی، ہوں؟“ اس نے سبزہ زار پر چلتے ہوئے غفر سے سر جھکنا۔ ”کیا یہ دونوں عورتیں مجھے بے وقوف سمجھتی ہیں؟“

اپنے دروازے پر کر کر اس نے موبائل نکالا اور کال ملائکر کان سے لگایا۔

”جی فرمائیے۔“ سعدی کی مصروف آواز گوئی۔

”کدھر ہوتم؟“

”عموماً اس وقت شریف لوگ اپنے آفس میں ہوتے ہیں، مگر اونہ سوری، آپ کی چونکہ اپنی کوئی جا بہ نہیں اور چار سال سے آپ بیکار ہیں، تو آپ کو کیا معلوم۔“

”بک بک مت کرو۔ فوراً اپنے وادا کے گھر جاؤ۔“

”جی بالکل، میں تو بیٹھا ہی فارغ ہوں، اور آفس بھی میرے مرحوم ابا جان کا ہے نا، جو میں جب چاہے منہ اٹھا کر نکل جاؤں۔“ وہ جلا، صنا بیٹھا تھا۔ آگے پیچھے کاغذوں کا ڈھیر۔ کپیوٹر پر کھلے ڈھروں کام۔ اوپر سے تازہ تازہ پڑی بس سے ڈاٹ۔

”تم جا رہے ہو یا نہیں؟“

”ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نکلا تو دوبارہ یہ لوگ داخل نہیں ہونے دیں گے، اور جو میری بس ہیں نا، وہ پہلے ہی....“

”تمہارے دادا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری زمر پھپھو سے شادی کروں۔ کیوں ہو گئی زبان بند؟ اب امی کو لے کر ان کی طرف جاؤ اور جو بھی مناسب لگے کرو۔“ اور دوسرا طرف سعدی کی زبان واقعی بند ہو گئی تھی۔ فارس نے فون رکھا اور اندر چلا گیا۔

قدرتے فاصلے پر واقع کاردار قصر کے لاڈنچ میں تھکی تھکی سی جواہرات اپنی مخصوص اونچی کرسی پر بیٹھی تھی۔ تھوڑی تلے ہٹلی جائے وہ لمڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سہہ پہر میں آس پاس سناتا ساتھا۔ ہاشم، تو شیر و اس، سونیا، کوئی بھی گھر پہنچتا۔ وہ بہت عرصے بعد کسی دیکھنے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اور یہ سناتا کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ بجائے آفس واپس جانے کے، وہ ادھر ہی بیٹھ گئی۔ آج کی کارروائی نے اسے تھکا دیا تھا۔

پیچھے ایک ہفتے میں اس نے بارہ ماہی کے کئی ادوا کو ذہن میں دھرا یا تھا۔

سات سال پہلے..... جب وہ سب پہلی دفعہ ملے تھے۔

پانچ سال پہلے..... جب وہ خوشی سے ایک دوسرے پہ عنایات کیا کرتے تھے۔

چار سال پہلے..... جب ان کے خاندانوں میں خونی لکیر آتھی تھی۔

گمراہی کے ابواب کا آخری حصہ بھی رہتا تھا۔ اور جواہرات کاردار کے لئے یہی سب سے تکلیف دھتا۔

ڈیڑھ سال پہلے کیا ہوا تھا، سعدی اب ان کے گھر کیوں نہیں آتا تھا، اور وہ تمام مسئلے جو ہاشم نہیں سنبھال سکتا تھا۔  
وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی یاد کرنے لگی.....

اس کی نم آنکھیں کھڑکی پہ چھیں، اور اس کے شستے پر پرانی کہانیاں ابھر ابھر کر ڈوبنے لگیں۔

❖❖❖

کوئی ہے رنگ، کوئی روشنی، کوئی خوبصورتی..... جدا جدا ہے تاثر ہر اک لمحے کا

موجودہ دن سے ڈیڑھ سال قبل:

قصیر کاردار میں وہ شام بہت سے رنگوں، قہقہوں اور چہل پہل کے ساتھ اتر رہی تھی۔ میری اینجیوٹرے اخاء، مسکراتی ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں نیچے کافی آوازیں آرہی تھیں، جیسے مہماں آئے ہوں۔ وہ اوپر آئی اور ہاشم کے کمرے کے سامنے رکی۔ دروازہ اونچ کھلا تھا۔ ڈرینگ مرر کے سامنے کھڑے سعدی اور ہاشم کی پشت جھلک رہی تھی۔ سعدی کچھ کہہ رہا تھا، اور ہاشم مسکرا کر سنتا کف لنس پہن رہا تھا۔

میری نے دروازہ بجا یا۔ وہ دونوں مڑے۔ اس نے ڈر اس اندر کیا۔

”سر، آپ کو کاردار صاحب نیچے بلا رہے ہیں۔“

”میں بس تیار ہوں۔“ اس نے دوسرا اکٹھا کر پہنچنے ہوئے خود کو آئینے میں دیکھا۔ وہ مسکرا کر سر ہلاتی واپس مرجنی۔

سعدی نے واپس اسے دیکھا۔ وہ آفس سے ابھی آیا تھا اور چونکہ سعدی کی پوری فیلی ڈنر پر مدعا تھی، اس لئے وہ آتے ساتھ ہی جلدی ڈنر کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ نیچے سب کھانا شروع کرنے کے لئے اس کے منتظر تھے۔ سعدی بلا نے آیا اور پہلو ہیں کھڑا ہو گیا، بیہاں تک

کہ سیری کو بھاگی گی۔

"نچے ذرا کا پتہ ہوتا تو میں جلدی آ جاتا۔ شہری تھا، بھول گئی تھی۔" اس نے پر غوم اٹھا کر کپ اترتے آئئے میں اپنے عکس دیکھنے ہوئے کہا۔ "سو تھا ری میں نے بارہ ذرا پتہ کیا ہے ہوں؟" اس نے ذرا کی وہ پتھر سے پوچھی۔

"تھی، مگر وہ تو پر اتنی بات ہو گئی اب تو اندری فیصلہ کا راست بھی آگیا ہے اور جب انکل کو اس کے انھیں تھے میں ایسے میشنا کا علم ہوا تو انہوں نے ہمیں ذرا پڑھو کر لیا۔" پر غوم کا اپرے کرتے ہاشم نے مکرا کر سعدی کو دیکھا۔ وہ سیاہ کوت اور سفید شرت میں ملبوس تھا، اسی طرح سے چھوٹے تھے اور چھرے کی حالت و سمجھی کی بڑھ گئی تھی۔ اندرا بھی بھی مصوص تھا۔  
بولتے بولتے سعدی رکا سانس اندر کو کھینچا۔ پھر تھائی انداز میں ہاشم کو دیکھا۔

"کتنا اچھا پر غوم ہے۔"

"سو تو ہے۔" ہاشم نے مکرا کر آئئے میں خود کو دیکھتے، اگر ان پا ایک اور اپرے کیا پھر کپ اٹھائی، شیشی پڑھائی۔ صیحتی کو ذہنی میں ڈالا اور سعدی کی طرف چڑھایا۔

"اب یہ تھا رہا ہے۔"

"وہ ایک دم بدک کے پیچھے ہوا۔ ہاتھ اٹھا کر جلدی سے فلی میں سر ہلانے لگا۔" ہمیں نہیں ہاشم بھائی میں اس نے تو نہیں کہہ دیا تھا۔

"رکھ لونیا را!"

"نہیں، پہلی نمبر ای مطلب نہیں تھا۔" وہ اپنا شرمندہ تھا کہ جنمیں۔ اگر آپ اس طرح گریں گے تو میں وہارہ بھی آپ کی کسی چیز کی تعریف نہیں کر سکوں گا۔"

ہاشم نے اس کی پوری بات تسلی سے نہیں پھر سر ہلا کیا اور پر غوم کی ولی اس کے کوت کی جیب میں ڈال دی۔

"مجھ سے بجٹ میں تم بھی نہیں جیت سکتے۔ سو کوشش کیوں کرتے ہو؟ چلو یعنی اپ انتخاب کر رہے ہوں گے۔" اس کا کندھا تھپتی کر دو دوازے کی طرف بڑھ گیا۔ پہلے حد قفت سے کھڑے سعدی نے خود کو دفعہ کوسا۔ مگر اب وہ تخت و اپس نہیں کر سکتا تھا اور پھر کرے پا۔ ایک سرسری نظر ڈالتا اپس پلٹا۔ ان چند منٹوں میں بھی اس نے محض کریا تھا کہ وہاں شہریں کی کوئی چیز نہیں رکھی تھی۔ وہ غالباً اختلاف کروں میں درجے تھے۔ شہر ان تھا نہیں بھولی تھی اور ایک دوسرے سے بات تک نہیں کرتے تھا اور یہ سب کو پڑھتا۔

وہ دونوں اکٹھے بیرونی اتار بے تھے جب ہاشم نے سرسری سوال کیا۔ "فارس کیسا ہے؟ ملاقات ہوئی؟"

"تھی، بس ایک دوبارہ میٹھے نیل جا۔ کہا ہوں آپ کو تو پہ بے الگینہ سے واپس آئنے کے بعد ان تین چار ماہ میں میں جاپ و نیمرہ میں بہت مصروف تھا۔"

"ہوں۔ اس کا کیس کیسا جا رہا ہے؟"

"وہیں سے ملا تھا۔ وہ تو امید دلا دتا ہے کہ چند ماہ میں ان کو بری کر دے لے گا ہے نا؟" قدرے امید سے ہاشم کو دیکھا۔ وہ بڑو تیک سکر ادا کیا۔

"ہاںکل۔" اور دونوں آگے چڑھتے آئے۔

ڈرائیکر دوام میں روشنیوں کی برسات تھی گویا۔ قانون، میزی کی صدمہ بیان اسے جل رہا تھا۔ سربرہاتی کری پا اور گلزاریب کاردار ہوا جان تھے۔ وہ ایسیں ہاتھ جو اہرات تھی اور باعیسیں ہاتھ کی چلی کری خالی تھی۔ ہاشم نے وہی کری سنبھالتے ہوئے اور گلزاریب کی سیدھی میں وہ سربرہاتی کری پتھی جس کو دیکھا جس کو دو زمر کے حادثے کے بعد یعنی آجھی سال بعد آپ دیکھ رہا تھا۔ اس کی عینک، ماٹھے پر کے اور

بڑے۔  
ہزار کے تھے گیرجاں گی۔ تاہم بھر جو سونہ پختکی اور کھٹکی کہیں گی۔  
تو کے کہڑے کے تھے چیزیں تھیں اور تھیں۔ کہڑے نے اسے جاندے تھے ملکی۔ ملکی اسے بھر کر  
لی کاٹھ کی۔ پہنچا پہاڑ کا نہ کارے ہیں اسے لے لیں گے کہ کس کی طرف چھوڑیں۔  
تھیں کوہتاں آئیں اپنے تھے کے ساتھ۔ صحنی نے کھڑک کا سے کیا ہو گئے کہ کس کی طرف چھوڑیں۔  
تو تم تو نہ اس ساتھ کا تھا تو کہا تھا کہ کا تھا جائیداد۔  
تھیں نے پہلے صحنی کو کہا اور اس کی سمت خدا کوڑیں نے اے گئی گئیں۔  
آدمیوں کے۔ ایک آئی پڑھوں گیں۔ اس سے اپنے سر پر ہٹایا ایک خدا کوڑیں پاول اور ڈاکٹر کوڑیں پاٹے

مکالمہ میں اپنے بھائی کو اپنے بھائی کا بھائی کہا جائے۔ اسی طبق میں اپنے بھائی کو اپنے بھائی کا بھائی کہا جائے۔

کے لئے کامیابی میں ملکی شرکتی اور ایکلی کرنٹ کو اپنے درجہ بندی میں خود کی تحریک کرنے سے اسے دیکھتا ہے۔ تکمیل کرنے کا پڑا پکا ہے۔

”کہا جائے کہم کیلئے کوئی بھی نہیں“  
اور گریوب کے سارے حصی نے ہے اپنے جیب میں بالآخر اس نامہ کو کوئی کاٹاں جائے نہ کرے۔ اس کی خوشی تک

کیلی اگر کوئی سفرہ میں آتے تو، جنی نے تھلی میں جنی سفرہ کی پسندیدگی کی وجہ سے اپنے بھائی کے ساتھ۔

”بھروسو، یک دن کا بارج اور سماں اور بڑیں بڑیں بڑیں جس کا نہ کہا سکتے ہیں۔ میرا بھروسو، میرا بھروسو۔“

لے مین هو کے اپنے بھائی کا نام تھا۔ ”کراپ پری ایکس“ کے وظائف croquembouche

”ایک سو گیارہ فلمیں اور ڈرامے دیکھنے کے باوجود تم نے بورڈ کیسے ناپ کیا؟“ ایک مکڑا توڑتے ہاشم نے یونہی پوچھا تو نہیں نے چونک کرائے دیکھا، پھر چہرے پر ناسپندیدگی پھیل گئی۔

”میں بہت کچھ ایک ساتھ کرنے میں ماہر ہوں ہاشم بھائی!“

ہاشم کندھے اچکا کر کھاتا رہا۔ شہرین بس پلیٹ کو دیکھتی کھارہ تھی۔ جواہرات مختار بگر مسکراتی نظر وہ سے بار بار لا دخ کی سست دیکھتی جہاں شیر و غائب ہوا تھا۔ سوائے سعدی کے وہ کسی کی بات کا ابھی دل سے جواب نہیں دے رہی تھی۔ شیر و اور اونگریب کا کسی نہ کسی بات پر روز بھگڑا ہونا معمول بن گیا تھا۔ صبح بھی نئی گاڑی لینے کی فرمائش پر اسے جھاڑ پڑی تھی۔ اور پھر سعدی کو بروادشت کرنا۔ اس کا عیناً محال ہو چکا تھا۔

کھانے کے بعد سب لا دخ میں آییشے تو وہ وہاں سے بھی اٹھ گیا۔ اُنہیں اچھا رہا، آوازیں باتیں۔ اور انگریب صاحب کی کوئی کال آگئی وہ اٹھ کر باہر گئے تو سعدی کے ساتھ صوفے پہنچنی ندرت نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

”کیا تم نے ہاشم سے فارس کے کیس کی بات کی؟“

”ان کا دلیل کر تو رہا ہے نامی اب اور کیا کرے۔“

”کیا کر رہا ہے وکیل؟ ڈھائی سال سے چند ماہ چند ماہ کی رث لگا رکھی ہے ایسے تو اگلے پانچ سال گزر جائیں گے اور فارس باہر نہیں آئے گا۔“ وہ اس کو شکوہ کنان، نما آنکھوں سے دیکھ کر بولیں تو سعدی نے خفیٰ سے ان کو دیکھا۔

”تو میں کیا کروں امی؟ ہاشم بھائی وکیل کو پیسے دے رہے ہیں، اب تاریخ نہیں ملتی اگلی پیشی کی تو ہم کیا کریں۔“

”تم سعدی اپنے ماموں کو بھولتے جا رہے ہو۔ تم سب اپنی زندگی میں مگن ہو کر اس کے حال پر چھوڑ چکے ہو۔“

”امی!“ اس کا دل دکھ گیا۔ ایسے نہیں ہے۔ میں نے جاب شروع کی ہے، چھے بجھے تو تھر آتا ہوں، اتنے کام ہیں، میں پھر کر بھی کیا سکتا ہوں؟“

ندرت نے جواب نہیں دیا۔ آنکھ کا کنارہ پوچھتیں، خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔ سعدی نے بھی رخ پھیر لیا۔ (اب وہ اور کیا کرے؟ وہ وکیل تو نہیں ہے نامی کو سمجھے ہی نہیں آتی۔) اس نے چڑ کر سوچا۔ (امی کو تو ہر وقت ایک ہی سوچ پر بیٹھان کی رکھتی ہے کہ.....) اسی وقت ندرت بڑ بڑا ایس۔

”پتہ نہیں وہ اس وقت کس حال میں ہو گا؟ کھانا بھی کھایا ہو گا یا نہیں؟ نہ جانے کتنے ظلم کر رہے ہوں گے پولیس والے اس پر۔“  
(بالکل! یہی سوچ!) وہ تنگ کر رخ پھیر گیا۔ شہرین اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا تو وہ کسی اور جانب دیکھنے لگی۔ ندرت ہنزو، ہی سوچ رہی تھیں۔ فارس۔۔۔ اس مظلوم کا اس وقت کیا حال ہو گا؟

..... ♦♦♦♦♦ .....

قصر عمر گواہی دے گا کیسے کیسے کرب ہے ..... کیسی کیسی رت گزری ہے ہم پر اتنے سالوں میں جیل کے برآمدے میں مددم تباہ جل رہی تھیں، پہریدار اسی حوالاتی کوٹھی کے باہر جمع تھے، اور وہ اندر کھڑا، سفید کرتے کے آستین موڑے، سلاخیں پکڑے، غصے سے اونچا اونچا کہہ رہا تھا۔

”اے سنگل پسلی، بات دماغ میں فٹ کرلو، آئیندہ اس طرف سے۔۔۔“ (کنارے والے کمروں کی طرف اشارہ کیا) ”اشرف چیم کا کوئی بندہ ادھر آیا تو اپنے قدموں پر اپس نہیں جائے گا۔“

جواب میں اس سیل سے موچھوں والے اشرف چیم نے چلا کر کچھ کہا تو وہ اور بھی بھڑک گیا۔

”اس کو چپ کر الامحمدین، درنہ آج یہ میرے ہاتھوں نہیں بچے گا۔“

”اچھا بس کردے، تو ہی چپ ہو جا۔۔۔“

”میرے گروپ کے بندے اس کے باپ کے ملازم نہیں ہیں جو اس کے حصے کی مشقت کریں، اس کو آخری دفعہ سمجھادو، درنہ۔۔۔“  
”وہ اب بلند ہوتا جا رہا تھا، پھر بکھل سپا ہیوں نے آ کر معاملہ رفع دفع کرایا۔ فارس ہونہ کرتا سر جھنٹتا واپس زمین پر آبیٹھا۔ اس تاریک کمرے میں دوسرے کوئے میں کوئی اور بھی بیٹھا تھا۔

”غازی بھائی، یہ سپاہی آپ لوگوں سے ڈرتے کیوں ہیں؟“

”ہم چھٹ کر چلے جائیں گے، یہ یہیں ڈبوئی دینے رہیں گے، اصل قیدی تو یہی ہیں۔“ وہ بے زاری سے بولا، پھر تیکھی نظر دوں نے اس لڑکے کو دیکھا جس کا چہرہ تاریکی میں تھا۔

”اپنے حصے کا کام وقت پر ختم کیا کرو، تمہارے باپ کی جیل نہیں ہے یہ۔“

”یوں، میرے ایک قیدی کی حیثیت سے بھی بہت رائیں ہیں جن کی واپیلیشن کے جرم میں میں گورنمنٹ آف پاکستان کو ۸۰۰ کر سکتا ہوں، اور جب سے میں ادھر آیا ہوں، میرا ایک بھی رائٹ پور انہیں کیا گیا۔“ وہ بہت سمجھی گی سے کہتے ہوئے آگے کو ہوا تو چرا رہنی میں آیا۔ وہ خوش بکھل نوجوان تھا وہ، بال نو عمر لڑکوں کی طرح ماتھے پر کئے تھے، اور آنکھوں میں لاپرواہی تھی۔

”جاگ جاؤ، بیٹا، یہ پاکستان ہے!“

”پتے ہے۔ مگر جتنا وقت آپ جیل میں بھگڑوں اور گروہ بندی پر لگاتے ہیں نا، اگر اتنا اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے پر لگادیتے ہو۔۔۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

”اپنے کام سے کام رکھو۔ زیادہ انگوٹھی نہ ہو۔“ وہ چڑکرخ پھیر گیا۔

”ویسے آپ نے یہ دونوں قتل کیے تھے؟“ کچھ دیر بعد وہ بکھری سے پوچھنے لگا۔ فارس نے مذکور ترشی سے اسے گھورا۔

”بچھلے جھٹے گھنٹے سے کتنی دفعہ پوچھ پکھے ہو، میں بار بار بتانے کا پابند نہیں ہوں۔ تم بتاؤ، کس جرم میں آئے ہو؟“ کڑے انداز میں نئے سل میٹ کی تفتیش شروع کی جو آج کے بھڑکے کے باعث ابھی تک ہوئیں تھیں۔

”میں۔۔۔“ اس نے بے پرواہی سے سامنے کے بال ہٹائے۔ ”کریڈٹ کارڈ فراؤ کے جرم میں۔ حوالاتی قیدی ہوں۔ کیس مددالت میں چل رہا ہے۔“

”تو تم نے جرم کیا تھا؟“

”کیا تو تھا!“ وہ چڑانے والے انداز میں مسکرا یا۔

”لگ بھی رہا ہے۔ پر اسکیوٹ کون کر رہا ہے؟“ یہ سوال وہ اکثر پوچھا کرتا تھا۔

”وہ جو پورے کورٹ میں سب سے سڑی ہوئی پر اسکیوٹر ہے۔ زمر یوسف۔“ اس نے منہ بنا یا۔ فارس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”تمہارا دکیل اس کے مقابلے میں کیس جیت جائے گا؟“

”ہا۔۔۔ ایسا ویسا۔۔۔ ہاشم کاردار ہے میرا دکیل۔“ اس نے کالر جھاڑے۔ فارس چونکا۔

”اس کو دینے کا پیسہ کہاں سے آیا؟“ شکل سے تو تم یتیم خانے سے بھاگے لگتے ہو۔“

”وہ میں، اصل میں اور نگزیب کاردار کا یک پیشہ مینیجر ہا ہوں، اس لیے انہوں نے زبردستی ہاشم کو میرا دکیل مقرر کر دیا ہے۔“ احر شفعت نس کر بولا۔ فارس نے چونک کرا سے دیکھا۔

”تو تم اور گنزیب کاردار کے لئے کام کرتے تھے؟“

”بھی۔ آپ کے ماموں کے لیے۔ اور نہیں، میں اتفاق سے آپ کے بیل میں نہیں آیا۔ ہاشم نے مجھے ادھر بھجوایا ہے، تاکہ میں آپ کا خیال رکھ سکوں۔“ فارس نے جواباً تیر نظروں سے اسے گھورا۔

”خیال رکھ سکو یا نظر؟“

”ظاہر ہے، نظر!“ وہ لا پرواہی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ باہر اندر ہیرے میں مدھم جلتی بیوں میں پھر یہ اڑپتھے نظر آرہے تھے۔

”کیا کرتے تھے ماموں کے لئے؟“ وہ اس بڑے کو سلسلہ چھپتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ایکشن اسٹریٹیجی، کیمپنی میجنٹ، پبلک اینج کنسلنٹنگ اور غیرہ۔“

”یعنی ان کو ایڈ واائز کرتے تھے۔ کبھی جیل میں سڑتے بھانجے کو نکلوانے کا مشورہ نہیں دیا؟“

”وہ...“ احر نے کھیانے انداز میں تھوڑی کھجاتی۔ ”وہ تو مدد کرنا چاہ رہے تھے آپ کی مگر...“

”مگر؟“ وہ چونکا۔

”دیکھیں ان کے ایکشن کے لیے یہ اچھا نہیں تھا، سو میں نے مشورہ دیا کہ... وہ خود کو اعلیٰ کر لیں آپ سے... بھتی وہ میرے کلام بخشت تھے، مجھے ان ہی کافائدہ دیکھنا تھا۔“ وہ جلدی جلدی وضاحت دے رہا تھا اور فارس ایک دم سے اٹھ کر بیٹھا، میں نہیں چلتا تھا کہ اس کی گردن مردود رہے۔

”تو یہ یہک مشورے دینے والے تم تھے؟“ ضبط بھری کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ ”یوں کرو، اپنا سامان سمیٹ لو اور صبح کسی اور سیل میں اپنی شکل گم کر لینا۔ یہاں نہیں رہو گے تم۔“ درشتی سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کر دور چلا گیا۔

احر نے مخصوصیت سے گردن سینے پر گردادی۔

”صحیح بولنے کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔“

❖❖❖

سب سخن، اس لب سخن کے اسیر..... سارے موسم گلاب ہیں جیسے اور گنزیب کا لسن کر آگئے تھے۔ لا دُنخ میں سوائے خاموش بیٹھی ندرت کے سب باقیں کر رہے تھے۔ خین اور سعدی، ہاشم کی سیاست کے موضوع پر کئی کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ اور گنزیب آکر بیٹھے تو خین پوچھنے لگی۔

”کیا آپ نے وہ تمام ڈرامے دیکھے جن کے لئے میں نے آپ کو میل کیے تھے؟“

”اتنا وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔ ہاں دس پندرہ سال بعد کبھی فرست ملی تو دیکھوں گا۔“

”ویسے اگر آپ نے“ کے، ڈرامے (کورین ڈرامے) نہیں دیکھئے...“ کے، پوپ نہیں سنا تو کچھ دیکھا نہیں ہے۔“

”کیا تمہیں سارے کورین ایک جیسے نہیں لگتے؟ ایک ہی چائینز شکل والے؟“ اور ان کے اس سوال پر خین حسب معمول

جد باتی ہو گئی۔

”ہم ساری قوموں کا یہی مسئلہ ہے۔ ہمیں دوسری قوم والے ایک جیسے لگتے ہیں۔ سیاہ فام بھی ایک سے اور چائینز بھی ایک سے۔

ورنہ وہ بھی اتنے ہی مختلف ہوتے ہیں جتنے ہم اور خوبصورت بھی بہت ہوتے ہیں۔...“

حمد بولے جا رہی تھی۔ ہاشم آہستہ سے اٹھ کر کچن کی طرف آگیا۔ کچن گھر کے آخری کونے میں تھا۔ وہاں سینٹر میبل پو شیر و اس کھانا کھا رہا تھا۔ میری اینجیوئری بھری تھی۔ ہاشم نے چوکھت میں کھڑے تھکی ہوئی سانس بھری۔ شیر نے چونک کرا سے دیکھا، پھر شرم دیگی سے پلیٹ

۔۔۔۔۔

”کھاؤ شبابش، میں منع تو نہیں کرنے آیا۔“ مگر وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے بڑھا یا۔

”میں نہیں کر سکتا اس کو برداشت۔ اور آپ لوگ اس کو فیصلی سمیت مددوکر لیتے ہیں۔“

ہاشم نے میری کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گئی۔ پھر وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

”تمہیں ابھی تک یہی عرصہ ہے کہ اتنے سال پہلے اس نے تمہاری شکایت میں کوئیں لگائی؟“

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟“ وہ بگرا۔

”کیا تم نے پھر ڈر گز لیں؟“

”نہیں تو۔“

”اور ڈر گز نہ لینے سے تمہاری تعلیم پا چھا اثر پڑا، آج تم ایک کامیاب انسان ہیں چکے ہو۔ اس نے تمہارے لئے ایک اچھا کام کیا، اور تم ناراض ہو؟“

نوشیر وال کے تنے اعصاب ذرا ذہلیے پڑے۔ ”وہ تو ٹھیک ہے مگر.....“

”مگر یہ کہ شیر ڈر کیا یہ وہ سعدی نہیں ہے جس نے تمہاری جان بچائی تھی، تمہیں بروقت ہستال لے جا کر؟“  
نوشیر وال چپ ہو گیا۔

”اب اس ناراضگی کو بھول جاؤ۔“

”کیسے بھول جاؤں؟ پانچ سال اس ٹینشن میں گزارے کہ میری ہرمودو کو وہ مانیٹر کر رہا ہے۔ جو می سے میرے بے عزتی ہوئی، اسے بعد کتنا عرصہ میں مجھ سے مجرموں کی طرح سوال جواب کرتی رہیں۔ اور....“

”تمہارا اس سے کسی لڑکی پہنچا تو نہیں ہے؟“ ہاشم نے مسکراہٹ دبا کے پوچھا۔ اس کا مودہ مزید بگڑ گیا۔

”اتنا لوز رگلتا ہوں میں آپ کو؟“ (اور یہ شکر تھا کہ گئے برسوں میں ایک لڑکی کے مغتیر سے پڑنے والی مارکی بھنک ہاشم کو نہیں پڑی تھی۔ جب وہ مار پڑی تھی، تو سعدی سامنے بیٹھا کیفے میں کافی پی رہا تھا۔ اف!)

”چلو پھر مودہ ٹھیک کرو۔ لا ونچ میں اس کی وہ تیز طرار بہن پھر سے بولنا شروع ہو چکی ہے۔ اس کو برداشت کرنے کے لئے مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“ نوشیر وال سر جھنک کر ہنسا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں باہر نکل تو راہداری میں میری کھڑی، ایک فلپوٹر کی کوپکھ سمجھا رہی تھی۔ وہ زوس، مگرذ ہین سی لگتی لڑکی تیز تیز سر ہلائے جا رہی تھی۔ ہاشم نے سوالیہ نظروں سے میری کو دیکھا۔

”سری یہ فیونا ہے۔ فی... او... نا۔“ توڑ توڑ کر اس کا نام ادا کیا۔ ”یعنی ملازم مہے ہے۔ مزد جواہرات نے رکھی ہے۔ آج سے جوان کیا ہے اس نے۔“

”ہوں۔“ وہ ایک اچھتی نظر اس پڑا تھا آگے نکل گیا۔ شیر نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔

اندر جب حین اور گنگریب سے بات کر رہی تھی تو شہرین مسلسل سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر جواہرات سامنے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے شہرین کو خود کو سعدی سے لاطلق ظاہر کرتی تھی سو خاموش رہی۔

ہاشم اور نوشیر وال اپنے آئے تو حین کا ڈرامہ ناما بھی تک جاری تھا۔

”بیٹا آپ کو پتہ ہے، شیر وکل تائیوان جا رہا ہے۔ ابھی آپ کسی تائیوانی ڈرامے کی بات کر رہی تھی نا۔“ ہاشم نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا اور سامنے صوفے پہ بیٹھا۔ حین کی چلتی زبان رکی سر گھما کر شیر و کو دیکھا۔

”تایوان میں کیا رکھا ہے؟ جانا ہے تو ساؤ تھک کو ریا جائیں۔“

”آفس کے کام سے جارہا ہوں۔“ شکایتی نظر باپ پڑا۔ ”کو ریا کئی دفعہ جا چکا ہوں پہلے۔“

”تو دوبارہ چلے جائیں۔ میرے لیے kimchi لے آئے گا۔“ وہ پر جوشی ہو کر کہنے لگی۔ سعدی نے تنبیہ نظر وہ سے اسے گورا گوروہ متوجہ نہیں تھی۔ اکھڑے اکھڑے سے بیٹھے شیر و نے کندھے اچکائے۔

”ہاں دہاں بھی ایک دو دن کے لیے چلا جاؤں شاید۔ لے آؤں گا۔“

”واو... یو آرکی۔“ آگے پیچھے نو شیر و اس جیسے لوز رکولفت نہ کرانے والی حینہ بے اختیار مصدقی سانس بھر کر رہ گئی۔

ندرت ہنوز خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کو اس ڈنر میں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

❖❖❖

کچھ بھی کہو، سب اپنی انداز پر اڑے ہیں..... سب لوگ یہاں صورت اضمام کھڑے ہیں

اس سردی رات جب فارس اپنے نئے ساتھی قیدی کوخت سے ناکر پرے لیٹ پکا تھا، اور ندرت کاردار قصر میں عدم دلچسپی سے بیٹھی تھیں، ان سب سے دور، یوسف صاحب کے گھر میں، صداقت بھاپ اڑاتی کافی زمر کے سامنے رکھ رہا تھا۔

وفعتاً سر برائی جگہ پہ بیٹھے ہڑے اباذر اکھنوارے۔ وہ باسی اخبار دیکھتے ہوئے چوکی نظر انھا کر ان کو دیکھا۔

”کس بات کی تہیید باندھنا چاہ رہے ہیں؟“

”وہ... فارس کے کیس کی سماعت اسی میں ہے نا؟“ اس ذکر پر اس کے ابر و تن گئے۔ واپس اخبار دیکھنے لگی۔

”آپ یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں کہ لاڈنخ کی میز پر کھا من آپ نے نہیں دیکھا جس میں مجھے پیش ہونے کے لیے کہا گیا ہے؟“

”زم...“ وہ بے بسی سے آگے کو ہوئے۔ ”کیا تم اس کے خلاف گواہی دو گی؟“

”جوچ ہے وہی کہوں گی۔“ وہ اخبار پڑھتی رہی۔

”ڈھائی سال ہو گئے اس بات کو تم ایک دفعہ بھی اس سے نہیں ملیں۔ اس کی بات تو سن لو۔“

”میں نج ہوں نہ پر اسکیوں ڈرنہ ڈینیوں۔ میں صرف ایک گواہ ہوں۔ اپنی بات وہ عدالت میں کہے۔ مجھے کیوں امید رکھتا ہے؟“

”سعدی سے تو مل لیا کرو۔“ انہوں نے ایک اور کوشش کی۔

”وہ میری موجودگی میں گھر آتا تو مل لیتی۔ نہیں آتا تو میں کیا کروں؟“

”وہ تو تمہارا سعدی ہے، ہمارا سعدی۔ اس کا کیا قصور ہے؟“

”جب مجھے اس کی ضرورت تھی، وہ میرے ساتھ نہیں کھڑا تھا۔ ہستال میں رشتہ داروں کی لعن طعن کے وہ تکلیف دہ دن، وہ راتیں

جب میں درد کی شدت سے بیدار ہو جاتی تھی، میں نے کیسے گزارے، مجھے یاد ہے۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اکیلی ٹھیک ہوں۔“ صفحہ پلٹا کر اندر وہی طرف سامنے کی۔ چھرے پہ سنجیدگی اور سپاٹ پن تھا۔ وہ افسوس سے اسے دیکھنے گئے۔

”کیا تمہیں اپنی گواہی پہ خود یقین ہے؟“

”نہ ہوتا تو بھی گواہی نہ دیتی۔ اور رہی گواہی تو وہ میں پچھلی پیشی پر دے چکی ہوں۔ اس دفعہ مجھے صرف Cross

Examine کرنے کے لئے بلا یا جارہا ہے۔“ ساتھ ہی گم اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

”ندرت کو ٹرپل ویسل (دل کی نالیوں کی) بیماری ہو گئی ہے۔ اس کا دل ٹھیک کام نہیں کرتا۔ اگر فارس کو سزا ہو گئی تو وہ صدمے سے

مر جائے گی۔“

”یہ فارس کو مجھ پر گولی چلانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ دوسرا گھونٹ بھر کر مگ و اپس رکھا۔ نگاہیں اخبار پر پیچے کی سمت دوڑانی گئی۔ ناک کی لوگ دمک رہی تھی۔

”سعدی کے گھر ہی چلی جایا کرو۔“

”ضروری کام ہوا تو چلی جاؤں گی۔ ناراض تھوڑی ہوں میں اس سے۔“ ساتھ ہی اس کافون بجا۔ وہ بات کرنے میں مصروف ہو گئی اور بڑے ابا اپنی ادھوری چائے کو دیکھنے لگے۔ آج تو چائے کے ساتھ بات بھی ادھوری رہ گئی تھی۔

.....♦♦♦.....

ہم نہ کہتے گھر جاؤ گے ..... کس جگہ پیچے ہو آخر دیکھو  
(یہ نہ کہتے گھر جاؤ گے ..... کس جگہ پیچے ہو آخر دیکھو)

رات کا ندھیر اہر سوچھیلا تھا۔ سردی مزید بڑھ گئی تھی۔ چھوٹے باعیچے والے گھر میں سعدی کے کمرے میں اندر ہرا تھا۔ وہ کمل تا نے گھری نیند سورہ تھا۔ یکا یک وہ ذرا سا ہلا۔ پھر کمل ہٹایا تو ٹکھرے بال، اور چہرہ واضح ہوا۔ وہ اچنچبھے سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دماغ اتنا سویا ہوا تھا کہ معلوم نہ پڑتا تھا۔ آواز کھڑر سے آرہی تھی۔ زوں زوں۔

اس نے نکلیہ ہٹایا۔ پیچے دبایا موبائل نج رہا تھا۔ آہ۔ وہ نیند سے کراہا۔ موبائل اٹھایا۔ رات کے ڈیڑھ بجے اور ان جان نمبر۔ اکتا کر اس نے فون کاں سے لگایا۔ ”ہیلو؟“ آواز بھاری اور نیند میں ڈوبی نکلی۔

”سعدی! اسی وقت میرے گھر آسکتے ہو؟“

اس کی نیند میں ڈوبی آنکھیں ڈرائی کھلیں۔ ”کو... کون ہے؟“

”سعدی! انہو اور میری بات سنو۔“ ذرا زور سے کہا گیا تو وہ چونک کرا تھا۔ ”ہاشم بھائی؟ خیر بہت؟“ جیرت سے آنکھیں ملیں۔  
ٹیبل لیپ جلایا۔ گھڑی روشن ہوئی۔ ڈیڑھ بجے۔

”ابھی اسی وقت میرے گھر آؤ! اپنی بہن کو لے کر۔ ٹریک نہیں ہو گا! میں منٹ لگیں گے۔ تم دونوں آؤ اور اکیسوال منٹ نہیں ہونا چاہیے۔“ اس کا لہجہ انداز سعدی فکر مند ہو گیا۔

”مگر ہوا کیا ہے؟“

”تم ابھی تک بستر سے نہیں نکل کیا؟ جلدی کرو یا میں انتظار کر رہا ہوں۔“ اور فون بند ہو گیا۔ وہ جیران و پریشان سا بیٹھا رہ گیا، پھر تیزی سے بستر سے نکلا۔ دو تین منٹ بعد وہ منہ پر چھینٹے مار کر بڑے بد کر زجیک پہنچ کارکی چاپی اٹھائے ہاہر آیا تو لا دنخ سے آواز اس آرہی تھیں۔ معلوم تھا وہ جاگی ہوئی ہو گی۔

کپیوڑ کے سامنے کری پیڑا درپر کر کے بیٹھی ہیڈ فون چڑھائے، بہت ہوئی اسکرین کو دیکھتی ساتھ بیٹھا لے سے پاپ کارن اٹھا کر منہ میں رکھتی، خین روز رات گئے تک یوئی پائی جاتی تھی۔ آہٹ پر وہ چوکی پھر بھائی کو آتے دیکھ کر پر جوش سی بتانے لگی۔

”پتہ ہے، سو پر جو نیز (کوریا کا ایک بینڈ) ایک شو میں آئے ہوئے ہیں، اور ان کو لوگ اپنے مسئلے بتا رہے ہیں، جیسے ایک لڑکے کا دوست سانپ اور بچھوکھا نے لگ گیا ہے تو وہ ....“ سعدی نے آگے آکر کپیوڑ کی تار کھپتی۔

”سوئیٹر پہنؤ اور باہر آؤ! میں کار میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”ہا!“ وہ ہکا بکارہ گئی۔ پھر غصے سے ہیڈ فون اتارے۔ ”اتی مشکل سے ویڈیو ڈاؤن لوڈ کی تھی اور ....“

”خین جلدی کرو۔ کوئی وجہ ہے تو کہہ رہا ہوں نا۔“ بختنی سے کہہ کر وہ باہر کل کیا۔ کار اسٹارٹ کی تو وہ بھی آہی گئی۔ گرین لبا

میں عارت گر

اور کوٹ پہنے (جو تھا تو ایل شاپ کا، مگر اسی کی تاکید تھی کہ ہر ایک کو کہنا ہے، سارہ لندن سے لائی ہے)، اندر سوئٹر۔ گردن کے گرد دو پڑا اور بالہمیز بینڈ لگا کر کھلے چھوڑے پہرے پہ ڈھیروں ناراضی لئے۔ چپ چاپ فرنٹ سیٹ پا آیا۔ سعدی خاموشی سے ڈرا یوک کرتا رہا۔ پھر جنین نے اپنے (اور اسی کے مشترک) موبائل پر گانا آن کر لیا۔

—Hello Hello You Shiny Boy ساتھ میں سر دھنے لگی۔

”بند کرو اس سورج نیز کے ماہشیتا کو۔“

"یہ ماشینا نہیں ہے، اسی ہنتر کا گانا ہے، اس میں Lee Min Ho آتا ہے۔ پتہ ہے، اس کے باپ کو گورنمنٹ نے مار دیا ہوتا ہے، تو وہ کئی سال بعد انقام لینے کو ریا کے صدر کا سکیورٹی آفیسر تھیں جو جاتا ہے، اور..."

پھر کی.... "ہم کہاں چار ہے ہیں؟"

”ہاشم بھائی نے بلا پا ہے۔ کوئی مسئلہ ہے؟“

وہ حیران رہ گئی۔ ”تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کیا ہاشم بھائی خود ہر مسئلے سنبھال نہیں پا کرتے؟“ اس کی نقل اتنا کر کر سچھ کیا۔

”بیمار اخیال ہے دنیا میں ابھی کچھ مسلسلے ہیں جنہیں وہ نہیں سنبھال سکتے۔“ سعدی نے گھری سانس بھر کر شانے اجاتے۔

جب وہ کاردار قصر کے اندر ونی دروازے میں داخل ہوئے تو ہاشم سامنے ہی کھڑا تھا۔ سیاہ ٹراوزر پر گردے ٹی شرت پہنے، وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے شاید پہلی دفعاً سے ٹی شرت میں دیکھا تھا۔

”اوپر میرے کمرے میں جاؤ“ میں آ رہا ہوں۔“ اس نے سعدی کو اشارہ کیا۔ اس کا حلیہ ساتھ ہی مصروف گر پریشان انداز۔ اور پھر پلکٹ کر لاؤ نج میں پریشانی سے نہیں، کچھ بولتی جو اہرات۔

”مجھے سمجھنیں آ رہی تم اتنی دیر کیوں کر رہے ہو ہاشم؟ ان کو پیسے دا اور میرے بیٹے کو دا پیس لاو...“، دباد با غراتی وہ رکی، دونوں بہن بھائی کو دیکھ کر جھکا لگا۔ ”ان کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟“

سعدی، خین کا ہاتھ تھا مے فوراً اوپر لے آیا۔ ہاشم کے کرے کا دروازہ کھونے سے قبل انہوں نے نجی ماشم کو کستہ بنایا۔

”مگی، آپ آرام سے بیٹھ جائیں، میں کر رہا ہوں نا۔“ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے وہ سمجھا رہا تھا۔ دروازہ بند ہوا تو آوازوں کا رستہ رک گیا۔

اندر کر کے کی ساری بیتیاں خود، خود جل اٹھیں۔ وہ دونوں خاموش اور غیر آرام دہ سے کاؤچ پہ جائیں۔ میز پہ ہاشم کا لیپ ناپ رکھا تھا۔ وہ آن تھا، مگر اسکرین اسٹیننڈ بائی یہ تھی۔ سماں تاریک۔

”یہ کیا ہو رہا ہے بھائی؟“

”کوئی مسئلہ ہے ان کے گھر میں...“ اور تبھی وہ عجلت سے دروازہ کھولتا اندر آیا۔ سامنے میز کے کنارے آبیخا۔ حین کے بالکل سامنے۔ سعدی کو دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

”خین، نیچے اب جو میں پوچھوں مجھے سچ سچ بتانا۔“

ختنیں نے ناجھی سے اسے دیکھا اور پھر سعدی کو۔

‘‘جی؟’’

”کیا تمہارا علیشا سے کوئی کانٹکٹ ہے؟“

۱۷۰

”تم حق کہہ رہی ہو؟“ ہاشم نے اس کوغور سے دیکھتے پوچھا تو حنین کے ابر و قن گئے۔

”میں آپ سے ڈرتی نہیں ہوں جو جھوٹ بولوں گی۔ نہ اس سے رابطہ رکھنے کے لئے مجھے آپ کی اجازت چاہیے۔“

”حنین،“ سعدی نے اسے تادبی اندرا میں گھورا مگر وہاں کے اثر ہونا تھا۔

”اوے۔ مگر کیا تم جانتی ہو وہ ابھی کہاں ہے؟ یا معلوم کر کے دے سکتی ہو؟“

”مگر ہوا کیا ہے؟“

ہاشم نے گھری سانس لی ترچھے ہو کر لیپ تاپ کی کیز کو چھوڑا۔ اسکرین روشن ہوئی۔

”شیر و تایوان سے کوریا گیا تھا۔ والپن نہیں آیا۔ ڈیڑھ گھنٹے پہلے مجھے فیس بک پک کی اُن جان آئی ڈی کی جانب سے ویدیو می ہے۔“

حنین اور سعدی نے چوک کر اسے دیکھا۔ نوشیر و اس ان غواہو گیا تھا اور ہاشم نے انہیں بلا یا تھا؟

وہ اب ویدیو کھول رہا تھا۔ اسکرین پہ ایک کرہ تھا۔ لکڑی کا فرش، پیچھے سلاں یہنڈنگ ڈور۔ کاؤچ۔ الماری۔ چھٹ۔ پیچھے نظر آتا ایک ڈنپ بورڈ۔ وسط میں رکھی کری جس پر نوشیر و اس بیٹھا تھا، ہاتھ پیچھے بند ہے تھے۔ بھرے بال، روئی آنکھیں۔ گردن بھکی ہوئی۔ کیمرہ آن ہا۔ تو اس نے چہرہ اٹھایا۔ وہ شدید تکلیف میں لگ رہا تھا۔

”ڈیڈ... بھائی.... یہ لوگ آپ کو ایک اکاؤنٹ نمبر اور ایک رقم ای میل کر رہے ہیں اور...“ وہ رک کر کیسے کی سمت دیکھنے لگا، ہماں سے اسے ہدایات مل رہی تھیں۔ یقیناً ان غواہ کا رہا ہیں کھڑے اسے متینہ کر رہے تھے۔ چہرے پر خوف لئے شیر و تھوک ٹھلتا پھر سے کہنے لگا۔ ”آپ چار گھنٹے کے اندر اندر یہ رقم بھجوادیں، ورنہ یہ مجھے مار دیں گے۔ میں کوریا میں ہوں۔ اگر آپ میں سے کوئی کھر سے بھی لکھا یا یہاں آنے لی لوٹش کی یا کسی کو کال کرنے کی تو یہ مجھے مار دیں گے۔“ آنسو خونزدہ ہر اس ان شیر و کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ سدا کا ڈر پوک شیر و ملی کا پچ لگ رہا تھا۔

”بھائی پلیز، مجھے یہاں سے نکال لو۔ اور کسی کو فون مت کرنا۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ مجھے مار دیں گے۔ ان کے پاس آپ تمام نہ رہیں یہ ہر چیز مانیٹر کر رہے ہیں۔“ اور اسکرین سیاہ ہو گئی۔

سعدی نے بے یقینی کے عالم میں سراٹھا یا۔ ہاشم تھا تھا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

”کیا آپ نے پولیس کو کال کیا؟ آپ کے تو کتنے ہی کانٹیکشنس ہوں گے ایجنسیز میں۔“

”کیا تھا۔ میرے لوگ کورین پولیس سے بات کر رہے تھے جب یہ دوسری ویدیو موصول ہوئی۔ تمہیں کال کرنے کے دس انت بعد۔“

چند بیٹن دبائے اور پیغام کھولا۔

وہی کمرہ اور ویسے ہی نڈھال، بندھا ہوا شیر و۔ البتہ اب اس کے ماتھے سے خون بہر رہا تھا۔

”بھائی، انہوں نے منع کیا تھا کسی کو کال کرنے سے۔ آپ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟ مجھ سے کوئی محبت نہیں ہے آپ کو؟ ایک مانسٹر کو بھی اپنے نپچ سے محبت ہوتی ہے۔ پلیز ان کو رقم دیں اور مجھے یہاں سے نکالیں۔ ورنہ یہ پہلے میرے کان کا ٹیس گے، پھر انگلیاں۔“

ویدیو ختم ہوئی اور ہاشم کے چہرے کی تکلیف بڑھ گئی۔ شیر و کا خون نکلتے دیکھا بہت اذیت ناک تھا۔ حنین خاموش تھی اور سعدی ہکا بکا۔

”کیا وہ لوگ آپ کے فونز بگ کر رہے ہیں؟“

”میں نہیں جانتا مگر.... اب ہم کسی سے رابطہ نہیں کر رہے۔ میں نے سب کو منع کر دیا ہے۔“

”مگر....“ سعدی بے چینی سے آگے ہوا۔ ”یہ خالی خوبی دھمکی بھی تو ہو سکتی ہے۔ آپ غفیہ طور پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش....“

”اوہ.... اس سارے معاملے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ حسین پہلی دفعہ بولی۔ دیکھو وہ ابھی تک اسکرین کو رہی تھی۔ (اس لوزر کے کان کی جگہ بال کاٹ دیں وہ تو کتنا اچھا ہو۔ اونہوں نہیں۔ یہ تو آئینہ دیکھتے ہی مر جائے گا۔)

”مجھے تک ہے کہ اس میں علیہا ملوث ہو سکتی ہے۔“

”کبھی نہیں۔“ حسنه ناگواری سے اسے نوکا۔ ”وہ کمزور اور بزدلی ہے۔ آپ کے بھائی کواغوا ناممکن؟“

”وہ کسی کے ساتھ مل کر یہ کر سکتی ہے۔ میں نے اس کی فیس بک پروفائل چیک کی تھی۔ دیکھو اس نے کور فون Seoul (کوریا کا ایک شہر) کی لگارکی ہے۔“ اس نے اسکرین پر علیہا کی پروفائل کھول کر دکھائی۔

”یہ اس نے کوئی جھے مادہ پہلے لگائی تھی اور وہ اس لیے کہ ہم کے ڈرامے اور کے پوپ کے شوقین ہیں۔ ہمیں کے کلپر پسند ہے، میری بھی پروفائل پر یہی سب ہے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کوریا میں ہوں اس وقت۔“

”مگر اس دا بھے کی مجھے تصدیق کرنی ہے۔ اگر خاور ہوتا تو وہ یہ سب کر لیتا۔“ مگر وہ دور و زقبل ہی اپنے کسی کام سے ملک سے باہر گیا ہے۔ میں اس کے بغیر بالکل مغلوق ہوں۔ ”میز کے کنارے پر بینخا تدرے بے بی سے کہتے ہاشم پر سعدی کو ترس سا آیا۔

”ہاشم بھائی، ہم آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ آپ بتائیں کیا کرتا ہے۔“

اس بات پر حسنے نگھو کر سعدی کو دیکھا، اور پھر ہاشم کو۔ وہ ابھی تک ناگواری محسوس کر رہی تھی۔

”اوے، حسین سنو۔ تم ہمکنگ جانتی ہو، تم نے ڈیپ کوئی دفعہ بتایا تھا۔ سو تم علیہا کی لوکیشن ٹریلیں کرو۔ ساتھ میں تم اس ویڈیو بیجنے والے کی لوکیشن بھی ٹریلیں کرو۔ پھر اس فارن بینک اکاؤنٹ کو ٹریلیں کرو کہ یہ کس کے نام ہے، اور اس شخص کی تمام تفصیلات مجھے دو۔ ساتھ ہی شیرو کے موپائل کو ٹریلیں کرنے کی کوشش کرو کہ آخری دفعہ وہ کب اور کہاں استعمال ہوا تھا۔ فی الحال وہ بند ہے۔ کتنی دیر میں تم یہ سب کر سکتے ہو؟“ وہ سنجیدہ تھا اور حسین نے اتنی ہی سنجیدگی سے سرہلا یا۔

”دس سے بارہ منٹ میں۔“

”واقعی؟“ ہاشم تو ہاشم سعدی کو بھی جھٹکا گا۔

”شیور۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ گر آپ نے سیٹ نہیں لگایا۔ بھی تک۔ ”معصومیت سے ادھر ادھر دیکھا۔

”کیا؟“ ہاشم سمجھا نہیں۔

”کیوں؟ ہم ہالی وڈ کے کسی سیٹ پر ہیں نا، اور میں تو ہوں ہی Nolan Ross جو کھٹ کھٹ کر کے سب کچھ فناٹ ہیک کر لوں گی، اور دس منٹ میں مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”حسین!“ سعدی نے اس کے جو تے پر جوتا رکھ کر دیا۔

”سوری ہاشم بھائی مگر نولن اور Huck ہیچے Horribly Hillarious Hackers صرف ہالی وڈ میں ہوتے ہیں۔ میں انہیں سے کسی بینک کا مین فریم ہیک نہیں کر سکتی۔ نہ ہی ہم فیس بک میٹن سے کسی کا آئی پی ایڈریلیس یا لوکیشن معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں فیس بک کمپنی سے رابطہ کرنا ہو گا اور اس میں دو ماہ لگیں گے۔“

ہاشم اب بچپنے سلسلتی ہو گا اور ہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ (بد تیزی لڑکی)

”تو تم کیا کر سکتی ہو؟“

”ایسے مت دیکھیں مجھے۔ خاور بھی نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو ایک کیک چاہیے اور میں دیوار پر لگ بیکری کے اشتہار کو پھاڑ کر اندر سے کیک نکال لوں، مگر اشتہار کے کاغذ کے پیچھے دیوار ہوتی ہے، بیکری نہیں۔ کیک نکالنے کے لئے ہیں اسی کا تالہ توڑنا پڑے گا۔ گھر بیٹھے یہ سب نہیں ہو سکتا۔“

”یعنی کتنے کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔“

”خیراب یہ بھی نہیں کہا میں نے۔ میں یہ کر سکتی ہوں کہ علیہا کو ای میل کرتی ہوں، اس کے جواب سے اس کی لوکیشن ڈھونڈتی ہوں۔ ساتھ اس ویڈیو سیجنے والے کا کاؤنٹ ہیک کرتی ہوں، شاید اس کے اپنے ان باکس سے کوئی سراغ مل جائے۔ کوئی فون نہ بڑ کوئی دوسرا ای میل ایڈریس۔“

ہاشم خوش نہیں تھا مگر انھے کھڑا ہوا۔

”اوکے تم کام شروع کرو۔“

”ابھی نہیں کر سکتی میں کچھ۔“ وہ اس کی بات پر جاتے جاتے پلٹا۔ سعدی نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔ خینیں نے بے نیازی سے ٹھانے اچکائے۔

”اصل میں خالی معدے کے ساتھ میراد مانگ کام نہیں کرتا۔ بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میرا شوگر لیول بھی لوہور ہا ہے۔“

ہاشم نے گویا جھپٹ کر انش کام اٹھایا، اور ضبط کرتے ہوئے چباچا کر بولا۔ ”میری اوپر آؤ اور میڈم جو کہیں، ان کو پانچ منٹ میں بنانا ہلا دو۔ ہری اپ۔“ اور دھاڑ سے دروازہ بند کرتا ہر نکل گیا۔

”تم کچھ زیادہ ہی بد تینیز ہوتی جا رہی ہو۔“ سعدی نے واقعی غصے سے اس کا بازاڑ جھنھوڑا۔ ”ابھی پاپ کارن نہیں کھا کر آ رہی کیا؟“

”ایک تو اچھا بھلا سو پر جو نیزد دیکھ رہی تھی، اوپر سے سردی۔ خواہ خواہ مجھے اٹھایا دے بھی اس انوکھے لاذلے کے لئے۔ اب بھتیں۔“

ہٹھائی سے شانے اچکاتی لیپ ناپ قریب کرنے لگی۔

چند منٹ بعد لیپ ناپ گود میں تھا، ایک ہاتھ میں جوس کا گلاس۔ سامنے پین پزار۔ کٹل۔ ساس۔ فرنچ فراائز۔ منہ مسلسل چلاتے ہے، وہ کیزدبار ہی تھی۔ سعدی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا، تو اس نے فرنچ فراائز کی پلیٹ بڑھائی۔

”کھائیں گے؟“

”ان کا بھائی اغوا ہو گیا ہے، سارا گھر پر بیشان ہے، انہوں کا پیچا س کروڑ ماں لگ رہے ہیں اور تم کھا رہی ہو؟“

خینیں نے جوس کا گھونٹ بھرا، اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”پیچا س کروڑ میں کتنے زیو ہوتے ہیں؟“

”آف...“ وہ کراہ کر اٹھا اور باہر نکل آیا۔ شیر ہیوں کے اوپر رینگ سے بھاگنا۔ اور نگریب پر بیشانی سے ماتھا مسلطہ بیٹھے تھے۔

ہاشم ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا اور جواہرات نہیں میں چلا رہی تھی۔ ”تم لوگ پیے کیوں نہیں دے رہے؟ وہ شیر و کو مار دیں گے۔“

ہاشم!“

آنوساں کی آنکھوں سے ابلجے کوتیا تھے۔

”ہم پیسے دے دیں گے، بات پیسوں کی نہیں ہے می۔ مگر شیر نے ان کی شکلیں دیکھ کر ہوں گی۔ کیا گارنی ہے کہ وہ پیسے لے کر اس کو چھوڑ دیں گے۔ ایسے لوگ تاوان لے کر مغوی کو مار دیا کرتے ہیں۔“

”تو تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟“ اور نگریب بھی غصے سے بولے تھے۔

”ان کی لوکیشن، یا ان کے بارے میں کوئی معلومات۔ کوئی لیور تھے ہونا چاہیے ہمارے پاس جس کے اوپر ہم ان سے شیر و کوز نہ سلامت واپس لیں۔“

جو اہرات نفی میں سر ہلاتی ندھال سی بیٹھ گئی۔ ہاشم موبائل پنیر ملانے لگا۔ سعدی افسوس سے واپس پلٹ آیا۔ اندر وہ صوفے پہنچی ہاشم کے ہیڈفون چڑھائے، چسپ کھاتے ہوئے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا کوئی نئی ویڈیو آئی ہے؟“ وہ تیزی سے لپکا۔

”اوہ ہوں۔ میں اس کے اکاؤنٹ کو ہیک کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چند گھنٹے لگیں گے۔ تب تک میں اس ڈرائے کی آخری وہ قطیں دیکھ لوں۔“ بڑے غور سے اسکرین کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ وہ جو جوش سے لپکتا تھا، جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”پتہ ہے بھائی! اتنا مزے کا ڈرامہ ہے 49 Days میں جو ہیر و نہ ہے نا۔...“

”یا اللہ۔ کب شماں کو ریا ایتم بم بنائے گا اور کب اسے جنوبی کو ریا پر گرائے گا۔ کب جان چھوٹے گی اس ”کے“ پھر سے۔“ وہ کراہ کر پیچھے کو ہو گیا۔ نہیں کے ڈرائے سر چکر ادیتے تھے۔ وہ منہ بنا کر (ہونہ.....) پھر سے دیکھنے لگی۔

.....❖❖❖.....

ویران سرائے کا دیا ہے ..... جو کون و مکاں میں جل رہا ہے اس رات بھی حوالاتی کو ٹھہری کی سلاخوں کا صرف کنارہ روشن تھا، باقی سب تاریکی میں ڈوبا تھا۔ ایک کونے میں فارس اور دوسرے میں احرar.... دور دور چت لیٹھے چھٹ کو دیکھ رہے تھے۔ فارس روشنی والے کونے میں تھا، ٹیوب لائٹ کی مدھم سی کرن اس کی تاریک دنیا کو روشن کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس کی کوشش کے باوجود احرار اسیل سے نہیں گیا تھا۔ اب اس نے کوشش بھی ترک کر دی تھی۔

”فارس بھائی!“ اس نے ہلکے سے لپکا۔ چت لیٹھے، چھٹ کو تکتے فارس کی پیشانی پل پڑے۔

”کیا تمہیں کسی نے خاموش رہنا نہیں سکھایا؟“

”میں نے سیکھا ہی نہیں۔ ویسے کوئی سکھانے والا تھا بھی نہیں۔“ قدرے تو قف کیا۔ ”آپ نماز پڑھتے ہیں؟“

”ہوں۔“

”وہ تو میں نے دیکھا ہی تھا۔ نماز میں بھی ساتھ والی کو ٹھہری سے کیا آوازیں آرہی ہیں، سب خبر ہوتی ہے آپ کو۔“

”سب کو ہوتی ہے۔ اب سو جاؤ۔“ وہ بے زار ہوا۔

”سینیں نا۔ کیا ہمیشہ سے پڑھتے تھے؟“

”نہیں، جیل میں آنے کے بعد شروع کی۔“

”تو آپ کیوں پڑھتے ہیں نماز۔ اپنے سگے بھائی کے قتل کے الزام۔...“

”وہ میرا سوتیلا بھائی تھا، اپنے فیکٹشنس درست رکھو۔“

احررنے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ ”مطلوب وہ آپ کو پسند نہیں تھا؟“

”صرف تھہاری غلطی درست کر رہا ہوں، زیادہ اٹھنی نہ ہو (زیادہ چکپنہیں!)۔“

”تو کیوں پڑھتے ہیں آپ نماز؟“

”مجھے خود نہیں پتہ، وہ بہت دیر بعد بولا۔“ کچھ دن پڑھتا ہوں جوش سے، پھر ڈھیلا پڑ جاتا ہوں، اور کئی دن یوں گزر جاتے ہیں جیسے اندر ہیری سرگ میں ہوں۔ پھر کچھ دن پڑھتا ہوں۔ تب اپنا آپ بہت نیک لگتا ہے۔ ہلکا اور پارسا۔ مگر پھر ڈھیلا ہو جاتا ہوں اور یہ

ہے۔ نہ پڑھنے کا چکر بھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ چاہوں تو ہر وقت پڑھوں، میرے اندر بہت اسٹینٹا ہے۔ مگر میری نماز مجھے کوئی فرق نہیں ڈالتی۔“  
۱۹: نہ ادل سخت ہو گیا ہے۔“

”اس نے بھی یہی کہا تھا۔“ چت لیٹھے احر نے ہولے سے کہا تو فارس چونکا۔

”کس نے؟“

”چڑیل نے۔ پچھلے سال آیا تھا میں، اور نگزیب صاحب کے کہنے پاپ کی پیشی دیکھنے۔ تب جب انہوں نے چڑیل کو گواہی کے باہم یا تو اس نے بھی یہی کہا۔“

”کون چڑیل؟“

”اوہ، پر اسکیوں مرزمر۔ گھنگریا لے بالوں والی چڑیل۔“ فارس کے ابر و تن گئے، ناپسندیدگی سے گردان موڑ کر اسے دیکھا۔

”بکومت۔“ مگر اس نے نہیں سن۔ وہ چھٹ کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔

”جب استغاثہ نے اس سے اس کی حالت کا پوچھا تو اس نے کہا میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا، میری نماز بھی نہیں۔ کیونکہ اب یہ نماز کے آخر میں دعائیں مانگتی۔ میرے حادثے نے میرا دل، میری زندگی، میری نماز، ہر شے کو مردہ کر دیا۔“  
فارس چپ رہا۔ چہرہ واپس پھیر لیا۔ نگاہیں چھٹ پر جائیں۔

”میں بھی پانچ وقت کی نماز پڑھنا چاہتا ہوں، اچھی اور لبی نماز، زندہ نماز، بگر مجھ سے یہیں ہوتا۔ کیا کروں؟“

”پر اسکیوں مر سے پوچھو۔“ اس بات پر احر نہسا۔ باہر پھیلی سر درات ہرگز رتے پل سیاہ پڑتی گئی۔

”اچھا نہیں۔ آپ کا کیس کیسا جارہا ہے؟“ احر نے اس سے رخ کروٹ بدلی۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر کمر کے بل لیٹا چھٹ کو، لیکھ رہا تھا۔ سفید کرتا اندھیرے میں بھی دمک رہا تھا۔

”ڈھائی سال میں تین پیشیاں ہوئی ہیں، کیسا جارہا ہو گا؟“

”اوہ۔ میری تو چند دن میں چار ہو چکی ہیں۔“

”کیونکہ تم اور نگزیب کاردار کے آدمی ہو۔“ اس کے اندر تک کڑواہٹ پھیل گئی۔

”نہ کریں یا۔ کیوں ان سے اتنے خفا ہیں؟ وہ برے نہیں ہیں، بس اپنا فائدہ اور پرکھا انہوں نے۔“

”اور وہ بھی تمہارے کہنے پر۔“ تلخی سے نگاہ پھیر کر دور لیٹھے احر کو دیکھا۔ ”ویسے اب تک کیا پورنگ کر چکے ہو میرے ہارے میں؟“

”ہاشم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی دوبارہ نہ کسی اور نے کچھ پوچھا۔ اگر پوچھے گا تو بتا دوں گا۔“

”کیا؟“

”انتا ہی جتنا آپ کے بارے میں سارے جیل کو معلوم ہے۔ جھٹڑے، پھٹڈے، غیرہ۔“ وہ لاپرواہی سے ہنسا۔

”اور اگر میں کہوں کہ مجھے اس کیس میں بھی تمہارے سابقہ بآس نے پھنسایا ہے تو ان کو بتا دو گے؟“

احر ایک دم کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھا، حیرت اور اچھنچھے سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”کاردار صاحب نے؟ وہ کیوں پھنسا میں گے آپ کو؟“

”وہ نہیں۔ ہاشم۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس نے ہی یہ دونوں قتل کروائے ہیں، بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ اگر وہ چاہتا تو آج میں

باہر ہوتا۔“

احمر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر فنی میں سر ہلایا۔ ”نبیس فارس بھائی۔ جن دنوں آپ گرفتار ہوئے تھے، میں دن رات کاردار صاحب کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ واقعی آپ کے لئے پریشان تھے، مگر کچھ میری حکمتِ عملی اور کچھ ان کی اپنی سوچ تھی کہ انہوں نے آپ کے اوپ سے ہاتھ کھینچ لیا۔“

”ایکشن جیتنے کے بعد تو وہ میری مدد کر سکتے تھے نہ۔“

”میرا خیال ہے، ان کی نظر میں آپ قصور وار تھے۔ ہاں مگر ہاشم نے تو آپ کے لئے بہت بھاگ دوڑ کی۔ میں ان دنوں وہیں تھا۔ ہاشم نے بارہا آپ کو بے قصور کہا، اور ان دنوں وہ آفس، جیل، کچھری کے چکر لگا کر تکان کا شکار لگتا تھا مگر اس نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ تھیک ہے آپ اس کو پسند نہیں کرتے، مگر اس کے بارے میں اتنا غلط مت سوچیں۔“ فارس کافی دیر خاموشی سے چھٹ کو دیکھتا رہا۔

”شاید تم درست کہہ رہے ہو۔ شروع میں اس پر شک تھا مگر پھر اتنے سال اس بارے میں سوچا۔ ہمارے جائیداد کے جھوڑے اتنے بڑے نہیں تھے کہ وہ مجھے اندر کرواتے، جب کہ میں ان سے کچھ مانگ بھی نہیں رہا تھا۔ دوسرا ان کی میرے بھائی سے یہوی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ کوئی بھی چیزان کی طرف اشارہ نہیں کرتی، مگر.....“

وہ لختے بھر کو تھہرا۔ احرارِ دھیان سے اسے سن رہا تھا۔

”مگر آخری فتوی دل سے لیا جاتا ہے، اور میرا دل ہاشم کے لئے کبھی اچھا نہیں سوچ سکتا۔“

”آپ کو ان کے بارے میں نہیں یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

”تو کیا کروں؟ جیل توڑ دوں؟“ وہ کوفت زدہ ہوا۔

”اچھا ایک بات تو بتا سیں۔“ مگر فارس کو اب احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔ فوراً کروٹ بدلتی۔

”چپ کر کے سو جاؤ۔ زیادہ اٹھنی نہ ہو۔“

اس کے انداز پر احرار نے منہ بنایا (ہونہ) اور برے دل کے ساتھ واپس لیٹ گیا۔

”یوں.... میرے بھی کچھ پر زن رائی نہیں ہیں، اور ان میں سب سے پہلی چیز صاف ستری نصدا کا ہونا، ہائی جین والی ڈائیٹ کا ہونا،

اور....“ تھوڑی دیر بعد ”اٹھنی“ پھر شروع ہو چکا تھا۔



مگر یہ قتل کی سازش کہاں سے آنکلی ..... وہ لوگ تو تھے میرے خاندان کے ہی ہاشم کے کمرے میں سینٹرل ہائینگ سے کافی گرمائش تھی۔ جنین چس کھاتے کمپیوٹر پر کام کر رہی تھی۔ صوفے پر پیچھے کوئی لگائے سعدی کو نہیں آنے لگی۔ مگر جنین کی آواز نے جگا دیا۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

”آئیں ان کی فوٹو زد کیجھتے ہیں۔“ وہ دچکی سے کھتی ہاشم کے لیپ ناپ پر فولڈر کھولے جا رہی تھی۔ سعدی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ”بری بات ہے جسے کسی کی ذاتی چیزیں نہیں دیکھتے۔“

”اوے کے، آپ آنکھیں بند کر لیں۔“ اس نے پرانی تصویریں کھول لیں، ہاشم کی اشیں فورڑ کے دنوں کی۔ تب بھی وہ ایسا ہی تھا، مگر ذرا بیگ۔ شہریں بھی ان میں تھی۔ کلاس فیلو تھی شاید۔ یا جو نیز۔

”یہ آج کہاں ہے؟“

”اپنی امی کے گھر۔ ہاشم بھائی نے بتایا ہے۔“ سعدی نے لبوں پر مٹھی رکھ کر جماں روکی۔ جنین تیز تیز تصویریں آگے کرتی جا رہی تھی۔ پھر وہ اس سے بھی بورہ گئی اور واپس ڈرامہ لگایا۔ دھنعتاً ہاشم کمرے میں داخل ہوا تو جنین نے جھٹ اسکرین پر اصل کام والی ونڈا

مانے کر لی۔

”علیشا کا بھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ اغوا کار کا اکاؤنٹ ہیک کرنے میں ابھی کچھ اور گھنٹے لگیں گے۔“ اس نے اطلاع دی۔ اُم نے بس سرہلایا اور الماری کی طرف آیا۔ سعدی یونہی گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ الماری سعدی کی پشت پر تھی۔ ہاشم نے دروازہ کھولتا تو نانے سامنے آئے۔ تیرے خانے میں ایک ڈیجیٹل لاک والا سیف نصب تھا۔ ہاشم نے چند ڈیجیٹ دبا کر سیف کا دروازہ کھولا، اندر ہنڈات، چیک بکس، نوٹ، بہت کچھ نظر آیا۔ وہ چیزیں الٹ پلت کر کے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ سعدی نیند میں ڈوبی آنکھوں سے اسے ہمدردی دے دیکھنے لگا۔

اس نے چیک بک لکالی اور کچھ پیپر۔ اندر سیف میں ہر چیز بکھر پکھی تھی۔ اور سعدی واپس گردن موڑ نے ہی لگا تھا کہ، نگاہ میں کچھ سیف کی دیوار کے ساتھ ایک لفاف سے کچھ جھلک رہا تھا، ایک تصویر کی سفید پشت جس پر سرخ اور نیلے ننھے ننھے انگوٹھوں کے نہان تھے۔ جیسے پینٹ میں ڈوکر لگائے گئے ہوں۔ بس ایک جھلک دکھائی دی اور ہاشم نے سیف بند کر دیا، پاسورڈ دبا کر لاک کیا اور باہر نکل کیا۔

اور سعدی یوسف کی ساری دنیا وہی ٹھہر گئی۔ نیند کھل چکی تھی۔ وہ سالوں بعد اب جا گا تھا۔

”خد۔۔۔“ اس کو اپنی آواز کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔ ”تمہیں یاد ہے جب میں دادی کی ڈیتھ پر آیا تھا پاکستان، وارث ماہوں کی ڈیتھ سے پچھے ماہ پہلے شاید۔ تب میں ان کی بیٹیوں کی ایک تصویر لایا تھا جس کی بیک پہ پینٹ میں ڈبو کر ان دونوں کے انگوٹھوں کے نشان ثابت کیے تھے؟“

”جی۔ وہ آپ نے وارث ماہوں کو دی تھی۔ اور انہوں نے اسے اپنے لیپ ٹاپ کی الٹی طرف کارڈ ہولڈر میں ڈال دیا تھا تاکہ ان کے پاس رہے ہر وقت۔“ خین مصروف سی کیزد باتی کہے جا رہی تھی۔ اس کو لگا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔

”وہ۔۔۔ وہ تصویر اب کہاں ہو گی؟“

”کیا ہو گیا ہے بھائی؟“ وہ کھٹ کھٹ ناٹپ کرتی بولی۔ ”ماہوں کے قاتل ان کا لیپ ٹاپ لے گئے تھے، اب تک تو انہوں نے وہ سب تباہ بھی کر دیا ہو گا، سنبھال کر تھوڑی رکھی ہو گی۔“

سعدی کی مری مری نگاہیں بند الماری پر مروک ہو گئیں۔ چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

”ہاشم اور میرے لیے کوشش کرے؟ ناممکن!“ کہیں اپنی سے فارس کی جھنجھلانی ہوئی آواز گوئی۔

”مجھے ہاشم پر شک ہے۔ اسی کا ہاتھ ہو گا اس میں۔“

”ہاشم چاہتا تو میں باہر ہوتا۔ میں باہر اس لیے نہیں ہوں کیونکہ اس نے چاہا ہی نہیں۔“

”ماہوں کہہ رہے تھے انہیں ہاشم بھائی پر شک ہے۔ ماہوں کو ایسا نہیں سوچنا چاہیئے۔“

”میں فارس کی وجہ سے اپنی بیوی اور بچی کو وقت نہیں دے پا رہا۔“

”ہاشم کو میرے افسیر کے بارے میں پتہ چل گیا، دیکھو کیا کیا اس نے میرے ساتھ۔“

اس کو لگا اس کے ہاتھ کپکار ہے ہیں۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ بالکل سن سامیخا تھا۔ پلکیں بھی نہیں جھپک پا رہا تھا۔

”وہ تصویر... تمہیں واقعی یاد ہے حنڈ کہ ماہوں کے لیپ ٹاپ کے کارڈ ہولڈر میں ہی تھی؟“

”جی۔ مگر آپ کو کیوں خیال آیا چاونک؟“ وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سنبھل کر پھیکا سامسکرایا۔

"یونہی تھا کام کہاں تک پہنچا؟"

"ہورہا ہے۔ ویسے آپ کو یہ بات عجیب نہیں لگی کہ نو شیر داں بھائی کا اغوا نہیں دنوں میں کیا گیا جب خاور یہاں نہیں تھا۔ اور نگزیب

انکل نے بتایا تھا مجھے کہ خاور داں کے آفس اور گر کا پیوڑ جی نہیں ہے اور یہ کار دار زکار کا رو بار کیا ہے؟"

"یہ ایک کارٹیل کو ہیڈ کرتے ہیں۔"

"کارٹیل کیا ہوتا ہے؟"

"فضول سوال مت پوچھو تھیں پتہ ہونا چاہیے کیا ہوتا ہے۔" وہ ایک دم چڑ کر بولا۔ دماغ اتنا الجھا ہوا تھا کہ حین کی باتیں بے زار کر رہی تھیں۔ اس نے جواب میں زور سے ہونہ کہہ کر رخ پھیرا۔

"میری توبہ جواب آپ سے کچھ پوچھوں یا بتاؤ۔ ہونہا!"

ہاشم کے قدموں کی آواز آئی تو وہ ذرا سنجھل کر بیٹھا۔ ہاشم اندر آیا۔ وہی پریشان، نیس چہرہ لیے۔ سعدی کے پیچھے آ کر الماری کھوئی۔ سعدی نے اب کے گردان نہیں موڑی۔ سامنے ڈرینگ مر رکھتا تھا۔ وہ آئینے میں ہاشم کو دیکھتا رہا۔ اس نے سیف کا کوڑ دبايا۔ چار ہند سے۔ سعدی نے دماغ میں فید کیے۔ سیف کھلا تو اس نے کاغذات واپس رکھے اور اسے بند کیا۔ پھر سے کوڑ دبايا۔ سعدی نے اب کے پکا یاد کر لیا۔ وہ اس کی تاریخ پیدائش تھی۔

وہ چلا گیا اور سعدی کتنی ہی در حین کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا کام جاری تھا۔ وہ بھائی کے چہرے کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بس چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کتنی ہی پرانی باتیں یاد آئیں۔ امی کہتی تھیں، ہاشم کا وکیل کیوں ان کو ہر دفعہ اسال دیتا ہے، کیوں وہ کچھ ٹھوں نہیں کر رہا، اور وہ ہربات عدالتی نظام پر رکھ دیتا۔ تب آنکھوں پر اعتدال کی پتی بندھی تھی۔ اب اس میں سوراخ ہو رہے تھے۔

کیا پتہ ہاشم نے وہ لیپ ناپ وارث کے قاتلوں سے حاصل کر لیا ہوا رودھ تصویر کھلی ہو گر اس نے ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ کیا پتہ اس میں کچھ ایسا ہو جو فارس کے لیے نقصان دہ ہو۔۔۔ مگر اس نے ہمیں کیوں بتایا؟۔۔۔ ہر تو جیخ کے آخر میں وہ الجھ جاتا۔ ہاشم نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہوا شاید، کچھ تو سوچا ہو گا۔ کیا پتہ یہ کوئی اور تصویر ہو، اس کی اپنی بیٹی کی، مگر نہیں، اس کی یادداشت، بہت اچھی تھی۔ یہ وہی فوٹو تھی۔

"میں ابھی آئی۔" حین ایک دم اٹھی اور باہر چلی گئی۔ اس نے کچھ نہیں پوچھا۔ بس یونہی چپ سامنے بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم چونک کر

سر اٹھایا۔۔۔

وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ گردن ادھر ادھر موڑی۔ پھر آہستہ سے اٹھا اور الماری کی طرف آیا۔

اس کی تربیت، اس کا ایمان، سب کہہ رہے تھے کہ کسی کا لا کر کھولنا گناہ ہے مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ آخری فتویٰ مجھ سے لو، میں کہتا ہوں ایسا کرڈا تو کرڈا لو۔ اور دل سے بحث کا وقت ہی نہیں تھا۔ اس نے جلدی جلدی کوڑ ڈالا۔ لا کر کھولنا۔ تصویر والا لفافہ سامنے تھا۔ سعدی نے کپکپاتے ہاں تھوں سے فوٹو نکالی اور اٹھائی۔

امل اور نور۔ اس کے دل کو دھکا لگا۔ یہ وہی فوٹو تھی۔ ہاشم کو بچ پسند تھے۔ وہ بچیوں کی تصویر بتاہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جواب تک بے لیقینی کے عالم میں تھا، ایک دم سے اس کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔ لب بھیج گئے۔ مژ کر دروازے کو دیکھا جس کے پار، بیچے لا ونچ میں ہاشم بیٹھا تھا۔ ایک لمبے کواس کا دل چاہا، ابھی جا کر اس کو گریبان سے پکڑنے اور اس سے پوچھنے کہ اس نے کیوں کیا ان کے ساتھ ایسا؟ اس کا اس سب میں ہاتھ تھا۔ فارس ٹھیک کہتا تھا کیونکہ فارس اس کو جانتا تھا۔ اور سعدی اس کو بالکل نہیں جانتا تھا۔

مگر وہ فارس نہیں تھا۔ اس کو غصے سے بے قابو ہو کر ہاشم کا گریبان نہیں پکڑنا تھا۔ اس کو کچھ اور کرنا تھا۔

اس نے وہ لفافہ نکالا۔ اس میں مزید بھی کچھ تصویریں تھیں۔ وہ ان کو دیکھا گیا اور دل ہر ایک پر ڈوبتا گیا۔

وہ اس ریسٹورانٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تھیں۔ خون میں لت پت زمر، بھی لوگ بھی اکٹھے ہونا شروع نہیں ہوئے

۱۹...وہ اور سے لی گئی تھیں۔ اور ہوش کے کمرے کی کھڑکی سے۔

سعدی کی آنکھوں سے نینداب تک بالکل غائب ہو چکی تھی۔ وہ ساکت، سانس روکے ایک کے بعد ایک تصورید کیھر رہا تھا۔ اس نے  
مالماں اپنے پیشہ و رفتار، اپنی مہارت کی تصاویر اپنے پاس سنبھال کر رکھتے ہیں، اور فخر سے اپنا بے عیب کام دیکھا کرتے ہیں، مگر اسے  
اللہ اُن آیاتھا۔

لگافے کی آخری چز اک فلیش ڈرائیور تھی۔ سعدی نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پر کوئی ٹیک نہیں لگا تھا۔۔۔

بابر نکل کر جنین نے رینگ کے اوپر سے جھانا۔ ہاشم نیچے صوفے پر بیٹھا، انگلیوں سے پیشانی مسل رہا تھا۔ سراہبایا تو حمد نے اشارہ

۱۴: اہرات مسلسل کچھ بول رہی تھی، اور نگزیب فون پر بات کر رہے تھے۔ ہاشم اس کے اشارہ کرنے پر انھوں کو پر آیا۔ جس وقت سعدی لاکر  
۱۵: روز دوبار باتھا، وہ دونوں بندرو روازے کے آگے کھڑے تھے۔

”نوشہ والی کا کمرہ کون سا ہے؟ مجھے چک کرنا ہے کہ ان کا کمپووزر ہیک تو نہیں کیا گپا؟“

”لیے تا تو وہ ساتھ لے کر گیا تھا، مگر وہ زیادہ ڈیکٹاپ استعمال کرتا ہے۔“ ہاشم ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پچھے

۱۱۔ نہ بتا جائے، اور کسی موقوٰتی بدل کی طرف اشارہ کرنا۔ (عین اس وقت سعدی دیوار کے پار لا کر میں سے تصویر پیس نکال کر دیکھ رہا تھا)

کے بڑا اور پیغمبر مسیح (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آنکھوں پر آنکھیں پڑیں۔ وہ فرم رہا آگے چاکر کر کے بیٹھ گئے اسے آن کیا۔

”اُخڑے تو آ کر کے اپنے تھیں والے سے ڈاغا سے سلے۔“

اگر دفعہ اپنی لب بات ہوئی تو ان پر  
”غیر شامخ اگھنے سہل احمدی

”ہوں۔ اچھا مس پیور کا پاسورڈ لیا ہے؟“

او انہ نے آریٰ تھیں۔ پتھریں۔ ہاں نے شانے اچکائے۔ تھکا تھکا سا وہ صوفی پر رسا لیا۔ دروازہ پورا ٹھلا ٹھلا۔ یچے سے بواہراتے ہو کے ان

”او کرچ بھی سے ازاد آتا ہوا۔“ اٹھنے پڑا ہے ماسورہ نہیں تھا، سواس نے آسانی سے کمپوٹر کھول لیا۔ اب وہ خاموشی سے کیز

”کہا آپ لوگ میںے دے رے ہیں؟ میر امطلب سے ابھی آپ اینے لا کر سے کچھ نکال رہے تھے۔“

”ڈنڈے کا سہنارا۔ مسکر شے و سے بڑھ کر نہیں ہیں۔“ وہ بند آنکھوں کو مسل رہا تھا۔

"آ کے ام، سالم کرنے کا بھاشناک ترکہ کرے، کیا معلوم وہ آے کہ کمیونٹرز اور فون شہ نہ کر رے ہوں۔ صرف ایک خالی

لہا مسکن آ کتا تین کانیکش بھول گر ”

بُو، اپ بے ٹوائے ہا۔ سی ہوں گے۔

"وہ لکھ کر میں اس کے مقابلے میں قعماً گا۔ کاشتہ ہمہ بھی تاتا، امنا، کونا، نکا، تو ہم وہ بھی رہ قمہ۔ سچتے۔" اور ہبھوں۔ میں اپنے بھائی کی رندی پر سکتیں ہوں گا۔ ایک دفعہ وہ واپس آجائے بھیریں اس تو ہم وہ بھی رہ قمہ۔"

۶۰۰ تھے۔ اُنہوں نے تھنڈے نگاہیں پڑھ کر کہا۔

لہرہی۔ دوسری جانب حامی رہی تو میں نے مرد ان سور مرد یعنی۔

وہ صوفی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کو میں اپنے بیٹے کی اور رب تھا لہذا دل وہی نہیں تھا جس کے ساتھ اس کی بیٹی کی نسبت میں اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔

”سوری میرا مطلب اپ لودی رننا نہیں کھا۔ مرہا مامے اے، ای سے میں مس رہلایا۔“ علیشا کا

معاملہ میں نے غلط طریقے سے ہینڈل کیا۔ پھر ابھی بھی میں تم پر غصہ کر گیا۔ مجھے تمہارے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آئیں ایک سوری بینا۔ آنکھیں بند کیں، انگلیوں سے پیشانی مسلط رہا۔ خینہ ہاتھ روک کر اسے دیکھے گئی۔

”میں نے جو بھی کہا، پر پیشانی میں کہا۔ میں اپ سیٹ ہوں۔ میرا بھائی مجھے بہت عزیز ہے۔ میں بہت اپ سیٹ ہوں۔“ اب وہ پھر نے بند آنکھوں کو مسل رہا تھا۔ خینہ دم سادھے اسے تک رہی تھی۔ پھر ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ بہت امید بے بی اور آس سے اسے دیکھا۔ ”اگر خاور ہوتا تو میں بھی ایک چھوٹی پچھی سے درخواست نہ کر رہا ہوتا، مگر میں اس وقت بالکل مغلوق ہوں خینہ...“ مدھم، تھکی آوازیں دو کہتا گیا اور وہ سانس روکے سنے گئی۔ ”تم کچھ بھی کرو! بس میرے بھائی کو اذیت دینے والوں کا پتہ کرو! مجھے کرو! گی نا؟“

اس نے ہاشم کو پہلی دفعہ تاکمز روک دیکھا تھا۔ اس نے شاید ہاشم کو دیکھا بھی پہلی بار تھا۔ اس طرح۔ اس نظر سے۔ اور یہ وہ لمحہ تھا جب ہاشم کے لئے خینہ ذوالفقار یوسف خان کا دل پلٹ گیا تھا۔ اور یہ وہ لمحہ تھا جب متصل کمرے میں کھڑے، لاکر میں سے تصویریں نکال کر دیکھتے سعدی ذوالفقار یوسف خان کا ذہن ہاشم کے لئے پلٹ گیا تھا۔

ان دونوں کے احساسات سے بے خبر ہاشم اپنی کمزوری، اپنے بھائی کو کسی دوسرے کے ہاتھ پا کر خود کو بہت بے بس محسوس کرتے ہوئے شیر و کمرے کے کاونچ پر نذر حال بیٹھا تھا۔

خینہ نے آہنگی سے رخ پھیر لیا۔ اس کے اپنے ہاتھ ذرا سے کلپائے تھے۔ پھر اس نے کچھ پھیر پڑت کیے، کمپیوٹر آف کیا، اور صوفے کی طرف گھومی۔

”آپ پر پیشان مت ہوں۔ وہ علیشا نہیں ہے علیشا ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ ایک کمزور لڑکی ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ مجھ سے ایسکیوڑ کریں، آپ بڑے ہیں، آپ نے وہی کیا جو آپ کو ٹھیک لگا۔ مگر ایک دفعہ آپ کو علیشا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اس کو پیے دینے سے آپ کی دولت کم نہ ہو جاتی، جیسے انواع کاروں کو دینے سے کم نہیں ہوگی۔“ مدھم سا کہہ کروہ باہر نکل آئی۔ ہاشم نے معلوم نہیں سنائیں بھی تھا۔

وہ واپس کمرے میں داخل ہوئی تو سعدی نے چونک کرس اٹھایا۔ وہ ہاشم کا لاکر کھولے کھڑا تھا۔ خینہ کو پہلے تو جھٹکا لگا، پھر گڑ بڑا کر جلدی سے دروازہ بند کرتی قریب آئی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”یہ فلیش چاہیے تھی مجھے۔“ جلدی سے وہ لفاف، جس میں وہ اقسام یہ ذال چکا تھا، واپس رکھا، لاکر بند کیا اور اس کی طرف گھوما۔ ”مجھے اس کو کاپی کرنا ہے۔ مت پوچھو یہ کیا ہے، بس میرے آفس کی چیز ہے۔ مجھے پتہ ہے یہ غلط ہے مگر تمہارے پاس کوئی ڈیو اس ہے جس پر میں یہ کاپی کر سکوں؟“

خینہ نے سر جھٹکا، اس ایک پرسوں لمحے کا اثر اکل کیا، اور گہری سانس لے کر، مشکوک نظروں سے بھائی کو دیکھتی آگئے آئی۔ ہاشم کی اسنڈی ٹیبل کی دراز کھولی، ادھر ادھر ہاتھ مارا اور واپس مزدی تو ہاتھ میں یو ایس بی تھی۔

”کیا یاد کریں گے، کس تھی سے پالا پڑا تھا۔ کاپی کر لیں، کچھ دن بعد آکر چپ چاپ رکھ دینا۔“

عام حالات میں اس چوری پر ڈانٹ دینے والے سعدی نے چپ چاپ اسے لیپ ناپ میں لگالیا۔

”اس میں ان کے کارٹیل کے کچھ ڈاکو منشیں ہیں۔ میرے پر جیکٹ کے لیے فائدہ مند ہیں۔“

”کارٹیل کیا ہوتا ہے؟“ وہ جو چیس اٹھا کر کھانے لگی تھی، رکی۔ پھر سر جھٹکا۔ ”خیر، نہیں بتانا بالکل بھی، اب آپ مجھے کچھ نہ بتایا۔“

ایسا میں بھی نہیں بتاؤں گی کچھ۔“

”سرنہ کھاؤ میرا۔ باہر جا کر مسز کاردار کے پاس بیٹھو۔“ وہ اس فلیش کو کاپی کر رہا تھا، جیسے ہی کام ختم ہوا، اس نے اصلی فلیش نکالی، اور اسے واپس لا کر میں رکھ دیا۔ جب پلٹا تو وہ ہنوز بیٹھی تھی۔ چیز اٹھا اٹھا کر منہ میں رکھتی ہوئی۔

”تم جاؤ بھی اچھا نہیں لگتا جب سے آئے ہیں ان کو ایک لفظ تسلی کانہیں بولا۔“

”اوکے!“ وہ مٹکوں نظرؤں سے اسے دیکھتی اٹھی اور باہر آگئی۔

ہاشم اب سیرھیاں اتر رہا تھا۔ حینیں نے دروازہ بند کر دیا، اور اس کے ساتھ یونچ اتر آئی۔ جواہرات اور اونگریب مخالف صوفوں پر ۱۰ نہ سے بیٹھے تھے۔ پوری رات کی ڈننی اذیت نے تمکا دیا تھا۔

”ڈونٹ وری انکل، ایک دفعہ نوشیرواں بھائی بخیریت گھر پہنچ جائیں، تو میں رقم کوڑ لیں کرلوں گی۔“

جواہرات نے تیز نظرؤں سے اسے گھورا۔ اور کیا اس میں اسی لڑکی کا ہاتھ ہے؟“

”نہیں، اس کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں۔“ اس نے شانے اچکا دیے۔ پھر قریب سے گزرتی میری اینجیو کو روکا۔ ”سن تو تمہارے فیش ۱۱ ہاں؛ یا نہیں ہوئے ابھی تک؟“

”بس میں لا ہی رہی تھی۔“

”ویسے آج کل میں ایک کرین ڈرامہ دیکھ رہی تھی Days 49۔ اس کا ایک فلپائنی ورثن بھی عنقریب بننے لگا ہے، کیا تمہارے مل میں بھی کے کچھ مشہور ہے؟“

”بہت زیادہ۔“ میری نے اس کو دیکھا، پھر سلکتی نظرؤں سے خود گھورتی جواہرات کو اور جلدی سے وہاں سے کھسک لی۔

اندر بیخا سعدی اب ہاشم کے لیپ ناپ کو لکھاں رہا تھا۔ کچھ تو ملے گا۔ سرسری سا ایک ایک فائل کھولتا، وہ ماہیں ہونے لگا تھا۔ بالآخر چند ڈاکو منش ملے جن کے نام نہیں تھے، صرف نمبر ز تھے اور وہ لاکٹھ تھے۔ انہی میں کچھ تھا۔ اس نے ان کو کاپی کرنے کی روش کی مگر یہ ناممکن تھا۔ اب کیا کرے؟ اور تبھی اغوا کاروں کا الگا پیغام آیا۔

پیغام پڑھ کر سعدی تیزی سے باہر ریلنگ پا آیا۔ یونچ سب بیٹھے تھے۔ حینیں بھی ٹانگ پٹانگ رکھے، پاؤں ہلاتی، موبائل پہن دبا، اور قمی۔

”ان لوگوں کا نیا پیغام آیا ہے۔ پیسے مل گئے ہیں، نوشیرواں چار سے پانچ گھنٹے تک پہنچ جائے گا مگر اس کے پہنچنے تک وہ نہیں ہا ہتے کہ ہم کسی کو خبر کریں۔“ وہ لیپ ناپ لئے یونچ اترتے ہوئے تارہ تھا۔ فلیش جیب میں تھی، اور چہرے پر گہری سمجھیدگی تھی۔ ذہن ابھی مل الجھا تھا۔

سب خاموش رہے۔ سعدی جسم کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ لیپ ناپ گھنٹوں پر رکھے، پھر سے کام کرنے لگی۔ چونکہ اسکرین حینیں کی الی طرف تھی تو کانوں میں ایکر فرز لگا دیے اور ڈرائی کی قطع چلا دی۔

”اور شیرود کے آنے تک وہ لوگ بہت دور جا چکے ہوں گے۔“ اونگریب بے بسی بھرے غصے سے بڑبڑائے۔ جواب میں جواہرات اور ہاشم ایک ساتھ بولنے لگے۔ سعدی نے ہاشم کو دیکھا تو دل نرم پڑنے لگا۔ وہ اتنا پریشان اتنا نوٹا ہوا لگ رہا تھا اور وہ اس کے بارے میں کیا ہے، فر رہا تھا؟ کیسے اس کے لارک سے کچھ چراک لے آیا؟ کیسے کر دیا اس نے یہ سب؟ تبھی اسکرین پر نظر پڑی۔

”ابھی تو تم کوئی اور ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔“ سعدی نے ہلکے سے سرگوشی کی۔ حینیں ایک لمحے کو گزبردی۔

”وہ.... یہ بھی میرا فنورت ہے، یونہی دوبارہ دیکھ رہی ہوں۔“ وہ خاموش رہا۔ ابھی ہوئی نیگاہیں اسکرین پر ہیں جہاں حینیں مناظر

آگے کر کے دیکھ رہی تھی۔

”آ.....ہاشم بھائی.....“ کوئی گھٹتے بعد سعدی نے اسے پکارا۔ وہ جو درمیان میں انھ کر باہر چلا گیا تھا، شیرد کے آنے کی تیاری وغیرہ ایسپورٹ فلائلنگ ٹیک کرنے، اب آکر بیخا تھا، اڑاچونک کرا سے دیکھا۔

”ہاں بولو۔“

”فارس ما میں کا وکیل کہہ رہا تھا کہ یہ میں اگردارث ما میں کی فائلز جائیں تو کسی نہ کسی طرح ہم ان کے اصل قاتلوں سکے پہنچ سکتے ہیں؟“

ہاشم ابھی تک شدید پریشانی کا شکار تھا، اس نے ذرا سے ثانے اچکائے۔

”مشکل ہے، اب کہاں ملیں گی اس کی فائلز۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ تم کوشش کرو مگر مشکل لگتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی بالکل، سمجھ رہا ہوں اب۔“ ذرا سا اثبات میں سر ہالایا، ہاتھ سے نامحسوس انداز میں جیز کی جیب کو چھوا جہاں فلیش موجود تھی۔ ہاشم اب موبائل دیکھنے لگا۔ اور سعدی گاہے بگاہے ایک سنجیدہ نظر اس کے چہرے پر ڈال لیتا۔ بار بار وہ دل میں ہاشم کی طرف صفائی پیش کرتا تھا، وہ ساری صفائیاں دم توڑ نے گیں۔ رات کی تاریکی میں اس کے اعتماد کا خون بھی آہستہ آہستہ رہنے لگا، اور رس رس کر بالآخر اس نے اعتماد کے لائے کو ادھ موکر دیا

❖❖❖

اس کے اپنے گھر کا صفائیا دن کو کیسے ہو پایا ..... وہ جوش بھر شہر کی خود نگرانی کرتا رہتا ہے صبح سورج نکلنے اور ہر سور و شنی پھینٹنے تک وہ لوگ وہیں لا وہنچ میں بیٹھے رہے۔ ناشتے کی میلیزاب میری اور فیونا لے کر جاری ہیں جب بیر ونی دروازے پہل چل چکی۔ ہاشم شیر و کو ایسپورٹ سے لے کر آ گیا تھا۔ جواہرات اور اونگزیب تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ سعدی ہنوز خاموش سوچ میں ڈوبا بیخا تھا، اور جنین، وہ جوں کے گھونٹ گھونٹ پیتی، تیکھی نظر وہیں سے دونوں ماں باپ کو اپنے بیٹھے کو گلے لگاتے دیکھتی رہی۔ وہ واقعی ہکان کا مارالگ رہا تھا، ماتھے کے زخم پر بیڈنڈ تھا۔ آنکھیں روئی روئی تھیں۔ زبردستی مسکراتا ماں سے گلے لگ کر الگ ہوا تو ان دونوں ماں بھائی کو بیٹھے دیکھ کر چونکا، پھر فوراً ہاشم کی طرف دیکھا۔

”جنین کمپیوٹر میں اچھی ہے، ہم ان لوگوں کو ٹریلیں کرنے کے لئے اس کی خدمات لے رہے تھے۔“ اس نے وضاحت دی۔

”تو کیا آپ نے پیسے واپس حاصل کر لئے۔“ وہ حیرت سے پوچھتا صوفے پر بیخا۔ اونگزیب ایک طرف اور جواہرات دوسری طرف بار بار نام آنکھوں کو پوچھتی۔ اونگزیب گوکا اپنے تاثرات کو خرت کر کر ہی بیٹھے تھے، مگر اندر سے وہ زرم پر چکے تھے۔

”نہیں!“ ہاشم مسکراتے ہوئے (بالآخر) اور واپس آتے اعتماد کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیخا۔ ”ہم تمہارے آنے سے پہلے ان کا تعاقب کر کے تمہاری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے تھے۔ مگر جنین کہہ رہی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ٹریلیں کر سکتی ہے۔“

”تو کیا ان دونوں کو کال کرنے پا نہیں نے مجھے یہ زخم دیا؟“ بگز کر کہتے اس نے پیشانی کے زخم کی جانب اشارہ کیا۔ اسے سعدی کا یہاں ہونا سخت ناگوار گز رہا تھا۔ جواہرات نے اس کا ہاتھا پنے ہاتھوں میں دبایا۔

”ہاشم نے تو بس یونہی ان کو بلا لیا....“ ساتھ ہی جتنی نظر جنین پر ڈالی اور پھر شیرد کے ماتھے کے بال ہنا کر بیڈنڈ تھیک کرنے لگی۔ وہ ایک دم بہت خفاظت آنے لگا تھا۔

”آپ لوگوں نے مجھے بچانے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟ جانتے ہیں میرا کیا حال تھا ادھر؟ کتنا غوف میں نے محسوس کیا؟ کیا پیسے مجھ سے زیادہ اہم تھے؟“

”ایسا نہیں ہے شیرود۔“ اور نگزیب نے بھی ہولے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مگر اس نے کندھا جھٹک دیا۔ حنین نے جوں کا گاں رکھا، اور رکھنا ہماری۔

”آپ نے ان کی شکل میں تو دیکھی ہوں گی نوشیر وال بھائی؟“

”ہاں!“

”چلیں یہ اچھا ہوا کیونکہ دیسے ان لوگوں کو تریس کرنا مشکل ہے۔ اصل میں، میری کوریا کے ایک پولیس چیف سے بات ہوئی ہے۔ (سعدی نے چونکہ کر حنف کو دیکھا ہوا پورے اعتماد سے نوشیر وال کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔) ان کو دو لوگوں پر شک ہے۔ یہ دونوں نامور مجرم ہیں اور دونوں کل رات امریکہ منتقل ہو گئے ہیں، افسوس کہ اب نہ تم ان سے رقم واپس لے سکتے ہیں نہ ہی ان کو پکڑ سکتے ہیں۔ آپ بس ان دونوں کی تصویریں دیکھ کر تنفر مکر دیں کہ آپ کو پکڑنے والے گروہ کا سراغنہ کون تھا۔ حیران مت ہوں ہاشم بھائی، مجھ سے زیادہ کورین لوگوں کو کون جانتا ہے؟“ اس نے دو پر نٹ آؤٹ سامنے کیے۔ دو کورین مردوں کے کلوڑاپ سب کے سامنے ہوئے۔

ہاشم بے چینی سے آگے ہوا۔ ”مجھے بتائے بغیر تم کیسے کسی سے بات کر سکتی ہو؟ اگر وہ شیر و کونقصان پہنچاتے تو؟“

سعدی نے ایک چھپتی ہوئی نظر ہاشم پر ڈالی۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ کیا صرف شیرود کی جان اہم تھی؟ اور امال اور نور کے لیے کوئی اہم نہیں تھا؟

”بیاتی ہوں، پہلے شیرود بھائی کو نفرم تو کر دیں کہ ان میں سے کون تھا وہ۔“ نوشیر وال نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھئے پھر دائیں والے پڑھہ را آنکھیں سکیڑیں۔

”بیہی تھا۔ بالکل یہی تھا۔“

”شیورا!“ حنین نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”سو فیصد۔ مگر اب یہ کہاں ہو گا؟“

حنین نے گہری سانس لی، جیسے کندھوں سے کوئی بو جھا اتر گیا ہو۔ اور پھر مسکرائی۔ شرارت سے معمومیت سے۔

”یہ آج کل امریکہ میں ہے، فلم کی شوٹنگ کے لئے۔ اورہ سوری، شیرود بھائی، مگر یہ Lee Min Ho ہے۔ کوریا کا دوسرا بڑا ایکٹر۔ یہ پہلی تصویریں کی پلاٹٹک سرجی سے پہلے کی ہے، دوسری سرجی کے بعد کی۔“

کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ کسی کواس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ نوشیر وال کا رنگ سفید پڑنے لگا۔

”نوشیر وال بھائی، آپ خود بتائیں گے یا میں بتاؤں کہ اپنے آپ کو آپ نے خود ہی انداز کیا تھا۔ اور وہ تاو ان کی رقم وہ بھی آپ کے ہی اکاؤنٹ میں ہے۔“ جواہرات کا شیرود کا کندھا مسلتا ہاتھ رک گیا۔ اور نگزیب بے اختیار آگے کو ہوئے، اور ہاشم بالکل ساکت بیٹھا رہ گیا۔

”کیا.... بک.... واس ہے؟“ شیرود کلایا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”سارے ذین لوگوں کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ انہیں لگتا ہے کہ کوئی ان کو بے وقوف نہیں بن سکتا۔ اسی لئے میں نے اپنے شک کی تصدیق کا انتظار کیا۔ جو کہ اب ہو گیا۔“ تصویریں لہرا کیں۔

”یہ مت کہیے گا کہ سارے کورین ایک سے لکتے ہیں تو آپ نے غلط بندے کی تصویر کی تصدیق کر دی۔ کورین بھی اتنے ہی مختلف ہوتے ہیں جتنے کہ ہم۔“

”تم.... کیا کہہ رہی ہو تمہیں خود بھی علم ہے؟“ جواہرات دانت میتی غرائی۔ سعدی بالکل چپ بیٹھا تھا۔

”مجھے ہی تو علم ہے ممزکاردار۔ شیرود بھائی بھی بھی اچھے کر ملن نہیں بن سکتے کیونکہ انہوں نے چند غلطیاں کر دیں۔ جو پہلی دینہ یو

بھیجی، توان کی رقم کے لئے اور دوسری جس میں ماتھے پر ختم تھا، دونوں میں ان کاروں نا مجھے سوری گمراہ اکاری لگتا تھا، اور یونو، میں اتنے ملکوں اور کلپھر کے ڈرامے دیکھ چکی ہوں کہ اداکاری کو مجھ سے بہتر جو نہیں کر سکتے آپ لوگ۔ سو میں نے وید یوز کی تاریخ چیک کی۔ وہ دونوں تین دن پرانی تھیں، ختم والی بھائی۔ شیر و بھائی کو اندازہ تھا کہ ہاشم بھائی اپنے جانے والوں کو فون ضرور کریں گے اس لئے انہوں نے دو وید یوز تیار کر لیں۔ انہوں سے چند گھنٹے پہلے اگر ان کی ہاشم بھائی سے بات ہوئی تھی تو یہ وید یوز تو اس سے بھی پہلے کی تھیں۔ سو ظاہر ہوا کہ جعلی تھیں۔ گمراہ پ کو یہ وید یوز کو ریا میں تیار کرنی چاہیے تھیں، کیونکہ..... ایک اور پرنسٹ شدہ صفحہ لہرایا جس میں شیر و کی وید یوکا اصل امیج تھا۔ ”یہ جو آپ کے پیچھے دیوار پر سوچ نظر آ رہا ہے، یہ عام پاکستانی سوچ جیسا ہے، جبکہ کوریا میں سوچ کھو کھلے ہوتے ہیں، اندھے کے آدھے چھلکے کی طرح،

پلگ ان کے اندر ڈالا جاتا ہے۔ یہ کورین سوچ نہیں ہے۔ اور.... وید یوکا ایک اور اسٹل امیج مکراتے ہوئے سامنے لائی۔ ”چھت پ کوئی فائر الارم نہیں ہے، جبکہ کورین گھروں میں چھت پ فائر الارم ضرور ہوتا ہے۔ آپ نے لکڑی کا فرش، سلاں یہ نگ ڈوزہ رجیز پر فیکٹ رکھی، مگر.... ایک سو گیارہ کورین ڈرامے اور فلمیں دیکھنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ سو میں نے آپ کے کپیوٹر کی ہسٹری چیک کی۔ ایک اور کانڈزان کے سامنے میز پر رکھا۔ اب وہ کھڑے کھڑے، باقی کاغذ ہاتھ میں پکڑے بول رہی تھی اور سب اس کو ان رہے تھے۔ ہکاہکا۔

”پچھلے ہفتے میں یہ وہ تمام دیب سائنس ہیں جو آپ نے کھولیں، اپناFake اغوا کرنے کے طریقے، ”غیرہ وغیرہ۔ اور آپ نے وہ فیک کلڈ نیپ والے بہت سے امریکی ڈرامے اور فلمیں بھی دیکھیں، کیونکہ آج کل یہ امیر مان باپ کے گڈڑے بچے کا خود کو اغوا کر لینا ہر دوسرا سے امریکی ڈرامے میں ہو رہا ہوتا ہے، یہ رہے ان تمام ڈراموں اور فلموں کی لست جو آپ نے ڈاؤن لوڈ کر رکھے تھے۔ اوه ہاں، اور وہ اپنا کان کاٹ کر بھینجے والا آئینڈا... وہ ”اسکینڈل“ سے تھا، اس میں ڈویل کی بیٹی نے تو واقعی اپنا کان بھینج دیا تھا، مگر مجھے معلوم تھا، اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ مگر آپ نے صرف وہ قطع ”بکھی، تھی، مجھے تو وہ“ ایک منٹر بھی اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے، ”والا ڈائیلاگ بھی یاد تھا۔“

نوشیر وال دھوان دھوان ہوتے چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا جیسے کچھ ڈس گیا ہوا سے۔ اور گنزیب کے لب بھنج چکے تھے، کشٹی کی نہیں ابھر آئیں، سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ہاشم ابھی تک سن تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ جھوٹ بولنا بند کرو۔ میرے ہی گھر میں تم میرے بیٹے کے بارے میں کیا بولے جا رہی ہو،“ جواہرات غصے سے کاپنی آواز میں بولنے لگی۔ ”اگر ایسا کچھ تھا تو تم اسی وقت بتاتی۔“

”اگر میں یہ سب آپ لوگوں کو تب بتا دیتی تو آپ فوراً شیر و بھائی کو فون کر کے لنفرنٹ کرنا شروع کر دیتے اور یہ واپس ہی نہ آتے اور ممکن تھا کہ میں ہی غلط ہوتی، تو مجھے تصدیق تو کرنی تھی نا۔ کیوں بھائی؟“ ”محظوظ ہونے والے انداز میں آنکھیں گھما کر سعدی کو دیکھا۔ وہ ہر شے سے بے نیاز چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اسے کچھ بھی مزید ہیران نہیں کر سکتا تھا۔

باقی سب بھی خاموش تھے۔ ہاشم بالکل شل، اور گنزیب ضبط کیے اور جواہرات بے چین، کبھی ادھر دیکھتی کبھی ادھر۔ نوشیر وال کا چہرہ دھوان دھوان ہو رہا تھا۔ مگر وہ شاک سے نکل آیا تھا۔ بدقت کھڑے ہوتے اس نے چلانے کی سُنی کی۔

”میں.... میں تمہارا منہ نوچ لوں کا، تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ مجھ پر اتنے گھٹیا اڑام لگانے کی....“

”تمیز سے بات کرو میری بہن سے۔“ سعدی ایک دم تیزی سے اٹھا۔ سلکتی نظر وہ سے شیر و کو دیکھا، اور پھر حنہ کو۔ ”چلو۔“

”ابھی سے کیوں؟ ابھی تو شیر و بھائی کی کلاس شروع ہوئی تھی۔“ حنیں نے منہ بنایا مگر سعدی دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا، سواس نے شانے اپکائے، نوشیر وال کو مسکرا کر دیکھتے بال جھکتے اور سعدی کے پیچھے ہوئی۔

”آپ لوگ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟ اس پاگل کو کسی نے ٹوکا کیوں نہیں؟ میں اتنی تکلیف سے گزر کر آ رہا ہوں اور....“ نکلتے ہوئے انہوں نے نوشیر وال کو پھر کر چلا تھا سنا۔ مگر کسی اور کی آواز نہیں آئی۔ سب خاموش تھے۔

برآمدے میں آکر سعدی نیچے چلا گیا تاکہ کارا دھر لے آئے۔ حنین ستون کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ باہر صبح تازہ دم سی اتر رہی تھی۔ ہوا مہنگی اور دھنڈ بھی پھیلی تھی۔ حنین نے کوٹ کی بندسر پر گردی۔ تھی عقب میں دروازہ کھلا۔ وہ چونک کرمزی۔ ایک لمحے کو دھڑکا، کہ کہیں اُنہیں منزوپنے نہ آگیا ہو۔۔۔ مگر۔۔۔

ہاشم آہستہ سے دروازہ بند کرتا بہر آیا۔ اس نے سوئٹر تک نہیں پہننا تھا، باہر آنے کے باوجود اس کو سردی نہیں لگ رہی تھی۔ چہرہ سفید اہان زدہ تھا۔

”تھیک یو بیٹا۔ تم دونوں کا کہ تم لوگ پوری رات ہمارے ساتھ رہے۔“ وہ کس وقت سے بول پا رہا تھا۔ حنین کو اندازہ تھا۔ اس کے الہام پڑھو۔

”کوئی بات نہیں ہاشم بھائی۔“ شیر و سے آنکھیں گھما کر بات کرتی وہ کوئی اور تھی اور یہ اتنی زم کوئی اور تھی۔

”مجھے بتاؤ کس طرح تمہارے اس فیور کا بدله دے سکتا ہوں؟ کوئی چیز کوئی کام کچھ چاہیے تمہیں؟“

اپنے گرد بازو لپیٹیں، ہڈ سرپر گرانے ہدنے سے نزی سے مسکراتے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، کچھ بھی نہیں۔ میں اپنے سارے مسئلے خود حل کر لیں ہوں یا اپنے بھائی کو کہہ دیتی ہوں۔“

”بجھی کبھی انسان اپنے بھائی کو بھی اعتاد میں نہیں لیتا، مجھے آج اندازہ ہوا ہے، اگر کوئی بھی ایسا مسئلہ ہو جو تم سعدی کو بھی نہ بتانا چاہو اہم کال کر لیتا۔ جیسے تم لوگ میری ایک کال پا آئے ہو، میں بھی آؤں گا، اوکے؟“ دھنڈ آکر دو صحن میں پھر سے وہی فسوں چھانے لگا۔ دور کہیں اُن نے موسیقی کی تال چھیڑی تھی۔ بدقت وہ ہاشم پنگا ہیں جمائے، مسکرا پائی۔

”اوکے، لیکن اگر میرے کال کرنے پا آپ نے پوچھا کہ کون حنین؟ تو؟“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ پھر وہ نہ ہبرا۔ ”سنو، علیشا سے کہنا، مجھے کال کر لے۔ میں اس کی فیس کی رقم اسے بھجوادوں گا۔“

وہ ایک دم چوکی۔ ”آپ۔۔۔ آپ کی فیس بھریں گے؟“ خوشی سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”میں اتنا برا بھی نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھتی ہو۔“ ستے ہوئے چہرے سے وہ مسکرا یا۔

سعدی ہارن دے رہا تھا، وہ ہاشم کو خدا حافظ کہہ کر زینے اترتی نیچ چ آئی۔ فربت سیٹ پہ بیٹھی۔ اپنی پرفارمنس یاد کر کے خود ہی ای۔ ”کیا آپ نے دیکھا میں کس طرح بولی؟ تھوڑا سا دل دھڑکا تھا میرا، ہاتھ بھی کاپنے مگر جب میں بولی تو واو۔۔۔ بالکل ہیر و کن لگ رہی تھی میں۔ اور پوتے ہے ہاشم بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہ علیشا کی فیس۔۔۔“ سعدی خاموشی سے ڈرائیور کرتا کارا گے لے گیا۔۔۔

ہاشم برآمدے میں کھڑا نہیں دیکھتا ہا۔ سخت سردی اور دھنڈ میں، یہاں تک کہ کار درور چلی گئی۔ پھر وہ والپس اندر آیا۔

”کیا یہ سب صحیح تھا؟ تم نے اپنے باپ کو بے دوف بنایا؟ تم.....“ اور لگنیزیب کھڑے چلا رہے تھے جو اہرات ہنوز پر پیشان، مضطرب

ایمی تھی، اور نو شیر و اس ان کے مقابل کھڑا تھا۔

”آپ لوگوں کو اس پاگل بڑی کی بات پا اعتبار ہے وہ اور سعدی۔۔۔ یہ لوگ ہمیشہ میرے گھر میں فساد کرتے ہیں، وہ سعدی تو.... ہاشم

ہماں، آپ نے اس کو دو تھپٹ کیوں نہیں لگائے جب وہ یہ ساری کبواس کر رہی تھی؟“ ہاشم کو آتے دیکھ کر وہ طیش سے چینا تھا۔

خاموش ہاشم قدم قدم چتا اس کے قریب آیا، اس کے مقابل کھڑا ہوا، اندر تک اترتی نگاہوں سے اس کا چہرہ تکتا رہا، اور پھر.... ایک زور دار تھپڑا اس کے منہ پہ مارا۔

نو شیر و اس بڑا کر پیچھے ہوا۔ جیرت سے گنگ، اس نے اپنے سرخ گال پہ ہاتھ رکھا۔

”کاش میں تمہارا نہیں سعدی کا بھائی ہوتا۔“ نہ غصہ نہ ناراضی، سرف دکھ سے ایک ایک حرفاً ادا کیا، پھر سے میز کو نکھو کر ماری، حنین

کے پرنٹ کردہ کاغذات بکھر کر زمین پر گر گئے۔ اور آگے بڑھ گیا۔ نوشیر و اس گال پر ہاتھ رکھ بے یقینی سے اس کو میڑھیوں پر اوپر جاتے دیکھنے لگا۔ پھر خ موڑا۔ اور انگزیب سرخ چہرہ لئے اسے گھور رہے تھے۔

”ہاں کیا ہے میں نے یہ سب۔“ گال سے ہاتھ ہٹا کر وہ غصے سے چلا یا۔ ”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایسے ہاتھ روک کر پیسے دیتے ہیں مجھے جیسے میں سوتیل اولاد ہوں۔ ہاں آپ کا بھی دل چاہتا ہے کہ میری جگہ یہ..... یہ.....“ دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے خینہ نکلی تھی۔ ”یہ زکی آپ کی بیٹی ہوتی۔ انہی لوگوں کی باتوں پر زیادہ یقین ہے نا آپ کو؟ یہ سعدی زیادہ پسند ہے نا آپ تینوں کو؟“ لال بھوکا ہوتا بولتا وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”دفعہ ہو جاؤ میرے سامنے سے۔“ وہ بھی طیش سے چلا گئے تھے۔ ہاشم نے گویا کان بند کیے اور پرانے کمرے میں قدم رکھا، اور دروازہ بند کر لیا۔ نوشیر نے بے بسی سے اس کے بند دروازے کو دیکھا۔ آنسو بہنا تیز ہو گئے۔ وہ مڑا اور کاف سے آنکھیں رگڑتا سیر ہیاں چڑھتا گیا۔ اپنے کمرے میں آگ کر دروازہ دھاڑ سے بند کر کے وہ کمپیوٹر نیبل کے سامنے آیا تو اسکرین کو دیکھ کر رکا۔ بند اسکرین پر ایک Sticky Note چپا تھا، جس پر خینہ نے لکھا تھا۔

”عقل کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ گم اور شیر و بھائی، ساتھ میں زبان چڑھاتی سائیلی بھی تھی۔ اس نے نوٹ جھپٹ کر مٹھی میں مردڑا۔ کاف سے دوبارہ سے آنکھیں رگڑیں۔ اب ان میں خون اتر رہا تھا۔ اتنا لمباڑا رامہ اور سب بر باد گیا تھا۔“

”آج پھر اسی سعدی نے اپنی بہن کے ذریعے میرے گھر میں فساد ڈالا۔ میں قسم کھاتا ہوں، ایک دن میں سعدی یوسف کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا۔“ اور ڈیڑھ سال گزر جانے کے بعد بھی نوشیر و اس کو اپنی قسم یاد تھی۔

باہر اور انگزیب، جواہرات پر چلا رہے تھے۔ ایک لفظ بھی اس کی حمایت میں بولا تو میں سمجھوں گا تم بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ اپنے بیٹے سے کہو، صبح دس بجے تک میری ساری رقم میرے اکاؤنٹ میں واپس پہنچا دے ورنہ۔“

باہر سورج کی کرنوں نے دھند میں سے راستہ بنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں سے دور، اس چھوٹے باعثے والے گھر میں خینہ سونے ہا چکی تھی اور سعدی اپنے کمرے میں بیٹھا، لیپ ناپ پر وہ فلیش لگا کر دیکھ رہا تھا۔ اس میں وہی تصاویر تھیں جن کی پرنٹ شدہ شکل وہ لا کر میں دیکھ چکا تھا۔ اور دو آڈیو فائلز تھیں۔ ایک میں فارس کہہ رہا تھا کہ اب زمرہ ہوٹل کی بجائے ریسورٹ آئے۔ دوسرا آڈیو طویل تھی۔

سعدی نے پلے کی۔ پہلی دفعہ سنا تو وہ سن رہ گیا۔ زمرہ تھیک کہہ رہی تھی۔ فارس نے اسے واقعی یہ سب کہا تھا۔ تو کیا ہاشم کی طرح فارس بھی اس سے جھوٹ بولتا آیا تھا؟

دوسری دفعہ سے سنا تو مزید صدمہ لگا۔ فارس یہ سب کیسے اور۔۔۔ کیوں؟

تیری دفعہ سنا تو بے یقینی گھبراہت میں بدلنے لگی۔ کیا اس کے گرد سب جھوٹ بولنے والے موجود تھے؟ پھر چاکوں کون تھا؟ چوتھی دفعہ پر کوئی عجیب سا احساس ہونے لگا۔ کچھ غلط تھا۔ چند الفاظ فارس اس طرح نہیں بولتا تھا۔ وہ بار بار آڈیو دہرانے لگا۔ اتنی دفعہ کر اسے گنتی بھول گئی۔ چھرے پر بس ایک چونک جانے کا احساس نظر آ رہا تھا۔ وہ فارس نہیں تھا۔ بہت غور کرنے پر اسے احساس ہوا تھا کہ لبجھ میں ہا کسا، بس ہا کسا سفر ق تھا۔ پہلی دفعہ منہ میں اسے بھی وہ فارس لگا تھا۔

اور زمر۔۔۔ وہ چونکا۔۔۔ زمر نے تو وہ آڈیو بس ایک ہی دفعہ سئی تھی! اوہ!

ڈھائی سال سے بکھرے گئے اب پڑل میں جزنے لگے تھے۔۔۔ اور جو شکل سامنے آ رہی تھی وہ بہت بھیا مک تھی۔  
وہ ہاشم کی شکل تھی۔

آج دوپہر کے سورج نے دھند کو بہت ہلاک کر دیا تھا۔ روشن دان سے روشنی جھلک کر کمرے کے وسط میں رکھی میز پر گردی جس کے ایک طرف فارس بیٹھا تھا، اور دوسری جانب سعدی۔ ساتھ میں فارس کا وکیل۔ وہاں اداں کر دینے والی خاموشی تھی جس میں بچپناوے اور تاسف کی سی ویرانی بھی تھی۔ سعدی نے بہت دیر بعد جھکا سراٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں بلکل سی نمی تھی، اور بہت ساری شرمندگی۔

”آئی ایم سوری!“

”کس بات کے لئے؟“ غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھتے فارس کو اچنچھا ہوا۔

”آپ کو اتنا کم کمزور کرنے کے لئے۔“

”کوئی بات نہیں، تم جاب کر رہے ہو مجھے پڑتے ہے۔“ اس نے سمجھنے والے انداز میں ہلکے سے کندھے جھلکلے۔ سعدی اس طرح اسے دیکھتا ہا۔ فارس سفید کرتے شلوار میں ملبوس تھا۔ ایک زمانے میں چھوٹے کٹے بال اب بڑھ پکے تھے، اتنے کہ انہیں کس کر پونی میں باندھ رکھا تھا۔ شیوپلکی بلکل بڑھی تھی، مگر دوسرے قیدیوں کی نسبت وہ کافی صاف سترہ اسالگتا تھا۔

”اب اس آڈیو کا کیا کرنا ہے؟“ فارس نے وکیل کے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ یہ میری آواز نہیں ہے، مگر مشا بہت بہت زیادہ ہے۔ اگر میریم نے کہی سنی ہے تو ان کو اب میں اپنی بے گناہی کا لیقین کبھی نہیں دلا سکتا۔“ وکیل صاحب حکنخا رے۔

”ہم نے اسے ایک ایکسپریس کو دکھایا ہے، اس نے یہ ثابت کر کے بتایا ہے کہ یہ converted ووائس ہے۔ جعلی ہے۔“

”ہم نے نہیں، میں نے۔“ سعدی نے تختی سے ان کو دیکھا۔ ”آپ تو اس کے پاس چلنے تک کو راضی نہیں تھے۔“

”میں ایک اور کیس کے سلسلے میں معروف تھا۔ اور تمام قانونی پیچیدگیاں آپ کو سمجھا چکا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ سعدی مزید تختی سے جواب میں کچھ کہتا، فارس نے بے چینی سے اسے نو کا۔

”کیا ہم کو رث میں یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ میری آواز نہیں ہے؟“

”نہیں، جب تک کہ سعدی اس کا سورس ظاہر نہیں کرتا، کو رث اس کو کیسے قول کرے گا۔“

”محمود صاحب میں آپ کو کتنی دفعہ بتا چکا ہوں، یہ آڈیو مجھے میری پچھپو نے نکلا کر دی ہے اور میں ان کا نام لے کر ان کو incriminate نہیں کر سکتا۔ اور میری اجازت کے بغیر آپ بھی یہ نہیں کر سکتے۔“

”بھی پھر تو مسئلہ بن جائے گا! یہ ہمارے حق سے زیادہ خلاف جائے گی۔ میں اسے کو رث میں پیش کرنے کی نصیحت کبھی نہیں کروں گا۔“ محمود صاحب ہاتھ جھاڑ کر پیچھے کو ہو بیٹھے۔ سعدی نے ایک تیکھی نظر ان پڑالی، پھر واپس فارس کو دیکھا۔

”ماں اگر میں آپ کے لیے کوئی فیصلہ لوں تو مجھے اپنی زبان دیں، کہ آپ اعتراض نہیں کریں گے۔“

”نہیں کروں گا، لیکن۔“ وہ اپنے سے بولنا چاہ رہا تھا مگر سعدی فوراً محمود صاحب کی طرف گھوما۔

”آپ کو میں فارس غازی کے وکیل کے منصب سے ہٹاتا ہوں۔“

وہ ایک دم سیدھے ہوئے، حیرت سے اسے اور پھر فارس کو دیکھا۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ناگواری سے ما تھی پٹکنیں ابھریں۔

”یہی کہ آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔“

”میں فارس غازی کا وکیل ہوں، آپ کا نہیں!“ وہ ایک دم چمک کر بولے۔ فارس چند لمحے چپ رہا۔ ہاری پاری دونوں کے

چہرے دیکھے۔

میں غارت گر

”میں سعدی کی تائید کرتا ہوں۔ آپ جاسکتے ہیں۔“ سعدی کے لبؤں پہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کامان نہیں توٹا۔ ابھی دنیا سے اس کے اپنے ختم نہیں ہوئے تھے۔

وہ جیسے بہت ضبط کر کے اٹھے۔

”انہماں بچکانہ رو یہ ہے یہ، پیشی سے چند دن پہلے آپ دکیل کو فارغ کر رہے ہیں۔ مجھے ہاشم کا درار نے ان کا دکیل مقرر کیا تھا۔“

”اور انہی سے وصول کچھ گا اپنے بقايا اور جبات کیونکہ میں تو آپ کو اپنے حلال رزق سے ایک پائی بھی نہیں دینے لگا۔“ بے نیازی سے انہیں باہر جانے کا رستہ دکھایا۔ وہ اپنی چیزیں سمیتے، کوٹ کا بن بند کرتے، منہ میں بڑا تے باہر نکل گئے۔

”یہ سب کیا تھا؟“ فارس غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا؟“

”سعدی تم مجھے پریشان کر رہے ہو!“ وہ فرمندی سے کہتا آگئے ہوا۔ ”یہ آذیوں کر بھی زیادہ رہی ایکت نہیں کیا میں نے، کیونکہ میرے لیے کچھ بھی پریشان کن نہیں ہے سوائے تمہاری شکل کے۔ ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ؟“

جمز اور ہائی نیک کے اوپر جیکٹ پہنے بیٹھاڑ کا ادا سی سے مسکرا یا۔ ”میں ریشم کا بن چکا ہوں اور ریشم اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔“ مجھ سے آپ کچھ بھی نہیں الگو پائیں گے۔ اس وقت میرا کام آپ کو یہاں سے نکلوانا ہے، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا کروں گا۔ سوال مت کریں، وہ بتا میں جو میں نے پوچھا تھا۔ ”اس نے یاد دلایا۔“ جن لوگوں پر آپ کوشک ہے، ان کی فہرست بنائی آپ نے؟“

”ہاں لکھو۔“ وہ بتانے لگا اور سعدی بین نکال کر لکھنے لگا۔ کوئیکر وہ چند لوگ جن کے خلاف اس نے کیسز تیار کیے تھے، دارث کا باس۔ اور باس۔ سعدی نے چینی سے نظریں اٹھائیں۔

”ہاشم بھائی کا نام نہیں لکھوایا آپ نے؟“

فارس کچھ دیر سوچتا رہا، پھر فتحی میں سرہلا یا۔ ”اوہ ہوں۔ اس کا تعلق نہیں ہے اس سب سے۔“

”مگر آپ نے خود کہا تھا کہ۔“

”میں نے ڈھائی سال اس بارے میں سوچا ہے، پہلے گرم دماغ سے، پھر ٹھنڈے دل سے، مگر ہاشم کے پاس یہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور اس نے میرے لئے بھاگ دوڑ بھی کی ہے کافی، سو میں بے شک اسے شدید ناپسند کرتا ہوں، مگر اس کو اس سب میں نہیں گھیشیوں گا۔ یہ غلط ہے۔“

سعدی نے گھری سانس لے کر اس فہرست کو دیکھا اور پھر فتحی میں سرہلا یا۔

”بھول جائیں اس بات کو۔“ کاغذ مرور ذکر مٹھی میں دبایا۔ ”آپ کا اے ٹی ایم، کریڈٹ کارڈ زاور چیک بکس ہاشم بھائی نے رقم کافی ہو گی۔“

”جب اتنے سال میں کہتا رہا کہ ہاشم سے پیے مت لو میرے دکیل کے لیے تب تم نے وہ نہیں کہا جاؤ ج کہہ رہے ہو۔ اب کیا ہوا ہے؟“ وہ ابھی تک آنکھیں سیئر کر اس کو دیکھ رہا تھا۔

”مجھے ان پر اعتبار نہیں رہا۔“ اس کی آواز میں تکلیف تھی۔

”سعدی کیا چھپا رہے ہو؟“

”سوال مت کریں۔ انتظار کریں۔“ اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فارس متکفر نظر وں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

باہر ڈھوپ اب تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پر معمول کی تریک بہرہ رہی تھی۔ کارڈ رائیو کرتے سعدی نے پینڈ زفری کا نوں میں لگائے اور موبائل پر نمبر دل کیا۔ چند گھنٹیوں بعد ہاشم نے پک کر لیا۔

”ہاں بیٹھا خیر ہے؟“ وہ مصروف گر رہا تھا۔

”جی ایک کام تھا آپ سے۔“ یہ اتنے دن بعد پہلی دفعہ ہاشم سے بات ہو رہی تھی۔

”ہوں بولو۔“

”میں نے محمود صاحب کو فائز کر دیا ہے۔ اب مجھے ماموں کے لئے ایک بہتر وکیل کی تلاش ہے۔“

”کیوں؟ فائز کیوں کیا؟“ وہ جو نکا تھا۔

”کیونکہ مجھے وہ سوت اور نا اہل لگتے ہیں۔ خیر، آپ مجھے پانچ بھتے بہترین وکیلوں کے نام نیکست کر دیں، جن کو مجھے ہائز کرنا چاہیے۔“

ہاشم چند لمحے کو خاموش ہو گیا۔ پھر بولا تو کافی سوچتے ہوئے۔ ”اوکے،“ کرتا ہوں۔ میرے ریفارنس سے ان سے مل لینا۔ کام ہو جائے گا۔ ویسے ساعت کے اتنے نزدیک آ کر وکیل کو فائز کرنا بے وقوفی ہے سعدی۔“

”اور یہ تو میں جان گیا ہوں کہ میں لکنابے وقوف ہوں۔“

”کوئی مسئلہ ہے تو میں محمود صاحب سے بات کر لیتا ہوں، مفاہمت تو ہر ای شوپہ ہو سکتی ہے۔“

”مفاہمت کی ہی تو گنجائش نہیں رہی۔ آپ نیکست کر دیجئے گا بھی۔“

اور موبائل فرنٹ سیٹ پر ڈال دیا۔ چہرے پر چھائی تلکی میں اضافہ ہو گیا۔ لب بھینچ گئے۔ آنکھوں میں غصہ ابھرا۔ کتنے دن اس کے دل و دماغ میں جنگ جاری رہی تھی۔ ہاشم کے لئے کئی دلیلیں آئندھی کیں مگر۔۔۔ سب بے کار تھا۔ جب آنکھوں سے اندھے اعتماد کی پی اتری تو ہرشے کو نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلے لگا۔ وہ صرف قاتل کو جانتا ہے، مگر اب آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ وہی ہے جو فارس کو باہر نہیں آنے دے رہا۔ اگر ہاشم چاہتا تو فارس باہر ہوتا۔ فارس اور ندرت نے کتنی دفعہ یہ بات اس سے کہی مگرتب سمجھ کیوں نہیں آتا تھا؟ یہ اعتماد کتنی بھی انک شے تھا۔ اندھا کر دیتا ہے۔ بہر، لگڑا کر دیتا ہے۔

تبھی موبائل بجا۔ ہاشم نے چند نام اسے نیکست کر دیے تھے۔ سعدی نے ان کو اچھے سے ذہن نشین کر لیا۔ یہ وہ وکیل تھے جن کو ہاشم چاہتا تھا وہ ہائز کرے، یعنی یہ وہ تھے جن کو ہاشم خرید سکتا تھا۔ اسے اب معلوم ہو گیا تھا کہ اس فہرست کے وکیل اسے بالکل نہیں ہائز کرنے۔ گذ!

وہ جب زمر کے گھر کے گیٹ تک آیا تو وہ پورچ میں کار سے اتر رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے وہ مزدی تو دیکھا۔ سعدی نے کار بہر رکوک دی تھی اور اب قدم قدم چلتا اس کی جانب آ رہا تھا۔ جیز پر جیکٹ پہنے چہرے پر چھائی سمجھیگی وہ قریب آیا تو احساس ہوا کہ وہ اس سے لمبا ہو گیا تھا۔ پہنچنے نہیں کب سے۔

”کیسے ہو؟“ اس نے سپاٹ آنکھوں اور بے تاثر لمحے میں پوچھا۔ وہ ”ٹھیک“ کہتا اس کے ہمراہ لان میں پچھی کر سیوں کی طرف آیا۔

”کچھ کہنے آیا ہوں آپ سے۔“

”مجھے فارس سے نہیں ملنا، نہ ہی اس کی صفائی سننی ہے۔“ وہ کرسی پہنچی، ناگ پہنچی، ناگ پہنچی۔ بازو سینے پہنچی۔ بال ہاف کچھ میں بند ہے تھے اور ڈھوپ کے باعث بے زاریت بھری آنکھوں کو سکیڑ رکھا تھا۔

”چھپھو۔۔۔ ایک دفعہ دوسرو طرف کی کہانی سن لیں۔“ وہ آگے کوہو کراس کے مقابل بیٹھا۔

”میں بچ نہیں ہوں نہ میں اس کو سزادے سکتی ہوں۔“ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ ”میرے سننے کا کیا فائدہ؟“

”اگر... مجھ سے کوئی گلہ ہے تو کہہ دیں۔“ وہ ڈھائی سال سے بتانا چاہتا تھا، ایک دفعہ وہ گلہ کر دے کہہ دے کہ اس سے بد تیزی سے بات کرنے کے بعد وہ اس کو چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ سوری کیوں نہیں کہا؟ اس کے آپریشن کے وقت وہ کہاں تھا؟ کیوں اس کی روی کوئی کہاں تکلیف دہ دنوں میں وہ اس کے پاس نہیں تھا؟ واپس کیوں نہیں آیا؟ گروہ کہتی ہی نہیں تھی۔ اب بھی نظر انداز کر گئی۔

”تم کیا کہنے آئے ہو؟“

”آپ بچ کہہ رہی تھیں۔ واقعی آپ کو کال کی گئی تھی۔ آپ نے جو بتایا واقعی ایسا ہوا تھا۔“

”اچھا! ڈھائی سال بعد یقین آگئا تھیں سعدی؟“ وہ سنتی گئی۔ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کر اسے دیکھتی۔ بازو ہنوز یعنی پل پیٹے۔

”مگر وہ کنور میڈ و اس تھی۔ جعلی آواز۔ یہ نہیں۔“ اس نے موبائل نکال کر پہ چند بیٹن دبائے۔ آوازیں ابھر نے لگیں۔ زمر سیدھی ہوئی، آنکھوں میں تکلیف ابھری۔ بس چند فقرے وہ سن پائی۔

”بند کرو اسے۔“ اور ناگواری سے چہرہ پھیر لیا۔

”کیا یہ سب اسی طرح ہوا تھا؟“

”میرے ہاں یاناں کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ڈھائی سال پہلے تم لوگوں نے کہا میں جھوٹ بول رہی ہوں، آج کہہ رہے ہو میں بچ بول رہی تھی۔ پانچ سال بعد کہو گے، یہ واقعی فارس کی ہی آواز تھی۔“

”آئی ایک سوری۔ جیسے آپ نے ہماری بات نہیں سنی ویسے ہی، ہم نے بھی آپ کی بات نہیں سنی۔ میں سمجھا آپ کسی کو کو رکر رہی ہیں، مگر ایسا نہیں تھا۔“

”ڈھائی سال بعد میرا یقین کرنے کا شکر یہ۔“ وہ سارا کرب ضبط کر چکی تھی۔

”لیکن آپ تیسری بات کا امکان ذہن میں رکھ کر سوچیں، پھر یہ کال جعلی تھی۔ ہم کو رث میں یہ ثابت کر سکتے ہیں۔“

”اور یہ تھیں کیسے ملی؟“

”میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں۔“ وہ بے اختیار پچھے ہوا۔

”اس صورت میں یہ میرے لئے قابلِ بول نہیں ہے۔“

”اگر آپ اس میں لمحے پر غور کریں تو محسوس ہو گا کہ....“

”جب یہ کال مجھے موصول ہوئی، میں ایک Sniper کے نشانے پر تھی، مجھے لمحے اور آواز کے pitch پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس آواز کے ساتھ میری زندگی کی سب سے تکلیف دہیا جڑی ہے۔ اس لئے کوئی آج آ کر کہہ دے کہ یہ جعلی ہے، تو میں کیسے مان لوں؟“ تیز لمحے میں کہتی وہ اس کو شاکی نظر وہ سے دیکھ رہی تھی۔

”ایک دفعہ سوچ کر دیکھیں۔ کوئی تیسرا آدمی بھی اس میں ملوٹ ہو سکتا ہے۔“

”مثلاً کون؟“ سعدی نے جواب میں تھوک لگا۔

”مثلاً... مثلاً ہاشم کاردار۔“ بہت کر کے اس نے کہہ دلا۔ زمر من سی ہو گئی۔



”ہاشم کاردار؟“ زمر کوشاک سے نکلنے میں چند لمحے لگے اور پھر ایک دم آنکھوں میں ناگواری در آئی۔ ”اس کا نام کیسے لے سکتے ہو تو میں؟“

”وہ ان کے کزان ہیں۔ پھر جائیداد کے تنازعے! وہ فارس نازی کو اس میں پھنسا سکتے ہیں۔ اس سے ان کو فائدہ ہو لا انسان نہیں۔“

”اوکے سعدی بہت ہو گیا۔“ ناگنگ پر رکھی دوسری ناگنگ سیدھی کی اور درشتی سے کھتی آگے کوہوئی۔ ”میں یہ یقین اسٹریٹچی بہت دفعہ اس استعمال کرچکی ہوں۔ جب اپنے دفاع میں کوئی بات نہ ہو تو کسی تیرے شخص پہ شک دلواد۔ مگر کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟“ سعدی کی گردون نفی میں ملی۔ (کیا اس آڈیو اور ان تصاویر کا ہاشم کے کمپیوٹر سے ملتا یا ثبوت تھا جسے وہ پیش کر سکے؟ ہرگز نہیں۔) ”پھر تم کیسے کسی پر اتنا بڑا الزام لگا سکتے ہو؟ فارس کے خلاف میری گواہی کو چھوڑ دوتب بھی ثبوت ہیں۔ اس کی گن، اس کے فنگر اس قسم مجھے اس سے بڑے ثبوت ہاشم یا کسی اور کے خلاف لا کر دو، میں تمہاری بات سنوں گی، مگر اس سے پہنچنے نہیں۔“ تلخی سے بولتی وہ کھڑی گل۔ سعدی نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اکتا ہی ہوئی لگ رہی تھی۔

”تو آپ ڈھائی سال سے ہماری بات اس لئے نہیں سن رہیں کیونکہ ہم ثبوت نہیں دے رہے؟“

”اگر مجھے جھوٹا کہنے کی بجائے کچھ کہتے تو میں سنتی۔“

”آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔“ سر ہلا کر وہ کھڑا ہوا۔ چند لمحے دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔

”آخری بات، پھپھو۔“ وہ ذرا جھجکا۔ ”مجھے کسی ایسے وکیل کا بتائیں، جو ہم افروڑ بھی کر سکیں، اور وہ ہمارے ساتھ مغلص بھی ہو۔ فارس والی لے لیے۔ (اس کے سامنے اب وہ اسے ماموں کہنے سے دانتہ احتراز برتنے لگا تھا۔)

زمر نے سر جھکا۔ ذرا توقف کیا۔ تھے اعصاب ڈھیلے جیسے پڑے۔

”خلیجی صاحب سے مل لو۔ نمبر اور پتہ نیکست کر دیتی ہوں۔ ان کے پہلے تاثر پر مت جانا۔ اچھے وکیل ہیں۔“ اور اسی طرح بینے پر اعلیٰ وہ مڑ گئی۔ اسے پیچھے آنے کا نہیں کہا۔ چاہے تو وہ اندر آ جائے، چاہے تو نہ آئے۔ سعدی یا سیت سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ڈھائی ماں تھے وہ بس اس کی پھپھوٹی۔ زمر نہیں۔

اگر ایک دفعہ، ایک دفعہ وہ شکوہ کر دے تو وہ اسے بتا دے گا، یا شاید نہیں بتا دے گا۔ اس ایک دفعہ.....

.....♦♦♦.....

جو زہر پی چکا ہوں تمہیں نے مجھے دیا..... اب تم تو زندگی کی دعا میں مجھے نہ دو چھوٹے باغیچے والے گھر کے لا و نخ میں فل آواز کے ساتھی وی چل رہا تھا۔ ندرت کتابوں کی نکیاں بناتیں، بڑی ڈش میں رکھتی جاں میں۔ ساتھ ہی صوفے پر جیرا اور پر کھٹنیں موبائل پر نمبر ملارہی تھی۔ بار بار کال ملاتی، پھر کاٹ دیتی۔ بالآخر باب ہمت کر رہی تھی۔ دوسری ڈل مکثی جاتی رہی۔ پھر ندرت نے اسے کہتے سن۔

”کیا میں علیہا سے بات کر سکتی ہو؟“ وہ سراٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

”میں نہیں ہوں۔ حمد۔ پاکستان سے۔“ وہ ذرا پچکا کر کہہ رہی تھی۔ ”علیہا میری میلز کا جواب نہیں دے رہی۔ وہ کدھر ہے؟“

”اصل مجھے اس کو کسی کا پیغام دینا تھا۔“

وہ اب بہت دھیان سے دوسری طرف کی بات سننے لگی تھی۔ بالکل چپ۔ خاموش اور ساکت۔ پھر بغیر کچھ کہے فون رکھ دیا۔

”کیا ہوا؟“ مگر حسد نہیں سن۔ چپ بیٹھی رہی۔

سعدی اندر آیا اور سلام کر کے ماں کے قریب صوفے پر گرسا گیا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”فارس سے ملے؟“ وہ امید سے پوچھنے لگیں۔

”جی اور پچھو سے بھی۔“ وہ دور خلا میں دیکھتا پی سوق میں گم تھا۔

”کیا وہ اب بھی تمہاری بات سننے کو تیر نہیں؟“

”ان کا قصور نہیں ہے۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔“

”تم سے بھی وہی روایہ ہے؟“

”چھوڑیں ای۔“ وہ چھرے پہ بشاشت والپس لاتے سیدھا ہوا اور ہاتھ بڑھا کر چنے کی دال اور گوشت کے پے مکھر کو تین الگیا میں اٹھانا چاہا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پہ چھپت رسید کی۔

”ہزار دفعہ کہا ہے، مت کھایا کرو درمیان سے۔ بے برکتی ہوتی ہے۔“

مگر ندرت کی ڈھیٹ اولاد کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ سعدی نے مکھر منہ میں رکھا اور چباتے ہوئے پھر سے پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ نیمیا۔ بدستور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دفتاً ان کو خیال آیا۔

”سعدی... بیٹا وہ مرکز کے فرنٹ پہ جو بکری ہے نا، وہ لوگ جگہ خالی کر رہے ہیں۔ کیوں ناہم اس کو کرایے پلے کر کوئی کام شروع کر دیں؟“

”آپ نے ابھی تو اسکوں کی جا ب ختم کی ہے۔ اور آپ کی صحت بھی اتنی اچھی نہیں۔ کیوں خود کو ہلکا ن کرتی ہیں؟“

”خرچے بہت ہیں اور تمہاری تنخواہ سے وہ نہیں پورے ہوتے۔ میں آج کل یہی سوق رہی ہوں۔ بکری کی جگہ کافی بڑی ہے۔ کپڑوں کا بیویک شروع کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر فارغ بیٹھی رہی تو زیادہ بیمار ہو جاؤں گی۔“

سعدی نے ایک نظر ان کے ہاتھوں کو دیکھا جو مہارت سے کباب کو شکل دے رہے تھے۔ کچھ یاد کر کے وہ مسکرا یا۔

”آپ ریسٹورانت کھول لیں ای۔ کسی کو کھانا کھلانے سے پیارا احسان کیا ہو گا بھلا؟“

”ریسٹورانت؟“ وہ سوق میں لجھیں۔

”مگر پہلے کسی سے مشورہ کر لیجئے گا۔“

”کس سے کروں؟“

”کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے دلوگوں سے مشورہ لیتے ہیں ای، ایک وہ جس نے اس کام میں فائدہ اٹھایا ہو، اور ایک جس نے اس میں نقصان اٹھایا ہو۔“ پھر خدا دیکھا جو ابھی تک شل بیٹھی تھی۔

”کون بیگم ریسٹورانت بننے سے تمہارے تون پھر جائیں گے؟“ سعدی نے اسے آواز دی۔ اس نے سفید پڑتا چھرہ اٹھایا۔

”ہاشم بھائی سے بات ہوتا نہیں بتا دیجئے گا کہ اب علیشہ کو ان کے پیسوں کی ضرورت نہیں رہی۔“

کچھ کباب کا نکلا اس کے حلق میں رہ گیا، وہ چونکا۔ ”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”اس کو جب پیسے چاہیے تھے، تب انہوں نے نہیں دیے۔ پھر اس نے خود ہی حاصل کرنے چاہے۔“ وہ شاک کے عالم میں ہل رہی تھی۔ اس نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر چوری کرنے کی کوشش کی۔ وہ کمپیوٹر میں اچھی تھی، اور قسمت میں بڑی۔ سب گرفتار ہو گئے۔ اب وہ جیل میں ہے، ایک لمبے عرصے کے لیے۔“ وہ بے یقین تھی، بالکل حق دق۔ پھر ایک دم انٹھ کر اندر چل گئی۔ سعدی ابھی تک ساکت ہا۔ بیٹھا تھا۔ ندرت افسوس سے کچھ کہہ رہی تھیں مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

اور پھر جب شاک اتر اتوہ طرف تاسف چھا گیا۔

انہی پھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ ..... مرے گھر کے راستے میں کوئی کھکشاں نہیں ہے  
قصیر کاردار میں ملازموں کی چھل پہل جاری تھی۔ سرما کی وہ دھند آمیز صبح باہر تک محدود تھی۔ اندر سینٹل ہینگ نے لاونچ کو گرا  
رکھا تھا۔ نئی لڑکی کی ایک ان ڈور گلے کو پانی دے رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر اور نگزیب کے کمرے کی سمت بھی دیکھ لیتی تھی جہاں دروازہ  
ادھ کھلا تھا اور وہ آئینے کے سامنے کھڑے تیار ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ فیوجو ناہاں سے مکمل منظر نہیں دیکھ سکتی تھی، آوازیں بھی مدد حاصل تھیں۔  
مگر جھگڑے کی آواز بہرائی بھی سمجھ لیتا ہے، وہ تو صرف زبان سے نا آشنا تھی۔

اگر اندر جھاگلوتو سامنے کا ڈچ پٹا نگ پٹا نگ جما کر جو اہرات بیٹھی تھی۔ سلکتی آنکھیں اور نگزیب کی پشت پہ جمی تھیں۔

”اگر تم ایک دفعہ شیر و کی بات سن کر۔۔۔“

”اپنے بیٹی کی سفارش مت کرو میرے سامنے۔ میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ وہ تلمیز سے کہتے تائی کی ناث باندھ  
رہے تھے۔

”وہ کتنا ہاپیور ہے، تم جانتے ہو۔ اس طرح کاروی رکھو گے، تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔“

”تو چلا جائے۔ دو دن فٹ پا تھو پر ہنپڑے گا تو عقل آ جائے گی۔ اپنے باب کو بے دوقوف بناتا ہے۔“

”اگر وہ گیانا اور نگزیب تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔“ وہ بمشکل ضبط کر کے بولی تھی۔

”ہر شے کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہاری بے جا حمایت نے اس کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔“ کار جھٹک کر کوٹ پہنا۔ تنفر بھری نگاہ  
آئینے میں پیچھے نظر آتی جو اہرات پڑاں اور پھر باہر نکل گئے۔ وہ دیہی بیٹھی کلستی رہ گئی۔

لاونچ میں وہ لمحے بھر کر کے نوشیر والی سینٹر ہیوں کے وسط میں کھڑا تھا۔ خاموش، فکر مند سا۔ اور نگزیب نے اس پر نظر ڈالی اور اتنی  
جلدی پلانی کر جیسے کوئی ناگوار نظارہ سامنے ہو مژرے، میری کو آواز دی، اور واپس کرے میں چلے گئے۔ فیوجو نا جلدی سے پانی رکھ کر میری کو  
بلانے بھاگی۔ شیر و دیہی زینے پر بیٹھ گیا۔ گردان جھکالی۔ نہ پسے ہاتھ میں رہے نہ رہتے۔

”کتنے دن تک یونہی بیٹھے رہو گے؟“ شہرین سرسری سا پوچھتی، ہاتھ میں کٹے سیبوں کی پلیٹ پکڑے، اس کے ساتھ زینے پر بیٹھی تو  
وہ چونکا پھر دوبارہ سر جھکالیا۔

”جب تک وہ مجھے معاف نہیں کر دیتے۔“

”تو تم ان سے معافی مانگ لوں۔ سپل۔“ ملازموں کی زبانی وہ سب سن چکی تھی۔

”کتنی دفعہ ماں گ چکا ہوں، مگر جواب میں چیخ چلا کر مجھے دفعان کر دیتے ہیں۔“

”اور ہاشم؟“ اس نے پلیٹ سے پھل کا مکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

”وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے۔“

”اور تم نے اسی لئے اسے ایک دفعہ بھی مخاطب نہیں کیا؟ کھاؤ گے؟“ ساتھ ہی پلیٹ بڑھا۔ نوشیر والی نے بے دلی سے منہ پھیر  
لیا۔ البتہ اب شہرین سے پہلے کی طرح بے زار نہیں رہتا تھا۔ صرف وہی تھی جس نے سارا قصہ سننے کے بعد اس سے ہمدردی جنمائی تھی اور کہا تھا  
”بھتی تم نے لامبی میں تو نہیں کیا تھا، ایک ایڈو پچھر تھا، اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے؟“ اب بھی وہ کندھے اپکا کر کہہ رہی تھی۔

”یوں کرو اور جاؤ، اور ہاشم سے معافی مانگ لو۔ بات ختم۔ اس کو صرف تمہاری معافی کا انتظار ہے۔“

”واقعی؟“ اس نے بے چینی سے شہرین کو دیکھا۔ تھیڑ پھر سے یاد آیا۔ بے اختیار گال پہ ہاتھ رکھا۔

”ہاں نا۔ وہ تم سے کبھی خنا نہیں ہو سکتا اور مجھے اپنا فون دے جاؤ۔“

”کیوں؟“ وہ فون دیتے دیتے رکا۔ شہرین نے موبائل اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔

”وقت ضائع مت کرو وہ آفس کے لئے لکل ہی نہ جائے۔“

”اچھا۔“ وہ فوراً اوپر آیا۔ تھوڑی دریاس کے کمرے کے باہر کارہ، پیچے سیرھیوں پر بیٹھی شہرین نے اس کے موبائل سے سعدی کا نمبر نکالا اور اپنے پر منتقل کیا۔

شیرے نے بغیر کھکھٹائے دروازہ کھولا۔ ہاشم ڈرینگ مرکز سامنے کھڑا تھا۔ کوٹ ابھی اسٹینڈ پر تھا، اور وہ کف لنس پہن رہا تھا۔ آہٹ پر گردن موڑی اسے دیکھا اور واپس کف لنک پہنے گا۔

”آؤ شیرو۔“ انداز نارمل تھا۔ نہ غصہ نہ پیار۔ وہ سر جھکائے، لب کا تا قدم قدم چلتا قریب آیا۔ یہ اس دن کے بعد دونوں کی پہلی بات چیت تھی۔ یہ سوچل بایکاٹ اس کے لئے بہت عجین ثابت ہوا تھا۔

”بھائی۔ ابھی تک ناراض ہیں مجھ سے؟“ نگاہ اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہاشم نے تائی گردن میں ڈالی اور آئینے میں دیکھتے اس کی گردہ لگانے لگا۔

”کیا میں اسے مذدرست سمجھوں؟“

نوشیروال نے بے چینی سے چہرہ اٹھایا۔

”آئی ایم سو ری بھائی۔ میں نے آپ کو بہت ہرث کیا۔“

”میں مذدرست قبول کرتا ہوں۔ بھول جاؤ سب۔“ تائی کی گردہ باندھتے ہوئے بھی وہ نہیں مسکرا یا۔

”آپ مجھ سے ابھی تک ناراض ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے ناث کسی کا لردست کیے، اسٹینڈ سے کوٹ اٹھایا اور مڑ کر شیر و کو سنجیدہ نظروں سے دیکھا۔ ”ناراض نہیں ہوں، جرمان ہوں۔ اس پر نہیں کہ میں یہ وقوف کیے بنا۔ اعتبار کرنے والے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس پر بھی نہیں کہ تم ایک کرمنل ڈین رکھتے ہو۔ بلکہ صرف اس پر کہ اگر تمہیں پیسے چاہیے تھے تو تم میرے پاس کیوں نہیں آئے؟“

”ایڈو پچر کرنا... چاہ رہا تھا... بس۔“ نوشیروال نے شرمندگی و خفت سے گردن جھکا دی۔ ہاشم نے کوٹ پہننا اور اسے دیکھتے ہوئے بننے دیکیا۔

”تم شیر و میری ایک بات اپنے دماغ میں بھالو۔ تمہارا بھائی تمہارے سب معاملے سنبھال سکتا ہے۔“ اس کے کندھے پر ختنی سے ہاتھ چھایا۔

تو نوشیروال نے شرمندہ چہرہ اٹھایا۔ ”تمہیں پیسے چاہیے، تم میرے پاس آؤ گے۔ تمہیں کوئی بڑی چاہیے، تم میرے پاس آؤ گے۔ تمہیں کسی کی جان چاہیے، تم میرے پاس آؤ گے۔ مگر تم خود کچھ نہیں کرو گے۔ کبھی بھی نہیں۔ سمجھ آیا؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ پھر قدرے جھکا۔ ”وہ جو کہا آپ نے کہا شدہ... وہ... سعدی آپ کا بھائی ہوتا...“

”وہ ایک اچھا لڑکا ہے، رشتؤں کا پاس کرنا جانتا ہے، وہ ہمارا تیرسا بھائی ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی، مگر وہ نہیں ہے۔ اور نگزیب کاردار کے دو ہی بیٹے ہیں، میں اور تم۔ تمہاری نظر میں میری لتنی اہمیت ہے، مجھے اتنی نہیں معلوم، مگر میرے لئے تم اور سونیا برابر ہو۔“

”آپ کو پتہ ہے میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں، کتنا احتراں کرتا ہوں آپ کا۔“

”نہیں مجھے نہیں پتا۔“ پر فیوم خود پر چھڑ کتے سنجیدگی سے کندھے اچکائے۔ شیر و روہا نسا ہو گیا۔

”یہ سچ ہے۔“

”پھر سے ثابت کرو۔ کیونکہ مجھے دوبارہ سے تمہارے تخریبی ذہن پر اعتبار کرنے میں وقت لگے گا۔“ اس کے کندھے کو تھپٹھپا کر کرہو ۰ ۰ ۰ میل اٹھاتا ہر نکل گیا۔ اب بھی نہیں مسکرا یا۔ نوشیر وال پریشان ساو ہیں کھڑا رہ گیا۔

شہریں اب سیر ہیوں کے وسط میں کھڑی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر راستہ دیا۔ ہاشم چندز یعنی اڑا پھر اس کے قریب رکا۔

”کچھ کاغذات پر تمہارے دستخط چاہئے ہیں، دو پھر میں آفس آ جانا۔“

”میں خلع لے رہی ہوں، طلاق نہیں چاہو تو یہ لمبی چوری رقم اور مراعات نہ بھی دو۔ ضرورت نہیں مجھے تمہارے پیے کی۔“

”وہ باتیں مت کہو جن کا مطلب تم خود بھی نہیں جانتی۔ جو دے رہا ہوں، اپنی بیٹی کے لئے دے رہا ہوں۔ ماں سے الگ نہیں رہتا اس کو۔ اب ہٹو سامنے سے۔“ وہ مزید سرکی، اور ہاشم نیچے اتر گیا۔ وہ تملا تے ہوئے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں شدید اضطراب بیٹھی۔

وہ ماں باپ کرے کے سامنے رکا تو جواہرات نہ نوز کا وُجہ پہنچ کیلے کلس رہی تھی اور ڈریسر مرر کے سامنے کھڑے اور نگزیب میری اینجیو اہدیات دے رہے تھے۔ وہ چوکھت میں آ رکا۔

”میں علیشا کی فیصلے پے کر رہا ہوں۔ کسی کو کوئی اعتراض ہوتے بھی مجھے کچھ کہنے کی زحمت نہ کرے، میرا دماغ آج کل بہت گھوما ہوا ہے۔“ اطلاع دی اور اسی سمجھیدہ چہرے کے ساتھ مڑ گیا۔ جواہرات تملا کر انھی، اور نگزیب نے اسے برہنی سے پکارا مگر وہ باہر جا پکھا تھا۔

۱۰۰ بے کسی سے ایک دوسرا کے کو دیکھ کر رہا گئے۔ باہر دھندا بھی تک چھائی تھی۔ وہ بآمدے تک پہنچا تھا جب خاور تیزی سے قریب آتا دھائی دیا۔ وہ فکر مند لگ رہا تھا۔

”سعدی یوسف نے آپ کے کیے وکیل کو فائز کر دیا ہے۔“

”معلوم ہے۔“

”آپ اتنے بے فکر کیے ہو سکتے ہیں؟“

”فکر کی کیا بات ہے؟“ وہ الناصر ہاں ہوا۔ ”لوگ وکیل بدلتے رہتے ہیں۔ اگلا بھی ہمارا ہی ہو گا۔ نہیں تو نج تو ہمارا ہی ہے۔“

”مگر مجھے پریشانی ہے۔ ان لوگوں کو وہ آڑ یو کہاں سے ملی؟“

”کون سی آڑ یو؟“ وہ ٹھہٹک کر رکا۔ خاور نے محمود صاحب سے جو سننا تھا تادیا۔

”ہاں زمرائیے کام کر سکتی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے تو ایسا ہی ہو گا۔“ وہ کار کی طرف جا رہا تھا۔ خاور تیزی سے اس کے پیچے پکا۔

”میں اوقتی ایسا ہی ہے؟ ہو سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہا ہو۔“ ہاشم رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”آپ نے اسے اور اس کی بہن کو اس رات اپنالیپ ٹاپ دیا تھا، کہیں اس نے وہ آپ کے پاس سے تو نہیں نکالی؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ بے زار ہوا۔ ”وہ آڑ یو میرے سیف میں ہے۔ میں نے دو دن پہلے ہی دیکھی ہے۔ لیپ ٹاپ میں میرے

۱۰۱ اکونٹس کا فولڈر لاک ہے۔ وہ دونوں اتنے بھی اسماڑ نہیں کہ ہر چیز کھول لیں اور سعدی جھوٹ نہیں بولتا، جو کہہ رہا ہے وہی ہو گا۔ مگر نج ہماری

ہے پھر کیا مسئلہ ہے؟“

”سر آپ کا اور کفیل نہیں....“ وہ کہتے کہتے رکا۔ ہاشم نے ایک سخت کاٹ دار نظر اس پر ڈالی، اور آگے بڑھ گیا۔ خاور نے بے

چینی سے تھوڑی کھجائی۔ بظاہر ہاشم ٹھیک کہہ رہا تھا مگر پھر بھی اسے یہ لڑکا کچھ گڑ بڑگ رہا تھا۔ خیر، ہاشم سعدی کو زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا۔ یقیناً۔ وہ سرجھٹتا، آگے بڑھ گیا۔

ٹوٹے ہوئے مکاں ہیں مگر چاند سے مکین ..... اس شہر آرزو میں اک ایسی بھی گلی ہے وہ ایک ابتر سآف تھا۔ فالکوں کے ڈھیر بے ترتیب کتابوں سے بھرے ریک اور میز پر بکھرا تنا کچھ، کہ اس سارے میں کری پر بیٹھا سعدی بے حد بے بسی محوس کر رہا تھا۔ اس کے مقابل، آفس کے مالک کی کرسی پر موجود اچھیر عمر صاحب نیچے جھکے دراز سے کچھ نکال رہے تھے۔ دفتارہ سید ہے ہوئے۔ وہ اڑے اڑے کھجڑی بالوں، موٹی عینک اور شریف چہرے والے انسان تھے۔ سعدی کو ان پر ترس، خود پر حرم اور زمر پر غصہ آیا جس نے اسے یہاں بھیجا تھا۔

سید ہے ہوتے ہی انہوں نے کچھ فالکنڈھ پ سے میز پر رکھیں۔ نتیجتاً اوپر تلے رکھی سیاہ کتابیں دھڑام سے سعدی کی طرف لے رکھیں۔

وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہوا۔ ایک موٹی کتاب پیر پہ جاگی۔ باقی دو گھنٹوں پر۔ آؤچ!  
”لگی تو نہیں؟“ انہوں نے ناک پر عینک دھکلیتے پوچھا۔

”بالکل نہیں جی۔“ (میں کوئی انسان تھوڑی ہوں؟) وہ جھک کر ان کو سینئے لگا۔ پھر میز پر رکھیں، اسی بے چارگی سے خلیجی صاحب کو دیکھا۔

”سر، آپ بے شک ابھی اپنے کام کر لیں، میں پھر آ جاؤں گا۔“ وہ کرسی کے کنارے پر آگے کو ہو گیا۔ بھائی کے کوتیار۔

”نہیں نہیں، میں آپ کی بات سن رہا ہوں۔“ انہوں نے دائیں باسیں گردن بلائی۔ ”کیس بھی دیکھ لیا تھا میں نے۔“

”تو پھر آپ یہ کیس لیں گے؟“ بے تو جی سے پوچھتے پیچھے کھڑی الماری پر نظر ڈالی۔ شنیش کے دروازوں کے پیچھے کتابیں اور فالکیں بھری تھیں۔ اوپر تلے اڑے سے کاغذ۔ بے ترتیبی سی بے ترتیبی۔

”دیکھو بیٹے، فارس غازی جیسے بندے کا دفاع کرنا آسان نہیں۔“

”خیر ہے آپ رہنے دیں، میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔“ وہ شکری کہتا جلدی سے اٹھا۔ بس بھاگنے کی دریتھی۔ یہ اتنا بھی مرد میں بیٹھ گیا۔

اس آدمی کی تو عینک گم جائے یہ نہ ڈھونڈ سکے، فارس کو کیا خاک رہا کروائے گا۔ ”مجھے پتہ ہے، فارس غازی کا دفاع آپ کے لئے مشکل ہوگا، کیونکہ آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ہی قاتل ہے، تو.....“

”نہیں۔ میرا خیال ہے وہ بے گناہ ہے۔“

وہ جو بس مڑنے ہی والا تھا، ایک دم ٹھہر کر انہیں دیکھنے لگا۔ ”جی؟“

”ہاں تا، گناہ کا دفاع کرنا زیادہ آسان ہے۔ مگر بے گناہ کا کیس سوچ سمجھ کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اگر ایک معصوم آدمی کا تم دفاع نہ کر سکے اور وہ جیل چلا گیا، تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔“

وہ آہستہ سے دوبارہ بیٹھا۔ آگے کو جھک کر۔ حیرت اور الجھن سے ان کو دیکھنے لگا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ وہ بے گناہ ہیں۔ باوجود پر اسکیو ٹرزم کے بیان کے؟“

”پر اسکیو ٹرزم صاحب نے تو یہ بیان دینا ہی تھا۔ وہ سرکار بنام سجاد راؤ کی پر اسکیو ٹرزم جو رہی ہیں۔ ویسے مجھے بڑی حیرت ہے تمہارے پیچھے کیلے اس کیس کا ذکر نہیں کیا۔“ ابھی ابھی نکالے فالکنے کے گھٹے کو اس کی طرف دھکلیا۔ اس سے قبل کہ کتابیں دوبارہ گرتیں، سعدی نے جلدی سے واپس پُش کیا۔ البتہ وہ ان کے چہرے سے اپنی بے چین نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

”یہ کون سا کیس تھا؟“

”یہ دارث غازی قتل سے کوئی پانچ ماہ پہلے ختم ہوا تھا۔ میں اس میں ڈیفنیس اٹارنی تھا اور زمر صاحبہ پر اسکیوڑ۔ ایک آدمی نے اپنی ۱۰ گولی چلائی، مگر ایسا کرنے سے قبل اس کے سامنے اعتراض کیا، اس کی پر اپرٹی پر قبضہ کرنے کا، اس کے ساتھ مزید کچھ زیادتیاں کرنے کا۔ امت سے بیوی تھے گئی اور اس نے پویس کو بتا دیا۔ سات ماہ زمرگی ریزیں یہاں کا پہلا یس تھا ریپوہی بہانی تھی، بہر حال فیصلہ انہی کے حق میں آتا۔ میرا خیال ہے، جس نے بھی فارس کے بھائی اور بیوی کا قتل کیا ہے، اس کی ڈسٹرکٹ کورٹ کے کیسر پر گہری نظر ہو گئی، اسے معلوم ہوا کہ انہیں اپنی زبان سے کہی بات میں سب سے اچھا پختہ تھا۔ پر اسکیوڑ صاحبہ ویسے بہت سمجھدار خاتون ہیں، لیکن وہ یہاں مارکھا گئیں، کیونکہ وہ اپنی طرح کا ایک کیس پر اسکیوڑ کر چکی ہیں۔“

”یعنی۔۔۔ زمر اپنے حملہ آوارکی کاں پر اس لئے یقین کر رہی ہیں کیونکہ وہ آخری منٹ کے اعتراف کے ایسے ہی ایک کیس کو لے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا کرے۔“ ایک دم اسے محسوس ہوا کہ زمر نے اسے صحیح بندے کے پاس بھیجا ہے۔ (ان کے پہنچنا پر مت جانا!)

”بالکل۔ ویسے لوگ یہ کرتے بھی ہیں۔ قتل برا بوجھ ہوتا ہے۔ انہیں کسی سے تو بانٹنا ہوتا ہے۔ بہت سے کیمز دیکھنے ہیں میں نے بہاں لوگ کسی کو مارنے سے پہلے اپنے پچھلے گناہوں کا اعتراف کر لیتے ہیں۔“

”مجھے پتہ ہے یہ سب کس نے کروایا ہے۔“ وہ ایک دم جوش میں بولنے لگا تو انہوں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر روکا۔ ”شش شش۔“ وہ بے القبار رک گیا۔

”کیا وہ لوگ طاقتور ہیں؟“

”بہت زیادہ۔“ اس کے گلے میں کچھ انکا۔

”اور کیا تمہارے علاوہ کوئی اور بھی جانتا ہے کہ وہی اصل قاتل ہیں؟“

”نہیں۔“

”تو پھر اپنا منسی لو۔“

”جی؟“ وہ دم بخود رہ گیا۔

”دیکھو بنچے، تم ایک با اثر آدمی کو اس میں نہیں گھیست سکتے۔ ایسا کرو گے تو وہ فارس کو جبل میں ختم کروادیں گے اور تمہیں جبل سے ۱۱ تم جس کو بھی ان کے نام بتاؤ گے ان کی زندگی خطرے میں ڈالو گے۔ تم ان کو گناہ گارثا بات مت کرو، صرف فارس کو بے گناہ ثابت کرنے لیں لشکر کرو۔ ایک دفعہ وہ باہر آجائے، پھر جو کرنا ہو کر لینا۔“

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ بات غلط نہیں تھی۔

”کیا ہم ان کو رہا کروالیں گے؟“

”اگر نجح ایماندار ہو تو ہاں۔“

اور اتنے دنوں میں یہ پہلی امید کی کرن تھی جو اسے نظر آئی تھی۔ اندھیری رات کا پہلا تارہ۔ جو سورج نکلنے کی نوید ہوتا ہے۔ اسی تو صبح ہو گی۔ وہ خود کو بہت ہلاک پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

❖❖❖

جس کو دیکھو، اس کے چہرے پر کیسی سوچ کی ..... جیسے ہو جائے، مقدر کسی شے کا مقدر سوچنا  
سعدی کورٹ سے واپس اپنے آس کی طرف جا رہا تھا جب کسی اجنبی نمبر سے فون آنے لگا۔ اس نے ڈرائیور کرتے ہوئے

کال لے لی۔

”سعدی؟“

”جی... کون؟“

”شہرین بول رہی ہوں۔“ اس نے موبائل کان سے ہٹا کر اسے گھورا۔

”کہیے، کیسے فون کیا مسز کار دار؟“

”کیا ہم مل سکتے ہیں؟ کسی الی جگہ جہاں میرے اور تمہارے گھروں کو علم نہ ہو!“

”جہاں تک مجھے یاد ہے میں تھیں سال کا ہوں اور آپ کم از کم بھی مجھے سے بارہ سال بڑی ہیں، تو۔۔۔“

”اوہ شٹ اپ، مجھے تمہارے ساتھ ڈیٹ پنیس جانا، تم سے ایک کام ہے۔ مگر ہاشم کو پتہ نہ چلے۔“

”پھر ٹھیک ہے۔ پتہ نیکست کرتا ہوں دو پھر میں آ جائے گا۔“ اپنی حیرت چھپاتے ہوئے اس نے فون کان سے ہٹایا۔ عرصہ پہلے شہرین نے اس سے صلح کر لی تھی، اس کوتب سے معلوم تھا کہ ایک دن یہ لڑکا اس کے کام آئے گا، اور وہ دن آن پہنچا تھا۔

❖❖❖

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بھایا اشکوں نے ..... جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو مٹھدا کون کرے کچھ دیر بعد وہ سارہ کے آفس میں موجود تھا۔ وہ کرسی پر برا جمان ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو پڑھ رہی تھی۔ پھر چہرہ اٹھایا اور جمل سے دیکھا۔

”یہ تمہاری اس ہفتے میں لی جانے والی دوسری لیو ہے۔ اگر میں یہ دے دوں تو آفس کے باقی لوگ کیا خیال کریں گے؟“

”مجھے فارس ماموں کے کیس کے لئے کچھ اہم کام کرنے ہیں۔“

”وہ اتوار کو نہیں ہو سکتے کیا؟“

سعدی نے معصومیت سے سرفی میں ہلایا۔ ”اوہ کو پاکستان میں چھٹی ہوتی ہے۔“

سارہ نے سمجھنے والے انداز میں اسے گھورا، پھر کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔

”تمہیں اتنے اہم ادارے میں بطور ایک سائنسدان کام کر رہے ہو تو اپنی ڈگری کی وجہ سے، مگر یہاں سب جانتے ہیں کہ تم میرے بھائی ہو۔ اگر اسی طرح میں تمہیں فیورز دینے لگی تو تم یہاں اپنی عزت کھودو گے۔ پہلے تاثر دائی ہوتے ہیں سعدی!“

”مگر تج نہیں ہوتے۔“ وہ ادای سے مسکرا کیا۔ ”خیر، آج کے بعد ایسا نہیں ہو گا۔ بس آج کے لئے...“

”صرف آج کے لئے۔“ تنبیہی نظر وہ سے اسے دیکھ کر سارہ نے درخواست پر تخطی کیے۔ پھر کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”آپ کیسی ہیں؟ بہت دن سے کام کے علاوہ آپ سے کوئی بات نہیں ہو سکی۔“ اس نے دیکھا، سارہ کے چہرے پر ملال بھری مسکرا ہٹ بکھر گئی۔ نیلی آنکھوں اور نرم چہرے والی سارہ اب بھی پہلے کی طرح لگتی تھی، مگر بس صرف لگتی ہی تھی۔ ایک ہنک انہیں جلد رہا کروالیں گے اور اصل قاتلوں کو سزا کی آنکھوں میں آ کر ٹھہری گئی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے۔ میں امی بچیاں، ہم سب ایک دوسرے کو سنجھا لے ہوئے ہیں۔“ ذرا توقف کیا۔ ”فارس کیسا ہے؟“

”بے گناہ آدمی قید میں رہ کر کیسا ہو سکتا ہے؟ بس، اور غم و غصے سے نہ حال۔ مگر، ہم انہیں جلد رہا کروالیں گے اور اصل قاتلوں کو سزا دلوائیں گے۔“

”اس سے کیا ہو گا سعدی؟ وارث واپس تو نہیں آئے گا۔“

اور وہ اس کے اسی فقرے کا انتظار کر رہا تھا، کہ ایڈو ویٹ خلی سے ملاقات کے بعد اس کو اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔

”ہم قاتل کو سزا مقتول کو واپس لانے کے لئے نہیں دیتے۔ بلکہ اس لئے دیتے ہیں تاکہ وہ کسی اور کو قتل نہ کرے۔ قصاص میں زندگی

ہتی ہیں، مقتول کی نہیں؛ بلکہ کسی اور کی۔ آپ کی آپ کے بچوں کی فارس غازی کی یا شاید میری اپنی۔“

اب کے سارہ نے آنکھیں سکر کر غور سے اسے دیکھا۔ کرسی پر پیچھے کو ہوئی ہاتھوں میں قلم گھماتے ہوئے کچھ سوچا۔

”تمہارا انداز پر اسرار ہوتا جا رہا ہے۔“

”اوہ ہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اب میں جاؤں؟“ اور وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”یا آخری دفعہ ہے سعدی یوسف خان!“ اس نے درخواست کی طرف خلی سے اشارہ کیا۔

”جی بالکل، اس ہفتے میں آخری دفعہ۔“ کاغذ اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ سارہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی اور پھر سر جھک کر پیور کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اور جس وقت وہ بہاں سے نکل رہا تھا، اسی شہر میں کئی میل دور، ہاشم اپنے آفس میں موجود، فون پر کہر رہا تھا۔

”کیسی ہو چکے؟ تمہارا پھر سے شکریہ۔“

اپنے لاوانج میں صوفے کے ساتھ کھڑی، لینڈ لائن فون کا رسیور کان سے لگائے ہندا اسی سے مسکرائی۔ اُس اور کے ہاشم بھائی۔

”یہ شیر و بھائی نے وہ دیہ یو شوٹ کہاں کی تھی۔“

”اس کا ایک کافٹچ ہے ایوبیہ میں، وہیں پہ... خیر... فارس کا کیس کیسا جا رہا ہے؟ اس آڈیو سے کوئی فرق پڑا یا نہیں؟“

”بھائی کہہ تو رہا تھا کہ فرق پڑے گا۔“

”ہوں، ویسے وہ کہاں سے ملی آڈیو؟“ بظاہر سری سا پوچھا۔

”زم رپچھو نے نکلا کر دی تھی، مگر.... یہ بات آپ کسی کو بتائیے گا نہیں۔ یہ فیملی سیکریٹ ہے۔“ اس نے مدھم سا کہا، وہی جو بھائی نے بتایا تھا۔ ”زم رپچھو کو بھی نہیں بتائیے گا کہ میں نے بتا دیا ہے۔“

”یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے کیا؟“ وہ اتنا حیران ہوا۔

”اس یقین دہانی پر وہ مسکرا دی۔“ ہاشم بھائی، آپ بہت اچھے ہیں۔“

”معلوم نہیں، خیر نہیں ایک کام کہا تھا؟“

حنین کی مسکراہٹ سمنٹی گئی۔ آنکھوں میں گہرا کرب چھانے لگا۔ ”علیشا کو...“ اور جو سنا تھا بتاتی گئی۔ وہ دوسری جانب بالکل غاموشی سے منتگیا ہیاں تک کہ حنین کو لگا، وہ بہاں موجود ہی نہیں ہے۔ ”ہاشم بھائی، کچھ تو بولیں؟“

وہ چپ رہا، بالکل چپ۔ حنہ کا دل ڈوبنے لگا۔ جیسے نیلے پانیوں میں بحری جہاز ڈوب جاتا ہے۔

”کیا آپ اتنا بھی نہیں کہیں گے کہ آپ کو افسوس ہے؟ کیا آپ کو ذرا سا بھی افسوس نہیں؟“ اس کی آواز بھرا گئی مگر ہاشم نے فون رکھ دیا۔ اس دن کے بعد سے وہ حنہ کے لیے ایفل ناور بن گیا۔ گوکہ اس نے چند منٹ انتظار کیا کہ وہ کال بیک کرے گا مگر نہیں، کوئی کال نہیں آئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اب اگلے ڈیزہ سال وہ اس سے سوائے دور دور سے خاندانی تقریبات پر ملنے کے، بالکل نہیں مل پائے گی۔ اور یہ بھی کہ دوبارہ وہ ہاشم سے فون پر بات ڈیزہ سال بعد تباہ کرے گی جب وہ امتحانی مرکز میں چینگ کرتی پکڑی جائے گی۔

اگر ہم سب کا ہن (نجوی) ہوتے تو زندگی کا سارا تھرل ہی ختم ہو جاتا!

خود کو بڑھا چڑھا کے بتاتے ہیں یار لوگ ..... حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی چھوٹے باعینچے والے گھر سے قدرے فاصلے پر میں روڈ پر موجود وہ شاپ اس وقت رینوویشن کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اندر مستری مزدور لگتے تھے۔ پینٹ کی مہک، لکڑی اور سینٹ کا جایجا بکھراوا، چیزوں کی اٹھائی۔ ندرت اس شاپ کو چھوٹا سارا بیسٹورانٹ بنانے کی تیاریوں پر نگرانی کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی گاہے بگاہے کونے میں رکھی میز کی جانب بھی دیکھ لیتیں (جو آج ڈیڑھ سال بعد رینوویشن کے مرکزی سنگ ایریا میں شامل تھی) جہاں سعدی کے ساتھ ہاشم کی بیوی بیٹھی تھی اور وہ خاموشی سے اس کو سن رہا تھا۔ ندرت اس طرف نہیں گئی تھیں۔ سعدی نے بتایا تھا کہ فارس کے کیس کے سلسلے میں اسے شہریں سے کوئی کام تھا، تفصیل کو رہنے دیں اور ندرت نے پھر پوچھا نہیں۔

شہریں ہاتھ بآہم پھنسائے وقفے وقفے سے شانے جھنک کر اور اپرواچکا کر مدد حرم بول رہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا آپ ہاشم بھائی سے اتنی عاجز ہیں۔“

”اتنی دیر سے بتا رہی ہوں، کس طرح وہ مجھ پر نارچ کرتا ہے، شک کرتا ہے، مرتا ہے، اب بھی تمہیں لگتا ہے کہ مجھے عاجز نہیں آنا چاہیے؟“ ناگواری سے تھی خیک کر بولی۔ سعدی نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

”تواب کیا آپ ان سے انتقام لینا چاہتی ہیں؟“

”وہ بھی لوں گی، اپنے اوپر کیے گئے ایک ایک ظلم کا حساب لوں گی، لیکن ابھی میں کسی اور کام کے لئے آئی ہوں۔“

”میں ہاشم بھائی کا دوست ہوں، ان کے خلاف آپ میری مدد لیں گی، اتنا اعتبار کیسے ہے مجھ پر؟“

”میرے تمام آپشنز میں تم سب سے زیادہ بھروسے کے قابل گلے مجھے۔ کسی پروفیشن کو ہاڑ کیا تو وہ ہاشم کو بتا دے گا یا مجھے بلیک میل کرے گا۔“

”سواس کا مطلب ہے آپ سے کچھ غلط ہوا ہے؟“ اس نے جوں کا گھوٹ بھرتے ہوئے غور سے شہریں کو دیکھا۔ اس کا رنگ بدلا۔

”ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک مسئلہ ہے جس میں مجھے ہاشم پھنسا سکتا ہے۔ اب تک تو تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ مجھے ذلیل کرنے کے لئے کسی حد تک جاستکتا ہے۔“

اور اندازہ تو سعدی کو ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے اتنی بھی رام کہانی صرف اس لئے سنائی تاکہ جو وہ آگے بتانے جا رہی ہے اس میں وہ خود بے قصور لگے۔ خیروہ متتا گیا۔

”ہماری طلاق کے بعد بھی کی کسیلئی مجھے چاہیے اور مجھے ہی ملے گی لیکن اگر ہاشم کو میرے بارے میں کچھ بھی بر ا معلوم ہوا تو وہ سوئی کو مجھ سے چھین لے گا۔ میرے کرزن والی بات پر اپنی ہو گئی اور دب گئی۔ اب ایک اور مسئلہ ہے۔“ کہتے کہتے وہ ذرا رکی بالوں میں ہاتھ پھیرا اٹکیاں مردڑیں۔

”آپ سے کیا ہوا ہے؟“

”گالف کلب میں کچھ عورتیں کارڈز کھیلتی ہیں، آئی سوئر میں ان میں شامل نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے وہ صرف ایک کارڈز یا گیم تھی، مگر میں نے کافی کچھ لوز کر دیا اس میں۔“

”اوکے۔ پھر؟“

”ان کے پاس کوئی رجسٹر کوئی کپیوٹر کا رڈ کچھ نہیں ہوتا، میں نے سارا پیسہ بعد میں پورا کر دیا، مگر اس شام کی سی سی ٹی وی فوچ ان کے کپیوٹر میں ہے۔ اور اگر کلب میں کبھی کسی نے وہ ہاشم کو دے دی، گوکر وہ ایسا نہیں کرتے، مگر میں رسک نہیں لینا چاہتی۔ ہاشم کو نہیں معلوم میں کتنی بڑی رقم ہاری تھی۔ اس کو رقم سے فرق نہیں پڑتا، مگر ہاشم کاردار کی بیوی gambling کرتے ہوئے دکھائی دے..... یہ ایک اسکنڈل

ہے، اس کی کتنی بدنامی ہوگی، اور کوئی بھی اسکینڈل مجھے میری پچی کی شکل دیکھنے سے تا عمر محروم کر سکتا ہے۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“

”تم اور تہاری بہن ان چیزوں میں اپنچھے ہو۔ کلب کے ریکارڈ سے اس دن کی فوجی غائب کر دؤ میں تمہیں کچھ بھی دینے کو تیار ہوں۔“

”اپنی بہن کو ایسے کلب میں لے کر نہیں جانے والا سو میری بہن کا نام آئیندہ اس معاملے میں نہیں لیں گی آپ، مگر آپ کا کام کر دوں گا۔ ڈوٹ وری۔“

”کیسے کرو گے؟“ وہ متعجب ہوئی۔

”یہ میرا منسلک ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ویسے، ہاشم بھائی جیسے شاطر آدمی کو دھوکہ کیسے دے لیتی ہیں آپ؟“

”ہر شخص کی ایک کمزوری ہوتی ہے، اس کی بھی ہے۔ اسے لگتا ہے جن لوگوں سے وہ محبت کرتا ہے وہ اس کو کبھی دھوکہ نہیں دے سکتے۔ جیسے اس کی فیملی، جیسے کبھی میں تھی، اور جیسے اب تم ہو۔ وہ تم سے حق میں بہت محبت کرتا ہے، کہتا نہیں ہے مگر اسے تم شیر و کی طرح ہی پیارے ہو۔“ سعدی نے (ہونہہ) سر جھنکا۔ شہرین گھری سانس بھر کر پیچھے کو ہو بیٹھی چہرے پر آئے بال پرے ہٹائے۔ ”اور تم جواب میں کیا لو مگر؟“

”آپ کو ہاشم بھائی سے ان کے تمام ظلم و ستم کا بدلہ لینا ہے نا؟ تو بس اس وقت کا انتظار کریں، جب ہم مل کر یا کام کر سکیں۔“

شہرین نے الجھن سے اسے دیکھا۔ ”تم تو ہاشم کے دوست ہو۔ ایسا کیا ہوا تم دونوں کے درمیان؟“

وہ مسکراتے ہوئے کرسی دھکیلتا اٹھا۔

”آپ کے بر عکس، میرے آپنے میں سب سے کم قابل انتباہ آپ ہیں۔“

شہرین نے شانے اچکائے۔ وہ سعدی کی ہربات سننے پر مجبور تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

گئے تھے زعم میں اپنے پر اس کو دیکھتے ہی ..... جو دل نے ہم سے کہے تھے پیام، بھول گئے

یہ سرما کی ایسی سردد دہر تھی جب ذرا سی دھوپ روح تک کوکنور بخشتی۔ ایسے میں عدالت کی عمارت کے گرد کہر کے دائرے میں دھوپ چھید کر کے چوری چھپے داخل ہو گئی تھی۔ مگر کہر عدالت کے اندر شکوہ شہبات نے ہنوز سب دھنڈا رکھا تھا۔

جنس سکندر بغور و کیل دفاع خلیجی صاحب کو بولتے سن رہے تھے جو کٹھرے میں کھڑی زمر سے سوال کر رہے تھے۔ سامنے حاضرین کی چند کریساں رکھی تھیں۔ بمشکل ڈیڑھ قطار بھر کر سیاں جواس اٹی وی اور فلم سے یکسر مختلف اور بد صورت کوثر روم کو مزید بدندا دھکھا رہی تھیں۔ کمرے سے باہر کچھری میں پھرتے بھانت کے لوگوں کا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا مگر وہ سب زمر کوں رہے تھے۔ سعدی خاموشی سے، اور فارس ناگواری سے۔ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ فارس کی تیوری چڑھی تھی۔ آنکھوں میں زمر کو دیکھتے دباد باغصہ تھا۔ سفید کرتے کے کف، کلائی پر موڑ کئے تھے، اور بال پونی میں بندھے تھے۔

البته سعدی بالکل چپ چاپ تھا۔ ریشم بننے کے بعد کا نرم مگر بے لپک سا.....

زمر بھی اتنی ہی بے لپک لگ رہی تھی۔ سفید لمبی قیمیں، اوپر بلیک منی کوٹ۔ دو پڑھانوں پر اور اعتماد سے انھی گردن۔ وہ زمر ہی لگ رہی تھی۔ اور صرف خلیجی صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ دیکھ چکی ہیں کہ کس طرح ابھی ایک ایکسپرٹ witness (ماہر گواہ) نے یہ ثابت کر کے دکھایا ہے کہ اس ریکارڈ نگ میں

موجود فارس غازی کی آواز اصلی نہیں ہے۔“

”الفاظ وہی ہیں جو میں نے سنے تھے۔ ریکارڈنگ کے بارے میں عدالت درست فیصلہ کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ریکارڈنگ سے اصل آواز نکال کر جعلی ڈالی گئی ہوتا کہ عدالت میں اپنی مرضی کی بات ثابت کی جاسکے۔ آفراہل، اس ریکارڈنگ کا سورس غیر قصدیق شدہ ہے۔“ ذرا سے شانے اچکائے۔

”یہ فیصلہ عدالت پر چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔“ خلیجی صاحب نے اس کو بے اختیار ٹوکا۔ پھر کثیرے کے مزید قریب آئے۔ ”کیا آپ اب بھی اپنے بیان پر قائم ہیں؟“

”جو جس طرح ہوا، جو میں نے سنایا میں نے کورٹ اور پولیس کو بتا دیا۔ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے۔“ وہ بے تاثر اور مطمئن کمری تھی۔

”اور جب آپ نے سن لیا تھا کہ ایک شخص آپ کو قتل کرنے جا رہا ہے تو آپ بھاگ کیوں نہیں؟“

”وہ میرا اس سوڈا نٹ تھا، میرا رشتہ دار تھا، مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے مارے گا۔ میں اسے خالی حکمی سمجھی تھی۔“

”مگر بعد میں آپ کو یقین آ گیا؟“

”مجھے تین گولیاں گئی تھیں، میرے سامنے ایک لڑکی قتل ہوئی، کیا یقین نہیں آنا چاہیے تھا؟“ وہ پر سکون ٹھنڈے انداز میں جواب دے رہی تھی۔

”یعنی آپ مانتی ہیں کہ آپ نے اس وقت گولی مارنے والے کی بات کو غلط بھیجا کیا اور وہ بھاگ کر غلطی کی؟“

”بھاگ کر کہاں جاتی؟ سارا ریسٹورانٹ تو اوپن تھا۔ اور اس کے پاس sniper گئی تھی۔“ ایک کاٹ دار نظر سامنے بیٹھے فارس پڑا (وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، بچپن ہوئی نظروں سے) اور واپس خلیجی صاحب کو دیکھا۔ ”اس نے ایسی جگہ منتخب کی جہاں بھاگنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔“

خلیجی صاحب نے ہاتھ میں بکڑے کا غذاء پر نظر ڈالی، پھر سر اٹھایا کر اسے دیکھا۔ ”زم صاحب، آپ کب سے پر اسکیوں ٹریں؟“

”میرا خیال ہے آپ کے کاغذ اور دماغ دونوں میں تاریخ درج ہو گی، بہر حال، ساڑھے تین سال سے۔“

”میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اسے جوابات کو مختصر کر دیجیے۔“

”پھر آپ کو چاہیے کہ آپ مجھ سے ڈبلیو کو پچھزنا پوچھیں۔“ (یعنی کہ کیا، کیوں، کب، کہاں والے سوالات۔) خلیجی صاحب نے اثر لیے بنا کاغذات کو پھر سے دیکھا۔ دو انگلیوں سے کان کی لو مسٹلہ فارس آنکھیں سکوڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ آپ اپنے جو نیز میں ایک سخت گیر پر اسکیوں ٹرکے طور پر مشہور ہیں؟“

”بالکل۔ اور کیسا، ہونا چاہیے پر اسکیوں ٹرکو؟“ اس نے گردن کر دی۔ وہ فارس کو نہیں دیکھ رہی تھی۔

”زم صاحب، آپ جانتی ہیں کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے، قانون کے تحت ہم فارس غازی کو presumed innocent کہیں گے، مجرم نہیں۔ گو کہ آپ اسے مجرم ہی خیال کرتی ہیں۔“

”بالکل۔“ سرا ثابت میں ہلایا۔ فارس نے (ہونہس) سر جھکا۔

”اور زمر جب آپ کسی کو پر اسکیوں ٹرکتی ہیں، تو اس کو مجرم گردان کر دی ایسا کرتی ہیں، درست؟“

”بہوت اور شوہاد اس کے خلاف ہوں تو، ہاں!“ وہ ٹھنڈی اور پر سکون تھی۔

”میں آپ سے پھر درخواست کروں گا کہ اپنے جوابات کو ہاں یا انہاں تک محدود رکھیں۔“

”یہ سوال پچھرے ہے۔“

خلجی صاحب نے ضبط سے گہری سانس لی۔ پھر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ کمرہ عدالت میں سنانا چاہیا تھا۔

”پچھلے ساڑھے تین سال میں آپ کے پراسکیوٹ کیے گئے کیمز میں سے قتل کے سولہ مقدمات ایسے ہیں، جن کے فیصلے آئے ہیں۔“

”جی!“

”اور ان میں سے سات فیصلے دفاع کے حق میں ہیں۔ یعنی کہ سولہ دفعہ آپ نے کہا کہ یہ شخص قاتل ہے، نو دفعہ عدالت نے کہا کہ آں یہ قاتل ہے، مگر سات دفعہ عدالت نے کہا کہ یہ قاتل نہیں ہے۔“

”سات دفعہ شواہد اور گواہیاں اتنی مضبوط تھیں کہ فیصلہ.....“ تصحیح کرنے لگی مگر۔۔۔

”ہاں یا نہیں، زمر صاحبہ!“ قدرے بلند آواز سے یادو دہانی کروائی۔ زمر نے گہری سانس بھری۔

”جی ہاں۔“

”یعنی کہ سات دفعہ آپ غلط ثابت ہوئیں۔ سولہ میں سات....“ انگلیوں پر گنا۔ ”تقریباً پچاس فیصد تناسب نکلتا ہے۔ یعنی... آپ نے سات لوگوں کو پھانسی کی طرف لے جانا چاہا، مگر عدالت نے انہیں بے گناہ قرار دے دیا۔ اس تناسب سے آپ جتنے لوگوں کو قصور وار شہرا تی ہیں، ان میں سے آدھے تو بے گناہ نکلتے ہیں۔“ زمر کے ابروتن گئے اور فارس کے تنے اعصاب ڈھیلے ہوئے۔

”ہم سب جانتے ہیں کہ آپ الفاظ کے ہیر پھیر سے کام لے رہے ہیں، ورنہ ایسے نہیں ہوتا۔“ وہ تھنچ کر بولی۔ سعدی اپنے جو توں کو دیکھ رہا تھا۔ فارس نے بے چینی سے پہلو بدلًا۔ نا گواری سے خلجی صاحب کو دیکھا۔

”زمر صاحبہ“ کیا یہ درست نہیں کہ آپ پراسکیوشن افس میں بیٹھ کر دفاع کی جانب سے کان بالکل بند کر لیتی ہیں، اور ایک دفعہ کی کو محروم گردان لیتی ہیں تو یہ ثابت کرنے کے لئے آخری حد تک جاتی ہیں؟“

”میں بغیر وجہ یا ثبوت کے کسی کو محروم نہیں گردانتی۔“ چاچا کار سلگتی آنکھوں سے انہیں دیکھ کر بولی۔ سامنے کھڑے خلجی صاحب نے اثبات میں سر ہلا کیا۔ پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذ دیکھی۔

”کیا یہ درست ہے کہ وارث غازی قتل سے چند روز قبل آپ نے ایک موک مرائل میں حصہ لیا تھا۔ سرکار بنام ہیری پورڈ!“ اور زمر نے بری طرح چونک کر سامنے بیٹھے سعدی کو دیکھا۔ اس نے گردن مزید جھکا دی۔ زمر کی آنکھوں میں بے یقینی صدمہ دھچکا، ہر شے ابھری تھی۔

”جی ہاں!“ وہ دوبارہ خلجی صاحب کی جانب مڑی تو جیسے ڈھیروں غصے کو ضبط کر رہی تھی۔

”اس میں آپ نے ہیری پورڈ کو سیدر کر ڈگوری کا قاتل ثابت کر دیا۔ کیا یہ درست ہے؟“

”وہ ایک موک مرائل تھا!“ گلابی پڑتی آنکھوں سے وہ غرائی تھی۔ مگر وہ اثر لیے بنا کاغذات کو پڑھ رہے تھے۔

”جبکہ ہیری پورڈ کے چوتھے حصے میں درج اس واقعے کی تفصیل کے مطابق ہیری قاتل نہیں تھا۔“

”وہ ایک موک مرائل تھا!“ سختی سے کٹھرے کا جنگلہ پکڑے وہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”زمر، میرا آخری سوال۔“ کاغذ سے چہرہ اٹھا کر انہوں نے سادگی سے پوچھا۔ ”کیا ہیری کو پراسکیوٹ کرنے سے قبل آپ نے وہ

چوڑھا حصہ پڑھا تھا؟“

”وہ ایک موک مرائل تھا، خلجی صاحب!“ اس کی آواز کا نپی۔

”اس چوتھے حصے کے مطابق، ہیری نے گناہ تھا گناہ کرگا؟“

فارس نے جو اُنھے سے اسے گھورا۔  
سعدی نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اتنی ہمدردی تھی تو گولی کیوں ماری؟“  
اد فارس بے چینی سے سعدی کی طرف جھکا۔ ”وکیل کو منج کرو۔ اس کے ساتھ یوں نہ کرے۔ وہ ایک عورت ہے۔“

”لیاں نہیں ماری تھی؟ تو اگر کوئی یا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو کرنے دیں۔“ اور پھر سے قدموں میں دیکھنے لگا۔  
”وہ تمہاری پچھو ہیں۔“ اس نے گویا ملامت کی۔

"اور مجھ سے زیادہ مضبوط ہیں، سہہ لیں گی۔"

اور جی صاحب کہہ رہے تھے۔

”میں آپ سے ایک سادہ سی بات پوچھ رہا ہوں۔ ہیری پوٹر کی چوتھی کتاب کے تحت ہیری پوٹر، جس کو آپ نے سزا دلوائی تھی، گناہ کا رتھا مایہ گناہ؟“

لب بچنے، زمر نے سرخ ہوتی آنکھیں خلجی صاحب پہ جما میں، چند لمحے منتظری خاموشی چھائی رہی۔  
”بے گناہ!“

ایک لفظ بولانج نے قلم سے کاغذ پر کچھ نوٹ کیا، خلیجی صاحب ”ڈیش آئل“ کہتے یونچے کو ہے مگر وہ ان سے پہلے پرس کندھے پر ذاتی یونچا تری آئی۔ سعدی کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے سراخا کر دیکھا، زمر نے ملامتی، کاٹ دار نظر اس پر ذاتی اور آئے چلتی جلتنی بیہاں تک کروہ کرہ عدالت سے باہر تھی۔ کوئی اسے روک کے دکھائے تو اس کی ماں اسے روئے۔

رہا دری میں چلتے ہوئے اس کا چہرہ احساس تو ہیں سے سرخ پڑ رہا تھا۔ پار بار وہ کنپی ملائی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ واپس اپنے آفس آئی اور اندر جو بھی بیٹھا تھا اس کو ”بایہ جاؤ، فوراً“ کہہ کر بھیجا اور کرسی پر گرسی گئی۔ آنکھیں گلابی پڑھی تھیں، سر درد لاگ۔

پتہ کیں ملی دیر وہ ادھر بیٹھی رہی، پھر پس اور چاپیاں اٹھا کر باہر نکلی۔ راہداری میں ابھی آگے آئی ہی تھی کہ سامنے سے دو اہلکار ہٹکڑی لگے فارس کو لے کر آرہے تھی، اس کے ہاتھوں سے بندھی زنجیریں سپاہیوں کے ہاتھوں سے جڑی تھیں۔ ساعت ختم ہو چکی تھی۔ اسے قریب آتا دیکھ کر وہ رکا، گردن ترجمی کر کے سایتی کو دیکھا۔

”نذر اسلام، تمہاری بیوی کا نام رخصانہ ہے، چار بچے ہیں تمہارے، سیلہائٹ ٹاؤن کے پاس گھر ہے تمہارا، اگر تم نے مجھے پر اسکیوڑ سے بات کرنے سے روکا، تو یاد رکھنا، جس دن چھوٹوں گا، سب سے پہلے تمہارے گھر جاؤں گا۔“ ایک کاٹ دار نظر الہکار پڑاں جو بے بسی سے خلک لبوں پر زبان پھیکر کر رہ گیا۔ وہ ہلتی ہوئی قریب آرہی تھی، اسے دیکھا تو رخ پھیکر نکلنے لگی، مگر۔

”آپ نے کہا آپ میرے ساتھ کھڑی ہوں گی، میری دکیل بنیں گی۔“ زمر کی، چونک کراسے دیکھا۔ وہ وسط راہداری میں، ہنکھریوں میں کھڑا، بہت ضبط سے اسے دیکھتے کھڑ رہا تھا۔

”اس ریکارڈنگ میں آپ نے کہا، آپ میرا ساتھ دیں گی، حالانکہ آپ کو بتایا جا رہا تھا کہ میں نے وارث کو مارا ہے۔“ وہ چند قدم مزید قریب آیا۔ دونوں الہکار ساتھ کھینچنے آئے۔ راہداری میں سے گزرتے لوگ رک رک دیکھنے لگے۔ زمرہ بھینچنے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سانس تیز ہو رہی تھی۔ وہ دو قدم مزید آگے آیا۔ انہی غصے بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے بولا۔

”بھائی کو مارا تو حیرھی، بات سننے کو تیار ھیں آپ، مگر آپ کو مارا تو اصول بدلتے ہیں؟“

وہ بھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھئے گئی۔ پہلو میں گرے ہاتھ سے پرس کوزور سے بھینچا۔ ضبط سا ضبط تھا۔

”آپ نے کہا، ادھر کشہرے میں، ہٹھکڑی والے ہاتھ سے کردہ عدالت کی سمت اشارہ کیا۔“ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا، جو کہا، مگر آپ کوئی نہیں تھیں، آپ زمر تھیں! انگلی اٹھا کر، پیچھے ہٹتے، اس نے غصے اور درد سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھا ”آپ سے، کم از کم آپ سے مجھے امید تھی کہ آپ مجھے سنیں گی، مگر آپ نے سب سے پہلے میری امید توڑی۔“ اور وہ پیچھے ہٹا گیا۔ ”میں بے گناہ تھامیدم زمر، میں بے گناہ تھا!“ غصے کی جگہ ان آنکھوں میں دکھ بھر آیا اور پھر وہ پیچھے ہٹا گیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اسے لیے مزدگئے، مگر اس کی آنکھیں۔ وہ امہم لکھ تھیں۔ زمر نے ادھر ادھر دیکھا، ہر رک کرا سے دیکھتے شخص کے اوپر وہی آنکھیں چسپاں تھیں۔ وہ تیز چلتی دوسرا سمت بڑھنے لگی۔ اس کا سانس اب بھی بے ترتیب تھا، اور آنکھوں کا گلبی پن بروحتا جا رہا تھا۔

گھر آ کر اس نے ابا، صداقت، کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ کمرے میں بند ہو گئی۔ ڈاکٹر کی اپائنٹمنٹ پر بھی نہیں ملی۔ بس بستر پر چوت لیٹیں چھت کو دیکھتی رہی۔ پھر شام ڈھلنے اسٹڈی میبل پر آئیں، اور پچھھے فائلر کو پڑھتی رہی۔ رات دیر تک اس کے کمرے کا ملی مظہر ہا۔ کب سرفائل پر کھے وہ سوگئی اسے پتہ بھی نہیں چلا۔

❖❖❖

کیا گزرتی ہے بھری دنیا میں تھا شخص پر ..... ایک لمحے کے لیے خود سے پچھڑ کر سوچنا رات کا دوسرا پھر تھا شاید، جب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں اندھرا تھا۔ لیپ جانے کب بجھ گیا۔ شاید بجلی چلی گئی تھی۔ وہ بال پیش تھی اٹھی۔ بتی جلاں۔ یوپی ایس نے کمرہ روشن کر دیا۔ وہ قدم قدم چلتی ٹیکیں تک آرکی۔ وہاں سیاہ جلد والی موٹی موٹی قانون کی ستمائیں رکھی تھیں۔ زمر نے ہاتھ اٹھا کر ان کو چھووا۔ آنکھوں میں کرب اپھرا۔ پھر وہ مزید لا میں جانب آئی۔ یہاں الماری تھی۔ اس نے پٹ کھول۔ جو توں والے خانے میں ایک ڈبہ رکھا تھا جس میں چند ایک تراثے اور کاغذ پڑے تھے۔

یہ ڈھانی سال قبل اس نے جمع کیے تھے۔ پھر چھوڑ دیے۔ یہ تکلیف دیتے تھے اور وہ تکلیف سے بچنا چاہتی تھی، پھر بھی بچ نہیں پاتی۔ مگر جو تکلیف، ہنکڑت آج اٹھانی پڑی تھی۔ بھری عدالت میں.... اس نے ذبے کو چھوئے بنا الماری بند کر دی اور باہر نکل آئی۔ گھر ویران، اندھیر پڑا تھا۔ اور سرد بھی۔ وہ باہر لان میں آگئی۔ برآمدے کے اسٹیپ پر بیٹھی۔ ایک گال آنکھوں پر رکھے، دور گھاس اور پودوں کو تکتی، خاموش بیٹھی رہی۔ لمحے چپ چاپ کئتے رہے، یہاں تک کہ فجر اترنے لگی، تب زمر اٹھی اور لان کے گنارے تک آئی۔ یہاں پودوں کو پانی دینے کے لئے نونٹی لگی تھی۔ اس نے وہی کھوئی، مٹھنے تخت پانی سے وضو کیا اور وہیں گھاس پر کفر نے نماز کی نیت پاندھی۔

آخری سجدے کے بعد، التحیات پڑھ لیا اور سلام پھیرا تو دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، مگر پھر گردادیے۔ چپ چاپ سجدے کی جگہ کے گھاس کو دیکھتی رہی۔ اس پر انگلی پھر تر رہی۔ سخت سر دی میں بغیر سوٹر کے وہ کتنی ہی دیر یہاں بیٹھی رہی۔

وہ رات اس حوالاتی کوٹھڑی میں بھی آنکھوں میں کافی گئی تھی۔ وہ ذرا سا کونہ جہاں برآمدے کی بتی کی مدھم روشنی گرتی تھی، آج لارس ادھرنیں لیٹا تھا۔ وہ دوسری دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اکڑوں، سر دیوار سے نکائے، آنکھوں کی بتلیاں سکیڑے دور سلاخوں کے پار دیکھ رہا تھا۔ باہر فجر بھی تک تازہ تھی۔ پھر بیدار بہل رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ چند ایک کوٹھڑیوں میں سے آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ احر مہال لیتا، آنکھیں مسلتا اٹھ بیٹھا، پھر ادھر ادھر دیکھا۔

”غازی بھائی۔ ادھر کیوں میٹھے ہو؟ سوئے نہیں کیا؟“

”اوہ ہو!“ وہ باہر دیکھتا رہا۔ یقیناً وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ احر بیوں پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکتا سیدھا ہو کر بیٹھا۔ فارس اس سے چند قدم

لی دو رہتا۔

”کیا بات ہے؟ نماز نہیں پڑھی؟“

”پڑھ لی۔“

”اس نماز کا کیا فائدہ جس کے آخر میں کوئی دعا ہی نہ مانگی جائے؟ چار سجدے کیے اور اٹھ گیا۔“ پھر وہ خود ہی ہنسا، مگر جب فارس نے قہقہے کا جواب نہیں دیا تو وہ چپ ہو گیا۔

”برے حالوں میں لگ رہے ہوا آپ۔“ وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کرغور سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر قریب کھسک آیا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟ اپنے پرزن رائمس کے بارے میں؟“

خلاف معقول فارس بے زار نہیں ہوا، بلکہ ہی نقی میں گردن ہلائی۔

”پھر کیا چیزیں کے بارے میں؟ کل کورٹ میں پیش ہوئی تھی نا!؟“

”ہوں!“ فارس نے اثبات میں سر ہلاایا۔

”آپ نے بتایا ہی نہیں کل سے کہ کیا ہوا۔ کیا اس نے وہی کہا جو پہلے کہہ چکی تھی یا، کچھ نیا تھا اس میں؟“

”سب پرانا تھا۔“

”تو اتنے آپ سیٹ کیوں ہو؟“

”عدالت نے تو مہینے بعد کی تاریخ دی ہے۔“ تکلیف سے کہتے اس نے گردن پھیر کر احر کو دیکھا جس کے لب اورہ میں سکرے۔ ”اُن مہینے اپنی انو ہی میں ایک پیشی کا انتظار نہیں کر سکتا۔“

”مگر.... آج تو سب کچھ آپ کے حق میں گیا تھا۔“

”مجھے بھی بھی لگا، سعدی کو بھی گر جب نج نے اگلی تاریخ دی تو میرے دکیل نے بھانپ لیا کہ نج بک چکا ہے۔“ تکان سے کہتے اس نے آنکھوں کے درمیان کی بڑی مسلی۔ ”اتنے مہینے کے انتظار، جس کی اتنی راتیں، مگر انصاف کی کوئی امید نہیں۔“

احمر نے گردن پھیر کر روشنی والا کونڈ دیکھا جو آج خالی پڑا تھا۔

”مجھے بھی لمبی تاریخ مل گئی ہے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد منہ سورے بولا تو فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”مگر تمہارا دکیل تو ہاشم ہے۔“

”ہاشم اپنے والد کے مجبور کرنے پر میرے لئے کوشش کر رہا تھا۔ مگر اسے اندر سے مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں، شروع شروع میں اس نے یوں ظاہر کروایا کہ بس میں رہا ہوا کہ ہوا، مگر.... اب تک اور نگزیب کاردار مجھے بھولنے لگے ہیں،“ بھیل دفعہ وہ بے فکر اور لاپرواہ نہیں لگا تھا، اسے جیسے اب واقعی فکر ہونے لگی تھی مگر وہ اسے چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔

فارس نے کرب سے سر جھکنا۔

”پھر اب آپ کیا کریں گے؟“

”تم کیا کرو گے؟ بلکہ۔“ وہ ایک دم احر کو دیکھنے لگا۔ ”بلکہ ہم کیا کریں گے؟“ تو وہ جو ہنوز اداں بیٹھا تھا، پونکا، پھر پیچھے کو ہٹا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے؟“ مشکوک انداز میں اسے گھورا۔

فارس کچھ کہنے بنالس کو دیکھتا رہا۔

”نہیں، بالکل نہیں۔“ احر نے جلدی سے ہاتھ اٹھا دیے۔ ”میں وہ نہیں کرنے والا جو آپ سوچ رہے ہیں۔“

”میرے پاس ایک پلان ہے اسچنی، اگر تم سننا چاہو تو!“

”بالکل بھی نہیں، ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے، عدالت پر یقین رکھیں، بس!“ بگڑ کر کہتا وہ پرے لیٹ گیا۔ فارس اسے دیکھ رہا تھا، اس نے گھبرا کے کروٹ بھی بدلتا۔  
باہر فخر میں ایک دیران صبح کی روشنی گھلتی گئی۔

❖❖❖

واجب القتل اس نے ٹھہرایا ..... آئتوں سے، روایتوں سے مجھے جسش مکرم کے چیمبرز میں خاموشی چھائی تھی۔ ہمیرے ماحول کو گرم اور خنک کر رکھا تھا۔ زمر سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ اپنی اُس پر برا جمانِ عینک کے پیچھے سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”مجھے پر اسکیوں آفس سے استغفاری دے دینا چاہیے!“ بہت دیر بعد اس نے سراہیا تو آنکھوں میں ہٹکا تھی۔ گھنگھریاں لیں اس طرف سے گالوں کو چھوڑتی تھیں۔ انہوں نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

”تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے زمر؟“  
”یہی کہ میں ایک اچھی پر اسکیوں نہیں ہوں۔ میرے خیالات فکسدہ ہو چکے ہیں، اور میں تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا چھوڑ چکی ہوں۔“ وہ ایت بھری آنکھیں ان پر جمائے بدق塘 ایک ایک لفظ ادا کر پائی۔ جسش مکرم نے مایوسی سے لنگی میں سر ہلا کیا۔

”سب سے برے مریض، ڈاکٹر ہوتے ہیں، اور سب سے برے گواہ خود وکیل بنتے ہیں۔ تم نے یہ ثابت کر دیا۔“ پھر قدرے آگے اٹھ چکے۔ ”مجھے بلکہ پوری کچھری کو معلوم ہے کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ دفاعی وکیل گواہ کو ڈس کر یہیث کرنے کے لئے ہر قسم کا ہتھکنڈہ اتنا ممال کرتے ہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم اس وکیل کی بات دل پر لے لوگی۔“

”وہ میرے راستے میں آیا اور اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا کہ وہ بے گناہ ہے۔“  
وہ چونکے۔ ”کون؟“

”فارس۔“ وہ کہہ کر چپ ہو گئی۔ چند ثانیے کو چیمبرز میں سنا تا چھا گیا۔

”کیا اس نے یہ پہلی دفعہ تم سے کہا؟“

”میں ڈھائی برس تک اس سے ملنے سے انکار کرتی رہی، اس لیے نہیں کہ مجھے تکلیف ہوتی ہے، اس لیے بھی نہیں کہ کوئی مجھے شوت یا ہوں نہیں لا کر دیتا۔ یہ وہ بہانے تھے جو میں بناتی تھی، صرف اس لیے کہ مجھے معلوم تھا، اگر وہ میرے سامنے آیا اور کہا کہ وہ شرمند ہے تو میں اسے معاف کر دوں گی۔ مگر کل وہ سامنے آیا تو کہا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اور میں نے سن بھی لیا۔“

”اوہ کیا مان بھی لیا؟“

اس بات پر زمر نے ٹھنڈی سانس بھری اور گردان جھکا کر اپنے ناخن کھر چنے لگی۔  
”میں کنیفوڑ ہو گئی ہوں۔“

”جیسا کہ دفاعی وکیلوں کی خواہش ہوتی ہے، اگر کوئی نہ کر سکو تو کنیفوڑ کر دو۔“ وہ قدرے ناراض نظر آنے لگے۔ زمر نے نفی میں گردان ہلائی۔

”شاپیو وہ ٹھیک ہیں۔ میں اپنے غم بیماری اور ٹراما میں خود غرض ہو گئی ہوں۔ میں نے دوسرا طرف کی کہانی سننا چھوڑ دی ہے۔ مجھے اس کی بات سننی چاہیے تھی۔ وہ قاتل تھا بیانیں، مجھے اس سے ملتا چاہیے تھا۔“  
”تمہاری جگہ کوئی دوسرا بھی ہوتا تو یہی کرتا۔“

”مگر میں کوئی دوسری عورت نہیں تھی۔ میں زمر تھی۔ مجھے اپنے جذبات ایک طرف رکھنے چاہیے تھے۔“ انہوں نے جواباً اتنا کرناک سے مکھی اڑائی۔

”یہ کتابی باتیں ہیں، کوئی بھی انسان اتنا غیر جائز نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارے دوست و کلاعہم جھوں کے سامنے پیش ہونے سے یہ کہہ کر معدورت نہ کر لیتے کہ یہاں Conflict Of Interest آگیا ہے۔ وکیلوں کے بھی جذبات ہوتے ہیں۔“

”اور بطور ایک بچ آپ کو کیا لگتا ہے؟ سرکار بنام فارس غازی میں مجرم کون ہے؟“ وہ بالکل خالی نظروں سے ان کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

”جتنا میں نے اس کیس کے بارے میں سن رکھا ہے، میرا خیال ہے فارس غازی مجرم ہے۔“ عینک کے بازو کا کنارہ دانتوں میں دبائے وہ کندھے اچکا کر بولے۔

”کیونکہ ثبوت اس کے خلاف ہیں؟ مگر قانون تو یہ کہتا ہے کہ عدالت کا فیصلہ آنے تک ملزم کو ” مجرم“ نہ کہا جائے بلکہ اسے سمجھا جائے۔“ وہ بہت تکلیف میں بول رہی تھی۔ Presumed Innocent

”یہ درست ہے۔“

”اور قانون یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایک طرف ملزم کے خلاف شواہد کا پہاڑ ہو، مگر دوسری جانب اتنا ذرا سا...“ انگوٹھا اور انکشیف شہادت قریب کر کے بتایا۔ ”اتا ذرا سا بھی شک Reasonable Doubt ہو تو ہمیں ملزم کو بری کر دینا چاہیے کیونکہ سو گناہ گاروں کو بری کر دینا ایک معصوم کو سزا دینے سے بہتر ہے۔“ اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحے اسی سنائے میں پھسل گئے۔

”میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، اور وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا، سر۔“

عینک کا ہینڈل چباتے ہوئے انہوں نے ہنکار اٹھرا ”ہوں، تو تمہیں کیا ڈر ہے؟“

”اگر میری وجہ سے ایک بے گناہ آدمی کو سزا ہوئی تو میں زندگی میں بھی دوبارہ لا نہیں پریکٹس کر سکوں گی۔“

جس سکرمان آگے کو ہوئے سوچتے ہوئے عینک کے کنارے سے میز پر نادیدہ لکیریں لکھنگیں۔

”تو پھر؟ کیا وہ بے گناہ ہے؟“

”میرے پاس بہت کچھ ہے جو اس کو مجرم ثابت کرتا ہے میری نظروں میں، مگر ان کے پاس Reasonable Doubt ہے اور اگر میں ان دونوں کو ان پڑوں میں رکھوں.....“ میز پر کھٹے ڈیکوریشن ترازو کی سمت اشارہ کیا۔ ”تو تی بھر شک کا پڑا ہمیشہ جلد جائے گا۔“

”شک کیا ہے؟“

”وہ آواز جو میں نہ سنبھال سکتی وہ جعلی تھی۔ یہ میرے لئے مانا بہت مشکل ہے، آپ کے لئے بھی ہو گا، لیکن.....“ وہ بے چینی سے آ کے اہوئی۔ ”اب دو باتیں ہیں۔ اول، قاتل فارس ہی تھا اور یہ آذیور دو بدلتے بعد پیش کی گئی ہے، اسی لئے وہ لوگ اس کا سورس نہیں بتا رہے۔ دوم، (ایک گھری سانس لی) آڑیوں اصلی ہے، وہ فارس نہیں تھا، وہ ایک جعلی آواز تھی۔“

”تمہارا دل کیا کہتا ہے؟“

”دل سے آخری فتویٰ لیا جاتا ہے، پہلا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہی مجرم ہے، اسی نے کیا ہے یہ سب۔ لیکن.....“ اور یہیں آکر ان پورا وجود کرب میں بہتلا ہو جاتا۔

”تمہارے دل میں عینک آگیا ہے۔“

زمر نے اثبات میں سرہلایا۔

”اور تم نے اس کا حل یہ سوچا کہ تم فرار ہو جاؤ؟ استغفاری دے کر؟“

”میں فرار نہیں ہو رہی۔ میں شاید اس کری کی مستحق نہیں ہوں۔ شاید پر اسکیوٹشن کی کرسی پر بیٹھ کر میں دوسرا رخ دیکھنا چھوڑ مل گئی ہوں۔“

”جب عدالت میں اس وکیل نے یہ کہا کہ تمہارے اتنے کیسز کے فعلے تمہارے خلاف آئے ہیں، تو تم نے اسے سچ کیوں نہیں بتایا؟“  
”اور سچ کیا تھا؟“ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”یہ کہ ان کیسز میں ملزم بری اس لئے ہوئے تھے کہ کبھی گواہ ڈر گئے یا بک گئے، کبھی صحیح ہمت نہ کر سکے، کبھی ثبوت نہیں تھے، کبھی شک کا فائدہ دیا گیا۔ میں روز کتنے ہی ایسے کیسز میں لوگوں کو بری کرتا ہوں جہاں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملزم ہی مجرم ہے مگر میرے سامنے اتنے ثبوت ہیں پیش نہیں کیے جاتے جو ان کو جیل میں روک سکے۔ پر اسکیوٹر کا کام حقائق اور شوابد سامنے لانا ہوتا ہے، اور تم ایک بہترین پرائیکوٹر ہو زمر!“ پھر گہری صافی لے کر پیچھے ہوئے۔

”رہا فارس غازی کا کیس تو اس کے خلاف اتنے ثبوت ہیں کہ تم نہ گواہی دیتیں، تب بھی وہ جیل میں ہوتا۔ پھر بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ اس کے بے گناہ ہونے کا ذرا سا بھی چافیں ہے، تو تم اپنی گواہی واپس لے لوا اور جا کر ایک دفعہ اس کی بات سن لو۔ اگر وہ کہے کہ وہ بے گناہ ہے تو یقین مت کرنا، کیونکہ سب ملزم یہی کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی اور بات کہے تو دھیان سے سن لینا۔“

زمر نے اثبات میں سرہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تحنیک یوسر۔ میں بہتر محسوس کر رہی ہوں۔ میں اپنی گواہی واپس لے لوں گی، گوکہ مجھے ابھی تک خود پر یقین ہے، مگر اس کیس سے الگ ہونے کے لئے میں یہ ضرور کروں گی۔“ کہتے ہوئے وہ پہلی دفعہ قدرے سکون سے مسکرائی۔ وہ واقعی بہتر محسوس کر رہی تھی۔

❖❖❖

اب کہ ہم پھرے تو شاید بھی خوابوں میں ملیں ..... جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں جیل کے برآمدے میں معمول کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ صحن میں قیدی ادھرا دھر چلتے، پھرتے، کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کونے میں سرما کی دھوپ سے بے نیاز وہ دونوں بھی موجود تھے۔ فارس ناگ موز کردیوار سے ایک پاؤں لگائے کھڑا تھا اور احمد اس کے سامنے کھڑا سینے پر بازو لپیٹ دھوپ کے باعث آنکھیں چندھیا کرائے دیکھ رہا تھا۔

”پریشان ہوا چنی؟“

”نہیں یار!“ احمد نے بے چینی سے سر جھکا اور پتیاں سکیز کر دو رسنید کپڑوں والے قیدیوں کو دیکھنے لگا۔

”اے!“ فارس نے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ بالایا۔ ”مسئلے ہے کوئی؟“

”ہاشم اس ساعت پہنچیں آیا۔ تالے جا رہا ہے۔ اگلے ہفتے بھی معلوم نہیں آئے یا نہیں۔“ اور ان ڈھیر سارے دونوں میں پہلی دفعہ وہ مایوس نظر آنے لگا تھا۔

”ہاشم کے وعدوں پر ہو گے تو یہی ہو گا۔“ پھر ادھرا دھر سرسری سادیکھا اور احمد کے قدرے قریب ہوا۔ ”مجھے یا تمہیں کوئی عدالت یہاں سے نہیں نکالے گی۔ اب بھی وقت ہے میرے پلان کے بارے میں سوچو۔“

احمر نے ہلکا سا اثبات میں سرہلایا۔ فارس نے ہاتھوں میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور چباتے ہوئے گردن موز کر سامنے دیکھنے لگا۔ ایک الہکار اسی طرف آر رہا تھا۔

”تمہاری ملاقات آئی ہے غازی۔“ اس نے فارس کو مخاطب کیا۔

”کون ہے؟“ کاغذ چباتے اکتاہٹ سے پوچھا۔

”پرائیو ٹر صاحبہ۔“

کاغذ اس کے حلق میں پھنس گیا، ملتے جبڑے رکے چونک کراسے دیکھا، پھر احمد کو۔ وہ بھی ایک دم سیدھا ہوا تھا۔

”چڑیل آئی ہے؟ آپ سے ملنے؟“ شاک اتنا شدید تھا کہ وہ اسے نوک بھی نہ سکا۔ بس کاغذ منڈ سے اگلا اور خاموشی سے پاہی کے پیچھے ہولیا۔

جب وہ اس کمرے میں داخل ہوا تو میز کے اس پارکر سی پہ بیٹھی تھی۔ گھنگری لے بال آدھے کچھ میں بندھے تھے، ناگ پہنچ

جائے، شال کندھوں کے گرد اور بار بار کلائی کی گھری دیکھتی۔ آہٹ پر نظریں اٹھائیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آیا اور اس کے سامنے

بیٹھا۔ بال دیسے ہی پونی میں تھے اور شیو ہلکی ہلکی سی نظر آتی تھی۔

”لاگ نائم میڈم!“، آنکھیں سکین کر اسے دیکھ رہا تھا۔

زمر نے سر کو ہلکے سے اثبات میں جنمیش دی۔ ”لاگ نائم“ فارس!

اور بیٹھی نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔ ہاتھ گود میں رکھ لئے تھے اور مٹھیاں ضبط سے بھیج لی تھیں۔ ذہن کے پردوں پر وہی آوازیں گوئیں لگیں۔ (میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا زمر۔ آئی ایم سوری۔) اس نے ان تکلیف وہ یادوں کوڑہن سے جھکنا چاہا، مگر یہ آسان نہ تھا۔

”سو؟“ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا، منتظر تھا۔

”میں تمہیں سننے آئی ہوں۔ تم ڈھائی سال سے بھی درخواست کرتے رہے ہوئے۔ تو اب میں یہاں ہوں۔ کہو جو بھی کہنا ہے۔“ فارس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ بکھری۔

”دیر کی آپ نے آنے میں۔ اب مجھے آپ کے قانون سے کوئی امید نہیں رہی۔“

وہ خاموشی سے اسے دیکھئے گئے۔

” بتاؤں کیا کہنا ہے مجھے آپ سے؟“ وہ ہاتھ باہم ملا کر میز پر رکھے آگے کو جھکا اور چباچا کر ہر لفظ ادا کیا۔ ”یہی کہ میری بیوی کی موت کی ذمہ دار آپ بھی ہیں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس کا ہاتھ پکڑتیں اور وہاں سے بھاگ جاتیں۔ آپ کو اسے چانا چاہیے تھا۔ اس کی حفاظت کرنی چاہیے تھی۔ مگر اپنی دوسروں کو قاتل کرنے کی مہارت پر یقین کر کے آپ نے اسے بھی لفڑان پہنچایا اور خود کو بھی۔“ زمراب کہنی کری کے تھپ پر رکھے انگلی تھوڑی تلے جائے، اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرے پاس اپنے دفاع میں کہنے کوئی بھی چوڑی بات نہیں ہے۔ دل اچاٹ ہو گیا ہے اس قانون سے۔ صرف اتنا کہوں گا کہ تین سال آپ کے شہر میں گزارے، اتنا تو جانتی تھیں آپ مجھے کہ ایک دفعہ میری بات سن لیتیں۔ اتنا تو یاد رکھتیں کہ آپ میری بھیج تھیں۔ ایک دفعہ تو تصویر کا دوسرا رخ دیکھتیں۔“ وہ پھر رکا، کہ شاید وہ کچھ بولے مگر وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ ناک کی لوگنگ ہنوز دمک رہی تھی۔ فارس نے اس لوگنگ پر نظریں جائیں تو لمحے کی کڑواہٹ زائل ہونے لگی۔ اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے۔

”مجھے قاتل سمجھتی ہیں تو سمجھیں میڈم جو دل میں آئے سمجھیں، مگر ایک دفعہ میرے کیس کو ضرور دیکھیں، اور وہ بھی خود دیکھیں۔“ وہ اپنے پیچھے ہوا۔ ”کچھ کہیں گی نہیں آپ؟“ اب کے اس کا لہجہ دھیما تھا۔ زرم تھا۔

”میں کہنے نہیں، سخنے آئی تھی۔ کیونکہ اگر کہنے پا آئی تو آواز باہر تک جائے گی۔“ وہ گھری سانس لیتی، ٹھنڈے انداز میں انٹھ کھڑی ہل۔ سپاٹ نظر دوں سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ ”یقیناً تم کہہ چکے ہو جو کہنا تھا، سول ملاقات ختم ہوئی۔“ اور کرسی دھکیل کر دروازے کی طرف ہل۔

فارس نے بے حد تکلیف سے اسے جاتے دیکھا، اور پھر آنکھیں بیچ کر گردان جھکا دی۔

جب وہ واپس آیا تو احمد صحن کے اس کونے میں منتظر ساہل رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر بے چینی سے پکا۔  
”کیا کہہ رہی تھی چڑیل؟“ امید اور خوشی سے اس نے پوچھا۔

”وہ اپنے تغیر کو مطمئن کرنے آئی تھی، ورنہ اسے اب بھی یقین ہے کہ میں مجرم ہوں۔“ احمد کی آنکھوں میں الجھن احمدی۔  
”مگر... کہا کیا اس نے؟“

”کچھ نہیں، کیونکہ اگر وہ کچھ کہے گی تو آوازیں باہر تک جائیں گی۔“ وہ دیوار سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا۔ انداز ڈھیلا دھیلا ساتھا۔

”لیکن وہ آئی تو سہی نا۔ آہستہ آہستہ ہی انسان پکھلتا ہے۔“

”وہ پھر نہیں آئے گی اسٹنپی۔ مجھے ایک موقع ملا اور میں نے وہ بھی گنودیا۔ اسے قائل نہیں کر سکا میں۔“ وہ گردان موڑ کر آنکھیں ہلے دھوپ کی سمت دیکھنے لگا۔ امید کی کر نیں اب سورج سے بھی نکلنابند ہو گئی تھیں۔

”لیکن چڑیل کو چاہیئے تھا کہ---“

”اگر تم نے ایک دفعہ پھر اس کو چڑیل کہا تو میں اپنا ہاتھ تمہارے جبڑے تک لے جانے پا مجبور ہو جاؤں گا اور اس کے نتیجے میں تم اپنے دو تین دانت گنوداد گے۔“ وہ جتنے تھمل سے بولا تھا، احمد کی چلتی زبان اسی تیزی سے بند ہوئی۔ پھر ہونہ کہہ کر سر جھٹکا۔

.....

سیف انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے!! ..... ورنہ دنیا میں کوئی بات نہیں بات نہیں  
زمر گھر میں داخل ہوئی تو لاونچ سے آوازیں آرہی تھیں۔ حینیں آئی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرف آگئی۔ بڑے اباہیل چھیر پہ بیٹھے مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے اور حده صوفے پر میر اوپر کر کے بیٹھی، ان کو کسی کورین ڈرامے کی کہانی سنارہی تھی۔ خوب مزے سے، مسکرا مسکرا کر، آنکھیں گھما گھما کر۔ زمر کو چوکھٹ میں دیکھ کر اس کی بولتی بند ہوئی۔ سنجیدہ ہو کر پاؤں اتارے۔ آہستہ سے سلام کیا۔ ابا نے مز کر دیکھا۔ وہ تھکی تھکی سی ماںے صوفے پا آبیٹھی۔

”تمہیں دیہو گئی آج؟“ انہوں نے پوچھا۔ حینیں سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

”میں کورٹ سے سیدھی جیل چلی گئی تھی۔ فارس سے ملنے۔“

حینیں نے کرنٹ کھا کر سراٹھایا۔ وہ سرسری سا بتا کر، صداقت کو آواز دینے لگی کہ اس کی چیزیں لے جائے۔

”فارس سے۔۔۔ کیا بات ہوئی؟“ ابا کے بے یقین الفاظ اٹکے۔

”وہ چاہتا تھا میں اس کو سنوں، میں نے سن لیا۔“ صداقت اندر آیا تو وہ اسے چیزیں تھمانے لگی۔ حمدہ جلدی سے آگے ہوئی، ساری ماڑاٹی بھلا کر تیزی سے پوچھا۔

”اور کیا مان بھی لیا؟“

”اس نے کہا کہ وہ بے گناہ ہے بس اور جیل میں کوئی ایسا شخص مقید نہیں جو یہ فقرہ منتر کی طرح نہ دہراتا ہو۔“ وہ تکان سے کنپتی مسل

رہی تھی۔

”پھر ہمیں ان کے ساتھ تھی، میں نے پولیس کو بھی بتایا تھا، وہ بے گناہ ہیں۔“ وہ ترپ کر بولی تھی۔ زمر نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، انگلی سے برادر کپٹی مسلتی رہی۔

”جسے بچے میں ہمیں کٹھرے میں نہیں کھڑا کرنی چاہتی۔“

”مگر آپ ایک دفعہ مجھ سے تو پوچھیں کہ کیا ہوا تھا؟“

”اوکے، خین یوسف!“ اس نے سرا ثابت میں ہلا کیا، بیچھے ہو کر بیٹھ گئی، تا انگ پٹانگ جائی۔ ”شروع کرتے ہیں پھر۔“ خین نے کمر سیدھی کر لی۔ بڑے ابا خاموش ہی بے بی سے ان دونوں کو دیکھنے لگے جو آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ اور دونوں کے درمیان بہت ساقا صلد تھا۔

”اس روز، جب مجھ پہ فائزگنگ کی گئی تم ہوٹل کے کمرے میں تھیں۔ ایک سے سازھے تین بجے تک تقریباً؟“

”جی!“ اس نے گردن کر لائی۔

”اور اس دوران فارس کہیں نہیں گیا؟“ زمر بخیج دیکھی سے سوال کر رہی تھی۔

”نہیں، وہ ہمارے ساتھ تھے۔“

”اور اس دوران تم بھی کہیں اٹھ کر نہیں گئی؟“

”جی نہیں۔“

”تم سارا وقت اسی کمرے میں تھی؟“

”جی۔“

”اور اس دوران تم نے فارس سے نظر نہیں ہٹائی؟ فارس اور علیشا کے سوا کسی سے کوئی بات بھی نہیں کی؟“

”نہیں۔“

”پولیس کو بھی تم نے بالکل بھی کہا تھا۔ کیا میں اسے تمہارا حتمی بیان تصور کرلوں؟“

”جی، میں پر اسکیوڑا!“ کافی اعتناد سے گردن کر لائے وہ بولی۔ زمر نے آنکھیں پیچیں، گھبری سانس لی، اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ پند لمحے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں وہی باکس تھا جو وہ الماری میں جو توں کے خانے میں رکھتی تھی۔

”یہ تمہاری ای کے موبائل کابل ہے۔ وہ موبائل جو اس روز تمہارے پاس تھا۔“

خین نے قدرے حرمت سے وہ کاغذ تھاما، اور جب اس پہ نگاہیں دوڑا میں تو اس کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔

”تم نے پولیس کو بھی کہا کہ تم نے اس دوران کسی سے کوئی بات نہیں کی، یعنی ایک لمحے کو بھی قارس سے غافل نہیں تھیں۔ جب کہ اس مل کے مطابق تم نے ڈیڑھ بجے اپنے گھر چا رہنٹ، اور پونے تین بجے اپنی ایک دوست کو دوں منٹ کے لیے کال کی۔“ پھر ایک دوسرے کاغذ اس کے سامنے کیا۔ ”یہ اس ہوٹل کی لابی کے سی سی ٹی وی کیمرے کا ایک اسٹل ایچ ہے۔ اس میں تم نیچے ایک شاپ میں کھڑی دکھائی دے رہی ہو اور وقت ہوا ہے دونج کر سترہ منٹ۔ مگر تم نے کہا تھا کہ تم اس دوران کمرے سے کہیں نہیں گئی۔“

”میں بتانا بھول گئی تھی، اور یہ فائزگنگ سے بہت پہلے کا وقت ہے۔“ اس نے بچھے چہرے کے ساتھ وضاحت دینے کی کوشش کی۔

”جسے بچے میں نے تم سے اس بارے میں کوئی بات اس لیے نہیں کی کیونکہ میں جانتی تھی، تم ڈھائی گھنٹے ایک کمرے میں نک کر نہیں بیٹھ سکتیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے یہ بتائیں کیوں نہیں بتائیں، تم قارس کو پر ٹیکٹ کرنا چاہتی تھی، مگر حمد، یہ گواہی کا معاملہ ہے، اور گواہی کے معاملے میں ہمیں اگر کسی کی ایک بات جھوٹ معلوم ہو تو اس کی باقی ساری باتیں بھی چیز نہیں رہتیں۔ میں تھک گئی ہوں، آرام

ارنے جا رہی ہوں۔ آپ لوگ بتیں کریں۔ ” وہ نرمی سے کہتی کاغذات واپس ڈبے میں ڈالتی اٹھ گئی۔ خین چہرہ جھکائے کہتی ہی دیر اسی طرح بیٹھی رہی، اور ابا، وہ بس افسوس سے اسے دیکھتے رہے۔ اگر ان کے خاندان کے سارے لوگ ایک دن کے لیے اپنی ذہانت پر بھروسہ رنا پھوڑ دیں تو کتنا اچھا ہو۔

میں چاہتی ہوں مراعکس مجھ کو لوٹا دے  
وہ آکینہ ہے اک بار میں نے دیکھا تھا

اس روز چھوٹے باغیچے والے گھر میں خین کی جیخ پکار گئی تھی۔ اپنے کمرے کی ساری الماریاں تلپٹ کیے وہ کاغذات ڈھونڈ رہی تھی۔ میڑک کی سندبے فارم، شناختی کارڈ۔ ہمیشہ داخل کی آخری تاریخ سر پر آئی کھڑی ہوتی اور اس کے کاغذات نہیں مل رہے ہوتے تھے۔

۲۹

اس تلاش میں کتنے عرصے کی کھوئی ہوئی درجوں چیزیں مل جاتیں، مگر اصل شے ندارد تھی۔  
”کتنی دفعہ کہا ہے اپنی چیزیں ترتیب سے جوڑ کر رکھا کرو۔ لوگوں کی بیٹھیوں کو دیکھا ہے کبھی، کیسے ہر چیز...“ امی کی ڈاٹ پھشکار اے سعدی ”یک گراڈ میوزک، کہا کرتا تھا“ پکن سے سنائی دے رہی تھی۔ تسبیحی سیم کرے میں داخل ہوا۔  
”خدا یہ تمہارے لئے کوئی سر آیا ہے۔ امر یکہ سے۔“

وہ جو الماری میں سردی یہ بیٹھی تھی، چونکی پھر سب چھوڑ چھاڑاں کی طرف آئی۔ سہم اتنا اچھا تو تھا نہیں کہ ڈبہ رکھ جاتا۔ اطلاع دینے ساتھ ساتھ کھول بھی رہا تھا۔ اس نے درستی سے وہ جھپٹا، اسے کمرے سے بھگایا، اور پھر خود کھولنے لگی۔  
اندر ایک چھوٹی ڈبی تھی۔ اس میں ایک کی چین تھا۔ علیہا کا کی چین۔ ساتھ میں تہہ شدہ خط۔ دھڑ کتے دل سے خین نے کاغذ کی ٹہیں کھولیں۔

”ڈیر خین۔“

میں سے معلوم ہوا کہ ڈھانی سال بعد تمہارا فون آیا ہے۔ سن کر خوش ہوئی۔ میں اس دور سے نکل چکی ہوں جب ای میل اور نیکست لیا کرتی تھی۔ جہاں اس جیل میں مجھے خط لکھنا زیادہ پرسکون لگا، اس لئے لکھ رہی ہوں۔ کم از کم اسے تم پڑھے بغیر منا تو نہیں سکو گی۔“  
خین وہیں زمین پر پھیلی چیزوں کے درمیان بیٹھ گئی، اور گویا سانس روکے پڑھتی تھی۔

”میں اپنا کی چین تھیں بھیج رہی ہوں۔ یہ میرے انقام کے عزم کی نشانی ہے۔ جب ہاشم نے تمہارے سامنے مجھے بے عزت کر کے کالا تو میں نے سوچا تھا، کہ تم بھی اپنی پھیپھو چیزی ہو۔ جیسے اس نے فارس کی بات نہیں سنی، دیسے ہی تم نے بھی میرے نہیں سنی۔“ گرتم دونوں اپنی جگہ ٹھیک ہو۔ کافی عرصہ میں نے سوچا، کہ ہاشم سے اس بات کا بدلہ لوں مگر پھر میں نے جان لیا کہ میں اتنی کمزور اور خوفزدہ سی لڑکی ہوں کہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سو میں نے بد لے کی تمنا کو ترک کر دیا۔ یہ کی چین بھی تھیں دے رہی ہوں۔ سب لوگوں میں سے صرف تھیں۔ لاکٹ بھی اسی لئے تھیں دیا تھا کہ ایک دن ہم محرم راز بن جائیں گے۔ اور تم میرے ساتھ کھڑی ہوگی۔ پھر مجھے میرا حق مل جائے گا۔  
گروہ دن اب کبھی نہیں آئے گا خین۔ مایوسی انسان کو بتا کر دیتی ہے، مجھے بھی کر دیا۔ میں نے ڈرگز میں فرار چاہی۔ جرام میں چاہی۔ اب لگتا ہے کہ زندگی ضائع کر دی۔ تھیں یہی بتانے کو خط لکھ رہی ہوں کیونکہ مجھ میں اور تم میں ذہانت کے علاوہ اور بھی کچھ مشترک ہے۔ ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی طبیعت۔ کہتے ہیں ہر انسان کے اندر دو بھیڑیے ہوتے ہیں۔ ایک اچھائی کا دوسرا براہی کا۔ غالب وہی رہتا ہے جس کو ہم مخلاتے پلاتتے ہیں۔ میں تھیں بتاؤ خین، میرے اندر کا منفی بھیڑ یا غالب ہاگیا، اور میں نے وہ کر دیا ہے دنیا جرم کہنے دھوکہ کہنے یا ڈرگز کہنے مگر خدا اسے ایک ہی لفظ سے پکارتا ہے۔ ”گناہ“، اور میں تھیں بتاؤں، تمہارا بھی بدی کا بھیڑ یا جلد یا بدیر غالب آئے گا، اس لئے منہ بکر

رہی ہوں۔ گناہت کرنا۔ کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ کسی کی اچھی نیچھے سے فائدہ مت اٹھانا۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ایسا ضرور کرے گی۔ کیونکہ تم بھی evil چینس ہو۔ شاید مجھے سے بھی زیادہ۔ تو بس اتنا جان لو حسین، کہ ہر گناہ صرف توبہ کر لینے سے معاف نہیں ہو جاتا۔ بڑے گناہوں کے بڑے کفارے ہوتے ہیں۔ سو کچھ بھی غلط مت کرنا۔ کیونکہ کفارے دیتے تھاری زندگی بیت جائے گی اور غم کم نہیں ہو گا۔ مجھے اس خط کا جواب مت دیا۔ میں اس قید میں کچھ عرصہ مزید رہنا چاہتی ہوں کسی بھی تعلق کی امید کے بغیر۔ مجھے میری غلطیوں کے لئے معاف کر دینا۔ میں بھی تمہیں تھاری اچھائیوں کے لئے معاف کرنی ہوں۔ دن کے آخر میں ہم تینوں ایک سے ہیں۔ میں، تم، زمر۔۔۔ کمزور چیزوں میں جو ہمیشہ اپنے سے کئی گناہ بڑے دشمن بناتی ہیں۔

## نقط

علیہما کاردار۔

خین کا چہرہ سفید تھا اور لب جامنی۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں۔ کپکاٹے ہاتھ کا غذ پہ جھے تھے۔ وہ بس شل بیٹھی بار بار ان الفاظ کو پڑھ رہی تھی۔ کسی نے گردن دبوچ کر اسے اپنی ہی ذہانت اور قابلیت کی تاریک سرگ سے نکال کر حقیقت کے روشن کرے میں لا کرنا کیا تھا، اور اس کرے میں ہر طرف آئینے تھے اور ان میں نظر آتے سیاہ سفید عکس اس کے وجود کو کرچی کرچی کر رہے تھے۔

باہر سے آتی ندرت، اسامہؓ تھی وہی سب کی آوازیں اس کے لئے لایتھی ہو چکی تھی۔ وہ نمک کا جسم سبی، اس کا غذ کو ہاتھ میں لئے فرش پہ بیٹھی تھی۔ میڑک، ایف ایس سی کے رزلٹ کا رد، بہترین طالبہ کے سریشکیٹ، فلاں اور فلاں ایوارڈ، سب اس کے آس پاس ہی بکھرا تھا، اور وہ ان سب جھوٹے کاغذوں کے ڈھیر میں ایک سچے پرچے کو پکڑے بیٹھی تھی۔

زندگی میں پہلی دفعہ خین ڈال فقار یوسف خان نے خود سے سوال کیا، وہی جو وارث ماموں کے قتل کی رات فارس نے ہوئی میں تب پوچھا تھا جب اس نے اس لوگ کا ذکر کیا تھا۔

”تم کون ہو حسین؟“

اور ارد گرد لگا آنکھوں کی دیواریں کہہ رہی تھیں۔

ایک کمزور کاشکار کرنے والی غارت گر۔۔۔ ایک بے بس انسان کی جان لینے والی خین!

❖❖❖

خود سے بھی کوئی ربط نہیں مرا ان دنوں ..... تجھ سے تعلقات کی تجدید کیا کروں پبلک پر اسکیوشن آفس کی کھڑکی سے سرما کی دھوپ چھن کر آتی، میزوں پر کھنکوں کو چکار رہی تھی مگر موسم سے بے نیاز مر سنجیدگی سے بصیرت صاحب سے وہ پوچھ رہی تھی جوان کو الجھارہتا تھا۔

”کیا آپ نے اس کیس میں کسی دوسرے مشتبہ شخص کو چیک کیا تھا؟“

”زمزی رکھی ہیں ساری فائلز۔“ انہوں نے جیسے ہاتھ اٹھا دیے۔ ”اوہ آپ جس دن کہیں، میں یہ کیس آپ کو دینے کو تیار ہوں، اوہ بات کرلوں گا میں۔“

”مجھے یہ کیس فائلز نہیں دیکھنی، نہ یہ کیس چاہیے۔“ وہ گویا کسی ناپسندیدہ شے سے دور رہتی۔ ”میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ کہا آپ نے اس کیس کی دیتی تفتیش کی تھی جیسے آپ کو کرنی چاہیے؟“

”کیا آپ کو فارس کے قاتل ہونے پر شہر ہے؟“ وہ حیران تھے۔

”نہیں، مگر میرے خیالات سے فرق نہیں پڑتا۔ میں اس کیس کی پر اسکیوٹر نہیں ہوں، آپ ہیں۔ میں وکٹم ہوں، دوسرا رخ نہیں۔“

”الہنا ہاتھی مگر آپ کو ہر خد دیکھنا چاہیے۔ میں یہ پوچھ رہی ہوں، کیا آپ نے کسی دوسرے کے (مشتبہ شخص) کو چیک کیا تھا؟“  
”ظاہر ہے میں نے کیا تھا۔ ہر اس شخص کو جس کا کیس سے ذرا سا بھی تعلق بتاتا تھا۔“ وہ پھر کوئی فائل اٹھانے لگا مگر زمر نے ہاتھ اٹھا اور دیا۔

”مجھے کوئی فائل نہیں دیکھنی، میں نے خود کو اس کیس سے تعلق کر لیا ہے۔ مجھے بس زبانی بتادیں، کیا آپ کو کوئی ایسی چیز ملی جو فارس اپ ہے گناہ ثابت کرتی ہو؟“ یہ کتنا تکلیف دھقا، گمراہے کہنا تھا۔

”نہیں۔ کوئی بھی چیز کسی بھی دوسرے شخص کی طرف اشارہ نہیں کرتی تھی۔“  
وہ چند لمحے لب سچنے ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”کیا آپ نے ہاشم کا ردار کو چیک کیا تھا؟“ چند لمحے سننا چھا گیا۔ اسی وقت زمر کا فون بجا۔ حین کی امی کا نمبر تھا۔ اس نے عجلت میں کال اٹھائی۔

”پھر چھو؟“ وہ حین تھی۔

”حین میں ذرا بڑی ہوں، تھوڑا ٹھہر کر کال کرتی ہوں۔“ اور بصیرت صاحب کو دیکھا۔ اس کی توقع کے برعکس وہ بولے۔  
”وہ ان پہلے لوگوں میں سے تھا جن کو میں نے چیک کیا تھا کیونکہ فارس کا اصرار تھا، پیوارث کے قتل کو کور کرنے کی سازش ہے۔ تو ہو سلتا ہے، کہ وارث غازی کے پاس ہاشم کا کوئی کیس ہو، جس کو چھپانے کے لئے ہاشم نے اسے قتل کر دیا ہو۔ مگر... انہوں نے فائل کھوئی اور اس میں رکھنے والی اسی صفحے کی طرف اشارہ کیا۔ زمر کی نگاہیں اس پر جھکیں۔

”یہ ان تمام کیسز کی فہرست ہے جو وارث غازی کے پاس تھے۔ ان میں ہاشم یا اس کے باپ کا کوئی کیس شامل نہیں ہے۔“  
زمر چند لمحے کو چھپ سی ہو گئی۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھی۔

”ہم سب جانتے ہیں بصیرت صاحب کے ہاشم کتنا کر پڑتے ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کے خلاف نیب میں ایک کیس بھی نہ ہو؟“  
”آپ غلط سمجھی ہیں۔ غازی کے پاس اس کا کیس نہیں تھا، دوسرے اٹھارے آفیسرز کے پاس اس کے میں یوں کیسز یہ تھیں ہیں۔“  
”اوہ۔“ اس کے تین اعصاب ڈھیلے پڑے۔

”تو میں نے وارث کے موجودہ کیسز سے متعلقہ افراد کو چیک کیا۔ کسی کے خلاف کچھ نہیں ملا۔ میں نے ان تمام آفیسرز سے بھی فرداً فردابات کی جو ہاشم کے کیسز دیکھ رہے تھے اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہاشم یا اس کے خاندان نے کبھی بالواسطہ ان لوگوں کو کوئی دھمکی نہیں دی۔ سب ہانتے ہیں، نیب کیسز کا کچھ نہیں بنتا۔ اور وہ ان کوڑا دھرم کا کریارشت دے کر ان کا منہ بند نہیں کرتا۔ بلکہ ان کو کورٹ میں لا کر بہت فخر سے اپنا دفاع کر کے ان کو خوار کیے رکھتا ہے۔ اگر تو ہاشم کا کوئی کیس وارث کے پاس ہوتا تو میں تب بھی فرض کر لیتا کہ ہو سکتا ہے وارث کو کوئی ایسی بات معلوم ہوئی ہو جو ہاشم کے لئے نقصان دہ ہو، مگر اس کا تو سرے سے کوئی کھاتہ ہی وارث کی طرف نہیں کھلتا۔“

زمر نے فائل بند کر کے پرے کر دی۔ اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

”زمر... فارس غازی نے دو قتل کیے ہیں، اس نے یہ بات خود آپ سے کہی تھی، اس کو نہیں معلوم تھا کہ آپ نئے جائیں گی، اور سب کو بتا دیں گی، اس لئے...“

”مگر وہ مجھے ہپتال دیکھنے آتا رہا تھا، میرے بیان سے پہلے۔ اس نے دوبارہ مجھے مارنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ پتہ نہیں کیوں وہ اس کی طرف سے صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اتنی سکیورٹی اور پولیس کی تعیناتی کے باعث، وہ ایسی کوشش کرنے کی بے وقوفی کیسے کر سکتا تھا؟“ وہ اٹا جیران ہوئے۔ ”کیا آپ

کو وہ بے گناہ لگنے لگا ہے۔؟

”یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ میرے نزدیک وہ گناہ گار ہے، اور میں چاہ کر بھی کوئی ایسی مجنبیں ڈھونڈ پا رہی جو اس کو ان جرائم سے بری کر دے۔“ وہ گہری سانس لے کر اٹھ کر ٹری ہوئی۔

خین ان کاغذوں کے ڈھیر کے بیچ ہنوز بیٹھی، موبائل پندرہ ملا رہی تھی۔ پہلی دفعہ پچھا ہٹ سے پھر بے چینی سے، اور پھر بے قراری سے، اور اب دیواں سے، بار بار زمر کو نمبر طاری ہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہرہ ہے تھے۔ اسے لگا وہ چند سال پیچے چل گئی ہے، جب چھت پر اندر ہیرے میں بیٹھے، زمر نے زم لجھے میں سیم اور اسے جنات کا قصہ سنایا تھا۔ تب اسے لگا تھا، جنات سے زیادہ طاقتور انسان ہوتا ہے، اور اس کے لئے وہ انسان زمر تھی، جو اس کا نہ رستہ حل کر سکتی تھی۔ اب بھی اسے یہی لگ رہا تھا۔ درمیان کے ماہ و سال اور ان کی تینی کہیں کھوئی تھیں۔ صرف زمر تھی جس کو وہ اپنا مسئلہ بتا سکتی تھی۔ اور زمر نے ساتویں کال اٹھا کر بس اتنا کہا۔

”خین میں بڑی ہوں، تمہیں ذرا دیر تک کال کرتی ہوں۔“ اور وہ خاموش آنسوؤں کے ساتھ فون ہاتھ میں لے بیٹھی رہ گئی۔ کافی دری بعد وہ بجا۔ اس نے دیکھا، زمر کا نمبر آ رہا تھا۔ آنکھیں کی پشت سے آنکھیں رکھیں اور کال اٹھائی۔

”ہاں حصہ سوری میں اس وقت.....“ وہ زمی سے کہنے لگی تھی مگر اس نے درشتی سے بات کاٹی۔

”سوری مجھے کہنا چاہیے، غلطی سے کال کر لی تھی۔ کسی اور کو ملا رہی تھی۔ بائے۔“ اور فون رکھ دیا۔ آنسو پھر سے بہنے لگے۔ اتنے سال بعد اس نے پہلی دفعہ زمر کو پکارا تھا، مگر وہ مصروف تھی۔ کیا اس کی مصروفیت خین کی بھیگی رندھی آواز سے زیادہ اہم تھی؟ اس کا دل ٹوٹ سا گیا۔

زمر کی پھر سے کال آنے لگی مگر خین نے موبائل آف کر دیا۔

علیشا ٹھیک کہتی تھی، وہ جلد یاب رکوئی ایسا گناہ ضرور کرے گی جس کا کفارہ اسے پوری زندگی دینا پڑے گا۔ بس علیشا کو یہ معلوم نہیں تھا، کہ خین وہ گناہ چند ماہ پہلے ہی کر چکی تھی۔

.....♦♦♦.....

ہجر کی رات کائنے والے ..... کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

خین کی ادھوری، ان کی کال اس کے ذہن میں انکسی گئی تھی۔ اس صبح بھی وہ ساعت ختم ہوتے ہی کورٹ روم سے نکلنے کی بجائے کرسی پر بیٹھ گئی اور با کو کال ملانے لگی۔ آج دھوپ نہیں نکلی تھی اور سر دکرہ عدالت میں صبح بھی تیباں جلی تھیں۔ جشن صاحب اپنے چیبرز میں واپس جا رہے تھے، الہکار احمد شفیع نامی لڑکے کو واپس لے جانے کی تیاری کر رہے تھے، ہاشم پھر نہیں آیا تھا اور سب کا وقت ہی ضائع ہوا تھا۔ وہ اطراف میں نظریں دوڑاتی، بابا کو جاتی گھنٹیں رہی تھیں۔

”آپ نے پوچھا جس سے؟“ ان کا سلام سنتے ہی وہ سر جھکائے مدھم سا پوچھنے لگی۔

”میں نے کال کی تھی، وہ جلدی میں تھی، کہہ رہی تھی غلطی سے تمہیں کردہ عدالت میں ہو کوئی بات نہیں ہے۔“

”اوہ ہوں۔ کوئی بات تھی۔ وہ ٹھیک نہیں تھی۔ آپ دوبارہ پوچھنے کی کوشش کریں۔“

”تم خود اس کے گھر جلی جاؤ۔“ اور بابا کی تان بیسیں آکر ٹوٹا کرتی تھی۔ زمر نے ”رہنے دیں ابا“ کہہ کر کال کائی تو احساس ہوا، پسید شلوار قمیض میں کوئی اس کو سامنے آ کھڑا ہوا ہے چونکہ کسر اٹھایا تو وہ احر تھا، الہکار بھی ساتھ تھے۔ زمر نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرہ خالی ہوا تھا۔

”میم!“ وہ ملتی، بے چین سا انگریزی میں کہنے لگا۔ ”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”اپنے نکل کے بغیر آپ کو مجھ سے بات نہیں کرنی چاہیے۔“ زمی سے کہتی وہ اٹھی۔ پر س کندھے پلٹکایا۔

”پر اسکی یوڑ بصریت کہاں ہیں؟ مجھے ان کا پوچھنا ہے۔“ کہہ کر اس نے پھر الہکاروں سے درخواست کی کہ چند لمحے مزید اس کو بات

رنے دیں۔

”وہ ایک ہفتے کی چھٹی پہنچے ہیں۔“ وہ موبائل پر س میں ڈالتی جانے کو مزدی۔

”مجھے غازی کے بارے میں بتانا ہے۔ فارس غازی، وہ کچھ غلط کرنے جا رہا ہے۔“

زمر کے قدم مجنون ہوئے۔ آہتہ سے اس نے گردن موڑی۔ آنکھیں سکوڑ کراچنے سے اسے دیکھا۔

”کیا؟“

”پہلے آپ وعدہ کریں کہ بھی ظاہر نہیں کریں گی کہ یہ آپ کو مجھ سے معلوم ہوا ہے ورنہ فارس مجھے جان سے مار دے گا۔“ پریشانی نے کہتا، وہ آگے کوہوا۔

”میں سن رہی ہوں۔“ وہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔

”اس نے کچھ پلان کیا ہے۔ اسے عدالت سے امید نہیں رہی تو وہ۔ جیل میں کچھ لوگوں سے انتقام لینے جا رہا ہے۔ وہ کچھ

ماںیوں کے ساتھ جیل میں riots کرنے جا رہا ہے۔ اور اس فساد میں کچھ لوگ جان سے بھی جائیں گے۔“

”کیا فارس نے خود کہایہ؟“

”جی۔ یہ وہ تمام تفصیل ہے جو مجھے معلوم ہو سکی ہے۔ وہ مجھے بھی اس میں شامل کرنا چاہتا ہے مگر میں نے ابھی اسے حتیٰ جواب نہیں

یا۔“ ساتھ ہی ایک مرزا اکنڈا اس کی جانب بڑھا یا۔ زمر نے کاغذ پکڑ کر کھوچتی نظر وہ نظر وہ سے اسے دیکھا۔

”اور آپ مجھے یہ کیوں بتا رہے ہیں؟“

”مجھے پولیس پر اعتبار نہیں ہے، کسی وکیل کو بتانا زیادہ بہتر لگا مجھے۔ آپ اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ دی سکتی ہیں۔ اب مجھے جانا ہا یہی۔“ جیسے کوئی اضطراب ختم ہوا۔ وہ پرسکون سا سانس لیتا ہلکاروں کے ہمراہ مر گیا۔ زمر کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑی، سوچتی نظر وہ سے اس طرف دیکھتی رہی جہاں سے وہ گیا تھا۔

جب وہ اپنی حوالاتی کو ٹھہری تک واپس لایا گیا تو سہ پہر اتر چکی تھی۔ سپاہی نے سلاخوں کا دروازہ کھولا، وہ اندر آیا، تو دروازہ مغل کر لایا۔ احر قدم قدم چلتا دیوار تک آیا، اور پھر فرش پر اکٹوں بیٹھ گیا۔

فارس چند قدم دور اسی طرح بیٹھا تھا۔ احر قریب آیا تو اس نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

”کہاں تھے؟“ گردن موڑ کر اسے دیکھا جو قریب بیٹھا اپنے گھنٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

”کچھری۔“

”معلوم ہے۔ مگر۔ کچھ اور بھی ہوا ہے کیا؟“ وہ غور سے احر کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”وہی جو ہونا چاہیے تھا۔“

”بک بھی چکو۔“ وہ اکتا گیا۔

احر نے ہولے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”میں نے انہیں بتا دیا کہ آپ جیل میں riots شروع کرنے لگے ہیں۔“

چند لمحے کو ٹھہری میں سنا تا چھا گیا۔ فضا بوجھل ہو گئی۔

”اوڑ؟ اس نے یقین کر لیا؟“ فارس کے پوچھنے پر احر مکرایا۔

”ایک ایک حرفاً!“ اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ دونوں ہلکے سے ہنس دیے۔ یہ وہ ان چند دفعہ میں سے تھا جب احر نے اسے

مشتبہ دیکھا تھا۔

”اگڑا!“ پھر سے سخیدہ ہوتے ہوئے فارس نے جیب سے مژاڑا کاغذ کالا اور سامنے پھیلایا۔ پھر باہر دیکھا۔ الہکار دور تھے۔ وہ مدھم آواز میں کہنے لگا۔

”جعرات کی رات فیصلے کی رات ہوگی۔ اگر اس نے یقین کر لیا کہ ہم Riots شروع کرنے لگے ہیں تو وہ لوگ جیل کے شانی ہے پاہر...“ نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”اپنی نفری تین گناہوں کا داد میں گے۔ ایسے میں جنوب مشرقی دیوار پر نفری کم ہو جائے گی۔ ہم فساد نہیں کریں گے، ہم اس طرف صرف آگ لگائیں گے۔ یہ ہمارا diversion ہو گا اور یوں ہم جنوب مشرقی حصے سے نکل جائیں گے۔“

”جانتا ہوں۔ ہم کوئی تین سو دفعہ اپنا منصوبہ دھرا پچھے ہیں۔ اب تو میں خود کو آدھا جیل سے باہر تصور کرنے لگا ہوں۔“ وہ رکا۔ فارس جو کاغذ لپیٹ رہا تھا، قدرے چونکا۔

”ایک منٹ۔ تھہارے چہرے پر کچھ اور بھی لکھا ہے۔“ اس نے نgor سے احر کو دیکھا۔ ”کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

”وہ..... دراصل....“ وہ انکا۔ پھر انھ کر چند قدم مزید دور جا بیٹھا (کہ اگلی بات سن کر فارس غازی اس کا گریبان نہ جھپٹ لے) اور کان کھجاتے ہوئے سادگی سے بولا۔ ”پرانی ٹری بسیرت چھٹی پر ہیں۔“ فارس کوشک لگا۔

”تو تم یہ ساری بکواس کس سے کر کے آئے ہو؟ میں نے کہا تھا پولیس کو نہیں انوالو کرنا۔“

”وہ..... چڑیل.... کوتایا ہے۔“

اور اس کے گویا چودہ طبق روش ہو گئے۔ ”کیا بک رہے ہو؟ میں نے منع کیا تھا کہ.....“ وہ غصے سے چلانا چاہتا تھا مگر پھر بیدار قریب آرہے تھے سوطیں بھری آواز دراصل بائی۔ ”اس سے کیوں کہا؟“

”اگر آپ اپنا غصہ ایک طرف رکھ کر میری بات سنیں تو زیادہ اچھا ہو گا۔ پوری کچھری میں سب سے زیادہ آپ کو سزا کوں دلوانا چاہتا ہے؟ ظاہر ہے چڑیل۔ بصیرت صاحب شاید میری بات پر کافی نہ دھرتے، مگر وہ دھرے گی اسے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا آپ کو سزا دلوانے کا۔ اور پھر بصیرت صاحب تھے ہی نہیں، ہفت بعد آئیں گے اور میں ہفت بعد ان سے کیسے ملوں گا؟ اگر درخواست کروں ملنے کی تو ان کو شک نہیں ہو گا کیا کہ اتنے علی الاعلان کیوں کر رہا ہوں؟ میرے پاس صرف آج کا دن تھا، اور میں نے وہی کیا جو بہتر لگا۔“

”اس کا استعمال کر کے جیل نہیں توڑنا مجھے۔“ وہ ناگواری سے غریا۔ ”اس طرح تو وہ ساری عمر سمجھے گی کہ میں مجرم تھا۔“

”جب آپ جیل توڑیں گے تو سب ہیں سمجھیں گے۔ پھر مسئلہ کیا ہے؟“

اور فارس چپ ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھاما۔ آنکھیں بند کر کے کنٹی مسلی۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں اس کا استعمال نہیں کرنا چاہتا۔“

”کیوں؟“ دور بیٹھے احر نے پتلیاں سکیڑ کر اس کا چہرہ تکا۔ ”آپ دونوں کے درمیان کچھ رہا ہے کیا؟“

اس نے چوک کر رہا تھا۔ آنکھوں میں ناگواری آئی۔ ”بالکل بھی نہیں۔“

”اچھا سو روئی مجھے یونہی لگا۔“

”کیا لگا؟“ اس کا سائنس رک گیا تھا۔

”نہیں دراصل.... اتنا کچھ ہو جانے، اتنے سال گزر جانے، آپ سے اتنی نفرت ہونے اور آپ کے خلاف ہر جگہ بیان دینے کے باوجود بھی جب آپ اس کا ذکر سننے ہیں تو، کچھ آتا ہے آپ کے چہرے پر۔ اور پھر چڑیل بھی، سوری.... زمر بھی ابھی تک آپ کو ”فارس“ کہ کر بلاتی ہے۔ اس نے ہر چیز کے بعد بھی First Name Terms ختم نہیں کیں۔“

”ایسے کسی عورت کا نام نہیں لیتے، ہر وقت فضول بک بک نہ کیا کرو۔ دماغ گھوما ہو اے میرا اس وقت۔“

اس نے درختی سے ڈپٹ کر رخ پھیر لیا۔ احمد کو اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، سو شانے اپکا کمرہ گیا۔

”اچھا سوری۔ غلطی سے کہہ دیا۔ خیر۔“ پھر آرام سے لیٹ گیا، بازوؤں کا تکنیہ سرتلے رکھا۔ ”آپ باہر جا کر کیا کریں گے؟ میں تو ام لمہ بھاگ جاؤں گا۔ یہاں تو نوکری کرنیں سکتا اور.....“ وہ بولے جارہا تھا اور فارس چہرہ موڑے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

❖❖❖

آپ لوگوں کے کہے پر اکھڑ جاتے ہیں ..... لوگ تو جھوٹ بھی سو طرح کے گھڑ جاتے ہیں

عین اس وقت جب وہ دونوں اس کو گھڑی میں یوں بیٹھے تھے چند میل دور کارداری کی کمپنی کے ناپ فلور کی راہداری میں زمرا ایک بیچ ہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں کافی کے دو ڈسپوزیبل گلاس تھے۔ ایک سے وہ کچھ سوچتے ہوئے وقوف قفق سے گھونٹ بھر دی تھی۔ دوسرا سے ہاٹل بند تھا۔ نگاہیں راہداری میں گزرتے لوگوں پر جی تھیں۔ دفعتا وہ کھڑی ہوئی، کیونکہ دوسرے جانب سے ہاشم چلتا آ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس، دوسرے میں کپڑے موبائل پہن دبا تا۔ زمر کے قریب وہ رکا، پہلے اس کے پر دیکھئے پھر نظریں اٹھائیں۔ وہ بند ڈھکن کا گاں اس کی طرف بڑھائے ہوئے کھڑی تھی۔ ہاشم کھل کر مسکرا یا۔

”بغیر چینی کے؟“ گلاس پکڑتے ابر واٹھائی۔ زمر نے سر کو خم دیا۔

”بغیر چینی کے!“ اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

”ویسے آپ تو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے؟“

”آپ مجھ سے ساعت پہ غیر حاضری کی باز پرس کرنے نہیں آئیں، جانتا ہوں۔ وہ کام بتایے جو آپ کو ادھر کھینچ لایا؟“ وہ گھونٹ ہتے ہوئے مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ کے آفس کی سمت جا رہے تھے۔

”کچھ دیر کے لئے میرے ساتھ احمد شفیع کا دیکھ بندی بنے بغیر بات کر سکتے ہیں آپ؟“

”میں سن رہا ہوں۔“

”احمر کتنا قابل بھروسہ انسان ہے؟“

”کافی حد تک۔“ ہاشم نے شانے اچکائے۔ ”میرے والد کے ساتھ اس نے کافی عرصہ کام کیا، گو کہ میں اسے پسند نہیں کرتا، مگر اہ ایک قابل اعتبار انسان ہے۔ کیوں؟“ اب غور سے ساتھ چلتی زمر کو دیکھا۔ ”کیا اس کی کسی بات پر بھروسہ کرنے میں آپ کو وقت پیش آ رہی ہے؟“

”ہوں۔“ وہ ذرا سما مسکرا کی۔ ”تو وہ ایسا شخص ہے جس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟“

”ہاں وہ اچھا لڑکا ہے، مگر ہوا کیا ہے؟“ دونوں اب آفس کے دروازے کے سامنے گھڑے تھے۔

”آپ کافی ختم کیجیے۔“ وہ مسکرا کر مرگی تو ہاشم نے یچھے سے پکارا۔

”میں اس مشورے کے بد لے میں ضرور کوئی فیور مانگوں گا۔“

”آپ کب بد لئے مانگتے؟“ وہ رکے بنا آگے چلتی گئی۔

”وہ ٹیپ آپ کو کہاں سے ملی؟“ ہاشم نے عقب میں پکارا۔ زمر بیچ راہداری میں رکی۔ ایڑھیوں پر گھوٹی۔ اچھبی سے اسے دیکھا۔

”کونی ٹیپ؟“

”آپ کی اور فارس کی کال جو عدالت میں پیش کی گئی۔ سعدی نے بتایا کہ وہ آپ نے نکلو اکر دی تھی۔“ گھونٹ بھرتے ہوئے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”یہ سعدی نے کہا؟“ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ ہاشم قدرے چونکا۔ ابرو سکیڑے۔

”کیا آپ نے نہیں نکلا کر دی؟ کیا اس نے جھوٹ بولا؟“

”وہ جھوٹ کیوں بولے گا؟ ظاہر ہے میں نے ہی نکلا کر دی ہے اور کہاں سے نکلاؤ ہے، یہ نہیں بتاؤں گی۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ اس نے آپ کو کیوں بتایا؟ میں نے منع کیا تھا۔“ وہ زمر تھی، فوراً سنبھل گئی اور ناپسندیدگی سے بات مکمل کر کے پلٹ بھی گئی۔ ہاشم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ اگر زمر کے ہاتھ آڈیو گلی ہے اور اس کے باوجود وہ فارس کو گناہ کار سمجھتی ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں، وہ بھی خواجہ خاور کی بات پر ابھی تک انکا تھا۔ اونہوں۔ سرجھک کر کافی کا گلاس پکڑے، وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

❖❖❖

فصل جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے ہیں ..... حدود وقت سے آگے نکل گیا کوئی

وہ رات قصر کاردار پر یوں اتری کہ اپنے اندر ڈھیر وہ خوفناک بھید چھپائے ہوئے تھی۔ دور جنگ سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں پرندوں کی سیکی ہوئی چکاراً اور پھر ہر سو طاری ہو جانے والا موت کا نشان۔ سب اس رات میں گم سا ہو گیا تھا۔

لوگ روم میں ٹوی وی چل رہا تھا اور ہاشم صوفے پیغم دراز، پیر میز پر رکھئی وی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ سو نیا اس کے کندھے پر سر رکھتے تھے جیلی، کسی کتاب کے صفحے الٹ رہی تھی۔ شہرین جا چکی تھی اور چند دن تک سونی ادھر ہی تھی۔ اور اب وہ دونوں باپ بیٹی وہاں اکٹھے بیٹھے تھے، اس بات سے بکسر بے خبر کہ ان کے دامیں سمٹ اور نگزیب اور جواہرات کے کمرے کے بندروں ازے کے پیچھے کیا ہو رہا تھا۔

کمرے کے اندر مدد حم زرد بیان جلی تھیں۔ جواہرات ناٹ گاؤں میں ملبوس، بیٹہ کے ساتھ کھڑی، حیران پریشان سی ایک فالک کے صفحے پلٹا رہی تھی۔ با تھر روم کا دروازہ کھلا تھا، اندر تیز سفید روشنی میں اور نگزیب کھڑے، شیو بنار ہے تھے۔ (ان کورات کو شیو بنانے کی عادت تھی)۔ بلیڈ گال پر پھیرتے ذرا وقف دیا اور گردن موڑ کر جواہرات کو دیکھا جو ہنوز شاک کے عالم میں فالک دیکھ رہی تھی۔

”اب اپنا میلوڈ رامہ شروع کر دینا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں، اور اسے نہیں بدلوں گا۔“

”اورنگزیب!“ اس نے سفید پڑتا چہرہ اٹھایا اور بے یقین سے با تھر روم میں کھڑے اپنے شوہر کو دیکھا۔ ”تم ایسا کیسے کر سکتے ہو وہ تمہارا بیٹا ہے۔“

”جس نے مجھے بے توف بنا کر پسیے تھیا نے کی کوشش کی، کم از کم وہ میرا بیٹا کھلانے کے لائق نہیں۔“ تغیر سے کہتے ری رجمح اگ لگے گال پر پھیرا۔

جو اہرات کے سفید چہرے میں سرخ ابھری اور پھر شیرنی کی آنکھیں بھی لال انگارہ ہونے لگیں۔ فالک چینکی اور دندناتی ہوئی با تھ روم کے دروازے تک آئی۔

”تم نے اس کے کاٹنیں فریز کر دیے، میں چپ رہی۔ اس سے بات نہیں کر رہے، میں چپ رہی۔ مگر تم اس کی کمپنی اس سے واپس لے رہے ہو، تم اس کو قلاش کر رہے ہو، میں اس پر چپ نہیں ہوں گی۔“ وہ غصے سے پھنکاری تھی۔

”اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر لو۔“ آئینے میں خود کو دیکھتے اور نگزیب نے تھوڑی پریز رپھیرا۔ ”میں اس کو یہاں سے بھیج رہا ہوں۔ مجھے وہ اپنے اردو گرد برداشت نہیں ہے۔“

”وہ تمہارا بیٹا ہے۔“ وہ چلا کی۔ ساٹھ پروف دیواروں نے تمام آوازیں دباییں۔ باہر لا ونچ میں بیٹھے ہاشم اور سو نیا بے خبری وی دیکھتے رہے۔ با تھر روم کے عین اوپر ہاشم کی بالکوئی میں کھڑی، پودوں کو پانی دیتی میری اینجو بھی بے خبر، لگنگاتی ہوئی پانی دیتی رہی۔

”اس لئے اسے اب ایک عرصہ میرے بغیر رہنا ہو گا۔ خود کمائے گا، خود کھائے گا۔“

”یہ راہے یا انتقام ہے۔“

”تم چاہو تو اپنے بیٹے کے ساتھ جا سکتی ہو۔“ اس بات پر جواہرات نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

”تم ہو کون مجھے یہاں سے نکالنے والے؟“ وہ سرخ آنکھوں سے غرائی تھی۔

”میں اس گھر کا مالک ہوں۔“

”تم ایک احسان فراموش بے جس اور گھٹیا انسان ہو۔“ وہ حلق کے مل چلا تھی تھی۔ سانس بے ترتیب ہو رہ تھا، اور آنکھیں لا ال۔

اور نگزیب کے کان سرخ ہوئے غصے سے اسے دیکھا۔ وہی غصہ جو دریٹ میں نو شیر والا اور فارس نے لیا تھا۔

”اپنے کام سے کام رکھو۔ اور اپنے بیٹے سے کہو کہ کاغذات پر دستخط کر دئے ورنہ مجھے دوسرا طریقے بھی آتے ہیں۔“

”تم ایسا نہیں کرو گے۔“ وہ چوکھت پر ہاتھ تھی سے جمائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرائی۔ ”ہاشم ایسا نہیں ہونے

اے گا۔“

”میں مالک ہوں، ہاشم نہیں۔ تمہارے بیٹے کیا، میں تمہیں بھی ہرشے سے بے غسل کر سکتا ہوں۔“

”تمہاری سوچ ہے؟“ نفرت سے انہیں دیکھا۔

”نوشیر والا اب ادھر نہیں رہے گا۔ میری طرف سے وہ آزاد ہے۔ جیسے میں نے محنت کر کے کیا، وہ بھی کمالے۔“

”محنت؟ ہونہہ، میرے باپ کے گلزوں پر پلنے والے ہو تم! یہ سب میرے باپ کا تھا، تم اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔“ وہ شدید

فقارت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اور نگزیب غصہ ضبط کیے اسے دیکھتے رہے، پھر سر کو اشتابات میں ہلا کیا۔

”میں مزید کیا کر سکتا ہوں، بتاؤ تمہیں؟ میں علیہا کو اس گھر میں لا سکتا ہوں۔ بلکہ اچھا کیا، تم نے فیصلے میں میری مدد کر دی۔ ہاشم

تو یہ بھی اس کی فیس دینے کا سوچ پڑھے ہوئے ہے وہ اس فیصلے سے بہت خوش ہو گا۔ اس کو مزید اشتغال دلا کر وہ دوبارہ آئینے میں دیکھتے، شیو کرنے لگے اور چوکھت میں کھڑی نائٹ گاؤں میں ملبوس جواہرات کا پورا جسم جل کر بھسوم ہو گیا۔

لب بچنے، گھرے گھرے سانس لیتی، سرخ دیکھی آنکھیں اور نگزیب پر جماۓ کھڑی اس زخمی شیرنی کے اندر ایک جوار بھانا سا پلنے لگا۔ بر سوں کا دبالا دا بلٹنے لگا۔ اتنا زیادہ کہ اس کے تیز ہوتے تنفس کی آواز اور نگزیب کو بھی آنے لگی۔ نظریں موڑ کر اسے اسی حقارت سے دیکھا۔

”اپنی بد صورت شکل لے کر تم بھی یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتیں؟“

”کون کہاں جائے گا، یہ فصلہ اب میں کروں گی!“ نفرت سے کہتی وہ بیچھے ہی۔ ”میں ساری عمر تمہاری ہر بری بات برداشت کرتی رہی، لیکن تم مجھے اور میرے بیٹے کو یہاں سے بے دخل کرنا چاہتے ہو، اب تم دیکھو کہ میں کیا کرتی ہوں۔“۔ بیچھے ہتھی گئی یہاں تک کہ ڈرینگ نیبل تک آر کی۔ وہاں سامنے اس کا ہمیز Straightening اڑ کر رکھا تھا۔ وہ کوئی عقل دخود سے بے گاہ لمحہ تھا جب اس نے راڑا اٹھائی اور کر کے پیچھے کر لی۔ پھر قدم قدم چلتی با تھر دوم کی چوکھت تک آئی۔

اور نگزیب کے آدھے چہرے پر ابھی فوم تھا۔ گال پر کوئی کٹ لگا تھا جس کو صاف کرنے کے لیے وہ ٹشو لینے نیچے بھکے، تھی ان کی بھلی گردن کے پیچھے آئینے میں جواہرات کا چہرہ ابھرا۔ نفرت اور غصب سے بھری آنکھوں سے پر چہرہ۔ اور نگزیب ٹشوٹھا کر سیدھے ہوئے تو مٹھکے۔ مگر.....

جواہرات نے پوری قوت سے آر کن راڑ ان کے سرکی پشت پر ماری۔ وہ لڑکھڑائے اور دا میں جانب جا گئے۔ ٹائلز کے فرش پر پہلو کے مل۔ کہنی کے مل۔ ایک کٹ کنٹی پر لگا، اور پھر سیدھے ہوئے۔ جہاں جواہرات نے مارا تھا، وہ جگہ فرش سے آگئی۔ خون نکل نکل

کر جئے گا۔

جو اہرات ہاتھ میں آڑن را ڈپکڑے، انہی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، اور وہ اس کے قدموں کے پاس بے یقین سے گرے پڑے تھے۔

”جا..... جوا.....“ الفاظ ایک ایک کر نکلے۔ درد سے بولنے کی کوشش کی، اپنا ہاتھ اٹھا کر بڑھانا چاہا، کہ وہ ان کو تھام کر اٹھائے، مگر وہ چوکھت پر کھڑی رہی۔ لب بھیپے شعلہ بار نظروں سے انہیں دیکھتی۔

غرتی میں اور امیری میں،

بیماری میں اور صحت میں، ہم ساتھر ہیں گے۔

حتیٰ کہ موت ہم کو جدا کر دے۔

اور وہ ان کے ساتھ ہی کھڑی تھی مگر موت ابھی جدا کرنے نہیں آ رہی تھی۔ گہرے گہرے سانس لیتے اور نگزیب کا خون لکھا رک گیا تھا۔ چوٹ شدید تھی، مگر جان لیوانہیں، انہوں نے ہیلی کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ جواہرات چوکی، پھر فوراً پیچھے ہوئی۔ واپس کمرے میں آئی۔ صوفے پر کھا کشن اٹھایا۔ واپس اور نگزیب تک آئی۔ وہ اٹھنے کی ناکام کوشش اور تکلیف کے احساس سے ہانپئے لگے تھے۔ ان کے سر کے قریب دھنلوں کے بل بیٹھی اور کشن ہاتھ میں ڈپکڑے ان کے اوپر جھکی۔

”مجھے تمہارے ساتھ یہ بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔“ کشن اور نگزیب کے منہ پر جما کر دبایا، یوں کہ آنکھیں کشن سے باہر تھیں اور ان آنکھوں میں بے پناہ بے یقینی اٹھ آئی۔ وہ بے اختیار اپنے بے جان ہاتھوں سے اس کی انگلیاں ہٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ چھین، آوازیں، سب کشن کے اندر دب گیا۔ وہ چہرہ ان کے کان کے قریب کی کہڑی تھی۔

”کیا تم جانتے ہو میں نے اور ہاشم نے تمہارے لئے کیا کچھ کیا؟“

ہو لے سے کہتے اس نے کشن مزید ور سے دبایا۔ مزاحمت کرتے اور نگزیب اس کے ہاتھ کو ڈپکڑے پاؤں ادھراً دھرمارہ ہے تھے۔

”ہم نے وہ کیا تھا جس کا الراہ فارس کو لینا پڑا۔ ہاشم نے مردیا تھا ان دلوگوں کو۔ کیا تم نے سنا؟ تمہارا بھاجن جابے گناہ تھا۔ کیا تم نے سنا؟ ہاشم نے کیا تھا یہ سب۔ اور میں بھی اس میں شامل تھی۔ کیا تم نے سنا؟“

اور نگزیب کے پاؤں ساکت ہو گئے تھے۔ جواہرات کے ہاتھوں کو ہٹاتے ہاتھ بھی خمہر گئے تھے۔ جواہرات نے چہرہ اٹھا کر دیکھا، ان کی بے یقینی اور دکھ سے پھیلی آنکھیں ساکت تھیں۔ سانس نکل چکا تھا، مگر کیا آخری بات انہوں نے سئی تھی؟ کیا پہلے سانس نکلا تھا یا پہلے دل نے صدمے سے کام کرنا چھوڑا تھا؟

اس نے کشن ہٹایا۔ چونکہ ان کے سر سے نکتا خون فرش پر دوسرا طرف کو جارہا تھا، سو جواہرات کے کپڑوں پر خون کا کوئی نشان نہیں لگا تھا۔ وہ آہستہ سے کھڑی ہوئی۔ اور نگزیب کی کھلی آنکھیں، کھلے لب، اور بے حس و حرکت وجود اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں اسڑی شتر را ڈاً اور دوسرے میں کشن لئے کھڑی جواہرات کے سندل چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ ایک دم چونک کراس نے ادھراً دھردیکھا۔

وہ با تھروم میں کھڑی تھی، اس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا، اور اس کا بینا چند قدم دور دیوار کے پار موجود تھا۔

”اوہ خدا یا۔“ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ ہر اس ان نظروں سے اور نگزیب کی لاش کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا تھا۔ اوہ خدا..... اب وہ کیا کرے؟

جواہرات سینے پہ ہاتھ رکھ کے اپنی بے ترتیب دھر کنیں سنتی کتنی دیر دیوار سے لگی کھڑی، تیز سانسیں لیتی رہی۔ بمشکل اعصاب بہتر ہوئے تو وہ با تھروم سے نکلی۔ کمرے کے دروازے تک آئی۔ اسے ذرا سا کھولا۔ درز سے باہر صوفے پہ بیٹھے ہاشم اور سونیا نظر آئے۔ اس نے

جلدی سے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ وہ اس کا ہر مسئلہ سنبھال لیا کرتا تھا، مگر آج وہ ہاشم کو نہیں بلا کتی تھی۔ اسے جو کرنا تھا خود کرنا تھا۔ کشن اور آن راؤ اور نگزیب کی لاش کے ساتھ ہی گرے تھے۔ وہ تیزی سے اندر آئی، خون کے تالاب سے بیرون بچاتی وہ دونوں نہیں اٹھائیں، ڈرینگ روم کی واڈر روب کھولی، اوپری خانے میں پیچھے کر کے ان کو گھسایا، الماری بند کر کے لاک کی اور پھر مری تو بید کنارے گری فائل نظر آئی۔ وہ جو فساد کی جڑ تھی۔ پھر تی سے اس کو بھی دراز میں گھسایا۔ پھر آگے آئی۔ ڈرینگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ ریشی گاؤں کندھوں سے ڈھلک رہا تھا، چہرہ سفید تھا، بالکل مردہ اور آنکھیں... نہیں.... اس کی آنکھیں ناقابل بیان تھیں۔ ان کی اینیت لکھنی نہیں جاسکتی۔

وہ با تھر روم میں داخل ہوئی۔ سنک کے اوپر کھڑے نیل کھولا۔ چہرے پہ پانی ڈالا۔ پھر اسے تو یہ سے چھپھایا۔ قدر سے سکون آیا۔ نک کے مرمریں پتھر پہ تھر کئے، اس نے نیچے دیکھا۔ اور نگزیب کی کھلی آنکھوں والی لاش ہنوز پڑی تھی۔ اب اسے کیا کرنا تھا؟ یہ..... یہ اس نے نہیں کیا تھا۔ یہ صرف ایک حادثہ کیسے بنانا تھا۔ اور اسے حادثہ کیسے بنانا تھا۔ جواہرات کا داماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے پہلے با تھر روم کے دوسرے دروازے کو دیکھا جو پچھلے برآمدے میں کھلتا تھا۔ اور پھر واپس کرے میں آئی۔ کرے کا بھی ایک دروازہ پچھلے برآمدے میں کھلتا تھا۔ جواہرات نے اس دروازے کی چھٹی گردی اور پھر سے با تھر روم میں آئی۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔

”یہ اس طرح اور نگزیب نے لاک کیا ہوگا، پھر وہ شیو بنانے لگے ہوں گے۔“ اس نے بڑہ راستے ہوئے شیو کے سامان کو سنک کے سلیپ پہ پھیلایا۔ ریزرا اور نگزیب کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا، اس نے وہ اٹھا کر ان کے ٹھنڈے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ ان کا چہرہ دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی۔

”اور شیو کے دوران انہوں نے نہیں دیکھا کہ یہ ٹوٹی ایک ہو رہی ہے۔“ کہتے ہوئے سنک کے نیچے جھکی وہ نیچے سے کھلا تھا، اس نے پانپ میں ریزرا سے ہلاکا سا کٹ لگایا۔ پانی دھار کی صورت میکنے لگا۔ وہ اس طرف جا رہا تھا جہاں اور نگزیب کا وجود گرا پڑا تھا۔“ اور پھر اس پانی سے وہ پھسل گئے، سر پر چوت لگی اور.....“ بڑہ راستہ روکی، ان کی لاش کے ایک طرف سے احتیاط سے پھلا ٹک کر وہ با تھر روم کے دوسرے دروازے تک آئی جو برآمدے میں کھلتا تھا۔

اس نے سوچا کہ ایک آخری نظر مرکرا نگزیب کو دیکھے مگر.... وہ پلٹے بنا دروازہ کھول کر باہر آئی اور اسے احتیاط سے اپنے پیچھے بند کیا۔

باہر سر دھواہر سوچل رہی تھی۔ ریشی گاؤں کو خود پہ لپیٹنے، اس نے ادھرا دھر دیکھا۔ اس طرف سی ٹی وی کیمرے نہیں تھے۔ آس پاس کوئی ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ وہاں اندر ہیر اور سر دی تھی۔ نیچے فارس کی انگلی بھی اندر ہیرے میں ڈوبی دکھائی دیتی تھی۔ جواہرات سے چند قدم کے فاصلے پر کرے کا دروازہ تھا جس کی چھٹی اس نے اندر سے گرا کھی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹ سر جھکائے، وہ دروازے کی طرف جا رہی تھی، جب ”مسز کاردار“، آواز پہ وہ کرنٹ کھا کر اچھلی، ادھرا دھر دیکھا۔ پھر.... گردن اٹھائی۔ اوپر ہاشم کی بالکوئی میں پودوں کو پانی دیتی میری جھکی کھڑی تھی۔

”آپ اتنی ٹھنڈہ میں باہر ہیں۔ کیا میں آپ کوشال لا دوں؟“

وہ فکر مندی سے کہتی پانی کی بکٹ رکھنے لگی۔ جواہرات نے سفید پڑتے چہرے پر بیشکل مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں اندر جا رہی ہوں۔ یہ پودے دیکھنے آئی تھی۔“ برآمدے میں قطار میں رکھے پودوں کی طرف اشارہ کیا۔ خواہ نواہ کی وضاحت۔

”میں نے ان کو وقت پر پانی دے دیا تھا۔“

”اوکے۔ تم ایسا کرو اور نگزیب کے لئے کافی بنا دو۔ وہ ابھی شاور لیں گے، سونپندرہ میں منٹ تک لے آنا۔“ اور پھر بدلت مسکرائی۔ سانس ابھی تک انکا تھا۔ میری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور نگزیب صرف اس کے ہاتھ کی کافی پیٹتے تھے۔ جواہرات کمرے کا دروازہ کھوؤں کر اندر آئی اور پھر پہنچ دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کیے گھرے سانس لیئے گئی۔

میری نے کچھ نہیں دیکھا، میری نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ پھر ڈرینگ نیبل کی طرف آئی۔ اسٹول پہنچی۔ اٹھایا۔ چہرے پر پاؤڑ کیا۔ آنکھوں میں مسکارا۔ اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک۔ مسکرا نے کی کوشش کی۔ کیا وہ بہتر گ رہی تھی یا اس کی آنکھیں ابھی تک کھوکھلی رکھ رہی تھیں؟

گاؤں کی ڈوری کسی اور موبائل اٹھائے وہ باہر نکلی۔ ہاشم اور سونیا بدستور اسی طرح بیٹھتے تھے۔ ٹوی چل رہا تھا۔

”ہاشم، میرا جی میں نہیں کام کر رہا۔ کیا تم اسے فکر کر دو گے۔“ موبائل فکرمندی سے کہتے اس کی طرف بڑھا یا۔ وہ جو ابھی ماں کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، لگا ہیں موبائل پر جھکا دیں اور اسے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”کیا مسئلہ ہے۔“ اسکرین پر انگلی چلاتا دیکھنے لگا۔ جواہرات اس کے قریب صوفے پہنچی، ناگ پٹا نگ جماں، انگلیاں باہم ملائیں، گویا ان کی بزرگی روکنے کی سعی کی۔

”بیمبو سینڈنیں ہو رہیں۔ اپنے اکاؤنٹ کی طرف کچھ بھیج کر دیکھو۔“

”اوکے۔ وہ ناچ پ کرنے لگا۔“ یہ ہاشم ہے مام کے فون سے لکھا اور اپنے ای میل پہ بھیجا۔

”چلی گئی۔ شاید کوئی وقت ایسا ہو۔“ مسکرا کر کہتے موبائل اس کی طرف بڑھا یا۔ جواہرات نے بدقت مسکراتے اسے تھاما۔ وہ پھر سے ٹوی دیکھنے لگا۔

”تمہاری اپنے ڈیڈی سے کوئی بات ہوئی؟“

”شیر کے بارے میں؟ نہیں۔ میں ان کے غصے کے بعد ٹوٹے ہونے کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔“

”علیشا کے بارے میں۔“ وہ ذرا توقف کے بعد انک اٹک کر کہنے لگی۔ لگا ہیں ٹوی اسکرین پر جمی تھیں۔ ”تم اس کی فیس دیئے گے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے ڈیڈی سے ایک دفعہ کھل کر بات کرو۔ کیا پیدا ہو خود بھی دل سے بہی چاہتے ہوں، اور اسی بھانے شیر کو معاف کر دیں۔“ بولتے ہوئے اسے لگا سے گردن پر سینہ آرہا ہے، اور شاید ہتھیلیوں کے اندر بھی۔ دل بھی دھک دھک کر رہا تھا۔

ہاشم آنکھیں ٹوی پر جمائے چند لمحے خاموش رہا۔

”اب نہیں دے رہا فیس۔ ضرورت نہیں رہی۔“

وہ چوکی۔ ”کیوں؟“

”اس نے پیسے کے لئے جرم کیا، پکڑی گئی، اب جیل میں ہے اور یونیورسٹی جانے کی ضرورت نہیں رہی۔“

جواہرات دم سادھے اسے دیکھے گئی۔ اسے یوں لگا، آنسو آنکھوں سے اسلنے کو بے تاب تھے، مگر اس نے انہیں نگل لیا۔

”آئی..... آئی ایم سوری!“ ہاشم نے بس سرخوم دیا اور اسکرین کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ دونوں کچھ نہیں بولے، حتیٰ کہ میری کافی کیڑے اٹھائے آئی۔

”سوری مجھے دیر ہو گئی، میرے بیٹے کا فون آگیا تھا۔“ وہ عادتاً واضحت دیتی کمرے کی جانب بڑھی۔

”کاردار صاحب سے کہنا، باہر آ جائیں، ہاشم نے ان سے کچھ بات کرنی ہے۔“ جواہرات نے پکارا۔ وہ سر ہلا کر اندر چل گئی۔ چند

تھیں بعد باہر نکل آئی۔

”سر باتھر دو میں ہیں، میں نے کافی نیبل پر کھدی ہے۔“

جو اہرات نے (ہاتھوں کی نمی مٹھی میں چھپاتے) تجھ سے اسے دیکھا۔

”ابھی تک نکلنیں؟ شاید شیو بنانے لگے ہوں۔ او کے تم جاؤ۔“ اور جیسے سر جھٹک کر خود ہی مطمئن ہو گئی۔

”میں ان سے ابھی اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔“ کافی دیر بعد وہ بولا۔ دیکھ بنوزٹی وی کور ہاتھا۔

”مگر تمہیں کرنی چاہیے۔“ وہ زمی سے بولی۔ تو ہاشم چپ رہا۔ چند منٹ یونہی بیخا سوچتا رہا۔ پھر اٹھا۔

”اوکے۔“ پھر اور نگریب کے کمرے کی جانب بڑھا۔ جواہرات کا میک اپ سے ڈھکا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ زور سے صوفے کی گدی مٹھی میں پھنسی۔ سانس روکے ہاشم کو اندر جاتے دیکھا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ کرہ خالی تھا۔ کافی میر پر دھری تھی۔ ادھر ادھر گردن گھمائی۔ باتھر دو مکار دروازہ بند تھا۔ ہاشم والپس پلٹ آیا۔

پوکھٹ میں ایک دم وہ ٹھہرا۔ جواہرات اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”ڈیڈ کتنی دیر سے اندر ہیں؟“

”کیا ابھی تک نہیں نکلے؟“ وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہرے پر درآتی پریشانی چھپا نہیں سکی۔

”وہ اتنی دیر کبھی بھی نہیں لگاتے۔“ ہاشم ایک دم مڑا۔ اور باتھر دو مکار کے دروازے تک آیا۔ اسے کھکھایا۔ پہلے ہلاک۔ ”ڈیڈ؟“ پھر زور

سے ”ڈیڈ؟ ڈیڈ؟ آپ ٹھیک ہیں؟“

جواہرات تیزی سے اس تک آئی۔ ”اور نگزیب؟“ کامپتی آواز میں پکارا۔ ہاشم اب پریشانی سے دروازہ دھڑک دھڑک رہا تھا۔

”اس دروازے کی چاپی کدھر ہے۔“

”نہیں، وہ چھٹی چڑھاتے ہیں عموماً۔“

وہ اب زور سے دروازے پر ہاتھ مارنے لگا۔ ساتھ ان کو پکار کھی رہا تھا۔ شور سن کر میری بھاگی چلی آئی۔

”ڈیڈ دروازہ نہیں کھول رہے میری، تم برآمدے، والا دروازہ چیک کرو وہ کھلا ہے کیا؟“ وہ زور سے دروازے کو بوٹ سے ٹھوکر

مارتے بولا۔ میری ہکابکا آگے بڑھی کہ ”میں وہ دروازہ دیکھتی ہوں، تم شیر و کوبلاو۔ جاؤ میری!“ جواہرات کو قدرے چلا کر کہنا پڑا۔ میری کو سمجھے

نہیں آیا کہ کیا کرے، مگر پونکہ جواہرات خود برآمدے کی طرف جانے لگی تھی تو وہ فوراً لاڈنخ میں بھاگی۔

جواہرات چند ہی لمحے بعد والپس آگئی۔

”وہ دروازہ بھی بند ہے۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ ہاشم نے سنا بھی نہیں وہ دیوانہ وار باپ کو پکارتے دروازے پر بوٹ مار رہا تھا۔

”ڈیڈ۔ آپ اندر ہیں؟ ڈیڈ؟“ اور تھیجی شیر و بھاگتا ہوا اندر آیا۔ میری بھی اس کے پیچھے تھی۔

”تمہارے ڈیڈ....“ جواہرات نے اسے صورت حال سمجھانی چاہی۔ مگر آنسوؤں نے گلابند کر دیا۔ اسے سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”ڈیڈ؟ ڈیڈ؟“ وہ ہاشم کے ساتھ اسی دیوانہ وار انداز میں اونچا اونچا پکارتا دروازے کو دھکا دینے لگا۔

”خاور کہاں ہے؟“ جواہرات کے پوچھنے پر میری بتانے لگی۔

”وہ تو گھر جا چکا ہے۔ اسے کال کروں؟“

”ضرورت نہیں ہے۔“

(اور جو آخری شخص وہ ادھر چاہتی تھی وہ خاور تھا۔)

ڈیڈ... ڈیڈ....، ان کو پکارتے ہوئے ہاشم نے پوری قوت سے دروازے کو ٹھوکر ماری تو چھپنی توئی، وہ اڑتا ہوا دوسروی جانب جا گا، اور اندر کو لڑھکتا ہاشم گرتے گرتے بچا۔

اور پھر اسے لگا، اس کے جسم سے جان نکل گئی ہے۔

فرش پر خون تھا۔ اور چت گرے، کھلی آنکھوں والے اور نگزیب کاردار۔ ان کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ چہرہ بے رنگ۔

نوشیر و اس بچوں کی طرح چینتا ان کو پکار رہا تھا، اور ہاشم۔۔۔ وہ بے دم سا گھننوں کے بل نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ میری نے چیخ روکنے کو دونوں ہاتھ مٹھے پر کھلنے۔ پھر نگاہیں اٹھیں۔ برآمدے کی طرف کے دروازے کی چھپنی کھلی تھی۔

”میری..... ہاسٹل..... ڈاکٹر..... کسی کو کال کرو۔“ آنسو ابل کر جواہرات کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ میری کا لمحہ بھر کو کندھی پر الجھاڑ، ہن وہاں سے ہٹا درودہ فوراً باہر بھاگی۔ جواہرات نے سفیدی بھیکے، چہرے کے ساتھ اندر قدم رکھا۔ شیر و ان کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا۔ شاید رو بھی رہا تھا، ان کو بار بار پکار رہا تھا، اور ہاشم بالکل ساکت سا ان کے قریب بیٹھا تھا۔ ان کے بے جان لڑکے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔

جواہرات قدم چلتی اور نگزیب کے سر کے قریب آکھڑی ہوئی، اس کے دونوں بیٹھے باپ پر بھکے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹی، جیسے شاک اور بے یقینی سے ہٹ رہی، ہوئیہاں تک کہ اس کی پشت پر برآمدے کا دروازہ آگیا۔ اس نے نامحسوس انداز میں ہاتھ پیچھے کیا، چھپنی لگائی (جس کی آواز شیر و کے زور زور سے باپ کو پکارنے کے شور میں دب گئی) اور پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی اور نگزیب کے سر کے قریب آئی۔

”کوئی آکیوں نہیں رہا؟“ میں کسی کو بلا کیں۔ ڈیڈی کو ہاسٹل لے کر جانا ہے۔“ شیر و آستین سے آنکھیں رگڑتا کہہ رہا تھا۔“ یہ کیا ہوا ہے ڈیڈی کو؟“

”ہی از ڈیڈی شیر و۔“ ہاشم نے بے جان سا کہتے ہوئے باپ کے ہاتھ کو تھاما۔ جیسے ہی ان کی جلد کو مس کیا، ہر سو کرب سا بھیل گیا۔ ”ہم باہر بیٹھے رہے اتنے قریب، اور وہ اکیلے تھے۔ وہ پھسل گئے....“ اس نے ارد گردگرے پانی کو دیکھا۔ ”اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلا۔“ وہ سرخ ہوتی آنکھوں سے کہتا اٹھا، اور سہارا دے کر باپ کو اٹھانے لگا۔ نوشیر و اس نے دوسرے کندھے سے نہیں تھاما۔ اور لوگ اسی دن کے لئے تو بیٹھے مانگتے ہیں!

میری واپس آگئی تھی۔ ہاشم اور شیر و اور نگزیب کو باہر لارہے تھے۔

میری کی نگاہیں سب سے پہلے برآمدے کے دروازے تک گئیں۔ چھپنی بند تھی۔ مگر اس نے ابھی تو دیکھا تھا کہ.... لیکن سوچنے کی مہلت نہیں ملی۔ کیونکہ جواہرات جو بالآخر ہر بوجھ سے آزاد ہو کر ساری کارروائی کامیابی سے اپنے رنگ میں دکھا کر، نہ حال ہی ہو گئی تھی، اور شاید اپنا تو ازان برقرار رکھکی اور گرنے کو تھی۔ کہ میری نے ”مزکاردار“ چلاتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کو تھاما۔

ہر شے سے بے نیاز، اس کا ذہن بھیا نک تار کی میں ڈوب رہا تھا، اور آنکھوں سے پانی برابر گر رہا تھا۔

اور نگزیب۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔

.....❖❖❖.....

بے کراں تھائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا..... تیرے میرے درمیان بس اک خلا رہ جائے گا  
نیند کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، جس قسم میں اس وقت جواہرات ڈوبی تھی وہ، بہت تکلیف دہ تھی، اور اس سے جا گناہ اس سے بھی زیادہ کرب آمیز۔ آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے بیٹھ پھیلیں لخاف میں لیتی تھی۔ پھیلیں جپھکا جپھکا کارا گرد دیکھتے، وہ کہیوں کے بل اٹھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ پہلے لگا وہ سب خواب تھا، مگر نہیں۔ حقیقت لمحہ بھر میں ہی سامنے ناچنے لگی۔

وہ کمرے میں تھا تھی مگر یقیناً گھر میں بہت لوگ جمع تھے۔ اس نے پیر زمین پر رکھے۔ سائیدنجل پر دوا میں دھری تھیں۔ اسے سکون ادا نہیں دے کر ڈاکٹر آفتاب ملک نے سلاایا تھا۔ ان کے فیلی ڈاکٹر۔ سرکاری ہسپتال میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ۔ جن کو سب سے پہلے بلا یا ادا تھا۔ یہ نام ذہن میں آیا تو جھما کا سا ہوا۔ وہ جھکلے اسٹھ کھڑی ہوئی۔

خوف اور وحشت نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ڈاکٹر دھوکہ کھا جائے گا کیا؟ شاید نہیں۔

بمشکل قدم قد مچلتی وہ دروازے تک آئی، ذرا سا کھولا تو باہر ہاشم اور خاور کھڑے نظر آئے۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ ابھی میں نہیں ہوئی تھی اور سمیت کے گھر آنے والوں کا انتظام کھلے سبزہ زار میں تھا۔ جواہرات نے دروازے کے پیچھے کان لگا کر سنا۔ خاور کہہ رہا تھا۔ ”موت سے پہلے وہ فیروزیات کی پارٹی سے آئے تھے۔ مجھے ڈر ہے انہوں نے سر کو کچھ ڈرگز نہ پلا دی ہوں۔ ہمیں پوسٹ مارٹم لروانا چاہیے، تاکہ اگر وہ کسی اور وجہ سے پھسلے ہوں تو وہ سامنے آجائے۔“

”میں اپنے باپ کی لاش کی بے حرمتی نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ سیاہ کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس تھا، آنکھوں میں سختی تھی مگر چہرہ اور دبر ان ساتھ تھا۔

”سرودہ اتنے کمزور نہیں تھے کہ گریں تو اٹھ نہ سکیں۔ ڈاکٹر آفتاب خود اصرار کر رہے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کروانا چاہیے، تو آپ کو کروانا ہا ہے۔“

ہاشم نے اب کی بار انکار نہیں کیا۔ اس کی خاموشی نیم رضا مندی تھی۔ جواہرات نے گھری سانس لی اور دروازہ پورا کھولا۔ باہر کل۔ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہاشم فکر مندی سے آگے بڑھا۔

”میں آپ ٹھیک ہیں؟“ نرمی سے اس کوشانوں سے تھامنا۔ خاور نے افسوس سے تعزیت کی۔

”اورنگزیب کہاں ہے؟ منع مت کرنا، میں ہوش نہیں کھوؤں گی، کچھ دیراں کے پاس بیٹھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے بھی اتنی نرمی سے کہا کہ وہ اسے کندھوں سے تھامے رہا باری میں آگے لے آیا۔ بہاں ایک بیڈ روم میں ڈاکٹر آفتاب میت کے ہمراہ کھڑے تھے۔ وہ اندر آئی اور ملازموں کو باہر نکل جانے کو کہا۔ ہاشم اور میری سمیت سب نکلے اور دروازہ بند کر دیا تو اورنگزیب کے سر ہانے کھڑی جواہرات ڈاکٹر آفتاب کی جانب گھوئی۔ وہ دونوں اب اکیلے تھے۔

”تو آپ کہہ رہے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کروانا چاہیے؟“ وہ تکمیلی نظروں سے انہیں گھورتی، ایک دم پھکاری تھی کہ وہ جو تعزیت کرنے لگے تھے، تعجب سے اسے دیکھنے لگے۔

”جی، کیونکہ جوزخم ان کے...“

”طوبی یاد ہے کون تھی؟“

ڈاکٹر آفتاب کو گویا لقوہ ہو گیا، ہکابا کا سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ سینے پر بازو لپیٹے، چھپتی نظروں سے دیکھتی ان کے قریب آئی، بالکل مقابل یہاں تک کہ واضح محسوس ہونے لگا کہ وہ ان سے دراز قدم تھی۔

”طوبی آپ کی بیوی کے پہلے شوہر سے ہوئی بیٹی تھی۔ یاد ہے آپ نے کیسے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی اور میں نے اسے کو راپ کرنے میں آپ کی کیسے مدد کی تھی؟ آپ کی بہت ساری گفتگو یکارڈ ڈھنے میں ہے میرے پاس۔ کیا سنوادوں آپ کے بچوں کو؟“

ڈاکٹر آفتاب نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، پھر پریشانی سے اس کے قریب آئے۔

”مسز کار دار وہ میرے اور آپ کے درمیان تھا!“

”تو پھر جیسے وارث غازی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ نے بدلوائی تھی؟ ویسے ہی یہ رپورٹ بھی میری مرضی کی لکھی جائے گی۔ سمجھا آ

رہا ہے کہ میں کیا بات کر رہی ہوں؟“

ڈاکٹر آفتاب کا سر خود بخواشیت میں ہلا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

باہر سب لوگ بکھر چکے تھے۔ ہاشم برآمدے میں جا کھڑا ہوا تھا۔ سزہ زار میں بیٹھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ دیہن کھڑا دور پہاڑوں پر طلوع ہوتا صبح کا سورج دیکھنے لگا۔

”ہاشم بھائی!“ وہ کب اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا اسے علم نہیں ہوا۔ سعدی کے پکارنے پر چونکا۔ وہ جیسے خر ملنے پر آفس کے راستے سے ہی ادھر آ گیا تھا۔

”بہت افسوس ہوا مجھے۔ کیسے ہوا یہ سب؟“ وہ تاسف سے پوچھ رہا تھا اور پر ٹرمردہ کھڑا ہاشم آہستہ آہستہ بتانے لگا۔

”آئی ایم سوسوری ہاشم بھائی۔ میں سمجھ سکتا ہوں جب آپ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے ہوں گے اور ان کی لفظ دیکھی ہو گی تو کیسا محسوس ہوا ہو گا۔ فارس غازی نے بھی ایسا ہی محسوس کیا ہو گا جب وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوا تھا اور اس کے بھائی کی لاش عینچے سے جھوول رہی تھی۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔“ اور بہت سادگی سے کہتے اس نے ہاشم کا کندھا تھی پھیلا۔ وہ ایک دم چونک کر اس کو دیکھنے لگا۔ سعدی کے انداز پر نہیں چونکا اس نے تو انداز نوٹ ہی نہیں کیا۔ بس بات دل کے اندر تک چیڑتی ہوئی اتر گئی۔ وہ ساری تکلیف پھر سے یاد آ گئی۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

”تھینک یو سعدی، آنے کا شکر یہ تمہاری بہن نہیں آئی؟“ بات بد لئے کی کوشش کی۔

”نہیں وہ... آفس سے سید ہے ادھر آ گیا۔“ سعدی نے بہانہ لھڑ دیا۔ اب کیا بتاتا کہ جب سے علیہا کا خط ملا تھا جو چپ سی ہو گئی تھی۔ نہ کسی سے بات کرتی، نہ بنتی۔ وہ ذرا ان مسلکوں سے فارغ ہو جائے پھر اس کا مسئلہ بھی دیکھ لے گا۔ اترتے سورج کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

❖❖❖

جانے کس کے لیے وا ہے ترا آغوش کرم ..... ہم تو جب لئے ہیں ایک زخم نیا لیتے ہیں

جیل کی اوپنجی چار دیواری کے اندر اس کھلے احاطے میں وہ دونوں کنارے کنارے چل رہے تھے۔ احمد حم آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور فارس آنکھیں سیکھے گردن موڑ کر ایک طرف دیکھ رہا تھا

”آپ نے سوچا ہے یہاں سے نکل کر کیا کریں گے غازی بھائی؟“

”تم سے مطلب؟“

”تو پھر اتنا پوچھ لیں کہ میں یہاں سے نکل کر کیا کروں گا؟“

”تم وہی کرو گے جو پہلے کر کے ادھر آئے ہو۔ فراڈ اور جعل سازی۔“ اس نے اسی خشک انداز میں کہہ کر سر جھٹکا۔ احمد نے نہایت صدمے سے اسے دیکھا۔

”میں نے صرف ایک.... انکشت شہادت اٹھا کر دکھائی“ صرف ایک دفعہ یہ حرکت کی تھی اور دوبارہ بھی نہیں کروں گا۔“

”تم بالکل کرو گے۔ انسان نہیں بدلا کرتے۔ جو ایک دفعہ کرتا ہے وہ دوبارہ ضرور کرتا ہے۔“ ساتھ ہی جوتے سے کنکر کو جھوکر ماری۔

”اشفاق حمد نے کہا تھا، جو اچھا انسان صرف ایک دفعہ گناہ کرے اور پھر تو بکر لے تو وہ دوبارہ بھی ایسا نہیں کرتا۔“

”یہ اشفاق احمد نے نہیں کہا تھا۔ ابھی ابھی کھڑا ہے۔“ اس صاف گوئی پر احمد نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”اتنے خشک کیوں ہو رہے ہیں؟ کاردار صاحب کی موت کا مجھے بھی بہت افسوس ہے، مگر....“

”کیا تم کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتے۔“ وہ جھلا گیا۔ احر نے ہونہ کر کے منہ پھیر لیا، پھر لوں میں کچھ بڑا یا۔ پھر ذرا کی ذرا اس کا ہا۔ لَا کہ بڑا ہست کا کیا عمل آیا ہے، مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

”آپ کو ان پا بھی تک غصہ ہے؟“

”اونہوں۔ صرف افسوس ہے۔ غصے والی ایجھ منٹ نہیں رہی ان سے کبھی۔“

”اور شاید اس بات کا بھی دکھ ہے کہ وہ آپ کی بے گناہی معلوم کیے بغیر ہی دنیا سے چلے گئے۔“

”پچھے نہیں۔“ وہ اسی طرح بے زار سا قدم اٹھا تارہ۔ دونوں تبر کے جب راہ میں ایک سپاہی آن کھڑا ہوا۔  
”تمہاری ملاقات ہے۔“ فارس کو اشارہ کیا۔

”کون؟“ وہ چونکا۔

”پر اسکی یوں ٹر صاحب۔“ ان دونوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ احر کے لب ”اوہ“ میں سکرے۔

”ایک بفتے میں دوسری ملاقات؟ یہ چزیل کو اتنا حکم کب سے آنے لگا؟“

مگر وہ سے بغیر بے تاثر اور خت تاثرات کے ساتھ چلتا سپاہی کے پیچھے ہولیا۔ جب اس کے سامنے آ کر کری پہ بیٹھا تو ابرو نے تھے  
مگر آنکھوں کی ختنی میں کمی تھی۔

وہ سفید لمبی قمیض کے اوپر سیاہ منٹ کوٹ میں ملبوس تھی کوٹ میں سفید دو پیڑشانوں پر تھا اور بال کچھ میں ہاف بندھے تھے۔ نگاہیں میز پر کھے اپنے باہم ملے ہاتھوں پڑھیں، لوگ کی دمک برسوں بعد بھی ولیسی ہی تھی۔ وہ بینچہ چکا تو زمر نظریں اٹھا کر اس کے پھرے تک لے گئی۔ وہ سپاٹ مکبہ نہ تھی، ہوئی نگاہیں تھیں۔

”ایک بفتے میں دوسری دفعہ؟ اتنا حکم کب سے آنے لگا آپ کو؟“ احر کے الفاظ (یمنز کر کے) دھرانے۔ آنکھیں اس کی بھوری آنکھوں پر جی تھیں۔

”پہلے سنبھالی تھی، اب بولنے آئی ہوں۔ دھیان سے سنتا، کیونکہ جب میں بولوں گی تو آواز باہر تک جائے گی۔“ الفاظ اس کے اہل سے ادا ہوئے اور ماحول کا تباہ بڑھ گیا، فارس کی آنکھوں کی نرمی مدھم ہوتی گئی۔

”کہیے۔“

”تم نے کہا، میں تصویر کا دوسرارخ نہیں دیکھتی۔ یہ بھی کہا کہ مجھے بالکل یاد نہیں کر سکھی میں تمہاری ٹیچھی۔ تم غلط تھے۔“  
فارس نے گہری سانس باہر کو نکالی۔ (اسے علم ہو گیا تھا۔) وہ جیسے ڈھیروں غصہ ضبط کرتے اسے گھورتی کہہ رہی تھی۔

”جب وہ تمہارا سائیڈ لک میرے پاس آیا، تب میں صرف مشکوک ہوئی تھی، مگر فارس میں تصویر کا دوسرارخ ضرور دیکھتی ہوں،“ سو ہب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک وفادار انسان ہے، تو یہ بھی پتہ چل گیا کہ اپنے سیل میٹ سے دغا کیوں کرے گا؟ تم لوگ جیل میں کوئی

پان نہیں کر رہے۔ تم جیل توڑنے جا رہے ہو۔“ اس کی سلکتی نگاہیں فارس کی آنکھوں کے اندر اتر رہی تھیں۔ وہ سپاٹ چہرہ لئے خاموش رہا۔

”ذو نٹ وری“ میں اس مکنہ جرم کو روپورٹ نہیں کروں گی۔ میرے لئے زیادہ اچھا ہے کہ تم جیل توڑا اور پھر سے دہی جرم کرو جس کے لئے اندر گئے تھے۔ پتہ ہے تم کیا کرو گے؟“ آگے جھکی، میز پر زور سے ہاتھ مارا، دیکھی آنکھوں سے اسے تنفس سے دیکھا۔ ”دوبارہ شادی کرو گے،“ اور اس یوں کو بھی مار دو گے، تم سب واکف گلزار کی سائیکل ایک ہی ہوتی ہے۔ اس لئے توڑ جیل، تاکہ سب جان لیں کہ تم گناہ کا گرتھے اسی لئے بھاگے۔“

وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کری پہ بیچھے کو ہو کر بیٹھا، منہ میں کچھ چباتے ہوئے۔ شاید کوئی کاغذ کا ٹکڑا اٹھا۔

”مگر تمہیں یہ پلان کسی اور کے ساتھ مل کر بنانا ہو گا کیونکہ احر شفیع کے خلاف چار جزو اسیکیوشن ڈرپ کر رہا ہے۔ ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے سودہ جلد رہا ہو جائے گا۔“ فارس نے کوئی رُغمِ نہیں دیا۔ اس سے دیکھتا رہا۔

”معلوم ہے کیا، اتنے سال بعد، پہلی دفعہ میں نے چند دن کے لئے فرض کر لیا تھا کہ تم بے گناہ ہو، میں تمہارا کیس خود لینے کی تھی، میں تمہیں Presumed Innocent خیال کر کے تمہاری طرف کی کہانی کے حق میں ثبوت ڈھونڈنے جا رہی تھی، مگر.....“ اور پھر اس کی آنکھوں میں صدمہ اترتا۔ نفرت سے اسے دیکھتی نظر میں گردن ہلائی۔ ”مگر تم نے پھر مجھے استعمال کیا۔ فارس تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں تمہاری سچی تھی، سعدی کی پھر سچی یا کوئی بے کار چیز جس کو تمہیش استعمال کرتے جاؤ؟ میرا یہ حال کر دیا تم نے کیا یہ کافی نہیں تھا جو تمہیں رہائی بھی میرے کندھے پر پیر کھکھل کر چاہیے تھی؟“ آگے ہو کر ایک ایک لفظ غصے سے بولتی ہوئی زمر کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں اب نبی بھی اترنے لگی تھی۔

”اس حرکت کے لئے کسی بھی پر اسیکیوژن پولیس آفیسر کو استعمال کر سکتے تھے، کیا مجھے استعمال کرتے ہوئے اس لڑکے کو میر لئے پیغام دیتے تھیں ایک لمحے کو بھی احساس نہیں ہوا کہ تم بار بار ایک عورت کو استعمال کر رہے ہو؟ تم مجھے سے چاہتے کیا تھے؟“ غصے سے بولتے بھی ایک آنسو آنکھ سے لڑک کر گال پر جا گرا۔ اسے خود بھی نہیں احساس ہوا کہ کوئی آنسو گرا ہے۔

وہ تباہی چپ رہا۔

”اور معلوم ہے میں اتنی دری سے تمہارے سامنے کیوں نیٹھی ہوں؟ تمہارے منہ سے صرف معدورت سننے کے لئے۔ یہ کہنا اتنا مشکل نہیں تھا فارس! مجھے دوبارہ استعمال کرنے کے لئے میری زندگی بر باد کرنے کے لئے، میری سخت تباہ کرنے کے لئے کیا تم ایک دفعہ بھی معاف نہیں مانگ سکتے؟“ میز پر زور سے ہاتھ مار کر وہ آگے کو ہوئی، آنکھیں سرخ دیکھ رہی تھیں۔ ”یہ کہنا اتنا مشکل نہیں تھا فارس۔“ آئی ایم سوری زمر، ”بس تین الفاظ تھے، تم ایک دفعہ مجھے سے معافی مانگ کر دیکھتے، تم ایک دفعہ یہ سارے جھوٹ بولنے کی بجائے، گلٹی plead کر کے دیکھتے۔“ میں تمہارے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔ مگر جو تم نے اب کیا ہے، اس سے تم میرے دل میں موجود اپنا آخری نرم گوشہ بھی کھو چکے ہو۔ تم نے ابھی ابھی اس شخص کو گنوادیا ہے جسے اگر تمہاری بے گناہی کا لیقین ہو جاتا تو وہ تمہاری سب سے بڑی طرفدار بن سکتی تھی، مگر اب.....“ پچھے ہوتے ہوئے تغیر سے اسے دیکھتے، نظر میں گردن ہلائی۔ ”اب نہیں۔ اب مجھے تمہارے کیس میں نہ گواہ بنتا ہے نہ کچھ اور۔ میں نے اپنی گواہی بھی واپس لے لی ہے، اس لئے نہیں کہ تم سے ہمدردی ہے، صرف اس لئے کہ میں تمہارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ کیونکہ میرا تم سے کوئی ذاتی جھگٹکا تھا، نہیں۔ اگر ہوتا تو تم دیکھتے میں کیسے تمہیں انجام دیتی ہوں۔ لیکن نہیں۔“ سر جھک کر میز پر سیدھا ہاتھ مارا، وہ چپ چاپ بند ہونٹوں سے کاغذ چباتے اسے دیکھتا رہا۔ ”میں تو ایک استعمال کی شے تھی جس کے ذریعے جب چاہو تم اپنا مطلب نکالو۔ اور تمہیں ابھی بھی کوئی شرمندگی نہیں؟“ تجھ بھرے صدے سے اسے دیکھتی وہ نظر میں چڑھا بلا رہی تھی۔ ”فارس، تم نے مجھے اس قابل نہیں جھوڑا کہ میں کبھی اپنا گم بسا کوں، کبھی ماں تک نہیں بن سکتی میں!“ (اس کا چبا تا جبڑا کا، آنکھوں میں چونکے کا تاثرا بھرا جسے اگلے ہی پل وہ چھپا گیا۔) ”میرے کبھی بنچے نہیں ہوں گے، میرا غم لئے میرا باب وقت سے پہلے مر جائے گا، مگر تم..... کیا تم اب بھی معدورت کے تین لفظ نہیں کہہ سکتے؟ آئی ایم سوری زمر..... یہ تین لفظ بولنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ اس سے کچھ بھی نہیں بد لے گا، میں اب بھی تمہارے ساتھ کھڑے ہوئے کا نہیں سوچوں گی، لیکن شاید..... تمہارے لئے... یہ تمہارے اپنے لئے ہوشاید!“ تیز تیز بولتے اس کو سانس چڑھ گیا تھا۔ سو خاموش ہو گئی۔ وہ کہہ چکی تھی جو وہ کہنے آئی تھی، اور آواز باہر تک گئی تھی یا نہیں، میز کے پار بیٹھے فارس کے اندر تک ضرور گئی تھی۔

وہ آگے کو ہوا، ہاتھ باہم ملا کر میز پر رکھے اور سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا، اور پھر جب بولا تو ایک ایک لفظ تھہرا ہوا مگر مضبوط تھا۔

”مجھے افسوس ہے جو آپ کے ساتھ ہوا۔ مجھے دکھ ہے کہ آپ کے والد آپ کا غم لے کر وقت سے پہلے مر جائیں گے۔ مجھے بہت اُس ہے کہ آپ کی زندگی تباہ ہوئی، بہت صدمہ ہے کہ آپ کبھی اپنی فینیل نہیں بنایا میں گی، بہت زیادہ ہمدردی ہے کہ آپ کی صحت وقت کے ساتھ بگزتی چلی جائے گی.... مگر....“ ذرا سار کا، بنا پلک جھکپے اس کی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔ ”مگر میں فارس عازی ہوں، اور فارس عازی کی اپنی نظر میں اس کی بہت عزت ہے، سو میدم ڈسٹرکٹ پر اسکیو نگاہ اثارنی صاحبہ میں.... معانی.... نہیں مانگوں گا۔“ چباچا کر الفاظ ادا کیے۔ ہلا سانپیں سرہلایا۔

”آپ نے جو کرنا ہے کر لیں، مگر میں معانی نہیں مانگوں گا۔“ کھڑا ہو گیا۔ جھٹکے سے کرتے کا گریبان ٹھیک کیا، آستین پیچھے فولاد لیا۔ ملاقات ختم اور سلکتی نظروں سے اسے دیکھی انھی پرس اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

”اسے بتایا کیوں نہیں کہ آپ نے بصیرت صاحب کو یہ سب کہنے کا کہا تھا، اسے نہیں۔ یہ میری غلطی تھی۔“ جب وہ واپس آیا سیل میں دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا تو سلاخوں کے قریب کھڑے احرانے پوچھا۔ اسے اپنی رہائی کا سن کر خوشی نہیں ہوئی تھی پلان غارت جانے کا افسوس زیادہ تھا۔ اپنی رہائی والی بات تو مذاق گئی تھی۔

”اور وہ یقین کر لیتی؟“

”کرے یا نہ کرے، بتانا تو چاہیے تھا۔“

”میں ساری زندگی اس کو اپنی صفائیاں نہیں دے سکتا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جیسی ہے اسے رہنے دو۔ اس نے بھی بہت کچھ کھو یا ہے۔“

”کم از کم جیل میں تو نہیں ہے وہ۔“ وہ جمل کر بولا۔

”قید کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ اس کی قید اور طرح کی ہے۔ اگر اس قید میں اس کا واحد روزانہ کسی کو ازالہ میں دینا اور دیے چلے جانا ہے تو مجھے وہ اس سے نہیں چھیننا چاہیے۔ کم از کم اس کے پاس کوئی ہے تو یہی جس کو وہ ازالہ میں دے سکے۔ میرے پاس وہ بھی نہیں اور جب کوئی ایسا نہ ہو تو انسان خود کو ازالہ میں لگتا ہے، سو وہ جیسی ہے، اسے رہنے دو۔“ وہ مدھم آواز میں سر جھکا کے کھدرا تھا مگر احرنگی میں سرہلاتا بجھت کرنے لگا، لیکن اسے سن کون رہا تھا؟



موت سے گزر کر یہ کیسی زندگی پائی..... شاخ شاخ ہوتا ہے وار کا گماں یارو جواہرات کاردار کے کمرے میں ہیئر کی گرماش تھی۔ دو پھر میں بھی بند پر دوں کے باعث انہیں الگتا تھا۔ وہ گردن تلے پھولے پھولے سیکر کھے، سیاہ ریشمی خاف میں لیٹیں ویران اور بیمار کھتی تھی۔ بال کانوں کے پیچھے اڑے علقوں سے مزین روئی روئی آنکھیں میک اپ کے بغیر پیلا کمزور چہرہ۔ وہ تھی بھی سیاہ لباس میں اور دیوان آنکھوں سے دیکھ بھی پر دوں کی سیاہی کو رہی تھی۔

سعدی سامنے کری پہ گھٹنے ملا کر بیٹھا، فکر مندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی طبیعت پوچھنے آیا تھا مگر وہ سوتی جاتی کیفیت میں ہاکل بے گانی دکھائی دیتی تھی۔ دواؤں کا اثر شدید تھا۔

”مسز کاردار اللہ آپ کو اکیلانہیں چھوڑے گا۔ وہ آپ کو سنبھال لے گا۔ بھروسہ کر کے دیکھیں اس پر، آپ کا ہر مسئلہ وہ حل کر دے گا۔“ وہ مزی سے سمجھا رہا تھا جب کھڑکی کو دیکھتی جواہرات کے لب پھٹ پھڑائے۔

”کیا تم نے وہ ڈاکیومنٹری شود کیجا ہے؟“ میں غارت گر (Predator) (I)؟“

500

۱۰۷۳-۱۰۷۴ء کے درمیان میں پنج پیشوا کا انتخابی فرمانکاری کیتی گئی تھی، جس کے

三

10

"کارڈر پاکتہ کاہلے ہیں جیسے Predators اور اپنے کام کر رہے ہیں۔ ایک کاہلہ

*—Lester H. Ladd, Jr.*

"بے اگلی بھلے ہی۔ اگرچہ اسے مالی پڑھاں میں نہ مل کر جو کوئی بھلے ہی  
نہ مل کر لے۔ اس کے مالی کا یہ کیا بھلے کے سامنے رکھنا کوئی کوئی نہ ملے۔"

لِكُلِّ مُؤْمِنٍ فِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ مَا يَفْعَلُونَ

hyenas کے نزٹے میں ہوتے ہیں۔ واقعیت آتی ہے۔ عمل نہیں کرتی۔ بھیتی بھی نہیں ہے۔ صرف فراغتی ہے اور hyena، ہل نہ معلوم ہے کیون؟ کیونکہ ماہدیت کی آنکھوں کے سیاہ tear lines ہوتی ہیں جو غرائب وات اسے بہت با رعب اور خوفناک بناتی ہیں۔ اور پھر نما بنا جاتی ہے اور وہ... وہ اپنے بچوں کو دیں ہیں لے آتی ہے۔ اور تم لوگ... تم لوگ بھیتے ہو مادہ پھیتا بھوک کے لئے نیتیات میں فکار کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا سعدی۔ کوئی اپنی قوتوش سے کسی کا خون نہیں کرتا۔ اپنے بچوں کے لئے اپنی ہو۔ کے لئے وہ ایسا کرتی ہے۔ اور پھر سر بھیج پڑ رائے اس نے آنکھیں مونڈ لیں۔ آنسو پنپ اُر رہے تھے۔ سعدی المومن سے لمبی پٹخی، سمجھے اسے دیکھا رہا۔

"چاڑی سعدی! بھگا کیا اچھوڑ دو۔" اس نے کروٹ پہلی تو دو اونچوڑ کردا ہوا۔

پنجویں بعد جو اہرات نے کروٹ پہلی تو دو کھلے دروازے سے باہر کا منظر دھائی دیا۔ سعدی، بیری، ہلیج کے ساتھ کھڑا پکھوکہ رہا۔ ان کی باتیں عام نویست کی ہیں، وہ نہیں یا ہی تھی اصرف بیری کی وجہ وہی ہی اسے بے بین کر گئی۔ وہ کیا کیا یوں کی سعدی کے سامنے اور کیا کیا کیا کیا تو؟ اگر جو سعدی نے وہ نہ دیا ہے، وہ ہمیں چاہتی تھی، مگر خواب آور دو اکا اثر گمراہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی اکھیں بند ہوئی تھیں۔ اس نے دیتا گیا اور دل ڈوب ڈوب کر اپنے نارہ رہا۔

اس سے پکھر بے خبر سعدی بیری سے اس کے مالک کی تحریت کر رہا تھا۔

خود بہل آرزو ہے آپی سماں ام کے سوا

حاصل آرزو ہے آپی سماں ام کے سوا

وہ گھر تیا تو ساتا ساتھ۔ سیکھ اسکوں گیا تھا اور اسی غالباً نئے پئے رسکھوڑاٹ۔ حسین نے اس کا ہام رکھا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ یہ ہام ہل کی جگن سے مکار شد و تھی، مگر وہ تھی کہاں؟

اس کے گرے میں جھاناک تو وہ بیدہ پا کرزوں بیٹھی تھی۔ سامنے چند کا تھات پر زرد پورہ ہوئے ہے۔ تھے۔ وہ اندر آیا۔ لٹا ہیں اس جانے اس وجود سے کا تھوڑا بیک گئیں۔ اسے پھیٹے بکھل کا جھکا کا۔ جیزی سے ان پر بچپنا۔ لکڑوں کو اٹا پلا کر دیکھا۔

"یہ کس نے کیا ہے؟" تو تمہارا ایجیشن فارم تھی جیزی مگر یونورٹی کے لئے۔ "پہلا خیال ہم کی طرف گیا تھا۔ وہ بے سکت بیٹھیں اور پریشانی سے سامنے بیٹھا۔

"وہ... یہ تم نے کیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے جیسیں؟ بتاؤ بھگے۔" زنی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ جو بسر کی چادر کو نکر رہی تھی، اکھیں اٹھا گیں۔ سنا میک کے وہ پچھوٹی لکھی تھیں۔

"میں ایجیشن نہیں اون گی۔ بھگتیں پڑھنا۔" آنسو ہیں سے آنکھیں بھر گئیں۔

"حسین، سب کر دو۔ علیشا نہیں پڑھ کی تو اس میں تمہارا تصور تھیں ہے۔" اب کے اسے فسر جی ہاتھ۔

"بھگتیں پڑھنا بھائی۔" مگر وہ اس کی نہیں من رہا تھا۔

"وہ علیشا اور بامیں کام عامل تھا۔ تم تے پچھوڑنا نہیں کیا، تم خود کو ہرم ملت بھجو دو۔"

"میں بھرم ہوں۔ میں گا بگار ہوں۔" آنسو اس کے کالوں پر تھک رہے تھے۔

"وہ علیشا کو وہ ملا جو اس نے بولیا تھا ملیٹھا نے..."

"کیا علیشا علیشا کا رکھی ہے؟ آپ نے؟" بھاڑے میں اپنی علیشا۔" وہ ایک دم اتنی زور کی چلائی کر سعدی بے احتیاء بیکھے ہتا۔ اس کی اولاد سے پھٹے گئی تھی۔" ہربات ملیٹھا کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ یہ میں ہوں، حسین! اُنگی سے اپنے پیٹ پر تھک دی۔" یہ بیرے گاہد ہیں!"

پچھوڑنا اس کے انداز میں اس کی آنکھوں میں کہو دپنکا۔ پہلی دفعے سے لگا کر وہ علیشا کے لئے اپنی بیٹھ نہیں ہے۔

”کوئی اور بات ہے پھر؟ کیا ہوا ہے حد؟“ قدرے الارڈ سا ہو کروہ اس کا چہرہ کھو جنے لگا۔ حین کے آنسوؤں میں روائی آگئی۔  
”میں کون ہوں، بھائی؟“

”تم حد ہو... ہمارے گھر کا سب سے پیار اور ذہین بچ۔ تم کے کلپن کی دیوانی ہو، اور...“ وہ جلدی جلدی بتانے لگا۔ ”وہ تم پر بورڈ ناپ کیا ہے، تم نے...“ اس کی آخری بات پر حین سر گھٹنوں پر گرا کر رونے لگی۔

”نہیں کیا میں نے ناپ نہیں لی میں نے پہلی پوزیشن!“

”حین کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ پریشانی سے اس کا سر تھپک رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھنیں آرہا تھا۔ اس نے بھی چہرہ اٹھایا، گلی آنکھوں پر بھائی کو دیکھا۔

”میں نے بورڈ ناپ نہیں کیا۔ مجھے غارت کر دیاں کوریں ڈراموں اور فلموں نے۔ میں تو اس سال پڑھی بھی نہیں ٹھیک سے۔“  
اس کا سر تھپکتا سعدی کا ہاتھ ٹھہرنا۔ حیرت سے اس نے حد کو دیکھا۔

”کیا اول فول بولے جا رہی ہو؟“

”میں نے بورڈ ناپ نہیں کیا۔“

”پاگل ہو گئی ہو؟ پورا شہر جانتا ہے تم نے بورڈ ناپ کیا ہے، تم... تمہارا رزلٹ کا رہا، بورڈ کی تقریب، اخبار میں چھپا رہا، وہ سب سچ تھا۔“

”نہیں تھا وہ سچ۔“ وہ زور سے چیخنی۔ ”میں نے جینگ کی تھی۔ سنا آپ نے؟ میں نے پیپر زپہلے سے دیکھ رکھے تھے۔“  
اسے گویا پھوڈنک مار گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا۔ نفی میں سر ہلا کا چیچھے ہوا۔ ”کیا بکواس ہے حد؟ کوئی چینگ کر کے ناپ نہیں کر سکتا... کوئی پیپر زبھی پہلے نہیں دیکھ سکتا۔ تم میرے ساتھ...“ تم کوئی پر یہنک کر رہی ہو؟“ اسے اب بھی لگ رہا تھا وہ ایک دم ہنسنا شروع کر دے گی، مگر وہ رور رہی تھی۔

”میں نے دیکھے تھے... سب پیپر زد دیکھے تھے، مجھے معلوم تھا ایکراام میں کیا آنا ہے۔“ مگر وہ اب بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ہیں گے میں لقتنی اچھی کیوں نہ ہو، تم کسی بورڈ کا میں فریم ہیک نہیں کر سکتی۔ تم کہہ کیا رہی ہو؟ پیپر زتو بورڈ کے پاس نہیں ہوتے، اتنی سخت سیکورٹی ہوتی ہے۔“ وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ”پیپر سیٹ کرنے والوں تک کو فائل پیپر کا علم نہیں ہے۔“  
بورڈ کا کوئی اہم کار�ک پیپر نہیں دیکھ سکتا سوائے...“ اور نہیں پوہا انکا۔ بے یقینی سے حین کو دیکھا۔

”سوائے آفسر کافیڈ یشل پر لیس (OCP) کے،“ اس نے بھائی کا فقرہ مکمل کیا۔

”تم مذاق کر رہی ہو۔ ہے نا؟“ بالکل دنگ سا کھڑا وہ کپکاپی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ ”اوی پی ایماندار شخص کو نہیں جاتا ہے۔“

معزز، دیانت دار آدمی، کوئی اوی پی ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے پتہ ہے تمہاری اس دوست کے ابوادی پی چیز، جو اسکوں میں تھی تمہارے ساتھ، مگر ابوادی پی تھیں پیپر نہیں دکھا سکتا۔“ وہ اب بھی ذاتی طور پر یہ قبول کرنے سے انکاری تھا۔ حین نے دکھری بھیکی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”کیا آپ جانتے ہیں، انسان اپنے خاندان کے لئے کس حد تک جا سکتا ہے؟“ اور آنسو پھر سے مپ مپ گرنے لگے۔ سعدی ہے دم سایڈ کے پر لے کنارے پہ بیٹھا۔ حین سے کافی دور۔ اس کی شل سی نظریں اس پر جی تھیں جو اپنے گھٹنوں کو دیکھتی بتا رہی تھیں۔

”حیرا کے ابوادی پی ہیں، انہی کی وجہ سے حیرا ہمارے بورڈ سے امتحان نہیں دے سکتی۔ جیسا کہ اصول ہے۔ حیرا امیرے پاس“

ال۔ امتحانوں سے پندرہ دن پہلے، یہ دن تھے جب میں شدید باؤ میں تھی۔ آپ باہر تھے اور میں سارا دن رات کے ڈرائیور کی بھتی اور پھر یہ اچھی نہیں رہی، مگر کتابوں میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایف ایس سی کے فرست ائیر میں قسم سے میں نے واقعی محنت کی تھی اور بورڈ میں ۱۱ سرے ہائی ایسٹ مارکس تھے میرے۔ اب مجھے پوزیشن لینی تھی۔ انہیں یا ای کو خوش کرنا تھا۔ وہ کہتیں اگر تم فیل ہوئی تو تمہارا کمپیوٹر بند رہا دوں گی۔ یہ ماہیں غصے میں ہمیں ہماری پیاری چیز سے دور کرنے کی دھمکی کیوں دیتی ہیں ہمیشہ؟“ ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑا۔ سر ہملائے وہ بول رہی تھی اور وہ سانس روکے سن رہا تھا۔

”تب ہی حمیر امیرے پاس آئی۔ ساتھ میں اس کے ابو بھی تھے۔ میری کمپیوٹر skills کی شہرت دور درست تھی۔ لڑکیاں کام لے کر الٹا آتی ہیں، میں کبھی کرتی ہوں، کبھی نہیں۔ بد لے میں کچھ نہیں لیتی۔ بس تعریف بہت ہوتی ہے۔ حمیر اکو بھی کام تھا۔ اس کی بہن کی محلے کے اسی لڑکے سے دوستی ہو گئی تھی، لڑکے کے پاس اس کی ویڈیو تھی، ابو نے وہاں شادی سے انکار کر کے ایک معزز گھرانے میں رشتہ کروایا۔ مہینے بعد اس کی شادی تھی، مگر وہ لڑکا بلیک میل کرنے لگا۔ عین شادی کے روز ویڈیو کی تصاویر بنا کر فائلشن میں بانٹے گا، یہی کہا تھا اس نے۔ حمیر امیرے پاس آئی، درخواست کی کہ اس لڑکے کا سارا کمپیوٹر ڈیٹا منا دوں۔ کچھ کروں۔ تو..... میں نے کہا کہ وہ اپنے ابو کو بھیجے، کیے۔ اگلی صبح اس کے ابو آئے۔ یہیں ڈرائیکٹ روم میں۔ اسی اسکول تھیں، میں نے انہیں ادھر بھایا، ان کی بات سنی، وہ شرمندہ اور بے بس نظر آتے تھے، بولے کہ میں کیا رکھتی ہوں؟ تو میں نے کہا....“ اس کے آنسوؤں نے سارا منظر وہندہ حلا کر دیا۔ اور اس وہندہ میں سے ایک پرانا منظر ابھرنے لگا۔

ان کا ڈرائیکٹ روم... صوفے پہ بیٹھے اور ہیزر مگر معزز اور شریف سے فاروق صاحب اور ان کے سامنے صوفے پٹا نگ پٹا نگ بہا کر بیٹھی ہیں۔ عینک لگائے، بال فرنچ چوٹی میں باندھے وہ سنجیدہ اور پر سکون نظر آ رہی تھی۔

”میں اس کا موبائل اور گھر کے تمام کمپیوٹر وائرس ڈال کر انفیکٹ کر دوں گی۔ پھر اس کو پیغام سمجھوں گی کہ جن فلیش اور سی ڈیز میں تم نے وہ سب ڈال کر رکھا ہے وہ خراب ہو چکی ہیں۔ جیران ہو کر وہ ان کو باری باری چیک کرے گا۔ یوں ہر شے Infected ہو جائے گی۔“ چند گھنٹوں میں اس کا تمام ڈیٹا مٹ جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ میں اس کے کمپیوٹر تک رسائی حاصل کر کے اس میں موجود اس کی بہنوں وغیرہ کی کچھ زلے لوں گی، پھر ان کے ذریعے اس کو بلیک میل کروں گی کہ اگر نازیہ باجی کے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی کہا تو میں اس کی بہنوں کی تصویریں فوٹو شاپ کر کے اسی کے محلے میں بانٹ دوں گی۔ اس کے بعد اس کی مجال نہیں ہوگی کہ وہ نازیہ باجی کو دوبارہ بلیک میل کر سکے۔“

وہ گویا سانس روکے سن رہے تھے۔ بکشکل سرا ثابت میں ہلایا۔

”بینا آپ یہ سب کر سکتی ہیں؟ واقعی؟ نارمل لوگ تو...“

”میں نارمل نہیں ہوں۔ میں خنیں ہوں۔“ وہ لختے بھر کر کی ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”مگر آپ نے یہ سوچا ہے کہ اگر میں کبڑی گئی یہ سائبر کرامہ ہے آخڑ تو میرا کیا ہو گا؟ بدنام بھی ہوں گی اور جیل بھی ہو گی۔ زندگی تو بر باد ہو جائے گی میری، سو اگر آپ کی بیٹی کے لئے میں اتنا کچھ کرنے جا رہی ہوں تو آپ کو بھی میرے لئے کچھ کرنا ہو گا۔“

”جی بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ آگے کو ہوئے۔

”آپ اوسی پی ہیں، آپ کے پاس اگلے مہینے ہونے....“

”ایک لفظ بھی اس سے آگے مت بولا۔“ وہ لال سرخ ہوتے ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ”سوچنا بھی مت کہ میں ایسا کچھ کروں گا۔“

”میں بورڈ ناپر ہوں، مجھے پیپر زنہ دکھائیں تب بھی دوسری پوزیشن لے لوں گی۔“ وہ بھی ساتھ کھڑی ہوئی، ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ختنی سے بولی۔ ”مگر مجھے پہلی لینی ہے، یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔“

”میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا۔“ انگلی انھا کرختی سے تنہیہ کی۔ وہ تجھی سے مسکرائی۔

”تو پھر کسی اور ایک پھر کے پاس جائیں، اور اس سے کہیں کہ اس لڑکے کا ڈینا مٹا دے، مگر.... میرا ذیٹا کیسے منائے گا کوئی؟ آپ شاید بھول رہے ہیں، وہ وید یومیرے پاس بھی ہے۔“

فاروق صاحب بے یقین سے جھٹکا کھا کر دو قدم پچھے ہے۔

”اور اس وقت بھائی مجھے لگا میں نے اس شخص کو آدمار دیا ہے۔ ان کو قائل کرنا آسان نہیں تھا، مگر وہ مجبور ہو گئے۔ میں نے ان کا کام کر دیا اور انہوں نے میرا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ رزلٹ آنے تک نازیہ کی ویڈ یوتلف نہیں کروں گی، تاکہ وہ میری تحری نہ کرو اسکیں۔ مجھے پہپر زدے دیے انہوں نے اور میں نے بورڈ ناپ کر لیا۔ مجھے کوئی گلت نہیں ہوا۔ رزلٹ والے دن ان کو کال کر کے کہا کہ وہ میرا کے پاس بھی دی ہے، انہوں نے جواباً کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا۔ اتنے میینے گزر گئے مگر مجھے ایک دفعہ بھی گلت محسوس نہیں ہوا۔ جس نے وارث ماموں کو قتل کیا تھا، اسے بھی شاید ایک دفعہ تو دکھ ہوا ہو گا، میں تو ان سے بھی بری نکلی کہ مجھے تو لگا میں پہپر زد لیکھنے بنا۔ بھی دوسری پوزیشن لے سکتی تھی، کوئی جرم نہیں کیا میں نے۔ مگر یہ حق نہیں تھا۔ علیشا کے خط نے مجھے بتایا کہ یہ حق نہیں تھا۔ میں اپنے نمبر لے لیت، مرمر کر میراث پر آجائی مگر میں ٹاپ کبھی نہ کر سکتی کیونکہ مجھے ان کو رین ڈراموں نے پڑھائی سے دور کر دیا تھا۔ علیشا کے خط نے مجھے بتایا کہ میں کتنی بری ہوں۔ تب بھی میں نے سوچا۔ میں فاروق صاحب سے معافی مانگ لوں گی، اور بس۔ سو علیشا کے خط کے بعد میں نے ان کے گھر فون کیا، تو ان کی بیٹی نے بتایا، جس دن میرا رزلٹ آیا تھا، اس روز میرا فون سننے کے بعد وہ اسٹڈی نیبل پر گئے، اپنا ستعفی لکھا، دستخط کیے اور سرو یہس میز پر رکھ دیا۔ حیرا ان کو بلا نے کی مگر تب تک وہ مر چکے تھے۔ وہ مر گئے بھائی۔ برسوں اس نازک عہدے کی دودھاری تلوار پر ایمان داری سے چلے تھے، ان کو میں نے کاش کر رکھ دیا۔ میں نے اس شخص کی جان لے لی۔ میں کوں ہوں بھائی؟ میں کوں ہوں؟، وہ گھنٹوں پر رکھ رہے جا رہی تھی۔

اور وہ سامنے بالکل چپ بیٹھا تھا۔ بہت دیر بعد وہ ذرا سنبھلی۔ سر اٹھایا، ہتھیلی کی پشت سے گیلا چہرہ صاف کیا۔

”میں اب ایڈمیشن نہیں لوں گی۔ ہرگناہ تو بے معاف نہیں ہو جاتا۔ بڑے گناہوں کے بڑے کفارے ہوتے ہیں۔ یہ مت کہنا میں دوبارہ امتحان دے دوں۔ میں ان کتابوں کو دوبارہ کھوں بھی نہیں سکتی، پڑھنا تو دور کی بات۔“ وہ ان پر زہ پر زہ کا غذوں کے مزید گلڑے کرنے لگی۔ پھر نظر میں انھا کر بھائی کو دیکھا۔ وہ بالکل چپ تھا۔

”کچھ تو کہیں۔“

”مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھا، اور بنے دم قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ خشی کا سرمزید جھک گیا اور بہت آنسوؤں میں روانی آگئی۔ بڑے گناہوں کے بڑے کفارے۔۔۔



قصیر کاردار پہ سہہ پہر سرما کی خنہنڈ اور خنکی اندر سوئے اتر رہی تھی۔ لاوٹخ کی دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے ہے تھے باہر کی روشنی نے سارے لاوٹخ کو روشن کر رکھا تھا۔ ملازم کاموں میں لگے آجар ہے تھے۔ ایسے میں اوپنجی کھڑکی کے آگے جواہرات کھڑی تھی۔ مغربی طرز کا سیاہ گھنٹوں تک آتا لباس اور سیاہ ٹائپس میں ملبوس، سینے پر بازو لپیٹے، دامیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں کہنی پر مسلسل دستک دیتی، اس کی شیرنی سی آنکھیں باہر جی تھیں جباں بزرہ زار پر سعدی چل کر آتا دکھائی دے رہا تھا۔

آج اور نگزیب کی وفات کو ساتواں روز تھا اور اس دوران وہ کئی دفعہ جواہرات کا حال پوچھنے آچکا تھا۔ مگر اس آخری ملاقات میں وہ جواہرات کا اس کے سامنے اول فول بول دینا، وہ اس کا میری سے بات کرنا، وہ جواہرات کو ابھی تک چھبرہ رہا تھا۔

اور پھر اس کی تیکھی نظروں میں مزید ناگواری ابھری۔ بزرہ زار پر چل کر آتا سعدی درمیان میں رکا۔ میزی جو ترے انھائے گزر رہی تھی،

اس لے فناہب کرنے پر کراس سے بات کرنے لگی۔ جواہرات کو الفاظ اتنی دور سے نئی نہیں دے رہے تھے مگر اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیا اس کو اپنے گھر میں چین نہیں جو روز چلا آتا ہے؟" عقب میں نو شیر والے کہا تو وہ چوک کر لئی۔ وہ حسیوں میں باٹھ ڈالے۔ "اٹا کواری سے کھڑکی کے پار سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

"اب مجھے برا بھلامت کیجیے گا کہ میں نے آپ کے دوست کی شان میں گستاخی کر دی۔" ساتھ ہی اکتا ہے ہوئے انداز میں ہاتھ الہ، یہ کہ وہ ڈانٹ سننے کے موڑ میں نہیں ہے۔ جواہرات چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر مزکر کھڑکی کو دیکھا۔ یونچ کھڑے سعدی اور میری اینجیوں اور ہم افنتو تھے۔ میری کچھ کہے یا نہیں، جو وہ اس دن خود اتنا کچھ کہہ جگی، وہ بھی خطرناک تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو اسے یہاں ہر وقت نہیں آنا چاہیے۔ تو پھر کیوں نا اس کا اس گھر میں داخلہ بند کر دوں؟" چکتی ہوئی آنکھوں نے ملراتی وہ شیر و کی طرف گھومی۔ سات دن بعد وہ بالآخر سنبھلی ہوئی، پرانی والی جواہرات لگ رہی تھی۔

نو شیر والے جیرت سے اسے دیکھا۔ "آپ کیا کریں گی؟"

"جو میں کروں گی، وہ تمہارے بھائی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھئے؟"

نو شیر والے کو چند لمحے لگے اس کا مطلب سمجھنے میں اور بھر اس کا سرخود بخود اثبات میں ہل گیا۔ "سمجھ گیا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ ایڑھیوں پر گھومی اور تیز تیز قدم اٹھاتی آگے چلتی گئی۔ اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔ شیر و تیزی سے

لہٹ پکا۔



## باب 10:

## عقد

وہ خائن وقت کی کچھ بے دیانت سا عتیں ہوں گی  
میرے اندر کا "میں" مجبوس کرڈا لا گیا پر ہوں زندگی میں!  
برداشتی لا ابادی وقت تھا  
جو ہو گیا ایک مشتعل پچھا!  
دی زندگی میں متعلف کر کے چالی قلزمِ ملوک میں چینگی  
کہیں تو سعیتِ افلاک میں چینگی  
وہ چالی اب نہیں ملتی!  
متعلف در نہیں کھلتا!  
مجھے تو خود سے ملنا تھا۔  
میں کب تک وسعتِ افلاک چھانوں گا؟  
کہاں تک دھنڈ میں کھوئے ہوئے آفاق چھانوں گا؟  
(سید نصیر شاہ)

سزہ زار پر میری اتیخو کھڑی ابھی تک سعدی سے بات کر رہی تھی۔ جواہرات سینے پہ بازو پیش چلتی قریب آئی تو آوازیں بھی سنائی دیئے گیلیں۔

"میرا خیال ہے بلکہ جتنا تمہارے بیٹھے کے کینسر کو میں نے ریسرچ کیا ہے وہ آپریشن کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فلک مرست کرو۔ پیاری کا جلد علم ہو جانا تو اچھی بات..... وہ اسے تسلی دیتے مڑا تو جواہرات اور شیر و چلتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ سعدی نری سے مسکرا یا اور سر کو خدمت کر سلام کیا۔

"مسز کار دار آپ کو پہلے سے بہتر دیکھ کر خوشی ہوئی۔"

"اُن دونوں میں اتنی دفعہ دیکھ کچھ ہو، فرق تو نظر آیا ہو گا۔" وہ بظاہر مسکرا ای اور عین اس کے سامنے آرکی۔ سعدی کو.... کچھ مجبوس ہوا۔

نگاہیں جواہرات کے کندھے کے پیچھے شیر و تک لگنیں جو تنفس سے اسے گھورا ہاتھا۔

"پوچھ کری ہوں میری ملازمت سے کیا بات ہو رہی تھی؟" وہ اب بھی مسکرا رہی تھی مگر آنکھوں سے شعلوں کی پیشیں اٹھا اٹھ کر باہر کو

”میری نے مجھے بتایا تھا اپنے بیٹے کے کینسر کے بارے میں۔ میں نے اس کو انٹرنسیٹ پر سچ کیا تو۔۔۔“  
”یہ ہاشم کو بتانے والے مسئلے ہیں میری انجیو، یا گھر آنے والے ہر دوسرے شخص کو؟“ مسکراتی مگر سلگتی آنکھوں سے میری کو گھورا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑا۔ وہ سوری کہتی، ندامت سے سر جھکائے ائے قدموں مزگئی۔ سعدی کی مسکراہٹ سکتی۔ اچنپھے سے جواہرات کو دیکھا۔  
”آئی ایم سوری، مسز کاردار میں آپ کی خیریت پوچھنے آیا تھا، اور۔۔۔“

”خیریت پوچھنے یا یہ معلوم کرنے کے اور انگریزیب و صیت میں تمہاری بہن کے نام کچھ جھوڑ کر تو نہیں گے؟“  
سعدی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”جی؟“ اس نے بے شفہی سے ان دونوں کو دیکھا۔

”میرے بیٹے کے خلاف اس کے باپ کے کان بھرتے وقت تمہاری بہن نے ذرا احساس نہیں کیا کہ یہ صدمہ اور انگریزیب کی جان لے سکتا ہے؟ بلکہ صرف وہی کیوں، تم دونوں شامل تھے نا اس ڈرامے میں! کیا سوچتا ہے؟ اپنے بیٹے کو دوں اون کر کے اپنی جائیداد تم لوگوں کے نام لکھ جائے گا وہ؟“ مسکراہٹ ہنزوں لبوں پتھی، مگر آواز غصے سے بلند ہو رہی تھی۔

”مسز کاردار، آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ سعدی نے ناگواری سے انہیں ٹوکا۔ جواہرات کی آنکھوں کی رگیں گلابی پڑنے لگیں۔ سینے پر بازو لپیٹے وہ وہ قدم مزید آگئی۔

”کیا تھا اگر تم دونوں انگریزیب کے بجائے مجھے یا ہاشم کو تباہی میں وہ سب بتا دیتے، مگر تم نے ذرا اس شخص کا احساس نہیں کیا؟ اس کو اندر رہی اندر یہ غم کھا گیا سعدی، اور وہ اس حالت میں مرا کہا پنے بیٹے سے ناراض تھا اور اس سب کے ذمہ دار تم ہو۔“ اس بات پر سعدی نے فوراً سنجیدگی سے اثبات میں سر بھالیا۔

”جی ہاں بالکل، اپنے آپ کو انواع بھی میں نے کیا تھا اور جھوٹ بول کر باپ سے پیسے بھی میں نے مانگے تھے نا۔“ وہ تنے ابرد کے ساتھ ناگواری سے بولا تو جواہرات لمحے بھر کو چپ ہوئی۔

”اے۔۔۔ میرے باپ کا نام بھی نہ لینا۔“ نوشیروالا نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ انگلی اٹھا کر تنہیہ کی۔ ”تم لوگوں نے ان کو میرے خلاف درغایا تھا، اس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”میں معافی مانگ بھی نہیں رہا۔ میں صرف مسز کاردار کی طبیعت پوچھنے آیا تھا۔“ وہ بکشکل ضبط کر پایا۔

”میری طبیعت دیکھ لی تم نے؟ میرا شوہر اس حالت میں مرا کہ وہ شیر و کوڑس اون کرنے والا تھا۔ دیکھ لیا ہم کتنی اذیت میں ہیں؟“ نوشیروالا نے تدرے پونک کر ماس کو دیکھا۔ وہ سعدی کو دیکھتی تکلیف اور برہی سے کہہ رہی تھی۔

”اس سے پہلے بھی تم شیر و کی زندگی تناک کرتے رہے ہو، مگر اس دفعہ تم لوگوں نے حد کر دی سعدی!“ یہ آخری نظرہ شیر و کو دیکھ کر ادا کیا جس پر اس کا غصہ مزید بڑھا، اور اس نے نفرت سے (ہونہ) سر جھٹکا۔

سعدی نے ایک ناپسندیدہ نظر دونوں پڑا۔ سر کو خم دیا (بہت اچھا)۔ وہ قدم پیچھے ہٹا، اور پھر نوشیروالا کو مخاطب کیا۔

”تم نے کبھی وہ کچھ رے کے ڈبے دیکھے ہیں نوشیروالا جو سڑک کنارے نصب ہوتے ہیں۔ ان پر کھا ہوتا ہے Use Me۔ تم نے بھی خود پر یہی حروف لکھوار کھے ہیں۔ جو بھی آئے اپنا کچھ صاف کرنے کے لئے تمہیں استعمال کرے (جواہرات پر تیز نظر ڈالی) اور چلا جائے۔ سو میں مزید آپ کی ان گیمز کا حصہ نہیں بن سکتا۔ اللہ حافظ۔“

وہ مژا اور مخالف سمت چلتا گیا، اور جب تک نوشیروالا کو اس کا نظر سمجھ آیا، وہ دور جا چکا تھا۔

”الوکا۔۔۔“ وہ مٹھیاں بھیجن کر رہ گیا۔ ”اگر یہ دوبارہ ادھر آیا ناگی تو۔۔۔“

”اگر غیرت ہوگی تو دبارہ اس گھر میں داخل نہیں ہوگا اور اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ غیرت والوں میں سب سے زیادہ غیر والا ہے۔“

جو اہرات اذیت سے مسکراتی، اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ نو شیر وال کے اندر کی آگ ٹھنڈی ہونے لگی۔ ڈھیلے پڑتے ہوئے اس نے گھری سانس لی اور مژے نے لگا، پھر لیکی رکا۔

”وہ آپ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے کہا تھا نا؟ ڈینڈ مجھے ڈس اون تو نہیں کرنے لگے تھے نا؟“، جواہرات نے چونک کرائے دیکھا جو قدرے تذبذب مگر امید سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جواہرات کی مسکراہٹ پھیلی پڑی، آنکھوں کی سفیدی گالی۔ نم گالابی۔

”نہیں وہ تمہیں... تمہیں کبھی ڈس اون نہیں کر سکتے تھے۔ یہ میں نے صرف.... بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے کہا تھا۔“ اثبات میں سر بلکہ تقدیق کی۔ بہت سے آنسو اندرا تارے۔ نو شیر وال پر سکون سا ہو کر آگے بڑھ گیا۔ جواہرات نے ہاتھوں کی نبی چھپانے کے لئے مٹھیاں بند کر لیں۔ پھر گردان موڑ کر برآمدے میں کھڑی میری کو دیکھا۔ اس کا کیا کرے؟ اصل گواہ جو خود بھی اپنی گواہی سے لام تھا، وہ تو ابھی ادھر ہی تھا۔

❖❖❖

ترک تعلقات کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ تو وہ راستہ ہے کہ بس چل پڑے کوئی سعدی سرخ کانوں اور تنے تاثرات کے ساتھ قصر کاردار کے داخلی گیٹ سے باہر نکلا، ہی تھا، تاکہ اپنی کارٹک جائے کہ سامنے نہ رک کر آتی دکھائی دی۔ وہ قدم قدم چلتا سڑک پر جا کھڑا ہوا۔  
بپاڑی پر بل کھاتی سڑک دیران تھی۔ اردو گروں کے فاصلے پر اوپنے محلات تھے، جو کاردارز کے قصر کی مانند و سعیج بیزہ زار میں دروازہ کھول کر اندر آ بیٹھا۔

”آپ ادھر کیسے؟“

”جنازے کے بعد دوبارہ آنہیں سکی، سواب مسز کاردار کے لئے آئی تھی۔ وہ ہپتال میں مجھے وزٹ کرنے اکثر آتی تھیں، میرا آنا بنتا ہے۔“ خشک سپاٹ انداز میں وڈا سکرین کے پار دیکھتے وضاحت دی۔ سعدی نے ڈیش بورڈ پر نظریں جمائے انتظار کیا، کہ وہ شاید کہے (سب تم میرے پاس نہیں تھے، تب وہ آتی تھیں) مگر وہ گلہ ہی تو نہیں کرتی تھی۔  
”اور تم ادھر کیسے؟“ چہرہ موڑ کرائے دیکھا تو سعدی نے بھی اس کی جانب گردان پھیری۔ دونوں کی نظریں میں۔ دونوں نے عہد کر رکھا تھا کہ دل کی بات نہیں کہنی۔

”مسز کاردار کو دیکھنے آیا تھا اور اب اچھے سے دیکھ چکا ہوں۔ سو ماپسی کے سفر کی تیاری کر رہا تھا۔“  
زمر چند لمحے خاموش رہی۔ پھر زمزی سے کہنے لگی۔

”میں نے معلوم کیا تھا ہاشم اس کیسی میں ملوٹ نہیں ہے۔ کم از کم بظاہر تو نہیں ہے۔“

”خود معلوم کیا یا کسی اور نے کر کے دیا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا کیونکہ اس کے نزدیک دونوں میں اتنا فرق تھا جتنا پہلے اور ساتویں آسمان میں۔

”خوب نہیں کیا مگر...“ وہ رکی ” بصیرت صاحب نے اسے چیک کیا تھا، اس کا کوئی عمل خل نہیں ہے اس معاملے سے، مگر تم بتاؤ، تمہیں

ایسا کیوں لگا کہ ہاشم اس میں ملوٹ ہو سکتا ہے؟“

”مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگا۔ بس جس کا نام منہ میں آیا بول گیا۔ آئی ایم سوری، مجھے یوں کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے تھا۔“ اس نے مادگی سے معذرت کر لی۔ زمر بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

”تم نے اس کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دی، میں اتنے دن اس کی پوچھ چھ کرواتی پھر رہتی تھی اور اب تم کہہ رہے ہو کہ تم نے پونہی کہہ دیا تھا؟“ شدید غصے کو بہشکل اس نے ضبط کیا۔ تو وہ سارے دن جو اس نے فارس کے حق میں کوئی بھی بات ڈھونڈنے میں صرف کیے، وہ سب ایک مذاق تھا؟

”مجھے سمجھ نہیں آیا کس کا نام لوں۔ بس ان کا لے لیا۔ یہ لوگ... انگلی سے کاردار قصر کی جانب اشارہ کیا۔“ اب میرے ساتھ پہلے کی طرح برتاؤ نہیں کرتے۔ مجھے شاید اسی بات کا غصہ تھا۔ وہ بہشکل ضبط کرتی اسے گھوڑتی رہی۔ اس نے ندامت سے سر جھکا دیا۔ بلکہ سا بولا۔ ”سوری!“

”اور تم نے ہاشم سے یہ کیوں کہا کہ وہ آڑ یوں میں نے نکلا کر دی تھی؟“ سعدی نے جھٹکے سے سراخھا۔

”یعنی انہوں نے آپ سے پوچھا؟ تو پھر کیا کہا آپ نے؟“

”جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔“

”معلوم ہے۔ تب ہی کہا تھا۔“ وہ اداسی سے مسکرا یا۔ سب کچھ دیے ہی ہوا تھا جیسے اس نے سوچا تھا۔

”میں ان سے خفا تھا، کیونکہ وہ بھی آپ ہی کی طرح فارس ماموں کو قاتل خیال کرتے ہیں، اور اب چونکہ میں ماموں کے لئے کوشش کر رہا ہوں تو وہ مجھ سے خفایہں۔ مگر مجھے اچھا لگا کہ آپ نے میرا مان رکھا۔ اور آپ ماموں سے ملنے جیل گئیں، اس کے لیے شکر یہ۔“

”کیا تمہارے ماموں نے تمہیں یہ بتایا کہ اس نے مجھے استعمال کر کے جیل توڑنے کی کوشش کی؟“

سعدی کی مسکراہٹ غالب ہوئی۔ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ”کیا مطلب؟“

زمر نے مجھنے چند فقرے تفصیل بتانے پر ضائع کیے جس کے بعد سعدی کی رنگت زرد پڑتی چل گئی۔

”آئی ایم شیور پھپھوکوئی غلط فہمی ہو گی ورنہ وہ کبھی ایسے نہیں کر سکتے۔ میں ان سے...“

”سعدی میں تھک گئی ہوں!“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کو بولے سے روکا۔ ”میں نے اس کیس سے بھی خود کو الگ کر لیا ہے۔“ میں مزید فارس کے مسلوں میں نہیں الجھنا چاہتی۔ پھر بھی میں دوبارہ ابھی۔ اتنے دن میں نے پہلی دفعہ فرض کرنا شروع کیا کہ وہ بے گناہ ہو سکتا ہے، مگر اس نے پھر وہی کام کیا۔ مجھے مزید مت سمجھا۔ اپنے ماموں کو سمجھا تو کھدا را اپنے اور دوسروں کے اوپر رحم کرے۔ مجھے مزید مت ستائے۔ میں نے اس کا کیس خود پر اسکیوٹ نہیں کیا، میں اب گواہی بھی واپس لے چکی ہوں، اور کیا چاہتے ہو تم لوگ مجھ سے؟ جب میرا دل کھتا ہے کہ وہی میرا مجرم ہے تو مجھے زبردستی اس کو بے گناہ کہنے پر مجبور مرت کرو۔ میں نے کوشش کی تھی، میں ہر چیز ایک طرف رکھ کر اس کے پاس گئی۔ اس کے لیے ہاشم کو بھی مشتبہ بنالیا۔ مگر اس نے پھر وہی کیا۔“

”وہ کتنی ہی دیر چپ بیٹھا رہا۔ سر جھکائے۔ پھر آہستہ سے بولا۔“

”آئی ایم سوری۔“ مجھے آپ کو ان کے پاس جانے کے لیے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ آپ کی تکلیف کا اندازہ کرنا چاہیے تھا۔ آپ کی تکلیف ہم میں سے سب سے زیادہ ہے۔ وہ جیل سے چھوٹ جائیں، تب بھی نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں، آپ نہیں شروع کر سکتیں۔ کم از کم اتنے آرام سے نہیں۔ آئی ایم سوری۔ اب ہم اس بارے میں بات نہیں کریں گے۔ لیکن۔“ اس نے چہرہ اٹھا کر امید سے زمر کو دیکھا۔ ”مجھ سے ایک وعدہ کریں۔ ایک دن میں آؤں گا آپ کے پاس ثبوت لے کر، تب آپ کو مجھے سننا ہو گا، اور اگر وہ ثبوت قابل قبول ہوا

تو اسے ماننا بھی ہو گا۔“

”شیور!“ اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”میں تو تم سے ہمیشہ کہتی رہی ہوں، مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ جو میں مان بھی سکوں تو میں ضرور مان لوں گی۔“ پھر وہ چپ ہو گئی۔ ”سعدی میں تم سے پھر کہہ رہی ہوں، اگر کوئی ایسی بات ہے جو فارس کے حق میں جائی ہو، تو مجھے بتاؤ۔ میں ایک دفعہ پھر اس کی یہ حرکت بھی نظر انداز کر کے اس کے لیے کوشش کرنے کو تیار ہوں۔ اگر کوئی تیرا شخص ملوث ہے تو مجھے بتاؤ۔“ ”نمیں پچھو۔“ اس نے نفی میں سر ہلاایا۔ ”کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ جو سوچتی ہیں، ابھی وہی سوچتی رہیں۔ کچھ ملا مجھے تو آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔ آپ بس اپنا خیال رکھیں۔“

”میرے لیے افسرده مت ہو بیٹا، میں ٹھیک ہوں۔“ اس سے لگاہ ملائے بناؤ وہ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیر اس کا چہرہ تکتا رہا۔

”آپ کی بر تھڈے ہے اگلے میں، میں نے ایک کتاب آپ کے لیے رکھی ہے۔ کبھی وقت ملے تو اسے پڑھیے گا۔ اس میں دل کی بیماریوں کی شفایہ ہے۔“ خاموشی دوبارہ دونوں کے نیچے حائل ہو گئی۔ پھر زمر نے اسے دیکھا، وہ نہزادے ہی دیکھ رہا تھا۔ زمر کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہاتھوں پہنچلیں اور سیاہ کی چین پر آٹھبھریں جو اس نے انگلیوں میں پکڑ رکھا تھا۔ اس پر سنہرے حروف میں لکھا تھا۔“ Ants Everafter

”نیالیا ہے؟“ گو کہ اب وہ تعلق نہیں رہا تھا، نہ بے تکلفی، مگر وہ پوچھ بیٹھی۔ اس نے جواباً گردن جھکا کر کی چین کو دیکھا۔ نفی میں سر ہلاایا۔

”اوہ بھوں۔ علیشا نے خنین کو دیا تھا۔ خنین کے لئے اس کے ساتھ تکلیف دہ بادیں جزی ہیں، سو یہ میں نے رکھ لیا۔ آج صبح گھر سے نکلنے سے پہلے یونہی حد کے کمرے میں گیا اور اٹھا لایا۔“ سیاہ ہیرے نما پتھر پر انگلی پھیرتے وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ بالخصوص یہ عبارت۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ اس کی آواز میں قدرے نے زمی در آئی تھی۔ پوچھتے ہوئے وہ اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ وہی بچ تھا جس کو اس نے انگلی پکڑ کر چلانا سکھایا تھا؟

”جب میں چھوٹا تھا پچھو تو ابو کے ساتھ فخر پڑھنے مسجد جایا کرتا تھا۔ تب وہاں مسجد کی دیوار پر چھت سے فرش تک چیزوں کی قطار ہوتی تھی۔ ہر موسم میں ہر گھر ہی میں۔ تب ابو کہا کرتے تھے، اگر مجھے کچھ ہو جائے سعدی تو تم اپنے خاندان کا خیال رکھنا۔ بڑے ابا ایک کمزور مرد ہیں گرتمہیں بہادر بنتا ہے۔ تم سعدی میرے بعد اس خاندان کے بڑے مرد ہو گے۔ اور تمہارے خاندان کی عورتیں بُوڑھے اور بچے یہ سب چیزوں کی طرح ہیں، کمزور اور نازک۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، بادشاہ اور چیونیاں۔ تم سعدی اپنی چیزوں کو جوڑ کر رکھنا۔ تم سعدی میرے بعد اپنے خاندان کے سربراہ ہو گے۔“ کی چین سے نظریں اٹھا کر اس نے اداں مسکراہٹ سے زمر کو دیکھا۔ ”اور میں پچھلے کئی برس سے یہی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اور کرتار ہوں گا۔ آپ جو، امی سب ایک جیسے ہیں۔ چیزوں میں اور معلوم ہے پچھو چیزوں میں کیا قدر مشترک ہوتی ہے؟“

وہ کتنا پیارا بولتا تھا، مخصوص اور سادہ۔ نگاہیں اس پر جمائے زمر نے نفی میں سر ہلاایا۔ وہ اس کی جانب جھکا اور آہستہ سے بولا۔

”وہ یہ ک..... ساری چیزوں میں اندھی ہوتی ہیں۔“ اور پھر اس نے لاکھوں اور واٹہ و اکیا اور سلام کہہ کر باہر نکل گیا۔ زمر اسٹریگ ک پر ہاتھ رکھ کر تھی دیرو ہیں بیٹھی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ لمحے بھر کو اس کا دل چاہا کہ اسے روک لے، مگر۔ روکنے کے لیے کوئی بہانہ نہیں تھا۔

اگلے ڈیڑھ سال تک اس نے سعدی کو نہیں دیکھا۔ نہ وہ اس کی موجودگی میں آیا، نہ وہ ان کے گھر گئی یہاں تک کہ ہاشم نے ایک روز

آ کراس سے کہا کہ وہ سعدی کو سونی کی سالگرہ کا کارڈ دے آئے..... اور چار سال بعد زمر کو وہ بہانہ مل ہی گیا جس کی لاشوری طور پر اسے تلاش تھی۔

❖❖❖

شقق اپنے بھی کیا نہ لے ہیں ..... آستینوں میں سانپ پالے ہیں جس وقت زمر اور سعدی باہر کار میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، قصر کے اندر اپنے کمرے میں اوپر کرتی پہنچی جواہرات، نگل کی انگوٹھی تھما تے، سوچ میں موت تھی۔ کمرے کے کھلے دروازے سے لا و نج میں نئی فلپینو لڑکی فیجن نا بکٹ اور سوب لئے میرھیاں صاف کرتی نظر آ رہی تھی۔ دفعتاً جواہرات نے موبائل نکالا اور ایک نمبر ملا کر انھی، دروازہ بند کیا اور پھر فون کان سے لگایا۔

”جی ڈاکٹر آف قاب۔ کیا حال ہیں؟ فیصلی کیسی ہے آپ کی؟“

”سب... بھیک ہیں مسز کار دار ہیں۔ آپ کی طبیعت کسی ہے؟“ وہ پھر کام سکرا کر بولے۔

”ہوں۔ ایم فائس۔“ نخوت سے بولی، ذرا وقفہ دیا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھ لی تھی میں نے۔ میں مطمئن ہوں۔ اب آپ مجھے بتائیں، کیا کوئی غیر مطمئن تو نہیں؟“ ”نہیں۔“ وہ لمحے بھر کر کے ”ہاشم نے اور ان کے سیکیورٹی آفیسر خاور نے، ان دونوں نے مجھ سے پوچھا تھا، اور انگریز صاحب کے چہرے کے بارے میں۔“

”کیا پوچھا تھا؟“ اس کا سانس رک گیا۔

”کاردار صاحب کی موت سرکی چوت کی وجہ سے نہیں ہوئی، دم گھنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسمودر نگ کے باعث ناک اور اس کے اطراف کا حصہ کافی سفید سا پڑ گیا تھا۔“

”تو آپ نے کیا کہا؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”یہی کہ کاردار صاحب کا ایستھما بگزرا تھا، وہ اسی وجہ سے گرے تھے اور چوت لگی، موت بھی اسی وجہ سے ہوئی۔ وہ دونوں ڈاکٹرز نہیں ہیں، مطمئن ہو گئے تھے کیونکہ بہر حال کاردار صاحب کو شدید مدد تو تھا ہی۔ ویسے بھی homicidal smothering کی تشخیص بہت مشکل سے ہو پاتی ہے۔ سو میں نے وہ بات سنچال لی تھی۔ یہ ایک طبعی موت تھی۔“

جوہرات کی انکی سانس بحال ہوئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کیا۔ چند معقول کی باتیں کہہ کر فون رکھ دیا۔ پھر انھ کر دروازہ کھولا۔

فیجن انسانی کرتی اب آخری زینے تک آچکی تھی۔ جواہرات نے اسے بلکہ سے آواز دی۔ وہ چیزیں رکھ کر موڈب سی چلی آئی۔ ”خمنہ آ رہی ہے، دروازہ بند کر دو۔“ وہ واپس کری پا آن پہنچی اور مسکراتی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ فیجن نا سب رفتاری سے دروازہ بند کر کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ جواہرات نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ سیاہ بالوں کی پونی بنائے، پھینے چینی نقوش والی خوش شکل اور کم عمر لڑکی تھی۔

”کام میں دل لگ گیا ہے تمہارا؟“

”جی۔ میری ایسیخیو نے سب سکھا دیا ہے مجھے۔“ تدرے شرما کر بولی۔

”ہوں۔ پیچھے گھر میں کون ہوتا ہے تمہارے؟“

”ماں اور چار بہنیں، ایک بھائی۔ میں سب سے بڑی ہوں۔“ سر جھکائے اس نے لب کھلے۔ آنکھوں میں نبی آئی۔

”تمہاری تنخواہ سے ان کا گزر بر اچھا ہوتا ہو گا مگر بھائی کو پڑھانا، عزت دار نوکری دلوانا، یہ سب تو مشکل ہو گا ہوں؟“ وہ ایسے لگ پڑا۔

اُنگلی پھیرتی غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فینیجن نے جھکے سر کو انبات میں جبکش دی۔  
”یقوت ہے۔“

”کاش میں تمہاری تنواہ بڑھا سکتی، مگر میری انجیو ہیڈ اسٹاف ہے اور تم صرف ایک ماتحت میڈ۔ ہاں اگر تم میری انجیو کی جگہ ہوتی تو لاکھوں میں کھیلتی، لیکن...“ فینیجن نے جھکی پلکیں اٹھائیں۔ امید اور خوف کے ملے جلتا تاثر سے اسے دیکھا۔  
”لیکن؟“

”اس کی پوزیشن پر پہنچنے میں تو تمہیں سات آٹھ سال لگ جائیں گے۔ اس کا اگلے تین سال تک کا معابدہ رہتا ہے ہمارے خاندان سے۔ اور اس کی رو سے میں اسے بے وجہ نکال نہیں سکتی۔“ وہ رکی۔

فینیجن نے تابعداری سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی، وہ بہت اچھا کام کرتی ہے۔“

”مگر وہ تمہاری طرح تیز اور پھر تیل نہیں ہے۔ اس کو اپنے بچے کی فکر کھائے جاتی ہے جس کو وہ فلپائن میں چھوڑ آئی ہے۔ تم اسے بہتر ہیڈ اسٹاف بن سکتی ہو۔“

”مگر... یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ اگلے کئی سال تک اسی پوسٹ پر ہے گی اور آپ اسے نکال بھی نہیں سکتیں۔“ قدر ہے مایوسی اور بے دلی سے کہتے اس کی آنکھیں پھر بھکیں۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اسے نکال نہیں سکتی۔ چاہوں تو ابھی نکال دوں۔ کھڑے کھڑے... مگر اس کے لئے وجہ کا ہونا ضروری ہے۔“

” وجہ؟“ فینیجن نے چونک کر اسے دیکھا۔ الجھن سے ابرو سکیز ہے۔

”ہاں۔ جیسے چوری۔“ ایئرنگ کو دو انگلیوں سے مسلتے وہ مسکرائی۔

”جس دن اس نے چوری کی، وہ ذمی پورٹ کر دی جائے گی۔ اور مجھے معلوم ہے وہ جلد یا بدیر چوری ضرور کرے گی۔ اسے اپنے بچے کے علاج کے لئے پیسے درکار ہیں، تنواہ سے بھی کئی گناز زیادہ۔ جب اسے یہ معلوم ہو گا کہ یہ باسک...“ سنگھار میز پر کھٹے سے جیولری باسک کی جانب اشارہ کیا۔ ”جس کا کوڈ میری تاریخ پیدائش سے کھلتا ہے، اور اس میں میرا ایک فیمتی نیکلیں رکھا ہے تو کیا وہ خود کو روک پائے گی؟ اسے اس بارے میں سوچنا چاہیئے، ہے نا۔ فی اونا؟“ تھہر تھہر کر مسکرا کر اس کا نام ادا کیا۔

زمر کے آنے پر جب فینیجن اسز کاردار کے کمرے سے نکلی تو اس کی آنکھیں ایک انوکھے خیال سے چمک رہی تھیں۔

.....❖❖❖

جو کھلی کھلی تھیں عدا تو میں مجھے راس تھیں ..... یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے  
ہاشم کاردار کا آفس جس فلور پر تھا، اس کی راہداری سپاٹ لائیٹس سے جگلگاری تھی جب سعدی کی لفت کا دروازہ کھلا۔ نکلنے سے قبل اس نے لفت کے آئینے میں اپنا عسکر دیکھا، ذرا رکا، گریبان کا اوپری مبن کھولا، سوئیٹر کے آستین پیچھے چڑھائے، ماتھے پر ہاتھ مار کر بال ذرا بکھیرے، پھر باہر نکلا۔ تیز قدموں سے راہداری پار کی۔ لمحے بھر کو ہاشم کے آفس کے باہر بنے ذیک پر کا۔  
”ہاشم اندر ہیں؟ مس حلیمه؟“ ذیک پگلی نیم پلیٹ پر نظر ڈال کر سخیدگی سے پوچھا۔ خوبصورت سی سیکرزری نے ٹاپ کرتے ہاتھ رو کے اور زنگا ہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”جی، مگر وہ کچھ کام کر رہے ہیں۔ آپ کے پاس اپاٹنگٹھ ہے؟“

”ضرورت نہیں ہے۔“ تیلخی سے کہہ کر وہ آفس ڈور تک آیا اور دروازہ دھکیلتا اندر واصل ہو گیا۔ حلیمه ہڑا کر پیچھے پلکی۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ بہت غصے سے وہ اس کی میر تک جا پہنچا۔ ہاشم جو کوٹ پیچھے لکھا ہے، شرٹ اور ویسٹ میں ملبوس

بیخافائل پہ کچھ لکھ رہا تھا، اس نے سراخا کر کے دیکھا، پھر پیچھے آتی حیلہ کو اور آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ رکی اور پھر لپٹ گئی۔ سیٹ پہ پیچھے کو نیک لگاتے، اس نے اب سمجھ دی گئی سعدی کو دیکھا جو غصیلی آنکھوں اور سرخ کانوں کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ بنا کسی غصے یا تنقی کے بھی ہاشم بولا تو آواز سخت تھی۔ اسے سعدی کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔

”یہ تو آپ بتائیں گے۔“ دونوں ہاتھ میز پر رکھے وہ سامنے کو جھکا۔ ”زمرو کیوں بتایا جو شین نے آپ کو بتایا تھا؟“

”انتی کیا بڑی قیامت آگئی ہے سعدی کہ تم اپنے میز زکھول گئے ہو؟“ اب کے اس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ قلم میز پر ڈالا۔ ثانی کی ناث ڈھیلی کرتے نیک لگائے اس لڑکے کو دیکھا۔

”اعتنت بھیجا ہوں میں میز زکھاں۔ مگر آپ کے میز زکھاں ہوئے جب حد اور میرا اعتماد توڑا؟“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ زمر تم لوگوں کے لئے غیر ہے۔ بتانے کا شکر یہ۔ اب میں کام کرلوں؟“ تلخی سے اس کو گھوڑتے سامنے فائدوں کے ڈھیر کی جانب اشارہ کیا۔ ”اور تم بھول گئے ہو تو یاد دلا دوں کہ میں اہم معاملات میں الجھا ہوں، اور اپنی تماکن میز اور کاریٹل کی ان دونوں سر برآتی کر رہا ہوں کیونکہ میرا بابا سات دن پہلے مر آہے۔“

”میرا بابا دس سال پہلے مر اتھا، اس لئے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم باپوں کو درمیان سے نکال کر بات کریں۔“ اس انداز پہ ہاشم نے اب ”اوہ“ میں سکیرے، تعجب سے ابرد اتھا۔

”تو تم مجھ سے لڑ نے آئے ہو؟“ اس نے زور سے فائل بند کر کے پرے کی اور ڈھیر و غصہ ضبط کیا۔ سارا مودہ غارت ہو گیا تھا۔

”میری کیا مجال کہ میں آپ سے لڑوں؟ میں صرف آپ کو کفرنث کرنے کے لئے آپ کے آفس سے بہتر جگہ کوئی نہیں تھی۔ سو مجھے بتائیں، کیوں بات کی آپ نے زمر سے؟ انہوں نے مجھ پہ اعتماد کیا تھا، اب کیسے دوبارہ کریں گی؟“ وہ کافی بد تیزی سے کھڑا بول رہا تھا۔

”کیا میں نے تم سے جواب مانگا تھا جب تم نے میرے کیے دکیل کو فائز کیا تھا؟“ وہ تلخی مگر ضبط سے بولا تو سعدی مزید بھڑک اٹھا۔

”ماں تکیں جواب۔ میں دوں گاہر جواب۔“ ساتھ ہی میز پہ زور سے ہاتھ مارا اور اتنے غصے سے وہ اسے گھوڑ رہا تھا۔

”تو کیوں کیا میرے دکیل کو فائز؟“

”کیونکہ وہ دکیل بھی آپ جیسا تھا ہاشم بھائی۔ آپ کی طرح اسے بھی فارس غازی کی بے گناہی کا یقین نہیں تھا۔ آپ کو کیا لگتا ہے میں پچھہ ہوں؟ اونہوں!“ نفرت سے اسے دیکھتے سرفی میں ہلایا۔ ”مجھے سب سمجھا آگیا ہے۔ آپ کو بھی اندر سے سیکی لگتا ہے کہ فارس نے قتل کیے ہیں۔ آپ بھی ان کو برائحتی ہیں۔ اوپر سے آپ جو بھی کہیں اندر سے آپ نے بھی ان کو اکیلا چھوڑ دیا ہے۔“

”بالکل، میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔۔۔ پھر؟ کیا کرو گے تم؟“ وہ اب بھی برداشت کر رہا تھا۔

”میں آپ سب پہ ثابت کروں گا کہ قتل انہوں نے نہیں کیے تھے۔ آپ زمر، سب ایک جسے ہیں۔ آپ سب نے ان کو اکیلا کر دیا ہے۔ اتنے سال میں آپ ایک دفعہ ان سے ملنے جیل نہیں گئے۔ لوگوں کی باتیں آپ کے دل میں بھی بیٹھ گئی ہیں، اور آپ بھی۔ آپ بھی باقیوں کی طرح ہی ہیں۔“ کہتے ہوئے وہ بے حد ہرث اور دکھی سالگتا پیچھے ہٹا۔ ہاشم سختی اور ناپسندیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ دکیل کے بدلا و پہ پاز پرس کرنے پر تم مجھ سے ایسے بات کرو گے تو میں اس ذکر کو نہ چھیڑتا۔“ ہاشم کا صدمہ اور غصہ، حقیقی تھا۔

”مجھے آپ کی بات سے فرق نہیں پڑتا۔“ وہ پیچھے نہتے مزید بلند آواز میں غصے سے بولا تھا۔ ”آپ کا انتیج میری نظر وہ میں تباہ ہو چکا ہے۔ اس لئے بتا دوں، آپ کے والد کے چہلم کا دعوت نام آیا تھا، میں نہیں آؤں گا،“ میرے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔ آئندہ ہمیں کسی بھی

دعاوت پہ بلانے کی زحمت نہیں سمجھتے گا، انکار سن کر آپ کو خود شرم دنگی ہو گی۔“ تغیر سے جذبائی انداز میں کہتا وہ مڑا اور باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کرتے اسے اندر کا منظر جو نظر آیا اس میں ہاشم غم و غصے اور قدرے صد میں بیخا سے دیکھ رہا تھا۔ پھر دروازہ بند کر دیا۔ راہداری میں چلتے سعدی نے گھری سانس لی۔ دانستہ بھر کائے اور تنے اعصاب کو گویا ڈھیلا کیا۔ باٹھا بھجی قدرے لرز رہے تھے اور دل دھڑک رہا تھا۔ لفت کے پاس رکات و اس کے دھاتی دروازے میں اپنا عکس دیکھتے خود کو شاباش دی۔

(اچھی پر مار نہشی سعدی! اگر جواہرات یہ نہ کرتی، تب بھی میں نے ان کے گھرنے جانے کا کوئی توبہ نہ ڈھونڈنا ہی تھا، کہ اب ان کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھانا، بنس کربات کرنا، سب عذاب تھا۔ ہر جگہ وارث کا خون نظر آتا۔ سوا چھا کیا تم نے سعدی۔ اب ہاشم بھائی کم از کم یہ نہیں جان سکیں گے کہ میں ان کی اصلیت جانتا ہوں۔ اسے صرف اعتماد توڑنے کا غصہ خیال کریں گے، اگر نہ کرتا تو میرے کھنچے کھنچے دیے سے وہ سمجھ جاتے۔ بہت اچھا کیا سعدی۔ روز ان کی شکل نہ دیکھنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا!) لفت میں کھڑے کرتے وہ خود کو نارمل کرتا، داد دے رہا تھا۔ دل البتہ ویران ساختا۔ آنکھوں میں بار بار نبی آتی جسے وہ سوئیٹر کے آتنیں سے رگز لیتا۔

❖❖❖

بھولنے والا لوٹ تو آیا..... وقت مغرب یا عشاء کا تھا

چھوٹے باعیچے والے گھر میں کچن سے کپٹے کھانے کی مہک یوں پھیل رہی تھی جیسے پانی کے گلاس میں پکا انک کا قطرہ پھیلتا ہے۔ ساری فضا اشتہار انگریز خشبو سے محطر ہو گئی تھی۔ ایسے میں جنین، سعدی کے خالی کمرے میں بے مقصد کری پہنچنی تھی۔ کہداں میز پنکاۓ پر ہتھیلیوں پر گردادیا۔ عینک اتار کر سائیڈ پر کھدو۔ پچھر دیر انگلی سے میز پر لکیریں کھینچتی رہی۔ پھر بیکا یک چوکنی۔

قریب میں سفید جلد والی کتاب رکھی تھی۔ ساتھ ریپا اور کارڈ۔ سعدی وہ کتاب کسی کو تھنے میں دے رہا تھا؟ اچنچبے سے اس نے کارڈ اٹھایا۔ سالگرہ کا کارڈ، زمر کے نام۔ اوہ۔ پھر ہوکی سالگرہ تھی ناچندوں بعد۔ تو سعدی وہ کتاب زمر کو دینے جا رہا تھا۔ یہ وہی کتاب تھی جو برسوں پہلے اس نے ایک دفعہ یونہی کھول لی تھی۔ اب دوبارہ کھولی تو پہلے صفحے پہ ہاشم کا نام لکھا تھا۔ اس نے نام پر انگلی پھیری اور مسکرا دی۔ پھر بے مقصد صفحے پلٹتی رہی۔ دھنعتا درمیان میں ایک درق پر رکی۔

سات سو برس پہلے کے زر دمانوں کو جاتا دروازہ سامنے تھا۔ جنین نے رک کر سوچا کہ اندر جائے یا نہیں، پھر بنا مزید کچھ سوچے اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے دھکلیا۔ لکڑی کے قدیم مشق پٹ وابوئے۔ وہاں سے ڈھیروں روشنی کا سیلا ب اٹھا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ روشنی قدرے تھی تو اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ قدیم مشق کے اس زرد سے مکان کے باہر کھڑی تھی جو مسجد سے ملختہ تھا۔ ایک زمانے میں اس نے بیہاں مجع میں گھرے ایک ”بیمار“ کو دیکھا تھا۔ آج بیہاں دیرانی تھی۔ سننا تھا۔ زردی شام اتر رہی تھی۔ روشنی اب ختم ہو چکی تھی۔ مکان کے اندر چراغ جل رہے تھے۔ پاجامے، لمی قیص، اور ہمیر بینڈ لگے بالوں والی حدہ اس سارے زرد مظفر نے میں واحدر نگنیں شے تھی۔ اس نے پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بیکی چال چلتی پھونک کر قدم رکھتی مکان کے اندر آئی۔ پہلے کمرے کا پردہ ہٹایا اور سر نیچا کر کے اندر داخل ہوئی۔

اس مطالعاتی کمرے میں جگ جگہ دیے جل رہے تھے یا چند ایک موٹی موم ہتیاں۔ دیوار میں بنے خانوں میں کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے فرش پر دوزانو ہو کر شیخ معلم بیٹھے تھے اور چوکی پر دھرے کورے پرچے قلم سیاہی میں ڈبوڈ بکر لکھتے جا رہے تھے۔

وہ سینے پر بازو پیٹیے چوکھت میں کھڑی تقدیمی نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ پھر گردن کڑا کر پکارا۔

”کیا آپ نے اپنی کتاب ختم نہیں کی؟“ وہ سر جھکائے لکھتے رہے۔ جنین نے آنکھیں ناراضی سے سکیریں۔ اردو گرد سب زردی مائل تھا، جیسے پرانے زمانے کا پرنٹ ہوا اور ایک وہی کلکفل تھی۔ پھر قدم قدم چلتی قریب آئی۔ چوکی کے عین سامنے۔ سر تر چھا کر کے گویا جھانکا۔

”کیا آپ کی کتاب میں واقعی دل کی بیماریوں کا علاج ہے؟“ پوچھتے وقت شکل یوں بے نیاز بنائی گئی جواب میں دلچسپ نہ ہو، مگر ماری حیات جواب پہلی تھیں۔

”ہر مرض کی دوا ہے۔ جو اسے جانتا ہے، وہ اسے جانتا ہے، اور جو اسے نہیں جانتا، وہ اسے نہیں جانتا۔“ سر جھکائے کہتے ہوئے ۱۰ بولے تھے۔

”آہ۔ آپ کے زمانے کے مرض!“ اس نے گیا مایوسی سے ہاتھ جھاڑے۔ پھر سامنے پیٹھی، چوکی پکنی رکھی اور ہتھیلی پر تھوڑی آرائی۔ ”طاعون، اور دوسرے و باعی مرض ہمارے زمانے میں نہیں ہوتے۔ ہمارے مسئلے اور ہیں یونو۔ مگر نہیں، آپ کو کیا پتہ۔“ پھر جیسے اسے غصہ آیا۔ تیری چڑھا کر بولی۔ ”آپ سات سو سال قدیم کے ایک بوڑھے ہیں۔ ایک نایو (naive) بوڑھے۔ آپ کو تو یہ تک نہیں معلوم کہ کپیوڑ کیا ہوتا ہے، انٹرنیٹ کیا ہوتا ہے، اُنی وی شوز کے کہتے ہیں... اور وہ زندگی کیسے تباہ کرتے ہیں۔ مگر نہیں۔۔۔ اف!“ جیسے کراہ کر سر جھکتا۔ افسوس سے ان کو دیکھا۔

”آپ کی کتاب میری مد نہیں کر سکتی کیونکہ اس میں میرے کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔“

وہ ہنوز قلم سیاہی میں ڈبوڈ بوکر لکھتے جا رہے تھے تو زیچ ہو کر حنہ ان کے پر چہ پہنچکی۔ گردن تر چھپی کر کے پڑھا۔

”اے ایمان والوں، بے شک خمر، اور میسر، اور انصاب، اور ازالام شیطان کے گندے کاموں میں سے ہیں، پس ان سے بچوتا کتم نجات پاؤ۔“ حمد نے سر اٹھایا، آنکھیں سکیر کر مشکوک نظر دوں سے ان کو دیکھا۔

”مجھے پتہ ہے یہ آیت ہے، مطلب بھی پتہ ہے۔ خمر ہوتی ہے شراب۔ میسر ہوتا ہے جوا۔ انصاب ہوتے ہیں بت اور ازالام....“ آنکھیں پیچ کر دہن پر زور دیا۔ ”ہاں، فال کے تیر وغیرہ، رائٹ؟۔۔۔ مگر اے شیخ! میرے ملک کی میری جیسی مذہل کلاس کی لڑکیوں پر اپلائی نہیں ہوتا۔“ نہایت افسوس سے ان کو دیکھتے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”آپ کے زمانے میں ہوتے ہوئے دمشق میں شراب کے مٹکے۔ وہ جیسے سیم جازی کے نادر میں ہوتے تھے، ہم تو اس مشروب کا نام بھی نہیں لیتے، لیما پڑے تو انگریزی میں الکھل کہہ دیتے ہیں، انگریزی میں چیزیں کم بہبودہ لکتی ہیں۔“ رازداری سے آگے ہو کر ان کو اطلاع دی۔ وہ نئے بغیر لکھتے جا رہے تھے۔ ”بہر حال، شراب، جوا، بت، پانے، کسی سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں میرا....سو،۔۔۔ وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھی۔“ آپ کی کتاب میرے کسی کام کی نہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا، آپ سات سو برس پرانے ایک نایو بوڑھے ہیں۔“ قدرے مایوس، قدرے خنگی سے وہ واپس جانے کو مژری۔

دوز انو بیٹھے، قلم سے پر چے پہ لفظ اتارتے شیخ نے ہولے سے پکارا۔

”جب شراب حرام کی گئی تھی تو وہ برتن بھی توڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا جن میں وہ پی جاتی تھی۔“ وہ اس کو نہیں دیکھ رہے تھے، غالباً لکھتے ہوئے اونچا بول رہے تھے۔ حنین نے تاسف سے سرفی میں ہلا�ا۔

”جیسا کہ میں نے کہا، آپ کے اور میرے زمانے کے مسائل مختلف ہیں۔“

قدیم دیوان خانے کی موم بیان ہنوز جھلکا رہی تھیں۔ وہ ان کی مدھم روشنی میں راستہ بناتی آگئے آئی اور چوکھٹ کا پروہ ہٹادیا۔

دوسری جانب مہیب تاریکی تھی۔ اس نے تاریکی میں قدم رکھا اور.....

اور کتاب بند کر دی۔ سر اٹھایا تو بھائی کی اسٹڈی نیبل پر بیٹھی تھی۔ کمرہ سفید نیوب لائٹ سے روشن تھا۔ لا دنخ سے بولنے کی آوازیں آری تھیں۔ حمد نے بے دلی سے کتاب واپس رکھی، اُنھی ہی تھی کہ سعدی اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر رکا، پھر نظریں چاکر الماری کی طرف چلا گیا۔

”ناراض ہیں آپ؟“ وہ بے قراری سے اس کے پیچھے آئی۔ چند لمحے وہ یونہی کھڑا رہا، پھر اس کی طرف گھوما۔

”نہیں۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔“ گھری سانس لے کر بولا۔

”دل سے کہہ رہے ہیں؟“

”ہا۔“ وہ اس کے سامنے آیا۔ نری سے اس کو ہاتھ سے کپڑہ کر بیدن پہنچایا۔ اور قریب بیٹھا۔ وہ سر جھکائے اپنے گھنٹوں کو دیکھتی رہی۔

”تم کسی کی موت کی ذمہ دار نہیں ہو جائے۔ اوی پی صاحب کا بھی اتنا ہی قصور ہے جتنا تمہارا۔ ان کو تم پر نہیں اللہ پر بھروسہ کرتا چاہیے تھا۔ امی کے پاس جاتے، تمہاری حرکت بتاتے، تو امی تمہیں دو تھپر لگا کر ان کا کام بھی کروتا تھی اور معافی بھی مانگنے کو تھیں۔ ان کو پیپر زبھی نہ دینے پڑتے اور کام بھی ہو جاتا۔ مگر انہوں نے بزدی کار است منصب کیا۔ یہ ان کی بھی غلطی ہے۔ سواب بہتر ہے کہ ہم اس واقع کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں۔“ حنین نے جھکے سر کو فتحی میں ہلایا۔

”میں ایڈیشن نہیں لے رہی۔ میں بی اے کروں گی۔“

”ٹھیک ہے، اب تم انجینئرنیں نہیں بنو گی۔ تم یہ ڈیزائنر نہیں کرتی۔ سب کہتے تھے تم کو ہر وقت کمپیوٹر کے آگے مت بیٹھنے دیا کرو پنج بگڑ جائے گی مگر میں نے تمہارا انتہر نیت، کمپیوٹر، گیمز، کچھ نہیں روکا بھی۔ مجھے تم پر اعتبار تھا۔ تم نے میرا اعتبار توڑا ہے۔ حنہ ایک لفظ کی جیلنگ بھی آپ کی ڈگری کو ”ناجاڑے“ بنا دیتی ہے۔ جو لوگ چیلنگ کر کے میڈیکل میں ایڈیشن یافتے ہیں، وہ ساری عمر مفت علاج بھی کرتے رہیں، تب بھی ان کی کمائی پاک ہو گی کیا؟ الہبھاں کے اصول بد لئے نہیں جاتے۔ یونواد حصہ میں تمہیں اس کے لئے معاف کر رہا ہوں۔ کیونکہ تم میں اور دارث ماموں کے قاتل میں فرق ہے۔ تم نے کہا ان کو گلکٹ محسوں ہوا ہو گا، تمہیں وہ بھی نہیں ہوا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں، مجھے بھی لگتا ہے ان کو گلکٹ ہوا ہو گا، وہ ماموں کی قبر پر بھی گئی ہوں گے، ان کے نام پر چیری میں بھی کی ہو گی، آج بھی ماموں کے قاتل اگر ماموں کی بچیوں کو دیکھ لیں تو ان کے لیے بہت دکھ محسوس کریں گے، مگر کیا دکھ ہونا کافی ہوتا ہے؟“ اس نے فتحی میں سر ہلایا۔ ”بڑے گناہوں کے کفارے ہوتے ہیں، خالی خوبی گلکٹ اور دکھ جائے بھاڑ میں۔ ذرا دیر کو زرتاشہ کا سوگ انھوں نے بھی منیا ہو گا، اور پھر کیا اعتراض جرم کیا؟ کیا کفارہ ادا کیا؟ خود کو قانون کے حوالے کیا؟ نہیں! تم ان جیسی نہیں ہو۔ تم نے کفارہ ادا کیا ہے، اور دکھ کفاروں کے بعد گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اوسی پی صاحب کی جان تم نے نہیں ان کی بیٹی اور ان کی بزدی نے لی ہے۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں مگر مجھے بہت عرصہ لگے گا دوبارہ تم پر اعتبار کرنے میں اور اب تم جو بھی پڑھنا چاہتی ہو ہو، لیکن تم مجھ سے ایک وعدہ کرو گی۔ ایک پاک عقد۔ کتم دوبارہ یہ کام نہیں کرو گی۔ کیونکہ حنہ اگر بھی مجھے یہ پتہ چلا کہ حنین نے دوبارہ پیپر میں چیلنگ کی ہے، تو اس دن ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ انگلی انھا کرختی سے وہ تمہیہ کر رہا تھا۔“ مجھے دوبارہ بھی یہ سننے مت دینا نہ کہ تم نے پھر سے بھی کام کیا ہے۔“

حنین نے جھٹ سر اثبات میں ہلادیا۔ (ایسا تو بھی بھی نہیں ہو گا، کبھی بھی نہیں۔ اسے یقین تھا۔)

”مگر حنہ، فی الحال، بی اے کرنا بھی اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ مسئلہ تمہاری ایڈیشن ہے۔ کمپیوٹر اور ڈی ڈراموں کی ایڈیشن۔“

”ایڈیشن؟“ وہ چوٹکی۔ بری طرح۔ ایک دم سب رک گیا۔ وہ سات صدیاں پلے کے شیخ معلم کے نیم تاریک دیوان خانے میں بیٹھے تھی، اور دو رکھیں سعدی بول رہا تھا۔

”میں بھی دو تین ڈرائیور اے فالو کرتا ہوں۔ پچھلے دو سال سے Suits اور چار پانچ سالوں سے Grey's Anatomy دیکھ رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ڈرائیور اے مت دیکھو، فلمیں مت دیکھو میں یہ کہوں گا تو تم نہیں مانو گی۔ میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ حد میں رہ کر دیکھو۔ زیادتی کسی بھی چیز کی ہو، نقصان دیتی ہے۔“

”وہ اس کا چھرہ دیکھتی چپ چاپ سوچے گئی۔

”کیا سوچا پھر تم نے؟“

”خمرشیطان کی گندگی میں سے ہے۔“ وہ ہولے سے بولی تو سعدی نے ناکھی سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ اسے بات کاموں عکل سمجھنیں آیا تھا۔ وہ درکش اور زمانے میں نیٹھی بول رہی تھی۔

”شخ نے ٹھیک کہا تھا۔ ہر شخص کا خر مختلف ہوتا ہے۔ پتہ ہے الکھل کیوں حرام ہے؟ کیونکہ وہ نشہ کرتی ہے، اور لست ذاتی ہے۔ ہر نشر الی چیز خرم ہوتی ہے۔ چاہے وہ مشروب نہ ہو یا اس کا رنگ سرخ نہ ہو۔ میرا خر یہ سب تھا۔ یہ کمپیوٹر موبائل امنٹر نیٹ، ٹی وی۔ سواب...“ اس نے نئی میں سرہلایا۔ ”میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کروں گی۔“ کوئی عزم تھا جو اسی لمحے کر لیا۔ سعدی نے بے اختیار سمجھانا چاہا۔

”جس کوئی بھی چیز بذاتِ خود اچھی یا بُری نہیں ہوتی۔ اس کا استعمال اسے اچھا یا بُرًا...“

”بالکل بھی مت کہیے گا یہ فضول بات جلوگ دھرا دھرا کرنیں تھکتے۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”ہر چیز کے بارے میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بذاتِ خود اچھی یا بُری نہیں ہے۔ کچھ چیزوں کا براستعمال ان کے اندر برائی کا اثر اتنا راح کر دیتا ہے کہ.... کہ ان میں آپ کے لیے اچھائی ختم ہو جاتی ہے۔ جب خرم منوع ہوئی تھی تو ان برتوں کو بھی توڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا جن میں وہ پی جاتی تھی۔ آپ خر کے برتن میں آب زم زم نہیں پی سکتے بھائی۔“

”خیز، آج کل کے برتوں کو دھو کر استعمال کیا جا سکتا ہے وہ اس زمانے میں کدو کے برتن تھے جو.....“ وہ اسے فتویٰ اور فقہ بتار باتھا مل رہیں نے نئی میں سرہلایا۔

”زمانہ نہیں بدلا بھائی۔ اب بھی مسئلے وہی ہیں جو سات سو سال پہلے کے دمشق میں ہوا کرتے تھے۔ کسی اور کے لئے یہ چیزیں بُری نہیں ہوں گی مگر میرے لئے ہیں۔ میں ان کو اب ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔“ نئی میں سرہلاتی خنین کی آنکھیں بھیکیں جا رہی تھیں۔

”لیکن حدا تکھل بھی اکٹھی حرام نہیں ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ منع کی گئی تھی۔ تین حصوں میں۔ ایک دم سے ان چیزوں کو زندگی سے ہکالوگی تو اپنا ایک حصہ ان ہی کے ساتھ کھو دو۔ اذ بیکنڈ آدمی کو ایک دم سے منتیات سے نہیں ہٹایا جاتا۔ ڈوز بلکی اور مزید بلکی کی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ چھوڑو۔ خود کو دبا کر، جبر کرو گی تو کتنا عرصہ ضبط ہو گا؟ ایک دن اپر ٹنگ کی طرح واپس دیں آ جاؤ گی۔“

”نہیں۔ اگر ابھی نہیں چھوڑا تو کبھی نہیں چھوڑ سکوں گی۔“ وہ نال میں گردن بلائے جا رہی تھی۔ سعدی نے مزید سمجھانا چاہا مگر حمدہ نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ چپ ہو گیا۔ اگر وہ اپنا ضبط نفس آزمانا چاہتی تھی، تو سعدی کو اسے روکنا نہیں چاہیے۔

اگلے روز ندرت نے جب کچن کی چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر لا اونچ میں جھاناک تو دیکھا، وہ کمپیوٹر پیک کر کے سعدی کے کمرے میں شفث کر رہی تھی۔ اسلامت فون میں سے اس نے پہلے ہی سم زکال کر اے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا اور امی کی سم چھوٹ پرانے نوکیا سیٹ میں ڈال کر نہیں دے دی کہ میں اب یہ نہیں استعمال کروں گی۔ ندرت کو سعدی نے پتہ نہیں کیا کہہ کر سمجھایا تھا کہ وہ پہلے تو چپ رہیں، پھر رہا منٹلگیں، انہیں اس کے انجینئرنگ میں ایڈمشن سے لینے کا بہت دکھ تھا، مگر وہ بے خس بی سنتی گئی۔ کتنے دن ندرت نے اس کے ساتھ سر پھوڑا، پھر خود، ہی تھک کر خاموش ہو گئیں۔ زندگی میں اور بھی غم تھے خنین کے سوا۔

اوہ اس تھیاںی اور خاموشی کی نئی سر ٹنگ میں داخل ہونے کے بعد خنین یوسف کے لیے ایک ہی روزن تھا۔ اپنا عبد! اگلے بورڈ ایگزام میں، (لبی اے کے فائل ایگزام میں) اوہ اپنی محنت سے پاس ہو گی، جیسے سینڈائزر سے پہلے ہر سال ہوتی رہی تھی، اور جس دن ایمانداری کا رزلٹ آئے گا، اس کے دامن پلکا بے ایمانی کا داغ دھل جائے گا۔ بھائی اس پہ پھر سے اعتاد کرنے لگے گا۔ اب وہ کبھی بھی اس کو یہ سنتے کا موقع نہیں دے گی کہ خنین نے چینٹنگ کی ہے۔ اب خنین ایسا کبھی بھی نہیں کرے گی۔ سعدی نے کہا تھا اگر اسے دوبارہ ایسا کچھ پڑتے چلا تو اس دن وہ دونوں الگ ہو جائیں گے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہو گا، اسے یقین تھا۔

وہ غلط تھی۔

یہ عیاں جو آبِ حیات ہے اسے کیا کروں؟ ..... کہ نہاں جو زہر کے جام تھے مجھے کھا گئے!  
جنیل کامل اقامتی کمرہ مایوسی اور ذریش کی فضائے بوجمل ان دونوں کے گرد موجود تھا۔ فارس پیچھے کو بیک لگائے، تانگ پٹانگ جا کر منہ میں کچھ چباتا، نظریں آگے پیچھے کی چیزوں پر دوڑ رہا تھا، جبکہ سعدی دبے دبے غصے اور نفلی سے اسے گھور رہا تھا۔  
”اور وہ سمجھ رہی ہیں کہ آپ نے انہیں استعمال کرنے کی کوشش کی۔“

”بریکنگ نیوز سعدی، ہر بات تمہاری پیچھوئی وجہ سے نہیں ہوتی۔“ اس نے تختی سے سر جھکا۔

”اتی مشکل سے وہ راضی ہوئیں آپ سے ملنے کے لیے اور آپ نے سب کچھ غارت کر دیا۔“ وہ دبادبا چالا یا تھا۔

”تو کیا کروں؟“ فارس نے برہمی سے سعدی کو گھورا۔ ”مزید ڈھائی سال یہاں گزر دوں؟“

”جب میں نے کہا تھا کہ آپ کو یہاں سے نکال لوں گا تو۔؟ کیا ضروری تھا زمر کو دوبارہ خود سے بدھن کرنا؟“ اس کا غصہ آم ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔

”وہ ہمیشہ سے مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔ تمہاری ذہین فلین پیچھو (ظفر سے اسے دیکھا) اتنا تو پتہ نہیں لگا سکیں کہ فارس غازی ہے گناہ ہے!“

اس بات پر وہ پیچھے ہو کر بیٹھا، آنکھیں سکیر کر چھمٹی ہوئی نظروں سے فارس کو گھورا اور پھر چبا چبا کر بولا۔ ”فارس غازی صاحب، میری پیچھواؤ آپ سے کئی گنازی اداہ سمارٹ اور سمجھدار ہیں، آپ کی طرح وہ باہوں سے نہیں سوچتیں، دماغ سے سوچتی ہیں۔ اور ہاں، اگر آپ کی جگہ وہ جیل میں ہوتیں تو ڈھائی سال کیا، ڈھائی دن میں باہر نکل آتیں۔“

”تھیک یو دیری چیج! سعدی۔ میں بہت مرعوب ہوا ہوں۔“ اس نے اتنی ہی برہمی سے سر جھکا۔

”آپ کو یہ بات جیران کر رہی ہے کہ اتنی اسماڑت ہو کر بھی ان کو آپ کی بے گناہی کا یقین نہیں ہے؟“ کچھ دیر بعد وہ قدرے ہموار لبھجے میں بولا۔ فارس کچھ کہے بنا سے دیکھنے لگا۔ ”ماموں، آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔ بات ذاتیت یا بے دوقنی کی نہیں ہے۔ اسی کو دیلمہ لیں۔ امی بالکل بھی ذہین نہیں ہیں۔ دودھ چو لہے پر کھر بھول جاتی ہیں۔ ان سے پوچھو کوکہ ولڈ ٹریئیسینٹر پر ہملہ کب ہوا تھا تو تاریخ یا سن یا نہیں ہوگا، مگر کہیں گی، تب سعدی فلاں کلاس میں تھا۔ ان کا کینڈر ان کے بچوں کی پیدائش، ان کے چلنے، بولنے، یا فلاں کلاس میں ہونے کے مطابق ان کے ذہن میں فٹ ہے۔ بالکل ہی بھولی ہیں امی۔ مگر جب میں نے ان سے کہا کہ ماموں کی جعلی شیپ سن لیں تو انہوں نے نہیں سنی، سن لیتیں تب بھی نہ مانتیں۔ اپنی تمام ترسادگی کے باوجود ان کو جتنے ثبوت آپ کے خلاف مل جائیں، وہ آپ کو گناہ گار نہیں مانیں گی۔ پتہ بنے کیوں؟“

”کیونکہ ان کو مجھ پر اعتبار ہے۔ اور۔۔۔ وہ ٹھہرا، اثبات میں سر بلایا۔“ اور میڈم زمر کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے!“ بہت سالوں بعد اس کو وہ بات سمجھ آئی تھی۔

”بالکل۔ وہ آپ پر اعتبار نہیں کرتیں، سواب آسمان سے فرشتے اتر کر بھی آپ کے حق میں گواہی دیں، وہ بت بھی نہیں مانیں گی کیونکہ تو تا اعتبار جو زنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور وہ کیوں کریں آپ پر اعتبار؟ وہ آپ کو جاتی ہی کتنا ہیں؟ چند ماہ کے لیے آپ ان کے اسٹوڈنٹ رہے تھے، وہ کبھی بھی آپ سے بے کلف نہیں تھیں، آپ کام کے علاوہ ان سے کبھی کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کام پڑنے پر آپ سے رابطہ کر لیتیں یا خاندانی تقریبات میں آپ سے سرسری اسی ملاقات ہو جاتی، اور بُس۔ وہ آپ کو دیں جانی تھیں جیسے ہم جانتے ہیں۔ جیسے امی جانتی ہیں۔ جس دن وہ آپ کو جاننے لگیں گی، اسی دن اعتبار بھی کرنے لگیں گی، اس لیے پلیز، ان کو دشمن سمجھنا چھوڑ دیں۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتا وہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ ”زمر دشمن نہیں ہیں، زمر دہ دادھان ہیں جن کو میں اپنے ساتھ کھڑا کرنا چاہتا

”اُس جنگ میں، مگر ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے، ان کو اڑام مت دیں۔ میں آپ کو باہر نکال لاؤں گا، ترستی۔ صرف چند ماہ۔ مجھے ہند ماہ کا وقت دیں۔ میں آپ کو یہاں سے نکال لوں گا۔“ سینے پہ ہاتھ رکھے، آگے بھٹکئے وہ خفگی سے ہی سہی التجا کر رہا تھا۔ فارس نے ہلاکا سا اٹھا میں سر ہلایا۔ مگر اسے ساتھ ہی تیکھی نظر وہ بھی دیکھا۔

”اور تم کیا کرو گے۔“

سعدی نے گہری سانس لی پیشانی انگلی سے کھجائی۔

”جو بھی کرنا پڑا۔“

”اے۔ بات سنو۔“ اس نے انگلی انھا کرتے تھیں کی۔ ”کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا، ورنہ چار دن میں ادھر جیل میں بند ہو گے۔“ بے زاری اور غصے کے پیچھے جیسے وہ فکر مند ہوا تھا۔ سعدی لب بھینچا گے ہوا، جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میری جو مرضی آئے میں کروں گا، جو بھی کرنا پڑا کروں گا۔ زیادہ مسئلہ ہے آپ کو تو مجھے گرفتار کروادیں۔“ ذہنی سے کہتا وہ اٹھ لڑا ہوا۔ فارس نے بے بھی بھری رہنمی سے اسے گھورا۔

”کچھ غلط کرنے کیا ضرورت ہے؟“

”میں آپ پا احسان کرنے جا رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید کبھی آپ بھی ایسا ہی احسان میرے اوپر کرنے کے قابل ہوں۔ اوہ اینڈ یو آر، میلم!“ مسکرا کر سر کے خم سے اس کا وہ شکریہ قبول کیا جو اس نے نہ کہا تھا کہ کہنا تھا۔ اور پھر جب وہ مڑا تو اس نے سنا، فارس نے قدرے تذبذب کے بعد کہا تھا۔

”سنو۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو تمہاری مدد کر سکتا ہے۔“

..... ♦ ♦ ♦ .....

سمجھتا کیا ہے تو دیوانہ گانِ عشق کو زاہد! ..... یہ ہو جائیں گے جس جانب، اسی جانب خدا ہوگا!

سعدی قدم قدم زینے چڑھتا اوپر آیا۔ راہداری کے سرے پہ عمارت کا فلور نمبر لکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی چٹ سے پتہ ٹیکلی کیا اور ادھر ادھر گھمائی۔ آگے پیچھے فلیٹ کے بندروازے تھے۔ وہ داہیں طرف کے دوسرے دروازے پے آیا، اور نیل جگائی، ”کون ہے؟“ اندر سے مردانہ آواز سنائی دی۔

”مجھے احر شفیع سے ملتا ہے۔“

دروازہ کھلا، ذرا سی درز سے اس نوجوان نے باہر جھانا کا۔ ماتھے پہ کھمرے بال، ٹراؤزر پر شرت پہنے وہ سیاہ آنکھوں والا نوجوان تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک سعدی کا جائزہ لیا جو جیز پر گول گلے کی سوئر پہنے کھڑا متذبذب سا اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے کوئی پر آرڈننس کیا۔“ وہ بے زاری سے دروازہ بند کرنے لگا۔ سعدی جلدی سے بولا۔

”میں سعدی ہوں۔ فارس غازی کا بھانجا۔“ (کیا میں دیکھنے میں ڈیلوی بوانے لگتا ہوں؟)

بند کرتے کرتے وہ رکا، پھر دروازہ پورا کھول دیا۔ اب کنوں جوان نے قدرے غور سے اسے دیکھا، پھر سر تر جھا کر کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سعدی قدرے بیجان سے اندر آیا۔

”آپ حال ہی میں جیل سے رہا ہوئے ہیں، ماموں نے بتایا تھا۔“ چھوٹے سے فلیٹ کو طاڑانہ نظر وہ سے دیکھتے، وہ لاڈنخ کے

وسط میں کھڑا بارے بات بولا۔ جواب میں احرمنے شانے اچکائے۔

”ہوں۔ میرے وکیل نے سارے شوت مٹا دیے اور اس گھنگریا لے بالوں والی چڑیل پر اسکیوں نر کو نیچتا چار جز ڈرپ کرنے

پڑے۔“وہ اوپن کچن میں آیا، فرنج کھولا۔ دوکوک کے کین نکالے اور مژا تو سعدی صوفے کے ساتھ کھڑا۔ لکل چپ سا اسے دکھر رہا تھا۔

”بیٹھو۔“ اس نے اسی لاپرواہی سے اشارہ کیا۔ مگر وہ نہیں بیٹھا۔

”وہ گھنگریا لے بالوں والی پر اسکیوں نریمیری سگی پچھو ہیں۔“

دانست سے کین کامنہ کھولتے احمد روگو یاچکی آئی۔ بمشکل سختی وہ پیچرے پے معدترت خواہنا تاثرا لایا۔

”آئی ایم سوری میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ بیٹھونا!“

ایک لمحے کو سعدی نے راہداری کو جاتے دروازے کو دیکھا، گویاہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہو، مگر یہ تو وہ جان گیا تھا کہ پہلے تاثر چ نہیں ہوتے، سو سر ہلا کر صوفے پے بیٹھا۔ احمد نے دوسرا کین اس کی طرف اچھالا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں کچ کیا۔ (یونہی پتہ نہیں کیوں نوشیر والا یاد آیا۔)

چند منٹ بعد وہ دونوں صوفوں پر آئنے سامنے بیٹھے تھے۔ سعدی گھنٹے برابر کھے، آگے ہو کر، اور احمد صوفے کی پشت پے بازو پھیلائے تماںگ پٹاںگ جمائے، ایک پیر جھلاتا، اپنی سیاہ آنکھیں سکینیز کرائے دیکھ رہا تھا۔

”میں چاہتا ہوں، نج فارس غازی کے حق میں فیصلہ دے دے۔ اس کے لئے میں کیا کروں؟ ما موں نے کہا تھا آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔“

احمد نے کین اونچا کر کے گھونٹ بھرا سے نیچ کیا۔ ابر و اچکائے۔

”سمپل۔ ایک Presentation تیار کرو اس میں غازی کے حق میں سارے ثبوت ڈالو، اور یہ دکھاؤ کرو کہ تنا اچھا انسان ہے، پھر اسے ایک فلیش ڈرائیور پہ ڈالو اور وہ ڈرائیور نج کے گھر لے جاؤ، اس سے درخواست کرو کہ وہ یہ دیکھ لے، اس کے کمپیوٹر پر اسے چلاو۔ پھر اس کی خوب منت کرو کہ وہ اسے رہا کر دے۔“

”کیا صرف منت کرنے سے وہ رہا کر دے گا؟“

”اب نہیں یار!“ احمد نے بد مردہ ہو کر ناک سے مکھی اڑائی۔ ”جو فلیش تم اس کے کمپیوٹر میں لگاؤ گے، وہ اس کے سسٹم میں ایک mole داخل کرے گی۔ اس کے بعد نج صاحب اس کمپیوٹر پر جو کچھ لکھیں گے یا دیکھیں گے، اس کی لمحہ بہ لمحہ تھمارے کمپیوٹر پر آجائے گی۔ چند ہفتوں میں تمہیں اچھا خاصاً موالی جائے گا نج کے خلاف۔ پہلے گنمام طریقے سے اسے بھیجننا۔ اگر وہ ڈر جائے، اور جانے میں آجائے تو حکم کھلابیک میل کرنا۔ چند ہفتوں میں غازی باہر ہو گا۔“

سعدی کامنہ کھل گیا۔ پھر آہستہ سے اس نے اثبات میں سر کو جو نہیں دی۔ (واو) احمد اب آخری گھونٹ اندر انڈیل رہا تھا۔

”ایک اور کام بھی ہے۔“

”بولو۔“ اس نے کین رکھ کر سنجیدہ متوقع نظر وہ سعدی کو دیکھا۔ وہ قدرے متذبذب تھا۔

”ایک معزز خاندان کی لڑکی کی ایک گاف کلب کے ریکارڈ میں کچھ فوجھ ہیں جو...“

”کیسی فوجھ؟ جو؟ ڈرگن؟ یا کچھ اور؟“ وہ جو رک رک کرتا رہا تھا، احمد نے اتنی ہی سادگی سے پوچھا۔

سعدی نے گھری سانس لی۔ فخر پاٹھ کر قرآن پڑھنے والوں کو غلط باتیں کرنا زیادہ ہی غلط لگا کرتا ہے۔

”وہ کارڈ رکھیل رہی تھیں۔ آف کورس جو۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”مطلوب فوجھ غائب کرنی ہیں؟ ہو جائیں گی۔ کلب کا نام کیا ہے؟ ویسے مجھے اندازہ ہے یہ کہ ہوا ہو گا، بہر حال، نام تارتغ، لڑکی کی تصویر سب دے دو۔ میں کرلوں گا۔“

”مگر آپ اس کے شوہر کو نہیں بتا میں گے۔“ احرمنے اچھے سے ابردیکھیرے۔  
”کیا میں اس کے شوہر کو جانتا ہوں؟“  
”مسز شہرین کاردار۔“ اس نے پنکھاتے ہوئے بتایا۔

احمر چونک کر سیدھا ہوا۔ نالگ سے نالگ ہٹائی، حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ہاشم کاردار کی بیوی اود ہو۔ یہ تو کافی شرمناک ہو گا۔“ اس ساحب کے لئے۔ بیوی کی گیبلنگ فوٹچ؟ چچ چچ۔ یہ تو اسکینڈل بن سکتا ہے۔ ”اس نے ما تھے کو چھوا۔“ ہاشم کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ غازی کا کزن ہے، مجھے پند نہیں ہے مگر وہ ایک عزت دار آدمی ہے۔ اود تم اس سے ناراض تو نہیں غازی کی طرح؟“ سعدی کے پاس نام پر آئی ناپسندیدگی دیکھ کر اس نے وضاحت دی۔ ”اس نے تو اپنی پوری کوشش کی تھی غازی کو نکلوانے کے لیے مگر اس کے والد اس رُوک دیا، اور انہوں نے بھی اپنے ایڈ واائز کی وجہ سے ایسا کیا۔“ گویا مالمقی انداز میں اس نے اپنے سر پر چپت رسید کی۔ سعدی نے اب سے دیکھا۔

”کون ایڈ واائز؟“ کیا ان کو کسی نے فارس کی مدد نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا؟“ پوچھتے ہوئے اس کے ابرد غصے سے تن گئے۔ احرمنے پہالتیار اس کو دیکھا، پھر سینٹرپبل پر کھے کا نج کے گلدن پر نظر ڈال جو اگر ٹوٹا تو بہت زور کا لگتا۔ آوج! ”آ..... ہاں شاید کسی نے مشورہ دیا تھا۔ پتہ نہیں کون تھا، میں نے تو اڑتی اڑتی سنی ہے!“ گڑ بڑا کر کہتے اس نے تھوک لگا۔

”تو کیا آپ شہرین کی فوٹچ غائب کر سکتے ہیں؟“ وہ بے چینی سے آگے ہوا۔ ”ہاں، لیکن وقت لگے گا، کسی اور سے نہیں کرو سکتا۔ خود کرنا پڑے گا۔“ ”آپ کا اس سب پر وقت کے ساتھ پیسہ بھی لگے گا تو....“ کہتے ہوئے سعدی نے جیز کی جیب پر ہاتھ رکھا گویا بُوہ نکالنے لگا ہوا۔

”نہیں“ میں غازی کے بھانجے سے پیسے نہیں لوں گا۔ ”نہیں پلیز“ میں آپ کو ہاڑ کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو لوگ ایسے کاموں کے لئے ہاڑ کرتے ہیں، تو ظاہر ہے مجھے انہیں لگے گا اگر میں....“

”سنونچے۔“ سنجیدگی سے کہتے اس نے ہاتھ اٹھا کر سعدی کو مزید بولنے سے روکا۔ ”پہلی بات۔ میں تم سے پیسے نہیں لوں گا، اور ام می بات، جس جیب پر تم نے ہاتھ رکھا ہے، تمہارا بُوہ اس میں نہیں، بلکہ دوسرا جیب میں ہے۔ شرمندہ مت ہوتا، مجھے پتہ ہے تم اپنی اواری کی وجہ سے کہہ رہے ہو اس لئے سنو میں بھی اپنی خودداری کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ میں غازی کے بھانجے سے پیسے نہیں لوں گا۔“ سعدی نے تکان سے ٹھنڈی سانس بھری، اب شرمندہ کیا ہوتا؟ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تھینک یو فری سروہز کرنے کے لئے۔“ اور ہلاکا سا ملایا۔

”ایک منٹ بھائی ایک منٹ!“ احرم اٹھ کر آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اب یہ نہیں کہا کہ فری کام کروں گا۔ تمہارا کام ہو اے گا، مگر شہرین بی بی سے کہنا، میرا چیک تیار کھیں۔“ ”اوہ۔ شیورا!“ وہ سنبھل کر مسکرا دیا۔

بلکہ.... احرم کا شھوڑی پر دوالگیاں رکھے کچھ سوچا۔ ”مسز شہرین سے کیش لینا۔ چیک نہیں۔ اے یہ نہیں پتہ چلنا چاہیئے کہ یہ کام ہے کروار ہے ہو۔“

”کیوں؟“

”وہ اپنے شوہر کو بتا دے گی۔ اور وہ سارا غصہ مجھ پر نکالے گا، اسے ویسے ہی میں ناپسند ہوں۔“

”ارے نہیں۔ وہ دونوں علیحدہ ہو چکے ہیں، اور وہ تو خود اسے ہاشم بھائی سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں۔“ اس کی بات پر احمد نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”پتہ ہے ہر قوت کا مسئلہ کیا ہوتا ہے؟“ قریب آ کر قدرے رازداری سے پوچھا۔ سعدی نے نفی میں گردن ہلاکی۔ ”وہ کسی نکی کے سامنے کبھی نہ کبھی بول ہی پڑتی ہیں، سو آج نہیں تو دوسال بعد وہ ہاشم کو ضرور بتائے گی۔“ Once a Kardar, Always a Kardar اس لئے...“ ابر و اٹھا کرتے تنبیہ کی۔

”اوے۔ سمجھ گیا۔“ اور اس کا بھر سے شکریہ کہتا باہر جانے کو مڑا۔

”ویسے غازی کے کیس سے شہرین کاردار کا کیا تعلق؟“ تھوڑی کھجاتے ہوئے اس نے قدرے پر سوچ انداز میں پوچھا۔ سعدی کے قدم تھے۔ احمد کی جانب پشت تھی سوچوں نگل کر قدرے اعتاد سے پلتا۔

”شہرین والا معاملہ ایک ذاتی قبور ہے۔ اس کاماموں کے کیس سے کوئی تعلق نہیں۔“

”آہا۔“ احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ گویا مطمئن ہو گیا ہو۔ اس سے زیادہ اسے دلچسپی نہ تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

یہ حقیقت ہے جہاں ٹوٹ کے چاہا جائے ..... وہاں پچھڑنے کے بھی امکان ہوا کرتے ہیں شام تصر کاردار پر گہری سیاہ پچیل پچیل تھی جب ہاشم یہ دونی دروازہ عبور کر کے لاڈنگ میں داخل ہوا۔ ملازم اس کا بریف کیس لئے پچھپے تھا۔

جو اہرات اپنی مخصوص اوپنجی کری پر اجمان تھی، اور نو شیر وال اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کوئی بات کر رہے تھے، ہاشم کو دیکھ کر خاموش ہوئے۔ خلافِ معمول وہ سیدھا اوپنیں گیا۔ نائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا، قربی صوفے پر آبیٹھا۔ تھکا تھکا اور کسی سوچ میں لگ رہا تھا۔

”خبریت؟“ جواہرات نے ممتاز نظر وں سے اس کا چہرہ تکا۔

”سعدی آیا تھا آج۔“ وہ سرتلے بازوؤں کا تکمیلہ بنائے، پیر میز پر رکھے، سامنے دیوار کو دیکھتے سوچتے ہوئے بولا تو جواہرات اور شیرا نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

”کیوں؟ کیا کہہ رہا تھا؟“ گردن کی موتیوں کی لڑی پر خواہ توہا تھک پھیرتے وہ سرسری سابوی۔ آنکھوں میں بے چینی المآلی تھی۔ جواب میں وہ ساری بات اسی سوچ میں گم انداز میں بتاتا گیا، جسے سن کر جواہرات کے تین اعصاب ڈھیلے پڑئے، شیرا نے بھی گہری سانس لی۔

”میں نے وکیل کے بدلاو کی بات پر باز پرس کی تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے کبھی مجھ سے ایسے بات نہیں کی۔ مجھے لگا وہ لڑنے کا بہانہ چاہتا تھا۔“ پھر ایک دم چونک کر گردن موزی۔ فیجنو نا اسپرے کی بوتل اٹھائے گزر رہی تھی۔ ہاشم نے اسے پکارا تو وہ رکی۔

”سعدی کو جانتی ہونا؟ کیا وہ آج گھر آیا تھا؟“ فیجنو نانے جواب دینے سے قبل ایک ذرا کی ذرا نظر جواہرات پر ذاتی جو دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی، پھر ہاشم کو دیکھا اور مسکرا کرنی میں سر ہلایا۔

”نوس۔ آخری دفعہ میں نے اسے چار روز قبل ادھر دیکھا تھا۔“ ہاشم نے سر ہلا کر اسے جانے کو کہا۔

”آپ کی تو کوئی بات نہیں ہوئی اس سے؟“ اب وہ جواہرات کو اچھے انداز میں مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔

”نہیں کیوں؟ ہمارا کیا تعلق؟“

”نہیں مجھے لگا وہ لڑنے کا بہانہ ڈھونڈنے آیا تھا۔ کسی اور بات پر خاتما اور غصہ کسی اور طرح نکلا۔“ پھر ہولے سے سر جھٹکا۔“ شاید ہی زیادہ ہی سوچ رہا ہوں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ اتنے سال جس لڑکے کے ساتھ میں اتنی شفقت سے پیش آتا رہا، وہ اس طرح اکٹ لیے کر سکتا ہے مجھ سے؟“ اسے کافی دکھ ہوا تھا۔ شیر و نے بُشکل ناگواری چھپائی۔

”وہ تو اسی طرح کا ہے۔ بد تیز اور احسان فراموش۔ آپ کو ہی اس کی اصلیت دیرے پتہ چلی۔ مگر آپ اب بھی اس کے ساتھ وہی ہے نے بھائی والا روئیر کھیں گے، مجھے پتہ ہے۔“

”اب نہیں۔“ ہاشم کے چہرے پتختی گھل گئی۔ آنکھوں میں بے بناہ بختی اتر آئی۔ اس کے دل میں سعدی کے لیے گردہ بڑی گئی، سو پڑی۔ ”جس طرح وہ آج بد تیزی سے بولا میں دوبارہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ پیر نیچے اتارے اور جھک کر بُوٹ کا تمدھ کھولنے لگا۔ ”یہی بہتر ہے۔“ جواہرات زمی سے مسکرائی اور شیر و کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا کیا۔ وہ بھی آرام دھ نظر آنے لگا تھا۔

ہاشم تسمہ کھول کر سیدھا ہوا، اور جیب سے ایک کی چینیں نکال کر شیر و کی جانب اچھائی جواہر نے بروقت کچ کی۔ پھر اسے الٹ پلٹ لرچا بیاں دیکھیں۔

”یہ کیا ہے؟“

”تمہاری نئی کار۔“ بیٹھے بیٹھے چہرہ انھا کروہ تکان سے مسکرا یا۔ نو شیر و ان نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور پھر چاہیوں کو۔

”نہیں، یہ وہ اسپورٹس کار نہیں ہے جو تم چاہتے تھے۔ اس کی جگہ ایک ایکر یکنون گنڈری کار دے کر میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں لے۔ شیر و ان کو تمہاری کمپنی جو ڈیم نے تم سے لی تھی، میں نے تمہیں واپس کر دی ہے۔ تمہیں ہر وہ چیز نہیں ملے گی جو تم چاہتے ہو، بلکہ وہ دی جائے گی تو تمہارے لئے بہتر ہو۔“ اور پھر تیزی سے مسکرا یا۔

”تھینک یو سوچ بھائی۔“ وہ حیران خوش تیزی سے باہر کو بھاگا۔ ہاشم اب انھ کروہ پر جارہا تھا۔ جواہرات مسکراتے ہوئے سکون اور اطمینان سے دونوں بیٹھوں کی جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ لاونچ میں اکیلی رہ گئی تو میر پر کھے شیر و کے فون کی بپ بجی۔ اس نے بنا تو قوف کے موہاں انھا کر دیکھا۔ شہرین کا متوج تھا۔

کوئی عامی بات کی تھی اس نے مگر جواہرات کے ابر و تن گئے۔ پر سوچ انداز میں بیرونی دروازے کو دیکھا جہاں سے شیر و گیا تھا اور پھر.... انگلیوں کو حرکت دی پیغام منایا۔ فون واپس رکھا، اور اسی شان سے اس کرسی پر بیٹھی رہی جو کسی ملکہ کا خاصا ہوتی ہے۔ تین گردن بے ہاڑ مسکرا ہئت اور ایک عظیم الشان سلطنت کے خیال سے جھکتی آنکھیں۔

وہ آزاد تھی۔ اور انگریب کی غلامی کی زنجیروں سے یکسر آزاد۔ سوا گلاؤ بڑی برس بہت اچھا گزرا۔ ہاشم نے کاروبار، گھر، سب سنجال رکھا تھا۔ سونی شہرین کے پاس ہوتی، کبھی آ جاتی تو اچھا لگتا۔ شہرین آتی تو اچھا نہ لگتا، مگر وہ اس کو فی الوقت خمل سے برداشت کیے ہوئے تھی۔ شیر و کا شیری کی جانب بڑھتا جان بھی اس کی نظر میں تھا، مگر ابھی اسے برداشت کرنا تھا۔

سعدی اور اس کے خاندان کا داخلہ بیہاں اب بند تھا۔ سونی کی انگلی پارٹی پر (جو اور انگریب کی وفات کے پانچ ماہ بعد ہوئی) اس نے سعدی کو دعوت نامہ بھجوایا، مگر وہ نہیں آیا۔ ہاشم بھی اب اس کا ذکر نہیں کرتا تھا، سوائے ایک دو دفعہ کے جب اس نے بتایا کہ سعدی اسے اپنے آس پاس نظر آیا ہے، کبھی کسی ہوٹ تو کبھی کسی اور پبلک پلیس پر، جیسے وہ کسی چیز کے پیچھے ہے، تو جواہرات نے نظر انداز کیا۔ مگر ہاشم زیادہ عرصہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ عرصہ بھی اس لئے توجہ نہیں کر سکا کہ باپ کے مرنے کے بعد نیک اور کرنا، ہر شے سنجالنا، ان سب کھمیزوں نے اسے مصروف کر دیا تھا۔ ایسے میں کس کے پاس اتنا وقت تھا کہ جیل میں جہنم واصل ہوئے کزن یا اس کے بھائی کی فکر کرے؟

اسے جس دن سعدی کو ”چیک“ کرنے کا خیال آیا، فارس اسی دن رہا ہو کر ان کی زندگیوں میں واپس پہنچ گیا، اور جیسے پر سکون ندی میں زوردا پھر آن گرا تھا۔

آج ڈیز ہسال بعد کی اس خاموش سہمہ پہر، جب جواہرات زمر کے گھر سے فارس کے ہمراہ لوٹی تھی، اور اپنے خالی گھر میں اسی اہل بھی جانتی تھی۔ ہاشم اعتراف کرے یا نہیں، وہ آج بھی سعدی سے محبت کرتا تھا۔ وہ آج بھی اسے مس کرتا تھا۔ تو پھر..... بالآخر..... ہم بھی ڈیز ہر س قبیل کے سرماء کے سرد ماضی کی کہانی کو دیں، فن کر کے مکمل طور پر ”حال“ کے موسم گرامی

جانب ہڑتے ہیں، جہاں فارس غازی کی رہائی کے بعد سب کی زندگیاں بدل رہی تھیں۔

❖❖❖

رک گیا میں سزا سے کچھ پہلے ..... اس کو احساس خود خطا کا تھا

یوسف صاحب کے روشن گھر پر مئی کی گرم شام اتری تھی اور وہ ڈرانگ روم میں عین اسی جگہ دہیل چیز پر بیٹھے تھے جہاں وہ پہر میں تب بر اجمان تھے جب فارس اور جواہرات ادھر تھے۔ البتہ اب حاضرین بدل چکے تھے۔ ندرت سامنے صوفے پر بیٹھیں، دھیکی آواز سے بڑے باکوٹل دے رہی تھیں اور سعدی وہ جو آفس سے فارس کا فون سن کر گویا بھاگتے ہوئے اسی کو لئے ادھر آیا تھا، کھڑکی کے ساتھ کھڑا، انہی میں سر ہلا رہا تھا۔ پھر ان کی جانب مڑا تو چھرے پر خطا تھی۔

”آپ کس طرح اپنے منہ سے یہ بات فارس ماموں سے کہہ سکتے ہیں؟ کم از کم امی یا مجھ سے توبات کرتے۔ وہ کیا سچتے ہوں گے؟“

”زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے، سعدی۔“ ندرت خفا ہو کیں۔ ”آج کل لڑکی والوں کا کہنا معیوب نہیں سمجھا جاتا، اور اس میں غلط بھی کیا ہے؟ اگر زمر کو اعتراض نہیں تو تم کیوں حواس باختہ ہو رہے ہو؟“

”یہ جس جگہ آپ بیٹھی ہیں ادھر بالکل ادھر پچھلے بیٹھنے فارس ماموں بیٹھے تھے جب زمر آئیں اور ان کو کھڑے کھڑے یہاں سے نکال دیا۔“ باقاعدہ انگلی سے اس صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ندرت نے بے اختیار پہلو بدلا۔ ”مان ہی نہیں سکتا میں کہ زمر مان گئی ہیں۔“ بہت بی شدت سے اس نے نہیں میں سر ہلا کیا۔ بڑے ابا نے گردن اٹھائی۔ بے بسی سے اسے دیکھا۔

”وہ مانی نہیں ہے، اس نے کہا کہ جو میری مرضی ہو میں کر دوں۔“

”یعنی کہ آپ لوگ ان پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ایسا مت کریں بڑے ابا۔“ وہ ناراض ہوا۔

”اور اسی جگہ کھڑے ہو کر تم نے پچھلے ہفتے سعدی مجھے کہا تھا کہ میں زمر کی شادی کر دوں، فارس سے۔“ وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گیا۔

”مگر ایسے نہیں کہ وہ زبردست یہ فیصلہ کریں۔“

”تو پھر جاؤ بیٹے،“ زمر سے بات کرو اس سے پوچھو کہ بغیر جر کے بتائے وہ کیا چاہتی ہے۔ میں وہی کروں گا جو وہ چاہتی ہے۔“ سعدی کھڑا اب کاٹا رہا۔ وہ الجھا ہوا تھا، خفا بھی تھا۔ کیا چیر غلط تھی وہ سمجھنیں پار ہا تھا۔ مگر کچھ صحیح نہیں تھا۔

”مجھے اس سب میں سرزا کاردار کی مداخلت نہیں پندا آئی بڑے ابا۔ وہ کیوں اتنی بے چین ہیں میں زمر کی شادی کے لئے؟“

”ان کو کہا تھا میں نے کہ زمر کو شادی کے لئے قائل کریں، وہ میرے کہنے پر مداخلت کر رہی ہیں۔“ ان کیوضاحت پر سعدی نے الجھے الجھے انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”مجھ نہیں پتہ، مگر مجھے یہ اس طرح تھیک نہیں لگ رہا۔“ اور اسی تنکر چہرے سے باہر لکل آیا۔  
لان میں شام اندر ہیر ہو چکی تھی۔ وہ برا مددے کے اسٹیپ پر بیٹھا کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر جیب سے موبائل نکالا اور جواہرات کا نمبر ٹالا۔ فون کان سے لگائے تجھیہ آنکھوں اور تنے تاثرات کے ساتھ دوسرا جانب جاتی گھنٹی منتر تھا۔

”سعدی! اتنے عرصے بعد فون پر تھاری آواز سنی۔ کبھی کبھی ہمارے لئے وقت نکال لیا کرو۔“ وہ زرم خوشگوار انداز میں بولی تھی۔  
”آپ یہ گلہایے کرتی ہیں جیسے خود بھی واقف نہ ہوں کہ اب میرے لئے وقت کس کے پاس نہیں ہوتا۔“ چاہ کر بھی وہ بے زار نہیں ظاہر کر سکا تھا خود کو۔ ہاشم کی ماں کو ہاشم کے کارنا موں سے وہ ہمیشہ الگ رکھتا تھا۔ ہر چیز کے باوجود!

”اس رات شادی میں بھی تم نے مجھ سے خاص بات نہیں کی۔ سونی کی پارٹی پر اس نیکلیں والے واقعہ کا...“

”مسز کاردار آج آپ نے کیا کیا ہے؟“ اس نے اکھرے خشک انداز میں بات کافی وہ تو ترنٹ بولی۔ ”اور کیا کیا ہے میں نے؟“

”مجھ نہیں معلوم آپ کیوں زمر اور فارس کی شادی کروانا چاہتی ہیں۔ مگر وجہ جو بھی ہو، میں نے ہرے باکو کہہ دیا ہے کہ ایسا کرنے کی الی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے بھتی سے کہتے گو یابات ختم کی۔

”تیسری دفعہ سعدی؟“ وہ مخطوط مزہ لینے والے انداز میں گویا ہوئی تو وہ الجھا۔

”سوری؟“

”پہلی دفعہ بچپن میں زمر کے جیز کو آگ لگانا، اور دوسرا دفعہ چار سال پہلے زمر کو ایک خطرناک کیس میں دھکیلنا۔ دوبار تم نے اس کی فناہی نہیں ہونے دی۔ اب تیسری دفعہ رخنڈا لوگے؟“

”ایکسکیو ڈرامی؟“ بے یقینی سے اس نے فون کو کان سے ہٹا کر دیکھا۔

”مشکل بات نہیں کی میں نے۔ تم نے خود بتایا تھا، بچپن میں وہ تمہیں اپنی شادی کی چیزیں دکھاری تھیں اور پھر وہ چلی گئی اور تم وہیں ملھتے رہے، پھر کھیل کھیل میں آگ لگ گئی اور اس کا جیز جل گیا۔“

”میں اس وقت دس سال کا تھا، مسز کاردار!“ کچھ دیر پہلے کے تنے تاثرات غائب تھے اور وہ پھیکے پڑتے چہرے کے ساتھ مشکل ہل رہا تھا۔

”او، تم اچھی طرح جانتے تھے کہ تم کیا کر رہے ہو۔“ وہ شاید مسکرائی تھی۔ ”تم سے کھیل میں آگ نہیں لگی تھی۔ تم نے جان بوجھ کر آگ لگائی تھی۔“ اس نے مخطوطی سرگوشی کی اور وہ دم سادھے سانس روکے بیٹھا رہ گیا۔

”میں اس وقت دس سال کا تھا، مسز کاردار!“ مگر وہ کہے جا رہی تھی۔

”وہ تمہاری بیست فرینڈ تھی، اور وہ شادی کے بعد کراچی چلی جاتی۔ تم جیس ہو گئے تھے اور ان سیکیور بھی۔ مجھے جب تم نے بتایا تھا، وہ میں نے تمہاری آنکھیں پڑھی تھیں، بچے۔ وہ آگ تم نے خود لگائی تھی۔“

”میں اس وقت دس سال کا تھا، مسز کاردار۔“ بدقت کہہ کر اس نے نچلے لب میں دانت پوست کیے۔ جیسے ڈھیروں ضبط کیا۔ آنکھوں میں نبی آئی تھی۔

”مگر اب تم دس سال کے نہیں ہو۔ اب بڑے ہو جاؤ، اور اپنی پچھوکو اس کی زندگی گزارنے دو۔ اس کے رشتے میں مداخلت مت اڑو۔ کیونکہ جب تم مداخلت کرتے ہو تو وہ صرف نقصان اٹھاتی ہے۔“

”آپ.... آپ یہ اس لئے کہہ رہی ہیں تاکہ.... بتا کہ میں اس معاملے سے خود کو الگ کر لوں اور آپ کا جو بھی مقصد ہے وہ پورا ہو جائے۔“ اس نے کمزور بچھ کو مضبوط کرنے کی ناکام جهد کی۔

”ہاں میں اسی لئے کہہ رہی ہوں، مگر یہی تھج ہے۔ کیا نہیں ہے؟“ اور لمحے بھر کی خاموشی کے بعد فون بند ہو گیا۔  
سعدی کتنی دیر چپ چاپ اس اسٹیپ پر بیٹھا رہا۔ آنکھیں قدموں میں اگے گھاس پر جائے وہ مسلسل اب کاٹ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا جو اہرات اسے ڈسٹر ب کرنا چاہتی تھی، مگر اس بات کا علم ہونا ڈسٹر ب ہونے سے روک نہیں سکتا۔

❖❖❖

میں دلائل پر تکمیل کر بیٹھا..... آہ ! وہ وقت انجما کا تھا  
کافی دیر بعد جب وہ اٹھ کر اندر آیا تو ندرت اور بڑے ابا مسلسل اسی بات پر غور و خوض کر رہے تھے۔ وہ اس چہرے کے ساتھ نہیں آیا جس کے ساتھ گیا تھا۔ سوان کو دیں چھوڑے راہب اری میں آگے چلا گیا۔ لا و نج میں ٹی وی چل رہا تھا اور ملازم اڑکا صداقت استول پر بیٹھا پیار چھیلیتے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر شرمندہ سانخنسے لگا مگر سعدی مزید آگے بڑھ گیا۔ زمر کے دروازے پر دستک دی۔ پھر اسے دھکیلا۔

وہ اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ فائل پر جھکا لی پر جلا تھا، اور وہ گردن ترچھی کیے قلم سے کچھ لکھ رہی تھی۔ آہٹ پر چہرہ انھیں اٹھایا۔  
بھوری انگھوں میں نرمی آئی اور مسکرائی۔

”آؤ سعدی!“ سامنے کا وچ کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح چپ چاپ دہاں آبیٹھا۔

”اور کیا ہو رہا ہے؟“ فائل بند کرتے ہوئے اس نے اسی نرمی سے پوچھا۔ سعدی نے بدقت سکرانے کی سعی کی۔

”بس جا ب چل رہی ہے۔ آپ..... وہ رکا۔ سرا بھی تک جھکا تھا۔

”ابا نے بھیجا ہے مجھ سے بات کرنے کے لئے؟“

”جی، مگر..... میں آپ سے وہ بات نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ جو دلائل پر تکمیل کیے مزید چند فقرے بولنے جا رہی تھیں اپنے ازی سپاٹ انداز میں بے تاثر سے فقرے سعدی کی بات نے اسے روک دیا۔ وہ چوک کرنا بھی سے اسے دیکھنے لگی ”تو پھر.....؟“

”بڑے ابا نے کہا ہے کہ آپ اس شادی پر راضی ہیں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں زمر کر آپ جو بھی فیصلہ کریں گی، میں اس میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔“ سر جھکائے، انگلیاں مردوزتے بجا بجھا سا کہہ رہا تھا۔ آپ بغیر کسی بجوری یا دباؤ کے فیصلہ کریں اپنی زندگی کا فیصلہ۔ میں آپ کو سپورٹ کروں گا۔“

زمر نے اثبات میں سر بلایا۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس سب کے پیچھے کوئی وجہ ہو گی۔ آپ ان سے نفرت کرتی ہیں اور پھر بھی آپ ان سے شادی کرنے والی ہیں۔“

زمر کے بظاہر پر سکون چہرے پر سایہ سالہ رہا، مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ سر جھکائے وہ کہے جا رہا تھا۔

”آپ کا دل بھی ان کی طرف سے صاف نہیں ہوا، لیکن اس سب کے باوجود بھی آپ ان سے شادی کرنے جا رہی ہیں تو میں آپ سے صرف ایک چیز چاہتا ہوں۔“ اس نے جھکی نظریں انھا کر زمر کو دیکھا جو دم سادھے اسے سن رہی تھی۔

”کیا آپ مجھ سے وعدہ کرتی ہیں کہ آپ فارس ماموں کو کبھی ہرث نہیں کریں گی؟“

زمر نے تھوک لگایوں کے اس کی آنکھیں ٹھنکریا لے بالوں والے خوبصورت لڑکے پر جھی تھیں۔ اور اب خاموش تھے۔

”کیا آپ مجھ سے وعدہ کریں گی کہ آپ کبھی بھی ان کو دانستہ طور پر نقصان نہیں پہنچائیں گی؟“ وہ برے اور بھیاں کے خوف سے

زیر اٹر کہہ رہا تھا۔ زمر نے خواہ مجھے چہرہ پھیر کر میز کو دیکھا، پھر لیپ کو پھر فلکر کو اور پھر دوبارہ سعدی کو۔ اتنا بڑا وعدہ جوان قام کے ہر ارادے کو مارڈا ہے؟

”میں.... میں اسے نقصان نہیں پہنچا دیں گی۔ آئی پر امس!“ چند لمحے بعد وہ سعدی کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی اور ۱۱ بارہ تھوک نکلا۔ سعدی نے گہری سانس لے کر بھنوں پہ ہاتھ رکھے، سر جھکا دیا۔ گویا تنے اعصاب ڈھیلے کیے۔ زمر ہنوز پلک نہیں بنایا سے دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے سراٹھیا مسکرا لیا۔ اور انھوں کھڑا ہوا۔

”میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ جو بھی چاہیں گی میں وہی کروں گا اور کروا دیں گا۔“ زمر پھیکا سما مسکرا لی۔ (اور جب وعدہ توٹے گا تو وہ اس کے بارے میں کیا سوچے گا؟)

”ابا چاہتے ہیں، میں اس سے شادی کرلوں، میں کرلوں گی سعدی۔“

”میں نے کہا تا، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ وہ دروازے تک گیا، پھر رکا۔ مسکرا ہٹ مددھم ہو کر حزن میں بدی۔ سر جھکائے نہماڑے، ایم برے سے بولا۔

”اور مجھے معاف کر دیجیے گا، میری ہر اس چیز کے لئے جس نے آپ کو نقصان دیا۔ آئی ایم سوری،“ زمر میں جان بوجھ کرنیں کرتا، پھر بھی میری وجہ سے کچھ غلط ہو جاتا ہے!“ اور پھر رکے بنا بارہ نکل گیا۔

زمر نے کپٹی کو انگلی سے ملا۔ اسے لگا، انگلیوں میں لرزش ہے۔ جیسے گھما کر رخ دا میں طرف کیا تو سلگھار میز پہ لگا آئینہ سامنے آیا، اور اس کا عکس بھی۔ کرسی پہ بیٹھی، گھنکریا لے خوبصورت بالوں والی لڑکی جس کے ناک کی لوگ دمک رہی تھی۔ مگر آنکھیں پر پیشان تھیں۔ تیبھی اس کا فون بجا۔ وہ چوکی۔ غیر شناسنامہ آرہا تھا۔ تمام سوچوں کو ہن سے جھلتے، اس نے موبائل کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“

”پر ایکیو ٹرصلہبے، مجھے تو پیچا نتی ہوں گی آپ۔“ اور وہ فارس کی آواز کیسے نہیں پہچان سکتی تھی؟ فکر مند تاثرات بد لے۔ آنکھیں بخیدہ اور سپاٹ ہو گئیں۔

”جب فارس۔ کہیے۔“

”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتی ہیں کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ وقت آپ بتائیں، جگہ میں بتاؤں گا۔“ اس نے آنکھیں بیچ کر بہت سی کڑواہت اندر اتاری، اور پھر ہوار لبھے میں بولی۔ ”اوکے اکل شام چار بجے مل سکتی ہوں میں۔ مگر کہر؟“

”اسی ریشور انٹ میں جہاں آپ کو بلا کر گولی ماری تھی میں نے۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟“

زمر کی آنکھوں کی سرد مہری مزید بڑھی۔ ”شیور۔“ اور موبائل کا بٹن زور سے دبا کر کال کافی۔ اذیت سی اذیت تھی۔

..... ♫ ♫ ♫ .....

عکس چننے میں عمر گزری ہے ..... ایسا ٹوٹا ہے آئینہ مجھ سے  
چھوٹے باسیچھے والے لگھر کے لا ونچ میں ٹی وی کا شور جاری و ساری تھا اور جنین فنی میں سر ہلاتی ادھر ادھر چکر لگاتی پھر رہی تھی۔ دفتا  
وہ رکی، اور تنہ ہی سے صوفے پہ بیٹھے سعدی کو گھوڑا۔  
”وہ جھوٹ بول رہی ہیں۔“

”کیا تم چند لمحے کے لئے زمرا اور اپنے تمام اختلافات بھلا کر ان کے لئے غیر جانبداری سے نہیں سوچ سکتیں؟“ وہ تھک سا گیا تھا۔ حین نفی میں سرہلاتی سامنے بیٹھی۔ ہاتھ سے ماتھے پر کئے بال ہٹائے جو پھر دوبارہ وہیں گر گئے۔

”وہ اصل بات چھپا رہی ہیں۔ یہ ہوئی نہیں سکتا کہ وہ بغیر کسی منفی وجہ کے ماموں سے شادی پر راضی ہو جائیں۔“ وہ مانے کو تیار نہیں تھی۔

”میرا خیال ہے وہ بڑے ابا کہ کہنے پر ایسا کر رہی ہیں، اور دل میں ابھی بھی ماموں کے لئے بغض ہو گا۔ شاید وہ بحث کی تلاش میں ہیں ان کا ساتھ دینا چاہیے، ناکہ ان پر شک کرنا چاہیے۔“

”اوہ خدا۔ آپ لوگوں کو کیوں نہیں نظر آ رہا؟“ وہ مجسہ، حیران پریشان تھی۔ ”وہ زمر یوسف ہیں، ان کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ فارس ماموں کو نقشان پہنچانا چاہتی ہیں، اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے۔“

”انہوں نے مجھے اپنی زبان دی ہے کہ وہ فارس کو کوئی نقشان نہیں پہنچائیں گی۔“ وہ ایک ایک حرفاً بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔ حین چپ ہو گئی۔ سینے پر بازو لپیٹ لیے اور ابھی ابھی سی انگلی کا ناخن دانت سے کترنے لگی۔

”مگر....“ چند ثانیے بعد انگلی دانوں سے نکال کر وہ حتیٰ انداز میں بولی۔ ”مگر میں ان پر یقین نہیں کر سکتی۔“

”بس کرو حین۔“ ندرت کچن سے اکتا کر نکلیں۔ ہاتھ میں کفگیر تھا، گویا حین کو دے مارنے کا ارادہ ہو۔ ان دونوں کے سامنے کھڑے، کمرپہ ہاتھ رکھے، وہ جب بولیں تو بے زار لگ رہی تھیں۔

”کوئی عقل ہے تم میں؟ وہ فارس کو برا بھلا کہتی تھی تب بھی ہم سب کو شکایت تھی، اب نہیں کہہ رہی، تب بھی تم اس کے پیچھے پڑی ہو۔ جب ایک دفعہ اس نے اپنے الامات واپس لے لئے تو اسے معاف کر دواب۔“

”مگر وہ کیسے بُنی خوشی ماموں سے شایدی کر سکتی ہیں؟“ حین اب کے ذرا دھیمے لجھے میں بولی۔ لاشوری طور پر کشن پر ہاتھ رکھ لیا۔ اوہ راہی نے کفگیر گھمایا، اوہ راہس نے کشن کوڈھاں بنایا۔

”کیونکہ اس میں تم سے زیادہ عقل ہے۔“ وہ بھی گویا تھک گئی تھیں۔ ”وہ بیمار ہے بیٹا، اس کے گردے خراب ہیں، اور بڑے ابا پہلے سے زیادہ بیمار رہنے لگ گئے ہیں۔ (حمد نے آہستہ سے کشن چھوڑ دیا۔) اس کو فارس سے بہتر رشتہ نہیں ملے گا، وہ سمجھ چکی ہے۔ اس لئے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے گزشتہ رویہ کا ازالہ کرنے جا رہی ہے۔ تو تم دونوں کیوں میں مخ نکال رہے ہو؟“

”نہیں، مجھے تو اب کوئی اعتراض نہیں۔“ سعدی نے فوراً ہاتھ اٹھا دیے اور احتیاط سے کفگیر کو دیکھا جو ہنوز اسی کے کمرپہ رکھے ہاتھ میں تھا۔ حین چپ چاپ اپ کاٹی رہی۔ چہرے کی ٹھنکی اب تاسف اور ندامت میں بدگئی تھی۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ بس اتنا سا کہا، اور اٹھ کر اندر چل گئی۔ ندرت افسوس سے اسے جاتے دیکھتی رہیں۔

”اسے کیا ہو گیا ہے سعدی؟ یہ پہلے ایسی نہیں تھی۔“

سعدی نے گہری سانس لیتے ریمورٹ اٹھا لیا۔

”امی.... ہم میں سے کوئی بھی پہلے ایسا نہیں تھا۔“

ندرت کچھ منہ میں بڑا تمیں پلٹ گئیں۔ سعدی وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اُنی وہی چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا۔ سیم اس کے لیپ ٹاپ پر بیٹھا کوئی گیم کھیل رہا تھا۔

”آپ کو کمپیوٹر چاہیے بھائی؟“ اسے آتے دیکھ کر تابعداری سے پوچھا۔

”اوہوں۔ تم بیٹھو۔“ اس نے جھک کر اسٹنڈی ٹیبل کے نچلے دراز سے ایک چھوٹا سا بکس نکالا۔ اور الماری تک آیا۔ پٹ کھول کر

اصطیاط سے باکس کا ڈھکن الماری کے اندر کر کے ہٹایا۔ (سیم دور تھا۔ اس طرف اس کا رخ نہیں تھا۔) باکس کے اندر ایک پلٹیشن اور ہیروں کا جھلما جاتا نیکلیں رکھا تھا۔ (جو اہرات کا نیکلیں جوا سے واپس کرنا تھا۔) اور ساتھ میں سفید رنگ کی فلیش ڈرائیو۔ اس نے ڈرائیونکا لی ڈبہ الماری کے اندر چھپا کر رکھا اور باہر نکل آیا۔

خین اپنے بیٹھ پلٹھی ایک رسالے کے ورق پلٹ رہی تھی جب سعدی چوکھت میں آیا۔

”یہ وہ فائلر ہیں جو مجھ سے نہیں کھلیں۔ کیا تم انہیں کھول دو گی؟“

وہ چوکی۔ سر گھما کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں تعجب در آیا۔

”میں..... آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں، میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کرتی اب۔“

”کچھ دن اسے اپنے پاس رکھو۔ اگر موڑ بننے تو کر دینا۔ نہیں تو واپس دے دینا،“ مگر اسے رکھو اور سوچو کتم میری مدد کرنا چاہتی

” ہے یانہیں۔“

وہ فلیش اس کی سمت بڑھائے ہوئے تھا۔ خین کی آنکھوں میں نھکی تھی، مگر اس نے چپ چاپ وہ پکڑ لی۔ سعدی چلا گیا تو وہ انھیں الماری تک آئی، اس کے نحلے جو توں والے خانے کے برابر بیٹھی۔ ایک بڑا باکس نکالا۔ اس میں وہ لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ اور دوسراے ایسے کئی گadgeٽ رکھتے تھے جو اورنگزیب کاردار نے اسے دیے تھے۔ علیشا کا لاکٹ بھی ادھر ہی تھا۔ حنے نے وہ فلیش بھی ان منوعہ اشیاء کے ساتھ رہ دی اور وہ بند کر کے اندر دھکیل دیا۔

پھر گھری سانس بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوچنا کیا تھا؟ جو طے کر لیا تو بس کر لیا۔

❖❖❖

اپنے قاتل کی ذہانت پہ جیران ہوں میں ..... ہر روز ایک نیا طرز قتل ایجاد کرے مئی کی چلچلاتی سہہ پھر پورے شہر کو گویا جھلساری تھی۔ ایسے میں اس پوش علاقے کا وہ ریشورانٹ خالی لگ رہا تھا۔ دور کوئی اکا دکا نہ ہے تھی، ورنہ گرمی نے کاروبار مختدا کر رکھا تھا۔

گھنگری لے بالوں کو ہاف کچر میں باندھے، کہنی پر پس انکا نئے سیاہ منی کوٹ اور سفید لباس میں ملبوس زمر تناسب چال چلتی اندر اٹھ لیں ہوئی اور سیدھی دروازے کے قریب ایک میز تک چلی آئی۔ گئے برسوں میں ایک روز ادھر زرتابشہ بیٹھی دکھائی دی تھی، اب وہ کسی خالی ریشورانٹ کافی بدل چکا تھا۔ رنگ، فرنچیز، شاید میو بھی۔ مگر اسے تو ایک ایک تفصیل یاد تھی۔ سوکوش کی کہ بھوری آنکھوں کو میر پر رکھے گلدارن پہ جمادے اور ہلائے نہیں۔ ورنہ کچھ اندر تک مل جاتا تھا۔

”لاگ نائم، میڈم!“ وہ کری کھنچ کر سامنے بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا تو زمر نے آنکھیں اٹھائیں۔ آخری ملاقاتات کا منتظر آنکھوں میں جھلما دیا۔ جیل کا ملاتاتی کرہ، اور میز کے پار بیٹھا سفید کرتے شلوار اور کسی ہوئی پونی والا فارس۔ (میں۔۔۔ معافی۔۔۔ نہیں مانگوں گا!) پھر منظر بدلا اور چار برس پہلے کی زرتابشہ اسٹرالیوں میں دبائے ادھر بیٹھنی نظر آئی، اور اب..... اب وہ پوری آستین کی اٹی شرٹ میں ملبوس ہاتھ باہم لا کر میز پر رکھے، چھوٹے کئے بالوں کے ساتھ، بلکی نہری آنکھوں کو سکیرے اسے دیکھ رہا تھا۔

ان تینوں مناظر میں، زرتابشہ، جیل والا فارس، اب کا فارس، ان سب میں اگر کچھ مشترک تھا تو وہ زمر تھی۔ وہی بال، وہی سیاہ کوٹ، وہی

سفید لباس۔ سب آگے بڑھ گئے یا پیچھو رہ گئے، ایک اسی کی زندگی رکی ہوئی تھی۔

”لاگ نائم، فارس!“ ویر نے آ کر میو کارڈ سامنے رکھے۔ زمر نے کافی مانگوائی۔ فارس نے کچھ نہیں مانگوایا۔

”تو کیوں ملنا چاہتے تھے آپ مجھ سے؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کرو وہ خندسا بابولی۔  
”آپ کے والد نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے شادی کرلوں۔“ اس کے تاثرات دیکھنے وہ رکا۔ زمر نے ہلکے سے اثبات میں سر کو ختم دیا۔

”مجھے معلوم ہے۔ انہوں نے مسز کاردار کے کہنے پر ایسا کیا اور مسز کاردار نے میرے کہنے پر۔“

فارس نے تجہب سے چہرہ ذرا پیچھے کیا۔ پتلیاں سکیئر کرائے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے زمر نے ابر و اٹھائی۔

”کیوں آپ کو کیا لگا تھا؟ میں جھوٹ بولوں گی، ادا کاری کروں گی، یہ ظاہر کروں گی کہ آپ کو معاف کر دیا ہے یا بے گناہ سمجھتی ہوں اور دل سے اس شادی پر راضی ہوں؟“ ذرا سے استہراۓ نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ مجھے بالکل نہیں جانتے فارس!“

وہ پیچھے ہو کر بیٹھا، کھوجی مشتبہ نظرؤں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے واقعی امید نہیں تھی کہ وہ خود ہی ہر شے کا اعتراف کر لے گی۔

”آپ نے مسز کاردار سے ایسا کرنے کے لیے کیوں کہا؟“

”کیونکہ مجھے چند دن پہلے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے میرا رشتہ مانگا تھا اور میری امی نے انکار کیا تھا۔ اس سے پہلے میں اتنے سال یہ سمجھتی رہی کہ آپ نے مجھے صرف استعمال کی ہے سمجھ کر استعمال کیا، کوئی زل ڈینج۔ مگراب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ ذاتی جگہ تھی۔ میں مظلوم نہیں تھی، انتقام لیا تھا آپ نے مجھ سے۔ وہ خبریں پڑھنے کے انداز میں کہے گئی۔ کافی آگئی تو اس نے کپ اٹھا لیا۔ جلتا ہوا مائع لبوں سے لگایا۔“

”اچھا۔ پھر؟“ وہ چھپتی آنکھیں اس پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔

”اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب تک میری آپ سے شادی کروانا چاہتے ہیں۔ سو میں نے مسز کاردار سے کہا کہ وہ ایسا کروادیں۔ میں آپ سے شادی کے لئے تیار ہوں۔ کافی اچھی ہے۔“ سراہ کراس نے کپ واپس دھرا۔

”ہوں۔ اور کس لئے؟“ جواب میں زمر نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

”یہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے میں آپ سے آپ کے جرام کا اعتراف کرو اسکتی ہوں۔ اور مجھے یہی کروانا ہے۔“

”تو اگر آپ مجھ سے انتقاماً شادی کرنا چاہتی ہیں تو مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟“

”کیونکہ آپ کے برعکس میں کمرپہ دار کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں آپ کو پہلے سے وارن کر رہی ہوں۔ میں یہ شادی آپ سے اعتراف جرم کے لئے کر رہی ہوں۔ اس لئے آپ چاہیں تو یہ شادی نہ کریں اور میرے ابا کو انکار کر دیں۔ فیصلہ آپ کا ہے۔“ کپ کے منہ پر انگوٹھا پھیرتی وہ کہہ رہی تھی۔ فارس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔

”اس آپشن کا شکریہ کیا میں اس پوزیشن میں ہوں کہ جب وہ اپنے منہ سے کہہ چکے ہیں تو ان کو انکار کر دوں؟“

زمر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ”میں نے آپ کو مطلع کرنا تھا،“ کر دیا۔ مجھ سے شادی کریں گے تو اعتراف جرم کرنا ہی پڑے گا ایک دن۔ آگے آپ کی مرضی۔ کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ پرسکون، مطمئن آنکھیں فارس پر جھیلیں۔

فارس آگے ہوا، میز پر ہاتھ رکھ کر اس کی سمت جھکا۔ ”کیا آپ مجھے پہنچنے کر رہی ہیں؟“

”سچائی بتا رہی ہوں!“

”اور یہ سچائی کتنے لوگوں کو مزید بتانے کا ارادہ ہے آپ کا؟“

”اگر آپ نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔“ کپ پرے کر کے اس نے بیگ کی اسٹریپ کندھے پر ڈالی۔ سرد سامنکاری! اور اگر آپ کو شادی پر کوئی اعتراض نہ ہو تو اتنا خیال رکھیے گا کہ میرے بھتیجے اور میرے ابا س معااملے سے بے خبر ہیں جو ہمارے درمیان ڈسکس ہوا ہے۔ اس سب میں ان کو دکھنیں پہنچانا چاہیے۔“

”شیورا!“ اس نے تلخی سے گردون کو ختم دیا۔

”کوئی اور سوال نہیں ہے تو میں جاؤں؟“ اور پرستھا میں بھی، کرسی دھکیلی، اور جانے کے لیے مڑی۔

”صرف ایک سوال، میم!“ وہ جیب سے والٹ نکالتے اٹھا۔ سر جھکاۓ چند نوت نکالے میز پر کھڑا اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ پاٹ لر سوال اپنے نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اگر میرے خلاف اس ساری ان تھک محنت کے بعد آپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں بے گناہ تھا تو کیا کریں گی آپ؟“

زمر، جو اس کے مخاطب کرنے پر کی تھی، پر سپاہاتھر کھڑی، چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”هم دونوں جانتے ہیں کہ آپ بے گناہ نہیں ہیں!“

پھر مڑی اور تیز تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھی۔ اس کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا، یا اس نے جواب سوچا ہی نہیں تھا۔

فارس کا ان کی لومستہ سوچتی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

❖❖❖

ہو گلہ کسی سے کیوں اپنی مات کا ہی جب ..... شہبہ جو دلا دیں وہ اپنے ہی تو مہرے ہیں

قصیر کاردار میں اس رات ڈائینگ ہال میں لکھانا جن دیا گیا تھا، اور ہاشم خالی سربراہی کری کے دائیں ہاتھ پہلی کری پہ بیٹھا، نیکین

پھیلار ہاتھا جب اس نے لاڈنچ کی سمت سے جواہرات کو آتے دیکھا۔

”کس کافون تھا؟“ جواہرات پہلے سربراہی کری پہ بیٹھی، لٹکنگی سے پیچھے کی، پھر کہیاں میز پر رکھے دونوں ہاتھوں کو اد پر تلے رکھ کر

تھوڑی ان پہ جائے، مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ بینیٹ کے ساتھ سفید شرٹ میں ملبوس سر جھکاۓ پلیٹ اپنی طرف کر رہا تھا۔

”فارس کا۔“

چاول پلیٹ میں نکلتے ہاشم نے ناگواری سے سر جھنکا۔

”اتباہ منہ مت بناؤ۔ اس نے بتایا کہ وہ زمر سے شادی کے لئے راضی ہے اور یہ کہ میں زمر کے والد کو مطلع کر دوں۔“

”کیا اسے یہ اطلاع اپنی بہن کو نہیں دینی چاہیے تھی؟“

”ان کو بھی دے گا۔ مجھے تو بس یہ جتار ہاتھا کہ زمر نے اسے تادیا ہے کہ اس نے خود یہ بات شروع کرنے کے لئے مجھے کہا تھا۔“

کائنے سے چاول بیوں تک لے جاتے ہاشم نے رک کر اچھبے سے اسے دیکھا۔

”زمر نے اسے کیوں بتایا؟“

”اے مجھ پا اعتماد نہیں ہے۔ اسے لگا ہو گا کہ میں اس راز کو اس کے خلاف استعمال کر سکتی ہوں اسی لئے بتا دیا۔ مجھے بھی اس کی

امید نہیں تھی، عگر بہر حال وہ ایک عقلمند ہوتا ہے۔“ گھری سانس لے کر جواہرات نے سلااد کے پیالے سے چیچ بھر کر اپنی پلیٹ میں ڈالا۔

”انتقام لینے کے ایک ہزار طریقے ہوتے ہیں۔ اسے فارس سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بالکل بھی یہ سب پسند نہیں

آ رہا۔“ وہ ناپسندیدگی سے کہتا، پلیٹ پر جھکے کھا رہا تھا۔

”تمہیں کیا بارالگ رہا ہے؟“

”وہ شادی کے بعد ادھر.....“ اب وہ سے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا جس کے پار دور سبزہ زار نیکسی کھڑی تھی۔ ”ادھر آ کر رہے لگ جائے

گی۔ صبح شام مجھے اس کی شکل دیکھنی ہو گی۔ ناقابل برداشت۔“ منه میں چاول رکھے برہم آنکھوں کے ساتھ چباتا رہا۔

”یہمارے لئے زیادہ اچھا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ۔“ وہ مسکرا دی۔

”شیر و کھاں ہے؟ کل بھی ڈر زپ نہیں تھا۔“ تھوڑی خاموشی کے بعد ہاشم نے مقابل رکھی خالی کری کو دیکھ کر پوچھا۔  
”دوسروں کے ساتھ باہر ہے۔ شاید۔“

”آپ نے پوچھا نہیں یہ کون سے نئے دوست نکل آئے ہیں اس کے؟“  
”خود ہی تو کہتے ہو، اس پر دباؤ نہ الا کروں۔ سو خاموش ہوں۔“

ہاشم نے نیکین سے لب پھینکھائے اور پھر اسے گویا میز پر پھینکا۔ جواہرات نے چونک کرا سے دیکھا۔ وہ بہم نظر آ رہا تھا۔  
”وہابھی تک شہری کی وجہ سے ایسا ہے؟“

”اس بات کو ڈر ہفتہ ہی تو ہوا ہے، اتنی جلدی کیسے سن بھلے گا۔ خیر، تم بات کر کے دیکھو۔ کیونکہ جب میں بات کروں گی تو پھر ایک ہی دفعہ کروں گی۔“ مسکراتے ہوئے مگر سرد لبجھ میں کہہ کر وہ کھانے لگی۔

”پھر کبھی سہی۔“ ہاشم میز سے سیل فون انٹھاتا، کری دھکیل کر انٹھ کھڑا ہوا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں ہنوز غصہ اور ناگواری موجود تھی۔

.....❖❖❖.....

تو محبت سے کوئی چال تو چل! ..... ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھ کو!  
اپارٹمنٹ بلڈنگ کے اس فلور پر مدھم بتیاں جل رہی تھیں۔ سیرھیاں ویران تھیں، البتہ لفت کی یہ ورنی اسکرین پر نمبر بدلتا نظر آ رہا تھا۔

دفعتا لفت ادھر ہی رکی۔ دروازے ’سکن‘ کی آواز سے کھلے۔ اندر سے اسٹریپ والا بیگ کندھے پڑا لے جیز، ظی شرت اور الٹی پی کیپ والا احمر رنگا۔ مانچے پر کئے بال اب کے کیپ کے اندر تھے اور لاپرواہ چہرے پر وہی تاثرات تھے جو بیمشہ ہوتے تھے۔ لبوں کو گول کیئے وہ مدھم ہی سیئی بجا تا پنے دروازے تک آیا۔ چابی لاک میں گھمائی۔ اسے کھول کر اندر قدم رکھا۔  
راہداری میں اسی طرح سیئی بجا تا آگے آیا۔ لاونچ کی میز پر بیگ رکھا اور کیپ اتاری، ہی تھی کہ ایک دم کرنٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

کچن کا وزیر کے اوپرے اسٹول پر فارس اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ کہیاں کا وزیر پر جمائے وہ سافت ڈریک کے کین سے گھونٹ بھر رہا تھا۔

”اوہ ایم جی!“ احمر نے بے لینی سے اسے دیکھا، پھر پلٹ کر راہداری کو اور پھر رہا تھا میں کپڑی چاہیوں کو۔ ”کیا تم میرے گھر کا لاک توڑ کر اندر آئے ہو؟“

فارس نے گھونٹ بھرتے بھرتے رک کر پھر گھمایا۔ چھوٹے سے فلیٹ کا جائزہ لیا۔

”یہ گھر ہے؟“

”کم از جیل نہیں ہے۔“ وہ جل کر کہتا کا وزیر تک آیا اور خلکی سے اسے دیکھا۔

فارس اسی گرے پوری آستین کی شرت میں مبوس تھا جو سہ پھر زمر سے ملاقات میں پہن رکھی تھی۔

”میں نے پوچھا، تم میرے اپارٹمنٹ میں داخل کیسے ہوئے؟“

”اے... تمیز سے... کیا تم مجھے آپ نہیں کہا کرتے تھے؟“ اسے گھوکر دیکھا اور کیم انچا کر کے آخری گھونٹ اندر انڈیلا۔

”تب ہم اتنے بے تکلف نہیں تھے۔“ خود ہی شانے اپکا کر، اپنے سوال پر لعنت بھیجتا، وہ فرتیج تک آیا، اور کھول کر اندر جھانکا۔ پھر دروازہ بند کر کے برا منہ بنا کر پلٹا۔

”آخری کین تمہیں ہی مبارک ہو، غازی۔ اب بتاؤ، مزید کتنا سلحوں چاہیے؟“

دوسری اسٹول کھیج کر اس کے ہمراہ بیٹھا اور رخ بھی اس کی طرف پھیر لیا۔ جبل سے نکلتے ہی فارس نے اسے فون کر کے اسلحوں مانگوایا تھا، جو اس نے ارتیخ کر کے دے بھی دیا تھا۔

”اسلحہ نہیں چاہیے۔“

”پھر؟“

”میں شادی کر رہا ہوں۔“ خالی کین ہاتھ میں گھماتے اس نے چڑھہ موڑ کر احر کو دیکھا۔ احر کا پہلے تو منہ کھل گیا۔ پھر اس نے بند کر لیا۔ پھر اثبات میں دو تین دفعہ سر ہلایا۔

”گذ۔ مبارک ہو۔“

فارس نے ابر و اٹھا کر ”بس یہی؟“ والے انداز میں اسے دیکھا۔

”اور کیا پوچھوں؟“ ناراضی سے سر جھکتا۔ پھر چھت کو دیکھتے ذرا سا سوچا۔

”ویسے کون ہے یہ بیچاری جس سے تم شادی کرنے جا رہے ہو؟“

فارس چند لمحے سوچتا رہا، پھر گہری سانس لی۔ ”چیل سے۔“

”نہ کرو بھائی۔“ احر نے ناک سے کھمی اڑائی۔ ”اب اتنی کوئی بری شکل کی بھی نہیں ہو گی جو اسے چڑیل کہا جائے، پتہ ہے یہ سب لڑکیاں...“ بولتے بولتے ایک دم اسے بریک لگی۔ اسٹول سے چھکلے سے اٹھا۔ نہایت بے قینی سے فارس کو دیکھا جو ہنوز بیٹھا کیں کو ہاتھوں میں گھمارا تھا۔

”وہ..... وہ چڑیل؟ نہ کرو یار.... وہ پر اسکیو ٹرزر مر یوسف؟“ اس کے کندھے کو جھنھوڑتا وہ واپس اسٹول پر بیٹھا۔ آنکھیں ابھی تک بے قینی سے پھیلائیں۔

”مگر کیوں؟ دماغ تو ٹھیک ہے؟“ وہ حیران پریشان سا پوچھے جا رہا تھا، فعتاً درستیل بھی۔

”کھانا مانگوایا تھا۔ لے آؤ۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے کین ڈسٹ بن کی جانب اچھائتے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو احر کو چارونا چاراٹھنا پڑا۔

پندرہ منٹ بعد وہ دونوں لاڈنچ کے صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میز پر ٹیک ااوے کے ڈبے کھلے پڑے تھے اور کھانا ختم ہوا چاہتا تھا۔

”میرا مشورہ مانو تو فوراً شادی سے انکار کر دو۔ ورنہ جو زمر صاحبہ تمہیں برآ پھنسائیں گی نا، یاد رکھو گے۔“

فارس نے بے زاری سے ناک سے کھمی اڑائی۔

”نہیں کر سکتا انکار۔ اس کے باپ کے احسان ہیں مجھ پر۔ وہ نہ ہوتے تو میں یہاں نہ ہوتا۔“

”اور ان کی بیٹی نہ ہوتی تو واقعی تم یہاں نہ ہوتے۔“

”بکومت۔“ وہ نشوٹے ہاتھ صاف کرتا پیچھے ہو کر بیٹھا۔ باز صوفے کی پشت پر لمبا سا پھیلایا۔ اوپن پکجن کی سمت دیکھتے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”ویسے ایک بات سوچنے کی ہے۔ اگر اس کو تم سے.....“ فارس نے نگاہیں اس کی جانب پھیر کر گھورا۔ احر کا۔ ”اگر ان کو تم سے.....“

(تعجیج کرتے بات جاری رکھی) ”اعتراف جرم کروانا ہے یا تمہیں مجرم ثابت کرنا ہے تو اس کے لئے شادی کرنے کی کیا ضرورت؟ مطلب یہ

کام تو کسی اور طریقے سے بھی ہو سکتا ہے نا۔“

”مجھے معلوم ہے وہ کیوں شادی کرنا چاہتی ہے! جب آخری دفعہ وہ جیل میں مجھے ملنے آئی تھی تو اس نے کہا تھا، اچھا ہے جیل تو زور اور باہر جاؤ، دوبارہ شادی کرو اور اس بیوی کو بھی مار دو۔ تم وائف کلر زکی سائیکلی... پہنپیں کچھ ایسا ہی بولا تھا اس نے۔“ ہلکے سے سر جھکا تو احمد کا مند کھل گیا۔

”تم... تم ان کے نزدیک وائف کلر ہو، اور... اور بیوی کو قتل کرنے والے ہمیشہ بھی تو کرتے ہیں۔“ احمد نے پر جوش انداز میں صوفے کے بازو پہ ہاتھ مارا۔ ”وہ پہلے قتل کے لازم سے فجح جائیں تو دوبارہ شادی کرتے ہیں، اور دوبارہ قتل کرتے ہیں، دوسرا بیوی کو۔ وہ سمجھتی ہیں کہ تم انہیں بھی مارنے کی کوشش کرو گے اور پکڑے جاؤ گے۔“

”نہیں۔ اسے اچھے سے پتہ ہے کہ میں اسے نہیں ماروں گا۔ مگر باقی دنیا کو تو نہیں پتہ۔“

”مطلوب؟“ احمد نے الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ دو انگلیوں سے تھوڑی کے بال نوچتے کہہ رہا تھا۔

”وہ مجھے زمر یوسف کے ارادہ قتل کے جرم میں پھنسانا چاہے گی۔ وہ واقعات کو اپنی مرضی سے ترتیب دے گی۔ ایسے کہ دنیا مان نے فارس غازی نے پھر سے زمر قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دفعہ لوگ اس کا یقین کر لیں گے۔“

احمد دم بخود بیخہ ان رہا تھا۔ ذرا دیر کو خاموشی چھا گئی، پھر اس نے گویا جھر جھری لی۔

”سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم اس سے شادی کر رہے ہو؟ ابھی بھی وقت ہے یار۔ اس کے باپ کو انکار کر دؤ یا یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ۔“

مگر فارس نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”اس کے پاس میرا جرم ثابت کرنے کا یہ آخری راستہ ہے۔ میرے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا یہ آخری راستہ ہے۔ میں اس کو نہیں گنواؤں گا۔ وہ اپنی پوری کوشش کر لے!“ تب بھی مجھے نہیں پھنسا پائے گی۔ بچھلی دفعہ اگر وارث کے قاتل مجھے بیٹ اپ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تو وہ میری غلطی تھی۔ ”وہ انگوٹھے کے ناخن سے تھوڑی مسلتا، میز پر بکھرے ڈبوں کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔“ میرا بھائی قتل ہوا تھا تو مجھے زیادہ احتیاط کرنی چاہیے تھی، مگر مجھے لگا تھا.....“ اس نے تلپی سے مسکرا کر سر جھکا۔ ”کہ مجھے کوئی پھنسانہیں سکتا۔ تب تک میں لوگوں کو گرفتار کرنا آیا تھا، کوئی مجھے کیسے گرفتار کر سکتا تھا؟“ مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہو گا اُپنی۔ اس دفعہ میں تیار ہوں۔ ”حقیقی نگین لجھے میں کہہ کر اسے دیکھا اور پھر انھ کھڑا ہوا۔ احمد ابھی تک فکر مندی سے اسے تک رہا تھا۔

”میدم پر اسکی بوڑکا قصور نہیں ہے۔“ فارس نے اب کے نزدی سے اسے گویا تسلی دی۔

”ہاں وہ تمہیں پھانسی پڑکا دے گی، تب بھی کہنا اس کا قصور نہیں ہے۔“ وہ جان سے جل گیا تھا۔

”اوہوں۔ یہ میرا قصور ہے۔ میرے بھائی کے دشمن اور میرے دشمنوں نے میری وجہ سے مجھے پھنسانے کے لئے اس کو زخمی کیا۔ اگر وہ مجھے مور دا لازم تھہراتی ہیں تو وہ غلط نہیں ہیں۔“ چاپی اور فون اٹھا کر وہ راہداری کی جانب بڑھ گیا۔

”مجھے پتہ ہے کیا گلتا ہے؟“ عقب سے احمد کی اداز پر اس کے قدم تھہراتے۔

”مجھے گلتا ہے یہ سب وہ بہانے ہیں جو تم نے گھڑے ہیں۔ اس کے ابا کے احسان اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع، اس کے دکھوں کی وجہ تھا ری ذات کا ہوتا۔ اوہوں۔ سب بہانے ہیں غازی۔“ وہ بکھرے ڈبے سیستہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ فارس نہیں مزاویں رکھ رہا۔ آنکھیں بیرونی دروازے پگی تھیں اور گردن میں ڈوب کر ابھرتی گئی واضح دکھائی دی تھی۔ اسے پتہ تھا اُپنی کیا بنیں والا ہے۔

”تم اسے پسند کرتے ہو اور اسے کھونا نہیں چاہتے۔ یہ پہلی وجہ ہے۔ باقی وجہات اس کے بعد آتی ہیں۔“

”بکومت!“ وہ بنا پلٹے مدھم آواز میں بولا، تیز قدموں سے باہر نکلا اور دروازہ زور دار ”ٹھاٹھا“ سے بند کیا تو ڈبے اکھٹے کرتے احمد کے ہاتھ سے کچھ گرتے گرتے بجا۔

”آؤچ!“ اس نے فنگ سے راہداری کی سمت دیکھا۔ ”چ بولنے کا تو زمانہ ہی نہیں رہا، اٹھنی۔ اونہوں۔ احمد۔“ ناگواری سے تصحیح کرتا وہ انٹھ کھڑا ہوا۔

❖❖❖

کتنی عجیب بات ہے جو نہ چاہتا تھا میں ..... قسم سے اس طرح کا مقدر ملا مجھے یوسف صاحب کا بغل رات کے اس پہر خاموش اور اداس پڑا تھا۔ لا دخن کی کھڑکی سے اندر جانکو تو سب تاریک تھا سوائے یوسف صاحب کی دھیل چیز کے جسے وہ خود چلاتے، راہداری کی سمت لے جا رہے تھے۔ سناٹے میں پہیوں کی چیزوں نے جیسے کوئی مدھم سانوہ بلند کیا۔ پھر اس میں زمر کے کمرے کے دروازے کی چرچا ہٹ بھی شامل ہوئی جسے دھکیل کروہ اندر داخل ہوئے۔ وہ جائے نماز پڑھنی دو پہنچے چہرے کے گرد لپیٹے سلام پھیر چکی تھی اور اب دعائیں کی جائے تھیں جائے نماز پا انگلیاں پھیرتی کچھ سوچ رہی تھی۔ آہت پہ چونک کر گردن موڑی۔ انہیں دیکھ کر نرمی سے مسکراتی اور رخ ان کی سمت پھیرتے ہوئے آزوں میٹھے کر گھنون کے گرد بازوؤں کا حلقة بنالیا۔ پھر نرمی سے پوچھا۔

”آپ سوئے نہیں ابھی تک؟“ بڑے ابا نے نم آنکھوں سے اس کا چہرہ تکا۔ سیاہ دو پہنچے کے ہالے میں وہ گندی چہرہ تھا۔ خوبصورت نہیں تھی وہ مگر اچھی شکل کی تھی۔ پر کشش۔ اور کچھ اس کا ٹھنڈا پر سکون انداز تھا جو اسے پر کشش بناتا تھا۔ وہ بھگو بھگو کراور لپیٹ کر بھی اسی ٹھنڈے انداز میں مارا کرتی تھی اور اپنی نرمی اور لٹکنی کے باوجود وہ ان کو بہت پیاری تھی۔

”تم ناراض ہو کیا؟“ انہوں نے اس کا سوال شاید سنا ہی نہیں۔ بس گلی آنکھوں سے دیکھتے اپنی پوچھنے لگے۔

”نہیں ابا۔ میں کیوں ناراض ہوں گی؟“

”تم نے سعدی سے کہا کہ تم شادی کرلوگی فارس سے۔ کیا یہ ناراضی میں کہا؟“ زمر کی آنکھوں میں کر چیاں سی ابھریں مگر وہ ان کو چھپا کر مسکرا دی۔

”زمر سے کوئی زبردستی کرو سکتا ہے کیا؟“

”پھر بیٹے تم کیوں شادی کرلوگی اس سے؟ تم انکار کرنا چاہتی ہو تو کر دو۔ میں ساری باتیں یہیں ختم کر دوں گا۔ وہ بھی پہنچنے نہیں کیسے میں سز کاردار کی وجہ سے وہ سب فارس سے بول گیا۔....“ شاشٹکی سے نغمی میں سر ہلاتے وہ خخت رنجیدہ خاطر لگ رہے تھے۔

”اس روز جس شادی پہ میں سعدی لوگوں کے ساتھ گئی تھی نا، ادھر میں نے حماد کو دیکھا۔ کرن بھی ساتھ گئی اور وہ بچے بھی۔“ وہ اداسی سے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

”تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے ورنہ میں صرف خود کو اور باقی سب کو نقصان دوں گی۔ اس لئے اب میں اس فیصلے پر عملدرآمد کرنے جا رہی ہوں، تاکہ تم سب کی زندگی میں بہتری آئے، ہم سب اس نا سور سے جان چھڑا لیں جو چار برس قبل ہماری زندگی میں آیا تھا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر تم دل سے فارس سے شادی پر راضی ہو؟“

”میں اپنی زندگی سے یہ نا سور اکھاڑا چھیننے کے لئے کسی بھی حد تک جانے کے لئے تیار ہوں ابا، فارس سے شادی تو چھوٹی بات ہے۔“ وہ بہت ضبط سے مسکراتی اس کا نام لے کر کہہ رہی تھی۔

”اور... تم نے اس کی طرف سے اپنادل صاف کر لیا کیا؟“ ان کے چہرے پہام جائی تھی، پھر بھی ذرتے ذرتے پوچھا۔ گھنٹوں کے گرد بازو لپیٹنے پڑھی سر اثبات میں ہلایا۔

”میرے خیالات اس کے بارے میں بالکل چیزیں، اگر کوئی ابہام تھا بھی تو وہ دور ہو چکا ہے۔ میں اس سے ملی تھی شام میں، ہم دونوں نے اس بارے میں بات کی، اپنی ترجیحات بتائیں، اور وہ میری طرف سے مطمئن تھا۔ جب ہی اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اس کے متعلق میرے دل میں کوئی میل نہیں، کوئی بغض نہیں، مگر اتنا کہوں گی کہ اس شادی کے بعد کم از کم ہم سب چاچی سے واقف ہو جائیں گے۔“ اس نے بچ سب بتا دیا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے اور ابا کیا سمجھیں گے۔

”اچھا تمہاری بات ہوئی ہے اس سے؟“ انہوں نے قدرے تسلی بخش انداز میں سر ہلاتے ہوئے صرف اپنی خواہش کا مطلب سمجھا۔

”جی، بالکل۔ اس نے تخلی سے میری فیلمینگ نہیں اور پھر وہ رضامند ہو گیا۔ اور اگر وہ راضی ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس سے شادی کر کے ایک نئے سفر کا آغاز کرنا چاہوں گی ابا، اور یہی سفر ہم سب کو حقیقت پسند بنائے گا۔“ اور پھر وہ نرمی سے مسکرائی۔ بڑے ابا نے شادی کا دوپٹے میں لپٹا سر تھکا، اور بلکل ہی مسکراہٹ اور ڈھیروں سکون کے ساتھ واپس پلٹ گئے۔ جب ان کی وہیل چیز براہ رکھ لئی تو زمر کی آنکھوں کی نرمی، عجیب ہی تکلیف میں بدل گئی۔ وہ ست روی سے اٹھی اور دروازہ بند کیا۔ پھر دروازے سے کمر لگا کر چند لمحے کھڑی رہی۔ ”قاتلوں کو ہم اس لئے سزادیت ہیں ابا تا کہ وہ مزید معصوم لوگوں کی زندگیوں سے نہ کھلیں۔ اس شخص نے ہمیشہ انہی کو نقصان دیا ہے جو اس کے لئے اپنا بیت رکھتے تھے۔ اور اب آپ سب اس کے لئے اپنا بیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف میرے لئے نہیں ابا۔ یہ ہم سب کے لئے ہے۔ ہمیں فارس غازی نامی ناسور کو اپنی زندگیوں سے اسی طرح نکالنا ہوگا۔“ اداسی سے سوچتی وہ دوپٹے کی تہیں چہرے کے گرد سے ہوئے گی۔



اتنا بھی صبر و شکر کا قائل نہیں یہ دل ..... کہ ہر کیفیت میں آپ کے گن گائے جائے گا  
اگلی صبح شہر پر پہلے سے بھی گرم طلوع ہوئی تھی۔ چھوٹا باغ پچھے دھوپ میں جھلس رہا تھا۔ لگاس دکب رہا تھا۔ پھول جمل رہے تھے۔ ایسے میں گھر کے اندر کو لکھنڈی، نم ہوانے گری کو کم کر رکھا تھا۔ اور وہ قنے و قنے سے اس کوڑ سے اڑتے پانی کے چینٹنے کبھی سامنے میٹھے فارس کو جبا چھوتے تو کبھی حین کو آلتتے۔

ندرت لینڈ لائی کار یسیور کان سے لگائے بات کر رہی تھیں اور تیک لگا کر تانگ پہٹا گک جائے بیٹھا فارس، جس کا ایک بازو صوفے کی پشت پہ پھیلا تھا، انہیں دیکھ رہا تھا۔ مقابل صوفے پہ پیرا درپر کر کے بیٹھی حین گھنٹوں پہ آم کی پلیٹ رکھے بیزاری قاشیں کاٹ رہی تھی۔

”جی۔ یہ فارس نے ہی مجھ سے کہا ہے ہرے ابا۔“ ندرت نے کہنے کے ساتھ فارس کو دیکھا۔

”جی وہ اسی اتوار کی بات کر رہا ہے۔ جی ابا میں نے بھی اسے کہا تھا کہ اتوار میں صرف تین ہی دن ہیں، مگر اس کا کہنا ہے کہ وہ دیر نہیں کرنا چاہتا۔ آپ زمر سے پوچھ کر بتا دیں، اگر اس کوئی اعتراض نہیں ہے تو.....“ وہ رک کر بات سننے لگیں۔ چہرے پہ سکون اور خوشی تھی۔

”جی ابا۔ ٹھیک ہے۔ میں فارس کو بتا دیتی ہوں۔ شکر یہ ابا۔“ فون رکھ کر وہ اس کی جانب مڑیں۔

”وہ کہر ہے ہیں، نکاح کے لئے اتوار کا دن ٹھیک ہے۔ مان گئے ہیں۔“

فارس نے تجب سے ابردا کھٹے کیے۔ ”اپنی بیٹی سے بات کیے بغیر؟“

”ان کا کہنا ہے کہ جب دوسری طرف سے تاریخ مانگی جائے تو ان کا نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے دو فتح بھی تو یہی ہوا تھا۔ اب وہ ذرگئے

ہیں۔ مگر تم مجھے بتاؤ، اتنی جلدی مچانے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ فرست سے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”زیادہ دیری کی تو شاید میں اپناز ہن بدلوں۔“ ہلکے سے شانے اچکا کروہ کولر کی سمت دیکھنے لگا۔

”دو دن میں کیا تیاری ہو گئی؟ مانا کہ صرف گھر کے لوگ ہوں گے مگر کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔“

”امی میرے کپڑے بھی لینے ہیں۔“ حنین نے قاش کھاتے لقدمہ دیا۔

”میرے کپڑے بھی۔“ اندر سے سیم نے گلا پھاڑ کر پکارا۔

”ہاں، بس زمر کا ڈریں لوں یا نہیں، تم لوگوں کی چیزیں پوری ہونی چاہیے۔ انہوں نماز پڑھو۔“ جل کر کہتیں، گھنون پہ ہاتھ رکھ کر اٹھیں اور کرے کی طرف چل دیں۔

”ابھی بھی وقت ہے، انکار کر دیں، ماموں۔“ حنہ نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

”میں سن رہی ہوں حنین۔ فضول بکواس مت کیا کرو۔ انہوں نماز پڑھو۔“ اندر سے امی کی غصیلی آواز یہاں تک آئی گروہ سکون سے آم لی قاش کو دانتوں سے مند کے اندر لے جاتی رہی۔

”میں انہیں انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے مجھ پر احسان ہیں۔“ اس نے آواز ہیسی کر لی۔ حنین پیلے رس والے ہاتھوں سے چھکلوں کی پلیٹ اٹھائے کھڑی ہوئی اور کچن میں چل گئی۔ جب واپس آئی تو تھا منہ دھلا ہوا تھا۔ سنجیدگی سے اسے دیکھتی اس کے قریب صوفے پہنچی۔

”امی سے کہہ دیں، وہ انکار کر دیں گی۔“ نیا آئندہ یا پیش کیا۔

”کیوں چاہتی ہو میں انکار کروں؟“

”کیونکہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ غلطی کرنے جا رہے ہیں۔ وہ آپ کو پسند نہیں کرتیں، پھر کیے رہیں گے ان کے ساتھ؟“

”تمہیں لگتا ہے میں بھول گیا ہوں جوانہوں نے میرے ساتھ کیا تھا؟“

حنین نے چونک کرا سے دیکھا۔ ”کیا نہیں بھولے؟“

”چار سال!“ فارس نے انگوٹھا اندر کر کے چار انگلیاں اسے دکھائیں۔ ”چار سال اس عورت نے جو میرے ساتھ کیا، مجھے جس طرح ذہل کیے رکھا، پوری دنیا کے سامنے مجھے قاتل ثابت کرنے کی کوشش کی، میرا ساتھ نہیں دیا، وہ سب بھولا نہیں ہوں میں۔“ اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خختی در آئی تھی۔

حنین بالکل رک کرا سے دیکھنے لگی، پھر چہرہ نفی میں ہلاتی پیچھے ہی۔

”تو آپ یہ شادی مجبوری میں، زبردستی نہیں کر رہے؟ آپ ان سے انتقام لینا چاہتے ہیں؟“ اس کی آنکھوں میں بے یقینی پھیلی تھی۔

”نہیں، صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔“

مگر حنہ نے اونہوں نفی میں گروں ہلائی۔ ”یونو اسٹ ماموں، آپ یہ شادی کر لیں۔ آپ دونوں ایک دوسرا کے کوڈیز روکرتے ہیں۔“

جل کر کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فارس ہلکا چھلکا سامسکرا یا۔ اسے حنہ کی بات نے لطف دیا تھا۔ گردن اٹھا کرا سے دیکھا جو پہلے کی طرح اب عینک نہیں لگاتی تھی۔

”عینک والی حنہ کہاں گئی؟“ اس کے پھرے پر کچھ کھو جتہ وہ جیسے سوچنے لگا۔

”آپ بیٹ کروالی تھیں آنکھیں۔ اب تو عینک بھول بھال گئی۔“ اس نے نظریں چرالیں۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی، پھر دوبارہ اسے دیکھا تو ہنوز پر سوچ نظرؤں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

”تم میں کچھ بدل گیا ہے۔“ چند دن لگے تھے مگر اس نے بھی بھانپ لیا تھا۔ اور حسین نے بے اختیار سوچا کہ پچھلا ڈیڑھ برس زیادہ اچھا تھا جس میں اتنے رشتے داروں سے میل ملا پ نہیں ہوا اور کسی نے اس سے یہ بات نہیں کہی جوان ڈھائی ہفتوں میں کئی لوگ کہے تھے۔

”ویسی ہی ہوں۔ اتنا ہی کھاتی ہوں۔ اتنا ہی بولتی ہوں۔ آپ بات کو بدلنے کی کوشش نہ کریں۔“ خفگی سے کہتے اس نے ریمورٹ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے اسی کی چنگھاڑ سنائی دی۔

”سیم حسین میں جوتا اتاروں گی تو تم لوگ انھوں نے نماز کے لئے؟“

حسین نے پیر پنج کر ریمورٹ رکھا اور غصے سے بڑھائی۔ ”پہنچیں ان زبردستی کی نمازوں کا کیا فائدہ۔“ اور سر جھٹک کر کرے کی طرف چل گئی۔

فارسی وی کی اسکرین کو دیکھتا کچھ سوچتا ہے۔

❖❖❖

ایک شکست کے بعد لے مجھ کو سب کے سب اڑام نہ دے ..... کچھ کچھ تیری بات ہے جی لیکن پوری ٹھیک نہیں! اگلی صبح قصر کار دار پسند ہے پر پھیلائے یوں روشن ہوئی کہ برآمدے کے اوپنے سفید ستون سونے کی مانند چمکنے لگے۔ ایسے ہی ایک ستون کے ساتھ ہاشم موبائل پہن دباتا چلا آ رہا تھا۔ گرے پن اسٹرائپ سوت میں ملبوس بال جیل سے پیچھے کیے وہ آفس کے لئے تیار تھا۔ ساتھ چلتی جواہرات نے مسکرا کر اسے دیکھا وہ کوئی منج نائب کرتے اور پری زینے پر کا تھا۔ نیچے بزرہ زار پر کارتیار کھڑی تھی۔ ایک ملازم نے بریف کیس اندر رکھ دیا تھا، دوسرا دروازہ کھو لے کھڑا تھا۔

پیغام بھیج کر اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ ”آپ آرام سے آئیں گی آفس؟“

”ہوں۔ دس بجے تک۔“

”شیر دکھنے کے آئے گا، میں....“ فون کی بجتی گھنٹی پر وہ رکا، ایک منٹ کا اشارہ کیا اور فون کان سے لگا۔ ”ہاں بولو۔ اچھا۔ ہاں ٹھیک ہے، تم میری اینجیو کو دے دو کام وہ سنچال لے گی۔“ فون بند کر کے جواہرات کا گال جو منے آگے بڑھا کر وہ جھٹکے سے پیچھے ہیں۔ ہاشم پہلے جیران ہوا پھر جواہرات کی بے بیقی سے پھیلی آنھوں کو دیکھا تو گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔

”مجھے اس سعدی والے معاملے نے مصروف کر دیا،“ ورنہ میں آپ کو بتانے والا تھا۔

”کیا تم نے کہا، میری اینجیو؟“ وہ ششدہ ری اسے دیکھ رہی تھی۔

”اب تک آپ کا غصہ مختدرا ہو جانا چاہیے۔“

”کیا تم نے کہا میری اینجیو؟“ وہ مضطرب مگر بلند آواز میں بولی۔

”میں نے اسے ڈی پورٹ نہیں کروایا، اس کی ایجننسی سے بھی بات نہیں کی۔ آپ سے کہا تھا کروں گا، مگر نہیں کیا۔ مجھے فیکٹری میں کچھ لوگوں کی مگر انی کروانی تھی، میری سے بہتر یہ کام کوئی نہیں کر سکتا،“ سو میں نے اسے روک لیا۔“

”تم یہ کیسے کر سکتے ہو ہاشم؟“ جواہرات کا اضطراب غصے میں ڈھلنے لگا۔ ”کیا تم بھول گئے اس نے میر انیکلیس چرایا تھا۔“

”وہی نیکلیس جو ڈیڑھ بھتے سے سعدی کے پاس ہے؟“

”بات چوری کی ہے! اس نے اعتراض جرم بھی کر لیا تھا۔“

”یہی بات اس کو زیادہ قابل اعتبار بناتی ہے می۔ اس نے چوری کی، مگر پھر جھوٹ نہیں بولا۔ وہ کتنے سال ہمارے خاندان کے

ساتھ وفادار رہی ہے، اس کا بچ پیار تھا، اس نے اس نے یہ کر دیا۔“

”تم کیسے اس کو دوبارہ کام پر رکھ سکتے ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ وہاب تک بے یقین تھی۔

”ریلیکس می۔ صرف ایک مہینے کی بات ہے، میرا کام ہو جائے میں اسے واپس بھجوادوں گا۔“

”وہ پھر کوئی ایسی حرکت کرے گی ہاشم، تمہیں اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

”کیوں فکر کرتی ہیں؟ ہاشم سب سنپال لے گا۔ صرف ایک مہینہ ہی تو ہے، می۔“ اس کے کندھے کے گرد بازو رکھ کر گویا تسلی دی، اور مسکرا کر الوداعی کلمات کہتا برا آمدے کے زینے اترنے لگا۔ جواہرات سفید پر پیشان چہرہ لئے کھڑی، اضطرابی انداز میں لاکٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔

(ڈیڑھ سال لگا سے ہاشم کی وفادار ملازمت کا بھروسہ توڑنے میں اتنی مشکل سے ایسے اس سے جرم کروایا کہ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ اس کا اصل جرم کیا تھا۔ اور اس سب کے باوجود بھی وہ اسی شہر میں تھی۔ مگر وہ حکم خلا اس کی مخالفت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاشم کوشک ہو گیا تو... نہیں۔) وہ فنی میں سرہلانی اندر کی طرف مڑکی۔

ہاشم کی کار جب مرکزی گیٹ تک آئی تو ایک دوسری کار اندر داخل ہو رہی تھی۔ ڈرائیور اسٹریٹ گک کے پیچھے بیٹھی شہرین کا چہرہ دیکھ کر ہاشم کے ماتھے پہل پڑ گئے۔ ایک اشارہ ڈرائیور کو کیا، دوسرا مقابل کار میں موجود شہرین کو۔ ڈرائیور نے کار سائیڈ پر گاڈی اور بارہنکل گیا۔ چند لمحے بعد، بچھل نشست کا دروازہ کھول کر شہرین ساتھ بیٹھی۔ وہ صبح کی مناسبت سے سفید بنا آستین کی اوپنی قمیش اور نیچے ٹراؤز میں ملبوس تھی۔ شہرے باب بال چونچ کی صورت چہرے کے اطراف میں آتے سائیڈ کی مانگ اور شہرے چہرے پر شدید فکر مندی کیفیت۔

”میں تمہیں تین دن سے کال کر رہی ہوں، تم امینہ نہیں کر رہے۔“ اس کی طرف چہرہ کر کے بیٹھی مضطرب سی کہنے لگی۔ ”ہاشم میں سونیا کی ماں ہوں، میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں اس کے بغیر کیسے رہوں گی؟“

وہ سر جھکائے موبائل پہ بیٹن دبارہ تھا، آخری بات پہ ہاتھ رکا۔ سخت نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تمہیں یہاں اس لئے بھایا ہے تاکہ ملازموں کے سامنے تماشہ نہ بنے۔“ (شہرین نے یہ اختیار چہرہ موڑ کر دیکھا۔ دور کھڑا ڈرائیور۔ داخلی گیٹ پر مامور سکیورٹی الہکار۔) ”تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں جن میں سے دو تم ضائع کر چکی ہو۔ جو کہنا ہے کہو اور چھٹے منٹ سے پہلے تمہیں میری کار سے باہر ہونا چاہیے۔“

”میں نے فلاٹ آگے کروالی ہے۔ سموار اور منگل کی درمیانی رات کو جانا ہے۔ صرف ایک مہینے کے لئے۔ پلیز سونی کو میرے ساتھ جانے دو۔“

”سونی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ بات ختم۔“ تنے ابرد اور شنک لمحے کے ساتھ اس نے کہا تو شہرین کے چہرے کی پریشانی بڑھ گئی۔

”ہاشم ایک ہفتے سے میں نے سونی کو دیکھا تک نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے گھر ہے، میں....“

”وہ اپنے باپ کے گھر ہے اور اب یہیں رہے گی۔“

”میں اس کی ماں ہوں۔“

”یہ بات تمہیں میرے خلاف اس لڑکے کی مدد کرنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔“ تیجی سے کہتے ہاشم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے ہاشم اور اپنے درمیان سیٹ کافیر ک بے بسی سے بھینچا۔

”وہ میرا دوست ہے، وہ میرے کئی کام کر چکا ہے۔ میں صرف اس کا فیور لوٹا رہی تھی۔ وہ تمہارا دوست ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ

تمہارے خلاف کچھ کر رہا ہوگا، میں تو اسے کوئی ایڈو پختہ بھی تھی۔“

”ہر چیز ایڈو پختہ نہیں ہوتی شہری۔“ درشتی سے کہتے اس نے دور کھڑے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

”اے کہو جو اس نے میرا چرایا ہے، وہ اپس کر دے تو میں سونی کو تمہارے ساتھ جانے دوں گا، ورنہ نہیں۔“

”وہ تو مجھ سے بات بھی کرنے کا روا دار نہیں۔ وہ....“

”تمہارے پانچ منٹ تمام ہوئے۔ اب جاؤ۔“ اور موبائل اٹھا کر بٹن دبانے لگا۔ شہرین بے بسی سے اسے دیکھتی رہی، پھر دروازے کی طرف مڑی، اسے کھولا، اور ہیل والا یہ زمین پر رکھا ہی تھا کہ سر جھکائے موبائل پٹن دبا تاہام دھمکتے سے بولا۔

”اور وہ میرا دوست نہیں ہے۔ ہاشم کے دل سے جو اتر گیا، سواتر گیا۔“

شہرین ایک پاؤں روشن پر رکھے دروازہ پکڑے چند لمحے کو بالکل سن ہی رہ گئی۔ گلے میں آنسوؤں کا گودا سا پھنسا، مگر پھر آنکھوں کی نمی اندر جذب کر کے وہ گردن کڑا کر باہر نکلی اور دروازہ دے مارنے والے انداز میں بند کیا۔ کارزن سے آگے بڑھ گئی تو وہ مڑی۔ پھر بیلی اڑک اوپر جاتی تھی اور اٹھان پر قصر کا دراثتھا پر عزم آنکھوں سے اس نے اس اونچھل کو دیکھا اور قدم قدم اوپر چڑھنے لگی۔ اس گھر میں ابھی ایک اور شخص تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔

.....

نہ گنواد ناوک نیم کش، دلی ریزہ ریزہ گنوادیا ..... جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تین داغ داغ لٹا دیا

یوسف صاحب کے بیٹگل میں وہ صبح پہلے سے زیادہ مصروف طلوع ہوئی تھی۔ لاڈنخ میں بڑے اباہیل چیزیں پہنچنے بار بار فکر مند رنگاہ اٹھا کر زمر کے کمرے کی سمت دیکھتے تھے جہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ فجر کے ساتھ ہی یہ پہل شروع ہو چکی تھی اور اب تک جاری تھی۔

”صداقت“ یہ باکس پکڑا۔ ”صداقت“ یہ کتابیں اس کارٹن میں ڈالو۔ ”صداقت“ یہ گیرج میں رکھ آ۔ ”ساتھ میں زمر کی

ہدایات بھی سنائی دے رہی تھیں۔ بڑے ابا خاموشی مگر بے چینی سے راہداری پنگا ہیں مرکوز کیے بیٹھے اس دوسرے جو تے کا انتظار کر رہے تھے جو زمر نہیں پھیلک رہی تھی۔

دفعتا وہ آتی دکھائی دی۔ رف کپڑوں میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے، دونوں ہاتھوں میں خاکی کارٹن پکڑے اس نے لاڈنخ کے فرش

پ کارٹن دھرا اور صوفے پہنچنے لگئی۔

”صداقت۔“ کارٹن کا چار ٹکڑوں والا ڈھکن بند کرتے اس نے آواز دی۔ وہ بھاگا آیا۔ ساتھ ہی ڈکٹ شیپ اور قپچی اسے تمہائی۔

”اس میں میرے اہم ڈاکومنٹس ہیں، جب فارس صاحب کے گھر جاؤ تو ان کو میرے دوسرے سامان کے اوپر رکھنا، کسی چیز کے پیچے نہ دے دینا۔“ شیپ سے ڈھکن کو سیل کرتے وہ سادگی سے ہدایات دے رہی تھی۔

”جی باجی۔“ وہ تابعداری سے سر ہلا رہا تھا۔ جب کارٹن بند ہو گیا تو اسے اٹھا کر گیرج میں رکھنے چلا گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں واپس

جانے لگی کہ ابھی اور بہت کام رہتا تھا۔

”تم یہ کن کاموں میں لگی ہو؟“ وہ اکتا چکے تھے۔

زمر گھری سانس لے کر ان کی طرف مڑی۔ آپ نے خود ہی کہا کہ سنڈے کو میری شادی ہے، تو انہا سامان پیک کر رہی ہوں۔“

”کیا تمہیں برالگا ہے؟ اگر کوئی اعتراض ہے تو بتاؤ، میں.....“

”لبے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پریشان مت ہوں۔ میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے جلد شادی سے کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے بس

آپ کی فکر ہے۔“

”میں سعدی کے مگر چلا جاؤں گا، یہ گھر مہینے کے آخر تک خالی کر دوں گا۔“

”اور سب کچھ سمجھنا تو مجھے ہی ہے نا۔“ نرمی سے مسکرا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تم نے اپنے کپڑے نہیں لئے۔“ ان کی پریشانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

”بھاگی نے کہا تھا، وہ شام کو آئیں گی اور ہم اکٹھے جا کر لے لیں گے۔“ وہ زرم آنکھوں سے مسکراتی رسان سے بتا رہی تھی۔ بڑے ابا نے متھر نظر دیں سے اس کا چہرہ کھو جا۔

”مگر تم اس جلد شادی سے خوش تو ہونا؟“

”ابا۔ جو بعد میں ہونا ہی ہے تو اسے ابھی کر لینا چاہیے۔ مجھے کوئی پرالمنہیں۔ اچھا میں اب اپنے کپڑے پیک کر لوں۔“ ان کی تسلی کروائے وہ آستین فولڈ کرتی راہداری میں آگے چلتی گئی۔ ابا نے بس سر ہلا دیا۔

دہ کرے میں آئی اور کھلے سوت کیس کو دیکھا جس کے ساتھ بینگرز میں ٹنگے کپڑے پڑے تھے۔ اس نے ان کو بینگر سے اتار کر تھہ کرنا شروع کیا۔ تبھی راہداری میں قدموں کی آواز آئی۔

”صداقت یہ جو شاپر زیں، ان کو....“ مصروف انداز میں کہتے ہوئے اس نے سر اٹھایا تو یکدم مخدود ہو گئی۔

چوکھت میں صداقت کھڑا تھا۔ سر جھکا تھا۔ ذرا شرما تا، ذرا بچکتا۔ دہاتھوں میں خاکی لفافے میں لپٹا ہوا کچھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ بالکل نہ ہر کرائے دیکھنے لگی۔

”باجی.... وہ جو میری چاچی آئی تھی ناس دن گاؤں سے؟ کل وہ پھر آئی تھی۔ اس کو بتایا تھا کہ باجی کی شادی ہونے والی ہے۔ یہ وہ گاؤں سے لائی تھی آپ کے لئے۔“ وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا اور خاکی لفافے میں لپٹنے شے بڑھائی۔

”یہ.....“ زمر نے اسے تھاماً اور لفافہ ہٹا کر دیکھا۔ اندر شیشوں اور کڑھائی والی شال تھی۔

”ہمارے ہاں جی بیٹیوں کو شادی پر یہ ضرور دی جاتی ہے۔ تو میں نے چاچی سے کہا کہ ایک باجی کے لئے بھی لے آئے۔“ انگلیاں مردوز کر سر جھکائے شرما شرما کر صداقت کہہ رہا تھا اور زمر میں ہاتھ میں پکڑی شال کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ بہت خوبصورت ہے صداقت۔“ وہ بمشکل پھیکا سامسکرائی۔ ”چاچی کو شکریہ کہنا، مگر.... تم نے خواہ مخواہ اتنا خرچ کیا۔ میری شادی....“ حلق میں کوئی پھنسنا سا لگا۔ ”کوئی عام شادیوں کی طرح تھوڑی ہے؟“

”پر باجی شادی تو ایک ہی دفعہ ہوتی ہے، جیسے بھی ہو۔“ اس نے کوئی فلاسفہ گھر ناچاہا مگر نہیں گھر بیا۔ سو جلدی سے شاپر زاٹھا نے لگا۔

”ان کو باہر رکھ آتا ہوں جی۔“ وہ چلا گیا اور زمر کھڑی اس شال کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں کرچیاں سی چھر رہی تھیں۔ تکلیف سی تکلیف تھی۔

پھر شال ہاتھوں میں پکڑے وہ ایک دم باہر لگی۔ راہداری میں وہ نہ ہری۔ ابا ہیل چیز پر بنیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

”ابا، میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ یہ اصلی شادی نہیں ہے۔ میں صرف اس کو برآد کرنا چاہتی ہوں،“ وہ اتنا ہلکا بڑا بڑا ای کہ خود کو بھی سنائی نہ دیا، ابا تو کافی دور تھے۔ پھر یہاں کیک انہوں نے گردن موڑی تو دیکھا وہ راہداری میں کھڑی پیکٹ ہاتھوں میں پکڑے، انہیں دیکھے جا رہی ہے۔

”کوئی بات ہے زمر؟“

وہ ”بجی“ میں سر ہلاتی قریب آئی۔ ان کے بالکل مقابل آکھڑی ہوئی۔ کہنے کے لئے ہونٹ کھو لے، پھر بند کر دے۔

”ابھی فارس کا فون آیا تھا۔“ وہ اسے خاموش دیکھ کر خود ہی بتانے لگے۔ ”اس نے کہا کہ کاردار خاندان میں سے کسی کو شادی پر نہ

بلا یا جائے۔ گوکر میں مزکاردار کو مدعا کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے پھر بھی فارس کی بات مان لی۔ وہ بمحendar ہے۔ کچھ سوچ کر کہہ رہا ہو گا۔

”آپ نے وجہ نہیں پوچھی؟“ زمر کے چہرے کی فکر مندی اور بے چینی اب قدرے ٹھنڈے تاثرات میں ڈھلنے لگی تھی۔

”کوئی بھی وجہ ہو مجھے فارس پہنچ دے ہے۔ وہ غلط فیصلہ کر کے مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ تم کچھ کہہ رہی تھیں؟“ نہیں دوبارہ خیال آیا کہ وہ ادھر کیوں آکھڑی ہوئی۔ زمر نے گہری سانس لی۔

”جی۔ میں یہ دکھانے آئی تھی۔ دیکھیں صداقت کیا لایا ہے میرے لئے۔“ ٹھنڈے نرم انداز میں کہتی وہ پیکٹ کھول کر ان کو دکھانے لگی۔ صداقت اندر آیا تو وہ دونوں شال کھول کر دیکھتے اس پر تبصرہ کر رہے تھے۔ وہ شرما کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

❖❖❖

کوئی تعویذ ہو رو بلا کا..... میرے پیچھے محبت پڑ گئی ہے  
شہرین چیونگم چباتی، آنکھوں پر ڈارک گلاس ز لگائے۔ گردن کرا کر چلتی قصر کاردار میں داخل ہوئی تو سامنے لا دخن کی اوپنجی کری پ  
جو اہرات کو بیٹھے دیکھا جو ملکہ کی شان سے برا جہاں، گھنٹوں پر رکھا اخبار کھو لے دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پنگا ہیں اٹھا کر دیکھا۔ سامنے شہرین کھڑی  
تھی۔

”گذمار نگ مزکاردار۔ سونی کہاں ہے؟“ سن گلاس ز اونچے کر کے بالوں پر چڑھاتے اس نے ادھر ادھر دیکھتے پوچھا۔ یہ سعدی  
کو لیپٹاپ کا پا سورڈ دینے کے بعد پہلی دفعہ تھا جب وہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی، اور اسی لئے جواہرات سے نگاہیں ملانے سے احتراز کر  
رہی تھی۔

”اپنے کمرے میں۔ اور یقیناً تم اس بات سے واقف ہو گی کہ سونی کو یہاں سے لے کر نہیں جاسکتی۔“ وہ پھر سے اخبار پڑھنے  
لگ گئی۔

شہرین نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھتے جیسے بہت ضبط کیا۔  
”بالکل۔“ ہلکے سے کندھے اچکائے۔ اور سڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہیل کی نک نک ہرز یعنی کے ساتھ اوپر چلتی گئی۔ جواہرات مسکرا  
تے ہوئے اخبار پڑھتی رہی۔

اوپر رینگ کے ساتھ کھڑی شہرین نے نیچے دیکھا۔ ذرا سامسکرائی۔ اور پھر پورے اعتماد کے ساتھ نوشیر وال کے کمرے کے  
بند دروازے پہنچی سے دستک دی۔ نگاہیں نیچے بیٹھی جواہرات پر مرکوز تھیں جس نے یقیناً دستک کے محل وقوع کا انداہ کر لیا تھا مگر کوئی رد  
عمل نہیں دکھایا۔

”نشیرو۔ دروازہ کھولو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ تیری دستک کے بعد اس نے پکارا۔ تبھی دروازہ کھل گیا۔ سامنے  
نوشیر وال کھڑا تھا۔ تراویز اور شرٹ میں بال اڑے اڑے سے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ نیند سے جا گا تھا، اور شہری کو دیکھ کر  
پورا جاگ گیا تھا۔

وہ کچھ کہے بنا اندر چلی آئی، گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لیا اور پھر آرام سے ایک کاؤچ پہ بیٹھ گئی۔ ٹانگ پنگا ہوئے جمائے ہی  
جھلاتے ہوئے شیر کو دیکھا۔

”فریش ہو کر آ جاؤ۔ ہمیں بات کرنی ہے۔“ انداز نرم مگر تکمیل سے بھر پور تھا۔ وہ جز بسا اسے دیکھتا تھا روم کی طرف چلا گیا۔ ”سونا  
والے معاملے میں میں آپ کی مد نہیں کر سکتا۔ آپ کو مجھ سے امید نہیں رکھنی چاہیے۔“ چند منٹ بعد اس کے سامنے بیڈ کے کنارے پر بیٹھا  
وہ حلقے دھلانے چہرے والا نوشیر وال ورنہ قدرے خشکی سے کہہ رہا تھا، البتہ لبجکی خشکی زبرد تھی۔ بار بار وہ نرمی میں ڈھنڈ لگتی اور وہ اسے پھر

تے غصے اور ناگواری میں لپیٹتا۔ گاہے بگاہے نگاہیں اٹھا کر شہرین کے خوبصورت سہرے چہرے کو بھی دیکھ لیتا۔ وہ اسی اعتقاد اور اطمینان کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”ناراض تو مجھے تم سے ہونا چاہیے، مگر تم مجھ سے کیوں خفا ہو؟“

”جو آپ نے سعدی کے ساتھ مل کر کیا، اسے ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں۔“ اکھڑے اکھڑے لجھے میں کہتے وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”تم اس قسم کے انسان تو نہیں تھے شیر و کہ شہری کی کوئی بات ہی نہ سنو۔ میں ہاشم کو اصل وجہ نہ بتاؤں، مگر تمہیں اتنا تو معلوم ہوتا چاہیے کہ تمہارے پوچھنے پر میں ضرور بتاتی۔“

”اصل وجہ؟“ شیر و نے چونک کر اسے دیکھا۔ شہرین کی آنکھوں میں افسوس اترتا۔

”تو کیا تم نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری طرح میں بھی استعمال کی جاسکتی ہوں؟ میں بھی یہ کرنے پر مجبور ہو سکتی ہوں۔ مجھے تمہاری خود غرضی پر افسوس ہو رہا ہے۔“ اور پھر ایک دم وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”جب تم نے میری مجبوری سمجھی ہی نہیں، تو میرے بتانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے تو مجھے سخت مایوس کیا ہے شیر و۔“

اور وہ تاسف سے کہتی دروازے کی طرف بڑھی۔

نوشیر وال ہڑ بڑا کر اٹھا۔ ”نہیں، پلیز۔ آپ جائیں مت۔ مجھے بتائیں تو سہی کہ اصل بات کیا ہے؟“ ساری اکڑ، ناراضی، غصہ اڑنچھو ہو گیا۔ اور وہ ایک دم پر بیٹھا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی طرف گھومی۔ سخت نظروں سے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”میں کیوں بتاؤں تمہیں؟ تم کون سا میرا یقین کرو گے؟ تم بھی سعدی کی طرح مجھے ذلیل ہی کرو گے۔“ خنگی سے کہتی وہ خود ہی بیٹھ گئی۔ اب کے نوشیر وال اس کے سامنے بیٹھا تو ذرا متفکر ہو کر بیٹھا تھا۔

”سعدی نے آپ کو.....؟“ اجھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”میں نے اس دن سعدی کو اپنادوست کہا، جب تم اور ہاشم سونی کو ڈر اپ کرنے آئے تھے۔ غلط کہا تھا میں نے۔ اس لئے تاکہ اسے اصل بات نہ بتانی پڑے۔“ کہتے ہوئے اس نے گہری سانس خارج کی، تھوڑی تک آتے بالوں کی چونخ نماں ناٹ انگل سے پیچے ہٹائی۔ وہ اپنے بھی گلر توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”سعدی میرا دوست نہیں ہے۔ تم مجھے جانتے ہو، میں اور تم ایسے لڑکے کو کیسے اپنادوست بنا سکتے ہیں؟“ اس نے کہتے ناگواری سے ناک سے مکھی اڑائی۔ ”اس کے پاس میری ایک ویڈیو یوٹھی۔ ایک پارٹی کی ویڈیو اب تفصیل مت پوچھنا، بس وہ ویڈیو مجھے اسکینڈل ایز کر سکتی تھی۔“ میں نے اسے کہا کہ ویڈیو اس کلب کے سٹم سے مناؤ، مگر وہ اتنی آسانی سے مٹانے والا نہیں تھا۔ مجھے سے پانچ لاکھ لئے اس کام کے، اور کہا کہ بد لے میں ایک فیور مانگوں گا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ بد لے میں مجھے تمہیں استعمال کرنے کو کہے گا۔ اونہوں۔ ”نئی میں سر ہلاتے اس نے آنکھیں بند کر کے ماتھے پر انگلیاں رکھیں۔

نوشیر وال بالکل سانس روکے سن رہا تھا۔ دم بخود۔

”میں تو اس سے ملتی بھی نہیں تھی۔ مجھے مال میں جالیاں اس نے۔ سونی کی پارٹی کی صبح۔ اور بولا کہ یہ کام کر دوں۔ میں نے انکار کیا تو اس نے کہا، کیا میں نے بھی ایسے ہی انکار کیا تھا۔ آپ کا کام کرتے وقت؟ یہ ایک دھمکی تھی اگر میں انکار کروں گی تو میری ویڈیو یوٹیکر کر کے میرا اسکینڈل بنوائے گا۔ اس کے بعد سونی کو ہاشم میرے سامنے سے بھی دور کر دے گا۔ میں تم لوگوں سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔“ (اور شیر و کے پہرے کو دیکھتی وہ دل گرفتی سے کہہ رہی تھی۔ لفظ ”تم لوگوں“ پر نوشیر وال کی آنکھوں میں حیرت برہی میں بد لنگلی۔ اس برہی میں سعدی کے

لئے نفرت اور شیری کے لئے ہمدردی تھی۔)

”وہ آپ کو بلیک میل کر رہا تھا؟ تو مجھے یاہش بھائی کو کیوں نہیں بتایا؟“ حسب عادت وہ بھڑک کر آگے ہوا، گویا اٹھنے کو تیار ہو۔ شہرین نے گز برا کر دروازے کو دیکھا جس کے پاؤ نیچے جواہرات اخبار پڑھ رہی تھی۔ اسے لمحہ بھر کو ذرا لگا کہ یہ گھاڑا اگر دندنا تاہماں باہر نکل گیا تو ساری کہانی گئی فلاپ۔

”ہاشم میرا کچھ نہیں لگتا، شیرو۔“ اس نے بظاہر بہت ضبط سے کہا مگر بڑی بڑی سبز لینز لگی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”ہاشم میر اشوہر نہیں ہے۔ ایسے لڑکوں سے صرف آپ کے شوہر پر دلیکٹ کرتے ہیں آپ کو اور میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔ میں.....“ سینے پر انگلی رکھ کر بھرائی آواز میں بوی۔ ”میں اکلی ہوں، بالکل اکلی۔“ سانس ناک کے ذریعے اندر کھینچا، انگلی سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا۔ ”مجھے نوشلا دو۔ میں پتھ نہیں کیوں ایسو شنل ہو رہی ہوں۔“ گلی آواز سے ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے اس نے چہرہ پرے پھیر لیا گویا آنسو چھپانا چاہ رہی ہو۔

نوشیر وال فوراً اٹھا اور بید سائیڈ نیبل سے نشوکا باس کا سانحہ کراس کے سامنے کیا۔

”آپ.....“ اسے سمجھنے لیں آیا کہ کیا کہے۔

”تھینک یو۔“ اس نے آنکھیں تھپتیجا کر صاف کیں اور چہرہ اس کی طرف پھیر کر مسکرائی۔ ”میں تم سے ہمدردی لینے نہیں آئی تھی، نہ اس لئے آئی ہوں کہ تم ہاشم سے سو نیا کے لئے بات کرو۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ تم اس سے کوئی بات نہ کرو۔ میں تمہیں مزید تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بس تم میری طرف سے دل صاف کرلو۔“ وہ انھوں نی پرس کی لمبی زنجیر کندھے پر ڈالی، ہلکا سانو شیر وال کے کندھے کو تھپتیجا یا اور باہر نکل گئی۔ وہ بالکل گم صمسم سا بیمارہ گیا۔

سونی کے کمرے کی طرف جاتے وہ رینگ پر کی چھرہ جھکا کر نیچے جھانا کا۔ جواہرات اب ادھر نہیں تھی۔ وہ مسکرائی اور پورے کر دفر اور اٹھی گردن کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

قاتل سے عشق بھی ہفتول سے ہمدردی بھی

ٹو بھلا کس سے محبت کی جزا مانگے گا

ہاشم کاردار کے آفس میں اسے سی کی ننکی اور خنثی پھیلی تھی، اور وہ کوت میں ملبوس پا اور سیٹ پر بر امہان، موبائل کان سے لگائے سامنے رکھی فائل کے صفحے پلاتتے، کہہ رہا تھا۔

”بڑے ہو جاؤ شیرو۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے، بکواس کر رہی ہے۔“ اکتا کراس نے شیرو کی کہانی درمیان سے کافی۔ ”وہ اس کی تاگ جتنا لڑکا اسے بلیک میل کرے گا؟ پانچ سال گزارے ہیں میں نے اس عورت کے ساتھ یہی گئی ہو گئی اپنے مسئلے اس کے پاس لے کر۔“

”مگر بھائی، وہ سعدی ہے ہی.....“ نوشیر وال جس کی شہرین کے لئے نزم آواز سعدی کے نام پر بڑی سے کاپنے لگتی نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر ہاشم مصروف تھا اور بے زار بھی۔

”سعدی کو میں سنپھال لوں گا، تم بس شہری سے دور ہو۔“

”مگر آپ سو نیا کو۔“

”وہ تمہیں دوسرا دفعہ بے دقوف بنارہی ہے شیرو۔ پہلی دفعہ اس پر لعنت، دوسرا دفعہ تم پ۔“ لمحہ میں بے زاری اور غصہ در آئے لگا۔ ”اور اب تم اگلے آدھے گھنٹے میں مجھے آفس میں نظر آؤ۔“ موبائل بند کر کے میز پر ڈالا، اور انھی سے منہ میں کچھ بڑھاتے قلم دان تے قلم نکال کر کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ کام ختم کر کے فائل بند کی اور انٹر کام اٹھایا۔

”حلیہ، خاور آفس میں ہے؟“

”جی وہ شاید نچلے فلور پہ ہیں۔“

”اسے میرے پاس بھیجو۔۔۔“ ریسیور رکھتے رکھتے وہ رکا۔ ”وہ اس لڑکے سعدی یوسف کا کوئی فون آیا؟“

”سرمیں نے دو دن پہلے دوبارہ ان کو کال کی تھی، انہوں نے کہا کہ اگلے ہفتے آئیں گے وہ دن نہیں بتایا۔ میں ان کو کال کروں؟“

”اونہوں۔ وہ خود کرے گا۔ بہر حال، جب کہی وقت اور دن مت دیکھنا، اسے آنے کا کہہ دینا۔“ ریسیور کھرکر اس نے بیک لگائی

اور پھر سوچتے ہوئے اوپر چھٹ کو دیکھنے لگا۔

خاور اندر داخل ہوا تو وہ سیدھا ہوا۔ سنجیدہ ٹھنڈے تاثرات سے اسے دیکھا۔ وہ سیاہ کوٹ اور پینٹ میں ملبوس اونچا لمبا ساتھا۔ نائی

نہیں باندھتا تھا۔ بال اور مونچھیں دونوں سیاہ تھیں۔ رنگت سانولی اور نقش تما سب تھے۔ ہاتھ باندھتے سنجیدگی سے چلتا وہ سامنے آیا۔

”وہ ملا جو میں نے تلاش کرنے کے لئے کہا تھا؟“

خاور کی آنکھوں میں مایوسی در آئی۔ نفی میں گردان ہلائی۔

”نوسرا۔ ابھی تک تو اس لڑکے کے بارے میں کوئی dirt نہیں ملا۔“

ہاشم قدر رے بڑھی سے آگے کو ہوا۔ ”تو تم اتنے دنوں سے کیا کر رہے ہو؟ وہ کچھ دن بعد میرے سامنے اور ہر کھڑا ہو گا، اور اگر میرے

پاس کوئی لیورج ہی نہیں ہو گا اس کے خلاف تو میں اسے کیسے سنجال لوں گا؟“

”سرمیں نے پوری کوشش کی، مگر وہ ہر طرح سے صاف ہے۔ اپنے خاندان کا وہ فیورٹ ہے، تو دوستوں کا آئندہ میں۔ کسی کو کوئی کام

ہوتا سعدی یوسف ہے نا۔“ وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ ” محلے کا چوکیدار رکھنا ہو یا لگلی میں اسپیڈ بریکر بنانا ہو، مہساں یوں کے لڑکے فوراً اسی کے

پاس جاتے ہیں، بہترین اسٹوڈنٹ اور جاب پہ ایک ایماندار اور محنتی ایسپلائی۔ اس کا کوئی ڈرائیور نہیں ملا مجھے۔ وہ لڑکا گویا فرشتہ ہے۔“

ہاشم ہلاکا سامسکرا ہے۔ سر دلخی مسکرا ہے۔ نفی میں سر ہلا یا اور میز پر رکھا ہیں انگلیوں میں گھماتے بولا۔ ”میں تمہیں بتاؤں خاور کوئی

بھی فرشتہ نہیں ہوتا۔ سب کے راز ہوتے ہیں۔ تم نے درست جگہ نہیں دیکھا ہو گا۔“

خاور ایک دم چوک کر اسے دیکھنے لگا۔ آنکھیں سکریٹرے پکھو چا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایک جگہ میں نے واقعی نہیں دیکھا۔“ پھر سوچتے سوچتے اثبات میں سر ہلا یا۔ ”بالکل، وہ فرشتہ نہیں ہے۔“

”ایک دن دیں، اس کی انسانیت دکھاتا ہوں آپ کو۔“ ہاشم نے سکر اکر اثبات میں سر ہلا یا اور خاور عجلت میں باہر نکل گیا۔

ہاشم نے گھری سانس لے کر خود کو بہتر محسوس کیا، پھر مو بال اٹھایا اور زمر کا نمبر ملا کر کان سے لگایا۔ سیٹ کی پشت سے بیک لگائے وہ

اب لبوں میں کوئی دھن گنگنا تے چھت کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

.....❖❖❖.....

میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے ..... تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں  
مال میں دو پہر کی نسبت سے رش تھا۔ مطمئن، خوش باش، مصروف لوگ اوپر یونچے آگے پیچھے آ جا رہے تھے۔ ایسے میں دکانوں کی  
قطار کے سامنے راہداری میں حین اور سیم بھی چل رہے تھے۔ ایک شاپ کے سامنے وہ رکے جد سیم کی جانب گھوی، شراری چک دار آنکھوں  
سے اسے دیکھا۔

”اے موئی آلو! وندو شاپگ کے دواصول یاد ہیں؟“

ھنگریا لے بالوں والے دبلے پتلے اور لمبے لڑکے نے جھٹ اثبات میں سر ہلا یا۔ ”بالکل۔ تم ہر چیز مجھے دکھا دکھا کر کوہی، سیم، یہ  
لے لو اور میں بگڑے بچوں کی طرح نہیں کرتا آگے بڑھ جاؤں گا۔“

”گذ!” وہ مسکرائی پھر اس کی کہنی میں بازو دالے شاپ میں داخل ہوئی۔ قدم بقدم دونوں ریکس کی جانب آئے۔ خین نے مختلف کپس سیم کو دکھانی شروع کیں۔ ”سیم بنچے دیکھو یہ آپ پر کتنی پیاری لگے گی۔“

وہ بگڑے انداز میں نفی میں سر ہلاتے بولا۔ ”نہیں ماما، مجھے یہ نہیں چاہیے۔“

”ماما؟“ اس نے تتملا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سب سیڑھے میں انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

”سیم جان!“ وہ جبرا مسکرا کر پیارے بولی۔ ”لبی ہی یور سیلف، ورنہ ابھی آپ کے پاپا کو شکایت لگاتی ہوں۔“

”مگر ماما، پاپا تو کئی سال سے اوپر ہیں، اکاڈمی ننگ میں۔ (حساب کتاب میں)“

محصولیت سے آنکھیں جھپکا کر بولا اور اس سے پہلے کہ وہ سارے شغل پر لعنت بھیج کر اس کا کان مردڑتی، بینڈ بیگ میں رکھا موبائل بچ اٹھا۔

وہ جلدی سے موبائل نکالتی شاپ سے باہر آئی۔ سیم بھی جیچھے پکا۔

”کیا امی اور پچھوئے نے شاپنگ کر لی؟ کیا وہ بلا رہی ہیں؟“ حمد موبائل نکال کر دیکھ رہی تھی اور سیم سوال کر رہا تھا۔ یہ زمر کا موبائل تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے حمد کو اس لئے دیا تھا کیونکہ وہ اور ندرت بالائی فلور پر نکاح کا جوڑا خرید رہی تھیں، اور سیم اور خین بیک کرنے کیں بیٹھے کئے تھے ایسے میں ان کو ”آزاد“ کرنے سے قبل زمر نے اپنا فون حمد کو دے دیا، کہ جب فارغ ہوتے ندرت کے فون پر بتا دے۔ اب بھی سیم یہی پوچھ رہا تھا مگر خین بالکل چپ سی ہو کر بجھتے فون کی اسکرین دیکھ رہی تھی۔

ہاشم کا دراکار کا ننگ۔ فون پکڑے ہاتھوں پر پیسہ آنے لگا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”اٹھانا مت حمد، پچھوئے کا فون ہے۔“ سیم نے تنبیہ کی مگر جسے دنیا کا بدترین مرض لاحق ہو جائے وہ اور کیا کرے؟ اس نے انگوٹھے سے بزردار کے کوسلا نیڈ کر کے موبائل کان سے لگایا۔

”ہیلو؟“

”ہیلو۔ زمر؟“ وہ ذرا اٹھنے کا تھا۔

”نہیں، میں خین۔“ دھڑکتے دل اور بے قابو ہوتی خوشی سے وہ جلدی جلدی بتانے لگی۔ ”اصل میں ہم مال میں ہیں، پچھو اور اسی دور ہیں، سوان کا فون میرے پاس ہے۔“

”اوے کے۔ کیسی ہوتم خین؟“ وہ نرمی سے پوچھنے لگا۔

”میں بالکل ٹھیک۔ آپ کیسے ہیں؟“ وہ بھی اعتماد سے مسکرا کر بولی۔ ایسے میں وہ سیم کی طرف متوجہ نہیں تھی جو خلکی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں ہمیشہ کی طرح بہت اچھا ہوں۔“ اس کے انداز پر وہ بلکا ساہنس دی۔

”تمہارا رزلٹ کب ہے؟“ اگلے سوال پر حمد کی مسکرا ہٹ پھیکی پڑی، فوراً سیم کو دیکھا جو بے زار سا کھڑا تھا۔

”اگست میں۔ اور....“ وہ رک گئی، تھوک نگلا۔ سارے لحاظ پھر سے آنکھوں میں تازہ ہوئے۔ امتحانی مرکز میں ہاشم کو بلانا، پھر وہ سیاہ اور سنہری پارٹی۔

”دونٹ وری،“ تمہارا رزلٹ بہت اچھا آئے گا، اتنا کچا کام تو نہیں کیا ہو گا ناہاشم نے۔ اس کے نرم تسلی دینے والے انداز پر وہ پھیکا سامسکرائی مگر پر جو شیع اعصاب اب ڈھیلے پڑے چکے تھے۔ اور ایفل ٹاور کی روشنیاں بھی ماند پڑنے لگیں۔

”میں پچھو کو جا کر بتاتی ہوں، وہ آپ کو کمال بیک کریں گی۔“

”وہ کال بیک نہیں کریں گی۔ میں دس منٹ میں دوبارہ کال کرتا ہوں۔“ اور فون بند ہو گیا۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“

”مجھے خونہیں پتہ کرو کیا اور کیوں کہہ رہے تھے۔“ خود سے ابھتی وہ آگے بڑھ گئی۔

جب وہ اس آؤٹ لٹ پا آئے جہاں زمر اور امی تھیں تو دس منٹ بیت چکے تھے۔ وہ دونوں کاؤنٹر پکھڑی تھیں۔ ندرت سادہ ہی سر پہن لئے کھڑیں، شانگ بیگ میں موجود جوڑے کو چیک کر رہی تھیں۔ کامدار جوڑے کارنگ آف وائٹ ٹھاڈ راسی جملک سے نہیں کو اندازہ ہوا۔ پھر وہ زمر کی طرف آئی، جو بال آدھے کچھ میں باندھے سر جھکائے، بل کی رسید پس میں رکھ رہی تھی۔ اس کے ”پھپھو“ کہنے پر چہرا اٹھایا۔ نہیں سے دراز تھی، دو اچھے دراز۔ اور زیادہ جاذب نظر بھی۔ بھوری آنکھوں سے حد کو دیکھا اور زمی سے مسکرائی۔

وہ جب ایسے مسکراتی تھی تو نہیں گزرے رسول کی ساری تیغی اور ناراضی بھولے گئی۔

”ہاشم بھائی کافون آرہا ہے۔“ دوبارہ بحث سیل کو اس کی طرف بڑھایا۔ زمر نے موبائل سامنے کر کے دیکھا، پھر گہری سانس لے لرکان سے لگایا۔

”جی ہاشم، کہیے۔“ مصروف سے انداز میں وہ پرس بند کرتی گویا ہوئی۔

”نہیں بتا رہی تھی، آپ شانگ کر رہی ہیں۔ مجھے گیس (Guess) کرنے دیں، کیا یہ آپ کی شادی کی شانگ ہے؟“ وہ گویا مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ زمر نے فوراً نہیں کو دیکھا، وہ ہاشم کی بات نہیں سن سکتی تھی، مگر جلدی سے بولی۔ ”میں نے کال ائینڈ کر کے بتایا تھا کہ ہم مال میں ہیں۔“ ایک دم اپنا آپ مجرم لگنے لگا۔ نظریں فوراً جھکا دیں۔

”ہاشم، آپ نے کیسے فون کیا؟“ بے تاثر، نہنہ دے انداز میں پوچھتی وہ نہیں کے ہمراہ چلتی باہر لگی۔ ندرت اور سیم اگلی شاپ میں سیم کے کپڑوں کے لئے چلے گئے تھے۔ ندرت نے حد کو بھی آواز دی مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔

”آپ کو شادی کی مبارک باد دینے۔“

”ایک منٹ!“ اس نے فون کان سے ہٹائے بغیر بلند آواز میں نہیں کو پکارا۔ ”حد، اگر یہ صاحب اگلے پانچ منٹ تک فون بند نہ کریں تو تم اوپھی آواز میں مجھے پکار کر کہنا کہ بھا بھی مجھے بلا رہی ہیں، اور کے؟ جی ہاشم، آپ کیا کہہ رہے تھے؟“ رسان سے کہتی وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ (حد کا تو منہ ہی کھل گیا۔)

وہ جواب میں زور سے ہنسا تھا۔

”میں یہ کہہ رہا تھا، کہ اگر آپ کو اس روز وہ گولیاں میں نے ماری ہوتیں تو کیا آپ مجھ سے بھی شادی کر لیتیں؟“ وہ محظوظ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔ میں آپ کو قتل کرنا پسند کرتی، مگر ہزار حصوں میں۔“

”پھر فارس کو ہزار حصوں میں کیوں نہیں مارا؟“ وہ مزہ لیتے ہوئے مخاطب تھا۔ ”چار سال چپ کیوں رہیں؟“

”اچھا انسان برا کرے تو خاموشی بہتر ہے، لیکن آپ جیسا برا انسان اگر برا کرے تو خاموش نہیں رہنا چاہیے مجھے۔“

وہ جواب میں پھر سے نہ دیا۔ زمر اور حمہ ہنوز ساتھ ساتھ گیلری میں چل رہی تھیں۔ حد کے کان ادھر ہی لگے تھے۔

”اور اس برے انسان کو شادی کپڑیں بلا جائی آپ نے؟“

”یہ سوال آپ اپنے کزن سے کریں۔ یہ فیصلہ ان کے ہیں۔“

”زمر...“ اب کے وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”آپ غلطی کر رہی ہیں۔ اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے آپ کو۔“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ہاشم!“

”آپ نے اس کو ذاتی نہیں رہنے دیا جب اسے میری گئی سے ڈسکس کیا۔“

زمر نے کوکان سے گھری سانس بھری۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ فارس آپ کے قابل نہیں ہے۔ اس کا جرم بھول بھی جائیں، تو اس کی اکھڑ طبیعت غصہ لا پرواہی،“

وہ آپ کی تائپ کا آدمی نہیں ہے۔ ”قدرتے توقف کے بعد اس نے گویا زمر کو پکارا۔“ کیا سوچ رہی ہیں؟“

”اوہ آپ بالکل بھی نہیں جانتا چاہیں گے جو میں سوچ رہی ہوں۔“ اس کے انداز پر ہند نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں

ایک شاپ کے باہر کھڑی ہو گئی تھیں اور زمرا ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگ کپڑے دوسرے سے موبائل کوکان سے لگائے ہے تکون سے کہہ رہی تھی۔

”مشلا کیا؟“

”میں یہ سوچ رہی ہوں ہاشم کہ مسئلہ میں نہیں ہوں، مسئلہ فارس ہے۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ کو فارس کی ہر یوں چھپتی ہے۔ وہ جب بھی شادی کرے گا، آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ بطور ایک فرشت کزن، آپ کا اس سے ان کہا، لاشوری سا مقابلہ ہے۔ موازنہ ہے۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ زرتاشہ کی شادی کے روز بھی جب آپ اشیج پر آئے تھے، اور میں وہاں تھی، اور فارس وہاں نہیں تھا، تب آپ نے زرتاشہ سے بھی اس کے غصے اور اکھڑپن کا تذکرہ کیا تھا جس کی وجہ سے دہن کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہی ہوں ہاشم کہ آپ یہ جان بوجھ کرنے نہیں کرتے۔ لاشوری طور پر تب کرتے ہیں جب آپ کو اپنی شادی کی ناکامی یاد آتی ہے۔ سو مسئلہ میں نہیں ہوں، مسئلہ فارس ہے۔“

خین بس اس کو دیکھے جا رہی تھی، سانس رو کے، شاکٹ۔ اور دوسرا جانب ہاشم خاموش ہو گیا تھا۔

”ویل... آپ نے کافی سخت باتیں کہدیں۔“ جب وہ بولا تو آواز مدمگ بکھی ہوئی تھی۔

”میں معدرنہ نہیں کروں گی، اگر آپ میری ذاتیات میں دخل دیں گے تو پھر اپنی ذاتیات کے بارے میں بھی آپ کو سننا پڑے گا۔“ زری سے کہہ کر اس نے ابر و انہا کر خین کو دیکھا۔ وہ گز بڑا کراون پچاسا بولی۔

”چھپھوای بلارہی ہیں۔“ کہہ کر خوب شرمندہ ہوئی۔

”آپ نے سن لیا؟ مجھے جانا ہے۔“ اور موبائل بند کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

”بجا بھی کدھر رہ گئیں؟“ عام ساندراز جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ خین بالکل چپ رہ گئی۔ اور وہ تب تک نہیں بولی جب تک وہ چاروں شاپنگ سمیت اوپر فوڈ کورٹ میں ایک نیبل پر بیٹھنے لگئے۔ زمر نہ رہتے سے ان کے ریسورائٹ کے حوالے سے باتیں کرنے لگی۔ وہ ریسورائٹ ان دونوں باتا ہا جب زمران سے قطعہ تعلق ہی، مگر خون کے رشتے ”صلح“ کے بعد پرانی باتوں کا ذکر نہیں چھیڑا کرتے۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہی چیز خون کوپانی سے گاڑھا بناتی ہے۔

نہ رہت اور سیم اٹھ گئے تاکہ سیم کے جوتے لے لیں تو خین جوس میں اسٹر اگھماتی، نگاہیں جھکائے، سرسری سا بولی۔ ”ہاشم بھائی نے براتومانا ہو گا اتنی سخت باتوں کا۔“

”ہاشم کے برمانے سے کے فرق پڑتا ہے؟“ زمر نے مسکرا کر شانے اپکائے۔ پھر گردن ترچھی کر کے اسے تغور سے دیکھا۔ ”کسی

بات پر پریشان ہو ہوئے؟“

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”نہیں.... مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں۔“ چہرہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ ڈیڑھ سال قبل کی چینگ سے اب کی

۱۱۸۔ تذکر کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

”آریو شیور؟ اگر کوئی مسئلہ ہو تو ضرور شیئر کرنا۔“ اس نے زمی سے حند کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

”آپ کوایسا کیوں لگا؟“

”کیونکہ اب تم بہت خاموش رہتی ہو۔ پہلے تم بہت بولا کرتی تھی۔“

خنین کے ابر و بھجھ گئے۔ ایک سخت نظر اپنے ہاتھ پہ دھرے زمر کے ہاتھ پہ ڈالی اور دوسرا زمر کی آنکھوں پر۔

”میں اور آپ پچھو، کبھی بھی ایک دوسرے سے بہت نہیں بولا کرتے تھے۔“ اپنا ہاتھ نکالا اور کری دھلیتی انٹھ کر دوسرا طرف چلی۔ زمر گھری سانس لے کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اور خون کی سب سے بڑی خوبی اور خامی بھی ہے کہ اگر اسے باہر کی ہوا لگ جائے تو وہ تم ہاتا ہے۔ عرب کے الہی زبان اس جمنے کو عقد کہتے ہیں، مگر یہ نہیں بتاتے کہ جسے خون کو کوئی پکھلانے کیسے؟

..... ♦♦♦ .....

دنیا کی وسعتوں میں اسے ڈھونڈتا رہا ..... لیکن خدا میری ذات کے اندر ملا مجھے!

چھوٹے باغیچے والے گھر کے باہر ابھی رات کا تیسرا پھر تھا۔ گھرے جامنی آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ راہداری کے پہلے ۱۱۰۱ سے اندر جھانکو تو بستر پہ چادرتانے سعدی سورہ تھا۔ پھر نہ کوئی آہٹ ہوئی، نہ آواز آئی، اور وہ آہستہ سے بازو وہٹا کر اٹھا۔ نیند سے ۹۴ آنکھوں کو مٹھی سے ملا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سائیڈ نیبل سے موبائل اٹھا کر روشن کیا۔ فخر میں ابھی آدھا گھنٹہ تھا۔

وہ لوگوں میں کوئی دعا پڑھتا بستر سے اتر اور با تھر روم کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ جب باہر نکلا تو کرتے شلوار میں ملبوس تھا ہاتھ منہ اور پیر گلیے تھے جب وہ راہداری میں دبے قدموں چلتا پر ورنی دروازے تک آیا تو نورت نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ خوابیدہ ۱۱۰۱ میں جیرت سے سکیڑ کر اسے دیکھا۔

”سعدی؟ ابھی تو آذان بھی نہیں ہوئی۔ تم جلدی کیوں اٹھ گئے؟ کیا الارام جلدی نج گیا؟“

”میں تو الارام نہیں لگا تا امی، آپ کوئی پتہ؟“ اسے جیسے معصوم ساتھی ہوا۔

”تو پھر کیسے اٹھے ہو؟“

”میں بس اللہ تعالیٰ سے رات میں کہہ دیتا ہوں کہ مجھے صحیح اس وقت جگا دیجیے گا تو اللہ مجھے جگا دیتے ہیں۔“ اور سادگی سے سلرایا۔ ”امام صاحب کی طبیعت رات پھر خراب تھی، میں نے کہا کہ صحیح میں امامت کراؤ۔ اس لئے جلدی جا رہا ہوں۔“

”اچھا خیر سے جاؤ۔“ انہوں نے شاید کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر خنین اور سیم کے کمرے تک گئیں۔ بلند آواز میں ڈانٹنا شروع کیا۔ ”کوئی شرم حیا ہے تم دونوں میں؟ انھوں قرآن پڑھو، نماز پڑھو....“ سعدی باہر نکل آیا تو آوازیں دم توڑ گئیں۔

کالوں کی سڑک دیران، اندھیر پڑی تھی۔ سعدی نے تازہ ہوا کو محسوس کرتے سراٹھا کر دیکھا۔ زین والوں کو آسمان پر تارے جنمگاتے دکھائی دے رہے تھے اور آسمان والوں کو زمین پر قرآن پڑھنے والوں کے گھر چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اندھیرے کی وہ گھڑی تھی جس میں سب سے زیادہ نور پھیلا تھا۔

اس نے پینڈنڈ فری کا نوں میں لگایا، قرآن پین نکالا (ایک سفید پین کی صورت کا آل جس کی نوک قرآن کے جس حرف پر رکھو ہیں سے تلاوت کی ریکارڈ مگر چلے گئی ہے) اور سورتوں کا کارڈ نکال کر تمام سورتوں کے ناموں پر سوچتی نظر ڈالی۔ اپنے روز کے فخر کے قرآن میں وہ سورہ غافر پڑھا۔ اب اصولاً اس سے اگلی سورہ پڑھنی تھی، مگر وہ سوچتا رہا۔ پھر عادتاً اپنی پسندیدہ سورۃ نَعْمَل پر قلم کی نوک رکھدی۔ سراٹھا کر ابرو اکٹھے کیئے بے بسی سے آسمان کو دیکھا۔

"او کے اللہ تعالیٰ آئی ایم سو ری مجھے قرآن ترتیب سے پڑھنا چاہیے مگر میں کیا کروں مجھے یہ سورۃ بہت پسند ہے۔" مسکرا کر کاؤں میں چند زفری پکا کرتے قدم قدہ مہر مزک کنارے سے پلٹے گا۔

"اللہ تعالیٰ مجھے آج بھی یاد ہے جب میں الوہ کے ساتھ سچھ آتا تھا تو وہ مجھے جو نبیوں کی تھمار دھکایا کرتے تھے۔ جب میں وہ پڑھا فرمائیں تو لوں کو کیزے کوڑوں سے کیوں طایا جائے؟ مگر بہت سالوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ تمیل کیزوں کیزوں کی سورۃ نبیوں ہے۔ "بیبلی" کی سورۃ نبیوں کو کیسے جو زکر لکھا ہے مجھے آپ نے یہ اس سورۃ سے سکھایا ہے۔"

جانشی اندھیر سے میں دوسرا جملے "مسکرا کر سر گوشی میں بولتا جا رہا تھا۔

اوپر کا لوٹی میں کسی گھر کی چھت پر کوئی تو مر لڑکی فون کان سے لگائے۔ آنسو بار بار ہو چھتی، کسی ہاتھ کے لٹل اپنے ہائے فربند سے گوشی میں بات کر رہی تھی۔ سامنے والے ایک اور گھر میں ایک لاکاہر ستر میں لینا سوپاگیں داؤں ہاتھوں میں پکڑے تک تک کر رہا تھا اور چھرے پر وہی سکراہٹ تھی جو مرٹی عشق میں جانا لوگوں کے چہروں پر اس وقت ہوا کرتی ہے۔ یہ رات کا وہ پہر تھا جب صرف محظوظ کے لئے جاؤ چاہتا ہے۔

"اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہریاں پا رہا رحم کرنے والا ہے۔" مزک کنارے پچھے گھٹکھڑیا لے بالوں والے لڑکے کے کاؤں میں لگے چند زفری میں آواز گوئی تھی۔ "طس۔ یہ آیات یہ قرآن کی اور اس کتاب کی جو رہن ہے۔"

ہاتھ میں پکڑے چین پاس نے پاز کا فن دیا۔

"اوہ اللہ۔" بے سی بھری سکراہٹ سے آنکھوں کو دیکھا اور بھرنگی میں سر بلاتے گردن جھکائے چھٹا گیا۔ "مطلوب کر میں کبھی بھی بخان ہو چاتا ہوں ایو۔" کتاب بینیں والی بات آپ نے کتنی وصفتادی قرآن میں پھر ہر چند سورتوں کے بعد سیکن آیت کیوں لے آتے ہیں آپ اللہ؟ مجھے سچنے دیں۔ "لب کا جج، آنکھیں دراچھی کرو وہ اتفی سچنے کا۔" ہوں۔ "پچھلے اور سوچنے ہوئے بڑی بڑی۔" ہر دفعاں آیت کا مجھے یہا مطلب بخواہتا ہے۔ وہ کسی اللہ آتا مجھے پڑھے کہا گر ان الفاظ کا صرف ایک حقیقی مطلب ہوتا تو یہ قرآن میں بار بار نہ ہوتا جاتے۔ کتاب بینیں۔ کتاب رہن۔ یعنی..... "دو مزک کنارے قدم اٹھا کاہر جھکائے کہہ رہا تھا۔" یعنی آپ مجھے یہ سمجھا رہے ہیں کہ آگے جو آیات آپ مجھے دیں گے وہ اس کتاب کی ہیں جس کے ملادہ مجھے دنیا میں کسی چیز سے کوئی روشنی نہیں ملتی۔ کہیں سکون نہیں ملتا۔ کہیں خوشی نہیں ملتی۔ مجھے اس کتاب کے ملادہ کوئی نہیں تھا کہ مجھے کیا کر رہے ہیں۔ کوئی نہیں انکی پکڑ کر سچھ دینیے کرنا سکتا۔ بھرے دل کی ہات کو گھر کر انہی بات اور کوئی فوجیں سمجھائے گو۔" مسکرا کر تو شدی سے بولنے اس کے تاثرات بدلتے گے۔ آنکھوں میں اواہی در آئی۔ دل بھر سا آیا۔

اپنی زندگی کی وجہیہ گیاں تو کچھ قدرات اسپا یاد آنے لگے۔ گیا کھوپا اور کیا پایا۔ جانشی سچ میں اوسیاں گھٹی گئیں۔

"یہ بہت ہے اور خوبخبری ہے، ان لوگوں کے لئے جو ایمان والے ہیں۔" کاؤں میں مکملی وہ مہر آواز کہہ رہی تھی۔ وہ سامنے دیوان اندھیر مزک کو اسی سے دیکھے گیا۔

"انہ آپ کو کیسے علم ہوا ہے کہ اس آیت کے بعد میں افسر دہ ہو جاؤں گا؟" کیسے آپ فوراً انگلی آیت میں رہم لے آتے ہیں؟ کیا آپ کو ہر انسان کا اتنا خیال ہوتا ہے یا میں اونچل ہوں؟" افسر وہی کوڑہ تھی وہ بڑات سے خود ہی نہیں دیا۔ "خوب جری۔" اور بھری سالی لی۔ تو یہ کتاب پڑھنا اس لئے ضروری ہے کیونکہ یہ بھیں قیصلہ کرنا سختی ہے ایسا ہی ہے نا اللہ؟ آپ نے ان آیات کے ذریعے مجھے سکھایا کہ برسے لوں میں انسان کیسے ہو۔ "آگلے رکھے جو اسے وہ کھائے جو ابھی پاس نہیں ہے۔ مگر کبھی تو ملے گا۔ بھی تو ہم بھی دوں دیکھیں گے نا اللہ جس کا وہ دہ ہے۔ مگر اللہ... کیا یہ خوب جری برے لئے بھی ہے؟ آپ نے کہا۔ یہ ایمان والوں کے لئے ہے۔ مگر مجھے خود بھی نہیں پڑے کہ میں ہوں ہوں یا نہیں؟ اگر خود کو مومن بھجوں تو خود پسندی ہے۔" اب بے خود کو منافق بھجوں تو یہ ماہی ہے۔ مجھے کیسے پڑے گا کہ میں ہوں ہوں؟"

”بادتار خواهی بخوبی کے لئے۔“ پوچھ دی جس سے جواب مل کی تھی کہ ”ایک دن ایک خواجہ کا گھر کر لے گا۔“

”کوئی بھائی نہ ہوا کرتے ہیں۔ اور وہ اگر لخت پاپتی، کھجیں۔“  
 ”لیکن اس کے لئے سرداری میرے ہے۔“ تکی جیخ کام کر دیں۔ لیکن اسی اپنے انتہا تک کیلیں بھی۔ شدید بھرپوری کے لئے کام کرنے والے سارے ہے۔“ تکی جیخ کام کر دیں۔ لیکن اسی اپنے انتہا تک کیلیں بھی۔ اس کے لئے سرداری میرے ہے۔“ بھبھکتی میں سارے سارے ہے۔ پونچیں یا آس کے لئے دکھلیں۔ لیکن کام کرنے والے سارے ہے۔“ اس کی تھاں کو کھانا پیٹ کیں۔ لیکن اسی سے تاریخاً۔ کھڑکیں دکھلے ہے۔“ کچھ بھبھکتی میں سارے ہے۔“ اس سے پہلے تو اسی میں میرے دکھلے ہوئے تھے۔“ کام کرنے والے سارے ہے۔“ کام کرنے والے سارے ہے۔“ کام کرنے والے سارے ہے۔“

مذکور شد که این مقاله بحثی در مورد این است که آنکه این مقاله که تقریباً کار مسکن بود، چه مکانی را برای این مقاله انتخاب کردند.

لے کر کہہ رہا تھا۔ ”جب میں نماز نہ پڑھوں یا قرآن نہ پڑھوں یا لوگوں پر اپنے حصے سے خرچ نہ کروں تو میرا آخرت پر ایمان کمزور ہو جائے گا؟ اور... اور میں ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں گا جو بہت عمل کرنے والے ہوں گے مگر صرف تھنکنے والے ہوں گے؟“ تجھ سے اس نے پوچھا جواب اسے خود بھی معلوم تھا۔ ”تو چیز مجھے نماز اور قرآن سے دور کرے گی، اللہ کے راستے کے علاوہ جس بے مقصد چیز میں اپنا مال یا اپنا ٹیکنٹ لگاؤں گا، آپ مجھے وہ بے مقصد چیزیں دلچسپ اور خوبصورت بنانکر دکھاتے جائیں گے اور پھر میں انہی میں بھکتار ہوں گا؟ کیا صرف ایک نماز کا چھوڑ دینا اتنا مہنگا پڑے گا؟ نماز جاتی جائے گی، بے مقصد چیزیں آتی جائیں گی؟ ایسے چلا جاتا ہے ایمان؟ صرف ایک نماز کے جانے سے؟ ایک جھوٹ بولنے سے؟ ایک دل دکھانے سے؟“ ایک کنارے پر دھھکر گیا۔ تجھ ساتجھ تھا۔ حیرت سی حیرت تھی۔ سرانح کراس نے گہرے پر اسرار آسمان کو دیکھا۔ دل بھر سا آیا۔ ہینڈ زفری اتار دیے۔

”اللہ تعالیٰ آئی ایم سوری ہر اس چیز کے لئے جسے میں نے نماز سے اوپر کھا۔ میں بار بار معافی مانگوں گا۔ آپ بس معاف کرنا مت چھوڑیے گا۔“ اسی طرح خود سے بڑھ رہا تا وہ قدم بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ مسجد کے دروازے تک آن پہنچا۔ گل خان خلافِ معمول دروازے پر ہی مل گیا۔ سعدی اپنے فخر کے قرآن میں الجھا تھا اسے نہیں دیکھا۔ لبوں میں مدھم سا بھی تک پچھے بول رہا تھا۔ جوتے اتارے تو ساتھ کھڑے گل خان نے حیرت سے اس کا بازو ہلا کیا۔

”کس سے بول رہے ہو سعدی بھائی؟“

وجو اپنی ”دعا“ ختم کر کے درود پڑھ رہا تھا جبکہ کرجوئے پھانٹ کے کی جانب متوجہ ہوا۔

”میں اللہ تعالیٰ سے بات کر رہا تھا۔“ اور ننگے پاؤں اندر صحن میں قدم رکھا۔ دم توڑتی رات کی اس گھری صحن کی اینٹیں بھٹکی تھیں۔

”توبہ... توبہ.....“ گل خان دوالگیوں سے باری باری دونوں کان چھوٹا چیچھا آیا۔

”اللہ سے ایسے بات نہیں کیا جاتا۔ اور (ادھر) مصلے پر بیٹھ کر ادب سے بات کرتا ہے۔“

”میں ادب سے ہی بات کرتا ہوں، جیسے اپنے بڑوں سے کرتا ہوں۔“ وہ زمی سے کہتا اندر چلا آیا۔ گل خان کو خوب غصہ آیا۔

”سادی بھائی.... ابھی مولوی صاحب دیکھ لیتا تم کو ایسے بات کرتے تو تمہارے پیغام لگ جاتا۔“

”اچھا تم بتاؤ مجھے کر دعا کیسے مانگتے ہیں؟“ وہ پر سکون سامسکرا تاہوا بہاعت والے سرکزی کمرے میں آگے بڑھ رہا تھا۔

”ادب سے تیزی سے اور ادھر مصلے پر بیٹھ کر دعا مانگا جاتا ہے۔ سر جھکا کر ررو کر۔ ہاں!“ باتھ ہلا بلکہ خنفلی سے اشارہ کر رہا تھا۔

سعدی نے مسکرا کر اس چھوٹے پھانٹ کے کوڈ بکھا جو سید پشاوری ٹوپی پہننے پا سینے پر چڑھائے کھڑا تھا۔

”اللہ ہماری وہی دعا قبول کرتے ہیں گل خان جو ہم نے دل سے مانگی ہوتی ہو اور دل سے نکلی با تین نیچرل ہونی چاہیں۔ مصنوعی لفاظی، اورنی وی پر بیٹھے علماء والی مشکل گاڑھی اردو۔ نہیں یا ر...“ اس نے بے چارگی سے نفی میں سرہلا کیا۔ ”میں عام زندگی میں جو سادہ زبان بولتا ہوں، مجھے اسی نیچرل انداز میں اللہ سے بات کرنی چاہیے۔“

”توبہ۔ تم چلتے پھرتے کون سابات کر رہا تھا، ہاں؟“ اس کے اندر کے مفتی کو ہضم نہیں ہوا، گھور کر مشکوک انداز میں پوچھا۔

”میں فخر کا قرآن سن رہا تھا، ہر آیت کے بارے میں اپنے خیالات اللہ کو بتا رہا تھا اور اس کے بعد میں ان کو وہ بتا رہا تھا جو میں نے

کل کیا، اور جو آج کروں گا۔“ جانی دار نوپی سر پر لئے اس نے رسان سے جواب دیا۔ برآمدے میں لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ کوئی اسے سلام

کرنے رکا تو وہ ادھر متوجہ ہو گیا۔ فارغ ہو کر واپس گھوما تو گل خان سوچتی نظر وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے بھائی، تم ایسے خود سے بول رہا ہوتا ہے۔ تم کو ایسے اللہ تعالیٰ سے بات کرنا کس نے سکھایا؟“

”وہ بہکا سامسکرا کیا، مگر وہ اداس مسکرا ہہت تھی۔“ ”میری چھپھونے۔ وہ بھی ایک زمانے میں ایسے ہی دعا مانگا کرتی تھیں۔“ مسکرا بہت

آہستہ آہستہ لوں سے غائب ہوئی۔ ”اب نہیں ملتیں لوگ بدل جاتے ہیں۔ دل خخت ہو جاتے ہیں۔“ پھر سر جھکا۔ بہت سے خیال بھی جھکتے۔ ”تم بتاؤ، آج تمہارے تایانے کس جگہ تھیں مار کر تمہیں نماز کے لئے اٹھایا ہے؟“ اب کے اس نے آنکھیں سکیز کر گل خان کے پہرے کو ادھر ادھر سے جانچا۔

”ہا!“ گل خان نے غصے سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”ہم ایسا کوئی نشانی ہے جو خود نہیں انھیں سکتا ہاں؟“ کمرپہ باتھر کھکھنے سے اسے گھورا۔ سعدی نے ”اچھا؟“ والے انداز میں ابرداٹھایا۔ گل خان اسی طرح گھورتا رہا، پھر قدرے جزو بڑا، گدی پہ باتھر کھکھنے سے ”کیا گردن ابھی تک سرخ ہے؟“ رازداری سے پوچھا۔ سعدی بے اختیار بہت دیا، اس کے سر پہ چپت رسید کی اور امامت کی جگہ کی طرف بڑھ گیا۔ گفتہ بھرلوگوں کی صافیں ترتیب دی جا رہی تھیں۔ نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

بس گفتہ بھرلوگ! الساقون السابقوں!

❖❖❖

موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو ..... پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے اور پھر فخر کی وہ گھڑیاں انسان کو کبھی دوبارہ نہ ملنے کے لئے کھو چکی تھیں۔ روز نبیر طلوع ہو گی، مگر اس دن کی پھر نہیں آئے گی۔ سورج پوری آب و تاب سے چکنے لگا تھا، جب وہ سارہ کے گھر کا گیٹ عبور کرتے اندر آیا۔ آفس کے لباس میں تیار سیاہ سنہری کی چین انگلیوں میں گھماتے اس نے داخلی دروازہ بجا یا تو فوراً کھل گیا۔ سامنے نور اسکول یونیفارم میں تیار کھڑی تھی۔ وہ اس کو پیار کرتا، اندر آیا تو لاڈنخ میں ذکر یہ بیکمال کے بال بنا رہی تھیں۔ ایک آنکھ اس کے بالوں پہ پور دوسرا ٹیلوی وی پہ شور کرتی تھی کسی عورت پر تھی۔ اس کے سلام کرنے پہنچنیں، پھر مسکرا کر خوشدی سے اسے خوش آمدید کہا۔ ساتھ ہی ملازم کو آزادی کرنا شتہ لائے۔

”تھینک یو نانی، میں ناشتہ کر کے آ رہا ہوں۔“ اپنی امی کی خالہ سے شائگی سے مغذت کرتے وہ صوفے پہ بیٹھا۔ نانگ پہ نانگ رکھی، اور ادھر ادھر متلاشی نظر دوں سے دیکھا۔

”ارے سعدی تم؟“ سارہ اندر سے پرس اور بیگ اٹھائے عجلت میں چلی آ رہی تھی، اسے دیکھ کر کی خیریت سے سوال کیا۔ ساتھ ہی دوسرے ہاتھ میں پکڑے کاغذ بیگ میں رکھے۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

”آفس کے راستے میں سوچا، آپ سے ادھر لیوں۔ پھر وہاں تو وقت ہی نہیں ملتا، باس!“

”کیا ہوا؟ خیریت؟“ وہ سامنے آئی۔ بالوں کا فرج جوڑا بنائے لمبی قیص، دو پہنچانوں میں ناپس پہنچنے سعدی کی پرا جیکٹ ڈاڑھ کیڑھ آفس کے لئے تیار لگ رہی تھی۔

”کل کے پروگرام کا پوچھنا تھا۔ آپ آئیں گی نا؟ زمر اور فارس کا نکاح ہے کل۔“ بعوراں کے چہرے کے اتار چڑھا و دیکھتے اس نے اختیاط سے لفظ چنے۔ سارہ کے بیگ میں کاغذ کھسپیرتے ہاتھ ذرا کی ذراڑھیلے پڑے، گردن موزی۔ ادھر ادھر بھاگتی چھیوں کو دیکھا۔

”اپنے بیگز لہو اور گاڑی میں بیٹھو۔ فناٹ میں آ رہی ہوں۔“ پھر چہرہ اس کی طرف پھیرا۔ ذرا پھیکا سامسکرائی۔

”ہاں ندرت آپا نے فون کیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی سن کر۔ ہاں تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ فارس کو رہا ہوئے ابھی تین ہفتے تو ہوئے ہیں۔ مگر... ضرور یہی اچھا ہو گا۔“ سر ہلا کر کہتے اس نے موبائل بیگ کے زپ والے خانے میں رکھا۔

”آپ..... آئیں گی نا؟“

”اصل میں میری پلانگ کیشن کے کچھ عہد یادوں کے ساتھ کل مینگ ہے۔“

”کل اتوار ہے خالہ!“

”تو لفظ پہ نامیٹنگ۔“ (ذکر یہ بیگم نے نقشی میں ٹکان سے سر جھکا)

”آپ کو پتہ ہے میں پلنگ کمیشن والوں سے لفظ کی تاریخ اور وقت معلوم کرلوں گا۔“

”اوے سعدی!“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”میں نہیں آسکوں گی۔“

”ہم لوگ آپ کی فیملی ہیں، آپ کو آنا چاہیے۔ میں جتنا سب کو جوڑ کر رکھنا چاہتا ہوں اتنے ہی سب ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔“ اس نے شاک کی نظر دیں سارہ کو دیکھا۔

”تمہیں پتا ہے میں گیرنگز میں نہیں جاتی۔“

”مجھے یہ پتہ ہے کہ آپ فارس ماموں سے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ حیرت بھرے دکھ سے وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ قاتل نہیں ہیں، یونو ڈیٹ!“

”مگر فارس وجہے اس سب کی!“ وہ قدرے بلند آواز سے بولی۔ آنکھوں میں درد بے بی، نبی سب ایک ساتھ ابھرا۔ ”اس کو پھنسانے کے لئے اس کے بھائی اور بیوی کو مارا گیا۔ فارس کا مطلب ہے ”مصیبت“ اور میں اپنے بچوں کو ہر قسم کی مصیبت سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ جب ایک دفعہ کوئی سرجاتا ہے تو واپس نہیں آتا، بھلے تم اس کے لئے کتنا انتقام لیتے پھر د۔“

سعدی چند لمحے کے لیے خاموش رہ گیا، مگر پھر مضبوطی سے اس کی آنکھوں میں دلکش کر بولا۔ ”یونو ڈیٹ، سب سے زیادہ مصیبت میں کون لوگ پڑتے ہیں؟ جو سب سے زیادہ مصیبتوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں... میں یو ان آفس۔“ اور اسی سنجیدہ پھرے کے ساتھ وہ ذکر یہ بیگم کو سلام کرتا باہر نکل گیا۔

سارہ نے افسوس سے سر جھکا، پھر مردی توڑ کیہ بیگم خنگی سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”ای! میں کسی لیکھر کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں نے کہا، ہم نہیں جائیں گے تو نہیں جائیں گے۔“ ان سے نگاہ ملائے بغیر وہ بیک اٹھائے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ جب وہ باہر نکلی تو سعدی کی کار درور جا رہی تھی۔

❖❖❖

### قیس تھا لا جواب لیلی بھی..... جب سوال ایک کی بقا کا تھا

الوارکی شام یوسف صاحب کے گھر پر کوئی ایسی دھن فضاؤں نے بکھیر کھی تھی جس میں نہ اڑتھی نہ مویتی، صرف کیفیت تھی۔ خوشی کی کیفیت۔ لا و نج میں رونق سی لگی تھی گو کہ مہماں کوئی نہیں تھا، سب اپنے ہی لوگ تھے۔ ادھر سامنے صوفے پندرت اور فارس کے کزن، جمال بھائی تھے۔ ان کی بیگم تھیں۔ سارہ کی والدہ ذکر یہ خالہ تھیں۔ ان کے ہمراہ شفون کا جوڑا پہنچنے عرصے بعد تیاری ہوئی، ندرت بیٹھی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے ان لوگوں سے موج گفتگو تھیں۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر مقابل صوفوں کی سمت بھی دلکش لیتیں، جہاں فارس بیٹھا تھا۔ اس نے آف داٹ کرتا پہن رکھا تھا، تین ہفتے قبل جیل سے رہا ہوتے وقت کے بے حد چھوٹے بال اب قدرے بڑھ کر اچھے لگ رہے تھے۔ البتہ خاموش تھا، سنجیدہ اور خاموش۔ بس گردن بڑے ابا کی طرف موزے دھیان سے ان کی کوئی بات سن رہا تھا۔ بڑے ابا خوش تھے، دھیما مسکرا بھی رہے تھے۔ انہوں نے بھی آف داٹ نئی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ تازہ دم اور سخت مند کھائی دے رہے تھے۔ کبھی فارس سے کوئی بات کہتے تو کبھی قریب بیٹھے نکاح خواں قاری صاحب سے۔ ایسے میں سیم ہتھیلیوں پر چہرہ گرانے سب سے زیادہ اداں بیٹھا تھا۔ اگر ندرت اس کو غلطی سے دلکش لیتیں تو بنا آواز کے ہونٹ ہلا کر پوچھنے لگ جاتا۔ ”کھانا کب لے گا؟“ اور دو تین دفعوں ندرت کا ہاتھ جوتے تک جاتے جاتے رہ گیا۔ راہداری سے آگے بڑھتے جاؤ تو زمر کے کمرے کا دروازہ آ جاتا۔ وہ بند تھا۔ اس کے پار اندر بھی گویا مصروف ساند از لگتا تھا۔ خین اپنے گلابی لبے گاؤں میں ملبوس، کھلے بالوں میں ہمیز بینڈ لگائے سر جھکائے درینگ ٹیبل پر کھلما میک اپ کا سامان ٹھیک کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اسی

ل لان فرزانہ کھڑی کچھ کھردی تھیں۔ فرزانہ کے شوہر احمد بھائی جو زمر کے بھی کزن ہوتے تھے سعدی کے ہمراہ سامنے کا واقع پہنچتے تھے۔ سعدی جو بھورے کرتے میں مبسوں تھا، قلم کھولتے ہوئے نکاح کے کاغذات لے کا واقع سے انھا اور جھک کر انہیں زمر کے گھنٹوں پر لما جو ذریں ٹیکل کے استول پہنچتی تھی، ان کی طرح رخ کی ہوئے تھی۔ اس نے بلکہ کام کی سفید لمبی بیکھی پہن رکھی تھی۔ یہ سلک کا پاجامہ ٹکنوں لوڑ ہکل نظر آتا تھا۔ کامدار دوپہر کے کناروں کی بزرگ پینگ اور کہیں کہیں سبز استووز کے سوا پورا الباس سفید تھا۔ بال سید ہر کر کے اونچا جوڑا بنا تھا۔ جس پر دوپہر نکال تھا، میک اپ بلکا تھا، کافنوں میں اور گردن میں نہیں ہیرے تھے۔ وہ خوبصورت لگ رہی تھی اور پر سکون بھی۔ کافی سکون سے یہ بھکائے نکاح کے کاغذات کے صفحے پلانے پھر کا جل سے گہری کی ہوئیں بھوری آنکھیں انھا کر سعدی کو دیکھا اور سوالیہ ابر و اٹھائی۔

”یہ کیا ہے؟“ احمد بھائی کی موجودگی کے باعث مسکرا کر پوچھا۔ وہ بھی شرارت سے مسکرا ہٹ دباۓ اتنی معمومیت سے بولا۔

”اسے نکاح نامہ کہتے ہیں۔“

”جی، مگر سعدی..... یہ سیکشن کائنے سے میں نے غالباً منع کیا تھا۔“ مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کا اٹھارہ حق طلاق کی جانب تھا۔

”یہ آپ کے والد کی خواہش تھی، جو مجھے جیسے تابعدار پوتے نے پوری کی۔ آپ کو کوئی اعتراض؟“

زمر نے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”میرے والد سے کہیے، جس طرح میں نے کہا تھا، ویسا ہی نکاح نامہ تیار کر لے بھجوا کیں، میں دستخط کر دوں گی۔“ کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔ سعدی نے مسکرا کر کاغذ کے بجائے اس کا ہاتھ تھاماً اسے آہستہ سے انہوں سے اٹھایا اور دروازے تک لے آیا۔ دروازہ کھولا، اور سامنے لاڈنگ کا منظر دکھایا۔ یہاں سے بڑے ابا اور فارس نظر آرہے تھے کیونکہ وہ مر لازمی جگہ پہنچتے تھے۔

”آپ یہ بات اپنے والد کو خود جا کر کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ کتنے خوش ہوں گے وہ سن کر، ہے نا؟“ اسی معمومیت سے سعدی نے ام اور دیکھا۔ زمر نے اس طرف چھر کیا۔ ابا مسکراتے ہوئے فارس سے کچھ کھرد رہے تھے۔ خوش پر امید پہلے سے جوان۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تماشہ نہیں کر سکتی تھی۔ زمر نے گھوڑ کر سعدی کو دیکھا۔

”تمہیں پتہ ہے کسی کی مرضی کے بخلاف ڈاکو منٹ پر دستخط کروانا کتنا بڑا جرم ہے؟“

”جی۔ تو آپ بھی اس جرم میں گرفتار کیوں نہیں کروادیتیں؟“ وہ پھر سے مسکرا یا۔ زمر بہنچنے ہیں کھڑی اسے گھورتی رہی۔ تبھی اسے ابا کی بات سنتے فارس نے انہیں دیکھنے کے لئے سراخایا تو... رنگاہ پھسلی۔ راہداری کے سرے پر کمرے کے کھلے دروازے پر وہ سعدی کے ساتھ کھڑی تھی۔ نیم رخ نظر آتا تھا۔ دوپہر سر پر نکال تھا اور۔ یہ سلک گرتا میکی کا فلمی۔ وہ سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ فارس نے ایک نظر ادا کیا، پھر فوراً چہرہ موڑ کر ابا کو دیکھنے لگا۔

”میں ابا سے حساب بعد میں لے لوں گی۔ اور یہ مدت سمجھنا کر ایک سیکشن کائنے یا نکائنے سے میرے حقوق پر کوئی فرق پڑے گا۔“ ادازے میں کھڑے انگلی اٹھا کر دبی آواز میں اسے تنپیہ کی۔ ”وکیلوں کو ایک ہزار ایک طریقے آتے ہیں، اپنی مرضی کے مطابق قانون کو اسالنے کر لئے۔“ خنگی سے اسے دیکھ کر مڑی اور رکی مسکرا ہٹ کے ساتھ واہیں استول پا کر بیٹھ گئی۔ کمرے کے باقی لوگ اپنی آوازوں سے باعث ان کی گفتگو سے یکسر انجان رہے۔ وہ بیٹھی تو سعدی نے نکاح نامہ اس کے گھنٹوں پر رکھا، اس کے قریب جھک کر اس نے دعا یہ ملہات پڑھے۔ قلم اس کے ہاتھ میں دیا۔

”کیا آپ زمر یوسف ولد یوسف خان، فارس غازی ولد طبیر غازی کو دس لاکھ روپے حق مہر سکر راجح الوقت اپنے نکاح میں..... وہ لاکا نجیدگی سے عقد نکاح کی سطور پڑھ رہا تھا۔ زمر کا سر جھکا تھا، اور قلم الگیوں کے درمیان تھا۔

”میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا۔ صرف ایک گولی۔ آئی ابھری زمر۔“

”قبول ہے۔“ اس نے سر ہلا کر بکا سا کہا۔

”میں بے گناہ تھامیدم زمر، میں بے گناہ تھا۔“

”قبول ہے۔“

”میں.... معافی.... نہیں مانگوں گا۔“

”قبول ہے۔“ آخری دفعہ کہتے اس کی جھچی آنکھوں میں گلابی سی نبی ابھری۔ مگر اس نے وہ سب اندر اتار لی۔ دھڑ ادھڑ مطلوبہ جگہوں پر ستحٹ کیے۔ قلم اور کاغذات سعدی کی طرف بڑھائے۔ وہ کوئی دعا پڑھتے اٹھا، زمر کے سر پر ہاتھ رکھا، جھک کر اس کے بال چومنے اور کاغذات لئے، امجد بھائی کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ زمر نے چہرہ اٹھا کر دیکھا تو حنین اسی طرح کھڑی تھی اور فرزانہ باجی اپنی بیٹی کے ہمراہ اسی طرح بولے جا رہی تھیں، گلروہ جانتی تھی، کہ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہے گا۔

”مبارک ہو پھچو۔“ حنہ نے آہستگی سے نگاہ ملائے بغیر کہا تو زمر نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔ رخ واپس ڈرینگ مرکی جانب موزا۔ اپنا عکس دیکھا۔ کامدار بہاس میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔

ادھ کھلے دروازے سے باہر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایجاد و قبول کے الفاظ۔ اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے جبرا مسکراتے وہ آوازیں سنیں۔ فرزانہ باجی اور ان کی بیٹی باہر نکل گئیں۔ حنین وہیں کھڑی رہ گئی۔ باہر دعا ہو رہی تھی۔

زنر نے جھک کر ڈریس کا دوسرا دراز کھولا۔ دوڑ پیاس نکالیں۔ ایک سیاہ تنمیں ڈبی اور دوسرا سرخ۔ پہلی ڈبی کھولی تو وہ اندر سے خالی تھی۔ سوائے نئھے سے کارڈ کے جس پر فارس کے لکھے الفاظ کی سیاہی ابھی نک ویسی ہی تھی۔ حنہ نے ذرا چونک کرائے دیکھا جو ساتھ ہی دوسرا نبی ڈبی کھول رہی تھی۔ اس کے اندر واٹ گولڈ کی نئھی سی نئھ رکھی تھی۔

”دیکھو جو دن۔ اپنے مجھے شادی کا کیا تھا دیا۔“ زمر دو انگلیوں سے ناک کی لوگ اتارتے ہوئے ہوئی۔ یہ واپس رکھنی تھی اور نئی پہنچی۔ حنین ایک دم بے چینی سے سیدھی ہوئی۔

”آپ.... یہ مت اتاریں۔“ اسے سمجھنہیں آواہ کیا کہے۔

لوگ کھولتے اس کے ہاتھ رکے۔ سوایہ نگاہوں سے حنہ کا چہرہ دیکھا۔ ”کیوں؟“

”یہ.... یہ اچھی لگ رہی ہے۔ بس آپ یہ نئھ مت پہنیں۔“

”کیوں نہ پہنے؟“ آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ ندرت بڑے ابا کی دھیل چیز لارہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے زمر کے قریب آئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، مھم آواز میں کوئی دعا دی۔ حنین اس دوران بے چینی سے انگلیاں مروڑتی رہی۔

”ہاں تو کیوں نہ پہنے میری بیٹی میرا تھنڈی؟“ انہوں نے مصنوعی خفگی سے حنہ کو دیکھا۔

”کیونکہ... یہ نئھ مجھے پسند آگئی ہے۔ پھچو کے پاس تو اس سے زیادہ قیمتی والی پہلی ہی ہے۔ یہ میں رکھ لوں ابا؟“ لپک کر نئھ کی ڈبی اٹھائی اور معمومیت سے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔ بڑے ابا مسکرا دیے۔

”میں نے اپنی بیٹی کے لئے خریدی تھی۔ اب کون ہی بیٹی اسے رکھے، یہ تم دونوں خود طے کرلو۔“

کہتے ساتھ انہوں نے زمر کے چہرے کو بھی دیکھا۔ وہ بھی رنی سے مسکرا دی۔

”شیور حنہ۔ یہ تمہاری ہوئی۔“ وہ ڈھیلی کر دہ لوگ دوبارہ کئنے لگی۔ اور ندرت کا ہاتھ جوتے تک جاتے جاتے رہ گیا۔

”تیز ہے تم میں؟ اب نے زمر کو شادی کا گفت دیا ہے، کسی کا گفت لینا کہاں سے سیکھا ہے تم نے؟“ نئھ سے لال پیلی ہوتیں ندرت

کا بس نہیں چل رہا تھا وہ پھر لگا دیں اسے۔

”تو باقی سب بھی تو اپانے دیا ہے پھر کو اب مجھے اچھی لگ گئی تو کیا ہوا؟“ وہ زد مٹھے پن سے کہتی دبی مٹھی میں جذبے کے کھڑی رہی۔

(تم تو گھر پہنچنے میں سیدھا کرنی ہوں میں۔) ندرت نے اشارہ مدد عاصم جہاد یا۔ وہ ڈھینوں کی طرح دوسروی جانب دیکھنے لگی۔ زمر

بڑے ابا سے بات کر رہی تھی۔ پھر وہ مسکرا کر دوبارہ اسے کوئی دعا دیتے، ندرت کے ہمراہ باہر کی طرف ہولے تو زمراس کی طرف گھوئی۔

”تو تم ناک سلوار ہی ہو؟ اچھا لگے گا تم پ۔“ مسکرا کر کہتے وہ کھڑی ہوئی۔ ابھی بس پہنڈ منٹ میں اسے باہر جا کر مہمانوں کے

سامنے بیٹھنا تھا۔ فارس کے ساتھ بیٹھنا تھا، وہ آئینے میں اپنے سارے پا دیکھتی، کندھے سے دو پٹے کی پن درست کرنے لگی۔

خین ڈبی کھول کر نظر کو یونی چھیرنے لگی۔

اور یہ تبھی تھا جب ان دونوں نے وہ آواز سنی۔ کھلی کھڑکی کے باہر گھر کی چاروں یواری تھی، اور درمیان کی چارفت کی گلی میں سعدی

موبائل پر ٹبلٹ میں بات کرتا چلا آرہا تھا۔ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”میں حلیہ میں سمووار کو یعنی کر کل، صبح دس بجے آنا چاہتا ہوں۔ آ جاؤ۔؟“ وہ موبائل کان سے لگائے چہروں جھکائے کہہ رہا تھا۔

بنین اور زمرے بے اختیار اسے دیکھنے لگیں۔ نکاح کے فوراً بعد اتنے مصروف وقت میں بھی وہ کسی کو یوں باہر نکل کر کال کر رہا تھا۔ زمر آنکھیں سکیڑ

لراستے دیکھتی کھڑکی کے قریب آئی۔

”اوے۔ پھر میں دس بجے پہنچ جاؤں گا۔ آپ....“ کہتے کہتے نگاہ اٹھائی تو کھڑکی کی جالی کے اندر لہن بنی زمر کھڑی تھی۔ وہ ”آپ

ہاٹم کو....“ کے بجائے ”آپ اوپر بتا دیجئے گا،“ کہہ کر جلدی سے کال بند کر کے زمر کو دیکھ کر مسکرا یا۔

”ہوں۔ تو یہ حلیہ کون ہے؟“ اس نے شراتی مسکراہٹ دبائے پوچھا۔ سعدی نے ”اف“ کے انداز میں ہننوں بھنپ کر اسے دیکھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایک مینگ کا نام لے رہا تھا۔“

”اور کس سے مینگ؟ حلیہ کے والدین سے؟“

”اللہ زمر۔ آپ بھی نا۔“ اس نے شرم نہ سے ہوتے ہوئے سر جھلایا۔ ”مجھے واقعی اس کے باس سے ملتا ہے۔“

”اچھا تو کون ہے حلیہ کا باس؟“ وہ اسی طرح مطمئن پسکون ہی پوچھ رہی تھی۔ سعدی نے سوچتے ہوئے تھوڑی کھجائی۔ کیا جواب

، سات سالوں کی ساری یادیں اندکا نکھلوں کے سامنے آئیں اور پھر....

”وہ.... نیک کام کا ایک سائنسدان ہے، کام کے سلسلے میں ملنا تھا اس سے۔ آپ بھی نا۔“ اور بہت خفی سے سعدی ذوالفقار یوسف

نان نے جھوٹ بول دیا، پھر واپس مڑ گیا، یہ جانے بغیر کہ آج اس نے اپنی زندگی کی دوسری بڑی غلطی کر دی ہے۔ پہلی اسے کلیں اسی وقت

رانی تھی۔

زمر مسکراہٹ دبائے جاتے دیکھتی رہی اور خین نے گہری سانس لے کر کندھے اچکا دیے۔

وہ دونوں، اور لاڈنخ میں بیٹھے مسکرا تے بڑے ابا، اور سنجیدہ سا بیٹھا فارس، اور کھانا کھلنے کا انتظار کرتا سیم، اور خوشی سے بار بار نہ ہوتی

نکھلوں کو پوچھتیں ندرت، اور کچن میں بھاگ بھاگ کر کام کرتا صداقت، وہ سب اس بات سے ناواقف رہے کہ ٹھیک تھیں گھنٹے اور بارہ منٹ

بعد وہ سعدی یوسف کو کھو دیں گے۔



”آرہی ہے چاہ یوسف سے صدرا“

باب 11:

کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھو والا؟

”اور ہاتھ تھا بھیر وہ کارکھوالا،

جبکہ قابل تھا کھیت کا سان۔

اور گزرتے وقت کے ساتھ ایسا ہوا کہ

قابل لایا اپنے باغ کا پھل (قدرے کم تر پھل)

قربانی کے طور پر اپنے رب کے لیے،

اور ہاتھ لایا اپنے ریوڑ کے اول زاد، صحت مند بھیر،

اور خدا نے عزت دی ہاتھ اور اس کی قربانی کو،

مگر قابل اور اس کی قربانی کو عزت نہ بخشی۔

پس قابل بہت غضبناک ہوا،

اور اس کا چہرہ بھٹک گیا۔

تو پکارا خدا نے قابل کو،

کہ کیوں ہوتم غصے میں؟ کیوں بھٹک گیا ہے تمہارا چہرہ؟

اگر تم (خالص) یئل کرو گے، تو کیا وہ قبول نہ کی جائے گی؟

اور اگر تم نہیں کرو گے (خالص) یئل،

تو گناہ تمہاری چوکھت پر گھات لگائے بیٹھا ہے۔

اور تم اس کی خواہش کے تابع ہو گے۔

اور قابل بات کرنے لگا اپنے بھائی ہاتھ سے،

اور ایسا ہوا کہ جب تھے وہ دونوں کھیت میں،

تو قابل اٹھ کھڑا ہوا اپنے بھائی ہاتھ سے کے مدد مقابل،

اور قتل کر ڈالا۔

پس پوچھا خدا نے قابل سے،

”کہاں بے تہارا بھائی ہاتھی؟“

تو وہ کہنے لگا،

”محنے نہیں معلوم۔ کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھو والا؟“

اور اس پر خدا تعالیٰ نے فرمایا

”یہ تم نے کیا کر دیا؟“

تہارے بھائی کے لہو کی آواز

مجھے زمین کے اندر سے پکار رہی ہے!

اور اب تم ملعون ہو اس زمین میں

جس نے اپنے لب کھول کر

تہارے بھائی کا خون

تہارے ہاتھ سے جذب کر لیا ہے۔

اب جب تم کھیتی باڑی کرو گے،

تو یہ زمین تمہیں نفع نہیں دے گی۔

ایک مفرور اور آوارہ گرد کی طرح

بھکٹے پھر دے گے تم اس زمین پر۔

پس کہا قabil نے خدا سے،

”میری سزا میری برداشت سے بہت زیادہ ہے!“

(تواتر)

عقد نکاح ہو چکا تھا۔ زمر کو اندر سے لا یا گیا تو ایک طرف سیم اور دوسری طرف سعدی تھا۔ اس نے سعدی کی کہنی تھام رکھی تھی، اور اسی طرح تدم قدم چلتی، زم مکراہت کے ساتھ آگے آ رہی تھی۔ وہاں موجود تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ فارس بھی۔ وہ زمر کے چہرے کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ لگا ہیں سعدی کی کہنی تک تھیں۔ زندگی یچیدہ ہو گئی تھی۔

زمر کو اس کے ساتھ بخادا یا گیا تو وہ بھی اسی سنجیدگی سے بیٹھ گیا۔ بظاہر وہ ندرت کی طرف متوجہ تھا جو اس سے پچھ کہہ رہی تھیں مگر نکھلیوں سے اس کا نیم رخ دکھائی دے رہا تھا، وہ دو پہاڑ پر پھر گھنٹوں سے نیچے میکی کافلیز درست کرتی، مکرا کر کسی رشتہ دار کی مبارکباد کا جواب دے رہی تھی۔ اس نے میک اپ ہلا کر رکھا تھا، اور عام حالت میں (اپنی پرکشش شخصیت سے بہت کردیکھو تو) وہ جو محض متناسب شکل و صورت کی مالک تھی، آج واقعی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

اب ندرت جھک کر زمر کو پچھہ کہنے لگیں۔ آنکھیں نہ تھیں جن کو وہ بار بار پوچھتیں۔ وہ جواب میں زم مکراہت سے سرابات میں بلاتی رہی۔

مبارک، مسلامت، مٹھائی۔ اس مختصر سی تقریب کا آخری جز مکمل ہو چکا تو صداقت دوسرے ملازموں کے ساتھ کھانا لگانے لگ گیا۔ سیم نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے گردن اوپھی کر کے آتے جاتے ملازموں کی نرے دیکھنی چاہی، تو حنین نے ہاتھ دبا کر اسے مٹھنا کیا۔

”یہ چاول اور چکن ہے۔ اتنی محنت نہ کرو۔ بار بی کیو آخر میں ہے۔ میں پہلے ہی دیکھ پچھی ہوں۔“ اطمینان سے اطلاع دی۔ وہ فارس

اور زمر کے صونے کے قریب بیٹھی تھی۔ درمیان میں صرف بڑے ابا کی وہیل چیز تھی۔

دفعاتا بڑے بھین کی طرف چہرہ کر کے کہنے لگے۔ ”لڑکی، کیا تم وہ نورنگ پہنچی سمجھی یا ایسے ہی لے لی میری بیٹی سے؟“

”اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کی اس بات پر غیرت میں آ کر میں وہ نخچہ واپس کر دوں گی تو ایسا نہیں ہونے والا۔ میں نارمل نہیں ہوں، میں بھین ہوں۔ پچھوپا سمجھی لوگ سوٹ کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اسے اتاریں۔“ وہ بڑے ابا کی جانب چہرہ جھکا کر، آنکھیں گھما کر بولی، اور فارس نے بے اختیار اس کو دیکھا۔ مگر بھین نے بھر پور کوشش کی کہ وہ فارس کی طرف نہ لکھے۔ شاید اسے ہی آ جائے۔ شاید ڈھیر سارا رونا۔

ندرت نے سمجھی سن لیا تھا۔ کافی ملال سے (اور حمدہ کو گھورتے ہوئے) اس کی اس ”ڈھنائی“ تفصیل سے بیان کرتے افسوس کرنے لگیں۔ فارس نے اپنے پیر کے انگلوخنے کو دیکھتے پوری بات سنی۔ مگر چپ رہا۔ زمر نرمی سے اتنا ہی بولی۔ ”حمدہ ٹھیک کہہ رہی ہے بھا بھی۔ مجھے یہ لوگ بہت پسند ہے، میں اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتی۔“

فارس کا سر جھکا تھا، گردن میں ڈوب کر ابھر تی گلی نمایاں ہوئی۔ بھین بال کان کے پیچھے اڑتی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”یہ کہاں سے ہوا تھی؟“ فرزانہ با جی زمر کے اس طرف بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”یہ میری ایک اسمودنٹ نے مجھے دی تھی۔ آپ کو پتہ ہے نا، بچاں اپنی ٹیچر کو ایسے لفظ دینے کے لئے کریزی ہوتی ہیں، میں ہمیشہ واپس کر دیتی ہوں، مگر یہ کھلی۔“ وہ جو دفعاتا اس لوگ کے حسب نسب سے نادا قفت تھی، سادگی سے ان کی طرف چہرہ کیتے تباہے گئی۔ کھانا لگ چکا تھا۔ اشتہا انگیز خوشبو ہر سوچھلی تھی۔ باقتوں، مسکراہوں کے شور میں فارس بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ نگاہیں سامنے میز پر جمی تھیں۔ پہلو میں پیٹھی زمر اپنا کامدار دوپڈہ درست کر رہی تھی۔ سیم نے کھانے کے لیے جاتے، اس کے گھننوں پر پھول لا کر کھے تھے۔ ایک گلی سے اس کے دو پہنچے کا کام اڑ گیا تھا۔ وہ الجھتے تاروں سے اس کو نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بار بار بُٹی کو کھینچتی، مگر وہ الگ نہ ہو پاتی۔ وہ بے اختیار گردن جھکا کر دیکھنے لگا۔ وہ غلط سمت سے کھینچ رہی تھی، اور مسلسل حرکت پر فارس کو اس تاہت ہو رہی تھی۔ اس نے با تھہ بڑھایا، اور بُٹی کھینچ لی۔ زمر نے چونک کرا سے دیکھا۔ نگاہیں میں۔ اس کی رسی مسکراہٹ مدمم ہوئی۔ چھرے پر بُھی آئی۔

”مجھے آپ کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“ دبی دبی سی وہ بولی اور جختی سے کامدار دوپڈہ چھڑایا۔ ”جب تک زندہ ہیں، یاد رکھیے گا۔“

اور قدرے دوسری طرف سرک گئی۔ چونکہ کھانا ڈال کر اکا دکا لوگ ادھر ہی آرہے تھے تو وہ اگلے ہی لمحے چہرے پر پھر مسکراہٹ لے آئی۔

فارس نے کچھ نہیں کہا، محض لب بیچنے سامنے دیکھنے لگا، جہاں میز کے گرد کھڑے لوگ جھک کر کھانا نکال رہے تھے۔ منظر تبدیل ہونے لگا۔ فضا میں بد لیں۔ وقت چند سال پیچھے گیا۔ یونیورسٹی کی لاسبریری میں اس شام کا منظر نمایاں ہوا۔ اس منظر پر ایسی زردی چھائی تھی؛ جیسے پرانی کتابوں میں ملنے والے سوکھے پھولوں پر چھائی ہوتی ہے.....

لاسبریری کی کھڑکی سے باہر اترتی شام گھری ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ کونے والی میز پر گھنگریا لے بالوں والی لڑکی پیٹھی، چہرہ جھکائے کاغذ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ باہمیں ہاتھ، پہلی کرسی پر وہ پیچھے ہو کر بیٹھا زمر کے کاغذات کو دیکھ رہا تھا۔ جھکے چھرے کے باعث ایک گھنگریا لیٹ کاغذ کو چھوڑ رہی تھی۔

دفعاتا ساتھ رکھا چھوٹا، پرانا نوکیا ذرا سانچ کر خاموش ہو گیا۔ زمر نے قدرے کوفت سے سراٹھا کرا سے دیکھا۔ ”ایک تو لوگ صرف مسڈ کاں کیوں دیتے ہیں؟“ وہ بڑا بڑا۔ موڈ آف تھا اور تھکن زدہ لگتی تھی۔ موبائل اٹھا کر کاں ملائی اور اسے کان پر لگایا۔ قلم انگلیوں میں گھٹائی، منتظر خاموشی نے گئی۔ پھر کمپیوٹر اسزدآ آواز آئی تو اس کی آنکھوں میں ڈھیروں بے زاری اتری، (بیٹنس ختم)۔ جھمٹلا کر فون کان سے ہٹایا اور پرس میں ہاتھ ڈالا۔

”انسان کا فون خراب نہ ہو، میں!“

”یہ کس کا فون ہے؟“ وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میری امی کا۔ پری پیدا ہے۔“ پرس سے ایک کارڈ نکلا۔ ”میں پوسٹ پیڈ استعمال کرتی ہوں، وہ خراب تھا تو عارضی طور پر بھی۔“ وہ اتنی لمبی، غیر ضروری بات اس سے نہیں کیا کرتی تھی، یا بھی بس برے مودہ میں بول گئی۔ کارڈ نکلا، اور چہرہ جھکائے، اس کی سلوو کونگ، ناخن سے رگڑنے لگی۔ فارس کے ابر و بھنچ۔ قدرے غیر آرم دہ سا وہ آگے ہوا۔

”یہ.....“ اور متذبذب سارکا۔ زمر نے رگڑتا ناخن روک کر آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”جی؟“

”یہ ناخن سے نہیں اسکریچ کرتے۔ ادھر لایے۔“ جیب سے چابی نکالتے ہوئے دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ زمر نے ایک نظر اس کے ہاتھ پہ ڈالی، دوسری کارڈ پہ کارڈ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ فارس چابی نکال کر اٹھا اور کارڈ اسکریچ کرتے چند قدم آگے چلتا گیا۔ لامبیرین کی نیبل تک کا، باکس سے دو شوونکا لے اور واپس آیا۔ کری کھنچ کر بیٹھا، شواس کی طرف بڑھائے۔

”ناخن صاف کر لیں۔ یہ نیلگی صحت کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔“ زمر نے نش پکڑ لئے اور پھر ناخن صاف کرتی اس کو دیکھ گئی۔

وہ اب اس کا موبائل اٹھائے، کارڈ سے منہر دیکھ کر تاہم کر رہا تھا۔ ری چارن ج کر کے موبائل اس کے سامنے رکھا۔ پھر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ متذبذب ہی اسے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ بولی نہیں تو فارس کو کہنا پڑا۔

”اب ملا لیجئے کاں!“

زمر نے کچھ کہے، ناپرس میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نکال کر سامنے رکھا۔ فارس نے چونک کر دیکھا۔ وہ پلاسٹ میں لپٹے، نو کارڈ کی اسٹرپ تھی۔ ان میں سے دسوال کارڈ وہ تھا جو اس نے ابھی ابھی فیڈ کیا تھا۔ کارڈ زداٹھا تے ہوئے، چابی دوبارہ جیب سے نکلتے وہ مسکرا دیا اور زمر... وہ سر جھکتے ہوئے نہیں دی۔

”تھیک یو۔ مجھے یہ..... انگوٹھے کا ناخن اٹھا کر بتایا۔“ ناخن سے نہیں کرنا۔ جب تک زندہ ہوں یاد رکھوں گی۔“

زرد زمانوں کی شام وقت کی دھول میں مدھم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ نئے اور نئیں مناظر اطراف میں ابھرنے لگے۔

باتیں، قیچیں، برتوں کی آواز، کھانے کی خوشبو۔ وہ سر جھنک کر واپس حال میں آیا۔ تقریب جاری و ساری تھی۔

❖❖❖

کاش کوئی ہم سے بھی پوچھے ..... رات گئے تک کیوں جائے گے؟

قصر کاردار کے اوپرے ستون رات میں بھی روشن نظر آتے تھے۔ ایسے میں فینیونا لا و ناخن کی میری ہیاں چڑھ کر اوپر آئی اور نو شیر وال کے کمرے کا دروازہ بجا کر کھولا۔ نو شیر وال اندر نہیں تھا، غالباً ہاتھ روم میں تھا۔ مدھم تی جل رہی تھی۔ وہ پانی کی بکٹ لئے بالکوئی کی سمت باہر نکل آئی۔ باری باری پودوں کو پانی دیا۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر انکھی کی سمت بھی دیکھ لیتی جہاں سفید پاؤں کو جھوٹے بس والی دہن کو ایک خاتون ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی سے باہر لارہی تھیں۔ فینیونا نے اشتیاق سے گردن اوپنی کر کے دیکھنا چاہا۔ نگر دہن کی پشت تھی۔ وہ ماہیوں ہو کر اندر آگئی۔

واپس جاتے جاتے اسٹری نیبل تک ٹھہری۔ وہاں کاغذ کی کھلی پڑیارکھی تھی۔ اس پر سفید دانے دار شے رکھی تھی۔ اس نے ٹھہنک کر اس پر یا کو دیکھا۔ بے اختیار استجابة یا بروائٹھائی تجویزی باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ فینیونا جو نک کراس طرف دیکھنے لگی جہاں سے وہ آ رہا تھا۔ ملکجے لباس اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ بہت سست سالگ رہا تھا۔ فینیونا نہیں بلی، وہیں کھڑی رہی۔ نو شیر وال اسے دیکھ کر چونکا، فوراً سے پڑیا کو دیکھا۔ پھر ابرو تھن گئے۔ بے زاری سے سر جھنکا۔

”جاو، جا کر بتا دو ہاشم بھائی کو کہ میں ذرگز لے رہا ہوں۔“  
فینو نانے تھوک نگا، بظاہر مسکرائی۔

”اگر میں گھر کے ایک فرد کی بات دوسرا کو بتانے والی ہوتی تو مسز کاردار مجھے پہلے دن ہی نکال دیتیں، سر۔ میں آپ کی ملازمت ہوں، آپ کے حکم کی پابند ہوں۔“ تابعداری سے سر جھکا کروہ بولی تو شیر و مشکوک نظر وہ اسے گھورتا رہا، پھر اسندی نیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ چابی کے لوہے سے نکڑوں کو چور چور کرنے لگا۔

”سر، کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“ قدرے ہمدردی سے اس نے ڈرگ پیتے شیر و کے ہاتھوں کو دیکھا۔

”مجھے کسی کی مدد کی کیا ضرورت؟“ بے پرواہی سے شانے اچکائے مگر آواز میں ادایاں گھل رہی تھیں۔ ”میں نوشیر وال کاردار ہوں، بھائی کہتا ہے، تم ایک بڑے خاندان میں پیدا ہونے والے بڑے انسان ہو۔ میں کیوں مدد مانگوں گا کسی سے؟“ وہ جیسے خود پڑھنے کر رہا تھا۔ فینو نا بکٹ پکڑے فکر مندی سے ہھنوں سکیڑے دو قدم آگے آئی۔

”آپ کو ایسے نہیں سوچنا چاہیے۔ آپ واقعی ایک بڑے انسان ہیں۔“ فینو نانے رک کر مزید خوبیوں والے سابقے لا جھنے جوڑ نے کی کوشش کی مگر... شیر و کی کوئی خوبی یاد نہیں آرہی تھی۔

”ہونہہ۔ سر جھکائے، چابی سے پاؤڑ پیتے“ اس نے استہزا سے سر جھکا۔ ”پتہ نہیں۔ کون بڑا ہے کون چھوٹا۔“ میں نے میرا نام نوشیر وال رکھا۔ جانتی ہوا س کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“  
فینو نانے نفی میں گردن ہلاکی۔

”بادشاہ۔ سپرہیرو۔ ہونہہ۔“ پھر سر جھکا۔ بے اختیار ایک منظر یاد آیا۔

کو ریا جا کر ان غواکڑ رامہ کرنے سے چند دن قبل حنین کو دیے جانے والے ڈنر میں جب سب لاڈنخ میں بیٹھے تھے تو جواہرات نے ندرت کی اسی بات کے جواب میں کہا تھا۔ ”مجھے نہیں لگتا مجھے اپنے چھوٹے بیٹے کے نام سے زیادہ کوئی نام پسند ہے۔ نوشیر وال۔ ایک بڑا بادشاہ۔ ایک بڑا ہیرو۔ سپرہیرو۔“ فخر سے گردن تن کرنو شیر وال کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں مسکرا کر بولی تھی۔ وہ بھی ذرا سامسکرایا۔ اور وہ تیز طرار لڑکی۔ وہ شدید ارداری میٹنگ حنین وہ فوراً سعدی کے قریب جھکی اور کان میں سرگوشی کی۔ ”بھائی، اگر یہ وزر سپرہیرو ہے تو میں تو پھر ہیں آفڑائے ہوں۔“ اور سعدی نے بہت وقت سے اپنی مسکراہٹ روک کر اس کو چپ رہنے کو کہا، کیونکہ نوشیر وال فریب ہی بیٹھا تھا۔ اور اس نے سن لیا تھا.....

”میرے نام سے لے کر میری شخصیت تک، میری ہر چیز کا مذاق بنا تھے ہیں وہ دونوں۔“ چابی زور زور سے پاؤڑ پہ دباتا وہ کہہ رہا تھا۔ ”یونیورسٹی سے لے کر اب تک وہ سعدی وہ ہمیشہ میرا کمپیشن بنارتا ہے۔“ میں کی نظر میں ہاشم بھائی کی نظر میں وہ بہت اعلیٰ چیز ہے اور میں کیا ہوں؟ ایک لوز؟“ اس کی آواز سے اکتا ہٹ مفتود ہو کر دکھ میں بدلتی جا رہی تھی۔ فینو نانا تاسف سے اسے دیکھتی، سنتی گئی۔

”اس نے میرا ہر ششیت خراب کیا ہے۔“ میں کو میری شکایت لگاتا تھا، تب سے اب تک، میں میری طرف سے ان سیکیو رہتی ہیں۔ ہاشم بھائی کو وہ ان غواوالی بات بتائی، وہ آج تک مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے، کبھی میرا فون لے لیتے ہیں، کبھی مجھے جھڑک کر کہتے ہیں کہ شیر، تم پچھنیں کرو گے، جیسے میں تو اب قابل اعتبار رہا ہیں نہیں۔ پتہ نہیں کیا کر بیٹھوں۔“ چابی پرے ڈالی اور گہری سانس لے کر نیک لگا لی۔ چہرہ اب بالکل نوں کے دروازے کی طرف تھا، اور وہاں سے آتی روشنی میں اس کی آنکھوں میں کچھ بھی تکھائی دے رہا تھا۔

”اور میرے ڈیندی... اس نے ڈیندی اور میرے درمیان اتنا فاصلہ پیدا کر دیا کہ میں ان کی مٹیں کرتا رہا وہ مجھے معاف کر دیں، مگر وہ مجھ سے باتیں نہیں کرتے تھے۔۔۔“ اس نے آنکھیں بند کیں، ختم پھر سے تازہ ہوئے۔ ”اس رات تو میں نے سوچ لیا تھا، آج سونے سے پہلے

میں ان کے پاس جاؤں گا ان کے گلے لگ جاؤں گا، اور اس دفعہ وہ مجھے معاف کر دیں گے، اور اسی رات فیجنامیر سے ذیڈ مر گئے۔  
فیجنام کو احساس ہوا کہ بے خودی کے عالم میں بند آنکھوں سے بولتا شیر و غالباً نشیات کے زیر اثر ہے۔ اسٹڈی میبل کے قریب ہن  
میں خالی پڑیاں تازہ تازہ گرائی نظر آ رہی تھیں۔

”اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ مجھ سے ناراض تھے۔ مجھے لگا سعدی اس سے بڑا نقسان مجھے نہیں پہنچا سکتا۔ مگر....“ کرب  
بڑھا۔ ”اس نے پہنچایا۔ وہ لڑکی جسے میں پسند کرتا ہوں، اس نے اسی کو بلیک میبل کیا، اور پھر میرے اور اس کے رشتے کو اتنا پچیدہ کر دیا کہ باشم  
بھائی اور می.....“ آنکھیں کھولیں، نبی میں سر بلایا۔ ”اب وہ بھی مجھے اس لڑکی کے ساتھ تعلق رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ سعدی نے میرے  
ہرشتے کو خراب کیا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔“ وہ سوت ڈھیلے انداز میں نبی میں سر بلاتے کھڑکی کو دیکھتے کہے جا رہا تھا۔  
”ایک دن میں اس سے انتقام لوں گا۔ ہر چیز کا انتقام۔“ ذرا دیر کوٹھرا۔ ”اب تم جاؤ فیجنام۔ اور دوبارہ شکل مت دکھانا مجھے۔“  
فیجنام قدرے گز بڑا کر جی اچھا کہتی ہاہر نکل گئی۔ نوشیر وال کری پہ بینجا، اسی طرح باہر کی روشنی کو دیکھتا رہا جو کمرے کا اندھیرا دور  
کرنے کے لئے اب بھی ناکافی تھی۔

❖❖❖

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں، کچھ کر نہیں پاتے ..... پھر بھی لوگ خداوں جیسی باتیں کرتے ہیں  
وہ کتنی ہی دیر ادھر بیٹھا رہا۔ پھر مدھمی دستک ہوئی تو اٹھا۔ انداز پہنچا بتا تھا، سوسائیٹی میبل سے ماٹکھ فریشنر اٹھا کر منہ میں اسپرے کیا  
اور چہرے پہ بثاشت لاتا دروازہ کھولا۔  
باشم کافی کامگی پکڑے سامنے کھڑا تھا۔  
”سعدی نے میری سیکرری کوفون کیا ہے۔ وہ صح آئے گا ہم سے ملنے۔ ہم تیوں کو دہاں ہونا چاہیے۔ ایک خاندان کی  
طرح، ہوں؟“  
گل سے گھونٹ بھر کر اسے نیچے کرتے ہوئے، سمجھی گی سے تاکید کی۔ وہ مطمئن اور پر اعتماد لگ رہا تھا۔ نوشیر وال نے بلکے سے  
اثبات میں سر بلایا۔

”میں تیار ہوں گا۔“  
”گزر!“ اس کی نگاہوں اور الفاظ کے ”عجیب“ سے انداز کو وہ محسوس کرتا مگر جیب میں رکھا مو بالکل بجا۔ وہ پیغام چیک کرتا اپنے  
کمرے تک آیا۔ گل اور فون اسٹڈی میبل پر دھرنا اور بالکونی کے دروازے میں کھڑی سونی کو پیچھے سے آ کر بازوؤں میں اٹھایا، اس کا گل چوما  
اور چہرہ اپنی طرف کیا۔ وہ گردن پیچھے پھینک کر بننے لگی۔

”بابا... ادھر کون آیا ہے؟“ چہرہ سیدھا کر کے اس نے چمک دار شراری آنکھوں سے پوچھا۔ باشم نے بالکونی کے پار دیکھا جہاں  
رات اتر پچھلی تھی اور نیچے انیکسی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک کار واپس جا رہی تھی۔ سعدی کی کار۔ اور برآمدے میں سفید کرتے میں کھڑا فارس  
کار کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ باشم مسکرایا۔

”ہماری فیملی میں ایک ناخوٹگوار اضافہ۔ صبح ملاقات کریں گے ان سے بھی۔“ وہ بھی مخطوط سا ہو کر خود سے بولا، اور سو نیا کو انھائے  
اسٹڈی میبل کی طرف آیا، جہاں لیپ تاپ کھلا تھا، اور چند فائلز کی منتظر تھیں۔  
”بابا ب کام کریں گے اور سونی اب سونے جائے گی، نہیک۔“ وہ کرسی دھکیل کر بیٹھتے ہوئے اسے کہہ رہا تھا جب مو بالکل نج اخھا۔  
نبہر دیکھ کر باشم نے بے چینی سے اسے اٹھایا۔

”ہاں خاور۔“

”آپ درست تھے۔ سعدی فرشتہ نہیں ہے۔ مجھے کچھ ملا ہے۔“ دوسری طرف خاور بولتا جا رہا تھا اور ہاشم مسکرا کر سنتا گیا۔ پورے جسم و جاں میں گویا کون سا پھیل گیا۔

”زبردست خاور۔ تم نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا کہ تم میرے لئے کتنے ابھم ہو۔ کل ہم ایک ساتھ اس لڑکے کو کشف نہ کریں گے۔“ مسکرا کر اس نے موبائل رکھ دیا۔

دیوار کے پار، نوشیر وال اپنے کمرے میں ڈرینگ روم کے سامنے کھڑا تھا۔ وارد روپ کھلا تھا۔ نائی ریکس، کف لنس۔ کوت۔ شرٹ۔ اس نے آہستہ آہستہ ہر ریک سے ایک ایک چیز چھپنی شروع کی۔ نام فورڈ کا سوت، ہیری روزن کی شرت، Zegna کی نائی۔ بیس کا چناو کر کے اسے سامنے لٹکایا۔ پھر اسی خاموشی سے ایک الماری کا پٹ کھولا۔ اندر سیف نصب تھا۔ اس نے کوڈ دبایا تو نغمہ دروازہ باہر کو کھلا۔ شریر نے ہاتھ اندر ڈال کر نکلا تو اس میں ایک Glock کی سیاہ چمکتی پستول (گن) تھی۔ G-41۔ برانڈ ڈاٹا زاہد ماؤل۔ اس نے گولیاں نکالیں اور انہیں میگزین میں بھرنے لگا۔

ایک..... دو..... (تم نے وہ کچھے کے ذبے دیکھیے ہیں جن پر یوزمی لکھا ہوتا ہے؟)

پانچ..... پچھے..... (ہاں نوشیر وال میرے ہاں بھائی نے تمہارے جیسی چیزیں کم ہی دیکھی ہیں)

وس..... گیارہ..... (تمیز سے بات کرو میری بہن سے، چلو ہندیاں سے)

بارہ اور یہ ہوئے مکمل تیریہ۔ بھرا ہوا پستول اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس بھاری لوہے کے ہاتھ میں آ جاتے ہی جسم میں گویا کرنٹ سادوڑ نے لگا۔ گردن مزید اکڑ گئی۔ لیوں پر تنفس بھری مسکرا ہٹ آگئی۔

”نہیں ہاشم بھائی۔ آپ سعدی یوسف کو نہیں سن چاہ سکتے۔“ پستول پر نظریں جمائے وہ خود سے بڑھا یا۔ ”یہہ مسلکہ ہے جسے میں خود سن چاہ لیوں گا۔ کل کا دن اس کا اس دنیا میں آخری دن ہو گا۔ لیں بہت ہو گیا۔“

ایک مضبوط عزم کے ساتھ اس نے کل کے لباس کے اندر پستول رکھا اور پھر بستر کی طرف چلا گیا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں ..... شمار ابھی سے جدائی کی ساعتیں کرنی جس وقت ہاشم اور نوشیر وال اپنے اپنے ارادوں کو سوچنے میں مصروف تھے، انیکی کے باہر سے سعدی کی کار گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ فارس برآمدے میں کھڑا اولادی انداز میں ان کو جاتے دیکھتا ہا۔

اندر گھر میں نشاناتھا۔ اس کا گھر، زمزماں سامان، ہر شے ترتیب دے کر، سارے کام ختم کر کے، ندرست جو خصیٰ کے ساتھ ہی ادھر آگئی تھیں۔ اب اس گاڑی میں بیٹھی واپس جا چکی تھیں اور پیچھے گھر بیکھرا کل خاموش اور دیران سا ہو گیا تھا۔ لاڈنج میں کھڑے فارس نے گردن اٹھا کر اوپر جاتے لکڑی کے گول زینے کو دیکھا جس کے اختتام پر دو بیڑوں تھے۔ ایک وہ جو بھی فارس اور زر تاشہ کا ہوا کرتا تھا اور دوسرا وہ جس میں اس وقت وہ بیٹھی تھی۔

وہ گہری سانس لے کر قدم قدم زینے لے چڑھنے لگا۔ لکڑی پیر کے نیچے بلکل ہی چھپی۔ خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ اوپر آیا۔ ”اس“ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر زرد روشنیاں جلی تھیں۔ سنگھار میز اور دوسری دو میزوں پر پھولوں کے تین بوکے رکھتے تھے۔ وہ بھی سعدی نے رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی شے ایسی نتھی جو سجاوٹ کھلا لی جائی تھی۔

چوکھت میں کھڑے ہو کر اس نے دیکھا۔

بیند خالی تھا۔ لگا ہیں آگے پھسلیں۔ وہ ڈرینگ نیبل کے سمنول پر بیٹھی تھی۔ فارس کی طرف پشت تھی۔ مگر آئینے میں اس کا عکس دکھائی، ماتھا اور چوکھت میں کھڑا فارس بھی نظر آتا تھا۔ وہ مصروف سی بندے اتار رہی تھی۔ کامدار دوپٹہ سر پر تھا اور آنکھوں کا جل اب بھی تازہ تھا۔

”سب جا چکے ہیں۔“ وہ دیں کھڑے کھڑے ہے بلکہ مگر سپاٹ انداز میں بولا۔ آپ کا سامان میں نے اوہ رکھوادیا تھا۔ پکن نیچے جا اور اس میں تقریباً سب کچھ موجود ہے۔ آپ کی ڈرینگ نیبل پر اس گھر کی ذمی کیت چاہیاں پڑی ہیں آپ کے لئے۔ سوائے...“ وہ ”نیچے سمعت کے۔ اس کے لاک کی چابی میرے پاس ہو گی۔ اس میں میری بیوی کی بہت سی چیزیں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ان کو کسی بھی نہ کوئی نقصان پہنچے۔ باقی پورا گھر آپ کا ہے۔ جو چاہے کریں۔“

وہ آئینے میں خود کو دیکھتے دوسرا بندہ اتار رہی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”میں نے کچھ بھی نہیں اپنہ۔ آپ اپنے الفاظ ضائع نہ کریں۔“ بندہ اتار کر چہرہ جھکائے اسے جیولری باکس میں رکھا۔

فارس چند لمحے لب بھینپے خاموش کھڑا رہا پھر جانے کو مزا اور جیسے نہ چاہتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ کوئی چیز چاہیے؟“ زمرے نے چہرہ سیدھا کیا، اور زکا اتارنے لگی۔

”صرف یہی کیمیرے سامنے کم سے کم آیا کریں۔ مجھے بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔“

فارس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری جو اس نے بمشکل ضبط کی۔ ایسے بات مت سمجھے جیسے آپ مجھے جانتی ہیں۔“

نکا اتارتے اس کے ہاتھوں کے وہ اسٹول سے انھیں، اس کی جانب گھوٹی، آنکھوں میں چھپن لیے اسے دیکھا۔ ”میں جتنا آپ کو وجہتی ہیں، اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

”اوپر پھر بھی آپ نے مجھ سے شادی کر لی؟“

”آپ کو پتہ ہے میں نے آپ سے کیوں شادی کی ہے!“ وہ بھی اتنی ہی بے زاری سے کہہ کر گھوم گئی، اور آئینے میں دیکھتی کا نکلی۔

”مجھ نہیں معلوم تھا آپ اپنی ظالم ہیں۔“ چوکھت میں کھڑے، سینے پر بازو لپیٹے، وہ اسے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بوا اخراج زمرے ہی الاتے ہوئے، اس کے عکس کو تیز نظروں سے گھورا۔

”آپ اس سب کے حقدار ہیں۔ یہ مت سمجھئے کہ جیل سے نکلنے کے بعد آپ کی سزا ختم ہو گئی ہے!“

”اچھا!“ اس نے ابر و اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”ویسے کیا کریں گی آپ میرے ساتھ، مجھے بھی تو بتائیے۔“ دیوار سے ٹیک لگائے، وہ اس نے مسلسل دیکھ رہا تھا۔

”میرا اور اپنا وقت ضائع مت سمجھئے، اور جائیے یہاں سے۔ اگر آپ کچھ دری مزید یہاں ٹھہرے تو خدا کی قسم، میں...“ دبے دبے

لئے نے اس نے ایک نظر فارس پڑا ای اور دوسری پھلوں کی ٹوکری میں رکھی جپھری پہ۔ ”...کچھ کریم ہیں گی!“

فارس نے چونک کراس کی نظر وہ کے تعاقب میں دیکھا اور پھر اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ آنکھوں میں افسوس در آیا۔

”گذ ناہیت!“ کہہ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا، نظریں ابھی تک اس پر تھیں۔ وہ ان الفاظ پر تیزی سے چوکھت تک آئی، دروازے کا دہل پڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ”گذ ناہیت“ فارس۔ ”کہہ کر دروازہ زور سے بند کیا۔ لاک کے دو ڈلک ہوئے اور اندر سے مقفل ہو گیا۔ فارس نے گھری سرد سانس خارج کی، بلکہ سے سر جھکا اور مژگیا۔

اپنے کمرے میں آیا تو وہاں مرکزی دیوار پر آج بھی زرتاشہ اور اس کی تصویر آؤیزاں تھی۔ وہ سیاہ سائز ہی میں ملبوس تھی اور مسکرا دی تھی۔

کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھوala؟

اس کی آنکھوں کے سامنے تمام مناظر لہرائے جب وہ زرتاش سے اکھڑے الجھ میں یاغصے سے بات کر جاتا تھا۔ اور ایک یہ عورت تھی.... اس نے دیوار کو دیکھا جس کے پار وہ بچلوں سے مہکتا کر رہا تھا..... اور ایک یہ عورت تھی جس کو پچھری میں لوگ وزمنوں کے حساب سے گالیاں دیتے تھے مگر ایک بھی عورت تھی جس پر اسے غصہ نہیں آتا تھا۔

”آپ اس دن کیا کریں گی میڈم پر اسکیوڑ، جس دن آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ فارس غازی سچا تھا؟“ تصویر کو دیکھتے ہوئے وہ بڑا بڑا تھا۔

باہر رات اسی طرح بھیگ رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں موجود زمباب ایس تبدیل کر کے اس اجنبی بیٹھا پا بیٹھی تھی۔ زمر کا فرنیچر۔ زمر کا نیا بیڈ کو۔ مگر پھر بھی ہر شے پر ائی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے فارس کے سامنے کا بے تاثر چڑھا ب تکلیف کے احسان میں لپٹا تھا۔ وہ اداہی سے بیڈ کو پہاڑھ پھیر رہی تھی۔

”کیا گاڑا تھا میں نے فارس کا جواں نے میرے ساتھ یہ کیا؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی لوں سے پھسلا۔ مگر اداہی الفاظ تک ہی مدد و د رہی۔ نہ دل بھرا یا نہ آنکھ ہیگی۔ وہ زمر تھی وہ رلا سکتی تھی، مگر وہ روتنی نہیں تھی۔

رات مزید گھری ہوتی چلی گئی اور اب چند گھنٹے بعد اس نے ایک ایسے دن کو جنم دینا تھا جوان دو خاندانوں میں سے کسی کو بھی بھولنے والا نہیں تھا۔

❖❖❖

یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نباہتے ہیں ..... ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی! صبح پورے اسلام آباد پر طلوع ہوئی تو اس میں باسی گلاب کی پتیوں اور کافور کی خوشبو پھیلی تھی۔ وورجنگلوں میں جانور یوں نوہ بلند کر رہے تھے جیسے رات کی تاریکی میں کوئی غارت گر کسی نفع پھیز کے بنچ کو چڑھا کر چلا گیا ہو۔

قصر کاردار کے سبز زار پر واقع انگریز کے اندر بھی صبح کی روشنی پھیلی تھی۔ فارس اپن کچن کی گول میز کے گرد بیٹھا مگ سے چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا جب لکڑی کے زینے پر باریک ہیل کی آواز نیچے آتی سنائی دی۔ وہ نر کا نہ مڑا۔ سامنے فرتش کے چکتے دروازے میں عکس دکھائی دے گیا تھا۔

وہ سیاہ منٹ کوٹ پہننے لگا اور فائلز اٹھائے زینے اتر رہی تھی۔ گھنگری اے بال سمیت کر چھے کے بال نہیں طرف ڈال رکھے تھے اور موبائل پر کوئی پیغام ناپ کرتے ہوئے نہ کہیں جھکلی تھیں۔ اسی طرح چلتی آئی اور فرتش کے پاس رکی۔ ڈور کھولا۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ ”تو آپ آفس جا رہی ہیں؟“ کہا گیا اس پر جمائے چائے کا گھونٹ بھرتا دہ ہلکے سے بولا۔ وہ استول پہنچنی اس کی طرف پشت کی پانی پہننے لگا۔ جواب نہیں دیا۔

”ویسے پر اسکیوڑ رصلبھا!“ آنکھیں سکیز کر اسے دیکھتے کوئی غیر محسوسی مسکراہٹ دبائے وہ ہلکے انداز میں گویا ہوا۔ ”آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ اگر میں آپ کے والد کو جا کر اس شادی کی حیثیت بتا دوں تو کیا ہوگا؟“

زمر پانی پی کر کھڑی ہوئی، نل سے گلاس دھویا، واپس رکھا اور اس کی جانب گھوئی۔ سخیدہ چھپتی ہوئی نگاہوں سے اس کا چڑھا دیکھا۔ ”آپ بھی بھی یہ نہیں کریں گے۔“

”اچھا؟“ فارس نے ابر و اخایا۔ ”آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں یوسف صاحب کے سامنے جا کر یہ بات ان سے نہیں کہوں گا؟“ زمر کے لوں پر ہلکی سی تلخ مسکراہٹ آئی۔ ”کیونکہ سامنے سے پچھے کرنے کے لئے جو guts چاہیے ہوتے ہیں وہ آپ میں نہیں ہیں۔ آپ صرف پیچے سے دار کرنے والوں میں سے ہیں۔“ ٹھنڈے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔ فارس کی دبی ہوئی

”ابہت بھی غائب ہوئی ابرا کٹھے ہوئے، آنکھوں میں سخت درآئی مگ کے ہینڈل کوزور سے دبایا تھی میں بھیجا، گویا ضبط کیا ہو۔

”کیوں؟ غصہ آ رہا؟ مجھے بھی آیا تھا۔ مگر اب نہیں آتا۔“ ایک کاٹ دار نظر اس پر ڈال کر وہ اپنی فائلز سینٹ دروازے کی جانب بڑھ۔

”پھر کی، اور مز کرا سے دیکھا۔“ مجھ سے مخاطب ہونے کی کم سے کم کوشش کیا تھی۔ اور ہاں آئنیدہ اس کا نرٹریکٹ کو شادی مت کیے گا۔

اپ...“ سلکتی نظروں سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ ”آپ میرے شوہرنیں ہیں۔ صرف میرے باپ کے مقروض ہیں اور اپنا قرضہ اتار پہ ہیں۔“

فارس نے چہرہ موڑ لیا اور مگ سے گھونٹ بھرنے لگا۔ وہ راہداری عبور کر کے دروازہ تک آئی ہی تھی کہ وہ بجا۔ زمر نے اسے کھولا۔ وہ

میں بے اختیار اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ سامنے سے ہمی تو بہر گھڑا شخص نظر آیا اور اسے دیکھتے ہی فارس نے بے زاری سے چہرہ پھیر لیا۔

”گدھ مارنگ، ممزغازی!“ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہاشم نے مسکرا کر کہا تو زمر گھری سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ آفس کے لئے

لے کر رہا تھا۔ وجہہ اور ہشاش بنشش۔ چوکھت پر کھڑا تھا اور پر فیوم کی خوشبوائی کے اندر تک بھیل گئی تھی۔

”مارنگ، کاردار صاحب۔“ وہ جرم مسکراتی۔

”بہت خوشی ہوئی آپ کو اس.....“ ہاشم نے نگاہیں آگے پیچھے دوڑا کیں۔ ”..... گھر میں دیکھ کر آ رام سے ہیں آپ؟“

”مجھے بھی بہت خوشی ہوئی آپ کو اپنے ہمسائے میں دیکھ کر۔ امید ہے ملاقات ہوتی رہے گی۔ اب اگر آپ مجھے اجازت دیں

ا۔“ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ ”میری آج پیشی ہے اور مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”پہلے میری بات سن لیجھ۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آج رات آپ ڈنر ہمارے ساتھ کریں گے۔ تم نے سن لیا، فارس؟“ ساتھ

لے ہاندہ اور اسیں پکارا۔

میز پر موجود فارس نے اکتا کر سر جھکا۔ ”میں مصروف ہوں۔“

مگر ہاشم نے توجہ نہیں دی۔ ”مجھے منی جواب کی عادت نہیں ہے۔ ہم ڈنر پر آپ کا نظائر کریں گے۔ ٹھیک آٹھ بجے۔“ اپنی کلائی کی

لہاری کے ڈائل پانگلی سے دستک دے کر دکھایا۔ زمر نے گھری سانس لے کر سر کو خود دیا۔ ”شیور۔ ہم آئیں گے۔“ وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ

لے یا۔ اس کے نکلنے کے چند لمحے بعد زمر، پیچھے دیکھے بنا، بہر گلی۔ ہاشم کی کار درور جاری تھی۔

وہ انکیس کے برآمدے کے زینے اتری سبزہ زار پر آئی۔ وہاں فارس اور اس کی کاریں گھڑی تھیں۔ اپنی کار کا لاک ھولنے زمر نے

اپنی اٹھا کر ادھر ادھر سرسری ساد دیکھا۔ سامنے قصر کاردار کی عجی بالکونیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ایک بالکونی ہاشم کے کمرے کی تھی، اسے اندازہ

لہاں ہاتھ میں دوسری بالکونی تک گئیں؛ جس کے شیشے کے دروازے کے پیچھے کمرے میں کوئی گھڑا نظر آ رہا تھا۔ زمر

لے انکیس سکیڑ کر دیکھا۔ وہ تو نوشیر والوں تھا۔ اس کے ہاتھ میں سکریٹ تھا، جلوبوں لگائے ہوئے تھا۔ اس نے بھی غالباً زمر کو دیکھ لیا تھا، فوراً

سکریٹ والہ ہاتھ پیچھے کرتا مڑ گیا۔ زمر سر جھک کر کار میں بیٹھ گئی۔

❖❖❖

قبوں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتنا رو..... ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں!

وہ صح کافور کی مہک لئے، چھوٹے باعینچے والے گھر پر بھی ویسی ہی پر ملاں سی طلوع ہوئی تھی۔ ندرت کچن میں کھڑیں ناشتہ بنا رہی

ھیں۔ سعدی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ غالباً وہ تیار ہو رہا تھا۔

راہداری میں آگے جاؤ تو حنین اپنے کمرے کے بینڈ پر ٹک لگائے، بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ میں سفید جلد والی کتاب تھی جو کل رات

سے سامان میں دیکھ کر وہ اس سے پوچھ کر لے آئی تھی۔ زمر نے نہ وہ پڑھی تھی، نہ پڑھنی تھی۔ اب اس کے صفحوں کے کنارے ناخن سے

رُگْرُتی، وہ سوچے جا رہی تھی۔

”شکر ہے کل نکاح پڑھا شم بھائی نہیں تھے، ان کو دیکھتے ہی امتحانی مرکز والا واقعہ یاد آ جاتا، اور بھائی کے سامنے اپنا آپ بحرب لگتے۔“ وہ مدھم آواز میں بزبردی تھی۔ پھر اب تو فکر سے بھچنے۔ ”مگر بھائی کو بتاؤں یا نہیں؟“ الجھتے ہوئے اس نے سر جھکا۔ پھر زگا میں کتاب تک گئیں۔ تو تمام خیالوں کو ذہن سے ہٹاتے، اسے کھول لیا۔

وہ دروازہ سامنے تھا جو اسے صد یوں پہلے کے زرد زمانوں میں لے جایا کرتا تھا۔

اس نے اسے دھکیلا۔ اوپنچے پٹ وا ہوئے۔ دوسرا جانب چاند کی میٹھی روشنی میں ڈوبی رات تھی۔ ایک کھلا میدان اور سامنے... خین نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ ایک بلند مضبوط قلعہ جس کے آگے پھر بیدار چکر کاٹ رہے تھے۔

اس سارے سیاہ سفید مظفر نامے میں وہ ما تھے پہ کئے بالوں اور ہمیر بینڈ والی لڑکی گلابی قیص اور سفید تراہ زرز میں ملبوس، فریش سی نظر آتی تھی۔ مگر صد یوں پہلے کے لوگ اس کو دیکھنیں سکتے تھے۔

وہ آہنی گیٹ عبور کر کے کھلے ٹھن میں آئی۔ اسے پار کیا تو آگے برآمدہ تھا۔ وہ اندر چلتی آئی۔ اندر ہیرا بزہ گیا۔ مگر جیسے جیسے وہ قدم آگے بڑھاتی گئی، راہداری کی دیوار پر قطار میں نصب مشعل دان جلتے گئے۔ جیسے کوئی قدیم زمانوں کا جادو ہو۔

اندر ہیرا قدرے کم ہوا۔ وہ ایک کھڑکی کے سامنے جا رکی۔ اس کے دروازے پر زنجروں میں لپٹتے تھے مشعل دان کے پھر پھراتے زرد شعلوں میں دکھائی دیتے تھے۔ دیوار پر ایک اہمیتی ہوئی چوکی تھی۔ خین دیوار کو پکڑے اس چوکی پر کھڑی ہوئی تو پچھہ ایک سلاخ دار کھڑکی کے برابر آیا۔ بے چین نگاہوں سے سلاخیں پکڑے اس نے اندر جھانا کا اور پھر گہری سانس بھری۔

اس کے شیخ (استاد) سفید خستہ حال لباس میں اٹھے بال اور داڑھی کے ساتھ، چہرے اور ہاتھوں پر زخموں کے نشان لئے دیوار سے لگ کھڑے تھے۔ کھڑکی سے چند ہاتھ دائیں طرف۔

”اے شیخ۔ میں اتنے برسوں بعد آئی ہوں، اور آپ کو اس تید خانے میں بند دیکھتی ہوں۔ ایسا کیا کر دیا آپ نے؟ آپ کا خلینہ تو مسلمان ہے نا؟“ افسوس سے سر بلاتے اس نے سوال کیا۔

اندر دیوار سے لگے کھڑے شیخ معلم نے تکان مگر سکون سے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔

”شد الرجیل الی قبر انکلیل۔“ (سواری کا باندھنا، محبوب کی قبر تک جانے کے لئے)

”انہوں نے یہ کہا تو آپ نے کیا کہا؟“ اس نے تجب سے پوچھا۔

”بدعت! بدعت!“

”اُف!“ خین نے گھرے تاسف سے انہیں دیکھا۔ ”ہم سب کو معلوم ہے کہ یہ بدعت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت، کی نیت سے سواری باندھنا بدعت ہے، نیت مسجد بنوی علیہ السلام کی ہوئی چاہیے، تمہیک ہے بالکل تمہیک ہے۔ مگر شد الرجیل الی قبر انکلیل کا انکار آپ کو زندگا میں لے آیا، اے شیخ۔“ ملامتی نظرلوں سے وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ”مطلوب“ کیا ضرورت تھی اتنا کھلم کھلا اشینڈ لینے کی۔ اور ہاں فائدہ لیا ہوا اس اشینڈ کا؟ اب تو ایک دنیا جاتی ہے میں صرف روضہ مبارک کی نیت لے کر جایوں سے دعاوں کی پر چیاں تک پھیلتی رہیں عورتیں، اب قبر کی نیت اور مسجد کی نیت کا ز مین آسمان جتنا فرق کسی کو نہیں سمجھ آتا۔ مجھے بھی بھائی نے ایک زمانے میں بتایا تھا، اب تو بھول بھال گیا۔“

شیخ خاموشی سے کھڑے اپنے ہاتھوں کو دیکھے گئے۔ وہ سیاہ ہور ہے تھے۔ خین نے چہرہ مزید آگے کر کے اندر جھانا کا۔

”آپ کی کتابیں، قلم..... کیا سب چھین لئے انہوں نے؟ اُف.....“ کراہ کر اس نے آنکھیں پیچیں۔ ”تمہیک ہے، بندہ حق بات کہتا

بے نلام حکمران کے سامنے مگر یار اتنا بھی کیا کہ اس بات کے پیچھے ساری زندگی بر باد کر رہا تو آپ کی ادھوری رہ گئی۔ اب لکھیں گے یہ؟ آنکھیں کھول کر مزید برہمی سے ان کو دیکھا۔ وہ اپنے سیاہ تھوں کو دیکھ رہے تھے۔ حنہ ایک دم چوکی۔ فرش پر چند کو بلے رکھے تھے اور.... اس کی نظریں اوپر احتیٰ چل گئیں۔ دیواروں پر جا بجا کو بلے سے عبارتیں لکھی تھیں۔ آیات، احادیث، قرآن کی نشانیوں میں غور و فکر کرنے لئے اعد کے نکت..... دیوار میں بھری یڑی تھیں۔

”جب تک اللہ نہ چینے، کوئی نہیں چھین سکتا۔“ اس کو بالکل ساکت، متوجب پا کر وہ بولے تھے۔ خیں چپ سی ہو گئی۔ بتنے اعصاب قدم، ڈھلنے پڑے۔ جسم سے سرزی آئی۔

۔ پیر پاپلے پر پہنچا گیا۔ ”اوہ جب زندگی سب کچھ یہی نہ آجائے تو کیا کرنا چاہیے؟“ شاید پہلی دفعہ اس نے کوئی سوال پوچھا تھا۔

”دعا...“ وہ ملکا سا بولے۔

”دعا کیا کرتی ہے؟“ سلاخوں سے سر نکا کروہ ان کو دیکھتے کہیں اور گم تھی۔

”آنے والی مصیبت کو روکتی ہے۔ اور جو مصیبت اتر پچھلی، اس کو ہلکا کرتی ہے۔ یہ مومن کا ہتھیار ہے، دین کا ستون ہے، آسمانوں اور این کا نور ہے۔“

اُن کی آواز قید خانے کی اوئیجی دیپاروں سے نکلا کر ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

خینیں گم صمی کھڑی رہی۔ ہاتھ سلاخوں پر جنے رہے۔ پھر ماٹھے پر بل آئے۔ اکیسویں صدی کے دماغ نے بحث کے لئے نکتے

اٹھو

”آے کی مصیبتیں ملتی ہوں گی دعا وں سے۔ ہماری تو نہیں دور ہوتیں۔“

”دعا مصیت سے کمزور سے تو مصیت حاوی ہو جائے گی۔ دعا مضبوط ہے تو دعا حاوی ہو گی۔“

”اور اگر دونوں ہی ایک جتنی مضبوط ہوں؟ تو؟“ وہ ترنٹ بولی۔

”تو دعا قائم تک اس مصیبت سے لڑتی رہے گی۔“

”لیکن.. وہ جو کمک۔ اگر دعا چھوڑ دی، ماشدت کم کر دی تو مصیبت حاوی آجائے گی؟“

شیخ معلم نے اشتات میں سر ملا دیا۔ حسین کے لب اُوہ میں سکڑے۔ اپردا کھٹھے کر کے سوئنے والے انداز میں وہ ان کو دیکھے گئی۔

”اور کہا کرتی ہے دعا؟“

”دعا قدر و فضا کو رد کر سکتی ہے، و لے ہی جسے نیکی عمر بڑھاتی ہے اور گناہ رزق سے محروم کرتے ہیں۔“

”مگر...“ اس کی آنکھوں میں غیر آرام دہ سی لمحہن ابھری۔ اڑھیاں اٹھا کر وہ مزید اوپری ہوئی۔ ”میری تو دعائیں قبول نہیں

“ ”

قد یہ مقدمہ خا نز کا کوئی نسلیہ سے بچا ہو، وار سے نکل رکھے ہرگز نرس چھکائے، مسکرا کرنے میں گردن بلائی۔

”یہ شخص کو دعا قبول ہوتی ہے اگر وہ حلبہ باز کی آنکھ کرے تو۔“

”حلہ از کی مطلے ہے؟“

”مطلب... کہ تم کھنگلے کر میں نزدِ عاکِ اور بست دعا کو، مگر سردار دعا قبول ہوتی نہیں نظر آ رہی۔“ کہنے کے بعد تم لوگ

الله يحيى كمالاً كمالاً حمد و شكر

وہ جو اک بات تھی کے خان دانتوں سے کترتی، سختی حا رہی تھی۔ آخر میں یے اختصار اگھماں لبوں سے نکالیں۔ ”یعنی کہ جب یہ کہا تو

”دعا قبول نہیں ہوگی، لیکن اگر یہ نہ کہوں تو ہو جائے گی؟؟؟“

انہوں نے اثبات میں سر بلادیا۔ پچھے ہوا کے جھونکے سے مشعل داں کا شعلہ پھر پھڑایا۔ رات کی پراسراریت میں اضافہ ہوا۔

”اچھا مگر....“ اس کو پھر سے بے چینی ہوئی۔ ”کچھ لوگوں کی دعا بہت جلدی قبول ہو جاتی ہے۔ کیا اس لیے کہ وہ بہت نیک ہوتے ہیں؟؟“

”یہی ہوتا ہے، مگر...“ وہ لختے بھر کر کے حمہ نے ان کی آواز سننے کو مزید کان سلاخوں کے قریب کیا۔ ”مگر قبولیت دعا کا اصل راز دعا مانگنے والے کا طریقہ ہوتا ہے۔ وہ کیسے مانگتا ہے، اور کتنی شدت سے مانگتا ہے۔“

”اور اس کے بعد دعا کیں قبول ہو جاتی ہیں؟؟“

”ہاں سب کی سب دعا کیں قبول ہو جاتی ہیں۔“ انہوں نے اثبات میں سر بلادیا۔ خین نے گہری سانس کھینچ کر ما تھا سلاخوں سے نکا دیا۔ آنکھیں موند لیں۔

”میں دعا مانگتی ہوں کہ بھائی مجھے وہ امتحانی مرکز والا قصہ سننے کے بعد معاف کر دے اور مجھے سے ناراض نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سب کچھ ایک دم سے بالکل ٹھیک ہو جائے؟؟“ اس نے کتاب سے ما تھا اخایا تو صفحے کھلے پڑے تھے۔ قدیم زمانوں کی مشعلیں وقت کے پانیوں نے بجھادی تھیں اور وہ اپنے کرے میں بینڈ پہنچی تھی۔ کتاب بند کر کے اس نے دو پہ چہرے کے گرد لپٹا، اور دعا کے لئے ہاتھ اخایا دیے۔

باہر راہداری میں سعدی کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ باہر نکلا تو سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ گرے شرت پر سفید سیاہ ترچھی دھاروں کی نائی ہندھی تھی۔ بال اس نے فخر کے بعد جا کر کٹوائے تھے۔ اب سامنے سے جیل لگا کر پچھے کیے تو سیدھے لگتے۔ اگر مرتات تو پچھے ت گھنگری لے نظر آتے۔

ندرت چائے لے کر راہداری میں آئیں تو وہ گول میز کے سرے پر کرسی کھینچ رہا تھا۔

”آفس کے لئے دینیں ہو رہی تھیں؟؟“ حیرت سے پوچھتے انہوں نے مگ اسے تھایا۔

”نہیں، آفس نہیں جا رہا۔ کسی اور کام سے جا رہا ہوں۔“ وہ بنا عجلت کے آرام سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ ندرت نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے سوٹ کو دیکھا۔

”یہ اپنا سب سے اچھا سوٹ تو تم آفس بھی نہیں پہن کر جاتے۔ آج کیا خاص ہے؟؟“

سعدی نے کپ ہٹا کر سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔ ”میں نا جھاگ کرشادی کرنے جا رہا ہوں۔“

انہوں نے دھپ سے اس کے کندھے پر تھہر لگایا اور مصنوعی خفگی سے بڑوں تین پلٹ گئیں۔

وہ ناشتہ کر کے اخٹا اور ابھی راہداری کے سرے تک آیا ہی تھا کہ خین کمرے سے باہر نکلی۔ وہ چہرے کے گرد دو پہ لپٹے، مضطرب اور بے چین لگ رہی تھی۔

”تمہاری فخر کی اداں اس وقت ہوتی ہے؟؟“

”نہیں وہ....“ اس نے غور نہیں کیا۔ ”کیا ہم تھوڑی دیریات کر سکتے ہیں؟؟“

سعدی نے غور سے اسے دیکھا جو انگوٹھے سے درمیانی انگلی کا ناخن کھرپتھے ہوئے بول رہی تھی۔

”تم کافی دن سے کہہ رہی ہو کہ تمہیں بات کرنی ہے، پھر رک جاتی ہو۔“

خین کا گانٹھک ہونے لگا۔ کچھ کہنے کے لئے لب کھولے پھر بند کر دیے۔

”نمیں آپ جائیں اتنی خاص بات نہیں ہے۔ پھر کبھی سمجھی۔“ ارادہ بدلتا ہے۔

”شیور؟“ سعدی نے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ حسین نے اثبات میں سر بلاد لیا۔

وہ مسکرا یا اور خدا حافظ کہتا پلٹ گیا۔ دروازہ بند ہوا تو وہ دیس بے چین سی کھڑی سوچتی رہ گئی۔

❖❖❖

جہنم ہو کہ جنت، جو بھی ہو گا ..... یہ کیا کم ہے کہ ہمارا اور اس کا سامنا ہو گا!

وہ عمارت سڑک کنارے پوری آب و تاب سے کھڑی تھی۔ بالائی منزل کے کارزاں فسیں خنکی پھیلی تھی۔ چوڑی میز کے پیچھے پادر

یہ پہاڑیں لگائے بیخا، مسکراتے ہوئے کاغذات پلٹا جا رہا تھا۔ پھر چہرہ اٹھا کر سامنے کھڑے خاور کو دیکھا۔

”یہ بہت زبردست کام ہے خاور!“ ستائش سے فولڈ رمیز پڑا لئے، اس نے پیچھے کوئیک لگائی۔ کھڑکی کے پاس یعنی پہاڑوں پیشے

میں جواہرات نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

”اس کے خلاف ذرا سا کچھ رکاوٹی ہے کیا؟ وہ معلوم نہیں ہمارے خلاف کتنی فائلز اور شوت لے کر آئے گا۔“

”میم“ یقیناً اس نے بھی اب تک بہت کچھ نکال لیا ہو گا، مگر تم اس کے ہر دار کا توڑ کرنا جانتے ہیں۔“

وہ ناک سکوڑ کروالیں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سیاہ لبے گاؤں اور موتویوں کے آوزوں میں ملوس بھورے بال کندھے پہ آگے

لاؤ دھنا خوش اور مضطرب لگ رہی تھی۔

”آپ کیوں فکر کرتی ہیں میں؟ ہاشم سنہجات لے گا۔“ وہ مطمئن اور پرسکون تھا۔

اور ہاشم کی میز کے عین سامنے، دیوار سے لگے صوفوں میں سے ایک پہ براہماں نو شیر داں بالکل خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں ہلکی

کابی ہو رہی تھیں، اور وہ مسلسل کچھ سوچے جا رہا تھا۔۔۔

اس عمارت کی پیغمبنت میں میں اسی وقت سعدی اپنی کارپارک کر رہا تھا۔ پیغمبنت دو پھر کے باوجود اندر ہی پڑی تھی۔ کار روک کر وہ

پھر دیر خاموشی سے اسٹریٹنگ وہیں پہاڑھر کے بیٹھا رہا۔ اسے وہ فلیش ڈرائیور یاد آئی جس میں موجود فائلز وہ کھول نہیں سکتا تھا۔ اس کے پاس

ہاشم کے خلاف کچھ نہ تھا۔ سو اے ایک آخری پتے کے۔ اگر یہ دھمکی سے کھیل گیا تو... تو سب دھمکی ہو سکتا تھا۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ کھولا اور اپنا قرآن پین نکالا۔ چند منٹ دباۓ اور وہ ہیں سے تلاوت لگائی

جہاں سے اس روز چھوڑی تھی۔

سعد الغامدی کی پرسو ز آواز گاڑی کے اندر گو بنجئے گی۔ ”میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں وہ تکارے ہوئے شیطان سے!“ وہ خاموشی سے

خنے لگا۔

”اور آپ سکھائے جاتے ہیں قرآن بڑے حکمت والے بہت علم والے کی جانب سے۔“

سعدی کے لبوں پا داس مسکرا ہٹ پھیل گئی۔

”میں ابھی یہی سوچ رہا تھا اللہ تعالیٰ کہ میں قرآن میں کیا تلاش کر رہا ہوں اس وقت جب کہ مجھے اور پہاشم بھائی کے آفس میں

ہوں چاہیے؟ اور دیکھیں، مجھے جواب مل گیا۔ جب میں قرآن پنور کرتا ہوں تو گریں کھلنے لگتی ہیں۔ یہ قرآن مجھے اللہ کی طرف سے دیا جا رہا

ہے۔ اللہ جو نور ہے اور ساری روشنی اللہ آپ سے ہی ملتی ہے۔ مجھے اب سمجھ آیا کہ جوانز جی مجھے چاہیے جو کسی بھی موسیٰ کفرعون کے دربار میں

جانے کے لئے چاہیے ہوتی ہے وہ صرف قرآن دے سکتا ہے۔“ ہلکی مسکرا ہٹ کے ساتھ وہ زیر لب کہہ رہا تھا۔ قاری غامدی اُنلی آیت اسی مدھم

خوبصورت آواز میں پڑھ رہے تھے۔ ”جب موئی نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ.....“

وہ ایک دم چونکا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ (اوکے اللہ سیر نیسلی مجھے بھول گیا تھا تھا کہ آگے مویٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ویسے اللہ آپ ابھی مویٰ علیہ السلام کا ذکر کرنا کتنا پسند ہے۔ ہر چند آئیوں کے بعد پھر سے فرعون و مویٰ اور مویٰ فرعون۔ مطلب کبھی کبھی میں حیران ہو جاتا ہوں۔ قرآن میں اتنا ذکر کسی کا نہیں جتنا مویٰ کا! کیوں؟) اس نے بولا نہیں۔ صرف سوچا تھا۔ آیت کاماعتوں میں گونج رہی تھی۔

”اور جب مویٰ نے کہا اپنے گھروالوں سے کہ میں نے دیکھی ہے ایک آگ۔“

میں ابھی وہاں سے آپ کے لئے کوئی خبر لاتا ہوں  
یا لے کر آتا ہوں کوئی سلسلتا ہوا انکارہ  
تاکہ آپ اسے سینکھیں۔“

ذراد یک وقفہ آیا تو سعدی نے گھر انس لیا۔

”آہ مویٰ۔“ اس نے سیٹ کی پشت سے سرٹکا کر انکھیں بند کر لیں۔ بلکی آواز میں ساتھ ساتھ بڑ بڑا تار ہا۔ ”تو اللہ تعالیٰ، آپ نے سورۃ نعل کی تہبیدی آیات کے بعد پہلے قصے کا آغاز ہی مویٰ علیہ السلام کی ”فیملی“ سے کیا۔ مجھے اسی لئے یہ سورۃ بہت اچھی لگتی ہے اللہ تعالیٰ کیونکہ یہ فیملی و بیلووز کی سورۃ ہے۔ دیکھیں نا، مویٰ علیہ السلام نے جوبات کبی اس میں ”آپ“ کا صینہ استعمال کیا۔ حالانکہ اس وقت ان سے ساتھ صرف ان کی اہمیت تھیں بے شک وہ امید سے تھیں، مگر سامنے تو صرف وہی تھیں نا ان کے۔ پھر بھی مویٰ علیہ السلام نے ان کو آپ کہا۔ پکارا۔ جمع تعظیم کا صینہ۔ ہمارے انبیاء جو ہمارے باپ تھے کتنے میز ز تھے نا ان میں۔ کتنے نرم اور خوبصورت لوگ تھے وہ۔ کوئی حیرت نہیں مجھے کہ آپ اللہ تعالیٰ قرآن میں ہر چند صفحات بعد مویٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں۔ کتنی پرواہ کتنا خیال تھا ان کے انداز میں اپنے خاندان کے لئے۔ پھر ہم اپنے گھروالوں کے لیے اتنے زم کیوں ہیں بن سکتے؟“

کار میں خاموشی چھاگئی۔ پھر وہی پر سوز آواز ابھرنے لگی۔

”پھر جب مویٰ وہاں (اس آگ کے قریب) آئے،

تو ان کو آواز آئی کہ

بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے

اور جو اس کے آس پاس ہے۔

اور پاک ہے اللہ

وجود و نوں جہانوں کا رب ہے۔“

سعدی نے پاز کے بٹن کو دبایا، بند آنکھوں کے ساتھ چند لمحے لیے ان الفاظ کو اندر جذب کرنے کے لیے۔

”اللہ مجھے نہیں پیتا کہ آپ کی آواز سننا کیسا ہوگا، مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ جب میں قرآن سنتا ہوں، تو میرے لیے وہی آپ کی آواز ہوتی ہے، اور یہ الفاظ بعض دفعہ میری استطاعت سے زیادہ وزنی بن کر میرے دل پر اترتے ہیں۔ میرے لیے یہ قرآن اور اس سے جڑی ہے شے بابرکت ہے، کیونکہ یہ قرآن مجھے بتاتا ہے کہ اللہ کون ہے۔“ وہ ٹھپرا۔ بند آنکھوں سے تکان بھرے الفاظ ادا کرتے آواز بلکی ہو گئی۔

”اللہ میرا رب ہے، اور میرے ابو نے مجھے بتایا تھا کہ رب کے کہتے ہیں۔ وہ جس نے ہمیں بنایا ہے، وہ جس کا ہمارے اوپر سب سے زیادہ حق ہے، اور وہ جو ہمارے لیے سارے فیصلے کرتا ہے۔ خالق، مالک، مدبرا!“

انگوٹھے کو اس بٹن پر رکھ کر دبایا تو آیات کا سلسلہ جزا۔

”اے مویٰ“

بے شک وہ میں ہوں اللہ۔

غالب، حکمت والا۔

اور پھینک دو اپنی لاخی کو۔

توجب اس (مویٰ) نے دیکھا کہ وہ (لاخی) حرکت کرتی ہے

گویا کہ ہو کوئی سانپ

تو پیچھے پھیر کر بھاگا

اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

(توفیما یا اللہ نے) اے مویٰ۔

ڈروہنیں۔

بے شک میرے پاس پغیر بڑا رہنیں کرتے۔“

سعدی آنکھیں بند کیے، سیٹ سے سر نکالے بیٹھا رہا۔ بیوی کی مسکراہٹ میں ادا سیاں گھلتی گئیں۔ ”پغیر بڑا کون ہوتا ہے اللہ؟ وہ جو اچھائی کا حکم دے اور برائی سے رو کے۔ آپ سارے پیامبروں کے ساتھ ایسے ہی کرتے ہیں نا۔ ان کو اندر ہیرے میں روشنی کی جھلک دکھاتے ہیں، اور جب اس نور کا پیچھا کرتے وہ اس تک آپنکچھے ہیں تو آپ ان کو بتاتے ہیں کہ اللہ کون ہے۔ پھر آپ ان کو کہتے ہیں کہ اپنا عصا سامنے ڈال دو۔ یہاں تو آپ نے ”عصا“ کا لفظ استعمال کیا مگر اپنے اسی قرآن میں ایک اور جگہ آپ نے موٹی سے یہ فرمایا کہ ”ڈال دو وہ جو تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے۔“ توبات یہ ہے اللہ، کہ سب کے دائیں ہاتھ میں عصا نہیں ہوتا۔ دائیں ہاتھ میں انسان کا میانٹ ہوتا ہے، کوئی ہنر۔ یا کوئی قیمتی چیز۔ تو اللہ جب آپ کا پیامبر اپنا عصا پھینک دیتا ہے تو اس کا نتیجہ ایک دم سے اتنا خوفناک اتنا ڈر اتنا اور پر ہیبت ہوتا ہے کہ انسان مڑ کر بھاگے نہ تو کیا کرے؟ فرعون کے ساحر جو بھی گھڑا میں میرے دائیں ہاتھ کی چیز اس کو نگل لے گی، میں جانتا ہوں، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ کے پاس اس کے پیامبر بڑا رہنیں کرتے، نہ اپنے ماضی سے نہ اپنے مستقبل سے، مگر مجھے فرعونوں کے پاس ”ڈرنے“ سے ڈر لگتا ہے۔ اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا، گویا پھر سے ہلاک ہونے کے لیے۔ پین قرآن آف کر کے ڈیش بورڈ میں رکھا۔ کار بند کی۔ چابی، موبائل، والٹ سنجلاتا بہر نکل آیا۔

مطلوبہ فلور پہ جب لفت کے دروازے واہوئے تو سامنے واک تھر و گیٹ تھا۔ وہ اس سے گزرنے کی بجائے ایک طرف سے نکل کر آگے چلتا آیا۔ کسی نے نہیں روکا۔ جب ہاشم کے آفس کے سامنے آیا تو کام کرتی حليمہ کے اس طرف سیاہ کوٹ میں ملبوس خادر مستعد کھڑا تھا۔ ”کاردار صاحب آپ کے منتظر ہیں۔“ سعدی اس بات پر آگے بڑھنے لگا تو خاور نے ہاتھ راہ میں حائل کر کے اسے روکا۔ سعدی نے گہری سانس لی۔

”میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ چاہیں تو تلاش لے لیں۔“ مسکرا کر وہ بولا۔ خاور نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کے لباس کو تھپتھیا۔ سیل فون نکال کر حليمہ کی میز کی ٹوکری میں ڈالا۔ اور پھر مطمئن ہو کر پیچھے ہٹا۔ سعدی نے کوٹ کا بٹن بند کیا۔ اوپر جیب میں لگا سلوٹ پین درست کیا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا!

میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

اندر آفس میں ایک طرف صوفے پر نو شیر وال بیخا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ماتھے پر بل پڑ گئے۔ سامنے مرزا زی میز کے پیچے باشم نیک لگائے۔

برا جہاں تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرا یا۔ جواہرات جواب باشم کی کرسی کی پشت پر کہنی نکالے کھڑی تھی، وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

”آؤ سعدی!“ باشم زی سے کہتے جگہ سے اٹھا اور باتھ بڑھا یا۔ سعدی آگے آیا تھا ملا لیا اور پھر سامنے کری سمجھنے کری سمجھنے کری سمجھنے کری سمجھنے کری سمجھنے۔ وہ بخیدہ نظر آ رہا تھا۔

”کیا لوگے؟ چائے؟ سافٹ ڈرنک؟“ انٹر کام اٹھائے ہوئے اس نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”کافی!“ وہ بس اتنا بولا۔ باشم نے اثبات میں سر ہلایا اور رسیور کان سے لگا کر کہا۔ ”حیمہ دو چائے اندر بھیجو۔“ پھر رسیور کا گر بلکے چکلے انداز میں اسے نوکا۔ ”تنی گرمی میں کافی نہیں پینی چاہیے تمہیں۔“

سعدی گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ (اسے باشم سے اور کس بات کی موقع تھی؟) اور پھر جیب سے پلا سٹک زپ لا ک بیگ میں مقید نیکلیں نکال کر میز پر رکھا۔

”آپ کی امانت جو غلطی سے آپ کی ملازمت نے میری جیب میں ڈال دی تھی۔“

نیکلیں میز پر پڑا رہا۔ کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔ وہ سعدی کو دیکھ رہے تھے۔

”تم کیا کہنا چاہتے تھے سعدی؟“ باشم نے اسی مسکراہٹ سے اسے دیکھتے بات کا آغاز کیا۔ سعدی نے گردن موڑ کر پیچے باتھ باندھے کھڑے خاور کو دیکھا اور پھر باشم کے ساتھ کھڑی جواہرات کو۔

”خاور ہمارا اپنابندہ ہے، اس کی موجودگی میں بات کرو۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”آئی سی!“ سعدی نے سرا اثبات میں بلا یا البتہ اندر سے کچھ نہ تھا۔ (تو کیا جواہرات بھی.....؟) بہت کچھ بھجھ میں آیا۔ پھر ذرا سا کھنکار اور باشم کی آنکھوں پر نگاہیں جھائے بولا۔

”ہم جس دین کے مانے والے ہیں باشم بھائی، اس میں مختلف مسئلتوں کے لئے مختلف اسکولز آف تھاٹ ہوتے ہیں۔ قتل کے مسئلے پر بھی دو آراء ہیں۔ (باشم اسی طرح مسکرا کر اسے دیکھتا رہا) پہلے مسلک کا کہنا ہے کہ سچے دل سے تو بہ کی جائے یادیت دی جائے تو قتل معاف ہو جایا کرتا ہے، وہ حدیث میں مردوں اس واقعے کو دلیل بناتے ہیں جس میں نبی اسرائیل کے ایک عالم کے پاس ایک ایسا شخص آیا جس نے ننانوے قتل کیے تھے۔ اس نے قتل کی معافی کا پوچھا اور منفی جواب ملنے پر اس عالم کو بھی قتل کر دیا۔ ایک اور عالم کے پاس گیا تو معافی کی امیدیں گئی۔ بہر حال واقعہ آپ کو معلوم ہو گا۔“ وہ سانس لینے کو رکا۔ جواہرات اور باشم کی مسکراہٹوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ پیچے بیخا نو شیر وال جو بیباں سے سعدی کی پشت دیکھ سکتا تھا، بے حد رُزو اسامنہ بنائے بیخا تھا۔ حیمہ اندر آئی اور چائے رکھ کر باہر چلی گئی تو وہ پھر سے کہنے لگا۔

”دوسر اسلک کہتا ہے کہ نہیں، قتل کی کوئی معافی نہیں۔ اگر آپ کو قتل کی سزا یعنی سزاۓ موت دنیا میں نہیں دی گئی تو پھر دیت یا تو اپنے امید تو کی جا سکتی ہے کہ یا آپ کو معاف کروادیں گے مگر اصل فیصلہ قیامت کے دن ہو گا جب اللہ مقتول کے باتھ میں قاتل کا سردے کر کہنے گا کہ اپنابدلہ لے۔ یہ دوسرا اسلک کہتا ہے کہ قرآن میں جب اللہ کسی گناہ کا ذکر کرتا ہے اور اس کے عذاب کا، تو آخر میں یہ فرمادیتا ہے کہ وہ لوگ عذاب میں رہیں گے، سوائے ان کے جنہوں نے تو بہ کی اور اچھے عمل کیے وغیرہ وغیرہ۔ مگر قتل کی آیات کے آخر میں سخت عذاب کی دعیہ شانے کے بعد اللہ نے نہیں کہا، سوائے اس کے اور اس کے۔ نہیں۔ اللہ نے قاتلوں کے لئے وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے، کہہ کر بات ختم کر دی۔ اب بہت سے مسلمان ایک عقیدہ رکھتے ہیں، اور بہت سے دوسرا۔ میں بھی اسی دوسرا مسلک سے تعلق رکھتا ہوں جو کہتا ہے کہ قتل کی کوئی معافی نہیں۔ جان لی ہے تو جان دیتی پڑے گی۔ کیونکہ ہر انسان اپنے بھائی کی جان کا رکھووالا ہوتا ہے۔ ایک قتل اس سے جڑے تمام انسانوں کا

کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھو لا؟

قتل ہوتا ہے۔ ایک قتل..... صرف ایک بے گناہ مسلمان کا قتل ہاشم بھائی کعبہ کوڈھادینے سے بڑا گناہ ہے۔ اور آپ نے تو میرے خاندان کے دلوگ مار دیے۔ اس کی آواز بلند ہوئی اور قدرے کلپائی۔ آنکھوں میں دکھ اور صدمہ اترنے لگا۔

انتہے سال بعد پہلی دفعہ ہاشم کے منہ پر وہ بول دیا جو ابھی تک دل میں چھپا کر رکھتا تھا۔ چند لمحے آفس میں خاموشی چھائی رہی۔ اے سی کی محفل ک، جنم کی پیش میں بد لے لگی۔ پھر ہاشم نے اسی زمی سے اسے دیکھتے پوچھا۔

”اور کیا شہوت ہے تمہارے پاس کہ یہ سب میں نے کیا ہے؟“

”صرف میرے دل کی گواہی۔ اور پچھنئیں۔“

ہاشم اور خاور نے چونک کر اسے دیکھا۔ (اب وہ کھڑکی کے ساتھ جا کھڑا ہوا تھا جہاں سے وہ سعدی کو سامنے دیکھ سکتا تھا)۔ جواہرات ہاشم کی کرسی پر نکالی کہنی بٹا کر سیدھی کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں اچنچھا آیا۔

”تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں؟“ ہاشم کو حیرت ہوئی۔

”نہیں۔ میں نے آپ کی فائزہ چراہی تھیں اس رات پارٹی میں۔ مگر میں انہیں کھول نہیں پایا۔ وہ کر پٹ ہو گئیں۔ وہ میری قابلیت سے اور پر کی چیز تھی۔“

(خاور کی گردن قدرے فخر سے مزید تی۔) ”میں نے ڈیڑھ سال کو شش کی کہ کوئی ثبوت ڈھونڈ لون، مگر مجھے اعزاز کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ لوگوں نے بہت پاک کام کیا ہے۔“ قدرے تکان اور ستائش سے اس نے خاور کو دیکھا۔

”ڈیڑھ سال؟“ ہاشم نے سوالیہ ابر و اٹھائی۔

”آپ نے زرتا شدہ اور وارث غازی کو قتل کر دیا۔ میں ڈیڑھ سال سے جانتا ہوں۔ آپ کے بھائی کی مہربانی سے....“ عقب میں بیٹھے شیرودی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے ایک رات آپ کے گھر گزاری۔ آپ کا سیف جو آپ کی تاریخ پیدائش سے کھلتا ہے اس میں وارث ماموں کی بچپوں کی تصویر تھی۔ میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور میں جان گیا کہ یہ سب آپ نے کروایا ہے۔“

شیرود کا چہرہ یوں ہو گیا گویا کسی نرک نے پکل دیا ہو۔ ہاشم کی مسکراہٹ جاتی رہی۔ اس نے بس ایک سخت ملامتی نظر نو شیرود اپنے ڈالی اور پھر سعدی کی جانب متوجہ ہوا۔

”اور اپنی اس تھیوری کے بارے میں تم نے اور کس کس کو بتایا ہے؟“

”کسی کو بھی نہیں، کیونکہ آپ تو ایک واثق کا لرکر مغلل ہیں، کوئی کیسے یقین کرے گا کہ آپ یہ سب کرو سکتے ہیں۔“

ہاشم نیک چھوڑ کر آگے کو ہو بیٹھا۔ سوچتے، الجھتے انداز میں اسے دیکھا۔ ”اور تمہارے پاس یہ ثابت کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے؟“

”نہیں، مگر مجھے کسی ثبوت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں یہاں آپ کو پولیس کے حوالے کرنے نہیں آیا۔ میں آپ کو اپنے خاندان کے حوالے کرنے آیا ہوں۔“

”مطلوب؟“ جواہرات اچنچھے سے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

”میں یہاں آپ کو یہ کہنے آیا ہوں ہاشم بھائی کہ آپ سچائی کا خود اعتراف کر لیں۔ میرے خاندان کے سامنے جا کر اعتراف جرم کر لیں۔ یوں فارس غازی بری ہو جائے گا، ہر اڑام سے۔ آپ سارہ خالہ سے معافی مانگیں۔ اور ان کے باپ کی دیت کی رقم ان کی بچپوں کو ادا کر دیں۔ ہم آپ کے خلاف پولیس میں نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو معاف کر دیں گے۔“

اور ہاشم کو پہلی دفعہ لگا، وہ سو نیا کی پارٹی سے لے کر ب تک جو ”سعدی، سعدی“ ذرا مے سے پریشان ہوا، وہ سب بے کار رکھا۔ یہ تو

ایک بے دوقوف، گھاڑا اور معموم سا بچھ تھا۔ بلکہ یہ تو پورے کا پورا گدھ تھا۔

اور یہ سوچ کروہ زور سے نہ دیا۔ جواہرات بھی قدرے سکون سے مسکرائی۔ ہنستے ہنستے ہاشم نے چائے کا کپ ہوننوں سے لگایا۔ گھونٹ بھرا اور پھر اسے ہٹایا۔

”مجھے یہ کہنے دو سعدی، کہ آج تم نے مجھے واقعی ما یوس کیا ہے۔ میں ایک سوٹ ایک ہی دفعہ پہنچا کرتا ہوں، تم نے میرے اس سوٹ کا فرست دیئے ضائع کر دیا۔“

”جی؟“ وہ ابھیں بھرے انداز میں ہاشم کو دیکھنے لگا۔ ”کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے یہ قتل نہیں کیے؟ او کہ آن ہاشم بھائی، ہم دونوں جانتے ہیں کہ یہ آپ نے کیا ہے۔“

”میں نے انکار نہیں کیا!“ ہاشم نے تازہ دم مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ میں نے کیا ہے، وارث میرے راستے میں آرہا تھا۔ میں نے اسے مر دادیا۔ خاور نے اسے خود کشی کار بگ دیا۔ مگر یہ کافی نہیں تھا۔ اس کا قتل کوراپ کرنے کے لئے ہمیں زرتابش کی قربانی بھی دینی پڑی۔ زمر کو بھی زخمی کرنا پڑا، جس کے لئے مجھے بہت افسوس ہے۔ ہاں ٹھیک ہے سعدی یہ سب ہم نے ہی کیا ہے۔ مگر خاور اور میں نے۔“ سعدی کی دکھ بھری لگا ہیں ہاشم کی کری کے ساتھ کھڑی جواہرات تک لگئیں۔ پھر وہاں سے کھڑکی کے آگے کھڑے خاور تک جا پھسلیں۔ تو یہ سب ساتھ تھے؟ شروع دن سے؟

”مگر تم سعدی، تم نے تو آج مجھے سخت ما یوس کیا ہے۔ میرا خیال تھا، تم بیوت کا کوئی انبار لے کر آؤ گے میرے پاس۔ مگر تم... تم تو وہی معموم بچے ہو جس سے میں سات سال پہلے ملا تھا۔ تم کس دنیا میں رہتے ہو؟“ اب کے ہاشم کو افسوس ہونے لگا۔ آگے ہو کر، ہتھیلیاں باہم ملائے، وہ برہمی سے کہنے لگا۔ ”تمہیں کیا لگا تھا، یہ قتل کی لمبی سی تقریر یاد کر کے میرے سامنے ڈھراو گے اور میں فوراً جا کر تمہارے خاندان کے پیروں میں گرجاؤں گا اور ان کی متنیں کروں گا کہ وہ مجھے معاف کر دیں؟ مطلب، تم نے یہ سوچا بھی کیے؟“ غصے اور افسوس سے زیادہ حرمت شدید تھی۔

”تو کیا آپ اب بھی معاف نہیں مانگیں گے؟ کیا آپ اتنے گلٹ کے ساتھ رہ لیں گے؟“ سعدی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”تم اپناد ماغ کہاں چھوڑ کر آئے ہو سعدی؟ تمہیں واقعی لگا تھا کہ ہاشم تمہارے کہنے پر یہ کر لے گا؟ اف!“ جواہرات کو اس کی بات نا گوارگز رہتی تھی۔

”اوہ آپ سارہ خالہ کو دو دیت بھی ادا نہیں کریں گے؟“

”توبات آخر میں پیسے پا آگئی ہے؟“ نائی کی ناث ڈھیلی کرتے ہاشم نے بیک لگائی۔ ”میں ایک پھونٹ کوڑی بھی نہیں دوں گا، کیا کر لو گے تم؟“

”میں.... وہ شدید دکھ کے عالم میں باری باری ان سب کے چہرے دیکھنے لگا۔“ میں زمر اور فارس ماموں کو بتا دوں گا، مجھ پر کریں گے سب لیتیں!“ مگر خاور کچھ غیر آرام دہ سا سعدی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس غصے میں کچھ بناوٹ لگتی یا شاید اس کا وہم تھا۔

”کم از کم زمر تو تمہارا لقین نہیں کرے گی۔“ جواہرات نے ناک سکوڑ کر کہا۔ ”اس کے دل میں فارس کی نفرت اتنی پختہ ہے کہ وہ اپنی زندگی فارس سے انتقام کے لئے داؤ پلا چکی ہے، تو وہ کیسے مانے گی تمہاری بات؟“

”انہوں نے کسی انتقام کے لئے یہ شادی نہیں کی۔“ وہ ایک دم کھڑا ہوا۔ کان سرخ ہوئے آنکھوں میں غصہ اتر۔ ”وہ فارس غازی کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا میں گی۔ جس مقصد کے لئے آپ ان کی شادی پر اتنا زور دے رہی تھیں وہ کبھی پورا نہیں ہو گا۔“

”تمہیں اپنے خاندان کے بارے میں اپنی معلومات اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے سعدی!“

”میں زمر کو ساری حقیقت بتا دوں گا۔“

”تم ایسا نہیں کرو گے۔“ ہاشم کا انداز ٹھنڈا تھا۔

”کیوں؟ کیا مجھے بھی مار دیں گے آپ؟“ دکھ سے اس نے ہاشم کو دیکھا۔

”اوہ ہوں۔“ ہاشم نے گردن دا میں سے با میں ہلائی۔ ”میں بس یہ فائل دے دوں گا۔ اعلیٰ عدالتی اور پولیس حکام کو۔ پراسکیوشن اُں کو۔ میڈیا کو۔“ ایک فائل اس کے سامنے ڈالی۔ سعدی نے مشتبہ نظر دوں سے اس کو دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”تمہارا اعمال نامہ۔ جو مجھے ڈھونڈنے میں دو دن لگے۔ تمہارے خیال میں مزید چیزیں ڈھونڈنے میں پولیس کو کتنا وقت لگا گا؟“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو میں ڈرجاؤں۔“

”کیا تم نے جج کو بیک میل نہیں کیا؟ اس فائل میں تمہارے اور جسٹس سکندر کے درمیان تبادلہ کی گئی ای میلز اور نیکست میسچر کا یاد رہے۔ جو ہمیں خود جسٹس صاحب نے مہیا کیا ہے۔ بے شک تمہارا نمبر پر ایویٹ ہے، اور ای میل ان جانا، لیکن جسٹس صاحب کا نمبر تو اصلی ہے۔ جیسے ہی میں نے یہ فائل پر اسکیوشن آفس بھجوائی، فارس غازی پھر سے گرفتار ہو جائے گا۔ اور اس دفعتم بھی ساتھ ہی میل جاؤ گے۔“  
تمہارا خاندان تمہیں کھو دے گا سعدی!

سعدی نے گہری سانس لی۔ کرسی کھینچی۔ واپس ناٹک پٹا نگ رکھ کر دیکھا۔ سنجیدگی سے ہاشم کو دیکھا۔

”اور اگر میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں تو...؟“

اب کے ہاشم کھل کر مسکرا یا۔ جواہرات نے بھی مطمئن ہی سانس خارج کی۔ نوشیر وال ہنوز خاموش تھا، اور خاور.... وہ اب بھی غیر آرام دہ سا کھڑا تھا۔ کچھ تھا جو اسے ڈسٹرబ کر رہا تھا۔ کچھ غلط تھا۔

”میرا خیال ہے ہم ایک معابرے کو پہنچ سکتے ہیں۔“

ہاشم نے کڑوی چائے کا کپ اٹھایا، گھونٹ بھرا اور پھر اسے ہاتھ میں پکڑے کہنے لگا۔

”پاکستان میں ایک انسان کی دیت کتنی ہے؟ یہی کوئی تیس اکٹیس لاکھ روپے۔ میں تمہیں تیس کروڑ دوں گا۔ دیکھو یہ رشوت نہیں ہے، دیت ہے۔ تمہارا حق ہے کہ تم اپنے ماموں کی دیت لو۔ میں تمہیں خرید نہیں رہا۔ کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے، جو بھی میں نے کیا۔ وہ نملٹ تھا۔ آئی ایک سوری فارڈیٹ!“ افسوس سے سر بلاتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی۔ ”لیکن میں بھی تو خوش نہیں ہوں اس کے بعد دیکھو میرا باپ بھی مر ہی گیا، بے شک قدرتی موت تھی، مگر میں نے کسی کو ہونے کا غم اٹھایا۔ (جواہرات کی گردن میں گلٹی ہی ڈوب کر ابھری) میری شادی ٹوٹ گئی۔ میری بچی ڈسٹرబ ہو کر رہ گئی۔ مجھے دوبارہ گھر بنانے کی تمنا ہی نہیں رہی۔ اب میں صرف کام پر دھیان دیتا ہوں۔ میں نے بھی بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میں اپنی سزا کاٹ رہا ہوں۔ اب تم مجھے مزید کیا سزا دینا چاہتے ہو؟ دیکھو بچے، اگر تم آنکھ کے بد لے آنکھ ماگو گے، تو ساری دنیا اندھی ہو جائے گی۔ تم معاف کرنا سیکھو، در گزر کرو اور آگے بڑھ جاؤ۔ تیس کروڑ لاپتی فیملی کو باہر سیٹل کرو، میں تمہیں امر یکہ میں کسی بہترین کمپنی میں جا ب دلوادوں گا، میرا وعدہ ہے! ایا چاہو تو ہم مل کر نوشیر وال کی کمپنی چلا سکتے ہیں۔ تم پچاس فیصد کے پارٹنر ہو گے۔ جو تم تھر کوں میں کر رہے ہو، وہی پر ایوٹ سیکٹر میں کرو۔ تم سائنسدان لوگ سرکاری اداروں میں صرف ضائع ہو جاتے ہو۔ میرے پاس آؤ، میرے ساتھ کام کرو۔“ بہت سکون، نرمی اور امید سے ہاشم نے کہا۔ سعدی ہلکی سکراہت سے اسے دیکھے گیا۔

”تیس کروڑ دیں گے آپ مجھے؟ میرے خاندان کے ایک مرد کے بد لے میں؟“

کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھو والا؟

”ہوں۔“ باشم نے سرا ثبات میں بلایا۔ سعدی آگے کو جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں آپ کو ساخت کر دوں گا، مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے اس آدھے مرد جتنے بھائی کا گلا گھونٹ کر اسے پلچھے سے لٹکا دوں اور ہبھوں کے یہ خود کشی ہے۔ منظر ہے؟“ کمرے کا درجہ حرارت بدل گیا۔ نوشیروان کے بدن میں شرارے دوزے وہ بھڑک کر کھڑا ہوا (آدھا مرد؟) کہ باشم نے باخدا خدا کرائے تھم جانے کا اشارہ کیا۔ اور خود سعدی کی طرف دیکھا تو چھرے پر بے پناہ تھی تھی۔

”میرے بھائی سے تمہارا خاندان مقابله نہیں کر سکتا، اس لئے کوشش بھی مت کرو۔“ برہمی سے چبا چبا کر وہ بولا۔

ساتھ کھڑی جواہرات بھی آنکھوں میں پیش لئے سعدی کو گھور رہی تھی۔ ”تم اپنی بات کرو۔ کیا لوگے اپنا منہ بند رکھنے کے لئے؟“

”منہ بند نہیں رکھوں گا۔ آج ہی جا کر سب کو سچائی بتا دوں گا۔ جرم کیا ہے تو بھگتا پڑے گا باشم بھائی!“ وہ بھی اتنی ہی تختی سے بولا تھا۔ باشم تاسف سے اسے دیکھ گیا۔

”کیا تم وہی نہیں ہو جس کو ہمیشہ میں نے فیملی کی طرح تریث کیا؟ کیا تم وہی نہیں ہو جو خود بھی ایک بچہ کو بلیک میل کرنے کا جرم کر پکھے ہو؟“

سعدی ایک دم نہیں دیا۔ باشم بھی تختی سے مسکرایا۔

”اس میں مراجید کی بات تھی؟“

”پکھنیں۔“ اس نے مسکراہت دباتے سر جھکا۔ ”ایک کتاب میں فخر میں روز پڑھتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں اس میں پرانی کہانیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے مگر میں آپ کو بتاؤں، اس کی پرانی کہانیوں میں بہت پچھے ہے۔ اسی میں ایک کہانی میں ایک چرواہے کی بھی ہے، کسی زمانے میں اس چرواہے کو ایک بادشاہ نے ایڈا پٹ کیا تھا، مگر جب برسوں بعد خدا نے اس کو اسی محل کے دربار میں کلمہ حق کہنے بھیجا، تو بادشاہ وقت نے کہا۔ آپ وہی نہیں ہیں مولیٰ جو ایک قتل کر کے یہاں سے بھاگ گئے تھے؟ تو مجھے صرف قدرت کی حس مزاح پکھی آئی۔“

”یہ بہت دلچسپ لمحہ نہ ہے مگر میرے پاس وقت کم ہے۔“ اس نے کلامی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے بات کافی۔ ”تمہیں میرے پیسے رکھ لینے چاہیے تھے مگر تم نے نہیں رکھے۔ تھماری مرضی۔ اب سنو۔ اگر...“ سعدی کی آنکھوں میں دیکھتے اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی ٹھیکی در آئی۔ ”اگر تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو میں تمہاری فالک آگے کر دوں گا۔ پوری دنیا جان جائے گی کہ تم اور فارس فرزاڈ ہو اور یہ کہ تمہاری بہن نے کس طرح بورڈا گیزار میں چینگ کی ہے۔ تم تینوں رات تک تھانے میں بند ہو گے۔“

اور سعدی یوسف کو لگا، ساری کائنات تھم گئی ہے۔ یہ ناممکن... ناممکن... ناممکن تھا کہ باشم یہ بات جانتا ہو۔ وہ ایک دم انٹھ کھڑا ہوا۔

”میری بہن کے بارے میں بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی محنت سے بورڈ تاپ کرتی رہی ہے۔“ غصے سے وہ غرایا تھا۔

”ہمیشہ کا تو نہیں پتہ گکر دیتے پہلے اپنے آخری پیپر میں جب وہ چینگ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی اور اس نے مجھے وہاں بلا یا تھا تو...“ باشم سرسری انداز میں کہتے اس کے تاثرات دیکھ کر کا چھرے پر ایک دم حیرانی لے آیا۔ ”اوہ... اس نے تمہیں نہیں بتایا؟“

سعدی کی آنکھیں غصے اور اچھبھے سے سکریں۔ ”کیا کہانیاں سنارہے ہیں آپ مجھے؟“

”سعدی!“ جواہرات نے مسکراتے ہوئے اسے پکارا۔ ”تمہاری بہن دوستی قبلِ سونی کی پارٹی کی صبح اپنے پیپر کے دوران چینگ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی اور اس نے باشم کو مدد کے لئے بلا یا تھا۔ تمہیں تو باشم کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔“ سعدی کا غصہ بے یقین میں بدلتا گیا۔ اس نے باری باری ان سب کے چھرے دیکھے۔ ”مجھے آپ کی کسی بات پر یقین نہیں ہے۔“ باشم نے جواب دینے کی بجائے ایک نمبر ملا کر اسپیکر آن کیا اور موبائل کو ہاتھ میں گھما تے سعدی کو مسکرا کر دیکھتے دوسرا جانب

”بھی السلام علیکم کاردار صاحب۔“ فون جلد ہی انھالیا گیا۔

”ولیکم السلام خوب ج صاحب۔ کیسے مراجیں۔“ وہ کہہ فون پر باتھا اور دیکھ سعدی کو رہا تھا۔ سعدی خاموش تھا، چبھتی، مشتبہ گاہیں اُم پنی تھیں۔

”اللہ کا کرم ہے۔ آپ سنائیے؟“

”میں نے اس بچی کے سلسلے میں فون کیا تھا۔ یاد ہے آپ کو آپ کے کانج میں بی اے کے الگزام میں جو بچی جینگ کرتی پکڑی گئی تھی اور اس نے مجھے بلوایا تھا۔“

”بھی، جی، اپر زینٹ صاحب نے مجھے بعد میں تمام صور تھاں بتا دی تھی۔ حسین یوسف نام تھا اس کا، اور روں نمبر تھا، 13051۔ آپ نہ دت تو جناب اس کے پیپر سرخ کا نالگا، ہی تھا۔“

سعدی کی رنگت زرد پڑنے لگی۔ اس کے قدموں سے آہستہ آہستہ جان نکل رہی تھی۔ قطرہ بقطرہ۔

”یہ تو آپ کی کرم نوازی ہے جی۔“ ہاشم نے اس کا چھروہ دیکھتے شکر سے سر کو خم دیا۔ ”ویسے اب بھی اگر آپ اس کی روپرٹ کر دیں، تا پہ زینٹ کی گواہی کافی ہو گی اس کا رزلٹ یکنسل کروانے کے لئے؟“

”بھی بالکل سر۔ جب اسے اس طرح بچا سکتے ہیں تو روپرٹ بھی کر سکتے ہیں۔ کیا روپرٹ کرنی ہے اسکی؟“ وہ رازداری سے ہے۔ ہاشم مسکرا یا۔ اور وہ مسکراتے ہوئے بہت بینڈ سم کلتا تھا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو تباہ اس کا۔“

”اوکے جی۔ اچھا کاردار صاحب ایف ٹین میں میرا جو پلاٹ...“

”کل ڈنر پا یئے گا، ویس بات کریں گے۔“ سلسلہ منقطع کر کے اس نے موبائل میز پر ڈالا۔

”بیٹھ جاؤ سعدی۔ اور محضہ اپنی پیسو۔“ مسکرا کر سزی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ گروہ کھڑا رہا۔ اس کی رنگت سفید پر رہی تھی، اور انہوں میں سرخی ابھر رہی تھی۔

”کیا باتفاق آیا کہ تمہاری بہن تم سے زیادہ بچہ پر بھروسہ کرتی ہے؟“

سعدی کی کنپتی کی رگیں ابھرنے لگیں۔ سفید رنگت سرخ پڑنے لگی۔ ہاشم کی آنکھوں میں دیکھتے وہ غرایا۔

”اس جعلی کال سے مجھے رتی برادر فرق نہیں پڑتا۔ میری بہن ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ آپ صرف مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لئے ایسا کر رہے ہیں یا آپ کی بھول بے کہاں طرح آپ ہمارے خاندان کو توڑ سکتے ہیں۔“ اس کے اندر جو طوفان برپا تھے ان کو جن دقوں سے چھپا کر اس نے بظاہر گردن کڑا کر کہا، صرف اس کا دل جانتا تھا۔ قدموں میں لرزش تھی، دل ڈوب رہا تھا، گروہ سعدی تھا، اسے ابھی نہیں ٹوٹا تھا۔ اس پنڈمنٹ اور....

”تو جاؤ اپنی بہن سے پوچھلو۔“ ہاشم نے بس افسوس سے اتنا کہا گوکہ وہ خود بھی اس کے اتنے یقین پر تملکا رہا تھا۔ سعدی غصے سے اسے دیکھتا، میز پر دونوں ہاتھ رکھ کے آگے جھکا۔

”میرے.... خاندان..... سے.... دور ہیں، ہاشم بھائی!“ خون رنگ ہوتی آنکھوں سے وہ بلند آواز میں غرایا تھا۔ ”ورنہ میں وہ

کروں گا آپ کے ساتھ کہ آپ کی نسلیں یاد رکھیں گی، اگر آپ کی نسلیں نئی پائیں تو!“

پیچھے کا دفع پہ بیٹھے نو شیر وال کے کان سرخ پڑے۔ صوفے کی گدی کو منگی میں زور سے بھینچا، گویا ضبط کیا۔ دوسرا باتھ بار بار جیب

کی طرف جاتا۔ خاور کی نگاہ بھی بار بار اس کے جیب کی طرف جاتے ہاتھ تک اٹھ جاتی۔

ہاشم ابھی تک نیک لگائے پر سکون بیخا تھا۔ اس دھمکی پر زخمی سامسکرایا۔ اتنا بغض ہے تمہارے دل میں میرے لئے تو ابھی تک مجھے ہاشم بھائی کیوں کہتے ہو؟“

سعدی نے کچھ کہنے کے لئے لب کھو لے مگر الفاظ ختم ہو گئے۔ اس سوال کا جواب خود اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

”آپ کا لحاظ کر جاتا ہوں، آج کے بعد نہیں کروں گا۔ دوبارہ میری بہن کا نام مت لینا۔ ہاشم کا ردار!“ انگلی اٹھا کر، چلتی سے اسے دیکھتے تنبیہ کی اور اس سارے میں بھلی دفعہ ہاشم کے چہرے پر شدید تکلیف ابھری۔ کہیں کچھ چھن سے ٹوٹ گیا تھا۔ کبھی نہ جز نے کے لئے جواہرات نے وہ تکلیف دیکھ لی تھی، فوراً اپ کراسے مقابض کیا۔

”تو پھر جاؤ اور اپنے خاندان کی فلک رکرو، ہماری نہیں۔“

سعدی نے تغیر سے سر جھکتا۔

”موتو بغیہ کم!“ قرآن کے دو الفاظ بلند آواز میں پڑھے (مرجاً اپنے غصے میں تم لوگ!)، کری کو بیر سے ٹھوکر ماری، اور سرخ آنکھوں سے ان دونوں کو گھورتے مرڑ گیا۔ ہاشم نے اسی تاسف سے اسے باہر جاتے دیکھا۔ دروازہ بند ہوا تو وہ تعجب اور افسوس سے بولا۔ ”یہ اتنا بے دوف ہو گا میں نے نہیں سوچا تھا۔“ نو شیر داں سعدی کے پیچھے گیا تھا، خاور بھی احتیاط اٹھانے لگا، مگر ہاشم کی بات نے اسے روک دیا۔

”میرا نہیں خیال سر! کہ وہ بے دوف ہے۔ جب اسے آڈیولی، میں نے کہا تھا، یہ لڑکا گزر بڑ ہے۔ مگر آپ نے تب بھی اسے اندر استیمیٹ کیا تھا، اب پھر آپ وہی کر رہے ہیں۔“

”بس کرو یار۔“ ہاشم نے بے زاری سے لیپٹاپ کھوں کر سامنے کیا۔ ”وہ ایک معصوم بچہ ہے، مجھ سے جھوٹ تو بول نہیں سکتا۔ دیکھا نہیں کیسے ایک ہی سانس میں سب بتا دیا۔“ ناک سے مکھی اڑاتے وہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ خاور نے بے چینی سے پہلو بدلا، مگر وہ خوب بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا چیز ٹنگ کر رہی ہے۔

”مجھے نہیں لگتا وہ بچ بول رہا تھا سر۔ مجھے لگتا ہے وہ ادا کاری کر رہا تھا۔ وہ کسی اور چکر میں تھا۔“ وہ خوب بھی متذبذب تھا۔ جواہرات نے اکتا کر اس کو دیکھتے ناک سے مکھی اڑائی۔

”بہت ہو گیا سعدی نامہ بس کر دو۔“ اور ہاشم کے سامنے کری پا کر بیٹھی۔ ناگ پٹانگ جماں۔ گردن کی مala کے موتوں پر انگلی پھیرتے سوچتے ہوئے ہاشم کو مقابض کیا۔ ”کیا وہ کسی کو بتائے گا؟“

”بتانا ہوتا تو اب تک بتاچکا ہوتا۔ اسے پڑھے کوئی اس کا یقین نہیں کرے گا۔ ابھی غصے میں گیا ہے، مختدا ہو گا تو میں بات کروں گا اس سے۔ میں اسے سن بھال لوں گا۔ خاور یہ رپورٹ میں نے تمہیں کہا تھا کہ....“ ہاشم نے اسکرین پر کچھ دیکھتے خاور کو اشارہ کیا تو وہ جو گا ہے بگا ہے بند دروازے کو بے چینی سے دیکھ رہا تھا، بادل خواستہ اس کے قریب آگیا۔ جواہرات موبائل نکال کر میلر چیک کرنے لگی۔ وہ تینوں اس تماشے سے ساٹھ پروف دروازوں کے باعث بے خبر ہے جو باہر ہو رہا تھا اور جس کا خاور کوڑ رہتا۔

تم کو اپنی نشست دکھتی ہے؟

یا مرے حوصلے سے خالف ہو؟

سعدی جب آفس سے نکلا تو اس کا پھرہ زرد تھا، اور آنکھیں گلابی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس نے ہاشم کے آفس کے باہر ہاں پا رکیا جس میں صرف حلیہ سیکریز کا ذیکر تھا۔ آگے لمبی راہداری تھی جس کے آگے لفت تھی۔ جگہ اُسی تھی کہ ہاشم کے آفس میں کون آ رہا ہے

ہان بارہ ہا ہے، اس کا علم حلیمہ یا چندگارڈز کے علاوہ اس فلور پر کسی اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔

اور بھی ہاشم کے آفس سے نکلے والے لڑکے کا چورہ ایسا بے رنگ ہو رہا تھا کہ وہ بھی سراخ کر دیکھنے لگی۔ اور پھر رنگ ہوں کا زاویہ ۱۹۔ سعدی کے عقب میں نوشیر والے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آیا۔ چھرے پر دباد با غصہ لیے اس کا انداز جارحانہ تھا۔ سعدی کے ساتھ سے گزر کر ۲۰ مانے آکھڑا ہوا۔ سعدی رکا، گلابی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

” یہ میرے بارے میں کیا بکواس کر رہے تھے تم؟ ” نوشیر وال نہیں پھلانے، غصے سے پھنکا را۔ ” اس وقت تو میں خاموش رہا ایونلے..... ”

” کیونکہ نوشیر وال، جب دو مرد آپس میں بات کر رہے ہوں تو تمہیں چاہیے کہ تم خاموش ہی رہو۔ ” سعدی سرخ پرستی آنکھوں سے ہاند آواز میں ایسے چباچبا کر بولا کہ نوشیر وال کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ منہ یوں ہو گیا جیسے طمانچہ مارا گیا ہو۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا تھا، لیسوں سے اسے نظر آیا۔ ہاشم کی سیکری نے ہنسی چھپانے کو چورہ جھکایا تھا۔ نوشیر وال نے لال بھجھو کا چورہ اس طرف پھیرا۔ (کیا یہ بھی روک رہی ہے؟ کیا یہ مجھ پہنسی ہے؟) وہ ایک دم جارحانہ انداز میں اس ڈیک تک آیا۔

” کیا فتنی لگ رہا ہے تمہیں؟ ہاں؟ ” زور سے زمین پر رکھے سسم یونٹ کوٹھو کر ماری۔ بھاری یونٹ ایک طرف کوڑھکا۔ حلیمہ کی مکراہٹ غائب ہوئی۔ ہکایا کسی وہ اٹھی۔

” سر... آپ کیا کر رہے ہیں؟ ”

” بکواس کرتی ہو میرے آگے۔ ” نوشیر وال نے برہمی سے بازو دار کر میز کی چیزوں گردادیں۔

” میرا غصہ ایک کمزور لڑکی پر نکال رہے ہو؟ مرد بن نوشیر وال۔ مرد بنو! ” اور بس ایک قبر آلو نظر اس پر ڈال کر، اپنا فون اٹھا کر، آگے بڑھ گیا۔

شیر و تملہ کرو اپس گھوما تو دیکھا حلیمہ اس طرح پریشان ہٹھری تھی۔ چیزیں یکھری پڑی تھیں۔ سعدی پر دباسا را غصہ اور عود کر آیا۔

” ہٹھری شکل کیا دیکھ رہی ہو میری؟ ” وہ آگے بڑھا۔ زور سے اس کی کمپوڑا اسکرین کو دھکا دیا۔ وہ لٹ کر دوسرے طرف جا گری۔ حلیمہ ڈر کر زور قدم پیچھے ہٹی۔ ہر اس انگلیوں سے شیر و کود دیکھا۔ جس کے نقش غصے سے بگڑ رہے تھے۔ اسے لگادہ بھی کے ابھی اسے نوکری سے نکل جانے کا کہہ گا مگر نوشیر وال کے ذہن پر اس وقت دوسری چیزیں سوار تھیں۔ سعدی کی لفت جا چکی تھی۔ شیر و دوسری لفت کی طرف پکا۔



جم کی نوعیت میں کچھ تقاضت ہو تو ہو ..... در حقیقت پارسا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں  
کچھری کی راہداری میں انسانوں کا حجم غیر تھا۔ کوئی آرہا تھا، کوئی جارہا تھا۔ ایسے میں احرستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنے لاپرواہ حلیے کے بر عکس، آج وہ سیاہ پینٹ کے ساتھ سفید ریسیں شرست میں ملبوس تھا، کف بھی بند تھا اور بال بھی پیچھے سیٹ کر رکھے تھے۔

بال آخر وہ رکا۔ ایک ادھ کھلے دروازے کے اندر وہ بیٹھی دکھائی دی۔ میز کے اس پارکر سی پر براجمن، سر جھکائے، فائل پر دواني سے قلم چلاتی۔ گھنگری لے بال کچر میں آدھے بند ہے تھے اور ایک لٹ جھک کر فائل کو چھو رہی تھی۔

احمر فوراً سے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحے کے لئے سوچ جا رہا۔

(یہ میری طرف سے غازی کی شادی کا تھا ہے۔ مگر....) وہ رکا۔ (جب میں چڑیل کی غلط فہمی دور کروں گا اور اسے حقیقت بتاؤں گا کہ وہ میری غلطی تھی اور نہ غازی نے اسے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تو وہ کیا کرے گی؟ ہوں... سوچنے دو۔

دیوار سے بیک لگائے اس نے آنکھیں بند کیں اور تصویر کرنا چاہا۔

وہ دروازہ کھٹکھاتا ہے، زمر چہرہ اٹھا کر اسے دیکھتی ہے، چونکی ہے۔ ”احمر شفیع؟“ ابر و اٹھاتی ہے، پھر اندر آنے کے لئے سر کو خم دیتی ہے۔ وہ بھکتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے۔ متذبذب سے سلام کر کے کہتا ہے۔

”آپ کوشادی کی مبارک ہو۔ میں پہلے اس لئے نہیں آیا کہ آپ کاغذی سے کوئی رشتہ نہیں تھا، مگر اب رشتہ ہے، سو مجھے آپ کی یہ نظر فتحی دور...“

اور وہ بات کاٹ کر کہتی ہے۔ ”تمہید کا ٹیک، اور کام کی بات پا آئیں۔“ وہ گہری سانس بھر کر رہ جاتا ہے، پھر جلدی جلدی تاتا نے لگتا ہے۔

”اس دن غازی نے مجھے بصیرت صاحب کے پاس بھیجا تھا۔ جعلی مجری کرنے۔ وہ آپ کو استعمال نہیں کر رہا تھا، یہ میری غلطی تھی۔“

وہ ایک دم حیرت زدہ رہ جاتی ہے، مضطرب سی کھڑی ہوتی ہے۔

”کیا تم بھی کہہ رہے ہو؟“

”بھی میں...“ اور وہ مزید تفصیل بتانے لگتا ہے۔ وہ جیسے جیسے سنتی جاتی ہے، اس کا رنگ زرد پڑتا جاتا ہے، یہاں تک کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

”یعنی کہ اس نے کچھ نہیں کیا، اور میں ایسے ہی اتنے سال اس کو مور والازام تھبہرا تی رہی۔ اوہ میرے اللہ!“ وہ سر دنوں ہاتھوں میں گرائے بیٹھ جاتی ہے۔ ”کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟ میں نے اس کو تاتفاق سمجھا۔“

”اوہ بھوں!“ احر نے بر سامنہ بنا کر آنکھیں کھولیں۔ تصور غائب ہوا۔ راہداری میں لوگوں کا شور سما عتوں میں گونجے لگا۔ اس نے اپنے سر پر چپت رسید کی۔ ”یہ چیل اتنی ایکوشنل اس نے پھر سے آنکھیں بند کر کے سوچنا چاہا۔ تصور کا پر دہ روشن ہوا۔“

وہ زمر کے سامنے کھڑا ہے اور اسے بتا رہا ہے۔

”وہ میری غلطی تھی۔ غازی نے مجھے بصیرت صاحب کے پاس بھیجا تھا۔“

وہ ایک دم غصے سے کھڑی ہوتی ہے۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے، میں تمہاری بکواس پر یقین کرلوں گی؟ یہ کہانی کسی اور کو جا کر سناؤ۔“ میں جانتی ہوں کہ اس روزا سی نے تمہیں میرے پاس مجری کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ ”غضے سے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ کہتی ہے۔

”اُف!“ احر نے تملکا کر آنکھیں کھولیں۔ بے بسی سے چوکھت تک گردن نکال کر جھانکا۔ جہاں وہ پرسکون سی، سر جھکائے فائل پر لکھتی جا رہی تھی۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ جی کڑا کراوٹ سے لکا، اور دروازے کو انگلی سے بھیجا۔

لکھتے لکھتے زمر نے سر اٹھایا، اسے دیکھ کر وہ چونکی۔ ”احمر شفیع؟“ ابر و اٹھا کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔ پھر قلم بند کر کے کرسی پر پیچپے کو بیک لگائی۔ سر کے خم سے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ متذبذب سا اندر داخل ہوا اور سلام کیا۔ تھوک نگل کر خشک گلا تر کیا۔ اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

”میں آپ کوشادی کی مبارک دینے آیا تھا، اور ساتھ میں ایک پرانی غلط فتحی بھی دو رکن تھی۔“

وہ خاموشی مگر نرمی سے اس کو دیکھتی رہی۔

”وہ جعلی مجری جو میں نے کی تھی، وہ مجھے آپ کے پاس جا کر نہیں کرنی تھی۔ غازی نے مجھے بصیرت صاحب کے پاس بھیجا تھا، وہ نہیں تھا تو میں نے آپ کو بتا دیا، یہ میری غلطی تھی۔ اس کو تو پہنچی نہیں تھا کہ میں اس طرح کر دوں گا۔“ (سانس روکے) احر نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی، پھر اسی پر سکون اور زم انداز میں بولی۔ ”مجھے پتہ ہے۔“

احمر کے سارے تصورات بھک سے از گئے۔ ”جی؟“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ ”آپ کو کیسے پتہ؟“

”مجھ سے ہی تو آپ نے پوچھا تھا بصیرت صاحب کا۔ وہ نہیں تھے تو آپ نے مجھے بتادیا میں سمجھنے تھی۔“

احمر تیزی سے دو قدم آگے آیا۔ ”مطلوب کہ... آپ جانتی ہیں سب۔ تو پھر آپ غازی سے خفا کیوں ہیں؟“

”کیونکہ اس نے مجھے استعمال کر کے جیل توڑنی چاہی۔“ ہلکے سے کندھے اپنکا کردہ اسی سکون سے بولی۔ احراء بھجن سے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”مگر... ابھی آپ نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ میری غلطی تھی۔ تو...؟“

زمر چند شانیے اسے دیکھتی رہی، پھر گہری سانس لے کر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بینھنے احراء۔“

(اتقی عزت؟) کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سوچتا، ”مگر ابھی وہ فوراً سے کری سنبھال کر بیٹھا۔ آگے کو ہوئے، بے چینی سے اسے دیکھا۔

”آپ کے انداز سے لگتا ہے کہ آپ ہماری شادی کے بارے میں ”بہت کچھ“ جانتے ہیں۔ میں اپنے ذاتی معاملات یوں ڈسکس نہیں کرتی مگر چونکہ موضوع آپ نے چھینا ہے اور اس سے آپ کا تعلق بھی ہے، اس لئے... مجھے بتائیے۔ اس روز کیا تاریخ تھی جب آپ نے پاس جعلی نجیبی لے کر آئے تھے؟“

”آ... پتہ نہیں۔“ وہ گزبر ہدایا۔

”اس روز سولہ تاریخ تھی۔“ کیا آپ کو یاد ہے کہ اس کے بعد فارس سے ملنے میں کس دن جیل آئی تھی؟“

”یقین کیجئے، جیل میں مجھے کیلئے نہیں دیا گیا تھا، گو کہ یہ میرے پر زن رائیں کے خلاف تھا، مگر.....“

”اکیس۔ میں اکیس تاریخ کو دوبارہ جیل آئی تھی اور میں نے فارس کو بہت سنائی تھیں۔ یعنی چار دن بعد۔ تھیک؟“

”جی۔ تھیک!“ وہ توجہ سے سن رہا تھا۔

”آپ نے کس دن فارس کو بتایا کہ یہ مجری آپ نے میرے سامنے کی ہے؟“

”اسی دن سولہ تاریخ کو۔ جاتے ساتھ ہی بتایا۔ بہت غصہ ہوا مجھ پر۔ اس نے کہا کہ وہ آپ کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور....“

ہش سے بولتے بولتے وہ رکا۔

زمر اداسی سے مسکرائی۔ ”اور پھر فارس نے کیا کیا، احراء؟“

اور احراء کو گا اس کے منہ پر چاکب دے مارا گیا ہو۔ وہ ہونقوں کی طرح زمر کی شکل دیکھنے لگا۔ (”پھر؟“ اس نے غائب دماغی سے

ہے ایسا۔)

”آپ مجھے یہ بتانے آئے ہیں کہ وہ بے تصور ہے کیونکہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ وہ تصور دار ہے کیونکہ اس نے کچھ نہیں کیا۔“

احمر بس شل سما سے دیکھے گیا۔ کیا وہ فارس کی حمایت میں اتنا نہ ہا بھوگیا تھا کہ اسے سامنے کی بات نظر نہیں آئی؟

”سولہ تاریخ کو آپ نے اسے بتایا کہ آپ نے مجھے استعمال کیا ہے، مجھے اندازہ تھا یہ بات آپ اسے جاتے ساتھ ہی بتائیں گے۔

ہا آگے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ کیا ہوا۔“ تخلی سے کہہ رہی تھی۔

”وہ آپ پر خفا ہوا، غصہ ہوا۔ اور پھر.... وہ چپ ہو گیا۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے اسے چار دن دیے۔“ انگو خا بند کر کے چار

اٹیاں دکھائیں۔ ”چار دن تاک وہ اپنی غلطی کو درست کر لے۔ مجھے یقین تھا یہ صرف ایک غلطی ہے۔ اٹھا رہ تاریخ کو سے جو ذیشل رہیا نہ کی

تو سیع کے لئے عدالت لایا گیا۔ کاریڈور میں میں نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو اس نے مجھے وہاں روک کر کہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ مگر اخبارہ تاریخ کو وہ مجھے دیکھ کر خاموشی سے گزر گیا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ ایک دفعہ وہ کہہ دے یہ احرم کی غلطی تھی، ہم آپ کو استعمال نہیں کر سکتے، مگر اس نے پلان جاری رکھا۔ اس نے..... پلان.... جاری.... رکھا.... احرم!

احمر ہاکل لا جواب ساہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ وقت تھا جب میں نے ڈھانی سال تک اس کی بات نہیں سنی، کیونکہ مجھے ڈر تھا، میں اسے معاف کر دوں گی، اور جب وہ میرے سامنے آیا تو میں نے شاید اسے معاف کر بھی دیا تھا میں اس کے کیس کی خود تحقیق کرنے جا رہی تھی، میں سب کچھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی، میرا دماغ کہتا تھا، وہ اتنے گواہ جنہوں نے اسے گن لے کر ہوٹل کے کمرے میں جاتے دیکھا ہے، جنہوں نے اسے اپنے بھائی کے ہوٹل کے کمرے سے رات کو نکلتے دیکھا ہے، وہ سب حق کہہ رہے ہیں؟ مگر دل کہتا تھا، میں اسے ایک چانس اور دوں۔ اور میں نے دیا۔ احرم صاحب، میں نے اس کو چار دن دیے کہ وہ اپنی غلطی درست کر لے۔ ٹھیک ہے اسے نہیں پڑھتا، مگر جب پڑھ چل گیا تب کیا کیا اس نے؟ کیا مجھے تباہی کہ ہم 20 riots نہیں جیل توڑنے جا رہے ہیں؟ کیا سوچا کہ فرار کے بعد میرا کیا بنے گا؟ میں ایک عورت ہوں۔ ایک عورت کے ساتھ یہ پوری کچھی کیا کرے گی؟ اس کو معلوم تھا سب، مگر اس نے کچھیں کیا۔ اس دن میں نے ہمیشہ کے لئے فارس پا اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب مجھے اس پا اعتبار ہی نہیں رہا۔ پھر بھی جب میں اس کے پاس گئی تو اس سے کہا کہ تم نے اپنے سائیڈ کاک (احمر کے ابر و بھنپے) کو میرے پاس بھیجا تو یہ کہتے ہوئے بھی میری خواہش تھی کہ وہ کہہ دے..... مجھے تو نہیں پڑھتا، میں نے تو کچھ اور کہا تھا، مگر اس نے پلک تک نہیں چھکی۔ یعنی وہ جانتا تھا کہ آپ مجھے کہہ آئے ہیں، اور اس نے کچھیں کیا۔ معافی بھی نہیں مانگی۔ احرم کیا اسے مانگنی نہیں چاہیے تھی؟“

احمر کا سر خود بخود اثبات میں ہلا۔ ”اس نے شاید اس لئے...“ وہ تھہر گیا۔ ساری دلیلیں ختم ہو گئیں۔ بے بی سے اس نے زمر کو دیکھا۔ ”یہاں اس کا قصور ہے، مگر اس نے وہ قتل نہیں کیے۔“ وہ نگاہیں زمر کے چہرے سے ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ جو پر سکون ہی نیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ادا تھی، مگر اطمینان بھی تھا۔

”جب آپ کا ایک دھوکہ سامنے آجائے تو آپ کے سارے سچ مشکوک ہو جاتے ہیں۔ اور یہ مت کیجئے کہ اس نے وہ قتل نہیں کیے۔ آپ کے چہرے پر لکھا ہے کہ آپ کو خود بھی یقین نہیں کہ وہ بے گناہ تھا۔“

احمر نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ ”مجھے نہیں پڑھ لگتی ہے۔ آئی ایم سوری۔ ہم نے بہت غلط کیا۔“ نخت سے گردن قدرے جھکا کروہ بولا۔ مگر وہ میرا دوست ہے، مجھے اس کی ہربات ٹھیک لگتی ہے۔ آئی ایم سوری۔ ہم نے بہت غلط کیا۔“ نخت سے گردن قدرے جھکا کروہ بولا۔ ”مجھے آپ کی مغفرت سے فرق نہیں پڑتا۔ آپ میرے کچھیں لگتے۔“ نرمی سے کندھے اچکا کر وہ بولی تو وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر انٹھ گیا۔

”اگر آپ کو کبھی یہ معلوم ہوا کہ وہ بے گناہ ہے، اور اسے پھنسایا گیا ہے تو آپ کیا کریں گی؟“

”وہ بے گناہ نہیں ہے، کم از کم مجھے اس پا ب یقین نہیں آتا۔“

”میں دوبارہ آپ سے مغفرت کرتا ہوں۔“ اس کا آفس چھوڑنے سے پہلے احرم نے پھر سے کہا تھا۔ زمر نے سر کو بس خم دیا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس نے مغفرت قبول نہیں کی تھی۔



لغزشوں سے ماورا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں ..... دونوں انسان ہیں، خدا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں۔ احرم اپنے کچن کے اوپرچے اسنول پر سوچ میں گم بیٹھا تھا جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر بھاری قدم قریب آتے سنائی دیے۔

”کیوں بلا یا ہے؟“ فارس بے نیازی سے پوچھتا ساتھ والے اسٹول پر بیٹھا۔ کہناں کا دنتر پر رکھ لیں اور گردان موڑ کر اسے دیکھنے چاہیے۔“ چھوٹی کر کے سامنے کسی غیر مرمری نفطے کو دیکھ رہا تھا۔

”اے! ایلو!“ فارس نے اس کے چہرے کے آگے چلکی بجائی۔ وہ چونکا نہیں، بس آہستہ سے گردان موڑ کر اسے دیکھا۔

”آج کچھری گیا تھا کسی کام سے۔ میدم زمر سے ملاقات ہوئی۔“

”پھر؟“ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔

”یا، ہم نے ایک لڑکی کو استعمال کر کے جبل تو زنی چاہی۔ لعنت ہے ہمارے اوپر۔“

وہ پہلے قدرے حیران ہوا، پھرنا گواری سے لب بھینچ لئے۔ چہرہ موڑ کر سامنے دیکھنے لگا۔

”یہ قصہ کیوں دھرا رہے ہو؟“

”ہم نے ایک لڑکی کو استعمال کیا یا ر؟“ وہ خخت پر ملاں تھا۔

”ایک منٹ۔ میں نے تمہیں دوسرا سے وکیل کے لئے پیغام دیا تھا، یہ تمہاری غلطی تھی۔“ خنگی سے اس نے بات کائی۔

”اور پھر تم نے کیا کیا؟“ وہ بھی اتنی ہی درشتی سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے میری غلطی کو ٹھیک کیا؟ مجھے ایک دفعہ بھی کہا اے جا کر اس کو سب تادیتے ہیں۔ تمہیں پتہ تھا کہ ایسی مخبری پر کارروائی کے بعد اگر ہم فرار ہو گئے تو اس کے ساتھ کیا ہو گا، مگر تم نے سب کچھ ملند دیا۔“

”ایسے ظاہر مت کرو جیسے تم نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ بڑھ ہوا۔

”مگر میں اس کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ غازی تمہیں، کم از کم تمہیں پلان جاری نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اور پھر بعد میں تمہیں اس سے معافی ہی مانگنی چاہیے تھی۔ وہ قتل تم نے نہیں کیے ہو گئے، تم بے قصور ہو گئے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم زندگی میں ہر معاملے میں بے قصور ہو۔ تم نے واقعی اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔“ سنجیدگی سے وہ کھڑا رہا تھا۔ فارس نے ابرو کے ساتھ چہرہ موڑ سے سامنے دیکھتا رہا۔ چند بلیں ایک ہدیہ تاؤ کی کیفیت میں خاموش گزرے۔ پھر وہ اسی خنگی سے بولا۔

”میں کیوں معافی مانگتا؟ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی تھی۔“

احمر نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ ”بالکل۔ تم نے اس پر گولی نہیں چلائی۔ تم نے اس کا دل توڑا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو یہ زیادہ بڑا گناہ ہے۔“ ملامتی انداز میں کہہ کر وہ اٹھ گیا اور گھوم کر لاوچ کی سمت آیا اور میز پر رکھا موبائل اٹھا کر بٹن دبانے لگا۔ چند لمحے اس اظہار لا مقابقی کی نظر ہو گئے۔

فارس ابھی تک اونچے اسٹول پر بیٹھا، خنگی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ احر اس کی پشت پر تھا۔ جب وہ مزید کچھ نہ بولا تو فارس نے گھری سانس لی۔

”مجھے پتہ ہے، میں نے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ میں خود غرض ہو گیا تھا۔“ پھر وہ گویا اکتا کر پیچھے گھوما۔ ”میں ڈھائی سال نے بیل میں بندھا، میرے پاس کوئی دوسرا راستہ.....“

”اوہ پلیز، کوئی وضاحت مت دینا۔ کسی کا دل توڑنے کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی۔“ موبائل جیب میں رکھتے احر نے چاہیوں کا پچھا اٹھایا اور اپہاری کی سمت بڑھ گیا۔

”اگر تمہیں خود جانا تھا تو کیوں بلا یا مجھے؟“ اس نے بے زاری سے پکارا۔

”یہ بتانے کے لئے کہ میں آج کے بعد چڑیل کو چڑیل نہیں کھوں گا۔ دراصل آج مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنی بری نہیں ہے، جتنی

کورٹ میں مجھے لگا کرتی تھی۔ اور ہاں! ” دروازہ کھولتے کھولتے وہ رکا۔ مژ کر سمجھیگی سے دور بیٹھے فارس کو دیکھا۔ ” میرا خیال ہے وہ جو تمہارے ساتھ کر رہی ہے، تم وہ ڈیزرو کرتے ہو۔ ” پھر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ بدتریز۔ پلے سے خراب موڈا اپنی نے مزید خراب کر دیا تھا۔ وہ اسٹول و حکیمتا خود بھی جانے کے لیے اٹھا اور یہ تھی تھا جب ندرت کا فون آیا۔

” میں نے زمر کو کال کی تھی، اس نے بتایا وہ آفس میں ہے۔ تم دونوں یوں کراؤ دو پھر میں ہماری طرف آجائو۔ ” سعدی صبح کہہ کر گیا تھا کہ شام کو یہ سورانٹ کو کشمرز کے لئے بند کر کے باربی کیوں کریں گے۔ ”

” رات کو ہاشم نے کھانے پر بلا یا ہے۔ ”

” میں نے زمر سے بات کر لی ہے، وہ کہہ رہی ہے ہاشم سے مغدرت کر لے گی۔ تم بھی آجائو۔ ” اور ندرت عجلت میں فون کاٹ گئیں۔ فارس نے بے زاری سے موبائل کو تکا۔

اگر ہاشم سے مغدرت کرنی ہی تھی تو میرے سامنے ہاں کرنے کیا ضرورت تھی۔ بے حد برے موڈ میں وہ وہاں سے نکلا تھا۔

❖❖❖

سانس روکے کھڑا تھا ملک الموت ..... سامنا دیپ کو ہوا کا تھا چھوٹے باعینچے والے لگھ کے لا اونچ کو کولنے ملھنڈ بخش رکھی تھی۔ کھانے کے برتن اٹھائے جا چکے تھے ندرت خوشی خوشی زمر کو پچھا بتا رہی تھیں جو صوفی پہنچی، نرمی سے مسکراتی ان کو دیکھ رہی تھی۔ حد قریب میں پیارا پر کر کے پہنچی، ڈا بجست پڑھتے ہوئے ناخن چباری تھی۔ ” فارس کو دیکھو آیا ہی نہیں، کب سے فون کیا تھا اسے۔ ” ندرت نے گھڑی دیکھتے ہوئے قدرے خفگی سے کہا۔ زمر بدقت مسکرا پائی۔

” سعدی کب آئے گا؟ ” موضوع تبدیل کیا۔

” پہنچیں، آج کسی کام سے گیا تھا، شاید دیر ہو جائے۔ ”

اور عین اسی وقت بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ان تینوں نے بے اختیار اس طرف دیکھا۔ وہ شاید تیزی سے اندر آیا تھا، اس لئے اگلے ہی لمحے رابداری عبور کر کے چوکھت پر آن رکا۔ کوٹ پہننا ہوا تھا، مگر نائی ڈھیلی تھی، بال قدرے لکھر چکے تھے اور دھوپ کی تمازت سے چہرہ تتمایا ہوا لگ رہا تھا۔ ماتھے پر پسینہ بھی تھا۔ مگر یہ اس کا حلیہ نہیں، کچھ اور تھا جس کے باعث وہ سب اس کو دیکھنے لگے۔

چار جانہ انداز اور آنکھوں میں دباغصہ۔ زمر کو دیکھ کر وہ چوکھت پر تھا، سرخ غصیل آنکھوں سے دم کو دیکھا۔ گرد تر چھپی کر کے اشارہ

کیا ”بات سنو میری؟ ”

نہ سلام، نہ کچھ۔ خیں کے رسالہ کپڑے با تھم ہونے لگے۔ چہرہ بے رنگ ہوا۔ بھائی کو پتہ چل گیا۔ حد ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد بھی اپنا اعتبار کھونے سے نہیں بچا سکی۔ سب اکارت گیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

زمر کی نظر وہ نے سعدی سے خیں کے چہرے تک کا سفر کیا جو ایک دم پر یشان نظر آنے لگی۔ سعدی کہہ کر رکا نہیں، مڑ گیا۔ حد مر۔

مرے قدموں سے اٹھی، اور اس کے پیچھے گئی۔

” سعدی ” ندرت نے قلمروندی سے پکارا۔ مگر اس نے نہیں سن۔ وہ کمرے میں آیا، کوٹ اتار کر کر سی پڑالا اور پٹانا تو جہا اٹھا یا، مروڑتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سعدی نے دروازہ پاؤں سے دھکیل کر بند کیا اور اس کی جانب گھوما۔ (دروازہ چوکھت سے ابھی چا، الہ دور تھا جب باہر سے زمر نے ہینڈل تھام لیا۔ ذرا سی درز باقی رہ گئی۔)

”تمہارے آخری پیپر میں جواہر اسکول میں تھا، کیا ہوا تھا؟ ہاں کیا ہوا تھا؟“ وہ طیش سے اسے گھوتے وہ قدم مزید قریب آیا۔  
حمد نے ڈرتے ڈرتے پلکیں اٹھائیں۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“

”خین میں نے تمہیں رکھ کر تھہر مارنا ہے اگر تم نے مجھے سیدھی طرح پوری بات نہ بتائی تو۔ تم چینگ کرتے کپڑی گئی تھی، اور تم نے  
ہاشم کو بلا یا تھا، ہاں؟“

خین میں کی سعدی کا چہرہ مٹکتی آنکھیں نہ ہوئیں۔ ذرا سا اشتباہ میں سر بلایا۔ سعدی کے قدموں تلے زمین سر کرنے لگی۔ ہاشم صحیح کہہ رہا  
تھا۔ اس کے کان سرخ ہوئے۔

”تمہارا بھائی مر گیا تھا جو اس گھنیا آدمی کو بلا یا تم نے؟“ وہ بے حد غم و غصے سے دھماڑا تھا۔

”تمہیں کیا پر ابلم ہے اس بات سے؟“ زمر مخندے انداز میں کہتی اندر داخل ہوئی۔ حمد نے نہ آنکھوں سے چونک کرا سے دیکھا۔  
وہ خین کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سعدی کے مقابل۔

”زمر میں اپنی بہن سے بات کر رہا ہوں، آپ درمیان میں مت آئیں۔“ اس نے غصے کو ضبط کرتے بہشکل لحاظ کیا۔ وہ سینے پر بازو  
لپیٹے وہیں کھڑی رہی۔ ملی بھی نہیں۔

”مگر میں تم سے بات کر رہی ہوں۔ ہاشم کو بلانے کے لئے میں نے کہا تھا اسے۔ اس نے پہلا فون مجھے کیا تھا۔“ سعدی کی آنکھوں  
میں دیکھ کر اسی سکون سے بولی۔ خین کا دل دھک سے رہ گیا۔

”مجھے پتہ ہے آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ کو اس بات کا علم بھی نہیں تھا۔“ وہ اتنے ہی غصے سے بولا۔

”شاید تم بھول گئے ہو کہ میں تم سے آٹھ سال بڑی ہوں۔ اس لئے پہلی بات، مجھے ذرا تیز سے بات کرو۔ دوسرا یہ کہ مجھ تم سے  
جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا فون ریکارڈ چیک کرلو بے شک۔“

سعدی کے تنے کندھے قدرے ڈھیلے ڈڑے، مگر غصہ بھری آنکھوں میں مشکوک و ثہبہات لئے وہ زمر کو دیکھتا رہا۔

”اچھا اگر آپ کو یہ بات پتہ تھی تو کیا نام ہے اس وکیل کا جو اس لاءِ کائن کا منتظم ہے اور جس سے ہاشم نے بات کر کے اس کو....“  
غصیلی نظر خین پڑا۔ ”اس مسئلے سے نکل دیا تھا؟“

”راجہ عبد الباسط، ممبر ہائی کورٹ بار۔ کیا گھر کا ایڈریس بھی دوں ان کا؟“ وہ اتنی بڑھی سے بولی کہ سعدی کی آنکھوں میں الجھن  
ابھری۔ باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھے۔

”اگر خین نے آپ کو کال کیا تھا تو آپ خود کیوں نہیں گئیں؟ ہاشم کو کیوں انوالو کیا میرے گھر کے معاملے میں؟“ وہ اب بھی مشکوک  
تھا اور غصہ پھر سے چڑھنے لگا۔

”کیونکہ میں دن میں پچھیں کام کر کے دیتی ہوں اس کے دو چاروں کردے گا تو احسان نہیں کرے گا۔“ وہ خفی سے کہہ رہی  
تھی۔ ”اس وکیل سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں اس کے گروپ کو ووٹ نہیں دیا تھا میں نے دوسرے بھی کتنی مسئلے ہیں میرے ساتھ۔ میں  
جااتی تو مسئلہ مزید بگرتا، اس لئے میں نے حد سے کہا کہ ہاشم کو کال کرتی ہوں۔ میرے کرنے سے پہلے حد نے کر لی کال اور وہ پہنچ بھی گیا۔  
تمہیں کیا پر ابلم ہے اس سب سے؟“

”تم نے.....“ سعدی کے چہرے پا اشتعال ابھرنا۔ انگلی اٹھا کر عین انداز میں پوچھا۔

”تم نے چینگ کی تھی یا نہیں؟“

اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب زمر کو بھی معلوم نہیں تھا، سو وہ اسی اطمینان سے خین کی طرف گھوئی۔ ”بولا بھی خین، اپنی پوزیشن کلیر کرو، کھانہیں جائے گا وہ تمہیں۔“

اور خین جو اس وقت مختلف کیفیات کا شکار ہو رہی تھی، اس کا دل بھرا آیا۔ آنکھوں سے آنسو شپ پر گرنے لگے۔ ”میں نے چینگ نہیں کی تھی، پچھلی بڑی نقل لکھ کر مجھے دی کہ اگلی کو دوں۔ وہ تو شویر انہیں تھا، نہ میں نے کچھ پڑھا اس میں۔ میں نے تو صرف ٹشوپ کیا تھا۔ ممتحن نے مجھے دیکھا، اور دوسروں کو نہیں، لیس مجھے اخدادیا اور پھر...“ وہ سارا واقعہ واضح واضح بتانے لگی۔

”تمہیں پتہ تھا اس ٹشو میں کیا لکھا ہے؟“ وہ بختی سے پوچھ رہا تھا۔ اور ایک یہی نکتہ تھا جہاں پہنچ کر پچھلے دو ہفتے سے خین کا دل ڈوبتا تھا۔

”مجھے پتہ تھا، مگر...“

اور سعدی نے بے زاری سے سر جھلایا۔ ”تمہیں پتہ تھا اور پھر بھی تم نے ٹشاگے پاس کیا۔ تم نے ان کی اعتمادت کی۔ تم ان کی چینگ میں شریک نہیں۔“ نفی میں سر ہلاتے اس نے غصے اور صدمے سے ہد کو دیکھا جس کے آنومزید یتیز سے گرنے لگے تھے۔ ”تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا خین۔“

”اچھا اگر تم اس کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟“ زمر نے اس کی توجہ خین سے ہٹائی۔

”میں اسی وقت کھڑا ہو کر وہ ٹشو تمہن کے حوالے کر دیتا۔ اعانت جرم جرم کرنے کے برابر ہوتی ہے۔“

”تم ایسا کر بھی سکتے ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ کرہ امتحان میں بڑا کے ہوتے، جو تھانے چلے جائیں، پر چکٹ جائے اور تین سال امتحان نہ دے سکیں تو کوئی قیامت نہیں آتی،“ مگر حمد کے ساتھ لڑ کیاں تھیں اور ان کی عزت اگر خاک میں ملے تو پورا خاندان تباہ ہوتا ہے سعدی۔ کیا یہ ان دوڑکیوں کو ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا دیتی؟ وہ تیز لمحے میں اس سے مخاطب تھی۔ ساتھ ہی آنکھوں میں بے پناہ بہی تھی۔

سعدی کے ماتھے کی تیوریاں قدرے ڈھیلی پڑیں، مگر پوری طرح نہیں۔

”اورا ب کیا ہو گا؟ وہ وکیل اس چیز کو اب بھی استعمال کر سکتا ہے۔“

”تمہیں لگتا ہے میں اسے یہ کرنے دوں گی؟“ اس نے الماجست سے سعدی سے پوچھا۔ کوئی بوجھ ساتھا جو سعدی کے دل سے سر کنے لگا۔ وہ رخ موڑ کر گہرے سانس لیتا خود کو کمپوڑ کرنے لگا۔ حم فرمندی سے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھتی۔ اس کا سانس ابھی تک اٹکا تھا۔

”مجھکیوں نہیں بتایا ہاں؟“ اس نے ملامتی نظروں کا رخ زمر کی طرف کیا۔

”تمہیں بتاتی تاکہ تم وہ کرو جو بھی کر رہے ہو۔ آخر میں ہوتا فارس کے ہی بھانج نہ۔ (فی الحال وہ دونوں بھانجے اس ریفرنس پر احتجاج کرنے کی بہت نہیں رکھتے۔ وہ اسی تیز برہم انداز میں بولتی گئی۔) اور تم کیا کر لیتے وہاں آکر سوائے منسلکہ بڑھانے کے؟ میں نے وہی کیا جو مجھے ٹھیک لگا۔ حمد نے بھی وہی کیا جو اسے ٹھیک لگا۔ زیادہ اسماڑ بننے کی ضرورت نہیں ہے، جب تم انگلینڈ میں مزے کر رہے تھے۔ (سعدی نے اس لفظ پر بے اختیار ابر و اٹھائی۔) تو یہاں زمر اور خین اپنے مسئلے خود کر رہی تھیں۔ کیا ہم نے تمہیں بتایا جد کی اس کلاس فیلو کے بارے میں جو اسے ہر اس کر رہی تھی یا اس و اس پر نیل کے بارے میں جو غلط طریقے سے اس کی محنت چڑانا چاہ رہی تھی یا ان لوگوں کے بارے میں جن کو میں اور حمد گھر جا کر ان کی غیر قانونی جائیداد کے خلاف کارروائی کی دھمکی دے کر آئے تھے۔ ہم نے تو بہت سارے مسئلے اکٹھے سلیمانیے ہیں، کس کس کا بتاؤں میں تمہیں؟“ ایک واقع کوتین سے ضرب دے کر اس نے کہا تو سعدی کا غصہ جاتا رہا۔ وہ واقعی بلکہ نکر دونوں کی شکل دیکھنے لگا۔

”میری بات کان کھول کے سنو سعدی، آئیندہ اس لبجھ میں اپنی بہن سے بات مت کرنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“ انگلی اخنا رختی سے اس کو وارنگ دی۔ ”اب باہر نکلو تم دونوں کا مودہ ٹھیک ہونا چاہے۔ بھا بھی کو جنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔“ ایک آخری ناراض نظر ان پر ڈال کر وہ باہر نکل گئی۔

چیچے سعدی اور حنین کے درمیان خاموشی حاصل ہو گئی۔ وہ جھلی، بیھی یلکوں کے ساتھ کھڑی تھی، اور وہ گوکے ابھی تک نفلی سے اسے دیکھ رہا تھا، مگر صاف ظاہر تھا وہ مخفیاً ہو چکا ہے۔

”آئی ایم سوری۔ میں نے صرف اس لئے نہیں بتایا کہ مجھے لگا، آپ مجھے غلط سمجھیں گے، مگر میں آپ کو بتانے والی تھی۔“

”اگر تم غلط نہیں تھی تو میں تمہیں کیوں غلط سمجھتا؟ زمر جو بھی کہیں، تم لوگوں کو مجھ سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ ہم ایک فیلی ہیں، ہم ایک دوسرے سے باتیں نہیں چھپاسکتے۔“

”آپ نے کہا تھا کہ اگر آپ نے دوبارہ جیلگ کا سنا تو ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔“

”اوہ!“ سعدی نے جھلا کر سر جھٹکا۔ ”ای دن میں پچاس دفعہ کہتی ہیں کہ تمہاری تالگیں تو زدیں گی، کبھی آج تک تو زدی؟“

حنین نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر فتحی میں سرہلایا۔

”انسان تنہیہ کرتے ہوئے بہت سی باتیں کہہ دیتا ہے، ایسا کرنا تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ ہم ایک خاندان ہیں، تم لاکھ دفعہ غلطی کرو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، میں تمہارا بھائی ہوں۔ موت کے علاوہ کوئی چیز ہمارے درمیان نہیں آ سکتی۔“ اور موت کا لفظ اتنا ادا اس کر دینے والا تھا کہ حنین کا دل لرز گیا، مگر وہ کہہ رہا تھا۔ ”میری بات سنو، اب تم کبھی بھی آئندہ ہاشم کو نہیں بلاو گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ تم مجھے بلاو گی، میں نہیں ہوں تو تم زمر کو بلاو گی، مگر بھی بھی ہاشم پر بھروسہ نہیں کرنا۔“

”وہو یہ نہیں ہیں جیسے آپ ان کو سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے اتنا کرتے ہیں، اور ہم....“

”بالکل بالکل Saint Hashim کی برائی تو میرا خاندان سن نہیں سکتا۔“ افسوس سے اس نے ہنہ کو دیکھا۔ ”بہر حال، ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی میں فریش ہوں۔“ حنین نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ باہر نکلی تو سعدی کچھ یاد آنے پر ساتھ ہی باہر آیا۔ زمر ندرت کے ساتھ لا دنخ میں پیٹھی تھی۔

”مجھے کچھ کام کرنا ہے، پھر میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ریسٹورانت میں جمع ہو جائیں رات کے کھانے کے لئے۔ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔“ اس نے اب ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اطلاع دی۔ زمر مسکرا دی، سر کو خم دیا۔ وہ پلٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی زمر نے حنین کو اشارہ کیا، اور وہ ندرت سے مذدرت کر کے حنین کے کمرے میں چلی آئیں۔ زمر نے دروازہ بند کیا اور جب اس کی طرف گھومی تو چہرے پر ڈھیروں غصہ تھا۔

”تم نے ہاشم کو کمال کیا؟ ہاشم کا درا رکو؟“ غصے اور صدمے سے دبی آواز میں پوچھتی اس نے حنین کو کہنی سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

”وہ میرے مقر دش تھے، مجھے سمجھ نہیں آئی اور کیا کروں۔ میں.....“ اس نے تفصیل سے ایک ایک بات بتا دی۔

”سعدی کو کس نے بتایا؟“ اس نے غصے سے گھوڑتے بات کاٹی۔

”پتہ نہیں، انہوں نے نہیں بتایا۔“

”ظاہر ہے ہاشم نے بتایا ہو گا۔“

”کبھی بھی نہیں۔ وہ نہیں بتا سکتے۔ کسی اور نے بتایا ہو گا۔“ حنین نے جتنے وثوق سے کہا، زمر نے چونک کرا سے دیکھا۔ آنکھوں میں

تجب گہرا ہوا۔

”ہاشم اچھا آدمی نہیں ہے جد۔ کبھی دوبارہ اس کو اپنے مسئللوں کے لئے نہیں بلانا۔ اچھا؟“

”اچھا،“ وہ خفیف سی ہو کرہ گئی۔ پھر یاد آیا۔ ”آپ کو کیسے پتہ ان وکیل صاحب کا نام؟“

”تم نے خود تایا تھا کہ تم کہاں ایگزام دے رہی ہو۔ وہاں ایک ہی سینٹر لا یئر ہیں۔ میں جانتی ہوں ان کو۔“  
اوہ۔ تو باقی سب حق تھا۔

”اب قیامت تک سعدی کو پتہ نہ چلے کہ تم نے مجھے کال نہیں کی تھی، اوکے؟“ موبائل پر نمبر ملاتی وہ باہر کی طرف بڑھی پر سبھی جس انداز سے کندھے پر ڈالا۔ حسین نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”آپ کہاں...؟“

”مجھے ایک روپرٹ اٹھانے جانا ہے لیب، شام تک آ جاؤں گی، مگر سنو۔“ جاتے جاتے دوبارہ بختنی سے تنفس کی۔ ”آندھہ کوئی بھی مسئلہ ہے، تم اسے نہیں مجھے بلا دے گی۔“ جا ہے تمہیں مجھ سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو۔“

آخربی الفاظ پہنچنے کا دل ایک دم خالی ہو گیا۔ وہ ہیں شل سی کھڑی رہ گئی۔ زمر اس کو دیکھے بغیر، موبائل پر بٹن دباتی آگے بڑھ گئی۔ کھڑے کھڑے ندرت کو کام کا رہا تھا، اور پھر اسی طرح موبائل پر دیکھتی رہا۔ اور دروازہ ہکھلا تو۔۔۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ بیذل پر ہاتھ رکھنے لگا تھا، اسے دیکھ کر رک گیا۔ زمر نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا، پھر واپس موبائل پر نظریں جھکائے ایک طرف ہو گئی۔ وہ خاموشی سے اندر آیا اور وہ باہر نکل گئی۔ فارس گروں موز کرا سے جاتے دیکھتا رہا۔ دل میں چھپا کر ب اور آنکھوں کا حزن مزید بڑھ گیا۔

(تم نے اس کا دل توڑا ہے۔ مجھ سے پوچھ تو یہ زیادہ بڑا گناہ ہے۔)

جس وقت وہ ندرت سے مل رہا تھا، اور حسین کھڑکی سے باہر زمر کو جاتے دیکھ رہی تھی، اندر سعدی اپنے باتھر وہ سے تازہ دم ہو کر نکل رہا تھا۔ گیلے بال تو یہ سے رگڑتے، سفید آدمی آستین کی ٹی شرت اور نیلی جبڑہ پہنے وہ پہلے سے بہت ہلاکا چکلا لگ رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ لاک کیا۔ اور وہ کوٹ جو آج پہن کر گیا تھا، اسے اٹھا کر کمپیوٹر چیز پر آ بیٹھا۔ لیپ تاپ آن کیا۔

”سوہاشم بھائی.... سعدی یوسف ایک معصوم بے وقوف بچہ ہے نا۔“ کوٹ کی اوپری جیب سے چین نکالا اور کوٹ کو پیچھے بیٹھ پا چھال دیا۔

”اور یہ معصوم بچہ اتنا گھاٹر ہے کہ آپ کو جا کر کہتا ہے کہ اعتراض جرم کر کے معافی مانگ لیں، اور دیت ادا کریں۔ آپ کے خیال میں سعدی آج آپ کے پاس اس لئے آیا تھا؟“ بالآخر وہ تکان میں مسکرا گیا۔ لیپ تاپ اسکرین روشن ہو چکی تھی۔ ”نہیں ہاشم بھائی، میں آپ کے پاس ”اس“ لئے آیا تھا۔“ اپنے پین کو دیکھنے ہوئے وہ بڑا ہیا اور پھر پین کا ڈھکن کھولا۔ اندر نہ نہیں تھی۔ اس کی جگہ یو ایس پی پلگ تھا۔ سعدی نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ پلگ لیپ تاپ میں داخل کیا۔

”مجھے صرف آپ کا اعتراض جرم چاہیے تھا ہاشم بھائی۔ اور وہ مجھے مغلی گیا۔“ چین لیپ تاپ میں لگ چکا تھا اور اب وہ اسکرین پر پڑ دکھرا رہا تھا جو اس میں لگے نہیں کیسے نے ریکارڈ کیا تھا۔ سعدی کی اوپری جیب میں لگا قلم ہاشم کے آفس میں داخل ہونے سے لے کر وہاں سے نکلنے تک تمام مناظر بہترین کوالٹی میں عکس بندر کرتا آیا تھا۔ چونکہ زیادہ وقت اس کے سامنے ہاشم اور جواہرات رہے تھے، اس لئے وہ اسکرین پر بالکل سامنے نظر آئے تھے۔ پوائنٹ بدینک پر جیسے انزو یور یکارڈ کروار ہے ہوں۔

”میری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا، مگر کیا آپ کی اپنی بات پر بھی کوئی یقین نہیں کرے گا؟“ آسودہ ہی گھری سانس بھرتے اس نے کرسی پر بیک لگا لی۔

”آپ لوگوں نے فارس غازی کو پھنسایا میکنا لو جی۔ آپ کو کیسے لوٹا تا ہوں۔“

میں ایک بے وقوف بچنیں ہوں۔ آپ بھول گئے کہ میں ایک سامنہ دان ہوں۔ ”  
و یہ یوہ بہترین کوالٹی اور کلیسٹ آواز کے ساتھ اس کے سامنے چل رہی تھی، اور وہ بازوؤں کا تکیہ ہنا کر سرتلے رکھے، میک لگانے اطمینان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

❖❖❖

جان محسن تو بھی تھا ضدی، انا مجھ میں بھی تھی ..... دونوں خود سر تھے، جھکا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں  
دو پھر باری ہو کر شام میں ڈھل گئی اور سارے شہر پر نیلا ساندھیرا پھیلنے لگا۔ ایسے میں جھوٹے باخیچے والے گھر کے لاڈنخ میں رونق  
کلی تھی۔ بڑے بازاری سے مدھم آواز میں فارس سے کچھ کہر ہے تھے جسے وہ سنجیدگی سے سن رہا تھا، البتہ گاہے بگاہے ببا ایک پر تشویش نگاہ زمر  
پہنچ ڈالتے جو فارس کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے سامنے بیٹھنی تھی۔ وہ نوبیہا تاڑکیوں کی طرح ہی لگ رہی تھی، شفون کے بلکے کام والے لمبے نیوی  
بایوگا ڈن اور سلک پا جائے میں ملبوس، جھکے چہرے پر میک اپ بھی نظر آتا تھا، اور کانوں میں آڈپزے بھی، مگر وہ جس طرح سامنے جا کر بیٹھی تھی  
اور ابھی تک فارس سے مخاطب نہیں ہوئی تھی، یہ یوسف صاحب کو کھلک رہا تھا۔

ندرت بھی نیا جوڑا پہنچنے اندر کمرے میں تیار ہو رہی تھیں۔ میک اپ کے لئے جنین کی محتاج تھیں، بیڈ پہنچی اسے سخت سست نہ اتے  
ہوئے جلدی کرنے کا کہہ رہی تھیں، جس کی اپنی تیاری ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ ڈنر یسٹریو رائٹ میں سعدی کی طرف سے تھا اور اس کا  
پان تھا کہ سب مل کر بازی کیو کریں گے۔ دیڑ فارغ۔ امی کو بھی ریسٹ ملے گا۔ البتہ وہ خود تھوڑی دیر پہلے باہر نکلا تھا۔ کہاں، اس نے نہیں بتایا۔  
”جنین میری اچھی بیٹی، جلدی کر دی مری لپ اسٹک لگادو۔“ ندرت بیڈ پہنچیں، اسے مسلسل پکار رہی تھیں۔ (میک اپ کے لئے  
نیویوں کی محتاج مائیں۔) وہ جلدی سے ناپس پہنچتی ان تک آتی۔

”نہیں نہیں، صبح کون کہہ رہا تھا مجھے لکھنؤ پھوڑ جنین۔“ ان کے سامنے کھڑے، بجھک کر ان کو لپ اسٹک لگاتے وہ ترنٹ بولی  
تھی۔ بھائی سے صلح ہو گئی، ایک بوجھو دل سے ہٹ گیا، وہ بھی موڑ میں آ گئی تھی۔ اب ندرت نہ بول سکتی تھیں، نہ جوتا اتنا نہیں ہاتھ پاؤں تک نیچے  
لے جاسکتی تھیں۔ (ذرایلپ اسٹک مکمل کر لے نا۔)

”تمہاری جاب کا کیا بنا؟“ باہر لاؤخ میں فارس نے بظاہر توجہ سے ابا کا سوال سن گراں کی بار بار زمر کی طرف اٹھتی فکر مند نگاہیں  
اے نظر آ رہی تھیں۔

”اپنی ابھنسی میں تو کوئی چانس نہیں رہا، ایک دو پرائیوٹ سیکیورٹی ابھنسیز میں اپلائی کیا تھا، اپنیٹ کر لیا گیا ہے، کیم سے  
بوائن کرنا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ ابا نے پھر زمر کو دیکھا جو لاتعلقی سے سامنے بیٹھی موبائل پٹاپ کیے جا رہی تھی۔

”زمر!“ فارس نے عام سے انداز میں اسے پکارا تو زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ابا کو جو اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”آپ ادھر کیوں بیٹھی ہیں؟ ادھر آ جائیں نا۔“ اس نے بڑے صوفے پر اپنے ساتھ خالی نشت کی طرف اشارہ کیا۔ بڑے ابا  
ناموٹی سے زمر کو دیکھنے لگے۔

اس نے جیسے ڈھیروں غصہ ضبط کیا، بدقت مسکرائی۔ البتہ آنکھوں میں فارس کے لئے شدید تپش تھی۔

”سوری میں آپ لوگوں کو وقت نہیں دے پا رہی۔ کچھ اسی میلوں کرنا تھیں۔“ بظاہر مسکرا کر کہتی، وہ اھنی اور جب اس کے ساتھ بیٹھی تو

درمیان میں نامحسوس سافا صدر کھا۔ بڑے ابا غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھا و دیکھ رہے تھے۔

”سعدی کیا کہہ رہا تھا؟ کب آئے گا وہ۔“ فارس نے چہرہ موڑ کر اسے مخاطب کیا۔ ساتھ ہی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (بڑے ابا

دوسری سمت بیٹھے تھے اس کے مڑے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ اسے ابا کے سامنے مخاطب کر رہا تھا، اسے جواب دینا تھا۔ ”وہ.....ابھی آجائے گا تھوڑی دیر تک۔“ اندر اٹھتے ابا کو دباؤ کرو مسکرا کر بولی۔ ابا کے چہرے پر اطمینان سا چھانے لگا۔ اندر سے آتی ندرت چلنے کا کہنے لگیں تو وہ اس طرف دیکھنے لگے۔ زمر نے اسے تیز نظروں سے گھورا، مگر وہ اسی سمجھیگی سے واپس ابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ناگپر ناگپر جائے پھر سے موبائل دیکھنے لگی۔ البتہ اندر کوئی ابا سا اٹھنے لگا تھا۔ (یہ سب اتنا آسان نہیں تھا جتنا شروع میں لگا تھا۔)

”چلیں ہم ریسٹورانت چلتے ہیں، سعدی ویس آجائے گا۔“ ندرت نے جلدی چائی اور سیم نے ابا کی چیز تھامی۔ حینہ گھر کے دروازے لاک کرنے لگی۔ زمر اور فارس ساتھ ساتھ اٹھے۔ بڑے ابا نے سیم سے آہستہ سے پچھہ کہا، وہ مزکران دونوں کو دیکھنے لگا۔ پھر جلدی سے حینہ سے کیمروں لے آیا۔

”آپ دونوں کی ایک پکج لے لوں؟ امی آپ بھی آجائیں نا۔“

”نہیں میری تصویریں اچھی نہیں آتیں۔“ ندرت دوسرے کاموں میں مصروف تھیں، منع کر گئیں۔ زمر نے بھی انکار کرنے کو بھولے، پھر سیکھیوں سے دیکھا، ابا کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ جبرا مسکرا کی۔ ساتھ کھڑے فارس پر ہلکی سی نظر ڈالی۔ وہ سیاہ پینٹ پر پورے آتین اور گول گلے کی سفید شرت پہننے ہوئے تھا۔ (اس کی ساری شرٹ ایک جیسی ہوتی ہیں!) سیم کیمروں لے کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ فارس مسکرا یا نہیں، بس اسی سمجھیگی سے زمر کے ساتھ کھڑا رہا۔ البتہ وہ جبرا مسکراتی رہی۔

کلک۔ اور دکھا دختم۔ وہ اس سے پہلے ہی باہر نکل آئی۔ اب مزید اس کے قریب رہنا برداشت سے باہر تھا۔ اور یہ باہر پھیلتے اندر ہیرے کو دیکھ کر پہلی دفعہ تھا جب زمر کو ایک دم سے فکر ہونے لگی۔

”سعدی کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ کدھرہ گیا؟“ وہ خود سے بڑا بڑا۔

”بس وہ آتا ہی ہو گا۔“ ندرت عجلت سے خوشی سے گھر لاک کر رہی تھیں۔ زمر کی آنکھیوں میں تفکر بلکورے لینے لگا۔ کچھ ٹھیک نہیں محسوس ہوتا تھا۔

.....❖❖❖.....

سلوک یار سے دل ڈوبنے لگا ہے فراز ..... مگر یہ محفل اعداد ہے، کیا کیا جائے!

قصر کاردار اندر ہیرے میں ڈوبنے لگا تو ملازموں نے ساری بیان جلا دیں، اور اونچا محل چکنے لگا۔ لاونچ میں ایک ملازم گلے پر جھکا پتے تراش رہا تھا اور فیجنونا اس کے سر پر کھڑی ہدایات دے رہی تھی؛ جب ہاشم اندر داخل ہوا۔ فیجنونا فوراً اس تک آئی۔ چیچھے آتے ملازم سے ہاشم کا بریف کیس لے لیا، اور اسے جانے کا کہا۔ وہ کوٹ اتارتے ہوئے سیرھیوں کی طرف چلتا گیا۔ فیجنونا چیچھے پکی۔

”کیبات ہے، ڈزرکی تیاری نہیں ہو رہی کیا؟“

”مسرز مر نے مسز کاردار کو فون کر کے مذعرت کر لی تھی۔ مسز کاردار نے کل کے ڈزر کا کہہ دیا ہے۔“

”کیوں؟“ سیرھیاں چڑھتے ہاشم نے تعجب سے مزکر اسے دیکھا۔

”تفصیل نہیں معلوم۔ غالباً ان کے بھتیجے نے پہلے دعوت دے دی تھی۔“

”سعدی۔“ ہاشم نے رخی سامکرا کر سرجھنا کا، اور زینے چڑھتا گیا۔ فیجنونا بے چین سی چیچھے آئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو فیجنونا نے اس کا کوٹ لے لیا۔ بریف کیس بھی اختیاط سے رکھا۔

”کچھ کہنا ہے؟“ وہ ناگپر ناگپر کر کے اتارتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں موبائل نکال کر دیکھنے لگا۔

”بھی۔ مگر آپ کسی کو نہیں بتائیں گے کہ آپ کو مجھ سے معلوم ہوا ہے۔“ وہ مضطرب سی اس کے سامنے کھڑی سرجھکائے کہہ رہی تھی۔  
”بولو۔“

”مجھے معلوم ہے مجھے گھر کے ایک فرد کی بات دوسرا کو نہیں بتانی چاہیے، مگر آپ کے خاندان سے وفاداری کے باعث میں ....“  
”اپنی تقریر مختصر کر کے کام کی بات پڑ آؤ۔ مجھے تمہاری اخلاقیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ موبائل کی اسکرین کو انگوٹھے سے  
اپ کرتا جا رہا تھا۔

”بھی۔“ وہ شرمندہ سی ہو کر جلدی جلدی بولنے لگی۔ ”میں نوشیر وال صاحب کے متعلق بات کرنا چاہتی ہوں۔“

اسکرین پر انگوٹھا پھیرتے ہاشم نے چوک کرائے دیکھا۔ ”کیوں؟ کہاں ہے وہ؟“

”وہ تو صح آفس کے لئے نکلے تھے، اس کے بعد گھر نہیں آئے۔“

”کیا واقعی؟“ اسے اچنباہو۔

”مگر میں بچھلی رات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ جب...“ وہ بے چینی سے جلدی جلدی بولنے لگی۔ ہاشم ابرو سچنے متا گیا۔

❖❖❖

میرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو ..... جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر، وہ قرض آج چکا دیا  
اندھیرا آہستہ آہستہ چھوٹے باغیچے والے گھر اور اس کا لوئی کو نگل چکا تھا۔ نوشیر وال کاردار اپنی گاڑی کھیں دور کھڑی کر کے، اس  
کا لوئی کے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ ساری گلی سنسان، اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ کہیں اکادکا یو پی ایس کے از جی  
سیور جل رہے تھے۔ باقی گھپ اندھیرا تھا۔ جس کے باعث پی کیپ پہنے کھڑے نوشیر وال کا چہرہ دور سے صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہاں قریب  
سے دیکھو تو وہ کینہ تو زناظروں سے اس گھر کو گھوڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے باہر سعدی کھڑا موبائل پنہر ملا رہا تھا۔ نوشیر وال کی آنکھیں سرخ  
لگتی تھیں اور پوپوٹے سوچے سوچے سے۔ جیبوں میں ڈالے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ وہ اسی صبح والے ویسٹ نائی اور پینٹ میں ملبوس تھا۔  
یہ وقت تھا جب سعدی کھر سے نکلا تھا اور ابھی اندر زمزماں اور فارس بڑے ابا کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ موبائل جیب میں ڈالے ہیندز فری  
کانوں میں لگائے، وہ آگے بڑھنے لگا تو نوشیر وال درخت کی اوٹ سے نکلا اور اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

سعدی جیز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ابوں میں کوئی مضمونی سیئٹی گنگنا تا۔ مگن سا چلتا جا رہا تھا۔ دفتار وہ رکا۔ مڑکر پیچھے دیکھا۔ احتیاط  
سے اس کا تعاقب کرتا نوشیر وال قریبی درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ (وہاں ہر گھر کے آگے پوے یا درخت تھے)۔ سعدی نے آنکھیں سکیڑ کر  
اندھیر سڑک کو دیکھا، اور ادھر ادھر گردن گھمائی، پھر سرجھک کر آگے بڑھ گیا۔ نوشیر وال درخت کے عقب سے نکلا اور احتیاط سے فالدر کھے  
پھر اس کا تعاقب کرنے لگا۔

سعدی یوسف چلتا گیا۔ موڑ کر بچھلی گلی میں آگیا۔ یہ بھی تاریکی میں ڈوبی تھی۔ نوشیر وال یہاں بھی اس کے پیچے چلتا رہا۔ اس  
کے دل میں ہر اٹھتے قدم کے ساتھ جوش اور ابال بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک لا اٹھا جو سچنے کو بے تاب ساتھا۔  
تیرسی گلی میں مرنے سے قبل سعدی نے پھر رک کر پیچھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اچنجا ساتھا۔ گلی ویران اور خالی تھی۔ دور شاید  
کسی موڑ سائکل کے چلنے کی آواز نہیں دی۔ وہ سرجھک کر پھر سے آگے بڑھ گیا۔

ایک گلی سے نکل کر دہاگلی میں مرن جاتا۔ چند منٹ بعد نوشیر وال نے چوک کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ وہی گلی تھی جہاں سے وہ ابھی پانچ  
منٹ پہلے نکلے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ انہی تین چار گلیوں میں ہی پھر رہے تھے۔ کیا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے؟  
نوشیر وال کی آنکھوں میں برہمی در آئی۔ اندر ہی اندر شدید تملکاہٹ ہوئی۔ اس نے اپنا اور سعدی کا درمیانی فالدے بڑھا

دیا۔ دفعتاً سعدی ایک گلی کا موڑ کر دوسری میں چلا گیا تو وہ بے قدموں اس موڑ تک آیا۔

اگلی گلی سنان تھی۔ خانی، ویران۔ سعدی کہیں نہیں تھا۔

”ڈیم ات!“ غصے سے اس کا چہرہ سرفہرست نہ لگا۔ وہ ادھراً در گھوما آگے پیچھے پھرا۔ مکمل اندر ہرا۔

اس گلی میں کوئی بقیٰ نہ تھی۔ سوائے دو تین گھروں کے سڑک کے اطراف کے باقی تمام پالش پر زیر تعمیر مکان تھے یا محض سریے کھڑے تھے۔ دن میں یہاں مزدود ہوتے اور رات میں محض جنات۔ نوشیر وال اس گلی کی چوڑی سڑک کے وسط میں کھڑا شدید جھنگلا ہٹ سے آگے پیچھے ایک ایک گھر میں جھانک رہا تھا۔ وہ کہاں گیا؟

اس نے پوری گلی عبور کی۔ اندر ہرے کے باوجود اطراف میں وہ اتنا دیکھ سکتا تھا کہ سعدی ادھرنہیں تھا۔ وہ کہیں راگیر بولتے ہوئے گزر رہے تھے۔ دو چار گلیاں چھوڑ کر سڑک سے نریف کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ایسے میں اس نے رک کر سعدی کی کوئی چاپ سننی چاہی مگر پس منظر کی آوازوں کے باعث یہاں ممکن تھا۔

وہ پھر سے پچھلی گلی میں آیا۔ شدید تملکا ہٹ اور اندر بلتے غصے سے آگے پیچھے جھانا کا۔ مگر نہیں۔ سعدی جس گلی میں گم ہوا تھا، وہ وہیں ہو گا۔ چند منٹ ضائع کر کے نوشیر وال و اپس اس زیر تعمیر مکانوں والی ویران اور اندر ہیر گلی میں آیا۔

سڑک کے وسط میں کھڑے ہوئے اس نے ادھراً در کیجھ کر اندازہ کرنا چاہا کہ وہ کہاں غائب ہوا تھا۔ تبھی وہ کہیں موبائل کی گھنٹی بجی۔ اگلے ہی لمحے وہ بند کر دی گئی، مگر نوشیر وال کے لبوں پر بے اختیار مسکرا ہٹ اٹھ آئی۔

وہ آواز دا میں طرف کے ایک زیر تعمیر مکان سے آئی تھی۔ سعدی اپنا فون سالمشت کرنا بھول گیا تھا۔ نوشیر وال نے جیب سے پستول نکالا اور اسے ایک ہاتھ میں پکڑے اعتماد سے قدم اٹھا تھا اس گھر تک آیا۔

گھر کا گیٹ لگ چکا تھا، مگر اندر برہنہ اینٹوں کی عمارت کے دروازے کھڑکیاں ابھی ندارد تھے۔ گیٹ کے قریب آ کر اس نے گردن اوپنجی کر کے جھانا کا۔ وہاں بجری اور سیست کے ڈھیر کے ساتھ پوریچ میں سعدی کھڑا تھا۔ منہ دوسری طرف تھا۔

”کیا تم مجھ سے چھپ رہے تھے؟“ ظریہ انداز میں اسے پکارتے وہ گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ پاؤں سے گیٹ و اپس دھکا دے کر بند کیا۔

سعدی جو پشت کیے کھڑا تھا، اس کی نگاہیں پہلے نوشیر وال کے ہاتھ میں پکڑے پستول تک گیئیں اور پھر اس کی آنکھوں تک۔

”تم کیا کر رہے ہو یہاں، نوشیر وال؟“ بظاہر طمینان سے کہا۔

”میں تمہیں تمہارا کام دینے آیا ہوں۔“ پستول کی نال بازو لمبا کر کے اس کی طرف بلند کی۔

سفیدی شرٹ میں ملبوس چھوٹے کٹھنکریا لے بالوں والا لڑکا اداسی سے مسکرا یا۔

”میں نے کبھی کسی کی جان نہیں لی۔ میرا کام مجھے گولی کے ذریعے دینے آئے ہو؟“

”تم اسی قابل ہو۔“ اس پر پستول تا نے نوشیر وال کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ ”بہت دفعہ میں نے تمہیں برداشت کیا، سوچا ہاشم بھائی سنھمال لیں گے تمہیں، مگر نہیں۔ سعدی... تمہارا ایک ہی حل ہے۔ اس کے علاوہ تم کسی اور طریقے سے ہماری زندگوں سے نہیں نکلو گے۔“

”تم واقعی مجھے مارنے آئے ہو؟“ ابرداخا کر بلکل مسکرا ہٹ کے ساتھ اس نے تعجب کا اظہار کیا۔ اسے معلوم تھا نوشیر وال کبھی اس پر گولی نہیں چلا سکتا۔ نوشیر وال دوست رہا تھا۔

”ہاں تاکہ تم مجھے مزید نقصان نہ دو۔“

”میں نے تمہیں کبھی نقصان نہیں دیا۔ نوشیر وال۔“ نزدی سے کہتے ہوئے سعدی کا ساتھ اپنی جیب کی طرف ریگ رہا تھا۔

”زیادہ اسماڑت بننے کی کوشش مت کرو۔ اپنا موہل نکال کر زمین پر پھیک دو۔“ پستول کو مزید تانے شیر و نے برہمی سے کہا۔

سعدی نے گھری سانس لی۔ موہل نکالا اور جھک کر زمین پر رکھا۔ زمر کی کال آ رہی تھی۔ مگر... وہ سیدھا ہو گیا۔ اس نے سوچا کاش اس کا بین

کیسرہ اس کی فرنٹ پاکٹ میں ہوتا، مگر وہ بھی اس کے پاس ابھی نہیں تھا۔ نہتاً سعدی یوسف اب نوشیر وال کی تی پستول کے سامنے کھڑا تھا۔

”میرا قصور کیا ہے؟“ اندر ہیرے میں بھی اس کے چہرے کا اطمینان نظر آتا تھا۔

”انتا کچھ کرنے کے بعد تم میں اتنی بھی شرم نہیں کہ اپنا قصور پوچھ رہے ہو؟“ صدمے اور غصے سے سامنے کھڑے نوشیر وال کی آواز

کپکپائی۔ ”تم نے میری زندگی کی ہر خوشی spoil کی۔ تم نے مجھ سے میرا بھائی چھینا، میری ماں کا اعتبار چھینا، میرا باپ اس حالت میں مرا کہ وہ

مجھ سے نفرت کرتا تھا، تمہاری صرف تمہاری وجہ سے!“ بھرے ہوئے انداز میں کہتے اس کی آواز بلند ہوئی۔ آنکھوں کی سرفح اور طیش بڑھ

رہا تھا۔

”میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ اچھائی کی ہے شیر و۔“

”بکواس نہیں کرو۔“ وغیرا۔ ”آج تم اپنا منہ بند رکھو گے، آج تم مجھے سنو گے۔“

”اوکے، شیر و!“ سعدی نے سر کو تسلیما ختم دیا، البتہ بھلی دفعہ اس کے چہرے پر چھایا اطمینان، قدرے پر بیٹھا گئی میں بدلتا نظر آیا تھا۔

””میرا نام نوشیر وال ہے!“ وہ غصے سے پھیلی آنکھوں کے ساتھ چلا یا۔ پستول ہنوز تان رکھی تھی۔“ مجھے اس نام سے مت پکارو جس

سے میرے دوست پکارتے ہیں۔ تم میرے دوست نہیں ہو۔ تم ایک احسان فراموش آدمی ہو۔ تم... تم نے میرا ہر رشتہ خراب کیا ہے۔ تم نے میرا

اور شیری کا تعلق بھی خراب کیا ہے۔“

”میں نے شہریں سے....“

”اپنی بکواس بند رکھو سعدی!“ غضباً کا ہو کر اس نے کلک کے ساتھ پستول لوڑ کیا۔ سعدی کو سرخ تھی جلتی بھتی محسوس ہونے لگی۔

”تم نے شیری کو بلیک میل کیا، تم نے میرے اور اس کے ہر ممکنہ تعلق کو خراب کیا۔... تم ہمیشہ میرے ساتھ ہی کرتے ہو۔ تم اس قابل

نہیں ہو کر تمہیں زندہ چھوڑا جائے۔“

”مجھے تمہارے اور شیری کے بارے میں کچھ نہیں پتہ۔ مگر میں نے اسے بلیک میل نہیں کیا۔ میں مزید کوئی صفائی نہیں دوں گا، مگر تم

مجھ سے میری زندگی نہیں چھین سکتے۔“ وہ سنجیدہ نظریں نوشیر وال پر جائے، تھہرے ہوئے لبھ میں کہہ رہا تھا۔ یہ زندگی اللدنے مجھے دی

ہے، کسی انسان کو حق نہیں ہے کہ وہ مجھ سے میری زندگی چھیٹے۔“

اندر ہیرے پورچ میں، پینٹ کے ڈبوں، بھری اور سیمٹ کے ڈھیر کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے ان دونوں لڑکوں کے چہرے

اندر ہیرے میں مدھم سے دکھائی دیتے تھے۔ دونوں کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا اور نظریں ایک دوسرے پر جی تھیں۔

”آج تم مجھے روک نہیں سکتے۔ میں نے تم کھائی تھی تمہیں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔“ تھہر، حقارت سے اسے دیکھتے شیر و نے

دوسرے ہاتھ کے کاف سے مندرجہ۔ سعدی کی آنکھیں سکڑیں۔ نظریں اس کے پستول بکڑے ہاتھ تک گئیں۔ جو بلکا ساکپکپا رہا تھا۔

”تم پھر سے ڈرگز لینے لگے ہونا۔ ایسا مت کروا پس ساتھ شیر و۔“ اس کی آنکھوں میں فکر مندی ابھری۔

”اپنی بکواس اپنے پاس رکھو۔ آج تمہاری باتیں مجھ پر اڑنہیں کر سکتیں۔ آج تم نے اپنے ہر عمل پر مہر لگادی ہے۔“ تھہر سے اسے

دیکھتا وہ غریبا تھا۔ ”آج تم نے میرے خاندان کو دھمکایا ہے، میرے بھائی کو دھمکایا ہے، میں تمہیں عبرت کی مثال بناؤں گا۔“ اس کے چہرے پر

پیش آ رہا تھا۔

کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھوala؟

”تم ایک اچھے انسان ہو شیر و تم اپنے بھائی جیسے نہیں ہو۔ تمہارے بھائی نے میرے خاندان کے دلوگ قتل کروائے ہیں، زمر کی زندگی بر باد کی ہے، فارس کو تباہ کیا ہے، میرا ان سے جو بھی مسئلہ ہے تم سے کبھی بھی شکایت نہیں رہی۔ تم اندر سے اچھے ہو۔ تم اپنے والد کی طرح ہو۔ غصے کے تیز ہو، مگر تمہارا دل اچھا ہے۔“

”نام بھی مت لینا میرے باپ کا۔“ اس کی آنکھیں مزید سرخ ہوئیں، آستین سے منہ رگڑا۔

”دیکھو جو صحن میں نے تمہیں کہا، غصے میں کہہ دیا۔ آئی ایم سوری نو شیر وال مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ وہ محتاط نظر وہ سے اس کے پسول کو دیکھتا سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کا اندر ہیرا ان دونوں کے گرد مزید مہیب ہوتا جا رہا تھا۔

”تمہاری معدرت کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ نفرت سے اسے گھوڑتے شیر و نے دائیں طرف تھوکا۔

”دیکھو، تم میرے مسلمان بھائی ہو۔ مجھے مارنا چاہتے ہو، مار دو۔ تم اگر مجھ پہ ہاتھ اخھاؤ گے، میں تب بھی تم پہ ہاتھ نہیں اخھاؤں گا۔ تم پوائش بلینک پہ مجھے شوت کر کے چلے جاؤ۔ کوئی یہاں نہیں ہے، مگر شیر وال اللہ دیکھ رہا ہے۔ اللہ تمہیں کبھی یہ منظر ہونے لئے نہیں دے گا۔ قتل بہت بڑا لگت ہے، اتنا بوجھ تم پوری زندگی کیے اخھاؤ گے؟ دیکھو شیر و تم...“ رسان سے چونکے کے انداز میں وہ سمجھاتے ہوئے کہے جا رہا تھا۔ مگر نو شیر وال نے ٹریگردد بادیا۔

سائکنیس نے آواز دبای۔ کلک ہوا۔ ایک گولی شعلے کی لپیش لئے نکلی اور سعدی کے پیٹ میں پیوسٹ ہو گئی۔ خون کا فوارہ پھوٹا۔ وہ بے اختیار آگے کو جھکا۔ پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے بے یقینی صدمے سے پھیل آنکھوں سے نو شیر وال کو دیکھا۔

(میں نے تمہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا..... تمہارے ڈیڈ فلکر مند تھے نو شیر وال.... تمہیں نیچے جا کر انہیں ان کے بیٹے کی شادی کی مبارکباد دینی چاہیے۔)

شعلے بار نظر وہ سے اسے گھوڑتے نو شیر وال نے تنے بازو کے ساتھ دو پارہ ٹریگردد بایا۔ دوسری گولی، اس کے کندھے میں جاگی۔ وہ دہرا ہو کے گھٹنوں کے بل زمین پہ جاڑھا۔ درداتا شدید تھا، اس کے لبوں سے کراہیں نکلنے لگیں۔

(میں تمہیں ایک کہانی ساختا ہوں نو شیر وال۔ میں ایک ایسے لڑکے کو جانتا ہوں جس کا باپ اسکوں پیچر تھا.....)

”آہ.... آہ.... آہ....“ تکلیف سے چبرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ اور سفید شرست بھی سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ نو شیر وال قدم قدم چلتا تھا۔

”میں نے کہا، مجھے شیر و مت کہو۔ میرا نام...“ اس نے بوٹ سے سعدی کے منہ پہ ٹھوکر ماری۔ وہ کمر کے بل زمین پہ گرا۔ ”.... نو شیر وال ہے۔“ حقارت سے کہتے، اس کے ساتھ کھڑے، گردن جھکائے اس نے سعدی کو دیکھا۔ وہ تیزی سے بہتے خون کے ساتھ زمین پہ گرا پڑا تھا۔ بوٹ جہاں پہ لگا تھا، وہاں منہ سے خون رنسنے لگا تھا۔ درد بے حد شدید تھا۔ اس کا جسم جل رہا تھا۔ وہ کراہنا چاہ رہا تھا مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ سفید پڑتے چہرے اور بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنے سر پہ کھڑے نو شیر وال کو دیکھا۔ وہ ہاتھ جھکائے، ابھی تک اس پہ پسول تانے ہوئے تھا۔

(اس سب کے بعد ڈیڈ مجھے کیا سمجھتے ہوں گے؟ صرف اپنا بیٹا!

”یہ میرے باپ کے لئے تھا۔ اور یہ....“ اس نے دوسرے بازو سے منہ رگڑتے اس کی طرف پسول تانے ٹریگردد بایا۔ گولی کہاں لگی، نو شیر وال کی آنکھوں کے آگے منیاں کے باعث بار بار چھاتے غبار نے ٹھیک سے معلوم نہ ہونے دیا۔ سعدی کی ٹانگ خون میں بھیکتی دکھائی دے رہی تھی۔ ”اور یہ شیری کے لئے ہے۔“ اس نے لڑکھڑا آواز میں چلا کر کہا۔

نیچے گرے سعدی کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ درد اس کے دل تک کو کاٹ رہا تھا۔ ”اللہ....“ اس سے شدید تکلیف کے

۱۰۹ بہ انہیں جارہا تھا۔ ”اللہ تم سے... حساب لے گا... آہ...“ اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کے آگے اندر ہرا چمارہا تھا۔ پھر انوشیروال دھنڈ لارہا تھا۔

”مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں ہے۔“ شدید نفرت سے اسے دیکھتے شیر و نے بوٹ سے اس کے سر کو ٹھوکر ماری۔ سعدی کا زخمی چہرہ، ہے! حک گیا۔ ”تم ابی قابل ہو!“ اس نے بوٹ سے اس کے وجود کو چند اور ٹھوکریں ماریں۔ کتنی اور کدھر، حساب کتاب کھو گیا تھا۔ بالآخر صاحب لارہا اور ادھر ادھر دیکھا۔

وہ اندر ہیرے پورچ میں کھڑا تھا، اس کے قدموں میں خون للت پت سعدی گرا پڑا تھا۔ آگاہی، اس کے دماغ کو چڑھی کو کہیں ہرنے لگی تھی۔ وہ تیزی سے جھکا، سعدی کا موبائل اٹھایا، جس پر خون کے محض چند قطرے گئے تھے، اور اسے جیب میں ڈالے مزگیا۔ اب اسے ہلاہ ت جلد یہاں سے لکھنا تھا۔

تب ہی.....

.....❖❖❖.....

دل تجھ سے پھر کر بھی ..... کہاں جائے گا اے دوست!

فوڈی ایور آفڑ کی ساری بیان جلی تھیں، باہر ”کلوڑ“ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر تمام میزیں خالی تھیں، سوائے درمیان میں ایک لمبی میز کے سامنے کردارہ سب منتظر سے بیٹھے تھے۔ فارس خاموشی سے بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا، پھر ذرا کمی ذرا نگاہ زمر پر ڈالتا جوینے پر بازو پیشی، اٹھنے پہلی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا، اور نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھتی تھیں۔

”آجائے گا۔ تم بیٹھ جاؤ۔“ بڑے اپانے نری سے پکارا۔ ان کی وہیل چیز لمبی میز کی سربراہی نشست کی جگہ پر رکھی تھی۔ فارس ان لے دائیں ہاتھ پہلی کرسی پر تھا۔ ایک کرسی (زمر کے لئے) چھوڑ کر جنین بیٹھی تھی۔ وہ بھی گاہے بگاہے وال کلاک کو دیکھتی، پھر چہرے پر اٹھی آ جاتی۔

ندرت، جنید اور سیم کے ساتھ کچکن میں تھیں۔ باقی سب کی چھٹی تھی۔ سیم غالباً مد کروانے کی بجائے کام بڑھا رہا تھا۔

”اتی دیر ہو گئی، وہ اپنی گاڑی بھی نہیں لے کر گیا یعنی قریب میں کہیں گیا ہے، تو واپس کیوں نہیں آ رہا؟“ وہ بظاہر خود کو پرسکون رکھتے۔ بیٹھے بولی تو آواز میں فکرمندی چھپلتی تھی۔

تجھی ریسورانت کا ڈنٹر پر رکھا فون بجا۔ چھتی ہوئی آواز۔ نہلکی زمر کی، چونک کرفون کی سمٹ دیکھا۔ کچکن سے جنید بھاگتا ہوا آیا، اور تقدی سے ریسیور اٹھا کر بولا۔ ”فوڈی ایور آفڑ۔“ دوسرا طرف کہے جانے والے الفاظ پر اس کے تاثرات بدلتے گئے۔

”جی..... جی.... اچھا... کدھر؟“ نگاہیں اٹھا کر زمر کو دیکھا۔ وہ وہیں ساکن کھڑی اسے دیکھے گئی۔

”اوکے۔“ فون رکھ کر وہ چند لمحے تذبذب سے وہیں کھڑا رہا۔ سب اس کو دیکھنے لگ گئے تھے۔

”کیا ہوا؟“ فارس نے اس کی مسلسل زمر پر جمی پریشان نگاہیں غور سے دیکھیں۔

”وہ..... میرا بھائی تھا۔ میڈم میں نے جو کام آپ کو کہا تھا...“ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ زمر نے اثبات میں سر ہایا تو وہ جلدی سے بیروفی دروازے کی طرف بڑھا۔ ”آپ میری بات سن لیں گی دو منٹ؟“ وہ قدم قدم چلتی اس کے پیچھے آئی۔ بڑے ابا، نین اور فارس سب ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

باہر نکلتے ہی جنید نے ریسورانت کا شکشے کا دروازہ بند کیا اور بے حد پریشانی سے اس کی طرف گھوما۔ ”وہ... اندر سعدی بھائی کے ادا... ان کے سامنے بتانا نہیں چاہیے اور....“

”سنوجو بھی تھا راتا میں ہے، کس کا فون تھا؟“ اس نے بات کائی۔ بے قرار نگاہیں جنید کی آنکھوں پر جمی تھیں۔

”وہ.... سعدی بھائی... پستال سے فون تھا۔ سعدی بھائی کو گولیاں لگی ہیں اور...“ شاید وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر زمزمل کے پر باتھے رکھتی دو قدم پیچھے ہی۔ اس کو سانس نہیں آ رہا تھا۔ چہرہ زرد پڑنے لگا تھا۔

”میری.... میری کارکی چاپیاں... اندر سے لاو۔“ اس نے پوری بات سنی بھی نہیں۔ وہ گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ قدم اٹھا کہیں رہی تھی، وہ پڑکہیں رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے بہت سے مناظر گذرا ہونے لگے۔ اطراف کی ساری آوازیں بند ہو گئیں۔ ہرش سلو موش میں ہو رہی تھی۔

وہ کار کے دروازے کے ساتھ کھڑی تھی۔ جنید نے چابی اس کے ہاتھ میں تھامی۔ اس نے کی ہوں میں چابی ڈالنی چاہی۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ لوہا سوراخ کے اندر نہیں جا پا رہا تھا۔ دروازے کے سائیڈ میر میں اسے فارس باہر آتا دکھائی دے رہا تھا۔ پریشان سی حدا اس کے پیچھے زینے پھلا گئی آ رہی تھی۔ وہ جنید سے کچھ کہہ رہا تھا، تیز لمحے میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ دروازے میں زمر تک نہیں آ رہی تھیں۔ وہ لرزتے ہاتھوں کے ساتھ چابی دروازے میں لگا رہی تھی۔ ریموٹ کے بٹن کو دبانتا یاد نہیں رہا تھا۔

”مجھے دیجئے۔ آپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھئے۔“ وہ عجلت میں کہتے اس کے عقب سے آیا اور چابی اس کے ہاتھ سے لینی چاہی۔ مگر اس نے چابی مٹھی میں دبوچے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ پھر سفید چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تو آنکھیں ویران ہی تھیں مگر ان میں سامنے کھڑے شخص کے لئے واضح تنفس نظر آتا تھا۔

”آپ اکیلی نہیں جا رہیں، ہم ساتھ جائیں گے، ادھر دیجئے۔“ بہت ضبط سے کہتے فارس نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چابی لی۔ اس کا اپنا چہرہ بھی بے رنگ ہو رہا تھا مگر پریشانی کے تاثرات پر عجلت کا عنصر نمایاں تھا۔ زمر نے نگاہیں جھکائیں تو دیکھا، چابی سوراخ میں گھساتے اس کے ہاتھوں میں بھی بلکل سی لرزش تھی۔

”وہ ٹھیک ہو جائے گا، اسے کچھ نہیں ہو گا، آپ اندر بیٹھئے۔“ ذرا یوگ سیٹ پر بیٹھتے اس نے زمر سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ وہ چند لمحے دیں، بے دم سے کھڑی رہی۔ خنین جو جنید اور فارس کی بات سننے کے بعد اندر چلی گئی تھی، بھاگتی، ہوئی واپس آئی تھی۔

”میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ فارس کی کھڑکی کے ساتھ کھڑے وہ رو دینے کو تھی۔ زمر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی فرنٹ سیٹ تک جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے بار بار اندر چھارہ اچھارہ رہا تھا۔ پس منظر میں آوازیں آ رہی تھیں۔

”میں تمہیں کال کر دوں گا، تم اپنی ای اور دادا کے پاس رکو۔“

”میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ بھائی نے کہا ہے انہیں دیر ہو جائے گی اور ہم مار کیٹ تک جا رہے ہیں۔ خدا کی قسم ماموں اگر آپ مجھے نہ لے کر گئے تو میں اتنا چیخوں گی، اتنا چیخوں گی کہ امی اور بڑے ابا کو سب پتہ چل جائے گا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہرہ رہے تھے اور، فقرے کے آخر میں اس نے بھکلی لی تھی۔

”بیٹھو!“ یا آخری آواز تھی جو زمر نے سنی اور پھر وہ بے دم سی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کار تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی تھی، مگر اس کی آنکھوں کے آگے سب کچھ گذرا ہو گیا تھا۔ وہ ادھر نہیں تھی۔ وہ ہاپسٹل میں تھی اور اس کے بھائی نے ایک کبل میں لپٹا پچھا اس کے بازوؤں میں دیا تھا۔ وہ حال اور ماضی کے درمیان کہیں تیر رہی تھی۔



کبھی فراز نئے موسوں میں رو دینا..... بھی تلاش پر انی رقبتیں کرنی!

قصر کاردار کے لاڈنخ میں لگئی دی ویلیف پیغمبر نا کتاب میں ترتیب سے رکھ رہی تھی جب اس نے نوشیروان کو اندر داخل ہوتے

ایسا۔ وہ فوراً سر جھکائے جلدی جام کرنے لگی۔ نوشیر وال سیدھا یہ ہیوں پہ چڑھتا گیا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑا ہٹتی اور سمل آنکھوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ دور کسی خیال میں گم ہے۔ کسی اطمینان انگیز سرشار سے خیال میں۔

اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر ساری بیانات جل رہی تھیں۔ اتنی تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ناگواری سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ساکت رہ گیا۔

سامنے کا دیچ پہ ہاشم بیٹھا تھا۔ صبح والی شرت اور پیٹ میں ملبوس تھا۔ نائی اور کوت اتارنے کے بعد اس نے لباس بھی نہیں پہلا تھا۔ اور اب ناٹنگ پٹا نگ جائے بیٹھا وہ جھبھتی نظروں سے چوکھت میں کھڑے شیر و کود دیکھ رہا تھا۔

”رک کیوں گئے۔ اندر آؤ۔“ ظریز سا بولا تو نوشیر وال نے (بظاہر) سرسری سا سر جھکا۔ ہاتھ میں پکڑا کوت بید پڑا۔

”آپ ادھر....؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے مجھے تمہاری حرکتوں کے بارے میں معلوم نہیں ہو گا؟“ سلگتی نظر وہ غصے سے ایک دم پھنا تھا۔ ”کیا سوچ کر تم نے یہ کیا، ہاں؟“

نوشیر وال کا سانس رک گیا۔ پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

(ہاشم بھائی کو اتنی جلدی کیسے پتہ چل سکتا ہے؟ ابھی تو وہ ہیں خون میں گرا پڑا ہو گا۔)

”وہ.... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں سمجھنا نہیں۔“ انک انک کریں سفید پڑتے چہرے کے ساتھ اس نے کہنا چاہا۔ جواب میں ہاشم نے ہاتھ بڑھا کر میز پر کھکھت اٹھائے اور زور سے اس کے گھٹنوں پر دے مارے۔ سارے پیکٹ شیر و کے قدموں میں جا بکھرے۔

”اوہ.... یہ...“ ایک ریلیف کا احساس تھا جس نے شیر و کا سانس بحال کیا۔ اس کے چہرے کی رنگت واپس آنے لگی۔ ذرا سے

شانے اچکا کر دہ الماری کی جانب بڑھا۔ ہاشم ایک دم تپ کر اٹھا۔

”تمہیں اندازہ ہے یہ کیا ہے؟ یہ تمہاری بر بادی ہے۔ تم....“

”کس نے بتایا آپ کو؟“ وہ بے پرواہی سے الماری کھولے اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

”کس نے بتایا مجھے؟ یعنی کہ اور لوگوں کو بھی معلوم ہے؟ کیا صرف میں بے خبر تھا؟“ وہ الثاثتے غصے سے بولا کہ نوشیر وال کو اس کی سچائی پڑ رہی تھی۔ وہیے بھی یہ مسئلہ اب کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

”شیر وال اگر آئندہ میں نے تمہیں دیکھا کرم....“

”نہیں لوں گا ڈر گز، بس ٹھیک ہے، سن لیا ہے۔“ وہ بے زاری سے بولا تھا۔ ہاشم ایک دم رک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں کچھ بدلا ہوا تھا۔

”کہاں سے آ رہے ہو تم؟“ کھوجتی نگاہوں سے اس کی پشت کو دیکھتے اس نے جس انداز میں پوچھا، نوشیر وال نے چونکہ کرچہ گھما یا پھر فراظ نظریں چڑک رہا پس ہونے لگا کہ....

”ادھر میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ، کہاں سے آ رہے ہو تم؟“ نوشیر وال نہ چاہتے ہوئے اس کی جانب مڑا۔

”میں باہر تھا۔ یونہی آگے پیچھے۔“

”جھوٹ مت بلو۔ کدھر تھے تم؟“ اس کی آنکھوں سے لمحے بھر کو بھی نظریں ہٹائے بغیر ہاشم اسے دیکھے جا رہا تھا۔ شیر و نے اتنا کہ ادھر ادھر دیکھا۔

”کیا میں بچہ ہوں جو ہر بات کی روپورث دیا کروں؟“

”تم....ہاشم کچھ سوچتے سوچتے چونکا۔“ تم سعدی کے پاس تو نہیں گئے؟“

”میں کیوں جاؤں گا اس کے پاس؟“ وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”مجھے معلوم ہے تم اسی کے پاس گئے ہو گے۔ پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیا ہو گا تم نے اسے۔ میں لکنی دفعہ تھیں کہوں گا کہ اسے تنہا چھوڑ دا میں اسے سنبھال لوں گا۔ کہاں ہے وہ اس وقت؟“ جیب سے موبائل نکالتے ہاشم نے پوچھا تھا۔

”مجھے کیا پتہ دہ کہاں ہے۔ کیا میں اس کا گارڈ ہوں؟“ وہ گزر کر بولا تھا۔ اس کے انداز پر نمبر ملاتے ہاشم نے صرف اسے گھورنے پر اکتفا کیا، پھر موبائل کان سے لگایا۔ نوشیر وال خنگی سے مند میں بڑبڑا نہ لگا۔

”کیا کہا ہے تم نے اسے؟ تم مجھے بتا دو ورنہ وہ مجھے بتا دے گا اور....“ موبائل کان سے لگائے وہ درشتی سے کہہ رہا تھا جب بیٹھا پر گرے شیر و کوٹ میں کچھ قھر تھرانے لگا۔ ان دونوں نے اس طرف دیکھا۔ شیر دکار نگ پھیکا پڑا اور ہاشم... وہ چوک کر قدرے تعجب سے آگے بڑھا، اور کوٹ میں ہاتھ دال کر نکالا تو سعدی کا دا بھریشن پر لگا فون ہاتھ میں تھا۔ اس نے بے یقینی سے شیر و کوڈ دیکھا جو بالکل چپ کھڑا تھا۔

”یہ اس کا فون تھاہرے پاس کیا کر رہا ہے؟“ دونوں فون اس نے بیٹھ پڑا لے اور اب جب وہ شیر و کے سامنے آیا تو عنصیل نگاہوں میں بے پناہ بخوبی تھی۔ ”بولو۔“

نوشیر وال نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”میں نے اسے شوٹ کر دیا ہے اور اس کا فون انھالا یا ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔“ ہاشم نے اکتا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے سیدھی طرح بتاؤ کیا کہہ کر تم نے اس کا فون چھینا ہے؟ تم ایسا...“

”کیا آپ نے سنا نہیں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر چاچا کر بولا۔ ”میں نے سعدی کو شوٹ کر دیا ہے۔“ پھر تیزی سے آگے بڑھا، کوٹ اٹھا کر اندر سے پستول نکال کر اس کے سامنے میز پر ڈالی۔ ”پوری تین گولیاں ماری ہیں۔ اب نہیں بچ گا۔“ اعتراض نے کوئی سرشاری سی سارے وجود پر انذیل دی۔ گردن کڑا اک اس کے سامنے کھڑے وہ بولا تو ہاشم بالکل تھہر کر اسے دیکھنے لگا۔ سانس روکے شل سا۔

”میں نے آپ سے کہا تھا نیا یہ وہ مسئلہ ہے جسے آپ نہیں سنبھال سکتے۔ سو آج میں نے مسئلہ ختم کر دیا۔“

کمرے میں سنا چھا گیا۔ ہاشم کے ذہن کو اس کے الفاظ سمجھنے میں چند لمحے لگے تھے اور جب سمجھ آیا تو.... اس کی آنکھیں بے یقینی سے چھیلیں چہرے پر سرفہری اتری۔ وہ آگے بڑھا ہا شم آگے اور نوشیر وال کے چہرے پر چٹاخ چٹاخ دوچھڑ لگائے۔ وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھا۔ بوکھلا کر دوسرا طرف لڑکھ رہا، دیوار کا سہارا لے کر سنبھلا اور منہ پر ہاتھ رکھنے کے لئے یقینی سے ہاشم کو دیکھا، جو تیز تیر سانس لیتا تھا۔ صدمے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے.... تم نے اسے گولی مار دی؟ اوہ میرے خدا! تم.... تم گھٹیا انسان.....“ اس کا گریبان پکڑ کر غصے سے اس کو جھٹکا دیتے، وہ چلا یا تھا۔ ”تم نے کیسے اسے گولی مار دی؟ کہہ ہے وہ؟ کہہ پھینک آئے ہوا سے؟“

بالکل گنگ ہوئے شیر و کاگر یا بن جھوڑ اور ماتھے پر ہاتھ رکھنے کے ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔ اس کا دماغ گویا بھک سے اڑچکا تھا۔

”وہ مر تو نہیں گیا؟ کیا وہ زندہ تھا جب تم وہاں سے آئے ہو؟ بتاؤ؟“ غصے کی جگہ پر یثاثی نے لے لی، وہ دوبارہ اس کی طرف رکا۔ شیر و کا سر خود بخود دشابت میں ہل گیا۔

”اوہ میرے خدا.... نوشیر وال یہ تم نے کیا کیا؟ تم کیسے اس کی جان لے سکتے ہو؟“لامت بھری نظر وہ اسے دیکھا تو وہ متوجہ ہوا۔

”آپ کو کیوں اس کی اتنی فکر ہے؟ کیوں اتنی محبت ہے آپ کو اس سے؟“

”نوشیر وال!“ ہاشم نے آگے بڑھ کر اس کو نندھوں سے پکڑ کر جھوڑا۔

”اس نے... تہاری... جان بچائی تھی! کیا تم بھول گئے ہو؟ کیا تم نے اس شخص پر گولی چلائی جس نے تمہاری جان بچائی تھی؟“

اور ایک لمحے کو نو شیر وال کا دل بالکل خالی ہو گیا۔ وہ کنکر ہاشم کا پھرہ دیکھنے لگا۔ وہ اسے چھوڑ کر پھر سے ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا تھا۔

اسے سمجھنیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔

”یہ... یہ فون اور گن اسے تم ہاتھ بھی نہیں لگا دے گے اب۔“ دنوں چیزیں اٹھاتے ہوئے اس نے بختنی سے اسے تنہیہ کی۔ پھر انہاموں کا اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ اگر تم اس کرے سے نکلے تو میں تہاری جان لے لوں گا۔ سمجھے؟۔ پتے نہیں وہ بچایا نہیں۔ ”فون کا ان سے لگا تھا“ اسیز سانسوں کے درمیان اور بے رنگ ہوتے چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

”ہاں خاور، فوراً گھر آؤ۔ جلدی... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“ عجلت سے کہتا، گن اور فون لئے وہ کرے سے باہر نکل گیا، تو پہپہ ہر طرف ویرانی اور خاموشی چھا گئی۔ نو شیر وال دنوں ہاتھ پہلو میں گرانے ہنوز ہا بکا سا کھڑا تھا۔

❖❖❖

میرے صبر پر کوئی اجر کیا؟ مری دو پھر پر یہ ابر کیوں؟ ..... مجھے اوڑھنے دے اذیتیں، مری عادتیں نہ خراب کر!

ہسپتال میں دو ایکوں کی بوکے ساتھ کوئی خوست تھی جو ہر سو پھیل تھی۔ یہ وہ عمارت تھی جہاں انسان کو اس کے دکھ لے کر آتے تھے۔ اپر بیشن تھیز کے باہر جگد جگہ پولیس الہکار دکھائی دیتے تھے۔ راہداری میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ فارس بے چینی سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔ ار بار اڑ کر بند دروازوں کو دیکھتا، اور پھر مزکو جزو دیوار سے لگی، سفید چہرہ لئے بالکل خاموش، گم صم کھڑی تھی۔ اس کی نظریں دروازے پر جمی تھیں، اور ان میں زمانے بھر کی ویرانی تھی۔ وہ روئی نہیں تھی۔ سواس کا ہلکا میک اپ، آویزے، خوبصورت لباس و یہی دمک رہے تھے، مگر چہرے کی بے رونقی نے سب ویران کر دیا تھا۔ واحد آواز نہیں کے رو نے کی تھی۔ وہ زمر کے قریب کھڑی، سر جھکائے، گھٹا گھٹا ساروںے جارہی تھی۔ پھر ان نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔ گلی آنکھوں سے فارس کو دیکھا۔

”ماموں..... اتنی دیر ہو گئی۔ یہ لوگ باہر کیوں نہیں آتے؟ کوئی کچھ بتاتا کیوں نہیں ہے؟“

فارس نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ”سر جری ہو رہی ہے وقت لگے گا۔ اگر دوبارہ امی کافون آئے تو وہی کہنا جو پہلے کہا ہے کہ ہم مدی کے کسی دوست کے لئے ادھر ہیں...“

”مگر بھائی کو کون گولی مار سکتا ہے؟“

”ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ تم بس دعا کرو۔“ وہ سر حکمتتے دوبارہ شنبے نے لگا۔ حنف چونکی ”دعا“ اسے کچھ یاد آیا۔

”میں.... میں اب نہیں روؤں گی۔“ اس نے ہتھیلی کی پشت سے گلی آنکھیں رگڑیں۔ اور دو پہر سر پر رکھ کر چہرے کے گرد لپیٹنے لگی۔ ”میں دعا کروں گی۔ دعا کے علاوہ کوئی چیز مقدر نہیں بدلا کرتی۔“ آنسو بار بار ابل کر آرہے تھے وہ پوروں سے ان کو صاف کرنے لگی۔ ”میں دعا کروں گی۔ دعا کے علاوہ کوئی چیز مقدر نہیں بدلا کرتی۔“ جو زیادہ شدید ہو گی وہ جیت جائے گی۔ مجھے یقین ہے۔ اب دیکھنے کا آپ میں اعلموں گی اور کیسے بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ ہے نا؟“ آخر میں ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ وہ چلتے چلتے اس کے پاس ٹھہر اداسی سے اس کا چہرہ ایسا، پھر اس کا چہرہ تھپٹھپا کر اپنے کندھے سے لگایا۔ نہیں کے گرم گرم آنسو پھر سے گرنے لگے۔

”دعا کرو۔“ اس کا سر تھپک کر وہ اس سے علیحدہ ہوا تھدہ اثبات میں گردان ہلاتی، ہاتھوں کا پیالہ بنائے، زیر لب کچھ بڑھانے لگی۔

فارس نے دوبارہ قدم اٹھاتے ہوئے زمر کو دیکھا جو ہنوز سر دیوار سے نکائے بٹ بنی دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اعلیٰ، ویران تھیں۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور فارس کا ریڈور کا موڑ مڑ گیا۔ چند لمحے بعد جب واپس آیا تو ہاتھ میں شاپر میں لپٹی ٹھنڈے پانی

کی بوتل تھی۔

حدہ کے قریب آ کر اس نے بلکا سا اس کے کندھے کو چھو۔ حدہ نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اپنی چھپھو سے کہو پانی پی لیں۔“ بوتل شاپ سے نکال کر اسے تھما تے سرگوشی کی۔ حدہ نے چونکہ کر زمر کو دیکھا جو تھیز کے دروازے کو تک رہی تھی۔ پھر فوراً بوتل لے کر اس تک آئی۔ ”چھپھو.... پانی پی لیں۔“ اس نے زمر کی کہنی چھو کر کہا تو وہ چوکی۔ چوڑہ پھیر کر اسے دیکھا۔ پھر بے اختیار نگاہیں اور فاصلے پر کھڑے فارس کے ہاتھوں تک جا ٹھہریں۔ خالی شاپ۔ اس نے دوبارہ بوتل کو دیکھا۔

”مجھے پیاس نہیں ہے۔“ وہ بنا تاثر کے کہہ کر رخ پھیر گئی۔

”تھوڑا سا ہی پی لیں۔“ مگر زمر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ حین نے بے بھی سے فارس کو دیکھا، وہ گہری سانس لے کر وہاں سے ہٹا اور راہداری میں چکر کاٹنے لگا۔

انتظار بہت تکلیف وہ تھا۔

❖❖❖

اب کے ہم پھرے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں ..... جس طرح سوکھے ہوئے بچوں کتابوں میں ملیں آپریشن تھیز کے اندر، میز پر سعدی اپنے اوپر جھکے لوگوں، خود سے جزی نالیوں اور اپنے ماں کو کامٹے اوزاروں سے بے خبر، بند آنکھوں سے لیتا تھا۔ اس کی پلکوں کے پیچھے ایک اور دنیا تھی۔ وہاں نہ خون تھا، نہ تھیار تھے۔

نہ گولیاں..... نہ تکلیف..... نہ آنسو.....

وہ ایک تازہ سی صبح تھی جس میں چڑیوں کی چچہا ہبٹ گونجتی تھی۔ ایک چشمہ تھا، جس کے کنارے پتھروں پر ایک گھنگریا لے بالوں والا لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے گورے سفید پیر مختدے پانی میں ڈبو رکھے تھے۔ ساتھ والے پتھر پر ایک لڑکی بیٹھی تھی، جس کے لمبے گھنگریا لے بال کمر تک آتے تھے اور وہ جھک کر پانی میں باس کی لمبی چھپڑی سے لکریں بھیجن رہی تھی۔ اس کی ناک میں سونے کی بالی جیسی نتھی اور کم عمر چہرے پر سوچ کا غصہ تھا۔ اس نے بھی پا جامدہ ذرا اوپر فولڈ کر کے پیڑ پانی میں ڈبو رکھے تھے۔

”مگر...“ لڑکے نے قدرے فلکر مندی سے چوڑہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”موی علیہ السلام تو پیغمبر تھے نا، اتنے بہادر اور اپنے...“ پھر وہ فرعون کے پاس اکیدے کیوں نہیں گئے؟ انہوں نے کیوں کہا کہ انہوں نے ہاروں کو ساتھ لے کر جانا ہے؟ کیا ان کی زبان میں واقعی لکنت تھی؟“ ”ارے نہیں۔“ لڑکی نے دامیں باسیں گرد़ن ہلاتی۔ ”انبیاء جو ہوتے ہیں نا سعدی وہ معصوم اور عیوب سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ عقیدہ اگر تمہارا درست نہیں تو تم مسلمان نہیں ہو سکتے۔ ان کی زبان میں کوئی لکنت نہیں تھی۔ یہ صرف اسرائیلیات کی وہ روایتیں ہیں جن کو مسلمان مفسرین بغیر کسی ثبوت یا دلیل کے quote کرتے رہتے ہیں۔ موی کی زبان میں لکنت نہیں تھی، وہ صرف بہت فضح نہیں تھے اور ان کے بھائی ہاروں زیادہ اچھا بول سکتے تھے۔“

”تو کیا صرف اس نے وہ لے کر گئے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ؟“ لڑکے نے کنکر پانی میں اچھا لئے پوچھا تھا۔

”ہاں اور اس لئے بھی کہ جو سپورٹ انہیں چاہیے تھی، وہ ان کو اپنے بھائی سے ہی مل سکتی تھی، کیونکہ ہر انسان اپنے بھائی کا رکھو ॥“ ہوتا ہے۔

دوسرے انکلر پھینکتا اس کا ہاتھ رکا، وہ تھہر کر اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔

”مگر میرا تو کوئی بھائی نہیں ہے، پھر میرا Keeper کون ہوگا؟“

وہ لڑکی بھلکی سی بھی، پھر بازو اس کے کندھے کے گرد پھیلا کر اسکے قریب چوڑہ کر کے بولی۔ ”تمہاری Keeper میں ہوں۔ میں

لیں ہمیشہ پر ویکٹ کروں گی۔ ہمیشہ....، آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔ جسے کا منظر وقت کے آسمانوں میں گھلتا گیا۔... گھلتا گیا۔ اور نیبل پر لیئے م ایس کی بنداگیوں کے پچھا اندھیرا چھانے لگا۔

❖❖❖

جس سے پہلے بھی کئی عبید و فائق تھے ہیں، ..... اسی دورا ہے پہ چپ چاپ کھڑا رہ جاؤں باہر رات گھری ہو رہی تھی۔ سیاہ اور خونا ک۔ ایسے میں سڑک کنارے کھڑی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا شام کا رواز فرمدی سے نہا۔ ٹھیس مل رہا تھا جب دوسرا روازہ کھلا۔ اس نے چونک کر چہرا اٹھایا۔ خاور اندر بیٹھ رہا تھا۔

”کیا ہے وہ؟“ ہاشم نے بے قراری سے اس کا چہہ و کھوجا۔

خاور نے گھری سانس لی۔ ”اچھی خبر نہیں ہے۔“

ہاشم کا دل ڈوب کر ابھرنا۔ آنکھوں میں کرب سا اترنے لگا۔ ”کیا وہ.... مر جائے گا؟“ الفاظ کہنا بھی تکلیف دہ تھا۔ خاور نے گویا ۱۰ ت سے اسے دیکھا۔

”خبر یہ ہے کہ وہ فتح جائے گا اور میرا خیال ہے یہ ہمارے لئے اچھی خبر نہیں ہے۔“

”وہ فتح جائے گا؟“ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”جی۔ میں نے معلوم کیا ہے۔ ایک گولی کندھے میں لگی ہے دوسری پیٹ میں اور تیسری ناگ میں۔ کوئی بھی گولی مہلک نہیں ثابت ہو۔ نوشیر وال کا نشانہ اچھا ہے مگر ظاہر ہے وہ ڈرگز کے زیر اثر تھے اور غصہ میں بھی اس لئے....“ اس نے تاسف سے سر جھکا۔

”وہ... وہ فتح جائے گانا!“ ہاشم نے بے چینی سے بات کافی۔

”جی.... میں لکھ کر دے سکتا ہوں وہ فتح جائے گا اور اگلے دو تین گھنٹوں میں ہوش میں آکر سب کو تادے گا کہ اسے کس نے گولی ماری تھی۔ اور صرف یہی نہیں وہ یہ بھی بتائے گا کہ ہم نے اور کیا کیا ہے۔“ برہمی سے وہ کہہ رہا تھا۔ ہاشم نے تکلیف سے آنکھیں میچ لیں۔

چند لمحے کار میں خاموشی چھائی رہی۔ گھر اسکوت۔

”ہو سکتا ہے وہ نہ بتائے۔“ ہاشم نے تنکے سہارا لینے کی کوشش کی۔ خاور نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”سر، میں آپ کی اس بچے کے لئے فینگر کی بہت قدر کرتا ہوں، مگر مذعرت کے ساتھ وہ آپ کے لئے ایسی کوئی فینگر نہیں رکھتا ہے۔ ہوش میں آتے ہی سب بک دے گا اور اس کے بعد فارس اتنی ہی گولیاں نوشیر وال کو مارے گا۔ کیا آپ کو گلتا ہے کہ وہ لوگ ہمیں چھوڑے گیں گے؟“

”تو پھر کیا کروں؟“ وہ بے زار ہوا۔ مگر اس بے زاری میں تکلیف تھی۔

”کیا مطلب کیا کریں؟“ نہیں اس وقت ایک ہی چیز کرنی ہے۔ سر جری ختم ہوتے ہی میرا کوئی لڑکا اسے ایک ذرا سا انجیکشن لگا۔ گا۔ اور....“

”خاور!“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا غرایا تھا۔ ”میں سعدی کو نہیں ماروں گا۔ وہ... وہ ایک چھوٹا بچہ ہے۔“

”آپ کچھ مت کریں“ میں کروں گا جو کرنا ہے اس کا مرنا ضروری...“

”اگر تم نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو میں خدا کی قسم تمہیں اپنے باتھوں سے گولی مار دوں گا۔“ انگلی اٹھا کر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا ہو اتنی ختنی سے بولا کہ خاور کو اس کا چہہ دیکھنے لگا۔

”خاور کو افسوس ہوا تھا۔ ہاشم نے سر جھکا۔“ You love the boy, don't you?”

”میں قاتل ہو سکتا ہوں، مگر میں درندہ نہیں ہوں جو اس کو.... یوں مار دوں۔“ نفی میں سر ہلاتے وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

”اوکے اور نو شیر وال کا کیا ہو گا؟ میرا خیال ہے۔ اس وقت آپ کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ کو ان دونوں میں سے کس سے؟“

محبت ہے؟“  
ہاشم نے سریش کی پشت سے نکار تکلیف سے آنکھیں موند لیں۔ وہ بہت ڈسٹر ب نظر آ رہا تھا۔ خاور نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔  
وقت نکل رہا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے شیر سے کئی گناز یادہ محبت ہے۔ سعدی کو خاموش کروانا ضروری ہے۔ اوکے!“ اس نے اثبات میں سر ہلا کیا۔ ”اب تم وہ کرو جو میں تمہیں کہتا جاؤں....“ خاور توجہ سے سننے لگا۔

❖❖❖

پھرے لوگ کبھی بھی لوٹ کے نہیں آتے دوست ..... بس فقط یادوں کے کچھ نشان ہوا کرتے ہیں  
سفید راہداری ابھی تک خاموش تھی۔ زمرہ نوز اسی طرح کھڑی آپ یعنی تھیز کے دروازوں کو دیکھ رہی تھی۔ نہیں زمین پر آکر دوں نہیں  
چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں گرائے دعاماً نگ رہی تھی۔ فارس مخالف دیوار سے کمرنکائے ایک گھٹنا موڑے کھڑا تھا۔

اروگر دلویں المکار نہ نوز پر بیداری کر رہے تھے۔ وردی میں مبوس سرمه شاہ بھی وہیں تھا، مگر ایک حد سے وہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ ان  
فاصلے پر کھڑا احتیاط سے فارس کو دیکھ لیتا جو گاہے بگاہے اس پر ایک تیز نظر ڈالتا تھا۔ اس نے زمر سے بات کرنے کی کوشش کی تو فارس نے  
صرف ہاتھ اٹھا کر اسے رک جانے کا کہا اور وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

(سرمه شاہ وہی اے ایس پی تھا جس نے فارس غازی کو چار سال قبل گرفتار کیا تھا۔ جو فارس کے گھر جا کر اس کی گاڑی سے ملنے والی  
وارث سے جزی چیزیں اسے دکھا کر اس کیس سے علیحدہ رہنے کی دھمکی دے کر آیا تھا۔ اور حوالات میں تو اس سے روز کی ملاقات رہتی تھی۔ اور  
اس ملاقات کے نشان فارس کی کمر پر آج تک موجود تھے۔)

کتنے گھنٹے بیت چکے تھے کسی کو یاد نہیں تھا۔ جب دروازے کھلتے سب ادھر ہی بڑھے۔ زمر سب سے آگے تھی۔

”وہ کیسا ہے؟“ اس نے پریشانی سے سر جن کا چھروہ دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ آوازاتی ہی بلکل تھی کہ بمشکل سنائی دیتی تھی۔

”آپ فلمرمٹ بیجھے وہ ٹھیک ہے۔ آپ یعنی ہو چکا ہے اور اب وہ Stable ہے۔ کچھ دیر تک اسے وارڈ میں شفت کر دیں گے۔“  
کیا وہ صرف الفاظ تھے یا کوئی روح تھی جوان میں پھونک دی گئی تھی۔ حس نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ اس کی بچکیاں سنائی دیے  
گئی تھیں۔ فارس نے نہ حال سے دیوار سے کمر لگا کر آنکھیں بند کیں۔ اور زمر... وہ بس یک نک ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟“

”ایک دفعہ وارڈ میں شفت میں ہو جائے تو آپ مل سکیں گی۔“ وہ آگے بڑھنے لگے، زمر فوراً ان کے پیچے لپکی۔

”کب... کب شفت کریں گے وارڈ میں؟“

”بس ہوڑی دیر تک۔“

زمر نے بلکے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حس اور فارس کے برعکس اس کے چہرے پر اطمینان نہیں اتر اتھا۔ وہ ہیں کھڑی بے ہمیں  
منتظر نہ ہوں سے تھیز کے بند دروازوں کو دیکھنے لگی۔

کافی دیر بیت چکی اور وہ سعدی کے باہر لانے کا انتظار کرتے رہے۔ فارس اب ادھر ادھر ہٹلتا، بار بار کلائی کی گھڑی دیکھ رہا تھا۔  
خین گیلا چہرہ صاف کیے ہکا سامسکراتی ہوئی اب کھڑی ہوئی تھی۔ زمر دیکھی ہی گم صدم دیوار سے لگی تھی۔

تھیٹر کے دروازے کھلے اور ایک سسٹر باہر نکلی تو فارس اس کی طرف پکا۔

”کب شفت کریں گے سعدی کو؟ اسے ہوش آ گیا؟“

نزس نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”وہ مریض جس کو گولیاں لگی تھیں؟ اس کو تو شفت کر دیا گیا ہے کب کا؟“

فارس کے ابر و تجہب سے اکھتے ہوئے۔ ”ہم تب سے میں کھڑے ہیں اسے تو باہر نہیں لایا گیا۔“

”ارے وہ بیک ڈور سے لے کر گئے ہیں ناوارڈ میں۔“ اس نے اوٹی کے دوسرا دروازے کی سمت اشارہ کیا جو کار پیڈور کا موڑ مذکور آتا تھا۔ یہاں سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ فارس اور حمد مژہ کراس طرف دیکھنے لگے۔ زمر بے چینی سے آگے بڑھی۔

”کس وارڈ میں؟ پلیز مجھے اس طرف لے جائیں۔“

”آئیے۔“ وہ اپنا کام چھوڑ کر آگے چل دی تو زمر اس کے پیچھے لپکی۔ فارس اور حمد ساتھ چلتے پیچھے آرہے تھے۔

”یہ ادھر ہے آپ کا مریض۔“ وارڈ میں آ کر نزس نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ آگے پیچھے گھومی اور... دفعتاً تھہر گئی۔

زمر نے چہرہ موڑ کر اطراف میں دیکھا۔ اجنبی چہرے غیر شناسالوگ۔

”اوٹی ون سے جو بلٹ انجریز والا مریض ڈاکٹر بخاری نے بھیجا ہے وہ کہا ہے؟“ وہ کسی کو روک کر پوچھ رہی تھی۔ زمر کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔ اس نے ویران نگاہیں اٹھا کر حمیں کو دیکھا جو اتنی ہی متوجہ لگ رہی تھی۔

”یہاں تو کوئی مریض نہیں لایا گیا۔“

”کیا مطلب؟ میرے سامنے وارڈ باؤنڈری سے لے کر گئے تھے۔“

ہر چیز سلو موشن میں ہوتی نظر آ رہی تھی۔

”کیسے غائب ہو سکتا ہے ہمارا مریض؟ میں تمہاری جان لے لوں گا۔ اگر اسے کچھ ہوا تو۔“ وہ غصے سے اس کی طرف پکا تھا۔

اور میں منظر میں کوئی کہدا رہا تھا....

”وہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تھا، دو وارڈ باؤنڈری اسٹرپچر پیشافت کو لارہے تھے، مگر وہ رسپیشن کی طرف جا رہے تھے۔“

اس نے دیکھا، فارس اس طرف بھاگا تھا۔ حد بھی پیچھے دوڑی تھی۔

سوالات، حساب کتاب، پولیس الہکاروں کی بھاگ دوڑ۔ زمر ان سب میں اجنبیوں کی طرح قدم قدم چلتی گئی۔ چلتی گئی۔ یہاں تک کہ رسپیشن ہال سامنے دکھائی دینے لگا۔ فارس تھی اور غصے سے بازو اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کرتا پولیس آفیسر سے کچھ کہدا رہا تھا۔ اردو گروفر افرانی سی بھی تھی۔ حمیں جیران پر بیشان ہی گردن گھمائے آس پاس دیکھ رہی تھی۔ اسے ست قدموں سے آتے دیکھا تو دوڑ کر اس تک آئی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ بھائی کہاں ہے؟“

زمر نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ اسے لے گئے ہیں۔“ اس کی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دی۔ ہلکی سرگوشی کی طرح۔

”کون؟ کون لے کر جا سکتا ہے بھائی کو؟“

زمر نے فنی میں گردن ہلائی۔ ”کون ہیں؟ مجھے نہیں پتے۔ مگر.... یہ وہی ہیں جنہوں نے اس کو گولی ماری ہے۔“ اس کی ویران نگاہیں فارس پر جا ٹھہریں جو ایک پولیس الہکار کے ہمراہ تیزی سے باہر جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ زمر نے یا سیت سے سر جھکتا۔ ”وہ ہمارے بچے کو ہمارے ہاتھوں سے لے گئے ہیں، اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ وہ ہال کے کنارے نصب بنیخ پر بیٹھ گئی اور سر دیوار سے نکلا دیا۔ حمیں جو بھی تک

جیران پریشان کھڑی تھی۔ ایک دم سے رو نے لگی، پہلے ہلکی اور پھر اوپنجی آواز سے۔  
ان دونوں کارِ عل دینے کا طریقہ اتنا ہی مختلف تھا جتنی وہ خود ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

❖ ❖ ❖

ہر کسی کے جلنے کا اپنا انداز ہوتا ہے ..... پروانے جتنے بھی جلیں، مگر دیا نہیں ہوتے  
رات کی سیاہی نے صبح کی سفیدی کو جگدی اور نیلا ہٹ بھرا اندھیرا قصر کاردار پر اترنے لگا۔ نوشیر وال کے کمرے کے پردے ہے  
ہوئے تھے۔ وہ تیز اسی کی ٹھنڈی میں "خاف تانے" سینے کے بل سور ہاتھا۔ دھنٹا اس نے کروٹ لی اور چہرہ اوپر ہوا تو بند آنکھوں سے منہ بکڑا۔  
کچھ سو گھا۔ دھواں۔ بو۔ وہ آنکھیں چندھیا کر ادھر ادھر دیکھتا اٹھ بیٹھا۔ پلکیں جھپکائیں، ذرا بصارت واضح ہوئی تو اس کے چہرے پر شاک  
ابھرا۔ منہ ذرا سا کھل گیا۔

سامنے صوفے پر ہاشم بیٹھا تھا۔ ناگ پنگ جمائے کہنی صوفے کے بازو پر رکھئے وہ سگریٹ انگلیوں میں پکڑے، منہ سے نکال  
رہا تھا۔ دھوکیں کام رغولہ سالبوں سے نکلا اور اوپر اٹھتا گیا۔ میز پر شیر کے پستول کے ساتھ اس کے سگریٹ اور فرشیات کے پیکٹ پڑے تھے  
ایک پیکٹ تازہ کھولا گیا لگتا تھا۔ نوشیر وال کی پریشان نگاہیں واپس ہاشم کے چہرے تک اٹھتی گئیں۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، اور اس کی  
آنکھیں گلی تھیں، ناک سرخ تھیں۔

"کیا وہ مر گیا؟" اس نے ہلکے سے پوچھا۔ ہاشم نے چہرہ اس کی طرف موڑا۔ اس کی گلی آنکھوں میں گلابی ریگیں ابھری ہوئی  
دھائی دیتی تھیں۔

"میں اسے نہیں مار سکتا تھا، اس لئے یہاں سے دوڑ بھیج دیا ہے۔ بے فکر ہو وہ اب کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا۔" وہ بولا تو آواز زکا مزدہ  
سی لگتی تھی۔ "پولیس ہماری، ہمپتال کا عمل، ہمارا، قانون ہمارا۔ نہ تمہیں کسی نے اس کا لوٹی میں جاتے دیکھا، نہ نکلتے۔ ہمپتال میں کافی شورڑا والا  
فارس نے، مگر اب تھک ہا کر وہ لوگ گھر جا چکے ہیں۔ اب جتنا تلاش کر لیں، وہ انہیں نہیں ملے گا۔ مبارک ہونو شیر وال، تمہارے بھائی نے ہر  
دفعہ کی طرح اس بار بھی تمہارا بچھیلا یا پکھ اسیست یا یا۔" سگریٹ لبوں تک لے جاتے اس نے تنخی اور طنز سے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ مگر  
اس کی نظروں کی ملامت.... نوشیر وال کی آنکھوں میں خفگی اتری۔

"کیا وہ ابھی بھی زندہ ہے؟ آپ نے اسے کیوں بچایا؟"

"تم فکر مرت کرو۔ تم بس سو جاؤ۔ اسین فورڈ میں میرا ایک پروفیسر تھا۔ جھک کر ایش ٹرے میں سگریٹ کا نکٹرا اصل۔" وہ کہا کرتا تھا  
قاتلوں میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے۔ قتل کرنے کے بعد ان پر نیند ضرور طاری ہوتی ہے۔ مجرم کو کھونج لگانے کے لئے ہم پہلے اسی جگہ کا تعین  
کرتے ہیں جہاں وہ جا کر سویا تھا۔ تم بھی سو جاؤ۔ کیونکہ یہ وہ آخری پرسکون نیند ہے جو تمہیں ملے گی۔"

"آپ اتنے آپ سیٹ کیوں ہیں؟ ایک بندہ مارنے سے کون سی قیامت آ جاتی ہے۔ آپ نے بھی تو...." حدِ ادب تھا کہ بے زاری  
سے کہتے کہتے بھی وہ رک گیا۔

"قتل چھوٹی بات نہیں ہوتی نوشیر وال۔" وہ ملامتی نظروں سے اسے دیکھتے گلی آواز سے بولا تھا۔

"میں کاردار ہوں، مجھے کوئی پولیس نہیں گرفتار کر سکتی۔ چند دن بعد میں سب اسے بھول جائیں گے۔"

"کسی کام رہا ہوا بچھی بھی پیدا ہو تو وہ اسے نہیں بھولتا، تم کہتے ہو وہ اسے بھول جائیں گے؟"

"کیا آپ نے دو لوگ نہیں مارے تھے؟ کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں؟"

"ہاں سارا قصور میرا ہے۔ غلط کیا میں نے تمہیں بتا کر۔" غصے اور دکھ سے کہتے اس نے سگریٹ کھڑکی کی طرف پھینکا۔ "وہ دلوگ

میرے کچھ نہیں لگتے تھے وہ دو اچھے مگر عام سے لوگ تھے۔ تم نے شیر و اس پہ گولی چلائی جوان کے خاندان کا ہبڑا تھا۔ ابھی وہ شاک میں ہیں چوتھیں گھنٹوں میں یہ شاک صدمے میں بد لے گا۔ اور پھر غصے میں۔ وہ اسے ڈھونڈنیں گے اور اس کے مارنے والے کو بھی... مگر تم بے قدر ہو۔ تمہارا بھائی ہے نا! تمہیں بچا لے گا، ہمیشہ کی طرح؟“ اس نے زکام زدہ انداز میں سانس ناک سے اندر رکھی۔

”آپ کو وہ اتنا پسند ہے کیا؟“ نو شیر و اس خفگی سے چہرہ جھکائے بڑا بڑا۔ جواب میں ہاشم نے میز پر رکھے بڑے سائز کے فوٹو گراف اٹھا کر اس کی طرف اچھا لے۔ ساری تصویریں بیٹھا اور فرش پر گر گئیں۔

”یہ دیکھو تم نے کیسے اس کے چہرے پہ مارا ہے۔ تین گولیاں مارنے کے بعد بھی تم نے اسے مارا۔ وہ انسان کا بچہ تھا نو شیر و اس ایسے تو کوئی جانور کو بھی نہیں مارتا۔“ دکھ اور غصے سے اس نے شیر و کو ملامت کیا۔ وہ منہ میں کچھ بڑا کرہ گیا۔

”خیر..... یہ سب اب ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ میں یہاں صرف ایک سوال کا جواب لینے بیٹھا ہوں۔“ شیر نے چونک کرا سے دیکھا۔ وہ اب ذرا خود کو سنجھاتے ہوئے سنجیدگی سے اس کو دیکھتے کہہ رہا تھا۔

”تم نے مجھے بتایا کہ کیسے تم اس کے پیچھے گئے، اس کو تین گولیاں ماریں اور واپس آگئے۔ پلیس روپرٹ کے مطابق بھی اس کو تین گولیاں ہی گئی ہیں۔ مگر نو شیر و اس کا رد ادارہ میں جانتا ہوں کہ یہ پورا حق نہیں ہے۔“

”میں سمجھنا نہیں۔“ شیر و کے تاثرات بد لے رنگ پھیکا پڑا۔

”تم نے مجھ سے کچھ چھپا ہے۔ اور اب تم مجھے بالکل صاف صاف بتاؤ گے۔“ کہتے ہوئے اس نے پستول کا میگزین نکال کر شیر و کے سامنے کیا۔ بیڈ پر پیرو اور کر کے بیٹھنے نو شیر و اس نے تھوک ٹکلا۔

”یہ جو فوری دن ہے۔ اس کے میگزین میں تیرہ گولیاں ہوتی ہیں۔ تم میگزین بھرے بغیر تو گئے نہیں ہو گے، سو اگر تیرہ میں سے تین گولیاں تم نے سعدی کو ماری ہیں تو باقی کتنی پچھنچا چاہیں؟“

”وس!“ شیر و کی آواز ہلکی تھی۔

”مگر اس میں سات گولیاں ہیں۔ اور اگر تم نے مجھے بتایا کہ وہ باقی تین گولیاں کہاں گئیں تو خدا کی قسم نو شیر و اس میں یہ ساتوں گولیاں تمہارے سر میں اتار دوں گا!“ وہ جس طرح چباچا کر کر اسے گھوڑ کر بولا تھا، نو شیر و اس کے پاس پسپائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

”جب میں نے تیری گولی مار کر اس کا فون اٹھایا اور جانے لگا تو....“ کہنے کے ساتھ اس کی ننگا ہوں کے سامنے وہی خوفناک منظر پھر سے تازہ ہوا۔

وہ اندر ہیرے پورچ میں کھڑا تھا، اس کے قدموں میں خون میں لٹ پت سعدی گرا پڑا تھا۔ آگاہی اس کے دماغ کو چڑھی کوکین ہرن کرنے لگی تھی۔ وہ تیزی سے جھکا، سعدی کا موبائل اٹھایا، جس پر خون کے محض چند قطرے لگے تھے اور اسے جیب میں ڈالے مڑ گیا۔ اب اسے جلد سے جلد یہاں سے لکھنا تھا۔

تب ہی..... جب کہ وہ مرنے لگا تھا، اس نے وہ آواز سنی۔ زیر تعمیر گھر کے اندر سے کوئی کھٹکا ہوا تھا۔ کسی بلی کے بچے کی سی آواز۔ ہلکی سی کراہ۔ وہ چونک کرو اپس گھوما۔ اندر ہیرے میں آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔

”اے... کون ہے ادھر؟“ پستول سیدھا تھا نے وہ احتیاط سے قدم قدم چلتا گھر کے اندر ورنی حصے تک آیا۔ وہاں گھپ اندر ہیرا تھا۔ ”کون ہے؟ بولو....“ اس نے پکارا۔ مگر خاموشی چھائی رہی۔ مگر وہاں کونے میں کوئی حرکت سی ہوئی۔ وہ کوئی ہیولہ ساتھا جو حرکت کر رہا تھا۔

نو شیر و اس نے پستول ناک کر کیے بعد دیگرے فائز کیا۔ پھر قریب آیا۔ موبائل کی اسکرین روشن کر کے اس طرف ڈالی۔ وہ سینٹ کا

ایک خالی پیپر بیگ تھا۔ جو سیر ہیوں کے ساتھ گرا تھا۔ وہ سر جھٹک کر مڑا اور باہر آیا۔ سعدی ہنوز وہیں گرا پڑا تھا۔ وہ ایک تنفس نگاہ اس پر ڈال کر گیٹ کی طرف بڑھا، مگر.... کسی احساس کے تحت اس نے گردن موڑی۔

بنا دروازوں کے اس گھر کے ڈھانچے کی کچی کچی سیر ہیوں کے اوپر... کوئی سایہ گم ہوا تھا۔ اسی وقت پس منظر میں پولیس کے سارے بنجے لگے۔ وہ تیزی سے باہر کو دوڑا۔ چند منٹ بعد وہ بخیریت کافی دور کھڑی اپنی کار تک آچکا تھا۔

”مجھے شیور نہیں ہے، مگر شاید وہاں کوئی تھا... شاید نہیں تھا۔“ اپنے کمرے میں بیٹھے سر جھکائے، نوشیروان کہہ رہا تھا۔

ہاشم ایک دم اٹھا۔ سارا نشہ ہرن ہوا۔ ”کیا اس نے پچھلے گھنٹوں کا حوالہ دیا؟ میر انام لے کر کچھ کہا؟“

”ہاں، بہت کچھ بولا تھاں نے۔“

”تو پھر ظاہر ہے وہاں کوئی تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہاں کون ہے۔ اودہ میرے خدا!“ بے اختیار اس نے ما تھے کو چھوڑا۔

”تمہیں کسی نے گولی چلاتے دیکھا ہے۔ یعنی کہ اب موقع کا گواہ بھی موجود ہے۔ لعنت ہے تم پر نوشیروان!“ غصے اور پریشانی سے سر جھٹک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”تمہارا پاس پورٹ کہاں ہے؟ مجھے دو۔ اور اپنا سامان تیار کرو۔ تم ابھی اس وقت ملک سے باہر جا رہے ہو۔ تم اس موقعے کے وقت بھی ملک میں نہیں تھے۔ میں پاس پورٹ پر بیک ڈیٹ کی ایگزیکٹ Stamp لگوادوں گا۔ پاس پورٹ لاو، جلدی!“ آخر میں وہ غصے سے چلا یا۔ تو نوشیروان تیزی سے ستر سے اتر اور الماری کی طرف لپکا۔

ان چند گھنٹوں میں پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کیا کر چکا ہے۔



باب 12:

## یاصاجی الجن

(اے میرے قید خانے کے دوساریوں)

ایک دن میرا وقت بھی آئے گا  
اور تم قیمت چکاؤ گے اپنے کیے کی  
اور تم دیکھو گے، کہ میں قطعاً جبھی نہیں ہوں  
ایک دن میں آسیب کی طرح تمہیں ڈراؤں گی  
یہ میرا وعدہ ہے جس کا بھی تم کو اندازہ نہیں  
مگر تم تباہ خواہش کرو گے کہ کاش  
ہم کبھی نہ ملے ہوتے!

ایک دن!  
کیونکہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔  
اور تمہیں رحم کے لئے گڑگڑاتے کوئی نہ من پائے گا  
کیونکہ ابھی تو تم نے کچھ نہیں دیکھا  
سوغور سے سنو۔

ایک دن تم جواب دو گے اپنے اعمال کا  
بس انتظار کرو اور دیکھو۔  
اور تب تم جانو گے میرے خاندان کو  
نقسان پہنچانے کے بعد کیا ہوتا ہے!  
ایک دن میں تمہیں ڈھونڈلوں گی۔  
مجھے پرواہ نہیں کہ اس میں کتنی دیرگتی ہے۔  
یا مجھے اس کے لئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے

کیونکہ میں کبھی اپنا وعدہ  
توڑانہیں کرتی!

(Petite Magique کی نظر "انتقام" سے)

سعدی یوسف کی گمشدگی کے پانچ گھنٹے بعد۔

آج صبح چھوٹا باغچہ دیران پر اتھا۔ سورج کی پیش نے سارے پھول جھلسا دیے تھے۔

اندر لا ونچ میں ندرت کے رو نے کی آواز سب سے اوپر تھی۔ وہ چہرہ جھکائے، نبی میں سرہلاتی روئے جا رہی تھیں۔

"ہم اس کو ڈھونڈ لیں گے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" فارس ندرت کے گھنٹے پر ہاتھ رکھ کر ان کو تسلی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رتجھ کے باعث سرخ تھیں اور چہرے پر تکان تھی۔

"اب کہاں ڈھونڈو گے؟ اب تک تو وہ اسے...." اور دو پٹے میں چہرہ چھپائے اور زور سے رو نے لگیں۔ ان کا کندھا مسلتی حین میں بھی "امی خود کو سنبھال لیں" کہتی پھر سے رو نے لگی تھی۔ سیم سر گھنٹوں میں دیے کارپٹ پر بیٹھا تھا۔ سامنے بڑے ابا، گردان گراۓ، خاموش آنسو گرا رہے تھے۔

"وہ بالکل ٹھیک ہو گا" اور اس کا خیال رکھا جا رہا ہو گا۔ "سنگل صوفے پر گھنٹے ملا کر بیٹھی زمر نے بے تاثر سے انداز میں کہا تو وہ سب اس کو کھنٹے لگ۔ وہ اب بھی اسی طرح گم صمم چپ رہی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" اپنے سراخھائے بغیر گلی آواز میں پوچھا۔

"کوئی بھی بلٹ انجری مہلک نہیں تھی۔ اگر انہوں نے اسے مارنا ہوتا تو پہلی دفعہ میں مار دیتے، یا پھر جیسے نکال کر لے گئے ہیں؛ اسی طرح آپ یعنی ٹیبل پر مار دیتے۔ ان کو وہ زندہ چاہیے، اس لئے وہ اس کا خیال رکھیں گے۔"

"مگر کون ہیں وہ لوگ؟ بھائی نے کسی کا کیا لگاڑا اتھا؟" حین نے بے بسی سے روئے پوچھا۔

زمر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ "مجھے نہیں پتا۔" اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پس اٹھایا، چاپیاں نکالیں۔ حین نے تحریر سے اسے دیکھا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" زمر نے جواب دیے بنا اسٹریپ کندھے پر ڈالی، موبائل بیک میں رکھا۔ فارس نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"میں جا رہا ہوں تھا نے۔ آپ مت جائیے۔"

"میں گھر جا رہی ہوں۔" کسی سے نگاہ ملائے بنا وہ مڑ گئی۔ حین کی آنکھوں میں صدمہ اڑا۔

"آپ بڑے ابا، امی، سب کو اتنی تکلیف میں چھوڑ کر جا رہی ہیں؟"

زمر کو عقب سے اس کی آواز آئی۔ ٹکرہ قدم قدم آگے بڑھتی رہی۔ حنہ نے بے دردی سے آنکھیں رکڑیں۔

"ٹھیک ہے۔ جائیے۔ ہمارا بھائی جیسے یا مرے۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ نے تو دیے بھی چار سال ان سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔" زمر کے قدم لمحے بھر کو تھے، پھر وہ آگے بڑھ گئی۔

"حین کم از کم اس وقت لڑائی مت کرو۔" وہ خنگی سے نوکتا اٹھا۔ حنہ نے صرف ملامتی نظروں سے اسے دیکھا اور رخ پھیر گئی۔ اسی گھنٹا گھنٹا سا بھی تک رو رہی تھیں، اور بڑے ابا کے ضعیف چہرے پر آنسو نوزنگپر رہے تھے۔

"وہ اب کسی کو نہیں ملے گا، میری امید کھو گئی ہے۔" وہ دھمکی دل سے کھرد رہے تھے۔

جو خیال تھے نہ قیاس تھے، وہی لوگ مجھ سے پچھڑ گئے ..... جو محبوں کے اساس تھے، وہی لوگ مجھ سے پچھڑ گئے اس نے انیکی کا دروازہ کھولا تو اندر نہ آتا تھا۔ وہ اسی زرد چہرے اور دیران آنکھوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ پھر لکڑی کے زینوں پر قدم رکھتی چڑھتی گئی۔ ایک ہاتھ ریلینگ پر تھا۔ دوسرا میں پرس اور خاکی لفافہ تھام رکھا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر زمر نے پرس فرش پر ڈال دیا۔ پھر خاکی لفافہ کھولا۔ فل سائز تصاویر نکالیں۔ پھٹے ہونٹ، سرخ نشانوں اور نخوں والا چہرہ لیے، بند آنکھوں سے لیٹا سعدی۔ خون آلو دلباس۔ زمر نے ایک کے بعد ایک تصویر سامنے کی۔ اس کی بھوری آنکھیں اس لڑکے کی بند آنکھوں پر جمی تھیں۔ خشک بھوری آنکھیں۔

پھر یہاں کیک ان میں پانی بھرا۔ اتنا کہ وہ ڈبڈ بائیں۔ اور آنسو چہرے پر تیزی سے لٹکنے لگے۔ اس نے زور سے وہ تصویریں سامنے دیوار پر دے ماریں اور پھر آنکھوں کے بل بیٹھی چلی گئی۔ چہرہ جھکائے، مٹھیاں فرش پر رکھے وہ ایک دم بلک بلک کرو نے لگی تھی۔

”کیوں اللہ؟ کیوں؟“ روتے روتے اس نے گیلا چہرہ انھا کر چھٹ کو دیکھا۔ ”کیا اتنے سال اسے اس لئے بڑا کیا تھا کہ کوئی آئے اور گولی مار کر چلا جائے؟ کیا ہم اپنے بچوں کو اس لیے بڑا کرتے ہیں؟ کیا آپ کی دنیا میں کوئی قانون نہیں؟ کوئی انصاف نہیں؟“

اس نے زمین پر بیٹھے بیٹھے چہرہ بیدڑ پر رکھ دیا۔ دائیں گال پر آنسو سڑھکتے دھائی دے رہے تھے۔

”میں نے اسے کہا تھا کہ میں اس کا خیال رکھوں گی۔ کئی سال پہلے، جب ہم کالام میں تھے۔ ایک چشمے کے کنارے اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں، تو اس کا کیپر کون ہو گا؟ میں نے کہا، میں ہوں گی۔ دو سال بعد یہم بیدا ہوا، مگر اسے تب بھی پوچھا تھا کہ اس کی کیپر زمر ہو گی، ہمیشہ اس کا خیال رکھے گی، مگر میں اس کا خیال نہیں رکھ سکی۔ میں اسے نہیں چاہا۔ کیوں اللہ، کیوں؟“ وہ سکیوں سے روئے جارہی تھی۔

”میں اب پہلے کی طرح آپ سے بات نہیں کرتی، میں ویسے دعائیں مانگتی۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میرے پاس سعدی تھا۔ ماتھا بیڈ سے نکائے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے کہا رہی تھی۔

”کیسے کسی نے اس کو گولی مار دی؟ کیسے اس کو اتنی تکلیف دی؟ اللہ، کوئی جانور کو بھی ایسے نہیں مارتا، وہ تو پھر انسان تھا۔“ وہ بولتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ ”میں نے اللہ.... میں نے چار سال اس سے تعلق نہیں رکھا، میں نے چار سال ضائع کر دیے۔ میں کہاں سے وہ وقت واپس لاوں؟ پلیز میرے ساتھ یہ میت کریں۔“ سر بیڈ کنارے سے لگائے وہ بچوں کی طرح روئے جارہی تھی۔

کتنے لمحے بیتے، سورج کتنا تیز ہوا، معلوم نہیں۔ وہ اسی طرح بے خبری روتی گئی۔ یہاں تک کہ دروازہ دھیرے سے کھٹکا۔ پھر کھلا۔ چوکھت میں کھڑے فارس نے اندر دیکھا تو ساری پولیس نوٹوگراف بکھری نظر آئیں اور وہ زمین پیٹھی بیڈ کے کنارے پر سر رکھ روتی تھی۔ نیچے رکھا اس کا موبائل مسلسل زوں زوں کر رہا تھا۔

”زمر!“ وہ دھیرے دھیرے قدم انھا تا قریب آیا۔ آنکھوں میں تکلیف لئے زمر کو دیکھا۔

”مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ اس نے چہرہ انھا یا نہ آنسو پوچھے۔ بس آپ جناب کا تکلف بھی آج ختم کیا۔

”نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہ بہت ہلکا سا بولا تھا۔ پھر جھک کر اس کا موبائل انھا یا۔

”بصیرت صاحب کا فون ہے۔“

”مجھے تھا چھوڑ دو فارس۔“ وہ چہرہ انھا کر اسے تنفر نظر دوں سے دیکھتی ایک دم چلائی۔ ”جب بھی تم ہماری زندگیوں میں آتے ہو، کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے۔ ہر چیز ہمیشہ تمہاری وجہ سے ہوتی ہے۔“

وہ چپ چاپ کھڑا دکھ سے اسے دیکھ گیا۔

”مجھے نہیں پتا اسے کس نے مارا، لیکن اگر اس کا کوئی دشمن بنا ہے تو صرف تمہاری وجہ سے۔ تم نے ایک پڑھنے لکھنے والے بچے کو جیل کچھری اور عدالتوں کے چکر میں دھکیل دیا۔ تم نے اس کو پتہ نہیں کتوں کا دشمن بنادیا۔ مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہے۔“ ملامت سے اسے دیکھتی، وہ اوپنجا اونچا کہتی پھر سے رو نے لگی تھی۔

فارس خاموشی سے اس کے ساتھ اکڑوں بیٹھا اور گھنٹوں کے گرد بازو پھیلائے۔ پھر گردن گھما کر اسے یاسیت سے دیکھا۔

”مجھے پتا ہے اس کے دشمن میری وجہ سے بنے ہیں، میں نے اسے کہا تھا کہ میرے لئے غلط چیزوں میں انوالومت ہونا۔ گروہ ہوا۔ میں جیل میں تھا، اسے نہیں روک سکتا تھا۔“ وہ بدقت بول رہا تھا۔ اس کے انداز میں شدید تکلیف تھی۔

”تم ایک ہی دفعہ ہماری زندگیوں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ تمہاری وجہ سے ہم اور کتنا نقصان اٹھا میں گے؟ خدا کی قسم میرا دل چاہتا ہے تمہیں جان سے مار دوں۔“ دکھ پا ب غصہ غالب آنے لگا۔ وہ اس سے تین فٹ کے فاصلے پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ ان الفاظ پر بھی چہرے پر کوئی غصہ، کوئی تباہی نہ ابھری۔ بس تکان سے اسے دیکھے گیا۔

”آپ جو کرنا چاہتی ہیں میرے ساتھ کر لیں۔ میں آپ کو نہیں روکوں گا۔“

”بے فکر ہو۔“ زمر نے تباہی سے سر جھکا۔ ”میں تمہارے ساتھ کچھ نہیں کروں گی۔“ مجھے تم سے شادی بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر خیر...“ اس نے نہ تھیل سے آنکھیں رگڑیں۔ ”میں نے اس سے وعدہ کیا تھا، کہ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ اور میں اپنے عدے پورے کیا کرتی ہوں۔“ ساتھ ہی ملامتی نظر وں سے اسے دیکھا۔ ”تم یہ مت سمجھنا کہ تم فج جاؤ گے، ایک دفعہ میں سعدی کو ڈھونڈ لوں، پھر میں تم سے بھی حساب لوں گی۔“ اس ایک ایک زخم کا جوتمن نے میرے خاندان کو دیا ہے۔“

”آپ کو مجھ پر غصہ ہے! اور آپ تکلیف میں ہیں، میں بھی ہوں۔ مگر یہ پہلی دفعہ نہیں ہے جب مجھے یہ کہا گیا ہے کہ ہبہ تال جاؤ، کیونکہ تمہارے خاندان کا کوئی فرد گویوں سے بھون دیا گیا ہے۔“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے تکلیف اور بدقت سے بولا تو لگلے میں گولہ سا اتنے لگا مگر اس نے نگل لیا۔ ”لیکن میں آپ کی طرح روپیں سکتا۔ میں روپا نہیں چاہتا۔ میں اس ایک ایک شخص کو جس نے میرا خاندان جتا ہے، ذھونڈ کر اس کی چڑی اور ڈھیر ناچاہتا ہوں۔“ اب کے اس کی آنکھوں میں درشتی ابھری اور گردن کی ریگیں ٹھپٹی ہوئی دکھائی دیں۔ زمر نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

”مجھے کچھ مت سناؤ۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ اور رخ موز لیا۔ گلی آنکھیں پھر سے رکڑ کر صاف کیں۔

”مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ میری بات سنیں۔ سعدی سے برابر کا رشتہ ہے ہمارا۔ نہیک ہے آپ کا کچھ زیادہ ہو گا،“ مگر اس وقت ہمیں آپس میں لڑنے کی بجائے ایک ساتھ مل کر اس کو ڈھونڈنا ہو گا۔“

”اتنی تو انائی مجھ پر خرچ مت کرو۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گی، اور میں ہر اس شخص کو ڈھونڈ لوں گی جو اس میں انوالوں تھا اور پھر دنیادی کیمی کی میں اس کے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ مگر یہ تمہاری بھول ہے فارس کو میں اس سب میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی۔“ اس کو تیز نظر وں سے گھوڑتی وہ چاچا کر بولی۔

”نہ آپ اسے اکیلی ڈھونڈ سکتی ہیں نہ میں۔“

”مجھے تمہاری کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“ تباہی سے کہتی وہ انھی۔ ”میں اکیلی سب کر لوں گی۔“ تمہارا کیا بھروسہ، کل کو مجھے بھی بچ آؤ۔“

فارس کے ماتھے پبل پڑے۔ دماغ کھول گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا۔

”ایسا سمجھتی ہیں آپ مجھے؟“ غصے سے اس کے مقابل کھڑے پوچھا تو چہرہ سرخ پر رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی؟ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے مجھے استعمال کر کے جیل تو زندی چاہی؟“ وہ میں اس لی آنکھوں میں دلکھ کرتے ہی غصے سے غرائی تھی۔ فارس کے لب بیخنگ کے چند لمحے ضبط سے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

”میں پولیس اٹیشن جا رہا ہوں، کیا آپ چلیں گی؟“ بدقت ضبط سے سپاٹ سا پوچھا۔

”ہونہے۔“ زمر نے فتحی میں سر جھکا اور زمین پر گراموبائل اٹھایا۔ ”یہ ساری پولیس انہی لوگوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ یہ جتنی ناک اس لایس اسے نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔“ ساتھ ہی موبائل پر مسدہ کالزد لکھ رہی تھی۔ اس کی ناک اور... آنکھیں ہنوز گلابی تھیں اور آن پوپرہ نہ لگے تھے۔ فارس کے چہرے کا سپاٹ پن قدرے کم ہوا۔

”مجھے پتہ ہے پولیس ملی ہوئی ہے بے فکر ہیے ان میں سے ایک ایک آفیسر کا وقت آئے گا۔“ اور جانے کے لئے مرا۔ تبھی زمر نے انہیں سے لگایا۔

”جی بصیرت صاحب...“ وہ چوکھت میں ٹھہر گیا۔ مژا نہیں۔ وہ عقب میں فون پر کہہ رہی تھی۔ آواز کوتار مل کرتے ہوئے۔

”آپ کا بہت شکر یہ۔ نہیں ابھی تک تو کچھ پتہ نہیں جل سکا۔ میں تھوڑی دیر میں گھر سے نکلوں گی پھر دیکھوں گی۔ اچھا...“ وہ رک نہ لگی۔ پھر انہیں تلنگی تھی۔ فارس نے چونک کر گردن موڑی۔

”مجھے اسی قسم کے آرڈر کی توقع تھی مگر یہ کافی جلدی آگیا۔ نہیں، مجھے اب اس سے فرق نہیں پڑتا۔ آپ کا شکر یہ۔“ موبائل رکھ کر اس لیا گیا۔ اٹھیں تو فارس اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”مجھے ایڈو کیٹ جزل نے بغیر وجہ بتائے مutilus کر دیا ہے۔ اب میں پر اسکیوں نہیں رہی۔“ اتنی بھی تلنگی سے بولی۔

”کیا؟“ فارس کو حیرت کا جھکھا لگا۔ ”مگر اس طرح کی معطلی غیر قانونی...“

”اچھا ہی ہوا۔“ زمر نے زکام زدہ ناک سکوت تے شانے اپکائے اور الماری کی طرف بڑھ گئی۔ ”یہ وہ پہلی غلطی ہے جو ہمارے ہاتھی نے کی۔ اس سے انہوں نے مجھے یہ بتا دیا ہے کہ وہ پارسون لوگ ہیں۔ یہ ان کی پہلی چال تھی۔ بساط بچھادی گئی ہے اور کھیل شروع ہو ہے۔ اب وہ دیکھیں گے کہ ان کا مقابلہ کس سے ہے۔“ تلنگ سے بڑی بڑی وہ الماری میں بینگر الٹ پلت کرنے لگی۔ فارس کا ذہن ان ایک لفظ ادا۔ آیا۔

(ہمارے دشمن؟ کیا اس کو خود بھی احساس نہیں کہ اس نے ”میرے“ یا ”سعدی“ کے بجائے ”ہمارے“ کہا؟)

اور اس ساری پریشانی، اذیت اور صدمے کی کیفیت کے باوجود ایک ہلکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ریگ گئی۔ پھر وہ سر جھک کر اسی کی ایسا بہت کچھ کرنا تھا۔



گھروں پہنام تھے، ناموں کے ساتھ عہدے تھے..... بہت تلاش کیا ، کوئی آدمی نہ ملا !  
قصیر کاردار کے ڈائیگنگ ہال کی بھی میز ناشستے، چھلوں اور مشرود بات سے بھی تھی مگر جواہرات سب چھوڑ کر پوری طرح ہاشم کی طرف

.....

حق دقیقی تھی جا رہی تھی۔ وہ سر جھکائے چائے کے گھونٹ بھرتے بتا رہا تھا۔ آفس کے لیے تیار اور ہلکا میک اپ کیے تازہ دم اس اساتھ کے بر عکس وہ قدرے سے تھا۔ سوٹ، نائی، سب درست تھا، بس آنکھیں ہنوز سوچی ہوئی تھیں۔

”سعدی کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے اب معلوم ہو رہا ہے۔“ بے حد حیرت اور افسوس سے وہ فتحی میں سر ہلا رہی تھی۔ سامنے ہاتھ

باندھے کھڑا خاورا پنے جو تے کو دیکھتا رہا۔ ہاشم کی نظریں بھی چائے پہنچی تھیں۔

”اس کی قیلی تو بہت ڈسٹرپ ہوگی۔“ جواہرات کہنی میز پہ جائے، ائیر مگ پہ انگلی پھیرتی، آنکھوں میں تاسف بھرے کہہ رہی تھی۔

”آخرون کر سکتا ہے یہ؟“ پھر چونک کر ہاشم کو دیکھا۔ ”تم نے تو...“

ہاشم نے عینکیں مٹھی میں بھینپا اور خفگی سے نظریں اٹھائیں۔ ”میں اس پہنچی گولی نہیں چلا سکتا، نہ یہ خاور نے کیا ہے۔ ہم اس کے

واحد دشمن نہیں ہیں۔“

”اوہ۔“ اسے سکون آیا۔ پھر گلاس اٹھا کر جوس کے دو گھونٹ بھرے۔ خاور اور ہاشم نے ایک خاموش نظر کا تابا لہ کیا۔

”مگر...“ یکا یک جواہرات کا سانس انکا۔ چہرے پر پیشانی آئی۔ ”وہ کل ہمارے پاس آیا تھا۔ کوئی ہم پہ شک...“

”کسی کو نہیں پتے کہ وہ کل ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم آفس کے کل کے سی سی ٹی وی ریکارڈ کو لیکسٹر کر دیں گے۔ زیادہ لوگوں نے اسے

دیکھا بھی نہیں۔ اگر پتہ چل بھی جاتا ہے تو کیا ہوا؟ کوئی ہم پہ شک نہیں کر سکتا۔“

”ہوں۔“ جواہرات نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہمپتاں سے اگر وہ غائب ہوا ہے تو ظاہر ہے اتنی رُخی حالت میں۔ اونہوں۔“

اہمی تک زندہ بھی نہ ہو شاید۔ پھر یکا یک ایک خیال کے تحت چوکی۔ ”ہاشم.... سعدی کا یہ حادث... میرا مطلب ہے اس کے جانے کے بعد اس کوئی نہیں ہے جو جانتا ہو کہ ہم نے وہ سب کیا تھا۔“

ہاشم نے ملامتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیا آپ کو اس حادثے کا ذرا بھی افسوس نہیں؟“

”اوہ نہیں، آف کو رس ہے۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔“ وہ فوراً معدتری انداز میں کہتی ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”آفس جا

سے پہلے ان کے گھر چلیں گے۔ یہ تو ابھی اس کا دامغِ الٹا تھا، ورنہ وہ بہت پیارا لڑکا تھا۔ میرا بہت اچھا دوست۔“ (ایسے ہی نارت گروالی کہا کہا

یا آئی جو ایک شام اسے ابتر ہوئی حالت میں سنائی تھی۔ چلو اس کہانی کا دوسرا گواہ بھی ختم ہوا۔ اور پہلی؟۔)

”میری کو بھجوادیا تم نے؟“ سرسری سا پوچھا۔

”جی، اسے ملک بدر کر دیا ہے آج۔“ اور جواہرات کا دل مزید ہلکا ہو گیا۔ (شکر!)

”اوے کے۔“ اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ بے زاری سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”شیر و پھر ناشتے پہنیں آیا۔“ وہ ذرا انکر مند ہوئی۔

”وہ رات دہنی چلا گیا تھا۔ آپ جب تک پارٹی سے آئیں، میں سوچا تھا، بتا نہیں سکا۔“ اس نے سیل فون اٹھاتے سرسری

اطلاع دی۔

جواہرات نے شدید حیرانی سے چہرہ اٹھایا۔ ”مگر کیوں؟“

”دوستوں کے ساتھ پروگرام تھا۔ پریشان مت ہوں، اسے کچھ دن ریلیکس کرنے دیں۔ اور ہاں یہ سعدی والی بات اسے۔“

بتائے گا ابھی۔ ڈسٹرپ ہو جائے گا وہ۔ آخر... وہ دونوں... دوست تھے۔“ آخری نفرہ بدقت ادا کیا۔ پھر جواہرات سے نگاہ ملائے بغیر اسے۔

نکل گیا اور وہ بس سر ہلا کر رہ گئی۔

”مجھے پتہ ہے وہ کیوں گیا ہے۔ کیونکہ شہرین نے آج سچ وہاں جانا تھا۔“ ناراضی سے بڑھاتے گلاس اٹھایا۔

”آپ مسز کاردار سے کیوں چھپا رہے ہیں؟“ خاور نے اس کے پیچھے سے آکر پوچھا تھا۔

”معاملہ مٹھندا ہونے دو، پھر بتا دوں گا۔ ابھی کوئی لا پرواہی ہم افروڑ نہیں کر سکتے۔“ دبی آواز میں کہتا وہ اس کے ساتھ باہر رہ آمد

تک آیا تھا۔ سیر ھیوں کے سرے پر دونوں رکے۔ ہاشم نے چہرہ گھما کر نیچے چلیے بزرہ زار کو دیکھا۔

”تم نے اس مکنے گواہ کو چیک کیا؟“ یہ پریشانی ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔

”جی،“ مگر ایسا کوئی گواہ پولیس کے پاس پیش نہیں ہوا نہ ہی سعدی کے گھروالوں سے کسی نے رابطہ کیا ہے۔ میر انہیں خیال کہ وہاں اولی اور بھی تھا۔ وہ صرف نوشیر وال صاحب کی ڈرگز کے باعث <sup>hallucination</sup> ہو سکتی ہے۔“

”مگر میں اس امکان کو رد نہیں کر سکتا۔“ ہاشم مطمئن نہیں تھا۔ ”تم معلوم کرنے کی کوشش کرو۔“ اور زینے اترنے لگا۔ خاور سر ہلاکر رہا۔ ایک طویل اور اندر ہیرات بالآخر ختم ہوئی تھی۔  
حصہ معمول ہاشم کا ردار نے سب سنبھال لیا تھا۔



وہ دیکھنے آیا تھا کہ کس حال میں ہیں ہم!

چھوٹا باغچہ ہنوز جھلس رہا تھا۔ اندر لا اونچ میں جنین خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سامنے صوفے پہ ہاشم اور جواہرات ساتھ ساتھ ہٹھے تھے۔ ابا پنی ویل جیسے نہ ہمال سے لگ رہے تھے اور ان کے ساتھ کھڑی زمران کو دوادے رہی تھی۔ ہاشم بار بار رنگاہ اٹھا کر اس کو غور سے دیکھا تھا۔ پڑ مردہ اداں جنین کے بر عکس وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔

اس کے آنے کے بعد ہی وہ اور فارس کیے بعد دیگرے آئے تھے۔ (فارس پھر چلا گیا تھا۔) وہ بدلتے ہوئے بس میں تھی۔ سامنے کے بال پیچے کر کے پن لگائے، باقی کھلے چھوڑے ناپس پہنچنے ہر روز کی طرح تیار لگ رہی تھی۔ یہ ناصل نہیں تھا۔

”آپ ٹھیک ہیں زمر؟“ ہاشم نے فلمرندی سے اسے مخاطب کیا۔ وہ ابا کو پانی کا گلاس پکڑا تے چونکی۔ چہرہ گھما کر ہاشم کو دیکھا۔ بلکہ سے شانے اچکائے۔

”جی۔ شکر یہ۔ ابا آپ کھانا کھا لجئے گا، مجھے دیر ہو جائے گی۔“ ابا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تم کہاں جا رہی ہو؟“  
وہ اداں سے مسکرائی۔ ”سعدی کو ڈھونڈنے۔“

ہاشم کی گردان کے گرد پھند اسالگئے لگا۔ فوراً سے جنین کی طرف متوجہ ہوا۔

”اب تمہاری امی کیسی ہیں؟“

”دوادے کر سلا یا ہے۔ بہت آپ سیٹ ہیں۔“ اس کی آنکھیں ڈبڈا گئیں۔ شاکی نظر زمر پڑا۔ (ان کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ ایک آنوجو بہایا ہو!)

زمر ابا کو دوسرے کمرے میں لے گئی، جب واپس آئی تو وہ کہہ رہا تھا۔

”آپ لوگوں نے مجھے کیوں فون نہیں کیا؟ میں ہوتا تو دیکھتا کس طرح کوئی اسے لے کر جاتا ہے۔“ وہ خفا ہوا تھا۔ جواہرات نے تاسف سے اس کا ہاتھ دبایا۔ اسے پتیہ تھا وہ سعدی کے لیے کیا بذببات رکھتا تھا۔

”ہاشم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سعدی اس کا دوست تھا، آپ کو ہاشم کو بلانا چاہیے تھا۔“

”ہاشم کو بلانے“ سے زمر اور جنین دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کچھ یاد آیا۔

”ہاشم کیا آپ نے سعدی کو بتائی تھی ایگزام والی بات؟“ زمر نے بغور اس کے چہرے کو دیکھتے پوچھا تو ہاشم نے چونک کر حنہ کو دیکھا۔ وہ بھی سانس رو کے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کون سنی بات؟“

”جب ایگزام میں حصہ نہیں...“

”اوے میم پر اسکیو مر۔“ ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔ ”میں اس بارے میں بات نہیں کر سکتا۔ انارنی کلاں کت پر یوچ لج کے تخت یہ میرے اور حین کے درمیان ہے۔ اگر آپ کو کچھ جانتا ہے تو حین سے پوچھ لیں۔“

”میں سب جانتی ہوں۔ صرف سعدی کو بتانے کے متعلق پوچھا ہے۔“

”میں ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اتنے اعتناد سے بولا تھا کہ حنڈ کی آنکھیں مزید بھیگیں۔ اس نے زمر پر ”دیکھا؟“ والی جاتی نظر ڈالی۔ جواہرات بھی اسی اعتناد سے گردن اکڑائے بیٹھی رہی۔ زمر البتہ مشکوک نظروں سے ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔

”ہوا کیا تھا؟“

”بھائی کوکل کسی نے بتایا تھا۔ یہ نہیں پڑتا کہ کس نے....“

”کیا تم نے اپنی کلاس فیلوز سے پوچھا؟ مجھے وہاں بہت سے لوگوں نے آتے دیکھا تھا۔“

”اوہ وہاں۔“ حین کو یاد آیا۔ ”نامعہ کا بھائی، سعدی بھائی کا دوست ہے۔ شاید اسی نے بتایا ہو۔“

”اور تم نے سب سے پہلا شک مچھ پر کیا؟“ ہاشم مسکرا یا۔ حین کو ڈھیر ساری شرمندگی نے آن گھیرا۔

”آہم۔ یہ کس بارے میں بات ہو رہی ہے۔“ جواہرات نے باری باری ان کے چہرے دیکھے۔

ہاشم نے ”ایک غیر اہمی بات تھی۔ جانے دیجئے۔“ کہہ کر موضوع بدل دیا۔

زمر باہر نکلی تو با غصے کے گیث ساتھ اسامہ کھڑا، اداسی سے دھوپ کو دیکھ رہا تھا۔ صبح اب دوپہر میں تبدیل ہو رہی تھی۔

”مجھے اس جگہ جانا ہے۔ کیا تم مجھے پتہ سمجھا دو گے، سیم؟“ وہ اس کے قریب آ کر بولی تو وہ چونکا پھر فوراً سر ہلایا۔

”آپ اکیلی مت جائیں۔ میں ساتھ آؤں گا۔“ اس کے کندھے کے برابر آتا سیم ایک دم بخیگی سے بولا۔ زمر ہلاکا سماں مسکرائی پھر اس کی کہنی تھام لی اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

”ماں وہ بھی ادھر گئے ہیں۔“ جگہ کا نام لئے بغیر اس نے بتایا تو وہ ہلاکا سا پوچنی تھی۔

جیسے ہی وہ زیر تیر گھر قریب آیا، زمر کے قدم بھاری ہوتے گئے۔ چہرے کی رنگت زرد پڑتی تھی۔ آنکھوں میں نبی ابھری جس کو اس نے اندر اتار لیا۔ (اللہ مجھے صبر دینا! پچھہ دیر کے لیے ہی ہی!)

گیٹ کے سامنے جب وہ رکی تو آنکھوں میں کرب کی جگد افسوس نے لے لی۔ اس نے ادھر ادھر گردن گھٹائی۔

”پولیس نے اتنی جلدی کر ائم سین وہو دیا؟“... غصہ بھی اس نے اندر دبایا۔ وہاں چند لوگ اور پولیس الہکار دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے پورچ میں قدم رکھا تو سیم کی کہنی زیادہ تھی سے بھیجنی۔ سامنے فرش پر چاک زدہ خاکہ بناتھا (جدھر سعدی گرا ملا تھا)۔ اپنی گلابی پر تی آنکھیں اٹھائیں تو گھر کے اندر وہی حصہ میں وہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کی زمر کی جانب پشت تھی اور وہ اپنیوں کی برهنہ بیٹریوں کے پاس آ دھا جھکا کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آ گئے آئی۔ فارس سے فالصلوڑ کئے رخ پھیر کر کھڑی اور گردناگا ہیں دوڑانے لگی۔

”ادھر کیا ہے ماں؟“ سیم اس کی طرف گیا تو وہ چوک کر پڑتا، تو دیکھا وہ اس کی طرف پشت کی کھڑی تھی۔ فارس نے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی، پھر سیم کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”یہاں دو گولیوں کے نشان ہیں۔ اور ایک گولی اس دیوار میں بھی لگی ہے۔“ وہ اتنی آواز میں بولا کہ زمر من لے اور وہ سن کر چونک کر مڑی تھی۔

”مگر.... یہاں گولیاں کیوں ہیں؟“ سیم نے ناگھی سے دونوں کو دیکھا۔

”اس کے اینگل سے لگتا ہے کہ یہ....“ کہتے ہوئے اس نے گردن موڑی، وہ اب ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں تو وہ سیڑھیوں

میں لگے سوراخوں کو دیکھنے لگی۔ ”... یہ پورچ سے ہی چلائی گئی ہے۔ ظاہر ہے اسی شورنے چلائی ہے۔“  
”مگر.... ادھر کیوں وہ گولی چلائے گا؟ سعدی بھائی تو بالکل دوسرا طرف تھے۔“  
”شاید اس کا نشانہ بر اھا۔“ فارس نے سرسری ساتھرہ کیا۔

”یا شاید یہاں کوئی اور بھی تھا۔“ وہ بالکا سا بڑا بڑا۔

”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ کوئی اور بھی تھا؟“ وہ چونکا زمر نے جواب نہیں دیا، بس گردن موڑ کر دوسرا طرف دیکھنے لگی۔ سیم نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

”پھچھو آپ کو کیسے پتہ؟“  
”میں نے ابھی معلوم کیا تھا کہ پولیس کوکس نے کال کی کیونکہ سعدی کو بروقت ہسپتال پہنچا گیا تھا تو....“ وہ سیم کو بتانے لگی۔ آواز ہلندر کھی۔ فارس اسے غور سے دیکھتے ہوئے سننے لگا۔ ”تو معلوم ہوا کہ ہمسائے میں سے کسی نے کال کی تھی اور پتہ سمجھا تھا، مگر جب پولیس آئی تو یہاں رُخی سعدی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور ہمسائے میں..“ زمر نے ادھر ادھر گردان گھمائی۔ ”... سارے گھر تو ابھی زیر تحریر ہیں۔“

”یعنی کہ وہ شخص جس نے پولیس کو کال کی اس واقعے کے وقت بیہن تھا؟“

زمر نے لگا ہیں پھیر کر فارس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”تھی۔ کال کرنے والی کوئی لڑکی تھی۔“ اور وہ مژگُنی۔ اسے جانتے دیکھ کر سیم پیچھے لپکا۔

”پھچھو... کیا ہمیں یہاں اور نہیں پکھ تلاشنا چاہیے؟ مثلاً کوئی نشانی، کوئی ثبوت، کوئی فنڈر پرنٹ...“

”سب دھل کرتا ہو چکا ہے سیم۔ ہمیں اس کو دیں ڈھونڈنا ہے جہاں وہ کھو یا تھا۔“ وہ جیسے صرف یہ جگہ دیکھنے آئی تھی۔ کسی اور چیز کی امید نہ تھی۔

سیم اور وہ ساتھ ساتھ چلتے واپس آئے تھے۔ فارس چند قدم پیچھے تھا۔ سیم اندر چلا گیا اور وہ ابھی با غیچے کے دہانے پر تھی جب اس نے عقب سے پکارا۔

”میں ہامہل جا رہا ہوں۔ ان کی انتظامیہ نے.....“ زمر بات مکمل ہونے سے پہلے ایڑھیوں پر گھومنی۔

”ان کی انتظامیہ نے پولیس کو نامکمل سی ٹی وی فوٹو جگہ دی ہیں، میں جانتی ہوں، اور یہ بھی جانتی ہوں کہ مکمل فوٹو جگہ کیسے نکلوانی ہیں اور وہ میں نکلوں گی۔ آپ اپنے کام سے کام رکھئے، میرے راستے میں مت آئیے۔“ سر دسپاٹ سا کہتی وہ واپس مژگُنی تو فارس نے ایک تاسف آمیز سانس لے کر سر جھکا، اور گھر کی طرف بڑھ گیا۔ فارس جیسے ہی اندر گیا، ہاشم باہر آتا دکھائی دیا۔

”مجھے بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لئے۔“ وہ سینے پر بازو لپیٹے کھڑی با غیچے کے جملے پھول دیکھ رہی تھی، جب وہ عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

”آپ کا شکریہ ضرورت پڑی تو بتا دوں گی۔“ ہاشم نے بس سر کو خم دیا۔ چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی۔

”یہ کون کر سکتا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم، مگر ہو جائے گا۔“ ہاشم نے تھوک نگلا۔

”جس وقت سعدی کو گولی لگی، اس وقت....“ مژکر گھر کو دیکھا جہاں ابھی وہ اندر گیا تھا۔ ”... فارس کہاں تھا؟“

زمر نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر گھر کو۔ ”کیا مطلب؟“

”کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ آپ کے خاندان میں ایک بڑی ٹریبیڈی ہوئی تھی جس کے باعث وہ جیل گیا تھا، اور پھر جب وہ جیل

سے نکلتا ہے تو ایک اور ثریجٹی ہو جاتی ہے؟" سرسری انداز میں کہتے وہ زمر کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

زمر پلک بھی نہ جپک سکی۔ "وہ اس کا بھائی نہ ہے، ہاشم!"

"جیسے وارث اس کا بھائی تھا اور زرتاش اس کی بیوی تھی؟"

زمر نے آنکھیں سیکڑ کر قدرے تجھ سے اسے دیکھا۔ "فارس کا سعدی والے واقعے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے، وہ اس وقت کہیں

اور تھا۔"

"اوہ کم آن زمرا!" ہاشم نے بے زاری سے ہاتھ چھرے کے آگے جھلایا۔ "اس کے پاس ہمیشہ alibi ہوتا ہے، آپ اس پر اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی کیسے اعتبار کر سکتی ہیں؟ وہ فارس ہے، اس سے کچھ بھی بجید ہے۔ ہم سب جانتے ہیں، آپ نے اس سے کیوں شاہی کی۔ اور میرے نزدیک تو اس کے جرم میں آج ایک جرم کا مزیداً ضافہ ہو گیا ہے۔ اب وہ وقت ہے جب آپ کو فارس کے خلاف کوئی نہیں قدم اٹھانا چاہیے۔"

زمر نے لب بھیجنے اور تین نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "آپ پوچھیں گے نہیں کہ اس کا alibi کون ہے؟"

"اس دفعہ کون ہے؟" اس نے استہرا سیئر بھٹکا۔

"میں! وہ اس وقت میرے ساتھ تھا۔"

لمحے بھر کو وہ کچھ بول نہیں سکا، پھر وضاحتی انداز میں گویا ہوا۔ "میں فارس پر اعتبار نہیں کر سکتا، میں آپ سیدھے ہوں، سعدی میرا دوست تھا، اور...."

"اوکے ہاشم، ایک بات۔" وہ ایک ہاتھ اوپنچا کر کے اسے درمیان سے ٹوکتی، اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اسی سرد بھری بولی۔ "آپ فارس کو ناپسند کرتے ہیں، مگر مجھ سے زیادہ نہیں۔ آپ سعدی کو پسند کرتے ہیں، مگر مجھ سے زیادہ نہیں۔ اس لئے میری یہ بات مل کر آخڑی دفعہ دھیان سے سننے۔ فارس... نے... یہ... نہیں کیا۔ اپنے کچھے اعمال کا وہ حساب دے گا، مگر آپ... آپ نے اگر اپنے خاندان ال تماز عات کے بد لے کے طور پر فارس کے خلاف میرے بھتیجے کی ثریجٹی کو استعمال کرنا چاہا، تو آپ مجھے اپنا دشن بنالیں گے۔ دوست ہم بھل بھی نہیں تھے۔"

ہاشم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"یہ موضوع ختم ہوا۔" وہ ایک سلکتی ہوئی نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ ابھی دروازے کے قریب آئی تھی کہ وہ کھلا اور فارس ہاں نکلتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر رکا اور ہٹ کر راستہ دیا۔ زمر آگے نہیں بڑھی، وہیں کھڑے فارس کو دیکھا اور کافی صاف آواز میں بولی۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میری کار میں کچھ مسئلہ ہے۔" آنکھیوں سے نظر آرہا تھا کہ باغیچے میں کھڑا ہاشم ہلکا سا چونکا تھا۔

"اوکے، میں انتظار کر رہا ہوں۔" فارس ایک سنجیدہ مگر جیران نظر اس پر ڈال کر آگے چلا آیا۔

زمر اندر آئی، کمرے سے اپنی ایک دو چیزوں اٹھا کیں تو لا و نج میں پیٹھی جو اہرات کی آواز ساعت میں پڑی۔

"اب تم لوگوں کو اس جگہ نہیں رہنا چاہیے۔ یہ علاقہ محفوظ نہیں ہے۔" وہ نین سے کہہ رہی تھی۔ زمر تھہر کر کچھ سوچنے لگی، پھر سر جملہ کر باہر نکل آئی۔

پرس کہنی پڑکائے اس نے باہر قدم رکھا تو دیکھا فارس گاڑی کی طرف جاتے ہوئے رک کر ہاشم سے کچھ کہہ رہا تھا۔ دونوں کا اندا

عام اور سرسری تھا۔ زمر خاموش نظروں سے ان کو دیکھتے ہوئے کار کی طرف چلی آئی۔

نئی منزل کی راہ ڈھونڈو تم! ..... میرے غم سے پناہ ڈھونڈو تم!  
چند منٹ بعد جب کار سرک پروال تھی تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھی زمر نے موبائل پر چلتا ہاتھ روک کر سرسری ساپوچھا۔  
”ہاشم تم سے کیا کہہ رہا تھا؟“

وہ ڈرائیور کرتے ہوئے چونکا رخ زرا پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے موبائل پر لگی تھی۔  
”پولیس کی کار روائی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“  
”کیا تم نے اسے کسی مکانے گواہ کا بتایا؟“  
”نبھیں تو۔“

”اس کو پچھہ مت بتانا۔“

”کیوں؟“ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ زمر نے چڑھا اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں وہی ازلی سرد مہری تھی۔  
”یہ مت سمجھنا کہ تمہیں فیور دے رہی ہوں میں صرف یہ نہیں چاہتی کہ سعدی کے کیس کی تفییش پر ہاشم اثر انداز ہو،“ کہتے ہوئے وہ  
ہم موڑ کر کھڑکی کے باہر گزرتاڑیک دیکھنے لگی۔ ”ہاشم نے مجھے کہا ہے کہ یہ واقعہ میں تمہارے اوپر ڈال دوں۔“  
اٹھیرنگ دھیل پر اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوئی بے شقینی سے اس نے زمر کو دیکھا۔  
”یہ کہا اس نے؟“ اس کے کان سرخ ہوئے آنکھوں میں طیش ابھرا۔ پھر لب بھینٹ لیے اور غصے سے ایکسلیٹ پر پاؤں کا زور  
لاھاریا۔ اندر ہی اندر لا واسا بلٹنے لگا تھا۔

”مجھے پتہ ہے اس میں تمہارا ہاتھ نہیں ہے، لیکن اپنے پچھلے اعمال کا تم حساب دو گے۔ ایک دفعہ یہ معاملہ ختم ہو جانے دو۔“ باہر  
دھمکت وہ تھی سے کہہ رہی جب اس نے زور سے بریک پر پیور کھا کر جھٹکے سے رکی؛ وہ بے اختیار ڈیش بورڈ پر جھکتی گئی مگر خود کو سنبھال لیا۔ غصے  
سے چڑھا اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ اس سے زیادہ اشتغال سے اسے گھور رہا تھا۔

”بس بہت ہو گیا۔ بہت سن لی میں نے آپ کی بکواس۔“ وہ غصے سے غریباً تھا۔ زمر ڈرائیور بیچھے ہوئی۔

”ہاشم کو دیکھ لیوں گا میں، مگر اب آپ کا بھی لایا ظہر نہیں کروں گا۔ اس لئے آئندہ میرے آگے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت  
دکھلیا میں نے اپنے گھر والوں کو قتل ہوتے اور خود پر اذام لگتے۔ آج کے بعد کوئی مجھے نہیں بتائے گا کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ سمجھیں آپ؟“  
آنکھوں میں تپش لئے اس کو دیکھ کر کہتے وہ کار سے نکلا اور ٹھاڈ دروازہ بند کیا۔

وہ غفراد بے بسی سے اسے گھورتی ویسی بیٹھی رہی۔ کار ہسپتال کے سامنے رکی کھڑی تھی اور وہ چاپیاں جیب میں ڈالتا ب اس طرف  
ہمارا تھا۔

چند منٹ بعد وہ ہسپتال میں ایک کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ بیگ کہنی پر نکائے سن گلاسز گھنگریا لے بالوں پر اوپر چڑھائے وہ  
آج سیاہ پا جائے پر بلکی سبز لمبی تھیں پہننے ہوئے تھیں اور سبز دوپٹہ دائیں کندھے پر تھا۔ سکون سے کھڑی وہ فارس اور سیکیورٹی آفیسر کو بحث کرتے  
دیکھ رہی تھی۔ سیکیورٹی ٹیم کے دو افراد دروازے کے آگے کھڑے تھے۔

”سر، میں آپ کو بتا چکا ہوں، ہم نے پولیس کے حوالے سب کچھ کر دیا ہے اگر آپ کو زید کوئی فوچج نکلوانی ہے تو کورٹ آرڈر لانا ہو  
گا۔ درستہ میں آپ کو اس کمرے میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔“  
”اور آپ کا قانون اس وقت کہاں تھا جب میرے بھائی کو ہسپتال سے انکو لایا گیا؟ ہاں؟“ غصے سے بولتے اس کی آواز بلند ہو  
رہی تھی۔ زمر گھنگریا لٹ انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔

”سر مجھے مجبور اسکیو رٹی سے آپ کو باہر نکلنے کو کہنا پڑاے گا۔“ سرد لمحہ میں کہتے آفیسر ساتھ میں اسے تیز نظر دوں سے گھوڑ بھی، تھا۔ پچھے کھڑے دونوں ابلکار آگے ہوئے۔ ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔

”اے.... ہاتھ نہیں لگانا۔“ اس نے سختی سے ہاتھ انداختا کر ان کو روکا۔

”اسلام و علیکم۔“ وہ زم سامکراتی، کھنکھاری۔ فارس نے بس ایک تیز نظر اس پڑالی۔ مگر وہ سیکیو رٹی آفیسر کو دیکھ رہی تھی۔

”میں زمر یوسف ہوں، ڈسٹرکٹ...“

”میم مجھے پتہ ہے آپ کون ہیں، اور نہیں، ہم آپ کو کوئی نیپ نہیں دے سکتے۔ اگر آپ کو نیپ چاہیے تو وارثت لے کر آئیں۔“ اس نے سختی سے زمر کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ وہ اس طرح مسکراتی رہی۔

”اوے۔ کل عدالت کھلے گی تو میں وارثت لے آؤں گی، مگر آپ نے نیبیں پوچھا کہ میں کس فوٹج کا وارثت لاوں گی؟“

”میم، میں آپ کو بہت تحمل سے...“

”کل جب میں کوٹ جاؤں گی تو جانتے ہیں کہ کس کے وارثت نہیں گے۔ 16 مارچ کا جب ایک ممبر قوی اسٹبلی کی نوکرانی کا ایک ابارشن آپ کے ہاسپیٹ میں ہوا تھا، ستائیں جنوری کا جب آپ کے وارڈ سے دونوں مولود بچے غائب ہوئے تھے، اور آپ کی فارمیسی کے ریکارڈ کا سرچ وارثت بھی جہاں پچھلے تین میینے میں آپ کے ایک خود ساختہ مٹی و نامن نے آدھ درجن عروتوں کے مبینہ طور پر مس کیرج کروائے ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ مٹی و نامن ابھی تک مکمل طور پر اپر و دنیبیں ہوا۔ سو پتہ ہے کیا آفیسر یہ ایک اچھا اور براہستا ہے، مگر یہ ایک پرائیویٹ ہسپتال ہے، اور سر کار ایک نجی ہسپتال کے ساتھ کیا کر سکتی ہے یہم دونوں جانتے ہیں، سواب آپ مجھ سے پوچھیں کہ مجھے کیا چاہتے؟“ ایک سانس میں تیز تیز بولنے کے بعد وہ رکی اور مسکرا کر باری باران تینوں کے چہروں کو دیکھا۔

آفیسر ان چارج غصے بھری بے بسی سے اسے گھورتا رہا ”میم!.....“

”مجھے سے پوچھئے آفیسر کہ..... مجھے... کیا..... چاہیے؟“

اس نے ضبط سے گھری سانس لی۔ ”آپ کو.... کیا چاہیے؟“

”جب آپ سامنے سے ہٹ کر مجھے کنٹرول روم میں جانے کا راستہ دیں گے، تب ہی میں بتا سکوں گی۔“

آفیسر چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر دوسروں کو اشارہ کرتا ایک طرف ہٹا اور دروازہ کھوں دیا۔ زمر نے ایک چھتی ہوئی (مگر فتحانہ) نظر فارس پڑالی۔ جس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑھکے تھے، اور آگے بڑھ گئی۔ پھر بظاہر انہی سخت تاثرات کو چہرے پر طاری کیے وہ اس سے عقب میں اندر واخل ہوا۔

چند منٹ بعد ایک کمپیوٹر اسکرین کے سامنے کری پہ موجودی آر انچارج فولڈر زکھوں کر ان کو مطلوب فوجیوں کو دکھارا رہا تھا۔ زمر اسی کری کے ساتھ کھڑی ذرا جھک کر دیکھ رہی تھی، اور فارس اس کے کندھے کے پچھے کھڑا تھا۔

”دلوگ تھے۔“ وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے بڑھا تھا جہاں کاریڈور میں دو ماںک والے وارڈ بواائز اسٹریچ پچلا تے ہوئے دکمال دے رہے تھے۔ اسٹریچ پر لیٹے لڑکے کے اوپر چادر ڈلی تھی، مگر سر سے ذرا سے گھنگریا لے بال نظر آتے تھے۔ زمر کے حلک میں آنسوؤں کا کووا۔ پھنسنے لگا مگر اس نے بلکوں کو جھپک کرنی اندر رہا۔

”یہ فوٹج پولیس کے پاس بھی ہے۔ یہ نہیں چاہیے۔“ فارس نے بے زاری سے آپریٹر کو دیکھا تھا۔ ”لفٹ کی فوٹج کہاں ہے؟“

آپریٹر نے سر ہلا کر ایک اور فولڈر کھولا۔ تھیز میں اسٹریچ پر لانے سے قبل وہ دونوں لفت سے اترے تھے۔ یہ اس سے پہلے کی یہ تھی۔ لفت میں وہ دونوں کھڑے تھے۔ ان کے سروں پر بزرگو پیاں اور چہرے پر بزرگ ماںک تھے۔ دفعتاً ایک وارڈ بواۓ جس کا رخ کیمپرے

کے میں سامنے تھا، اس نے چینکے کو منہ پہ ہاتھ رکھا۔ پھر چینک مار کر ماں کہا۔ رو مال سے منہ صاف کیا اور ماں کے درست کر لیا۔

”بیچھے کرو۔“ آپریٹر نے پیچھے کر کے رو کا اور تصویر کو بڑا کیا۔ وارڈ بوانے کا چہرہ کافی واضح تھا۔ وہ ایک پکی عمر کا مرد تھا اور اس کی محنتی مونوچیں تھیں۔

”کیا آپ نے پولیس کو یہ دکھایا؟“ اس نے باری باری آپریٹر اور سیکورٹی آفیسر کو گھوارا۔ آفیسر جو سینے پہ بازو لپینے کھڑا تھا، ذرا بے زار ہوا۔

”نہیں، کیونکہ انہوں نے یہ فوچ نہیں مانگی تھی۔“

فارس نے جیب سے ایک فلیش نکالی اور سسٹم میں داخل کی، سیکورٹی آفیسر فوراً آگے بڑھا۔ ”نہیں، آپ میراڑ بنا کاپی نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہارے سامنے کل کی تمام فوچ کاپی کرنے لگا ہوں اور تم مجھے خاموشی سے یہ کام کرتے دیکھو گے۔“ پھر آپریٹر کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

”جو فوچ رز میں کہہ رہا ہوں وہ کاپی کرتے جاؤ۔ شباباں!“ آپریٹر نے بے بُی اسے انچارج کو دیکھا جو حاضر خون کے گھونٹ پی کر لہڑا رہا، دوبارہ کچھ نہیں بولا۔

”یہ بھی کرو... اور یہ بھی... مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”مگر سریز دوسرے فوچ رکی ویڈیو...“

”میرا دماغ پہلے بہت گھوما ہوا ہے، مجھے مزید خراب مت کرو۔“ وہ جس طرح اس لڑکے کو گھوکر بولا تھا، مرنے ناپسندیدگی سے اسے ایکھا اور دہاں سے ہٹ کر دروازے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ کرسی کے ساتھ جھکا، انگلی سے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے آپریٹر کو ہدایات اے رہا تھا۔

.....

ابھی سے برف الجھنے لگی ہے بالوں سے ..... ابھی تو قرض ماہ و سال بھی اتنا رہا نہیں!

اس اپارٹمنٹ کی دیواریں خوبصورت سجادوں سے ڈھکی تھیں اور فرش ششی سے چمدگدار تھے۔ لوگ روم میں ٹوی بلند آواز سے چل رہا تھا اور بڑے صوفے پہ نیم دراز نو شیر والا پاؤں میز پر رکھنے ناپسندیدگی سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ رفتی شرث اور کھلےڑا زر میں ملبوس، اس کامنے بھی دھلا ہوا نہیں لگتا تھا۔ پھر اسی بے زاری سے اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملا کر کان سے لگایا۔

”ہاں شیر و تم ٹھیک ہو؟“ ہاشم مصروف سے انداز میں بولا تھا۔

”خاک ٹھیک ہوں؟ قید پڑا ہوں ادھر۔“

”میں نے کہا تھا، گھر میں بند مت رہو۔ دئی میں اپنے ایک ایک دوست سے ملو، تاکہ سب کو معلوم ہو کہ تم ادھر ہو اور ادھر ہی تھے۔“ ہبھی پوچھتے تو کہنا کہ میں اتوار کی رات آیا ہوں۔ سمجھے؟“

”آپ تو ایسے برتاؤ کر رہے ہیں جیسے واقعی مجھے کبھی گرینڈ جیوری کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ خدا کے لئے بھائی...“

”شکر ادا کرو کہ میں نے تمہیں بچالا ہے اور سب سنجھاں لیا ہے، لیکن اگر تم نے میری بات نہ مانی نا شیر و تو میں انگلی دفعہ تھیں نہیں بچاؤں گا۔ اب میرا دماغ مت خراب کرو اور دوستوں کو جا کر ملو۔“ تینی سے کہہ کر فون رکھ دیا گیا۔ نو شیر والا غصے سے موبائل کو گھوکر رہ گیا۔

مکانیزم کوئنچنگ کی طرف ایجاد ہے اس سے کھلا اس کا بے شکاری گیا جسے میں اپنے تھکانے کوں جو کریکٹر ہے۔

بھی اسی سبک کے ذمہ کے لئے کافی نہیں۔ بھی، بھی انھیں بھی... تو ان کا گلے بھی مارنا چاہیے۔

ایک بڑا کمال مہماں گردی ہے اس سے ساری اخباروں کے میں اخالی نہاد پر یونیورسٹی کی کامیابی کا منہج لگائی گئی۔

”کوئی بھی اپنے میں نے اگلی آپ کی پہنچ دیکھی۔ اپنے میں ہی ان میں کوی بھرپور ایک

کوئی کامپنی کے مالک ہے۔ اس کی وجہ سے اس کو اپنے مالک کے طور پر نہیں  
تھا۔

— 1 —

میں نے ایک بھل کاپے اور کوئی اور جیسی پھر مونگا کاپ دہلی طرف سے جس کے آں پر کافی خوش بجھا اگیا  
وہی کھل کر بھل کاپے کے پیچے آتی ایسا طرف کھلے کر کھلے گئی۔

کوئی سچھنگی نہیں کہ اس کا ایسا ایک ایسا بھائی تھا جو اپنے بھائی کو اپنے بھائی کے لئے کوئی کام نہیں کر سکتا۔

بھارتی سکالپریڈ کے ایک ایجاد کرنے والے تھے۔

کاری کر کر اپنے اس کے ساتھ جا کر چکا۔ ”کہتے ہیں کہ بھی جس دن کے قدمہ پابندی میں سنتہ کے کوئی نہیں لے سکتے ہے جو انکی عین طرفی ہے۔“

”کوئی بھائی نہ ملتے ہے اس لئے جن کو کہا جائے ”شاعر نے لکھی

”جسیں اس سارے تھاڑی اپنی کان کے ساروچ کر دیتا ہے۔ جس کی پکیں، مکتوب اور۔“ لای آئندہ نبی خداوندی۔

"ہمیں یہ بھی کیا ہے؟ پانچ کا نتیجہ کاری کر دیں تھوڑا ملے جاتے ہیں۔"

### “Theirselves”

”اے اب لے پاٹے پکڑا تھا اور اس میں لے کر بیٹھا ہے تھا۔“ اس کو اکابریٰ فیض نے سرپرستی دیتے ہوئے سے لے آگئے۔

"مگر؟" اپا جان ہوئے۔ "تمہیں کس نے کہا؟"

"بھری فرزند کا مگر بھی ہے اسی کا لونی میں۔ اس کی طرف گئی تو دیکھا تھا۔"

"وہ پہلا توز مرے کب کا ہی دیا۔ حسین۔" ندرت نے تابا۔

چھٹے کے لئے لاونچ سے کوئی آواز نہیں۔ راہداری میں کمزی زمر نے آنکھیں کھولیں۔

"چج دیا؟" حسین شاکر تھی۔ "مگر کیوں؟"

"اس کو شاید کسی مقدمے کے لئے رقم پا یے تھی۔" ندرت نے بے پرواہی سے تابا، گویا یہ کہ فیرا اہم تھا۔ باخا موش رہے۔

"مقدمے کے لئے؟ اف۔ بڑے ابا۔ آپ نے ان کو جس کرنے کیسے دیا؟ وہ آپ کے لئے ایک سلیو روٹی تھی۔ ایک سہرا تھا۔"

"وہ زمر کا تھا۔"

"ہونہ۔" حد کی تھی سے بھری آواز آئی تھی۔ اور زمر صرف اپنا سو بھی جیں۔ اور پھر تھے سے بوقت انہیں کر آئی تو وہ راہداری میں کمزی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دم بھر گئی۔ نظریں اس کے حصہ میں گئیں تو زمر نے بھی چھک کر گردن موزی، فارس بھی یچھے کمزی تھا۔ مگر زمر کے پھرے کے بر عکس اس کی آنکھوں میں حسین کے لئے ہمارتی تھی۔

"بھائی کا کچھ پڑھ چلا؟" اس نے بے تابی سے فارس کو ہاتھ لیا۔ بھروس کے نئی میں پٹختہ سر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈیندیں اور "وہ تجزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

وہ دونوں ساتھی ساتھ جو پڑھتے ہوئے لاونچ میں داخل ہوئے۔

بڑے ابا اور ندرت دونوں نے بے قراری سے ان کو دیکھا۔ مگر۔ چھروں پلکھی تحریر پڑھلی اور لگا جیں، ماہس پٹ آئیں۔ وہ سامنے صوفی پچاگر بیٹھا۔ زمر چوکت میں کمزی رہی۔

"میں جاتے وقت آپا کو ہاتا کر گیا تھا۔ کہاں آپ لوگ ہمارے ساتھ چال کر رہیں گے۔" اس نے بات کا آغاز ابا کو دیکھتے ہوئے کیا۔ انہوں نے انہیں لئی میں گردن ہلانی۔

"میں اسی گمراہ میں تھیں۔ ہوں صداقت ہے میرے پاس۔ ہاں تم باقی سب کو لے جاؤ۔" ایک ہی دن میں وہ کمزود نظر آئے گئے تھے۔

"ابا وہ گمراہ آپ نے مینے کے آخر میں دیے بھی خالی کرنا تھا اور یہ جگاب رہنے کے قابل تھیں۔ اس نے پلیز صدمت سمجھے اور ہمارے ساتھ چلیں۔"

"زمر تھیک کہہ دیں اب آپ کا کہنیں اور رہنمائی کیجیں تھیں ہے۔" وہ ابا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ہاصل اکاری تھے اور ندرت حامل تھیں۔

"فارس، ہم انتہے سارے لوگ کیسے رہیں گے اور ہم؟"

"انتا چھوپا ہیں ہے وہ گمراہ۔ حسین پیدا روم ہیں۔ بیچھے والا، یونس ساتھ اور ہم لے لیں گے صداقت پورن کے ساتھ رہنے والوں میں رہ لے گا اور اور پر۔۔۔" وہ کا ایک نظر زمر کو دیکھا۔ وہ بھی اسے بن دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اور زر تاش والا اپنا نام کر رہا آپ کے اور حسین کے لئے کافی ہے۔ باقی... ہمارا تو دیے بھی ایسی والا کمرہ ہے۔ آپ کے اس نے زمر کو دیکھے، ہاتھیڈی سے بات مکمل کی۔ اور واڑے پر دیکھے اس کے پاتھکی گرفتخت ہوئی تھی اور دونوں گئے ایک خاموش تیز نظر اس پا ایں۔ مگر جب بولی تو آواز صورتی۔

"سب آرام سے آجائیں گے۔ آپ بس پٹختہ کی چاری کریں۔" اور مرتے ہوئے کاٹوں میں ندرت کی آواز پڑی۔

”میرا بینا ہوتا تو ہمیں کہی یوں نہ جانے دیتا...“

بڑے ابا مسلسل انکار کر رہے تھے اور فارس کچھ کہر رہا تھا مگر زمر نے بغیر آگے چلتی آئی۔ سعدی کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ وہ دیوار سے لگاں کے بیڈ پر بیٹھ گئی جوتے اتار کر پیدا کرنے اور دیوار سے بیک لگائی۔ آنکھوں میں پانی سا ابھر رہا تھا، جس کو اندر اتارے بنا، دیوار سے سر زکارے، بس چپ چاپ سامنے دیکھئے گئی۔ دل خالی تھا، ہاتھ خالی تھے، دنیا خالی تھی۔

اسی دیوار کے دوسرا طرف نہیں کے کمرے میں بھی ایسے ہی بیڈ لگا تھا، اور وہ بھی اسی دیوار سے لگی اکڑوں بیٹھے سرگھنوں پر کھ رہا تھا۔ دل خالی تھا، ہاتھ خالی تھے، دنیا خالی تھی۔  
دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں۔

ہمارا سعدی کہاں ہو گا اس وقت؟

❖❖❖

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں ..... عجب رسم چلی ہے، دعا نہ مانگے کوئی  
اس نے بدقت آنکھیں کھولیں تو دھنڈلی ہی چھٹ نظر آئی۔ پلکیں آہستہ سے چھپکیں تو منظر قدرے صاف ہوا۔ سعدی کے چہرے پر  
تکلیف ابھری، حیات جانے کے ساتھ درشدت سے لوٹ آیا تھا۔ وہ ہلاکا سا کر رہا۔ پھر گردان موڑی  
وہ ہسپتال کے بیڈ پر لیٹا تھا، اور اس کے ارگرد ایک کشادہ اور چمکتا ہوا کمرہ تھا۔ اس نے کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کی، مگر جسم جیسے  
جام ہو چکا تھا۔

”آہ۔“ اذیت کے احساس سے آنکھیں بیچ لیں۔

”ریلیکس، آرام سے....“ ایک عورت تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔ سعدی نے مندی مندی ہی آنکھیں کھولیں۔ یہ چہرہ.... وہ  
اسے پہچانتا تھا مگر اس وقت ذہن میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کون ہے۔

”ای کہاں ہیں؟“ وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بڑا بڑا یا۔

”آپ کو پانی چاہیے؟ یا کچھ اور؟ کہیں تکلیف ہو رہی ہے؟“ آوازِ لہجہ سب شناسا تھا، مگر یہ کون...؟ اس نے پلکیں چھپکیں۔ خود پر  
چکلی اسماڑتی اعورت کا چہرہ واضح ہوا۔ بھورے نہرے مرنے بال اور غیہ جلد....

”میری ای کہاں ہیں؟“ اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اٹھنیں پا رہا تھا۔

”آپ کو پانی دوں؟“ اب کے سعدی نے اُجھن سے آنکھیں سکری کر اسے دیکھا۔ کیا وہ اس کی بات سن نہیں سکتی تھی؟ اس نے پھر  
اٹھنے کی سعی کرنی چاہی، مگر کیا شے تھی، جو اس کو حرکت نہیں کرنے دے رہی تھی۔ اس کی نگاہیں اپنے بازوں تک گئیں... دونوں بازو، کہنی سے  
کلائی تک بیڈ کے ساتھ اسٹرپس سے بند ہے تھے۔

ایک دم سے ذہن پر دوائیوں سے چھایا نشہ اور غنوڈی اترنے لگی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

”میں کہاں ہوں؟“ بے حد حیرت اور وحشت سے اس نے خود پر جھکی عورت سے سوال کیا۔

”کیا آپ کو پانی چاہیے؟“ اس نے اسی نری سے پوچھا۔ ذہن میں بکھرے ٹکڑے جڑنے لگے۔ اس عورت کو یقینتی اس کی آنکھیں  
سکڑیں۔

”میری؟ میری؟“ کہنے کے ساتھ اس نے بازو زور سے کھینچے مگر گرفت مضبوط تھی وہ کے رہے۔

”میں کہاں ہوں؟“ وہ سیدھی ہوئی، سینے پر بازو لپیٹ کر اسے دیکھا۔

”آپ کو پانی چاہیے یا نہیں؟“

سعدی نے سر نکلیے پر گردید۔ میری کوتھی اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی حیرت تھی۔

”میں کہاں ہوں؟ میرے گھروالے کہاں ہیں؟“، مگر میری کا وَجْہ کی طرف گئی، شاید فون وغیرہ پر کسی کو اطلاع دی، کہ چند لمحے بعد دروازہ کھلا، اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔

”میری ای کہاں ہیں؟“ وہ بدقسم بول پڑا تھا۔ نکلے پر کھی گردن ذرا موڑی تو دھندراسا منظر نظر آیا۔ نیلی جنیز پر گھنٹوں تک آتا سفید اور آل پینے، ایک لڑکی اس کی جانب آ رہی تھی۔ اس کے بال سیدھے اور لمبے تھے، کہنی تک آتے، اور گردن میں اٹیتھ پڑا تھا۔ قریب آئی تو پھرہ واخض ہوا۔

گندمی رنگت، اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور ان میں ایک معصوم ساتاڑ۔ زمی میں اس کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔

”میری..... ای کہاں ہیں؟“ وہ اس کو اپنی انجیکشن لگا رہی تھی، اور سعدی ایک ہی بات دہراتے جا رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ اندر ہمرا، پھر روشنی، پھر اندر ہمرا۔

پھر وہ میری کی طرف گھومی۔ ”اس کے ہاتھ کھولوں دو کم از کم۔ وہ بیمار ہے، اور زخمی بھی۔ اس حالت میں بھاگ کر کہاں جائے گا؟“ اس کی آواز میں ترجمہ تھا۔ مقابل کھڑی میری نے اسے تیز نظروں سے گورا۔

”تمہیں اس سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے! اپنے کام سے کام رکھو!“

”اپنے باس سے کہو، صرف اس کے ہاتھ کھولوں دیں۔ وہ... الفاظ گذمہ ہو گئے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

..... ♦♦♦♦♦

سازش تھی رہبروں کی یا قسمت کا پھیر تھا..... ہم بھرتوں کے بعد بھی قاتل کے گھر میں تھے

اس رات تصریکاردار کے عقب میں ایکسی کی ساری تباہی روشن تھیں۔

صداقت پکن میں کھڑا ندرت کے ساتھ چیزیں سیٹ کرو رہا تھا۔ ندرت پھر اس کے بعد نہیں روئی تھیں۔ دو دن لگے ساری تیاریوں میں اور آج تیسرے دن وہ لوگ بالآخر اس انکسی میں آچکے تھے۔ لا وغیرہ بھی صفائی کے بعد چکنے لگا تھا۔ لا وغیرہ میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلتا جس میں بڑے ابا ایک سنگل بیٹھ پڑیتھے، فاصلے پر دوسرے بیٹھ پسارے دن کا تحکماہارا سیم سورہا تھا۔

اوپر سیڑھیوں چڑھ کر جاؤ تو فارس اور زرتاب شہ کے پرانے کمرے کا حلیہ ذرا بدلا ہوا تھا۔ فارس کی کوئی چیز ادھرنہ تھی۔ خنین اور ندرت کے بیگز اور کپڑے دہاں دکھائی دے رہے تھے۔

ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر مدھم زرد تباہ جل رہی تھیں۔ (یہ وہی کمرہ تھا جس میں زمر شادی کے دن سے رہ رہی تھی)۔ سعدی کے لائے بکے وہیں رکھے تھے گو کہ وہ اب سوکھے تھے۔ ایک الماری کھلی تھی اور فارس اس کے سامنے کھڑا، اس میں اپنی چیزیں رکھ رہا تھا۔ وقتاً اس نے ہاتھ روک کر ایک نظر ان باکسرز پر ڈالی جن میں زمر کے کاغذات تھے اور جو اس نے (بادل خود است) فارس کی چیزوں کے لئے اس الماری سے نکال لئے تھے۔ اور پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا جو اسٹڈی نیبل پر اس کی طرف پشت کیے، لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ مدھم زرد حقیقی میں بھی اس کے گھنٹریا لے بال چک رہے تھے۔

”آپ یہ باکسرز نیچ پیمنہ میں رکھ دیں۔ پیمنہ کی چاپی آپ کی ذرینگ نیبل پر پڑی ہے۔“ پچھلے دو دن کی خاموشی کے بعد اس نے پہلی دفعہ سے مخاطب کیا تھا۔ وہ جواب دیے بنا کام کیے گئی۔ فارس نے گھری سانس لی۔

”آئی ایم سوری، اس دن آپ پے غصہ کر گیا۔“

”آپ کی معدرنتوں کا وقت گزر چکا ہے۔“ وہ مڑے بنا کندھے اچکا کر بولی۔

”کوشش کروں گا اس کمرے میں کم سے کم آؤں اور آپ کو زیادہ پریشان نہ کروں۔ یہ بھی مجبوری ہے۔“

وہ چپ چاپ اسکرین کو دیکھئے گئی اور وہ اس کے بالوں کو۔

”اگر آپ میری وجہ سے غیر آرام دہ ہیں تو اس کے لئے بھی معدرت کرتا ہوں۔ یہ آپ کا کمرہ ہے، آپ کا ہی رہے گا۔ میں صوفے پر سوڈاں گا۔ جب تک ہمیں ساتھ رہنا پڑے۔“

زمر کی نائپ کرتی انگیاں تھیں، گردان موڑ کر جاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں نے اپنے کمرے میں یہ صوف آپ کے لئے ہی ڈالوایا ہے۔“ اور واپس گھوم گئی۔ فارس نے مخفی سانس لی، پھر الماری کا پت بندر کرتا کھڑکی تک آیا تو دم ٹھہرا۔ پردہ ذرا سر کا کر نیچے دیکھا جہاں برآمدے میں ہاشم کھڑا ہیں سے بات کرنا نظر آ رہا تھا۔ فارس کے جڑے بچپنے۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔

ائیکس کے برآمدے میں وہ کھڑی تھی اور اس کے سامنے ہاشم تھا۔ ہاشم کے عقب میں سزہ زار اونچا ہوتا دھائی دیتا اور چوٹی پر وہ بلند محل تھا۔ مگر جب ہاشم سامنے ہوتا تو دوسری ہرشے اپنا حسن اور عظمت کو دیتی تھی۔ اب بھی وہ زمی سے مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

”اچھا کیا جو تم لوگ بیہاں آگئے۔ سیئل ہو گئے ہو یا کوئی مدد چاہیے؟“

”نہیں، تھیں یو سب ہو گیا۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ بال پونی میں بندھے تھے اور لباس ملگا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ رات کو بھی پچکدار سفید شتر میں ملبوس کتنا تازہ و دم لگ رہا تھا۔ حنہ کو احساں کمری نے آن گھیرا۔

”وہ بندہ پکڑا گیا نہیں؟ جو لفٹ کی فوج میں ملا تھا؟“

”نہیں۔ پتہ نہیں۔“ حنہ نے یاسیت سے شانے اپکائے۔ ہاشم نے غور سے اسے دیکھا۔

”تم اس معاملے میں کوئی دلچسپی کیوں نہیں لے رہی؟“

”پچھوا درماموں کر رہے ہیں ناسب۔“

”مگر وہ سعدی کے لیکل دارث نہیں ہیں۔“

”مطلوب؟“ اس کے چہرے پر آتی لمحن دیکھ کر وہ قدرے حیران ہوا۔ ”کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟ پچھوا درماموں قانونی دارث نہیں ہوتے۔ اس کیس میں صرف تمہاری امی یا تم سعدی کے دارث ہو۔“

”اور سیم؟“

”وہ اٹھارہ سال سے چھوٹا ہے، سودارث نہیں ہو سکتا۔“

”اوہ۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ بے دلی سے سر جھکائے جوتے سے فرش کھر پنے لگی۔

”تم کتنے سال کی ہو؟“ سامنے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہاشم نے پوچھا۔

”میں۔“

”میں پہنچتیں سال کا تھا جب میرا باپ مر۔ میں بیس کا نہیں تھا، پھر بھی لوگوں نے میرا استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے میری صحیت یاد رکھنا۔ جب آپ کے گھر کا سر برہا نہ رہے، تو آنکھیں اور کان کھلی رکھتے ہیں۔“

خشن چپ چاپ اسے دیکھئے گئی مگر اس کے چہرے پر لمحن بھری ناپسندیدگی کا تاثر تھا۔ ”مگر فارس ماموں اب ہمارے سر برہا ہیں،“

”....اسی پل دروازہ کھلا اور فارس باہر آیا۔ حنہ نے چونک کرا سے دیکھا۔ ایک دم اپنا آپ چور لگا۔

”ہیلو فارس!“ ہاشم نے اسی طرح مسکرا کر سر کو خم دیا۔ حنہ فوراً اس کی طرف مڑی۔

”ماموں! ہاشم بھائی آپ کا پوچھر رہے تھے، میں سمجھی آپ سوچ کے ہیں۔“

فارس نے ایک تیز سپاٹ نظر ہاشم پر ڈالی، پھر حنہ کو اشارہ کیا۔ ”اندر جاؤ۔“ آواز میں سختی تھی۔ وہ سر جھکائے ”اوے گذناہت“ کہتی فوراً اندر کھکھ لی۔

اب وہ اپنے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ آستین چڑھائے تھے ابر و اور دبے دبے غصے کے ساتھ ہاشم کو دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ پرسکون کھڑے ہاشم نے ابر و اٹھائے۔

”وقت نہیں مل سکا، کچھ حساب کتاب کرنا تمہارے ساتھ۔“ آنکھوں میں نپش لئے اسے گھورا۔ ”کیا کہہ رہے تھے تم اس دن زمر سے؟ کہ سعدی کا حادثہ میرے سر پر ڈال دو؟“

”اوہ کم آن!“ ہاشم نے بے حد حرمت سے سر جھکا۔ ”کیا اس نے یہ بتایا ہے تمہیں؟ اور کیا یہ نہیں بتایا کہ اس نے خود کیا؟ ان لیکن ممزغمازی نے مجھے بہت صاف لفظوں میں بتایا کہ وہ آپ سے مجھ سے زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ اور یہ بھی کہ....“ طنزیہ لمحے میں وہ گویا ہوا۔

”اور یہ بھی کہ اتفاق سے اس دفعہ بھی آپ کے پاس alibi ہے۔ تو میں نے پوچھا، فارس اس وقت کہاں تھا۔ بولیں میرے ساتھ تھا، مگر وہ اپنے تمام اعمال کا حساب بھلتے گا۔ میں نے پوچھا، آپ یہ فارس پر ڈالنا چاہتی ہیں؟ تبھی تم آگئے۔ شاید انہوں نے تمہارے سامنے اپنی پوزیشن کلیر کرنے کے لئے یہ کہا ورنہ.... اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو بہت محتاط رہتا، کیونکہ ہم سب کو پتہ ہے کہ انہوں نے تم سے شادی کیوں کی ہے۔“

”میری بات کان کھوں کر سنو ہاشم!“ وہ چھپتی ہوئی نظر وہ سے اسے دیکھتا آگئے آیا۔ ”یہ میرا گھر ہے، اور زمر میری بیوی ہے۔ تم مجھے مقابلے پر اس کی بات کا زیادہ لیقین ہے، اس لئے میری بیوی سے.... دور رہو!“ چاچا کراکی ایک لفڑا دکا کیا۔ ”اگر ایک لمحے کے لئے بھی مجھے لگا کہ تم سعدی کے حادثے کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو یاد رکھنا، میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔“ ایک تیز نظر اس پر ڈال کر وہ مڑنے لگا، پھر رکا۔ ”اور ہاں، میرے گھر میری غیر موجودگی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا دوست سعدی تھا۔ اس گھر میں اب تمہارا مزید کوئی دوست نہیں ہے۔“ اور اندر جا کر زور سے دروازہ بند کر دیا۔

ہاشم بمشکل ضبط کرتا مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سبزہ زار پر چلتا گیا۔ اس کے چہرے پر شدید غصہ تھا۔ اس کے کمرے کی بالکلونی سامنے تھی۔ بیرونی زینے سے وہ بالکلونی پر چڑھا اور اندر کمرے میں آ کر موبائل پنپر ملایا۔ خاور نے پہلی گھنٹی پر کال انٹھائی۔

”جی سر؟“

”خاور، مجھے نہیں پتہ تم یہ کیسے کرو گے....“ عصیل آنکھوں کے ساتھ وہ فون میں غرایا تھا۔ ”مگر مجھے فارس غازی جیل کے اندر چاہیے، کبھی بھی باہر نکلنے کے لئے۔“

”اوے سر۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“

کال بند ہوئی تو ہاشم نے اسی بڑی سے فون صوف پر پھینک دیا۔ اور منہ ہی منہ میں چند انگریزی گالیاں اسے نکالیں۔ غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

انگریزی کے اندر فارس سیڑھیاں چڑھ کر اور آیا تو حد کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ مجھے چہرے کے ساتھ بیٹھ پڑتی تھی۔ وہ

چوکھت میں ظہرا۔

”آئندہ ہاشم سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔“ نہ تھی، نہ زمی، بس ہموار بجھ میں کہہ کر، اس کا ”جی اچھا“ میں جھلکتا سرد یکھ کروہ اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ (اپنا کمرہ؟)

ہلکی دستک دے کر دروازہ ہکھلا تو کمرے کی تھی بھی تھی، صرف ڈرینگ روم کا بلب بل رہا تھا۔ اسٹڈی ٹیبل خالی تھی۔ وہ بہیڈ پر لفاف گردن تک اوڑھے، آنکھوں پر بازو رکھ لیتھی تھی۔ (کیا یہ میرے جانے کا انتظار کر رہی تھی؟) وہ آہستہ سے دروازہ بند کرتا بیٹد کے قریب آیا۔ دوسرا انکھی اٹھایا اور صوفے پر رکھا۔ پھر یونی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ آنکھیں بازو سے ڈھکی تھیں، مگر ناک کی لوگنگ دمکتی نظر آرہی تھی۔ فارس کے چہرے پر چھائے تئے تاثرات ڈھیل پڑے۔ نظر زمر کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی۔ وہاں دوائیں رکھی تھیں، اور ساتھ میں جگ گلاس۔ جگ خالی تھا۔ اس نے جگ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو وہ پانی سے بھرا تھا اور ٹھنڈے پانی کے باعث جگ کو پیندا آیا ہوا تھا۔ جگ واپس دھرتے اس نے گردن جھکا کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی، وہ جانتا تھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ لبوں پر اپھر کر معدوم ہوئی۔ پھر صوفے کی طرف آگیا۔

گھر کی بیان آہستہ بھنگ لگیں۔ خاموشی چھانے لگی۔ کتنے ہی پل ان کے کمرے میں آہستہ سے سرک گئے۔ وہ ہنوز بازو آنکھوں پر رکھ لیتھی تھی، اور وہ صوفے پر نیم دراز سینے پر لیپٹاپ رکھے، ہسپتال کی فونج بار بار دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چکار رہی تھی۔ ڈرینگ روم کی تھی اب بند ہی، اور باقی کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔

ایک دم سے وہ اٹھنے پڑی۔ بالکل سیدھی۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ پاؤں نیچے اتارے بالکل دم بخود سی پٹھنی تھی۔ ”اوہ!“ وہ ہلکا سا بڑا بڑا۔

”زمر... آپ ٹھیک ہیں؟“ وہ لیپٹاپ میز پر رکھتا خود بھی اٹھ بیٹھا۔ زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ نیم اندھیرے میں کہی اتنا واضح تھا کہ اس کی آنکھیں خوابیدہ تھیں۔ شاید وہ سوگی تھی اور بچی نیند سے جا گئی تھی۔

”وہ... ویڈیو....“ وہ بے خودی کے عالم میں بولی۔

”کون ہی ویڈیو؟ ہاسپیٹل والی؟“ وہ ایک طرف کو ہو بیٹھا۔ ”آئیے، دیکھ لیجئے۔“

وہ ایک دم اٹھی، اور ننگے پیر تیزی سے اس تک آئی۔

”کیا آپ اس ویڈیو کی بات کر رہی ہیں؟ بیٹھ جائیئے،“ وہ جو کافی مضطرب سی لگ رہی تھی، صوفے کے کنارے نکل گئی، اور آگے کو جھک کر اسکرین دیکھی۔ ہسپتال کے ایک کاریڈور کی فونج چل رہی تھی۔

”اوہ ہوں... لفت والی...“ وہ پریشانی سے بولی تو فارس نے ”اچھا“ کہہ کر مطلوبہ ویڈیو لگائی۔ زمر نے چہرہ مزید آگے جھکایا تو گھنگریاں لئیں کندھوں سے چھسل کر سامنے کو گریں۔ فارس نے ذرا کی ذرا نظر اس پر ڈالی۔ وہ بال کان کے پیچھے اڑستی، آنکھیں سکیڑے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ... یہ دیکھو،“ اس نے ایک منظر کو اشیل کیا تو فارس نے توجہ اور دھیان اسکرین کی طرف لگانا چاہا۔

”مجھے ابھی یاد آیا، یہ آدمی... دیکھو... چھینک مارنے کے لئے ما سک اتارنے سے پچھے سینڈ پہلے... اس نے نظر اٹھا کر کیسے کی طرف دیکھا ہے؟“

وہ ایک دم چونکا۔ اسکرین پر اس شخص کی نگاہ اٹھا کر فوراً واپس موڑ لینے کو زمر نے اشیل کر رکھا تھا۔

”یعنی کہ وہ اس بات سے واقع تھا کہ لفت کا کیسہ اس کی تصویر بنا رہا ہے۔“

"ہاں اور پھر بھی اس نے ماسک اتارا۔" زمر کا اضطراب اب غصے میں بد لئے گا تھا۔ "تاکہ ہم اس کا چڑھتی سے دیکھ لیں۔ اب ہمارا دن میں پولیس اس کو پکڑ بھی لے گی اور یہ اعتراض جرم بھی کر لے گا۔"

"کیونکہ یہ صرف ایک کرایے کا آدمی ہے جسے اصل مجرم خود کو چھپانے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔" وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے ہے۔ بول رہا تھا۔ پھر کچھ یاد آیا۔ "یہ دیکھتے۔ میں دوسرا فوٹج چھپ کر رہا تھا۔ یہ اس کا ریڈور کو دیکھتے۔" اس نے ایک اور روئیدی یونگ کر، سالاں ۱۰ سالہ رہا تھا۔ فارس نے ذرا فارور ڈکیا۔ "اس شیخے کے دروازے کو دیکھتے۔ اس میں مخالف کاریڈور کا عکس جھلک رہا ہے۔"

زمر نے گردن مزید آگے کر کے غور سے دیکھا۔ "اس عکس میں ایک نر جاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے اس کی پشت ہے اس طرف،" ماراستے میں وہڑے میں سے کچھ گرتی ہے، پھر اٹھاتی ہے اور چلی جاتی ہے۔

"اوکے پھر؟" نیم اندر ہیر کرے میں وہ دونوں صوفے پہ ساتھ ساتھ بیٹھے بات کر رہے تھے۔

"اس کا ریڈور میں اگلے آدھے گھنٹے میں ہر پانچ منٹ بعد ایک نر کا عکس دکھائی دیتا ہے جو حق راستے میں کچھ کر رہا ہے۔ یا تو ہسپتال کی ساری نریں اندھی ہیں یا پھر یہ ایک ہی پانچ منٹ کا کلپ ہے جسے بار بار دہرا یا گیا ہے۔"

"یعنی اصل آدھے گھنٹے کی شیپ غائب ہے؟" وہ چوکی۔ "اگر ہسپتال والے ان آر گناہ نر کر منزو کے ساتھ مل کر یہ شیپ ڈاکٹر سکتے ہو؟ اسکا لاث والی شیپ بھی غائب کر سکتے تھے۔ مگر نہیں۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کھیل کھیلا۔" اس کی پیشانی پر پل پڑ رہے تھے اور وہ غصے سے کہتی ہے، اس قیمتی۔ "ان کو پوتھے تھا، ہم فوٹج نکلوا یہیں گے سو وہ ہر اس راستے پہ بیٹھے ہیں یہیں بھٹکانے کے لئے جو سعدی تک جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہم سے ملن آگے رہیں گے۔" وہ ذہنی طور پر اتنی الحمی ہوئی تھی کہ فارس نے کنھوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے صوفے پہ اس کے ساتھ اگلی ہے اسے احساس نہیں ہوا۔

"اگر وہ ہمیشہ ہم سے دو قدم آگے رہیں گے تو ہم سعدی کو کبھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔"

"پاکل! وہ اسکرین کو پلیس سکریٹری کر دیکھے گئی۔ اندر ہیر کرے کمرے میں واحد دھم سی روشنی عجب فسول ٹکھیر رہی تھی۔ وہ بدقت (زمر اظریں ہٹا کر) سامنے دیکھنے لگا۔ لا بھری یہ کسارے منظر اردو گدارت نے لگے تھے۔"

"بس پھر ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈتے۔" وہ قطعیت سے بولی تو وہ چونکا۔

"کیا مطلب؟"

"ہم ان کے قدم پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر وہ ہمیشہ دو قدم آگے رہیں گے، سو ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈتیں گے۔ ہم ان کو ان کی گردن سے پکڑ لیں گے۔ وہاں سے جہاں سے انہوں نے تصور نہیں کیا ہوگا۔" وہ لیپ ٹاپ کو دیکھتی، گویا خود سے بول رہی تھی۔

"مگر ہم نہیں جانتے، وہ کون ہیں۔"

"وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں نہیں جانتے، مگر... یہاں پر انہوں نے ایک غلطی کر دی ہے۔" وہ پہلی دفعہ مسکراتی اور نگاہیں موز لرفارس کو دیکھا۔ "کیا تم نے کر میں لاء میں پڑھا نہیں تھا کہ۔ Its not the Crime, Its the cover-up."

فارس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "پاکل۔ مجرم کو اس کا جرم نہیں پکڑ داتا، بلکہ جرم کو چھپانے کی کوشش پکڑتا تھی ہے۔"

"سو اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش میں، انہوں نے اپنا ایک بندہ ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اب تک وہ ہمارے لئے ایک الجان گروہ تھا مجرموں کا۔ مگر اب... اب ہم ان کے ایک ساتھی کو جانتے ہیں۔ یہ لفٹ والا آدمی۔" مگر فارس نے نغمی میں سر ہلایا۔

"یہ تو صرف ایک ہر کارہ ہے، کرایے کا آدمی۔ جن لوگوں نے سعدی پر حملہ کیا ہے، یہ آدمی ان کو جانتا تک نہیں ہو گا۔"

"پاکل، وہ بھی یہی سمجھتے ہیں مگر فارس... وہ کسی کو تو جانتا ہو گا۔ کسی نے تو اس کو پیسے دیے ہوں گے اس کام کے۔ ہم اس آدمی کے

ذریعے اس کوڈھونڈیں گے جس نے اسے پیے دیے، اور پھر اس سے اوپر والے کو اور یوں زینے پر زینہ چڑھتے، ہم ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے سعدی کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ سواب ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈیں گے، ہم ان لوگوں کو ڈھونڈیں گے۔ جس دن ہمیں یہ لوگ مل جائیں گے، اس دن سعدی بھی مل جائے گا۔“ اس کے لمحے میں عزم تھا۔

"اوکے۔ ایسے ہی کرتے ہیں، مگر ان تک پہنچنا آسان نہیں ہو گا۔ کیا آپ نے بیلٹک رپورٹ دیکھی؟ سعدی کو GLOCK گن سے گولی ماری گئی۔ تو یہ امکان ہے کہ جی فورٹی ون استعمال کی گئی۔ پاکستان میں جی فورٹی ون مگوا توڑھائی تین لاکھ سے کم کی نہیں ملتی۔ اور کون مگوا سکتا ہے اتنے آرام سے گلاک کی پستول؟ اسلحے کی درآمد منوع ہے، اور صرف سنگل امپورٹ لائنسس کے ذریعے ہی کوئی ایک وقت میں ایک ہی پستول مگوا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے، مہنگی ترین guns میں سے ایک ہے۔ کلاس اور نیٹ چیک کریں ذرا ان لوگوں کا۔" وہ اسکریں کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کر رہا تھا، ایک دم رکا۔ اس نے زمر کو چوکتے ہوئے دیکھا تھا۔ گن کے ذکر پر جیسے وہ ہوش میں آئی۔ بے اختیار چوک کر آس پاس دیکھا۔ وہ اس کے صوفے فی... ایک دم وہ کھڑی ہوئی۔ چھرے پر سیاست میں آگئا۔

”ظاہر ہے، قاتل اسلحے کے بارے میں آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔“ تینی سے کہہ کر وہ تمیزی سے بیٹھ کی آئی۔ زرد ہوسکوں کا سارا فسول غائب ہو گیا۔ اندر ہیرے میں دوسرا یہ رہ گئے۔ ایک صوفے پہ بیٹھا تھا اور دوسرا بینڈ کے ساتھ اس کی طرف پشت کی کھڑی تھی۔

”گذنا شت۔“ فارس کے چہرے یہ سمجھدگی اتر آئی۔ اس کی بات کو نظر انداز کر کے وہ کمپووزٹ آف کرنے لگا۔

جنہیں مانتا ہی نہیں یہ دل، وہی لوگ میرے ہیں ہمسفر ..... مجھے ہر طرح سے جو راس تھے، وہی لوگ مجھ سے پچھڑ گئے دیوار کے پار جنین اور ندرت کے کمرے کی مقی جل رہی تھی۔ ندرت بیٹھ پہ بیٹھیں نماز پڑھ رہی تھیں۔ اور جنین کروٹ کے بل یعنی چادر یہ انگلی سے لکیریں پھینکتی چارہ ہی تھی۔ زمر کے الفاظ ہذہ ہن میں گونج رہے تھے۔

”مجھے سعدی کا لیپٹاپ کھول دھین۔ میں کسی شاپ پر جا کر بھی کھلواسکتی ہوں، مگر یہ کام تم مجھے خود کر کے دوگی۔ اگر تم کچھ کر سکتی ہو تو!“ وہ جانتی تھی زمر نے صرف اس کو اکانے کے لئے ایسا کہا تھا، مگر وہ ان باتوں میں اب نہیں آیا کرتی تھی۔ پھر بھی وہ اٹھی اور سلیپر زپہن کر پاہر نکل آئی۔

چند لمحے بعد جن پیسمنٹ کے زینے اتر رہی تھی۔ بیان جلا کیں تو سارا تھہ خانہ روشن ہوا۔ وہ ایک کھلا سا کمرہ تھا جس میں ستون لگے تھے اور پورے گھر کے رقبے پر وہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کا آدھا حصہ اس سامان اور باکسر سے بھرا ہوا تھا جو خالی گھر کر کے شفٹنگ کے وقت وہ ادھر لائے تھے۔ ایک کونے میں الگ سے چند باکسر کے تھے۔ خین قدم قدم چلتی اس کو نے تک آئی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر انکھیں غم ہوئیں۔

سعدی کی چیزیں!

اس نے سعدی کے کپڑوں والا باکس کھولا۔ ایک شرٹ نکالی۔ صاف سترہی سفیدی شرٹ۔ وہ سوتے وقت عموماً یہی پہنتا تھا۔ لی شرٹ دونوں ہاتھوں میں پکڑے، وہ فرم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جب ہی اندر ہیرتہ خانے سے آواز آئی۔

”یا صاحبی اجنب“ (اے میرے قید خانے کے دوساریو!) اس نے چونک کر گردن گھمائی۔ سعدی کی آواز تھی وہ۔ مگر وہ خود ادھرنہیں غنا... وہ دور کہیں کسی دوسرے زمانے میں اسے یکار رہا تھا... ایک منظر ساز ہن میں روشن ہوا۔

ریاست ہاؤس کا کمرہ۔ فاصلے سے بھی دو سنگل بیٹھ۔

دونوں بیڈز کے پاؤں کی طرف نیچے لگے دمیٹر۔ (انگریزی حرف T) کی طرح ندرت کا بیڈ خالی تھا۔ اس کی پائیتی سے نیچے کچھ میٹر پر سیم سورا تھا۔ دوسرے بیڈ پر جنین آنکھوں پر بازور کئے چادر گردان تک تانے لیتی تھی۔ نچلے میٹر پر سعدی چت لیتا تھا۔ اسی

دہلی شرث میں ملبوس۔ یکا کیک اس نے بازو پہ ہاتھ مارا۔

”حہ یہاں کتنے چھریں۔“

وہ آنکھوں سے بازو ہٹائے بغیر نیند میں ڈوبی آواز میں بولی۔

”یہاں ایک بھی چھر نہیں ہے بھائی۔ آپ صرف مجھے بلوانے کے لئے ایسے کہہ رہے ہیں۔ پلیز سو جائیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔“

مدی کے چہرے پہ خفگی ابھری۔

”یا خنین، بندہ کوئی بات ہی کر لیتا ہے، ہم کب سے اس قید خانے میں پڑے ہیں۔“

”اس چھوٹے شہر میں صیفی خالہ لوگوں نے ساری بارات کے لئے اتنا چھار یستہ ہاؤس بک کروایا ہے، ہمیں پورا ایک کمرہ ملا ہے، ان کو قید تو نہ کہیں۔ اور سو جائیں۔“

چند لمحے کی خاموشی۔ پھر وہ بولا۔ ”مجھے نیند نہیں آ رہی۔ امی کہاں رہ گئیں۔“

”وہ فرزانہ خالہ کے کمرے میں ہیں۔ وہاں ساری خالائیں، مہانیاں محفل لگائے بیٹھی غائبیں کر رہی ہوں گی۔ آپ بھی وہیں چلے ہائیں۔“

”نہیں یار.... اتنی مشکل سے بندہ روز کی پانچ نمازیں پوری کر پاتا ہے، ایویں سارا اثواب ان سب لوگوں کو دے دیں جن کو ہم سخت ناہند کرتے ہیں؟“

”پھر سو جائیں۔“ جمائی روکتے، اس نے کروٹ بدلتی۔ نیند سے آنکھیں بند تھیں۔ چند لمحے گزرے، پھر اس نے بڑے پیارے پکارا۔

”یاصاجی الجن!“ (اے میرے قید خانے کے دونوں ساتھیوں!)

خنین کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلے۔ بازو ہٹایا اور کہنی کے بل اٹھ کر چہرہ اونچا کیا، وہ نیچے تھا، تبھی نظر نہ آیا، تو وہ انھی اور تکیہ اٹھا کر ہاں والی طرف رکھا اور گھوم کر اس طرف سر کھدیا۔ پھر گردن اٹھا کر دیکھا تو وہ نیچے لیٹا، مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر دوسرے لہی پڑالی (سیم) جو کب کا سوچ کتا۔

”سورۃ یوسف؟“ اس نے مسکرا کر آیت کا متن پوچھا۔

”ہوں۔ میری فیورٹ سورۃ!۔“

”بُلْ كَرْدُو بِهِمْ۔ آپ سے تو جس سورۃ کا ذکر کرو، آپ کہتے ہیں، یہ میری فیورٹ ہے۔“

”کب کہا میں نے ایسا؟“

”مجھے زیادہ بولنے پر مجبور نہ کریں اور سو جائیں۔“ دوبارہ ما تھے پر بازو رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

”یاصاجی الجن!“ ذرا در گزری تو اس نے پھر نرمی سے ہند کو پکارا۔ وہ ”ہوں“ کر کے رہ گئی۔ ”میں ایک بات سوچ رہا تھا۔“

”دل میں سوچیں بھائی۔“ مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا، بولتی گیا۔

”تمہیں یاد ہے، یوسف علیہ السلام نے جب قید خانے میں اپنے ساتھیوں کو ان کے خواب کی تعبیر بتائی تھی، ایک کوسولی پر چڑھنا تھا، اور اس سر کے کو بادشاہ کا ساتی بننا تھا۔ یوسف علیہ السلام نے ساتی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جانا تو میرا ذکر کرنا۔ اس سے اگلی آیت یاد ہے تمہیں؟“

رات کے ڈیڑھ بجے، وہ کچی نیند میں ڈوبی خنین سے پوچھ رہا تھا۔ حہ کے چہرے پہ چھنجلاہٹ نسودار ہوئی (ہمہ ایہہ کیڑی آیت

اے؟) (اب یہ کون سی آیت ہے؟) اف بھائی کوکون سمجھائے کہ ہر کوئی آپ کی طرح قرآن کریزی نہیں ہوتا۔  
”نہیں۔ کون سی آیت؟ جماں روکتے پوچھا۔ آنکھیں بند تھیں۔“

”وہ سورۃ یوسف کی سب سے دلچسپ آیت ہے، اور انکھیں وہی نہیں یاد؟“  
(لوگی... ان سے پوچھو تو ہر دوسری آیت ”سب سے دلچسپ“ ہوتی ہے۔)  
”ابھی نہیں....“ جماں سے آواز پھر بھاری ہوئی۔ ”یاد آ رہی۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ وہ چت لیٹا، ایک دم ایکسا اسٹڈ سابول۔ اور ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں، اور سارے سمندر روشانی، اور ان سے لکھنے بیٹھو تو ختم ہو جائیں سمندر، مگر اللہ کی باتیں کہاں ختم ہوتی ہیں؟ اور قرآن کے اچھے اسنودُ شیخوں کو بھی بک بولنے کا موقع چاہیے ہوتا ہے۔

”یوسف علیہ السلام نے اس قیدی سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔ اگلی آیت ہے، شیطان نے بھلا دیا اس کو ذکر کرنا اپنے آتا سے تو وہ نہ سبھارہا قیدی میں کئی سال۔“  
”ہوں۔“ وہ آدھ پون لفڑاں پائی۔

”اب سنو مرے کی بات۔ اس آیت میں ”اپنے آقا سے ذکر کرنے“ کے لئے لفاظ آیا ہے ”ذکر ربہ“۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ آقا سے ذکر کرنا۔ اور آقا کا ذکر کرنا۔ اصل میں اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ پہلا، شیطان نے اس ساتھی قیدی کو بھلا دیا کہ وہ بادشاہ سے یوسف کا ذکر کرتا۔ اور دوسرا، شیطان نے یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا اپنے رب کا ذکر کرنا، اس لئے وہ سبھرے رہے جیل میں اگل کئی سال۔ آئی سمجھو؟“

”ہیں؟“ وہ بکشکل آنکھیں کھول پائی۔

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میرے بھائی یوسف یہ الفاظ نہ کہتے تو اتنے برس جیل میں نہ سبھرے رہتے۔“

”مگر انہوں نے جیل سے نکلنے کی کوشش ہی تو کی تھی، اس میں کیا بری بات ہے؟“

”میرے یا تمہارے جیسے لوگوں کے لئے جیل سے نکلنے کی کوشش کرنا دراصل خود ایک جہاد ہے، ایک اچھا کام ہے، ہم کریں تو نہیک ہوگا، مگر مقرر بین کی حستات دراصل سیاٹ شمار ہوتی ہیں۔“

”کس کی کیا، کیا شمار ہوتی ہیں؟“ اس نے ترجمہ مانگا۔

”مطلوب جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہوتے ہیں، ان کی حستات یعنی جھوٹی نیکیاں، ان کی غلطیاں شمار ہوتی ہیں۔ گناہ نہیں کہ انہیاء کبھی گناہ نہیں کرتے تھے۔“

”نہیں سمجھ آئی بھائی۔“

”ویکھو، مسجد میں جھاڑو لگانا کتنی اچھی بات ہے۔ ہے نا؟ جو عورت مسجد میں جھاڑو لگاتی تھی، جب فوت ہو گئی تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے لئے خصوصی دعا کی۔ یہ ایک حسنہ ہے۔ ایک نیکی۔ لیکن تصور کرو کسی ایسے اسکارکو جس کا عمل بھی بہت ہو۔ اللہ نے اسے رسی سورہ زد دیے ہوں، ٹیکنٹ دیا ہو، موقۇع دیے ہوں کہ وہ پوری دنیا میں جا کر دین کی تلخی کرے بڑے بڑے فورمز پر جا کر قرآن کی باتیں لوگوں کو سنائے، اب اگر ایسا بندہ سب چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں دن رات صفائی کرنے لگ جائے تو ہو گی یہ بھی ایک نیکی مگر یہ اس کی براہی شمار ہو گی۔ کیونکہ جو جتنا نیک اور اچھا ہوگا، اللہ کی اس سے توقعات اتنی بڑھ جائیں گی۔ کوئی عام بندہ رہائی کا کہہ بادشاہ سے توبہت اچھا، مگر اللہ تعالیٰ اہ یوسف علیہ السلام سے اس سے کہیں زیادہ کی توقع تھی۔“

”مطلوب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا؟“

”نہیں استغرا اللہ... جمہ انبیاء کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے کام نہیں کرتے تھے۔ وہ معموم تھے اور یوسف علیہ السلام کی تو اللہ نے صرف اس ذرای کی طرف توجہ دیائی، کیونکہ وہ ایک کامل انسان تھے۔ صبر والے اور علم والے۔ یہ ایک غلطی تھی، کہ انسان کو مصیبت میں صرف اللہ کی طرف دیکھنا چاہئے۔ اچھا باب وہ سنو جو میں سوچ رہا تھا۔“ وہ چت لیٹا بولتا جا رہا تھا۔ ”تم نے نوٹ کیا، یوسف علیہ السلام کو دینا ۱۱ حسن دیا گیا تھا اور جن عورتوں کو خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ خوبصورت ہو وہ روز سورۃ یوسف پڑھتی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ الہما ایک دفعہ بھی سورۃ یوسف میں نہیں کہا کہ یوسف خوبصورت تھے۔ ان کے حسن کا ذکر بھی نہیں کیا۔ کیونکہ اللہ نے ہمیں ”حسن القصص“ (رواۃ یوسف) اس لئے دی تھی تاکہ ہم کسی انسان کی ان خوبیوں کو جان پائیں جو اس کو اللہ کی نظر میں خوبصورت بناتی ہیں، مگر خدا یار کوئی یہاں ۱۲ ان سمجھ کر کیوں نہیں پڑھتا۔ تم سن رہی ہونا؟“ ہاتھ بڑھا کر حنہ کے بالوں کی لٹکھنی۔ ”کٹو، یا رسنو میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“

”سو نے دو بھائی۔“ وہ نیند میں تھی۔

”ایک وقت آئے گا جنین یوسف جب تم میری باتوں کو مس کیا کرو گی۔“ بڑے ہی خفا انداز میں وہ بولا۔

”ایں؟ کون سا وقت؟“ اس کے ذہن میں کوئی فکر جا گی۔

”جب میں شادی کے بعد رخصت ہو کر کسی کا گھر داما دبن جاؤں گا۔“

”توبہ!“ وہ نیند میں بھی زور کی نہی۔ ”آپ کو کوئی گھر داما دنہیں بنائے گا۔“

”ایویں نہیں بنائے گا؟ جیب غالی ہے تو کیا ہوا بندہ بہت اچھا ہوں میں۔ ایک تو خوش اخلاق اتنا ہوں، اور پر سے خوبصورت بھی ہوں۔“ ”ذرار کر پوچھا۔“ ”ہوں نا؟“

اس نے بالآخر تکیہ اٹھا کر زور سے نیچے اچھالا۔ ”سو جا بھائی۔ میں کبھی نہیں مس کرنے والی آپ کو۔ جائیں کر لیں شادی۔“ یاد کا بلبلہ پھٹا اور وہ واپس اس نیم اندر ہیرتہ خانے میں آئی۔ اس کی آنکھوں سے منکتے آنسو سعدی کی شرث پر گزر ہے تھے۔ دل تھے بری طرح نوٹ گیا تھا۔ وہ سعدی کے لیپٹاپ اور دوسرے gadgets والا باکس چھوئے بغیر واپس ہوئی۔ کسی بھی چیز کا دل نہیں ہوا رہا تھا۔



یہ اہل درد بھی کس کی دہائی دیتے ہیں ..... وہ چپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہم نوا اس کا دہ بار کے کاظمی کے اوپنے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ پیچھے لوگوں کا شور، مویقی، جلتی، بھتی روشنیاں تھیں۔ وہ بار کلاں کی گھری دیکھتا۔ ہرے پر فکر مندی بھی تھی اور امید بھی۔

”ہے شیرا!“ وہ اسکی پل اس کے ساتھ والے اسٹول پر آبیٹھی۔ کلچ کاظمی پر دھرا اور چہرہ اس کی طرف موڑا۔ اپنے سنہری بالوں کو اونچی (اور چھوٹی) سی پونی میں کے اور سرخ لپ اسٹک لگائے۔ شہرین ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا یا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“ ایک دم سے ساری دنیا نگینہ ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے لئے آرڈر کرنے لگا۔

”میں تو ٹھیک ہوں،“ مگر تم نے سعدی کے بارے میں سنا؟ اواہ گاؤ! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔“ وہ سرشاک کے عالم میں نفی میں ہاتھ موبائل پر انگلی پھیر رہی تھی۔ نوشیر واس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ حلق میں کوئی کریلا پھنسا۔ ”جی، میں نے سنا۔“

”مطلوب کہ لا قانونیت کی حد ہوتی ہے۔ پہلے گولی اور پھر انگو۔ یہ پچھر دیکھی تم نے؟“ اس نے اسکرین پر وہی پلیس فوٹو گراف

نکال کر اس کے سامنے کی۔ ”یہ وائرل ہو رہی ہے۔ اس کے یونیورسٹی کے دوست اس کے لئے HashTag Save Saadi ترینڈ کا بہت پرمومٹ کر رہے ہیں، مجھے بھی اسی سے پتہ چلا۔ تمہیں پتہ ہے انہوں نے لیڈز میں اس کے لیے vigil بھی کیا ہے۔ دیکھو کتنی برقی طرح پیٹا گیا ہے اسے۔“ وہ فکر مندی اور تاسف سے بولے جارہی تھی اور وہ صبر سے گھونٹ بھرتا گیا۔ مشروب زہر جیسا تھا۔

”آپ واپس کب جا رہی ہیں؟ سو نیا کو مس تو کر رہی ہوں گی۔“

”میں اگلے ہفتے چلی جاؤں گی مگر یقین کرو جب سے میں نے سعدی والی نیوز دیکھی ہے، بہت اپ سیٹ ہوں۔ شکر ہے تم مجھے کم از کم کسی سے ڈسکس تو کر سکتی ہوں۔ اس دن اتنا کچھ بول گئی میں اس کے بارے میں جو بھی ہے، وہ اچھا لڑکا ہے۔“ پھر کر سوچا۔ ”ہے کہنا چاہیے یا تھا؟“

”واپس جا کر کیا بلازیں میں آپ کے؟“

”ایک سو شلانیت کے کیا بلان ہو سکتے ہیں؟ وہی روٹین لا انگ۔ ویسے تمہیں کیا لگتا ہے سعدی کو ان لوگوں نے مار دیا ہو گا؟“  
گلاس پن نو شیر و اس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی اور لب بھٹخ گئے۔ آنکھوں میں بے پناہ بے زاری اتری۔ ”پتہ نہیں۔“ اور گھونٹ بھرا۔ شہریں ہنوز تاسف سے بولے جا رہی تھی۔  
وہ مراد ہوا ہا تھی بھی سوالا کھکھ کا تھا۔

❖❖❖

یہ گرد بادِ تمنا میں گھومتے ہوئے دن ..... کہاں پہ جا کے رکیں گے یہ بھاگتے ہوئے دن

### دو ہفتے بعد

وہ گرم صبح قصر کاردار اور محققائیکسی پہ چمکدار سی طلوع ہوئی تھی۔ زمر نے آئینے کے سامنے کھڑے بالوں میں برش پھیرتے کھڑی سے باہر دیکھا تو سبزہ زار پہ ملازموں کی چھپل پہل شروع ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ تبھی با تھر ووم کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آیا۔  
زمر نے برش رکھ دیا اور پس اٹھائے باہر نکل گئی۔ فارس نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا اور دوسرا کمرے پر ڈالی جس کو وہ ہر صبح چند منٹوں میں نفاست سے سمیٹ چکی تھی۔ تکیے بیڈ پہ بیڈ کو برابر۔ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سر جھکا اور الماری کی طرف آیا۔ آنے سے جاب پہ جاتے پانچواں دن تھا۔

یہ پانچ جوں تھی، اور اکیس میں کے اذیت ناک دن کو گزرے قریباً دو ہفتے بیت چکے تھے۔

زمر باہر نکلی تو یچھے صداقت کے کچن سے خوب سو آ رہی تھی۔ وہ حدا کے دروازے پر کی پھر اسے دھکیلا تو اندر کا منظر نمایاں ہوا۔ ندرت کا بیڈ خالی تھا، اور جنین اپنے بیڈ پہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ بال پونی میں بند ہے، وہ ڈل اور کمزور لگتی تھی۔ آہٹ پر چہرہ اٹھایا، آنکھوں میں اسید جا گی۔

”بھائی کا کچھ پتہ چلا؟“

”اوہ ہوں۔ لیکن اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ ہم مل کر سعدی کو ڈھونڈیں گے۔“ حمد کے چہرے کی جوت ماند پڑ گئی، اس نے تھوڑی گرادي۔

”میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میری وجہ سے... اپنے آخری دن بھائی اتنا ناراض ہوا تھا۔ میں آپ کی طرح نہیں ہوں، کہ....“ نظریں جھکائے نہ گئی سے بولی۔ ”اس سے چار سال بات نہ کروں اور پھر ظاہر کروں کہ مجھے اس کی بہت پرواہ ہے۔“

چوکھت میں کھڑی زمر کی آنکھوں میں نبی اکھری۔

”جنین مجھ سے ایک غلطی ہوئی تھی، اور میں اس کے لئے شرم مند ہوں۔ تم نے سنا؟ آئی... ایم... سوری فارڈ یہت!“ وہ بولی تو آنکھوں

ہل ٹکوہ اور آواز میں کپکلا بہت تھی۔ ”میں نے چار سال اس سے تعلق نہیں رکھا، میں نے غلط کیا، اور مجھے تب یہ احساس ہو گیا تھا جب ابا نے بتایا اے مجھے گر دہ سعدی نے دیا تھا۔ میں اس دن اس کے پاس چلی گئی تھی اور ہمارے درمیان سب ٹھیک ہو گیا تھا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چار مال ملت گئے۔ مجھے سرتے دم تک ان کا افسوس رہے گا۔“ اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ خین نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اہلی کرچیاں ہی بکھری تھیں۔

”اگر تم مجھ سے پوچھو تو میرا دل چاہتا ہے کہ ہر اس شخص کو روکوں جو اپنے کسی خونی رشتے دار سے ناراض ہے اور کہوں کہ اس کو کمال لے ادا سے تعلق جوڑ لے چاہے اس نے آپ کا لکھنا بھی دل کیوں نہ دکھایا ہو۔ میری طرح اتنے سال ضائع نہ کرو بے کار کی انا میں۔ اگر تعلق نہیں جوڑ دے گے تو پتہ ہے کیا ہو گا؟ آپ کے بچوں میں انہی بین بھائیوں کی شکلیں اور عادتیں نظر آنے لگیں گی جن سے آپ بہت دکھی دل کے ماتھہ علیحدہ ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کیوں بنتا ہے آپ کی اولاد میں آپ کے رشتؤں کی مشاہدہت؟ اس لئے تاکہ ہم ان کو نہ بھول سکیں۔ کیونکہ اُر ہم نے جلد صلح نہ کی تو وہ مر جائیں گے، کھو جائیں گے، یا ہم مر جائیں گے۔ میں نے غلطی کی تھی اور مجھے اس کے لئے ہمیشہ اس رہے گا۔ مگر تم میری غلطی کیوں دہرا رہی ہو؟“

آخری فقرے پہنچ نے منہ موڑ لیا۔

”ایک حادثہ کے بعد اپنے واحد پیرینٹ کو مزید بیکار دیکھنا، اور ساری دنیا سے کٹ آف کر کے کمرے میں پڑ جانا، اور جواب اپنے ہمارے پاس ہیں، ان کو ہر وقت الزام دیتے رہنا، تمہیں لگتا ہے یہ تمہاری کہانی ہے حمد؟ نہیں۔ اگر چار سال پیچھے جاؤ تو یہ میری کہانی ہے۔“

ہب میں اس غلطی کو نہیں دہرا سکتی تو تم کیوں دہرا رہی ہو؟“

خین نے جواب نہیں دیا۔ منہ موڑ نے گیلی آنکھوں سے کھڑکی کو دیکھ گئی۔

”مجھے نہیں پتہ تمہیں کون سا گلکٹ روز بروز کمزور کرتا جا رہا ہے، لیکن میں جس خین کو جانتی ہوں وہ ہمارے خاندان کا سب سے چیزیں اور بولڈ پر تھا۔ اتنی ڈل اور کم اعتماد نہیں تھی وہ۔ تمہیں سعدی سے محبت ہے تو انہوں اور اس کرے سے باہر نکلو اور اس کے لئے کوشش کرو۔ یا م از کم میری اس کے لئے محبت کو جج کرنا چھوڑ دو۔“ اور وہ مژگی تو پیچھے سے حمد ہلکا سابو لی۔

”مجھے پتہ ہے آپ کو بھائی سے بہت محبت ہے اور ساری بات ہی بھی ہے کہ آپ کو صرف بھائی سے محبت ہے۔“ گیلی آنکھوں سے اس نے زمر کی پشت دیکھی۔ ”اگر سعدی کی بجائہ حمد کھوئی تو آپ اتنی بھاگ دوڑ کھی نہ کریں۔ میرے اور آپ کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم ایک ٹیم کھیلیں ہو سکتے، اس لئے میرے ساتھ بار بار یہ pep talk کرنا چھوڑ دیں۔“

زمر نے گہری سانس لی اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ پیچھے خین کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”وہ میرا بیست فریبی تھا پھپھو، آپ کو اندازہ بھی نہیں کہ میں کتنی اکیلی ہو گئی ہوں؟“ سر جھکائے، آنسو صاف کرتے وہ خود سے کہہ رہی تھی۔

زمر نیچے لا ون خ میں آئی تو صداقت چائے لارہا تھا۔

”بھا بھی ریسٹورانٹ چلی گئیں؟“

”بھی بھی۔ ہر روز جلدی چلی جاتی ہیں اور دیر سے آتی ہیں۔ آئی جی کو تو چپ ہی لگ گئی ہے۔“ زمر نے جوابی تبصرہ نہ کیا اور تاگ پٹانگ جما کر پیٹھی چائے کا کپ اٹھایا تھی وہ سیرھیاں اترتا دکھائی دیا۔

”تھانے سے فون آیا ہے۔ بلا رہے ہیں۔ کیا آپ چلیں گی؟“ والٹ جیب میں رکھتے اس نے پوچھا۔ زمر نے گھونٹ بھرتے ہوئے شانے اچکائے۔

”میں ایک انمار نہ ہوں، ایک نوٹس پر ان پولیس والوں کو وعدالت بلواسکتی ہوں۔ ان کو کام ہے تو وہ ہمارے پاس آئیں۔“  
(جلی رہی کامل۔ خیر) اس نے کوٹ کا مٹن بند کرتے گھری سانس لی۔

”وہ لفڑ والا آدمی... نیاز بیگ... اسے کل رات گرفقار کر لیا گیا ہے۔ دو پھر میں آپ کو پک کر لوں گا، آپ اس سے ملتا تو چاہیں گی۔“ زمر نے چوک کر کپ پیچ کر کے اسے دیکھا۔ وہ اب ریک سے چابی اٹھا رہا تھا۔ وہی گلے کی شرٹ پر گرے کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ (جاب شروع کر لی، مگر کارروائی ڈریس شرٹ یا نائی پہننا تو اس کو پسند ہی نہیں ہے جیسے!) بال ذرا بڑھتے تو پھر سے چھوٹے کر دالیے۔ الہ جاب کے لحاظ سے مناسب لگ رہا تھا۔ زمر نے نظریں پھیر لیں اور ہلاکسا اثبات میں سر ہلا دیا۔  
”اوکے۔“

فارس نے بس رک کر ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر یہ ورنی دروازے کی طرف چلا گیا۔

❖❖❖

چلو یہ سیل بلا خیز ہی بنے اپنا ..... سفینہ اس کا، خدا اس کا، ناخدا اس کا  
ہسپتال کا کشادہ اور پرتعیش کرہ اس صبح بھی دمک رہا تھا۔ کاؤچ پر میری بیٹھی، کتاب چہرے کے سامنے کیے ہوئے تھی۔ بسترہ  
لیٹے سعدی کے بازو آزاد تھے، مگر پاؤں میں ہنگڑی لگا کر بیٹھ کے ساتھ نصی کر دی گئی تھی۔ سر کی طرف سے بیداونچا کر رکھا تھا اور وہ کھلی آنکھوں  
سے پہلے سے خاصا بہتر نظر آتا، اور دگر دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں کاردار صاحب نے میری نگرانی کے لئے ادھر چھوڑا ہے؟“ دفتار اس نے پکارا۔ مگر میری کتاب پر چھتی رہی۔

”کیا تمہیں معلوم ہے، مجھے گولی کس نے ماری تھی؟“

میری نے صفحہ پلٹایا۔ نگاہیں صفحے پر جمی تھیں۔ وہ پلکیں سکیڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں سب معلوم ہے۔ تم بھی ان کی شریک جرم ہو۔“

خاموشی نے پھر سے اطراف کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دفتار سعدی نے ٹھنڈی سانس لی۔

”تمہارا بچہ کیسا ہے؟ اس کا علاج کیسا جارہا ہے؟“ اب کے اس کا انداز دوستہ تھا۔

میری نے پلک تک نہیں چھکی۔ اسی طرح پر چھتی رہی۔ سعدی نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔ کمرہ بالکل صاف تھا۔ اس کاؤچ اور  
بیٹھ اور ضروری طبی اشیاء کے علاوہ اس کمرے میں کوئی بھی شے نہ کھی تھی جو.... اس کے کسی کام آسکتی۔ کوئی کھڑکی تک نہ تھی۔

”میرے گرد والے میرے لئے پریشان ہوں گے۔ ان کو صرف اتنا بتا دو کہ میں زندہ ہوں۔“ بولتے ہوئے اس کی آواز ہمہ آئی۔  
بہت امید سے میری کو دیکھا۔ مگر اس نے نگاہیں تک نہیں اٹھائیں۔

”مجھے کچھ چاہیے۔“ کچھ دیر بعد سعدی نے پکارا۔ میری نے فوراً چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آدھے آستین کی ہسپتال کی شرٹ میں  
ملبوس، تکیوں کے سہارے نیم دراز، اس کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا؟“ اس نے بے تاثر سپاٹ انداز میں دریافت کیا۔

”مجھے قرآن لا دو۔ میں اسی کو پڑھ لوں گا۔ جیسے تم بور ہو رہی ہوؤ یے ہی میں بھی بور ہو رہوں۔ اتنا تو تم کر سکتی ہو میرے لئے۔“

”اوکے۔ منگوادوں گی۔“ اور دوبارہ سے کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔ سعدی نے گھرے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

❖❖❖

ہر غلط بات پر میں آپ کی کہہ دوں لبیک! ..... اس طرح خون صداقت نہیں کر سکتا میں

تھانے کے اس کمرے میں چوکور میز پھیلی تھی۔ فارس اور زمر برا بر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دائیں ہاتھ اے ایس پی سرمد شاہ تھا۔ سامنے پھیلی کرسیوں پر نیاز بیگ برا جان تھا۔ کندھے کرسی کی نیک پر گرانے، گریبان کے بٹن کھلے تھے، سیاہ موچھیں اور سیاہ آنکھیں تھیں جن میں زمانے بھر کی بے زاری سموجے وہ زمر کو دیکھ رہا تھا۔

”تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے سخنی کو گولی ماری ہے۔“ زمر نے چھپتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے، ٹھنڈے انداز میں پوچھا تھا۔ منہ میں کچھ چباتے ہوئے اس نے اثاثت میں گردن ہلائی۔ ”ہاں۔ اس کاری ٹیورانٹ خریدنے کی بات ہی تو کی تھی۔ آگے سے بولانیں پتچی۔ سارے لوگ شروع میں یہی کہتے ہیں۔ میں نے صرف اصرار کیا۔ دو تین دفعہ جا کر ملا بھی اس سے۔ مگر سالانچے میں آگیا۔ مجھے گالیاں کرنے لگا۔ سب برداشت ہوتا ہے، بی بی مگر...“ انگلی اٹھا کر سلکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”گالی برداشت نہیں ہوتی۔ سو دیں پھر کادیا اسے۔ اب جا کر اگلے جہاں میں بیچا پنی دکان۔“ ساتھ ہی استہزا یہ سر جھکتا۔

”اے... زبان سنچال کر!“ وہ ذرا غصے سے آگے کو ہوا تو سرمد شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھمنے کا اشارہ کیا۔ زمر نے محض ایک نا پسندیدہ نظر فارس پڑا اور دوبارہ نیاز بیگ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ہبھتال سے کیوں غائب کیا تم نے اسے؟“

”صاف بات ہے بی بی۔ جب تک لاش نہیں ہوتی، قتل ثابت نہیں ہوتا۔ لس وارڈ بوانے کو ملایا ساتھ اور لے گئے اسے۔ گاڑی میں ڈالا اور کوڑے کے ڈھیر پر چینک دیا۔ صحیح جا کر دیکھا میں نے۔ نام و نشان تک نہ تھا۔ خلاص۔“ بے پرواہی سے ہاتھ سے اشارہ کر کے تایا۔ فارس بہت ضبط سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اتنی ہی ٹھنڈی تھی۔

”کون سی گالی دی تھی اس نے؟“

”آہ... کیا دہرا دیں اب؟“ اس نے تنجی سے ہنس کر سر جھکتا۔ اے ایس پی کے ابر و سچنے۔ ”حد میں رہ کربات کرو نیاز بیگ۔“

”تو بی بی کو منع کرونا۔ کیوں میرا منہ کھلوانا چاہتی ہے؟“

”میں نے پوچھا...“ زمر اس کی آنکھوں میں دیکھتی آگے ہوئی۔ ”کون سی گالی دی تھی اس نے؟“

”دہرا دیتا ہوں مگر تمہارے بندے کو اچھا نہیں لگے گا۔“ استہزا یہ سر جھلی مسکراہست لبوں پر بکھیرے اس نے فارس کو دیکھا جو اتنے ہی غصے سے اسے گھور ہا رہتا۔ اور پھر اس نے تین چار اردو کی گالیاں دہرا دیں۔ میز پر رکھی فارس کی مٹھیاں بچ گئیں۔

”اور کتنی دفعہ دیں اس نے یہ گالیاں؟“ زمر کا چہرہ دیسا تھا۔

”چار ایک بار تو دی تھیں۔ تبھی اسے خلاص کرنا پڑا۔“

”اوہ یہ سب کہنے کے کتنے پیسے دیے گئے ہیں تھیں؟“ وہ خود کو بولنے سے روک نہیں سکا۔ زمر نے ضبط سے گھری سانس لی۔ (فارس کو برداشت کرنا، نیاز بیگ کو برداشت کرنے سے زیادہ مشکل تھا۔)

نیاز بیگ کے چہرے کے اطمینان اور استہزا میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”نیاز بیگ کسی سے ڈرتا نہیں ہے۔ ڈنکے کی چوٹ پر بولا ہے سب کیونکہ ابھی وہ افسر بیدا نہیں ہوا جو چاروں سے زیادہ...“ انگوٹھا بند کر کے چار انگلیاں دکھائیں۔ ”... نیاز بیگ کو حوالات میں رکھے۔ اس لئے اپنی وکالت عدالت میں کرو بی بی۔ میرے پر یہ سکنے نہیں چلنے والا۔“ مسلسل منہ میں کچھ چباتے، وہ پچھے ہو کر بیٹھا اور ایک طنزی مسکراتی نظر زمر پڑا۔ ”ویسے وہ تمہارا بھتبا تھا کیا؟ پیچ پیچ... بہت رویا تھا پچ جب گولی لگی۔ بالکل بڑی کیوں کی طرح۔“

”بس، بہت ہو گیا۔“ سرمد شاہ فارس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا، (اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر نیاز بیگ کا گریبان پکڑ لے)

اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ہنگڑیاں لگے نیاز بیگ کو اندر لے گئے۔ دروازے میں گم ہونے سے قبل اس نے مسکراتے ہوئے پیچھے زمر کو دیکھتے، منہ سے وہ تنکا تھوک کر پرے پھینکا تھا۔

”اس ساری بکواس کا کیا مطلب تھا؟ شخص....“ اس کے جاتے ہی وہ ایک دم جیسے کھول کر کہنے لگا تھا، مگر اسی پل زمر نے (میز کے نیچے سے) جوتی کی ہیل اس کی پنڈلی پر زور سے ماری۔ فارس نے چونک کرا سے دیکھا۔ وہ سامنے اے ایس پی کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کے تعاون کا شکریہ۔ اس سے وہ جگہ معلوم کرنے کی کوشش کیجئے جہاں اس نے باڑی پیچنی تھی۔ کوڑا کوں انھاتا ہے، ٹرک کہاں جاتے ہیں آپ۔ میں باڑی ری کو رکر کے دے دیں، اور اس شخص کو اس کی سزا دلوادیں، اس سے زیادہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔“ اس کے انداز پر وہ خون کے گھونٹ بھر کر خاموش ہو گیا۔ وہ اب پرس انھا کر کھڑی ہو رہی تھی۔

”ہم باڑی ری کو رکرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ پھر مجھے بہت افسوس ہے۔“ سرمد شاہ سرکو خم دے کر تعزیت کرتے انٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی انھا۔

”آپ کا بہت شکریہ۔ جو اللہ کی مرضی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔“ وہ مڑی اور ایک تیز نظر فارس پر ذاتی باہر نکل آئی۔

گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی۔ وہاں جانے تک اس نے بکشکل ضبط کیا تھا، مگر چالی دروازے میں گھساتے ہوئے وہ طیش سے زمر کی طرف گھوما۔

”وہ شخص میرے سامنے...“

”فارس غازی، وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں، تماشہ مت بناؤ۔ گھر جا کر بات کرتے ہیں۔“ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے وہ تنخی سے بولی اور موبائل پاک نمبر ملانے لگی۔ وہ اندر کھوتا، ذرا یونگ سیٹ پر بیٹھا اور زور سے دروازہ بند کیا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

مجھے لمحہ بھر کی رفاقتون کے سراب اور ستائیں گے ..... میری عمر بھر کی جو پیاس تھے، وہی لوگ مجھ سے بچھر گئے حینیں اور ندرت کے کمرے میں وہی بے رونقی چھائی تھی، اور وہ گم صمی بیڈ پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ سیم اندر آیا اور دھپ سے ساتھ آ گرا۔

”حہ، چت لیئے چھت کو تلتھے پکارا۔“ آج میں نے اسکوں سے چھٹی کی اور امی نے پوچھا بھی نہیں۔ پہلے یاد ہے کبھی چھٹی نہیں کرنے دیتی تھیں۔ میں بغل میں پیاز رکھ کر سو جاتا کہ شاید صح بخار ہو جائے مگر نہ بخار ہوتا، نہیں۔ اور اب تو وہ بولتی ہی نہیں ہیں۔“

”یاد ہے حہ، تھند رکیش میں بھی، مرا! یا اس کا کوئی ساتھی کسی تھند ریگت کو انداز کر لیتا یا نقصان پہنچاتا تو آخر میں باقی کیش اس کو بچا لیتے تھے اور سب طیح ہو جاتا تھا۔ کیا ہمارا بھائی بھی والپس آجائے گا؟“

”ہمیں تو یہ بھی نہیں پتہ کہ ہمارا مرا کون ہے۔ اور جو اسے ڈھونڈنے کے لئے بظاہر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، ان کو بھی کچھ نہیں پتہ۔“

وہ نگل سے بولی۔ ”ماموں بھی بدل گئے ہیں۔ پچھوٹھی بدل گئی ہیں۔“

سیم کہنی کے مل بیٹھا اور چہرہ انھا کرا سے دیکھا۔ ”تم بدل گئی ہو؟“

حینیں نے گلہ آمیز نظر اس پر ذاتی۔ ”جاو، مجھے پڑھنے دو۔“ اور خلاف معمول وہ بنا پھوپھو چرا کیے باہر نکل گیا۔ پھر وہ اٹھی، اور سائید نیبل پر دھری سفید جلد والی کتاب انھائی۔ گھنون پر رکھ کر بے دلی سے صفحے پلٹانے لگی۔ ...

دروازہ ٹھلا تو تیز روشنی امنڈ کر آنکھوں کو چندھیا گئی۔ وہ ماتھے پر ہاتھ کا چھبھا بنا کے قدم قدم چلتی آگے آئی تو دیکھا، اس کے ارد گرد

قد یہ دمشق کی ایک روشن دوپہر آباد تھی۔ ہر شے زردی میں لپی تھی۔ مگر پبلے کے بر عکس وہ بے دلی سے سر جھکائے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہے راستے پر آگے بڑھتی گئی۔ دھول جوتوں کو آلوہ کرتی گئی۔ جب چہرہ اٹھایا تو مسجد سے متحقق جو جہرہ سامنے تھا اور ایک طرف درخت تلے وہی ہبیوں کا سا پچھرا آدمی اکڑوں بیخا تھا۔ اس کے چہرے کی مردانی اور دیرانی ہنوز برق را تھی۔

اج چھوٹی دیوار کے ساتھ خش کھڑے تھے۔ پیر نک آتا سفید چمکدار لباس پہنے، مسکراتے ہوئے۔ وہ بنا سکرائے قریب آ رکی۔

”کیا آپ نے اس بیمار کو بھی تک شفایا ب نہیں کیا؟“

”بیمار خود کوشش نہ کرے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“

وہ کچھ راستے پر چلنے لگئے تو وہ بھی سر جھکائے بدل سی ساتھ ہو لی۔

”تم کیوں اداس ہو؟“

”میرا بھائی کھو گیا ہے، اور میں دن رات اس کے لئے دعا کرتی ہوں۔ مگر میں سوچتی ہوں، کہ جو مقدر میں لکھا ہے وہ تو ہو جائے کا جو نہیں لکھا وہ نہیں ہوگا، پھر بندہ دعا کیوں کرتا ہے؟“

دھول سے اٹے راستے پر وہ دنوں آگے چلتے جا رہے تھے اور وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”وہ بھی ایسا ہی سوچتے ہیں۔“ چلتے چلتے شیخ نے ایک طرف اشارہ کیا تو دنے نے چونک کر سراہیا۔ سڑک کنارے بازار میں ایک

قہوہ خانے کے باہر چوکیوں پر چند لوگ بیٹھے تھے اور بلند آواز میں بحث کر رہے تھے۔

”جو مقدر میں ہے وہ ملے گا، جو نہیں مقدر، وہ نہیں ملے گا، سوسوال کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔“ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا اور باقی سرد ہیں رہے تھے۔ حسین نے ابھی ہوئی نگاہیں اٹھا کر شیخ کو دیکھا۔ وہ مسکرائے۔

”یہ کہتے ہیں، دعا کرنے یا نہ کرنے کا کیا فائدہ؟ سب کچھ تو لکھا جا چکا۔ مگر یہ ان کی جہالت ہے اور اپنے مسلک میں یہ خود تضاد رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہے تو پھر ان سے پوچھواؤ،“ سریسر اپنی تمہارا مقدر ہے تو پانی پوچھا یا نہ پوچھا۔ سب بھج جائے گی۔ کھیتی مقدر ہے تو دنہ دنہ الیا نہ ڈالو اناج، اُگ ہی جائے گا۔ تو پھر کھاتے پیتے کیوں ہو؟ دانے بوتے کیوں ہو؟“ وہ قدم بڑھاتے گئے اور حسین ان کے ساتھ آگے چلتی گئی۔ قدیم بازار میں لوگوں کی بھیڑ سے شور آوازیں، قبوے کی مہک سب خلط ملط بورہ تھا۔

”اور ان کو دیکھو۔“ ذرا رک کر انہوں نے چتوںوں سے ایک کھلے خیمے کی طرف اشارہ کیا جہاں اندر فرشت نشست بچھائے چند لوگ بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پر مخصوص ٹوپیاں تھیں اور وہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

”یہ کہتے ہیں، دعا تو بس عبادت ہے، ثواب کا ذریعہ۔ نیکی اور بدی تو کوئی جا چکی، تو دعا کرنا بس نیکی کی نشانی ہے اور عذاب پانا،“ کفر کی علامت ہے۔ نہ نیکی خیر کا سبب ہے۔ نہ عذاب کفر کی وجہ ہے۔ دعا صرف ثواب کے لئے کرو ورنہ ہونا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ جس نے اس گھری مرنا ہے، اب وہ خود کشمی کرنے طاعون سے مرنے یا اسے قتل کیا جائے سب برابر ہے، مگر نہیں۔ ”شیخ نے افسوس سے نفی میں سرہلایا۔“ یہ بھی غلط ہیں۔“

”تو پھر صحیح کون ہے؟“ وہ پست آواز سے، اور چہرے پر تکان لئے پوچھنے لگی۔ شیخ دوبارہ چلنے لگے تھے۔ حمد کے پیغمبر دھول میں اٹے جا رہے تھے۔

”یہ یہ وہ جو صحیح ہیں۔“ انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا تو حسین نے دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ ایک درخت تلے چادر بچھا کر چند لڑکے قرآن پڑھ رہے تھے۔ ان کا معلم ان کو سامنے چوکی پر برا جہاں تھا۔

”یہ کہتے ہیں کہ کوئی کام تباہ ہوتا ہے جب اس کے لئے اس باب اختیار کیے جائیں، اور دعا ان اس باب میں سے ایک ہے۔ سیرابی

کھانے پینے کے ساتھ ہے، ہیئتی دانہ بونے کے ساتھ ہے، اور جانور کی جان نکنا زنج کرنے کے ساتھ ہے۔ اور وہ جو بیمار تم نے دیکھا، وہ یہی بات نہیں سمجھ پا رہا کہ اس باب میں سب سے طاقتور سبب دعا ہے۔“

وہ اب رکے اور اپنے قدموں پہ واپس جانے لگے۔ تھکی تھکی سی حنہ بھی ساتھ پڑی۔

”اور جو دعا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے، وہ؟“

”کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔ فتح کثرت افواج سے نہیں ملتی، آسمانوں سے مدد کی صورت اتر آکرتی ہے۔ جو اللہ سے نہیں ملتا، اللہ اس پر خفا ہوتا ہے، پس تم دوسروں کے ساتھ جتنی بھلانی کرو گی، اتنا ہی اللہ تمہیں عطا کرے گا۔ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر یونس علیہ السلام، خدا کی تسبیح کرنے والوں میں نہ ہوتے تو اس دن تک کہ جب لوگ کھڑے کیے جائیں گے، مجھلی کے پیٹ میں ہی رہتے۔“

”مگر شیخ، جب دعا سب سے طاقتور تھیار ہے تو دوسری چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے دعا کی بھائی ٹھیک ہو جائے، وہ ہو گیا۔ میں نے دعا کی وہ بھائی پر خفائنہ ہوا رہ بات بھی سن بھل گئی۔“ وہ تھینی دوپہر میں کچھ راستے پر چلتی کہہ رہی تھی۔ ”دعا کافی ہے ناپھر تو۔“

”یہ تو کل نہیں، کامی ہے۔ بے عملی ہے۔ جہالت ہے۔ عقلمند وہ ہے جو تقدیر کو تقدیر سے توڑے اور تقدیر کے مقابلے میں تقدیر کو ہی لاکھڑا کرے۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”مطلب یہ ہے لڑکی کہ اس باب بھی قدرت نے دیے ہیں اور پریشانیاں بھی۔ ان کو آپس میں لڑا دو اور آسمانوں سے مدد کی دعا کرو۔ اور سنو۔ قرآن پڑھا کرو۔ اس میں ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔“

مسجد آگئی تھی اور وہ بیمار نوز درخت تلے بیٹھا تھا۔ اکروں سرگھنؤں پر کھے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ لاغر اور مایوس سا وجود۔ اس نے ایک ترم بھری نگاہ اس پر ڈالی اور قدم آگے بڑھا دیے۔

”امام کو کیا معلوم میرے مسلکوں کا! ایک سات صدیوں پہلے کے نائی بوڑھے امام کو کیا معلوم؟“

شیخ دیں مسجد کے پاس کھڑے رہ گئے۔ اور وہ مدرسۃ الجوزیہ (School of Jauzwiya) سے دور بہت دور صدیوں کی مسافت طے کرتی چلتی تھی۔

❖❖❖

وہ تو زخموں کو نمکدان بنا دیتے ہیں ..... دل کے زخموں پر سیاست نہیں کر سکتا میں دوپہر تنور جھلس رہی تھی جب فارس نے کارائیکسی کے سامنے بزہ زار پر روکی اور ایک سلکتی نظر اس پر ڈالی۔ وہ موبائل کان سے لگائے دوسری طرف جاتی گھنٹی سن رہی تھی۔

”وہ نہیں اٹھائے گا فون۔ چھوڑ دیں اس انویسٹی گیٹر کا چیچا۔ اب باس نہیں ہیں آپ اس کی۔“ زمر نے زور سے فون پر سیں پنچا۔ پیشانی پر بل لیئے وہ منہ میں کچھ بڑھ رہی تھی۔

”اس شخص کا منہ تو ڈناتھا میں نے مگر آپ کی وجہ سے چپ رہا اور وہ اسے ایس پی۔ وہ سب ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں، کیا ضرورت تھی اس کے سامنے خاموش رہنے کی۔“

”مجھ پر چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئی ملازم نہیں ہوں۔“ وہ ناگواری سے اس کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔ ”میں نے نہیں کہا تھا مجھے تمہاری ضرورت ہے، تم نے کہا تھا کہ ہم ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ اگر میرے ساتھ کام نہیں کرنا تو جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔ میں اپنے بچے کو اسکیلے ڈھونڈلوں گی۔ لیکن اگر میرے ساتھ کام کرنا ہے تو سب میرے طریقے سے ہو گا۔“

”وہ میرے سامنے اتنی کواس کرتا رہا اور میں سنتا رہا۔ لعنت ہے مجھ پر۔“ اس نے غصے سے اسٹرینگ پر ہاتھ مارا۔ زمر نے بے السیار کنپٹی کو مسلا۔

”فارس تم مجھے مزید ٹینشن دینے کے علاوہ پچھنیں کر سکتے۔ مجھے بھی پتہ ہے کہ کون کس کے ساتھ ملا ہوا ہے، گربات بات پر اگلے کر بیان پکڑنے اور دانت توڑنے کے علاوہ بھی بہت طریقے ہوتے ہیں۔ مگر میں بھی کسے بتا رہی ہوں۔“ سرجنٹ کروہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی جہاں بزرہ زار اور انگکسی دکھائی دے رہی تھی۔

فارس نے تپ کر اسے دیکھا۔ ”تواب کیا ہو گا؟ وہ تواصل مجرموں کو کور کر گیا ہے۔ کل کلاں ضمانت پر رہا ہو جائے گا۔ اور وہ اسے ایس پی ایس پی بن جائے گا۔ ایسے ملے گا ہمیں سعدی؟“

”میرا اس اے ایس پی کے ساتھ ایک ورنگ ریلیشن ہے، تم اپنے غصے میں اندر ہے ہو کر اسے خراب نہ کرو، یہ میرا درخواست ہے۔“

”مجھے ایک گھنٹہ میں جائے اس نیاز بیگ کے ساتھ، میں دیکھتا ہوں وہ کیسے سب نہیں بکتا۔“

”کیا بتائے گا وہ؟ اس کو کچھ بھی نہیں پتہ۔ اگر پتہ ہوتا تو سرمد شاہ سے ہمارے سامنے نہ لاتا۔ یہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا؟“ وہ دوبارہ سے موبائل نکال کر نمبر ملانے لگی۔ جھنجلا ہٹ اور اکتا ہٹ اس کے چہرے پر بکھری تھی۔ فارس چہرہ اس کی طرف موڑے اسے دیکھنے لگا۔ وہ نمبر ملاتے ہوئے بڑا رہی تھی۔ ”مجھے پتہ قاتم کام ہنانے کی بجائے صرف بگاڑو گے۔ تم سے کچھ نہیں ہو گا۔“

وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھ گیا۔ اندر اٹھتا ابال ذرا کم ہوا۔ چہرے کی رنگت نارمل ہونے لگی؛ پھر اس نے گہری سانس لی۔

”آپ کو کیا چاہیے؟“ زمر نے فون کان سے لگاتے ہوئے اکتا ہٹ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”انویسٹی کیپٹر کو کیوں کال کر رہی ہیں؟ کیا چاہیے آپ کو؟“ اس نے دہرا یا۔

”ایسے مت پوچھو، جیسے تم میرا کوئی کام کر سکتے ہو۔“ بے زاری سے اس نے فون ہٹایا اور لاک کھولا۔

”ایک آدمی ہر اس کر رہا تھا آپ کو پھر آپ نے مجھے بتایا۔ کیا دوبارہ اس نے کبھی تنگ کیا آپ کو؟“ زمر کے دروازہ کھولتے ہاتھ تھے، چونکہ کراس نے فارس کو دیکھا۔

”دو تین دفعہ آپ نے کچھ لوگوں کے بینک اکاؤنٹس اور بیک گراؤند چیک کرنے کے لئے کہا تھا، میں نے وہ کر کے دیا تھا یا نہیں؟“ وہ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھ رہا تھا۔ زمر کے ابر و مشتبہ انداز میں اکھٹے ہوئے۔

”تب تم قاتل نہیں تھے۔“

”میں نے پوچھا، آپ کو... کیا چاہیے؟“ ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ نظریں ابھی تک اس کی آنکھوں پر تھیں۔

”تم کیا کر سکتے ہو میرے لئے؟ اس نیاز بیگ کا بیک گراؤند چیک کر سکتے ہو؟ اس کا پولیس ریکارڈ، مالی حالات، خاندانی حالات، ڈیلنگز، مجھے ہر چیز چاہیے وہ بھی جو اس کو خود بھی نہ معلوم ہو۔ اگر میرا انویسٹی کیپٹر ہوتا تو کل شام سے پہلے ہر چیز میری نیبل پر ہوتی۔ بولو، تم کر سکتے ہو؟“ درشتی سے چاچپا کر بولتی، ایک ملامتی نظر اس پڑال کر اس نے دروازہ کھولا تو سننا۔

”کل دوپہر سب آپ کی نیبل پر ہو گا۔“ وہ نکلی تو وہ زن سے کاراگے لے گیا۔ زمر نے مڑ کر برہمنی سے اسے دیکھا۔ ”بد تیز۔“ انگلی سے چہرے پر آئی لشیں ہٹائیں اور انگکسی کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ تبھی عقب میں آواز آئی۔

”بیلوڈی اے۔“ وہ گھوپی۔

قدرے جھنجلا یا، قدرے جھکلتا سانو شیر و اس وہاں کھڑا تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھا، اور پھر مز کر ایک خفاظ نظر

عقب میں برآمدے میں کری پتیلی جواہرات پڑالی۔

”اوہ نو شیر و اس۔ آپ کو بہت عرصے بعد دیکھا ہے۔“ وہ خود کو پر سکون کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں دیئی گیا ہوا تھا۔ کل واپس آیا ہوں۔ مجی نے بولا کہ...“ ایک بے زار نظر پھر دور پتیلی جواہرات پڑالی جواہراتی دیکھ رہی تھی۔ ”آپ سے تعریف کروں۔“

”تعزیت؟“ زمر کے دل کو دھکا سالا گا۔ ابر دھنچ گئے۔

”مطلوب وہی... مددی کے لئے۔ مجھے بہت... بہت افسوس ہے۔“

”تھیک یو نو شیر و اس، مگر وہ زندہ ہے اور ہم اسے ڈونڈ لیں گے۔“ قدرے خشک انداز میں بولی۔ نو شیر و اس کی گرد میں کوئی پھنسنا سما پھنسنے لگا۔

”ہاں شیور کیوں نہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے ویسے۔“ جلدی سے بات سنجاہی۔ ”مگر یہ کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟“

”پولیس ان کو ڈھونڈ رہی ہے جلد پتہ چل جائے گا۔“

”آپ کوئی پتک نہیں؟“ اس نے غور سے زمر کا چہرہ دیکھتے پوچھا۔  
(ہاشم سامنے ہوتا تو اس سوال پاسے ایک تھپر تو لگا ہی دیتا۔)

”آپ بتائیں، آپ کو کس پتک ہے؟ آپ کا تواہ فرینڈ تھا۔ اس کے سو شل کانٹیلیشن کو آپ جانتے ہوں گے نا۔“

”نہیں... مجھے کیا پتہ۔ میں تو کافی دن سے اس سے ملا بھی نہیں تھا۔ ان فیکٹ میں تو اس واقعے سے ایک دن پہلے دیئی چلا گیا تھا۔ مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں اس کے پاس اس مشکل وقت میں نہیں تھا۔“ ظاہر لاپرواہی سے شانے اچکائے مگر اندر سے اس کا سانس خشک ہونے لگا تھا کیونکہ وہ چھپتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جی، مجھے پتہ ہے آپ تب دیئی میں تھے اُس اور کے۔ ہاشم نے بتایا تھا۔“ وہ بات ختم کر کے مرنے لگی، مگر ایک دم رکی۔ چونکہ اسے دیکھا۔

”مددی کے واقعے سے ایک دن پہلے، مطلب میری شادی والے دن آپ دیئی گئے ہوئے تھے؟ میں تاریخ کو؟“

”جی۔ اور سوری بھول گیا۔ شادی کی مبارک ہوا آپ کو۔“

زمر نے بے اختیار پیچھے اس کے کمرے کی بالکلونی کو دیکھا جہاں ششیٰ کے دروازے کے پیچھے وہ اکیس تاریخ کی صبح اسے کھڑا نظر آیا تھا، پھر اسے دیکھا۔ آئکھیں سکیر کر۔ (یہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟ یا اتنے دن گزر جانے کے باعث یہ تاریخوں کو مکس اپ کر رہا ہے؟ یا شاید اس نے اتنے دن مجھ سے افسوس نہیں کیا، اس لیے بہانہ گھوڑا ہاہے۔ اسٹوپڈ!)

”او کے۔ ڈی اے۔ آپ کا دن اچھا گزرے۔“

زمر نے سر جھٹکا۔ ”میں پلک پر اسکیوں نہیں ہوں اب۔“ محض اتنا بتا کر وہ پلت گئی۔ نو شیر و اس نے شانے جھٹکے اور واپس ہو لیا۔

لبون میں سیئی بجا تا وہ جواہرات کے ساتھ کری پڈھپ سے آگرا تو اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”ڈھنک سے افسوس کیا یا نہیں؟“

”ہاں کر لیا۔“ اس نے ہاتھ جھلا کر اشارہ کیا۔ ٹانگ پٹانگ جمائے پتیلی جواہرات نے رس بھرا گلاں ہونٹوں تک لے جاتے سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”شیر کیا مسئلہ ہے؟ تم دونوں بھائی مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟“

”اوہ میں بس کر دیں۔“ وہ بے زار ہوا۔ ”آپ کو بتائے بغیر کیا چلا گیا، تب سے تفیش کر رہی ہیں۔“

”کوئی توبات ہے۔ سعدی والے معاملے سے اگر تم لوگوں کا کوئی تعلق ہے تو مجھے ابھی بتا دو۔“

”مجھے نہیں پتہ یہ سعدی والا معاملہ بھی! میں تو وہی میں تھا، مگر بہت خوشی ہوئی۔ زندگی سے ایک مسئلہ تو کم ہوا۔ اندر جا رہا ہوں آپ بنیصیں اتنی گری میں باہر۔“ منہ کے راویے بگاڑتا، وہ اٹھا اور بیرونی زینے کی طرف بڑھ گیا (جو اوپر اس کے کمرے کی بالکونی تک جاتا تھا) جواہرات سوچ میں گما سے جاتے دیکھے گئی۔

❖❖❖

تحریر نج کر تو کبھی بات نج کر ..... پاتے ہیں رزق صورتِ حالات نج کر  
اگلی سہہ پہر پہلے سے بھی زیادہ گرم تھی۔ یہ شعبان کے آخری ایام تھے اور شہر بھر میں مصروفیت بڑھی گئی تھی۔ ایسے میں اس بلند  
عمارت کے ٹاپ فلور کے آفس میں بھی معمول کی چل پہل پہل جاری تھی۔

ہاشم کاردار کے آفس کے باہر بیٹھی سیکرٹری، نج بریک کے دوران، ایک ہاتھ میں سینڈوچ لئے، دوسرے میں میگزین پکڑے، قدرے  
تعجب سے پڑھتی جا رہی تھی۔ تبھی انہی کام بجا تو وہ میگزین پیش کرنے کے لیے رکھ کر، فوراً متوجہ ہوئی۔

”جی سر؟ اوکے!“ ریسیور کھرا کر اٹھ گئی۔ اس کے سینڈوچ بیگ تسلی میگزین کا آدھا صفحہ دکھائی دے رہا تھا۔ شہر سرخی واضح تھی۔  
”نیس کام کے نوجوان سائنسدان اور تھرکول کے سینٹر انجنئرنگ کو لاپتہ ہوئے پندرہوائی روز ہو گیا۔“ ساتھ میں آدمی ڈھکنی تصویر بھی  
چلک رہی تھی۔ گھنگری اے بالوں والا لڑکا مسکراتا ہوا۔

حیمہ نے آفس کا دروازے دھکیلا تو منظر ساکھتا گیا۔ چوڑی میز کے پیچھے ہاشم، بغیر کوٹ کے بیٹھا فون پہ بات کر رہا تھا، اور سامنے  
کری پہ خاور بیٹھا ایک فال کے صفحے پلٹا رہا تھا۔

ہاشم نے اگلی سے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا، پھر فون پہنس کر کسی کو الوداعی کلمات کہئے، پھر اسے دیکھتا اس کی طرف متوجہ  
ہوا۔ ”حیمہ وہ لیٹر ز مجھے ابھی لا دو میں سائنس کردیتا ہوں۔ پھر مجھے لکھنا ہوگا۔“

”اوہ سرا!“ وہ چپ ہوئی۔ قدرے تدبیب سے رکی۔ ”سر میں نے ابھی میگزین میں دیکھا، آپ کا وہ فرینڈ، سعدی یوسف... وہ  
منگ ہے۔“ صفحے پلٹتے خاور نے ایک دم مز کرایے دیکھا اور دوبارہ فون انٹھاتے ہاشم نے بالکل بھر کر، پھر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔  
”ہاں وہ تو کافی دن سے منگ ہے، ہم سب، اس کے دوست اور خاندان والے بہت اپ سیٹ ہیں اس کے لئے۔“ ہاشم بولا تو  
لبخ سے فکر مندی چھلکتی واضح دکھائی دی۔

”اوہ آئی ایم سوری سر! اکیس میسی کو وہ آیا تھا ادھر، اور کے پتہ تھا کہ اسی رات...“ وہ تاسف سے بول رہی تھی اور ہاشم کی گردن میں  
ڈوب کر بھرتی گلٹی واضح دکھائی دی۔

”کے پتہ تھا! خاور چوکے انداز میں ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔ ہاشم ذرا کھنکھارا۔

”حیمہ تم نے اس ہفتے بہت دفعہ کال کی تھی اسے، کیا پوپیس نے تم سے کچھ پوچھا اس بارے میں؟“  
وہ ٹھنک کر کی، آنکھیں اچھبے سے سکڑیں۔ ”نہیں سرا!“

”در اصل پوپیس اس کی گرل فرینڈ کو دھونڈ رہی تھی، وہ بھی منگ ہے اور تمہاری کالز کی وجہ سے انہوں نے مجھ سے تفیش کی تھی، مگر  
میں نے انہیں تسلی کروادی کہ تمہارا اس سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ (خاور  
نے مسکراہٹ چھپائے کو چھڑے نیچے کر لیا۔)

”نبیں سر میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔“ وہ ایک دم جیران پر بیشان نظر آنے لگی۔

”ہاں میں نے بھی انہیں بھی کہا کہ تمہاری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور کافی بھی تم نے نہیں، میں نے کی تھیں آفس سے وہ مشکوک تھے، ان کو میں کسی لڑکی کا چہرہ چاہیے اس منگ گرل فرینڈ کے ساتھ فٹ کرنے کے لئے، مگر تم فکر مت کرو، ہاشم کاردار کی سکرپٹری کو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ میں سنجال لوں گا۔“ رسان سے اس کی تسلی کرائی۔

”تھینک پوسرا!“ وہ ذرا پر بیشان ذر امنون ہی واپس پڑی۔ اپنے ڈیک پ آ کر اس نے کسی کراہیت بھری شے کی طرح وہ میگزین موز کرڈ سسٹ بن میں پچھکا اور سینڈوچ لے کر واپس کمپیوٹر پر بیٹھ گئی۔ (اف۔) ساتھ ہی جھر جھری لی۔  
اندر خاور نے ستائی مسکراہٹ سے سامنے بیٹھے ہاشم کو دیکھا۔

”اب یہ قیامت تک سعدی کا ذر کرنیں کرے گی۔“

اس نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ”ہاشم سب سنجال سکتا ہے۔“ پھر ذرا آگے کو ہوا۔ ”اس شخص کا کچھ پتہ چلا جو موقع پر موجود تھا؟“

”مجھے یہ ایک واہے سے زیادہ کچھ نہیں لگتا۔ اگر وہاں کوئی انجان شخص ہوتا تو گواہی کے لئے آگے آتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بالفرض اگر وہ سعدی کا کوئی جانے والا تھا تو اس سنسان گلی میں کیا کر رہا تھا؟ یقیناً سعدی نے ہی اسے بلا یا ہو گا۔ میں نے اس کا سارا کال ریکارڈ چیک کیا ہے، اس نے ہمارے آفس سے جانے کے بعد کوئی کال نہیں کی۔ سو یہ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی ہو۔“ مگر ہاشم کی آنکھوں میں تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔

”پولیس کو کس نے بلا یا؟“

”ہمسایوں میں سے کس نے فون کیا تھا انہوں نے اس کی جھیں سئی تھیں۔ پولیس کو معلوم نہیں تھا، مگر میں نے زمر صاحب سے پوچھا تھا، وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ سعدی کے محلے کی کوئی خاتون ہیں اور زمر کی ان سے بات ہوئی ہے، انہوں نے بھی کچھ نہیں دیکھا۔“  
ہاشم نے گھری سانس لی، پیچھے کوئی لگائی اور سوچتی نظر وہ سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔

”اس کے کال ریکارڈ زدہ لوگ بھی نکلاوائیں گے۔“

”عیمہ نے اپنے نمبر سے کوئی کال نہیں کی، آپ کے ڈیک فون سے کی تھی اور وہ آپ کا دوست تھا، کوئی شک نہیں کرے گا۔“

”اس کے فون سے کچھ نہیں ملا؟“

”اونہوں۔ صفا چلت۔ اسے شاید ڈر تھا کہ ہم اس کا فون بگ نہ کر رہے ہوں، اس لئے وہ اس میں کوئی پر خطر شے نہیں رکھتا تھا۔ بہر حال وہ مکمل طور پر تباہ کر کے ڈسپوز آف کر دیا ہے۔ کسی کو نہیں ملے گا۔ جیسے وہ خود کسی کو نہیں ملے گا۔“

ہاشم کے چہرے پر ایک عجیب سا احساس ابھرا۔ اس نے خاور کی طرف دیکھا اور جب بولا تو آواز ہلکی تھی۔

”کیسا ہے وہ؟“

”ری کو رکر رہا ہے۔ جلد شفت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور...“ وہ رکا۔ ”وہ پڑھنے کے لئے قرآن مانگ رہا تھا۔“

”وے دو۔“ ہاشم نے نائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے قدرے تکان سے کہا۔ خاور کو بے چینی ہوئی۔

”ہمیں اس کو ہسپتال میں ہی ختم کر دینا چاہیے تھا۔ اس کو زندہ چھوڑ کر آپ غلطی کر رہے ہیں۔“

”خاور! ہم یہ موضوع ختم کر چکے ہیں۔“ خاور سہلا کر اٹھ کر ہوا۔

”میں نے ہمیشہ سوچا سر کہ جب نجومی کہہ دے کہ اس سال میں پیدا ہونے والے لڑکے کو مار دینا بہتر ہے، تو نیل میں تیرتے

صدوق کوڈ بودنے کی بجائے اسے اپنے پہلو اور دل میں جگہ دینے کا غلط فیصلہ انسان سے کون کرواتا ہے؟ مگر کچھ دن سے مجھے لگنے لگا ہے کہ اتنی محبت پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ خیر۔ اس نے گہری سانس لی۔ ”مزکاردار مجھ سے بار بار اشاروں کتابیوں میں وہ پوچھ رہی ہیں جو آپ انہیں نہیں بتانا چاہ رہے۔ اس بارے میں غور کیجئے گا۔“  
وہ چلا گیا اور ہاشم قم انگلیوں میں گھما تا، سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔

❖❖❖

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں ..... لیوے نہ کوئی نام، ستمنگ کہے بغیر! ”فودلی ایور آفڑر“، ریشور اٹ کے اندر اس سہبہ پہرا کا دکا لوگ ہی موجود تھے۔ کونے کی ایک میز پر زمر کاغذات پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس نے زرد پھولدار جوز اپہن رکھا تھا، اور بال آدھے کچھ میں باندھے، سر جھکائے، صفحے الٹ پلت کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر کاڈنر کے ساتھ کھڑی ندرت کو بھی دیکھ لیتی جو رجسٹر چیک کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں تلے گہرے حلقات تھے اور چجزہ زرد تھا۔ ”بھا بھی، ہم اسے بہت جلد ڈھونڈ لیں گے۔“ بلکہ سما کرا کر زمر نے ان کو پکارا۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھے ناسر ہلایا۔ زمر کی مسکراہٹ مددم ہو گئی۔ ندرت اب زیادہ بات نہیں کیا کرتی تھیں۔ زمر روز ادھر ہی ہوتی مگر آج خلافِ معمول خنین بھی ساتھ آئی تھی۔ البتہ اس کے قریب نہیں بیٹھی۔ کچن میں کھڑی رہتی یا کبھی باہر آ جاتی۔

”خدا۔ کیا تم مجھے سعدی کے لیپٹاپ کا پا سورڈ کھول کر دے سکتی ہو؟“ زمر نے زمی سے اسے پکارا۔ وہ کچن کے دروازے پر کھڑی تھی اس کی بات پر مڑ کر اسے دیکھا۔

”مجھے نہیں آتے یہ کام۔“ اور رخ پھیر لیا۔

”ہم دونوں جانتے ہیں کہ یہ سچ نہیں ہے۔“

”لیپٹاپ سے کیا ملے گا؟ کال ریکارڈ سے بھی تو کچھ نہیں ملا۔“ وہ خنکی سے اس کی طرف پشت کیے بولی تھی۔ زمر نے گہری سانس لی۔

”کیا تم نے اپنی دوستوں سے پتہ کیا؟ کس کے بھائی نے بتائی تھی سعدی کو وہ بات؟“

”نامعہ کے بھائی نے بتایا ہوگا۔ اب وہ کوئی مانے گی تھوڑی؟“

”اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ ڈاکٹر سارہ سے پوچھوئیں کام میں حیمنا می سیکرٹری کس کی ہے؟“

زمر کے پاس ان کاموں کی ایک لمبی فہرست تھی جو اس نے خنین کو دیے تھے اور جو خنین نہیں کر کے دے رہی تھی۔ اس بات پر نکل کر پلپی۔

”سارہ خالہ ابھی تک تھر میں ہیں، کہہ رہی تھیں وہ اپس آکر پتہ کریں گی اس سیکرٹری کا۔ وہ خود اتنی پریشان اور شاکن ہیں بھائی کے لئے۔ کہہ رہی تھیں، نیلند پر بھی سب بہت اپ سیٹ ہیں بھائی کی وجہ سے۔ اب بار بار کیا نگک کروں ان کو؟“

زمر نے نفی میں سر ہلاتے گہری سانس خارج کی اور واپس کاغذات کی طرف متوجہ ہوئی۔ تبھی سامنے دروازہ کھلا اور کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی میز کے قریب آ کھڑا ہوا۔

”میم، السلام علیکم۔“ زمر نے سر اٹھایا۔ احر سامنے کھڑا تھا۔ تذبذب اور فکر مندی سے اسے دیکھتا۔

”علیکم السلام۔ بیٹھئے۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر کچھ صفحے نکال کر دوسرا فائل میں لگانے لگی۔

”آ..... وہ..... میں نے آپ کو ابھی کال کیا تھا، آپ نے بتایا آپ ادھر میں۔“ کری گھنچ کر سامنے بیٹھتے اس نے یاد دلا دیا۔ (چیل کا کیا بھروسہ۔)

”ہوں۔ کافی جلدی مل گیا آپ کو ایدر لیں۔“

”نو پر اب لم۔ میں چیلے بہت آچکا ہوں ادھر۔ سعدی کے ساتھ۔ اوہ... مجھے بہت افسوس ہے اس کے لئے۔“ جلدی سے آگے ہو کر وہ تاسف سے کہنے لگا۔ ”میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا ہو گا۔ اگر میں کچھ کر سکوں اس کے لئے تو پیلیز بتائیے۔“

”آپ کے خیال میں اس کے ساتھ یہ کس نے کیا ہو گا؟“ وہ کاغذات سینتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ..... وہ رکا، بچپنا ہستے کہنی کھجائی۔“ کورٹ میں ایک نججی سے سعدی نے اس نجج کو...“

”اساپ!“ زمر نے ایک دم باتھا اٹھا کر اور آنکھیں نکال کر اسے روکا۔ وہ تھہر اور نا بھجی سے اسے دیکھا۔

”ہم اس بارے میں بات نہیں کر رہے، اوکے!“ اسے گھوڑ کر، بظاہر ٹھنڈے اندماز میں کہا۔ وہ ذرا الجھا۔ ”گر آپ میری بات تو سن لیں۔“

”احمر، اگر مجھ سے کورٹ میں پوچھا گیا کہ ہم نے ایسی کوئی بات کی ہے یا نہیں، تو میں اسینڈ پ چھوٹ نہیں بول سکتی، اس لئے ہم ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے۔ اوکے!“ ابرواٹھا کر تھی سے جتایا۔ احرم کا منہ کھل گیا۔

”آپ جانتی ہیں کہ غازی کیسے رہا ہوا تھا۔“

”اسے نجج نے رہا کیا تھا، میں یہی جانتی ہوں۔“ کھا جانے والی نظر وہ اسے دیکھتے احتیاط سے الفاظ کا چنانہ کیا۔

”جی، بالکل، آف کورس۔“ احرم نے دم بخود اثبات میں سر ہلایا۔ ”مگر، جمیں سکندر نے کبھی کوئی.... ذکر کیا؟“

”احمر، جمیں صاحب میرے پاس آئے تھے اور میں نے وہی کہا جو میں نے کہا تھا۔“ تھہر تھہر کر وہ بولی۔ احرم نے سمجھنے والے اندماز میں گردن بلائی۔ زمر کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر پھر سے تازہ ہو گیا....

وہ اپنے آفس میں کھڑی تھی اور جمیں سکندر بدلتے رکوں والا چورہ لئے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

”یہ پیکٹ مجھے آپ کے سمجھنے بھجوایا ہے، اس کو ایک نظر دیکھئے اور بتائیے، کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔“

زمر نے سینے پر بازو لپیٹے اور چھپتی ہوئی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ ”یور آئز“ میں اس کو نہیں کھلوں گی، مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے، اس میں ثبوت اور شواہد ہو سکتے ہیں، جو اس نے اپنے ماموں کے حق میں جمع کر کے بھیجے ہوں آپ کو اور اس میں کوئی قابل اعتراض نہیں ہے۔ اس لئے آپ اس پیکٹ کو لے جائیے اور بطور نج وہی سمجھنے جو آپ کو بہتر لگتا ہے، کیونکہ میں یہ کیس آپ سے ڈسکس نہیں کر سکتی، یہ غلط ہے، سو....“ ساتھ ہی کلامی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ”مجھے چلانا ہو گا۔“ اور پس وغیرہ سمنئے گئی۔

”آپ کو اچھی طرح پڑھتے ہے کہ اس میں کیا ہے۔“

”یور آئز“ میں نے اس کو نہیں کھولا، اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔“ اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ہلکا سار جھنکا تو یاد کا بلبلہ ہوا، اور وہ واپس ریسٹورانٹ میں آئی۔

”کوئی اور کام جس میں آپ سعدی کے شریک رہے ہوں؟“ سمجھی گی سے احرم کو دیکھ کر وہ پوچھنے لگی۔

”مز شہرین کا ردار کا ایک کام تھا...“ وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ زمر غور سے سنتی رہی۔ آخر میں بس اتنا بولی۔ ”مجھے شہرین کی وہ ویڈ یوچا ہے۔ آپ کے پاس ہو گی یقیناً۔“

احمر نے جیرت سے اسے دیکھا۔ ”سوری مگر میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے کہ وہ میں ہر جگہ سے مٹا چکا ہوں، میرے پاس وہ

"مجھے... وہ... ویڈ یو... چاہیے احمد! توڑ توڑ کر اس نے الفاظ ادا کیے۔ احمد کے چہرے پر بے پناہ افسوس بھرا۔

"مطلوب آپ مجھے اتنا کوئی گراہوا انسان سمجھتی ہیں کہ میں کلب کے ریکارڈ سے مٹا کر اس کو اپنے پاس رکھ لوں گا؟ مجھے آپ کی سوچ پا افسوس ہے اور...." جذباتی انداز میں وہ بولے جا رہا تھا کہ زمر نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ "احمد شفیع!" اور اس کو گھوڑا۔

"اوکے سوری۔ میرے کمپیوٹر میں پڑی ہے کل لادوں گا۔" اس نے فوراً ہاتھ اٹھا دینیے۔ پھر بے چارگی سے احمد ادھر دیکھا، ذرا دیر

کوٹھکا۔

"ایکسکیو زمی یا یار کی کون ہے؟" زمر نے اس کی نظر دوں کے تعاقب میں کچ کی سمت دیکھا جہاں خیں قدر ہے رخ موڑے کھڑی تھی۔ زمر نے واپس ایک تیز نظر احمد پر ڈالی۔

"یہ سعدی کی بہن ہے، یعنی کہ فارس کی بھائی، اور اگر فارس بیہاں ہوتا تو آپ کی آنکھیں نکال چکا ہوتا ب تک۔" زمی سے گویا ہوئی تو وہ جو دیکھے جا رہا تھا، ہر بڑا کر سیدھا ہوا۔

"میں نہیں سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" کرسی پر رخ بھی موز لیا۔ پھر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں۔ کل ویڈیو لا دوں گا۔" عجلت میں کہتا، شرمندہ سافورا بہر نکل گیا۔ زمر نے دیکھا۔ باہر شیشیے کے دروازے کے پار فارس آتا دکھائی دے رہا تھا۔

احمد نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اس کے پاس لمحے بھر کر کا۔

"تم ادھر؟" فارس نے دھوپ کے باعث آنکھیں چند ہیا کر اسے دیکھا۔ آج اس نے بھورا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اندر گول گلے کی سیاہ شرٹ۔ (پھر ویسی ہی شرت!) ہاتھ میں کچھ کاغذ پکڑ رکھتے تھے۔

"سعدی کا افسوس کرنے آیا تھا، مگر اب سوچ میں پھر کاغذ پکڑ رکھتے تھے۔" سعدی کا افسوس کرنے آیا تھا، مگر اس دن فیصلہ کیا تھا، پڑیل کو پڑیل نہ کہنے کا، وہ واپس لے لوں۔ "نہایت جل کر بولا۔

"مطلوب؟" اس نے تعبیر سے اسے سر سے پیروں تک دیکھا۔

"دفع کرو۔" احمد نے سر جھلایا۔ پھر جلدی سے قریب ہوا۔ "پتہ ہے کیا،" زمر میڈم سب جانتی ہیں، کہ کیسے تم باہر آئے، کیسے سعدی نے بچ کو بلیک میل کیا، اور وہ بچ سب سے پہلے انہی کے پاس گیا تھا، مگر.... وہ تیز تیز بولے جا رہا تھا۔ فارس نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

"ایک منٹ ایک منٹ!" جیرت اور شاک سے اس نے بات کاٹی۔ "اس کو چھوڑو، تم کیسے جانتے ہو یہ سب؟" جذباتی انداز میں بولتے احمد کو بیک گئی۔ منہ کھل گیا۔ (oops) بے اختیار و قدام پیچھے ہٹا۔

"میری ای میرا انتظار رہی ہوں گی، میں چلتا ہوں۔"

"تمہاری امی کے انتقال کو سات سال گزر پچے ہیں۔ سیدھی طرح مجھے پوری بات بتاؤ!"

"وہ... دیکھو۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے.... آخر لوگ میرے پاس مشورے لینے آتے ہی کیوں ہیں؟" وہ واقعی روہاں ہوا۔ "میں نے تو صرف ایک مشورہ..."

"تم...!" وہ انتہائی غصے سے آگے بڑھا۔ "تم نے میرے بھائی کو بلیک میل بنا دیا۔" دلی دلی آواز میں غریا تھا۔

"تو اور کیا کرتا؟ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ دیکھو مجھے جلدی ہے، بھی میں جا رہا ہوں، بعد میں بات کرتے ہیں ہاں۔" تیز تیز بولتا، پیچھے نہتے وہ مڑا اور اپنی کار کی طرف لپکا۔ فارس بکشکل بخطب کر کے اسے جاتے دیکھا رہا، پھر واپس مڑا تو شیشیے کی دیوار کے پار زیستور اسٹ کے اندر

وہ تینی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پر جھکا کر کاغذ پٹ کرنے لگی۔

”اس کو تو بعد میں پوچھوں گا۔“ ایک چشکیں نگاہ دور جاتے اپنی پڑال کروہ (گہری سانس لے کر) اندر آیا۔ زمر سر جھکائے کاغذ دیکھ رہی تھی جب ان کاغزوں پر اس نے ایک فولڈر کھلا۔ زمر نے سراخایا۔ وہ سنجیدہ سامانے کھڑا تھا۔

”آپ کے انویسٹی گیٹ نے جواب نہیں دیا؟“ زمر نے اس کا طنز نظر انداز کر کے فولڈر کھولا۔ آہستہ آہستہ کاغذات پر نظر دوزاتی گئی۔ ابر واٹھ، لب سکڑے۔

”نیاز بیگ دو دفعہ جیل جا چکا ہے، صرف ایک بار تین سال کی سزا کافی تھی۔ مبینہ طور پر قتل کر چکا ہے۔ اور دونوں دفعہ الزام سے نکل آیا تھا۔ چار بیجے ہیں، ایک بیوی، جو سیلا سب ناؤں میں اس کے گھر میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک...“ وہ رکا۔ ”ایک عورت سے اس کا تعلق ہے، ایمنہ امیاز نام ہے اس کا، اس کو فیصلے کر دیا ہوا ہے، اور ایک این جی او میں اچھی نوکری دلوار کھی ہے۔ باقی سب اس فولڈر میں ہے۔“

زمر صفحے پلٹانی گئی، (اور چہرے پر تاثر کرنے تاثرات نہ آنے دینے کی کوشش کرتے خود کو سپاٹ رکھا) پھر لگا ہیں اخہائیں۔

”مجھے اس امیز امیاز کی ایک ایک تفصیل چاہیے۔ یہ کہاں رہتی ہے، کیا روئیں ہے اس کی، کب...“ الفاظ لبوں میں رہ گئے۔ فارس نے کوٹ کی اندر ونی جیب سے چند تہہ شدہ کاغذ کا نکال کر اس کے سامنے رکھے۔

”اور کچھ؟“ وہ سنجیدہ تھا۔ سپاٹ سا۔

”نہیں۔“ وہ بے نیازی سے کاغزوں کی تمیں کھوتی قدر رے رخ موڑ گئی۔ وہ بھی نہیں رکا۔ ندرت کو بس سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی زمر کے چہرے کی لا تلقی ہوا ہونے لگی اور وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ تیز تیز ان کاغذات کو پڑھنے لگی۔

.....❖❖❖.....

### ہم سے نہ پوچھو بھر کے قصے

ہپتال کا وہ کمرہ ساری دنیا سے الگ تھا۔ اور کثا ہوا لگتا تھا۔ سعدی بیٹھے سے نیک لگائے پاؤں لبے کے بیٹھا تھا، اور دو تین افراد اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک جھک کر اس کی ناگنگ کے زخم کی ذریں تبدیل کر رہا تھا۔ خود وہ بس سینے پر بازو لپیٹے خاموشی سے ان کو یہ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شروع میں اس نے ان میں نہ سز سے ہمکلام ہونے کی کافی کوشش کی تھی مگر وہ نہ سنتے تھے نہ جواب دیتے تھے، سو اب تو انہی ضائع کرنا بے فائدہ تھا۔ سوائے اس ڈاکٹر کے۔ آج وہ بال پونی میں باندھے، اس کے سر پر کھڑی، گردن جھکا کر پٹی بدلنے کے عمل کو دیکھ رہی تھی۔ کام مکمل کر کے وہ لوگ اسی خاموشی سے چلے گئے جس طرح آئے تھے۔ البتہ وہ چند لمحے کے لیے کھڑی رہی۔

”کیا تمیں اس پیر کی ہتھڑی سے تکلیف تو نہیں ہو رہی؟“ ذرتے ذرتے میری کو نظر انداز کرتے اس نے پوچھا۔ میری ایک دم ناگواری سے اٹھی۔

”نہیں۔“ سعدی نے رخ پھیر لیا۔ لڑکی نے بسی بھری ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”تمہارا کام ختم ہو گیا ہے مایا، اب تم جاؤ۔“ میری نے اس کو ٹکھوڑا۔ مایا سر جھکائے، ”اوے“ کہتی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولنے ہوئے، مڑک رکیں بے بس، دکھی نظر اس پڑالی اور پھر باہر نکل گئی۔

میری صوفے پر بیٹھ گئی۔ سعدی اب اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ ڈھیلائ پڑھکا تھا یا شاید اس قید سے نکلنے کا راستہ کوئی نہ تھا۔

اس نے سائیڈ نیبل سے اپنا قرآن اٹھایا اور خاموشی سے صفحے پلٹانے لگا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کل تلاوت کہاں سے چھوڑی تھی، پھر یاد کرنے کی کوشش کیے بغیر اس نے اپنی پسندیدہ سورت کھوی۔ چیزوں کی سورة۔ پیامبروں کی سورت۔

”مجھے اپنا قرآن پین بھی چاہیے۔“ صفحے سے نگاہ اٹھائے بغیر اطلاع دی۔ جواب بھی اسی سرداںداز میں میری کی طرف سے آیا تھا۔ ”تمہیں کسی بھی قسم کا gadget نہیں مل سکتا۔ سوری۔“

سعدی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اعوذ بالله پڑھا، اور صفحے پر دھیان دیا جہاں سفید کاغذ کے اوپر سیاہ الفاظ جگہ گار ہے تھے۔ اس کی ان میں ان الفاظ پر جمگنیں۔ کمرے میں چھایا ڈپریشن، تنا و اور افرادگی، ہر شے اس جگہ گاہت میں پس منظر میں جانے لگی۔ آیت اس سے کہہ رہی تھی۔

”مگر جس کسی نے بھی ظلم کیا، پھر برائی کے بعد اسے نیکی سے بدل دیا ہو تو بے شک میں (اللہ) غفور اور رحیم ہوں۔“

چند لمحے کے لئے اس کا رابطہ کمرے کے دوسرے حصوں سے کٹ گیا۔ بیٹھ کے گرد سیاہ جگہ گاہت کا ایک ہالہ سائیخ گیا جس میں وہ سر جھکائے بیٹھا، ہاتھ میں پکڑی کتاب پڑھ رہا تھا۔

”اللہ تعالیٰ!“ وہ مدھم آواز میں بڑا بڑا یا تو سیاہ ہیروں سی جگہ گاہت دل کے اندر اترنی ہر آگ کو مختندا کرنے لگی۔ ”مجھے یہ آیت یاد ہے۔ جہاں بھیپن میں میں قرآن پڑھنے جاتا تھا، وہاں میری ٹیچر نے یہ آیات بہت اچھے سے پڑھائی تھیں۔ وہ کہتی تھیں، عربی بہت کا زار ہی زبان ہے، اس میں ہر لفظ کا بہت وسیع مطلب ہوتا ہے۔ قرآن تب سمجھ آئے گا جب اس کے ہر لفظ کے مطلب کو سمجھو گے۔ جیسے اللہ دیکھیں نا آپ نے کہا، جو کوئی ظلم کرے تو ظلم کا مطلب کیا ہے؟ اس سارے ہنی تنا و میں بھی مجھے یاد ہے۔ ظلم کا مطلب ہے، کسی کے حق میں کمی کرنا۔ تو آپ مجھے یہ سمجھا رہے ہیں اللہ کہ ہم زندگی میں جب بھی کسی کے حق میں کمی کریں تو احساس ہونے پر صرف سوری کر دینے کی بجائے برائی کو اس دکھ اور تکلیف کو ہمیں اچھائی اور محبت سے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان سارے دنوں میں مجھے لکنے لگا تھا کہ میں اس قید میں اس لئے پڑا ہوں کیونکہ میں نے زمر کا دل دکھایا تھا، وہ بیمار تھیں، انہوں نے کیا انہیں کیا میرے لئے کیا تھا اگر میں فارس ماموں کی مسلسل حمایت کرنے کی بجائے دکھاوے کو ہی ان کی بات پر یقین کر لینے کی اداکاری کر لیتا، مگر میں نے ان کا حق ادا نہیں کیا۔ اگر چار سال انہوں نے تعلق نہیں رکھا تو میں بھی ان کی موجودگی میں ان کے گھر نہیں جاتا تھا، میں نے بھی کال کرنی چھوڑ دی۔ آخر میں پہل تو پھر بھی انہوں نے کی۔ وہ سو نیا کی سالگرہ کا کارڈ لے کر آئیں، میں تو نہیں گیانا۔ مگر اب آپ مجھے بتا رہے ہیں کہ اگر میں نے اس ظلم کو اچھائی سے بدلتے کی کوشش کی ہے تو پھر آپ غفور بھی ہیں اور رحیم بھی۔ اتنا تو مجھے پتہ ہے کہ پیچھے گھر میں مجھے کوئی بھی برانہیں سمجھتا ہوگا۔ میری ماداے کی کوششوں نے میری سب کمی کوتا، ہی ڈھانپ لی ہوگی۔“ وہ سر جھکائے بڑا بڑا تے ہوئے چونکا۔ ”اوہ!“ جیسے کچھ سمجھ آیا۔ ”اوی لئے آپ نے کہا کہ آپ غفور اور رحیم ہیں۔ غفور کہتے ہیں ڈھانپنے والے کو جو گناہوں کو ڈھانپ کر ان کو منادے معااف کر دے۔ اور رحیم...“ اس نے آنکھیں میچ کر یاد کرنا چاہا۔ کندھا پھر سے درد کرنے لگا تھا۔ ..... بار بار رحم کرنے والا، لوگوں کی غلطیاں، گناہ سب بار بار معاف کر کے پھر سے ان کو موقع دینے والا۔“

سیاہ حروف کی جگہ گاہت اس کے گرد کسی اوپنے دائرے کی طرح رقصان تھی۔ باقی سب کچھ چھپ گیا تھا۔ بدقت اس نے اگلے الفاظ پڑھنے چاہے۔

”اور اپنا ہاتھ ڈال لجھتے اپنے گریبان میں (اے موی) وہ نکلے گا سفید چمکدار، بغیر کسی عیب کے (یعنی کسی بیماری کی وجہ سے نہیں، مجراتی طور پر) یہ نو (9) نشانیاں ہیں، ان کو لے جائیے فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔ بے شک وہ لوگ ہیں جو حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔“

”آہ اللہ!“ سر جھکائے بیٹھے لڑکے نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ ”میں نے بھی یہی کرنا چاہا تھا مگر مجھے بھول گیا تھا کہ موئی تھا نہیں گئے تھے۔ وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر گئے تھے۔ میں نے زندگی کی دوسری بڑی غلطی کی زمر اور خنیں سے جھوٹ بول کر کہ میں نیکا مجا

رہا ہوں۔ اب ان کو کون بتائے گا کہ میں کہاں ہوں، اور پہلی غلطی...، اس کی بند آنکھوں کے آگے ایک مظہر ہرایا۔ ”گولی لگنے سے چند منٹ پہلے... میں نے وہ پین کیسرہ ایک غلط شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔ اوہ اللہ!“

پھر اس نے ذہن سے ساری یادوں کو جھک کر آنکھیں کھولیں اور الگی آیت پا انگلی رکھی۔

”پھر جب ان کے پاس آنکھیں کھول دینے والی ہماری نشانیاں آگئیں تو وہ کہنے لگے، یہ تو حکم کھلا جادو ہے۔“ ایک ایک لفظ اس نے تھہر کر اندر اتارا۔ دل و دماغ میں عجیب قتوطیت اور اذیت بھرتی گئی۔

”اللہ آپ کو تو پتہ تھا کہ وہ اس کو نہیں مانیں گے ہدایت کی کوئی بات ان کے دل کو موم نہیں کر سکے گی۔ پھر آدمی کیوں جا کر کسی مذکور غلام کو لکارے؟ وہ اپنا عمل کریں اور ہم چپ چاپ اپنی نماز و زدہ کرتے رہیں۔ میں بھی کوئی ان کا دل موم کرنے نہیں گیا تھا، مگر یونہی ایک انہوںی سی آرزو تھی کہ شاید وہ مداوے کے لئے پکھ کریں۔ پکھ کرنا چاہیں، مگر فائدہ کیا ہوا؟“ سیاہ جگہ گہٹ کو مایوس کا انہیں رانگنے لگا اور جیسے جیسے آس پاس سیاہ دھویں کے مرغولے اٹھنے لگے... اس کا دل پھر سے زخم زخم ہونے لگا۔

”اور انہوں نے ان کا انکار کیا ظلم اور تکبر کے ساتھ حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے...“

وہ پڑھتے پڑھتے چونکا۔ سیاہ دھواں پھینا تھہر گیا۔ ساری فضاساکن ہو گئی۔

”حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے۔“

پھر دیکھو!

کیا ان جام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا!“

دھواں چھٹ گیا۔ سیاہ حروف جگہ گہٹ پھر سے ارگرد پھیل گئی۔ اس بیٹھے سر جھکائے لڑکے کے چہرے پہ تکان بھری مسکراہٹ آٹھہری۔ اس نے گھری سانس خارج کی۔ ہننوں سے اسی کتاب کی ایک اور آیت ادا ہوئی۔

”اور جو اللہ پہ بھروسہ کرتے ہیں، اللہ ان کے لیے ضرور راستہ نکالتا ہے۔“

مقدس کتاب بند کی، ادب سے چوما اور سائیڈ نیبل پر کھدو۔ پھر اسی سے مسکراتے واپس نیک لگائی۔

میری ہنوز بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سعدی خاموشی سے مسکراتا، چھٹ کوتکتا رہا۔

”اور تم ہاشم کا رد از دیکھنا ہمیں، کہ ہم کیسے بخرا حمر کو دھوؤں میں کانتے ہیں، اور پھر تمہیں اسی میں ڈبوتے ہیں۔ تم دیکھنا۔“

❖❖❖

غم کی حدت سے کوہ سار پکھلتے دیکھے..... انسان تو پھر انسان ہوا کرتے ہیں  
قصر کاردار سے پرے ایکسیں میں ان دنوں سمجھوتے کی سی فضا چھائی تھی۔ رمضان شروع ہو چکا تھا، اور پہلے چند روزے کے گزرے، پتہ ہی نہیں چلا۔ عجیب سی روشنی بنی ہوئی تھی۔ افظاری کے بعد سحری تک کوئی نہ سوتا۔ پھر سحری کر کے سیم اور شنیں دو پھر تک سوتے۔ ندرت کا وہی طریقہ تھا۔ رمضان کے باوجود جلدی ریسنور انٹ چلی جاتیں۔ زرمبھی گھر نہ لکتی اور فارس جا ب پہ ہوتا۔ بڑے ابا خالی پڑے لاؤ نے میں سارا دن صداقت کے ساتھ بے مقصد بیٹھے رہتے۔

صداقت بولتا رہتا، یا سیم اٹھ جاتا تو وہی بولتا، یا وہ دنوں ٹی وی دیکھتے رہتے۔ اور دنوں کو لگتا کہ وہ موسمیقی سے بھر پور، دو کان نسمیشن میں لوگوں کی طرف بھکاریوں کی طرح تختے اچھاتے دیکھ کر ثواب کمار ہے یہ۔ ابا سیم سے اتنا بھی نہ کہتے کہ رمضان عبادت کا مہینہ ہے، ٹی وی کے سامنے بیٹھنے سے اسے ضائع نہ کرو۔ کہ انہیں ڈر تھا اگر وہی لا اونچ میں آ کر نہ بیٹھے گا تو یہ تہائی شاید ماراں دے۔ جنین پہلے بھی ست تھی اب تو ہر کام سے گئی۔ کمرے میں بند رہتی، یا باہر لان میں بیٹھی گردن اٹھائے تصر کو دیکھتی رہتی۔

ایسکی ہی ایک رات زمر اور فارس کے کمرے میں مدھم زرد بیتل جل رہی تھی۔ بجلگی ہوئی تھی، یوپی ایس پر پنکھا چل رہا تھا، گمراۓ سی لی منڈنہ باقی تھی۔ فارس صوفے پر پاؤں لبے کیے لیٹا، سینے پر لیپٹا پر کچھ کام کر رہا تھا (وہ ایک کار پوریتہ فرم میں بطور چیف سائیونری افسر تھیں تھا۔) سامنے جائے نماز پر زمر احتیات میں بیٹھی تھی۔ سرپر دو پڑھے اچھے سے پیٹھے اس کا چہرہ بھکرا تھا۔ فارس کی طرف اس کی پشت قی۔ وہ نکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تراویح ختم کر کے اب وتر کا سلام پھیر رہی تھی۔ پھر جائے نماز سینئٹی انھی تھیں۔

”آپ کی نماز کافی خوبصورت ہے۔ سلو اور آرام سے۔ میں بھی پڑھتا تھا میل میں۔ مطلب اتنی اچھی نہیں۔ آس پاس کی ساری آوازیں سنائی دیتیں اور سارے دن کے کام یاد آتے۔“ اسکرین کو دیکھتا وہ بولا تو وہ جو پشت کیے کھڑی جائے نماز تھہ کر رہی تھی، رک گئی مگر مزمزی نہیں۔ ”اور آپ کی طرح پانچ وقت کی نہیں پڑھتا تھا۔ کچھ دن پر بھی، پھر چھوڑ دی۔ مگر.... ایک بات۔ دعا میں بھی نہیں مانگتا تھا، مگر مجھ تو یہ ہے کہ دعا کے بغیر نماز ادھوری ہوتی ہے۔“

وہ بلکہ سامزدی، چھپتی نظر اس پر ڈالی۔ ”میں دعاء مانگوں یا نہیں، یہ میرے اور میرے اللہ کا معاملہ ہے۔“

”میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“ وہ شانے اچکا کر اسکرین کی طرف متوجہ تاپ کرتا رہا۔

زمر جائے نماز رکھ کر اسٹڈی ٹیبل پر آئی۔ (اس کی طرف اب بھی پشت تھی۔) انگلی سے چہرے کے گرد اڑ سادو پنہ کھولا۔ فائل سامنے کی قلم اٹھایا۔ الفاظ پر نگاہ پڑی تو ہر چیز مدھم ہونے لگی۔ اپنی زندگی کی فلم کی طرح نظر وہ کے سامنے گھوم گئی۔

”اللہ تعالیٰ۔“ اس نے بنا آواز لب بھلائے۔ آنکھوں میں اضطراب در آیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ میں پہلے جیسی دعا نہیں کرتی۔ آپ سے بات بھی نہیں کرتی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ سے ناراض ہوں، نعوذ باللہ۔ بس میرا دل خخت ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا تھا میرے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں بچا مگر میں غلط تھی۔ جب تک انسان کی سانس ہے، اس کے پاس کھونے کو کچھ نہ بچھ ضرور ہوتا ہے۔ میرے پاس بھی تھا۔ سعدی۔ اور اب وہ نہیں ہے۔ ابا، اور باقی سب ہیں، میں ان کو کونا نہیں چاہتی۔ اور میں سعدی کو بھی واپس لانا چاہتی ہوں۔ میں ہر اس شخص کو مبرت کی مثال بنانا چاہتی ہوں جس نے میرا خاندان تباہ کیا ہے، اور میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ جب تک وہ ہمارے پاس واپس نہیں آ جاتا، آپ اس کا خیال رکھیے گا۔ آپ اس کو اکیلانہ سمجھیجے گا۔“ اس نے آنکھیں بند کیں تو دو آنسو ٹوٹ کر چہرے پر گرے۔ پھر بھیجنی پلکیں کھولیں۔

”فارس!“ اس کی آواز بھی رندھی ہوئی تھی۔ اس نے چوک کر رکھا۔ پھر لیپٹا پر ہٹا کر اٹھا اور قدرے تشویش سے اس کی پشت کو دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”آنچ نیاز بیگ کی ضمانت ہو گئی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ بلکہ سابو لا نگاہیں اس کے سر کی پشت پر تھیں، جس سے دو پڑھے پھسل گیا تھا اور بھورے گھنگریا لے بال جھلک رہے تھے۔

”اس نے بچ کے سامنے کہا کہ اس نے یہ قتل سیلف ڈیفنیس میں کیا تھا۔ اس نے کہا کہ سعدی اس کو مارنے لگا تھا۔ اس نے...“ ایک اور آنسو آنکھ کے کنارے سے ہٹا۔ ”اس نے ہمارے فخر پر انھکر مسجد کی امامت کروانے والے سعدی کے بارے میں کہا کہ وہ اس سے ڈرگز خریدتا تھا اور یہ بھگڑا ذرگز پر ہوا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس کے چہرے پر ایک خمی تاثر آنھہ رہا۔ قتل سے نکلنے کا سب سے اچھا طریقہ مقتول کی اتنی کردار کشی کرنا ہے کہ بچ کو لگائے مار کر قاتل نے دنیا پر احسان کیا ہے۔ اپنے ہی بتایا تھا کہ مرتل لااء کی کلاس میں۔“

زمر نے آنکھ انگلی کی نوک سے پونچھی اور پہلی تواس کی آنکھیں اور ناک گلابی ہو رہی تھی (اور ناک کی لوگ۔ اس نے نگاہ چراںی۔)

”تم نے کہا تم میرا ساتھ دینا چاہتے ہو۔ میں کیسے یقین کروں کہ تم میرے ساتھ پھر سے کوئی دھوکہ نہیں کرو گے۔“

”زمر!“ اس نے گہری سانس لی اور اسی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”میں وہ نہیں ہوں جس کو اس نے اپنا گرد دیا تھا، نہ میں وہ ہوں جو اس کی یونیورسٹی کی فیس دیتا تھا، مجھے پتہ ہے اس بارے میں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس سے آپ سے کم محبت تھی۔“  
وہ چونکی تھی، آنکھوں میں شاک ابھا۔

”مجھے پتہ ہے، اور نہیں بتاؤں گا کہ کیسے پتہ ہے، مگر یہ یاد رکھیے، کہ وہ میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا۔ اس نے میرے لئے بہت کچھ کیا، اور میں اسے کچھ نہیں بتا سکا کہ اس سے کتنی محبت تھی مجھے۔ آپ کو میں اپنے ساتھ مغلظ نہیں لگتا، خیر ہے، مگر اس کے ساتھ کتنا مخلص ہوں، یا آپ کو پتہ ہے۔“

زمر نے ہلاک سا اثبات میں سر ہلایا۔ لب کھولے پھر بند کر دیے۔ (وہ نہیں بتائے گا، تو وہ کیوں منت کرے؟ ضرور اب اسے بتایا ہو گا۔)

”پھر... کیا چاہتی ہیں آپ؟ میں کیا کروں؟“ آپ کے ذرا زبرد سے پوچھا۔

زمر نے گہری سانس لی۔ (یا اللہ مجھے اتنا صبر دینا کہ میں اپنا ضبط کھوئے بغیر اس شخص کے ساتھ کام کر سکوں جس سے مجھے شدید نفرت ہے۔)

”کیا تم نے شرزاں کے بارے میں سنائے؟“ اس نے فارس کو مخاطب کیا تو آواز متوازن تھی اور بے تاثر۔

اور جب وہ دونوں آنیندہ کالائی عمل طے کر رہے تھے تو ساتھ والے کرے میں ندرت بیٹھ پڑھکی ہاری سورہی تھیں، اور جنین لیٹھی ہوئی، ان کے فون پر سعدی کی تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ماتھے پر کئے بال اب آنکھوں تک آتے تھے۔ باقی تھکیے پکھلے پڑے تھے۔ وہ پہلے سے پُر مردہ اور کمزور لگتی تھی۔

اسکرین پر انگلیاں پھیرتے یکدم غلطی سے واٹی فائی کو چھو لیا۔ شاید سیم نے اس فون سے زمر کے کمرے میں رکھا واٹی فائی پہلے استعمال کیا تھا کہ پاسورڈ پوچھنے بنادہ آن ہو گیا۔ اسی نے یہ اسارت فون چھبے باہ پہلے لیا تھا، وابر کے لئے۔ حنہ تو اسے ہاتھ بھی نہ لگاتی، گراب لگا رہی تھی۔ وابر پر امریکہ سے کسی کزن کا منیج آیا پڑا تھا۔ اس نے کھولا اور پھر واٹی فائی بند کرنے لگی، یا کیا یک ٹھہر گئی۔

”ای نے واٹس ایپ نہیں ڈاؤن لوڈ کیا،“ اندھیر کمرے میں ایک نظر کروٹ لئے سوئی ندرت پر ڈال کر سوچا۔ ”ڈاؤن لوڈ کرنے میں کیا حرج ہے؟ بھائی کی ڈی پی دیکھ لوں گی۔“ اس نے پلے اسٹور آن کیا۔ واٹس ایپ ڈاؤن لوڈ کیا۔ اور پھر فہرست دیکھی۔ سعدی بھائی۔ اس کے اسٹیشن میں لکھا تھا۔ Ants Everafter۔ وہ اداسی سے مسکرائی۔ بھائی کا کی جیجن بھی بھائی کے ساتھ کھو گیا تھا۔ اس نے سعدی کا چوکھتا کھولا۔

### Last Seen 22 May

حمد چونکی۔ بھائی کا حادثہ ایکس میسی کو ہوا۔ مگر اگلے دن بھی کسی کے پاس اس کا فون تھا؟ وہ سوچنے لگی۔ پھر ایک خیال نے ذہن کی رو بھینکا۔ اس نے سیاہ نہرے جگہ تھے ہند سے یاد کیے اور موائل میں لکھے۔ اور ہاشم کاردار کے نام سے محفوظ کیے، پھر نیکیں کی فہرست دیکھی۔ (پتہ نہیں ہاشم بھائی واٹس ایپ پر ہیں یا نہیں؟)

دفعتاً فہرست اوپر کرتا انگوٹھا رکا، آنکھوں میں کچھ چکا۔ ہاشم کاردار۔ ساتھ میں اپنی اور سوئی کی سیلفی۔ وہ ہلاک سامسکرائی۔ کھڑکی کو دیکھا جس کے پار، اور پر قصر تھا۔ ہاشم کا نام دبایا۔ پیغام سیچنے کا صفحہ کھلا۔ اوپر ”آن لائن“، جگہ گارہا تھا۔

مجھے موائل رکھ دینا چاہیے یہ چیزیں میرے لئے نہیں ہیں، ان کے نتائج برے نکلتے ہیں، اس نے خود کو کہا مگر سنایہ نہیں، اور با میں

ہاتھ میں موبائل پکڑے کروٹ کے بل لیئے، دائیں کی انگلی سے ناپ کرنے لگی۔  
”ہاشم بھائی؟“

”کون؟“ چند لمحے بعد جواب چکا۔ بلکی سی تھر تھرا ہٹ ہوئی۔ حنہ نے فوراً اُنی کو دیکھا۔ وہ سورہ تھیں اور موبائل سائنس کر دیا۔  
”حنہ۔ یہ ای کافون ہے۔“

”تھیں؟ ہماری پڑوں نہیں؟“ وہ اسٹڈی نیبل پر بیٹھا، لیپ تاپ اور فائلز کھولے ہوئے کام کر رہا تھا، جب موبائل بجا، سوہہ اور طرف متوجہ ہوا۔ پیغام بھیج کر موبائل رکھا اور پھر سے ناپ کرنے لگا۔

”مشکر ہے آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ کون تھیں؟“  
”کیسی ہوتم؟ تم لوگ آتے ہی نہیں ہو اس طرف۔“  
”رمضان کی وجہ سے روئین بدل گئی ہے۔ افطاری سے پہلے شدید پیاس سے بڑھا، افطاری کے بعد بہت کھا کر بڑھا۔“ اتنے عرصے بعد ناپ کرنے کے باعث تھیں کی رفتارست تھی۔

”یقہ ہے اور سعدی کا کچھ پتہ چلا؟“  
تھہائی میں ڈوبا کرہ اداس ہو گیا۔ موبائل کی روشنی سے چمکتا ہندہ کا چہرہ بھی گیا۔  
”نہیں۔“ ذرا تھہر کر مسیح کیا۔ ”اوے آپ سو جائیں۔ میں نے یونہی آپ کو آن لائن دیکھ کر میکست کر دیا تھا۔“ وہ بردے دل کے ساتھ فون رکھنے لگی۔

”نہیں، میں جا گا ہوا ہوں۔ کل کورٹ جانا ہے۔ اسی کی تیاری کر رہا تھا۔ میں بات کر سکتا ہوں۔ نو پر الیم۔ تم بتاؤ، کیا کرتی رہتی ہے سارا دن؟“ وہ پیغام بھیج کر فون رکھ دیتا اور پھر سے کام کرنے لگ جاتا۔ تکمیل توجہ اور دھیان سے اسکرین پر نظریں جھائے۔

”میں... کچھ بھی نہیں... بس بھائی یاد آتا ہے۔ اور....“ وہ لکھتی گئی۔ باہر رات پھلتی گئی۔ قطرہ قطرہ۔ تار کی بڑھتی گئی۔ اور وہ میکست پر نیکست کرتی گئی۔

وقت اور جگہ کا سارا احساس ختم ہو گیا۔ ہر اگلے پیغام کے انتظار کی بے قراری، اور ہر پیغام پڑھتے وقت لبوں پر مسکرا ہٹ۔ کیونکہ ابھی دنیا میں وہ خوشیدہ ہی نہیں کی گئی جس کا نشہ آدمی رات کو کسی ناخشم سے موبائل پر بات کرنے سے زیادہ ہو۔

سحری کے قریب اس نے لکھا۔ ”اب سو جاؤ۔ پچھے صبح کورٹ جانا ہے۔“

”اوے گذ ناٹ!“ مسکرا کر اس نے لکھا، پھر ساری گفتگو کو منثانے کا بٹن دبایا۔ پھر ہلکا سا چوکی۔ (منثانے کی کیا ضرورت؟ ہاشم بھائی ہی ہیں۔ ان سے بات کرنے میں غلط کیا ہے؟) مگر جب والش ایپ نے پوچھا کہ واقعی سب منثانے ہے تو اس نے لیں کا بٹن دبادیا۔ پھر فون رکھا اور آنکھیں بند کیں تو سعدی ایک دفعہ پھر سے یاد آگیا۔ کرب بڑھ گیا اور اس میں اب ایک اور کرب بھی شامل ہو گیا۔

❖❖❖

اس کے نزدیک غمِ ترک وفا کچھ بھی نہیں۔ مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں  
شام بارش کے باعث پہلے سے ٹھنڈی اور خوشنگواری اتر رہی تھی۔ ہاشم نے قصر کا داخلی دروازہ کھولا تو اندر کا منظر نمایاں ہوا۔ اوپرے اور وسیع لاون ٹنگ میں بڑے صوفے پر جواہرات تمکنت سے بیٹھی تھی۔ کہنی صوفے کے ہتھ پر جمائے وہ چائے کی نازک پیالی سے گھونٹ بھرتی۔ مسکراتی نظرؤں سے سامنے بیٹھی شہرین کو دیکھ رہی تھی جو اس سے قطعاً بے نیاز، سو نیا کے بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ ساتھ میں چیونگ بھی چبا رہی تھی۔

آفس سے تھکے ہارے آئے ہام نے ایک مشتر کے سلام کیا، اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

”سوئی اپنے بابا کو بتا دو، کہ آج سونی ماما کے ساتھ جا رہی ہے اور دون بعد آئے گی۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ کہ سونی کتنی خوش ہے ان سارے پلائز پر جو مانے سونی کے لئے بنائے ہیں۔“ آخری پن لگا کراس نے سونی کے زم بالوں میں برٹش پھیرتے اوپر چاسا کہا۔ تو سونی خوش خوشی اٹھی اور بھاگتی ہوئی ہاشم کی نالگوں سے لپٹ گئی۔

”بابا.... سونی ماما کے ساتھ جا رہی ہے۔ اور پتہ ہے مانا نے....“ آگے اس نے جوش میں وہ چند فقرے دہرائے جو شہرین کی ڈھائی

گھنٹے کی محنت کا نتیجہ تھے۔

ہاشم نے مسکرا کر اس کا گال تھیچایا، اور پھر ایک تیز سنجیدہ نظر اس پر ڈالی جواب ناگ پٹاگ پٹھارے بیٹھی جاتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاشم سونیا کو انکار نہیں کر سکتا، اسے معلوم تھا۔

”شیور۔ انجوائے کرو۔“ جھک کر اس کا گال چو ما اور سیدھے ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا اور پھر ایک قہر آلو نظر شہری پر ڈال کر اوپر کی جانب قدم اٹھادیے۔ شہری نے فاتحانہ مسکراہٹ جواہرات کی طرف اچھائی جو عادتاً مسکراتے ہوئے چائے پی رہی تھی۔

”پتہ نہیں کیوں لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ شہری کو ہرا سکتے ہیں۔“ انگلی سے سنبھری بال نزاکت سے پیچھے کرتے وہ بولی۔ ساتھ ہی دور کھڑی فیجھ ناکا اشارہ کیا۔ وہ آئی اور سونی کو تیار کرنے ساتھ لے گئی۔

”صرف وہی ایسا سمجھتے ہیں جو شہری کوئی دفعہ ہر اپنے ہوں۔“ جواہرات نے شانے اچکائے۔

تبھی دروازہ پھر سے کھلا اور موبائل کے مٹن دباتا، الجھا ہو نو شیر و اس اندر داخل ہوا۔ وہ ویسٹ اور نائی میں ملبوس تھا، اور پیچھے ملازم اس کا بربیف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ میقیناً وہ ہاشم کے ساتھ آفس سے آ رہا تھا۔

ماں کو سلام کرتے ذرا کی ذرائع اٹھائی تو نہ ہبرا۔ شہری سامنے بیٹھی تھی ابر و بھینچ کر جواہرات کو دیکھتی، کسی تابر توڑ جملے کے لئے تیار۔

”اوہ ہائے!“ نو شیر و اس ہلکا سماں کرایا۔ جواہرات نے پوری گرد گھما کر اس کی مسکراہٹ دیکھتی۔

”ہیلو!“ شہری کا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔ بد مرہ سی اٹھی اور سونی کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ حیران ہوا۔ وہ مزی، تیکی نظر وہیں سے اسے دیکھا۔ ”اپنی بیٹی کے لئے آئی تھی، اس کو لینے جا رہی ہوں، ورنہ مجھے قطعاً کوئی خواہ نہیں اس گھر میں بار بار آنے کی۔“ تتنے ابو کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ ہاتھ میں موبائل جوں کا توں اٹھا کر کھا تھا۔ جواہرات کی مسکراہٹ، شدید ناپسندیدگی میں بدلتی گئی۔ اور شیر و گوھر تے اس نے تاسف سے سر جھکنا۔

”وہ صحیح کہہ رہی ہے، اس گھر میں ذرا دیر بیٹھی ہے، ورنہ آتے ساتھ ہی سونی کو لے کر زمر کے پاس چلی گئی، سعدی کا افسوس کرنے! جاؤ، تم فریش ہو گو۔“

نو شیر و اس کا دل جیسے اچاٹ ہو گیا۔ وہ برہمی سے زینے چڑھنے لگا۔

.....❖❖❖.....

دنیا تو ایک برف کی سل سے سوا نہ تھی ..... پہنچی ذرا جو آنچ تو دنیا تمام شد!

اس شام، جب دفاتر میں لوگ اپنے کام جلد از جلد نپاتتے، گھر جانے کی تیاری میں تھے کہ پانچ بجھے میں ذرا سی دیر ہی باقی تھی، ایسے میں اس عمارت کے اندر ایک چھوٹے آفس کے سامنے لاونچ نما کمرے میں فارس کھڑا تھا۔ اس نے نیلی کف والی شرت اور سر پر پی کیپ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر گلائز تھے، اور کیپ کو چہرے پر خاصا جھکا رکھا تھا۔ ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ لئے (جو اوپر سے شفاف

پاٹنک میں پیک تھے) وہ پیون کو سیدنکال کر دے رہا تھا۔

”ایمنہ صاحبہ کے لئے ہیں، ان سے دستخط کروالائیے۔“ آفس کے بندرووازے کی طرف اشارہ کیا تو پیون سر بلکر، گلدستہ احتیاط سے پکڑے اندر چلا گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا رہ گیا۔ فارس نے ٹکھیوں سے جھری سے دیکھا۔ اندر آفس میں میز کے پیچے ایک نارجی ڈائی بالوں والی لڑکی نما عورت بیٹھی تھی اور پیون اس کی میز پر گلدستہ رکھ رہا تھا۔

”کس نے بھیجے ہیں؟“

”نام نہیں بتایا۔ بس اتنا بولا کہ نیاز بیگ کے کسی پولیس والے دوست نے بھیجے ہیں اپنی ترقی کی خوشی میں جو آپ کی وجہ سے ہو رہی ہے۔“ وہ رخ موڑے کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ پیون نکل آیا۔ رسیدا سے لا کر دی جسے اس نے رجسٹر میں لگایا تبھی رجسٹر ہاتھ سے پھسلا اور سارے کاغذ کھر گئے۔ رسیدا، پرچیاں، فوٹو اسٹیٹ کا نہ۔

”معاف کرنا!“ وہ بچوں کے مل زمین پر بیجا کاغذ سمیٹنے لگا۔ آہستہ آہستہ۔ کیپ والا سر جھکائے۔ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا۔ پیون کھمی اندر آ رہا تھا، کبھی باہر جا رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے پرچیاں اٹھاتا اور رجسٹر میں لگاتا رہا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ اور ٹکھیوں سے پیون کو دیکھا۔ وہ اپرے لے کر راہداری کی طرف جا رہا تھا۔ ادھر وہ نکلا، ادھر فارس تیزی سے اٹھا اور آفس کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔

میز پر سر نکائے، ڈائی بالوں والی عورت آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ ساتھ ہی گلدستہ کھلا ہوا پڑا تھا اور اس سے عجب مہک انھر رہی تھی۔ ناک بند کر کے وہ تیری سے قریب آیا، گلوٹ دے ہاتھوں سے اسے واپس ریپ کیا۔ پھر لینڈ لائن فون کا تارکاٹا۔ انٹر کام کا تارکاٹا۔ کمپیوٹر کی تار کو مقطع کیا۔ ایمنہ کا پرس کھنگالا۔ اندر سے چاہیاں نکالیں۔ پھر میز پر کھامو بائل جیب میں ڈالا اور دروازے تک آیا۔ جھری سے باہر دیکھا، پیون ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اس نے جلدی سے تی، پنچھا سب بند کیے۔ باہر نکلا۔ دروازہ لاک کیا۔ باہر لگا ”اوپن“ کا رد پلانا کر ”کلوڈ“ سامنے لایا۔ اور پھر، حسیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے، وہ آگے چلتا گیا۔

پھر شام گھری ہو گئی، افطار کے قریب لوگ سٹ کر گھروں کے اندر چلے گئے تو شہر قدرے سنسان لگنے لگا۔ مغرب باسی ہوئی اور رات اترنے لگی۔

ایسے میں ایک بڑے اور مہنگے پرائیوٹ ہسپتال کے باہر کھلے پارکنگ ایریا کے ایک کونے میں ایک کار گھڑی دکھائی دیتی تھی اور ڈرائیور ٹک سیٹ پر فارس، پی کیپ پہنے بیٹھا نظر آتا تھا۔ چیونگ چباتے ہوئے وہ آنکھیں سکیز کر، ہسپتال کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں یہ ورنی استقبالی سے ہٹ کر بہر ایک اندر ہیر کونے میں اسے زمر دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں سے وہ نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اگر قریب جا کر دیکھو تو وہ اس دیران کو نہیں میں ایک نر کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نر نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتے ایک پیکت زمر کی طرف بڑھایا۔

”سب کچھ پورا ہے؟“ زمر نے سر گوشی میں پوچھا۔ نر نے جھٹ سرا ثابت میں ہلایا۔

”اوکے... وہ ابھی آئے گا، آگے تم جانتی ہو تو تمہیں کیا کرنا ہے۔“ کہنے کے ساتھ پرس سے ایک بند خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ نر نے فوراً ہاتھ اٹھائے۔ ”نمیں، نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کے مجھ پر احسان ہیں۔“

”رکھلو۔ میں خوشی سے دے رہی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر زبردستی پیکت تھا دیا۔ نر نے شرم مند ہوتے ہوئے اسے رکھ لیا۔ تبھی فارس کو وہ واپس آتی دکھائی دی۔ اس نے نیلی قیص پہن رکھی تھی اور سیاہ دوپٹہ سر پر تھا۔ وہ سر جھکائے متناسب چال چلتی اس طرف آ رہی تھی۔ فارس نے ہاتھ بڑھا کر فرنٹ سیٹ کا لاک کھولوا۔

”آدھا کام ہو گیا۔“ اندر بیٹھتے ہوئے زمر نے عام سے انداز میں اطلاع دی اور پیکت ڈیش بورڈ پر رکھا۔ فارس نے ایک نظر اس پر

ڈالی۔ وہ سر سے دو پڑے اتار کر اب گھنگریا لے بالوں کو گول مول پیٹ کر جوڑا بنا رہی تھی۔ وہ سامنے دیکھنے لگا۔

”اب؟“

”وہ آجائے پھر فون کرتے ہیں۔“ اس نے متلاشی نظروں سے دور ہسپتال کے بیرونی دروازوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ آچکا ہے۔ جب آپ گئیں تب ہی آگیا تھا۔“ کہنے کے ساتھ اس نے اینہے کاموبائل زمر کی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے رومال میں پیٹ کر کپڑا۔ کال وہ ملاچکا تھا کیونکہ اس کے ہاتھوں پر گلوز چڑھے تھے۔ پلاسٹک کے شفاف پتلے گلوز۔ زمر نے کان سے موبائل لگایا۔ ایک رومال منہ کے قریب فون پر رکھا۔ گھنٹی کے بعد مردانہ آواز ابھری۔

”ہاں اینہے!“

”میں ہسپتال سے بات کر رہی ہوں، یہاں ایک بی بی کو لایا گیا ہے، نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی ہے اس نے۔ اینہے نام ہے اس کا۔“ وہ پختون بجھ میں روانی سے بول رہی تھی (اور وہ ہلکا سامسکرایا۔ وہ۔ پڑیل اداکاری بھی کرتی ہے۔) ”اس کے فون پر آپ کا آخری نمبر ڈائل کیا گیا تھا۔“

”کیا؟ کون سے ہسپتال سے؟“ دوسری طرف الجھن اور پریشانی در آئی۔ زمر نے جلدی جلدی نام اور پتہ بتایا۔ ”پدرہ بیس منٹ بعد پولیس آجائے گا، اگر تم نے آنا ہے صاحب تو جلدی آؤ۔“

”پولیس سے کچھ نہیں کہتا۔“ میں آرہا ہوں بس۔ اور۔ ”مگر زمر نے سننے بغیر کال کاٹ دی۔

”یہ بج کہاں سے سیکھا آپ نے؟“ مسکراہٹ چھپائے اس کو دیکھ کر پوچھا تو زمر فون ڈیش بورڈ پر دھرتے ہوئے اسی بے تاثر انداز میں بولی۔

”آریو شیور وہ اینہے سے یہاں آنے سے پہلے رابطہ نہیں کر سکے گا۔“

فارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ”جبی۔“

زمر نے ایک اچھتی نظر اس پڑا۔ ”کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟“

اس نے چہرہ موڑ کر زمر کو دیکھا۔ ”گلا گھونٹ کر سیکھے سے لے کا دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ خود کشی ہے۔“  
وہ اکتا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

رات باہر قطرہ قطرہ بہتی رہی۔ کار کے اندر خاموشی چھائی رہی۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ دھنٹاً وہ سیدھا ہوا۔

”وہ نیاز بیگ!“ زمر نے بھی اسی طرف دیکھا۔ شلوار سوت میں ملبوس نیاز بیگ ہسپتال کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ فارس نے گردن گھمائی۔ ”اس کی کار قریب میں ہی کہیں ہو گئی جلدی میں لگ رہا ہے۔“ لاکھولتے ہوئے اس نے ڈیش بورڈ سے پیکٹ اٹھایا اور دروازہ کھوالا۔ زمر نے قدرے بے چینی سے اسے دیکھا۔

”دھیان سے! ہلکا سا بولی۔ وہ چونکا اس کی آنکھوں کو دیکھا اور ہلکا سامسکرایا۔

”میں نہیں چاہتی تمہاری لاپرواہی سے کوئی گڑ بڑھو۔“ وہ وضاحت دے کر رخ موڑ گئی۔ اس کی مسکراہٹ پھیلی پڑی۔ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

اندر استقبالیہ تک نیاز بیگ تیز قدم اٹھاتے پہنچا۔ وہ نیز کاؤنٹر کے پیچھے دو تین افراد کے ہمراہ کھڑی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر فوراً

اس طرف متوجہ ہوئی۔ ”جبی؟“ وہ اسکے مخاطب کرنے پر ہیں رکا۔

”ہاں وہ... اینہے نامی خاتون کو لایا گیا ہے، مجھے فون آیا تھا، اور...“

”پرائیوٹ روم“ بھئے نمبر میں ہے وہ۔ آپ یہاں سے سیدھا جا کر دائیں مڑکر...“ وہ عجلت میں رستہ سمجھاتی گئی۔ وہ سنجیدگی اور تدرے اضطراب سے سرہلا تے، آگے بڑھ گیا۔

چند راہداریاں عبور کر کے کمروں کے نمبر پر ڈھتا، وہ مطلوبہ کمرے کے قریب آیا۔ باہر دو پولیس الہکار کھڑے تھے۔ نیاز بیگ کی تیوری چڑھی۔ وہ دروازے کے نزد بیگ جانے لگا تو ایک سپاہی نے راستہ روکا۔

”کیا کام ہے؟“

”اندر میرا مریض ہے۔ اسے دیکھ لوں، پھر تم سے بات کرتا ہوں۔“ وہ تدرے اکھڑے لجھ میں کہہ کر آگے بڑھنے لگا، مگر سپاہیوں نے پھر سے روک دیا۔

”اجازت نہیں ہے۔ مریض سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟“

اس سے پہلے کہ وہ غصے سے کچھ جواب دیتا، دروازہ کھلا۔ نیاز بیگ کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ اے ایس پی سرمساہ، عام پیٹ شرٹ میں ملبوس، باہر نکل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چونکا۔

”نیاز بیگ۔ تم ادھر کیسے؟“ تجуб سے آنکھیں سکینہ کرائے دیکھتے، اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔

”یہ تمہارے تھانے کی حدود تو نہیں ہے اے ایس پی...“ وہ بھی ذرا حیران ہوا۔ ”خیر میری پیچان کی ایک عورت... (آنکھ سے اشارہ کیا) ادھر ایڈھت ہے۔“

سرمساہ کا برو بے اختیار اٹھا۔ ”ادھر؟ اس کمرے میں؟“

”ہاں۔ دیکھوا سے پولیس کیس مت بناؤ، یا اتنا کوئی بڑا معاملہ...“

”تم شزا کو کیسے جانتے ہو؟“ سرمساہ نے تیزی سے بات کاٹی۔ اس کی متوجب لگا ہیں نیاز بیگ پہ جھی تھیں۔

”کون شزا؟“ وہ ٹھہرا۔

”آئی جی صاحب کی بیٹی اور میری کزن شزا ملک، جوری پ اور ثار چر کے بعد پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کوما میں ہے۔ بتاؤ، کیسے جانتے ہو اسے؟“ سرمساہ کی لگا ہوں کا تعجب اب کھو جتے تاڑ میں بدلتا ہوا تھا۔ ایکدم نیاز بیگ کو کسی انہوں کا احساس ہوا۔

”نہیں، شزا کون؟ میں تو نہیں جانتا کسی شزا کو۔ میں تو ادھر ایمنہ کے لئے آیا تھا۔ وہ میری ایک عزیزی ہے۔“ پھر کرہ نمبر دیکھا۔

”شاید غلط کمرہ نمبر بتا دیا انہوں نے۔ میں پوچھتا ہوں دوبارہ۔ اور... افسوس ہوا تمہاری کزن کاسن کر۔“ غلط وقت پہ غلط جگہ پہ ہونے کا احساس ہوتے ہی وہ عجلت میں کہتا اس کا کندھا پھٹپھاتا، جیب سے موبائل نکال کر مڑا۔

سرمساہ آنکھیں سکینہ کرائے جاتے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک نظر اپنے ایس آئی پڑا، وہ بھی انہی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سرمساہ اس کے پیچھے لپکا۔ پیچھے کمرے کے دروازے کی ہلکی درز کھلی تھی جس سے بیڈ پلیٹی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ ہوش و خرد سے بے کانا۔ آسیجن ماسک لگا تھا۔ بہت سی دوسری نالیاں بھی۔ اس کے بال بھورے سنہرے سے تھے اور کان کے قریب ان میں تلی کی شکل کا گونوں والا کلپ لگا تھا۔

”کیا نام بتایا تم نے اپنی عزیزی کا؟“ راہداری کے آخر میں اس نے نیاز بیگ کو جالیا۔ جو موبائل نمبر ملا کر کان سے لگائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پہ بچھن تھی۔ سرمساہ کے پکارنے پر چونک کر گردن گھمائی۔

”ہاں وہ ایمنہ ہے، میری جانے والی۔ ہبتال والوں نے ابھی فون کر کے بتایا۔ میں پوچھتا ہوں ابھی۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو اے ایس پی؟“

وہ ذرا اکتایا۔ ”بھی میں نہیں جانتا تمہاری کرزن کو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہاری عزیزہ کی عیادت کرلوں۔“ اس نے ابرو سے اسے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ تیز جا چختی لگا ہیں بار بار نیاز بیگ پڑتا تھا۔ وہ اندر کو فوت کا شکار وہ پریشان ہونے لگا، مگر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ واپس استقبالیہ کا ونڈ تک آپنچے۔

”اوہ بی بی، کس کمرے میں بھیج دیا تم نے مجھے؟“ وہ بگر کر کہتا اسی نرس سے مخاطب ہوا۔ ”وہ تو کسی شزادی بی کا کمرہ ہے۔“

”سر آپ نے شزادک کے کمرے کا ہی پوچھا تھا، تبھی میں نے روم نمبر سکس بولا۔“ وہ سادگی سے گویا ہوئی۔ سرمد شاہ نے پوری گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں نے اینہا اتیاز کا پوچھا تھا۔“ تم لوگوں نے مجھے کاں کر کے بلا یا ہے۔“ ساتھ ہی جیران پریشان نگاہ اے ایس پی پڑا۔ جوبس چپ چاپ اسے گھورا رہا تھا۔

”سوری سر مجھے شزادک سنائی دیا تھا۔“

”اینہا اتیاز۔“ وہ جھک کر پیک کرنے لگی۔ ”یہاں تو کوئی اینہا اتیاز نہیں لائی گئی۔ نہ ہم نے اس سلسلے میں کسی کو کاں کی ہے۔“

”کیا بکواس ہے۔ تم لوگوں نے مجھے ابھی کاں کی خود مجھے بلا یا خود کشی کا کیس تھا۔“ غصے سے لال پیلے ہوتے اس کے ماتھے پہ پسینہ آ رہا تھا۔

”سریہ سارے فونز آپ کے سامنے رکھے ہیں، آپ کاں ریکارڈز چیک کر لیں۔ ہمارے پاس کوئی اینہا اتیاز نہیں لائی گئی۔ آپ نے خود ابھی شزادک کا پوچھا تھا مجھ سے۔“ وہ روہاںی ہو گئی۔

”تمہیں کس نمبر سے فون آیا؟“ وہ جو چپ کھڑا تھا، تھہرے ہوئے لبھ میں بولا۔ نیاز بیگ نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔

”اینہ کے موبائل سے فون آیا تھا۔“ وہ واپس اسے کاں بیک کرنے لگا۔

”گھنٹی جا رہی ہے، کوئی اٹھا نہیں رہا۔ میں اس کے گھرد بیکھتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ!“ ماتھے کو جھوکر عجلت میں اسے سلام کیا اور باہر کی طرف بڑھا۔ ایس آئی نے بے اختیار سرمد شاہ کو دیکھا۔ وہ سوچتی نظروں سے نیاز بیگ کو باہر نکلتے دیکھ رہا تھا۔

”نیاز بیگ کی کارکون سی ہے امجد حسین؟“ اس نے سوچ میں ڈوبے پکارا۔

”سرہمیشہ نیلے رنگ کی نسان میں دیکھا ہے اسے۔“

”اور اس دن ہمیں جو گناہم پر موصول ہوئی تھی یاد ہے؟ فون کرنے والی عینی شاہد نے کہا تھا کہ اس نے ایک آدمی کو شزادا کو کارک ڈگی سے نکال کر سڑک پر چینکتے دیکھا تھا۔ کون سی کارروائی تھی اس نے؟“

”نیلی نسان۔ مگر سرثی پر جھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ خود متذبذب تھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ سرمد شاہ کے چہرے پر بے پناہ تھی درآئی۔ وہ باہر نکلا۔ ایس آئی فوراً چیچھے پکا کر دور کاڑیوں کی قطار کی طرف نیاز بیگ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی موبائل پر مسلسل نمبر ملار ہا تھا۔ جب تک وہ دونوں اس تک پہنچے وہ نیلی نسان سے چند قدم دور تھے۔

”تمہاری اینہ نے فون نہیں اٹھایا؟“ خشک انداز میں اس نے پوچھا تو وہ چونک کر گھوما۔ چہرے پر دباد باغصہ در آیا۔

”اے ایس پی، میں پریشان ہوں اس نامم! اینہ گھر بھی نہیں پہنچی اور فون بھی نہیں اٹھا رہی، کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔“ وہ ذرا جھنجھلا یا ہوا ذرا متفکر کہ رہا تھا جب ایس آئی نے آواز دی۔ ”سر!“

سرمد شاہ نے اس طرف دیکھا۔ وہ چند قدم دور نیلی نسان کے ساتھ کھڑا ان کو بلار ہا تھا۔ نیاز بیگ فون کاں سے لگائے جھلا کر بولے

جار ہاتھا، مگر سردم شاہ نے بغیر آگے آیا۔

نیاز بیگ کی کار کے ڈیش بورڈ پر ایک موبائل ٹھہرا تا ہوا جل بجھ رہا تھا۔ اندر ہیرے میں اس کی روشنی و ندا سکرین پر عکس بنارہی تھی۔

عکس پر نیاز بیگ کا نام اور نمبر لکھا آرہا تھا۔ سردم شاہ نے تیز نظروں سے اسے گھورا جو روشنی دیکھ کر اسی طرف آیا تھا۔

”تمہاری ایمنہ شاید اپنا فون تمہاری کار میں بھول گئی۔“

وہ حیران پریشان ساقریب آیا۔ موبائل دیکھ کر اس کے چہرے پر شاک در آیا۔ تیزی سے کار کھولی اور موبائل نکال کر چہرے کے سامنے کیا۔ وہ ایمنہ کاہی موبائل تھا۔ اس نے الجھن بھری زگا ہیں اٹھائیں تو اسے اس پر تیکھی نظروں سے اسے گھورا جا تھا۔

”یہا دھر کیسے....؟“ وہ بھی ڈیش بورڈ کو دیکھتا، بھی موبائل کو۔

”امجد حسین، ذرا گاڑی کی تلاشی لو۔ شاید ایمنہ بی بی بھی مل جائے۔“ اے ایس پی نے تحکم سے ایس آئی کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا

تھا نیاز بیگ کی پریشانی پر منظر میں چل گئی اور ابروتن گئے۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے گھر جاتا ہوں۔“ ہاتھ جھلا کر قدرے کھر درے انداز میں کہتے ایس آئی کو روکا۔ ایس آئی

نے اے ایس پی کو دیکھا۔ وہ آگے گئے ہوا اور نیاز بیگ کی آنکھوں میں دیکھتے تھم سے بولا۔ ”نیاز بیگ، اس وقت مجھے غصہ دلا کر مجھے اپنا دشمن مت نہا۔ میں نے بڑے موقعوں پر تمہارا ساتھ دیا ہے، اس لئے چپ چاپ یہاں کھڑے رہو۔“ پھر امجد حسین کو اشارہ کیا۔ ”گاڑی کھلو۔“

چند لمحوں بعد تین چار مزید اہلکار وہاں کھڑے تھے ایس آئی نارچ سے اندر روشنی مارتا کار کی میٹیں خانے کلوز کمپارٹمنٹ چیک کر رہا

تھا۔ اے ایس پی سردم شاہ کمر پہ ہاتھ باندھے، پھر یہ تاثرات کے ساتھ یہ کار روائی دیکھ رہا تھا اور نیاز بیگ تملاتا ہوا ساکھرا تھا۔

”یتم اچھا نہیں کر رہے۔“ ایک سلکتی نظر سردم شاہ پر ڈال کر ہلاکا سابو لا۔ سردم شاہ خاموش رہا۔ ایس آئی اب ڈیگی کھوں رہا تھا۔

”میں پہلے مصیبت میں ہوں، اور سے تم کسی مشتبہ کی طرح میرے ساتھ بتاؤ کر رہے ہو۔ میں یہ بے عنقی بھولوں گا نہیں۔“

”سر!“ ایک دم ایس آئی سیدھا ہوا، اس کے چہرے پر کوئی ایسا ہاکا تاثراتھا کہ سردم شاہ فوراً ڈیگی کی طرف آیا۔

”یہ دیکھئے۔“ اس نے نارچ کی روشنی ڈگی کے ایک کونے میں مار دی۔ سردم شاہ نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس کی

اے میں پھٹسی گئیں۔

وہاں ایک جگہ تا ہوتلی کی صورت کا، تین اچھے چوڑا، ہمیر کلپ گرا تھا۔ اس میں چند ہلکے بھورے بال بھی اڑے تھے (اور چند بال لامٹے فالے پڑگی میں بکھرے بھی تھے جو بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے)۔ تلی کے چند بگ جگنگا رہے تھے، اور باقی ٹگوں کو سوکھے خون کے ایموں نے ماند کر رکھا تھا۔ شرزا کا خون۔

سردم شاہ کی آنکھوں میں سرخی ابھری۔ وہ تیوارا کر اس کی طرف گھوما۔

”نیاز بیگ اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لو۔ رفیع محمد اسے ہتھڑی لگاؤ۔“ وہ غرایا تھا۔

”کیا بکوا....“ نیاز بیگ کی ساری جھلاہٹ ہوا ہوئی، وہ حیران پریشان سا آگے ہوا مگر ایس آئی کو تلی نما کلپ اٹھا کر پلاسٹک بیگ

میں الاتے دیکھ کر اس کا چہرہ فتح ہوا۔

”اوہ یہ میری انہیں ہے.... یہ میری گاڑی میں کہاں سے۔ اوہ میری بات سنو۔“

سردم شاہ نے پوری قوت سے اس کے منہ پر گھوسنامارا۔ وہ ایک دم تیوارا کر پیچھے کو گرا، مگر گرنے سے پہلے سردم شاہ نے گریبان سے

مٹنے کرائے اٹھایا، اور اس کا خون وہ رستا چھرہ قریب کیا۔

”میں نے تمہیں کتنے کیس سے نکالا، کیا اس لئے کہ تم میرے خاندان کی لڑکی کے ساتھ ایسا کرو گے؟ تم (گالی) گھنیا انسان! وہ

میری بہنوں جیسی تھی۔ ”شاکر سے نیاز بیگ کو جھٹکے سے چھوڑا۔ ایک الہکار نے اس کے ہاتھ موز کر پیچھے باندھے۔ وہ نفی میں سرہلانے لگا۔ ”نہیں نہیں، یہ کوئی گز بڑا ہے، مجھے اس میں پھنسایا جا رہا ہے، میں نہیں جانتا تمہاری بہن کو۔ میری بات سنو!“ وہ دو الہکاروں کی آنی گرفت میں پھر پھر اتا چلا رہا تھا۔

”آئی جی صاحب کوفون لگاؤ اور بولو... تھانے آجائیں۔“ سرمد شاہ سرخ چہرے کے ساتھ ایس آئی کو کہہ رہا تھا۔ اور دور سڑک کے اس پار کر کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی زمر گھنگریاں لٹ انگلی پر پیشی وہ منظر دیکھ رہی تھی۔ آواز سنائی نہ دیتی مگر وہ ایک منظر سواؤ اوازوں پر بھاری تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا، مگر آنکھوں میں سردی پیش بھی تھی۔ فارس نے گہری سانس لی، اور کافی ریلیکسڈ سے انداز میں سیٹ کی پشت سے بیک لگائی۔

”آر یوشیور۔ اے ایس پی کو اصل معاملہ سمجھنہیں آئے گا؟“

”میں اسے جانتی ہوں، کام کیا ہے اس کے ساتھ۔ اگر اس میں اتنی عقل ہوتی تو چار سال سے اسے ایس پی نہ ہوتا، سال ڈیڑھ پہلے ایس پی بن چکا ہوتا۔ یہ اس کے گھر کا معاملہ ہے۔ اس کی جج منٹ کو غیرت ڈھانپ دے گی۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی کہہ رہی تھی۔

”مگر اس کی جلد ہی ترقی ہونے والی ہے۔“

”اس کی ترقی کا انحصار اسی کیس پر ہے۔ اس کو شرا کا مجرم مل گیا، یعنی اس کو ترتی مل گئی۔“ زمر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ دور نیاز بیگ سپاہیوں کی گرفت میں پھر پھر اتا، مسلسل چلا رہا تھا۔

”اب دیکھو، کون لڑکیوں کی طرح جیخ رہا ہے۔“ وہ اسی منظر کو دیکھتے بولی تو لمحے میں نبی ہی تھی اور آنچ بھی۔ فارس نے بیک لگائے، گردن اس کی طرف موزی۔

”کل جب ایمنہ اس سے لاک اپ میں ملے گی تو اس کی بات کن کر نیاز بیگ کو بھی لگے گا کہ اسے پولیس نے پھنسایا ہے اس کیس میں۔ ہمارے دشمن ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہوں گے اور اس دفعہ ہم ان کا تماشہ دیکھیں گے۔“ وہ رکا۔ ”مگر شزا۔۔۔؟“ زمر نے گہری سانس لی۔ ”اس کے مجرم یقیناً چالاک لوگ ہیں، ان کو کبھی نہیں ملیں گے۔ وہ بیچاری پنج شاید چند دن زندہ رہ پائے۔ مگر وہ کبھی ہوش میں آئے گی، نہ کسی کو کچھ بتا پائے گی۔“ وہ بھی تک پولیس موبائل کو دیکھ رہی تھی جس میں اب وہ چیختے چلا تے نیاز بیگ کو لا رہے تھے۔

”وہ کلپ جو میں نے اس کی ڈگی میں رکھا ہے، کیا اس کے خاندان والے پچانیں گے نہیں کہ گوکہ وہ شزا کے کلپ کے جیسا ہی ہے۔ مگر اس کا نہیں ہے۔ کیا معلوم شزا کے پاس صرف ایک ہی کلپ ہو۔“

”اوہ ہوں۔ وہ ڈیائز کلپ ہے، اور اس کے جیسا کلپ جو میں نے خریدا تھا، وہ اس وقت شزا کے بالوں میں لگا ہے۔ جس کلپ پر اس کا بلڈ اور بال لگا کر سڑنے مجھے دیتھے، وہ شزا کا اصلی کلپ ہے۔ وہ اسے فارنزک بھیجن گے، ہر طرح سے چیک کریں گے۔ مگر شزا کے بالوں میں لگا کلپ کوئی نہیں چیک کرے گا۔“ سرسری سابتارہی تھی۔

”اوہ۔“ وہ چپ ہو گیا۔ پولیس موبائل اب دور جا رہی تھی۔

”زمر نے گردن موز کر اسے دیکھا، پھر کچھ کہتے ہے چپ ہوئی۔ پھر سامنے دیکھنے لگی۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر ہلکا سا بولی۔“ ”گذ جا ب، فارس!“ اس کے لمحے میں نرمی تھی، مگر وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ ذرا سامکراتے ہوئے کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

”پلان آپ کا تھا۔ گذ جا ب نہیں کوئی طرح رومندا تھا۔ یہ سعدی یوسف کو بچانے کا واحد طریقہ تھا۔“

”بیاؤں گی۔ جب ضرورت پڑی تو؟“ وہ پھر سے ویسی ہی روکھی ہو گئی۔ مگر ایک تبدیلی آئی تھی۔ کم از کم وہ بات تو کرنے لگئے تھے۔

اہمی وہ رستے میں تھے کہ زمر کا موبائل بجا۔ ڈاکٹر سارہ غازی۔

”جی ڈاکٹر سارہ۔“ اس نے مصروف سے انداز میں فون کان سے لگایا۔

”کچھ پتہ چلا سعدی کا زمر؟“ وہ فکر مندی سے بولی۔

”کہاں سارہ؟ آپ بس دعا کریں۔ اچھا میرا کام ہوا؟“

”جی میں نے پتہ کیا تھا۔ نیکام میں کوئی حلیمہ کام نہیں کرتی۔ ایک حلیمہ سرفراز ہے مگر وہ انجینئر ہے سیکرٹری نہیں۔“ زمر نے تکان اٹھیں مجھ لیں۔

”نہیں وہ حلیمہ ہی تھی۔ خیر تھیں یو۔ واپس آ کر چکر لگائیے گا۔ بچ آپ کو مس کرتے ہیں۔“

”جی، میں بس قہر میں پھنسی ہوں اتنے دن سے۔ سعدی کی پریشانی الگ، جیسے ہی آئی، چکر لگاؤں گی۔“ زمر نے فون رکھ دیا اور ۱۰۰۰ روپے طرف۔

وسری طرف، اپنے بیڈروم میں کھڑی سارہ نے بھی موبائل رکھ دیا۔ اور جیسے ہی وہ پہنچی، ذکر یہ بیکم پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

اہوں نے ایک تاسف بھری نظر سارہ پہنچا۔ جو سادہ شلوار قمیص میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر چوکی۔

”کیوں ان کو ادا نہ کر رہی ہو؟ تم پچھلے ایک میئنے سے جب سے سعدی کھویا ہے، یہیں اس گھر میں قید ہو۔ پھر بار بار جھوٹ اہوں؟“

سارہ کی سبز نیلی آنکھوں میں نبی در آئی۔ ”میں ان لوگوں سے نہیں ملتا چاہتی۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ملی تو وہ جان لیں گے۔“

”کیا جان لیں گے؟“ وہ ذرا حیران ہوئی۔ سارہ کے آنسو بہنے لگے۔

”ای! اس رات سعدی کے ساتھ اس گھر میں میں تھی۔ اسی میں نے اپنے سامنے اسے گولیاں لگتے دیکھا ہے۔ اسی میں ہوں وہ گواہ لے اہ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔“



## باب 13:

”من الماس رابہ ملکہ دادم!“  
 (میں نے پیش کیا ملکہ کو ایک ہیرا!)

وہ سورا ہوتے ہیں  
 جو چینتے ہیں گوٹ!  
 مگر وہ قست ہوتی ہے  
 جو شطرنج کھیلتی ہے!  
 اور تم بہت دیر سے جان پاتے ہو  
 کہ وہ کون تھا جو آغاز سے ہی  
 کھیل رہا تھا دونوں queens کے ساتھ!

(Terry Pratchett)

ذکیرہ بیگم دل تھام کر رہ گئیں۔ لب کھل گئے اور آنکھوں میں بے یقین پھیلی۔  
 ”تم سارہ؟ تم ادھر تھیں؟ مگر.... کیوں؟“ سہارے کے لئے بیدا کناڑہ تھاما۔ وہ بھی آہنگی سے بیٹھی۔ آنسو شپ پر گرفتار ہے تھے۔  
 ”اس نے مجھے وہاں بلا یا تھا....“ سر جھکائے، انگلی سے ہتھیلی مسلط، وہ بتانے لگی۔  
 ذرا دیر کے لیے، ہم ایک ماہ قبل، ایکس میگی کی صبح تک پیچھے جاتے ہیں، جب سعدی ہاشم کا ردار کے آفس میں بیٹھا تھا تو چند میل دور،  
 اپنے آفس میں بیٹھی سارہ انٹر کام اٹھائے کہہ رہی تھی۔  
 ”ماریہ میں انشی ٹیوٹ جا رہی ہوں کلاس لینے آپ یوں کرو سعدی کو کہو کہ جو پرینٹشن اس نے.....“  
 ”ڈاکٹر سارہ سعدی آج نہیں آیا۔“ دوسری طرف سے اس کو عجلت میں ٹوکا گیا تو سارہ ذرا دیر کو رکی۔  
 ”نہیں آیا؟“ ابرو بیچخے آنکھوں میں غصہ در آیا۔ موبائل اٹھا کر کال ملائی۔  
 ہاشم کے آفس کے باہر حلیہ بیٹھی کام کر رہی تھی جب تو کری میں رکھا سعدی کا موبائل بجھنے لگا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ”بلاؤ کڈ نمبر  
 کانگ“ اور واپس کام کرنے لگی۔  
 سارہ نے فون رکھا تو چہرے پر شدید ناراضی تھی۔ کلاس لینے کے بعد وہ باہر نکلی تو دوبارہ سے اس کو کال ملائی۔ اب کے اس نے

"جی؟" وہ خود بھی اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔

"سعدی یوسف، آپ آج آفس نہیں آئے۔" دانت پ دانت جما کر تحل سے پوچھا۔

"مجھے.... کچھ کام تھا۔" ہاشم کے آفس سے باہر سڑک پر وہ گاڑی دوڑاتا گھر کی طرف جا رہا تھا۔

"آن پانچ بجے سے پہلے آ کر اپنا ٹرمینشن لیٹر و موصول کر لیتا" سعدی۔ کیونکہ میں مزید تمہاری بے قاعدگیاں برداشت نہیں کروں گی۔ ان نہیں آسکوتو کل آنے کی رحمت نہ کرنا، ہم لیٹر بھوادیں گے۔ خدا حافظ۔" سختی سے بولی۔

"میں گھر جا کر آپ کو دسرے نمبر سے کال کرتا ہوں یہ فون بگ ہور ہا ہو گا۔" اس نے ایسے عجلت میں کہا جیسے سارہ کی بات کی کوئی ایسا نہیں۔ اف۔

شام کو وہ گھر پر تھی جب اس کا موبائل بجا۔ ندرت بھا بھی کالنگ۔

"جی بھا بھی؟"

"بھا بھی کا بینا بول رہا ہوں وہ بھی خوبصورت والا۔" وہ صبح کی نسبت ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ سارہ کے چہرے پر خنکی در آئی۔

"ٹرمینشن لیٹر پوست کر دیں گے ہم آپ کو آس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں نے اپنی بس کو نہیں سارہ خالہ کو فون کیا ہے۔ ضروری بات کرنی ہے۔ اس کے بعد بے شک مجھے نوکری سے نکال دیجئے گا۔"

وہ بیوہ ہواتو سارہ کے چہرے کی خنکی کم ہوئی۔ اگر وہ پرو جیکٹ ڈائریکٹر تھی، پرس سڈرائیں میں پی ایچ ڈی تھی، تو وہ بھی سعدی تھا!

"بولو۔"

"شام کو میں ساری فیملی کو اپنے ریسٹورانٹ میں آکھا کر رہا ہوں، آپ بھی آئیں گی کیونکہ مجھے سب کو کچھ بتانا ہے۔"

"میں نہیں آسکتی۔ جو بتانا ہے ابھی بتا دو۔"

"آپ کے شوہر کے قاتل سے ملا میں آج۔ اس سے اعتراف بھی کروالیا۔ ثبوت بھی ہے میرے پاس۔ مجھے پتہ ہے آپ کو بدلہ

لئے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، مگر کم از کم یہ تو آپ..... جانا چاہیں گی کہ آپ کو اپنے بچوں کو کس سے محفوظ رکھنا ہے۔"

اور سارہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ کھڑی سنتی گئی۔ پھر اس نے وہی کیا جو سعدی نے کہا مگر ایک چیز پر وہ راضی

"ہوں ہوئی۔"

"میں کسی فیملی ڈر زکا حصہ نہیں بنوں گی۔"

"اوکے، آپ ہمارے گھر کے قریب جو پارک ہے، وہاں آئیں، ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں، اگر میں آپ کو راضی نہ کر سکا تو ٹھیک ہے۔"

"آپ دہیں سے گھر چلی جائیے گا اور میں ریسٹورانٹ۔"

وہ اتنے پر راضی ہو گئی۔ صرف اتنے پر۔

مغرب ڈھل بچی اور اندر ہیرا پھیل گیا تھا جب اس نے پارک میں نیچ پر بیٹھ کلائی کی گھڑی دیکھی، اور پھر سعدی کو کال کرنے کے

لئے فون زکالا۔ مگر اس کی تاکید یاد آگئی۔ اس کا فون مکملہ طور پر بگ ہور ہا ہو گا (گو کہ ایسا نہیں تھا مگر وہ احتیاط کر رہا تھا) سواں نے صرف پیغام

بیجا۔ "کدھر ہو؟"

جو بذرا دیر سے موصول ہوا۔ اسٹریٹ نمبر فورٹین میں رائٹ لین میں جوز پر تعمیر گھر ہیں، ان میں سبز گیٹ والے گھر کے اندر

ہا میں میں آ رہا ہوں۔ ریسٹورانٹ نہیں آسکتیں تو اتنا تو کرنا پڑے گا۔"

اب یہ سارہ کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا، مگر وہ سعدی تھا۔ اس کو میلوڈ رام کی عادت تھی، یقیناً کوئی وجہ تھی جب تک وہ کہہ رہا تھا۔ وہ پیدل چلتی چند گلیاں عبور کر کے اندر چلی آئی۔ رات کا وقت، سنان گلی، مہیب تاریکی۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ وہ اس پر اسرار منظر نامے سے نذری نہ کھرا تھا۔ بس اس گھر کے پورچ میں پار بار گھڑی دیکھتی، ٹھلٹی رہی۔ وہ عمر اور تجربے کے اس حصے میں تھی جہاں انسان جنات اور بھوت پریت سے نہیں ڈرتا۔ صرف انسانوں سے ڈرتا ہے۔

گیٹ پر آہٹ ہوئی تو وہ مڑی۔ جھنجھلا کر کہنے لگی۔ ”سعدی اتنا رام کرنے کی...“ مگر وہ ”شش“ منہ پر انگلی رکھتا تیزی سے قریب آیا۔ سارہ رک گئی۔ وہ بار بار... گردن موڑ کر پیچھے دیکھتا تھا۔

”آپ یوں کریں، رسیٹور اٹ جائیں، میں....“

”سعدی میں نے بتایا ہے میں ادھر نہیں جاؤں گی۔ تمہیں مجھے کچھ بتانا ہے تو بتاؤ ورنہ میں جا رہی ہوں۔“

”شش آہستہ۔“ اس نے پھر گردن موڑی۔ پھر ذرا خنگی سے اسے دیکھا۔ ”میرے پیچھے کوئی لگا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے اس کے پاس گن ہے۔“ (سارہ کا منہ کھلا) ”نہیں وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا، وہ میرا دوست ہے، مگر آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آپ یوں کریں؛ رسیٹور اٹ جائیں، اور یہ...“ اس نے چاہیوں کا چھانکا۔ (علیشا کے کی چین سے اس نے چھانچ کا ایک سلوپیں بھی نہیں کر رکھا تھا۔) اور اسے سارہ کے ہاتھ میں تھما یا۔ ”یہ جا کر زمر کو دیجئے گا۔ میرے پاس اس کی کوئی کاپی نہیں ہے، پلیزا سے مت کھوئے گا، بس زمر کو دے دیں، اور کہنا سعدی آرہا ہے۔ پھر بے شک گھر چلی جائیے گا، میں بعد میں وضاحت کر دوں گا۔“

”سعدی یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم...“ وہ پریشان ہونے لگی۔

”ڈاکٹر سازہ جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کریں۔ جائیں۔ جلدی۔“ سارہ نے اثبات میں سر ہلا کیا اور جانے کے لئے مڑی۔ ساتھ ہی پاؤچ کھول کر اندر کی چین رکھا تھی، پاؤچ میں رکھا موبائل زور سے چھیخا کوئی کال آرہی تھی۔ اندھیرہ نامے میں آواز گوئی۔ باہر گلی میں شیر دکو لگا کہ سعدی اپنا فون سائیکلت کرنا بھول گیا ہے۔ مگر وہ سارہ کا فون تھا۔.....

”اوہ ڈیم!“ سعدی نے تیزی سے اس کا فون چھٹا اور اسے سائیکلت کیا۔ اور ذرا فکر مندی سے گیٹ کی طرف دیکھا۔

”وہ ادھر ہی آجائے گا۔ اوپر سیڑھیوں سے جائیں، ساتھ والے گھر کی چھت پھلانگ لیں، اور نہیں وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا، بس جو ہو جائے، آپ نے سامنے نہیں آتا۔ چاہے جو بھی ہو جائے۔ اب جائیں۔“ کندھے سے تقریباً اس نے سارہ کو دھکیل دیا۔ اس وقت بھی صرف سارہ کی فکر تھی۔ شیر نے دیکھ لیا تو سمجھے گا کہ وہ سارہ کو سب تاچکا ہے، اور پھر سارہ کو وہ نقصان پہنچا کیں گے۔

سارہ کے تحمل حواس بالا خرکام کرنے لگے۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں تک آئی۔ سینڈل اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور زینے پھلانگ گئی۔ مزکر دیکھا تو سعدی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور تبھی گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ سارہ اوپر آگئی۔

اوپری چھت خالی تھی۔ سریئے ستون آوھی دیواریں۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی، سچ سچ کر قدم مرکھتی، ذرا آگے آئی۔ تبھی اس نے وہ آواز سنی۔ نیچے سعدی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ فارس کی آواز۔ نہیں۔ نوشیر والا؟ اس کی آواز فارس سے ملتی تھی۔

سارہ واپس مڑی اور سیڑھیوں کے دہانے تک آئی۔ ذرا سی گردن نکال کر جھانکا۔ وہ نوشیر والا تھا اور وہ سعدی پر پستول تانے ہوئے تھا۔ ایک لمحے کے لئے نظروں کے سامنے اس کی نظروں میں وارث کی ٹپکھے سے لگتی لاش گھوم گئی۔ وہ دم سادھے، سن سی کھڑی رہی۔ اس نے چند الفاظ سنے۔ وارث کو انہی لوگوں نے مارا ہے۔ وارث کو ہاشم نے مارا ہے۔ اس کی نگاہیں نوشیر والا کے پستول تانے ہاتھ پر تھیں، اور ذہن... ذہن کن ساتھا۔ مگر نہیں۔ اسے ان الفاظ کی فی الحال کوئی سمجھنے تھی۔ بس اسے سعدی کی فکر تھی۔ اندھے کو بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ گولی چلا

اے گا۔ اور سعدی اس کو تھٹا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ کیا کرے؟ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوزائی۔ کوئی پتھر جسے وہ شیر و کسر پہ مار سکے، مگر اس نے دیکھا، اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ لمبیں وہ عورت تھی، کمزور تھی۔ وہ اکیلی پچھنہ بیس کر سکتی تھی۔ پھر کس کو بلائے؟ فارس؟ نہیں۔ پولیس۔ سائز نہستے ہی وہ بھاگ ہائے گا۔

ڈاکٹر سارہ غازی نے اگلا فیصلہ بھومن میں کیا تھا، اور بھومن میں ہی وہ نگہ پیر چلتی ساتھ والے گھر کی چھت تک آئی۔ دونوں چھتیں ملیں۔ مگر وہ ایسی جگہ نہ تھی کہ وہ پھلانگ سکے۔ اس نے کونے میں (نوشیروال سے حتی الاماکان دور) کھڑے ہو کر مو بال پہ پولیس کو کال لی۔ (اس کا نمبر پر پائیٹ تھا، کال بریں نہ کی جاسکتی تھی۔) مدھم سرگوش میں جلدی جلدی ان کو سمجھایا کہ اس ایڈریس پہ ایک شخص فائرنگ کر رہا ہے۔ اور وہ جلدی پہنچیں۔ انہوں نے ایڈریس کنفرم کیا اور اسے تسلی دی کہ ایک مو بال اس علاقے میں گشت کر رہی ہے۔ وہ جلد پہنچ جائیں گے۔

”آپ کون ہیں اور کہاڑ سے بول رہی ہیں؟“  
”میں..... بھائی سے بول رہی ہوں۔“

”اوکے، آپ اس شخص سے دور رہیں، کہیں چھپ جائیں، پولیس کے آنے تک باہر نہ نکلتے گا۔“ اس نے پوری بات سے بغیر فون ٹا اور بیلی کی چال چلتی واپس آئی، سیر ہیوں کے دہانے پر کی۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں جو پریشانی اور فکر مندی سے سکڑی تھیں، ٹماں اور روشنست سے پھیلی گئیں۔

سعدی گرا پڑا تھا، اور وہ کراہ رہا تھا۔ اندھیرے میں خون کا رنگ دکھائی دیتا تھا مگر اس کی سفید شرٹ درمیان سے سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ سارہ نے چیخ رکنے کو منہ پہ ہاتھ رکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے نو شیر والے نے اسے دو گولیاں ملید ماریں۔ گولی کی آواز سنائی نہ دیتی تھی، ایک کلک ہوتا تھا اور از میں پُر لڑا کر اہتا تھا۔ پھر وہ اسے بوٹ سے ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ اسے مارتا ہارتا تھا اور اپر سیر ہیوں کے دہانے پہ ملک کی پہلی پی ایچ ڈی ان پر اسیں ڈیڑاں نیک کام کی زمین سے فضا اور فضا سے فضا میں مار کر دینے والا ہمہائل بنانے والی سائنسدان اور تھرکوں کی پراجیکٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر سارہ غازی کی پکاری تھی۔ اس کا دل لرز رہا تھا اور رنگ خوف سے سفید پڑ رہا تھا۔ اس نے لکنچہ دفعہ کمزور رہا تھوں سے پتھرا ٹھایا، مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اسے کھینچ کر دے مارے۔ ہر ٹھوک کے بعد وہ جیسے جانے کو مرتا، ہر کر کر سعدی کو مارتا۔

وہ بس لمحے گن رہی تھی، اور ادھر سارہ سعدی کو فوراً اٹھا کر ہسپتال لے جائے۔ بالآخر وہ جانے کے لئے مڑا مگر جاتے ہاتے اس نے پوری قوت سے سعدی کے منڈپ پہ بوٹ مارا تھا۔ سارہ کی آنکھوں میں ایک دم بہت سا پانی اترتا۔ اس نے پتھرا ٹھایا اور اسے ہوا میں بلند کرتے ہوئے لبوں سے بہلی سی سکاری نکلی۔ وہ کتنی مشکل سے چینیں، آنسو بددعا، سب کو روکے بیٹھی تھی یہ وہی جانتی تھی۔ اور یہ کراہ نو شیر والے نکل بھی پتھنی تھی جب وہ ایک دم گھوما۔ سارہ فوراً دیوار کی اوٹ میں ہو گئی۔ ”اے... کون ہے ادھر؟“ وہ احتیاط سے قدم بڑھا رہا تھا۔ سارہ گھرے گھرے سانس لیتی، دیوار سے کمرناکے کھڑی رہی۔ پھر اسے گویوں کے کلک اور ان کے سیر ہیوں اور دیوار سے گرانے کی آواز سنائی دی۔

گولیوں کے بارے میں خبریں سننا، اور ان کو فلموں اور ویڈیو گیمز میں دیکھنا اور بات ہوتی ہے، مگر ان کو خود پہ برستے دیکھنا... یہ اندھی کے تکلیف دہ تجربات میں سے ایک ہے۔ سارہ نے آنکھیں بند کر لیں، اس کا سارہ وجود کا نپ رہا تھا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا، پھر اوٹ سے نکلی، نو شیر وال جاتے جاتے اسی پل وال پس مڑا۔ اور اندھیرے میں سارہ اپیولہ سافوراً اوٹ میں ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا وہ ابھی آئے گا اور اسے بھی گولیوں سے بھومن دے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ گیٹ عبور کر کے باہر۔

نکل گیا۔

وہ دوڑ کر نیچے آئی۔ سعدی زمین پر گرا کر اہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”سعدی!“ اس نے جھبھوڑا۔ اس کا پیڑہ چھپتا ہیا۔ سعدی نے غنوہ سی آنکھیں کھولیں اسے دیکھ کر ان میں کوئی احساس نہ جاگا، بس وہی غنوہ صدماتی بے یقین سی کیفیت۔

”میں نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ وہ آتے ہی ہوں گے تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ وہ اس کے زخم پر ہاتھ رکھتی کہہ رہی تھی۔ خون بہنے جا رہا تھا۔ سارہ کا لباس لہو لہان ہو رہا تھا۔

دور پس منظر میں مدھم سے سارہ سنائی دے رہے تھے۔

سعدی کی نیم جان آنکھیں اس کی آنکھوں پر جا ٹھیریں۔ اس نے لب کھولے۔

”ڈاکٹر... سارہ...“ کوئی ریلیشن شپ نائل استعمال کیے بغیر اس نے سرگوشی میں... حلق سے مشکل الفاظ باہر نکالے۔

”رن... فار...“ اس کے لبوں سے خون بنبئے لگا تھا، مگر سارہ کا پورا وجود رن ہو گیا۔ اسے معلوم تھا وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ رن فار یور لائف۔ اپنی زندگی کے لیے بھاگو۔ ساتھ ہی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ جانے کا۔ نکل بھاگنے کا۔ یہ وہ سعدی نہیں تھا جس نے کچھ دیر پہلے، بہت اعتماد سے کہا تھا کہ وہ میرا دوست ہے، مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ یہ وہ سعدی تھا جس کے یقین کے چہرے پر ابھی وہ بوٹ مار کر گیا تھا۔

سارہ اب قریب ہوتے سنائی دے رہے تھے۔ بجلی آگئی تھی۔ گلی روشن ہو گئی تھی۔

سارہ ایک دم اٹھی اور باہر کو بھاگی۔ گیٹ پورا کھول دیا۔ پھولے سانس، تیز دھڑکن، اور بے جان ہوتے وجود کے ساتھ وہ تیز تیز دوڑ رہی تھی۔ نگاہوں میں ایک ہی شے تھی۔ وارث کی ٹکھے سے جھوٹی لاش۔ وہ راستے میں دو جگہ گری، گھنٹے رگڑے گئے، ہتھیلیاں چھل گئیں، مگر وہ پھر سے اٹھ کر دوڑ نے لگی۔ سارہ اب اسی گلی سے سنائی دے رہے تھے۔ لوگوں کی آوازیں بھی۔ ان کو سعدی مل گیا تھا۔ وہ مزید تیز دوڑتی گئی۔ یہاں تک کہ پارک کے قریب کھڑی اپنی کار تک پہنچ گئی۔ اندر بیٹھ کر تیز تیز سانس لیتے، اس نے خود کو نارمل کرنا چاہا۔

موبائل فرنٹ سیٹ پر ڈالا اور سیٹ کی پشت سے سر نکا کر آنکھیں موند لیں۔ اسٹینر نگ پر ہاتھ رکھتے تو وہ بری طرح کیپکار ہے تھے۔ دل بند ہونے کو آتا تھا۔ اور یہ تباہ جب اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں، اور اسے احساس ہوا کہ اس کا پاؤ چ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

سارہ نے وحشیانہ انداز میں کپڑے جھاڑے سیٹ پر چیزیں الٹ پلٹ کیں۔ گاڑی سے نکل کر دیکھا۔

پاؤ چند ارادتھا۔ سعدی کی چاپیاں، سعدی کا پین۔ اس نے کھو دیا تھا۔ مگر اس وقت سعدی زیادہ اہم تھا۔

آخروہ صرف ایک پین ہی تو تھا!

اس نے لرزتے ہاتھوں سے کار اسٹارٹ کی اسے واپس اسی گلی کے دہانے پر جانا تھا، اور ایک فاصلہ کھکر پولیس کی موبائل کو فالو کرنا تھا۔ وہ سعدی کو جب تک ہسپتال پہنچانیں دیکھ لے گی، اسے چین نہیں آئے گا۔۔۔

”پھر میں نے ان کا تعاقب کیا۔ جب وہ اسے ہسپتال لے گئے تو میں واپس آگئی۔ ان کے ریسٹورانت کا ل کر کے ملازم کو میں نے ہی بتایا کہ وہ کس ہسپتال میں ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ گھر آ کر میں کمرے میں بند ہو گئی، کپڑے بد لے۔ صبح کار کی سروس بھی کروائی۔ سارے نشان مٹا دیے۔ اسی صبح میں نے دو جمع دو کر لیے تھے، اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وارث کو بھی انہی لوگوں نے مارا ہے۔“ اپنے کمرے میں بیٹھ پہنچی سارہ جھکے چہرے اور آنسوؤں کے ساتھ بتا رہی تھی اور ذکر یہ بیگ حق دن سے جارہی تھیں۔

”مگر وہ کون تھا؟ جس نے گولی چلائی؟“

سارہ نے غنی میں چہرہ ہلایا۔ ”میں نہیں بتا سکتی۔ ان لوگوں نے دارث کو بھی مارا، وہ میرے پھولوں کو بھی مار دیں گے امی۔ اگر میں نے زمر کوتا تو وہ کہے گی کہ گواہی دو۔ میں گواہی نہیں دے سکتی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس نے جیسے سعدی کو مارا ہے وہ مظہر مجھے نہیں بھوتا۔“ ”مگر تم ان کو اتنا تو بتا دو کہ یہ کس نے کیا ہے؟“

”میں نے بتایا تو زمر کو پتہ چل جائے گا کہ میں ہی وہ گواہ ہوں، جس کو وہ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان کو پتہ ہے کہ وہاں کوئی تھا، مجھے نہیں نے بتایا ہے۔ زمر کہے گی، گواہی دو وہ میری جگہ ہوتی تو دے دیتی گواہی، اس کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس ہے۔“ نہیں یہیں ہیں۔ امی جب کوئی مر جائے تو واپس نہیں آتا۔ وہ لوگ کس طرح اسے ہسپتال سے لے گئے۔ انہوں نے اس کو مار کر لاش بھی مان ب کر دی ہوگی۔ وہ اسی طرح ہمارے ساتھ بھی کریں گے۔ وہ غنی میں سرہلاتی روتنے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ذکر یہ بیگم کا دل بھرا آیا۔ انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔

”مگر زمر کہتی ہے وہ زندہ ہے۔“

”امی زمر نے نہیں دیکھا تھا اسے سعدی کو قتل کرتے۔ میں نے دیکھا تھا۔ اور اسے ہسپتال میں نے پہنچایا تھا۔ آپ مجھے بزدل سمجھتی ہیں تو سمجھیں، مگر وہ میں ہوں جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ مگر وہ پھر بھی اسے لے گئے۔ جتنی بے رحمی سے اس کو وہ مار رہا تھا، اس کے بعد وہ اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ امی سعدی مر چکا ہے، کیونکہ اس نے دارث کے قاتلوں کو نفرین کیا تھا۔ میں اگر سعدی کے قاتل کو نفرین کروں گی تو ہم سب بھی میریں گے۔“ وہ ایک دم وحشیانہ انداز میں چلانی تھی۔ ”مجھے اپنی پرواہ نہیں ہے، مگر میری یہیں ہیں دو! اور.... اور یہ لوگ جو سوچل یہ یا پہ سعدی کے نام سے تحریک چلارے ہیں، امی ان میں سے کسی کو وعدالت آنا پڑے تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ ہر کوئی زمر نہیں ہوتا۔“ ”اور وہ جو چیزیں سعدی نے تمہیں دی تھیں؟ وہ نہیں ملیں؟“

”نہیں میں بعد میں دوبارہ اس علاقے میں گئی تھی۔ ہر وہ جگہ دیکھی جہاں سے گزری تھی۔ مگر میرا پاؤچ نہیں تھا۔ اس میں میری ایک رنگ تھی، پیسے تھے اور سعدی کی چاہیاں بھی۔ پھر سعدی کی گمشدگی کے کوئی چاردن بعد میں اس زیرِ تیز مکان میں گئی۔ وہاں اوپر چھٹ پ پ، جہاں میں نے چھپ کر پولیس کو فون کیا تھا، وہاں اب بھری کاڈ ہیر رکھا تھا۔ میں نے بھری ہٹائی تو ایک کونے میں جہاں اس رات سینٹ پچھی تھی، اب پک کر سخت ہو چکی تھی، اس میں میرے پاؤچ کے دموٹی اسلکے تھے۔“ ”ذکر یہ بیگم کی آنکھوں میں اجھدا ابھرا۔“ ”مطلوب؟“

”میں نے وہیں رکھا ہو گا پاؤچ، سینٹ پچھی تھی، وہ اس سے چپک کیا۔ بعد میں کسی نے اسے کھینچ کر اتارا تو موٹی اندر ہی اسکے رہ گئے۔ یہ پولیس کا کام نہیں ہو سکتا تھا، کسی مزدور نے کیا ہو گا اور پھر اس جگہ بھری ڈال دی۔ پاؤچ میں میرے پیسے تھے، ہیرے کی انگوٹھی تھی اور وہ کی چیزوں تھا۔ پھر میں اس گھر کے ٹھیکیدار سے ملی، اسے بتایا کہ میں ایک وکیل ہوں اور ادھر میرا پرس گرا تھا۔ اس نے کہا کہ میں ہزار دوں تو پرس اپنے لادے گا۔ میں نے دے دیے۔“

”پھر؟“ ”ذکر یہ بیگم وہیان سے سن رہی تھیں۔“

”تین دن بعد میں دوبارہ گئی تو اس نے کہا کہ کسی مزدور نے اخھایا تھا پرس، اور اس نے وہ مجھے واپس کر دیا۔ اندر پیسے اور انکوٹھی ویسی ہی رکھی تھی۔ مگر سعدی کا کی چیزوں نہیں تھا۔“

”مگر وہ کہاں گیا؟“

”مجھے نہیں پتہ، مگر کیا فرق پڑتا ہے امی؟ جب سعدی نہیں رہا تو کیا فائدہ کسی دوسرا چیز کا؟“ وہ گھنٹوں میں سردیے کتھی دیر روئی رہی۔ پھر بالآخر اس نے چہرہ اخھایا۔ آنسو پوچھے۔

”کچھ دن میں میں چلوں گی ان سے ملنے۔ مگر ابھی نہیں۔ مجھے سنپنے میں کچھ وقت لگے گا۔“ مگر ذکر یہ بیگم جانتی تھیں کہ چونکہ اس نے اپنے دل کا بوجھ بلکا کر دیا ہے تو اب وہ جلد سنپنے جائے گی۔ وہ افسوس سے اسے دیکھے گئیں۔  
ندوہ بہادر تھی نہ بزدل۔  
وہ ایک ماں تھی۔

.....♦♦♦.....

میرے ہونے کی خود کوئی توجیہہ کر ..... مجھ کو لگنے لگا ہے کہ بے سود ہوں !  
رات ایکسی پر گھری ہو رہی تھی۔ رمضان کے باعث بتیاں روشن تھیں۔ بڑے ابالائخ میں وہیں چیز پر بیٹھے تھے اور صداقت ان کے پیار کے ناخن کاٹ رہا تھا۔

تبھی دروازہ کھلا تو اب انے گردن موڑ کر دیکھا۔ زمر اندر داخل ہو رہی تھی۔ فارس بیچھے تھا۔ دونوں کے چہروں پر ایک ہم آہنگ سا اطمینان بکھرا تھا۔ نیاز بیگ کو گرفتار ہوئے دو گھنٹے ہی تو ہوئے تھے۔

”میں اپنے پرائیوٹ نمبر سے لوکل چینز کو کال کرنے جا رہا ہوں، صح تک شرامک کیس کے ملزم کے پکڑے جانے کی خبر عام ہو گی۔ اے ایس پی کو اتنی شہرت اور ہاپ ملے گی کہ پھر وہ نیاز بیگ کو باہر نہیں آنے دے گا۔“

”اوکے۔“ زمر نے سر بلادیا۔

اور بڑے ابا نے صرف دور سے دیکھا، کہ وہ دونوں سرگوشی میں بات کر رہے تھے۔ کوئی اطمینان ساتھا جوان کے رُگ و پے میں اترتا گیا۔

صداقت فوراً سے اٹھا۔ اسٹری کے اسٹینڈ سے فارس کی شرٹ اٹھا لایا۔  
”فارس بھائی، یہ جل گئی۔“ شرٹ سامنے گی۔ شرمندگی سے سر بھی جھکایا۔  
زمر نے چونک کر شرٹ کو دیکھا، اس کی تیوری چڑھی، پھر ذرا تھی، فوراً سے فارس کو دیکھا۔ (یہ ابھی صداقت کوڈا نہ تو سہی! میں اس کو....)

”وہ بیک والی پریس کر دو پھر۔“ فارس نے بس ایک نظر اس شرٹ کو دیکھا، اور سیر ہیوں کی طرف بڑھ گیا۔ زمر کے لب ذرا کھل گئے۔ قدرتے تجھ سے اس نے فارس کو جاتے دیکھا۔  
”اس نے کچھ بھی نہیں کہا؟“

صداقت نے بہت تسلی آمیز انداز میں ہاتھ جھاڑے۔ ”پچھلے ہفتے بھی ایک جلانی تھی، تب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔“  
زمر کھول کر اس کی طرف مری۔ اگلے دس منٹ تک صداقت نے سر جھکا کر اس کی صلوٰتیں سینیں جن میں مسلسل ”صداقت آپ کا دھیان کہاں ہوتا ہے؟ آپ یہ اور آپ وہ؟“ کی تکرار تھی۔

اور اوپر چڑھتے فارس نے سر جھکا تھا۔ (ملازم آپ ہے، اور شوہرت ہے؟ یہ عورت کبھی نہیں سیدھی ہو گی!)  
چند منٹ بعد، زمر کے کمرے کی بیٹی بھی تھی اور وہ بیڈ پر لیتی تھی۔ (فارس کمرے میں نہیں تھا۔) کھلی آنکھوں سے چھت کو دیکھتے، اس کے سامنے ایک منظرلم کی طرح چل رہا تھا۔ چار سال پہلے.....  
آفس میں بیٹھی زمر اور سامنے بیٹھے صیرت صاحب۔ وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ ”فارس غازی کی گاڑی سے پولیس نے وہ رتی ری کو رکی ہے جس کے ذریعے وارث غازی کا گاگا گھونٹا گیا تھا۔“

”جی، فارس آیا تھا میرے پاس، اس نے کہا کہا کے سے سیٹ اپ کیا گیا ہے۔“ وہ فوائل پر لکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”زمر صاحبہ یہ فارس کیسا آدی ہے؟ مطلب کہ ایک ایورنچ مجرم تو ایسے ثبوت کار میں چھوڑ سکتا ہے، ہم روز ایسے بیسوں کیسز دیکھتے ہیں، مگر ایک کرمنٹی اسارت آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔“

زمر پین لوں پر رکھے کچھ دیر سوچے گئی۔ ”جی بتاؤں تو میں اس کو نہیں جانتی۔ کچھ میں یہ میرے پاس پڑھا ہے وہ پھر بس کبھی سر رہا ملاقات ہو گئی تو ہو گئی۔ کم گو ہے، ہاں اگر بولے تو پنی تلی بات کرتا ہے۔ سمجھدار لگتا ہے مجھے زراغتی کا تیز ہے، مگر۔ کرمنٹی اسارت ہے یا نہیں، ایسی باتیں تو کسی کے ساتھ رہ کر ہی پڑھ چل سکتی ہیں۔ اس لئے میں کچھ لہنہیں سکتی۔ ویسے ایک ایجنٹی میں اچھی پوسٹ پر ہے ایسے ہی تو نہیں کیا ہو گا تا۔“

”میڈم ایجنٹی میں تو ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، فریکل فلش بھی میز کرتی ہے، شخصیت بھی میز کرتی ہے، سب بہترین اور اسارت نہیں ہوتے۔“

یہ زمر اور زر تاش کو گولی لگنے سے پہلے کی گفتگو تھی جو آج رات ویسے ہی اس کی ساعتوں میں گوجنے لگی۔

(میں ایک میں یہ سے اس کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ سعدی کو کھوئے ایک مہینہ ہو گیا اور یہ....) اس نے گردن موڑ کر نیرس کی طرف بیکھا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ (اس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ کتنی احتیاط سے ہر شے کی۔ ایک ایک چیز کا خیال رکھا۔ تو پھر یہ اپنے بھائی کو مار کر ثبوت کاڑی میں کیوں چھوڑے گا؟ پہلے تو تم اس کو نہیں جانتی تھی، مگر اب جانے لگی ہو تو کیا ہے جو تمہیں لکھنے لگا ہے زمر؟) وہ سوچے گئی۔

فارس اور زمر کے کمرے اور ندرت اور حنین کے کمرے کا نیرس مختصر کہا۔ وہاں ایک کین کا صوفہ بچھا تھا۔ فارس اس پر بیٹھا تھا اور پاؤں لبے کر کے ریلنگ پر رکھے تھے۔ سامنے ہاشم کے کمرے کی بالکونی پر نگاہیں جمائے وہ کچھ سوچے جا رہا تھا۔

”آپ ادھر کیوں بیٹھے ہیں؟“ خدا ساتھ آ کر بیٹھی تو وہ چونکا۔ پھر نیک لگائے رکھے، بل گردن موڑ کرا سے دیکھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لئے کھلے بالوں میں ہیئت بینڈ لگائے ساتھ آ بیٹھی تھی۔

”یونسی۔“

”پھر چھوٹے کمرے سے نکال دیا؟“ خدا نے آنکھیں اس پر جمائے سنجیدگی سے پوچھا۔ فارس نے ”اف“ کہ کر چہہ واپس سامنے کر لیا۔

”یہاں والا ”اف“ تھا یا؟“ میری ذاتیات میں مداخلت نہ کرو، والا اف تھا؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ سورہ ہی ہے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔“

”مجھے بھی نہیں آ رہی۔“ اس نے ایک مایوس نگاہ میل فون پڑا۔ (ہاشم کو کتنی دیر ہوئی عیکست کیا تھا، مگر کوئی جواب نہیں۔ سامنے اس کے کمرے کی تی بھی بھی تھی۔ گھر نہیں تھا شاید!) اور گھنٹے ملائے ٹیک لگائے پیچھے ہو کر بیٹھی رہی۔

”سعدی اس وقت کیا کر رہا ہو گئیں؟“ وہ دور آسمان کو دیکھ رہا تھا، چھرے سے تھکا تھکا لگتا تھا۔ خدا کی آنکھوں میں اداسی آگی۔ اس نے اپنا سر فارس کے کندھے پر رکھ لیا۔

”میں یہ نہیں سوچنا چاہتی۔ میرا دل گھٹتا ہے۔ وہ کہیں کسی جگہ مجبوس ہوں گے اور ان کے مجرم آزاد گھوم رہے ہیں۔“

”اوہبوا۔“ فارس نے گردن دا کیسیں باسیں بھالی۔ ”اب ان میں سے کوئی آزاد نہیں گھوٹے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں، نہیں!“

”مجھے نہیں آتا اب کسی بات پر یقین!“

اس نے بازو وحد کے کندھوں کے گرد جمائل کراس کے بال تکپے اور نگاہیں دور آسمان پر جمائے کہنے لگا۔ ”خدا کیا ہم لوگ تمہارے لیے کچھ نہیں ہیں؟ کیا سعدی کے جانے سے تم ہم اس سے بھی الگ تھلک رہا کرو گی؟“

وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔“

”پھر تم زمر سے ایسے بات کیوں کرتی ہو؟“

آئی رسلی ہیست ہر۔ ”خنگی سے قصر کو دیکھتی وہ کہہ رہی تھی۔

”اونہوں۔ تم اس سے نفرت نہیں کرتی۔ تم اس سے ناراض ہو۔“

خنین ناراضی سے منہ میں کچھ بڑا آئی۔

”تم سارا وقت کمرے میں کیوں بندرا رہتی ہو؟ ہمارے ساتھ کیوں نہیں آتی؟“ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

”میں ایک ناکام انسان ہوں۔ میرے اندر بہت سارا شر ہے۔ میں جب بھی کسی چیز میں ہاتھ ڈالوں گی اسے بگاڑ دوں گی۔“

”مگر تم وہ تو کر سکتی ہو جو زمر نے تمہیں کہا ہے۔ یہ انتقام اور انصاف کا واحد طریقہ ہے۔“

”میں ان کے حکم کی غلام نہیں ہوں آپ کی طرح۔“ اس نے خنگی سے فارس کے کندھے سے سرہنایا اور آگے ہو کر ٹیکھی۔ ”بھائی کہتا تھا، انتقام کے لئے چیونیاں بن کر کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک فیملی بن کر۔ ایسے نہیں ماموں کو وہ جب چاہیں مجھے آرڈر دے کر چلی جائیں، میری فیلنگرو کا خیال رکھے بغیر۔ وہ کون ہوتی ہیں مجھے آرڈر کرنے والی؟“ وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”تمہارے بھائی نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ چیونیوں کی ایک ملکہ بھی ہوتی ہے؟“

ایک ثانیے کو ساری فضا ساکن ہو گئی۔ خنین بالکل ٹھہر گئی۔ وہ گردن تک اب بازوں کا تنکیہ بنائے، نیم دراز پر سکون سا سے دیکھ رہا تھا۔ ایک پل کو وہ کادل نرم مووم ہونے لگا، مگر پھر اس نے گردن کرائی۔ (سامنے ہاشم کے کمرے کی تی جلی تھی)

”وہ میری ملکہ نہیں ہو سکتیں۔ کبھی بھی نہیں۔ آپ مانیں ان کا حکم۔“

”تمہیں لگتا ہے میں اس کے حکم پر چلتا ہوں؟“

”کیا میں دیکھنے کی رہی؟ آپ وہی کر رہے ہیں جو وہ حکم دے کر چلی جاتی ہیں۔“

وہ ہلاکا سا ہنس دیا۔ حنفہ کو اس کا ہنسنا اچھا گا۔ کتنے عرصے بعد اس نے فارس کو بہت دیکھا تھا۔

”یہ جو تمہاری پھپھو جبصی عورتیں ہوتی ہیں نا، ان کو بہت تکنیک سے قابو کرنا پڑتا ہے، اور میں وہی کر رہا ہوں۔“

حنہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مطلوب؟“

”مطلوب کہ پہلے انہیں یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ ایک ملکہ ہیں، ہر فیصلہ انہی کا مانا جائے گا، اور آپ صرف ان کی مدد کے لیے ہیں۔ پھر جب وہ آپ کی عادی ہو جائیں تو کشڑوں ان کے ہاتھ سے آہستہ آہستہ لے لیا جاتا ہے۔“ تکان سے مکرایا۔

حنہ کے اندر کی دھیانی محبت جانے لگی، اور وہ خنگی سے اس کو سخت ننانے لگی تھی مگر توبہ ہی موبائل واپسیت ہوا۔ (آہ)۔ وہ اسے شب بخیر کہتی اٹھ گئی، پھر جاتے جاتے مڑی۔ ”مجھے موبائل لینا ہے، میرا اپنافون۔ آپ لادیں گے؟ مگر پیسے امی دیں گی۔“

”ہاں، ایک فون خریدنے سے میں تو غریب ہو جاؤں گا۔“

”نہیں، پلیز، صبح امی آپ کو میسے دے دیں گی، آپ لے لینا، ورنہ وہ ناراض ہوں گی۔“

”اپنی امی سے کہو اتنا...“ وہ رک گیا۔ سر جھکا۔ ”اچھا صبح بات کرتے ہیں۔“

”شب بخیر ماموں۔“ ہلاکا سامسکرا کر کہا تو وہ جواب دے کر پھر سے سامنے دیکھنے لگا۔

وہ جس کو بھلانے میں کئی سال لگے تھے

اک لمحہ غفلت میں درآیا وہی لمحہ!

حده کمرے میں آئی۔ امی کروٹ کے بل لیٹھی تھیں۔ وہ فوراً اپنے بستر پر آئی۔ اور موبائل کھولا۔ ہاشم اس کی آنکھیں جگھا چھیس۔ سارے دن کی تھکن اتر گئی۔

”کدھر تھے آپ سارا دن؟“

”لڑکی میں مصروف ہوتا ہوں۔“ مسکراتی اسکالی۔ ”تم سناؤ کیا کیا آج؟“

”کچھ نہیں۔ بھائی یاد آتا رہا۔ ابھی مامور کے ساتھ ٹیکر پر میٹھی تھی۔“ وہ کروٹ کے بل لیٹھی اندر ہیرے میں چکتی اسکرین کو دیکھتی جا رہی تھی۔

”ہوں۔ کیا با تیں ہو رہی تھیں مامور سے؟“ ہاشم اپنے کمرے میں نائی ڈھیلی کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے موبائل پٹا سپ کرتا جا رہا تھا۔ وہ دو تین لوگوں کو ایک ہی وقت میں جواب دے رہا تھا۔

”وہ چاہتے ہیں، میں زمر کے کہنے پر بھائی کا لیپ ٹاپ کھول دوں۔ مگر مجھ سے اب یہ کام نہیں ہوتے۔ جب بھائی کے کہنے پر نہیں کیا تو زمر کے لئے کیوں کروں؟“

”سعدی نے کیا کہا تھا؟“

”ان کی کچھ فائیزر کر پٹ ہو گئی تھیں، مجھے کہا کہ کھول دو میں نے نہیں کھول کر دیں۔ دل ہی نہیں کرتا تھا۔ پتہ نہیں صحیح کیا یا غلط۔“ ہاشم نے ”اُس اور کے“ لکھ کر سینڈ کیا، کوٹ اتارا، گردن کی پشت کو ہاتھ سے دبا کر جیسے پھوٹوں کو ریکس کیا، موبائل بینڈ پر رکھا اور با تھرود مٹک آیا۔ بینڈ میں قل کھولا۔ پانی کی دھارا گرنے لگی۔ اس نے با تھر سالس کا جارا خھایا ہی تھا کہ یہ کیدم رکا۔ ساری دنیا سا کت ہو گئی۔ پانی، جار سب چھوڑ کر وہ تیزی سے واپس آیا اور فون انھیما۔

”کون ہی فائیزر کر پٹ ہو گئی تھیں؟“ حد کے اگلے چار پانچ پیغام پڑھے بغیر نیکست کیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”بھائی کی کوئی آفس فائیزر تھیں۔“

”وہ جو یو ایمس بی میں تھیں؟“ اس نے روشنی میں تیرچلایا۔ سامنے کی بات تھی۔

”جی... آپ کو کیسے پڑھے؟“

”ارے وہ سعدی نے تمہیں دیں؟ میں کب سے انہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ میں نے دی تھیں سعدی کو، مجھ سے کھل نہیں رہی تھیں، ابھی کدھر ہے وہ فلیش؟“ ادھراں کے قدموں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔

”میرے پاس ہے۔ ساماں میں ہی پڑی ہے کہیں۔“

”تم مجھے ابھی لا کے دے سکتی ہو؟ بس دو منٹ کے لیے آؤ، اور مجھے بالکوئی میں پکڑا کر چلی جاؤ۔“

”مامور ٹیکر پر میٹھے ہیں، مجھے شوٹ نہ کر دیں۔“ یہ لکھتے ساتھ ہی اس کا دل خراب ہوا۔ (اگر مامور کو پتہ چلا کہ میں ہاشم بھائی سے اس وقت بات کر رہی ہوں تو وہ کیا سوچیں گے؟)

”اچھا۔“ ہاشم رکا۔ ”مجھے وہ کل ہی چاہیے ہے، صحیح دے جاؤ گی فلیش؟“

”او کے۔“

”تم نے اسے کھول کر دیکھا؟ فائیزر کو رکیں یا نہیں؟“

”نہیں۔ میں نے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ صحیح لا دوں گی۔“ وہ لکھتی جا رہی تھی جب...

”جنین... کس سے بات کر رہی ہو؟“ امی نے اس طرف کروٹ لی، موبائل کی روشنی دیکھی تو اسے پکارا۔ جنین کا سانس رک گیا۔

”وہ.... گیم کھیل رہی ہوں۔“ ساتھ ہی جلدی جلدی ”مجھے جانا ہے بانے،“ لکھ کر واٹی فائی آف کیا۔

”یہ نام ہے فون استعمال کرنے کا؟ رکھوا در سو جاؤ۔ حیری کے لئے پھر اختنے مت پڑتی ہے تم سب کو۔ اب نہ دیکھوں میں تمہارے ہاتھ میں موبائل۔“ ختنی سے اسے ڈپا تو وہ جلدی جلدی سارے تجھ مٹائی، فون بچھا کر چلتی ہے۔ آنکھیں زور سے بیچ لیں۔ ”اف۔“

اگلی صبح آفس جانے سے پہلے، ہاشم سوٹ میں ملبوس، مکمل تیار، اپنی بالکوں کی سیر ہیاں اتر کر انکھیں تک آیا۔ (تلی کر لی کہ فارس کی کار نہیں کھڑی۔) اور دروازہ کٹکھایا۔ صداقت نے کھولا تو اندر کا منظر بھی کھلتا چلا گیا۔ زمر پر س میں کاغذ ازستی تیاری دروازے کی طرف آ رہی تھی۔ پیچھے ندرت میز سے برتن اخبار ہی تھیں۔ بڑے ابا بھی سامنے بیٹھنے نظر آئے۔ اسے دیکھ کر سب رک گئے۔ وہ ہشاش بشاش سامکرایا۔

”گند مارنگ۔ صح صح آپ کو تسلیک کیا۔ حینیں کے پاس میری ایک فلیش تھی، وہ لینے آیا تھا۔“ ندرت نے اسے اندر بلایا اور خود دکا بلانے اوپر گئیں۔

”کون سی فلیش؟“ زمر نے اچھنے سے اسے دیکھا۔

”میں نے سعدی کو پکھا فائزہ دی تھیں کھولنے کے لئے مجھ سے کھل نہیں رہی تھیں۔ اس نے کہا کھول دے گا، مگر وہ کر پٹ ہو گئیں شاید۔“

تبھی حینیں اوپر سے آتی دکھائی دی۔ نیند والا چرا جس پر دو چھینٹے مارے تھے۔ آنکھوں میں اسے دیکھ کر زرمہٹ آگئی۔

”ہاشم بھائی!“

”حینیں، بچے، میری فائزہ دی تھیں سعدی نے تمہیں۔“ آنکھوں سے دیکھا زمر آنکھیں سکیڑ کر اس کو دیکھ رہی تھی۔

”جی میں لا تی ہوں۔“ وہ بیسمیث کی طرف جانے لگی۔

مگر زمر نے اسے اشارہ کیا، کہ ذرا تھے۔ پھر ہاشم کی طرف مڑی۔

”کیا کلر تھا اس فلیش ڈرائیور کا؟“

”سوری؟“ ہاشم نے تاہمی سے اسے دیکھا۔

”مطلوب کس رنگ کا کور تھا اس یو ایس بی کا؟“ حمد کیسے ڈھونڈے گی اتنی ساری فلیش ڈرائیور میں اگر اسے کلر ہی نہ پڑتا ہو تو؟“

بڑے رسان سے بتایا۔ ہاشم کا دل چاہا، زمر کی گردن مردوڑے، مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حمد بول آئی۔

”وہ بیک کلر کی ہے۔ پیچھوں مجھے پڑتا ہے وہ کوئی ہے، میں ابھی لا تی ہوں۔“ ساتھ ہی خفی سے زمر کو دیکھا جو ایک دم کلس کر رہا آئی تھی۔ وہ حینیں کو روکنا چاہتی تھی، مگر حینیں اگلے ہی منٹ ایک یہاں یو ایس بی لے آئی اور اسے ہاشم کی طرف بڑھایا۔

”یہ لیں۔“ ہاشم مسکرا کر شکریہ کہتا، زمر پر جاتی نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر اس نے جلدی سے اسے لیپ ناپ میں لگایا۔ اندر ایک ہی فولڈر تھا اور وہ لا کنڈ تھا۔ لمبی لمبی اصطلاحات نمبرز۔ اس کو کھولنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے یو ایس بی نکالی اور نیچے کچھ کچھ میں آیا۔ کمیٹ سے سل کا پتھر نکالا۔ اور اسے زور زور سے فلیش ہی مارا یہاں تک کہ وہ بالکل پچک کر رہا گئی۔ پھر اس نے اسے کوڑا داں میں پھینکا اور ہاتھ دھوکروں اپس اور چلا آیا۔

بالآخر ہر ثبوت منٹ گیا تھا۔ اب آج سے ایک منے دن کا آغاز ہو گا۔ معصوم مژہ کی، اس لڑکی سے ہمدردی ہوئی۔

.....

مزما کے طور پر ہم کو ملا قفس جالب..... بہت تھا شوق ہمیں آ شیاں بنانے کا!

ان سب سے دور بہتال کے اس کمرے کی ساری تیاریاں روشن تھیں۔ وہ بیند پر لینا تھا اور میری اس کے بازوؤں کے اسٹریپ کوں رہی تھی۔

‘مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، مگر تم جانتے ہو اگر تم با تھروم سے پانچ منٹ کے اندر نہ لکھ تو مجھے باہر کھڑے گا رڈ کو بلانا ہے گا۔’ وہ انھ کر بیٹھا، پاؤں زمین پر اتارے (آہ) تکلیف ہوئی۔ آنکھیں کرب سے بھیجیں۔ میری نے سہارا دینے کو اس کوشانے سے لفڑا منا چاہا، اس نے جھٹکے سے بازو چھڑایا اور آگے بڑھ گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا وہ با تھروم تک آیا۔

دیوار کا سہارا لیتے وہ (آہ) درد سے لب بھیجنما، سنک تک آیا۔ بندکن کو دنوں ہاتھوں سے تھا میں اس نے چھڑا اٹھا کر آئیں میں دیکھا۔ ہونتوں کا زخم بھر چکا تھا، چھرے کے نیل رنگ بدل چکے تھے، مگر گال اور پیشانی کا زخم دیساہی تھا۔ گردن کی چھٹیں کم نظر آ رہی تھیں۔ ‘میں نے کبھی ایسے مارا تھا تھمیں نو شیر وال۔ جو تم نے میرے ساتھ یہ کیا؟’، ‘تل کھولا اور پانی دنوں ہاتھوں میں بھر کر چھرے پر آئیں۔’ وہ اڑکی جس کے ملگیتیر نے تمہیں یونیورسٹی میں پیدا تھا، کبھی اس کو تو پلٹ کر مارنے کی بہت نہیں ہوئی تھیں۔ یہ انقام نہیں تھا نو شیر وال۔ یہ حسد تھا۔’

سرخ آنکھوں سے آئینے میں دیکھتے وہ بڑھ دیا۔ ‘میں کبھی کچھ نہیں بھولتا۔ تم میں سے ہر ایک کو حساب دینا ہو گا۔’ چھرے سے پانی کی ہوند میں ٹپک رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا۔ ان دنوں وہ سارا دن سوچتا رہتا تھا۔ ‘بس ایک دفعہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔’ ایک نظر اپنی رُخی ناگ پڑا، دوسری پیٹ پر جہاں شرٹ کے اندر پتی بندھی تھی۔ یہ دنوں زخم ہر روز بہتر ہو رہے تھے۔ صرف یہ کندھے والا بار بار خراب ہو جاتا۔ ‘میں کہاں ہوں؟ اپنے گھر سے کتنا دور؟’، ‘اس کا دماغ بھکننے لگا، یکدم وہ چونکا۔’ گردن گھمائی۔ کمرے میں تو کوئی کھڑکی نہ تھی، مگر شادر کے اوپر ایک نحشا سارومن داں تھا۔ ایک فٹ اونچا، دوفٹ چڑا۔ پیچھے شیش تھا، اور آگے سلاخیں۔ شیشے کے اوپر سیاہ پینٹ کر کے باہر کے منظر کو بلاک آؤٹ کر دیا گیا تھا۔ ویسے بھی اس روشن دان سے آدمی کیا، بازو بھی نہ گز رکھ ل سکتا۔ اس لیے روز اس کو دیکھ کر وہ مالیوس بوجاتا تھا۔ مگر آج... بہتر ہوتی صحت نے ہنی حالت بھی بہتر کر دی تھی۔ سعدی نے ادھرا دھن نظر دوڑا۔ صابن، شیپو، نشوپیپر... اس کے علاوہ کچھ نہ تھا اس با تھروم میں۔

مگر اس نے زندگی سے یہ سیکھا تھا کچھ نہ ہو۔ تب بھی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوتا ہے۔

وہ تو لیے کے اسٹینڈ تک آیا۔ تو یہ اتارا۔ اور اسٹین کاراڑا باہر کو کھینچا۔ ذرا ساز وڑا اور راڑا تھا میں آگیا۔ اب وہ شاور تک آیا۔ گردن انھا کرناونچائی جائی۔ اتنی اوپنچی نہیں تھی چھٹ۔ سلیپر ز سے پیر نکالے اور ایک با تھ سے شادر کی نلی پکڑے اس نے نچلے تل پر پیر رکھا۔ (آہ) زخم کو یادھڑنے لگ۔ درد سے دانت خنثی سے جمائے۔ کراہ روکی۔ اوپر چڑھا۔ دوسرا پیر، گرم پانی کے نل پر رکھا۔ اور با تھ لمبا کیا۔ راڑا روشن دان کی سلاخوں کو چھو نے لگا۔ سلاخوں کے پیچھے شیشے کا پٹ بندھا اور اس کے کندھے میں تالہ سالاگا تھا۔ تالہ نہیں تو رُسکتا تھا وہ مگر....

پوری قوت سے اس نے راڑا کا سرا شیشہ میں مارا۔ ایک دُو تین....

دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میری کی غصے سے بھری آواز۔ پھر گاڑڑ زکی دھاڑ۔ وہ کچھ نہ سوچے بغیر بار بار راڑ شیشے پر مار رہا تھا۔ کندھے کا زخم ادھڑ نے لگا تھا۔ درد بڑھ گیا۔ وہ مزید ضریب میں لگا تاگیا۔ قوت پوری نہ لگائے کے باعث ضرب زور کی ندگتی اور شیشے بے اثر رہتا۔ کندھے سے خون رنسنے لگا۔

اور تب ہی شیشے میں چھٹا ہوا۔ درمیان سے سوراخ۔ سعدی نے راڑا پھینکا۔ ایک با تھ دیوار پر کھٹے دوسرے سے کاٹھ کے نکڑے نکالے۔ ذرا ساروزن بننا۔

دروازے کا لاک ٹوٹا۔ دوآدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ غصے میں اسے گالیاں دے رہے تھے۔

سعدی نے ایک نظر باہر چلپلاتی دھوپ کے منظر پڑا۔ وہ عمارت کی غالباً سب سے اوپر کی منزل پر تھا، اس لئے... یہاں سے گویا پورا شہر نظر آتا تھا۔ مگر... اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں میں دھشت اور حیرت اڑ آئی۔

نیچے ایک گارڈ نے وہی راڑاں کی ران کے زخم پر مارا۔ اس کے منہ سے دبی دبی سی چیخ نکلی۔ وہ گرنے لگا تھی جو دوسرے نے کھینچ کر اسے نیچے اتارا۔ ہاتھ میں کاٹج لگنے سے خون بہر رہا تھا اور کندھے سے خون ہنوز رس رہا تھا۔ وہ حکیم شحیم سے گارڈ زماں سے گھینٹتے ہوئے واپس لائے اور بیڈ پر پٹھا پھر سے اس کے بازو باندھنے لگے۔ اور اس دوران وہ بستر پر گرا۔ درد سے کراہتے ہوئے اونچا اونچا پوچھر رہا تھا۔

”میں کہاں ہوں؟ یہ کون سا شہر ہے؟ کوئی مجھے کچھ بتاتا کیوں نہیں ہے؟“ کرب کی شدت سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری نے ان گارڈز کو ڈاکٹر کو لانے کھینچ دیا ہے اور خود اس کے سر ہانے آ کھڑی ہوئی۔

”میں نے کہا تھا تمہیں“ کہ دیر مت لگانا۔ ”خختی سے وہ بولی تھی۔ سعدی نے گلی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”یہ کون سا شہر ہے؟ یہ میرا شہر نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے۔“

”یہ پوچھو کہ یہ کون سا ملک ہے۔“

اور اس کے الفاظ پر سعدی ذوالقدر یوسف خان کا پورا و جو دن ہو گیا۔ یک نکد وہ میری کو دیکھ گیا۔

”بھاگنے کی کوشش بے کار ہے سعدی، کیونکہ یہ اندھیا ہے، اور یہاں تم بغیر پاسپورٹ کے لائے گئے ہو۔ جس دن تم اس قید سے نکلو گے، تم ایک پاکستانی جاسوس کی طرح اندھیا کی گلیوں میں یونہی چھپتے پھر گے اور وہ جلد یاد رکھنے کی ضرورت نہیں کہ بھارت میں ایک غیر قانونی طور پر آئے ہوئے پاکستانی وہ بھی جو یہ کام کا سامنہ دان ہو، اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس لئے دوبارہ یہ کوشش مت کرنا۔ یقین بھارتیوں کی قید سے بہتر ہے۔“ درشتی سے کہتی وہ واپس کا وچ پہ جائیتھی اور سعدی بالکل سن سارہ گیا۔

.....♦♦♦.....

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشین تھا ..... اس کو بھی اپنے خدا ہونے پر اتنا ہی یقین تھا !  
ہاشم کے آفس کے اندر ماحول میں وہی تنا و تھاجو ”دی سعدی یوسف“ کے ذکر پر چھا جاتا تھا۔ ہاشم کی کرسی خالی تھی، کوٹ اس پر انکا تھا، اور خود وہ آستین موڑے ادھر ادھر ٹھہر رہا تھا۔ میز کے سامنے کری پر شیر و بیٹھا ہاتھوں میں ڈیکور بال گھمار رہا تھا۔ خاور قریب میں ہاتھ باندھے کھڑا کھڑ رہا تھا۔

”زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ نیاز بیگ نے اے ایس پی کی کمزون کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اے ایس پی اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں اور وہ اسے بلیک میل کر رہا ہے کہ وہ سعدی کے خاندان کو ساری حقیقت بتادے گا۔“

ہاشم ٹھیلتے ٹھیلتے رکا، غصے سے خاور کو دیکھا۔

”سارے شہر میں ایک بھی کرایے کا آدمی ملا تھا تمہیں جو اے ایس پی کا دشمن نکلے؟“

”اے ایس پی نے پیش کیا تھا سر۔ اس رات وقت کم تھا، اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس کی کمزون کا مجرم نکلے گا۔ اب معاملہ اس کے خاندان کا ہے۔“

”اوہ اگر جو اس نیاز بیگ نے کچھ بک دیا تو؟“

”وہ ہمیں جانتا ہے، نہ اے ایس پی کو ہمارا پتہ ہے۔ میں درمیان والے فرد کو کہہ رہا ہوں کہ اے ایس پی سے کہنے، نیاز بیگ پر ہلکا ہاتھ رکھئے، مگر سرہائی پر و فائل کیس ہے۔ وہ لڑکی سعدی یوسف جیسے خاندان کی نہیں تھی، اس کا خاندان بار سوخ ہے۔ مگر بالفرض وہ کچھ بول بھی دیتا ہے تو بھی ہمارا ذکر نہیں آئے گا۔“

”رکو... وہ چونکا۔“ اس میں فارس یا ز مرکا ہاتھ تو نہیں؟“

”ان کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“ خاور کو تجھ بھوا۔ ”یہ کوئی اڑاں نہیں ہے، نیاز بیگ ہسپتال جا کر اس لڑکی کا کام تمام کرنا چاہتا تھا، پولیس

نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ اور یہ کیس سعدی والے واقعے سے بھی پہلے کا ہے۔

”اگر اس میں ان دونوں کا ہاتھ نہیں ہے تو وہ ایک مہینے سے کر کیا رہے ہیں؟ میں نہیں مان سکتا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔“ ہاشم نے میں سر ہلار ہاتھا۔

”سر میں ان پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ وہ اس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ مگر وہ سعدی کو ڈھونڈ رہے ہیں، اس کے حملہ آوروں کو نہیں۔ وہ روز مختلف ہاپٹلز، مردہ خانوں، سعدی کے جانشے والے دوستوں، اور ہر اس جگہ جاتے ہیں جہاں سے اس کا کوئی سراغ مل سکے۔ وہ واقع غنیمیں بیٹھے، مگر وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔“ خاور جو کہہ رہا تھا وہ درست تھا۔ وہ ان پر بلکل پھلکی نظر رکھے ہوئے تھا، مگر اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بظاہر ان ساری رسومات کو پورا کرتے ہوئے، وہ درحقیقت کیا کر رہے تھے۔

”میرا دل نہیں مانتا۔ کیا ان کو کسی سے بدلا نہیں لیتا؟ یہ ان کا طریقہ نہیں ہے۔“

”سر ان کے خیال میں سعدی زندہ ہے، ان کا کہنا ہے ایک دفعہ دھل جائے، پھر ہم ہر ایک کو دیکھ لیں گے۔“  
(نوشیر والا نے بے زاری سے سر جھنکا۔ ہونہہ)

”سر آپ کہتے ہیں تو میں باقاعدہ ان کا جو بھیں گھٹنے تعاقب کروایا کروں؟ ان کے فوز بگ کر لیتے ہیں، یوں ان کی ہر حرکت پر نظر رہے گی۔“

”ابھی نہیں۔ ذرا نہیں کہ دیکھو۔ ان کو شک نہیں ہونا چاہئے کہ سعدی کے واقعے میں کوئی ہائی پروفائل شخص ملوث ہے۔“ وہ کہ کوڈھن سے جھنک کر وہ واپس کر سی پا آبیٹھا۔ خاور نے بھی سامنے والی کری ٹینچی۔ شیر واب موبائل پہن دبارہ ہاتھا۔ (زندگی سے کبھی سعدی نکلے گا بھی یا نہیں؟)

”اے ایس پی نیاز بیک کو سنبھال لے گا، فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر سروہ ڈاکٹر مزید رقم مانگ رہا ہے۔“  
ہاشم کے ابر و بھنچ۔ چہرے پر ناگواری پھیلی۔ ”کیا مطلب مزید رقم مانگ رہا ہے؟ اس کو کتنا کچھ دلوا کر دیا ہے، اور کیا چاہیے اس کو؟“

”اے اپنے پرائیوٹ ہسپتال کی بلڈنگ مکمل کرنی ہے، بس آخری ٹھیک ہیں، دو تین ماہ میں ہسپتال کا افتتاح کرنا چاہتا ہے۔ اس کو اندازہ ہے کہ اے ایس پی کسی بڑے آدمی کے لئے کام کر رہا ہے، اس لئے وہ بھی بلیک میلگ پا تر آیا ہے۔“

”اف؟“ ہاشم نے پیشانی مسلی، پھر شیر و پہنگاہ پڑی جو نہ کھٹک ناٹپ کیے جا رہا تھا۔

”دیکھ رہے ہو کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے۔“

شیر وہ نے بگڑ کر سر اٹھایا۔ ” المصیبت کو ہسپتال میں ہی ختم کر دینا چاہیے تھا آپ کو۔ خواہ خواہ اسے چھایا۔“

خاور نے تائیدی انداز میں گھری سانس لی۔ ”نوشیر والا صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

ہاشم نے ہاتھ جھلایا۔ ”بکومت۔ ہر وقت دوسروں کا خون بھانے کی بات مت کیا کرو۔“

خاور چند لمحے کے لیے بالکل چپ ہو گیا، پھر وہ آہستہ مگر مضبوط آواز میں بولا۔ ”میرے تین بیٹے تھے مر، جب ایجنسی والوں نے مجھ پر الزام لگایا ان جرام کا جو میں نے نہیں کیے تھے، اور میں نے ان کو مانے سے انکار کر دیا، تو اس بر گیڈیر نے اپنے آدمی بھیجے اور میرے بڑے دونوں بیٹوں کو سر بازار گولیوں سے بھون دیا۔ تب ایک گیارہ سال کا تھا اور دوسرا نو سال کا۔ وہ میری ساری زندگی کی کمائی تھے، مگر ان کو مارتے وقت کسی نے رحم نہیں کھایا، سو یونو وات سر، مجھے اب کسی دوسرے کی فیملی ٹوٹنے سے فرق نہیں پڑتا۔ سعدی یوسف کہتا ہے، فارس غازی بے گناہ تھا۔ میں بھی بے گناہ تھا۔“ تب آپ نے اور آپ کے والد نے مجھے سپورٹ کیا اور مجھے اپنایا۔ میری آپ کے خاندان سے وفاداری

غیر مشروط ہے، اس لیے میں ہمیشہ درست مشورہ دیتا رہوں گا۔“  
ہاشم ذرا ذہلا پڑا، پھر اثبات میں سرہلا یا۔ ”تحیک یون خاوراً، شیر و بھی چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تھا جس کے تاثرات سخت تھے۔  
”بہر حال، میں ایک پائی نہیں دے رہا اس ڈاکٹر کو۔ اے ایس پی سے کہو اپنے بندوں کو خود سنجا لے اور نہ ہم سنجا لے پائے تو  
دوسرا طریقے سے بات کریں گے۔“

خادر نے اثبات میں سرہلا یا اور اٹھ گیا۔ ہاشم نے پیچھے کوئی لگالی اور تجوہی ملنے ہوئے پچھھوپنے لگا۔  
نوشیر والہ نوزٹا نپ کر رہا تھا۔ یکدم رکا۔ اس کی آنکھیں چمکیں، اسکرین پر اس کے ”کیا ہم مل سکتے ہیں؟“ کے جواب میں شہرین  
کا پیغام بالآخر آگیا تھا۔

”ویک اینڈ پر ملتے ہیں۔“  
وہ مسکرا کر جواب ناٹپ کرنے لگا۔

.....  
عجیب خواہش ہے میرے دل میں، بھی تو میری صدا کو سن کر ..... نظر جھک کانے تو خوف کھانے، نظر اٹھانے تو کچھ نہ پائے!  
رمضان کا دوسرا عشرہ چل رہا تھا۔ انگسی کے برآمدے کے آگے بزرہ زار پر شام پھیل رہی تھی۔ ادھر لان چیز رکھی تھیں۔ اور  
صداقت افطار کے برتن لگا رہا تھا۔ دو پہر بارش کے باعث موسم خوشگوار تھا۔ عموماً افطاری سب اندر کرتے، مگر آج مہمان تھے جن کے باعث  
یہاں گھاس پاہتمام تھا۔

سارہ، ذکر یہ بیگم، امل اور نور۔ ان کے آنے سے پر مردہ ہی انگسی کھل سی اٹھی تھی۔ امل نورخنہ اور سیم برا آمدے میں نظر آرہے تھے جبکہ  
بزرہ زار پر رکھی کر سیوں پر ذکر یہ بیگم، ندرت سے با تین کرتی دکھائی دے رہی تھیں اور زمر کے قریب بیٹھی سارہ بالکل چپ تھی۔ اس نے سرخ  
لان کا جوڑا پکن رکھا تھا اور سرخ دوپنہ سر پر پہنچا، آنکھیں ویران سی تھیں۔  
”در اصل میں قھر میں پھنس گئی تھی۔ کچھ کام بہت گز بڑھو گئے تھے۔ مشینری وغیرہ کا مسئلہ تھا جلدی آنہیں حل کی تھی۔ پچھلے ہفتے واپس  
آئی ہوں۔“ ذرا دیر بعد اس نے پھر سے زمزما کو وضاحت دی۔

”اُس اور کے سارہ، آپ فون کرتی رہتی تھیں، یہی بہت ہے۔“

تبھی زمر نے دیکھا کہ ہاشم چلا آ رہا ہے۔ سارہ کی اس طرف پشت تھی، اس نے نہیں دیکھا۔ وہ غالباً ابھی آفس سے لوٹا تھا، سارہ کو  
دیکھتے ہی ادھر آ گیا۔

”گلڈ ایونگ لیڈیز۔“ مسکرا کر مخاطب کیا تو سارہ ایک دم چوک کر مڑی۔  
ہاشم پیچھے کھڑا تھا۔ ذکر یہ بیگم فوراً تھیں۔ وہ ان سے اپنا تعارف کروارہا تھا۔ سارہ کی رنگت زرد پڑتی گئی۔ پیشانی کی رگیں ابھرنے  
لگیں۔

”آئیں ہاشم بیٹھیں۔“ ندرت نے اسے کری پیش کی۔  
”میں کوئی گانہیں، ڈاکٹر سارہ کو دیکھا تو چلا آیا۔ بہت عرصے سے آپ سے اور آپ کے بچوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیسی ہیں  
آپ؟“ سارہ بمشکل کھڑی ہو پائی۔ نظریں ہاشم کے چہرے پر جارکیں، تو اندر کوئی جوار بھائی سا لپکنے لگا۔ دارث کی پیچھے سے جھوٹی  
لاش... پورچ میں گراسعدی... سرخ پانی....

”میں نہیک ہوں۔“ وہ سامنے آبیٹھا تو سارہ واپس بیٹھی۔ ساتھ ہی پرس میں با تھڑا الا، اندر ایک نخا سا چاقور کھا تھا۔

”بچے کہاں ہیں آپ کے؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ زمر نے حنہ کو آواز دی۔ سارہ بے بسی سے زمر کو روکنا چاہتی تھی، مگر الفاظ میں انک گئے۔ حنین، امل اور نور کو لئے باہر نکلی تو ہاشم کو دیکھا چیزہ کھل اٹھا۔

”السلام عليكم!“ حنہ نے مسکرا کر سلام کیا۔ اس نے بھی اتنے ہی مسکرا کر علیکم السلام کہا۔ نگاہیں ملیں تو ان میں کوئی راز چھپانے کی امالة نہ تھی۔ (اب حنہ کے پاس اس کا ذاتی سیل تھا، جو فارس اگلے دن لے آیا تھا۔ اس پر پا سورہ لگا تھا، اور اب اسے ہاشم کے پیغامات ملانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ روزہ ہی بات ہو جاتی تھی۔)

”کتنے پیارے بچے ہیں آپ کے۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا تو امیل اور نور شرماتی، مسکراتی، اس اسارت اور پہنڈسم بندے کے قریب اُ میں۔ سارہ نے پرس کے اندر چاقو پُر گرفت مضبوط کی۔ اس کا تنفس تیز ہو رہا تھا، سرخ ہوتی آنکھیں ہاشم پُر جمی تھیں۔ وہ باری پاری ان بچوں کا پیار کر رہا تھا۔ ان سے اسکول اور یہ حائلی کا پوچھ جھوڑ رہا تھا۔

تبھی ذکیرہ بیگم نے اس کی دلی کیفیت سے یکسر بے خبر ندرت سے پوچھا۔ ”سعدی کا کچھ ہے جلا؟“

سارہ کی نگاہیں ہاشم پر جبی رہیں۔ اس نے اہل کا نرم چھوٹا باتھ تھام رکھا تھا، اور مسکرا کر اس کی بات سن رہا تھا۔ سعدی کے ذکر پر اسے ہل تک نہیں رستگی۔

سارہ نے چاٹو چھوڑ دیا۔ پرس پرے رکھ دیا... پھر چہرہ ندرت کی طرف موڑا۔

”الله غارت کرے ان لوگوں کو جنہوں نے سعدی کے ساتھ یہ کہا۔ اس کو گلہاں مارس، اس کو مارا، پھر بہستاں سے غائب کر دا۔“

اہل پکھ بولے جارہی تھی اور ہاشم مسلسل مسکراتے ہوئے اس کو سن رہا تھا۔ اسے اب بھی کوئی فرق نہیں مڑا تھا۔

”ندرت آپ دیکھنا، اس شخص نے جو آپ کے بچے کے ساتھ کیا ہے، اللہ اس کی اپنی اولاد کو بھی ایسے ہی تڑپا تڑپا کر مارے گا اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے تو اسے پتے چلے گا، کہ کسی کے بچے کا خون بہانا لکھنا دردناک ہوتا ہے۔“

اور سارہ کو نکھیوں سے نظر آیا تھا کہ ہاشم کا ردار کے چہرے کی رنگت ایک دم تغیری ہوئی تھی۔ مسکراہٹ پھیکی بڑی۔

”ایسے نہیں کہتے سارہ، بچے سب کے سانچے ہوتے ہیں۔“ ذکیرہ بیگم نے ٹوکا تھا۔

بلاشم اعلیٰ کی بات ختم ہوتے ہی، بمثکل چہرے کو نارمل رکھے انٹھ گیا۔

”اچھا لگا آپ لوگوں سے مل کر۔“ ایک برہمی نگاہ سارہ پڑال کر (جوڑ کی بیگم کی طرف متوجہ تھی) وہ زمر سے ندر کرنے پر معدتر گرتا آگے بڑھ گیا۔ خاموش بیٹھی خینہ کا دل بجھ گا۔

سارہ بہتر نظر آ رہی تھی، جسے دل کی کوئی بھر اس نکلی تھی۔

گھر آتے ہی ہاشم نے موبائل یہ ایک نمبر ملایا۔

"ہاں فرید... ایسا کرو اور نگزیب کاردار کے نام کی مسجد اور مدرسے میں عید تک افطاری میری طرف سے بھجوایا کرو، پورے اہتمام سے بھجوانا، میری بیٹی کے نام سے، ہاں صدقے کے طور پر۔ نہیں پیار نہیں ہے، بس ویسے ہی۔ یونو۔" کال بند کر کے اسے کافی سکون ملا۔ یہ لیک ہے! ایسے سارے کھا تے کلینیر رہتے ہیں۔ کاروبار بھی چلاو، اور اللہ کو بھی خوش رکھو گذ۔

www.myscript.com

میری صدا ہوا میں بہت دور تک گئی ..... میر میں پلا رہا تھا جسے کے خبر رہا !

ویک اینڈ کی شام بالآخر ان پنچی اور نو شیراں کلب کے لاونچ میں ایک کاؤچ چبیٹھا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس نے بلیک ڈریس گھٹ کے آستین ڈرافولد کر کے تھے اور نیچے خاکی جیمنز تھی۔ بال کنو اکران کی ڈیوڈ بیکمن سپائکس بنائے وہ کافی فریش اور اچھا لگ رہا تھا۔

”ہیلو شیر وَا“ وہ سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر ہاتھ بلایا۔ سفید نائٹس پا ایک کندھے کے بغیر والی شرت، اور گلے میں سکون کی والا۔ کہنی پہ نکبر انڈ بیگ۔ شہرین مسکرا کر اس کے ساتھ صوفے پا آئیں۔ نانگ پہ نانگ چڑھائی۔ پرس درمیان میں رکھا۔

”سوری مجھے دیر ہو گئی۔ اتنا تریکھ تھا آج۔ پھر ماں کو ایک فنکش پہ جانا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی دیر کروادی۔ تم کیسے ہو۔“  
وہ مسکراتے ہوئے ساتھ بیٹھا۔ ”اچھا ہوں۔ لا ہور کا ٹرپ کیسار ہا؟“

”بس تھک گئی۔ ایک فنڈ ریز رکھا، اور ایک سیمنار۔ تم سناو۔ گری زیادہ ہو گئی ہے نا آج کل؟“  
چند فقردوں کے بعد باتیں جیسے ختم ہو گئیں۔ خاموشی چھا گئی۔ قریب سے گزرتی کسی لڑکی نے شیری کو ہاتھ بلایا تو اس نے بھی مسکرا کر ہاتھ بلایا۔ بیہاں سب ان کو جانتے تھے۔ پھر شیر و کی طرف گردن موڑی۔ ”سعدی کا کچھ پتہ چلا؟“  
اور بس۔ مانوسار اموڈی غارت ہو گیا۔

”نہیں۔“ اس کے ابرد بھخ گئے۔

”ویسے تمہیں کیا لگتا ہے؟ اسے کسی نے قید کر کھا ہو گایا مار دیا ہو گا؟ تم نے دیکھا، اس کے بج کے بیس ہزار Likes ہو چکے ہیں۔“  
اوہ بے چارا۔ چیچی۔ افسوس سے سر جھٹکا۔

نوشیر و اس کے لئے مزید ضبط کرنا مشکل تھا۔ وہ گویا کھول کر اس کی طرف گھوما۔

”سعدی، سعدی، سعدی۔ جب بھی ہم ملتے ہیں، اس سعدی کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوتی آپ کے پاس۔ وہ مر کر بھی ہمارے بیچ میں کیوں ہے؟ بھول جائیں سعدی کو۔ مر گیا سعدی۔ جنم رسید ہو گیا سعدی۔ اتنی مشکل سے جان چھڑائی ہے اس سے، مگر آپ پھر اس کو درمیان میں لے آتی ہیں۔“

غصے سے تیز تیز وہ بولتا جا رہا تھا۔ ار گرد چند لوگوں نے گردنیں ان کے کا وچ کی طرف موڑیں۔ شہرین ہکابکا سی اسے دیکھے  
گئے۔ (اتنی مشکل سے جان چھڑائی اس سے... جان چھڑائی...)  
”وہ تمہارا دوست تھا اس لئے....“ وہ انکی۔

”نہیں تھا وہ میرا دوست۔ زہر لگتا تھا مجھے..... میں خوش ہوں کہ وہ نہیں رہا۔ بات ختم۔ کیا بہم کوئی اور بات کر سکتے ہیں؟“ درشتی  
سے کہتا وہ پچھے کو ہوا۔ نظر ایک لڑکے پر پڑی جو پورا گھوم کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”اے۔ کام کرو اپنا۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس کو بھی جھاڑا۔ وہ فوراً کھسک لیا۔ پھر انہی برہم تاثرات سے شہرین کو دیکھا جو ہنوز دم بخود تھی۔

”میں آپ سے سعدی کے بارے میں بات کرنے تو نہیں آتا۔ پھر آپ ہمیشہ مجھے یوں ہرث کیوں کرتی ہیں؟“ ذرا دیر بعد خندی سانس لے کر بولا تو غصہ ذرا کم تھا۔ شہرین نے جھر جھری لیتے ہوئے سامنے دیکھا۔

”اوے کے آئی ایم سوری۔ تم لوگ اچانک اس کے دشمن بن گئے ہو۔ میری معلومات اپ ڈیٹیڈ نہیں تھیں۔ پہلے ہاشم نے اس کو اپنی پارٹی پہ بے عزت کیا۔“ (سو نیا کی سالگرہ یاد آئی۔) ”اور اب تم کہہ رہے ہو کہ... خیر...“ گھری سانس لی، اور اس کو دیکھا تو چہرے پے قدرے رکھائی در آئی تھی۔ گھری سامنے کی۔

”کیوں بلا یا تھام نے؟ کوئی کام تھا؟ مجھے جانا ہے ماں کو پک کرنے۔“

”آپ کو کہیں نہیں جانا، آپ صرف میری بات کا برا مان گئی ہیں۔“ وہ ذرا ناراض ہوا۔

”کیا نہیں ماننا چاہیے؟“

”شہری کیا ہم کبھی اپنی بات نہیں کر سکتے؟ کسی تیسرے فرد کو درمیان میں لائے بغیر؟“

شہری نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سخیدہ نظر آرہا تھا۔

”ہمارے درمیان کون اپنی بات ہوتی ہے؟“

”آپ کو معلوم ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ وہ درآگے ہوا۔ چہرے پر بے بُسی درآئی۔ ”کیا ہم کبھی کبھی یوں مل نہیں سکتے؟ بات نہیں

ملتے؟ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ یہ بات جانتی ہیں۔“

شہرین کی آنکھوں میں ایک دم بے حد اچنبا ابھرا۔ ”شیرہ میں تمہاری بہت پرواہ کرتی ہوں، تم جانتے ہو۔ مگر... تم میرے شوہر کے ہم لے بھائی ہو۔“

”سابقہ شوہر کے۔“

”.... اور میری بُسی کے انکل ہو۔ پھر تم مجھ سے عمر میں گیارہ بارہ سال چھوٹے ہو۔ تمہیں مجھ سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔“ زری سے ٹوکتی وہ پرس اٹھانے لگی۔

شیرہ کی آنکھوں میں بے بُسی کے ساتھ دکھنی ابھرا۔ ”یہ باتیں بے معنی ہیں۔“

”اوکے شیرہ، بہت ہو گیا۔“ اب کے شہرین کی نگاہوں میں خختی اتری۔ ”جو تم کہہ رہے ہو وہ بے معنی ہے۔ ہم رشتے دار ہیں، اور انھے دوست بھی۔ مگر اس سے آگے کامت سوچنا۔ مجھے بہت برالگا ہے تمہاریوں کہنا۔“ ڈپٹ کر بولتی وہ پرس اٹھانے اٹھی اور باہر کی طرف ہمی۔ نوشیر وال پیچھے لپکا۔

”پھر مجھے بار بار استعمال کیوں کیا؟“ وہ غصے اور بے بُسی سے بولتا اس کی تیز رفتار سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میری زری کا فائدہ یوں اٹھایا؟“

”میں تمہیں صرف ایک اچھا دوست سمجھتی ہوں۔ مجھ نہیں پتا باقی تمہارا ذہن کیا کیا گھڑ کر تمہیں دکھاتا رہا۔“ وہ تیز قدموں سے ہٹتی باہر جا رہی تھی۔

”اگر میری جگہ سعدی یہ بات کہتا تو مان لیتیں آپ؟“

”تم دونوں ہی میرے لئے پچ ہو۔ اور وہ ایسی بات کبھی نہ کہتا۔ میرا احترام کرتا تھا وہ۔“ وہ باہر نکل گئی۔ کھلے لان میں اب وہ اکے جارہی تھی نوشیر وال رک گیا۔ بے بُسی اور دکھنے اسے جاتے دیکھا۔

”اس کو اتنا اچھا سمجھتی تھیں تو میرے سامنے اس کو اتنا برا کیوں کہا؟ آپ کو اندازہ بھی نہیں کہ میں نے.... میں نے کیا کیا آپ کے لئے....“ وہ پیچھے سے چلا یا تھا۔ شہرین کے قدم رو۔ وہ گھومی۔ ہاتھ کا جھجھ ماتھے پہ بنا کر دھوپ کے باعث پتیاں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ وہ گلابی ہم سے کے ساتھ آنکھوں میں پانی لئے غصے اور صدمے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”گیٹ اے لاکف، شیرہ!“ وہ اپس پلٹ کر آگے بڑھ گئی۔ اس شے کوڑہن سے جھکتی جو نوشیر وال کے الفاظ اور اندازے سے بتا رہے تھے۔ پچھے عجیب ساتھا اس کے سرخ بھبھوکا چہرے پر اس وقت۔ وہ کسی اعتراض سے چند لمحوں کی دوری پر تھا۔



دیکھتا ہوں سب شکلیں، سن رہا ہوں سب باتیں ..... سب حساب ان کا ، میں ایک دن چکا دوں گا !  
فودی ایور آفتر پر گا کھوں کا معمولی رش تھا۔ ندرت کا دنتر کے ساتھ رکھی میز پر کچھ بلز وغیرہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کا خول جو سارہ اور بھجوں کے آجائے سے ذرا مختلا تھا، پھر سے واپس پتھر بن گیا تھا۔ قریب سے جنیدڑے اٹھائے گزر رہا تھا۔ تبھی راستے میں اچانک سے گل خان

آکھڑا ہوا۔

”کیا ہے؟“ جنید نے بدقت کو فت چھپائی۔ (سعدی کا لاؤلا۔ ایک مہینہ پشاور میں گزار کر بالآخر یہ واپس آگیا تھا۔)

”جنید بھائی، یہ تم سعدی بھائی کی بچپن کے لئے جارہے ہونا؟“ نرے میں کافی سکے کی طرف اس نے اشارہ کیا۔ ”یہ بھیں دے دو، ہم لے جائے گا۔ دے دو بھائی!“ جنید نے ایک بے بس نگاہ ندرت پر ڈالی جو بنے نیاز بیٹھی کام کر رہی تھیں اور نرے اسے تھامی۔ ”خود منہ نہ لگانا۔“

”ایسا کوئی مفت خورہ سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں بھائی؟ لا حول ولا قوہ،“ بگڑ کر کہتا نہ رے اٹھائے سینہ ہیاں چڑھتا گیا۔ جب اوپر دروازے سک پہنچا تو نیچے جھانکا۔ جنید ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سکے گھونٹ بھرا۔ (آہ اس ریسٹورانت کی لذیذ کافی) اور ہونٹ صاف کرتے سنجیدہ چہرہ بناتے دروازے ہٹکھٹا کر کھولا۔ اگلا منظر سا کھلتا گیا۔

اوپر والا کمرہ اتنا ہی کھلا تھا جتنا نیچے ریسٹورانت تھا۔ گرفرش خالی تھا۔ دو یواریں شیشے کی تھیں جن کے پار انہیں میں جگہ کتے شہر کی بیان و کھائی دے رہی تھیں ایک بڑی میز پر کاغذ اور فائلز بکھری تھیں۔ فارس پشت کیے کھڑا ایک فائل کے صفحے پلنار ہاتھا۔ ساتھ ہی کری پٹا نگ پٹا نگ جمایے، قسم الگیوں میں گھماتی زمر بیٹھی، نبی میں سر بلاتی کہہ رہی تھی۔ ”اب سرمد شاہ کو دیکھنے کا وقت ہے، میرا خیال ہے...“ آہست پر گردن گھماتی تو گل خان کو آتے دیکھ کر نرمی سے مسکراتی۔ ہاتھ بڑھا کمگہ اخایا۔

”ارے گل خان۔ تم اتنا عرصہ کہہاں تھے؟“ وہ سعدی کی لگندگی کے دنوں میں آجاتا تھا، پھر درمیان میں مہینہ بھرنہ آیا تھا۔ فارس نے پلٹ کر بس ایک نظر دے لی۔

”باجی ام پشور گیا ہوا تھا۔ اما رابا کا بچازاد بھائی مر گیا تھا۔“ ہاتھ جھلا کر کہتا وہ کری کھجھ کر سامنے میجا۔ وہ بارہ تیرہ سال کا بچوں لے سیب سے گالوں اور بھورے بالوں والا پھان لڑکا تھا۔ شلوار قمیص پہنتا اور پانچ ٹنخوں سے اوپر رکھتا۔ سر پر پشاوری نوپی تھی۔

زمر جو بغور کافی سکے کو دیکھ رہی تھی، اس بات پر نظریں اٹھائیں۔ ”بہت افسوس ہوا۔ ویسے یہ کافی بہت سیئی ہے ہے نا؟“ کپ لبوں سے لگاتے مسکرا کر پوچھا۔ گل خان نے بے اختیار تھوک لگا۔ اور ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بات بد لئے کی غرض سے جلدی سے بولا۔

”باجی، تم ادھر کیا کر رہی ہو؟“

”نیچے کشمکش ہوتے ہیں، اور مجھے کام کرنے کے لئے جگہ چاہیے تھی، اوپر والا ہاں ویسے بھی رینو ولشن کے لئے بند پڑا تھا، سو بھا بھی نے مجھے دے دیا۔“

”اچھا۔“ اس نے اثبات میں سر بلایا۔ ”بچ باجی، اس دن ام حیات آباد میں اپنے چاپے کی دکان پر بیٹھا تھا، تو ہمیں یاد آیا، جب سعدی بھائی کھو یا تھا، اور تم ادھر سارے ملازموں سے پوچھ رہی تھی کہ بھائی کا کسی سے جھگڑا اتھا یا دشمنی تو نہیں تھی، تو واللہ باجی، اس دن یاد آیا، ایک دفعہ بھائی کا دھڑکا سا جھگڑا ہوا تھا، ریسٹورانت کے باہر کی سمت اشارہ کیا۔

وہ جو دیوار پر لگی تصویریں دیکھتے، کچھ سوچ رہا تھا، چونکہ کرگل خان کو دیکھنے لگا جوز مر کے سامنے بیٹھا تھا۔ زمر نے ناگ سے ناگ بھائی اور سیدی ہی ہو کر بیٹھی۔ آنکھیں سکریں۔

”کس سے ہوا جھگڑا؟“

”ایک آدمی تھا اس کی بیگنی سی ڈبے گاڑی تھی، بوت بیگنی والی۔ پڑتے ہے اس کی گاڑی کی...“

”جھگڑا اسکے بات پر ہوا تھا؟“ فارس نے تو کا۔

”ہمارے اوپر ہوا تھا!“ اس پھانہ میں آف ٹرائے نے فٹر سے بینے پہ باتھ مارا۔

”وہ ہم کو کچلنے والا تھا، مگر بھی ہماری زندگی باقی تھی ہم فوج گیا۔ وہ نکلا اور تمیں انگریزی میں ڈانٹا۔ تھمی سعدی بھائی کلک کر آیا اور اس اونچی انگریزی میں کوئی لمبی سی بات کی۔ پھر وہ کار میں بیٹھا اور جلا گیا۔“

”اور جھگڑا کب ہوا؟ مطلب دونوں نے ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھایا؟ گالیاں دیں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ گل خان کو اپنی روادا ایک مہل تلنے لگی۔ ذرا دھیلا پڑا۔

”نبیس ایسا کچھ نہیں ہوا، مگر جو اس نے انگریزی میں بولا.....“

”تمہیں انگریزی آتی ہے؟“ فارس نے پھر تو کا۔

گل خان کی غیرت اور حمیت پر گویا تازیا شپر۔ تملکاً کر گھوما۔

”گل خان پانچویں فیل سہی، مگر جھگڑے والا الجہ خوب سمجھتا ہے۔“ غصے سے کان سرخ ہوئے تھے۔

”اچھا یہ بتاؤ۔“ زمر نے پنج کی عزت رکھنی چاہی۔ ”وہ کون تھا؟ کیسا لگتا تھا؟“

گل خان نے ایک ”ہونہبہ“ والی نظر فارس پر ڈالی، فسی ادا کارہ کی طرح سر جھکا اور باجی کی طرف متوجہ ہوا۔ (یہ ملکہ کی آن بان والی ہندی اسے بہت اچھی لگتی تھی اور اس کا شوہر اتنا ہی برا۔ ہونہبہ) ”اب اتنا شکل نہیں یاد مگر ایسے لش پش کپڑے تھے، بال اور کھڑے تھے اور دونوں سے نیچے یہ چھوٹی سی داڑھی تھی۔“

”فرج کچ کرت؟“

”ہاں وہی۔ اور... باجی اس کا گاڑی بوت مہنگا تھا۔ کوئی چار پانچ کروڑ کا ہوگا۔“ زمر نے گہری سانس لی۔ بچا ب لمبی چھوڑ رہا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے چار پانچ لاکھ؟“

”نبیس باجی، چار پانچ لاکھ کا تو تین چار گاڑیاں گل خان بھی خرید لے، اس کا گاڑی کروڑوں کا تھا۔ سعدی بھائی نے خود بتایا تھا۔“ اس نے ذرا بے کی سے زور دیا۔ زمر اس کو جانے کا کہنے لگی تھی کہ فارس ایک دم چونکا۔

”ایک منٹ... کار کار گنگ کیا تھا؟“

”سفید!“ اس کی آنکھیں چکیں۔ فارس اور زمر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”نوشیر وال کی روشن رائس!“ ایک دم ڈہن میں جھما کہ ہوا۔

مگر جب جنید کو بلا یا تو اس نے عام سے انداز میں سارا قصہ دہرا یا۔

”فارس بھائی، کوئی جھگڑا اور غیرہ نہیں ہوا تھا۔ یہ بچہ اپنائی بد تمیز اور شراری ہے۔ اس کی گاڑی کے نیچے آنے لگا تھا۔ غلطی اس شخص کی نہیں تھی، سعدی بھائی باہر گئے اور جا کر اس سے صرف بات کی۔ میں ذرا دور تھا، نہیں مگر آدمی غصے میں لگتا تھا، ظاہر ہے بچہ مرتے مرتے بچا تھا۔ سعدی بھائی نے نہیں تھنڈے طریقے سے اسے دوچار باتیں کہیں، وہ پلت کر چلا گیا۔ جواب میں کچھ بھی کہے بغیر۔ میں نے بعد میں پوچھا کہ یہ کون تھا۔ سعدی بھائی نے کہا میرا پرانا دوست ہے۔“

”ٹھیک ہے، کوئی ایسی بات نہیں ہے، میں دیکھ لیوں گا۔“ فارس نے بے تاثر سے انداز میں ان دونوں کو جانے کا اشارہ کیا۔ گل خان نے ایک پر امید نگاہ زمر پر ڈالی جو کچھ سوچ رہی تھی، اور پھر دوسرا (شدید کینہ توڑا اور رقبابت سے بھری) نظر فارس پر ڈالی اور پھر بے دلی سے انہکر باہر نکل گیا۔ ریسورانٹ کے باہر اپنے پھولوں کے اسٹال کے ساتھ آ کر وہ کھڑا ہوا تو سخت کبیدہ خاطر لگ رہا تھا۔

”ہمارا بات کا تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، سارا بات باجی اسی فارس بھائی کا سنتی ہے، ہر روز شام کو ادھر آ جاتا ہے، ہونہبہ!“ غصے سے منہ میں بڑھ رہا۔ پھر احتیاط سے لباس کی اندر ورنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا تو پھرے پر غصے کے ساتھ ساتھ دلکھ بھی تھا۔

”وہ شکل کا اچھا ہے تو کیا ہوا، گل خان بھی کسی سے کم نہیں۔ اب جب تک یہ باجی کے پاس رہے گا، ہم بھی یہ ہیرے والا چابی مالی کو نہیں دے گا۔“ مٹھی کھول کر دیکھی تو اس میں سیاہ مصنوعی ہیرے والا کی چین تھا جس پر Ants Everafter لکھا تھا، اور اس میں چاپوں کے ساتھ ایک سلوپیں بھی تھی تھا۔ گل خان نے چند لمحے افسوس سے سعدی کے کی چین کو دیکھا اور پھر اسے احتیاط سے واپس اندر ملی جیب میں رکھ کر جیب کی زپ پر بند کر دی۔ ایک کینٹ تو نظر اوپر ریٹورانٹ پڑاں اور پھر سر جھنک کر اشال کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چند لمحے وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے تھے۔

”سو نیا کی سالگردہ والے دن بھی شیر و نے سعدی سے تلخ کلامی کی تھی، میں درمیان میں آیا تو وہ مختصر پڑ گیا۔“

”خیز وہ اس کا دوست تھا، دوستوں میں ایسی باتیں ہو جاتی ہیں۔“ وہ کہنے کے ساتھ فون پر نمبر ملارہی تھی۔ فارس خاموش ہو گیا مگر، پچھے سوچ رہا تھا۔

”نوشیر وان“ میں زمر بات کر رہی ہوں...“ گھری سانس لی۔ ”میں اب ڈی اے نہیں ہوں۔ آپ مجھے صرف مسز زمر کہہ سکتے۔“ اچھا آپ گھر پہ ہو؟ اوکے، میں تراوٹ کے بعد گھر آ جاؤں گی، مجھے آپ سے ملتا ہے۔“ اور موبائل کان سے ہٹایا۔ فارس سینے پر بازو لپیٹے میز سے کنارے سے نیک لگائے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”وہ سعدی کا دوست ہے،“ میں اس پر شک نہیں کر رہی، مگر ہو سکتا ہے وہ سعدی کے مزید دوستوں کے بارے میں پچھے جانتا ہو۔ ”لڑکی جو سعدی کے ساتھ تھی میں نہ طور پر شاید وہ اس کو جانتا ہو۔ وہ پچھے تو چھپا رہا ہے۔“

”ویسے وہ لٹی کھوپڑی کا بگڑا بچہ ہے، اس کا دماغ اتنا دور تک نہیں جایا کرتا۔ پھر بھی آپ اس سے یہ بات کلیئر کر لیجیے گا۔“ اس سے عادتاً اسکی نوٹس کا پیدا اٹھایا قلم سے اس پر لکھا۔ ”گل خان، ڈبہ گاڑی، نوشیر وان۔“ اردو میں یہ الفاظ لکھ کر اس نے میز کے کونے پر چکا، تاکہ زمر کو یاد رہیں۔ اور خود مزد کر دیوار کی طرف چلا گیا۔

”ہم اے ایس پی کی بات کر رہے تھے۔ فارس، اب ہمیں اس کو کارنر کرنا چاہیے۔“

”نہیں، پہلے ڈاکٹر بخاری۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔

”وہ سجن جس نے سعدی کا آپریشن کیا تھا؟“

”وہ اس رات کال پہ نہیں تھا، سعدی کو ہسپتال لانے کے بعد وہ اچانک سے آیا اور نیک اور کر لیا۔ اسی نے وارڈ یوائز بھیجی، اور اسی نے سعدی کو ہسپتال سے نکلوایا ہے۔ وہ راہداری جس کی اصلی فوٹچ نکال کر ایک ہی کلپ بار بار دھرایا گیا ہے، میں نے اس سے ملحقہ“ راہداریوں کی فوٹچ چیک کی ہیں۔ دلوگ باری باری دہا مڑے ہیں۔ ایک اے ایس پی، اور دوسرا وہ ڈاکٹر۔ یعنی اے ایس پی نے ڈاکٹر ساتھ اس کا ریڈور میں باتیں کی تھیں، اور بعد میں وہ فوٹچ مٹا دی تاکہ پتہ نہ چل سکے کہ ان دونوں نے مل کر یہ کام کروایا ہے، اس لیے پہلے، ڈاکٹر!“

”تم نے کہا تھا کہ ہر چیز میری مرضی سے ہو گی۔“

”سب آپ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔“

”کیا واقعی؟“

”آپ کو سعدی واپس چاہئے نہیں؟“ وہ چپ ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، پہلے ڈاکٹر ہسپتی!“ قلم انگلیوں میں گھماتی وہ خشک سا بولی۔ کام اپنی جگہ، گریز اور اعراض اپنی جگہ۔ اگر مجھے تمہارے اس کے لیے مغلص ہونے کا یقین نہ ہوتا، تو میں کبھی بھی تمہاری بات نہ مانتی، اور.....“ قلم گھماتی انگلیاں ٹھیمیں۔ نگاہیں میز کنارے پر چکے نوٹ پر

ہالہمہریں تھیں جو فارس نے ابھی لگایا تھا۔

”گل خان ڈبہ گاڑی، نوشیر وال۔“ اس نے ان الفاظ کو پڑھا ایک دفعہ دو دفعہ... شاید دس دفعہ، نگاہ اٹھا کر فارس کو دیکھا، پھر ان اللاظ کو۔ پھر نوٹ اتار کر مٹھی میں دبایا۔ پس اٹھایا، اور ایک عجیب سی نظر اس پر ڈالتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ فارس نے اچنپے سے اسے ہاتے دیکھا۔

(اب اسے کیا ہوا؟ پھر تو نہیں دماغِ الٹ گیا؟)

.....  
کیا روز تماشہ کہ نیا خواب، نیا غم ..... مرنے کی جو ٹھانی ہے تو اک بار میں مر بھی!  
قصر کاردار میں ڈریبل خوبصورتی سے بھی تھی۔ سب کھانا کھا رہے تھے جب زمر کافون آیا تھا۔ نوشیر وال نے موبائل بند کیا تو ہاشم اور جواہرات اسی کو دیکھ رہے تھے۔

”زمرم سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟“

”پتہ نہیں۔“ شہرین کے صبح والے برتاوے کے بعد وہ جو بدقت سنبھلا ہوا لگ رہا تھا، اس کال پر رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ نگاہیں جھکا لیں۔ ہاشم نے ٹمپین مروڑ کر میر پر ڈالا۔ اکتاہٹ اور بے زاری سے۔ جواہرات نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”ہاشم کیا ہو رہا ہے؟“ ٹمپین نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا تو ہاشم کری دھکیل کر اٹھا۔ ”میرے کمرے میں آئیں۔“ ساتھ ہی ڈیوٹی پکھری فیکھ ناکو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً پلٹ گئی۔

”ہاشم تم...“

”میرے کمرے میں آئیں می۔“ ایک ملامتی نظر نوشیر وال پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ نوشیر وال بے زاری اور تملہ اہٹ سے اٹھا تھا۔

پندرہ منٹ بعد ہاشم کے بند دروازے کے پیچھے کا منظر قطعاً خوشگوار نظر نہیں آ رہا تھا۔ نوشیر وال بیڈ کے کنارے بے زاری سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ہاشم کا ڈچ پٹانگ پٹانگ جمائے صوفے کی پشت پر بازو پھیلائے برا جمان تھا اور جواہرات... وہ جلدی پیر کی شیرنی کی طرح آگے پیچھے پھر کاٹ رہی تھی۔ اس کی رنگت سفید اور سرخ کے درمیان بدلتی رہتی، اور آنکھوں میں صدمہ بے یقینی، غصہ سب کچھ تھا۔

”تم....“ رک کر نوشیر وال کو گھوڑا، اور تین انگلیوں سے اس کی تھوڑی پکڑ کر زور سے جھکا دیا، شیرو نے (اوہہوں) منہ پرے ہٹایا۔ ”تم انتہائی احسان فراموش انسان ہو۔ اس نے جان بچائی تھی تمہاری۔ اور تم نے اس کو مار دیا؟ اور تم؟“ پلٹ کر شعلہ بار نظر ہاشم پر ڈالی۔ ”اگر وہ مر رہا تھا تو کیا ضرورت تھی اس کو اتنے تردید سے وہاں سے نکالنے کی؟“ وہ اتنی دیر سے بول بول کر اب ہانپئے گئی تھی۔

”اس کو مر نے دیتا اور شیر و کو قتل بنادیتا؟ کیا یہ اتنے بڑے گلٹ کے ساتھ ساری زندگی گزار سکتا تھا؟“ وہ بھی بڑھ ہوا۔ (شیر و کچھ بڑا یا۔)

”اور مجھے بتانے کا رادا کہ کب کا تھا؟ تھا بھی یا نہیں؟“

”اوے کئی، بہت سن لیا میں نے۔ اب بس کریں، بیٹھیں اور سوچیں کہ اب کیا کرنا ہے۔ زمر شیر و سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟“ ”تم مجھے بتاؤ گے کہ اب کیا کرنا ہے؟“ وہ غرائی تھی۔ ”اس گھر کی اس امپائر کی ملکہ میں ہوں، یہ فیصلے میں لیتی ہوں کہ کون کیا کرے گا۔ سمجھئے تم!“ ہاشم گھری سانس لے کر رہا گیا۔

”یہ سنبھال رہے ہو تم چیزیں کہ ابھی ڈیڑھ ماہ نہیں ہوا اسے کھوئے اور زمر کو اس پر شک ہو گیا ہے۔“ ملامتی نظر ان دونوں پر ڈالی۔

جواب کے لئے مکمل پڑھنا پڑتا ہے

"میر، کوئی اپنے بھی کر لکا۔ جس نتھیں میں تھے اُن کے اکٹھا کر دیجئے گے۔"

وَالْمُؤْمِنُونَ الْمُؤْمِنَاتُ وَالْمُؤْمِنُونَ الْمُؤْمِنَاتُ

سید علی بن ابی طالب

"کوئی نہیں۔ ۱۷۲۰ء میں کیا کہ کر سکتے تھے؟ آئی تھی بارگی میں، ہم اپنی دوڑ پڑھ لے گے۔" بارگی کے مطابق اسی کے مطابق ہے۔

لورڈ سٹی ہاؤس کے سطح پر اسی سکائی لائی کامپنی کی کوئی قدرانہ حکومتی بھروسے نہیں کی جاتی۔

سوسن میں اگلے بارہ سو سال کے بعد میں اپنے بھائی کے ساتھ پرانی خانہ بندی کے قریب پہنچا۔

او ایک مددگاری کی طرح ہے جو ہمارے باتوں کی سرگرمیوں کے لئے کامیابی کا پیشہ کرے۔

Digitized by srujanika@gmail.com

”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ كُلُّ خَلْقٍ يُنَزَّلُ إِلَيْهِ“

"کوئی کوئی نہیں ملے جائے گا۔" ۱۶

19. *Leucosia* (Leucosia) *leucostoma* (Fabricius)

*Journal of Research of the National Bureau of Standards*

#### Classification

Figure 1. The effect of the number of nodes on the performance of the proposed method.

کلکتیوں کے لئے ایک ایسا مکان تھا جو اپنے علاوہ اپنے کام کے لئے بھی مفید تھا۔

Fig. 12. - *Streblus fimbriatus* (Linné) (continued).

وَمِنْهُمْ مَنْ يَرْجُوا أَنْ يُخْلَدُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا يَرْجُوا مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا نَعْلَمُ مَا يَرْجُونَ

میراث اسلامی و سنتی ایرانی را در سراسر جهان ایجاد کنید.

کتابیں ملے تو پہنچتے ہیں اسی کا سب سے بڑا سرچ

وَالْمُؤْمِنُونَ الْمُؤْمِنَاتُ لِلرَّحْمَةِ وَالرَّحِيمِ

لے کر مدد گاریں اور میں تک بڑا مل ساٹے ہوں یاد پڑے تو کیسے ہے۔

۲۰۱۷ء کے ایک بڑے ایجاد میں اسی نام پر ایک بزرگ ایجاد کیا گی۔

لیں ہے اس کا پس سے بھوت بخوبی لگتی اپنی تاریخی لی ماتھ دل کی قلبیں اس کے پورے پھرستے نہیں۔

"کیوں آپ نے مجھے بالکل میں وکیلیا تھا اس تو کر کرتے ہوئے۔" تھا جیس پشیمانی سے جوکا ایں۔ "میں سگرست نہیں لیا رہا تھا۔" "اوہ" اس کی آنکھیں تعجب سے بچلیں۔ "آپ ذرگزا استعمال کرتے ہو؟"

"بیز بی یا بھائی کو مت ہتا یہ گا۔ بھائی مجھے بان سے مار دے گا۔ اسی لئے میں نے آپ سے بھوت بولا۔ آپ بھی کو بتا دیں گی" "مجھے بھی ارتقا۔"

"آپ اپنی بالکل میں اس تو کر کر رہے تھے اور آپ کے گمراہ اوس کا نہیں پہاڑا؟"

"پہلے یہ تھا جب میں ذرگزا لیتا تھا پھر سعدی نے بہت مشکل سے میری عادت بچڑھاتی بھی اور بھائی کو نہیں پہاڑا میں بھر سے لیتے لگ گیا ہوں۔ صرف سعدی کو پہتھا۔ ظاہر ہے وہ تھوں سے ہر بات نہیں بھیت۔ میں اسی لئے اس کے آخری رتوں میں اسے بھی ادا بیٹا کر دیا تھا۔ مگر اب... آکی سو یہ نہیں بچوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں جس آپ کسی کو پہتمت ہاتھا یہے گا۔"

ذرا پچھہ لئے غور سے اسے دیکھی رہی۔ "آپ کا سعدی سے بچڑا کیوں ہوا تھا۔ اس کے راستوراٹ کے باہر اور پھر بیان پارنی میں؟"

"بچڑا" نو شیر داں کی آنکھوں میں حیرت اتری (اور دل کا اپ کر رہا گیا)۔ "میرا تو اس سے کوئی بچڑا نہیں ہوا۔ ہاں بس اس نے مجھے بچڑا قی ذرگز کی وجہ سے ادا میں اس کو اتنا بخوبی کر رہا تھا۔ مگر مجھے پہاڑے ہے، میرا بچڑا ہی پاہتھا تھا۔"

"اوکے تھیک ہے نو شیر داں۔" اس نے سر بلایا الودا تھی انداز میں اور بگات میں گھر کی طرف بڑھا گئی۔ اس کے ذہن میں فی الحال کچھ اور چال رہا تھا۔ نو شیر داں نے سکراتے ہوئے اسے واپس جاتے دیکھا اور پلت گیا۔ بیسوں میں، کچھ ہاتھ پیسے میں جیک پکے تھے اور دل ہنوز زور سے دھڑک رہا تھا۔ ملک خلک تھا۔ مگر جو اہم اس کے دینے اعتماد (اور پائش کی آئندھی کی Witness Preparation) نے اقی ثابت گردیا تھا کہ وہ ایک کاردار ہے۔ آخری قہقہہ اسی کا ہو گا۔

میں اپنی جناؤں پر نام نہیں ہوا تھا

میں اپنی وفاوں کی تجارت نہیں کرتا

ذرا اندر آئی تو لایا جیسی بھٹکتے تھے لاڈنی میں۔ سعدیات اور سکم فی ولی کے آگے جزو کر دیتے، کوئی دو کان رمضان فرائیں دیکھ رہا تھا۔ اسی دل کا رہا تھا۔ وہ سلامہ دعا کیے بغیر سیدھی اور پر چلی گئی۔ ہاں نے فرمندی سے اسے دیکھا تھا۔

کمرے میں آکر اس نے چیزیں کویا بچھیں اور فارسی کیکی چٹ لئے؛ درستگی نہیں تھی۔ مختلف خانے کھو لے۔ آگے بچھے ہاتھ مارا۔ بے حد آر گانا نہ زمر کو دہ دیتی ڈھونڈتے میں تم منٹ لگ۔ اس نے سیاہ گلیں وہی کھوئی، بھی زمانے میں اس ذہنی میں اس کو وہ لوگ فلی تھی۔ اور لوگ کے ساتھ ایک چٹ بھی تھی۔ ذرا لے وہ چٹ نکالی۔ اور پھر دلوں پر چیباں کھول کر سانے کیں۔

الفقاٹ مختلف تھے۔ مگر دلوں اور دوہنیں لکھی گئی تھیں۔ تھائی دا جھی تھی نہ بڑی۔ مگر وہ ایک تھی۔ "کاف" کی آنکھاں یا ان کی گواہی، اکل ایک تھی۔ وہ جیس زمین پر بھٹکتی چلی گئی۔ حق در حق۔ متحیر۔ شل۔ یا، بار ان الفقاٹ کو بھیج کر۔ اکل ایک سے۔

پھر سکھار بیز پہ بھیلیاں رکھ کر وہ بھڑی ہوئی تو آئئیں میں بھس نظر آیا۔ گھنکر یا لے بال کھلے تھے۔ پھر وہ ذر دل، آنکھوں میں بھیبی

حیرت اور صدمہ تھا اور ناک... ناک میں او لوگ دیک رہی تھی۔ وہ تھسا الماس (بیڑا) اس وقت زمر یوسف کی پوری زندگی کو تھہڑا ہا لا کر رہا تھا۔

بھر ان بھوری آنکھوں میں فصل بھڑا۔ اس نے فوج کر دہ لوگ اہاری۔ کسی سکروہ شے کی طرح ذہنی میں دال کر بندی۔ پھر باہر نکل۔ ساتھ دا لے کمرے کا دروازہ بختکھا لیا۔ حد تے فوراً یہ کھول دیا۔ اس کو دیکھا تو داری کو خبری۔ اسکی آنکھوں میں سرخ تکریں

اپھری ہوئی تھیں، لب بچنے ہوئے تھے اور... ناک  
میں لوگ نہیں تھی۔ حین کی ابھی ہوئی نگاہیں اس کے ہاتھ پر جارکیں۔ زمر نے ہتھیلی سیدھی پھیلا رکھی تھی۔ ”میری نوز  
رنگ، حین!“

”جی؟“

”میں نے کہا حین یوسف کے مجھے میری نوز رنگ واپس چاہیے۔“ چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔ حین کی ناگوں سے جان نکل گئی۔ اس  
نے پہلی دفعہ زمر کو اپنے ساتھ اتنے کثیلے اور سرد لبجے میں بات کرتے دیکھا تھا۔ اور جیسے زمر کو دو جا رکرنے میں چند منٹ لگے تھے خدہ کو بھی  
توھڑی ہی دریگی۔ وہ خنک لبوں پر زبان پھیرتی پہنچی، اور الماری کھولی۔ آگے پیچنے باہمہ مارا۔ پھر ڈرینگ ٹیبل تک آئی۔ اس کے ایک ایک  
خانے کو چیک کیا۔ زرتاشہ کی ساری چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ کچھ الہبز۔ کچھ سی ڈیز۔ بے حد دس آر گناہزد حین کو نتھ کی ڈبی ڈھونڈنے میں  
کچھ دریگ لگی اور پھر اس نے جھکی نظرؤں کے ساتھ ڈی اس کی طرف بڑھائی۔ زمر نے اسے جھپٹا اور ملائمتی نظر دل سے اسے گھورتی مزگی۔  
فارس اور ندرت اکٹھے واپس آئے تو رات مزید تاریک ہو چکی تھی۔ وہ لاونچ میں کھڑا بڑے اباۓ رکی کلمات کہہ رہا تھا جب خدہ  
آہستہ سے اس کے قریب آئی۔ جب وہ متوجہ شہ بواتو اس کی کہنی ہلائی۔ وہ چونک کرمزا۔

”کیا؟“

حین نے ابرو سے اوپر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”انہیں کیسے پہنچا؟“

”کیا؟“ فارس کو اچھدا ہوا۔

”اوہ۔“ (تو بھی اس کی پیش نہیں ہوئی تھی۔) ”پھپھوک دیکھ لیں، وہ آتے ساتھ ہی کمرے میں بند ہو گئی ہیں۔“ بکسا کہا مگر ندرت  
نے سن لیا۔ اب انے بھی گردن موڑی۔ لاونچ میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ فارس نے محسوس کیا سب اسی کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ کسی  
سے بھی ناکاہ ملائے بغیر سیرھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بید کے کنارے بیٹھی تھی۔ رخ موڑے۔ وہ اندر آیا۔ کوت اتارا۔ اسے لٹکایا۔ سرسری سی نظر اس کے سر کی  
پشت پڑا۔ کمرے میں خاموشی آیا کہ ہوا کیا ہے۔ اور تب اس کی نگاہ اپنے صوفے پر پڑی۔  
اس کے سرہانے سیاہ مخلیں ڈبی رکھی تھی۔ فارس نے چونک کراۓ دیکھا جواب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے سامنے، بینے پر  
بازو لپیٹنے، جھمٹی نظرؤں اسے دیکھ رہی تھی۔

فارس کے چہرے کے تاثرات سخت اور سپاٹ ہو گئے۔ ڈبی انھائی اور اسے سنگھار میز پر زور سے رکھا۔ ”واپس کرنے سے بہتر ہے  
اسے پھینک دیں۔“

زمر کی آنکھیں میں دکھ کے ساتھ ملامت بھی اپھری۔ ”تم کب مجھے دھوکہ دینا چھوڑو گے؟ فارس؟“  
”میں نے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔“ وہ بھی سامنے آ کھڑا ہوا اور لبجے کو برہم کیا۔ ”اسنہوڑ نہیں مجھر زکو گفشن دیتے ہیں۔ میں نے بھی  
دے دیا۔ پہننا یا نہ پہننا آپ کا فیصلہ تھا۔“

”تم نے اپنا نام نہیں لکھا تھا اور پر۔“

”آپ میری لکھائی پہچان سکتی تھیں۔“

”اگر تمہیں بھول گیا ہے تو یاد کروادوں، قانون کی کتاب میں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ میں نے تمہاری انگریزی کی لکھائی دیکھی تھی  
صرف۔ پھر تم نے نام کیوں نہیں لکھا؟“ اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

”او کے فائن!“ وہ بھی اونچا بولا تھا۔ ”نمیں لکھا، نہیک ہے نمیں لکھا۔ تو کیا کریں گی آپ؟“ زمر کی آنکھوں میں پانی سا بھر آیا۔

”تم اتنے سال میر انداز اڑاتے رہے، تمہیں بالکل کوئی لحاظ نہیں آیا۔ میں تمہاری تجھر تھی!“ بولی وہ غصے سے تھی، مگر آواز گلی تھی۔ اور ان بھوری آنکھوں میں آسودہ یکھنا۔ فارس نے سر جھکنا۔

”جب آپ کو گولی مار سکتا ہوں تو کچھ بھی کر سکتا ہوں، میں تو ہوں ہی برا۔ اس لئے میری طرف سے.... پھینک دیں اسے یا آگ ہیں ڈال دیں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں معدرت کروں گا، تو یہ میں نہیں کرنے لگا۔ بلکہ میں تحک چکا ہوں آپ کو دھاختیں دے دے کر۔ اس لئے میرا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت آپ میری تجھر تھیں، مجھے جیل بھینجے والی گواہ نہیں تھیں!“ وہ واپس مزا، چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا، تب دیکھا، ذرا سی درز کھلی تھی۔ وہ دروازہ پورا بند کرنا بھول گیا تھا۔ یا اللہ۔ ان کا دماغ سنتا اٹھا۔ ساری آوازیں یقینگئی ہوں گی!

مڑک رائیک نگاہ زمر پڑالی جو خاموش کھڑی، آنکھوں میں پانی اور ڈھیروں غصہ لئے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر باہر نکلا۔ زور سے دروازہ بند کیا۔

پیچے لا ڈنخ میں سنا تھا۔ حسین، ندرت، ابا، سیم، سب اوپر ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ لب بھینچتے تیزی سے زینے اترتا کیا۔ ندرت اٹھیں۔

”فارس کہاں جا رہے ہو؟“

”کام سے جا رہا ہوں۔ آ جاؤں گا۔“ ہاتھ جھلا کر ان کو اشارہ کرتا وہ باہر نکل گیا۔

”حسین جاؤں کو روکو۔ اسے کہومت جائے۔“ مگر حسین وہیں بیٹھی رہی۔

”ای خیر ہے، میں جا سکیں، وہ آ جائیں گے۔“ اس نے بظاہر خود کو بے فکر ظاہر کیا البتہ بار بار پریشان نگاہ اوپر اٹھتی تھی۔ (اسے پڑھا فارس ابا سے شرمدہ ہے، کہ انہوں نے اسے ان کی بیٹی کے ساتھ اس طرح بات کرتے سناؤ گا۔)

بہت اندر تک جلا دیتی ہیں،

وہ شکایتیں جو کبھی بیان نہیں ہوتیں

ندرت چند لمحے چوکھت میں کھڑی رہیں، پھر واپس آئیں۔ سیرھیوں کے پاس ٹھہر کر گردان اونچی کی۔ ”زمر... زمر!“ ان کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ حسین چوکی۔ ابا بھی چوکے۔ سعدی کے جانے کے بعد پہلی دفعہ ان کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔ اور آنکھوں میں غصہ۔ زمر کمرے سے باہر آئی اور اپر یینگ کنارے رکی۔ گلی آنکھیں رگڑی تھیں۔

”جی؟“ وہ پر سکون نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم نے فارس کو کیا کہا ہے؟ وہ کیوں چلا گیا ہے؟“

اوپر کھڑی زمر کی آنکھوں میں ذرا تعب سا ابھرا۔ الفاظ پچھیں، انداز پر۔

”میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔“ (ابھی تو کچھ کہنا شروع بھی نہیں کیا تھا۔)

”ہم نے خود سنائے، تم دونوں چھکر رہے تھے۔“ وہ پریشان تھیں اور غصے میں تھیں۔ ”تم اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہی ہو؟“ یہ شادی تمہاری مرضی کے بغیر تو نہیں ہوئی تھی۔“

حسین نے چہرہ موڑا۔ کچن کے دروازے پر کھڑا صداقت بنا لپک جھکے، ادھر دیکھ رہا تھا۔

”اے!“ اس نے صداقت کو متوجہ کیا۔ وہ چونکا۔ کھلا منہ بند کیا۔

”جاوہ اپنے کوارٹر میں۔ ادھر کیا کھڑے ہو؟“ ذپت کر بولی تو وہ شرمندہ سافورا بہر کھسک گیا۔

ادھر زمر آواز پنجی کیے کہہ رہی تھی۔ ”ایسا کچھ نہیں ہے بھا بھی۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود گیا ہے۔“

”سعدی بھی ایسے ہی گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ اب فارس بھی واپس نہیں آئے گا۔ تم نے اسے مجبور کیا ہے گھر چھوڑنے پر۔“

سعدی بھی تھاری وجہ سے گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز غصے سے بلند ہو رہی تھی۔

”میری وجہ سے؟“ زمردم بخود رہ گئی۔

”ہاں۔ تم اس روز سعدی سے لڑی تھیں۔ میں نے خود سناتھا۔ تم اس کوڈاٹ رہی تھیں۔ اس کے بعد وہ گھر سے چلا گیا اور واپس نہیں آیا۔“

خین کو لگا، کسی نے اس کے منہ پر یلپت دے مارا ہو۔ وہ ہکا بکا سی کھڑی ہوئی۔ ”تمیں امی، پچھلو تو میرے لئے... میری سائید لے رہی تھیں۔“ اس نے دھشت سے زمر کو دیکھا جو یلپت پر ہاتھ رکھئے سن سی کھڑی تھی۔

”سعدی میری وجہ سے نہیں گیا بھا بھی۔“

”تم نے فارس کو گھر سے نکالا ہے، جیسے تھاری امی نے مجھے نکالا تھا، تم لوگوں نے ساری زندگی ہمارے ساتھ یہی کیا ہے، اب تم فارس کے ساتھ وہی کر رہی ہو۔“ دکھ سے ان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

”ندرت!“ اپانے برہمی سے ٹوکا۔

”میری امی کے بارے میں کچھ مت کہیے۔ اور سعدی میری وجہ سے نہیں گیا۔“ وہ بدقت بول پائی۔ اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگی تھیں۔ ”میں اس سے نہیں لڑی تھیں، صرف ذرا ساختا...“

”تمہیں کیا حق تھا اس سے خفا ہونے کا؟“ وہ ایک دم زور سے چلا میں۔ خین ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ ”وہ میرا بیٹا تھا۔ تھارا بیٹا نہیں تھا۔ یہ میرے بچے ہیں، ان کو صرف میں ڈاٹنے ہو سکتے ہوں، تم اپنے سارے حق اپنے بچوں کے لئے رکھو۔“

”ندرت، بس کر دو!“ ابا بلند آواز میں بختی سے بولے اور ندرت چپ ہو گئیں۔ کیونکہ کہنے کے بعد ان کو احساس ہوا تھا کہ ان کا آخری فقرہ... ان کا آخری فقرہ مناسب نہ تھا۔

اور اس آخری فقرے نے زمر کا دل ہی توڑ دیا۔

اس کا ریلپت پر جما ہاتھ نیچ گر گیا۔ وہ پھرہ جھکائے قدم قدم زیستے اترتی گئی۔ لا دنچ میں دھشت ناک ساستا چا گیا۔ زمر کسی کو بھی دیکھئے بغیر یہ دونی دروازے کی طرف بڑھی۔ خین کی نظریں اس کے قدموں پر جاٹھہریں۔ وہ ننگے پیر تھی۔ پھر وہ اسی طرح باہر نکل گئی مگر خین میں کھڑکی کا پردہ سر کا کردیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

دروازہ بند ہوا تو ندرت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں، سیرھیاں چڑھتی گئیں۔ وہ شاید رو بھی رہی تھیں۔

ابا فکر مندی سے بند دروازے کو دیکھ رہے تھے پھر سیم اٹھا اور باہر گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آگئا۔ ”پچھو باہر نہیں ہیں۔ کہاں چلی گئیں؟“

خین نے پریشانی سے فارس کا نمبر ملایا۔ اس نے کال کاٹ دی۔ ایک باڑ دوسرا بار۔ پھر اس نے غصے سے ٹیکست بھیجا۔

”امی اور پچھو کی لڑائی ہوئی ہے اور اسی نے پچھو کو گھر سے نکال دیا ہے۔“ اور پھر گھری سانس لے کر بیٹھ گئی۔ حسپ توقع فون فوراً بجا۔

”کیا ہوا؟“ وہ واقعی تشویش سے بولا تھا۔ آواز سے لگتا تھا، ڈرائیور کر رہا ہے۔

”وہی جو لکھا تھا۔ امی نے پھپھو کو بہت سا میں اور وہ گھر سے چل گئیں۔“

”تصور کس کا تھا؟“ چند جھوٹ کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

”آپ کا!“ اور پھر امی کے سارے الفاظ دہرا دیے۔

تھوڑی دیرگزری اور گاڑی کی آواز آئی تو بڑے ابا کے چہرے پر چھائی تفکر کی لکیریں کم ہوئیں۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا تو فلم مند لگ رہا تھا۔

”آپ کہر چلے گئے تھے؟“

”یونہی۔ باہر۔“ اس نے ابا سے لگا ہیں چرا میں مگر ابا کو اس کا غصے سے ان کی بیٹی پر چلانا یاد دیہیں تھا، ان کو صرف زمر کی فکر تھی۔

”جاو، زمر کو دیکھو وہ کہاں چلی گئی۔“

”گاڑی تو کھڑی ہے اس کی۔ تمہاری امی کہاں ہیں؟“ ساتھ ہی اوپر دیکھا۔

”امی ٹھیک ہیں، ان کی فکر مت کر رہیں۔ بس پھپھو کو لے آئیں۔ ان کو کھونا ایسے ہے جیسے ہم سعدی بھائی کو دوسرا دفعہ کھو دیں گے۔“

زمین ایک دم ادا س ہو گئی تھی۔

”میں دیکھتا ہوں، تم جاؤ پہنچی امی کے پاس بیٹھو۔“ وہ ائے قدموں مزگیا۔

باہر سبزہ زار سنسان پڑا تھا۔ وہ قصر کے فرنٹ تک آیا۔ ملازموں کی آگے پیچھے آمد و رفت کچھ غیر معمولی لگ رہی تھی۔

زمر کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ گیٹ کے قریب آیا تو اوپری کی بنیں سے گارڈ نے پکارا۔

”سر! مسز غازی اس طرف گئی ہیں۔“ اس نے چونک کر گردان اٹھائی۔ گارڈ اشارہ کر کے بتا رہا تھا۔ وہ باہر گئی تھی۔ باہر سڑک تاریک تھی۔

”فلیش لائست دو۔“ اس نے ہاتھ اٹھایا۔ گارڈ نے لائست اس کی طرف اچھالی۔

”لے جائیں سر! بھلے ہمیشہ کے لئے لے جائیں۔“ دل برداشت سا کہتا گارڈ واپس بیٹھ گیا۔

فارس نے لائست تھامی اور گیٹ سے باہر آیا۔ وہ پہاڑی کو کاٹ کر بنائی سڑک تھی۔ دور دور اوپر نچے محلات تھے، کہیں کئی کئی کنال کی گجد خالی تھی۔ وہاں جنگل اگے تھے۔ وہ جو گرز پھر دوں پر رکھتا، سڑک کنارے اوپر چڑھنے لگا جہاں اوپر نچے درخت تھے۔ ساتھ ہی فلم مندی سے اسے پکارتاروشنی پھینک رہا تھا۔

”زمر!“ آواز رات کے اندر ہیرے میں گم ہو جاتی، کبھی لوٹ کر سنائی دیتی۔ وہ اوپر چڑھتا آیا۔ نارچ والا ہاتھ مسلسل ہل رہا تھا۔ پھر روشنی ایک جگہ تھی۔ درختوں کے بیچ اسے وہ نظر آئی تھی۔ زمین پر نگئے پاؤں اکڑوں بیٹھی۔ تھوڑی گھنٹوں پر رکھے۔

فارس نے گھری سانس خارج کی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس تک آیا۔ پتوں اور سوکھی ٹھینکوں کے جو گرز تلے کھلنے کی کرج نے خاموشی کو توڑا۔ وہ اس کے قریب آ رکا۔

”آپ اور ہر کیوں بیٹھی ہیں؟ گھر چلیں۔“

وہ نہیں بیلی۔ گردن بھی نہیں اٹھائی۔

”زمر، ہم سارے مسئلے گھر جا کر سلجھا سکتے ہیں۔ اٹھیں۔“ جب اس نے جواب نہیں دیا تو فارس نے نارچ زمین پر رکھی اور اس کے سامنے درخت سے نیک لگا کر خود بھی اکڑوں بیٹھ گیا۔

"آپانے جو بھی کہا دل سے نہیں کہا۔ وہ آپ کو ہرث کر کے خود بھی ہرت ہیں۔ مجھے پتہ ہے۔ ان سے ناراض مت ہوں۔"

"میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔ سعدی سے بھی نہیں تھی۔" وہ ہلاکا سابولی تو آواز زندگی ہوئی تھی۔ تارچ پتوں پر پڑی تھی، روشنی مختلف سمت کے درختوں پر پڑی تھی۔ زمر کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔

"ان کو پتہ ہے آپ سعدی سے خفہ نہیں تھیں۔ نہ ان کو یہ بات اذیت دے رہی ہے۔"

زمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"سعدی میری وجہ سے نہیں گیا۔ میں نے اسے نہیں بھیجا۔ میں چار سال اس سے ناراض بھی نہیں تھی۔ مجھے یہ لگتا تھا کہ بچا اب مجھ سے محبت نہیں کرتے، اس لئے میں پیچھے ہٹ گئی تھی، مگر میں غلط تھی۔ اور مجھے اس کے لئے بہت دکھ ہے۔" آنسو پوپ آنکھوں سے گر رہے تھے۔ کون سی لوگ، کہاں کا خشت، دونوں کو بھول گیا تھا۔

رات کا سناٹا اور جنگل کے اوپنے درخت خاموشی سے سن رہے تھے۔ سامنے تنے سے یک لگائے فارس نے دکھ سے اسے دیکھا۔

"سب کو پتہ ہے یہ بات۔"

"میرے پاس کوئی امید نہیں ہے، سوائے ان بچوں کے۔ مگر نہیں...." اس نے فنی میں سر ہلایا۔ "یہ میرے بچے نہیں ہیں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر سعدی کو ہم واپس لے آئیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے تو سب سیئیں ہو سکتے ہیں، سوائے میرے۔ میرا کیا ہو گا؟" آنسو برابر گرتے جا رہے تھے۔ اس نے چہرہ جھکایا اور ناک سکوڑ کر پانی اندر اتارا۔

"وہ واقعی آپ کے بچے نہیں ہیں۔ وہ آپ کے مختلف رشتہ ہوتا ہے۔ اس کے اپنے حق ہوتے ہیں اور وہ آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

زمر نے جواب نہیں دیا۔ جھکے چہرے پر لڑکتے آنسو اندھیرے میں بھی اسے دکھائی دے رہے تھے۔ بلکل ہوا چل رہی تھی؛ جس سے اس کے ھنگریا لے کھلے بال بار بار اڑ کر چہرے پر آ رہے تھے۔

"مجھے دوبارہ بھی وہ خوشی نہیں مل سکتی جو کبھی میرے پاس تھی۔"

"زمر، روئیں مت۔ آپ کو روئتے دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ آپ پر یہ سوٹ نہیں کرتا۔ آپ مضبوط اچھی لگتی ہیں۔ اور مغرب ور بھی۔ اور اکھڑ بھی..." اس نے چہرہ اٹھایا۔ اگلی آنکھوں میں تجب دیا۔

وہ اس کے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اور بد تیز بھی... اور روڈ... اور Bossy اور... بے مردت بھی، اور...، وہ نرمی سے ایک ایک لفظ گنوتا جا رہا تھا۔ چند لمحے وہ اس کو دیکھتی رہی، پھر ہلاکا سماں کرائی اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

"میں ایسی نہیں ہوں۔" گردن کر کر بیکھی آنکھوں سے مسکرا کر بولی۔ "میں کنشرو لڈ، مٹھنے اور شاستہ مزاج کی ہوں۔"

"آپ کی ڈکشنری میں شائٹنگ کی تعریف کیا ہے؟" وہ بھی ذرا سماں کرایا۔ زمر ہاتھ سے آنسو پوچھتی ہلاکا ساہنہ دی۔

"عورتوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے جیسی میں ہوں۔" پھر مسکرا ہٹ آہستہ کہنی۔ چند لمحے پسلے کی تلخی نے دل کو دوبارہ سے کک دی۔ اس نے گردن موڑ کر دور تک پھیلے درختوں کو دیکھا۔ کہیں دور کبھی کسی گازی کی زن سے گزرنے کی آواز سنائی دیتی۔ پھر سناٹا چھا جاتا۔

"کیا وہ مجھ پر اتنی خفا تھیں؟" وہ پھر سے آزدہ ہوئی۔

"اوہ بھو۔ اُنہیں آپ پر غصہ نہیں ہے۔ ان کو ازالتم دینے کے لیے کوئی چاہیے۔ ہم سب کو چاہیے ہوتا ہے۔ وجہ یہ گھر ہے۔ ان کی اس گھر سے اچھی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔"

"مطلوب؟" وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں سامنے بیٹھے فارس کا چہرہ مدھم ساد کھائی دیتا تھا، مگر اس پر آنچھی تھی۔

”ابھی گھر چلیں۔ پھر کسی وقت ان سے پوچھ لجئے گا۔“

”نبیل، بتاؤ میں سن بھی ہوں۔“ وہ دھیان سے اسے دیکھ رہی تھی۔

فارس نے گھرنی سانس لی۔ ”یہ میری امی کا گھر ہے اور....“ کہتے ساتھ مارچ انھائی کو اسے بند کر دے، تبھی روشنی زمر پر گری تو وہ چونکا۔ مارچ اس کے اوپر ڈالی۔ زمر نے آنکھیں چندھیا کر چہرہ پر بھیا۔ وہ اس کے قدموں میں دیکھ رہا تھا۔ کپڑوں پر مٹی۔ کائنے اور....

”پاؤں کو کیا ہوا ہے آپ کے؟“ چونکہ کراس کے چہرے کو دیکھا۔ ”آپ گری ہیں؟“ زمر نے سر جھکا۔

”شاید۔“

اس نے روشنی اس کے پاؤں پر ڈالی۔ انگوٹھا خون میں ڈو باتھا۔ وہ انٹھ کھڑا ہوا۔

”گھر چلیں۔“

”تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے، تمہیں پتہ ہے۔“ ہمیشہ کے برعکس، وہ غصے یا ختنے سے نہیں بولی تھی؛ بس تھکن ہی تھی آواز میں۔

”اچھا، میں آتا ہوں۔“ جانے لگا، پھر رکا۔ ”میرے آنے تک ادھر سے ملیے گا نہیں، ورنہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، آپ ابھی مجھے جانتی نہیں ہیں۔“ سینپہر کرتا وہ نیچے اترتا گیا۔ مارچ بھجا دی تھی۔ گیٹ تک دوبارہ آیا تو گارڈ کا کیبن خالی تھا۔ کیبن کی سڑھی کے آس پاس دیکھا۔ مدھم مدھم ہی آوازیں آئیں۔ فوراً قربی درخت کی اوٹ میں ہوا۔ پھر ہنہیں کو درمیان سے بھاننا۔ گارڈ کی پشت تھی، اور اس کے سامنے فیونا کا گھری۔ کہہ رہی تھی۔

”مجھے واقعی نہیں معلوم کہ وہ سارے اشاف کو کیوں نکال رہے ہیں، مگر اکبر تم بے فکر ہو۔ میں اپنے اشاف کی ہیئت نہیں، خیر خواہ بھی ہوں۔ میں مزر کاردار سے کہہ دوں گی کہ تم لوگ جاؤ گے تو میں بھی جاؤں گی۔“

”اور وہ تمہیں ایک بہتر بیچج دے دیں گے اور تم نہ بھر جاؤ گی۔ اگر تمہاری جگہ میری انتہی ہوتی تو وہ ہم سب کے لئے بُرّتی۔“ وہ مایوس لگ رہا تھا۔

”میرا تصویر نہیں ہے اس میں۔ یہ سب مزر زمر نے کیا ہے۔ انہی کا فون آیا تھا اور اس کے بعد مزر کاردار نے یہ حکم جاری کیا۔“

وہ اوٹ سے نکلا اور آواز دی۔ ”اکبر!“ گارڈ فوراً گھوما۔ فیونا بھی چوٹی۔ وہ چلتا ہوا ان تک آیا۔

”میری بیوی کو چوٹ لگی ہے۔ کچھ لا دو پتی وغیرہ کے لئے۔“ فیونا کو مخاطب کیا تو وہ فوراً تا بعداری سے آگے ہوئی۔

”اکبر پنے کیبن سے ایڈ باکس لے آؤ۔ سر، چوٹ زیادہ ہے؟ میں ڈاکٹر کو فون کروں؟ یا پھر میں ان کی پتی کر دوں؟“

”اوہ ہوں۔ میں کروں گا۔“ اکبر پیکٹ لے آیا تو فارس فیونا پا ایک گہری نظر ڈالتا چیزیں لئے پلٹ گیا۔

بے خیالی میں کبھی انگلیاں جل جائیں گی

راکھ زرے ہوئے بھوکی کی کریدا نہ کرو

اوپر آیا تو زمر دیے ہی نیٹھی تھی۔ وہ اس کے سامنے میخا۔ ایک گھنٹا موڑے، دوسرا پاؤں زمین پر رکھے۔

”اور کہاں چوٹ آئی ہے؟“ آنس پیک نکال کر اسے دیا جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا، اور آسمیں اوپر کر کے کہنی پر رکھا۔ فارس نے مارچ اسے تھامی۔ ”یہ اس ایمگل پر رکھیں۔“ اور جب روشنی اس کے انگوٹھے پر نے لگی تو وہ گیلے واپس سے اس کے پیر کا خون صاف کرنے لگا۔ زمر اس کے بھلکے سر کو دیکھئے گئی۔

”ندرت بھا بھی کو اس گھر سے کیا مسئلہ تھا؟“ ان دونوں کو معلوم تھا وہ کیا سننے کے لئے بیٹھی ہے۔ وہ سر جھکائے، زخم صاف کرتے

کہنے لگا۔

”یہ میری امی کا گھر ہے، اور میری امی ان کی سوتیلی ماں تھیں۔“ اس نے آہستہ سے وہ نوکلی ہی چیز اس کے ماں سے نکالی جس نے انگوٹھے کو کاٹا تھا۔ زمر کے لبوب سے ”سس، نکلی۔ فارس نے رک کر اسے دیکھا۔

”ہلا ساز خم ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔ کل بیٹھنے کا بخیکشناں لگاؤ لیجھ گا۔“

”مجھے کوئی درد نہیں ہو رہا۔“ اس نے شانے اچکائے۔ پھر کی۔ سرسری انداز میں پوچھا۔ ”تمہارے ابو اور تمہاری امی اور ان کی پہلی بیوی کے... میرا مطلب ہے... کیسے تعلقات تھے ان سب کے؟ ویسے مجھے پتہ ہے، مگر صرف ان کی سائیڈ کی استوری۔ تمہاری سائیڈ کی نہیں معلوم۔“

اور یہ پہلی دفعہ تھا جب زمر نے بغیر کسی غصے یا عداوت کے اس کی طرف کی کہانی سننی چاہی۔ اس کے انگوٹھے پر دو لاگتے ہاتھ رکے۔ لمحے بھر کوڑ، ہن کہیں دور جا پہنچا۔

”یہ گھر میری امی کا ہے۔ شادی سے پہلے وہ اپنے بھائی اور نگزیب کاردار کے ساتھ ان کے گھر رہتی تھیں۔ تب یہ جگہ اتنی ڈیویلپڈ اور ایلیٹ نہیں تھی۔ ابونے ان سے محبت کی شادی کی تھی۔ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی۔ مگر اتنے لگتے نہیں تھے ان میں کہ اپنی بیوی کو ساتھ لے جاتے۔ ندرت آپ اور وارث کی امی نے بہت ہنگامہ کیا شادی پر۔ سوپتا نہیں کس نے طے کیا مگر امی ادھر انکی میں رہنے لگیں۔ ابو سیمیں آ جاتے، کبھی رہتے، کبھی چلے جاتے۔ وہاں ان کے نکے تھے۔ یہاں صرف بیوی۔“ سر جھکائے، آہستہ آہستہ آئمنٹ اس کے انگوٹھے پر لگاتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ اس کو تابو لئے کی عادت نہیں تھی۔ زمر کے لئے وہ ایک کم گوپا سر اسرا شخص تھا۔ کیا سوچتا ہے، کیا چاہتا ہے وہ کبھی نہیں کہتا تھا۔ آج کہہ رہا تھا، اور وہ بالکل یک نیک محوکر سن رہی تھی۔

”میں آٹھ سال کا تھا جب ندرت اور وارث کی امی کا انتقال ہوا۔ ابو مجھے اور امی کو پھر اپنے گھر لے گئے۔ ندرت آپا تب انہارہ سال کی تھیں، اور وارث بارہ کا۔ ہم لوگ چھ ماہ رہے ادھر...“ بولتے بولتے وہ چپ ہو گیا۔ پھر پیکٹ سے پٹی نکالی اور اس کے انگوٹھے کے گرد پیٹنے لگا۔ جنگل کے اوپنے درختوں میں خاموشی چھا گئی۔

”پھر؟“ وہ بے چینی سے بولی۔ اپنی ساری اناکڑ اور بے نیازی چند لمحے کے لئے پس پشت ڈالے۔

”پھر کیا؟“ وہ سر جھکائے سفید پٹی لپیٹ رہا تھا۔

”ندرت بھا بھی لوگوں کا رویہ کیسا تھا تم لوگوں کے ساتھ؟“ اس نے ندرت بھا بھی کے ذکر کوڑ رانمایاں کیا۔ وہ یہ سوال صرف انہی کی وجہ سے تو کر رہی تھی۔

فارس نے گھری سانس لی۔ ”وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ اور میری ماں سے بھی۔ ہم سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ امی بھی کوئی بہت صابر شاکر خاتون نہیں تھیں، ناموں جیسا غصہ تھا ان میں بھی۔ مجھ میں بھی۔ خیر۔ بہت جھگڑے ہوا کرتے تھے آپا اور امی کے۔ وارث لڑتا نہیں تھا مگر جہاں میں آ کر بیٹھتا، وہ انھوں جاتا۔ اگر بول رہا ہوتا تو مجھے دیکھ کر چپ ہو جاتا۔ ہم پچھے ماہ وہاں رہے۔ بدترین دن تھے وہ...“

”پھر واپس کیوں چلی گئیں تمہاری امی؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔ پچھنیں کیوں، اس مہیب تاریک جنگل میں اس کے ساتھ بیٹھے، اسے چار سال پہلے کی وہ گولیاں وہ فون کال، سب بھونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، وہ فارس عازی سے پہلی دفعہ عمل رہی ہے۔

”امی نہیں گئی تھیں۔ میں گیا تھا۔“ سر جھکائے، فارس نے پٹی کے اوپر شفاف پٹپٹ لگا کر اسے پکا کیا۔ پھر پیچھے ہٹا۔ زمر نے بھی یہ ذرا پیچھے کھینچ لیا۔ واپس درخت سے نیک لگا کر اکڑوں بیٹھا، اور دمیں جانب درختوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں اپس سیٹ تھا ایک دن، تنگ آگیا تھا ادھر سے تو بھاگ گیا۔ مذاق نہیں کر رہا۔ بیج میں۔ ڈھانی گھنٹہ بھاگتا رہا۔ پھر یہاں پہنچ گیا۔ واپس۔“

”تمہیں گھر کا راستہ آتا تھا؟ اتنی سی عمر میں؟“ اس کو تجھ بھا۔ فارس نے گردن اس کی طرف موڑی، ادا سی میں مسکرا یا۔

”مجھے تو بہت کچھ آتا ہے۔ آپ مجھے جانتی ہی کتنا ہیں؟“

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس پر سوچ نظر وہ سے اسے دیکھے گئی۔

”میں ادھر آیا تو اور نگزیب ماموں کا دروازہ کھلکھلایا۔ وہ گھر پہ نہیں تھے۔ مسز کار دا تھیں۔ یہ لوگ تب بھی امیر تھے، مگر اتنے امیر نہیں تھے۔ ان کا گھر بھی تب مختلف تھا۔ یہ عالیشان قصر تو بعد میں ڈھا کر کھڑا کیا تھا۔ خیر۔ مسز جواہرات گھر پہ تھیں۔ وہ مجھے اندر لے آئیں، لئے کمرہ تیار کروایا، میرے بیرون کی مرہم پٹی کی۔ بہت خیال سے دو دن مجھے اپنے گھر رکھا۔ تیسرے دن میرے ماں باپ کو بلا یا، اور لما پہنچ کو لے جاؤ۔ یہ سارے کار دار زار ملکی گھوڑی وائلے ہیں، مہماں بس دو دن اچھا، پھر مچھلی بن جاتا ہے۔“

وہ ہلکا سامسکرا ہی۔ وہ بھی شاید مسکرا یا تھا، مگر اب پھر سے گردن موڑے اندھیر درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ ”ای اور میں واپس ادھر ہی آئے اور ابو اپنے بچوں کے ساتھ رہے۔ اگلے سال ندرت آپا کی شادی ہو گئی۔ وارث کو ابو نے پڑھنے لا ہو رہی تھیں، جن کو دہ بار بار کان کے بیچ اڑت تھی۔ نگاہیں فارس کے چہرے پئی تھیں۔ اس نے اب سر درخت کے تنے سے لگا رکھا تھا، اور آنکھوں میں بے پناہ تھکن تھی، کرب

”میں دس سال کا تھا جب سعدی پیدا ہوا۔“

(میں آٹھ سال کی تھی۔) اس نے صرف سوچا۔ بولی نہیں۔ وہ بھی کبھی تو بولنا تھا، اسے لگا اگر بولے گی تو اس کی یکسوئی ٹوٹ جائے گی۔

”اور میں تیرہ سال کا تھا جب ندرت آپا ناراض ہو کر ہمارے گھر آگئیں۔ ان کا آپ کی ای سے جھگڑا ہوا تھا۔ سعدی کو بھی وہیں چھوڑا نہیں میں، کہ خود پالیں۔ اور ابو چونکہ دوسرا گھر بیچ چکے تھے، اس نے ان کے پاس یہاں آنے کے سوکھی چارہ نہ تھا۔ یہ وہ واحد عرصہ تھا جو آپا نے اس گھر میں گزارا، اور تب بھی حالات دیے ہی تھے، جیسے آج ہیں۔ سعدی ان سے چھن چکا تھا، اور وہ بہت کرب اور تکلیف میں تھیں۔ تین ماہ بعد ابو کا انتقال ہو گیا، اور ندرت آپا کی ساری زندگی گویا ہو میں معلق ہو کر رہ گئی۔ وارث کی چھیلیاں تھیں، وہ بھی ادھر آگئا۔ اب ہمارے جھگڑوں کی ماری و جوبات ختم ہو چکی تھیں۔ سعدی نہیں تھا، تو پہنچ نہیں کیوں آپا کارو یہ مجھ سے بد لئے لگا۔ انہوں نے مجھے ایک چھوٹے بھائی کے طور پر قول کر لے۔ وہ لوگ اب بھی مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے، مگر برا بھی نہیں کہتے تھے۔ پھر آپا کی صلح ہو گئی تو وہ چلی گئیں اور وارث بھی... میں اور ای

”ای ہوتے۔“

وہ پوری توجہ سے سن رہی تھی۔

”میں اخہارہ سال کا تھا جب امی فوت ہوئی۔ تب آپا آئیں اور مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔ اس صلح کے بعد ہی آپ کے ہمالی نے ان کو الگ گھر لے دیا تھا۔ میں کافی عرصہ ان کے گھر رہا۔ حنہ تب ایک سال کی تھی۔ مگر اس کے بعد آپا اور وارث نے ہمیشہ میرا خیال، لاما، ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو سمجھنا شروع کر دیا، اور ہمارے سارے اختلافات پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ بلکہ.... وارث اور میں تو اس تھیں دوست بن گئے تھے.... وہ یاد کر کے کہتا جا رہا تھا۔

”پھر بھی تم نے اسے قتل کر دیا!“

خوبصورت رات کافسوں چھنا کے سے ٹوٹا۔ وہ کہہ کر ایک دم چپ ہو گئی۔ فارس نے چونکہ کر اسے دیکھا، پھر آنکھیں مچ کر جیسے اس سارا ضبط کیا، اور جب آنکھیں کھولیں تو زمر نے دیکھا، اس کے تاثرات اب سخت ہو چکے تھے۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے انٹھ کھڑا ہوا۔

پیکت اٹھالیا۔ (یہ عورت کسی دن واقعی میرے ہاتھوں ایک قتل کروائے گی!)

”حری کا وقت شروع ہونے والا ہے، گھر چلیں سب پریشان ہوں گے آپ کے لئے۔“ وہ اس کی طرف سے رخ موڑ گیا۔ وہ ہم اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ آگے چلنے لگا۔ زمر کو اندر ہی اندر اس موقعے پر وارث کی موت کا فوس کرنے پر افسوس ہوا۔

وہ دونوں خاموشی سے گیٹ تک آئے تو اس نے پیکت اوپر کی بن تنک اچھا جسے گارڈ نے بر وقت کچ کیا۔ پھر ایک نظر ساتھ چلتی زم پڑا جو کسی اور خیال میں مگر تھی۔

”مسنگ کاردار نے اسٹاف نکال دیا سارا۔“ غور سے اسے دیکھا۔ اس نے بھلے سے شانے اچکائے۔

”ان کی مریضی۔“ وہ اس سے لاءِ علم تھی۔ فارس نے فیکن نا کی باتوں کو ہن سے جھکا۔

”آپ نے نوشیر وال سے بات کی؟“ اب وہ دونوں سرسری انداز میں بات کرتے بہرہ زار سے لگز رہے تھے۔

”ہوں،“ وہ بتاتی گئی۔

”آپ نے یقین کر لیا؟“

”نہیں وہ اب بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ ضرور پکھ جانتا ہے اور اسے چھپا رہا ہے۔“

”میں بات کرتا ہوں۔“ ”نہیں، فی الحال اس کو کھلا جھوڑ دو، اگر وہ کاشش ہو گیا تو نہیں بتائے گا۔“

جب وہ دونوں اندر آئے تو حد سیم اور اباویے ہی لا ونخ میں بیٹھے تھے۔ ان کو پر سکون اور نارمل سا آتے دیکھ کر ان سب کے ہمی سانس بحال ہو گئے۔ پھر کسی نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ صداقت کو حد نے بلا یا، وہ آکر حری کیا رتیا کرنے لگا۔ زمر دی کیا پیکت اور تجھ لئے ایسا کرے میں چلی گئی۔ ندرت نے بھی حری کمرے میں ہی کی۔ باقی سب یعنی خاموش سے لا ونخ میں بیٹھے رہے۔

جب فخر اتر آئی اور سورج طلوع ہو کر تپانشہر اہو گیا، اور سب اپنے کمروں سے نکلے، تیار ہو کر ایک نئے دن کے آغاز کے لئے زمر باہر آئی اور ندرت کو سلام کیا۔ انہوں نے جواب بھی دیا اور یہ بھی پوچھا کہ وہ ابھی ریسٹورانٹ جائے گی یا بعد میں۔ زمر نے بھی اتنے ان نارمل انداز میں بتایا کہ وہ پہلے کوئٹ جائے گی ایک کلائٹ کی ساعت ہے اور پھر ریسٹورانٹ آئے گی۔ اور یہ سب کہتے ہوئے سب نے دیما کے اس نے وائٹ گولڈ کی ننھے پہن رکھی ہے، مگر کسی نے نہیں پوچھا کہ وہ لوگ کہاں گئی۔

اور جیسے کہ عموماً رشتے داروں میں ہوتا ہے، لڑائی کے بعد معافی تو کوئی نہیں مانگتا مگر موڑ اچھا کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ ہمارے کے شکوئے دھل گئے ہیں، سوان کے گھر کا ماحول بھی نارمل ہو گیا۔ البتہ اسی صبح، زمر کے نکلنے سے پہلے خین نے سعدی کا لیپ ناپ لا کر اس سے سامنے رکھا۔

”یہ میں نے کھول دیا ہے۔ اب کوئی پا سورڈ نہیں ہے اس پر۔ آپ دیکھ لیں۔ کوئی اور بھی کام ہو تو بتائیے گا۔“ لگا ہیں جھکائے۔ پلٹ گئی۔ زمر نے بھی کچھ نہیں کہا۔

مگر اس واقعے کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ ندرت جو بالکل چپ ہو گئی تھیں، وہ نارمل ہونے لگیں۔ سیم حد کو ڈاٹ ڈپٹ، گھر کے کام سب کچھ انہوں نے نارمل انداز میں پہلے کی طرح کرنا شروع کر دیا۔ سعدی کے لئے دعا اور یادویں ہی تھی، مگر انہوں نے سمجھوتا کر لیا تھا۔ خین نے بھی اس کے بعد زمر کو سنانا بند کر دیا اور زمر نے فارس سے تین باتیں کہنی چھوڑ دیں۔

بالآخر سعدی یوسف کے گھر والوں نے یہ جان لیا تھا کہ ایک دوسرے کا لازام دینے سے کچھ حاصل نہیں ہونا، بلکہ جو پاس ہے وہ بھی چلا جائے گا۔

دو چار نہیں مجھ کو، فقط ایک دکھا دو ..... وہ شخص جو اندر سے بھی باہر کی طرح ہو سعدی نے آنکھیں کھولیں تو دھنڈتی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ منظرِ رواوضخ ہوا۔ وہ آہستہ سے کہنی کے بل اٹھا۔ بیٹھا اور آس پاس دیکھا۔

پچھلے چند دن سے وہ اس کمرے میں جا گا کرتا تھا۔ نیند کی حالت میں اسے شفت کیا گیا تھا، کہاں؟ کچھ معلوم نہیں۔ رمضان کتنا مُزr چکا تھا، سحری کب ہے اور افطار کب؟ اس کمرے میں کچھ خبر نہ ہو پاتی تھی۔

وہ ایک سادہ بیدڑوم تھا۔ دیواریں سینڈ کلر میں پینٹ شدہ تھیں۔ دروازے سفید تھے۔ ایک سنگل بیٹھتا جس پر وہ لیٹا تھا۔ ساتھ ملختہ ہاتھ درم۔ اور کچھ نہیں، سوائے سائیڈ نیبل پر کھے اس کے قرآن اور جائے نماز کے، یا پھر ایک کاؤچ کے جس پر دن کا اکثر حصہ میری اتنجیو آ کر بیٹھ جاتی تھی۔

اس وقت وہ دوپاں نہیں تھی، بلکہ دروازہ کھول کرڈا اکٹھا مایا اندر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک زس بھی تھا۔ سعدی نے نظر اٹھا کر دیکھا، کھلے دروازے کے پار گارڈز کھڑے تھے، آگے شایدی وی لاوٹن تھا۔ اتنا ہی نظر آیا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔

مایا بیگ کے قریب اسنوں پیٹھی۔ اس کے لبے بال کھلے تھے جنہیں وہ کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ نیلی جیزر پل مباسفید اور آل پہن رکھا تھا۔ کم عمر چہرے پر معصوم ساتاڑ تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ مایا نگاہیں سعدی کے زخموں پر جھکائے، زس کو پٹی کی بدایت دیتی رہی۔

اس کے زخم مندل ہونے کے قریب تھے۔

زس چلا گیا، تو وہ اٹھی، گولیاں اور پانی کا گلاس بھر کر اسے دیا۔ نگاہیں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں اس لڑکے کے لیے اپنا بیکت بھری ہمدردی تھی۔

”پی لو۔ تم روزہ نہیں رکھ سکتے، دوادی نی پڑتی ہے۔ یہ مسٹر کار دار کا حکم نہیں ہے، میرا ہے۔“

اس نے گلاس تھاما اور دوپانی سے نگل لی۔

وہ اسنوں پیٹھ کریو نہیں اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”تمہاری فیملی میں کون کون ہے؟“

سعدی نے چوبک کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی شفاف آنکھوں میں ڈھیروں ترجم لئے، اسے دیکھ رہی تھی۔

”بہن، بھائی، ابھی کچھ لوگ۔“

”کیا ان کو معلوم ہے کہ تم کس کے پاس ہو؟“

”نہیں۔“ وہ ملکا سایوالا۔ سر جھکا دیا۔

”میں اپنے باپ کی وجہ سے مجبور ہوں۔ وہ مقر و پیش ہیں باشم کاردار کے۔ اور میں اس نوکری پر مجبور ہوں، ورنہ...“ اس کی آواز سرگوشی میں بدلتی۔ تھیجی دروازہ ایک دم کھلا۔ مایا کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئی۔ سعدی نے بھی چونک کردیکھا۔

میری اندر داخل ہو رہی تھی اور... اسے کچھ کھٹکا تھا۔

”تم ابھی تک کیوں بیٹھی ہو؟“

مایا ذرا گھبرا کر اٹھی۔ صاف ظاہر تھا وہ میری کے رعب میں تھی۔

”میں اس سے طبیعت پوچھ رہی تھی۔“ وہ ذرگئی تھی۔

میری نے گھوکر اسے دیکھا۔ ”تمہیں اس سے مخاطب ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ باہر جاؤ۔“ مایا فوراً سے باہر نکل گئی تو میری اس کے قریب آئی۔ سلکتی نظرتوں سے اسے گھورا۔

”وہ کیا پوچھ رہی تھی؟“

”یہ کہ میری فیملی میں کون کون ہے؟“

میری چند لمحے بے بی بھرے غصے سے اسے دیکھتی رہی، پھر اس نے زور دار پھر سعدی کے منہ پر مارا۔

اس کا پورا دماغ گھوم گیا، دنیا چکر گئی۔ دوسری طرف کوگر نے لگا اور ابھی سنبھل ہی نہ پایا تھا کہ وہ جھکی، اور اسے گردن سے دبوٹا سامنے کیا۔

”میں زندگی میں تمہیں پہلی اور آخری نصیحت کر رہی ہوں، سعدی یوسف خان! مایا اچھی ہے، بہت اچھی۔ لیکن اگر تم نے اس ا استعمال کرنے کی کوشش کی تو تمہارا بہت براحال ہو گا۔ ہاشم تمہاری جان لے لے گا۔“ جھکلے سے اس کی گردن چھوڑی۔ سعدی کا پورا سر ہوا کر رہا گیا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کہا اسے۔“ (اگر کسی مرد نے ما رہوتا تو وہ وضاحت نہ دیتا مگر وہ میری تھی۔) لیکن میری سے بغیر ہی تیزی سے باہر مایا کے پیچھے لپکی تھی۔

.....  
وہ مجھ کو قتل کر کے کہتے ہیں ..... مانتا ہی نہ تھا یہ، کیا کہئے؟  
ائیسی دھوپ میں جلس رہی تھی جب وہ کسی کام سے گھر آیا۔ اور سیدھا اوپر اپنے کمرے کا دروازہ کھولتا تو دیکھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ روشنی اندر آر رہی تھی۔ زمرا سڑی نیبل پیٹھی، مٹھی گال تک کچھ سوچے جا رہی تھی۔ سامنے سعدی کا لیپ ناپ کھلا پڑا تھا۔  
وہ رات والے لباس میں تھی بال بھی گول مول بند ہے تھے۔ صبح سے باہر نکلی نہیں تھی۔ پیر کا انگوٹھا اس روز سے آج تک پٹی میں نہ تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتے الماری کی طرف بڑھ گیا۔

”کیا تم نے میری کچھ زلی تھیں؟“ اس کے سوال پر وہ رکا، اور پلناؤ توجہ سامنے آیا، اس پر تجھ بھت کیے پیٹھی رہی۔  
”کیا؟“

”جب میں اس ریسورانٹ میں رخی پڑی تھی، اور تمہاری بیوی بھی تو کیا تم نے اس منظر کی کچھ زلی تھیں؟“ بڑے ٹھنڈے انداز میں پوچھا۔ مڑی بھی نہیں۔ فارس کے ابر و قن گئے، آنکھوں میں تختی در آئی۔

”آپ جواب میں کیا سننا چاہتی ہیں؟ کیا بات آپ کو خوش کرے گی؟ بتائیے، میں کہہ دیتا ہوں۔“  
زمر نے جواب نہیں دیا۔ چپ پیٹھی رہی۔ وہ بھی پلاٹ گیا۔ الماری سے چند کاغذات نکالے اور پٹ زور سے مار کر بند کیا۔ پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ پھر سے اسکرین پر وہی تصویریں نکال کر دیکھنے لگی، جو سعدی کے لیپ ناپ میں تھیں۔ (یہ وہی تصاویر تھیں جو سعدی نے ہاشم کے لاکر سے نکالی تھیں، اس رات جب شیر و نے اپنے اغوا کا ناٹک رچایا تھا۔) سعدی کے سامان، اس کے ٹیبلیٹ اور اب اس کے لیپ ناپ میں سوائے ان تصاویر کے کچھ بھی ایسا نہ ملا تھا جو اس کے کسی دشمن کی خبر کر سکتا۔

بالآخر زمر نے موبائل اٹھایا اور احر کے نام منع لکھا۔ ”احر شفیع، کیا ہم مل سکتے ہیں؟“  
جواب چند لمحے بعد آگیا تھا۔

”پہلے بولیے، پلیز!“ ساتھ ہی زبان نکالت اسما نیبل! وہ ہلکا سماں کرائی۔ ایک گھنٹے میں ریسورانٹ پہنچ جائے، اس سے پہلے کہ میں اپنا ارادہ بدلت دوں۔“ اور موبائل پرے ڈال دیا۔

آدھے گھنٹے بعد زمرتیار ہو کر بال آدھے کچھ میں باندھے پرس کہنی پکا نکلی تو پر سکون لگ رہی تھی۔ کارکی طرف بڑھتے اس نے دیکھا، سامنے بزرہ زار پر، مسز کاردار کے کمرے کے عقبی برآمدے میں جواہرات اور ندرت بیٹھی تھیں۔ (کافی دن سے جواہرات سے لاتاں نہیں ہوئی، سواب ادھر جا بیٹھی تھیں۔) جواہرات نے مسکرا کر ہاتھ بٹایا۔ زمر نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور کار میں بیٹھی۔ پھر ان کی نظر وہ گے سامنے کا رزن سے آگے گزگزی تو جواہرات نے ندرت کی طرف چہرہ موڑا۔

”ایسا لگتا ہے زمرفارس کے ساتھ خوش نہیں ہے۔“

ندرت جو اسی طرف دیکھ رہی تھیں، چونکہ جواہرات کو دیکھا۔

”نمیں، وہ دونوں ٹھیک ہیں۔“ ذرا سنبھل کر بولیں۔

”میں اس لئے کہہ رہی ہوں کیونکہ مجھے ان دونوں کی فکر ہے۔ مجھے شادی شدہ جوڑے ایسے ایک دوسرے سے کٹے کئے نہیں رہتے۔“

”یہ دونوں رہتے ہیں۔“

”سعدی کی وجہ سے... ایسا ہے!“ وہ بس اتنا کہہ پائیں۔ آنکھوں میں ڈھیروں تکان اتری۔

”میرا نہیں خیال کر صرف سعدی کی وجہ سے ایسا ہے۔ اگر سعدی آگیا تو کیا یہ دونوں ایک دم سے ٹھیک ہو جائیں گے؟ اونہوں۔“

ندرت خاموش رہیں۔

”یقیناً یہ بتیں آپ کے ذہن میں بھی گھوم رہی ہوں گی ندرت، مگر ظاہر ہے آپ یہ فارس سے کہنے والے سکتیں کیونکہ آپ اس کے گھر میں رہ رہی ہیں۔“ مسکراتے ہوئے نرمی سے وہ کہہ رہی تھی۔ ”مگر کبھی کبھی انسان کو اپنے چھوٹوں کو ٹوک دینا چاہیے۔ اس میں انہی کا فائدہ ہے۔“

ندرت نے ایک گھری سانس اندر اتاری۔ ”نمیں مسز کاردار میاں بیوی کے معاملے میں ہمیں نہیں بولنا چاہیے، ایک دوسرے کو الام دینے سے صرف گھر کا ماحول خراب ہوتا ہے اور پھر یہ گھر تو میرے ابو اور بھائی کا ہے، میرا اپنا ہی ہوا، اس لئے مجھے سب کا سوچنا چاہیے۔“ اپنے ازلی گھر لیا اور سادہ انداز میں وہ کہتی گئیں۔ جواہرات کو بات پسند نہیں آئی، مگر خاموش رہی۔

وہ اٹھیں تو فیونا آئی۔ ایک نحاسا باکس اور خط کالفافہ سامنے کیا۔

”کوئی ڈرائیور تھا، آپ کے لئے دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا، اوپر نام لکھا ہے۔“ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ جواہرات نے باکس کھولا۔ اندر میروں

غمبل پاکیں ہیروں سے جھملاتا بریسلیٹ رکھا تھا۔ اس نے دو انگلیوں میں بریسلیٹ نکال کر دیکھا۔ پھر کارڈ کھولا۔ اس پر فارسی میں لکھا تھا۔

”مَنِ الْمَاسِ رَبِّهِ مُلْكُه دَادِم!“

چہ الماس را ملکہ مغرور!

ہارون عبید۔“

(میں نے پیش کیا ملکہ کو ایک ہیرا! کیونکہ ہیرے ملکہ کو مزید مغرور بناتے ہیں)

”ہارون عبید اور اس کی ایرانی ماں کا فارسی ٹیچ!“ وہ اس کارڈ کو دیکھ کر بے نیازی سے مسکرائی۔

”سو اتنے سال بعد ہارون عبید اسی شہر میں واپس آئی گئے۔“ کوئی عجیب سماح احساس تھا جو اس خوبصورت اور سُنگدل ملکہ کو اپنی لپیٹ

میں لے رہا تھا، اور یہ احساس یقیناً ناخوچوار نہیں تھا۔

”مَنِ الْمَاسِ رَبِّهِ مُلْكُه دَادِم! اس نے مسکراتے ہوئے دھرا یا۔“

تیرا بھولا ہوا پیچاں وفا ..... مر رہیں گے اگر اب یاد آیا  
ریسٹورانٹ پر افطار بونے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ ملازموں کی بھاگ دوزگی تھی۔ ایسے میں اوپری پورشن لاک کر  
کے، زمر نیچا آئٹھی تھی اور اس وقت اس کے سامنے ہستا مسکراتا احمد بیٹھا تھا۔

”جی، سرزمزرا کیسے یاد کیا آپ نے مجھے؟“

وہ تالگ پر تالگ جائے، گھنگریاں لٹ لٹگی پر لپٹتے بولی۔ ”مجھے آپ کی سرد سز درکار ہیں۔“

”یعنی آپ مجھے ہار کرنا چاہتی ہیں؟ گذ۔“ ذرا سامسکرا یا۔

”پہلے مجھے آپ کی باہر اندر رائے چاہئے، خالص غیر جانبدار رائے۔“

”شیور دیسے میری کنسٹلشنی فیں پانچ ہزار روپے ہے، مگر چونکہ آپ غازی کی وائے ہیں تو آپ سے میں....“ ذرا سوچنے کی  
ادا کاری کی۔ ”پانچ ہزار ہی لوں گا۔“ شرارت سے مسکرا یا۔

زمر نے پرس سے ایک گلابی نوت نکال کر سامنے رکھا۔ ”ایک غیر جانبدار اور سمجھدار انسان کی حیثیت سے آپ...“

”میں، جب آپ اتنی عزت کرتی ہیں تو مجھے لگتا ہے، ابھی بے عزتی ہونے والی ہے۔“ اس نے نوت والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”احمر شفیع میں سنجیدہ ہوں!“ اور وہ واقعی سنجیدہ تھی۔ صرف ایک لمحہ لگا احمد کو سیدھا ہونے میں۔

”پوچھیئے۔“ آپ کے وہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

”آپ ایک sensible اور ذہین انسان ہیں، کر مثال بھی رہ پکے ہیں، اور ایک پیدائشی فراہد بھی ہیں، مطلب کہ تجربہ کار ہیں، اس  
لئے اپنی پوری ایمانداری سے بتائیے، آپ کی رائے میں، کیا فارس غازی نے اپنے بھائی اور بیوی کو قتل کیا تھا؟“

”ایمانداری سے بتاؤں؟“

زمر نے اثبات میں گردن بلا کی۔

”جی، میرے خیال میں، اس نے بالکل یہ دونوں قتل کیے تھے۔“

زمر ذرا سامسکرا کی۔ ”واو۔ میرا خیال تھا، صاحبی الجن، بہترین دوست ہوتے ہیں۔“

”سرزمز، آپ نے مجھ سے میری دیانتدار نہ رائے مانگی، میں نے دے دی۔ غازی کو خود بھی علم ہے کہ مجھے اس کی بے گناہی کا  
یقین نہیں۔“ وہ اب کمکل سنجیدہ تھا۔ کمکل پر فیشن۔

”آپ کو کیوں یقین نہیں؟ آپ تو اس کے دوست ہیں۔“

”دوست ہوں، انداھا نہیں ہوں۔ غازی کے خلاف جتنے ثبوت ہیں، وہ اتنے ہوں ہیں، اتنی مضبوط گواہیاں ہیں، کہ ایسا ممکن نہیں کہ  
کوئی اس حد تک جائے آپ کو پھنسانے کے لئے۔ اگر اس کا کوئی سر عالم کھلے عام دنیں ہوتا تو میں پھر بھی مان لیتا، مگر فی الحال میرے خیال  
میں، اس نے یہ قتل کیے تھے۔ ہاں آپ کے بر عکس میں اسے مار جن دے سکتا ہوں۔ اس کی بیوی اور بھائی اس کو دھوکہ دے رہے تھے، اس کے  
پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔“

”میرے خیال میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس نے واقعی وہ قتل کیے تھے اور مجھ پر گولی چلائی تھی۔“ چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی۔

”سرزمز، آپ نے یقیناً مجھ سے اب اگلا سوال پوچھنا ہے، کیونکہ صرف ایک ایک سوال کے لئے تو آپ مجھے بلا میں کی نہیں۔ سو یاد  
رکھئے۔ اس کے پانچ ہزار الگ سے ہیں۔“

”شیور!“ اس نے دوسرا گلابی نوت نکالا، اور سامنے رکھا، پھر سعدی کے لیپ تاپ کو قریب کیا، چند میں دبائے اور پھر بولی۔ ”مجھے

دنہ تساویریں ہیں، اور ساتھ میں اس کال کی آڑیو جو فارس نے مجھے کی تھی۔ یہ دونوں ایک ہی وقت میں کاپی کی گئی ہیں، آج سے ڈیپر ہسال ہے۔ یہ تصویریں مجھے اور زرتاشہ کو گولی مار دینے کے بعد کی ہیں۔ ”زمر نے لیپٹاپ کارخ اس کی طرف موزا۔ احمد بنجیدی سے اسکرین کی اسے توجہ ہوا، مگر تصاویر دیکھ کر... اس کے لیب کھل گئے، آنکھیں صدمے اور تعجب سے پھیلیں۔ پھر اس نے خود ہی اسکرین فولڈ کر دی۔ زمر بظاہر نارمل اور پر سکون، اس کو دیکھ رہی تھی۔

”آئی ایم سوسوری؟“

”میں غلط ہو سکتی ہوں اپنی جانبداری کی وجہ سے، مگر آپ بتائیے۔“ وہ تھہری۔ ”آپ کے خیال میں، کیا فارس یہ پچھر ز لے سکتا

احمر کا سرنگی میں ہلا۔ ”کبھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ murderer ہو سکتا ہے،“ monster نہیں۔ اور یہ تصویریں...“ اس نے سرنگی میں سر ہلا�ا۔ ”اُنہوں دیکھیں، آزر لکنگ،“ تی ہی ان دلوگوں کو اپنی زندگی سے مٹانے کے لئے ہے یہ ہات بلڈڈ مرڈر ہوتا ہے، مگر ایسی تصویریں... یہ تو کولڈ بلڈڈ مرڈر پل جاتی ہیں، ان میں آپ کی اپنے بیکار کے ساتھ کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہوتی۔ نہ محبت، نہ نفرت۔ وہ آپ کے لئے صرف آپ کی مہارت کا ثبوت ہوتا ہے۔ آپ کبھر ہی ہیں ناکہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

زمر نے اثبات میں سر ہلا�ا۔ ”بالکل، کیونکہ میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں فارس کے بارے میں ہربات پر یقین کر سکتی ہوں، مگر وہ اس حد تک نہیں جا سکتا۔ وہ نہیں کر سکتا۔“ اس نے پنی میں بندھے انگوٹھے کو جو تے سے مسلا۔ میز کی چمکتی سطح میں اپنا عکس نظر آیا تو وہ اس کی نتھے گھنگی، مگر اس نتھے ”الماس“ (ہیرے) والی لوگ میسی چمک اس میں نہ تھی۔ احر پچد لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ ریسٹورانت میں لوگوں کی چہل پہل سے وہ دونوں کٹ چکے تھے۔

”مسز زمر، آپ کو پچھا اور بھی چاہیے شاید مجھے سے؟“

زمر نے بکھری گردن ہلائی۔ ”مجھے ایک قابل اعتماد انویسٹی گیٹر چاہیے اور مجھے پتہ ہے کہ آپ اپنے کام میں مہارت رکھتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں، آپ مجھے پتہ کر کے دیں کہ یہ تصویریں ہوٹل کے کس کمرے سے لی گئی ہیں، کس نے میں۔ اور سعدی کو یہ کہاں سے ملیں؟ مجھے لکھتا ہے وہاں کوئی اور بھی تھا۔ یہ فارس نہیں ہے، تو پھر کون ہے؟ ہو سکتا ہے اسی شخص کا سعدی کی گمشادی میں با تھہ ہو۔ فارس کے دشمن ہیں، اور عدی کو اسی کے دشمنوں نے غائب کروایا ہے۔“

”شیور۔ میں پتہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں، اور آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے اور آپ کے درمیان رہے گا۔“

”فارس...“ زمر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ احر نے غور سے اسے دیکھا۔ ”جی؟“

”آپ کا کبھی کسی غصہ و رآدمی سے واسطہ پڑا ہے احر؟“

”جی۔ میرے ابو۔ بہت غصہ رہتے۔ اسی لیے تو میں اتنا سوہنہت ہوں۔“

”غصہ و رآدمی پتہ ہے کیسا ہوتا ہے؟ اسے جلد غصہ چڑھتا ہے، پھر وہ نہیں دیکھتا کہ آگے کون ہے، بس اسے رگید دیتا ہے، پھر غصہ شہنڈا ہوتا ہے تو معافی مانگتا ہے، دوبارہ کبھی غصہ نہ کرنے کا وعدہ کرتا ہے، اور کچھ دن بعد پھر وہی حرکت کرتا ہے۔ مگر فارس... وہ ایک طرف ایک فضیلا انسان مشہور ہے، مگر۔ کوئی چیز ایڈاپ نہیں ہوتی اس کے پر سناٹی اسکچ میں۔ کچھ غلط ہے۔ وہ جیل میں کیسا تھا؟“ ”وہ اپنا سارا وقت... مطلب زیادہ وقت... بڑائی جھگڑوں میں گزارتا تھا، یونو... پھٹے، گروہ بندیاں، اور وہ دوسروں کے لئے ہی

لڑتا تھا۔ اگر انداخت وہ اپنے پر زن رائٹس حاصل کرنے کے لئے لگاتا تو آج جبل جنت بن چکی ہوتی۔ دیسے میں ایک تحریک شروع کرنا چاہتا ہوں، قیدیوں کے پر زن رائٹس کے حوالے سے، اور.....”

”تھینک یو احمد!“ وہ ذرا بیکان سے مسکراتی۔ ”تو آپ میرے لئے کام کریں گے؟“

”بالکل، مگر کچھ وقت لگے گا۔ اور... میم۔ میں پندرہ ہزار فی گھنٹے لوں گا۔ میرے علاوہ آپ کسی سے یہ کام کروں ابھی نہیں سکتیں!“

”نہیں، اس کو ایک ایک پرہ بائز کرنے کی فیس کہتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ ہارون عبید مجھے کتنا پے کر رہے ہیں؟“

”کون ہارون عبید؟“

احمد کا منہ بنا۔ ”آپ اتنے مشہور سیاستدان کو نہیں جانتیں، میں نہیں مان سکتا۔“

”اچھا وہ ہارون عبید۔ انہوں نے تو ایک اسکنڈل کے بعد فاران مشری سے استغفار دے دیا تھا۔ اب کہاں سے آگئے؟“

”آہ، ہمارے سیاستدان! یہ کچھ عرصہ Hibernite کرتے ہیں، پھر دوبارہ میدان میں آجائتے ہیں، اور اپنا امتحان درست کرنے کے لئے ان کو ہمارے جیسے کنسٹلش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب دیکھئے گا، تین ماہ کی میڈیا یا کمپنی کے بعد میں ان کو کیسے مشہور کرتا ہوں۔“ زمر نے ہاتھ اٹھا کر اس کی چلتی زبان کو روکا۔

”میں قائل ہو گئی آپ کی فیس کے لئے۔ مگر میرا کام ہونا چاہیے۔“

”شیور!“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بالآخر زمر یوسف کو کچھ کسون ملا تھا۔

.....

بجھ گئی شمعِ حرم، بابِ کلیسا نہ کھلا..... کھل گئے زخم کے لب، تیرا دریچہ نہ کھلا  
جب زمر گھر آئی تو کمرے میں وہ صوفے پٹانگ پٹانگ جمائے بیٹھا، گھٹنے پر کھے لیپٹاپ پکام کر رہا تھا۔ آہ! پہنچی نظر  
انداز کرتا کام کرتا رہا۔

”کل میں جاؤں گی ڈاکٹر تو قیر سے ملنے۔ جیسا کہ ہم نے ڈیسائڈ کیا تھا۔“ وہ پرس اور فائلز سائیڈ میبل پر کھرہ ہی تھی۔

”اوہ! ہوئے۔ ابھی کچھ دن تھہر جائیں۔“ زمر نے تجھ سے اسے دیکھا۔

”فارس، نیاز بیگ والے واقعے کو آنہ دن گزر چکے ہیں، اب مزید کتنا انتظار کریں گے؟ اگر تب تک سعدی نہ رہا تو؟“

”وہ لوگ اسے نہیں ماریں گے، اگر مارنا ہوتا تو اونی میں مار دیتے۔ یہ آپ نے ہی کہا تھا۔“ وہ ٹاپ کر رہا تھا۔

”مگر جو مقصد انہیں اس سے چاہیے وہ پوارا ہو گیا تو وہ اسے زندہ کیوں رکھیں گے؟“

”وہ ایک سائنسدان ہے، ایک حساس ادارے کا سائنسدان۔ وہ اس سے ہر ممکن کام لیں گے۔ اور چند دن کی ہی تو بات کر رہا ہوں میں۔ آگے آپ کا ہی فیصلہ ہو گا۔“

وہ پہنچی نظر وہ سے اسے دیکھنے لگی۔ ”میرا نہیں خیال کہ اب فیصلے میں کر رہی ہوں۔ فی الحال تو تم ڈیسائڈ کر رہے ہو کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟“ فارس نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”پتہ نہیں آپ کیا بولے جا رہی ہیں۔ میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر تو قیر، میں ہے۔ ذرا دونوں میاں بیوی آ جائیں، پھر ہم ان کو دیکھ لیں گے۔“

”دونوں میاں بیوی؟ اس کی بیوی کا کیا ذکر؟“

اور فارس غازی کی تاپ کرتی انگلیاں تھیں، ایک دم رک کر اس نے زمر کو دیکھا۔

”میرا مطلب تھا، ہم دونوں۔“

”نہیں، تمہارا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ سامنے کھڑی چھپتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”تم نے اس کی بیوی کا ذکر کیوں کیا؟“

”زمر“ میں سارے دن کا تھکا ہوا آب ہوں، کیا اس وقت میرا دماغ خراب کرنا ضروری ہے؟“ ایک دم غصے سے اکتا کراٹھا اور لیپ تاپ اٹھائے باہر نکل گیا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر مژدی تو دیکھا، صوفے پر اس کا والٹ پڑا تھا۔ زمر نے چند لمحے کے لئے سوچا، پھر والٹ اٹھایا۔ اندر جھانکا، اس میں پیسے تھے۔ چند ایک وزنگ کارڈ زراور اے ٹی ایم کارڈ۔ اس نے وہی نکالا۔ اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

### Faris Taheer Ghazi

”فارس طمیر غازی؟“ وہ بڑا بڑا۔ ”مجھے تو اس کا پورا نام بھی نہیں معلوم۔“ کارڈ والپس رکھ کر اس نے والٹ وہیں ڈال دیا۔ پھر وہ

بیٹھ پیٹھی اور سینڈل اتارتے ہوئے سوچنے لگی۔

(مجھے اس میں کوئی شنک نہیں کہ وہ ایک قاتل ہے، اس میں بھی کوئی شنک نہیں کہ وہ سعدی کے ساتھ مخلص ہے۔ مگر اس کے علاوہ میں کیا جانتی ہوں فارس کے بارے میں؟ ایک کم گو غصہ و را اور پر اسرار شخص۔ مگر اس سے ہٹ کر... فارس غازی کون ہے؟) وہ سوچ میں گم بیٹھی رہی۔

پھر ایک دم وہ اٹھی۔ نیچے آئی تو فارس نہیں تھا۔ یہ ورنی برآمدے سے آوازیں آرہی تھیں، وہ ندرت کے ساتھ باہر بیٹھا تھا۔ زمر دبے قدموں سے چلتی پیسمت کی سیرھیاں اترنے لگی۔ نیچے تہہ خانہ اندر ہی پڑا تھا۔ اس نے ایک ہی ہتھ جلانی، تو وہ وسیع کرہ نیم اندر ہیر ہو گیا۔ وہاں کونے میں ایک چھوٹے سے کمرے کا دروازہ تھا، جیسے کوئی اسنور وغیرہ ہو۔ فارس نے اس کوشادی کی پہلی رات بتا دیا تھا کہ پیسمت کی چاپی وہ اس کو نہیں دے رہا، ادھر زرتابش کی چیزیں پڑی ہیں۔ پھر جب حدود لوگ ادھر آ کر رہنے لگے تو سامان رکھنے کے لیے اس نے پیسمت کھول دی، بگری کر دی۔ زمر اس کے بند دروازے کے سامنے آ کر ٹھہری... اس کی چاپی اب بھی اس نے کسی کو نہیں دی تھی۔ کیا رکھتا تھا وہ اس میں؟ اکثر وہ اسے پیسمت سے اور پر آتے دیکھتی تھی۔ بار بار اسے اس کمرے میں جانے کی کیا ضرورت پڑتی تھی؟

زمر نے اس کمرے کا لاک گھما�ا، وہ مغلل تھا۔ ذرا دھکا دیا۔ بے سود۔

”آپ ادھر کیا کر رہی ہیں؟“

آواز پتھی کہ صور، وہ کرنٹ کھا کر پڑی۔

نیم اندر ہیرے میں وہ سیرھیاں اترتاد کھائی دے رہا تھا۔ چہرے پختی تھی اور آنکھوں میں برہمی۔ تہہ خانے میں اس رات عجیب تی پرساریت بکھری تھی۔ زمر دو قدم پیچھے ہٹی۔ کمر دیوار سے جا گئی۔ وہ قدم قدم چلتا اس طرف آ رہا تھا۔

”میں...“ زمر نے تھوک لگا۔ سابق ڈسٹرکٹ پر اسکی پورے سارے الفاظ اس اندر ہیر کمرے میں کھو گئے تھے۔ ”میں... سعدی کی چیزیں دیکھنے آئی تھیں۔“

وہ اس کے عین سامنے آ رکا، چھپتی نظریں اس کی آنکھوں پر گاڑھیں۔

”سعدی کی چیزیں یا میری؟“ ایک قدم مزید قریب آیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑ کئے گا، مگر بظاہر گردن کر کر اکربوی۔ ”میں جو بھی کروں، تم سے مطلب؟“ اور سر جھٹک کر ساتھ سے گزر

نے لگی، کفارس نے اسے دونوں کہنوں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے واپس دیوار سے لگای۔  
”میں نے آپ کو..... منع کیا تھا..... ادھر آنے سے...“ چاچا کر، اس کو گھوڑتے وہ بولا تو زمرکی رنگت زرد پڑنے لگی۔ ”منع کیا تھا  
یا نہیں؟“

”کیا... تھا۔“ اس کے الفاظ اٹکے۔ جنگل کی وہ رات اور اس کا سحر غائب ہو گیا، وہ پھر سے اس روئیوں میں تھی اور وہ اسے کال  
پکھردا ہاتھا، وہ بد صورت اور خوفناک باتیں جو اسے کبھی نہیں بھوتی تھیں۔ ایک اس دن اسے فارس سے ڈر لگا تھا، اور ایک آج رات اسے ڈر لگ  
رہا تھا۔

”تو پھر شرافت کی زبان آپ کے اس اللہ دماغ کو کیوں سمجھ نہیں آتی، ہاں؟“ غصے سے بولا تو زمرکی اس پر جمی آنکھوں میں گویا  
سانس رکنے کی کیفیت سونے لگی۔ مگر وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہے، میں دیکھنے آئی تھی تمہاری چیزیں۔ پھر کیا کرلو گے تم؟ میں... تم سے نہیں ڈرتی!“

”اچھا؟ بند کر کے چلا جاؤ آپ کو اسی کرے میں دوچار دن کے لیے؟ ڈرتی تو نہیں ہیں نا آپ!“ اسے کہنوں سے پکڑے جھٹکا

سادیا۔

”مجھے میں ہینڈل مت کرو۔“ بدق塘 اس نے اپنے بازو چھڑانے چاہے مگر بے سود۔

”میری بات کاں کھول کر نہیں زمر بی بی!“ پر پش نظر دل سے اسے دیکھتے، وہ چاچا کر بولا۔ ”میں جتنا آپ کا لحاظ کرتا ہوں، اتنی  
آپ بڑھتی جاتی ہیں۔ کسی دن مجھ سے واقعی اپنا قتل کروا کر رہیں گی، اس لیے آئیندہ... آئیندہ اگر میں نے کبھی آپ کو اپنی چیزوں کے قریب بھی  
چھٹتے دیکھ لیتا، تو دیکھنے گا، کہ کیا حال کرتا ہوں آپ کا۔ ابھی جانتی نہیں ہیں آپ مجھے۔“ جھٹکے سے اسے چھوڑا، اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ  
رکی، تیزی سے بھاگتی ہوئی سیرھیاں چڑھتی گئی۔ ابا اور سیم کے کمرے سے ملختہ اسٹڈی روم میں آکر اس نے دروازہ لاک کر لیا۔ پھر گھرے  
گھرے سانس لیتی دروازے سے پشت نکائے آنکھیں بند کیے کتنی ہی دیر کھڑی رہی۔

”تھیں اس سے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تھی زمر، اب بھگتو!“ عادت کے برخلاف اس نے خود کو ملامت کیا۔ کتنی ہی دیر پھر وہ  
ادھر ہی کھڑی رہی۔ یہ تو طبقاً کل صبح تک وہ واپس کرے میں نہیں جائے گی۔  
آج دوسرا دفعہ اسے فارس سے ڈر لگا تھا۔

❖❖❖

زبان پر مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے ..... ہر ایک حلقة، زنجیر میں زبان میں نے!  
سعدی یوسف کا وہ کمرہ جن خاموش پڑا تھا۔ وفتحاً با تحروم کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ قدرے لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔  
بیڈ کا سہارا لیا، اور بیٹھا۔ پھر بند دروازے کو دیکھا۔ چند لمحے سوچا۔ اور جھک کر سائیڈ نیبل کا دراز کھولا۔ اندر ایک پیچ رکھا تھا جو اس نے سنک کے  
پیچ سے اتارا تھا۔ اس نے یہ پیچ بالکل شنک کر کے ادھر رکھا تھا۔ اب چند دن بعد وہ اسے نکال کر دیکھ رہا تھا۔

پیچ پر زنگ لگ چکا تھا۔ سعدی مسکرا یا۔ اس نے اپنی گردن کو چھواجہاں ہلکا ہلکا ساپینہ مسلسل آیا رہتا تھا۔ اس کا شنک ٹھیک تھا۔ ہوانم  
تھی۔ کچھ زیادہ ہی نہ۔ وہ میقیناً کسی ایسے شہر میں تھا جو سمندر سے قریب تھا۔

(اور ہاشم کو لگتا ہے کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا تو یہ اس کی بھول ہے۔)

پیچ رکھ کر اس نے ٹھیک لگائی اور سائیڈ نیبل سے قرآن اٹھایا۔ چہرے کے زخم اب تقریباً مندل ہو چکے تھے۔ البتہ وہ پہلے سے کمزور  
گلتا تھا۔

آج کتنا وال روزہ ہے، کچھ نہیں معلوم۔ وہ کتنے سارے پڑھے گا، کوئی حساب نہیں، کبھی دل چاہتا تو پڑھتا جاتا، کبھی اتنا بے زار اور اداس ہوتا کہ دودو دن قرآن نہ کھولتا۔

(سب اس وقت کیا کر رہے ہوں گے؟ امی چھوٹے باغیچے والے گھر میں افطاری بنارہی ہوں گی، کبھی ناموں اور پچھوپھی آ جایا کرتے ہوں گے اور با تواب امی اور حمد کے ساتھ رہتے ہوں گے....) اس نے بھکتے ذہن کو قرآن کے صفات پر کروز کرنا چاہا۔  
”میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی، دھنکارے ہوئے شیطان سے۔“ تعود پڑھ کر اس نے انہل و ہیں سے کھوی جہاں سے اس روز چھوڑی تھی۔

”اور بے شک ہم نے دیا داؤ دا اور سلیمان کو علم....!“

سعدی کے ابرو ستائشی انداز میں اٹھے۔ (گھر والوں کی یاد محو ہونے لگی۔) ”واه... اللہ تعالیٰ... اس طرح کی آیات اور... یہ شاہانہ انداز... دی کنگ آف آل کنگز... جب آپ فرماتے ہیں ہم نے یہ کیا تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔ میں بتوں کو پوچھنے والوں انسانوں کو خدا کا بیٹا مانتے والوں اور قربوں کو سجدہ کرنے والوں کے سامنے گردن اٹھا کر فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ دیکھو، میرا رب تو یہ ہے! بادشاہوں کا بہوش! میرے اور اس کے درمیان کوئی تیر انہیں ہے؟“ زمی سے مکراتے سر جھکائے وہ کہہ رہا تھا۔ (اور اللہ کی باتیں تو ختم نہیں ہوتیں، سو سعدی نے آیات کے الفاظ پر توجہ دی۔)

”ہم نے دیا داؤ دا اور سلیمان کو علم! اور ان دونوں نے کہا، سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جس نے فضیلت دی ہم کو، بہت سے مومن بندوں کے اور پر۔“ اس نے رک کر درساوچا۔ ”کتنی امیزگ بات ہے اللہ تعالیٰ۔ اکثر ہماری فیصلیز میں کئی بچوں میں سے ایک یادو بہت لائق لکھتے ہیں، ماں باپ اپنی تربیت پر اتراتے ہیں اور وہ بچے اپنی ذہانت پر مگر آپ کہتے ہیں کہ جیسے داؤ دعیہ السلام کے ۱۹ (انیس) بیوں میں سے صرف ایک سلیمان علیہ السلام کو آپ نے خاص علم عطا کیا تھا، ویسے ہی ہر ایک کو مجھے بھی، علم آپ نے ہی دیا۔ عمل بھی آپ دیتے ہیں، اگر ماں باپ دیتے تو ساری اولاد کو دیتے، مگر باقی اولاد کو بھی آپ نے ضرور پچھا اور عطا کیا ہوتا ہے۔ پتہ ہے اللہ تعالیٰ لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں، سعدی تمہیں اتنا اچھا قرآن کس نے سکھایا؟ میں کہتا ہوں، مجھے میرے رب نے سکھایا ہے۔ آپ اسی سے علم کے لیے دعا کریں، وہ آپ کو مجھ سے بھی اچھا قرآن سکھائے گا۔“

قید خانے کا وہ کمرہ اس تینی دوپہر میں بھی کھلے پہاڑی مقام کی طرح مختنڈا ہو گیا تھا۔ سعدی اور گرد سب کچھ بھلائے بیس ان الفاظ کو پڑھ رہا تھا۔

”اور وارث ہوئے سلیمان، داؤ دکے۔ اور کہا (سلیمان نے) کہا لوگو، ہم سکھائے گئے ہیں، پرندوں کی بولیاں، اور ہمیں عطا کی گئی ہے، ہر چیز! بے شک یہ وہ فضل ہے جو روشن (نمایاں) ہے۔“ گھنگریا لے بالوں والے لڑکے کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”اور فلمی اداکاروں، سیاسی لیڈر ز اور ایسے تمام لوگ جن کی وجہ شہرت وہ کام ہیں جو اللہ کو نہیں پسند، ان سب کی پرستش کرنے والے پرستاروں کے سامنے میں گردن اٹھا کر کہہ سکتا ہوں، کہ دیکھو میرے آباء تو یہ لوگ ہیں۔ جوانیاء ہیں۔ جو اتنی شان سے بات کرتے ہیں۔ انہیں اللہ نے کیا کیا نہیں عطا کیا، اور انہوں نے اپنا علم روک کر نہیں رکھا، بلکہ نہیں کیا۔ نعمتوں کا اعتراف کیا اور یہی شکر ہوتا ہے۔ اور ہم لوگ۔“ اس کی مسکراہٹ اداسی میں بدلتی۔ ”ہمیں تو ذرا سا ہر آجائے، ہم کسی کو بتاتے نہیں کہ کہیں وہ ہم سے اچھا نہ کر لے۔ اتنے نگک دل کیوں ہیں، اللہ تعالیٰ؟“

کمرے میں اس وقت سکینت ہی سکینت اتری تھی۔ ٹھنڈی میٹھی سی چھایا۔ وہ سر جھکائے، آگے پڑھنے لگا۔

”اور اکٹھے کیے گئے سلیمان کے لئے ان کے لئکر جنوں میں سے اور انسانوں میں سے اور پرندوں میں سے تو وہ پورے ضبط میں

رکھے گے تھے۔“

سعدی نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا۔

”اللہ تعالیٰ! ضبط کے لئے جو لفظ آپ نے استعمال کیا ”وزع“، اس کا اصل لغوی مطلب کیا تھا بھلا؟“ کچھ دماغ آج کل ست رہتا تھا، سوذرادیر سے یاد آیا۔ ”ہاں! فوج کو تیب وار حصول میں رکھنا۔ ایک دوسرا مطلب بھی تھا۔“ ذرا ذرا ہن پر زور دیا۔ ”شاید... روکنا او منع کرنا۔ سوبات یہ ہے اللہ تعالیٰ۔“ آنکھیں کھول کر وہ ذرا سکون سے اپنی بات سمجھانے لگا۔ ”کہ جنوں اور پرندوں کو تو رہنے دیں، صرف انسانوں پر بھرائی کرنے کے لئے، اپناراج قائم رکھنے کے لئے، بھلے وہ گھر کا ہو یا کسی ادارے کا، یا پورے ملک کا؟“ سپلن سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اور جب اس سپلن کو بھی ڈسپلن کرنا چاہیے۔ نزدیکہ روک ٹوک ہونہ کم... خیر... پھر کیا ہوا؟“ بہت سرہ بہر دفعہ نئی لگتی، سو دلچسپی سے اگلی آیت کی طرف آیا۔

”یہاں تک کہ وہ (سلیمان علیہ السلام) جب آئے چیونٹیوں کی ایک وادی تک...“ (وہ ہلاک سامسکرا یا۔ یہ چیونٹیاں اسے کتنی پسند تھیں۔) ”تو کہنے لگی، ایک (ملکہ) چیونٹی یا ایها النمل (اے چیونٹیوں) اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ یہ نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان اور اس کے لئکر تھمیں روندے ایں!“

”ارے واه... آج کی آیات اتنی regal آرہی ہیں اللہ تعالیٰ میں تو خود کو ایک قیدی محسوس ہی نہیں کر رہا۔ پہلے آپ پھر سلیمان علیہ السلام پھر چیونٹی! ہر کسی کی اپنی شان ہے۔“ اس نے کھلے دل سے سراہا۔ ”اب یہ چیونٹی... نہ گھبرائی، تہ بھاگی!“ اس نے پہلے باقی سب کا سوچا، وہ ملکہ تھی، اس نے اپنی جماعت کی خیرخواہی چاہی، مگر وہ ذہین بھی تھی، اس کو معاملہ ڈیل کرنا آتا تھا۔ شورنیں چاپا، پورے وقار اور بردباری اور جمل سے چیونٹیوں کو میطاب کر کے اندر جانے کا کہا، اور پھر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں، اس نے بھی چھوٹی حرکت نہیں کی بڑا دل رکھا، اچھا گمان کیا کہ اگر بالفرض سلیمان کا لئکر تھمیں روند بھی دیں تو بے خبری میں ایسا ہو گا۔ آپ سے اوپنج اور بڑے لوگ عادتاً آپ کو روند کر نکل جاتے ہیں، اپنی حفاظت آپ کو خود کرنی ہوتی ہے۔ اللہ پتہ ہے کیا میری بیچر کہتی تھیں، نہل ذہین females کی سورۃ ہے۔ اس میں ایک چیونٹی ہے، جو چیونٹی ہو کر بھی ملکہ ہے، اور اس میں ایک ملکہ ہے، ملکہ بلقیس (ملکہ سبا)۔ وہ ملکہ ہو کر بھی ایک چیونٹی ہی ہے۔ دیکھا جائے تو ساری عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ کسی کے لئے ملکہ اور کسی کے لئے چیونٹی ہوتی ہیں۔“

اس ٹھنڈی چھایا والے کمرے میں بیٹھا وہ لڑکا، اداسی سے مسکراتے ہوئے بولے جا رہا تھا جب دروازہ کھلا۔ سعدی نے چونک کر سرا اٹھایا۔ مایا اندر واخی ہوئی تو اس کی آنکھوں میں بے پناہ حزن تھا۔ وہ اس کے کندھے کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ قرآن اس کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ نیبل پر وھرا۔ آنکھیں بند کیں، اپنے جسم پر صلیب کا نشان بنایا۔ ”خداؤند یسوع مسیح مجھے معاف کرنا۔“ پھر آنکھیں کھولیں، اور اس کی متوجہ نظر وہ نہ کیا۔ بیگنیشن اس کے بازو میں پیوست کیا۔ وہ بھی سوال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سوئی چبھی، اور پھر... ایک دم ساری دنیا سکن ہوتی گئی۔ منظر دھنڈلاتا، پھر واضح ہوتا، پھر دھنڈلاتا، وہ بھی نہ سکا، اس کا جسم سن ہو چکا تھا۔ مایا نے اسے لٹایا، کروٹ کے بل، یوں کہ اس کا چھروہ دروازے کی طرف تھا، اور دونوں بازوؤں سمت گرے ہوئے تھے۔ چہرہ شاکڈا اور ساکن تھا، جیسے وہ بت بن گیا ہو، مگر آنکھیں سب دیکھ رہی تھیں۔

مایا سر جھکائے باہر نکلی اور کھلے دروازے سے... سعدی کی بے جان آنکھوں نے دیکھا کہ ایک قدری بیس نصیس سوٹ میں ملبوس، وجہہ اور اس اس ادمی اندر واخی ہوا ہے۔ اس کے بال جیل لگا کر پیچھے سیٹ تھے، کلائی کی گھڑی، چکتے بوٹ۔ وہ سب دیکھ سکتا تھا۔

کسی نے کرسی لا کر رکھی اور وہ سعدی کے قریب بیٹھا، ناگ پٹا نگ پٹا نگ بھائی۔ شاہانہ انداز میں کرسی کی پشت پر بازو پھیلایا۔

”ہیلو اگین!... سعدی!“ ہاشم کی آواز بھاری ہو کر اس کی سماعتوں سے نکل رہی تھی۔ وہ بنا پلک جھکپے، نیم مردہ سا پڑا سے دیکھے گیا۔

”کیسے ہوت؟ اودہ آئیں سوری۔ اس بھیکش کے لئے، چند گھنٹوں میں تم بھیک ہو جاؤ گے۔ میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں، بُس یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم بھی پر حملہ کرو اور تمہارے زخم ادھر میں۔ مجھے تمہاری فکر ہے بچے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہاری فکر صرف مجھے ہی ہے۔ تبھی تو عید سے پچھلے دن پہلے میں اپنی تمہارے پاس آیا ہوں، تمہارا عید کا تھنڈے کر۔“

آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ وہ ناٹگ پٹانگ جمائے بیٹھا، انگلی سے تھوڑی مسلتے کہہ رہا تھا۔

”کیا تم میرا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہو گے؟ میں نے تمہاری جان بچائی، کیونکہ میں سعدی... میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ایک اتنے ذہین اور قابل سائنسدان کو ضائع کیوں ہونے دوں؟ دیکھو میں نے تمہیں ایک اچھی آفردی تھی، کہ میرے لئے کام کرو، مگر تم نے جواب میں کیا کیا؟ تم نے میرے بھائی کو گالی کو گالی دی۔ مگر میں تمہارا ہر قصور معاف کر رہا ہوں۔ آج سے ہم نئی شروعات کریں گے۔“

سعدی اسی طرح، بے جان، مردہ سا، خالی آنکھوں اور مفلوج بدن کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔ وہ اب جیب سے ایک بڑا پیکٹ نکال رہا تھا۔

”مگر اس سے پہلے... تمہارا عید کا تھنڈے۔“ پیکٹ سے اس نے ایک لارج فوٹو گراف نکالا۔ ”تمہیں معلوم ہے، تمہاری فیلی شفت ہو گئی ہے، گیس کرو کہ ہر؟ میرے گھر کی انیکسی میں۔ تم نے کہا تھا کہ میں ان سے دور رہوں، مگر وہ خود قریب آگئے ہیں۔“

سعدی کی مفلوج آنکھوں میں سرخی سی ابھرنے لگی۔ گروہ ہل نہیں سکتا تھا۔ ہاشم نے تصویر اس کے سامنے کی۔ (لان کا منظر، سارہ اور ذکیہ خالہ کے ساتھ افظار کی میز پر ہاشم، امل اور نور کو پیار کر رہا تھا۔ یہ تصویر یہ اس دن اس کے حکم پر فیونا نے لی تھی۔)

”دیکھو تمہاری باس بھی عرصے بعد تمہارے گھر آگئی، میں بھی کچھ دیر بیٹھا ان کے ساتھ وہ سب یوں بات کر رہے تھے جیسے تم مر چکے ہو۔“

مفلوج پڑے سعدی کا دل مفلوج نہیں تھا اور وہ بڑی طرح ڈوبا تھا۔ (سارہ خالہ نے کسی کو نہیں بتایا؟)

ہاشم نے تصویر اچھا دی۔ وہ سعدی سے کلرا کر فرش پر گری۔ اس نے دوسری تصویر سامنے کی۔ (رات کا منظر... انیکسی کے سامنے کھڑے بات کرتے شیر و اورز مر۔)

”معاف کرنا، مگر کہیں یہ تمہاری ڈیزیر زمر تو نہیں ہے جو اس وقت شیر و سے اتنے دوستانہ انداز میں بات کر رہی ہے؟ شیر و وہی ہے نا جس نے تم پر گولی چلائی تھی؟ مگر... زمر اور فارس کو فکر نہیں ہے اس بات کی۔ ویسے بھی نیاز بیگ ناہی کرایے کاغذ اپکڑا جا چکا ہے، اور اس نے تمہارے قتل کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ اب سب تمہیں روکر چپ بھی ہو گئے ہیں۔ اودہ ہاں زمر کی جا ب چلی گئی، اور آج کل وہ بھی اپنی جا ب کے لئے فارس کی طرح مصروف ہے۔“

وہ تصویر بھی بھیک کی طرح سامنے چھینگی۔ اور ایک اور تصویر یہ نکالی۔ (انیکسی کے بیرونی زینے پر خاموش اور اداس پیغمبھی نہیں۔)

”تمہاری بہن... بس وہی اکیلی رہ گئی، مگر فکر مت کرو مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری بہن کو مجھ پر سیکرٹ قائم کا crush ہے، سو... ہم اپنے دوست بن گئے... وہ کہہ رہا تھا، اور سعدی کی آنکھوں میں سرخ خراشیں ابھر رہی تھیں، اس نے پورا زور لگا کر رامٹھنے کی کوشش کی، مگر... جسم ہلنے سے قاصر تھا۔ کیا مرننا ایسا ہوتا ہے؟“

”اب وہ بے چاری بچی مجھے دن رات میسیح کرتی ہے، اور تمہیں پتہ ہے، میں اب کیا کروں گا؟ کسی رات جب فارس گھر نہیں ہو گا، تو میں اسے اپنے پاس بلاوں گا۔ جو بھی بہانہ کروں گا، وہ معصوم بچی مان لے گی، تمہیں پتہ ہے نا، میرا کرہہ اس کے کتنے قریب ہے، سو میں کوشش کروں گا کہ اس event کی بھی تصویریں لوں، مگر... تمہیں بر لگھے گا، اس لئے، اگر تم چاہتے ہو کہ میں ایسا نہ کروں تو آج سے ہم نئی شروعات کریں گے۔ تمہارے گھر والے تمہیں بھول چکے ہیں۔ کوئی شوت میں نہیں چھوڑا اپنے خلاف۔ اور ہاں، تمہاری بہن نے تو وہ فلیش بھی میرے حوالے کر دی جس میں میری فالنڑ تھیں۔ سوتھم ان لوگوں کو بھول جاؤ، سعدی۔ تمہاری فیلی اب میں ہوں، اور میرا کاروبار اب تم بنو گے۔“

وہ اٹھا اور قدم قدم چلتا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ ”میں نے تمہیں اس لیے چھایا کیونکہ مجھے تم اچھے لگتے ہو، لیکن تم پرانی انوسمان میں مفت میں نہیں کر رہا۔ اس لیے آج سے تم میرے لئے کام کرو گے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہاری بہن کے ساتھ کیا کر سکتا ہوں ایسے مجھے واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ کہیں کوئی بزری بھی تھی۔ سعدی کی مفلوج آنکھوں نے دیکھا وہ جیب سے سیل فون نکال رہا تھا۔ پھر مسکرا یا۔

”ناکس نائینگ! پاکستان سے ہے اور وہ بھی تمہاری بہن کا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں، تب تک تم میری بات پر غور کرو!“ ہون کا ان سے لگایا اور خوشگوار سے انداز میں بولا۔ ”ہیلو! چین۔ کیسی ہو؟“ اپنیکر آن کر دیا تھا۔ کمرے میں چین کی آواز گوئی۔ ”میں ٹھیک۔ آپ باہر گئے ہوئے ہیں؟“

”ہوں۔ میں انڈیا ہوں، ایک پرانے دوست سے ملنے۔“

مفلوج لیٹے سعدی کا تنفس تیز ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔

”اچھا وہ... مجھے پوچھنا تھا... وہ عجلت میں لگ رہی تھی۔“ آپ نے وہ فلیش کھول لی؟“

”ارے ہاں وہ خاور نے کھولی۔ شکریہ! تمہاری وجہ سے میرے اتنے قیمتی ڈاؤمنش محفوظ رہے۔“ دوسرا طرف خاموشی چھا گئی۔ ”کون سے ڈاؤمنش تھے اندر؟“

”میرے آفس کی فائلز تھیں۔“

وہ پھر چپ ہوئی۔ ”آپ مجھے وہ فلیش واپس کر سکتے ہیں؟ وہ بھائی کی چیز تھی، میں اسے بھائی کی یاد کے طور پر رکھنا چاہتی ہوں۔“ ”آہ....“ وہ رکا۔ ”اچھا میں تمہیں پرنس شدہ ڈاؤمنش بھیج دوں گا واپس آ کر۔ یا پھر...“ ذرار کا۔ ”تم کسی دن آ کر میرے کمرے لے جانا۔“ نے کروٹ لئے لڑ کے کاپڑہ دیکھا۔ ایک آنسوں کی ساکت آنکھ سے پلک کر تکیے میں جا گرا تھا۔

ہاشم باہر نکل گیا اور پیچے کمرے میں قبرسی خاموشی چھا گئی۔

کیا مرنا ایسا ہوتا ہے؟

.....  
وہ بیکیں سے لوٹ جائیں جنہیں سر عزیز ہیں ..... ہم سر پھروں کے ساتھ کوئی سر پھرا چلے اور ہزاروں میل دور اسلام آباد کے اس مضائقتی علاقے میں... قصر کی انکسی کے پیمنہ میں کھڑی چین نے ہاشم کی کال کاٹی تو اس کے چہرے پر شدید ملال چھایا تھا۔

”تواب آپ مجھ سے بھی جھوٹ بولنے لگ گئے ہیں، ہاشم؟“ وہ بڑا ای۔ ”آپ نے وہ فلیش کھولی ہی نہیں، یا پھیک دی یا کسی کو دے دی، اگر کھو لتے تو دیکھ لیتے کہ اس میں میرے دوکور یعنی ڈرائے تھے جو میں نے اسی رات لاک کر کے آپ کے لیے تیار کھئے تھے، کیونکہ میں آپ کو بتانے کی غلطی کر چکی تھی اور اب ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ مگر آپ نے کیسے مجھ سے جھوٹ بول دیا!“ سر جھٹکا اور پھر اپنے سامان سے اس نے علیشا کے نیکلیں کے ساتھ کھی سفید فلیش ڈرائیونکالی جو سعدی نے اس کو دی تھی۔

”آپ کو تو اس ڈرائیونکا بھی نہیں پتہ تھا تو یا آپ کی کیسے ہوئی؟ اتنا جھوٹ؟“ اس کا دل بری طرح دکھا۔ ”محبت ایک طرف، لیکن میں بھائی کی چیز آپ کو نہیں دے سکتی تھی!“ اس نے باکس بند کیا اور فلیش لیے اوپر زینے چڑھنے لگی۔ (آخروں یکھوں تو سہی، اس میں اتنا کیا خاص ہے جو سعدی بھائی اور ہاشم، دونوں اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے؟)

پکھو دیر بعد وہ لیپ ٹاپ کھولے لاؤخ میں بیٹھی تھی، فلیش لگا رکھی تھی اور وہ اس پروگرام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی جس کے ذریعے

ان ڈاکوں میں کو مغل کیا گیا تھا۔ تبھی زمر سیر ہیاں اتر کر نیچے آئی۔

”میں یہ سوٹ میں جا رہی ہوں، حمد، فارس آئے تو اسے بتا دینا کہ نیچے تھے خانے میں جو اسٹور روم بنایا ہے، اس کا لاک تڑوا دیا ہے میں نے آج۔“ اطلاع دے کر وہ نیچے چلی گئی۔ حمد نے بے دھیانی سے اس کی بات سنی۔

ذرادیر بعد ہی فارس گھر میں داخل ہوا تو اسے لیپ تاپ پکام کرتے دیکھا۔

”تمہارے ہاتھ میں کمپیوٹر؟ خیریت؟“ دروازہ لاک کرتے اس نے ایک اچھتی نگاہ گھر پر ڈالی جو رات کی خاموشی میں ڈوبتا تھا۔

”جی۔ اور پھر یہ نیچے آپ کے اسٹور تک گئی ہیں، اس کا لاک تڑوا دیا تھا آج انہوں نے۔“ وہ بھی بیٹھی تھی، بے تو جھی سے بتایا۔

اور فارس غازی کا دماغ ایک دم گھوم کر رہا گیا۔ پھر تیزی سے میڑھیوں کی طرف لپکا۔

سُب رفتاری سے زینے پھلانگتا نیچے آیا تو سیع تھہ خانہ تاریک پڑا تھا، کونے والے کمرے کا دروازہ بند تھا اور وہ اسکی دروازے سے کمرہ کا نئے پہ بازو لپینے کھڑی تھی۔ منتظر۔ وہ غصے سے سرخ چہرہ لئے جا رہا نہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

”کس کی اجازت سے آپ نے اس کمرے کا لاک تڑوا دیا؟ منع کر کے گیا تھا نا میں کہ.....“ غصہ ناک ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ غراتے ہوئے قریب آیا، کہ دفعناً رکا۔

زمر بس خفیہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اتنا کیوں ڈر گئے ہو؟ میں نے تو نہ سے مذاق کیا تھا۔“

فارس نے بے اختیار کر دروازے کو دیکھا وہ لا کڈ تھا۔ اس نے گھری سانس لی۔ وہ اس کو اکسارہی تھی۔

”کیا چاہتی ہیں آپ؟“

”پلیز اپنا غصہ مجھ پر ضائع مت کرنا، کیونکہ نہ میں تم سے ڈرتی ہوں، اور نہ میں کبھی اس کمرے کا لاک تڑوا دوں گی، بلکہ تم مجھے خود یہ کمرہ کھول کر دکھاؤ گے۔“ مھنڈے انداز میں وہ کھردہ تھی۔ ”اور تم مجھے خود بتاؤ گے کہ تم اس میں کیا رکھتے ہو، تم سارا دن کیا کرتے ہو، تم چار سال سے کیا کرتے رہے ہو۔ تم ہمیشہ کہیں جا رہے ہوتے ہو، کہیں سے آرہے ہوتے ہو۔ تم سے شادی سے پہلے میں نے اس ریஸورائٹ میں آ کر تم سے صرف سچ بولا تھا، دشمنی اپنی جگہ دیانتداری اپنی جگہ سواب سچ بولنے کی باری تمہاری ہے۔“ وہ کچھ دریل بھنچ برہی سے اسے دیکھتا رہا۔

”ذرتا نہیں ہوں آپ سے۔ صرف اس لیے اپنی کچھ چیزیں الگ رکھتا ہوں کیونکہ اگر آپ دیکھیں گی تو میرے ساتھ کام نہیں کریں گی۔“

زمر دو قدم آگے آئی، تیکھی نظریں اس کی آنکھوں پر گاڑھیں۔ ”فارس، جیسے ہم نے نیاز بیگ کو گھیرا، ویسے ہی سر مد شاہ کو بھی گھیر لیں گے، اور آہستہ آہستہ سعدی کے ہر ایک مجرم کو، مجھے کم از کم سعدی کے معاملے میں تم پر اعتبار ہے، لیکن میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ فارس تھیر غازی کون ہے؟ کم از کم مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں کس کے ساتھ کام کر رہی ہوں!“

فارس نے گھری سانس لی، اور پھر جیب سے چاپوں کا گچھا نکالتا اس کمرے کے دروازے تک آیا۔ ایک چالی لاک میں گھمائی، اور پھر... دروازہ کھول دیا۔



## ”مَنِ المَّا سِ رَابِيْ بِكَلْمَه دَادِمَا“ (حَصْدُ دُومَ)

ابھی تو دل میں ہے جو کچھ بیان کرنا ہے ..... یہ بعد میں سہی کس بات سے گرنا ہے  
دروازہ کھلا تو تاریک سا کمرہ سامنے آیا۔

فارس نے سونج پہ باتھہ مارا۔ بتیاں روشن ہوئیں اور... چوکھت میں کھڑی زمرکی آنکھوں میں تھیر اتر آیا۔ وہ قدم قدم چلتی آگے آل اور گردان گھما کر دیکھا۔ گو کہ اس نے کسی ایسے ہی منظر کی توقع کی تھی، مگر اس کا جنم اتنا زیادہ ہو گا، یہاں سے اندازہ نہیں تھا۔  
اس کمرے میں کاغذ تھے۔ بے تحاشہ کاغذ۔ تین دیواریں کاغزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ نوٹس، تصاویر، اخبار کے تراشے اور پہنچنے تھے۔ اسٹڈی بیبل پہ لیپ پ کے ساتھ کچھ فائلز دھری تھیں، اور کچھ جدید آلات۔ دو مزید لیپ ناپس۔ زمر نے چہرہ فارس کی طرف موڑا تو،  
اسی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”جو میں کرتا رہا ہوں۔ پچھلے چار سال سے۔“

زمر کی نظریں پھر سے کاغزوں سے ڈھکی دیوار تک گئیں۔ وہاں بہت سے لوگوں کی تصویریں لگی تھیں۔ کچھ کو تو وہ پہچانتی تھی۔ جلس سکندر، (فارس کے کیس کا نج) اے الیس پی سرمد شاہ، وارث غازی کا باس الیاس فاطمی، ڈاکٹر تو قیر بخاری (جنہوں نے سعدی کا آپریشن کیا تھا) کی بیوی ڈاکٹر ایمن بخاری... اور بھی کچھ لوگ جن کو وہ نہیں پہچانتی تھی۔ وہ ڈاکٹر ایمن کی تصویر پہ نظریں مرکوز کیے آگے آئی۔

”تو تم واقعی ڈاکٹر تو قیر کی بیوی کو جانتے تھے۔ وہ تمہاری....“، اس نے تصویر کے اوپر نیچے لگے کاغزوں پر نظر دوڑائی۔

”وہ تمہاری سایہ کا ٹرست تھی!“

فارس خاموش رہا۔

”اس نے کورٹ میں بیان دیا تھا کہ تم نے اس کے سامنے اعتراض جرم کیا ہے... اور... یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمہیں نیل بھجوایا، اور جیل سے نکلنے نہیں دیا۔“ وہ اوپر سے نیچے تک ان دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”تم... تم واقعی چار سال سے فارغ نہیں ہیئے تھے۔“ زمر کہتے کہتے چوکی۔ ”تم انتقام پلان کر رہے تھے؟“

فارس طہیر غازی نے اثبات میں سر کو خم دیا۔ اب وہ چوکھت سے بیک لگائے، بازو سینے پہ لپیٹے کھڑا تھا۔

”اور یہ لوگ...“ وہ ایک دوسری دیوار پہ چپاں کا گند دیکھنے لگی۔ ”یہ کون ہیں؟“

”جیل کے ساتھی!“

زمر نے اچھے سے ان تصاویر کو دیکھا۔ ”یہ کہ مرمنڈر ہیں جن کو جیل میں جب کسی سے لڑنا ہوتا یا کام لکوانا ہوتا، یہ تمہیں آگے لگادیتے یہ تھا کہ وہ غصے اور جارحیت کو استعمال کرتے تھے، مگر یہ لوگ۔ ان کا تمہارے اس... اس انتقام سے کیا تعلق؟“

”آپ کو کس نے کہا کہ یہ مجھے استعمال کرتے تھے؟“ دنخی سے مسکرا یا تو زمر چونک کرائے دیکھے گی۔

”زمر بی بی کسی نے ایک دفعہ مجھے کہا تھا کہ تمہاری کمزوری تمہارا غصہ ہے۔ سو اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنالو۔ میں نے اتنے سال یہی کیا ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے، اتنا بے وقوف ہوں میں کہ بناؤ پے سمجھے پرانے پھٹوں میں کو دپڑوں گا؟“

وہ بالکل خہر کرائے دیکھنے لگی۔ ذہن میں جھما کہ ساہوا۔

”انہوں نے تمہیں استعمال نہیں کیا، بلکہ تم نے... تم نے ان کو استعمال کیا۔ اوه...“ لب بے اختیار سکڑے۔ اسے کچھ کچھ سمجھا آنے لگا تھا۔

”میں نے جیل میں چار سال ان کرمنڈر، اسمگلر، کرایے کے قاتلوں، اور ڈرگ ڈیلرز کے ساتھ تعلقات بنائے ہیں، ان کے مکے سمجھائے، ان پر احسان کیے، ان کی کمزوریاں بھی جانیں، اور ان کی طاقت بھی تاکہ وقت پڑنے پر ان دونوں کو استعمال کر سکوں۔ میں ایک بڑے تلاab میں تھا جس میں گندی مچھلیاں تھیں۔ مجھے باہر کے مگر مچھوں سے لانے کے لیے ان کی مدد چاہیے تھی۔“ چوکھت سے ٹیک لگائے کھڑے فارس نے زخمی مسکرا ہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ ”جب جیل گیا تھا تو اکیلا تھا، جب باہر آیا ہوں تو بہت سے کامیکس ہیں میرے پاس۔“

”اور وہ سب تمہیں تمہارے انتقام میں مدد دیں گے؟“

”بالکل!“ اس نے شانے اچکائے۔

”زمر پر پھر سے آگے پیچھے گوم کر اس کمرے کو دیکھنے لگی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں تیر کے ساتھ بمحض تھی۔

”دگران لوگوں نے.....“، ”اکٹرا میں، اے ایس پی وغیرہ کی تصاویر کو دیکھتے بولی.....“ اگر تمہیں جیل میں ڈالا تھا تو تمہارے اپنے جراحت کی وجہ سے اور....“

”اوکے مزز زمر! میں آخری دفعہ آپ کو یہ بات بتانے جا رہا ہوں۔“ ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور بہت تخلی سے بولا۔ ”اور اس کے بعد آپ کبھی میری منت بھی کریں تو میں نہیں دھراوں گا، اس لئے ابھی دھیان سے نہیں۔“ سنجیدگی سے چاچا کر بولا۔ ”میں نے وہ قتل نہیں کیے تھے، نہ آپ پر گولی چلانی تھی،“ ذرا اٹھرا۔ ”مگر مجھے پتہ ہے کہ آپ یقین نہیں کریں گی مٹھیک ہے۔ سو نہیں، مجھے سے زندگی میں ایک ہی بڑی غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ وارث کی چیزیں جب میری کار سے برآمد ہوئیں تو مجھے احتیاط کرنی چاہیے تھی، مگر میں اور کو نفیذ نہ تھا۔ مجھے لگا مجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ اور اسی اعتماد نے مجھے جیل پہنچا دیا۔“ تلخی ٹکریل سے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

”آپ مجھے قاتل سمجھتی ہیں، مٹھیک ہے، بالفرض میں نے وہ قتل کیے بھی تھے، تب بھی، کیا مجھے Fair Trial کا حق نہیں تھا؟“

”تھا!“ زمر کا سر خود بخود اشاعت میں ہلا تھا۔

”کیا اس بدترین تشدد کی اجازت تھی جو مجھ پر کیا گیا؟ کیا اس سائیکل کا ٹریست کو حق تھا کہ میرے پرائیوٹ سیشنز کو رٹ میں بیان کرے؟“

اس کی گرون فنی میں ہلی۔ ”نہیں۔“

”کیا اس بجھ کو حق تھا کہ وہ مجھے تو دس دس ماہ بعد کی تاریخیں دیا کرے؟ کیا پر اسکیوں ٹریسیرت کا فرض نہیں تھا کہ وہ کیس کی پوری

تفقیش کرے؟“

زمرے نے اب کے بس گردن ہلائی۔

”تو زمری بی... میرا بھائی مر اتھا، یوئی مری تھی، میرا خاندان بنا ہو گیا تھا، اور مجھے فیر ٹرائل کا حق بھی نہیں دیا گیا۔ سو...“ دیواروں کی طرف اشارہ کیا۔ آنکھوں میں تپشی تھی جو زمرے نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ”جیل جانے کے چار ہفتے بعد میں نے یہ سب پلان کرنا شروع کیا تھا۔ اور میں اپنے انتقام کو ضرور پورا کروں گا۔ میری زندگی کے ان چار سالوں کا حساب ان لوگوں کو دینا ہو گا۔“

پراسرار اسٹوروم میں خاموشی چھا گئی۔ بہت دیر بعد وہ بول پائی۔ ”تم ان لوگوں کو قتل کرنا چاہتے ہو؟“

وہ ہلاکا سما مسکرا یا۔ ”میں قاتل نہیں ہوں، اور قتل کرنے سے یہ لوگ ایک ہی دفعہ مر جائیں گے، اس لئے موت سے نہیں، یا اپنی زندگیوں سے اپنے کیے کا حساب چکائیں گے۔“

زمرے نے ایک گہری سانس لی اور اسٹری ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ وہ گہری سوچ میں دکھائی دیتی تھی۔

”تمہیں جیل سے نکلے ڈھائی ماہ سے اوپر ہو چکے ہیں، مگر یہ لوگ تو آزاد ہیں۔ میرا مطلب ہے، تم نے ابھی تک کچھ کیا کیوں نہیں؟“

”دو چیزیں۔“ اب کے قدرے نرمی سے تنانے لگا۔ ”پہلی، مجھے فاشنی اسٹرانگ ہونا تھا، پیسہ چاہیے تھا، امی نے ایک فلیٹ چھوڑا تھا میرے نام لا ہو رہیں۔ اس کو بچنا تھا، اسی میں لگا تھا۔ اور دوسرا، مجھے ابھی یہ جانا تھا کہ ان سب لوگوں کو چلانے والا کوون ہے؟ کون ان کو حکم دے رہا تھا؟ آپ بے شک یہی سمجھ لیں کہ میں نے وہ قتل کیے تھے، تو پھر کون ہے میرا دشمن جس نے مجھے جیل بھجوایا، اور باہر نہیں نکلے دیا؟ اتنا بے وقوف تو نہیں ہوں نا میں کہ ایسے ثبوت اپنی کار میں چھوڑوں گا!“ زمرے نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”کسی نے تو مجھے ایسے پھنسایا تھا کہ میں باہر نہ نکل سکوں؟“ زمرے نے پھر ہاں میں گردن ہلائی۔ اسے پہلی دفعہ اپنا آپ فارس کی ٹھپر جیسا نہیں، اس کی استوڈنٹ جیسا لگ رہا تھا۔ ”پھر... کیا تمہیں معلوم ہو سکا؟“

فارس نے سچائی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ تمام لوگ جو مجھے جیل بردا کرنے میں ملوث تھے، وہی لوگ سعدی کی گمشدگی سے جڑے ہیں۔ جب وہ ہسپتال لے جایا گیا، تو ڈاکٹر بخاری کی اس دن ڈیوٹی نہیں تھی، مگر ان لوگوں کو معلوم تھا کہ اس ہسپتال میں ان کے کام کا بندہ کون ہے اس کی بیوی کو پہلے استعمال کر چکے تھے، سوانہوں نے ڈاکٹر بخاری کو ہسپتال بھیجا، وہ آیا، اور اپنا کام دکھا گیا۔ اگر مجھے اس وقت معلوم ہوتا کہ یہ ڈاکٹر ایکن کا شوہر ہے، تو میں...“ بے سی اور غصے سے اس نے کچھ خخت کہنا چاہا، مگر سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ اسی طرح اسے دیکھ گئی۔

”کیا سعدی کو یہ سب معلوم تھا؟“

”نہیں۔“ فارس گردن موڑ کر ان کا غزوں کو دیکھتے بولا۔ ”وہ ایک دن ٹھیج کے وقت آیا، تو میں نے اس کمرے کو لاک کر دیا اور خود باہر والی ٹیبل کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ وہاں چند کاغذ لگار کئے تھے.....“ زمرے نے مڑ کر دیکھا، وہاں چند کاغذ اور الیاس فاطمی کی تصویر اب بھی لگی تھی۔ ”وہ ہی سمجھا کہ میں صرف اس ایک ماسٹر مائسٹر کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں، اور اسے مارنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی ٹھیج نہیں کی۔ میں اسے اس سب سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس کو کچھ معلوم تھا شاید جسے وہ چھپا رہا تھا، کیونکہ وہ سعدی تھا، آپ کی طرح تھا!“ زمرے نے چونک کرائے دیکھا۔ ”آپ دونوں ایک ہی جیسے ہیں، اسٹریٹ فارورڈ۔ مجھے پتہ ہے کہ اس نے مجرم تک پہنچ کر کیا کیا ہو گا!“ سر جھٹکا۔ ”اُن لوگوں کو لنفرنٹ کیا ہو گا، دو چار نصیحتیں جھاڑا یا ہو گا، اور ارادہ ہو گا کہ سب کو اپنا کارنا سہ بتا کر کہے، فلاں فلاں ملوث ہے اس میں، اس کے خلاف مقدمہ درج کرتے ہیں اور یوں نہیں انصاف مل جائے گا۔“ تیخی سے پھر سر جھٹکا۔ ”مجھے پورا یقین ہے اس نے ضرور ان لوگوں کا حاس دلایا ہو گا کہ وہ ان کے راز جانتا ہے، اور انہوں نے اسے خاموش کر دیا۔ مگر میں....“ زمری کی آنکھوں میں دیکھ کر ختنی سے بولا۔ ”میں سعدی یوسف نہیں ہوں۔“

میں فارس غازی ہوں۔ میں بھی باقی نہیں کرتا اور جو میں ان لوگوں کا حشر کروں گا وہ دنیا دیکھے گی۔“

”سو تم اسی لئے ڈاکٹر والا معاملہ ڈیلے کر رہے تھے کیونکہ تم میرے پلان کے مطابق ان کو صرف اکیلا اور ایکسپوزیٹی نہیں کرنا چاہتے، بلکہ... تم ان کو بتاہ بھی کرنا چاہتے ہو۔“  
”بالکل۔“

”اور تمہیں معلوم تھا کہ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی، اس لئے تم نے یہ سب مجھ سے چھپایا۔“

”ابھی وہ وقت نہیں آیا جب آپ مجھے کسی چیز سے روک سکیں، مگر میں آپ کی بلا وجہ کی بحث نہیں سن سکتا تھا۔“ ذرا سے شانے اچکائے۔

”اسی لئے پہلے تم نے مجھے اعتماد میں لیا اور پھر آہستہ سارا کنشروں میرے ہاتھ سے لینے لگے۔ اور جب مجھے شک ہوا، تم نے مجھے غصہ میں ٹال دیا، ایکچھہ کلی فارس....“ وہ سر ہلاتے ہوئے سمجھنے والے انداز میں کہنے لگی۔ ”میں نے تمہیں کبھی خدا یا ندرت بھا بھی یا سعدی پر غصہ کرنے نہیں دیکھا، کبھی اب اسے بھی غصے سے بات نہیں کی، صداقت کو بھی نہیں جھاڑا، سو میں تمہیں بتاؤں مجھے کیا لگتا ہے؟“ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مجھے لگتا ہے، تم اپنا غصہ کنشروں کرنا جانتے ہو، مگر تم اسے استعمال کرتے ہو۔ جیسے تم اسے جیل میں استعمال کرتے تھے۔ تم اتنے غصہ ور ہو نہیں جتنا خود کو ظاہر کرتے ہو، تاکہ لوگ تمہیں گمز و راجر جذباتی سمجھیں اور تم اپنا کام کر جاؤ۔ اور تم نے دیکھا، وہ اے ایسی نیت میں قطعاً خوفزدہ نہیں ہے جتنا وہ مجھ سے جھگلتا ہے۔“ وہ ہلاکا سماں کرایا۔

”تو آپ اتنے دن سے مجھے اسٹرڈی کر رہی تھیں؟“

”واٹ اپور!“ اس نے شانے اچکائے۔ پھر انہی کرایک کاغزوں سے بھری دیوار کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”تو اب تم چاہتے ہو کہ تم ان لوگوں کو صرف استعمال ہی نہ کریں، بلکہ ان کو سزا بھی دیں۔“

”میں یہ کام اکلیدے کر سکتا ہوں، آپ نہ شامل ہوں تو آپ کی مرضی!“

”ہاں، تم بہت کچھ کر سکتے ہو، مجھے انداز ہو رہا ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر آپ میرا ستھر دیں گی؟“ وہ بغور سے دیکھ رہا تھا۔ زمر دیوار کو دیکھتی رہی۔

”اگر تم سعدی کو واپس لے آؤ تو میں سب کچھ کرنے پر تیار ہوں۔“ اس نے خود کو کہتے شنا۔

”جب جیل میں تھا میں، اور یہ سب لوگ میرے خلاف تھے، مجھے اذیت دے رہے تھے تو صرف ایک شخص تھا جس نے میری بات پر اعتبار کیا تھا، اور جس نے مجھے باہر نکالا تھا اس قید سے۔ وہ سعدی تھا۔ اور میں اسے واپس لے آؤں گا۔ لیکن اس کے لئے آپ کو میرے طریقے سے کام کرنا ہوگا، سوز مردی بی...“ وہ دو قدم چل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور جب بولا تو آنکھوں میں مضبوط عزم تھا۔ ”آج سے سارے فیصلے میں کروں گا۔ اور آپ مجھ سے زیادہ بحث نہیں کریں گی۔“ چند لمحے زمر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”ٹھیک ہے، مگر ایک آخری سوال۔“ اور پھر وہ زخمی سامسکرائی۔ ”تمہارے ان سارے مجرموں میں میری تصویر کدھر لگی ہے؟ آخر تمہیں جیل تو میں نے بھیجا تھا۔“

فارس کی گردی میں گلٹی سی ڈوب کر بھری۔

”میرا نمبر ان میں کون سا ہے؟ کب آئے گی میری باری؟“ وہ چند ثانیے کچھ کہنے نہیں پایا۔

”جیسا کہ آپ نے خود کہا تھا، جب سعدی مل جائے گا، تب آپ مجھ سے اپنا حساب لیں گی، سو میں بھی تب ہی آپ سے حساب لوں گا۔“ اور اس نے صرف اپنی اناکے باعث وہ کہا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اور وہ اس بات سے بے خبر، کہ یہ وہ عورت ہے جسے وہ ایک

ہزار دفعہ بھی معاف کر سکتا ہے سرہلا کر گہری سانس لیتے ہوں۔

”ٹھیک ہے۔ میں تب تک تمہارے ساتھ ہوں جب تک سعدی نہیں مل جاتا۔ مگر آج سے میں ہر جگہ تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“

”نہیں، میں دیکھنا چاہتی ہوں کتنے کام کرتے ہوں کل کو جب تم مجھ سے اپنا حساب لو تو کم از کم مجھے تمہارے طریقوں کا علم تو ہونا۔“

قطیعت سے کہتی وہ مژگُنی۔ فارس خاموشی سے اسے بیڑھیاں چڑھتے دیکھتا رہا۔ تمہے خانے میں ایک دم ادا سی چھائی تھی۔

.....♦♦♦.....

اب جو چاہیں بھی تو اس طرح نہیں مل سکتے ..... پیڑ اکھڑے تو کہاں بار ڈگر لگتا ہے

ان سے سینکڑوں، ہزاروں میل دور اس کمرے میں مقید سعدی یوسف بیڈ پیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین تصویریں

تھیں جب کوہہ بار بار اوپر نیچے کر کے دیکھ رہا تھا۔ ہاشم اپنا زہر اگل کر جا چکا تھا، اور سعدی کا سن کرتا جسم بھی آہستہ آہستہ نارمل ہو چکا تھا۔

(ڈاکٹر سارہ نے کسی کوئی نہیں بتایا) وہ یا سیت سے سوچ رہا تھا۔ (اس نے اپنا بین ایک غلط شخص کے ہاتھ میں دے دیا، اسے ہمیشہ

سے معلوم تھا وہ کتنی بزرگ اور ذری سی ہے، مگر سب بنا سوچے سمجھے ہوا۔ اس کی زندگی کی دوسری بڑی غلطی زمرا درجنہ سے جھوٹ بولنا تھی کہ

وہ کسی سائنسدان سے ملنے جا رہا ہے اور پہلی بڑی غلطی ... سارہ پر اعتبار کرنا تھی۔)

مسلسل تصویریں شغل کرتے زمرا نو شیر وال کی تصویر اور پلا یا۔ آنکھوں میں سرفہرستی دوڑنے لگی۔ ہنین کی تصویر اور آئی تو دماغ

پھٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گھرے سانس لئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

تبھی دروازہ کھوں کر میری اینجیون اندر داخل ہوئی۔ اس کے قریب آ کر سپاٹ سا بولی۔ ”مجھے ذرا کام ہے، مایا بھی آتی ہوگی، تمہاری

پی دیکھے گی۔ زیادہ ہو شیاری مت دکھانا۔ مایا بھی ہے، بہت اچھی، مگر اسے استعمال کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

وہ سر جھکا کے تصویریں الٹ پلٹ کرتا رہا۔ اس کی بات گویا آن سی کی۔ وہ چل گئی تو مایا اندر آئی۔ نس بھی ساتھ ہی آیا، مگر مایا نے

ایک دم سے خاطب کیا۔

”وہ... میرا بلیک بیک داخلی دروازے کے قریب رہ گیا ہے، ذرا لیتے آؤ۔“ وہ سرہلا کر باہر گیا، تو مایا تیزی سے اس کی طرف آئی۔

بے چینی سے اس کو دیکھا۔

”سنو، میری اینجیو گھر پہنیں ہے، اور میں ابھی سیدھی بازار جاؤں گی، کاردار صاحب پ کا آدمی بازار کے اندر میرے ساتھ نہیں جائے

گا، تم مجھے اپنی فیملی کا کوئی نمبر دو، میں ان کو کال کر کے اطلاع کر دوں گی کہ تم کہاں ہو۔“ وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔

سعدی نے گویا نہیں سنا، بس انہی تصویریوں کو دیکھتا رہا۔

”تم من رہے ہو؟“ وہ جھمحلائی اور اس کا کندھا ہالا یا۔ ”سعدی، مجھے کوئی کانٹیکٹ نمبر دو جہاں میں فون کر سکوں۔ تاکہ تم ان کے پاس

واپس جاسکو۔“

سعدی نے اس کے یوں ہلانے پر آنکھیں اٹھا کر اجنبی نظریوں سے اسے دیکھا۔

”میری کوئی فیملی نہیں ہے۔ نہ مجھے کسی کے پاس واپس جانا ہے!“

مایا دھک سے رہ گئی۔ پھر اس کی شفاف آنکھوں میں بے پناہ دکھا بھرا۔

”ایسے مت کہو۔ تمہاری فیملی تمہاری منتظر ہو گی۔“

”میں نے کہا تا، میری کوئی فیملی نہیں ہے۔“ اس نے وہ تصویریں اکٹھی کیں، اور شرپ سے چھاڑیں، پھر اکٹھی کر کے دوبارہ چھاڑیں

اور دروازے کی طرف اچھاں دیں۔ تبھی نہس واپس اندر داخل ہوا۔ سارے پر زے اس کے قدموں میں گر گئے۔  
مایا ب پکھنیں کہہ سکتی تھی، مگر آنکھوں میں بے پناہ تکلیف اور کرب لیے وہ نہ کوہدایات دینے لگی۔

❖❖❖

اجنبی لگنے لگے خود تمہیں اپنا ہی وجود ..... اپنے دن رات کو اتنا بھی اکیلا نہ کرو  
اس رات ایسی میں خاموشی چھائی تھی۔ سیم اور ابا اپنے کمرے میں سونے جا چکے تھے۔ فارس گھر نہیں تھا۔ اور نردت کو آج ذکیرہ  
ماہ۔ بہت اصرار سے اپنی طرف لے گئی تھیں۔ ایسے میں خین اکیلی لاوٹ کے صوفے پہ لیتی تھی۔ اُنی وی مدھم آواز میں چل رہا تھا، مگر وہ چھٹ کو  
تلی سوچے جا رہی تھی۔ ہاشم کے جھوٹ کے بارے میں۔ فلیش کے بارے میں بھے وہ کھول نہیں سکتی تھی۔ ہاشم سے بات نہ کرنے کے بارے  
میں۔۔۔

تبھی میز پر کھافون بننے لگا۔ خین نے ستر روی سے گردن موڑی۔ ہاشم کی کال آرہی تھی۔ اسی پل دروازہ کھلا اور اس نے فارس  
لو اندر آتے دیکھا۔ وہ موبائل اٹھانے کے لئے ہاتھ بھی نہ بڑھا سکی۔

”کس کا فون ہے؟“ وہ اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ وہ مس یک نیک گردن اٹھائے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”خین میں پوچھ رہا ہوں، اس وقت کس کا فون آرہا ہے؟“ وہ غصے سے پوچھ رہا تھا اور خین کا پوڑا وجود سن تھا۔ دل نے ساتھ چھوڑ  
ایسا تھا، جسم سے جان نکل رہی تھی۔۔۔ فارس نے فون اٹھایا تھا۔۔۔ اب وہ سب جان جائے گا۔

کرنٹ کھا کر جیسے اس کی آنکھ کھلی اور وہ ایک حلقے سے اٹھ بیٹھی۔ پورا جسم پینے میں ڈوبتا تھا۔ ادھر ادھر گردن گھمائی۔ وہ اکیلی تھی۔ اُنی  
ہی ہنوز چل رہا تھا۔ موبائل ہاتھ میں تھا۔ وہ کب سوئی پتہ ہی نہیں چلا۔ پہلے اس نے موبائل دیکھا۔ کوئی کال نہیں تھی۔ اور وہ خواب تھا!  
آہست پہ چونکی۔ فارس دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ اسی طرح متوض سی بیٹھی تھی۔ اس نے لاک لگایا، اور قدم قدم چلتا  
قریب آیا۔ حند کو دیکھ کر آنکھوں میں استغجب ابھرا۔

”ادھر کیوں سورہی ہو؟“

”وہ ای... امی ذکرینا نی کی طرف گئی ہیں نا، تو.... میں... اکیلی تھی۔“

”ہاں انہوں نے مجھے بتایا تھا، تو تم اکیلی کیوں ہو؟ سیم کو اپنے ساتھ سلانا تھا۔“ ایک نظر ابا کے کمرے کے بند دروازے کو  
دیکھا۔ ”اچھا اب ادھر مت سو۔۔۔ سچ ملازم بڑا کا آتا ہے، اس کے لئے دروازہ کھولنا ہوتا ہے۔ شبابش، آٹھو اور ہمارے کمرے میں آجائے۔“ ساتھ  
ہی اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا، مگر آنکھوں میں حند کے لئے بے حد نرمی تھی۔

خین کی آنکھیں ڈبڈا گئیں۔ وہ ایک دم اٹھی اور اس کے بازو کے گرد ہاتھ پیٹ کر اس کے کندھے سے ماتھا نکال دیا۔

”ماموں میں آپ کو بھی نہیں کھونا چاہتی۔ میں نے بہت برا خواب دیکھا۔ میں آپ کو کھونے والی تھی۔“ آنسو پ پ اس کی  
آنکھوں سے بہر رہے تھے۔ ”میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔۔۔ بہت زیادہ۔“

فارس نے گھری سانس لی۔ ”نہیں حند میں تمہیں اس وقت کچھ کھلانے باہر نہیں لے جا سکتا۔“

روتے روتے حند نے ناراضی سے چہرہ اٹھایا۔ ”دنیا میں کھانے سے بڑے مسائل بھی ہو سکتے ہیں۔“

”مثلا؟“ اس نے غور سے خین کے چہرے کو دیکھا۔ بالوں کو پونی میں باندھئے اس کی آنکھیں گلی نظر آرہی تھیں۔ اس سوال پر  
مزید بھرا میں۔

”میں بہت بری ہوں۔۔۔“ گلٹ بہت شدید تھا۔

فارس نے ابر و اٹھائی۔ ”شکل میں؟“

حنین ہلکا سا نہیں دی۔ اس کا باز و چھوڑا۔ آنسو رگڑے۔ ”آپ کے ساتھ ایموجنل ہونے کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”چلو اب اپنا ڈرامہ ختم کرو اور آؤ۔“ وہ مسکرا دی۔ دل ایک دم ہلکا پھلکا سا ہو گیا۔ وہ سیر ہیاں چڑھنے لگا توہم نے سوچا، بس اب ۱۰

ہاشم کو یوں چھپ کر بیکست نہیں کرے گی۔ بس ختم یہ سلسلہ۔

دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو زرد تی جل رہی تھی، اور زمر آنکھوں پر بازو رکھ لیتھی تھی۔ فارس کی نگاہیں اس کے پیر پر جارکیں

جس کا انگوٹھا ہنوز پٹی میں مقید تھا۔

”زمر!“ اس نے پکارا تو اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔

”خد آپ کے ساتھ سوئے گی میں آپا ولے کمرے میں جارہا ہوں۔“ اطلاع دیتے ہوئے وہ اپنی چیزیں اٹھا رہا تھا۔ زمر اٹھ گئی۔

”ارے تم ایکیں کیوں تھیں؟ سیم کو بولا تھا میں نے.... خیر آ جاؤ، اب سو جاؤ۔“ وہ نرمی سے کہتی اٹھی اور اس کے لیے کاف نکالنے لگی۔

حنین چپ چاپ آ کر زمر کے دوسرا طرف لیٹ گئی۔ موبائل پر سحری کا الارم لگا کر اپنے اور زمر کے تیکے کے درمیان رکھ دیا۔

(زمر سے کوئی بات نہیں کی۔) اور ماتھے پر بازو رکھ لیا۔ موبائل کی لائٹ جل رہی تھی۔ روشنی بجھنے کا وقت دومنٹ تھا۔ ڈیڑھ منٹ بعد حمہ نے

کروٹ بدلتی۔ تھجی موبائل تھر تھر رہا۔ زمر چوکی۔ موبائل نیز حاپڑا تھا۔ اوپری بار میں نئے میتھیں کی پہلی سطر نظر آ رہی تھی۔

”ہاشم کا ردار کیا میں تمہیں کال کر لوں؟“

حمد نے کروٹ لی، زمر نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ اسے آہٹ سنائی دی۔ پھر فون آف ہونے کی ٹوں گوئی۔

پھر وہ سوگئی، مگر زمر یوسف کی نیندا اڑ چکی تھی۔ (ہاشم نے ایسا میتھیں حمد کو کیوں کیا؟)

اگلی شام وہ کمرے میں بیٹھی کیس اسٹری کر رہی تھی تو دروازہ دستک کے بعد کھلا۔ اس نے چونک کرس اٹھایا۔ سارہ چوکھت میں

کھڑی تھی۔ آنکھوں میں ادا سی، بیوں پر زرم مسکرا ہے اور بال نیس سے فریخ ناٹ میں بند ہے تھے۔ وہ اور ذکیہ خالہ، ندرت کوشانگ کے لیے

پک کرنے آئی تھیں۔ یہ بھی ندرت کا اصرار تھا۔ عید کی تیاری کرنی تھی۔ سعدی کے کپڑے بھی لینے تھے۔ زمر کے لیے کل ہی لے آئی تھیں۔

(ڈسٹریکشن۔)

”آئیے سارہ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سارہ اس کی فالز کو دیکھتے قریب آ کر بیٹھی۔ وہ ان دو ماہ میں دوسری دفعہ آ رہی تھی۔ پہلے ادھر

ادھر کی چند باتیں کیں۔ پھر وہی ذکر آیا۔

”سعدی کا کچھ پتہ چلا؟“ (مٹھی پر پسینہ آیا)

”نہیں، مگر پتہ چل جائے گا۔“

”آپ کو تابعین کیسے ہے کہ وہ زندہ ہو گا؟“ یہی بات سارہ کے سمجھنے نہیں آ رہی تھی۔ زمر آزردگی سے مسکرائی۔

”کیونکہ ہم زندہ ہیں۔“

سارہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ بدقت چند باتیں میں کرپائی۔

”کیا کوئی گواہ سامنے نہیں آیا؟ کسی نے کچھ تو دیکھا ہو گا؟“ بظاہر سرسری سا پوچھا۔

زمر نے گہری سانس بھری۔ ”نہیں، کوئی سامنے نہیں آیا۔ گواہ عموماً سامنے کم آتے ہیں۔ سب کی اپنی فیملیز ہوتی ہیں۔ ویکلم نو

پاکستان!“

”تو کیا گورنمنٹ ان کو witness پر ٹکشن نہیں دے سکتی؟ ان کی فیملیز کی حفاظت نہیں کر سکتی؟“

”سارہ ہمارا ستم بہت زیوں حال ہے۔ ہم گواہ چھپا دیں، تب بھی لوگ ان کا پتہ نکال لیتے ہیں۔ خیر!“ اس نے سر جھکا۔ ”ہر کوئی اتنا ہبادرنیں ہوتا۔“

سارہ کے لیے مزید بیٹھنا دو بھرتا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اس کا مطلب ہے گواہوں کو اپنی حفاظت خود کرنی ہوتی ہے! خیر! میں چلتی ہوں!“ زمر نے مسکرا کر الوداع کہا اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

❖❖❖

ہم خاک نشین، تم خن آراء سر بام ..... پاس آ کے ملو، دور سے کیا بات کرو ہو!

رمضان اسی طرح خاموش سا گزر گیا اور عید کی شام قصر اور اس کے سبزہ زار پر اتری تو بے پناہ روشنیاں لئے ہوئے تھی۔ بے قبر، اہمہرت اور خوش باش لوگ ٹھیل رہے تھے۔ دیگر زرے اٹھائے، مشروبات سرو کرنے نظر آرہے تھے۔ ایسے میں سبزہ زار کے وسط میں ہاشم، ان شلوار قیص میں مبوس، گلاں تھائے، ہفتہ ہوا مہماںوں سے با تین کرتا نظر آ رہا تھا۔ جواہرات بھی قریب کھڑی تھی۔ سبز گاؤں میں مسکراتی ہی ہانوں میں زمردار ہیرے جڑے آدیزے پہنے۔ کارزار کی عیدی کی پارٹی اتنی ہی جگہتی ہوئی ہوتی تھی۔

ان سے دور ہٹو تو سبزہ زار کے بالکل کنارے پا ایک الگ تھلک میز پر Yousufs کا نیک لگا تھا۔ وہاں سیم اور حین کھڑے مدھم اہاز میں بات کر رہے تھے۔ ندرت جو ساتھ بیٹھی تھیں، ابا سے بلکل پھلکی بات کرتیں، پھر خاموش ہو جاتیں۔ سعدی کی باتیں۔ سعدی کے نہ نہیں ادا کی۔ اگر نے سیم کے آف و ایٹ کرتے جیسا بڑا اسائز سعدی کے لئے بھی لیا تھا۔ سعدی کی یاد، سعدی کی محبت سے بڑھی تھی۔

سیم بدول لگ رہا تھا۔ بدول توحہ بھی تھی۔ بھی نیلی قیص میں مبوس، کھلے بالوں میں ہمیر پینڈ لگائے ہوئے تھی۔ ماتھے پر کئے بال تر پچھے اہڑے سے نیچے گرتے تھے۔ (ماموں والے خواب کے بعد اس نے ہاشم سے بات نہیں کی، نہ ہاشم نے پھر نیکست کیا)۔ حند کی نظریں بھکتی ہوئیں اُپر بانہبریں۔ وہ دور تھا، بیغل ناوار کی طرح۔ اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ ہونہہ، اس نے منہ پھیر لیا۔

قریب میں زمر کھڑی فارس سے بات کرنی نظر آرہی تھی۔ اس نے ای کی لائی سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی جس کے آستین کہنیوں پہنچتا آتے تھے۔ بال جوڑے میں تھے اور صرف دھنگریاں لیتیں گا لوں پر گرتیں۔

”کیا تم پارٹی میں نہیں شامل ہو گے؟“ خنگی سے فارس سے پوچھا جو ابھی باہر سے آیا تھا اور سیدھا اندر جا رہا تھا۔ جیز پر سفید کرتا۔ اس میں پشاوری چپل۔ منہ میں کچھ مسلسل چباتا ہوا۔ بے نیازی سے ابر واچکا۔ ”کارزار کی پارٹیز کی عادت نہیں مجھے۔ آپ لوگ انجوائے ایسا۔“

وہ گویا کھول گئی۔

”ہم انجوائے کرنے نہیں آئے۔ میں اس لیے تیار ہوئی ہوں تاکہ بھا بھی کو یہ نہ لگے کہ میں نے وہ باتیں بھلا کیں۔ اگر تم نہ اے،“ اُن کو بھی لگے گا۔ کیوں میری فیلی کو میرے خلاف کرنا چاہتے ہو؟“

”اوکے، بھیں ہوں میں۔“ فارس نے تخل سے اس کی بات سنی، اور چند لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھا جن میں برہمی (اوی) بیک وقت اتنا خوبصورت اور اتنا سانگدل کیسے ہو سکتا ہے؟) پھر رخ پھیر لیا۔ وہ حند کی طرف آگئی۔

”سو یہ یو ایس بی کا کیا قصہ ہے؟ جو اس دن تم نے ہاشم کو دی، وہ سعدی نے تمہیں نہیں دی تھی؟“ کچھ دن سے حند کو لیپ ٹاپ سے اکھ، لہر زمر نے صبح جب پوچھا تھا تو اس کے جواب سے نکالنیجہاب سوالیہ انداز میں دہرا یا، تو حین نے بس سر ہلایا۔

”جی۔ میں بھائی کی چیز ان کو نہیں دے سکتی تھی۔ نہ آپ کو دوں گی۔“

”اوکے مگر جب وہ کھل جائے تو بتانا۔“ اور دنوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ البتہ زمر محسوس کر رہی تھی حند کی بار بار ہاشم کی طرف

اٹھی نظریں۔ کچھ تھا جو اسے غیر آرام دہ کر رہا تھا۔

دور کھڑے ہاشم نے فارس کو دیکھا تو ساتھ موجود خاور سے سرگوشی کی۔ ”بیل کب جا رہے ہے؟“

”بس پکھوں تک۔ میں پکا کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”جلد کرو۔ مجھ سے یہ ادھر برداشت نہیں ہوتا۔“ ناگواری سے کہہ کر گھونٹ بھرا۔

”آپ کی اس سے پھر بات ہوئی؟“ خاور نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

”نہیں۔ ابھی تو اسے اس کی بہن کے حوالے سے خوفزدہ کیا ہے۔ کچھ دن سوچ گا وہ۔ پھر بات کروں گا۔“

پھر نگاہیں جواہرات پہ جا ٹھہریں جو ذرا فاصلے پر کھڑی ہارون عبید سے بات کر رہی تھی۔ ہاشم نے رخ پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں

عجیب سارکب اٹھتا تھا ہارون عبید کو دیکھ کر۔ کوئی بہت شدت سے یاد آتا تھا۔

”مجھے امید نہیں آپ میرے تختے کو پہنیں گی، مگر ایسا نہیں ہوا۔“ ادھر وہ جواہرات سے کہہ رہے تھے۔ وہ دراز قدم اور باوقارت

سیاستدان تھے۔ آنکھیں گر تھیں اور ان میں وہی نرم سا شاطر پین تھا جو سیاستدانوں کا خاصہ ہوتا ہے۔

”میرے پاس دن بھر میں ڈھیروں تختے آتے ہیں ہارون، اگر ہر ایک کا دل رکھنے لگ گئی تو ملک نہیں رہوں گی۔ حکمرانی ”نان“

کرنے کا نام ہے۔ ورنہ ”ہاں“ تو سب کہہ لیتے ہیں۔“

وہ مسکرانے۔ ”میں آپ سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ آپ کے گھر میں کھڑا ہوں۔ آپ ہماری دعوت پر جب آئیں گی، تو ہم اس افتخار کو سینیں سے شروع کریں گے۔“

”تب کی تدبیحی جائے گی!“ جواہرات نے انگلی سے بال پیچپے کرتے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے، ان نہیں کی طرف بہت سے لوگ

آپ کی توجہ کے منتظر ہیں۔“

ہارون عبید نے ذرا کی ذرا اس طرف دیکھا، پھر سر کو تم دیا۔ ”آپ اپنے مہماںوں کو اٹھانے کریں، اور میں نہیں۔“ مسکرا کر پلٹ گئے۔

وہ بھی مسکرا کر ان کو جاتے دیکھتی رہی، انگلی مسلسل نیکلیں کے بزر پتوں پر پھیر رہی تھی۔

”اس عمر میں بھی آپ سے سیکھنے کو بہت کچھ ہے مسز کاردار۔“ شہرین کھنکھار کر کہتی اس کے قریب آئی تو جواہرات نے چوکہ کا

اسے دیکھا۔ وہ آسمانی رنگ کی میکسی میں ملبوس تھی، باب کٹ نہرے بال بلوڈ رائے کر کے سیٹ تھے اور آنکھوں میں معنی خیز مسکراتا تھا۔

”اگر آپ ان کا تختہ پہن لیتیں، یا ان سے چند فقرے سے مزید کہہ دیتیں تو آپ کی کشش ماند پڑنے لگتی، کیا ہی اچھا ہنر ہے کسی اکسانے کا۔“

جو جواہرات نے ایک پر پیش نظر اس پڑاںی، مگر بیوں پر مسکرا ہٹ جی رہی۔ ساتھ ہی بازو بڑھا کر روپڑی کی ٹرے سے گلاس اٹھایا اور اتنی

تیزی سے واپس لائی کہ وہ اتنے لگا شہری کے اوپر... مگر... کسی نے گلاس اور جواہرات کے ہاتھ دونوں کو تختے سے پکڑ کر مشروب گرنے سے

روکا۔ شہری مل بھی نہ سکی۔ جواہرات نے بھی چونک کر دیکھا۔

فارس اس کا ہاتھ پکڑے، گلاس واپس ٹرے میں رکھ رہا تھا۔ ”دھیان سے مسز کاردار، آپ اپنی بہو کے کپڑے خراب کرے

والی تھیں۔“

جو جواہرات کی مسکرا ہٹ غائب ہوئی۔ گھور کر فارس کو دیکھا۔

”تمہارا شکریہ فارس میں اسے یاد رکھوں گی۔“ ان دونوں کو گھورتے آگے بڑھ گئی۔

شہری جو اس غیر موقع صورت حال کے لئے تیار تھی، بہشکل سنبھلی تھی۔ جوں کے گلاس کو دیکھ کر جھر جھری لی اور پھر فارس کو دیکھا۔

"تھینک یو تم نے میرا ذریں بچا لیا۔" اس نے بس ہلکے سے کندھے اچکائے۔ منہ میں کچھ چبارا تھا اور گردون موڑے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ذرا اکتا یا ہوا ذرائبے نیاز۔ شہری نے کتنے دن بعد غور سے اسے دیکھا تھا۔

"تھیں جبل سے باہر دیکھ کر اچھا لگتا ہے فارس۔" پھر نگاہ دور کھڑی سرخ سارا ٹھی والی زمر پپڑی، جو مسکرا کر کسی سے بات کر رہی تھی۔ شہری کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ "تم نے جلدی نہیں کر دی شادی میں؟"

وہ چونکا۔ "کیوں؟"

"یوئی۔ ذی اے کے چہرے سے لگتا ہے وہ خوش نہیں ہے تمہارے ساتھ۔"

"کیوں؟ کیا اس کے چہرے پر وہی ناخوش تاثر ہے جو تمہارے چہرے پر ہوتا تھا جب تم ہاشم کی بیوی تھیں؟"

انگاروں پر پانی ڈالا تو وہ اور بھڑک اٹھے۔ شہری کی آنکھوں میں جھمن بھری بے بُی ابھری۔ "تھیں ان مظالم کا اندازہ بھی تھیں ہے جو ہاشم نے مجھ پر کیے ہیں اس نے مجھے اتنے سال نارچ جے۔"

"چار سال جیل میں رہا ہوں شہری اپنے نارچ زکی اتنی بُی فہرست ہے کہ کسی دوسرے کے نارچ ز سننے میں دلچسپی نہیں رہی۔ سی یوں،" ذرا اکتا کر کھتا، سر کو الوداعی انداز میں خم دیتا وہ آگے بڑھ گیا۔ شہری کی نظر وہ نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ پھر نرمی سے مسکرائی۔ کوئی بھی

بات اسے بری نہیں لگی تھی۔ اپنی میز سے نوشیر وال نے غور سے یہ سب دیکھا تھا پھر بڑھ کر منہ موڑ لیا۔

اسی اثناء میں زمر کو پیچھے سے کسی نے "السلام علیکم" کہہ کر پکارا تو وہ چونک کر پڑی۔ ڈنر جیکٹ میں ملبوس مسکراتا ہوا حمرہ وہاں کھڑا تھا۔ وہ ہلکا سامسکرائی۔

"آپ ادھر کہاں؟"

"بھول گئیں؟ ہارون عبید کا کمپسین میں بھر ہوں۔ جہاں وہ وہاں ہم۔" سر کو جھکا کر اسماں سے کہا۔

"میرے کام کا کیا بنا؟"

"صرف رہا بہت جلد کوئی اپ ذمیت دوں گا، مگر ایک بات۔ ہارون عبید کا کمپسین میں بھر... پندرہ ہزار فی گھنٹہ لیتا اچھا نہیں لگے گا،" سو۔"

ذرا سوچنے کی ادا کاری کی۔ "میری فیں بڑھائیں۔ ۲۵ ہزار فی گھنٹہ!"

"پچیس ہزار فی گھنٹہ؟" زمر نے مسکرا کر دھرایا۔

"ویسے تو یہ بھی کم ہیں، مگر چلیں، آپ کے لئے اتنی رعایت کر سکتا ہوں۔"

"تھینک یو سوچ احر۔ آپ بہت اچھے ہیں، اور اتنے ہی اچھے لگ رہے تھے اس فوٹج میں جس میں آپ کریٹ کا رڈ فراؤ کرتے دکھائی دے رہے تھے، صبح ہی میں نے دیکھی، واحد اور بھل کا پی جو آپ کا کیس بند کرنے کے بعد مجھے ملی، اتنی بڑی نہیں ہے کہ دوبارہ کیس کھولا جاسکے، لیکن...." چہرہ موڑ کر سوچتی نظر وہ سے ہارون عبید کو دیکھا۔ "اگر ہارون عبید نے یہ دیڈ یو دیکھی، اور ان کو لگا کہ اس کا ریلیز ہونا ان کی کمپسین کے لئے شرمناک ہوگا، تو وہ کیا کریں گے؟ خیر یہ سوچنا میرا کام نہیں ہے۔ ہاں تو ہم آپ کی فیں کی بات کر رہے تھے۔" گھنگریا لیٹ اٹکی پر لپیٹئے، بڑی تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ وہ لب بھینچنے دانت پیٹتے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ویسے آپ کا ایک بڑا خوبصورت نیک نیم رکھا تھا میں نے اس وقت بہت یاد آ رہا ہے۔" جرأ مسکرا کر بولا۔ "اور فیں؟ چھوڑیں بھا بھی۔ آپ میرے دوست کی بیوی ہیں، آپ سے فیں لیتے اچھا لگوں گا۔"

"تھینک یو احر؟" مسکرا کر سر کو خم دیا۔ "میرا کام ہو جائے تو وہ فوٹج آپ کی ہوئی! چڑیل آگے بڑھ گئی اور وہ کینہ تو ز نظر وہ سے

اے جاتے دیکھتا رہا۔

”وہ ڈاکٹر جس نے گولیاں لگنے کے بعد اس کو بچایا تھا، اس کو چوک میں کھڑا کر کے پچاس درے تو لگنے ہی چاہیں!“ پھر زور سے بوٹ گھاس پہ مارا۔ اور اسی برے منہ سے پلنائوس سامنے کھڑی لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ نیلی لمبی قمیض میں مبسوں تھی، اور ہتھی مٹھی تلے رکھے، دور پچھے دیکھتی سوچ میں گم تھی۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتا وقدم قریب آیا۔

”آپ سعدی کی بہن ہیں نا؟“ حمد نے چونک کر گردن موڑی، پھر سیدھی کھڑی ہوئی۔ اسے سر سے پیر تک دیکھا۔  
”جی۔“

”میں نے اس دن آپ کو پہچان لیا تھا، آپ کی تصویر دیکھی تھی ایک دفعہ کسی اخبار میں۔ آپ نے کوئی بورڈ ناپ کیا تھا، ہے نا؟“  
بالآخر سے یاد آگیا تھا کہ اس نے حمد کو کہاں دیکھا تھا۔

حنین یوسف کے چہرے کی رنگت سفید پڑی۔ ”جی۔“ تھوک لگلا۔

”اچھا تو کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟“

”بی اے کیا ہے۔“

وہ حیران ہوا۔ ”صرف بی اے؟ آپ کو تو ڈاکٹر یا نجیسٹر بننا چاہیے تھا، ورنہ بورڈ کیوں ناپ کیا؟ کیا نقل کر کے کیا تھا؟“  
اور احمد کے لیے بہت سی باتیں صرف مذاق ہوتی تھیں، یہ بات بھی کہہ دی، مگر حنین کی رنگت برف کی طرح ہو گئی۔

”آپ ہیں کون مجھ سے ایسے بات کرنے والے؟“ احمد کو ایک دم احساس ہوا۔

”میں غازی کا دوست ہوں تو، سوری مگر...“

”مطلوب مجھے ماموں سے بات کرنی پڑے گی۔“ ایک دم وہ گھوم کر فارس کی طرف گئی۔

احمر کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ زمر سے بات کر لیتا تھا، وہ جاب کرنے والی، سمجھدار لڑکی تھی، کسی کو خود سے فریب نہ کرتی، اس کی اور بات تھی، مگر فارس کے گھر کی کسی دوسری لڑکی کو اوفیزیڈ کرنے کا مطلب اتنے برسوں کی دوستی بھاڑ میں جھوٹنے جیسا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا مگر وہ دور کھڑے فارس تک گئی، اور اس کو متوجہ کیا۔ احمد سانس روکے اس طرف دیکھے گیا۔

حنین نے اسے کچھ کہا، فارس نے فوراً مژکر احمد کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی بلوتی اس کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہے جا رہی تھی۔ فارس نے اچھبی سے پھر احمد کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھا (”میں دیکھتا ہوں“) مگر حمد نے فوراً اس کا بازو تھام کر رکا، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جیسے تسلی کروالی (میں دیکھوں گی)۔ فارس نے مژکر دو تین دفعہ اس طرف دیکھا اور واپس پلٹ گیا۔ حمد نے ایک تیز نظر احمد پر ڈالی، (اب مجھ سے بات کرنے کی بہت نہ کرنا) اور آگے بڑھ گئی۔

احمر کا گلاں پکڑنے سے ہاتھ پینے میں بھیگا تھا۔ وہ شل کھڑا تھا۔ (خدا یا، وہ غازی کو کیسے صفائی دے گا؟) تھوڑی دیر بعد اس نے بہت کی، فارس کی طرف آیا۔ سمجھنیں آیا کیا کہے۔ اس لڑکی نے جانے کس انداز میں بات کی ہو۔ فارس دور جا رہا تھا، وہ روک نہیں سکا، پھر وہاں کھڑے بورے ہوتے ہوئے سیم کو مخاطب کیا۔ ”سنو... میں سعدی کا دوست ہوں،“ سیم متوجہ ہوا تو مذبذب سے کہنے لگا۔ ”ابھی آپ کی سفر میرے بارے میں جو کہہ رہی تھیں غازی سے، وہ....“

”جی؟“ سیم نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر مژکر دور جاتی حمد کو۔ ”آپ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا، وہ تو ان کر سیوں کا پوچھ رہی تھی، کہ وہ زرتاشہ مہانی کے جیزیر کی ہیں نا۔“ اس نے ان کر سیوں کی طرف اشارہ کیا جو دہاں رکھی تھیں جہاں ابھی احمد کھڑا تھا۔ ”مگر ماموں کہہ رہے تھے کہ انہیں نہیں یاد کر وہ زرتاشہ کی ہوں، حمد نے کہا کہ رہنے دیں وہ خود چیک کر لے گی۔ آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔“ وہ حیران سا صفائی

دینے لگا، اور احمد کے اوپر تو مانو ٹھنڈا پانی ڈال دیا کسی نے۔ جلدی سے غلط فہمی کی مغدرت کرتا پڑتا تو تملدار ہاتھا۔  
(یہ کیا چیز تھی؟)

❖❖❖

تو بھی ہیرے سے بن گیا ہے پھر ..... ہم بھی کل کیا سے کیا ہو جائیں گے  
اگلی صبح جب جواہرات ڈائیگ نیبل کی سرباہی کریں پہ بر اہمان ناشتہ کر رہی تھی، تو سامنے کھڑی فیونا نے جھکی آنکھوں مگر اٹھی گردن  
سے کہا۔

”اگر اسٹاف جائے گا تو میں بھی جاؤں گی مسز کار دار!“

گلاس سے گھونٹ بھرتے جواہرات نے آنکھیں اٹھائیں اور مسکرائی۔ پھر ٹیک لگا کر بغورا سے دیکھا۔

”تم فیونا ہو، مگر تم جواہرات کار دار نہیں ہو۔ تمہاری خواہش ہے کہ تم جواہرات ہوتی، مگر تم نہیں ہو۔ تو میں تمہیں پہلی اور آخری  
بار ایک بات بتاتی ہوں۔ سارے اسٹاف کو نکال کر تمہیں اس لئے رہنے دیا کیونکہ تم وفادار ہو، مگر..... تم جانا چاہو تو چلی جاؤ، میں تمہارا پے  
چیک بنا دیتی ہوں۔ لیکن جاتے وقت تمہیں بونس اور وہ نیکلیس چھوڑ نا پڑے گا جو تم نے میری انجبو سے چوری کروایا، اور جو میں نے بعد  
میں تمہیں دے دیا تھا۔“

فیونا نے نظریں اٹھائیں۔ ان میں تعجب تھا، اور فکر مندی بھی۔

”میں نے وہ آپ کے کہنے پہ چوری کروایا تھا میری سے!“

”یہ تم کیا کہر ہی ہوا تباہہ ازالہ۔ فیونا اگر یہ بات تمہاشم کے سامنے کہو تو وہ کیا حال نہ کرے تمہارا؟ پیچ پیچ۔“ افسوس سے کہتے اس  
نے گلاس لبوں سے لگالیا۔

فیونا بارے دل سے پلٹ آئی۔ کچن کے قریب راہداری پیسمنٹ میں جاتی، جہاں ملازمین کے کمرے تھے۔ چھوٹے مگر صاف  
ستھرے کمرے۔ اس کے کمرے میں ایک سنکل بیٹہ بچا تھا، ایک سنگھار میز اور ایک الماری تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی اور دراز سے وہ  
نیکلیس نکال کر گردن سے لگایا جو مسز کار دار نے اسے اکیس میگی کی شام بڑی لاپرواہی سے دان کر دیا تھا۔

آئینے میں نظر آتے عکس میں ہیروں کی چمک حمرائی تھی۔ اس چمک میں اسے وہ گھنکریا لے بالوں والا لڑکا یاد آیا جس کی جیب میں

اس نے نیکلیس پارٹی کے دوران ڈالا تھا۔ یقیناً اسی نے یہ مسز کار دار کو واپس کر دیا ہوگا۔ اور اب۔ یہ فیونا کا تھا۔

ملازموں کی ملکہ نے ہیروں سے جھلما لتے نیکلیس کو گردن پر لگائے، چہرہ تک رکھا تھا۔ رکھا تو آنکھوں میں بھی وہی چمک ابھر آئی۔  
پکھ دیر بعد وہ مسز کار دار کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”نیا اسٹاف کس تاریخ سے رکھنا یہے یہم؟ کیا میں بھی انڑو یو میں شامل ہوں گی؟“

”آف کورس!“ جواہرات مسکرائی تھی۔

❖❖❖

مرے ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو ..... مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو  
ملاقاتی کرہ آج بھی ویسا ہی تھا مگر ماحول میں تباہ کارخ اور تناسب بدلتا چکا تھا۔ اے ایس پی سردم شاہ موجود نہیں تھا، اور بالآخر کئی  
دن بعد وہ دونوں نیاز بیگ سے تباہی میں مل رہے تھے۔ وہ آگے ہو کر بیٹھا، قدرے بے چین اور مضطرب لگتا تھا۔ ایک آنکھ سوچی تھی، کان تلے  
زخم ہوتوں اور گردن پہ جما خون۔ زمر گھنکر یا لیٹ انگلی پہ لپیٹنے اور پس سے نیچے اس کے زخم دیکھ رہی تھی۔

"میں نے اس کو گولی بھیں ماری تھی۔ میں... " وہ کہنے لگا تھا، مگر فارس نے سے میز پر ٹھوک مارتے ہوئے آگے ہوا۔ " کھواں مر کرو۔ میرے بھائیجے کو تم نے مار کر پیچکے دیا اور اب تم اپنا بیان بدل رہے ہو۔"

"فارس ارٹلیکس!" زمر نے نرمی سے اسے خاطب کیا جو سے سے نیاز بیک کو گھوڑا باتھا۔ "وہ بیان نہیں بدلتا، میرا ذیال ہے،" میں پہنچتا نے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم بولا نیاز بیک میں سن رہی ہوں۔"

"پہلے مجھے تباہیں میرے بولتے سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟" وہ زمر سے خاطب ہوا تو اس کی آنکھوں میں بے چینی تھی۔

"کیا مطلب چیزوں کی یا قاتمہ ہو گا؟" وہ گویا کھوں اٹھا۔ "مجھے پانچ منٹل جائیں تمہارے ساتھ تو تم سے سب انگوالوں کا اس لے زیادہ قائم کرنے کا تھا میں مرت کر کے کام میں ہات پا آئے۔"

"فارس تم غصہ مت کر مجھے ہات کرنے والا" قتل سے گویا اس کو سمجھاتی، وہ نیاز بیک کی طرف متوجہ ہوئی۔ فارس مر جھک کر پیچے ہو گئی اور تندی سے اس کو دیکھنے لگی۔

"میں چیزوں و عددہ معاف گواہ بنا لوں گی" تم اس کیس سے بھی نکل جاؤ گے اور شریعت کے کیس سے بھی۔ میں سرکاری پر ایکجا رہ جائیں ہوں مگر سعدی یونٹ کیس میں پر ایکجھے رہیں ہیں اس سے مجھے تباہی بہتر ہات جو تم پڑھنے ہو۔"

"شریعت کیس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارے لار کے کاظل... تو وہ قتل نہیں ہوا۔" وہ بنے بھی بھرے امطراپ سے بولتے لگا۔ "... ایکس میں کی رات مجھے اسیں پیائے تو نہ کیا اور رہتال ہا یا پھر اس سرجن بناری کے پاس لے لیا یا کہ یہ لاکانہ باب کر رہا ہے مگر جب آپ نہیں ہو جائے اور اس کی حالت خطرے سے باہر آجائے تب ان کو وہ زندہ چاہیے تھا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ کچھ ماں کے لئے اس لار کے قتل کے جرم میں اندر جانا ہوگا مگر ہم چیزوں کو ہوتیں گے۔"

"جلے میں کیا دیا؟"

"پھی... اور میرے بھائی میں بیک کے اوپر کس لتم کرتے کی یقین دہائی کروائی۔ میرا بھائی ابھی تک مفروضہ ہے، چھپے سال اسٹنک کی وجہ سے۔ خیر... میں نے وہی کیا۔ جو میرے ساتھ دوسرا دوسرا ڈبوائے تھا، وہ ان کا اپنا لڑکا تھا۔ تمہارے لار کے کو اسٹرپچر پر باہر لائے ایسیوں لیس میں ڈالا اور سب تھا۔" میں ڈاکٹر زرس۔ خیر میں دیس سے گرفتار ہاگیا۔ اسے اسی پیائے کہا پھر دن چھپ جاؤ پھر پکڑ لیں گے چیزوں۔ بیان لٹک سب تھیک ہو گیا، مگر اس روز اس نے مجھے شریعت کے کیس میں پھنسا دیا۔ اس نے مجھے دہاں بلوایا اور پھر گرفتار کر لیا۔ یہ زمر انھیں۔ فارس بھی کھڑا ہوا۔ نیاز بیک نے چیرہ اخلاک را نہیں دیکھا۔

"مجھے کب گواہی دیتی ہوگی؟"

"کون ہی گواہی؟" زمر نے ساتھی پر سکدھے پڑا۔

"ابھی... تم نے کہا کیل صدی کر تم مجھے عددہ معاف گواہ بنا لوں گی اور..."

"میں نے کب کہا؟" زمر نے تجویز سے فارس کو دیکھا۔

"نیاز بیک... " وہ میز پر دلوں ہاتھ درکھا کر جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "بوا دمی اپنا بیان اتنی وقہ بدل لے اس پر ہم یقین نہیں کر سکتے۔ تم ہی قائل ہو، میں معلوم ہے۔"

نیاز بیک ایک دم مششدرہ کیا تھا۔

"اور اسے اسیں پی اتارا دوست ہے۔ اس نے میں پہلے ہی تاو یا تھا کر تم یہ سب کہو گئے، اس نے... دوبارہ تم سے مل کی

سماخ است کر لے کی وجہ سنت گئی۔ اکابر نے کبھی بڑا نہیں ہو گئی طرف چڑھ گئے۔ جیسے وہ اپنے دھر کا حضور سماخ کا اعلان کر رہا تھا۔

۲۰۱۷ء میں اپنے

"ایسا کیمی کہ آپ کو پہلے نہ مل سکا۔ لیکن اپنے کام سے جو تم کی خوبی ہے، اس کی طرف بڑک کر لے جائیں گے۔" اس کے بعد میرزا نے اپنے کام کی خوبی کا کچھ تجھیاں۔

کس نے اپنی کتابوں پر نیکا نہ ملنا بھاپ پاں الیساں دا کر پیگی۔ اسکی بھلی کے پس راستہ ملے تھے  
وہ کبھی تھی۔ سرمهدھے کرنی سا سلی۔ میں اصحاب اعلیٰ کہا ہے۔ ”مکھی بے کا آپ نے اس کاٹھی کئی کہا۔“  
”لیے صاحب اتم نے کام کو کام لیا ہے جو مدد و مدد کی دلچسپی ملے جاتے ہیں۔ اس کی دلکشی اپنے  
پہاڑ کر کرچوں کی خوبی کوئے پہاڑی تھی۔ گھر میں باخوبی کھلے کھڑے کیں۔ اصل گھرچاہا سماں کا اس سے اسکیں پھر کر  
کے باخت باخت رکھا۔

"خداوند کی خواستہ کیوں نہ کر سکتے تھے اس کوئے لڑائے کی کہ کے جس کو مردانگی حکم دیا ہے اس کا کمال تواریخ سماں کو کے کام کے پورا نہیں۔ میں اگر اس سے اپنے بھائی کی ملکی صورتے خالی کی کے لئے تو ۱۹۷۳ سے تسلیم اور درستگی کی لئے اور اگر سے بکھرنا گئے تو کبھی بھروسے کیا کر سکتے تھے؟

بیخاں کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے نگاہیں اٹھائیں، اداسی سے مسکراتے۔ ”ہم ضرور آئیں گے اور مجھے بہت افسوس ہے آپ کے بھیج کر لئے۔ کیا آپ لوگوں کی کسی سے دشمنی تھی؟“ وہ دعوت نام لفافے میں ڈالتے سادگی سے پوچھ رہے تھے۔

زمر نے گود میں رکھی مٹھیاں سخت سے بھیج لیں، آنکھوں میں تپشی انجھی، مگر پھر بظاہر یا سیت سے مسکراتے نہیں میں سرہلایا۔

”چند پیسوں کے لئے ایک شخص نے اسے مار کر لاش پھینک دی۔ ہم آج اسی کو ملنے گے تھے، اس نے اپنا بیان بھی تبدیل کر دیا۔ لوگ پیسوں کے لئے کس حد تک چلے جاتے ہیں۔ ہے ناڈاکڑ صاحب؟“

”بالکل، آئی ایگری!“ افسوس سے وہ سرہلار ہے تھے۔ ”خدا کرے جو قاتل پکڑا گیا ہے وہ اپنے انعام کو پہنچ۔“

”خدا کرے سب اپنے انعام کو پہنچیں۔“ وہ نظریں جھکائے ہلکا سابو لا تھا۔ ڈاکڑ تو قیر کو کمرے میں ایک دم آسیجن کی کمی محسوس ہونے لگی۔ زمر کو دیکھتے بات کا رخ بدلا۔

”اے ایسی پی صاحب کا مجھے فون آیا تھا، وہ کہہ رہے تھے نیاز بیگ پولیس اور ہسپتال انتظامیہ کو مور والازام خبر ارہا ہے۔“

”پولیس؟“ زمر نے تجب سے انہیں دیکھا۔ ”پولیس نہیں، صرف آپ کا ذکر کیا تھا۔“

”مسرز زمر، میرا یا ہسپتال کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں آپ کو یقین دہانی کرواتا ہوں۔“ سینے پہ ہاتھ رکھ کر وہ فکر مندی سے کہہ رہے تھے۔

”آپ کو رس ہمیں پہنچتے ہے، بلکہ جب اے ایسی پی صاحب نے کہا بھی کہ ہم ایف آئی آر میں کوئی اور نام درج کروانا چاہتے ہیں، تو ہم نے....“ فارس کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔ ”اکار کر دیا۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ نیاز بیگ جھوٹ بول رہا ہے۔“

”اے ایسی پی نے آپ سے... میرا نام ایف آئی آر میں ڈالنے کا پوچھا؟“ انہوں نے بروقت نفرتہ پکڑا تھا۔

”نہیں، انہوں نے صرف کسی اور نام کا پوچھا تھا۔ دیکھیں وہ ہمارے بہت اچھے دوست ہیں، وہ صرف انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ہمیں ہمارے تمام حقوق دے رہے تھے، خیر۔ آپ میموریل پر ضرور آئیے گا، ہماری فیلی اور فریذ ز آپ کے اس جیپر کی بہت قدر کریں گے۔“ وہ چائے کا آخری گھونٹ بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

فارس بھی اٹھا، ڈاکڑ تو قیر کی طرف مصلحت کے لئے ہاتھ بڑھایا، جسے انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے تھا۔ البتہ ان کے پر سکون تاثرات میں اضطراب تھا۔ وہ الوداعی کلمات کہتے ہوئے خاصے ڈسٹرپ تھے۔

اور اسی لمحے دروازہ کھلا۔ فارس کی اس طرف پشت تھی مگر ایک ناؤں سی آہٹ سنائی دی تھی۔ انگوٹھی کے ٹنگیں سے دستک دینے کا انداز۔ زمر مڑی۔

اندر آنے والی عورت ذرا بھرے چہرے اور بوٹے قد کی حامل تھی، بال کچر میں بند ہے تھے، دکش شخصیت، بہترین لباس، کانوں میں ناپس۔ دونوں ناپس میں ایک، ایک موٹا سا Solitaire جزا تھا۔ وہ جھملا تے ناپس اتنے خوبصورت تھے کہ اس عورت کی شخصیت کو کوئی گناہ یا نکھار گئے تھے۔

”یہ میری والُف ہیں، ڈاکڑ ایکن.... یہ مسرز مر.... اور....“

فارس نے آہستہ سے گرد من موڑی۔ ڈاکڑ تو قیر کے الفاظ کنویں میں گونجتی آواز کی مانند دور دور تک سنائی دے رہے تھے، لمحوں کے لئے ساری دنیا سا کن ہو گئی تھی۔ اور مسکراتی ہوئی ڈاکڑ ایکن قریب آرہی تھیں۔ اس نے اس عورت کے پلٹے لب دیکھئے، وہ زمر سے کچھ کہہ رہی تھی، تعارف پھر تزییت بھرے الفاظ.... آوازیں بند ہو چکی تھیں.... پھر ڈاکڑ ایکن نے چہرہ اس کی طرف موڑا، اس کی آنکھوں میں مجاہن کا

مُکررائی اور ہاتھ سے اس کے کندھے کو بہلا سا تھتھپھایا۔ جیسے کسی پرانے مریض نے پچھے سے عرصے بعد اس کا ڈاکٹر مل رہا ہو۔ اس کی انگوٹھی کے اندر کی طرف کوئی نوکیلی شے تھی جو فارس کے کندھے پر چھپی تھی..... اور وہ جھیں..... بہت کچھ تازہ کر گئی.... اس کے ارد گرد کا منظر بدلا۔ کمرہ بدلا۔ کیلنڈر بدلا۔ سارے تین سال قبل وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا اور ڈاکٹر ایکن چلتے ہوئے اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

”میرے مریض میرے بچوں کی طرح ہیں۔“ اس کے کندھے کو تھپکا۔ انگوٹھی چھپی تھی۔ فارس نے بے زاری سے سرجھکا۔

”تھے میں آپ کا مریض ہوں نہ آپ کا بچہ۔ میرانا م فارس غازی ہے۔“

”اور میں ڈاکٹر ایکن بخاری ہوں.....“ مُکررا کرنزی سے کہتی وہ سامنے کری پچا بیٹھی۔

”مجھے کسی سایکاٹرست کی ضرورت نہیں ہے، ڈاکٹر ایکن اور مجھے پوتہ ہے کوئٹھ مجھے کیوں ان سیشنز پر مجبور کر رہی ہے۔ اگر آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ اس طرح میں ان جرائم کا اعتراف کرلوں گا، جو میں نے نہیں کیے تو آپ اپنے فیکٹشنس درست کر لیں۔“ وہ نیک لگائے بیٹھا۔ تانگ پہنچا نگ جماۓ خشک سا کہرہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے اور ایک ہاتھ پر پٹی بندھی تھی۔

”تمہارے خیال میں اس کا مقصد صرف Confession کروانا ہے؟ اونہوں!“ نفی میں سر ہلایا۔ ”Confession وہ واحد“ C ” ہے جس کا میرے او تمہارے رویلیشن شپ سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہیں معلوم ہے پنجاب پر زن کے چار C کون سے ہیں؟“ وہ کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ آنکھیں سیزیر کرائے دیکھتا رہا۔

”کسلڈی.....“ وہ نرمی سے کہنے لگیں۔ ”کیسر..... کنٹرول اور Correction!“ ہم یہاں انہی کے لئے ہیں۔ میں تمہاری طرف کی کہانی سننا چاہتی ہوں تاکہ تمہاری وہنی حالت متوازن رہے۔“ وہ نوٹ پیدا سامنے رکھے قلم کھول رہی تھی۔ ”تم جو بھی کہو گے وہ ڈاکٹر پیش  
privilege کے تحت محفوظ رہے گا۔“

”میں پنجاب پر زن کے چار C‘ جانتا ہوں، کیا آپ Confidentiality کے پانچ C‘ جانتی ہیں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا پوچھ رہا تھا.....

”ہاں، وہ پانچ“ سی ” جن کے تحت پر یوٹھ توڑا جا سکتا ہے۔“ consent, court order, comply with the law, continued treatment and communicate a threat.“

(مریض کی اجازت، کورٹ کا حکم، قانون کی پاسداری کے لیے، مریض کے علاج کے لیے ناگزیر ہونا، یا مریض کی طرف سے دوسروں کو خطرہ ہونے کی صورت میں سد باب کے لیے۔ ان میں سے کسی وجہ کی بنا پر سایکاٹرست کسی کو اپنے مریض کی بات بتا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔)

”کیسے ہو فارس غازی!“ انگوٹھی کی چھپی لوٹی اور ارڈر کا منظر بدلا۔ ماضی تخلیل ہوا، اور وہ حال میں ڈاکٹر ایکن کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ عادتاً اس کا کندھا تھپک کر ہاتھ نیچے گرا پچکی تھی۔ ایسی عادت عام طور پر اس معاشرے کی خاتمی ڈاکٹر ز میں نہیں ہوتی۔ مگر وہ عورت عام نہیں تھی۔

”آپ.....“ اس نے سوالیہ نظر وہ سے باری باری دونوں میاں بیوی کو دیکھا، آنکھوں میں الجھری۔

”میں ڈاکٹر تو قیر کی بیوی ہوں۔“

”اوہ!“ اس کے لب سکڑے۔

”آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“ زمر نے بظاہر خوشنگوار حیرت سے فارس کو دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں گھورا بھی۔ (کتنا داکار ہے یہ اور ہاشم کہتا تھا اسے اداکاری نہیں آتی۔)

”یہ... ڈاکٹر ایمن ہیں... میری...“ فارس نے ڈاکٹر ایمن کو دیکھا، آوازنوت سی گئی ...

”میں فارس کی ڈاکٹر رہی ہوں اور اس کے بھائی کی بھائی اور بد قدمتی سے مجھے اپنے پیشہ کے خلاف کوڑت میں گواہی دینی پڑی۔“

وہ اداسی سے مسکرا گئی۔

”اوہ۔ تم تو ان سے بہت خفا ہو گے اس کے لئے۔“ زمر کی آنکھوں میں فکر مندی ابھری۔

”ایسا نہیں ہے، ڈاکٹر ایمن نے میرا بہت ساتھ دیا ہے جیل کے وقت میں ان دونوں میں ڈھنی طور پر متوازن نہیں تھا، اس لئے ان کو کوڑت کو میری ڈھنی حالت کے بارے میں بتانا پڑا، انہوں نے جو کیا، اچھا کیا۔“ وہ مدافعانہ انداز میں زمر کو کہنے لگا۔

”مسز غازی،“ فارس صحیح کہہ رہا ہے، اس وقت اس کے لئے یہ ضروری تھا۔ ”پھر زمی سے اس کو دیکھا۔“ اب کیسے ہوتا؟“

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے اسی زمی سے جواب دیا۔ ”کوڑت نے مجھے بری کر دیا،“ میں نے اپنے کیے کی سزا کاٹ لی، زمر نے مجھے معاف کر دیا، ہم نے شادی کر لی، Moved on!“ (زمر کے تو سر پر لگی تلووں پر بھی، مگر کچھ کرنے سے قاصر تھی۔)

”مجھے بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر فارس!“

”مجھے سے زیادہ نہیں ہوئی ہوگی۔“ وہ بظاہر مسکرا گیا۔ میں کوئی زور سے اسے جکڑ رہا تھا، مگر وہ پر سکون نظر آ رہا تھا۔

”آپ کے نالپس بہت خوبصورت ہیں!“ جاتے ہوئے زمر نے تعریف کی۔ ڈاکٹر ایمن مسکرا گئی۔

”تو تیرنے لاست مندرجہ اینورسری کا گفت دیا ہے۔ مرد گوماً اپنی محبت کا اظہار ہیروں سے کیا کرتے ہیں۔ ہے نا، فارس؟“ مسکرا کر فارس کو دیکھا، اس کی گردن میں گلٹی سی ابھری۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ ڈاکٹر ایمن نے زمر کے ہاتھوں کو دیکھا۔

”آپ کی تو ابھی شادی ہوئی ہے، مگر آپ نے کوئی ڈائمنڈ نہیں پہننا ہوا۔“

کمرے میں لمحے بھر کی طویل خاموشی چھائی۔

”مجھے چمکتے پھر وہ میں کوئی نشش نہیں نظر آتی!“ بس مسکرا کر اتنا کہہ پائی۔

”زمر نے مجھے معاف کر دیا، ہم نے شادی کر لی، واہ!“ باہر کار کی طرف جاتے وہ استہرا سیئے انداز میں دہرا رہی تھی۔

”مجھے اس کو یقین دلانا تھا کہ میں مودو آن کر چکا ہوں۔“ وہ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ زمر گھوم کر اس کے سامنے آئی اور تیز نظر وہ اسے گھوڑا وہ رک گیا۔

”تم نے اسی لئے مجھ سے شادی کی، ہے نا؟ تاکہ تم ساری دنیا کو یقین دلا دو کہ تم مودو آن کر چکے ہو؟ نئی زندگی شروع کر چکے ہو، کون بے چارے فارس غازی پر ٹک کرے گا اب؟“ وہ دونوں پارکنگ لالٹ میں آمنے سامنے گھڑے تھے۔

”آپ سے شادی کرنے کے لئے میرے پاس تین وجوہات تھیں۔ پہلی، آپ کے والد کے احسان ہیں، مجھ پر ان کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا، میں شادی کر کے واقعی سب کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں آگے بڑھ چکا ہوں۔“

”اور تیسرا؟“ فارس کی نظر میں اس کی خفا آنکھوں سے ہوتی، نہچہ پھسلیں۔ رخ موڑ گیا۔

”میں آپ کے آگے جواب دہ نہیں ہوں، کیونکہ اس شادی کے معاملات آپ نے شروع کیے تھے، میں نے نہیں!“ اور ایک طرف سے نکل کر کار کی طرف بڑھ گیا۔

اندر کیلئے میں ڈاکٹر تو تیر کمرے کا دروازہ بند کر کے ناراضی سے ڈاکٹر ایمن کی طرف گھوسمے۔

تمہیں بتایا تھا میں نے کہ وہ آرے ہے ہیں، پھر یہاں اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی؟، نائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے، وہ ماتھے کا پیسہ

صاف کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ایمن سامنے کرسی پہنچی لا پرواہی سے ناٹ سے کھی اڑائی۔

”اس کو آج نہیں تو کل پتہ چلا، ہی تھا کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔“

”وہ چار سال جیل میں رہا ہے، تم نے اس کی ضمانت نہیں ہونے دی، وہ تھوڑی دیر میں دو جمع دو کر لے گا، پھر کیا وہ نہیں سوچے گا کہ امالق سے تمہارے ہی شوہرنے اس کے بھانجے کا آپریشن کیوں کیا ہے؟“

”ریلیکس! میں اس کو جانتی ہوں، اس کا چہرہ پڑھ سکتی ہوں، میں اپنے کام میں بہت اچھی ہوں، مجھے اندازہ تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ جیل میں ضرور نکلے گا، یا بھاگے گا، اس لئے میں نے اس کو ایسے برین واش کیا تھا کہ وہ میرے خلوص پر کبھی شک نہیں کرے گا۔ نہ آج نہ کل۔ چار ماں بیل میں رہا ہے، اب کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو اسے دوبارہ جیل بھجوائے۔“ گریبان میں ازیں سن گلائز اتار کر ان کو وہ اب بیک میں اال رہی تھی۔

”ایمن... ایمن!“ وہ متغیر اور پریشان سے ان کے سامنے آبیٹھے۔ ”ہم نے ان کا بھانجا غائب کروا یا ہے، اور وہ جعلی واردہ بوائے اماں انام لے رہا ہے، کھلم کھلا۔“

”ڈونٹ وری سرمد شاہ سے سنجال لے گا۔ یہی وقت ہے، جب ہم اس سے مزید ڈیماںڈ زمنوا سکتے ہیں، ورنہ ہم کسی بھی وقت کہہ ملتے ہیں کہ پولیس نے ہمیں مجبور کیا یہ سب کرنے کے لئے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

ڈاکٹر تقریب سر جھنکا، آستین سے پیشانی کا پیسے صاف کیا۔

”وہ کسی کا بیٹا تھا، ہمارے بھی تین بیچے ہیں، ہم نے اس کی زندگی داؤپر کگا دی۔“

”تمہیں ان ہزاروں لوگوں کی زندگیوں کے بارے میں سوچتا چاہیے تو قیر جو ہم اپنے ہاپٹل سے بچائیں گے، صرف دو ماہ رہتے ہیں اس ہسپتال کی اوپنگ میں جس کے لئے میں نے اور تم نے پچھلے کمی سال کام کیا ہے۔ سرمد شاہ نے فارس کے خلاف گواہی دینے کے لئے کیا دیا تھا ہمیں؟ صرف پلات کا بضہ۔ اس کے اوپر ہر چیز ہم نے خود لگائی ہے۔ اس لئے تم سرمد شاہ سے بات کرو اور اس سے کہو، ہماری ڈیماںڈ زپوری کریں!“ وہ دونوں گفتگو کر رہے تھے اور باہر رات قطرہ قطرہ پھٹتی جا رہی تھی، سب کے گناہوں کو چھپائے۔ سب کے پردے ڈالے!



جب عشق تھے راس نہیں ہے تو مرے دل ..... ہونا تھا یہی حال ترا بارِ دُگر بھی

یہ تین دن بعد کا ذکر ہے۔

رات کی تاریکی اس زیر تعمیر گھر پر بھی چھائی تھی۔ پورچ میں خون کا تالاب بہرہ تھا، اس پر وہ گھنگریا لے بالوں والا لٹکا اونڈھا گرا تھا اور نوشیر وال جا بجا بوث سے اسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ پھر تھک کر وہ رکا۔ ایک استہزا سیئے نظر اس بے سدھ وجود پر ڈالی اور جانے کے لئے مژا۔ اسی پل وہ اونڈھا لٹکا سیدھا اللٹکھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ خون سے اور آنکھیں نفرت سے سرخ تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے نوشیر وال کو ہالوں سے پکڑا اور زور سے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ وہ درد سے چینا۔ اور....

ایک جھٹکے سے وہ اللٹکھ۔ کرہ خاموش پڑا تھا اسے سی کی مٹھنڈ کے باوجود نوشیر وال کا پورا جسم پسینے میں بھیگا تھا، دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، مت جلانی، پانی کی بوٹل لرزتے ہاتھوں سے لبوں سے لگائی، پانی کچھ اندر انڈیلا، کچھ بیٹھ پر چھلکا۔ چند گھونٹ بھر کر وہ گھرے سانس لیتا ڈیک لگا کر بیٹھا۔ (بھول جاؤ اس کو شیر ذی صرف ایک خواب تھا۔ سعدی بھی واپس نہیں آئے گا۔) آنکھیں بند کیے وہ خود کو تملی دے رہا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب ان ڈھائی ماہ میں اس نے سعدی کو خواب میں دیکھا تھا۔ ڈھائی ماہ ہو گئے سعدی کو کھوئے؟ اس نے موبائل اٹھا کر تاریخ دیکھی۔ اگست کا وسط آپریچا تھا اور وہ ابھی تک اکیس میں والے واقعے کو بھول نہیں پایا تھا۔ اف۔۔۔

نوشیر وال کے کمرے کے باہر بزرہ زارتاریک پڑا تھا۔ ایسکی کی بھی ایک دو کے ساتھ اتم بیان بھی تھیں۔ اندر جھانکو تو لا دُنخ میں نیم اندھیرا تھا۔ ایسے میں زمرتہ خانے کی سیر ہیاں اترتے دکھائی دے رہی تھی۔

نیچے آ کر وہ رکی۔ ایک طائرہ نگاہ کھلے تھے خانے میں ڈالی۔ اس کی بیان جلی ہوئی تھیں۔ فرش پر کچھ کافی کھرے تھے، ان پر ریاضی کے نمبر زار پر نہیں کیا کیا لکھا تھا۔ دلیپ ناپ کھلے تھے اور جنین فرش پر بیٹھی، ملکجہ لباس اور گول مول بال باندھے بے قراری سے ناپ کیے جا رہی تھی۔

”حمد... تم سوئی کیوں نہیں ہو؟“ وہ فکر مندی سے کہتی قریب آئی۔ حینہ ٹھک ٹھک ناپ کر رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس کی یہی حالت تھی۔ کھانا، سونا، سب چھوڑ کر وہ دن رات بیہیں بیٹھی اس یا ایس بی کو کھولنے کی کوشش کرتی رہتی۔

”پھر چھو بھائی غلط تھا، فائلز کر پڑت نہیں ہوئیں۔ بلکہ ہو گئی تھیں، مگر میں نے ری کو رکر لیں۔ مجھے لگا یہ اسٹینڈرڈ Bit 4096 RSA Encryption ہو گی مگر یہ algorithm جس نے بھی فیکٹر کیا ہے، یہ مختلف ہے۔“ وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

”جنین!“ وہ اس کے سامنے دوز انویٹھی۔ ”مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہی اس میں مختلف کیا ہے یہ آر ایس اے لگتا ہے assymteric ہے، اس کی دو کیز ہونی چاہئیں، ایک پلک اور ایک پرائیوٹ مگر...“

زمر نے فلیش لیپ ناپ سے کھٹخی لی۔ وہ جو ہوش و حواس کھوئے انداز میں بولے جا رہی تھی، ہکا بکا سا سر اٹھایا۔ زمر نے فلیش کا کور چڑھا کر اسے پرے ڈالا پھر زری سے حمد کو دیکھا۔

”یہ فلیش، اس کی فائلز، مجھے کچھ نہیں چاہیے، کچھ بھی اہم نہیں ہے حمد، تم سے زیادہ نہیں۔“ حینہ بکر کرا سے دیکھنے لگی۔

”تم نے کہا تھا اگر سعدی کی جگہ تم کھو جاؤ تو میں کیا کروں گی؟ حمد، تمہیں واقعی لگتا ہے کہ تم کھونیں چلکی؟“ حینہ کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے، آنکھوں میں پانی آگیا۔

”میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں ایک Failure ہوں!“

”میں جس حین کو جانتی ہوں وہ ایک سپر ہیر تھی؛ جس نے شیر کے اغوا کا پول کھولا تھا، مجھے آج بھا بھی نے وہ قصہ سنایا...“

”میں بدلتی ہوں!“ آنسوں کے گال پڑا ٹھکے ز مر آز ردگی سے مسکراتی۔

”جس دنیا سے میں تعلق رکھتی ہوں، اس میں انسان نہیں بدلتے۔ بدلتے ہیں لیکن وہ نہیں بدلتے۔ صرف اپنے نقاپ بدلتے ہیں، سوتھ واقعی کچھ بھی نہیں کر سکتیں، اگر خود سے بھاگتی رہوگی۔“

”میرے اندر بہت سارا شر ہے۔“ اس نے سرج کا دیا۔

”تم اس کو نہیں بدلتے۔ سواس کو اپنی طاقت کیوں نہیں بنائیتی؟“ ذرا دریکوٹھہری۔ گردن پھیر کر اس مقفل اسٹوروم کو دیکھا۔ پھر سرج کھکا۔ ”مجھے دیکھو، میں بے جا صدی اور ہٹ دھرم ہوں، جب اپنی فطرت نہیں بدلتی تو یہ احساس ہوا کہ اگر میں ایسی نہ ہوتی تو پر اسیکیوشن کی سیاسی کرسی پر دو دن بھی نہ بیٹھ سکتی، سعدی کے مجرموں کے آگے گھنٹے میک کر ان کو معاف کر چکی ہوتی، مگر اب... میری وہی بری چیزیں میرے کام آ رہی ہیں۔ تم بھی یہ کر سکتی ہو، مگر اس کے لئے تمہیں اس کیڑے کو باہر نکالنا ہو گا جو تمہیں اندر سے کھا رہا ہے۔“

تھہ خانے میں چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ پھر حمد نے نگاہیں جھکادیں۔ وہ دونوں آمنے سامنے فرش پر بیٹھی تھیں۔

”آپ مجھ سے نفرت کریں گی!“

”مزائی می!“ ذرا توقف کیا۔ جیسے کوئی راہ نکالی۔ ”آج ہم ایک دوسرے سے باری باری سچ بولتے ہیں۔ پہلے میں بولوں گی!“

حد نے اثبات میں سرہلا یا، پھر خود ہی بولی۔ ”مجھے پتہ ہے آپ بھائی کی فیس دیتی تھیں، مجھے ماموں نے بتایا تھا، اس رات جب امی نے لڑائی کے بعد آپ جنگل میں چل گئی تھیں۔“ نگاہیں جھکا دیں۔ ”آئی ایم سوری۔“ زمر نے نفی میں سرہلا یا۔ ”ہم یہاں سوری اور تھینک یوز کے لئے نہیں بیٹھے۔ حق بولنے بیٹھے ہیں۔“ (ماموں کی طبیعت تو وہ بعد میں صاف کرے گی!) اسے سامنے فرش پہنچھی، وہ لٹ انگلی پر لپیٹنے کہہ رہی تھی۔ ”میرا چیز یہ ہے کہ میں نے فارس کے رشتے سے انکار نہیں کیا تھا، امی نے کیا تھا، مجھے اس رشتے کی خبر اس دن تھہارے منہ سے ہوئی، اور مجھے لگا فارس نے مجھ پر گول انتقاماً چلائی تھی۔“ زمر نے آنکھیں بند کیں۔ تکلیف پھر سے عود آئی تھی۔ ”اسی لئے میں نے اس سے شادی کی، اس سے انتقام کے لئے، مگر میں اس کو کوئی مادی نقصان نہیں پہنچا سکی، کیونکہ میں نے سعدی سے وعدہ کیا تھا کہ اسے ہرث نہیں کروں گی۔“ آنکھیں کھولیں۔ اداسی سے مسکرائی۔ حمد بالکل شل اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے شک تھا، مگر اس نے اتنا سب کچھ نہیں سوچا تھا۔

”اب تمہاری باری!“

حنین نے نگاہیں جھکا دیں۔ ”میں ہاشم سے بات کرتی ہوں، نیکست پر کال پر۔ میں ان کی محبت میں بنتا ہو چکلی ہوں، اور یہ دن بدن جان لیوا ہوتی جا رہی ہے۔“ بہت دیر بعد نظریں اٹھائیں تو زمر اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ نہ کوئی ملامت، نہ حیرت۔

”تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہوئی تم یہ تعلق ختم کرنا چاہتی ہو؟“

”میں اسے ختم کر دوں گی، مجھے پتہ ہے ہم کبھی شادی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مجھ سے اس فلیش کے بارے میں جھوٹ بولا، تب سے میں نے ان سے بات نہیں کی۔ میں بہت ڈسٹرپ ہوں۔“ آنسوابل ابل کراس کی آنکھوں سے بہرہ ہے تھے۔ زمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”تمہیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ مگر تم جو بھی فیصلہ کرو گی، میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔“ اس نے زمی سے حمد کا ہاتھ دیا۔ کوئی غصہ، کوئی ڈاٹ، کچھ بھی نہیں۔ حمد آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔ ”آپ کی باری!“

”ولی...“ زمر نے گہری سانس لی اور سر جھکایا۔ فرش پر انگلی سے لکیر چھپنی۔ ”مجھے سعدی کے لیپ ٹاپ سے جو پچھر زملیں وہ میں نے فارس کو نہیں دکھائیں، وہ پچھر ز فارس نہیں لے سکتا، ایسی پچھر ز Trophy collector لیتے ہیں۔ (وہ قاتل جو اپنے شکار سے وابستہ کوئی شے اپنے پاس رکھتے ہیں۔) اس لئے میں ان کی تحقیق کرو رہی ہوں، مگر حنین میں بہت ڈسٹرپ ہوں۔ اتنے سالوں بعد اگر وہ بے گناہ نہ نکل آیا... تو مجھے یہ چیز مار ڈالے گی۔“ اس کی آنکھوں میں کرب اتر۔ ”پتہ ہے کیا، میرا ایک حصہ چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ نہ نکلے۔ مگر دوسرا حصہ مجھ چاننا چاہتا ہے!“ چند گھرے سانس لے کر اس نے خود کونارل کیا، پھر حمد کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری باری!“

حنین فارس کے حق میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کوئی۔ وہ حج کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

”میں نے کسی کی جان لی ہے۔“ پھر زمر کے تاثرات دیکھے۔ وہ متوجہ تھی۔ ”میں سن رہی ہوں۔“

”میرے بورڈ کے اوی پی میری فرینڈ کے ابو تھے...“ وہ کہتی گئی، ساری تفصیل، ساری با تیں ستائی گئی...“ اور جب میں ان کو بلیک میل کر رہی تھی تو پھر پھر میں اپنی لٹ انگلی پر لپیٹ رہی تھی، شاید میں زمر بننے کی کوشش کر رہی تھی، مگر میں غلط تھی۔ آپ بہت سے لوگوں کو بلیک میل کر سکتی ہیں، مگر چینیں جسے کام کے لیے...“ پہلے دن سے لے کر ان کی موت تک اس نے سارا واقعہ سر جھکائے کہہ سنایا۔ وہ ٹوٹی بکھری نظر آ رہی تھی۔ بار بار آنسو پوچھتی۔ پھر نگاہیں دھیرے دھیرے اٹھائیں۔ اب زمر اسے کیا کہے گی؟ ”تم ایسی شرمناک حرکت کیسے کر سکتی ہو حمد؟“ وہ یوں چلائے گی؟ یادوہ زمی سے کہے گی۔ ”تم نے معافی مانگ لی، توبہ کر لی جو ہوا ہے اسے بھول جاؤ۔“ مگر زمر کچھ نہیں بولی۔ حنین کی آنکھوں میں بے قراری ابھری۔

”پلیز کچھ تو کہیں۔ کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ آنسو پھر سے مٹنے لگے۔  
”تمہیں سن کر افسوس ہو گا۔“

”نہیں“ میں سن لوں گی، آپ کہیں، جو بھی آپ کے دل میں ہے۔ ”گیلے چہرے کے ساتھ وہ بولی۔ وہ واقعی تیار تھی۔  
”حنا“ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ تمہاری کہانی بہت کمزور ہے۔  
”جی؟“ حنا کا ہکا بکامہ کھل گیا۔ آنسو رک گئے۔

”یا تو تم مجھے پوری بات نہیں بتا رہی ہوئیا پھر تمہاری کہانی میں بہت سے جھوٹ ہیں۔“  
”میں..... میں سب سچ بتا رہی ہوں، آئی سویرا!“ وہ حیران تھی۔

”مجھے پتہ ہے تم حق کہہ رہی ہو، مگر مجھے یہ بات ناقابلِ ہضم لگ رہی ہے کہ ایک اوسی پی جو اتنے سال سے اس پوست پر تھے، انہوں نے تمہارے چند فترے سن کر، گھٹنے کیے تھے میک دیے؟“

”کیونکہ میں نے بتایا تھا، میری ویدیو والی دھمکی سے ان کی فیلی.....“

”خین ساری دھمکیاں فیلی سے ہی شروع ہوتی ہیں۔ اوسی پی صاحب کو اتنے برسوں میں کیا کبھی کسی نے دھمکایا نہیں ہو گا؟“  
پیسوں کا لالچ نہیں دیا ہو گا؟ ایسی پوست پر موجود لوگ بہت ٹرینڈ اور تجوہ بکار ہوتے ہیں، ان کو بلیک میل کوئی کرنا اچھے سے آتا ہے، اور تمہارے بقول وہ بہت ایماندار بھی تھے تو انہوں نے اتنی آسانی سے تمہیں پیپرز کیے دے دیے؟ ایک اوہیز عرصہ کا سر کاری آفیسر، ایک اخخارہ سالہ بچگی کے آگے چند منٹ میں ڈھیر کیے ہو سکتا ہے؟“

”بھائی نے بھی یہی کہا تھا مگر بھائی کا کہنا تھا کہ وہ بزدل تھے، ان کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے تھا اور....“ وہ الجھن سے کہہ رہی تھی۔  
زمر نے ناک سے لکھی اڑائی۔

”سعدی کو تور ہے دو۔ وہ تو آئیڈیلیست ہے، مگر میں پریکٹیکل ہوں۔ اور میرا نہیں خیال کر تھیں خود بھی پورا قصہ معلوم ہے۔“ وہ زمری اور افسوس سے کہہ رہی تھی۔ اور خین حیران پریشان پیشی تھی۔ اس کو ملامت کی امید تھی یا اڑھارس بندھانے کی، مگر.... زمراتی پریکٹیکل کیوں تھی؟ وہ پہلے سے زیادہ ڈسٹریب ہو گئی تھی۔

”شاپیٹمہیں خین پورا قصہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس بات پر سوچنا۔ اب سو جاؤ، ہم صحیح بات کریں گے۔“ وہ مسکرا کر کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ حنا اسی طرح پیشی رہی۔ وہ سیڑھیوں تک گئی تھی جب خین نے پکارا۔

”آپ کو مجھ پر ذرا بھی غصہ نہیں آیا، ہاشم والی بات سن کر؟“ زمر مڑی تو دیکھا، خین پریشان نظر وہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زمر زری سے مسکرائی۔

”اس میں غصے والی کیا بات ہے؟ اب سو جاؤ۔“ اور زینے چڑھتی گئی۔ اور آکر لاؤخ کا دروازہ بند کیا تو چہرے کے تاثرات بد لے۔ جر اپر سکون، نارمل رکھا چہرہ غم و غصے میں ڈھلتا گیا۔

”اس گھٹیا آدمی کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ خین کو یوں ایکسپلائٹ کرے؟ اس نے اپنی عمر نہیں دیکھی؟“ وہ غصے سے کھوٹی لاؤخ میں ٹھہر رہی تھی۔ اگر فارس کو پتہ چلا تو ہاشم کی جان لے لے گا۔ خین تو کم عمر ہے، نا سمجھ ہے، مگر ہاشم وہ اس کی فیلنگز کے ساتھ کیوں کھیل رہا ہے؟ تمہیں تو میں اچھا سبق سکھاؤں گی ہاشم!“ وہ جو سوچ رہی تھی، اس کے چہرے پر حرف بر حرف اترتا جا رہا تھا۔ فارس اور پر سے سیڑھیاں اترتا آیا تو ایک نظر اسے دیکھا جو غصے سے کھوٹی ادھر ادھر ٹھہر رہی تھی۔ پھر کچن میں گیا۔ پانی کی بوتل فرٹع سے نکالی اور واپس آیا، اس کے قریب رکا۔

”کیا ہوا ہے؟“

اس نے خفگی سے فارس کو دیکھا۔ ”مجھے سے بات مت کرو۔ مجھے غصہ آیا ہوا ہے۔“  
”آپ کو چوبیں میں سے کچیں گھنٹے غصہ آیا رہتا ہے، پانی پیس، اور چند منٹ کے لیے کنٹرولڈ، ٹھنڈے اور شاستہ مزاج کی ہو جائیں۔“ بوتل سامنے رکھی اور اوپر سیر ہیوں کی طرف بڑھ گیا۔ زمر نے تملا کر اسے جاتے دیکھا۔ (یہ مجھے میرے الفاظ لوٹا رہا تھا؟ ہاں؟ بہت بہانہ نہیں آگیا اس کو میرے آگے؟)

اور ساتھ وालے قصر میں نوشیروان بیٹہ پر بیٹھا، سفید ساپاڈو (آنکھیں بند کیے) ناک سے سانس کی صورت اندر اتنا رہا تھا۔ سیاہ رات ایک دفعہ پھر سب کے گناہ اور سب کے راز چھپائے، تاریک ہوتی جا رہی تھی۔

.....❖❖❖

متارع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے ..... کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے سینڈ کلر دیواروں والا کمرہ خاموش تھا۔ سعدی بیٹہ پر بیٹک لگا کر لیٹا تھا۔ دھنٹا دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دروازے کی اوٹ میں آکھڑا ہوا۔ چال میں لڑکھڑا ہٹ اب بہت کم تھی۔  
دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مایا اندر داخل ہوئی۔ خالی کمرہ دیکھ کر وہ رکی، گارڈ سے کچھ کہا تو گارڈ تیزی سے اندر آیا۔ اسی پل سعدی اور گارڈ پر چھپتا۔ گارڈ تیار نہیں تھا، قدرے لڑکھڑا۔ باہر سے دو مزید گارڈ اس طرف لپکے، اور کھینچ کر سعدی کو اس گارڈ سے علیحدہ کیا اور بیٹہ پر چلنا۔

”آہ!“ اس کے کسی زخم پر کسی کا ہاتھ پڑا تھا۔ دہرا ہو کر بیٹہ پر گرا وہ کراہا تھا۔ گارڈ غصے میں بول رہے تھے، مگر ڈاکٹر مایا تیزی سے ۶ مگ آئی۔

”اس کو باندھنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ٹھیک ہے، میں سنجال لوں گی، تم لوگ جاؤ۔“ ان کو اشارہ کیا، تو وہ قدرے پس و پیش کے بعد باہر چلے گئے۔ سعدی اب سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ درد سے آنکھیں بار بار میچتا۔ وہ اسنول کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھی۔  
”یہ کیا حرکت تھی؟“ وہ جواب دیے: بنا سیدھا ہوا، اور بیٹک لگا کر بیٹھا۔ پاؤں اور پر کیے۔  
”اس جگہ یہ واحد گارڈ نہیں ہیں، یہاں قدم قدم پر پھرے ہیں، تم اس طرح یہاں سے نہیں بھاگ سکتے۔“ آواز آہستہ کی۔

سعدی نے اس کو دیکھا۔ پھر عجیب سے انداز میں مسکرا لیا۔

”میرے زخم ٹھیک ہو گئے ہیں، اب تو کوئی نس بھی کافی ہے تو تم کیوں ہر روز آ جاتی ہو؟“  
”کیونکہ میں...“ اس نے بے کسی سے بند دروازے کو دیکھا، آواز مزید ٹھیکی کی۔ ”مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہیں۔“

”۱۱۔“

”اچھا واقعی؟ کس چیز کی مدد؟“  
”یہاں سے نکلنے میں۔“ وہ بے بس نظر آ رہی تھی۔

”ڈاکٹر مایا!“ اس نے چھپتی ہوئی نظریں مایا پر گاڑیں۔ ”کیا میری شکل سے یہ لگتا ہے کہ میں کل پیدا ہوا تھا؟“  
”کیا مطلب؟“ وہ بھی سعدی اس کو گھورتے چباچبا کر بولا۔

”اپنی ادا کاری بھچ پڑائی مت کرو۔ میں بچ نہیں ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ تم میرے ساتھ گذ کا پ کھیل رہی ہو۔ ہاشم میری ڈھنی ایفیت اور ارادوں سے باخبر رہنا چاہتا ہے، اس لئے اس نے تمہیں کہا کہ ہمدردی کی آڑ میں تم میرا اعتماد حیثیت، اور میرے فرار کے ہر طریقے کی ہمیزی کر کے نا کام بناو، اس حد تک کہ میں اس قید کی زندگی سے کپڑا و ماڑ کرلوں اور نکلنے کا رادہ تک کر دوں۔“ اور چہرہ پھر لیا۔

مایا کے شاکنڈ چہرے پر دکھ کے تاثرات ابھرے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”تمہیں اپنے ہمدردوں اور دشمنوں میں فرق کرنا ہی نہیں آتا تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجھ پر اتنے الزام لگانے سے پہلے تمہیں خدا کا خوف کرنا چاہیے تھا۔ میں ایک غریب آدمی کی مجبور بیٹی ہوں، مگر تم اپنی تینوں سے نکلو گے تو تمہاری آنکھیں کھلیں گی۔“ پھر ملامت بھری نگاہ اس پر ذاتی اٹھی۔ اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

باہر آ کر مایا نے کچن کی طرف جاتے ہوئے نشوونکا لے، آنکھیں رگڑیں، اور ساتھ ہی کچن میں دیوار پر لگنون کا رسیور اٹھایا۔

”ہاشم کا ردار کو ملا دو۔“ آپ پریٹر کو ہدایت دی۔ چند لمحے بعد ہاشم کی آواز ابھری تو وہ تیزی سے بولی۔

”سر، اسے شک ہو گیا ہے کہ آپ نے مجھے کام کے لیے رکھا ہے۔“

دوسری طرف بمشکل ہاشم نے ضبط کیا۔ ”ایک کام کہا تھا میں نے تم سے، کہ اس کو اٹریکٹ کرنے کی کوشش کرو؛ اتنا کہ وہ تمہیں اپنا بہترین ساتھی سمجھنے لگے، مگر نہیں... تم سے یا ایک کام بھی نہ ہو سکا۔“

”سر میں کوشش کر رہی ہوں۔ مگر وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ میری بھی ہر وقت روک ٹوک کرتی ہے۔ آپ میری انبیو کو میری جاب بتا کر اسے سمجھا دیں کہ ایسا نہ کیا کرے۔“ وہ اکتا کر کہہ رہی تھی۔

راہداری میں کھڑی میری نے رک کر ساری بات سنی اور پھر تیزی سے سعدی کے کمرے میں آئی۔ گارڈ نے دروازہ ہکولا تو اس نے دیکھا وہ بستر پر نہم دراز ہے۔ میری نے دروازہ بند کرتے ہوئے اسے غصے سے گھورا۔

”کیا کہا ہے تم نے مایا سے؟“ سعدی نے نظریں اٹھائیں۔

”وہی جو تم نے مجھے بتایا تھا میری!“

”میں نے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ہاں۔“ وہ پر سکون سا کہہ رہا تھا۔ ”تم ہمیشہ کہتی تھیں، مایا بھی ہے، مایا بھی ہے، مگر تم نے نہیں کہا کہ وہ اچھی لڑکی ہے یا اچھی ڈاکٹر ہے، یوں تو تمہارے تھپڑ کے بعد میں یہ جان گیا تھا، کہ تمہارا مطلب ہے، مایا بھی Cop ہے۔ یوں، گذکاپ، بیڈکاپ، اس تھپڑ سے تم نے میری توجہ حاصل کی، جھینک یواس ٹپ کے لئے۔“ مسکرا کر سر کو ختم دیا۔

میری کارگنڈ زر ابد لا بے اختیار بند دروازے کو دیکھا، پھر جی کر اکر بولی۔ ”پتہ نہیں کیا بولے جا رہے ہو؟ میں نے تمہیں کوئی ہفت نہیں دی، خود سے بتائیں مت فرض کیا کرو۔“ غصے سے اسے ڈانٹ کروہ واپس جانے کو مژدی۔ ”اور گارڈ پر آئیندہ حملہ مت کرنا، اس طرح تم بھاگ نہیں سکتے!“

اس کے جانے کے بعد سعدی نے سر جھکا۔ ”کس نے کہا کہ میں بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا؟“ اور اپنے نیچے سے وہ سگریٹ لائز نکالا جو اس نے گارڈ کی جیب سے نکالا تھا۔ گذ جاب سعدی! اسے دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا۔

..... ♦♦♦ .....

اسے گنو کر اسے پھر پانے کا شوق دل میں یوں ہے محسن ..... کہ جیسے پانی پر دائرہ سا کوئی بنائے تو کچھ نہ پائے جب ہاشم نے فون رکھا تو وہ ایک ہوٹل میں چند فراد کے ساتھ بلنے بیبل کے پاس کھڑا تھا۔ بات ختم کر کے وہ ان کے قریب واپس آیا اور سلا دکھاتے ہوئے گفتگو کو دیں سے جوڑ نے لگا جہاں سے مایا کی کال نے توڑا تھا۔

قریباً تین گھنے بعد جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا، تو اس کے سینے میں عجیب سی جکڑن ہو رہی تھی۔ یہ یقیناً سلا دکھا جس کی کوئی

۱۰۱۔ ایسا خراب شے اے لڑگی تھی۔ ایک لمحے کو اسے لگا ہے، پھر دیوار کا سہارا لیا۔ سامنے فوجونا کا حیران اور پریشان چہرہ نظر آیا، سب لمونٹن میں ہو رہا تھا۔ آوازیں بند تھیں۔ نوکر بھاگ کراس کی طرف آرہے تھے۔ وہ سہارے کے لئے بڑھے ہاتھ جھکلتا، لڑکھر اتا ہوا کمرے مل آی۔ کوٹ اس نے کھاگرایا، جوتا کدھرا تارا، کوئی جربنیں۔ با تھر روم تک بمشکل پہنچا، واش میں پہاڑھر کے جھکا۔ بے حد تکلیف زدہ تھی تھے آئی۔ پھر پانی منہ پہ پھینکا۔ چہرہ اٹھا کر آئینے میں دیکھا تو رنگ پخرا ہوا اور آنکھیں ڈھال لگتی تھیں۔ آگے اسے ٹھیک سے یاد نہیں... کب ہے پہ لیٹا۔ کب اس نے جواہرات اور ڈاکٹر کو اپنے سر پر کھڑے بات کرتے سنا (ذرا سی فوڈ پاؤائز نگ ہے میم، صبح تک بالکل ٹھیک ہوں گے، اراد صاحب!) کب کمرے میں اندر ہی راچھایا۔ کب روشنی ہوئی۔ وہ سوتی جاگتی کیفیت میں بستر پر نہ حال لیٹا رہا۔

مشنی کی کیفیت سے اس کی آنکھیں حلی... چھت گھومتی دکھائی دے رہی تھی۔ کہنی کے بل ذرا سیدھا ہوا۔ کرسی پر ایک فلپینو ملازمہ بیٹھی تھی۔ اسے جاگتے دیکھ کر سیدھی ہوئی۔ ہاشم نے ذرا نگواری سے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ نہیں گئی تو بدقت مگر خختی سے بولا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“ ۱۰۲۔ وہ متذبذب سی باہر نکل گئی۔

مگر وہ ٹھیک نہیں تھا۔ بمشکل اٹھ پایا۔ اور بے جان قدموں سے چلتا با تھر روم تک آیا۔ واش میں پہ جھکا۔ اسے بہت زور کی تھے ال تمی مگر ایسے لگتا تھا جیسے اندر تک سب کچھ صاف ہو گیا ہو۔ بدقت منہ پہ پانی ڈالا۔ شرٹ اور کلف بھیگ گئے۔ دیوار کو پکڑ کر جلتا بہر نکلا۔ ہالی جائے کا وچنگ تک آیا اور نہ حال سا اس پر لیٹ گیا۔ کروٹ کے بل، نیم مردہ سا۔ اسے شدید سردی لگ رہی تھی۔ اتنی بہت نہیں تھی کہ اسے فی بٹھا آف کر پاتا۔ کروٹ کے بل لیئے لیئے، اس کی آنکھیں کھڑکی پہ جی تھیں۔ پلک جھپکتا تو منظر صاف ہوتا، دوبارہ جھپکتا تو ہر طرف بادل ہے۔ کبھی کھڑکی بڑی ہو کر دکھائی دیئے لگتی، بھی پردوں کے بلنے کی آواز سمندروں کی لہروں کے شور جتنی بلند ہو جاتی۔ ہر شے ہر آواز کی گناہ، میوسوں ہو رہی تھی۔ شکلیں، ہیو لوے، بادل، سب آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے۔ ایسے میں ایک دفعہ اس نے پلک جھکی تو کھڑکی کے آگے، ہلالی روشنی نظر آئی۔ اتنی دودھیا روشنی کہ آنکھیں چندھیا جائیں، پھر اس روشنی میں سے ایک ہیولہ سا بھرنے لگا۔

سفید لمبی میکسی میں ملبوس کوئی لڑکی... اس سوتی جاگتی hallucinating (بیماری کے باعث غیر حقیقی چیزوں کا نظر آنا) سی ایت میں بھی اسے لگا کہ اس کی موت آپنگی ہے، وہ مر نے والا ہے اور وہ ملک الموت کا عکس ہے جو اس کی روح لینے آیا ہے... اس نے دھنڈی بھاٹ سے اس وجود کو قریب آتے دیکھا۔ اس کی میکسی پاؤں تک آتی تھی، اور پینے پہ بندھے ہاتھوں میں گلدستہ تھا۔ سرخ گلابوں کا۔ اس نے اسیں اٹھا کر اوپر دکھنا پا چاہا۔ دھنڈلا سانظر آیا۔ اس کے چہرے کے گر درسرخ ریشمی استوپ لپٹا تھا، جو نکھلوں پہ اکٹھا ہو کر سامنے انگریزی حرفاں کی طرح گرتا تھا۔ ہاشم نے نیم غنودہ سے انداز میں پلکیں جھپکیں۔ وہ قریب آئی۔ دودھ ملائی ساچھہ، کرٹھل جیسی گرے آنکھیں، اور سرخ ہال پہ ہمروہی بھری سکراہٹ۔ جھک کر وہ اس کے ساتھ پھول رکھ رہی تھی۔

۱۰۳۔ اُنہی ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ملک الموت نہیں تھی، ملک الموت تو وہ خود تھا۔ اب وہ اس کے اوپر کوئی چادری ڈال رہی تھی۔ ۱۰۴۔ رہا دی لگنا بند ہو گئی تھی۔ ہاشم کی پلکیں بھاری ہو کر گئیں۔ بمشکل کھولیں تو کمرے میں روشنی میکی ہی تھی مگر وہ غائب تھی.... اس کا داماغ نیز میں اہنگتا گیا۔

جانے لکھنی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ آہتہ سے اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں شام کی نیلا ہیں تھیں۔ بتیا بھجتی تھیں۔ وہ پینے میں شراب اور فلاں اسٹھنا تھا، اور حواس بہتر تھے۔ اٹھتے ساتھ ہی اس نے ادھ اوہ رہ دیکھا۔

۱۰۵۔ اس کے اوپر چادر تھی، نہ ساتھ پھول رکھے تھے۔ ہاشم نے بے حد کرب سے آنکھیں میچیں۔ (ایک باری سلاادنے اسے اتنا بیمار کر اس بری طرح سے hallucinate کرنے لگے؟ ایسا خیل؟ ایسا خواب؟) سر جھٹک کر وہ اٹھا اور با تھر روم کی طرف چلا گیا۔ چند

منٹ بعد لکھا تو نہ کرٹی شرٹ اور رڑاوز ریس میں ملبوس تھا۔ لکان ابھی تک چہرے پر واضح تھی۔ سست قدمی سے چلتا باہر آیا۔

لا و نخ روشن تھا۔ جواہرات صوفے پتھی، چائے پی رہی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر فکر مندی سے کپ رکھا۔

”تمہیں ابھی آرام کرنا چاہیے۔ اب کیسے ہو؟“

”بہتر!“ وہ اس کے ساتھ صوفے پا آبیٹھا اور پاؤں میز پر رکھ لئے۔ آنکھیں موند لیں۔

”کیا کھالیا تھا؟ اتنے بیمار لگ رہے ہو۔ شیر اور میں بہت پریشان تھے۔“ اس کو بہتر دیکھ کر بھی جواہرات کی تلی نہیں ہو رہی تھی۔

ہاشم نے آنکھیں کھولیں اور چھپت کو تکنے لگا۔ ”میں نے ایک خوبصورت خواب دیکھا۔“

”اچھا۔“ وہ زمزی سے مسکرائی۔ ”کس کو دیکھا؟“ اب وہ صوفے پا آدمی مرکار سے دیکھ رہی تھی۔

”تھی کوئی!“

جواہرات نے گھری سانس لی۔ ”اسے کال کرو۔ ڈنر پہ بلا لو۔ کتنے عرصے سے تم نے اس سے بات نہیں کی۔“

ہاشم نے آنکھیں بند کر لیں۔ ”میں مصروف تھا۔ اب بھی ہوں۔“ پھر سیدھا ہوا تو دیکھا، جواہرات اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں گئی، ہم اس بارے میں بات نہیں کرنے لگے۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔ انویں بنت ہے، میں نہیں چاہتا اسے کبھی میرے

بارے میں وہ سب معلوم ہو۔ وہ گناہ جو میں نے کیے ہیں.... دارث.... زرتاشہ... وہ سب...“ اس نے سر جھکا۔

”کسی کو بھی علم نہیں ہو گا، مودو آن ہاشم!“ اس نے خفگی سے ٹوکا اور کپ اٹھایا۔

ہاشم اٹھ گیا۔ ”میں تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر لیتا ہوں۔“ جواہرات خاموش رہی۔ جانتی تھی وہ موضوع سے پچھا ہا۔

رہا ہے۔

وہ کمرے میں آیا تو فیجنونا ساتھ ہی آئی۔

”فیجنونا، مجھے کافی لا دو۔“ لائٹ جلاتے ہوئے اس نے کہا پھر رکا۔ ”میرا لیپ ناپ کہاں ہے؟“

”سر، سوری، مگر آپ کو کافی نہیں مل سکتی۔ آپ کالیپ ناپ اور بریف کیس بھی مسز کاردار کے کمرے میں رکھ دیا ہے میں نے اسکے

دودن آپ کوڈاکٹر کے تجویز کردہ ڈائش پلان پر عمل کرنا ہو گا۔ کوئی کام نہیں۔ صرف ریسٹ۔“

”تم ابھی اور اسی وقت اپنی نوکری سے فارغ ہو۔“

فیجنونا نے مسکراہٹ دبائی۔ ”تحینک یوسر، مگر آپ کو اپنی جیزوں میں سے کچھ بھی نہیں مل سکتا، سوائے آپ کے سیل فون کے۔“ سایہ

نبیل پر دھرے فون کی طرف اشارہ کی، ”ابھی جوں لا تی ہوں اور پرہیزی کھاتا۔“ مستعدی سے کہتی وہ ایڑیوں پر گھوی۔ ہاشم مسکرا کر قدم قدم پاتا بیڈ تک آیا۔

”اور ہاں سر!“ وہ جیسے کچھ یاد کر کے واپس گھوی۔ ”میں نے پھول ادھر رکھ دیے تھے۔“ آتش دان کی طرف اشارہ کیا تو ہاشم لے چوک کر دیکھا۔ وہاں شیف پہ گلداں میں سرخ گلاب رکھے تھے۔ ہاشم کی نظریں فوراً صوفے تک گئیں۔ صوفے کے قدموں میں گول مول دی ہوئی چادر پر ڈی تھی۔

(جو شاید اس نے نہیں میں اتنا ردی تھی۔ تو وہ اس کا خواب نہیں تھا.....)

”یہ کون لایا؟“ وہ تھیگر سا آتش دان کے فریب آیا۔

”سر کسی لڑکی نے صحیح آپ کے لئے کال کی تھی، میں نے بتایا آپ بیمار ہیں، تو وہ دوپھر میں آئی، نام نہیں بتایا، مگر نو شیر و اس صاحب۔“

اس کو جانتے تھے، مسز کاردار اس وقت گھر پہنچیں۔ میں نے اسے آنے دیا۔ آپ کو دیکھ کر اور یہ پھول رکھ کر وہ چل گئی!

”تم دوسری دفعہ اپنی نوکری سے فارغ ہو فیجن۔“ خفی سے کہتا وہ پھولوں تک آیا اور اندر لگا کارڈ نکلا۔ سفید سے کارڈ پر سرخ روشنائی سے تحریر تھا۔

### ”Get Well Soon , Grim Reaper!“

اور یونچ چھوٹا سا لکھا تھا۔ ”آبدار ہارون عبید!“

ہاشم ذرا سامسکرا یا۔ موبائل اخبار اور کامپیکٹ لست اور پر کی۔ ایک نام پر کا۔ Red Riding Hood۔ پہلے کال کا ٹھنڈا دبایا۔ پھر (اونہوں) کال کاٹی۔ اور متوجہ کھانا۔ ”تھینکس، آبی!“

باہر یڑھیاں اترتی فیجن، ساتھ سے گزرتے شیر و کود کیکر کی۔ ”سر، دو ہر میں جوڑ کی آئی تھی ہاشم صاحب کے لئے، اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ کیا آپ اس کو جانتے تھے؟“

شیر و جوفون میں الجھا تھا، رکا اور تیز نظروں سے فیجن ناگو گھورا۔

”آف کورس۔ وہ ہارون عبید کی بیٹی ہے۔ اور زہرگانی ہے مجھے وہ۔ اب ہٹوسا منے سے۔“ اور برے موڈ کے ساتھ اور آیا۔ (ایک تو ہاشم بھائی کوہی لوگ کیوں پسند آتے ہیں جو مجھے ناپسند ہوتے ہیں؟ ایک سعدی، اور ایک یہ فساوی! میں ابھی تک بھولانہیں ہوں کہ کس طرح یونیورسٹی میں اس نے مجھے اپنے ملکیت سے پہنچا تھا۔ ہونہے!) منہ میں بڑبڑا تاواہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

❖❖❖

صرحاً میں جی رہا تھا جو دریا دلی کے ساتھ ..... دیکھا جو غور سے تو وہ پیاسا بہت لگا ہاشم نے جب نیکست بھیجا تو اس کے موبائل سے نادیدہ لہر نکلی اور اڑتی ہوئی ہوا میں بہتی چلی گئی۔ سڑکیں عبور کیں، گھر پھلانگے، اور بالآخر ایک سر بزرگ میدانوں سے گھرے اونچے محل میں تیرتی ہوئی آئی، ایک کھڑکی سے اندر کو دی، اور اسٹری نیبل پر رکھے موبائل میں جا اتری۔ موبائل اسکرین میسٹیج ٹون سے چمکی اور بجھ گئی۔

وہ ایک وسیع و عریض سی اسٹری سی گتی تھی۔ اس کے دروازے پر نیم پلیٹ لگی تھی۔ ”آبدار عبید۔ Hypnotherapist“۔ اندر دیکھو (ایسی کھڑکی سے) تو اسٹری نیبل کی کنٹرول چیز کی پشت نظر آتی تھی۔ سفید آستین میں ملبوس کہنی کری کے بازو پر جمی تھی، اور سرخ اسٹوں میں ڈھکا رہا۔ سر پیچے سے دکھائی دیتا تھا۔ یہاں سے اس کا چہرہ تو نظر نہ آتا، البتہ سامنے کا واقع پہنچ پہنچ جمائے، قیمتی سوٹ میں ملبوس درمیانی عمر کا آدمی بیٹھا داشت دکھائی دے رہا تھا اور وہ قدرے الجھن سے کہہ رہا تھا۔

”تو آپ میرا علاج کیوں نہیں کر سکتیں؟“

سرخ اسکارف والا سر جیسے گھری سانس لے کر جھکا گیا۔ ”مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا یہ کہتے ہوئے، مگر آپ کو سایکا ٹریست کی ضرورت ہے، اور میں سایکا ٹریست نہیں ہوں نہ ہی سایکا لوجست۔ یہ وہ ہوتے ہیں جو ذہنی مراضیں کا علاج کرتے ہیں نہ ہی میں میڈیکل ڈاکٹر ہوں جو کسی جسمانی یا باری کا علاج کر سکوں۔ میں hypnotherapist ہوں۔“ اس کی آواز زم اور سادہ تھی۔

”مگر.... وہ الجھا۔“ نہ جسمانی نہ ذہنی، اگر دونوں کا علاج آپ کے پاس نہیں ہے، تو.... آپ کیا کرتی ہیں؟“

”میں hypnosis کے ذریعے آپ کو ایک بہتر ہنی حالت میں لے جاسکتی ہوں، جہاں آپ خود کو ایک بہتر انسان کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سیلف اپری و منٹ کے لئے ہوتا ہے، بڑی عادتیں اور بڑی یادوں سے پچھا چھڑانے کے لئے۔ اور اس کی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو کسی سایکا ٹریست کی ضرورت ہے۔ میں ایک ریفر کر رہی ہوں۔“ قلم سے کاغذ پر چند الفاظ لگھیئے اور شرپ سے پیڈ سے صفحہ اتار کر اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ ان سے مل لیں۔ یہ آپ کا بہترین علاج کریں گے۔“

ان صاحب نے تذبذب سے صفحہ ٹھام لیا۔ ”مگر.... آپ کے والد نے مجھے کہا تھا کہ آپ بہت اچھی تھیں اپس ہیں۔“

”میں بہت اچھی تیراپسٹ ہوں، اسی لئے آپ کو ایمانداری سے بتا رہی ہوں کہ آپ کو میری ضرورت نہیں ہے۔“ وہ صاحب اتنے چند الوداعی کلمات کہہ کر باہر نکل گئے۔ دروازہ بند ہوا تو اس نے کری موڑی اب کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھو تو اس کا داہنارخ نظر آتا تھا۔ وہی ملائی ساپھرہ، اور بلی جیسی گرے آنکھیں جن کے ابر و ناراضی سے بچنے تھے۔ سرنخ ہونٹ دانت سے کاٹتے، اس نے موبائل اٹھایا۔ ہاشم کا نیشن سرسری سا پڑھ کر ایک کال ملائی۔

”ایمن.... بابا کہاں ہیں؟ نہیں، ان کو فون مت دو۔ بس اتنا بتا دو کہ ان کا بھیجا پانچ سو چھبوسوں مریض بھی میں نے واپس کر دیا ہے۔ اسی لیے اپنے سیاسی دوستوں کو میرے پاس نہ بھیجا کریں، اس امید پر کہ ان کے سارے راز میں آپ کو بتا دوں گی۔ اور ہاں ایمن، یہ در دے کر کہنا، کہ میں بہت بہت خفا ہوں۔“ زمیں نفکی سے کہہ کر موبائل رکھ دیا۔ پھر وہ اٹھی اور دروازے کی طرف چلی گئی۔

اب تم کھڑکی سے بہت کر کھڑے ہو تو دیکھو گے کہ، چند لمحے بعد وہ اس اسٹڈی کے یہودی دروازے سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں بزرہ زار در درستک پھیلا تھا۔ وہ ایک نظر بزرے پر ذاتی گھاس کے کنارے چلنے لگی۔ سادہ لمبا سفید فراک پینے جس کے چوڑی دار آستین تھے اور چہرے کے گرد غختی سے سرخ اسٹول لپیٹے۔ وہ چلتے ہوئے ہاتھ پوتوں کے پتوں سے گزار تی جا رہی تھی۔ ایک سفید ایرانی بلی دوڑ سے بھاگتی آئی اور اس کے قدموں کے برابر چلنے لگی۔

”سنو.... بیلا۔“ اس نے نفکی سے بلی کو مخاطب کیا۔ ”میرا موڑ بہت خراب ہے، اور آج میں مزید کوئی کلاں نہیں دیکھنے لگی۔“ ذرا آگے آکر کی۔ برآمدہ خالی تھا۔ کر سیاں بھی خالی تھیں۔ آبدار نے ”oops“ والے انداز میں بلی کو دیکھا۔ پھر جلدی سے کندھے اچکائے۔ ”چلوا چھا ہوا۔ اور کوئی کلاں نہیں، میں انکار کرتی تو برالگنا ان کو۔“ بلی نے اس کے قدموں سے خود کو گڑتے اس کے گرد چکر کاٹا۔ وہ پھر سے چلنے لگی۔

”ویسے تمہیں کیا لگتا ہے؟ بابا نے میری بات کا برآنا ہو گا؟ مگر... اونہیں بیلا۔“ وہ اداں ہوئی۔ ”ایمن (ڈرائیور) نے پوری بات بتائی، ہی نہیں ہوگی ان کو۔ بابا سمیت کوئی بھی مجھے سیر نہیں لیتا۔ سوائے میرے کلاں کے۔ حالانکہ ان کو بھی مجھے سمجھنے نہیں لینا چاہیے۔ اب میں دیکھنے میں کوئی پھوپھیراپسٹ تھوڑی لگتی ہوں؟ ایک تو میں نرم دل اتنی ہوں، اوپر سے کیوٹ بھی ہوں۔“ رک کر پوچھا۔ ”ہوں نا؟“ بلی جواب میں غالباً غاؤں کرتی مسلسل اس کی ناغوں سے خود کو گڑ رہی تھی۔

دور سے دو ملازموں نے دیکھا کہ وہ چلتی آ رہی ہے۔ جوڑ زادہ ہیلر عمر تھا، وہ نوجوان ملازم کی طرف مڑا۔

”تم آبدار بی بی کو بتاوا، اپنے سارے مسئلے مسائل کا جن کی وجہ سے تم لگ (بادر پی) نذریکا قرضہ والپیں نہیں کر سکتے۔ بی بی بہت ہمدردا اور مہربان ہے، تم ابھی ان کو نہیں جانتے، نئے ہونا۔ وہ تمہیں لگ کے سے مہلت دلادیں گی۔“ ہمدردی سے مشورہ دیا۔ نوجوان ملازم کی بہت بندھی۔ فوراً آگے گیا، جہاں وہ روشن پہ چلتی آ رہی تھی۔

”آبدار یہم!“ اس نے ہاتھ باندھے مودب سا پکارا۔ وہ رکی۔ نظر بھر کر اسے دیکھا۔

”آپ نے اس دن کہا تھا کہ لگ کے لئے گئے پیے جلد واپس کر دوں۔“

”ہاں غصہ، وہ بے چارہ پہلے ہی اتنا غریب ہے، نرم دلی میں دے تو بیٹھا ہے لیکن ابھی اس کو سخت ضرورت ہے ان کی۔“

”وہ دراصل...“ سر جھکا کر بے چارگی سے بتانے لگا۔ ”میری بہن کی شادی قریب ہے وہ سارے پیے اس میں لگ گئے پھر بھی کم پڑ رہے ہیں، والد میرے سلطان کے مریض ہیں، ڈاکٹر نے کہا کہ علاج کی منزل سے نکل چکے ہیں۔ دوا کا خرچ بہت ہے۔ آپ پلیز

گک سے کہہ دیں، وہ ذرا مجھے مہلت دے دے۔ آج کل دو وقت کے کھانے کا خرچ بھی پورا نہیں ہو پاتا ہمارے گھر کا۔“ وہ دکھ اور بے کسی سے کہہ رہا تھا۔

آبدار کی آنکھوں میں فکر مندی ابھری۔ وہ قدم فریب آئی۔ ”اوہ ہو۔ آئی ایم سوسنی غضیر۔ تمہارے تو بہت برے حالات ہیں، میں ابھی لک کے بات کرتی ہوں، نہ صرف وہ مہلت دے گا، بلکہ تم کہوتا میں تمہاری بہن کی شادی کے لئے پانچ دس لاکھ اڑخ کر دوں؟“ اپنا بیت اور ہمدردی سے پوچھ رہی تھی۔ ملازم غضیر نے آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں امید کی خوشی تھی۔

”بلی یہ تو آپ کا احسان ہو گا۔“

”شیور۔ میں ایسا کرتی ہوں، لک کے پیسے بھی خود ہی ادا کر دیتی ہوں، اور تمہیں مزید رقم بھی دے دیتی ہوں۔ اوکے؟“ وہ آگے بڑھی۔ پھر رکی غضیر فرط جذبات سے شکریہ بھی نہ کہہ پایا تھا جب وہ واپس گھوئی۔

”مگر ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے غضیر۔“ بہت ہی فکر مندی سے بتانے لگی۔ ”میں نے تمہارا بیک گراوڈ چیک کروایا تھا، ایسا ہے کہ تمہاری کوئی بہن نہیں ہے، اور والد تمہارے دس بارہ سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔ تمہارے ہینک اکاؤنٹ جس میں ہر ماہ تمہاری تنخواہ جاتی ہے، اس میں بھی کافی رقم ہے، اور لک کے پیسوں سمتیں وہ تمام رقم تم نے اپنے ہمسائے کو دیتی ہے، اس کی بیٹی سے شادی کے بد لے میں سو یونو وائٹ! میرے مختی اور ایماندار لک سے جو پیسے تم نے باپ کی بیماری کا کہہ کر تھیا ہے تھے نا، وہ ان کو کل صبح سے پہلے واپس ملنے چاہیں، ورنہ... اگر میں نے بابا کو بتایا تو....“

بہت ہی نرمی سے کہتے فقرہ ادھورا چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں جھاناکا۔ مسکرائی اور مرگئی۔ ادھر غضیر کے ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جارہا تھا۔ ہکا کا سا وہ ادھیز عمر ملازم کی طرف گھوما جس نے مسکرا کر موچھوں کوتا و دیا۔

”بولتا ہنا، ابھی تم بی بی کو نہیں جانتا۔“ غضیر نے تملکا کر اسے دیکھا تھا۔ (لک کا وفادار)

وہ اپنے قصر کی چار دیواری کے ساتھ قدم قدم چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ بلی بھی ساتھ ہی تھی۔ دھڑتا ایک دروازے کے قریب وہ رکی۔ آنکھیں چکیں۔ سرارت سے بلی کو ”دشش“، چپ رہنے کا اشارہ کیا اور دبے قدموں آگے آئی۔ کھلے دروازے سے گردن نکال کر جھاناکا۔ وہ کمپن آفس کے طور پر استعمال ہونے والا کرہ تھا۔ دیواروں پر کاغذ۔ چارٹس۔ ملٹی میڈیا۔ نوجوان ورکرز آگے پیچھے ہل رہے تھے، کوئی بول رہا تھا، کوئی کمپیوٹر پر بیٹھا تھا۔ ان میں ذرا اونچے چبوترے پر کھڑا اُٹی شرٹ اور پی کیپ والا نوجوان، جس کو وہ احر شفیع کے نام سے جانتی تھی، کہہ رہا تھا۔

”فاطمہ، مجھے رات ایک دوست کے میموریل ڈرپ پر جانا ہے، پیچھے جب ہارون صاحب پر اُمَّ نام میں انش رو یو دیں گے تو تم میری جگہ ہو گی۔“ فاطمہ کے پیچھے کسی ورکر کو دیکھ کر اونچا بولا۔ ”یہ کیا ہے، رضا؟“ آبدار کی نظریں اس طرف گھومیں جہاں ایک لڑکا ہینگ ڈریں گیک اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

”سریزی عید صاحب کا شلوار سوٹ ہے، یہ شو کے لیے بھیجا ہے ڈیزائنر نے۔“ وہ ہینگ ڈریک میں لباس دکھار رہا تھا۔ احر کے ماتھے پہلے۔

”ہر گز نہیں۔ وہ شلوار سوٹ میں مزید دراز قد لگیں گے، شو کے فارمیٹ میں تیوں سیاستدانوں کے سامنے میز نہیں ہو گی اور وہ کھڑے ہوں گے، مخالف والے چیمہ صاحب کو دیکھا ہے تم نے کتنے کمزور اور مخفی سے ہیں، ہارون صاحب ان کو bully کرتے نظر آئیں گے۔ اس کو بدل کر ٹوپیں تیار کرواؤ۔ تائی گھرے رنگ کی ہو۔ ان کو فائیٹر لگانا چاہیے، ڈکٹیشنریں۔“ پھر اسی سنجیدگی سے فاطمہ کی طرف متوجہ ہوا، تھی دروازے میں گرد نکال کر دیکھتی لڑکی پر نگاہ پڑی جو فوراً سے اوٹ میں ہو گئی۔ فاطمہ کو رکنے کا کہہ کر تیزی سے باہر آیا۔ وہ دیوار کے ساتھ

کھڑی تھی۔

”ہیلو احمد!“ اسے دیکھ کر سنبھل کر مسکرائی۔ ”میں فارغ تھی، سوچا کیمپن کے لئے خود کو ولینیز کر دوں۔ کوئی کام ہے میرے لئے؟“ معمومیت سے آنکھیں جھپکائیں۔

احمر نے بہت ضبط سے گھری سانس لی۔ ”نہیں مس عبید، آپ کے لئے کوئی کام نہیں۔ بلکہ آپ کے اس کمرے میں داخل ہونے پر بھی میں پابندی لگانے جا رہا ہوں۔“

آبدار کی آنکھوں میں خنگی اکھڑی۔ ”سور وہ۔ میں بابا کو شکایت کروں گی۔“

”پھر مجھے بھی بتانا پڑے گا کہ جب بھی آپ کیمپن آفس میں آتی ہیں، کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہوتا ہے۔“ دانت پر دانت جمائے اسے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”بھی میرے بیگ سے مرا ہوا چوہا نکلتا ہے، کبھی موبائل چار جرز ڈسٹ بن میں خوب خود جا پہنچتے ہیں، کبھی ہماری فائلز میں چھپکی کی دم خود سے آگرتی ہے۔“

وہ نظریں جھکا کر انگلیاں مروڑنے لگی، تو احر نے چند ایک گھرے سانس لئے۔ ”مجھے پتہ ہے آپ نہیں چاہتیں کہ آپ کے بابا کامیاب ہوں، کیونکہ اس صورت میں وہ آپ کو وقت نہیں دے پائیں گے، مگر اچھا ہو گا اگر آپ اپنے ریلیشن شپ کو بہتر بنانے پر غور کریں،“ جمائے میرے کام میں تانگ اڑانے کے سو... انگلی سے چوکھت کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ باؤڈری اب آپ کراس نہیں کریں گی۔“

آبدار کی تملکی ہوئی نظریں اوپر اٹھیں۔ زوٹھے پن سے کچھ کہنے لگی تھی کہ احر کی شرٹ دیکھ کر رکی۔ آنکھیں سکیریں۔

سفید شرٹ پر بلیک اینڈ وائٹ ایک مسکراتے تو جوان کی تصویر بنی تھی، جس کے چھوٹے گھنگریا لے بال تھے اور اوپر ریاضی کا نشان

#SaveSaadi hash tag

”یہ کون ہے؟“ وہ اچنپھے سے بولی۔ احر اپنی ساری تقریبا کارت جاتے دیکھ کر مزید جل گیا۔

”میرا دوست ہے منگ ہے، اس کے میموریل ڈنر میں جانا ہے رات کو اسی کے لئے پہنی ہے۔“ نفگلی سے کہتا پلٹ گیا۔

آبدار ابھی کی کھڑی سوچتی رہی۔ (یہ کون تھا؟ کہاں دیکھا ہے میں نے اسے پہلے؟)

اس کی بی بی اب بیٹھی اس کے پیر چاٹ رہی تھی۔



پھر اکھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی ..... اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا۔ میموریل ڈنر ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کے بیوکوٹ ہال میں منعقد تھا۔ اندر روشنیاں جگدا گاری تھیں۔ اسٹچ کے پیچے دیوار گیر بیز لگا تھا۔ جس میں سعدی مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا، اور ساتھ #SaveSaadi لکھا تھا۔ #وہی تصویر پرنٹ ہو کر ہال میں بیٹھے بہت سے لڑکے لڑکیوں کی شرٹ پر چھپتی تھی۔

احمر شفیع بھی اسی شرٹ میں کھڑا، سعدی کے دونوں دوستوں سے بات کر رہا تھا جب اس نے زمر کو اس طرف آتے دیکھا۔ وہ گھنگریا لے بالوں کو جوڑے میں لپیٹنے، قدر رے علقت میں لگ رہی تھی۔

”السلام علیکم احمد!“ پھر دوسرے لڑکے کو مخاطب کیا۔ ”تیرے نمبر پر تقریب میری بھتھی کرے گی،..... اوکے؟ اور اس کو آدھے پون گھنٹے کا نام چاہیے گا۔ وہ سعدی کی بہن ہے آخر!“

”آ..... اوکے مزز زمر!“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ احر کچھ کہنے لگا مگر وہ مرگی۔ اب وہ داخلی دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ چہرے پر مسکرا ہٹ سجائے۔ سامنے سے ڈاکٹر ایمن اور ڈاکٹر تو قیر چلے آرہے تھے۔

”مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ لوگ آئے۔“ ان کو رسیو کر کے وہ انہیں ان کی میز کی طرف لے آئی۔ ”بچے نہیں آئے آپ کے؟“

”وہ بہت چھوٹے ہیں مسز زمر، میوریل کی باتیں ان کے ذہنوں پہنچوگوار اثر نہ ڈالیں، اس لئے ان کو نافی کی طرف چھوڑا ہے۔“  
ڈاکٹر ایکن بتا رہی تھیں۔ زمر کی گردان میں گلٹی سی ڈوب کرا بھری۔ مگر جبرا مسکراتی رہی۔

”بالکل۔ ہر شخص کو اپنے بچے کو پر وینک کرنے کا حق ہے۔“ اور پھر جب مریٰ تو مسکرا ہٹ غائب تھی اور آنکھوں میں شدید تکلیف تھی۔ اسی طرح چلتی وہ خنین کی میز نکل آئی جہاں ندرت، سیم اور فارس بیٹھے تھے۔ فارس بار بار گھری دیکھ رہا تھا۔ زمر نے اس کے ساتھ خاموش نظر کا بادلہ کیا، پھر خنین کے قریب جھکی۔

”تیرے نمبر پر وہ تمہیں اٹھ پہلا کیں گے۔ تمہیں تقریر کرنی ہے، وہ بھی چالیس منٹ کی۔“

”وات؟“ خد نے دہل کر اسے دیکھا۔ ”مگر میں اپنے بھائی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی کسی سے۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ مجھے کوئی تقریر وغیرہ نہیں کرنی ہوگی۔“

”مجھے نہیں پرواہ میں نے کیا کہا تھا۔“ وہ دبی سر گوشی میں بولی۔ ”مگر تمہیں اگلے چالیس منٹ اٹھ پہ جا کر بولنا ہے، اور اتنا اچھا بولنا ہے کہ کسی کو میری اور فارس کی کمی محسوس نہ ہو۔ اب میں جارہی ہوں۔ کوئی سوال نہیں۔“ فارس اتنا سن کر اٹھ کر بیک اٹھ کی طرف جانے لگا۔

وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ خنین سے کچھ بولا نہیں گیا۔ ”مگر... میں کیا کہوں گی؟“

”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ خود سوچو۔“ رسان سے کہہ کر وہ اٹھ آئی۔

وہ کار میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی بے چینی سے بولا۔ ”میں اکیلا کر لیتا سب، آپ کو آنے کی ضرورت نہیں تھی۔“

”میں تھا ری مدد کے لئے نہیں آ رہی۔“ اور زور سے دروازہ بند کیا۔

اندر چند منٹ تو خنین یونہی بیٹھی رہی۔ پھر جب اس کا نام پکارا گیا تو اس نے بہت سی نظریں خود پہ اٹھتی محسوس کیں۔ پھر چھوٹے پھوٹے قدموں سے چلتی ڈائیس تک آئی۔ نم ہوتے ہاتھوں سے مائیک سیدھا کیا۔ ایک نظر اس بھرے ہاں پر ڈالی جس میں ہر عمر کے افراد، سول سو سائی کے اراکین، طبلاء، کچھ رشتے دار سب بیٹھے تھے۔ دل کا نپا۔ نگاہ جگہ داری۔ چند رکی کلمات کہئے پھر رکی۔

”میں کوئی تقریر لکھ کر نہیں لائی، کیونکہ میں تقریر کرنا بھی نہیں چاہتی۔ عجیب سالگتا ہے اپنے بھائی کے لئے تقریر کرنا، رسمی جملے کہ کر پنداں سو بہا کرتا لیاں سمیٹنا۔“ جھکی آنکھوں سے سر جھکا۔

”پاکستان میں ہر سال ہزاروں لوگ قتل کیے جاتے ہیں، بم دھماکوں میں، نارگٹ کلگن میں۔ اور ہزاروں انگوایے کیے جاتے ہیں۔ کچھ مار دیے جاتے ہیں، کچھ تاوان لے کر چھوڑ دیے جاتے ہیں، مگر چند لوگ... چند لوگوں کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ وہ شہر یا تاشیر ہو، فرزند یوسف رضا گیلانی ہو، یا سعدی یوسف ہو۔ ان کے انگوایا کاربرسوں ان کو زندہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے گھروالوں کو روز مارتے ہیں...“

جھکی نظروں سے ڈائس کی سٹھپنے دیکھا۔ وہاں میوریل کا پمفلٹ رکھا تھا۔ سعدی کی تصویر۔ اس کو دیکھ کر بہت کچھ یاد آنے لگا۔

”ہم عام ہیں بھائیوں جیسے تھے۔ ای کو ٹنگ کرتے تھے بہت۔ وہ فون پر کبھی کسی خالہ ممانی سے کسی کی غیبتیں کر رہی ہوتیں تو بھائی پارتا۔ ای یہ غیبت ہے، اور ای غصے سے جوتا اٹھا کر پھیکتے ہوئے کہتیں، ”میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔“ چہرہ جھکائے وہ ذرا سا بھی۔ ہاں میں ہمیں نہیں گوئی۔“ ای سارا دن، ہم بھائیوں کو برآ بھلا کہتی تھیں، اگر کبھی کسی رشتے دار کے سامنے ہماری تعریف کرتیں تو بھائی کہتا، ”میں تھیں نہیں الگتا کہ ای جھوٹ بول رہی ہیں؟“ نظریں اٹھائیں تو دیکھا۔ سامنے بیٹھی ندرت اور سیم مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں نہ تھیں۔ وہ پھر تسلیں جھکا کر کہنے لگی۔

”بھائی اور میں اکٹھے اسکول جاتے تھے۔ پانچ سال کا فرق تھا، ہم میں۔ دو بجے چھٹی ہوتی، دو بیس پہ ہم گھر پہنچتے۔ آتے ساتھ یہی بے چینی ہوتی کہ آج کھانے میں کیا پاکا ہو گا؟ بھاگ کر دیکھی کا ڈھکن اٹھاتی۔ جس دن گوہی یا کریلے شدے ہوتے تھے، اس دن مجھے لگتا میں امی کی لے پاک اولاد ہوں۔“ مسکرا کر سر جھکائے وہ کہہ رہی تھی۔ ایک دفعہ پھر سب نہیں تھے۔

”خیر، پونے تین تک نہاد ہو کر کھانا کھا کر میں جلدی سے سونے لیٹ جاتی، معلوم تھا کہ بمشکل آنکھ لگے گی ہی کہ... تین بجے... وہ چنگھاڑتی ہوئی آواز اٹھادے گی۔ جی ہاں۔ قاری صاحب کی گھنٹی کی آواز۔ اف۔“

ہال میں زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ (اور وہ بھی تھی صرف اسی کے گھر قاری صاحب تین بجے آتے تھے۔)

”میں روز تین میں سے پانچ منٹ پہلے دعا کیں، میں شروع کرتی، اللہ کرے قاری صاحب آج نہ آئیں۔ بارش ہو جائے۔ بیمار ہو جائیں۔ کبھی تین سے پانچ منٹ اوپر ہو جاتے اور گھنٹی نہ بجی ہوتی، تو میں اتنی خوش ہوتی، مگر، میں اسی وقت گھنٹی نجاتی۔ اف۔ بہت تپ چڑھتی تھی۔ لیکن کبھی.... سال میں ایک آدھ بار... وہ سر پر اسز چھٹی کر بھی لیتے۔ اس خوشی کا کوئی ثانی نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی کبھی لگتا ہے کہ اسی طرح ایک دن بھائی گھر آجائے گا۔ سر پر اسز۔ اس خوشی کا بھی کوئی ثانی نہیں ہو گا۔“

بھکھے چہرے پہ آنسو ٹوٹ کر گرنے لگے، مگر اس کی آواز ہموار تھی۔ ہال میں پن ڈر اپ سائیلینس تھا۔ ذا کٹر ایکن جذبات سے عاری پڑھ لئے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ ذا کٹر تو قیر بار بار پہلو بدلتے تھے۔

”مگر پتہ ہے کیا... وہ کہہ رہی تھی...“ بھائی قاری صاحب کے آنے پر میری طرح نہیں چڑھاتا تھا۔ میں غصے سے قاری صاحب کی برائیاں کرتی۔ کہتی بھائی یہ غلط فتوے دے دیتے ہیں، کبھی کہتے ہیں یہ حرام، کبھی وہ حرام۔ یہ مولوی اتنے نگ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ ایک دن بھائی نے مجھے صوفے پہ ٹھایا اور بولا۔ ”حمد پتہ ہے، مولوی کون ہوتا ہے؟ وہ جس کی معمولی تعلیم ہوتی ہے، مسجد کے ایک جھرے میں رہتا ہے، چار پانچ بچھے ہوتے ہیں، اور اتنی کم تجوہ جس میں ہم ایک ڈر زکر لیں۔ وہ اس میں پورا مہینہ گزارتا ہے۔ بچوں کو پڑھاتا ہے۔ دو دوست کی روٹی کی فکر بھی کرتا ہے، اس کو کہاں ملے ہیں، کھلا کرنے کے موقع؟ مدینہ یونیورسٹی یا گلاسکو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی نہیں کی ہوتی اس نے۔ یہ جو سوند بونڈ بہترین اسلامک اسکالرز بڑے بڑے سینیماز اور فورمز پیکچر دریتے ہیں، ریسرچ پیپرز نکالتے ہیں، نہ ان جیسا ذہن ہوتا ہے اس کا، نہ اتنے موقع ملے ہوتے ہیں۔ وہ تو منہ اندھیرے اذان دیتا ہے، لوگوں کو نماز کے لئے اٹھاتا ہے، رمضان میں تراویح پڑھاتا ہے، بچوں کو قرآن پڑھنا سکھاتا ہے۔ اس کی انکم دیکھو، اس کے حالات اور اس کا پاس منظر تو دیکھو، پھر اگر وہ نگ نظر ہے، سخت فتوی دے دیتا ہے، تو کیا تم لوگ اس کی ان بالوں کو اس کے ان سارے احسانات کے پیش نظر جو وہ تم لوگوں پر کرتا ہے، آگوڑنہیں کر سکتے؟ کیا اس کے طوے کی پسندیدگی پر لطفی بنا ضروری ہے؟“ مگر میں نے پھر بھی کہا۔ جو بھی ہے بھائی، تین بجے آنا کوئی انسانیت نہیں ہے!، ہلکا سا ہنسی تھی وہ... سب سن رہے تھے۔ غور سے خاموشی سے اور وہ بلوچی جاری تھی۔۔۔ اس کے اندر کا کھاتا کیڑا ادم توڑنے لگا تھا۔

ضیغام نے اب تو پتھر کر دیا اور نہ فراز!

دیکھا کوئی کدل کے زخم جب آنکھوں میں تھے

ان سے دور نہیں اندھیر کا لوٹی میں ایک بیگلے کے سامنے چار دیواری کی اوٹ میں وہ کھڑا تھا۔

”ان کا گارڈنہیں ہے کیا؟“ ساتھ کھڑی زمرنے پوچھا تھا۔

”اوہ ہوں، آج کل ان کا گارڈنہپتال کی عمارت میں ہوتا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے گیٹ کے لاک میں پک ڈال کر گھما رہا تھا۔

زمر نے چورہ دوسری طرف کر لیا۔ ”کسی دن، ہم عدالت میں کھڑے اس لمحے کی بات کر رہے ہوں گے اور میں چاہتی ہوں کہ خود کو

کیے بغیر (کٹھرے میں جھوٹ بولے بغیر) کہہ سکوں کہ تمہیں کبھی کچھ الیگل کرتے نہیں دیکھا۔“

گیٹ کھل گیا، وہ ان سے کرتا اندر بڑھ گیا۔ زمر پیچھے آئی۔ باہر گئی نیم پلیٹ جگہ گاری تھی۔

ڈاکٹر تو قیر بخاری۔ ڈاکٹر ایمن بخاری۔

”کالونی میں ایک ہی سی سی ٹی وی کیمروں ہے، جس کو میں نے دوپہر میں ڈس اسٹبل کر دیا تھا۔“ وہ گھر کے اندر ورنی دروازے کے سامنے بیٹھا، اور ایک نیمی ہی پک pick لاک میں گھستے بولا۔ زمر سینے پہ بازو لپیٹے ساتھ کھڑی، اسے دیکھے گئی۔

”کسی کے گھر کا لاک تو زنا، کسی کی پر اپنی پڑیں پاس کرنا، مجھے یقین نہیں آ رہا میں ایسے کام میں ملوث ہو رہی ہوں۔ تمہیں پتہ ہے ٹریس پاسنگ کی سزا کتنے سال ہوتی ہے؟“ وہ جھبڑ جھبڑی لے کر دوسرا طرف دیکھنے لگی۔

”ایکسٹورشن (بلیک میلنگ) کی سزا کتنے سال ہوتی ہے؟“ وہ اسی سنجیدگی سے پک کوکی ہول میں گھستے باری باری لاک کی pins دھکلینے لگا۔ زمر ملکس کر چپ ہو گئی۔

وہ ایک اپن دھکلیں رہا تھا۔ یوں جیسے پیانو کی کیز پا انگلیاں چلا رہا ہو، اور جو تال انھی تھی، اس نے اندر ہیرے میں ایک منظر اس کے سامنے نہ را دیا۔

”ندرت بہن بھی چاہی کدھر کھو بیٹھیں، اور آپ نہ ہوتے تو ہم آج گھر کے باہر رات گزارتے ماموں۔“ وہ چھوٹے باغیچے والے گھر کے دروازے پہ کھڑے تھے، فارس بچوں کے بل بیٹھا لاک میں pick گھسارتھا اور کم عمر سعدی ستائشی انداز میں کھدرا تھا۔ ”ویسے بغیر چاہی کے کیا کوئی لاک اتنی آسانی سے کھل سکتا ہے؟“

”ابھی دنیا میں وہ لاک نہیں باجوہ تو رانہ جا سکے۔ ادھر غور سے دیکھو میں یہ کیسے کر رہا ہوں۔“

”میں سیکھ کر کیا کروں گا؟“ کم عمر لڑکے نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ فارس نے سراہا کرتندہ ہی سے اسے دیکھا۔

”ابھی کہیں لا کڈ ہو جاؤ تو باہر تو نکل سکو گے۔ اب دیکھو...“ وہ بتانے لگا۔ ”یہ سیپل لاک ہے۔ تھے pins ہیں اندر۔ اس کی چاہی کے ایسے دانت ہوتے ہیں جو اندر ورنی سانچے میں فٹ ہو جاتے ہیں، تم چاہی گھماو تو pins آگے سرک جاتی ہیں اور لاک کھل جاتا ہے۔“ سعدی ساتھ میٹھے گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ ”یہی کام تم چاہی کی جگہ اس سادہ pick (نیمی ہی لوہے کی اسٹک) سے بھی کر سکتے ہو۔ باری باری ہر پن کو سر کاتے جاؤ، ون، تو، تھری....“ اس کی انگلیاں مہارت سے چل رہی تھیں۔ ”فور، فائیو، سکس، ملک!“

کلک کی آواز آئی، لاک کھلا، تو وہ چونکا۔ پیانو کی دھن غائب ہوئی۔ اردوگر مظفر نامہ بدلا۔ وہ اندر ہیرے پورچ میں کھڑا تھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ (امید کرتا ہوں سعدی کہ جو کچھ میں نہ تھیں سکھایا تھا وہ تھیں یاد ہو۔) دونوں ساتھ ساتھ اندر آئے۔

”میں اپنا کام کرتا ہوں، آپ تب تک بیدروم میں جا کر ان کے دراز وغیرہ چیک کریں۔“ وہ بیگ کندھے سے اتارتاذ رانینگ روم کی طرف جاتے کھدرا تھا۔ زمر نے رک کر اسے دیکھا۔

”مجھے آرڈر مت دو۔ مجھے پتہ ہے مجھے کیا کرنا ہے۔“

فارس نے گھری سائنس لے کر اسے دیکھا۔ ”بہت بہتر!“ اور آگے بڑھ گیا۔

وہ بیدروم میں آئی۔ چند منٹ لگے اسے تمام دراز، الماریوں کے کاغذات دیکھنے میں۔ فارس کی دی گئی چاہیوں میں سے کوئی نہ کوئی چاہی ہر دراز اور لاکر میں لگ رہی تھی۔ چند ایک کی کیمروں سے پچھر لیں۔ پھر واپس ڈرائیننگ روم کی چوکھت تک آئی تو وہ بچوں کے بل زمیں پہ بیٹھا، اپنا کام کر رہا تھا۔

اسے مصروف دیکھ کر زمر اس کھلے سے استڈی روم میں آئی جوڈا کٹر ایمن کے ہوم ملینک کے طور پا استعمال ہوتا تھا۔ اندر آتے ہی وہ تیزی سے الماریوں کی طرف لپکی۔ جس شے کی اسے تلاش تھی، وہ ڈھونڈنے میں چند منٹ لگے۔ ایک الماری، جس میں درازوں کی طرح

خانے تھے اس میں پیشند نوش رکھے تھے۔ فائلز اور آڈیوی ڈیز۔

”جی۔ جی۔ جی۔“ وہ حروفِ تجھی کے اعتبار سے آر گناہ زڈ فائلز پہ انگلی پھیرنے لگی۔ پھر رک۔ ای ایف جی۔ جی سے غازی۔ فارس غازی۔ اس نے فائل کاٹی۔ اندر چندسی ڈیز بھی تھیں۔

(اور ڈاکٹر ایمن نے کورٹ میں کہا تھا کہ اس نے کبھی غازی کے سیشن ریکارڈ نہیں کیے، مگر یہ جھوٹ تھا۔) اس نے باکس میں سے ہی ڈیز نکال کر اپنے پرس میں منتقل کیں۔ پھر ایک دوسرے مریض کی سی ڈیز اس باکس میں ڈال دیں اور اسے واپس فارس کے فولڈر میں رکھ کر دراز بند کرتی مڑی ہی تھی کہ.....

”چلیں!“ وہ چوکھت میں کھڑا تھا۔ زمر کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا پھر بھی وہ اس کا قدر رے بوكھلا یا چبرہ دیکھ چکا تھا۔

”کیا ہوا؟“ غور سے اس کو دیکھا۔ اس نے اس کو سی ڈیز نکالنے نہیں دیکھا تھا۔

”تم نے اپنا کام کر لیا؟“ وہ خود کونارمل کرتی آگئے آئی۔ ”میرا مطلب ہے ایک اور الیگل کام؟“

فارس کے لب بھی گئے۔ ”آپ آرہی ہیں یا آپ کو جھوڑ کر چلا جاؤں؟“

وہ اب تک نارمل ہو چکی تھی، اس بات پر سلگ کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اور نیم اندھیرے میں چھپتی نظر وہ اسے دیکھا۔

”تم یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہو کہ مجھے ادھر جھوڑ کر جا سکتے ہو؟“

فارس کے لبیوں پر مدمم سکراہٹ رینگی۔

”اوہ آپ کے خیال میں، میں آپ کو ادھر جھوڑ کر کیوں نہیں جا سکتا؟“

وہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”کیونکہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم اپنی بیوی کو جان سے تو مار سکتے ہو، مگر اس کو یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔“ اس کی آنکھوں میں

دیکھتی دوقدم آگئی۔ ”کیونکہ تم اپنے ابوکی طرح نہیں بننا چاہتے۔“

فارس کی سکراہٹ غائب ہوئی، چہرے پر سمجھی گی اتری۔ ”چلیں!“ اور بیگ کندھے پہ ڈالتا آگئے بڑھ گیا۔ وہ گہری سانس لے کر (شکر) اپنے پرس کو مضبوطی سے تھامے اس کے پیچھے آئی۔

اور حسپ معمول کچھ دیر بعد وہ کار میں بیٹھے سرسری اور خشک انداز میں بات کر رہے تھے۔ زمر اس کو بنائی گئی تصاویر دکھارتی تھی۔

”تم نے جوان کے بینک اکاؤنٹس کی ڈیبلیو ہائی تھیں، ان اکاؤنٹس کے علاوہ کوئی اور چیک بک نہیں نظر آئی تھے۔ میرا خیال ہے یہ ان کے واحد اکاؤنٹس ہیں۔“

”لیکن ان میں کوئی پیسے نہیں ٹرانسفر ہوئے۔ سعدی والے واقعے سے اب تک۔ مطلب کوئی بھی چوری رقم نہیں۔ بلکہ صرف نکلوائے گئے ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے کھدرا تھا۔ زمر نے ایک اور تصویر سامنے کی۔

”وہ جو ڈائیمینڈ ناپس ڈاکٹر ایمن نے پہن رکھے ہیں، ان کا ان وہ اس بھی لا کر میں موجود تھا، جو بڑی رقم نکلوائی گئی تھی، وہ انہی کے لئے تھی۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا کہ سعدی کے بد لے انہوں نے ڈاکٹر بخاری کو کچھ نہ دیا ہو۔ کچھ تو دیا ہے کہ وہ مالی طور پر اتنے بے فکر ہو گئے ہیں کہ مہنگے تھے خرید رہے ہیں۔“

ہال آگیا تھا، وہ کار کھڑی کرنے لگا۔ یہ ہال پانچ منٹ کی ڈرائیور پر تھا اور زمر کے کہنے پر لڑکوں نے ڈاکٹر بخاری کی ہی ہاؤ سنگ

ہمانی میں بک کروایا تھا۔

”فارس ہم کیوں یہ فرض کر رہے ہیں کہ ان کو صرف پیسے ہی دیے جاسکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کچھ اور دیا ہو۔ کوئی فور، کوئی سفارش۔“

”میں کل چیک کرتا ہوں۔“ وہ سر پلا کر نکلنے لگی جب وہ آہستہ سے بولا۔

”میری بیوی نے آخری ملاقات میں آپ سے کیا کہا تھا؟“

زمر نے مذکرا سے دیکھا، اس کی نظریں وہنہ اسکرین پر جی تھیں۔ (آخری ملاقات؟) اس کے اندر اب اسالٹنچ لگا جسے بکشکل دبایا۔

”یہی کہ وہ تم سے نفرت کرتی ہے اور تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“ وہ بے بی بھرے غصے اور عجلت میں کہتی نکل گئی۔ اسے دیر

11 ہی تمی خدہ نے پتہ نہیں کیے سنجا لا ہو سب۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے فارس کا چہرہ نہیں دیکھا جو ایک دم بہت ڈسٹر بذ لگنے لگا تھا۔

جب وہ بہل میں واپس پہنچا تو حسین، جو ابھی تک تقریر کر رہی تھی، ان کو باری باری آتے دیکھ کر جلدی سے ”ڈیٹس آل“ کہہ کر نیچہ اتر

الی۔ ہال تالیوں سے گوئی خنے لگا۔ وہ اتنا چھا بولی تھی کہ کچھ لوگ کھڑے ہو کرتا لیاں بجارتے تھے۔ احر شفیع بھی انہی میں سے ایک تھا۔ (ماننا

ہے گا، غازی کے خاندان میں کوئی نارمل نہیں ہے۔)

وہ واپس آ کر بیٹھی تو زمر، جو اپنی کرسی پر بیٹھی تالیاں بجارتے تھے۔ ”آئی ایم سوری، میں نے تمہیں اس پوزیشن

بن ڈالا کر...“

”اپ کچھ کلی تھیں یوز مر!“ خدہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتے مسکرائی۔ ”مجھے لگا آج بہت دن بعد بھائی سے بتیں کی ہیں۔“ ایک دم گز

11 ال رکی۔ ”مطلوب، زمر پھپھو!“ لاحقہ لگا کر خفت سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

زمر صرف مسکرا دی۔ فارس خاموشی سے دور بیٹھی ڈاکٹر ایکن کو دیکھتا رہا۔

❖❖❖

”نام رکھیں، ہی توڑ دی ہیں، میں نے آنکھیں ہی پھوڑ دی ہیں..... زمانہ اب مجھ کو، مرا آئینہ بھی دکھائے تو کچھ نہ پائے چند دن مصروف سے گزرے، وہی روٹین والی زندگی۔ اور پھر ایک چکلی صبح ہاشم کاردار کے آفس کے باہر جلیس فون پر کسی کوہدیاتی اپنی نظر آرہی تھی۔ بندروازے کی چلی درز سے اندر جاؤ تو ہاشم پاور سیٹ پر لیک لگائے براجماں تھا، اور سامنے کرسی پر بیٹھا نو شیر والا برانسہ بنائے ہمدرہ تھا۔

”طبعیت آپ کی خراب ہوئی، شامت میری آگئی۔ مطلب اب مجھے روز آفس آنا پڑے گا؟“

وہ بہکسا نہیں دیا۔ ”نہیں“ میں بوڑھا نہیں ہو رہا۔ لیکن تم بھی اب بچے نہیں رہے۔ تمہاری کہنی اب تمہارے حوالے ہے۔ تم اس کو

لہاں لے جاتے ہوئے تم پر محصر ہے۔ ”ذرار کا۔“ اب سعدی تھر کوں میں نہیں ہے۔ یہی وقت ہے جب ہم پر اجیکٹ لے سکتے ہیں۔ ”نو

یہ، وال کا حلقت تک کڑوا ہو گیا۔ ”بھائی یا رائیک اس کے نہ ہونے سے تھر کوں کا کیا بگڑے گا۔“

ہاشم میز سے ایک کریش بال انھا کر انگلیوں میں گھماتے مسکرا یا۔ ”تم میری بات نہیں سمجھ۔ وہ ان کی سائید پر نہیں ہے، وہ ہماری

مانیڈ پر ہے۔“

نو شیر والا نے چونک کرا سے دیکھا۔ ”وہ ہمارے لئے کبھی کام نہیں کرے گا۔“

”کرے گا۔ اس کی بہن اس کی کمزوری ہے۔ میں نے اسے سے حوالے سے اچھا خاصا خوفزدہ کر دیا ہے۔“

”آپ کیا کریں گے اس کی بہن کا؟“

ہاشم نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ”وہ چھوٹی بچی ہے، مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر اسے ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ سعدی کی

واحد وارث ہے۔ سعدی کی ماں کو تو رہنے والے دو اس کو *insane* قرار دینا آسان ہے۔  
”بھائی۔“ شیر و الچ کر سوچنے لگا۔ ”اگر... بالفرض.. اس چھوٹی لڑکی کو کچھ ہو جائے، مطلب کہ یہ مر و رجاء، تو حق قصاص کا کیا ہو گا؟“

”حق قصاص منتقل ہو جائے گا۔ اس لڑکی کے شوہر کو۔“

”وہ چونکا۔“ اور شوہر چاہے تو معاف کر دے؟“

ہاشم نے اثبات میں سرہلایا۔ ”بالکل۔“

نوشیر والی نے ستائش سے ابرد اکٹھے کیے۔ ”واو۔ انٹرستنگ۔ اس کو واقعی ہاتھ میں رکھیں پھر۔ مگر آپ کہہ رہے تھے کہ کئی دن سے اس نے آپ کو نیکست نہیں کیا۔“

”کیونکہ میں نے اسے نیکست نہیں کیا۔ جس دن میں کروں گا۔ وہ فوراً جواب دے گی۔ کیا تم لا کیوں کو جانتے نہیں ہو؟“ یہ پٹاپ کی طرف متوجہ ہوتے اس نے تبصرہ کیا۔ شیر و الچ سانس بھر کر رہ گیا۔ (واہ۔۔۔ بھائی کمال کا تھا۔ ایک اس سے تو نقل ٹھیک سے ہوانہ ایک لڑکی پٹ سکی۔) سینے میں میں سی اٹھی۔



سینکڑوں طوفان لفظوں کے دبے تھے زیر لب ..... ایک پتھر تھا خاموشی کا کہ جو ہلتا نہ تھا  
انیکسی میں وہ صبح خاموشی پھیلی تھی۔

لا و نج میں ابا بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ ساتھ صوفے پر زمر پیرا اوپر کھے بیٹھی، یہ پٹاپ گود میں رکھئے کانوں میں ایفر فونز لگائے ہوئے تھی۔ اسکرین پر جو وند و کھلی تھی اس سے ظاہر تھا کہ وہ فارس کے آڈیوسیسٹریس رہی تھی۔ بہت سے سن لئے تھے اور بہت سے رہتے تھے۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کا یہی معمول تھا۔ جب وقت ملتا، اسی طرح بیٹھ کر اس کی باتیں سنتی رہتی۔ پتہ نہیں کیوں عادت کی ہوتی جا رہی تھی اس کی آواز کی۔

ابا مسلسل خاموشی سے اس کے پتھرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ وہ ان آوازوں سے بے خبر تھے جو زمر کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

”تمہیں اپنی بیوی سے محبت تھی؟“ ڈاکٹر ایمن پوچھ رہی تھی۔ زمر کے ابرو سکڑے بانے محسوس کیا وہ دھیان سے سننے لگی ہے۔

”وہ میری بہت اچھی دوست تھی، اپنچھ مٹت تھی ہمارے درمیان، ہمدردی، خیال کا رشتہ تھا اور کیا ہوتی ہے محبت؟“

”مطلب کہ محبت نہیں تھی۔“

”وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی، اور میں اس کو بہت مس کرتا ہوں، جیل میں تو بہت زیادہ۔ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ میں صرف حق بولنا چاہتا ہوں، اور میرا حق آپ کے علاوہ کوئی سننا نہیں چاہتا۔“

”تمہیں کسی اور سے محبت تھی، ہے نا؟“

”مجھے حق کیوں کر رہی ہیں آپ؟“ وہ دھیما سا بولا تھا۔

”یہ میری جاب ہے۔ تمہارے اندر کے خیالات باہر لانا۔ مگر یہ محفوظ رہے گا۔ تم جانتے ہوئے confidentiality کے پانچ C۔“

”وات ایور!“

”تو اس سے شادی کیوں نہیں کی جس سے محبت تھی؟“

چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی۔ زمر کو بے چینی ہوئی، کہیں آگے ٹیپ بلینک تو نہیں؟ مگر پھر فارس کی آواز اجھری۔  
”ہونہیں سکی۔“

”اس نے انکار کر دیا؟“  
”پتہ نہیں۔“

(اُف، اس کو کیا مسئلہ ہے، ٹھیک سے بتاتا کیوں نہیں ہے؟ بات گھمانی ضرور ہے؟) وہ چڑی۔  
”کبھی بتایا اس کو؟“

ذرا اوپر ہوا۔ ”میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ یہ کس چیز کا نجیگش تھا۔“ ایک دم زمر چونکی۔

”تمہاری اجازت سے لگایا ہے، یہ... truth serum تھا۔ میں چاہتی تھی، تم سمجھ بولو۔“

زمر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اس کی آواز میں تکلیف محسوس کر سکتی تھی۔ (کیا ڈاکٹر نے اس کو سائیکلو ایکٹوڈرگز دے کر امداد کروایا تھا؟) فارس سے سارے اختلاف اپنی جگہ، اس کا اعتراض قتل سننے کا اشتیاق اپنی جگہ، مگر اس کے اندر کی انصاف پسند لڑکی کو پہنچ بہت برالگ رہا تھا۔

”آئندہ مجھے یہ انجیکٹ مت کیجئے گا۔“ وہ نیم غنوڈیگی میں بول رہا تھا۔ ”جو پوچھنا ہے ایسے ہی پوچھ لیا کریں۔“

”اوے کے اس لڑکی کا بتاؤ، اسے کبھی بتایا یا نہیں؟“

”نہیں۔“ اس کی آواز آہستہ آہستہ ڈوٹی جاری ہی تھی۔

”کبھی کوشش کی؟“

”کی تھی۔“

”کیسے؟“

”میں نے اسے.... ایک ہیرا دیا تھا۔“

وہ جو چہرے پر اذیت لئے سن رہی ایک دم ٹھہری گئی۔ بالکل بہوت۔

”کون تھی وہ؟“

”میرے نزوں بہت مضبوط ہیں، ڈاکٹر۔ جو نہیں بتانا چاہتا۔ نہیں بتاؤں گا۔“ آواز ہلکی اور غنوڈہ تھی۔ چند لمحے کی خاموشی۔

”فارس، تم نے اپنے بھائی کا کیوں قتل کیا؟“ زرمی سے پوچھا۔

”میں نے نہیں کیا۔“ گھری سانس لینے کی آواز۔

”اوے کے تم سوچاؤ،“ چند منٹ کی خاموشی کے بعد سیشن ختم ہو گیا۔ وہ متیر، ابھی، حیران سی پیٹھی رہی۔ پتہ نہیں اس کا دل کس بات پر الماتھا۔ اور حیرت کس بات پر تھی۔

”چھوڑ وزمر۔ اس کو لڑکیوں میں ہیرے بانٹنے کی عادت ہے؟ ایک اپنی ٹیچپر کو دیا، ایک اس لڑکی کو اور زرتاشہ کا و لیسے کا سیٹ بھی اتنا نہ کھا۔ ہونہے!“ اسی فونز اتارتے ہوئے وہ تکلیف میں ڈوبی آواز کوڑہن سے جھکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”اچھا بالفرض وہ میری بات کر بھی رہا تھا تو وہ تب کی بات تھی۔ اب تو میں اس کی دشمن ہوں۔“

”کیوں پریشان ہو؟“ ابا کی آواز پر وہ چوکی۔ وہ اسی کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے سر جھکتا۔

”بس... ایک پرانا کیس اسٹڈی کر رہی تھی۔“ اٹھ کر چیزیں سمینے لگی۔ انہوں نے یاسیت سے اسے دیکھا۔

”کتنے عرصے سے ہم نے بات نہیں کی۔ تھاہرے پاس اب وقت نہیں ہوتا زمر!“

وہ ٹھہر گئی۔ دل کو دھکا سالگا۔ ایسا نہیں ہے۔ میں سعدی والے معاملے میں الجھی رہتی ہوں۔ ورنہ... آپ کو پتہ ہے آپ پر طنز کرنے کا موقع میں چھوڑا نہیں کرتی۔ رسان سے کہتی ان کے قریب آجیلی۔ وہ دھیما سامسکرائے۔

”سعدی میں جائے گا۔ میں بہت دعا کرتا ہوں۔ دنیا میں ایسا کچھ نہیں ہے جو دعا سے نہیں سکتا ہو۔“

وہ اداسی سے مسکرائی۔ تبھی فون بجا۔ نمبر دیکھا تو اس دن وہ واقعی اسے اٹپنی لگا۔ ”سوری ابا، مجھے یہ کال لینی پڑے گی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے گہری سانس بھری۔ اب وہ بات کرتی سیر ہیوں پر چڑھتی جا رہی تھی۔

”مسز زمر، میں اسی ہوٹل سے آ رہا ہوں۔“ وہ بتارہا تھا۔ تصاویر میں نیچے ایک ہورڈ نگ بورڈ نظر آ رہا ہے۔ پورے ہوٹل میں اوپر یہی صرف نوایے کرے ہیں جن سے یہاں گل بن سکتا ہے۔“

”آپ نے نوک کر دیکھے؟“

”جی۔ مگر پچھر زاسی کمرے سے لی گئی ہیں جس سے آپ پر فائر گک کی گئی۔“

”کیسے؟“ زمر نے بات کافی۔ (اف، اس کے معانی کو سورہ تو لگنے چاہیے۔) مگر بظاہر تخلی سے بولا

”دیکھیں، تصویر میں کھڑکی کے پٹ پہ ایک نشان سا ہے، کیل وغیرہ ٹھونک کر رکھا لئے کا۔ یہ نشان مجھے ان نوکروں کی کسی کھڑکی پر نہیں ملا۔ سوائے اسی کمرے کے۔ اب پینٹ کی جب سے ڈھک گیا ہے لیکن موجود ہے۔“

”یعنی ہماراڑافی کلیکٹر بھی اسی کمرے میں موجود تھا۔ تو وہ فارس کے جانے کے بعد آیا ہوگا؟“

”نہیں، وہ کافی دیر سے یہاں تھا۔“

”احمر میں بہت احسان مند ہوں گی اگر آپ ایک ہی سانس میں پوری بات بتادیں۔“ وہ اکتائی۔

(یہ ہوئے پورے ایک سوچپا س درے!)

”تصاویر میں کھڑکی کے شیشے میں جو عکس پڑ رہا ہے، اس میں میز کے اوپر گرے ایش ٹرے نظر آ رہی ہے۔ زوم کر کے دیکھا ہے میں نے۔ مگر ہوٹل کی کراکری میں تمام ایش ٹریز، اب بھی اور رب بھی، شفاف شیشے کی ہیں۔ سو گور کیا تو معلوم ہوا کہ ایش ٹرے سگریٹ کی راکھ سے بھرے ہونے کے باعث گرے لگ رہی ہے۔ یعنی ہماراڑافی کلیکٹر کافی دیر سے بیٹھا نظر کرتے ہوئے سگریٹ چھوک رہا تھا۔ چین اسموکر ہے وہ۔ اور غازی سگریٹ نہیں پیتا۔“

زمر چند لمحے خاموش رہی۔ ”یعنی وہ فارس کے ساتھ تھا؟“

”یا شاید غازی اس کے ساتھ تھا ہی نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے واقعی فریم کیا گیا ہو۔“

”اس کو بے گناہ مت سمجھیں، اس نے یہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے۔“ مگر لجا تاخت اور مضبوط نہیں تھا۔

”مجھے اس ٹرافی کلیکٹر کے بارے میں مزید کچھ ٹھوس معلوم کر کے دیں۔ آپ نہ بھی کر سکیں، تب بھی آپ کی فوٹج آپ کو دے دوں گی۔“ احر کے اندر تک خندھنی پڑ گئی۔ (چلو پچا س درے واپس لیے)

وہ فون رکھ کر آئی تو ابا کو سیم لان میں لے جا رہا تھا۔ اور فارس باہر سے آ رہا تھا۔ زمر نے جلدی سے آ کر اپنالیپ ناپ آف کیا۔ وہ سیدھا اس تک آیا۔

”آپ کا اندازہ درست تھا۔ ڈاکٹر بخاری کو سعدی کو غائب کرنے کے لیے کوئی رقم نہیں دی گئی۔“ وہ چند کاغذات اس کی طرف

بڑھاتے بولا۔ ”مگر ایک ماہ قبل کچھ فارنڈ فرز نے ہپتال کے لیے مشینی عطیہ کی ہے۔“

”سارا پیپر و رکھلین ہے۔ قانونی طور پر اب ان کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔“ وہ کاغذات الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ وہ ہلکا سامسکرا یا، ایسی مسکراہٹ جس میں شدید یتپش تھی۔

”قانون کی بات بھی کون کر رہا ہے؟ اس وقت نجح، حیوری اور جلا، فارس طہیر غازی ہے!“ سینے پر انگلی سے دستک دی، اور اوپر چڑھتا گیا۔ زمر نے بے اختیار مر کر اسے دیکھا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن ..... زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے  
ان سے دوڑاں سینڈ کر دیواروں والے کمرے میں وہ بینڈ پر پیر اور کر کے بیٹھا تھا۔ اپنے قرآن کو ہاتھ میں لئے وہ سرورق پر ہاتھ  
پھیرتا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر چہرہ اٹھایا۔ قرآن کھولا۔ پانی کے جگ کو دیکھا جو سائیڈ نیبل پر دھرا تھا۔ اس میں اپنا عکس نظر آیا۔ گردان کے نشان واضح  
تھے، باتی سب کچھ مندل ہو چکا تھا۔ اس نے گنے کی کوشش کی۔ یہ گست کے آخری دن تھے۔ اسے تین ماہ ہو چکے تھے اس قید میں۔ خیر۔ میرا وقت  
بھی آئے گا۔

نظر میری پڑی جو سامنے کا واقع پیٹھی تھی۔

”تم نے کیا کیا تھا جو سزا کاردار نے تو کری سے نکالا؟“

”روزِ روز یہ سوال مت دہرایا کرو۔“ اتنا کر میگزین لیے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ اسے اس کو باہر نکالنا تھا سواب آرام سے لے جو  
قرآن کی طرف مبذول کی۔

”میں پناہ چاتا ہوں اللہ کی وحی کارے ہوئے شیطان سے۔ شروع اللہ کے نام سے جو حُسن اور حُریم ہے۔“

اس روز وہ چیونٹی والا حصہ پورا بھی نہیں پڑھ پایا تھا، جب میانے اسے انجیکشن دیا تھا۔ پھر بعد میں صرف ناظرہ تلاوت کرتا رہا کچھ  
دن۔ کہاں تھا وہ تفسیر میں؟ مطلوب آیت ڈھونڈ کر زیرِ لب پڑھنے لگا۔

”تو (سلیمان) مسکرا دیے ہنتے ہنتے، اس (چیونٹی) کی بات پر....“ سعدی وہیں رکا۔

”مسکرا دیے ہنتے ہنتے؟ پتہ ہے کیا اللہ میں نے بہت دفعہ سوچا کہ ان الفاظ کی کیا ضرورت تھی قرآن میں؟ دیکھیں نا، یہ تو انسانہ  
کا کرتے ہیں، کرداروں کے چہرے کے تاثرات، ہنسی، غیرہ بتانا۔ قرآن میں مگر کچھ بھی ایکسٹر انہیں ہوتا۔ تو اس کی وجہ۔۔۔ خیر و جوہات تو بہت  
ی ہوں گی، مگر مجھے یہ سمجھ آیا کہ دیکھیں، یہی قصہ تورات میں یوں لکھا ہے، کہ چیونٹی کی بات سے سلیمان علیہ السلام کو غصہ آیا، انہوں نے اسے  
خن دیا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس آیت نے دوسری آسمانی کتابوں میں درج اس مسخ شدہ قصے کو گویا کینسل کر دیا، اور بتایا کہ آپ کے انبیاء کتنے  
بیمارے اور زخم دل لوگ تھے۔ نگاہ اٹھا کر اور پر دیکھا۔ ”اور دوسری بات، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کہ ”وہ ہنتے ہنتے مسکرا دیے۔“ میں نے ان دو  
الفاظ پر غور کیا تو یہ لگا کہ خالی ”وہ مسکرا دیا“، بھی کہا جا سکتا تھا۔ پھر ”ہنتے ہنتے مسکرا دیا“ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر احساس ہوا کہ غالباً اس کا  
طلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو چیونٹی کی بات نے اتنا لطف دیا تھا کہ وہ ہنتے کو تھے، مگر بسط کر کے صرف مسکرا دیے۔ انبیاء بہت مسکرانے  
اے لوگ تھے، مگر ان کے مسکرانے میں بھی میزز ہوتے تھے، گریس تھی، وقار تھا۔ وہ اونچا تقدیمہ نہیں لگاتے تھے ایسے نہیں کہ حل کا کو اونٹر آئے  
اپنے ان کے دل زندہ تھے۔ کیا کوئی ہے جو میرے انبیاء کا مقابلہ کر سکے؟، ان قدیم قصے کہانیوں کو پڑھتے ہوئے وقت کا احساس ختم ہو جاتا  
تھا۔ وہ اپنا کمرہ جن، ان تین ماہ کی اذیت، ہاشم کی باتیں، سب بھوتا جارہا تھا اور پڑھتا جارہا تھا۔

”پھر (سلیمان) اس کی بات سے ہنتے ہنتے مسکرا دیے اور کہنے لگا۔ اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں آپ کے احسان کا شکر  
کروں جو آپ نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں وہ نیک کام کروں جو آپ پسند کریں اور مجھے اپنی رحمت سے نیک بندوں

میں شامل کر لیں۔"

"ہوں اے" اس نے تھکلی ہوئی سائنس لی۔ "سو... سلیمان علیہ السلام نے انسان کا شکر کرنے کا کہا تو... اپنے ماں باپ کا ذکر کیوں کیا؟ ایک منٹ۔" حکتگر یا لے بالوں والا لڑکا ہوتا وہ اکر سچنے لگا۔ "وہ جیونتی کی ذات پر مکارے تھنات تو جیونتی کی ہو رہی تھی اور سلیمان علیہ السلام کو اپنے ماں باپ کا خیال کیوں آیا؟ شاید اس لئے کہ۔" وہ سوچنے ہوئے کہ رہا تھا۔ "یہاں باپ ہی ہوتے ہیں جو اولاد کو بیووں میں سالی یا سلیمان بناتے ہیں لہازی یا بے لہازی ہناتے ہیں، ورنہ یہا تو ہر کوئی اللہ کی فطرت پر ہوتا ہے۔ یعنی کہ... فکر کرو کر رہا تھی" تو فتنہ سے مبتا ہے۔ "تو فتنہ" بھی "دعا" سے ملتی ہے۔ مطلب کہ دنیا میں ہر چیز دعا سے ملتی ہے۔ اگر دعاوں سے یقین انہی چاہئے تو اس "یقین" کے لئے بھی دعا مانگی جاتی ہے۔ اور دیکھیں اللہ سلیمان علیہ السلام تو جیخبر تھے۔ وہ آں ریتی اتنے نیک تھے۔ بھر بھی دعا کر رہے ہیں کہ اللہ آپ مجھے نیک بندوں میں شامل کر لیں۔ اور پھر وہ نیک کام جو اللہ آپ پر سند بھی کریں۔ "مکحہ دینا موشیں بیخارا ہا۔ وہ موقع رہا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ دل میں بول رہا ہے یا زبان سے کہہ رہا ہے۔" اللہ تعالیٰ، میں اکثر دیکھتا ہوں لوگ میوزک شوز متعقد کر کے جیزینی ہٹت کرتے ہیں اب کوئی مانتے یا نہ مانتے موتیقی کی اجازت اللہ آپ نے ہمیں نہیں دے رکھی اور کسی کے نہ انتے سے حرام طال نہیں ہو جائے کا اس انسان کو نیک کام کرتے وقت سوچنا چاہیے کہ یہ اللہ کے اصولوں کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ ورنہ جیسے اللہ آپ نے کہہ رکھا ہے کہ بعض اوقات اللہ گناہ گاروں سے بھی دین کا کام کردا رہتا ہے۔ یعنی کہ اگرست یا طریقہ درست نہ ہو تو ہم بہت غل کرنے والے مگر صرف جھنکنے والے ہوں گے؟ اف امیں صرف اڑ رانے والی ہاتھیں کیوں سوچتا اور گرتا ہوں؟" بھر بھری لی۔ "شاید اس لئے کہ مجھے لگتا ہے ہر وقت لوگوں کو اور خود کو کوئی سب معاف ہو جائے گا" اور بیٹت کی جور دوں۔ کا کہہ کر سلاۓ رکھنا تھا ان دو ہوتا ہے۔ پار پار انسان کو Reality check لئے رہتا چاہے۔"

خیر... وہ اگلی آیت کی طرف بڑھا۔

"اور (سلیمان نے) پرندوں کی ماضری لی تو کہا، کیا بات ہے جو میں بد پر کوئی نہیں دیکھتا؟ کیا وہ غیر ماضر ہے؟ میں سے بخت ہر ایسا ذرع کر دوں کا یاد ہے جس سے پاس کوئی واضح دلیل لے کر آئے۔"

"تو ٹاہر ہوا اللہ کی حسن اخلاق اور چیز ہے، اور ڈیلن کے لیے بخت اصول ہانا اور چیز ہے۔ خیر... تھا جس اگلی آیت پر جما گیں۔

"بھر تھوڑی درج بعده بد حاضر ہوا اور کہا کہ میں حضور کے پاس وہ بخرا ہا ہوں جو حضور کو معلوم نہیں اور لا یا ہوں ملک سما سے یقینی خبر۔

میں نے ایک گورت کو پایا ہے جو ان پر بھر انی کرتی ہے (ملکہ سا) اور اسے ہر چیز دی گئی ہے اور اس کا برو اساتھ ہے۔ میں نے پا ہے کہ وہ اور اس کی قوم اس کے سوا سورج کو بجھدا کرتے ہیں اور شیطان نے ان کو ان کے اعمال خوبصورت کر کے دکھانے ہیں اور انہیں راستے سے روک دیا ہے۔ سو وہ درست را و پنکھی چلتے۔"

اس دلپس قصہ کو پڑھتے پڑھتے وہ ان الفاظ پر بھر جا۔

"شیطان نے ان کے اعمال ان کو خوبصورت کر کے دکھانے ہیں؟ مطلب کہ یہ مسئلہ کیا ہے شیطان کے ساتھ؟" ایک دم سے اسے بہت سارا افسوس آیا۔ "کیا انسان کو اکیلانہ میں پچھوڑ سکتا؟" میں بھری چیزیں اچھی ہا کر دکھانے تک نہیں کر سکتا؟ ہم کون سے اللہ کی مبارکات کیا کریں۔ طال کھا گئیں لوگوں سے بھلائی کریں آپ نہ شیطان کو لا ک اپ کر دیں کبھی اور... "بھلتے ہو لئے" دکا۔ اور رہمان میں بھی تو ہوتا ہے بھر بھری۔ "لگاہ اغا کراو پر بکھا۔"

"اچھا سوری یہ شیطان کو لا ک اپ والی بات و ایک لیتا ہوں میں۔ خواہ گتو اہ ایک قتل ہو گیا میں۔" سر جھک کر آیات کی طرف

شیوه‌نامه

• ٢٠١٣

## "Lungs and Heart"

"کام ہے بھر کنی ہے، اسی سی خست، دلخیز کا ناکہ کنکا، نکل کھو رہا۔ جان کی کل کل کی سد کارے  
اوے، کچھ کو ٹھہر کیا تو تھہر کا تھیں مل کر کوئی اگلی رنگ دھانوں میں ہوں۔ اب پھر کوئی  
کھانے"

بھری اس کی کہانی پڑھ کر احمد علی اگر بھی اس کا اپنے اکابر اس کا قبول کرے۔ ”بھری اس کی کہانی میں سلسلہ میں بھری اس کے عالی خدا کے کیمپ کا نئی کیا تصور کر کر۔ تاریخی راستے کیمپ، سعی نے، پیغمبر کے کھلے گھر میں بھری اس کا نئی کام سے کامیاب بھری طرف پہنچنے لگی۔

## مختصر کتاب فلسفی

三

"ٹکر نے کی خدھڑتیں ہے۔ جو سارے کی ملائیں تھیں اور وہاں پہنچا۔ لیکن یہ بے خان مچیں گئیں۔ اگر نیا مال  
کا فلم ہے تو اس کی سمجھتے ہے کے اپنے فلم ہے۔" جو اپنا اک پروڈیوسر کے ہاتھ میں ہے جو اپنے اپنے کھلا کھلا سے  
کہا جائے۔ اسی کا نام اسی کے اپنے فلم ہے۔

三

”اور کچھ؟“ سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

”اور بس اتنا کہ اس روز جو تم نے کیا، وہ بزدلانہ حرکت تھی۔ مجھے مفلوج کر دیا کیونکہ تم میرے روی ایکشن سے ڈرتے تھے۔ اتنا بھی کیا ذرنا ہاشم؟ میں تم پر تب جھپٹتا، جب مجھے تھہارے کسی لفظ کا اعتبار ہوتا۔ مگر تم جھوٹ بول رہے تھے۔ وہ تصویریں اور وہ بتیں تم نے میرا ذہن خراب کرنے کے لئے کہی تھیں۔ اس لئے میں نے ان کو پھاڑ دیا ہے، کیونکہ میری بہن نے تم سے کوئی غلط بات نہیں کی۔ وہ تم سے یو ایس بی کا ہی پوچھ رہی تھی۔ اس لئے میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔ میرے پاس آؤ، میرے سامنے بیٹھو اور میرے آنکھوں میں دیکھ کر وہ سب دھرو اور جو تم نے اس دن کہا، مگر مجھے مفلوج نہ کرو۔ پھر دیکھو میں کیا جواب دیتا ہوں۔ تمہیں اپنی آفر کا جواب چاہیے نا؟“

”سعدی! مجھے تھہاری بہن میں کوئی انٹرست نہیں۔ میرے نزدیک وہ میری بیٹی کی عمر کی ہے، لیکن جو میں نے کہا، وہ خالی حکمی نہیں تھی۔ میں کرنے پر آؤں تو کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”فون پر نہیں ہاشم۔ میرے سامنے میری آنکھوں میں دیکھ کر یہ بات کہنا۔“ اور فون میری کی طرف بڑھا دیا۔ ہاشم نے فون رکھتے ہی انٹر کام اٹھایا۔

”کچھیں اشتر سے کہو ہفتے کے روز جیٹ تیار رکھے، مجھے ملک سے باہر جانا ہے، کسی کا دماغ درست کرنا ہے۔“ اپنے پرائیویٹ جیٹ کے پانکھ کے لئے پیغام دے کر اس نے رسیور واپس ڈال دیا۔

اور اداہ سعدی کے کمرے میں کھڑی میری نے فون گارڈ کو دے کر جانے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ چلا گیا تو وہ دروازہ بند کر کے چند لمحے اس کو دیکھتی رہی۔

”دینیکلیس؟“

”کیا؟“ سعدی نے ابرواٹھائی۔

”میں نے ممز کاردار کا نیکلیس چرایا تھا۔ اسی لئے انہوں نے مجھ نو کری سے نکالا۔“ اور پھر اس کو دیکھئے بنابہر چلی گئی۔ سعدی وہیں کھڑا، گھرے سانس لیتا خود کو نارمل کرنے لگا۔ دل کا بادشاہ بننا اتنا مشکل نہیں تھا۔



کرو کچ جبیں پر کفن، میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو ..... کہ غرور عشق کا بانکپن، پس مرگ ہم نے بھلا دیا  
وہ رات گرم تھی، اور بے رحم۔ مھنٹی تھی اور منقتم۔

اس علاقے میں ویران پلاٹ تھے یا فاصلے پر عمارتیں۔ رات کے اس پھر سڑک سنسان تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اسٹریٹ لا ٹینس بھی اچانک سے آف ہو گئی تھیں۔ ایسے میں ڈاکٹر ایمن کے نو تعمیر شدہ ہسپتال کی عمارت اس وقت اندر ہی پڑی تھی۔ دروازے پتالہ لگا تھا۔ اور باہر دو گارڈ زمیثے تھے۔ وہ آپس میں اسٹریٹ لا ٹینس کی بات کر رہے تھے۔ پیڈسل فین ساتھ ہی چل رہا تھا۔ ایک گارڈ جمالی لیتے ہوئے منہ پہاڑھر کھی رہا تھا کہ دفعنا اس کے کندھے میں کوئی شے آ کر چھپی۔

چھپن شدید تھی، پھر ہلکی ہوتی گئی۔ جسم کسی خالی بادل کی مانند ہو رہا تھا۔ گردن اور کندھے کے درمیان کوئی سرخی چھپی پڑی ہے۔ سنکھیوں سے اسے نظر آیا کہ ساتھ والا گارڈ کری سے نیچے گرتا جا رہا تھا۔ اس کا اپنا جسم بھی ڈھلک رہا تھا۔ اور اسی ڈھلکی گردن سے اس نے دیکھا۔ دو جو گرز والے پیراں کے سامنے آر کے تھے۔ جو گرز سے اوپر جیز نظر آئی، اس سے اوپر نہ دیکھ سکا اور غنوڈی میں ڈوستا گیا۔ جیز کے اوپر اس نے سیاہ شرٹ پہن رکھی تھی جس کے آٹین کلائی سے بالشت بھر پیچھے ختم ہو جاتے تھے۔ نگاہ اوپر اٹھا تو اس کا چہرہ نظر آتا تھا جو اس وقت پتھر یا ساتھا۔ چھپنے کے باں اور ہلکی بڑھی شیوں۔ آنکھوں میں سرد پیش تھی۔ اور پہلو میں گرے ہاتھ میں پستول تھی۔

اندھیرے میں بھی فارس غازی کی ٹھنڈی آنکھوں میں چھین نظر آتی تھی۔

(”ڈاکٹر ایمن میرے ساتھ دہرا یے۔ میں اللہ کو حاضر ناضر جان کر حلف اٹھاتی ہوں کہ جو کہوں گی مجھ کہوں گی، مجھ کے سوا کچھ نہیں ہوں گی۔“ تین سال پہلے وہ سفید کرتے میں مبسوں ڈیفنس کی کرسی پر بیٹھا، سلگتی ہوئی نظروں سے کثیرے کو دیکھ رہا تھا جہاں کھڑی ڈاکٹر ان سے حلف لیا جا رہا تھا۔

”میں اللہ کو حاضر ناضر جان کر کہتی ہوں کہ جو کہوں گی مجھ کہوں گی، اور مجھ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔“

”اور عدالت سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔“

”اور عدالت سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔“)

فارس نے پستول بچھلی جیب میں اڑسا۔ جھکا۔ دونوں گارڈز کی گردنوں سے ٹرینکولا تزرڈ ارٹس darts نکال کر کندھے پر لٹکے ہک میں ڈالے۔ پھر ایک کوندھوں سے گھسیتا ہوا سڑک کے اس پارے جانے لگا جہاں جھاڑیاں تھیں۔

(”کیا آپ اس شخص کو پہچانتی ہیں ڈاکٹر ایمن؟“)

”جی۔ یہ وارث غازی کی تصویر ہے۔ وہ میرا پیشہ تھا۔ تین ماہ تک وہ میرے پاس آتا رہا تھا۔“

”آپ جانتی ہے مجھ نے آپ کو ڈاکٹر پیشہ privilege توڑ نے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے آپ وارث غازی کے سیشنر کی نیچر عدالت کو مطلع کریں۔“)

اب دونوں بے سدھ ہوئے گارڈز و جھاڑیوں میں اوندھے پڑے تھے۔ اور وہ کندھے پر بیگ لٹکائے، واپس ہسپتال کی عمارت پر ٹھنڈا جا رہا تھا۔ اب ایک ہاتھ میں چھوٹا کھڑا ابھی نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے سامنے وہ رکا، اور زور سے کھڑا اتالے پر مارا۔ تالہ ٹوٹا۔ اس نے بوکر سے دروازے کو ٹوکر ماری۔ دروازہ اڑتا ہوا دوسروی طرف جالا۔ وہ اندر داخل ہوا۔

(”وارث پریشان تھا۔ اور گلٹی بھی۔ اس نے بتایا، اور یہ سب میرے نوش میں بھی لکھا ہے جو میں نے عدالت کے حوالے کیے ہیں، اور وہ اپنے بھائی فارس کی بیوی کو پسند کرتا تھا اور اس کے ساتھ تعلقات تھے۔“ کثیرے میں کھڑی عورت سکون سے کہہ رہی تھی اور اس نے بیٹھا سفید کرتے والا غازی، اس کو انہی چھتی نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخی آرہی تھی اور مٹھی بھنگی ہوئی تھی۔ ”اس نے کہا اس دفع میں ایک راضی نہیں تھی سب زبردست ہوا، مگر اب وہ بھی مکمل طور پر ان لوڑ ہو چکی تھی۔ وہ بہت گلٹی تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے بھائی کو اس نے سوچ بورڈ پر ہاتھ مارا۔ بتیاں روشن ہونے لگیں۔ اندر سے ہسپتال ٹائلر کے فرش اور سفید دیواروں سے جگہا رہا تھا۔ قیمتی اب، بہترین مشینری۔ بس دو مہینے بعد وہ افتتاح کے لیے تیار تھا۔ وہ بتیاں جلاتا، آگے بڑھتا گیا۔ آنکھوں میں سردی ٹھنڈی لئے... وہ ایک لمرے کو دیکھتا جا رہا تھا۔

(”اپنی موت سے دو دن قبل وہ میرے پاس آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بھائی کو اس کے افسیر کا علم ہو گیا ہے اور وہ اس سے چھپتا ہے۔ اسی لئے وہ گھر نہیں جا رہا۔ بلکہ ہائیل میں رہ رہا ہے۔ وہ تنہائی میں فارس سے ملنے سے گھربانے لگا ہے۔“)

فارس قدم قدم چلتا آگے بڑھ رہا تھا۔ تین سال پہلے کے عدالتی کمرے کی ساری کارروائی اس کے چہرے پر اترے سرد پین کے ہاتھ میں پہنچا تھی۔

(”جی ہاں، فارس غازی کے لئے بھی کورٹ نے مجھے اپوانش کیا تھا۔ میں بچھلے آٹھ ماہ سے فارس کا علاج کر رہی ہوں۔ اپنے اپنے یوچ توڑتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ کافیڈ پیشہ میں سے ایک اگر Consent ہے تو وہ میرا مریض مجھے

نہیں دے گا۔ ”نظر وں کا رخ فارس کی طرف موڑا۔ وہ انہی سرخ گلابی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔“ دوسرا سی کورٹ آرڈر ہے مگر میرے زدیک اس سے زیادہ اہم Continued treatment کے لئے یہ بہتر ہے کہ میں یہ سب کورٹ کوتاؤں۔ آئی ایک سوری فارس!“)

وہ وسط کمرے میں آ کھڑا ہوا۔ بیکھوا، اور اندر سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکلا۔ پہلے صفحے پر چند الفاظ نظر آئے۔ سرکار بنام فارس غازی۔ پی ڈبلیو (پر اسکی یونیٹ witness)، ڈاکٹر ایمکن کی گواہی۔ وہ انہی سردا آنکھوں میں آنچ لئے اس پلندے کو دیکھ رہا تھا۔ (”ٹرینٹ کے دوران فارس نے مجھے بتایا کہ اسے پہلے دن سے اپنی بیوی کی حرکتیں پسند نہیں تھیں۔ وہ امپھور اور پچگانہ سی تھی۔ مگر وہ اس کو چانس پر چانس دینے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے اپنی بیوی کو اپنے بھائی کے ساتھ دیکھ لیا۔ اس کی غیرت کے لئے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ وہ دونوں سو نہیں سکا۔ کسی کو بتانیں سکا۔ وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔“)

”کیا آپ نے اس سے یہ اعتراض کروانے کے لئے کبھی کوئی ڈرگ استعمال کی؟“  
”نہیں۔ میں نے کبھی اس کو کوئی سائیکلوکیشوڑ رگ نہیں دی۔“

اس نے بیگ سے ایک چھوٹی استری نکالی۔ کاغذوں کا پلندہ میز پر رکھا اور استری کا لوہا کاغذوں کے اوپر لایا۔ پلک لگا کر سوچ آن کیا۔ پھر کلہڑا اٹھایا۔

(”اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ان دونوں قتل کردے مگر وہ پکڑنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ یہ آز کلگن نہ لگے۔ فارس غازی نے 2 نومبر اور اٹھائیں جنوری والے سیشن میں اعتراف کیا تھا کہ اس نے یہ دونوں قتل کیے ہیں، اور اسے ان پر بہت افسوس ہے۔ آپ میرے نوٹس چیک کر سکتے ہیں۔ آڈیو شیپ کی اجازت اس نے مجھے نہیں دی تھی۔ اب میں یہ سب اس لئے کورٹ کو بتارہی ہوں کیونکہ اگر آپ نے فارس کو حضانت پر رہا کیا تو وہ خود کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مجھے اپنے پیشہ کی فکر ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی اور جرم میں ملوث ہو کر چند دن بعد پھر جیل میں بند ہو۔ اس لئے ابھی کچھ ماہ تک اسے کشدہ میں رکھنا ضروری ہے۔“)  
وہ دیوار تک آیا، چند لمحے اپنی سردا آنکھوں سے دیوار پر لگ گئی۔ پاپ کو دیکھا رہا، پھر پوری قوت سے کلہڑا اس پر مارا۔ پاپ چیرا گیا۔ سس کی آواز سے گیس لیک ہونے لگی۔

فارس طہیر غازی نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور اہدواری کی طرف چلتا گیا۔ استری تلنے کے کاغذ در میان سے ہلکے ہلکے بھورے ہونے لگے تھے۔ وہ دروازے سے باہر نکل آیا، اور اسے بند کر دیا۔ ایک نظر اٹھا کر اس دو منزلہ خوبصورت عمارت کو دیکھا۔ (”مجھے معلوم ہے تم مجھے سے خفا ہو گے۔“) ساعت ختم ہونے کے بعد وہ اس کی کرسی کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سرخ آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ مٹھی زور سے بھیج رکھی تھی۔ ”مگر مجھے تمہاری فکر ہے، تم تھیک نہیں ہو۔ اگر باہر جاؤ گے تو خود کو نقصان دو گے۔“ فارس نے سرخ آنکھیں اٹھا کر سے دیکھا۔

”یہ مت سمجھنا کہ میں نے جھوٹ بولा ہے۔ تم نے یہ سب اس دن مجھے بتایا تھا، جب میں نے تمہیں ٹروٹھ سیرم دیا تھا۔ تمہیں یاد نہیں ہو گا، مگر میں کورٹ میں یہ کہنے پر مجبور تھی۔ مجھے نوٹس پر نوٹس آرے تھے۔ پھر میں نے جو بھی کیا، تمہیں پر ڈیکٹ کرنے کے لئے کیا۔“ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھیک۔ آنکھی کے اندر کچھ نوکیلا سا چھجا۔ ”تم ایک دن دوبارہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ آؤ گے۔ چند سال کی ہی توبات ہے!“ اب وہ جارہی تھی۔ سفید کرتے والے شخص نے سرخ آنکھوں کا رخ موز کر اسے جاتے دیکھا۔

”مجھے اس دن کا انتظار ہے ڈاکٹر!“ وہ بڑا یا تھا۔

ہستیاں کی عمارت اسی طرح اندر ہیر کھڑی تھی اور فارس غازی اب اس سے دور چلتا آ رہا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کندھے پر بیک

امحانے وہ مطمئن سے قدم اٹھا رہا تھا۔ سی منظر میں کھڑی تاریک عمارت دور ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دم... رات میں روشنی ہوئی۔ عمارت کے اندر دھماکہ سا ہوا۔ سنہری آگ کے شعلے کھڑکیوں سے باہر لپکنے لگے۔ دروازے جل رہے تھے۔ آگ کے ہاتھ انگلیاں پھیلائے آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پلاں ہے تھے۔ اور وہ جیزیر کی جیبوں میں ہاتھڈا لے چلتا جا رہا تھا۔

❖❖❖

اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تھا لیے دل کو ..... اک زمانے میں مراج ان کا سر عرش بریں تھا آسمان پر سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہسپتال کی عمارت کو لئے کی طرح سیاہ پڑی تھی، دھوئیں کے بادل ابھی تک اوپر اٹھ رہے تھے۔ اردوگروں تھا۔ فائر بریگیڈ رپورٹر کے کیسے۔ پولیس۔ ایک جگہ وہ دونوں گارڈز کھڑے ایک پولیس افسر سے بات کر رہے تھے۔ فاصلے پر ایک پولیس موبائل کے ساتھ ایس پی سرہدا شاہ کھڑا تھا۔ تو قیر بخاری کوں رہا تھا۔ جو پاگلوں کی طرح غرار ہے تھے۔

”تم لوگوں نے میری برسوں کی محنت بردا کر دی۔ اپنے بچوں کی طرح خیال کیا تھا اس عمارت کا میں نے۔“

”ڈاکٹر صاحب آرام سے میں نے کہا، ہم تقیش کر رہے ہیں۔“

”خاک تقیش کرو گے تم؟ کل تم نے مجھے فون پر کہا تھا کہ اوپر والے کہہ رہے ہیں، اگر پھر کوئی مطالبہ کیا تو جو ہے وہ بھی نہیں رہے گا، اور آج میرا ہسپتال جلا ڈالا گیا۔ اندھا ہوں میں؟ بچے ہوں میں؟“ آستین سے کف رگڑتے پسینے سے تپھرے اور سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتے دبادبا سا چلائے تھے۔ ”تم سب بھگتو گے۔ وہ... نیاز بیگ کا جھائی اور تم... تم سب ملے ہوئے ہو۔“

”میں بڑا لحاظ کر رہا ہوں آپ کا۔ محنت نہ محنت۔ یہ جگہ ہم نے آپ کو دی تھی۔ آدمی سے زیادہ مشینیں ہم نے آپ کو دی تھیں۔“

ناگواری سے نوکا۔

”میں نے اپنی ساری جمع پوچھی کنسٹرکشن پر لگائی، میرے اوپر فرضہ ہے مجھے نگاہ کر دیا تم لوگوں نے۔“ وہ بال نوچ رہے تھے۔ واقعی بال نوچ رہے تھے۔

قدرے فاصلے پر کار آرکی اور تیزی سے دروازہ کھوں کر ڈاکٹر ایکن باہر نکلی۔ ادھرا دھر دیکھتی، قدم بڑھائے تو سامنے عمارت نظر آئی۔ وہ زنجیر پا ہوئی۔ برف ہوئی۔ نمک کا مجسہ ہوئی! اس کی آنکھیں اس کو لئے کی ہوئی عمارت پر جا ٹھہریں، لب ہلکے سے کھل گئے... اور دل... دل خالی ہو گیا۔ بے اختیار اس نے کار کے دروازے کا سہارا لیا۔

سب جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

بانا پلک جھکے، وہ اس عمارت کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کار گنگ پیلاز رد ہو رہا تھا، اور کانوں کے ہیرے ویسے ہی جگہ گار ہے تھے۔

❖❖❖

کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مدد مقابل تو بتاؤ..... وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تیئن تھا اس شام ڈاکٹر ایکن بہت تحکی تحکی نہ حال سی اپنے لاونچ میں اندر ہیرا کیے بیٹھی تھی۔ گھر خالی تھا۔ بچوں کو نافی کی طرف بھیج دیا تھا اور ڈاکٹر تو قیر تھانے گئے ہوئے تھے۔ وہ پیرا اور پر کیئے یک نیک بیٹھی خلا میں دیکھ رہی تھی۔ پھر یکا یک کھٹکا سا ہوا۔ وہ چوکی۔ ٹھک ٹھک ٹھک۔ مدھم سی بیٹ۔ وہ ستر روی سے اٹھی اور اہد اری کی طرف آئی۔ اندر ہیر گھر میں ادھرا دھر چلتی اپنی اسٹڈی کے دہانے پر آرکی۔ دروازہ دھکیلنا۔ اندر گھپ اندر ہر اتھا۔ صرف کھڑکی سے نیکوں روشنی آتی تھی۔ وہ جانے لگی، تبھی یک دم رکی۔

میز کے پیچے، کنٹرول چیز پر کوئی بیٹھا تھا۔ اس کا سارا وجود اندر ہیرے میں تھا۔ صرف ایک ہاتھ نظر آ رہا تھا جس سے وہ میز پر ایک پین کو ”ٹھک ٹھک“ بجا رہا تھا۔

”پنجاب پر زن کے چار سی ہوتے ہیں۔ کنسروں، کسٹڈی، کیسر اور کریکشن۔“ تاریکی میں بھی وہ اس کی آوازن لکھتی تھی۔ وہ بت بن گئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔  
”کافیڈ پیشہ کے پانچ سی ہوتے ہیں، جن کے تحت پر یوچ توڑا جاسکتا ہے۔ آپ کو یہ نو کے نو ۵ یاد رہے۔ مگر مجھے صرف ایک C کا علم ہے۔“

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگئی۔ پلکیں جھپک کر اندر ہیرے میں آنکھوں کو عادی کیا، تو منظر واضح ہوا۔  
”اور وہ C ہے۔ کاربن۔“ وہ آگے ہوا۔ نیلی روشنی میں فارس کا چہرہ واضح ہوا۔ اس پر سردی مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں تپش تھی۔ وہ آگ اور برف ایک ساتھ دیکھ رہی تھی۔

”وہ کاربن نہیں جو آپ کے کانوں میں ہیں۔“ انگلی سے ڈاکٹر ایمن کے کانوں کی طرف اشارہ کیا جن میں جگگاٹے ہوئے دنیا کے سخت ترین کاربن تھے۔ ”بلکہ ایک ہائیڈروکاربن۔ وہ سی جو آپ کو بھول گیا تھا۔ CH4“  
ڈاکٹر ایمن کا سانس حلق میں انک گیا۔ ”میتھین؟ نیچرل گیس۔“ وہ شل رہ گئی۔ ”تم نے... تم نے آگ لگائی ہے میرے ہستال میں۔ ہے نا؟ تم نے کیا نای سب؟“ اس کا سارا خون سست کر چہرے میں آیا۔ وہ ایک دم آگے آئی۔  
”کیوں کیا تم نے ایسا؟ وہ میرے برسوں کی محنت تھی۔ وہ میری پوری زندگی تھا۔“ وہ دبادبا سا چلائی تھی۔ ”ہمارے اوپر قرضہ ہے۔ اسے کیسے اتاروں گی میں؟ میں تباہ ہو گئی ہوں فارس غازی!“

”گڑا!“ اس نے سر کو خم دیا۔ ایکن کی آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔

”تم... تم نے مجھ سے بدلہ لیا۔ پر یوچ توڑ نے کا۔ پر جری کا۔ ہاں بولا تھا میں نے جھوٹ۔ اور اب تم دیکھو میں تھہارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔“ میز پر دونوں ہاتھ رکھے، جھکی کھڑی وہ زخمی ناگن کی طرح پھنکا رہی تھی۔ ”میں ابھی کے ابھی پوپیس بلارہی ہوں۔ تو تو قیراے ایس پی، میں سب کو بتاؤں گی کہ تم نے کیا ہے یہ سب۔ کاؤنٹ آف مونٹے کر سٹوواپس آگیا ہے اور وہ ایک ایک سے بدلہ لے رہا ہے۔ اور میں...“ اس کا سانس بھر رہا تھا۔ ”میں میڈیا پیسی سب بتاؤں گی۔ تھہاری بیوی اور تھہارے بھائی کے انہر کی ایک ایک تفصیل بتاؤں گی۔“  
”نہیں، آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔“ آواز پر وہ چوٹی۔ کھڑکی کے پردے کے ساتھ کھڑی لڑکی آگے چلتی آئی اور فارس کی کرسی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ وہ ایک انگلی سے مسلسل اپنی گھنگریاں لفت لپیٹ رہی تھی اور اس کا چہرہ نیلی چاندنی میں دمک رہا تھا۔  
ڈاکٹر ایمن ہاتھ ہٹا کر سیدھی ہوئی۔ شر بار نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا۔ فارس اب پیچھے کوٹک لگائے بیٹھا، مسلسل پین سے میرکی سطح پر ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔

”یہ تم دونوں کی بھول ہے کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“

فارس نے قلم رکھا اور میز پر افوٹو فریم اٹھا کر سامنے کیا جس میں ایمن، تو قیر اور ان کے تین بیچے مسکرا رہے تھے۔ ”آپ کا برا بیٹا بہت پیارا ہے ڈاکٹر!“

ڈاکٹر ایمن نے استہزا سے ”اوہ“ کر کے سینے پر بازو لپیٹے۔ ”اچھا تو تم میرے بیٹے کو مارنے کی دھمکی دے رہے ہو؟ ہونہے۔“ تم نہیں کر سکتے۔ You Don't have it in you۔

ڈاکٹر کی طرف موڑا۔ ”کوئی کسی کو قتل کرنے نہیں جا رہا ڈاکٹر ایمن۔“ سکون سے بولی۔ ”مگر مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے ڈرائیگ روم میں دوسرا دلنس کیسرے لگے ہیں۔“

ڈاکٹر ایمن نے بیانیں بھرے غصے سے انہیں دیکھا۔ ”تم لوگوں نے میرے گھر میں کمرے لگائے ہیں؟ اچھا، تو کیا ریکارڈ کیا تم نے؟ اسے ایسیں پی او رہماری بتاتیں؟ ہونہے۔ ہم ایسی ملاقاتیں گھر پہنچیں کرتے۔“

”ہم یہی ریکارڈ کرنا چاہتے تھے لیکن، ہم نے کچھ زیادہ دلچسپ ریکارڈ کیا ہے۔“ کہتے ہوئے ذمہ نے اپنے اسماڑ فون کی اسکرین روشن کی۔ نیم انڈھیر کمرے میں روشنی چکی۔ اسکرین اس کے سامنے لا لی۔ ایمن کی آنکھیں اس پر چھکیں۔

”یہ آپ کی اور آپ کے بھنوئی کی ایک گفتگو ہے۔“ اس نے پہنچیں کیا، صرف امثل امیج نظر آرہا تھا مگر ڈاکٹر ایمن کا چہرہ ایک دم سفید پر نے لگا۔ اس نے بیانیں سے ذمہ کو دیکھا۔ کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا۔

”جیسا کہ میرے ہر بیٹے نے کہا، آپ کا بڑا بیٹا بہت پیارا ہے، مگر وہ صرف آپ کا بیٹا ہے۔ ڈاکٹر تو قیر کا نہیں۔“ اسکرین سامنے لہرائی۔ ”اس کا باپ آپ کی بہن کا شوہر ہے۔ وہ ڈاکٹر تو قیر کو تو علم نہیں ہے نا اس بات کا؟“

ڈاکٹر ایمن کری کی پشت پکڑے پکڑے بھکی۔ چند گھرے سانس لئے۔ پھر سامنے بیٹھی۔ اس کا چہرہ وہ نہیں تھا جس کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

فارس دونوں ہاتھ باہم ملائے، میز پر آگے کو ہوا۔ اس کی نیم مردہ آنکھوں میں دیکھا۔ ”قدرت کا ایک اصول ہے، کہ جب کوئی کسی پر ایسا ازالہ لگاتا ہے جو اس نے کیا ہو یا ترک کر چکا ہو تو مرنے سے پہلے وہ خود اس میں ضرور ملوث ہو جاتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں جھاکتے فارس کی

نظر وہ میں تپش ابھری۔ ”تم نے میری بیوی پر بھری کپھری میں ازالہ لگایا، تم نے میرے بھائی پر ازالہ لگایا۔“

چند لمحے تک ایمن کچھ بول نہ پائی۔ آنکھوں میں آنسو گئے۔ ”کیا تم یہ سب بھول نہیں سکتے تھے؟ رہا ہو گئے، شادی کر لی، سیل ہو گئے۔ کیا تم... تم معاف نہیں کر سکتے تھے؟“

”تم لوگوں نے معافی مانگی کب تھی؟ تم لوگوں نے میرے بھانجے کے ساتھ بھی وہی کیا جو میرے ساتھ کیا۔ لیکن اب کم از کم تم ایک لبے عرصے تک کسی کے ساتھ دوبارہ نہیں کر سکو گی۔“ دوبارہ بیک لگائی۔ آنکھیں سکیر کر اسی تپش سے دیکھا۔ ”اور اب... محترم آپ وہی کریں گی جو ہم آپ کو بتائیں گے۔“

”جی ڈاکٹر ایمن، اور ہم میں اور آپ میں یہی فرق ہے۔ وہ بھی خشک سا کہری تھی۔“ ہم چاہیں تو آپ کے شوہر کو بتا دیں۔ آپ کا میکہ بھی چھوٹے گا، سرال بھی۔ شوہر اور دو بچے تو جائیں گے ہی۔ مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کی ذاتی زندگی خراب نہیں کریں گے۔ تب تک جب تک آپ ہمارے کیے پہل کرتی رہیں گی۔“

اس کے آنسو بہرہ ہے تھے اور وہ بے بُسی سے انگلیاں مردوڑی ذمہ کوں رہی تھی۔

”آپ ہر ایک کو یقین دلائیں گی کہ اس واقعے میں علیم بیگ کا ہاتھ ہے، یہ بھی بتائیں گی کہ وہ آپ کو فون پر ڈھکیاں دیتا رہا ہے۔“ آپ کو پتہ ہے آپ کو کیا کرنا ہے۔ ڈاکٹر ایمن نے بھیگے چہرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور اب!“ وہ اسی سمجھدگی سے بولا۔ ”اب آپ بتائیے، سعدی یوسف کے بارے میں۔ ہر وہ چیز جو اس رات ہوئی۔ زیادہ پس و پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ دیکھو چکی ہیں میں کیا کر سکتا ہوں۔“

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ پھر اس نے چہرہ اٹھایا۔ وہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”وعدہ کرو تم کبھی تو قیر کو نہیں بتاؤ گے، میرے اور کامران کے درمیان اب کچھ نہیں ہے، وہ ایک پرانی بات تھی۔ تو قیر کوئی سے بہت بت ہے، پلیز تم...“

”ڈاکٹر ایمن اگر آپ کے منہ سے نکلنے والے اگلے الفاظ میرے جواب کے علاوہ ہوئے تو میں اسی وقت یہ ویڈیوڈاکٹر تو قیر کو فار ورڈ کر دوں گا۔“

”اوے کے اوے!“ اس نے ہتھیلی سے آنسو رکھتے ہاتھ اٹھائے۔ ”اس رات تو قیر کو اے ایس پی کافون آیا، اس نے کہا کہ ایک لڑکا غائب کرنا ہے جب اس کی حالت خطرے سے باہر...“

”یہ سب مجھے پتہ ہے۔ یہ بتائیں، اے ایس پی کے علاوہ کون شامل تھا اس میں؟“  
وہ لمحہ بھر کو خاموش رہی۔ ”ہمارا رابطہ صرف اے ایس پی سے تھا، مگر.... اے ایس پی اسی شخص سے ہدایات لیتا تھا جس سے تمہارے کیس میں لیتا آیا تھا۔“ رک کر اس کو دیکھا۔ ”تمہارا جج، جسٹس سکندر۔“

”مجھے پتہ ہے نج بکا ہوا تھا اور...“

”تمہیں غلط پتہ ہے۔ نج بکا ہوا نہیں تھا۔ نج خریدار تھا۔“

زمر اور فارس نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

”وہ نج ہمارے یانی ایک کی طرح ایک مہرہ نہیں تھا۔ وہ اسی جنم میں برابر کا حصہ دار تھا جس کو چھپا نے کے لئے یہ سب ہوا تھا۔ اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتی۔ پلیز اب بیہاں سے جاؤ۔“ کرب سے کہتے اس نے منہ پھیر لیا۔

وہ اٹھا اور گھوم کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ زمر بھی پیچھے گئی، تب ایمن بولی۔

”آئی ایم سوری، جو میں نے کیا تمہارے ساتھ۔“ فارس نے مڑ کر ایک نظر اس پر ڈالی۔

”نہیں، آپ کو قطعاً کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ دس منٹ پہلے تک آپ وہ سب دوہر اندا جا ہتی تھیں۔“

اس نے گردن موڑ کر بھیگے چہرے سے فارس کو دیکھا۔ ”تب میں غصے میں تھی۔“

”اور اب آپ صرف خوفزدہ ہیں۔“ مدھم مگر مضبوط آواز میں بولا۔ ”کم از کم چار سال لگیں گے آپ کو اپنا قرضہ اتارنے اور دو باہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے۔ اور آپ جانیں گی کہ ہر پل اپنی زندگی تباہ ہو جانے کا خوف کیا ہوتا ہے، خوف کی قید کیسی ہوتی ہے، وہ فیلینگ کیسی ہوتی ہے جب آپ اپنی صفائی بھی نہ دے سکیں؛ جب آپ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگیں۔ مگر ڈونٹ وری ڈاکٹر، آپ ایک دن نارمل ہو جائیں گی۔ چند سال کی ہی توبات ہے۔“ ہلاکا سڑاڈاکٹر ایمن کا کندھا تھپکا اور اور تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔

..... ♦♦♦ ♦♦♦ .....

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو ..... میں ایک دریا کے پار اترات تو میں نے دیکھا  
وہ ریشورات کے سامنے کار میں بیٹھے تھے اور دونوں کے درمیان خاموشی چھائی تھی۔ زمر تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے دو دن لگا تار تماں فیڈز دیکھی تھیں؛ اور قست سے اس کو مطلوبہ شے مل گئی تھی۔ مگر اب تھک پچھی تھی۔ کچھ ذہن بھی الجھا تھا۔ فارس کے فقرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ (گناہ کا لوگ اپنی بے گناہی پر اعتماد تو نہیں ہوتے.... اف زمر، بس کر دو، اس کے حق میں کوئی صفائی نہیں۔) کراہ کر اسے دیکھا تو وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہلاکا سماں سکرایا۔

”گذایونگ سمز زمر! میرا نام فارس طمیر غازی ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

اور وہ تھکی تھکی ہی ہلاکا سماں سکرائی۔ ”مجھے بھی۔“ پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

”میں نے جھوٹ بولا تھا آئی ایم سوری۔“ باہر دیکھتے ہوئے وہ بولی تو وہ چونکا۔

”تمہارے لئے نہیں بتا رہی، اس لئے بتا رہی ہوں کیونکہ میں نے غلط کیا۔ تمہاری بیوی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ آخری وقت تک

تمہارے لئے پوزیسیون ہے۔ ”کچھ دیر باہر دیکھتی رہی جو اب نہیں آیا تو آنکھوں کا ر斧 اس کی طرف پھیرا۔

اس نے جیسے گہر انسان لیا تھا۔ پھر سر جھکا۔ کم از کم زمر سے اب وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ”کچھ کھائیں گی؟“ ”ہوں!“ گردن ہلا دی اور سریت سے نکال دی۔ آنکھیں بند کر دیں۔ وہ اندر چلا گیا۔

باہر پھولوں کے اشال پر ڈوٹی شام کے اندر ہیرے میں بیٹھا گل خان چھڑی سے فٹ پاٹھ پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے فارس کو باہر جاتے دیکھا، اس کی آنکھیں چمکیں۔ دوڑ کر زمر کی کھڑی تک آیا۔ وہ آنکھیں بند کیے پیٹھی تھی۔ اس نے شیشہ بجا یا۔ زر چونکر سیدھی ہوئی۔ پھر شیشہ نیچے کیا۔

”زمر بایجی۔“ وہ چکا ”ہم کو تمہیں کچھ دینا تھا۔“ بے چینی سے دیکھا، اندر فارس کا انتہ پر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ پھر جیب سے سیاہ ہیرے والا کی چین نکال کر دونوں ہاتھوں سے اس کی طرف بڑھایا۔ زمر کی آنکھوں میں تحریر بھرا۔

”تھمہیں کہاں سے....“

”بعد میں بتائے گا، جب یہ تمہارا بندہ نہیں ہو گا سامنے۔ کل رات سعدی بھائی کو خواب میں دیکھا۔ بھائی بہت خفا تھا میں سے۔“ وہ اپن آتا نظر آ رہا تھا، گل خان کا منہ کڑوا ہوا وہ پلٹ گیا۔ زمر نے بے اختیار شکریہ پکارا۔ پھر کی چین کو دیکھا۔ اس میں ایک سلوپین بھی نہ تھی تھا۔ اس نے پین کھولا۔ اندر یوالمیں بی پلٹ تھا۔ فارس قریب آ رہا تھا، اس نے جلدی سے اسے پرس میں رکھ دیا۔

جب وہ گھر آئی اور کھانے کے شاپر ز صداقت کو پکڑائے تو حنین اور سیم لا دخ میں بیٹھے تھے۔ سیم فوراً اٹھا۔ ”پھپھوٹھے کہہ رہی ہے میری بر تھڈے سلیمی بیٹ کریں گے ہم۔“ وہ مسکر دی۔ اس کا گال تھپٹھپایا۔

”کیا ہاشم کا کوئی نیکست آیا؟“

حنین نے ادا سی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اوکے، اب سیم کی بر تھڈے کے لئے انوائی کرنے ہم دونوں اس کے پاس جائیں گے، اور جیسا ہم نے ڈیسا مذکور کیا تھا، وہی کریں گے۔“

”آپ تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ چلو۔“ بال جوڑے میں لپٹتے ہوئے وہ سیرھیاں اتر رہی تھی۔ فارس نے دیکھا تو پوچھا۔ ”کہہ؟ صداقت کھانا اکارہ ہے۔“

”بس پانچ منٹ میں آتے ہیں۔ مسز کاردار سے کام تھا۔ حنہ میرے ساتھ آؤ۔“ اور حنین سر جھکائے، نظر ملائے بغیر اس کے ساتھ اہ آگئی۔

کچھ دیر بعد وہ ہاشم کے سامنے اس کے لام میں پیٹھی تھیں۔ ہاشم نے اپنی بیماری کا بتایا البتہ اب وہ فریش لگ رہا تھا۔

”سوری ہاشم ہمیں نہیں معلوم ہو سکا کہ آپ بیمار تھے۔“ زمر نے کہہ کر حنہ کو دیکھا۔ تو وہ بظاہر مسکرا کر بولی۔ ”تھمی آپ نے اتنے دن تے مجھے نیکست نہیں کیا، ہاشم بھائی۔“

اور وہ جو مسکرا کر کچھ کہنے جا رہا تھا، چونکا۔ زمر کو دیکھا اور پھر حنہ کو۔

”ہاں میں بس آرام کرتا رہا۔“ البتہ وہ قدرے غیر آرام دہ ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ لگا تھا کہ یہ ایک چھپی ہوئی جیٹ ہے، مگر زمر والق ف

تھی؟ منظر نامہ بدلنے لگا تھا۔

”ای لئے میں نے حمد سے کہا کہ ان کی خیریت پوچھتے ہیں، ورنہ تمہیں یا سعدی کو وہ جواب نہ دیں، یہ ناممکن ہے۔“ وہ مسکراتی۔ ہاشم

جرما مسکرا یا۔

”اچھا ہشم بھائی، پھر آپ کل آ رہے ہیں نا سیم کی سالگرد ہے؟“ خین کے دل میں اذیت، ہی اذیت تھی مگر وہ زمر کی ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور تھی۔ (ہمیں اس کو یقین دلانا ہے کہ یہ کوئی چھپا ہوا فخر نہیں ہے، بلکہ سب اس سے واقف ہیں، تاکہ وہ کبھی زندگی میں تمہیں یا فارس کو بیک میل نہ کر سکے، حمد!)

”کل میرا ایک ڈنر ہے، مجھے وہ کینسل کرنا پڑے گا۔“

”تو بس آپ ڈنر کینسل کریں۔“ زمر سان سے بولی۔ وہ دونوں بہت اپنائیت سے اصرار کر کر ہی تھیں۔ منظر نامہ واقعی بدلتا رہا تھا۔ (خین نے زمر کو بتا رکھا ہے؟ تو فارس؟ اورہ پلیز نہیں!)

”اوکے!“ اسے پورا منظر نامہ جانتا تھا۔ سو مسکرا یا۔ ”میں کرتا ہوں۔“ کال ملا کر موبائل کان سے لگایا۔

”کل کے ڈنر کی ریزرویشن کروادی ہے؟ چلو یہ اچھا ہو گیا۔ ہاں اسے پرسوں پر رکھ دو۔ کل میری فیبلی میں ایک ڈنر ہے۔ اور کے تھینک یہ حلیمه!“ موبائل رکھ کر مسکرا کر انہیں دیکھا۔ ”چلیں شکر ہے حلیمه نے ابھی انویشیشن کال نہیں کی تھی۔“ وہ بالکل بے خبر کہے جا رہا تھا۔ اور سامنے بیٹھی خین کی ناگلوں سے جان نکلنے لگی۔ زمر کی رنگت زرد پڑنے لگی۔ وہ دونوں یک نک ہاشم کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر زمر ذرا سنبھل کر مسکراتی۔

”یہ کون تھی؟ آپ کی کسی ڈائیٹ کو تو ہم نے خراب نہیں کر دیا؟“

”ارے نہیں یہ حلیمه تھی، میری بیکر ٹری۔“ نہس کر سر جھکتا۔

اور اگر پیچھے مرکر کیکھو اور سوچو کو وہ کون سالجھ تھا، وہ ایک لمحہ جس نے انصاف اور انتقام کی وہ جنگ شروع کی تھی؛ جس نے ان سب کی زندگیاں بدل دی تھیں، تو وہ یہی لمحہ تھا جب ہاشم نے کہا تھا۔ ”یہ حلیمه تھی، میری بیکر ٹری!“

..... ♦ ♦ ♦ .....

ہاب 15:

## اور وحی کی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کی طرف!

یہ کمرہ ہے جہاں میں کبھی نہیں گئی  
یہ کمرہ ہے جہاں میں کبھی سانس نہیں لے سکی  
اندھیرا یہاں چگاڑ کی طرح پھیلا ہے۔  
کوئی روشنی نہیں سوائے ایک مدھم ٹارچ کے  
(شہد کی مکھیوں کی) چینی زردی ہر شے پہے۔  
اورسیاہ غلبہ۔ تباہی۔ احساسِ ملکیت۔

مگر یہ دیں جو میری مالک ہیں۔  
نظام نبے حس۔ صرف لاعلم۔  
یہ شہد کی مکھیوں کا وقت ہے!

سرما میں وہ خود کو سارے برف زار میں پھیلا لیتی ہیں،  
جہاں گرم دنوں میں کھیاں صرف اپنے لائے اٹھاتی تھیں۔  
شہد کی کھیاں سب عورتیں ہوتی ہیں۔  
کنیز میں اور ملکہ۔

وہ اپنے مردوں سے چھکا راپا چکی ہوتی ہیں۔  
موسم سرما عورتوں کے لئے ہے۔

کیا اس سرما میں ان کا جھٹہ برقرار رہ پائے گا؟  
کیا وہ اگلے سال میں داخل ہو سکے گا؟

وہ کس چیز کا ذائقہ محسوس کریں گی؟

کر سس کے گلابوں کا؟

شہد کی کھیاں آزاداڑ نے گئی ہیں۔

وہ بہار کی چمک محسوس کر رہی ہیں۔

(سلو یا پلا تھ)

ہاشم سے جلد معدترت کر کے وہ دونوں اٹھائیں۔ خاموش۔ بالکل خاموش۔

گھر میں کھانے کی میز سیٹ تھی۔ حین اور زمر چب چاپ آ کر بیٹھ گئیں۔ کھانا شروع ہوا۔ حنے نے چند لفے بمشکل لئے۔ زمر کی تو بھوک مرچ کی تھی۔ فارس کھانا کھاتے ہوئے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گر بولا کچھ نہیں۔

ادھر کھانا ختم ہوا، ادھر حصہ پیشہ کی طرف چلی گئی۔ وہ بھی تیزی سے چھپے گئی۔ سب مژہ کران کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں کیا ہوا؟

پہلے زمر نے تہہ خانے کا رووازہ لاک کیا۔ پھر نیچے آئی تو دیکھا، ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

”حین یاد ہے میرے نکاح والے روز سعدی کی حییہ سے اس کے باس سے ملنے کی اپائٹھٹ لے رہا تھا؟“

”سارے شہر میں ایک ہاشم کی سیکرٹری تو نہیں ہو گی حییہ نام کی۔“ حین مانے کو تیار نہ تھی۔ زمر تیز نظروں سے اسے گھورتی سامنے کھڑی ہوئی۔

”مگر سارے شہر میں جس حییہ کا باس تمہارے ایگزام میں چینگ والی بات جانتا تھا، وہ ہاشم ہی تھا۔“  
”حین ایک دم مثل رہ گئی۔“

”دیکھو جو، ہاشم ہمیں پہلے دن سے کہا ہے کہ وہ سعدی سے اس شادی کے بعد سے نہیں ملا۔“ اس نے کرن، جماد کے جانے والوں کی شادی کا ذکر کیا (وہ شادی جس پر زمر نے مسز جواہرات سے مدد مانگی تھی) ”مگر ہاشم ہم سے جھوٹ بول رہا تھا۔ نو شیر والا بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ دونوں ضرور بچک جانتے ہیں۔“

”بکھی نہیں۔ وہ بھی ایگزام والی بات بھائی کو نہیں بتائیں گے۔“ وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ ”اور بھائی کو ہاشم سے ملنے کے لیے اپائٹھٹ کیا ضرورت؟ بھائی کے کالل ریکارڈز میں بھی آپ کے کاٹ کے وقت کسی کو کال کرنے کا ریکارڈ نہیں ملا تھا۔“

”ہو سکتا ہے وہ کوئی اور سماں استعمال کر رہا ہو۔ کچھ تو تھا اس ملاقات میں جو ہاشم نے اسے ہم سے چھپایا۔“

”ہاشم... ہاشم! بس کر دیں بچپو!“ وہ ایک دم چلانی تھی۔ ”ہر وقت ہاشم برائے کی گردان۔ کیا گزارا ہے انہوں نے آپ کا؟“

”زمر کے ابرونا گواری سے بچنے۔“ تمہارے دماغ پر جو پتی چھٹی ہے، اس کو اتنا کر دیکھو گی تو نظر آئے گا۔“

”مجھے آپ کو وہ سب بتانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ پتہ تھا ایک دن آپ مجھے یونہی نج کریں گی۔“ بے بی سے اس کی آنکھوں میں آناؤ گئے۔

پھر آنکھیں رگڑیں۔ ایک دم ذہن میں جھما کہ سا ہوا۔

”وہ نیکلیں... جو بھائی کی جیب میں کسی نے پارٹی والے دن ڈالا تھا۔ وہ نیکلیں بھائی کی چیزوں میں نہیں تھا جب ہم ادھر آئے تھے۔ اگر واقعی بھائی ہاشم سے ملنے گیا تھا تو ہو سکتا ہے وہ ہی واپس کرنے گیا ہو۔ کیا بتاتے ہاشم ہمیں؟ چوری شدہ نیکلیں واپس کرنے آیا تھا سعدی؟ ان کو گاہو گا کہ ہم غلط بھیجیں گے، سو بھائی کی عزت رکھی۔“ وہ زمر سے زیادہ خود کو تسلی دے رہی تھی۔

”تو پھر سعدی کی کون سی عزت رکھنے کے لئے ہاشم نے اس کو ایگزام والی بات بتائی؟“

ایک دم حنہ کی آنکھوں میں غصہ در آیا۔ انہوں نے کچھ نہیں بتایا ہو گا۔ میں بھی یقین نہیں کر سکتی۔ مگر آپ تو مجھے نج کریں گی ٹااب۔

ٹھیک ہے ساری عقل آپ میں ہے، میں اندر ہی سہی۔“

زمر پیر پتھ کر مژہ اور سیر ہیاں چڑھتی گئی۔ حین گھرے گھرے سانس لیتی وہیں کری پیٹھنگی۔ اس کی رنگت اڑ چکی تھی اور ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ مگر گردن نفی میں ہل رہی تھی۔ (میں بھی یقین نہیں کروں گی۔ زمر اپنے بغض اپنے پاس رکھیں۔ بھی ان کو فارس ماموں

لال لگتے ہیں، کبھی ہاشم۔)

اس نے موبائل اٹھایا اور اسکرین روشن کی۔ ہاشم کا آخری پیغام ”کیم آئی کال یو؟“ ڈیڑھ ماہ پہلے آیا تھا۔ پورا اگست دونوں کی کوئی اتنیں ہوئی۔ ابھی پھر اس کا مستحق آیا۔

”زمر جانتی ہیں کہ تم مجھ سے بات کرتی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں تو پچھلے سات سالوں سے آپ سے بات کرتی آئی ہوں، اس میں چھپانے والی کیا بات ہے؟“ وہ بظاہر حیران ہوئی، مگر زہن مزید ابھتھا جا رہا تھا۔ مگر وہ بات کرتی گئی۔

زمر اپر کمرے میں آکر بیٹھی تو شدید غصے میں تھی۔ وہ صوفے پہ بیٹھا، سیل فون پہ کچھ ناپ کر رہا تھا، نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”میں ان رہا ہوں۔“

وہ چونک کرفارس کو دیکھنے لگی۔ ”کیا؟“

”وہی جو آپ کہنا چاہتی ہیں۔ بتا میں کیا مسئلہ ہے؟“

اور اس ایک لمحے میں زمر کو لگا، اگر کوئی ایک شخص تھا جو اتفاقی تھل سے اس کی ساری بات سنے گا تو وہ وہی تھا۔ وہ اس کی طرف گھوی۔

”تم نے کوئی اتنا اندھا انسان دیکھا ہے کبھی جس کے سامنے ایک ہزار بثوت لا کر رکھو تب بھی وہ نہ مانے؟“

فارس نے نظر اٹھا کر سر سے پیروں تک زمر کو دیکھا۔ ”جی۔ دیکھا ہے۔“ زمر خور کیے بنا کرہ رہی تھی۔

”لوگ اتنے اندھے کیوں ہو جاتے ہیں کہ نہ بات شیش نہ سمجھیں؟“

”کیونکہ ان کے ایسا شنز انو لاوڈ ہوتے ہیں۔“

زمر بالکل چپ ہو گئی، پھر سر جھک کر رخ پھیل لیا۔ وہ چند لمحے اس کو دیکھتا رہا۔ ”آپ اور نہ پیمنہ میں کیوں گئی تھیں؟“ مگر زمر

کے پاس جواب تیار تھا۔

”خین سے کہا تھا ایک کلاںٹ کے لیے کچھ کام کرنے کو، وہی دیکھ رہی تھی۔“ اسے پتہ تھا زمر جھوٹ نہیں بولتی، سو مطمئن ہو گیا۔ مگر

وہ خود شدید غیر مطمئن تھی اور اس سب میں دراز میں رکھا کی چین اس کے ذہن سے یکسر جو ہو چکا تھا۔

جب کنج قفس مسکن تھہرا، اور جیب و گریبان طوق و درکن

آئے کہ نہ آئے موسمِ گل، اس در ڈیگر کا کیا ہو گا؟

نیچے تہہ خانے میں بیٹھی خین موبائل پہنچا پکر رہی تھی۔ ”اوے گڈ ناٹ۔“ فون رکھا تو خر کا اثر ہوا ہونے لگا۔ سکون ختم ہو گیا۔ وہ

تو زخم پہ صرف کی ڈلی رکھ رہی تھی۔ ادھر رف پکھلی، ادھر جلن پھر سے شروع۔

جب سوچوں سے نگ آگئی تو شیخ کی کتاب اٹھائی اور وہیں فرش پہ بیٹھ گئی۔

پچھلے دو ماہ سے اس نے یہ کتاب نہیں پڑھی تھی۔ جب بھی تکلیف ہوتی، وہ ہاشم میں ”ڈسٹریکشن“ ڈھونڈتی۔ اب صفحے کھولے تو

روشنی کا ساچکتا روازہ سامنے نظر آیا۔ اسے دھکیلا تو قدیم دمشق کی ایک دو پہر کھلتی چل گئی۔

مدرسہ الجوزیہ کے سامنے کا منظر نامہ زرد ساتھا۔ ایسے میں مسجد کے سامنے درخت نہیں بیٹھی تھی۔ وہ تحکم چکی تھی۔ تکان بہت شدید

تھی اور اپنا آپ کمزور محسوس ہو رہا تھا۔

وہ لکنی دیرو یہیں پہنچی دوپہر میں بیٹھی رہی۔ قریب میں پانی کا جو ہڑتھا۔ وہ کنکراٹھا کراس میں پھیکلتی رہی۔ پانی میں دائرے بنتے

رہے۔ دھناؤ اس نے قدموں کی چاپ سنی۔

سر اٹھایا تو ہر طرف سے لوگ چلتے ہوئے اس کے قریب آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے گرد دائرہ سالگ گیا۔ بجوم کا دائرہ۔ وہ سب اسے دیکھ رہے تھے، چہ مگویاں کر رہے تھے۔ وہ ابھی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ تبھی لوگوں نے راستہ چھوڑا اور حنہ نے دیکھا، اس کے باریش شہنشاہ قدم چلتے آ رہے ہیں۔ وہ اسی طرح بیٹھے ان کو نکلنے کیکھے گئی۔ وہ اس کے قریب آٹھہرے۔ تاسف بھری مسکراہٹ سے اس کا چہہ دیکھا۔ تبھی ایک صدالگانے والے نے صدالگانی۔

”کیا ہے اس شخص کی دوا جس کو ایک لا علاج مرض نے یوں جکڑ لیا ہو کہ اس کا دین اور دنیادنوں بر باد ہونے والے ہوں؟“  
شخ نے گھری سانس بھری۔ ”اللہ نے اتاری ہے ہر مرض کی دوا۔ جو اسے جانتا ہے وہ اسے جانتا ہے جو اسے نہیں جانتا، وہ اس نہیں جانتا۔“

اور تب حنہ نے دیکھا کہ شخ کے ساتھ کوئی موجود ہے۔ اس پرانے زمانے کے پرنٹ میں ایک رنگی لڑکی۔ اس کی عینک لگی تھی، بالوں کی فریخ چوٹی تھی۔ پھرہ تازہ اور شاداب تھا اور وہ خینہ کی طرف اشارہ کر کے شخ سے پوچھ رہی تھی۔

”اے کیا مرض لاحق ہے؟“

درخت نئے بیٹھی حنہ نمک کا مجسمہ ہو گئی۔ ششدر۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے ساتھ والی لڑکی سے گویا ہوئے۔

”اے مرض عشق ہے۔“

خینہ ایک دم بدک کر کھڑی ہوئی۔ بے یقینی سے سرفی میں ہلایا۔ یہ سب غلط ہو رہا ہے۔ میں یہاں نہیں ہوں، میں وہاں ہوں، اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں... یہاں تو وہ بیٹھا ہوتا تھا۔ وہ لاغر، کمزور، ہڈیوں کا بخیر... وہ بیمار شخص۔ مجھے... مجھے کوئی بیماری نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔“  
دونوں بازوں سینے پہ پھیلائے، وہ وحشت سے کہہ رہی تھی۔ پھر قدم بڑھائے تو جو ہڑکناڑے زنجیر پا ہوئی۔ پانی میں اپنا عکس جھلکایا۔ وہ ڈلن کمزور اور بے رونق چہرے والی، کہیں کھوئی کھوئی سی لڑکی۔ وہ واقعی اس کا چہرہ تھا۔ اس نے بے یقینی سے سرفی میں سر ہلایا۔ وہ اس کے قریب اکھڑے ہوئے۔

”علاج کے لئے ضروری ہے کہ میریض کو اپنے مرض کا ادراک بھی ہو۔ وہ خود سخت یا ب ہونا چاہے، تب ہی ہو سکتا ہے۔ کیا تم ٹھیک ہو ناچاہتی ہو؟“

خینہ کا گویا دل ہی ٹوٹ گیا۔ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ زمین پیٹھتی چلی گئی۔ آنسوؤں کی آنکھوں سے روائ تھے۔

”یہ میں نہیں ہوں۔ یہ میں نہیں ہو سکتی۔“ ہاتھ مٹی پر کھے وہ رو نے لگی تھی۔ ”میں اس بیمار شخص جیسی نہیں بننا چاہتی۔ میں کیا کروں، شخ؟“ وہ بچوں کے بل اس کے ساتھ بیٹھے۔

”میرے پاس تمہارے مرض کا علاج ہے۔ اس کے لئے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“ وہ نرمی سے کہہ رہے تھے۔ ”دوائے شانی کے سفر پر۔ تم چلوگی، لڑکی؟“

خینہ نے کتاب بند کی تو آنکھوں سے آنسوگ رہے تھے۔ نرمی میں سر ہلاتے اس نے آنکھیں رگڑیں۔ ”مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے نہیں پڑھنا اس کتاب کو۔“ اس نے آنکھوں میں سرد دیا۔ برف کی ڈلی لگانا، زخم پر مرہم لگانے سے زیادہ آسان تھا۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں ..... کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں وہ صحیح ملکی اور گرم طلوع ہوئی تھی۔ اوائل ستمبر کے دن تھے۔ جس میں کسی تھی مگر گرمی ہنوز ویسی ہی تھی۔ ایکسی میں ناشتے کی خوبیوں میں۔ فارس آفس کے لئے تیار چائے پی رہا تھا۔ زمرہ اشام کو فون کر کے سالگرہ کی تقریب کے ماتحت ہونے کا بتا کر معدودت کر رہی تھی اور سیم اس پر خوش نہ ہونے کے باوجود خاموش تھا۔

اسی دوران حصہ نے فارس سے کہا کہ اسے رسیٹور انٹ چھوڑ دے۔ ہامی بھر کر وہ کہنے لگا۔

”جیسے زمر کی کلاں کے لیے کیا دیسے، ہی میرا ایک کام کر دو گی؟“

حمد نے چونک کر زمر کو دیکھا۔ زمر نے ظاہر اطمینان سے فون رکھا اور ادھر آئی۔

”فارس پوچھ رہا تھا کہ رات ہم یہ سمعت میں کیا بات کر رہے تھے تو مجھے بتانا پڑا کہ کس طرح تم نے میری کلاں کے کانٹیکٹ کا

”کہوت کھول کر دکھایا مجھے۔“ آنکھوں میں اشارہ کیا۔ خینہ نے نظریں جھکا دیں۔ ”جی۔ کر دوں گی۔“

وہ چابی اور والٹ لینے اٹھ گیا۔ میز کے گرد وہ دونوں رہ گئیں۔ ابا اور سیم کافی فاصلے پڑی وی کے آگے بیٹھے تھے۔

خینہ نے صرف ایک ناراض نظر اس پڑا۔

”کیا یہ دھمکی تھی؟ کہ اگر میں نے یہ کانٹیکٹ ختم نہیں کیا تو آپ ماںوں کو بتا دیں گی؟“

زمر نے چھپتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں اس سے نہیں بہشم سے بات کروں گی اب، اور جس دن میں نے بہشم سے بات کی نا، وہ تمہاری طرف دیکھنے سے بھی جائے گا،“

س لئے بہتر ہے کہ تم خود سے رابط ختم کر دو۔“ اسے گھورا۔ بہت ہو گئی نرمی اور لذاد۔

خینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ (”میں کیا کروں اللہ تعالیٰ؟“) پھر وی پہ نگاہ پڑی۔ ابا چینیں بدلتے ہوئے ایک لوکل کیبل

پیٹیں پر کے، جس پر تلاوت لگی تھی۔ ایک ہی نظر میں حمد نے پہلی سطر پڑھی۔

”وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَيْنَا أَنْخَلٍ.. (اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی کمکی کی طرف) ...“ مگر فارس واپس آگیا تھا اور زمر سے کچھ آہستہ

آواز میں پوچھ رہا تھا۔

”جب میں رہا ہو تو سعدی نے مجھے بتایا کہ اس نے جج کو بیک میل کیا ہے۔ اس کے پاس جج کے خلاف مواد تھا۔ وہ مواد مجھے اس

کی چیزوں سے نہیں ملا۔“

”اس کے لیپ ناپ میں بھی کچھ نہیں ہے۔ اس نے یقیناً جج کو واپس کر دیا ہو گا۔“

خینہ بے دھیانی سے سننے لگی۔ ندرت اپنام اٹھائے آبی خیس تو ان کی بات پر رخ موڑ لیا۔ یہ بتیں ان کو عجیب سی وحشت میں بتلا

کرتی تھیں۔ مگر وہ ان کو ان کو اپنے پیچیدے گیوں میں پڑنے سے روک بھی نہیں سکتی تھیں۔ فارس کہہ رہا تھا۔

”مگر سعدی نے ایک کاپی ضرور رکھی ہو گی اور کوئی اس بارے میں ضرور جانتا ہو گا۔“

زمر کھڑی ہوئی۔ ”اس کوئی کو رسیٹور انٹ بلاؤ اور اس سے کہو کہ انسانوں کی طرح سب اگل دے درنہ اچھا نہیں ہو گا۔“

قصیر کاردار کے ڈائینگ ہال کی اوپنی کھڑکیوں سے بزرہ زار پہنے اور فارس کا رہا میں بیٹھنے نظر آ رہے تھے۔ اگر ہال میں دیکھو تو سر

کری پیٹھی جواہرات تمنکنت سے گردن اٹھائے خاور کو دیکھ رہی تھی۔ بہشم بھی ناشتہ کرتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ مودب

ماکھڑا کہہ رہا تھا۔

”....بظاہر یہ صرف گیس لیکچ کی وجہ سے ہوا۔ مگر ڈاکٹر بخاری اور ڈاکٹر ایمن نے ٹھلم کھلانیا زیادگی کے بھائی کو الزام دینا شروع کیا۔ اس کے خلاف ایک کیس بڑھ گیا۔“

”ہاں تو مسئلہ کیا ہے؟ ان کے آپس کے مسئلے ہیں یہ۔“ جواہرات نے ناک سے مکھی اڑائی۔ خاور ہلاکا سماں سکرایا۔

”مسئلہ یہ ہے مسز کاردار کہ سب کچھ بہت پر فیکٹ تھا۔ گارڈز کو مارا نہیں گیا، جلنے نہیں دیا، بلکہ آگ سے دور کر دیا گیا، اسٹریٹ لامبٹ آف ہو گئیں، آگ کے پیچھے کے سی ٹنی وی خراب کردیے گئے۔ علیم بیگ ایک غندہ ہے اور غندہ ایسی پر فیکشن سے کام نہیں کرتے۔“

”فارس!“ ہاشم نیپکین سے لب تھپتھپاتے پیچھے ہو کر بیٹھا۔ ”یہ فارس نے کیا ہے ہے نا؟“

خاور نے اثبات میں سر ہلاایا۔ ”مجھے بھی یہی لگا، یہی کا اشائل ہے، مگر اس رات وہ گھر پہنچتی تھا۔ گارڈز نے اسے آتے دیکھا۔ اور پھر صبح جاتے دیکھا۔ وہ رات گھر سے نہیں نکلا۔ یہی بات مجھے سمجھنیں آئی۔“

”ہو سکتا ہے اس نے کسی اور کے ذریعے یہ کام کروایا ہو۔“

”بہر حال میں پتہ کر رہا ہوں۔“ وہ چلا گیا تو نوشیر وال آتا دکھائی دیا۔ نیند سے بھری آنکھیں، اور سست انداز کری پڑھے سامنا۔ ذرا حواس بیدار ہوئے تو گفتگو کی طرف توجہ کی۔ جواہرات، فکر مندی سے کہر ہی تھی۔

”اس ڈاکٹر نے فارس کے خلاف گواہی دی تھی۔ اس کے شوہرنے سعدی کو غائب کروایا۔ یقیناً فارس نے ان سے بدله لیا ہے۔“

”ضوری نہیں ہے یہ اس نے کیا بھی ہو۔ وہ ابھی جیل سے آیا ہے۔ مزید ڈبل افورڈ نہیں کر سکتا۔“ ہاشم پر یقین نہیں تھا۔ بہر شیر، دیکھا جو اپنے ناشتے کو ڈھکا شکھنے کا کورا اخہار ہاتھا۔ ہاشم سماں سکرایا۔

”دیکھنے نوشیر وال کا ردوار آج آفس وقت پا آئیں گے۔“

شیر نے جمائی روکتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

”لیکن سعدی پھر ہمارے لئے لازمی کام کرے گا۔“ شرط یاد دلائی۔

”باکل۔ میں تین چاروں تک جاؤں گا اس سے ملنے۔ جو تفصیلات چاہیں وہ لے کر ہی آؤں گا۔“ سیل فون اٹھاتے ہوئے۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

”تم سعدی سے چھنکارا حاصل کرو ہاشم۔ وہ تمہیں نقصان دے گا۔“

”پچھنیں کر سکتا وہ۔“ بے نیازی سے سر جھکتے وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔



اس مال کی دھن میں پھرتے تھے..... تاجر بھی بہت، رہن بن بھی کئی

”چلیں۔“ حنہ کار میں آ کر بیٹھی تو فارس کا لپکی سے بات کر رہا تھا، سر ہلا کر فون رکھا۔

”ہم ایک جگہ سے ہو کر ریشور انت جائیں گے۔ گیس کروکس نے کاں کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے؟“ اس کے الفاظ ہے، حنہ چوکی تھی۔

جس وقت وہ دونوں ریشور انت کی طرف جاتی سڑک پر گامزن تھے، قصر کار دیواری کے ساتھ خاور مختار نظر ہوں۔ دیوار کو دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ دیوار کا وہ حصہ تھا جو فارس کی انگلی کے عقب میں تھا۔ اس کے پیچھے سڑک تھی۔ آنکھیں کیکر کر دیکھتا وہ ایک جگہ رکا۔ یہاں ایک لوہے کا دروازہ تھا۔ جوزمانوں سے بند پڑا تھا۔ اس پر پرانا تالہ لگا تھا۔ اس جگہ گارڈز نہیں تھے، نہ کمرے۔ خاور پچھے ہے، متذبذب سماں سے دیکھتا رہا، پھر جھک کرتا لے کوچھوا۔ لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

تالہ پر انا تھا، اور زمگ آلو دبھی۔ مگر... اس کے مقابل ہونے کی جگہ پہنچ نہیں تھا۔ جیسے تیل وغیرہ ڈال کر صاف کیا گیا ہو۔ چالی گھنائے والی جگہ کا زمگ بھی صاف تھا۔

(سوفارس غازی رات کو ادھر سے نکلتا تھا۔ گذ، گذ!) اس کے ہاتھ خدا نگ گیا تھا۔

فارس اور حسین ریشور امنٹ میں داخل ہوئے تو ایک دم خنہ رکی۔ تعجب سے فارس کو دیکھا اور شکل یوں بنائی جیسے حلقتک کڑوا ہو گیا ہو۔

سامنے ایک کوئے والی کرسی پر تازہ دم اور خوبصورت، شہریں کاردار بیٹھی تھی۔ لبوں پر سرخ لپ اسٹک اور سنہرے بالوں کی چھوٹی سی پوپنی۔ فارس کو دیکھ کر مسکرا کر گھری ہوئی۔ اس پر نظر پڑی تو مسکرا ہٹ میں کی آئی۔

"تو آپ پہچھو سے چھپ کر اس سے ملتے ہیں؟" اس کی دھیانی محبت پھر سے جاگی۔

"بکومت۔ اس نے پہلی دفعہ ملنے کا کہا ہے۔ کوئی کام تھا۔" اسے گھر کر دہ آگے آیا۔ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ حسین بھی (منہ باتی) ساتھ بیٹھی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا تمہاری بھائی بھی تمہارے آفس جاتی ہے۔" شہری کو خود کا آنا گوارنزر اتھا۔ حسین نے صرف ایک کاٹ دار نظر انھا کرایے دیکھا۔

"ہم ضروری کام سے جا رہے تھے، تمہارے فون پر..." فارس نے کلائی کی گھری دیکھی۔ "پندرہ منٹ نکالے ہیں۔ اب بتاؤ کیا ہاتھی؟"

ایک لمحے کے لئے شیری کو بھجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے، پھر بلکہ سے شانے اچکائے۔

"میں سعدی کے کیس کا پوچھنا چاہتی تھی۔ میں نے ساتھا کوئی مہنگی گن استعمال ہوئی ہے۔ سعدی کی شونگ میں۔ اگر تم کہو تو... ہاتھ میز پہ باہم ملا کر کھتی آگے ہوئی؟" تو میں پاپا سے کہہ کر اس گن کے لامنز نکلا سکتی ہوں، تاکہ...

"میں یہ کام ڈھائی ماہ پہلے کر چکا ہوں۔ جن لوگوں کے پاس وہ گن ہے، ان میں سے کوئی ایک بھی ہمارا دوست ہے نہ دشمن۔"

"تو پھر وہ گن کس کی ہوگی؟"

"ظاہر ہے اس کا نام اور ریکارڈ اسٹ سے مٹا دیا ہو گا۔" وہ سنجیدگی سے ٹانگ پٹانگ جمائے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"کون سی گن تھی وہ؟"

"آپ کو گنر کے بارے میں کتنا پتا ہے شہریں؟" حسین رہ نہیں سکی۔ شہری نے نکل کر اسے دیکھا۔ پھر پر س سے ایک Cobalt (پستول) نکال کر میز پر کھلی۔

"اگر آپ ہاشم کاردار کی بیوی ہوں اور شونگ کلب کی ممبر بھی ہوں، تو آپ کو گنر کے بارے میں بہت علم ہوتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تمہارے ہاشم اور شیریو کے پاس کون کون سی گن ہے۔" ذرا اکتا کرا سے ٹوکا۔ "مگر جو برائٹ گن استعمال ہوئی ہے، وہ ماذل آگے پچھے کسی کے پاس نہیں ہے۔ گلاں جی فورنی ون۔"

اور شہریں کا سانس اٹک سا گیا۔ بمشکل آنکھوں کو اس پر کھے مسکرا پائی۔

"جی فورنی ون؟ اچھا۔" وہ رکی۔ تاثرات پ قابو پالیا۔ وہ گنر کی بات کرنے ہی نہیں آئی تھی۔ وہ تو حنہ کو دیکھ کر بات بنائی پڑی۔ اگر

اس نے پہلے چیک کر لیا ہوتا کہ... اونہوں۔

"اگر کچھ اور نہیں ہے تو ہم جائیں؟" وہ فون جیب میں ڈالتا کھڑا ہوا۔ شہری نے جبری مسکرا کر سر کو ختم دیا۔

حد بھی بے دلی سے انھیٰ تھیں لگاہ سامنے دیوار پر جا ٹھہری جہاں بڑی سی کیلی گرفتی آؤ یہاں تھی اور اس پر خطاطی سے لکھا تھا۔ ”وَاوَحَى رَبُّكَ إِلَيْنَا أَنْخَلٌ“، حین کی آنکھیں سکڑیں۔ صبح والی تی وی اسکر یہن یاد آئی۔ مگر سر جھٹکا۔ یہ صرف ایک اتفاق تھا۔ فارس کے ساتھ وہ باہر نکلی تو ذہن بہت الباھا ہوا تھا۔

”خواہ خواہ ٹائم ضائع کروایا اس پلاسٹک نے۔“ وہ سخت کوفت کا شکار لگ رہی تھی۔

فارس نے ڈرائیور گ سیٹ پر بیٹھنے ہوئے اچھے سے دیکھا۔

”پلاسٹک کیا؟“

”یہ شہرین... اس کا تعلق Plastics سے ہے۔ آپ کونہیں پتے Plastics کا؟“ تجوب سے اسے دیکھا۔ پھر بیک لگا۔ بتانے لگی۔ ”یہ اپر مدل کلاس اور ایلیٹ میں پائی جاتی ہیں۔ بچپن سے ان کی مرنینگ ہوتی ہے۔ بھاری کتاب سر پر رکھ کر سیدھا چلنے کی، ہونوں کو مخصوص زاویے پر کھنے کی۔ جب بھی کھڑی ہوں گی، کہیاں برابر اور ہاتھ تین انچ کے فاصلے پر ہوں گے۔ چہرے کو بالکل سپاٹ اور گردان اور اٹھا ہو کھٹکی ہیں۔ وائٹ اور نیچ کا ہر شید ان کے پاس ہوتا ہے۔ بے حد دلی پتلی اور ڈاٹ کا نشس ہوتی ہیں۔ دراصل ایوری گسک ہوتی ہیں۔ فاقہ کرتی ہیں۔ کسی دن کچھ زیادہ کھالیں تو علق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتی ہیں۔ اس شدید جسمانی مشقت کے بعد ان کے چہرے پر گواہ خول سا چڑھ جاتا ہے۔ اور یہ پلاسٹک پلاسٹک لگنے لگتی ہیں۔“ وہ خبر نامہ پڑھنے کے انداز میں بتا رہی تھی۔

ڈرائیور کرتا فارس بے اختیار ہنس دیا۔

”اچھا..... ویسے تمہاری پچھو کیا ہیں؟“

”وہ پلاسٹک ہوڑی ہیں۔ وہ نیچرل ہیں۔“ ڈرائیور ہو کر آہستہ سے بولی۔ ”مگر نیچرل سیسے!“

”وہ بھی کھوتا ہوا۔“ وہ بڑا بڑا اور پھر دونوں ہنس پڑے۔ وہاب بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ریسٹورانٹ قریب تھا۔

❖❖❖

مجھے شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے ..... لے گئے ساتھ مری عمر گزشتہ کی کتاب احر شفیع جب ریسٹورانٹ میں داخل ہوا تو دیکھا، سامنے ایک میز کے پیچے وہ تیوں بیٹھے تھے۔ کسی امنڑو یو پیٹل کے انداز میں۔ بار بار گھڑی دیکھتا، کان کی لو مسلتا فارس، گھنگریاں لٹ انگلی پر لپٹتی، منتظری زمر، اور انگلیاں مروڑتی گردن جھکائے بیٹھی تھیں۔ احر گہری سانس بھر کر رہا گیا۔

(چلو جی۔ سارا پاگل خاندان اکٹھا جمع ہے، احر شفیع کی کلاس لینے۔ ان کو بے عزتی کرنے کے لئے کوئی اور نہیں ملتا؟) منہ بناتا آئے آیا، سلام کیا۔ جس کا کوئی جواب نہ ملا۔ پھر بھی مسکرا کر سامنے بیٹھا۔

”مجھے ہارون عبید کے ساتھ ایک گھنٹے میں چڑال جانا ہے، اس لئے...“

”سعدی نے نج کو کس چیز سے بلیک میل کیا تھا۔“ فارس نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ احر نے گہری سانس بھری۔ (ہونگی کلاس شروع!)

”مسز زمر کا نوں پر ہاتھ رکھ لیں تو میں بتانا شروع کروں؟“ معصومیت سے پوچھا۔ زمر نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”میں سن رہی ہوں۔“

احر نے تھوڑی کھجاتی۔ ”سعدی نے مجھے ایک بورڈ کے آفیس کا فنیڈ یونیٹ پر لیس (اوی پی) کے بارے میں بتایا تھا جو کہ ایک کر پٹ آدمی تھا، اور ہر سال پیپر لیک کیا کرتا تھا۔“

خین یوسف کا سانس رک گیا۔

ذرادیر کے لیے احراء دران تینوں کو یہیں چھوڑ کر ہم پچھلے سال کے جنوری میں واپس جاتے ہیں جب سعدی اوسی پی صاحب کے گھر گیا تھا۔ وہ ایک گلٹ سے بھرا دل اور جھکے کندھے لے کر وہاں آیا تھا۔ آئٹی کے پاس ڈرائیکٹ روم میں سر جھکائے بیٹھے، اس نے بھاری ضمیر سے کہا تھا۔

”میں ان کی وفات کے اتنے عرصے بعد آ رہا ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے ان کا۔“ (یہ خین کے بتانے کے ایک ماہ بعد کا ذکر ہے۔)

”کوئی بات نہیں جو تمہاری بہن نے کیا، وہی ہمارے لئے بہت ہے۔“ اس نے چونک کسر اخایا، مگر آئٹی بہت محبت اور سادگی سے کہہ رہی تھیں۔ وہ وہی جانبی تھیں، جو حنہ نے کیا۔ وہ نہیں جوان کے شوہرنے کیا۔ اور جس کا گلٹ ان کو لے کر ڈوبا۔ وہ چائے کے لئے اٹھیں تو سعدی نے سر ہاتھوں میں گرائے بے اختیار دعا مانگی۔

”اللہ تعالیٰ میں آپ کے سامنے اپنی بہن کی غلطی کو جسٹی فائی نہیں کروں گا۔ میں کوئی صفائی نہیں دوں گا۔ لیکن اس کی نیت ان کی جان لینے کی نہیں تھی۔ اللہ، آپ کو پتہ ہے کہ اس کو علم نہیں تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ پلیز میری مدد کریں، میں کسی طرح ان کی فیملی سے معافی مانگ سکوں؟ ایک ایماندار افر کے ضمیر کی قیمت لگانے کے بوجھ سے دل کو آزاد کر سکوں۔ جو آپ پہ بھروسہ کرتے ہیں، آپ ان کو سوانحیں کرتے۔ پلیز مجھے اس بوجھ سے نکال لیں۔“ چہرے پہ ہاتھ پھیر کر وہ سیدھا ہوا۔ آئٹی چائے لارہی تھیں۔

”انکل کی ڈیجھ ہارت ایٹک سے ہوئی تھی، کیا زیادہ پریشان رہتے تھے آخری دنوں میں؟“ وہ نظریں ملائے بنا پوچھ رہا تھا۔

”نہیں، ٹھیک تھے بالکل؛ بیٹی کی شادی ہو گئی تو مطمئن تھے۔ بلکہ خوش بھی تھے۔“ سعدی نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ دیوار پر ان کی بیٹی کی شادی کے فتوٹ کی چند فریز لگی تھیں۔ خوبصورت، جگر جگر کرتے لباس میں موجود تھیں، اور گھر کی عورتیں۔ فیقیتی زیور۔ سعدی کی لگاہیں ڈرائیکٹ روم میں اور ہر دوڑیں۔ قیمتی پردے، ڈیکور پیپر۔ اس نے سر جھکایا۔

”آخری دن کیسے تھے؟ اس دن رزلٹ آیا تھا۔“

”بالکل ٹھیک تھے سعدی۔ ناریل باتیں کر رہے تھے اور بلکہ جسٹس صاحب سے بھی ٹھیک گپ شپ کرتے رہے۔ وہ تو ان کے جانے کے بعد کافی دیر سے میں ان کے کمرے میں گئی تو...“ سرفی میں ہلا کر آئٹی نے آنکھ کا کنارہ صاف کیا، لیکن سعدی یوسف خان کا دماغ ایک جگہ ایک چکا تھا۔

”کون جسٹس صاحب؟“

”ان کے بڑے اچھے دوست ہیں، جسٹس سکندر سیشن کورٹ میں ہوتے ہیں، وہ ملنے آئے تھے نامیرا کے ابو سے۔ کمرے میں ان سے باتیں کرتے رہے، ہم لوگ باہر لاوٹنے میں تھے۔ وہ نکلے تو بتایا کہ اوسی پی صاحب ابھی کام کر رہے ہیں، کہہ رہے ہیں بچے شورنہ کریں۔ میری بڑی بیٹی کے دو بچے بھی آئے ہوئے تھے نا۔ ان کے جانے کے کافی دیر بعد، میں اور حمیرا اندر آئے تو دیکھا، وہ فوت ہو چکے تھے۔ استغفار بھی لکھا پڑا تھا۔“

سعدی ایک دم آگے ہو کر بیٹھا۔ ”آپ نے... آپ نے ڈاکٹر کو بلا یا تھا؟“

”ہاں، ڈاکٹر نے بتایا ہارت ایٹک سے موت ہوئی ہے۔“

”آپ نے پوست مارٹم کروایا تھا؟“

”نہیں بیٹا، اس کی کیا ضرورت تھی۔ میرے بیٹے نے کہا بھی تو ان کے دوستوں، رشتے داروں نے منع کیا کہ لاش کی بے حرمتی ہوتی۔“

"جی بالکل میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔" جبراً مسکرا یا۔ بچینی سے پہلو بدلا۔ (یعنی بیٹے کو معلوم ہو گیا تھا؟)

"ان کا کمرہ دیکھ سکتا ہوں میں؟ ان کا کمپیوٹر وغیرہ؟"

"بینا کمپیوٹر اور فائیلز تو محکے والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ کمرہ دیکھ لوت۔ اپنے گھر کے بچے ہو۔ صفائی وغیرہ کرتی ہوں، مگر ان کی باتی چیزیں نہیں چھینتی۔"

وہ اسے ایک کمرے میں لے آئیں۔ وہ بیدار وہ چھوٹا مگر پر قیش تھا۔ گھر کافی دفعہ رینویٹ ہوا لگتا تھا۔ سعدی کے جھکے کندھے اٹھ کچے تھے اور بھاری دل ہلکا ہو رہا تھا۔ وہ ان کی کتابیں دیکھتا رہا۔ آگے پیچھے کوئی کاغذ کوئی فائل نہیں چھوڑتی تھی "محکے والوں" نے دفعتہ دہ رکا۔ اسنڈی نیبل کے وسط میں کپ رکھا تھا۔ اس میں چند پین تھے۔ ایک پین مختلف تھا۔ سعدی نے وہ سلوپ پین انھیا اور ڈھکن کھولا۔ اندر یہ ایس پی پلگ تھا۔ اس نے جلدی سے ڈھکن بند کیا۔ پھر آئٹی کی طرف مڑا۔

"مجھے انکل سے بہت عقیدت تھی، اگر آپ کو برانے لگے تو ان کا ایک قلم رکھوں؟ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا رہے گا۔"

اور آئٹی نے کھلے دل سے اجازت دے دی۔ وہ ان سے چار جنہیں مانگ سکتا تھا، لیکن کوئی بات نہیں چار جن کہیں سے خرید لے گا۔ انسانی عقل مہینوں، سالوں لگی رہتی ہے، کسی ایک کلیوکی تلاش میں، جیسے سعدی لگا تھا، اتنے دن سے نجح کے کمپیوٹر میں کوئی ایک کام کی چیز تلاش کر رہا تھا، مگر جب عقل تھک جاتی ہے، تو ایک دم سے سب سے قیمتی چیز انسان کی جھوٹی میں پکے پھل کی طرح گراوی جاتی ہے۔ آگ لینے کے لیے جانے والوں کو پیغمبری مل جاتی ہے۔ وہ لمحہ، الہام کا لمحہ ہوتا ہے..... کچھ لوگ اسے "اتفاق" کہتے ہیں۔ ایمان والے اسے "مدد" کہتے ہیں۔۔۔۔۔

اور آج احمد شفیع زر اور فارس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "سعدی ان کی تعریت کے لئے ان کے گھر گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک گلی میں احساس لئے ادھر گیا تھا، ان کی فیملی کو وہ پہلے سے جانتا تھا۔" احمد سانس لینے کو رکا۔ ان کو متوجہ پا کر مسکرا یا۔ "ویسے میری کنسٹلنسی فیں..."

"کام کی بات پا آؤ!" فارس ایک دم برہنی سے کہتا آگے ہوا تو وہ ہاتھ اٹھاتے جلدی سے ذرا پیچھے ہوا۔ " بتار ہوں، بتار ہوں۔" گھری سانس لی۔ "ان کی چیزوں میں سعدی کو ایک پین کیسرہ ملا۔" (زمرنے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ اف۔) "اس پین کے ذریعے اوس پی صاحب نج کی ویڈیو ز بناتے تھے۔ وہ کافیڈ پیشل پریس کے آدمی تھے۔ ان کے پاس بہترین gadgets میں جیسے لگا تھا، جو اس کو ڈیٹیکٹرز کے باوجود ناقابل گرفت بناتا تھا۔ بہر حال اس پین میں کچھ ویڈیو ز تھیں۔ کالے دھندوں کے اعتراض کی وجہ پر۔ سعدی نے تمہارے رہا ہونے کے بعد وہ تمام ویڈیو ز مٹادیں، سوائے ایک کے۔ اس ویڈیو میں نج اور اوی پی کی آخری ملاقات تھی، اور وہ ایک terrible ویڈیو تھی۔ اوسی پی نے صرف یہ سوچ کر کیسہ آن رکھا تھا کہ نج کی دھمکیوں کو ریکارڈ کرے گا، اس لیے اس نے استغفاری بھی آرام سے لکھ دیا۔ مگر..... اس نے جھم جھرمی لی۔ "اس ویڈیو کی وجہ سے نج نے غازی کو رہا کیا۔"

"اب وہ پین کہاں ہے؟" فارس کے سوال پا احرنے شانے اچکائے۔ زمر جلدی سے بولی۔ "میں سعدی کی چیزیں دوبارہ دیکھوں گی، مل جائے گا!" ذرار کی۔ لیکن اگر نج کے طاقتور مجرم دوست ہیں، تو اس نے فارس کو رہا کرنے کی بجائے ان دوستوں سے مدد کیوں نہیں مانگی۔"

"مسز زمر، آپ وہ ویڈیو دیکھیں گی، تو جان لیں گی کہ کوئی بھی اپنے ساتھی مجرموں کو ایسی چیز کی ہوانہیں لگنے دے سکتا۔ وہ اس کی مدد کرتے، لیکن پھر اس کی کمزوری کے ذریعے اس کو غلام بنایتے۔ غازی کو رہا کرنا زیادہ آسان تھا۔"

"تو اوی پی صاحب نے خود کشی کیوں کی تھی؟" حین انہی گلی شاکی نظر وہ اسے احمد کو دیکھ کر بولی تو احمد نے اسے دیکھا، پھر فارس

اور وحی کی آپ کے رب نے شہد کی بھی کی طرف!

کو۔ پھر شاہ نے اپکا کئے۔ ”اس ویڈیو اور سعدی کے مطابق، اوسی پی صاحب کو قتل کیا گیا تھا۔ ان دونوں کا آپس میں لین دین کا کوئی تائز عطا۔“

”سعدی نے آپ کو خود یہ بتایا؟“ حسین کی آواز غصے سے بلند ہوئی۔ احر نے سن بھل کر ”جی۔“ میں سر ہلایا۔

حسین نے گلے بھری نظر زمزدہ ای۔ احر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کون ہیں؟ ان کو کیوں بتایا؟ میں بہن تھی۔ مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ ایک دم سے پچویس آنکھوں میں بھی ختم ہو گئی۔ فارس احر کو اشارہ کرتا اٹھ گیا۔ وہ دونوں چلے گئے تو حسین نے آنسو ہاتھ کی پشت سے رگڑے۔ ”بھائی کو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں سمجھتی رہی میں نے ان کی جان لی ہے۔“

”حسین یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ ہمیں سعدی نے کچھ نہیں بتایا۔ رہی اوسی پی کی بات، تو میں نے تمہیں کہا تھا، ان کے لیے بیپروز دنیا آسان تھا کیونکہ وہ یہ کام پہلی دفعہ نہیں کر رہے تھے۔“

”مگر جب میں نے ان سے کہا تو ان کے تاثرات..... وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔“

”کیونکہ جس چیز کو وہ اتنے سال پیسوں کے بد لے بیچتے آئے تھے، پہلی دفعہ وہ انہیں اپنے خاندان کی عزت کے بد لے بیچنی پڑی۔ یہ جھٹکا کسی کو بھی ہلا سکتا ہے۔“

حسین نے اثبات میں سر ہلایا، اور آنسو رگڑے۔ ”میں نے ان کی جان نہیں لی۔ لیکن میں پھر بھی قصور وار ہوں۔ بلیک میں اور

چینگ کی۔“

”حسین دنیا میں تمہارے آس پاس کوئی ایسا انسان نہیں ہے جس سے کبھی کوئی گناہ نہ ہوا ہو۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ گناہ کے بعد تم کیا کرتی ہو۔“

”میں نے توبہ کی تھی، سچے دل سے۔“

”توبہ نہیں ہوتی کہ اس گناہ کا ڈپریشن لے کر ہرشے تیگ کر بیٹھ جاؤ۔ توبہ مایوسی اور خودا ذیتی کا نام نہیں ہے۔“

”تو پھر کیسے کی جاتی ہے توبہ؟“ وہ ہلکا سابوی۔

”توبہ المصور کا مطلب ہے..... انسان کو احساس گناہ ہو، پھر نہ امیت گناہ ہو، پھر معافی مانگے اور اگر کوئی کفارہ ہے تو وہ ادا کرے۔ پھر دوبارہ وہ کام نہ کرنے کا عہد کرے اور پھر اچھے کام کرے۔ توبہ ثابت سوچ کا نام ہے۔ فریش اشارث لینے کا۔ نئی زندگی کے آغاز کا۔“

”اور پھر سب معاف ہو جاتا ہے؟“

”ہاں سب معاف ہو جاتا ہے۔ مگر ہر گناہ سے بڑا گناہ پڑتے ہے کیا ہے؟ اپنے گناہوں کو حصی فائی کرنا۔“

حسین نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلادیا۔ اسے بے اختیار اپنی کتاب اور شیخ یاد آرہے تھے

”ہاشم سے یوں بات کرنا، ایک گیزام سے بڑی چینگ ہے۔ یہ سعدی اور فارس کے ساتھ چینگ ہے۔“ اس کا فون بجھنے لگا تو گفتگو ختم ہو گئی۔ حسین اٹھ کھڑی ہوئی۔ زمر نے موبائل اٹھاتے ہوئے اسے پکارا۔

”مجھے وہ پین مل گیا ہے حسین۔“ حسین نے چوک کراہے دیکھا۔ ”مگر اس کی بیڑی ختم ہے۔ اس کا چار جرڑ ہونڈ دو مجھے، اور تم اس کو کھول لیں گے۔ ابھی فارس یا احر کو نہیں بتانا۔ مجھے کسی پہ اعتمان نہیں ہے۔“

اس کو وہ چھوڑ کر مرحوم گل خان کی تلاش میں نکل آئی۔

جو تھے سے عہد و فاستوار کرتے ہیں!

چند منٹ بعد وہ اس زیر تعمیر مکان میں کھڑی تھی۔ وہ اب تعمیر کے آخری مرحلے میں تھا۔ دروازے لگ چکے تھے۔ سینٹ ہو چکا تھا۔ ایسے میں اس کی حజمت پہنے ایک کرے (جو تین ماہ پہلے کھلا میدان تھا، اور جہاں سارہ چھپی تھی)۔ گل خان ساتھ کھڑا مایوسی سے ادھر تھا۔

ادھر زمین پہ باتھ مارہ تھا۔ پھر باتھ جھاڑتے اٹھا۔

”وہ موتی ادھر ہی چکے تھے باجی۔ بعد میں فرش برابر ہوا تو گم ہو گئے۔“

”کس کے موتی؟ اور تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا کہ سعدی کا کی چین تھیں کہاں سے ملا؟“ وہ دونوں اب گھر کی سڑھیاں اتر رہے تھے۔

”باجی ہمارا تیا ادھر زمروں کرتا ہے اسے سعدی بھائی نے یہاں نوکری دلو اکر دیا تھا۔ بھائی کو گولی لگنے کے تیر سے یا چوتھے دن اس گھر کا ٹھیکیدار ہمارے گھر آیا تا یہ کو بولا کہ کسی عورت کا پرس ادھر گرا ہے اس گھر میں، کس نے اٹھایا ہے؟ تا یہ نے بولا ہم ڈھونڈ دے گا۔ وہ ٹھیکیدار چلا گیا۔ مگر باجی یہ جو گل خان ہے نا، اس کا کھوپڑی بہت چلتا ہے۔“ وہ اب مرچ مسالہ لگا کر پورے ایکشن کے ساتھ کہا بھائی یہاں کر رہا تھا۔ ”ام کوتا یہ پہنچ ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ام نے تا یہ کا جاؤ گیا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ الماری سے ایک گلابی رنگ کا بُونہ نکال کر دیکھ رہا ہے۔ اس کو یہ ادھر چھپت پڑا اٹھا۔ اس کا دو موتی ٹوٹا ہوا تھا اور سیمنٹ میں چکا تھا۔ تا یہ نے پرس اٹھا کر اس جگہ بھری ڈال دی۔ یہ سارے باتے اس نے اگلے دن ٹھیکیدار کو بتایا۔ ٹھیکیدار بہت دیندار آدمی ہے پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے اور صرف دو نائم ہیروں پیچتا ہے، مگر اس نے کہا کہ بُونہ عورت کو واپس کرنا ہے۔ تو تا یہ نے اس میں سے تھوڑے سے پیے نکال کر الگ کیے اور بُونہ الگ رکھا۔ بس ادھر تیا یا سویا، ادھر گل خان نے الماری پہ چھاپا مارا۔“

وہ تخلی سے سنتی ہوئی چلتی جا رہی تھی۔

”مگر اندر کیا دیکھتا ہے، کہ ایک ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ یہ جگر جگر چکتی۔ اور بھی پیسے ہیں۔ ایک دو انگریزی کے کارڈ بھی تھے۔ اور باجی... اس میں سعدی بھائی کا چابی بھی تھا۔“

زمر نے چونک کراسے دیکھا۔ ”پھر؟“

”پھر ہم نے چابی اٹھایا۔ دیکھو باجی، ہم بھائی کا بہت وفادار ہے۔ ہم نے اسے حفاظت سے رکھا۔ پھر ہم پشور چلا گیا۔ واپس آیا تو...“

”تو اتنے دن مجھے کیوں نہیں دیا؟“

گل خان کی اس بات پہ سُنی گم ہو گئی۔ ”وہ... باجی... تمہارا بندہ ہر وقت آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ ام کو اس سے ڈر لگتا ہے۔“ سر کھجایا۔ مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ واپس مڑی۔

”مجھے اس ٹھیکیدار سے ملاؤ۔ فکر نہ کرو میں کی چین کا نہیں بتاؤں گی۔“

ٹھیکیدار کامنہ کھلوانے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے تھے وہ فرفرتا نے لگا۔

”ایک عورت تھی۔ اس نے چادر کر کھی تھی۔ چہرہ بھی ڈھک رکھتا تھا۔ وہ میرے پاس آئی اور اپنے پرس کا پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک وکیل ہے اور یہاں اس قتل کیس کے سلسلے میں آتی جاتی رہتی ہے، اس لئے پرس کو ٹوٹھی۔ میں نے ایک دو روز میں پرس ڈھونڈ کر دے دیا۔ وہ دوبارہ اسی گھر میں ملنے آئی تھی۔ اس نے پیسے بھی دیے مجھے مگر وہ خوش نہیں تھی۔ بار بار چاہیوں کے گچھے کا پوچھتی تھی۔“

”کوئی اور بات جو اس کے بارے میں یاد ہو؟“

وہ سوچنے لگا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں میڈم جی۔ دلبی پتی تھی، لڑکی ہی لگتی تھی۔ ہاں رنگ گورا تھا اور آنکھیں ہلکے رنگ کی تھیں۔ نیلی بزرگ مری۔“

”اگر وہ کبھی دوبارہ آئے تو آپ اس نمبر پر مجھے بتائیں گے۔“ ایک کارڈ اسے کپڑا تے ہوئے اس نے تاکید کی تھی۔ جب وہ واپس

لئی تو سوچ میں گم تھی۔ ریسٹورانٹ میں داخل ہوئی اور سیدھی اوپر چڑھتی گئی۔

نیچے ریسٹورانٹ میں اکاڈمیا لوگ تھے۔ خین کونے والی میز پر آبیٹھی اور ہتھیل پر چہرہ گرا یا۔

(میں تو بہ کرچک ہوں، معافی ماگ چکی ہوں، مگر ہاشم کو کیسے چھوڑوں؟ نہیں انہوں نے بھائی کو کچھ نہیں بتایا، مگر مجھے پھر اتنا

شک کیوں ہے؟)

سر جھنک کر خین نے سیل فون نکالا اور پھر دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے آن لائن قرآن ڈاؤن لوڈ کیا۔ کتنے عرصے سے اس نے قرآن نہیں پڑھا تھا۔ اس کو وہ ایسے سمجھ نہیں آتا تھا جیسے سعدی بھائی کو آتا تھا۔ حالانکہ سعدی اور سیم نارمل ذہانت کے لوگ تھے، جیسے تو وہی تھی، تو

ساری ماتھیں لوگ کیوں کھاتے ہیں؟  
قرآن کھلا تو وہ بے دلی سے انگوٹھے سے اسکرین اور کرتی گئی۔ صفحات اور نکتے گئے۔ بالآخر ایک جگہ وہ رکی۔ آنکھیں بند کیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب جو بھی وہ آیت پڑھے گی، اس پر عمل کرے گی، چاہے وہ یہ کیوں نہ کہے کہ عورتوں کو چھپے دوست نہیں بنانے چاہیے، یا پر وہ کرنا چاہیے یا نگاہوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔

آنکھیں کھولیں اور اسکرین کو دیکھا۔

”اور اللہ ہی ہے جس نے اتار آسمان سے پانی تاکر زمین کو اس کی موت کے بعد اس سے زندہ کر دے۔ بے شک اس میں ایک نشانی ہے اور ان لوگوں کے لئے جونگوڑے سنتے ہیں۔“

(ہوں۔ بارش کا ذکر ہو رہا ہے بیہاں۔ گذ۔ آگے چلو) اس نے اگلی آیت پر نظریں مرکوز کیں۔

”اور تمہارے لئے بے شک چوپائے مویشیوں میں ایک نشانی ہے۔ ہم تمہیں پلاتے ہیں ان کے پیٹوں سے خون اور گوشت کے درمیان سے خالص دودھ جو نوشگوار ہے پینے والوں کے لئے۔“

(مطلوب کر...؟ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ خون اور گندگی کو دودھ سے ملنے نہیں دیتا، یوں ہم خالص دودھ پی لیتے ہیں؟

ٹھیک ٹھیک!

”اور چلوں میں بھورا اور انگور۔ تم ان سے بنا تے ہونشا آور چیزیں اور اچھا رزق۔ بے شک اس میں ایک نشانی ہے اس قوم کے لئے جو عقل رکھتی ہے۔“

(مطلوب کر...؟ انہوں۔ شراب کا میں نے کیا کرنا ہے؟ آگے چلو۔)

”اور تمہارے رب نے وحی کی شہد کی بھی کی طرف کہ بنالے اپنا گھر پہاڑوں میں اور درختوں کے اوپر، اور انچی چھتوں پر۔ پھر کھاتام پھولوں میں سے اور چل اپنے رب کے آسان راستوں پر۔ ان (شہد کی بھیوں) کے پیٹوں سے نکلتا ہے ایک مشروب، مختلف سے ہیں جس کے رنگ، شفا ہے جس میں لوگوں کے لئے بے شک اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جونگوڑہ کرتے ہیں۔“

خین نے ایک دم موبائل التار کھدایا۔ یہ تو وہی آیت تھی جو وہ آج تیری بار...؟ کوئی سننی خیز لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑائی تھی

گردن پر ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ ایسے لگا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔  
(ابن، مجھے نہیں پڑھنا قرآن نہ شیخ کی کتاب۔ یہ سب چیزیں ذرا تی ہیں۔) جھر جھری لے کر اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ بہت

دن بعد اس کا دل تھا کہ وہ کچھ کھائے، کچھ اچھا، اتنا اچھا کہ سب بھول جائے۔

.....❖❖❖.....

آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دیکھتا ہوا پھول ..... مجھ کو لوٹا دو مری عمر گزشتہ کی کتاب  
حنین نے اگلے تین چار روز خود کو کھانے، اُنہی وی، کپیوڑے گیم اور ہاشم میں مصروف کر لیا، مگر بے سکونی بڑھ گئی تھی۔ نہ ان چیزوں میں  
دیکھی رہی تھی اُنہاں سے اعتبر رہا تھا، زمر کے پاس بھی نہیں گئی نہ دل لگا کر پین کیمرہ کا چار جڑ ہوئا۔ زمر نے بھی اس سے دوبارہ بات نہیں کی۔  
بچھے تبردار اے روز حنین نے ہتھیارہ اُل دیے، اور ای کا قرآن کا نوحہ اٹھائے، کاپی پین لیے، فوڈی ایور آفزر یسٹورانٹ کے اوپر کمرے میں آ  
بیٹھی جہاں آج زمر نہیں تھی۔

اب حنین نے وہ آیتِ نحل ایک بڑے کاغذ پر لکھی اور سر پر دو پڑے لیے، ہاتھ میں قلم پکڑے..... اس پر غور کرنے لگی۔ آن لائن تفسیر بھی  
پڑھی۔ شہد کی افادیت، شہد سے شفا۔ ایک دم دو چوکی۔ شیخ کے بیمار سے اس کو اپنا خیال آتا تھا۔ تو کیا اس کے مرضِ عشق کی شفا بھی شہد میں تھی؟  
کیا اس بات کی کوئی سینس بنتی تھی؟

کچھ سوچ کر جنید کو پکارا جو کسی مہمان کو اٹھینڈا کر رہا تھا۔

”سنوجنید بھائی۔“ وہ آیا تو وہیں کھڑے کھڑے پوچھنے لگی۔ ”یہاں آگے پیچھے کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے خالص بالکل  
خاص شہدمل سکے؟“

جنید نے اچھبھے سے اسے دیکھا۔ ”مجھے نہیں پتہ۔“ جانے لگا، پھر دوبارہ عجیب انداز میں اسے دیکھا۔ ایک دفعہ سعدی بھائی نے  
بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا۔“

”کیوں؟“ دو چوکی۔

”پتہ نہیں۔“ وہ خود عجیب سے اچھبھے کا شکار، اپس لوٹ آئی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

ہر آئے دن یہ خدا وندگاں مہر و جمال ..... لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں  
ان سب سے دو سمندر پار.... سعدی یوسف اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اب کے وہاں کونے میں ایک اسٹڈی ٹیبل نظر آتی تھی جس پر  
صف جریل رکھا تھا اور وہ پین سے اس پر بے خیالی میں تکونیں بنارہ تھا۔ آج نئی میرون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی خاص تبدیلی نظر نہ  
آتی تھی۔

دروازے کالاک کھلنے کی آواز آئی، اس نے سر اٹھایا۔ دو گارڈ ز اندر داخل ہوئے اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔  
وہ اٹھا اور ان کے ہمراہ پہلی دفام کمرے سے باہر آیا۔

باہر کوئی لاونچ، ڈرائیگ روم ناپ پکھنہ تھا، جیسا کہ اس کا گمان تھا۔ پلکا ایک قدرے کلام کرہ تھا، جس میں اُنہی وی لگا تھا۔ کونے میں  
چند کر سیاں رکھی تھیں۔ وسط میں جھوٹی میز اور اس کے گرد دکر سیاں۔ ایک کرسی پر وہ شخص زینکا کے گرے سوت میں ملبوس، قیمتی پر فیوم کی مہک میں  
بسا، ناگ پٹا ناگ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر سعدی کا سارا خون سست کر آنکھوں میں آگیا، مگر نہ وہ کچھ بولا، نہ آگے بڑھ کر اس کا گریبان  
پکڑنے کی کوشش کی، بس شر بار نظر وہیں سے اسے دیکھتا، میز کی دوسری طرف پچھی کریں۔ آب بیٹھا۔

کمرے میں سعدی کے پیچھے دو گارڈ ز تھے، تین گارڈ ز دروازوں پر تھے۔ پکن کی چوکھت پر مودب سی میری کھڑی تھی۔  
”ہیلو! گین سعدی!“

وہ چپ رہا۔ صرف اسے چھپتی نظر وہیں سے گھوٹا رہا۔ ہاشم کا ردار نے گھری سانس لی۔  
”یو آر ویکم!“ نظر کیا۔

سعدی کے بیوی پتلخ مسکراہٹ آٹھبری۔ ”تمہیں لگتا ہے کہ اپنی جان بچانے پر میں تمہارا شکری یاد کروں گا؟ انہوں!“ مسکراہٹ سہٹ کر صرف تپش رہ گئی تھی۔ ”پچھلے تین ماہ سے میں اگر کسی کے جسم میں تین گولیاں اتنا رنا چاہتا ہوں، کندھے پیٹ، اور ٹانگ میں تو وہ نو شیرواں ہے، نفرت ہو گئی ہے مجھے تمہارے بھائی سے۔ لیکن اس کے باوجودو... حق یہ ہے کہ نو شیرواں مجھ تسل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہترین نشانہ باز تھا، ذرا سی کوئی کے باوجود اس کا نشانہ خطا نہیں ہونا چاہیے تھا وہ مجھے سر میں گولی مار سکتا تھا، سینے میں بھی مار سکتا تھا، مگر اس کو خود بھی علم نہیں کوہ مجھے گولیاں صرف اس لئے مار ہاتھا تک مجھے نیچے گرا کر اپنے بوٹ سے مار سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی گولیوں سے میں مر سکتا تھا اور میں اس کے لئے اسے بھی معاف نہیں کروں گا۔“ ذرا شہرا۔ ”لیکن اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم نے مجھے بچایا ہے، تو خود کو آئینے میں دیکھو،“ نفرت سے اسے دیکھتا ہو کہہ رہا تھا۔ ”کیونکہ تم اپنے بھائی سے کہیں زیادہ sick ہو۔ جو الفاظ تم نے میری بہن کے بارے میں کہے، حق کہوں تو تم سے امید نہیں تھی اس گھٹیاپن کی، لیکن پھر سوچا جو قبول کر سکتا ہے وہ پچھلے بھی کر سکتا ہے۔ ایک دفعہ پھر کہوں گا، میری غیرت کو لکا کارنے سے پہلے آئینے میں دیکھنا، کیونکہ یہ الفاظ اس شخص کے منہ سے مصلحہ خیز لگتے ہیں، جو نہ اپنی بہن کی حفاظت کر سکا، یہاں تک کہ وہ جیل چلی گئی، نہ اپنی سابقہ بیوی... خیر... سر جھکا۔ ”میں تمہارے لیوں پر گر کر تمہارے والی زبان استعمال نہیں کر سکتا۔“ حالانکہ اس نے یہ فقرے تیار کر کر لئے تھے، ہر مرد کی طرح اس کو بھی غصہ تھا، لیکن بولنے کا وقت آیا تو اسے پستہ تھا وہ ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔

ہاشم کا رد ارائگی اور انگوٹھے کے درمیان رخسار کئے، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھا سنتا ہا۔ ”تمہاری تقریریں مجھے پسند ہیں، مگر ان کو مجھ پڑائی ملت کیا کرو۔ اگر تم کہہ چکے تو اب سنو!“ سعدی پچھی اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ ”تم میرے آفس آئے، تم نے میرے خاندان کو دھکایا، تم نے میرے بھائی کو گالی دی...“

”مجھے ان دو الفاظ پاپا فوس تھا، مگر کیا وہ اتنے بڑے تھے کہ تمہارا آدھے مرد جتنا بھائی مجھے گولیاں مار دے؟ عزت، غیرت صرف تم لوگوں کی ہے؟ ہمارے سامنے ہماری عورتوں کی بات کرو اور ہم چپ چاپ سن لیں؟“

”میری بات دوبارہ مت کاٹنا!“ ہاشم نے انگلی اٹھا کر اس کو تنبیہ کی۔ ”تم نے میرے بھائی کو گالی دی، اس نے اپنا انتقام لیا۔ اس کے بعد بھی میں نے تم پر حرم کھایا اور تمہیں بچایا۔ میں تمہیں یہاں لے آیا، تمہارے اوپر اتنا خرچ کیا، اس کے بعد تم مجھے کال کر کے ایک لست تمہارتے ہو، کہ تمہیں یہ یہ چیز چاہیے۔“ استہرا ایسے مسکرا کر سر جھکا۔ ”جیسے تم یہاں پنک پہ ہو!“

”کیا تم اتنی دور مجھے انکار کرنے آئے ہو؟“

”اوہ، میں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہیں تھوڑی بہت سہولتیں مل سکتی ہیں، اور تمہاری فیملی کو تحفظ، خصوصاً تمہاری بہن کو اگر تم....“

”میری بہن کا دوبارہ نام مت لینا!“ اس کی آنکھیں سرخ ہوئیں، بلند آواز سے غرایا۔ مگر وہ کہہ رہا تھا۔

”اگر تم مجھے وہ دُو جو میں چاہتا ہوں۔“ کہتے ساتھ ایک فولڈر اس کے سامنے رکھا۔ سعدی نے شر بر انظرنوں سے اسے گھورتے فولڈر پاٹکھیں جھکائیں۔ پہلے صفحے کے چند الفاظ پڑھے۔ پھر اس کے ابر و تجуб سے سکڑے۔ اس نے کاغذ اٹھا کر دیکھے۔

”تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں بتاؤں، کہ جس کو ملے پہ ہم کام کر رہے ہیں، اس کی بیٹی یو دیلو کیا ہے؟“ ناگواری سے ہاشم کو دیکھا۔ (یہ کوئلے کی heating values ہوتی ہے۔) ”ہمارے کوئلے کی density، porosity --- اس کا moisture content --- یہ باتیں تم مجھے سے پوچھ رہے ہو؟ یہ کافی نیشنل معلومات ہیں، میں یہ نہیں دے سکتا۔“

”اس کے علاوہ بھی کچھ پوچھا ہے میں نے۔“ ہاشم نے اسی سکون سے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔ سعدی نے بڑھی سے اسے دیکھا۔

”ہماری experimental demonstration“ ہمارے سارے لیب درک کا ڈینا، تم چاہئے ہو کہ میں تمہیں یہ سب بتاؤں، کہ کیسے

ہم اپنے پروجیکٹ کو scale up کریں گے؟ ہاشم کاردار، ہم نے راتوں کو جاگ جاگ کر تحریر کے اس بیابان میں کام کیا ہے، جس دن ہم نے پہلی دفعہ گیس بنا کر شعلہ جلا یا تھا، اس دن اس پراجیکٹ کے ہر سائنسدان، ہر نجیسٹر اور ہر مزدور کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تم آنکھیں نے اس ملک کی بجلی کا پیڑ اغرق کر دیا ہے۔ ہم تم جیسے IPPs کی تیل کی سیاست سے اس ملک کو نکالنا چاہتے ہیں، اور تم سمجھتے ہو کہ سعدی یوسف اتنا بے غیرت اور بے ضمیر ہے کہ وہ اتنی بڑی امانت ایک آئی پی پی کے مالک کے حوالے کر دے گا؟“ پھر پیچھے ہو کر بیٹھا۔

”ہم جو بھی کرتے ہیں، قانون کے مطابق کرتے ہیں۔“

”ہا!“ سعدی نے سر جھکا۔ ”میں بتاتا ہوں کہ تم کیا کرتے ہو۔ ادھر آؤ میری، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“ اسے اشارہ کیا۔ وہ متذبذب سی چل آئی۔

”میں تمہیں سادہ زبان میں سمجھاتا ہوں، مشکل اصطلاحات استعمال کر کے اپنی معلومات کارب نہیں سمجھاڑوں گا۔ تمہیں پتہ ہے میری آئی پی کون ہوتے ہیں؟ Independent Power Producers۔ یہ پارائیوٹ اور خود مختار ادارے ہیں۔ تمہارے مالک بھی ایسی ہی ایک کمپنی کو چلا رہے ہیں۔ یہ لوگ فرنیس آنکھ سے بجلی بنا کر حکومت کو پیچتے ہیں۔ بد لے میں جب لوگ بل ادا کرتے ہیں تو اس مل سے یہ مزید تیل خرید کر مزید بجلی بناتے ہیں۔ یہ سائیکل چلتا رہتا ہے۔ لیکن ماشاء اللہ میرے ملک پاکستان میں امیر لوگ بجلی کے بل ادا نہیں کرتے۔ یوں سمجھو کر پندرہ نکڑے چاہیے ہیں بجلی کے ملک کو، لیکن بل تیرہ کا ادا ہوا ہے، تو اگلی دفعہ آئی پی پی تیرہ نکڑے بجلی بنائے گی۔ یوں چند گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ ہو جائے گی۔ مگر پھر ہوا یوں کہ نوے کی دہائی میں ہماری حکومت نے ان آئی پی بیز کے ساتھ معاملہ کیے، جہاں بہت سی کمپنیز یوں سمجھو کر دور پے کی بجلی بنا کر حکومت کو چار روپے میں بینچا چاہرہ ہی تھیں، وہاں حکومت نے ان آئی پی بیز کے ساتھ معاملہ کیا جو دور پے کی بجلی حکومت کو بیس روپے میں بینچتی ہیں۔ کیونکہ اس میں روپے کا میں پر سینٹ اس شخص کی جیب میں جانا تھا جس کو ہم مسٹر نہیں پر سینٹ کہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قانونی بات سنو، میری اینجینئری حکومت نے ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے کہ چاہے یہ ایک نکڑا بجلی بنا میں، چاہیں پندرہ نکڑے، حکومت ان کو انہی پندرہ نکڑوں کی بجلی کے پیسے دیتا رہے گی۔ اب یہ قانونی لوگ ہر سال دس، یا

آٹھ نکڑے بجلی بناتے ہیں، ان کا کیا جاتا ہے۔ جن دنوں زیادہ لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہاشم کاردار جیسے لوگوں کا موڈنیس ہے زیادہ تیل خریدنے کا، اس لیے یہ کم بجلی بنا میں گے۔ یہ ہوتا ہے شارت فال۔ یہ ہے وہ لائن لاسر، لائن لاسر کی گردان کی حقیقت۔ پاکستان میں کوئی لوڈ شیڈنگ نہیں ہے، کوئی بجلی کا بحران نہیں ہے، یہ صرف آئی پی پیز ہیں، جب ان کو پندرہ نکڑوں کے پیسے مل رہے ہیں تو یہ بھلے ایک نکڑا بھی بنا میں، ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔“ بول بول کروہ سانس لینے کو رکا۔ ہاشم نے اشارہ کیا تو میری واپس مرجانی۔

”اب تم ہمارے پراجیکٹ کی معلومات چاہتے ہو تاکہ اس کو ایک کر کے پراجیکٹ کو سبوتاؤ کر سکو؟ پہلے تمہاری آنکھ لای کی وجہ سے تھر کوں کو حکومت پیسے نہیں دیتی۔ مزید کتنا نقصان دو گے تم لوگ اس ملک کو؟“ تمہیں رات کو نیند کیسے آ جاتی ہے؟“ دکھ، صدمے اور برہمی سے وہ بولا۔ ہاشم خاموشی سے ستر رہا۔ اسے کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”تمہاری تقریبی ہو گئی؟“

”میرا جواب ناں میں ہے، تم جاسکتے ہو۔“ فولڈر بے زاری سے واپس ڈالا۔ ہاشم چند لمحے چھپتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ ”تم وہ گفتگو بھول گئے ہو گا لیا جو پچھلی دفعہ یہاں آ کر میں نے کی تھی؟“

گود میں رکھی سعدی کی مٹھیاں پھین گئیں، مگر اس نے خود کو مٹھدار کھانا چاہا۔ (نمیں سعدی، وہ تمہیں توڑنا چاہتے ہیں۔ تم نے نہیں

”وہ گلگوجس میں تم نے میرے خوف سے مجھے مفلوج کر دیا تھا؟“

”میں وہ ایک... ایک لفظ دوبارہ دھرا سکتا ہوں، مگر تمہیں تکلیف ہو گئی بچے۔ اور میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔“

”تمہارا محبت کا فلسفہ تمہاری ہی طرح کر پڑتے ہے۔ تم اپنے محبوب لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔ تم نے کبھی نوشیروال کو بڑا بھیں ہونے دیا، وہ ایک ایک چیز کے لئے تمہارا محتاج ہے۔ تم نے شہرین کے ساتھ بھی بیٹی کیا۔ اسے اپنی مرضی کے ساتھی میں ڈھانے کی کوشش کی۔ تم مجھے پسند کرتے ہو، میں جانتا ہوں، کیونکہ مجھے تو سب پسند کرتے ہیں۔“ کندھے اچکا کر بظاہر لاپرواہی سے بولا۔ دل میں امتحنے کو دہانے کی کوشش کی۔ ”تم نے مجھے اس لئے نہیں بچایا کہ تم مجھے پسند کرتے ہو۔ تم اپنے بھائی کو گلکٹ سے بچانا چاہتے تھے، اور مجھے اس کی کمپنی کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے، مگر... میں... رُک رک بولا۔“ میں... نوشیروال... نہیں ہوں!

ہاشم کوٹ کا بہن بند کرتے ہوئے اٹھا۔

”تمہارے پاس تین گھنٹے ہیں۔ سوچ لو۔ میں ایک کام سے جارہا ہوں۔ مجھے واپسی پر یہ کاغذ بھرے ہوئے ملنے چاہیں، ورنہ تمہاری ہٹ دھری کی قیمت تمہاری بہن ادا کرے گی۔“

سعدی نے سختی سے میز پر ہاتھ جمادیے۔ پھر خود کو روکا۔ اس نے ایک مہینہ اس دن کے لئے مشق کی تھی۔ وہ اتنی جلدی نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔

”تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جاؤ اپنے کام بھیتاو۔“

”تین گھنٹے!“ ہاشم نے کلائی کی گھری دکھاتے ہوئے تمہیہ کی اور گارڈ زوکوا شارہ کرتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

چند منٹ بعد وہ واپس کمرے میں موجود تھا، مگر اب کی بار انہوں نے کمرے کا صرف شیشہ کا دروازہ بند کیا، دوسرا لکڑی کا دروازہ کھلا رہنے دیا۔ یہ اسی دن سعدی کو معلوم ہوا تھا کہ اس کے کمرے کے دروازے تھے۔ لکڑی کا اندر کی طرف کھلتا۔ شیشے کا باہر کی طرف۔ لکڑی کے دروازے پر دلا کس لگتے تھے اور شیشے والے پر نمبر ز پیڈ۔ یعنی وہ کوڈ سے کھلتا تھا۔

اب وہ بیٹھا لادنخ نما کمرے میں مستعد گارڈ زد کیھے کرتا تھا۔ فولڈرز اور پین بیٹھ پر ساتھ رکھا تھا۔ اور میری قریب کھڑی کہہ رہی تھی۔

”وہ جو کہہ رہا ہے، کرے گا بھی سکی۔“

”جب مشورہ مانگوں تب دینا۔ ابھی مجھ سے بات مت کرو۔“ منہ پھیر لیا۔ میری سر جھٹک کر باہر نکل گئی۔

..... ♦♦♦ .....

کون قاتل بجا ہے شہر میں فیض ..... جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی  
ہاروں عبید کے گھر کے آرام دہ اور کوزی لوگ روم میں ٹوی چل رہا تھا، اور وہ صوفے پر بیٹھے چند کاغذات دیکھ رہے تھے۔ ساتھ  
آبدار بیٹھی گا ہے ان کو دیکھتی تھی، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ تھی ایرانی بلی دوڑتی ہوئی آئی اور جست لگا کر آبدار کی گود میں بیٹھ گئی۔ ہاروں  
نے (انہوں) فنگی سے بلی کو دیکھا پھر اسے۔

”آبی، اپنی ملیوں، گھوڑوں اور پنزوں کو گھر کے اندر مت لایا کرو۔“ ٹوکا مگر زری سے اور کاغذ دیکھنے لگے۔ آبدار نے تو جیسے نہیں  
نہیں، آلتی پاتی کر کے اور پر ہو بیٹھی، اور بلی کی نرم کھال پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی۔

”بابا، آج آپ اتنے دن بعد دوپہر میں گھر پہنچے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں میں چائیز بنائیتی ہوں، پھر ہم ساتھ لفٹ کریں گے۔ ملک؟“

”نبیں مجھے ایک لمحہ پر پہنچا ہے ابھی۔ یاد آیا، مسز کاردار نے ویک اینڈ پر ہمیں کھانے پر بلایا ہے۔ تم چلوگی؟“

اور انہوں نے دیکھا ہی نبیں کہ چائیز کا پلان کینسل ہونے پر آبی کی آنکھوں کی جوت کیسے بھگی ہے۔ ہلاک سانپی میں سر ہلایا۔ ”نبیں ہے جانے کا۔ اس دن بھی تو گئی تھی ناہشام کی عیادت کے لئے اب اگر وہ لوگ آئے تو پھر جاؤں گی۔ روز روڑ جاتے اچھا نہیں لگتا۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ کاغذات دیکھتے رہے۔ آبدار سر جھکائے بلی کوست روڈی سے سہلاتی رہی۔ ”مسز کاردار کو آپ کا تختہ کیما لگا؟ آپ نے بتایا نہیں۔“ دل کو پھر سے جوڑ کر گفتگو کا آغاز کیا۔

”انتا قیمتی بریسلیٹ کے اچھا نہیں لگے گا؟“

”میں اس شعر کی بات کر رہی ہوں بابا جو آپ نے مجھ سے لکھوایا تھا، مَنِ الْمَاسِ رَأَبْ مَلَكَ دَادَم۔“

”میں نے تمہیں انگریزی میں لکھنے کے لیے کہا تھا، تم نے فارسی میں لکھ دیا۔“

”کوئیں کو سمجھا آگیا ہوگا۔ خیر کیسی ہیں وہ؟ آپ لوگ ابھی بھی اپنے کارٹیل میں ساتھ کام کر رہے ہیں نا۔“

تب ہی ہارون کا فون بجا۔ آبدار نے اچک کر اسکرین دیکھی۔ ہاشم کاردار کا لنگ۔

”اوہ۔ پہلے میں بات کرلوں۔ میں نے اسے اس دن سے کال بیک ہی نہیں کیا۔“ اس نے موہائل لینا چاہا۔ انگر ہارون نے سختی سے فون پیچھے کر لیا۔ ”یہ تمہارے لئے نہیں ہے۔“ ایک دم سارے کاغذ چھوڑ کر وہ فون کان سے لگائے اٹھ گئے۔ آبدار متوجہ سی بیٹھی رہی۔ پھر کاغذوں کو دیکھا۔ وہ محض بزر تھے۔ تو باہاتی دیر سے ہاشم کی کال کا انتظار کر رہے تھے۔

”دشش،“ بلی کو تھپک کر بھگایا، اور پھر سنگے پاؤں سچ کچ کر چلتی ان کے پیچھے آئی۔ وہ گیلری سے گزر کر اسٹڈی روم میں چلے گئے تھے اور اب دروازہ بند تھا۔ وہ دبے قدموں دروازے تک آئی اور اسے ہلاکا سادھکیلا۔ بنا آواز کے وہ ذرا سا کھلا۔ ہارون دوسرا طرف رخ کیے بات کر رہے تھے۔ آبدار آنکھوں میں معصومی شرارت لئے سختی رہی۔ اس کی برتھڈے اگلے ماہ تھی۔ ہاشم اس کی ساگرہ پا انوکھے تختے بھیجا کرتا تھا۔ بابا بھول جاتے تھے تو کیا ہوا؟ ہو سکتا ہے اس سال وہ.....“

”تمہارا تھکوں والا Scientist کہاں تک پہنچا ہاشم؟“ وہ کہہ رہے تھے۔ ”تمہیں یقین ہے وہ تمام معلومات فراہم کر دے گا؟“

ذر اٹھہرے۔ ”میں عجلت اس لئے چارہا ہوں کیونکہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں چائیز رجڑڑ کمپنی جلد از جلد شروع کرنی ہے۔“ وہ ناخوشی سے کہہ رہے تھے۔ آبدار کی آنکھوں کی شفوقی الجھن میں بدالی۔

”میں نے لڑکے کو ملک سے باہر بھیجنے اور اس کو اپنے سیف ہاؤس میں رکھنے میں تمہاری جتنی مدد کی تھی! اب تم بھی اتنی ہی جلدی مجھے کوئی رزلٹ دو ہاشم!“

وہ مرنے لگے تھے۔ آبدار فوراً لئے قدموں والپس بھاگی۔ البتہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

یقیناً بابا کوئی غلط کام نہیں کر رہے وہ کسی سائنسدان کی حفاظت کر رہے تھے۔ مجھے کیا؟ مگر سر جھٹک دینے سے وہ سوچیں جھٹکی نہیں جا رہی تھیں، وہ جس چہرے کے ساتھ گئی تھی، اس کے ساتھ وہ اپنی لوٹی تھی۔



اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہنچا ہے، ..... جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھائے جائیں گے  
ہاشم واپس آیا تو گارڈز ہٹھکڑی لگے سعدی کو لئے اس کے سامنے آئے اور کرسی پہنچایا۔ ناگ پٹانگ جمائے کرد فر سے بیٹھے ہاشم  
کاردار نے سر کو خم دیا۔ ہاشم کو دیکھتا رہا۔ ایک گارڈ نے کاغذات لا کر میز پر رکھے اور ساتھ قلم بھی۔

”چار گھنٹے ہو چکے ہیں۔ تم نے ابھی تک لکھنا شروع نہیں کیا۔“ نارمل انداز میں سوال کیا۔

”میں جواب دے چکا ہوں۔“ لڑکے کی چھتی نظریں اس پر جی تھیں۔

”کیا چاہتے ہو؟ تمہاری بہن کو تمہارے سامنے فون کرو؟ اوہ سعدی؟“ افسوس سے سر جھکتا۔ ”کیوں مجھ سے ایسے کام کروانا

ماہتے ہو جو کرتے ہوئے مجھے افسوس ہوتا ہے؟“

سعدی کی آنکھیں سرخ ہوئیں۔ ”بار بار میری بہن کا نام متلو،“ وہ غرایا تھا۔ ”تم یہ سب اس لئے کر رہے ہو تاکہ میں اپنی فیملی سے بذریعہ ہو جاؤ۔“ گمراہیاں نہیں ہو گا کبھی ہاشم؟“

”حالانکہ ایسا ہو جانا چاہیے، کیونکہ تمہاری فیملی تمہیں بھول کر اپنی زندگی میں مگن ہو چکی ہے۔ اگر میرا بھائی کھویا ہوتا تو میرے پاس الہر چلانے کا وقت نہ ہوتا، مگر تمہاری بہن...“

وہ ایک دم بھوکے شیر کی طرح ہاشم پر جھپٹا تھا۔ ہھکڑی میں بند ہے ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ کر اس کی گردن دبو جنی چاہی، مگر

امم نے سختی سے اسے پیچھے ڈھکیلا۔ گارڈز نے بروقت اسے قابو کیا۔ وہ سرخ پسینے سے ترچھرے سے چلا رہا تھا۔ ”اللہ غارت کرے تمہیں، اللہ بر باد کرے تمہیں۔“ اس کی سرخ آنکھیں گیلی تھیں اور چلانے کے باعث آواز بیٹھنی تھی۔ ہاشم نے

ہماری سے کار رجھکتے میری نے جلدی سے رومال لا دیا جس سے اس نے گردن تھچپھائی جہاں ذرا سی خراش پڑ گئی تھی۔

گارڈز سعدی کو زبردستی بھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ تیز تیز سانس لیتا ہاپنے ہوئے مسلسل چلا رہا تھا۔ ہاشم رکھ کر چند لمحے سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔

”اپنی جذبہ ایتیت کو پرے رکھ کر میری بات سنو۔ کان کھول کر،“ آنکھوں میں سختی لئے وہ بولا تھا۔ ”تم یہاں اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہو، تمہیں اپنے سے بڑے دشمن نہیں بنانے چاہیے تھے،“ مگر تم نے بنائے۔ اب اپنے خاندان کو اپنی غلطیوں کی سزا ملت دو۔ پندرہ منٹ پہلے میں نے تمہاری بہن کو میتھج کیا تھا۔ کہ مجھے اس سے ملتا ہے۔ گھر میں نہیں۔ ایک ہوٹل میں...“ وہ موبائل نکالتے ہوئے بتا رہا تھا۔ سعدی گھرے مگرے سانس لیتا، نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے کہا کہ میراڑا نیور سے پک کر لے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ میں ملک سے باہر ہوں۔“ اسکرین اس کے سامنے کی۔ ”اس کا ڈی یو تیچ آیا ہے۔ یہ اصلی ہے۔ خود سن لو۔“ سعدی کی نظریں اسکرین پر ٹھہریں۔ اس پر واٹس ایپ کی گفتگو کھلی تھی۔ اور ”خین یوسف“ لکھتا۔ ہاشم نے نگاہیں سعدی پر جائے پلے کا بٹن دبایا۔

”اوکے، میں آ جاؤں گی، آپ ڈرائیور ہیچ دیں۔“ میں ریسٹورانٹ میں ہوں، مجھے واپس بھی ادھر ڈریپ کروائیے گا، مجھے بھی آپ سے بات کرنی ہے۔ بائے!“ خین کی مصروف الجھی آواز ختم ہوئی۔ سعدی کا دل کانپ کر رہا گیا۔ ہاتھوں میں لگی ہھکڑیاں کیا ہوتی ہیں، کوئی اس سے پوچھتا۔

”سو سعدی یوسف..... میراڑا نیور ٹھیک نہیں منٹ بعد اس کو پک کرنے جائے گا اور ایک ہوٹل میں چھوڑ دے گا۔“ سرد ہمراہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے تنا نے لگا۔ ”ڈونٹ وری،“ تمہاری بے وقوف بہن کو کچھ نہیں ہو گا، مگر میرے گارڈز اسے وہیں بند کر دیں گے اور صبح سے پہلے اس کو لوٹنے نہیں دیں گے۔ اور تمہاری جسمی فیملیز میں ایسا ایک واقعہ اس پرچی کی ساری زندگی بر باد کر سکتا ہے۔ سواب سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ خود بھی پیچھے ہو کر بیٹھا اور تسلی سے جیسے اسے مژدہ سنایا۔

”اللہ بر باد کرے تمہیں....“

”اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو یہ نمبر دیکھو لو۔ یہ تمہاری بہن کا ہی نمبر ہے۔ مگر شاپ اس نے تمہارے جانے کے بعد لیا تھا۔“ اس کو دیکھتے

ہوئے ہاشم نے خین کے نام پر لکلک کیا تو اس کی پر دو فالیں کھل گئی۔ سعدی کی بی بھری غصیلی نظریں ہاشم سے ہوتیں اسکرین پر ٹھہریں۔

اسکرین پر حمد کی پروفائل پکج تھی۔ اس کی اور سیم کی سیلی۔ نیچے ایک موبائل نمبر لکھا تھا۔ اور ساتھ ہی اس کا واٹس ایپ اسٹائنس۔

”وادی ربک ایں انخل!“ ساتھ میں ایک ویدیو یوکسٹرے کا نشان۔ اور لکھا تھا

۔ Updated 6 mins Ago سعدی ایک دم چونکا۔ ہاشم کو دیکھا۔

”آڈیو دو بارہ دکھاو۔“ ہاشم نے حکم کی تعییں کی۔ آڈیو پلے کی، مگر سعدی صرف آڈیو کا وقت دیکھ رہا تھا۔ وہ بیس منٹ پہلے کی تھی۔

خین کی آواز اس کی سماحت میں نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہ صرف اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ بیس منٹ پہلے؟ پچھے منٹ پہلے؟ کیمیکل انجینئرنے ذہن میں جمع تفریق کی۔ جواب گھائٹے کا نہیں تھا۔ پھر اس نے نیگاہیں اٹھائیں، مگر اب ان میں نہ غصہ تھا، نہ نفرت، نہ بے بھی بھرا دکھ۔

ان میں کوئی عجیب ساتاڑ تھا۔ ٹھنڈے گوشت جیسا۔

پھر سعدی نے گھری سانس لی، اور ذرا بیچھے کو ہوا۔

”سو؟“ کندھے اچکائے۔

”سو جتنی جلدی تم یہ کاغذ پر کر دو گے، اتنی جلدی میرے بندے تھاری بہن کو عزت اور حفاظت سے واپس چھوڑ دیں گے۔“

سعدی انہی نظروں سے اسے دیکھتا ہے۔ ”تم چاہو تو میری بہن کو اغوا بھی کر سکتے ہو، مگر تم ایسا نہیں کر دے گے، تم کوئی اور جرم افروز نہیں کر سکتے، اور چاہتے ہو کہ میری نظروں میں میری بہن کو گراو۔ ہے نا؟“ ابردھا کر پوچھا۔ اس کی آواز میں کاث تھی۔ ہاشم دونوں ہاتھ میز پر رکھ آگے ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانا کا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم زندگی میں پہلی دفعہ خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھو،“ ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔ ”اب جب اپنی بہن کے پچانے کے لئے تم یہ کاغذ پر کر کے ایک جرم کرو گے، تو تمہیں احساس ہو گا کہ انسان کو اپنے خاندان کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ پھر تم جانو کے کہ تم ہیر نہیں ہوئے میں ولن ہوں۔ بلکہ ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔“ زخمی سامسکرایا۔ ”آج ہم برابر ہو جائیں گے سعدی! کیونکہ جو کرنا ہوتا ہے وہ کرنا پڑتا ہے۔“

سعدی بھی آگے کو ہوا۔ (گارڈ زفروں اچوکس ہوئے) مگر اب وہ ہاشم پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر نہ لگا تھا۔

”میں اور تم... برادر نہیں ہیں، کیونکہ میں....“ کاغذ پر دھکیلے۔ ”ان کو پڑنہیں کروں گا۔“

”اوہ بے غیرت بننا پسند کرو گے؟ اپنی بہن کا کوئی خیال نہیں ہے؟“ اس نے گویا ملامت کی۔ سعدی بیچھے ہوا۔ سکرایا۔

”میری بہن تم سے ملنے نہیں آئے گی۔“

”یہ آڈیو جعلی نہیں تھی۔ یہ اصلی تھی۔ میراڑا بیسوار اب تک نکل چکا ہو گا۔ تھاری بہن واقعی آرہی ہے۔“

”مجھے پتہ ہے، یہ آڈیو اصلی ہے، مگر.... میری.... بہن.... نہیں آئے گی!“ چاچا کا لفاظ ادا کیے۔ ہاشم نے تاسف سے سر جھکا۔

”مجھے اس لڑکی پر ترس آرہا ہے۔ تم اس کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے۔ خیر، تم سوچ لو۔ ہمارے پاس پوری رات ہے۔“ گردن لی خراش کو سلٹے ہوئے وہ سکون سے بولا اور دور کھڑی میری کو لگا۔ سعدی پھر سے اس پر بچھے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

”وہ ابھی تمہیں کاں کرے گی، اور کچھ گی کہ تم گاڑی نہ بھیجو۔ تمہارے ڈرائیور کو خالی ہاتھ آنا پڑے گا، کیونکہ فارس غازی کی بہن

کے بیٹوں اثاث سے تم ایک لڑکی کو زبردستی تو لے جائیں سکتے۔“ اس کا اعتماد واپس آ رہا تھا۔ ہاشم کو پہلی دفعہ اچھا ہوا۔ وہ کیا اس کر رہا تھا؟

”تم نے شاید غور سے سنائیں، تھاری بہن میری بات روئیں کر سکتی وہ....“ جیب میں اس کا موبائل بجا۔ وہ ایک دم رکا۔ سعدی لی

زخمی سکراہٹ پھر سے نمودار ہوئی۔

”اٹھا وہ اس کا رد اور اپنے مکمل آن رکھو کیونکہ میری بہن ابھی تم پر غرائے گی اور میں وہ سننا چاہوں گا۔“

”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ مگر اپنا شوق پورا کرلو۔“ وہ اسی کروفر سے اٹھا اور گارڈ زو کا شارہ کیا۔ وہ اس کا ہرا شارہ پہچانتے تھے اس سے سعدی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس قید خانے میں لا یا جانے والا پہلا قیدی نہیں تھا۔ یہ کوئی دوسرہ ہاؤس کے طور پر استعمال نہ تھا۔

گارڈ زے سے واپس اس کے کمرے میں لے آئے۔ لکڑی کا دروازہ کھلا رہنے دیا اور شستے کا دروازہ مغلل کر دیا۔ سعدی بینخانیں، دروازے کے ساتھ کھڑا رہا۔ دیوار میں لگا انٹر کام کی طرح کا اپنیکر ایک گارڈ نے چلا دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ ہاشم نے اپنے سیل کو کس طرح اس سے جوڑ رکھا تھا، مگر اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کو ان کی گفتگو سنائی دے سکتی تھی، مگر سعدی کی آواز نہیں جاسکتی تھی۔  
ہاشم کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ جب دروازہ بند ہو چکا اور اس نے اپنے قیدی کو شستے کے دروازے پر ہاتھ جمائے خود کو دیکھتے پایا تو لال انھالی۔

”ہیلو جنین!“ خونگوار لبجے میں بولا۔ نظریں شستے کے پار سعدی پر جمی تھیں۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ گہرے سانس۔  
”جنین؟“ ہاشم نے پھر پکارا۔

”آپ نے ڈرائیور بھیج دیا؟“ سپاٹ سانداز تھا۔

”ہاں! بھیجنے والا ہوں۔ تم تیار ہو؟“ طنزی نظریوں سے سعدی کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھا۔ پھر خاموشی۔  
”نہیں، میں نہیں آ رہی۔ ڈرائیور واپس کر لیں۔“

سعدی کی انھی گردان مزید انھگی۔ ہاشم پر جمی چھپتی نظریوں میں ملامت در آئی۔

ہاشم کا رد اور کو ایک دم گردان کی خراش میں شدید درد ہوا۔ اسے لگا اس نے غلط سنایا ہے۔

”کیا مطلب؟ مجھے تم نے ابھی کہا، تم؟“

”مجھے پتہ ہے میں نے کیا کہا، اور اب میں کہہ رہی ہوں کہ میں نہیں آ رہی، سو نہیں آ رہی، باٹ ختم!“

شستے پر دونوں ہاتھ رکھے سعدی نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس اندر اتاری۔

”کیا مطلب؟ مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی جنین۔“ ہاشم کا گلادوب رہا تھا۔ میز پر رکھے کاغذ دیکھتے اس نے نائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ ہاروں کو کیا جواب دے گا؟

”رات کو گھر آئیے گا، ماموں کے سامنے کر بیجھے گا جو بات بھی ہو۔ آخ راپ ماموں کے کزن ہیں، اتنا تو حق ہے نا آپ کا۔“ وہ سرد مہری مگر گلی سی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”اوپلیز مجھے ہر وقت کا لست کریں۔ میں آپ سے رشتے دار سمجھ کر کبھی بات کر لیتی ہوں تو آپ اس کا غلط فائدہ مت اٹھایا کریں۔“

ہاشم نے متعجب سے ہو کر دروازے کو دیکھا۔ سعدی اسی طرح وہاں کھڑا رہا تھا۔ ہاشم کے ماتھے پھٹنڈا پسینہ آ گیا۔ ایک دم سب غلط ہو رہا تھا۔

”تمہیں دس منٹ میں کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔ کسی نے منع کیا ہے مجھ سے ملنے کے لئے آنے کو؟“ وہ ذرا غصے ہوا۔ شستے کے پار کھڑے سعدی کی نظریں... ہاشم کا چہرہ احساس توہین سے سرخ پڑنے لگا۔

”ہاں۔ کیا ہے منع؟ میرے بھائی نے منع کیا ہے۔“

ہاشم کا سانس رک گیا۔ وہ بالکل پلک چھپکے بنا سعدی کو دیکھے گیا۔

”سعدی... تمہاری سعدی سے بات ہوئی ہے؟“ وہ اگلی دس زندگیوں میں بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ سعدی تو سارا الٰہ اس کے سامنے بیٹھا رہا تھا۔ تو پھر....؟

”ہاں ہوئی ہے میری سعدی بھائی سے بات۔ اب پیز... مجھے ڈمپر بت کریں۔“ اور ملک سے فون بند ہو گیا۔  
ہاشم نے بُشکل ”ہیلو“ کہا۔ پریشانی سے تجب سے۔ چند لمحوں کے لئے اسے بھول گیا تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے، صرف یہی یاد تھا۔  
وہ پسینہ پسینہ ہو رہا ہے، اور اس کا دل حیرت اور شاک سے دھر کرنا بھول چکا ہے۔ فون کان سے ہٹا کر چہرہ اٹھایا۔  
شیخ کے دروازے کے پار کھڑا سعدی آنکھوں میں چھپن بھرے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاشم تیزی سے آگے آیا، کوڑا کر دروازہ مل  
اور اسے گریبان سے کپڑا کر سامنے کیا۔

”کیا کیا ہے تم نے؟ ہاں؟“ تجب اور غصے سے وہ چلا یا تھا۔ ”وس منث میں کیا بدل دیا ہے تم نے؟ اس (گالی) نے میرے۔“  
فون بند کر دیا۔“

”فاذ اقراءت القرآن فاستعذ بالله من الشيطن الرجيم!“ (پھر جب تم قرآن پڑھو تو پناہ مانگا کرو وہ نکارے ہوئے شیطان۔)  
سعدی تیز تیز سانسوں کے درمیان بولا تھا۔ ہاشم نے اس کو گریبان سے جھکا دے کر چھوڑا، اور انہی بے یقین نظر وہ سے دیکھا پیچھے ہوا۔  
”بے شک....“ وہ واپس بیٹھ پڑیتھے ہوئے، گھرے تھکے سانس لے کر خود کو پر سکون کر رہا تھا۔  
”بے شک اس (شیطان) کا کوئی زور نہیں چلتا ان لوگوں پر جو ایمان لائے...“ اپنی پریشانی ہتھیلیوں پر گراۓ وہ چہرہ جھکا  
آنکھیں بند کیے پڑھ رہا تھا۔ ”اور جو اپنے رب پر تو کل کرتے ہیں۔“  
ہاشم انہی بے یقین آنکھوں سے اسے دیکھتا قدم قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔  
”بے شک (اس) شیطان کا زور انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کر لیتے ہیں...“ (سورہ نحل) اس کی آواز دھیمی ہو رہی تھی  
ہاشم تر پریشانی اور حیرت زدہ آنکھیں لئے دروازے تک پیچھے ہٹ گیا۔

”آج کے بعد تم میری بہن کو میرے خلاف استعمال نہیں کر سکتے، اس لیے اگلی دفعہ مجھے دھمکا نے آتا تو کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا۔“  
بلند آواز سے کہہ کر گویا اسے چلپخ کر رہا تھا۔  
”تم... تمہاری بہن... فارس... سب اس کی سزا کاٹو گے۔ تم انتظار کرو۔“ چوکھت تک رکا اور زور سے غرایا۔ اس کا چہرہ صرخ،  
تھا اور گردن کی خراش دیکھ رہی تھی۔ آستین سے تر پریشانی رگڑی اور مز کر باہر نکلتا گیا۔  
سعدی ابھی تک زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا، اگر اس کی آواز اتنی بلکی تھی کہ سنائی نہ دیتی۔ پورے زندان خانے میں سماں چھایا تھا۔  
میری اس کے پاس آئی۔ اسے پانی لا کر دیا۔

”تم نے کیا کیا سعدی؟“  
سعدی نے چڑا ہوا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تم نہیں سمجھو گی۔“

میری کی آنکھوں میں تاسف در آیا۔ ”جب تم سات سال پہلے قصر کاردار آئے تھے تو تمہارے آگے دروازہ میں نے کھولا تھا۔ اگر کھولتی تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔“ سعدی کچھ کہنے بنانپانی کے گھونٹ بھرنے لگا۔



اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں ..... جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تکنوں سے نہ ٹالے جائیں گے  
سعدی اور اس کے زندان خانے کو ہیں چھوڑ کر ہم چند منٹ پیچھے واپس اسلام آباد کے اس روئیشور انٹ میں جاتے ہیں جہاں

ا) ہم کمرے میں خین بیٹھی رجسٹر پہ پول بوئے بنارہی تھی۔ وہ آیت ہنوز لکھی موجود تھی، مگر خین کو جب کچھ خاص سمجھنا آیا تو غور و فکر کرنا ترک ایسا۔ تھی زمرا اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

”موباں کمپنی نے بالآخر گلے روپورٹ بیچ دی۔“ وہ اندر سے کاغذ نکالتے ہوئے دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ خین نے چونک کر اتے دیکھا۔

”مگر بھائی کام موبائل سگنل آخری دفعہ ہماری کالوں میں آن ہوا تھا یہ بتایا تو تھا پولیس نے۔“

”ہاں مگر اس کا واٹس ایپ اگلے دن بھی آن ہوا تھا، باسیں میں کو پولیس نے یہ نہیں بتایا۔ اس لئے میں نے کمپنی سے رابطہ کیا تھا۔“

”ت روی سے سہی کام انہوں نے کر دیا۔ تم تو کر کے دینے پڑتا نہیں تھیں۔“ وہ طنز نہیں تھا، بل سادگی سے کہا اور صفحے کھول کر پھرے کے مانتے کیے۔

خین نے نگلی سے کچھ کہنا چاہا پھر سر جھک کر اس کے قریب آئی اور کاغذ پہ دیکھا۔ پھر دونوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

”یہ علاقہ..... یہ تو وہی ہے پھر جہاں ہم اب رہتے ہیں۔“

”اور جہاں کاردار زرہتے ہیں۔“ زمر سوچتے ہوئے پڑھتی جا رہی تھی۔ خین الجھ کر رہ گئی۔

”سعدی کو آخری کال ہاشم کی طرف سے کی گئی ہے۔ دیکھو... یہ پولیس کی روپورٹ میں نہیں تھا۔“ وہ دکھار رہی تھی۔

”اس رات ہم سب ہی بھائی کو کال کر رہے تھے۔“

”مگر ہاشم کی کال کے وقت فون قصر کاردار یا ہماری انیکسی کے آس پاس تین کلو میٹر کے علاقے میں تھا۔ دوبارہ وہ بارہ بجے کے بعد ان ہوا، تقریباً رات کے تین بجے۔ تب بھی وہ اسی علاقے میں تھا۔ اس کا واٹس ایپ بھی تبھی آن ہوا ہوا۔“ کاغذ کھکھل کر وہ سنجیدگی سے خین کو ملنے لگی۔ ”سعدی کی دو چیزوں کھوئی تھیں۔ کی چیز اور موبائل۔ کی چیز ممکنہ طور پر اس گواہ لڑکی کے پاس تھا، مگر سیل فون کس کے پاس تھا؟“ اور وہ اسے اس علاقے میں کیوں لے کر گیا؟“

”آپ کو کیا لگتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے کہ صرف ایک گواہ نہ ہو بلکہ قصر کاردار میں سے بھی کوئی گواہ ہو۔“ چند لمحے سوچا۔ ”نوشیر وال اس دن سے متضاد باتیں لہر رہا ہے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی وہاں موجود ہو۔ ظاہر ہے وہ سعدی کا دوست ہے وہ....“

”نہیں وہ بھائی کا دوست نہیں ہے۔“ وہ ایک دم بولی۔ زمر رک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”مگر... سب جانتے ہیں کہ وہ دونوں اسست ہیں۔“

”میں باقی سب سے زیادہ جانتی ہوں بھائی کے بارے میں۔ میں نے سگنل ڈھونڈنے میں مدد نہیں دی، مگر پچھلے چار سال سے اب نہ فارس غازی ادھر تھا، نہ زمر یوسف، تب خین ہی تھی جو سعدی کے ساتھ تھی، اس لئے... وہ دوست نہیں تھے!“ قطعیت سے بتایا۔ اور یہ بھی طعنہ تھا۔ زمر نے گہری سانس لی۔

”وجہ؟“

”کسی لڑکی کو شیر و نگ کرتا تھا، اس لڑکی نے اپنے مگنیتر سے شیر کو پوٹایا۔ بھائی نے سامنے موجود ہونے کے باوجود شیر و کوئی مدد نہیں کی۔ آرام سے بیٹھا رہا۔ اس پر وہ بھائی سے خفا ہو گیا۔“

”مگر سعدی نے کوئی مدد کیوں نہیں کی؟“

”پتہ نہیں۔ پھر بعد میں وہ ڈرگز لیتا تھا تو بھائی نے اس کی شکایت اس کی ممی کو لگائی، پھر میں نے اس کے انداز کا پول کھولا۔ شیر و بھائی“

تو تب سے ہمارے جانی دشمن ہیں۔“

”تم نے پہلے نہیں بتایا۔“

”آپ نے پوچھا ہی نہیں۔“ اس نے شانے اپکائے۔ چند لمحے خاموشی چھاگئی۔

”تمہارا خیال ہے کہ... شیر و سعدی کو گولی مار سکتا ہے؟“

”اُر نہیں.... اس سے تو انوغابی ٹھیک سے نہیں ہوتا، گولی کہاں مار سکتا ہے کسی کو۔ میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ وہ دوسرا آکوا ॥“ سکتا ہے مگر بھائی سے بغض کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ خاموش ہو۔“

”جو بھی ہے، تم مجھے شام میں وہ پین چارچ کر کے دو گی، ہو سکتا ہے اس میں کچھا، ہم ہو۔“ پھر واپس گھوم کر دوبارہ سے کاغذ، لمحہ گئی۔ آنکھوں میں ستائش تھی۔

”یہ موبائل سگنل بھی کیا چیز ہے خین! انظر بھی نہیں آتا مگر اتنا مضبوط ہے کہ ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنا نشان نہیں کھوتا۔“

خین نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا، اور رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔ ابھی نگاہوں سے اس آیت کو دیکھنے لگی۔ تبھی موبائل بجا۔ اس نے بے زاری سے دیکھا۔ ہاشم کا پیغام تھا۔ اسے لٹنے کے لئے بلا رہا تھا۔ وہ ناٹپ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی؛ گردن موڑ کر دیکھا، زمرفون پل، ویل سے بات کرتی اٹھ کر جا رہی تھی۔ وہ چالی گئی تو وہ نے پیغام روکارہ کر کے اسے بھیجا۔ ملنا، ہی تھا تو آدھے گھنٹے کے لیے وہ مل لے کی، اسی حلیمہ والی بات بھی کلکنیر کر لے گی۔ اور پھر سے رجڑ کے کنارے پھول بوٹے بنانے لگی۔ وہ آیت ابھی تک صفحے پر بلکہ رہی تھی۔ وادی، لمبی اُنخل۔

شہد میں شفا ہے، مگر... دل کی بیماری کی شفا شہد میں کیسے ہے؟ اس آیت میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کر لے ہیں۔ مگر کون سی نشانی؟ وہ سوچتی جا رہی تھی۔ ذہن میں زمر کے کہے الفاظ گونج رہے تھے۔

”یہ موبائل سگنل بھی کیا عجیب چیز ہے خین...“

شہد کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟ عسل؟ اس نے ذہن سے اس آواز کو جھکتے ہوئے آیت پر توجہ دی۔ ہو سکتا ہے ”عسل“ کا کوئی اہم مطلب بھی ہو۔ کہتے ساتھ اس نے عسل کا الفاظ آیت میں ڈھونڈنا چاہا۔

”یہ موبائل سگنل بھی کیا عجیب چیز ہے....“

مگر ایک منٹ۔ وہ ابھی۔ عسل کا الفاظ تو آیت میں تھا، ہی نہیں۔ آیت میں شہد کا الفاظ تو تھا، ہی نہیں۔ وہاں تو صرف ”مشروبات“ (شراب) لکھا تھا۔ پھر... وہ شہد کیوں ڈھونڈ رہی تھی؟

”یہ موبائل سگنل بھی.....“

وہ صفا پے قریب لائی۔ آنکھوں کے بالکل قریب۔ پلکیں سکوڑ کر اسے دیکھا۔ وہ غلط شے کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ ”آیت عسل“ نہیں تھی۔ وہ ”آیت محل“ تھی۔ موضوع شہد نہیں تھا، موضوع شہد کی بھی تھا۔ ہنی بی۔ دی ہنی بی۔

زمر ساتھ آ کر پیٹھی اور اپنا کام کرنے لگی۔ خین اسی طرح صفحے کو دیکھ رہی تھی۔

(سعدی بھائی بھی مجھ سے ایک دفعہ پوچھ رہے تھے۔)

(یہ موبائل سگنل بھی کیا عجیب چیز ہے خین۔)

وہ تحریری خود سے بڑھ رہی۔ ”موبائل سگنل۔“

”سوری؟“ زمر نے اسے سوالیہ دیکھا، اسے لگاہ نے اسے پکارا ہے، مگر خین، اس وقت کسی اور دنیا میں تھی۔ اس نے نہیں بتا۔

ہم تیزی سے اٹھی اور زمر کے آگے رکھا سعدی کا لیپٹاپ اٹھایا، اور اسے اپنی میز پر لے آئی۔ بے قراری سے وہ جلدی جلدی کیزد باتی فیں بکھول رہی تھی۔

سعدی کا فیں بکپپوں کا ایک گروپ تھا، چھوٹا سا، جہاں وہ ہر ہفتے اپنی ایک سیلف و ڈی یو پوسٹ کرتا تھا، اس میں وہ کسی منتخب آیت کی اپنی سمجھ اور علم کے لحاظ سے تفسیر بیان کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اس نے سال بھر پہلے چھوڑ دیا تھا، جب کی مصروفیت کی وجہ سے، مگر وہ ڈی یو زاب بھی اس گروپ میں تھیں۔ حمدہ اس گروپ میں تھی، مگر چونکہ وہاں سعدی کے دوست تھے، سواس کو کوٹ کرنے کی اجازت بھائی کی طرف سے نہیں تھی، لیکن ویڈیو ز وہ دیکھا کرتی تھی، نیت چھوڑنے کے بعد بھی وہ ان ویڈیو کو تدبیح کیلئے لیتی جب بھائی امی کو دکھاتا... اسے لگتا تھا وہ ان کو ایک کان سے سن کر دوسرا سے نکال دیتی ہے، لیکن آج دونوں کانوں کے درمیان کچھ املک گیا تھا... مطلوبہ صفحہ کھل گیا... وہ ویڈیو آج بھی وہاں موجود تھی۔ اس کا نام ”آیت خل“ تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ویڈیو کھولی۔ کانوں میں ایئر فونز لگائے۔

اسکرین پر یسٹورانٹ کی کونے والی میز نظر آنے لگی۔ ایک یا سو اسال پہلے کا سعدی ادھر بیٹھا تھا، اور اسکرین پر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ چند ابتدائی فقرے۔ حمدہ نے اسکرین کو انگلیوں سے چھووا۔ کتنے دن بعد اس نے سعدی کو بولتے دیکھا تھا۔

چند بھروسے بعده موضوع پر آ گیا تھا۔

”کل صبح فجر پر میں سورۃ خل پڑھ رہا تھا، تو آیاتِ خل نظروں سے گزریں، تو میں نے ان پر غور و فکر کیا۔ ہم اکثر قرآن میں اللہ تعالیٰ کو فرماتے سنتے ہیں کہ ”اس میں نشانی ہے اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے۔“ غور و فکر کرنا کیا ہوتا ہے؟ اس آیت کی تفسیر سے تفسیر پڑھ لیتنا؟ کیا یہ کافی ہوتا ہے؟ میرے خیال میں نہیں۔“ ذرا رک کر سانس لی۔

”غور و فکر کہتے ہیں تفہیش کو جیسے انگریزی فلموں میں سراغ رسان حضرات چھوٹے چھوٹے کلیوز کا تعاقب کرتے ہوئے مجرم تک پہنچتے ہیں۔ میرے نزدیک قرآن میں غور و فکر کرنا بھی میری میں evidence کو فال کرنے جیسا ہے... یعنی ٹھوس شواہد کا پیچھا کرنا۔ ٹھوس شواہد میں ہر دوہ چیز آتی ہے جو ٹھوس ہو جسے آپ چھوکیں۔ جیسے ایمان، کفر، شرک، روزہ نماز یہ ٹھوس چیزیں نہیں ہیں۔ مگر سمندر پانی، جانور، شہد یہ ٹھوس چیزیں ہیں۔ سو، آیاتِ خل کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس میں موجود میری میں شواہد کا تعاقب کرتا ہوں۔ شاید تدبیح کچھ سمجھ آئے۔“ وہ سانس لینے کو تھہرا اور حمدہ بالکل سانس روکے اسے سن رہی تھی۔

”اس میں میری میں چیز شہد تھی، میں چند بھروسے پر گیا، خالص شہد کے لئے۔ مگر پھر ایک دن مجھے اندازہ ہوا کہ لفظ شہد تو آیت میں لکھا ہی نہیں ہے، یہ آیاتِ عسل نہیں تھیں یہ آیاتِ خل تھی۔ موضوع خل ہے، سارا مسئلہ خل کا ہے۔ تب مجھے ایک بہت دلچسپ بات معلوم ہوئی، مگر اس کے لئے ہمیں پچھلی تین آیات کو ملا کر پڑھنا ہو گا۔“ اب اس نے میز پر کھا قرآن کھولا اور اس میں سے دیکھ کر بتانے لگا۔

”ان چار آیات میں اللہ تعالیٰ نے چار قسم کی ڈرگس کا ذکر کیا ہے۔ ایک ایک کر کے سب کو دیکھتے ہیں۔“

وہ ”اعوذ بالله من الشیطون الرجیم“ پڑھ کر آیت پڑھنے لگا۔ اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی، مھر زندہ کر دیا اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد۔ بے شک اس میں البتہ ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور سے سنتے ہیں۔ ”چھرہ اٹھایا اور اپنی ازلی مخصوص مگر بیماری مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

”اب بظاہر یہ زمینداروں اور کسانوں سے متعلقہ آیت لگتی ہے، کہ کیسے بارش کے بعد بخربز میں زرخیز ہو جاتی ہے، مگر جو لوگ سنتے ہیں، یعنی جو لوگ قرآن کو غور سے سنائے ہیں، ان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں عموماً جب آسمان سے نازل شدہ پانی، کا ذکر کرتے ہیں، تو اس سے مراد وحی ہوتی ہے۔ وحی الہی۔“ قدرے تو قوف سے کہنے لگا۔

”وحی تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو قرآن اور الہامی کتابوں کی صورت میں۔ ان میں اللہ بندے سے مخاطب ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اللہ پردے کے پیچھے سے خود بندے سے مخاطب ہوں، جیسے موئی علیہ السلام سے کوہ طور پر ہوتے تھے، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج کے موقع پر ہوئے تھے۔ تیسرا قسم یہ ہے کہ اللہ اپنے فرشتے کو انسان کے پاس کوئی پیغام دے کر بھیجیں۔ اس تیسرا وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو جوانبیاء کے پاس جبریل علیہ السلام کے ذریعے اڑا کرتی تھی۔ اور دوسرا ”الہام“، یعنی دل میں خیال کا ڈالے جانا۔ یہ ہر انسان کو ہوتا ہے۔ مگر یاد رکھیں الہام شیطانی بھی ہو سکتا ہے، اور فرشتے کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے، اس کو نجاح آپ شریعت کے اصولوں پر ہی کریں گے۔ یہی الہام موئی علیہ السلام کی والدہ کو ہوا تھا جس کی بنائے انہوں نے اپنا پچھنیل میں اتنا رکھا اور یہی شہد کی مکھی کو ہوا تھا، یعنی ان کے دل میں خیال ڈالا گیا تھا۔“ چند لمحے کے لئے رک کر قرآن کو دیکھا۔

”تو ان پانچ آیات میں پہلی قسم کی ڈرینک ”پانی“ ہے۔ وحی الہام جو آسمان سے اترتی ہے اور مردہ دلوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ کوئی بھی چیز دل کو ایسے زندہ نہیں کرتی جیسے قرآن کرتا ہے، اور کوئی بھی چیز ایسے دل مردہ نہیں کرتی جیسے اونچے قیقهے کرتے ہیں۔“ پھر صفحہ پلتایا۔ ”اگلی آیت دیکھئے ہیں۔“ پہلے عربی پڑھی، پھر اردو میں بتانے لگا۔

”اور بے شک تمہارے لئے مویشی جانوروں میں ایک سبق ہے۔ ہم تمہیں ان کے پیٹوں میں گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتتے ہیں، خونگوار ہے وہ پینے والوں کے لئے۔“ سعدی نے چہرہ اٹھایا۔

”بارش وہ چیز ہے، جو فصل پر ہو یادل پر اس کا فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔ بارش کو اللہ نے ہمیشہ رحمت کہا ہے، کسی قوم کو بارش سے عذاب نہیں دیا، ہم ڈیکھنیں بنتے، اور پلانگ نہیں کرتے، اس لئے بارش رحمت ہے جاتی ہے، ورنہ بارش تو سارا سرفائد ہوتی ہے۔ اب دوسرا قسم کی چیز دیکھئے۔ دودھ۔“ وہ کہہ رہا تھا اور حسین ہرشے بھلائے یک نک اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ سب اس طرح کیوں نہیں سمجھ آیا تھا جیسے سعدی کو آیا تھا؟

”دودھ ان اچھی چیزوں کی مثال بیان کرتا ہے جو بڑی چیزوں سے لٹکتی ہیں۔ خون اور گوبر کے درمیان سے خالص اور پاک دودھ کا نکلنَا، ہمیں یہ بتاتا ہے کہ برے سے برے حالات میں بھی ہم اپنے خلوص اور پاکیزہ نیت سے راستے نکال سکتے ہیں، اگر ہم چاہیں تو۔ آپ کو معلوم ہو گا وہ واقعہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین بیالوں میں سے دودھ کا انتخاب فرمایا تھا۔ کیونکہ دودھ عین نظرت ہے۔ تو فطرت میں کوئی چیز اچھی یا بُری نہیں ہوتی، آپ گندگی میں سے بھی اچھی چیز نکال سکتے ہیں۔ اب تیسرا ڈرینک دیکھئے۔“

قرآن سے پڑھ کر سنانے لگا۔

”اور بھجو اور انگور کے پھلوں سے تم بنایتے ہونشہ آور چیزیں (شراب) اور اچھا رزق (بھی بناتے ہو)۔ بے شک اس میں ایک نشانی ہے اس قوم کے لئے جو عقل رکھتی ہے۔“

”تو میرے عقل والے دوستوں، تیسرا مشروب، یعنی شراب بنایا جاتا ہے پاکیزہ پھلوں سے۔ بھجو جیسے شجر طیبہ سے بھی بڑی چیزیں بن سکتی ہے۔ یہ سب آپ کے اوپر ہے۔ آپ اچھی چیز سے بھی بری بناتے ہیں، اور بری سے بھی اچھی نکال سکتے ہیں۔ اس لئے چیزوں کو درست استعمال کریں۔ کمپیوٹر سے اچھے کام کیا کریں۔ جو نہیں دیکھنا چاہیے، وہ نہ دیکھا کریں۔ اور جس کی اجازت نہیں ہے، وہ بھی نہ کیا کریں۔ آپ کوئی نادل پڑھ رہے ہیں، مگر پیر نہیں نے اجازت نہیں دی ناولز پڑھنے کی، تو اسے پڑھ کر آپ پیر نہیں کے ساتھ خیانت کر رہے ہیں۔ ان کو کوئی نہیں کریں، لیکن چچپ کرمت پڑھیں۔ یہ غلط ہے۔“

پھر اگلی آیت کی طرف متوجہ ہوا۔

”اور وحی کی تمہارے رب نے شہد کی مکھی کی طرف۔“

کہ بنائے اپنا گھر پہاڑوں پر  
اور درختوں میں، اور اس میں جو دھڑکتے ہیں (اوچی چھتیں)

پھر کھاہر قسم کے چھلوں میں سے۔

پھر چلتی رہا پہنچ رب کے آسان راستوں پر۔

نکلتا ہے ان (شہد کی مکھیوں) کے پیڑوں سے شربت۔

مختلف ہیں ہنگ اس کے۔

شفاء ہے اس میں لوگوں کے لئے۔

البتہ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جغور و فلکر کرتے ہیں۔“

سعدی چہرہ اٹھا کرو اپس کیسرے میں دیکھنے لگا۔ ”ظاہر یہ ایک بہت سادہ سی آیت ہے۔ اس میں چوتھے مشرد بکاذ کر ہے۔ شہد۔

جس کے پینے میں شفا ہے۔ میری ٹپپر کہتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شہد کے ”پینے“ میں شفا کا ذکر کیا ہے۔ ویسے شہد پینے اور شہد کھانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کبھی آزم کر دیکھنے گا۔ ”ذرار کر گھری سانس لی۔ خشن بے قراری سے اس کو دیکھتی اس کے الگ الفاظ کی منتظر تھی۔

”اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کے دل میں خیال ڈالا کہ وہ آبادیوں سے دور اور پنج محفوظ جگہوں پر اپنے گھر بنائے، چھلوں میں سے کھائے، اور آسان راستوں پر چلے۔ پھر جو اس کے پیٹ سے نکلے گا، شہد، اور ایک دوسرا رطبت بھی وہ شفا بخش ہوتی ہے۔ یہ تو ہو گیا آسان ترجمہ۔ مگر جغور و فلکر کرنے والے لوگ سادہ تر جھے پہنس نہیں کرتے۔ ان کو کوئی نزدیکی مطلب ڈھونڈنا ہوتا ہے، اور وقت اور حالات کے ساتھ یہ مطلب بدل جایا کرتے ہیں، قرآن میں وسعت ہے، مگر افسوس کہ قرآن پڑھنے والوں میں وسعت نہیں ہے۔ خیر۔“ صفحہ پا ایک نظر دوڑاتے گردون جھکائی۔

”میں کافی در شہد ڈھونڈتا رہا۔ خالص شہد پھر مجھے اندازہ ہوا کہ خالص شہد ناپید ہوتا جا رہا ہے، تو میں شہد کی مکھی کی طرف آیا۔ اس آیت میں ٹھوس شے وہی تھی۔ مجھے اس دوران ایک دلچسپ ریسرچ ملی۔ گوکر کچھ لوگ اس تحقیق کو نہیں مانتے، اور وہ کہتے ہیں کہ شہد کی کمی کی وجہ biopestides کا بے دریغ استعمال ہے، لیکن میں اس تحقیق کو مان سکتا ہوں، کیونکہ مجھے اس میں اور اس آیت میں ایک لنک نظر آتا ہے۔“ کہنے کے ساتھ اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور اس کی نثاریک اسکرین کمرے میں دکھائی دی۔ ”شہد کیوں ناپید ہوتا جا رہا ہے، اس کی وجہ ہے یہ چیز۔ نہیں، یہ موبائل نہیں، بلکہ اس کے گرد چکراتا، آن دیکھا موبائل سکن۔“

فون رکھا اور پھر سے سامنے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ موبائل سکن بہت عجیب چیز ہے، آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں، کوئی آپ کو فون کرے تو یہ آپ کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ عین آپ کے کان کے قریب آبجتا ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ جگہ جگہ اوپنے ناوارز لگتے ہیں۔“

جن سے جڑا ان نادیدہ لہروں کا جال پوری دنیا میں بچھا ہے، یہاں تک کہ دنیا نہیں کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ مگر یہ بری بات نہیں ہے، سیل فون ایک ضرورت ہے، نیکنا لو جی ہے۔ سب کے پاس ہوتا ہی ہے۔ لیکن.....“

خین کی آنکھیں یکدم بھیگنے لگیں۔ اس کو یاد تھا کہ وہ آگے کیا کہے گا، مگر وہ اسے ایسے سنے گی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

”لیکن ہوا یوں کہ شہد کی مکھی اللہ کے حکم پر دور پہاڑوں درختوں میں اپنا گھر بنایتی ہے، وہ سارا دن باہر پھرتی ہے، ہر پھول پھل پہ بیٹھتی ہے، اس کا رس لیتی ہے، اور پھر وہ اپس اپنے گھر جاتی ہے، اور... نہیں۔ نہیں رک جائیں۔ کیونکہ جب بچپن میں آپ نے یہ عمل پڑھا تھا، تب شہد کی کھیاں گھروں کو لوٹی تھیں، مگر آج 2014ء میں ایسا نہیں ہوتا۔ وجہ ہے.... یہ!“ موبائل کی طرف اشارہ کیا۔

”بے بھی کر سے تک ہے تو اس کا پانچ کروپا سو سو لکھی روپیں کیا۔ سے پورا تھا۔ ۱۰ بھول بھل پنچنگی ہے اکتوبر  
لے کر دیکھی کمری مدرسہ اعلیٰ ہے تکمیل و نہادن عی۔ موہل تکمیر کی اپروپی کا جال پھیلا گئا۔ شہری کمی جب کسی مکمل کی طور پر کامی  
ہے آج خدا بھی لپکتے چڑھتا ہے جوں کمکھیں پکڑ کر اکرمؐ رضیؐ پر آجھا گلے ہے۔ اس کر سے کامی کو جنم کو دینی ہے۔  
اپنے کمری کو ہر سو سو بھول بھل ہے۔ ۱۰ بھول بھل ایک جگہ سے ساری بھاری بھاری چال چکا ہے۔ اسی بھل کا کمکن کر کر رہا ہے۔ جوں  
دن کے سارے کام کرنے والی شخصیں کی تعداد کم سے کم ایک ہے۔ جب کچھ مسلمانوں کیں لے جاؤ۔ کوئی تائید مل ہے؟ اسی ہم ایک  
بھر ٹکرے کے سارے اکھیاں کے ساری بھل کی خالی بیان کرنے کا کمکن ہے۔“

جیکے نے اسی سرگزشت کیلئے اپنے بھائی کے مال سے آجی ڈیڑھ تھے کہا۔

۱۰۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے گسرہ آف کر دیا۔ دیکھ بھی رک گئی اور جنین کی تو میسے زندگی ہی خبر گئی۔

وہ بہل پتھی تھی، ہونتوں پتھی رکے بھیکے پھر سے کے ساتھ۔ آنسو پ پ تھوڑی تکے گر رہے تھے۔ اس نے تمیں ماہاتم نہیں، اے جیسے آتی مفتیاں سوچی تھیں۔ سعدی نے ان کو اس منت کی ایک دلیل بھی میں فتح کر دیا تھا۔ حرم اور ناخرم کے اصول؟ ساری باتیں ختم ہو گئی۔ اس کا پورا داماغ سن تھا۔

زمر کام کرتے کرتے مڑی تو اس پر لکڑ رہی۔ وہ اپنے فونز کا نئے اسکرین کو آنسو بھارتے دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" "ٹکر مندی سے پوچھا۔

"آئیندہ؟" وہ بہل اتنا بولی۔ پھر فون اخفا کیا اور وہ اُس اپنے ایک ایڈیشن بدل دیا۔ ساتھ میں دلیل بھیکپ کاٹان بھی ہالیا۔ بھائی شہس دیکھ لیا، وہ بھائی تھی؛ مگر یہ ایک عادت تھی جو گئے برسوں سے اس نے اپنا رکھی تھی۔ میں پکھا عرصے کے لئے اس نے لا لوکی تھی، سا اب بھی کر لی۔ "جیسی؟" زمر نے ریزی سے پکارا۔ جنین جواب دیے، ہاہا تھوں میں چہرہ چھپا کر دنے لگی۔ زمر نے ریخ موڑ لیا اور اسے روائے دی۔ وہ روائی گئی اور دیگئی دوئی گئی۔ بیہاں تھک کر آنسو فتح ہو گئے۔ پھر اس نے پھر اخفا کیا، آنکھیں رگزیں اور ہاشم کو کال کی۔ (وہ اُس اپنے پیل کاں کر تھی اسے معلوم نہ ہوا کہ وہ ملک سے باہر ہے۔)

زمر نے ریخ موڑے ایک ایک بات سنی جو اس نے باشم سے کی، اور پھر اس نے جب فون ڈائل کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا۔ وہ اب فتنے سے آنکھیں رگز رہی تھی۔ وہ توں نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ عاصوی سب کر رہی تھی۔

اور اگر تم سے بھی کوئی کہے، کہ انسان کی کی گئی تسلیٰ حکوم پھر کر اس کے پاس ایک دن ضرور لوئی ہے، تو یقین کر لینا! کیونکہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔



قصہ سازش اغیار گھوں یا شگھوں شگوہ یا رطرحدار گروں یا شگروں؟  
گلب کے لاوائخ میں روشنی مہم تھی۔ بار کا وزیر کے ساتھ فوشیر والا، اونچے اسنول پر بیٹھا تھا اور سلسلہ دلوں تھوں سے موبائل کے بینن دیا رہا تھا۔

شیرین باریک بیل سے پتھی قریب آئی اور ساتھ وہ اسے اسنول پر بھی ریخ اس کی طرف موڑا اس کے پھر سے کے آگے باتھ بلا دیا۔  
شیر وہ لے چکر کر آنکھیں اخاہیں۔ اسے دیکھ کر انہیں خلی آئی۔

"آپ اور ہم؟ خیر ہے؟" لٹک رہی سے کہتا، وہ بارہ بہن دیانتے لگا۔ شیری نے اس کے ہاتھ سے موہاں لے کر کا وزیر پر ڈالا۔  
"تمن دون سے جھیں کاں کر رہی ہوں، اخھاتے کیوں نہیں ہو؟" زرد ٹھیک پن سے گویا ہوئی۔ شیر وہ نے بے زاری سے شانے اپنکا لے۔ "مجھ سے گیا کام آپا؟ آپ کو؟"

"ہر وقت مجھ سے خطا کیوں رہتے ہو؟ دیکھو، ہم اونچے دوست بھی تو ہیں آؤ، آپ مذاہیک کرو، کارڈز کھیلتے ہیں۔" اسے پارو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ زیادہ دیوار پر زارہ پر قرار دیکھ کر کا اور ساتھ کھینچا آیا۔

پنڈ مفت بعد وہ دلوں ایک بیڑ کے گرد بیٹھنے پتھے کھیل رہے تھے۔

"تم ہار رہے ہو شیر وہ؟"

"نہیں... بھی دیکھنے گا۔" اس کی محل توجہ کارڈز تھی۔ اپنے پتھے دیکھ کر یہ سچ رہا تھا کہ اس سا پیٹھے کے...  
"بھیج کر کھو دن کے لئے تمہاری جی ذوری وہن لے سکتی ہے؟" ایک دم پچھک کر شیری کو دیکھا۔ وہ بھی پھوٹوں کو دیکھتے ہوئے سرسری الخواز

میں پوچھ رہی تھی۔

”کیا؟ بظاہرنا سمجھی دکھائی۔ شہری نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”انتے ڈمب مت بنو۔ تمہاری جی فورٹی ون، گلاک گن جو پچھلی برخڑے پے تمہیں ہاشم نے گفت کی تھی، میرے سامنے تو تم نے تقہ کھوا لاتھا۔ مجھے دے سکتے ہو چند دن کے لئے۔ پکھہ دوستوں میں شواف کرنا ہے۔“

شیر و اس نے پتے میز پر ڈال دیے۔ تندہی سے اسے دیکھا۔ ”تو یہ سارا میٹھا انداز اس لئے تھا؟ اور میں سمجھا آپ کو واقعی میرا خیال ہے۔“

”خیال ہے تو دوست سمجھ کر ایک گن مانگ رہی ہوں، نہیں دینی تو نہ دو۔ غصہ کیوں ہو رہے ہو؟“

نوشیر وال کے حلقوں میں کانے اگ آئے۔ ”میرے پاس جی فورٹی ون نہیں تھی، فورٹی فائی تھی۔ ماذل تو نمیک سے یاد رکھا کریں۔“

سر جھنک کر ادھر ادھر دیکھا۔ تھیلیاں نمیکیں اور رنگت بدلتی ہی تھیں۔

شہریں کارڈ زر کھکھل کر آگے ہوئی اور بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”رسیلی؟ مجھے تو جی فورٹی ون یاد پڑتی ہے۔“

”تو پھر آپ اپنی یاد داشت کا علاج کروائیں، کیونکہ میرے پاس ایسی کوئی گن نہیں ہے، سن آپ نے؟“ بھڑک کر کہتے وہ اٹھا۔

پیشانی بھی تر ہو رہی تھی اور آنکھوں میں بے چینی کی تھی۔ شہری نے گردن اٹھا کر دیکھی سے اسے دیکھا۔

”نمیک ہے، مجھے غلط یاد ہو گا، ایک گن ہی تو ہے، اس میں اتنا غصہ کیوں دکھار ہے ہو؟“

وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھکا کا در سرخ آنکھوں سے اسے گھورا۔ ”آئیندہ میرے راستے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے جائیں فارس کے آگے پیچھے پھریں۔ جیسے میں تو جانتا ہی نہیں۔“

شہری کی ذرا رنگت بدلتی بے اختیار ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اب سیدھا ہو کر مرغ گیتا تھا اور باہر کی طرف جا رہا تھا۔

مگر شہری کو اپنا جواب مل گیا تھا۔

❖❖❖

یہ رات اس درد کا شجر ہے ..... جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

وہ رات جب قصرِ کاردار اور ملحقہ آنکھی پر اتری تو ستمبر کی گرم اور جبز زدہ فضا سے پُر تھی۔ نوشیر وال اپنے بیٹہ پے چینی سے کروٹ بدلتا رہا تھا، ذہن میں ہاشم کی باتیں گونج رہی تھیں۔

(”میرے پاس شہری سے بڑے مسائل ہیں اس وقت۔ تم نے جو کہا، وہ بہت ہے، مزید اس پر بات مت کرو۔ کچھ نہیں معلوم ہو گا اسے۔“)

ابتداء ایک عجیب سی پریشانی اس کے وجود سے لپٹی تھی۔ کیا یہ مسئلہ کبھی نہیں ختم ہو گا؟ سعدی یوسف کا آسیب اس کا یقیناً کب چھوڑے گا؟ اس کمرے سے دور ہٹو تو آنکھی کی تقریباً تمام تباہ بیکھی تھیں۔ فارس سورہ تھا، جب زمراحتیاط سے کمرے سے نکل آئی۔ تہہ خانے میں آ کر دروازہ لاک کیا، (دروازے ساؤنڈ پروف تھے) اور پھر جلدی سے فرش پہنچی ہد تک آئی۔

”کیسے چارج کیا پین؟“

”لیپ ٹاپ سے۔ اس میں دو دیہ یوز ہیں۔ ایک نج صاحب کی ہے، میں نے ابھی وہی شروع کی تھی۔ دیکھیں۔“ وہ دیہ یو دیکھنے کے بعد دونوں نے اف جھر جھری لی۔ پھر حد نے دوسری دیہ یو کھولی۔ اب وہ دونوں فرش پہنچی تھیں اور سامنے اسکرین کو چہرہ جھکا گئے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

منظر کھلا اور ایک راہداری سی نظر آئی۔ آفس کے باہر منظر نیبل کے پیچھے موجود یکرٹی۔ ڈیک کلینڈر پر واضح لکھی تاریخ۔ اکیس منی۔

خاور اور ایک ساتھ گارڈ۔ کیمرے کے آگے پیچھے پھٹپھٹا کر چیک کر رہے تھے۔ ایک موبائل چاپیاں نکال کر سیکرری کی ٹوکری میں رکھا۔ سعدی آواز پس منظر سے آئی۔ حینہن کے ابرو اٹھے۔

”بھائی نے کوٹ کی فرنٹ پاکٹ میں ڈالا ہوا ہے پین۔“

”اور یہ ہاشم کا آفس ہے۔ وہ اس کی تلاشی لے رہے ہیں۔“

پھر ”اوکے“ کے سکلن کے بعد کیمرہ آگے بڑھتا گیا۔ زمر کی آنکھوں میں تعجب ابھرا۔ ”وہ ڈیکٹر سے چیک کر رہے تھے تو پین کیوں نہیں پکڑا؟“

”ماموں کے اس کون آرٹسٹ دوست نے بتایا تو تھا، یہ پین نہیں پکڑا جاتا۔ خاور اسلی یا اوڑھونڈرہا تھا، اسے لگا ہو گا کہ یہ عام پین ہے۔ وہ ہاشم کا مہمان تھا، خاور اس کا کوٹ تو نہیں اتردا سکتا تھا۔“

دونوں کی نظریں اب اسکرین پر ٹھہر گئی تھیں۔ اندر آفس میں تینوں کاردارز تھے۔ خاور تھا۔ سعدی نیکلیس میز پر رکھ رہا تھا۔۔۔ تھہ خانے میں گئی گھڑی کی نکٹ واخ سنائی دے رہی تھی۔ سعدی قتل عمد کے بارے میں اسلام کے دونوں مذاہب کا نقطہ نظر بتا رہا تھا۔۔۔

گھڑی کا پینڈول مسلسل جھوول رہا تھا۔ دا میں با میں۔

وہ سعدی کو تین کروڑ دے رہا تھا، جواب میں سعدی نے اس کے بھائی کی قیمت ساٹھ کروڑ لگائی تھی۔۔۔

کونے میں چھوٹے سے با تھر روم کی نوٹی سے پانی ایک ہو رہا تھا۔ ٹپ ٹپ۔

ہاشم اب سعدی کو جو کوہیک میل کرنے والا قصد سنا رہا تھا۔ فائل دکھار رہا تھا۔

تھہ خانے میں ٹکھے کی ہوا سے سے دیوار پر لگے کاغذ ہلکے ہلکے پھٹ پھٹ رہے تھے۔

ہاشم اب حینہن کے امتحانی مرکزوں اے وکیل صاحب کو کال کر کے کہہ رہا تھا کہ وہ حینہن کا کیس دوبارہ کھلو سکتا ہے۔

ٹکھے کی گزر مسلسل سنائی دے رہی تھی۔۔۔

اب سعدی باہر سیکرری کے ڈیک کے ساتھ نوشیر وال کو کہہ رہا تھا کہ مرد بنے... اور پھر... لفت کے دروازے بند ہوتے دکھائی دیے... اور اسکرین تاریک ہو گئی۔

اس وقت... اس دنیا میں... اس شہر میں... اس گھر میں... اور کوئی آواز نہیں تھی۔ سانس لینے کی بھی نہیں، دل دھڑکنے کی بھی نہیں۔

کہتے ہیں جب فرشتے روح نکالتے ہیں تو آواز نک نہیں آتی۔ مگر کیا کبھی تم نے شیطان کو روح نکالتے دیکھا ہے؟ اس کی بھی آواز نہیں آتی۔

مری سر کشی بھی تھی منفرد، مری عاجزی بھی کمال تھی

میں ان پرست بلا کا تھا، سو گرتو اپنے ہی پاؤں میں!

”کاردارز نے کیا ہے یہ سب۔“ حینہن کسی خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ ”بھائی کو بھی انہوں نے ہی شوٹ کروایا تھا۔ بھائی

انہی کے پاس ہے۔“

زمفرش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے حینہن کو نہیں دیکھا۔ بس ننگے پیروں سے زینے چڑھنے لگی۔ تھہ خانے کا دروازہ کھولا۔ لا وغ خاموش پڑا تھا۔ وہ قدم قدم اٹھاتی سیڑھوں تک آئی۔ اور چوڑہ اٹھا کر دیکھا۔ سب دھنڈ لاتھا۔ اندھیرے اور روشنی کے فلیش سے چمک رہے تھے۔ کبھی منظر صاف ہوتا، کبھی اندھیرا چھا جاتا۔ اس کو گرم گرم آنسو اپنے گالوں پر گرتے محوس ہو رہے تھے۔ ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اور چڑھنا چاہا۔ قدم دوزنی تھے دل بھاری تھا، اور سانس... سانس اکھڑتی تھی۔

چوتھے زینے پر وہ رکی، دہرے ہو کر چند گہرے سانس لئے... پانی سے لدی آنکھیں جھپکیں، پھر قدم اٹھائے۔ سرچکار ہاتھا۔ اندھیرا۔ روشنی۔ پھر اندر ہیرا۔ دھواں ہی دھواں تھا۔

وہ اور پری سیڑھی پر گھٹنوں کے بل گرسی گئی۔ ہاتھر یلینگ سے پھسلتا نیچے آگرا۔ چہرہ جھکائے، تیز تیز سانس لیتے، وہ دو ہری ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے گرم گرم پانی میں روانی آگئی تھی، مگر ایسے لگتا تھا وہ سب کسی اور کے ساتھ ہو رہا ہے۔ کسی سلو موشن فلم کی طرح۔ دونوں ہاتھ فرش پر رکھے، وہ دو ہری ہوئی، پھوٹ پھوٹ کرو نے لگی۔ گھٹی گھٹی سکیاں گو نجی نگیں، مگر ان کی آواز نہیں آتی تھی۔ سانس بے ترتیب تھا، اس کی بھی آواز نہیں آتی تھی۔ دل لگتا تھا کسی نے کندھ پھری سے چار گلکڑوں میں کاٹ دیا ہو۔ اندر سے خون بھل بھل نکلنے لگا ہوا اور اوپر سے آنسو گر رہے ہوں۔ اس کی بھی آواز نہیں آتی تھی۔

اس نے گیلے چہرے، اور اکھڑتے سانس کے ساتھ کھڑے ہونے کی کوشش کی، پیروں میں جان نہیں تھی۔ بدقت وہ کھڑی ہوئی۔ دیوار کا سہارا لیا۔ اس کو واقعی سانس نہیں آ رہا تھا۔

دیوار پر ہاتھ رکھئے، اس نے دروازہ دھکیلا۔ اندر مضموناٹ بلب جلا تھا۔ وہ کاڈچ پر سور ہاتھا۔ وہ آج آفس سے تھا ہوا آیا تھا، اس لئے بخبر سور ہاتھا... بخبری بھی نعمت تھی۔ وہ نعمت زمر یوسف خان سے چھپنے چکی تھی۔

وہ دروازے سے سر لگائے، وہیں چوکھت میں بیٹھتی گئی۔ اندر اسے کی مخفیت تھی۔ اسے یکدم خست سردی لگنے لگی تھی۔ ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔ سانس ڈوبتا جا رہا تھا۔

پہلی دفعہ ہاشم کے ذہن میں گو نجتے فقروں، فارس کی بے گناہی، سعدی، ان سب سے ہٹ کر پہلی دفعہ، زمر کو احساس ہوا کہ اسے واقعی سانس نہیں آ رہا۔ وہ کیفیت صرف جذباتی نہیں تھی۔ وہ جسمانی تھی۔ اسے ایستھما ایمیک ہو رہا تھا۔ اس نے کھانے کی کوشش کی نہ ہوا اندر جاتی تھی، نہ باہر آتی تھی۔ اس کے ناخن سفید پڑ رہے تھے۔ منظر اندر ہیرے میں ڈو بتا، کبھی واپس روشن ہوتا.....

نیم جان آنکھوں میں بے بسی لئے اس نے صوفے پر لیئے فارس کو دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ وید یوڈ یکھنے سے پہلے، یا ان تین ماہ میں اگر کسی کو وہ اس تکلیف میں آواز دے سکتی تھی، تو وہ ہی تھا۔ مگر اب؟ کھوایا ہوا حق کوئی کیسے واپس لائے؟

”فارس!“ اس نے مدھم سرگوشی میں پکارا۔ آنکھوں سے آنسو برابر گر رہے تھے۔ دل پڑھی رکھئے، وہ شدید تکلیف میں کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ تھکا ہوا تھا، اور واقعی نیند میں تھا، اس تک آواز نہیں گئی۔ زمر بمشکل اٹھی۔ چند قدم خود کو گھسیتا۔ صوفے کے آگے رکھی میز کا کونہ پکڑے پکڑے شدید تکلیف میں بیٹھی۔ وہیں فرش پر۔

(فارس!) آواز نہیں نکلی۔ صرف ہونٹ ہے۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس نے بے جان ہوتے ہاتھ سے فارس کی آنکھوں پر رکھا بازو ہلایا۔

”فارس.... اخو!“ آواز بھی نہ نکل پائی، مگر فارس نے ایک جھکٹے سے اپنا بازو ہٹایا اور ایک دم اٹھتے ہی دوسرے ہاتھ سینے تک رکھی پس توں تک گیا، مگر پھر وہ رک گیا۔

”زمر؟“ خوابیدہ آنکھوں میں تعجب بھرے وہ اٹھا۔ اور پھر... کوئی احساس طہانت تھا جو زمر کا منظر پھر سے دھندا نے لگا۔ نہ حال، تھکن زدہ۔

اگلے مناظر اس کوٹوٹ کوٹ کر نظر آئے تھے۔ اندر ہرے کے درمیان چند روشن ٹکپس... وہ پریشانی سے اس کا چہرہ تھپٹھپاتے ہوئے اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا وہ روشن باتھر ووم کے سنک پر کھڑی تھی، اور آئینے میں اسے نظر آ رہا تھا کہ وہ نوٹی سے اس کا منہ دھلا رہا ہے۔ اب بھی وہ اسے پکار رہا تھا... اندر ہیرا... پھر روشنی... اس نے دیکھا کہ وہ بیٹھ پر لیٹی تھی، تکیوں کے سہارے سر کی جگہ اونچی تھی، سردی کے

ماٹ اس نے لخاف گردن تک تان رکھا تھا۔ پنچھا اے سی سب بند تھا۔ اور وہ اس کو ان ہیلر دے رہا تھا...

زمر نے ڈھال سی ہو کر سر بیڈ کراؤن سے ڈکا دیا۔ آنکھیں بند کر کے چند گھرے سانس لئے آسیجن بحال ہو چکی تھی۔ اس کی رنگت بہتر ہو رہی تھی۔ آنکھیں کھولیں وہ ساتھ، ایک گھنٹا موڑے بیٹھا، فکر مندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اسے آواز آنے لگی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”آپ اپنے استھما کے لئے ان ہیلر کیوں نہیں رکھتیں ساتھ؟ آپ کو اندازہ ہے اگر آپ کے میڈیں کمیڈیٹ میں ان ہیلر نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟“

اس نے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اسے لگا وہ اسے پہلی دفعہ دیکھ رہی ہے۔ پوری آستین کی ٹی شرت، ٹراؤز، چھوٹے کٹے بال اور یہکی بڑھی شیوں۔ آنکھوں میں چھایا تھکر۔ زمر بیڈ کراؤن سے سرٹکائے اسے دیکھتی رہی۔

”وہ بچ زہر میلے تھے!“

فارس نا سمجھی سے ذرا آگے ہوا۔ ”کیا چیز؟“

”کئی سال پہلے... جب یہ شہر... اسلام آباد... غیر آباد تھا... اور ہم... ہم سادہ، غریب لوگ تھے...“ اس کے چہرے کو تکتی وہ کہہ رہی تھی ”... تو ہم نے... ہم نے ایک غلطی کی۔ ہم نے غلط دوست بنائے فارس... ہم نے... آسٹریلیا سے دوستی کی... اس وقت وہ... ہمیں بے ضر لگتے تھے... امیر تھے، مگر اچھتے تھے۔ خوش اخلاق تھے... ہمیں لگا وہ ہمارے جیسے ہی ہیں، ہمارا بھلا چاہتے ہیں...“ آنکھوں سے گرتے آنسوؤں میں تیزی آگئی۔ وہ غور سے اسے دیکھتا، اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہماری حکومت... ہم... اپنا شہر آباد کرنا چاہتے تھے... ہمارے امیر دوست نے کہا وہ ہمارے مد کرے گا... ہم نے اس پر بھروسہ کیا، نہیں کرنا چاہیے تھا۔ فارس ہم نے کیوں اس پر بھروسہ کیا؟“ بے چارگی سے پوچھتے وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

”آپ بے کار با تیں مت سوچیں، آرام سے سو جائیں، اب آپ کا سائلس ٹھیک ہے۔“ وہ نرمی سے اس کی توجہ ہٹا رہا تھا، مگر اس نے فتحی میں سر ہلا�ا۔ اسی طرح رو تے کہتی رہی۔

”تمہیں پتہ ہے... آسٹریلیا میں حکومت نے ہمیں بیچ دیے، پھر اور پر...“ اشارہ کیا۔ ”اوپر ہیلی کا پتہ سے وہ بچ پورے شہر میں گرائے گئے... ان سے درخت نکلے... اونچے مضبوط تناور درخت... وہ فارس ہماری دوستی کی علامت تھی... مگر وہ بچ زہر میلے تھے... انہوں نے... اس شہر کو تباہ کر دیا۔ ان درختوں کی جڑیں میلیوں دور تک پھیلی ہیں، اور وہ اس شہر کا میٹھا پانی پی گئے... اور ان کے پتے... ان کے پتے استھما لاحق کرتے ہیں... اس دوستی نے ہم سے ہمارا سانس نکل چھین لیا فارس... ہم نے کیوں ان پر اعتبار کیا؟“ وہ پھر سے بلک بلک کرو نے لگی تھی۔

”زمر گورنمنٹ پالیسی آپ کی غلطی نہیں ہے۔ وہ درخت آسٹریلیا میں بھی ہیں، بلکہ ہمارے ماحول کو سوٹ نہیں کیے، جیسے ان کو خرگوش سوٹ نہیں کیے تھے۔ آپ کا استھما ٹھیک ہو جائے گا۔“

زمر نے فتحی میں سر ہلا�ا۔ ”یہ تکلیف اب کبھی نہیں جائے گی۔ جب... جب وہ درخت لگائے جائے ہوں گے۔ تو کسی نے تور دکا ہو گا... کہا ہو گا کہ اس کی بات سنی جائے... ہم نے اس کی بات کیوں نہیں سنی؟ ہم اتنے ضدی، اتنے ہٹ و ہرم، اتنے اندر ہے، ہرے کیوں ہو گئے تھے؟ ہم نے اس کو کیوں نہیں سن؟ اس کو ایک دفعہ وضاحت کا موقع کیوں نہیں دیا؟“

”زمر...“ اس نے غور سے زمر کی روتو آنکھوں میں جھانا کا۔ ”کیا کچھ ہوا ہے؟ کوئی اور بھی بات ہے؟ یا یہ صرف اس دے کی تکلیف کی وجہ سے ہے؟“

زمر نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”یہ تکلیف چھوٹی نہیں ہے۔ یہ تکلیف بہت زیادہ ہے فارس۔“ مٹھی سے دل پر دستک دی۔ ”محچھے اندر تک جلن ہو رہی ہے۔“

اس نے تشویش سے پوچھا۔ ”پہلے بھی ہوا ہے اتنا درد؟“

”بھی نہیں ہوا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی تکلیف ہو گی فارس! میں کدھر جاؤں فارس؟“

”انھیں میں آپ کو ہاسپٹل لے جاتا ہوں۔“ وہ واقعی اٹھر ہاتھا۔ زمر نے فنی میں سر ہلایا۔ ”مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”ضد مت کریں۔“

”ضد؟“ اس کے دل کو آری نے چیر کر کھدیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ٹیک چھوڑ کر لمبی لیٹ گئی۔

”مجھے سونا ہے، اور کبھی نہیں اٹھنا۔“ اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہر ہے تھے۔ وہ کھڑا چند لمحے کے لئے اسے دیکھتا رہا۔

”کچھ کھانے کے لئے لا دوں آپ کو؟“

”زہر دے سکتے ہو؟“ وہ بند آنکھوں سے بڑا بڑا تھی۔

”استغفار اللہ۔ کیوں مجھے دوبارہ جیل بھیجا چاہتی ہیں؟“ اور فارس غازی تو ایسی باتیں کرتا رہتا تھا، اب بھی کہہ کر جھکا، اور اس کا

تکمیل ٹھیک کرنے لگا۔ زمر نے آنکھیں کھولیں، ان میں ایسا دل کٹنے والا احساس تھا کہ... الفاظ کو روک نہ پائی۔

”تمہیں مجھ سے نفرت نہیں ہوتی؟“

وہ جھک کر تکمیل درست کرتا رہا۔ قدرے تجھ سے اس کو دیکھا۔ ”مجھے آپ سے نفرت کیوں ہو گی؟“

”میں نے چار سال پہلے تمہیں قید میں ڈالا تھا!“

”آپ نے سات سال پہلے مجھے قید میں ڈالا تھا!“ وہ بہکسا بولا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وقت چند لمحوں کے لئے بالکل تھم گیا۔ اس کا سانس پھر سے تھم گیا۔ مگر اب یہ دمہ نہیں تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔

زمر کی آنکھوں سے آنسو ایک دفعہ پھر بہنے لگے۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ نظریں چراکرا اس کو سونے کی تائید کرنے لگا۔ زمر نے آنکھیں بند کر لیں۔

اب وہ واپس صوفے کی طرف جا رہا تھا....

یونچ تھے خانے میں بتی اور پنکھا ہنوز چل رہا تھا۔ گھڑی کی ٹیک ٹیک، ٹوٹی کی ٹپ ٹپ... سب سنائی دے رہی تھی۔ جنین اسی طرح بے سدھ لیپٹاپ کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں خنک تھیں۔ وہ ایک سینٹ کے لئے بھی نہیں روئی تھی۔ بس ہنویں بچپن بیٹھی رہی، بیٹھی رہی، بیٹھی رہی۔

پھر ایک دم اٹھی۔ تیزی سے اوپر آئی۔ گھر خاموش اور ساکن تھا۔ وہ کچن میں آئی۔ اسٹینڈ سے پھل کاٹنے والا چاقو اٹھایا اور بیردنی دروازے سے باہر نکل آئی۔

باہر بنزہ زاررات کے اس پھر خاموش پر اتھا۔ زیادہ وقت نہیں ہوا تھا، شاید بارہ یا ایک بجے تھے۔ وہ تیز قدموں سے گھاس پر چلتی آگے جا رہی تھی، اس کا چہرہ پھر میلا تھا، اور آنکھوں میں شعلے سے لپک رہے تھے۔

وہ گھڑی کتنی ہی دیر اس قصر کو دیکھتی رہی، پھر کنارے پر لگی درختوں تک آئی۔ ایک درخت کے قدموں میں بیٹھی اور زور زور سے اس کے تنے پر چاتومارنے لگی۔ ضرب در ضرب۔ نفرت سے، غصے سے، شاک سے۔

”جنین!“ آواز پر چونک کر گردن گھمائی۔ خاور موبائل پر بات کرتا اس طرف آرہا تھا۔ پھر فون رکھا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

قدرے تجھ سے اسے دیکھا۔

”تم اس وقت ادھر کیا کر رہی ہو؟“

”میں اس درخت کو کانے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”فارس صاحب کو پتہ ہے کہ تم ادھر ہو؟ وہ خفا ہوں گے۔“

وہ گھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے یہ درخت زہر لگنے لگا ہے۔ دل چاہتا ہے اسے ایک ہی ضرب لگا کر گرا دوں؟ میں یہی سوچ کر چھری لیے گھر سے نکلی تھی۔ مگر میں غلط تھی۔ ایک نکٹے میں ذبح کر دینے سے تو سارا مزموم ہو جائے گا۔ کیوں نا بار بار کانا جائے؟ ہمارے گلووں میں؟“

(اف ٹین ایجرز) خاور کافون پھر سے بخنے لگا۔ اس نے مسکرا کر اسے سائینٹ کیا۔ ”انگریزی فلم میں کم دیکھا کرو اور اب اندر جاؤ۔

فارس صاحب نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہو گا۔ جاؤ۔“

”تھیں یو، خاور...“ رکی۔ الجھن سے شانے اپکائے۔ ”میں آپ کو کیا کہہ کر پکارا کروں؟ صرف نام سے پکارنا برا الگتا ہے اور ہمیں شپ ناٹکلڈ سے میرا اعتبار اٹھ چکا ہے۔“

”کر قتل خاور! تم مجھے کر قتل خاور کہہ سکتی ہو۔“

”اوہ یہ۔ آپ ایکس ملٹری ہیں نا، یاد آیا۔“ حنین نے اثبات میں سرہلایا۔ ”اچھا لگا آپ سے بات کر کے کر قتل خاور۔“ میں اکثر ہات کرنی چاہیے۔ وہ سرکشم دیتا مرکز کر جانے لگا تو وہ نے پکارا۔ ”کر قتل خاور... آپ کی فیصلی ہے؟“

خاور نے مرکرا سے دیکھا۔ ”ظاہر ہے!“

”اچھا۔ کون کون ہے آپ کی فیصلی میں؟“

”میری والدہ میری بیوی اور...“ ذرا رکا چہرے پر مدھم ہی مسکرا ہٹ آئی۔ ”میرا بیٹا۔“

”گذ!“ اذیت میں مسکرائی۔ خاور کافون پھر سے بخنے لگا۔ وہ مرگیا تو حنین بھی گھر کی طرف واپس چلی آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ مکر نشک تھیں۔

.....♦♦♦.....

انا پرست تو ہم بھی غصب کے ہیں لیکن ..... تیرے غور کا بس احترام کرتے ہیں  
رات جانے کس پھر بارش ہوئی تھی کہ جب صبح طلوع ہوئی تو موسم خوبگوار اور ابر آلود تھا۔ زمر نے کروٹ بدی نیند روئی تو آنکھیں ہولیں۔ وہ ڈرینگ نیبل کے سامنے کھڑا گھڑی پہن رہا تھا۔ کھڑکی سے روشنی اندر چھن چھن کر آ رہی تھی۔

زمر کی آنکھیں بدستور جل رہی تھیں۔ اسی طرح کروٹ کے بل لیئے، لحاف گردان تک تانے ہلکا سا پکارا۔

”فارس!“ وہ چونک کر مڑا۔ راؤ ٹنیک کی شرٹ میں ملبوس وہ گھڑی کی اسٹریپ بند کرتے آفس کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ رہا کام سکرا یا۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بہتر...“ وہ رکی، آواز خراب گلے چھی تھی۔

”تمہیں کیسے پتہ تھا مجھے استھما ہے؟“

”مجھے آپ کے بارے میں بہت کچھ پتہ ہے۔ اسی لئے...“ اسٹریپ کا بکل بند کرتے ہوئے وہ اس کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ ”کیا کل کچھ ہوا تھا؟ آپ صرف استھما کی وجہ سے ایسے نہیں رویا کرتیں۔“

زمر نے تھوک لگلا۔ ذرا سا بدقت مسکرائی۔ ”مجھے سعدی یاد آ رہا تھا، اور میں اس سے چار سال تک تعلق نہ رکھنے پلٹی تھی۔ اب بھی

میں بہت بہت گلٹی ہوں فارس!“ گلا پھر سے رندا۔

”وہل جائے گا، میں اسے ڈھونڈلوں گا، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ پھر گھڑی دیکھی۔ ”میں چلتا ہوں، آپ آرام کیجھے گا۔“  
”تم مجھے آپ کیوں کہتے ہو؟“ اسے عجیب وقت پر عجیب سوال یاد آ رہے تھے۔

فارس نے ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”کیونکہ ہم ایک دوسرے کے لئے اجبی ہیں۔“

اور فارس غازی تو اکثر ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن آج سے پہلے اتنا درد نہیں ہوا تھا۔ زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کل رات کے لئے شکریا!“

اس نے محض سر کو خم دیا اور مڑ گیا۔ مگر جاتے جاتے اس نے ایک دفعہ پھر زمر کو غور سے دیکھا تھا۔ (کچھ ہوا ہے اس کے ساتھ۔ کچھ بدلتا ہے۔) لیکن کیا؟ وہ سمجھنے میں پار ہاتھا۔

بیدار اہل قافلہ سونے کے دن گئے  
ہشیار آگ سے ہے جنگل گھر اہوا

چند گھنٹے مزید گزرے تو وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی یہڑیاں اترتی دکھائی دی۔ بڑے ابا کے کمرے سے ماحقاً اسٹنڈی کا دروازہ کھلا تھا۔ نیچے کش رکھ کر نیم دراز جنین نظر آ رہی تھی۔ وہ ادھر آئی، دروازہ بند کیا اور کاؤچ پر آبیٹھی۔ دونوں نے خالی دیران نظروں کا تبادلہ کیا۔

”میں نے پین سے وہ فلم منادی ہے، اور اس کو سات مختلف جگہوں اوری ڈیزیں میں ڈال کر محفوظ کر دیا ہے۔ آپ کیسی ہیں؟“

حمد نے شانے اپکائے۔ ”میں شاکنہ ہوں۔“

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ زمر اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی اور حمد چھٹت کو۔

”میں شروع میں فارس کو اچھا سمجھتی تھی، مگر پھر میری فیلنگر بدل گئیں۔“

”میں شروع میں ہاشم کو را سمجھتی تھی، مگر پھر میری فیلنگر بدل گئیں۔“

زمر نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔

”میں نے اس پر بالکل اعتبار نہیں کیا۔“

”میں نے اسی پر اعتبار کیا۔“ جنین چھٹت کو دیکھتے میکائی انداز میں بولی تھی۔

”میں نے اس کی کوئی بات نہیں سنی ہد!“

”میں صرف اسی کو سنتی رہی۔“

”مجھے نہیں پتہ تھا وہ ایسا نکلے گا۔ جنین!“

”مجھے بھی نہیں پتہ تھا وہ ایسا نکلے گا!“

”میں نے اس کا یقین کیوں نہیں کیا ہے؟“

”میں نے اس کا یقین کیوں کیا، پھر ہو؟“

پھر جنین نے نگاہوں کا رخ اس کی طرف پھیرا اور یا سیت سے اس کو دیکھا جو رات والے ملکے بس میں اداس سی کاؤچ پر بیٹھا۔ پاؤں بیٹھی تھی۔ ناک کی نتھی کی چمک ماند تھی۔ جنین کو احساس ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا عکس تھیں۔ مر رائج۔ جو ہو بہو ایک سا ہونے کے باوجود دلائیں با میں سے الٹا ہوتا ہے۔

فارس ماموں نے کیا کہا جب آپ نے ان کو بتایا؟“

زمر نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔ خنین ایک دم اٹھی۔ سوگ جیسے ٹوٹا۔ ”اوہ گاؤ۔ آپ نے ان کو نہیں بتایا؟“

”میں اس کو نہیں بتاؤں گی! کیا مجھے بتانا چاہیے؟“

خنین بالکل چپ ہو گئی۔ ”ماموں ہاشم کو گولی مار دیں گے۔ وہ اپنے غصے کو کنٹرول کرنا جانتے ہیں، لیکن اس ویڈیو سے وہ سمجھ جائیں گے کہ سعدی بھائی کاردارز کے ہی پاس ہے۔ اور....“

”اور وہ اس دفعہ صرف ان کو ایکسپوز کرنے یا مالی تقصیان پر بس نہیں کرے گا۔ وہ ان کی جان لے لے گا۔ میں ساری رات سوچتی ہیں ہوں خنین۔ یہ ڈاکٹر ایمن یا بیاناز بیگ یا جسٹس سکندر نہیں ہے، یہ ہاشم کاردار ہے، فارس کا اس سے تعلق ہے۔ وہ پاگل ہو جائے گا اور سب رواب ہو جائے گا۔ اس کا دل اسے کنٹرول کرنے لگے گا۔ اور ایسے میں وہ غلطی کر بیٹھے گا۔“ اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ ”سعدی نے لما تھا مجھے، اسے ہاشم پر شک ہے، میں نے کیوں اس کی بات نہیں سنی؟ میں نے فارس کی زندگی برداشت کر دی تھا!“

خنین اس کے قریب آئی۔ اس کے قدموں میں بیٹھے اس کے گھنٹوں پر ہاتھ رکھے۔

”اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انہوں نے ہر چیز بہترین طریقے سے پلان کی تھی۔ آپ نے اپنی صحت کھوئی تھی، آپ کے ابا کو لانے ہو گیا تھا، آپ اور کیا کرتیں؟“

زمر نے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”مجھے اس کی بات سننی چاہیے تھی۔“

”آپ نے سنی تھی، پھر اپنی گواہی بھی واپس لے لی تھی۔ آپ نے ان کو جیل نہیں بھیجا۔ یہ سب کرمل خاور اور ہاشم کاردار نے کیا ہے۔ میری طرح خود کو الہام دے کر مایوس کا شکار مت ہوں۔ مجھے دیکھیں۔“ بے چارگی سے شانے اچکائے۔

”مجھے لگتا تھا میں بہت روؤں گی، مگر میں نہیں روئی۔ میرے اندر کی آگ میرے آنسوؤں کو سکھا چکی ہے۔ مجھے ان سے انتقام لینا ہے۔ کل میں خیبر لے کر ان کے گھر گئی، سوچا جو سامنے آئے اس کو قتل کر دوں گی۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ ہم یوسف خاندان، ہم ان سے ہر دفعہ اہل ہمارے جاتے ہیں؟ کیونکہ ہم یوسف بن کاردار بن کر نہیں سوچتے۔“

”اور سعدی کو واپس لانے کے لیے ہمیں کاردار بن کر سوچنا ہوگا۔“ زمر نے اثبات میں سر ہلا�ا۔ نم آنکھیں رگڑیں۔ ”ہم فارس کو اسی پفہ نہیں بتائیں گے۔ کاردارز نے ہمارے ساتھ ناٹک کھیلا اتنے برس۔ اب ادا کاری کرنے کی باری ہماری ہے۔“

”اور ہم سے اچھی ادا کاری وہ کرنیں سکتے۔“ خنین انگارے ہوتی آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ زمر بھی ہلاکا سما سکرائی۔

”آپ فارس ماموں کو اتنا تو بتا سکتی ہیں تا کہ آپ کو ان کی بے گناہی پر یقین ہے؟“

زمر نے گھری سانس لی۔ ”خنین میں بہت لگلٹی ہوں، مجھے نہیں لگتا میں بھی دوبارہ لااء پر یکیش کر سکوں گی، میں نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے، لیکن اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں فارس کے قدموں میں گر کر معافی مانگوں گی تو ایسا نہیں ہوگا۔ اگر میں زمر یوسف ہوں تو میں سر زندگی کر سکتی۔“

خنین نے اثبات میں سر ہلا�ا۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے۔

”چھپو، ہم کیوں بے وقوف نہ کئے؟ ہم تو اتنے جیسیں لوگ تھے اتنے اسارت۔ کاردارز کو پہلے ہی دن سے کیوں نہ پکڑ کے؟“

”یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا، ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہوتا ہے۔ خنین آپ جتنے اسارت ہو جائیں، کوئی آپ سے زیادہ اسارت ہوتا ہے، اور کبھی آپ ان سے زیادہ اسارت ہوتے ہیں۔ ہم بے وقوف نہیں تھے۔ ہم صرف انسان تھے۔ ہم خدا نہیں تھے۔ ہم دلوں میں عال نہیں جان سکتے۔ وہ ہمارے اتنے اچھے اتنے میزرا ڈاول ملسا رے رشتے دار تھے، رشتے داروں پر کون شک کرتا ہے جسے؟“

”فی الحال ہمیں ان سے زیادہ اسماڑت ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر ہماری کمزوریاں ہیں، تو ان کی بھی ہوں گی۔“

”ہم ان کمزوریوں کو ڈھونڈیں گے۔ اور ہاشم کو ایسی سزا دیں گے، کہ دوبارہ وہ کسی کے ساتھ وہ نہ کر سکے جو ہمارے ساتھ کیا۔“  
خین ایک دم اٹھی۔ ”چاکلیٹ کھا میں گی؟“

کچھ دیر بعد اس کرے میں جھانک تو حمد پاؤں لبے کے نیچے کش پلیٹ تھی اور زمراء پر صوفے پلیٹ تھی۔ دونوں اپنی چاکلیٹ کا ریپر کھول رہی تھیں۔ فرش پر گولڈن گول چاکلیٹس کا یہ برا ساڑہ بھلا پڑا تھا۔ اور ارگردوس میں گولڈن ریپر کھرے تھے۔ آدھا ڈب ختم ہو چکا تھا۔  
زمرے نے ایک ریپر گول مردوڑ کر نیچے اچھالا اور چاکلیٹ چباتے ہوئے ایک دم ہنسنے لگی۔ ”میں واقعی چار سال پہلے ایک ریکارڈ ڈکال سے بات کر رہی تھی اور مجھے لگا، میں فارس کی روح کو قتل جیسے جرم سے بچا رہی ہوں۔“

خین نے ہنسنے ہنسنے گردن پیچھے کو پھینکی۔ ”اور ہاشم اور اس کی بوٹوں کی ماری ماں... باہمیں متینی کی صبح ہمارے گھر آ کر بولے... ہمیں کیوں اطلاع نہیں دی؟ ہاہاہا۔“ زمرہنستی جارہی تھی۔

”اور ہم نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔“

خین کے ہنسنے ہنسنے آنکھوں سے آنسو بنتے گلے۔ ”اور میں ہاشم کو متین کرتی رہی وہ تو سارے متین بھائی کو پڑھاتا ہوگا،“ کو دیکھو میں تمہاری بہن کے ساتھ کیا کیا کر سکتا ہوں۔“

زمرہنستی جارہی تھی۔ ”اور ہاشم میرے ہاسپل بنز پر کرتا ہے۔ جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہو۔“ خین کے ہنسنے ہنسنے بنتے بنتے آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی۔....

باہر لا ون خ میں سیم منہ سورے بیٹھا تھا۔ جوان در چاکلیٹ کا ڈب کھایا جا رہا تھا وہی تھا جو جنہے نے بہت پیار سے سکم کو بر تھڈے پر تختے میں دیا تھا اور آج اتنے ہی پیار سے اس کی الماری سے نکال لیا تھا۔ تبھی فارس اندر داخل ہوا۔ ابا کو سلام کر کے سیم کو پکارا۔

”تمہاری پچھوٹھی تھیں؟“

”ہاں، وہ اسندی میں ہے۔ خین کے ساتھ۔ تم جلدی آگئے بیٹا۔“ ابا کو حیرت ہوئی۔

”زمر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، میں نہیں لے کر جاؤں گا تو وہ چیک اپ کے لئے نہیں جائیں گی۔“

سیم نے ناراضی سے اسے دیکھا۔ ”بالکل ٹھیک ہیں وہ۔ اور وہ کٹو بھی بالکل ٹھیک ہے۔“

فارس نے غور سے اسے دیکھا اور ساتھ آ بیٹھا۔ ”کیا ہوا؟“

”پچھو کے دماغ کو پکھہ ہو گیا ہے۔“

(تمہیں آج پتہ چلا ہے؟) مگر صرف سوالیہ ابر و اٹھایا۔

”میری ساری چاکلیٹس لے لیں، اب اندر بیٹھی ہیں، اور نہستی جارہی ہیں، میں ایک دفعہ اندر گیا تو وہ کٹو ہتی، باہر جاؤ،“ ہم اس وقت بہت دلکھی ہیں۔ یار ماموں، دکھ دکھ میں دونوں میری ساری چاکلیٹس کھا گئیں۔“

فارس نے اچھے سے بند دروازے کو دیکھا۔ پھر اٹھ کر دستک دی۔ حنے نے دروازہ کھولا۔

”حج والی ویدیوں گئی ہے ہمیں۔ دیکھیں اور آپ بھی انجوائے کریں۔“ مسکراتے ہوئے پین اس کی طرف بڑھایا۔ فارس کی نظریں پیچھے صوفے پر دراز مرستک گئیں۔ وہ چاکلیٹ کھولتے ہوئے مسلسل نہستی جارہی تھی۔

(استغفار اللہ) وہ نفلگی سے بڑا کر پین لیے اور چلا گیا۔

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی ..... ہم گھوم پھر کر کوچہ قاتل سے آئے ہیں  
یہ چند دن بعد کا قصہ ہے۔ رات ہارون عبید کے گھر بھی ویسی ہی سیاہ تری تھی۔ ڈائینگ ہال میں لمبی سی میز کے گرد شاہانہ طرز کی اوپنی  
رسیاں رکھی تھیں۔ سربراہی کرنی پڑا ہارون بر اجمن سنت تھے، اور دلیل ہاتھ پیشی جواہرات سے گفتگو کر رہے تھے۔ وہ رات کی مناسبت سے سیاہ  
اباس میں ملبوس تھی، گردن میں سیاہ نگوں اور ہیر دل سے بچکا گئے تھے۔ کلیس پانگی پھیرتی مسکرا کر ہارون کی بات کا جواب دے رہی تھی۔ جواہرات  
لے دائیں ہاتھ ابدار پیشی سر جھکائے چاولوں میں مست روی سے جھجھ بلا رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر جواہرات کو بھی دیکھ لیتی۔ ان نگاہوں  
میں ناراضی تھی، پوزیو قسم کی ناراضی تھی۔ ابی کے موبائل پر پیغام آیا۔ ڈاکٹرنویں۔

”آبدار، دو کیسر مزید آئے ہیں، آپ کی ریکوائرمنٹ کے مطابق ہیں، انہوں یا ورنچ کروادوں؟“ وہ ایک دم خوشی سے ”جی شیور“ لکھنے لگی۔  
”آبی!“ دفعتاً جواہرات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”تم اس روز ڈنر پہ نہیں آئیں، ہاشم تمہارا پوچھ رہا تھا۔“ آبی فوراً سنبھل گئی۔ ڈرای  
مسکرا کی۔

”آپ کو پتہ ہے میں پارٹیز، اور ڈنر پہ نہیں آیا کرتی۔ میں ہاشم سے مذکورت کر لوں گی۔“

”اتنے سال بعد دوبارہ سے شہر مودو کرنا، تمہیں مشکل تو نہیں ہوئی؟“

آبدار نے شانے اچکائے۔ ”مجھے سارے شہر اچھے لگتے ہیں۔ کراچی میں چند سال رہنے سے وہ بھی اچھا لکھنے لگ گیا تھا۔“

”ہاشم میری کالنگ کا جواب نہیں دے رہا جواہرات۔“ ہارون نے گلہ کیا۔

”وہ جب سے واپس آیا ہے اپ سیٹ ہے، تم کچھ دن کے لیے میرے بیٹے کو ٹنگ نہ کرو تو اچھا ہے ہارون۔“ اور اس بات پر فال  
ماہفہ بلند ہوا۔ آبی جرأہ مسکرا کی اور سر جھکائے منہ میں کچھ بڑا رہا۔ دفعتاً نظر سر کے کی بوتل پر پڑی۔ سرئی آنکھوں میں شرارت چمکی۔ احتیاط  
تے ان کو دیکھا۔ جواہرات ہارون کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اور یہ چائیز کمپنی کا کیا مقصد ہے؟ ہاشم اور تم کن کاموں میں لگے ہو؟“

آبدار نے سر کے کی بوتل اٹھائی۔ بوٹل چھوٹی تھی گر کاس پر کوئی نیک نہیں تھا۔ اس نے اپنے گلاس میں ٹھوڑا سا ڈالا پھر... مصروف

تے انداز میں جواہرات کے واٹر گلاس میں اٹھیا۔ اسے پورا بھرا۔ وہ دونوں ہنزو ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیزانداز میں باشیں کر رہے تھے۔

تل رے فاصلے پر کھڑے ملازم نے بے بُسی سے آبدار کو دیکھا، مگر آبی کی ایک گھوری اور وہ چپ رہ گیا۔

آبدار نے تصویب سے بوتل بند کر کے پرے کھدی اور بہت سنجیدگی سے کھانا کھانے لگی۔ مگر بلوں پر مسکرا ہٹ مسلسل تھی۔

دفعتاً اجازت طلب کر کے احر اندر داخل ہوا۔ آبدار نے چونک کر سراخھایا، پھر خنگی سے اسے اور پھر ہارون کو دیکھا۔

”بابا، کیا ڈنر نیبل پر بھی کیسے منیجگر کا ہونا ضروری ہے؟“

”احمر کو میں نے ہی بلا یا تھا۔ لااؤ، پیپر زدو۔“ احر نے مودب سے انداز میں پیپر بڑھایا تو انہیوں نے عینک ناک پر جماتے دستخط  
لے۔ جواہرات نے گردن اٹھا کر احر کو دیکھا۔

”احمر شفیق... تمہیں ہارون کے لئے میں نے ریکیمنڈ کیا تھا۔ امید ہے تم نے ان کو ماپس نہیں کیا ہوگا۔“

احمر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دیا، گویا شکریہ ادا کیا۔ پھر ڈنیوٹی پر کھڑی فلپیو میڈ کو خاطب کیا۔

”سو زین پلیز مز کار دار کا اور گلاس اٹھا لو اس پر ڈسٹ ہے۔ گلاس بدلت کر لاؤ۔“

آبدار نے ہر بڑا کر سراخھایا۔ وہ سو زین کا انتظار کیے بغیر خود ہی گلاس اٹھا کر اسے پکڑا نے لگا۔ آبی کی آنکھوں میں تملہ ہٹ ابھری۔

احمر اسے دیکھنے بغیر، کاغذ لئے واپس بلٹ گیا۔ وہ مذکورت کر کے پیچھے آئی۔

”سنوا حمر شفیع!“ لان میں تیزی سے چلتی آئی اور ناراضی سے اسے پکارا۔ احمد تسلی سے مرا۔ ”بی؟“

”میرے ملازموں کی ہمت بھی نہیں ہے کہ میری ڈائینینگ نیبل پر مداخلت کریں تو آپ کو کس نے اجازت دی کر اکری ہٹانے کی؟“

”مس عبید، ہم دونوں کو پتہ ہے آپ نے کیا کیا ہے۔ ایک کڑوا گھونٹ پی کر ذرا سا کھانیں کر، مز کاردار یہاں آتا رک نہیں کریں گی۔ اگر کچھ خراب ہوگا تو آپ کا اور آپ کے والد کا رشتہ۔“

وہ منہ میں کچھ بڑا بڑا۔

”مجھے فارسی میں گالیاں ذرا اوچی دیا کریں تاکہ مجھے سمجھ میں آئیں۔“

”اپنے دوست کی جگہ تمہیں مرڈ رہو جانا چاہیے تھا۔ اس کی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔ آج پھر وہ کسی ”سید سعدی“ واک سے واپس آیا تھا۔

”نو اش لیکن وہ صرف منگ ہے۔ امید ہے کہ زندہ ہو گا۔“

وہ جو خلکی سے اندر جانے لگی رکی۔

”تو تاوان نہیں مانگا کسی نے؟“

”نہیں۔ مگر وہ نیک کام کا سائنسدان تھا، تھرکول میں کام کرتا تھا، ایسا بندہ بذاتِ خود بہت قیمتی ہوتا ہے، تو یقیناً اس کو مقیدر کھکھلا سے قیمتی معلومات نکلوائی جا رہی ہوں گی۔ خیر یہ صرف ایک تھیوری ہے۔“

اور آبدار عبید، جو حمر شفیع پر فاتحہ پڑھ کر جانے لگی تھی، اور محض انسانی ہمدردی کے لئے چند سوال پوچھ لئے تھے، ایک دم رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”تم کہہ رہے ہو کہ وہ تھرکول کا سائنسدان تھا اور... اسے کسی نے کہیں چھپا کھا ہے؟“ دل زور سے دھڑکا۔

”ہوں۔ اوکے۔ میں آفس جا رہا ہوں۔ آپ ڈریکٹر کریں۔“

اور آبدار عبید وہی گھم کھڑی رہی۔ ایک لمحے نے اسے قید کر لیا تھا۔

وہ الہام کا لمحہ تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے ..... یہ غم سحر کا یقین بنا ہے

اس رات انیکسی کے تہہ خانے کی ساری بیان جلی تھیں، اور اس چھوٹے کمرے کا دروازہ ٹھلا تھا۔ فارس اور حمدہ کری پہ بیٹھے تھے، نکدہ زمر میز سے ٹیک لگائے کھڑی خین کو بتا رہی تھی۔ کہ کس طرح انہوں نے پچھلے سائز ہے تین ماہ میں اس گن کے تمام خریداروں کا پتہ کیا۔ مگر بے سود۔ جائے وقوع کے آگے پیچھے سی کی لٹی ودی کیسرے چیک کروائے، مگر ہر جگہ سے ریکارڈنگ صاف ملتی۔ ایک بیلنسر، ایک بیلنس، پرائیویٹ ڈاکٹر، سعدی کے ہر ممکنہ دوست، ایک ایک سے ملے۔ وہ بتائے جا رہی تھی اور خین سن رہی تھی۔ (کیا جنگ میں جانے والے اور پیچھے بیٹھے رہ جانے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ جب وہ خود کو ہاشم میں مصروف رکھ رہی تھی تو یہاں کوئی راتوں کو جاگ جاگ کر ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاشم، اف۔ اس نے سر جھٹکا۔ وہ کوئی شین اتنی کرش نہ تھا کہ حقیقت معلوم ہونے پر دل سے نکل جاتا اور وہ بُنی خوشی رہنے لگتی۔ وہ تو مرض عشق تھا اور آج بھی پہلے کی طرح جان لیا تھا۔)

فارس دیوار پر گلی جج کی تصویر دیکھ رہا تھا جب حد نے پکارا۔

”آپ کو ہسپتال یوں جلانا نہیں چاہیے تھا۔“

فارس نے سوالیہ اپرواٹھائی۔

”آپ کو ان دونوں میاں بیوی کو اندر لاک کر کے ہسپیتال جلانا چاہے تھا۔“

وہ بُلکا ساہنسا۔ بہت دن بعد۔ شاید بہت سالوں بعد اس نے حنے کو واپس موڈ میں دیکھا تھا۔ پھر آگے ہو کر لیپٹاپ کی اسکرین اس لے مانے کی۔ اسے کام سمجھا یا۔

”تمہے کرلو گا؟ شیور؟“

”تکہ مسماع نہیں ہے۔“

یہ لوئی مسلمہ، ہی یہیں!

زمر کافی بنانے جاہی ہی، آج پوری رات جاگ کر ہر چیز فائض کرنی تھی۔ جاتے جاتے رکی۔ ”حتماً تمہارے لئے کریم ڈالوں؟“

”بھی۔ بالکل۔“ خدہ نے مسکرا کر کہا۔ زمر مبھی مسکرا کر سر ہلا تی چل گئی۔ فارس نے ایک گھبری نظر اس پر ڈالی، دوسری حین پر۔ پھر

اپ کرتے ہوئے سرسری ساتھ رہ کیا۔

”دکھ کیا کیا شکی ادھر سکتی ہو گئی سے۔“

خینی نے جو نک کر اسے دیکھا، پھر حک کر یوں۔ ”کسی کو بڑی جلوہ ہو رہا ہے۔“

”وَاللَّهُ أَعْلَمُ“، أَكَدَ زُجْجَانِيَّاً حسْنَى مُسْكَنَى كَأَنْ كُلَّ بَرِّ كَاطِنٍ يَتَهَوَّدُ صَشْكَانِيَّاً كَذَا كَمَا تَسْعَى سَانِيَّاً بَعْدَهُ

۱۰ اور نہ بہت سے لوگ مشکل میں رکھاتے.....

و زم کیک می کھنے کا فنا تھا جو نہ سست سمعوا کی اتنی کر رہی تھی کہ کسی سچے کا شہادت اور شمشک کا لکھنے کا کام

این تھی۔ زمر نے رخ بالکل موز لیا۔ کم از کم اگلے کچھ دن تک وہ ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی ورنہ خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا۔ ابھی خود کو تیار اتنا تھا۔ مضبوط کرنا تھا۔ ایک لمبی ادا کاری کے لیے۔

• ♦ ♦ ♦

اں ال سیہ شاخ کی کمان سے، جگر میں ٹوٹے میں تیر جتنے ..... جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے دو ہفتے بعد جب تمبردم توڑ رہا تھا، اور جس اور گرمی کافی حد تک کم ہو چکی تھی، انگلی پر شام پھیلی تھی۔ فارس اپنے کمرے کے باٹھروم میں، کے سامنے کھڑا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھتے، وہ ریز سے آہستہ آہستہ شیونگ کر کیم واپ کر رہا تھا۔ ایک واپ۔ دوسرا واپ۔ ایک جگہ ہلاکا مالٹ لگا تو وہ رکا۔ انگلی سے خون کی نسخی بوند کو چھو کر دیکھا۔ آنکھوں میں وہی سرد مہری پیش تھی۔

(”میں نے تمہیں اپنے چیمبرز میں صرف اس لئے بلا یا ہے فارس غازی تاکہ تم وہاں تماشانہ کرو۔“ وہ میز کے سامنے ہٹھڑی میں لم، اقا، اور میز کے پیچھے کھڑے نج، کپ میں ٹیک کھولتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

‘اے کہو جو تم نے کہنا سے اور پھر خاموشی سے غائب ہو جاؤ۔’)

فارس نے بلیڈر کھا اور ٹوٹی کھوئی۔ جھک کر ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھرا اور چہرے پڑا۔ مختد اپنی چہرے کو دھوتا، کچھ چھینٹے اپنے بھی گراتا گیا۔

(”میں نہیں کھوں گا کہے گناہ ہوں، سو فصلہ میں ایکس سننے کے بعد آئے کو کرنا ہے، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میں ایکس سننا چاہئے۔

کوہاٹ ایڈن کے طبق مجھ کو ایک بیان مل لئے تھے کہ "پچھے چھے صدیک سا عتمد نہیں ہوتے"۔

”بھکڑی لگے ہاتھوں کومیز پر کئے وہ بے کی بھرے غصے کے کھرہ رہا تھا۔“ تاریخ ملے تو پراسکیو مرنیں آتا، کبھی نجح غالب ہوتا ہے، اسی ہڑتاں ہو جاتی ہے۔ میں دوسال سے چودہ، چودہ دن کی امید پر جیل میں معلق ہوں۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ تم لوگوں میں سے کوئی بھی مجھے

باہر نہیں لانا چاہتا، پھر بھی، میں تم سب کو ایک موقع دیتا ہوں...“ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر توڑ توڑ کر الفاظ ادا کیے۔ ”میرا... کیس... سنا جائے۔ ہر ہفتے سنا جائے۔ غیر معینہ مدت کے لئے ملوٹی نہ کیا جائے۔ نج صاحب!“ وہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے، سوچ میں گم ڈریں شرت کے بٹن بند کر رہا تھا۔ تین... دو... ایک۔ اوپری بٹن کو کاچ میں مقید کرتے، اس کی آنکھوں میں وہی سردی آگ تھی۔

(نج صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے۔ رعونت سے اسے دیکھتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرا، پھر کپ رکھ کر آگے ہوئے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اگلی دفعہ اگر مجھے پکارنے کی غلطی کرنا، تو مجھے یور آز، کہنا۔ ساتھ نے؟ یور آز۔ کیونکہ میں.... ایک عزت مآب عدالت کا آزر بیبل نج ہوں۔“ سینے پر انگلی رکھ کر تکبر سے کہا۔ ”میں ایک میں آف آز ہوں۔ اگر تم سے بات کر رہا ہوں تو اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھو۔ یور آز، ساتھ نے؟ میں ایک سیلف میڈ آدمی ہوں۔ ایک دن میں عدالت عظیمی کا چیف جنس ہوں گا۔ اور تم جیسے آز کلر زبت بھی جیل میں سرڑ رہے ہو گے۔ تم مجھ پر شوت کا کیا الزام لگاؤ گے، پیسہ میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں.... فارس غازی،“ میں جنس سکندر حسین ہوں۔ میں اپنے آز کے لئے جیتا ہوں۔“)

وہ اب کمرے میں ڈرینگ نیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ گرے کوٹ پہننے ہوئے اس نے اپنے عکس کو دیکھتے کا لرد درست کیے۔ پھر پر فیوم کی شیشی اٹھا کر اپنی گردن پر اپرے کی۔ لمحے بھر کے لئے آنکھیں بند کیں۔ خوبصوری ہر جگہ پھیل گئی۔

(”تو تم پہلے ہی فصلہ کر چکے ہو کہ میں مجرم ہوں۔ اب میری بات سنو۔“ ہتھکر یوں والے ہاتھ میز پر رکھے دہ کھڑے کھڑے نہ کی طرف جھکا اور ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں پتہ ہے کون ہوں؟ میرے پاس وہ گنز کیوں ہوتی ہیں؟ کیونکہ میں.... ایک... شکاری ہوں۔ اور میں قبر تک اپنے شکار کا پیچھا کرتا ہوں۔ اس لئے یور آز، تمہیں میں اس کیس سے دستبردار ہونے کے لیے تو کہوں گا ہی، لیکن ایک بات اپنے مالکوں کو بھی بتا دینا۔“ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھتے ہوئے چاہیا کر بولا۔ ”انہیں کہنا کہ ایک دن فارس غازی پاہر ضرور آئے گا، اور اس دن۔ فارس غازی ہو گا، نج بھی... جیوری بھی... اور جلا دبھی!“ پھر سر کو خم دیا۔ ”یور آز!“

”فارس!“ وہ مسکرائے۔ ”جس دن میں سپریم کورٹ کے جنس کا حلف اٹھا رہا ہوں گا، اس دن بھی تم جیل میں سرڑ رہے ہو گے۔“ اس نے آنکھیں کھولیں۔ (اس واقعے کے ایک دن بعد اس نے نج کو کیس سے دستبردار ہونے کی درخواست دے دی تھی، نج ہٹ بھی گیا لیکن سعدی کے ہاتھویڈ یوگ جانے کے بعد۔۔۔ سعدی نے سارا کھیل ترتیب دیا اور وہی نج دوبارہ اس کیس کی سماحت کرنے لگا۔) فارس نے آہستہ سے کوٹ کا بٹن بند کیا۔ عکس میں اپنے پیچھے زمرا کھڑی ہوتی دکھائی دی۔ وہ اس کی شرت کے کارکو دیکھ رہی تھی۔

”تم نائی کیوں نہیں پہننے؟“ فارس نے چہرہ موڑ کر انہی سرد پیمنے نظر وں سے اسے دیکھا۔

”کیونکہ نائی مجھے پھاٹی کے پھندے کی طرح لگتی ہے۔“

اور فارس غازی تو ایسی باتیں کیا کرتا تھا، لیکن آج سے پہلے اتنا درد... زمر نے نگاہیں چراتے سر جھکا۔ وہ سیاہ ڈریں میں بال ہاف باندھے تیار کھڑی تھی۔

”تم تیار ہو؟“

”پوری طرح!“ وہ کہتے ہوئے چاہیاں اٹھائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

صحح کا بادشاہ شام کو مجرم ٹھہرے ..... ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا ہے! ہال میں وسیع پیانے پر ڈریبلز لگی تھیں۔ ہائیکورٹ بار ایسوی ایشن کے مبڑ، بجو، سینٹر و کلاء، پر اسکیو ٹرزا، سب شامل تھے۔ ایک ہوئے سوت والا شخص جو دیکھنی نہیں تھا، مگر جس طرح آگے پیچھے ہدایات دے رہا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ جو ڈریبلز ہاں جس سکندر کی طرف سے "ہائیکورٹ کا نجح مقرر ہونے کی خوشی" میں دیا گیا ہے، اس کا فائدہ کرنے والا یہی امیر آدمی ہے۔

ایک میز پر زمری یوسف کھڑی تھی۔ سیاہ لباس، اور ہلکی جیولری کے ساتھ، مسکراتے ہوئے وہ جسٹس سکندر کو مبارکباد دے رہی تھی۔

"آپ آج کل نہیں نظر آرہیں۔" سعدی والی تختی بھلائے (کہ یہ تو کچھری کاروز کا معمول تھا) وہ مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔

"جاب ختم ہونے کے بعد کچھ ماہ پر ایوٹ پر کیکش کی تھی۔ کچھ دن سے وہ بھی چھوڑ دی ہے۔ آج کل ہاؤں وائف ہوں۔" مسکرا کر

ساتھ سوت میں لمبیں ہینڈسم سے فارس کی طرف اشارہ کیا تو جسٹس صاحب اس کی طرف مڑے۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ اسکی طرف اچھا لی۔

"معلوم پڑتا ہے کہ شکاری نئی زندگی شروع کر چکا ہے۔ گذ؟" مصافی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ فارس کھلے دل سے مسکرا یا۔

بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔

"کرتو چکا ہوں، لیکن انسان اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔" جسٹس صاحب کی آنکھوں میں دیکھ کر اضافہ کیا۔ "یور آزرا!"

"گلڈ گلڈ!!" انہوں نے سرا ثابت میں ہلایا۔ "ہماری دعوت قبول کرنے کا شکریہ۔ خوشی ہوئی تم سے دوبارہ مل کر۔"

"مجھ سے زیادہ نہیں ہوئی ہوگی۔ اور بہت مبارک ہو آپ کو یور آزرا۔ بالآخر آپ کو وہ سب ملنے جا رہے ہیں، جس کے آپ مستحق ہیں۔"

نج صاحب نے سر کے خم سے شکریہ وصول کیا۔ فخر سے ارد گرد پھیلی تقریب، اس عزت اور وقار کو دیکھا جو ہر ایک کی آنکھوں میں ان

کے لئے تھا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا، شکاری۔ ایک دن ہم پریم کوٹ بار میں ملیں گے۔" فارس ہلکا ساہنہ دیا۔

"اور ہاں تمہارے بھانجے کا افسوس ہوا۔ لگتا ہے، اس نے اپنے قد سے بڑے دشمن بنانے تھے مگر تم اپنا خیال کرنا۔" کالر جھاڑے اور آگے بڑھ گئے۔ ان سے ہاتھ ملانے کے لئے بہت سے لوگ منتظر تھے۔

طویل میز کے گرد بیٹھے افراد اب اٹھ اٹھ کر بٹیبل کی جانب جا رہے تھے۔ زماں پی جگہ سے اٹھی۔ چند وکلاء حد ساعت میں بیٹھے

تھے سو شانگی سے فارس کو خنا طب کیا۔

"آپ کو کچھ لا دوں۔"

"میں آرہا ہوں۔" وہ اس کے ساتھ اٹھا۔ وکلاء برداری کو یاد تھا کہ وہ مرڈڑڑاں کے تحت چار سال جیل میں رہا ہے، یہ بھی یاد تھا کہ زمر نے اس کے خلاف گواہی دی تھی اور اکثریت کو اس کے گناہگار ہونے کا یقین بھی تھا، لیکن مقدمے جیل، پیشیاں یا اس کیمیوٹی میں اتنا عام تھا، خود ہر ایک پاتنے کیمز تھے اور اتنے کیسر میں اس نے ایک دوسرے کو پھنسا رکھا تھا کہ عالم لوگوں کی نسبت ان کو اس بات سے فرق کم پڑتا تھا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے بٹیبل تک گئے۔ فارس نے جھک کر اس کے کان کے قریب سرخوشی کی۔ "مجھے آپ نہ کہا کریں، میں صداقت تھوڑی ہوں؟" زمر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرا ای، چپ چاپ کھاناڑا لئے گئی۔ وہ ڈل لگ رہی تھی۔

دفعتاً ایک دیڑہاں سے گزر اور یکوت اٹھائے، اس نے باری باری ریسٹورانٹ میں لگے ہرٹی وی اسکرین کا چیل بدل۔ ایک منصوص چیل سیٹ کیا۔ اور آواز اوپنی کر دی۔ پھر سر جھکائے فارس کے قریب سے گزرنے لگا تھا تو فارس نے اس کی جیب میں لپٹے ہوئے نوٹ رکھے، اور کندھے کو ہلکا سا تپکا تو وہ آگے بڑھ گیا۔ فارس نے نظر اٹھا کر سی اٹی وی کیسرے کو دیکھا، جس کا رخ اس طرف نہیں تھا اور مسکرا یا۔ (آج کی شام، یور آنر کے نام!)

وہ دونوں واپس طویل میز پر آبیٹھے، تو جشن سکندر ان کے سامنے، مگر چند کریساں چھوڑ کر بیٹھے تھے۔ وقار سے کھڑی گردان، اور غفرنے سے اٹھنے کندھوں کے ساتھ وہ کہہ رہے تھے۔

”میں آپ کو بتاؤں جشن اسیدا یے موقعہ شخص کے کیریئر میں آتے ہیں، لیکن حلال کا ایک لقہ جو آپ اپنی اولاد کے حلقت سے گزارتے ہیں، اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔“ وہ کہہ رہے تھے اور باقی افراد نے ہرشے جانے کے باوجود بھی سر دھنا۔ ”وہ کہتے ہیں ناکہ گیڈڑی کی سوالہ زندگی سے بہتر ہوتا ہے....“

”شیر کا ایک دن!“ فارس نے مسکراتے ہوئے گاس لبوں سے لگایا۔ جشن صاحب اپنا فقرہ پورا نہیں کر سکے کیونکہ زمر نے کاٹنا زور سے پلیٹ میں گرا یا تھا۔

”اوہ گاڑا!“ چہرہ موڑے وہ اتنا اوپنجابوی کہ چند لوگ اسے دیکھنے لگے، پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ٹی وی اسکرین کو دیکھا اور.....

ریشوراث کے اس ہال میں تین ٹی وی اسکرینز نصب تھیں۔ یہ بڑی بڑی صاف اور واضح اسکرینز۔ اور سب لوگ اب مژمڑ کران پر چلتی نیوز دیکھ رہے تھے۔ نیوز کا سڑھپ معمول حلق پھاڑ کر اونچا اونچا دیکھ رہی تھی۔

”یہ یہ یہ یہ پچھہ دیر پہلے انہنزیٹ پر پوسٹ ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی واڑل ہو گئی ہے۔ ہم آپ کو ایک دفعہ پھر بتاتے چلیں کہ ویڈیو میں موجود سیاہ کوٹ والے شخص کی شناخت ہائیکورٹ نجی جانب جشن سکندر حسین شاہ کے نام سے ہوئی اور...“

ریشوراث میں سنا تا چھا گیا تھا، جشن سکندر ہاتھ میں گاس پکڑے سُن سے گردن اٹھائے وہ ویڈیو دیکھ رہے تھے۔ اسی کو اٹھی کی صاف اور واضح ویڈیو۔ جس میں اسٹنڈنٹ نیبل کے سامنے ایک کرسی پر اوسی پی صاحب نظر آ رہے تھے، اور تیز تیز کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کے سر پر جشن صاحب کھڑے تھے اور غصے سے کچھ کھڑہ رہے تھے، آواز ہیک سے نہیں آرہی تھی، مگر آواز کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ جیسے ہی اس کی پی نے کاغذ اور قلم رکھا، نجی نے جواب اس کے سر کے پیچے کھڑے تھے اور کیمرے میں بہت واضح نظر آ رہے تھے ایک دم اوسی پی کی گردن میں بازو ڈال کر ان کو جکڑا، اور اس سے پہلے کہ وہ ان کا ہاتھ ہٹا پاتے، نجی نے ایک سرخ اس کے کندھے میں گاڑھی۔ اوسی پی

مزاحمت کر رہے تھے، ان کا بازو ہٹاتے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، لیکن پھر.... ان کا جسم ڈھیلا پڑتا گیا۔ گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ نجی نے سرنج جیب میں ڈالی، کار جھکلے۔ اوسی پی کا سر کا غذ پر رکھا، بازو درست کیے۔ جیسے وہ لکھتے لکھتے سو گئے ہوں، اور جانے کے لئے مڑ گئے۔ یہ ایک طویل ویڈیو میں سے کاٹا ہوا ایک نخساں کا ٹپ تھا جس کی قیمت سعدی یوسف نے فارس غازی کی بربت لگائی تھی۔ اب وہی کلپ ریشوراث میں ایک نیشل ٹی وی چینل پر چل رہا تھا اور جشن سکندر کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

پھر لوگ مژمڑ کران کو دیکھنے لگے۔ جیرت، شاک، اور ایکسا عتمت سے۔ ان کا الشارکا موبائل مسلسل وابریث ہونے لگا۔ ڈنر کے فنڈر نے جلدی سے پیٹ کو واشارہ کیا، وہ اب اس سے پچھلے دروازے کا پوچھ رہا تھا۔ جشن سکندر ایک دم اٹھے۔ کسی سے بھی نگاہ ملائے بغیر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ دوکلاء ان کے ساتھ لپکے۔

فارس غازی نے زیرِ لب مکراہٹ کے ساتھ گلاس سے مزید ایک گھونٹ بھرا اور دلچسپی سے ار د گر دیکھی افراتفری دیکھی.....

جشن سکندر نے بیرونی دروازے سے باہر قدم رکھا، تو نیچے سڑک پر پورا روز تھے۔ ان کے کیمرے، فلیش کی چھکتی لاپیٹس۔ مائیکس کی قطار۔ پریشان حال سماں بینجیر کہہ رہا تھا۔ ”سرہمیں نہیں معلوم ان کوکس نے ادھر بیا ہے لیکن.....“

اندر ٹکیک لگائے بیٹھنے والے فارس نے گلاس سے آخری گھونٹ بھرا۔ اس کے لبوں پر سردی مکراہٹ ہنوز جمی تھی۔

جشن سکندر کو کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ سر جھکائے، زینے اتر رہے تھے۔ (اے ایس پی، آج رات ایک لڑکے کو غائب کرنا

ہے۔ ہسپتال کا نام بھیج رہا ہوں، مگر پہلے اس کا آپ ریشن ہونے دوڑا کا کٹر تو قیر بخاری کو بھی ادھر بلا لو۔ لڑکے کو زندہ سلامت نکالنا ہے۔) گارڈ زمزیدیا کے نمائندوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر یکے بعد دیگرے مائیک ان کے چہرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”کیا آپ اس ویڈیو کی تصدیق کرتے ہیں؟“

”کیا ان شرمیدیت بورڈ کے آفسر کا فنیڈینشل پر لیں کی جان لینے والے آپ ہی تھے۔“

(میرے بس میں ہوتا تو اس لڑکے کو دیہی ختم کروادیتا۔ لیکن دوستوں کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ ارے نہیں، فخر مت کرو، کسی کو علم نہیں ہوگا۔ ہو بھی جائے تو وہ متوسط طبقے کے معنوی لوگ ہیں، ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟ جانے والے ایس پی، بہت دیکھے ہیں فارس غازی جیسے!)

وہ چہرہ جھکائے، اپنے ساتھیوں کی معیت میں ہجوم سے نکل رہے تھے۔ ساتھی وکلاء اور گارڈز بیشکل رپورٹر کے درمیان سے راستہ بنایا رہا تھا۔ ریسٹورانت میں کھانا بھول کر چمگوئیاں اور پھر دسکشن شروع ہو چکی تھی۔ نی وی کی آواز اوپنی کر دی گئی تھی۔ ڈزر کے فنڈر کو

ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ اس کے ہائیکورٹ میں تیرہ کیسز پھنسنے تھے اور ان کو چند منٹ پہلے تک پہنیے لگ جانے تھے، مگر اب.....؟

باہر جوش صاحب کی کارروائی ہوئی اور ذرا طوفان تھا، تو وہ دونوں بھی نکل آئے۔ پارکنگ ایریا تک جاتے ہوئے فارس کہہ رہا تھا۔

”امتنی کے مطابق، سعدی نے بچ کو کہہ رکھا تھا کہ یہ ویڈیو اس کے لائے کے پاس ہے، اور اسے کچھ ہونے کی صورت میں وہ اس کو انفریت پڑال دے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بچ کو اس اسکینڈل سے نکالنے کے لئے کون آتا ہے؟“ وہ محفوظ سا کہتا کہ کالاک کھول رہا تھا۔ زمر دوسری طرف خاموش کھڑی تھی۔

”بچ ایک مہرہ نہیں تھا، وہ ان لوگوں کا دوست ہے، سواس کے دوست اس کو بچانے ضرور آئیں گے۔ کوئی سیاستدانوں میں سے کوئی وکلاء برادری سے، کوئی بنس کمیونٹی سے اور کوئی قانون نافذ کرنے والے اداروں سے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ کون کون اس کو بچانے آتا ہے۔ وہ لوگ اب بوكھلا چکے ہوں گے، اور وہ غلطیاں کریں گے۔ زمر میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔“ لاک میں چاپی روک کر اس نے اسے پکارا۔ زمر نے چونک کر سراٹھا یا پھر گرد بھائی۔ ”ہوں، میں سن رہی ہوں۔ اس طرح ہم ان سب لوگوں تک پہنچ جائیں گے۔“

فارس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”ہم سعدی تک پہنچنے کے اتفاقریب ہیں۔“ انگلی اور انگوٹھے سے ایک انج کا فاصلہ کھایا۔ ”مگر آپ اتنی ڈل اور بچھنی بھی کیوں لگ رہی ہیں؟“

”نہیں تو۔“

”کچھ تو ہوا ہے۔ ورنہ کل رات تک آپ بہت ایسا نہیں اور خوش تھیں۔“ پھر را دیا۔ ”بچ آپ اپنے ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔ کیا کہا اس نے؟“ زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ (”مسز زمر“؛ ہن میں ڈاکٹر قاسم کے الفاظ گو بچ۔“ میرے پاس آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔“)

”ہاں میں گئی تھی۔“ وہ سانس لینے کو رکی۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

(”جس عطا یہ شدہ گردے پا آپ سردا بیو کر رہی ہیں، وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔“)

”مگر فارس.... ڈاکٹر صاحب تھے ہی نہیں۔ میں انتظار کر کے واپس آگئی۔“ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ دل ہنوز زور زور سے دھڑک رہا تھا، مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔



باب 16:

## میر امرضِ مُسْتَبْر!

میں نے ایک سر کپ اٹنڈہ کیا تھا

اس چھڑی جیسی لڑکی ٹو انکا اسٹینز بری کے ساتھ

وہ بہترین استھیلٹ تھی

اسے فشن کا جنون تھا۔

جتنی دلی ہو جائے، کم تھا۔

ایک پاؤ ڈیہاں سے، ایک پاؤ ڈیہاں سے۔

ہر فن کی طرح بھاگتی تھی۔

مگر پھر وہ چلنے کے قابل بھی نہ رہی

تب میں نے جانا کہ وہ ایزوریسک (فیساٹی بیمار) تھی۔

اس بیماری نے اس کی بصارت چھین لی تھی

میں نے نہیں دیکھا ٹو انکا سے زیادہ کسی کو

اپنے جسم کے بارے میں اتنا جنوں۔

ساری زندگی اس نے جس چیز کے پیچھے ہاگتے گزاری

اسی نے اسے بتاہ کر دیا۔

تم کہتے ہو برلن، انتقام تمہارا جنون ہے۔

میں تمہیں بتاؤں انتقام جنون نہیں ہوتا۔

یہ تو ایک بیماری ہے۔

جودل کو کھاتی ہے

اور روح کو زہر یلا کر دیتی ہے۔

(دی بلک لست کے کردار ”ریمنڈر یڈنکن“ کا مکالمہ)

مُسْتَبْر کے آخری ایام میں گرمی کم تھی مگر جس اب بھی تھا۔ ایسے میں اس ہسپتال کی اوپھی بلڈنگ کی ایک کھڑکی سے جھانکو تو اندر ڈاکٹر

لام بشارت کے کمرے میں زمر بالکل خاموش بیٹھی تھی اور ڈاکٹر قاسم اس کو تاسف سے دیکھ رہے تھے۔

”آپ کو اپنے ہر بیان کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔“

زمر نے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”ممکن نہیں ہے۔ آپ مجھے میرے کذفنی کا بتائیں۔ کیا وہ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے؟“ بظاہر مضبوط انداز سے پوچھا۔

”زمر، آپ نے چار سال اس ڈنپیڈ کذفنی پر گزارے ہیں...“

”مگر یہ پرنیکت بیج تھا، آپ نے کہا تھا، میری قسمت اچھی ہوئی تو میں سال بھی گزار سکتی ہوں۔“ ڈاکٹر پر جی آنکھوں میں کرب ماں بھرا۔

”آئی ایک سوری زمر، مگر پچھلے تین ماہ سے نہ آپ دو اٹھیک سے لے رہی ہیں، نہ چیک آپ کے لئے آتی ہیں، پچھلے ہفتے ٹیکش کے لیے بھی میں نے زبردست آپ کو بلایا تھا۔“ دردار کے گہری سانس لی۔ ”آپ کی کذفنی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ مکمل نہیں، تقریباً۔“

”کتنے عرصے بعد مجھے نئے کذفنی کی ضرورت پڑے گی؟“

”جلد از جلد۔ جتنی دیر کریں گی۔ اتنا مسئلہ ہو گا۔ کیا آپ نے کسی اور ڈاکٹر کی رائے لی؟“

”جی، میں ڈاکٹر فاروق احسان کے پاس گئی تھی۔ ٹیکش بھی دوبارہ کروائے۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ مجھے جلد از جلد ٹرانسپلانٹ لروانا ہو گا۔“ کمرے میں ایک آزردہ سی خاموشی آٹھہری۔

”کیا آپ کی فیملی میں کوئی ایسا ہے جو آپ کو کذفنی ڈونیٹ کر سکے؟“ قدرے توقف سے انہوں نے پوچھا۔

”میں کوئی گیم تو نہیں کھیل رہی کہ ایک چیز ضائع ہو جائے تو دوسرے سے مانگ لوں۔ کذفنی ڈونیٹ بہت بڑی بات ہے۔ اور میں اپنی فیملی سے کچھ بھی نہیں مانگنا چاہتی مزید۔“ وہ اس سوال پر ناخوش ہوئی تھی۔

”اوے ریلیکس!“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ ”میں ڈوز کا بندو بست کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جتنی جلدی اور گن ملے، اتنی جلدی ام ٹرانسپلانٹ کر دیں گے، لیکن آپ نے پہلے کی طرح اب بداحتیاٹی نہیں کرنی۔ میں پھر کہوں گا، آپ اپنی فیملی میں کسی کو راضی کرنے کی.....“

۱۰۰ مزید یہ بتیں نہیں سن سکتی تھی۔ فضا میں موجود جس اور گھنٹن بڑھ گئی تھی، اس لیے انھوں کھڑی ہوئی۔



اپنی تلاش کا سفر ختم بھی کیجھے کبھی ..... خواب میں چل رہے ہیں آپ اسی جس زدہ دن جب پرندے اکتائے اکتائے اڑ رہے تھے، ایک اور ہسپتال کے پرائیوٹ روم میں آبدار عبید ایک کرسی پیٹھی تھی اور سامنے بستر پر لیئے مریض کی باتیں توجہ سے سن رہی تھی۔ وہ ایک درمیانی عمر کے صاحب تھے۔ ابھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ الہاں دغیرہ ہنوز گئی تھیں۔ چہرے پر بھی نقاہت تھی۔

”پچھلی ملاقات میں آپ مجھے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔“ وہ نری اور رسان سے کہہ رہی تھی۔ ”ویسے تو میں ہپنڈو قھرا پسٹ ہں، مگر ایک ریسرچ کے سلسلے میں مجھے آپ کا کیس سنتا ہے۔ کیا آپ کمزور نہیں ہیں؟“

”جی! آپ پوچھئے۔“ انہوں نے نقاہت سے اسے دیکھتے سر ہلا�ا۔

”اوے۔“ آبدار نے گہری سانس لی۔ ”آپ کی سرجری کے دوران جو ادھار صاحب، ایک وقت ایسا آیا تھا جب آپ کا دل بند ہو گیا تھا اور آپ کو داپ لانے میں ڈاکٹر زکو پچاس سینڈز لگے تھے۔ ان پچاس سینڈز کے لئے آپ clinically ڈینڈ ہو چکے تھے۔“ وہ غور سے ان کا ہمہ دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے پھر اثبات میں سر ہلا�ا۔ ”ان پچاس سینڈز میں... کیا ہوا تھا؟ کیا دیکھا آپ نے؟“

جواد صاحب کے چہرے پر تکلیف ابھری۔ ذرا سے شانے اپکائے۔ ”آپ یقین نہیں کریں گی۔“  
”مڑائی می!“ وہ مسکرانی۔

انہوں نے گہری سانس لی۔ آنکھیں بند کر کے یاد کیا۔ ”اس وقت میری سر جری جاری تھی۔ نشے کے باوجود مجھے تکلیف ہو رہی تھی، کچھ آوازیں بھی کانوں میں پڑتی تھیں، ڈاکٹر زو غیرہ کی، پھر میں نے سنا کہ وہ لوگ مجھے لوز کر رہے ہیں، ذرا سی افراتفری پھیلی۔“ وہ رکے۔ وہ غور سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ ”پھر؟“

”پھر جیسے اچانک سے میری ساری تکلیف ختم ہو گئی، میں نے خود کو بہت بہکھا محسوس کیا۔ میں اس بارے میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتا، لیکن آپ پوچھ رہی ہیں تو...“ سر جھکتا۔ ”ایسے جیسے میں کسی بوجھ سے آزاد ہو گیا ہوں۔“  
”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”میں نے... محسوس کیا کہ...“ وہ آنکھیں موندے دقت سے بول رہے تھے۔ ”... کہ جیسے کوئی مجھے کھینچ رہا ہے۔ میں آپریشن میبل پر لیٹا تھا۔ میں نے خود کو اس کے نیچے سے نکھلا محسوس کیا، ہلکا اور آزاد، اور اس کے آگے... ایک تاریک جگہ تھی، جیسے کوئی غار یا سرنگ ہوتی ہے، میں اس میں سے گزر کر دوسری طرف نکلتا گیا۔“ آبدار نے نوٹ بک پر کچھ لکھتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر؟“

”اس غار نما تاریکی سے نکل کر میں نے دیکھا کہ... میں اسی آپریشن تھیں ہوں، مگر اوپر... فضا میں تیر رہا ہوں۔ آپ یقین نہیں کریں گی۔ مگر میں نے اوپر سے دیکھا، کہ نیچے میبل پر میرا جسم لیٹا ہے، اور ڈاکٹر ز مجھے مسلسل روایا ہو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“  
اس دفعہ آبدار نے کاغذ کو دیکھنے، بنچند الفاظ لگھیئے۔ ”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”اس کے بعد...“ انہوں نے یاد کیا۔ ”میں نے اوپر فضا میں دیکھا، اپنے والد کو، اور ایک بچی کو جو میرے بچپن میں اسکوں میں کرنٹ لگنے سے مر گئی تھی، اور بھی چند فوت ہوئے رشتہ داروں کو، وہ مجھے دیکھ رہے تھے، لیکن میرے اور ان کے درمیان ایک سرحد تھی، مادی سرحد نہیں، نہ ہی کوئی لکیر۔ وہ ایک ایسی ان دیکھی باڈندری تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا میں اس طرف تھا اور وہ لوگ دوسری طرف۔ وہ مجھے مسلسل واپس جانے کا کہہ رہے تھے، اور میں نہ آگے جا سکتا تھا نہ پیچھے مرسکتا تھا۔“

”کیا آپ نے وہاں کسی اور کو دیکھا؟“

کتنے ہی لمحے وہ کچھ نہ بولے۔ پھر اسی طرح بند آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”روشنی۔ وہ روشنی تھی، مگر نیوب لائٹ یا سورج یا چاند کے جیسی روشنی نہیں۔ وہ مختلف قسم کی تھی۔ شاید اسی کونور کہتے ہیں، مگر وہ صرف نور نہیں تھا، وہ نور کا وجود تھا۔ A being of light۔ آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”میں سمجھ رہی ہوں۔ کیا اس نے آپ سے بات کی؟“ وہ بغور ان کے چہرے کی اذیت دیکھ رہی تھی۔

”جی۔ مگر ایسے نہیں جیسے انسان کرتے ہیں، الفاظ سے نہیں، پھر بھی مجھے سمجھا رہی تھی کہ وہ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہا ہے۔ اس نے مجھے تباہ کا ابھی میرا وقت نہیں آیا، اور یہ کہ مجھے واپس جانا ہو گا۔“ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ”پھر ہر شے روایا کئہ ہو گئی۔ میں واپس ہوتا ہوا اپنے جسم میں داخل ہو گیا۔ بھاری اور وزنی۔“

”اس وجود کے قریب کیا محسوس کیا آپ نے؟“

”غیر مشرود طحیت۔ احساس قولیت۔ علم کی تڑپ۔ وہ سر اپا محبت تھا۔ وہ کون تھا؟ اور کیا یہ صرف ایک خواب تھا؟“  
”نہیں، یہ NDE تھا۔ آپ سمت دنیا میں بزراروں لوگ اس سے گزر رچے ہیں۔ چونکہ آپ کی موت کا مقررہ وقت ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اس لئے آپ مر کر بھی زندہ ہو گئے۔“ قدر رے رکی۔ ”رمی بات کہ وہ کون تھا، تو آج تک کوئی

انسان نہیں بتاسکا کہ وہ کون تھا۔ اس تجربے سے گزرنے والے یہود کہتے ہیں کہ وہ جبرايل علیہ السلام تھے، عیسائی کہتے ہیں وہ مسیح ابن مریم تھے، مسلمان کہتے ہیں کہ وہ ملک الموت عزرايل علیہ السلام تھے، لیکن مجھ سے پوچھو تو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ نورانی وجود جو مرکر زندہ ہونے والوں کو ملتا ہے، وہ کون ہے۔ فرق اس سے پڑتا ہے کہ وہ آپ کو کیا سکھاتا ہے؟ ”اپنی چیزیں سمیٹ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔“ مجھے اب چلنا چاہیے۔“

”آپ خوش نہیں لگ رہیں، جیسے آپ کو جس چیزیں کی علاش تھی وہ آپ کو نہیں ملی۔“

آبدار کی گردن میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ وہ جبرايل کرتے ہیں۔ ”کوئی بات نہیں۔ آپ آرام کیجئے۔“ اب وہ مسکرا کر الوداعی کلمات کہرہی تھی۔

❖❖❖

کہ جس ہاتھ میں پتھر، کماں میں تیر نہ ہو ..... کوئی بھی ایسا مرے شہر مہرباں میں نہ تھا  
قصیر کاردار کے لا دخیل میں اس صحیح کھلی کھڑیوں سے روشنی چھین کر آ رہی تھی۔ شہرین سیڑھیاں چڑھتی اور آئی اور ہاشم کے  
کمرے کا دروازہ کھولا۔

اندر وہ ڈرینگ نیبل کے سامنے کھڑا تھا۔ شرٹ کے کارکھڑے تھے اور میز پر رکھی تین عدد ٹائیز میں سے ایک اخخار ہاتھا۔ آہٹ پر  
نظر اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ سفید شرٹ اور خاکی پینٹس میں بلوس، سنہرے بالوں کی اوپنی پونی بنائے شہری مسکراتی ہوئی آرہی تھی۔

”سوئی ہم دونوں کو اپنے اسکول فنکشن میں ساتھ ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔ اونہہ گرے نائی نہیں جائے گی اس کے ساتھ۔“ وہ  
آگے آئی اور ہاشم کے ہاتھ سے زمی سے گرے نائی لے کر رکھی اور بیوی اٹھائی۔ ہاشم نے بس مسکرا کر اسے دیکھا، بولا کچھ نہیں۔ شہری اس کے  
سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”شیر و کی کمپنی کیسی جارہی ہے؟ میں نے شاہی تم دونوں ہارون عبید کے ساتھ شرکت داری کر رہے ہو اس کمپنی میں؟“ اس کے  
کارمزید کھڑے کیسے اور نائی گردن میں ڈالی پھر گرد لگانے لگی۔

”تم نے صحیح شاہی۔“

وہ ہاشم کی آنکھوں میں دیکھ کر گردہ کو اپنے تنک لائی۔ ”ہاشم!“ مٹھاں سے پکارا۔ ”سعدی کہاں ہے؟“

”یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے۔ تمہاری بہت دوستی تھی اس سے۔“ وہ بھی اسی انداز میں مسکرا یا۔

”بس گن سے اسے باراگیا ہے، وہ گلاں جی فورٹی ون تھی۔ شیر کے پاس ہے ایسی گن۔ انکار مت کرنا۔“ مسکرا کر اس کے  
کھڑے کا لرسید ہے کیے، پھر نائی کی ناث کپکی کی۔ ”کہیں یہ نہ ہو کہ میں فارس کو کال کر دوں۔“ اب وہ ڈرینگ نیبل سے نائی پن اٹھانے مڑی  
تو ہاشم نے اپنا موبائل اٹھایا۔ شہری واپس ہوئی اس کی نائی کو شرٹ کے ساتھ پون کے ذریعے نصیحت کیا، تو ہاشم نے نمبر ملارا پسکر آن کیا۔ تیسرا  
کھنٹی پر فارس کا ”ہیلو؟“ کمرے میں گونجا۔ نائی پون لگاتی شہری نے چونکہ کر ہاشم کو دیکھا۔ وہ اسی طرح مسکرا ہاتھا۔

”فارس یا رشہری کو تم سے ضروری بات کرنی ہے، اس کے فون کی بیڑی ختم تھی۔ اس کی بات سن لوڑ را!“ اعتماد سے موبائل اس کی  
طرف بڑھایا۔ شہری کے ہاتھ اس کی نائی پن پہ ہی جم گئے۔ دم بخود ساکت۔ فارس ”ہیلو؟“ کہرہ ہاتھا۔ اس نے بدقت تھوک لگلا۔ ”ہاں  
فارس کیسے ہو؟“ رخی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھتے جبرايل کرتے ہوئے۔ ”اکتوبر کے پہلے دیک ایڈ پہ ہماری ہاؤس دارمنگ ہے۔ تم آسکو گے؟“

”نہیں۔ بڑی ہوں۔“ ذرا توقف سے بولا۔ ”اور کچھ؟“

”نہیں۔ تھینک یو۔“ جلدی سے بولی۔ ہاشم نے فون بند کر کے میز پر ڈالا۔ پر فوم اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھتے گردن پہ کچھ کا۔ نضا

ایک دم معطر ہو گئی۔ ”تمہارے تو الفاظ ہی غائب ہو گئے شہری یقیناً اس لئے کہ تمہارے باپ کا سارا کاروبار میرے اوپر تمنے نہ سامیرے اور انحصار کرتا ہے۔ رہی سعدی کی بات تو اس کو غائب کرنے میں میرا نہیں، تمہارا ہاتھ ہو سکتا ہے، اور اگر تم نے فارس کو کچھ کہنا ہوتا تو بہت پہلے کہہ دیتیں۔ کوٹ؟“ کوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ شہری نے مرے ہاتھوں سے کوٹ کو سامنے کیا۔ ہاشم نے اس میں اپنے بازاڑا اور پھر اسے کندھوں پر برادر کرتے اسی طرح بولتا گیا۔

”اور جو گن میں نے شیر کو گفت کی تھی، وہ جی فورٹی فائی تھی۔ اس کا تام پیپروک میرے لاکر میں موجود ہے۔ سو اگلی دفعہ مجھے بلکہ میل کرنے کے لئے کوئی بہتر طریقہ ڈھونڈنا بجائے...“ کوٹ کے مبنی بند کرتے ہوئے اس کی طرف گھوما اور مسکرا کر اس کے کندھے پر لٹکا پرس اتارا۔ بجھے چہرے والی شہری حرکت بھی نہ کر سکی۔ ”بجائے میرا اعتراف ریکارڈ کرنے کے۔“ پرس سے ریکارڈ نگ پر کھاصل فون نکال کر اس کے سامنے لہرایا، اور دروازے تک آیا۔ فینو نا کو بلا یا۔

”اس کو چوہلہ میں پھینک دو۔“ سیل فون اس کو تمہارتے درشتی سے بولا۔ پھر مڑ کر بہت بنی شہری کو دیکھا۔

”تم آرہی ہو یا میں اسکیلے جاؤں؟“

”مجھے تمہاری نئی کمپنی میں شیئر زچا ہے۔ تینتیس فیصد۔“ بمشکل گردان اکڑا کر بولی۔ ہاشم مسکرا یا۔

”شہری....“ چہرہ اس کے کان کے قریب کیا۔ ”میں تمہیں اپنی کمپنی میں ایک پائی بھی نہیں دینے لگا۔“ وہ باہر نکل گیا اور شہری نے تملک کر پیر پنچا تھا۔

.....♦♦♦.....

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج؟ ..... آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے، آئینہ بھی ہے اس صحیح ختنی اسٹریڈیمیل پر اپنی پسندیدہ کتاب درمیان سے کھو لیتھی تھی۔ کچھ دن سے وہ اسے باقاعدگی سے پڑھ رہی تھی، اور اٹھا سی فصلیں پڑھنے کے بعد دل پر گناہوں سے لگنے والے زنگ کو سمجھنے کے بعد بالآخر وہ اس فصل پہنچ گئی تھی جس کا اسے انتظار تھا۔

”بابہ! 89 مرض عشق کی دووا!“

ایک گھری سانس لیتے ہوئے اس نے پوری توجہ سے وہ دروازہ ڈھونڈا جو قدیم زمانوں میں لے جاتا تھا، اور پھر اپنے hypnosis میں خود کو غرق کرتے ہوئے پٹ کھول دیے۔

دوسری جانب ایک روشن دوپہر واضح ہوئی۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ ایک چراگاہ پر کھڑی تھی۔ بزرگ... ہر سو سیزہ۔ اور اس زمردی گھاس پر سفید پھولے پھولے سے بھیڑ جا گا گھاس چرتے دھکائی دے رہے تھے۔ کیا واقعی دشمن میں اتنا سبزہ تھا؟ مگر کوئی بات نہیں۔ یہ حنہ کی دنہ تھی۔ وہ قدم قدم چلتی آئی اور ایک پتھر پہنچنے شک کے دامیں جانب آبیٹھی۔ بھکلے کندھوں کے ساتھ اس نے محض اتنا کہا۔

”میں آگئی ہوں۔ سمجھے بتائیے۔ کیا ہے میرا علاج؟“

شخ اپنے سفید سرگی لباس میں بیٹھے تھے۔ نگاہیں دور چرتے بھیڑوں پر تھیں۔ ہلکا سا بولے۔

”وقف الہوی بی حیث انت فلیس لی۔“

متاخر عنہ ولا متقدم“

(تیری محبت نے سمجھے دہاں لا کھڑا کیا ہے جہاں تو ہے۔

اب یہاں سے سمجھے نہ کوئی پیچھہ ہٹا سکتا ہے نہ آگے بڑھا سکتا ہے۔)

”درست۔ میں بھی ایسے ہی نقطے پر کھڑی ہوں۔“ وہ بھی سامنے دیکھنے لگی۔ ”میرا دل جل رہا ہے، میں بے چین ہوں،“ مضرب

اہ۔ کیا اس قاتل جادو کے اتار کا کوئی منتر ہے؟ میرے دل میں یہ مرضِ مستر (پرانا، مسلسل چلے آنے والا مرض) اپنی جگہ بنا چکا ہے، اور میں اپنا دل خوبیکی ہوں۔ کیا میں پھر سے اپنے دل کی مالک بن سکتی ہوں؟ وہ گناہ گار ہے، قاتل ہے، پھر بھی میں اس سے نفرت نہیں کر پا رہی۔“

”مریضِ محبت کو سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہیے لڑکی، کہ کسی شخص کے قبھے سے اپنا دل چھڑانے کے لئے اس کو ”بھولنا“ یا اس نے نفرت کرنا ضروری نہیں۔“

”بھولے بغیر مواؤ آن کیسے کیا جائے پھر؟“

”اس کا علاج کر کے۔ انسان کو چاہیے کہ اس مرض کو یا تو پیدا نہ ہونے دو، لیکن اگر پیدا ہو چکا ہے تو اس کے علاج کے دو طریقے ہیں۔ آج میں تمہیں پہلا طریقہ سمجھاتا ہوں۔“

”اور کیا گارنٹی ہے کہ میں یہ کروں گی تو میر ادل مجھے واپس مل جائے گا؟“

”تیرہمارے اوپر مختصر ہے کہ تم کتنے اچھے سے دواليتی ہو۔“

اس کا دل پھر سے شکوہ و شہابات کا شکار ہونے لگا۔ سات سو سال پرانے شیخ کو کیا معلومِ موالی، انٹرنیٹ، آئل کار ٹیلز پاکستان کے مراہر انہی اور ان سارے مسئللوں کا جو اسے در پیش تھے۔ مگر پھر بھی اس نے سننا چاہا۔ شیخ کا پہلا توڑ۔

”غص بصر۔“

”آ... مطلب؟“ اسے عربی بھول بھال گئی تھی۔

”اپنی زیگاہ کو پست رکو، زیگاہ کی حفاظت کرو۔ اس کو نہ دیکھو جس کی وجہ سے دل کھو یا ہے۔“ حنین نے حیرت سے ان کو دیکھا جن کی الہیں سامنے تھیں۔ بھیڑ چ را گاہ میں چڑھے تھے۔ ہوا چل رہی تھی، مگر حد کا دماغ الجھ گیا۔

”زیگاہ پست کرنے سے کیا ہو گا؟“

”وس فائدے ہیں۔ سنوگی؟“ شیخ نے مسکرا کر پھرہ اسکی طرف موڑا۔ حننے اثبات میں سرہلا یا۔

”پہلا۔ یہ اللہ کا حکم ہے، اور جو بھی انسان فلاح پاتا ہے، وہ حکمِ اللہ مان کر ہی فلاح پاتا ہے، اور جو ناکام ہوتا ہے، وہ حکمِ نہ ماننے کی وجہ سے ناکام ہوتا ہے۔“

حنین مزید توجہ سے سننے لگی۔

”دوسرا فائدہ۔ اس کی نظر جو زہر آلو دیر تیرہمارے دل تک پہنچا کر تیرہمار ادل ہلاک کرتی ہے، آنکھ کی حفاظت سے وہ تیرہمارے دل مل نہیں پہنچے گا۔“ وہ انگلیوں پر گوارہ ہے تھے۔

”سوم، نظر کی حفاظت سے دل میں پوری توجہ سے اللہ کے لئے محبت پیدا ہوتی ہے، ورنہ جن لوگوں کی زیگاہ آزاد اور آوارہ رہتی ہے، ان کا دل منتشر رہتا ہے۔ آزاد زیگاہی بندے اور اللہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔“

”صحیح!“ وہ بالکل محو ہو کر سن رہی تھی۔

”چہارم۔ آنکھ کی حفاظت سے دل مضبوط اور پسکون رہتا ہے اور آزاد زیگاہی یعنی ہر غلط چیز یا شخص کو دیکھ لینے سے دل مغموم رہتا ہے۔“

”پنجم۔ زیگاہ پست رکھنے سے دل میں ”نور“ پیدا ہوتا ہے۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ سورۃ نور میں اللہ نے غص بصر کی آیت کے بعد اسی آیت نور پیش کی؟ کیونکہ دل میں نور نظروں کو حفاظت سے داخل ہوتا ہے، اور جب دل نورانی ہو جائے تو ہر طرف سے خیر اور برکت اس انسان کی طرف دوڑتی ہے۔ اور حسن کے دل اندر ہیر ہوں، ان کو شر اور تکالیف کے بادل گھیرے رکھتے ہیں۔“

چراگاہ اور اس کے اجلے اجلے بھیڑ، ہر چیز نہیں کے ذہن سے محو ہو چکی تھی اور وہ مکمل یکسوئی سے سُن رہی تھی۔ بوڑھا استاد کہہ رہا تھا۔  
”ششم۔ تم اللہ کا اصول جانتی ہو۔ اس کے لئے جو چھوڑو گے، وہ اس سے بہتر عطا کرے گا۔ تم ”نگاہ“ چھوڑو وہ بد لے میں ”نگاہ“ عطا کرے گا۔ وہ تمہیں بصیرت دے گا، فہم و فراست کی نگاہ عطا کرے گا، اور تمہاری فراست بھی خطا نہیں ہوگی۔ مومن اسی نگاہ کی وجہ سے ایک سوراخ سے دوسری بار نہیں ڈسا جاتا۔“  
نہیں کے دل کی اگر ہیں کھل رہی تھیں۔

”ساتویں چیز۔ آزاد نگاہی سے انسان ذلیل ہوتا ہے، اپنے نفس کے قدموں میں خود کو روک کر بے تو قیر کر دیتا ہے، مگر جونگاہ کی حفاظت کرتا ہے، اللہ اس کو عزت دیتا ہے، لوگوں میں بھی، فرشتوں میں بھی۔“ وہ سانس لینے کو رکے۔  
”آٹھویں بات۔ نگاہ کے ذریعے شیطان اتنی تیزی سے دل میں جا پہنچتا ہے جتنی تیزی سے کسی خالی جگہ میں خواہشات بھی نہیں ہوتیں۔“  
سکتیں۔ وہ امیدیں دلاتا ہے، گناہوں کی توجیہات پیش کرتا ہے، اور انسان گناہ کی آگ میں یوں جلتا ہے جیسے کسی بکری کو تور میں ڈال کر بھونا جائے۔ اسی لئے شہوت پر ستوں کو قیامت کے دن آگ کے تنوروں میں ڈالا جائے گا۔“  
”اوہ۔“ وہ چوکی۔ ”یہ جہنم کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں، یہ گناہوں کو symbolize کرتی ہیں، جیسا گناہ اسی شکل کی سزا؟“  
شیخ نے اثبات میں سر ہلاایا۔

”نویں چیز۔ غصہ بصر سے دل کو قرآن پر غور فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ورنہ جن کی نگاہیں آوارہ ہوں، ان کے دل اتنے پھنسنے اور الجھے ہوتے ہیں کہ یہ فراغت ان کا مقدار نہیں بن سکتی۔“  
”آخری یعنی دسویں چیز!“ انہوں نے گہری سانس لی۔ ”انسان کے دل اور آنکھ کے درمیان ایک سوراخ ہے، ایک راستہ ہے۔ جس کام میں آنکھ مشغول، اسی میں دل مشغول ہوتا ہے۔ ایک کی اصلاح سے دوسرے کی اصلاح ہوتی ہے، ایک کے فساد سے دوسرے کا فساد ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی نگاہ کو صاف رکھو، شخص کو نہ دیکھو، جس کی طرف دل ہمکتا ہے، کیونکہ یہ تمہارے لئے حرام ہے۔ اگر حالاں ہوتا تو ٹھیک تھا، لیکن حالانکیں ہے۔ سو جب اپنی نگاہ کی مالک بن جاؤ گی تو دل کو بھی واپس حاصل کرلوگی۔ یہ پہلا طریقہ کرو۔“

نہیں نے کتاب بند کی تو قدیم زمانوں کا فسون، سبز چراغاہ، اور اجلے بھیڑ، سب غائب ہو گئے، آنکھیں موند کر اس نے کتاب پر رکھ لیا۔ وہ صبح شام کھڑکی سے ہاشم کی بالکونی دیکھا کرتی تھی، وہ کب آتا ہے، کب جاتا ہے، اسے ساری خبر تھی۔ کیونکہ نگاہ وہیں لگی تھی۔ یہ نظر ہوتی ہے جوانوں کو ہاندی اور انسان کو قبر تک پہنچاتی ہے۔ کیا نظر بد والی حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا؟ وہ کسی اور دنیا میں گم سوچے جا رہی تھی۔

❖❖❖

میں اپنے باپ کا یوسف تھا اس لیے محسن ..... سکون سے سونہ سکا، بھائیوں سے ڈرتا رہا  
سعدی یوسف کے زندگی خانے میں خاموشی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑا قلم سے ایک لکیر لگا رہا تھا۔ نیلی جیزیر پہنچنی شرٹ پہنچی تھی  
وہ اب پہلے سے دبلا گلتا تھا۔ میری نے میز پہنچانے کی ٹرے رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہاں کونے میں کئی اور لکیریں بھی لگی تھیں۔ چار ماہوں  
دودن۔ وہ قید کے دنوں کا یوں حساب رکھتا تھا۔

”کیا آج ہماری عیید ہے، میری؟“ میز کی طرف آتے اس نے اداسی سے پوچھا۔

”نہیں، کل ہے۔“

(مجھے یہاں چار ماہ سے ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی میرے لیے نہیں آیا۔ کیا واقعی میرے گھروالے میرے لیے کوشش کر رہے ہوں گے؟) سوچنے ہوئے وہ بے دلی سے کھانا شروع کرنے لگا۔ پھر رک کر اسے دیکھا۔

”میری انجیو... رات کو کیا ہوا تھا؟ تم پڑھتے پڑھتے اس کا وجہ پر گئی تھیں، پھر نیند میں ایک دم سے اٹھیں اور باہر چل گئیں۔ دیکھو جس تھارے ادھر آنے پر اعتراض نہیں۔ اگر تو میں تمہیں پسند آگیا ہوں تو میرے جیسے بینڈ سم لڑ کے....“

”بومت... تم میرے بیٹے سے چند سال ہی بڑے ہو گے۔“ فتحی سے اسے جھپڑا۔ پھر تکان سے کنپی سہلائی۔ ”میں سونے جاں ہوں“ گارڈ برتن لے جائے گا۔ اسے پتہ تھا کہ میری کے سوا دو کسی کو اپنے کرے میں برداشت نہیں کرتا۔

”اگر تم نے رات کو کوئی براخواب دیکھا ہے تو بتاؤ، میں تمہیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں، یا صاحبِ لجن؟“

”خود کو جوزف سمجھنا چھوڑ دا رکھانا کھاؤ۔“ درشتی سے ٹوکتی وہ سامنے بیٹھ گئی۔ مگر سعدی نے کھاناڑ ہک دیا۔

”کون سا خواب ہے جو تمہیں اکثر رات کو نیند سے جگادیتا ہے؟“

میری کچھ لمحے خاموش رہی، پھر یوں تو لجہ زرازم تھا۔ ”پہلے نہیں... پہلے تو میرے بیٹے کا ہی خیال آتا رہتا تھا۔ اس کا علاج ہاشم اماں ہا ہے نا۔ مگر جب سے میں نے تمہیں وہ نیکلیں والی بات بتاتی ہے وہ سب یاد آنے لگا ہے۔ جب مزکاردار نے علاج کی رقم دینے والا کارکیا تو کیسے فیونا میری ہمدرد بن کر مجھے اکساتی تھی کہ ان کا نیکلیں چرالوں۔ اس کو ان کے جیولری باکس کا کوڈ بھی معلوم تھا۔“

”اسے کیسے پتہ تھا؟“ وہ چونکا۔

”صاف بات ہے، مزکاردار مجھے نوکری سے نکالتا چاہتی تھیں، مگر کانٹریکٹ کے تحت میرا درایہ رہتا تھا۔“ سو فیونا نے ان کے امباہ مارا کھیل ترتیب دیا۔ میں نے چوری کرڈ الی اورڈی پورٹ ہونے کے قریب تھی کہ تمہاری وجہ سے ہاشم مجھے یہاں لے آیا۔“

”مزکاردار کو کانٹریکٹ سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”ہاشم بلا جہاں کو اپنے بابکی ملازمت کو نہ کرنے دیتا۔“

”مطلوب؟“ وہ الجھا۔

”ان میاں یوں کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔ اور نگزیب کاردار مجھ سے جواہرات پر نظر کھواتے تھے وہ اسی لئے مجھ سے بد ملن، نہ تھیں۔ حالانکہ ان کی پسند کی شادی تھی۔ جواہرات نے اپنے ایک بے حد چاہنے والے کو ٹھکرایا اور نگزیب سے شادی کی اور نگزیب کی ملی میاں ہی تزویائی، اس سے اور نگزیب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ جواہرات نے اور نگزیب کو دو بیٹے دیے۔ دولت دی۔ مگر اب وہ ایک دوسرے بے زار آچکے تھے۔“

”تمہیں یہ سب کیسے پتہ ہے؟“

میری مسکراتی۔ ”بے وقوف لڑکے میں اس گھر کی ملازمت مدد رہی ہوں، مالک سمجھتے ہیں جیسے ہماری زبان نہیں، ویسے ہمارے کان بھی نہیں اس اکابر ہم ہر کھانے پر ہر چائے پر موجود ہوتے ہیں۔ گھر کے سارے راز ہمارے سینوں میں دفن ہوتے ہیں۔“

”واہ۔ خیر، کیا چیز تمہیں ڈسٹرپ کرتی ہے؟“

”وہ رات جب اور نگزیب کاردار کی موت ہوئی۔“ اس نے جھر جھری سی لی۔ ”شاید اندر سے میں خود اتنے برس مزکاردار کی محبت ہی ایک پاکارکی منتظر رہی ہوں۔ اس رات زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ انہوں نے مجھ سے مسکرا کر بات کی تھی۔ میں اوپر ہاشم کی بالکلوں میں اسکے لیے ساتھ ہوں پر اپنے بیٹے سے بات کر رہی تھی۔“ وہ یاد کر کے بتا رہی تھی۔ ”وہ نیچے اپنے با تھر ووم کے دروازے سے جو پچھلے ہام سے میں کھلتا تھا، باہر نکل رہی تھیں۔ ان کو سر دی میں دیکھ کر مجھے فکر ہوئی، میں نے ان کو کچھ گرم اوڑھنے کا مشورہ دیا۔ وہ مسکراتی تھیں۔ پھر اسکے لئے کافی لانے کا کہا۔ سب اچھا تھا۔ مگر کچھ وقت بعد اور نگزیب صاحب کی موت...“ جھر جھری لی۔ ”اس کے بعد سعدی وہ بھی بھی میرے ساتھ اچھی نہیں رہیں۔ ہر وقت ترش اور خفا۔ سعدی میں نے گیارہ سال ان لوگوں کی خدمت کی۔ مگر ان میں سے کسی نے

گیارہ منٹ انٹر نیٹ پر میرے بیٹے کے کیمز کو سرچ نہیں کیا۔ صرف تم نے احساس کیا تھا میرا۔ کاش میں نے تمہارے آگے اس قصر کا رواہ،  
بھی نہ کھولا ہوتا۔“

”میری!“ وہ ہمدردی سے آگے ہوا۔ ”تم اس رات کو اس لئے بار بار دیکھتی ہو کیونکہ تم نے اور نگزیب کاردار جیسے اپنے ایک نمائیٰ اکھو یا تھا۔ تم دل سے چاہتی ہو کہ وہ اپس آ جائیں۔ اور کچھ نہیں۔“

”کیا میرے خواب کا کوئی مطلب نہیں نکلتا، جوزف؟“ اسے مایوس ہوئی۔

”اگر ہم قدیم مصر کے قید خانے میں ہوتے اور میرے ساتھ فرعون کی کنیز قید ہوتی تو تمہارا خواب بہت قیقی ہوتا، اس کے بے لے میں یا تو تمہیں سزاۓ موت دی جاتی اور پرندے تمہارا سر نوچ کھاتے، یا تم ایک دفعہ پھر سے شاہی محل جا کر ملکہ اور اس کے بیٹوں کی خدمت کرتیں۔ مگر نہ میں جوزف ہوں، نہ مجھے خواب کی تعبیر بتانی آتی ہے، میں تو تمہارا دل ہلکا کرنا چاہتا تھا۔“

میری نے غیر مطمئن انداز میں سر ہلایا مگر اٹھتے ہوئے وہ ناخوش لگ رہی تھی۔ شاید یہ پچھا اور تھا جو اسے ہمیشہ سے الجھاتا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

میں اپنے ڈوبنے کی علامت کے طور پر ..... دریا میں اک آدھ بھنور چھوڑ جاؤں گا  
جسٹس سکندر کے ڈرانگ روڈ میں زرد بیان جلی تھیں۔ اُنہی اسکرین پر مسلسل وہی خبر چل رہی تھی۔ سامنے ٹھہلتے جسٹس صاحب  
نے غصے سے ریبوٹ اٹھا کر اُنہی بند کیا۔ پھر ہاشم کو دیکھا جو ناگ پٹاگ کجا کر بیٹھا تھا، باز صوفے کی پشت پر پھیلا کھا تھا اور ناخوشی لے  
باوجود خود کو پر سکون رکھے ہوئے تھا۔

”میرا گھر سے نکنا تک عذاب کر دیا ہے رپورٹر نے۔ آپ کو تو کسی نے یہاں آتے نہیں دیکھا؟“

”نہیں۔ خاور نے کالونی خالی کروائی تھی پولیس سے۔“ ہاشم نے ناک سے کمھی اڑائی۔ تبھی خاور اندر داخل ہوا۔ دروازہ بند کیا،  
جسٹس صاحب کے مقابل آکھڑا ہوا۔

”یہ سب نہ ہوا ہوتا سراگر آپ میں مگری کو مجھے پوری بات بتاتے۔ آپ نے بتایا کہ سعدی آپ کو آپ کے بینک اکاؤنٹس لی  
تفصیلات اور آپ کے افیئر کی تصاویر کے ساتھ بلیک میل کر رہا ہے جو اسے آپ کے کمپیوٹر سے ملی تھیں۔“

”یہ چیز ہے۔ اس نے میرے کمپیوٹر کے سائیکل ہن سے مٹائی ہوئی چیزیں نکال لی تھیں۔“ وہ چیز کہہ رہے تھے۔

”اوہ ویڈیو؟ اس ویڈیو کا کیوں نہیں بتایا آپ نے؟“

جسٹس سکندر نے سر جھکنا اور آگے پیچھے ٹھلنے لگے۔ وہ سخت کبیدہ خاطر نظر آرہے تھے۔

ہاشم نے قدرے ٹھنڈے انداز میں پکارا۔ ”وہ ویڈیو سعدی کو کہاں سے ملی تھی۔“

”میں نہیں جانتا...“

”کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ وہ اب کس کس کے پاس ہوگی؟ کیونکہ میرے خیال میں یہ فارس غازی کا کام ہو سکتا ہے۔“ ہاشم پر یقین تھا۔

”اُنہوں۔“ جسٹس سکندر نفی میں سر ہلاتے سامنے صوفے پہ بیٹھے۔ ”وہ دماغ سے نہیں ہاٹھوں سے سوچتا ہے، اتنی بھی پلانگ وہ  
نہیں کر سکتا۔“

ہاشم اور خاور نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ہاشم نے گھری سانس لی۔ ”وہ میرا کزن ہے؟“ میں رسول سے اس کو جانتا ہوں یا اسی کا کام ہے۔“

”اس کو کے نے کہا تھا کہ یہ ویڈیو صرف اس کے وکیل کے پاس ہوگی، اگر سعدی کو کچھ ہوا تو وکیل اس کو ریلیز کر دے گا۔“ خاور نے  
چونکہ کر انہیں دیکھا۔ ہاشم کے بھی ابر و بھنپ۔

”کون ہے اس کا وکیل؟“

”زمیر یوسف نہیں ہے، کوئی اور ہے۔“

”تو سارا نے چار ماہ انتظار کیوں کیا؟“ خاور کو بھجن ہوئی۔ ”اگلے ہی دن ویڈیو کیوں نہ ریلیز کر دی؟“

”وہ (گالی) میرے ہائیکورٹ بج بنے کا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں کوئی عام بچ نہیں ہوں، میرا بھائی سیکرٹری ہے، سیاسی خاندان ہے میرا اور اب اس (گالی) کی وجہ سے مجھے مستغصی دینا پڑ رہا ہے۔ مجھے نہیں پتہ ہاشم، لیکن اڑکا تمہارے پاس ہے، اس سے پوچھو کو ویڈیو کس نے ریلیز کی ہے، اس سے پوچھو دو رہنا اگر میں ڈوباتیا درکھانا، تم سب کو لے ڈوبوں گا۔“ وہ غصے سے انگلی اٹھا کر کہہ رہے تھے۔ ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر دیہر کا اشارہ کیا۔

”آرام سے یور آئز۔ ہارون عبید اور ہاشم کا رد ارجیسے دستوں کی موجودگی میں آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔“

مگر واپس کار میں بیٹھتے اس نے خاور سے کہا تھا۔

”سعدی سے اس وکیل کے بارے میں پوچھنا ہو گا۔“

”آپ کو نہیں سر مجھے پوچھنا ہو گا۔“ خاور سختی سے بولا تو ہاشم نے ایک گھری نظر اس پر ڈالی۔

”جو بھی پوچھنا منہ زبانی پوچھنا۔ اسے کسی قسم کا تاریخ چوتھا دینا۔“ خاور اس بات سے شدید کوفت کا شکار ہوا مگر خاموش رہا۔ اسے فارس سے زیادہ وکیل پر شہرت ہے۔

❖❖❖

میں جب بھی عالمِ حیرت میں آئیں دیکھوں؟ ..... ہزار نیزوں پر اپنا ہی سر نظر آئے  
انیسی پر دم توڑتے سبز تبر کی وہ رات قدرے جس آسودا تر ہی تھی۔ نیچے تہہ خانے میں زمر چند کاغذات کھول کر دیکھ رہی تھی، اور  
فارس ادھرا دھرم شبلتے ہوئے فون پر بات کر رہا تھا۔ خینہ انگلی سے میز پر لکیریں بنا رہی تھی۔

”خلیجی صاحب نے بھی لا علمی ظاہری کی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ سعدی کا وکیل کون تھا۔“ فارس نے فون رکھا تو زمر نے چہرہ اٹھا کر  
اسے دیکھا۔ بلیک پینٹ پر گرے شرٹ پہنے، وہ چھوٹے کئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے الجھا الجھا لگ رہا تھا۔ ”ہو سکتا ہے فارس، سعدی نے جھوٹ  
بولا ہوا اس کا کوئی وکیل نہ ہو۔“

”نہیں، اس نے کسی کو بتایا ہو گا۔“ وہ مطمئن نہیں تھا۔

حالانکہ بھائی کو یہ سب ہمیں بتانا چاہیے تھا۔ خینہ نے صرف سوچا، مگر شاید اس کا ذمہ دار سعدی نہیں وہ اور زمر تھیں۔

”ویڈیو کی فارنزک جلد آ جائے گی۔ بچ مستغصی ہو جائے گا مگر وہ بھی گرفتار نہیں ہو گا ویڈیو جعلی اور اوی پی کی موت طلبی قرار دے دی  
جائے گی۔ پچھلے دن بعد میڈیا یانی ایش پکڑ لے گا اور اس کو سب بھول جائیں گے۔ ویکیمڈیا کستان!“

”ابھی تک سوائے پولیس کے، کوئی کھل کر بچ کی حمایت میں سامنے نہیں آیا۔ دیکھتے ہیں...“ ان دونوں کی باتوں سے خینہ کو بوریت  
ہونے لگی تو اور پر چلی آئی۔

کل عید تھی۔ اس دفعہ خینہ نے نئے کپڑے نہیں لئے تھے۔ اسی سعدی کے لئے بھی نئے کپڑے نہیں لائی تھیں۔ پتے نہیں کیوں۔

وہ کچن کی گول میز پر آ بیٹھی۔ لا دنچ میں اٹی وی چل رہا تھا اور بڑے ابا قریب بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ندرت اس کے ساتھ  
آبیٹھیں۔

”دشمن باتی کے ہاں سے کارڈ آ گیا ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ان کے بیٹے کی شادی ہے۔ سوچ رہی ہوں ولیم بھگتا آؤں ذکر ہے۔“

حالہ اور سارہ کے ساتھ۔“

”ای! آپ کا جانا ضروری ہے کیا؟“ وہ سوچ میں ڈوبی بولی۔ بڑے ابا نے چونک کر کتاب سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اے لو۔ ضروری کیوں نہیں؟ خاندان کا معاملہ ہے۔ پھر کچھ دینا دلانا بھی پڑتا ہے۔“

”اُف! ای! پوری بات تو نہیں۔“ وہ جھلائی۔ ”آپ کا بھی شاکستہ خالہ سے وہی رشتہ ہے ناجو فارس ماموں کا ہے؟“

”ہاں تو؟“

”تو ماموں سے کہیں نا کہ وہ چلے جائیں۔“ ابا سے دیکھتے زیرِ لب مسکرائے۔ مگر ندرت نہیں سمجھی تھیں۔

”اس کو کیوں بخک کروں جنین؟ وہ بے چارہ پہلے ہی کام میں مصروف رہتا ہے اس کے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں ای! ان کے پاس وقت نہیں ہوتا، کیونکہ وہ پچھلے چار ماہ سے سعدی بھائی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ ای! وہ لوگ اپنی شادی کے بعد ایک دفعہ بھی باہر کھانا کھانے نہیں گئے۔ کبھی ساتھ گھومنے نہیں گئے۔ سعدی بھائی کے ساتھ یہ سب انہوں نے نہیں کیا۔

پھر ہم کیوں سارا بوجھاں دونوں پڑال دیں۔ اور ان کو کوئی اپسیں ہی نہ دیں۔“

ندرت چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ ”مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔“

”مگر مجھے تو آگیانا۔ اب نہیں۔“ پر جوش سی رازداری سے کہنے لگی۔ ”آپ کہہ دیں ماموں سے کہ آپ کے گھنٹوں میں درد ہے، اور آپ نہیں جاستیں سودہ چلے جائیں۔ آگے سے وہ کہیں گے؛ اچھا میں جنین اور سیم کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ آپ کہنا، کوئی ضرورت نہیں، اپنی بیوی کو لے کر جاؤ۔ وہ پچھنہیں کہیں گے؛ بلکہ صرف زمر پھپھو کو دیکھیں گے، وہ خود ہی کہہ دیں گی کہ میرا تو کورٹ میں فلاں کام ہے، آپ کہنا، ہفتہ کی شام کوں سا کورٹ ہوتا ہے؟ پھر دو تین جذباتی ڈائیلاگ بولنا کا میرا سعدی ہوتا تو وہی چلا جاتا، ساتھ آنکھوں میں آنسو بھی لے آتا، جیسے دادی کے سامنے ایکنگ کرتی تھیں ویسے ہی، بس پھر دونوں مان جائیں گے۔“ چنکی میں مسئلہ ہی حل کر دیا جنین نے۔ ندرت کا بس جوتے پہاڑھ جاتے رہ گیا۔ بڑے ابا مسکرا کر کتاب پڑھنے لگے۔

تحوڑی دیر بعد کھانے کی میز کے گرد سب بیٹھے تھے اور خاموشی سے کھانا کھایا جا رہا تھا۔ تھی ندرت نے بات چھیڑی۔

”فارس۔ شبتم باہی کے بیٹھے کا دلیمہ ہے اگلے ہفتے۔ تھارا الگ کارڈ بھیجا ہے۔“

اس نے لقمہ لیتے ہوئے محض سر ہلا دیا۔

”میرے گھنٹوں میں بہت درد ہے آج کل، ایسے کرو تم چلے جاؤ، صرف چند گھنٹوں کی ہی توبات ہے۔“ فارس نے رک کر انہیں دیکھا۔ بڑے ابا مسکرا کر چہرہ جھکائے ہوئے تھے۔

”میں؟“

”میں نہ کہنی مگر جانا ضروری ہے، اچھا نہیں لگتا۔“

”اچھا۔“ فارس کی نظریں جنین کی طرف اٹھیں۔ ”خدا اور سیم کو ساتھ بھیج دیں پھر...“

بے خر سیم کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”ہیں؟ پچی؟ کب جانا ہے؟“ جنین نے زور سے اس کے پاؤں پر اپنا جوتا مارا، اس کی بولتی بند ہوئی، پھر بے چارگی سے فارس کو دیکھا۔ ”سوری ماموں، میرے ایگزار میں ہیں۔“

”ان دونوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انہوں نے تمہیں زمر کے ساتھ بلا یا ہے، تو تم دونوں میاں بیوی چلے جاؤ نا۔“

زمر نے نوالہ منہ میں رکھتے چونک کرانہیں دیکھا۔ پھر فارس کو۔ اس نے بھی زمر کو دیکھا تھا۔ پھر سن بھل کر بولی۔

”بھا بھی، میں ضرور جاتی، مگر کورٹ میں میری ایک ضروری ساعت ہے اور....“

فارس کو چند ماہ لگے تھے یہ سب حاصل کرنے میں۔ اسے یہ سب کس نے دیا، اس شخص کا قسم بعد میں سنو گے، ابھی اتنا جان لو کر سرمد شاہ کی ماں متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر اس کا ماموں، جو آئی جی کے عہدے پر فائز تھا، وہ امیر بھی تھا اور بار سونج بھی۔ نہ صرف اس نے اپنی بیٹی (شزادہ کی بڑی بہن عائذہ) سے سرمد شاہ کی شادی کی؛ بلکہ اس کا کیریئر بھی بنوایا۔ اس کو اپنے طبقے میں پیدا جانے دیے۔ سرمد شاہ نے ان سب کو شے میں اتنا رہا تو اس کے لئے لکنکر فارس کی جیب میں تھا۔ پی کیپ والا سرجھ کا کربیٹھے وہ گزرے سالوں کو سوچ رہا تھا۔ پھر ایک لمحہ ہر یاد پر حادی ہونے لگا۔ ارڈگر دموجوڈ "حال" تحلیل ہو کر ماضی میں بد لئے لگا۔۔۔

وہ سفید کرتے میں ملبوس اس کال کو ٹھڑی میں تھا۔ اس کے ہاتھ دیوار کے ساتھ اوپنے بندھے تھے۔ آنکھیں بند کیے، سختی سے دانت پا دانت جمائے وہ یوں کھڑا تھا کہ اس کے سر سے خون بہر رہا تھا۔ چہرے پر اذیت کے آثار تھے۔ ایک سپاہی یکے بعد دیگرے اس کی کمر پہ نہر سمارتا تھا۔ سرمد شاہ بھی دہیں کھڑا تھا۔ یوں فارم کی بجائے سفیدی شرٹ پہنے وہ پینے میں تر تھا۔ ایک دم لپک کر فارس کی گردان دبو چی۔

"مجھے تمہارا اقبالی بیان چاہیے۔ غازی!"

"میں نے... قتل نہیں کیا۔" وہ بند آنکھوں سے نہ حال سایو لا تھا۔ جواب میں سرمد شاہ زور زور سے چینخ لگا تھا۔۔۔

ویژنے پیالی میز پر کھلی تو فارس چونکا۔ ماضی تحلیل ہوا۔ وہ ریشور انٹ میں بیٹھا تھا، کھڑکیوں پر بوندیں ہنوز گردی تھیں، ماحول نہ اور ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ایسے میں اس نے بھاپ اڑاتی کافی کی پیالی بلوں سے لگائی۔

لابی میں سے گزرتے لوگ اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بل پر کر کے اٹھا اور سرجھ کائے، جیبوں میں ہاتھ دا لے آگے چلتا گیا۔ ذہن میں ہر وہ لمحہ گزر رہا تھا، وہ جیل کے اذیت ناک ماہ سال، اور وہ اس رات ہسپتال میں گزرے چند گھنٹے... جب ان کے ہاتھوں سے اس اے ایس پی نے سعدی کو غائب کروادیا تھا۔ نفرت، غصہ، انتقام، وہ ہر جذبے میں گھرا آگے بڑھتا گیا۔

متعلقہ ہاں کے داخلی حصے سے اندر کی رنگارنگ تقریب نظر آرہی تھی۔ کونے میں رک کر فارس نے دور کھڑے آئی جی صاحب کے ساتھ بات کرتے سرمد شاہ کو دیکھا۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا، اور مسکرا کر خوش باش سا اپنے سر کے ساتھ مگن تھا۔ فارس کی قیمت سر دناظریں اس سے ہوتیں، مرکزی دیوار تک جارکیں۔

"پسی بر تھڈے ارسم شاہ۔" وہاں لکھا تھا۔

ایک دم فارس کی نظروں میں الجھن ابھری۔ اس نے آگے پیچھے دیکھا۔ غبارے پھول، اور اوپنی سی کیک ٹیبل۔ مہانوں میں جا ججا نظر آتے بچٹوپیں اور نائی میں کھڑا پیارا ساسات سالہ بچہ۔ جو سرمد شاہ کی یوں عائذہ کے ساتھ کھڑا تھا۔

(تو وہ خاندانی تقریب سا لگرہ کی تھی؟)

فارس بالکل سُن سا ہو کر اس بچے کو دیکھے گیا۔ بچہ بہت پیارا تھا۔ اس کے ہونٹ گلابی اور آنکھیں کانچ جیسی تھیں۔ شرما کر، مسکرا کر وہ اپنے جیسے کم عمر بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ کسی نہیں شہزادے کی طرح۔ اس کی کانچ سی آنکھوں کی معصومیت ایک دم ہر شے، ہر جذبے پر حادی ہونے لگی۔

فارس کے تاثرات بدل چکے تھے۔ سرد پن غائب ہوا۔ آنکھوں میں تکلیف سی ابھری۔ پھر ایک دم وہ مڑا۔

ہٹل کے کچن کی پشت پر جب وہ پہنچا تو ایک کیسر اس کا منتظر تھا۔

"لا کیں پیکٹ دیں، میں ارتیخ کر دوں گا۔" ادھر ادھر دیکھتے رازداری سے بولا۔

"نہیں۔ ابھی نہیں۔" وہ بے سکون لگ رہا تھا۔

کیٹر نے جیت سے اسے دیکھا۔ ”آپ نے ایک ہمینہ مجھے تجوہ دی اس کام کے لئے اور اب؟“  
”میں نے کہا نا۔ بھی نہیں۔ تم جاؤ کام کرو۔“ اور واپس پلٹ گیا۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا، بارش مسلسل بر سر ہی تھی۔ خین اور زمر لاونچ کے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ وہ لاک بند کر کے آگے آیا۔  
پانی میں بیگنا ہوا لگتا تھا۔ جانے کتنی دیر سڑک کنارے بارش میں چلتا رہا تھا۔

خین اسے دیکھ کر بے قراری سے اٹھی۔ ”کیا بنا اس آدمی کا جس نے میرے بھائی کو ہماری نظر وہ کے سامنے ہبستال سے غائب کروا یا تھا؟“

فارس نے بس ایک خاموش نظر اس پڑالی اور سڑھیاں چڑھنے لگا۔ خین نے ناگھی سے زمر کو دیکھا۔ وہ خود بھی چونکی تھی۔ پھر فراپیچھے گئی۔  
وہ کمرے میں کھڑا گھڑی اتار رہا تھا۔ زمر سامنے آئی۔  
”کیا بننا؟“

”میں نے...“ وہ چپ ہوا۔ گھڑی اتار کر میز پر رکھی۔ پھر پیکٹ نکال کر ساتھ رکھا۔ ”میں نے نہیں کیا۔“  
”کیا مطلب نہیں کیا؟“ وہ حیران سی رہ گئی۔

”وہ اس کے بچے کی سالگرد ہی۔ اس کا بیٹا وہاں موجود تھا۔“ وہ اب صوفے پہ بیٹھا، سر جھکائے جو گرز کے تسمے کھول رہا تھا۔  
”تو؟“

”تو یہ کہ وہ ایک سات سال کا بچہ تھا۔“ اس نے جو گز راتا رے۔

”تمہیں اس پر حرم آگیا؟“ زمر کو آگ لگ گئی تھی۔ ”کیا تم وہ سب بھول گئے جو اس نے ہمارے خاندان کے ساتھ کیا؟“

”زمر بی بی... میرا دماغ اس وقت خراب مت کریں۔ میں اس بچے کے سامنے اس کے باپ کا کردار نہیں کھول سکتا تھا۔“ وہ ایک دم غصے سے اس کے سامنے آیا۔ ”تقریب میں سارے لوگ اس کے باپ پر پل پڑتے وہاں ایسی ایسی باتیں کی جاتیں جن کو وہ بچہ بھی نہ بھولتا۔ اس کا باپ اس کی ماں سے بے وقاری کر رہا ہے اس سے جھوٹ بولتا رہا ہے وہ بھی نہ بھوتا۔ وہ ساری زندگی کی محبت، کسی رشتے کا اعتبار نہ کرتا۔ ہر انسان کا باپ اس کے لئے آئینڈیل ہوتا ہے، آئینڈیل توڑنے سے اس کی شخصیت بھی ٹوٹ جاتی ہے۔“

کمرے میں نہایتا چھا گیا۔ گھڑ کی پہ بارش تر تر بر سر ہی تھی۔ زمر نے افسوس سے اسے دیکھا۔

”تمہاری سوتیل ماں نے بھی ایسا ہی کیا تھا نا!“ کوئی برف کا اولہ ساز ور سے کھڑ کی پر گرا تھا۔

”مجھے درمیان میں مت لائیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر دو کا۔ آنکھیں سرخ ہوئیں۔

”تم خود اپنے آپ کو درمیان میں لائے ہو۔ جو سر دشائے کیا، وہ اس کے ذمے ہے۔ اس کے بچے کو کبھی نہ کبھی پتہ چل جائے گا۔ یا تم اسے معاف کر رہے ہو؟“

”میں کسی کو معاف نہیں کر رہا۔ صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ یہ چیز کسی اور طریقے سے کسی اور وقت کی جاسکتی ہے۔ بعد میں وہ اپنے بچے کو کیسے ڈیل کرے یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، لیکن آج کی الہانت کی وجہ میں نہیں بنتا چاہتا۔ میرا انتقام میری ہماری نہیں ہے، نہ اس نے مجھ سے میری انسانیت چھینی ہے۔“ وہ مژا اور شنک کپڑوں کے لیے الماری کھول لی۔

زمر گھری سانس بھر کر رہ گئی۔ ”تم غلطی کر رہے ہو، اور تم اس کے لئے بہت پچھتا و گے۔“

وہ نظر انداز کر کے کپڑے نکالنے لگا۔ بارش کی تر تراہٹ مزید تیز ہو گئی تھی۔

قاتل مرا نشان مٹانے پہ ہے بعند ..... میں بھی سینا کی نوک پر سر چھوڑ جاؤں گا  
موسم اگلے چند دن ویسا ہی مٹھنڈار ہا، مگر پھر آہستہ آہستہ بارش کا شرختم ہو گیا، جس اور گرمی واپس آگئی۔ البتہ آزاد کشمیر کی طرف جاتی  
اس پہاڑی، بل کھاتی سڑک پر اب بھی مٹھنڈی چھایا سی تھی۔ ایک لش مچھتی کارو بہاں دوڑ رہی تھی۔ نوشیر وال کاردار اسٹریٹ گنگ وہیل کے پیچے  
موجود تھا۔ آنکھوں پر برانڈ ڈگلاسز لگے تھے، کلائی میں فیتنگ گھٹری۔ منہ میں چیونگم چبا تادہ ڈرائیور کر رہا تھا۔  
ڈلیش بورڈ پڑا لفون کی اسکرین دفعتاً چمکی۔ اس نے اسے اٹھایا۔ اسید کا پیغام تھا۔ سب دوست کشمیر پہنچ چکے تھے اسی کا انتظار ہو  
رہا تھا۔ ”میں دو پھر تک پہنچ جاؤں گا“، لکھ کر پیغام بھیجا اور پھر سے ڈرائیور کرنے لگا۔

یکدم اس نے کار کو بریک لگائی۔ ناٹر چرچ پر آئے۔ خون کی بوندیں وہ اسکرین تک اڑ کر آئیں۔ لمحے بھر کو وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ لیکن  
پھر تیزی سے باہر نکلا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ مرنے والا کوئی کتا تھا، اور اس نے اسے بچانے کی کوشش بھی کی تھی، مگر.....  
باہر آ کر وہ رکا۔ اگلے تاروں میں آیا۔ وہ کتنا نہیں تھا۔

وہ کتے کا پچھا۔ ایک معصوم شہری لیبر اڈار۔

وہ پکلا گیا تھا۔ خون جا بجا بکھرنا تھا۔ نوشیر وال بچوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔ پریشانی سے اس کو دیکھا۔ پلے کی گردن میں کالر  
تھا۔ ”آر یو“ اور مالک کا نام ”اینڈر رس...“ دوسرا لفظ خون میں ڈوبنے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسی فارنز سیاح کا کتا تھا۔ شاید ہسپانوی۔  
نشیر وال کو سمجھنیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پھر اس نے آواز سنی۔ اور پہاڑ پر دختوں سے کوئی عورت پکار رہی تھی۔ ”آر یو... آر یو۔“  
نشیر وال نے بچلی کی تیزی سے اپنی ڈیزیر اسٹریٹ اتاری کتے کو اس میں لپٹا اور بھاگتا ہوا کار کے اندر بیٹھا۔ جیکٹ کی گھٹری  
فرنٹ سیٹ پر ڈالی اور تیزی سے کار آگے جا کر فرما آہستہ کی۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ خون سے بھرے تھے۔

شیر و کو ایک دم مٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس نے کار روکی۔ اور جیکٹ کی گھٹری لئے باہر نکلا۔ سڑک کے دہانے پر کھڑے اس نے  
سوچا کرتے کی لاش نیچے کھائی میں پھیک دے، مگر وہ اسے نہیں پھینک سکا۔ مٹھنڈی ہوا کے باوجود اس کا جسم پسینے سے تر تھا۔  
وہ سڑک کنارے گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا اور خون آلود ہاتھوں سے مٹی کھو دنے لگا۔ زرمٹی بھی نہیں کھو دی جا رہی تھی۔ سانس چڑھنے  
لگا تھا۔ بمشکل بدققت وہ ایک چھوٹا سا گڑھا کھو دیا۔ پھر جیکٹ کھولی تو اندر نہ ماوصوم پلاخون میں ڈو بامراپڑا تھا۔

نشیر وال کے دل کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے چہرہ اٹھا کر اپنے چار سو دیکھا۔

ویران پہاڑ اونچے درخت۔ کھاتی۔ کھلا آسمان۔

وہ لاش کو دیں چھوڑ کر کار میں آ بیٹھا۔ خون آلود فرنٹ سیٹ۔ کپکا تے ہاتھوں سے دوبارہ کار اسٹارٹ کی۔ اسے گھر  
جانا تھا۔

(کوئی جانور کو بھی اپنے نہیں مارتا، نشیر و! وہ تو پھر انسان کا پچھا۔)

شیر و نے سر جھلنکا اور ایک سلیٹر پر زور بڑھا دیا۔ وہ ہر جگہ تھا، وہ ہر منظر میں تھا، اس سے فرار نا ممکن تھا۔ اور اب گلٹ کا یہ مرض بڑھتا جا  
رہا تھا۔

چند گھنٹوں بعد قصر کاردار میں جھانکو تو نوشیر وال کا رگھر کے اندر ونی گیراج میں لے آیا تھا، اور اب گارڈ کو بدایات ذرے رہا تھا۔

”اس کا وہی طرح صاف کرواؤ۔ ایک دصہ بھی نہ باقی رہے۔“

لاؤخ میں جواہرات تیار بیٹھی تھی۔ بالوں کا جوزا بنائے، گردن میں دکتے ہیرے۔ ہاتھ فینیونا کے سامنے بچھار کر تھا جس پر وہ

کیونکس لگا رہی تھی۔ شیر و کو اس طرح آتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

"تم تو دوستوں کے ساتھ گئے تھے؟ اور یہ کپڑوں کو کیا ہوا ہے؟" وہ جواب دیے بنا اور چلا گیا۔ جواہرات نے چتونوں کے اشارے سے فیجنونا کو روکا، ہاتھ نکالا، اور اس کے پیچھے اوپر گئی۔

شیر و اپنے کمرے کے ڈرینگ روم میں الماریوں کے پٹ کھو لے کرڑا تھا۔ چہرے پر عجیب بے زاری اور بے چینی تھی۔

"تمہارے کپڑوں پر خون کیوں لگا ہے؟ کیا کسی سے لڑ کر آئے ہو؟" وہ فکرمندی سے اس کے سامنے آئی۔

"فکر نہ کریں، کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔"

"مجھے بچ بتاؤ، شیر، کس سے جھکڑا کیا ہے؟" اس نے اسے کہنی سے تمام کراپنے سامنے کیا۔ نوشیر وال بالکل ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ کو لوگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"تمہاری حالت وہ بتاری ہے جو تمہارے الفاظ نہیں کہہ رہے۔ اب کے وہ بخت سے بولی۔ شیر نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"کتنے کا بچ تھا وہ میں کتنے کا بچ پھر۔" وہ ایک دم بلند آواز میں بولا۔ "میں نے غلطی سے اسے مار دیا، مگر میں اس کا خون آؤ د جو دنہیں دیکھ سکا۔ میں اس کو دفنا بھی نہیں سکا۔ مجھے ہر جگہ اس کا خون نظر آ رہا تھا۔ اس کی مالکن اس کو پکار رہی تھی۔ آریو، آریو۔ وہ آوازیں مجھے پاگل کر رہی ہیں۔" وہ وحشت سے چلا یا تھا۔

"اوکے اوکے!" جواہرات نے نرمی سے اس کو شاناوں سے تھاما۔ "ریلیکس، کوئی بات نہیں، یہ صرف ایک حادثہ تھا۔ تم ان چیزوں سے بہت اوپر بہت مضبوط ہو۔ تم ایک کاردار ہو اور...."

"اور میں ایک بڑے خاندان کا بڑا آدمی ہوں، عظمت میرا مقدر ہے، یہی نہیں ہوتی آئی ہیں نا۔ آپ مجھے ساری عمر؟" غصے سے کہنی چھڑائی۔ "بس کر دیں، نہیں سننی مجھے یہ بتیں اس وقت۔ کیونکہ میں.... اب مجھے ان پر یقین نہیں آتا۔" بڑھم سے صدمے سے اسے دیکھتا۔ کپڑے لئے با تھر روم میں چلا گیا اور دروازہ جواہرات کے منہ پر بند کر دیا۔

وہ گہری سانس لے کر رہی تھی۔ (خیروہ نارمل ہو جائے گا)۔ اور اپنی نیچے چلی آئی۔ اس کی ابھی تیاری رہتی تھی۔

.....

میں ریگ زار تھا، مجھ میں بے تھے نہائے ..... اسی لیے تو میں شہنما یوں سے ڈرتا رہا

ان سے دور چلے آؤ تو شام کے اس پھر، ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کے بینکوٹ ہال میں دیسے کافکشن منعقد تھا۔ روشنیاں جگہ گارہی تھیں۔ دلہاد ہم پھولوں سے بچ اسچ پر بیٹھے، مسکرا کر تصویریں بنوار ہے تھے۔ یعنی ایک میز کے گرد سر پیٹھی غیر دلچسپی سے اسچ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے زرد بی قمیں پہن رکھی تھی، بال جوڑے میں تھا اور کانوں میں آویزے تھے، موقع کی مناسبت سے ہلکی چکلی تیار وہ اچھی لگ تھی۔ فارس ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ ناگ پٹا ناگ جائے، مسلسل سیل پر ہٹن دبارہ تھا۔ ایک دوسرے سے کٹے کٹے اور بے نیاز۔

تبھی سارہ ادھر آتی دکھائی دی۔ وہ سادگی سے تیار ہوئی تھی۔ ایک بیٹی اہل ساتھ تھی، دوسری کوئنے جانے کس وجہ سے ساتھ نہیں لائی تھی۔ ان کو دیکھ کر پھیکا سا مسکرائی۔ زمر بھی مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فارس نے نہیں دیکھا تھا، سر جھکائے سیل پر لگا تھا، مگر اہل نے جیسے ہی اسے دیکھا، ایک دم ماں کی انگلی چھڑا کر آگے لپکی، اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ چونکا، مگر... پھر۔۔۔ ناگاہ بچی پر پڑی تو زری سے اس کے گرد بزاوہ ہمال کیے، اور اسے خود سے لگائے رکھا۔ سارہ جوز مر سے رسی کلمات کہہ رہی تھی، ایک دم رک کر دیکھنے لگی۔ آئندھیں گلابی ہو گیں۔

وہ تو بس ایک دفعہ ملنے آیا تھا رہائی کے بعد اور سارہ نے اسے رکھائی سے خود سے دور نہیں کا کہا تھا، پھر وہ صرف دو دفعہ آئی ان کے گھر (آنکھی میں) مگر صرف تب جب وہ گھر پہنچی تھا، کہ فارس غازی کا مطلب تھا "مصیبت"۔ اور اہل تو اس سے پہنچنے نہیں کئے تھے عرصے بعد مل رہی تھی، پھر بھی اسے وہ یاد تھا؟ اہل اب فارس سے الگ ہوئی تو وہ اسے دونوں کھمیوں سے تھامے، مسکرا کر اپنے سامنے کھڑا کیے، پوچھ رہا

قہا۔ ”تم کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟ میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔“ اس نے اپنے نہنے ہاتھ کو فارس کے گال اور ٹھوڑی پہ پھیرا۔ فارس نے دونوں ہاتھوں میں ٹھام کر چوما۔

لمحہ بھر کے لئے ان کے ارد گرد شادی کا نقش غائب ہو گیا۔ وہ چار ساڑھے چار سال قبل چلے گئے، جہاں قبرستان سے لوگ لوٹ رہے تھے اور ایک تازہ کچی قبر پر وہ کھڑا ہنوز مٹی ڈال رہا تھا۔ اس کا چہرہ ویران تھا، اور آنکھوں میں گلابی ساپانی تھا۔ قبر مکمل طور پر ڈھک چکی۔ ساتھ پانچ سالہ مل خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔ لوگ دور جا رہے تھے۔ نور کھڑتی تھی، وہ الگ مراج کی تھی، اس کو سارہ نے نہیں آنے دیا، مگر مل کو وہ زبردستی اس کے باپ کے جنازے پر لے آیا تھا۔

قبرستان تقریباً سنسان ہو چلا تھا۔ سورج اور پتپ رہا تھا۔ وہ بھی ہنکان زدہ سامنی پا بیٹھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مسلیں۔ ”آپ رور ہے ہیں، چاچو؟“ مل نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ فارس نے نہیں میں چہرہ ہلایا، زکام زدہ سی سانس اندر کو کھینچنی آنکھوں میں گلابی پانی تھا۔ مگر اس نے ان کو گڑ لیا، پھر مل کو دیکھا۔

”اپنے باپ کی قبر مت بھولنا بھی مل۔ اس کو اس لئے مارا گیا کیونکہ وہ ایک سچا آدمی تھا، ایک ایسا آدمی جو ظلم کے خلاف اٹھ سکتا ہو۔ وہ بہادر تھا۔ میں بھی اسی کا بھائی ہوں۔ اللہ کی قسم، میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ سمجھتے ہیں، ہم غریب ہیں، کمزور ہیں، تو ان کا ہاتھ نہیں روک سکتے؟ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ کبھی یہ نہیں سمجھو گی کہ تمہارے باپ نے خود کشی کی تھی، اور میرا وعدہ ہے، میں اس کے ایک ایک قاتل کا سر تمہارے ہاتھ میں لا کر دوں گا۔“ اسے پتہ تھا مل کو اس کی باتیں نہیں سمجھا۔ نیکی گی، مگر وہ جواب میں کچھ کہری تھی۔۔۔

قبرستان تحلیل ہو گیا، اور وہ روشنیوں سے مزین اس ہال میں موجود تھے۔ فارس بیٹھا ہوا تھا، اور اس نے مل کے ہاتھ ٹھام رکھے تھے۔

”آپ اتنے بڑی کیوں ہوتے ہیں؟ جب بھی ماں سے کہوں آپ سے ملنا ہے، وہ کہتی ہیں، چاچو بڑی ہیں۔“ وہ اس کے کان کے قریب شکوہ کر رہی تھی۔

فارس نے ذخی نظر اٹھا کر سارہ کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو یہ میرا خون ہے، تم خون میں لکیر نہیں کھینچ سکتی۔ سارہ کا گلارندھا۔

”تم چاچو کو اتنا مس کر رہی تھیں تو مجھے کہتیں، میں تمہیں ملوالاتی۔“ بیٹی کو مخاطب کیا۔ شرمندگی اور خفت کے ساتھ۔ وہ اتنے سال الگینڈر ہے، فارس کے ساتھ ایک شہر میں تو صرف چند ماہ رہے، پھر وہ جیل چلا گیا، لیکن ایسے وہ دوڑ کر اس کے پاس آئی تھی، جیسے رسول کا ساتھ ہو۔ یہ خون کیا چیز تھی؟ اس کا رگوں میں بہنا کیسے سب کو جوڑ کر رکھتا تھا۔ اس کا ناقص بہائے جانا کیسے سب کو توڑ دیتا تھا۔ زمر بس خاموشی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

”سعدی کا کچھ پتہ چلا فارس؟“ اس نے پوچھا، تو آواز میں آس بھی تھی، خفت بھی۔ وہ انہی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ مل کو کسی نے بلا لیا تھا سوہہ بھاگ گئی۔

”میں اسے ڈھونڈ لوں گا.....“ خشک سا کہہ کر دوسرا طرف دیکھنے لگا۔ میز پر عجیب ساتھا در آیا۔ اسے سارہ کا اپنے ساتھ رو یہ یاد تھا۔

”تمہیں آنکھ پیٹنے... یعنی آئی پی پی زکو چیک کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ان کا اس میں کوئی ہاتھ ہو۔“ سارہ نے خود کو کہتے سن۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر سر ہلایا۔

”کر رہا ہوں۔“ سارہ اٹھ گئی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس پرائیوٹ نمبر تھا، چاہتی تو خفیہ ایس ایس بھی

بچج دیتی، لیکن وہ جانتی تھی، وہ اس کوڑہ ہونڈ لے گا، اور زمر اسے کورٹ میں دھکیل دے گی۔

”ہارون عبید والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“ وہ تمہارہ گئے تو زمر نے ہلکے سے سرگوشی کی۔ اے ایس پی کو وہ اب ڈسکس نہیں کرتے تھے، وہ ماننا نہیں تھا لیکن وہ اس کو معاف کر چکا تھا۔

”ہوں۔ میں ہارون عبید کے بیچھے ہی لگا ہوا ہوں، مگر اتنے دن سے اس کی ایک قابل گرفت چیز بھی نہیں مل سکی۔“ وہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ ”میں بچ ہارون عبید اور اے ایس پی کا لئک جوڑنا چاہتا ہوں، الیاس فاطمی کے ساتھ۔ مگر ان تینوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں بن رہا۔“

”یعنی درمیان میں کچھ منگ ہے؟“

”درمیان میں ”کوئی“ منگ ہے۔ کوئی ایک شخص ہے ان سب کے درمیان۔“ نئی میں سر ہلاتے وہ سوچ رہا تھا۔ زمر نے تھوک لگلا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔

”کھانا لگ رہا ہے۔“ وہ اٹھنے لگی تو ایک دم اسے چکر سا آیا۔ میز کا سہارا لے کر واپس بیٹھی۔ فارس اپنے فون پہ بیٹھ دبارہ تھا، اسے نہیں دیکھا۔ چند گھنے سانس لے کر اس نے خود پر قابو پایا۔

”ہم باہر کہیں اور ڈنر کر سکتے ہیں فارس؟“ اسے اتنے لوگوں میں ایک دم گھنن ہونے لگی تھی۔ اتنی دور نیبل تک جائے گی کھانا ڈالنے تو کہیں گر جائے گی۔ فارس نے اس بات پر بے اختیار اسے دیکھا اور پھر ہمیشہ کی طرح اس کی بات مان لی۔ ایک دم سے زمر کو حساس ہوا، کہ اسے فارس کو بتا دینا چاہیے۔ اپنی خرابی طبیعت، کذبی، وہ سب۔ پرس میں ایک رپورٹ بھی تھی، اسے وہ فارس کو دکھادی چاہیے۔

جن پھر وہن کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں

جب ان کو زبانی تو ہم پہ ہی برس پڑے

کچھ دیر بعد وہ اسی ہوٹل کے ریشور انٹ میں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ وہاں مدھم زردو بیٹاں تھیں۔ میز پر تازہ پھول رکھے تھے۔ موم بقی جل رہی تھی۔ وہ بیک لگائے، مسلسل کان کی لومستا، ویٹ کو آرڈر دے رہا تھا اور زمر کے ہاتھ گود میں رکھے پرس پڑتے۔ فارس کے ساتھ پہلی دفعہ ایسی جگہ پہ ڈنر کرنا۔ بہت آ کورڈ تھا۔ تبھی زمر کا فون بجا۔ اس نے فوراً اٹھا لیا۔

”جی صداقت؟ جی ظاہر ہے وہ کپڑے استری کرنے تھے۔ میں نے نہیں بتایا تو آپ کو خود سمجھنا چاہیے تھا۔“ رک کر خنگی سے سن۔ ”میں نے وہاں کپڑے نہیں رکھے تھے تو کیا کسی چڑیل نے آکر رکھے تھے؟ روز اسٹینڈ پر کپڑے کون رکھتا ہے؟ حد کرتے ہو آپ بھی۔“ بڑا کر فون رکھا تو دیکھا، فارس ذرا چونک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے خود کو ”چڑیل“ کیوں کہا؟“

”مثال دی تھی۔ کیوں؟ کیا ہوا؟“ اس نے نامجھی سے اسے دیکھا۔ ”تم کیوں مسکرا رہے ہو؟“

فارس نے مسکرا ہٹ دبائے چہرہ جھکا کرنی میں سر ہلا کیا۔ ”میں بالکل بھی نہیں مسکرا رہا۔“

وہ فوراً آگے ہوئی۔ ”نہیں بچ سچ بتاؤ۔ تم ایسے صرف تب مسکراتے ہو جب تمہیں کوئی بات معلوم ہوتی ہے اور مجھے نہیں۔“ پھر رک کر اپنی بات پر گور کیا۔ ”کیا کسی نے تمہارے سامنے مجھے چڑیل کہا ہے؟“

”میرے سامنے کوئی آپ کو چڑیل کہنے کی بہت کر سکتا ہے کیا؟“ فارس نے سمجھی گی سے اسے تسلی دی۔ زمر کے تین اعصاب

قدرے ڈھیلے پڑے۔ اس کے انداز میں اتنا مان، اتنا اعتبا و تھا۔ پرس میں ہاتھ ڈال کر پورٹ دوانگلیوں سے پکڑی۔ پھر سری سا بولی۔

”اس بات کا کیا مطلب تھا جو اس رات تم نے کیا؟“ اسے یقین تھا کہ فارس کو معلوم ہے وہ کس بات کا ذکر کر رہی ہے۔

”وہ اسے دیکھتے ہوئے تھے لہا کا سماں مسکرا یا۔“ اس کا مطلب یہ تھا کہ۔ آپ نے مجھے... سات سال پہلے... قید میں ڈالا تھا۔“

وقت ایک لمحے کے لئے تھم گیا، مومنت کا شعلہ ہلاکا سامنہ ملایا۔ پھولوں کی خوبیوں پاس پھیلی۔ زمریک نکل اس کی آنکھوں میں دیکھئے گئے۔ ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

### I Fell in Love with You Seven Years ago!

وہ آرام سے کہہ گیا۔ اس کے لیوں پر مسکراہٹ تھی، مگر وہ اس مسکراہٹ کو پہچانت تھی۔ یہ روان پرور مسکراہٹ نہیں تھی۔ یہ سرد آگ سی تھی۔

”تم نے مجھ سے شادی کیوں کی فارس؟“ وہ بالکل ساکت سی۔ دم سادھے پیٹھی تھی۔ دو انگلیاں اب بھی روپرٹ پڑھیں۔

”میں آپ کو پتا چکا ہوں۔ تیری وجہ بھی بتائے دیتا ہوں۔“ اس نے لمحے بھر کے لئے بھی زمر کی آنکھوں سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ ”میں سات سال پہلے جب اس شہر میں پوسٹ ہو کر آیا تھا تو میں نے آپ کی کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ یہ تب ہی ہوا تھا۔ مجھے... آپ سے... محبت ہو گئی تھی۔“ وہ زمی سے کہہ رہا تھا مگر یہ زمی آنکھوں میں نہیں تھی۔ ”میں آپ کے قریب رہنے کے لئے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ آپ کے بارے میں ہر چیز جانے لگا تھا۔ آپ سعدی کی فیس دے رہی ہیں، آپ حند کے لئے اپنی چاپیاں جان بوجھ کر لئے بھول جاتی ہیں، آپ کو کب سے استھما ہے۔ مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولتا تھا کہ مجھے نوٹس نہیں ملے۔ مجھے ملے تھے۔ میں نے چھار کر پھینک دیے تاکہ آپ مجھے زیادہ وقت دے سکیں۔ مجھے تباہ احساس ہوا کہ میں مریضِ عشق بنتا جا رہا ہوں۔“

وہ سانس لینے کو رکا۔ وہ بالکل دم سادھے اسے سن رہی تھی۔

”پانچ سال پیچھے چلتے ہیں زمر۔ میں نے آپ کوہ نوز پن بھیجی، مجھے لگا تھا آپ میری لکھائی پہچان جائیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسی لئے جب آپ کی والدہ نے رشتے سے انکار کیا تو میں نے دوبارہ کوشش نہیں کی۔ میں ”آپ“ کے لئے نہیں لڑا۔ میں... آپ کے لئے... نہیں لڑا۔ میرے نزدیک ایک ایسی عورت کے لئے لڑنا بے سود تھا جو میری لکھائی بھی نہ پہچان سکے۔ میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ شادی بھی کرنی، لیکن میرا ایک حصہ پہلے بھی اور آئندہ بھی آپ سے محبت کرتا رہے گا۔ اس ایک حصے کی وجہ سے میں اپنی بیوی سے ویسی محبت نہیں کر سکا جیسی کرنی چاہیے تھی۔ شروع شروع میں، میں اس کے نام کو اپنے بھائی کے نام سے جوڑنے پر رہتا تھا، مجھے لگتا تھا یہ صرف اس سے محبت نہ کرنے کا گھٹ ہے ورنہ اس کے حقوق و فرائض تو میں نے سب پورے کیے تھے۔ ڈانٹتا تھا، مگر بلا وجہ نہیں۔ وہ میری بہت اچھی دوست تھی۔ لیکن جیل کے چار سال میں یہ نہیں بھج سکا، اگر میر اور اس کا تعلق صرف دوستی یا گلکٹ کا تھا تو میں اسے اتنا مس کیوں کرتا ہوں؟ محبت تو مجھے آپ سے تھی مگر آپ کے لئے میں کبھی نہیں لڑا، اس کے لئے پھر بھی لڑ رہا ہوں۔“ نضا میں ایک دم Rebecca de Winters کی مہک پھیل گئی۔ وہ اب بھی سانس روکے ہوئے تھی۔

”مجھ سے شادی کرنے کی تیری وجہ کیا تھی؟“

وہ اسی طرح زخمی سرد مسکرا کیا۔ ”محبت نہیں تھی۔ اگر محبت کے لئے آپ سے شادی کرنی ہوتی تو تو ساڑھے پانچ سال پہلے کر لیتا۔ مگر نہیں۔ میں نے آپ سے شادی بھی کی، اور آپ کی ہربات برداشت کی۔“ کہتے ہوئے وہ آگے کوہوا اور اس کی آنکھوں میں جھاناک۔ ”اس لئے نہیں کہ میں کمزور تھا، یا یہ میری شرافت تھی۔ رشت می زمر، میرا ایک حصہ ساری زندگی آپ کی قید سے نہیں نکل سکے گا، میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، اور میں آپ کو ایک ہزار دفعہ بھی معاف کر سکتا ہوں، مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ کے ساتھ جو بھی ہوا، میری وجہ سے ہوا۔ لیکن....، وہ رک۔ وقت بھی رک گیا تھا۔ وہ نمک کا مجسمہ بنی، یہ نمک اس کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن میرے اور آپ کے تعلق، میری برداشت، میری خاموشی، میرا آپ کی پرواہ کرنا، آپ کے زخموں کی مرہم کرنا، محبت اس میں کبھی بھی شامل نہیں تھی۔ میں نے آپ سے غلط کہا تھا کہ میں آخر میں آپ سے اپنا حساب لوں گا، مجھے آپ سے نہ انقام لینا ہے نہ کوئی حساب۔ لیکن....“

وہ پھر رکا، زمر کا سانس بھی رکا۔

”لیکن جو آپ نے میری ساتھ کیا، میں ایک بات بھی نہیں بھولا۔ آپ سے شادی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ.....“ چہہ مزید آگے کیا۔ مومتی کے ٹھنڈتے شعلے کے پیچے اس کی پرچش آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ”میں آپ کی آنکھوں میں گلٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ تب کیا کریں گی جب آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ فارس غازی بے گناہ تھا۔ میں صرف اسی دن کے انتظار میں ہوں، اس دن جب آپ کو سچائی معلوم ہو گی۔ میں اپنی بے گناہی ثابت کرلوں گا اور آپ ٹوٹیں گی۔“ مومتی کا شعلہ ایک دم بجھ گیا۔ زمر کی انگلیوں نے رپورٹ کو چھوڑ دیا۔ نگاہیں ہنوز فارس پہ چھی تھیں۔

”یہ جو آپ کو بہت غور ہے ناخود پہ کہ آپ بہت قابل ہیں، میں یہ غور ٹوٹے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کی آنکھوں میں گلٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی انتقام، کوئی انصاف نہیں چاہیے مجھے آپ سے۔ صرف احساسِ ندامت۔ اسی لئے میں نے آپ سے کوئی تعلق جوڑنے کی کوشش نہیں کی، کوئی حق نہیں مانگا، کیونکہ مجھے آپ کے ساتھ رشتہ بنانے میں دلچسپی نہیں رہی۔ وہ وقت کب کا گزر گیا۔ اب ہم صرف پارٹنر ہیں، ساتھ کام کر رہے ہیں، میں آپ سے کبھی نفرت نہیں کر سکتا، اور محبت کرنا چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ لیکن آپ جیسی عورت کے ساتھ میرے جیسا بندہ کبھی بھی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں، لیکن میں آپ کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے صرف اس دن کا انتظار ہے جب آپ میرے سامنے ٹوٹیں گی اور اس دن زمر بی بی میں آپ کو آزاد کر دوں گا، عزت سے طلاق کے کاغذات تھا دوں گا، مگر اس سے پہلے میں آپ کی ہر کڑوی بات برداشت کرتا رہوں گا، محبت یا شرافت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ میں آپ کو آزار رہا ہوں۔ یہی آپ کی سزا ہے۔ کیونکہ میرے زندگی آپ ایک بے وقوف عورت اور بہت بڑی دلکیل ہیں۔“

مومتی سرد ہو چکی تھی۔ پھولوں میں رہیکا کے ساتھ کافور کی بوہی رچ بس گئی تھی۔ مدھم بتیاں پر اسرار اور خوفناک لگ رہی تھیں۔ وہ بہت سکون سے سرد لبجھ میں کہہ کر پیچھے ہوا۔ دیہر کھانا سرد کرنے آ کھڑا ہوا تھا۔ سردار پلیٹ پر گرم استینک شرمنڈر کر رہی تھی، یوں لگتا تھا زمر کے اندر تک کوئی دلک رہے ہوں۔ کوئی آس ہی ٹوٹ گئی تھی۔

ویہر ہٹا تو وہ ہلکے سے بولा۔ ”کھانا کھائیے۔ وہ وقت گزر چکا جب آپ کو مجھے مندا تھا۔ تب آپ کو اپنی صحت عزیز تھی۔ حالانکہ مری تو میری بیوی تھی، آپ کو تو ڈر کر کنڈنی بھی مل گیا۔“ تلخی سے کہہ کر، وہ جو بے خر تھا، کھانا شروع کرنے لگا، مگر یہ آخری بات.... یہ آخری باتیں زمر کا دل ایسے ہی توڑ دیا کرتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں سرخی در آئی۔ زور سے پرس کی زپ بند کی اور آگے کو ہوئی۔

”فارس غازی!“ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہزار سال بھی انتظار کرو تو وہ دن نہیں آئے گا۔ میں زمر یوسف ہوں اور اپنی نظر وہ میں میری بہت عزت ہے۔ زمر... تمہارے سامنے نہیں ٹوٹے گی۔ کبھی بھی نہیں۔“ پھر اسی تی گردن کے ساتھ کھڑی ہوئی اور پر س اٹھایا۔ ”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ اس نے بندلوں سے لقمہ چباتے ہوئے چل سے پوچھا۔ وہ ویسا ہی مدھم خیال رکھنے والا فارس غازی بن گیا تھا۔

”گھر۔“

”اتی رات کو آپ کیب سے نہیں جائیں گی۔ تھوڑی دیر ک جائیں، میں ڈر اپ کر دیتا ہوں آپ کو۔“

زمر نے بغیر جانے کو مژدی تو وہ کھڑا ہوا اور اس کے سامنے آیا۔

”اچھا آپ کار لے جائیں، میں کیب سے آ جاؤں گا۔“ چابی بڑھا۔ زمر نے رختی نظر وہ سے اسے دیکھا، پھر چابی بھٹی اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اسی سکون سے واپس بیٹھ گیا۔

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے ..... پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن  
خین نے قصر کاردار کی چوکھت عبور کی تو جواہرات، مکمل تیار بہر کے لئے چلتی آ رہی تھی۔ خین مسکرا کر قریب آئی۔

”مسز کاردار ایسا میاں گاؤ، آپ کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں۔“ سادگی اور مخصوصیت سے تعریف کی۔ جواہرات مسکرائی، زمی سے اس کا گال چھوڑا۔ ”مجھے معلوم ہے۔ تم کیسے آئیں؟“

”مجھے خاور سے کام تھا۔ کیا وہ اندر ہیں؟“ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔ ”پلیز آپ ان سے میری سفارش کر دیں کہ وہ میرا کام لازمی کریں۔“

جواہرات غلبت میں تھی، پھر بھی اس کے ساتھ کنٹرول روم تک آئی اور چوکھت سے حکم جاری کیا، ”خاور حمدہ کو اسست کر دو“ اور چلی گئی۔

اندر چند اسکرینز گلی تھیں۔ ایک لیپ تاپ کے سامنے خاور بیٹھا تھا، کام کرتے ہوئے اس نے سراخایا اور قدرے ناخوشی سے حمدہ کو دیکھا۔

”ہیلو کرٹل خاور!“ وہ دوڑ کر آئی اور سامنے کری کھیچ کر نیٹھی۔ ناگ پناگ جمائی۔

”ہیلو خین۔ کیا کام ہے؟“

”بہت اہم کام ہے۔“ ایک فلیش اس کی طرف بڑھائی۔ ”اس میں میرے دو کورین ڈرامے ہیں۔ ان کو encrypt کر دو۔“

خاور نے گھری سانس لی۔ ”خین، تم یہ کام خود بھی کر سکتی ہو۔ پا سورڈ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔“

”مجھے پا سورڈ چھوڑیں، اسٹینڈرڈ RSA تک کا معلوم ہے، مگر یہ سب میری اس دوست کو بھی معلوم ہے جس کو میں ٹرک کرنے جائی ہوں۔ سو مجھے ان فائزکو ایسے encrypt کر کے دیں خاور کہ وہ اسے نہ کھول سکے۔“

”میرے پاس اس وقت بہت کام ہے خین۔ کسی اور وقت آتا۔“ اکتا کر کھتا وہ واپس تاپ کرنے لگا۔

”پلیز کرٹل خاور!“ منت کرتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔

خاور جواب دیے بنا کام کرتا رہا۔ حمدہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”ارے یہ ڈیجیٹل فریم ہے نا، اچک کر ایک فوٹو فریم اٹھائی۔“ ان میں یہ پڑکی طرح تصاویر چلتی پھرتی ہیں۔ یہ آپ کے بیٹھے کی تصویر ہے؟“

”ہاں۔ اسے واپس رکھ دو۔“ اس نے فریم حمدہ کے ہاتھ سے لے کر واپس رکھا تو اس نے اچک کر لیپ تاپ کے ساتھ رکھی کا سراخایا تھیں۔ ”ان میں کسہ رہ لگا ہے نا، واڈیہ میں ایک دن کے لیے اپنی کنزز کو دکھا سکتی ہوں؟“ خاور نے جلدی سے وہ اس سے واپس لی۔

”پلیز خین کسی چیز کو ہاتھ مٹ لگو۔“ پھر بمشکل ضبط کرتے ہوئے ایک نظر اپنے سامنے پھیلی کام کو دیکھا، اور دوسرا اس پر ڈالی جو صوصیت سے آنکھیں جھپکاتے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر قدرے خفگی سے فلیش اس سے لی، اور ایک دوسرے کپیوٹر کی طرف آیا۔ حمدہ بھی جلدی سے اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

اب وہ خاموشی سے اس کا کام کر کے دے رہا تھا۔

”پا سورڈ تاپ کرو۔“ تھوڑی دیر بعد اس نے کی بورڈ اس کے سامنے کیا۔ اور کسی مہذب انسان کی طرح دوسرا طرف دیکھنے لگا۔

وہ نے تاپ کیا، اور سیدھی ہوئی۔ چند منٹ مزید ضائع کیے خاور نے پھر اس کی طرف گھوما۔

”ہو گیا تمہارا کام۔ اب جاؤ۔“

”مگر میں اسے کھولوں گی کیسے؟“

”اُف۔“ اس نے اکتا کر چند بیٹن دبائے اور کی بورڈ اس کے سامنے کیا۔ ”پاسورڈ ناپ کرو، کھل جائے گا۔“

”چینک یو سوچ کر قتل خاور۔“ خوشی سے کہتے ہوئے اس نے ناپ کیا۔ پھر مسکراہت انجھن میں بدلتی۔

”یہ کیوں نہیں کھل رہا؟“

”کیونکہ تم غلط پاپسورڈ لکھ رہی ہو گی۔ تمہیں یقین ہے کہ یہی پاسورڈ تھا۔“ تخلی سے بولا۔

”کیا مطلب یقین ہے؟ میں پاگل تو نہیں ہوں نا۔ انسادوں پاپسورڈ تھا میرا۔ اُف یہ کیوں نہیں کھل رہا۔“ وہ پریشانی سے بار بار پاپسورڈ ناپ کرنے لگی۔ خاور نے قدرے غصے سے نوکا۔ ”مت کرو، تم فائلز کر پڑ کر دو گی۔“ مگر تیرسری دفعہ جب پاپسورڈ نہ لگاتا تو... فائلز کر پڑ... لکھا آنے لگا۔

”اُف جنین۔“ خاور نے بے زاری سے فلیش کھینچی اور اسے تھماہی۔ ”اب اسے جا کر آگ میں جھوکناوار مجھے کام کرنے دو۔“

”کیا مطلب؟ میں نے ایک ہفتہ لگا کر ان کوڈ اؤن لوڈ کیا ہے، میری فریبند سے شرط لگی ہے، پلیز کر قتل خاور مجھے یہ کھول کر دیں۔“ وہ بدواس ہو گئی تھی۔

”جنین مجھے ایک سیمینار کے لیے سکیویرٹی پلان تیار کرنا ہے، میرے پاس بہت کام ہے، تمہاری ٹین انج حركتوں کے لئے وقت نہیں ہے، میرے پاس۔ جاؤ۔“ رکھائی سے کہہ کر وہ واپس اپنی کرسی پہ آیا۔

”پلیز کر قتل خاور۔“

”جاو جنین!“ وہ سمجھیدگی سے ناپ کر رہا تھا۔ چند لمحے وہ خاموش رہی تو خاور نے نگاہ اٹھائی۔

سامنے کھڑی جنین چہرہ جھکائے رہو رہی تھی۔ موٹے موٹے آنسو گا لوں پڑھک رہے تھے۔ خاور نے کراہ کر کنپتی ملی۔ ”اب کیا ہے؟“

”اگر میری جگد آپ کا بیٹا ہوتا تو مجھے ایسے ہی کرتے؟“ اس نے جھکے چہرے کے ساتھ آنسو گزے اور فلیش پکڑ کر ست روی سے جانے کو مڑی۔ ساتھ ہی بیکی لینے کی بھی آواز آئی۔

خاور نے آنکھیں بچ کر خود کو مجھے ڈھیروں صبر دلایا اور پھر اسے آواز دی۔

”میں صرف **decrypt** کر کے دوں گا، لیکن دوبارہ **encrypt** نہیں کروں گا۔“

وہ ائمہ قدموں بھاگ کر واپس آئی۔ آنسوؤں والے چہرے کے ساتھ مسکرائی۔ ”چج؟“

”لکنی ڈرامہ ہوتم۔“ ناگواری سے بولا۔ حمد نے پلکیں جھپکاتے فلیش اس کو تھماہی۔ پھر اس کی کرسی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ وہ

شدید کوفت زدہ فلیش اڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یہ لمبا کام ہے اور تم اس دوران خاموش رہو گی۔ مجھے زائد باتیں پسند نہیں۔ تمہارے پہلے لفظ پر میں کام روک دوں گا۔“ تیزی

سے ناپ کرتی انگلیاں مسلسل چل رہی تھیں۔ اس کی کرسی کے ساتھ کھڑی حصہ ہتھیلی تھوڑی تلے جائے، دیکھی سے اسے دیکھتی رہی۔

”سوآپ نے... ElGamal کے ذریعے کی کو...“ خاور نے پلٹ کر گھور کر اسے دیکھا، اس نے فوراً اپنے لبوں پر انگلی رکھ لی۔

”اچھا سوری، میں چپ!“ وہ شدید کوفت زدہ ساکمانہ زدینے لگا۔ جنین اب دانتوں سے دبائے، ایکسا انڈسی دیکھ رہی تھی۔ جس کو اتنا ماہراستا،

ملے، وہ نہ سکھے، یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

غور حسن سرپا نیاز ہو تیرا ..... طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترے

اسامدی وی کے سامنے بیٹھا تھا اور ندرت فون یہ بات کر رہی تھیں۔ ابا پسے کمرے میں جلدی سونے جا چکے تھے۔

”اچھاڑ کیہ خالہ۔ اللہ حافظ۔“ ندرت سارہ کی امی سے فون پر بات ختم کر کے سیم کی طرف مڑیں۔ وہ ناخوش لگ رہی تھیں۔ ”فارس

اور زمر کو دیکھو۔ شادی کا فنکشن چھوڑ کر باہر ڈنگز کرنے پلے گئے۔ اب اس کی کیا اٹنگ بنتی ہے؟ اگر وہاں کھانا تھا تو گھر آجائے، فضول پیسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ فارس بھی جہاں یوں کہہ چل پڑتا ہے۔“

سیم نے مڑکران کو سنجیدگی سے دیکھا۔ ”امی کچن میں دیکھیں۔ چولہا بند ہے نا؟ کیونکہ مجھے جلنے کی شدید بوآری ہے۔“

”ہاں ہاں بند ہے۔ دودھ کڑھ گیا تھا تو میں نے اتنا لیا۔“ وہ اپنے ہی خیال میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اٹھ گئیں۔ سیم نے سر جھٹکا اور واپسی وی دیکھنے لگا۔

کافی دیر بعد دروازہ کھلا اور اس نے تھکی تھکی سی زمر کو آتے دیکھا۔ وہ بھی، بے رونق لگ رہی تھی۔ سیدھی نیچے تہہ خانے میں چلی گئی۔ سیم آہستہ سے اس کے پیچھے گیا۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اداں اور اکیلی۔

”آپ اکیلی کیوں آئی ہیں؟ ماموں کہاں ہیں؟“

”تمہارے ماموں کو خود نہیں پہنچتے کہ وہ کہاں ہیں۔“

”آپ آپ سیٹ ہیں؟“ اس نے جھکتے ہوئے پوچھا۔ زمر نے جواب دیے بنابر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ سیم نے اس کے ساتھ زینے پر کچھ رکھا۔ اور پھر اسی واپس چلا گیا۔ زمر نے گردن موڑ کر دیکھا۔

وہ چالکیں کاڑ بھٹھا۔ زمر زخمی سماں کرائی۔

”ضروری نہیں کہ جو چیز ایک دفعہ اچھی لگے، وہ ہمیشہ اچھی لگتی رہے۔ جیسے وہ اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتا، جتنا آج میں نے اسے جان لیا ہے۔“ وہ خود سے بڑا بڑا۔ ”اسے خوب بھی نہیں معلوم کہ اسے زرتا شہ سے اپنی سوچ سے زیادہ محبت تھی اور مجھ سے اپنی سوچ سے بہت کم۔“

اندھیرے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر پیر میں لٹی چالکیں کی مہک کے اندر بھرے ”رہیا۔“ کی خوشبو بھی بس گئی تھی۔

❖❖❖

جنوں میں شوق کی گہرائیوں سے ڈرتا رہا ..... میں اپنی ذات کی سچائیوں سے ڈرتا رہا

زمر یوسف نے زندگی میں پہلی دفعہ فارس کے بارے میں اتنی بڑی بات بالکل درست کہی تھی، لیکن اگر وہ سن لیتا تو تجھ اور جیرت سے تردید کر دیتا۔ وہ جلد ہی گھر آگیا تھا۔ پہلے وقت دیکھا۔ نماز کا خیال آیا پھر ”کچھ دیر بعد“ سوچ کر ناٹ دیا۔۔۔ جیل سے آنے کے بعد وہ بہت کم نماز پڑھ پاتا تھا۔ کمرے میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے جوتے اتنا رے۔ دفعتاں سیل بننے کی آواز آئی۔ زمر شاید با تھروم میں تھی، سیل بیڈ پر ڈا تھا۔ فارس کسی خیال کے تحت اٹھا، اور اس کا موبائل اٹھایا۔ احر شفیع کا پیغام آیا تھا۔ اس کے ابر و بھنپے۔ سیل اٹھایا اور زمر کا پیٹرین ملا کر اسے کھوا۔

”مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے، کال می جب میر امتحن دیکھیں۔“ فارس کے ابر و مزید تن گئے۔ انگوٹھے سے اسکرین اوپر کی۔

پرانے میسجر۔ باہر ملنے کے کسی کام کی طرف اشارہ۔ فیس کی بات۔ احر کافیں کے لئے شکریہ کرنا۔ سب بہم تھا، مگر... تھے ابر و اور بھنپے لوں کے ساتھ اس نے فون واپس اپنی جگہ پر رکھا اور باہر بالکوئی میں آگیا۔

وہاں تاریکی تھی۔ فارس کرسی پر پاؤں لمبے کر کے شیم دراز ہوا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دل و دماغ و دھصوں میں بنتے تھے۔ (وہ اس کو کبھی دھوکہ نہیں دے گی) وہ ایک بے وقوف عورت اور بدترین وکیل سہی، مگر وہ پیٹھے پیچھے حملہ کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ مگر پھر بھی وہ اتنا

بے چین کیوں تھا؟ شک بڑھتا کیوں جا رہا تھا؟) اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تاریکی میں اپنی ساری زندگی کی فلم کی طرح چلنے لگی... فارس غازی نے ایک ایسے گھر میں جنم لیا تھا جہاں ایک ”بیمار“، شخص پہلے سے موجود تھا۔ اس کی ماں جو مرض عشق میں بتلا تھی۔ وہ ایک کاردار تھی۔ علیمہ کاردار۔ بے حد خوبصورت۔ ہاشم جسے نقش اور نویشراواں جیسا مراجع نجھڑ، غرور، غصہ سب کسی کاردار جیسا تھا۔ کسی زمانے میں یہ سب اپنے جو بن پہ ہوتا ہوگا، مگر جس عمر میں اس کے ذہن نے شعور کی منزل پر قدم رکھا، وہ بہت حد تک ڈھنکی تھی۔ اسے ایک شادی شدہ آدمی سے محبت ہوئی تھی۔ گوکہ اور انگریزب کاردار کی بہن تھی، امیر تھی، خوبصورت تھی، لیکن پھر بھی محبوب کو خریدنے والی اُنہوں کے قدموں میں روٹ دیا۔ ہر قیمت پر اسے اپنا ناچاہا، اور اپنا بھی لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کو بھی اس کی ماں سے محبت تھی، مگر یہ متوازن محبت تھی، اس میں ”مرض“، کا عنصر نہ تھا۔

علیمہ کے لئے طمیر نے سب کچھ کیا، اس کو اپنانام دیا، اولادی، مگر ایک الگ گھرنے لے کر دے سکا۔ علیمہ کو الگ گھر کی تھنا بھی نہیں تھی۔ وہ جہاں تھی خوش تھی تب تک جب تک وہ ان ماں بیٹی سے ملنے آتا رہے۔ اور وہ اکثر آتا تھا۔ فارس کے لئے وہ آئیز میل مرد تھا۔ مضبوط اور بہادر۔ ہر بچے کے لئے اس کا باپ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی ایسا جس کو کوئی نہیں ہر اسکتا، جو ہر مسئلے کو حل کر سکتا ہے، ہر پریشانی میں ان کی ڈھال بن سکتا ہے۔

پھر ایک دن آئیز میل کا یہ مجسم بھی خاک بوس ہو گیا۔

اس روز کس چیز کی دعوت کی گئی تھی؟ بالکوئی میں بیٹھے فارس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ہاں، اس کے پاس ہونے کی خوشی میں۔ شاید کوئی پوزیشن لی تھی اس نے۔ اس کا باپ اس کی ماں اور پھر سالہ فارس، وہ بہت سرست اور غیر اس دعوت کا حصہ بننے تھے۔ سب کچھ بہت اچھا تھا۔ تھنگ، رنگ، خوبصورت، روشنیاں۔ دعوت اور انگریزب نے دی تھی۔ کسی زمانے میں ان کو اپنی بہن اور بھانجے سے، بہت لگاؤ ہوتا تھا۔ لیکن پھر... جو اہرات کاردار نے اپنے کی ملازم کے ہاتھوں طمیر غازی کی پہلی بیوی کے گھر پیغام بھجوادیا۔ وہ اپنے دو بچوں ایک بڑی لڑکی اور ایک فارس سے کچھ بڑے لڑکے کے ساتھ اس دعوت پر آدمیکی۔ ندرت اور وارث کی ماں ولایت بیگم۔ وہ سخت گیر، فربہی مائل اور او سط تعلیم یافتہ عورت تھی۔ اگر وہ کسی اوپنی ڈگری کی حامل ہوتی، تب بھی شاید وہ بھی کرتی جو اس نے کیا۔ علیمہ کے سوچ سرکل، اور انگریزب کے رشتے داروں اور دوستوں کے سامنے اس نے چلا چلا کر سب کو بتایا کہ وہ اس دھوکے باز انسان کی پہلی بیوی ہے۔ یہ تو دو بچوں کا باپ ہے، اور اب یہاں کھڑا ہے ایک خوبصورت اور جوان عورت کے ساتھ۔

جو اہرات اپنے بیٹی کے ساتھ سکون سے بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی، اور انگریزب اور طمیر اسے سمجھاتے رہے کہ علیمہ اور انگریزب سب جانتے ہیں کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا، اس نے ناک کیا ہے، گناہ نہیں کیا، مگر سارا مسئلہ یہی تھا کہ ولایت تو نہیں جانتی تھی۔ اسے تو آج علم ہوا تھا۔ اس نے اپنی زبان اور اپنے آنسوؤں سے جو کچھ کہا، وہ کونے میں کھڑے فارس کا ذہن تا عمر اپنے باپ کے لئے داغدار کر گیا۔ یہ نہیں تھا کہ اس کی باپ کے لئے محبت میں کسی آئی یادہ ان سے نفرت کرنے لگا۔ بس اتنا تھا کہ اس نے اپنے باپ کا ماں اور اعتماد کھو دیا۔ اگر ولایت نہیں جانتی تھی، تو وہ بھی نہیں جانتا تھا مگر اس وقت اس کا خیال کسی کو نہیں تھا۔ سب تقریب کی شرمندگی اور اہانت کو تخلیل کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ وہ وہیں اس کو نے میں کھڑا رہا۔ ساکت۔ خوفزدہ۔ بے یقین۔ فکر مند۔ اس کو ایک دم اپنا آپ کمزور اور بے سہارا لگا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا اس کا باپ ولایت بیگم کو صفائی پیش کر رہا تھا، وہ پریشان تھا، اور بے چین بھی۔ وہ سب کچھ لگ رہا تھا سوائے ایک بہادر مرد کے۔ اور یہ سب کرتے ہوئے اس نے علیمہ کاردار کو قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ خوبصورت لڑکی بے بس اور بے سہارا کھڑی تھی۔ طمیر غازی ان دونوں کا سہارا نہیں بن سکا تھا۔ گھر کا سر برہا ایسا نہیں ہوتا۔ گھر کے سر برہا کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خاموشی سے اپنی ماں کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ علیمہ کی ان گوئی کا گنجینہ اسے چھا تھا۔ اس چھین میں بھی احساس تحفظ تھا۔ ان دونوں میں کون کس کو تحفظ

اے رہا تھا؟ دونوں کو نہیں معلوم تھا۔ مگر اس دن سے فارس کو لگنے لگا تھا کہ ہر رشتہ یا تو ختم ہو جاتا ہے یا وہ کو دے جاتا ہے۔ اس نے باپ سے محبت کرنا کہم نہیں کی؛ لیکن یہ احساس ہو گیا کہ وہ ایک ایسا مرد ہے جو کٹھن وقت میں ان ماں بیٹے کے سر کی چھت نہیں بن سکتا۔

طہییر غازی اپنی پہلی بیوی اور خاندان کے ہاتھوں آہستہ آہستہ شکست تسلیم کرتے گئے۔ مہینوں بعد ادھر چکر لگا پاتے۔ یا بالکل نہ آتے۔ فارس کو نہیں معلوم کہ یہ فیصلہ کس نے کیا تھا لیکن ایک دن وہ ان دونوں کو اپنے خاندانی گھر لے ہی آئے۔ یہاں سے زندگی کا ایک نیا اب شروع ہوا تھا۔ نگین فلم جیسے بلیک اینڈ واٹ اور mute ہو گئی تھی۔ ولایت بیگم کے گھر میں وہ دوقیدی عجیب انداز میں لائے گئے تھے۔ نہ ان کے کوئی حقوق تھے زمان تھا۔ ان سے بات کرنا گناہ، ان کی پرداہ کرنا جرم تھا۔ گھر میں واضح لکیر گھنچ گئی تھی۔ ایک طرف ایک کمرے میں وہ ہاؤں میں پلی، مرض عشق میں بنتا، ہر حال میں طہییر کے ساتھ رہنے کی خواہاں لڑکی اپنے کم عمر بیٹے کے ساتھ تھی۔ اور دوسری طرف طہییر کی خاندانی بیوی اور اس کے دو بچے جن کو پورے خاندان کی سپورٹ حاصل تھی۔

اور اس کا کمزور بادپڑ ریا کے دو کناروں کو ملانے کی کوشش میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو اس سب سے نکالنا پاہتا تھا، مگر ایک ان اسے احساس ہوا کہ وہ شخص کبھی اس پانی سے نہیں نکل پائے گا۔ اس دن فارس گھر چوڑ کرو اپس بھاگ آیا تھا۔

نمر کمرے میں آچکھی تھی۔ آہست نے فارس کا ارٹکاڑ توڑ دیا۔ وہ پرانی یادوں کو جھٹک کر موبائل نکال کر بے مقصد بیٹن دبائے گا۔

❖ ❖ ❖

یہ طفل و جوان اس نور کے نور موتی ہیں، اس آگ کی کچی کلیاں ہیں جس میٹھے نور اور کڑوی آگ سے ظلم کی اندر گھر رات میں پھوٹا صبح بغاوت کا گلاش یا الگ بات تھی کہ اس سہہ پہر ہارون عبیدی کی رہائش گاہ کا بزرہ اداں تھا۔ آبدار کی کھڑکی سے دکھائی دیتے لان میں سورخاموش میٹھے تھے بٹھنیں اداسی سے کونے میں دلکی تھیں۔ بلی جانے کیاں گم تھیں۔ اور وہ خود... کپیوڑا سکرین کے سامنے بیٹھی تھی۔ ”سیو سعدی یوسف“ کا صفحہ کھول رکھا تھا اور آنکھوں شدید اداسی لئے اس لڑکے کی سکراتی تصویر دیکھ رہی تھی۔ ذہن کے نہاں خانوں میں ایک منظر سامانہ رہا تھا۔ آبی نے آنکھیں بند کر لیں اور اس پاہ کے جھرنے کو بنہنے دیا، اتنا کہ اس کے پانی میں وہ خود بہتی چل گئی۔

وہ یونورٹی کے کیفے میریا میں بیٹھی تھی۔ وہ سردی دوپہر تھی۔ سرما کی اداسی ہر جگہ گھلی ہوئی تھی۔ وہ سر جھکائے، جرٹل پر چندا، ہم نکات لئے جا رہی تھی۔ جب اس نے وہ آواز سنی۔ کسی کے کسی کومار نے کی آواز۔ چونکہ کرس اٹھایا تو کیفے کے ایک کونے میں جہاں دیواری بی تھی، پتلی گلی کی طرح، وہاں ایک لڑکا دوسرے کو پیٹ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ حیران پریشان سی اٹھتی مار کھانے والے لڑکے کے چہرے پر نظر پڑی۔ وہ لوشیر داں کا ردار تھا۔ آبی نے ناک سکوڑی اور واپس بیٹھ گئی۔ (گذ فارہم!)

اس کے ساتھ والی میز پر ایک قدرے در میانی عمر کی دلی عورت بیٹھی تھی۔ سر بالکل گرائے، چپ، خاموش۔ سکھیوں سے آبی کو نظر آیا، ایک ٹھنگریا لے بالوں والا لڑکا دو کافی سگ لئے ادھر آ کر بیٹھا ہے۔ اس کی آبی کی طرف پشت تھی وہ بھی توجہ دیے بنا کام کرتی رہی۔ البتہ ان کی باتیں کان میں پڑ رہی تھیں۔ وہ لڑکا شاید اس عورت کا استھوڈن تھا اور عورت کو تو وہ نیچر کی حیثیت سے پچانی بھی تھی۔

”یہ تمہارا دوست ہے ناجوہ کھارہا ہے۔“ کیفے میں اس وقت لوگ بہت کم تھے، پھر بھی وہ اٹھ کر اس طرف دوڑے تھے۔ مگر وہ لڑکا پوچھی سے سمجھے بغیر شیر کو مارے جا رہا تھا۔ ”تم بھی اس کی مدد کے لئے جاؤ۔“

”اس کی مدد کے لئے بہت سے لوگ ہیں، ابھی پولیس بلا لیں گے، مگر آپ کی مدد کے لئے اس وقت صرف میں ہی ہوں۔“

آبی خاموشی سے گردن ترچھی کیے تھتی رہی۔

”تم میری کیا مد کر سکو گے؟ تم خود ایک بچہ ہو۔ میرا تیسری اس کیرج ہوا ہے، آج تو ڈاکٹر نے بھی نامیدی کی باتیں کی ہیں۔ میں بھی ماں نہیں بن سکتی۔“ آبی نے یونہی سر اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ لڑکے کی پشت تھی، مگر عورت کا نیم رخ واضح تھا اور وہ سر جھکا ہے، آنسو پوچھ رہی تھی۔

”مسز مرجان، تھوڑے تھل سے میری بات سنیں۔“ وہ زمی سے کہہ رہا تھا۔ آبدار پھر سے کام کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا اب وہ اسے تسلی دے گا۔ علاج کے طریقے یا پھر ایڈاپشن، یا اس حقیقت کو قبول کر کے ثابت سوچ کے ساتھ رہنے کی صحیحت۔

”آپ کا ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے، آپ *(infertile)* (بانجھ) ہیں۔ آپ کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے۔“

لکھتے ہوئے آبی رکی۔ اس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ اسے برا لگا تھا۔ ایسے کہتے ہیں کسی کو بھلا؟ مذکور شاکی نظر وہ سے دیکھا۔

دور کو نے میں لوگ شیر کو اٹھا رہے تھے وہ لڑکا بھاگ پڑا تھا۔

”آپ بانجھ کہلانے پاتی آپ سیٹ کیوں ہیں؟“

”سعدی!“ مسز مرجان نے صرف گلہ آمیز نظر وہ سے اسے دیکھا۔

”آپ قرآن پڑھتی ہیں، مسز مرجان؟“

(اچھا ب دا براہم علیہ السلام یا ذکر یا علیہ السلام والا واقعہ دہرائے گا۔) آبی نے دوبارہ سے کام کی طرف متوجہ ہوتے سوچا۔

”بھی کبھی۔“

”بھی کبھی کبھی اس دنیا کے کروڑوں لوگوں کا مسئلہ ہے۔ خیر آپ نے اس میں ذکر یا علیہ السلام والا واقعی تو پڑھا ہوگا، انہوں نے اللہ سے دعا کی کہاں کو اکیلانہ چھوڑیں تو...“

”تو اللہ نے انہیں بھی عطا کیے مگر وہ پیغامبر تھے سعدی۔“

سعدی نے گھری سانس لی۔ ”میم، خوبصورت لڑکوں کی بات کا نہیں کرتے۔ اس لئے تھل سے مجھے سنیں۔ جب ذکر یا علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ نے ان کو ایک دم سے اولاد نہیں دے دی، بلکہ پہلے بشارت دی، کہ ان کے ہاں بیٹا ہوگا۔ مگر جب یہ بشارت دی تو ذکر یا علیہ السلام حیرت سے پوچھنے لگے، کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا، ہم نے اس سے پہلے آپ کو بھی تو تخلیق کیا تھا، اور آپ بھی تو کچھ نہیں تھے۔ آپ مجھے بتائیں مسز مرجان، کیا آپ نے غور کیا اس پر؟“

”دیکھو سعدی، میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ ذکر یا علیہ السلام کو یہ بتارہ ہے تھے کہ آپ کچھ بھی نہ تھے یعنی ہر انسان پانی کا ایک قطرہ ہوتا ہے اور یہ تنا امیز نگ ہے کہ وہ بچھنے کا انسان بن جاتا ہے، ہم سب کی پیدائش امیز نگ ہے، لیکن میرا کیس مختلف ہے۔“

”نہیں... یہیں پہ ہم دونوں مختلف ہیں، کیونکہ قرآن پڑھنے اور قرآن پغور و فکر کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ اب اسی آیت کو دیکھ لیں۔ اللہ نے ذکر یا کو خاطب کیا کہ ”آپ بھی تو کچھ نہ تھے“ آپ نے اس سے مراد ہر انسان کی پیدائش لی، لیکن میرے خیال میں اس کا ایک اور مطلب بھی ہے۔“

آبی بے اختیار گرد موز کر دیکھنے لگی۔ مسز مرجان نے بھی قدرے متذبذب سے اس لڑکے کو دیکھا۔

”میرے خیال میں مسز مرجان، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم ”ہر انسان“ کی پیدائش نہیں صرف ”ذکر یا کی پیدائش“ پغور کریں۔“

”مطلوب؟“

”ذکر یا بنی اسرائیل تھے۔ اور بنی اسرائیل، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کی اولاد ہوتے ہیں۔ آپ بتائیں، یعقوب کس کے بیٹے تھے؟“

”الحق علیہ السلام کے...“

”اور الحق کس کے بیٹے تھے؟“

”ابراہیم علیہ السلام کے!“

”ابراہیم اور سارہ کے، علیہما السلام!“ اس نے اضافہ کیا۔ پشت ہونے کے باوجود آپ کو لگ تھا وہ مسکرا یا ہے۔

”آپ کو پتہ ہے بنی اسرائیل اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوموں میں سے ایک ہے۔ ہم پڑھان ہوں یا گورے لوگ، فلسطینی، یا ملک اسرائیل کے یہودی، ہم بنی اسرائیل ہیں۔ اسی لئے پڑھانوں اور گروں جن کو ہم ”انگریز“ کہتے ہیں، ان کی شکلیں ملتی ہیں، کیونکہ ہم سب پیچھے سے اسرائیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ذکر یا بھی اسرائیل تھے۔ میں بھی اسرائیل ہوں۔ اور ہم سب کی ماں تھیں۔ حضرت سارہ۔ آپ کو معلوم ہے سارہ کون تھیں؟“

”دنیا کی سب سے خوبصورت خاتون تھیں وہ۔“ مسز مرجان کو پیدا ہوا۔

”بالکل، وہ دنیا کی سب سے خوبصورت خاتون تھیں، اور وہ بانجھ تھیں۔“

ایک لمح کے لئے آبدار کا سانس رک گیا۔ ارد گرد ہر شے ختم گئی۔ مسز مرجان بھی بالکل خبر کر سعدی کو دیکھ رہی تھیں۔

”تو اللہ تعالیٰ نے ذکر یا علیہ السلام سے جو فرمایا، شاید اس کا مطلب یہ بھی تھا مسز مرجان کہ آپ اپنی پیدائش پر غور کریں ذکر یا۔ آپ بھی تو ایک بانجھ عورت کی اولاد ہیں۔ آج دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اسی بانجھ عورت کی اولاد ہے۔ اگر سارہ کے اولاد ہو سکتے ہے، تو دنیا کے ہر مرد اور عورت کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے۔“ مسز مرجان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”مگر وہ... وہ پیغامبر کی زوج تھیں۔ اس لئے ان کی اولاد ہوئی۔“

”نہیں۔ ان کی اولاد اس لئے ہوئی کیونکہ انہوں نے دعا کی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی، جب ذکر یا علیہ السلام نے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ اللہ تعالیٰ دعاء نہیں کرتے، لیکن اس میں یقین ہونا چاہیے۔ آپ کسی پیر، کسی قبر، کسی مزار، کسی تعمیز کو سیلہ بنا میں گی تو اللہ آپ کو انہی کے حوالے کر دے گا۔ آپ ایسا مامت کیجئے گا۔ اگر آپ تجدہ نہیں پڑھیں کسی دعا کے لئے، تو اس کا مطلب ہے آپ اس کو پانے کے لئے خود بھی سیر کیں نہیں ہیں۔ شدید پریشانی کے حالات میں دعا میں بھی شدید مانگنی ہوتی ہیں۔ یہ پانچ وقت کی نماز کے بعد روٹین کی طرح دعا مانگنا کافی نہیں ہوتا۔ حقی بڑی آزمائش ہے، اتنا زیادہ اپنی دعا کو بڑھائیں۔ یہ وہی اللہ ہے جو حضرت سارہ کا اللہ تھا۔ کیا آپ کی دعا بھی ویسی ہے جیسی سارہ کے شوہر کی تھی؟“

مسز مرجان کی آنکھوں سے آنسو شپ پچ گر ہے تھے۔ آبدار بالکل خبر کر سن رہی تھی۔

”مگر سعدی... یہ میری آزمائش ہے یا گناہوں کی سزا؟ یہ فرق کیسے معلوم کروں؟“

”معلوم کر کے کیا کریں گی؟ سزا ہوئی تو معافی مانگیں گی، آزمائش ہوئی تو دعا کریں گی کہ اللہ اس میں کامیاب کرے؟ مسز مرجان، مجھ سے پوچھیں تو یہ معلوم کرنا لا یعنی ہے۔ اس بحث کو چھوڑ دیں اور یہ دونوں کام کرتی رہیں۔ آپ کو پتہ ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر آزمائش کیوں ڈالتا ہے؟“

بھیکے چہرے کے ساتھ مسز مرجان نے فنی میں سر ہلا�ا۔

”بعض دفعہ کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کوئی او خدا درجہ دے دیتا ہے، مگر اس کے اعمال اتنے نہیں ہوتے کہ وہ اس درجے تک پہنچ جائے۔“

یعنی وہ اچھا آدمی ہوتا ہے مگر بہت زیادہ نیکیاں نہیں کر پا رہا ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ نا انصافی تو نہیں کر سکتا نا، سو اس شخص کو اس درجے تک پہنچا لے کے لئے... سمجھیں پہلی سیر ہی پہ کھڑے شخص کو دویں سیر ہی تک پہنچانے کے لئے اللہ اس پر پریشانیاں ڈالتا ہے، تاکہ اس کے گناہ جائز ہے ظاہر ہے گناہ کم ہوں گے تو وہ اپر امتحان جائے گا۔ جس دن وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے اس کی آزمائش کھول دی جاتی ہے۔ یہ میری خواہ گھڑی بات نہیں ہے، یہ صحیح حدیث کا مفہوم ہے۔“

”مطلوب کر... یہ سب ہمیں کسی مقام تک پہنچانے کے لئے ہوتا ہے؟“

”جی۔ اب یا آپ پہ ہے کہ آپ اس مقام تک کتنی جلدی پہنچتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کریں، تو جلدی زینے عبور کریں گی حدیث میں آتا ہے کہ انسان کو کوئی چیز ملنے والی ہوتی ہے کہ اس کے گناہ آڑے آجائے ہیں۔ اس لئے گناہوں سے بچیں، اور زیادہ سے زیادہ اچھے اعمال کریں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گشادگی کا انتظار بہترین عبادت ہے۔ اس لئے اپنی کشادگی کا انتظار کیجئے۔“ اولادی، اولاد کی معدودی، یا پیاری، یا اولاد کا ہو کر مر جانا، یہ سب کوئی curse نہیں ہے۔ یہ تو انیاء کی آزمائش تھی۔ یہ بڑے لوگوں ل آزمائش ہوتی ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں۔ ہو سکتا ہے روزی قیامت آپ کو کشادگی کے انتظار میں گزارے یہ ماہ و سال بہت قیمتی لگیں کیونکہ آنے والے وقت آپ کو وہ دے جائے گا، جو اور کوئی نہیں دے سکتا۔ میں پھر کہتا ہوں یہ curse نہیں ہے کیونکہ اللہ ہمیشہ ان لوگوں کی سایہ پر ہو گا، من اور آذمانے کے لئے اتنے بڑے بڑے دکھ دیتا ہے۔“

آبدار عبید کو ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا پھر بھی اس کو لگا، اس کی آنکھ سے آنسو گرا تھا۔ کوئی اتنا زم اتنا پیارا کیسے بول سکتا ہے؟ اس نے ایک دفعہ پھر گھوم کر اس لڑکے کو دیکھنا چاہا۔ اسکی پشت تھی مگر سامنے گلاس ڈور فرنچ میں اس کا چہرہ منعکس ہو رہا تھا۔ چھوٹے گھنگھر یا لے ہال، خوبصورت چہرہ، صاف رنگت، بھوری آنکھیں۔

”سعدی۔ تم نے میری امید پھر سے زندہ کر دی ہے۔ میں اس احسان کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکوں گی۔“ مسز مرجان آنسو گز ہے ہوئے اسے ممنویت سے دیکھتی کہہ رہی تھی۔ ”کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی ہوں؟“

”بالکل۔“ وہ ذرا جوش سے آگے کو ہوا۔ ”اگر کلاس میں کبھی کوئی ایسا مقابلہ ہو جس میں سب سے پہنچ سماں کے منتخب کیے جانا ہو،“ وعدہ کریں، آپ مجھے وہ دیں گی!“ اور وہ روتے روتے رو تے ہنس دی تھیں...“

اور اب... اتنے سال بعد آبدار عبید اداسی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ میز پر اس کا سفری یہیک تیار کر رکھا تھا۔ وہ قیدی تھا یا صرف مہمان یہ فیصلہ اس سفر کے بعد ہی کرنا تھا۔ لیکن اس فیصلے کے بعد وہ کیا کرے گی؟ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ قسمت بھی کیسے عجیب انداز میں اس سے ملانے جا رہی تھی۔



وہ اپنے زغم میں تھا، بے خبر رہا مجھ سے... اسے گماں بھی نہیں، میں نہیں رہا اس کا اس صحیح مطلع صاف تھا۔ سورج بھی مکمل روشن تھا۔ بڑے ابا کے آبائی قبصے میں ان کے چھیرے بھائی کی وفات کی اطلاع نہ رئے قریب آئی تھی۔ ندرت فوراً سے چلنے کی تیاری کپڑے لگیں۔ ابا بہت آزدہ تھے، مگر ان کا جانا بھی ضروری تھا۔ سونا شستے کے بعد ندرت ابا اور صداقت سفر پر کل پڑے۔ اور دو تین دن کے لئے ریشور افت بند کرنے کا کہہ دیا۔

وہ گئے تو گھر میں خواہ مخواہ کا سنا تا چھا گیا۔ سیم اسکول جانے سے انکار کر کے سونے چلا گیا۔ فارس اور زمر کی اس رات سے بات چیت بند تھی (گوک فارس کے لئے یہ نئی بات نہیں تھی، سودہ نارمل تھا، مگر زمر کا دل بری طرح نو تھا کہ وہ اس کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی)۔

صحیح باتی ہو کر ایک روشن دوپہر میں ڈھلی تو ایک سر کاری دفاتر کی عمارت کے اندر ایک آفس میں فارس غازی بیٹھا تھا، اور مسلسل کان

ہستے تیدی جن کے ہاتھ پیر زنجروں میں تھے، وہ ایک دم سے سامنے آئے تھے ان کے چہرے... اف... حم خوف سے جمگی، مگر زمر نے کہیں سے کھینچ کر اسے سائیڈ پپ کیا۔ وہ دونوں ہستے ہوئے انہیں دیکھتے آگے بڑھ گئے۔ حین کے ہاتھ کا پنپنے لگے۔ وہ بمشکل دو قدم مزید چل پائی۔

”مجھے گھر جانا ہے ناپس!“ وہ ہمت ہار پکی تھی۔ زمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”میں نے کہا تھا تم لوگوں کو نہیں آنا چاہیے۔“

”میں تو ٹھیک ہوں۔“ سیم واقعی ٹھیک نظر آرہا تھا مگر وہ رودینے کے قریب تھی۔

”آپ مجھے والپس چھوڑ کر آئیں۔ ابھی اسی وقت۔“ اس نے نام آنکھوں سے زمر کا ہاتھ کپڑا لیا۔ وہ گھری سانس لے کر واپس مزگی۔ واپسی پر کورٹ روز کے کھلے دروازے ان کے باہمیں ہاتھ تھے۔ حم نے دھشت اور خوف کے احساس کے باوجود دگا ہے بگا ہے اندر جھانکا۔ ایک سو دس دفعہ لعنت ہوا مرکی ڈراموں پر۔ وہ کورٹ روز مزاں بالکل بھی امریکی ڈراموں جیسے نہ تھے۔ ہاں بھارتی فلموں سے تھوڑی بہت مشاہدہ رکھتے تھے، مگر بھارتی فلموں والے کورٹ روز مانگے میلے اور لوگوں سے کچھ کچھ ہر ہوتے تھے۔ یہ صاف سترے تھے۔ لکڑی کا کام بھی سنہر اچک دار تھا۔ مگر ڈراموں فلموں کے برعکس ان میں وہ کرسیوں کی لمبی لمبی دو قطاریں نہیں تھیں۔ بلکہ کریساں تو صرف دو تین پڑی تھیں۔ باقی اور نجح کا نجح اور دونوں طرف کٹھرے بنے تھے۔ شور ہی شور۔ وہ ڈراموں والی پر تقدس خاموشی ناپید تھی۔

کار میں والپس بیٹھتے ہوئے اس نے زمر سے کہا تھا۔ ”میں بالکل بالکل بھی وکیل نہیں بننا چاہتی۔“ اور غفلی سے اندر بیٹھ کر دروازے لاک کر دیے۔ سیم کو بھی اندر بھالیا۔ وہ ناخوش تھا مگر اسے اپنی بہن کا خیال رکھنے کے لیے وہاں بیٹھنا تھا کیونکہ وہ گھر کا بڑا امر تھا۔

زمر بار بار گھری دیکھتے جب والپس آئی تو مجریت کے کمرے کے باہر اسے احر کھڑا نظر آیا تھا۔ اس نے بھی زمر کو دیکھ لیا۔ سوتیزی سے قریب آیا۔ ”مزز زمر۔“ وہ فکر مند لگ رہا تھا۔ ”میں نے بہت کوشش کی مگر آئی ایم سوری میں پرچہ کتنے سے نہیں روک سکا۔ ہوا کیا ہے؟“

”اس کو پھر سے فریم کیا گیا ہے۔ مژد رکیس ہے اور اس کے پاس alibi بھی نہیں ہے۔“

”اوہ ہو۔“ وہ ادھر ادھر متلاشی نظر وں سے دیکھ رہا تھا۔ زمر کو معلوم تھا کہ اسے کس کا انتظار ہے۔

”احمر، آپ کے یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”وہ میرا دوست ہے۔“ زمر نے گھری سانس لی۔

”فی الحال وہ ایسا نہیں سمجھتا۔“ احر نے ابر و تجوب سے سمجھنے۔ وہ جواباً جتنے مختصر الفاظ استعمال کر سکتی تھی، کر کے ساری کھانا ڈالی۔ احر کی فکر مندی، پریشانی میں بد لی۔

”بی، میں نے بھی کہا تھا ہوٹ والوں سے کہ میں جنس ڈیپارٹمنٹ سے ہوں اور کیا کہتا؟ اس روز وہ ہاروں صاحب کی رہائش گاہ پر آیا تھا تو اس نے مجھ سے سوال جواب کیے تھے، میں نے محتاط جواب دیے، جھوٹ نہیں بولا۔“

”اوہ ہاں آپ نے مجھے نیکست بھیجا تھا کہ آپ کو کال کروں؟ گیس واث، وہ نیکست میں نے صبح دیکھا، کیونکہ وہ مجھ سے پہلے فارس کھول چکا تھا۔“ اور اس کی ٹوٹ نہ چاہتے ہوئے بھی ملامتی ہو گئی۔ ”ایسی کیا خاص بات تھی؟“

احمر ایک دم شرمندہ ہو گیا تھا۔ ”وہ تو... کچھ بھی نہیں تھا۔“ زراٹھر کر بتانے لگا۔ ”میں شادی کر رہا ہوں، فاطمہ سے، کیمپن ٹیم میں میرے ساتھ کام کرتی ہے، میں اسے مکنی کا کیا تھدوں بھی پوچھنا چاہتا تھا، پلیز برامت منا یے گا، نہ میں آپ کا کوئی کوئی ہوں نہ دوست،“ مگر آپ سے زیادہ میرے حلقة احباب میں کوئی sophisticated نہیں ہے صرف اس لئے۔ میں غالی کو وضاحت دے دوں گا۔“

زمر بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ ”خیر، مبارک ہو آپ کو۔“ مگر اس وقت، آپ کو دیکھ کر وہ کچھ الٹا سیدھا بول دے گا، آپ ابھی چلے جائیں، جب وہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو میں آپ کی ملاقات کروادوں گی۔“ اور وہ متال، متذبذب سالوٹ گیا۔

زمر کافی دیر اس راہداری میں کھڑی رہی۔ لوگ اسی طرح آجاتے تھے۔ وہ دیران ادا ناظروں سے سب دیکھتی رہی۔ ذہن بار بار اس کینڈل لائٹ ڈریز میں کی گئی اس کی سلگتی با توں پہ بھٹک جاتا، مگر نہیں، ابھی یہ سب نہیں سوچنا تھا۔

دفتار وہ سیدھی ہوئی۔ پولیس الہکار اسے لارہے تھے۔ رات والی جیزرا درگرے شرٹ میں ملبوس تھا۔ ایک رات میں ہی شیو برہی لگتی تھی۔ زمر کو دیکھ کر اس کی سنبھالی آنکھیں سکریں، ان میں چھپن اتری، مگر منہ میں کچھ چباتا آگے بڑھتا رہا۔ وہ ہلاکا سماں سکرا تی، مگر اگلے ہی پل مسکرا ہٹ غائب ہوئی۔ فارس کے قریب سیاہ کوت اور نائی میں ملبوس خلیجی صاحب چلتے آرہے تھے۔

”ڈونٹ یوڈیر!“ زمر کے سر پر لگی تلوہ پہ بھی۔ وہ قریب آئے تو وہ بظاہر مسکرا کر خلیجی صاحب کی طرف گھومی۔

”آپ یہاں خیریت سے بھی صاحب؟“

”یہ میرے وکیل ہیں۔“ وہ جیھتی آنکھیں زمر پہ جاتے بولا۔ زمر نے سلگتی ناظروں سے اسے دیکھا مگر ہنوز مسکراتے ہوئے بولی۔

”آخری اطلاعات تک تمہاری وکیل میں تھی۔“

خلیجی صاحب فون پہ بات کر رہے تھے سر کے اشارے سے اسے سلام کیا۔ فارس چند قدم چل کر اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا۔ جتنی اجازت اس کی زنجیر اس کو دیتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”زمر بی بی..... مجھے آپ سے کسی اچھائی کی امید نہیں ہے۔“ دبی سرگوشی میں بولا۔ وہ اس سے لمبا تھا، زمر کو چہرہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنا پڑ رہا تھا۔

”ان سے ہے؟“

”وہ میرے ساتھ وفادار ہیں۔“ چباچبا کر الفاظ ادا کیے۔

”اچھا!“ زمر دانت پہ دانت جما کر مسکرا تی، پھر سر کو خم دیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ خلیجی صاحب فون بند کر چکے تھے، اب اس سے حال احوال دریافت کرنے لگے۔ وہ جواب دیتی چند قدم آگے چلی آئی۔ پھر مزید چند قدم۔ یہاں تک کہ وہ دونوں فارس کی حد سماut سے دور ہو گئے۔ وہ تیکھی ناظروں سے ان دونوں کو بات کرتے دیکھنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ واپس اس کی طرف آئے۔ خلیجی صاحب نے خوشنگوار انداز میں زمر کو دیکھتے فارس کو مناٹب کیا۔ ”تم فکرنا کرنا، زمر اچھے سے سب ہینڈل کر لیں گی۔ میں پھر اپنے آفس کی طرف جاتا ہوں۔“ فارس کا شانہ تھکا اور زمر کو گرم جوشی سے الوداع کہہ کر وہ آگے چلتے گئے۔ زمر نے مسکرا کر فارس کو دیکھا۔ ”وفادار ہاں؟“

”کیا کہا ہے آپ نے ان سے؟“ وہ خلک انداز میں بولا تھا۔ ”بلکہ کس چیز سے بلیک میل کیا ہے ان کو؟ ایک یہی کام تو آتا ہے آپ کو!“

”جب تم چار سال میل میں لوگوں سے جھگڑ جھگڑ کر اپنے لئے دشمن بنا رہے تھے نا، تو میں ایک سیاسی عہدے پر کام کر رہی تھی۔ یہاں لوگ میری بات ٹالا نہیں کرتے۔“ وہ بھی اتنی ہی تلخی سے بولی تھی۔ ”ہاں میں نے تم سے چند جھوٹ بولے تھے، احر کو بھی ہاڑ کیا تھا، لیکن تمہارے خلاف نہیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو تم سمجھ رہے ہو۔ دیکھو! ابھی وقت کم ہے، تمہارا نام ابھی پکارا جائے گا۔ اس وقت کو لڑنے میں ضائع مبت کرو۔ دیسے بھی زیادہ سے زیادہ تین ہفتے بعد ٹرائل شروع ہو جائے گا، تم ان تین ہفتوں میں جتنے وکیل ڈھونڈ سکتے ہو، ڈھونڈ لو، میں کسی ایک کو بھی تمہاری طرف نہیں رہنے دوں گی، اس لئے ان تین ہفتوں کے لئے مجھے اپنا وکیل رہنے دو۔ جسی دن ٹرائل شروع ہو، اس دن تم فیصلہ کر لیتا۔ مجھے فائز کر دینا، میں چلی جاؤں گی، لیکن اس سے پہلے نہیں۔ اوکے!“ غصے اور سمجھانے والے ملے جلے انداز میں وہ بول بول کر چپ ہوئی۔ تو وہ بھی چند لمحے سوچتا رہا۔ ”آپ کو اگر میرا وکیل رہنا ہے تو ایک کام کریں۔“

زمر گھری سانس بھر کر رہ گئی۔ ”کہو!

”شزا ملک... وہ لڑکی... اے ایس پی کی کی کزن اور سالی... وہ دونوں پہلے کو ما سے نکل آئی ہے، سو آپ نے اس امر کو قینی بناتا ہے کہ وہ نیاز بیگ کو جیل سے نکلنے نہ دے۔ کیسے! یہ میرا درود سرنہیں ہے!“ حکم صادر کر کے وہ پلت گیا۔ زمر اسے دیکھ کر رہ گئی۔ راہداری میں بھانت بیویاں ہنوز گونج رہی تھیں۔

❖❖❖

جسے گئے ہوئے خود سے ایک زمانہ ہوا ..... وہ اب بھی تم میں بھکلتا ہے اب بھی آجائے گالف کلب کے سبزہ زاروں پر زمردی قایلین ساچھا لگتا تھا۔ فضا میں آتے سرما کی مہک تھی، گھاس بھی گویا الم بالیٹا یہ زم گرم دھوپ سینک رہا تھا۔ وہ دونوں گھاس پر آگے چلتے جا رہے تھے۔ ہارون نے ٹی شرت کے اوپر پی کیپ اوڑھ رکھی تھی، اور جواہرات نے ٹھنڈوں تک آتا سادہ کرتا پہن رکھا تھا، اور بال جوڑے میں بندھے تھے۔ اتنے casual ہی میں بھی وہ نازک اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ پہلے ماہ اس نے آنکھوں کی کامیک سرجی (آئی لڈلف) کروائی تھی جس سے اس کی آنکھیں زیادہ بڑی اور گھری لگنے لگی تھیں۔

”میں تمہیں آج بھی پہلے کی طرح گالف میں ہر اسکتا ہوں۔“ مسکرا کر اس کی طرف چہرہ کر کے بولے۔

”برسون پہلے میں ایک بے دوقافل کی تھی، جو تمہاری باتوں میں آ کر تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔“ وہ بھی تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ہارون ٹھہر گئے۔ اس کوقد رے افسوس سے دیکھا۔

”یہ رشتہ ختم کرنے میں تم نے پہلی کی تھی۔“

”اتنے دن بعد تم نے بالآخر یہ ذکر چھیڑی دیا ہے تو اپنی تصحیح کر لو ہارون۔“ وہ سینے پر بازو لپیٹنے اس کے سامنے آئی اور سرد مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ہمارے درمیان کبھی کوئی رشتہ نہیں تھا، تم اور میں اچھے دوست تھے، بلکہ دوستوں سے بڑھ کر تھے پھر ہم نے شادی کا فیصلہ کیا تھا، اور ہمارے خاندان کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔“

”اور پھر تم نے مجھے ٹھکرایا کہ اونگزیب سے شادی کی تھی۔“

”یہ وہ چو اس تھی جس پر میں پچھلے ارتیں سال سے پچھتاری ہوں ہارون، لیکن یہ مت بھولنا بھی کہ میں نے تمہیں اس لئے ٹھکرایا تھا کیونکہ تم اپنی ایرانی کزن کے ساتھ انوالوں تھے۔ اور تم جانتے ہو کہ میں تمہاری بے وفائی سے واقف ہو گئی تھی، پھر بھی تم کتنے دھڑ لے سے میری آنکھوں میں دیکھ کر مجھ سے شکوہ کر لیتے ہو کہ میں نے تمہیں ٹھکرایا تھا۔“ ملکہ کی اٹھی گردن، اور مسکراہٹ ہنوز برقرار تھی۔ ہارون نے گھری سانس لی۔

”تمہیں اتنی پرانی باتیں یاد ہیں، اور ونگزیب کی موت کے بعد ان دو سالوں میں...“

”ایک سال دس ماہ میں...“ اس نے میکا کمی انداز میں تصحیح کی مگر وہ کہہ رہے تھے۔ ”لکن دفعہ میں نے چاہا کہ ہم کم از کم دوستی کے رشتے میں پھر سے نسلک ہو جائیں لیکن تم ہر دفعہ پرانی باتوں کو کیوں درمیان میں لے آتی ہو!

”ہارون!“ وہ ایک قدم آگے ہوئی اور شیرنی جیسی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالیں۔

”تم میرے صرف دوست نہیں بننا چاہتے میں جانتی ہوں، تمہارے پاس ہم سے زیادہ دولت ہے لیکن ہمارے پاس تم سے زیادہ طاقت ہے، ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے، اس لئے ہم ساتھ کام کر رہے ہیں، لیکن میرا اعتماد تم کئی برس پہلے کو ٹکے تھے۔ اگر تمہیں دوبارہ بے مجھ سے کوئی تعلق استوار کرنا ہے تو اس کے لئے تمہیں میرا اعتماد چاہیے، اور اعتماد میں بھیک میں بھی نہیں دیتی۔ اسے تمہیں کہانا ہو گا۔“ اور پھر دلکشی سے مسکرائی۔ ”سمجھت کرم کھو یا ہوا اعتماد کمالو۔“ پھر سر کے خم سے اشارہ کیا۔ ملازم فوراً حاضر ہوا۔ تا بعد اداری سے

کٹ لئے آگئے۔ ہارون صرف مسکرائے اور کھیل کی طرف متوج ہوئے۔ دور دور تک پھیلے سبزے کا ہر تنکا دلچسپی سے یہ کھیل دیکھنے کا منتظر تھا۔

وہ دل کہ اب ہے لہو تھوکنا ہنر جس کا ..... وہ کم سے کم ابھی زندہ ہے، اب بھی آجائے۔ انہیں تک واپس جاتے ہوئے زمران دونوں کو بتا رہی تھی۔ ”پانچ دن کا جسمانی ریمانڈ مل گیا ہے پولیس کو۔ چودہ دن تک وہ اس میں تو سیچ کرواتے رہیں گے، پھر فارس کو جوڑ پیش کر دیا جائے گا، یعنی کہ：“ ان کے پوچھنے سے پہلے بتانے لگی۔ ”اس کو جیل بھج دیا جائے گا، اور باقاعدہ مقدمہ شروع ہوگا۔ پہلے پر ایکیو ٹرائپنے دلائیں دے گا، پھر ہم دیں گے، پھر پر ایکیو ٹرائپنے گواہ پیش کرے گا، پھر ہم کریں گے۔ اس کارروائی میں عرصہ لگ جاتا ہے، لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ نج مقدمے کے دوران کسی بھی دن کسی بھی وجہ سے ملزم کو بری کر سکتا ہے۔ بے گناہ غائب کرنا، گناہ گارثابت کرنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ”دونوں جواب میں پکھنہ بولے۔

مگر گھر کے دروازے پہنچ کر حنہ کے منہ سے ”اوہ“ نکلا اور زمر کا ایک دم دل بیٹھ گیا۔ ندرت کی کار جس میں صداقت ان کوڈ رایہ کر کے گاؤں لے گیا تھا وہ وہاں کھڑی تھی۔ ایک دریا کے پار ایک اور دریا کا سامنا! زمر نے لاوٹخ کا دروازہ ھکولا تو سامنے بڑے ابا گلر مند بیٹھے تھے اور ندرت پریشان کی نظر آرہی تھیں۔ زمر نے فون بند کر کھا تھا اور حنہ اپنافون گھر چھوڑ گئی تھی۔ یقیناً انہوں نے کئی کالزکی ہوں گی۔ ”زمر!“ ندرت گھننوں پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے اٹھیں۔ ”فارس کو کیوں لے کر گئی ہے پولیس؟ جیسے ہی جواہرات نے بتایا، ہم فوراً آگئے۔“

”یا اللہ یہ ممزوج جواہرات بھی نا!“ ہنین غصے سے بڑ بڑاتی آگے آئی اور ندرت کو شانوں سے تھام کرو اپس بٹھایا۔ ”زمر! تماڈ کیا ہو رہا ہے یہ سب؟“ اب ابھی بے جیلن تھے۔ وہ تھکی تھکی سی سامنے بیٹھی اور تفصیل، تسلی اور امید سے سب بتانے لگی۔ ندرت بے ساختہ روئے گئی تھیں۔ ”اس ملک میں کوئی قانون، کوئی دستور نہیں ہے کیا؟ جب دیکھو میرے بھائی کو مقدمات میں پھنساتے رہتے ہیں۔“

اللہ غارت کرے ان کو۔“

”آمین!“ حنہ بڑ بڑا لی تھی۔ اس آمین کہنے میں بھی دل ٹوٹ کر سوبار جڑا تھا۔

ندرت کو حنہ اور کرے میں لے گئی۔ باقی سب بھی بکھر چکے اور وہ دونوں اکیلے رہ گئے، تو اب انہی سے اس سے پوچھا تھا۔ ”کیا وہ باہر آ جائے گا؟“

”مجھے دل قنی نہیں پتا ابا!“ وہ سیر ہمیں کی طرف بڑھ گئی۔ اب غمگین سے بیٹھے اس کے لہجے پغور کرتے رہ گئے۔

دلیلوں سے دوا کا کام لینا سخت مشکل ہے ..... مگر اس غم کی خاطر یہ ہنر بھی سیکھنا ہو گا کوبلوکی پر نہ فضاؤں میں لپٹے ہوئیں کی پیسمند میں اٹھا ٹھنچ جاری تھی۔ پھر دیدار سعدی کے کمرے کی دیوار پاپیل سی ڈی ڈی ڈی لگا رہے تھے۔ ڈی ڈی ڈی کا ایک چھوٹا کارٹن، پھل، چاکلیں، خشک میوے، جوس کے ڈبے، نئے کپڑے، تازہ ریلیز ہوئے بیسٹ سلریز۔ سعدی غیر دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا جو وہ لوگ لا لا کر اس کے کمرے میں رکھ رہے تھے۔ وہ سیاہ جبشی صورتِ فصیح ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ ”ان احسانات کی وجہ؟“ اس نے سنجیدگی سے جبشی صورت کو مخاطب کیا۔ اس نے ایک اچھتی نگاہ سعدی پر ڈالی۔ ”یہ ہارون عبدی کی طرف سے ہے، وہ سب جو تم نے ما نگا تھا۔“

”جس سے مانگا تھا، وہی دیتا تو اچھا تھا۔“ وہ بے زار سا اٹھ کر لاوچ نہ کمرے میں آگیا۔ کسی نے اسے نہیں روکا۔ وہ اس کپڑا ڈنڈل ملا پھر سکتا تھا، اجازت مل گئی تھی۔ وہ ابھی وہاں بیٹھا ہی تھا کہ یکدم فتح اس کے کمرے سے باہر نکلا، اور کنگ فلم میں لپٹی چیزیں میز پر پلیں۔ سعدی مخدود ہو گیا۔ اندر اس کالائیز کا نٹا، چند کیل وغیرہ تھے۔ نگاہیں اٹھا کر فتح کو دیکھا۔

”سنومائیکل اسکوفیلڈ، زیادہ اور اسارت بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ پھر گھری سانس لے کر الجہ نرم کیا۔ ”یہاں سے نکنا ہے تو ان صاحب کے لئے کام کرو۔ ایک ڈیڑھ سال کی بات ہے، پھر وہ تمہیں آزاد کر دیں گے۔“

”ارے واہ۔ یہ سن کر میری آنکھیں بھرا میں!“ وہ طرف سے بولا تھا۔ فتح اسے گھوڑتا ہوا پلٹ گیا۔ میری ساتھ آ کر پیٹھی اور جب وہ اس نتھارہ گئے تو ان نواز شات کی بابت دھمی سرگوشی میں بتا نے لگی۔

”یہ سب مس آبدار نے بھجوایا ہے۔“ پہلے کی طرح وہ اب سخت نہیں رہی تھی، شاید لمبی قید سے تنگ آ گئی تھی۔ ”مگر اس لڑکی سے بچ ا رہنا۔“

”ایک اور گلڈ کاپ!“ اس نے شانے اچکائے۔

”نہیں سعدی!“ وہ اس کو سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ ”وہ بڑی نہیں ہے، مگر وہ بہت چالاک ہے۔ دراصل وہ خطرناک ہے۔ دیکھو اس لے ہاپ کو سمز جو اہرات نے شادی کے لئے ٹھکرایا تھا، مگر ان دونوں کے درمیان اب بھی بہت کچھ باقی ہے۔ دوستی، کاروبار، چنگاریاں۔“ ذرا سانس لینے کو رکی۔ سعدی بے دلی سے سن رہا تھا۔ ”اور آبدار ہے تو بہت اچھی،“ مگر میں اس کے ساتھ بھی شے غیر آرام وہ رہتی ہوں۔ اس نے اپنی ماں کو کم عمری میں کھوایا تھا۔ پھر امریکہ چل گئی۔ سنا ہے وہاں ایک دفعہ یہ ڈوبنے لگی تو ہاشم نے اس کی جان بچائی۔ جب ہاشم لی شادی کو شاید ایک سال ہوا تھا۔ اس دن کے بعد اس کا دل شہری سے اچاٹ ہو گیا۔ اسے شہری میں صرف خامیاں نظر آتی تھیں، مگر میں گواہ اہل ہاشم نے اس سے بے دفائل نہیں کی، نبنا کی بھی کوشش کی، مگر آبدار۔ وہ ہاشم کے دل میں رہتی ہے، اس لئے اس سے دور رہنا سعدی!“

”تو ہاشم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟“ اسے پہلی دفعہ لپٹی محسوس ہوئی۔

”ہاشم اپنی طلاق اور بابا کی موت کے بعد سے بہت مصروف رہا ہے، لیکن اب چونکہ وہ دونوں ایک شہر میں ہیں، وہ اسے اپنانے کا صور سوچ گا لکھ کر رکھلو۔“

”رکھ لیا۔ لیکن اگر ہاشم اس کی اتنی پرواہ کرتا ہے تو اس کو میرے پاس بھیجا نہیں چاہیے تھا۔“ اسے جانے کیوں افسوس ہوا۔

”یہی میں سمجھنہیں پا رہی۔ ہاشم نے کیوں اسے آنے دیا؟“ میری نے سر جھکا۔ بھی دروازے پر آہت ہوئی۔ میری جلدی سے ہن کی طرف چل گئی۔ بر قی دروازہ کھلا اور اسے سرخ اسکارف کی جھلک دکھائی دی تو اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسی ساپت اور معصوم چہرے کے ساتھ پاٹ آ رہی تھی۔ سعدی پر ایک نظر ڈالی، ساتھ موجود گارڈ سے مقامی زبان میں کچھ کہا اور آگے بڑھ گئی۔

چند لمحوں بعد وہ گارڈ کی معیت میں اسی دو کرسیوں والے کمرے میں داخل ہوا تو آبدار سینے پر بازو لپیٹی اور ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ ابرو ت گارڈ کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا تو وہ اس کی طرف گھومی۔

”تم نے کہا اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ آدمی کے پاس ایک ہی دل ہوتا ہے، مگر میں آدمی نہیں ہوں۔“

”مطلوب؟“ وہ مشتبہ نظرلوں سے اس کو دیکھ رہا تھا جو دروازے کی طرف پشت کے کھڑی تھی۔

”ڈور نمبر فور، مجھے کرٹی خاور کی مدد کرنی ہے، سو مجھے تمہارے وکیل کا نام چاہیے، اگر تم مجھے بتا دو تو میں تمہاری مدد بھی کروں گی، یونہ میرے دو دل ہیں، میں.... غیر جانبدار ہوں!“

”اوہ تم میرے لیے کیا کرو گی؟“ وہ اب بھی مشکوک نظر میں اس پر جمائے ہوئے تھا۔

”یہ فارس غازی نے تمہارے لیے بھجا ہے۔“ اس نے سینے پر لپٹے بازوں کو لے اور ایک ہاتھ میں پکڑا تھا شدہ کاغذ دورے دکھایا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

”میں کیسے یقین کروں کہ تم جھوٹ نہیں بول رہی؟“

”میری شکل پر لکھا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی، خیر تم اس کی لکھائی پہچان لینا، یہ اسی نے لکھا ہے۔ لیکن...“ کاغذ والا ہاتھ پہلو میں گرا لیا۔ ”میں تمہیں یہ تب دوں گی جب تم مجھے وکیل کا نام بتاؤ گے۔“ سعدی آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے کتنے ہی لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”فارس غازی کو معلوم ہے میں کہاں ہوں؟ کس کے پاس ہوں؟“

”اس کو سب معلوم ہے۔ اب نام بتاؤ۔“ وہ جیسے فیصلہ کر کے آئی تھی۔

”تم بچ کہہ رہی ہو، ٹھیک ہے۔“ اس نے گھری سانس لی۔ ”لیکن میں وکیل کا نام صرف ہاشم کو بتاؤ گا۔“ ہاشم درمیان میں کہاں سے آگیا؟“ اس کے ابر و ناخوشی سے بچنے۔

”درمیان میں نہیں۔“ سعدی نے غور سے اسے دیکھتے کہا۔ ”وہ اس وقت تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔“

آبدار کرنٹ کھا کر دروازے کی طرف پڑھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی، سعدی نے ایک دم جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کاغذ کھینچ لیا تھا۔ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ اس نے اگلے ہی لمحے خود کو ششدرا درخالی ہاتھ کھڑے پایا۔

”قید خانہ انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے، مس!“ مظوظ سماں سکرا کر وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور کاغذ کھول کر ایک نظر ان الفاظ پڑا۔ پھر نگاہ انھا کر دیکھا۔ وہ شاک سے نکل آئی تھی اور غصہ اس کی آنکھوں میں ابھر رہا تھا۔ ”وابس کرو۔“

”گارڈر کو بلا لو۔ وہی مجھ سے چھین سکتے ہیں اب یہ۔“

”اوے کے فائن، اب تمہیں یہ میل گیا، اب مجھے نام بتاؤ۔“ ذرا بے بُی بھری خفیٰ سے سینے پر بازو لپٹنے لوئی۔

سعدی نے ایک دفعہ پھر ان حروف کو پڑھا، کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”میں نے کہانا، ہاشم کو بتاؤ دوں گا نام، تو اسی کو بتاؤ گا۔“ آبی نے آہستہ سے کاغذ تھما۔ کچھ دیر لب کا ثی رہی۔ غصہ قدرے کم ہوا۔

”تمہیں سمجھا آگیا وہ تمہیں کیا کہنا چاہتا ہے؟ ہمن کا کیا مطلب ہوا؟“ اچھبے سے استفسار کیا۔

”خود کشی!“ وہ جل کر بولا تھا۔ اس پیغام پر جیسے اسے غصہ آیا تھا۔

”اس نے کہا تھا یہ تمہاری آزادی کا پروانہ ہے۔“

”ان کا دماغِ خراب ہے۔“

آبدار چند قدم کا فاصلہ عبور کر کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اس آدمی کا دماغِ ہرگز خراب نہیں ہے!“

”تم نہیں جانتی فارس غازی کو۔“ وہ جھلایا تھا۔ ”وہ ہاتھوں سے سوچتے ہیں، ان کا غصہ ان کی جنمت کو دھندا دیتا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں یہاں اتنے میئے سے قید ہوں، ان کو معلوم ہے میں کہاں ہوں، پھر بھی مجھے بچانے نہیں آئے۔“ وہ مشکوہ کر گیا تھا۔

”سعدی یوسف! مجھے نہیں پتہ تم انسانوں کو کتنا پہچانتے ہو، لیکن میں ایک عامل تو یہ ہوں، مجھے انسانوں کو پڑھنا آتا ہے۔ اور جس فارس غازی سے میں ملی تھی، وہ ویسا نہیں ہے جیسا تم اس کو جانتے ہو۔ شاید وہ کبھی ویسار ہا ہو، لیکن اب نہیں ہے۔“ مجھے نہیں پتہ ان حروف کا کیا

مطلوب ہے، لیکن تمہیں ایک بات ذہن میں بھالینی چاہیے۔ ”اس کی بھوری آنکھوں کو دیکھتے ہمدردی سے آواز آپستہ کی۔“ تمہیں یہاں سے نکالنے کوئی نہیں آئے گا۔ نہ میں، نہ فارس غازی، نہ تمہارے خاندان میں سے کوئی اور۔ تمہیں یہاں سے صرف ایک شخص نکال سکتا ہے، اور اس کا نام سعدی یوسف ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو خود ریسکیو کرنا ہو گا؟“

”آپ کے گارڈز کی مہربانی سے انہوں نے میری لاک پک بھی آج چھین لی ہے!“

”لاک پک؟“ اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔ ”تمہیں لگتا ہے یہ لاک پک سے کھل والے دروازے ہیں؟ یہاں ریٹینا سینزر لگے ہیں سعدی یوسف! ان کو یہ گارڈز بھی نہیں کھول سکتے۔ ویسے میں نے تمہاری پروفائل پڑھی تھی جو فصح نے بنایا کردی تھی۔ تم سعدی، تم فارس مازی نہیں ہو جو ہر لاک کھول لو گے یا ان گارڈز سے ہاتھا پائی کر کے یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔ تمہیں لڑنا آتا ہے، نہ گن چلانی آتی ہے، نہ ان دروازوں کے لاسکھوں نہیں کھول سکے۔ نہ ام اچھے بلکہ مدلہ ہو۔ نہ ہی پڑھائی میں تم کوئی بہت ہی اعلیٰ دارفع تھے۔ وہ ٹیلنٹ جو تمہارے ارد گرد کے آؤں کے پاس ہیں، وہ تمہارے پاس نہیں ہیں!“ سعدی کی آنکھوں میں شدید ناگواری ابھری۔

”سو تمہارا مطلب ہے مجھے کچھ نہیں آتا۔ اکپورٹی جب تمہارے باپ نے مجھے قیدیں کیا تھا اور میں اپنی دنیا میں رہ رہا تھا، تب لوگ مجھے بہت پسند کرتے تھے۔“

”کبھی سوچا لوگ تمہیں کیوں پسند کرتے تھے؟ ہر شخص کے پاس ایک خاص ٹیلنٹ ہوتا ہے، تم لاک پکس جمع کرنا چھوڑ دو کیونکہ وہ تمہارا ٹیلنٹ نہیں ہیں۔ تمہیں ایک ہی چیز کرنی آتی ہے زندگی میں اور اسی چیز کی وجہ سے لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں۔“

سعدی کے ابر و تعجب سے اٹھے۔ ”کیا؟“

”تمہاری باتیں!“

”واث؟“ اسے عجیب سالگا۔

”سعدی، تمہاری قائل کر لینے والی زبان ہی تمہارا سب سے بڑا ٹیلنٹ ہے۔ تم لوگوں کو کونوں کر سکتے ہو۔“

”میں نہیں کر سکتا!“ اسے خود بھی یقین نہیں آیا تھا۔

”کیوں کیا تم نے ابھی مجھے کونوں نہیں کیا کہ ہاشم میرے پیچھے کھڑا ہے؟“ وہ چونک کرا سے دیکھنے لگا۔ آبی نے سر جھکا۔ ”آل رائیں۔ میرا کام ختم ہوا۔ تم جانو، اور ہاشم جانے!“ وہ ایک گہری نظر اس پڑا تی بہر نکل گئی۔ سعدی ناخوشی سے کھڑا انہی الفاظ کو سوچتا ہا۔

.....❖❖❖.....

اپنوں کی مشکلوں سے بوجھل سادل ہے رہتا

اکتوبر کے وسط سے موسم بدلنے لگا تھا۔ سرما کی پہلی دن تک سنائی دے رہی تھی مگر تھانے کے اندر وہ ہی خوف، وحشت اور تشدید کا موسم تھا۔ وہ ایک کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ (زمر کی وجہ سے اس کو چند سو ہو تیس مل جاتی تھیں جن میں یہ وقت بے وقت کی ملاقاتیں بھی تھیں۔) وہ خاموش بجیدہ سا پلکیں سکوڑ کر احر کو دیکھ رہا تھا، جبکہ وہ وضاحت دے رہا تھا۔

”دیکھو مزر زمر نے واقعی مجھے ہاڑ کیا تھا، لیکن تمہیں پھنسانے کے لئے نہیں۔ میں کلاں پر یوں لج کے تحت تمہیں نہیں بتا سکتا تھا۔“

”کیوں ہاڑ کیا تھا اس نے تمہیں؟“ اس کی جھوٹی نظریں احر پڑ گئی تھیں۔

”وہ تو میں تمہیں اب بھی نہیں بتا سکتا، کیونکہ یہ ورک ایتھرکیس کے خلاف ہے۔ اگر یہ تب غلط تھا، تو اب بھی غلط ہے۔ وہ بتا دیں تو

اٹک بات ہے۔ لیکن مجھے جماری دوستی بہت عزیز ہے، اس لئے میری طرف سے اپنا دل صاف کرو۔“

”کر لیا۔ اور کچھ؟“ اس کا لہجہ تھنڈا اور نگاہیں ہنوز پر تپش تھیں۔ احر گہری سانس لے کر پیچھے ہوا۔ پھر سوچتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”مطلوب تم واقعی سوچ سکتے ہو کہ چڑے... مسز زمر تمہیں یوں جیل بھجو سکتی ہیں؟“

”میں بہت کچھ سوچ سکتا ہوں۔“

”مگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا غازی۔“

”تو ثابت کرو!“ وہ سپاٹ لبجھ میں کہہ کر پیچھے کو ہو بیٹھا۔ احر کی آنکھوں میں اچنباہ بھرا۔ ”کیسے؟“

”مجھے ایک شخص سے ملتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ کے لئے۔“ وہ کہہ رہا تھا مگر احر کی آنکھیں پھیلیں۔ فوراً اپنا تھا کر روکا۔

”دیکھو غازی،“ میں بے شک پر زن رائش پر یقین رکھتا ہوں لیکن یہ رائش سے اوپر کی بات ہے۔ پھر آواز بے چارگی سے پیچ

کی۔ ”یا تم حوالات میں ہوندہ منت کے لئے بھی ہم تمہیں یہاں سے نہیں نکال سکتے۔“

”تمہارے پاس میرے جوڑیشل ریمانڈ تک کا وقت ہے۔ دو ہفتے!“ اگلیوں کی وی بنا کر دکھائی۔ ”مجھے اس شخص کے پاس جانا ہے۔

یا تو تم اور تمہاری کلاں تھیں یہ سب ارتیخ کر کے دو گے، یا میں خود جیل توڑ کر چلا جاؤں گا، کبھی واپس نہ آنے کے لئے کون سا آپشن، بہتر ہے اپنی

کلاں تھیں سے پوچھ کر بتا دینا۔“ وہ جتنی تعلیمی اور قطعیت سے کہہ رہا تھا، احر بے بُکی سے اسے دیکھے گیا۔ زندگی میں بہلی بار اس نے سوچا تھا کہ پر زن

رائش جائیں جہنم میں، ارے ان قیدیوں کو تو انداز کا کر درے مارے جانے چاہیے ہیں۔

”کون ہے وہ شخص؟“

.....❖❖❖.....

کئی بار دکھایا ہے ہمیں آئینہ وقت نے ..... ڈرتے جو ہار سے ہم، بے کار بن کر جیتے  
انیکی کے برآمدے میں نووارد ہوئی سرما کی شام چھائی تھی۔ وہ نہیں تھا تو موسم کی گر بھوثی بھی ہر روز ناپید ہوتی جا رہی تھی اور خوف کا  
کہر فضا میں رچتا بستا جا رہا تھا۔ برآمدے میں آدھے بندھے گھنکریا لے بالوں والی زمرہ سنینے پہ بازو لپیٹ کھڑی، سنجیدگی سے سامنے کھڑے، احر کو  
کن رہی تھی جو بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔

”پلیز مجھ پڑلا یے گا میت، مجھے قانون بھی مت سمجھائیے گا، مجھے معلوم ہے یہ سب کتنا غلط ہے مگر وہ اس سے ملا چاہتا ہے۔“

بات ختم کر کے اس نے ڈرتے ڈرتے زمر کے تاثرات دیکھے۔ وہ خاموش کھڑی تھی، چہرہ نارمل تھا۔

”وہ اس سے اب کیوں ملنا چاہتا ہے؟ اتنا عرصہ جب وہ باہر تھا، تب کیوں نہیں ملا؟“

”میں نے بھی بھی پوچھا تھا، وہ کہتا ہے کہ پہلے وہ آہستہ آہستہ کام کر رہا تھا، مگر اب وقت نہیں ہے۔“ پیامبر نے پھکپاتے ہوئے پیغام

دیا۔

”ٹھیک ہے، وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے، تو ہم کروادیں گے ملاقات!“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ احر کا منہ کھل گیا۔

”واث؟ مطلب کہ...“ پھر منہ بند کیا، خنکی سے اسے دیکھا۔ ”آپ کو اس کا مطالبہ برائیں گا؟“

”نہیں۔ وہ سچائی جاننا چاہتا ہے، تو سچائی جانے کا بہترین وقت دوران قید ہے۔ اگر وہ آزاد ہوتا تو کچھ کر بیٹھتا، لیکن اب اسے

برداشت کرنا ہوگا۔“ زمر نے شانے اچکائے۔ وہ ساری جمع تفریق کر چکی تھی۔

”یعنی آپ سچائی جانتی ہیں؟ آف کورس یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، جلدی سے اپنی حد میں واپس آیا۔“ مگر ہم اس کو حوالات سے نکالیں

اور واپس کیسے لا کیں گے؟ یہ بہت خطرناک ہے!“

”میں کروں گی، ہوڑی سی آپ کی مدد چاہیے ہوگی۔ اور ہاں... ٹرائل کے لیے مجھے ایک انویسٹی گیئر کی ضرورت ہے۔ پچیس ہزار فی گھنٹہ رائٹ!“ ذرا زیستی سے پوچھا۔

احمر اداسی سے مسکرا�ا۔ ”مجھے آپ سے کوئی رقم نہیں چاہیے۔ میں صبح آؤں گا، ہم تب معاملات ڈسکس کر لیں گے۔“ ذرا رکا۔ ”ویسے میں وہی ہوں جس کو ایک زمانے میں آپ کو رٹ میں کھڑی پر اسکیوٹ کر رہی تھیں اور...“

”احمر!!!“ اس کی ایک نظر کافی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے جلدی سے بولا ”آف کورس آپ کو یاد ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ تبھی برآمدے کا دروازہ کھول کر شینیزی سے باہر نکلی، احرار کو دیکھ کر ٹھکی۔ پھر ذرا کی ذرا خفاظ اس پر ڈالی۔ احرار الوداعی کلمات کہہ کر برآمدے کے زینے اترنے لگا۔ مگر وہ دیکھنے خشکیں کامداز.... بار بار اس کو کھلکھل رہا تھا۔

کیمپن آفس میں بیٹھے وہ اسی سوچ میں گم تھا جب فاطمہ نے اس کے سامنے کافی کامگ رکھا۔ اور مقابل کری کھنچ کر بیٹھی۔ احرار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ گلاسز لگانے والی گوری اور دکشی لڑکی تھی۔

”تمہارے خیال میں وہ مجھے ہر دفعہ اتنی ناگواری کیوں دکھاتی ہے؟“ سنجیدگی سے پوچھا۔ فاطمہ نے گھونٹ بھرتے شانے اچکائے۔

”شاپی تمہاری کسی بات سے ہرث ہوئی ہو۔“

”نہیں، میں نے تو دونوں دفعہ مختلف باتیں کہی تھیں۔ مگر مجھے ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ وہ لڑکی.... سعدی کی بہن.... وہ مجھ سے... ان سکیوڑ رہتی ہے، جیسے اسے مجھ سے کوئی خطرہ ہے۔“ نفی میں سر ہلاتے وہ جیسے الجھا ہوا تھا۔ ”اس لڑکی کے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔“

”احمر!“ فاطمہ آگے ہوئی اور دلچسپی سے بولی۔ ”اس کیمپن میں ہم نے کتنے مسلسل کیے ہیں۔ کوئی پرل پہلے ہم سے نج سکا ہے کیا؟“

”دنہیں!“ وہ بھی دلچسپی سے آگے گہوا۔ ”ایسا کرو اس لڑکی کے بارے میں ہر معلومات مجھے ڈھونڈ کر دوتا کہ ہم کوئی لنک جو دسکیں۔“

”راجرباں، لیکن ہم یہ کر کیوں رہے ہیں؟ اس کی فیضی تو تمہاری دوست ہے نا۔“

”ہاں وہ میرے دوست ہیں، لیکن میں مجسوس ہوں، اور جب تک میں اس کو حل نہیں کروں گا، مجھے چین نہیں ملے گا۔“ وہ بہت بے چینی سے کہہ رہا تھا۔ فاطمہ نے نیک لگاتے سرکوش دیا اور کافی کے گھونٹ بھرنے لگی۔

..... ♦♦♦

گر وقت کبھی آتا باطل کی خدائی کا ..... ہم موت سے نہ ڈرتے، تلوار بن کر جیتے کمرے میں ٹوی کا بے ہنگم شور گونج رہا تھا۔ سعدی بیٹھ پر لیٹا تھا، پیر پنچی صورت بنا رکھتے تھے اور غیر دلچسپی سے دیوار پر نصب اسکرین دیکھ رہا تھا۔ وی گوست ایڈز وی ڈارک نہیں جو وہ کتفتی ہی دفعہ گزرے برسوں میں دیکھ چکا تھا، اس قید خانے میں سخت کبیدہ خاطر لگ رہی تھی۔ (ٹوی پر صرف ڈی وی ڈی چلتی تھی، کوئی چیلن نہیں آتا تھا۔)

اکتا کراس نے ٹوی بند کیا۔ کمرے کی خاموشی عجیب لگتے لگی۔ اس نے سر ہاتھوں میں گرالیا اور سوچنے کی کوشش کی کہ وہ اتنا ہے سکون کیوں ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے چونکا۔ ”اسکرین!“ اسکرین میں سکون کب اور کس کو ملا تھا، جو اسے ملے گا؟ بھلے وہی وی اسکرین ہو، کمپیوٹر اسکرین ہو یا موبائل اسکرین۔ اسکرین سستی، بے سکونی اور یہ زاری عنایت کرتی ہے اگر یہ اللہ کے ذکر سے خالی ہو! وہ اٹھا اور باٹھ روم چلا گیا۔ کچھ در بعد گلے ہاتھ پر اور چہرے کے ساتھ باہر نکلا اور پاناقرآن لے کر اسٹنڈی نیبل پر آبیٹھا۔

”پتہ ہے کیا اللہ تعالیٰ، اس اسکرین کی نماز اور قرآن کے ساتھ ہمیشہ ایک جگ جگ چھڑی رہتی ہے۔ جتنی زیادہ ہمارے زندگیوں میں

”اسکرین“ آتی ہے، اتنی ہماری نماز کم ہوتی ہے۔ اور جتنی نماز آتی ہے، اتنی ہی اسکرین خود بخود جانے لگتی ہے۔ ہم بیک وقت دو ول نہیں رکھ سکتے۔ حیا سے عاری دل، اور مومن کا دل، یہ ایک سینے میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ خیر، آج کون کی سورۃ پڑھوں؟“ اس نے صفحہ پلٹتے سوچا۔ وہی بے ترتیب قرآن کی روشنیں۔ وہ چند سورتیں آگے پیچھے سے پڑھتا تھا مگر تم کو صرف وہی قصہ سنایا جاتا ہے جب وہ چیزوں کی سورۃ پڑھتا تھا۔ سو آج بھی اس نے انہل کھول کر تعودہ اور تسمیہ پڑھا۔

”میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں دھکارے ہوئے شیطان سے۔ شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان بار بار حرم کرنے والا ہے۔“ اس نے آیات دیکھیں۔ ملکہ سبا کو سلیمان علیہ السلام کا خط مل چکا تھا اور اس کو پڑھنے کے بعد کافی سچھ یوں تھا۔

”وہ کہنے لگی اسے سردار و مجھے میرے کام میں مشورہ دو، تمہارے حاضر ہوتے ہوئے میں خود سے کوئی قطعی فصل نہیں کرنے والی۔ انہوں نے کہا۔ ہم قوت والے ہیں اور معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے تو دیکھ لو کہ تم کیا حکم دیتی ہو؟“

”سوکیا مطلب ہوا ان آیات کا؟“ سعدی دانت سے نچالاب دبائے سوچنے لگا۔ ”سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کریم جس میں کلمہ تھا کہ میرے پاس مطیع و فرمانبردار بن کر چلی آؤ۔ اس کے بعد ملکہ اپنے لیڈرز سے مشورہ لیتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ مشورے کے لئے یہاں پر ”افتوقی“ کا لفظ استعمال ہے، یعنی مجھے فتوی دو۔ اللہ تعالیٰ آپ نے ”مشورے“ کا لفظ نہیں استعمال کیا۔ فتوے کا کیا۔ فتوی کہتے ہیں کسی مشکل مسئلے کے جواب کو۔ مجھے اس سے یہ سمجھا آیا ہے اللہ تعالیٰ کہ فتوی ”جواب“ ہوتا ہے۔ جب مانگا جائے تب دیا جائے۔ یہ نہیں کہ جگہ جگہ اٹھتے بیٹھتے، ہم ہر کسی پتوے لگاتے جائیں۔ اور ملکہ کا قصہ ایک طرف، ہمارے ہاں ہرگلی کا مولوی اور ہر یونیورسٹی کا اسلام پروفیسر بھی فتوے لگادیتا ہے، جبکہ اسلام میں ہر کوئی فتوے دینے کا اہل نہیں ہوتا ہے۔ مفتی کا مقام حاصل کرنے کے لئے خاص تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا اور کمرے کا وحشت ناک سناتا اب آہستہ آہستہ سکنیدت بھری خاموشی میں بدل رہا تھا۔

”ویسے انسان کو ہمیشہ مشورہ کرنا چاہیے، مشورہ انسان کو سوائی سے بچالیتا ہے۔ بہترین مشورہ اللہ سے مشورہ ہوتا ہے، اور بہترین فتوی دل کا فتوی ہوتا ہے، آخری فتوی۔ خیر۔“ اس نے صفحہ کو دیکھا۔ ”ملکہ نے مشورہ مانگا تو سردار ان قوم نے اپنی طاقت بھی واضح کر دی اور آخری فیصلہ بھی ملکہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر آگے کیا ہوا؟“ وہ پڑھنے لگا۔

”وہ کہنے لگی کہ بے شک جب بادشاہ کی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد کرتے ہیں، اور وہاں کے رہنے والے عزت دار لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔“ سعدی کو کچھ یاد آیا۔

”اللہ تعالیٰ یہ آخری الفاظ“ اور وہ اسی طرح کیا کرتے ہیں، ان کے بارے میں دو آراء ہیں نا۔ پہلی رائے یہ ہے، کہ یہ ملکہ کا ہی قول ہے، مگر مجھے دوسرا رائے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تصریح ہے ملکہ کی بات پر، کوئی قعی طاقت کے نشی میں گم لوگ دوسروں کی عزتوں کی پرواہ کہاں کرتے ہیں۔“

کمرے کی وحشت کسی حد تک کم ہو چلی تھی۔ اس کا منتحر ہن دھیرے دھیرے کئی دن بعد، فوس کس کر پار رہا تھا۔ وہ عربی میں اگلی آیات پڑھنے لگا۔ اور بے شک میں سمجھنے والی ہوں ان (سلیمان) کی طرف ایک ہدیہ۔ پھر دیکھتی ہوں کہ ہمارے قاصد کس چیز کے ساتھ لوٹتے ہیں۔“

”واہ ملکہ... مشورہ آپ نے ضرور مانگا سردار ان قوم سے، لیکن آخر میں کی تو آپ نے اپنی ہی مرضی۔“ وہ مصنوعی ساخنا ہوا۔ ”مجھے ہمیشہ یہ آیات پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ملکہ ایک تو اپنے لیڈرز کو چیک کر رہی تھی، دوسرا وہ جنگ کے جانے امن کے پیغام کو حصی فائی بھی کر رہی تھی۔ چیزوں کی طرف وہ بھی اپنی قوم کے لئے خلص تھی، اور سب کا سوچتی تھی۔ وہ قطعی فیصلہ کر سکتی تھی مگر تھی وہ ایک عورت ہی، اس کو ایک فیصلہ لینے سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو اس فیصلے کی وضاحتیں اور صفا بیان دینا تھیں۔ وہ ملکہ ہو کر بھی چیزوں تھی، مگر وہ درست تھی۔ عورت اگر

بھی خاندان میں دب بھی جائے، جاہیت کا جواب بھی صلح صفائی سے دے، اور بظاہر چیزوں کی طرح انہی اور خاموش زندگی بھی گزارہی، اولاد وہ بھی کوئی بری بات نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگوں کے سکون کے لئے اپنی اناکی قربانی دینا برا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“

سعدی نے سر جھکا اور توجہ اگلی آیات کی طرف مرکوز کی۔

”توجب وہ (قادہ) آئے سلیمان کے پاس (تحفے لے کر) تو وہ کہنے لگا۔ کیا تم مال کے ذریعے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ تو جو اللہ نے مجھے عطا کر رکھا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو اس نے تم کو عطا کر رکھا ہے۔ بلکہ اپنے تحکموں کے ساتھ تم خود ہی خوش ہوتے ہو۔ واپس جاؤ ان لے پاس ورنہ البتہ ہم ضرور ان کے پاس ایسے لشکر لاائیں گے جن کے مقابلے کی طاقت ان میں نہ ہوگی۔ اور ہم ان کو ان کی بستی سے ذلیل کر لے کالیں گے اور وہ پست ہو کر ہیں گے۔“

”سبحان اللہ!“ سعدی نے گھری سانس لی۔ ”تحفے تھا ناف دینا پسندیدہ عمل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیا بھی کرتے تھے، لیا بھی لرتے تھے۔ مگر سلیمان علیہ السلام نے کیوں یہ تحفہ قبول نہیں کیا؟ کیونکہ یہ رشتہ تھی۔ رشتہ اس شے کو کہا جاتا ہے جو جائز کونا جائز یانا جائز کو جائز ہنانے کے لئے دی�ا جائے۔ ملکہ کا تحفے بھیجا اس امر کی نشاندہی تھا کہ وہ معاملہ خوشامد سے رفع دفع کرنا چاہتی تھی۔ مگر سلیمان علیہ السلام ایسے پھندوں میں نہیں آتے تھے۔“ وہ رکا۔ ”مگر وہ کیوں نہیں آتے تھے ایسے پھندوں میں؟ کیا اس لئے کہ وہ پیغمبر تھے؟ نہیں، بلکہ اس لئے کہ اس...“ اس نے آیت میں ہی جواب ڈھونڈا۔ ”اس لئے کہ انہوں نے اپنی نعمتوں کے بارے میں اعتراض کیا کہ یہ مجھے عطا کی میں اللہ نے۔ اور یہاں ان کے لا و لشکر جنات پرواز کی سواریاں مراد نہیں ہیں۔ یہاں مراد ہے، پیغمبری۔ کتاب کا علم۔ اللہ کا قرب۔ تو جو اللہ کے آگے بُدے میں سر رکھتا ہو اس کا سر ان پھندوں میں نہیں پھشتا۔ ان کی ساری شان یہ انکاڑی طریقہ یا ان کے اصولوں کی وجہ سے ہے۔ اور اللہ یہ تو مجھے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ کوئی پیغمبر کسی کو ذلیل نہیں کر سکتا، یہاں ذلیل کرنے اور پست کرنے سے مراد جنگ کی خونزیزی ہے۔ یہاں ملکہ کے پورے ملک کے عوام کی آخرت کی فکر کر رہے تھے۔ اگر ملکہ اور سردار ان قوم نے اسی طرح پورے ملک کو سورج کی پرستش پر اکائے رکھا تو اس قوم کو درست را دکھانے کے لئے حکمران طبقہ کو جنگ کے ذریعے ملک سے کالنا بھی برا سودانہ تھا۔“

وہ آیات اتنی دلچسپ تھیں کہ سعدی کو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ اسے سب یاد تھا کہ آگے کیا ہو گا، مگر قرآن ہر امام انسان پر نئے طریقے سے اترتا ہے۔ اب سلیمان کے دربار کا منظر بتایا جا رہا تھا۔

”سلیمان نے کہا، اے سردارو، کون ہے تم میں سے جوان کے مطیع ہو کر آنے سے قبل اس (ملکہ) کا تخت اٹھا کر میرے پاس آئے۔“ وہ لختے بھر کو تھہر اور مسکرا یا۔

”ملکہ نے بھی کہا یا بھا الملو (اے سردارو) سلیمان نے بھی کہا، یا بھا الملو (اے سردارو) ملکہ نے بھی ان کی قوت چیک کی، سلیمان نے بھی ان کی طاقت جا چنی چاہی، مگر دونوں کا انداز مختلف تھا۔ سلیمان علیہ السلام نے مشورہ نہیں مانگا، رائے نہیں مانگی، صرف جواب مانگا، یوں کہ جو وہ کرنے جا رہے تھے وہ نبوت کا مجموعہ تھا اور کچھ معاہدے ایسے ہوتے ہیں جہاں آپ کو دوسروں کی آراء کے اثر سے کل کر فصلے کرنے ہوتے ہیں۔ سلیمان نے بھی اپنی مرضی کی، ملکہ نے بھی اپنی مرضی کی، مگر مجھے ہمیشہ لگتا ہے کہ چونکہ وہ ایک عورت تھی، اسی لیے اس کو صفائی اور اضافتیں دینا پڑ رہی تھیں۔“ پھر اگلے الفاظ پر نظر دوڑائی۔

”کہا جات میں سے ایک عفریت (دیو) نے، میں اس (تخت) کو لاوں گا تیرے پاس تیرے اس جگہ سے اٹھنے سے قبل، اور بے بلک میں اس پر قوی اور امین ہوں۔“

”کس جگہ سے اٹھنے سے قبل؟“ سعدی نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا۔ چونکہ وہ عربی کا قرآن تھا، تفسیر لکھی ہوئی نہ تھی، اور دو دن سے اسکریں دیکھ دیکھ کر فوکس کم ہوتا جا رہا تھا۔ سو بدقت یاد آیا۔ ”سلیمان علیہ السلام“ کا دربار صحیح سے نصف النہار تک لگا کرتا تھا، جن کا مطلب

تھا کہ دربار ختم ہونے سے پہلے لے آؤں گا۔ فلسطین، جہاں سلیمان علیہ السلام تھے، سے قوم سبا کے ملک کا فاصلہ ہزاروں میل پر بھی تھا۔ وہ جن اس کو چند گھنٹے میں عبور کر سکتا تھا، مگر بے چارے کو بھی اس پر ہدکی طرح اپنی امانت کی صفائی دینی پڑ رہی ہے کہ میں اس تخت کے ہیرے موتوپیوں سے کچھ چڑھاں گا نہیں۔ سلیمان علیہ السلام کا کتنا رعب تھا اپنی رعیت پر۔ حضرت عمر بن خطاب فرماتے تھے کہ جوزیادہ ہنستا ہے اس کا رب کم ہوجاتا ہے۔ مگر اپنے بڑوں کی ساری باتیں ہمیں عین موقع پر کیوں بھول جاتی ہیں؟“

گردن جھکائے رکھنے سے اس کی گردن دکھنے لگئی تھی مگر یہ طقہ کا پڑھتے وقت اس کو آگے پیچھے کا ہوش نہیں ہو سکتا تھا۔

”کہاں شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا، میں لا اوں گا اس (تخت) کو تیرے پاس تیرے پلک جھپکنے سے بھی پہلے۔“ (سعدی کو محسوس ہوا، اس کے بازوں کے رو تکنے کھڑے ہو رہے تھے)۔ ”پھر جب دیکھا سلیمان نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا تو کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ کیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکر کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے تو یقیناً وہ شکر کرتا ہے اپنی ہی ذات کے لئے اور جو کفر (یعنی کفر ان نعمت یا ناشکری) کرتا ہے تو میرا رب تو بہت بے نیاز بہت عزت والا ہے۔“

سعدی نے ہلکی سی جھر جھری لی۔ ہونت سکیز کر سانس خارج کی۔

”یہ شخص کون تھا، اور اس کے پاس کون سی کتاب کا علم تھا؟ آپ نے ہمیں یہ سب نہیں بتایا اللہ، بعض کہتے ہیں یہ خود سلیمان ہی تھے مگر یہ قول کرنا درست ہے۔ زیادہ بہتر رائے ہے کہ یہ ایک انسان تھا اسرا ہمیلات اس کا نام آصف بتاتی ہیں، اس کے پاس کسی خاص کتاب کا علم تھا جو جادو نہیں تھا، اور وہ پلک جھپکتے میں تخت کو سلیمان کے پاس لے آیا تھا۔ لوگوں کو عوماً یہ آیت بہت ہی fascinating کرتی ہے۔ مجھے اس سے اگلے الفاظ زیادہ fascinating کرتے ہیں۔ پلک جھپکتے میں ہزاروں میل کا فاصلہ عبور کر کے تخت آ جاتا ہے سلیمان کے پاس، اور وہ کہتے ہیں یہ میرے رب کا فضل ہے۔ ہمارے پاس جب پلک جھپکتے میں ہزاروں میل دور سے کوئی ای میل، کوئی فیلم، کوئی ویدیو کال آ جاتی ہے، تو ہم کہتے ہیں یہ سامن کا فضل ہے، اسکا اپنے کا فضل ہے۔ وائی فائی کا فضل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سلیمان نے اس ذی علم شخص کی تعریف نہیں کی ہو گی، یقیناً کی ہو گی مگر پہلی تعریف اللہ کی بیان کی۔ یہ سب سامن کے کرشمے ہیں، اسکا اپنے وائی فائی سب، لیکن ہم، پہلی تعریف اللہ کی بیان نہیں کرتے۔ اللہ ہمیں نعمتوں سے اس لئے نہیں نوازتا کہ ہم بہت نیک ہوتے ہیں، بلکہ اس لئے نوازتا ہے کہ ہم ان کے بعد بھی نیک رہتے ہیں یا نہیں۔ ذکر نعمتوں کی حفاظت کرتا ہے اور شکر نعمتوں کو بڑھاتا ہے۔ اور اگر کوئی ناشکری کرے، اور اللہ آپ نے ناشکری کے لئے ”کفر“ کا لفظ استعمال کیا، تو اللہ ناشکروں سے بے نیاز ہے، اور ان کی تعریف کے بغیر بھی اتنا ہی باعزت ہے۔“

وہ عوماً اتنی زیادہ آیات پر اکٹھے غور فکر نہیں کیا کرتا تھا، مگر فی الحال اس قصے کو نیچ میں ادھورا چھوڑنا اس کے لئے نامکن تھا۔ وقت کمرے میں چھائی لئی وی کی خوست، قید کا احساس، سب ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

”سلیمان نے فرمایا، بدلتا اس کے لئے اس کا تخت، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ (ملکہ) ہدایت پاتی ہے یا بے ہدایت لوگوں میں سے ہو جاتی ہے؟ تو جب وہ آگئی، اس سے پوچھا گیا، کیا اسی طرح ہے تیرا تخت؟ بولی ”گویا کہ یہ وہی ہے۔ اور ہم دیے گئے علم اس سے پہلے ہی اور ہم تھے اطاعت گزار۔“

”ان الفاظ میں لئتی وسعت ہے نا اللہ۔ ان کے بارے میں بھی دو آراء ہیں، ایک یہ کہ یہ پوری سطہ ملکہ کا کلام ہے، دوسری یہ کہ ملکہ نے صرف تذبذب سے صرف اتنا کہا ”گویا کہ یہ وہی ہے“، صاف پہچانا بھی نہیں کیا، اور آگے کے الفاظ سلیمان کے ہیں۔ یہ مجھے زیادہ بہتر رائے لگتی ہے۔ کاش قرآن پڑھنے والوں میں بھی اتنی ہی وسعت آجائے جتنی قرآن کی آیات میں ہے۔“

اس نے تو جاگلے الفاظ کی طرف مبذول کی جہاں اللہ فرمرا تھا۔

”اور وہ کا تھا اس (ملکہ) کو اس (سورج) نے جس کی وہ عبادت کرتی تھی اللہ کے سوا۔ بے شک وہ کافروں میں سے تھی۔“

”روکا تھا؟“ وہ ایک دم چونکا۔ ”اللہ کی عبادت کرنے سے آپ کو کیا چیز رکتی ہے؟ فخر پر آپ کی آنکھوں پر کیا چیز بوجھ ڈالتی ہے اور اتنے نہیں دیتی؟ صرف نیند میں اتنی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کی آپ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں۔ عبادت کرتے ہیں ماہری و انکساری سے کسی کے سامنے جھک جانے کو۔ مجھے یاد آرہا اللہ، آپ نے ایک جگہ قرآن میں بتوں کی عبادت کرنے والوں کے لئے یہ الشاعرا استعمال کیے ہیں کہ ”کیوں ہوتا ہے آگے جم کر بیٹھنے والے۔“ تو جس بری چیز کے آگے ہم جم کر بیٹھتے ہیں، ”مہوت“ مسحور سے وہ ہمارے ۱۰۰۰ ہوتے ہیں۔ پلٹ کر ایک خانگاہی وی کی تاریک اسکرین پر ڈالی۔ اور جتنی زیادہ ان مسعودوں کی مداخلت زندگی میں بڑھے گی، اتنی نمازِ کم وہ کی یہ تو طے ہے۔“ پھر اس نے دھیان آج کے سبق کی آخری آیت پر لگایا۔

”کہا گیا، ملکہ سے داخل ہو جا محل میں (جو شیشوں کا بنا تھا) تجب اس نے دیکھا اس (شیشے کے فرش کو)،“ صحیح اس کو حوض، اور نہہ ایوں سے (لباس) اور پر اٹھائیا، تو فرمایا سلیمان نے ”بے شک وہ ایک محل ہے پچنانشے کا بنا۔ تو کہنے لگی اے میرے رب، بے شک میں نے ۲۳ ملر یا اپنی جان پر اور میں اسلام لاتی ہوں سلیمان کے ساتھ، اللہ رب العلمین کے لئے!“

”شیشے کا محل!“ سعدی نے خندی سانس بھرتے مقدس کتاب بند کی۔ ”کہتے ہیں اس محل کا کر مثل کلیسہ گلاس فلور تھا اور اس کے نیچے ہالی بہتا تھا۔ ملکہ جو پہلے ہی اتنی متاثر ہو چکی تھی اس اعجاز کو دیکھ کر تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی کہ سلیمان، اللہ کے رسول ہیں، اور جس شے پر وہ ہیں، وہ اُمیک ہے اور اس کی ساری زندگی کی عبادت اور ریاضت غلط تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ اس آیت سے ہمیشہ ایک بات محسوس کی ہے۔ دین کی تبلیغ اُنے کے لئے صرف تقریر نہیں کرنی ہوتی؛ دوسروں کو متاثر بھی کرنا ہوتا ہے۔ سلیمان نے پرندے کے ذریعے خط تخت کو لے آئے اور مرد ٹھٹھے کے محل سے ملکہ کو متاثر کیا، کیونکہ سلیمان کا مجرمہ جنت، چرند پرندے اور اپنی مخلوقات اور علوم کا مسخر کرنا تھا۔ انہوں نے اپنے مجرمے سے ملا۔ امداد کیا۔ یہ قصہ پڑھ کر میرے جیسا عام انسان تھوڑا احساسِ کتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ بھی ہمارے پاس تو نہیں ہیں شیشے کے محل اور نباتات کے لشکر، اڑنے والے تخت، دربار اور بادشاہی۔ مگر... ہمارا مجرمہ یہ شان و شوکت ہے بھی نہیں۔ ہماری امت کا مجرمہ ہے ”قرآن“ اور ”یہ قرآن سے لوگوں کو متاثر اور مسحور کرنا ہو گا۔ کبھی قرآن سن کر اور کبھی خود چلتا پھرتا قرآن بن کر۔ تب ہماری تبلیغ دھیان سے سنبھال جائے گی۔“ ہے کو تھوں میں گرا کروہ اب دعا مانگنے لگا۔ چونکہ تلاوت ختم ہو چکی تھی تو کمرے کی دھشت و لیسی ہی محسوس ہونے لگی۔ گویا کہ وہ پہلے سے اُت لمحتی۔ مگر وہاں موجود تھی، یہ چیزیں تیزی سے ختم نہیں ہوا کرتیں۔

سعدی نے نوٹ بک انجائی اور اس پر وہی الفاظ لکھے جو فارس نے لکھے تھے۔ Haman۔

سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کے ملک کے لوگوں کی دنیا و آخرت بچائی اپنی ”نعمت“ استعمال کر کے۔ اس کو اپنی جان بچانی تھی اپنا ایشناٹ اتمال کر کے۔ اور وہ سرخ اسکارف والی بڑی ٹھیک کہتی تھی۔ اس کو صرف ایک چیز یہاں سے نکال سکتی تھی۔ اس کی زبان۔

ایک عزم کے ساتھ اس نے ان حروف پر کاشنا گایا۔ مگر یہ صرف کاشنا نہیں تھا۔  
یہ صلیب تھی!

.....♦♦♦.....

یہ ادا سیپوں کے موسم یونہی رائے گاں نہ جائیں ..... کسی یاد کو پکارو، کسی درد کو جگاؤ  
سر مادہ ہیرے دھیرے شہر کو لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسی میں عجیب ہوا کا عالم تھا۔ اسامدی وی سے بے زار کونے میں اسکوں کا کام  
لے بیٹھا تھا۔ ابا کمرے میں لیئے تھے۔ ندرت نے ریشور ایٹ جانا چھوڑ رکھا تھا، وہیں پکن کی گول میز پر بے خیال، کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہتیں۔  
وزیر سے کہتیں ان کو فارس سے ملتا ہے، پھر خود ہی ارادہ بدل دیتیں۔ ان کی نمازیں لمبی ہو گئی تھیں۔ باہمیں گھٹ گئی تھیں۔ سب کے کروں کی  
تیہ بھی بدل گئی تھی۔ صداقت اب ابا کے ساتھ سوتا تھا، سیم اوپر ندرت کے ساتھ اور جنین زمر کے ساتھ۔ کون کس سے خونزدہ تھا، یا کون کس کا

خیال رکھنا چاہ رہا تھا یہ سوچنے کے دن نہیں رہے تھے۔

خدا اس وقت یونچ پیغمبر میں تھی۔ اوپر زمر کے کمرے کی تی مددم تھی اور اندر وہ چہرے کے گرد و پشت پیٹی بینچی نماز پڑھ رہی تھی۔ سلام پھر کراں نے خالی خانی نظروں سے دیران کمرے کو دیکھا۔ خالی صوفے کو دیکھا۔ اس کی آن چھوٹی الماری کو دیکھا۔ وہ ہوتا تھا تو اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہیں تھا تو ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ وہ نہیں ہے۔ کیسے اس کے خاندان نے چار سال گزارے ہوں گے اس کے بغیر؟ زمر کا چہرہ جھک گیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ہاتھ پیالہ صورت اٹھائے۔

”میں نے بہت غلط کیا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ۔ وہ بے گناہ تھا مگر میں نے اس کا اعتبار نہیں کیا۔ میں نے اس کو اس جہنم سے نہیں نکالا۔ میں کیسے اس گلکت سے نکلوں؟ وہ اچھا انسان ہے مگر مجھے اس سے کوئی محبت، کوئی نفرت پچھبھی نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں، دل میں، میں اب بھی اسے پسند نہیں کرتی۔ مگر مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ پلیز میری مدد کریں۔ کوئی راستہ نکالیں۔ مجھ سے بات کریں۔“ آنسو ٹپ پ آنکھوں سے گر رہے تھے۔ دل بھی دکھی تھا۔ میری صیاں چڑھنے کی آواز آئی اور وہ اپنے خاندان کے ہربندے کی مختلف چاپ پہچانتی تھی۔ فوراً آنکھیں رگڑ دیں۔

دروازہ کھلا اور جنین اندر داخل ہوتی رکھائی دی۔ پھر بید پر گرنے کے سے انداز میں لیٹ گئی۔ دفتاً گردن اونچی کر کے اسے دیکھا۔ وہ جائے نماز تھہ کر کے کھڑی ہو رہی تھی۔

”میں کتنی درپہلے آئی تھی، آپ تب بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔“

”اتفاق تولگ ہی جاتا ہے۔“ وہ رسان سے کہتی میز پر جائے نماز رکھتی دوپتے کو کھولنے لگی۔ خدا کہنی کے بل اونچی ہوئی اور ہتھیلی تک گال رکھ کر اسے دیکھا۔

”آپ اتنی بھی نماز میں کیا پڑھتی ہیں؟“

”ساری مسنون دعائیں!“ وہ رخ موڑے کھڑی اب دوپتے سے بال آزاد کر رہی تھی۔

”کون ہی ساری دعا میں؟ میں تو سجنک اللہم پڑھتی ہوں، پھر سورۃ فاتحہ، پھر قل هو اللہ، پھر رکوع، سجدۃ التحیات، درود ربِ العلی اور پھر سلام۔“ چٹکی میں خدا کی نماز ختم ہو گئی تھی۔

”تم ہر اسٹیپ کی صرف ایک دعا پڑھتی ہو؟“ رخ ابھی تک موڑے وہ بال برش کرنے لگی۔

”ہاں تو ہر اسٹیپ کی ایک ہی دعا ہوتی ہے، ہمیں مولوی صاحب نے ایسے ہی سکھائی تھی بچپن میں۔“ زمر اس کی طرف گھومی۔ آنکھوں کا گلابی پن اب کم تھا۔ اور مولوی صاحب نے کہاں سے سکھی تھی نماز؟“

”اپنے مولوی صاحب سے۔ سوری.... مطلب حدیث کی کتابوں سے۔“ گز بڑا کر تصحیح کی۔

”ہم سب کو نماز سکھائی ہے رسول اللہ ﷺ نے۔ انہوں نے ہر اسٹیپ کی کئی دعا میں سکھائی تھیں۔ یہ بھی فرمایا کہ جو تین دفعہ سجان ربِ العلی سجدے میں پڑھتا ہے تو اس کا سجدہ تو ہو جاتا ہے۔ مگر وہ ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ ہم سجان ربِ العلی نہ پڑھا کریں؟“

”اف میں نے یہ کب کہا کہ نہ پڑھا کریں۔ یہ تو لازمی ہے پڑھنا۔ مگر رکوع و تجوید کو ”اعلیٰ“ یعنی بہترین بنانے کے لئے دوسرا دعا میں بھی پڑھنی ہوتی ہیں۔ نمازان کے بغیر بھی ہو جاتی ہے، مگر ان کے ساتھ زیادہ اچھی ہوتی ہے۔“

”دوسرا دعا میں؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک دم پریشان۔ ”ہاں بھائی بھی شاید پڑھتا تھا، مگر مولوی صاحبان کیوں پوری نماز نہیں سکھاتے؟!“

”کیونکہ وہ ایک چھے سال کے بچے کو ایک دم بوجمل نہیں کرنا چاہتے اور یہ گمان کرتے ہیں کہ بڑا ہو کر خود ہی سیکھ لے گا۔ یہ ساری ماں میں احادیث کی صحیح کتب میں درج ہیں جن میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ مگر بڑے ہو کر کوئی نہیں سیکھتا کیونکہ نوے فیصلہ مسلمانوں کو علم ہی اُس تک نماز کی اور دعا میں بھی ہیں۔ یا یہ کہ قل ھو اللہ کی جگہ قرآن کی دوسری سورتیں بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔“ وہ دو ہیں ڈریر کے اشول پر الی ہال برش کرتے کہہ رہی تھی۔

خین الجھی تھی۔ ”تو وہ جو ہم سنتے ہیں کہ ہمارے بزرگ لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے وہ اس لئے کہ وہ ان میں تمام دعائیں میں مت تھے؟“

”بالکل۔“

”میں تھیں الفاظ لکھا کر پڑھتے ہوں گے۔ سوری۔“ ذرا شرمende ہوئی۔ ”اچھا مجھے بھی بتائیں، کون سی دعائیں پڑھنی ہیں۔“

”حمد۔“ وہ حمد کی طرف گھومتے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتی۔ ”تم ایک باشور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ تمہیں نصیحت کرنا میرا کام ہے،“ میں منہ میں نواں دینا میرا کام نہیں ہے۔ میں ناصح ہوں استاذ نہیں۔ تم اگر ناونز پڑھ سکتی ہو، کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہو تو تم احادیث کی کتابیں میں نوکھوں کر ساری دعائیں پاکر سکتی ہو۔ تمہیں اپنی نماز کو اعلیٰ بنانے کے لئے خود محنت کرنی ہو گی۔“

”اچھا!“ اس کا پھرہ اتر گیا۔ (ایک دو دعائیں میں بتا دیتیں تو کیا ہوتا؟)

”اور تم بالکل بھی نماز نہیں پڑھتی ہو وہنے۔“ اس نے نزی سے کہا تھا۔ خین الجھی اب کاٹتے بستر پر لکیریں کھینچنے لگی۔

”دیکھیں میں فخر پڑھنیں اٹھ پاتی۔ فخر نہ پڑھوں تو باقی پڑھنے کا کیا فائدہ؟“

”فائدے نقصان کے لئے نماز نہیں پڑھی جاتی، ایکسر سائز اور صحت کے لئے بھی نہیں پڑھی جاتی، نماز اللہ کو خود سے راضی رکھنے لئے پڑھی جاتی ہے۔ دیکھو جا ب کرنا یا نہ کرنا ایک اچھی مسلمان اور ایک کم اچھی مسلمان لڑکی میں فرق کرتا ہے، یق و اور جھوٹ مومن اور مغلق میں فرق کرتا ہے، مگر نماز مسلمان اور کافر میں فرق کرتی ہے۔ جو نماز نہیں پڑھتا وہ مسلمان نہیں ہوتا۔“

”یاراب ایک دم سے مجھے کافر قو نہ بنا دیں۔“

”سوری حمد، مگر یہ بات میں نہیں کہہ رہی۔ یہ حدیث کی کتابوں میں لکھی ہے۔ نماز کے بغیر ہم مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں؟“

”مگر زمر مجھ سے فخر پڑھنیں اٹھا جاتا۔ آپ کو لگتا ہے میں کوشش نہیں کرتی؟ کرتی ہوں۔ الارم بجا تا ہے، امی بھائی سب اٹھاتے ہیں۔ میں نہیں نہیں اٹھ سکتی۔“ وہ روپاں ہوئی۔

”الارم کلاک با تھر دم میں رکھ کر سویا کرو۔ اٹھ جاؤ گی۔“ ایک وقت کے لئے اتنی نصیحت کافی تھی وہ بال پیٹھے اٹھی۔ ”اب بتاؤ جو کام میں نے تمہیں دیا تھا، وہ کرو لوگی؟ اچھا ب یوں دل موس کرنے بیٹھو، تمہیں تو اتنی ساری قرآنی سورتیں حفظ ہیں، جب تک نماز کی دعائیں نہیں ملتیں، انہی کو سورۃ اخلاص کی جگہ پڑھ لیا کرو۔ یاد تو ہیں نا وہ؟“

”وہ؟“ وہ چوکی۔ ”بی جی یاد ہیں۔“ جلدی سے نگاہیں جھکا میں اور ثیبلیٹ سامنے کر لیا۔

ایک حافظ قرآن کے لئے کسی دوسرے کو یہ بتانا یا سمجھانا کہ وہ قرآن بھول چکا ہے، بہت مشکل، بہت تکلیف دہ تھا۔

..... ♦♦♦ .....

خود کو سنتے ہیں اس طرح جیسے ..... وقت کی آخری صدا ہیں ہم

اس رات سعدی اپنے کمرے میں آنکھوں پر بازو رکھ لیتا، نیند میں تھا جب ایک دم اس کے وجود میں بے چینی سی پھیلی۔ وہ جھکلے سے اٹھ بیٹھا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اف۔ دی گوست اینڈ دی ڈار کنیس اتنی دفعہ دیکھنے کے باعث خواب بھی جنگلوں اور شیروں والے آرہے

تھے۔ وہ فلم کا منظر مسلسل پوری رات خواب میں دیکھتا رہا تھا۔ کیا زندگی میں یہ غارت گرم تھے جواب خواب میں بھی انہی کو دیکھنا ہوگا؟ وہ دایمیں جانب کروٹ لیتے، گال تلے دنوں ہاتھ رکھے، اسی فلم کی کہانی سوچنے لگا۔ وہ پیشل جیوگر افک ناپ کے چینل نہیں دیکھتا تھا، اس کا خیال تھا کہ انسانوں کے مسائل زیادہ توجہ طلب ہیں۔ مسز کاردار دیکھتی تھیں ایسے شوز۔ اکثر اس کو بتایا کرتیں۔ وہ سونے کی کوشش کرتے ہوئے، آنکھیں موندے گھوم پھر کرای نجھ پر سوچنے لگا... جواہرات... وہ مادہ غارت گر کی کہانی... اور اگلی ملاقات میں اس کی اتنی بے عزتی کرنا... وہ میری سے بات کر رہا تھا... ان کو اچھا نہیں لگا تھا... اس کا ذہن نیند میں ڈوب رہا تھا۔ میری کے الفاظ کی بازگشت ہر سو سنائی دے رہی تھی... وہ مجھ سے خائف رہتی تھیں سعدی... جیسے ان کو مجھ سے کوئی ڈر ہو... ان کی ایما پر فیونا نے مجھے نوکری سے نکلوایا۔ آخری دفعہ میں نے ان کو دیکھا تھا... اور انگریزیب کے باחרوم کے پچھلے دروازے سے نکلتے... پچھلے دروازے..... بیک ڈر... پچھلا دروازہ...  
”وہ ایک دم بھلی کی سی تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور چہرے پر پسینہ تھا۔ گھبرا کر وہ بستر سے اتر اور ساری بیال جلا دیں۔ پیشانی پر ہاتھ پھیرا جنم کانپ رہا تھا۔

پھر جلدی سے دروازہ ٹکٹھا تھا۔ چست گارڈ نے فوراً کھولا۔

”میری کو بلاو۔“ وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ گارڈ نے آواز دی۔ میری نیند سے بھری آنکھوں سے بھاگتی آئی۔ ”کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ سعدی نے اسے اندر آنے دیا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔

”اس کرے میں کوئی سمنے کا آللہ، کوئی ریکارڈ تو نہیں ہے نا؟“

”نہیں۔ یہ لوگ اتنے فارغ نہیں ہیں کہ تمہاری باتیں سیئں۔ کیا ہوا ہے؟“

”تم نے مسز کاردار کو اور انگریزیب کاردار کے باחרوم سے نکلتے دیکھا تھا نا؟“ وہ سانس روکے اس کو دیکھتے پوچھ رہا تھا۔ میری کے چہرے کا رنگ بدلا۔ آہستہ سے صوفے پہنچی۔ ”ہاں۔“ وہ تیزی سے اس کے سامنے بیجوں کے ملن بیٹھا۔

”اگر مسز کاردار کے دہاں سے نکلتے وقت اور انگریزیب زندہ تھے تو انہوں نے وہ دروازہ ضرور لاک کیا ہوگا۔ میں نے ساتھا ہاشم نے باחרوم کا دروازہ توڑ کر مردہ باپ کو دہاں سے نکالا تھا۔ یاد کرو میری..... یاد کرو۔ دروازہ توڑ نے سے پہلے پچھلا دروازہ چیک کیا تھا کسی نے؟“

”وہ لا کلڈ تھا۔“ میری خواب کی سی کیفیت میں بوی تھی۔

”کس نے چیک کیا تھا؟ تم نے؟“

”میں کرنے لگی تھی، مگر... مسز کاردار نے مجھے نو شیراں کو بلانے بھیجا، انہوں نے ہی چیک کیا تھا۔“

سعدی نے تھکنی تھکنی سانس اندر کھنچی۔ ”اور جب دروازہ ٹوٹا تو...؟“

”تو میں نے دیکھا، پچھلے دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ سعدی میں فلیپینو میڈ ہوں، میں گھر کے چھپے پنپے پر نظر رکھتی ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کنڈی کھلی تھی، مگر جب میں ڈاکٹر کو کال کر کے آئی تو کنڈی بند تھی۔“ وہاب بھی گویا نیند میں بول رہی تھی۔

”اوہ تمہیں ڈاکٹر کو کال کرنے مسز کاردار نے بھیجا ہوگا؟“ میری نے اثبات میں سر ہالیا۔ سعدی اٹھا اور اسٹڈی ٹیبل کی کری کھنچ کر بیٹھا۔ وہ گھری سوچ میں گم لگتا تھا۔ میری جیسے نیند سے جاگی۔ ”تم بھی وہی سوچ رہے ہو جو میں سوچ رہی ہوں سعدی؟“

”دش!“ اس نے ہوتوں پر انگلی رکھی۔ ”دیواروں کے کان ہوتے ہیں میری، اور یہ بات کسی اور کوئی نہیں معلوم ہوئی چاہیے۔“ پھر انگلیاں بالوں میں پھنساتے سر نیچ گرالیا۔ میری اب بھی بے لیقین تھی، مگر وہ جران نہیں تھی۔

”میں پچھلے ڈیرہ دو سال سے یہی سوچتی آئی ہوں سعدی۔ مگر میں اتنا برا نیچہ نکالنے سے ڈرتی تھی۔“ اس نے جھر جھری لی۔

”تم یہاں سے نکلنا چاہتی ہو میری؟“ اس نے ایک دم سراخا کر پوچھا تو میری کو اس کی آنکھوں میں چمک دکھی تھی۔

بڑے قیدی جن کے ہاتھ پیر زنجروں میں تھے وہ ایک دم سے سامنے آئے تھے، ان کے چہرے... اف... حمد خوف سے جنم گئی، مگر زمر نے کہنی شیخ کراستے سائیڈ پے کیا۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے انہیں دیکھتے آگے بڑھ گئے۔ جنین کے ہاتھ کا پنٹے لگے۔ وہ مشکل وقدم مزید چل پائی۔

”مجھے گھر جانا ہے؟ واپس!“ وہ ہمت ہار چکی تھی۔ زمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”میں نے کہا تھا تم لوگوں کو نہیں آنا چاہیے۔“

”میں تو ٹھیک ہوں۔“ سیم واقعی ٹھیک نظر آ رہا تھا مگر وہ رودینے کے قریب تھی۔

”آپ مجھے واپس چھوڑ کر آئیں۔ ابھی اسی وقت۔“ اس نے نم آنکھوں سے زمر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ گھری سانس لے کر واپس مڑ گئی۔ واپسی پر کورٹ روزم کے کھلے دروازے ان کے باہمیں ہاتھ تھے۔ حمد نے وحشت اور خوف کے احساس کے باوجود گاہے بلکہ ہے اندر جھاناکا۔ ایک سو دس دفعہ لعنت ہوا مریکی ڈراموں پر۔ وہ کورٹ روزم بالکل بھی امریکی ڈراموں میں نہ تھے۔ ہاں بھارتی فلموں سے تھوڑی بہت مشابہ رکھتے تھے، مگر بھارتی فلموں والے کورٹ روزم گندے میلے اور لوگوں سے کچھ کچھ بھرے ہوتے تھے۔ یہ صاف ستھرے تھے۔ لڑکی کا کام بھی سنہر اچک دار تھا۔ مگر ڈراموں فلموں کے بر عکس ان میں وہ کرسیوں کی لمبی لمبی دو قطاریں نہیں تھیں۔ بلکہ کریاں تو صرف دو تین پڑی تھیں۔ باقی اور پنج کا پنج اور دونوں طرف کٹھرے بنے تھے۔ شور ہی شور۔ وہ ڈراموں والی پر تقدس خاموشی ناپید تھی۔

کار میں واپس بیٹھتے ہوئے اس نے زمر سے کہا تھا۔ ”میں بالکل بالکل بھی وکیل نہیں بننا چاہتی۔“ اور خغلی سے اندر بیٹھ کر دروازے لاک کر دیے۔ سیم کو بھی اندر بیٹھا لیا۔ وہ ناخوش تھا مگر اسے اپنی بہن کا خیال رکھنے کے لیے وہاں بیٹھنا تھا کیونکہ وہ گھر کا بڑا مرد تھا۔

زمر بار بار گھری دیکھتے جب واپس آئی تو مجھ سیٹ کے کمرے کے باہر اسے احر کھڑا نظر آیا تھا۔ اس نے بھی زمر کو دیکھ لیا۔ سوتیزی سے قریب آیا۔ ”مسز زمر،“ وہ فکر مند لگ رہا تھا۔ ”میں نے بہت کوشش کی مگر آئی ایم سیوری میں پرچہ لئنے سے نہیں روک سکا۔ ہوا کیا ہے؟“

”اس کو بھر سے فریم کیا گیا ہے۔ مرڈ کیس ہے اور اس کے پاس alibi بھی نہیں ہے۔“

”اوہ ہو۔“ وہ ادھر ادھر متلاشی نظر وں سے دیکھ رہا تھا۔ زمر کو معلوم تھا کہ اسے کس کا انتظار ہے۔

”احمر، آپ کے بیہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”وہ میرا دوست ہے۔“ زمر نے گھری سانس لی۔

”فی الحال وہ ایسا نہیں سمجھتا۔“ احر نے ابر و تجب سے بھیخ۔ وہ جو ابا جتنے مختصر الفاظ استعمال کر سکتی تھی، کر کے ساری کھانا ڈالی۔

”امرکی فکر مندی، پریشانی میں بدلتی۔“

”جی، میں نے بھی کہا تھا ہوٹل والوں سے کہ میں جنس ڈیپارٹمنٹ سے ہوں، اور کیا کہتا؟ اس روز وہ ہارون صاحب کی رہائش گاہ پر آیا تھا تو اس نے مجھ سے سوال جواب کیے تھے، میں نے مختاط جواب دیے، جھوٹ نہیں بولا۔“

”اور ہاں آپ نے مجھے نیکست بھیجا تھا کہ آپ کو کال کروں؟ گیس وات وہ نیکست میں نے صبح دیکھا، کیونکہ وہ مجھ سے پہلے فارس کھول چکا تھا۔“ اور اس کی ٹون نہ چاہتے ہوئے بھی ملامتی ہو گئی۔ ”ایسی کیا خاص بات تھی؟“

احمر ایک دم شرمندہ ہو گیا تھا۔ ”وہ تو... کچھ بھی نہیں تھا۔“ ذرا راٹھر کر بتانے لگا۔ ”میں شادی کر رہا ہوں، فاطمہ سے، کیمپن ٹیم میں میرے ساتھ کام کرتی ہے، میں اسے مٹکنی کا کیا تھد دوں سکیں پوچھنا چاہتا تھا، پلیز براہم مانا یے گا، نہ میں آپ کا کوئی کوئی ہوں نہ دوست، مگر آپ سے زیادہ میرے حلقة احباب میں کوئی sophisticated نہیں ہے۔ صرف اس لئے۔ میں غازی کو دھاخت دے دوں گا۔“

زمر اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ ”خیز، مبارک ہو آپ کو۔“ مگر اس وقت، آپ کو دیکھ کر وہ کچھ الٹا سیدھا بول دے گا، آپ ابھی چلے جائیں۔“

جب وہ خٹھدا ہو جائے گا تو میں آپ کی ملاقات کروادوں گی۔“ اور وہ متالی متنبدب سالوٹ گیا۔

”اپنا خیال رکھنا فارس!“ وہ اب جانے کے لئے اٹھ رہی تھی۔ فارس بھی کھڑا ہو گیا۔

”عجیب بات ہے سارہ، سعدی کے بارے میں سو شل میدیا، پولیس، روپورز سب نے کہا تھا کہ اسے ”پبلے“ مارا پیٹا گیا، گولی ”بعد“ میں ماری گئی، کیونکہ گولیاں عموماً آخر میں ہی ماری جاتی ہیں، مگر اس کے ڈاکٹر نے ایک دن یونہی مجھے بتایا کہ ایسا لگتا ہے جیسے اسے ”پبلے“ گولیاں ماری گئیں، پھر مار پیٹ کی گئی۔“

”اس میں عجیب کیا ہے؟“ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔ فارس اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھتے ہوئے ہلاکا مسکرا یا۔

”صرف یہی کہ آپ کو یعنی درست ترتیب معلوم ہے۔“ سارہ کا سانس ایک دم تھم گیا۔

”نہیں، میں تو بنا سوچے بول رہی تھی۔ اب تو اپنی باتیں خود بھی نہیں یاد رہتیں۔“ بدقت مسکرا ای۔

”آف کرس، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔“ فارس نے سر کو ختم دے کر احترام سے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

سارہ کے جانے کے قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ زمر کے ساتھ اسی کرے میں بیٹھا تھا۔ سارہ کے برعکس وہ جو اس ماحول کی عادی تھی: سامنے بینیجی سنجیدگی سے نوٹ پیڈ پر قسم گھشتی اسے کل کالائج عمل لکھ کر بتاری تھی۔ (دیواروں کے کانوں کی کیا خبر) ساتھ ہی بار بار ششی کی چھوٹی بوتل سے پانی کا گھونٹ بھی بھرتی اور رکھ دیتی۔

”چونکہ بد قسمتی سے میں تمہاری دوکلی ہوں، اس لیے اپنے اور قمر الدین صاحب کے تعلقات کی تفصیل بتاؤ مجھے۔“

”مجھے یاد نہیں۔“ وہ بے زاری سے سر جھٹک کر دوسرا طرف دیکھنے لگا۔

”فارس اپنے نہیں چلے گا۔ میں تمہارا کیس کیسے لڑوں گی جب تم مجھے کچھ بتاؤ گے ہی نہیں؟“

”تو مت لڑیں۔ میں نے نہیں کہا لڑنے کو۔“ اس نے بینیجیدگی سے اسے دیکھتے شانے اچکائے۔ زمر نے بمشکل ضبط کیا۔

”میری بھی بھجوڑی ہے فارس غازی۔ کیونکہ میں نہیں بھوٹی کہ ہم ایک نیم ہیں! اس لیے مجھے کچھ بتاؤ تاکہ میں ٹرائل کی تیاری کر سکوں۔“

”وہ ٹیک لگائے، تا نگ پٹا نگ جائے، اسے دیکھتا رہا۔“ ”مجھے یاد نہیں۔“

”پھر رہو والات میں!“ وہ کھول کر اٹھی، شیشے کی بوتل اور فائلز اٹھا کیں اور دروازے کی طرف بڑھی۔

”جیسے اس ملک میں واقعی قانون نام کی کوئی چیز ہے۔“ وہ سر جھٹک کر بڑا بڑا تھا۔

”زمر دروازے پر کی۔ مڑی نہیں۔“ کیا کہا تم نے؟“

”جا میں زمر بی بی۔ میرے پاس آپ سے بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔“ اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”زمر دو قدم آگے آئی، فائلز میز پر دھریں، اور غرائی۔“ میں نے پوچھا... کیا... کہا تم نے۔“

”میں نے کہا، جیسے اس ملک میں واقعی قانون نام کی کوئی چیز ہے۔“

”زمر کے کان سرخ پڑے، چہرہ دہنکے لگا۔ خالی ہاتھ میز پر رکھ کر آگے کو جھکی۔“ کیسے کہہ سکتے ہو تم کہ اس ملک میں قانون نہیں ہے؟ اس ملک میں کوئی قانون پر چلنے والا نہیں ہے؟ اگر اس ملک میں کوئی ایماندار ہے، تو تمہارا بھائی کیسے ایماندار تھا؟ یہ ملک زندہ کیسے ہے اگر اس میں قانون نہ ہو؟ اور پلیز مرت شروع کرنا میرے سامنے اپنے ٹرائل کا ذکر۔ ہاں ٹھیک ہے، نہیں، ہو تو تمہارا فیفر ٹرائل، تم بڑی بھی بیک مینگ کے ذریعے ہوئے تھے۔ تمہیں ”اصاف“ نہیں ملا دعاالت سے، لیکن اپنے اس بد دماغ سے دماغ میں یہ بات بٹھا لو فارس غازی کی اس ملک بدلک دنیا کے ہر ملک کی عدالتیں، انصاف کی عدالتیں، نہیں ہوتیں، وہ ”قانون کی عدالتیں“ ہوتی ہیں۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو مجرموں کو ملک سے راتوں رات بھاگنا نہ پڑتا، لوگ گواہوں کو نہ خریدتے، پاسپورٹ پر بیک ڈیٹ میں ایکزٹ اسٹیمپ نہ

لگاتے۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو مجرم دھڑکے سے جرم کر کے عدالت میں تسلیم بھی کر لیتے مگر کوئی... کوئی نہیں تسلیم کرتا عدالت میں کیونکہ اسے پتہ ہے اگر تسلیم کر لیا تو فیصلہ قانون کے مطابق ہوگا۔ اسی ملک میں عدالتوں نے کئی دفعہ ہر خطرے اور ہر دھمکی سے بے خوف ہو کر بڑے بڑے نذر فیصلے بھی کیے ہیں۔ اسی ملک میں بڑے بڑے لوگوں کو ان چھوٹے چھوٹے مجرم نے جیل بھیجا ہے۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو کوئی ایک شخص بھی رات کو سونہ سلتا، مگر ہم سب سوتے ہیں، کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ ابھی اتنی بھی اندر ہرگز نہیں بھی۔ قانون کمودر ہے، بے بس ہے، مگر وہ ”ہے۔“ وہ ہے تب ہی تو اس سے گلہ ہے۔ اس ملک میں... فارس غازی... قانون... ہے... اور چاہے تم اسے مانو یا نہ مانو... وہ قانون مجھ سے تم سے ہم سب سے اوپر ہے۔ اس لئے آئندہ میرے سامنے یہ کہنے کی ہمت نہ کرنا کہ اس ملک میں قانون نہیں ہے۔ سنا تم نے؟ سنا تم نے؟“ بے ربط سانسوں کے درمیان غصے اور برہمی سے غراتے وہ کہہ رہی تھی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھا سن رہا تھا، جب زور کا چھنا کہ ہوا۔ زمر نے جو کانج کی نازک بوتل بے حدختی سے بھیجنگ کر کی تھی وہ اس کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تھی۔ ”آہ۔“ وہ ایک دم پیچھے کوہٹی۔ چھن چھن، مکڑے نیچے گرے۔

ایک دم ایپے دلے۔ پس بُن رے یپے دلے۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اس کا ہاتھ کپڑا۔ کافی اندر بھی لگا تھا اور خون بھل بھل گر رہا تھا۔ تیز تیز سانس لیتی زمر نے ناراضی سے ہاتھ نکالنے کی کوشش کی، مگر اس نے دوسرا ہاتھ سے اس کی کلائی بھی کپڑلی، پھر ایک خفاف نظر زمر کے دیکھتے گلابی چہرے پر ڈال کر آہستہ سے کافی بخوبی لئے گا۔ درد کی شدت سے اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر فروٹ کھوں لیں کہ ان میں پانی در آیا تھا۔

فارس نے کافی تھے نام، کہ میں تمہارے سامنے ٹوٹوں؟ روؤں؟، آنسو اندر اتارتی وہ اسی بھی سے بولی تو آواز بھیگی ہوئی تھی۔  
”یہی چاہتے تھے نام،“ کہ میں تمہارے سامنے ٹوٹوں؟ روؤں؟ جیسے انکار کرنے لگا تھا، مگر پھر خاموشی سے سر جھکائے کافی تھے نکلا۔ خون  
ایک دم تیزی سے بہنے لگا تھا۔ ہتھیلی کے عین وسط میں کٹ لگا تھا۔ اس نے ادھر ادھر کسی چیز کی تلاش میں دیکھا، مگر کچھ بھی نہ تھا، تو ایک ہاتھ سے  
اس کی کلائی پکڑے، دوسرا ہاتھ ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اپنے ہاتھ بھی خون آلوو ہونے لگے۔ چند بوندیں نیچے بھی گردی تھیں۔ دونوں اسی طرح چند  
لمحے کھڑے رہے، پھر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ انہیں گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ایک طرف میرے رخموں پر مرہم لگاتے ہو کہتے ہو کہ میں روڈ‘bossy’ غصہ و راجحی لگتی ہوں، روتے ہوئے نہیں، اور دوسرا طرف کہتے ہو مجھے گراہوا توٹا ہوا، رسوا اور ذلیل ہواد کینا چاہتے ہو؟ ان میں سچ کون سا ہے؟“ وہ اسی طرح زخم پر ہاتھ رکھ کر کھڑا تھا اور وہ پوچھ رہی تھی۔ ”اگر وہ ریسٹورانٹ والی باتیں سچ تھیں، تو کچھل ہربات جھوٹ تھی، یہ بھی جھوٹ ہے۔“ اس نے جھکلے سے اپنا ہاتھ نکالنا چاہا، مگر اس نے مزید مضبوطی سے کپڑا۔ ”اوہہوں، ایک منٹ خون رکنے دیں۔“

”پتہ ہے کیا فارس!“ وہ اسی شاکی انداز میں بولی تھی۔ ”تم دو دلوں کے ساتھ جی رہے ہو۔ ایک میں زرتاشہ سے محبت نہ کرنے کا گلٹ ہے، ایک میں مجھ سے بہت زیادہ محبت کر لینے کا گلٹ ہے۔ تمہارے یہ دونوں دل جھوٹ بولتے ہیں۔ زرتاشہ سے محبت تھی تمہیں، اور تمہاری سوچ سے زیادہ تھی۔ یہ صرف گلٹ نہیں ہے جس کی وجہ سے لڑ رہے ہو اس کے لئے۔ اور ہتھیں میں!“ اس نے ہمیکی پلکیں بند کر کے آنسو اندر اتارے اور جب آنکھیں کھولیں تو وہ خنک تھیں۔ ”تو مجھ سے تمہیں زرتاشہ سے کئی گناہ زیادہ محبت ہے، مگر وہ اتنی اوپنجی اور عظیم نہیں ہے کہ تم اس میں ہر چیز معاف کر دو۔ نہ وہ اتنی کمزور اور کھوکھلی ہے کہ تم اس میں مجھے گراہواد یکھن کی خواہش کرو۔ اللہ نے نہیں بنائے کسی آدمی کے سینے میں دو دل۔ تمہیں ایسے دل کو ایک جگہ ایک طرف رکھنا ہوگا، اور خود سے سچ بولنا پڑے گا۔“

فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ پھر چہرہ جھکائے اپنا تھا کہ ہٹا کر دیکھا، تھیلی کے کٹ سے بہت خون رک چکا تھا۔ اسی طرح اس نے زمر کا تھا اور پرکیا، اور بیوں سے لگایا۔ آنکھیں بند کیے۔ چند لمحے۔ چند سانسیں۔ پھر چھوڑ دیا۔ اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ ”اپنا خیال رکھا کریں۔“

”یہ بھی جھوٹ ہے۔“ زمر نے دکھ سے اسے دیکھا، اور اپنی چیزیں اٹھائے، باہر نکل گئی۔ پھر اٹھے قدموں واپس آئی، اور ادھ کھلا دروازہ زور سے دے مارنے کے انداز میں بند کیا۔ اس کی دھمک اب کتنی ہی دیر دنوں کے کانوں میں گوختنی تھیں۔

❖❖❖

وہ کہانیاں ادھوری، جو نہ ہو سکیں گی پوری ..... انہیں میں بھی کیوں سناؤں، انہیں تم بھی کیوں سناؤ؟  
ہاسٹل کے پرائیویٹ رومز کی راہداری میں سفیدی میاں روشن ہیں۔ چکتے فرش پان تینوں کا لکھ نظر آ رہا تھا۔ سفید اور آل پہنے، مونا  
چشم لگائے، اور بال جوڑے میں باندھے خین ایک فربی مائل نر سے بات کر رہی تھی۔ تبھی سیم نے اسے فرمادی سے دیکھا۔ ”حمد تم دیے کر  
لوگی جیسے پھپھونے کہا ہے۔“

”ہاں، مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ حمد نے شانے اپکائے، فولڈر سنجالا، عینک ناک پہ پیچھے دھکیلی اور سیم کو دیں چھوڑ کر نر س کے ساتھ  
آگے چل گئی۔

ہسپتال کی وباء اور شفاء سے رچی بسی فضای میں لمحے خاموشی سے چھلتے رہے۔ ایک کمرے میں بیڈ کی پانچی پہ بیٹھی خین، اب گلاسز  
اتارے سامنے نہیں دراز سنہرے بالوں والی لڑکی کو دیکھیوڑی بہت ہے۔

”آپ ساری تفصیل سن چکی ہیں، شزا۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں، آپ سے ملنے کے لئے یہ کرنا پڑا کیونکہ باہر سیکورٹی بہت ہے۔ یہ  
میرے بھائی کے کیس کی تفصیلات ہیں۔“ اس نے فالکھول کر شری امک کے سامنے کی۔ وہ پیچھے کو ہوئی بالوں میں ہمیر بینڈ لگائے، نقاہت زدہ  
مگر سپاٹ نظروں سے حمد کو دیکھ رہی تھی۔ ”وہ بھی اغوا ہوا تھا آپ کی طرح۔ آپ مل گئیں، وہ نہیں ملا۔ اس کو اغوا کرنے والا نیاز بیک... میری  
فیلمی کو اسے جیل میں منتقل رکھنے کے لئے آپ کے کیس کو وجہ بنانا پڑا۔ تب آپ کو ما میں تھیں۔ شکر ہے کہ اب آپ ٹھیک ہیں۔“ اس نے گہری  
سانس لی۔ شزا اب بھی خاموش تھی۔ نر س دروازے پرے چینی سی کھڑی تھی۔

”ایک ہفتہ آپ کو ہوش میں آئے ہو گیا ہے، لیکن آپ اپنے مجرموں کے بارے میں کوئی بیان نہیں دے رہیں۔ میں جانتی ہوں کہ  
آپ خوفزدہ ہیں۔ آپ بہت تارچہ سے گزری ہیں۔ ہم بھی گزر رہے ہیں۔ اسی لئے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اپنے مجرموں کا نام آپ لیں یا نہ  
لیں، لیکن اس شخص نیاز بیک کو جیل سے نہ نکلنے دیں، تاکہ کل کو کوئی اور شری ایسا سعدی نہ اغوا کیا جاسکے۔ اور ہاں...“ اس نے اضافہ کیا۔ ”آپ کو  
اپنے مجرموں کے خلاف کوئی مدد چاہیے ہو تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“ گویا دیوار سے بولتے بولتے وہ چپ ہو گئی۔ اب مزید کیا کہے۔

”تمہیں پتہ ہے دنیا میں کتنی آوازیں ہوتی ہیں؟“ وہ حمد کے پیارے پندرہ سالے تینی سے گویا ہوئی۔ خین کے ابر و تجھ سے  
اکٹھے ہوئے۔ ”سوری میں...“

”آن گنت۔ دنیا میں ان گنت آوازیں ہوتی ہیں۔ جسم کے پھر میں زمین پہ گھینٹنے کی آواز، کمر سے پھر رکڑنے کی خراشوں کی آواز...  
سوکھے پتوں اور جھاڑیوں پر کھینچنے جانے کی آواز... بیچ جگل کے آپ کو لا پختنے کی آواز... پھر رکڑھا گھونے کی... مٹی باہر پھینکنے کی آواز... بالوں  
سے کھینچ کر رکڑھے میں ڈالنے کی آواز... باتھوں سے مٹی اوپر ڈالنے کی آواز... بے ترتیب سانسوں کی آواز... مٹی کے اوپر پتے ڈالنے کی... پھر  
سوکھے چمر پتوں پر دور جاتے بھاری بوٹس کی آواز... پھر جگل کی خاموشی کی آواز... زندہ قبر کے اوپر سانپ رینگنے کی آواز... پرندوں کے ایک  
دم سے درختوں سے اڑ جانے کی... جگلی سوروں کی آواز.... ان کے آپ کے اوپر پتوں کو سو گھنٹے پھرنے کی آواز... کتوں کی بھوک... کیڑوں  
کے جسم پر رینگنے کی آواز... خنزیروں کے بدیو دار سانسوں کی آواز... رات کی تار کی کی ہونا ک آواز... گدھوں کے اوپر منڈلانے کی  
آواز.... پھر دور کہیں انسانوں کی آواز... خنزیروں کے بھاگ جانے کی آواز... آتے قدموں کی آواز... تمہیں پتہ ہے دنیا میں کتنی آوازیں  
ہوتی ہیں؟“ وہ پھر میلے چہرے اور سرخ آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھی اور خین بالکل ساکت، اب کھولے سن رہی تھی۔

”میں نے بہت سی آوازیں سنی ہیں، اس جگل میں نیم مردہ حالت میں پڑے۔ میں اس لئے خاموش نہیں ہوں کہ میں خوفزدہ ہوں یا میرے ذہن پر اثر ہو گیا ہے۔ مجھے تمہاری یا تمہارے بھائی کی مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے، کیونکہ کوئی بھی حتیٰ کہ بھائی بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کے لئے کچھ کہا جائے۔ تم حاکمی ہو۔“

ہوئے رانے کے پھیلیا جائے۔ اب س. ج۔ ہکابا بیٹھی حندے ایک دم اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ بے ترتیب سانسوں اور سفید چہرے کے ساتھ وہ تیز تیز چلتی راہداری کا موڑ مزدی تو سیم انتظار کر رہا تھا۔ ”تم نے کر لیا، نہ؟“ وہ آگے چلتی گئی۔ سیم پیچھے لپکا۔ خینن نگی میں سر ہلاتی تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ سیم دیکھ سکتا تھا کہ وہ جس چہرے کے ساتھ گئی تھی، اس کے ساتھ دا پس نہیں لوٹی تھی۔

عداوت ہی عداوت ہے، محبت بھول بیٹھا ہوں ..... چلو کوئی تو رشتہ ہے اسے پھر یاد کرنے کو زمر کے جانے کے بعد سے وہ لاک آپ میں قید تھا۔ دیوار کے ساتھ اکڑوں بیٹھئے، گھری سوچ میں گم۔ بار بار اس کی زرد رنگت زگا ہوں میں گھومتی تھی۔ (تم مجھے ٹوٹا ہواد لکھنا چاہتے ہو نا!) فارس نے سر جھکا۔ ”ہاں میں ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں آپ کو۔“ اس نے آنکھیں بند کیں۔ ذہن کے بردے سے ایک منظر سا سوچنا چاہا۔ اس کی فرضی خواہش کا منظر... مگر پھر تکلیف سے آنکھیں کھول دیں۔

بندیں۔ ان کے پردے پایک سرسر سوپاچا گھا۔ اس کو سوس دے۔ ... دیکھو۔ خوشی تو زمر کے لازم اور ان تمام طرز و طعنے بھری باتوں سے بھی نہیں یہ تصور وہ تھا جو وہ چاہتا تھا، پھر اس کو سوچ کر کہ کیوں ہوتا تھا؟ خوشی تو زمر کے لازم اور ان تمام طرز و طعنے بھری باتوں سے بھی نہیں ہوتی تھی، اصولاً تو اس کو پھوٹی شرمندہ لڑکی کو تصور میں دیکھ کر خوشی ہونی چاہیے تھی، مگر نہیں ہوتی تھی۔ اسی لئے تو کی تھی اس سے شادی، وہ اس کو خود اذیتی کا شکار کرے گا، خصیر کی ملامت سے گھیر لے گا، پھر یہ سوچ کر خوشی یا تسلیم کیوں نہیں ملتی تھی؟ کیا وجہات وہی تھیں جو وہ سوچتا تھا؟ پاجوہ سوچتا تھا وہ صرف توجیہات تھیں؟

حوالہ سرگزیوں کے پار مہم روشنی تھی۔ اس روشنی کو بے خیالی سے دیکھتے فارس غازی کا ذہن ایک دفعہ پھر پچھے چلا گیا۔۔۔۔۔

ولایت بیگم گھر اس نے کیوں چھوڑا تھا؟ وہ کیوں ایک رات گھر سے نکلا تھا؟ وہ چاہتا بھی تو نہ بھلا سکتا تھا۔

اسے یہ معلوم ہوا لایا۔ دل میں باہمی رہنے کے سینیوں پر۔ علیمہ کارو دیان کے ساتھ عجیب ساتھا۔ ولایت بیگم کے ولایت بیگم کی وفات کے بعد ندرت اور وارث کو ابوائیسی میں لے آئے۔ علیمہ کارو دیان کے ساتھ عجیب ساتھا۔ ولایت بیگم کے گھر میں وہ بس ہوتی تھی، یہاں وہ مالکن تھی۔ غلنہمیں کرتی تھی، ہر شے مہیا کرتی تھی، ہر سہولت، ہر آسانی، مگر ان سے بات نہیں کرتی تھی۔ ندرت کے اپنے غم بہت تھے۔ شادی کے بعد شوہر سے ناراضی اور شیرخوار بچے کو سرمال والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آنے کا غم وہ بہت دلکش تھی۔ وارث خاموش رہتا تھا۔ جیسے نہ کسی سے محبت ہونے کی سے مگل۔ پھر آہستہ آہستہ وقت بدلا۔ ندرت اسکے کام کرنے لگ گئی۔ اس کا خیال

رکھنے لگتی۔ وہ چھوٹا تھا، وارث سے بھی کافی چھوٹا، ندرت کو اس میں سعدی نظر آنے لگا تھا۔ وہ بھی بھی بے خیالی میں اسے سعدی بھی پا کر دیتی، وہ برما نے بغیر چپ چاپ آ جاتا تھا۔ اس کی صحیح نیں کرتا تھا۔

وارث لگا سر لگاتا تھا۔ پڑھتے وقت بھی، اُنہی دی دیکھتے وقت بھی۔ سرما کی ایک شام وہ ایکسی کے لاکنچ میں بیٹھے تھے جب ابو نے وارث سے کوئی شے ڈھونڈنے کو کہا، تو وہ جو بغیر عینک کے بیٹھا تھا، سادگی سے بولا کہ اس کی عینک ٹوٹ گئی ہے، وہ نہیں ڈھونڈ سکتا۔ ابو نے وہی کام فارس سے کہہ دیا۔ فارس خاموشی سے اٹھا، اور اندر گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں وارث کی عینک تھی، جس کے ششے نکل ہوئے تھے۔ عینک اس نے وارث کے سامنے رکھی۔ ”اس کے ششے ہوتے تب بھی وہ زیر نمبر کے تھے۔ ان سے تمہاری نظر پر کوئی فرق نہ پڑتا۔ جاؤ، اور جواب نے کہا ہے وہ ڈھونڈ کر لاؤ۔“

اس نے یہ الفاظ بہت آہستہ سے کہے تھے۔ اُنہی کا شور تھا، اور ابو دور تھے، سن نہ سکے۔ وارث کا رنگ سفید پڑا۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اس وقت تو وہ چپ چاپ اٹھ گیا، لیکن رات کو اس کے ساتھ والے سنگل بیٹھ پڑتے اس نے پوچھا تھا۔ ”تمہیں کیسے پہتہ کہ میری نظر کمزور نہیں ہے؟“

”مجھے پتہ ہے۔“ وہ چلتے لیے چھت کو دیکھتے بولا تھا۔

”میں اس لئے لگاتا ہوں کیونکہ مجھے عینک اچھی لگتی ہے۔“ پکھد دیر بعد اس نے خود ہی وضاحت دی۔ فارس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا، وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ تم پاچھی نہیں لگتی، اس سے تمہاری آنکھیں اندر کو ڈھنس جائیں گی، مگر اس نے وارث کا چہرہ دیکھا، اور اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ اس کی خوشی چھین لے۔

”ہاں یہ تم پاچھی لگتی ہے۔“ اس دن کے بعد ان دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کرنے کے لئے بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ وارث اس کا دوست بن گیا، وہ بھی کبھی اس کوڈانت بھی دیتا تھا، جب اسکوں میں فارس کسی سے لڑکر، کسی کا دانت توڑ کر آتا تو وارث غصے سے اس کو کار سے پکڑ کر جھبھوڑتا۔ ”یوں لڑتے رہو گے لوگوں سے تو جیل میں پڑے ہو گے کسی دن۔“ اور اب فارس سوچتا تھا، کہ وہ جیل اس لیے گیا تھا کیونکہ اس دفعہ وارث لڑا تھا!

امی کی وفات کے بعد اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ سارا سارا دن سڑکوں پر آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ بے مقصد، بے رونق زندگی کو ایک دم وہ صرف گزارنے لگا تھا۔ کبھی دوستوں کے ساتھ کسی طرف نکل گیا۔ تو کبھی اکیلا کسی ٹرین میں بیٹھ گیا۔ وارث لاہور تھا، ندرت اپنے گھر میں خوشی اور ابو کو وفات پائے تو عرصہ بیت چکا تھا۔ فارس کی زندگی میں اکتا ہے، بے گاں بڑھ گئی تھی۔ اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ پکھد دوستوں کے ساتھ وہ شکار پچانے لگتا تھا۔ اس باپ کا چھوڑا ہوا پیسہ وہ جھونکتا جا رہا تھا۔ وہ گز نہ وہ خوبصورت گز نہ جن کو ہاتھ میں پکڑ کر تاک کر کسی پرندے کی طرف نشانہ باندھنے کی کیفیت اور سروہی کچھ اور ہوتا تھا۔ وہ گز نہ اس کا جنون بنتی گئیں۔ ندرت اس کی حالت اور یہ آوارگی، دیکھ کر اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ عام حالات میں وہ بہن کے گھر جا کر نہ رہتا، مگر اپنے گھر میں ذہن ایسے پراغنڈہ رہتا تھا کہ وحشت ہونے لگتی۔ حمد تب تین سال کی تھی۔ سعدی اسکوں جاتا تھا، ایک وہی ہوتی تھی جو دن رات اس کے ساتھ بیٹھ کر با تیں کرتی تھی۔ اتنا بولتی کہ الامان۔ یہ کیوں ہے؟ یہ کیا ہے؟ وہ بھی زیج ہو جاتا، کبھی ہنس دیتا۔ زندگی انہی دو اختراؤں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

وہ پڑھائی میں ہر گز ترے دن نکلا ہوتا جا رہا تھا۔ دور کے شہروں، جنگل، بیبانوں میں جانا، کئی کئی دن گھر نہ لوٹنا، عجیب تھی اس کی زندگی بھی۔ وارث فون پ غصہ کرتا رہتا، وہ فون بند کر دیتا۔ ندرت پیار سے سمجھا تیں وہ دوسرے کان سے نکال دیتا۔

پھر ایک دن ندرت کے سر آئے۔ پتہ نہیں ندرت نے ان سے کیا کہا تھا کہ جب وہ ان کے پاس اکیلا چپ اور بے زار سا بیٹھا تھا، تو وہ اس سے باتوں باتوں میں پوچھنے لگے۔ ”تم کیا کرو گے آگے؟ کیریئر کے حوالے سے؟“

”جس چیز کا مود بننا۔“ اسے لگا بھی لیکچر شروع ہو گا، سومریدا کتا گیا۔

”تمہاری زندگی میں ترجیحات کیا ہیں؟“

”کیا؟“ وہ واقعی الجھاتھا۔

”تمہاری ترجیحات؟ کس کو سب سے اوپر کھتے ہو؟ کس کے لئے سب کچھ کر سکتے ہو؟“

فارس لمحے بھر کو چپ ہوا۔ ”اپنے خاندان کے لیے۔“

”وہ تو بھی ہے نہیں۔“

”ہے تو سبھی۔“

”خاندان یوں اور بچوں کا نام ہوتا ہے۔ میں جانتے استحقاق سے اس گھر میں آتا ہوں، اس لئے کہ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔ کیا میں اپنے بھائی یا بہن کے گھر اتنے استحقاق سے جا سکتا ہوں؟ حکم چلا سکتا ہوں؟ نہیں۔ وہ بھی میرا خاندان ہیں، لیکن اس عمر میں آ کر یوں بچ سب سے پہلے آتے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو زندگی میں؟“

وہ متذبذب رہا۔ زیادہ بات نہیں کر سکا، مگر چند دن وہ سوچتا رہا۔ پھر ایک دن وہ ان کے گھر گیا۔ معلوم ہوا تھا کہ ان کی بیٹی کا جیزہ جل گیا ہے، بہت نقصان ہوا ہے۔ وہ افسوس کے لئے گیا تھا، مگر ان کے پاس بیٹھے اس نے ان سے کہا تھا۔

”میری ترجیحات ایک سادہ زندگی کی ہیں۔ میری یوں میرے بچے، ایک چھوٹا سا گھر، جس میں کوئی پیچیدگیاں نہ ہوں۔ کوئی سازشیں، کوئی منافقت، کوئی دوسری یوں کے جھگڑے نہ ہوں۔ ایک سادہ زندگی گزاروں میں۔ نائن ٹو فائیو کی جا ب، اور گھر کا سکون۔ یہی چاہتا ہوں میں۔“

”پھر محنت کرو۔ اپنی یوں اور بچوں کا سوچ کر محنت کرو، کہ تم ان کو کیا دے سکتے ہو۔“ اور اس گفتگو نے فارس کی سوچ بدل دی تھی۔ وہ جیسے کسی لمبے خواب سے جا گا تھا۔

آنے والے سالوں میں خود پر خوانجواہ کے چڑھے قرضے پڑھائی کی تکمیل، نوکری، ہر فرض کی ادائیگی میں ندرت کے سرنے اس کی مدد کی تھی۔ ان سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا، (سوائے دور پار کی رشتے داری کے) مگر احسانات بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ان کی بات جیسے سنتا کسی اور کی نہیں سنتا تھا۔

وہ نوکری میں اچھا جا رہا تھا، سادہ زندگی سادہ ہی چل رہی تھی، لیکن پھر اسے اندر وہ سندھ بھیج دیا گیا۔ وارث اگلے ماہ اس سے ملنے آیا تو محنت برہم تھا۔ ”تم نے مجھے کہا کہ تمہاری سندھ میں پوستنگ ہوئی ہے!“

”اورنہیں تو کیا؟“

”تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں یہاں سزا کے طور پر بھیجا گیا ہے۔“ وہ بے حد تنخ پا ہو رہا تھا۔ فارس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔“

”یہی بات تم نے کہی تھی اپنے ڈائیریکٹر سے۔ فارس تم نے غلط کیا ہے۔ اس بینک آفیسر کے اریسٹ وارنٹ نکل رہے تھے اور تم نے اسے اطلاع دے دی تاکہ وہ صفائی قبول از گرفتاری کروالے!“

”پہلی بات، میں نے کوئی شوت چھوڑا نہیں، دوسری بات، وہ بینک آفیسر تین چھوٹی چھوٹی بیٹیوں کی ماں ہے اور بے گناہ ہے۔“

”تو وہ اس کے ٹرائل میں ثابت ہو جائے گا کہ وہ بے گناہ ہے۔ تمہیں بیچ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”وارث وہ ایک جوان، مدل کلاس عورت ہے، اگر وہ بے گناہ نہ ہوتی تب بھی میں اس کو خبردار کرتا، صفائی اس کی چوبیں گھنٹوں

میں ہو ہی جاتی لیکن اگر وہ ایک رات بھی حوالات میں گزار دیتی، تو وارث اس کی زندگی بر باد ہو جاتی۔ مرد کئی سال بھی جیل میں رہے تو کچھ نہیں ہوتا، عورت کو کون قبول کرے گا بعد میں؟ ہاں ٹھیک ہے میں نے جرم کیا ہے۔“ وہ بھی برہی سے بول رہا تھا۔“ لیکن مجھے دس بار ایسا موقع ملے میں تب بھی بھی کروں گا۔ کیونکہ میں اسی معاشرے میں رہتا ہوں جہاں جیل میں ایک رات بھی رہی عورت کی بیٹیوں کی شادیاں نہیں ہو پاتیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے، کیونکہ جو قانون روٹی نہیں دے سکتا، وہ ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ بھلے اس کی پاداش میں مجھے کتنے ہی سال اس چھوٹے شہر میں پوشٹ رہنا پڑے۔“

”فارس!“ وہ تحک کر ساتھ بیٹھا اور سمجھا نے لگا۔ ”دیکھو“ صحیح“ کام کرنے کے لیے قانون تو زنا ضروری نہیں ہے۔ میں باقی دی بک کام کرنے والا آدمی ہوں، وہ بھلائیٹ رو یہ ڈر اتا ہے۔ اگر ان کو کوئی ثبوت مل جاتا تو تم جیل بھی جاسکتے تھے، اور اگر تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو، تو میں اگلے پانچ سال بعد تمہیں جیل کی سلانخوں کے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔“ سمجھاتے سمجھاتے دخفا ہو گیا تھا۔“ اور پتہ ہے میں تمہیں اگلے پانچ سال بعد کہاں دیکھ رہا ہوں؟“ وہ آگے ہو کر سنجیدگی سے وارث کی آنکھوں میں جھا ٹک کر بولا تھا۔ ”اسی نقلي عينک کے پیچھے!“ اور ایک دم وہ دونوں ہنپڑے تھے۔“ آہنی سلانخوں کو دیکھتے ہوئے وہ خی سامسکرا یا تھا۔ اسے جیل میں سب سے زیادہ وارث یاد آتا تھا۔

❖❖❖

ہو نہ سکا کبھی ہمیں اپنا خیال تک نصیب ..... نقش کسی خیال کا لوح خیال پر رہا اس مصروف شاہراہ پر اس نوبجے اچھی خاصی سردی ہونے کے باوجود ریفک کی گہما گہما لگی تھی۔ ساتھ ہی قطار میں ڈرائیور شاپس تھیں جن کے سامنے زمزکنے پر گاپرس مضبوطی سے پکڑنے ملائشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی چل آ رہی تھی۔ وہ تبر کی جب اسے وہ نظر آیا۔ کنارے پر کارکھڑی کیے، ڈرالا سوئٹر پہنے اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا۔“ احر۔ مجھے دیر ہو گئی نا؟“ مغدرت خواہانہ انداز میں جلدی جلدی کہتی قریب آئی۔ ”کیا وہ لڑکا آ گیا؟“ احر چونک کرم اپھر فخر سے سر کو ختم دیا۔

”جی، اور کام بھی ہونے والا ہے۔“ مسکرا کر سامنے اشارہ کیا۔ زمر نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں پولیس کا ناکہ تھا اور ایک نوجوان اپنی کار سے نکلا کھڑا حیرت اور تجھ سے سیکورٹی افران سے بات کر رہا تھا جو ایک دم سے اس کو گھیر کر اس سے باز پر س کر رہے تھے۔ وہ صرف پولیس الہکار نہیں تھے۔ بلکہ کسی دوسرے محکمے کے افران بھی تھے۔

”وہ چیزیں اس کی کار میں ڈالا دی تھیں نا احر؟ پولیس اس کو اریست کر لے گی نا؟“ گلمندی سے وہ بولی تھی۔

”جی۔ جب یہ گیس بھروانے پہ پہ رکھا تو میرے لڑکے نے ایک بیگ اس کی ڈگی میں رکھ دیا تھا۔ بیگ میں اس لڑکے کے آئی ڈی کا رڈ کی کاپی اور اس کے ڈائیوینگ لائننس کی کاپی بھی ہے، وہ انکار بھی کرے بن بھی وہ لوگ اس بیگ کو اسی کی ملکیت سمجھیں گے۔“

”اوکے۔ تھیں کیمپ یو۔“ ہر چیز پلان کے مطابق جاری تھی اسے ذرا سکون ملا۔ ”کافی ساری ڈرگز ڈالی ہیں نا؟“

”ڈرگز؟“ احر نے نگاہوں کا رخ موڑا۔ ”کون ہی ڈرگز؟“

زمر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”احمر، اس کے بیگ میں ڈرگز ڈالنے کو کہا تھا میں نے آپ کو تاکہ پولیس اسے گرفتار کرے۔“

”میں آپ کو شکل سے کوئی ہیر و ن آسکلگا تھا ہوں یا بذات خود کوئی ششی لگتا ہوں جو میرے پاس ڈرگز ہوں گی؟ نہیں آج آپ مجھے تاہم دیں کہ میں آپ کو کیا لگتا ہوں۔“ وہ بہت ہی دخفا ہوا تھا۔ زمر کا دماغ ویسے ہی آج کل گھومارہتا تھا اب تو مزید کھول گیا۔

”احمر، آپ نے کیا ڈالا ہے اس کے بیگ میں؟“ پریشانی سے ان لوگوں کو بھی دیکھا۔ آفسرز کے پاس کئے بھی تھے اور وہ گھوم گھوم

کراس کے سامان کو سونگھر ہے تھے۔ لڑکا ابھی تک بحث کر رہا تھا۔

”دیکھیں، یہ ڈرگز، یہ اسلخ، یہ کرنی اسٹنگ..... یہ میوزیم کے نوار دات سارے انگریزی فلموں والے گھے پے آئندیا زیست تھے۔ میں نا بڑا اور پچل بندہ ہوں۔ میں نے سوچا کوئی پاکستانی چیز ٹرانی کروں۔ وہ دیکھیں۔“ فخر سے مسکرا کر اس طرف اشارہ کیا۔ زمر پر بیان سے ادھر دیکھنے لگی۔ وہ لوگ اب ڈگی کھو لے کھڑے تھے۔ دھنٹا ایک آفیسر نے بھورا بیگ کھولا اور پھر گویا شور مچا دیا۔ باقی الہکار بھی ادھر ہی لپکے۔ لڑکا حیران پر بیان وضاحتیں دے رہا تھا۔ زمر نے ایڑیاں اوپھی کر کے دیکھنا چاہا۔ بمشکل ایک آفسر سامنے سے ہٹا تو کھلے بیگ کا دہانے نظر آیا۔ اور اس کے اندر۔

”کچھوے!“ وہ بے یقینی سے احر کی طرف گھوی تھی۔ ”استغفار اللہ احمد، آپ نے کچھوے ڈال دیے؟“ دل چاہا، اس کو زمین میں گاڑ دے۔

”پورے بچپاں کچھوے۔“ اس نے اسی تفاخر سے اس طرف اشارہ کیا۔ دور سے اتنا پتہ چلتا تھا کہ اس بیگ میں چھوٹے چھوٹے شامی کتاب کے سائز کے کچھوے چل رہے تھے۔ زمر نے ماٹھے کو چھووا۔

”اف احمد... آپ کو مذاق لگتا ہے یہ سب؟“

”دیکھیں ممز زمرا!“ وہ سنجیدہ ہوا۔ ”اگر ڈرگز ڈالتی یا اسلخ، تو وہ گرفتار ہو جاتا، لیکن صبح سے پہلے تک باہر ہوتا۔ سوائے والملہ لاکف والوں کے کوئی بھی محکمہ اس کو کل دو پھر تک نہ رکھتا۔“

”کچھوے احمد!“ وہ اب بھی شدید نالاں تھی۔

”یہ والملہ لاکف والوں کے خاص *spotted* کچھوے ہیں، صبح ہی چوری ہوئے ہیں۔“ مسکرا کر آنکھ دبائی۔ ”یہ لڑکا کل سنگا پور جا رہا ہے، سنگا پور میں ایک کچھوہ کئی ہزار کا بکتا ہے۔ وہ لوگ کچھوے کھانے کے شو قین ہیں مگر وہاں پابندی ہے اس کے شکار پر کیونکہ اس معصوم کی نسل ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ سو ہمارے ہاں سے لوگ اسمبلی کرتے ہیں۔ بی پاکستانی۔ بی پاکستانی۔“

زمرنے صرف گھور کر اسے دیکھا اور سامنے دیکھنے لگی جہاں والملہ لاکف کے الہکار اس لڑکے کو ٹھکری لگا رہے تھے۔ اور وہ مسلسل چلا رہا تھا۔ زمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ آئندیا کچھ اتنا برا بھی نہ تھا۔ لیکن احر شفیع کو شکریہ کہنا.... ناممکن!

وہ گھر آئی تو خنین اس کے کمرے میں چلت لیتی، چھت کو دیکھتی، ایوس نظر آ رہی تھی۔ بیک اور موپائل رکھتے ہوئے اس نے حد کو مخاطب کیا۔ ”شرا کا کیا بینا؟“

”میں نہیں کر سکی۔“ وہ شرم مندہ تھی۔

”اوکے! میں خود اس سے بات کر لوں گی۔“ خنین سیدھی انٹھ بیٹھی، بے چینی سے اسے دیکھا۔ ”وہ تکلیف میں ہے، اس کو اکیلا چھوڑ دیں۔“

”خنین، اس کی صحت اب بہت بہتر ہے۔ اور ہم اس کی مد بھی کریں گے اس کے مجرموں کو پکڑنے کے لیے۔“ وہ بال برش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہاتھ پہ پیٹ بندھی تھی۔ حمد کو نہیں نظر آئی۔ وہ کہیں اور تھی۔

”وہ اب بھی وہی آوازیں سنتی ہے۔ جنگل کی جانوروں کی، خنزیروں کی، اور...“ خنین ایک دم ساکت ہوئی۔ چونکہ کر زمر کو دیکھا۔ پھر رکا کیک بستر سے اتری اور ننگے پیر بھاگتی باہر نکل گئی۔ زمر سر جھٹک کر رہ گئی۔ حمد اب تیز تیز زینے پھاٹکتی تھہ خانے کی طرف جا رہی تھی۔ اسے ابھی بھی کچھ یاد آیا تھا۔

بے وفا کی گھڑی، ترک مدارات کا وقت ..... اس گھڑی اپنے سوانہ یاد آئے گا کوئی عالیشان بلند بالا سا بلکہ تھا جس میں صبح کی ٹھنڈا اور سرما کی دھوپ مل جل کر آٹھ بھریں تھیں۔ ملازم خین کوڈ رائینگ روم میں بھاکر چلے گئے تھے۔ وہ شرا کی دوست تھی اس نے بھی کہا تھا۔ اس روز کے برعکس وہ کھلے بالوں پر ہیر بینڈ لگائے ہاتھ میں فائل فولڈر کپڑے ناگ پٹاںگ جمائے بیٹھی کافی پر اعتماد نظر آرہی تھی۔ کھڑکی سے باہر لان میں منتظر بیٹھا اسمانہ نظر آرہا تھا۔

چوکھت پٹشرا کھڑکی دھکائی دی تو خین جگ سے اٹھی۔

”میں نے کہا تھا، مجھے تمہاری مد نیبیں کرنی۔“ وہ بے نیازی سے پلنگی تھی۔

”تم نے کہا تھا، تمہیں بھاری بوٹس کی دھمک سنائی دی تھی، تم نے کہا تھا، کوئی بھائی اس قابل نہیں ہوتا کہ اسکے لئے کچھ کیا جائے۔“

شرا چونک کراس کی طرف گھوئی۔ حنفولڈر سے کاغذ نکال کراس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ”تمہارا تو کوئی بھائی نہیں ہے شرا۔ مگر تم عادتاً اپنے بہنوئی سرمد شاہ کو بھائی کہہ کر پکارتی ہوئی۔“ کاغذ اس کے چہرے کے آگے لہرایا۔ شرا کے ان باکس میں سرمد کی میلو کے پرنٹ آؤٹ۔ شرا کی رنگت سفید پڑی۔ ”اس نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری بہن کو چھوڑ دے گا، تمہیں اپنا لے گا، اور جس دن تم اخوا ہوئی، اس روز اسی نے آتا تھا تمہیں پک کرنے۔ اسی نے کیا ہے یہ سب! مگر لکتنا ادا کار ہے وہ۔ جب میری نیلی نیاز بیک کو اس کیس میں پھنسانا چاہا، تو اس نے ایسی اچھی ادا کاری کی کہ ہم سب بھی کنوش ہو گئے کروہ اپنی ”بہن“ کا مجرم نیاز بیک کو ہی سمجھ رہا ہے۔“

شرا اسٹک کے سہارے چلتی چپ چاپ سامنے آ کر بیٹھی۔ بھیگ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں کسی کو نہیں بتا سکتی کیونکہ سب کو میں قصور والوں گی۔ کوئی نہیں مانے گا کہ میر اس سے تعلق صرف پسندیدگی کا تھا۔“ وہ ایک دم نکست خوردہ لگنے لگی تھی۔ کچھ دریگی اسے کھلنے میں۔

”میں یہ تعلق ختم کرنا چاہتی تھی، میں چھپ چھپ کر فون پہ بات کرنے والے لگت سے بیک آگئی تھی، اسی لیے اس نے بلا یا تو میں ملنے چلی گئی۔ مجھے نہیں پہنچتا تھا وہ یہ سب... آواز زندہ گئی۔“ تم نہیں سمجھ سکتی میں کیا محسوس کر رہی ہوں!

خین اس کے سامنے دھیرے سے بیٹھی۔ ”میں سمجھ سکتی ہوں شرا۔ تم نے ایک غلط آدمی سے محبت کی، جو تمہارا رشتے دار تھا، تم سے عمر میں بڑا تھا، تم اسے بھائی کہتی تھیں۔ اور اس نے... اس نے تمہاری حوصلہ افزائی کی۔“ اس کے اندر بہت کچھ اٹکا۔ ”اس کے لیے تو یہ محض وقت گزاری تھی۔ تمہارے لیے یہ رودگ تھا۔ تم بیک وقت اس سے بات کر کے خوش بھی ہوتی تھیں اور کلٹی بھی۔ تم دو لوں کے ساتھ جی رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے تمہیں بلا یا۔ تم چلی گئیں۔“ بہت کچھ یاد آیا تھا۔ ”تمہیں نہیں پہنچتا کہ وہ ایک کرمنل بھی ہے، تم جاتی یا نہ جاتی، تمہیں کبھی نہ کبھی پہنچتا چلی ہی جاتا۔ اور تب بھی تم دھصولی میں بہت جاتیں جیسے اب تھی ہوئی ہو۔ تمہارا ایک دل اس سے شدید محبت کرتا ہے، دوسرا دل اس سے نفرت کرتا ہے۔ ایک طرف تم اس سے انقام لیتا چاہتی ہو۔ مگر انقام خوشی نہیں دیتا۔ دوسری طرف تم اب بھی، اس سب کے بعد بھی، دور اندر اس کو پاتا چاہتی ہو، مگر اب خوشی پانے سے بھی نہیں ملے گی۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”تم ساری آوازیں بھول جاؤ اور اپنی آواز اخھاؤ، تمہاری آواز کے پس منظر میں ہر شے غائب ہو جائے گی۔“

”نہیں کر سکتی! وہ سارا الزرام مجھ پڑاں دے گا۔ بابا اور عائزہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔“ بے بسی سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

”کتنے لوگوں کو پہنچتا ہے کہ تم اس سے یوں میسجھ پہ بات کرتی تھی؟“

”صرف مجھے اور سرمد کو!“ آواز کپکپائی۔ آنکھوں میں بیک وقت دونوں جذبے ابھرے۔

”تو پھر تم یہ والی بات چھپا لو۔“ شرا چونک کراسے دیکھنے لگی۔

”تو میں کیا کہوں گی؟ کیوں ملنگئی تھی سرمدسے؟ اور میری کسی جھوٹی وجہ پر بابا کیسے یقین کریں گے؟“  
”اس پر کر لیں گے؟“ مسکرا کر اس نے ایک پھولہ ہوا پیکٹ شزا کی طرف بڑھایا تھا۔ ”تمہیں سر مدد شاہ کی الماری سے یہ ملا تھا۔ تم اسی کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھی، اور اس نے جو بھی کیا تمہیں خاموش کرنے کے لیے کیا،“ شزا حیرت سے اسے دیکھتی پیکٹ کھولنے لگی۔  
تھوڑی دیر بعد جب وہ لان میں آئی تو سیم نے بے اختیار پوچھا تھا۔

”کیا تم نے کر لیا پچھوکا کام؟“

”ہاں کر لیا!“ اس نے مزے سے سیم کی کہنی میں بازو ڈالا اور آگے چلنے لگی۔

”ویسے یہ سب تھا کیا؟“ وہ تمجس ہوا۔ حد نے اسے گھورا۔

”چپ کر کے چلو۔ زیادہ جہاں سکندر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سیم نے مٹکوں نظروں سے اسے دیکھا مگر چپ رہا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

خزان کے پھول کی مانند بکھر گیا کوئی ..... تجھے خبر نہ ہوئی اور مر گیا کوئی  
کورٹ کی راہداریوں میں ہنوز ویسا ہی رش تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں اور آتے جاتے قدموں کی دھمک۔ ایسے میں ایک  
راہداری کے باہر وہی لڑکا جو گزشتہ رات کچھوے اسمگل کرتے کپڑا اگیا تھا، وہ تھکڑیوں میں کھڑا تھا، ساتھ پولیس الہکار موجود تھے۔ چند کلاماء اور  
ایک سوت میں ملبوس صاحب جو چہرے مہرے سے اس لڑکے کے والد لگتے تھے آپس میں بحث کر رہے تھے۔

”میں کراچی میں نہ ہوتا تو دیکھتا میرا بیٹا کس طرح حالات میں رات گزارتا ہے۔“ والد برہنی سے کہہ رہا تھا۔ پھر گھٹری دیکھی۔

”کتنی دیر مزید لگے گی؟“، کیل جواب میں جلدی جلدی کچھ بتانے لگا۔ تبھی دور راہداری سے زمر چلتی آتی دکھائی دی۔ بال جوڑے میں چہرے  
پسکراہٹ اور چال میں اعتماد۔ ان صاحب کے پاس وہ رکی۔

”کیا میں آپ سے علیحدگی میں بات کر سکتی ہوں؟“ شاشنگی سے ان کو مخاطب کیا۔ لڑکے کا والد چونک کرمزا، اسے دیکھا، پھر ساتھ

چلا آیا۔

”دکشم کے یہ آفیسر آپ سے ملتا چاہتے ہیں، مگر علیحدگی میں، انہوں نے یقین دلایا ہے کہ آپ کے بیٹے کاریکارڈ بھی فلیسر ہے گا۔  
ان کو معلوم ہے کہ وہ ہی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہے۔“ مسکرا کر ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ پھر اس کی پیشانی کو دیکھا جاں بلکہ لہا کاپسے  
تھا۔ مگر خود بھی اس پسینے سے بے خبر، اس آدمی نے کارڈ لیا، اور پھر ایشات میں سر ہلاایا۔  
تھوڑی دیر بعد وہ اس کے ساتھ چلتی اس کو مختلف راہداریوں سے گزارتی چلتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی بار بار گھٹری بھی دیکھتی۔ نکھیوں  
سے اس نے دیکھا کہ وہ شخص ہائی کی نائب ڈھیلی کر رہا تھا۔ جیسے اسے ٹھن ہو رہی ہو۔

زمر ایک دروازے کے سامنے رکی۔ وہاں دو پولیس الہکار گھٹرے تھے۔ ایک نے دروازہ کھول دیا۔

”آپ اندر چلے جائیں، الیاس فاطمی صاحب!“ وہ مسکرا کر بولی تو اس نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ خالی کورٹ روم  
تھا۔ الیاس فاطمی دو قدم اندر گیا ہی تھا کہ زمر نے دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا کر لاک ملک سے بند کیا، پھر چابی نکال کر پولیس الہکار کی مٹھی  
میں دبائی۔

”اگر وہ مقررہ وقت سے پہلے باہر کلا، تو تمہارے آدھے پیسے کاٹ لوں گی۔“ گھور کر تنیہ کی۔ سپاہی نے سینے پہ باتھ رکھا۔

”آپ فکر ہی نہ کریں میڈم صاحب۔“ زمر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ (آئی ایم سوری اللہ تعالیٰ، ان تمام قوانین کے لئے جو آ  
رج میں نے توڑے! اور فارس اور احر جیسے کر منڈو کے ساتھ کام کرنے کے لیے!) جھر جھری لے کر وہ بڑبواتی جا رہی تھی۔ کوئی عادت سی تھی

جو دا پس آرہی تھی۔

خالی کورٹ روم میں آگے چلتے یکدم الیاس فاطمی مڑا۔ اسے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ چونکہ کروہ دروازے تک آیا اور اس کو نئے کوہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ.....

”اپنی تو نانائی بچا کر کھو۔ دروازہ لاکڑہ ہے، اسے تو زنے میں پندرہ منٹ لگیں گے، جبکہ تمہارے پاس صرف بارہ منٹ ہیں۔“ آواز پر وہ ایک دم گھوما۔

نج کے خالی چیمبر کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل رہا تھا۔ کورٹ روم کی کوئی تینیں جعلی تھیں۔ دن کی روشنی کافی تھی، پھر بھی نج کا نہ تھا، اندھیرے میں لگ رہا تھا۔ الیاس فاطمی نے آنکھیں سکید کر تجھ سے دیکھنا چاہا۔

نیلی چیمز کے اوپر اس نے بھوار سویٹر پہن رکھا تھا۔ پوری آستین والا سویٹر چھوٹے کئے بال اور بڑھی شیو۔ نہری آنکھوں میں چبھن لئے وہ نج کی کرسی کے پیچے آ کھڑا ہوا، اور کرسی کی پشت پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔ ہتھڑی میں بند ہے ہاتھ۔

”ڈر نہیں۔ میں ہتھڑی میں ہوں۔ قید میں ہوں۔ پہچانت میں مجھے؟ میں فارس غازی ہوں۔ وارث غازی کا بھائی!“ الیاس

فاطمی کی گردن کے بال تک کھڑے ہو گئے۔ لب کھل گئے۔ آنکھوں میں شاک ابھرا۔ پھر ایک دم گھوما۔

”پچھری میں جہنم کی طرح کا شور ہے، دروازہ پینے کی آوازن بھی لی جائے تو فائدہ نہیں۔ تمہارے پاس صرف گیارہ منٹ ہیں کیونکہ تمہاری طبیعت خراب ہوتا شروع ہو چکی ہے۔“ فاطمی نے دروازے پر ایک دفعہ ہی ہاتھ مارا تھا کہ اس کا آخری فقرہ سن کر چونکا پلت اسے دیکھا۔ وہ اسی سکون سے کرسی کے اوپر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

”تمہارے سر میں سر در ہو رہا ہے نا؟ ہرگز رتے پل کے ساتھ یہ تیز ہو جائے گا۔ کیونکہ جو چائے تم نے پر اسکیوٹر کے آفس میں لی تھی، وہ چائے نہیں تھی۔“

فاطمی نے بے اختیار اپنی بیٹھانی کو چھووا۔ وہ ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ گلے پر کھا۔ وہ گھٹ رہا تھا۔ آنکھیں وحشت سے پھیلیں۔

”کیا... کیا مطلب؟“ وہ مڑ کر پھر سے دروازہ بجانے لگا، گرہاتھوں سے جان نکل رہی تھی۔

”وکیل سے شادی کرنے کا ایک فائدہ ہوتا ہے۔ آپ کورٹ کا ہر ملازم خرید سکتے ہیں۔ اس ملازم نے زیادہ پکنہ نہیں ملایا۔ صرف ایک چھوٹی شیشی تھی۔ زہر کی۔“ ہلاک سامسکرا یا۔ ”میرا ایک دوست ہے، لاہور کے مضادات میں اس کا اپنا فارم ہاڈس ہے، اور لیب بھی۔ وہاں ایسے واڑس اور زہر یا مخلوں کلپن کیے جاتے ہیں۔ ابھی تو تمہارا دم گھٹ رہا ہے، لیکن اگلے آٹھ منٹ میں سانس بھی رکنے لگے گا، پھر ناک اہ، کانوں سے خون آئے گا، پھر دل کی دھڑکن بے قابو ہو گی....“ وہ کہتے ہوئے چلتا ہوا کرسی کے پیچے سے نکلا۔ ”پھر سینے میں شدید درد اٹھے گا۔“ وہ جبوترے کے دہانے پر آ کھڑا ہوا اور نیچے دیں بیٹھ گیا۔ ”اور گیارہویں منٹ تمہارے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی اگر....“ بند مٹھی کھول کر دھکائی۔ اس میں شفاف شیشی تھی جس میں شفاف مخلوں تھا۔ ”اگر تم نے اس پوائز ان کا antidote نہیں لیا۔“ الیاس فاطمی نے قدم بڑھا۔ ”مگر اکڑا کر زمین پر گرا اور بے اختیار دیوار کا سہارا لیا۔ پھر سفید چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو؟“ اس کا سانس رکنے لگا تھا۔ ”ٹھیک ہے، پھر گیارہ منٹ بعد پنچھل جائے گا۔“

الیاس فاطمی بے اختیار پلتا اور خود کو زمین پر گھینٹنے دروازے کو شیم جاہاتھوں سے بجا یا۔ باہر دونوں پولیس الہکار کھڑے اونچی آواز میں فون پر بات کر رہے تھے۔

”اگر تم نے دوبارہ دروازہ پیٹا تو میں اس شیشی کو توڑ دوں گا۔ قربی ہسپتال جانے میں رش آور کے باعث تمہیں پون گھننے لگے گا۔“

گھرے گھرے سانس لیتے فاطمی نے ہاتھ کی پشت سے ناگ رکڑا تو... اس پر خون لگا تھا۔ اس نے خوف اور دھشت سے سامنے ہٹرے پہ بیٹھے فارس کو دیکھا۔ ”تم... کیا چاہتے ہو تم؟ میں نے تمہارے بھائی کو نہیں مارا۔“

”مجھے معلوم ہے، تم نے صرف اسے بیچا تھا۔“ وہ شیشی کی کو ہاتھ میں گھماتے، نگاہیں اس پر جمائے بولا تھا۔ ”مجھے دوسرا لوں کے لاب دو تو، میں یہ antidote (تریاق) تمہیں دے دوں گا۔ اگر تمہارے منہ سے نکلنے والے الگے الفاظ میرے سوال کے جواب کے علاوہ اے تو میں اسے توڑ دوں گا۔“

”بولو... بتاؤ... کیا پوچھنا ہے۔“ وہ نیم جاں زمین پر دو ہرا ہوا بمشکل بول پایا۔

”وارث نے تمہیں کچھ فائزہ تھیں، یقیناً وہ ثبوت تم نے کسی تک پہنچا دیے تھے اور انہوں نے وارث کو مار دیا۔“ نگاہ اٹھا کر حضت نئکتے ٹکھے کو دیکھا۔ ”ان فائلز میں کیا تھا؟“

”وہ... منی لانڈرنگ کر رہے تھے... وہ ان کی کربشان کا پتہ لگاتے لگاتے غلط سمت آکھا تھا۔“ بے ربط پھولی سانسوں کے درمیان وہ رہا تھا۔ ”وہ دھشت گردوں کے لئے منی لانڈرنگ کر رہے تھے۔ پشاور میں میشنگز کا ریکارڈ تھا، کوئی گواہ بھی تھے۔ وہ میرے پاس نہیں۔ وارث کے لیپ ناپ میں تھیں۔“

”آئی سی!“ اس نے گھری سانس لی۔ ”تو وہ دھشت گرد ہیں۔ گذ!“ وہ ہلکا سامسکرایا۔ ”دوسرا سوال، ان لوگوں کا ماشر مائنڈ کون ہے، ہر تنظیم کا ایک بربین ہوتا ہے، جو حکامات دیتا ہے۔ ان کا بربین کون ہے؟ میرے بھائی کے قتل کا حکم کس نے دیا تھا؟“

فاطمی کے کانوں سے خون رنسنے لگا تھا۔ آنکھوں سے پانی ٹپک رہا تھا، اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ مجھے جان سے مار دے گا۔“ میں نے شیشی کو اونچا اٹھایا، گویا گرانے لگا ہو۔ فاطمی دہل کر رہا گیا۔ ”ہاشم... ہاشم کاردار۔ تمہارے بھائی کے قتل کا حکم ہاشم نے دیا تھا.....“ کمرے میں ایک دم موت کا سنا ناچھا گیا۔

اپنے تیسیں دھا کر کے فاطمی نے اسی خوف اور دھشت سے فارس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سپاٹ تھا۔ سخت اور سرد۔ ”ہاشم کاردار؟“ وہ راتے ہوئے اٹھا اور قدم قدم چلتا فاطمی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ گردن جھکا کر اسے دیکھا۔

”میں نے پوچھا تھا، ان کا بربین کون ہے؟ ہاشم کاردار یا اس کی ماں؟“ فاطمی کی آنکھیں حرمت سے چھلیں۔ ”تم جانتے ہو؟“ نضا ایک دم سا سکت ہو گئی تھی۔

وہ ہلکا سامسکرایا۔ ”میں ساڑھے چار سال سے جانتا ہوں۔ یہ بھی کہ میرے بھائی اور بیوی کو کس نے قتل کروایا، یہ بھی کہ میرا بھانجا اپنی کے پاس ہے۔“

فاطمی نے تعجب اور بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”مگر ہاشم نے کہا تھا، تم نہیں جانتے کہ اس سب کے پیچھے کون ہے۔“ ”میں واقعی نہیں جانتا کہ ان سب کے پیچھے کون ہے۔ ہاشم اپنی ماں کے پیچھے ہے، یا جاہرات اپنے بیٹے کے پیچھے ہے۔ یہ جاننا رے لیے ضروری ہے، تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ مجھے کس کی جان اپنے ہاتھوں سے لینی ہے۔“

”مگر ہاشم نے کہا تھا... تم ادا کار نہیں ہو۔“ وہ اب بھی بے یقین، خوفزدہ تھا۔

”جس غازی کو وہ جانتا تھا، وہ ادا کار نہیں تھا۔“ اس نے اذیت سے آنکھیں موندیں۔ ”جیل نے میرے ساتھ کیا کیا، میں نے جیل کیا کیا ہے... آنکھیں کھولیں۔ ان میں سرداً گ تھی۔“ ہاشم نہیں جانتا۔ کوئی نہیں جانتا۔ اور اب تم لوگ مجھے دوبارہ دیں بھیجنا چاہتے ہو!“

”مگر... ہاشم نے کہا تم سمجھتے ہو تمہاری بیوی نے تمہیں اس میں پھنسایا ہے۔“ ”پانچ منٹ کے لیے میں نے یہی سمجھا تھا۔“

”تمہیں.... تمہیں معلوم ہے تمہارا بھانجنا...“ اسے شدید کھانسی آنے لگی تھی۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا مگر حیرت اور بے قیمتی اسے الہ حالت بھی بھلائے دے رہی تھی۔

”مجھے اس کے اغوا سے اگلے دن معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سب ہاشم نے کروایا ہے۔ گر میں...“ پنجے کے بل اس کے قریب زمین پیٹھا۔ ”میں وہ سزا ہے چار سال پسلہ والا آدمی نہیں ہوں جس نے جیل جاتے ہی ہاشم کاردار کا نام لیا تھا۔ جیل نے مجھے بدل دیا ہے الیاس فاطمی ا مجھے ادا کاری آگئی ہے۔ مجھے لوگوں کے سامنے کیا نظر آتا ہے، یہ میں خود طے کرتا ہوں اب۔“ ذرا سا اس پر جھکا۔

”تم لوگ... ہمیشہ ایک بات بھول جاتے ہو.... کہ فارس غازی... بھی ایک کاردار کی ہی اولاد ہے!“ پھر شیشی والی مٹھی بلندل الیاس فاطمی دہرے ہوئے بے اختیار ہاتھ اٹھانے لگا مگر اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی۔

”تم میر ازاد جان پکھے ہو۔ تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔“

”نہیں.... پلیز... دیکھو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ دیکھو وقت ختم ہو رہا ہے... یہ مجھے دے دو خدا کے لئے...“ وہ شاید رو بھی رہا تھا۔ ”اگر تم نے....“ شیشی اور پڑھائے اس کی آنکھوں میں دیکھتے چاپتا کروہ بولا۔ ”کسی کو ایک لفظ بھی بتایا تو یاد رکھنا۔ میں تمہیں دُل ماروں گا۔ مگر تمہاری بیٹی... جو شادی کے آٹھویں سال بالآخر اپنی اولاد کی منتظر ہے.... صرف ڈھانی ماہ بعد... میں اس کا بچہ غائب کر دوں گا۔“ تم اور تمہارا سارا خاندان زندہ در گور ہو جاؤ گے۔ بری خبر یہ ہے کہ تمہاری بیٹی سفر نہیں کر سکتی، تم اس کو کہیں بھیج بھی نہیں سکتے....“

وہ جلدی جلدی نئی میں سرہلانے لگا اس کا گویا سانس بند ہو رہا تھا۔ ”میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ پلیز یہ مجھے دے دو۔“

فارس اٹھا، سیدھا کھڑا ہوا۔ گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ ”میرا بھائی تمہارے پاس آیا تھا ملزے کے کر... اس نے تم پر اعتماد کیا تھا؟“ ام نے معلوم ہے اس کے ساتھ کیا کیا؟“ شیشی فضا میں بلند کی۔ ”تم نے اسے چھوڑ دیا۔“ اور اس نے شیشی چھوڑ دی۔ الیاس فاطمی کے منہ نے نکلی۔ شیشی اس کے قریب گر کر چکنا چور ہو گئی۔ مخلوں بہہ گیا۔ وہ جھک کر انگلیوں سے مخلوں اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”یہ تم نے کیا کیا۔ تم نے مجھے مار دیا....“

فارس نے دروازہ کھٹکھایا۔ ساتھ میں کچھ کہا بھی۔ الہکار نے جلدی سے اسے کھولا اور اندر آیا۔ اس کی چھکڑی کو اپنی زنجیر کے ساتھ

نہیں کیا۔ پھر نیچے گرے پا گلوں کی طرح اس مخلوں کو چاٹتے روتے بلکہ فاطمی کو دیکھا۔ ”یہ مرتو نہیں جائے گا؟“

”اس جیسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔ فکر نہ کرو زہر نہیں دیا۔ تارچ ڈرگ تھی، آدھے گھنے میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ بے نیازی ۔

کہہ کر وہ ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ادھر الیاس فاطمی ابھی تک کراہتے روتے اس مخلوں کو چاٹنے کی سعی کر رہا تھا جو صرف... سادہ پانی تھا۔ راہداری میں چلتے ہوئے زمر مخالف سمت سے آئی اور اس کو روکا۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ دھڑ کتے دل سے پوچھا۔ فارس نے نئی میں سرہلایا۔

”اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔ ابھی تک اس شخص کا پتہ نہیں چل سکا جو فاطمی کو اس بحث سے جوڑ سکے۔“ وہ بے زار اور خفاگ رہا تھا۔ ام

کے چہرے پر مایوسی پھیلی۔ ”کیا واقعی؟“ وہ ”جی“ کہہ کر الہکاروں کی معیت میں آگے بڑھ گیا۔ اس کا نام پکارے جانے کا وقت قریب تھا۔

آج اس کا چودہ روزہ جسمانی ریمانڈ فتم ہو رہا تھا۔ عدالت نے ضمانت کی درخواست مسٹر دکتر نے ہوئے اسے جوڑ لیا تھا۔ جیل بھیجنے کا حکم صادر کر دیا۔ اپنی گرفتاری کے چودہ دن بعد بالآخر وہ اسی جیل دوبارہ جارہا تھا جو چار سال تک اس کا ”گھر“ بنی رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلتی باہر تک آئی تھی جہاں ”حوالات“ (جیل لے جانے کے لیے وین نما خوفناک سواری) تیار کھڑی تھی۔ لمحے بھر کے لیے اس نے فارس کو روکا تھا۔

”آج عدالت نے تمام کاغذات، تفتیش کی تفصیلات، چالان وغیرہ کی کاپی ہمارے حوالے کر دی ہے۔ اب ہمارے پاس الہ“

ہفتہ ہے الگی سماں تک۔ سواب تم جس کوچا ہوا پناوکیل مقرر کرو!“ وہ کچھ کہنے لگا تھا مگر زمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے بات جاری رکھی۔  
”لیکن اگر تم مجھے ہاتھ رکنا چاہتے ہو تو۔ فارس۔ تمہیں مجھ سے... ریکوئیسٹ کرنی ہوگی!“  
اس کا ابرو بے اختیار رکھا۔ برہمی سے کچھ کہنے لگا۔ پھر گردان گھما کر دیکھا۔ اس کے انتظار میں الہکار کھڑے تھے۔ بہت ضبط سے زمر کی طرف گھوما۔ وہ مسکراہی تھی۔

”میں..... ریکوئیسٹ کروں؟“ اپنی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ زمر نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔ ”بالکل۔ ورنہ کوئی اور وکیل ڈھونڈلو۔“  
”مسز زمر۔“ ایک نظر اس کے پیٹ میں بندھے ہاتھ پر ڈالی، دوسرا ناک کی نتھ پ۔ ”کیا آپ کرہ عدالت میں میری نمائندگی کرنا پسند کریں گی؟“

”پہلے کہو، پلیز!“ (اور یہ الفاظ کہتے اسے کچھ اور نہیں صرف کچھوے یاد آئے تھے۔)

فارس نے صبر کا گھونٹ بھرا۔ ”پلیز!“

”شیورا!“ وہ مسکرا کر شانے اچکاتی پرسنگھا لے لگی۔ ”اگر تم یہ سائنس کر دو۔“ ایک چیک اور پین نکال کر اس کے سامنے کیا۔ فارس کے اب کی بار دنوں ابرو اٹھے۔ ”یہ میری چیک بک کا چیک ہے؟“  
”اور اس پر جو رقم لکھی ہے وہ میری ابتدائی فیس ہے اسائنس کر دو، یا کوئی اور وکیل ڈھونڈلو!“

”یہ صرف ابتدائی فیس ہے؟“

”ہاں فارس۔ تم نے کیا بے مول سمجھ رکھا تھا مجھے؟“ مسکراتے ہوئے بھی اس کی آواز میں ٹھکوہ در آیا تھا۔ فارس نے بس ایک تیز نظر اس پر ڈالی، ہتھیڑی لگے ہاتھوں سے قلم تھاما اور سائنس کر دیا۔ پھر اسے انہی نظروں سے گھورتا جانے کے لیے پلٹ گیا۔  
وہ اس ٹھنڈی سی سہبہ پھر میں ان الہکاروں کو اسے حوالات میں ڈال کر لے جاتے دیکھتی رہی۔

..... ♦♦♦ .....

انمول پتھروں کی قیمت لگائی ہے سب نے ..... دیوار جو نہ بنتے، بازار بن کر جیتے  
سمدر کنارے وہ اوپنی ہوٹل کی عمارت رات کے اس پھر روشن تھی۔ نیچے تاریک تہہ خانے میں میری اینجیفون لیے سعدی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ جو اضطرابی انداز میں مسلسل ٹھیک رہا تھا، تیزی سے اس کی طرف پکا آنکھوں میں شدید بے چینی تھی۔ ”کال کرو ہاشم کو!“

”تم نہیں کر رہے سعدی، تم پچھتاوے گے!“ وہ شدید متفکر تھی۔ ”تمہیں فارس کے مشورے پہ بھروسہ ہے؟“  
”دیکھو وہ غصے کے تیز ہیں جلد باز ہیں ہاتھوں سے سوچتے ہیں، میں سب جانتا ہوں، مگر میرا دل کہتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں! اور میں دل کی سننا چاہتا ہوں۔“ میری نے سر جھٹکا، اور فون ملا کر ہاشم سے بات کروانے کا کہہ کر ریسیور سے دیا۔  
”بولاو سعدی!“ ہاشم کا لہجہ خشک تھا۔

”میں اپنے وکیل کا نام بتانے کو تیار ہوں۔ مگر...“

”مگر تمہیں بد لے میں کچھ چاہیے۔ بتاؤ۔“ وہ آفس میں بیٹھا، فون کان اور کنڈھے کے درمیان رکھے، کاغذات کھنگال رہا تھا۔  
”میں صرف آپ کو بتاؤں گا۔ آپ اور آپ کی والدہ دنوں میرے پاس آئیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ بتابداوں گا۔ میں آپ کے لئے کام بھی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن بد لے میں میے لوں گا، بہت پیے۔ وہ پیے میرے خاندان کو دیے جائیں گے۔ اور میرا بیکچ آپ اور من کا ردار میرے ساتھ بیٹھ کر مجھ سے دسکس کر کے طے کریں گے۔“

”اس تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

”میں تھک چکا ہوں ہاشم بھائی۔ میں ننگ آ گیا ہوں۔“ وہ روانی میں کہہ گیا تھا، پھر کر مسکرا یا۔ اور بظاہر صحیح کی۔ ”ہاشم!“ میری کو دیکھتے آنکھ دبائی۔ اگر وہ ندرت ہوتی تو جوتا اٹھا لیتی۔

”اگلے ہفتے ہم نے آنا ہے ادھر ٹھیک ہے تمہارے پاس بھی آ جائیں گے، لیکن تم اپنا وعدہ پورا کرو گے۔“ اس کی آواز میں بھلی سی زمی تھی۔

”اور پلیز... اس ہپتو ہر اپسٹ سے کہیں، بیہاں سے چلی جائے، میں نہیں کروانا اس سے علاج۔ کیوں میرے پیچھے پڑی ہے؟“

وہ کاغذ فائل سے نکالتا رکا۔ ایک دم چونک کر چہرہ اٹھایا۔ فون کندھ سے نکال کر ہاتھ میں لیا۔ ”کون ہر اپسٹ؟“

”وہی سرخ اسکارف والی، آپ کے بزرگ پاڑھر کی بیٹی۔ جس کو کرنل خاور میرے پاس لایا ہے۔“ لختے بھر کر کا۔ ”کیا آپ کا نہیں پتہ؟“

دوسری طرف فون منقطع ہو چکا تھا۔ ہاشم موبائل رکھتے ہی آندھی طوفان کی طرح کمرے سے نکلا تھا۔ نائی کی ناٹ ڈھیلے کرتے۔

سرخ چہرے کے ساتھ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہاں عبور کر کے سامنے آیا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔

خاور فون پہ بات کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اٹھا۔ ہاشم آگے بڑھا، فون کا کریڈل کھینچ کر زمین پر دے مارا۔ خاور ایک دم شش درہ گیا۔ اس نے گریبان سے کپڑا کر خاور کو جھکا دیا۔

”کس کی اجازت سے تم آبی کو وہاں لے کر گئے؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟“ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا وہ دھماز اتھا۔

”سر... میں نے ہپتو ہر اپسٹ کی بات کی تھی آپ سے... میں نے ہارون صاحب سے...“ وہ ہکلاتے ہوئے وضاحت دیئے لگا۔

”کبواس بند کرو۔ تم میرے لئے کام کرتے ہو ہارون عبید کے لئے نہیں۔“ غصے سے اس کا لرجھنک کر اسے پرے دھکیلا۔ ”تم مجھ سے پوچھ بخیر اتنا برا اقدم کیسے اٹھا سکتے ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”سر، میں تو....“

”کبواس بند کرو۔“ اس نے زور سے بوٹ کی ٹھوک رکھی اور نازک سی لٹی ٹرالی اسٹ کر پیچھے جا گری۔ ”ابھی... ابھی اس کو واپس!“

گئم دہاں سے۔ خاور اگر وہ دوبارہ اس سے ملی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ ساتھ نے!“

خاور کا اہانت اور شاک سے بھرا چہرہ چوڑ کر وہ اسی طرح باہر نکل گیا۔ اسے کہیں پہنچنا تھا جلدی، ورنہ شاید وہ واقعی خاور کو شوٹ کر دیتا۔ خاور ابھی تک دنگ تھا۔ میں منظر میں ایک آواز ابھری تھی۔ ”تم کبھی کاردا نہیں بن سکتے۔ وہ تمہیں کبھی اپنے ساتھ نہیں بھاتے۔“

❖❖❖

رہا بتلا میں عمر بھر آ گے کی دوڑ میں ..... جو آج مڑ کر دیکھا تو تھا کھڑا تھا میں

سرمد شاہ ان دونوں ایک درکشان کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ فارس غازی جوڈیشل ریمانڈ پے جس دن جیل بھیجا گیا، اس روز

سرمد شاہ واپس آیا تھا۔ اسی پورٹ سے گھر کے راستے میں اس نے ڈرائیور سے پوچھا تھا۔

”عائزہ بی بی کہاں ہیں؟ دو دن سے فون نہیں اٹھا رہیں۔ لینڈ لائن بھی نہیں مل رہا۔“ ڈرائیور لاعقلی کا اظہار کر کے خاموش رہا تھا۔

البتہ پار بار بیک و یومر میں صاحب کو دیکھتا ضرور تھا۔

کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی اور وہ دروازہ کھولتا باہر نکلا تو دیکھا، لان میں عائزہ اور شزا کے والد کھڑے تھے۔ وہ دراز قد سیاہ سر میں

قلموں والے بھرے جسم کے تونمند انسان تھے، سفید شلوار سوٹ میں ملبوس، اور چہرے کا رنگ سرخ، گلابی سا۔ ساتھ موجود چار افراد، بھی

اے، دیکھ کر ہرے ہوئے تھے۔ سر مدد شاہ کو انہوں کا احساس ہوا تھا۔

”السلام علیکم انکل۔“ وہ بظاہر مسکرا کر کہتا، گلاسز گر بیان میں انکاتا ان کی طرف آ رہا تھا۔ آئی جی صاحب آگے بڑھے اور ایک دم اتے کر بیان سے پکڑ لیا۔

”ساری دنیا کہتی تھی، جیسا باپ ہے ویسا بیٹا نکلے گا، پھر بھی میں نے تمہارا اعتبار کیا۔“ انہوں نے بھاری بھر کم ہاتھ اس کے منہ پر جڑا لگا۔ غصے سے وہ بہت سے مغلفات بھی کہہ رہے تھے۔ سر مدد شاہ پیچھے کوٹھر لایا۔ ”تم نے میری دونوں پیٹیاں بر باد کر دیں۔“

”انکل، کیا ہو گیا ہے؟“ اس کا چہرہ سرخ ہوا، وہ ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرنے لگا، دونوں جوان آگے بڑھے اور آئی جی صاحب کو تمام کر بکشکل ہٹایا۔ ایک نے سرعت سے سر مدد شاہ کے ہاتھ پیچھے باندھے اور اس سے پہلے کہ وہ مراجحت کر پاتا، اس نے ہتھڑی بند کر دی۔

”کیا کر رہے ہو، چھوڑو مجھے... انکل... میری بات سنیں۔“ وہ بھی غصے سے چلایا تھا۔ ”وہ جھوٹ بول رہی ہے، وہ بکواس کر رہی ہے، میں...“

”وہ تمہاری دوسری شادی کے بارے میں جان گئی تھی اس لئے تم نے اسے انخوا کر لیا۔ تم نے میری بیٹی کو بر باد کر دیا۔“ وہ غصے اور دکھ سے پھر اس کی طرف بڑھے تھے مگر دونوں جوانوں نے انہیں پھر سے تمام کر پیچھے کیے رکھا۔

”سر، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ اندر جائیں، یہ ہمارے حوالے ہے۔“ ایک آفسران کو تسلی دے رہا تھا۔

”عائزہ کہاں ہے؟ عائزہ کو بلاو۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ وہ ان دو الہکاروں کے زرنے میں پھنسا، سرخ چہرے کے ساتھ چلا چلا

کر ملازموں کو کھسپہ رہا تھا۔ مگر کوئی نہیں سن رہا تھا۔

”نام مت لو میری بیٹی کا۔“ وہ انگلی اٹھا کر تنیہہ کرتے گر جے تھے۔ ”عائزہ، ارسم، اور شزا کو ملک سے باہر بھیج دیا ہے میں نے،“ ساری زندگی تم اپنے بیٹے کی شکل کو ترسو گے۔ تم بھی تو جانو اولاد کو کھونے کا درد کیا ہوتا ہے سرمد۔“

”آپ میرے ساتھ ایسے نہیں کر سکتے۔ چھوڑو مجھے۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟“ وہ چلایا تھا۔

”اسے دور لے جاؤ میری نظروں سے۔ اس سے طلاق ناے پر دستخط کرواؤ، اور پر اپرٹی کے کاغذوں پر بھی، اس کو.... اس کو اتنا مارو، دلید کہ اس کی شکل بدل جائے۔“ وہ تیز تیز بولتے ہاپنے لگے تھے۔ دو الہکار اس کو زبردستی کھینچنے، گھینٹے کار کی طرف لے جارہے تھے۔

”دیکھ لوں گا میں تم سب کو کوئی بھی عدالت میں مجھ پر کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔“ وہ ہنڈیانی انداز میں چلایا تھا۔ آفسرنے اسے کار میں دھکا دیا، پھر جھک کر جختی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کون سی عدالت؟ ہم تمہارے جیسے کسی قہانے نہیں لے جارہے۔ ہم تمہیں یورو کی زیر زمین جبل میں لے جارہے ہیں۔“

کر منل پر دیسکر کوڑ ہم پر اپلائی نہیں ہوتا، نہ تم تمہیں کسی عدالت میں پیش کریں گے۔ آج سے تم ایک مسٹنگ پر سن ہو۔“ اور کھٹاک سے دروازہ اس کے منہ پر بند کیا۔ آئی جی صاحب ابھی تک غصے سے ہاپنے اس کو گالیاں نکال رہے تھے۔ پھر وہ تھک کر کری پنڈھال سے بیٹھے۔

انہیں معلوم تھا وہ طاقتوں لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا ہے، وہ ناجائز پیسا بناتا ہے، فیورز دیتا ہے، مگر انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔

وہ غیر جاندار رہنا چاہتے تھے۔ اور انسان کو جنم میں اس کی غیر جانداری ضرور پہنچاتی ہے۔

انیکی کے تہہ خانے میں دیوار پر لگے کاغذوں کے سامنے جنین کھڑی تھی۔ ہاتھ اونچا کر کے اس نے سر مدد شاہ کی تصویر اتاری اور اس کے دو ٹکڑے کر کے قریب جلتے ہیٹھ پر رکھ دیے۔ آگ کے شعلے تصویر کو اپنی پیٹ میں لے کر سیاہ کرنے لگے۔

کبھی جو مدتیں بعد اس کا سامنا ہو گا ..... سوائے پاس آدابِ تکلف کے اور کیا ہو گا  
حمد نے اطمینان سے مڑکر زمر کو دیکھا جو میز پر فائلز اور کتابیں رکھنے والی باری تھی۔ سراخاٹے بغیر بولی۔  
”اس کو انجوائے مت کرو۔“ حمد چوکی۔ پھر خفیف سا سر جھکا۔ ”میں تو انجوائے نہیں کر رہی۔“

زمر کے موبائل کی ٹون بھی تو وہ فون اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اس کے ڈاکٹر پیغام تھا۔

”خوش قسمتی سے ایک ڈوز کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اس کا نمبر بھیج رہا ہوں، آپ اس سے بات کر لیں اور تمام معاملات ملے  
لیں۔ غریب آدمی ہے، پیسوں کی سخت ضرورت ہے اسے!“ ساتھ ہی ایک نمبر موصول ہوا۔ زمر نے گھری سانس لی اور ”ڈوز“ کے نام سے  
اسے محفوظ کر دیا۔ دل سے ایک بو جھ ساہتا تھا۔

”وہ فائلز کہاں تک پہنچیں جیں؟“

” بتایا تھا نا، اپنی ایک فلیش خادر کے پاس لے کر گئی تھی، اس پر تحریر کر کے اس سے انکر پوٹ کرنے کا طریقہ سیکھا ہے۔  
اب ان فائلز پر احتیاط سے اپلاسی کر رہی ہوں وہ طریقہ۔ بہت سی چیزیں اب بھی نہیں معلوم سو کچھ دن لگیں گے۔ شاید مہینے۔ مگر،  
جائے گا!“ وہ پر امید تھی۔

ان سے چند کوں دور، قصر کاردار کالا ونج پور اروشن تھا اور اپر سے نوشیر والا چہرے پر ڈھیروں بے زاری سجائے۔ سنتی سے زندہ  
اتر رہا تھا۔ جمائی روکتے وہ نیچے آیا اور صوفے پر ڈھیروں بے زاری سجائے۔

”می کہاں ہیں فیونا؟“ نیونا سامنے آئی تو اس نے پکارتے ہوئے میز پر پیر کھے اور موبائل چہرے کے سامنے کی فیس بک

کھونے لگا۔

”مسز کاردار اور ہاشم صاحب صحیح سری لنکا کے لئے نکلے تھے۔ ان کی کوئی مینگ تھی۔ اور ایک سیمنار بھی تھا۔“

”ہوں۔“ وہ خاموشی سے بیٹھا موبائل دیکھتا رہا۔ شہرین کی ساری نامم لائیں چیک کی۔ ایک ایک پوسٹ پر ڈھیں مگر پھر بے زار ہو گیا۔  
سر جھنک کر چہرہ اٹھایا تو مرکزی دیوار پر بڑا سوکھورین ڈیزائن کا فریم آؤزیں اس دیکھا جس میں وہ چاروں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اور انگریز  
ہاشم جواہرات اور وہ خود۔ شیر واسے نکلے گیا۔ مکمل فیلی گروپ فوٹو۔

ایک خیال نے ذہن پر ٹکلی سی دستک دی۔ کیا یہ مکمل گروپ فوٹو تھا؟ مگر فیلی تو مکمل نہ تھی۔ کسی معمول کی طرح اس نے موبائل  
اسکرین کو چھوڑا۔ سرچ کے خانے میں لکھا ”علیشا کاردار“ اور پکج بھی سوچے بنا لک کر دیا۔

نہ فہرست میں پہلے نام کی بریکلش میں لکھا تھا (Ants EverAfter)۔ جس زمانے میں گھر میں اس لڑکی کے نام پر جواہرات اور  
اور انگریز میں لڑائی ہوتی تھی، تب اس نے سرچ کیا تھا اس کو۔ شاید اسی لئے اس کا نام اب بھی نکل آیا تھا۔ سرفہرست۔ نوشیر والا نے پروفائل  
کھوئی۔ کوڑو نوپر لک لک کیا۔ وہ دو ہفتے قبل لگائی گئی تھی۔ پہلے سے ذرا بڑی بڑی اور مسکراتی ہوئی علیشا، کتابیں لئے کسی یونیورسٹی کے باہر کھڑی  
تھی۔ اس کی آنکھیں... شیر واسے نے اسکرین کو زوم ان کیا... بالکل انگریز یہ جیسی تھیں۔ نوشیر والا جیسی۔ فارس جیسی۔

کتنے ہی پل بیت گئے۔ وہ یونہی گردی ترچھی کیے اس کی تصویر دیکھتا رہا۔ وہ rehab سے سخت یا بہو کر آگئی تھی اور اب تعلم  
حاصل کر رہی تھی۔ یہ تصویر سے واضح تھا۔ بغیر کسی دوسرے خیال کوڈ ہن میں لاۓ شیر واسے فریڈریکویٹ کے آپشن کو ملک کر دیا۔

”دوستی کی درخواست بھیج دی گئی ہے۔“ فیں بک نے ادب سے اطلاع دی۔ وہ عجیب سامنوس کرنے لگا تھا۔



نہ شاہ پر مرے ہم، نہ شاہ سے ڈرے ہم ! ..... کچھ عجیب گرنہ ہوتے، شاہ کار بن کے جیتے کولبوکی پر نم، بھیکی ہواں میں اس شام عجیب سا جوش تھا۔ جو مایوسی کی انہما پہنچنے والوں کوئئے دن کے سورج کی امید دلا یا کرتا ہے۔ ایسے میں اس طویل قامت ہوٹل کی عمارت کی ایک کھڑکی سے اندر جھاگو تو بید پر نیم دراز آبدار کتاب پڑھنی دکھائی دے رہی تھی۔ بال اس کارف سے آزاد لبے اور سرخ رنگ کے تھے۔ چکتا ہوا سرخ بھورا رنگ۔ بید سائیڈ نیٹل پر دھرا موبائل خاموش تھا۔ اس پر ہاشم کی پچھلے سات دنوں میں سات کا لزاں تھیں جو اس نہیں اٹھائی تھیں۔ خاور کی ایک ہی تھی جو اس نے سن کر بے رخی سے صرف استا کھا تھا۔

”ابھی وہ دن نہیں آیا جب ہاشم کا ردار مجھ پر حکم چلا سکے جب مرضی ہو گی چلی جاؤں گی۔“ اور کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

اب بھی پڑھتے پڑھتے اس نے اچانک دراز کھولا اور وہ مڑا تڑا سا کاغذ نالا۔ ہمن۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ وہ الجھ کراس تصویر پہ لاتھ پھیرنے لگی....

زیر زمین جاؤ تو سعدی کے کمرے کے باہر بنے لاوچ میں ہاشم، گرے سوٹ، ثانی اور مسحور کن پر فیوم میں لپٹا، ایک کرسی پر ناگ کپ پر جائے بیٹھا تھا۔ جبکہ جواہرات درزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی، پرس نیچے رکھتی، دوسری کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہت مگر آنکھوں میں شدید کوفت تھی۔

سعدی سامنے آ کھڑا ہوا تو وہ بدقت مسکرائی۔ زراکت سے ماتھے پاۓ بال انگلی سے پیچھے جھکلے اور سر سے پیٹک اسے دیکھا۔ ”تم کیسے ہو سعدی؟ مجھے خوشی ہے کہ تم نے درست راستے کا انتخاب دی رہے ہیں، مگر کر لیا۔“

وہ سفیدی شرٹ اور نیلی جیزیر میں ملبوس تھا۔ چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں نرمی تھی۔ ذرا سا مسکرا ایا۔ ”میں ٹھیک ہوں مسز کار دار کیا آپ نے مجھے کبھی مس کیا؟“ پھر مقابل کرسی پر بیٹھا اور ایک نظر ہاشم پر ڈالی جو سنجیدہ اور سپاٹ نظر آ رہا تھا۔

”کیوں نہیں۔ تم ہمارے بہت اچھے دوست تھے سعدی!“

”میں اب بھی آپ ہی کا دوست ہوں۔“ اس نے جواہرات کی آنکھوں میں دلکھ کر یاد دہانی کروائی۔

”کام کی بات پر آؤ سعدی۔ تمہیں کیا چاہیے؟ میں کو بمشکل میں نے ساتھ آنے پر راضی کیا ہے۔ اگر اس میں پھر تمہاری کوئی گیم ہوئی تو...“

”شہرین کار دار۔ میری وکیل شہرین تھی۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”اس کو دی تھی میں نے ویٹی یوکی ایک کاپی۔ نیلے رنگ کے لفافے میں ایک سی ڈی ہے جو encrypted ہے۔ اس نے اپنے کمرے کے لاکر میں رکھی تھی۔“

ہاشم بری طرح چونکا تھا۔ ناگ سے ناگ ہٹائی۔ ایک نظر جواہرات کو دیکھا جو دوسری جانب یک ناگ دیکھ رہی تھی۔ ”میری ادھر کیا کر رہی ہے؟“ میری کچن کی چوکھت پر جھکائے کھڑی تھی۔

”شہری؟ شہری نے ... تم پچ بول رہے ہو؟“

”میں جھوٹ نہیں بولتا تمہیں پتہ ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسی انداز میں بولا تھا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

”میری ادھر کیسے ہاشم؟“ جواہرات کی خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ بے یقین ناگا ہیں میری پچھے چھیں۔

”میری کو ہاشم نے میری دلکھ بھال کے لئے رکھ لیا ہے مسز کار دار۔ فکر نہ کریں۔ ہمارا بہت اچھا وقت گزر رہا ہے یہاں۔“ مسکرا کر اطلاع دی تو جواہرات ایک دم گم صمی اسے دلکھنگی۔

”کام کی بات پر آؤ سعدی۔ تمہارا پچھے؟“

”میں نے آپ کو یہاں پچھا اور بتانے کے لئے بلا یا ہے۔“ ہاشم کے چہرے پر بڑی ابھری۔

”تمہاری گیمنہیں ختم ہوں گی ہاں؟ میں جا رہا ہوں۔“ وہ بے زار سا کھڑا ہوا، ہی تھا کہ سعدی نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تمہارے باپ کی موت طبعی نہیں تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔“

لمح بھر کو ہرشے ساکت ہو گئی۔ باہر بہتا سمند ر تیز چلتی نم ہوا ہاشم کی آنکھیں۔ اور جواہرات کی دھڑکن۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“ وہ بیٹھا نہیں، انداز میں غصے سے زیادہ تجھ تھا۔

”تمہارے باپ کا چہرہ مرتے وقت بے حد سفید تھا۔ تم نے ڈاکٹر سے بھی پوچھا تھا مگر ڈاکٹر نے تم سے جھوٹ بولा۔ اس نے کہا یہ اس تھما کی وجہ سے ہے۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ لمح بھر کے لئے ہاشم کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹائے بغیر۔ ”مگر ڈاکٹر پک چکا تھا۔ تم نے بھی یقین کر لیا، کیونکہ تمہارے نزدیک یہ ناممکن تھا کہ تمہارے ناقابل تغیر باب کو تمہارے دیوتا جیسے باپ کو کوئی قتل کر سکے۔ قتل تو ہم چیزوں جیسے لوگ کیے جاتے ہیں۔ پیر کے نیچے مسلے جاتے ہیں۔ آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارا باپ بھی قتل ہوا تھا۔“

جواہرات ایک دم کھڑی ہوئی۔ وحشت سے دور کھڑی میری کو دیکھا۔ اور پھر سعدی کو جو ہاشم کے مقابل کھڑا تھا۔ اس نے ہاشم کا چہرہ دیکھا، وہ بہم تھا، متعجب تھا اور... اور وہ چونکا ہوا بھی لگتا تھا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”تمہارے آفس آکر بھی تم سے سب سچ بولا تھا میں نے ہاشم۔ تم مجھے جانتے ہو۔ میں ثبوت اور گواہ دیکھ چکا ہوں، اسی لئے کہہ رہا ہوں۔ تمہارے باپ کو قتل کیا گیا تھا، اور جانتے ہو کس نے قتل کیا انہیں؟“ وہ بلکا سامسکرا یا، ایک سرد پتی نگاہ سفید چہرے والی جواہرات پڑا۔ وہ نمک کا مجسم بنی کھڑی تھی۔ بے یقین، خوفزدہ.... یہ کچھ کرنے کا وقت تھا۔ وہ بے ہوش ہو جائے، طبیعت خرابی کا کہہ کر ہاشم سے کہہ کر وہاں سے نکلیں۔۔۔ اسے سعدی کو خاموش کروانا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی ہرشے بے سود تھی۔

”ہاشم یہ جھوٹ بول رہا ہے، اس کی بات مت سنو۔“ بدقت وہ بڑا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ مگر ہاشم نے نہیں سن۔ اس کا غصہ کم ہو رہا تھا، اور وہ چونک کر سعدی کو دیکھ رہا تھا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”جاوہ، اپنے ڈاکٹر کی پٹی پر پستول رکھو اور اس سے پوچھو کہ کس نے روپرٹ بد لئے کا حکم دیا تھا؟ وہ بھی اسی کا نام لے گا جس کا نام میں لوں گا۔ بتاؤں، کون ہے وہ؟“

”ہاشم!“ جواہرات کی آنکھوں میں آنسو آئھرے۔ وہ صرف ہاشم کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ سعدی کی آنکھوں میں دیکھتے کسی نہ انس میں تھا۔ وہ پر یقین نہیں تھا، مگر وہ شک میں تھا۔ ”تم میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہے ہو، مجھے معلوم ہے سعدی!“

”مگر تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم اس شخص کا نام جاننا چاہتے ہو۔ تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کس نے قتل کیا تمہارے باپ کو۔“ پھر سے ایک کاٹ دار نظر جواہرات پڑا۔ ”تمہارے باپ کوas نے مارا ہے جس کے ساتھ تم ایک چھت تلے رہتے ہو۔ قاتل تمہارے گھر میں سے ہی ہے...“

جواہرات کو لگا، سعدی نے زنجیر کا پھندا اس کی گردن میں ڈال رکھا ہے اور اب آہستہ آہستہ زنجیر گھمار ہاہے۔ گویا کھینچنے ہی والا ہو۔

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاشم.... اس کو مت سنو!“ اس کا گلارندھ گیا۔

”وہ جس کو تم سے محبت کا دعویی ہے... تمہاری خیر خواہی کا دعویی ہے، تم سے دوستی کا دعویی ہے... جس پر تم بہت اعتماد کرتے ہو... اس نے تمہیں دھوکہ دیا ہے ہاشم کا ردار!“

جواہرات کی آنکھوں کے آگے اندر ہرے چھانے لگے۔ اس کا سانس رک چکا تھا۔ گردن کے گرد زنجیر ٹنگ ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ اب بھی شک و بھی مگر تھے سانسوں کے ساتھ سعدی کو دیکھ رہا تھا۔ سعدی ایک قدم مزید اے بڑھا، ہاشم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سکرایا۔ ”خاور۔ کرنل خاور نے قتل کیا ہے تمہارے باب کو۔“ اور چند فلورا پر۔۔۔ بیٹھ پیغم دراز سرخ بالوں والی لڑکی کا گند کو دیکھتی ایک دم سیدھی ہو کر پیٹھی۔ اس کی بلی جیسی آنکھیں چمکی تھیں۔ ”میں اسے غلط دیکھ رہی تھی۔ یہ کائنات نہیں ہے۔“ وہ دبے دبے جوش سے بڑھ رہی تھی۔ ”یہ کراس ہے۔ صلیب ہے۔ اور یہ لفظ۔۔۔ یہ ان نہیں ہے۔۔۔ یہ ہامان ہے۔“ اس کے بروائٹھے۔ ”اور ہامان کون تھا؟“ وہ چوکی۔ ”فرعونِ موسیٰ کا وزیر۔۔۔ اس کا دست راست۔۔۔ اس کے سارے کام سرانجام دینے والا۔۔۔ اس کی حفاظت کرنے والا۔“ وہ بھبھی۔۔۔ اتنے دن بعد اس نے بالآخر وہ پیغام ڈی کر پڑ کر لیا تھا جو کہہ رہا تھا۔۔۔

”ہامان کو۔۔۔ سولی چڑھادو!“

❖❖❖.....

باب 18:

## بھاری ہے وہ سر... جو پہنتا ہے تاج!

میری رعایا کے ہزاروں لوگ  
کیسے اس گھری سور ہے ہوں گے!

اے نیند، اے میٹھی نیند!

قدرت کی نرم طبیب!

کتنا ذرا ہوں میں تم سے

کہ تم مزیداب میری آنکھوں کو بوجھل کر کے  
میری حیات کو نیان میں نہیں دھکیتی!

اے سکون کی دیوی، کیونکہ تم رہتی ہو

چھوٹی بستیوں کے گندے میلے بستروں میں،  
مگر شاہی پلنگ کو چھوڑ جاتی ہو؟

اے نیند، تم اس گتاخ گھری کسی بھری جہاز پ

بھیگے ہوئے لڑکے پر تو مہربان ہو سکتی ہو

مگر اس پر سکون اور خاموش رات میں،

ہر آسائش اور نعمت ہونے کے باوجود،

ایک بادشاہ کے پرداہونے سے انکاری ہو؟

مگر اس لیے کہ

رہتا ہے بھاری وہ سر،

جو پہنتا ہے تاج!

(ولیم شیکسپیر کے ڈرائے لگگ ہنری فورسے "لگگ ہنری" کا مکالہ)

"خاور... کریل خاور نے قتل کیا ہے تمہارے باپ کو!" جہاں جواہرات ششد رہ گئی وہیں ہاشم کے کان کی لوئیں سرخ ہوئیں۔

آنکھوں میں برہی عود آئی۔

”تم خاور پہ اتنا بڑا لازم کیسے لگا سکتے ہو؟ ایک منٹ!“ پتلیاں سکیرے نفی میں سر ہلاتے دہ بولا تھا۔ ”یہ کیا تمہاری کوئی نئی یکم ہے؟“ تم مجھے اور خاور کو توڑنا چاہتے ہو؟ جانتے ہونا کہ وہ میرا خاص آدمی ہے!“ ”میں صرف تمہیں اذیت دینا چاہتا ہوں، اور اپنی بات ثابت کرنے کی ضرورت مجھے نہیں ہے۔ تحقیق تم نے خود کرنی ہے۔“ جواہرات سفید چہرے کے ساتھ مدد ہالی و اپس پیشی۔

”کیا بکواس ہے یہ سعدی!“ مجھے پیسے، میرے لیے کام، وہ سب جھوٹ تھے جن کے بھانے تم نے مجھے یہاں بلا بیا!“ ہاشم نے بے زار ماہر بھٹکا۔ ”اور میرے باپ کی موت صرف ایک حادثہ تھی۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ انہیں قتل کیا گیا تھا ہاں؟“

”گواہ ہے میرے پاس!“ سعدی نے جواہرات کو دیکھتے ہوئے سر کو ہلکا ساختم دیا۔ وہ جو دم بخوبی پیشی چوکی۔ ”سعدی تم یہ کیا...“ ”مسز کاردار ہیں گواہ! کیوں مسز کاردار؟ کیا آپ نے مجھے نہیں بتایا تھا، دوسال پہلے کہ آپ کو شک ہے خاور پہ؟“

ہاشم ایک دم بالکل ٹھہر گیا۔ جواہرات کا سانس تک رک گیا۔

”میں آپ کو خاور پہ شک تھا؟“ اس کی ٹون بدی۔ چونک کر مال کو دیکھنے لگا تھا۔

”لارام سے ہاشم۔ تم دیکھنے رہے ہے وہ خوفزدہ ہیں۔“ سعدی نے نرمی سے مداخلت کی۔ ”میں بتاتا ہوں، تمہارے والد کی موت پہلے دن بعد جب میں مسز کاردار کی خیریت پتہ کرنے آیا تو انہوں نے مجھے سے اپنے خدا شے کا اظہار کیا تھا۔ ان کو شک تھا کہ انہوں نے لمبی سے باہر کوئی سایہ ساتھ روم سے نکل کر انہیں میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔ انہوں نے کہا، وہ ان کے سب سے فادر ملازم کا سایہ لاتا تھا مگر وہ پر یقین نہیں تھیں۔ میں نے بھی ان کی بات کو سمجھی گی سے نہیں لیا تھا لیکن..... قید خانہ انسان کو غور فکر کے لیے موقع دیتا ہے۔“ وہ بے جار باتھا مگر ہاشم ٹھیک سے سن بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ششدہ ریٹھی مال کے پاس آیا، اور سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

”میں یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا واقعی آپ نے کچھ دیکھا تھا؟“

جواہرات نے سفید چہرہ اٹھایا۔ ایک نظر سعدی پہ ڈالی۔ گردن کی زنجیر شک ہوئی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ سہی وقت تھا جب وہ سراٹھا کران نام لازماں سے انکار کر سکتی تھی، اور اس موقع بیک میل سے نجیک تھی، مگر سراٹھا نے کے لئے کوئے اعمال ناے چاہیے ہوتے ہیں۔ اس نے گلابی، نم پڑتی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھا۔ وہ فکر مندی اور برہمی کے ملے جلتے تاثرات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھا۔ ”وہ... صرف ایک سایہ تھا، مجھے نہیں یاد میں نے خاور کا نام لیا ہو۔“ آنسوؤں سے اس کا گلارندھا۔ ہاشم کے چہرے پر جیسے کسی نے ہمانہم دے مارا تھا۔

”تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ زور سے چلاتے ہوئے اس نے بوٹ سے میز کو ٹھوک کر ماری۔ میز چائے کے کپس سمیت الٹ گئی۔ جہاں می کی مسکراہٹ تھی، دل زور سے دھڑکا، وہاں بچن میں کھڑی میری بھی کانپ گئی۔

”میں... میں بوزھی ہو رہی ہوں، شاید وہ نظر وہ کادھوک ہو، میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ جواہرات نوٹے پھوٹے لفظ بول رہی تھی۔ بار بار انگلیوں کے پوروں سے چہرہ تھپتھپاتی۔ ”میں تو اس بات کو بھول بھال گئی تھی۔“ ایک ملامتی، بھیگی نظر سعدی پہ ڈالی۔ اس نے ٹھلیں بند کر کے سر کو ختم دیا۔ گردن کی زنجیر اب کس گئی تھی۔ ہاشم اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں نہیں مان سکتا۔ خاور میرا اوفادار ہے۔ اس کا ڈیڈی سے کوئی بھروسہ نہیں تھا۔“ وہ اب نفی میں سر ہلاتے اب ادھر ادھر ٹھیٹے خود کو کپوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں، یا میرا اندازہ غلط ہو۔ تم پوست مارٹم کرنے والے ڈاکٹر سے پوچھ لو۔“ ہاشم گھوم کر اس کے اس آپ کا رہ سے پکڑ کر اسے کھینچ کر اٹھایا اور اپنے مقابل لاکر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتے وہ غریبا تھا۔

”اگر یہ بات جھوٹ نکلی تو میں تمہیں وہ سزا دوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ سمجھے تم!“ جھٹکے سے کارچھوڑا۔

"تمہارے باپ کو قتل کیا گیا ہے ہاشم۔ اگر خاور نے نہیں تو کسی اور نے۔ کس نے کیا ہے یہاب تمہیں خود کھو جانا ہے۔"

ہاشم ایک تیز گرفتار مفترض بسی نظر اس پڑال کر "چلیں میں!" کہتا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ نائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہ غصے میں لگتا تھا اور شدید بے سکون بھی۔ جواہرات بدقت اپنے قدموں پر کھڑی ہوئی۔ ملاتی نظر وہ سعدی کو دیکھا۔

"اتنی اذیت کیوں دے رہے ہو مجھے اور میرے بیٹے کو؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ خاور نے یہ سب کیا ہے؟" مضبوط بنانے کی کوشش میں کمزور اداز مزید کپکپائی۔

"آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ جب تک آپ کے بیٹے آپ کے ساتھ ہیں، کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اس کے الفاظ پوہا اندر تک کانپ گئی۔

"اگر یہ جھوٹ نکلا تو میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا سعدی!" دروازے پر کھڑا ہاشم انگلی اٹھا کر غصے سے تنفس بھر کر رہا تھا۔ سعدی نے بینے پر ہاتھ رکھ کر کوئی خدمت دیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ جیسے ہی کمرے میں آیا میری پیچھے آئی۔

"یہ بہت برا آئیڈیا تھا۔ سعدی۔" وہ شدید پریشان تھی۔ "جب خاور کے خلاف کوئی ثبوت ہے ہی نہیں تو وہ کیسے مجرم ثابت ہو گا؟" وہ زخمی سامنکرایا۔ "ثبوت مجھے نہیں ڈھونڈنے۔ ثبوت مسز کارا خود پیدا کریں گی، کیونکہ ہاشم ایک بات پر یقین کر چکا ہے، کہ اس کا باپ طبعی موت نہیں مرا۔ اب الزام کس کے سر آئے گا؟ یہ مسز کارا دار نے طے کرنا ہے۔ اب وہی ثابت کریں گی کہ خاور اصل مجرم ہے!"

"مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا؟" یہ سوال میری کواب بھی الجھار ہاتھا۔

"دیکھتی جاؤ! وہ گھری سانس لے کر بیٹہ پہ بیٹھ گیا اور میری فکر مند سی باہر نکل گئی۔ وہ شدید ناخوش تھی۔

❖❖❖

تو میرا حوصلہ تو دیکھے، داد تو دے کہ اب ..... مجھے شوق کمال بھی نہیں، خوف زوال بھی نہیں  
لمح بھر کے لیے ایک ہفتہ پیچھے جاتے ہیں۔

سنہری نرم گرم دھوپ جیل کے ٹھنڈے میں بکھری تھی۔ فارس غازی سفید کرتے میں ملبوس، ایک سپاہی کی معیت میں چلتا آرہا تھا۔ لگ بھگ چھے سات ماہ بعد وہ اس جیل میں دوبارہ داخل ہوا تھا۔ راہب اری پرانی اور گندی میلی تھی۔ دیوار میں سلاخیں لگا کر دروازے بنائے گئے تھے۔ جگہ جگہ سطور، شعر اور نام دیواروں پر لکھے تھے۔ وہ تنے ابرڈاٹھی گردن اور بے نیازی کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا۔ راستے میں چند جگہوں پر اسے سلام کیا گیا۔ جس کا اس نے بھی سر کے خم اور کبھی ماتھے کو ہاتھ سے چھو کر اسی بے نیازی مگر اپنائیت سے جواب دیا اور آگے چلتا گیا۔

وہ ایک طویل کھلا اور روشن سا کمرہ تھا۔ دونوں مخالف دیواروں کے ساتھ دو قطاروں میں میٹرس لگے تھے۔ ہر میٹرس کے اوپر دیوار پر کھوٹی پر متعلقہ قیدی کے کپڑے، سوئیڑوں اور غیرہ لٹک رہے تھے۔ کوئی بیٹھا تھا، کوئی گروہ کی صورت کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو کسی کی نگاہ ادھر پڑی، کسی نے اس کا نام لیا۔ گرد نہیں مڑیں۔ خاموشی ہر سوچیلی۔ بہت سے سلام بلند ہوئے۔ وہ سر کے خم اور بڑی راہت سے جواب دیتا کونے تک آیا۔ یہ میٹرس اس کا تھا۔ وہ نیچے بیٹھا۔ سر جھکا کر جوتے اتنا نے لگا۔

"تو ادھر دوبارہ کیسے نا زی؟" کسی نے متکفر سا پکارا تھا۔

"مرڈرا!" دیوار سے تیک لگائے، اکڑوں پیٹھ گیا۔ اور سامنے خلا میں دیکھنے لگا۔ چند مزید باتیں سنائی دیں پھر وہ سر گوشیوں میں بدل گئیں۔ وہ اب نگاہ گھما کر ان درود دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر آنکھیں بند کیں۔

جب وہ پہلی دفعہ جیل میں آیا تھا وہ ایسا نہیں تھا۔ تب کچھ بھی ایسا نہ تھا۔ مگر اس نے ذہن سے ان دونوں کو جھٹک دیا۔ اور گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ قیدی ابھی تک مژمڑ کرائے دیکھ رہے تھے۔

پھر ایک گروہ نے کسی کو راستہ دیا اور ایک شخص ان کے پیچے سے کل کر سامنے آتا دھائی دیا۔ اس کی داڑھی اور موچیں سکھوں کی ۱۰۰ نصیں آنکھوں میں سرمدہ اور چہرے پہ اپنا سیت بھری مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر فارس اٹھ کر گراہوا۔

”غازی!“ اس نے مصالحت کی بجائے پنجہ سا بڑھایا جس کے ساتھ فارس نے پنج ماکر جگڑا، اور پھر اس سے گلے ملا۔ علیحدہ ہو کر اس نے ”سلکار فارس کو دیکھتے اس کا شانہ تھپکا۔“

”اداس نہ ہو یار۔ یہ بھی تیر اپنا ہی گھر ہے۔“

فارس نے افرادہ مسکراہٹ کے ساتھ ہلکے سے سر جھکا۔ ”ندیہ گھر ہے نہ اپنا ہے۔“

”چل آ۔ تجھے بچھنے دوستوں سے ملوانا ہوں۔“ وہ اس کو دوستانہ انداز میں شانے سے تھامے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔

اس کا نام محمد جلال الدین آتش تھا، مگر یہاں اسے صرف ”آتش“ کہا جاتا تھا۔ اس کی آنکھ کے قریب ایک گھرے زخم کا پرانا شان

ما پچھا اس کے ساتھ چلتے فارس نے ایک خاموش نظر اس کی آنکھ کے نشان پر ڈالی تھی۔

یہ زخم اسے فارس نے ہی دیا تھا۔ کسی اور زمانے کی اور دنیا میں۔

اس منظر کو سات دن بیت چکے تھے۔ وکیل دفاع کو دیے گئے سات دن کی مهلت آج تمام ہوئی تھی۔ سوکل اسے پھر

””والا ت“ (گاڑی) میں ڈال کر عدالت لے جایا جانا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی سجیدہ اور خاموش تھا۔

..... ♦♦♦♦♦ .....

سبھی پریاں محبت کی جفا نے مار ڈالی ہیں ..... ایک آسیب آیا تھا، یہاں گفاظ سے پہلے  
سعدی کے پاس سے آ کر ہاشم اپنے کمرے میں دائیں باسیں ٹھیں رہا تھا، اور جواہرات مضطرب سی کرسی پہنچی تھی۔ وہ صرف  
۱۱ اپ تھا، پریشان چونا کہوا تھا، مگر جواہرات... اس کا چہرہ سفید اور جسم بے جان تھا۔ وہ بار بار لب کھولتی لیکن پھر ہاشم کے تیور دیکھ کر چپ  
ہاں۔

ہاشم کو یہیں چھوڑ کر، خلیل فلور پہ جاؤ تو کروں کے بندرووازے راہداری کے دونوں طرف قطار سے لگے تھے۔ دھنٹاً ایک دروازہ

مول را بدارنکی اور تیزی سے لفت کی طرف بڑھ گئی۔ لفت پیچے اتری تو وہ کچن میں آئی اور یہاں سے سیدھی ہیڈلشیف کے سر پہنچی۔  
”مجھے نیچے جانا ہے۔“ مقامی بھاشامیں سجیدہ کے کہا۔ شیف نے تذبذب سے اسے دیکھا۔ ”مجھے اجازت نہیں ہے مادام۔ فتح

صاحب کی غیر موجودگی میں....“

اس نے اسٹینڈ سے ایک تیر جھر اٹھایا اور اس کی نوک شیف کے کامنٹر پر کھے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیانی خلا میں گاڑھی پھر تیکھی  
اللہ، میں سے اس کا یکدم شل ہوتا چہرہ دیکھا۔ ”تم مجھے بتاؤ، اگر میں تمہیں قتل کر دوں تو کیا میں جیل جاؤں گی؟ تمہیں نہیں لگتا کہ میرے بابا مجھے  
ہ، اپا میں گے؟“ شیف نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ٹکالیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سعدی کے کمرے کے باہر کھڑی تھی۔ دستک دے کر دروازہ کھولا تو وہ ہنوز مضطرب سا، مگر سوچ میں گم بیٹھ پہ بیٹھا  
لے اسے دیکھ کر چونکا۔ پھر کھڑا ہوا۔ ”میں نے وکیل کا نام بتا دیا ہے ہاشم کو۔ اب تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ اندر آئی، دروازہ بند کیا، اور بند دروازے سے پشت لگائے، چمکدار آنکھوں اور مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ ”ہامان  
اں ہے؟“

سعدی کی گردن میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ مگر آنکھوں میں سختی در آئی۔

”ماموں نے تمہارے ذریعے پیغام بھیجا، انہیں تم پہ اعتبر تھا، مجھے نہیں ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم سب بھول جاؤ۔“

”کون ہے ہمان اور کیا کرو گے تم اس کے ساتھ؟“ وہ پلکیں جپکا کر شیطانی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

”کم از کم تمہاری طرح میں لوگوں کو سر راہ پٹوایا نہیں کرتا۔“

آپ کی مسکراہست تھی۔ ابر و تجہب سے بچنے۔

”تم نے اس روز بھی مجھ سے یہی بات کہی۔ کتنے جھ مینٹل انسان ہوت۔ تم نے خود سے فرض کر لیا کہ نوشیر والوں کو پٹوانے میں میرا

ہاتھ تھا!“

”محترم آپ کے مغتیر نے خود نوشیر والوں کو بتایا تھا کہ وہ آپ کا مغتیر ہے اور یہ کہ اگر اس نے دوبارہ آپ کو شک کیا تو اچھا نہیں ہو گا۔ اس سے بھی انکار کر دیں۔ اسی لئے میں نے کہا تا، مجھے آپ پا اعتبار نہیں ہے۔“

سو گوار کمرے میں ایک دم تنا و سارہ آیا۔ آپی لمحے بھر کو بالکل سُن رہ گئی۔ تحریر۔ مہبوت۔ وہ جو بہت کچھ کہنے کے ارادے سے آئی تھی، سب بھول کر باہر کو پلکی۔ پھولے نفس اور سرخ چہرے کے ساتھ تیز تیز اوپر آئی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے رک کر بیتل بھائی۔ پھر بند مٹھی سے اسے بھایا۔ زور سے۔ جواب موصول نہ ہوا تو انچا سابو لی۔ ”آبدار ہوں۔ دروازہ کھلو!“

اگلے ہی لمحے دروازہ اندر کو کھلا اور ہاشم کا رد اس سامنے نظر آیا۔ کوٹ اور ننائی ندارد، آستین کہیوں تک موڑے وہ ڈسٹر ب لگ رہا تھا۔ پس منظر میں کرسی پیٹھی جواہرات دکھائی دے رہی تھی۔

”کیسی ہو، ریڈی؟“ جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔

”مجھ تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ برہم نگاہیں اس پر جائے سینے پہ بازو لپیٹے ہوئے تھی۔

”ابھی میں.... بات نہیں کر سکتا۔ بعد میں....“ وہ واپس اس وقت بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”جب نوشیر والوں مجھے یونیورسٹی میں ٹک کر رہا تھا تو میں نے تمہیں کال کی تھی۔ صرف تمہیں۔ اور تم نے میری شکایت کے جواب میں کہا تھا کہ تم سنپھال لو گے۔ کیسے سنپھالا تھا تم نے؟“

ہاشم دروازہ بند کر کے اہدواری میں آکھڑا ہوا۔ بولا کچھ نہیں۔ اس اسے دیکھتا رہا۔

”ایک دن اچانک سے اس نے مجھے کا لڑ کرنا چھوڑ دیا۔ دوبارہ کبھی میرے راستے میں نہیں آیا۔ میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ کیوں؟“

”آبی!“

”تم نے اپنے ہی بھائی کو پٹوایا، ہاشم؟“ وہ بے یقین تھی۔

”کس نے بتایا تمہیں؟ تمہارے نئے بیٹھ فرید نے؟“ ہمکا ساطن ز کیا۔

”ہاشم! تم نے میرے کسی مغتیر کا کہہ کر اس کو پٹوایا؟ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟“

”سنوا آبدار!“ اب کے وہ سختی سے بولا تھا۔ ”میرا بابا پ میرا آئینڈیل تھا۔“ کرب سے لمحے بھر کو آنکھیں بند کیں۔ ”جب میں ہائی اسکول میں تھا تو میں کچھ غلط لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔ میرے باب نے مجھے ان کے ساتھ پولیس سے کپڑا وایا اور تھانے میں ایک رات کے لیے بند کروا یا۔ میں اس کے بعد کبھی ان لڑکوں سے نہیں ملا۔ میری پڑھائی ٹھیک ہو گئی۔ جیسے میرے باب نے مجھے ہینڈل کیا تھا، میں نے شیر و کوکھی دیسے ہی ہینڈل کیا اور وہ بھی ٹھیک ہو گیا۔ وہ میرا بھائی ہے، اس کی حفاظت مجھے کرنی ہے، کیسے، یہ صرف میں جانتا ہوں۔ گذناشت!“

ایک اچھتی نظر اس پڑاں کر، اس کے منہ پر دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ آبدار بھی تک بے یقین کھڑی تھی۔

جو ہرات اسے آتے دیکھ کر پریشانی سے اٹھی۔ ”ہاشم! شاید تم خواہ مخواہ سعدی کی بات کو سیر کیں....“

”میرا بابا قتل ہوا ہے گی!“ وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا قریب آیا۔ ”مجھے اپنے باب کی غش دیکھ کر ہی سمجھ جانا چاہیے تھا،“

”بن نے ڈاکٹر پھروسہ کیا۔ سعدی ٹھیک کہتا ہے، میرا تکمیر مجھے دھوک دے گیا۔ میرا ناقابل تغیر باب کیسے قتل ہو سکتا ہے، میں یہ ماننے لے تیار نہ تھا۔ ورنہ ہر چیز میری آنکھوں کے سامنے تھی۔“ نقی میں سر ہلاتے، وہ نجڑی رنگت کے ساتھ کری پہ بیٹھا۔ جواہرات مضطرب ای لمی ای رہی۔

”کیا خاور ایسا کر سکتا ہے؟“

ہاشم نے بند دروازے کو دیکھا جس کے پار کچھ دری پہلے آبی کھڑی تھی۔

”غمی خاور بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے بتائے بغیر۔“ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسلیں۔ ”مگر وہ میرے باپ کو نہیں مارا۔“

”ہمیں اس ڈاکٹر سے بات کرنی چاہیے۔“ جواہرات نے فوراً موبائل اٹھایا، مگر اگلے ہی لمحہ وہ شش درہ گئی جب ہاشم نے تختے، وہ بال اس کے ہاتھ سے چھینا۔

”کوئی کسی سے بات نہیں کرے گا۔ صرف میں بات کروں گا اس سے۔ آپ بھی کسی کو کال نہیں کریں گی۔“ انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

”اہات کا سانس رک گیا۔“ میں تمہاری ماں ہوں ہاشم!“

”اور جو مر اتھا، وہ میرا بابا پ تھا۔ جو بات آپ نے سعدی کو بتائی، وہ مجھے نہیں بتائی گئی۔ اس وقت مجھے کسی پہ بھروسہ نہیں ہے۔“ گلابی الگھوں کے ساتھ وہ دکھ سے کہتا اٹھا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ”آپ پہبھی نہیں۔“ اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ جواہرات کی آنکھ سے ایک اولکا اور چہرے پڑھک گیا۔ ہاشم زور سے دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ وہ بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔

..... ♦♦♦

روز قیامت ہے میرا ہر روزِ حیات ..... حشر ہوں، اور خود اپنے اندر برپا ہوں  
اسلام آباد میں انگلی صبح سرداور نرم سی محسوس ہوتی تھی۔ سورج بادلوں کے پیچھے چھپا تھا۔ اور ان بادلوں کا رنگ گناہوں کی طرح سیاہ تھا،  
گویا سارے شہر پہ اندھیرا سا چھایا ہوا۔ ایسے میں کچھری کی سفید عمارت کھڑی کھڑی سی کھڑی تھی اور ایک وسیع اور بلند ہال کے اندر دیکھو تو  
راہدار یوں کے جہنمی شور سے بے نیاز، وہاں عدالتی کا رروائی جاری تھی۔ بلند چوتھے پے اپنی اوپھی کرسی پر برآ جمان سیشن نج جتاب فخر الزماں  
صاحب تاک پہ عینک جمائے ہاتھ میں پکڑے کاغذ سے پڑھ کر کھرد رہے تھے۔

”فارس طبیب غازی! کیا آپ نے 12 اگست کی صبح ناظم فاروق کے ساتھ مارکر قتل کر قمر الدین چودھری کو انوکھا کیا، اور.....“  
سامنے کثیرے میں فارس گروں تینے، ریلینگ پہ ہاتھ رکھ کر ٹھہر کے کھڑا، سنجیدگی سے سن رہا تھا۔ صاف سترے سفید کرتے میں ملبوں، تازہ  
نیشیو، اور تازہ کٹوائے بالوں کے ساتھ وہ ہوتوں کے زخم کے باوجود تدرست تو انالگ رہا تھا۔  
چوتھے سے نیچے اڑو تو سامنے دونوں اطراف میں میزیں رکھی تھیں۔ ایک طرف سرکاری پر ایک یوں ٹریبیٹھا تھا، ساتھ میں دو وکلاء اور  
بھی تھے۔ دوسری میز کے پیچھے کرسی پہ بیک لگائے، قلم انگلیوں میں گھماتی زمر یتھی، سوچتی نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ ادھرنج صاحب فرد  
جرم پڑھ رہے تھے۔

”اور لاش کو کار میں ڈالا اور ناظم فاروق کے ساتھ اسے مقتول کے گھر لے آئے، پھر اسے گھر کے باہر پھینکا اور اسی کار میں فرار ہو  
گئے۔“ نج نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”کیا آپ ان جرام کا اقرار کرتے ہیں؟“  
”نبیں یور آزر۔ میں بے قصور ہوں۔ میں نے یہ انگواء اور قتل نہیں کیا۔“ زمر نے لگاہ سامنے رکھے کاغذ پہ ڈالی۔ اس پر یہی سوال  
وجواب لکھے پڑے تھے۔ روٹین کی کارروائی جاری تھی۔

”کیا آپ کو 13 اکتوبر کی رات آپ کے گھر سے گرفتار کیا گیا اور آپ سے مذکورہ پستول برآمد کیا گیا؟“

”نہیں یور آز۔ میری گرفتاری کے وقت میرے پاس میری گن نہیں تھی۔ جس پستول کی برآمدگی لکھی گئی ہے وہ پولیس نے میرے اوپر ڈالی ہے وہ پستول نہ میرا ہے نہ میرے پاس سے ملا ہے۔“ سنجیدگی سے وہ سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

”آپ کس طرح پلیڈ کریں گے؟“

”وہ اسی میکانگی انداز میں بولا تھا۔ plead innocent.“

زمر نے آخری سوال پر نظر دوڑائی جو کاغذ پر لکھا تھا۔ ایک سطر کا سوال (کیا آپ اپنے خلاف گواہ کے طور پر پیش ہونا چاہیں گے؟) اور اس کا ایک لفظ ”نہیں“ میں جواب۔ نجح صاحب بھی اب وہی پوچھ رہے تھے۔

”فارس طبیر غازی“ کیا آپ سی آرپی سی 340 کے تحت اپنے خلاف گواہ کے طور پر پیش ہونا چاہیں گے؟“ زمر ہونٹوں میں قلم چباتے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ لختے بھر کو رکا۔ پھر اسی تینی گردان سے بولا۔

”جی۔ یور آز!“

زمر بھلی کی تیزی سے کھڑی ہوئی۔ ”یور آز، مجھے اپنے کلاسٹ سے بات کرنی ہے۔“ نجح نے ایک گہری نظر فارس پر ڈالی، دوسرا زم پر۔ ”آپ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے وکیل سے کنسٹکٹ کر لیجھے۔“ گویا تنبیہ کی۔ مگر وہ ویاہی مطمئن کھڑا رہا۔ ”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ یور آز۔ میں اپنا گواہ بننے کو تیار ہوں۔ کیونکہ میں بے گناہ ہوں۔“ اور ایک اچھتی نظر نیچے کھڑی زمر پر ڈالی جو ایک دم پریشان سی ہو گئی تھی۔

(جب عدالت میں کسی شخص کے خلاف کسی الزام پر مقدمہ چل رہا ہوتا ہے تو ملزم کے پاس خاموش رہنے کا حق ہوتا ہے..... کوئی اس سے عدالت میں گواہی دینے یعنی اعتراض جرم کرنے کے لیے نہیں بلکہ..... ہاں اگر وہ خود چاہے تو اپنا گواہ خود بننے کے لیے خود کو پیش کر سکتا ہے..... اس صورت میں پراسکیو ٹرکو اس سے سوال کرنے اور اس پر جروح کرنے کا حق ہو گا..... اس کو اللہ کی قسم اٹھا کر حق جح جواب دینا ہو گا.....)

”ٹھیک ہے۔ آپ کوڑا کل کا حق دیا جا رہا ہے۔ گیارہ نومبر کو استغاثہ عدالت میں اپنے....“ وہ آرڈر جاری کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ اور زمر کا بس نہیں چل رہا تھا۔ کران کا ہھکڑا اٹھا کر فارس کو دے مارے۔

کارروائی ختم ہونے کے بعد وہ اس کے ساتھ چلتی باہر آئی، اور جس وقت پولیس الہکار اس کو ہھکڑی لگا رہے تھے وہ بہت ضبط ت ہو گئی تھی۔

”فارس تم گواہی نہیں دے سکتے۔“ آنکھوں سے تنبیہ کی۔ وہ چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگا، پھر ذرا سامسکرایا۔

”میں بے گناہوں گواہی دے سکتا ہوں۔“

”وہ تم سے 28 اگست کی رات کے بارے میں پوچھیں گے۔“

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ ہھکڑی بند ہوئی اور وہ اسے لے کر مڑ گئے اور زمر... پیر پیخ کر رہ گئی۔ وہ شدید پریشان ہو گئی تھی۔ وہ اس کے لیے عدالت میں ایک ہزار جھوٹ بول سکتی تھی، اور عدالت میں یہی تو کیا جاتا ہے، مگر کھڑے میں کھڑے ہو کر گواہ کے طور پر قسم اٹھا کر جھوٹ۔۔۔ یہ پرجی تھی، اور وہ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا فارس بھی جھوٹ نہیں بولے گا، اور ہاشم کو بھی معلوم تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گا، اسی لئے تو سارا کھیل ترتیب دیا تھا، قاتل نہ کسی arsonist ہونا ہی کھل جائے! اف وہ اس آدمی کا کیا کرے۔ بہت بڑے موڑ کے ساتھ وہ اپس پلٹی تھی۔

شہر کے دوسرے حصے میں قائم قصر کاردار کی اوپنی کھڑکیوں سے باہر صبح کا سیاہ آسمان نظر آ رہا تھا۔ لاونچ کی ایک کھڑکی کے قریب کری پیشم دراز، پیر چھوٹی میز پر کھٹکے، نوشیر وال رات والے کپڑوں اور بکھرے بالوں میں تازہ تازہ نیند سے جاگا، موبائل پلکا تھا۔ انگلی سے انکرین اوپر پیچے کرتے، بے زاری اور سستی سے نیوز فیڈ دیکھتے، وہ ایک دم شہرا۔ ذرا چونکا۔ سستی غائب ہوئی۔ اطلاع موصول ہوئی تھی۔ علیہا کاردار نے آپ کی دوستی کی درخواست قول کر لی ہے۔

نوشیر وال نے تھوڑی پر فرخ داڑھی کھجائی۔ ایک دم اپنا آپ چھد سالاگا۔ اس حرکت کی وجہ سمجھنیں آئی۔ کیوں کیا ایسے؟ قوطیعت کا دوسرا درہ پڑنے لگا تو اب وہ کھٹکھٹے ہوئے۔ خفگی سے علیشا کی پروفائل کھوئی، اور دوستی ختم کرنے کے نشان کو ملک کرنے ہی لگا تھا کہ.... علیشا کا پیغام موصول ہوا۔ سرخ نشان ابھرا۔ شیرونے اسے دبایا۔ ”نوشیر وال کاردار؟ تم نے مجھے ایدے کیوں کیا؟“ اس کی انگلیاں بنا سوچے سمجھے کی پیدا پہنچ لگیں۔ ”کیوں؟ کیا میں تمہیں ایڈنیں کر سکتا؟ کیا ہم فیملی نہیں ہیں؟“ ساتھ ہی کندھے بھی اپھکائے تھے۔

”واہ۔ پچیس سال بعد تمہیں یاد آگیا کہ ہم فیملی ہیں۔“

”اگر میری جگہ ہاشم بھائی نے تمہیں ایڈے کیا ہوتا تو تم شاید کسی اور طرح جواب دتی، ہے نا؟“

”ہاشم کو مجھے ایدے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہر میںیں مجھے فون کر لیتا ہے، اور وہ میری فیصلی بھی ادا کر رہا ہے، اس کے بد لے میں مجھے صرف تمہارے خاندان سے دور رہتا ہے۔ اس لئے مجھے اسی طرح جواب دینا چاہیے۔ باقے۔“ اور وہ آف لائن ہو گئی۔

نوشیر وال کو غصہ نہیں آیا، وہ اسی طرح عجیب سے احساس میں گھرا بیٹھا رہا۔ تبھی باہر ہلچل کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ چونکا اور گردن موڑ کر دیکھا۔ کھڑکی کے پار کتی کاریں... کھلتے دروازے... آوازیں... تیز تیز گھر کی طرف بڑھتا ہاشم... پیچھے جواہرات... سب دکھائی دے رہا تھا۔ شیرونے ایک دم جلدی سے فیس بک بندکی اور فون پاکٹ میں گویا چھپتا، اٹھا۔

”ہیلو بھائی۔ آپ جلدی آگئے۔“ ہاشم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو شیر و جبرا مسکراتا سامنے آیا۔

ہاشم سنجیدہ ایک سپاٹ نظر اس پڑھاتا تیزی سے کنڑوں روم کی طرف چلا گیا۔ شیرونے قدرے حیرت سے اسے دیکھا، پھر پیچھے آتی مضطرب سی جواہرات کو۔ تبھی فیون تو سامنے آئی، ادب سے ہاتھ باندھ مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا۔

”خاور کہاں ہے؟“ جواہرات نے اسی اضطراب سے پوچھا تھا۔

”مسٹر خاور کوکل ہاشم صاحب نے فون کر کے سندھ جانے کا حکم دیا تھا، وہاں پلانٹ پر کچھ کام تھے۔ غالباً دو تین روز میں آپے کا۔“

”اچھا۔“ جواہرات آدھی بات اُن سنبھلی کے پیچھے گئی۔ فیجھ نا تو اثر لئے بنا کھانا لگانے کا حکم دینے کچھ کی طرف چل گئی، البتہ نو شیر وال قدرے اچنچھے قدرے خفگی سے ماں کے پیچھے آیا۔

”آپ لوگوں کا موڑ کیوں خراب ہے؟“ کنڑوں روم کے دروازے پر آیا تو اگلے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ ہاشم مختلف دراز، اور خانے کھول کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ جواہرات اس کے سر پر کھڑی پریشان سی کہہ رہی تھی۔

”کچھ دریا رام کرلو، شام کوڈا انکر و اسٹلی کو گھر بلکہ برات کر لیں گے۔“

ایک کانڈ دراز سے نکال کر وہ اسے جیب میں اٹھتا اٹھا۔ ”میرے باپ کی موت کو اس نے مذاق بنا کر کھدیا اور آپ کہتی ہیں میں آرام کرلو؟“ ایسے پیچھے کر بولا تھا کہ جواہرات چپ رہ گئی۔

”کیا ہوا بھائی؟“ نوشیر وال چونکا تھا۔

”ہم ڈاکٹر واٹلی کی طرف جا رہے ہیں، لباس بدلو۔“ تختی سے کہہ کر فون پر کال ملانے لگا۔ نوشیر وال نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔ جواہرات نے اثبات میں سر کو جبکش دی۔

”رئیس، تم پہنچنے میں اب تک؟۔“ وہ اب فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔ ماحول کا تنا وہ ہرگز رتے پل بڑھتا جا رہا تھا۔

❖ ❖ ❖

ند کوئی سمت نہ منزل، سو قافلہ کیسا؟ ..... رواں ہے بھیڑ فقط، بے قیاس لوگوں کی کاردار از کو وہیں چھوڑ کر سبزہ زار عبور کر کے، انیکی کے اندر آؤ تو دوپہر کے باوجود دسمبر کے باعث اندر انہیں اساتھ اور یہ بلاائیں جل تھیں۔ پکن کی گول میز کے گرد ندرت بیٹھی مڑھیں چھیل رہی تھیں، اور حین ساتھ میں موگ پھلی کے شاپر سے موگ پھلیاں نکال کر کھا رہی تھیں۔

”ہزار روپے کہا ہے، چھلکے اسی شاپر میں صاف موگ پھلی کے ساتھ نہ پھینکا کرو۔“ اس کے مسلسل چھلکے اندر، ہی پھینکنے پر ندرت نے ٹوکا۔ حند سرہلا کراب چھلکے میز پر رکھنے لگی۔ ندرت کو پھر سے تاؤ آیا۔

”حین سکونی تیز ہے تم میں؟ دوسروں کی بیٹیاں دیکھی ہیں؟ سگھڑ سیقہ شعاڑ کام کر تو، کیا کیا نہیں ہوتیں؟ تم کب سیکھوگی؟“  
”ای، پہلی بات، ماں میں کہ نہ ہونے کا غصہ مجھ پر نہ نکالیں۔ دوسرا بات۔“ پھلی منہ میں ڈالتے چباتے سنجیدگی سے ان کو دیکھ کر کہنے لگی۔ ”دوسروں کی بیٹیاں میری طرح پڑھائی میں اچھی اور پسیوڑ جیسیں نہیں ہوتیں۔“  
”لڑکیوں کے کام یہ کسیوڑ نہیں آتے۔“

”یار امی میں نہ سلامی کڑھائی کر سکتی ہوں، نہ مجھے دس قسم کی چنیاں بنانی آتی ہیں۔ مجھ سے نا آپ سگھڑا پے کی توقع چھوڑ دیں۔“ موگ پھلی پھانکتے بہت ادب سے اطلاع دی۔

”تمہیں لگتا ہے سگھڑا پا دس قسم کی چنیاں بنانے اور سلامی کڑھائی کرنے کا نام ہے؟“ آواز پر حند چوکی۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ بڑے ابا دیل چیز گھستنے ادھر آرہے تھے، چہرے پر زم مسکراہٹ تھی۔ ندرت اٹھ کر چوہبھی کی طرف چل گئیں۔ فارس کے ذکر سے وہ رنجیدہ ہو گئی تھیں۔

”ہاں نا وہی ہوتی ہیں نا سگھڑا لڑکیاں جوڑا بجھت کی کہانیوں میں گھر کے بنے کتاب، سموے، تل کر مہماںوں کے سامنے رکھتی ہیں اور ساتھ میں گھر کی ہی چنیاں... اور فلاں تائکے سے کڑھائی شدہ میز پوش بچھاتی ہیں۔“ وہ مزے سے بتا کر ہنسنے لگی۔ ابا نہیں بنتے۔

”وہ سگھڑ نہیں ہوتیں۔ وہ ملیخند ہوتی ہیں۔ یہ تو ملیخند ہیں۔ مگر سگھڑا پا اس کا نام نہیں ہوتا۔“

”اس سے پہلے کہ دادا حضور، آپ مجھے بتائیں کہ میں پھوہڑ ہوں، میں آپ کو بتاتی چلوں کہ آپ کی صاحبزادی کو بھی وکالت کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ نہ وہ کھانا بنا تی ہیں، نہ سلامی کڑھائی کر سکتی ہیں۔“ مداغوانہ انداز میں اطلاع دی۔

”بالکل۔ زمر کو گلگ نہیں کرتی۔ تمہیں تو دوچار انواع و اقسام کی ڈشز بھی بنانی آتی ہیں، اسے وہ بھی نہیں آتیں۔ سادہ روٹی چاول، اور دو ایک سالن کے علاوہ وہ کچھ نہیں بنا سکتی۔ سلامی کڑھائی کو تو اس نے کھی باتھ نہیں لگایا۔ مگر پھر بھی حصہ وہ پھوہڑ نہیں ہے، سوچو کیوں؟“

”کیونکہ آپ اس وقت مجھے نصیحت کرنے کے موڈ میں ہیں؟“ اس نے ناک سے کھھی اڑائی۔

”نہیں، کیونکہ تمہیں پھوہڑ کی اصل تعریف نہیں معلوم۔“

حند نے آنکھیں تیکھی کر کے ابرا دھانے۔ ”پھوہڑ وہی ہوتی ہے جو دس قسم کی چنیاں نہ بنائے، میز پوش اور ٹیکوڑی پر کڑھائی نہ کر سکے۔“

”ہر گز نہیں۔ پھوہڑوہڑ کی ہوتی ہے، جو صاف ستری نہ ہوا اور جو آر لانا نہ ہے“ ہو۔“

خین نے کندھے جھٹک کر اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”میں تو صاف ستری بیٹھی ہوں ابا۔“ اس کے کپڑے واقعی صاف، اسٹری شدہ تھے بال بھی سلیقے سے فرنچ چوٹی میں گوندھے تھے۔ منہ بھی دھلا، نکھر انکھ را تھا۔

”پھوہڑ کا دارہ ایک لڑکی کے اس کے گھر سے تعلق کے گرد پھیلا ہوتا ہے۔ پھوہڑ کی وہ ہوتی ہے جس کے باخھر دوم کا ٹوٹھ برش والا کپ اندر سے صاف نہ ہو۔۔۔ جس کی کچک کمیڈی کی اوپری سٹھ پر گریس کی تہیں جی ہوں۔۔۔ جس کے پردوں کی راؤ کے اندر ورنی طرف جائے ہوں۔۔۔ جس کے کچک سنک کی نیل والی دیوار (ایک اپلیش) صاف نہ ہو۔۔۔ اور بتاؤں؟ یا پہلے تم یہی چیزیں چیک کراؤ، کیونکہ تمہاری امی بہت یقیناً مند اور سکھڑا ہیں، مگر پچھلے تین بیفتے فارس کی گرفتاری کی وجہ سے وہ گھر پر توجہ نہیں دے پا رہیں تو یہ چیزیں تمہاری ذمہ داری میں آتی ہیں۔ جاؤ چیک کر کے آؤ۔“ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔

خین نے موگ پھلی کالغافہ پرے دھکیلا اور چمک کر ان کو دیکھا۔

”صفائی صداقت کرتا ہے۔“ ذرا رکی۔ ”ٹھیک ہے امی اب پہلے کی طرح سر پر کھڑی ہو کر نہیں کرواتیں صفائی، مگر میرا باخھر دوم اور ہمارا کچک چمک رہا ہوتا ہے ہمیشہ۔“ کری دھکیل کر اٹھی اور ”بیٹو بروٹس“ والے دکھ سے ابا کو دیکھتی، سیرھیوں کی طرف بڑھتی۔

پہلے اپنا بیدر دیکھا۔ صاف ستر اپڑا تھا۔ طمانیت کا احساس ہوا۔ پردے ہٹائے اور اندر ورنی راؤ زد پکھیں۔ ول ایک دم دھک سے رہ گیا۔ جائے! (مگر بڑے ابا تو کبھی اور نہیں آئے۔) باخھر دوم میں آئی۔ تازہ تازہ دھلا تھا۔ فنکل کی خوشبو۔ صاف، لش چمکتا باخھر دوم۔ ذرا خوش ہوئی۔ پھر ٹوٹھ برش کپ ہولڈر سے نکالا اور اندر رجھان کا۔ یک تھو۔ کراہ کر سنک میں پھیکا۔ اندر سے پیلا پانی جمع تھا۔ اف! سب کی یہ جگہیں میلی ہوتی ہیں، اچھا۔ خود کو تسلی دی۔ پھر جلدی سے زمر کے کمرے میں آئی۔ چپکے سے پردے ہٹائے صاف راؤ۔ باخھر دوم میں ٹوٹھ برش کپ میں جھانکا۔ اندر سے نکھر اصاف ستر اکپ۔

ایں؟ وہ جز بزر ہوئی۔ سارا گھر صداقت صاف کرتا تھا۔ پھر فرق کیوں؟ اس نے زمر کی الماریاں کھولیں۔ دراز نکال کر دیکھے۔ ہر شے سلیقے سے تھہ شدہ رکھتی تھی۔ ایک اس کی الماری کھولنے پر کپڑے باہر کو کیوں التھتے تھے؟ دراز کیوں زنگ لے کے بعد کے علاقوں کی طرح لگتے تھے؟

اوہنہوں! ابا بھی نا۔ دھپ دھپ کرتی نیچے آئی اور خنگی سے ان کے سامنے بیٹھی۔ انہوں نے مسکرا کر اطمینان سے اسے دیکھا۔

”کتنی چٹنیاں اور مرے ملے میری بڑی بیٹی کی الماریوں سے میری چھوٹی بیٹی کو؟“ انہوں نے سادگی سے سوال کیا۔

”دیکھیں، میں جیسی ہوں، ٹھیک ہوں۔ کوئی کسی چیز میں اچھا ہوتا ہے، کوئی کسی میں پھر مجھے نہ اتنا نام ملتا ہے، نہ موقع کہ گھر کے کام کروں۔“

ابارازداری سے قریب ہوئے اور آہستہ سے بولے۔ ”ساری ست نکمی اور پھوہڑ کیاں بھی کہتی ہیں۔“

حمد نے شدید ناراضی سے ان کو دیکھا تھا۔ وہ اب وہیں چیزیں موزر ہے تھے۔

❖❖❖

تمام عمر بگلوں کی فصل کائے گا۔۔۔ کہا تھا کس نے کہ صمرا کی آیاری کر اس تاریک سی دوپہڑا کٹڑا اسٹلی جو سر کاری ہبتال میں ہیئت آف ٹیپار ٹمنٹ تھے، ہبتال کے پار لگ کر ایسا کی طرف جاتی رہے تھے کہ ایک سیاہ شیشوں والی کاران کے سامنے آرکی، اور دوسوٹ میں ملبوس افراد باہر نکلے۔

”آپ کے گھر پہاڑی کا ردار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اور کارا دروازہ کھول دیا، گویا اندر بیٹھنے کا شارہ ہو۔ ڈاکٹر واٹلی کا چہرہ

ایک دم سفید پڑنے لگا تھا۔

جس وقت وہ ان افراد کے ہمراہ اپنے ہی گھر میں کسی یہ غال کی طرح داخل ہوئے سامنے ڈرائیور روم کا دروازہ کھلا تھا اور بڑے صوف پہ ہاشم کار دار بر اجمن نظر آ رہا تھا۔ گرے سوت میں ملبوس، تانگ پٹانگ جائے وہ دوالگیوں میں خنک سگار گھمارہا تھا۔ سامنے میز، ڈاکٹر واٹلی کے سگار کا ڈبھلا پڑا تھا۔

”آؤ“ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ”جس طرح وہ سلگتی پر تپش نظریں ان پر گاڑھے بولا تھا، ان کے قدم سست ہوئے۔ ساتھ جواہرات بیٹھی تھی۔ سیاہ لمبی کافтан شرت اور سفید نائیس میں سیدھے بھورے بال چہرے کے ایک طرف گرائے اور ملبوں پر سرخ لپ اسٹک کی تھی۔ وہ بھی ان کو نہیں چھتی نظر دیں سے دیکھ رہی تھی۔ کونے میں نوشیر والا گھٹھنے ملائے بالکل خاموش شل بیٹھا تھا۔

وہ ڈھیلے قدموں سے چلتے سامنے آئے۔ ریس نامی سوت میں ملبوس اوپنج لبے مردنے ایک کری پٹھنے کے انداز میں ہاشم اور جواہرات کے مقابل رکھی، اور انہیں کندھے سے کپڑا کر گویا اس پر دھکلیا۔ پھر تمام گارڈز باہر چلے گئے۔

”ہاشم، کیا ہوا، آپ لوگ اتنے...“ ڈاکٹر واٹلی نے بولنے کی کوشش کی مگر ہاشم ایک دم اٹھا، ایک کاغذ ان کے سامنے پنچا۔

”یہ وہ بکواس ہے جو میرے باپ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ پر تم نے لکھی تھی۔“ غصے سے وہ غارتہ ہوئے ان کے سامنے میز کنارے پر آبیٹھا۔ ”اب مجھے بتاؤ، میرا باپ کیسے مرا تھا، کس نے مارا ہے میرے باپ کو؟ بولو۔“ ایک دم ان کا کارپکڑ کر جھکنا دیا تو ڈاکٹر واٹلی ہکابکارہ گئے۔

”ہاشم تم کیا کہہ رہے ہو؟ کاردار صاحب کی موت گرنے کے باعث...“

ہاشم نے زور کا طمانچہ ان کے منہ پر چڑا تھا اور اس سے پہلے کہ گریبان سے پکڑ کر ان کو اپنے سامنے کھڑا کرتا، جواہرات اٹھی، اور ہاشم کے دونوں کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے تھنھنے کو کہا۔ شیر واب بھی شل، گم صم بیٹھا تھا۔

”ہاشم، تم واپس بیٹھو ان سے بات میں کروں گی۔ واپس بیٹھو ہاشم یہ میرا حکم ہے۔“ وہ جو غصے میں پاگل ہو رہا تھا، اس نیس چلتا تھا کہ ڈاکٹر کو بچ کر ماہی دے، بکشل انھا اور صوفے تک گیا۔ مگر بیٹھا نہیں۔ اس کی رنگت سرخ تھی اور رہا تھا کانپ رہے تھے۔

اب کے جواہرات اسی اطمینان سے ڈاکٹر واٹلی کی طرف متوجہ ہوئی، جن کا چہرہ تھہڑ کے باعث باکیں جانب کوڑا ہک گیا تھا، اور وہ کھانتے ہوئے سنھلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ڈاکٹر واٹلی... میں جواہرات کاردار ہوں۔ گردن انھا اور مجھے دیکھو... دیکھو کہ میں کون ہوں۔“ جواہرات نے تحکم تے کہا تھا۔ کھانتے کھانتے کھا نہتے نقاہت زدہ سرخ چہرہ انہوں نے انھا یا اور ملکہ کو دیکھا۔ وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ بالکل سامنے کہ ہاشم عقب میں چھپ گیا تھا۔

”میں جواہرات ہوں۔ اور نگزیب کاردار کی بیوی۔ ہاشم کاردار کی ماں۔ میں ہوں مالک اس ساری ایسا پر کی!“ سینے پر ایک انگل سے دستک دیتی وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں ڈائزیکٹر ہوں، میں چیف ایگزیکٹو ہوں۔ میں ہوں ملکہ!“ شعلہ بار نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر جمائے، اب ان کی کری کے گرد گول چکر میں ٹھیٹھنے لگی تھی۔ ڈاکٹر واٹلی کے ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جارہا تھا۔ بار بار کچھ کہنے کو لے کھو لئے، پھر بے چارگی سے بند کر دیتے۔

”اس وقت ڈاکٹر واٹلی اس کمرے میں ساری طاقت کی مالک میں ہوں۔ یہاں سب میرے حکم پر چلتے ہیں۔ سب میرے پابند ہیں۔ اور جو دھوکہ تم نے ہمارے خاندان کو دیا ہے وہ دراصل تم نے مجھے دیا ہے۔“ گھوم کر ان کے سامنے آتی، وہ چباچا کر کہہ رہی تھی۔ ہاشم ابھی تک پھر کھڑا غصے سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ شیر واب کی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر جھی خیس اور لب سلے تھے۔ مہر بند۔

”اس وقت اگر تمہیں کوئی سزا دے سکتا ہے تو وہ میں ہوں! اس وقت تمہیں اگر کوئی فنا کر سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ تمہارے اور صرف میں قہڑاں سکتی ہوں۔“ ان کے گرد چکر میں گھومتے، وہ بلند آواز میں بول رہی تھی اور ڈاکٹروں اس طی نام آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔

”اگر اس وقت تمہارے خاندان کو تمہاری زندگی کو کوئی بر باد کر سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ اگر اس وقت تمہاری اولاد کو تمہارے سامنے لا کر کوئی مار سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ تمہیں مجھ سے ڈرنا چاہیے۔ جہنم بھی میں ہوں!“

ڈاکٹر نے پیشانی کف سے رُکھی۔ چہرہ جھکایا۔ ہاشم سر جھک کر کچھ بڑا بڑا یاتھا۔ جواہرات اسی طرح طواف میں گھومتی بول رہی تھی۔ ”اور اگر اس وقت تمہیں کوئی بچا سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔“

”میں اس کو...“ ہاشم ایک دم غرائب نگار مگر جواہرات نے تختی سے اسے گھورتے تھم جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بمشکل ضبط کر پایا۔

”اگر اس وقت تمہیں کوئی معاف کر سکتا ہے تو وہ بھی میں ہوں۔ تمہیں صرف میں ہی اس عذاب سے نجات دلا سکتی ہوں۔ صرف میں تمہیں اپنے بیٹے کے قہر اور اپنے شوہر کی روح سے بچا سکتی ہوں۔ صرف میں تمہاری ڈھال بن سکتی ہوں۔“ اوپھا اوپھا غرائب کے انداز میں کہتی وہ ہنوز ان کے گرد طواف کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے روپورٹ بدی۔ صرف میں... صرف میں تمہاری ڈھال بن سکتی ہوں۔“ اوپھا اوپھا غرائب کے انداز میں کہتی وہ ہنوز ان کے

گرد طواف کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ گرا لیا۔

”میں ہی رحم ہوں، میں ہی مرمت ہوں، میں ہی قہر ہوں، میں ہی تمہاری خدا ہوں اس وقت.... سو....“ سات چکر مکمل ہوئے۔ وہ

اب ان کے سامنے میز کے کنارے پر آئکی اور تن گردن کے ساتھ ان کو دیکھا۔ ”سواب مجھے بتاؤ... کس کے کہنے پر ہم سے جھوٹ بولا تھا؟“

ڈاکٹر واسطی نے چہرہ اٹھایا۔ سفید رنگت اور نرم آنکھوں سے اس شیرنی کو دیکھا، پھر پیچھے کھڑے ہاشم کو جس کا چہرہ ابھی تک سرخ تھا۔

”کرنل خاور!“ بدقت الفاظ ڈاکٹر واسطی کے لبوں سے نکلے۔ آنکھ سے ایک آنسو بھی ٹوٹ کر گرا۔ ”کرنل خاور نے مجھے دھمکایا تھا،

میں نے ڈر کے باعث اپنے خاندان کی حفاظت کے لئے... کیا یہ سب...“

جواہرات کے لبوں سے اطمینان انگیز سانس نکلی۔ گردن مزید تن گئی۔ مزکر ہاشم کو دیکھا۔ جس نے لمحے بھر کو آنکھیں بیچ لی تھیں، پھر

نڈھال سا صوفی پر بیٹھ گیا۔ کچھ درکودہ بالکل لا جواب ہو گیا تھا۔

کسی نے نہیں محسوس کیا کہ... خاموش سانو شیر وال اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔

”ہم کیسے مان لیں کہ تم سچ بول رہے ہو؟ کرنل خاور ہمارا فادار ملازم ہے۔“ جواہرات اب بلند آواز میں ڈاکٹر کو مخاطب کر رہی تھی۔ ہاشم بھی چہرہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں، اس نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔“ وہ بے چارگی سے بولے تھے۔

”کیا بھوت ہے اس کا کہ وہ تمہیں دھمکا رہا تھا؟“

”بھوت۔“ وہ ٹھہرے۔ باری باری دونوں کی صورتیں دیکھیں۔ ”اس نے کام ہونے کے بعد میرے اکاؤنٹ میں پیسے ٹرانسفر کیے تھے۔“

”تم نے وہ پیسے رکھ لئے؟“ جواہرات نے آنکھیں نکالیں۔

”مجھے معاف کر دیں ممزکاردار، میں مجبور تھا۔ میں نہ رکھتا تو وہ مجھ پر شک کرتا۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتا تھا، وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“

”جو تم کہہ رہے ہو، اس کی میں... خود خود تصدیق کرواؤں گا۔ اور اگر یہ جھوٹ نکلا تو یاد رکھنا، میں تمہاری جان لے لوں گا۔ خیز، چھوڑوں گا تو میں تمہیں اب بھی نہیں۔“ ہاشم تن فن کرتا وہاں سے نکل گیا۔ جواہرات نے ایک فاتحانہ مگر آسودہ نظر ڈاکٹر پر ڈالی جنہوں نے

ا ثابت میں سر کو خم دیا تھا۔ پھر وہ اسی اعتقاد کے ساتھ باہر نکل گئی۔

”ہم آنکھیں بند کر کے اس کی بات نہیں مان سکتے ہاشم۔ تم تصدیق کرواؤ۔ بغیر تصدیق کے خادر کو الزام دینا...“ باہر وہ بڑے سجاہ سے کہہ رہی تھی جب ہاشم نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”اگر آپ اس وقت مجھے بتاتیں تو میں دیکھنا خاور میری ناک کے نیچے یہ سب کیسے کرتا ہے۔ مگر آپ نے مجی...“ ملامتی نظر وہ سے دیکھتے اس نے سر جھکا۔ ”آپ نے سعدی کو بتایا، مگر مجھے نہیں۔“ اور رخ موڑ لیا۔ جواہرات بالکل لا جواب پیٹھی رہ گئی۔

.....♦♦♦.....

تنی اک داستان لکھیں گے ہم نے سوچ رکھا ہے ..... ختم کر دیں گے سمجھی تھے مگر آرام سے پہلے جب وہ گھر کے سامنے اتری تو انیکسی کی طرف سے زمر چلی آ رہی تھی۔ سفید بس اور سیاہ کوٹ میں ملبوس، گویا بھی ساعت ت لوئی تھی۔ ہاشم اور شیر و اندر چل گئے مگر جواہرات رک گئی۔ زمر قریب آئی نرمی سے مسکرا کر اس سے ملی۔

”مسز کاردار! مجھے آپ سے ایک کام ہے۔“

”شیو روئی بولو!“ وہ بھی نرمی سے اس کا ہاتھ تھا میں اسے بزرہ زار پر آگے لے آئی۔

”میں نے فارس کو بکشکل قائل کیا ہے کہ وہ اپنے گواہ کے طور پر خود پیش ہو۔“

”اوہ، مگر یہ تو اچھا آئیڈی یا نہیں ہے۔“

”مسز کاردار!“ زمر نے مسکرا کر اس کے ہاتھوں پا پنے ہاتھ رکھے۔ دونوں بزرہ زار پر آئنے سامنے کھڑی تھیں۔ اور پر سیاہ بادل ابھی تک بوجھل تھے اور ہلکے ہلکے گرج بھی رہے تھے۔ ”آپ بھول گئیں میں نے فارس سے کیوں شادی کی تھی؟“

جوہرات ذرا چوکی۔ پھر مسکرائی۔ ”تم اس کو اسی کی گواہی میں پھنسانا چاہتی ہو؟ تو کیا تم ہی نے اس کو اس مقدمے میں...“

”نہیں، یہ صرف اتفاق تھا، اس کے اور دشمن بھی ہیں، لیکن میں اس موقعے کو کھونا نہیں چاہتی۔“

”مگر وہ نکلنے ہے، گواہی مقاطط طریقے سے دے لے گا۔“ جواہرات نے بظاہر لا علیٰ ظاہر کیا۔ زمر قدرے قریب ہوئی اور مسکرائی۔ ”نہیں، وہ نہیں دے گا، کیونکہ میں اس وقت وہ کہیں اور کسی اور جرم میں ملوث تھا۔ میں اس کو پھنسالوں گی، اپنا انتقام لے لوں گی، مگر یہ صرف تب ہی ممکن ہے جب وہ گواہی کے لئے کہرے میں آئے۔“

”وہ راضی ہے، تو کیا مسئلہ ہے؟“

”مسز کاردار! میں نے بہت ادا کاری سے اسے قائل کیا ہے۔ اب مجھے اس کی گواہی کے وقت تک خود کو اس کا مغلص و کیل ثابت کرنا ہوگا، مگر وہ... وہ ڈیفینس witness وون (DW1) کے طور پر پیش ہوگا۔ خود سوچیے، ابھی تمام پر اسیکیوشن (Pws) witness پیش ہوں گے، کوڑ witness (Cw) کی باری آئے گی۔ میں یہ لگتے ہیں اس کا روای میں!“ پھر اپنا سیست تے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”آپ نے میری مدد کا وعدہ کیا تھا، پلیز میری مدد کریں۔ میں زیادہ عرصہ ادا کاری قائم نہیں رکھ پاؤں گی۔ مجھے ڈر ہے وہ بدل توڑ کر بھاگ جائے گا۔ کوڑ witness کا آپ کو معلوم ہے، لیکن تاریخ دے دیا کرتے ہیں، سوائے...“ ذرار کی۔ ”سوائے ان کیسز کے جن کو وہ خود تیزی سے چلانا چاہیں۔ آپ صرف چند روپاں ہلا دیں تو ہمیں تاریخ جلدی مل جایا کرے گی۔“

بادل زور سے گر جئے سیاہ دوپہر میں بھلی بھی کڑا کے کی چکنی۔ جواہرات نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کیا۔ گردن مزید تن گئی۔ آنکھیں چکنی تھیں۔

”میں سمجھ گئی۔ تم بے فکر ہو۔ میں دیکھ لوں گی۔“ اکڑے کندھوں کے ساتھ شان بے نیازی سے تسلی دی۔ زمر نے سر کے خم ت

شکر یہ ادا کیا اور مزگئی۔ اب وہ بزرہ زار پر چلتی انگلی کی طرف آتی دکھائی دی و رہی تھی اور عقب میں گھاس میں جواہرات سیاہ لباس اور سرخ پا اسک میں کسی خوبصورت مجسمے کی طرح کھڑی مسکرا رہی تھی۔

پہلے خاور اور اب فارس۔ اس کے دشمن خوبخود پسپا ہور ہے تھے۔ بارش کی پہلی بونداں اس کے اوپر گردی تو وہ اسی آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ گئی۔ اب صرف دوپیادے رہ گئے تھے۔ سعدی اور میری۔

جب تک زمرا نیکسی کے دروازے پہنچی بارش ایک دم تر تربر نے لگی تھی۔ وہ گھنگریا لے بالوں کو ہاتھوں سے جوڑے میں پیشی، اندر آئی۔ لاڈنخ میں یوب لا یئس جلی تھیں۔ ٹھنڈا سا اندھیرا پھر بھی محسوس ہوتا تھا۔ سب اپنے کمروں میں تھے۔ وہ اوپر آئی تو کمرے میں حنہ صوفے پہنچی، پیر جھلاتی سوچ میں گم تھی۔

”آپ کدھر گئی تھیں؟“ اسے آتے دیکھ کرہ خیال سے چونکی۔

”میں اس امر کو یقینی بنانے گئی تھی کہ فارس کے مقدمے کی تاریخیں جلد از جلد ملا کریں۔ دیکھنا، اب پراسکیو شن خود اس مقدمے کو تیز چلا میں گے۔“ وہ بات کرنے کے ساتھ اپنی چیزیں اور پرس جو آتے ہی ڈرینگ نیبل پر رکھ کر چلی گئی تھی، اب اٹھا کر ان کی بجھوں پر رکھ رہی تھی۔ خنین غور سے اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی گئی۔ اب وہ بستر کی طرف آئی اور اسے جوڑنے لگی۔

”آپ کے باتحر دوام کی صفائی کون کرتا ہے؟“ خنین اس سے زیادہ صبر نہیں کر سکتی تھی۔ کمبل تھہ کرتے زمر کے باتحر کے قدرے اچھبھے سے اس سوال پر اسے دیکھا۔

”صداقت کرتا ہے، کبھی میں خود کرتی ہوں۔“

”میں نے تو آپ کو کبھی صفائی کرتے نہیں دیکھا۔“

”صفائی میں دو منٹ تو لگتے ہیں۔ کیوں؟“ اسے سمجھنی میں آیا تھا۔ خنین چپ ہو گئی۔ چند منٹ میں وہ کرہ درست حالت پر داپک لا چکی تھی۔

(محکے کی بات کا پتہ نہیں چلتا۔ نہ میں اس فلیش کو ابھی تک کھول سکی۔ نہ میں فخر پنماز کے لئے اٹھ سکتی ہوں۔ نہ میں آر گناہ زد ہوں، نہ نیک اور تابعدار۔ میں ایک failure ہوں۔ صرف فیلیئر! وہ ما یو سی سے سوچتی رہی۔ کھڑکیوں پر بارش تر تر برستی رہی۔

❖❖❖

میں کس زبان سے گھر کو گھر کھوں کہ مجھے ..... صدف صدف میں ہجوم۔ شر نظر آئے  
شہر کی مصروف شاہراہ پر وہ طویل قامت عمارت تی ہوئی کھڑی تھی۔ اوپری منزل کے اس کشادہ آفس میں مدھم تباہ روش تھیں۔ آبوی میز کے پیچھے میٹھے ہارون عبید، کچھ کاغذات پر باری باری دستخط کر رہے تھے۔ سیکڑی جلدی ان کو کچھ بتاتے ہوئے کاغذ پلت کر اگلے صفحے سامنے لارہی تھی۔ تجھی دروازہ ذرا سانچ کر کھلا۔ ہارون نے چہرہ اٹھایا اور یہ نگ لگا سزر کے پیچھے سے جھانا کا۔

چوکھٹ میں جیز اور ہائی نیک سوئٹر میں ملبوس، سنجیدہ چہرے والا احمد شفیع کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

”آؤ احمد آؤ۔“ انہوں نے اسے آنے کا اشارہ کیا اور دستخط کرتے کہنے لگے۔ ”تمہارے ساتھ ایک آئیڈی یا ڈسکس کرنا تھا۔“

”سر!“ اس نے ادب سے کاغذ ان کے سامنے رکھا۔ ہارون نے ایک سرسری نظر ڈالی۔ گھر پھر پھر گئے۔ چونک کر کاغذ کو دیکھا۔

پھر احمد کو۔

”استغفی؟“، قلم کی کیپ بند کی عنیک اتاری اور پیچھے ہو کر بیٹھے۔ سر کے خم سے لڑکی کو جانے کا شارہ کیا اور اسے بیٹھنے کا۔

”سر میرا کا منٹ یکٹ آپ کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔ آپ کو اگلے ماہ سینئر بنایا جا رہا ہے، سو میرا کام بھی ختم۔“

”ہوں!“ وہ قلم ہاتھوں میں گھانتے غور سے اسے دیکھنے لگے۔ ”تم خفاہ کی بات پا؟“

”نہیں سر! مجھے بس ایک بہتر جا بدل گئی ہے۔“ وہ پھیکا سامسکرایا۔

”اچھا گلڈ۔ کس کے ہاں؟“

”ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے، میں جوان کرنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔“

اس بات پر ہارون نے آنکھیں سیڑی کر اسے دیکھا۔ ”میں نے تمہارے جبل والے دوست کے لئے سفارش کر دی تھی، میری بیٹی بھی

با شخص اس کے لئے وہاں گئی تھی، تم شیور ہو کرم سے خانہ بیٹیں ہو؟“

”نہیں سر! میری اتنی اوقات نہیں۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ آپ نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔“

”کاظم ریکٹ ری نیو کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں میں۔“ وہ قائل نہیں ہوئے تھے سوا سے پیشکش دی۔

”سر آپ جب بلا کیں گے میں حاضر ہوں گا، مگر میں اس دوسری جگہ واقعی جا بکرنا چاہتا ہوں۔“ احرمنانت بھری سنجیدگی سے

کہہ رہا تھا۔

”اوکے! اوکے!“ سرا ثابت میں ہلاتے وہ اس کا غندپر دخنط کرنے لگے۔ وہ خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔

جب وہ اس عمارت سے نکل کر زیر زمین پار گنگ ایریا میں اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس کے قریب ایک لمبی، شیشیوں والی کار آ رکی۔ تمہے خانے میں اونچے گول ستونوں سے کھڑے اس پار گنگ لاث میں خالی کاریں دور دور تک کھڑی تھیں۔ روشنی کم تھی۔ ویرانی اور

خاموشی۔ ایسے میں احرمنے دیر ان نظر وں سیاہ لمبی کار کو دیکھا، جس میں سے گارڈ نکل کر باہر کھڑے ہو گئے تھے اور پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔

اندر کھلی اسی جگہ تھی اور دو شستیں آمنے سامنے بی تھیں۔ ایک نشت خالی تھی، اور دوسری پتمنخت سے پیٹھی جواہرات مسکرا رہی تھی۔

”بھیلوا گیں احرمن!“ احرمن سر کو خم دیا اور اندر اس کے سامنے آبیٹھا۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ دونوں تمہارے گئے۔

”تمہارا شکر یہ ڈاکٹر واسطی والے معاملے کے لئے۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوئی۔

ہاشم نے جواہرات کو اس کا سیل فون اسی روز واپس کر دیا تھا مگر اس نے باہر جا کر ایک پر فون سے احرمن کو کال کی تھی۔ ہوٹل کافون،

اپناملازم اسے کسی پر بھروسہ نہ تھا۔ احرمنے اس نے مدد مانگی تھی۔ بد لے میں ایک آفردی تھی۔ ایک کام ہو چکا تھا، دوسرا ہونے جا رہا تھا۔

”زیادہ مشکل نہیں تھا۔ آپ خاور کو ہاشم کی نظر میں معمولی ثابت کرنا چاہتی تھیں، میں نے بیک ڈیٹس میں ان دونوں کے اکاؤنٹس

میں ہیر پھیر کر واڈی ہے۔ ہاشم چیک کرے گا تو سارا کام جیونیں ملے گا۔ بیک ڈیٹس میں دونوں کے فون بلز میں بھی رو دبل کی گئی ہے۔ میں

ایسے ایلکٹر تھمراست تعالیٰ کرتا رہتا ہوں۔ وہ فون ریکارڈ بھی نکلوائے گا۔ مجھے صرف یہی ثابت کرنے کو ہا تھا آپ نے کہ خاور نے ڈاکٹر کے

ساتھ میں بھگت سے کوئی کام کروایا ہے۔ تاریخ پونے دو سال پہلے کی دی آپ نے، مگر نہیں بتایا کہ معاملہ کیا تھا؟“

”تم جانتے ہو وہ میں نہیں بتاؤں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے اپنے ایئر رنگ پر انگلی پھیر رہی تھی۔ ”کیوں ناہم اس آفر کے بارے

میں بات کریں جو میں نہیں دی تھی؟“ احرمنے گھری سانس لی۔

”میں نے یہ سب بھی جا بھاصل کرنے کے لئے کیا ہے، مگر ممزز کار دار میں خاور کی طرح کا سیکیورٹی آفیسر نہیں بن سکتا۔“

”احرمنا مجھے صرف ایک پی آر او چاہیے، میرا ایک ذاتی نائب۔ اور تم قابل اعتبار ہو۔ خاور کا نام البدل میں اس سے بہتر رکھنا چاہتی

ہوں۔“

”خاور کا نام البدل آپ کو کبھی نہیں ملے گا۔ وہ آل ان دون تھا۔ ہاں دو تین لوگ مل کر اس کا کام سنبھال سکتے ہیں۔ میں یہ جا بھا

چاہوں گا۔“ اب کے وہ مسکرا یا۔ ”مگر پیسے سے زیادہ مجھے تحفظ چاہیے، میرا کوئی مقام ہونا چاہیے۔ میں کسی کی کمین نوکر کی طرح نہیں رہنا

"احمر تمہارے اندر سب سے پرکشش بات معلوم ہے کیا ہے؟" وہ مسکرا کر اسے دیکھتی محفوظ انداز میں کہہ رہی تھی۔ "تمہارے اندر کا شر! تمہاری فراڈ اور evil سائیٹ۔ طاقت کی خواہش۔ کنٹرول کی آرزو۔ تم ambitious ہو۔ مجھے ایسے ہی شخص کی ضرورت ہے۔!"

"پھر میں آپ کے لئے کام کرنے کو تیار ہوں، مسز کاردار!" سرانحًا کرایک عزم سے وہ بولا تھا۔ جواہرات نے ہاتھ مصانع کے لئے بڑھایا۔ احر نے سر کو خم دیتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کاردار ز کا حصہ بننے پر خوش آمدید!" مسکرا کر وہ بولی تھی۔ وہ بھی بھاری دل سے مسکرا یا۔

❖❖❖

دیکھ آ کر کبھی ان کو بھی جو تیرے ہاتھوں ..... ایسے اجڑے ہیں کہ آباد نہیں ہونے کے اس صحن جب سارے شہر کو سرما کی نرم گرم دھوپ نے اپنے پروں میں سمیٹ رکھا تھا، زمرہ اکٹھ قاسم کے آفس میں ایک لمبی ملاقات کے بعد قدرے ناخوش سی کرسی سے اٹھ رہی تھی۔

"میں سوچ کر بتاتی ہوں آپ کو... وہ بھی ساتھ ہی اٹھے۔

"آپ جو بھی فیصلہ کریں، جلدی کیجھے گا۔ ڈوز کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا، اور پرس کی اسٹریپ کندھے پر ڈالی۔

"زمر... کسی دوست سے اپنا مسئلہ شیر کیجھے گا۔ اس طرح آپ بہتر فیصلہ کر سکیں گی۔" وہ فقرہ اس کے ذہن میں انک گیا۔ وہاں سے نکل کر بے مقصد سڑکوں پر کار چلاتے، وہ لب کاٹتے ہوئے اسی فقرے میں انکی روی۔

"انتے سال بعد احساس ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کہ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔" نکلن پر کارروکے وڈا اسکرین کے پار پر سوچ نظریں جمائے خود سے بڑھ رہی۔ "صرف سعدی تھا۔ میں اس سے ہربات کر سکتی تھی۔ باقی اسکوں کافی کی فریڈریز ہیں مگر ان سے... ان سے وہ دل کا تعقیل کبھی نہیں ہیں، بن سکا۔ اور پچھلے چار سال... جب سعدی ساتھ نہیں تھا... تو بھی میں نے کوئی نیا دوست نہیں بنایا جس کو بغیر کسی ڈریا جھمک کے میں اپنا حالی دل کہہ سکوں۔ میں کیا کروں؟ کس سے کہوں؟" اس نے آنکھیں بند کر لیں، اور جب کھولیں تو خود کو اس ملا قاتی کے رو برو پایا۔ کمرے میں پایا جہاں وہ تیز پہ تھیلیاں رکھے، کری پہ بیٹھی تھی اور اس کے سامنے، فارس بیٹھ رہا تھا۔ وہ وہاں کیوں آئی، کیسے آئی، کیا لینے آئی، اسے کچھ معلوم نہیں تھا، بس دل نے کہا۔

"کہیے۔" وہ سنجیدگی، مگر قدرے لارپوادی سے اسے مخاطب کر کے بولا تو زمرہ را چوکی۔ خالی خالی نظریں اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ وہ باہم انگلیاں پھنسا کر میز پر رکھے، آگے ہو کر بیٹھا، اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"مجھے کچھ سوالات پوچھنے تھے ناظم کے بارے میں۔" اس نے اپنی فال کھول کر سامنے رکھی، اور لبچے کو مصروف ہاتھے ہوئے چند نکات پوچھنے لگی۔ دوسرا طرف خاموشی چھائی رہی تو زمر نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ پتلیاں سکیڑے نگور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں روشن داں سے تیز سنہری دھوپ چھمک رہی تھی، اور شعاعیں فارس کے ارد گرد سے نکل کر میز کو روشن کر رہی تھیں۔ ایسے میں فارس کا چہرہ تاریکی میں لگتا تھا، زمر کو بھی آنکھیں چند صیار کر سے دیکھنا پڑ رہا تھا۔

"گھر میں سب خیر ہے؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں؟" زمر نے آہستہ سے قلم کا ڈھکن بند کیا۔ چہرہ جھکائے چند لمحے سوچتی رہی۔

"میں احر کے ساتھ اس ہوٹل تمہارے معاملے کی کھوج لگانے گئی تھی، یہ معلوم کر لیا تھام نے، پھر یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں ہسپتال اپنے

ڈاکٹر سے بار بار ملنے کیوں جاری تھی؟ ”نظر اٹھا کر فارس کو دیکھا تو وہ ایک دم چونکا تھا، پھر مرید آگے کے ہوا۔“ آپ نے کہا تھا وہ میں کاچھ ویٹن کا چیک اپ ہے، ڈاکٹر آتا نہیں ہے اس لئے بار بار جانا پڑ رہا ہے، میں نے یقین کر لیا تھا، کیوں؟ کیا ہوا؟ کیا کوئی اور بات ہوئی ہے؟“ وہ ایک دم فکر مندا تھا۔ میں کیا کوئی معلوم تھا۔ زمر اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ گئے دنوں میں میں کیا گیا وہ ریسٹورانٹ ڈز... موم تی کا ٹھمنا تھا۔ شعلہ... زرتاش کا ذکر... وہ سب ایک دم سے درمیان میں حائل ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کورٹ میں ملاقات ہو گی۔“ وہ جانے لگی، مگر اس نے تیزی سے زمر کی کلائی پکڑی۔ وہ رکی۔ نظر اٹھا کر فارس کو دیکھا جس نے صرف ابرو کے اشارے سے اسے واپس بیٹھنے کو کہا تھا، اور پھر... دور کھڑے ڈیوٹی الہکار کو۔ ہولے سے کلائی چھڑاتی وہ واپس بیٹھی۔ ”میرا ڈوینڈ لذتی ضائع ہو چکا ہے۔“ خبرنا میں کی خبر کی طرح اطلاع دی۔ نظریں فارس کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ ایک لمحے کو بالکل لا جواب ہو گیا تھا۔

”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ بولا تو آواز بکھلی تھی۔

”بتانے لگی تھی،“ اس رات ریسٹورانٹ میں، گرتم نے زیادہ اہم باتوں کا ذکر چھیند دیا۔“ جیسے اپنے ہی زخموں پر نمک چھڑ کا۔ سس۔ درد کی ٹیکیں اٹھی تھیں۔

”زمر... میں...“ وہ جیسے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر گھری سانس لی اور سنجیدگی و فکر مندی سے پوچھنے لگا۔ ”آپ... ڈاکٹر نے کیا کہا اب کیا ہو گا؟“

”ٹرانسپلانت کروانا ہے، ڈوزنل گیا ہے، وہ غریب آدمی ہے، عمر میں کافی زیادہ ہے، بہت سخت مند بھی نہیں ہے، میں اس سے بھی ملتی تھی،“ فتنی پر سست سے زیادہ چالن ہے کہ میرا جنم اس کے گردے کو تجیک کر دے اور وہ گردہ لگتے ہی ضائع ہو جائے۔ مگر مسئلہ نہیں ہے۔ ”پھر؟“

”اس آدمی کو اسی ماہ ٹرانسپلانت کروانا ہے، اور پھر ملک سے باہر چلے جانا ہے۔ اگر مجھے نہیں دے گا تو کسی اور کو دے دے گا۔ سارا مسئلہ ناممکن لائن کا ہے۔ اگر میں ابھی سرجری کے لئے چلی گئی... تو مجھے ریکورنے میں بھی اتنا وقت لگے گا۔ تھہار اڑائیں متاثر ہو گا...“ بے بی سے فائل کی طرف اشارہ کیا۔ فارس ”ہوں“ کہتا پیچھے کو ہو کر بیٹھا۔ ”کیا ڈوزر ک نہیں سکتا؟ اس کا بندوبست ڈاکٹر نے کیا تھا یا آپ کا کوئی جانے والا ہے؟“

”نہیں، ڈاکٹر نے ہی ڈھونڈا تھا۔ وہ نہیں رک سکتا، اس کی بھی مجروری ہے۔ مجھے خود بھی زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں دو ڈاکٹرز کے پاس گئی ہوں۔ دنوں بیکی کہتے ہیں۔“

”اوہ آپ کو اپنی سخت کا انتخاب کرنا ہے یا میرا۔ ہے نا؟“ وہ کچھ دیر بعد اسی سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو آپ کس کو چوڑ کریں گی؟“

زمر چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ چار سال... وہ فون کال... نکاح نامہ... موم تی کا ٹھمنا تا شعلہ... ہیرے کی لوگ... ہر شے درمیان سے نکل گئی۔

”میں اڑائیں چھوڑ سکتی، کسی بھی قیمت پر نہیں۔ لیکن اگر میں نے اس ڈوز کو جانے دیا تو مجھے بعد میں ڈوز کیسے ملے گا؟ فارس...“ تھک کر جیسے اس نے سر جھکا۔ ”میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ کم از کم کچھ عرصہ میں جینا چاہتی ہوں۔“ وہ خاموش سا اسے دیکھ گیا۔

”تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟“

”آپ یہ رانسپلانٹ مت کروا سکیں۔“ بہت دیر بعد وہ اس کی آنکھوں پر نگاہیں جائے بولا تو لمحے بھر کو زمر کا دل ڈوبا۔ کوئی آس سی نہیں۔ شاید اسے امید تھی کہ وہ کہے گا وہ اس کی فکر کرے اپنا علاج کروائے، مگر وہ اسے خود کو منتخب کرنے کا کہہ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ زمر نے پلکیں جھکا دیں۔

”زمر!“ وہ قدرے آگے ہوا۔ شعا کیں ہنوز اس کے اطراف سے نکل کر میز پر گردھی تھی اور اس کا چہرہ ابھی تک اندر ہیرے میں تھا۔ میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں خود غرض ہوں۔ بلکہ وہ ڈوزر... وہ صحبت مند نہیں ہے، رسک بہت زیادہ ہے، پھر میں بھی آپ کے ساتھ نہیں ہوں گا، میں ادھر ہوں، گھر میں سب الگ ڈشرب ہیں۔ ابھی آپ سرجی والار رسک مت لیں۔“ لمحے بھر کو رکا۔ زمر نے اس کی سنبھالی آنکھوں کو دیکھتے اثبات میں سرہلایا۔

”آپ کی شکل سے لگ رہا ہے، آپ دل سے راضی نہیں ہیں۔“ درا دری بعد وہ مدھم سایپا۔ زمر نے تردید نہیں کی۔ ”آپ کو مجھ پر اعتبار ہے؟“

”ہے مگر...“

”آپ بس مجھ پر اعتبار کریں۔ مجھے یہاں سے نکلنے دیں۔ میرا وعدہ ہے، میں آپ کا یہ مسئلہ حل کر دوں گا۔“

”تم نہیں کر سکتے۔ ڈوزاب نہیں ملے گا۔“

فارس لمحے بھر کو چپ ہوا۔ ”میں...“ وہ جیسے کچھ کہنا چاہتا تھا گر پھر رک گیا۔ آپ کو ڈوز کذنی چاہیے نا؟ میں ایک ڈوز کے بارے میں جانتا ہوں، آپ کا رانسپلانٹ ہو جائے گا۔ بس مجھے یہاں سے نکلنے دیں۔“ وہ چونکی۔

”کون؟“ اس کے ابر و اچنچے سے اکٹھے ہوئے۔ ”اور تمہیں کیسے پتہ اس کا کذنی مجھے نیچ کرے گا؟“

”زمر، جس کذنی ڈوز کو میں جانتا ہوں، اس کا کذنی کبھی آپ کا جسم رجیک نہیں کرے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ پلیز!“ آگے کو ہوئے، میز پر ہاتھ رکھ کر وہ قدرے بے چینی اور فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ آپ صرف مجھ پر بھروسہ کریں۔ کریں گی نا؟“ وہ الجھنی تھی فارس کس کی بات کر رہا تھا، مگر... اس نے اس کی آنکھیں دیکھیں اور پھر ساری مزاحمت سارے شکوہ دم توڑ گئے۔ ”ٹھیک ہے۔ جب تم نکلو گے تو ہم یہ مسئلہ تب حل کر لیں گے۔“

فارس کے لبوں سے ایک اطمینان بخش سانس نکلی۔ وہ اٹھ گئی تو وہ دھیرے سے بولا۔ ”جو کچھ میں نے اس رات ریشور انٹ میں کہا، وہ...“

”نہیں فارس!“ زمرا یہ ہیوں پچھوئی اور ہاتھ اٹھا کر ایک دمختی سے اسے روکا۔ ”اس جگہ مت جاؤ۔ وہ جو بھی تھا، وہ ذاتی تھا۔ وہ جہاں تھا، وہیں ہے۔ اور یہ...“ اس کی فائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ٹیم درک ہے۔ اس میں اگر ہم امن سے کام کر رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ سب دھندا لگیا ہے۔ وہ جہاں تھا، وہیں ہے۔“ ستمبھہ کر کے وہ مر گئی اور وہ سرجھک کر رہا گیا۔

..... ♦♦♦ .....

خبر ہوتی اگر بعد از محبت یہ جنوں ہو گا..... تو ہم رستہ بدلتے برے انعام سے پہلے اس چکیلے دن جہاں اب بھی سڑکوں اور سبزہ زاروں پر گزشتہ روز کی بارش کا پانی ہلکا ہلکا ٹھہر انظر آتا تھا، وہ اوپری کوٹھی اپنے ستونوں پر کھڑی، بالکل خشک اور نکھری نکھری سی کھڑی تھی۔ گیٹ کھلے تھے اور اندر دو گاڑیاں یکے بعد دیگرے داخل ہوئی تھیں۔ کھٹ کھٹ، دروازے کھلے۔ گارڈز نکلے۔ ہاشم بھی باہر نکلا۔ سن گلاسز اتارے، اور ایک طاڑانہ نگاہ اطراف میں دوڑا۔ پھر سب کو وہیں رہنے کا اشارہ کرتا تیزی

سے اندر ونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اندر لالی تھی۔ پھر لا دنخ۔ دیوار پر شہری اور سونی کی بڑی سی تصویر آ دینے والی تھی۔ اسی دیوار سے گلے صوف پر سونی بیٹھی سر جھکائے، ٹیپ پکڑے گیم کھیل رہی تھی۔ ایک ملاز مرد قریب میں المرٹ سی بیٹھی تھی۔ اسے یوں آتا دیکھ کر فوراً رکھی۔

”سونی!“ بھاری آواز میں سمجھی گئی اس نے بیٹی کو مخاطب کیا تو سونی نے چہرہ اٹھایا۔ آنکھیں چمکیں۔ ”بابا۔“ ٹیپ چھوڑ کر رکھی اور بھاگ کر اس کے پاس آئی، مگر ہاشم نہیں ہلا۔ نہ ہی پچھی کو گلے سے لگایا۔ بس ملاز مرد کو مخاطب کیا۔ ”سونی کا سامان کار میں رکھوا۔ اور اسے بھی کار میں بٹھاؤ۔ شہری کہاں ہے؟“

ملاز مرد اس غیر متوقع حکم پر قدرتے تذبذب کا شکار ہوئی۔

”وہ اپنے کرے میں...“ ہاشم نے بغیر تیزی سے اس کے کمرے کی طرف آیا۔ دروازہ پیروں کی ٹھوکر سے کھولا، تو وہ جو سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی، کانوں میں ایئر رنگ پہن رہی تھی، اکتاہٹ سے سخت سست سنانے لگی تھی مگر آئینے میں اپنے پیچھے نظر آتے ہاشم کو دیکھ کر چوکی۔ پھر پوری اس کی طرف گھومی۔ چھوٹے بالوں کی اوپنی پونی بنائے، ست رنگی شرت سفید پینٹ پر پہنے، وہ میک اپ لگائے، تیار نظر آ رہی تھی۔

”تم ادھر کیے؟“ اچھنچھے سے اس نے پوچھا تھا۔ ہاشم نے اپنے عقب میں دروازہ ہند کیا اور تیزی سے اس کے سر پر آپنچا، اسے گردن سے دبوچ کر دیوار سے لگایا۔ ایئر رنگ چھنک سے زمین پر جا گرا۔

”ہاشم... تم کیا...“ وہ ہکا بکا، اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی، مگر اس کا گلا دب رہا تھا، آنکھیں ابل رہی تھیں۔

”تمہارے سیف میں نیلے رنگ کے لفافے میں ایک سی ڈی ہے۔ ہے یا نہیں ہے؟“ چباچا کر بولتے وہ اس پر نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔

”ہاشم.... چھوڑو...“ اس نے مزید زور سے گلا دبایا، شہرین کا سانس رکنے لگا۔

”ہے یا نہیں؟“ سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ غریا تھا۔

”ہے... ہے۔ مجھے چھوڑو،“ مگر ہاشم نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچے زور بڑھایا۔ اس کا رنگ سفید پڑنے لگا۔ ”کہاں سے آئی ہے وہ تمہارے پاس؟“

”سعدی.... سعدی نے دی تھی۔ مجھے چھوڑو میں بتاتی ہوں۔“ ہاشم نے ایک جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑی۔ وہ بے اختیار لڑکھڑائی، اور پھر گردن پر ہاتھ رکھ کر ہانتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھنی گئی۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ پھر چہرہ اٹھا کر صدمے اور نفرت سے اسے دیکھا۔

”تم انسان نہیں جانور ہو!“

وہ پھر اس کی طرف بڑھا تو شہری جلدی سے پیچھے کوہٹی۔ ”سعدی... سعدی نے دی تھی۔ میں نے اس کو ایک کام کہا تھا، اس نے یہ رکھوائی تھی۔“

بری طرح کھانتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

تھوڑی درپر بعد جب کھانی سنبھلی تو اس نے اٹھ کر لا کر کھولا اور اندر سے وہ نیلا لفافہ نکال کر ہاشم کو تھما یا۔

”اس میں کیا ہے؟“

”یہ encrypted ہے، اور میرے پاس اتنا وقت اور دماغ نہیں ہے کہ اسے کھوئی پھر دوں۔ اس نے کہا تھا اگر مجھے کچھ ہوا تو یہ میڈیا کو دے دینا۔“

”تو تم نے یہ کس کو دی تھی؟“ وہ گھنٹی سے پوچھ رہا تھا۔

”میں نے کیا کرنا تھا کسی کو دے کر؟ ایک دفعہ کھولنے کی کوشش کی، نہیں کھلی تو چھوڑ دیا۔ میں تو اسے بھول بھال بھی لئی تھی، مگر تمہیں کس نے بتایا اس بارے میں؟“ بنوуз گلے پہاڑھر کھٹکہ، وہ حیرت اور ناگواری سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر خیال آیا۔ ”اوہ لیٹ می گیس... سعدی نے بتایا ہوگا۔“

”کیا کام کہا تھا تم نے اسے؟“ وہ بلند آواز میں گرجا۔

”نہیں بتاؤں گی۔ اور... ابھی کے ابھی یہاں سے نکل جاؤ، بازوں پر کار کے دروازے کی طرف اشارہ کرتی وہ چلائی تھی۔“

”تم نے یہ دیہ یو یک کی ہے شہری، اور میں یہ جانتا ہوں۔ مگر میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا ابھی، کیونکہ تم سے بڑے سائل ہیں فی الحال میرے پاس۔ لیکن اس کے بعد...“ دیہ یو والا پیکٹ ہاتھ میں ہلاتے تنبیہ کرتے بولا تھا۔ ”اس کے بعد میں تمہیں دلکھ لوں گا، اور اس دلخیل میں تمہیں کوئی رعایت نہیں دوں گا۔“

”گیٹ آؤٹ!“ وہ بے لسی سے چلائی۔ ہاشم ایک سخت نظر اس پر ڈالتا باہر نکل گیا۔

❖❖❖

ہم ہیں وہ ثوٹی ہوئی کشتبیوں والے تابش ..... جو کناروں کو ملاتے ہوئے مر جاتے ہیں

راستے میں اس نے سونیا سے کوئی بات نہیں کی۔ سنجیدہ چہرے کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ سونی کو گھر ڈرپ کر کے وہ آفس آیا اور ایک آئی ٹی کے لڑکے کو بلایا۔ دس منٹ بھی نہیں لگے اسے انگر پشن کو کھولنے میں۔ اور جب وہ کھلی، تو اندر ایک ہی دیہ یو۔ تاریخ اسٹیپ بھی کوئی ڈیڑھ پونے سال پرانی تھی۔ سعدی نے یہ اتفاق انہی دنوں شہری کو دیہ یو تھی۔

”سوفارس نے دیہ یو یک نہیں کی تھی۔ شہری نے کی تھی۔“ وہ اب آفس میں خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ”اور اس کے بعد شہری میرے پاس آئی تھی، کہپنی میں شیرز کی بات کرنے۔ سعدی بچ بول رہا تھا۔“

اس نے میر پر کھلی ایک دوسرا فائل کھولی۔ اندر چند کاغذات رکھے تھے۔ ہر دو شے جو ریکس ڈھونڈ سکا تھا خاور اور ڈاکٹر کے تعلقات کے بارے میں۔ سعدی یہاں بھی سچا تھا۔ ہاشم پیشانی کو مسلسلہ، بند آنکھوں سے کتنی ہی دیر کری کی پشت سے نیک لگائے بیٹھا رہا۔ پھر فون اٹھایا۔ نمبر ملک کر سعدی سے بات کروانے کو کہا۔

”کہہ ہاشم۔ میری یاد کیسے آئی؟“

”تم بچ کہر ہے تھے۔“ وہ تھکان سے بولا تو دوسرا طرف سعدی نے بے اختیار تھوک نکلا۔

”تمہاری دنوں باتیں بچ تھیں۔ میرے ساتھ میرے اپنوں نے دھوکہ کیا ہے۔“

”کوئی گھنٹی بجی؟“

”ہاں بچ رہی ہے، عرصے سے بچ رہی ہے۔ میں اپنی بیٹی سے بات نہیں کر پا رہا، میرا اپنے باپ سے بہت گھر ارشتہ تھا، کسی نے ایک ہی وار میں ختم کر دیا۔ سوچتا ہوں، میری بیٹی سے بھی کوئی مجھے چھین لے گا، وہ کیسے سروایو کرے گی؟“

”تمہاری دنوں سچنا چاہیے تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔“ وہ بے زاری سے بولا تھا۔ ہاشم کتنے ہی لمحے خاموش رہا۔ رہی سے نیک لگائے آنکھیں موندے، فون کان سے لگائے، وہ گھرے دکھ کے زیر اثر تھا۔

”کیا کوئی نجات کا راستہ ہے سعدی؟ کیا میرے لئے کوئی معافی، اور توبہ کا راستہ ہے؟“

سعدی کو آگ لگ گئی تھی۔ ”تم جیسے لوگوں کے لئے کوئی معافی، کوئی توبہ نہیں ہوتی۔ اللہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ قتل معاف نہیں ہوا کرتا۔“

”اچھا۔“ وہ بکا ساہنسا۔ ”تمہارا خدا اتنا ظالم ہے کیا؟“

”ہاں وہ ظالموں کے لئے شدید العقاب ہے۔ اتنی زندگیاں تباہ کر کے تم معافی اور توبہ کی امید نہیں رکھ سکتے۔“

”کیا میرے لئے کوئی اچھائی کا راستہ نہیں ہے؟ کیا میں اس دلدل سے نکل سکتا؟ کیا تمہارے خدا کے پاس ذرا سی گنجائش بھی نہیں ہے میرے لئے؟“

”نہیں ہے۔ سن لیا تم نے؟ نہیں ہے۔“ وہ چلایا تھا۔ اندر بہت کچھ ابلغنے لگا تھا۔

”کیا تم میرے لئے دعا کرو گے سعدی؟ کہ میرے لئے کوئی راستہ نکل آئے؟ اس گلٹ اس دلدل، ان جرام سے نکلنے کا راستہ؟“ وہ آنکھیں بند کیے مددھ اور گلی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”تم جیسا دل کا اندھا آدمی اس قابل نہیں ہے کہ کوئی تمہارے لئے دعا کرے۔“ اور کھٹ سے فون بند کر دیا گیا۔ ہاشم نے ست روی سے فون میر پڑاں دیا۔

دوسری طرف سعدی فون ٹھیک کر کرے میں ادھر ادھر ٹھیکنے لگا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ دماغ کھول رہا تھا، مگر سکون سکون نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا جو کہا تھا، مگر... پھر کون سی آواز تھی جو بار بار ذہن پر دستک دینے لگی۔ جب اس نے ذہن کے کواز بند کر لئے تو وہ دل کو ٹھکھٹانے لگی، اور دل کے ٹھکٹے سے پیچھا چھڑانا ممکن تھا۔ وہ مضطرب سابقہ کے کنارے میٹھا اور سرد نوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ آوازاب بلند ہوتی گئی۔ قرآن کی... سورۃ عبس!

”وہ ترش رو ہوا

اور منہ پھر لیا

کہ اس کے پاس آیا ایک اندھا

اور کیا چیز سمجھائے تھی کو

شاید کہ وہ سدھ رجائے

یا نصیحت پکڑ لے

اور فائدہ دے اس کو نصیحت،

مختلف آیات ضمیر پر کوڑے بر سانے لگیں۔

”بلکہ بے شک وہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے

تو جو کوئی چاہئے یاد کرے اس کو

جو کرم حیفیوں میں ہے

بلند اور پا کیزہ ہیں۔

ہاتھوں میں ہیں لکھنے والوں کے

جو معزز ہیں، نیک ہیں!“

”نمیں اللہ تعالیٰ!“ اس نے سر اٹھا کر بی بھرے غصے سے اوپر دیکھا۔

”اتا سب کچھ ہونے کے بعد... میرا خاندان، ہماری زندگیاں بر باد ہونے کے بعد بھی آپ مجھے کیسے بتا سکتے ہیں کہ اس کی معافی اور تو بکی امید...؟ نہیں؟... ہرگز نہیں!“ وہ فنی میں سر بلا تے ہوئے بار بار اس بات کو جھٹلارہتا۔

”شاید کہ وہ نصیحت پکڑ لے... شاید کہ... شاید کہ....“ الفاظ ذہن پر ہتھوڑے برسار ہے تھے۔ بالآخر وہ اٹھا اور گارڈ کو آواز دی۔

چند لمحوں بعد وہ اپنے کمرے کے کونے میں زمین پر کڑوں بیٹھا گوں کان سے لگائے سر جھکائے ہوئے تھا۔

”بولو سعدی۔ کیا کہنا رہ گیا تھا؟“ اس کے لجھے میں تکان اب بھی تھی۔

”جب میں نے قرآن پر ہنا شروع کیا تھا تو ایک بات پر میں سخت الجھن کا شکار رہتا تھا۔“

”سعدی...“

”میری بات سنو۔ میں کبھی پریشان، کبھی خفا، اور کبھی متھیرہ جاتا تھا کہ وہ کتاب جس میں اللہ مجھ سے بات کر رہا ہے، جس کا موضوع انسان“ ہے، اور جوار بول کھربوں انسانوں کے لئے قیامت تک کے لئے سب سے بڑا نور سب سے بڑی سپورٹ ہے، اس میں تو اللہ اور انسان کی بات ہوئی چاہیے نا۔ پھر یہ ہر چند ورق اللئے کے بعد... بار بار... موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیوں آ جاتا ہے؟ اچھا ٹھیک ہے وہ کلیم اللہ تھے اللہ سے باقیں کرتے تھے، فرعون کے سامنے کلہ حق کہا تھا، اپنی قوم کے لیے لڑے تھے، مگر ہمیں اچھے سے یاد ہیں نایا واقعات، پھر اللہ کیوں کیوں ہر چند منٹ بعد آپ فرماتے ہیں کہ یاد کرو موسیٰ کو اور فرعون کو۔ دنیا کی سب سے بڑی کتاب میں سب سے زیادہ جس انسان کا نام لیا گیا وہ موسیٰ ہیں۔ اتنی دفعہ بار بار... کیوں؟ میں اکثر اللہ سے یہ سوال پوچھتا تھا اور مجھے اس کا جواب قید کے ان چند ماہ میں مل گیا ہے۔“ وہ سر جھکائے کہہ جا رہا تھا۔

”موسیٰ علیہ السلام پتہ ہے کون تھے؟ وہ بہت بڑے دل کے مالک تھے۔ ان کے ساتھ فرعون نے جو بھی کیا، ان کی قوم کے مردوں کو بس طرح ذبح کیا، ان کا اور ہارون علیہ السلام کا مذاق اڑایا، ان کو جادوگر کہا، ان کے معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہ لایا اور پھر جب یکے بعد مگرے سات قسم کے عذابوں میں فرعون بدلنا ہوا تو ہر عذاب اترنے پر وہ موسیٰ علیہ السلام کو کہتا تھا... موسیٰ...“ اس کی آوازم ہوئی۔

”اے موسیٰ... دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ وہ اسے ثال دے ہم سے تو پھر ہم ایمان لے آئیں گے۔ موسیٰ ہر دفعہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھادیا کرتے تھے، مگر وہ لوگ آفات ملنے کے بعد بھی ایمان نہیں لایا کرتے تھے۔ تو پہنچے ہے کون تھے موسیٰ؟ وہ بہت بڑے دل کے بہت عظیم انسان تھے۔ ان کا ظرف بہت بڑا تھا۔ انہوں نے انتہا تک پہنچنے کے باوجود فرعون پر give up نہیں کیا تھا، اس کو امید دکھانا نہیں چھوڑی تھی۔ اسی لئے وہ موسیٰ تھے۔ اسی لئے ان کا ذکر ہمیشہ کے لئے امر رہے گا۔“ آنکھیں بند کیے گہری سانس اندر کھنچی۔

”مگر میں ہاشم! میں موسیٰ نہیں ہوں۔ میرا اتنا ظرف اور اتنا دل نہیں ہے کہ میں تمہارے لئے دعا کروں۔ جو کچھ تم نے میری بھن کے بارے میں کہا، جو جانیں تم نے لیں، اس کے بعد میں تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتا۔ مگر ہاں... راستہ ہے۔“

”دوسری طرف بالکل خاموش تھی۔ اسے محض بالکل بالکل ہاشم کے تنفس کی آواز آ رہی تھی۔“ اگر تم نے قتل بھی کیے ہوتے تب بھی راستہ ہے۔ اللہ ہر چیز مغاف کر سکتا ہے۔ ہر گناہ، ہر قتل، ہر شرک!“

”جب تم میرے آفس میں آئے تھے تو تم نے کہا تھا کہ قتل کے بارے میں دو سالک ہیں، اور تم اسکے ساتھ ہو جو کہتا ہے کہ قتل مغاف نہیں ہوتا۔“

”میں اب بھی اسی کے ساتھ ہوں مگر وہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو تو بکیے بغیر مر جاتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے اگر وہ مشرک نہیں تھے تو اللہ روز قیامت ان کو مغاف کر دے گا، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں، اگر انہوں نے توبہ نہیں کی تھی تو مغاف نہیں ہوں گے۔ لیکن تم ابھی



پر اسکچھ غرمان نے سر کوٹ دیا اور واپس ہی چکا گیا۔ نجی صاحب نے زمر کو بات جادی رکھنے کی اجازت دی تو وہ اسی طرح انھی گردان کے ساتھ مخفوط ہموار آواز میں کہنے لگی۔

"میں ایک دکیل ہوں اور میں ایک پر اسکچھ غرمان ہوں پاپک پر اسکچھ شش آفس ایک بھاری ذمہ داری کا نام ہے جس کو میں نے انھی مال اخایا ہے۔ انسان کے سر پر جھنگی بھاری ذمہ داری ہوتی ہے اتنی زیادہ اس کی پرچہ ہوتی ہے۔ مگر ایک پر اسکچھ غرمان سے پہلے میں ایک انسان بھی ہوں اور بطور ایک گواہ کر ایک دکیل میں نے..." نجی صاحب کو دیکھتے ہوئے وہ بوقت تو آواز نے مجرم کا نیپی۔ "فارس طبع نازی کو مازی سے چار سال پہلے بخت بھجوایا تھا۔"

کان کی اوس مسمات اور بے نیاز ہے زار بھٹا فنک ایک دم چونک کرائے دیکھنے لگا۔ وہ کہہ دی تھی۔

"کیونکہ میرے زد دیک دا ایک مجرم تھا۔ مگر یہ میری طفلی تھی۔ نجی مت کی طفلی۔ اور ہم میں سے ہر ایک لمحہ غلطیاں کی نہ کسی کیس میں کر چکا ہے۔ مگر اس کے پاد جو دیکھنی طفلی جسی قائل نہیں کی جا سکتی۔ میں... غلط تھی جب میں نے قارس نازی کو بڑھ کیا تھا۔ دو ماہ قبل مجھے معلوم ہوا کہ قارس نازی بے گناہ تھا اس کیس میں وہ کسی بھی جرم میں ملوث نہیں تھا۔"

دو آہ سے سید حافظ کر بیٹھا۔ پاپک بچکے وہ گردان اخایے بس اسے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ میز کے پیچے سے لکھ کر نجی کے چہرے سے کہا تھا کہ مکفری ہوئی تھی۔ اسی جگہ جہاں کھڑکی سے چمن کر گرتی سورج کی روشنی بہت تیز پڑ رہی تھی۔

"... میں نے دو ماہ قبل یہ جانا کہ وہ سچ تھا اور میں غلط تھی! اسی لئے آج میں یہ اعتراف اس جگہ کھڑے ہو کر کرنا چاہتی ہوں تاکہ یہ لکھا جائے..." ایک نظر ساتھ بیٹھنے کو روت رپورٹ پڑا ایسی جو کھنکت ہے اپ کیے جا رہا تھا۔ اور یہ اس کیس کی فائلز میں ہمیشہ کے لئے گھونکا کر دیا جائے۔ کیونکہ ایک دفعہ مجھے سے قارس نازی نے پوچھا تھا کہ اگر میں نے یہ جان لیا کہ وہ بے گناہ ہے تو میں کیا کروں گی؟" گردن ہوڑ کر اس نے اسی انھی گردان کے ساتھ قارس کو دیکھا۔ تو میرا جواب یہ ہے کہ میں بھی کروں گی اسی اس کے ساتھ کھڑی ہوں گی اور اس کو انصاف دلاؤں گی۔ "اور روشنی میں کھڑی تھی تیز روشنی میں اور اس کے بھورے بال پچک کراخروٹی لگتا ہے تھے اور جب اس نے چھڑا ہوا کہ قارس کو دیکھا تو بھوری آنکھیں شہری دکھی تھیں۔ وہ باکل خاموش سا اسے دیکھے کیا۔ گردان میں گھنٹی سی ڈوب کر بھری تھی۔

پر اسکچھ غرے سے حریدہ برداشت نہیں ہوا تو اسکا "مزہ زمر آپ سب پکھا بھی کہ دیں گی تو اپنی آر گوٹ میں کیا کہنگی؟" نجی صاحب سر زمر کی بات ٹھی ہے۔ مگر حد ذات کو یا مرید نظر کھانا چاہیے کہ وہ قارس نازی کی بیوی ہیں اور ہر محبت کرنے والی یہوئی کی طرح... "مجھے اپنے شہر سے کوئی محبت نہیں ہے۔" وہ میز پر نجی صاحب کو دیکھتے ہوئے اسی انھی گردان کے ساتھ اسی روشنی کے بالے میں کھڑی ہوئی تھی۔ "نہ پہنچی شاپ ہے۔ ان قیادت میں اپنے شوہر کو پسند بھی نہیں کرتی اور بہت دفعہ میں اپنے شوہر کو جان سے مار دیا چاہتی ہیں کھڑی ہوئی تھی۔" ان قیادت گرفتار ہونے سے ایک دن پہلے وہ مجھے طلاق دینے کی بات کردا تھا... "(قارس نے قدرے لیٹر آر ایم دے سی..." (وہ بلکہ سا سکریا) "ان قیادت گرفتار ہونے سے ایک دن پہلے وہ مجھے طلاق دینے کی بات کردا تھا..." (قارس نے قدرے لیٹر آر ایم دے سی...) "مگر یہ نیچلی کورٹ نہیں ہے جہاں ہم کھڑے ہو کر ذاتیات کے بارے میں بات کریں اور ایک دھرے کے اور پر کچھ اچھا لیں نہیں پہلو ہے)"۔ اسی کورٹ نہیں کہا تھا کہ وہاں سر جنکا کر شکریہ ادا کیا۔ وہ تیز روشنی میں کھڑی تھی، جھکتی ہوئی مجھے سولے کے پیٹھے آس پاس گردے ہوں کہ دفاع کیجا چاہے۔ تھیک یو یور آئر۔ "سر جنکا کر شکریہ ادا کیا۔ وہ تیز روشنی میں کھڑی تھی، جھکتی ہوئی مجھے سولے کے پیٹھے آس پاس گردے ہوں۔ دکوئی لوٹا کھڑا جو دھنات آنکھوں میں آنسو نہ دامت سے جھکا سر۔ شمعانی کے لئے ہاتھ بندھتے تھے۔ مگر اعتراف جرم بھی گریا تھا۔ اعتراف نہ دامت بھی ہو گیا تھا۔ سر بھی اخمار رہا تھا کیونکہ... قارس نازی نے سوچا تھا۔ میا نیت صاف تھی۔ جو بھی کیا تھا مجھ کا ساتھ دا ہے کے لئے کیا تھا۔ پہلے بھی۔ اب بھی۔

"اب پر اسکچھ غر صاحب" یوئے آرام سے دلائل کا آغاز کر سکتے ہیں جن کے بعد ایسے لگے گا جیسے میرا کا کشت قتل الدین پودھری کے

ساتھ ساتھ نائن الیون حملے میں بھی ملوث تھا۔ وہ سادگی سے کہہ کر واپس آئی۔ کمر کری کی پشت سے لگائی، ناگ پٹانگ بجائی، گردن فارس کو دیکھا۔ اس کے تاثرات بدل چکے تھے۔ وہ ان چند لمحوں میں بہت سی کیفیات سے ایک دم گز رگیا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے اعتراض سے تمہیں خوش نہیں کر سکی نہ میں روئی نہ پیروں میں گری نہ ہاتھ جوڑے۔“ دھیر بولی۔ وہ بس اسے دیکھ گیا۔ وہ اس وقت کیا محسوس کر رہا تھا، وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ پروہ سامنے دیکھنے لگا۔ پراسکیو ٹراؤ ایل کا آغاز کر کر فارس کی آنکھیں ادھر جی تھیں، مگر گردن کی گلٹی بار بار ظاہر ہو کر معدوم ہوتی تھی۔

”آپ کو کب معلوم ہوا؟“ وہ اب بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ اسے واقعی نہیں اندازہ تھا۔

”جس رات مجھے استھما ایک ہوا تھا، وہ بہت دھیما بول رہی تھی۔“

فارس نے نگاہیں موڑ کر اسے دیکھا۔ سنہری آنکھیں بھوری آنکھوں میں دیکھتی رہیں۔ چند لمحے۔ چند سانسیں۔ جیسے وہ بہت پا چاہتا تھا۔ مگر.... بولا تو صرف اتنا۔

”کیا میں آپ کو ”تم“ کہہ کر بلاستہ ہوں؟“

زمر لمحے بھر کو لا جواب ہوئی۔ پھر خنگی سے گردن کڑائی۔ ”ہرگز نہیں۔“

وہ ہلکا منکر اکر اس کی طرف جھکا۔ اور تابعداری سے سر کو ختم دیا۔ ”ٹھیک ہے، جیسے تم چاہو!“

اب اگر وہ ڈسٹرکٹ کورٹ کا کمرہ نہ ہوتا اور ان کے پیچھے وکلاء نہ بیٹھے ہوتے تو زمر یوسف کی ہیل فارس غازی کے پیروں کو بتائی۔

اس کے چاہنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ مگر.... وہ خنگی سے سر جھٹک کر سامنے دیکھنے لگی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

ان کے بھی قتل کا الزام ہمارے سر ہے ..... جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں

کو لمبوکی بھیگی فضاؤں میں اس رات بارش نے مزید بھول دی تھی۔ کریل خاور مظاہر ہیات نے جب ہوٹل کی لابی میں قدم رکھا تو اس کا کوٹ نہ تھا، اور بال قدرے بھیکے ہوئے تھے۔ اپنے تنونہ جسم پر کوٹ کے کار برابر کرتا وہ ریسپشن تک آیا اور شناسانداز میں ریپشنٹ پوچھا۔

”ہاشم کاردار کون سے روم میں ہیں؟“ جب وہ لڑکی اسے مطلوبہ معلومات فراہم کر رہی تھی تو اس کی پشت پر دیوار پر آؤزیں ہائے کی چمکتی دھات میں خاور کا عکس جھلک رہا تھا۔ قدرے بھاری مگر فٹ جسامت کا حامل، اونچا ملبسا آدمی، جس کے بال کریوکٹ میں کٹے ایرانی طرز کی سیاہ موچھیں تھیں، اور گھنے ابر و تلے سیاہ، گہری آنکھیں۔ پیشانی پر مستقل پڑے دوبل، اور گندی رنگت۔ دیکھنے میں وہ پینٹا لیں سے اڑتا لیس سال کا لگتا تھا اور کم و بیش یہی اس کی عمر تھی۔

چند گھنٹے قبل ہاشم نے اسے کال کر کے جلد از جلد کو لمبوکی بھنچنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ کراچی میں جن کاموں میں پھنسا تھا، ان سب کو جھم کر فوراً ادھر آپنچا تھا اور اب لفت کی طرف بڑھتے ہوئے وہ مقینا اس امر کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ہاشم نے اس سے ڈسکس کرنا تھا۔ ہاشم نے کہا تھا، بات اہم تھی۔ خاور مجھس تھا اور پر جوش بھی۔ جو بھی مسئلہ ہوا، وہ اسے حل کر لے گا۔ ہاشم کے لئے وہ سب سنبھال لے گا، کیونکہ صرف وہی تھا۔ جو ہاشم کے تمام مسئلے سنبھالتا آیا تھا۔

کردوں کے بند دروازوں سے سمجھی راہداری میں وہ مطلوبہ دروازے تک رکا، نیل بجائی۔ پھر دیکھا، دروازہ قدرے کھلا تھا۔ اس ابردا کٹھے ہوئے۔ آنکھوں میں اچنچا بھرا۔ احتیاط سے دروازہ دھکیلنا۔ ایک ہاتھ بیلت میں اڑتے پستول پر بینگ گیا۔ پٹ کھلتا گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ صرف ایک زرد لیپ جل رہا تھا۔ خاور نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ ایک طرف دیوار گیر کھڑکی تھی جس

لے شش پانی کی بوندیں تذا اتر برس رہی تھیں۔ اس کے سامنے کری ڈالے ہاشم بیٹھا تھا۔ خاور نے اطمینان سے سانس خارج کی، جیب تک دیکھتا ہا تھو سیدھا ہو گیا۔ وہ ”سر“ کہتا قریب آیا۔ ہاشم کی اس طرف پشت تھی۔ آہٹ پر بغیر چونکے سر موڑا، اسے دیکھا، لہکا سامسکرایا اور اٹھا۔ معاشرے کے لئے ہاتھ بڑھایا جسے خاور نے گرموجو شی سے تھاما۔

”سب ٹھیک ہے سر؟“ خاور کو وہ دیکھنے میں بالکل نارمل لگا تھا۔ (اہم مسئلہ؟)

”لیں۔ آف کورس!“ ہاشم نے سمسکرا کر سر کو ختم دیا۔ ہاتھ ملا کر چھوڑا۔

”میرا دل چاہ رہا تھا میں کسی سے بات کروں۔ سو تمہیں بلا لیا۔“ کہتے ہوئے وہ ساتھ رکھی میز نک آیا۔ سیاہ پینٹ پر سلوگرے شرٹ پہنے اور کاف کہنیوں تک موڑے وہ ریلیکسڈ لگ رہا تھا۔ دو گلاسوں میں اس نے مشروب اٹھایا۔ ایک خاور کو تھایا، دوسرا خود تھامے سامنے آ کھڑا ہوا۔ گلاس بلند کیا۔

”کس کے نام؟“ خاور نے اپنا گلاس بلند کرتے پوچھا۔

”جو لیس سیزر کے نام!“ اس نے خاور کے گلاس سے گلاس نکلرایا، پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا وہ اپس کری پا آبیٹھا۔ ناگ پٹا نگ جما کر رخ کھڑکی کی طرف موڑے، گھونٹ بھرا۔ خاور اس کے سامنے ذرا تر چھپی کر کے کری پا آبیٹھا۔ قدرے آگے کو ہوئے۔ الرٹ اور سپ لیا۔ تابع دار آنکھیں ہاشم پر جبی تھیں جو شش پر برستی بوندیں دیکھ رہا تھا۔

”جو لیس سیزر... روم ڈلٹیئر... آج کل میں اس کے بارے میں اکثر سوچتا ہوں۔“ گھونٹ بھرتے ہوئے باہر دیکھتے وہ کہہ رہا تھا۔ ”چوالیس سال قبل از مسح.... پندرہ مارچ کے دن... سیزر کے اوپر اس کے اپنے سیزر ز نے حملہ کیا تھا، اور ان میں شامل تھا، مارک جونیئر بروٹس... سیزر کا دوست، اور *protege* کہتے ہیں پہلے سیزر جوان مردی سے لڑا گئر جب اس نے...“ ناگ ہیں یک نک بابر جمائے گلاس لبوں سے لگا کر نیچ کیا۔ ”جب اس نے بروٹس کو دیکھا تو اس نے دکھ سے کہا۔

”Et tu Brute? Then Fall, Caeser“

”تم بھی بروٹس؟ تو پھر ڈھے جاؤ، سیزر۔ اور یہ کہہ کر وہ ڈھے گیا۔“ ایک اور چھوٹا سا گھونٹ بھرنے کو وہ رکا۔ ”Et tu Brutus.... لا طین زبان کا وہ نخا ساقرہ جو انگریزی میں ”Brutus“ کہلاتا ہے، اس کو شہرت شیکپیئر کے قلم سے ملی ورنہ خاور... اگر شیکپیئر نے فقرہ اپنے پلے میں جو لیس سیزر کو بولتے نہ دکھاتا تو کون جان پاتا اس فقرے کو۔ مگر جانتے ہو، لوگ اس کا مطلب ٹھیک سے نہیں سمجھتے۔ قیاس کرتے ہیں کہ یوٹو بروٹس کا مطلب ہے کہ سیزر دکھ سے ”لعنی کہم بھی بے دفالٹ بروٹس؟“ کہہ رہا تھا، مگر یہ ایک نا مکمل معنی ہے۔“

خاور نے درمیان میں کئی دفعہ لب کھوئے اور پھر ادب سے بند کر دیے۔ وہ اس بے کار کہانی کو تخلی سے آخر تک سن سکتا تھا۔ مگر جانے اس نیم روش، شاہانہ بیدر روم کی نرم گرم فضا میں ایسا کیا تھا.... جو ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اندر سے الجھتا خاموشی سے گھونٹ بھرتا رہا اور اسے سنتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”کہتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں سیزر کے آخری الفاظ تھے ”کائے سے تیکلفون؟“ یعنی ”تم بھی بچے؟“ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے کہا تھا، تم بھی میرے بچے؟“ وہ بڑا ساہنسا۔ ”تارتان دان یہ بھی کہتے ہیں کہ بروٹس سیزر کا ناجائز بیٹا تھا۔ خیر...“ کھڑکی کو دیکھتے شانے اچکائے۔ خاور اب دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اس زمانے میں، قدیم روم میں ایک محاورہ بولا جاتا تھا۔ ”تم بھی میرے بچے طاقت کا مزہ پکھو گے۔“ شاید سیز رہی یہی کہہ رہا تھا جب اس نے کہا، تم بھی بروٹس!... تم بھی تاج پہنو گے۔ یہ دکھ کا اظہار نہیں تھا۔ یہ ایک بدعا تھی۔“ اب کے لگا ہیں خاور کی طرف پھریں۔ خاور بری طرح ٹھکنا۔ یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جن کو وہ پیچانہ تھا۔ سیاہ سر، پتھر جیسی آنکھیں۔

”سر کیا ہوا ہے؟“

”یونو.... جب سیزر نے یہ کہا، تم بھی بروٹس، تو اس نے کہا، تمہاری بھی باری آئے گی بروٹس! اور یہ کہہ کر وہ ڈھنے لگا۔ اور بعد میں بروٹس بھی تو ایسے ہی مرا تھا۔ مگر پتہ ہے کیا؟... اس نے خاور پر نظریں جمائے گلاس دائیں طرف میز پر رکھا۔“ یہ سب لوگوں کی باتیں ہیں۔ ورنہ تاریخ کہتی ہے، کہ سیزر نے مرتب وقت کچھ نہیں کہا تھا۔“

خاور نے آہستہ سے گلاس اسی میز پر رکھنا چاہا، مگر کھنہ نہیں سکا۔ گلاس اڑھک گیا۔ بے اختیار اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھا۔ اس کی رنگت بدل رہی تھی، چہرے پر پسینہ نمودار ہو رہا تھا۔ ”سر کیا ہوا ہے؟“ جیرت زدہ نگاہیں اٹھا کر دبنتے گلے کو پکڑے وہ بکشل بول پایا۔

”مورخ کہتے ہیں، سیزر کو مرتب وقت ایک لفظ کہنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ خاموشی سے مرا تھا۔ بالکل خاموشی سے۔ ایسے بڑے بڑے الفاظ شیکھیں کہا کرتا تھا۔ یا اسی کے الفاظ ہیں۔“ اس نے خاور کو دیکھتے ہوئے ایک اور گھونٹ بھرا۔

”سر... میں نے... کچھ نہیں...“ وہ چلانا چاہتا تھا، مگر گلا پکڑے گھننوں کے بل زمین پر گر گیا۔ منہ یوں کھولا جیسے قرناچا ہتا ہو مگر... آج اندر سے کچھ نہیں نکلنا تھا۔ اس کا منتظر دھندا رہا تھا۔ سامنے ناگ پٹا نگ جما کر بیٹھا اسے سر دنیروں سے دیکھتا ہاشم اسی دھنڈ میں گم تھا... اور دور... کسی کنویں سے نکراتی آواز کی طرح اس کی آواز گونج رہی تھی...“

”میرا خیال ہے، وہ واقعی خاموشی سے مرا تھا، کیونکہ بادشاہ... خاموش یہی مرا کرتے ہیں۔ مگر تم... تم تاج نہیں پہنو گے۔“

اس نے کرسی پر ہاتھ جما کر اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر دھنڈ... درد... اندھیروں میں ڈوبتا ہے... وہ اٹھنے نہیں پایا۔

”تم خاموش نہیں رہو گے... تم...“ ہاشم بیٹھے بیٹھے آگے کو جھکا تھا۔ ”تم مجھے سب بتاؤ گے... ایک ایک بات... کس کے لئے مارتم نے میرے باپ کو... سب کچھ...“

مگر الفاظ اب گلڈھونے لگے تھے۔ خاور کا ذہن گھرے اندھیروں میں ڈوب رہا تھا۔ مناظر کبھی نظر آتے، کبھی بادلوں میں چھپ جاتے۔ اس نے محسوں کیا، اس کو کسی چیز پر لٹا کر راہداری میں سے گزارا جا رہا ہے... راہداریاں... چھت... دروازے... چھت بدل رہی تھی... پھر وہ تاریک ہو گئی... وہ کچھ بڑا بھی رہا تھا، مضبوط قوت، ارادی کے باعث اس کا ذہن ابھی تک مفلوج نہ ہو سکا تھا... اور پھر چھت مزید تاریک ہوئی... یہاں تک کہ وہ زردی مائل بھوری سی لگنے لگی... دھنڈ لے ہوتے منظر میں اس نے دیکھنا چاہا... اس کا اسٹرپر ایک نگ کمرے میں دھکیلا جا رہا تھا، اور سامنے دو ہیو لے سے کھڑے تھے... وہ قریب آتے گئے... قدم... قدم... پھر ایک کا چہرہ واضح ہوا... اس کے بال گھرے بھورے اور ہلکے ٹھنکریا لے تھے، اور آنکھیں بھوری تھیں۔ اس کا مسکراتا چہرہ قریب آیا... اور اس کے الفاظ وہ آخری الفاظ تھے جو خاور کو سنائی دیے تھے۔

”خوش آمدید... یا صاحبی لاجن!“

### ڈپڑھ ماہ بعد

کبھی غور کا نشہ نہ سر پہ طاری کر..... مری بلا سے فقیری کر یا تاجداری کر سرمکھی خندہ سبیر کے تیرے عشرے میں بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک نیلی سی صبح تھی۔ دھندے سارے قصر کو اپنی لپیٹ میں لے کھا لئا۔ سورج منہ پھیرے ناراض سما، پادلوں کے پچھے گم تھا۔ ایسے میں نیونا قصر کے برآمدے کے زینے چڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔ اسکرٹ پہ دیٹر پہنے بال پونی میں باندھے وہ قدرے سنجیدہ اور ناخوش دکھائی دیتی تھی۔ برآمدے میں آکر اس نے اندر کھلتا بھاری متفقش لکڑی کا دروازہ، حلبلا تو جیسے ہی ہیرز کی گرم، ہکور دیتی ہوا درونی منتظر بھی کھلتا چلا گیا۔

اندر تمام بیان روش تھیں۔ لاونچ میں ملازم کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ سامنے ڈائننگ ہال کے شستے کے دروازے کھلے تھے اور مر براہی کری پہ باجان ملکہ نک سک سے تیار بیٹھی تھی۔ کھلے بال کندھے پہ بائیں جانب کوڈائے، فگر بہنگ سیاہ ناپ پہنے، جس پہ گرا سلوو اکٹ چک رہا تھا، وہ مسکرا کر گردناٹھائے، مسلسل ایرنگ پہ انگلی پھیرتی، ساتھ کھڑے احر کوڈ کھڑے کھڑے احر کوڈ کھڑے کھڑے۔ وہ بھی سیاہ جیکٹ میں ملبوس، ماتھے پکنے بال گیلے کر کے پچھے کو بنائے، سادہ سا مسکراتے ہوئے کھدمہ رہا تھا۔

”گو کہ آکشن گیارہ بجے شروع ہوگی، مگر آپ وہاں پہ گیارہ نج کر چودہ منٹ پہ پہنچیں گی یہ پرائس بولیں گی...“ ایک چٹ نکال کر سامنے رکھی۔ ”مسکرا کر حاضرین کو دیکھیں گی، سب امیزڈ ہوں گے، لا جواب ہوں گے، پھر آپ کے بیٹھنے سے پہلے پینٹنگ آپ کی ہوگی، اور آپ اسی شان بے نیازی سے اس کو بچوں کی فلاخ کے لئے بننے والے ادارے کو عطیہ کر دیں گی۔ کیمروں کے شرذن نج رہے ہوں گے، آپ نیوز میں ہوں گی، مگر آپ انٹرو یو دینے سے انکار کر دیں گی، کیونکہ آپ اپنے نیک کام کی تشویش نہیں چاہتیں۔ پی ایس! آپ کو مزید تشویش کی ضرورت اس ہفتے پڑے گی بھی نہیں۔“ اور مسکرا کر سر کو خم دیا۔ فیجنونے دور سے یہ مفڑد دیکھا، ناک سکوڑی، اور پچن کی طرف چل گئی۔

”اور یقیناً تم نے انتظامیہ سے پہلے ہی بات کر لی ہوگی۔“ چٹ کو دو انگلیوں میں اٹھا کر جواہرات نے دیکھا۔ ”وہ میرے علاوہ کسی کو پینٹنگ نہیں پہنچیں گے۔ راست!“

”نہ صرف یہ بلکہ وہ چودہ منٹ تک کسی کو اس رقم تک نہیں آنے دیں گے۔ سب سیٹل کیا جا چکا ہے...“ وہ ذرا را کا۔ ”مسز کار دار، آپ سیاست میں نہیں آرہیں، آپ پہلے ہی ایک philanthropist کے طور پہ جانی جاتی ہیں، پھر میں پہنچلے چند ہنتوں سے آپ کے لئے یہ پلیسٹی stunts کیوں ارتخ کر رہا ہوں؟“

جوہرات نے نزاکت سے کندھے اچکائے اور نیکین گھنٹوں پہ پھیلایا۔ ”میں پاپولر ہونا چاہتی ہوں۔ مقبول لوگ، کسی بھی عہدے یا آفس کے بغیر بھی ایک دنیا پہ حکومت کرتے ہیں۔ وہ ذہنوں پہ حکمرانی کرتے ہیں اور ان کی رائے سنی جاتی ہے۔ مانی جاتی ہے۔“ مسکرا کر اسے دیکھتے گاس بلوں سے لگایا۔

”بھاری اعزازات کی بھاری قیمتیں چکانی پڑتی ہیں مسز کار دار، مگر خیر، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ میں آپ کے ساتھ ہوں!“

”اور مجھے اسی بات کی فکر ہے کہ تم ان کے ساتھ ہو۔“ آواز پہ احر پوک کر پلٹا۔ سامنے سے ہاشم چلا آ رہا تھا۔ کوٹ، نائی، کاف لکس، سب نفاست سے خود پہ سچائے، تنے تاثرات کے ساتھ، ایک کاٹ دار نظر اس پہ ڈالتا وہ اپنی کرسی تک آیا۔ ملازم نے جلدی سے کرسی کھینچی۔ وہ بیٹھا اور اسی سنجیدگی سے نیکین پھیلانے لگا۔

”لگڈ مارنگ مسز کار دار!“ احر کو خم دیتا کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا، جواب نہیں آتا۔

”وہ بہت ٹیلینڈ ہے، ہاشم!“ جواہرات نے زمی سے اس کے ہاتھ کو دبایا۔ ہاشم نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ نو شیر وال بھی تھوڑی دیر بعد تیار ہو کر نیچے آگیا۔ اس کے بال پہلے سے بھی چھوٹے کئے تھے، فرنچ صاف تھی، اور آج کل وہ روز اسی خاموشی سے آفس جاتا اور واپس آ کر کمرے میں گم ہو جاتا تھا۔

ناشتر کرتے ہوئے ہاشم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو کھڑکی کے باہر احمد کھڑا اسکی ملازم کو کوئی ہدایت دیتا نظر آ رہا تھا۔ ہاشم نے ہوئے سے سر جھکا۔

”محض ہمیں اس پر ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔“ جواہرات نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا، پھر ہاشم کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تمہیں جس پر اعتبار تھا اسکا نام خاور تھا، وہ خاور جس پر تمہارے باپ نے بھی بھروسہ نہیں کیا تھا، مگر جس پر تمہارے باپ نے اعتبار کیا تھا، وہ احمد تھا۔ اب تم فصلہ کرو کر کوئی صحیح تھا کون غلط؟“

ہاشم کے لب بھی گئے، اور وہ مزید خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ جواہرات نے جھر جھری لیتے جوں کا ایک اور گھونٹ بھرا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خاور اور مگریب کے ساتھ یہ سب...“

”خاور نے ڈیکھ قتل نہیں کیا،“ نو شیر وال ایک دم کا نٹاٹھ کر بولا تو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ پل بھر کو جواہرات کا دل بیٹھا مگر وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرے باپ کو کسی نے قتل نہیں کیا، انہیں کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ وہ نیچرل ڈیستھ سے فوت ہوئے تھے، نا آپ لوگوں نے؟“ اور نیکمین پٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاشم نے گردن اٹھا کر تاسف سے اسے دیکھا۔

”تم ابھی تک denial میں ہو شیر!“

”آئیندہ کوئی بھی ان کے قتل کی بات نہیں کرے گا، نا آپ نے یا نہیں؟“ گزر کر کہتا، وہ کرسی دھکیلتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ ناشتہ ادھورا رہ گیا تھا۔ ادھوری چائے ادھورے ناشتے....

مزاج غم نے بہر طور مشتعل ڈھونڈے

کہ دل دکھاتو کوئی کام و ام میں نے کیا

دھند لکے کے پار ایگی کھڑی تھی۔ چھوٹی، کم مایہ، مگر مضبوط۔ اندر چھوٹے سے کچن میں دم کی چائے اور الائچی کی خوبصوری پھیل تھی۔ سیم گول میز پر موجود بڑے بڑے منہ بناتا ناشتہ زہر مار کر رہا تھا۔ فرائی انٹے کی زردی ٹوٹ چکی تھی، اور وہ کھاتے ہوئے بار بار ایک ملاحتی نظر خین پر ڈالتا جو جلدی جلدی توے پے توں سینک رہی تھی۔ زمر سفید لباس میں تیاری اپنی چائے دم پر کھڑی تھی۔ حمد کپ سکھاتے رکی تو توں جل گیا۔ سیم چلا یا تو وہ اس طرف بھاگی۔

”خین ڈونٹ وری، واپس آ کر ہم سب مل کر کچن صاف کر لیں گے۔“ زمر نے چوہا بند کرتے اسے تسلی دی۔ تو سیم کی پلیٹ میں رکھتے خین نے بے لیقی سے زمر کو دیکھا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ یہ کچن صاف نہیں ہے؟“ اس کے دل کو جیسے دھکا لگا تھا۔ زمر نے گڑ بڑا کر سیم کو دیکھا، پھر کچن کو (ہر چیز، چاہے وہ صاف دھلے برتن تھے یا پتی چینی کے ڈبے وہ کاٹنے پر رکھے تھے۔ پھیلاوا، ہی پھیلاوا۔)

”میرا مطلب ہے، ابھی تو تم نے کر لیا بعد میں..... ہم مل کر کر لیں گے۔“ سیم کو پھر دیکھا تو اس نے بنا آواز کے ”توبہ توبہ“ کہتے دونوں کا نوں کو انگلی سے باری باری چھووا۔

مگر خین سخت بے ولی سے کری پہ بیٹھ گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ زمر کا بھی فون آ گیا۔ وہ سیم کو لینے چلی گئی تو وہ نے گھر کے سارے دروازے لاک کر دیے۔ اب وہ اکیلی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ گھر کا یہ تخت و تاج اگلے دو ہفتے تک اسے اکیلے ہی سنبھالنا تھا۔

جہہ؟

صداقت شادی کر باتھا!

اس کی بلا سے وہ کسی سے بھی شادی کرے، جب بھی کرے، مگر اس نے کہہ دیا تھا کہ ندرت اور بڑے ابا کے بغیر اس کی شادی مکمل نہیں ہو سکتی۔ زمر اور خود نہیں کے بے حد اصرار پر ندرت اور ابا ایک ہفتے کے لئے صداقت کے گاؤں چلے گئے تھے۔ ایک ہفتے کی شرط بھی زمر نے الگی تھی۔ وہ چاہتی تھی، وہ دونوں اس ڈپریشن زدہ ماحول سے نکلیں، کچھ دن تازہ ہوا کھالیں، سو صداقت کے لئے قیمتی تختے لے کر وہ لوگ کل روانہ ہو گئے تھے۔ ندرت نے کہہ دیا تھا کہ زمر مصروف ہوتی ہے، اور نہیں کو کھانا بانانہیں آتا سو کھانا ریٹورانٹ سے آئے گا، کپڑے لانڈری پر جائیں گے، حدا کو صرف ناشتا اور صفائی کرنی ہوگی۔

مگر صفائی؟ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔ کل سے وہ چیزیں صاف کر کر کے جوڑ جوڑ کر ہلکا ہو چکی تھی، مگر پورا گھر بکھرا ہوا لگتا تھا۔ آج بھی وہ زمر کے نیچے آنے سے آدھا گھنٹہ پہلے پکن میں آئی تھی، سارا کچن صاف کیا، مگر کتنے مزے سے وہ کہہ گئی کہ صفائی نہیں لگ رہی تھی۔ بھی مطلب تو بھی تھانا۔

مھنڈی چائے کا گھونٹ بھرتے، اکیلے بیٹھے، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پہلے ہی دن رات ہاشم کا خیال اس کی آواز یہ سب ذہن سے نکلتا نہیں تھا، غرض بصر کر کر کے تھک گئی وہ، مگر وہ تو یہ ہی یاد آتا تھا، ذرا بھی نہیں بولا تھا۔ اس نے سوچا تھا غرض بصر میں کامیاب ہو کر وہ شخ کے الگ طریقے تک جائے گی، مگر کامیابی تو در لگ رہی تھی، سوبال آخر وہ کتاب اٹھالا تی اور لاوچ میں صوفے پر لینے اس نے مطلوب نصل کھول لی۔

دروازے کے پار کھلا دیا تھا۔ تیز سورج کی نہری کرنیں پانی پر جھلکاری تھیں۔ ایسے میں وسط دریا کو چیڑتی ایک لکڑی کی قدیم کشتی چلتی جا رہی تھی۔ بوڑھے شخ کسی ماہر ملاح کی طرح چپوں کو پانی میں چلاتے کشتی کو آگے دھکیل رہے تھے۔ ان کے سامنے وہ بیٹھی تھی۔ پہلے کی طرح کمزور اور بد دل۔ کہیاں گھنٹوں پر رکھے اور ہتھیلیوں پر چہرہ گرانے والے ناراضی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

”غرض بصر کر کر کے مر گئی میں۔ پہلے اس کو دیکھنا چھوڑا، پھر اس کی ای میلڈ، اس کے یکست، سب منادیے کہ ان کو دیکھنا بھی غرض بصر کے خلاف تھا، مگر وہ نہیں بھولا۔ میں تو اسے دیکھ بھی نہیں رہی، پھر وہ مجھے کیوں نہیں بھولتا، شخ؟“

شخ نے آہنگی سے گلے چبوٹا کر کشتی کے اندر رکھے۔ ہوا ہولے سے خود ہی نہرے پانی پر کشتی کو آگے بڑھانے لگی۔

”تمہارے زمانے میں، لڑکی سب سے مہلک بیماری کون سی ہے؟“

”ڈینگی!“، ”فوراً بولی، پھر گڑ بڑا!“، ”سوری۔ کینسر۔ سرطان۔“

”تو اگر سرطان کا مریض اپنی بیماری بھول جائے تو کیا تندرست ہو جائے گا؟“

”لیں۔ بیماری بھولنے سے کون شفایاں ہو سکتا ہے؟“

”تو میری بیٹی، مریض کیسے ٹھیک ہو گا؟ جسم سے اس سرطان (کینسر) کے نکلنے سے؟ یا یادداشت سے سرطان کا خیال نکلنے سے؟ اور جب وہ ٹھیک ہو جائے گا، تو کیا وہ سرطان کو بھول جائے گا؟“

وہ ایک عجیب انکشاف کا لمحہ تھا۔ حنہ نے دم بخود ان کو دیکھتے نظر میں سر ہلایا۔

”نہیں۔ اسے ساری عمر سرطان یاد رہے گا۔“

”لیکن اگر وہ تندرست ہو چکا ہے تو وہ یاد اسے تکلیف نہیں دے گی۔“

”تو کیا... تو کیا مجھے اپنے محبوب کو بھولنے کی ضرورت نہیں؟“ وہ بے یقین تھی۔ بھولے بغیر مودا آن کرنا... یہ کیسا علاج تھا؟

”وہ تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تم بھولنے کی کوشش ترک کر دو۔ علاج تم نے اپنے دل کا کرنا ہے، یادداشت کا نہیں۔ اسے دل سے نکالنا ہے، دماغ سے نہیں۔ اس مقام تک آتا ہے جہاں اس کی یاد پر تم بے حس ہو جاؤ۔ تمہیں فرق پڑنا ختم ہو جائے۔ نہ فرت ہونہ محبت!“  
حده کا دل جیسے ایک دم خالی ہو گیا۔ ملکر کران کا چہرہ دیکھنے لگی۔  
”مگر یہ کیسے ہو گا؟“

”اس کے لئے پہلے تمہیں ”محبت“ کو سمجھنا پڑے گا۔ انہوں نے چھواختا لئے اور پھر سے پانی میں چلانے لگے۔ کشتی کی رفتار تیز ہوئی۔ سنہری کرنوں سے چمکتا پانی اب تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ گویا ریا کے دو دہانے قریب آ رہے تھے۔ دونوں اطراف میں اگا بزرہ بھی گھنا اور گنجان تھا۔

”اور اس کو سمجھنے کے لیے پہلے عشق اور محبت میں فرق کرنا سیکھوڑا کی!“ دریا مزید تنگ ہو کر کسی نہر میں بدلتا جا رہا تھا۔ وہ جیسے شام سے دور، امیزوں کے جنگلات کے درمیان بہتی کوئی نہر تھی۔

”مجھے پتہ ہے۔“ وہ جلدی سے بوی۔ ”پہلے پسندیدی گی ہوتی ہے، پھر محبت، پھر عشق، پھر جنون، پھر دیوانگی!“ شیخ کے تاثرات دیکھ کر وہ چپ ہوئی۔ وہ انسوں سے مگر مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہے تھے۔ ”یہ درجے تمہارے ملک میں رانج ہوں گے، مگر جس زبان سے تمہاری زبان نکلی ہے، اس میں معاملہ ذرائع مختلف ہے۔ محبت درمیان میں نہیں ہے بلکہ محبت کے یہ سب درجے ہیں۔ محبت خود کوئی درجہ نہیں ہے۔“

”تو کتنے درجے ہیں محبت کے؟“

”سات۔ سنوگی؟“ وہ مسکرائے۔ کشتی اب اس سر بزرگ نہر کے درمیان داخل ہو چکی تھی۔ وہاں جا بجا کنوں کے بھول پانی پر تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ سورج گھنے درختوں کے درجے چھپ گیا تھا۔ مخفی میٹھی سی چھایا ہر سو چھائی تھی۔

”محبت کا پہلا درجہ ”علاقہ“ ہے، کیونکہ اس میں انسان کا اپنے محبوب سے ”تعلق“، قائم ہوتا ہے۔ علاقہ کے بعد ”الصباۃ“ ہے، اس میں انسان کا دل پوری گرویدگی کے ساتھ محبوب کی طرف جھک جاتا ہے، وہ اس کے سحر میں گھر جاتا ہے۔ تیسرا درجہ ”الغرام“ ہے۔ قرآن میں پڑھا ہو گا تم نے ”ان عذاباہما کان غراما“ ( بلاشبہ اس کا عذاب لازم ہونے والا ہے) سوالغرام میں محبت قلب کے اندر ہمیشہ کے لئے لازمی طور پر جایا ہے اور اس سے نکل نہیں پاتی۔“ وہ ذرا دیر کوسانس لینے رکے۔ ”پھر ”عشق“ ہے۔ محبت کی ایک انتہا۔ اور ایک بات کہوں، براتونہیں مانوگی؟“

”نہیں تو۔“

”یہ کیا تمہارے ملک کے لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ”عشق“ کا لفظ جوڑنا شروع کر رکھا ہے؟ تمہاری زبان جس زبان سے نکلی ہے، اس میں عشق کا لفظ مرد گورت کی الیکی محبت کے لئے استعمال ہوتا ہے جو معتبر نہیں کبھی جاتی۔ اس لفظ میں شرافت نہیں ہے۔ خود سوچو، کبھی کہہ سکتی ہو کہ اپنے ماں باپ سے عشق ہے تمہیں؟ عجیب لگتا ہے نا؟ اللہ کی محبت کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے لئے یہ لفظ قطعاً درست نہیں۔“

”آہستہ بولیں۔ کسی ثی وی پہ مداری نہ مسوز داسکار نے سن لیا تا، تو مجھے الائکا دے گا۔ آپ کو کیا پتہ آج کل ”عاشق رسول“ کے ماں کی ثی وی پتہ ڈیماٹ ہے۔“ شیخ نے مسکرا کر آہہ بھری۔

”کسی اور کو اگر حق بات کہنے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ ہے، اور وہ غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے، تو رہے۔ مگر نہ میں غیر جانبدار ہوں گا۔ نہ غلط چیز کو روکنے کے لئے کسی ملامت یافتے کی پرواہ کروں گا۔ عربی ادب کے ماہرین اور اہل زبان سے جا کر پوچھلو، اور نہیں تو قرآن پڑھنے والوں سے پوچھلو۔ اللہ نے اپنے اور رسول کے لئے ”محبت“ کا لفظ استعمال کیا یا عشق کا؟ میں تمہارے ملک کے مفتیوں

اور ”عاشقوں“ سے نہیں ڈرتا۔ جو لفظ مجھے اللہ کے رسول نے نہیں سکھایا، جو لفظ ایک اچھا لفظ، ایک شریف لفظ نہیں سمجھا جاتا، میں اس کو اللہ اور رسول کے ساتھ جوڑنے کی مخالفت کرتا ہوں، اور مجھے کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں ہے۔“

”ابن قیم والا حوصلہ اور جگر میرے اندر نہیں ہے، اس لئے ہم آگے چلتے ہیں شیخ!“ اس نے موضوع کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ وہ سرجھٹ کر چپو چلانے لگے۔ کشتی تیزی سے پانی کو چیڑتی تیرنے لگی۔

”عشق کے بعد ”شوق“ ہے۔ یہ دل کے اس سفر کا نام ہے جو پوری تیزی سے محبوب کی طرف شروع کیا جائے۔ پروردگار عالم کے متعلق اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ کو معلوم ہے کہ اس کے دوست اس کی ملاقات کا شوق رکھتے ہیں اس نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے کہ جب وہ لوگ جو اپنے دھکوں اور مسئلتوں میں صرف اسی سے مدد مانگا کرتے تھے وہ اس وقت اس سے ملاقات کر لیں گے اور ان کے دل میں موجود جذباتِ محبت کو قرار ملے گا۔“

پانی پر چمکتے کنوں کے پھول خود بخود ایک طرف ہٹ کر کشتی کو راستہ دینے لگے۔

”اس کے بعد ایتم ہے۔ یعنی کہ انسان اپنے محبوب کی عبادت کرنے لگ جائے۔ محبوب کی عبادت کرنے والا اس کا ”عبد“ (غلام) بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ساری انا، ساری عزت نفس سب اس محبوب کے قدموں میں ڈال دیتا ہے، کسی انسان سے ایسی محبت کی جائے، محبوروی میں نہیں، ظلم میں نہیں، بلکہ صرف محبت میں خود کو اس کے قدموں میں بے تو قیفر کر دیا جائے تو یہ شرک ہے۔ مگر اللہ سے ایسی محبت کرنا، خود کو اس کے سامنے جھکانا، اپنے چہرے کا ہر نقاب اتار کر، ہر انہا پس پشت ڈال کر، اس سے اپنے دل کا حال بیان کرنا، اس کے آگے دعا میں گزر کرنا، یہ ”عبادت“ ہے، اور عبادت محبت کی معراج ہے۔ جو اللہ کی عبادت نہیں کرتا، وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔“

اب ان کے چپو چلاتے ہاٹھوں میں روانی آگئی تھی۔ ہوا بھی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ دریا نہر کی مانند درختوں کی ننگ لگی سے گزر کر آگے بڑھتا ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

”اس کے بعد... کمال محبت... محبت کا آخری درجہ... خلت ہے۔ یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں محبوب کے سوانح کسی کی گنجائش ہوتی ہے، نہ دل کسی شرائکت کو برداشت کرتا ہے۔ اسی خلت سے غلیل ہے، اور یہ منصب اللہ تعالیٰ نے صرف دو انسانوں کو عطا کیا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس خلت کو حاصل کرنے کے لئے ان دو عظیم انبیاء نے بہت کچھ فرمان کیا تھا۔ ہم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے، مگر ایتم... یعنی ”عبادت“ تک تو پہنچ سکتے ہیں نا۔“ جیسے اسے تسلی دی۔

”اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تمہاری اپنے محبوب سے محبت کس درجے تک تھی؟“

”عشق تک!“ وہ بے اختیار بولی۔

”تو پھر سنو۔ مرض عشق کی مدافعت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ.... وہ ذرا دیر کر کے۔“ کہ اپنے دل کو کسی اور طرف مصروف کروتا کہ وہ عشق والے راستے سے رکے۔ یا تو کسی خوف کے ذریعے، یا پھر.... وہ ادا سی سے مسکرائے۔ ”یا پھر محبت کے ذریعے۔“

”محبت کے ذریعے؟“

”جیسے ہیراہیرے کو کاثا ہے، جیسے لوبالو ہے کو کاثا ہے، ویسے ہی عشق کو صرف عشق کاثا ہے، محبت کا علاج محبت سے کیا جاتا ہے۔ جب تک تمہارے دل کے سامنے کوئی بڑی محبت نہیں آئے گی، اس شخص کی محبت سے بڑی محبت تک وہ شفایا ب نہیں ہو گا۔“

”مطلوب مجھے کسی اور سے محبت کرنا ہو گی؟“

”نہیں۔ محبت جبرا کوئی کسی سے نہیں کر سکتا۔ یہ قسمت سے ملتی ہے۔ ہو گئی تو ہو گئی نہ ہوئی تو نہ ہوئی، مگر اس سے پہلے تمہیں اپنے دل کو مصروف کرنا ہو گا۔“

”اور دل کو مصروف کرنے کے لئے مجھے اپنی آنکھ کو مصروف کرنا ہوگا؟“

”بالکل۔ لیکن اس کے لئے دو چیزیں ہوئی چاہیں انسان میں۔ اول، اس میں اتنی عقل ہو کر ادنی اور اعلیٰ محبت میں تمیز کر سکے، اعلیٰ کو ادنی پر فوکیت دے سکے۔ اور دوم، اس میں اتنا صبر، ہمت اور استقامت ہو کہ فیصلہ کر لیا ہے تو اس پر ڈٹ جائے۔ بعض لوگ اپنا فائدہ نقصان خوب سمجھتے ہیں، مگر ان میں غلط کوترک کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ نہ خود کو نفع دیتے ہیں نہ دوسروں کو۔ مگر جن لوگوں میں اتنا صبر اور عزم ہوتا ہے، انہی کو اللہ اپنے دین کی امامت سونپتا ہے۔ اگر تم نے ان میں سے بننا ہے، تو نگاہ کو کسی اچھی طرف لگاؤ۔“

”اوکے۔ میں... میں کوئی مشغله ڈھونڈوں، راست؟“ کنوں کے پھولوں کی جوت بھجتی گئی۔ پانی کی روشنی مفقود ہوتی گئی۔ کشتمدھم ہو کر کہیں ڈوب سی گئی۔ اور اس نے خود کو لا کوئی خیں پیٹھے پایا۔ کتاب بند کر کے وہ اٹھ کر ہی ہوئی۔

”صرف نگاہ جھکانا کافی نہیں، نگاہ کو مصروف رکھنا بھی ضروری ہے۔“ ایک عزم کے ساتھ وہ یونچ پیسمت میں گئی۔ اپنے سامان سے چند اچھی کتابیں نکالیں۔ پھر پینٹنگ کے سامان کی لست بنائی جو وہ آج ہی خرید لے گی۔ لینڈ اسکیپ اور خوبصورت گھر پینٹ کرنے کا کتنا شوق تھا۔ لس وہ آج سے یہ ساری اچھی کتابیں پڑھے گی، اور اچھی اچھی پینٹنگ بنائے گی، یوں وہ مصروف ہو جائے گی اور اس کا دل ہاشم کے اثر سے نکل جائے گا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

❖❖❖

اس ایک بھر نے ملوادیا وصال سے بھی ..... کہ تو گیا تو محبت کو عام میں نے کیا آج کمرہ عدالت میں ٹھنڈتھی۔ سورج ہنوز ناراض تھا۔ ہیرپھی جل رہا تھا۔ مگر ایسے میں گویا موسم سے سب بے نیاز، دھیان اور روجہ کے کثہرے میں کھڑے شخص کو دیکھ رہے تھے، جو چالیں پینٹالیں برس کا مرد تھا، اور سامنے کھڑے پر اسکیوڑ کے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔

”مقتول قمر الدین سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟“

”میں ان کا بہنوئی ہوں۔“ بولتے ہوئے بلوں پر ہاتھ پھیرا تو نج نے ٹوکا۔ ”ذر اضاف اور بلند آواز میں جواب دیں۔“

”میں ان کا بہنوئی ہوں۔“ وہ ہنکھار کر پھر سے بولا۔ اپنی کرسیوں پر زمرا فارس اسی طرح بیٹھے تھے۔ زمرا غذ پر ٹھوڑی دیر بعد کچھ لکھتی، پھر نگاہ اٹھا کر سنجیدگی سے W.P. (پارسکیو شن کا گواہ نمبر ایک) کو دیکھنے لگا۔ فارس بیک لگائے، کان کی لومسٹنے، بچتی ہوئی نظروں سے کبھی گاؤ کو دیکھتا اور کبھی ایک کیلی نظر قریب بیٹھنے ناظم پر ڈالتا۔ ناظم وہ شخص تھا جس نے فارس کا شریک جرم ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔)

”29 اگست کی دو پہر کیا ہوا تھا؟“

”بھی کوئی لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔ میں اپنی بہن کے گھر کام سے آیا تھا۔ ابھی اندر داخل نہیں ہوا تھا، وہیں گیٹ پر کھڑا نون سن رہا تھا کہ ایک گاڑی، جس کی نمبر پلیٹ اتری ہوئی تھی، قریب آئی۔ دو لوگ سامنے والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ وہ کار سے اترے پھچلی سیٹ سے قمر الدین کی لاش نکال کر وہاں پھیٹکی اور اسی تیزی سے کار میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔“

”پھر آپ نے کیا کیا؟“ پر اسکیوڑ نے نزی سے سوال کیا۔

”میں جی فوراً آگے آیا، لاش کو سیدھا کیا، وہ قمر الدین ہی تھا مگر کافی خون آلو دھا۔ میں اسے فوراً ہسپتال لے گیا، ڈاکٹر نے کہا کہ موت واقع ہوئے چند گھنٹے گزر چکے ہیں، مگر ڈاکٹر نے میت ہمارے حوالے نہیں کی۔“

”ہمارے؟“

”یعنی کہ جی میں اور میرا بھائی، اس کو بھی میں نے فون کر کے بلا لایا تھا۔ ڈاکٹر نے شام کو میت حوالے کی، ہم اسے گھر لے آئے۔ پھر

صحیح ہم نے پویس کو اطلاع دی۔“

”جودو لوگ کارپ لاش پھینکنے آئے تھے، آپ ان کو پہچان لیں گے؟“

”جی ہاں جی۔ یہ دونوں۔“ پہلے فارس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہڑا یونگ سیٹ پہ تھا اور یہ (ناظم کی طرف انگلی اٹھائی) یہ فرنٹ سیٹ پہ تھا۔“

”کیا انہوں نے چہروں پر کوئی نقاب پہن رکھے تھے؟“

”نہیں جی، منہ کھلا تھا۔ بالکل صاف اور واضح۔“

پراسکیو ٹر نے سر کو خم دیا، اور پھر واپس اپنی کری کی طرف آتے ہوئے زمر کو دیکھ کر "your witness" کہتے ہوئے جرح کی دعوت دی۔ زمر اپنی جگہ سے اٹھی اور قدم قدم چلتی کٹھرے کے قریب آئی جہاں وہ بہنوئی کھڑا تھا۔ یہاں سے فارس کو اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ آدھے بندھے گھنگریا لے بال پشت پر اور ناک میں دمکتی سونے کی نظر۔ (اسے بے اختیار سیاہ ڈبی میں مقید وہ لوگ یاد آئی جواب بھی ان کے کمرے کی ڈرینگ ٹبل پر پڑی تھی۔ زمر نے اس رات کے بعد اسے چھواتک نہ تھا۔) چھرے پر بے پناہ سنجیدگی لئے اس نے بہنوئی محمد اقبال کو دیکھا۔

”اقبال صاحب سیٹلائٹ فون کی قیمت کتنی ہوتی ہے؟“

”جی؟“ اقبال نے الجھ کرا سے دیکھا۔ پراسکیو ٹر قدرے بے زار سا کھڑا ہوا۔

”آب جیکشن یور آزر۔ کاؤنسلر غیر مغلقة سوال ہو چھڑ رہی ہیں۔“

(ایک وکیل کے کسی سوال پر دوسرا وکیل جب اعتراض کرے تو جیسا تو اس اعتراض کو ”اوورول“ کہہ کر رد دیتا ہے یا سٹینڈ کہہ کر برقرار رکھتا ہے.....)

”اوورول، لیکن آپ اپنے سوال کامدے سے تعلق جلد واضح کریں۔“ نجح صاحب نے عینک کے پیچھے سے زمر کو دیکھتے تنبیہ کی۔ اس نے نحل سے سر کو خم دیا اور سوال دہرا یا۔ ”سیٹلائٹ فون کی قیمت کتنی ہوتی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”کیا اس لئے کہ آپ نے کبھی سیٹلائٹ فون استعمال نہیں کیا؟“

”جی بالکل میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔“

”اقبال صاحب، آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ جب یہ دونوں اشخاص کار میں آئے تو آپ گیٹ پر کھڑے تھے۔ آپ وہاں کیا کر رہے تھے؟“ اسی سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں فون پر بات کر رہا تھا، اپنے بھائی سے۔ آپ میرے فون کا مل چیک کر سکتی ہیں۔“ گردن کڑا کر بولا۔ زمر نے اثبات میں سر کو جبنت دی۔

”آپ کے بل میں بارہ نجح کر بیس منٹ پر اپنے بھائی کو تین منٹ کی کال کرنے کا ریکارڈ موجود ہے،“ درست۔ ”ذرار کی۔“ لیکن...“ اس نے پراجیکٹر اسکرین کی طرف اشارہ کیا جہاں قمر الدین کے گھر کی تصاویر پراسکیو ٹر نے ڈسپلے کر رکھی تھیں۔ وہ سڑک جہاں لاش پھینکنی گئی۔ وہ گیٹ جہاں بہنوئی کھڑا تھا۔

”لیکن قمر الدین کے گھر کے سامنے ایک لاکیوں کا اسکول ہے، کیا آپ نے یہ دیکھ رکھا ہے؟“

پراسکیو ٹر اور ہنچ کر آگے ہو کر بیٹھا اور توجہ سے سنبھل لگا۔ فارس کا بھی کان کی لوکومولٹا ہاتھ روک گیا، آنکھیں سکڑیں۔

”بجی دیکھ رکھا ہے۔“ زمرہ اپس میز تک آئی اور چند کاغذات اٹھائے۔

”یہ اسکول کی انتظامیہ کی طرف سے اینی ڈیوٹ ہے، اور اسی کا لوٹی کے چند معزز لوگوں کی طرف سے حلف نامے ہے یہ جن میں کہا گیا ہے کہ....“ باری باری چند کاغذات نجح صاحب کی ڈیکپ پا، اور پھر پر اسکیوٹر کی میز پر رکھے۔ ”کہ ہر روز نجح آٹھ بجے سے دو پھر دو بجے تک سکول میں جیبر لگائے جاتے ہیں تاکہ وہ لڑکیاں جو چچپ کرموبائل لاتی ہیں وہ ان کو نہ استعمال کر سکیں۔ اور محلے والوں کے مطابق ان جیمز کا دائرہ اتنا ہے کہ قربی گھروں کے وہ حصے جو اسکول کے سامنے پڑتے ہیں، وہاں ان اوقات میں موبائل اسکنلز نہیں آتے جن کی وجہ سے وہ کافی دفعہ اسکول والوں سے شکایت بھی کر سکے ہیں۔ سوا قابل صاحب، میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ اس گیٹ پر جہاں میں خود بارہ نجح کر بیس منٹ پر جا کر موبائل سے کال کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی ہوں، وہاں آپ موبائل پر اتنی لمبی گفتگو کیسے کر سکتے ہیں؟ الایہ کہ آپ کے پاس سیلائیٹ فون تھا؟“

”آب جیکش یور آز!“ پر اسکیوٹر جلدی سے کھڑا ہوا۔ زمرہ نے ہڈ کرا سے دیکھا۔ ”کس وجہ کی بنیاد پر؟“

”کاؤنسلر غیر متعلقہ بات کر رہی ہیں۔“

”یور آز، اس گواہ کے مطابق یہ بارہ نجح صاحب کی گیٹ پر موجود تھا، صرف تب ہی یہ کارپہ آنے والوں کی شکلیں دیکھیں دیکھ سکتا ہے لیکن اگر وہاں سگنل نہیں آتے تو پھر یہ ثابت ہے کہ گواہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا اور وہ فون اس نے کسی اور جگہ پر سناتھا۔“

”اوورولڈ!“ پر اسکیوٹر قدرے غیر آرام دہ سا بیٹھا۔ نجح نے گواہ کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ وہ اب تک سنبھل چکا تھا۔

”میرا خیال ہے میں نے بات گھر کے اندر کی تھی وہاں سگنل آتے ہیں، اور میں بات کر کے باہر آیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ....“

”آپ کو یہ یاد نہیں کہ آپ نے بات کہاں کی، آپ کو یہ یاد نہیں کہ آپ وہاں کیوں کھڑے تھے مگر آپ کو یہ یاد ہے کہ ان دونوں کی شکلیں کیسی تھیں اور یہ کہ ان کی کارکی نمبر پلیٹ غالب تھی؟“ اسی سنجیدگی سے وہ پوچھ رہی تھی۔

”دیکھیں، کافی دن گزر چکے....“

”آپ فوراً قمر الدین صاحب کو ہسپتال لے کر گئے تھے؟“ بات کاٹ کر اس نے اگلا سوال داغا۔ گواہ نے سرا ثبات میں ہلایا۔ ”جی ہاں۔“

”اور ان کے میڈیکل معائنے کے وقت آپ وہاں موجود تھے؟“

”جی۔“

”تو پھر کیا وجہ ہے کہ قمر الدین چودھری کی میڈیکول لیکل رپورٹ پر جو“ دوست ارشٹہ دار،“ کا خانہ ہوتا ہے، جس میں اس شخص کا نام کھا جاتا ہے جو طبعی معائنے کے وقت ساتھ ہو وہ خانہ خالی کیوں ہے؟“ اس نے رپورٹ کی ایک ایک کاپی نجح اور پر اسکیوٹر کے سامنے رکھی، تیری گواہ کے ہاتھ میں دی۔ گواہ نے قوک لگالا۔ سراٹھا کر پر اسکیوٹر کو دیکھا۔ وہ کاغذ پڑھتے ہوئے میری سے اٹھا۔ ”یور آز، ڈاکٹر سے بھول چوک ہو سکتی ہے، اتنے مریضوں کی موجودگی میں اکثر ڈاکٹر زاس خانے کو پر کرنا بھول جاتے ہیں۔“

”دوسری یعنی دولا شیئ، دور پورٹش!“ وہ مزید چند کاغذ میرے اٹھا کر لائی اور نجح صاحب کے سامنے رکھے۔ ”29 اگست کو ڈاکٹر سعادت نے قمر الدین چودھری کے علاوہ مزید دولا شوں کی میڈیکول لیکل رپورٹ تیار کی تھیں، ان دونوں میں دوست ارشٹہ دار کا خانہ بھرا ہوا ہے۔ اگر ڈاکٹر کو وہاں یاد رہا، تو اسے یہاں کیوں بھول گیا؟ یا پھر...“ گواہ کے سامنے کھڑے ہو کر مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”آپ وہاں موجود ہی نہیں تھے، بلکہ آپ کو پر اسکیوٹر نے روٹی رٹائی کہا یا دکرنے کو کہا ہے؟“

فارس ہلاکا سا مسکرا یا۔ یہاں سے ابھی تک زمرہ کا نیم رخ دکھائی دے رہا تھا، مگر اس کا انداز، اس کی نرم ہی سخت۔۔۔ اسے خود بھی نہیں

پتھکار کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

”آب جیکشن یور آئر“ پر اسکیوں فرغت سے بولا اور نجح صاحب نے فوراً سے ”sustained“ کہتے ہوئے زمر کو تینی نظروں سے دیکھا بھی تھا، مگر وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر ”withdrawn“ کہتی واپس کری پہ جائیں گی۔

”مجھے مزید کوئی سوال نہیں کرنا مگر میں گواہ کو دوبارہ بلا کر جرح کرنے کا حق حفظ کھانا چاہتی ہوں۔“ اب وہ عدالت کو اطلاع دے رہی تھی۔

فارس نے مسکراتے ہوئے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر پھر رک گیا۔ اور مسکرا ہٹ دبای۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ اس کی تعریف کرتا۔

❖❖❖

چلی جو سیلِ رواں پہ محبت کی کشتی ..... تو اس سفر کو محبت کے نام میں نے کیا سنده میں ایک طویل عرصے کی تعیناتی کے بعد اس کو بالآخر پہنچنے شہر میں واپس بلا لیا گیا تو وارث خوش تھا۔ اس کے خیال میں فارس کے کیریئر سے لکھ کر اتر گیا تھا اور اس کی ترقی کے چانسز بڑھ گئے تھے۔ مگر اس کی خوش گمانی چند ہفتوں میں ہی ختم ہو گئی اور فارس کے کوئیگ سے ملنے کے بعد وہ سیدھا قصرِ کاردار کی انگلی میں آیا تھا۔

”اب میں نے کیا کیا ہے؟“ اس نے فریج سے سافٹ ڈرنک کے دو کینن نکالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا تھا۔ پھر سیدھا ہو کر پلانا تو دیکھا، وارث گلاسز کے پیچھے سے اس کو تندہ ہی سے گھور رہا تھا۔

”مسئلہ یہ ہے کہ اس دفعہ تم نے کچھ نہیں کیا۔“

”تم میرے باس کی طرح بتیں کیوں کرتے ہو؟“ ایک کینن اس کی طرف اچھالا، اور دوسرا کھول کر خود صوفے پا آگرا۔ وارث نے سختی سے لب بھینچ کیں میز پہنچا اور اس کے سامنے بیٹھا۔ ”تمہارے سامنے ایک شخص گن لہراتا ہوا بھاگ گیا اور تم نے اس پر گولی نہیں چلائی!“ ”اس نے ایک بچے کو یغماں بنارکا تھا، اس کی گردان پر پستول رکھ کر، اس کوڑا حال بنا کر وہ کھڑا تھا، میں بچے کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔“ اور کینن بلوں سے لگائے گھونٹ بھرا۔

”تو تمہیں اس کے بازو پر گولی مارنی چاہیے تھی، اس رگ پر جس کے کتنے ہی وہ ٹریمگرد بانے سے مفلوج ہو جاتا۔ ڈونٹ میں کر تمہیں کسی نے یہ سب نہیں سکھایا۔“

فارس نے کین رکھا اور سمجھی گی سے آگے ہوا۔ ”وارث... وہ ایک انسان تھا۔ اس پر اسمگنگ کے جتنے مقدمے ہوں وہ ایک انسان تھا، میں ایک انسان پر گولی نہیں چلا سکتا تھا، اس اینگل سے میرا بیسٹ شاث اس کی کپٹی پلگتا، اور میں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا کسی کو۔“

”اور تمہیں کیا لگتا ہے، وہ بھاگ کر جو گیا ہے، تو کیا اب مسجد میں میلاد کروارہا ہوگا؟ نہیں غازی۔ وہ جتنے لوگوں کی زندگیاں منشیات سے خراب کرے گا، وہ تمہارے سر ہوں گی۔“ فارس چند لمحے خاموش رہا۔

”سارہ کیسی ہیں؟“ وارث نے مزید فرغت سے اسے دیکھا۔

”ٹاپ مت بدلو۔ قتل کرنا جرم ہوتا ہے، مگر یوں کی لائیں میں، فساد فی الارض کرنے والوں کو مارنا ثواب کا کام ہوتا ہے۔“

”کیا معلوم وہ تو یہ کر لے؟ یہک جو جائے؟ میں نے جو بھی کیا بچے کو بچانے کے لئے کیا، ہاں ٹھیک ہے، میری کمزوری ہے یہ کہ میں

ایک انسان پر گولی نہیں چلا سکتا، مگر.... ہو سکتا ہے وہ بد لئے والا ہوتا اور میں اس کا چالس اس سے چھین لیتا۔“

اس بات پر وارث غازی پورے دل سے مسکرا یا تھا۔

”میری ایک نصحت ساری زندگی یاد رکھنا، فارس۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ تکھر تکھر کر بولا تھا۔ ”انسان نہیں بدلا کرتے۔ لاکھوں میں سے ایک دو تو بدلتے ہیں، مگر ہر کوئی نہیں بدلتا۔“

یہ نصحت بھلانے میں اسے چند دن لگتے تھے، مگر زہن کے کسی نہایت خانے میں یہ ایک ضرور گئی تھی، لیکن یہ وہ دن تھے جب دل اور دماغ میں اور بھی بہت کچھ چل رہا تھا۔ اس نے زمر کی یونیورسٹی جوانئ کری تھی۔ شام کی کلاسزدہ اس سے لینے لگا تھا، اور یہ اس کو خوب بھی معلوم تھا کہ پورے شہر میں ایک یہی یونیورسٹی تھی۔ پھر وہ ادھر کیوں آتا تھا؟ صرف اس کے لئے۔

اس سے قل ان دونوں کی ملاقات زیادہ نہ رہی تھی، بلکہ رکی سلام سے زیادہ اس نے کبھی اس سے بات بھی نہ کی تھی، اور سندھ میں قیام کی اس طویل مدت کے دوران اس کو وہ بھول بھال بھی گئی تھی مگر یہاں آنے کے بعد... ایک روز اس نے اسے سعدی کے گھر سے لکھتے دیکھا تھا، اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر اس نے اس لڑکی کو کھو دیا تو دنیا میں کوئی اور اس کے لئے نہیں ہو گا۔

وہ اس کی یونی جانے لگا، اس سے بات کرنے کے موقع تلاش کرنے لگا، اس کا زیادہ سے زیادہ وقت لینے کے بہانے ڈھونڈنے لگا، اور وہ ہمیشہ ہی اسے ایک طرح سے ڈیل کرتی تھی۔ احترام اور عزت کے ساتھ، مگر یہ روا اور دور۔ وہ خوبصورت نہیں تھی، شکل و صورت میں وہ محض واجبی تھی، رنگت بھی گندی مائل تھی، بال خوبصورت تھے، مگر نہ وہ بننے سنوئے کی شو قین تھی، نہ وہ کسی سے بے وجہ بات کیا کرتی تھی۔ زیور کے نام پر وہ صرف ناک میں نتھ پہنکرتی تھی۔ شاید اسے اپنی ناک بہت عزیز تھی!

وہ بہت اچھی تھی، یا پھر اسے لگتی تھی۔ محبت کرنے والی، مگر مضبوط، دینگ اور بھی بھی ذرا ضدی۔ نرم لبجھ میں سخت باتیں کر جاتی تھی۔ قلم سے کانڈ پر لکھتے لکھتے، کسی بے معنی بات پر وہ بس ایک ابر و اٹھا کر اسے دیکھتی، اور پھر واپس کام کرنے لگ جاتی اور اس کا یہ انداز سامنے والے کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ دل کی اچھی تھی۔ مہربان، اور نرم ہی۔ اس میں ہر وہ خوبی تھی جو اس جیسے مرد کو متوجہ کرتی، مگر وہ اس معاشرے کا مرد تھا، جس کے لئے اپنی عزت اور عزت کا بھرم ہر شے سے اور پر تھا، کیونکہ آخر میں وہ تھی تو پیغم و لایت کے خاندان سے نا!

قصوں کہانیوں اور فلموں میں محبت کی شادیاں حیران گیز لکھتی ہوں، حقیقت اس سے مختلف تھی۔ وہ ابھی اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ جو بھی سنتا، آگے سے کہتا، اچھا... وہ دونوں ایک یونی ورثی میں ساتھ ساتھ.... اور اس سے آگے کی معنی خیز مسکراہیں، اور آنکھوں کی چمک... فارس کی طبیعت کو یہ گوارانہ تھا۔ بہت سالوں کی ریاضت کے بعد، کتنے اس باقی سیکھ کر اور کتنی اذیت کاٹ کر وہ، وارث اور ندرت ایک خاندان بننے تھے۔ وہ بالآخر ان کے خاندان میں دوسری بیوی کا بیٹا، نہیں بلکہ ندرت اور وارث کا بھائی سمجھا جانے لگا تھا، وہ اس عزت پر حرف بھی نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

سواس نے تاخیر کی، اور پھر وہ تاخیر کرتا گیا۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد وہ عزت سے اس کے لئے رشتہ بھجوادے گا۔ مگر میں، شادی اپنے شہر میں پوسٹنگ، موقع ترقی، اچھی جاب، بچے... فارس غازی کی زندگی کی ساری ترجیحات اس کے ساتھ تھیں۔

بہت ہی صفائی اور سلیمانی سے آراستہ اور مرتب شدہ!



دشت میں پیاس بھاتے ہوئے مر جاتے ہیں ..... ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں  
شیشوں سے ڈھکی عمارت کے اندر سورج کی نرم گرم کرنیں گرہی تھیں۔ سیکڑی علیمہ اپنے ڈیک کے پیچھے کھڑی ہاشم سے بات کر رہی تھی، جو فون پہن دباتا، ذرا دیر کو اس کی بات سننے کے لئے رکا تھا۔

”سر آپ ٹھیک ہیں؟“ علیمہ نے رک کر پوچھا تو ہاشم نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ گرے سوت اور گرے ویسٹ میں ملبوس، بال پیچھے کو جیل سے بنائے، وہ ہمیشہ کی طرح ہینڈ سم لگ رہا تھا، مگر اس کی آنکھیں بے خوابی کا شکار لگتی تھیں۔

”تھیک یو جلیمہ میں ذرا اور درکٹ ہوں۔“ پھر ٹھہر کر پوچھا۔ ”خاور کا کچھ پتہ چلا؟“

”نبیس سر۔ اس کی وہی ای میل آئی تھی مجھے۔ کہ کچھ دن کے لئے وہ روپوش ہو رہا ہے۔ پویس اس کے پیچے ہے۔ اس کے بیٹے کو

اگلے اس کا بھی میتح ملا ہے وہ بھی مجھ سے کئی بار پوچھ چکا ہے۔ آپ کو کچھ نہیں بتایا؟“

”نبیس، مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا۔“ ہاشم نے افسوس بھری لامعی سے شانے اپکائے اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

رنیس اس کا منتظر تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ اس کے سامنے آیا۔ ہاشم نے کرسی پر بیٹھنے ہوئے اس پر ایک سنجیدہ نظر ڈالی۔

”پر اگر میں؟“

”سر ہر طرح کی ٹارچ ٹکنیک استعمال کرچکے ہیں، وہ نہیں اعتراض کرتا۔ بہت سخت جان ہے!“

”میں جانتا ہوں!“ ہاشم نے لیپ ناپ کھولتے ہوئے سر کو ختم دیا۔ ”اس کو کڑی مگر انی میں رکھو اور مزید کوشش کرو۔ مجھے اس شخص کا نام چاہیے جس کے کہنے پر اس نے میرے باپ کو مارا ہے، یا اگر وہ اکیلا کام کر رہا تھا تو مجھے اس کا motive سننا ہے۔ بغیر وجہ کے کوئی قتل نہیں کرتا۔ اب جاؤ!“ ابرو سے اشارہ کیا اور پھر انہی تین تاثرات کے ساتھ اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”سرفارس غازی کا دو دفعہ پیغام آیا ہے وہ آپ سے.....“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ اگلے بہتے میں جاؤں گا اس سے ملنے۔“ مصروفیت اور قدرے بے زاری سے کہہ کر وہ کام کرنے لگا۔ رنیس سر

ہلا کر مڑ گیا۔

اور ہزاروں میل دور... سمند کنارے بننے ہوئیں کے تہہ خانے میں مستعد گارڈ زماں کی طرح اپنی جگہوں پر کھڑے تھے۔ پھر جیسے چہرے بنائے، چاق و چوبندا اور الٹ۔ تبھی سعدی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلتا وکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا خالی گ تھا جو اس نے باہر میز پر دھرا۔ پھر سنجیدہ چہرے کے ساتھ گارڈ زماں کی طرف آیا۔

”مجھے اس سے ملتا ہے۔“ یہ اجازت اسے چند دن پہلے سے ہی ملے گئی تھی، سو گارڈ سر ہلا کر اسے راہداری میں آگے لے آیا۔ ایک دوسرے کے کا لکڑی کا دروازہ کوڑ دبا کر کھولا تو سعدی نے اندر قدم رکھا۔ میروں میں نرم سلیپر، اوپر جیزیر پہلکی جرسی شرست پہنہ وہ تندرست اور تو انالگتا تھا، اس کے برکس دوسرے قیدی کا حال مختلف تھا۔

اس کے ہاتھ اور پیر جڑی ہتھڑی پوں سے بند ہے تھے، جن سے لکھتی زنجیریں دیوار میں نصب تھیں۔ زمین پر بیٹھا، دیوار سے ٹیک لگائے، وہ آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ چہرے اور گردن پر زخموں کے نشان، اور پرانے کپڑوں پر لگلے کٹ اور خون کے دھبے۔ بند آنکھوں کے گردنظر آتے تھیں۔ سعدی نے بالکل بے تاثر نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”ہیلو خاور!“

خاور نے نیل نیل آنکھیں کھولیں۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور ہونٹ پر بھی خون جاتا تھا۔ آنکھوں میں بہمی اور چھین لئے اس نے سعدی کو دیکھا۔

”کیا دیکھنے آئے ہو؟ یہی کہ میں زندہ ہوں یا نہیں؟“ پھر ہلاکا سامسکرایا اور فی میں سر ہلایا۔ ”میں اتنی آسانی سے مر نے والا نہیں

ہوں نپچ۔ تمہیں کیا الگتا ہے، تم میرے اوپر الزام لگا کر ہاشم کو مجھ سے بدھن کر دو گے؟ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“

پھر اٹھا۔ درد کی ٹیسیں انھیں مگر ضبط کر کے وہ سیدھا سعدی کے سامنے کھڑا ہوا۔

”میں تمہاری ساری گیم سمجھ گیا ہوں۔ پہلے دن سے سمجھ گیا تھا۔ تم ہاشم اور مجھے توڑنا چاہتے ہو، چاہتے ہو میں قید میں مر جاؤں اور تم

ہاشم کو تھہا کر کے مارو۔ ڈیو ایڈ اینڈ روول اے ہے نا؟“

سعدی ہلکا مسکرا یا۔ بولا کچھ نہیں۔ اس کی گردن پر سرخ خراش کا مندل نشان اب بھی موجود تھا۔ کوئی چار روز قبل اسے پہلی دفعہ خاور سے ملاقات کی اجازت ملی تھی تو خاور نے اپنی زنجیر کو اس کی گردن میں لپیٹ کر اسے مارنے کی کوشش کی تھی جسے بروقت گارڈز نے ناکام بنادیا تھا۔ وہ اس کو دیکھتے ہیں کیونکہ جتنا لگتا تھا۔ آج جیسے اونچا بولنے سے وہ اکتا پھا تھا سو اداز نازل رکھتی تھی۔

”کہا تھا میں نے ہاشم کو۔ سعدی یوسف فرشتہ نہیں ہے۔ کہاں گیا تمہارا اسلام، تمہارا دین جب تم مجھ پہنچنا کر دہ گناہ کا الزام لگا رہے تھے؟“ تقارت سے اسے دیکھا۔

سعدی ہلکا ساہنسا پھر سر جھکتا۔

”ہبیرے کو کافتا ہے کاردار زکو کافتا ہے کافتا ہے، ان جیسا سوچنا پڑتا ہے۔ چار سال...“ انگوٹھا اندر کر کے چار انگلیاں اس کو دکھائیں۔ ”چار سال میں نے قانون، وکیلوں، عدالتوں کے ساتھ تعاوون کر کے انصاف حاصل کرنے کی کوشش کی ہے مگر نہ میں فارس غازی کو قانونی طریقے سے نکال سکا، نہ وہ مجھے نکال سکے گا۔ سچو قانون انصاف نہیں دے سکتا، وہ بات نہیں کافی سکتا۔ اس لئے بہت سادہ طریقہ ہے انتقام لینے کا، ہاشم کو تمہارے خلاف بھڑکا کر تمہیں اسی کے ہاتھوں سے مر وا دوں۔“ وہ سانس لینے کو رکا۔ خاور اسی طرح غصہ اور نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مگر میں یہ سب انتقام کے لئے نہیں کر رہا۔ اس لئے تمہیں مر وا نے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ خاور کے ابر و بھنپے، وہ ذرا چوچا کا تھا۔

”میں تمہیں نہیں مر وا نے لگا کر قتل خاور۔ میں صرف تمہیں سوی چڑھا رہا ہوں، کیونکہ تم میری آزادی کا پروانہ ہو۔“  
”ایک منٹ تم...“

”نہیں، میں تمہیں ہاشم کے خلاف بھی نہیں استعمال کرنے لگا، میں نے صرف تمہیں سوی چڑھا رہا تھا، تمہاری گردن کا شنا ہاشم کا کام ہے، مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا، کیونکہ اسے کبھی یقین نہیں آئے گا کہ تم اس کے باپ کے قاتل ہو۔“  
خاور آنکھیں سکیڑتے تجب اور ناگواری سے اسے گھورتے قریب آیا۔ سعدی سے دو قدم دور اس کی زنجیر کس گئی۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے ہاشم تمہیں قاتل سمجھتا ہے؟ اونہوں۔“ لڑکے نے مسکراتے ہوئے نئی میں گردن ہلاتی۔

”وہ شک میں ہے۔ اسے صرف ایک چیز تمہارے قاتل ہونے کا یقین دلا سکتی ہے اور وہ ہے تمہارا اقبالی جرم!“  
”جو میں کبھی نہیں کروں گا۔“

”مگر تمہارے اقبالی جرم نہ کرنے سے وہ تمہاری بے گناہی مان نہیں لے گا۔ میں نے کہا تا، وہ شک میں ہے، اگر یقین ہوتا اس تو وہ تمہیں اب تک مار چکا ہوتا۔ صرف ایک چیز اس کو تمہاری بے گناہی کا یقین دلا سکتی ہے، اور وہ ہے.... میرا اقبالی جرم! کہ میں نے تم پر الزام لگایا۔“

”تمہارے بار بار بیان بدلنے سے تمہاری کریدی بلڈی ختم ہو جائے گی۔“

”جب میں اسے اصل قاتل کا نام بتاؤں گا، تو تم بری ہو جاؤ گے۔ میں نے تمہیں صرف سوی پہ چڑھا رہا تھا، سزاۓ موت نہیں دیں۔ مجھے معلوم تھا ہاشم تمہیں مارے گا نہیں بلکہ تمہیں اپنی بہترین جیل میں قید کر دے گا۔ یوں تم میرے پاس آ جاؤ گے۔ تم میری آزادی ہو، خاور۔ میں نے اتنے مہینے سوچا کہ مجھے یہاں سے کون نکالے گا۔ فارس، زمر، میری، بہن، کوئی دوست.... مگر نہیں۔“ مسکرا کر کہتا دو قدم قریب آیا اور انگلی سے خاور کے سینے پر دستک دی۔ ”مجھے یہاں سے تم نکالو گے۔ اور میں تمہارے حق میں گواہی دے دوں گا۔ ہم دونوں آزاد ہو جائیں گے۔“ خاور نے بختی سے اس کا ہاتھ جھکتا۔

”اوور مائی ڈیٹی بادی سعدی یوسف!“ وہ اس کو گھورتے چبا چا کر بولا۔ ”اگر مجھے آزاد ہونا ہوتا تو پہلے دن ہی ہو جاتا۔ یہ جیل میں لے نہیں تھی، اس کے ہر راز سے میں واقف ہوں، مگر مجھے اپنے مالک سے بھاگنا نہیں ہے، مجھے اس کے پاس واپس جانا ہے۔ میں اور تم... کبھی ماں گاہ کام نہیں کریں گے۔ رہے تم.... تو تم اپنی مخصوصیت کھوتے جا رہے ہو۔ تم بھی وہی بننے جا رہے ہو جن سے تم نفرت کرتے تھے۔“

”میری آفرمود دم دست کے لئے ہے۔“ ایک استہرا اپنے نظر خاور پر ڈال کر وہ مڑ گیا۔ دروازہ کھلاختا نے پہ گارڈ کی صورت نظر آئی تو نواز بے اختیار چلانے لگا۔

”مجھے ہاشم کا ردار سے بات کرنی ہے۔ میری ان سے بات کرواؤ۔ کیا تم نے سننیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ سعدی باہر نکل آیا اور کونگے بھرے بنے گارڈ نے دروازہ مغلل کر دیا۔ زنجروں میں کھڑا شخص اسی طرح چلا جا رہا تھا۔

❖❖❖

اس طرح لوگ اٹھ کر چلے جاتے ہیں چپ چاپ ..... ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں کورٹ روم میں مخدنا اور نشانی آج بھی موجود تھی۔ ڈریں پینٹ اور کوٹ میں ملبوس احر شفیع نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو اندر سب کو فاموشی سے کٹھرے میں کھڑے شخص کا بیان سنتے پایا۔ وہ بے قدموں چلتا آیا اور زمر کے ساتھ بیٹھے فارس کے دائیں جانب آبیٹھا۔ ”سوری گھے دیر ہو گئی۔“ معذرت خواہانہ مسکراہت کے ساتھ فارس کے قریب سر گوشی کی۔

فارس غازی کٹھرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سفید شلوار قمپیٹ کے اوپر براؤن کوٹ پہننے، وہ سنجیدہ اور سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ آواز پر گردن موڑ کر ایک گہری نظر احمد پہ ڈالی۔

”اچھا، مجھے لگا تم عجلت میں ہو۔“

احمر نے بیٹھتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“

فارس نے نگاہ اس کے پورے وجود پہ ڈالی۔ ”سلک شرث ڈیز ائرزو اج بدلا ہوا سلی فون، اتنی جلدی اتنا کچھ احمد؟“

”میں ترقی کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں خوش نہیں ہوئی؟“ اسے تجب ہوا تھا۔

”تم کا ردارز کے پاس کام کرنے لگے ہوؤہ میرے رشتے دار ہیں، میں ان کو جانتا ہوں، اسی لئے کتنے ہفتے سے تمہیں نصیحت کر رہا ہوں کہ ان کے سرکل سے نکل آؤ،“ ورنہ وہ تمہیں اپنے جیسا بنا لیں گے۔“

احمر کے چہرے پہ ناگواری بھری ہے بُی ابھری، وہ جوابا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر زمر نے ”شش“ کہہ کر ٹوکا تو وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ فارس سنجیدگی اور حمرا خوشی سے سامنے دیکھنے لگا جہاں پر اسکی یوڑا، ناظم سے سوال کر رہا تھا۔

”28 اور 29 اگست کی درمیانی شب کیا ہوا تھا، عدالت کو مطلع کیجئے۔“

”میں کار لے کر اس فیکٹری تک پہنچا جہاں غازی نے مجھے آنے کے لئے کہا تھا۔ وہ فیکٹری خالی، ویران اور سر سے بند پڑی ہے۔ میں نے کار بہر دیکھی کہ اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں بھاگ کر اندر آیا تو دیکھا کہ قمر الدین اسی کرسی پہ بندھا رہا ہے جیسا صبح میں اس کو چھوڑ کر گیا تھا اور سامنے فارس غازی کھڑا ہے، اس نے پستول اس پستان رکھا ہے۔ قمر الدین کی اگردن ایک طرف لڑکی ہوئی تھی اور غازی نے اسے کنٹھی میں گولی ماری تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اسے کیوں مارا؟ مارنا تو پلان میں شامل نہیں تھا، تو اس نے کہا کہ اس نے مجھے نازی باتیں کہی تھیں جن پر مجھے غصہ آگیا اور میں نے اسے پھر کا دیا۔ میں نے پوچھا کیسی باتیں؟ تو اس نے نہیں بتایا۔ پھر ہم سوچتے رہے کہ لاش کو کیسے ٹھکانے لگائیں۔ اس نے کہا کہ مقتول کے گھر پہنچن آتے ہیں، میں ڈر گیا،“ مگر اس نے مجھے ارضی کر لیا اور مجھے وہاں انتظار کرنے کو کہا۔ پھر وہ چلا گیا اور دوپہر کو داپس آیا۔ پھر اس نے کہا کہ لاش کو کار میں ڈالوں میں نے کہا میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اس نے خود

ہی لاش کو گھسیٹا اور گھسیٹنے ہوئے کار میں جا کر ڈالا۔ پھر ہم دونوں کار میں بیٹھ کر قمر الدین کے گھر گئے لاش چھٹی، جب ایک شخص جو اس کا بہنوئی تھا باہر کھڑا تھا۔

”کیا وہ فون پہ بات کر رہا تھا؟“ پراسکیو ٹرنے کہتے ساتھ ایک نظر زمر پڑا۔

”نہیں، اس کے ہاتھ میں فون تھا مگر وہ فون پہ بات نہیں کر رہا تھا۔“ زمر خاموش رہی۔

”اچھا، یہ بتاؤ تم فارس غازی اور مقتول کی جیل کی دشمنی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”میں قمر الدین کے رہا ہونے کے سال بعد آیا تھا جیل میں، مگر میں نے وہاں پانپے ساتھیوں سے سناتھا کہ...“

”آب جیکشن یور آزر!“ زمر نے بیٹھے بیٹھے قلم انگلیوں میں گھماتے آواز بلند کی۔“ heresay

”یور آزر، فارس غازی اور قمر الدین کی دشمنی کے بارے میں کورٹ کو بتانا ضروری ہے، تاکہ پوری تصویر واضح ہو سکے۔“ پاسکلیا!

جلدی سے بولا تھا۔

”مگر یور آزر یہ heresay ہے۔ اس نے کہا، اس سے سنا۔ آپ heresay کی ٹرائل میں اجازت نہیں دے سکتے۔ جو نام صاحب ابھی کہیں گے، وہ گواہی نہیں ہے، ثبوت نہیں ہے، بلکہ سنی سنائی بات ہے، وہ صرف تب کہی جا سکتی ہے جب استقاشہ عدالت میں اس ساتھیوں کو پیش کرے جنہوں نے ناظم سے یہ بات کہی ہے، مگر چونکہ ایسا کوئی شخص استقاشہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل نہیں ہے، سو یہاں اس کا جواب... کسی کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“

”مگر یور آزر!“

نجع صاحب نے ہاتھ اٹھا کر پراسکیو ٹرنے کو روکا، پھر آنکھیں مسلتے ہوئے چند لمحوں کے لئے سوچا۔ پھر اثبات میں

ہلایا۔“ sustained

پراسکیو ٹرنے صبر کا گھونٹ بھرا، چند ایک واجہی سوال پوچھئے اور واپس آبیٹھا۔ زمر قلم رکھ کر اٹھی اور چھوٹے قدم انہاں کٹھرے کے قریب آئی۔ ناظم خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”آپ کو انگریزی آتی ہے؟“ سنجیدگی سے سوال کیا۔ ناظم نے ایک نظر پیچھے بیٹھے پراسکیو ٹرنے کو دیکھا، اور پھر زمر کو۔ ”نی تھوڑی بہت۔“

”Dying declaration“ کیا ہوتا ہے؟ عدالت کو بتائیں گے؟“

”آ...“ اس نے تذبذب سے شانے اچکائے۔

”اوکے میں بتاتی ہوں Dying declaration نزاعی بیان کو کہتے ہیں، جو کوئی شخص مرتے وقت دیتا ہے، اور...“

”آب جیکشن یور آزر۔ مسز زمر مدعے سے باہر جاری ہیں۔“ پراسکیو ٹرنے کے جلدی سے کھڑا ہوا۔

”اوور روڈ۔ ان کی پوری بات سننے میں کیا حرج ہے۔“ نجع صاحب نے زمر کو ایک حوصلہ افزائے نظر سے نواز۔ وہ واپس نامہ طرف گھومی۔

”آپ نے کیا اس کیس کا نام سن رکھا ہے، اشرف پروین بنام سلیم شاہد؟“

”جی!“

”اس کیس میں سلیم شاہد پا اڑا مھا کر اس نے ایک شخص کو سڑک پر چھرا مار کر قتل کیا ہے، اور مقتول نے مرنے سے پہلے ایک، ایک نزاعی حالت میں بتایا تھا کہ اس کا قاتل سلیم شاہد ہے اور یہ کہ اس نے خاندانی عداوت کی بنا پر ایسا کیا ہے۔ اس را لگیر کا نام...“ میز سے ایک

کاغذ اٹھا کر لائی اور ناظم کی طرف بڑھا یا۔ ”مجھے پڑھ کر سنائیں۔“

ناظم نے ایک نظر کا گزد پڑا۔ ”ناظم فاروق ولد محمد فاروق۔“

”سو ناظم صاحب کیا آپ اس کیس میں بطور گواہ پیش ہوئے تھے، اور آپ نے متقتل کا Dying declaration عدالت کو سنایا تھا؟“

”جی ہاں۔“

”مگر عدالت نے ملزم سلیم شاہ کو بری کر دیا تھا۔ کیا آپ مجھے اسی کاغذ پہ ہائی لائٹ شدہ سطور اوپری آواز میں پڑھ کر سنائیں گے جس میں جسٹس نعیم الحق نے اس نزدیکی بیان پر یقین نہ کرنے کی وجہ بیان کی ہے؟“

وہ انگریزی میں سطور پڑھنے لگا۔ سب خاموشی سے سننے لگے۔

”دورانِ جرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ PW5 ناظم فاروق نے چند باتوں میں غلط بیانی سے کام لیا ہے، اس کے علاوہ PW5 ناظم فاروق کی کریڈیبلیٹی اور سابقہ ریکارڈ ایسا صاف ثقہ اور شک و شبے سے پاک نہیں ہے، اس لئے ان کی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔“ پڑھ کر وہ خاموش ہو گیا۔

”جو شخص ایک معاملے میں جھوٹ بول سکتا ہے، اس کی بات پر کسی دوسرے معاملے میں یقین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ الفاظ جسٹس محمد عامر ملک نے 1990 میں صابر بنام سرکار اپیل کیس کے دوران کہئے تھے اور ان الفاظ کی روشنی میں، کیا ہم آپ کی بات پر یقین کریں کہیں ناظم صاحب؟“

”یور آز، مسز زمر ایک اور کیس کو اس کیس کے ساتھ ملا کر گواہ کی کریڈیبلیٹی کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ اس نے پھر احتجاج کیا۔ زمر نے دونوں ہاتھ اٹھادیے۔

”اوکے فائن۔ مجھے گواہ کی کریڈیبلیٹی کو چیک کرنے دیں۔“ دوبارہ سے ناظم کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

”آپ کتنی دفعہ جیل جا چکے ہیں؟“ (اس سوال پر اسکیوں ٹرنے پھر سے پہلو بدلا تھا۔)

”دو دفعہ۔“

”کیا یہ درست ہے کہ آپ کے اوپر چوری اور انوادرائے تاداں کے پائچے مقدمے مختلف اوقات میں قائم ہو چکے ہیں؟“

”جی۔“ وہ ڈھنائی سے بولا۔ زمر نے جو صاحب کو ان الفاظ کو جذب کرنے کے لیے چند لمحے کا وقفہ دیا پھر بولی۔

”اس رات آپ جب نیکری پہنچے تو آپ نے گن فائز کب سنائی؟“

”جب میں نے کار پارک کی۔“

”اور پھر آپ دوڑ کر اندر آئے تو کیا دیکھا؟“

”یہی کفارس غازی نے گن مقتول پہنچانی ہوئی ہے۔ اور مقتول کی کپٹی سے خون بہر رہا ہے۔“

”کیا فارس غازی اس کو دوسرا گولی مارنا چاہتا تھا؟“

”آپ جیکشن یور آز، کاؤنسلر گواہ سے اس کی رائے مانگ رہی ہیں۔“ وہ پھر پیچھے سے بولا۔ جو نے ”sustained“ بولا ہی تھا اسے امن مرفرہ سے کہنے لگی۔

”اوکے، میں سوال کو rephrase کرتی ہوں۔ کیا آپ نے غازی کو دوسرا گولی چلانے سے روکا؟“

”نبیں، وہ دوسرا گولی نہیں چلا رہا تھا، اس نے مجھے دیکھ کر گن بیچے کر لی۔“

”اوکے!“ وہ واٹ بورڈ کی طرف آئی، ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”اس مقام پر آپ نے کار پارک کی، اور اس مقام پر فارس غازی نے آپ کے بقول گوئی چلائی۔ میں چند روز پہلے اپنے بیتچے کے ساتھ اس جگہ پہنچی، اور اس نے مجھے پوائنٹ اے سے پوائنٹ بی تک بھاگ کر دکھایا۔ سواس پارکنگ کی بجگہ سے اس اندر ورنی کمرے تک بھاگ کر بھی آتے اس کوڈیڑھ منٹ لگا۔ آپ کو بھی اتنا ہی وقت لگنا چاہتے۔ مجھے صرف اتنا سمجھا میں کہ گوئی چلانے کے بعد ڈیڑھ منٹ تک ایک آدمی، جس کا ارادہ بقول آپ کے دوسرا گوئی چلانے کا بھی نہیں تھا، کیوں اپنے مقتول پر پستول تانے رکھے گا۔ عومنا گوئی چلانے کے بعد پستول جھٹکا کھاتا ہے، اور لوگ پستول والا ہاتھ نیچے گردیا کرتے ہیں۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں نے جو دیکھا ہوا تباہی۔“ اس نے ڈھنائی سے شانے اچکائے۔ زمر نے ایک نظر نجح صاحب کے تاثرا پر ڈالی، جو کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے پھر دوبارہ ناظم کی طرف گھوئی۔

”اچھا، مجھے ذرا ری فریش کرنے دیں۔ غازی مبینہ طور پر لاش کو کس طرح کارٹک لے کر آیا؟“  
”گھیٹ کر۔“  
”فیس اپ یا فیس ڈاؤن؟“  
”بھی؟“

”لاش کا چہرہ اور پر تھا یا زمین کی طرف تھا؟“  
”آ..... اوپر تھا۔“

”جور استہ آپ نے پولیس کو بتایا تھا، جہاں مقتول کے خون کے دھبے بھی ملے ہیں، وہ پھر یا بھی ہے اور درمیان میں کافی گھاس بھی جیسا کہ آپ ان تصاویر میں دیکھ سکتے ہیں۔“ اس نے اپنی میز سے چند تصاویر اٹھا کر باری باری نجح صاحب اور پھر نیچے پر اسکیوٹر کی مہر رکھیں۔

”اس لحاظ سے جب کسی شخص کو ایسی زمین پر گھسیتا جائے تو اس کی کمر پر گڑ کے نشان یا کپڑوں کا پھٹنا، یا بزرگ مائل دھبے ہونا ناکام ہوتا ہے، مگر میڈیم یوگر پورٹ کے مطابق مقتول کے جسم پر ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔“ پر اسکیوٹر کھڑا ہونے لگا مگر وہ اوپنجی آواز میں بو لے کی ”اور اس سے پہلے کہ پر اسکیوٹر صاحب اعتراض کریں، 1990 میں جشن عامر ملک نے سردار لطیف کھوسے کے کلاشت صابر وغیرہ کی اہلی اس لئے منظور کی تھی کہ اگر اس نے مبینہ طور پر لاش کو گھسیتا تھا تو لاش پر بزرگ مائل دھبے یا گڑ کے نشان کیوں نہیں تھے؟ اس نجح منٹ کی،“ میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ناظم صاحب کے بیان میں جھوٹ ہے۔ اور لاش کو دلوگوں نے اٹھا کر کار میں ڈالا تھا، اور وہ دلوگ شریک جرم تھے۔“

”اوکے اب کا انسٹرل testify کر رہی ہیں۔“ زمر اسے نظر انداز کیے نجح صاحب کے سامنے آ کر یوں۔

”یور آر زجھے مزید کوئی سوال نہیں کرنا لیکن میں گواہ کوئی کراس کرنے کا حق محفوظ رکھتا چاہتی ہوں۔“ (پر اسکیوٹر کے تاثرات ہے چینی سے بگڑے) اور یور آر زا اگر اس دوران ناظم صاحب جیل توڑ کر کسی دوسرے ملک فرار ہو گئے تو عدالت کو ان کی گواہی خارج کرنی،“ اسکیوٹر صاحب کو اس گواہ کو give up کرنا پڑے گا۔“ اب وہ دونوں ایک ساتھ بولنے لگے تھے اور درمیان میں نجح صاحب بھی ناہلی سے کچھ کہنے جا رہے تھے۔

فارس نے ایسے میں مڑ کر احمد کو دیکھا جو کسی سوچ میں گم گلتا تھا۔

”میں پھر کہہ رہا ہوں،“ کار دار زکی جا بچھوڑ دو۔ خاور کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسرے کو اپنارائٹ ہینڈ نہیں بنائیں گے۔“  
”خادر نہیں ہے اب۔“ وہ ہلکا سابلاؤ فارس نے ایک دم چونک کرا سے دیکھا۔  
”کیوں کلدھر گیا وہ؟“ وہ تیزی سے سیدھا ہوا۔

”معلوم نہیں۔ نوکری سے نکال دیا ہے اسے یا خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے۔“ احرس منے دیکھنے لگا۔ فارس نے ہونٹ سکیز کر سانس خارج کی اور واپس چیچھے کو ہوا۔

”کچھ معلوم ہے کیوں؟ وہ تو ان کا قابل اعتبار آدمی تھا۔“ سرسری سا پوچھا۔

”نو آئیڈیا۔“ احرس نے شانے اپکائے۔ ایک مسکراہٹ فارس کے لبوں پر ابھر کر معدوم ہوئی۔ اتنے دن بعد سکون کا سانس نصیب ہوا تھا اسے۔ ایک نظر پر اسکیوں ٹرکی طرف دیکھا جو عددالت برخاست ہونے پا ب موبائل پر کوئی نمبر ملا تا تیزی سے باہر نکل رہا تھا۔

(کوشش کرتے رہو۔ مگر تمہیں پیسے دینے والا فون نہیں اٹھائے گا۔) وہ جب اٹھا تو مسکرا رہا تھا۔ (احر کچھ کہے بنا بہر نکل گیا تھا۔) زمر نے اپنی چیزیں سیستھے چونک کر اسے مسکراتے دیکھا۔ پھر آنکھیں سکیزیں۔

”ایسا کیا ہوا ہے جو میں نہیں جانتی؟“

”ارے نہیں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ ناظم کی طرف سے پریشان نہ ہو وہ جیل سے نہیں بھاگے گا۔“

”تمہیں کیسے پتہ؟“

”میں دیکھ لوں گا س معااملے مکو۔“

”بالکل نہیں۔“ قلم اٹھا کر سختی سے تنبیہ کی۔ ”تم کسی معاملے کو نہیں دیکھو گے۔ اور اگر تم نے کسی کو پھر جیل میں مارا پیٹا تو اچھا نہیں ہو گا۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ صبر اور قتل سے اس کے سامنے کھڑے اس نے پوچھا تھا۔

”اول، تم بالکل آرام اور سکون سے جیل میں رہو۔ کچھ نہ کرو، کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک شریف آدمی بن کر رہو۔ اور دوم۔ تم مجھے آپ کہا کرو۔“ اسے گھوڑ کرو ہے بلیخی کہ وہ اسی تابعداری سے بولا تھا۔

”جو تم کہو!“ زمر کے تو سر پر لگی تلووں پہ بچھی۔ ایہ ہیوں پتیزی سے گھومنی۔

”تمہیں پتہ ہے فارس اگر مجھ پر ایک قتل معاف ہوتا تو کس کو گولی مارتی؟“

”مجھے پتہ ہے۔“ وہ مسکرا کر ہلاکا سا اس کی طرف جھکا۔ ”تم خود کشی کرتی۔“ اور ایک طرف سے نکل کر سپاہیوں کی طرف بڑھ گیا جو اسے لینے آرہے تھے۔

اُف۔ اس نے نکل کر ڈھیروں غصہ اندر اتارتا تھا۔



ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پر بیٹھے ہیں ..... جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں  
یہ شاید اگلی رات کا قصہ ہے۔ اندھیرے اور دھنڈ میں ڈوبی انیکسی کی عمارت خاموش پڑی تھی۔ کچن میں دودھ اعلیٰ رکھا تھا، اور جنیں چوپھے کے آس پاس شہلی موبائل اسکرین پر انگلی پھیر رہی تھی۔ لمبا سویٹر پہننے پیروں میں مختلف رنگ کی جرا بیں جن سے انگوٹھے برہنہ ہو کر نکل رہے تھے، اور بالوں کو گول مول باندھے، وہ ایک بے ترتیب اور بھرے بھرے کچن کے اندر کھڑی تھی۔ سارے برتن دھلے تھے، مگر پھر بھی کچھ صاف نہ لگتا تھا۔ نجات کیوں؟

اسکرین کو دیکھتے اس کی آنکھیں پھیلیں۔ انگوٹھے اور انگلی سے اس سطر کو زدم کر کے بڑا کیا۔ بار بار پڑھا۔ ”نوشیر وال کاردار اور علیشا رہبیکا کاردار اب دوست ہیں؟“ فیس بک کی ایک پلک سی اطلاع کو وہ بار بار پڑھ رہی تھی۔ ہاشم کی پردفائل وزٹ کرنا چھوڑ چکی تھی، مگر باقی کاردار زکوود کبھی کبھی دیکھا ہی لیتی تھی۔

”مگر یہ دونوں دوست کیسے بن گئے؟“ اس نے دانتوں کے درمیان انگلی دبا کر سوچا۔ اچنچا سا اچنچا تھا۔ دل میں کھد بد ہوئی۔ ”آج ہی توفیق نے بتایا تھا کہ خاور اب یہاں جا ب نہیں کرتا، یعنی اگر میں اس پر ہیر و... مطلب پر لوز رکی پرو فائل ہیک کروں تو کسی کو نہیں پہنچا سکتے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ ایکسا پینڈھ ہو کر لیپ ناپ اٹھانے بھاگتی... سکس کی آواز کے ساتھ... دودھ اہل کر چوہلے پہ جا گرا۔

”اللہ میرے!“ وہ دہل کر پڑی اور جلدی سے چولہا بند کیا۔ ”پورے میں منٹ میں ادھر کھڑی رہی، مگر نہیں، تب نہیں، ابنا تھا اسے، اور ایک منٹ کے لئے فون اٹھا تو یہ گر گیا؟ میں کدھر جاؤں؟“ ڈوئی زور سے کاؤنٹر پر پڑھ کر وہ رو نے والی ہو رہی تھی۔ دفعتاً چوکھت میں زمر نمودار ہوئی۔ وہ اپنے لئے چائے بنانے آئی تھی شاید۔

”کیا ہوا؟“ اندر آتے تجب سے اس کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”حادث ہوا، قیامت ہوئی!“ وہ آنکھوں میں آنسو لئے غم اور غصے سے پلٹی۔

”میں.... میں خین یوسف... اب دس منٹ یہاں کھڑی ہو کر چولہا صاف کروں گی۔ اور پھر یہ فرش بھی۔ اس روز کتابیں لیں پڑھنے کے لئے، پینٹ خیریا تصویریں بنانے کے لئے، کہ آنکھ اور دل کو کیسے مصروف کروں مگر پڑھنے لگی تو فون نہیں ہوا۔ پینٹ کرنے لگی تو رنگ ہی ادھر ادھر بہنے لگے۔ اچھا ٹھیک ہے، نہ مجھے پڑھنے کا شوق ہے نہ آرٹسٹک ہوں۔ مجھے تو اجیختہ بنانا تھا، وہ بھی نہ بن سکی۔ ایم اے بھی نہیں کیا میں نے۔ آپ تائیں، کیا میں اتنی حیمنس لڑکی اس قابل تھی کہ یوں گھر میں ضائع ہوں؟ مجھے تو کپیوڑہ میکر بنانا تھا، آئی ٹی ایکسپرٹ، بڑے بڑے algorithms لکھتے تھے۔ مجھے لا نول روس، Felicity Smoak اور Huck کی طرح انگلیاں کھٹ کھٹ کر کے کپیوڑہ زکی دنیا پہ کھرانی کرنی تھی۔ اور کر کیا رہی ہوں میں؟“ دونوں ہاتھ بہاہا کر غصے اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بولے جا رہی تھی۔ ”میں یہاں پر برلن دھور رہی ہوں، چوبیوں کی گرل مانجھ رہی ہوں، با تھر روم صاف کر رہی ہوں، فرش اسکرپ کر رہی ہوں۔ جھاڑا اور ثاث لگا رہی ہوں۔ ارے نو کر انیاں کرتی ہیں یہ کام یا وہ پتی ورتا قسم کی یہو یاں جن کے پاس دنیا کا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا، نہ یہاں ہوتا ہے نہ ذہن ہوتا ہے، وہ کرتی ہیں ایسے کام۔ اور امی نے مجھے... مجھے ان کاموں پر لگا دیا ہے!“ وہ صدمے میں تھی۔ زمزحی سے سنتی رہی۔

”آئی ایم ڈن!“ دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے اعلان کیا۔ ”بہت بن پچھی میں ماں نہیں کرنے مجھے فارغ عورتوں والے کام۔“ پیر پڑھ کر آنسو پوچھتی، وہ دھپ دھپ لاؤنچ کی طرف بڑھ گئی، اور زمر، جس نے یہ ساری تقریر خاموشی سے سنبھالی، بس بلکی سی سانس لے کر بولی۔ ”تو پھر انداش ای پ اسٹیشن بھی بدل دو۔“

بیسٹ کی طرف جاتی خین رکی۔ مرکر بھیگی آنکھوں میں تجب بھرے اسے دیکھا۔ ”کیوں؟“

”کیونکہ جو آیت تم نے لگا کر ہے، اور حی ربک الی النحل، مجھے اس کا مطلب معلوم ہے۔“ وہ زمی سے کہتی، آستین موڑے چائے کی کیتیلی چوہلے پر رکھنے لگی۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

”یہی کہ.... سعدی کو اس آیت کے بارے میں بہت سے فلسفے آتے ہوں گے، مگر مجھے اس کا ایک ہی مطلب معلوم ہے۔ سادہ اور آسان سا مطلب کہ اللہ نے وحی کی شہد کی مکھی کی طرف، اور اسے کہا کہ وہ اپنا ”گھر“ بنائے..... اور.... وہ پھلوں پھلوں سے رس چو سے، یا آسان راستوں پر چلے، وہ یہ سب اس لئے کرتی ہے تا کہ اپنے گھر واپس آسکے، اور اپنے گھر کو میٹھے اور خوبصورت رنگوں سے بھر سکے۔ اور پھر اس ساری محنت کا جو نتیجہ نکلے گا، اس میں..... صرف اس میں شفا ہوگی..... تھمارے دل کی۔ کیونکہ دنیا کا سب سے زیادہ شفا بخش مشروب اس گھر میں بنتا ہے جو شہد کی مکھی کا گھر ہے۔ سب سے خوبصورت، سب سے زیادہ آر گنا نزد، لیکن آف کورس.....“ اس نے شانے اپکائے۔ ”یہ تو

بھاری ہے وہ سر..... جو پہنچتا ہے تاج!

ماہیوں، کم ذہن ہاوس وائپرو والے فضول کام ہیں، سوم اپنی شفناک تابوں اور پینٹنگز اور کمپیوٹر میں ڈھونڈو۔۔۔ ویسے بھی کل صداقت پس فیملی آجائے گا وہ اپنے سو..... تم پریشان نہیں ہو اور جا کر سوجاوا؟، کسی بھی ناراضی کے بغیر وہ اب مصروف سی دودھ کیتیلی میں انڈیل رہی تھی۔  
خیں ایک دم بالکل متھرا درسا کت کھڑی رہ گئی۔

زمر اسے چھوڑ کر چائے بنا کر اوپر آئی۔ اسامنہ درت والے کمرے میں ٹیب لئے بیٹھا کوئی گیم کھیل رہا تھا (اس کا چار جو صرف اس کمرے کے سوچ میں چلتا تھا) سو وہ اب اکیلی بیٹی کراون سے ٹیک لگائے، کمبل میں لٹپی، گھننوں پہ فائل رکھنے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔  
کپ ابھی آدھا ہوا تھا کہ موبائل بجا۔ اس نے چونک کردیکھا۔ غیر شناسنامہ۔ کان سے لگا کر مصروف اور مقاطسہ "ہیلو؟" کیا۔  
”السلام علیکم مسز زمر؟“ وہ مسکرا کر خوشگوار سے انداز میں بولا تھا تو زمر نے بے اختیار لگ سائیڈ پر کھا اور سیدھی ہوئی۔ بھوری آنکھوں میں حیرت ابھری۔

”ڈونٹ ٹیل می تم جیل تو زکر فرار ہو گئے ہو۔ اور اگر نہیں تو سیل فون کہاں سے ملا؟“

”ڈونٹ ٹیل می کہ تمہیں نہیں پتہ بیہاں کیا کیا مل جاتا ہے۔“ وہ رات کے اس پھر ایک تھاپڑی کوٹھڑی میں سلاخوں پہ ایک ہاتھ رکھ کھڑا دوسرا سے موبائل کان سے لگائے، مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ قدرے فاصلے پیچھا طسا پولیس الہکار ادھر ادھر دیکھتا پھرہ دے رہا تھا۔  
”اچھا اور کیا مل جاتا ہے؟“ اس نے مسکرا کر فائل پرے رکھی اور ایک انگلی پہ عادتاً ٹکٹکریاں لٹ پیٹتے گویا ہوئی۔  
”تم سن کر جیلس ہو گئے۔“

”آ، میرا اسٹینڈرڈ اتنا نہیں گرا کہ میں جیل میں خفیہ طور پر لاکی جانے والی لڑکیوں سے جیلس ہوں۔ ویسے کوئی خاص کام تھا کیا جو تم اپنی کسی دوست کو چھوڑ کر مجھے فون کر رہے ہو؟“  
”اس تنقیح اللہ۔ مذاق کر رہا تھا۔“ وہ خفا ہوا۔

”میں سیر کیس تھی! لٹ انگلی پہ لپیٹتے اس نے شانے اچکائے۔

”اچھا کام تو کوئی نہیں تھا۔ یوہ بھی خیریت پوچھنا چاہ رہا تھا۔“

”ہم ٹھیک ہیں، مزے میں ہیں۔“ پھر وہ ذرا اداس ہوئی۔ ”سعدی نہیں ہے بس!“

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا۔ ”ایک زمانے میں، میں اسی طرح سعدی کو کال کیا کرتا تھا۔“ کچھ یاد کر کے اداسی سے مسکرا یا۔  
”تم ہمیشہ سے ایک دنبر انسان تھے۔“

وہ ہلکا ساہنسا۔ زمر کچھ کہنے لگی مگر کھکھا ہوا۔ وہ چونکی۔ کھڑکی کے باہر بالکوئی کی تھی جل رہی تھی، وہاں کوئی سایہ سا تھا۔

”آ....“ وہ گردن اوپنجی کر کے دیکھنے لگی۔ فارس بھی ٹھہرا۔ ”کیا ہوا؟“

”بالکوئی میں کوئی ہے۔“ وہ ذرا آگے کوہوئی تو دیکھا، وہ شام کا کتابخا جو غالباً بالکوئی کی یہ ورنی سیڑھیاں چڑھ کر دہاں آئی تھا۔ وہ پرسکون ہی ہو کر واپس ٹیک لگاتی بتانے ہی لگی تھی کہ.....

”کیا مطلب؟ کون ہے باہر؟ تم اکیلی ہو؟ باقی سب کہاں ہیں؟“ وہ ایک دم اتنی تیزی اور پریشانی سے بولا تھا کہ زمر کتھے کتھے رک گئی۔ پھر اس کی آنکھیں چکیں۔ مسکراہٹ دبائے ذرا دیر کورکی۔ ”ہاں... میں اکیلی ہی ہوں.... لیکن... معلوم نہیں کون ہے۔ کوئی سایہ ہی ہے...“

”کدھر ہے؟ تمہیں وہ نظر آ رہا ہے؟ کھڑکی بند ہے؟“

”ہاں... اب نظر آ رہا ہے۔“ رک رک کر فکر مندی سے بتانے لگی۔ ”لباساً سانولاسا۔ کلرڈ آنکھیں ہیں۔“

”کھڑکی بند ہے؟“ وہ تمیزی سے بولا تھا۔

اس نے کھڑکی کی بند کنڈی کو دیکھا۔ ”نہیں تو۔“ اسی فکر مندی سے سر ہلا�ا۔

”رات کے اس وقت کھڑکیاں دروازے کھول کر پیشے ہوتی لوگ؟“

کتاب شیشے پر پنجے مارنے لگا تھا۔ وہ تنہائی کا شکار لگتا تھا۔

”فارس.... اب وہ کھڑکی پر کچھ مار رہا ہے۔“

اور جیل میں قید فارس غازی کو ایک دم سر چکرا تھی محسوس ہوا تھا۔ غصہ بے بی۔ اس کا دماغ سننا اٹھا تھا۔ ”تم فوراً اس کمرے سے نکلو اور یੱچے اپنے ابو کے کمرے میں جاؤ۔ حینیں! اسماء کو بھی وہیں بلاو اور کرہ لاک کر لؤ فوراً۔ پھر پولیس کو کال کر دیکھا میں ایک نمبر دیتا ہوں، ادھر کال کرو۔ اور ہاں.... دراز میں میری گن ہو گئی اسے نکالو۔ زمرت میری بات سن رہی ہو۔“ وہ اتنا پریشان تھا اور وہ کچھ بول ہی نہیں رہتی تھی۔

”میں نہیں باہر جا رہی، میں کوئی ڈرتی تھوڑی ہوں۔“ مسکرا ہٹ دبا کر آواز کو سنجیدہ رکھے بولی۔

”زمر میں کھڑرہا ہوں کمرے سے نکلو!“ وہ غصے سے بولا تھا۔ باہر کھڑے الہکار نے اسے اشارہ کیا۔ مگر اس وقت وہ کچھ اور نہیں سن پا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کو کاردار ز کے اتنا قریب چھوڑ آیا تھا.... وہ کیا کرے؟“

”میں کیوں نکلوں؟ میں یہی سب کچھ ڈیز رو کرتی ہوں نا۔ تم نے کہا تھا نا اس رات ریسوار انٹ میں..... کہ تم مجھے اس طرح دیکھنا

چاہتے

ہو..... اور.....“

”میں لعنت بھیجتا ہوں اس رات پر اور.....“ وہ دبادبا سا چلایا تھا۔ مگر اسی لمحے اسماء دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ایک دم حیرت سے بولا۔ ”پھر ہو..... یہ ہاشم بھائی کا کتنا۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟“

زمر نے گڑبردا کراس کو دیکھا اور پھر فون کو۔ دوسری طرف وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہوا تھا۔ زمر نے (اف) آنکھیں میچ لیں۔

”سمیم کیا کھڑرہا ہے؟“ وہ ذرا رک کر بولا۔

”پپ..... پپ نہیں.....“ خفت سے بولی اور ساتھ ہی غصے اور خفگی سے اسماء کو گھورا۔

فارس نے ایک طویل سانس کھینچی۔ تنے اعصاب ڈھیلے کیے۔

”باہر..... کتا ہے؟ صرف کتا؟“ ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا۔ اسماء!“ فون غصے سے اس کی طرف بڑھا یا۔ ”ماموں کا فون ہے۔ بات کرو۔“

”ہیں سچی؟“ وہ خوشی سے آگے بڑھا۔ پھر فون لیتے ہوئے زمر کے تاثرات دیکھ کر مسکرا ہٹ سکتی۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ خفگی سے کچھ بڑدا کر کمل تانے لیت گئی۔ اسماء نے حیرت سے فون کا ان سے لگایا۔

”ماموں؟“

”ذر اپنی پچھوکو فون دوا!“ اسے شدید تاو آیا تھا۔

اتی آواز تو زمر کو بھی سنائی دی تھی، جبھی کروٹ کیے بولی۔ ”میں سوگنی ہوں۔“

”وہ کھڑرہی ہیں وہ سوگنی ہیں۔“ اس نے اطلاع دی پھر پر جوش سبات کرنے لگا۔ ”آپ کیسے ہیں؟ ہم آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔ حنہ..... حنہ.....“ ساتھ ہی آواز دیتا ہوا یੱچے بھاگا تھا۔

”اُف۔“ آنکھیں موندے وہ سخت نغا تھی۔

فون کس نے سنا، کب بند ہوا، کچھ معلوم نہیں۔ خنین اس کے ساتھ آ کر لیٹی تو اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔ حدا دا اسی سے بند فون اس کے ساتھ رکھ رہی تھی۔

”سوری، میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔“ وہ چت لیٹی آز روگی سے چھٹ کو دیکھتے کہہ رہی تھی۔ ”ایسے موقعوں پر ہماری بہت یاد آتا ہے۔ اگر وہ ہوتا تو ایسے آسان لفظوں میں میرے ہر مسئلے کا حل بتا کر مجھے پر سکون کر دیتا۔ پتہ ہے.....“ بکھی کچھی کہتا تھا، حنہ کبھی مجھے بہت سا وقت ملے تو میں ایک کتاب لکھوں گا قرآن پر۔ میں نے پوچھا، تفسیر لکھو گے؟ کہتا، میں کیسے تفسیر لکھ سکتا ہوں؟ بہت تقاضہ موجود ہیں پلے سے ہی۔ میں صرف قرآن پر غور و فکر کر کے آیات سے ملنے والے اس باق کو لکھنا چاہوں گا، کہ میں نے اس آیت سے کیا سیکھا، کیا سمجھا۔ میں اسے ذرا تی تھی، کہ بھائی، فتوے الگ جائیں گے، لوگ کہیں گے آپ کو قرآن پر کچھ لکھنے کی اجازت کس نے دی؟ الہیت کیا ہے آپ کی۔ تو وہ نہ کہتا، ان لوگوں سے کہنا ہد، مجھے نہ ان کی اجازت کی ضرورت ہے، نہ مجھے ان کے فتووں سے فرق پڑتا ہے۔ مجھے قرآن پر غور و فکر کرنے کا حق اللہ نے دیا ہے، مجھے نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی تاکید اللہ نے کی ہے۔ کوئی پیر، کوئی عالم، کوئی پروفیسر مجھ سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔ میں اہل قرآن ہوں۔ ہم اللہ کا کنبہ ہیں۔ ہم اللہ کے مد دگار ہیں۔ ہم تو بھائی ڈنکے کی چوٹ پر قرآن عام لوگوں تک، عام ہاتھوں تک پھیلا میں گے عام اور سادہ زبان میں۔ ہاں جس دن ہمارے اوپھی دستاروں والے اور لمبے لمبے ناموں والے معزز علماء کرام، جس دن وہ گاڑھی اردو اور مشکل اصطلاحات میں بیان دینا اور کرتا ہیں لکھنا چھوڑ دیں گے، اس دن میرے کچھ بھی لکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن جب تک وہ قرآن کو عام نہیں کریں گے، میں تو ایسا کچھ ضرور لکھوں گا۔ کیونکہ جس نے مجھے سکھایا ہے، مجھے اس علم کا حق ادا کرنا ہے نہیں تو میری پوچھ دوسروں سے زیادہ ہو گی۔“

”تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو؟“

”کیونکہ جب ہم چھوٹے تھے تو سنتے تھے، حافظ قرآن کے والدین کے سر پر قیامت کے دن سونے کا تاج پہنایا جائے گا۔ بات یہ

ہے زمر، کہ اس تاج کے لیے ہم اپنے بچوں کو قرآن تو یاد کروادیتے ہیں مگر یہ یہوں جاتے ہیں کہ یہ تاج بہت بھاری ہے۔“

”خنین....“ اس کا دل دکھا، ایک دم اٹھنے لگی مگر حد نے کروٹ بدل لی۔

”ابھی مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ مجھے فی الحال مدد کی ضرورت ہے، مگر نہ آپ سے، نہ بھائی سے، نہ ہی کتاب والے شش سے۔ مجھے ان کی مدد چاہیے جنہوں نے میرے سر پر یہ تاج رکھا تھا۔ مجھے ان کو ڈھونڈتا ہے۔“ کروٹ لیے، اس کی آوازم ہو گئی۔ زمر خاموشی سے واپس لیٹ گئی۔

اور دور پاپ..... سمندر پاپ..... کرہ عجمن میں زنجیروں میں جکڑے قیدی کے سامنے، ریس بیجوں کے بل بیٹھا چند تصاویر زمین پر رکھ رہا تھا۔

”یہ تمہارا بیٹا ہے اور یہ تمہاری بیوی اور ماں۔ ان کو خاور صرف ای میل کر کے ایک نامعلوم مقام پر ایک نامعلوم گھر میں شفت ہونے کے لئے کہتا ہے اور کل وہ شفت ہو بھی گئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا وہ کہاں ہیں، سوائے ہاشم کاردار کے۔ تم ان کی خیریت چاہتے ہو تو اعتراض جرم کر لاؤ رہ نہ ہم سے اب کچھ بعید نہیں۔“

وہ کہہ رہا تھا اور خاور خاموش مگر سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔



میں جان بوجھ کر انجان بن رہا ہوں اگر ..... معاملات میں مجھ سے نہ ہو شیاری کر! کرہ ملاقات خالی تھا سوائے اس وجہہ اور مصروف ملاقاتی کے جو میز کے پار بیٹھا، تاگ پٹانگ جائے بار بار کلائی پہ بندھی قیمتی

گھڑی دیکھ رہا تھا۔ پورے کمرے میں اس کے پر فیوم کی مہک رچ بس گئی تھی۔

فارس غازی چوکھت پہ نمودار ہوا تو بے زار بیٹھے ہاشم نے نگاہیں اٹھائیں، پھر خود بھی گھڑا ہوا۔ مصافی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ”بیلو فارس!“

”تمہارا شکر یہ کہ تمہیں بالآخر میرا پیغام مل گیا۔“ وہ از لی بے نیاز انداز میں کہتا اس سے ہاتھ ملا کر کری کھینچ کر بیٹھا۔ ہاشم بھی کوٹ کا بنن کھولتے ہوئے سامنے بیٹھا۔

”ہاں میں مصروف تھا۔ زمر سے تمہاری خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔“ ذرا توقف کیا۔ ”سوری پہلے نہیں آ سکا!“ ہلکے سے ابرو اچکائے۔ فارس نے جوابناک سے کمھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ ملایا۔

”میں نے خاور کو دو تین دفعہ پیغام بھجوایا تھا، کوئی دو ماہ پہلے مسلکے کی نوعیت سے بھی آگاہ کیا تھا، کیا اس نے نہیں بتایا؟“ دونوں ہاتھ میز پر کھلے، آگے ہو کر بیٹھتے، فارس نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

ہاشم اس کے بر عکس نیک لگا کر ایک بازو کری کی پشت پھیلائے بیٹھا تھا، ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ”اس نے بتایا تھا، میرے ہی ذہن سے نکل گیا۔ کہو، کیا بات تھی؟ کوئی فناشل پر ابلم.....“

”اوہ ہوں۔“ وہ رکا۔ پھر ہاشم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”دو ماہ پہلے..... عدالت میں..... میرے پاس الیاس فاطمی آیا تھا۔“

”کون الیاس فاطمی؟“ ہاشم نے لاعلمی سے ابرو اٹھایا۔ البتہ فارس نے دیکھا، کری کی پشت پھیلے اس کے ہاتھ کی انگلیاں اندر کو مڑیں۔ یعنی کہ وہ چونکا تھا مگر چہرے سے ظاہر نہیں تھا۔

”وارث کا پاس۔ جس پر مجھے شک تھا کہ اس نے وارث کو مر دیا ہے۔“

”اوہ لیں لیں! فاطمی۔ نیب ڈائیریکٹر۔ آئی سی۔ تو کیا تمہاری اس سے بات ہوئی؟“ عام سے لجھ میں سوال کیا۔

”ہاں۔ کچھ دیر کے لئے۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تعادن کرنے کے لئے تیار ہے۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ میں باری باری اپنے ہر دشمن سے انتقام لے رہا ہوں۔ سو وہ نہیں چاہتا کہ اس کی باری بھی آئے۔“

”اے اچانک سے تم سے خوف کیوں محسوس ہونے لگا ہے؟“

”ہاشم!“ وہ قدرے قریب ہوا۔ ”میں تمہیں بالکل پسند نہیں کرتا، نہ تم مجھے پسند کرتے ہو، مگر چونکہ یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے، تو تمہیں بھی بتا دیتا ہوں۔“ اس نے گھری سانس لی۔ ”ڈاکٹر ایمن میری سایکا ٹرست تھی، اس نے کورٹ میں میرے خلاف گواہی دی تھی۔ میں نے اس کا ہاپسٹل جلا دیا۔“

ہاشم نے ابرو اٹھایا اور کری کی پشت سے بازو ہٹا کر قدرے آگے کو ہوا۔ چہرے پر حریت بھری مسکراہٹ ابھری۔ ”ڈونٹ ٹیل می!“

”لیکن جنس سکندر کی ویڈیو میں نے لیک نہیں کی تھی۔ میرا اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہے، اس نے مجھے بری کیا تھا۔ مگر فاطمی کا خیال ہے کہ میں اس کے پیچھے بھی آؤں گا، اس لئے وہ مجھ سے تعادن کرنا چاہتا تھا، تاکہ میں اس کو اور اس کے خاندان کو چھوڑ دوں۔“

”کیسا تعادن؟“

”اس نے کہا، وہ مجھے اس شخص کا نام بتانے کو تیار ہے جس کے ہاتھوں اس نے وارث غازی کا سودا کیا تھا۔“

”ڈیس گذ۔ تمہیں اس سے معلومات لئی چاہیے تھیں۔“ ہاشم نے خوشی کا اظہار کیا۔

”اس نے تمہارا نام لیا۔ کہا کہ تم نے مر دیا ہے وارث کو۔“ اسی بے نیازی سے ہاشم کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ہاشم کی انگلیاں زور سے اندر کو مڑیں، مگر چہرے پر تاثرات دیتے ہی رہے۔ پہلے اس نے دونوں ابرو اٹھائے اور پھر ایک دم بنس پڑا۔ ”لائیک سیر یکسلی؟“

”روکا بھی کہانی باقی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تم اور مسز جواہرات منی لانڈر گک کر رہے تھے۔ پشاور میں کسی دہشت گرد گروپ کے لئے کوئی میٹنگز وغیرہ تھیں؟ ان کا ریکارڈ وارث غازی کوبل گیا تھا۔“

ہاشم نے ہستے ہوئے فنی میں سر ہلایا۔ ”اوکے اکے..... تو میں منی لانڈر کے ساتھ قاتل بھی ہوں۔ سو.... یہ گفتگو کس طرف جا رہی ہے؟ مطلب سیر یکسلی.... تمہیں یقین آگیا؟“ فارس ایک دم بے زار ہوا۔

”اگر مجھے یقین آیا ہوتا تو کیا میں یہاں بیٹھا تھیں یہ سب بتا رہا ہوتا؟“

”تو تمہیں یقین کیوں نہیں آیا؟ ہو سلتا ہے وہ سچ بول رہا ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے محظوظ لگ رہا تھا۔

”کیونکہ میں عرصے پہلے نیب کے وہ سارے ریفرینسز چیک کر چکا ہوں جو تمہارے خلاف دائر تھے، وہ سب کرپشن کیسز تھے اور مجھے یقین ہے تم ان سب میں ملوث ہو۔ (ہاشم نے مسکرا کر اب اب تھا میں سر کو ختم دیا۔) مگر وہاں منی لانڈر گک کا کوئی کیس نہیں تھا۔ دوسرا بات وہ مجھ سے تعاون نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ مجھے اپنے ہی خاندان سے لڑا کر کمزور کرنا چاہتا ہے۔ دیکھو میرے تمہارے بہت جھگڑے ہوں گے، مگر ہم ایک خاندان ہیں۔ اس لئے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔“

”شیور۔ تباہ۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ اب اپنا سیت سے کہتا آگے کو ہوا۔

”الیاس فاطمی کا ایک بھائی ہے، وہ کشم میں ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہی وارث کا قاتل ہے۔ بالواسطہ یا بالواسطہ۔ تم اس کو چیک کرو۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے فاطمی جانے سے پہلے اپنے بھائی کو پہچانے کے لئے مجھے کسی دوسری طرف لگانا چاہتا ہے۔“

”جانے سے پہلے؟“ پہلی دفعہ ہاشم کے ابر حقیقی حیرت سے بھچے۔

”ہاں، اس نے کچھ کہا تھا جانے کے بارے میں۔ وہ اپنی بیٹی کو یا شاید فیملی کو باہر سیٹل کر رہا ہے۔ اسے دیکھ کر میرا خون اتنا مل رہا تھا کہ اس کی آدمی بات میں نے دھیان سے سنی ہی نہیں۔“ سر جھٹک کر وہ جیسے پھر سے غصے میں آنے لگا تھا۔

”اوکے ریلیکس۔ میں تحقیق کروانے کی کوشش کرتا ہوں، مگر مجھے یا تمہیں فاطمی جیسے لوگوں کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کے الزامات سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟“ شانے اچکا کروہ اسی طرح کی چند مزید نرم سی باتیں کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا البتہ جب وہ جانے کے لیے مڑا تو اس کی آنکھوں میں شدید خختی در آئی تھی اور انگلیاں زور سے اندر کو پھی ہوئی تھیں۔

اس کے جاتے ہی زمر اندر آئی تھی۔ جیران، متجب، مشکوک۔

”آج تو تم سے ملاقات ناممکن ہوئی تھی۔“ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے وہ شدید ابحصن کا شکار تھی۔ ”یہ ہاشم کیوں آیا تھام سے ملنے؟“

”میں نے بلا یا تھا۔“

”کیوں؟ کیا بات کرنی تھی؟“ زمر نے پتیاں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

”یہی کہ اس کا کتنا بہت آوارہ ہوتا جا رہا ہے، اور وہ میری طرف..... ہماری طرف آگیا تھا۔ اسے اتنا کہا ہے کہ اپنے کتنے کا خیال رکھے۔“

زمر نے ڈھنائی سے شانے اچکائے۔ ”کتنا ہی تھا، آگیا تو کیا ہوا؟ اتنی سی بات کے لئے اسے کیوں بلا یا؟“

”وہ بکا سامسکرا یا۔“ کیونکہ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہماری طرف آیا ہے، مگر وہ اس کا پال تو کرتا ہے زمزدہ اسے جلد یاد ری ضرور بتائے گا ہر بات۔ سو میں نے سوچا کہ میں پہلے بتا دوں۔“

زمر مخلوق نظر وہ سے اسے دیکھنے لگی۔ ”مجھے تمہاری بات پر یقین کیوں نہیں آ رہا؟“

”اوہ کم آن!“ وہ حیران ہوا۔ ”تم نے خود ہی تو کہا تھا، کچھ نہ کرو شریف بن کر رہو تو میں اس لئے آرام سے بیٹھا ہوں، کچھ بھی نہیں کر رہا۔“ بہت ہی سادگی سے اپنے خالی ہاتھ دکھائے۔

زمر نے جھر جھری لے کر سر جھکا۔ وہ واقعی شرافت اور سادگی کے ساتھ آرام سے بیٹھا تھا۔ وہ واقعی کچھ نہیں کر رہا تھا۔ اس کو فارس پر اعتبار کرنا چاہیے۔

❖❖❖

جو ہو سکے تو محبت کی پاسداری کر ..... مرا جو رنگ ہے اس میں قبول کر مجھ کو پرم فضاؤں کی سرزی میں پودہ تہہ خانے میں بنے کمرے خاموش تھے۔ سعدی یوسف اپنی استاذی نہیں پہ بیٹھا، قرآن کھولے ساتھ جرنل پر قلم سے کچھ لکھے جا رہا تھا۔ اب وہ پڑھتے ہوئے ساتھ میں لکھتا بھی تھا۔ یہاں وقت ہی وقت تھا، فراغت ہی فراغت تھی۔

”میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی دھنکارے ہوئے شیطان سے۔“ تعود پڑھ کر اس نے مطلوبہ جگہ سے انہل کھوئی اور گرد تر چھپی کر کے بیٹھا، آیات صفحے پا اتارنے لگا۔ سیاہی شرث میں ملبوس بیٹھا، وہ لکھتے ہوئے بالکل منہک اور مصروف دکھائی دیتا تھا۔

”اور رب بیٹگ ہم نے بھیجا قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو۔ کعبادت کرو اللہ کی۔ تو دفتار وہ دو فریق تھے جو باہم جھگڑ رہے تھے۔“

قلم بلوں میں دبائے چند لمحوں کو اس نے سوچا، پھر تیز تیز قلم صفحے پر چلانے لگا۔

”جب کوئی ہمارے پاس اللہ کی بات لے کر آتا ہے، تو مجھے یہ سمجھنیں آتا اللہ تعالیٰ کہ ہم اسی سے بھگڑنا کیوں شروع کر دیتے ہیں؟ ہم فوراً اس کا فرقہ، اس کا عقیدہ، اس کا خاندان اس سب کو زیر بحث کیوں لے آتے ہیں؟ نہیں مانی بات، نہ مانو۔ مگر ہم اسی قوم کیوں بنتے جا رہے ہیں جو برائی پھیلانے والوں کو تو قوی وی کے آگے جم کر بیٹھا کر دیکھتی ہے، مگر نیکی کا حکم دینے والوں پر فوراً سے فتوے لگادیتی ہے؟ اور مجھے یہ کبھی سمجھنیں آیا کہ قوم ثمود، قوم عاد اور قوم لوط ..... بار بار ان کا ذکر کیوں آ جاتا ہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ان کے ناموں اور ان پر اترے عذابوں کو کس اپ کر جاتا ہوں۔ یہ پورا قرآن پڑھ کر بھی مجھے یاد نہیں ہو پائے۔ ان کو یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔“

لکھتے بھر کر کر اس نے پھر سے وہی آیت پڑھی۔ ذہن میں آگئی کے کتنے ہی درکھلنے لگے۔ معانی منکش ہونے لگے۔

”اللہ تعالیٰ آپ نے فرمایا، کہ ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی، کو بھیجا۔ ثمود کے لوگوں کا بھائی صالح! یعنی اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے پاس ان کے جیسے ہی کسی بندے کو سمجھتے ہیں۔ اس میں بھی انہی جیسی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں تاکہ لوگ اس سے relate کر سکیں، مگر نہیں، ہمیں تو بملغ کے نام پر فرشتہ چاہیے ہوتا ہے۔ پہلے زمانوں کے لوگ بھی یہی کہتے تھے، اللہ نے فرشتہ کیوں نہیں اتارا؟ اب بھی یہی کہتے ہیں۔ اس عالم، اس مبلغ میں فرشتوں والی خصوصیات کیوں نہیں ہیں؟“ پھر سر جھک کر آگئی آیت پڑھی۔

”کہا (صالح) نے اے میری قوم، کیوں تم برائی کو بھلائی سے پہلے مانگنے میں جلدی کر رہے ہو؟ کیوں نہیں تم اللہ سے بخشش مانگتے تاکہ تم پر حکم کیا جائے؟“ وہ بکا سامسکرا یا اور پھر اسی طرح لکھنے لگا۔

”اللہ تعالیٰ۔ مجھے اس آیت کو پڑھ کر ہمیشہ یہ لگا ہے کہ انسان اپنی دعاوں سے بچانا جاتا ہے۔ بے اختیاری میں منہ سے نکلی دعائیں

اندر کی شکمیش کی عکاس ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں لوگ فوراً قیامت مانگ لیتے تھے، کہ بھی نازل کرو فرشتہ اور برابر کرو حساب۔ آج کل کے لوگ خود ہی بچ میٹھ ہو کر سارے حساب کتاب پورے کر دیتے ہیں۔ مبلغ کو بھی کثیرے میں لاکھڑا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خود ہی بچ، یوری اور جلا دین کر دین والوں کا فیصلہ نہادیں۔ اطاعت نہ کرنے کے بھی کتنے بہانے ہیں انسانوں کے پاس!

ذرا دریکو قلم والا ہا تھر روا کا۔ درمیانی انگلی کے اوپری پورے میں درد سا ہونے لگا تھا۔ writer's ache۔ لکھنا کتنا مشکل کام تھا!

پھر لمحے کے آرام کے بعد آگے پڑھنے لگا۔

”ان لوگوں نے کہا، ہم براشگون لیتے ہیں تم سے اور ان سے جو تمہارے ساتھ ہیں۔ کہا ( صالح نے) تمہارا شگون اللہ کے پاس

ہے بلکہ تم ایک گروہ ہو جو آزمائے جارہے ہو۔“

”عربی کتنی دلچسپ زبان ہے اللہ تعالیٰ۔“ وہ مسکراتے ہوئے تیز تیز قلم چلا رہا تھا۔ ”شگون کے لئے طائر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ طائر کہتے ہیں پرندے کو۔ اہل عرب پرندوں سے فال لیا کرتے تھے۔ سو شہود والے صالح علیہ السلام کو یہ بتا رہے ہیں کہ ہمیں تو تم سے ”بری لیلگ“ آتی ہے، اور تمہارے ساتھ والے مومنین سے بھی۔ یہ انسان کی ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ جب آپ کو کسی کی بات نہیں مانی تو تو اس کو اور اس کے ساتھ موجود تمام ہم خیال لوگوں کو لیل کر دو۔ ان کو کوئی بھی نام دے دو۔ سکیور، ماذرن قسم کے لوگ ایسے مبلغین کو

”قدامت پسند، دقیانوی، شدت پسند“ کہتے ہیں۔ اور دین والے جن کی عادت ہوتی ہے دوسرا دین والوں کی ناگ کھینچنا، وہ ان کو ”کم علم، کم عقل، گناہگار، ناپاک“ اور ایسے ہر اس لقب سے پکارتے ہیں جن میں کہنے والے کی پاکیزگی کی نمائش ہو، اور بے چارے مبلغ کی تذلیل ہو۔ بہانے۔ سب بہانے ہیں۔ کہ بس کسی طرح حق بات مانے سے فوج جاؤ۔ اس وقت ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ تو محض ایک آزمائش ہے۔ ہم خدا نہیں ہیں، پھر خدا کی طرح لوگوں کو جو کیوں کرنے لگتے ہیں؟ ہم خود فرشتے نہیں ہیں، پھر فرشتوں کی طرح لوگوں کے گناہوں اور خامیوں کا حساب کتاب کیوں رکھتے ہیں؟“

سفید صفحہ دھیرے دھیرے سیاہ ہو رہا تھا۔ اسے لگا آج وہ تلخ باتیں سوچ رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ خود بھی تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ خاور

ٹھیک کہتا تھا۔ وہ اپنی معصومیت کھوتا جا رہا تھا۔

اوہر قرآن فرمارہا تھا۔ ”اور تھے شہر میں نو گروہ۔ وہ فساد کرتے تھے زمین میں اور نہیں کرتے تھے وہ اصلاح۔ کہا انہوں نے کھاڑ قدم اللہ کی، البتہ ہم ضرور رات کو اس (صالح) اور اس کے گھر والوں پر حملہ کریں گے، اور پھر بعد میں ہم اس کے سر پرست سے کہیں گے کہ نہیں تھے ہم موجود اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت (اس جگہ پا) اور بے شک ہم ہی پچے ہیں۔“

”نو گروہ؟ سجنان اللہ۔“ وہ مسکرا کر لکھنے لگا۔ ”کہہ میں بھی نو بڑے قبائل تھے۔ اور اسی طرح انہوں نے بھی ہمارے بی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چال چلی تھی، کہ رات کو ہم وہ ناپاک کام کر لیں گے اور سچ معموم بن جائیں گے۔ آج کل کے مبلغین کے لیے بھی لوگ چالیں چلا کرتے ہیں، مگر لوگوں کو ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ ”فساد“ پھیلانے والے وہی ہوتے ہیں جو خود کسی کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ خیر، دلچسپ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، کہ وہ بھی آپ کے نام کی قسم اخبار ہے تھے۔ آج بھی لوگ آپ کا نام لے کر، جہاد کا نام لے کر، بے گناہ مسلمانوں اور بے گناہ غیر مسلموں کا قتل عام کرتے ہیں۔ اور دنیا بھر کا میڈیا یا کہتا ہے، یہ مسلمان ہیں۔ اگر اللہ کا نام لینے سے کوئی مسلمان ہو جاتا تو صالح علیہ السلام کے دشمن کیوں مسلمان نہ تھے؟ ایسے نہیں ہو جاتا کوئی مسلمان۔ یہ نام مسلمان ہمارے باپ اور ایہم علیہ السلام نے رکھا تھا اور اس کو ”پانے“ کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اللہ کے لئے لڑنے والے اور اللہ کا نام لے کر اپنے مذموم مقاصد کے لئے لڑنے

والے برا بر نہیں ہوتے۔“

لفظ سیاہ جگنگاتے ہیروں کی طرح دودھیا کاغذ پر بکھرے تھے اور وہ دھیرے دھیرے گویا مزید لگنے پر وہ بھاٹا۔

”اور انہوں نے چلی ایک چال۔ اور ہم نے کی ایک تدھیر۔ اور وہ شعور نہیں رکھتے تھے، پس دیکھو کس طرح انجمام ہوا ان کی چال کا۔

بے شک ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو، اور ان کی قوم سب کے سب کو!“

”استغفار اللہ!“ اس نے جھر جھری لی اور پھر سے قلم کاغذ پر رگڑنے لگا۔ ”اور انہیاء ایسے لوگوں کی چالوں سے نہیں ڈرا کرتے کیوں کو وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ ہر اس چیز سے برا ہے جس سے انسان خوف کھاتا ہے۔ جبرا میل علیہ السلام کی ایک حق آئی اور پھر زرزہ آیا۔ اور وہ ساری قوم تباہ ہو گئی۔“ لکھتے لکھتے اس نے قرآن کے جگنگاتے مگر اس کر دینے والے حروف کو دیکھا۔ وہ کہر ہے تھے۔

”تو یہ ہیں ان کے گھر... خالی گرے ہوئے بوجہ اسکے جو انہوں نے ظلم کیا۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے اس قوم کے لئے جو علم رکھتی ہے۔ اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جو (گناہوں سے) بچتے رہے۔“

سعدی نے چند لمحے کے لئے آنکھیں بند کیں۔ ایک دم قلم خالی ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح بند آنکھوں کے ساتھ لوگوں سے بڑھانے لگا۔ ”وہ علاقے.... وہ تباہ حالی بستیاں آج بھی زمین پر موجود ہیں.... شمود اور عاد کے علاقے..... بالکل بخرا اور ویران۔“ کتنی ہی دفعہ سائنسدان ان علاقوں کی مٹی اٹھا کر اپنی لیب میں لے کر آئے کہ ایسا کیا ہے اس مٹی میں جو یہ مردہ ہے، یہاں کوئی چیز نہیں اگتی؟ مگر ہوا کیا۔ اس مٹی سے تاکباری شعائیں نکلتی ہیں۔ اس پر تجوہ کرنے والے سائنسدان لیب میں کام کرنے والے ملازم تک کینسر کا شکار ہو گئے۔ جس بھی جگروہ مٹی رکھی جاتی، وہ اس جگہ کو گلانے اور جلانے لگتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں، وہ مٹی زہریلی ہے، میں کہتا ہوں، یہ گناہ تھے، جو انسان کو ہی نہیں اسکے خاندان اسکے ملک حتیٰ کہ اس کی مٹی کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ مگر ہم لوگ عبرت نہیں پکڑتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے فرمایا کرتے تھے کہ ان علاقوں سے تیزی سے گزر جایا کر دیا پھر روتے ہوئے گزر اکرو، مگر ہم لوگ..... ہم جاہل لوگ مونہجود اڑا اور ہڑ پہ جا کر اسکوں ٹرپ کے ساتھ پکن ملتے ہیں! تباہ حال بستیوں اور رکندرات، چاہے ان کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو، ان پر سے دیے گزرنا چاہیے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ ان پر تحقیق کرنا، ان کو اسٹڈی کرنا الگ بات ہے، مگر سیر اور پکنک کے لئے ان جگہوں پہ جانا.... مسلمانوں کو اندازہ ہی نہیں کہ وہ کتنے ہولناک کام کتنی آسانی سے کر جاتے ہیں۔“

اور جس وقت وہ ساری دنیا سے بے نیاز لکھے جا رہا تھا، اس سے سینکڑوں ہزاروں میل دور، اپنے آفس میں مرکزی سیٹ پر بیٹھی جواہرات، مسکرا کر سامنے کھڑے جبشی صورت اور براق سفید دانتوں والے فصح (ہارون عبید کے ملازم خاص) کو دیکھ رہی تھی جو باتھ پاندھے کھڑا اطلاع دے رہا تھا۔

”آپ کے کہنے پر ہم نے سعدی یوسف کو کریل خاور سے ملاقات کی اجازت دے دی ہے۔ ہارون صاحب، میرے اور آپ کے درمیان ہی رہے گی یہ بات۔“

”گذ!“ وہ پورے دل سے مسکرائی۔ گھونے والی کرسی کو ذرا سا گھمایا۔

”خاور کی زنجیریں کھوں دو، اسے سعدی کے ساتھ گھلنے ملنے دو۔ وہ دونوں ہمارے لئے بے کار ہیں، میرا بیٹا یہ بات نہیں سمجھ رہا، اسلئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود کوئی قدم اٹھائیں کیوں نہ یہ میرا تجوہ کہتا ہے وہ دونوں فرار کا سوچ رہے ہوں گے۔“

”لیں میم!“ اس نے سر کو خم دیا۔ ”ہم ان کی باتیں تو نہیں سن سکتے لیکن وہ بھی پلان کر رہے ہوں گے۔“

”مگر ہو سکتا ہے فصح کے کسی دن خاور، سعدی کو قتل کر دے اور پھر خود کشی کر لے۔“  
فضح کے ابر و تجہ سے بھیجے۔ ”مگر وہ ایسا کیوں کرے گا؟“

”تم کرو گے فصح؟“ وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر اٹھی اور شیرین جیسی سفاک آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانا کا۔ ”اور اتنی صفائی سے کرو۔“ ایک رات یہ سب کہ اگلی صبح ان دونوں کی لاشیں ملنے کے بعد تم یہ کہہ سکو گے کہ تم تو اس جگہ تھے ہی نہیں۔ میرے بیٹے کو خبر بھی نہیں ہو گی۔“  
”یہ سب آپ لوگوں کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا، مگر ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ میں ویسا ہی کروں گا جیسا آپ کہہ رہی ہیں!“ پلکیں  
مرا لاغھاتے ہوئے اس نے تائید کی۔

اس کے جانے کے بعد جواہرات نے کرسی کی پشت سے سڑکا کیا اور مسکراتے ہوئے چھت پر لٹکتے، جھملاتے فانوس کو دیکھا۔  
زندگی ایک دم کتنی خوبصورت لگنے لگی تھی۔

اس کا بھاری سر ہر بوجہ سے آزاد تھا!



باب 19:

## حق دفاع از خویشتن

ایک قانون ایسا ہے  
جونیں ہے کہیں لکھا ہوا  
گریقش ہے ہمارے دلوں پر!

وہ قانون جو نہیں نہیں ملا  
تر بیت، روانج یا کتابوں سے،  
بلکہ اس کو اخذ اور جذب کیا ہے ہم نے  
عین فطرت سے!

وہ قانون جو ہم تک نہیں پہنچا تھیوری سے  
بلکہ پہنچا ہے عمل سے۔

ہمیں نہیں دیا گیا وہ احکام کے ذریعے  
بلکہ سیکھا ہے ہم نے اسے الہام کے ذریعے!  
میں بات کر رہا ہوں اس قانون کی

جو کہتا ہے کہ

اگر ہماری جان کو خطرہ لاقن ہو  
سازشوں سے،

تشدید سے،

مسلح حملہ آوروں سے،

یادمنوں سے،

تو کوئی بھی طریقہ

اور ہر طریقہ جو ہم استعمال کریں  
اپنے دفاع کے لیے

وہ ہوتا ہے اخلاقی طور پر  
درست اور جائز!

(Marcus Tullius Cicero)

جیل کے احاطے میں صبح کی دھنڈ پھیلی تھی۔ قیدی بیدار ہوئے ادھر ادھر ٹھیل رہے تھے۔ ایسے میں وہ اپنے میڑس کے کنارے چپ ٹھاپ اکڑوں بیٹھا تھا۔ جیز کے اوپر سفید کرتا پہنے، دودن کی بڑھی شیو والے چہرے کے ساتھ، خاموش آنکھوں کو ہاتھوں پہ جائے بیٹھا، وہ الگیوں پر مسلسل ربر بڑیں لپیٹ رہا تھا۔ آنکھوں میں گہری مایوسی مگر صبر بسا تھا۔ فاختا کوئی اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتا ساتھ آبیٹھا۔ فارس نے پوچھ کر نکلے بناءز راسی گروں موڑی۔ وہ سکھوں کی سی داڑھی مونچھ والا آتش تھا۔ مسکرا کر اس کو کہنے لگا۔

”پریشان ہو غازی؟“

”نہ ہوں؟“ اس نے بے زاری سے سر جھکنا۔

”توبہ ہر چلا جائے گا یار، فکر نہ کر۔ وہ کیا لکھا ہوتا ہے قانون کی کتابوں میں؟ ملزم قانون کی پسندیدہ اولاد ہوتا ہے۔ قانون میں سارے فائدے اسی کو ملتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر ناک سے کھٹکی اڑائی۔ فارس نے جواب نہیں دیا۔ ربر بڑیں کو جیز سے الگیوں پر باندھتا، گھولتا رہا۔

”ایک زمانے میں تو، بہت نمازیں پڑھتا تھا غازی۔“

”اب بھی پڑھتا ہوں۔ کچھ دن پڑھی۔ کچھ دن چوڑی۔“ کندھے جھنک کر کہتے، اس کی نگاہیں ربر بڑیں پر بھی تھیں۔

”عادت کیوں نہیں بناتا؟“

”نہیں بتی۔ کچھ دن دل زندہ رہتا ہے۔ پھر بفتے گزر جاتے ہیں اور میں مردہ دل لیے پھرتا ہوں۔“ استہزا یہ سر جھنک کر اب وہ تیز تیز بڑیں کو الگیوں پر لپیٹ رہا تھا۔

”میں بھی عید کے عید پڑھتا ہوں ویسے تو نماز لیکن....“ آتش کھنکھار کر اس کے قریب نیک لگا کر بیٹھا اور سوچتی نظر وہنے سے چھٹ کو دیکھنے لگا۔ ”ایمان میرا مضبوط ہے۔ پہلے دن کی طرح۔“

فارس نے اس بات پر تیغ مسکرا ہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ ”دیکھو کون کہہ رہا ہے۔“ آتش اور آتش کی تاریخ سے کوئی نہیں واقع تھا، مگر وہ قسم تم پھر کبھی سنو گے۔

”چ کہہ رہا ہوں۔ تیرا ایمان خدا پر کمزور ہے۔“

”مجھے اب یقین نہیں آتا آتش کہ کوئی خدا ہے بھی یا نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے انگلی پہ مدل دربل لپیٹتے بولا تھا۔ انگلی کسی گئی تھی۔ خون رک میا تھا۔ آدمی انگلی سرخ اور آدمی سفید پڑنے لگی تھی۔

”ہیں؟“ وہ چونکا۔

”اگر خدا ہوتا تو کوئی میرے بھائی کو یوں قتل نہ کرتا، میری بے گناہ بیوی کو نہ مارتا۔ میرے چار سال جیل میں ضائع نہ ہوتے۔ مجھے اب یقین نہیں رہا کہ کوئی خدا ہے بھی یا یہ صرف لوگوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے بنائے گئے مذاہب ہیں۔“ وہ تیخی سے بول رہا تھا۔ آتش نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جس کا ذر تھا وہ قریب میں ہی بیٹھا تھا۔ ”مولوی۔“ وہ داڑھی والا نوجوان جو پچھے ماہ سے ادھر قید تھا، وہیں بیٹھا سنجیدگی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ آتش داڑھی کھجاتے ہوئے اس کے قریب کھکا۔

”آہستہ بول۔ نیا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔“

اس بات پر فارس نے نظر انہا کردا۔ میں با میں دیکھا اور اس نوجوان کو اپنی طرف متوجہ پایا۔

”ہاں بھی، کوئی مسئلہ ہے تمہیں؟“ تیوری چڑھا کر وہ اسے گھوکر بولا تھا۔ اس نوجوان نے گھری سانس لی۔

”پرانی کہانی ہے، مگر سنادیتا ہوں۔ ایک مومن شخص ایک جام کے پاس بال بنوانے آیا تو...“ وہ متوازن لمحہ میں، فارس کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہنے لگا۔ ”تو جام نے اس سے کہا، مجھے نہیں یقین کہ کوئی خدا جو درکھتا ہے، اگر وہ ہوتا تو اتنے بھوکے بیمار، اور دکھی لاگی ایسے بے بُکی کی زندگی نہ گزارہ ہے ہوتے۔ مومن سن کر چپ رہا، لیکن جب وہ باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ گلی میں چند ہپی پھر رہے ہیں۔ بے تعاہ بڑھی ہوئی داڑھی موچھے اور الجھے گندے بالوں والے لوگ۔ وہ فوراً اندر واپس آیا اور جام سے بولا۔ ”میرا نہیں خیال کہ اس دنیا میں کوئی جام ہے۔“ جام نے حیرت سے پوچھا۔ ”مجھے بال بنوانے کے باوجود بھی تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟“ تو مومن آدمی نے کہا، اگر کوئی جام ہنا تو گلی میں گندے بالوں اور بڑھی ہوئی شیوادا لے لوگ نہ پھر رہے ہوتے۔ اس بات پر جام نے کہا...“ نوجوان سانس لینے کو رکا۔ ”کہ وہ لوگ اس لیے اس حال میں نہیں ہیں کہ اس شہر میں کوئی جام نہیں ہے، بلکہ وہ اس حالت میں اس لیے ہیں کیونکہ..... وہ میرے پاس نہیں آتے۔“ متناہ سے بات مکمل کر کے نوجوان اٹھ گیا۔ آتش کھیانا سا ہنسا۔

”یہ مولوی بڑی سیانی بتیں کرتا ہے۔“ مگر فارس نہیں ہنسا۔ خاموش، سپاٹ نظروں سے اپنی آدمی سرخ، آدمی سفید انگلی کو دیکھتا ہوئے اس نے رہبینڈ زور سے تیخ کر توڑ دیا۔ انگلی آزاد ہو گئی۔ خون کا راستہ کھل گیا۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

❖❖❖

یہ دکھ ہے اس کا کوئی ایک ذہب تو ہوتا نہیں ..... ابھی امّہ ہی رہا تھا کہ جی ٹھہر بھی گیا  
وہ ایک دھنڈ میں لپٹی اتوار کی صبح تھی۔ جہاں شہر ابھی تک سستی اور نیند میں ڈوبتا تھا، وہاں قصر کا ردادر اندر سے سینٹرل ہائینگ سٹم میں گرماش میں بسا، مکمل طور پر بیدار تھا۔ ملازم مستعدی سے ادھر ادھر پھرتے کام پیٹا رہے تھے۔ کنٹرول روم میں احر کافی کے گے سے گھنٹا  
بھرتا، کمپیوٹر پر کھلا کھٹ کچھ نہ اپ کر رہا تھا۔ جیز پر ہلکا سویٹر پہننے، ہیر کے باوجود ناک سرخ ہو رہی تھی۔ ہاشم اپنے کمرے میں صوفے پر نیم دراز، چیر میز پر رکھ کر ساتھ پہنچی سونیا سے مکرا کر کچھ کہرا تھا اور جام تیز تیز بلوتی چکتی آنکھوں سے اسے کوئی قصد نہ رہی تھی۔

ایسے میں نو شیر وال کے کمرے میں بستر خالی تھا۔ لحاف آدھا بیٹھ پہ آدھا زمین پر لٹک رہا تھا۔ عرصہ ہوا وہ دیر سے اٹھنا چھوڑ چکا تھا۔ نینہ اب دیسے مہربان نہیں ہوتی تھی۔ وہ الماری کے سامنے زمین پر چوکڑی ڈال کر بیٹھا تھا، اور گھنٹوں پر فوٹو ال بم کھو لے آہستہ آہستہ صفحے پلٹ رہا تھا۔  
رف سے ٹراویز اور نیلی ٹی شرٹ میں ملبوس اس کے سپاگس بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر دیرانی پھی۔

وہ ہاشم کے دیسے کی تصویریں تھیں۔ سفید لباس میں دہن بنی شہری کو دیکھ کر دل میں کوئی جذبہ نہ جا گا فتنا ایک تصویر پر وہ رکا۔ آنکھیں سکریں۔ وہ اور انگریز کے گلے گلے رہا تھا۔ فوٹو گرافرنے ایک ایک لمحہ گویا عکس بند کیا تھا۔ اور انگریز قدرے جیران تھے اور شیر و کی آنکھیں نہ تھیں۔ اوپر رینگ پر ہاتھ رکھے جواہرات اور سعدی کھڑے تھے۔ جواہرات کا سرخ لباس... وہ اس سرخ رنگ میں اٹک گیا۔ ایک دم جیسے سرخ پانی میں سعدی کے اوپر بہنے لگا۔ پھر اور انگریز کے اوپر۔ شیر و کے ہاتھ تک سرخ مانع سے بھیکتے گئے۔

اس نے ال بم پھینکا اور تیزی سے ہاتھ جھاڑے۔ وہ صاف تھے۔ ال بم صاف تھی۔ کوئی خون نہیں، کوئی نمی نہیں۔ وہ آنکھیں مساتا آہستہ سے بیڈ کی طرف واپس آیا اور بیٹھتے ہوئے سر ہاتھوں میں گرالیا۔ پھر موبائل اٹھایا اور فیس بک ابنا کس کھول کر ”علیشا ر بیکا کاردار“ کا کلک کیا۔

”سوری ہو؟“ (جاننا تھا اس کی رات گھری ہو گئی۔)

”نہیں۔ پڑھائی کر رہی تھی۔“ وہ کچھ دیر ٹھہری۔ ”تم کیا کر رہے ہو؟“

”میں ڈیڈ کی پرانی تصاویر دیکھ رہا تھا۔ تمہیں وہ یاد نہیں آتے علیشا؟“

”میراں سے بھی کوئی قلبی تعلق نہیں تھا۔“

شیر و کار دل بری طرح دکھا۔ وہ خاموشی سے اسکرین کو دیکھے گیا۔ پچھدیر بعد علیشا کا پیغام چکا۔ ”میں اندر سے ہمیشہ ان کی توجہ کی طلب گاری ہوں۔ اکثر خواب میں دیکھتی ہوں کہ وہ زندہ ہو گئے ہیں، اور وہ جوان کے مرنے کی خبر سنی تھی وہ جھوٹ تھی۔“

”میں بھی!“ اس نے لکھتے ہوئے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ پھر پچھدیر سوچتارہ۔

”کھڑ گئے؟ اگر بات یونہی ادھوری چھوڑ دیتی ہوتی ہے ہرات تو مجھے سچ کیوں کرتے ہو؟“ وہ خفا ہوئی تھی۔

”میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ تمہارا حق ہے کہ تم جانو!“ ایک فیصلہ کر کے وہ لکھ رہا تھا۔

شیر و کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکو تو سامنے دھنڈلکوں کے پار انیسی کھڑکی تھی۔ فارس کے کمرے کی کھڑکی سے نیک لگائے نہیں فرش پہنچتی تھی۔ چھوٹا کمبل اپنے اوپر پھیلائے، موٹگ پھلی کھاتے ہوئے لیپ ناپ گود میں رکھے، آج عرصے بعد وہ فراغت سے پہنچیں اکھائی دے رہی تھی۔ (نیچے اسی اور صداقت نے کچن سنبھال رکھا تھا۔ صداقت یوں کوئی کوئی الحال گاؤں چھوڑ کر اداہ آگیا تھا۔)

جنین کے قریب زمر کری پہ نیک لگا کر پہنچی، قلم لبوں میں دبائے سوچ میں گم تھی۔ اس کے کھلے گنگریا لے بال کرسی کی پشت سے نیچے گر رہے تھے اور چھت پہ جمی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔

”یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔“ ایک نیچ پہنچ کر اس نے چہرہ سیدھا کیا اور کرسی حنہ کی طرف گھمائی۔

”ہوں!“ حنہ سے بغیر غور سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”قرال الدین کا قتل اس رات نہیں ہوا۔ خاور کو جب علم ہوا کہ فارس اس رات پکھ کر چکا ہے تو اس نے اگلی صبح قral الدین کو مردا یا، اور اکٹر اور گاؤں کو خرید کر موت کا وقت بدل دیا۔ لاش تو اگلی دوپہر ہی ملی تھی نا۔ تم کیا کر رہی ہو؟“ آخر میں الجھ کرا برو پہنچ۔ جواب نہ آیا تو وہ اگلی اور حنہ کے ساتھ نیچے کار پٹ پہنچی۔

”نوشیر وال۔ علیشا...؟ یہ کیا ہے؟“ اس نے چونک کر حنہ کا چہرہ دیکھا۔

”وہ۔ میں نے شیر و بھائی کا کاؤنٹ Phishing کے ذریعے ہیک کیا ہے... اور... اب اس لوزر کے میسچر پڑھ رہی ہوں!“ پھر حنہ کے تاثرات دیکھے۔ ”ایسے مت دیکھیں! ان کا علیشا سے رابطہ حال ہو گیا ہے، مجھے وجہ جانتی ہے!“

”جنین، ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم کا دراز کے نیت ورک کو نہیں چھیڑیں گے۔“ زمر سنجیدہ تھی۔

”مگر اب خاور نہیں ہے، تو درکس کا؟“ زمر، بہت پکھ کہنے لگی تھی پھر گردن موڑ کر دھنڈ میں ڈوبے قصر کو دیکھا۔ ”ویسے یہ خاور گیا کہاں؟ عرصے سے نظر نہیں آیا۔“ خاور کا ذکر کرتے ہوئے اس کی ٹون سرد ہو جاتی تھی، جیسے ہاشم کے لیے ہوتی تھی۔ سرداور بے رحم۔ مگر اسے ان لوگوں سے وہ نفرت نہیں محسوس ہوتی تھی جو فارس غازی سے ایک زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ وہ اس کے اپنے نہیں تھے۔ وہ غیر تھے اور فارس سب کچھ تھا، وہ بس غیر نہیں تھا۔

”اوہ گاڑا! یہ پڑھیں۔“ جنین تیزی سے سیدھی ہو کر پہنچی۔ زمر چونک کر اسکرین کو دیکھنے لگی۔

نوشیر وال: ”تمہارا حق ہے کہ تم یہ بات جانو۔“

علیشا: ”کیا؟“

نوشیر وال: ”ڈیڈ... ہمارے ڈیڈ کو قتل کیا گیا تھا۔“ (زمر کے ابر و تجب سے اٹھے۔ حنہ کا بکا تھی۔)

علیشا: ”واٹ؟ مگر... کیسے؟ ہاشم نے تو کہا تھا کہ ان کی موت با تھرودم میں گرنے کے باعث ہوئی تھی۔“

نوشیر وال: ”ہم سب کو بھی پتہ چلا ہے۔ ان فیکٹ دو ماہ پہلے۔“  
علیشا: ”کیا معلوم ہوا ہے؟ کس نے قتل کیا ہے ان کو؟“  
نوشیر وال: ”ہمارے ہی سکیورٹی چیف نے۔“ (حمد نے منہ پا تھر کھا۔)  
اسی پل بجلی چلی گئی اور وائی فائی آف ہو گیا۔ پیغامات کا راستہ رک گیا۔ حمد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”وہ سب سے اتنے کا،“  
”میرا بہت خیال کرتے تھے! بہت زیادہ۔“

زمر نے ہلکی سی جھبر جھری لی۔ ”سکیورٹی چیف یعنی خاور نے؟“

حمد نے ناک سکوڑ کر آنکھیں رگڑیں۔ ”دوسروں کے ساتھ جو کرتے تھے وہ خود اپنے ساتھ بھی ہو گیا۔ اسی لئے انہوں نے خا...  
نکال دیا۔“ مگر زمر بے چین ہو گئی تھی۔ خاور بھلا کیسے؟  
”یہ دنیا کتنی کریزی ہے؟ اودھ خین۔ تھارا کیا ہو گا؟“ حمد بڑھاتے ہوئے چیزیں سیستہ رہی تھی۔ زمر نے چہرہ اٹھا کر  
دیکھا۔ اس کی اورنگزیب صاحب سے ایک ڈھنی وابستگی تھی اور اب وہ ڈسٹر ب نظر آ رہی تھی۔ مگر زمر کو اس بات کو ہضم کرنے کے لیے پہم ادا  
چاہیے تھا۔ خاور ایسا کیسے؟ اور وہ کہاں گیا؟

.....♦♦♦.....

تمام عمر تعلق سے مخفف بھی رہے۔ تمام عمر اسی کو مگر بچایا ہے  
ہارون عبید کی رہائشگاہ پر بھی اتوار کا خمار چھایا تھا۔ پیش فرنچس سے آراستہ لاوٹ خاموش پڑا تھا۔ سڑھیوں کے اوپر۔۔۔ کروں۔۔۔  
سامنے بنے فرش پر آبدار کلائی پر گھری باندھتی چلتی آ رہی تھی۔ زر دلباس پر سرخ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے، وہ ابرو اکٹھے کیے قدر۔۔۔ نماں  
تھی۔

دفعتاً اسٹرڈی کے سامنے وہ ٹھہر کر رکی۔ اچنہ بھے سے دروازے کو دیکھا جوڑ راس کھلا تھا۔ اندر سے مدھم با توں کی آواز آ رہی تھی  
آبی خاموشی سے دروازے کے قریب آئی اور درز سے اندر جھانکا۔ اسٹرڈی نیبل کی کرسی پر بیٹھے ہارون کی پشت دکھائی دے۔۔۔  
تھی۔ وہ سامنے کھڑے جبھی صورتِ فصح سے مخاطب تھے اور فصح اس طرح کھڑا تھا کہ آبی کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر درز میں۔۔۔  
جھائکتی آبی کو دیکھا اور پھر بنا کی تاش روپ چہرے پر لائے ہارون سے کہنے لگا۔

”میں کام کی بات کی طرف آتا ہوں۔“ آواز دربلند کر لی۔ وہ جیسے آبی کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

”مسز جواہرات چاہتی ہیں کہ میں خاور اور سعدی یوسف دونوں کو قتل کر دوں ایسے جیسے سعدی کو خادر نے قتل کر کے خود کشی کر لی۔“  
ہاشم کو علم نہ ہو، کیونکہ ان کی اس لڑکے کے ساتھ ای موٹھل اچھ منٹ ہے۔“

”ہوں!“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”کچھ معلوم ہوا کہ خادر کو کیوں قید کیا گیا ہے؟“

آبی نے سانس روکے چہرہ مزید آگے گر لیا۔ (ہامان؟)

”نبیں سر۔ اس نے رقم میں غبن کیا ہے، یہی بتایا تھا ہاشم صاحب نے۔ اس سے تفیش کرنے صرف رئیس جاتا ہے۔ میر۔۔۔“  
اندر ہونے والی گفتگو سے علم ہیں۔“

آبی الجھن سے لب کاٹنے لگی۔ (سعدی نے کیسے؟)

”اوہ مسز کاردار چاہتی ہیں کہ ہم ان دونوں کو ختم کروادیں؟“

”جس سر، کیونکہ لڑکا بے کار ہے اس پر اتنا پیسہ خرچ کرنے کا فائدہ نہیں۔ اور ہا خاور تو ہم دو ماہ سے اس پر بھی خرچ کیے جا رہے ہیں۔“

ہاشم کا ردار کے پاس اپنی کتنی ہی جیلیں ہیں۔ مگر نہیں وہ چاہتے ہیں کہ صرف ہمارا پیسہ لگے۔ ”فصح شدید ناخوش تھا۔“  
”ہوں! تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ گھری سانس لے کر کہنے لگے۔ ”تم ان دونوں کو ختم کر دو۔ مگر آرام سے اور احتیاط سے۔ ہاشم کو نہیں پہچا چاہیے۔ مسز کا ردار کو ہماری مدد چاہیے تو ہم ان کی مدد کریں گے!“

آبی نے دکھ سے باپ کے سرکی پشت کو دیکھا اور پھر پرے ہٹ گئی۔

چند لمحوں بعد وہ لا و نخ کی میڑھیاں اتر رہی تھیں جب فصح پیچھے سے چلتا آیا۔  
”میم!“ آبی مڑی اور ایک چھپتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔

”آپ کیا کہتی ہیں؟“ آبی نے گھری سانس لے کر شانے اچکائے۔

”وہی جو تب کہا تھا جب تم نے بتایا تھا کہ مسز کا ردار نے رازداری سے تمہیں اپنے آفس بلا�ا ہے۔ میں نیوزل ہوں۔ جو تمہیں کہا جا رہا ہے، تم وہی کرو۔“

”اوکے!“ اس نے سر کو خم دیا۔

”مگر کیا تم نے وہ کیا ہے جو میں نے تمہیں کرنے کو کہا تھا؟“

فصح نے سر بلا کر اپنی نائی پگلی نائی پن اتاری جواندر کی طرف سے ننھے یواں بی پگ جیسی تھی، اور جیب سے دوسرا انکڑا انکال کر اس کے ساتھ جوڑا۔

”مسز کا ردار کا پورا حکم بمع ان کی دیئُد یوریکارڈ ہو چکا ہے۔ چونکہ ملاقات خوبی تھی! اسی لئے مجھے سکیو رٹی پر ڈوکول میں نہیں گزرنا پڑا! اگر گزرتا تب بھی میں یہ کام کر لیتا۔“ ادب سے اطلاع دی۔ ریڈر انیڈنگ بڑے اس نائی پن کیسرے کو با تھی میں لے کر دیکھا، پھر پر سوچ گر گھری نظر فصح پر ڈالی۔

”کیا اس کو معلوم ہے کہ فارس غازی جیل میں ہے؟“

”نہیں ہاشم کا ردار نے یہ براں سے چھپانے کا حکم دیا ہے۔“

”اوکے!“ وہ مسکرا کر زینے اترنے لگی۔ ”ہاشم کے احکامات مجھ پر لا گئنہیں ہوتے۔ یہ بات میں اسے خود بتا دوں گی۔“

”آپ؟“ وہ حیران ہوا۔ ”آپ نے دوبارہ اس سے کیوں ملتا ہے؟“

”کیا مطلب کیوں ملتا ہے؟ میں تم لوگوں کو وکیل کا نام دوں گی، بد لے میں وہ مجھے انٹرو یو دے گا۔ یہی ڈیل ہوئی تھی ناہماری؟ اس نے وکیل کا نام میرے کہنے پر دے دیا ہے، مگر میر انٹرو یو ابھی ادھار ہے۔ میں پچھہ کام مکمل کر لوں، پھر اس کے پاس جاؤں گی۔ تب تک اس کی موت کو نا لے رکھنا۔“ ایک مٹھی میں نائی پن دبائی اور دسرے ہاتھ سے کسی شاہزادی کی طرح اسے جانے کا اشارہ کیا۔ تخلیہ۔ اور وہ سر کو جھکا کر خم دیتا نیچے زینے اترتا گیا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

سحر ہوئی تو مرے گھر کو راکھ کر دے گا ..... وہ اک چراغ جسے رات بھر بچایا ہے  
کمرے میں نیم اندھیرا ساتھا۔ مدھم ناٹ بلب جل رہا تھا، اور سعدی آنکھوں پر بازو رکھے بستہ پر لیٹا تھا۔ اسندھی ٹیبل پر کانفوں کے پلندے عجیب بے ترتیبی پھیلائے دکھائی دیتے تھے۔ دفتار روازہ جبا۔ وہ آنکھوں سے بازو ہٹائے بنا نھیں سے اونچا سا بولا۔ ”میں نے منع کیا ہے نامیری کہ مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔ جان چھوڑ دواب!“ مگر دروازہ آہستہ سے کھل گیا اور پھر بند بھی ہو گیا۔ سعدی نے بازو ہٹایا اور اندھیرے میں پلکیں جھپکا کر دیکھا۔

چوکھت میں خاور کھڑا تھا۔ سعدی بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خاور و قدم قریب آیا تو چہرہ واضح ہوا۔ نیوں میں، زخمی چھرے اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ اسے گھور رہا تھا۔

”تم ادھر کیسے؟“ وہ بے اختیار جو کنا سا ایک قدم پیچھے ہٹا۔ گھٹنوں کی پشت بیڈ سے نکل رہی۔

”مجھے اس کپاڈ نہ میں کھلا پھرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ زنجیریں بھی کھول دی گئی ہیں۔ آج زخموں پر مرہم بھی لگایا گیا ہے، اور اچھا کھانا بھی ملا ہے۔“ موچھوں تے اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے محسوس بھی نہ ہوتے تھے اور آنکھیں سرخ انگارہ سی سعدی پر گزی تھیں۔

”گذرا! یعنی ہاشم کو تمہاری بے گناہی کا احساس ہو گیا اور اب تم رہا کر دیے جاؤ گے؟“ وہ محتاط سامزیداً میں طرف سر کا۔

”ڈر نہیں نپکے۔ میں تمہاری جان نہیں لوں گا۔ یہ کام ہاروں عبید کے آدمی کر دیں گے۔“

”دیکھو اگر تو یہ تمہاری کوئی گیم ہے، تو میں...“

”غور سے سنو بے وقوف!“ وہ آگے آیا اور اس کا کالر پکڑ کر اس کو جھکا دیا۔ ”یہم دونوں کو مارنے والے ہیں۔ میرا یہاں رہنا بے سود ہے، اور تمہیں یہاں مرنے دیا تو میری گواہی کون دے گا؟“

”ہاشم مجھے کبھی نہیں مارے گا۔“ اس نے ناگواری سے کالر چھڑایا۔

”ہا!“ وہ نہسا۔ ”ہاشم کا یہاں صرف ایک فادار آدمی تھا۔ میں! تمہارا شکر یہ اب یہاں ہاشم کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ اس لئے جس مقصد کے لیے تم نے مجھے اندر کر دیا ہے، میں وہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے ساتھ بھاگو گے یہاں سے؟“

”اچھا؟ تو تمہاری لاش کہاں ہے جس کے اوپر سے گزر کرم نے میری مدد کرنا تھی؟“ سعدی نے ادھر ادھر دیکھ کر جیسے کچھ تلاش کرنا چاہا۔ پھر طنزیہ سر جھکتا۔ ”میری آفرائیک پاڑ ہو چکی ہے، خاور۔“

”تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے نا۔“ خاور قریبی دیوار سے نیک لگائے اس کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”اور کیوں کروں میں بھروسہ؟ راتوں رات تم اتنے اچھے ہو گئے کہ میری جان بچانا چاہتے ہو؟“

”نہ میں اچھا ہوا ہوں نہ تمہاری جان بچانا چاہتا ہوں۔ نہ میں ہاشم کاردار کی طرح لفظوں کے بیہر پھر میں اچھا ہوں۔ میں نے اتنے سال ہاشم سے بھی صرف صاف بتیں ہی کہیں ہیں، صاف اور کھری۔ اس لئے تمہیں بھی اپنا پلان کھرا کھرا بتا دیتا ہوں۔“ جذبات سے عاری آواز میں وہ کھر رہا تھا۔ ”میں تمہیں لے کر ہاشم کے پاس جاؤ گا، تم میرے حق میں گواہی دو گے، اصل قاتل کا نام بتاؤ گے اور پھر میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔“

”واو۔“ سعدی کے ابر و ستائش سے اٹھے۔ ”مطلوب کر مجھ آخ میں مرنا ہی ہے تو میں یہاں کیوں نہ مروں؟“

”کیونکہ میرے ساتھ تم آزاد ہو گے، تمہارے پاس ایک فیصد چانس ہو گا۔ مجھ سے پیچھا چھڑا کر بھاگنے کا۔ تم یقیناً چانس لینا چاہو گے۔“

”اب مجھے تم سے امید نہیں رہی۔ ہاماں کو سولی تک لانا بے سود تھا۔“ کری کھنچ کر بیٹھا اور لیپ جلایا۔ کمرہ اچھا خاصار و شن ہو گیا۔ اب وہ منہ میں کچھ بڑا تھے اپنے کاغذ ترتیب سے رکھ رہا تھا۔

”میں نے ہاشم کو کبھی ڈاکٹر سارہ کے بارے میں نہیں بتایا۔“

سعدی کے ہاتھ ایک دم بخمد ہوئے۔ رگوں میں خون بھی جم گیا۔ اس نے چونک کر خاور کو دیکھا۔ وہ انہی سر دن تراٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔

”کیا مطلب؟“ سعدی کا دل زور سے دھڑ کا تھا۔

”اس رات جب نوشیر والا نے تم پر حملہ کیا تھا تو تم ڈاکٹر سارہ کے ساتھ تھے۔ تم نے متنی ڈیلیٹ کر دیے تو کیا ہوا؟ میں خاور اہل۔ کریں خاور مظاہر حیات۔ تمہارے میسچر ری کو کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اسی رات میں نے تمہارا اوٹس ایپ دوبارہ کھولا اور سب فی لوار کر لیا۔ مگر ہاشم کو نہیں بتایا۔“

سعدی نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”مگر تم غلطی کر گئے ہو۔ میں نے ڈاکٹر سارہ کو بلا یا ضرور تھا مگر وہ نہیں آسکی تھیں۔“

”تم اب پہلے سے بہتر جھوٹ بول لیتے ہو۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا، تم اپنی مخصوصیت کھوتے جا رہے ہو۔ سارہ نہ صرف دہاں آئی تھی بلکہ اسی نے پولیس کو بلا یا تھا۔ پریشان نہ ہو، میں نے ہاشم کو نہیں بتایا، نہ بتاؤں گا۔“

سعدی بے بسی بھری غصیل نگاہوں سے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اسے بھج نہیں آیا وہ اب کیا کہے۔

”اس لئے نہیں کہ میں ہاشم کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ بلکہ دو وجہات تھیں۔ پہلی، سارہ کبھی گواہی نہ دیتی۔ وہ خطرہ نہیں تھی۔ پھر بھی میں ایک روز اس سے ملا تھا۔ تمہاری گشادگی کے تیرے روز۔ اور میں نے اس کو اتنے اچھے طریقے سے دھمکایا (سعدی کی مٹھیاں بھیچن، چہرہ نہ ہوا)، اور یہ کہا کہ سعدی مر چکا ہے، اور اس کی بچپوں کی دھمکی بھی دی، ساتھ یہ تسلی بھی دی کہ ہاشم کو نہیں بتاؤں گا اس کا نام... کہ وہ کسی اپنے بھی بتانے کے قابل نہیں رہی۔ مجھے یقین ہے اس نے مجھ سے ملاقات کا تذکرہ اپنے فرشتوں سے بھی نہیں کیا ہو گا۔“ پھر بھری سانس لی۔ ”دوسری وجہ! میں چاہتا تھا ہاشم تمہیں مار دے، یوں ہر گواہ ختم ہو جاتا، لیکن اگر ہاشم کو یہ پتہ چلتا کہ ایک گواہ اور بھی ہے تو تمہیں مارنے کا لامدہ نہ ہوتا، اور وہ تمہیں چھوڑ دیتا۔ دونوں گواہوں کو ایک ساتھ مارنا داشمندی نہ تھی، ویسے بھی تم جو بھی سمجھو مجھے، میں ایک کمزور بے قصور عورت کو مارنے کے حق میں نہیں ہوں.... مجھے ایسے مت دیکھو۔ فارس کی بیوی نے ہماری باقی میں تھیں، اس کا قصور تھا، اور وہی اے کو بھی تو ہر معاملے میں ناگہ اڑانے کی عادت ہے بے قصور وہ بھی نہیں تھی سو....“

سعدی بھر کر آگے بڑھا اور ایک مکار کھڑکر اس کو لگایا، مگر خاور پھرتی سے با میں طرف کو ہوا، سعدی کا مکار دیوار پر لگا، اس سے پہلے کہ

وہ مرتا، خاور نے کمال تیزی سے اس کے دوںوں بازو پیچھے مروڑ کر اس کو دیوار سے لگایا اور اس کے کان میں غرایا۔

”تمہیں لڑنا نہیں آتا۔ تمہیں باتوں کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ ادھر منا ہے تو مرد۔ میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ ڈھونڈ لوں گا۔ لیکن اگر میرے ساتھ آتا ہے تو دو دن کے اندر اندر مجھے بتاو۔ میری آفر محبد و دمٹ کے لئے ہے۔“ وہ بازوؤں کے مرزوے جانے پر زور سے کراہ تھا۔ خاور نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا اور دروازہ کھولتا تیزی سے باہر گل گیا۔ سعدی اپنی دائیں کلائی پکڑئے لے کر اور بے بسی سے گھرے گھرے سانس لیتا وہیں دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ اس کے کان سرخ اور چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ پہلی دفعہ اسے اس قید نانے میں اپنا آپ غیر محفوظ لگا تھا۔

.....  
بدن کو برف بناتی ہوئی فضا میں بھی ..... یہ مجذہ ہے کہ دست ہنر بچایا ہے  
ایکسی کے کچن میں ناشتے کی اشتہا انگیز خوبصورتی تھی۔ صداقت بھاگ بھاگ کر سارے کام نپناتا پھر رہا تھا۔ شلوار قمیض کف والی ہاں رکھی تھی اور کوئی خوبصورتی لگا کر بھی تھی شاید۔

کچن کی گول میز پر دوپہر کے لئے سبزی کا مٹی ندرت نے نگاہیں اٹھا کر عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔ ”تمہارے گاؤں جانے میں اسی چار دن ہیں۔ ایسے بھاگ بھاگ کر کام کر رہے ہو جیسے شام کی رثین جھوٹنے والی ہو۔“

وہ شرمندہ ہو گیا۔ ”نہیں جی، میں تو سوچ رہا تھا کہ... سعدی بھائی ہوتے تو تکنی خوشی سے میری شادی میں شرکت کرتے۔“ جلدی سے ہات بنائی۔ پھر ندرت کی طرف پلاتا۔ ”پتہ ہے جی، میری گھر والی کے نانا بڑے اللہ والے ہیں، میں نے ان سے سعدی بھائی کے لیے دعا

کروالی تھی۔ وہ کہتے ہیں باجی کہ اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد آسانی کرنے والا ہے۔“

”اور اگر سعدی یہاں ہوتا تو پتہ ہے کیا کہتا؟“ سبزی کاشتے انہوں نے مسکرا کر سر جھکا۔ لمحے بھر کے لئے منظر بدلتا گیا۔ اردو گردیوں میں، فرنچیز، سب ڈھلتا گیا۔.....

چھوٹے بائیچے والے گھر کے لاونچ میں رات کے وقت بتیاں جلی تھیں۔ ٹی وی شورچاۓ بیٹھا تھا۔ ندرت ہاتھ میں ریموت پکڑے، اسامہ کو مسلسل خاموش رہنے کی تاکید کر رہی تھیں۔ ساتھ میں کتابوں کے آیزے سے نکیاں بنانا کر رہے تھے میں رکھتی جا رہی تھیں۔ اس آیزے کو جھکھنے کی جسارت کرنے والے اپنے تینوں بچوں کے ہاتھوں پہ باری باری ریموت مار کر ان کو پرے ہٹا چکی تھیں۔ (میری اولاد جمال بے جواہ بجے والے ذرائع کے دوران خاموش رہے۔ پورے دن کے کام کا ج کے بعد صرف ایک آنھ بجے والا ڈرامہ دیکھتی ہوں میں مگر نہیں۔ اتنا شور کرتے ہیں کہ حد نہیں۔) یہ الفاظ گالیوں اور لعن طعن سے سجا کروہ بار بار ڈانتھتے ہوئے دھر رہی تھیں۔ مگر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حسپتہ پر کر کے لیپٹاپ گھنٹوں پر کھے بیٹھی، ہیڈفون چڑھائے، کسی کورین آئیڈل کا شودیکھتی ہنسی جا رہی تھی۔ سیم اپنے ہوم ورک کی کتابیں پھیلائے مسلسل اوپنج آواز میں سعدی سے باتیں کر رہا تھا جو صوفے پہ پیر لبے کر کے لیٹا، کشن سر تلتے رکھے، موبائل پہ لگا تھا اور ساتھ ساتھ اسامہ کو جواب بھی دے رہا تھا۔

”ہاں تو مسئلہ کیا ہے؟ ایک سورۃ کا ترجیح یاد کرنے کو تو دیا ہے نیوشن ٹیچر نے۔ کرلو نا۔“

”بھائی، بھی ہماری عمر تو نہیں ہے ترجیح یاد کرنے والی۔“ وہ منہ میڑھا کر کے دہائی دے رہا تھا، غالباً کسی کلاس فیلو کی باتوں سے متأثر ہو کر کہہ رہا تھا۔ سعدی نے نظر اٹھا کر اسے ذرا سا گھوڑا، اور اسامہ نوراہل بل کر رہا تھا کہ نکالنے لگا۔

”اور ہم نے آپ کے لئے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔

پس بے شک تنگی کے بعد آسانی ہے۔

بے شک تنگی کے بعد آسانی ہے۔

تو جب آپ فارغ ہوں تو عبادت میں محنت کریں۔

اور اپنے رب کی طرف دل لگائیں۔“

سیم یاد کر رہا تھا۔ ندرت جوتا بھی نہیں اٹھا سکتی تھیں، کہ قرآن پڑھ رہا تھا، بس تملک کر کہنے لگیں۔ ”اندر جا کر پڑھ لو اسامہ۔ میرا ڈرامہ نکل رہا ہے۔“

مگر سعدی نے ایک دم چوک کر اسے دیکھا۔ ”تنگی کے بعد آسانی ہے؟ تم سورۃ الانشراح کی اس آیت کو صحیح نہیں پڑھ رہے۔“

اب کے اسامہ اور خود ندرت نے بھی رک کر اسے دیکھا تھا۔ حسین نے ہیڈفون کے باوجود سنا تھا، مگر بس سر جھٹک کر اسکرین کی طرف متوجہ رہی۔ (بس! اب شروع ہو اس عدی بھائی کا کوئی نیا فلسفہ۔)

”بھائی، یہ میرے پاس ترجیح میں لکھی ہوئی ہے۔“ سیم تو مانند کر گیا تھا۔ سعدی نے گھری سانس لے کر موبائل پرے رکھا اور انھوں بیٹھا۔ سنجیدگی سے ماں کو دیکھا (جو ادھی اس کی طرف باقی آدھی ٹوی کی طرف متوجہ تھیں۔)

”تنگی کے بعد آسانی ہے؟ یہاں اللہ نے نہیں فرمایا۔ ترجمہ غلط لکھا ہے۔ کچھ لوگ اس آیت کو نادانستگی میں غلط بولتے اور لکھتے ہیں۔“ ذرا سی سانس لے کر کہنے لگا۔ ”سورۃ الانشراح کی پانچویں آیت ہے، فَإِنْ مَعَ الْعُسْرِ يُرَا۔ پس بے شک تنگی کے ”ساتھ، آسانی ہے۔ بعد نہیں، ساتھ!“

ندرت ڈھیلی پڑیں۔ ”ہاں تو ایک ہی بات ہوئی نا۔“ ناک سے مکھی اڑائی۔ اور انھ کرٹی وی کے قریب والے صوفے پہ جا

بنیس۔ کبابوں کے آمیزے والی پرات اور خالی نرے بھی وہیں رکھ لی۔

”یہاں ایک بات نہیں ہے۔ ایک بات ہوتی تو یہاں اللہ ”مع“ (ساتھ) کے بجائے ”بعد“ کا لفظ استعمال کرتا، مگر اللہ کا قرآن اتنا پر فیکٹ ہے کہ حد نہیں۔ یہ دو آیات تو میری فیورٹ ہیں۔“

اور حسین یوسف نے (آف) کراہ کر رخ پورا موڑ لیا۔ سعدی نے مایوسی سے اسے دیکھا، اور پھر ماں کو جو نکلیاں بناتے ہوئے ہوئے وہی ایک تھیں، اور پھر سیم کی طرف چہرہ گھما یا، جو واقعی متوجہ تھا۔ چلو، کوئی ایک تو متوجہ تھا۔ سعدی کو حوصلہ ملا۔ اہل قرآن کو کوئی سنتا نہیں، ورنہ وہ تو ہل بول نہ تھکلیں۔

”یہ آیت اس سورۃ میں دو دفعہ آتی ہے۔ ایک ساتھ۔ یعنی دہرانی گئی ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے سیم یہ کیوں دہرانی گئی ہے؟“ دبے دبے ہوش سے وہ گھنگریا لے بالوں والا لڑکا مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میری مس کبھی تیں قرآن میں باقتوں کو.... زور دینے کے لئے دہرا جاتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔ تاکید کے لئے آیات دہرانی جاتی ہیں، مگر ان دو آیات کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ نہبہ دیں تمہیں پہلے یہ آیت سمجھاتا ہوں۔ فیان مع انقرض یُسرا۔“ فیان“ کا مطلب ہے ”پس بے شک“ یعنی جو بات آگے بتائی جا رہی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ ”مع“ کا طاب بے ”ساتھ۔“ شادی کا رد ز پڑھا ہوتا ہے نا۔“ بمع اہل و عیال،“ یعنی گھروالوں کے ”ساتھ“ آئیں۔ یہ دی ”مع“ ہے۔ تیرالفظ ”عسر“ بے یعنی ”تینگی“۔ پریشانی، مشکل، تکھن حالات۔ چوتھا لفظ ہے ”یسرا“، یعنی آسانی۔ فیان مع العسر یسرا۔ پس بے شک.... ساتھ ہے.... تینگی۔ آسانی۔ سمجھ آیا؟“

سیم نے اثبات میں سرہلا یا۔

”اوکے۔ اب دیکھو۔ اگلی ہی آیت میں پھر ان الفاظ کو دہرا جاتا ہے۔ ان مع العسر یسرا۔ بے شک ہر تینگی کے ساتھ آسانی ہے۔“ اس کا تھم۔ ہے نا؟ مگر نہیں۔ اللہ کا قرآن بہت امیزگ ہے۔“ درادیر کو مسکراہست دبا کر وقیدیا۔ حسین ہیڈون ان تارکر گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی تھی اور ندرت گو کہٹی وہی کوہی دیکھ رہی تھیں مگر آواز ہلکی کر دی تھی۔

”یہاں پر عربی زبان کا ایک دلچسپ اصول لا گو ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو اسم معرفہ، اسم نکرہ کا تو پتہ ہے نا؟ عام چیزیں نکرہ ہوتی ہیں، جیسے لا، شہر، میnar۔ مگر خاص چیزیں معرفہ ہوتی ہیں، جیسے اسلام، لا، ہور، مینار پا کستان۔ پڑھاتھا اردوگرامر میں یا نہیں؟“ دونوں کو یاد دلایا۔ حسین ایک دم ای۔

”پتہ ہے ہماری اردو کی ٹیچر کی انہی دنوں ملنگی ہو گئی اسلام نامی بندے سے، بس ہم تو ان دنوں سارے جملے اسلام کے بناتے تھے..... سوری آپ بات پوری کریں۔“ سعدی کی گھوری پوچھ جلدی سے چپ ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔

”عربی میں عام چیزوں کو خاص بنانے کے لئے ان سے پہلے ”ال“ لگایا جاتا ہے۔ جیسے انگریزی میں ”The“ لگاتے ہیں۔ اب اس آیت کو دیکھو۔ فیان مع العسر یسرا۔ یہاں خاص کیا ہے اور عام کیا ہے؟“

”العمر خاص ہے اور یہ عام ہے۔“ سیم جلدی سے بولا۔

”بالکل۔ تینگی ”خاص“ ہے اور آسانی ”عام“ ہے۔ اب یہاں لا گو ہوتا ہے عربی زبان کا ایک اصول۔“ وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے تما نے لگا۔ ”عربی میں اگر ایک فقرے میں ایک خاص لفظ ہو اور ایک عام لفظ ہو اور وہ بات اگر اگلے ہی فقرے میں دہرانی جائے تو اس کا طاب بدل جاتا ہے۔ یعنی دہرانے جانے کی صورت میں یہ سمجھا جائے کہ دوسرے فقرے میں جس خاص چیز کی بات کی جا رہی ہے وہ وہی ہے۔ فقرے والی ہے۔ مگر عام چیز پہلے فقرے والی نہیں ہے۔ عام چیز نہیں ہے، مختلف ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ دونوں الجھے تھے۔

”یعنی کہ دونوں آیات میں جس خاص چیز کی بات ہو رہی ہے وہ ایک ہی ہے۔ مگر جس عام (نکره) چیز کی بات ہو رہی ہے وہ“  
الگ الگ چیز ہیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔“

سعدی نے گہری سانس لی۔ اگر یہ آیت ایک ہی دفعہ ہوتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ ”تیگی“ کے ساتھ آسانی ہے، ”مگر دھرانے جانے کی صورت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جس تیگی کی بات دونوں آیات میں ہوئی ہے وہ ”ایک“ ہی ہے، مگر اس کے ساتھ دو دفعہ جس آسانی کی بات ہوئی ہے وہ دو مختلف آسانیاں ہیں۔“

”مگر اس سے مطلب کیسے بدلا؟“ حنفی کو اب بھی نہیں سمجھ میں آیا تھا۔

”ایسے کہ بے شک ایک تیگی کے ساتھ ایک آسانی ہے، پھر ”اسی“ تیگی کے ساتھ ”ایک اور آسانی“ ہے۔ دونوں آیات میں ایک ہی تیگی کی بات ہو رہی ہے، مگر ان کے ساتھ جڑی آسانیاں الگ الگ ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بتارہے ہیں کہ لوگون تم پر جب کوئی ایک مشکل آئی ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہم تمہیں ایک آسانی بھی دیتے ہیں، اور پھر ”اسی“ مشکل کے ساتھ ایک دوسرا آسانی بھی دیتے ہیں۔ اس کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بلکہ دہرانے سے اس کا یہ مطلب بنتا ہے کہ مشکل ایک ہی ہو گی، مگر انسان کو اس کے ساتھ بار بار مختلف آسانیاں بھی ملیں گی۔ ایک مشکل، مگر کئی آسانیاں۔ ایک عذر، مگر ایک سے زیادہ یہ رہ۔ ہم مشکل حالات میں انتظار کرتے ہیں کہ بھی تیگی کے ”بعد“ آسانی آئے گی، مگر آسانی تو اللہ تیگی کے ”ساتھ“ ہی دیتا ہے۔ ہم انسان مشکل کو دیکھتے اور اسی کو سوچتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ عطا کردہ ذہیروں آسانیاں بھول جاتے ہیں۔ قرآن کی ایک ایک آیت اتنی امیزگ ہے، کہ اس پر غور کرنے کے لئے سماں سال کی زندگی بھی کم لگتی ہے۔ اگر ہم مسلمان فیس بک اور اٹی وی سے باہر نکلیں تو ہمیں وقت ملے..... اچھا اچھا میں آپ لوگوں کو نہیں کہہ رہا۔“ ساتھ ہی جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھادیئے کیونکہ اسکریز کے آگے جبی ماں بہن جو پہلے توجہ سے سن رہی تھیں، اب ایک دم آنکھوں سے انگارے اگنے لگی تھیں.....

سبزی کاٹنی ندرت کی انگلی پر کٹ لگا تو وہ چونکیں۔ منظر لمحے بھر میں بدلتا۔ وہ انگلی کے اوپن کچن میں بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ہدیتیگی سوچتے ہوئے کچے مٹڑاٹھاٹھا کرمنہ میں ڈال رہی تھی۔ ندرت نے زور سے اس کے ہاتھ پر چپت لگائی۔

”ہزار دفعہ کہا ہے، اینے مت کھایا کرو بے برکتی ہوتی ہے۔“

”مجھے پتہ ہے آپ کیا سوچ رہی ہیں۔“ وہ اثر لئے بغیر ان کو سنجیدگی سے دیکھ کر بولی تو ندرت نے اس بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ کب آکر بیٹھی، انہیں پتہ بھی نہیں چلا۔ ”اور مجھے پتہ ہے صداقت کی اس بات کو سن کر بھائی کیا کہتا۔ مجھے پتہ ہے آپ بھائی کو یاد کر رہی ہیں۔“ ”نہیں۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔“ سر جھنک کر رخی مسکراہٹ کے ساتھ آلو چھیلے لگیں۔ ”ان دونوں میں ہر وقت سوچتی تھی کہ میرے ساتھ کتنا ظلم ہوا، ایک بھائی مارا گیا، دوسرا جیل میں ہے۔ میں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ میرے دو بیٹے تو میرے پاس تھے۔ جب سعدی..... جب سعدی نہیں رہا تو بھی میں نے یہ نہیں شکر کیا کہ فارس تو ہمارے پاس تھا۔ ہم اکیلے تو نہیں تھے۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ ناشکری نعمتوں کو گھٹاتی ہے۔“ وہ شاید خود سے بول رہی تھیں۔ ”مگر اب ہم سب کو مظلوموں والی خود ترسی سے نکلنا چاہیے۔ سعدی نہیں ہے، فارس نہیں ہے تو کیا ہوا۔ میرا ایک بیٹا تو ہے۔ ایک نکسی بیٹی تو ہے میرے پاس۔“

اور خشن جو بڑے پیار سے اور دکھی دل سے سن رہی تھی، آخری الفاظ پر تما نو پتھرے ہی لگ گئے۔

”ہاں بس“ میں یہی سوچ رہی تھی کہ آج اسی نے پورا پیر اگراف بول دیا مگر میری براٹی نہیں کی، طبیعت تو ٹھیک ہے، مگر بہت شکریہ

”مل کر، ادی آپ نے میری!“ غصے سے تن فن کرتی دہ اٹھ گئی۔  
ندرت پچھے سے مسلسل اس کوخت ست سناری تھیں۔ ”ایک ہفتے کی بات تھی، میرا سارا گھر اٹا کر رکھ دیا، کچھ بھی ڈھنگ سے  
ساف نہیں کیا، چھوہڑ لڑکی۔“

❖❖❖

سنایہ ہے کہ سبک ہو چلی ہے قیمتِ حرف ..... سو ہم بھی اب قد و قامت میں گھٹ کے دیکھتے ہیں  
سو موادر کی صح شہر کی سڑکوں پر کار و بار زندگی از سر نوشروع ہو چکا تھا۔ ریشور انٹ میں ہلاک پھلکارش تھا۔ ایسے میں اسامہ سیر ہیاں  
چڑھتا اور آیا اور اوپری ہال کا دروازہ کھولا۔  
ہال کی شیخشی کی دیوار سے نیچے سڑک پر بہت اڑیک صاف دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی کے قریب ایک دیوار پر چند کاغذات چسپاں  
تھے۔ ایک سیاہ کوٹ اور نائی والا نوجوان ان کاغذات کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک سیاہ کوٹ والی لڑکی بڑی بیڑے کنارے پیش  
چائے پیتے ہوئے سن رہی تھی، اور سامنے کرسی پر نیک لگائے تھے۔ ناگ پر ناگ جمائے پیشی زمرد دیوار پر لگی تصویروں کو دیکھ کر سوچتے ہوئے نئی میں  
سر ہلا رہی تھی۔ ”نہیں۔ یہ بھی نہیں۔“  
”السلام علیکم!“ سیم نے پکارا تو زمر نے گردان موڑی، مسکرا کر اس کو قریب بلایا۔ وہ باقی دونوں دکاء کو بھی سلام کرتا شرمیلی  
مسکراہٹ کے ساتھ زمر کے ساتھ آبیٹھا۔

”آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“

وہ بال باندھے سیاہ کوٹ میں ملبوس تھی۔ ناک کی سنہری ننھے دمک رہی تھی اور بھوری آنکھیں پر سوچ انداز میں دیوار پر مرکوز کر رکھی  
تھیں۔ ”ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ قر الدین مقتول کا قاتل ان سب لوگوں میں سے کون ہونا چاہیے۔“ سیم نے گردان موڑ کر ان تصاویر کو دیکھا۔  
”قری الدین کی گولڈ جیولری شاپ تھی۔ پیسے والا آدمی تھا۔ میگنوب کی غیر قانونی اسمگلنگ جیسے اڑامات کے باعث جیل گیا تھا۔“ وہ  
نوجوان وکیل بتا رہا تھا۔ ”اس کو مارنے کے لئے بہت سے لوگوں کے پاس بہت سی وجہات ہو سکتی تھیں۔“  
اسامہ قدرے پر جوش ہوا۔ ”یعنی کہ اصل قاتل ڈھونڈ کر پولیس کے حوالے کر دیں، تو ماں جھوٹ جائیں گے؟“  
وہ تینوں ایک دم سے اسے دیکھنے لگے۔ سیم قدرے جز بڑ ہوا۔

”اصل قاتل کی پرواہ کے ہے سیم؟ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ قاتل تک پہنچنا پولیس کا کام ہے۔“

”تو پھر ان لوگوں میں سے آپ لوگ قاتل کیوں ڈھونڈ رہے ہیں...؟“ وہ الجھا۔

”سیم، وہ لوگ فارس پر جھوٹا الام لگا رہے ہیں، ہمیں اس جھوٹ کا مقابلہ کرنا ہے۔“

”جج کے ساتھ!“ وہ پھر سے پر جوش ہونے لگا۔

”نہیں سیم۔ کورٹ میں مقابلہ جج کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ یہاں جھوٹ سے لڑا جاتا ہے اس سے بڑے جھوٹ کے ساتھ۔ الام  
سے لڑا جاتا ہے اس سے بڑے الام کے ساتھ۔“  
”یہ کورٹ ہے بیٹا!“ نوجوان وکیل مسکرا کر گویا ہوا۔ ”یہاں ایک جج ثابت کرنے کے لئے ایک سو ایک جھوٹ بولنے پڑتے  
ہیں۔“

”مطلوب....اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“ سیم نے پھر سے زمر کو دیکھا۔

”ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا۔ برڈن آف پروف (عدالت کے سامنے ثبوت ڈھونڈ کر لانے کی) ذمہ داری استغاثہ پر ہوتی ہے،“

استغاثہ (پراسکیوشن) وہ ہوتا ہے جو الزام لگاتا ہے۔ ملزم قانون کی محبوب اولاد ہوتا ہے۔ کسی ملزم کو قاتل ثابت کرنا بہت مشکل مگر اس کو بے گناہ ثابت کرنا آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ قانون ہر شک کافاً نہ ملزم کو دیتا ہے۔ ہم نے صرف بیٹھ کر پراسکیوٹر کے الزامات سننے ہیں اور پھر... ان کے کیس میں رتی برابر شک پیدا کرنا ہے۔ جو گواہ وہ پیش کریں گے، ہمیں ان کوڈس کریڈٹ کرنا ہے اُن کی عزت بھری کچھری میں محدود کرنی ہے۔ جو ثبوت وہ پیش کریں گے، اس ثبوت کے اوپر اتنے شکوک و شبہات کا کچڑا اچھانا ہے کہ وہ دفن ہو جائیں، اور پھر ہمیں ایک اور عدالت کے سامنے پیش کرنا ہے۔ کسی اور شخص پر شک و شبہہ ڈال کر اس پر قاتل ہونے کا ان ڈائریکٹ الزام لگانا ہے، وہ اتنا بردا نہیں ہو گا کہ وہ دوسرا مشتبہ شخص گرفتار ہو سکے، مگر اتنا تاضر وہ ہو گا کہ فارس کا مجرم ہونا مشکوک ہو جائے۔“  
”مگر آپ نے کہا تھا کہ آپ کوثر میں جھوٹ بولنے کے خلاف ہیں۔“ سیم کے چودہ سالہ مسلمان دل کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔

”میں، بلکہ ہر قانون کا احترام کرنے والا شخص پر جری کے خلاف ہوتا ہے۔ اللہ کی قسم اخْلَاقِ کثیرے میں کھڑے ہو کر جھوٹ بولنا یعنی پر جری کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ مگر وکیلوں کو ایسا کوئی حلف نہیں لینا ہوتا اور شرعاً گناہ نہیں ہے۔ ہم اپنے موکل کے دفاع کے لیے کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔“ زر اسے شانے اچکا کر بولی۔ سیم نے باری باری ان تینوں کے مطمئن چہرے دیکھے اور پھر دیوار پر گلی تصویریوں کو۔

”Is That Right?“

”It's Legal.“ زمر نے پھر شانے اچکائے تھے۔ ”اگر ایک آدمی اپنی زندگی بچانے کے لئے اپنے اوپر حملہ آور شخص کو قتل کر دے، تو اس کو سیلیف ذیفینس (دافائی ذات) کہتے ہیں، ہو قانوناً اور شرعاً گناہ نہیں ہے۔ زندگی انسانوں کے پاس اللہ کا سب سے قیمتی تھنہ ہے۔ اس کو بچانے کے لئے انسان اپنا ہر ممکن دفاع کرتا ہے۔ اور ہم یہی کر رہے ہیں۔ ہم فارس کے ذیفینس لائز ہیں۔ دفاعی وکیل۔“  
اسامدہ سے اب مزید ہضم کرنا مشکل تھا۔ جلدی سے کھڑا ہوا، زمر سے کارکی چاپی لی، اور ڈرائیور لے جانے کی اجازت مانگی، اور یونچ بھاگ آیا۔ دونوں کا نوں کو باری باری چھوٹے (توبہ توبہ) وہ اب زینے اتر رہا تھا۔ یونچ کچن میں کچھ کھاتی ہیں اس کی منتظر تھی۔ اسے حمد کے ساتھ جانا تھا۔ حمد کو مد کی ضرورت تھی۔

❖❖❖

میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنهائی کے صحراء میں ..... خود اپنی چاپ سن کے لرزہ بر اندام ہو جائے کو لو بیس واقع اس زیر زمین تہہ خانے میں میری استجیبو سعدی کے سامنے میز پر کھانا کھری تھی، اور وہ کاؤچ پہ بیخا بازو دینے پر لپیٹ کبھی کھانے کو دیکھتا، کبھی میری کو۔

”پہلے گارڈ سے کہو وہ اسے چکھے۔ پھر میں کھاؤں گا۔“

”ہم سب کھا چکے ہیں۔“

”پھر لے جاؤ یہ کھانا۔ مجھے کیا معلوم تم لوگوں نے اس میں کیا ملایا ہو۔“ برہمی اور قدرے اضطراب سے نرے پرے دھیلی۔ میری متبع رہ گئی۔ ”سب کے لئے بیکی کھانا بنتا ہے، تمہارے کھانے میں کیوں کچھ ملائے گا کوئی؟“

”پہلے کوئی اور چکھے گا، تب میں کھاؤں گا۔“ وہ ضد کر رہا تھا۔

”پھر بیٹھے رہو اسی طرح۔“ خفگی سے بڑا کروہ باہر نکل گئی۔

سعدی نے کھانے کو نہیں چھوٹا دیے ہی بیٹھا رہا۔ بھی سر دنوں ہاتھوں میں گرالیتا، بھی بازو اپنے گرد پیٹھ لیتا۔

”میں ڈر گیا ہوں۔“ کچھ دیر بعد خادر کے کمرے میں زمین پر بیٹھتے اس نے شستگی سے اعتراض کیا تھا۔

خاور ایک کونے میں کھڑا، لکڑی کے چھوٹے سے ٹکڑے کو جو اس نے دروازے کے کنارے سے اکھاڑا تھا، دیوار پر رُڑتا جا رہا۔ اداز پر درون گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کے زخماب بہتر تھے اور وہ پہلے سے تازہ دم لگتا تھا۔

"روز کھانا کھانے سے پہلے ذرا سہ نہ شروع کر دیا کرو۔ یہ ہمیں زہر دے کر نہیں ماریں گے۔ ہاشم لاشیں دیکھا چاہے گا، درندہ ان کو اس نا۔ گا۔ یہ کسی تدرتی طریقے سے ہمیں ماریں گے۔"

سعدی نے نگاہیں انھا کر بے بی سے اسے دیکھا۔ "یہ مری ہاشم سے بات نہیں کر رہے۔"

"یعنی میر ادازہ درست تھا۔ ہاشم عالم ہے۔" وہ اب پھر سے لکڑی کا لکڑا دیوار سے رُڑنے لگا تھا۔ منہمک اور مصروف۔

"ہم کب نکلیں گے یہاں سے؟" خاور نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ "اگر میں تمہارے ساتھ

114 115 116

"جب تم تیار ہو گے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ خاور کے سامنے بالکل مدد مقابل، اور درون کڑا کر بولا۔ "میں تیار ہوں۔"

خاور نے لکڑی کا لکڑا دیں رکھا اور اس کی جانب مڑا۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھا تھا، پھر ایک دم گھنادہ را کر اس کے پیٹ میں ایک لہنی سے اس کے کندھے پر ضرب لگائی اور پاؤں سے اس کے پہلو کو دھکا دیا۔ سعدی یکے بعد دیگر ضربوں سے بے اختیار یعنی کوگرا۔ 116 117 نے پیٹ پر دونوں پاؤں بازو روکھے وہ درد سے چلا یا تھا۔

"تم گھٹایا انسان....."

مگر خاور نے اس کی طرف بازو بڑھایا۔ "انھو۔ تمہیں باتوں کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ لڑنا تو بالکل بھی نہیں۔ انھو!"

"یہ کیا تھا؟" سعدی نے اس کا ہاتھ نہیں ٹھہما۔ وہرے ہو کر غصے سے اسے دیکھا چیجا تھا۔

"میں تمہیں بتا رہا تھا کہ تمہیں کچھ نہیں آتا۔ اور لڑکوں کی طرح مت روڈ۔ میں نے سادہ ملٹری تیکنیک سے تمہیں یعنی گرایا ہے۔" اس کی کوئی سامنے نہیں رکھتا۔ اس کا طریقہ اور ہے۔ اور قتل کرنے کا بالکل مختلف۔ اٹھو اور میرے سامنے کھڑے ہو۔ یہاں سے نکلنے کے لئے تمہیں جسمانی طور پر شہادت بننا ہو گا۔ ویسے بھی میں نہیں چاہتا کہ جب میں تمہیں قتل کروں تو تم کی معصوم بڑی کی طرح نظر آؤ بلکہ تمہیں کسی مرد کی طرح مقابلہ لے مارنا چاہیے۔ انھو۔ میں تمہیں سکھاتا ہوں۔"

"تم سکھاؤ گے مجھے؟ میں تمہاری جان لے لوں گا۔" وہ پھر کھڑا ہوا اور زور سے اس کو مکاڈے مارنا چاہا، مگر خاور نے بروقت اس 117 تھام کر مردڑا۔

"آہ۔" وہ آنکھیں بند کر کے کراہا۔ اسی کندھے پر کسی زمانے میں شیر دنے گوئی ماری تھی۔

"تمہیں کچھ نہیں آتا۔" اس کو پرے دھکیلنا اور تاسف سے نفی میں سر ہلاتا کہنے لگا۔ "تم تیار نہیں ہو۔ میرے ساتھ جانے کے لئے ہمیں تیار ہونا پڑے گا۔ جاؤ کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔ کل صبح ناشتے سے پہلے میرے پاس آتا۔ پھر ہم تیاری شروع کریں گے۔" سعدی نفرت اور مٹھے سے اسے دیکھتا دروازے کی طرف بڑھا۔

"اور سنو!" لکڑی کا لکڑا اپس انھاتے ہوئے خاور نے یاد دلایا۔ "مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمہیں ساتھ لے جانے کا۔ اگر چنان ہو تو تمہیں کرو گے جو میں کھوں گا۔ درندہ رہو یہیں اور مردی ہیں۔" سعدی نے زور سے دروازہ دے مارنے کے انداز میں بند کیا اور باہر نکل گیا۔ کارڈز نے خاموشی سے اس کو دیکھا اور اسی طرح کھڑے رہے۔

یقیناً خاور نے اسے مارا تھا۔ گذادیری گذرا۔

❖❖❖

مرے شوق کی بیہیں لاح رکھا! ..... وہ جو طور ہے، بہت دور ہے!  
یونیورسٹی میں معمول کے مطابق رش تھا۔ راہدار یوں میں بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسے میں اسماء کو باہر انتظار کرتا چھوڑ کر حنین تیز تیز ایک کارڈیور میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ یہ جان اور تذبذب کا آئینہ دار تھا۔ مگر چال مضبوط تھی، فیصلہ کن تھی۔  
دھنٹا ایک دروازے کے قریب وہ رکی۔ نیم پلیٹ پڑھی۔ علوم الدین شعبہ تفسیر القرآن۔ اس نے وہ نام کئی دفعہ پڑھا اور پھر دروازہ کھٹکھٹا کر کھولا۔

اندر آفس میں وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ میز کے پیچے کرسی پر برا جان، وہ عمر سیدہ خاتون تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا کر اٹھیں۔ اور اس سے ملیں۔ کرسی پیش کی۔ حنین چپ چاپ بیٹھی۔ سر جھکا لیا۔ وہ اب سامنے جائیں۔

”سعدی کی کوئی خبر؟“ اور ایسے چند چھوٹے چھوٹے سوال کرتی رہیں۔ حنف سر جھکائے جواب دیتی رہی۔ لب کاٹتی رہی۔ بہت دیر بعد اس نے سراخایا اور اپنی ٹیج کی مہربان آنکھوں میں دیکھا۔

”میں بچپن میں بھائی کے ساتھ قرآن پڑھنے آپ کے گھر آتی تھی، آپ کے پاس ہی، ہم دونوں نے آخری دس سیپارے حظ کیے تھے۔ آپ ہی نے ہمیں تفسیر پڑھائی تھی، بلکہ قرآن سکھایا تھا، مگر.....“ چند لمحوں کا وقفہ کیا۔ پس نیچے رکھا۔ نیک لگا کر بیٹھی۔ ذرا آرام دہ ہوئی اور ٹیچپر کی آنکھوں میں دیکھ کر بتانے لگی۔ ”مگر میں کھو چکی ہوں۔ میں اپنی زندگی ضائع کر رہی ہوں۔ نہ میں قرآن یاد رکھ پائی، نہ میں آرگنازڈ ہوں، نہ نیک ہوں، نہ ناممٹیخ کرنا سکی۔ میں فخر میں اٹھ نہیں پاتی اور باقی نمازوں کے لئے دل نہیں چاہتا۔ گو کہ میری خواہش ہے کہ میں بھی پانچ وقت کی نمازی بن جاؤں، مگر..... یہ بہت مشکل بہت بھاری چیز لگتی ہے۔“

وہ خاموشی سے سن رہی تھیں، اس بات پستائید میں سرہلایا۔ ”نماز بہت بھاری چیز ہے، واقعی!“

”مگر پھر وہ لوگ کون ہوتے ہیں جو منہ اندھیرے نیند توڑ کر اٹھتے ہیں اور ٹھنڈے پانی سے بھی خود کو بھگلو لیتے ہیں مگر نمازوں چھوڑتے۔“ وہ بے چین ہوئی۔

”حنین... اللہ فرماتا ہے.... بے شک نماز بہت بھاری ہے سوائے ان لوگوں پر جو شعیت رکھتے ہیں۔“

”شعیت کیا ہوتا ہے؟“ اسے سارے اس باقی بھول گئے تھے۔

”شعیت ڈر ہوتا ہے اور شعیت محبت ہوتی ہے، مگر نہ یہ صرف ڈر ہے نہ صرف محبت۔ یہ محبت بھرا ڈر ہوتا ہے جو انسان کو اپنے ماں باپ کا کہنا مانے پر مجبور کرتا ہے۔ صرف محبت میں ہم ان کی بات نہیں مانتے، یا صرف ڈر کے باعث ان کی اطاعت نہیں کرتے۔ کوئی جھرو تونہیں دے ماریں گے نا وہ نہیں۔ صرف یہ دھڑکا ہوتا ہے کہ ان کے اوپر، ہمارا پریشان نہ خراب ہو جائے۔ ہم ان کو دکھدیئے سے ان کی محبت کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔ جس کے دل میں اللہ کے لئے ایسی شعیت ہوتی ہے، نماز اس پر آسان ہو جاتی ہے۔“

”تو انسان اپنے اندر یہ شعیت کیسے پیدا کرے؟“

”تمہاری جگہ کوئی اور پوچھتا تو اس کے آگے لمبی تقریر کر سکتی تھی مگر تم حنین، تم پر یکیکل زیادہ پسند کرتی ہو۔“ کہتے ہوئے وہ لیٹر پیڈ سے چند کاغذ علیحدہ کرنے لگیں۔ حمد مسکرا دی۔ وہ درست جگد آئی تھی۔

”یہ دو کاغذوں۔“ انہوں نے دو کاغذ اس کے سامنے ڈالے اور پھر ایک سرخ اور ایک سبز قلم ان کے اوپر رکھا۔

”پہلے بائیں ہاتھ والے پا ایک سرخ دائرہ ٹھیکنگ اور اسی سرخ رنگ سے اس کے اندر ٹھیک جاؤ۔“

”کیا؟“

وہ رسان سے مسکرائیں۔ ”فون پتمنے کہا تھا کہ تم نے بہت سی ایڈ کشنر (لت) چھوڑی ہیں مگر تمہارا ہر مسئلہ اس لئے ہے کہ تم فوج پر  
بیٹھی۔ اب اس کا غذ پر کھوکھ جب تم فوج پر نہیں اٹھتی تو تمہیں کیا ملتا ہے؟“  
خین نے الجھ کر سوچا۔ پھر لکھنے لگی۔

”تھوڑی سی مزید نہیں۔ بہت سارا سکون۔ گرم گرم بستر۔ چند مزید خواب۔ ملیپور۔ سر اٹھایا۔“ ”اب؟“

”اب اس کے ساتھ لکھوڑ کہ تم اس وقت.... یوں سوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو کیسی لگتی ہو؟ تمہارا کیا امپریشن جا رہا ہوتا ہے اللہ کے  
سامنے؟“

لمحہ بھر کے لئے خین کے اندر کچھ ہلا۔ اس نے سر جھکایا۔ سرخ دائرے کو دیکھا۔ پھر لکھنے لگی۔

”اس وقت میں اللہ کے سامنے کیسی نظر آ رہی ہوتی ہوں؟“

ایک غافل لڑکی، جو سورہ ہی ہے۔ جو شیعوں کی طرح سورہ ہی ہے۔ جو روز قیامت سے بے خبر ہے، جس کو اپنے بنانے والے کے  
سامنے جاتے اپنے امپریشن کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ”اس کا ہاتھ کا نیا مگر لکھتی گئی۔“ جنت کی نہریں، جہنم کی آگ.... اسے نہ کسی پر یقین ہے نہ ان کا  
احساس ہے۔ اللہ کی طرف سے اسے بار بار پکارا جا رہا ہے گرد وہ دھنائی سے غرور سے سورہ ہی ہے۔ نماز پڑھنا اس کے نزد یک ایک حقیر کام ہے  
اُر حقیر نہ ہوتا تو وہ اٹھ جاتی۔ وہ اللہ کی نافرمان نظر آ رہی ہے۔ فرشتے اس کے بارے میں بھی جا کر اوپر بتائیں گے کہ فوج پر اسے سوتا پایا۔ اس  
کی ”اوپر“ والوں میں نہ کوئی قدر ہو گئی نہ عزت۔ وہ ہستکے ہوؤں میں سے ہے۔ اسی طرح غافل سوتی، جاگتی کسی دن مر جائے گی اور رحمت کے  
فرشتوں کو اس سے کوئی ہمدردی نہ ہو گی کیونکہ انہوں نے ہمیشہ سے سوتے پایا ہے۔ ”اس سے مزید نہیں لکھا جا رہا تھا۔“ اور پھر سارا دن وہ ست  
اور بے زار رہتی ہے۔ اس کا ہر کام بے بر کتا ہے۔ اس کا دال گفت سے بھر چکا ہے گمراں گفت کوئا لئے کے لئے بھی وہ اکچھ نہیں کرتی۔ اس کے  
اندر کوئی خیر نہیں ہے۔ جب وہ اللہ سے دعا مانگے گی تو کیا اللہ اس کی دعا قبول.....؟“ بس بہت ہوا۔ اس نے قلم چھوڑ دیا۔ دل پر بہت زور سے  
گلی تھی۔ صفا الملا کر کے میز پر رکھ دیا۔ سرا بھی تک جھکا تھا۔

”اب اس دوسرے صفحے پر بزر دائرہ کھینچو۔“ حمد نے ذرا سے توقف کے بعد دوسرا صفحہ اٹھایا۔ اور سبز دائرہ کھینچا۔ انگلیوں میں  
لرزش تھی۔

”اس پر کھوکھ فوج پڑھنے کے لئے تمہیں کیا کچھ کھونا پڑتا ہے۔“

وہ سر جھکائے لکھنے لگی۔

”نید تو زنا۔ گرم بستر چھوڑنا، سردی میں با تھر روم تک جانا، پانی سے خود کو بھگونا، اور پانچ.... دس منٹ کی نماز پڑھ کر داپس آنا۔“ وہ  
رک گئی۔

”اور اب یہ کھوکھ جب تم یہ کرو گی تو اللہ کے پاس تمہارا کیا امپریشن جائے گا؟“ وہ ذرا سی چوکی۔ پھر صفحے کو دیکھا۔ بزر دائرہ چک  
رہا تھا۔ وہ بنا سوچے لکھنے لگی۔

”اللہ کو اس وقت میں کیسی لگوں گی؟“

وہ ہر پچھلی بات منادے گا۔ میں اس کے سامنے ایک ایسی لڑکی ہوں گی جو اپنا آرام چھوڑ کر اس کی پہلی پکار پر اٹھتی ہے۔ جو اس کی  
بات مانتی ہے۔ اس کو قیامت کا احساس ہے۔ اس کو جہنم اور جنت کی پرواہ ہے۔ وہ غافلوں میں سے نہیں ہے۔ ٹھیک ہے اس میں بہت برا بائیاں  
ہوں گی، مگر فرشتے جب فوج اور عصر کے وقت اوپر جائیں گے تو اس کا اچھا ذکر کریں گے اللہ کے سامنے.... اوپر والوں میں اس کا نام عزت سے

لیا جائے گا، ”اس کے لکھنے میں روانی آئی تھی۔ دل زور زور سے دھڑ کنے لگا تھا۔

”وہاں اس کا امپریشن اچھا جائے گا۔ اس کی بہت سی غلطیوں سے صرف نظر کر لیا جائے گا۔ وہاں اس کی قدر ہو گی۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔ جب وہ فخر کے لئے اٹھے گی اور دوسروں کو بھی اٹھائے گی تو اللہ بھی اوپر والوں کے سامنے اس کی تعریف کرے گا، ”اس کا دل پھر سے بھر آیا۔ لوگوں پر ہاتھ رکھ کر خود کو قابو کیا۔ ”اس کا دل گلٹ سے پاک ہو گا۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔ اس کے کاموں میں برکت ہو گی۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔ وہ اس کو اپنے پاس ”نماز پڑھنے والوں“ میں لکھ لے گا۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا.... وہ ایک فقرہ اتنا تیقینی اور اتنا اندرستک ہلا دینے والا تھا کہ وہ اس کو بار بار لکھتی گئی بیباں تک کہ دائرہ بھر گیا۔  
لیکھنے میز پر دستک دی تو اس نے گہری سانس لی۔ نبی اندر ابтарی اور کاغذ الٹا کر کے میز پر ڈال دیا۔

”اب ان دونوں کاغزوں کو اپنی الماری پڑھی۔ یا بیڈ کے اوپر دیوار پر کہیں بھی لگا لو اور دن میں بیس دفعہ لازمی ان بالتوں کو پڑھو جتی کر یہ تمہارے دل میں بیٹھ جائیں۔ زندگی میں جب بھی کسی ایڈیشن کے ہاتھوں پر بیشان ہو، فوراً دو دائرے بناؤ، اور ایک میں لکھو کہ ذرا سی تکین کے لئے یہ کام کرتے وقت میں اللہ کو کیسی لگتی ہوں گی؟ اور دوسرے میں لکھو کہ اگر یہ چھوز دوں تو اس کو کیسی لگوں گی؟ وہ رکیں۔ ”مگر نماز کی عادت بنانے کے لئے تمہیں کچھ اور بھی کرنا ہو گا۔“

”کیا؟“ وہ تیزی سے بولی۔ اس وقت اندر سے اتنی بل بھی تھی کہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

”تمہیں یہ سمجھنا ہو گا کہ نماز ہے کیا؟“ وہ پر سکون سی بیچھے ہو کر بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ ان کی نرم آنکھیں ہد کے چہرے پر جی تھیں۔ ”نماز پر آپ کو الارم کلکٹ نہیں اٹھاتی۔ آپ کا ایمان اٹھاتا ہے۔ پچھلے دن اگر جھوٹ بولے ہیں، خیانت کی ہے، وعدہ خلافی کی ہے یا غیبت کی ہے تو اگلے روز فخر پر اٹھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

”میں کچھ دن نماز بہت اچھی پڑھتی ہوں، پھر کچھ دن چھوڑ دیتی ہوں۔ ایک فیر سے لکل کر دوسرے فیر میں چلی جاتی ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

”ہم مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نیت کی ابھیت نہیں سمجھتے۔ نماز میں دل کا سکون ہے، مگر یہ دل کے سکون کے لئے نہیں پڑھی جاتی۔ جو اس نے نماز پڑھتا ہے کہ اس کو پڑھ کر وہ خود کو مطمئن اور پر سکون محسوس کرتا ہے وہ خنت فتنے میں بتا ہے کیونکہ وہ اپنے ”دل“ کے لئے نماز پڑھتا ہے اللہ کے لئے نہیں۔ ایسے ہی لوگ phases میں بتلارہتے ہیں۔ کچھ دن نماز پڑھی پھر کچھ دن نہیں پڑھی کیونکہ دل کو جو مرہم لگانا تھا لگ گیا۔ اب ضرورت نہیں ہے۔ وہ اسی لیے کچھ دن بعد نماز چھوڑ دیتے ہیں کہ اب ان کو ضرورت نہیں رہی، اب وہ پر سکون ہیں۔ پھر جب تک پر بیشان نہیں ہوتے، نماز کے قریب نہیں جاتے۔ نماز پڑھ کر بہیش سکون نہیں ملتا تو اگر کیا سکون نہ ملے تو چھوڑ دیں۔ ہم نماز پڑھنا؟ داغ لگوانے میں شفا ہے۔ داغ لگوانا سمجھتی ہونا؟ جیسے کوئی کاری رخم لگے تو قدیم قوموں میں اور اب بھی چین جاپان بلکہ پاکستان میں بھی۔ ... سلاخ گرم کر کے اس جگہ کو داغا جائے تو زخم تھیک ہو جاتا ہے۔ اس میں شفا ہے مگر ہماری امت کے لئے یہ منع ہے۔ تو جو لوگ نماز کو ایکسر سائز سے تشبیہ دیتے ہیں، ان کو سوچنا چاہیے کہ اگر اللہ نماز میں شفافہ رکھتا بلکہ تکلیف رکھتا تو کیا ہم اسے نہ پڑھتے؟ نماز کو اپنادل مطمئن اور خوش کرنے کے لیے نہ پڑھا کرو۔“

”تو پھر ہم کیوں پڑھتے ہیں نماز؟“ اس نے نکتہ اٹھایا۔

”کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ دی ایڈ۔ فل اسٹاپ۔ ہم اسے اس نے پڑھتے ہیں تاکہ اللہ ارضی رہے ہم سے ہمارا امپریشن اس کے سامنے اچھا جائے۔ اور اگر ہمارے دل میں یہ ”شیعیت“ ہو تو یہ بہت آسان ہے۔“ وہ ذرا دریکو تھہبیریں۔ ”مگر یہ تو ہو گیا کہ ہم نماز کیوں پڑھتے ہیں۔ اب یہ دیکھو کہ نماز بذاتِ خود ہے کیا؟“ خین غور سے سن رہی تھی۔ وہ نرمی سے کہے جا رہی تھیں۔ ”نماز تمہارے خیال میں کیا ہے؟“

وہ چپ رہی۔ اس کے پاس بہت سے جواب تھے مگر کوئی تسلی بخش نہ تھا۔

❖❖❖

وہ لمحہ شعور جسے جان کنی کہیں ..... چہرے سے زندگی کے نقابیں الٹ گیا یوسف خاندان میں سے کسی نے کاردار ازدیگی نیوائیر ایو میں شرکت نہ کی جو اس سر درات ان کے لان میں منعقد تھی۔ حینہن اپنے کمرے میں بیٹھی، کھڑکی کی طرف سے منہ موڑے بے تحاشہ کاغذوں پر بنے دارزوں کو بھرتی گئی۔ وہ خوش نہیں تھی، مگر وہ مطمئن تھی۔ زمر کیس کی تیاری کرتی رہی۔ اسامہ جلدی سونے چلا گیا۔ ندرت کی رات کی نماز اور وظیفے ابھی جاری تھے۔ غرض ان کا پورا گھر خاموش تھا، مگر باہر "دنیا" کا ردار میں جشن منانے میں مصروف تھے۔

وہاں گویا رنگ و بوکا سیلا ب امنڈ آیا تھا۔ غبارے قتفے بتیاں۔ پارٹی کا انتظام اندر تھا، مگر بارہ بجے کے قریب سب لمبے کوت اور جیکش پہنے باہر نکل آئے تھے جہاں فائر و رکس کا اہتمام تھا۔

ایسے میں شہرین اندر ایک کونے میں بیٹھی، مشروب کے گلاس پر گلاس پئے جا رہی تھی۔ سرخ سائزی میں ملبوس، وہ بے رونق اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ دفعنا اس نے سراخایا تو اپر سیڑھیوں پر شیر و کھڑا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ شہری نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ مسکرا کر ہاتھ ہلایا، مگر وہ ایک اچھتی ہوئی نظر اس پڑال کر زینے اترنے لگا۔ لا دن تقریباً خالی تھا۔ سب باہر تھے۔ نوشیر وان بھی باہر نکل آیا۔ سر دی کے باعث جیکت کے کار کھڑے کر لئے۔ اوچھے برآمدے میں کھڑے اس نے ایک ویران نظر پیچے سبزہ زار پر شور مچاتے ہنستے مسکراتے لوگوں پر ڈالی۔ اس کی نگاہیں ایک ایک کا چہرہ کھو جتی رہیں، پھر سر جھٹک کر وہ دوسری سمت آیا، اور ایک ملازم کو اپنی کار رکا لئے کہا۔

"سر آپ اس وقت کہاں ...؟"

"زیادہ بک بک نہ کرو میرے سامنے۔ تم ہو کون؟ ہاں؟" اس کو گھورتے ہوئے غرایا۔ "جو کہا ہے وہ کرو۔" ملازم جلدی سے حکم جوالایا اور ازملی بے زار شیر و رکار لے کر باہر رکوں پر گم ہو گیا۔

رات ابھی جوان تھی۔ لان میں بہت سے لوگوں کے درمیان کھڑی سرخ میکسی میں ملبوس جواہرات کی بات پر مسکرا رہی تھی۔ کندھوں پر سفید منک کوٹ ڈالے وہ گردن اٹھا کر مسکراتے ہوئے آسمان پر نظر آتے فائر و رکس دیکھ رہی تھی جب احر اس کے قریب آ کر کھنکھارا۔ اس نے گردن موڑی، احر کو دیکھ کر مسکراہٹ گھری ہوئی، پھر اس کا بازو دھا مے ایک طرف چلتی آئی۔

"اتی پولیٹیکل گیدرنگ مسز کار دار؟ اور آپ نے کہا تھا کہ آپ سیاست میں قدم نہیں رکھنا چاہتیں۔" وہ اب برآمدے میں کھڑا اشکوہ کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ نیچے روشنی تھی۔ یہاں کھڑے وہ دونوں کوئی تاریک سائے لگ رہے تھے۔

"میرے پا پا ایک سیاست دان تھے، میرے داد دو بار گورنر ہے تھے، میں پھر بھی اس میدان سے دور رہوں گی، لیکن باروں کی دوستی میں یہ سب کرنا پڑتا ہے۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "اس سفید شال والی خاتون کو پہچانتے ہو؟" ابرو سے نیچے مہماںوں کی طرف اشارہ کیا۔ احر نے اس طرف گردن گھامی۔ وہاں چند اصحاب کے ساتھ ایک سفید شال والی عورت کھڑی بات کر رہی تھی۔ وہ شکل سے پھنان لگتی تھی۔

"ان کو کون نہیں پہچاتا؟"

"گزر؟، چمکتی آنکھوں سے احر کی آنکھوں میں جہاں کا۔" اس کو تباہ کر دو احر۔ تھاڑے پاس ایک مہینہ ہے، اس کے اتنے اسکینڈل لیک کر دے کر وہ استغفار دینے پر مجھ پر ہو جائے۔" ایک لمحے کے لئے احر بالکل سنائے میں رہ گیا۔ آسمان پر بلند آواز میں پشاخوں کے ساتھ آتش بازی ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

”مسز کاردار، کوئی عام عورت نہیں ہے۔ اس کا بھی سیاسی خاندان ہے، آپ جتنی امیر، آپ جتنی طاقتور ہے۔ اس سے دشمنی مول لینے کا کیا فائدہ؟ کل کوہہ ہم پر جوابی حملہ کرے گی۔“

”اور تب تم ہو گے ناہر حملے کا جواب دینے کے لئے۔ اس نے ایک پارٹی میں ہارون سے مس بی ہیو کیا تھا۔ میں ہارون پر احسان کرنا چاہتی ہوں۔ گیٹ ٹو درک۔ ایک مہینہ ہے تھا میرے پاس!“ اس کا شانہ تھپٹپا کروہ مسکراتی ہوئی، میکسی سنجاتی زینے اترتی گئی۔ احراب یقینی سے کھڑا رہ گیا، پھر چونکا جب ساتھ کوئی آکھڑا ہوا۔

”تم میں کاردارز کے لئے اتنے بڑے کام کرنے کی ہمت نہیں ہے تو آگاہ کر دینا، میرے پاس ملازموں کی کمی نہیں ہے۔“ سرمدہ ہری سے کہہ کر ہاشم نے ایک تند نگاہ اس پڑالی اور پھر زینے اتر کر لان کی طرف بڑھ گیا۔ احرار کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ رات کتنی سرد تھی۔

❖❖❖

ڈرا رہا ہے مسلسل یہی سوال مجھے ..... گزار دیں گے یونہی کیا یہ ماہ و سال مجھے سرماد کی اس دوپہر کو روم میں معمول کی سماعت جاری تھی۔ نجح صاحب سمیت تمام افراد توجہ سے کٹھرے میں کھڑے وردی والے پولیس الہکار کو سن رہے تھے جو پراسکیوٹر کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ کھٹا کھٹتا پہ ہونے کی آواز بھی پس منظر میں سنائی دیتی تھی۔

”اور جو تمیں بور کا پستول فارس غازی سے برآمد کیا گیا، وہ آپ کی موجودگی میں برآمد کیا گیا؟“ پراسکیوٹر نے کہتے ہوئے گردن پھیر کر دفاع کی میز کو دیکھا۔ جہاں زمر قلم گھماتے ہوئے، آرام دہ سی پیٹھی سن رہی تھی، اور ساتھ بیٹھا فارس چھپتی ہوئی نظریں گواہ پہ جاتے ہوئے تھا۔

”جی۔ میں اس وقت اے ایس پی سرمد شاہ کے ساتھ موجود تھا۔“ گواہ کھدر رہا تھا۔

(سرمد شاہ سمیت چند گواہوں کو پراسکیوٹر نے give up کر دیا تھا۔)

”پھر کیا ہوا؟“

”مجھے محروم نے اس رات ایک سرب رہ پارسل میں وہ پستول دیا جو میں نے پوری حفاظت اور ذمہ داری سے فائز کر لیا میں بھگوا دیا۔ لیب کے رزلٹ کے مطابق وہی پستول قمر الدین کے قتل میں استعمال ہوا تھا۔“

پراسکیوٹر نیچے اتر آیا اور زمر کو دیکھ کر ”آپ اگر جرح کرنا چاہیں!“ کہتا واپس اپنی کرسی پہ جا بیٹھا۔ (جس کا گواہ ہوتا ہے، پہلے وہ سوال کرتا ہے، پھر دوسرا کیل اس گواہ پر جرح کرتا ہے۔) وہ گھری سانس لے کر انھی اور سخیدگی سے کٹھرے کے سامنے نیچا کھڑی ہوئی۔

”فارس غازی کو کس روز گرفتار کیا گیا تھا؟“ سپاٹ لجھ میں پوچھنے لگی۔

”13 اکتوبر کی شام۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔“

”اوپر کب برآمد ہوا؟“

”اسی وقت۔“

”اوہ آپ نے اسے لیب میں کب بھیجا؟“

”وہ لمحے بھر کو چپ ہوا۔“

”اگلی دوپہر۔“

”اسی دن کیوں نہیں؟ ورک آئیکیس کے مطابق آپ کو وہ پارسل اسی وقت لیب کو بھیجنا تھا۔ آپ نے وہ سولہ گھنٹوں بعد بھیجا۔“  
”اے؟ جب کہ آپ کی برآمدگی کے وقت لیب کھلی تھی۔“

”مجھے ضروری کام سے گھر جانا تھا۔ اس لئے میں نے اس کو لا کڑ دو راز میں ڈالا اور سوچا کہ صبح آ کر.....“، مگر زمر نہیں سن رہی تھی۔ وہ  
اپنے صاحب کی طرف مڑی۔

”یور آئر دفاع یہ چاہتا ہے کہ آپ پر ایکیوشن Exhibit ایف یعنی اس گن کوڈ سکوری میں سے خارج کر دیں۔ یہ ایسا ثبوت نہیں  
ہے جو شک و شبے سے پاک ہو۔“

”آپ جیکشن یور آئر۔“ پر ایکیوژن فرور آئھا۔ ”دفتری کاموں میں دریسویر ہو جاتی ہے۔ یہ گن فارس غازی سے ملی ہے، اس بات کے  
گواہ موجود ہیں۔“

”اس بات کے صرف دو گواہ تھے۔ سریدشاہ کو پر ایکیوژن گیو اپ کر چکی ہے، اور ان صاحب کی کریڈیبلٹی مشکوک ہے۔“ وہ دونوں  
ایلس ساتھ تیز تیز بولنے لگے تھے۔ نجح صاحب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر زور زور سے خاموش کیا، پھر ہتھوڑا زور سے بھایا۔ وہ دونوں چپ  
ہے۔

”مسرز مر.... پر ایکیوژن صاحب کا پاؤ اسٹر درست ہے۔ دریسویر ہو جاتی ہے۔ ہم اس ثبوت کوڈ سکوری سے نہیں نکال سکتے۔“  
”زمر کی آنکھوں میں استحباب ابھرا۔ باری باری اس نے پر ایکیوژن اور نجح کو دیکھا، پھر سرکوم دے کر، خاموشی سے واپس آ کر بیٹھی۔  
فارس نے قدرے تجھ سے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔“ تم نے بحث کیوں نہیں کی؟“

”نجح ان کا ہے۔“ وہ شدید مشرب نظر آ رہی تھی۔ فارس ”اچھا،“ کہہ کر واپس پیچھے ہو کر بیٹھا۔ وہ اب بھی پر سکون لگتا تھا۔

.....

اسی کے دم سے تو قائم ابھی ہے تاریخ... یہ اک امید کہ رکھتی ہے پر سوال مجھے  
ملتا تھا میں کری کے اوپر فارس آ کر بیٹھا تو ششی کے پار راجمان لڑکی کو دیکھ کر چوک مگی۔ وہ زمر کی توقع کر رہا تھا مگر وہ سرخ  
اسکارف میں لپٹے چہرے اور نیچے لبے وائٹ کوٹ میں ملبوس آ بدار تھی۔ بلی جیسی سرمی، چیکٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی وہ مسکرانی۔  
”سلام!“

فارس نے ذرا کی ذرا نظر گھمائی۔ کمرے میں جا بجا ایسے ہی بتوہظ قطار میں لگے تھے اور ایک دن میں ہزار سے اوپر قیدی اپنے رشتے  
داروں سے ملاقات کرتے تھے۔

”میں الگ کمرے میں بھی مل سکتی تھی مگر ایسے سوالات زیادہ اٹھتے۔“ وہ سرمی آنکھیں فارس پر جمائے رسان سے بولی تھی۔ فارس  
نے گھری سانس لی، ذرا سا آگے کو جھکا۔

”میرا کام کرنے کا شکر یہ!“ دبی آواز میں بولا۔ خاور کوکس نے غائب کروایا ہے، اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا۔  
”میں نے آپ کا کام نہیں کیا، اس نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھینا تھا۔ میں تب بھی غیر جانبدار تھی، اب بھی ہوں۔“ وہ دھیں آواز  
میں کہہ رہی تھی۔

”پھر آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟“ اس کا لہجہ خشک ہو گیا۔

آبی نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ ”ملکہ نے دونوں قیدیوں کے سر قلم کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔“  
وہ ایک دم بڑی طرح چوک کرائے دیکھنے لگا۔ گویا سانس تک رک گیا ہو۔

”مجھے افسوس ہے، میں ان کے لئے مزید کچھ نہیں کر سکتی۔ نہ پرانے قیدی کے لئے، نہ نئے قیدی کے لئے۔ میں نے کہا تے آہ، ل اس سے ملاقات تک اس کو نہ مارا جائے، مگر وہ چند دن سے زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔“  
”وہ اسے نہیں مارے گا۔“ اس نے بخختی سے کہا تھا۔

”فارس غازی!“ وہ، اس حکم سے اس کی تکمیل تک بے خبر رہے گا۔ یہ حکم اس کی ماں نے دیا ہے۔ خیر، میرا کام تھا بتانا، اس سے ۱۱۱۰ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ آپ کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیجھے۔“

فارس نے پلکیں اٹھا کر زخمی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ان میں شدید گرما اور برہمی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ ذرا نرم ہوئی۔ ”آپ جیل میں ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر آپ ملزم ہیں۔ ممکن فرزید ناز نہیں قاتا، است۔ (ملزم قانون کی محبوب اولاد ہوتا ہے۔) باہر نکلے اور اسے خود بچائیے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔“ سرگوشی میں بہاء اٹھ گئی۔

اسی پل پیچھے سے زمر آتی دکھائی دی۔ اور اگلے ہی پل وہ ٹھنکی۔ سرخ اسکارف والی لڑکی فارس کے سامنے بیٹھی تھی۔

فارس نے دبی زبان میں کچھ کہا (مجھے کچھ دن دو۔ کچھ دن کے لئے ان کو نالو) جو مزکور وہاں سے سنائی نہ دیا۔ لڑکی نے آہ میں اچکائے اور مژگی۔ زمر کے ابر و بھنپے۔ آنکھوں کی پتلیاں سکریں۔ وہ لڑکی کی چھوڑی جگہ پر آبیٹھی۔  
”یہ کون تھی؟“

وہ نگاہیں جھکائے سوچ میں گم تھا۔ مٹھیاں بھنپ رکھی تھیں۔ پشاوری چپل میں مقید پیر کا انگوٹھا مسلسل بلارہا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ مضرطہ تھا، مگر ضبط سے بیٹھا تھا۔

”میں پوچھ رہی ہوں یہ کون تھی؟“ اب کے وہ درمیانی شیشہ کھٹکھٹا کر زیادہ درشتی سے بوی تھی۔ فارس نے آنکھیں اٹھا میں، ایک سپاٹ اچھتی نظر اس پر ڈالی۔

”میری پرانی گرل فرینڈ تھی، کوئی مسئلہ ہے آپ کو؟“

زمر کو اس جواب کی موقع نہیں تھی۔ جبڑے بھنپے اور آنکھوں میں ناگواری عودہ آئی۔ بنا کچھ کہے سیدھی ہو کر بیٹھی اور خلک انداز میں بات کرنے لگی۔ فارس اسی طرح بیٹھا ہا۔ سُن، پریشان، شل، بے چین۔

جنیل سے نکلنے اور سعدی کے انگوٹھے کے بعد سے اب تک، اس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا۔ سب پلان کے مطابق باہم تھا۔ گرفتاری غیر موقع تھی مگر وہ اس کی تیاری پہلے کر چکا تھا۔ صرف ایک یقین دہانی تھی کہ باشم سعدی کو نہیں مارے گا۔ یہ یقین دہانی، بہضبوط، بہت پختہ تھی۔

مگر آج وہ نہیں رہی اور وہ بالکل شل بیٹھا تھا۔



وہ شہر ہجر عجب شہر پر تحریر تھا..... بہت دنوں میں تو آیا ترا خیال مجھے کولموں میں اس اوپنے ہوٹل کے اندر ہیرتہ ہانے میں میری کچن میں بزری کاٹ رہی تھی جب گارڈز اس کے پاس آئے اور اسے ہم کہا۔ وہ جیران سی ان کو دیکھنے لگی۔ پھر ان کے ساتھ چل پڑی۔ سیکورٹی چیک پاؤنس سے گزر کر وہ لفت میں داخل ہوئے جو ہوٹل کے کچن پل پیٹھری میں رکی۔ جب کسی کو آنا جانا ہوتا تو ہید شیف پیٹھری کو خالی کرایا کے وہاں پہر بیداری پکھڑا ہو جاتا تھا۔ پیٹھری کی دیوار کے اندر یہاں جانے کا راستہ ہے یہ وہاں کسی کو معلوم نہ تھا۔

میری کو جب کچن سے گزار کر دوں اور پر لے جا رہے تھے تو وہ گردن موز موز کرا دھرا دھر دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں حیرت اور تجھ تھا۔ اسے جہاز سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ("بلائیڈ فولڈ" کر کے) لا یا گیا تھا اور اتنے ماہ بعد وہ بالآخر اپنی روشنی دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اسے ایک کمرے میں لے آئے۔ میری بچپن تھاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ پیشیں طریقے سے آر است نہری تھیں میں سجا کرہ تازہ پھولوں کی مہک میں بس تھا۔ وہ سویٹ کے ایک حصے سے دوسرے میں چلتی آئی جو سنگ ایریا کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں ایک بڑے صوفے پر ناگ پٹا نگ جائے مکراتی ہوئی جواہرات بیٹھی تھی۔ تازہ بڈوں کس کے باعث اس کی جلد کھصن کی طرح ملائم اور دمک رہی تھی۔ سیاہ گلرہ بانگ ناپ اور سیاہ اسکرٹ میں ملبوس، بھورے بال چہرے کے ایک طرف ڈالے وہ بڑی شان سے بیٹھی تھی۔

"بیٹھو میری اسنجو! دوانگلیوں سے اسی شان سے سامنے کری کی طرف اشارہ کیا۔ میری متذبذب سی وہاں آ کر بیٹھی۔

"مسنگ کارداز میں...."

"نبیں میری۔ میں بولوں گی۔ تم سنوگی۔ آج یہاں تم بولنے کے لئے نہیں لائی گئی۔" میری نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

"میں ماضی کو نہیں کر دیوں گی، مگر تمہارے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ تم کیا کچھ جانتی تھیں، مگر تم نے ہاشم کے سامنے وہ باتیں نہیں دھرا کیں۔ میرا نہیں خیال یہ تم نے سعدی کے گرینڈ پلان میں مدد دینے کے لئے کیا ہے۔ تم نے یہ... میرے لئے کیا ہے۔ کیونکہ تمہیں تمہاری جاب واپس چاہیے۔ میں میری اسنجو....." سینے پر ایک انگلی سے دستک دی۔ مکراتی آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ "میں تمہیں تمہارا کھویا ہوا مقام واپس دلا دوں گی۔ تم قصر کاردار واپس آؤ گی اور میرے اشاف کی ملکہ تم ہی ہو گی۔ تم ہمیشہ سے یہ چاہتی تھیں کہ میں تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔ مجھے تمہاری وفاداری کا یقین آگیا ہے۔ اور نگزیب تمہارے بارے میں ٹھیک کہتا تھا۔"

میری بس یک نک، گنگ سی اسے دیکھے گئی۔

"وہ دونوں بھائے کا پلان کر رہے ہیں، میں جانتی ہوں۔ تم ان کا ہر پلان مجھے بتاؤ گی۔ تم میری، ان کو بھاگنے نہیں دو گی۔ صرف چند دن تک۔ پھر تم قصر کاردار واپس آ جاؤ گی۔ چاہوں تو ابھی لے جاؤں تمہیں، مگر جواہرات کاردار کا بھروسہ بھیک میں نہیں ملتا۔ اسے کمانا پڑتا ہے۔ تو تم اسے کماو۔ سعدی کی دوستی کو بھول جاؤ۔ اپنے حفظ ذات کے بارے میں سوچو۔ صرف اپنے بارے میں!" اور ہاتھ کو بنیازی سے لہرا کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ مکراتی نظریں اب بھی اس پر جمی تھیں۔ میری مرے مرے قدموں سے اٹھی اور واپس جانے کو مزدی۔

"تمہیں بتایا گیا تھا کہ یہ اٹھیا ہے۔ ہے نا؟" اس کے الفاظ پر میری چونک کرمزی۔

"مگر یہ سری نکا ہے۔ دیکھو لہاشم کو تم پر اعتبار نہ تھا، جانتا تھا تم سعدی کو جس بخ تباودو گی۔ مگر مجھے... اب... تم پر... بھروسہ... ہے!"

میری اسنجو بالکل لا جواب ہو گئی تھی۔ واپسی کا سفر اس نے شل دماغ کے ساتھ کیا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

حالت میری نہ مجھ سے معلوم کیجئے ..... مدت ہوئی ہے مجھ سے میرا واسطہ نہیں

کلب میں مدھم بتیاں جلی تھیں۔ موسیقی بھی مدھم تھی۔ بار کا ڈنٹر پر دونوں کہیاں رکھ کر اوپنے اسٹول پیٹھی شہریں بھرے ہوئے گلاس کے منہ پر انگلی پھیر رہی تھی۔ لگا ہیں بار ٹنڈر کے عقب میں کھڑے ریک پہ جائے، وہ کسی سوچ میں کم تھی جب دوسری سمت سے نوشیر وال آتاد کھائی دیا۔ وہ اکھرے تین تاثرات چہرے پر جائے، جیکٹ اتار کر ملازم کو دیتا، رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شہری کو دیکھ کر ابرو پھੱپھے۔ پھر اس کے قریب اسٹول پر بیٹھا۔ اس کے آگے جھک کر پھٹلی بجائی۔ وہ چونک کراس جانب گھوئی۔

آج اس کا الباس سیاہ تھا اور میک اپ قریباً نار د۔ آنکھوں تلے حلقوں چھپانے کے باوجود دکھائی دے رہے تھے۔ شیر دکو دیکھ کر تھے

تھکے انداز میں سنہری بالوں میں انگلیاں پھیسر کر ان کو پیچھے جھکا۔ ”تم کدھر؟“

”پریشان لگ رہی ہیں۔ وجہ؟“

”تمہارے بھائی کے ہوتے ہوئے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ بوجھل آنکھوں اور تکھی آواز میں کہتی گلاس کو دو گھونٹ میں خالی کرے گا، پرے دھکیل دیا۔

”میری بیٹی مجھ سے لے کپٹنی میں مجھے شیر زنبیں دیے۔ یہ مت کہنا کہ اس بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ میں شدید ذہنی انسان کا شکار ہوں۔ اوپر سے سونی کہہ رہی تھی، تمہاری ممی نے اسے کہا ہے کہ ہاشم جلد و سری شادی کرنے والا ہے۔ سب کے پاس اپنی اپنی زندگی ہے۔ ایک میں ہی قصرِ کاردار کے گردھنوئے کی طرح منڈلاتی رہتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے کپٹیاں سہلا کیں۔ ”اور کیا قسم، میرا؟ صرف یہی کہ سعدی سے ذرا سی دوستی تھی میری؟ کیا میں پوچھتی ہوں ہاشم سے کہ اس کی کس کس سے دوستی ہے؟ ہونہے۔“

مہینوں بعد.....نوشیر وال سعدی کے ذکر پر بے زانیں ہوا بلکہ آنکھوں میں عجیب چھپی سی درآئی۔

”کتنا اچھا ہوتا اگر یہ سعدی لوگ ہماری زندگیوں میں نہ آئے ہوتے شہری۔“ وہ نفرت کی آنچ لئے بولا تھا۔

”بالکل!“ اس نے گویا کراہ کر کہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ متفق نہیں ہو سکتی تھی۔

”وہ خاندان خود کو بہت پارسا سمجھتا ہے۔ جیسے وہ اچھے اور ہم برے ہیں۔ ہر وقت وہ دونوں بہن بھائی اپنے غرور میں نہ ہما دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ کیا ان باتوں پر گناہ نہیں ہوتا؟ کیا سارے گناہ امیروں کے ہوتے ہیں؟ یہ مذل کلاس لڑکے لڑکیاں..... یا اپنے اعتماد کی آڑ میں کسی کو کتنا ہرث کر جائیں، ان کو سب معاف ہے؟“

”کیا ہاشم نے سعدی کو دیے اس دن مجھے مارا؟ اس کے ساتھ وہ سلوک کیا؟ نہیں نا۔ اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ میرے بھائی کے غم مختلف تھے۔“

”کبھی کبھی دل چاہتا ہے شہری کہ ان کی انیکسی کو آگ لگا دوں۔ سعدی سمیت ان سب کو مار دوں۔ ایک ہی دفعہ یہ سارا خاندان مٹ جائے۔“ وہ فتنم مزاجی سے کہہ رہا تھا۔ ”آخر ہم قاتل ہی ہیں نا تو ہم قاتل ہی اچھے۔ بس یہ لوگ ہماری جان چھوڑ دیں۔ ہم سے“، ہلکے جائیں۔ یہ لوگ..... یہ لوگ کسی آسیب کی طرح ہیں۔ جب تک ہمارے ارگوڑر ہیں گے، ہمیں بربی خبر ہیں ہی ملتی رہیں گی۔ میرا باپ بھائی نا راضی حالت میں مر اصرف.... صرف انہی کی وجہ سے۔ میرے باپ کی موت کی وجہ بھی یہی لوگ ہیں۔“ وہ شدید کرب سے دھیرے دھیرے کہتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں تپش تھی، اور دل جل رہا تھا۔ شہری نے ناک سکوڑ کر شانے اچکائے۔

”وات ایور۔ ان کے مرنے سے میرے مسئلے تو نہیں حل ہوں گے نا۔“ بیہاں پر شہری کو اختلاف تھا۔

شیرو نے سر جھکا اور بار بند رکو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ حالانکہ اب اس کا دل کسی چیز کے لئے نہیں چاہ رہا تھا۔ باپ کے ذکرے ایک دم سب کچھ جلا دیا تھا۔



کلمبوکے اس سردا رخانوں تھے خانے میں میری انجیو خاموشی سے کچن میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اس کی نظریں کسی غیر مرلی نظر نہ پہنچی تھیں۔ اس کے سامنے سعدی کے کمرے کا دروازہ مغلنے نظر آ رہا تھا۔

دروازے کے پار..... وہ سینے پہ بازو دلپیٹے کھڑا اندھی سے خاود کو دیکھ رہا تھا۔

”مجھے یہ سب سیکھ کر کیا ملے رگا؟“ وہ بے زار ہوا۔ خاور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سعدی کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں سنجیدہ تھیں۔

”یہ سلیف ڈینیس کے لئے ہے۔ تم میری لاٹ لائی ہوئیں تھیں مرنے نہیں دینا چاہتا۔“ اس نے سعدی کے دونوں ہاتھ پکڑے، اور اس کو زوراً دھر کھینچ کر درست کھڑا کیا۔

”خاموشی کو سننے کی عادت ڈالو۔ خاموشی کو دیکھو۔ محسوس کرو۔ میرے ہاتھوں کو دیکھو۔“ وہ آہستہ آہستہ ہاتھ گھماتے ہوئے کہہ رہا تھا، اور سعدی الرث سا اس کو دیکھ رہا تھا۔

”اس کو روکو!“ اس نے ایک دم اپنا ہاتھ تلوار کی طرح سعدی کے بازو پر مارنا چاہا تو سعدی نے تیزی سے اپنی کلاں جوابی تلوار کی طرح اسکی کلاں سے ٹکرائی۔

”ہاتھ کو درست رکھو۔ ایسے۔“ وہاب اس کو کلاں سے پکڑے بولتے ہوئے سکھا رہا تھا۔

دفعتاً سعدی نے اس کے کندھ سے اوپر دیوار پر کچھ دیکھا۔ ”کیا یہ شان تم نے لگایا ہے؟“

”کیا یہ شان؟“ خاور نے چہرا موز کر دیکھا۔ وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے چہرہ جیسے ہی واپس پھیرا، سعدی کا زور دار مکا اس کے منہ پڑا۔ لمحے بھر کو اس کا دماغ گھوم گیا۔

سعدی نے مٹھی کو چہرے کے قریب لے جا کر اس میں پھونک ماری۔ ”واو۔ اب میں ہتر محسوس کر رہا ہوں۔ چلوڑینگ جاری رکھتے ہیں۔“

خلاف توقع خاور برآمانے بغیر سر جھنک کر واپس سامنے آ کھڑا ہوا۔

باہر بیٹھی میری ہنوز کسی گھری انڈھی سوچ میں گھمھی۔

ان سے دور.... برماؤ کی اس سردرات میں جیل کا وہ تاریک یہ رک خاموش پڑا تھا۔ فارس مسلسل، دائیں سے باکیں ٹہلتا شد یہ اضطراب کی حالت میں لگتا تھا۔ آتش دیوار سے لگا، اکڑوں بیٹھا، منہ میں کچھ چباتا اسے صبر سے دیکھا رہا۔

”ایک نصیحت کی تھی تھیں۔ دشمن پر ترس نہ کھانا۔ تم نے وہی کیا۔ اگر نہ کیا ہوتا تو آج جیل میں نہ ہوتے۔“ اس کا اشارہ اے ایس پی کی طرف تھا۔

”اس پر نہیں، اس کے بچ پر ترس آیا تھا مجھے۔ اور زیادہ دماغ نہ خراب کرو میرا۔“ سلاخوں تک رکا، دونوں ہاتھوں سے ان کو کچڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ چہرے پر بے بُسی اور آنکھوں میں غصہ تھا۔

”ایے نہیں ٹوٹیں گی یہ۔ جب تم پہلی دفعہ جیل میں آئے تھے بھی ایسے ہی کیا کرتے تھے۔ بڑے عرصے بعد پرانا غازی نظر آیا ہے۔“

”پریشان ہوں میں!“ وہاں کھڑا بے بُسی بھری بُھی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پیچھے زمین پر بیٹھا آتش مسکرا یا۔

”تم پریشان نہیں ہو۔ تم خوفزدہ ہو۔“

”ہاں میں خوفزدہ ہوں۔ وہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ وہ بچہ ہے۔ کم عمر ہے۔ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پہلی دفعہ لگا ہے کہ وہ اسے ما دیں گے۔“ پھر وہ تہیہ کر کے اسکی طرف گھوما۔ ”مجھے یہاں سے نکالو۔ اپنے آدمیوں سے کہو۔ مجھے باہر لے جائیں۔ میں اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔“

”چچچچ۔“ آتش نے افسوس سے سر کونی میں بلایا۔ ”بہت عرصے بعد پرانا غازی نظر آیا ہے۔ کیا سکھا یا تھامہیں جیل میں چار سال وہ تمہارے ہاتھ قید کر سکتے ہیں، تمہارا دماغ نہیں۔ باہر نکل کر کیا کرو گے؟ خاندان کے ایک لڑکے کو بچانے جاؤ گے اور باقی عورتوں کو پیچھے چھوڑ جاؤ گے؟ پولیس کیا کرے گی تمہارے گھر والوں کے ساتھ، ہم دونوں کو علم ہے۔ غازی..... ہاتھوں سے مت سوچو! دماغ سے سوچو!“

فارس با میں ہاتھ سے کپٹی مسلتا سر جھکائے کھڑا رہا۔ کتنی ہی دیر۔

”کہتے ہو تو تمہیں باہر نکال دیتا ہوں، لیکن یہ عقلمند نہیں ہوگی۔ دماغ سے سوچ، تم اس وقت اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

فارس سلاخوں سے ما تھا بیکے، آنکھیں مندے کھڑا رہا۔ پھر اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ اس نے چہرہ اٹھایا۔ سنہری آنکھوں میں سوچ تھی۔ محنثی گھری سوچ۔

”شوکت کہاں ہوتا ہے آج کل؟“ اس نے بدلتی ہوئی، ٹھہری ہوئی آواز میں آتش سے اس کے ایک پرانے ساتھی کا پوچھا۔

”جہاں بھی ہے، تمہارا کام کل ہی کر دے گا۔ بول کیا کام ہے؟“ وہ دل سے خوش ہوا تھا۔ اسے پرانا غازی نہیں پسند تھا۔ اسے یہ والا غازی پسند تھا۔

❖❖❖

کے خبر کہ تمہرے خاک آگ زندہ ہو..... ذرا سی دیر ٹھہر اور دیکھ بھال مجھے سرمائے دھنڈلکوں میں انیکی ڈوبی کھڑی تھی۔ حین خوابیدہ چہرے کے ساتھ کچکن کی گول میز پہ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ وہ اب بھی فجر کے لئے نہیں اٹھتی تھی۔ الارم بھی نہیں لگاتی تھی۔ الارم کے باوجود نہ اٹھی تو؟ ڈر لگتا تھا۔ مگر باقی کی چار نمازیں پڑھنے لگی تھی۔ پچھرنے کہا تھا کہ جس وقت بھی اٹھو، فجر پڑھلو۔ وہ ساڑھے سات بجے فجر پڑھ لیتی تھی۔ قضا اور روشن۔ مگر گلٹ کم تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر ادھر ایک سرسری نظر دوڑا۔ زمر سیاہ کوٹ میں ایک فائل پڑھتی چائے پی رہی تھی۔ بالکل منہک سی۔ اسماء اسکوں یونیفارم میں ناشتہ جلدی جلدی کر رہا تھا۔ ندرت بھی تیزی سے کام کیتی، ریشور اسٹ جانے کی تیاری میں تھیں۔

ایک میں ہی ہوں، عالمی اور نا کام! اس کا ڈپریشن بڑھنے لگا۔ ست روی سے لقے زہر مار کرنے لگی۔ تبھی بیل ہوئی۔ ندرت باہر کو پکیں۔ حین کو صداقت کی آواز سنائی دی تھی۔ (اسے گاؤں سے آج صح و اپس آنا تھا) وہ سر جھکائے کھاتی رہی۔ تبھی اسماء اس کے قریب کھکا۔

”بھا بھی آنہیں رہی۔ بھا بھی آنگی ہے۔“ حمه نے چونک کر سر اٹھایا۔ دور سامنے، داخلی دروازے پر ندرت مسکرا کر صداقت اور اس کے ساتھ ایک لڑکی کو خوش آمدید کر رہی تھیں۔ صداقت کی عمر کی (یعنی حین سے چھوٹی) سانویں، دبلي پتی باؤں کی کس کر چوٹی کیے، مگر تھوڑا اس سنبھلی زیور پہنچ وہ گاؤں کی مزار عن جسمی لگتی تھی، مگر صاف ستری اور اچھی تھی۔

”حمه.... صداقت کی بیوی کا نام کیا ہوگا؟ امانت؟“ سیم پھر اس کے کان میں گھسا۔

”اور ان کے بچوں کا خیانت۔ خباثت!“ دونوں بہن بھائی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے۔ زمر نے نکاہ اٹھا کر ان کو دیکھا تو ان کی مسکراہست فور اسٹ گئی۔

اس کا نام امانت نہیں تھا، حسین تھا۔ سیم نے تو خیر بخشل بھی کا گلا گھونا مگر حین کھانی کے بہانے تھوڑا بہت بنس گئی۔ خیر سب نے اٹھ کر حسینہ بی بی کو خوش آمدید کہا۔ ندرت نے جانے سے پہلے اسے پکنی دکھایا، کام سمجھایا (اب آنگی ہے تو کیا خڑے اٹھانے۔ پہلے دن سے کام پر لگے گی تو آگے عادت ہوگی۔) اور پھر یکے بعد دیگرے سب گھر سے رخصت ہو گئے۔ صداقت نیچے بڑے بائے کمرے میں چلا گیا اور حین سائیں سائیں کرتے خاموش گھر میں ادھر ادھر ٹہلی، بالآخر ادھر پر اپنے کمرے میں آنگی۔ ایک ست نظر درود یوار پڑا۔ یہ کمرہ اتنا بکھرا کھرا کیوں لگتا تھا؟ جیسے چیزوں کا راش لگا ہے۔ مگر کہاں سے صفائی شروع کرے اور کون کرے؟

پکھ دیر بور ہوتی رہی پھر نیچے آئی تو حسینہ دوپہر کے، کچک صاف کر رہی تھی۔ لمحے بھر کو حد سیر ہیوں کے اختتام پر ٹھہری گئی۔ کچک کا ڈنٹرا بھی صاف نہیں کیا تھا اس نے، میلے برتن اکٹھے کر کے سنک میں رکھے تھے اور فرش کا جھاڑا دلگایا تھا۔ مگر کچک جس کو وہ اس ایک

بختے میں رگرگر تھک گئی۔ وہ کچن یکدم چکنے لگا تھا۔ صاف سترہ انھر انکھرا۔  
وہ ابھی ہوئی سی اور پن کچن کے دہانے پہ آرکی۔

”یتم نے.... کیسے صاف کیا؟“ تذبذب سے بولی تھی۔ ڈست بن کا نیا شاپر لگاتی حسینہ مژدی اور مسکرا کر اسے دیکھا۔  
”باجی اللہ جہنم رسید کرے میری پھیپھی کو بڑی ہی کوئی فتنہ عورت تھی، وہ....“  
”اے.... ایسے نہیں کہتے فوت ہوں کو“ وہ ڈپٹ کر بولی۔

”بجی باجی مگر وہ پوری فوت نہیں ہوئی۔ بدرجہ اب بھی پورے گاؤں میں منڈلاتی ہے،“ مگر ایک بات وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ  
شانو.... شانو مجھے پیار سے بلا تے ہیں.... وہ کہتی تھی، شانو؛ جب تک کسی کمرے کے چاروں کونوں سے رگرگر گند یا چیزیں نہ نکالی جائیں  
تب تک کمرے کی لاکھ صفائی کرو، صفائی نہیں لگے گی۔ فرش کے کونے صاف کیے میں نے اور اس شیلف (کاؤنٹر ناپ کے لیے پنڈ میں  
بولے جانے والا لفظ) کے کونوں میں رکھی ساری چیزیں اٹھائیں۔ باجی؛ جب کونے خالی ہو جائیں تو صفائی ہوتی ہے۔ کونوں کو ہمیشہ خالی رکھنا  
چاہیے۔ اب دیکھیں ناباجی، ہیں ہم گاؤں کے لوگ، مگر یہ باتیں صرف ہم، ہی لوگ جانتے ہیں، ورنہ آج کل کے موئے کمپیوٹر تو یہ باتیں نہیں  
سکھا سکتے۔“ ایک سوال کیا پوچھ لیا، تازہ تازہ اسلام آباد آئی میارن کو اپنا حساسِ کتری چھپانے اور رعبِ ذائقے کا موقع مل گیا۔ عام حالات  
میں خنین بہت کچھ کہتی (مثلاً یہ صداقت گاؤں میں جا کر سب کو بتاتا ہے کہ ماں کی بیٹی سارا وقت کمپیوٹر پر پیٹھی رہتی ہے؟) مگر.... اس حسینہ  
نے ایسی بات کہہ دی تھی جو خدا کے دل کو ایک دمِ حنجور کر کر کھوئی تھی۔

”غلط! بالکل غلط!“ وہ کسی خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ ”تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ کمپیوٹر انسان کو کیا کچھ سکھا سکتے ہیں۔“  
یہ کہتے ہوئے وہ فوراً اپس اور پر کو بھاگی پھر رکی۔

”سنؤ زیادہ باتیں نہ بنایا کرو۔ ہمارے گھر میں زیادہ بولنے والوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اور دھیان سے کام کرو۔“ رعب سے ڈپٹ  
کر تیز تیز سر ہیاں چڑھتی گئی۔ (حسینہ بڑ بڑا تے ہوئے جھاڑا دینے لگی۔)  
اپنے اور ندرت کے کمرے میں آ کر حنف فرش پر پیٹھی اور بیدھ پر لیپ ناپ رکھ لیا۔ گوگل صاحب اپنا خالی چوکھا لئے مسکرا کر اس کو  
دیکھ رہے تھے۔

صداقت کی شادی کے دنوں میں جب اسے گھر صاف کرتے وقت اپنی غلطیاں سمجھنہیں آتی تھیں تو سوچا اسی سے پوچھے (مگر اسی  
ڈانٹیں گی کہ جب پہلے کہتی تھی، تب کیوں نہیں سننا؟) کبھی سوچا بڑے ابا کو فون کرے (اوہہوں۔ پھر تو ان کی اخلاقی قیمت ہو جائے گی کہ پوتی نکمی  
ہے۔) کبھی خیال آیا۔.... زمر (مگر یہاں اتنا آڑے آگئی۔) سہم سے پوچھنا اپنی بے عزتی کروانے کے متراوٹ تھا۔ صرف سعدی تھا جو سب کی  
ستا، سب کی مدد کرتا تھا مگر سعدی نہیں تھا۔

لیکن گوگل بھی تو تھا۔ اس کا پرانا دوست۔

اس نے پوچھا (کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے) کیسے رکھا جائے اپنے کمرے کو صاف اور آرگنائزڈ؟  
لمحہ ہر میں جو بات نگاہوں کے سامنے چکنے لگتے تھے، اور یہ پہلی دفعہ تھا جب حسین ذوالفقار یوسف خان نے وہ دنیا دریافت کی تھی  
جو گھر سے باہر نہیں تھی بلکہ وہ جو گھر کے اندر تھی۔

”صاف لڑکی وہ ہوتی ہے جو گند الماریوں میں نہ پھیکنے بلکہ ڈست بن میں پھیکنے۔“ گوگل اسے سمجھا رہا تھا۔ اپنی الماریوں سے  
شروع کرو۔ سارا سامان.... اور سارے سے مراد ہے.... سارے کا سارا سامان باہر نکالو۔ تین ڈبے بناؤ۔ ایک روپی کا۔ ایک خیرات کا۔ اور  
ایک وہ جو تمہارا ہے۔“ وہ شاید گھنٹہ بھر بالکل سن سی، یک نک پڑھتی رہی، پھر اس نے آستین اور پر چڑھائے دو پٹھے کسا، بال باندھے۔ ایک عزم

سے اپنے کمرے کو دیکھا۔ آنکھوں میں چمک لئے وہ اوپنے سابوی تھی۔

”میں اس ملک کی سب سے آرگناٹرڈ ڈڑکی بننے جا رہی ہوں۔“ (شکر ہے سیم نہیں تھا، ورنہ انہاں تھا کہ بس!)

خین، ہیشہ سمجھتی تھی کہ گھنڈڑی کیاں وہ ہوتی ہیں جو چھوٹی سے چھوٹی چیزیں سنبھال کر رکھتی ہیں۔ غلط۔ وہ کہتوں اور گندی لڑکیاں ہوتی ہیں، کیونکہ سنبھالنے کے لئے رکھی چیزوں میں سے اکثر ”گند“ ہوتی ہیں۔

اس نے الماریاں خالی کیں۔ درازا لئے۔ شیف کا سامان بھی فرش پر ڈھیر کیا۔ چیزیں، چیزیں، چیزیں۔ ہم بذاتِ خود کتنی گندی میںیں قوم ہیں۔ روڈی سے الماریوں کو بھر کر رکھتے ہیں۔ مگر اب مزید نہیں۔

گوگل نے کہتا تھا، ہر دیجیٹر جو تم نے پہچھلے دوسارے استعمال نہیں کی وہ پھینکو۔ قابلِ استعمال چیزیں خیرات کر دو، اور صرف ضرورت کی چیزوں والیں رکھو۔ اس نے بھی تین ڈھیر لگانے شروع کیے۔ میک اپ کا ایکسپریس پرانا سامان، پرانی چوڑیاں، پرانے کپڑے، کاغذ، کاپیاں، کتابیں، جو تے، سوکھے ہوئے قلم، خالی ڈبے۔ اف انگند۔ جب اس کے تینوں ڈھیر مکمل ہوئے اور وہ انھی تو کرد کھڑی تھی، مگر حسینہ کو آواز دی (انا!) خود رہی کوڑے والے بڑے سیاہ شاپروں میں سب ڈالا اور باہر رکھا۔ پکن سے اخبار میں اٹھا کیں اور اپنی الماریوں میں بچھائیں۔ شیف صاف کیے۔ چیزیں درست کر کے جوڑ کے رکھیں۔ دراز صاف اور ہلکے ہو گئے۔ جب ساری الماریاں اور دراز اندر سے صاف ہو چکے تو وہ جالوں والا ڈنڈالی، ہر کونے سے جالے صاف کیے۔ گوگل کہتا تھا، پھول جھاڑو سے دیواروں پر بھی جھاڑو لگاؤ۔ جو حکم۔ وہ بھی کیا۔ پھر گلی اخبار سے شیشہ صاف کیا۔ گلے کپڑے سے ڈسٹنگ کی۔ جھاڑو لگایا۔ صوفے اور پلنگ دھکیل کر اور بالخصوص کنوں سے جھاڑو لگایا۔ رگ کو دیکیم کیا۔ فرش پہ پوپ لگایا۔ (موپ دھونے کی ہمت نہیں تھی وہ ایسے ہی کچن میں حسینہ کو دے آئی)۔ اب (ٹوٹی کمر کے ساتھ) واپس آ کر کرہ دیکھا تو طمانتی کا احساس ہوا۔ مگر ہاں نید شیث رہ گئی۔ جلدی سے اسے تبدیل کیا۔ اف سب انداز کھر گیا تھا۔ صاف چمکتا ہوا۔ گردن انھائی تو دل دھک سے رہ گیا۔ پنکھے پہ جالے تھے۔

اوہ نو۔ وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر کراہی تھی۔ اب اگر اپر جالوں والا جھاڑو مارا تو سارے کمرے کی صفائی کا بیڑہ غرق ہو جانا تھا۔ کیا کرے؟ دوڑ کر گوگل سے پوچھا۔ جواب پا کر سکھ کا سانس لیا۔ کمرے کے وسط میں میز پھینک کر رکھی، اور پرانا تیکے کا کور لئے اوپر چڑھی۔

ایک ایک پہ باری باری کو چڑھایا، اور رگڑ کر جالے اس کے اندر اتار لئے۔ پنکھا گزارے لائق صاف ہو گیا۔ جالے نیچے بھی نہیں گرے۔

اب جب نیچے کھڑے ہوئے خین نے گردن گھاٹھا کر اپنے کمرے کو دیکھا تو دل میں سکون سا بھر گیا۔ ایک تشفی کا احساس تھا کہ یہ کمرہ اندر تک الماری کے دروازوں اور نہاں خانوں تک صاف سترہا ہے۔ صفائی کا احساس... طمانتی... انمول ہوتی ہے۔ اس سارے میں اس کی حالت شدید گرگوں ہو چکی تھی مگر وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔ صاف استری شدہ کپڑے نکالے۔ نہاد ہو کر، بال برش کر کے پر فیوم لگا کے نماز پڑھی، نیچے جا کر کھانا کھایا اور پھر کمرے میں آ کر کمبل تان کر سو گئی۔ بڑی کوئی میٹھی نیند تھی جو اس وقت اسے آئی تھی۔

خین کی آنکھ باتوں کی آواز سے کھلی تھی۔ بمشکل اس نے آنکھیں کھولیں اور کمبل ہٹا کر دیکھا۔ مغرب ہو چکی تھی اور کمرے کی بتیاں جل تھیں۔ وہاں اساما اور ندرت کھڑے زمر سے بات کر رہے تھے جو کوٹ اور پرس اٹھائے چوکھت میں کھڑی ستائشی انداز میں کہر رہی تھی۔ ”واقعی بھا بھی، اس نے آج بہت کام کیا ہے۔ آپ کا کمرہ تو چمک رہا ہے۔“ خین نے پلکیں جھپکیں۔ کہنی کے مل انھی۔ (کمرا بھی تک اکڑی ہوئی تھی۔)

”پنکھا، لامس، ہر شے صاف کی ہے۔ الماریاں تک جوڑی ہیں۔“ ندرت کی آواز میں ستائش تھی۔ حنخ خوابیدہ آنکھوں اور بیوی پر ”سوم مسکراہت کے ساتھ انہی بیٹھی۔ دل بیویوں اچھلنے کا تھا۔ ادھر اسامہ کہہ رہا تھا۔

”واہ امی۔ یہ صداقت بھائی کی بیوی تو بہت اچھا کام کرتی ہے۔“

حنین کا منہ کھل گیا۔ وہ یکدم بالکل شل ہو گئی۔ زمرنے اسے انتھتے دیکھ لیا تھا۔ تبھی پکارا۔ ”حنین، تم نے اپنی نگرانی میں اس سے مفاسی کروائی تھی نا؟ دیے صداقت سے کہیں زیادہ سیقہ شعار ہے یہ لڑکی۔ آئی ایم اپریسٹا!“

حنین کے اوپر سے گویا ٹرک گزر گیا تھا۔ وہ سب اب بار بار حسینہ کی تعریف کر رہے تھے۔ ڈھیروں آنسو ہم کے حلق میں جمع ہوئے۔ آنکھیں ڈبڈ بانگنیں۔ وہ ایک دم سے رخ موڑ کر مکمل تان کرو اپس لیٹ گئی۔

اگر اس وقت وہ دفاع میں ایک لفظ بھی کہتی تو اسے پتہ تھا وہ رونے لگ جاتی۔ سوکمل کے اندر خود کو چھپالیا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

کہاں سے لا کیں بھلا ہم جواز ہم سفری ..... تجھے عزیز ترے خواب، اپنا حال مجھے  
اس چمکیلی مگر خندڑی دو پہر آبدار عبد اپنی رہائشگاہ کے گیٹ سے کارنکال رہی تھی جب ٹھنک کر رکی۔ ایک شخص وہاں منتظر سا کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک ڈبک پکڑ کر تھا جسے لہراتے ہوئے وہ کارنک آیا۔ آبی رکی، مگر شیشہ نہیں کھولا۔ اس نے قریب آ کر ڈبہ دکھایا۔ اوپر فارس غازی کا نام لکھا تھا۔ آبدار نے تیزی سے بیٹک کھوئی اور باہر نکلی۔ گیٹ پر مامور گارڈ اس طرف آنے لگے مگر اس نے ہاتھ انداختا کر کان کو پلت جانے کا اشارہ کیا اور خود اس شخص کی طرف مڑی۔

”یہ فارس غازی نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔“ اس نے ڈبہ بڑھایا۔ آبی نے تیکھی نظر دوں سے اسے دیکھتے ڈبہ تھاما۔ وہ فوراً پلٹ کر اپنے موڑ سائکل کی طرف چلا گیا۔

کچھ دری بعد وہ وہاں سے دوڑا۔ ایک ہاپسٹل کے پارکنگ ایریا میں کارروں کے اندر بیٹھی تھی۔ اور ڈبہ کھلا پڑا تھا۔ اندر ایک لکڑی کا چھوٹا سا پین کیس تھا، اور اوپر ایک چٹ رکھی تھی جس پر ایک نمبر درج تھا۔ وہ سوچتی رہی۔ بالآخر اس نے موبائل نکالا اور وہ نمبر ڈال کیا۔ پہلی گھنٹی پر کال مل گئی تھی۔ بھاری مگر دھیمی مردانہ آوازنائی دی تھی۔

”میرا پارکسل مل گیا؟“ آبدار کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”کیا آپ کی جیل میں پانچ کلو میٹر تک موبائل جیسے زندگیں لگے ہوتے؟“

”ہمیں جیسے زکوڈھوکہ دینے کے سو طریقے آتے ہیں۔ کیسی ہیں آپ؟“

”کنفیوز ہوں۔ اس پین کا کیا کروں؟“ اس نے لکڑی کا کیس کھولا۔ اندر پلاسٹک میں لپٹا نہری قلم رکھا تھا۔ وہ بال پین تھا جس کو پیچھے سے دبانے پر نب بار نکلتی تھی۔

”اے مت چھوئیں۔“ وہ جلدی سے بولا تھا۔ ”اس میں سائنائز ہے۔ زہر۔“

آبدار نے جلدی سے کیس بند کیا۔ خوبصورت پیشانی پر لکیریں ابھریں۔ ”میں اس کا کیا کروں؟“

”یہ اسے دینا ہے۔“ وہ دھیما سا بولا۔

”وہ اس کا کیا کرے گا؟“

”دفاع از خویشتن!“ (دفاع ذات!)

”آپ تو فارسی بھی بولتے ہیں۔“ مگر پھر وہ برہم ہوئی۔ ”میں اپنے باپ کو دھوکہ دوں، ہاشم سے دغا کروں، میں الاقوامی قوانین توڑ

ول اور سکھوئی کو بائی پاس کر کے یہ قلم اس تک پہنچا ہوں یہ کرنے کا حکم دے رہے ہیں آپ مجھے؟“  
”میں صرف درخواست کر رہا ہوں۔“ وہ زمی سے بولا تھا۔ اپنی بیر کر میں دیوار سے لگا کھڑا وہ آستین موڑے فون کان سے لگائے  
کھرد رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہ بڑی وہ غصہ وہ بے نی سب مفقوہ تھا۔ وہ بالکل پر سکون تھا۔  
آبدار کے تنے نقش پھر سے ڈھیلے پڑے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا دی۔

”اور میں یہ کیوں کروں گی؟“

”بدلے میں میں بھی آپ کے لئے کچھ کروں گا۔“

”مشلاً کیا؟“ وہ شرارت سے نچالاب دبا کر بولی۔

”جو آپ کہیں۔“ وہ بھی مسکرا یا تھا۔

”آپ میرے ساتھ چائے پیں گے؟“ کہہ کر اس نے بے اختیار دانتوں تلے زبان دبائی اور خفت سے آنکھیں میچیں۔ بیر ک  
میں کھڑے فارس کے ابر و تجہ سے اکٹھے ہوئے۔

”چائے؟“

”ودفعہ انکار کیا آپ نے چائے کے لئے۔ ایک تب جب آپ پہلی وفعہ ادھر آئے اور ایک تب جب ہم ایسیں ایجھے اوصاح کے  
کمرے میں ملے تھے۔“

وہ بہکساہنسا۔ سر جھکائے، نفی میں گردن جھکلی اور جوتے سے زمین کو مسلتے بولا۔ ”میں شادی شدہ آدمی ہوں، آبدار بی بی!“

”پھر تو آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ ترنت بولی۔

”اوکے... میں آپ کے ساتھ چائے پیوں گا، اگر میں باہر آیا تو۔ مگر آپ یہاں کو دے دیں گی۔“ فارس نے زمی سے یاد کرایا۔

”لیکن جب میں اس سے مل لوں گی تو فضیح کو دیا وقت ختم ہو جائے گا اور وہ اس کو مار دے گا۔“

”جو میں کھرد رہا ہوں آپ وہی کریں۔“ اس کی آواز سنجیدہ اور بے پلک تھی۔ آبی نے مسکرا کر شانے اچکائے۔

”آپ کو اچھا لگتا ہے یہ کرنا؟“

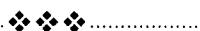
”کیا کرنا؟“

”جیل میں بیٹھ کر خود مقید ہو کر بھی ہم سب کو نشوون کرنا۔“

”میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ شرافت سے قید کے دن کاٹ رہا ہوں۔“ وہ سادگی سے بولا۔ بیوں پسکراہٹ پھر سے درآئی تھی۔

آبی مسکرا دی۔ ”میں اس جیل صرف اس لئے گئی تھی کیونکہ میں وہ جگد دیکھنا چاہتی تھی۔ دوبارہ بھی میں ادھر نہیں جانا چاہتی تھی۔  
مگر... (ٹھنڈی سانس بھری) آپ کے لئے میں یہ کروں گی۔“ وہ فون بند کرنے لگی جب اس نے پکارا۔ ”آبدار۔“ وہ ٹھہری۔

”تحمینک یو!“ وہ ٹھہرے ہوئے لبھ میں بولا تھا۔ آبدار عبید کو نہیں معلوم وہ کیوں مسکرا رہی تھی مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ ایک دم سے  
ساری دنیا خوبصورت لگنے لگی تھی۔



.....  
شہر آباد کر کے شہر کے لوگ ..... اپنے اندر بکھرتے جاتے ہیں  
دو پہر کی نرم نہری کر نیں قصرِ کاردار کی اوپرچی کھڑکیوں سے چھن چھن کر اندر گر رہی تھیں۔ لاونچ میں کنارے پہ کھڑکی کے آگے  
شاہانہ کرسی پہنچی جواہرات کر دفر سے ناک سے کمھی اڑا کر بولی تھی۔ ”اور بھی کچھ کھرد رہے تھے تم۔“

”آپ کا اس بفتے ایک Photo Op کرتا ہے۔ زرزلہ متأثرین کے ساتھ۔“ وہ ساتھ والی کرسی پر بیٹھا پنے سیل فون پر کچھ چیک لرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”احمر کیا یہ بہت مصنوعی نہیں لگ لگا؟“

”مسز کاردار۔ سب کو معلوم ہے کہ Photo Ops جھوٹ اور بکواس ہوتے ہیں، لیکن اس جھوٹ کو پیش کرنے کے لئے مہارت ہوئی چاہیے۔ جو جتنا اچھا جھوٹ بولتا ہے، اس کا فون و اوپ اتنا ہٹ جاتا ہے۔ اسی لئے آپ نے مجھے ہاتھ کیا ہے نا۔ سو مجھے اپنا کام کرنے دیں۔“ وہ خل سے کہہ رہا تھا۔ جواہرات نے جواباً ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ تھپکا۔ ”جو تم کہوا!“

لاڈنخ کے ان ڈور پلانٹ کو پانی دیتی فیجن نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کروہ منظر دیکھا اور پھر ناخوشی سے ناک سکوڑتی واپس کام کرنے لگی۔ وہ جواہرات کا اب صرف پی آر انہیں تھا۔ نہ ہی وہ صرف اس کا مجھ کسلنٹ رہا تھا۔ وہ اس کا ”بادی میں“ بتا جا رہا تھا۔ باہر لان میں کار رکی، دروازے کھلے اور ہاشم کاردار کوٹ کا بٹن بند کرتا باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ آنکھیں سامنے اونچے قصر پر جمائے چہرے پختی اور برہنی طاری کیے ساتھ نکلتے رہیں سے بات کر رہا تھا۔

”یہ میں جانتا ہوں کہ وہ بیٹھی کی صفائح کے لئے واقعی کورٹ گیا تھا۔ مزید کیا معلوم ہو سکا ہے؟“

”سرفاطی نے پچھلے تین ماہ میں چار دفعہ ہمارے جانے والے ایک کورٹیر کے ذریعے کرنی بابر لانڈر کروائی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے اٹاٹے باہر منتقل کر رہا ہے۔ وہ اپنی بیٹھی کے نام پر ایک گھر بھی بارسلونا میں قسطنوں میں خرید رہا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ پھر یہ نثارات کے ساتھ نتا براہم کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ رہیں اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔

”کیا اس سے بات کریں گے آپ؟“

”تمہاری جگہ خاور ہوتا تو یہ بھی نہ پوچھتا۔“ وہ کہہ کر لمحے کو کا پھر سر جھٹک کر اور پڑھتا گیا۔ ”ابھی اس پر نظر کو۔ صرف نظر۔“ وہ اندر آیا، اور اس ایک سرسری نظر مان اور اس کے بادی میں پڑاں کر اور پڑھا گیا۔ کچھ دیر بعد جب فریش ہو کر شرٹ اور ٹراؤزر ز میں ملبوس، آرام دھیلیے میں نیچے آیا تو جواہرات تہبا تیٹھی تھی۔ وہ احرم کی چھوڑ کری پہنچنے لگا۔ ناگ پٹا ناگ جما۔

”آپ نے کال کی تھی۔ کوئی اہم بات تھی؟“

”ہوں۔“ جواہرات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ خاور والے سارے مسئلے کے بہت دن بعد وہ بالآخر ذاتی طور پر پرکون ہوتا نظر آ رہا تھا۔ جواہرات نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھپکا۔

”ہاشم..... شہری اور تمہاری ڈائیورس کو دوسال ہونے کو آئے ہیں۔ سعدی، خاور وہ سارے مسئلے بھی حل ہو گئے ہیں۔ فارس بھی قصہ پاریسہ ہو گیا۔ اب آگے بڑھنے کا وقت ہے۔ نئی زندگی شروع کرنے کا وقت ہے۔“

”آپ چاہتی ہیں کہ میں شادی کر لوں۔“ وہ ہلکا سامسکرایا تھا۔

”بالکل۔ اور اب تمہیں جلد فیصلہ کرنا ہو گا۔ مجھ سے مسز شاستہ ذکی نے کہا ہے کہ ان کے بیٹھے کے لئے ہارون کو پیغام بھجواؤں۔ اگر ہارون، آبی کے لئے انٹر سٹڈ ہوا تو مسز شاستہ ذکی باقاعدہ پر پوزل دیں گی۔ لیکن اگر تم آبی میں دلچسپی رکھتے ہو تو کوئی فیصلہ کرلو۔“ وہ بہنے کے ساتھ زمزی سے اس کے ہاتھ کو تھپک بھی رہی تھی۔

ہاشم نے گھری سانس لے کر تنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وہ بولا کچھ نہیں، مگر چہرے پر سب لکھا تھا۔

”میں دیکھ سکتی ہوں کہ آبی کے لئے کسی اور کا پر پوزل آتا دیکھ کر تم ڈشرب ہوئے ہو اس لئے... فیصلہ کرلو۔“ ہاشم نے نظر اٹھا کر جواہرات کو دیکھا اور ذرا سامسکرایا۔

”وقتی... اب آگے بڑھنے کا وقت ہے۔“

سینہ ہیوں کے اوپر.... کمرے کے آگے بنی ریلگ پکھڑے نوشیروان کا حلقت تک کڑوا ہو گیا تھا۔ آبدار؟ وہی آبدار؟ وہ شدیدنا خوش نظر آنے لگتا۔

❖❖❖

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات..... سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں اس روز سردی پکھڑ زیادہ ہی تھی۔ کمرہ عدالت میں بیشہ جل رہا تھا۔ زمر سرخ پڑتی ناک کے ساتھ اپنی میز پہنچی، گواہ کے بیان کو سنت کاغذ پکھڑ لکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بخاری حدت سے گلبی پڑ رہا تھا۔ آنکھوں تلے حلقت تھے۔ فارس گاہے بگاہے نظر انداز کراں کو دیکھتا تھا۔ وہ گوکر پہلے کی طرح پر سکون تھا مگر اس کو دیکھتے ہوئے آنکھوں میں فکر مندی در آتی تھی۔ ذرا سا اس کی طرف جھک کر بولا۔

”طبعیت نہیں تھی تو ساعت میں نہ آتیں۔ اگلی تاریخ کا انتظار کر لیتیں۔“

زمر نے ملامتی نظر وہن سے اسے دیکھا۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہاری روز رو شکل دیکھنے کا۔ مگر جو تمہارے گھروالے ہیں نا، وہ بہت پریشان ہیں۔ چاہتے ہیں تم جلد رہا ہو جاؤ۔ تمہاری توعادت ہے جل جانا۔ تمہیں فرق نہیں پڑتا لیکن ان کو پڑتا ہے۔“

فارس نے سکون سے اس کی بات سنی۔ ”وہ میری گرل فریند نہیں تھی۔“

”جیسے مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔“ سر جھٹک کروہ کٹھرے کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ مسکراہٹ دبائے خاموش ہو گیا۔ کٹھرے میں اب کی بار ایک درمیانی عمر کی عورت کھڑی تھی۔ سانوا مگر سمجھیدہ چہرہ، نفس لباس، اور انھی ہوئی گردن۔ اس کے سامنے کھڑا پر اسکیوں ترسوال کر رہا تھا۔

”مقتول... یعنی آپ کے شوہر... قمر الدین صاحب..... فارس غازی کا ذکر آپ سے کرتے تھے؟“  
”جی۔“

”آب جیکشن یور آزر۔ heresay۔ (کسی سنائی بات)“ زمر نے بے زاری سے آواز بلند کی، ساتھ ہی زکام زدہ سانس ناک سکوڑ کر اندر کھینچی۔

”یور آزر مقتول کی بات کی اہمیت سے دفاع کیسے انکار کر سکتا ہے۔“  
”اوور ولڈ!“ نج نے پر اسکیوں ترسوال کی پوری توجیہہ سننے کی رحمت بھی نہ کی اور ناگواری سے زمر کا اعتراض روکیا۔ وہ شدید کینہ پر در نظر وہن سے ان کو دیکھتی رہی۔ فارس بار بار ایک خاموش نظر اس پر ڈالتا تھا۔

”جی وہ اکثر فارس غازی کا ذکر کرتے تھے۔“ اب وہ فارس اور اس کی دشمنی کے متعلق کورٹ کو آگاہ کر رہی تھی۔ زمر جھکائے کچھ لکھتے ہوئے سختی رہی۔ اپنی باری آنے پر وہ انھی اور اتنے ہی برے موڑ کے ساتھ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”مسنون الدین..... مقتول چند دکانوں کے مالک تھے اچھا خاصا پیسہ چھوڑ کر گئے ہیں۔ ان کی موت کے بعد وہ پیسہ کس کو ملا ہے؟“  
”وہ شرعاً تقسیم کیا گیا ہے۔“ خاتون سنجیدگی اور بردباری سے بولی۔

”چونکہ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی تو وہ رقم آپ کے اور مقتول کی بہن کے حصے میں آئی ہوگی۔“  
”جی بہاں۔“

”مقتول کی بہن کے شوہر آپ کے بھائی ہیں۔ وہ پچھلے ماہ گواہی دینے کے لئے آئے تھے۔ وہ مقتول کے سامنے اور بہنوئی دونوں ہیں۔ کیا یہ درست ہے کہ آپ کی وٹے سٹے کی شادی تھی؟“

”جی۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قمر الدین صاحب کی تمام پارٹی آپ کو اور آپ کے بھائی کو ملی ہے۔“ سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے ہیں ام نے سادگی سے بچھا۔

”آب جیکشن یور آز!“ پر اسکی یو ٹریزی سے اٹھا۔

”مسنیڈ!“ تج صاحب نے تنیسہ بھری نظر زمزدہ الی۔

”مسنیڈ قمر الدین!“ وہ گہری سانس لے کر اس کی طرف گھومی۔ ”کیا آپ کا اور قمر الدین صاحب کا کوئی جوانش مبنیک اکاؤنٹ

”جی، ہے۔“ وہ چونکی تھی۔

”اور کیا جن دونوں قمر الدین صاحب جیل میں تھے، آپ نے ایک خطیر قم نکلا کر اپنے بھائی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی تھی؟“ اس پہنچ کا غذات باری باری بچھا۔ اور پر اسکی یو ٹرکے سامنے رکھے، اور ایک کاپی گواہ کو تھامی۔ خاتون ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”مسنیڈ قمر الدین!... کیا یہ درست ہے کہ جب قمر الدین کو اس خطیر قم کے ٹرانسفر کا علم ہوا تو مبنیک آفس میں بیٹھے انہوں نے آپ کے ہمالی کے ساتھ جھکڑا کیا؟“

”جی۔ درست ہے۔“ لگا ہیں جھکائے وہ بولی۔

”اور اس جھکڑے میں آپ کے بھائی نے قمر الدین صاحب کو شدید بر اجلا کہا۔ اور اس جھکڑے کے ڈیڑھ ماہ بعد قمر الدین صاحب کا قتل ہو گیا۔ کیا یہ درست ہے؟“

”جی۔“ وہ ہلکا سایوی۔ لگا ہیں بدستور جھکی تھیں۔

”مجھے مزید کوئی سوال نہیں پوچھنا۔“ وہ کورٹ کو ایک اور suspect کے آرام سے مڑ کر اپنی کرسی کی طرف چلی آئی تھی اور پہلے سے بہتر نظر آرہی تھی۔ البتہ فارس نے ہلکے سے سرگوشی کی۔ ”پر اسکی یو ٹرکے نے آب جیکٹ نہیں کیا۔“

زمر چوکی۔ فارس تیکھی نظر وہ سے پر اسکی یو ٹرکے دیکھ رہا تھا جو سارا وقت خاموش بیٹھا رہا تھا اور اب گواہ کو re-exmine کرنے اندر رہا۔ ایک دم سے زمر کو حساس ہوا۔ خارجی عطیت کے باعث آن اس کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔

”مسنیڈ قمر الدین!“ وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”آپ نے وہ قم کیوں نکلوائی تھی؟“ زمر ابرد اکٹھے کیے آگے ہو کر پیٹھی۔

خاتون خاموش رہی۔

”مسنیڈ قمر الدین! اگر آپ جواب نہیں دیں گی تو فاضل عدالت کے سامنے آپ کا اور آپ کے بھائی کا کردار مشکوک ہو جائے گا۔“ ”میں.... وہ رکی۔“ ایک سال پہلے مجھے بریسٹ کینسرڈ ایگنوز کیا تھا۔ یہ قم اس کے علاج اور سرجری کے لئے نکلوائی تھی میں نے۔ قمر الدین صاحب کو پریشانی سے بچانے کے لئے لامع رکھا تھا۔ میرا بھائی ہر لمحے میرے ساتھ رہا تھا۔ لگا ہیں جھکائے وہ بولی تو آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

زمر نے کراہ کر آنکھیں میچ لیں۔ پر اسکی یو ٹرک اس کی میڈیکل روپریش عدالت میں جمع کر رہا تھا۔ پھر مژہ کرفا تھا نہ انداز میں زمر کو دیکھا۔

”کیا آپ پری کراس کرنا چاہیں گی گواہ کو؟“

”بُخسکس۔“ وہ تخت سے کہہ کر کاغذ پر لکیریں کھینچنے لگی۔ فارس نے دیکھا، وہ صرف ٹکونیں بنارہی تھی۔ آج کا دن اس کے لئے بہت برا ثابت ہوا تھا۔

.....  
یقین حرف دعا، بے یقین موسم میں ..... بہت کٹھن تھا بچانا مگر بچایا ہے ہوٹل کے پکن کی دیران پڑی پینٹری کے دروازے سے اندر جانے کے بعد فتح آبدار کو رہداری میں آگے لے آیا۔ ایک سیکوریٹ چیک پاؤ نکٹ پر وہ رکا۔

”میں، آپ اپنا پرس، سیل فون، کچھ بھی نیچنہیں لے جائیں۔ میں مhydrat خواہ ہوں، مگر ہارون صاحب آپ پہ بھی بھروسہ نہیں کرتے۔“

سفید لمبا سو بیٹر پہنے اور سرخ اسکارف میں مبوس آبی نے ایک چھتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور میز پر اپنا پرس اٹایا۔ چایاں، قلم، موہاں، لپ اسٹک۔ کریڈٹ کارڈ۔ سب کچھ میز پر گرا تھا۔ اب وہ ہاتھوں سے انگوٹھیاں اٹارنے لگی۔

فتح شرمندہ ہو کر ”نہیں، اس کی خیر ہے۔“ کہنے لگا مگر آبدار نے اسی خاموشی سے انگوٹھیاں میز پر پھینیں، کڑا اتارا۔ گھڑی کھول ا دہاں رکھی۔ اسکارف تلتے ہاتھ ڈال کر چین نوچ کر اتاری۔ دوبارہ اسکارف تلتے ہاتھ ڈالا اور اب سر کی چین اتاری۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ”کیا تمہاری تسلی ہو گئی کہاں میں لکیسر ہوں؟“ اور واک تھر و گیٹ سے گزری۔ کوئی سائز نہیں بجا۔ وہ ہر دھات سے پاک تھی۔ پھر مردی اور اسی خشکی نظر سے فتح کو دیکھتے بولی۔ ”اب اگر تمہاری اجازت ہوتی میں اس کا انٹرو یونوٹ کرنے کے لئے نوٹ بک اور پین اٹھا لوں؟“ کہتے ہوئے اپنی چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

”آف کورس ہیں!“

آبی نے اسی برے موڈ سے نوٹ بک اٹھائی، سنہری چین اٹھایا اور پھر اس کی طرف بڑھایا۔ ”ان کو بھی چیک کروتا کہ کل کو اگر ۱۰ بھاگ جائے تو تم مجھ پر الرام نہ دھر سکو۔ لو پیک کرلو۔“  
”میں صرف حکم کی تعیل کر رہا تھا۔ آئی ایم سوری۔“ سینے پہ ہاتھ رکھئے سر کو خم دے کر بولا اور آگے بڑھ گیا۔ آبی قلم اور نوٹ بک پکڑے اس کے پیچے ہوئی۔

جب سعدی یوسف کو اس کے سامنے لا بھایا گیا تو وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ سعدی بھی خاموش مگر اکھڑا اکھڑا سالانہ تھا۔ وہی سفید شرست پہنے جواب دھل کر بے رنگ ہو چکی تھی، وہ ابر و بھنپنے اسے دیکھ رہا تھا۔ خاموش بالکل چپ۔ فتح آبدار کے پیچے آ کھڑا تھا۔

”مجھے تمہارے Near Death Experience کے بارے میں چند سوال کرنے ہیں۔“ نشک لبھج میں کہتے ہوئے اس نے نوٹ بک کھول کر قلم اس پر جمایا اور پیچھے سے دبایا۔ نب نکل آئی اور اس نے بک پہ چند الفاظ لکھے۔ پھر اس کی خاموشی محسوں کر کے سر اٹھایا۔

”مجھے ہاشم سے بات کرنی ہے۔ یہاں کوئی میری اس سے بات نہیں کروارہا۔ یہ کہتے ہیں اس کا فون آف ہے۔“ ساتھ ہی ایک سیلی نظر پیچھے کھڑے فتح پر ڈالی۔

آبدار نے گہری سانس لی اور نگاہیں اس پر جمائے رکھے وہ بولی۔ ”تمہاری سر جری کے دوران، خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے تم Clinically مر چکے تھے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اس دوران تم نے کیا محسوس کیا؟“

”یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے چینی سے مگر ضبط سے بولا تھا۔ ”ہاشم کو بتاؤ کہ یہ مجھے مار دیں گے۔“

”تم نے کیا دیکھا؟ کوئی خواب؟ کوئی چہرہ؟ یا کوئی ایسا سفر جو تم بیان نہ کر سکتے ہو۔“

”تم میری مدد کرو گی یا نہیں؟“ وہ سن رہی تھی وہاب کے بولاتو آواز بلند تھی۔ چہرے پر دکھ تھا۔

”میں.... نیوٹرل ہوں۔“ اس نے ملک کے ساتھ پین بند کر دیا۔ اور نوٹ بک پر کھڑک راس کی طرف بڑھایا۔

”ایک گھنٹے بعد میری فلاست ہے۔ میں مزید تھاری باقیں برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر کچھ یاد آجائے تو اس پر لکھ دینا۔ اور کسی گارڈ کو دے دینا، وہ مجھ تک پہنچا دے گا۔“

فصیح آبی کی پشت پر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے آبی نے ابرو سے قلم کی طرف اشارہ کیا، گویا الجاکی کا سے پکڑلو۔ سعدی نے لمجھ بھر کا تامل کیے بغیر قلم اور نوٹ بک تھام لی۔ پر باری باری ان دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ آبدار سنجیدہ ای اٹھ گئی۔

”چلو فصیح۔ اگر زیادہ دیر نہ ہری تو مجھے تمہارے قیدی پر ترس آجائے گا۔“ بے نیازی سے کہہ کر وہ باہر جانے لگی جب فصیح رکا۔

”ایک منٹ۔ مجھے اس کو چیک کرنے دو۔“ وہ سعدی کی طرف بڑھا۔ آبی مجنون ہو گئی۔ سانس تک رک گیا۔

فصیح نے سعدی کے ہاتھ سے نوٹ بک لی اور اسے کھولا۔ اچھی طرح کٹکھالا۔ صفحے پلنائے۔ ان کو سونگا۔ (کوئی نادیدہ انک ہو شاید۔) پھر مطمئن ہو کر بک واپس کر دی اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ آبی کی جان میں جان آئی۔

فصیح کو اس پر شک نہیں تھا کیونکہ یہ پہلی دفعہ نہیں تھا جب آبدار اپنے کسی مریض کو نوٹ بک اور قلم دے آئی تھی۔ فصیح اس کے ساتھ کئی دفعہ ایسا ہی منظر دیکھا تھا جب مریض بتانے سے زیادہ لکھنا پسند کرتے تھے۔ بعد میں وہ فصیح کو نوٹ بک واپس لانے کے لئے بھیجی تھی۔ اب بھی باہر اہدراہی میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے فصیح سے کہا تھا۔

”جب وہ مر جائے تو میری نوٹ بک واپس لے آنا۔“

اور اندر اپنے خالی کمرے میں بیٹھا سعدی دیوار اور نوٹ بک کے صفحے پلنارہا تھا۔ وہاں آبی کے نوٹ کردہ چند NDEs کے تھے۔ سعدی بے قراری سے ان الفاظ میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ کوئی پیغام کوئی کوڈ۔

جبکہ نہری چکتا ہوا پین لا پڑا ہی سے میز پر کھا تھا۔



شیکب اپنے تعارف کے لیے یہی بات کافی ہے ..... ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے  
قصر کاردار کی انیکسی میں اس صبح شور و غل بر پا تھا۔ صداقت کا مختتم کر کے اپنے کوارٹر میں چلا جاتا تھا، آج بھی باہر تھا۔ حینہ فارغ ہی لا اؤخ میں چوکی کھینچ کر بیٹھی گا ہے بگا ہے کچن کو دیکھتی۔ اور ادھر ادھر ٹھیٹیں ندرت بھی تو کچن کو ہی انگارہ آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر ہوں رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، حینہ کو کچا جا میں۔

حینہ سمیت سب کو وہاں سے نکال کر دہ اور پن کچن میں کا ڈنٹر ٹاپ کے اوپر چڑھی کھڑی تھی۔ آستین چڑھائے، دو پٹھے کے بال باندھے، وہ کچن کو de-clutter کر رہی تھی۔ گندے سے پاک۔

جب ندرت کو معلوم ہوا کہ اپنا کرہے حینہ نے صاف کیا تھا، تو کافی خوش ہوئیں۔ حیران بھی۔ جتنا بھی (آج کہاں سے خیال آگیا?) مگر چلو اچھا ہے۔ اس کو بھی احساس ہوا گھرداری کا۔ یہاں تک ٹھیک تھا مگر جب آہستہ آہستہ دراز کھلنے پر معلوم ہوا کہ... آدھے سے

زیادہ سامان حین بی بی گھر سے باہر کر چکی ہیں تو ندرت پہلے جیران اور پھر غصہ ہوئیں۔ حالانکہ حین نے کام کی کوئی چیز نہیں پھیکی تھی، ماؤں والی عادت، کہ انیس سوتھر کی دہائی کی بھی سو یاں دھاگے سنہال کر رکھیں گی کہ شاید قیامت سے پہلے بھی کام آجائے۔

چلو بہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ مگر جب وہ پچھلے دو ہفتوں کے دوران باری ہر کمرہ (ماسوائے زمرے کے) صاف گلی تو ندرت کو غصہ آنے لگا، اور آج صحیح جب اس نے کچن میں قدم رکھا، یعنی کہ ان سب کو باہر نکالا تو ندرت ذوالفقار خان کے لے۔ برداشت کرنا ممکن ہو گیا۔

”ہر چیز ہلا دو گی، پھینک دو گی، وہ کینٹ کیوں کھول رہی ہو؟ اُن یہ مسالوں کے ڈبے کیوں نکال رہی ہو؟“ وہ، یہ ایسے ہوئے (ہند کا اتنا عرب تو تھا کہ منع کر دیا تو اپنے کچن میں نہیں جانا۔) بار بار پریشانی سے اسے پکارتیں۔

مگر حین پر سکون تھی۔ گھٹنوں کے بل کا وزیر ثاپ پہ بیٹھی، اور پری کینٹ سے چیزیں نکال کر کا وزیر پر رکھ رہی تھی۔

”میں کوئی بھی کام کی چیز نہیں پھیکوں گی امی۔ صرف ایک پارڑہ مصالحے کے پیکٹ نکال رہی ہوں۔“ شیشوں والے مصالحتے، اور کرشیشیاں دھوکر سکھا کرو اپس ڈال دوں گی۔ اندر پڑے سارے برتن دھونے ہیں۔ گند نکالنا ہے۔ صاف اخبار بچا کر، ہر چیز سیت رکھنی ہے۔“

”ہاں بھی ماں تو پھوہڑ ہے، ماں کو تو کچھ آتا ہی نہیں۔ تین بچے پال کر بڑے کیے جاب بھی کی، گھر بھی سنہالا، مگر نہیں...“ وہ بچوں کے بل بیٹھی، کینٹ پر با تحرک کھڑے مڑ کر ندرت کو دیکھنے لگی۔ ”پڑتے ہے کیا امی، ہر عورت کے اندر ایک شدید پوزی قوم ہے،“ ہوتی ہے۔ جیسے وہ اپنی ساس یا اپنی بہو کی خود مختاری اپنے گھر میں نہیں برداشت کرتی، اسی طرح وہ اپنی بیٹی کی خود مختاری بھی نہیں برداشت کرتی۔ آپ ماں میں یہ تو چاہتی ہیں کہ بیٹی بستر سے اٹھنے تو چادر درست کر کے اٹھنے، مہمانوں کے سامنے چائے دینے کا سلیقہ آتا ہو، مختلف بنا نیکھ لے، اپنا کمرہ صاف رکھا کرے، تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں، مگر جب بیٹی نے اپنی مرضی سے گھر سیٹ کرنا چاہا، وہاں آپ نے امہل بیٹھا۔ اسی لئے لوگوں نے ”ہاؤس و انف“ یا ”ہاؤس کیپر“ کی ژم بنائی، کصرف گھر کے صاحب کی بیوی یا گھر کی نوکرانی نہ آئی، چیزوں کو رکھنے اور چھیڑنے میں خود مختار ہوتی ہیں۔ مگر اب وہ دور ختم ہوا۔ آج سے حین یوسف ایک نئی نرم ایجاد کرتی ہے۔ ہوم گرل۔ لگدیں ایسا کو گھر کے کام سیکھ چاہیے، اگلے گھر کے لئے نہیں، بلکہ اپنے گھر کے لئے ہر وہ گھر جہاں وہ رہے۔“

اور اگر حسینہ سامنے دانت نکوئی سن نہ رہی ہوتی تو ندرت کا ہاتھ بار بار جوتے تک جا کر رک نہ جاتا۔

قریباً تین گھنٹے بعد وہ دھلے دھلانے کچن کے سامنے تھکن سے چور کھڑی تھی۔ اب پکن کیپنیڈیٹس اندر سے بھی صاف اور تم میں،“ clutter“ کیسے سب اس نے خود کیا تھا۔ یہ نوکریوں کے کرنے کے کام نہیں ہوتے۔ امی کی سوسنلواتیں سن کر بھی بہری بنی ”clutter“ کے بڑے بڑے شاپ باہر کوڑے کے ڈبے میں ڈال کر آئی۔ اب بس ایک کام رہ گیا تھا۔ اپنے بیٹھر دم کی ایک دو درازیں اس نے چھوڑ دی تھیں اس روز۔ اب ان کو نکال کر لا ونخ میں لے آئی اور ان میں سے ضروری، کچرا اور خیرات کا سامان الگ الگ کرنے لگی۔ اگر دیکھی ہی بے حال بند ہے بالوں اور تھکنے چرے کے ساتھ بیٹھی تھی، اور گود میں رکھے پرس کھول کر دیکھ رہی تھی جب بڑے ابا اپنی دلیل،“ دھکیلے قریب میں آکر خاموشی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔“

وہ مگن سی پرس خالی کر رہی تھی۔ یہ اس کے سارے پرس تھے۔ دفعتاً وہ رکی،“ ٹھکنی۔ ایک پرس میں سے پانچ سو کا نوٹ نکلا۔“

کھولا تو پچاس اور بیس بیس کے نوٹ تھے۔ ایک میں چند سکے تھے۔ اس نے خو شگوار حیرت سے سراٹھایا۔ ”مجھے تو یاد بھی نہیں تھا کہ نہ ہے۔“ پرانے پرس میں پیسے پڑے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے۔“

”یا اتفاق نہیں ہے۔“ ابا مسکراۓ۔ ”یہ تجھے ہے۔“

"تحقیق؟" وہ چوکی۔

"جب چھوٹی تھی تو سنتی ہو گی کہ دنیا میں صرف انسان اور جانور living things ہوتے ہیں۔ بڑی ہوئی تو پتہ چلا ہو گا کہ پودے اور درخت بھی جاندار ہیں۔ مگر دین پر ہوتے معلوم ہوتا ہے کہ پھر ہر دیوار سب جاندار ہیں۔ قیامت کے دن گواہی دیں گے نا یہ پھر یہ گھر یہ جگہیں۔ کچھ محسوس کرتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، تبھی گواہی دیں گے نا۔ اسی لئے زمین پر آہستہ اور تیز سے چلنا چاہیے۔ اسی لئے کچھ پھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں، اور یاد ہے، ایک پھر رسول پاک ﷺ کو بھی سلام کیا کرتا تھا۔ اسی لئے ان چیزوں کے سامنے جھکلے ہوئے اللہ کو بجدہ کر رہے ہیں۔ یہ سب لوگ تھنگوں ہیں۔ تمہیں دیکھتی ہیں، محسوس کرتی ہیں۔" وہ لحظے بھر کو رکے۔ "جب کوئی لڑکی اپنی الماری کا، اپنے کمرے کا خیال کرتی ہے، اس کے اندر کا زائد بوجھ نکال کر اس کو بلکا چھکا اور صاف کرتی ہے، خوبصورت بناتی ہے تو یہ الماریاں تمہارا شکر یہ ادا کرتی ہیں اور ان کے کونے کھدوں سے کوئی نہ کوئی تنفس نکل آتا ہے۔ کبھی کوئی پرانی کھوئی ہوئی چیز کبھی برسوں کے بھولے ہوئے پیسے۔ اس لئے ان درود یوار کا، ان چیزوں کا خیال رکھا کرو۔ یہ بھی تم سے پیار کریں گی۔ جنات اور انسانوں کے علاوہ باقی ساری مخلوق بہت احسان مانے والی، بہت قدر کرنے والی ہے۔"

خین نے متھیری ہو کر ان پیسوں کو دیکھا، پھر ابا کو۔ اس کے اوپر جیسے ایک نیا انکشاف ہوا تھا۔ اسی ٹرانس کی سی کیفیت میں وہ بولی تھی۔

"ابا، کوئی کہتا ہے لڑکیاں خلاء اور چاند تک پہنچ رہی ہیں، کوئی کہتا ہے وہ کورٹ، ہسپتال، فوج، ہر میدان کو فتح کر رہی ہیں۔ اب میں سوچتی ہوں کہ کتنا اچھا ہوا گرلز کیاں اپنے گھروں کے کونوں کھدوں تک بھی پہنچ جائیں۔ اگلے گھر جانے کے لئے نہیں، دوسروں سے تعریف سنتے کے لئے بھی نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے کہ صفائی کے بغیر ایمان آدھا دھورا ہوتا ہے، اور اس لئے کہ فرشتے صاف جگہوں پر آتے ہیں۔ جب ہمارے گھر اندر سے اتنے گندے ہوں گے الماریوں کے اندر دنیا جہاں کا گند سڑڑا ہا ہو گا؛ ڈست بن کچھرے سے ابل رہے ہوں گے تو کیا فرشتے ہمارے گھروں میں آنا پسند کریں گے؟" وہ اب سر جھکائے خود سے بلوٹی پر س النما رہی تھی۔ ایک پاچ روپے کا سکھ گود میں گرا۔ وہ مسکرا دی۔ اس کواب زمزما سامد یاندرت کی تعریف کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا گھر، اس کی الماریاں، اس کے درود یوار تو اتفاق تھے نا اس کی محنت سے۔ وہی اس کو شکر یہ کہہ رہے تھے۔ خین یوسف کے لئے یہی بہت تھا۔



ہر چند را کھ ہو کے بکھرتا ہوں راہ میں ..... جلتے ہوئے پروں سے اڑا ہوں مجھے بھی دیکھے  
ملاقائی ہاں میں معمول کا شور غل بر پاتھا۔ گلاں بوچھ کے دونوں طرف فارس اور زمر بیٹھے تھے۔ درمیان میں شیش تھا جس میں نہیں  
نہیں سوراخ تھے۔ ساتھ میں قطار میں وہ درجن بوچھ لگے تھے۔ ایک طرف قیدی تھے دوسری جانب ان کے عزیز دا قارب جوان سے ملاقات کر  
رہے تھے۔ وہ سر جھکائے سنبھیہ اور خاموش سی بیٹھی تھی۔ فارس نے انگلی سے شیشہ کھٹکھٹایا۔ زمر نے چونک پر اس کی سر اٹھایا۔ وہ بغورا سے دیکھ رہا تھا۔

"پر بیان ہو؟"

زمر نے سر جھکا اور فائل کھوئی۔ کان کے پیچھے بال اڑتے سر جھکائے اب وہ کہہ رہی تھی۔ "پر اسکیوں ٹرنے بہت سے گواہ give up کر دیے ہیں۔ جب دکاء چاہتے ہیں کہ کوئی کیس جلد از جلد چل تو وہ کم سے کم گواہ پیش کرتے ہیں۔ میری بیبی اسٹریٹجی تھی۔ مگر میں تمہارے گواہی دینے سے خوش نہیں ہوں۔ خیر۔ تم فیصلہ کر رہی ہی چکے ہو تو تمہیں witness پر یہ کرانی ہے۔ وقت کم ہے۔" کلامی پر بندھی گھڑی دیکھی اور سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ "جب وہ کوئی ایسا سوال پوچھیں جس کا جواب نہ دینا چاہو تو چار لفظ بول دینا۔ don't recall"

مجھے یاد نہیں۔ قانوناً یہ جھوٹ نہیں ہوتا۔ اور جب وہ تم سے پوچھیں کہ اس رات تم کہاں تھے تو کہنا ”میں نے بہت دفعہ بتایا ہے کہ میں اس رات گھر تھا۔“ اب یہ حق ہے کیوں کہ تم بہت دفعہ کہہ چکے ہو کہ تم اس رات گھر پر تھے۔ تمہاری بہت دفعہ کہی بات سچتی یا جھوٹ یا الگ بات ہے۔“ ”اوکے۔“ اس نے سر کو ختم دیا۔ اب وہ اس سے سوال پوچھنے لگی۔

”فارس غازی کیا آپ کے اور قرالدین صاحب کے درمیان کوئی دشمنی تھی۔“

”مجھے یاد نہیں۔“ وہ پر سکون سا بولा۔

”کیا آپ نے قرالدین کو جیل میں پینا تھا۔“

”مجھے یاد نہیں۔“

”گڑ۔“ وہ ذرا سامسکرائی۔ اب بہتر نظر آنے لگی تھی۔ ”کیا آپ نے قرالدین کو قتل کرنے کی حکمت دی تھی؟“

”نہیں۔“

”آپ 28 اور 29 اگست کی رات کہاں تھے؟“

”جیسا کہ میں بہت دفعہ بتا چکا ہوں میں اس رات گھر پر تھا۔“ تائیدی انداز میں ابر و اٹھائی۔ زمر نے مسکرا کر سر ہلا کیا۔

”کیا آپ پوری رات گھر پر تھے؟“

”مجھے یاد نہیں۔“ وہ سلچھے ہوئے انداز میں جواب دے رہا تھا۔ زمر کی رنگت واپس آ رہی تھی۔ وہ کٹھرے میں کٹھرے کوئی غلط ہات نہیں کرے گا۔ اس کی امید بڑھنے لگی تھی۔ مگر..... وہ فارس تھا۔ اس پر اعتبار کیوں نہیں ہوتا تھا؟

..... ♦ ♦ ♦ .....

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور ..... رستے میں جو کھڑا تھا، وہ کھسار ہٹ گیا  
وہ صبح سرداور ظالم تھی۔ خاموش اور بے حس۔ آج کمرہ عدالت میں بیٹھے فارس غازی نے سیاہ بینٹ کے اوپر گرے شرت اور یہاں کوٹ پہن رکھا تھا۔ تازہ شمیڈ زرا بڑھے بال گیلے کر کے پیچھے کو بنائے وہ سنجیدہ مگر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ساتھ بیٹھی سیاہ کوٹ اور گھنگریا لے ہالوں والی زمر کا چہرہ زرد تھا۔ اتنے ہفتوں کی ان تحکیم حنفی اور ہنفی دباؤ نے اسے اپنی صحت کی طرف سے غافل کر رکھا تھا، آج بھی وہ پہلے سے کمزور نظر آتی تھی۔ پچھلی کرسی پر سیاہ کوٹ میں ملبوس احر شفیق بیٹھا تھا۔ اس کی لاءِ ڈگری اور لا کسنس کے باعث اسے ادھر بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ (زمر کو نانوے فیصلہ یقین تھا کہ اس کی ڈگری جعلی تھی، مگر اپنے دفاع میں وہ صرف اتنا کہتا تھا کہ بغیر لاءِ ڈگری کے وہ سیاسی کنسلنٹ انہیں سکتا تھا، اور چونکہ بات درست تھی، اسی لئے وہ باز پر نہیں کرتی تھی)۔

جب فارس اٹھنے لگا تو زمر نے بے چینی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”بہت احتیاط سے گواہی دینا۔ پلیز، کچھ غلط مامٹ کرنا۔“

وہ اٹھنے اٹھنے واپس بیٹھا اور اسی سنجیدگی سے زمر کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں نے سازھے تین مہینے کچھ نہیں کیا۔ جو تم نے کہا،

کیا۔ ایسا ہی ہے نا؟“

زمر کا سرا اثبات میں ہلا۔

”میں یہاں خاموشی سے بیٹھ کر کیلوں کی بے کار بمحیں سنتا رہا۔ ایسا ہی ہے نا؟“

زمر نے اس کی آنکھوں پر نظریں جمائے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”اب میرے بولنے کا وقت ہے اور ان سب کے سنتے کا۔“ کہتے ہوئے اس نے زمر کے پیچھے کسی کو دیکھا۔ ”یہ کون ہے؟“

زمر نے چونک کر گردن پھیری تو استغاش کی کرسیوں پہ بیٹھ، قبیلی نفس سوت میں ملوس آدمی کو دیکھ کر وہ تھہر گئی۔

”یہ تو سابق پر اسکیوڑ جزل ہیں۔ یہ ادھر کیے؟“ فارس علمی سے شانے اچکاتے ہوئے انھی کھڑا ہوا تھا۔ زمر نے گھوم کر احر کو دیکھا جو نگاہیں اور پچوتے پہ جمائے بیٹھا تھا۔ ”پر اسکیوڑ جزل ادھر کیا کر رہے ہیں، احر؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ غازی نے کہا تھا، ان کو بلا، میں نے صرف اتنا کیا ان کی موجودگی یہاں یقینی بنائی۔“

”فارس نے کہا تھا؟“ وہ متوجہ رہ گئی، پھر واپس گھومی۔ اور اب یعنی سے فارس کو دیکھا جو کھڑے میں کھڑا احلف لے رہا تھا۔ وہ انھی کر

اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ساری باتیں ذہن سے جھٹک کر گواہی لینے لگی۔

”ریکارڈ کے لئے اپنا نام بتائیے۔“ اس نے خشک لبجے میں مخاطب کیا۔ وہ ہلاکا سما مسکرا کر بولا۔ ”فارس طبیر غازی۔“ نظریں زمر پر

جمی تھیں۔

”کیا یہ درست ہے کہ آپ کو 13 اکتوبر کی شام اپنے گھر سے گرفتار کیا گیا؟“

”جی۔“ وہ اب اس سے چند روشنیں کے سوالات کر رہی تھی۔ اور وہ مختصر جواب دے رہا تھا۔ آخر میں اس نے پوچھا۔

”کیا آپ حلیفہ کہتے ہیں کہ آپ کا قمر الدین چودھری کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“

”جی ہاں۔ میں نے یہ قتل اور اغوا نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں۔“

زمر مژدی اور پر اسکیوڑ کو ”your witness“ کہہ کر مخاطب کرتی اپنی کرسی پر آبیٹھی۔ پر اسکیوڑ بلوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجائے

اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”فارس غازی، آپ نے ابھی کہا کہ آپ مقتول کو جیل کے زمانے سے جانتے تھے۔ کیا آپ دونوں کے درمیان کوئی دشمنی، کوئی

رقابت تھی؟“

”مجھے یاد نہیں۔“ کھڑے پہ باتھر کھڑے کھڑے وہ پر اسکیوڑ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پر سکونی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

”کیا آپ کو یہ یاد ہے کہ آپ نے قمر الدین چودھری کو پیٹا تھا؟“

”آئی ڈونٹ ری کاں۔“

پر اسکیوڑ نے مسکرا کر بھر جھکا۔ ”کیا قمر الدین کے جیل سے چھوٹنے کے بعد آپ کا اس سے کوئی جھکڑا ہوا تھا؟“

”مجھے یاد نہیں۔“

”آپ 28 اور 29 اگست کی درمیانی رات کہاں تھے؟“

”میں رات نو بجے گھر آگیا تھا اور اگلی صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکلا تھا۔“ زمر نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ مقاطل الفاظ کا

چنانہ کر رہا تھا۔ گردن موڑ کر اس نے پر اسکیوڑ جزل کو دیکھا۔ وہ انگوٹھے کے ناخن سے انکشافت شہادت کا ناخن رگڑتے تھے، توجہ سے اس کو دیکھے رہے تھے۔

”کیا آپ پوری رات گھر پر ہے تھے؟“ پر اسکیوڑ نے وہ سوال پوچھا جس کا زمر کو دھڑ کا تھا۔

کمرہ عدالت میں چند ثانیے کے لیے ناٹا چھا گیا۔ پھر فارس طبیر غازی نے انھی گردن اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ کہا۔

”نہیں۔“

زمر کا دل لمحہ کے لئے رکا۔ احر بے اختیار سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پر اسکیوڑ بھی وہ قدم مزید قریب آیا۔

”تو آپ اس رات... کہیں جا کر واپس آئے تھے؟“ پر اسکیوڑ کو ”مجھے یاد نہیں۔“ کی توقع تھی، وہ خود بھی حیران ہوا تھا۔

”میں گیارہ بجے گھر سے نکلا تھا اور صبح پانچ بجے واپس آگیا تھا۔“

زمر نے بے اختیار سر دنوں ہاتھوں میں گردادیا۔

”آپ گیارہ سے پانچ کے دوران کدھر گئے تھے؟“

فارس نے ایک علاقے کا نام لیا جوڑا کنڑا میں کے ہستال کے قریب تھا۔

”یہ علاقہ قتل الدین کے قتل کی جگہ سے کافی دور ہے۔ میں پوری رات اسی علاقے میں تھا۔“ وہ پرسکون سا کہہ رہا تھا۔ زمر کو نہیں مہم

آئی وہ کس بات پر اعتراض کرے۔ اس کا گواہ اپنے ہی خلاف hostile witness ہن رہا تھا۔

”اور آپ وہاں کس جگہ تھے؟“

وہ لمحے بھر کر کہا۔ ”میں ایک عمارت میں گیا تھا۔“

”اور کیا وہ کوئی خالی عمارت تھی؟ کوئی زیر تیری ہستال؟ کوئی فیکٹری؟ جہاں آپ کی alibi ثابت کرنے کے لئے ایک شخص بھی نہ ہو۔“ پراسکیوڑ کے لبوں پر استہرا سیئے مسکرا ہٹ بھری۔

”وہاں 32 لوگ تھے جنہوں نے مجھے ادھر دیکھا پوری رات۔ میرے پاس 32 alibis ہیں۔“

جہاں پر اسکیوڑ لمحے بھر کے لئے لا جواب ہوا، وہاں زمر نے چونکر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح پرسکون کھڑا تھا۔ پرانیا!

جزل نے کراہ کر آنکھیں مچھیں۔

”32 لوگ؟“ پراسکیوڑ قدرے ہکلا کر سن چلا۔ ”یہ کون سی جگہ تھی؟“

”یہ ایک... ایک مینگ پلیس ہے۔ ملاقات کی جگہ۔ بور ہوئے لوگ ادھر جاتے ہیں۔“

”اور آپ ادھر کیوں گئے تھے؟“

”میں... کافی پینے گیا تھا۔“ وہ تازہ دم سی مسکرا ہٹ کے ساتھ بولا۔ پراسکیوڑ کو سمجھنے میں چند لمحے لگے۔

”آپ کا مطلب ہے یہ کوئی باریا کلب جیسی جگہ ہے۔“

”جی۔“

”تو... وہاں لڑکیاں بھی ہوں گی؟“ پراسکیوڑ نے اب کے مسکرا کر زمر کو دیکھا۔ ”کیا آپ کسی لڑکی کے ساتھ تھے؟“

”وہاں... لڑکیاں... نہیں ہوتیں۔ صرف مرد ہوتے ہیں۔“ وہ الفاظ توڑ کر بولا تھا۔ لمحے بھر کو کمرہ عدالت میں خاموشی چھائی زمر کو اپنے کانوں سے دھواؤ نکلتا محسوس ہوا۔ نچالب دانتوں تلے دبائے وہ بالکل سن سی فارس کو دیکھ رہی تھی۔

”اچھا... آئی سی... سو... آپ اس کلب میں تھے؟ پوری رات؟“

”پراسکیوڑ صاحب وہاں 32 لوگ... 32 مرد اس رات موجود تھے۔ کلب کی لابی کی سی سی اٹی وی فوٹج میں میرے آگے ہی ہیں۔ داخل ہونے والے 32 لوگوں کے چہرے بھی نظر آرہے ہیں۔ کچھ کے توانم بھی مجھے یاد ہیں۔ جو کلمبیا سے پڑھ کر آیا ہے... اور ایک بڑے سرکاری عہدیدار کا بیٹا ہے... وہ بار کا دنتر پر میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا... اس کا بازار و فرپیچر ہوا تھا اور.....“

زمر نے بے اختیار گردن موڑ کر پراسکیوڑ جزل کو دیکھا جن کی نظریں فارس غازی پر گڑتی تھیں اور کان سرخ تھے۔ ادھر وہ پر نکون سا کہہ رہا تھا۔ نجح صاحب ایک دم چونک کر فارس کو دیکھنے لگے تھے۔

”آپ پراسکیوڑ صاحب.... ان 32 لوگوں کو subpœona کریں، کورٹ بلائیں اور میری alibi کی تصدیق کر لیں۔ میں آپ کو ان کے نام دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ نے مجھے گرفتار ہی ان لوگوں کے ناموں کے لیے کیا ہے نا، تو مجھ سے نام پوچھیں۔“ سا، کی

سے نج صاحب کی طرف دیکھا۔  
”بالکل، آپ ان کے ناموں کی فہرست عدالت میں جمع کروائیں۔ عدالت ان کو باری باری طلب کر کے سوال جواب کر لے گی۔“  
پراسکیوٹر کا اعتماد اپنے آئے رگا۔

”یور آز!“ وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔ اب کچھ کچھ اسے سمجھ میں آنے لگتا۔ ”فارس غازی ان لوگوں کی فہرست عدالت کے حوالے نہیں کر سکتا کیونکہ... کیونکہ وہ عزت دار لوگ ہیں۔ اگر ان کو *sub pheona* کیا گیا تو یا ان کی توہین ہو گی۔ جیسے ایک سابقہ سرکاری آفیسر کا بیٹا، جس کا بازو فری پچر ہوا تھا، وہ نج بننے جا رہا ہے، اس کا کیریئر... متاثر ہو گا۔“ وہ جلدی کھڑا رہی تھی۔ پراسکیوٹر نے جلا کر اسے دیکھا تھا۔

”یور آز، اگر دفاع کو ملزم کی ایلی بائی ثابت کرنی ہے تو ان کو وہ فہرست عدالت کے حوالے کرنی ہو گی۔“  
”شیور، میں تو تیار ہوں دینے کے لیے۔ اسی فہرست کے لیے تو آپ نے مجھے گرفتار کروالا ہے۔“ وہ پرتپش مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ پراسکیوٹر نے اب کے الجھ کر اسے دیکھا۔

”کون سی فہرست؟ آپ کو اس لیے گرفتار کیا گیا ہے کیونکہ آپ نے قمر الدین کا قتل کیا ہے۔“ نج صاحب چونک جانے کے انداز میں باری باری کبھی فارس کو دیکھتے، کبھی پیچھے بیٹھے سابق پی جی کو۔  
”کیا آپ ایک بھی ثبوت لا سکے ہیں اپنے الزام کے حق میں؟“ وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ بے بی بھرے غصے سے کہہ رہی تھی۔

”فارس غازی بے گناہ ہے، کیا اس کے چار سال ضائع کر کے لوگ خوش نہیں ہوئے جو اس کو ایک دفعہ پھر تیدی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے؟ وہ اپنا بیان دے چکا ہے۔“ یہ *case of two versions* ہے۔ وہ اس رات قتل کی جگہ سے بہت دور تھا۔ ہمارے پاس 32 گواہ ہیں۔ لیکن ان کے نام پراسکیوٹر کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پہلک پراسکیوٹر آفس کو سابق افسروں کے بارے میں انتقامی کارروائیاں کرنے کا اختیار دے دیں۔ ”پہلی دفعہ پراسکیوٹر چونکا۔ مژکر تماشا یوں کی طرح بیٹھے سابق پی جی کو دیکھا، جو سرخ پچرے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے پراسکیوٹر کو پاناد مانگ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔

”ایک منٹ مسز زمر.....“

”نہیں جناب عالی! اب وہ وقت آگیا ہے جب ہم فارس غازی کو اکیلا چھوڑ دیں۔ اسے اس کی زندگی جینے دیں اور اس کے اوپر یہ جھوٹی مقدمات ختم کریں۔“ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور آواز غصے سے پھٹ رہی تھی۔

”یور آز، مسز زمر کیس کا رخ دوسری طرف موڑ رہی ہیں۔ یہ غلط بات کہہ رہی ہیں۔“ پراسکیوٹر پر اعتماد نہیں لگ رہا تھا۔ کبھی وہ پیچھے پی جی کو دیکھتا، کبھی کٹھرے میں کھڑے فارس کو اور وہ دونوں پراسکیوٹر سے بے نیاز ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ساٹ، گہری نظر وہ کے ساتھ۔

”مسز زمر واقعی غلط بات کہہ رہی ہیں۔“ نج صاحب نے برہی سے پراسکیوٹر کو مخاطب کیا۔ ”یہ دو *versions* کا کیس نہیں ہے۔ یہ *further inquiry* کا کیس ہے۔“ (زمرنے بے اختیار میز پر دونوں بازو رکھئے اور چہرہ ان پر گزادیا۔ اور فارس نے آنکھیں بیچ کر طویل سانس کھینچی۔) ”ایک fishing expedition ہے۔ اور مجھے اس نج پر بیٹھے شرم آرہی ہے کہ پہلک پراسکیوٹر آفس انتقامی کارروائیوں کے لیے اس حد تک گر سکتا ہے۔“

”جناب عالی یہ پیچوکش کو manipulate کر رہے ہیں۔“ پراسکیوٹر بوكھلا کر احتجاج کرنے لگا۔ نج صاحب نے غصے سے

ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”سرکاری آفس نے اس کیس میں اپنی ذمہ داری درست طریقے سے انجام نہیں دی۔ آپ کے گواہوں کے بیانات میں جھوٹ ہے۔ شواہد ناکافی ہیں۔ شریک جرم کریڈیبل نہیں ہے۔ آپ نے ماڑا ہے تین ماہ سے ایک ایسے آدمی کو زیر حراست رکھا ہوا ہے جس کو مقید کرنے کے لیے آپ کے پاس ناکافی ثبوت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔“ وہ شدید برہمی سے کہہ رہے تھے اور پراسکیپو ٹرائب کا ثنا سننے پر مجبور تھا۔ ”انہیں لوگوں کو کورٹ میں گھینٹنے کی میری نظر میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عدالت فارس غازی کے بیان سے مطمئن ہے اور سیکشن 249CrPC کے تحت فارس غازی کو ناکافی شواہد کے باعث باعزت بری کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اور پہلک پراسکیپوشن آفس کو انتباہ کرتی ہے کہ اس قسم کے اوچھے بھتکنڈوں پر اتر آنے سے گریز کریں تو یہ موجودہ پراسکیپو ٹرائب کی صحت کے لیے بہتر ہو گا۔“ شدید غصے اور ناگواری سے کہہ کر نجح صاحب نے اپنا ہتھوڑا ازور سے میز پر دے مارا۔ پیچھے میٹھے سابق پی جی نے آنکھیں بیچ کر گہری سانس لی، اور پھر فارس کو دیکھ کر سوڑ راساخم دیا اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ وہ اس کے احسان مند تھے۔

”اور آپ، فارس طبیر غازی.....“ نجح صاحب نے رخ اس کی طرف پھیرا۔ ”مجھے افسوس ہے اور شدید دکھ ہے کہ آپ کو فشنگ ایکسپیڈیشن کا شکار کر کے اتنے ماہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنے پڑے۔ میں پہلک پراسکیپوشن آفس کو ایڈوائس دوں گا کہ وہ آپ کو معدورت پیش کریں۔“

فارس نے کٹھرے کی ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر اٹھی گردن اور زخمی آنکھوں کے ساتھ بس اتنا کہا۔ ”آپ کا شکریہ پور آز، لیکن ان کی معافی میری زندگی کے سوا چار سال نہیں لوٹا سکتی۔ میرے خاندان اور دوستوں میں ہوئی میری بے عزتی اور توہین نہیں ٹھیک کر سکتی۔ میری دودھ کھو جانے والی نوکریاں عزت سے مجھے واپس نہیں مل سکتیں۔ جب آپ کسی بے گناہ آدمی کو قید میں ڈالتے ہیں تو آپ اس کو معصوم نہیں رہتے۔ وہ اپنے دفاع کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی خدا ہے بھی یا نہیں، کوئی قیامت آئے گی بھی یا نہیں، مگر مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ بے گناہ آدمی اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو روکنے کے لیے جو بھی کرے، وہ قانوناً اور شرعاً درست ہوتا ہے۔“ کچھ ہوئے ابڑو کے ساتھ وہ نیچے اتر آیا۔

زمر اس وقت ڈھیر سار ارونا چاہتی تھی، مگر وہ یہاں رو بھی نہیں سکتی تھی۔ بدقت سارے آنسو اندر اتار کر اس نے چہرہ اٹھایا، اور زگا ہیں جھکائے بال کان کے پیچھے اڑتے، اپنے کاغذ ترتیب سے رکھنے لگی۔ وہ خاموشی سے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ پراسکیپو ٹرائب نجح صاحب سے بات کر رہا تھا۔ صفائیاں، معدورتیں۔ زمر نے لگا ہیں جھکائے کاغذ پر لکھا۔ ”تم اس رات ہبتاں بھی گئے تھے یا نہیں؟“

فارس نے قلم اٹھا کر اس کے نیچے لکھا۔ ”صرف پچیس منٹ کے لئے گیا تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے، میں اتنی گرمی میں پوری رات اسی گلہ بیٹھا رہتا تھا؟“

”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ اس رات تم کہیں اور تھے؟“

”آپ نے پوچھا ہی نہیں۔“ سادگی سے لکھ کر کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔

زمر کے تیوری چڑھائی۔ کاغذ پر چند ہند سے لکھ کر اس کے سامنے ڈالا۔

”یہ میری بقا فیس ہے۔ وقت پر ادا کرنا۔“ خفی سے سرگوشی کی تو فارس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے رسیو کرنے نہیں آؤ گی؟“

”میکسی کر کے آ جانا۔“ وہ رخ موڑ سے سنجیدگی سے نجح صاحب کی طرف متوجہ تھی۔

”اوہ میکسی کا کاری؟“

”اپنی گرل فرینڈ سے مانگ لیں۔“ وہ اٹھ کر آگے چلی گئی، اور وہ تکان بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر گردن موڑی تو اصر ابھی تک ششدہ بیٹھا تھا۔ اس کو متوجہ پا کر آگے ہوا۔ ”تو اس رات تم ایسی جگہ تھے جس کے بارے میں کوئی گواہی دینے کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ واو۔ ایسے طریقے مجھے کیوں نہیں سوچتے؟“ وہ محظوظ ہوا تھا۔ فارس پیچھے کو جھکا اور دھیرے سے کہنے لگا۔ ”تم نے میرے کیس کے لئے تمام انویسٹی گیشن کی۔ اس کے لئے تمہارا....“

”اس کی فیس اس پکھی ہے۔“ اُختر نو رأس کے کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ ”پس کھوؤں کے پیسے الگ ہیں۔ تیکس الگ ہے۔ ویک اینڈ سے پہلے ادا کر دینا۔“ اور وہ جو شکریہ ادا کرنے لگا تھا، رک کر اس کا غذ کو پڑھنے لگا۔ ابرو بے اختیار اٹھے۔ باری باری فیس کے دونوں تحریری مطالبوں کو دیکھا اور پھر ماچھے پہلے لئے ”بہت بہتر“ کہہ کر خفگی سے رخ موڑ لیا۔

❖❖❖

یا اتنا سخت جان کہ تلوار بے اثر..... یا اتنا نرم دل کہ رگ گل سے کٹ گیا جس دو پھر فارس گھرو اپس آیا۔ وہ انیکسی والوں کے لئے عید کا دن تھا۔ حسینہ اور صداقت نے اچھا سا کھانا بنا لیا تھا۔ سیم ندرت اور بڑے ابا اس کے ساتھ لا کوئی نجی میں بیٹھے تھے۔ سب خوش باش اس سے باتمیں کر رہے تھے۔ وہ بھی مسکرا کر ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ وہ تھکا ہوا مگر مطمئن لگتا تھا۔

خین مل کر اسٹرڈی میں چلی گئی تھی۔ وہ کچھ کام کر رہی تھی۔ ایسے میں صرف زمر تھی جواب تک اس سے نہیں ملی تھی۔ اوپر اپنے کمرے میں وہ ناخن دانتوں میں دبائے ادھر ادھر ٹھیل رہی تھی۔ بار بار دروازے کی طرف بڑھتی، پھر سر جھٹک کرو اپس ہو لیتی۔ ذرا سی درز سے نیچے سے آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ (سب کو شکریہ کہہ رہا ہے۔ آپ آپ کا شکریہ، کھانے بھینجنے کا۔ انکل آپ کا شکریہ، دعا کرنے کا۔ صداقت تمہارا شکریہ، پتہ نہیں کس چیز کا۔ اور میں جو اتنے مبینے اس کے لیے خوار ہوتی رہی، میرا کوئی احسان نہیں!) وہ خفگی سے خود سے بڑھ رہا تھا۔

”میں زمر کو دیکھ لیوں۔“ وہ ایک لسکو ز کر کے انھا آیا تھا۔ اب زینے چڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ زمر نے جلدی سے تکیوں کے غلاف اتارنے نئے غلاف نکالے اور جس وقت وہ دروازہ ذرا سا بجا کر اندر واصل ہوا، وہ مصروف ہی تکیوں کے غلاف بدلتی نظر آرہی تھی۔

”السلام عليکم۔“ دروازے میں کھڑے وہ ذرا سا کھنکار کر بولا۔ زمر نے ایک بے نیاز، اچھتی نظر اس پر ڈالی (جنیز پر سوئٹر پہنے، وہ تھکا ہوا مگر مطمئن لگ رہا تھا) اور تکیے کو نئے کور میں ڈالتی ہوئے مصروف انداز میں بولی۔

”نمبر ایک۔ میں نے تمہارے لئے جو بھی کیا، ٹیکم پارٹر سمجھ کر کیا۔ نمبر دو، میں اب بھی نہیں بھولی کہ تم نے مجھے استعمال کر کے جیل توڑ نی چاہی تھی۔ نمبر تین، مجھے تمہاری رسیٹور انٹ ولی باتمیں بھی یاد ہیں۔ نمبر چار، تم جب چاہو، ڈائیورس پیپرز بنوالا، اگر میرے پاس حق طلاق ہوتا تو میں خود بنوایتی۔ نمبر پانچ، میں مزید تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اس لئے میں نے اپنا سامان نیچے اسٹرڈی روم میں شفت کر دیا ہے۔ یہ کمرہ اب صرف تمہارا ہے۔ نمبر پچھے، ہم نیم کی طرح.... پہلے کی طرح کام کرتے رہیں گے، لیکن، تمہاری بے گناہی معلوم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے تمہیں معاف بھی کر دیا ہے۔ نمبر سات....، الفاظ انٹوٹ گئے، کیونکہ وہ خاموشی سے قدم قدم چلتا اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں لے کر، اسے اپنے کندھے سے لگایا اور تھوڑی اس کے کندھے پر جائے، آنکھیں بند کیے اس نے صرف اتنا کہا۔ ”شکریہ۔ میرے لئے لڑنے کا۔“

چند ساعتیں اور گزریں۔ چند لمحے اور سر کے۔

زمر جو بالکل مخدود ہو گئی تھی، بمشکل گہری سانس لے کر بولی۔

”نمبر سات“ میں کل تمہارے خلاف restraining order فائل کروں گی۔ جس کے تحت تمہیں مجھ سے دس فٹ دور رہنا ہو گا۔ اور اپنے ہاتھ چھڑائے۔ فارس نے چہرہ اٹھایا، اسے کہنی سے تھاے اپنے سامنے کیا، اور قدر تے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”تم کل یہ آرڈر فائل کرو گئی؟ واقعی؟“

”بالکل!“ گردن کڑا کر بولی، مگر اس کی آنکھوں میں دیکھتا... اف۔

”مگر کل تو چھٹی ہے۔“

”میرا مطلب تھا، پرسوں۔“ تملک کر بولی، اور کہنی چھڑا کر دروازے کی بڑھائی۔

”اچھا، کمرہ مت جھوڑو، ہم بیٹھ کر اس بارے میں بات کر لیتے ہیں۔“ وہ پیچھے سے بولا تھا۔ تکان سے مسکرا کر۔

”نمبر آٹھ، میرا فیصلہ تھی ہے۔“ بظاہر خشک لبھ میں کہہ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ سیڑھیاں اترتے اس کے کانوں سے دھوئیں نکل رہے تھے۔ بخشکل چہرے کو نارمل رکھ کر وہ اسٹڈی میں آئی تو اندر نفرشہ بدلا ہوا تھا۔

ایک صوفہ کم بیڈ جو فی الحال کھلا ہوا تھا۔ (اور اس کی اوپر جائی دو میسرس جتنی ہی تھی) پھر نین لیپ ٹاپ لیتے بیٹھی تھی۔ اندر سفید فلیش لگی تھی اور حنہ یک نک اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا بنا؟“ زمر فوراً اس کے قریب آئی۔

”میں نے اس فلیش ڈرائیو کے پروگرام کوڈی کر پڑ کر لیا ہے۔ اور وہ کھل گئی ہے۔“

زمر کو آگے پیچھے کی ہرشے بھول گئی۔ دل و دماغ میں جیسے سکون سا اتر آیا۔

”اوہ ریلی۔“ وہ خوشی سے کہتی اس کے ساتھ آ کر بیٹھی اور اسکرین کو دیکھا۔

”کیا انکا اس میں سے؟“

خنیں ابھی نکل شلتھی۔ ”میں نے اتنے مہینے لگائے، اتنا وقت برہا دیکیا، صرف ایسا اور آنا کے لئے۔“

”کیا؟“

خنین نے اسکرین کا رخ اس کی طرف پھیرا۔ ”اس فلیش ڈرائیو میں سوائے فروزن فلم کے، کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر طرح سے گنجال بھی ہوں اسے۔ مگر یہ خالی ہے۔ یا تو بھائی نے اصل فلیش مجھے نہیں دی، یا اس نے غلط فوٹو رکا پی کیا تھا۔“ وہ ابھی تک سن ٹھی۔ ”اوہ نہیں!“ زمر نے ڈھنڈھال سی ہو کر سر پیچھے کو گرا لیا۔

اور قصر کاردار کے لاوٹھ میں جواہرات کا درا رغبے سے ادھرا دھر ہل رہی تھی۔ اس کی رنگت مارے غصب کے سیاہ پر رہی تھی، جبکہ صوفے پر بیٹھا شمش گردن پیچھے کو پھینکتا ہفتا جا رہا تھا۔ جواہرات نے رک کر ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ ”وہ رہا ہو کر ہمارے سروں پر پھر سے پہنچ گیا ہے اور تم بھیں رہے ہو۔“

”اس نے وہ نیس اسٹینڈ پکڑ رہے ہو کر، ایڈو و کیٹ جزل کو بلک میل کیا... ہاہا... ناؤڈ بیس کوں۔“ وہ بھس رہا تھا۔

”زمر کو تو میں دیکھ لیوں گی، تم مجھے بتاؤ اب ہم اس کو دوبارہ کیسے جیل بھیجنیں۔“

”اب بلک پر اسکیوشن آفس میں کوئی اس کو پر اسکیوٹ نہیں کرنا چاہے گا۔ میں نے آپ سے کہا تھا، کیس جلدی چلوانے کی کوشش نہ کریں، لیکن خیر۔“ بہتے ہنستے وہ پل بھر کر کا اور محفوظ انداز میں جواہرات کو دیکھا۔ ”میں مزید اس کو جیل میں نہیں بھیجنा چاہتا۔ اس کو صرف ایک شخص اندر کرو اسکتا تھا۔ کرٹل خاور۔ اب مزید کوشش نہ کیجئے۔ وہ ہمارے لئے خطرہ نہیں ہے۔ نہ بن سکتا ہے۔ اب مودو آن کرنے کا وقت ہے۔“

اچھے کام کرنے کا وقت ہے۔“ کوٹ کا بہن بند کرتا اٹھا۔“ میں مجی ایک اچھا انسان بننا چاہتا ہوں۔ میں راستہ بدلیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے پرانی دشمنیاں چھوڑ کر آگے بڑھیں۔“ ماں کا شانہ تھپک کروہ آگے بڑھ گیا۔ جواہرات وہیں کھڑی گلستی رہی۔ پھر کمرے میں آئی۔ دروازہ مغلفلی کیا اور فون ملایا۔

”مجھے اچھی خبر کب سماں گے فصح؟“ زہر خند لجھے میں وہ بولی تھی۔

”آج رات کام ہو جائے گا۔ پہلے سعدی اور پھر خاور۔“ سن کراس نے موبائل پرے ڈالا اور سنگھار میز کے قد آور آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سفید اور سرخ لمبے گاؤں میں ملبوس وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی، مگر چہرے پر چھایا غیض و غصب اس کے حسن کو گھپنا رہا تھا۔ شرارے پھوٹتی آنکھوں سے آئینے کو دیکھتے اس نے گردن میں پہنی موتیوں کی مالانوچ ڈالی۔ تر تر تر۔۔۔ سفید چکنے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر فرش پر گرنے لگے۔

اوپر اپنے کمرے میں بستر پر سستی سے نیم دراز پیروں کی قیچی بنائے نوشیر وال کھٹا کھٹ موبائل پہنچا پ کیے جا رہا تھا۔ بال بنے تھے اور لباس سے لگتا تھا کہ ابھی آفس سے لوٹا ہے۔ آنکھوں میں ازملی بے زاری کی جگہ مصروف ساتاڑھا۔ گویا گفتگو میں بہت منہمک ہو۔ ”بھائی شادی کرنے جا رہا ہے۔“ اسکرین پر الفاظ ابھر رہے تھے۔ دوسرا طرف سے علیشا کا جواب چکا۔ ”یہی بتانے کے لئے اتنی صبح نیکست کر رہے ہو؟“

”کیا تمہیں ذرا بھی دلچسپی نہیں سننے میں کوہ کس سے شادی کرنے جا رہا ہے؟“

”تم بتا دو۔“

”آبدار عبید سے، وہ ہماری یونی میں تھی۔ مجھے شدید ناپسند ہے وہ۔ بھائی کو وہی لوگ پسند آئے ہیں جو مجھے شدید ناپسند ہوتے ہیں۔“ لکھتے ہوئے ابرو ٹھنگ گئے اور آنکھوں میں خفگی عود آئی۔ ”اچھا۔ وہی جس کو تم یونی میں لگکر کرتے تھے اور پھر ہاشم نے تمہیں پٹوایا تھا؟“ وہ محفوظ ہوئی تھی۔ لمحے بھر کو نوشیر وال کا رد انہم میں ہو گیا۔ جیسے سارا خون جم گیا ہو۔ ہڈیاں برف کی ہو گئی ہوں۔

”کون ہا شم؟ اور تمہیں کیسے پہتے؟“ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ آلبی کے میکٹر کا نام بھی شاید ہاشم ہو۔

”کیا تمہارے بھائی نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں نے اور نگزیب صاحب کا کاڈنٹ اپنے پاس مر رکر کھا تھا۔ ان کی ساری ای میلز میں پڑھا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے ہاشم نے ان کو میل کر کے بتایا تھا کہ تم ان کے دوست کی بیٹی کو ننگ کر رہے تھے، اسی لئے اس نے اپنے کسی بندے کے ذریعے تمہیں پٹوایا تھا۔ شاید اس کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ خود کو اس لڑکی کا شوہر یا میکٹر ظاہر کرے۔“ وہ رکی۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم تھا؟“ نوشیر وال کے چہرے کارنگ یوں بخوبی گایا جیسے سینے میں گھاؤ لگا کر کسی نے سارا خون نکال لیا ہو۔ بے جان ہوتے ہاںوں سے اس نے موبائل فون وہیں لحاف پر گرا دیا اور سر اٹھا کر خالی خالی، شل، ششدرنظر وہیں سے سامنے دیکھا جہاں سنگھار میز کا آئینہ اس کا زرد چہرہ منعکس کر رہا تھا۔

اس کی ساری دنیا زمین بوس ہو گئی تھی۔

❖❖❖

فیض سر پر جو ہر اک روز قیامت گزری ..... ایک بھی روز مکافات نہ ہونے پائی  
کمرن خاور اپنے کرہ بجن میں زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ لگا ہیں دور خلا میں جب تھیں اور وہ کسی گھری سوچ میں گم دکھائی دیتا تھا۔

آنکھوں کے گرد لگنے والے ستمل ہو چکے تھے اور سخت بھی بہتر تھی۔ ایسے میں دروازہ کھلنے کی آواز سے وہ پورا کاپا۔ اور چرخ والی خلیا۔  
خادر کا نام کرنے کی فرمانے والا اور یہی نئے نئے میں پر رکھی۔ خادر کی نئی ہیں اور اسکے دروازے کے پار گئیں۔ وہاں ایک اور گاڑا نظر آ رہا تھا۔  
خادر کی آنکھیں پر سوچ انداز میں سکریں۔

"تمہاری اور اس کی تو سچ ڈیوبنی ہوتی ہے، تم لوگ اس وقت کیا کر رہے ہو؟ اور رات والے گاڑا زرگار ہیں ہیں؟" اس کا ما تھا نہیں۔  
خادر نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ گہری خاموشی نظر اور مزید گا۔ خادر جیزی سے انجھ کراس کے پیچھے آیا۔

"نیچے سعدی یوسف کے کمرے میں جانا ہے؟ ابھی اسی وقت۔" وہ چونکا ہوا الگا تھا۔ مگر جو رانے ایک ہم پیچھے مزگرا کیک دروازہ مکان نہ  
کے چڑھے پر دے مارا۔ جلد غیر مرتقی تھا۔ وہ تیورا کر پیچھے کو گرا۔ اسی اثما میں دو دروازہ آگے سے بند کر چکا تھا۔ خادر وحشیان انداز میں دروازہ  
پیش کر۔

"اگر تم نے اسے مارا تو میں جھینکنیں چھوڑوں گا۔ تم اس کو نہیں مار سکتے۔ اس کو بھی نہیں مر رہا۔"  
سعدی یوسف کے کمرے تک پہنچا یہ آوازیں نئی نئی دستی حیں۔ وہ اسلامی محل پہنچا کا نہ سامنے رکھے۔ سہری قلم سے لکھتا ہوا  
دیکھا۔

میں پہنچا کنٹا ہوں اللہ گی وحکایا۔ جو ہے شیخان سے۔  
سیاہی شرست میں ملبوس اس لڑکے کے ہزار و شیپور کیے بال کیلے اور سلیمان سے پیچھے کو بنے تھے۔ وہ گردن ترچھی کیے منہک رات قم کا مذہب  
پڑھ رہا تھا۔

"قرآن میں بہت سے واقعات آپ پھر پھر کر رہتے ہیں اللہ تعالیٰ۔ ان کو دیکھ رہا تھا کہ مقصد مختلف ہوتا ہے۔  
بیسے سورہ الحمل میں بیٹھنے بھی واقعات ہیں اُن میں ایک قد رہشتہ کے ہے۔ ویسے تو بہت ہی اقدار رہشتہ کے ہوں گی۔ مگر میں ہندو مسیح اور محمد و مطہر  
آدمی ہوں۔ اتنا خور و غور کر پاؤں گا۔ جتنی سیری ہائی و عتی ہے۔ سو میں کہہ باتا تعالیٰ کہ اب تک بیٹھنے واقعات پر خور و غور کر کیا ہے میں نے۔ ان  
سے میں ایک اکالی ہے جو پورے سسم کے خلاف کمزی ہے۔ پہلے موئی کا واقع۔ ایک موئی اور سامنے فرخون اور اس کے لاد افسر۔ پھر سلیمان  
اور ان کے سامنے ایک پورا نام جس کو وہ کنڑوں کیے ہوئے ہیں۔ پھر ایک سلیمان اور ان کے سامنے ملکہ سہا۔ اور اس کے سردار و سلطنت  
وہ سری چاہب ایک ملکہ سہا اور سامنے سلیمان اور ان کے لاد افسر۔ ایک چہہ جو پورے افسر کے سامنے اکیا اکڑا اپنی صفائی دے رہا ہے۔ پھر  
ایک شیب اور ان کے سامنے بوری کا فر قوم۔ لیکن اگر خور کر تو سورہ کا ہم "انہل" ہے۔ جو ہمیں۔ کوئی بھی بیہاں اکیا ہو کر بھی اکیا نہیں ہے۔  
موئی کے ساتھ جوان کے بھائی اور ان کی قوم ہے۔ سلیمان کے ساتھ جوان کے لوگ ہیں۔ ملکہ بھی اپنے سرداروں کے ساتھ ہے۔ شیب بھی اپنی قوم  
کی ایلویت سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بھی "وارث" تھے جن سے ان کے خلاف قتل کی سازش کرنے والے اور رہتے تھے۔ انہاں کو پڑے ہوئے  
کام کرتے وقت یہ نہیں موجا چاہیے کہ مجھا کیسے نے یہ سب کر لیا۔ میں اکیا ایک سیاف میدہ آدمی ہوں۔ بلکہ نہیں۔ بہت سے لوگ۔ خاموش  
خود تینوں چیزوں سے لوگ ہوں گے جنہوں نے آپ کا ساتھ دیا ہوا کہ ان کو کھوئا نہیں چاہیے۔ جو بندوں کا شکر نہیں کرتا اور رب کا شکر نہیں کرتا۔"

باہر گن میں وہی کا ردا خاموشی سے نہ سے میں پیٹھ کر رہا تھا۔ بھیج کا ناکاب را اور کیا۔ بھیج کیا۔ گلاں رکھا۔

"اور نجات دی۔ تم نے ان لوگوں کو بیوایاں لائے اور جو (اللہ سے) اڑتے رہتے ہے۔ اور لوگوں جب اس نے فریا۔ یا پی قوم سے کیا  
تم اس کا کرتے ہو۔" (بے جیانی) کا "حالانکم" دیکھتے ہووا۔

"فاختا" تیز تیز لکھتے اس مقصود مذاکرے نے گہری صافی لی۔ "اس لفظ کے ساتھ دہم میں عموماً ان کا مون کا خیال آتا ہے جو

لہجے میں بھری۔ یہاں تک سب سے اول نامی تھی۔ کوئی دھکر نہ کرنا تھا۔

”اک بارہے ایک دن تاریخیں کے اس سیرت کے لئے اسیں کہاں۔ جو کہ ایک مورخہ جات پڑھے۔“

"گردنی خوبی۔" توہنگی سکھات کے سارے لفڑی پڑھا۔ آئیں گلی یہ کہا، اکامہ گیا ہے کہ بڑا، سے ٹھیک ہے کہ بڑا  
وہ اپنے لئے لگیں۔ قائم کیاں کرنا بخوبی جو بھت پان کر کے، وہ احمد اکیس کے دہون میں خوبی پڑھی جو کہ بڑا ہے  
وہ اپنے لئے لگیں۔ اس کی براہ راست کر لئے تھا گلری، جو اپنے نیشنل لائسنس میں کامیابی کا نتالے ہے اور پہنچانی کیا جاوے۔  
اسی کام سے فریبی مارا تھا۔ اس کو براہ راست نہ اپنی نیشنل لائسنس تھی پھر وی کی طلاق تھا اور دیجے۔ میرے دادا اس کے  
چالاک اور اپنا:

زے میں بھری تے اکرم گرم پا داں کی پیٹتے، کجی سالوں میں بچکن کر جی۔ پانی کھاں میں اٹھا۔ بورے المانے گی تو گھر  
لے کے گے۔

卷之三

#### REFERENCES

”آئندہ باب میں کافی تکمیل کر کر اکالی ممالک کا پیش کیا جائے گا۔“  
 ”لہذا ہاتھ پر ہے اخراج کا نام گئی۔ اس سنبھال پاپس میں پندرہ کے آٹے، تیر کے آٹے، لیکے آٹے، گوچا اور رنگی آٹے۔  
 امریکی اس کے لئے میں ”لندن“ کہاں پر ہے میں ایسا کرتے ہیں۔ اور تمہارے تھرے والے اس میں کیا کوئی اونچائی  
 نہیں ہے۔ کچھ ڈینا وہ افسوس کرنے والے افسوس ہے تھے تھے اور ۱۹۴۵ء سے آئے اسلام کا پہلے ہے اس کا کوئی  
 افسوس نہیں۔ پہلے افسوس کی وجہ میں افسوس کرنے والے افسوس ہے۔ یہ سب ایک ہماری خوبی کی کہ تھیں مگر اس کے مقابلے میں سے افسوس کرنے  
 کرنے والے افسوس کی وجہ میں افسوس کرنے والے افسوس ہے۔ اگر اکالی کا افسوس کی وجہ میں مالک افسوس کرنے  
 کرنے والے افسوس کی وجہ میں افسوس کرنے والے افسوس ہے۔ اسی وجہ پر اکالی کا افسوس کی وجہ میں افسوس کرنے والے  
 افسوس کی وجہ میں افسوس کرنے والے افسوس ہے۔ کیونکہ ”قرآن“ کیا کہاں کی افسوس کی وجہ میں افسوس کرنے والے افسوس  
 کی وجہ میں افسوس کرنے والے افسوس ہے۔“

وہ ایجاد کیم تھا میں اس کے لئے کافی تھا۔ اس نے اپنے کام کے بعد کام کیلئے اپنے کام کے بعد کام کیلئے

وہ بھی سچا ہے کہ اسی تجسس کی وجہ سے جانشینی میں پولیس کی کامیابی کا سب سے بڑا عوامی خدش ہے۔

سعدی لکھ رہا تھا۔ کچن میں ہونے والی سرگردی سے بے نیازی۔

"انسان اسی کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ انجیل مقدس کے مطابق لوٹ کی بیوی نے لوٹ اور دو بیٹیوں کے ہمراہ نکلتے ہوئے.... پیچھے مر کر دیکھا تھا اور وہ نمک کا مجسمہ بن گئی۔ پھر اگئی۔ وہیں سے وہ "پیچھے مر کرنہ دیکھنا پھر کے ہو جاؤ گے۔" والی اصطلاح انکل ہے۔ جو گناہ آج لوگوں کو اتنا ہے کہ لگتا ہے، پر شل چوائیں لگتا ہے وہ اتنا سخت ناپسندیدہ ہے اللہ کے نزدیک کہ الہامی کتب میں آتا ہے۔ جبراہیل نے اپنے پر پہ اس پوری بستی کو اٹھایا، آسمان تک لے کر گئے اور واپس ٹھیخ دیا۔ وہ زمین میں ڈھنس گئے۔ ان پر پھرلوں کی نارگنڈ بارش بر سی۔ ہ شخص کے اوپر وہ پھر آ کر لگا جس پر اس کا نام منقش تھا۔ آج اس جگہ پر بحر مردار (dead sea) ہے۔ جہاں کوئی ذی روح نہیں رہ سکتا۔ جہاں پانی کے اندر... اتنے برسوں بعد بھی کوئی زندگی نہیں ہے۔۔۔ نزندگی پل سکتی ہے۔۔۔ یہ اتنے بڑے گناہ تھے اور آج لوگ...." قلم خشک ہوتے۔ لگا۔ اس نے رک کر قلم پھٹکا۔ پھر لکھا۔ بے سود۔ اس کا مودود خراب ہونے لگا۔ لکھنے کے لئے سب سے ضروری چیز ایک اچھا قلم ہوتی ہے۔۔۔ سعدی نے خنگی سے اس کے اوپر کے کلپ دیکھے۔ وہاں چار بڑن تھے۔ اس نے موجودہ نب کا بہن واپس اوپر کر دیا۔ اور دوسرا گرایا۔ لکھا تو وہ سرخ لکھتا تھا۔ اونہوں۔ اس نے تیرسا بہن دبا کر تیزی سے نب نکالی۔ وہ نیلی تھی۔ اور سعدی کو صرف سیاہ روشنائی پسند تھی۔ اس نے چوتھے بڑن کو پچھ کیا تو اندر سے... باریک سی نب نکلی۔ وہ اس سے لکھنے لگا پھر غور سے دیکھا۔ وہ نب نہیں تھی۔ سوئی کی طرح تھی۔ تیز دھار آ لے کی طری۔ اس کو آبدار کی آنکھوں کا اشارہ یاد آیا۔ وہ رک کر سوچنے لگا۔ تبھی دروازہ کھلا تو اس نے جھٹ قلم مٹھی میں دبایا اور یوں ظاہر کرنے لگا گویا اپنا لالما پڑھ رہا ہے۔

گارڈ نے دروازہ بند کیا۔ نڑے لا کر رکھی۔ باری باری چیزیں نکال کر میز پہ سجا کیں۔ پھر.... سعدی کی طرف پشت کیے.... جیب سے زنجیر کا نکلدا نکلا۔ وہ خاور کو باندھی گئی زنجیروں سے مشاہدہ کرتی تھی۔ اس پر خاور کا خون اور ڈی این اے موجود تھا، اور گارڈ کے ہاتھوں پہ دستانے چڑھے تھے۔ شفاف باریک دستانے۔

وہ ایک دم پلٹا اور پیچھے سے آ کر سعدی کی گردن میں وہ زنجیر ڈالی۔ بلکہ ڈالنی چاہی۔ مگر سعدی تیزی سے آگے کو جھکا، اور خود کو کردن سمیت دائیں جانب گرایا۔ گارڈ کے ہاتھ میں اس کی شرٹ کا پچھلا حصہ آیا تھا، وہ اس سے اس کو کھینچتے ہوئے زمین پر گرانے لگا۔ سعدی نے "میری... کوئی ہے...." چلاتے ہوئے ہاتھوں اور پیروں سے اس کو پرے دھکیلنا چاہا، مگر گارڈ کا زور بہت زیادہ تھا۔ وہ ھٹھنا سعدی کے سینے پر رکھ، پوری قوت سے اسے نیچے گرائے رکھے، زنجیر اس کی گردن میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا اور سعدی مسلسل سردا میں باسیں ہلاتے ہو۔ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پوری قوت لگاتے ہوئے گارڈ کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔۔۔ سعدی نے بھی اتنی ہی قوت سے اس کے ہاتھوں کو ڈال کر پرے ہٹایا اور اس سے پہلے کے امتحنا، گارڈ نے زور کا مکا اس کے جبڑے پر سید کیا۔

سعدی کا دماغ بھی گھوم گیا اور چہرہ بھی۔ اور جب چہرہ بائیں جانب گھوما تو اسے دھنڈ لاسانظر آیا۔ سنہری پین ساتھ میں گراپڑا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔۔۔ پھیلایا۔۔۔ قلم چند اخیز دو رہا۔ گارڈ نے اس کی گردن کے گرد زنجیر پیشی، اور اسے کرنے لگا۔۔۔ سعدی کی انگلیوں نے قلم کو پھٹا اور اگلے ہی لمحے اس نے قلم اٹھا کر گارڈ کے جسم کے اندر اتار دیا۔ دھنڈ لی بصارت کے باعث سمجھنیں آئی کہ کھڑھ مارا۔۔۔ مگر.... منظر درا داش ہوا.... گردن کی زنجیر ڈھیلی ہوئی تو دیکھا۔۔۔ پین گارڈ کے ہاتھ کی پشت میں کھب چکا تھا۔ زنجیر گارڈ کے ہاتھوں سے پھسل گئی اور وہ ایک جھکلتے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ اگلے ہی لمحے گھننوں کے بل زمین پر گرا۔ سعدی نے زنجیر گردن سے ٹکالے۔۔۔ لڑکھڑا کر کھڑے ہوتے اسے دیکھا۔ گھننوں کے بل بیٹھا گارڈ.... سعدی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی اور آنکھوں میں ایک شل ساتھ رہا۔ منہ سے یہ یک جھاگ نکلنے لگی اور وہ منہ کے بل نیچے گرا۔

سعدی ایک لمحے کے لئے تو ممجد ہو گیا، پھر تیزی سے اس کے اوپر جھکا۔

”Don't die“ جلدی سے اسے سیدھا کیا اور اس کا چہرہ تھپٹھایا۔ گارڈ ابھی تک سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

”مرنا مت پلیز مت مرتا۔“ وہ دوخت سے اس کو بخوبی تے کہہ رہا تھا۔ گارڈ کی متوجہ آنکھیں سعدی پہ چھیں۔ وہ آنی جیران آتنی ششدر آنکھیں تھیں... کہ سعدی کا دل بند ہونے لگا۔ اور ان آنکھوں میں روشنی بھی تھی۔ زندگی کی رمق۔ اور پھر.... سعدی نے دیکھا... لمحوں میں روشنی کی وہ جوت بجھ گئی۔ گارڈ کا جسم مختندا نیلا پڑ گیا۔ بے جان بالکل سرد۔

یہ وہ پہلا قتل تھا جو سعدی یوسف نے کیا تھا۔

اور یہ وہ پہلی رات تھی جب سعدی یوسف نے سعدی یوسف کو کھود دیا تھا۔

(اختتام حصہ دوم)



باب 20:

## لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

(حصہ سوم)

”ماہ کامل کی وہ برف رات!“  
 کوہ سار پہ سفید برف دمک رہی ہے۔  
 ایک قدم کا نشان تک نہیں ہے۔  
 ایک تہائی کی سلطنت ہے...  
 اور یوں لگتا ہے جیسے میں ملکہ ہوں!

میرے اندر کے طوفان کی طرح باہر کی ہوا بھی غرار ہی ہے  
 میں اپنے شر کو اندر نہیں دباسکی...

خدا جانتا ہے میں نے کتنی کوشش کی!  
 کہ ان کو معلوم نہ ہونے دوں!

وہ اچھی لڑکی ہیں جاؤں جو مجھے بناتا تھا۔  
 چھپالوں، محسوس نہ کروں، ان کو پتہ نہ چل جائے۔

مگر خیر... اب جان گئے سب!

سو... جانے دو... جانے دو

اب نہیں دباسکتی اس کو اندر

جانے دو... جانے دو

مژ رجاو... اور دروازہ ٹھیک دو

لوگ کیا کہیں گے، مجھے پرواہ نہیں۔

طوفان کو برپا ہونے دو۔

ٹھنڈے سے مجھے فرق پڑا، کبھی نہیں!

عجیب بات ہے کہ کیسے ذرا سے فاصلے سے

چیزیں جھوٹی دکھائی دیئے گئی ہیں۔  
اور وہ خوف جو کبھی مجھے گھیرے رہتا تھا،  
اب مجھے چھو بھی نہیں پا رہا۔

اب یہ دیکھنے کا وقت ہے کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔  
اب اپنی حدوڑ کو آزمانا ہے اور توڑنا ہے  
نہ کوئی تصحیح نہ کوئی غلط... کوئی اصول نہیں میرے لئے۔  
میں ہوں آزادا!

جانے دو... جانے دو  
تم اب مجھے کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھو گے  
یہاں کھڑی ہوں میں اور یہیں رہوں گی میں!  
ٹوفان کو برپا ہونے دو۔

کسی برف شارکی طرح ایک خیال دل میں جنم ساجاتا ہے!  
”میں کبھی واپس نہیں جاؤں گی، ماخی ماخی میں رہ گیا۔“

جانے دو... جانے دو  
اور میں انھوں گی تازہ صبح کی طرح  
جانے دو... جانے دو  
وہ پر فیکٹ گرل اب نہیں رہی...  
اور یہاں کھڑی ہوں میں دن کی روشنی میں  
ٹوفان کو برپا ہونے دو  
ٹھنڈ سے مجھے فرق پڑا کبھی نہیں!

Queen Elsa (فروزن)

فتح نے تیز قدموں سے راہداری عبور کی اور اضطراب پر قابو پائے دروازہ کھولا تو گارڈز اور میری خاموش کھڑے نظر آرہے تھے۔ سعدی کے کمرے کی چوکھت پر خاور کھڑا افرش کو دیکھ رہا تھا جہاں بے سدھ گارڈ لیٹا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی نے بند نہیں کی تھیں۔ وہ ہنوز شاک کے عالم میں کھلی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی زمین پر سعدی اکڑوں بیٹھا تھا۔ گھنٹے سینے سے لگائے وہ شل ساسا منے خلاء میں دیکھ رہا تھا۔ مٹھی سختی سے بند تھی۔

”کیا ہوا ہے ادھر؟“ فتح خود پر غصہ طاری کرتا، گارڈز کو ہٹاتا تیزی سے اندر داخل ہوا۔ لاش کے قریب جوتے روکے۔  
”وہ کھانا لے کر اندر گیا۔ پھر کچھ دیر بعد سعدی نے آواز دی۔ میں آئی تو یہ دونوں اسی حالت میں تھے۔ یہ کچھ بتانہیں رہا تھا تو میں نے خاور کو بلایا۔“ میری جلدی جلدی کہنے لگی۔ گارڈز بھی دم بخود تھے۔ مرنا یا مارنا، ان کی جا ب ڈسکرپشن میں شمول نہ تھا۔ وہاں کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ ان کا ساتھی گارڈ سعدی یوسف کو قتل کرنے اندر گیا تھا۔ اور جس نے اسے بھیجا تھا، اب وہ بیجوں کے میل لائیں گے قریب بیٹھا۔  
”اس کی موت زہر کی وجہ سے ہوئی ہے۔“ خاور نے خشک لجھے میں اسے مخاطب کیا، مگر فتح نے جھک کر اس کی بھنس چھوٹی، گردن پر

ہاتھ رکھا۔ پھر احتیاط سے ہاتھ کی پشت دیکھی۔ وہاں موجود نشان واضح تھا۔

”کہاں سے آیا ہر تمہارے پاس بولو۔“ اس نے سعدی کو جھپٹ کر کھڑا کیا۔ سعدی ابھی تک اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر جمی تھیں۔ فتح نے پہلے جرأت کی بند مٹھی کھوئی۔ اندر مرڑی تڑی تصویر تھی۔ پھر اس نے اس کی تلاشی لی، جیسیں چھپتا ہے۔

”پورا کمرہ چیک کرو ایک ایک چیز چھان مارو۔ زہر لیا۔ جیکچش کہاں سے آیا؟ مجھے جواب چاہیے۔ اس کی بھی تلاشی لو۔“ خاور میں طرف اشارہ کرتے وہ گرجا تھا۔ خاور نے ابر و اچکا کر ہاتھ اٹھادیے۔ گارڈ آدمی طوفان کی طرح کرہ سکھانے لگے۔ میری وہاں سے ہٹ آئی۔

قریباً ایک گھنٹہ گارڈ ز اس کے کمرے کو چھانتے رہے۔ ہر شانداری، بکھرا دی۔ مگر زہر لی سرخ نہ ملی۔ فتح، جواہرات کو کال مالا۔ وہاں سے نکل گیا۔ وہ سخت پریشان لگتا تھا۔ کمرے میں وہ دونوں تمہارے گئے تو خاور نے ایک گہری نظر سعدی پر ڈالی جو پھر سے فرش پر اکڑوں بینجا تھا۔ شل ساکت۔ لاش اب وہاں نہیں تھی۔

”مشکر کرو بروقت میری نے وہ پین چھپا دیا۔ ویسے کہاں سے آیا وہ تمہارے پاس؟“

وہ نہیں سن رہا تھا۔ بس یہ تک دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ تم پر حملہ کرنے آیا، تم نے اسے مار دیا۔ ٹھیک کیا۔ اب ہم زیادہ دن یہاں نہیں رکیں گے۔ ماہ کامل کی رات قریب اپنپنچی ہے۔“

اس نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ خاور سر جھٹک کر باہر نکلنے کا تو وہ بولا۔

”اس کی بھی فیملی تھی۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے مٹھی کھوئی۔ ”یہ اس کی جیب میں تھی۔ اس کی بیوی کی تصویر۔ ساتھ میں ایک پچی بھی ہے۔ دلوگ... دلوگ تھے اس کی فیملی میں۔ میں نے جس کی جان لی وہ ایک باپ بھی تھا۔“

”وہ ایک قاتل تھا۔“ خاور ناگواری سے بولا۔

”وہ... ایک... انسان تھا...“ سعدی نے آنکھیں اس کی طرف موزیں تو وہ سرخ تھیں، مگر خٹک تھیں۔ ان میں اس وقت بہت سے جذبات تھے۔ دکھ نصفہ گلٹ بے بسی۔ اور ان میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔

”تو پھر مبارک ہو سعدی یوسف۔ آج سے تم بھی ہم جیسے قاتلوں میں شامل ہو گئے ہو۔“ خاور گز کر کہتا باہر نکل گیا۔ سعدی نے ٹمی نظروں سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اس کا دماغ ابھی تک شل تھا۔

..... ♦♦♦ .....

میں ایسے جگھٹے میں کھو گیا ہوں ..... چہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے  
صحیح دھنڈ میں ڈوبی تھی۔ کہیں کوئی سنبھی کرن ذرا دیر کے لئے جھاکتی پھر دھنڈ لکوں میں گم ہو جاتی۔ زمر نے اسٹڈی روم (اپنے نے کمرے) کا دروازہ کھولा تو لا ڈرخ میں معمول کی گہما گہما نظر آئی۔ صداقت ابا کی وہیل چیزیں باہر لارہا رہا تھا۔ حسینہ انڈے پھینٹ رہی تھی۔ ندرست فرخ کھوئے کھڑی تھیں۔ سیم یونیفارم میں ملبوس ناشتے کے لئے دہائی دے رہا تھا۔ ایسے میں سب نے سیاہ کوت میں ملبوس تیاری زمر کو اسلامی سے نکلتے دیکھا تھا۔ ندرست بالکل تھہر گئیں۔ (ابھی کل ہی تو فارس آیا تھا اور...)۔ ابا نے بھی چونک کرانے سے دیکھا۔

”تم... ادھر تھیں؟“ ندرست نے صداقت کے باہر جانے کا انتظار کیشل کیا اور پھر پوچھے بنازرہ سکیں۔ وہ جو سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی، مڑکر بنا کسی تاثر کے ساتھ ندرست کو دیکھا۔ ”جی۔ مجھے دیر تک کیس اسٹڈی کرنا ہوتا ہے۔“ سادگی سے کہہ کر زینے چڑھنے لگی۔ اماں بالخصوص نظر انداز کیا جو بالکل خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

زینے عبور کرتے ہوئے اسے اپنی پشت پر سب کی حتیٰ کر حسین تک کی نظریں محسوس ہو رہی تھیں۔ ابھی وہ اوپر پتپتی ہی تھی کہ فارس (اور اس کے سابقہ) کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا۔ جیز پر پوری آستین کا سفید سویٹر پہنے وہ تازہ دم لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرا یا۔ ”السلام علیکم۔“ ایسے مسکرا کر بولا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ (نگاہیں اب تک پشت پر گڑی محسوس ہو رہی تھیں۔)

”علیکم السلام۔ میرے جانے کے بعد کتنے خوش لگ رہے ہو۔“

وہ ہلکا ساہنسا، اور نفی میں سر ہلا کیا۔ پھر اس کی تیاری دیکھ کر استفسار کیا۔ ”کورٹ جارہی ہو؟ کیوں؟“

”تمہارے کیس کی وجہ سے جتنے لوگوں کے کیمز میں نے لٹکائے ہیں نا، ان کو بھی تو دیکھنا ہے اور ہاں۔ میری فیس نہیں ادا کی

تم نے؟“

فارس نے گہری سانس لی۔ ”میری دوسری جا بھی جا چکی ہے نہیں ملتے ہی ادا کروں گا۔ کچھ دن کی مہلت دے دیجئے۔“ زمر نے بمشکل مسکرا ہٹ دبائی۔

”صرف کچھ دن!“ تنبیہ کی اور پھر حمہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ فارس نیچے اتر آیا۔ ندرت ان کو نازل دیکھ کر واپس کاموں میں لگ گئیں مگر ابا لکل خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔

اس نے حمہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بیدار کمبل لئے نیک لگائے بیٹھی تھی۔ الجھے بال، سوتی صورت، بالکل چپ سی ہوئی، گھٹنوں پر جنم لیپ ناپ کو دیکھ رہی تھی۔ زمر بیدار کے کنارے آبیٹھی۔ ”سوہماری اتنے مہینوں کی محنت ضائع ہو گئی۔ وہ فلیش بے کار ہے۔“

”ہوں۔“ وہ غیر معمولی چپ تھی۔

”ہمیں فارس کو بتا دینا چاہیے۔ پچھلے تین چار ماہ فارس کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے، مگر اب ہمیں سعدی کے لئے فوراً کچھ کرنا ہے۔ ہمیں فلیش چاہیے ہے حمہ کیا دیکھ رہی ہو؟“

”شیر و کا ان باکس۔ وہ رات علیشا سے بات کرتا رہا تھا۔ یاد ہے اس کو ایک دفعہ ایک لڑکی نے پٹوایا تھا۔ ہارون عبدی کی بیٹی۔ آبدار عبدی۔ مگر علیشا اسے بتا رہی ہے کہ اسے ہاشم نے پٹوایا تھا۔“ وہ سارا قصہ سنارہی تھی۔ پھر انی ہوئی نظریں اب بھی اسکرین پر جنمی تھیں۔ زمر اس کے ساتھ آبیٹھی اور غور سے ساری گفتگو پڑھنے لگی۔ (خین نے شروع کا پورشن چھپا دیا تھا۔) اب زمر کو کیا بتائے؟

”کون ہے یا آبدار عبدی؟“

حمدہ نے گوگل کر کے نتیجہ اس کے سامنے رکھا۔ وہ کسی سیمنار میں اپنے والد کے ہمراہ کھڑی تھی۔ سرخ اسکارف لئے، گرے آنکھوں والی خوبصورت لڑکی جو سفید پینٹ اور بھورے کوٹ میں ملبوس تھی۔ کسی باہر کے ملک کی تصویر تھی۔

”یہ تو...“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اب خین کو کیا بتائے؟

نیچ آئی تو فارس ندرت، اور اسامہ کچن میں گول میز کے گرد ناشتہ کر رہے تھے۔ سیم بولے جا رہا تھا اور فارس مسکرا کر سن رہا تھا۔ ایسے میں ابالاؤنچ کے دوسرے کنارے بیٹھے تھے۔ چپ بالکل چپ۔ زمر نے اپنا کپ لیا اور ان کے ساتھ آبیٹھی۔

”هم ٹھیک ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہے۔“ قدرے بے نیازی سے شانے اچکا کر کپ لبوں سے لگالیا۔

ابا نے انہی سنجیدہ خاموش نظروں سے زمر کو دیکھا۔ ”میں نے دیکھا ہے۔ تم دونوں نارمل طریقے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں تمہیں بتاؤں اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے یہ سب پہلے دن سے چلا آ رہا ہے۔ اب تم لوگ عادی ہو چکے ہو۔“

ان کے لمحے میں کیا کیا نہیں تھا۔ چائے اس کو اندر تک تیز اب کی طرح جلا گئی۔ وہ بالکل سن رہ گئی تھی۔ پھر بنا کچھ کہہ باہر نکل گئی۔ اور پاپنے بیڈ میں بیٹھی خین اسی سطح کو بار بار پڑھے جا رہی تھی جو شیر و نے علیشا سے کہی تھی۔

بھائی شادی کر رہا ہے۔۔۔ بھائی شادی... بھائی....

شخ کی دوا... اپنی پیچر کی دعا... نجیر کی قضا صلوٰۃ... سب اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اس کی ساری دنیا برف ہو گئی تھی۔

❖❖❖

میری کشتی کو بھلا موج ڈبو سکتی تھی؟..... میں اگر خود نہ شریک کف دریا ہوتا  
قصر کاردار بھی اس صبح دھند میں ڈوباتھا۔ اپنے کمرے میں سکھار میز کے سامنے کھڑا ہاشم اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے تائی کی گردہ لگا رہا  
تھا۔ چہرے پر سمجھی گئی تھی۔ گیلے بال پیچھے کو برش کیے وہاب بہتر لگتا تھا گویا پیچھے چند ماہ کی بے سکونی دھیرے دھیرے عنقا ہو رہی تھی۔ تبھی اس کا  
فون بجا۔ اس نے سکھار میز پر کھلے موبائل کا اپسیکر آن کیا اور کف لنکس اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بولو فصح۔“

”سر... رات میں آپ کا فون آف تھا، میں بتانیں سکا۔ سعدی نے ایک گارڈ کو قتل کر دیا ہے۔“

کف لنک کو کف پر نصیحتی کرتی اس کی انگلیاں ٹھہر گئیں۔ لمحہ بھر کے لئے وہ منجد ہو گیا۔ ”قتل؟“

”گارڈ اس کے کمرے میں گیا اور پچھدیر بعده اس کی وہاں سے لاش ملی۔ زہر کے انجیشن سے مارا گیا ہے اسے۔“

”کیسا نجیکشنا؟“ وہ چونکا۔

”ہم نے بہت ڈھونڈا اگر انجیشن نہیں ملا۔ اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا۔“

”فصح، میری بات کان کھول کر سنو۔“ وہ بولا تو آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر نصیحت دی آئی تھی۔ ”اگر مجھے کبھی یہ علم ہوا کہ تم خادر یا  
سعدی کو میرے خلاف... کسی بھی طرح... استعمال کرتا چاہتے ہو، تو میں جو تمہارے ساتھ کروں گا، وہ تمہاری سات نسلیں یاد رکھیں گی۔“

”سر، ہم خود شاکر ہیں کہ انجیشن...“

”اوہ شہ اپ! بے دقوف کچھ رکھا ہے تم نے مجھے؟“ وہ غرایا۔ ”زہر تم لوگوں کے علاوہ کون دے سکتا ہے اسے؟“

”سر، آپ بقین کیجیے، میں....“

”سعدی یوسف کبھی کسی کو قتل نہیں کر سکتا، مجھے کیا معلوم اس نے ایسا اپنے بچاؤ میں کیا ہے یا تم اپنے کیے گئے قتل اس پر ڈال رہے  
ہو۔ کل رات سے پہلے مجھے وہ انجیشن چاہیے۔ ورنہ میں تم سب کوز میں میں گاڑھ دوں گا۔“

فون بند کیا تو اس کا مودود سخت خراب تھا۔ اسٹینڈ سے اٹھا کر کوٹ پہننا اور آئینے میں خود کو دیکھتے پر فیوم گردن پر چھڑ کی۔ تبھی دروازہ بنا  
کی دستک کے کھلا۔ ہاشم نے ناگواری سے چوکھت کو دیکھا۔ وہاں نوشیر وال کھڑا تھا۔ شب خوابی کی ٹی شرٹ میں ملبوس، وہ سرخ آنکھوں سے  
اے دیکھتا چند قدم اندر آیا۔

”میں اس وقت بات کرنے کے موڑ میں نہیں ہوں، شیرو!“ وہ مڑ کر خراب مزاج سے کہتا تائی پن تائی پل گانے لگا۔

”وہ کون تھا؟“ وہ اتنی عجیب آواز میں غرایا کہ ہاشم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ماتھے پر سلوٹیں پڑیں۔ ”تمہارے میرز کہاں  
میں شیرو؟“

”شیرو!“ جواہرات اوپر کسی کام سے آئی تھی۔ کھلا دروازہ دیکھ کر اور شیرو کی آواز سن کر وہ متعجب سی چوکھت میں آکھڑی ہوئی۔

”وہ لڑکا جس نے مجھے یونیورسٹی میں پیٹا تھا۔ وہ کون تھا؟“

ہاشم کے ابرد بھنپ۔ تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ صرف تائی پن کو جوڑتی انگلیاں بختی سے بھنخ لیں۔ ”تم نے مجھے کبھی ایسے کسی  
لڑکے کے بارے میں نہیں بتایا۔“

”مگر آپ جانتے تھے۔“ وہ چلایا۔ ”آپ نے اسے بھیجا تھا مجھے مارنے۔ کیونکہ میں نے... آپ کی آبدار کو کا لزکی تھیں...“

وہ سنتی رہی۔ پھر تکان سے مسکرائی اور انٹھ کھڑی ہوئی۔ اب کی بات مکمل ہوئی اور اس کی واک۔ واپسی کا سفر خاموشی سے کئتا۔ اب انے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ کہہ کر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پیچھے پڑ جانا اور پارہ دہرانا، اولاد کوڈھیت بتاتا ہے اور ابا ایسا نہیں چاہتے تھے۔

❖❖❖

ایک ضرب اور بھی اے زندگی تیشہ بدست ..... سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے  
اگلی صبح فارس غازی نے کاردار اینڈ سنز کے ہیڈ آفس میں ہاشم اور جواہرات کی موجودگی میں سائیں کیے۔ انٹھ کران سے باری باری ہاتھ ملایا اور چند مصنوعی مبارکبادیں اور نیک تمنا کیں سن کروہ وہاں سے چلا آیا۔ اس کے جانے کے بعد جواہرات نے ہاشم کو دیکھا۔  
”وہ کراپی جانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا واقعی وہ ہماری زندگیوں سے چلا جائے گا ہاشم؟“

”اب موہ آن کرنے کا وقت ہے گی۔ ماضی کو ماضی میں چھوڑ کر نئی زندگی شروع کرنے کا وقت ہے۔ اس کو اس کی زندگی شروع کرنے دیں۔ جیل نے اسے سارے سبق سکھا دیے ہیں۔ اب وہ انتقام اور انصاف کے چکروں سے دور رہے گا۔“ وہ کافی مطمئن لگ رہا تھا۔  
میز پر انیکسی کی چاپی رکھی تھی۔ جو گندول جیپر کے طور پر فارس ادھر چھوڑ آیا تھا۔ یہ انیکسی ان کی ضد تھی، اور وہ اور نگزیب کاردار کی وجہ سے اتنے سال خاموش رہے تھے۔ پھر برے بھی نہیں بننا چاہتے تھے۔ اور اب... وہ ان کی جھوٹی میں آگئی تھی۔ کیا شاندار آغا ز تھانی زندگی کا۔  
”پراہرا پہ جانے کی تیاری کریں میں!“ وہ سکون سے بولا تھا۔ شیر و اور سعدی کے معا靡ے ذہن سے ہٹا کر وہ پراہرا انجوانے کرنا چاہتا تھا۔

سری لیکا میں تین بڑے پراہرا (پریڈ) ہوتے تھے۔ تینوں ”پویا“ یعنی ماہ کامل (پورے چاند) کی راتوں کو ہوتے تھے۔ پہلا جنوری میں ہوتا تھا۔ دوسرا فروری اور تیسرا جولائی میں۔ پچاری اور ہاتھیوں کا لشکر مندر سے شروع ہوتا اور شہر کی مختلف گلیوں کا چکر کاٹ کر اپنی منزل تک پہنچتا تھا۔ پورا شہر، اور پوری دنیا سے لوگ آکر فٹ پاتھ پر گھنٹوں کھڑے ہو کر پریڈ کے ان کی گلی تک پہنچنے کا انتظار کرتے تھے اور پھر اس کو گزرتے دیکھتے تھے۔ کاردار کو لبکھو کا ایک پراہرا ہمیشہ دیکھنے جاتے تھے۔ شہر میں پہلے ساتھ جاتی تھی لیکن اب ہاشم اس کو نہیں لے کر جارہا تھا۔ شیر و سے اس نے پوچھا تک نہیں۔ سونی کی جان تھی ان ہاتھیوں میں۔ وہ اس کو لے جا رہا تھا جواہرات کے ساتھ اور وہ مطمئن تھا۔

ماہ کامل کی رات سے دو روز پہلے گارڈز سعدی اور خاور کو ان کے کروں سے نکال کر لائے، اور ایک تیسرا کمرے کے دھاتی دروازے کھوئے جو صرف بجلی سے کھلتے تھے اور ان کو اندر دھکیلنا۔ وہ اس کپاڈ نڈ کا میک کیم سکیورٹی روم تھا۔ اندر دلو ہے کے بلگ رکھے تھے۔

”بہت جلد تم لوگوں کو اس جگہ سے منتقل کیا جا رہا ہے۔ تب تک تم ادھر رہو گے۔“ تیران سے سعدی کو بتایا گیا تو وہ فوراً خاموش کھڑی میری کو دیکھنے لگا، جیسے بہت شاکڈ ہوا ہو۔

”تم نے بتا دیا ان کو؟“ میری نے نگاہیں جھکا دیں۔ خادر نے غصے سے سعدی کو دیکھا۔ ”تم نے اسے کیوں بتایا؟“

”میں سمجھا وہ بھی جانا چاہے گی۔ میری تم ایسے کیسے کر سکتی ہو؟“ وہ بے حد ہرث لگتا تھا۔ میری خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے اپنے کان گو یا پلیٹ لئے تھے۔ جب دروازے قفل بند ہوتے گئے اور وہ دونوں تہارہ گئے تو سعدی اس کی طرف گھوما۔ ”تمہیں یقین ہے ہماری باتیں ریکارڈ نہیں ہو رہیں؟“

”کوئی بھی اپنی ذاتی جبل میں کیسرے ریکارڈ ریسرو ہنس نہیں لگتا سعدی، آپ کو کیا معلوم ڈی وی آر پی بیٹھا گارڈ بک جائے اور وہ ویڈیو، جو آپ کے خلاف ڈیتھ وارنٹ ہیں جا کر پولیس کو دے دے۔ پھر بھی مجھے چیک کرنے دو۔“

خاور کام پلگ گیا۔ دیواروں کو چھوکر۔ نیوں کر محosoں کیا کوئے چیک کیے۔ پھر بیگ کھنچ کر چڑھا اور جھپٹت کا معائنہ کرنے لگا۔

”سویری اسنجو نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا۔“ سعدی گھری سانس لے کر اپنے بیٹے کے کنارے میختا۔  
”تمہیں اتنا یقین کیسے تھا کہ میری ان کو بتا دے گی؟“

”وہ میرے لئے ہمدردی رکھتی ہے، مگر اسے اپنی جاپ واپس چاہیے تھی۔ اسی لئے میں نے اس کو یہ موقع دیا تاکہ اس کی نوکری اسے واپس مل جائے اور ہمارے بھائے کے خوف سے ہمیں وہ اس میکیاں سیکھو رہی تسلی میں شفت کر دیں۔“ کہہ کروہ چھٹ کو دیکھنے لگا۔ میری کو ان دونوں نے کیسے استعمال کیا تھا، میری کو کچھ علم نہ تھا۔

”سویہ دیسل ہے جہاں ہارون عبید نے اپنی بیوی کو رکھا تھا؟ اور اس کو یہاں سے نکالنے کے لئے تم نے راستہ بنایا تھا۔ ویسے کیا تم اسے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟ کیا بنایا تھا اس کا؟“

”تم میرے بیٹے فریڈنہیں ہو۔ ایسے سوال مت پوچھو۔ آج رات سے ہم کام شروع کریں گے۔“ اب وہ دبی آواز میں کہتا اس کو اس کے حصے کا کام سمجھا رہا تھا اور سعدی یوسف جانتا تھا کہ یہاں سے نکل کر بھی وہ خاور مظاہر حیات کا قیدی ہو گا۔

❖❖❖

درپیش صح و شام یہی کشمکش ہے اب ..... اس کا بنوں میں کیسے کہ اپنا نہیں ہوں میں فارس غازی اس رات جس وقت انیکی پہنچا، پورا گھر برهنہ سالگتا تھا۔ خالی دیواریں۔ سامان کے پیک شدہ ڈھیر۔ کارٹن۔ زمر کے (اسٹڈی کم نے کمرے) کے دروازے پر کراس نے دستک دی۔ پھر اسے دھکیلا۔

وہ اپنے صوف کم بیڈ پہنچی (جو زمین سے دو بالشت ہی اونچا تھا) فائلز سامنے پھیلائے، نوٹ بک پر کچھ لکھ رہی تھی۔ بال جوڑے میں بند ہے تھے اور ایک لٹ جھک کر کاغذ کو چھوڑ رہی تھی۔ آہٹ پر بھوری آنکھیں اٹھائیں تو اسے چوکھت میں کھڑے دیکھا۔

”آجاوں؟“ جیز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا، وہ سنہری آنکھیں اس پر جائے ذرا سماں کرایا تھا۔

”تمہارا گھر بے آؤ یا جاؤ۔“ وہ دوبارہ سر جھکا کر کام کرنے لگی۔ فارس دروازہ بند کر کے اندر آیا اور اس کے ساتھ بیٹھا۔

”اب یہ میر انہیں رہا۔ میں نے بیچ دیا۔“

”تمہارے اپنے فیصلے ہیں فارس۔ کسی کو کیا اعتراض ہو گا۔“

فارس خاموش رہا۔ یہ اس کی ماں کا گھر تھا، اس کی عمر گزری تھی اس میں۔ زرتاشہ کے ساتھ گزر را وقت... اچھی بری یادیں۔ وہ لمعہ بھر کے لئے وہ سب سوچنے لگا، پھر سر جھٹک کر زمزد کیا۔ ”کافی پہنچو گی؟“

وہ سر جھک کائے ذرا سماں کرائی۔ (واہ فارس غازی! آج آپ میرے لیے کافی بنائیں گے!) اور چہرہ اٹھایا۔ ”شیور۔“

”جنینکس۔“ میری کافی میں جینی مبت ڈالنا، اور کافی زیادہ ہو۔“ اب وہ ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ زمر کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”ایک منٹ۔ ہم میں سے کون کافی بنا رہا ہے؟“

”زمر بی بی، ابھی میں اتنا زن مرید نہیں ہوا کہ رات کے سارے ھے گیا رہ بجے، اپنی بیوی کے لئے کافی بناوں۔ اس لئے آپ بنائیں گی۔“ وہ کچھ نہ اٹھتی مگر اس نے اسے آپ کہا تھا۔ عرصے بعد۔ اچھا لگا تھا۔ بظاہر کاغذ پڑھ کر اٹھی۔ ”صرف اس لئے بنا رہی ہوں کیونکہ میر اپنا دل چاہ رہا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ دو بھاپ اڑاتے کپ لئے اندر داخل ہوئی، ایک اسے تھیا، اور دوسرا خود لے کر ساتھ بیٹھی۔ فارس الکڑوں انداز میں بیٹھا تھا، اور وہ پیر اوپر سمیٹ کر ڈیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھی۔ دونوں اپنی سوچوں میں گم گھونٹ گھونٹ کافی پینے لگے۔

”کل ہارون عبید کی چائے پر مدعو ہیں، ہم۔“

”یہ دعوت تمہاری گرل فرینڈ نے دی ہے یا اس کے باپ نے؟“

وہ بہکا سانہس دیا اور کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے!“

”اوہ سوری، مجھے بھول گیا، تمہاری کوئی گرل فرینڈ کیسے ہو سکتی ہے۔ تمہارے تو 32 ailibis تھے!“

”استغفار اللہ!“ اس نے تقّلی سے اسے دیکھا۔ ”میں صرف کافی پینے گیا تھا۔ صرف ایمی بائی بنانے۔ فوج نکالی، پکچر لیں اور آ

کیا۔ ایسی جگہوں پر نہیں جاتا میں۔“

”مجھے کیا معلوم۔ رات گئے تک گھر سے باہر ہوتے ہو۔ کہاں جاتے ہو کیا کرتے ہو۔“ شانے اپکا کروہ گھونٹ گھونٹ کافی

ہیئے گل۔

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ”نارمل کپڑا ایسی باتیں پوچھتے ہیں۔ ہم نارمل نہیں ہیں۔“

”سعدی کی غیر موجودگی میں ہم میں سے کسی کی زندگی نارمل نہیں ہو سکتی۔ فارس۔“ اس نے کپ پرے رکھا اور سنجیدگی سے اس کی طرف مڑی۔ ”ہم اسے کیسے ڈھونڈیں گے اب؟ مجھے تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔“

”میں ڈھونڈ رہا ہوں وہ مل جائے گا۔“ اس نے تسلی دی۔ اور زمر نے اس پر اعتبار کر لیا۔ وہ کرنا بھی چاہتی تھی۔ پچھلے چند ماہ فارس کو بیل سے نکالنا ان کے سروایوں کا مسئلہ۔ بن چکا تھا اور سعدی کی تلاش پس منظر میں چلی گئی تھی۔ کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ مگر فارس کو رہا ہوئے تین دن بیت پکھے تھے اور تین دن سے وہ بھی سوچ رہی تھی۔ کیا کرے؟ کیسے کرے؟

”ہارون عبید کی چائے تمہارے حلق سے اتر جائے گی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کا ہاتھ ہے اس سب میں؟“ وہ کئی دفعہ یہ بات اس سے کہہ پکھی تھی اور فارس کسی بھی اس پر تبصرہ نہیں کرتا تھا۔ (باشم کا نام وہ نہیں لیتی تھی اور وہ اسے گولی ہی نہ مار آئے!)

”میرے حلق سے بہت کچھ اتر جاتا ہے۔“ کپ اٹھائے وہ کھڑا ہو گیا۔

”کل ہم موکر جائیں گے۔ مجھے پتہ ہے تم تھکی ہوئی ہو گی مگر چائے پے جانا ضروری ہے۔ تیار رہنا۔“ زمر نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ اب سوچ میں گم، گھونٹ بھرتا بہر جا رہا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

میرے شوق کی بیہیں لاج رکھ! ..... وہ جو طور ہے بہت دور ہے!

وہ ایک ساکن سی شام تھی۔ سردی گویا قلفی جمالی تھی اور بہیوں کے اندر تک درد کر دیتی تھی۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ ماہ کامل۔ پویا۔ بدرا۔

چینی پورے چاند کو، ”فیلی ری یونین“ کی علامت سمجھتے ہیں۔ ماہ کامل کی رات چینی خاندان کے دور مقیم بیٹے بیٹیاں لوٹ کر اپنے گھروں کو آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ”گاؤں کے (خاندانی گھر) کے آسمان کا چاند زیادہ پچکیلا ہوتا ہے۔“ ساری دنیا کہتی ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، مگر چینی کہتے ہیں کہ جوڑے بنتے آسمانوں پر ہیں مگر ان کی تیاری چاند پر ہوتی ہے۔ ان کی لوک کہانیوں میں آتا ہے کہ پانچ پہ چانگ ای نام کی پرپی اپنے لکڑہارے کے ساتھ رہتی ہے اور اس نے آجیات پر رکھا ہے۔

بدھست لوگ ماہ کامل کو مبارک جانتے ہیں کیونکہ بدھا کی زندگی میں سارے اہم واقعات ماہ کامل کی رات کو پیش آئے تھے۔ وہ

اس رات کو انسان کی روحاںی اور زندگی کے لیے اہم سمجھتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ اس رات انسان اپنے دین کی طرف پلتتا ہے۔

ہندوؤں کا مانا ہے کہ چاند پانی کو چونکہ کنشروں کرتا ہے، اس لیے ساری دنیا کو کنشروں کرتا ہے اور وہ اس کا تعلق مقدس گائے سے ہوتے ہیں۔ چند دیyan اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ ماہ کامل کی رات عہد لینے یا وعدے کرنے کے لیے اچھی نہیں ہے۔ طبی ماہرین

کہتے ہیں کہ چاند انسانی جسم کے اندر زندگی پانی پر بھی آیے ہی اثر انداز ہوتا ہے جیسا کہ سمندر کی لہروں پر۔ دماغی امراض یاد مے اور جلد کی بیماریوں میں بتالوگوں کی حالت اس رات زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ Yale میں ہونے والی ایک تحقیق یہ بھی کہتی ہے کہ پورے چاند کی رات اگر کسی کا خون ہے تو وہ عام دنوں سے زیادہ بہتا ہے۔

فرشته کہتے ہیں کہ چاند کی چند مخصوص تاریخیں کپنگ (جامد) کے لیے زیادہ شفاف بخش ہیں۔ اور قدیم داستانیں یہ کہتی ہیں کہ اس رات پکھ (ویرودلف) انسان بھیڑ یہی بن جاتے ہیں اور صبح ہوتے ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ امریکی کہتے ہیں کہ انہوں نے چاند پر قدم رکھا تھا اور دنیا میں بہت سے کانسپر لی تھیور سٹ اس بات کو ایک ڈرامے کے سوا کچھ نہیں مانتے، اور وہ ٹھوس دلائی سے ثابت کرتے ہیں کہ آج تک کسی انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا۔ نیل آرم استرائل کی موت کے ساتھ ہی یہ راز کہ انسان نے چاند تخریک کیا تھا یا نہیں، بھی دفن ہو گیا ہے۔ اور دنیا کے سب سے عظیم انسان... ہمارے نبی محمد ﷺ نے ”من شر غاصق اذا وقب“ کی تشریع میں فرمایا ہے کہ ”غاصق چاند ہے“ اور ہر قرآن پڑھنے والا اس آیت کو پڑھ کر چاند کے شر سے پناہ مانگتا ہے۔

اور دنیا والوں سے بے نیاز وہ چاندی کا تحوال اس رات سرد سے آسمان پر چمک رہا تھا۔ پورا۔ مکمل۔ پویا۔

فارس غازی کا خاندان ایک پوش علاقتے کے اس بیکل میں آبسا تھا۔ بغلہ بزرگیوں سے ڈھکا تھا اور کافی خوبصورت تھا۔ ایکسی سے کئی گناہ کم قیمت، مگر اس سے کہیں زیادہ کھلا اور بڑا۔ ہر کسی کو اس کا اپنا کمرہ ملے گا، ایک اس بات پر خوش تھا اور اب ندرت، حسینہ اور صداقت کے ساتھ مل کر سامان رکھوار ہا تھا۔ سب تھک بھی گئے تھے اور اس وقت وہ حال تھا کہ ندرت کچھ مانگتیں تو خدا اور یہم ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ”تم قریب ہو، تم اٹھاؤ گے۔“ اور یہ تو بہن بھائیوں کا پرانا اصول ہے کہ ”قریب“ والا ہی کام کرے گا، سوزیا وہ شامت سیم کی آرہی تھی۔

گھر کسی حد تک سیٹ ہو چکا تھا، زمر اور فارس چائے پر جا پکے تھے۔ حنین اب صرف خالی ہی تھی۔ قصر کو گردن اوپنی کر کے دیکھنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اب گردن اور دل دونوں درد کرنے لگتے تھے۔ اتنے دن سے نماز نہیں پڑھ رہی تھی۔ نہ ادا نہ قضا۔ دل ویران تھا۔ وہ ای کی ڈانٹ ڈپٹ کو ان سنبھل کر کے وہ اپنی ٹیچر کے پاس جلی آئی تھی۔ ان کا گھر چند منٹ کی واک پر تھا۔ (یاد ہے کہ وہ اپنے پرانے علاقتے میں ریسٹورانٹ کے قریب ہی آبے تھے)۔ اب ان کے ڈرائیور گروم میں ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھئے وہ ایک دفعہ پھر اپنی کمزوریوں کا قرار کر رہی تھی۔ نماز کی عادت نہیں بنتی، وہ کیا کرے؟ وہ عینک اتار کر اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”ظہر اور مغرب تو سب پڑھ ہی لیتے ہیں، لیکن عصر کس کی قضا ہوتی ہے، اور فجر اور عشاء کون چھوڑ دیتا ہے؟ کیا آتا ہے حدیث میں؟“

”منافق!“ وہ جھست بولی۔

”اور منافق کون ہوتا ہے؟ کافر؟ مشرک؟ ہندو؟ یہودی؟“

حنین نے نفی میں سر بلایا۔ ”منافق کلمہ گو مسلمان ہوتا ہے، جو ایمان نہیں لاتا، صرف اسلام لاتا ہے۔“ حنین کا سر جھک گیا۔ کونے میں جلتے ہیڑ کی حدت سے چہرہ دیکھنے لگا۔

”چوری کرنے والا منافق نہیں ہوتا، حتیٰ کہ بدکار بھی منافق نہیں ہوتا، پھر منافق کون ہوتا ہے بھلا؟“

”جبات کرے تو جھوٹ بولے، امانت رکھے تو اس میں خیانت کرے، لڑے تو گالی دے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔“

”جھوٹا، خائن، وعدہ خلاف اور بدزبان۔“ ٹیچر نے انگلیوں پر گناہیا۔ یہ چاروں یا ان میں سے ایک چیز بھی کسی میں ہو تو وہ منافق ہوتا ہے۔ جھوٹ زبان سے بولا جاتا ہے، کالی زبان سے دی جاتی ہے، وعدہ زبان سے کیا جاتا ہے، امانت کی ذمہ داری زبان سے لی جاتی ہے!“

حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو کیا چیز منافق کو نماز سے دور کرتی ہے؟“

”اس کی زبان!“ وہ چونکی۔

”جھوٹ، خیانت، بذریعی، غلط الفاظ بولنا، بات سے بھرجانا، حیلے بھانے کرنا، غیبت کرنا کہ مسلمان کی عزت بھی ہمارے اوپر امانت ملی ہے یہ سارے گناہ انسان کو دوغنا بنا دیتے ہیں۔ گندرا کردیتے ہیں۔ ان سے دور ہو گئی تو نماز کے قریب آؤ گی۔ اب یہ مت کہنا کفر فلاں تو اتنا بھوتا اور بذریعہ ہے مگر فخر پڑھتا ہے۔ ہمیں کچھ نہیں پتہ کون کیسی نماز پڑھتا ہے۔ نہ کسی کو یوں نجح کرنا چاہیے۔ صرف اپنا معاملہ دیکھو۔“

حنین کے اندر باہر کچھ ہل کر رہ گیا تھا، مگر وہ بولے جارہی تھیں۔

”یہ تو ہو گیا کہ نماز سے کیا روکتا ہے۔ اب بتاؤ نماز خود کیا ہے؟“ پچھلی دفعہ کا سوال دھرا یا۔ وہ اب بھی چپ رہی۔

”یوں کرو!“ انہوں نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ”وضو کر کے آؤ اور میرے سامنے ایک رکعت نماز پڑھو۔ نہیں، یہ اصلی والی نماز نہیں ہو گی، ابھی عصر کا وقت بھی داخل نہیں ہوا۔ یہ کوئی scholarly advice ہے، نہ اس مشق کا تعلق دین سے ہے۔ یہ تو سف ایک ریہرسل ہو گی۔ جیسے اصل چیز سے پہلے ہم ریہرسل کرتے ہیں نا۔ اسی طرح۔ جاؤ۔“ با تھرودم کی طرف اشارہ کیا۔ وہ متذبذب ن اٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد وہ جائے نماز بچھائے کھڑی تھی۔ ٹیچر کا صوفہ اس کی پشت پر تھا اور یہاں سے اس کو صرف ان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دوپہر لپیٹ کراس نے مدھم آواز میں تکمیر خرید کے لئے ہاتھ بلند کیے۔

”اللہ اکبر!“ کہہ کر اس نے ہاتھ باندھے۔ وہ ابھی تک یہجان میں تھی۔ پیچھے سے ٹیچر کہنے لگی تھیں۔

”نماز کے لئے ہڑے ہوتے وقت تم اعتراف کرتی ہو کہ ”اللہ سب سے بڑا ہے۔“ تمہاری ہر مصروفیت ہر ضروری کام سے بڑا ہے۔ جب اس کی اذان آگئی تو تم چھوٹی ہو گئی اور اس کی بڑائی تسلیم کر کے مصلے پا آ کھڑی ہوئی۔“ وہ خاموش ہوئیں تو ان کی طرف پشت کیے گئے حین خین سینے پہ ہاتھ باندھے مدھم آواز میں پڑھنے لگی۔

”سب گاک اللہ ہم...“ (اے اللہ پاک ہیں آپ اپنی تعریف کے ساتھ اور با برکت ہے آپ کا نام اور بہت بلند ہے آپ کی شان اور آپ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔)

”جب نماز کی پکار آتی ہے، تو تم کسی نہ کسی کام، کسی مسئلے میں ابھی ہوتی ہو۔ مگر تم سب چھوڑ کر اللہ کے سامنے آتی ہو اور اس کو کہتی ہو کہ آپ پاک ہیں ہر عیوب سے انسانوں کی طرح نہیں جو دھوکے دیتے ہیں، کوئی اللہ، آپ کے لیوں کو نہیں پہنچ سکتا۔ میرے لئے سب سے بڑا نام آپ ہی کا ہے۔ میں آپ کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکوں گی نہ کسی انسان کے سامنے نہ حالات کے!“

حنین خاموشی سے نہ رہی تھی، نچالاب مسلسل کا نتے ہوئے۔ وہ چھوٹیں تو وہ اعوذ باللہ اور نسم اللہ پر ہر کر الفاتحہ پڑھنے لگی۔

”سب تعریف (سب شکر) اللہ کے لئے ہے جو رب ہے دونوں جہانوں کا۔ وہ رحمن ہے رحیم ہے۔ وہ ٹھہری۔“

”کبھی الفاتحہ پر غور کرو۔ یہ قرآن کا دروازہ ہے۔ اس سے گزر کر ہی قرآن ملتا ہے۔ اس میں تم اللہ کا شکر ادا کرتی ہو کہ اللہ آپ ہی دنوں جہانوں کے خالق، مالک اور مدد بر ہیں۔ آپ رحمن ہیں اساری کائنات کے لئے، چاہے کوئی مومن ہو یا کافر، انسان ہو یا چند پرند۔ اور آپ رحیم ہیں مومنوں کے لیے رحیم یعنی بار بار حرم کرنے والا۔ آپ بار بار ہمارے گناہ معاف کر کے ہیں ایک اور موقع دینے والے ہیں۔“

”وہ مالک ہے جزا کے دن کا۔“ الفاظ اس کے لیوں میں پھر پھرائے۔ وہ سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

”جزا کا.. بد لے کا دن... یہ آیت پڑھتے ہوئے اپنے سارے گناہوں کو سوچا کرو جن کا بد لہ ایک دن تمہارے سامنے لا لیا

”ایاک نعبد و ایاک نستعین۔“ وہ سر جھکائے ہاتھ باندھے بہت آہستہ سے پڑھ رہی تھی۔

”اب تم کہہ رہی ہو کہ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تمہیں ہر نماز کی ہر رکعت میں یہ آیت پڑھنے ہوتی ہے، کیونکہ میٹا دنمازوں کے درمیان بہت سے معاملات آتے ہیں، مسئلے، پریشانیاں پچلنجوں۔ اللہ چاہتا ہے تم ہر نماز میں کھڑی ہو کر اس سے کہو کہ تمہیں صرف اسی کی مدد چاہیے۔ جب بار بار کہو گی تو پھر کیا وہ مدد نہیں کرے گا؟“

”ہد نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں زور سے میچیں۔ دل پر کوئی آنسو زور سے گرا تھا۔

”دکھائیے ہم کو سیدھا راستہ۔ ان لوگوں کا راستہ انعام کیا ہے جن پر آپ نے۔ نہ کہ ان کا راستہ جن پر آپ نے غضب کیا، اور نہ ان کا جو گمراہ ہیں۔ آمین!“

”ہر دنمازوں کے درمیان تم نے بہت سے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ آج کیا پاکانے کے متعلق ہیں، یا کسی کے گھر جاتے ہوئے کپڑے کوں سے پہنچنے ہیں۔ اب تم کہو گی کہ نماز کا تی چھوٹی چھوٹی باقوں سے کیا تعلق؟ گنر نہیں خشن۔ نماز کا ہماری ہر چھوٹی، ہر بڑی بات سے تعلق ہوتا ہے۔ اس آیت کا پڑھنا تمہارے ہر فیصلے کو آسان کر دیتا ہے۔“

”وہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اب رکوع میں بھک گئی۔

”سبحان ربِ العظیم۔“ وہ تین دفعہ دھر رہی تھی۔

”میرا عظیم رب بہت پاک ہے۔ یہ اعتراف اللہ کے سامنے کرنے کے لئے رکوع میں جھکنا کیوں ضروری ہے؟ مجھے نہیں پتہ نماز کی عالمیت کیا ہے، مگر بس اتنا پتہ ہے خشن، کہ رکوع میں انسان معلق ہوتا ہے۔ اس کا سر، اس کی انا اور غرور کا سرچشمہ، اس کی عزت کی علامت، اس کا سر... وہ نہ زمین پر ہے۔ نہ اپنے لندھوں پر کھڑا ہے، بلکہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہے۔ ایسی بھی تھی تو حالات آتے ہیں نازندگی میں جب ہم بالکل معلق ہوتے ہیں، تو ایسے وقت میں بھی یہ احساس ہونا... کہ ”میرا عظیم رب بہت پاک ہے،“ یعنی وہ سب سے اوپر ہے اور وہ آپ کو دوبارہ سیدھا کھڑا کر دے گا... یہ بات ہمیں ہر روز از سر نویاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔“

”وہ بہت ضبط اور خل سے دوبارہ سیدھی کھڑی ہوئی۔

”سُبْحَانَ اللَّهِِ مَنْ حَمَدَهُ - رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ۔“

(سن لیا اللہ نے اس شخص کو جس نے اس کی تعریف بیان کی۔ اے ہمارے رب، سب تعریف آپ ہی کے لئے ہے۔)

”اور سیدھا کھڑے ہوتے تمہیں یہ یقین دہانی ہوتی ہے کہ جو تم کہہ رہی ہو، وہ اللہ کن رہا ہے اور اللہ اس کی قدر کرتا ہے۔ وہ تمہیں سمجھتا ہے، تمہاری ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو سمجھتا ہے اور اگر کوئی ایسا دوست مل جائے انسان کو تو اسے اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟“

”خشن نے پھر زور سے آنکھیں میچ کر کھولیں۔ نبی ضبط سے اندر رہی اتار دی۔ اور نیچے جھکی۔ گھنٹے زمین پر لگائے۔ ہاتھ پھیلا کر جسد کی جگہ پر رکھے اور پیشانی نیکتے ہوئے مددم آواز میں بولی۔ ”سبحان ربِ العلی۔“ (پاک ہے میرا بر ترب۔)

”جسے کے استغفارات پڑھتے ہوئے تمہیں چاہیے کہ اپنے گناہوں کو یاد کرو، مگر اس امید کے ساتھ کہ وہ تمہارا رب ہے، اور وہ بہت بلند ہے، انسانوں کی طرح دل میں بغرض نہیں رکھتا۔ تم معاف مانگو گی تو معاف کر دے گا کیونکہ صرف وہی معاف کر سکتا ہے۔ وہ ”غافر“ ہے۔ گناہوں کوڑھا نہیں والا۔ خاموشی سے ان کوڑھا پ دے گا۔ لوگوں کو نہیں بتائے گا۔ تم اس سے کہو گی کہ کسی کو مت پڑتے چلنے دیجئے گا تو، وہ نہیں پتہ چلنے دے گا کسی کو۔ اس سے کہہ کر تو دیکھو۔“

جسے میں ما تھا میکے بھی اس نے بہت برداشت سے گلے تک آئے آنسو اندر اتارے۔ اونھوں۔ وہ بہت مضبوط ہے ایسے تو نہیں

جذباتی ہو گی۔ پھر اللہ اکبر کہتی اتھ بیٹھی۔ پھر دبارہ سجدے میں گئی۔

”اور تم نے کبھی سوچا تھا... سجدے کے استغفارات میں معانی بھی ہے، اور ”حمد“ بھی۔ حمد یعنی تعریف اور شکر۔ سو جہاں تم اپنی ساری اتنا غور بھلا کر اللہ کے سامنے اپنے ہی قدموں کے لیوں پا پنا سر کھٹک ہو۔ وہاں تم صرف معانی نہیں مانگ رہی ہوتی، بلکہ شکر بھی ادا کر رہی ہوتی ہو۔ تمہاری بری عادتیں چھڑوا نے کا شکر پرانے گناہ ڈھانپنے کا شکر، تمہیں دنیا کی ہرنعمت دینے کا شکر، اور تمہیں اپنے سامنے سجدہ کرنے کی توفیق دینے کا شکر۔ یہ ہر کسی کو نہیں ملتی۔ اور آسمانی سے نہیں ملتی۔ ”خین اٹھ گئی۔ ضبط سے چند گھرے سانس لیتے اس نے خود کو نارمل کر لیا، اور سر جھکائے، بیٹھے ہوئے الیحیات پڑھنے لگی۔

”التحیات اللہ والصلوٰۃ والطیبات۔“

(میری ساری قوی بدنی اور مالی عبادات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں۔ اے نبی، آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت، سلامتی اور برکتیں ہوں۔ اور ہم پر۔ اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتی ہوں کہ تمہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔)

”تم اب سلام بھیجتی ہو... اللہ کے نبی پر... اور تم ان کو گویا مخاطب کر کے کہتی ہو... سلام ہوا پر پہ یا نبی... کیونکہ یہ وہی نبی ﷺ ہی ہیں جنہوں نے تمہیں نماز کے سکھائی ہے۔ یہ وہی ہیں جو تمہارے لئے معراج پر بار بار واپس گئے تھے اور نمازوں کی تعداد کم کروائی تھی۔ یہ وہی ہیں جو اپنی آخری سانس تک فرماتے رہے تھے نماز نماز نماز۔ یہ وہی ہیں جو تمہیں سال تھمارے لئے ہر کسی سے لڑے تھے، تمہارے لئے انہوں نے اشیندہ لیا، تمہارے لئے وہ روئے اور روئی قیامت بھی تمہارے لئے... تمہاری امت کے لئے آزاد بند کریں گے... اور ہم لوگ کہتے ہیں، فلاں چیز صرف سنت ہی تو ہے، فرض تھوڑی ہے، اور حدیث کا کیا ہے پتہ نہیں سچ ہو یا نہ ہو۔“

اور یہ بہت تھا۔ حنہ کے لیے اتنا بہت تھا۔ اس کے آنسو پر ٹپ گرنے لگے۔ گرم پانی سے چہرہ بھیکنے لگا۔

”پھر تم درود پڑھتی ہو۔ محمد ﷺ پر درود اور سلام بھیجتے، ان کے اور ان کی آل کے لئے برکت کی دعا کرتے، تم ایک دم سے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کر دیتی ہو۔ ایک دم سے... اچاک سے... ہمارے درود کا حصہ ابراہیم بن جاتے ہیں۔ کون تھے ابراہیم؟ وہ جنہوں نے وفا کا حق ادا کیا تھا۔ وہ جن کے پاس قلب سلیم تھا۔ وہ جو کسی اور کے سامنے نہیں رکھے۔ بھیڑ چال کا حصہ نہیں بنے۔ اپنی عقل استعمال کی۔ اپنا اللہ خود ڈھونڈ۔ اور جب ڈھونڈ لیا تو اس کو کھو یا نہیں۔ انہوں نے نہیں کھو یا تو تم نے کیسے کھو دیا؟“

آنوسوی طرح اس کے گالوں پر بہرہ ہے تھے۔ وہ زیر لب ”رب اجلمنی، پڑھ رہی تھی۔

”اور اب تم دعا بھی ابراہیم علیہ السلام والی ماںگ رہی ہو۔ اللہ کو ان کی دعا کیں کتنی پسند تھیں کہ ان کو قرآن اور نماز میں محفوظ کر دیا۔ تم کہہ رہی ہو اے میرے رب مجھے بنائیے نماز کا پابند اور میری اولاد کو بھی اے ہمارے رب، اور ہماری دعا قبول فرمائیں، اے ہمارے رب مجھے معاف کر دیں اور میرے والدین کو بھی اور تمام موننوں کو، حساب کے کھڑے ہونے کے دن!“

وہ اب دائیں بائیں چہرہ گھما کر سلام کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ سامنے ہی کیے رکھا۔ پیچھے نہیں موڑا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

”اگر نماز سمندر ہے تو میں تمہارے ساتھ ایک قطرہ ہی شیر کر پائی ہوں۔ اس کا مطلب اس کی پابندی کے ساتھ ہی کھلتا جائے گا تمہارے اوپر، لیکن اگر تم اس کا مطلب سمجھ جاؤ تو یہ تمہارے اوپر آسان ہو جائے گی۔ تم اس کا انتظار کرو گی، کیونکہ تمہارے پاس ہر نماز میں اللہ سے شیر کرنے کے لئے بہت سچھ ہو گا۔ تمہیں اس میں مزہ آنے لگے گا۔ یہ اللہ سے ”بات کرنا“ ہے۔ یہ معراج پر عطا کی گئی تھی رسول اللہ ﷺ کو۔ معراج پر وہ اللہ سے ہم کلام ہونے لگے تھے۔ ہم تو نہیں جاسکتے آسمانوں پر، ہم تو طور پر بھی نہیں جاسکتے تو ہمارے شوق کلام کی لائج اللہ نے نماز کے ذریعے رکھ لی۔ ہمارا طور ہماری معراج ہماری نماز ہے۔ اس کی عادت پکی ہوئی چاہیے، کیونکہ اگر ہم اپنے بچوں کو نماز کے لئے دیے

نہیں اٹھاتے جیسے اسکوں کے لئے اٹھاتے ہیں تو ہم ان کو ساری عمر کے لئے اندر ہے کنوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ سردی ہوؤیا گری، پچ تدرست ہے یا یمارا سے پیار سے پکڑا کر بستر سے کھینچ کر نکالنا پڑے اسے اٹھایا جانا چاہیے۔ اسکوں کے لئے اٹھاتے تو ہمیں ان کو سوتے دیکھ کر ترس نہیں آتا، پھر نماز کے لئے اٹھاتے وقت کیوں آ جاتا ہے؟ وہ آہستہ آہستہ بولتی چیس، بول بول کرنیں تھکتی تھیں۔ حمد و هیرے سے اٹھی جائے نماز تھہ کی اور داپس کریں آپیٹھی۔ گلابی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے وہ بولی تھی۔

”ابھی جوش تازہ ہے، گھر جا کر پھر سب پرانا ہو جائے گا۔ نماز پڑھ لوں گی، مگر قائم کیسے رکھوں گی؟“

”ساری مسلمان قوم ایک ہی چیر کی مرید ہے اور وہ ہے ”ڈنڈا“۔ کہتے ہیں آسمان سے اتریں چار کتابیں اور پانچواں اتر اڈنڈا۔ خین نماز کی عادت سات سال کی عمر میں نہیں ڈالی جائے تو اکیس سال کی عمر میں تم بغیر ڈنڈے کے اسے نہیں ڈال سکتیں۔ صرف دو ماہ کے لیے اپنے اوپر ڈنڈا رکھو۔ ساری عمر کی نماز پکی ہو جائے گی۔ لکھ کر رکھلو۔“

”مگر اس عمر میں امی کی ڈائبث سے نہیں ڈرتی نہ ان کے جوتے سے۔“

”تمہیں اپنا ایک نماز نگہبان بنانا پڑے گا۔“

”نماز نگہبان؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ہاں۔ اپنی کسی ایسی جانے والی لڑکی کو اپنا نگہبان مقرر کرو، جو تمہاری بیٹت فرینڈ نہ ہو، اس سے اتنی بے تکلفی نہ ہو کہ وہ تمہیں رعایت دے۔ کوئی ٹیچر ہو، کوئی بڑی لڑکی ہو، جس کا تم سے ذرا ریز روڑ اور ادب والا رشتہ ہو۔ اس سے تم کہو گی کہ وہ تم سے روز پوچھے کہ آج تم نے کتنی نمازیں پڑھیں۔“

”یوں تو میں اس کے ڈر کی وجہ سے پڑھوں گی، نیت میں تو کھوٹ آ جائے گا۔“

”واہ ابلیس... واہ۔“ انہوں نے مسکرا کر گھری سانس لی۔ ”شیطان جب“ بائیں“ نہیں آ سکتا تو وہ ”دائیں“ سے آتا ہے۔ یعنی جب وہ تمہیں کسی اچھے کام سے روکنے کے لیے ”بری چیزوں“ کی ترغیب نہیں دے سکتا، جیسے نماز سے روکنے کے لیے میوزک اور گانوں کی تو، تو وہ تمہیں ”اچھی چیز“ کے ذریعے خراب کرتا ہے۔ تمہاری اپنی نیت میں شک ڈلاتا ہے۔ کسی کے ساتھ نماز پڑھ رہی ہو تو کہے گا، تم تو ریا کاری کر رہی ہو، تمہاری نیت خراب ہے فلاں فلاں۔ اس سے تم پریشان ہو جاؤ گی اور عبادت کی لذت ختم ہو جائے گی۔ ”انہوں نے لمحہ بھر کا توقف کیا۔ ”پچ نماز نہ پڑھے تو اسے سمجھائے ڈاٹنٹھے پھر کیوں پڑھے گا؟ مان باپ کے ڈر سے نا؟ تو کوئی بات نہیں۔ کسی کے ڈر سے تو پڑھے گا۔ عادت بنے گی۔ بڑا ہو گا تو خود سمجھ جائے گا۔ تم بڑی ہو، مگر ابھی ”نماز“ میں grow نہیں کیا تم نے آہستہ کرو گی، پھر اللہ کا ذرا آتا جائے گا۔ سو ہمیں اچھی عادتیں ڈالنے کے لیے کوئی ڈنڈا ملے یا کوئی اسپریشن ملے دے لئیں چاہیے۔ تم اللہ کے لیے ہی یہ کر رہی ہونا۔“

بات ہمیں کے سمجھ میں آگئی تھی۔ بہت عرصے سے بعد... اس کے ذہن نے فخر کی نیند کا ”تربیق“، ”ہونڈ لیا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

زنگی کے بارے میں اک خیال یہ بھی ہے ..... آج زندہ رہنے سے جان دینا آسان ہے ماہ کامل کو لبوب کے آسمان پہ بھی دمک رہا تھا۔ شام گھری ہو رہی تھی۔ ہوٹل اسٹریٹ کے اوپر واقع تھا۔ اوپنجی سی عمارت شان سے کھڑی تھی۔

اور پوری اسٹریٹ اس وقت آہستہ آہستہ رش سے بھر رہی تھی۔ لوگ فٹ پاتھ کے کناروں پر آ کر بیٹھنے لگے تھے۔ جوش و جذبے سے بھر پور چند گھر یا انہیں گزارنی تھیں پھر پر اہر اپنا سفر طے کرتا مختلف گلیوں سے ہوتا درہ آتا تھا۔

ایش گرے سوٹ میں ملبوس تازہ دم اور وجہہ ہاشم اپنے سل فون کے نہن دباتا، ہوٹل کی لابی میں بیٹھا تھا۔ قریب میں اس کے دو ہتے میں ملبوس گارڈز مستعد کھڑے تھے۔ ہاشم کا ہے بگا ہے گھڑی پر نظر دوڑاتا، گویا وہ انتظار میں تھا۔ نیچے تھے خانے کا میکسیکم سکپورٹی سیل خاموش پڑا تھا۔ میری نے کھانا لا کر رکھا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی وہ اداں تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ اب ایک گھنٹے بعد چائے کے لئے آئے گی۔ ہمارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے۔“

خاور آگے بڑھا اور سعدی کے ساتھ مل کر پینگ انھا کر دوسرا کے اوپر رکھا۔ اب دونوں اس کے اوپر چڑھے یہاں تک کہ خاور ہتھوں نے چھٹ کو چھوپا۔ وہاں ایک تیز روشنی والا لائٹ فسٹر لگا تھا۔ اسکی پلیٹ کے نٹ وہ رات کو ہی ڈھیلے کر چکے تھے۔ اب کائنے سے ۱۰:۳۰ پاولوں کے ساتھ آیا تھا) ذرا سا گھما یا تو کیلیں بیچ علیحدہ ہو گئے اور پلیٹ ہاتھ میں آگئی۔

”کیا کسی کو اس راستے کے بارے میں نہیں علم؟“ سعدی نے بے چینی سے پوچھا۔

”یہ جیل میں نے ڈیزائن کی تھی۔ مجھے بہیں دن دیے تھے ہارون عبید نے۔ اتنے وقت میں بھی اگر میں یہ راستہ نہ رکھتا تو کرنل خاور ہوتا۔ میں نے یہ ہاشم کے لئے کیا تھا، کہ ہو سکتا ہے اسے ‘مسز عبید کو نکلانے میں کوئی فائدہ ہو۔“

”تم بھی شاہ سے زیادہ شاہ کے فوادار ہو۔“ سعدی نے مسکرا کر سمجھھا۔ خاور نے گھوڑ کر اسے دیکھا اور پھر پلیٹ ہٹائی۔ اوپر لو ہے لی پا درختی۔ اس نے انگلیوں سے ٹوٹوں کر کوئے میں ایک جگہ کو دیا۔ فوراً ہی لو ہے کی چادر سلا سینڈ کر کے ہٹتی گئی۔ آگے سیاہ خلا تھا۔ پہلے سعدی اوپر چڑھا اور پھر خاور۔ اندھیرے میں اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا چاہا۔ وہ ایک ایلی ویٹر شافت تھی۔ جس میں اپنی لفٹ نہ تھی مگر لفٹ کا پورا راستہ سا بنا تھا۔ اوپر عمارت کے اختتام تک۔ ذرا ذرا فاصلے پر نئے نئے بلب لگے تھے۔ ذرا دریر بعد آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو وہ راستہ صاف دکھائی دینے لگا۔ لو ہے کے جنگل..... راڑ ز اور ڈنڈے... درمیان سے لفٹ جتنی جگہ اکل خالی۔ سچ بیچ کر اوپر چڑھنا تھا اور اگر راستے میں پیر پھسلے تو یہاں سے لاش بھی نہ ملتی۔

اوپر آکر خاور نے لو ہے کی چادر بننے کر دی۔ اب وہ دونوں احتیاط سے ٹوٹوں کو اوپر چڑھنے لگے۔

تھوڑی دیرگز ری تھی کہ باہر کچن میں بیٹھی میری نے بے اختیار ماتھے پہاٹھ مارا۔ گارڈ نے استقہامی نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ کھانا کھانے سے پہلے مجھے بچکھنے کا کہتا ہے۔ اگر نہ چکھا ہو تو گھٹے بعد بھی کھانا یوئی رکھا ہو گا۔ ذرا میرے ساتھ آؤ،“ میں پہلے اس کا کھانا چکھلوں۔ ”برے موڑ کے ساتھ کہتی وہ گارڈ کو لئے سعدی کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

گارڈ نے کوڑ دبائے اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلنے کی آواز اتنی تھی کہ اوپر انڈھیرے میں چڑھتے سعدی اور خاور رک گئے۔

”اب؟“ سعدی کو مٹھنے لے پسینے آگئے۔ خاور بھی سن ہو گیا۔

نیچے میری جیسے ہی اندر داخل ہوئی، وہ گویا گلگ ہو گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ کوئی نہیں تھا یہاں۔ اگلے ہی لمحے گارڈز کا شور برپا ہوا۔

”کرنل خاور....“ سعدی نے لو ہے کی سیڑھی نما جنگل کپڑے گھری سانس لے کر اوپر دیکھتے کہا۔ ”زندگی ہمیں دوبارہ یہ موقع نہیں دے گی۔ اس لئے... تیز چڑھو۔“ اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ شدید خوف اور شدید پریشانی کے عالم میں بھی انسان سرو ایکو کر سکتا ہے اگر وہ خود ہارنا مانے۔ ان دونوں کی رفتار میں برق روی آگئی تھی۔ وہ تیز تیز اوپر چڑھ رہے تھے۔ نیچے گارڈز پا گلوں کی طرح کمرے کا ایک ایک کونہ ٹوٹ رہے تھے۔ تبھی کسی کی نظر اوپر ز راستے میں ہوئے لائٹ فسٹر پر پڑی۔



لفظ نشتر کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں ..... خط محبت کا بھی وہ لکھتا ہے تلوار کے ساتھ اسلام آباد میں اس سکس اسٹار ہوٹل کے زردوشیوں سے جملگاتے شاہانہ طرز کے ڈائینگ ایریا میں ایک میز پر وہ چاروں براہماں تھے۔ اور یہرے ادب سے اشیائے طعام پیش کر رہے تھے۔ وہ یوں بیٹھے تھے کہ میز کے ایک طرف آپی اور ہارون تھے اور دوسری جانب دوں۔ ہارون شلوار سوٹ کے اوپر کوٹ میں ملبوس، مسکرا کر آبدار سے پوچھ رہے تھے کہ اس نے اپنے مہمانوں کے سامنے اپنے والدی شکایتیں کی ہیں یا نہیں۔ آپی بھی مسکرا کر کہہ رہی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس نے سرخ اسکارف کشمیری لٹکیوں کے انداز میں چہرے کے لپیٹ کر پیچھے کوڈال رکھا تھا۔ کانوں میں ایک لہ اور ڈائمنڈ ناپس دمک رہے تھے۔ نیچے سفید ملامٹ سا سوئٹر تھا جس کی ہائی نیک کے اوپر زمر، کانپنیکلیس جگہ کارہاتھا۔ وہ خوش اور آسودہ لگ رہی تھی۔ بولنے کے ساتھ ساتھ مسلسل کھاری تھی۔

فارس ابھی تک خاموش تھا۔ چہرے پر رسمی مسکراہٹ سجائے وہ گرے شرٹ پر سیاہ کوٹ پہننے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی وہ سنہری آنکھیں اٹھا کر ہارون کو دیکھ کر مسکرا کر ان کی بات کا جواب دے دیتا۔ پھر سر جھکا کر پلیٹ کی طرف مصروف ہو جاتا، گوکروہ زیادہ کھانا نہیں رہا تھا۔ زمر آج دل نے تیار ہوئی تھی۔ آپی کے کورے سفید رنگ کے بر عکس اس نے سکل کی سیاہ لمبی قمیض پہن رکھی تھی۔ گھنگریاں بھورے بال سامنے سے ذرا سا پیچھے کر کے پن لگا کر کھلے چوڑ دیے تھے اور بھوری آنکھوں میں گبرا کا جعل تھا۔ جب کوئی اسے مناطب کرتا تو، آنکھیں ان پر جما کر جواب دیتی اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتی۔

مصنوعی باتیں، مصنوعی روشنیاں۔

”سوفارس غازی... آپ کتنا عرصہ جیل میں رہے ہیں؟“ پران کانکڑا کا نئے میں پھنسا تے ہارون نے سرسری انداز میں سوال کیا۔ آپی ذراغیر آرام دہ ہوئی مگر فارس نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ ”آپ سے تین سال کم...“ ہارون کو اس کے جواب نے چونکا یا بھی اور محظوظ بھی کیا۔ لقمه چباتے ہوئے مسکرا دیے۔ ”میں نے ساڑھے سات سال کی قید کافی ہے۔ کل ملا کر۔ تین دفعہ جیل جا چکا ہوں۔ تم ابھی مجھ سے بہت پیچھے ہو،“ طرز تجاوط بدل دیا۔ آبدار نے آسودہ سی سانس لی۔ زمر خاموش نظر گاہے بگا ہے فارس اور ہارون پر ڈال لیتی تھی۔

”آپ جہاں بھی رہے ہیں، آپ اے کلاس قیدی تھے۔ میں ای کلاس قیدی تھا۔ آپ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے سرا!“ آپی کے برو تجب سے اکٹھے ہوئے۔ ”آپ تو اتنیلی جیسیں آفسیر تھے پڑھے لکھے تھے، اچھے خاندان سے تھے، آپ کو تو عدالت اے کلاس الٹ کرنی چاہیے تھی۔ تعلیمی خاندانی پس منظر اور جاب وغیرہ کی بنیاد پر یوں کی کلاس کا تعین کرتی ہے ناعدالت۔“ اور تائیدی نظر دوں سے زمر کی طرف دیکھا جس نے محض سر ہلا دیا۔ (جب پتہ ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے؟)

”عدالت نے میری کلاس ”بی“ مقرر کی تھی مگر چونکہ میں ہارون عبید نہیں تھا اس لئے جیل کے اندر مجھے وارڈن کی مرضی کے بلاک میں پنچا گیا تھا۔“ وہ مہم مسکراہٹ کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر بتارہاتھا۔

”اور اس دفعہ؟“ ہارون نے تشویش سے پوچھا۔

”اس دفعہ میں اپنی مرضی سے ہی بلاک میں گیا تھا۔“ اور مسکرا کر سر جھکائے کا نئے سے کھانے کا کانکڑا توڑنے لگا۔

”سو جیل کیسی ہوتی ہے؟“ آپی اب نہیں کھارہ رہی تھی۔ کہنیاں میز پر رکھے، آگے ہو کر پیٹھی، پورے دھیان سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

”جیل...“ فارس نے رک کر سوچا۔ اس کے چہرے پر تکلیف سی ابھری۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر آبدار کو دیکھا تو سنہری آنکھوں میں کرچیاں سی تھیں۔

”جیل میں آپ اسکے ہوتے ہیں۔ کوئی آپ کا دوست نہیں ہوتا۔ کوئی آپ کا خیال نہیں کرتا۔“ اسے بہت کچھ یاد آیا۔ ”جب میں جیل میں گیا تو سب سے پہلے.... مجھے ایک کمرے میں جانا تھا۔ قراطین سے ملنے۔“  
”قراطین؟“ آپی اور ہارون دونوں نے تاکہی سے اسے دیکھا۔

”زمر نے سنجیدگی سے وضاحت کی۔ وہ بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔ یہ سب اس کے لئے“

بھی تکلیف دہ تھا۔

”مگر پاکستان میں ”کوارنٹین“ نہیں ہوتا۔ قراطین ہوتا ہے۔ جیل کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اپنے لجھے ہوتے ہیں۔“ پھر آپ کے ہنوز لجھے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”قراطین وہ شخص ہوتا ہے جو نئے قیدی... جس کو آپ امریکی فلموں میں ”نیوٹش“ کہہ کر پکارتے سنتے ہوں گی... اس نئی مچھلی کو قراطین کے پاس سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اس کی کلاس اس کا بلاک اس کی بیرک اس کے ذمے مشقت سب کچھ الارٹ کرتا ہے۔ قراطین جیل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ قیدی کو پہلی ملاقات میں اسے نہ مارنے کے ۲۵ ہزار لیتا ہے، وہ قیدی کو ہاتھ تک نہ لگانے کے ۳۰ ہزار لیتا ہے، وہ بہلا کام دینے کے 65 ہزار لیتا ہے اور یہ رقم وہ ہر مہینے قیدیوں سے ملنے آنے والوں سے لیا کرتا ہے۔ وہ طے کرتا ہے کہ آپ کی جیل میں قسمت اور زندگی کیسی ہونے جا رہی ہے۔ اگر آپ اس کوڈ راسا بھی خفا کریں تو قراطین بادشاہ آپ کو بدنام زمانہ مجرموں کی یہ کوں میں ڈال دیتا ہے اور آپ پوری پوری رات اس خوف سے سو نہیں سکتے کہ آدمی رات کو کوئی آپ کو صرف تکلیف پہنچانے کے لئے چھر امار جائے گا اور آپ نہ بھی مریں تو وہ تکلیف... وہ آپ کے اندر بہت کچھ ماردیتی ہے۔ اور دن کی روشنی میں تو یہ بھی مارنے والے بہت ہوتے ہوئے۔ اپنی پلیٹ کو دیکھتے ہوئے وہ کہے جا رہا تھا ”ہر روز شام پانچ بجے قیدیوں کی چینگ ہوتی تھی۔ قطار میں جانوروں کی طرح کھڑا کر کے ان کا معاشرہ کیا جاتا تھا۔ صرف مارنے پینے کا بہانہ تھا۔ اور کھانا...“ میز پر بھی انواع و اقسام کی ڈشز کو دیکھ کرو وہ مسکراہے۔ ”ختم میسٹر مسکراہے۔“ قانون کے مطابق ہر بیفتے میں تین دن پچھن اور بیف لا زمی ہے بریانی بھی بنے گی، اور دو وقت کی چائے بھی۔ صبح ناشتے میں بزری کی بھیجا بھی ملے گی مگری کلاس قیدی اگر گوشت کی شکل دیکھتے بھی تھے، تو وہ بڑا فلو سے مری ہوئی مرغیوں کا ہوتا تھا، یا پھر ہوتا ہی نہیں تھا۔ دال اور بزری کی بھی سب سے سستی قسم میتی تھی کھانے میں۔ ایک احسان حکومت کرتی ہے کہ گھر کا کھانا الاؤڈ ہے، مگر میری بہن جھلوکے اور کھانے میرے لئے بھیجا کرتی تھیں، وہ بہت کم مجھ تک پہنچتا تھا۔ راستے میں ختم ہو جاتا تھا۔ میں ان کو منع کرتا تھا کہ وہ محنت کیا کریں۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی رشوت نہ دی نہیں، لیکن یا کام بھی جیل میں شروع کیا۔ وارڈن کو پانچ سور و پیٹیہ بندہ ماہوار دو تو چار پانچ لوگ مل کر اپنا چولہا لگا سکتے ہیں، اور اپنا کھانا پا سکتے ہیں۔ جلد جلد پانچ پانچ لوگوں نے گروپ بنایا کام شروع کیا ہوا تھا۔ اسے ”ہانڈی وال“ کہتے تھے۔ میں بھی اس ”غیر قانونی“ اور ”رشوت الگیز“ کام میں چار سال شامل رہا، کیونکہ میں لنگروں والی والی اور مری ہوئی مرغی نہیں کھا سکتا تھا۔ ہمارے جیسے معاشروں میں۔ جہاں قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے، اپنی بقاء کے لئے انسان قوانین توڑنے پر مجبور ہو جائے، اور اس کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہ ہو تو کیا یہ کرنا غلط ہوگا؟ اسی لیے اسپنی... احر شفیع جب کہتا ہے کہ پرزن رائیں ملنے چاہیے ہیں تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔“

وہ تھیر اور سرجھکائے کائیں کو پلیٹ میں پھیرا۔ میز پر مسحور کن سامنا تھا۔ آپ کا گلارندھ چکا تھا اور آنکھوں میں پانی تھا۔ زمر بالکل خاموش اور سپاٹ تھی۔ ہارون نے گہری سانس لی۔

”تمہارا اوقتنی مجھ سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔“ وہ جیسے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

”مگر تم نے قراطین والی بات پوری نہیں بتائی۔ رشوت تو تم نے ہانڈی وال کو پہلی دفعہ دی تھی۔ تو قراطین کو کیا دیا؟“ فارس ان کو دیکھتے ہوئے زخمی سما مسکراہے۔ ”اس سے پہلی ملاقات کرنے والے خوف سے کانپ رہے ہوتے تھے وہ بادشاہ تھا، ان کو

پچھے کہہ سکتا ہا، ان کی عزت کا جنازہ نکال سکتا تھا۔ میرے ساتھ اس نے گفتگو میری بیوی کے نام سے شروع کی تھی۔“

آبی کا سانس رک گیا۔“ اور آپ نے کیا کیا؟“

”میں نے اسے... مارا۔“ اپنی ابرو کی طرف اشارہ کیا۔ ”اوہر سے خون نکلنے لگا تھا اس کا۔ بارہ نائک آنکھ کے قریب لگے تھے۔ اس نے مجھے سی کلاس میں بدنام زمانہ مجرموں کے ساتھ شفٹ کر دیا۔ تب وہ جیل میں ایک ”اعلیٰ عہدے“ پر فائز سرگاری ملازم تھا۔ آج وہ اسی جیل میں قید ہے۔“

”اور اس کو قید کس نے کروایا؟“ آبدار نے سانس رو کے پوچھا۔ وہ زخمی سامسکر لایا۔

”شاید کسی نے اپنی بیوی کے کردار پر حملہ کرنے کا انتقام لیا ہو اور صرف مارنے سے اس کا دل نہ بھرا ہو۔“ اور کندھے اپنکا کرپوری توجہ سے کھانے لگا۔ آبی بے اختیار مسکرا دی۔ اسے اس لمحے فارس پر فخر ہوا تھا۔ نگاہیں موڑ کر ہارون کو دیکھا۔ وہ بھی اس کی کمپنی سے لطف اندوں ہوتے دھائی دیتے تھے۔ آبدار کی گردن مزید اکڑ گئی۔ اس نے زمرکی طرف چہرہ پھیرا۔

”اور آپ نے ڈلوایا تھا فارس کو قید میں ہے نا؟“ بہت سادگی اور معصومیت سے اس نے زمرکی آنکھوں میں دلکھ کر پوچھا تھا۔ لمحے بھر کے لئے اس میز پر شدید تباود رہا۔ فارس نے چونکہ کرپلے آبی کو دیکھا، پھر زمر کو۔ اسے برالگا تھا، اور وہ ناگواری سے نوکنے لگا تھا جب...“

”آف کو رس میں نے فارس کو گرفتار کر دیا تھا۔“ وہ آبی کی آنکھوں پر نظریں جھائے، مسکرا کر بولی تھی۔ ”کیونکہ میں عبید، میں نے ساری زندگی لوگوں کو انصاف دلانے کے لئے جدوجہد کی ہے۔ اگر میرے اپنے خاندان میں، میرے وزن آف ٹروتھ کے مطابق، کوئی شخص مجرم ہے، تو میں انصاف کے حصول کے لئے، اس کے خلاف بھی کھڑی ہوں گی، اور قانون کی پوری مدد کروں گی۔ کیا آپ ایسا کر سکتی ہیں؟“

گردن اٹھا کر وہ ہموار گرفخر یہ لمحے میں بولی تھی۔ (دل پر جو گزری سو گزری)

آبدار کا چہرہ پھیکا پڑ گیا، اس نے بُشکل تھوک لگا۔ ہارون نے بھی تنبیہی نظروں سے اسے گھورا۔

”شاید میں ایسا کر سکتی۔ آئی ایم سوری۔ میں نے ساتھا، آپ نے سعدی یوسف کے میموریل ڈنر پر کہا تھا...“ (ہارون نے غیر آرام دہ پہلو بدلا) ”کہ آپ کے بھتیجے نے آپ کو اپنا گردہ ڈونیت کیا تھا۔ یہ سب بہت مشکل ہو گا آپ کے لئے... اس کا کھوجانا...“ وہ اب سخت الفاظ کا اثر اٹل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

زمر نے گہری سانس لی۔ ”مجھے نہیں پتہ وہ کہاں ہے، مگر مجھے امید ہے کہ وہ زندہ ہے۔ ان آنھ میں میں چند لمحوں کے لئے بھی اپنا فون آف نہیں کرتی، اس ڈر سے کہ وہ کال کرے گا اور اگر میں نے نہ اٹھایا تو کیا ہو گا؟“ کیونکہ مجھے پتہ ہے وہ سب سے پہلے مجھے کال کرے گا۔“

میز پر خاموشی کا دورانیہ بڑھ گیا، پھر ہارون نے ہمدردی اور اپنائیت سے پوچھا۔ ”وہ کس طرح کا انسان تھا؟“

”مہربان، زرم دل اور...“ زرم کہنے لگی، مگر فارس نے چہرہ اٹھا کر اطمینان سے کہا۔ ”فریب کار۔“

سب نے چونکہ کرا سے دیکھا۔ اب وہ سر جھکا کر پلیٹ میں چھری کا نٹا چلاتے ہوئے کھدرا تھا۔ ”اس نے اپنے خاندان کے ہر فرد کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ سب سے زیادہ محبت وہ اسی سے تو کرتا ہے تو ازادار بھی وہ اسی کا ہے، اور سب سے بڑی قربانی وہ اسی کے لئے دے گا۔ جب وہ نہیں رہا، تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم میں ہر شخص ہی خود کو سعدی کا سب سے اچھا دوست سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کو آپ فریب کا رہنیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔“

زمرکی آنکھوں میں آنسو آگئے، مگر اس نے کمال ضبط سے ان کو اندر اتار لیا۔ اس نے فارس سے سعدی کا ذکر بہت کم ساتھا اور اس

مرح تو شاید پہلی دفعہ، مگر پہلے کب وہ اسے بولنے کا موقع دیتی تھی؟

”فارس غازی!“ ہارون نے بہت امید سے اسے دیکھ کر کہا۔ ”میرے لئے کام کرو!“

”میں جا ب انش رو یوچائے پنیں دیا کرتا، اور آپ سے اتنے اچھے دوستانہ ماحول میں ملاقات کرنے کے بعد میں آپ کے لئے کام رنے کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ دوستوں کے ساتھ کاروبار پنیں کیا جاتا۔“

”اگر تم سیاستدان ہوتے تو اتنی جیل کاٹ کر دوٹ ملتے سیاستدان نہیں ہواں لئے اب نوکری تک ملتا مشکل ہوگی۔ نوکری کے بغیر تمہارا کیا بنے گا؟“ وہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہے تھے۔ فارس بند ہونتوں سے لقمہ چباتے ہوئے مسکرا یا اور زر آگے کو جھک کر ہارون کی ٹھیکھوں میں دیکھا۔

”آپ ایک بے گناہ آدمی کو ایک بدنام زمانہ جیل کے سی بلاک میں بے رحم اور خطرناک دہشت گردوں، اسمگر ز اور قاتلوں کے ساتھ چار سال کے لئے بند کر دیں اور اگر وہ سرو یوگ کر جائے تو کیا اس کے کچھ بن جانے میں آپ کو شک ہونا چاہیے؟“

بہت عرصے سے بعد ہارون کو کسی نے اتنا مظہوظ کیا تھا۔ مسکرا کر اثاثات میں سر ہلایا۔ ”میری پیشکش تمہاری میز پر دھری ہے۔ مجھے جواب کا انتظار ہے گا۔“ آبی بھی تائیدی انداز میں مسکرائی۔ اور زمر کو پنیں کیا، مگر کچھ بہت برا الگ رہا تھا۔

❖ ❖ ❖

تم بڑے لوگ ہو سیدھے ہی گزر جاتے ہو ..... ورنہ کچھ تنگ سی گلیاں بھی ہیں بازار کے ساتھ کو لبوب پر شام کی تاریکی پوری طرح چھا بچکی تھی۔ شہر کی چھماقی بیان روشن ہو گئی تھیں۔ اسٹریٹ پر منتظر کھڑے تماش بیوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے میں تاریکی ایلی ویز shaft میں وہ کافی اور چڑھائے تھے اور نیچے لو ہے کی چادر کو سلسل توڑنے کا نئے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چند گارڈ زاوپر بھی دوڑے تھے، کہیں تو کھلتی ہو گئی وہ شافت۔ مگر ہوٹل کے نقشوں پر وہ بھی ہی نہیں تھی۔

تیسری منزل پر رک کر خاور نے دیوار پر دستک دی۔ رہنم میں... تین دفعہ۔ وہاں چوکور سا کارڈ بورڈ لگا تھا۔ اگلے ہی لمحے کارڈ بورڈ اندر سلا بیٹھ ہوا اور روشنی نظر آئی۔ آگے ایک کھلی ہوئی الماری تھی۔ وہ دونوں یکے بعد یگرے الماری کے اندر سے ہو کر اس کرے میں آٹھرے ہوئے۔ اتنے عرصے بعد... سعدی یوسف نے کوئی اور کمرہ دیکھا تھا۔ روشن اور ہوادار... مگر اس نے ضبط نہیں کھویا۔ سنبھالا ہوا مختاط کھڑا رہا۔

سامنے کچن کا ہید شیف کھڑا تھا۔ ان کو اندر لا کر اس نے جلدی سے کارڈ بورڈ برابر کیا۔ اور الماری سے ایک بیگ نکال کر خاور کو تھامیا اور الماری کو لاک کیا۔

”تو تمہیں ہمارے... مطلب کرئی خادر کے پیغامات ملتے رہے تھے؟“ سعدی نے خادر کو بیگ کی زپ کھول کر اندر تماں جیزروں کی تملی کرتے دیکھا تو شیف کو مخاطب کیا۔

خادر سیٹھوچ کے ریپر پر کونے میں الفاظ لکھتا تھا۔ اور مرد و ترزو کر پلیٹ میں رکھ دیتا۔ سارا کوڑا امیری ہن میں پھینک دیتی۔ روز شام کو گارڈ زکوڑ اور پر بچن میں جا کر ڈال دیتے۔ شیف ایک ایک ریپر چیک کرتا تھا۔ یقیناً اس کو پیغام ملے تھے۔

”کرئی خادر کے مجھ پر احسان ہیں۔ میں ان کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تمہارے لئے نہیں۔“ درز دیدہ نظروں سے سعدی کو خشک لبجھ میں کہا اور کپڑوں کا پیکٹ تھامیا۔ وہ بھی بس اس کو گھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ خادر اب اس کے شانے کو تھیک کر اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

نیچے لائی میں ہاشم کاردار ہنوز صوفے پر بیٹھا، میلز کا جواب دے رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ گھڑی پر بھی نظر ڈال لیتا۔ پاہرا (پریڈ) کے اس اسٹریٹ تک پہنچنے میں کم وقت رہ گیا تھا۔

اوپر تیسری منزل کی لفت کے دروازے کھلے اور اندر خاور اور سعدی کھڑے نظر آئے۔ سیاہ پینٹ 'سفید شرٹ' اور سیاہ کوٹ پہنے۔ ماتھے پہ ویژہ زکی مخصوص نوپی سجائے وہ دونوں باہر نکلے۔

"سی ای ٹی وی ریوائٹ ہو چکے ہیں، کھڑوں روم میں کوئی نہیں دیکھ سکتا، بس کسی شناساگارڈ سے نہ کفرانا۔" خاور اس کو ہدایت دے کر راہداری میں ایک طرف کو چلا گیا اور سعدی سرہلا کر، تراہی دھکیلتا ہوا دوسرا طرف چلتا گیا۔

نیچے بیٹھے مصروف سے ہاشم کی طرف دو گارڈز تیز تیز چلتے آئے تو میں الرٹ سا ہوا۔ ہاشم کو پکارا۔ اس نے چہرہ انخایا اور ان دونوں کے چہروں پر اڑتی ہوانیاں دیکھ کر دے بے اختیار انھوں کھڑا ہوا۔ اب وہ تیز تیز گھبراہٹ سے اسے کچھ بتارہے تھے اور ہاشم کے چہرے کی رنگ متغیر ہو رہی تھی۔ پھر وہ بے اختیار آگے کو بھا گا۔....

سعدی یوسف سر جھکائے تراہی دھکیلتے۔ راہداری کے موڑ پر آنکھ برا۔ گردن نکال کر الگی راہداری میں جھانکا۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے باہر دو مستعد گارڈز کھڑے نظر آئے۔ سعدی نے جیب سے شوپاٹش کی ڈبلی جتنی شے نکالی، پھر سانس روک کر اس کا ڈھلن گھما یا اور جھک کر زمین پر آگے کوٹھا کادیا۔ وہ گارڈز کے قریب، بنا آواز کے چلتی گئی اور جا ٹھہری۔ اس میں سے بغیر رنگ کی ہوا نکلنے لگی۔ اوٹ میں کھڑے ناک پر ردمال رکھے سعدی دھڑکتے دل سے گھٹری دیکھنے لگا۔ ایک منٹ... دو... ساڑھے تین منٹ بعد اس نے گردن نکال کر جھانکا۔

گارڈز میں پڑھک چکے تھے۔ بے حس اور بے سدھ۔ وہ تراہی دھکیلتا تیزی سے آگے آیا اور مختلف دروازے کے سامنے ٹھہرا۔ دوسرا جیب سے ماشر کی کارڈ نکال کر دروازے میں لگایا۔ دروازہ کھولا اور ان دونوں کو گھیٹ کر دوسرا کمرے میں لاؤالا۔ پھر ان کو وہاں لاک کر کے اس کمرے تک پہنچا جہاں وہ پہرہ دے رہے تھے۔ ابھی وہ دروازے کے قریب کارڈ لے کر گیا تھا کہ.....

**savan** "savan! ehidi tuva ve?" سعدی بالکل منجمد ہو گیا۔ پھر ہلکا سا چہرہ موڑا۔

"پھر ذرا چینجے سے اسے دیکھا۔"

"oba alut?" (کیا تم نے ہو؟) وہ ایک انجحان زبان میں سعدی یوسف سے بات کر رہا تھا اور وہ جواب مانگ رہا تھا۔ سعدی نے گہری سانس لی۔

"mama danne nae. oba ahanna." (مجھے نہیں معلوم۔ نیچے جا کر خود معلوم کرلو۔) اور رخ موڑ کر تراہی میں چیزیں درست کرنے لگا۔ ویژہ بڑا تھا ہوا آگے بڑھ گیا اور سعدی یوسف نے دل میں اس دن کے لئے شکریہ ادا کیا جب اس نے فارس غازی کے پیغام پر عمل کر کے خاور کو اپنا صاحبِ اُجھن بنایا تھا۔ گزارے لائق سنبھالی صرف وہی اس کو سکھا سکتا تھا۔

کارڈ لگا کر اس نے دروازہ دھکیلنا۔ اندر ایک پریش اور شاہانہ طرز میں جاسویت روشن سانظر آ رہا تھا۔ ایک بیویشن کھڑی سو نیا کے بال بنا رہی تھی۔

"وہ تمہیں یچے بلارہے ہیں، کب سے کال کر رہا ہوں۔ جلدی جاؤ۔ سر غصے میں ہیں۔" وہ کوئی انجحان مگر غیر ملکی بڑی تھی، اس کو انگریزی میں ڈپٹا تو قدرے پریشان ہو گئی اور جلدی سے باہر کو بھاگی۔ سو نیا نے گردن گھما کر یچھے دیکھا۔ سعدی فوراً لپٹ گیا۔ جب لڑکی باہر نکل گئی تو اس نے دروازہ بند کیا اور ٹوپی اتارتے ہوئے آہستہ سے سونی کی طرف گوما۔

"ہیلو پرس!" مسکرا کر کہتے وہ قریب آیا۔ سو نیا کے ابردا کنٹھے ہوئے۔ معصوم چہرے پر جیرانی اور الجھن ابھری۔ خوبصورت آنکھیں سکتیں ہیں۔

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

”سعدی!“ وہ پہچان کر اسٹول سے انھی۔ سرخ لمبی میکینی میں وہ بالوں کی چوٹی بنائے، بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔

”تم تو... چلے گئے تھے۔“ انی عمر کے لحاظ سے وہ صرف اتنی حیران ہو سکتی تھی۔

وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آبیٹھا اور زمی سے اس کے دونوں ہاتھ تھا۔

”مگر میں واپس آگیا ہوں، سونی کے ساتھ ایک گیم کھیلنے۔ یاد ہے جب میں تمہاری بھی سے ملنے آیا تھا، جب تم دونوں فلم دیکھ رہے تھے مال میں اور پھر میں نے تمہارے ساتھ ایک گیم کھیلا تھا؟“

سونیا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ شرارت سے مسکرائی۔ ”آئی نو۔“

”سو... سونیا...“ مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ بولا۔ ”Do you wanna build a snowman“

اور سونیا کھل کھلا کر نہ دی۔ گردن پیچھے پھینک کر۔ دل کھول کر۔ اس کو یہ فقرہ جیسے گد گدا دیتا تھا...

نیچ تہہ خانے کے دروازے کھلے پڑے تھے اور ہاشم و سط میں کھڑا سرخ چہرے کے ساتھ گارڈز پر غرار ہاتھا، چیخ رہا تھا۔ ”وہ کہاں

ہا ملتے ہیں۔ ڈھونڈوان کو۔ وہ ہوٹل میں ہوں گے۔ نریکر سے ڈھونڈو۔“

ارڈگردا فراتی چھی تھی۔ گارڈز اگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ رینس کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کھٹ کھٹ ٹاکپ کر رہا تھا۔

تبھی ہاشم کے موبائل کی بیپ بجی۔ اس نے جلا کر دیکھا۔ ایک نئی ویدیو موصول ہوئی تھی۔ سونی کے ٹیبلیٹ سے۔ وہ پھر گیا اور

اب اس پر ٹکل کیا۔ تو منظر سونی کے کمرے کا تھا۔ وہ وسط کمرے میں تیار کھڑی تھی، دونوں ہاتھ مخصوص رنگ پر اٹھائے منڈرا کھولے، آنکھیں

ندیں یہیں وہ ساکت کھڑی تھی۔ جیسے برف کا مجسمہ ہو۔ (ہاشم گویا خود برف بتا گیا) کیمرہ ایک طرف کو پین ہوا اور سعدی کا چہرہ... صرف چہرہ

الحالی دیتا۔

”گد یونگ ہاشم کاردار۔ سونیا اور میں بہت انبوائے کر رہے ہیں۔ سونیا اس وقت سونیا نہیں ہے۔ وہ ”اولف“ ہے اور فریز ہو چکی

تھے۔ اور بابا کو اتنا تو معلوم ہو گا کہ صرف سچی محبت سے کیا گیا عمل ایک جسے دل کو پچھلا سکتا ہے ہے نا اولف؟“ اس نے رک کر سونیا کو دیکھا۔ وہ

ندیں آنکھوں سے مسکراہٹ دبائے، سر کو ذرا ساختم دے کر رہ گئی، اس سے زیادہ وہ نہیں بلکہ تھی۔ کیمرہ واپس سعدی کے اوپر ہوا۔ وہ اب اٹھ کر

ہنی کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ میں سونی کے روم میں ہوں۔ اور میرے پاس باہر کھڑے گارڈز کے ٹوائز بھی ہیں۔ ہاتھلہا کر بریٹا پستول

الحالیا۔“ اور میں پہلے بھی ایک گارڈ کو اس کے گرینڈ پیرنس تک پہنچا چکا ہوں، سو میری صلاحیتوں پر تمہیں ٹک تو نہیں ہونا چاہیے۔ اب دیکھنا یہ

ہے کہ سونی کے بابا سونی کے لئے... سوری اولف کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ میرے سارے لیکل ڈاکو منش لے کر اس کمرے میں آ جائیں، اور

بھی یہاں سے بیکریت نکلنے دیں، تو میں سونی کو پچھا دوں گا، ورنہ... سونی... ہار جائے گی!“ اور ویدیو بند ہو گئی۔

زندگی میں پہلی بار... ہاشم کاردار کو اپنا ساری اپنا دل... اپنی ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی رنگت پہلے سفید پڑی اور پھر

سرخ۔ بوکھلا کر اس نے چہرہ اٹھایا۔ ”وہ میری بیٹی کے کمرے میں ہے۔“

تب تک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا رہیں بھی بول اٹھا تھا۔ ”وہ واقعی اسی فلور پر ہے۔ وسط میں... یقیناً مس سونیا کے کمرے میں۔ اس

نے کندھے کے اندر لگاڑی کر میں نے ایکٹیویٹ کر دیا ہے۔ وہ اب فتح کرنے والیں جا سکتا۔“

”اور خاور... وہ کہاں ہے؟“ وہ زور سے چلایا تھا۔ نائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے، اس نے آسین سے تپیٹانی پوچھی۔ دماغ

اہمی تک گھوم رہا تھا۔

”وہ بھی دیہیں ہے۔“

”اس نے اپنے پیپر زماں گے ہیں۔ میں ادھر جا رہا ہوں۔ میرے پیچے پانچ آدمی میری بیٹی کے کمرے کی طرف بھیجو۔ تم دونوں

کمرے کی پچھلی طرف سے آؤ۔ اور نیکیں...“ وہ تیز تیز ہدایات دے رہا تھا۔ ” اسنا پھر زکو بلوا تو، وہ چھٹ پیٹھ کر یہ وہی دروازوں کوتاک میں رکھیں گے۔ سادہ کپڑوں میں گارڈ زکو ہوٹل کے چاروں طرف بکھیر دو۔ وہ دونوں زندہ یہاں سے نہیں نکلیں گے۔ ” دانت پیس کر غصے سے کہتا ہے باہر کی طرف بھاگا۔ دو گارڈ زاس کے ساتھ دوڑے تھے۔

وہ لفٹ میں تھا جب فون بجا۔ سو نیا کے نمبر سے کال آ رہی تھی۔ اس نے تیزی سے فون کان سے لگایا۔ ” اگر تم نے میری بیٹی کو نہہا بھی، تو میں تمہارے گلے گلے کر دوں گا۔ ” لال بھبھو کا چہرے کے ساتھ وہ چینا تھا۔

” گذ ایونگ ہاشم، کیسے ہو۔ مجھے بھی تم سے بات کر کے اچھا لگا۔ موسم کیسا ہے؟ ”

” سو نیا سے بات کرواد، تم سن نہیں رہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟ ” تیز تیز نفس کے دوران بانپتا، کانپتا وہ پھر غرايما تھا۔

” وہ توبات نہیں کر سکتی۔ وہ فروزن ہے۔ کیا فلم ہے ویے۔ کبھی ہمیں دوبارہ اکٹھے پیٹھ کر دیجئیں چاہیے۔ ”

” سعدی! ” لفٹ کے دروازے کھلے تو وہ باہر نکلا۔ چند گھرے سانس لے کر خود پر قابو پایا۔ ” میں تمہارے ڈاکو منش لے آؤں کا، ” تمہیں جانے دوں گا، تم میری بیٹی کو کمرے سے باہر نکالو، خود بے شک کمرہ بند کر کے بیٹھے رہوں میں تمہارے ساتھ پورا تعاوون کروں گا، مگر اے جانے دو۔ ”

” مرنے جاتے خوشی سے گراعتبار ہوتا۔ ” وہ گلستانیا تھا۔

” تم اتنا نیچے کیسے گر سکتے ہو؟ وہ ایک معصوم بچی ہے۔ کوئی انسانیت کوئی اخلاقیات باقی ہیں تمہارے اندر یا ایک قتل کرنے کے بعد تم ان سے بھی نزر رکھے ہو؟ ” وہ انہوں اور بے تینی سے کہہ رہا تھا۔

” کوئی گھنٹی بھی ہاشم کا ردار؟ یاد ہے وہ دن جب مجھے بے اس کر کے تم میری بہن کے بارے میں بات کر رہے تھے؟ میری بھی بہن حالت ہوئی تھی۔ ” الفاظ کے بر عکس اس کا ہجھ سپاٹ تھا۔ ہاشم نے پیشانی کو مسلتے ہوئے بمشکل خود پر قابو کیا۔

” اچھا میں کمرے کے باہر ہوں۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ ” دروازے کے سامنے کھڑے اس نے فکرمندی سے ادھر دھردیکھا۔ ” تمہ کارڈ زا، اپنی گن نکالے چوکس کھڑے تھے۔ ”

” میرے تمام لیکل ڈاکو منش جن کی مدد سے میں واپس جاسکوں۔ ”

” میں نے ملنگا یہ ہیں، چند منٹ لگیں گے۔ تم مجھے اندر آنے دو۔ ” کہہ کر اس نے دروازہ بھیا۔ لاک گھما یا۔ وہ بند تھا۔ بیج کا لی بھی بند تھی۔ وہ اندر جھا کنک بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ پاک ہو رہا تھا۔ ” سعدی، دروازہ کھولو۔ ” اس نے زور سے بھیا۔

” اگر تم نے ایک دفعہ بھر دروازے کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کی جان لے لوں گا۔ دروازہ صرف تب کھلے گا جب تم ڈاکو منش ہے اور سنو، تم اکیدا آؤ گے۔ ”

” ہاں میں اکیلا آؤں گا۔ مجھے پانچ منٹ دو۔ ” وہ بے چینی سے ادھر ادھر شبلنے لگا تھا۔ دوسرا طرف سے فون بند ہو گیا۔ ہاشم اپر میں کو کاال کر کے اسے جلدی وہ کاغذات اوپر بھیجنے کو کہہ رہا تھا۔ ایک خاکی لفافے میں چند روپی کاغذ۔ وہ یہ دکھا کر سعدی کو کم از کم دروازہ کھولنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ دروازہ کھل گیا تو اسکے بغیر تین مارکس میں ان دو فراریوں کو سنبھال لیں گے۔

جب تک ایک گارڈ اور آیا وہ لفافہ لے کر، جس میں ریکیں کا پاسپورٹ اور چند روپی کاغذ تھے۔ اس کمرے کو دونوں اطراف سے کیم ا جا پڑا تھا۔ ہاشم کا ردار کی آدھی نفری وہاں موجود تھی۔ کچھ لوگ بالکوئی میں اتر آئے تھے کچھ بندوں قیس سنجا لے راہداری میں کھڑے تھے۔ ہاں نے لفافہ پکڑا اور دروازہ کھٹکا تھا۔ جواب ندارد۔ اس نے گارڈ سے ماشر کی کارڈ لیا اور دروازے میں لگایا۔ دروازہ کھل گیا۔

” سعدی! میں تمہارے پیپر لے آیا ہوں۔ ” اس نے احتیاط سے کہتے ہوئے دروازہ دھکیلنا۔

وہ سنتی رہی۔ پھر تھا ان سے مسکرائی، اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابا کی بات مکمل ہوئی، اور اس کی واک۔ واپسی کا سفر خاموشی سے کثا۔ ابا نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ کہہ کر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پیچھے پڑ جانا اور باردار ہر انداز اولاد کوڈھیت بناتا ہے اور ابا ایسا نہیں چاہتے تھے۔

❖❖❖

ایک ضرب اور بھی اے زندگی تیشہ بدست ..... سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے  
اگلی صبح فارس غازی نے کاردار اینڈ سنر کے ہیڈ آفس میں ہاشم اور جواہرات کی موجودگی میں سائنس کیے۔ اٹھ کر ان سے باری باری ہاتھ ملایا اور چند مصنوعی مبارکبادیں اور نیک تنائیں سن کر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس کے جانے کے بعد جواہرات نے ہاشم کو دیکھا۔  
”وہ کراچی جانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا واقعی وہ ہماری زندگیوں سے چلا جائے گا، ہاشم؟“

”اب مواؤ آن کرنے کا وقت ہے می۔ ماضی کو ماضی میں چھوڑ کر نئی زندگی شروع کرنے کا وقت ہے۔ اس کو اس کی زندگی شروع کرنے دیں۔ جیل نے اسے سارے سبق سکھا دیے ہیں۔ اب وہ انتقام اور انصاف کے چکروں سے دور رہے گا۔“ وہ کافی مطمئن لگ رہا تھا۔  
میز پر انیکسی کی چاپی رکھی تھی۔ جو گڈوں پر ٹھیکر کے طور پر فارس ادھر چھوڑ آیا تھا۔ یہ انیکسی ان کی ضد تھی، اور وہ اونگریب کاردار کی وجہ سے اتنے سال خاموش رہے تھے۔ پھر برے بھی نہیں بنتا چاہتے تھے۔ اور اب... وہ ان کی جھوٹی میں آگری تھی۔ کیا شامدار آغاز تھا نئی زندگی کا۔  
”پراہرا پڑ جانے کی تیاری کریں می!“ وہ سکون سے بولا تھا۔ شیر و اور سعدی کے معاملے ذہن سے ہٹا کر وہ پراہرا انجوانے کرنا چاہتا تھا۔

سری لیکا میں تین بڑے پراہرا (پریڈ) ہوتے تھے۔ تینوں ”پویا“ یعنی ماں کامل (پورے چاند) کی راتوں کو ہوتے تھے۔ پہلا جنوری میں ہوتا تھا۔ دوسرا فروری اور تیسرا جولائی میں۔ پنجاری اور ہاتھیوں کا شکر مندر سے شروع ہوتا اور شہر کی مختلف گلیوں کا چکر کاٹ کر اپنی منزل تک پہنچتا تھا۔ پورا شہر، اور پوری دنیا سے لوگ آکر فٹ پاٹھ پر گھنٹوں کھڑے ہو کر پریڈ کے ان کی گلی تک پہنچنے کا انتظار کرتے تھے اور پھر اس کو گزرتے دیکھتے تھے۔ کاردار زکولبو کا ایک پراہرا ہمیشہ دیکھنے جاتے تھے۔ شہرین پہلے ساتھ جاتی تھی لیکن اب ہاشم اس کو نہیں لے کر جا رہا تھا۔ شیر و سے اس نے پوچھا تک نہیں۔ سونی کی جان تھی ان ہاتھیوں میں۔ وہ اس کو لے جا رہا تھا جواہرات کے ساتھ اور وہ مطمئن تھا۔  
ماہ کامل کی رات سے دو روز پہلے گارڈ ز سعدی اور خاور کو ان کے کمروں سے نکال کر لائے اور ایک تیرے کمرے کے دھاتی دروازے کھولے، جو صرف بجلی سے کھلتے تھے، اور ان کو اندر دھکیلا۔ وہ اس کمپاؤنڈ کا مکمل کیم سیکورٹی روم تھا۔ اندر دلوں ہے کے پنگ رکھے تھے۔

”بہت جلد تم لوگوں کو اس جگہ سے منتقل کیا جا رہا ہے۔ تب تک تم ادھر رہو گے۔“ جیران سے سعدی کو بتایا گیا تو وہ فوراً خاموش کھڑی میری کوڈ دیکھنے لگا، جیسے بہت شاکڈ ہوا ہو۔

”تم نے بتا دیا ان کو؟“ میری نے نگاہیں جھکا دیں۔ خاور نے غصے سے سعدی کوڈ دیکھا۔ ”تم نے اسے کیوں بتایا؟“  
”میں سمجھا وہ بھی جانا چاہے گی۔ میری تم ایسے کیسے کر سکتی ہو؟“ وہ بے حد ہرث لگتا تھا۔ میری خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے اپنے کان گو یا پلیٹ لئے تھے۔ جب دروازے قفل در قفل بند ہوتے گئے اور وہ دونوں تہارہ گئے تو سعدی اس کی طرف گھوما۔ ”تمہیں یقین ہے ہماری پاتیں ریکارڈ نہیں ہو رہیں؟“

”کوئی بھی اپنی ذاتی جیل میں کیسہ رے ریکارڈ ریاس و پیلس نہیں لگاتا سعدی، آپ کو کیا معلوم ڈی وی آر پی بیخا گارڈ بک جائے اور وہ ویڈیو، جو آپ کے خلاف ڈیتھ وارنٹ ہیں، جا کر پولیس کو دے دے۔ پھر بھی مجھے چیک کرنے دو۔“  
خاور کام پر لگ گیا۔ دیواروں کو چھوکر... ٹھوٹ کر محسوس کیا۔ کونے چیک کیے۔ پھر پلٹک کھیچ کر چڑھا اور چھت کا معائنہ کرنے لگا۔

سو ہاتھیوں کو قافلے اس وقت سڑک سے گز رنا تھا۔

ہاشم نے ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے اوپر جیسے کوئی انکشاف ہوا تھا۔

”پراہرا۔ وہ پراہرا کے ہجوم میں گم ہونے والے ہیں۔“ پھر تیزی سے مڑا۔ ”سڑک پہ جاؤ۔ اسٹریٹ میں پھیل جاؤ۔ وہ نظر آ جائیں گے۔“ موبائل بجا تو اس نے تیزی سے کال اٹھائی۔ دوسری طرف ریس تھا۔

”سر، سونی کافون باہر کی طرف جا رہا ہے... باہر پراہرا کی طرف۔ میں بھی ادھر جا رہوں۔“ ریس دوسرے ہاتھ میں ٹیب پکڑے ان کی لوکیشن کو سامنے رکھے بھاگتا ہوا کچن سے نکل رہا تھا۔

ہاشم اب اوپر کھڑا اپنے گارڈ کو چلا چلا کر ہدایت دے رہا تھا۔ چھت پہ موجود انسان پہنچتا تھا۔ جیسے ہی ان کو سعدی یا خاور دکھائی دیں، وہ ان کو گولی مار دیں گے۔

چند ہی منٹوں میں گارڈ زپوری اسٹریٹ پہنچیں گے تھے۔ ایک ایک کو دیکھتے وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

ایسے میں ریس ٹیب پہ لوکیشن کو سامنے رکھے دوڑتا ہوا باہر آیا تھا۔ دائیں باعیں گردن گھما تا، وہ سیاحوں کے ہجوم کو چیزتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ مگر راستہ نہیں مل رہا تھا۔ بیشکل لوگوں کو پرے ہٹاتا، دھکے دیتا، مغدر تین کرتا، وہ آگے آیا۔ موبائل نریکر کا سرنخ نشان ایک جگہ رک گیا تھا۔

وہ بدقت اس جگہ پہنچ پایا۔ سیاحوں کی خفگی اور ڈانٹ پھٹکا کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ٹیب کو دیکھا۔ سرخ دائرہ (سونی کا فون) سبز دائرے (خود ریس) کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر وہ دائیں طرف مڑنے لگا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ایک یورپین خدو خال کی سنبھرے بالوں والی بچی دائیں طرف جا رہی تھی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اس کے سر پہ پہنچا۔ اسکی بہڈ والی سوئیٹر کا ہڈ پیچھے کو گرا ہوا تھا، اور کمر پہنچنے بیک میں ٹیب کر رکھا تھا۔

”لعت ہے۔“ اس نے ٹیب اٹھا کر بدھوا کی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف انسانوں کا سمندر بکھرا تھا اور اس سب میں ان دونوں کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔

وہ دوڑتے تدموں سے اوپر ہاشم کے پاس آیا تھا۔ وہ وہیں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔

”سر...“ پھولے نفس کے دوران اس نے کہا۔ ”وہ نہیں ہیں۔ یہ فون انہوں نے پراہرا دیکھنے والی ایک بچی کے اوپر پلانٹ کر دیا اور خود رش میں آگے نکل گئے۔“

”میں لوگ سڑک پہنچلے ہو اور کسی سے وہ دلوگ نہیں پکڑے گئے۔“ وہ دھاڑا تھا۔ بار بار آستین سے پیشانی پوچھتا۔ دل چاہ رہا تھا۔ کوشٹ کر دے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی جلدی نکل گئے ہوں اور تمہیں نظر ہی نہ آئے ہوں؟ سلیمانی چنے پہن رکھے تھے انہوں نے نیا...“ ہاشم رکا۔ ایک دم سے اس کے اوپر ڈھیر ساری ٹھنڈی برف گرگئی تھی۔ آہستہ سے اس نے گردن موڑی اور یونچ سڑک پہ بہتے پراہرا کو دیکھا۔ سیاحوں کے رش کو دیکھا۔ ہاتھیوں کو دیکھا۔

”نہیں... ہم غلط تھے... پراہرا... پر یہ صرف ڈسٹریکشن ہے۔ ہمارا دھیان بٹانے کے لئے... وہ پراہرا کے ہجوم میں گم ہو کر نہیں نکلنے والے تھے۔“ چونک کران لوگوں کو باری دیکھا۔ ”کیا اس ہوٹل سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟“ ریس نے سوالیہ نظروں سے گرے کوٹ والے گارڈ کو دیکھا جو ہوٹل کی سیکورٹی میں سے تھا۔ اس نے فوراً نفی میں سر ہلا�ا۔ ”نہیں سڑ روازوں کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“ پیچھے کھڑا اشیف خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔

”کارا!“ ہاشم شعلہ بار نظر وہی اسے گھوڑا دو قدم آگئے آیا۔ ”میں ابھی تک ایسے کر مل سے نہیں ملا جو ایک عظیم الشان ہو ٹول نہیں، اس کے تہہ خانے میں ذاتی جیل رکھئے اور پھر پولیس کے اچانک ریڈ سے بچنے کے لئے کوئی خفیدہ راستہ نہ رکھے۔ مجھے بتاؤ کوئی... اور راستہ ہے یا نہیں؟“

”سر، آپ میرا یقین کریں، یہاں پر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ہوتا تو میں آپ کو پہلے بتاتا۔ پہلے یہاں پر میں ہو لزت ہے، مگر بعد میں ان کے اوپر سروز با تھر و مژہ بن گئے تو وہ بھی بند ہو گئے اور...“

ہاشم نے پوری قوت سے اس کے جبڑے پر مکاڈے مارا۔ وہ بچھے کو لڑاکھ گیا۔ دیوار کا سہارا لیا اور گرتے گرتے بچا۔

”ان کے پاس کمروں کے ماسٹر کی کارڈ رہیں ہیں، بے ہوش کرنے والی ٹیکس ہے اسلجھے ہے، ہو ٹول کی وردی ہے، کوئی اندر سے ان کی مدد کر رہا ہے۔ اور تمہارے جیسے گدھے کا خیال ہے کہ ان کے مدگار فرش کی چند اینٹیں اکھاڑ کر ان کے لئے میں ہوں کھوں کر نہیں رکھیں گے؟“ وہ چیخا تھا۔ جس کے منہ پر گلی تھی، وہ خون آلومنیہ پر ہاتھ رکھئے سر جھکائے سیدھا انٹ کھڑا ہوا۔

”کدھر ہیں میں ہو وز؟ لے کر چلو مجھے ادھر۔“ ایک دفعہ پھر گارڈ زکی دوڑیں لگ گئی تھیں۔

باتھر و مزایا میں اسے میں ہوں کی جگہ کا پتہ لگانے کے لئے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں تھی۔ کونے والا با تھر و مہم بندھا اور اس کے اوپر ”خراب ہے“ کا سائیں صاف نظر آ رہا تھا۔

”سر یہ کل سے لیک ہو رہا تھا، آج بھی ٹھیک نہیں ہو سکا۔...“ ہمیز آف سکیورٹی اس کا دروازہ کھولنے لگا تو وہ اندر سے لاکھ تھا۔ ہاشم

نے اسے پرے دھکیلا، اور بوٹ سے دروازے پر ٹھوکر ماری۔ ایک، دو... اور دروازہ اڑتا ہوا دوسرا طرف جالا۔ اندر فرش کے کونے میں اتنی جگہ اکھڑی پڑی تھی کہ ایک آدمی نیچے اتر سکے۔ نیچے میں فٹ کی اترائی تھی اور اس کے نیچے لمبی سرنگ۔ ہاشم آگے آیا اور اس میں ہوں کے دہانے پر کھڑے ہو کر، گردن جھکائے اندر کو جھانا کا۔ اوپر ایک نائل تلے ایک کاغذ رکھا تھا۔ ہاشم نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور چہرے کے قریب لایا۔

#### Everyone's bit of a fixer upper!

وہ سعدی کی لکھائی لاکھوں میں پچانتا تھا۔ غصے سے مردڑ کا غذ پرے پھینکا۔ گارڈ اور رئیس باہر کو بھاگے تھے۔ کچھ لوگ اندر اتر رہے تھے۔ کچھ باہر سے اس کے دوسرے دہانے تک جا رہے تھے۔ مگر ہاشم کا درجانتا تھا کہ وہ لوگ اب تک بہت دور جا چکے ہوں گے۔

❖❖❖

زہر کے پیالے کا گھونٹ گھونٹ لی لینا..... آگ میں اتر جانا، سر کو آسمان رکھنا کافی دیر پہلے، جس وقت ہاشم کا دردار سعدی سے فون پر اس کے ڈاکو منش لانے کی بات کر رہا تھا، اس سے کچھ دیر بعد وہ دونوں سڑک کنارے بنے اس میں ہوں کے اوپر رکھی لوہے کی پلیٹ اٹھا کر باہر نکل رہے تھے۔ سونی کا ٹیب وہ سروز با تھر و مہم تک جاتے ہوئے راستے میں ایک سیاح بچی کے بیک بیک میں گرا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اندھیر سڑک پر وہ تیزی سے باہر نکل اور لوہے کی پلیٹ برابر کر کے اسی طرح آگے بڑھتے گئے۔ سڑک قریباً سنسان تھی۔ عموماً وہ پر رونق ہوتی تھی مگر چونکہ یہ پر اہر کا روٹ نہیں تھا سو سارے لوگ گویا یہاں سے سمت کر ادھر جا چکے تھے۔ جو پھر رہے تھے، انہوں نے بیک بیک اور تار چڑپکڑے دوآ دیوں کو میں ہوں سے نکلتے دیکھ کر کران کو صفائی یا ہمینگ کا عملہ خیال کیا اور نظر انداز کیا۔

”ان کو میں منت لکھیں گے کم از کم اس میں ہوں کا معلوم ہونے میں۔“ خاور نے تیز تیز چلتے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ سعدی خاموشی سے چلتا رہا۔ وہ اتنے دونوں ہفتوں... مہینوں بعد... بتا زہ ہوا میں آیا تھا... سر اٹھا کر پورے چاند کو دیکھا جو سیاہ آسمان پر دمک رہا تھا۔ پویا۔ ماہ

کامل! اور اس کی چاندنی میں نیچے بہتے پراہرا کی موسیقی اور شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔

ایک موڑ مزک خاور نے لبوں میں انگلی ڈال کر سیٹی بجائی۔ تین دفعہ فوراً سے ایک نک تک tuk tuk (سری لنکن رکشا) تیزی سے چھتا ان کے قریب آ رکا۔ وہ دونوں جلدی سے اس میں بیٹھے اور نک تک سڑک پر گیا اڑتا ہوا دور چلا گیا۔

”اور یقیناً یہ نک تک ڈرائیور بھی تمہارا جانے والا ہو گا؟“ سعدی نے تیز ہوا کے شور میں اوپھی آواز سے ساتھ بیٹھے خاور سے پوچھا۔

”میں نے اس شہر میں ہاشم کار دار کے لئے برسوں کام کیا ہے۔ کیا میرے چند و فادار کا نیکش بھی نہیں ہوں گے یہاں؟“ وہ بگڑ کر بولا تھا۔ سعدی مسکرا کر رہ گیا۔ مگر وہ جانتا تھا، ابھی وہ آزاد نہیں ہے۔

جب تک ہاشم کار دار کے آدمی اس میں ہول نک پہنچے وہ دونوں مفرود رقیدی وہاں سے بہت دور جا چکے تھے۔

❖❖❖

اب یہ داغ بھی سورج بن کر انبر انبر چکے گا ..... جس کو ہم نے دامنِ دل میں اتنی عمر چھپایا ہے  
ہارون اور آبدار کے جانے کے بعد وہ دونوں میز سے اس ارادے سے اٹھے تھے کہ اب ہوٹل سے باہر نکلیں مگر باہر جانے کے مجاہے لان میں چلے آئے اور قدم خود بخوبی پول کے قریب اٹھتے گے۔ ندرت کافون آیا تو فارس نے کہہ دیا کہ وہ دیر سے واپس آئیں گے۔  
”تم واپس نہیں جانا چاہتے؟“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے زمر نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے قدم اخخار ہاتھا۔ کسی سوچ میں گم تھا۔

”کیا اپنی گرل فرینڈ کو مس کر رہے ہو؟ اسے کال کرو شاید کوئی بات رہ گئی ہو جو اس نے تم سے نہ پوچھی ہو۔“ بھروسی سے مشورہ دیا۔ فارس نے سہری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور ذرا مسکرا کیا۔

”تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ معصوم ہی لڑکی ہے۔ سادہ اور نہ ہبی ہی۔ وہ مجھ میں بالکل بھی انٹر سٹرنڈ نہیں ہے۔“ پول کے کنارے وہ دونوں آمنے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ اوپر تاریک رات میں چکتا پورا چاند پول کے نیلے پانی پر جھلک رہا تھا اور پانیوں کی روشنی زمر کے چہرے پر پڑ رہی تھی جو سنجدید ہو گیا تھا۔

”نہ وہ معصوم ہے نہ ہبی۔ اس کا سکارف ایرانی کلپر کا حصہ ہے یا اس کو اپنے بال نہیں پسند۔ نہ ہبی اسکا رف ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے تو وہ ایک بگڑی بچی کے سوا کچھ نہیں گئی۔ خیر وہ اتنی اہم نہیں ہے کہ ہم اس کو دسکس کریں۔ تم بتاؤ، گھر کیوں نہیں جانا چاہتے؟“ سینے پر بازو لپیٹنے والے پوچھ رہی تھی۔ گھنگری لے بھورے بال سمیث کر چہرے کے باہمی طرف ڈال رکھے تھے اور بھوری لاخیز سے مزین آنکھیں سیکھ کر اس پر جما رکھی تھیں۔ ناک میں پڑی سونے کی بالی ماں کا مل کی چاندنی میں دمک رہی تھی۔

”مجھے ڈریشن ہو گا، زمر۔ میرے لئے پہلی رات ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ تھانے کی پہلی رات، جیل کی پہلی رات، دوبارہ گرفتاری پہ جیل کی پہلی رات اور اب...“ سر جھکائے جوتے کی نوک سے گھاس کو مسلنے والہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ گھر میرے لئے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے بہت پیارا تھا۔ اس کو نیچ کر میں خوش نہیں ہوں۔“

”اب کیا کرو گے؟ جا ب کب ڈھونڈو گے؟“ وہ فکر مند تھی۔ وہ باپ بیٹی ڈہن سے محبو نے لگئے۔

”مل جائے گی جا ب۔ نہیں تو پیسے ہیں میرے پاس۔ چھوٹا موٹا کارو بارتو کرہی سکتا ہوں۔“ کندھے جھٹک کر لا پرواہی سے بولا تھا۔

”ندرت بھا بھی چاہتی ہیں کہ تم ریسُورانٹ میں ان کے ساتھ شراکت داری کرو۔ یا اوپر والے پورشن میں کچھ بنوالو۔“

اس نے استہزا سیر جھکا تھا۔ ”وہاں سارے رشتے دار آتے ہیں ہمارے میں ان سے نہیں ماننا چاہتا۔“

”فارس تم بے گناہ ہو دالت نے تمہیں بری کیا ہے تو کیوں بھاگتے ہو اپنے رشتے داروں سے؟“

”زمر بی بی لوگوں کو اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ یہ آدمی بے گناہ تھا یا گناہ کار۔ جیلوں میں جانے والے نوے فیصلوں مجرم ہوتے ہیں مگر لوگ سمجھتے ہیں سب مجرم ہیں۔ جن نظر وہ سے میرے رشتے دار مجھے دیکھتے ہیں میرے قریب آنے پر میرے بارے میں سرگوشیاں کرتے ہیں ان پر خون جلانے کے لئے میرے پاس نہ وقت ہے نہ توانائی۔“ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور پول کے کنارے پیٹھ گیا۔ زمر بھی گھری سانس لے کر ساتھ آ بیٹھی۔ ذرا کے دروازے کی گئی جیل کی باتوں نے اسے ڈسٹرپ کر دیا تھا۔

”میں چاہوں بھی تو تھرے قتل کے الزام سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ میں کبھی بھی نارمل نہیں ہو سکتا۔“ وہ سنجیدگی سے سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

”مگر میں ہونا چاہتی ہوں۔“ وہ گھننوں پر تھوڑی نکائے پورے چاند کو پانی میں تیرتے دیکھ کر گویا خود سے بوی تھی۔ ”میں بھی اس برف کو کچھلا ناچاہتی ہوں۔ مگر مجھے نہیں پتہ میں کیا کروں۔ تمہارے بارے میں سوچوں یا نہیں؟“

فارس نے گردن پھر کر اسے دیکھا۔ وہ اداں نظر آ رہی تھی۔

”تمہارا اور میرا ایک ساتھ کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس رات جو میں نے اس ریشور انٹ میں کہا تھا، میں اس کے لئے شرمende ہوں، مگر وہ حق تھا۔ جلد یا بدیر ہم الگ ہو جائیں گے۔“ مگر زمر نے اس دفعہ برا نہیں مانا۔ وہ نارمل رہی۔

”تو پھر کب دے رہے ہو تم مجھے طلاق؟“ پول میں جیسے چاند سے کوئی چیز آن گری تھی۔ کچھ چٹخنے کی آوازی آئی۔

”طلاق الگ ہونے کا واحد راست نہیں ہوتی۔ گو کہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی عناد نہیں ہے۔ صرف محبت ہے۔ عزت ہے۔ مگر میں ایک cursed آدمی ہوں۔ میرے ساتھ بہت سے مسلسلے ہیں۔ میرے دشمن ہیں۔ میری دشمنیاں ہیں۔ میں بہت جلد خوکو کو تم سے الگ کر دوں گا، تاکہ میری curse تمہیں مزید نقصان نہ دے۔ پہلے بھی تمہارا بہت نقصان ہو چکا ہے۔“

”وہ میری قست تھی، فارس!“ زندگی میں پہلی دفعہ اس نے تسلیم کیا۔

”وہ میرا قصور تھا۔ میں اپنے سے جڑی کسی عورت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔“ وہ پول کے پانی کو دیکھتے ہوئے یا سیت سے کہہ رہا تھا۔

”مگر...“ اس نے گھری سانس لی۔ ”جب تک ہم ساتھ ہیں، ہم خوش تورہ سکتے ہیں نا، زمر! ایک اچھے کپل کی طرح اور...“ زمر سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا جب فارس کا موبائل بجھنے لگا۔ اس نے ایک نظر دیکھا۔ آپا کا لگ۔ اس نے کال کاٹ کر فون آف کر دیا۔

”ہماری کریزی فیلمی ہمیں خوش نہیں رہنے دے گی۔“ وہ جل کر بولا تھا۔ ”جب بتا دیا ہے کہ نہیں آرہے ہم گھر توبار بار کال کر کے بلا میں گے کہ جمنڈی گوشت بنتا ہے، آ کر کھالو۔“ وہ ایک دم زور سے ہنسی۔ دھنعتاً اس کا اپنا موبائل بھی تھرھرانے لگا۔ زمر نے ہنسی روک کر اسکرین فارس کے سامنے لہرائی۔ ”خین کا لگ۔“ اور کال کاٹ دی۔ وہ سلسلہ کلام جوڑنے ہی لگا تھا کہ گھر کے پیٹی سی ایل سے کال آنے لگی۔ اسے یاد تھا کہ نئے گھر میں صبح ہی حصہ نے فون کی تاروں غیرہ جوڑ دی تھی۔ وہ پھر سے کال کاٹ کر فارس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم کیا کہہ رہے ہے تھے؟“ انجان بن کر پوچھا۔ باز و گھننوں کے گرد پیٹ کروہ بیٹھی تھی اور سیل ایسیں تک ہاتھ میں تھا۔

”یہی کہ کل کی کل دیکھیں گے۔ کیا پتہ ہم بھی الگ نہ ہوں۔ کیا پتہ سب ٹھیک ہو جائے۔ تو پھر...“ بیٹھے بیٹھے وہ اس کی طرف گھوما اور زمی سے مسکرا کر اس کا چھرہ دیکھا۔ ”زمر یوسف خان، کیا تم فارس غازی کی بیوی کی حیثیت سے ایک نارمل زندگی گزارنا چاہوگی؟“ زمر نے بے اختیار انہ کرتی مسکرا ہٹ دیا۔

”پہلے مجھے آپ کہو۔“

فارس نے سر کو ابتداء میں خم دیا، اور ذرا سا ٹکنچارا۔ ”زمر یوسف خان...“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر آہستہ آہستہ سے دہرا یا۔ ”کیا تم فارس غازی کی بیوی کی حیثیت سے ناریل زندگی گزارنا چاہو گی؟“

اور فارس غازی کو کون کسی بات کے لئے مجبور کر سکتا تھا؟ ہاں صرف وہی مجبور کر دیتا تھا۔ زمر نے گہری سانس اندر کو ٹھیکی۔ ”نمبر ایک“ میں تمہارے چودہ نکات سن چکا ہوں، اب تم۔“

”میں تمہارے چودہ نکات سن چکا ہوں، اب تم۔“

فون ایک دفعہ پھر زوں زوں کرنے لگا۔ غیر شناسنامہ رکھتا۔ فارس کے ابروتتے۔

”مجھے سننے دو، کوئی ضروری کا لئے نہ ہو۔“ اس نے موبائل کان سے لگایا۔ ”بیلیو؟“ فارس غور سے اس کے تاثرات دیکھنے لگا۔

”کون؟ حسینہ؟ اچھا یہ تمہارا نمبر ہے۔“ اور اس سے زیادہ فارس غازی سے برداشت کرنا مشکل تھا۔ فون زمر کے کان سے نوچا اور اپنے کان سے لگایا۔

”حسینہ، تم اسی وقت اپنی نوکری سے فارغ ہو۔ سامان سمیٹو، اور اپنی شکل گم کرو۔ میرے واپس آنے تک اگر تم مجھے نظر آگئیں تو اچھا نہیں ہو گا۔“ غصیلے اور اکھڑ لجھ میں ڈپٹ کر اس نے فون بند کیا۔

”سامائیٹ کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اس وقت تم صرف مجھے سنو۔“ موبائل اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ (زمر سمجھی اس نے واقعی سائیٹ کیا ہے، مگر اس نے خاموشی سے فون آف کر دیا تھا۔)

”کیا سنوں؟“ وہ تھوڑی گھنٹے پر کھلے دلچسپی سے اسے دیکھنے لگی۔ نیلے پول کے اوپر جھلملاتی چاندی منکھس ہو کر فارس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اردو گردشیت لگوں سے بے نیاز وہ بس اس کو دیکھنے لگی۔ سوئٹر کے آستینیں ذرا پیچھے چڑھائے، منہ میں کچھ چباتے ہوئے وہ پانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر سہری آنکھوں کا رخ اس کی طرف موڑا۔

”مجھے نوٹس ملے تھے۔“

”سوری؟“

”تمہاری کلاس میں جو نوٹس تم نے کاپی کر دیے تھے وہ مجھے ملے تھے۔ میں نے پھینک دیے تھے۔ مجھم تھے ریمیڈیل کلاس لینے کا بہانہ درکار تھا۔“

زمر کے ابرو استجواب سے اٹھے۔ چہرہ گھنٹے سے اٹھا لیا۔ ”تمہیں وہ سب لیکھ رہے تھے؟ پھر میں کیوں گھنٹہ گھنٹہ تمہارے ساتھ کھپاتی تھی؟“ وہ بر انہیں مانی تھی۔ اسے دھکا سالاگا تھا۔ اس نے فارس غازی کو نہیں سمجھا تھا، اور اس کی بڑی وجہ وہ ٹیوشن تھی جو وہ اسے دیتی تھی۔ ایک ہی تا پک بار بار اس کو پڑھانا پڑتا تھا۔

”مجھے ہر چیز سمجھ آتی تھی زمر بی بی۔ صرف آپ نہیں سمجھتی تھیں۔“ اب کے وہ مسکرا یا تھا۔ وہ خفاہی چپ ہو رہی۔

”اور وہ لڑکا جمیشید جس کو آپ میرے ساتھ تا پک سمجھانے لے آئی تھیں لا ابیری... بہت بر الگ سمجھے۔ اس کا میں فون میں نے غائب کیا تھا اور اس کو ڈھونڈنے وہ بے چارہ اٹھ کر گیا تھا۔ مگر آپ سمجھیں وہ لا پرواہ ہے اس لیے دوبارہ آپ نے اس کو نہیں پڑھایا۔“

”تم ہمیشہ سے ایک دن بر انسان تھے۔“

”اور وہ بندہ جو آپ کو ہر اس کر رہا تھا... اور آپ میرے پاس آئی تھیں۔“ وہ محظوظ سا اسے بتا رہا تھا۔ اور میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اس سے بات کروں گا۔ جانتی ہیں میں نے کیا کیا؟“

”جانتی ہوں۔“ سابقہ سٹرکٹ پر اسکیوڑ نے چہرہ آگے جھکا کہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ فارس بالکل ٹھہر گیا۔

”تم اسے اپنے کسی ثارچ پیل لے کر گئے اور اسے مارا پیٹا۔ ہے نا؟“

وہ لمحے بھر کے لیے لا جواب ہوا۔ ”اس نے آپ سے کچھ کہا تھا بعد میں؟“

”فارس... تمہارے پاس کیوں آئی تھی میں؟ اگر اس سے صرف بات کرنی ہوتی تو میں خود کر لیتی۔ مجھ سے بہتر کون کر سکتا ہے بھلا؟ تمہیں اس لیے کہا کیونکہ تمہاری جاپ... اور تمہاری شہرت کہتی تھی کہ تم اس کی طبیعت اس طریقے سے ٹھیک کر لو گے جس طریقے سے میں کروانا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ تم اس کو مارو۔ وہ با توں کا بھوت نہیں تھا۔“ اور ابرا خاکر (فاتحانہ) تائید چاہی۔ وہ چند ثانیے کو چپ رہا۔ پھر سر جھکا۔

”تم میں اور مسز کارڈار میں کبھی کبھی مجھے زیادہ فرق نہیں لگتا۔“ پھر جیسے کچھ پوچھنے لگا، مگر ارادہ بدل دیا۔ کم از کم آج کی رات نہیں۔

”اور بتاؤ۔ اور کیا کچھ کر چکے ہو تم میرے علم میں لائے بغیر؟“ مسکرا کر پوچھنے لگی۔ فارس نے ٹھہری پوچھتے وقت دیکھا۔

”پہلے چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہارون عبید کا حرام کا مال تھوڑا بہت زہر مار کیا تھا۔“ اور انھوں کھڑا ہوا۔ ”ویسے بھی ہمارے پاس ابھی بہت وقت ہے۔ کم از کم آج کی رات ہم واپس نہیں جا رہے۔ نہیں رہتے ہیں۔“

”اتے ہنگے ہوٹل میں؟“ اس نے گردن اٹھا کر استجواب سے اسے دیکھا۔

”روز رو ٹھوڑا ہی کرتا ہوں آپ پا تنا خرچ؟“ مسکرا کہ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اور ٹھکلنے والے انکار نہیں کیا کرتے۔ وہ اس کا ہاتھ ٹھام کر انھوں کھڑی ہوئی۔ اب پول کنارے وہ دونوں ایک دوسرے کے مدد مقابل کھڑے تھے۔ اپک دوسرے کی آنکھوں میں جھاٹکتے۔

”تم بھیشہ میرے سامنے ایک مختلف روپ میں آتے ہو۔ پہلے تم میرے رشتے دار تھے۔ پھر اسٹوڈنٹ بنے۔ پھر میرے بھرم۔ پھر ایک کاغذی انتقامی رشتے کا ایک پر زہ۔ پھر سعدی کے لیے میرے پارٹنر بنے۔ پھر ایک بے گناہ انسان کی حیثیت سے میرے سامنے کھلے۔ پھر میرے کلائیٹ بنے۔ اب شوہربن جاؤ گے۔ پتہ نہیں پھر کس روپ میں سامنے آؤ گے؟ کیا ابھی بھی کچھ ایسا ہے جو میں نہیں جانتی تمہارے بارے میں؟“

”ہاں۔ یہی کہ تمہارے کلائیٹ کا تمہاری فیس ادا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے!“ وہ اس سوال سے بچتا تھا مسکرا بہت دبا کر بولا تو وہ نہیں دی، پھر مصنوعی خلکی سے بولی۔

”نبہر ایک اب مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ تم اور میں مستقبل میں ساتھ رہیں گے یا نہیں، میں مزید کوئی پانگ کیے بغیر، نفع نقصان سوچے بغیر اس شادی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر نہر دو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی فیلٹنگ ہیں، کیونکہ نہر تین، میں تمہاری ریٹورنٹ والی کوئی بات نہیں بھولی؛ اور نہر چار، ابھی تک...“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے بولی۔ ”آئی ہیئت یو!“

وہ مسکرا کہ اس کی طرف جھکا۔ ”آئی ہیئت یو یو۔“

اور اس نے بہت وقت سے مسکرا ہٹ لیوں پر روکی تھی۔ چاندی میں نہائے جھملاتے پانی کے ساتھ سبزہ زار پہ وہ دونوں ساتھ ساتھ آ گے بڑھنے لگے۔ اور اولف صحیح کہتا تھا۔ کچھ لوگ واقعی اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے لئے پکھلا جائے۔



بڑا نہ مان۔۔۔ مرے حرف زہر سہی ..... میں کیا کروں کہ یہی زبان کا ذائقہ ہے کھانے کے بعد خدا پنے کمرے میں آئی تو اس نے فوراً سے پبلے میمونہ کو کال ملائی۔ میمونہ اس سے دو سال سینیر تھی۔ کالج میں دونوں ساتھ تھے۔ کسی کام کے سلسلے میں تعارف ہوا اور پھر درستی ہو گئی۔ وہ حافظ قرآن تھی اور شادی شدہ تھی۔ ایک بیٹا بھی تھا۔

”میمونہ بھائی، آپ میری نماز نگہبان بنیں گی پچھومن کے لیے؟“ مہذب انداز میں مدعایاں کر کے اس نے پوچھا۔

”جنین دیکھو میں اول تو کسی کی ذمہ داری لیتی نہیں لیکن اگر لوں تو اسے آخری سانس تک بھاجاتی ہوں۔ میں ہر روز نجمر کی اذان کے پیشناہ لیں میں مت بعد تمہیں کال کر کے پوچھوں گی کہ تم نے نماز پڑھی یا نہیں۔ اور روز رات تو تمہیں مجھے عیکت کر کے بتانا ہو گا کہ آج تم نے 5 میں سے کتنی نمازیں پڑھی ہیں۔ جس دن تم کوتا ہی کر دو گی، میں تم سے وضاحت پانگوں گی اور مجھے امید ہے کہ تم خود کو اور مجھے شرمندہ نہیں کرو گی۔“

میمونہ سے دیے ہی ایک ریزوڈ سارشہ تھا، اب تو مزید لکھا ظاہر گیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”ان شاء اللہ میں صبح اٹھ جاؤں گی۔“

اور زندگی میں ہبھی دفعہ جنین یوسف کو سمجھا آیا تھا کہ بچ کو نماز پڑھانے کے لیے ماں باپ کو ان پر سختی کیوں کرنی چاہیے۔ عادتیں ذاتے کے لیے سختی کرنی پڑتی ہے۔ اس نے فون بند کر کے اوپر آسان کی طرف دیکھا۔

”اللہ تعالیٰ ہمیشہ میں نے الارم کلاک پر بھروسہ کیا ہے مگر آج نہیں۔ کل صبح آپ مجھے انھا میں گے۔ مجھے نہیں پتہ کیسے یہ نیرام سلسلہ نہیں ہے، لیکن آپ مجھے انھا میں گے۔ ہر حال میں۔“

ان سے دور... کوئی بھی اس برف رات میں تیزی سے بھاگتا تک نک بالآخر ایک جگہ رکا۔ وہ دونوں بنا کچھ کہے اترے اور پھر، جہاں خاور چلتا گیا، وہ اس کے ساتھ کھینچا چلا آیا۔ سڑک پار کرتے وہ دفتار کا۔ سر کو جھکتا۔ گلے پر با تحرک کھا۔ خادر نے چونک کرا سے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”یونہی۔ منہ کا ذائقہ عجیب سا ہو رہا ہے۔ شاید گلا خراب ہے۔“ لبھن سے سر جھلتا وہ آگے بڑھ گیا۔ سڑک کے کنارے سے انہوں نے ایک اور نکل نکل دکا اور یوں تقریباً تین سوار یاں بدلت کر وہ دونوں اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے رکے۔ اندر میر ہیاں چڑھتے سعدی نے پوچھا تھا۔ ”تو اس عمارت میں ہے تمہارا خفیہ فلیٹ جس کے بارے میں کاردار زندگیں جانتے؟“

”میرے پاس ایسی خفیہ جگہیں ہیں۔“ وہ ماتھے پہ بل لئے کھر درے لجھے میں بتاتازی نے چڑھتا گیا۔

فلیٹ معمولی اور ساتھا۔ سعدی گردن اور ہر دھرم گھما تا۔ طاری نہ نظر وہ سے جائزہ لیتا اندر داخل ہوا۔ بیگ صوفے پر دھرا۔ خادر سیدھا اندر وہی کمرے میں چلا گیا۔ سعدی چوکھت پر آیا تو دیکھا۔ خاور کا پٹ ہٹا کر نیچے زمین پر جھکا ہوا تھا اور فرش کے اندر بنے ٹریپ ڈور سے ایک باکس نکال رہا تھا۔ سعدی آگے آیا۔ وہ ایک دھاتی باکس تھا۔ (ایسے باکس کو Go باکس کہتے ہیں۔) اس میں خاور کے نام کے تین پاسپورٹ تھے، پسول تھا اور تم کی گذیاں تھیں۔ ایک جنی میں بھاگتے وقت کا سارا سامان گو باکس میں موجود تھا۔

”اب ہمارے پاس پیسے بھی ہیں، اور پلان بھی۔ اب سعدی ہمیں فیزو پل کرنا ہے۔“ وہ نوٹ نکال کر باہر رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یعنی کہ ہم نے تمہارا نام لکھی کر دانا ہے، ہاشم کے سامنے تمہیں بے گناہ ثابت کرنا ہے۔ جانتا ہوں۔“ وہ کندھے اپکا کر مڑا، پھر دروازے کی چوکھت پکڑ کر کاٹ لہا سادہ ہوا۔ خاور نے پھر سے چونک کرا سے دیکھا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں شاید کچھ غلط کھالیا تھا۔“ وہ سر کو پھر سے نفی میں جھلتا باہر لا دُخ میں چلا گیا۔ ذرا دیر گزری تو خاور کو اس کے کھانے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے انھا اور باہر کو لپکا۔

کچھ سنک پر جھکا کر اپنا ہوائے کر رہا تھا۔

”کیا کھایا تھام نے؟“ خاور تو شویش سے کہتا اس کے سر پہ آپنچا۔ وہ دہرا ہوا، نہ حال ساچہ جھکائے، مزید قے کے لئے منہ کھولے ہوئے تھا۔ نقابت سے کراہ بھی رہا تھا۔

”میری نے... شاید کھانے میں کچھ ملا یا تھا۔“

”خہر و شاید کوئی دوار کھی ہو تو تمہاری جان میرے لئے بہت قیمتی ہے۔“ کہہ کروہ دوسرا طرف لپکا اور کمینڈٹ کھولی۔ دفعتاً خاور خہر۔ ”مگر... ایک منٹ... ہم نے تو اس کھانے کو کچھا ہی نہیں تھا۔“ وہ چونک کر پلٹنے کا تھا ک...“

اس کے سر کی پشت پر زور سے کوئی بھاری چیز آ کر گئی۔ خاور بے اختیار آگے کوڑھا کھا، مگر پھر ہاتھ سلیب پر رکھے، سنبلنا چاہا، لیکن سعدی نے پچھے سے اس کی گردن دبوچی، اور مخصوص رگ کو دبانتا گیا۔ خاور نے پوری قوت سے مزاحمت کرنی چاہی، ہاتھ پیر مارے... سلیب سے شیشے کے گلاں اگر کرٹوٹ گئے، مگر اس کی مزاحمت دم توڑتی گئی اور گردون ڈھلک گئی۔

”آف کورس ہم نے وہ کھانا نہیں کھایا تھا،“ اس کو نکھوں سے تھامے زمین پر احتیاط سے لٹاتے ہوئے، ہشاش بٹاش سا سعدی بولا تھا۔ ”تمہیں بروقت یا وہ آگیا، مگر بہت سی باتیں تم بھول گئے کرئی خاور۔“ اس کے سر پر کھڑے، وہ پرتپیش نگاہوں سے اس کے بے ہوش وجود کو کیکر کر کر رہا تھا۔ ”یہی کہاپنے دشمن کو درخت پر چڑھانا نہیں سکھاتے۔ تم اور میں دشمن تھے، یہیں اور رہیں گے۔ تم نے میرے وعدے پر اعتبار کیا۔ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں وہ چاہا، ایماندار سعدی یوسف نہیں رہا جو وعدے سے نہیں پھرے گا۔ کمار کی موت کے ساتھ وہ کھو گیا ہے۔ تمہارا نام مکیسر کر داں نے کارادہ نہ میرا کل تھام آج ہے۔ میں نے تمہیں صرف استعمال کیا ہے کیونکہ صرف تم اس جیل کو توڑنے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ اور وہ تم نے کر دی۔ تھیںکس، بٹ توھینکس۔“ کہہ کروہ اندر ورنی کمرے کی طرف چلا گیا۔ اور جب باہر آیا تو کندھے پر بیگ میں خاور کی تمام قسم اور اسلحر کھا تھا۔ اس کا ایک پاسپورٹ بھی وہ لے آیا تھا۔ باقی چھوڑ آیا تھا۔ ایک نظر اس نے پکن میں بے سدھ گرے خاور پر ڈالی، اور پھر وہ پی کیپ اٹھائی جو کارنس پر دھری تھی، اور اسے پہننے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

دروازہ باہر سے بند کرنا وہ بالکل نہیں بھولا تھا۔ تیر تیز زی نے اتر کروہ عمارت سے باہر نکل آیا، اور اب پورے چاند کی اس تخت بست رات میں، اندر ہیر سڑک پاپنالی کیپ والا سر جھکائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے کندھے پر بیگ لٹکائے، وہ دور چلتا جا رہا تھا۔

بالآخر وہ آزاد تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

زم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہوئے ..... تیرے ہاتھوں کے نشان اے چارہ گرد کیجھے گا کون؟  
ہوٹل کے ملوکانہ سو بیٹ میں بیٹ پر سونی، لکھل میں دبکی، بے خبر سورہی تھی، اور وہ بھی سونی کی طرح مطمئن ساتا گنگ پٹانگ جما کے بینجا جواہرات کو کیکر رہا تھا جو بے چینی سے ادھرا دھر چکر کاٹ رہی تھی۔ جب تک وہ ان کا پچھا کر سکتا تھا اس نے کیا، لیکن جب یہ یقین ہو گیا کہ وہ ان کی قیدے نکل چکے ہیں تو ہاشم اطہیناں سے اس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

”اب کیا ہو گا ہاشم؟ وہ دونوں نکل گئے۔“

”سعدی کی تصویر سے متاثرا کرچی، اور خاور کی اصلی تصویر پولیس کو دے دی ہے۔ وہ ان منگ لوگوں کی تلاش شروع کر چکی ہے۔  
ہمارے آدمی بھی لگے ہیں۔ جیل کو ہم نے صاف کر کے اس میں فالتو سامان بھر دیا ہے، اور اب وہ یہ سمعت اسٹور سے زیادہ پکھنہیں ہے۔ ہم ان کو نہ بھی پکڑ سکئیں بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سعدی کو ہم نے قید کر کے رکھا تھا۔“

”ثبوت!“ اس نے بے یقینی سے ہاشم کو دیکھا۔ ”ثبوت کی پرواہ کسے ہے؟ سعدی چھوٹتے ساتھ ہی گھر کاں کرے گا اور سب کو بتا دے گا۔“

”ان کے تمام نمبر زہم شیپ کر رہے ہیں، سری انکا سے آنے والی کال پکڑی جائے گی۔ ہمیں علم ہو جائے گا۔“

”وہ اسی میل کر سکتا ہے اور چلو کال تم پکڑ بھی لو تو وہ تو ان کو سب بتاچکا ہو گا۔ اتنا عرصہ اس کو اس لئے قید رکھاتا کرو، ہمارے راستے کھولے اور اب...“ وہ شدید پریشان تھی۔ ہاشم نے اچھبے سے ابر و اٹھائی۔

”آپ کے خیال میں اسے اتنا عرصہ اس لئے مقید رکھا کیونکہ میں اس کے منہ کھولنے سے ڈرتا تھا؟ میں.. اپنے.. لئے ڈرتا تھا۔“

”ظاہر ہے، ہمیں ہی نقصان ہو گا اس کا منہ کھلنے سے۔“

”میں اگر میں اس سے ڈرتا ہوتا تو شیر و کی بجائے میں نے اس کے گولیاں ماری ہوتیں، مگر میں نے تب بھی بار بار شیر دستے کھاتا کہ میں سعدی کو سنبھال لوں گا۔ میں اس کے منہ کھولنے سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہے۔“ صوفی کی پشت پر بازو پھیلائے، وہ مطمئن سا بیٹھا تھا۔

”تو پھر؟ ہم نے کیوں اسے اتنا عرصہ خاموش کرائے رکھا؟“

”کیونکہ بول کر وہ اپنی فیملی کو خطرے میں ڈالے گا۔ مجھے اس کی فیملی کی فکر تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کے ساتھ مزید پھنسنا ہو۔ لیکن اگر وہ بولے گا تو ظاہر ہے مجھے ان سب کو ”نکس“ کرنا پڑے گا۔ جتنے لوگوں کو بتائے گا، اتنے لوگ ہمارے نشانے پر آ جائیں کے۔“

”ہمیں“ کوئی نقصان نہیں ہو سکتا میں ”وہ“ اس وقت Vulnerable ہے۔

جو اہرات بالکل ساکتی ہو کر اسے دیکھے گئی۔ ایک قاتل ہونے کی حیثیت سے تمہیں یہ ڈرنہیں ہے کہ اگر وہ تمہارے قتل کے راستے کھوں دے تو تم دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے؟“ اس کی آواز میں اس کا اپنا اندر وہی ڈر غالب تھا۔

”میں...!“ اس نے حیرت بھری مسکراہٹ سے ماں کو دیکھا۔ ”وہ مجھ پر ازام لگائے گا تو کیا دنیا اس پر یقین کر لے گی؟

اوہ کیا ہے؟ نجح کو بلیک میل کرنے والا ایک گارڈ تو قتل کرنے والا۔

اور اسکے اپنے مبینہ قاتل نے اس کے بارے میں اعتراف جرم میں کہا تھا کہ وہ نشیات کی خرید و فروخت میں ملوث تھا۔ ایسے شخص کی ادا کریڈیبلیٹی ہوتی ہے؟ اور میں کیا ہوں؟ شہر کے بازار و کلاء میں سے ایک... آکل لابی کا کٹرولر... Philanthropist... جس کو بھی اسی کرمتیں کیس میں مطلوب نہیں قرار دیا گیا۔ میں واٹ کارل بائزت آدمی ہوں، میری ایک کریڈیبلیٹی ہے۔ میرے مقابلے پر اس کی بات کا کوئی یقین کرے گا؟ فرق اس سے نہیں پڑتا کہ کیا کہا جا رہا ہے، فرق اس سے پڑتا ہے کہ کون کہہ رہا ہے۔“ کوٹ سے نادیہ گرد جھاڑتے ہوئے اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔ جواہرات دھیرے سے کری پیٹھی۔ اس کا داماغ ہنوز سُن تھا۔

”فرق اس سے نہیں پڑتا کہ آپ کے کون سے راز کس کے پاس ہیں۔ فرق اس سے پڑتا ہے کہ آپ کے محروم راز کی کریڈیبلیٹی ایسا ہے۔“ وہ خود سے بولی تھی۔ ایک سکون ساتھ جو اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیتا گیا۔

”لیکن اس کی فیملی تو اس کا یقین کرے گی، ہاشم! پھر کیا ہو گا؟“

”پھر؟“ وہ کوٹ کا بیٹھن بندر کرتے ہوئے اخھا اور سنجیدگی سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پھر ہاشم سب سنبھال لے گا۔“ اور ڈرینک روم کی طرف بڑھ گیا۔ جواہرات بھی اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھ گئی۔ ایک طویل سرداور سمنی خیز رات اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔

❖❖❖

صرف احساں نداامت اک سجدہ اور چشم تر..... اے خدا کتنا آسان ہے منانا تجھ کو

اگلی فجر پر دھند غائب تھی۔ بالکل ندارد صفر۔ بادل بھی عنقا تھے اور جامنی آسان صاف تھا۔ ابھی فجر میں چند ساعتیں باقی تھیں۔ ایسے میں نئے گھر میں خین رضائی میں لپٹیں، آنکھیں موندے بے خبر سورہی تھی۔ ماتھے پر کئے بال بکھرے تھے اور باقی ہنکے پر پھیلے تھے۔ ایک

مینڈک کی بھیت کی مخلوق اس کے کندھے پر چپکے سے آئیں گی اور اس نے اپنی لمبی سوٹ کے ذریعے حمد کے دل کو پکڑا اور پھر اس پر گردہ لگائی۔ ایک دو تین۔ حمد بے خبر سوتی رہی۔ ساری دنیا سوتی رہی۔

”اے اوڑھ لپیٹ کر لینے والے... اخواو خبردار کرو۔“

وفلا ایک جھکلے سے حمد کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر آس پاس ہاتھ مارا۔ موپائل اٹھا کر روشن کیا۔ کیا وہ الارم سے اٹھی تھی؟ پانچ الارم لگائے تھے اس نے نگر... پہلے الارم کے بجھے میں ابھی چار منٹ رہتے تھے۔ پھر وہ کس چیز سے اٹھی؟ اذان کی آواز سے؟ مگر اذان میں ابھی وہ منٹ تھے۔ پہلی اذان تو ابھی ہوئی ہی نہیں تھی۔

”اور اپنے رب کی ہی بڑائی بیان کرو۔“

حنین سن رہ گئی۔ کوئی آواز اس کو سنائی دی تھی۔ بھولی ہوئی سورہ المدثر جو اس کو جاگتے میں بھی یاد نہ آتی، آج سوتے میں یاد آئی۔

”وہ مخلوق بھی خاموشی سے اس کے دل کو جھکے بیٹھی رہتی۔“

”سب تعریفِ اللہ کی جس نے ہمیں مار دینے کے بعد زندہ کر کے اٹھایا۔ اور اسی کی طرف ہم نے پہنچا ہے۔“ وہ اللہ کا نام لیتے ہوئے ایک دم اٹھ بیٹھی۔ دل کو باندھے ہوئے تین گرہوں میں سے ایک چھنا کے سے ٹوٹی۔

”حمد کچھ دریوں بیٹھی رہی۔ وہ کیسے اٹھ گئی؟ آج آنکھیں کھولتے اسے موت کیوں نہیں پڑی؟ احساں ذمہ داری تھا یا کیا؟“

اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو۔ اور ہر قسم کی گندگی سے اپنے آپ کو دور رکھو۔“

وہ سر جھک کر بستر سے نکلی اور جب وہ سٹک کے اوپر کھڑی ٹوٹی کھول کر پسونگر نے لگی تو دل پر دوسری گرہ بھی جھکلے سے ٹوٹ گئی۔ آدھی بھیگ کر وہ باہر نکلی اور جائے نماز اٹھانے لگی۔ پھر رکی۔ اونہہ۔ جلدی سے الماری میں گئی۔ اس دن درزی سے دونے سر دیوں کے جوڑے سل کر آئے تھے۔ اب وہ ان لوگوں میں سے نہیں رہی تھی جو نیا جوڑا ”کسی کے گھر جاتے ہوئے پہلی دفعہ پہنیں گے“ کہہ کر الماری میں سنجال کر رکھ لیتے ہیں۔ نیا جوڑا سب سے پہلے نماز میں پہننا ہوتا ہے۔ اس نے بال برش کیے، چوٹی گوندھی۔ نیالباس پہنا۔ سلیقے سے دو پہنچ چہرے کے گرد لپیٹا۔ اور جائے نماز پا آ کھڑی ہوئی۔ اللہ اکبر کہہ کر جیسے ہی رفع یدیں کیا، دل پر لگی تیرسی گرہ بھی ٹوٹ گئی۔ مگر وہ مخلوق ہار مانے کو تیار نہ تھی۔ وہ اس کے کان میں بولنے لگی۔ اس کو پچھلے دن کے کام یاد کروانے لگی۔ ذہن میں شٹک ڈالا کہ یہ دوسری رکعت ہے یا پہلی؟ اس میں بیٹھنا ہے یا نہیں بیٹھنا؟ پھر ہاشم کا چہرہ دکھانے لگی، مگر اسے علاج مل چکا تھا۔ نماز کے دوران ہی حمد نے اعوذ باللہ من الشیطین الرجیم بڑھ کر باب میں طرف کو تھوک دیا۔ اعوذ باللہ مجرمے کر دیتا ہے۔ لوگ آزمائے نہیں ورنہ اس سے بڑی دوا کیا ہوگی کوئی؟

باتی کی نماز سکون سے پڑ گئی۔

سلام پھیر کر جب اس نے دعا کئے تھے اسکے لئے ہاتھ اٹھائے تو سمجھ نہیں آیا کہ کیا مانگے۔ دل میں کوئی عجیب سی خوشی ابھری تھی۔ بار بار ادھر ادھر دیکھتی۔ وہ کیسے اٹھ گئی؟ اور اف... یا اٹھ جانے میں کتنا مراحتا۔ کتنا سکون تھا۔ اس اندر ہیرے میں اپنی اندر ہیر زندگی کے بارے میں اس نور والے سے بتیں کرتا کرتا اچھا لگ رہا تھا۔

(اوہ اللہ... اوہ اللہ... سب تعریف آپ کے لئے ہی ہے۔ آپ نے مجھے فجر دے دی۔ برسوں بعد میں فجر پا اٹھی... اوہ اللہ...)

زندگی میں پہلی دفعہ حنین یوسف کو بھجا آیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ... ہمارے پیارے رسول اللہ ﷺ... کیوں ان کو فجر کی دور کتعین دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ کیوں رحلت فرمانے سے پہلے... آخری سانسوں میں... وہ فرماتے رہے تھے۔ نماز نماز نماز... اور یہ کیفیت... یہ وہی ”چکھ“ سکتا ہے جو فجر اور تہجد پا اٹھتا ہے۔

”ہر شخص اپنے کمائے ہوئے اعمال کے بد لے میں رہن ہے۔“

سوائے دائیں بازو والوں کے  
جو جنتوں میں ہوں گے  
اور پوچھیں گے مجرموں سے  
کہ کیا چیز لے گئی تمہیں جہنم میں...  
(جہنم والے) کہیں گے ...

نہ تھے ہم نماز پڑھنے والے۔“ (سورہ المدثر)

جائے نماز طے کر کے وہ اٹھی اور کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ پت کھول کر سرد ہوا کواس نے اندر آنے دیا۔ وہاں ایک خوبصورت کالونی نظر آ رہی تھی۔ نئے گھر سے قصر کاردار جیسا منظر نہیں نظر آتا تھا مگر اسے وہ منظر دیکھنا بھی نہیں تھا۔

(کیا چیز لے کر گئی تمہیں جہنم میں؟ وہ کہیں پے گے... نہ تھے ہم نماز پڑھنے والے... نہ تھے ہم نماز پڑھنے والے...)

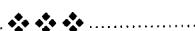
اس نے آنکھیں بند کر کے سرد ہوا کو محسوس کرنا چاہا۔ آج... اسے کچھ بہتر مل گیا تھا۔ حینہن کے خیال میں وہ اب بھی اللہ سے وہی محبت نہیں کرتی تھی جیسی کرنی چاہیے، مگر وہ اب اللہ تعالیٰ سے ایک ریلیشن شپ ضرور بنانا چاہتی تھی۔ اللہ کے سامنے اس کا اپریشن نیک ہے، جائے۔ اللہ اس کی تعریف کرے... اس کے دل میں... سب سے بڑی تمباکی ہی رہ گئی تھی۔ اور وہ جو اللہ کو پسند ہے۔ مجھ کی نماز... اس کو اس نماز سے محبت ہو گئی تھی۔ آج اسے اعلیٰ محبت اور ادا نی محبت میں فرق سمجھا گیا تھا۔

ٹھنڈی ہوا میں کھڑی حینہن نے آج... ہاں آج اس نے ہاشم کاردار کو دل سے جانے دیا تھا۔ مرض عشق کی جس برف نے اس سے دل کو جمادیاتھا، مجھ کی پہلی کرن نے اسے پکھلا دیا تھا۔

آج حینہن یوسف آزاد ہو گئی تھی۔ وہ اپنے دل کی مالک ہی نہیں، مگر اس نے اس ساحر کے قبضے سے اپنادل ضرور چھپایا تھا۔

اوہ کامل ابھی تک جامنی آسمان پر دمک رہا تھا اور زمین پر بہتے بڑے سمندروں کو اپنے اشاروں پر چلا رہا تھا۔ اوپر... نیچے

آگے... پیچھے...



کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی، بدل چلا دور آسمان بھی..... جو رات بھاری تھی میل گئی ہے، جو دن کڑا تھا گزر گیا ہے۔ صبح ایسا نہر اسونے کے حال سا جھملاتا سورج آسمان پر چکا تھا کہ سارے شہر نے پکھل کر انگڑائی لی۔ کوئی جمود ساٹوٹا۔ دھنہی چھپنی اس اونچے ہوٹل کا دسیع و کشادہ مرکزی ہیڈروم نہرے رنگ میں آراستہ دکھائی دیتا تھا۔ قیمتی دیوار گیر پر دے کھڑکی کے آگے سے ہے تھا، دھوپ پورے کمرے کو روشن کر رہی تھی۔ نہری ڈرینگ نیبل کے کنارے فارس بیٹھا تھا، اور سامنے اسٹول پر بیٹھی، خود کو آئینے میں دیکھ کر بال برش کرتی زر کوڈ یکھ رہا تھا۔ وہ چہرہ باہیں طرف جھکائے باؤں کے سروں میں برش چلاتے ہوئے بولی۔

”اب گھر چلتے ہیں، اس سے پہلے کہ سب سمجھیں، ہم واقعی بھاگ پکھے ہیں۔“

فارس نے بے اختیار سر جھکا۔ ”نی الحال وہ مجھے اپنے گھر والے کم اور سرال والے زیادہ لگ رہے ہیں۔“

وہ بہکا سانہس دی اور چہرہ جھکائے بال برش کرتی رہی۔

”پتہ ہے مجھے تمہاری سب سے خوبصورت بات کیا لگتی ہے۔“

”نہیں پتہ۔“

”تمہارے بال۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اس کی چند گفتگو یا لیٹیں، انگلیوں میں اٹھائیں۔ زمر نے بھوری آنکھیں اٹھا رہیں۔

سے دیکھا اور سکرائی۔ ”ہان میرے بالوں کے curls ہمیشہ سب کو پسند رہے ہیں۔“  
”نہیں، ان کے کرلنہیں مجھے ان کا رنگ پسند ہے۔“  
”رنگ؟“ زمر نے ایک دم چونک کر برش رکھ دیا۔

”ہاں۔ ان کا براون کلر۔“ (زمر نے بے اختیار تھوک نگاہ مگر وہ اپنی دھن میں کہہ رہا تھا۔) ”سعدی اور سیم کے بال بھی براون ہیں  
تر تھا را کلر بہت مختلف بہت خوبصورت ہے۔“ وہ زمی سے اس کے بالوں کو چھو کر کہہ رہا تھا۔ زمر... نے ذرا... غیر آرام دہ ہو کر برش رکھا۔  
”میرے بالوں کا رنگ بھی سعدی کی طرح ہے۔ مطلب میرا اصل کلر۔ یہ چالکیٹ براون تو میں... ڈائی کرتی ہوں۔“ اور اپنے  
زمی سے چھڑا تھے۔

فارس کو چند لمحے اس کی بات کا مطلب سمجھنہیں آیا۔ وہ بس سنہری آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ ”کیا مطلب؟“  
”فارس! میرے بال سعدی جیسے ہیں یہ راز یادہ براون میں نے خود کئے ہوئے ہیں۔ مجھے ایسے اچھے لگتے ہیں۔ میرا فون کیا تم  
نے آف کر دیا تھا؟“ اس نے اپنا فون اٹھاتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

”ایک منٹ۔ یہ اصلی کلرنہیں ہے؟ مگر جب میں نے تمہاری یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا، تب بھی تمہارے بالوں کا یہی کلر تھا۔“  
”میں ۲۲ سال کی عمر سے بال ڈائی کر رہی ہوں فارس۔ پاکستان کی ہر تیسری لڑکی بال ڈائی کرتی ہے۔ اف ائینے میسح...“ وہ  
سکرین کو دیکھ رہی تھی۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک اچھے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے تم سات... آٹھ سال سے مجھے دھوکہ دے رہی ہو؟ قانوناً اس کی کیا سزا ہوتی ہے؟“  
”میں نے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ تم نے پہلے کبھی اس بارے میں بات نہیں کی تو میں کیا بتاتی۔“ وہ نفا ہوئی۔  
”یہ تمہارے curls بھی نعلیٰ ہیں پھر؟“ وہ مٹکوک ہو چکا تھا۔

”اف فارس! میرا کچھ بھی نعلیٰ نہیں ہے، صرف ذرا سا کلر ہے یہ۔“ مگر وہ فی میں سر ہلاتا انٹھ کھڑا ہوا  
”نہیں زمر بی... آپ نے مجھے اتنے سال دھوکے میں رکھا۔ میں آپ کا ہر علم معاف کر سکتا ہوں، مگر یہ نہیں۔ آپ نے میرا دل  
ڈراہے۔ کیسے لوٹائیں گی آپ مجھے میرے آٹھ سال؟ کیونکہ آج مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے آپ سے بالکل بھی محبت نہیں رہی۔“ وہ فی میں گردن  
ہلاتا، ابھی تک تجھ سے کہہ رہا تھا۔ زمر نے گردن موڑ کر تند ہی سے اسے دیکھا۔

”کتنا بولنا آگیا ہے تمہیں۔“ وہ ابھی جواب میں کچھ تیکھا سا کہنے لگا تھا کہ اس کا اپنا موبائل جیب میں تھرھرانے لگا۔ اس نے کال  
گرد دیکھا۔ آبدار! اس نے کال کاٹی۔

”میں اس معاں ملے کو اتنی جلدی نہیں ختم کرنے والا، واپس آ کر اس بارے میں بات کرتا ہوں۔“ اس کا تو بھی واقعی دل نوٹ گیا  
لما۔ نفا سے لجھ میں کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اور پھر، اپنے دوسرے چھوٹے موبائل سے کال بیک کی۔ آبی نے فوراً اٹھا لیا تھا اور اس کی آوازن  
کر چکی تھی۔

”تو فارس غازی کا ”بلکڈ نمبر“ بھی ہے۔ امید ہے یہ بگ نہیں ہو رہا ہوگا، کیونکہ مجھے آپ سے بہت خاص بات کرنی ہے۔“  
”آنیندہ میری بیوی سے اس نون میں بات مت کیجئے گا۔“ وہ اندر زمر سے خالجہ میں شکایت کرنے والے فارس غازی سے  
اکل مختلف اور سنجیدہ لگ رہا تھا۔ آبدار کو لمحہ بھر کے لئے سمجھنہیں آیا، پھر رات والا اپناروہی یا آیا تو دانتوں تکے زبان دی۔

”میرے مند سے نکل گیا تھا، میں تو...“

”وہ مجھے بہت عزیز ہے، اور جتنی عزت میں اس کی کرتا ہوں، آپ سے تو قع کرتا ہوں کہ آپ بھی کریں گی۔ اب بتائیے، کیا بات

تھی؟، ہمارا مگر بے پلک انداز میں رات والا ادھار چکا کروہ بولا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی۔

”سعدی اور خاور کل جیل توڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔ میں نے رات میں آپ کو بہت کا لر کیں۔ مگر آپ کافون آف تھا۔“ مجھے بھی میں بولی۔

”کیا؟“ وہ ایک دم ششد رہ گیا۔ پھر بے اختیار پیشانی مسلی۔ ہونٹوں پر بند مٹھی رکھی۔ سمجھنیں آیا کہ جذبات کو کیسے قابو کرے۔

”ہاشم نے بابا کو بتایا ہے کہ وہ انہیں اب تک نہیں ڈھونڈ پائے۔ اب معلوم نہیں ڈھونڈ کر چھپا لیا ہے، یادا قلی وہ دونوں لاپتہ ہے۔“

چکے ہیں۔“

فارس نے کچھ کہنے بنافون رکھ دیا اور جب وہ واپس کمرے میں گیا تو بالکل خاموش تھا۔

گھر آ کر اس نے زمر کوب کے سوالوں کے جوابات دینے چھوڑ دیا اور خود اس اور پری منزل کے بیٹر دم میں آگیا جوز مراد اور اس کے لئے ندرت نے سیٹ کیا تھا۔ اس نے لیپ تاپ نکالا اور اس پر ایک محفوظ شدہ لنک کھولا۔

جو پین... زہریلا پین اس نے سعدی کو بیجتا تھا۔ اس میں جی پی ایس نریسر لگا تھا۔ اسکرین پر وہ جی پی ایس ایکسوسٹل دے رہا تھا۔

کل رات سے پہلے تک وہ اس علاقے میں تھا جہاں ہارون عبید کا ہوٹل تھا۔ مگر آج صبح۔۔۔ وہ اس ہوٹل سے کئی کوس دور... ایک پارک میں آ کر رک گیا تھا، اور انہی تک ایکٹھا۔

سعدی کے پاس اگر وہ پین تھا تو وہ اتنے گھنٹوں سے اس پارک میں کیوں بیٹھا تھا؟ یا پھر وہ پین کس کے پاس تھا؟ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا تھا۔ پچھلے آٹھ ماہ سے اس کو معلوم تھا کہ سعدی یوسف کہاں ہے۔ مگر پہلی دفعہ اس نے سعدی کی لوکیشن کھو دی تھی۔ شاید اس نے میں زمر کو کال کی ہو، مگر... فارس نے سر دنوں ہاتھوں میں گر ادیا۔

پچھلے آٹھ ماہ کی آن تھک محنت کے بعد... پہلی دفعہ وہ صرف اپنے اور زمر کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا، زندگی ہ اس کا بھی حق ہے۔ اور کم از کم کچھ دیر کے لئے زمر ساری دنیا سے کٹ کر، صرف اس کی باتیں نہیں، اس کو وقت دے۔ مگر وہ غلط تھا۔ اس کا زندگی پ کوئی حق نہیں تھا۔ اس کو صرف اپنا کام کرنا چاہیے تھا۔ اپنے بھائی اور بیوی کا انتقام لینا تھا اور سعدی یوسف کو واپس اپنے خاندان تک پہنچانا تھا۔ اسے اپنے نہیں سوچنا تھا۔ وہ تو cursed تھا۔ اسے زمر کافون نہیں آف کرنا چاہیے تھا۔

اب وہ پھر سے اپنے سنجیدہ اور سپاٹ خول میں سست آیا تھا اور کمرے میں ادھر ادھر نہیں ایک نمبر ملار ہاتھا۔

”ہاں فرمان ٹھیک ہو؟ اچھا یہ بتاؤ، کل شام ہوٹل میں سب خیریت رہی؟“

”میں نے آپ کو کال کی تھی، نمبر بند تھا۔ خیریت تھی مگر ہاشم کا دراکل ادھر آیا ہوا تھا۔ وہ اور اس کے آدمی پر اہرا کے وقت پا گلوں لے

طرح ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کچھ معلوم نہیں ہو سکا، مگر وہ کسی کو ڈھونڈ رہے تھے جیسے۔“

”ٹھیک ہے، آنکھیں کھلی رکھو اور مجھے روپرٹ دیتے رہنا۔“ اس نے اسی اضطراب سے فون بند کیا۔ فرمان تھا کی لینڈ میں سیٹل، نے کاخا ہشمند ایک بری ہو جانے والا اس کا جیل کا ساتھی تھا۔ اس نے اسے سری لنکا میں سیٹل ہونے کی پیشکش کی تھی۔ (احمر شفیع سے ہارون عبید تک سفارش کروانا، اپنا نام آئے بغیر اور احر کو مشکوک کیے بغیر، بہت آسان تھا۔) اور بدالے میں ”روپرٹ“ مانگی تھی۔ اب وہ کچھ سے سے اسی ہوٹل میں کام کر رہا تھا۔ اس کی رسائی کچن کے نیچے بنی جیل تک تو نہ تھی، مگر جہاں تک اس کی آنکھیں جاتی تھیں، وہ غازی کو خبہ، دیا کرتا تھا۔

اب اس نے ایک اور نمبر ملایا۔ ”عنایت تم ہسپتال میں نائٹ ڈیوٹی پر تھے کل رات؟ او کے گذ۔ تمہارے سامنے والی بلڈنگ میں

رات کو یا صبح میں کوئی آیا ہے؟ اچھا... اگر کوئی حرکت نظر آئے، کوئی آمد رفت ہو تو مجھے خبر کرنا۔“

وہ ایک ایک کر کے ہاشم کاردار کی ملکی وغیر ملکی جیلوں کے قریب موجوداً پہنچنے کو فون کر رہا تھا۔ وہ اس کی چاروں خفیہ جیلوں میں جانتا تھا۔ اگر وہ دونوں مفتر و قیدی ان جیلوں میں سے نہیں لائے گئے تو تیقیناً ہاشم ان کو بھی تک نہیں پکڑ سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ ازاد تھے تو سعدی نے فون کیوں نہیں کیا تھا؟ زمر کے علاوہ کسی اور کو بھی تو فون کر سکتا تھا۔ وہ تیقیناً کسی مشکل میں تھا۔ آٹھ ماہ پہلے یوسف خاندان نے سعدی یوسف کو کھوایا تھا، مگر فارس غازی نے اسے کل رات کھوایا تھا۔

اور اب اس کو ڈھونڈنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔

مگر اس سے پہلے اسے ایک کام اور کرنا تھا۔

اپنے چہرے پر اپنے برف تاثرات سجائے وہ کچھُ ڈاکٹریں لے کر، کسی سے بات کئے بناوہ گھر سے باہر آگیا۔ جب وہ کار کو ان اک کر رہا تھا تو زمر اس کے پیچے باہر آئی۔

”کوئی مسئلہ ہے فارس؟ تم پر یہاں لگ رہے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ تمہارے ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔ ڈوز کے ڈاکٹریں لے کر...“ بدقت ذرا سامسکر کر فائل اوپر اٹھا کر الہائی اور کار کے اندر بیٹھا۔ یہ وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے زمر کی ضرورت نہیں تو صرف وہی جائے گا۔ مگر اسی جلدی کیا تھی اسے؟ اسے کار باہر لاکلتے دیکھ کر زمر نے سوچا۔ مگر خیر۔ اسے فارس پر بھروسہ تھا۔ وہ سنبھال لے گا۔

.....♦♦♦♦♦

اس لمحہ خیر و شر میں کہیں اک ساعت ایسی ہے ..... جس میں ہربات گناہ نہیں ہوتی، سب کاررواب نہیں ہوتا ڈاکٹر قاسم نے اپنی کرسی سے اٹھ کر خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ جیزپ پہنچا سوئٹر پہنچنے، چہرے پر سنجیدہ اور برف تاثرات سجائے وہ سنہری گہری آنکھوں کو ڈاکٹر قاسم پر نظریں جمائے سامنے کریں پہنچا اور تانگ پٹاناگ جماں۔ فال اپنے سامنہ رکھ لی۔

”مجھے خوشی ہے کہ آپ سے بالآخر ملاقات ہو رہی ہے۔ بہت سنا تھا آپ کے بارے میں۔“ وہ خوش دلی سے بولے تھے۔ اس کے لئے کافی آرڈر کرنی چاہی مگر اس نے انکار کر دیا۔

”جو بھی بڑی باتیں سنی ہیں آپ نے وہ نسب درست ہیں۔“ وہ سر کو خدمتے کر بولا تھا۔

”نہیں، اپچی بھی سنی ہیں۔ خیر۔“ وہ جلد مدعا پر آگئے۔ ”زمر اپنے بارے میں بہت لاپرواہی بر تی ہیں۔ انہیں بہت پہلے ٹرانسپلانت کروالینا چاہیے تھا۔ خیر وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کے پاس کسی ڈوز کی روپورٹ ہیں، کہاں سے کروائے ہیں ٹیسٹس؟“ عینک لگاتے ہوئے انہوں نے روپورٹ کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر فارس نے کاغذ ان کی طرف نہیں بڑھائے۔

”میں اپنے تجربات خود کیا کرتا ہوں۔ کیا آپ کو گرمی نہیں لگ رہی؟“ اٹھتے ہوئے وہ تعجب سے بولا اور کھڑکی کھوں دی، پھر واپس آ کر بیٹھا۔ ڈاکٹر قاسم نے قدرے حریت سے اسے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر عینک اتار کر رکھی۔

”تو کون ہے یہ ڈوز؟“

”کوئی ڈوز نہیں ہے۔ میں نے زمر سے جھوٹ بولا تھا کہ میرے پاس ڈوز ہے۔“

کمرے میں ایک شش در ساستا چھا گیا۔ پھر وہ اسی بے مہری سے بولا۔

”میں نہیں چاہتا کہ وہ سر جری کروائے۔ آپ ڈاکٹر قاسم، اس کی سر جری نہیں کریں گے۔“

ڈاکٹر قاسم کے چہرے پر بے پناہ شاک سا بھرا۔ ”غازی صاحب، ان کی جان کو خطرہ ہے، انہوں نے سر جری نہ کروائی تو وہ جان سے جائیں گی۔“ ان کو بے حد افسوس ہوا تھا۔ وہ ہلاکا سامسکرایا۔

”آپ کی شرٹ بہت نفیس ہے۔“

ڈاکٹر قاسم نے اس کو یوں دیکھا گواہ اس کا دماغ چل گیا ہو، پھر گردن جھکا کر اپنی شرٹ کو دیکھا تو لمحے بھر کو وہ برف کا مجسمہ بن گئے۔ ان کی شرٹ پر... عین دل کے مقام پر... سرخ نقطہ تھا۔ روشنی کا نقطہ۔ سرخ لیزر جو کھڑکی سے ہوتا ہوا، ان کے دل پر نشانہ ہے تھا۔

”اپنے دشمنوں کو جیل نہیں بھیجا چاہیے، مار دینا چاہیے، کیونکہ جیل جانے کے بعد وہ خطرناک لوگوں سے دوستی کر لیتے ہیں، جیسا میرا یہ دوست جو برابر کی عمارت میں انسا پر گن لئے بیٹھا ہے، اور اسکی گن کا نشانہ عین آپ کے اوپر ہے۔ نہ... نہ... فون کی طرف ہاتھ مت بڑھانا، ورنہ وہ گولی چلا دے گا۔“

ڈاکٹر قاسم نے گردن اٹھا کر بے یقینی سے اس کو دیکھا۔ وہ نیک لگا کر بیٹھا، پر سکون سا بولے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی منہ میں کچھ چبارا ہا تھا۔

”اس فریم کو دیکھیں۔“ اس کے اشارے پر ڈاکٹر قاسم نے نظر اٹھا کر دیوار پر لگے فریم کو دیکھا جس میں ان کا کوئی سریعیت آؤزیں تھا۔

ایک سرخ لیزر اسپاٹ دہان بھی نظر آ رہا تھا، اگلے ہی لمحے بنا آواز کے ایک گولی فضنا کو جیرتی ہوئی آئی اور اسی نقطے کی جگہ پر آپس سے ہوئی۔ فریم کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ ڈاکٹر قاسم کا رنگ سفید پڑنے لگا۔

”یہ کیا نہ اق ہے فارس غازی؟“

”اوہ سوری، یہ ریہر سل تھی۔ اگر تم ہلے تو وہ اگلی گولی تمہارے اوپر چلائے گا، اس لئے میں نے کھڑکی کھول دی، تاکہ اگر وہ تمہیں مارے تو کم از کم یہ مخصوص شیشہ نہ ٹوٹے۔ خیر، ہم زمر کی بات کر رہے تھے۔“ ذرا ممکرا کران کے چہرے پر اپنی پرتپش نظریں جمائے وہ چبا چبا کہنے لگا۔ ”کتنے پیسے دیے کاردار نے میری یوہ کویہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ مرنے والی ہے؟ اس کا گردہ ضائع ہو چکا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”دیکھو، مجھے نہیں پہت تم کس ڈاکٹر کے پاس گئے ہو، مگر...“ وہ محتاط انداز میں بولنے لگے تھے مگر وہ ایک دم آگے کو جھکا اور زور پر با تھہ مار کر میز کی ساری پیچیں پرے دھکیل دیں۔ سب کچھ میں بوس ہو گیا۔

”انسان ایک شخص پر کبھی شک نہیں کرتا، اور وہ ہوتا ہے اس کا ڈاکٹر!“ میز پر دونوں ہاتھوں کے جھک کر غصے سے وہ غرایا تھا۔ ”تم نے اتنے ماہ میری یوہی کوٹار چر کیا، اس کو پل پل مارتے رہے، صرف اسلئے کہ تمہارے بینے کی پوری فیبلی کو انہوں نے باہر سیٹل کر دیا؟ تمہاری بیٹی ہ پارٹ ٹو ایگزام کلیسر کروادیا؟ تمہیں کیا لگتا ہے، عین میری گرفتاری سے کچھ روز پہلے تم اس کو اچانک سے بلا کر اچانک سے چند میٹر کروائے، لہ کے کاس کا کٹنی فیل ہو چکا ہے اور پھر میرے کیس کے دوران وہ مجھ سے کہے گی کہ اسے میرے کیس اور اپنے ڈوز کے درمیان کسی کو چھننا ہے اور میں اتنا گدھا ہوں جو یہ نہیں سمجھوں گا کہ یہ سارا ڈراما تم لوگ مجھے جیل میں رکھنے کے لئے رچا رہے ہوتا کہ وہ میرا کیس نہ لڑے؟“ ساتھ ہی زور سے میز پر با تھہ مارا۔

ڈاکٹر قاسم نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ ان کے ماتھے پہ پسینے کی بوندیں تھیں اور وہ بار بار اضطراب سے سر جھکلتے تھے۔

”ایک منٹ بھی نہیں لگا مجھے تھیں میں کہ اس کے ڈاکٹر کو کاردار خرید چکے ہیں، آخر چار سال سے وہی اس کے میدی یکل بلز پر کرتے ہیں نا، ان کی کمپنی کا تو بالواسطہ رابطہ رہتا ہے تمہارے ساتھ۔“ واپس کرسی پر بیٹھا، نیک لگائی، تانگ پتا نگ پتا نگ جمالی اور پھر اسی برہم اندہ:

میں بولا۔ ”میرے دوست کی گئی تمہارے اوپر تی ہے۔ مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔ حق تباہ کا۔ کاردار زنے کیا کرنے کے لئے کہا تھام ہے؟“

ڈاکٹر قاسم نے چند گھرے سانس لئے۔ روشنی کا سرخ وہبہ ابھی تک شرٹ پر پڑا ہوا تھا۔ بدقت وہ کہنے لگے۔

”مزد کاردار نے کہا تھا کہ میں اس کی دو ابدل دوں، کسی طرح اس کا اور گئی ضائع ہو جائے اور اس کو دوبارہ سر جری کروانی پڑے گی۔ اس سب میں لگ کر وہ تمہارے کیس کو وقت نہیں دے پائے گی اور وہ اپنی مرضی کے وکیل کو تمہارے ساتھ جوڑ دیں گے۔ مگر میں نے... دیکھو... میں برا آدمی نہیں ہوں... میں نے ایسا نہیں کیا۔“

”مجھے پتہ ہے تم نے ایسا نہیں کیا۔“ وہ درشتی سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”حالانکہ دوسرے ڈاکٹر نے بھی اسے یہی کہا کہ گردہ ضائع ہو گیا ہے، مگر چونکہ وہ جن پر اعتبار کرتی ہے، ان پر مکمل اعتبار کرتی ہے، سو میقیناً وہ صرف انہی ڈاکٹر کے پاس گئی ہو گئی جن کے پاس تم نے اسے بھیجا ہو گا۔“

”تمہیں کیسے پتہ اس کا گردہ ضائع نہیں ہوا؟“

”کیونکہ جس ڈوز کو میں جانتا ہوں... اس کا اور گئی کبھی رجیکٹ نہیں ہو سکتا۔ اسے زمر بہت عزیز تھی، اس کی قربانی ایسے ضائع نہیں ہو سکتی۔“

ڈاکٹر قاسم نے گہری سانس لے کر اثاثت میں سر کو خم دیا۔ ”سعدی یوسف۔ آف کورس۔ اس کا گردہ ٹھیک ہے۔ وہ پروفیکٹ تھی تھا۔ وہ چند سال اور چل جائے گا اچھے سے۔“

”اور میقیناً تم نے زمر کی دو ابھی بدلتی ہے، کیونکہ وہ زرداور بیمار لگنے لگی ہے۔“

”مجھے چند فیک symptoms ڈالنے تھے، تاکہ اسے محسوس ہو کر وہ بیمار ہے۔ دیکھو مجھے اپنی پیشہ بہت عزیز ہے۔ میں نے بہت دتوں سے مزد کاردار کو نالے رکھا ہے۔“

”ظاہر ہے، تم ایسا نہ کرتے تو تمہیں تمہارے وہ کروڑوں روپے کیسے ملتے؟ تمہیں اپنی نظر میں اچھا بھی تو بننا تھا اس لئے تم نے زمر کو نقصان نہیں پہنچایا۔“

”آئی ایم سوری۔ پلیز اس گئن کو میرے اوپر سے ہٹاؤ۔ میں... زمر سے معافی مانگ لوں گا، میں اسے سب حق بتا دوں گا۔“

فارس نے کھڑکی کی طرف رخ کر کے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے سرخ لیزر لائٹ ڈاکٹر قاسم کی شرٹ سے غائب ہو گئی۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ ٹشوکال کر ماتھے پر آیا پسند پوچھا۔

”تم زمر کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔ ابھی کچھ عرصہ نہیں۔ صرف اتنا کہو گے کہ تم کوئی حق دو اس تھا کہ ناجائز کرنا چاہتے ہو جس سے شاید اس کا تقریباً ناکارہ گرددہ کام کرنے لگے۔ کوئی بھی وجہ کھڑلیتا۔ تم ان کاموں میں ماہر ہو۔“ ڈاکٹر قاسم کو حیرت کا جھنکا لگا۔

”مجھے اسے بتانا ہے۔ اب میں اس سے مزید نہیں چھپا سکتا۔ میں برا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ زمر کو نقصان سے بچایا ہے...“

”دنیں، تم اسے کچھ نہیں بتاؤ گے۔ جس چیز کا میں انتظار کر رہا ہوں، اس میں ابھی ذرا وقت ہے، تب تک زمر کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔“

”فارس عازی، تم مجھے قتل نہیں کرنے والے بھلے تم مجھے اپنے انسا پرزا سے کتنا ہی ڈرالو۔“ وہ بھی تندہ ہی سے کہتے آگے کو بھکے۔ ”تم مجھے اب اپنے اشاروں پر نہیں چلا سکتے۔“ لیزر لائٹ ہٹ پچھی تھی اور ان کا گھویا اعتماد بحال ہوا تھا۔

فارس نے اپنے مخصوص انداز میں سرکوم دیا اور فائل کھولی۔ ایک کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

”مجھے تمہیں اپنے اشاروں پر چلانے کے لیے اسنا بھر گئی ضرورت ہے بھی نہیں۔ یہ دیکھو۔ یہ پچھلے ماہ کاریکارڈ ہے۔ تم نے ایک افغان نوجوان کا علاج کیا تھا جس کا نام ابوفرید حسان تھا۔“ ڈاکٹر قاسم نے یونک گاتے ہوئے اچھبھے سے اس لست کو دیکھا۔

”ہاں“ میں نے کیا تھا۔ وہ روشن چیک اپ کے لئے آیا تھا۔“

”اور یہ تمہاری چند تصاویر ہیں، اس مریض کے ساتھ۔“ اس نے ایک پرنٹ آکٹ نکال کر ڈاکٹر کے سامنے رکھے۔ وہ ان میں اس مریض کا معاشرہ کرتے نظر آرہے تھے۔ مریض کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ بھی داڑھی سر پر ٹوپی اور چہرہ ذرا جلا ہوا۔ ہاتھ پر بھی جلنے کا نشان تھا۔

”ہاں تو؟“

”تو یہ کہ یہ افغان باشندہ اب تک طور ختم کا بارڈر کر اس کر کے واپس جاچکا ہے۔ اور اس کا نام ابوفرید نہیں ہے۔ یہ ایک اداکار ہے۔ میں نے اس کو یہ حلیہ پانے کے لئے کہا تھا تاکہ یہ سائیڈ پوز سے لی گئی تصاویر میں ابوفرید کی طرح لگے۔ یہ ہے اصلی فرید۔“ اس نے ایک اور تصور نکال کر ڈاکٹر کے سامنے ڈالی۔ وہ ایک ذرا جلوے ہوئے چہرے والے نوجوان کی تھی۔

”تو پھر؟“

”پھر یہ ڈاکٹر قاسم کہ ابوفرید حسان ایک افغانی باشندہ ہے اور یونیورسٹی حملے میں حکومت کو مطلوب ہے۔ دہشت گرد ہے۔“ ۱۱ تمہارے پاس کبھی نہیں آیا، لیکن اگر کوئی تمہارے ریکارڈ کی یہ لست دیکھے، فہرست لہرائی۔“ اور یہ تصاویر دیکھئے، فوٹو سامنے کیا۔“ تو اسے لے گا کہ تم نے ایک افغان عسکریت پسند کا علاج کیا ہے۔“

”ایک میٹ... میں نے کسی دہشت کا علاج نہیں کیا۔“ ڈاکٹر قاسم کا سر گھومنے لگا۔

”تم یہ ثابت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر میں اپنکس کمیٹی کے کسی رکن یا کسی جریں کو یہ تصاویر اور یہ ریکارڈ بھیج دوں تو تم دہشت گروں کے سہولت کا رثا بات ہو جاؤ گے، دو گھنٹے کے اندر وہ تمہیں گھر سے اٹھائیں گے اور فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر تین ماہ میں چھانی چڑھادیں گے۔ تم سابق صدر کے بی ایف ایف (بہترین دوست) تو ہو نہیں کہ تمہیں کوئی رعایت ملے۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہے ہے تھے تم زمر کو حقیقت تانا چاہتے ہو؟“

ڈاکٹر قاسم نے بے اختیار سر کری کی پشت پر گردادیا اور بس بے بس سے اس کو دیکھئے گئے۔ فارس غازی کی سر دنظریں اب بھی ان پر جی تھیں۔ گھڑی کی سوئی نکل کر تی گئی۔

”نہ کاردار زکو بتاؤں گا، نہ زمر کو۔ میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔ لیکن... اس سے پہلے... میں چاہتا ہوں کہ تم میری بات کا یقین کرو۔“ کیونکہ جب میں کہتا ہوں کہ میں نے زمر کو نقصان نہیں پہنچایا کبھی تو میں غلط نہیں کہہ رہا۔ فارس غازی۔ میں۔ برآ آدمی نہیں ہوں۔“ اس لی آنکھوں میں جھانک کر کہہ رہے تھے۔

”شاید!“ فارس آہستہ سے سیدھا ہو کر بیٹھا۔ بہت آہستہ سے... ایک دم سے آسمان پر کوئی تاراٹو نا تھا۔ یا شاید وہ چاند تھا۔ بہت سے چکراتھے ہوئے تھے۔ مدار بدلتے تھے۔

جب وہ کار میں آ کر بیٹھا تو اکنیش میں چابی گھمانے میں اسے کافی دریگی۔ اس کے ہاتھ کے اوپر... سوئٹر کی آستین پتازہ خون۔ چند ہے لگے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے سوچا کہ زمر کو بتاؤ، مگر نہیں۔ اسے اپنا نہیں سوچتا تھا۔ ابھی نہیں۔

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے خود کو مختدا کرنا چاہا، پھر کار چلا دی۔

سرک پنگا ہیں مرکوز کئے ہر شے کوڈہن سے جھکا اور اپنے پرائیوٹ نمبر سے آبدار کو کال ملاتے ہوئے کار سائیڈ پر دوکی۔

”ایک دن میں دوسری دفعہ فارس غازی کی کال۔ مانا کہ میں بہت اچھی ہوں اور کیوٹ بھی، مگر...“

”آپ کے پاس پرائیوٹ جیٹ ہے نا؟“

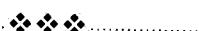
وہ چونکی تھی۔ ”ہمارے پاس دو پرائیوٹ جیٹیں ہیں۔ مگر کیوں؟“

”گڑ۔ میرے پاس بلیو پا سپورٹ ہے۔ اور آپ کے پاس پرائیوٹ جیٹ۔ ایک سوال پوچھوں آپ سے؟“ وہ ذرا اٹھر کر بولا۔

”آپ میرے ساتھ کوئی بچلیں گی؟“

اور آبدار عبید کا سارا وجود لمحے میں برف کا ہوا اور لمحے میں چھٹل گیا۔ زندگی اسے اتنا خوبصورت سر پر اتزوے گی، اس نے سوچا بھی نہ

تھا۔



باب 21:

## کافر۔ ماکر۔ کاذب۔ قاتل

(حصہ اول)

تمہیں جنگ میں کامیابی ملے گی

صرف مکاری سے!

سو تم خود کو رکھنا ہوا کی مانند تیز...

اور جنگل کی مانند گھننا...

جھپٹنا آگ کی لپٹ کی طرح....

اور جم کر کھڑے ہونا پہاڑ کی طرح...

اپنے منصوبوں کو پراسرار رکھنا، رات کی طرح

اور جب

چلو تو بیکاں کی کڑک کی طرح گرنا

جب مضبوط ہو تو خود کو کمزور ظاہر کرنا

اور جب کمزور ہو تو خود کو مضبوط ظاہر کرنا۔

دشمن کو لڑے بغیر چت کر دینا

ہی بہترین فتح ہے!

فتح یا ب جنگ بوج پہلے جنگ کو جیت لیتے ہیں

اور پھر اس جنگ کو شروع کرتے ہیں۔

شکست خورده لوگ پہلے جنگ شروع کرتے ہیں

اور پھر اسے جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ساری جنگی حکمت عملی منحصر ہے

فریب کاری پر

تب حملہ کرو جب لگے کہ نہیں کر سکتے

جب قوت استعمال کر رہے ہو تو لگئے کہ تم جامد بیٹھے ہو  
 جب قریب پہنچ چکو تو خود کو دور ظاہر کرو  
 اور جب دور ہوتم  
 تو یقین دلا دا سے کہ تم ہو بہت قریب!  
 اگر اس کی طاقت تم سے کہیں زیادہ ہے  
 تو اس سے اعراض برتو  
 اگر وہ غصیلا ہے تو اس کو چھپرو  
 خود کو نزد و ظاہر کروتا کہ وہ غرور میں بڑھتا جائے  
 اگر اس کی فوجیں تحد ہیں تو ان کو توڑو۔  
 اس پر تب حملہ کرو جب وہ تیار نہ ہو  
 اور وہاں سے کرو جہاں  
 تمہارے ہونے کا اسے گماں تک نہ ہو  
 صرف وہ جیتے گا جنگ،  
 جو جانتا ہے کہ کب ہے لڑنا!  
 اور کب ہے نہیں لڑنا۔

### Sun Tzu (The Art of War) (دی آرٹ آف وار)

چند ساعتوں کے لیے ہم ماہ کامل کی رات میں واپس جاتے ہیں۔  
 کرہل خاور کو بے ہوش کر کے اس کے پیسے اسلحہ اور پاسپورٹ چرا کر سعدی یوسف اب تیز تیز مرک کنارے چلتا جا رہا تھا۔ بار بار احتیاط سے پیچھے مرکر کر دیکھتا۔ سوتے جا گئے، شہر میں کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ درادور جا کر اس نے ایک نکل نکل رکشہ روکا، اور اس میں سوار ہو گیا۔ ”بلرز لیں۔“ اس نے فوراً سے پتہ بتایا۔  
 کوئی آدمی گھنٹے بعد وہ اسے پا کرتا نی سفارت خانے سے چند فرلانگ دور اتر گیا۔ وہ نکل سے اتر اور دور... کافی دور نظر آتی سفارت خانے کی عمارت کو دیکھا۔ سفید اونچے محل جیسی عمارت جس کے سامنے سر بزرگان بناتا تھا۔ وہ اس جنہی ملک میں پاکستان کی سر زمین کا واحد نکڑا تھی، جس پر نکلن قانون نہیں چل سکتے تھے وہ ایک دفعہ اس میں داخل ہو جائے تو نکلن پولیس اسے چھو بھی نہیں سکتی تھی۔  
 اس سڑیت میں لوگ ”ثریفک، روشنیاں، سب جاگ رہے تھے۔ سعدی کی لگائیں عمارت سے ہٹ کر سڑک پر پھسلیں۔ کونے میں درخت کے ساتھ ایک سیاہ دین پارکر دیتھی۔ پر لے کونے میں ایک آدمی کھڑا اموہاں پر بات کر رہا تھا۔ وہ ہاشم کا آدمی تھا کیا؟ وہ سفارت خانے جائے گا، سب کو اندازہ تھا۔ اس کی تاک میں بیٹھے ہوں گے وہ لوگ۔ وہ ایک ایک چہرے کو دیکھتا۔ ہر شخص مشکوک تھا، ڈر رہا تھا۔  
 اس سفارت خانے میں بھی لکڑاڑھانے کے بہت سے دیگر بھیدی ہوں گے ہی۔  
 سعدی واپس رکشے میں بیٹھا اور اسے چلے کو کہا۔ بیگ سینے سے لگائے، اب وہ سمت کر بیٹھا تھا، محتاج۔ قدرے ڈرا ہوا۔ اب وہ کیا کرے گا؟ کچھ علم نہیں تھا۔ خاور کو گرانا تو پلان کیا تھا، مگر اس سے آگئے نہیں۔

نَمْل نَكَنَ نَے اسے ایک ہوٹل کے کنارے اتارا۔ وہ چند منٹ ادھر کھڑا رہا۔ (کیا ان کو معلوم نہیں ہوا کہ کوہ کی ہوٹل جائے گا؟) وہ مڑ گیا اور اسٹریٹ میں آگے چلتا گیا، چلتا گیا یہاں تک کہ ٹانگیں تھک گئیں اور نفس تیز چڑھ گیا تو وہ رکا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے سمندر کی لہروں کا شور سنائی دیتا تھا۔ سمندر... جوانسان کے دل جیسا ہوتا ہے، بھی پر سکون، بھی اضطراب سے خالی ہیں مارتا... ہر بل بدلتا... وہ میں روڈ سے اتر کر ساحل تک آگیا۔ ساحل کا یہ حصہ سنسان پڑا تھا۔ اور پورا چاند خاموشی سے باulos کے بیچ شم دراز، گویا یہ لگا کر بینھا، نیچے بہتے سمندر کو ٹھیک رہا تھا۔ خالی ہیں مارتا شور... یجھتی چنگھاڑتیں، کئی کئی فٹ بلند ہوتیں لہریں اور پھر واپس پسپا ہوتا پانی... وہ ایک طرف آگیا جہاں پڑنا میں اور پتھر سے پڑے تھے۔ بیک اتار کر نیچے رکھا، اور بیک لگا کر وہیں بیٹھ گیا۔ ٹھنڈا بھی تھی، اور پر پورا جسم نبی کا شکار ہونے لگا تھا۔ اس نے سر پتھر سے نکلا کر آنکھیں موند لیں۔ اور نیند تو سوی پہ بھی آہی جاتی ہے، وہ سوی سے گزر کر آیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا جسم ڈھیلایا پڑتا گیا۔ ذہن نیند میں ڈوبتا گیا۔

اس کی آنکھ جانے کس آواز سے کھلی تھی۔ ایک دم دم ہر بڑا کراٹھا۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ بیک کو دیکھا۔ سب ٹھیک تھا۔ مگر... اس نے چہرہ انھیاں... ایک چیز غلط تھی۔

سورج نکل آیا تھا۔

سامنے افق پر سہری تھاں اتنا چمکیلا، آگ برسا رہا تھا، کہ سعدی کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے فوراً چہرہ ہاتھوں میں گرا لیا۔ صبح روشن تھی اور بڑی پیچھے سرڑک پر دواں دواں تھی۔ رش، لوگ، آوازیں۔ اس نے ہر پتھر کے لئے خود کو تیار کیا تھا۔ سوائے ایک کے۔ سورج! جو اس نے آٹھ ماہ سے نہیں دیکھا تھا۔ 21 جنوری... پورے آٹھ ماہ۔

سعدی بدھوای سے اٹھا، بیک اٹھایا اور سرڑک کی طرف بھاگا۔ سورج اس کی پشت پہ آگ برسا رہا تھا، گویا پچھا کر رہا ہوا اور وہ خوفزدہ سا آگے بھاگتا جا رہا تھا۔ ہاتھ پر عجیب سی سنسنی کا شکار تھے۔ سردی میں بھی سینے آرہے تھے۔ وہ رکا نہیں۔ ہر طرف روشنی تھی۔ تیز روشنی۔ یوں جیسے ساری دنیا کے پردے ہٹ گئے ہوں گے۔ عیاں ہو گیا ہو سب۔ وہ دوڑتا گیا۔ سرڑک کنارے... گلیوں میں... وہ تیز تیز بھاگتا گیا۔ اس سارے میں ایک بھی جگہ نہیں نظر آئی جہاں وہ رک سکے۔ جہاں وہ رکنے کا سوچے ہی۔ چوکنی مگر، خوفزدہ نظر وہ سے ادھر ادھر دیکھ کر چلتا وہ ایک جگہ بالآخر رک گیا۔

یہ ایک پرانتا کار خانہ تھا جو بند پڑا تھا۔ اس کھنڈر کو شستی لوگ اپنے قیام کے لئے استعمال کرتے تھے۔ وہ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک بالکل اندر ورنی کمرے میں آ رکا۔ جہاں سورج کی روشنی نہ پہنچتی تھی۔ گندرا، میلا، کاٹھ کباڑ سے بھرا کمرہ... پچھے بھی رانہیں لگا اسے۔ بس ہانپتا ہوا وہ جلدی سے نیچے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ بالکل سکڑ سست کر خوفزدہ نگاہیں دروازے پر جائے۔ خاور کی پستول ہاتھ میں رکھی۔ کوئی آئے اور وہ اسے چلا دے۔

سعدی اگلے کئی گھنٹے اسی طرح بیٹھا رہا۔ جسم اکر گیا۔ پستول اب بھی ہاتھ میں تھی۔ چہرے پہ پیسہ نہ تھا۔ ہر آہٹ پر وہ چونک کر سیدھا ہوتا۔ پستول تان لیتا۔ مگر وہ ہوا کا کوئی کھلا کھلا ہوتا، یا نیچے بیٹھے شنبیوں کی آوازیں۔ کلبوب بالکل کراچی جیسا تھا۔ وہی ماحول، وہی آدھے صاف سترے پوچھ علاقے اور باقی اس کے برکس۔

❖ ❖ ❖

اپنی تعمیر اٹھاتے تو کوئی بات بھی تھی..... تم نے اک عمر گنو دی میری مساري میں سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر اٹھا خیخ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ فارس نے کار سے نکلتے ہوئے بیل فون کو کان سے لگایا اور آستین کا خون آلود حصہ اندر کو موڑ لیا۔ آنکھیں چندھیا کر دور شہرے آسمان پر جائے، وہ گاڑی سے بیک لگا کر کھڑا دروسی

طرف جاتی گھنٹی سن رہا تھا۔

”ہاں فارس...“ ہاشم کا مصروف سالہ بہ سنائی دیا۔

”آفس میں ہو؟ آجائو؟“ کان کی لولستے ہوئے اس نے سادگی سے پوچھا۔

”میں کلبوبی میں ہوں۔ کہو، کیا ہوا؟“

”اوہ۔ تم سے کام تھا۔ خیرم آ تو بات کرتے ہیں۔“ وہ گویا فون رکھنے لگا۔

”میرے آئے بغیر، میری ایک کال پہ بھی یہاں سوکام ہو جاتے ہیں۔ تم بولو۔“ ہاشم محتاط انداز میں غور سے سن رہا تھا۔ اپنے سو بیٹ

کے صوف پہ بینجا، گرے سوت میں ملووس، ناگ پہ ناگ جائے وہ پوری طرح تیار تھا۔ اگر سعدی یوسف نے اسے فون کیا ہو تو...؟

”تم نے ایک دفعہ پیشکش کی تھی کہ اگر مجھے نوکری چاہیے تو تم سے...“

”تم میرے پاس کام کرنا چاہتے ہو؟“

”نہیں، تمہارا زیادہ احسان نہیں لینا چاہتا۔“ اکھڑ انداز میں بولا۔ ”مگر کراچی میں جو تمہارا دوست ہے... اور لیں الاطاف...“ سنائے ہے

اس کو سیکھو رہی میں کسی آدمی کی ضرورت ہے۔ اگر تم اس سے بات کرو۔ تو میں اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔“

”تم کراچی جانا چاہتے ہو جاب کے لئے؟“ ہاشم کو اس کے لمحے میں کچھ بھی غیر معمولی نہ لگا تھا۔ وہ عام انداز میں بات کر رہا تھا۔

”پھر اور کیا کروں؟“

”اچھا۔“ ہاشم نے سوچنے کے لیے وقفہ لیا۔

”اگر نہیں کر سکتے تو مجھے بتاؤ، میں تمہارا احسان نہیں لوں تو بہتر ہے۔“ وہ تنی سے بولا۔ ہاشم نے گہری سانس لی۔

”فارس... ابھی ایسا کوئی کام نہیں بنایا جو میں نہ کر سکوں۔ تم سمجھو کام ہو گیا۔“ ذرا رُثہرا، اور مسکرا یا۔ ”مجھے خوش ہوئی کہ تم نے مجھے

کام کھا۔“

”مجھے خوش نہیں ہوئی۔ مجبوری نہ ہوتی تو نہ کہتا۔ میری بیوی کا...“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ہاشم نے ابر و اخھایا۔

”کیا اس کی صحت کو کوئی مسئلہ ہے؟ تم بے فکر ہو، ہماری کمپنی اس کے بلز پے کرتی رہے گی؛ ذیلیک خواہش کے مطابق۔“

”وہ میری بیوی ہے ہاشم، اس کے بلز میں خود پے کرنا چاہتا ہوں۔“ تم اور لیں الاطاف سے بات کرو میں کل سے ہی کام پہ لگنے کو تیار

ہوں۔“ اس کے لمحے میں ہاشم کا دارلنے بے چینی محسوس کی تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ (وہ لوگ اپنے مسئللوں میں لمحے تھے۔ شاید زمر کی صحت

پھر سے خراب ہونے لگی تھی۔ اسے افسوس ہوا مگر اب اس کے بلز تو دے رہا تھا۔ اور کیا کرتا۔ سعدی نے ان کو کال نہیں کی، اس کی تشقی ہو گئی

تھی۔) فون رکھتے ہی اس نے اور لیں کو کال ملائی۔ علیک سلیک کے بعد وہ مدعا پہ آیا۔

”فارس غازی... میرا کزن ہے... وہ تمہارے پاس آئے گا، اور تم اس کو رکھو گے، چاہے تمہیں ضرورت ہو یا نہیں۔ اور بھر تھم

اس پر نظر رکھو گے۔ وہ کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے، پل پل کی روپورٹ چاہیے مجھے۔“ سخت لمحے میں وہ دوسری طرف کسی کو

سمجھا رہا تھا۔

❖❖❖

ایسا نہیں کہ ہم کو محبت نہیں ملی..... ہم جیسی چاہتے تھے وہ قربت نہیں ملی فون بند کر کے فارس گھر کے اندر داخل ہوا تو مصروفیت سی ہر سو بکھری تھی۔ ندرت کچن سے آوازیں دے رہی تھیں، جنین لاڈنچ کے ہیلف جوڑرہی تھی، زمر کو نے میں کھڑی استری اسٹینڈ پر کپڑے پر لیں کر رہی تھی۔ (یقیناً پچھلی رات وہ دونوں کہاں رہے وہ ان کو مطمئن کر چکی

تھی۔) فارس ذرا لکھنچا رہا۔ بڑے ابا نے اپنے دوائیوں کے باکس سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا، عینک کے پیچھے سے غور سے۔ وہ سامنے صوفے پر آبیٹھا۔ باری باری سب کو دیکھا۔ زمر نے صرف اسے دیکھ کر ابرداٹھا تھی (ڈاکٹر سے مل آئے؟) فارس نے سر کو خم دے کر اشارہ کیا۔ (ہاں سب نہیں ہے۔) پھر پکن سے آتی ندرت کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے جاب مل گئی ہے۔ سب رک کر اسے دیکھنے لگے، ندرت کے چہرے پر خوشی اتری۔ اس کے قریب آ کر بیٹھیں۔ "اللہ کا شکر ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کہاں ملی ہے؟"

"کراچی۔ مجھے کل سے جوان کرنا ہے۔"

زمر کے ہاتھ پر استری گئی تھی۔ سس۔ اس نے جلنے والی جگہ لبوں میں دبای۔ ندرت کی رنگت پھیکی پڑی۔ حینہ بھی فوراً اس طرف گھومی۔

"آپ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے ما موں؟" بھنویں انکھی کر کے بولتی، وہ پریشان اور خفادونوں تھی۔

"تھوڑے عرصے کی بات ہے، پھر کوشش کروں گا ادھر ہی پوشنگ کروالوں۔"

"فارس آتی دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟" ندرت اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے پریشان ہی کہنے لگیں۔

"تو کیا ہو گیا ندرت؟ لوگ نوکری کے لئے دوسرے ملکوں میں بھی جاتے ہیں۔ کوئی انوکھی بات نہیں ہے اس میں۔ اس کو یوں فکر مندنہ کرو۔ سکون سے جاب پر جانے دو۔ اور جلد اس جو تم نے یہاں رو نہ الا۔" بڑے ابا نے آخری فقرہ حد کو دیکھا جو خاموشی سے گردن اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا، پھر زمر کو جو سر جھکائے بہت ست روی سے کپڑے استری کی تھی، اور پھر پیر ٹھنڈ کرائے کرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے یقین تھا فارس اس کے پیچھے آئے گا اسے منائے گا، مگر وہ نہیں آیا۔

حینہ اپنے کمرے کے دروازے کے ساتھ گئی، زمین پر بیٹھی، خاموشی سے سر گھٹنوں میں دیے رو نے لگ گئی۔ وہ انہیں چھوڑ کر جارہا ہے اسے پڑھتا۔ پہلے ابو پھر وارث، پھر سعدی، ان کے سارے مردان کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

دوپھر کے کھانے کے بعد جب زمر اپنے کمرے میں داخل ہوئی وہ سامنے کھڑا نظر آیا۔ ایک چھوٹا بیگ بیڈ پر کھلا پڑا تھا اور وہ سر جھکائے کھڑا، اس میں سامان رکھ رہا تھا۔ زمر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور سینے پر بازو لپیٹنے اسے دیکھے... بس دیکھ گئی۔

"یہ اچانک سے جاب کس نے لگا کر دی؟" وہ مشکوک تھی۔ (ذہن میں ہارون عبد کانا نام گردش کر رہا تھا۔)

"ہاشم نے۔" سمجھی گئی سے کہتے اس نے زپ بند کی۔ زمر کا منہ کھل گیا۔

"ہاشم؟ تم ہاشم کے کہنے پر شہر چھوڑ رہے ہو، ہم سب کو چھوڑ رہے ہو؟" تم اس پر کیسے اعتبار کر سکتے ہو؟" فارس نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاشم میرا کزن ہے۔" پھر آنکھوں کی پتلیاں سکوڑیں۔ "کیوں؟ کیا اس کے بارے میں کچھ ایسا ہے جو میں نہیں جانتا؟"

زمر نے کندھے جھٹکے۔ "مجھے کیا پڑتا۔" میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ لیکن تھہرا ناپسندیدہ کزن آج تھہرا ابی ایف ایف کیسے بن گیا۔ خیر، تھہرا مرضی جو بھی کرو۔" وہ آنکھوں میں ڈھیروں نفلگی لئے ایک ملامتی نظر اس پر ڈال کر مڑی۔ تبھی سنگھار میز پر رکھا فارس کا موبائل بجھن گا۔ زمر قریب کھڑی تھی۔ گردن جھکا کر دیکھا۔ آبدار کانگ۔ اس کا حلقوں تک کڑا ہو گیا۔

"صرف آبدار؟ تو اب تم اس کے ساتھ فرست نہم ٹرم پہ ہو۔" مژ کر ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔ وہ خاموشی سے آگے آیا اور فون اٹھا کر اسے سامنے لیت کر کے جیب میں ڈال لیا۔

"میں چلی جاتی ہوں کمرے سے، تم تسلی سے اس سے بات کرلو۔"

"وہ تو میں تھہراے جانے کے بعد دیے بھی کر لوں گا۔" وہ اس کو دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

”ظاہر ہے، جیل میں یہ سب تو سیکھا ہو گام نے۔“ وہ جبراً مسکرا کر بولی تھی۔

فارس نے ذرا سا اس کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”تم جل رہی ہو اس سے؟“

”میں؟“ زمر نے بے یقین سے اسے دیکھا۔ ”اور اس پلاسٹک کی گزیا سے جلوں گی؟ ہونہہ۔“ اس نے سر جھکا۔ ”جلنے کے لئے مانے والا آپ سے بہتر نہ ہو تو کم از کم آپ کے مقابلے کا تو ہونا چاہیے۔“

”خوبصورت تو خیر وہ بہت ہے۔ اور اس کی سب سے اچھی بات پتہ ہے کیا ہے۔“ اس کے مزید قریب جھک کر سادگی سے بولا۔

”اس کے بالوں کا رنگ نیچرل سرخ ہے۔ وہ خوبصورت لگنے کے لیے مصنوعی ڈائی نہیں لگاتی۔“

زمر نے بمشکل اپنے بھڑکتے جذبات پر قابو پایا تھا۔ ”تو تم سارا وقت فون پا اس سے اس کے بالوں کا رنگ ڈسکس کرتے ہو؟“

”نہیں، اور بھی بہت کچھ کرتا ہوں۔ کام کی ساری باتیں۔ اس نے بہت کچھ کیا ہے میرے لیے۔ انکوئی مجھہ وہ اپنی ورک واکف لگتی ہے۔“

اس سے زیادہ زمر یوسف اس آدمی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے پرے دھکیلا اور خود روازے کی طرف بڑھی۔

”اچھا سوری میں مذاق کر رہا تھا، بات تو سنو۔“ فارس نے اسے روکنے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا مگر زمر نے تیزی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچا۔

”تم ما جھ سے دور رہی رہو رہنے.....“ اگلے ہی پل وہ مجنون ہو گئی۔ فارس نے جس ہاتھ سے اس کی کلاںی پکڑ رکھی تھی، اس کی آستین پر خون کے دھبے لگنے نظر آ رہے تھے۔

”یہ خون کیسا ہے؟“ اس نے چونک کر فارس کو دیکھا۔ وہ جو سکرا کر کچھ کہنے لگا تھا، نظریں اپنی آستین تک گئیں، چہرے کی رنگت بدی، فوراً سے اس کی کلاںی جھوڑ کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”یہ... شاید کان سے آ رہا تھا۔“ اس نے ساتھ ہی دو انگلیاں کان کے پیچھے لگا کر دیکھیں۔

”کیوں؟“ اس نے اچھبے سے اسے دیکھا۔ ”مھر و مجھے دیکھنے دو۔“

”اب ٹھیک ہے۔ شاید کوئی زخم وغیرہ تھا۔“ مگر وہ آگے آنے لگی تو وہ بولا۔ ”فکر مت کرو، آبدار ایک بہت اچھے ای اینٹی اسپیشلیسٹ کو جانتی ہے، میں اسے دکھادوں گا،“ اور وہ جو فلکر مندی سے آگے کوہئی تھی، اس نام پر کی۔ ماتھے پر بل پڑے۔

”ہاں، اسے ہی دکھاؤ،“ اور برمے موڈ کے ساتھ باہر نکل گئی۔

فارس نے بند روازے کو دیکھتے ہوئے طویل سانس لی، اور پھر سویٹر کی آستین دوبارہ سے موڑ لی اور بیٹھ کے ساتھ باہر نکل گئی۔ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے، اس نے بند آنکھوں کو مسلا۔

زمر اور حنین... دونوں اسے بہت عزیز تھیں۔ وہ ان دونوں کو ہرث نہیں کرنا چاہتا تھا مگر، حقیقت کے تیز چکتے سورج میں کھڑے ہونے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ اس کچھ دن اور....

”اٹھنی... آج مل سکتے ہو؟“ چند میٹ بعد وہ فون پر کہہ رہا تھا۔

احمر شفیع نے فارس کا فون رکھا اور نظر اٹھا کر سامنے نصب اسکرینز کو دیکھا جن پر ایک آفس کی مختلف فونچر چل رہی تھیں۔ احراس وقت کنٹرول روم میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ اس یک نیک، پتھریلی آنکھوں سے ان فونچر کو دیکھ رہا تھا۔ ذہن میں وہ فون کال گونج رہی تھی۔ جو چند گھنٹے پہلے اسے موصول ہوئی تھی۔

”احمر شفیع...“ وہ عورت کہہ رہی تھی جو سفید شال میں نیوائیر پارٹی میں اسے نظر آئی تھی اور جو چڑاں کے ایک با اثر سیاسی خاندان

سے تعلق رکھتی تھی۔ ”آج صبح جب میرے آفس کی فوج بھر لیک ہوئیں تو میرے سکیورٹی اسٹاف نے فوراً سے بھاگ دوڑ شروع کر دی کہ معلوم کریں، کس آئی پی ایم ریس، کس سروز، کس جگہ سے ان کو لیک کیا گیا ہے۔ بیک رینگ، اور پتہ نہیں کس کام میں لگے ہیں وہ، لیکن میں نے صرف ایک بات سوچی۔ کہ اس سب کا فائدہ کس کو ہو گا؟ اگر اس بات کا جواب ہو تو انسان کو کسی سراغر سانی کی ضرورت نہیں رہتی۔“

ذر اتوقف کر کے وہ بولی۔ ”سانپ کو مارتے وقت اس کا سر کچلا جاتا ہے کیونکہ قدیم داستانوں میں آتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں اپنے قاتل کی تصویر عکس بند ہو جاتی ہے۔ اور میری آنکھوں میں احر شفیق تمہاری اور تمہاری مالکن کی تصویریش ہو گئی ہے۔“

احمر نے ریموت اٹھا کر اسکریز کو آف کیا، اور موبائل اور چاپی اٹھاتا ہوا نکل گیا۔ اس کا ذہن اس وقت شدید باڑ کا شکار تھا۔

♦♦♦♦♦

منتظر میرے زوال کے ہیں ..... میرے اپنے بھی کیا کمال کے ہیں  
کو بلو کے اس پر قیمیں ہوں کے تھے خانے میں اس وقت شدید تباہ چھایا تھا۔ ہائی کار دارٹا نگ پٹا نگ جمائے بیٹھا موبائل کے بننے دبارہ تھا۔ نیوی بلیوسٹ اسٹر انپس والی نائی ڈائرنگ کاف لکس پینے بال جیل سے پیچھے کو جمائے وہ اپنی ساری شان و شوکت اور جاہ جمال سے وہاں بیٹھا تھا، گویا بچھی رات اس کے قید بیوں کا نکل جانا اس کے لئے پریشانی کا باعث تھا ہی نہیں۔

سامنے ہاتھ باندھ کھڑے ہوئے لوگوں کی تعداد کافی زیاد تھی۔ فتح بھی پیغام چکا تھا اور سخت مضطرب دھائی دیتا تھا۔ ہیڈ شیف تھل سے تارہ تھا کہ فراریوں نے آرڈر پہ تیار کیا کیک کیسے فرخ سے غائب کیا، اور یہ کہ ان کے ساتھ میقیناً اندر سے کوئی ملا ہوا تھا۔ ہیڈ شیف، فتح، رئیس، سب اپنی اپنی تھیوریز پیش کر رہے تھے۔ بار بار خاموش ہو کر ہاشم کو دیکھتے۔

”سر؟“، فتح سے مزید برداشت نہیں ہوا تو پاکار بیٹھا۔ ہاشم چند منٹ مزید بننے دباتا رہا، پھر بالآخر سراہیا اور مسکرا کر ان سب کو دیکھا۔

”Sun Tzu“ قدیم چین کا ایک جرنیل، اور فلسفی تھا۔ اس نے ایک مشہور زمانہ کتاب لکھی تھی۔ دی آرٹ آف وار (جنگ لڑنے کا فن)۔ ”موبائل میز پر ڈال کر وہ مسکرا کر گویا ہوا۔“ اس کتاب میں جب وہ یہ بات کہتا ہے کہ جنگ کے وظائف ہیں، ڈائریکٹ اور ان ڈائریکٹ لیکن ان دونوں کا ”ملاپ“، بہترین متأنج سامنے لاتا ہے تو ساتھ وہ مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ...“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے کھڑے افراد کی کمریں اور گرد نیں مزید سیدھے ہوئیں۔

”کہ میوز یکل نوٹس پائچ سے زیادہ نہیں ہوتے لیکن ان کا ملاپ لا محمد و دھنیں بنادیتا ہے۔“ قطار میں کھڑے افراد کے ساتھ تے گزرتا ہوا، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ کہتا ہے کہ پرانگری کلکڑ پائچ سے زیادہ نہیں ہوتے..... نیا۔ سرخ..... زرد..... سفید اور سیاہ..... لیکن ان کا کبھی نیشن لا محمد و درنگ بناسکتا ہے۔“ سب توجہ سے اسے نے گئے۔

کمرے میں غیر معمول سننا تھا۔ ”اور وہ کہتا ہے کہ بنیادی ذاتی پائچ سے زیادہ نہیں ہیں، کھٹا، تیکھا، نمکین، میٹھا، اور کڑوا۔ مگر ان کا ملاپ لا محمد و دھنیں لئے بنادیتا ہے۔“ ہاشم نے رک کر گھری سانس لی۔

”ہر چیز بہت پر فیکٹ تھی۔ منصوبہ بندی۔ اس پر عمل پیرا ہونے کا انداز۔ سب شاندار تھا۔ میں متاثر ہوا ہوں۔ لیکن...“ سرکوفی میں ہلاتے ہوئے وہ چند قدم مزید آگے آیا۔ سب سانس رو کے اسے دیکھ رہے تھے۔

”لیکن ان پائچ ذاتیوں میں سے ایک ایسا بھی ہے جو میری بیٹی کو نہیں پسند۔ nuts کا نمکین ذاتی۔ اس ہوٹ میں جب بھی یہ کیک بنایا جاتا ہے۔ وہ بلیوپیری کیک جو سعدی کلی میری بیٹی کے لیے لایا تھا۔ اس میں ہیڈ شیف nuts ذاتی ہے، لیکن پچھلے سال جب سونی

نے یہ یک چکھا تھا تو nuts کے ذائقے پر اس نے برآمدہ بنایا تھا۔ اور اب میں کیا دیکھتا ہوں کہ یہ کیک جو کسی مہمان کے آرڈر پر تیار کیا گیا تھا، اور بظاہر سعدی اور خاور نے چوری کیا تھا، اس کیک میں...“ وہ ہیڈ شیف کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”اس کیک میں nuts نہیں تھے۔“

شیف کارنگ سفید پر۔ ادھر کمرے میں سب چونکے تھے۔ دوسرا ہی لمحے فتح اس پر چھپنا اور اسے ینچے گرایا۔ دو گارڈز بھی اس پر ٹپے اور چندہ ہی لمحوں میں وہ اسکے ہاتھ پیچھے کو باندھ کر اسے قابو کر چکے تھے۔ وہ فی میں سر ہلاتا کہہ رہا تھا۔  
”سر آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں...“

”اوہ ہوں!“ ہاشم نے اسی پر سکون چہرے کے ساتھ فی میں سر ہلایا اور ایک پنج کے بل زین پر بیٹھا۔ ”جانتے ہو مسلسلہ کیا ہے؟ میرے اور تمہارے جیسے لوگ دوسروں کے ساتھ مخلص ہوں یا نہ ہوں، ہم اپنے کام کے ساتھ بے حد مخلص ہوتے ہیں۔ اس کو پریکشنا کے آخری لیوں پر کرتے ہیں۔ اور ایک بہترین شیف کی انا یہ کہتی ہے کہ جس کے لئے کیک بناؤ، اس کو وہ پسند آنا چاہیے۔“

کار سے نادیدہ گرد جھاڑ کر وہ اٹھا اور بے تاثر خست نگاہوں سے فتح کو دیکھا۔

”اس کی چجزی ادھیر دفعہ۔ یہ جو کچھ جانتا ہے اس سے الگواو۔ زندہ یا مردہ، مجھے ان دونوں کو واپس اس جمل میں دیکھنا ہے۔“ پھر ایک قہر آلو نظر اس شیف پر ڈالی جس کو وہ زنجیر پا کر چکے تھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہر ٹکل گیا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

پاؤں رکھتے ہیں جو مجھ پر انہیں احساس نہیں ..... میں نشانات مٹاتے ہوئے تھک جاتا ہوں  
فوڈی ایور آفر ریسٹورانٹ میں اس شام ہلکی چکلی گہما گہمی تھی۔ سلک شرٹ اور ڈنر جیکٹ میں ملبوس احمد شفیع اندر داخل ہوا، شناسائی سے کاڈنٹر والے لڑکے کو ہاتھ ہلایا اور سیدھا حاز میں اور پر پڑھتا گیا۔ اس کا چہرہ سبجدیدہ اور بے تاثر تھا۔ بالائی ہال کا دروازہ ہکھلا تو دیکھا، وہاں صرف فارس غازی کھڑا تھا۔ گرے سویٹر میں ملبوس، سینے پر بازو لیٹیئے وہ احرم کی طرف پشت کیے، شیشے کی دیوار سے باہر دیکھ رہا تھا۔ احرمنے دروازہ بند کیا تو فارس اس کی طرف گھوما۔ پھر چہرے پر سبجدیدگی لئے تین گھنٹے اس پر جمائے، وہ چند قدم آگے بڑھا۔  
”کیا حال ہے غازی؟“

”بلایا اور کام سے ٹھاگنے نیوز میں کچھ دیکھا ہے میں نے اٹھنی۔“ وہ تیز لمحے میں بولا۔ ”اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس میں کاردار زکا ہاتھ ہے مگر کاردار زکا دایاں ہاتھ تو آج کل تم ہو۔ ہے نا؟“

احمر نے بہت ضبط سے اسے دیکھا۔ ”کنسنٹنٹ کلائنٹ پر یونیٹ کے تحت میں اس بات کا جواب نہیں دے سکتا۔“

”اور اس بے ہودہ فقرے کا مطلب دوسرا لفظوں میں ”ہاں“ ہوتا ہے۔“

”ہاں ہو یا نا، تم کیوں جانا چاہتے ہو؟“

”کیا مطلب میں کیوں جانا چاہتا ہوں؟“ فارس کی آنکھوں میں غصہ اور تعجب دونوں عوادیے۔ ”منع کیا تھا تمہیں، کاردار زکی غلامی مت کر ڈوہہ تم سے ایسے ہی کام کروائیں گے۔ ایک بے قصور عورت کو رسوا کر کے کیا ملے گا تمہیں؟ کر مٹل بنتے جا رہے ہو تم!“  
احمر بسچے خاموش رہا۔ وہ دونوں چند قدم دور آئنے سامنے کھڑے تھے۔

”اپنا استغفاری لکھوادا پنی مالکن کے منہ پر مار کر آؤ۔ آج ہی اٹھنی۔ تم یہ جا بچھوڑ رہے ہو، اور میں تمہارے منہ سے ناں نہیں سنوں گا۔“

”جہاں تک مجھے یاد ہے، میں تم سے آرڈر نہیں لیتا، فارس غازی!“ اس کا لہجہ جنپی اور روکھا تھا۔

فارس کے ابروز یہ تن گئے پیشانی کے بلوں میں اضافہ ہوا۔ ووقدم ہزیر قریب آیا۔

”اور جہاں تک مجھے یاد ہے“ میں تمہارا دوست ہوں اور تمہیں ایسا انسان نہیں بننے دینا چاہتا جس کو میں پیچانوں بھی نا۔“

”پیچا نتا تو میں بھی نہیں ہوں اب تمہیں۔“ احراس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ٹھٹھے لجھے میں بولا تھا۔ لمحے بھر کو فارس کا سانس ہضم گیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ تم خود کیا ہو؟“ احرار کی آواز بلند ہونے لگی۔ ”میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے سروائیول کے لئے کر رہا ہوں، میں قانون توڑوں اپنی گردan آزاد رکھنے کے لئے تو وہ غلط... لیکن عظیم فارس غازی وہی کام کرے تو وہ صحیح۔ کیوں غازی؟ کیا تم وہ انسان رہے ہو جو مجھے پہلی دفعہ ملے تھے؟ تب تم نمازیں پڑھتے تھے، اب تم ایک athiest بن چکے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا تم نے ڈاکٹر ایمن کے ہسپتال میں آگ نہیں لگائی تھی؟ کیا وہ جرم نہیں تھا؟ کیا تم انتقام کے نام پر لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتے؟ تم دھوکہ نہیں دیتے؟ کیا معلوم تم نے وہ تیوں قتل بھی کیے ہوں۔ تم کرو سب ٹھیک۔ سب Justified۔ کاردار زدہی کام کریں، احرار شفیع لوگوں کے ویڈیو اسکینڈل لیک کرے تو وہ غلط۔“

”تم ایک ہی سانس میں مجھے کافر، دھوکے باز، جھوٹا اور قاتل کہہ رہے ہو۔“ فارس سرخ آنکھوں سے غرایا۔ ”یہ مت بھولو کر میرا خاندان جباہ ہوا تھا۔ میں جو بھی کرتا ہوں ان لوگوں کے ہاتھ روکنے کے لئے کرتا ہوں تاکہ وہ ہمیں مزید تباہ نہ کر سکیں۔“

”دو غلط مل کر ایک صحیح نہیں بناتے، فارس غازی!“ احرار نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ وہ دونوں آمنے سامنے سرخ چہروں کے ساتھ کھڑے تھے اور اتنی سردی میں بھی ہال میں شدید گرم سانتا ڈر آیا تھا۔ ”اسی طرح کاردار زدہ کے پاس بھی اپنے غلط کاموں کی توجیہات ہوتی ہیں۔“

فارس انگارہ آنکھوں سے اسے دیکھے گیا۔

”یہ.... میرا“ سروائیول ہے۔ یہ میرا سیلف ڈیفینس ہے، غازی اور اگر تمہارے لئے یہ درست ہے تو غلط یہ میرے لئے بھی نہیں ہے۔“

”اگر تمہیں یہ دونوں چیزیں ایک جیسی لگتی ہیں، اور تم ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتے، تو میں تمہیں کبھی نہیں سمجھا سکتا۔“

”تم مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو تو بہتر ہے۔ میں اپنی بیقا کے لیے لڑنا یکھے چکا ہوں۔ اس لئے میرے معاملوں سے دور رہو غازی۔“ ایک تھر آلو نظر اس پڑتا وادہ تیزی سے مڑا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے لمبے سانس لے کر خود کو تابو کر کر تا فارس تنہا کھڑا رہ گیا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گھری..... صبح ہونے کا مگر دل میں یقین رکھنا ہے وہ رات کو لمبو پہنچی اتر آئی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں سویا تھا۔ یونکی بیمار ہا۔ حتیٰ کہ رات بھی آدمی ہیت گئی۔ شہر خاموشی میں ڈوبتا گیا۔ تب وہ اٹھا اور یہ کندھ سے لگائے باہر کلا۔ سڑک سنسان تھی۔ وہ چونکا سا آگے بڑھتا گیا۔ بار بار گرد موز کر پیچھے دیکھتا۔ چند منٹ بعد وہ ایک دیران گلی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا جب دامیں طرف ایک بند بیکری کا بیزندیکھا۔ وہ انگریزی میں لکھا تھا۔ مسٹر بیکر۔ سعدی نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ تیزی سے بیکری کے دروازے تک آیا۔ اس کالاک عام ساتھا۔ مگر کھونے کے لیے کوئی تاز کوئی پن کوئی بھی چیز دستیاب نہ تھی۔ اس نے پستول نکالا (جس کے اوپر سائنس فرث تھا) اور لاک کی طرف رخ کر کے نریگر دبایا۔ پستول سے آواز آئی مگر اس نے زور کا جھٹکا کھایا۔ وہ پورے کا پوارہ لکر رہ گیا۔ دل تک کانپ گیا۔ مگر خیر... اب دروازے کو ٹھوکر کر ماری تو وہ کھل گیا۔ اندر بیکری سنستان تاریک پڑی تھی۔ اس اسڑیت کی بہت سی دکانوں کی طرح۔ یہ درمیانے درجہ کی بیکری تھی۔ اس نے لائٹ

ہال لے کر روش ہوا۔ وہ گھوم کر کاؤنٹر کے پیچے آیا اور شوکیس کے اندر جھانکا۔ گیکس، پیش ریز۔ براؤ نیز۔ اس سے آگے اس نے نہیں دیکھا۔ وہ ۱۰۰۱ نے بھوکا تھا۔ اس نے بیگ پرے رکھا اور ایک بڑا سا کیک باہر نکالا۔ ارڈر گرد کی چیج کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ کچھ خاص نظر نہ آیا تو وہ اپھوں سے شروع ہو گیا۔ وحشت سے دیوانہ اور وہ تیز تیز کھاتا جا رہا تھا۔ ساتھ بار بار دروازے کو بھی دیکھتا۔

تھین کی فہمنی تھی، کہ کبھی وہ کسی بیکری میں بند ہو جائے اور پھر... مزے مزے کی چیزیں بلاروک ٹوک کھاتی جائے، کھاتی جائے۔ لی خواہش کس کے نصیب میں لکھی تھی۔

ایک دم سے اسے کسی آہٹ کا احساس ہوا۔ وہ برق روی سے پیچھے کو گھوما اور پستول والا ہاتھ تان لیا۔ دوسرے بازو کی آسٹین سے ۱۰۔ پکی کریم رگڑی۔

بیکری کے اندر وہی دروازے پر ایک آدمی شب خوابی کے لباس میں کھڑا تھا۔ اس کے پستول تانے پر اس نے ہاتھ اٹھادیے۔

”ریلیکس ریلیکس...“ وہ اسے تسلی دینے کے انداز میں میں کہنے لگا۔ سعدی سرخ انگارہ آنکھیں اس پر جمائے پستول تانے رہا۔

”مجھے مت مارنا۔ تم کھالو جتنا کھانا ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں کھوں گا۔“ وہ چوکھت میں ہاتھ اٹھائے کھڑا کھردہ رہا تھا۔ سعدی اسی طرح پستول اس پتانے سے گھورتا رہا۔

”اس فریق میں صح کے پیزار کھے ہیں ماں یکرو یو میں گرم کر لو ان کو پچ اور ساتھ لے جاؤ۔ میرا دل اتنا چھوٹا نہیں۔ لے جاؤ۔“ وہ ہاتھ اٹھائے نرمی سے کھندا و قدم مزید آگے بڑھا۔ سعدی نے آپس سے پستول والا ہاتھ پیچ کیا۔

”میں بغیر پیسوں کے کچھ نہیں لوں گا۔“ ڈیڑھ دن بعد وہ بھلی دفعہ بولا تو احساس ہوا کہ آواز پھٹی سی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔ تم جو لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ تم برے انسان نہیں ہو، میں دیکھ سکتا ہوں۔ تم صرف بھونکے ہو۔“ وہ اہر دی سے بولا۔

سعدی نے اثبات میں سر ہلا یا اور سر جھکا کر شوکیس میں رکھی براؤ نیز کو دیکھا۔ ”مجھے یہ ایک ڈبے میں ڈال دو۔ جلدی۔“

بیکر ہاتھ گرا کر تیزی سے آگے آیا، ایک ڈبے کا گتا اٹھایا، اس کی اطراف کو موڑ کر اس کو چوکور ڈبے کی شکل دی، پھر سعدی کے ساتھ آ لمڑا ہوا اور جیسے ہی وہ براؤ نیز نکلنے کے لئے جھکا، سعدی یوسف نے کہنی اس کی گردن کی پیٹ پر ماری، اور اس سے پہلے کہ وہ سنجلتا، وہ بیکر کی گردن کو اپنے بازو کے نرخے میں لے کر اس کی مخصوص رگ کو دبا تا گیا۔

”تم نے پہلا فقرہ ہی مجھ سے انگریزی میں بولا۔ سنہالی کیوں نہیں بولی، ہاں؟ نہم روش نکرے میں پہلی دفعہ مجھے دیکھتے ہی تمہیں لیے معلوم ہوا کہ میں انگریزی سمجھنے والا فارنز ہوں ہاں؟“ بیکر ہاتھ پاؤں مارتارہ، مگر منہ سے آواز تک نہ لکی، یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر اٹھ گیا۔

سعدی نے جلدی سے ٹشاٹھا کر اپنے کریم والے ہاتھ صاف کی، پھر جھک کر اس کی جیب چھپتائی۔ اندر سے موبائل نکالا۔ نیا پیغام آیا ہوا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی سنہالی کے باوجود بیکر کا پیغام اور جوابی پیغام سمجھ لیا۔ اپنے کسی جانے والے کو ”پوسٹ والے لڑکے“ کی اپنی بیکری میں موجودگی کی اطلاع دے رہا تھا۔

کسی احساس کے تحت سعدی اٹھا اور بیکری کی بتیاں جلا میں۔ تلاش کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ کیش کاؤنٹر کے اوپر ہی اس کا پوسٹر لگا تھا۔

وہ ۱۰۰ فیصد اس کی شکل نہیں تھی، مگر سیاہ رنگ سے کھنچا خاکہ، گھنکریا لے بال، بھوری آنکھیں، گوری رنگت، انھی ہوئی ناک... نوے فیصد وہ سعدی ہی تھا۔ اس پوسٹر پر لکھا تھا کہ وہ تامل نا ٹینگر ز کا جا سوں ہے (تامل نا ٹینگر ز سری زنکا میں وہی تھے جو پاکستان میں تحریک طالبان

ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تامل ناٹیگر ز 2009 میں مکمل طور پر پسپا ہو چکے تھے۔) اور وہ تامل تحریک کو پھر سے اٹھانے کے لیے سرگرم کارکنوں کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اس کی گرفتاری پر بھارتی انعام رکھا گیا تھا۔ ساتھ ایک فون نمبر بھی درج تھا۔ ذمہ دشی۔ سعدی نے تیزی سے وہ پوشر چھاڑ کر اتار لیا (اوپر لکھے فون نمبر کے دو ہندسے دیوار سے لگرہ گئے)۔

پوشر بیگ میں ڈال کر وہ تیزی سے باہر نکلا۔ ابھی تک گلی سنسان تھی۔ اسے پکڑنے آنے والوں کو ابھی (پیغام کے مطابق) 10 منٹ لگنے تھے۔ میں روڑ سے اس نے نکل پکڑا، اور اس میں بیٹھ گیا۔ اب وہ جھک کر بیگ کو خود سے لگا کر نہیں بیٹھا تھا۔ اب وہ گردن اٹھائے سنجیدہ اور ہوشیار سا بیٹھا تھا۔ رستے میں اس نے تین رکشے بد لے۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اس جگہ سے کافی دوڑا یک فلیٹ بلڈنگ کی تیری منزل میں ایک اپارٹمنٹ کا تالہ کھول کر اس کے اندر کھڑا تھا۔ پوری عمارت میں صرف بھی فلیٹ یوں لگتا تھا کہ مکینوں سے خالی ہے۔ (اس کی بالکونی میں رکھے پوڈے سوکھ رہے تھے۔ گویا سارا خاندان جلدی میں گھر سے گیا ہو، کوئی ناگہانی آگئی ہو اور ابھی تک واپس نہ آسکا ہو۔)

اس نے مختلف الماریاں کھولیں۔ کپڑے دیکھئے۔ جوتے دیکھئے۔ لاونچ میں پڑا فون بھی دیکھا۔ مگر اس کو چھوڑا تک نہیں۔ پھر وہ ایک با تحریر میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد جب وہ باہر نکلا تو بڑی ہوئی شیو روی ہی تھی البتہ۔ گھنگری اے بالوں پر گویا استرا پھیر کر ان کو بہت چھوٹا کر دے تھا۔ شاید ناخن سے بھی آدھرہ گئے ہوں۔ نئی جیزی شرٹ میں ملبوس اس نے باہر آ کر بلوٹ پہنے۔ اور آئینے میں خود کو دیکھا۔ اب وہ اتفاق دے سعدی سے کافی مختلف لگ رہا تھا۔

وہ رات سعدی اسی فلیٹ میں رہا۔ ان کا کمپیوٹر اس نے کھول کر پاسورڈ اڑا کر، انٹرنیٹ کھولا۔ اپنا کوئی میل اکاؤنٹ وہ لاگ ان کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ندرت کی فیس بک آئی ڈی کھولی۔ (یہ کسی زمانے میں اسی کو بنا کر دی تھی یہ دونوں ملک رشتے داروں کی تصاویر دیکھنے، ان پر جھوٹی تعریفیں لکھنے اور اپنے ریسٹورانت کے تیچ پر لوگوں کے اچھے رو یو ز پڑھ کر خوش ہونے کے لئے وہ اسے استعمال کی تھیں۔) پاسورڈ سعدی کے پاس تھا۔ اس نے ڈالا اور پھر... گویا ایک نئی دنیا کھل گئی۔

وہ ایک کے بعد ایک گھر والے کی آئی ڈی دیکھتا رہا۔ سب کی نائم لائن بھری ہوئی تھی۔ تصویریں، چیک ان، کون کہاں گیا، کسی سا لگرہ ہوئی، کس نے کس کو بیگ کیا... جنین اور زمر کی اکٹھی مسکراتی ہوئی سیکھی... (یہ دونوں... ایک دوسرے کے ساتھ اتنی خوش؟) اسامہ۔ لی تصوریں... (یہ... اتنا بڑا؟ اتنا لمبا؟) اور پھر... فارس کی پروفائل... اس میں کچھ خاص نہ تھا... وہ کم ہی لاگ ان کرتا تھا۔ مگر اور پر اپر اسامہ۔ پوسٹ کی ہوئی تھی۔ ”ماموں... کراچی نہ جائیں۔“ فارس نے کوئی کہنے نہیں کیا تھا مگر نیچے جنین اور زمر کے جوابات تھے۔ زمر کہہ رہی تھی۔ اہم۔ فارس کو تنگ نہ کرے اور جسے نہ فلکی سے زمر کو فارس کی سایہ نہ لینے کا کہا تھا۔

وہ بالکل چپ بیٹھا رہا۔ سارے حساب اٹھے ہو گئے تھے۔ زندگیاں بدلتی تھیں۔ وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ سب آئے کل آئے تھے۔ ان کی زندگیاں کتنی پر سکون، اور صاف ستری تھیں۔

فارس... جو جیل میں تہجد اور فجر پڑھا کرتا تھا، اب بھی اس کا ایمان ایسا ہی مضبوط تھا۔ ہر قسم کے کفر سے پاک۔ حنین... اس کی بہن... جس کی پروفائل پر فجر کی نماز سے متعلق احادیث لکھی تھیں۔ وہ کتنی پچی سی حد تھی۔ ہر طرح کے جھٹ۔

پاک۔

زمر... صاف، کھری نذری زمر، جو ہر فریب سے دور تھی۔ ہر کمرے پاک تھی۔  
اور وہ خود... اس نے سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ ایک قاتل تھا۔

اس نے مژہ کرایک دفعہ پھر لا دئی تھی میں پڑے فون کو دیکھا۔ مگر پھر سر جھٹک کر ارادہ بدل دیا۔

وہ اپنے گھر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ان کی طرح روشن، نیک اور صاف ستر انہیں رہا تھا۔ اس کے اندر کے اندر ہیرے اس کے اپول کی ساری روشنی نگل لیں گے۔

یوں سعدی یوسف نے رہائی کے بعد کسی کو کال نہیں کی۔ اسے کرنی ہی نہیں تھی۔ صحیح وہ اس فلیٹ سے باہر نکلا اور کیب لے کر کوبلو نورث کے ٹرین اسٹیشن کی طرف آگیا۔ بالکل کراچی یا لاہور کے جیسا اسٹیشن تھا۔ مگر ذرا صاف ستر ازیادہ تھا۔ پہلے وہ اسٹال کی طرف آیا۔ وہ فریم کا چشمہ خرید اور اسے آنکھوں پہ لگایا، پھر پی کیپ ماتھے پہ مزید جھکا کر نکٹ ونڈ و تک آیا۔ لائن میں تب کھڑا ہوا جب سب سے آخر میں اس نے ایک لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ وہ ساتھ کھڑے لڑکے سے بات کر رہی تھی۔

”اوہ گاؤ۔“ وہ جیب تھپتھا کر اونچا سا بولا۔ ”میں اپنا سیل فون شاپ پہ چھوڑ آیا۔“ وہ دونوں مژہ کراس کا پریشان چہرہ دیکھنے لگے۔

”آپ میرے لیے کینڈی کا نکٹ خرید دیں گی۔ پلیز۔ میں سیل فون لے آؤں۔“ جلدی جلدی چند نوٹ اسے تھما کروہ وہ مژہ کر جھاگا۔ لاکی جیران رہ گئی مگر لڑکے نے اسے تسلی دی کہ وہ اس کے لئے نکٹ لے لیں گے۔

جب اس نے دیکھا کہ ان کی باری آچکی ہے اور وہ نکٹ لے چکے ہیں، تب وہ واپس ان تک آیا اور بہت ہی ماہی سے بتایا کہ وہ سیل کھو چکا ہے۔ انہوں نے ہمدردی کا اٹھا کرتے ہوئے اس کے بقایا میسے اور نکٹ اسے تھماۓ جنہیں لے کر وہ پھر سے وہاں سے غائب ہو گیا۔ تین کی روائی تک وہ ایک باتھروم میں دروازہ بند کر کے کھڑا رہا اور جیسے ہی وقت قریب آیا وہ باہر نکلا اور تین میں جاسوار ہوا۔ نہ کسی نے اسے محسوس کیا۔ وہ ایک کونے کی سیٹ پہ بیٹھ گیا اور اخباروہ کسی مسافر نے نہیں چھواتا کہ ہر کوئی اپنے اس امر ثوفون کے ساتھ لگا تھا، کوچھرے کے سامنے پھیلایا۔

دو منٹ بعد تین چل پڑی... اور اسے کوبلو سے دور لے گئی... دور... بہت دور...  
..... ♦ ♦ ♦ .....

یہ دن ہیں کہ یاروں کا بھروسہ بھی نہیں ہے ..... وہ دن تھے کہ دشمن سے بھی نفرت نہیں ہوئی تھی ہوٹل کی زیر زمین جیل میں فصح سعدی کے کمرہ جن میں کھڑا تھا اور اس کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں تمیں افراد اس شیف کو باندھ کر اس کے چہرے پہ کپڑا ذا لے اس پہ بار بار گرم پانی ڈال رہے تھے اور وہ درد سے کراہتا بے ربط الماظ بولے جا رہا تھا۔

میری فصح کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کو سعدی کی چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”وہ بیہاں سے کچھ بھی نہیں لے کر گیا، سوائے ان کا غذات کے جن پہ کچھ لکھا کرتا تھا۔“

”ہوں۔“ فصح نے بنکارا بھرا پھر سر اٹھا کر میری کو دیکھا۔ ”تم اوپر چل جاؤ۔ تم کاردار صاحب کے ساتھ واپس جاؤ گی۔“

میری کی آنکھیں نہ ہو گئیں۔ ”مگر میں نے ان کو ماہیں کیا ہے۔ میری مجری کی وجہ سے وہ اس کمرے تک پہنچے اور وہاں سے بھاگے۔“

”مگر تمہاری نیت صاف تھی۔ جاؤ، کاردار صاحب اور تمہارا انتظار گر رہے ہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ میری آنکھوں کو پوچھتی باہر نکل گئی۔ فصح مو بالکل پہن دبا تباہ آیا اور لفت کی طرف بڑھتے، دوسری جانب جاتی گھنٹی سنتار ہا۔

”سر، ایک اہم بات ہے۔“ لفت میں داخل ہو کر وہ مدھم آواز میں بولا تھا۔

”کیا ہوا، فصح؟“ ہاروں مصروف لجھ میں بولے تھے۔

”شیف ثوٹ پکا ہے۔ سب اگل دیا ہے۔ لیکن زہری میں سرخ کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ سر۔“ وہ متذبذب سار کا۔ ”سعدی یوسف کے سامان میں دو چیزیں منگ ہیں۔ ایک اس کے کاغذ، دوسرا اس آبدار کا پین۔ مس اپنی نوٹ بک اس کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔ میں وہ لینے کا تودہ پین یاد آیا۔ صرف وہی پین تھا جو سکھ رہی پوچھنے کیا گی تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں آبدار نے اس میں زہر...“

”آج تو تم نے میری بیٹی پر الزام لگا دیا ہے۔ آئندہ بھی مت لگانا۔“ وہ ایک دم گرج کر بولے تھے۔ ”وہ میرا پین تھا اور وہ سعدی نے نہیں رکھا تھا۔ آپ اسے واپس لے آئی تھی۔ تمہاری یادداشت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اپنی ناک کے نیچے سارا کھیل رچا تے شیف کو تم نہیں سکتے اور میری بیٹی پر الزام لگاتے ہو؟“

فضیح کے ایک دم پسینے چھوٹ گئے۔ رنگت متغیر ہوئی۔ ”سوری سر، میرا یہ مطلب...“ مگر ہارون اس کے سارے خاندان کو مغلظات سے نواز کرائے گویا ادھ مویا کر کے فون بند کر چکے تھے۔

وہ اس وقت اپنے آفس میں بیٹھے تھے۔ فون بند کر کے انہوں نے ریموٹ اٹھایا اور دیوار گیر کھڑکی کی طرف کر کے بٹن دبایا۔ بلاک آؤٹ بلائڈر فوراً سے کھڑکیوں پر گرنے لگے یہاں تک کہ ساری روشنی ختم ہو گئی اور آفس میں اندر ہمراچا گیا۔ ہارون نیک لگائے تھوڑی مسلسلے چھت کو دیکھتے تھے کتنی ہی دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے انٹر کام اٹھایا۔

”آفتاب کو بلا رو۔“

آدھے گھنٹے بعد.... وہ اسی طرح اندر ہمراکے، کرسی پر نیک لگا کر بیٹھے تھے جب آفتاب اندر داخل ہوا۔ وہ دبلا پٹلا، ادھیز عمر شخص تما اور اچھاسوٹ پہنچے ہوئے تھا۔ ہارون نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

”میری بیٹی نے مجھے صحن اطلاع دی تھی کہ وہ چند دن کے لئے میرا بنس جیٹ لے کر جا رہی ہے۔ اس نے میرے عملے کو بھی چھٹی دے دی ہے۔۔۔ مجھے معلوم ہے وہ کسی ایسے شخص کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہے جس کے بارے میں وہ مجھے نہیں بتانا چاہتی۔“

آفتاب توجہ سے سن رہا تھا۔

”وہ اپنے قابل بھروسہ لوگوں کو عملے میں رکھے گی۔ وہ تم پر بھروسہ کرتی ہے۔ اکثر تھیں کام کہتی رہتی ہے۔ تم اس عملے میں شامل ہو گے۔“

”اور میں آپ کو معلوم کر کے دوں گا کہ وہ کس کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں؟“

”میں پہلے سے ہی جانتا ہوں کہ اس کا نیا دوست کون ہے اور یہ بھی کہ وہ کولبیو کیوں جانا چاہتا ہے۔ تم بس کولبیو میں آپ کے قریب رہ گے، اور اس کی حفاظت کرو گے۔“ ان کا چہرہ اندر ہیرے میں تھا، اور دن کے اووقات کے باوجود آفتاب کوان کا چہرہ دیکھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دھیان اور غور سے سنتا گیا۔



اب سانس کا احساس بھی اک بار گراں ہے..... خود اپنے خلاف ایسی بغاوت نہ ہوئی تھی میری اینجیو نے اس روز یو میفارم کی بجائے سادہ بھوری اسکرت، بلا وز کے سیاہ لمبی جراہیں پہنی تھیں۔ جس وقت وہ کار سے نکل کر سبزہ زار پر کھڑی ہوئی، اس کی گردان خود بخود قصر کاردار کو دیکھنے... نگاہوں میں سموں کے لئے... اوپر اٹھتی گئی۔ دھندا اور سرخ شام کے ڈھلتے موسم میں پوری شان سے کھڑا اور نچا محل روشنیوں سے جگہ رہا تھا۔ اگلی کار سے ہاشم اور جواہرات نکلے تھے۔ سونی آگے بھاگ گئی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے قصر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میری نے گردان سیدھی رکھی اور دلی جذبات پر قابو پاتی، ہمت بھیج کر کے ان کے پیچھے چل پڑی۔ رواج کے مطابق خوش آمدید کہنے ملازم دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ فیکنابھی ان میں سے ایک تھی۔ سب سے آگے وہ اعتمادتے پڑی۔

مسکرا کر جواہرات کا استقبال کر رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹا اسی بے نیازی سے اندر داخل ہوئے اور فیجنونا نے دیکھا، ان کے پیچھے میری اینجو چل آ رہی ہے۔ فیجنونا یکدم بت بن گئی۔ بالکل مجدد۔ میری قدم قدم چلتی قریب آئی۔ اس کے ادھیز عمر چہرے پہ فیجنونا کے مقابلے میں ڈھروں لکیریں اور تجربے کے بل پڑے تھے۔ سنجیدہ آئی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے فیجنونا کو دیکھا۔

”بہروز سے کہو، میرا کمرہ تیار کرے۔“ تھکم سے کہا تھا۔ فیجنونا نے مژکر جواہرات کو دیکھا جو اندر جا رہی تھی اور پھر بے بسی بھرے تعجب سے واپس میری کو۔

”بہروز... سارا پرانا اشتاف... اب یہاں جا ب نہیں کرتا۔“ پھر ذرا اعتماد سے بولی۔ ”اب یہاں کا اشتاف بدلتا گیا ہے میری اینجیو۔“

”بہت اچھے۔ اس بد لے ہوئے اشتاف کے لوگوں سے کہو، میرا کمرہ تیار کریں اور یہ بھی کہو، صبح منہ اندر ہیرے وہ انھوں کر تیار ہو جائیں،“ کل میں سارے گھر کے ان ڈور پلانش کی جگہیں بدلنا چاہوں گی۔ ”پھر ایک طاری نظر برآمدے پہ دوڑائی۔“ اور ادھر کے سارے پودے کہاں گئے؟ میں چند دن کے لئے کیا گئی، تم لوگ تو نکلے ہو گئے ہو...“ ڈپٹ کر بولتی وہ اندر بڑھ گئی۔ فیجنونا ہا کباکا سی ساکت کھڑی رہ گئی۔

اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی جواہرات کہ رہی تھی۔ ”میری... مساج کے لئے سامان تیار کرو۔ میرے پیغمبہر دو دکر رہے ہیں۔“

اور اوپر سیڑھیوں کے زینے چڑھتے ہاشم نے آواز لگائی تھی۔ ”میری... بلیک کافی بھجو میرے کمرے میں فناٹ۔“ اور میری اینجیو مسکرا کر سر کو ختم دیتی، دونوں کو جواب دیتی آگے بڑھ گئی تھی۔

پہلے احرشقق اور اب میری اینجیو... فیجنونا کا سارا جو جو زین بوس ہو گیا تھا۔ اپنے کمرے کے دروازے کے قریب ہاشم رکا۔ سامنے سے نوشیر وال چلا آ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر ہاشم نے ٹاٹرات کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ شیر و معدتر کرنے پیچھے آئے گا مگر چند لمحے بعد زینے اتنے کی آوازنے اس کے دل کو دھکا سا لگایا۔ مگر وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ کوٹ اتارتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا۔ زندگی اس کے لئے معقول پا آ جی گئی تھی۔ سعدی یوسف کے بھاگنے کے بعد اسے اگا کارڈ کوں سا کھلنا تھا، اب اسے یہی سوچنا تھا۔

❖❖❖

اب تیرے قریب آ کے بھی کچھ سوچ رہا ہوں ..... پہلے تجھے کھو کر بھی ندامت نہ ہوئی تھی ایئر پورٹ جانے سے پہلے، گھر کے اندر سب سے مل کر خدا حافظ کہہ کر اب وہ پورچ میں آ کر کار میں سامان رکھنے لگا تھا، اور جانتا تھا کہ اس سے اس وقت کوئی خوش نہیں تھا۔ اس نے سارہ کو فون کرنے کا سوچا پھر ہنسنے دیا۔ وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ چکا تھا۔ موبائل نکال کر اس نے کال ملائی اور تھوڑی دیر کے لیے گیٹ سے باہر جا کر بات کرنے لگا۔

”میں پھر سے دہرا رہوں۔ تم چوبیں گھنٹے میرے گھر کے باہر رہو گے۔ میرے گھر کوں آتا ہے، یہاں سے کون کہاں جاتا ہے، تم ان پندر کھو گے۔ قادر میرے بھانجے کے قریب رہے گا۔ جب تک وہ اسکول میں ہو گا، وہ اسکول کے باہر کھڑا رہے گا۔ میں کچھ دن میں آ جاؤں گا، لیکن میرے پیچھے تم لوگ میرے گھروں کی حفاظت کرو گے۔“ اور دوسری طرف موجود نذر راستے تلی دے رہا تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ زمر نے ایئر پورٹ تک کی ڈرائیور خاموشی سے طے کی وہ بھی چپ سا کھڑکی کے باہر دیکھتا رہا۔ صرف خین ساتھ آئی تھی اور پیچھے پہنچی تھی۔ فارس نے اس سے ابھی تک بات نہیں کی تھی۔

پھر احاطے کے اندر آ کر... ڈیہروں مسافروں کے درمیان.... زمر اس جگہ رکی جہاں سے آگے وہ نہیں جاسکتی تھی۔ وہ بھی نہیں آیا۔ کچھ دنوں خاموش کھڑے رہے۔

”تو طے ہوا کہ تم نہیں روکے۔ بھٹکے کوئی کتنا ہی روکے؟“ سینے پر بازو پیسے وہ اس کے مقابل کھڑی اداں مسکراہٹ کے ساتھ پا پہنچ لگی۔

”کسی نے روکا ہی نہیں تو کیسے رکتا؟“ اس نے مسکراہٹ دبائی۔

زمر بس یا سیت سے اسے دیکھتی رہی۔ ”مت جاؤ۔“

”آ جاؤں گا واپس۔“ اس نے نظریں چڑائیں۔

”اور اگر جو نہ آئے فارس...“ وہ بے بُی سے دنوں ہاتھ اخاکر بولی تھی۔ جیسے اپنی بات کی وضاحت نہ کر پا رہی ہو۔ ”مجھے لگتا ہے میں تمہیں کھودوں گی۔“

”تم سب محفوظ ہو۔ پہلے نہیں تھے۔ اب ہو۔ کیونکہ اب ہم سب اکٹھے ہیں۔“ ارڈر گرو جو دلوگوں سے قطعاً بے نیاز ہو کر اس نے زمر کے دنوں ہاتھ تھامے۔ اسے پرواہ نہیں تھی کوئی دیکھ کر کیا سوچتا ہے۔ ہاتھ تھامنے کا مطلب صرف رومانس تو نہیں ہوتا۔ جیسے بھائی بہن ہا ماں باپ بیٹی کا ہاتھ تھام کر اسے حفاظت اور بھروسے کا احساس دلاتا ہے، ویسے ہی شوہر اور بیوی کے رشتے میں (اگر باپی وڈی کی عینک اتار لرم و دیکھو) تو دوستی، اعتماد، حفاظت، مان یہ سب ہوتا ہے، اور رومانس تو ایک بہت ثانوی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔

اور اس وقت وہ خود کو جتنا کھرو محسوس کر رہی تھی، فارس کا یوں ہاتھ تھام کر احساس دلانے سے... اس کی آنکھیں جانے کیوں بھیں گئیں۔ سرخ گڑی سے جڑی ساری تنقی ہوا ہوئی۔

”پچھلے ساڑھے چار سال اچھے گزرے فارس۔ میں ان سکیوں نہیں محسوس کرتی تھی خود کو۔ کھونے کے لئے کچھ رہا ہی نہیں۔ مگر اب... ماہ کامل کے بعد سے... اس رشتے کے بعد سے... کھونے کے لئے بہت کچھ آگیا ہے زندگی میں۔ پلیز جلدی واپس آ جانا۔“ وہ دکھی دل سے کہہ رہی تھی۔ آج اس سے لڑنے کا بھی دل نہیں چاہرہ رہا تھا۔

”تو تم مجھے مس کرو گی؟“ وہ مسکرا یا۔ مگر خوش و بھی نہیں تھا۔

”میں تمہیں مس کیوں کروں گی؟“ زمر نے مسکراہٹ دبائے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکالے۔ ”آئی ہیئت یو۔“ اور فارس غازی نے سر کو ختم دیا۔

”آئی لو یو!“ اور بیگ اخاکر کرندھے پڑاں لیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نہس دی۔ گردن پیچھے کو پھینک کر محفوظ ہو کر۔ پھر اس دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مسکرا کر محفوظ ہو کر۔ زمر کے دل میں ایک دم بہت سے واہیں در آئے۔

”تم ایسے ہی واپس آؤ گے نا؟ بدلتا تو نہیں جاؤ گے؟“

”نہیں۔“ اس نے مسکرا کر تلی دی۔ پھر اس کی طرف جھکا۔ ”اور میں اس کو دن میں تین چار کی بجائے صرف ایک یا دو کالز کیا کروں گا۔“

”ہاں ہاں کر لینا۔“ وہ پھر نہس دی تھی۔ وہ اسے صرف ستارہ ہا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس نے خود کو تلی دے دی اور پھر مڑ آئی۔ اس کو دور جاتے دیکھنا مشکل تھا۔ خود دور جانا زیادہ آسان تھا۔

خنین اس کی منتظر تھیں۔ وہ چپ چاپ اس سے آلمی۔ ماحول بوجھل ساتھا۔ اور پھر اسی بوجھل ماحول میں وہ دنوں گھر جانے کے بجائے ایک ریسوراٹ میں آبیٹھیں۔ خنین نے آرڈر دیا اور زمر گنگریاں لٹ انگلی پیٹھی تھی، خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”مبارک ہو۔ آپ کا شور بھاگ گیا، اور میرا بھائی ابھی تک گشہ ہے۔“ حمد نے تھوڑی دیر بعد جلے کئے انداز میں کہا۔

”ہم دونوں ناکام عورتیں ہیں کیونکہ ہمارے سب سے عزیز مرد ہمیں چھوڑ جاتے ہیں۔“ وہ خفگی سے بول رہی تھی۔ ”فرعون بھی تو

یہی کرتا تھا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے... بار بار... کہ بنی اسرائیل... وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور بیٹوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔“

”بیٹوں کو نہیں، عورتوں کو۔“ زمر نے دھیسی آواز میں صحیح کی گردہ نہیں سن رہی تھی۔

”یہ عذاب تھا بنی اسرائیل کا۔ ایسی ذلت کو کوئی آپ کے مردوں کو مار دے اور عورتوں کو چھوڑ دے۔ اکیلی عورتوں کو۔ بنی اسرائیل کی بے بس اور لاچاری تو دیکھو۔ بالکل ہماری طرح۔“

”ہاں ٹھیک ہے یہ آیت ”یقتلون ابنا نکم وہ یستحبون نسانکم“ بنی اسرائیل کی بے بس بیان کرتی ہے، مگر اس کے اور زدواجی بھی ہیں۔“ زمر نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

”مثلاً کون سے؟“ وہ سخت جل کئی بیٹھی تھی۔ فارس اس سے بات تک نہیں کر کے گیا تھا۔

”بہت سے ہوں گے ناخنیں۔“ وہ جیسے اس ذکر سے احتراز برداشت رہی تھی۔ اتنے برس سخت دل کے ساتھ گزارے تھے، اب کیا

پھلنا؟

”آپ بتائیں، میں سن رہی ہوں۔“ حمد نے لہجہ درادھیما کیا۔

”ہر آیت کے بہت سے رموز بہت سے زاویے ہوتے ہیں۔“

”ایک منٹ زمر۔ میں نے ایک بات بھائی سے کبھی نہیں پوچھی، پہلے ضرورت نہیں پڑی لیکن اب میں خود نفیوز ڈھورہ ہو رہی ہوں کہ جیسے بھائی کی فیس بک پر تفسیر ویڈیو یو ہیں.... وہ ذرا بچکپائی۔“ ہم جیسے عالم لوگ قرآن کی تفسیر کیسے کر سکتے ہیں؟“

”زمر دونوں کہیاں میز پر جائے آگے کوہوئی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔“ ہم جیسے عالم لوگ قرآن کی تفسیر کر بھی نہیں رہے، تفسیر تو مفسر کرتے ہیں۔ عربی گرامر، صرف خود غیرہ کی باتیں۔ حقائق کو حوالہ جات۔ آیات کا شانِ نژول وغیرہ بتانا۔“

”تو پھر وہ جو بھائی کے فیس بک گروپ میں اس کی ویڈیو یو ہیں وہ کیا ہے؟“

زمر لمحہ بھر کے لئے چپ ہوئی۔ آنکھیں نیچے جھکا کر اس نے گویا کچھ سوچا۔ حمد کے ماتھے کے بل نائب ہونے لگے۔ اور اس کی

اپنی آنکھوں میں دلچسپی اتری۔ پھر زمر نے آنکھیں اٹھائیں۔ (فارس کے جانے کا غم دونوں کے دل سے لمحہ کو نکل گیا۔)

”ہمارے رسول ﷺ نے کبھی اپنے آپ کو مفسر نہیں کہا تھا۔ قرآن ایک علمی کتاب بھی ہے، لیکن یہ ”صرف“ علمی کتاب نہیں

ہے۔ کیا اللہ نے قرآن میں نہیں فرمایا کہ... (قدرت سے اس نے آیت دہرائی، یہ نہیں تھا کہ آیت یاد نہیں تھی؛ بس اس کا یاد آتا اور خود کو

یاد دلانا مشکل لگ رہا تھا) یعنی ہم نے نازل کی آپ پر یہ کتاب جو مبارک ہے، تاکہ آپ اس میں تدربر (غور و فکر) کریں اور اس کے ذریعے

عقلمند لوگ نصیحت پکڑیں۔ تو حنین، ہم لوگ قرآن کی تفسیر نہیں کر سکتے، مگر اس کی آیات کے معانی کے اندر رہ کر اس میں تدربر کر سکتے ہیں اور

اس کی دعوت خود قرآن ہر انسان کو دیتا ہے۔ اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔ کوئی پیدائشی عام یا خاص نہیں ہوتا۔ اور اگر ہم اس کی ایک ایک

آیت کو اپنی زندگی سے ریلیٹ نہیں کریں گے تو نصیحت کیسے پکڑیں گے اس سے؟ دیکھو میں واقعی بہت نیک نہیں ہوں، اس کو پڑھتی بھی نہیں

ہوں اب۔ مگر میں جو قرآن کا مقصد سمجھی ہوں وہ یہ ہے کہ یہ ہر انسان کے لئے نصیحت ہے۔ یہ صرف ”تفسیر“ نہیں ہے۔ یا یہ صرف علمی کتاب

نہیں ہے۔ حنین پیچھے ہو کر بیٹھی۔ ویژاً آڑ رسو کرنے لگا مگر زمر ادھر متوجہ نہیں تھی۔ (اچھی بات ہے۔) حمد نے اپنی پلیٹ سیٹ کرتے ہوئے

کہا۔

"زمر جگن اگر ہر انسان خود سے تدبیر کرنے لگے تو کیا یہ صحیح ہوگا؟ کیونکہ اسی قرآن کے ذریعے لوگوں کو بعثت کا ہبھی ہے۔"

"تو پھر ہر قرآن پڑھنے والا بھٹک گیوں نہیں جاتا؟" دو اب زیادہ روانی سے بول رہی تھی۔ "لوگوں نے اس آیت کو بہت نہ استعمال کیا ہے کہ پچھلے قرآن سے بندہ بھٹک بھی سکتا ہے اس لئے اس کو صرف گھول کر کرنا اور پھر جنم کر کسی اپنی بھٹک پر کھو دے کوئی نہ فہم۔ کسی راستے پر سفر کرنے لگا تو یہ وہ بھٹک گایا منزل تک پہنچ جائے گا۔ بھٹکے کے اور سے اب کوئی غریبی نہ کرے کیا؟ لاگ تو روزہ سفر کرنے ہیں۔ کیونکہ سب کو علم ہے کہ جو سائیں بورڈز دیکھ کر سفر کرنے لگا کام من سخن پورز کرنے گا اور جیسیں بھٹکے ہیں۔"

"میں بھٹکنے کرنا چاہدی زمر۔" حسنے حرست سے پیٹ میں اچھی اچھی اسکس کا لیں فریج فراز بھر نے ساس ڈالی اور پھر سر بری انداز میں بولی۔ "مگر... اس طرح اگر ہر شخص قرآن کی تفسیر... تو وہ کی اور صحیح کی۔" قرآن میں تدبیر کرنے کے اس کو بیان کرنے، شروع کر دے یعنی اپنی رائے پر بیان کرنے لگ جائے... تو۔"

"ایسی رائے پر تو کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ قرآن میں ہے ہاؤ کہ جہنم والے کہیں گے ہم قیامت کو جھلاتے رہے۔ یہاں تک کہ آسیا ہم کو الجہن۔ اب الجہن کا مطلب "موت" ہے۔ آپ اس کا مطلب "جین کر لینا" نہیں لے سکتے۔ آپ کو اس آیت کے اندر وہ کہ اس سے مطلب کے دائرے میں رہ کری تدبیر کرتا ہے اور عقل استعمال کر کے اس سے اپنے لئے سبق کا لئے ہیں۔ اسی لئے اللہ کہتا ہے قرآن میں "کہ یہ نصیحت ہے حق والوں کے لئے۔"

"یہی تو میں کہدی ہوں زمر، کہ اگر ہر شخص یوں تدبیر کرنے لگے، بھٹکنے والا ہو جائے تو ہو جھٹکے والا آیت کے اندر رہ کری کہے یہ سب... جب بھی... کیا فتنہ جیسیں کمزرا ہو گا؟ کیونکہ بہت سے لاگ قلادة برٹیکس کرنے لگ جائیں گے اور دوسروں کو بمنکاریں گے؟" "جین اب فریج فراز ساس میں اپ کر کر کے کھاتی پوچھ رہی تھی۔ (ہرے ما موں... آپ کی وجہ سے کل سے کھانا نہیں کھایا۔)" "کیا مطلب کہ لاگ قلادة برگریں گے؟ لوگ پہلے ہی قلادة بر کر دے چکے ہیں۔ اسی قرآن کی آیات کو استعمال کر کے دوست گر بے کناہ لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔ قادر یا نی اسی قرآن سے اپنے مطالب کا لئے ہیں۔ سلامان رشدی جیسے لوگ اسی قرآن کو کوت کر کے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں ہی لوگ اُوین میں کوئی جزر نہیں۔ جیسی آیات کا معانی بدلت کر اسے استعمال کرتے ہیں۔ لوگ تو بیشتر سے یہ کام کر دے چکے اور کرتے رہیں گے۔ ایسے میں تو ہمیں زیادہ ضرورت ہے قرآن میں سمجھ تدبیر کرنے کی تاکہ ہم وہ دشی پہنچائیں اور اس سے قلادة بر کرنے والوں کے اندر ہجرے کو منا نہیں۔ لوگوں کو قرآن کا اصل مطلب بتا گیں۔"

"وہی تو زمر... اگر ہم بھی تدبیر کو فروغ دیں گے تو یوں لوگوں کے قلادة بر کا درجک ہے ہے گا۔ پہلے جہاں میں لوگ قرآن کو ملکا بیان کرتے تھے وہاں اب ہو لوگ ایسے کرنے لگ جائیں گے۔"

"باں تو کرتے رہیں۔" اس نے شانتے اچکا ہے تھے۔

"کرتے رہیں،" جین کا کانٹا پکڑے ہاتھ فضا میں معلق ہو گیا۔ مذکولہ گیا۔ "کرتے رہیں؟"

زمر نے ایک خندی سانس لی۔

"ہاں کرتے رہیں،" مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ یہ قرآن ہے۔ ڈیجیتیں اور اس کی خصوصیت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ جو اس میں قلادة بر کرے گا اس میں معنوی تحریف کرے گا اور خود ہی رسم اور کوئی کوئے نہیں پڑے گا۔ اللہ فرماتا ہے ہر جیسے سندھر کی جہاگ کی طرح ہے بہہ جائے گی۔ لیکن جو لوگوں کو نقش دیتا ہے صرف وہی رہ جائے گا۔ تو جو صحیح تدبیر کرے گا اس کا کام رہ جائے گا۔ باقی سب سندھر کی جہاگ کی طرح بہہ جائے گا۔ کتنے عرب شہروں نے قرآن کی طرح کام لکھنے کی کوشش کی کہاں ہے ان کا کام؟ کہاں ہے سلامان رشدی کی کتاب؟ پہ یہ کیا بھبھی امام مالک موقاً لکھ دے ہے تھے (عدیت کی ایک مستند کتاب) تو بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی کتب کا ہم موڑا رکھ کر

”باقی ملکت پروردگار کی بھی میں نہ سمجھ سکتا۔  
جن میں تھے اس کو زیر برداشت نہیں کیا۔ اس کی تائید اپنے کام کر لے گا۔“  
”باقی ملکت پروردگار کی بھی میں نہ سمجھ سکتا۔  
لے کر کچھ بھی کام کرنے کے لئے کوئی کام کر لے گا۔“  
”باقی ملکت پروردگار کی بھی میں نہ سمجھ سکتا۔  
لے کر کچھ بھی کام کرنے کے لئے کوئی کام کر لے گا۔“  
”باقی ملکت پروردگار کی بھی میں نہ سمجھ سکتا۔  
لے کر کچھ بھی کام کرنے کے لئے کوئی کام کر لے گا۔“  
”باقی ملکت پروردگار کی بھی میں نہ سمجھ سکتا۔  
لے کر کچھ بھی کام کرنے کے لئے کوئی کام کر لے گا۔“

باہر دیکھتے فارس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ ابرودرا اکٹھے کیے ہوئے تھے اور سر پر سیاہ پی کیپ پہن رکھی تھی۔

اس کے مقابل نشست پر آپ بیٹھی تھی۔ اس نے سرخ ریشمی رومال سر پر باندھ کر گردن کے پیچے گرہ لگا رکھی تھی اور رومال سے ٹکنے بھوری سرخ چوٹی بائیں شانے پر آگے کوڈال رکھی تھی۔ وہ ہتھیلی پر چہرہ جمائے سرخ لب کا تیز سبزمی آنکھیں فارس پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت اور خوشی دونوں تھیں۔ ملازم ٹڑے لئے اس کے پاس آ کر کھنکھارا تو وہ چوکنی، گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور ”تھینک یو آفتاب“ کہتے ہوئے گلاس اٹھالیا۔ ملازم فارس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے، گردن موڑے بننا ”زو تھینکس“ کہا۔ آپ نے ہاتھ کے اشارے سے آفتاب کو جانے کا کہا۔ وہ ایک خاموشی نظر فارس پر ڈال کر مر گیا۔

وہ دونوں تنہارہ گئے تو آبدار ہٹکھاری۔ ”کیپ اتار دیں۔ میرے ملازم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔“

فارس نے سنجیدہ چہرہ اس کی طرف موزا۔

”اس نے تین دفعہ مجھ سر سے پیر تک دیکھا ہے۔ وہ ہن میں میری پروفائل کر رہا تھا۔ لیتھ کرتے ہی وہ آپ کے والد کو کال کرے گا اور ان کے سامنے مجھے پروفائل کرے گا۔“

”نہیں“ وہ قابل بھروسہ آدمی ہے، آپ فرمت کریں، وہ....“

”مجھے بالکل فرنیں ہے آبدار۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے والد کو بتائے۔“ وہ بے تاثر نظروں سے اس کو دیکھ کر بولا تھا۔

آبدار کی آنکھیں اس پر ساکتی ہو گئیں۔ ”جی؟“

”میں اپنے کام خود کرتا ہوں، لیکن جب کوئی کام بساط سے بڑھ کر لگ لو اس کا بوجہ بانت دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہاشم جانے میں کو لمبوجار ہوں۔ اس کے لئے جو کر سکتا تھا، وہ کیا۔ لیکن قوی امکان ہے کہ کوئی مجھے دیکھ لے اور ہاشم کو بتادے۔ سو میں نے آپ کے ساتھ جانے کو ترجیح دی، کیونکہ آپ کا عملہ ضرور آپ کے والد کو بتائے گا اور میرے حصے کا آدھا کام وہ کریں گے۔“

”اور آپ کو کیوں لگتا ہے کہ بابا ہاشم سے اس بات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے؟“

”کیونکہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ وہ آپ کو دو شمنوں کی فائر لائن کے درمیان نہیں کھڑا کرنا چاہیں گے۔“ وہ ملکا سامسکرا یا۔ کیپ نے اس کی آنکھوں پر اندھیرا سا کیا ہوا تھا۔

”لیعنی... آپی تحریرہ گئی۔ آپ مجھے استعمال کر رہے ہیں۔“

”جی“ میں آپ کو استعمال کر رہا ہوں۔“ وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

آپ کو پھر بھی برائیں لگا۔ کہنی سیٹ کے ہتھ پر جمائے ہتھیلی پر چہرہ گرائے، اس کو دیکھتے ہوئے سوچ کر کہنے لگی۔ ”میرا خیال تھا، دوستوں کی طرح ساتھ جا رہے ہیں۔“

”ہم دوست نہیں ہیں آبدار۔“

”آپ مجھے آپی کہہ سکتے ہیں۔“

”اوکے!“ فارس نے سر کو خمدا اور بات دھرائی۔ ”ہم دوست نہیں ہیں، میں عبید۔“

”میں آپ کے ذاتی مسئلے میں آپ کی مدد کر رہی ہوں، پھر بھی ہم...“

”یہ ”ذاتی“ نہیں ہے میرے لئے۔“ اس نے سنجیدگی سے چہرہ آبدار کی طرف موزا۔ ”یہ میرے لئے ”کام“ ہے۔ مجھے کچھ کام کرنے ہیں واپس جانے سے پہلے اور...“ وہ رک گیا۔

”کدھر واپس جانے سے پہلے؟“ وہ چوکنی۔ چہرہ ہتھیلی سے اخایا اور سیدھی ہو کر بیٹھی۔ فارس چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

”جیل واپس جانے سے پہلے۔“

آپی دھک سے رہ گئی۔ ”آپ دوبارہ جیل کیوں جائیں گے؟“ فارس نے کافی دیر جواب نہیں دیا، لیکن جب وہ اسی طرح اسے دیکھتی رہی تو وہ تدرے زمی سے بٹانے لگا۔

”جب چار سال کی قید کاٹ کر نکلا تھا تو میرے پاس ایک پلان تھا، سب اسی کے مطابق کر رہا ہوں۔ یہ میرا ”کام“ ہے۔“ ورک“ ہے۔ ”پرشن“، نہیں ہے۔ اور اس کا انجام ایک ہی طرح سے ہو گا۔ مجھے واپس جیل جانا ہے ان جرام کے لئے جو میں نے ابھی کرنے ہیں۔ مگر اس سے پہلے مجھے اپنی نیلی کو حفاظ کرنا ہے، اور سعدی کو واپس لانا ہے۔“

آبدار چند لمحے کچھ بول ہی نہ سکی۔ ”پھر“ ذاتی“ کیا ہے آپ کے لئے؟ کیا آپ اپنے لئے نہیں جیتے؟“

”میری ایک بیوی ہے جس سے میں جھوٹ بول کر آیا ہوں، میری ایک بھائی ہے جس سے میں بات کیے بنا آیا ہوں۔ میرا ایک دوست ہے جس سے لڑا ہوں میں کل رات۔ مگر ذاتیت میں آپ سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا اس لئے ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔“ اس نے حد بندی واضح کی۔ آپی بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

”اسی لئے مسز زمر اور آپ کی ڈائیورس ہونے جا رہی ہے۔ (فارس نے چوک کرا سے دیکھا)۔ آپ آخر میں جیل جانا چاہتے ہیں، اس لئے ان کو آزاد کر دیں گے۔ حیران مت ہوں، مجھے مسز کا ردار نے بتایا تھا۔“

فارس نے خاموشی سے سر کواثبات میں ختم دیا۔

”کون سا جرم ہے جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ذاتی تو نہیں ہے“ ورک“ ہے نا، اس لئے بتادیں۔“

جهاز کے اندر ایک دم ڈھیر سارا شانا اتر آیا۔

”میں نے دوقل کرنے ہیں۔“

آپی کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سر لہر اترتی محسوس ہوئی۔

”تو ابھی تک کیے کیوں نہیں؟“

”پہلے ان کو تقیم کرنا ہے، پھر تو زنا ہے، پھر مارنا ہے۔ یہ شروع دن سے میرا ہدف تھا۔“ اس کی آواز بلکل تھی۔ ”اور پھر آپ گرفتاری دے دیں گے؟“ اس نے ادا سی سے پوچھا۔ ”لیکن اس کے علاوہ بھی تو کوئی راستہ ہو سکتا ہے۔ آپ ملک سے باہر بھاگ سکتے ہیں نا اور....“

”اپنے جرام کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں میں۔ فرانسیس چاہتا ان سے۔“

آبدار نے گہری سانس لی۔ ”تو میں آپ کی کیا ہوں؟ دوست نہیں ہوں، تو کیا پاٹری ان کرام م ہوں؟“

اس بات پر وہ مسکرا کر جیسے کسی کو یاد کر کے مسکرا ہو۔ ”میری پاٹری ان کرام ایک ہی ہے اس کی جگہ میں کسی کو نہیں دے سکتا۔“

”مگر اس سے جھوٹ بول کر آئے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے پلان کا انجام بھی ڈسکس نہیں کیا آپ نے۔ سو وہ آپ کی بیوی ہو سکتی ہے، آپ کی پاٹری ہو سکتی ہے، لیکن..... آپ کی سرمنی آنکھوں میں شرات چمکی۔ وہ آگے کو ہوئی، اور مسکرا کر اسی فاتحانہ انداز میں بولی۔“ آپ کو ماننا پڑے گا کہ آپ کی ورک و انکاف آبدار عبید ہی ہے۔“

اس بات پر وہ ہلکا سا بہس دیا اور پھر سر کواثبات میں دو تین دفعہ ہلایا۔ ”اوکے۔ آپ میری ورک و انکاف ہیں۔“

”جیسے آپ استعمال کر رہے ہیں۔“ مصنوعی خفگی سے اس نے گلم کیا۔

”بالکل،“ کیونکہ میں بد لے میں آپ کو کچھ دلوں گا، جو کبھی آپ لوگوں کو ہینا نہ کر کے ڈھونڈتی ہیں، کبھی فرازک والوں کے ساتھ

کام کر کے مجرموں کے انڑو یو زکر کے تلاش کرتی ہیں۔ بھی وہ چیز آپ جانوروں اور پرندوں کی فوج جمع کر کے حاصل کرنا چاہتی ہیں، بھی لوگوں کے NDE سن کر۔“

آبدار نے جیرت بھری دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ”اور وہ کیا ہے جو آپ مجھے دیں گے؟“

فارس نے ذرا سماں کر کر ابراچکائے۔ ”ایک دلچسپ ایڈوانچر!“

آبدار کا دورانِ خون ایک دم تیزی سے بڑھا، اس کے گال دیک گئے اور آنکھیں چمک انھیں۔ ”پھر ٹھیک ہے!“ وہ بہت محظوظاً ہوئی تھی۔

فارس پھر سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگ گیا۔

❖❖❖

تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہے غالباً ..... میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا فوڈلی ایور آفزر کے بالائی ہاں میں سورج کی روشنی کھڑکیوں سے چھپ کر آرہی تھی۔ زمر کو نے والی میز پر موئی کتاب رکھے اس میں سے نوٹس بنا رہی تھی۔ گاہے بگاہے موبائل پن نظر ڈالتی جو صحیح فارس کے جانے کے بعد سے ابھی تک اس کے نام سے روشن نہیں ہوا تھا۔ (کیا آدمی گھر اطلاع نہیں دے سکتا؟ یہ کیا کہ ایک مستیع کر دیا پہنچنے کا۔ وہ بھی فیس بک پ۔ کال نہیں کر سکتا تھا کیا؟) وہ سر جھٹک کر کام کرنے لگی، پھر ایک دم زور سے قلم بند کیا اور فون انٹھالیا۔ (ڈاکٹر کے ساتھ کیا بات ہوئی، تفصیل ہی نہیں بتائی۔ وہی پوچھ لیں۔) جواز گھڑ کر اس نے کال ملائی۔ گھٹنی جانے لگی، مگر... جواب ندارد۔

اکتا کہ اس نے فون پرے ڈال دیا۔ تبھی کسی نے دروازہ بلکا ساٹھ کھٹکھا یا۔ زمر نے مصروف سے انداز میں سراٹھا یا مگر ایک دم ٹھہر گئی۔ چوکھت میں نوشیر وال کھڑا تھا۔ ویسٹ اور نائی میں ملبوس بلکل تیار سا، وہ متند بذب لگ رہا تھا۔

”آئیے...“ زمر نے استغفار میں نگاہوں سے اسے دیکھتے کہا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سامنے آیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

”کیسی ہیں آپ، ڈی اے؟“

زمر نے کہیدیاں میز پر جمائے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”میں ڈی اے نہیں تھی، ڈی پی تھی۔ مجھے امریکی فلموں کے سے انداز میں مخاطب....“ ضبط سے گھری سانس لی۔ ”کر سکتے ہیں آپ۔ خیر کہیے۔ کیسے آنا ہوا؟“

شیر و اپنی فریخ کو دونا خنوں سے کھجاتے، نگاہیں اس پر جمائے، سورج سورج کر کہنے لگا۔

”ایک مشورہ چاہیے تھا۔ لیگل ایڈوانس۔“

”میں سن رہی ہوں۔“

”مجھے... کسی بہت اچھے اور باعتماد وکیل کا بتائیں جو کار پوریٹ کیسر اچھے سے ڈیل کر سکے۔“

”ہاشم کا دردار!“ وہ سہولت سے بولی۔

نوشیر وال کی آنکھوں میں بے چینی اور ناگواری ایک ساتھ ابھریں۔ ”کوئی اور...“

زمر نے ”اہ“ والے انداز میں اپرداٹھا۔ ”یعنی آپ اس معاملے کو ہاشم سے خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔“

”ان سے خفیہ کیوں رکھوں گا، وہ میرے بھائی ہیں، بس ان کو ڈسٹریب نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے پہلو بدلا۔ انداز دفاعی تھا۔

”اوکے۔“ زمر نے نوٹ پیڈ اٹھایا اور چند نام لکھنے لگی۔ ”یہیں افراد ہیں، مگر یہ آپ کا فون رکھتے ہی ہاشم کو کال کر کے بتائیں۔

گے۔ آپ کو کوئی ایسا ماہر و کیل نہیں ملے گا جن کو میں جانتی ہوں اور جو ہاشم کو نہ بتائے۔“  
”کیا آپ بھی ہاشم کو بتائیں گی؟“

زمر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور پھر قلم بند کر دیا۔ ”آپ کو کس قسم کا کام ہے نو شیر وال؟“  
”میں اپنی کمپنی میں پچاس فیصد شیئرز کا مالک ہوں۔ 25 ہاشم بھائی کے اور 25 ہارون انگل کے ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ باقی کے  
پچاس بھی میرے پاس آ جائیں۔ اگر میر اوکیل کوئی ایسا پچھر چلائے اور کمپنی کے باقی لازم کے دوچار جھوول تو میرے بھی ذہن میں ہیں اور...“  
”آپ ہاشم کو مزاد بینا چاہتے ہیں؟“ نو شیر وال ٹھہر گیا۔ زمر پنگا بین جائے، اس نے تھوک نگلی۔ آنکھوں میں بہت سے جذبات  
ابھر کر ڈوبے۔ مگر خاموش رہا۔

”آپ کسی بات پر ہاشم سے ناراض ہیں، اور اس کو مزاد بینا چاہتے ہیں۔“ وہ نیک لگا کر بیٹھی، قلم الگیوں میں گھماتی، اسے دیکھ کر  
سوچتے ہوئے بول رہی تھی۔ شیر و چپ رہا۔  
”آپ کو نہیں کرنا چاہیے۔ جس بھی طریقے سے 50 فیصد شیئرز لے لیں آپ ہاشم اگلے ہی دن اس کا غذہ کو بھک سے اڑادے  
گا۔ شیئرز حاصل کر کے آپ کو کیا ملے گا؟ میں کے لئے تو آپ نہیں کر رہے۔ اندر وہی تسلیم کے لئے کر رہے ہیں۔ تو نہیں کرنا چاہیے آپ  
کو۔ بلکہ اس کی بجائے... آپ وہ کریں جو ہاشم نہیں چاہتا۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکے۔ آپ شیئرز ”لینے“ کی بجائے شیئرز ”دے“ دیں۔“  
نو شیر وال کی آنکھوں میں اچھبا ابھرا۔ وہ ذرا آگے کو ہوا۔

”کدھردے دوں؟“

زمر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ”فری کنسلیشن کے پانچ منٹ گزر چکے ہیں۔ اب میں اگلی بات صرف اس صورت میں تاکتی  
ہوں جب آپ مجھے ہاڑ کریں۔ سو... آپ مجھے ہاڑ کر رہے ہیں یا نہیں؟“ زمی سے اس نے پوچھا۔ نو شیر وال کی آنکھیں چمکیں اور وہ پہلی دفعہ  
مسکرا پایا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

یہ عجیب قیامتیں ہیں تیری ریگزور میں گزاراں ..... نہ ہوا کہ مر میں ہم نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

ائیروپورٹ کے احاطے سے باہر نکلتے ہی آبدار نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

”یہ میرے اپارٹمنٹ کی چاہی ہے۔ ہمارے ہوٹل سے کافی دور ہے۔ اس کے اندر اس کا ایڈریس اور چاہیاں موجود ہیں۔ آپ  
جب تک چاہیں ادھر رہ سکتے ہیں۔“

فارس نے کیپ ماتھے پر مزید تر چھپی کر کے جھکاتے وہ پیکٹ پکڑا۔

”اوکیوں لوں گا میں آپ کافیٹ؟“

”کیونکہ آپ مجھے استعمال کر رہے ہیں۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔ فارس نے بے اختیار مسکراہٹ دبائی اور سر کو ختم دیا۔ ”سو تو  
ہے۔ جاتے وقت واپس کر جاؤ گا۔“ اور پیکٹ جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

”ہم دوبارہ ملیں گے فارس غازی!“ وہ چیخ کرنے والے انداز میں کہہ کر مڑ گئی۔ اس کی کار درور سڑک پر آر کی تھی۔

وہ وہاں سے سیدھا آبدار کے فلیٹ آیا تھا۔ پوش علاقے میں واقع ایک خوبصورت عمارت میں بنا وہ فلیٹ اندر سے بھی بہت  
خوبصورت تھا۔ چکنی چکنی سفید دیواریں، زم زم گوں کے پر دے، قیمتی گمراہ رن فرنیچر۔ وہ بنا آرام کیئے سب سے پہلے لیپ تاپ کھول کر بیٹھا اور  
اپنے جی پی ایس پین کا گنگنل چیک کیا۔ وہ ابھی تک اس پارک میں تھا۔ فارس نے راستے سے خرید ا نقشہ نکالا اور اسے پھیلا کر سامنے رکھا۔ وہ

پارک یہاں سے بچاں منٹ کی ڈرائیور ہے۔ وہ نفیت پر مختلف نکات پر نشان لگاتا، آگے کا لا جھ عمل تیار کرتا رہا۔ وہ مصروف ہو گیا تھا۔ زمریا ملم والوں کو کال کرنا اس کے ذہن سے کلک گیا تھا۔ یاد ہتا تو صرف سعدی۔

نوشیر وادی کو ”رخصت“ کر کے زمر نیچ آئی تو رسورانت کے باہر بچوں والاڑ کا گل خان بیٹھا تھا۔ اپنے بچوں کے اشال پر پالی کا چھڑ کا ڈر کرتا وہ مصروف نظر آ رہا تھا۔

”السلام علیکم گل خان!“ نزم ٹھنڈے انداز میں پکارا تو وہ چونکا اسے دیکھا اور شرمکرا تے ہوئے سلام کیا۔ پھر جلدی سے بوا۔ ”باجی یہ جو لڑکا ابھی یہاں سے نکلا تھا، یہ وہی تھا، سفید گاڑی والا جس کا سعدی بھائی سے....“ گل خان نے مزید سراغ سانی سے جو ہر دکھانے چاہے گزرنے ”مجھے پتہ ہے“ کہہ کر بات ختم کر دی۔ (ہاشم نے سعدی کو گولیاں مردادیں یہ معلوم ہو جانے کے بعد یہ سوچنا کر شیر دکا اس سے زبانی کلائی کبھی کوئی جھگڑا ہوا تھا بے معنی سالگت تھا۔)

وہ گھر آئی تو لا ونچ میں معمول کی چہل بہل لگی تھی۔ اس گھر کا لا ونچ کافی کھلا اور بڑا تھا۔ کچن یہاں سے نہیں دکھائی دیتا تھا۔ بغلی گیلری میں آگے بڑھو تو پھر آتا تھا۔ لا ونچ کے ایک طرف ڈائینگ ہال تھا۔ دونوں کے درمیان میں شیشے کے سلا نیڈنگ دروازے تھے۔ (ان کے پردے ابھی بغا نے تھے۔) بڑی ایل ای ذی اسکرین دیوار پر نصب تھی اور ندرت صوفے پر بنیھیں، عینک لگائے، موبائل کو دیکھ کر خینں کو پکاری تھیں۔

”خین، ذرا میرا جی میں تو دیکھو بار بار تنگ کر رہا ہے۔“ مگر فقار خانے میں امی کی کون سنتا ہے؟ حمدہ ڈائینگ روم میں کرسی پر بنیھیں لیپ ٹاپ میز پر رکھ کر کھٹ کھٹ کام کیے جا رہی تھی۔

”زمرفارس نے پہنچ کر اطلاع دی؟“ اب انے اسے پکارا تو اس نے نزم ہی مسکراہٹ کے ساتھ ”جی“ کہہ کر ان کی تسلی کر دی۔

”اس سے کہنا ویک یک اینڈ پر گھر آجائے۔ گر بار بار فلاٹس کا خرچ... اونہوں۔“ ندرت نے اپنی ہی بات کی خود ہی تردید کر دی۔ زمر حمدہ کے پاس آگئی اور شیشے کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس کے ساتھ کرسی پر بنیھی اور بورسی ہو کر اسے دیکھا۔

”کیا کربہ ہو؟“ خین کو جیسے کسی سامع کی تلاش تھی۔ جوش سے شروع ہو گئی۔

”اس فلیش میں فروزن کے سوا کچھ نہیں ہے، مگر یاد ہے، سونی کی سالگرہ کا کیک؟“ اس نے پچھلے سال کی سیاہ نہری سالگرہ یاد دلائی۔

”باربی کیک تھا۔ پنک باربی۔“

جو ابادھ نے اسکرین پر چند تصاویر نکالیں۔ سونی کی سالگرہ کی تصاویر۔

”یہ باربی لگتی ہے، مگر یہ باربی نہیں ہے۔ اس کی شکل غور سے دیکھیں۔ یہ آنا۔ سونی کو فروزن پند ہے۔“

”بنیھیں کیسے پتہ؟“

”زمر کون سا بچہ ہے جس کو فروزن نہیں پند؟ مگر سونی اپنے باپ کی طرح (دل میں کچھ چھبا) بہت اناوالی ہے۔ وہ کھلمن کھلا یہ ظاہر نہیں کر سکتی کہ وہ بھیڑ چال کا حصہ بن کر عام لوگوں کی طرح کسی فلم کی دیوانی ہے۔ وہ مختلف ہے۔ اس نے آنا اور باربی کو مس کر کے ایک نی ڈول بنائی۔ یہ بات ہم نے نہیں نوش کی تھی، مگر سونی کے دوست بچوں نے نوش کی ہو گی اور اسکی واہ واہ ہوئی ہو گی۔“ وہ جوش سے بتا رہی تھی۔

”فلیش حمدہ!“ زمر نے یاد دلایا۔

”ہاں وہی۔ اس فلیش میں صرف فروزن ہے۔ یہ فلیش ہاشم کے ڈیٹا سے بھری ہوئی چاہیے تھی۔ ہے نا؟ مگر فلیش کو خالی دیکھ کر میں سمجھی یہ غلط فلیش ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اس میں ہاشم کا وہی ڈیٹا تھا۔ فروزن بھی اسی کے ڈیٹا میں ہو گی، سونی نے ڈاون لوڈ کی ہو گی نا۔“

ہس فلیش میں زمرہا شم کی ساری فائلز موجود تھیں مگر کسی نے فروزن کے سواب پکھھ مٹا دیا۔“  
”مگر کس نے؟“ زمرچونکی تھی۔

”یہ تو سعدی بھائی ہی بتا سکتا تھا۔“ اس نے گہری آہ بھری۔ یہ ایسا ذکر تھا جس پر دونوں خاموش ہو گئیں۔ باہر سے امی کی پکار پھر سے شروع ہو گئی۔ ”حمد... میرا میل باکس فل ہو رہا ہے۔“

”ایک تو امیوں کو اسارت فون نہ لے کر دے بندہ۔ مصیبت میں اولاد آ جاتی ہے۔“ جل کر بولی۔ پھر چہرہ اونچا کر کے آواز لگائی۔ ”میں بڑی ہوں امی۔ رات میں دیکھ دوں گی۔“ پھر وہ زمر کی طرف گھومی اور چیختی آنکھوں کے ساتھ اعلان کیا۔ ”مجھے وہ فائلز چاہیے ہیں۔ میں ہاشم کے کپیوں کو بیک کرنے لگی ہوں۔ اور مجھے کسی کاڈ نہیں ہے۔“ زمر خاموش رہی۔ وہ اس کے ساتھ تھی۔ خاور نہیں تھا۔ اب ڈر کیسا؟

..... ♦♦♦ .....

اچھی لگتی نہیں اس درجہ شناسائی ..... ہاتھ ہاتھوں سے ملاتے ہوئے تحک جاتا ہوں کو بلوپہ شام نیلی اور بیکی بیکی سے سائے پھیلانے لگی۔ ایسے میں اس بلند بالا عمارت سے فارس نکلتا دھائی دے رہا تھا۔ وہ بھورے سوئٹر اور نیلی جیز میں ملبوس، جیبوں میں ہاتھ ڈالنے والہ سنجیدہ سی شہری آنکھوں سے سامنے دیکھتا، چلتا جا رہا تھا جب قربی کیفے کا گلاس ڈور کھلا اور اندر سے آبدار نکلتی دھائی دی۔ نیلی جیز پر سفید گھننوں تک آتا کوٹ پہنے، اس کے سیدھے سرخ بال کمرپگر ہے تھے اور سر کے اوپر سرخ ریشمی رومال باندھ کر گردن کے پیچے گراہ کارکھی تھی۔ سرمنی آنکھوں میں چک لئے، وہ شرارت سے سرخ لب کاٹتی دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے ساتھ آٹلی۔ فارس رک گیا اور قدرے خلکی سے اسے دیکھا۔

”آپ ادھر کیا کر رہی ہیں مس آبدار؟“

”آپ کو اپنے ذہن میں آئی باتیں شیر کرنے کے لئے کسی کی ضرورت تو ہو گی۔“ اس نے چک کر دک کر واٹف کا مقصد یاد دلایا۔

”میں اکیلازیادہ آرام دہ رہتا ہوں۔“

”مگر زیادہ خوش نہیں۔“ فارس نے قدرے سے سر جھکا اور تیز تیز چلنے لگا۔

”تھینک یو۔ میرا دل رکھنے کے لیے۔“ وہ اب نہستی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ فٹ پاٹھ پر چلتی جا رہی تھی، قریب سے گزرتے پچ کے ماتھے پر ہاتھ پھر کراس کے بال بکھیرے۔ پھر ذرا آگے ایک نہمی پچی کی پونی پیچپے سے کھینچی اور اس سے پہلے کہ وہ مزتی، آلبی جلدی سے آگے نکل گئی۔

”آپ کو بچا چھے لگتے ہیں، فارس؟“ وہ پیچپے مر مر کر ایک شراری نظر اس پچی پر ڈال کر کہہ رہی تھی۔ فارس نے ایک دم رک کراس کو دیکھا۔ وہ بظاہر ملکن سی کہہ رہی تھی۔

”آپ کا اپنی فیملی کے لیے دل نہیں چاہتا کیا؟ مگر... اوہ... مسز زمر تو... خیر...“ آلبی نے سادگی اور معصومیت سے شانے اچکائے اور ایک کیب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا، جیسے اس کی بات کو سوچنے لگا ہو۔

”جب آپ کو معلوم ہے کہ میں اور مسز زمر الگ ہو جائیں گے تو ایسی بات کا مقصد؟“

”ان سے الگ ہونے کے بعد آپ کی زندگی ختم تو نہیں ہو جائے گی نا؟ کبھی تو آپ کو اپنے ذات کے لیے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔“

”آپ میرے ساتھ نہیں آ رہیں۔ والپس جائیے۔“ قدرے پست مگر ڈسرٹ آواز میں اسے ٹوکتا وہ رکی ہوئی کیب کی

طرف بڑھا۔

کیب ڈرائیور اب گردن نکال کر اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ آگے کو جھکا اور مطلوبہ پارک کا نام لیا۔ ڈرائیور نے ایک نظر سر سے

پیر تک اسے دیکھا، اور پھر اثبات کا اشارہ کرتے ہوئے کرایہ بتایا۔

”انتے پینوں میں تو ہم پورا کلمہ بھوم لیں۔ فارز جان کر لوٹو نہیں۔“ آبی چمک کر کہتی آگئے آئی۔ ”تمہارا میسرد یکھی سکتی ہوں میں،“ اسٹینڈرڈ کرایہ بھی معلوم ہے مجھے۔“ پھر مخصوصیت سے فارس کو دیکھا۔ ”اب بھی ساتھ نہیں لے کر جائیں گے کیا؟“ اور کیب کار دوازہ کھول لیا۔ سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ توہارون عبید اور ہاشم کاردار کو آمنے سامنے لانا چاہ رہا تھا مگر یہ اچھی بلا پچھے پڑ گئی تھی۔

وہ پارک کافی بڑا اور خوبصورت تھا۔ وہاں غیر ملکی سیاحوں کی بہتات تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو فارس نے موبائل نکال اسکرین دیکھی۔ پارک کے وسط میں پین کا سکنل آ رہا تھا۔

”انتے بڑے پارک میں ہم کہاں ڈھونڈیں گے اس پین کو؟“ آبی کو مایوسی ہوئی۔ وہ خاموشی سے ادھر ادھر دیکھتا آگئے بڑھتا۔ یہاں تک کہ اس کے قدم رک گئے سکنل کی جگہ اس کے اپنے فون سے قرباً چند میسرد تھی۔ اس نے آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کر سامنے دیکھا۔ بزرہ زار پہ... چند میسرد اور ایک ٹکٹ کی کھڑکی بھی اور اندر ایک باور دی ملازم کھڑا لوگوں کو ٹکٹ دے رہا تھا۔

”وہ پین اس ٹکٹ کی بن میں ہے۔ آؤ۔“ وہ اسے اشارہ کرتا گھاس پر آگئے آیا۔

کی بن کے اندر کھڑا ملازم سر جھکائے کمپیوٹر پر ٹاپ کر رہا تھا۔ سامنے قطار لگی تھی۔ وہ دونوں بھی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ آبی اس کے آگئے تھی اور وہ پیچھے تھا۔ ان کی باری آئی تو آبی اس سے سنبھالی میں ٹکٹ کا پوچھنے لگی۔ فارس نے گردن ذرا اٹھا کر اندر جھانکا۔ شمشے کی دہا، سے اندر کا منظر واضح تھا۔ بڑی سی ڈسٹ بن میں فاست فوڈ کے چند خالی ڈبے رکھے تھے۔ ٹکٹ کلرک کے جو تو پر سوکھا ہوا کچپڑا لگا تھا، اور جمائی روکتا کمپیوٹر پر کچھ ٹاپ کیے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی منہری قلم کا نتر پر رکھا تھا۔ پین دیکھ کر آبی کی آنکھیں چکیں۔ مگر....

”چلو۔ جلدی۔“ اس نے پیچھے سے آہستہ سے سرگوشی کی۔ آواز میں بے چینی تھی۔ آبی نے جلدی سے وہ ٹکٹ تھامے اور پھر متوجه سی قطار سے نکلی۔

”پھیکوان ٹکٹس کو اور یہاں سے نکلو۔“ وہ غیر محسوس انداز میں رفتار بڑھاتا کھدد رہا تھا۔

”مگر کیوں؟ وہ پین اس کے پاس تھا، اس سے پوچھو تو سمجھی کر...“

”کوئی فائدہ نہیں۔ سعدی ادھرنیں ہے۔“ وہ بمشکل اس کی رفتار کا ساتھ دے پا رہی تھی۔ جب وہ باہر آگئے تو اس نے پھولی سانس کے ساتھ خنگی سے پوچھا۔

”وہ پین سامنے تھا، آپ نے....“

فارس اس کی طرف گھوما اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”پارک کی انٹری کے قریب جگہ کچی ہے، چند کھڈے ہیں، جہاں بارش کا پانی بن ہو جاتا ہے۔ آخری دفعہ بارش کب ہوئی تھی؟ ماہ کامل کی رات سے الگی صبح۔ سعدی کے بھاگنے سے الگی صبح۔ اس صبح یہ ملازم یہاں آیا تھا۔“ پکپڑ کے پاس سے گزرا تھا، اب وہ پکپڑ سوکھ چکا ہے مگر اس کے جوتے اب بھی میلے ہیں۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ دو دن سے گھر نہیں گیا۔ وہ صبح شام ادھر ہی بیٹھا رہتا ہے۔ کھانا کھانے بھی نہیں جاتا۔ فاست فوڈ منگوටا تھے، وہی کھاتا ہے۔ ایک ٹکٹ کلرک فاست فوڈ وہ بھی اتنا سارا کیسے افروز کر سکتا ہے؟ سوائے اس کے کوئی اس کو کھانا پہنچا دیتا ہے، تاکہ وہ یہاں بیٹھا رہے اور اگر کوئی سعدی کے پین کی تلاش میں آئے تو وہ اس کو پکپڑ لے۔“

”مگر ہو سکتا ہے سعدی نے اسے یہاں بھایا ہو۔“

”سعدی اس ملک میں پہلی دفعہ آیا ہے، رہائی کی الگی صبح ہی اس کے اتنے کانٹیکٹس کیسے بن سکتے ہیں؟“ وہ نفی میں سر ہلاتا کہہ، ہا

ما۔ ”کسی کے پاس سعدی کا پین ہے اور وہ اس میں موجود تجی پی ایس ٹریسر سے واقف ہے، اس لئے وہ اس کو bait کی طرح لگا کر اس شخص کا تنظار کر رہا ہے جس نے اسے وہ پین بھیجا تھا۔“

”اوہ او او!“ وہ ایک دم چمکی، پھر شکل پر مسکنیت طاری کی۔ ”کیا میں اتنے مزے کے ایڈ و انجر پر ٹھوڑا خوش ہو سکتی ہوں؟“  
”دنیس آپ واپس جا رہی ہیں۔“ وہ سڑک پر آگے آیا اور اس کے لئے ایک نیک روکنے لگا۔  
”مگر....،“ وہ احتجاج کرنے لگی۔

”اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں بغیر بتائے آپ کافیت چھوڑ کرو پوш نہ ہو جاؤ تو خاموش رہیں۔“  
وہ منہ بسو رے کھڑی تھی۔ نیک ساتھ آ کر کا تو فارس نے اشارہ کیا۔  
”اب جائیے۔“ پھر آواز میں نرم پیدا کی۔ ”صحیح میں گے۔“

اس بات پر وہ ہلاک سامسکرا کی اور اندر بیٹھ گئی۔ پھر اسے ہاتھ ہلایا۔ ”صحیح اپکا!“

”پکا۔“ اس کے انداز پر وہ بکشل مسکرا ہٹ رک پایا۔ چلو، ہو گئی تھا۔ وہ ایک معموم اور پیاری لڑکی تھی۔

وہ چلی گئی تو گویا ایک بوجھ سا اس کے کندھوں سے سر کا۔ واپس پارک میں آیا اور ایک کونے میں آبیٹھا۔ درختوں کے جھرمٹ میں اس جگہ سے دور نیک کی کھڑکی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ نیلگوں شام بھی آہستہ گہری ہونے لگی تھی۔  
فارس غازی انتظار کرنے لگا۔ ایک طویل اور کڑا انتظار۔

❖❖❖

یہ لفظ لفظ محبت کی یورشیں بھی فریب ..... یہ زخم زخم میجاںیاں بھی جھوٹی ہیں  
کینڈی پہاڑی شہر تھا، جیسے مری۔ سر بر ز پہاڑیاں، نیلا سرمنی با долوں سے ڈھکا آسمان۔ خوبصورت موسم اور چائے کے باغات کی سوندھی سوندھی مہک۔ سیاح دور دور سے کینڈی کو انجوائے کرنے آتے تھے۔ وہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ سڑک کنارے بنے اپنے ایئر کیفے میں بیٹھا تھا۔ عینک پہنچنے برساتی کے کارکھرے کیے، وہ گردن گھما کر ادھر ادھر گہری نظر؛ اتنا بھر کافی کامک لبوں سے لگالیتا۔ سیاح بیگ اس کے قدموں کے ساتھ رکھا تھا۔

باہمیں پا تھر ریشور انٹس اور شاپ کی قطار تھی۔ ابھی صحیح تازہ تھی۔ شاپ اور ریشور انٹ ماکان آکر اپنی اپنی دکانیں کھول رہے تھے۔ ایسے میں وہ ہر کیفیت کے مالک یا اسے کھولنے والے ورکر کو آنکھوں سے اسکین کرتا، پھر رد کر دیتا۔ کوئی شاطر لگتا تھا، کوئی مکار۔ کوئی فطرناک کوئی بے حد حص۔

ٹھوڑی دیر بعد ایک درمیانی عمر کی سنہاںی عورت ایک کافی شاپ کا لاک کھولنے نظر آئی۔ ساتھ ایک نھاڑ کا بھی تھا جو مسلسل اسے نیک کر رہا تھا اور وہ روہانی ہوئی اسے ڈانت رہی تھی۔ سعدی کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ وہ وہاں سے اٹھا آیا۔ اب وہ ذرا دوڑ جا کر ایک اپنے کیفے کے باہر بیٹھ گیا۔ چہرے کے آگے ایک میگزین پھیلایا۔ اس کی نظریں اسی کافی شاپ پر تھیں۔

کوئی گھنٹے بھر بعد وہ عورت شاپ سے باہر لکی۔ پچاس کے ساتھ تھا اور ہاتھ میں سامان کا تھیلا بھی تھا اور ایک لست بھی۔ وہ ابھی ہوئی سی خریداری کرنے جا رہی تھی۔ سعدی تیزی سے اٹھا اور فاصلہ کر کر اس کا چیچھا کرنے لگا۔ وہ کرتی تو وہ بھی رک کر مژا جاتا، کہیں کسی امثال پر کھو دیکھنے لگ جاتا۔

دو پھر کینڈی کے پہاڑوں پر چکلنے لگی۔ با долوں کی اوٹ سے سنبھری کر نیں جھائٹنے لگیں۔ اب وہ اس کا چیچھا کرتے مارکیٹ کے درست میں آپکا تھا۔ یہاں سے وہ مڑ گیا اور دو گلیاں عبور کر کے ایک تیری گلی میں آیا۔ ادھر کونے میں ایک لڑکا کھڑا، بہت رازداری سے اپنے مخصوص

گاہوں کو ایک طرف بلا کر انہیں منشیات کی پڑیاں بیچ رہا تھا۔ وہ اسے گزشتہ شام ہی تاڑپ کا تھا۔

اب سیدھا اس کے قریب گیا جو ادھر ادھر دیکھتا کسی گاہک کا متلاشی تھا۔ سعدی نے اسے آنکھوں سے اشارہ کیا اور دوسرا گلی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ منشیات فروش لڑکا، ذرا فاصلہ رکھ کر پیچھے آنے لگا۔ جیسے ہی وہ دوسری گلی میں مڑے، سعدی گھوم کر اس کی طرف آوار اسے کار سے پکڑ کر دیوار سے لگایا۔ پھر کہ کر ایک مکا اس کے منہ پہ جزا۔

”مکنپ کھڑے پولیس والے کے حوالے کر دوں گا تمہیں اگر آواز نکالی تو۔“ پستول اس کی پلی میں چھوتے وہ غرایا تھا۔ ختنی سے لڑکے نے گھبرا کر ہاتھ اٹھادیے۔ وہ خود بھی نشہ کا عادی لگاتا تھا۔

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ جلدی سے کہنے لگا۔

”پیسے میں تمہیں دوں گا، بد لے میں میرا ایک کام کرو گے۔ نہیں تو پولیس والے کو بلا تا ہوں میں۔“ اس کو دیوار سے لگائے وہ غرایا۔ چند منٹ بعد وہ واپس اسی گلی میں آ کھڑا ہوا تھا جہاں وہ عورت اب بھی ایک دکان سے چیزیں خرید رہی تھی۔ وہ قریبی دکان پر کھڑا ہو کر اخباریں لکھا لئے لگا۔ اسی لمحے وہ منشیات فروش سنہالی لڑکا اس گلی میں داخل ہوا۔ اب کے اس نے منہ پر رومال باندھ رکھا تھا۔ وہ سیدھا اس عورت تک گیا، اور ساتھ سے گزرتے ہوئے اس کا پرس اچکا اور ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ عورت پہلے لمحے تو شاک میں رہ گئی، پھر وہ چلانی۔

”میرا پرس....“

سعدی بجلی کی سی تیزی سے لڑکے کے پیچھے بھاگا۔ راستے میں اس نے جان بوجھ کر چند اسٹال بازوں مار کر گرائے۔ گلی میں شور و غل برپا ہو گیا۔ کچھ اور لوگ بھی اٹھ کر بھاگے مگر سعدی نے گلی کے کونے میں اس لڑکے کو جالیا اور دبوچ کر نیچے گرایا۔ پھر پرس واپس چھپنا۔ لمحے بھر کو اپنی گرفت ڈھیل کی اور لڑکے نے ہاتھ پکڑنے نہیں پا تو اس کے بازو میں اتار دیا۔ سعدی بے اختیار نیچے کوڑھ کا۔ لڑکا دم دبا کر بھاگ چکا تھا۔ وہ عورت دوڑتی ہوئی اس تک آئی تھی، پچھلی پیچھے تھا۔ سعدی نے خون بہاتے بازو کو دوسرے ہاتھ سے پکڑے اٹھتے ہوئے پرس اس کو تھایا۔ عورت نے پرس پکڑتے ساتھ ہی نیچے کو تھایا، اور لپک کر اس کا خون سے سرخ ہوتا گیلا بازو پکڑا۔

”آپ کا پرس۔“ سعدی نے نقابت ہتھی بھری مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ غرروہ جیسے پرس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ فکر مندی سے کچھ کہنے لگی۔ اس نے کھنکھا کر ”انگلش پلیز“ کہا۔

”اوہ....فارز۔“ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ”چلو میں تمہیں ہاپٹال لے چلو۔“

”نہیں، اس اکے میں خود چلا جاؤں گا۔“ ساتھ ہی بلکا سا کر اہا۔ اب مزید لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ ”یہیں روئیں کار لاتی ہوں۔“ عورت بھاگتی ہوئی آگے کوئی۔ وہ قریب جمع ہوتے لوگوں سے نیچے کو پھرہ جھکائے رخ موڑے کھڑا ہوا اور ایک طرف کو جلنے لگا جیسے دور جانا چاہ رہا ہو۔ لوگ کچھ کہر ہے تھے مگر اتنی سنہالی وہ نہیں سمجھتا تھا۔ عورت جلد ہی ٹیکسی لے آئی مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ لوگوں سے پوچھتی اسے ڈھونڈتی دوسری گلی تک آئی جہاں وہ فرض شناس اور نیک دل انسان جو اس کا پرس بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال بیٹھا تھا، سر جھکائے بازو کے زخم پر اوپری جیکٹ لپیٹ چلتا جا رہا تھا۔ اس عورت کا نام کامنی روپا سنکھی تھا اور اس کا دل اس طرح اس کو دیکھ کر بہت دکھاتا تھا۔ وہ تیزی سے کار سے نکلی اور اس کو جالیا۔

”میں نے تمہیں رکنے کو کہا تھا فارز۔ چلو میں تمہیں ہپٹال لے جائی ہوں۔“

”میں خود چلا جاؤں گا، آپ کی ٹیکسی خراب ہو گی۔“ وہ چھوٹے بالوں اور عنک دالا لڑکا مسکرا کر بولا تھا مگر کامنی نے خنکی سے اسے ڈپٹا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو، تم زخمی ہو، میری وجہ سے۔ بس ہپٹال قریب ہی ہے۔“

”مجھے ہسپتال نہیں جانا۔ میں زخم خودی لوں گا۔“

اب کے کامنی چوکی۔ اس کے انداز میں منت سی تھی۔

”اچھا نیکسی میں بیٹھو۔ میں فرست ایڈ کٹ لا کر تمہیں شاپ پلے جاتی ہوں۔“ اس نے اسے قاتل کر لیا۔ وہ لڑکا بدقتنیکسی میں بیٹھا۔ نہایا بچھلی سیٹ پلے آبیٹھا اور کامنی آگے۔

”پلیز...“ وہ بچھلی سیٹ کی پشت پر سرگارے نقابت سے آنکھیں مندے کہنے لگا تو کامنی نے بیک دیکھا۔ ”مجھے ہسپتال کے اندر مت لے جائیے گا۔ پولیس میرے پیچھے ہے۔ میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ خود کو میری وجہ سے خطرے میں نہ ڈالیں۔“

سنہالی عورت ہکا بکارہ گئی۔ اور سعدی یوسف کو انسانوں کی اتنی پیچان تو تھی کہ بند آنکھوں کے باوجود وہ جان گیا تھا کہ تیر نانے پلگا ہے۔

❖❖❖

وہ کون لوگ تھے ان کا پتہ تو کرنا تھا..... مرے لہو میں نہا کر جنہیں نکھرنا تھا

بیلوں سے ڈھکے بنگلے میں اس صحیح نینبھی، لیپ ناپ لگائے ہاشم کے کمپیوٹر کو ہیک کرنے کی سروڑ کوشش کر رہی تھی۔ اس کی زنبیل میں بہت سے طریقے تھے جن کو ایک ایک کر کے وہ استعمال کر رہی تھی۔....

ادھر زمر یوسف کو رث سے نکل کر اپنی فائلز اور کاغزوں میں ابھی پارکنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی جب اس کے ارد گرد تین سو سوٹ میں ملبوس افراد آکھڑے ہوئے تھے۔ زمر نے سن گلاسز اور کر کے بالوں پلکائیں اور دھوپ کے باعث آنکھیں سکریٹر کران کو دیکھا۔

”جی؟“

”مز زمر!“ ایک نے ادب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہارون عبید آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اپنے آفس کے کانفرنس ہال نمبر ٹو میں۔ آپ چاہیں تو ہم آپ کو لے جاسکتے ہیں۔“ ساتھ ہی ہارون کا آئی ذی کارڈ اسکی طرف بڑھا یا۔ یہ ایک طرح کی صفائت تھی۔

”تو چینک یو۔ میں خود آ جاؤں گی۔“ کارڈ پکڑ کر رکھائی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ البتہ دل... عجیب سے واہموں کا شکار ہو رہا تھا۔ جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نہیں جائے گی، تب ہی خود بخود کارکارا خان کے آفس کی طرف موڑ دیا۔ پون گھٹئے بعد وہ ان کے کانفرنس روم کے دروازے کی چوکھت میں کھڑی تھی۔ سفید لمبی میض اور سیاہ کوٹ پہنے، گھنکر یا لے بال جوڑے میں باندھے اور بھوری آنکھوں کو مشتبہ انداز میں سکوڑے، اس نے سامنے کانفرنس نیبل کی سربراہی کر لی پہنچنے ہارون کو دیکھا۔

”مجھے یوں طلب کیا جانا پسند نہیں ہے، عبید صاحب!“

”مز زمر، مجھے بھی آپ سے مل کر خوش ہوئی۔ آئیے۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس تھے اور سفید سرمی بال جیل سے پیچھے کیے۔ چہرے پر مسکراہٹ طاری کیے، انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ درزیدہ نگاہوں سے ان کو دیکھتی سربراہی کری کے دائیں طرف دو کریاں چھوڑ کر پیٹھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ واپس پیٹھے اور شفقت سے پوچھا۔

”میں نہیں ہوں، شکریہ۔ آپ بتائیے میں کیا کر سکتے ہوں آپ کے لئے؟“

”آپ کا شوہر کہاں ہے مز زمر، کیا آپ کو معلوم ہے؟“

زمر کے ابرونا گواری سے بھنجنے لگے۔ ”میں آپ کو کیوں بتاؤں اپنے شوہر کے بارے میں۔“

”میں نے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں ہے یہ پوچھا ہے کہ کیا آپ جاتی ہیں وہ کہاں ہیں؟“

اُس کی آنکھوں میں جھاگلتے ہوئے، مگر اکروپ چڑھے تھے۔ ذمہ کے دل کو چیزیں کیتے تھیں میں لیا۔ اور کال کی رات کی چالنی برف کی سفیدی میں بدلا لے گی۔

"وہ گراچی گیا ہے، جاب کے..."

"وہ کالبوٹیں بچہ بھری بیٹی کے ساتھ۔ کل وہ بیرے پا بھوت جیٹ پکالو گیا ہے۔"

ذمہ نے ضبط سے گود میں رکھی تھیں بچے لیں۔ گرچہ کے کوہ ت ناریں رکھنا چاہیا مگر وہ جانشی کی اتنی رنگت درپڑانے لگی ہے۔

"تو اس نے آپ کوئی نہیں تباہی؟" انہوں نے انہوں سے سرخچا۔

"بچھے بیٹیں معلوم آپ کیا کہ رہے ہیں؟" وہ بدقست کہہ باقی دل دماغ میں آدمیوں کی جگہ رہتی تھیں۔

باقیوں نے جہاں اس پا پچھل دبائے اور اسکرین اس کے سامنے رکھی۔ ذمہ نے موہاں کوئی پھوٹا صرف ٹاہد چکا کر دکھانے لگر پورٹ میں وہ آپ کے سامنے کھڑا اس سے کوئی پیکٹ لے رہا تھا۔ کیپ کی جگہ سے ٹھک کم دلخیچی مگر وہ فارس تھا اور لاکھوں میں پیچانے لگتی۔ پیچھے ایک پورٹ کا نام اور اگر دکھانے کا حول سب نظر آ رہا تھا۔

دل پا ڈھیروں آنسوگرے۔ وہ جانتا تھا۔ وہ سب جانتا تھا۔ وہ اس کا گھر سے باہر نہ رہتا۔ وہ اس کا راتون گودیر سے واپس آتا۔ وہ اس کی قوں کا لڑا۔ وہ جاب بھیں دھونڈ رہا تھا۔ وہ شروع سے اتم کے پیچھے تھا۔

"چھڑا۔" بظاہر ایک دچکائے۔ وہ بٹکل خود کو پس زد رکھ کر ہوئے تھی۔

"کیا آپ کو معلوم ہے وہ دہاں کیوں گیا ہے؟"

"وہاں کی آنکھوں پر ناگزیر ہائے خاموشی رہی۔

"ہمارا مہماں پکھداں قتل ہماری بیڑاں سے بھاگ گیا تھا۔ وہ اسی آؤ جوہ نے گیا ہے۔ آپ گرفتار ہیں نہیں، ہاشم کوئی پتہ چلے دوں گا۔"

"ہاشم درمیان میں کہاں سے آیا؟ وہ اس کا لڑا ہے۔" ذمہ کی آواز کا پنی۔ ناگزیر اب بھی باروں پر جھیلیں اور انہوں نے مکر اکر پیچھے ہوتے دیکھیں ساہے دیکھا۔

"آپ کو معلوم ہے میں کیا بات کر رہا ہوں، فارس کو کبھی معلوم ہے۔" ذمہ کی آنکھوں میں ایک دم دھم دی جاتیں بیٹھات ایک ساتھ اپنے اور ان سارے جنبہات نے اس کی آنکھوں کو سرخ کالیں مار دیا۔ وہ دچکائے۔ "آپ کو کا تھا وہ نہیں جانتا۔"

ذمہ کردن مولا کر دمری طرف دیکھنے کی سبب سے آسوا نہ رہا تھا۔

"آخر میں تے یہاں آپ کو یہ تانے کے لئے بھیں بیڑا کر دیتے تھے۔ عرصے سے بھری بیٹی کے ذریعے ہمارے مہماں سے رابطہ کے ہوئے تھے۔ میں سرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ بھری بیٹی کے ساتھ کیوں ہے؟"

ذمہ نے پچھا دیا۔ اس کی طرف سوزا تو اکھیں خلک تھیں مگر سرثی ملکی تھی۔ اپنے جاؤسوں سے پوچھ لئیں۔ اور پس اٹھا کر اٹھا کر ذمہ کی اب ترین بیٹھتا دیکھا۔ اور ان نے ٹھوٹھوٹھو کر گردن اٹھا کر سے دیکھا۔

"تو مزر کا بارا آپ کی شادی کے بارے میں درست کہتی ہیں آپ دلوں والی الگ ہوئے جا رہے ہیں۔ مگر کب؟"

"یہ بھی آپ مزر کا بارے پوچھ لیں۔ ایک پیچش نظر ان پر اسی کر دہ مڑی اور دوڑا سے کل طرف ہو چکی۔

"میرے اندازے درست ثابت کرنے کا شریعہ میز ذمہ۔ بچھے بیٹیں ہے کہم جلد دوبارہ ملیں گے۔ آپ کے بہت سے کام ایسے ہیں جو سرف میں پیدہ ہے کر سکتا ہوں۔"

فلائش ہیں۔۔ آگے کروانی پڑیں گی۔۔ یا شاید کینسل۔۔

وہ کہہ ہمدردی سے ہی تھیں، مگر انداز میں کوئی عجلت تھی۔ زمر بند آنکھوں سے سنے گئی۔

”دو شادیاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔۔ حماد کے تایا کے بیٹے کے فنکشنز بھی ساتھ ہی تھے۔ ویمہ تو ہم دے ہی اکٹھار ہے تھے۔ اب ظاہر ہے یہ شادی تو بھی ہوئی نہیں سکتی۔ سجاد کے فنکشنز تو کل سے شروع ہو جائیں گے۔ اب آپ تو جانتی ہیں ہماری بھی مجبوری ہے۔“

”سب کی مجبوریاں ہیں، میں جانتی ہوں۔۔“ ندرت بولیں تو آواز میں پسپائی تھی۔

زمر آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ ندرت اب شاید ان کے لئے کوئی جوں نکالنے لگی تھیں مگر وہ منع کرنے لگیں۔

”حمداباہر انتظار کر رہا ہے، ایسا کرتے ہیں ہم وہیں بیٹھتے ہیں، اس کمرے میں تو مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں ہستالوں میں ایسی گھٹن کیوں ہوتی ہے؟“

اور ان کی آواز دور ہوتی گئی۔ شاید وہ کمرے سے جا رہی تھیں۔ اور پھر دروازہ بند ہو گیا، سناٹا چھا گیا، قبر کی پہلی رات کا ساسناٹا۔۔ زمر نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اب کمرے میں اکیلی تھی۔

کھڑکی کے باہر دو پہر پہلے سی تازہ تھی گراب بادل امداد کر آ رہے تھے، بارش جیسے بر سے کوئی۔ وہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ چلتی چھت کوڈ کیکھنے لگی۔ اب کوئی بھی چیز افسوس نہیں دلاتی تھی۔ سارے احساسات مر گئے تھے۔ اسے پتھرخااب کیا ہو گا۔ دوسری دفعہ اس کی ممکنی نہ ٹوٹ جائے گی۔ پھر بھی ایک امید تھی، شاید ایسا نہ ہو۔

.....❖❖❖.....

کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے ..... کہیں آنکھیں، کہیں چہرہ نہیں ہے دروازہ اک دم کھلا، وہ چونکی۔ سوتی نہیں بن سکتی تھی۔ مگر پھر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ آنے والی فضیلہ یا ندرت نہیں تھیں۔ اس کو زمر کے پاس اکیلا چھوڑ دینے کا بہت تحکم سے کہتی، جواہرات کا ردار نے اندر قدم رکھا۔ بند گلے کے سبز گاؤں، لمبی سفید ہیل، بالوں کا نیس سا جوڑا بنائے، جوان، اور اسارت سی جواہرات مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ زمر اسی بے رنجی اور ناپسندیدگی سے اسے دیکھتی رہی۔

”ہیلو زمر اکسی ہو؟“

ایک فلپٹو ملازمہ اور ایک سوت میں ملبوس ملازم پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے لئے پیچھے آئے اور ساری میزوں کو بھر دیا۔ جواہرات نے آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گئے۔ ساتھ ہی شہرین کا ردار اندر آئی۔ اس نے لمبی قیص پہن رکھی تھی اور کندھے پہنچیں کا پرس تھا۔ نہرے باب کٹ بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں پیچھے کرتی، مصنوعی سی مسکراہٹ لیئے وہ زمر کے قریب رکی اور جیسے تعارف کروایا، ”میں ممزہ باشم کا ردار ہوں۔ ہم پارٹی میں ملے تھے۔“

زمر نے سر کے خم سے ان دونوں کے رکی کلمات کا جواب دیا، جیسے وہ شدید کوفت میں بنتا ہو۔ جواہرات نے زمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیسے شہرین کو بتایا۔

”زمر یوسف پلک پر اسکیوڑ ہے۔ باشم نے یقیناً تم سے ذکر کیا ہو گا۔“

شہرین نے منہ میں پچھے چباتے ہوئے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

”جی آئی نو۔ ذی اے ہیں یہ بہاں کی۔“ وہ زمر کی طرف مڑی ”سوڈی اے، کیسی ہوتم؟“ اس کو جیسے اپنے انداز تنخاطب پر خود ہی لطف آیا تھا۔

”تم اس کے ساتھ ہو... اس کے اپارٹمنٹ میں؟ تم...“ صدمے اور غصے سے اس کی آواز کا پنی۔ ”تم...“ ہر طرف دھواں ہیں تھا۔

”میری بات سنو۔ میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔ شروع سے۔ پلیز میری بات سنو۔“ وہ پسینے سے تر ہوتے چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

مگر سچ بولنے کا وقت اب گزر چکا تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ زمر نے کال کاٹ دی تھی۔ وہ پریشانی سے بار بار اسے کال ملارہ تھا کہ، وہ نہیں انٹھا رہی تھی۔

اوپر آسمان پر چمکتا چاند چار روز پہلے ماں کامل تھا۔

اب وہ کامل نہیں رہا تھا۔

چاند کی چاندنی اس کے اندر سے گھٹ چکی تھی اور آگے اندھیری رات تھی۔

..... ♦♦♦ .....

## کافر، ماکر، کاذب، قاتل

(حصہ دوم)

دریا کی اصل تیرتی لاشوں سے پوچھئے ..... ٹھہراو ایک چال، روانی فریب ہے  
فصح فون کان سے لگائے، تیز تیز مرک پہ چلتا جا رہا تھا۔ اس کی سیاہ پیشانی پہ سلوٹیں ٹھیں اور آنکھوں میں چھپتی ہوئی ناگواری تھی۔  
وہ دوسرا طرف بولتے انجان آدمی کو سن رہا تھا۔

”اگر میں کہوں ہاں تو کیا مجھے انعام کی رقم ملے گی؟“

”ہاں بالکل۔ کہاں ہے وہ تامل جاسوں؟“ وہ غیر دلچسپی سے بولا اور کارکار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا۔

”پہلے مجھے انعام کی آدمی رقم پہنچجو، پھر بتاؤں گا۔“ فصح کی ناک مزید پڑھ گئی۔

”دیکھو ستر، مجھے تامل جاسوں کی لوکیشن بتاؤ، اگر اسے ہم پکڑ پائے، تب انعام ملے گا ورنہ ایک دھیلا بھی نہیں ملے گا۔“ وہ بلا مبالغہ کہہ رہا تھا۔

”ایسے تو میں نہیں بتاؤں گا۔“ بوڑھا منہماں خفا ہو گیا۔

”جہنم میں جاؤ۔“ اس نے کال کاٹ کر سیٹ بیٹھ باندھتے ہوئے اکنیشن میں چابی گھمائی۔ پھر دوسرے سیل پہنبر ملا کر اپنیکر آن کیا اور کار پیوس کرنے لگا۔

”بولو فصح۔“ جواہرات تنگ لگ رہی تھی۔

”میم ابھی تک ان دونوں کا پیٹھ نہیں چل رہا۔ دونوں کے پوٹھر مزاگ الگ بخوائے ہیں۔ سعدی کا تامل جاسوس کے نام سے اور خاور کا مگڑے ڈنی تو ازان والے لاپتہ فرد کے نام سے۔ مگر لوگ یوگس کا لائز کرتے ہیں۔ پھر اور سمارٹ بن کر انعام کا ایڈوالنس مانگ کر رفوچ کر ہونا چاہتے ہیں۔ روزوں جگہوں پہ ان کی اطلاع ملتی ہے، میرے بندے بھاگ کر جاتے ہیں مگر سب فراؤ ہوتا ہے۔“

”مجھے اس تفصیل سے دلچسپی نہیں ہے۔ جب وہ مل جائیں تو جو تمہیں کرنا ہے وہ کرگزرننا۔“ اور اس کا ”راجز، میم۔“ سننے سے قبل ہی جواہرات فون رکھ چکی تھی۔

وہ اس وقت اپنے بستر میں لیٹی تھی۔ سادہ نائٹ شرٹ میں مبوس، بالوں کو گول مول باندھے، لحاف لپیٹنے، وہ ست اور بد مزہ ہی لگتی تھی۔ بیڈ کی پائینتی کی طرف اسٹوپ پہنچی فینو نا اس کے بیروں کا مساج کر رہی تھی۔

”مسنگ کاردار۔ کیا میری ایتھیو ہمیشہ کے لئے واپس آگئی ہے؟“ دھنعتاً اس نے جھکی لگاہوں کے ساتھ پوچھا۔

جوہرات نے آنکھیں کھول کر ناگواری سے اسے دیکھا۔ ”اپنے دماغ کو آرام دفینو نا۔ کون کدھر جائے گا، یہ میں طے کرتی ہوں۔“

اپ وہ تمہاری بھیڈ ہے، اس کو عزت دو۔ ”پھر اپنا پیر درشتی سے پیچھے کو کھینچا۔ فیجنہ کے ہاتھ خالی رہ گئے۔  
”دور ہٹو۔ میرا سارا موڑ خراب کر دیا۔ ہاتھ تیار کرو میرے لئے۔“

چند منٹ مزید سر کے اوپر پھر وہ لاونچ کی سیڑھیاں چڑھتی دکھائی دی۔ زمر دینا آتیں کے لمبا گاؤں پہنے بال جوڑے میں  
اندھے۔ تازہ میک اپ، اور زمر د جڑے آؤیزے پہنے وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔ شیر و کمرہ اندر ہی رہتا۔ وہ اسٹڈی کی طرف چلتی آئی۔ اندر  
تیار جل تھیں اور سامنے کپیوٹ نیبل پہ ہاشم چند کتابیں کھولے بیٹھا، کام کرتا نظر آرہا تھا۔ شرٹ کے آتیں کہنوں تک موزے وہ کتاب میں  
تک پچھڑ کر نوٹ پیڈ پہ لکھتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی۔ اس کے کندھے پر زری سے ایک ہاتھ رکھا اور دوسرا اس کی میز پر رکھے دہیں  
لہڑی ہو گئی۔

”جی می؟“ وہ سراخاۓ بنانہمک سایوالا۔

”تمہارے اطمینان پر حیرت ہے مجھے۔ تمہارا بھائی اس لڑکی کو لے آیا جس سے مجھے نفرت ہے، اس کو کمپنی کا ایک چوتھائی حصہ دے  
اٹا اس کو اپارٹمنٹ لے کر دے رکھا ہے اور دو دن سے وہ اسی شہر میں رہ رہی ہے مگر تم کچھ نہیں کر رہے۔“

”میں مودو آن کر چکا ہوں، می۔“ وہ اب لیپ ناپ پہ کچھ نہیں کرنے لگا تھا۔ جواہرات کا داماغ گھوم گیا۔

”ہاشم... اس لڑکی سے مجھے چھکنا کا کون دلا کر دے گا؟“

”اس لڑکی کا نام علیشا ہے اور وہ فیملی ہے می!“

”ہاشم...“

”می!“ اس نے عینک اتار کر رکھی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں، چہرے کے نقوش سب جواہرات کی کاپی تھے  
اور ان میں بھی اتنا ہی غصہ تھا۔

”میں اس کی فیس دے رہا تھا۔ وہ ایک سمسٹرم کر کے پڑھائی چھوڑ چکی ہے۔ وہ نکل کر کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میری اتنے سالوں کی  
فیس بچ گئی۔ اس کے بد لے شیر و نے اسے چند شیر زدے دیے ہیں، اور اچھا مجھے بھی نہیں لگا مگر میں کیا کروں؟ وہ دونوں میرے اپنے ہیں۔  
رہنے دیں اسے ادھر۔ کچھ دن بعد خود ہی اکتا کر چلی جائے گی۔ آپ کو کیا کہہ رہی ہے۔“ اور واپس کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
جواہرات اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کچھ تھی اور اب افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ایک وقت تھا جب اس کے شہر میں ہونے کی اطلاع نہ دینے پہنچ سے گاڑی میں بیٹھے مذہر تک رہتے رہے تھے۔“ مگر ہاشم پہ  
کوئی اثر نہیں ہوا۔

”وہ وقت میں گزار چکا۔ اب مودو آن کر جائیں می۔ اب میں ایک اچھا آدمی بن کر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“

جواہرات غصے سے مڑی اور پیر پچھتی وہاں سے چلی گئی۔ سیر ہیاں اترتے ہوئی وہ بڑے بڑے رہی تھی۔

”ان دونیوں کے لیے اتنے سال قربانیاں دیں۔ کیا کیا نہیں کیا۔ مگر اب یہ دونوں اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکے ہیں۔ تو تھیک  
ہے۔ کوئی گی میں بھی نہیں۔“ پرس سے میل نکالتی وہ باروں کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھی۔

.....❖❖❖.....

بولے تو سہی جھوٹ ہی بولے وہ بلا سے ..... ظالم کا لب و لہجہ دل آؤیز بہت ہے  
کولبو میں اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر اٹھا رہویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، اور اندر سیر ہیوں پہ کھڑا فارس  
دیوانہ وار بار بار سے کال ملار ہا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور ماتھے پر پسینہ تھا۔

”زمر کال اٹھاؤ، پلیز کال اٹھاؤ“، وہ موبائل کان سے لگائے بڑے اڑاکھا گرد و سری طرف وہ فون آف کر پچکی تھی۔ فارس نے فون کان سے ہٹایا، مڑ کر غصے سے اور فلیٹ کی طرف دیکھا جہاں آبی گم ہوئی تھی اور پھر۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، سیر ہیاں پھلانگتا اور آیا اور فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ تیز قدموں سے رہداری عبور کی اور لا دخ میں پیٹھی آبی کے سر پر جا پہنچا جو میز پر پڑے کھانے کے پیکٹ سمیت رہی تھی۔

”یہ کیا تھا؟“ وہ بلند آواز سے غرایا تھا۔ آبی نے سکون سے چرہ اٹھایا، پھر اس کے برہم تاثرات دیکھ کر آنکھوں میں حیرت ابھری۔

”کیا ہوا؟“

”یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ آپ کو پتہ تھا کہ دوسری طرف میری ہیوی ہے۔“ وہ غصے سے کہر رہا تھا۔ آبی اچنہبھے سے اسے دیکھتی کھڑی ہوئی۔

”میں نے ایسا کیا کہا؟“ پھر جیسے یاد کیا۔ ”میں تو کھانے کا کہر رہی تھی۔ میں سمجھنے نہیں فارس، کچھ غلط ہو گیا ہے مجھ سے؟“

اب کے وہ سمجھنے نہیں بولا۔ کمر پر دونوں ہاتھ رکھے، چھپتی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ تنفس ابھی تک تیز تھا اور ماتھے کے بل ہنزو دیے تھے۔

”آئی ایم سوری، اگر میری وجہ سے کچھ غلط ہوا ہے تو۔ کیا انہوں نے کچھ غلط سمجھا؟ مگر وہ آپ کی بیوی ہیں، آپ کو اتنا تو جانتی ہوں گی۔ انہیں آپ کو اتنی سی بات پر غلط نہیں سمجھنا چاہیے تھا۔“ وہ تجуб سے کہر رہی تھی پھر فکر مند تاثرات چہرے پر جائے آگے کو ہوئی۔ ”کیا میں کچھ کر سکتی ہوں آپ کے لئے؟ پریشان مت ہوں، میں فوراً ان سے بات کرلوں گی۔“

”میرے ساتھ یہ گیمنز نہ کھلیں آبدار بی بی۔“ وہ تیز تنفس پر قابو پاتا اسے گھوکر بولا تھا۔

آبی نے اسے دیکھتے ہوئے پلکیں چھپکیں تو ان میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

”میں نے کیا کیا ہے، سوائے آپ کی مدد کرنے کے؟“ وہ بے بُی سے بولی تھی تو فارس نے گہری سانس لی اور سر جھکتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

”اچھا رکھیں نہیں۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔“ وہ صوفے کے کنارے بیٹھا اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں گرائے کچھ سوپنے لگا۔ آبدار نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ پوچھا پھر سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”میں نے شام سے کچھ نہیں کھایا، یہ کھانا بھی ٹھہڈا ہو گیا ہے۔“

فارس نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اچھا سوری۔ مجھے آپ پر غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

آبدار کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ مامکھیں رکڑتی سامنے والے صوفے کے کنارے پر جائیں گی۔

”مجھے کھانا کھانا ہے۔“ وہ اب بھی منہ بسوارے ہوئے تھی۔

”جلیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس میں شنزدہ ماحول سے تو نکلیں۔“ تلخی کو پی کر وہ زخمی سامسکرایا تو بالا خروہ مسکرا دی اور کھانے کے پیکٹ سمینے لگی۔ ”یہ راستے میں کسی کو دے دیں گے۔“

فارس نے رک کر اپنی شرت کو دیکھا۔ ”میں کہرے بدلوں۔“ اور اندر کمرے کی طرف چلا گیا۔ آبی نے مسکراتے ہوئے سارے پیکٹ سمینے۔ پھر موبائل پر قریبی ریسٹورانٹ سرچ کرنے لگی۔ ساحل کنارے ایک خوبصورت ریسٹورانٹ میں بکنگ کروائی اور پھر مسکراتے ہوئے فون بند کر کے سوپنے لگی۔

گھڑی کی سوئیاں تک تک کرتی رہیں، وقت سرکتار ہا۔ جب پندرہ منٹ گزر گئے تو آبدار قدرے چوکی۔ فارس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ اٹھی اور اس کے کمرے کے باہر جا کر آواز دی۔ ایک آواز، دو آوازیں۔ جواب ندارد۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، پھر ڈور ناب گھمایا۔

دروازہ کھلتا چلا گیا۔

کمرہ خالی تھا۔ الماری کے پٹ کھلے تھے۔ اندر نہ فارس غازی کا منحصر سامان تھا، وہ خود تھا۔ کمرے کی کھڑکی بھی کھلی تھی۔ آبی بھاگ کر گئی اور کھلی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ وہاں پابپ لگے تھے۔ اور جالیاں۔ وہ ان کے نیچے سڑک پر جاتا تھا اور کوئی نکل یا نیکسی پکڑ کر کب کا کولبوکے بجوم میں گم ہو چکا تھا۔ وہ بالکل سن رہ گئی۔ پھر کھڑکی کی جالی میں ایک نوٹ پر نظر پڑی تو اس نے لپک کر وہ کاغذ وہاں سے اٹا رہا۔

”میں یہاں ریشور انس کے کھانے کھانے نہیں آیا تھا۔“

اور وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہو یا نہ ہو، محبت کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنا سارنا جائز ہوتا ہے۔ وہاں سے چند کلو میٹر دوڑوہ نیکسی سے اتر کر، بیک کندھے پڑائے دوسرے ہاتھ میں موبائل پنبر ملار ہاتھ۔ وہ اب زمر کوفون نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنا ادھورا کام مکمل کر رہا تھا۔ فون کان سے لگایا تو ایک نسوانی آواز بھری۔

”ہیلو۔“

”صباحت۔ میں بول رہا ہوں۔ فا...“

”فارس؟“ آواز میں خوشگوار حیرت ابھری۔ ”کیسے ہو فارس؟ اتنے عرصے بعد؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ شاید...“ وہ زخمی سا سکرایا۔

”شاید؟ یعنی ٹھیک نہیں ہو؟ کیا میں کچھ کر سکتی ہوں؟“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔

”جب پہلی دفعہ جیل گیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ آپ میرے لئے کچھ نہیں کر سکیں کیونکہ...“

”فارس آئی ایم سوسوری، میں کچھ نہیں کر سکی، میں نے بہت کوشش کی مگر یہ ممکن نہیں ہوا۔ تم نے جو میرے لئے کہا تھا اس کا بدلہ میں ساری زندگی نہیں چکا سکتی۔“ وہ شدید ممنونیت سے کہہ رہی تھی۔ ”تم نے اپنی نوکری خطرے میں ڈال کر مجھے میرے اریث دار نش کا بتایا تھا۔ تم کتنے سال سندھ میں پوشنڈر ہے، میری وجہ سے اور...“

”میں نہیں کہہ رہا تھا۔“ اس نے نرمی سے بات کاٹی۔ ”میں کہہ رہا تھا کہ پہلی دفعہ آپ نے میری مدارس لئے نہیں کی کیونکہ آپ اس وقت انہیا میں پوشنڈر ہیں، لیکن دوسری دفعہ جب میں جیل گیا تھا تو آپ نے مجھ سری لنگا سے فون کیا تھا۔ سری لنگا میں پوشنڈر ہیں۔ مجھے احسان کا بدلہ مانگنا...“ کرب سے آنکھیں بند کیں۔ ”بالکل اچھا نہیں لگ رہا، مگر مجبور ہوں۔ جہاں اتنے جراں کر چکا ہوں، وہاں ایک اور سہی۔“

”فارس!“ وہ ادا سی سے مسکرائی تھی۔ ”تم نے جو میرے لئے کیا، وہ جرم بھی تھا، اپنی نوکری کے ساتھ خیانت بھی، دھوکہ بھی اور غیر قانونی بھی۔ مگر وہ ”غلط“ نہیں تھا کیونکہ کچھ چیزیں قانون سے اوپر کی ہوتی ہیں۔ تم کل بھی بے گناہ تھے، اور کل بھی رہو گے۔“

وہ ہلکا سا سکرایا۔ ”کیا آپ اب بھی کولبو میں پوشنڈ ہیں؟“

❖❖❖

میں تو مقتل میں بھی قسمت کا سکندر نکلا..... قرعہ فال مرے نام کا اکثر نکلا  
بزر بیلوں سے ڈھکے بیٹھکے میں رات کے اس پھر مکمل خاموشی تھی۔ زمر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی، اور سیم کے سوالوں کا اس نے ”اسے بتا دیا ہے،“ کہہ کر جواب دیا تھا۔ آگے نیسم نے پوچھا نہیں نہیں۔ حنہ تو دیں لاؤخ میں نیچے بیٹھی ایپ ناپ میز پر رکھے اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ (ای اپنے کمرے میں اپنے وظیفوں اور دعاؤں میں مشغول تھیں۔) نیسم حنہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بڑے ابا بھی وہیں چیزیں گھینٹتے، ان

کے ساتھ آر کے تھے اور اب فرمندی سے بار بار حنہ سے پوچھتے تھے۔

”کیا تم سعدی کو ڈھونڈ سکتی ہو؟“

”نہیں ابا۔ لیکن میں امی کا پاسورڈ بدل رہی ہوں، وہ پاسورڈ کے لئے امی کا امی میل کھولے گا، تو میں ایک جعلی امی میل اندر محفوظ کر رہی ہوں۔ وہ اسے کھول کر اس کے لنک پر ملک کرے گا تو اس کی لوگیشن ہمارے پاس آجائے گی۔“ وہ ایک ہاتھ سے ٹاپ کرتی، دوسرا کے ناخن مسلسل دانتوں کے نیچ کتر رہی تھی۔

”حمد.... کیا بھائی تمیں واپس مل جائے گا۔“ سیم اس کا بازاڑ جھنجور کر بار بار پوچھتا تھا۔

”ہاں سیم۔ وہ واپس مل جائے گا اور پھر دیکھنا، ہم سب ہمیشہ خوش رہیں گے۔“ حنین کو یہ بہت آسان لگتا تھا۔

”کاش کہ ہمیں وہی سعدی ملے جسے ہم نے کھوایا تھا حنین۔“ ابا کی آواز غمزدہ ہو گئی۔ حمد نے مذکر استفہامیہ نظر دوں سے انہیں دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چہرہ نیچ گرانے، بس سر ہلا کر رہ گئے۔ وہ حنین کو مطلب نہیں سمجھا سکتے تھے۔

وہ سر جھٹک کر واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر کچھ سوچ کر اس نے سیو سعدی یوسف سچ کھولا۔ اس کے ایڈمن میں سامنے احر شفیع لکھا آرہا تھا۔ حنین نے سچ کو پیغام لکھا۔

”ایڈمن..... میں سعدی کی بہن ہوں۔ پلیز مجھے اس سچ کا ایڈمن بنادیں۔“

”تم اس کی ایڈمن کیوں بننا چاہتی ہو؟“ سیم نے اچھبھے سے اسے دیکھا۔

”سیم ہمارے فونز اور لینڈ لائن وہ لوگ ٹریس کر رہے ہوں گے کیا پتہ ہمارے فیس بک اکاؤنٹس بھی دیکھ رہے ہوں۔ ہم کوئی بھی ایسی بات نہیں لکھ سکتے جو بھائی کے لئے خطرہ بن جائے۔ لیکن سیو سعدی یوسف والا بیچ بھائی بھی دیکھتا ہو گا، میں اس کے ذریعے بھائی کو کوئی پیغام سچ سکتی ہوں۔“ وہ جوش سے بتا رہی تھی۔ اس کے لئے یہ بہت آسان تھا۔

ان سے ذرا فاصلے پر کمرے کے بندرواز سے کے پیچھے جھاناک تو زمانہ دیر ایک صوف فیپٹھی تھی۔ اس کی خشک آنکھیں چھٹ پر بھی تھیں اور چہرے پر دیرانی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا وہ موٹا بھند افون آف تھا۔

جانے کتنے لمحے سر کے... کتنی رات گہری ہوئی۔ جب اس نے وہ فون آن کرتے ہوئے گردن سیدھی کی اور پھر اس میں سیو واحد نمبر ملایا اور اسے کان سے لگایا۔ آنکھیں ہنوز خشک اور چہرہ سپاٹ تھا۔

فارس نے چھوتے ہی فون اٹھا لیا تھا۔ وہ اس وقت ایک زبوبی حال سے علاقے میں سڑک کنارے چل رہا تھا، ہاتھ میں پرچی تھی جس پر لکھا پتہ وہ تلاش کر رہا تھا۔ فون کان سے لگاتے ہوئے اس نے پرچی مٹھی میں دبائی اور بے چینی سے بولا۔

”اس طرح فون مت بند کیا کرو۔ میری بات تو سن لیا کرو۔“

”تم ہمیشہ مجھے مختلف روپ میں ملتے ہو۔“

”زمیر میں تمہیں...“

”مجھے میری بات پوری کرنے دو۔“ وہ صوفے پر پر کر کے بیٹھی، سر جھکائے، انگلیاں مردوزتی کہہ رہی تھی۔ ”پسلے تم میرے ایک بھولے بسرے رشتے دار تھے۔ پھر اسٹوڈنٹ بن گئے۔ پھر ایک ایسے اسٹوڈنٹ رہ گئے جو وقت پڑنے پر مجھے نیوز دے دیا کرتا تھا۔ پھر تم میرے سامنے ایک قاتل کی حیثیت سے آئے؛ جس نے اپنی بیوی کو مارا، اپنے بھائی کو مارا، اور مجھے بھی مارنے کی کوشش کی۔ پھر تم صرف ایک قیدی رہ گئے جو سفید کرتے شلوار میں ملبوس بالوں کی پونی بنائے، مجھے کبھی کبھار پکھری میں نظر آ جاتا تھا۔ پھر تم مجھے ایک چالباز قیدی لگے جس نے مجھے

ا تعالیٰ کر کے جبل توڑنے کی کوشش کی۔ پھر تم مجھے ایک ایسے رہا ہونے والے انسان جیسے لگ جو گناہگار ہوتے ہوئے بھی قانون کا مذاق اڑا کر نہیں سے نکل آتا ہے۔ پھر مجھے لگا تم ایک منتقم مراج انسان ہو۔ جس نے اپنارشتہ ٹھکرائے جانے کا بلہ مجھے سے لیا تھا۔ جب تم سے شادی کر لی تو تم ایک بے حس اور سرداری لگتے تھے مجھے جسے جو کہہ لو اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے لگا تم وہ نہیں ہو جو لگتے ہو۔ جو ہمیشہ لگتے تھے تم بے گناہ لگنے لگے مجھے۔ یہاں تک کہ مجھے یقین آ گیا کہ تم بے قصور ہو۔ مگر بے توف بہوجوانے دشمن سے نادا قف ہو۔ پھر تم میرے شوہر بن گئے اور ایک محبت کرنے والے وفادار آدمی جیسے لگنے لگے مجھے۔ مگر آج رات....، وہ رکی۔ تیز بول کراس کو سانس چڑھ گیا تھا۔ دوسرا طرف وہ باکل خاموشی سے سن رہا تھا۔

”آج رات لگا کہ تم ان میں سے کچھ بھی نہیں ہو۔ تم ایک اداکار ہو صرف مگر اب.... اب یہ نہیں لگ رہا۔“

”اب کیا لگ رہا ہوں میں تمہیں؟“ وہ تخلی سے بولا تھا۔

”ایک انسان۔ صرف ایک انسان جو اگر زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں لینا چاہے تو اس میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ بس پھر تمہیں مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ میں تھہاری بیوی بنوں۔“ ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر چہرے پر لڑک گیا۔

”کیا تم میری بات سنوگی؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہمیشہ کہتے ہو، ہم نے الگ ہو جانا ہے اور مجھے نہیں پتہ کہ کیوں، لیکن اگر الگ ہی ہو جانا ہے تو تم میری طرف سے آزاد ہو۔ جو کرنا ہے کرو۔ مجھے تم سے کوئی گلنہیں نہیں ہے۔ میں اور تم بھی ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس لئے....، اس نے گلی سانس کو ناک سکوڑ کر اندر لکھنچا اور ہاتھ کی پشت سے گال رکڑے۔“ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم میری طرف سے پریشان ہوئے بغیر تم جو بھی کر دیا تھا کہ میں تمہارا حق ہے۔ مجھے اعتراض نہیں۔“

وہ سڑک کنارے ایک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا، سنجیدگی سے دوسرا طرف سے آتی زمر کی آواز سن رہا تھا۔ آخر میں تنخی سے مسکرا یا۔ ”عظیم ڈسٹرکٹ پر اسکیوٹر صاحب نے ہمیشہ کی طرح اپنی کمی اپنی سی اور فیصلہ منادیا۔ لٹھیک ہے، جو تم چاہو۔“ اور اسی سنجیدگی سے موبائل نیچے کیا اور کال کاٹ دی، پھر سر جھنک کر آگے بڑھ گیا۔

زمر نے سر گھٹنوں میں دے دیا اور بازوں کے گرد پیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اب ہر طرف پھر سے اندر ہیڑا ہو گیا تھا۔

اور اسی اندر ہیڑ رات میں احر جب لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھا تو نئے پیغام نے اسے چونکایا۔ اسے پڑھ کر اس نے بلا کسی تردود کے حین میں یوسف کو اپنے بیچ کا ایڈمن بنادیا۔ پھر یونہی.... اس کی پروفائل کھوی۔ کچھ خاص نہ تھا ادھر.... البتہ.... ایک چہرہ دیکھ کر وہ چونکا تھا۔.... اب اس کی انگلیاں تیز تیز کی بورڈ پر ہر کرت کر رہی تھیں اور آنکھوں میں چمک سی تھی۔

ادھر کلبو کے آسان پر سیاہ بادل انکھی ہونے لگے تھے، گویا پورے شہر کو نہلا دینے کے لئے بے چین ہوں۔ ہوٹل کی بلند و بالا عمارت سر اونچا کیے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ اندر..... گراؤنڈ فلور کے سیکورٹی کشٹرول روم میں دو افراد کمپیوٹر مینیٹر کے سامنے بیٹھے تھے۔ وفعنا دروازہ کھلا اور سیاہ فام فتح اندر داخل ہوتا کھائی دیا۔

”تمہیں ریپیشن پر طلب کیا جا رہا ہے۔ کوئی ملنے آیا ہے تم سے۔“ ایک کو اکھڑ لجھے میں حکم دے کر وہ دوسرے کی طرف آیا، اور چند لمحے انتظار کیا، یہاں تک کہ پہلاؤ جوان کمرے سے چلا گیا۔

”خیریت، سر؟“ دوسرے آفسر نے کری اس کی طرف گھمائے فکر مندی سے اسے دیکھا۔ فتح نے جواباً اپنے اسماڑ فون کی اسکرین اس کے سامنے کی۔

”مجھے شام میں ایک کال آئی تھی۔ پوسٹروال لائٹ کے کے لئے۔“ اس بات پر آفسر نے اکتا کر سر جھنکا۔

”نہیں سنو۔ بے شک وہ عام کا لرز کی طرح بوگس ہی لگ رہا تھا، مگر...“ اس نے اسکرین سامنے لہرائی۔ ”اس کا موبائل نمبر کینڈی کا ہے۔“

”تو؟“

”تو یہ کہ اشتہار ہم نے کلب ہمیں دیا ہے۔ پھر کینڈی سے کیوں کوئی کال کر رہا ہے ہمیں؟“  
”ہو سکتا ہے نمبر کینڈی کا، ہو گر کا لکمبو میں ہو۔ آدمی سم کی بھی شہر سے لے سکتا ہے۔“ مگر فتح نے نفی میں سر ہلا�ا۔  
”مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سعدی یوسف کینڈی میں ہو؟“

”تو پھر اس کا لر کے پاس پورٹر کیسے آیا؟“ اس نے نکتہ اٹھایا۔ فتح نے الجھ کر سر جھکا۔

”اس نمبر کو ٹریس کرو۔“

”راجزِ سرا!“ وہ فرائے مانیٹر کی طرف گھوما اور کچھ ناٹپ کرنے لگا۔ پانچ منٹ بھی نہیں لگے اور اس نے سرا اٹھایا۔ ”نمہ آف ہے۔“  
سم موبائل میں نہیں ہے، ورنہ گنل مل جاتا۔ میں اس نمبر پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ جیسے ہی آن ہوتا ہے بتاتا ہوں۔“  
فتح کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”یہ اس کی کوئی ایکسٹر اسم ہو گی۔ تم اس کا سارا کال ریکارڈ نکلواد۔ کس کے نام ہے ہم سب کچھ۔“  
پھر جوش سے اس کا کندھا تھکا۔ ”ہری آپ۔“

انعام کی رقم کے صفر فتح کو اپنی آنکھوں میں چکتے دھکائی دینے لگے تھے۔ یہ جواہرات کا اس سے وعدہ تھا۔ ہارون کا انعام الگ۔  
خون اس کی رگوں میں بہت تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔

❖❖❖

میں ان میں بھکتے ہوئے جگنو کی طرح ہوں ..... اس شخص کی آنکھیں ہیں کسی رات کی مانند  
یہ کلبوں کے ایک زیوں حال اور پسمندہ علاقے کی ایک فلیٹ بلڈنگ تھی۔ سامنے کچھ رے کا ڈھیر تھا۔ میلی دیواریں۔ فلیٹس کی  
بالکونیوں پر سوکھتے کپڑے۔ اندر فارس گول سیڑھیاں عبور کر کے ایک دروازے کے سامنے آن ٹھہرا تھا اور اب دستک دے رہا تھا۔ اپنے بلکے  
سوئٹر کے آستین موز رکھے تھے اور سر پہ پی کیپ لے رکھی تھی۔ دو دفعہ دوبارہ دستک دی۔ پھر بیل بجائی۔ دروازہ ہٹکا سا کھلا۔ درز سے ایک ٹھنی  
اور سانو لے لڑ کے نے جھانا کا۔

”مجھے صبحت نے بھیجا ہے۔ صبحت مرزا نے۔ کام ہے تم سے۔“

لڑکا درز سے چند لمحے اسے جھانکتا رہا۔ پھر دروازہ کھول دیا اور زنجیر گردی۔ وہ دروازہ پرے دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ ساتھ  
ساتھ بولتا جا رہا تھا۔

”تعارف اور تمہید میں میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اپنا کمپیوٹر آن کرو۔ جو صلاحیتیں تم مختلف حکومتوں کو بیچتے رہتے ہو، مجھے ان کی  
ضرورت ہے۔ شکل کیا دیکھ رہے ہو۔ چلو۔“ اس کا مودہ پبلے خراب تھا، گھر کر بولا تو لڑکا جلدی سے اندر چلا گیا۔ فارس ماتھے پہل لئے اس  
کے پیچھے آیا۔ اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں تین کمپیوٹر رکھے تھے۔ ایک آن تھا۔ وہ لڑکا اسی کے سامنے کری کھنچ کر بیٹھا تھا اور مطلوبہ  
پروگرام کھول رہا تھا۔

”صباحت نے کہا تھا تمہیں گورنمنٹ کے فیشن recognition سافت ویریٹک access چاہیے۔ تصویر دو مطلوبہ لڑکے کی۔“  
کی بورڈ پٹاپ کرتے اس نے ہاتھ بڑھایا۔ فارس نے ایک فلیٹ اس کی ہتھیل پر رکھی۔ اور ساتھ کھڑا اسے دیکھنے لگا۔  
”اس میں سب تصاویر ہیں اس کی؟“ وہ فلیٹ ڈرائیور کا کر پوچھ رہا تھا۔

”نظر نہیں آرہیں کیا؟“ وہ درستی سے بولا۔ لڑکے نے سراہا کر اسے دیکھا، جیسے بہت ضبط کیا ہو، پھر سر جھنک کر کام کرنے لگا۔ ”میں اسے سُمِم میں ڈال رہا ہوں۔ اس چہرے کا لڑکا پچھلے اڑتا لیس گھنٹوں میں کولبو کے کسی اسٹریٹ کیم ائیر پورٹ، بس، ٹرین اگلے نیڑے کے کسی بھی پلک کیمرے کے سامنے اگر آیا ہو تو توفیق حمل جائے گی۔“

”کولبو میں نہیں، اسے کینڈی میں ڈھونڈو۔“ وہ کمپیوٹر نیبل کے کنارے بیٹھ گیا۔

وہ لڑکا، جس کا نام پریا تھا، گہری سانس لے کر مطلوب الفاظ ثابت کرنے لگا۔

”انگریزی فلموں کے برعکس فیش ریکو گنیشن میں کئی گھنٹے لگتے ہیں۔“ تھوڑی دیر بعد پریا جماں روکتے، بازوں کا تکیہ بنا کر پیچھے کو اٹا گا تے ہوئے بولا تھا۔ ”اگر وہ نظر آیا تو اسکرین پر ٹکل نج جائے گا۔ تم دیکھتے رہو میں تب تک کھانا کھالوں۔“ کہہ کروہ اٹھنے لگا، تو میز کے نئے پر بیٹھنے والے فارس نے اپنا پیر لبا کر کے راستے میں رکھ دیا۔ پریانے چونک کر اسے دیکھا۔ فارس نے جیب سے پستول نکال کر میز پر کھا، پھر مری جیب سے نہیں چھوٹا پستول نکال کر اس کے ساتھ ڈالا۔ پھر خفت نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ابرو سے واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جب تک وہ مل نہیں جاتا، تم کہیں نہیں جا رہے۔ واپس بیٹھو۔“

لڑکے نے ایک نظر اسے دیکھا، دوسرا بے اس نظر ان دو پستولوں پر ڈالی، پھر گہری سانس لے کر واپس بیٹھ گیا۔ پروگرام کے مسلسل ملے لی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دونوں کی نظریں اسکرین پر جمی تھیں۔ رات دھیرے دھیرے کٹنے لگی۔

❖❖❖

مری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں ..... ابھی روشنی ابھی تیرگی، نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا  
اگلی صبح دھوپ چھاؤں کا ساموسہ اسلام آباد کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ اس پر شکوہ عمارت کے بالائی فلور پر وہ ایک کشادہ سا اُس تھا۔ بلاسٹر کھلے تھے اور شہری روشنی آدھے آفس کو روشن کر رہی تھی۔ سیاہ بالوں کو

مرکزی کرسی پر نوشیر والیک لگائے بیٹھا ایک کرٹل بال ہاتھ میں گھمارا تھا۔ سامنے کھڑکی کے آگے علیشا کھڑی تھی۔ سیاہ بالوں کو اپنی پونی میں باندھے اس کی بے حد گوری جلد اور سرمنی آنکھیں دھوپ کی حدت سے چمک رہی تھیں۔ دھتنا اس نے چہرہ موڑ کر چھپتی ہوئی لہاؤں سے شیر کو دیکھا۔

”اب؟ اب کیا ہو گا؟“

”کیا ہونا ہے، تم یہاں کام کرو گی، آرام سے رہو گی۔“

علیشا کاردار کی آنکھوں میں خفیٰ اتری۔ ”تم نے مجھے یہ کہہ کر بلا یا تھا کہ مجھے میرے باپ کی جائیداد سے حصہ دو گے۔“

”دے تو رہا ہوں۔“ وہ حیران ہوا اور قدرے ناراض بھی۔

”میں نے کیا کرتا ہے اس کپکنی کا؟ میں سوچ رہی ہوں ان شیئر ز کو نیچے دوں۔“

نوشیر وال کے ماتھے پہل پڑے۔ ”اور ان کے بد لے رقم لے کر واپس چلی جاؤ؟“

”ہاں نوشیر وال میں اس رقم سے نئی زندگی شروع کر سکتی ہوں۔“

نوشیر وال ناگواری سے ابھی کچھ کہتا مگر دروازہ دستک کے ساتھ کھلا تو چوکھت میں زمر کھڑی نظر آئی۔ سیاہ کوٹ اور سفید لباس میں باہم، گھنگریا لے بال آدھے باندھے وہ مسکرا رہی تھی۔ بالکل پر سکون پر اعتماد اور اپنی ناک کی نتھی کی طرح تازہ مذکوٰ ہوئی۔ رات والے واقعے کا ماہنہ تک چہرے پر نہ ملتا تھا۔

”آئیے مسز زمز۔“ وہ اپنائیت سے کہتا اٹھا۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ شیر کو تقویت ملتی تھی۔

”تھیک یونو شیر وال۔“ وہ مسکرا کر کہتی آگئے آئی۔ ”ہیلو علیشا!“ ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ بس صح بچیر کہ کر رہی تھی، البتہ سینے پر لپٹیے باز، کھول کر پہلو میں گردادیے تھے اور جو پہلے بے نیازی سے کھڑی تھی، اب الرٹ سی ہو گئی تھی۔

”میں صرف اطلاع دینے آئی تھی۔“ کرسی کھینچ کر تیکھتی وہ نرمی سے گویا ہوئی۔ اور پس میز پر رکھا۔ ”مجھے صح ہاشم کا فون آیا تھا۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ علیشا چاہے تو آفس میں کام کرے۔ چاہے تو اپنے شیرز زاس سے بچ دے۔ وہ ان کے بد لے ایک خطیر رقم دینے، تیار ہے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ شیرود کے چہرے پر پہلے ہاشم کے نام سے جوزخی پن سا پھیلا تھا، اب وہ عنقا ہو کر غصے میں ڈھل گیا۔

”مگر یہ اچھا سودا ہو گا۔“ علیشا تدرے امید سے کہتی آگئے آئی۔ شیرود نے بے بسی بھرے غصے سے اسے دیکھا۔

”میں نے تمہیں شیرز زاس لئے نہیں دیے تھے کہ تم انہیں ہاشم بھائی کو بچ کر انہیں 50 فیصد کا مالک بناؤ اور میں بالکل معدور ہو جاؤں۔“

”اب وہ میرے شیرز ہیں، اگر تمہیں میرا خیال ہے تو....“ وہ بھی تیزی سے کہنے لگی۔ مگر زمر نے میز کو انگلی کے ناخن سے زورت کھکھایا۔ ایک منٹ! آفس میں خاموشی چھا گئی۔ پھر زمر نے نرمی سے اسے پکارا۔ ”نوشیر وال، کیا آپ کو میرے اوپر اعتماد ہے یا نہیں؟“

”مسز زمر، اگر یہ دونوں مل گئے تو میں ان کا ملکوم بن جاؤں گا اور....“

”نوشیر وال آپ کو میرے اوپر اعتماد ہے یا نہیں؟“ وہ اب جیجیگی سے بولی تو وہ ذرا چپ ہوا۔ ”مجھے ہے مگر....“

”تو فکر کیسی؟ میں آپ کی وکیل ہوں، آپ کے مسئلے حل کرنا میرا مسئلہ ہے۔ کچھ بھی ایسا نہیں ہو گا جو آپ نہیں چاہیں گے۔“

نوشیر وال نے ناخوشی سے سر کو خم دیا گرددہ آرام دہ نہیں لگ رہا تھا۔ زمر نے اب سر دنفروں سے علیشا کو دیکھا جو بے چین نظر آ رہی تھی۔

”مس علیشا کاردار۔ آپ نے اس روز دو کاغذات پر دستخط کئے تھے۔ وہ دوسرا کاغذ جانتی ہیں کیا تھا؟“

”آپ نے کہا تھا کہ وہ میرے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے ہے تا کہ کوئی مجھ سے زبردستی شیرز نہ چھین لے۔“

”آآ آ..... میں نے جھوٹ بولا تھا۔“ زمر نے شانے اچکائے۔ ”اس کاغذ کی رو سے آپ نوشیر وال کاردار کے علاوہ کسی بورڈ ممبر کو وہ شیرز نہیں بچ سکتیں۔ اور نوشیر وال کو بھی آپ ان کی مرضی کی قیمت پر بچیں گی۔ آپ اپنی مرضی سے وہ شیرز نہیں فروخت کر سکتیں۔“

نوشیر وال نے چوک کر زمر کو دیکھا۔ خود علیشا بھی متھیر کھڑی رہ گئی۔

”اوہ یہ شرط کچپنی کے باقی لازم کے سکیشن 18 کی شق (B) کے عین مطابق ہے۔ آپ ہاشم کو وہ بچ ہی نہیں سکتیں۔“ یہی لکار کر بینھی وہ قلم دو انگلیوں میں گھماتی، اٹیناں سے کہ رہی تھی۔ نوشیر وال کے چہرے کی رنگت واپس آئنے لگی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ علیشا نے سرمنی آنکھوں بے بسی بھرے زمر کو دیکھا۔ ”آپ نے مجھے مس کا بیٹھ کیا۔ کیوں مسز زمر؟“

”یونکہ میں آپ کی نہیں، نوشیر وال کاردار کی وکیل ہوں۔ آپ کو دولت کمانی ہے علیشا تو آپ کو کام کرنا ہو گا۔ دنیا کا کوئی کاروبار ایسا نہیں ہے جو انسان کو بھاکر کھلا سکے۔ آپ نوشیر وال کا گفت یوں اڑ انہیں سکتیں۔“ پھر چہرہ گھما کر نوشیر وال کو دیکھا۔ ”چونکہ ہاشم نے علیشا کو کام کرنے کی اجازت دے دی ہے تو آپ اپنے بھائی سے صلح کر لیں۔ وہ آپ سے سب سے زیادہ مخلص اور وفادار ہے۔“

نوشیر وال اب پہلے سے بہتر نظر آنے لگا تھا۔ گردن دوبارہ اکڑ گئی تھی۔ ”میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔“

وہ چھڑی ڈال کر پانی کی گہرائی دیکھ چکی تھی، سو علیشا سے مخاطب ہوئی۔ ”نوشیر وال کے ساتھ کام کریں اور مپنی کو ترقی دلائیں۔ یہ

اہ احسان کا بدلہ ہو گا جو اس نے آپ پر کیا ہے۔“

مگر اس فیری میں صحت سے وہ دونوں بے زار تھے۔ مختلف سمتوں میں رخ کئے وہ ذہن میں اپنے تحفظ اور اپنی بقا کے تابعے میں رہے تھے۔ وہ جانے لگی تو علیشا کسی خیال سے جاگی۔

”مسز زمر“ کیا میں خینے سے مل سکتی ہوں؟“

”دنیں۔“ وہ یک لفظی جواب دے کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ علیشا چپ رہ گئی۔ وہ مسلسل اضطرابی انداز میں انگیاں مردراہی تھی۔

❖❖❖

کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے ..... مدعہ ہم کو انتقام سے ہے

کولبو پر سورج نے سنبری شربت انڈیل دیا تھا۔ سارا شہر نے میں نہا گیا تھا۔

فتح نے اپنے فلیٹ سے نکلتے وقت فون کان پر لگائے فکرمندی سے پوچھا۔ ”اس کینڈی والے شخص کا فون آن ہوا یا نہیں؟ میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ تم اس نمبر کو نظر میں رکھا۔“ اور پھر فون بند کر کے کار کی طرف بڑھ گیا۔

کینڈی کی پہاڑیوں کے بیچ، سڑک کنارے بنی کافی شاپ کے اندر کام احوال زمگرم ساتھا۔ پکن میں سعدی اپنے کھڑا برتن ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مڑک کو مزید سحر انگیز بنانے کے لئے خاص برتن بھی منگوائے تھے، خود باہر جانے کی غلطی وہ نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ کسی اسٹریٹ کیم کی زد میں آ گیا تو وہ لوگ اسے ڈھونڈ لیں گے وہ جانتا تھا۔

کام ختم کر کے وہ کونے میں آیا اور کامنی کا لیپ ناپ کھولا اور استول پر بیٹھ گیا۔ کی بورڈ پر دونوں ہاتھ رکھے وہ فیس بک اکاؤنٹ لاگ ان کرنے لگا۔ پھر آنکھیں حیرت سے سکڑیں۔ پا سورڈ نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ملک سا ہوا۔ پھر تی سے اس نے فیس بک بند کیا اور کپیوٹر آف کر دیا۔ اسے مزید امی کے اکاؤنٹ کو نہیں کھولنا تھا۔ کسی کو پہنچ چل گیا تھا کہ وہ اکاؤنٹ کھول رہا ہے اور یقیناً اس کے لئے کوئی جال پچھا کر کر گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ خینے ہو۔ مگر وہ خطرہ نہیں لے سکتا تھا۔

واپس کولبو میں آؤ تو کپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھے، کھٹا کھٹ ناپ کرتے ہوئے شخص نے فنی میں سرہلا یا۔

”وہ نمبرا بھی تک آن نہیں ہوا۔“

وہ حیر کے پیچھے آ کھڑا اور سوچتی نظرؤں سے اسکرین کو دیکھا۔ ”کیا آف نمبر کو ٹریں نہیں کیا جا سکتا؟“

”دنیں۔ جب تک وہ نمبر آن نہیں ہو گا، اس کو ٹریں نہیں کر سکتے۔ اب؟“ مڑک رسوایہ نظرؤں سے اس کا چڑھ دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”وہ کینڈی میں ہے، مجھے اس کا یقین ہے۔ ایسا کرو اس نمبر کو بھی چھوڑو۔ تم ایک اور کام کرو۔“ وہ آگے پیچھے ٹکلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

”کیا کروں؟ اتنے بڑے کینڈی میں ایک شخص کو ڈھونڈنا ناممکن ہے۔“

”ڈارک نیٹ پر اس کا پوسٹر دیکھا ہے ناتم نے؟ اس پر موجود انعامی رقم کا نصف دوں گا، اگر ہم نے اسے پکڑ لیا تو۔“

”مجھے یقین نہیں ہے۔ تم اس کو ڈھونڈ کر اسے گولی مار دو گے، مجھے معلوم ہے۔“ کپیوٹر اسکرین کی طرف واپس گھومتے اس نے نیکلی سے کہا تھا۔ ”اب بتاؤ کیسے ڈھونڈیں گے ہم اسے؟“

وہ سوچتے ہوئے بولے گا۔ ”وہ کہیں کسی محفوظ جگہ پناہ لئے ہوئے ہے۔ وہ خود کو محفوظ سمجھتا ہے اور اسی لئے باہر نہیں نکل رہا۔ ہم

اسے باہر کالیں گے۔“

”مگر کیسے؟“ اس نے چونک کرم کر دیکھا۔

”میرے اور تمہارے برعکس وہ ایک اچھا انسان ہے۔ حرم دل اور مہربان۔ ہم اس کی رحم دلی کو اس کے خلاف استعمال کریں گے۔ اگر وہ کچھ ایسا نہیں جو اس کے مہربان دل کو دہلا دے تو وہ باہر نکل آئے گا اور میں اسے جا لوں گا۔“

”یعنی کہ ہم اس کے لئے جاں بچھائیں گے۔ لیکن ایسا کیا ہو سکتا ہے جسے سن کر وہ نکل آئے؟“ اور مذکور دوبارہ اسکرین کو مایوسی سے دیکھا۔ ”وہ نہ راہی تک آن نہیں ہوا۔“

..... ♦ ♦ ♦ .....

دھیمی دھیمی چال سے ہم کو راہ گزر طے کرنی ہے ..... ناز تھا جن کو تیز روی پر منزل تک وہ آئے کم زمر گھر میں داخل ہوئی، چیزیں حسینہ کو پکڑائیں، اس کو مارکیٹ سے چند ادویات لانے کے لیے بھیجا اور خود اُنگ ہال میں چل آئی۔ حمدہ کر سی پیغمبر اور پرکنے بیٹھی تھی۔ چائے کے دو خالی گھر ساتھ رکھتے تھے اور وہ لیپ ٹاپ پر نظریں جماۓ بیٹھی تھیں۔

”بھائی نے ایک دفعہ فیس بک کھولا، پا سورڈ بلا ہواد کیک کراہی میں نہیں کھوئی۔ وہ جیسے پیچھے ہٹ گیا ہے۔“ وہ نہ آنکھوں سے اسکرین کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ سیم بھائی رات والے کپڑوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ قریب بیٹھا تھا۔ چہرے پر مایوسی تھی۔

”سیم اٹھو۔ ای اور بڑے ابا کو بلاو۔“

”کیوں پھچھو؟“ سیم نے اچنچھے سے اسے دیکھا۔

”کیونکہ ہمیں ایک فیملی میٹنگ کرنی ہے اسامہ یوسف۔“ تحکم سے کہہ کر وہ سربراہی کری کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ اسامہ ڈھیلا سا اٹھ گیا۔ حمدہ اسی طرح دل موس کر بیٹھی رہی۔

ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی، سوندرت گھر پر ہی تھیں۔ وہ آئیں اور فلکر مندی سے باری باری ان سب کے چہرے دیکھتے پہلی کری پر بیٹھیں۔ سیم ابا کی وہیل چیزیں بھی دھکیلتا لے آیا۔ پھر سلا نیڈنگ ڈور بند کر دیا۔

”مجھے آپ سب سے بات کرنی ہے۔“ وہ کری کی پشت پر دونوں ہاتھیلیاں جماۓ کہہ رہی تھی۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے، سو اسے خین کے زمزما گئے آئی، لیپ ٹاپ کے پاور بنن پانگلی رکھ کر اسے دبایا۔ اسکرین آف ہو گئی۔ حمدہ نے ہٹ بڑا کر اسے دیکھا۔

”زمر میں بھائی کے لاگ ان کا انتظار...“

”میں نے کہا، ہم ایک فیملی میٹنگ کرنے جا رہے ہیں، تو تمہیں متوجہ ہونا چاہیے۔ اگر تمہارا بھائی رابطہ نہیں کر رہا تو اس کی کوئی وجہ ہو گی۔“ وہ ڈپٹ کر بولی تو خین بے دلی سے سیدھی ہو کر بیٹھی۔

”کل رات آپ سب نے مجھا لازم دیا۔ نہیں بھا بھی، میری بات سنیں۔ یہ معاملے میں آپ لوگوں سے بہتر ڈیل کر سکتی ہوں، اور چاہے آپ مجھ سے بڑے ہوں، آپ کو ان معاملات میں میری بات ماننی ہوگی۔“ ندرت کو لوب کھونے سے پہلے ہی اس نے خاموش کر دیا۔

”فارس اور میں نے یہ سب چھپایا، اس لئے نہیں کہ ہمیں راز رکھنے کا شوق ہے بلکہ اس لئے کہ خطناک راز بم کی طرح ہوتے ہیں انہیں ہم اپنے ”اپنوں“ کے ہاتھوں میں اس لئے نہیں دیتے کہ ان کی ذرا سی لاپرواہی ان ہی پر کوئی مریجذی نہ لے آئے۔ مگر اب آپ لوگ جان ہی گئے ہیں تو نہیں۔“ باری باری سب کی طرف نظریں گھماتی، وہ دلوں کی انداز میں کہہ رہی تھی اور سب دھیان سے اسے سن رہے تھے۔

”کاردار عزالت دار لوگ ہیں۔ وہ کرپٹ ہیں، سب جانتے ہیں، مگر وہ قاتل ہیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔ ہم جانتے ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ ہم جانتے ہیں۔ جس دن وہ جان گئے، اس دن زمین ہمارے لئے ننگ ہو جائے گی، اس دن کو ابھی نہیں آنا چاہیے۔ کم از کم جب

ہمارا سعدی ہمارے پاس نہیں ہے، تب تک نہیں۔ اس لئے آپ سب دوبارہ ان الفاظ کو نہیں دھرا میں گے۔ ”اس کا لہجہ بھی ہے تھا۔“ کوئی اب اس بات کا ذکر نہیں کرے گا۔ کاردار زیکا کرچے ہیں، آپ جیسے جانتے ہی نہیں۔ وہ لوگ ہمارے فونز شیپ کر رہے ہوں ہماری کالزن رہے ہوں گے۔ کوئی بھی فون پر یا ایسے بھی کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرے گا۔ بلکہ ہر کال میں آپ یوں مایوسی کا اظہار میں گے کہ جیسے ہم ابھی تک سعدی کے بارے میں بے خبر ہیں۔ ابھی جنگ کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہم نے خود کو نارمل ظاہر کرنا ہے۔ اسامتہ میں سے اسکوں جاؤ گے بلا ناغ، اور بھا بھی آپ ایک گھنٹے کے لئے بھی رسیورانٹ سے غائب نہیں ہوں گی، کیونکہ ہماری ہر قل و حرکت پر وہ نظریں رکھے ہوں گے۔ ہمیں ان کو ”شک“ کا موقع نہیں دینا۔ ہمیں ان کو اپنی طرف سے پر سکون رکھنا ہے۔ سب نارمل ایکٹ کریں لے۔ بالآخر خاموش ہو کر اس نے سامنے بیٹھے حاضرین کو دیکھا۔ سب متفق تھے یا غیر متفق، سب بات مان چکے تھے۔ صرف ندرت کے لبوں سے نکلا۔ ”اور سعدی؟ اس کا کیا؟“ ان کی آواز تک کانپ گئی۔

زمرنے میز سے اپنا پرس اور سیل فون اٹھاتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”فارس سنجال لے گا۔“ اور دروازے کی طرف گئی۔

.....  
شاید وفا کے کھیل سے اکتا گیا تھا وہ ..... منزل کے پاس آکے جو رستہ بدلتا گیا  
صحابی پوری طرح دوپھر میں نہیں ڈھلی تھی مگر فاطمہ اختر کا آفس سورج کی کرنوں سے مکمل طور پر روشن تھا۔ وہ فائل ریک کے سامنے کھڑی سورج کر ایک ایک فولڈرز کا لاتی پھر فنی میں سرہلا کروپا پس رکھتی۔ دفتارستک پر مڑی۔ چوکھت میں احمد کھڑا تھا۔ فینی شرث اور کوٹ میں ملبوس، وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا۔ فاطمہ نے بھی مسکراتے ہوئے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”اور صحیح سویرے جناب الحشرف نے مجھے یہ اعزاز کیوں کر رکھنا؟“ وہ اپنی سیٹ پر تھکن سے گرتے ہوئے بولی۔ احر تیزی سے آگے آیا اور کری کھیچ کر بیٹھا۔

”مجھے معلوم ہے میں آج کل کسی کو وقت نہیں دے پا رہا۔ میری جاب..... بہت لطف ہوتی جا رہی ہے۔“

”تم کریں خاور سے بہتر غلام بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر وہ بیٹھ تھا۔“ احر کے چہرے پر سایہ سالہ رہا یہ مگر پھر سر جھٹک کر آگے کوہوا۔

”میں نے تمہیں خین یوسف کو یسری بیچ کر کرنے کے لئے کہا تھا۔“

”وہ کلین ہے احر۔ میں نے بہت ڈھونڈا، مجھے کچھ نہیں ملا۔“ فاطمہ نے شانے اچکائے۔

”کوئی بھی کلین نہیں ہوتا فاطمہ۔“ وہ زخمی سامکرایا، پھر اپنائیں اس کے سامنے رکھا۔ ”کل رات اس نے مجھے میتھ کیا کہ میں اسے سیوسعدی یوسف کا ایڈمن بنادوں۔“

”تو بنا دو۔ اس کے بھائی کے نام کا بیچ ہے وہ۔“

”بات یہ نہیں ہے۔“ وہ دبے دبے جوش سے بول رہا تھا۔ ”بات یہ ہے کہ میں نے پہلی دفعہ اس کی فیس بک پر فائل دیکھی ہے۔“

”میں کب کی دیکھی چکی ہوں، اس میں کچھ نہیں ہے۔“ وہ بے زار آگئی تھی۔

”اس میں واقعی کچھ نہیں ہے۔ مگر اس میں ”کوئی“ ہے۔“ کہہ کر اس نے اسکرین فاطمہ کے سامنے کھڑی کی۔ وہ اچنہبھے سے آگے ہوئی۔

”یہ ایک لڑکی ہے جمیر انام کی۔ اس نے اپنے بآپ کی پکیکو پر و فائل پکپکر کے طور پر لگا رکھا ہے۔ ایف واٹی آئی، یہ آدمی ایک بورڈ کا او۔

”سی پی تھا، اور اس کو جشن سکندر نے قتل کر دیا تھا، اسی ویڈیو کو سعدی اور میں نے.... استعمال کیا تھا۔“ فارس کا نام نہیں لے سکا۔ چپ ہو گیا۔

”اوے تو؟“

”تو یہ کہ اس کی بیٹی اور حنین یوسف فریضہ تھیں۔ سعدی نے مجھے کہا تھا، وہ ندامت لے کر اوس پی کے گھر گیا تھا جب اس کو وہ ہیں کیمہ ملا۔ وہ گلٹی تھا مگر کیوں؟ وہ تو کبھی اوسی پی سے نہیں ملا تھا۔ پہلی دفعہ ان کے گھر گیا تھا۔ جب یہ بات میں نے غازی اور مسز زمر کو بتائی تھی، چھوٹی لڑکی ساتھ بیٹھی تھی اور اس کی شکل عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ ایسا کیا تھا جس پر سعدی گلٹی تھا۔“

فاطمہ بالآخر دلچسپی سے آگے کوئی۔ ”مگر کیا؟“

”یہی جانے کے لئے میں نے اس لڑکی کا کاؤنٹ ہیک کیا۔“

”حنین کا؟“

”نہیں۔ وہ خطرناک ہے۔ میں نے اس حیرا کا کاؤنٹ ہیک کیا اور حنین سے اس کی گفتگو پڑھی۔ دو سال پرانی گفتگو۔ اور جانتی ہے۔ مجھے اس سے کیا معلوم ہوا؟“

”کیا؟“ فاطمہ سانس روکے سن رہی تھی۔

”اوی پی کی بڑی بیٹی کی ویڈیو کسی کے پاس تھی، انہوں نے حنین سے مدد مانگی، حنین نے کہا کہ انکل خود آکر مجھ سے کہیں۔ پھر انہوں نے لگتا ہے کہ کام ہو گیا۔ چند ماہ بعد حنین نے اس سے اس کے ابو کا نمبر مانگا اور کہا کہ وہ ان سے بات کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد حنین نے اس کو کوئی میسح نہیں کیا۔ سارے میسح اسی لڑکی کے ہیں۔ وہ گلکہ کر رہی ہے کہ حنین ابو کی وفات پر آئی بھی نہیں نہ تعریت کا فون کیا۔ حنین نے جواب نہیں دیا۔ وہ گلٹی تھی۔“

”مگر کس چیز پر؟“

”یہی میں نے سوچا۔ جس دن اس اوسی پی کو فون کیا گیا ہو گا، اسی دن ان کی موت ہوئی۔ حنین موت کی اصل وجہ سے واقع نہیں تھی۔ اس نے سمجھا کہ... کہ اس کی وجہ سے ہوا ہے یہ۔“

”تمہیں کیسے پتہ کہ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے؟“

”کیونکہ فاطمہ اس دن اس کا بورڈ کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ حنین مجھ سے کس بات پر چوتھی تھی؟ جب میں نے اس سے اس کے رزلٹ کا پوچھا۔ میں نے کہا تھا، آپ نے نقل مار کر تو ناپ نہیں کیا تھا کیا؟ فاطمہ... فاطمہ... اس نے نقل سے ہی ناپ کیا تھا۔ اس نے ویڈیو ہٹانے کے لئے اس لڑکی کے باپ سے کیا مانگا ہو گا؟ اس نے بعد میں انجیمنٹ نگ میں کیوں داخلہ نہیں لیا؟ وہ میرے منہ سے کون سا ذکر سن کر میری طرف سے ان سکیورٹیں کرنے لگی، آتنا کہ اس نے مجھے یہ تاثر دیا جیسے غازی کو میری شکایت لگا رہی ہو۔ وہ یہی راز چھپا رہی ہے۔“ اس نے ایک سانچھت سے میز پر ہاتھ مارا۔

”اتی جھوٹی اور چالاک لڑکی میں نے پہلی دفعہ کہی ہے۔“ فاطمہ نے جھر جھری لی۔ مسٹری حل ہو گئی تھی۔

”میں نے کہا تھا، کوئی بھی کلین نہیں ہوتا۔“ مسکرا کر قطیعت سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فاطمہ نے ایک دم چوک کر سراخھا یا۔

”لیکن تم ان کی فیلمی کے دوست ہو۔ اس راز کا کیا کرو گے؟ یہ تو بے کار ہے تمہارے لئے۔“ وہ جو ایک پرzel حل کر کے فاتح اور مطمئن سا اٹھ رہا تھا، جاتے رک کر اسے دیکھا اور پھر زخمی سامسکرایا۔

”ہر راز کی قیمت ہوتی ہے فاطمہ۔ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح وہ ہمارے کام آسکتا ہے۔ ویک اینڈ پر ملتے ہیں۔“ چاہیوں والا ہاتھ ہلا کر وہ باہر نکل گیا اور فاطمہ سوچتی رہ گئی۔

راہ و فا میں ہر سو کا نئے، ڈھوپ زیادہ سائے کم ..... لیکن اس پر چلنے والے خوش ہی رہے پچھتائے کم  
سعدی یوسف کو اس کافی شاپ میں کام کرتے چوتھاروزہ ہونے کو آیا تھا۔ بوڑھے سنہالی روپا سنگھی نے ابھی تک اپنا نمبر آن نہیں  
لیا تھا۔

وہ پچھو دن میں کولمبوجا کر خود سے اس معاہلے کی تحقیق کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کامنی سعدی کے کام سے خوش تھی اور چار دن میں اس  
نے دیکھا تھا کہ چار پانچ لوگ پلٹ کر آئے تھے اور اپنے سماں تھے مزید مہمان بھی لائے تھے۔ کامنی کا بینا اسی طرح خاموش سا کوئے میں بینھ کر  
سب کو دیکھتا رہتا تھا۔

اس صحیح سعدی پکن میں کھڑا برتن ڈش واشر میں سیٹ کر رہا تھا جب اسے کامنی کی آواز سنائی دی۔  
”یہ تو منچو جتنا ہے۔“ سعدی ہاتھ پوچھتا باہر آیا تو دیکھا، وہ گردن اوپنی کئے، ایک ہاتھ کمر پر کھڑی افسر دگی سے ٹی وی دیکھے  
رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“  
”کینڈی میں بم بلاست ہوا ہے۔“ کامنی نے مڑے بغیر کہا۔ سعدی کی نظریں ٹی وی تک گئیں۔ ”تم نے نہیں دیکھا؟ صحیح سے یہ  
خبر چینل پر چل رہی ہے۔ غیر صدقہ اطلاع ہے کہ ایک عورت جاں بحق ہو گئی ہے، اور اس کا بچہ زخمی ہے۔ ہسپتال والے اس کا علاج نہیں کر  
رہے کیونکہ وہ غیر قانونی ہے۔“

”غیر قانونی“ لفظ پر سعدی نظریں چراتا اندر کو مژرا جب وہ بولی۔  
”بے چاری فلپین عورتیں۔ نوکری کے لئے کتنے دھنے کھاتی ہیں۔ اور اس کے بچے کو کینسر ہے۔“ وہ ایک دم تھہر گیا۔ بالکل شل۔  
ساكت۔ پھر دھیرے سے مڑا۔ نگاہیں اٹھائیں۔ اسکرین پا سبکی زخمی تصویر نظر آ رہی تھی۔  
تصویر دیکھ کر اس کا سانس تھم گیا۔ وہ میری انجیو کا بچہ تھا۔

کافی شاپ کی اوپری منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک پنگ رکھا تھا۔ الماری کا دروازہ ششیتے کا بنا تھا۔ ایک طرف  
چھوٹا سا غسل خانہ تھا۔ کمرے میں کھڑکی نہ تھی۔ سعدی خاموش سا بیٹھ کے کنارے بیٹھا تھا۔ سوچیں دل و دماغ میں طوفان برپا کر رہی  
تھیں۔ شور ہی شور۔

پھر اس نے چہرہ اٹھایا اور الماری کے دروازے میں اپنا عکس دیکھا۔ ”استرا“ پھرے سر اور بڑھی شیو والا سعدی پر پیشان نظر آتا تھا۔  
”میری کا ہی بچہ ہے وہ میں بچپنا تھا۔ مگر وہ تو امریکہ میں زیر علاج تھا۔ یہاں کیسے آ گیا؟“  
آئینے میں اس کو اپنا عکس اسی طرح پنگ کنارے بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دھنٹا اس کے عقب میں... ایک اور عکس ابھرا۔ وہ ٹی شرٹ  
پہنے، کلین شیو اور گھنگریا لے با لوں والا سعدی تھا۔ پرانا سعدی۔

”تھیں کیسے پتہ کہ وہ امریکہ میں تھا؟“

”میری نے بتایا تھا۔“ بیٹھ کنارے بیٹھنے کے نے احتجاج کیا۔  
”میری نے تو یہ بھی کہا تھا کہ تم انڈیا میں ہو۔ میری کو خوب بھی معلوم نہ ہوا یہ کہ اس کا بینا ادھر ہی ہے۔ تم نے میری کو استعمال کر کے  
جیل توڑی، انہوں نے اس جرم کی پاداش میں میری اور اس کے بیٹے کو دھماکے میں حادثاتی موت کا شکار کرنا چاہا۔“  
”نہیں۔“ وہ فی میں سر ہلار ہا تھا۔ ”یہ ریپ ہے۔ وہ مجھے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ میری کا بچہ بالکل ٹھیک ہو گا اور خود میری بھی۔“  
”اوہ اگر ایسا نہ ہوا؟ اگر تمہاری وجہ سے وہ مر گئی ہو، اور اس کا بچہ آج بے یار و مددگار پڑا ہو تو پوچھ کس کی ہو گی، شفیع احر؟“ گھنگریا لے

بالوں والے کے نے طفراور ملامت سے پوچھا تھا۔

”میں اب تمہاری طرح نہیں رہا۔ میں بدل گیا ہوں۔ میں نہیں جاؤں گا۔ یہ فسح کا کوئی پلان ہے۔“ وہ دباد بسا چیخنا تھا۔

”لوگ نہیں بدلا کرتے۔ تم بھی نہیں بدلتے۔“

”شفع....“ دروازہ کھٹکا تو وہ چونکا۔ چوکھٹ میں کامنی کھڑی تھی۔

سعدی نے چوک کر آئینے میں دیکھا۔ وہ عکس اب غائب ہو چکا تھا۔ وہ بہاں تھا تھا۔

”یخچ آجائے گا۔ یہ آئئے ہیں۔“ وہ پلنگی جب اس نے اٹھتے ہوئے پکارا۔

”کامنی تھی۔“ وہ ٹھہر کر مژدی اور استہفا میہ نظر دوں سے اسے دیکھا۔

”اگر..... ممکن ہو..... ہو سکتا ہے کہ یہ ممکن ہو کہ کوئی دوسرا انسان مشکل میں ہو، اور اس کو بچانے کے لئے آپ کو اپنی جان خطر۔

میں ڈالنی پڑے تو انسان کو کیا کرنا چاہیے؟“

”انسان کو وہ کرنا چاہیے جس کی وجہ سے وہ ”انسان“ کہلاتا ہے، کیونکہ اگر وہ انسانیت نہیں دکھائے گا، خطرہ نہیں لے گا، تو وہ یہاں

انسان ہوا؟ میں نہیں جانتی تھیں مگر تمہارے لئے خطرہ مول لیا تا۔ اب فائدہ ہی اٹھا رہی ہوں نا۔“ نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہہ کر۔

مژدی اور سعدی یوسف کا دل ایک دم بلکا چکلا ہو گیا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میری کے بیٹے کو ڈھونڈنے جائے گا۔ بھلے آگے کچھ بھی ہو۔

..... ♦♦♦ .....

تیرے نفعے تیری باتیں نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی ..... ہمیں یہ چاندنی راتیں نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی  
اس صبح بزرگیوں سے ڈھکے بیگلے میں اپنے کمرے میں بیٹھیں، بیڈ کراؤں سے نیک لگائے، گھٹنوں پر کمل ڈالے، ست روی۔  
موباکل اسکرین پر انگلی پھیر رہی تھی۔ بال پونی میں بند ہے تھے اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔ ان دو دنوں میں نفارس کا کوئی فون آیا۔ نہ سعدی  
نے اسی کا اکاؤنٹ لاگ ان کیا۔ اب وہ اسے کہاں ڈھونڈے؟ اس نے بھائی کا گروپ ہولا جہاں کی وہ خود بھی مبترھی، بلکہ اسی کو توبھائی۔  
ادھر کا ایڈسون بنا رکھا تھا اور خود وہاں اپنی قرآن میں تدبیر کی ویڈیو پوسٹ کرتا تھا۔ وہ کچھ دریا اس کی پرانی ویڈیو زدیکھتی رہی۔ پھر گردہ ل  
وال چیک کی۔ لوگ اب بھی قرآنی آیات، پیغمبر اور اپنے اپنے تدریپوسٹ کرتے تھے مگر سعدی والی بات کہاں تھی؟ وہ بے دلی سے وال نہ  
کرتی تھی۔ فتحتہ حکمی۔ آنکھیں حیرت سے چھلیں۔

”ندرت ڈولفقار یوسف نے Ronald Weasley کو گروپ ممبر بنانے کی درخواست قبول کر لی ہے۔“ یہ ایک نہ  
تھی۔ اطلاع تھی۔

یعنی ایک شخص جس نے اپنا نام روٹلڈ رکھا ہوا تھا، اس نے اس گروپ میں داخلے کی درخواست بھیجی اور اسے ندرت نے بطور ایڈسون  
قبول کر کے اسے گروپ میں داخل کر لیا۔ حینہن بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ پرسوں کی اطلاع تھی۔ پاسورڈ بدلنے سے بھی پہلے ندرت یوسف ل  
آئی تھی یہ کام کر پچھی تھی۔ سعدی ایک دفعہ زمر کے موک نارکل میں روٹلڈ ویزی (ہیری پورٹر کا ایک کردار) بناتا۔ ندرت تو اس گروپ کو ہبہ  
بھی نہیں کرتی تھیں، کجا کہ داخلے کی درخواست قبول یا رد کرنا۔ دوسرے ایڈ منزیری کام کرتے تھے۔

دو دن سے وہ روٹلڈ ویزی چند آیات پوسٹ کرتا تھا۔ سورۃ النمل کی اور ان کے بارے میں اپنے ”ریفلیکشن“ لکھتا تھا۔ اسے اس  
نے خاص توجہ نہیں دی تھی۔ دو چار لاکھ آگئے اور دو تین ”سبحان اللہ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ“ لکھ کر لوگ آگے بڑھ گئے، مگر حینہن نہیں بڑھ سکی۔ وہ دیں نہ  
گئی۔ بالکل ساکت و جامد۔

وہ آئی ڈی گویا خالی تھی۔ کچھ بھی نہ تھا اس میں۔ وہ اسے صرف گروپ میں پوست کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ سورۃ النمل کی تقریباً آدمی آیات اس نے لکھ دی تھیں، پھر رک گیا تھا۔ شاید اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ شاید وہ اب قرآن نہیں پڑھ پا رہا تھا۔ وہ اس کا ایک انداز پہچانتی تھی۔ وہ اس کا بھائی تھا۔

حنین نے نم آنکھوں کے ساتھ اسکرین کو چھوڑا۔ اس نے پروفائل پکھر میں گلاب کا پھول لگا رکھا تھا جس کا سرخ خون بہہ رہا تھا۔ انسان جس بھی حالت میں ہو، قید ہوئی آزاد ہوؤہ اپنی عادتیں نہیں چھوڑ سکتا تھا، وہ بھی خود کو بیان کرنے کے انوکھے طریقے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ انسان جس بھی حالت میں ہو، قید ہوئی آزاد ہوؤہ اپنی عادتیں نہیں چھوڑ سکتا تھا، وہ بھی خود کو بیان کرنے کے انوکھے طریقے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میمونہ کی کال آرہی سرخ خون گرا تا گلاب۔ اس ایک تصویر نے ہر شے کی عکاسی کر دی تھی۔ ایکدم اسکرین پر ایک نمبر جعلی بھجھنے لگا۔ میمونہ کی کال آرہی تھی۔ حنین نے آنکھیں صاف کر کے فون کان سے لگایا۔ وہ اس کی "نمہبیان" تھی۔ اس کو وہ روز پورٹ کرتی تھی کہ آج اس نے کتنی نمازیں پڑھیں اور ماہ کامل کی صحیح سے ان کی تعداد پائی تھی۔ کل کی بھی پائی تھیں۔ اس نے بہت ادب سے پچھلے دن کی رپورٹ پیش کی۔ "اللہ تھیں اپنی نماز کی حفاظت کرنے والی اور ان پر دوام اختیار کرنے والی بنائے۔ آمین۔" میمونہ نے فوراً سے دعا دی، پھر پوچھنے

گلی۔ "اور تم اپنا قرآن کس وقت دھراتی ہو؟"

"بھی؟" وہ بالکل دم بخود رہ گئی، پھر خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "میں حافظ قرآن نہیں ہوں، صرف چند سیپارے کئے تھے۔"

"حنین ہر مسلمان حافظ قرآن ہوتا ہے اگر اس نے ایک آیت بھی حفظ کر رکھی ہو۔ چاہے صرف سورۃ فاتحہ چاہے آخری چند سورتیں۔ کچھ بھی اگر اس نے یاد کیا ہے کبھی تو وہ اسے ساری زندگی "نبھانا" پرے گا۔ تم "نبھا" رہی ہو؟"

وہ چپ ہو گئی۔ میمونہ چند لمحے اس کے سامنوں کی اواز سننی رہی۔

"میں نے بہت سے مسلمان دیکھے ہیں جو قرآن یاد کر کے بھول جاتے ہیں۔ پھر ان کی زندگیاں حقیقی سکون سے محروم ہو جاتی ہیں۔ ہبھی تو اون کھو دیتے ہیں، کچھ ذلیل و رسوا ہوتے ہیں، کچھ دوسروں کے مقابح ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کو مسلمانوں کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ بھی حفاظت کی کیلگری میں آگئے ہیں اگرچہ انہوں نے صرف کبھی الناس اور الفلق ہی یاد کی ہو۔"

"تو پھر ایسے لوگ کیا کریں؟" وہ بے چینی سے بولی۔

"وہ دو باتیں ذہن میں پکی بٹھالیں۔ پہلی یہ کہ انہیں دنیا اور آخرت کا سارا سکون اور کامیابی تب تک نہیں ملے گی جب تک وہ واپس اس قرآن کو یاد نہیں کر سیں گے۔ اور دوسرا یہ، اگر انہیں لگتا ہے کہ عمر بڑھنے اور مصروفیات کی زیادتی کے باعث وہ اب آکر قرآن حفظ نہیں کر سکتے تو وہ غلط ہیں۔ قرآن ستر سال کی عمر میں بھی حفظ کیا جاسکتا ہے اگر بندے کے دل میں اللہ کی شعیت ہو۔"

"مجھ سے اب نہیں ہو گا۔" اس نے خود ہی طے کر لیا تھا۔

"ہو گا نہیں حنین، کرنا پڑے گا۔ آہستہ آہستہ شروع کرو۔ اللہ کہتا ہے تا کہ" اس کو یاد کروانا ہمارے ذمے ہے۔ "اور یہ کہ" ہم اسے آپ کو ایسے پڑھا دیں گے کہ پھر آپ نہیں بھولیں گے۔" تم شروع کرو گی دوبارہ حفظ کرنا اور اسے مکمل اللہ تعالیٰ کروائے گا۔" میمونہ بہت سلیمانی ہوئی اچھی لڑکی تھی۔ سی محمد اری کی باتیں کرتی تھی۔ مگر اتنی اچھی باتیں کر لیتی ہوگی، اُنہے کو پہلی دفعہ پتہ چلا تھا۔ اس کے دل میں امیدی بندھی۔

"او کے میں کوشش کروں گی۔"

"اور کس وقت کرو گی؟" وہ جیران ہوئی۔

"وقت ہی تو اہم ہے۔ کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا کہ" بے شک رات کا اٹھنا (تجدد میں اٹھنا) زیادہ شدید ہے نفس کو قابو کرنے کے لئے اور کلام پاک کو پڑھنے کے لئے۔ بے شک دن میں آپ کے لئے مصروفیات ہیں طویل۔"

"اسی لئے... قرآن فجر کے وقت ضرور پڑھنا چاہیے؟ منہ اندھیرے؟"

”حفظ کا تو وقت وہی ہوتا ہے۔ کیا تم نے وہ قول سنائے کہ حفظ کا بہترین وقت ہجد کا ہے، مطالعے کے لئے صحیح کا وقت، لکھنے کے لئے دن کا وقت اور بحث و مباحثے کے لئے شام کا وقت۔“

”اچھا۔“ وہ منجب ہوئی۔ پھر بولی۔ ”اوکے۔ میں روز صحیح نجمر کے وقت اپنا قرآن دھراوں گی۔“

”اور تمہیں کس نے یہ کہا ہے کہ قرآن صرف صفحے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر کے دھرا لینے سے یاد ہو جاتا ہے؟“ میمونہ زمی سے سوال پوچھتی تھی، تو کتنی کم تھی، مگر جنین چپ سی ہو جاتی تھی۔

”پھر کیسے یاد ہوتا ہے؟“

”قرآن یاد ہوتا ہے کسی انسان کو روز سنانے سے، اور پکا ہوتا ہے نماز میں روز اللہ کو سنانے سے۔ خود سے خالی خولی دھرا لینے سے پھر یاد نہیں ہو جاتا۔ تم یوں کرو روز کا سبق اور پچھلا سبق مجھے نجمر پر سنا دیا کرو۔“ وہ دو چھوٹے بچوں کی ماں تھی، پھر بھی یوں کہہ رہی تھی گویا سبق سننا اس کے لئے مسئلہ ہی نہ ہو۔

”اوکے، میں نے آخری دس پارے کئے تھے یاد۔ پھر کل میں اکیسویں سیپارے سے سناؤں گی۔“ وہ بھی جانے کیوں پر جوش ہو گئی تھی۔

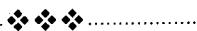
”اور جنین، جب حافظِ قرآن اپنا قرآن بھول جاتے ہیں تو وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ قرآن اول پارے سے نہیں یاد کیا جاتا، آندر سے کیا جاتا ہے۔ تم کل مجھے صرف الناس اور الفلق سناؤ گی۔“ وہ سارے فیصلے خود ہی کر رہی تھی، مگر اچھی بات ہے۔ کچھ باتوں کے لئے ہمیں خود پختخی کروانی پڑتی ہے۔

”اوکے، کل سے میں الناس سے شروع کروں گی۔“ پھر ٹھہر کر بولی۔ ”میمونہ باہی ہو سکتا ہے میں.... اصل میں میرا بھائی.... وہ نہیں ہے اور میں پریشان رہتی ہوں، تو کبھی ہو سکتا ہے سبق نہ کر سکوں تو....“

”تمہیں پتہ ہے لوگ مجھ سے اکثر پوچھ لیتے ہیں.... میں سائیکلو جسٹ ہوں تا، تو وہ اکثر پوچھتے ہیں کہ ہم نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ قرآن بھی، پھر حاجتیں کیوں نہیں پوری ہوتیں؟ دولت اولاد اچھا رشتہ اچھی نوکری، عزت، یہ سب کیوں نہیں ملتا۔ میں کہتی ہوں، ان سب کے لئے قرآن اور نماز نہیں پڑھتے ہم۔ اور یہ سب نماز اور قرآن سے نہیں ملتا۔ یہ دعا سے ملتا ہے۔ دنیا کے سوا مجھے ارب انسانوں کے پاس خواہشات کی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے، مگر قرآن آپ کو وہ سب نہیں دے گا۔ قرآن آپ کو وہ دے گا جس کے لئے آپ یہ سب چاہتے ہیں۔ سکون اور برکت۔ میں لوگوں سے کہتی ہوں، قرآن حفظ کرنا شروع کر دیں، روز کی ایک آیت کریں، آپ سوچ نہیں سکتے آپ کی زندگی کتنی ہا برکت ہو جائے گی۔ جنین تم حفظ شروع کر، پہلے تو بڑوں کی زبردستی پر کیا تھام نے حفظ اب دل سے کرو گی تو دیکھو گی کہ تمہاری گھر میں وہ برکت اور وہ نور آگیا ہے جس کے لئے لوگ مال اولاد خوبصورتی، امتیش طاقت سب ہو کر بھی ترستے ہیں۔ تمہاری زندگی ”بابرکت“ ہو جائے گی۔ تم آنکھیں بند کر کے میری بات پر یقین کرلو۔ میں تجربے سے کہہ رہی ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”یعنی اب میں پریشان نہیں ہو اکروں گی۔“

”ہو گی بھی تو قرآن تمہیں دل اسادے دے گا۔“ اور یہ تیلی جنین کے لئے کافی تھی۔ ان گزرے چار دنوں میں پہلی دفعہ وہ خود کہ پر سکون محسوس کرنے لگی تھی۔



خفا اگرچہ ہمیشہ ہوئے مگر اب کے ..... وہ برہی ہے کہ ہم سے انہیں گلے بھی نہیں  
وہ ہسپتال جہاں میری کاچھہ مبینہ طور پر داخل تھا، کافی شاپ سے تیس پیشیں منٹ کی ڈرائیور پر تھا۔ وہ اس سے ذرا درمیک نک —

اڑیگیا تھا۔ نقشہ ذہن شین کر کے نکلا تھا۔ سر پ پی کیپ پینے و محتاط نظر دوں سے اطراف کا جائزہ لیتا چل رہا تھا۔ ہستال پہاڑی پ اونچائی کی طرف تھا۔ وہ سڑک کی بجائے دوسری طرف سے پہاڑی پ چڑھنے لگا تھا۔ گوکر وہ میری انجو کے لئے فکر مند تھا مگر وہ محتاط بھی تھا۔ وہ شام کا وقت تھا۔ دور چائے کے باغات سے آتی سونہ میں مہک نے سر بزر پہاڑیوں کو مزید حسر انگیز بنادیا تھا۔ کہیں کہیں بادل گرنے اور بجلی چمکنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ایسے میں وہ خاردار اور دشوار ڈھلان پ اپنے جو گرذ کی مدد سے چڑھتا جا رہا تھا۔ ذرا اوپر جائی پ آ کر اسے سر جھنک دیا۔ اسے کامنی کی بات پ عمل کرنا تھا۔ انسان کو انسان کے لئے خطرے مول لینے ہوتے ہیں۔ اگر وہ آج لیکن سعدی نے سر جھنک دیا۔ اسے کامنی کی بات پ عمل کرنا تھا۔ انسان کو انسان کے لئے خطرے مول لینے ہوتے ہیں۔ اگر وہ آج نہیں گیا تو ساری عمر پچھتا نے گا، اور پہلے زندگی میں پچھتا وے کم تھے جو مزید بوجھا گھانتا؟ کامنی نے بھی تو اس کے لئے خطرہ مول لیا تھا۔

اور یکدم کسی نے جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی تھار برف سعدی کے اوپر گردی۔ ایک خیال نے اسے مخدود کر دیا۔ وہ بالکل ٹھہر گیا۔

لیکن کامنی تو غلط تھی! وہ کوئی ناکام عاشق تو نہیں تھا۔ وہ تو جھوٹی کہانی تھی۔ وہ ایک قاتل تھا اور ان کو دھوکہ دے رہا تھا۔ وہ ایک دم چونکا۔ کامنی نے غلط کیا تھا۔ وہ بھی غلط کر رہا تھا۔

ایک دم سے ساری تصویر اس کے اوپر واضح ہو گئی۔ کیبل نیٹ ورک میں سے کسی کو خرید کر ایک پٹی چلا اور بار بار ایک تصویر کھانا کیا مشکل تھا؟ فصح جیسے لوگ توئی وی چینلز کو خرید سکتے تھے یہ سب تو بہت آسان تھا۔

وہ ایک دم تیزی سے پلٹا اور سب قدموں سے ڈھلان اترنے لگا۔ تیز، مزید تیز۔ یہاں تک کہ اس کا سانس بے ترتیب ہونے لگا مگر رفتار بڑھتی گئی۔ یہ سب ایک پھنڈا تھا، وہ جان گیا تھا۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا اور اب اسے جلد از جلد وہاں سے لکھنا تھا۔

وہ پہاڑی سے اتر کر سڑک پ پ آ گیا اور سر جھکائے۔ نیز تیز چلنے لگا مگر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اس نے مڑک دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ مگر کوئی تھا۔ سعدی کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ وہ مزید تیز چلنے لگا۔ اس کی حساسیت اب پہلے سے کہیں تیز ہو چکی تھی۔ کوئی اس کے عقب میں تھا۔ فاصلے سے اس کا پیچھا کر رہا تھا مگر سعدی اس کو دیکھنیں پا رہا تھا۔

جلد ہی بازار کا رش والا حصہ شروع ہو گیا۔ وہ اب تیزی سے لوگوں کے درمیان راستہ بناتا، قریباً بھاگنے لگا تھا۔ مگر کوئی مسلسل اس کے تعاقب میں تھا، سعدی یوسف کی چھٹی حس بار بار سرخ ٹکنگل بخار ہی تھی اور اس کے سینے میں دھڑ کتے دل کی رفتار بے قابو ہو رہی تھی۔

ایک گلی کا موڑ مڑ کر وہ ایک دم بھاگنے لگا۔ اندھا دھنڈ۔ آگے پیچھے کے لوگوں کو باتھے سے پرے ہٹاتا، وہ بے قابو تھس اور سفید پڑے چہرے کے ساتھ دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ دیکھ لیا گیا ہے، وہ پکڑ لیا گیا ہے، یہ خیال جان لیا تھا۔

بازار کی حدود سے وہ نکلا تو ایک کالونی شروع ہو گئی جیسے مری میں ہوتی ہیں۔ اوپنی پنجی ڈھلان والی سڑک۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھا بھاگ رہا تھا، دفتہ احساس ہوا کہ پیچھے اب کوئی نہیں ہے۔ وہ گلی میں تہا تھا۔ شام ڈھلتی جا رہی تھی۔ مغرب کی نیلا ہٹ گہری ہو رہی تھی۔ ایسے میں وہ رک کر پیچھے دیکھنے لگا۔ اسٹریٹ میں سکون تھا۔ سکوت۔ سب ٹھیک تھا۔ سرخ الارم بند ہو گیا تھا۔ اس کا تعاقب کاراب وہاں نہیں تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ واپس مڑا تو کسی نے زور سے اس کے منہ پر مکاڈے مارا۔ سعدی دھرا ہو کر نیچ گو گرا۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ پھر میں سڑک پہاڑ کر کر اس نے سر اٹھانا چاہا۔ تعاقب کار کے جو گرزاںے صاف نظر آرہے تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ پاتا، اس شخص نے یکے بعد دیگرے بوٹ اور مکے سے دو تین ضربیں رسید کیں۔ چند لمحوں کے لئے سعدی یوسف کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہر شے ہر احساس، سن ہو کر رہ گیا جیسے ساری دنیا ختم ہو گئی تھی۔ جیسے موت آن پیچی تھی.... اور وہ ایک بے حس و حرکت لاش بن چکا تھا۔ اسے اتنا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھیں بند اور گردن ڈھکلی ہوئی ہے۔ اور کوئی اسے کندھوں سے پکڑ کر گھینٹا ہوا ایک طرف لے

کر جا رہا ہے۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ بارش کی بوندیں پہنچ پہ برس رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں پر بادلوں سے برسنی نہیں پڑی تو ہم کی تاریکی چھٹنے لگی۔ تعاقب کار نے سعدی کو درختوں کے ایک جھنڈ سے گزار کر کچی زمین اور گھاس پر ایک طرف لا پھینکا تھا۔ سامنے ایک جھیل تھی، گھپ اندر ہیرے میں وہ جگہ کینڈی کی درجنوں جھیلوں کی طرح سنان پڑی تھی۔ تکلیف کے باوجود سعدی نے جیب میں ہاتھ دالتے تیزی سے اٹھنا چاہا۔ مگر.... جیب خالی تھی۔

”کیا تم اس بستول کو ڈھونڈ رہے ہو سعدی یوسف؟“ وہ جو گھنٹوں کے مل زمین پر ہتھیار کے اٹھنے لگا تھا، اپنے سامنے اس کی بستول لہانے پر.... وہ بالکل ٹھہر گیا۔ مجدد ہو گیا۔ اور پھر اس نے شکست سے سرگرا دیا۔ اسی طرح زمین پر گرے ہوئے جھکے ہوئے گھرے گھرے سانس لیتا۔ وہ گویا ڈھنڈھے چکا تھا۔ وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔

”تو کیا لگا تھا تمہیں؟ میرے ساتھ یہ گیمز کھیل کر تم چھپ جاؤ گے؟ تمہیں لگا میں تمہیں نہیں ڈھونڈ سکوں گا۔“ غصے سے بولتے اس نے سعدی کے اس کندھے پر بوٹ مارا۔ جس پر نوشید والے گولی ماری تھی۔ درد کی ایک لہر انھی تھی جسے دبانے کو اس نے دانت پیتے ہوئے سر مزید نہیں واڑ دیا۔

”تمہیں معلوم ہے میرے لئے کیبل نیٹ ورک پر ایک خبر چلانا کتنا آسان تھا؟ تمہیں واقعی لگا میں تمہیں تمہارے ہول سے نہیں نکال سکتا؟“ وہ اس کے گرد طواف میں گھومتے ہوئے کہہ رہا تھا، اور بات ختم کر کے اس نے زور سے اس کی ناٹک پر بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ بالکل وہاں جہاں شیر و نے گولی ماری تھی۔ سعدی کراہ کر مزید ہرا ہو گیا۔ بارش اسی طرح بلکل بسلی برس رہی تھی۔

”پھر بھی مجھے لگا تم نہیں آؤ گے۔ مجھے اپنی تلاش میں مزید خوار کرو گے۔ مگر نہیں... میری ابجیو اور اس کا بچہ تمہارے لئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ ان کے لئے تم آئے۔“ اور پھر اس کی کمرپہ بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ وہ گھنٹوں کے مل زمین پر بیٹھا تھا، اس ٹھوکر پر درد سے مزید آگے کو جھک گیا، مگر اس نے کوئی مراحت نہیں کی۔ بس ہتھیلوں سے زمین پر ریکھنے لگا۔ بمشکل چند دقائق آگے بڑھ پایا کہ....

”میں لکنا خوار ہو اتھاری تلاش میں اور تم۔ یہاں کینڈی میں چھپے بیٹھے ہو۔ تمہیں واقعی لگا کہ تم مجھے سے چھپ سکتے ہو؟“ اس نے سعدی کو گردن سے پکڑ کر آگے کھینچا اور جھیل کے پانی میں اس کا چڑھہ ڈبودیا۔ ساتھ ہی وہ غصے سے بولتا جا رہا تھا۔ ”تمہیں لگا میں تمہارے پیچے نہیں آؤں گا؟ تمہیں لگا تم یوں چھپ کر بیٹھ جاؤ گے اور سب صحیح ہو جائے گا؟ بزدل انسان۔“

اسے زور کی ڈیکی دے کر اس نے اس کا سرنکالا اور چھوڑ کر سامنے جا کھڑا ہوا۔ سعدی نے کوئی مراحت نہیں کی۔ بس گیلا چڑھہ اور پر کر کے آنکھیں موندے گھرے گھرے سانس لینے لگا۔

”آٹھ ماہ... آٹھ ماہ میں نے... قید میں سوچا...“ سعدی نے نیم غنوہ سی آنکھیں کھول کر نقاہت سے سامنے افت پر ڈوبتے سورج کو دیکھ کر کہنا چاہا۔ ”کہ وہ لمحہ کیا ہو گا۔ جب ہم ملیں گے۔ مجھے لگا تھا... آپ مجھے گلے سے لگائیں گے، مگر... مگر آپ تو مجھے مار رہے ہیں، فارس ماموں!“

اور یہ کہنے کے ساتھ سعدی نے بھیل آنکھوں کا رخ پھیرا اور اسے دیکھا۔ جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جھیل کی طرف پشت کئے... اور سعدی کی طرف چڑھ کئے... وہ اس کے سامنے کھڑا تھا... جیز کے اوپر بھوری جیکٹ پہننے ہوئے تھا۔ بال اسی طرح چھوٹے تھے اور ماتھے پہ مل تھے... وہ اس کے سامنے کھڑا تھا... دونوں ہاتھ پہلوؤں پر رکھئے وہ سنہری آنکھوں میں شدید غصہ لئے اسے گھور رہا تھا... اندر ہیرے میں بھی اس کے چہرے کی رہی صاف دکھائی دیتی تھی... وہ اس کے سامنے کھڑا تھا... تڑ تڑ برستی پارش اس کو بھگوڑ رہی تھی... اس کے خفا چہرے پر پانی کے قطرے لڑھک رہے تھے۔

فارس غازی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیوں؟“ اس نے تکان سے فارس کا چہرہ دیکھ کر دھرا یا۔ ”آپ کیوں مجھے مار رہے ہیں؟“

اس بات پر فارس مڑ گیا، سعدی کی طرف کر کر لی اور پھر تیزی سے واپس گھوما اور زور کا مکا سعدی کے جبڑے پر دے مارا۔ ”کیونکہ تم اسی قابل ہو!“

یہ پہلی چوتھی جو بربی طرح سے لگی تھی۔ سعدی نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ کر چہرہ جھکا دیا۔ شدید درد سے آنکھیں بیٹھ لیں۔ پانی کے قطرے اسکے چہرے پر مسلسل گر رہے تھے اور بیوں سے خون رنسنے لگا تھا۔ بہت سا پانی آنکھوں میں بھی جمع ہو رہا تھا مگر ہر آنسو۔۔۔ اذیت کا آنسو نہیں ہوتا۔ نہ وہ خوشی کا ہوتا ہے نہ دعاوں کی قبولیت کا، نہ محبت کا، نہ شکوئے کا۔ وہ آنسو ہوتا ہے اور اسے بہنا ہوتا ہے۔

”میں سمجھا...“ سعدی نے چہرہ جھکائے۔ آستین سے مندر گڑا۔ ”فیض ہو گا۔“

”وہ تمہیں مجھ سے زیادہ نہیں جانتا۔ جو اسے معلوم ہوا ہمارا یوں نور سل رحم دل سعدی کس بات پر نکلے گا اپنے ہول سے۔“ طنز یہ سا وہ غرایا تھا۔ ”میری انجیو۔ اور اس کا بیٹا۔“ دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نے ”بہت ہو گیا“ والے انداز میں کہا۔ ”بس یہی دواہم لوگ رہ گئے تھے تمہاری زندگی میں جوان کے لئے نظر ہمول یعنی کوتیار ہو گئے۔ اور تمہارا خاندان؟ تمہاری ماں؟ تمہارے بہن بھائی؟ وہ سب جو تمہاری ایک کال کے لئے ترس رہے تھے، ان کا کیا؟ ہاں؟“ اور بات کے اختتام پر، فارس آگے آیا، اور اس کو گدی سے پکڑ کر سر کو نیچے جھکا کر گویا جھنجورا، پھر جھٹکے سے اسے چھوڑا۔ سعدی نے جھکا سر نہیں اٹھایا۔ آنسو اسکے چہرے پر لٹک رہے تھے۔ بارش کے قطروں جیسے آنسو۔

”بزدل انسان۔“ وہ اب اس کی جانب پشت کر کے اور جبھیں کی طرف چہرے کے دور جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ خفا تھا، وہ غصے میں تھا۔

”اگر کوئی چیز میں تمہیں بیچھے سکتا ہوں تو کیا یہ نہیں جان سکتا کہ تم وہاں سے بھاگ گئے ہو؟ کیا ایک پیغام نہیں چھوڑ سکتے تھے تم میرے لئے؟ ہزار طریقے تھے پیغام دینے کے مگر نہیں۔“ اس کی سنہری آنکھیں جو جبھیں کے پانی پر جبھی تھیں، ان میں دکھسا ابھرا۔ ”تمہیں لگا، فارس تمہارے لئے کبھی نہیں آئے گا۔“

سعدی نے گیلی آنکھیں اور گیلا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔ پہلو میں گردے دائیں ہاتھ کی پشت پر سعدی کا خون لگا تھا۔

”تمہیں مجھ سے امید ہی نہیں تھی کہ میں آؤں گا۔ تمہیں لگا ہی نہیں کہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تم نے سوچا اگر وہ آٹھ ماہ نہیں آیا تو اب کیا آئے گا؟ مگر جگ دھ جتنا ہے سعدی یوسف جسے معلوم ہوتا ہے کہ کب لڑنا ہے اور کب نہیں لڑنا۔“

سعدی گھنٹوں کے مل زمین پر بیٹھا تھا۔ گیلے پیچڑی والی زمین پر اب آہستہ سے اٹھا۔ انگ دکھ رہا تھا۔ مگر کراہ نہیں نکلی۔ ہر مار بری نہیں لگتی۔ کوئی اچھی بھی لگتی ہے۔ کوئی مار نے والا بھی اچھا لگتا ہے۔

”لیکن اگر تم میں اتنی عقل ہوتی تو میرے پاس آتے پہلے دن، مگر نہیں... تم کاردار ز کے پاس چلے گئے۔ ان کو نفرست کرنے۔ تمہیں مجھ سے امید ہی نہیں تھی سعدی۔“ وہ برہمی سے کھڑا رہا تھا۔ سعدی قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ سے خون ہنوز رس رہا تھا۔ وہ فارس کو دیکھ رہا تھا اور فارس ابر و بچخے ماتھے پر مل لئے سامنے جھیل پنے نظریں جائے ہوئے تھا۔

”پہلے بھی تم نے یہی کیا، ہر چیزا کیلئے کرنی چاہی۔ اور اب بھی تمہیں لگا کرم یوں...“

سعدی آگے بڑھا اور اس کے گلے گلے کرنا سکنے کندھے پر اپنی آنکھیں رکھ کر... رو نے لگا۔ جھوٹے بچوں کی طرح... آواز سے سسکیوں سے بچکیوں سے....

فارس کے الفاظ خود خود نوٹ گئے۔ اس کے ماتھے کے مل ڈھیلے ہوئے۔ لگا ہوں میں نزی سے ابھری۔ غصے کا ابال بخندنا ہوا۔ چند لمحے وہ اسی طرح کھڑا رہا، پھر ہلاکا سا اس کے کندھے کو تھپکا۔ اچھا بس ٹھیک ہے۔ آواز میں وہی ختنی تھی۔ پھر چہرے کو دوبارہ برہم بنالیا،

پیشانی کی سلوٹیں واپس لے آیا، اور اسے شانوں سے پکڑ کر پرے کیا۔

”اچھا۔ اب دور ہٹو۔ میری بیوی پہلے ہی مجھ پر ٹک کرتی ہے۔“ اکتا کر کہتا وہ مزگیا، سعدی کو اس کی آواز گلی گلی تھی، مگر اس نے فارس سے نظریں نہیں ملا گئیں۔ ملنا نہیں سکا۔ لیکن چھروں جھکائے، اپنی آنکھیں رگڑنے لگا۔ آنسو، بھی تک امداد کر آ رہے تھے اور وہ کہیں، ... سندر بن کے کسی گھنے جنگل میں.... بے خوف ہو کر.... کسی درخت تلنے پیٹھ کر.... ذہیر سار ارونا چاہتا تھا۔

❖❖❖

آہ یہ ظالم تھے حقیقت جتنے سفینے غرق ہوئے..... اکثر اپنی موج میں ڈوبے، طوفان سے ٹکرائے کم اس پر ٹھیش ریسٹورانٹ کے ماحول کو دھرم زرد تیوں نے پرسوں اور سحر انگیز بار کھا تھا۔ اس کا رزق نہیں پر کہ اسٹینڈ میں کھڑی تیوں موم بتیاں روش تھیں اور ان کے دونوں اطراف میں بیٹھے ہارون اور جواہرات ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کھانا بھی تک نہیں آیا تھا۔ جواہرات بیہاں کھانا کھانے نہیں آئی تھی۔

سلک کی سب قسمیں میں بالوں کو سمیت کر چھرے کے دائیں طرف ڈالے وہ گہرا میک اپ اور قیمتی گنیے پہنے ہوئے تھی۔ ہارون کا سوت گہرا نیلا تھا، اور سرمنی آنکھیں وہ بھی جواہرات پر ڈال لیتے بھی اپنے فون پر۔

”جو تمہاری مخالف کے ساتھ میں نے کروایا، اس پر تم نے شکریہ نہیں کہا۔“ مسکارے سے لدی آنکھوں سے اسے دیکھتی وہ گلہ کرنے

گلی۔

”میں نے تمہیں کچھ بھی کرنے کو نہیں کہا تھا۔“ جواہرات کے ابردا کٹھے ہوئے۔ آنکھوں میں بے چینی جھلکی۔ ”مگر میں نے تمہارا انتقام لیا اس سے۔ اس نے تمہاری....“

”جب میں نے تمہیں کہا ہی نہیں تو تم مجھے کیوں جتارہی ہو؟ تم نے جو کیا اپنے لئے کیا۔“ شانے اچکا کر انہوں نے گلاس تھے گھونٹ بھرا۔ جواہرات پیچھے ہو کر پیٹھی، اور سینے پر بازو لپیٹے، تیکھی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ ”تمہارا رویہ بدلا بدلا سا ہے۔“ ہارون نے گلاس کر کر سنجیدہ چھروں اس کی طرف موڑا۔

”تمہارا بیٹا میرے گھر میں گھس کر..... مجھے ہی دھمکی دے کر جاتا ہے اور تم کہتی ہو کہ میرا رو یہ بدل گیا ہے؟“ جواہرات کے تاثر زم پڑے وہ ہلاکا سماں کر کر ای۔ ”میں اس کے لئے مغدرت کر چکی ہوں۔ میں نے ہام کا ساتھ صرف اس لئے دیا تاکہ اس کو شک نہ ہو کہ سعدی کو مارنے کے لئے گارڈ کو ہم نے بھیجا تھا۔“

”ہم نے نہیں، تم نے بھیجا تھا۔ میں ان معاملوں میں شریک نہیں ہوں، صرف تمہارے لئے اپنے بندے پیش کر دیتا ہوں۔“ انہوں نے بخت سے انگلی اٹھا کر تنہیہ کی۔

”اچھا ٹھیک ہے، ہو گیا جو ہونا تھا۔“ اس کا انداز بھلانے کا ساتھا۔ زمی سے ان کے ہاتھ کو دبا کر بولی۔ ”اب وہ سب ماضی میں رہ گیا۔ کیوں ناہم اب مستقبل کی بات کریں۔“ ہارون نے ایک نظر اس کے انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ کو دیکھا جوان کے ہاتھ پر بہت لجاجت سے رکھا گیا تھا۔ پھر گہری سانس لے کر چھرے کی سلوٹیں ڈرا کم کیں۔

”مستقبل؟ تمہارے ساتھ مستقبل گزارنے کے لئے مجھے تمہارا اعتناد کمانا تھا جو تم بھیک میں بھی نہیں دیا کرتیں۔“

”کیا تمہیں لگتا ہے تم نے ابھی تک میرا اعتناد نہیں کیا؟“ وہ مسکرا کر بولی تو ہارون ذرا سماں کرائے۔ ”کیا میں نے کمالیا ہے؟“

”جس طرح تم نے اپنے بندے میرے لئے پیش کئے، میرا ساتھ دیا، اس... در در حیے مسئلے سے نپٹنے کے لئے... میرے دل میں تمہاری قدر مزید بڑھ گئی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ ہم ماضی کی ساری تلخیاں بھلا کر اپنے مستقبل کو تعمیر کریں۔“ زردوشیوں سے مزین پر

نسوں ماحول میں وہ آس پاس گلی محفل سے بے نیاز بے خبر، آنکھیں ان کی آنکھوں پہ جائے ہوئے تھی۔ ”میں چاہتی ہوں ہارون“ کہ میں اور نگزیرب کے دیے سارے زخموں کو اپنے دل سے ساتھ زندگی کا ایک نیا باب شروع کروں۔ ہم دونوں ”ایک“ بن کر اپنے ambitions کے لئے جدوجہد کریں۔ دولت، طاقت، اپنی ہرشے کو اکٹھا کر لیں، اور مل کر اپنے طبقے پر حکمرانی کریں۔ ”اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ہارون نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”اور تمہارے بیٹے؟“

”وہ کھلے ہوں کے ہیں۔ ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ میں اس مہینے کوئی اناوسہ نہیں کر دینی چاہیے تاکہ ہمارے حلقة احباب میں سب کو پتہ چل جائے کہ میں .... وہ جوش سے کہہ رہی تھی جب ...

”اور میرا اعتماد؟“ انہوں نے سکون سے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ملکہ بولتے بولتے رکی۔ ہارون پر ہمیں اس کی آنکھوں میں اچنجها اپھرا۔

”میرا اعتماد جواہرات؟ تم نے اسے کہا کیا ہے؟“

وہ یک نک اسے دیکھ گئی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

”جس عورت اپنے محبوب بیٹے سے جھوٹ بولے وہ قیدی جس کو اس نے اپنی امان میں لے رکھا تھا اس کو مردانے کی سازش کرے، جو اپنے شوہر سے شادی کے دوران بھی اپنے ایک کزن سے تعلق قائم رکھے، انکار مت کرنا کیونکہ بہت سے لوگ اس قصے سے بھی واقف ہیں۔ میں اس عورت پر کیسے اعتبار کر سکتا ہوں؟“

وہ بالکل پتھر ہوئی، بنا پلک چھپکے اسے دیکھ جاہی تھی۔ گویا ریت کا جسم ہے ہو۔ ہاتھ لگانے سے ڈھنے جائے گی۔

”تمہیں لگا تھا، میں تمہیں اپنالوں گا؟“ وہ اس کے قریب بھکے، اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”کیا تمہیں وہ وقت بھول گیا جب میں نے تمہیں پروپوز کیا تھا اور تم نے انکار کیا تھا؟ تم مجھے خود اس مقام تک لا کی تھی جہاں آکر میں تمہیں انگوٹھی پیش کر سکوں اور پھر جب میں نے کیا تو تم نے مجھے دھتکا دیا۔“ اس کے کان کے قریب وہ دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے اور وہ بالکل پتھر ہوئی سن رہی تھی۔

”میں نے تمہارا ساتھ تمہارا اعتماد کمانے کے لئے نہیں دیا، تمہیں اس مقام تک لانے کے لئے دیا تھا جہاں تم مجھے انگوٹھی پیش کر دا در میں تمہیں دھتکا رکھوں۔ اور تمہارا احسان لوٹا سکوں۔ میں خوش ہوں کرم نے مجھے انکار کیا۔ تمہارے جیسی ذہنی مریض عورت کے ساتھ زندگی گزارتا تو شاید میں بھی اور نگزیرب کی طرح قبر میں پڑا ہوتا۔ تمہیں لگا ہم دوست ہیں گمراہ یہم جواہرات کاردار.....“ ان کی آواز سرگوشی سے بھی ہلکی تھی۔ ”میں تم سے نفرت کرتا ہوں، اور بہت جلد بہت دلچسپی سے تمہاری اور تمہارے خاندان کی بربادی کا تماشادیکھوں گا،“ کیونکہ تم نے میری سیاسی حریف کا اسکینڈل بناؤ کر اسے اپنادمن تو بنایا ہی ہے، ”مگر اس کے علاوہ بھی تم اپنے دشمنوں سے نداوقف ہو جن میں تمہیں چلت کرنے کا میانٹ موجود ہے۔ جلد ہم تماشادیکھیں گے،“ یہی کاردار۔“ کہنے کے ساتھ اس کے ہاتھ کو جھٹک کر اپنا ہاتھ اٹھایا اور کوٹ کا بٹن بند کرتے اٹھ گئے۔ وہ سفید پر تے چہرے کے ساتھ بے دمی بیٹھ گئی ویران آنکھوں سے سامنے خلا میں دیکھ رہی تھی۔

.....  
شاید خوشی کا دور بھی آجائے اے عدم ..... غم بھی تو مل گئے ہیں تمنا کے بغیر  
کینڈی میں بارش اب قدم پچھی تھی۔ رات پوری طرح سیاہ ہو چکی تھی اور شہر کی بتیاں جل اٹھی تھیں گویا دور دو رنگ تھیں تھیں نہ سہری  
دی بکھرے ہوں۔ ایسے میں پہاڑی کے اوپر ایک مندر سا باتھا، جس کے باہر چوڑی اور طویل سیر ہیاں بنی تھیں۔ عبادت اور سیاحت کے  
لئے آئے لوگ سیر ہیاں چڑھ کر اوپر جا رہے تھے، کچھ کھڑے تھے، غرض ہر طرف گھما گئی تھی۔ آخری سے اوپر سیر گئی پر سعدی  
بیٹھا تھا اور لشون سے پھٹا ہوا، جسے خون والا ہونٹ دبارہ تھا۔ فارس چلتا ہوا آیا اور آس پیک اور ہم کا شاپر اس کی طرف بڑھایا۔

”سوری اس کے لئے۔“ اپنے ہونٹوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ کس چوت کی بات کر رہا تھا۔ سعدی نے جعل کرائے دیکھا اور رکھائی سے اس کے ہاتھ سے شاپر لیا۔

”ہاں صرف اس کے لئے سوری، باقی جو دوسوچھتر چوتیں لگائیں، ان کی تو خیر ہے، وہ تو آپ کے لیے لہوگرم رکھنے کے بھانے ہیں۔“

”بکواس نہ کرو۔“ وہ نھی سے سر جھٹک کر کہتا اس کے قریب سڑھی پہ بیٹھا۔ سعدی بڑا کراپنے ہونٹوں پر آئیں پیک رکھنے لگا۔ گرم گرم زخم کو ٹھنڈک ملی۔ اف۔

”اور؟“ فارس گھٹوں پر بازور کئے آگے کوہ کر بیٹھا تھا، ایسے میں جب بولا تو آواز میں سختی کم تھی۔ ”کیسے ہو؟“

سعدی کے زخم پر زور سے برف لگی تھی، اندر تک پکھ پلچل کر جاتا تھا، جم کر پکھلا تھا۔ اس کی گردان کی گلٹی ڈوب کر ابھری۔ اس سوال کا جواب بہت طویل تھا، اور اس کا جواب بہت مختصر تھا۔

”زخمی ہوں۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے تنگی سے بولا تھا۔

”بالوں کو کیا کیا ہے؟“

”جونظر آ رہا ہے۔“

”کہنا سوری۔ مجھے غصہ تھا تم پر بہت۔“

سعدی نے بڑا کر سر جھٹکا۔ فارس اسی طرح گردان موڑ کر اسے دیکھا رہا۔ سر سے پاؤں تک۔

”کہاں رہ رہے ہو؟“

”ایک کافی شاپ ہے۔ اس کی مالکن کا اعتماد جیتا تو اس نے رہنے دیا مجھے۔“ پھر نظروں کا زاویہ گما کر فارس کو دیکھا۔

”آپ نے کیسے ڈھونڈا مجھے؟ کیلئے کیسے پتہ چلا؟“

”خین نے بتایا تھا۔ ندرت آپا کا اکاؤنٹ کھولتے تھے تم تو ان کو ای میل آگئی کہ کیلئے کیسے کھل رہا ہے اکاؤنٹ۔ میری ایک پرانی کویگ تھی، جس کے اریسٹ وارنٹ کی مخبری کرنے پر مجھے سزا ملی تھی۔ وہ ایمکسی میں ہوتی ہے۔ اس کا جانے والا ایک نمونہ تھا۔ اس کے پاس گیا میں۔ اس نے تمہیں بہت ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ پھر میں نے اسے بولا کہ انعامی رقم کا آواحداں گا اسے تمہارا پوسٹرڈارک سائیس پر ہر جگہ گھوم رہا ہے، وہاں سے رقم وہ دیکھ چکا تھا۔ مگر اسے یقین تھا میں نے تمہیں ڈھونڈ کر گولی مار دی ہے۔ اور ولڈ دل میرا بھی یہی تھا، خیر۔“ اس نے سر جھٹکا اور بتانے لگا۔ ”میں نے اس کو کہا کہ تمہیں باہر نکالنے کے لئے تمہاری مہربان طبیعت کو استعمال کرتے ہیں۔ (سعدی نھیں سے کچھ بڑا یا تھا جو اگر فارس کے کافوں تک پہنچ جاتا تو اس کا دوسرا ہونٹ بھی پھٹ جانا تھا۔) ہم نے کیبل نیٹ ورک پر خبر چلوائی۔ ذرا سا کام تھا۔ جانتا تھا تم نیوز ضرور دیکھتے رہو گے۔ اگر نیٹ استعمال کر سکتے ہو تو نیوز بھی دیکھ سکتے ہو۔ اور بن، تم میری کے بیٹھ کو بچانے فوراً آگئے۔“ ساتھ ہی بڑھی سے اسے دیکھا۔ ”کم عقلن!“

سعدی خاموشی سے برف کا پیک گال پر رکھ کر دبائے لگا۔ فارس نے گھری سانس لی۔ ”پوچھا تو نہیں ہے تم نے مگر پھر بھی بتا دیتا ہوں کہ تمہارے گھر والے کیسے ہیں۔“ فارس سامنے دیکھتے ہوئے ذرا نرمی سے کہنے لگا۔ ”تمہاری امی ٹھیک ہیں، صحت بھی ٹھیک ہے، ریسٹورانٹ جاتی ہیں، پہلے ہم انگکسی میں رہتے تھے، پھر میں نے وہ اس بوڑھی جادو گرنی کو بیچ دی، اور ہم تمہارے پرانے گھر کے قریبی علاقے میں آگئے۔ تمہارے بڑے بابا پہلے سے زیادہ نحیف لگتے ہیں مگر اندر سے پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئے ہیں اور زمر...“ سامنے ٹھیکتے دیکھتے فارس کی شہری آنکھوں میں کرچیاں سی ابھریں۔ ”زمر ہمیشہ کی طرح ”زمر“ ہے، مگر تمہارے لئے وہ بہت..... بہت کام کرتی ہے۔ خین... (سعدی

ہاں نام پہلو بدل اور زور سے برف ہونٹ پد بائی۔ وقت کے ساتھ بہت ثابت ہوتی جا رہی ہے۔ زمر اور اس کی دوستی ہو گئی ہے۔ سیم بھی اپنے نہیں لڑتا۔ دونوں اکثر ساتھ آتے جاتے ہیں۔ سیم کے اسکول میں...“ آپ کیسے ہیں؟“ اس نے سنجیدگی سے فارس کو دیکھ کر بات کائی تو وہ ٹھہر گیا۔ محمد ہوا۔ لا جواب ہوا۔ چہرہ موڑ کر سعدی پہلی بجائیں۔

”میں؟“ بلکے سے کندھے اچکائے۔ ”ٹھیک ہوں۔“

”اور میں سعدی ہوں!“ وہ زخمی سامسکرایا۔ پہلی بار وہ مسکرا یا۔ ”کل بھی اپنے گھروالوں کی آنکھوں سے ان کے دل کا حال پڑھ لیتا آج بھی پڑھ سکتا ہوں۔“

”مجھے کیا ہوتا ہے سعدی؟“

”آپ بھی زخمی ہیں۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتا، گویا پڑھ کر بتا رہا تھا۔ ”اندر تک زخمی ہیں۔ فرستہ یہ ہیں۔ کرب مسلسل میں ہیں۔ لوگوں سے خفا ہیں۔ دکھی ہیں۔ مگر جو اہداف آپ نے زندگی میں طے کرنے ہیں، ان کی طرف جانے کی تگ دو دین لگے ہیں۔ مجھ سے مل را۔ آپ کے چہرے پر خوشی بھی ہے اور سکون بھی، مگر کاملیت نہیں ہے کسی احساس میں۔ جیسے یہ آپ کا صرف پہلا ہدف تھا، آپ مجھے واپس لے جانا چاہتے ہیں، اور پھر اپنے اگلے ہدف میں مصروف ہو جانا چاہتے ہیں۔ اب بھی آپ ذہن میں لاکچر عمل طے کر رہے ہیں، مگر یہ سب کر کے آپ اندر سے تھک چکے ہیں.... اور شاید...“ اس نے آنکھیں چھوٹی کر کے فارس کی آنکھوں کو غور سے پڑھا۔ ”شاید مالیوں بھی....“

فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا، اس کے چہرے پر کوئی احساس نہ تھا اور اس کے چہرے پر سارے احساس تھے۔ گردن کی گلٹی بھی اب کراہی تھی۔ آنکھوں میں بے بسی کے سائے تھے اور ان میں کہیں دور نہ ملتا تھا دیے بھی تھے۔ وہ امید، اور مایوسی کے درمیان کہیں معلق تھا،

ٹھیڈ سے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں کھو چکا ہے۔

”سعدی!“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دھیرے سے بولا۔ ”ایک بات میں تمہیں نہیں بتا سکا۔ تمہاری غیر موجودگی میں

تھا رے گھر میں ایک حادثہ ہوا ہے۔“

سعدی ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ آنکھوں میں بے قیمتی اور خوف لئے، اس نے بے قراری سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”تمہیں اپنا دل بڑا کر کے سننا ہو گا۔ جو خیر میں تمہیں دینے جا رہا ہو، وہ تمہیں اندر تک ہلا دے گی۔ تمہارے گھر کے ایک فرد نے بہت فاش غلطی کر دی ہے جس کا خیمازہ اسے ساری زندگی بھگلتا پڑے گا۔“

”مجھے بتا کیں، کیا ہوا ہے؟“ وہ تیزی سے بولا۔ دل لرز رہا تھا۔ (خین؟) فارس نے ہمدردی سے اسے دیکھتے دھیرے سے کہا۔

”صداقت نے شادی کر لی ہے وہ بھی ایک حسینہ سے۔“

ایک لمحے کو سعدی بالکل ساکت سا اسے دیکھ گیا، اور پھر... وہ ہنس پڑا۔ دل کھول کر۔ گردن پیچھے پھینک کر وہ ہنستا جا رہا تھا۔ فارس بھی سر جھکا ہے ہننے لگا تھا۔ اردو گزرنے لوگوں نے مژمڑ کران دونوں کو دیکھا تھا، جو دونوں بارش کے باعث ابھی تک گلے کپڑوں میں بیٹھے تھے۔ کپڑوں پر پکڑ بھی لگا تھا اور پھر بھی وہ ہنستے جا رہے تھے۔

دفعتاً فارس کافون بجا تو اس نے نکال کر دیکھا۔ پھر تیس پڑھ کر واپس جیب میں ڈال دیا۔

”کون ہے؟“

”اسی نمونے کا سیستھ تھا۔ آبدار کا نمبر دے کر اسے کہا تھا کہ اس کی لوکیشن پتہ کراؤ وہ کہہ رہا ہے کہ نمبر ابھی تک آن نہیں ہوا۔ اور اپنے

پسے مانگ رہا ہے۔“

”تو پیے دیں گے آپ؟“ سعدی نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے باب کی فیکٹریاں لگی ہیں جو میں پیے دوں گا؟“ وہ بگڑ کر بولا۔ سعدی مسکرا دیا۔

”تو اسے کیا کہا؟“

”یہی کہ نہیں دیتا،“ بے شک پولیس کے پاس چلے جاؤ، اور وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے بنس دیے۔ پھر فارس انٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو و سعدی میں تمہیں کھانا کھلاتا ہوں۔“ اس کا کندھا تھپک کر وہ بولا تھا۔ (اف۔ اسی جگہ جہاں ہو کر ماری تھی۔)

”بہت شکریہ۔ جو پہلے کھایا تھا اس سے میرا پیٹ بھر چکا ہے۔“ وہ جل کر کہتا انٹھ کھڑا ہوا۔ فارس نے بنس کر سر جھٹکا اور زینا اترنے لگا۔

”اور یہ آبدار کا کیا قصہ ہے؟ پہلے اس کے ذریعے مجھے پیغام بھجوائے رہے، اب اس کوڈھونڈر ہے ہیں۔ وہ کر کیا رہی ہے آپ نے ساتھ؟“ مٹکوک نظر دیے اسے دیکھتا وہ اس کے ساتھ ہے اتنے اتر رہا تھا۔

”زیادہ میرا دماغ خراب نہ کرو ایسے مجھے دیکھ کر، سمجھتے تو اسی کے ہو آخر...“  
وہ دونوں اب دور جا رہے تھے اور ان کی آوازیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔

.....♦♦♦.....

میرے قاتل کو پکارو کہ میں زندہ ہوں ابھی ..... پھر سے مقتل کو سنوارو کہ میں زندہ ہوں ابھی  
صحیح اپنے ساتھ ڈھیروں سرد ہوا میں لئے نعمدار ہوئی تھی۔ دھند بڑھ گئی تھی۔ سورج چھپ گیا تھا۔ سبز بیلوں سے ڈھکے بنگل کی کھڑکی سے اندر جھانکو تو ایک سنگل بیٹھ رکھا تھا، اس پر گلابی بیٹھ کر بچھا تھا اور جنین اکڑوں بیٹھی، سر پر دو پتھے لئے، فون کان پر لگائے سناری تھی۔ ”ویل کل ہمڑا ٹلمر ہ... آ... آ...“ رُک کر سوچا۔ آنکھیں بیچ کر۔

”الذی جمع مالا و عددہ“ دوسرا طرف میمون نے نری سے بتایا تھا۔ ”یہ تمہاری کل بھی غلطی ہوئی تھی جسے۔“

”حالانکہ جب میں نے یاد کیا تھا تب تھیک یاد تھا۔“ وہ روہانی ہوئی۔ ایک تو پچھومن سے اس کی گردن (مسلسل موبائل اور کمپیوٹر اسکرین پر چہرہ جھکانے کے باعث) شدید درد کرنے لگی تھی۔ زیتون کے تیل کی ماش، پتوں کی سوجن کم کرنے والی کریم اور گردن کی ایکسرس سائز سب کر کے دیکھ لیا مگر فرق نہ اراد۔ ای کی ایک کزن ڈاکٹر سے بھی پوچھا تو انہوں نے کہا کہ گردن میں کالر پہنا کرو۔ اور گردن کم جھکایا کرو۔ یہ حفظ سے پہلے کی بات ہے۔ اب حفظ شروع کرنے کے بعد گردن مزید جھکانی پڑتی قرآن پڑھتے وقت (یعنی گردن کے پٹھے اب مزید خراب ہوں گے) مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے محبوں کیا تھا کہ بلا مبالغہ ہر روز اسے کوئی چھوٹی موٹی چوٹ لگ جاتی تھی۔ کبھی وہ بیٹھ کے کنارے سے نکلا گئی، کبھی پاؤں پر پٹ گیا اور ہختا چھلا گیا۔ کبھی بخار کبھی آدھے سر کا درد۔ اف، وہ کہاں جائے؟

ادھر میمونہ کہہ رہی تھی۔ ”جو بھی حفظ کرنا ہو پہلے اسے دیکھ کر دس دفعہ پڑھا کرو۔ ہر آیت یاد کرنے کے بعد اسے پچھلی تمام آیات سے ملا کر دہراو۔ اور سنو، قرآن یخچر کر گردن جھکا کرنہ یاد کیا کرو۔ انسانی دماغ وہ الفاظ نہیں صحیح سے حفظ کر پاتا جوں کے لئے گردن جھکائی جائے۔ صرف وہی یاد کرے گا جو اس کو آئی لیوں پر نظر آئیں، یعنی قرآن ہو یا کورس کی کتاب کا رٹالگا ہو، کتاب کاٹھا کر چھرے کے برابر لا کر یاد کیا کرو۔“

میمونہ کے پاس ان گنت ٹپس ہوتی تھیں جو وہ وقا فو قیا شیئر کرتی رہتی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ نے سوچا۔ کیا حفظ سے کچھ بدلا تھا؟ سوائے صحیح جلد اٹھنے کے (جس سے دل میں بلکی سی خود پسندی بھی جا گئی تھی کہ تو میں اچھی ہو رہی ہوں۔) کوئی برکت، نور، غیرہ؟ مگر ابھی وہ کوئی خاص اندازہ نہیں لگا پار رہی تھی۔ دھنعتاً چوکھت میں زمر نظر آئی۔ گھنکریا لے بالوں کی پوئی باندھئے تاک میں سونے کی نتھے

پہنچے وہ مسکرا کر بولی تھی۔

”میں شیرو کے آفس جا رہی ہوں۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔“

خین چھلانگ مار کر نیچے اتری، اور بک شیلف پر کھی فلیش ڈرائیور اٹھا کر زمر کو دی۔ ”یہ صرف ہاشم کے لیپ تاپ میں لگا دین، اور...“ وہ جوش سے سمجھا رہی تھی اور زمر غور سے فلیش ڈرائیور کو دیکھتی سن رہی تھی۔

چند کلو میٹر کے فاصلے پر واقع قصر کار دار کو بھی سرمی دھنڈنے اپنے پروں تلنے دبار کھا۔ لاونچ میں ملازموں کی گھما گھمی لگی تھی مگر امنگ ہال خالی تھا۔ عرصہ ہوا وہ تینوں اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کرنا چھوڑ چکے تھے۔

ہاشم صبح سوریے آفس میں جا چکا تھا۔ نو شیر وال اپنے کمرے میں تیار ہو رہا تھا اور جواہرات... اس کا کمرہ خالی تھا۔ بیڈ پر بیڈ کور آدھا زی میں پر گرا تھا۔ ذرینگ نیبل پر فیومز کی ٹوٹی بولیں بکھری تھیں۔ کل رات کے پہنچے جوتے ادھر ادھر پرے دکھائی دیتے تھے۔ رات والا زیر بھی گوانچ کر اتارت پھیکا پڑا تھا۔ ایک دیوار پر فیوم کی شیشی کے مارے جانے کا نشان بھی تھا اور کمرہ بے حد معطر تھا۔

باتھر ووم کے آڈی دیوار پر لگے آئینے کے سامنے کھڑی جواہرات سرخ ہیگی آنکھوں سے اپنائکس دیکھ رہی تھی۔ سلیویس نائی میں اس کے بازوں کے فریکنر نظر آ رہے تھے۔ بکھرے بال، رات کا آدھا منایا، آدھا موجود میک آپ۔ وہ بیمار اور بوڑھی لگنے لگی تھی۔ اس کا دل بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس نے ٹوٹی تلنے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر کھا۔ پانی کسی بھیک کی طرح کشکوں میں گرنے لگا۔ چلو بھر کر اس نے منہ پر بچھنا اور بھر پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ چہرہ دھل گیا۔ بھر تو لیے سے منہ خشک کر کے خود کو آئینے میں دیکھا۔ اب آنکھیں خشک تھیں۔

”میرا زوال کبھی نہیں آئے گا۔ میں آج بھی دلت مند طاقتور اور خوبصورت ہوں۔ کیا سمجھتا ہے وہ خود کو؟“ شعلہ پار نظر وہی سے آئینے میں دیکھتی وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں ہار مان جاؤں گی؟ ہرگز نہیں۔ جب میں نے اور گنگریب کے آگے ہار نہیں مانی تو تمہارے سامنے کیوں؟“

آنکھیں رُک کر ایک عزم سے خود کو دیکھا۔ ”میں دوبارہ کھڑی ہوں گی۔ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر!“

اور جب وہ پاہر آئی تو اپنے ڈاکٹر کا نمبر ملا کر کہہ رہی تھی۔

”میری چھوڑی کے نیچے سے اسکن لٹکنے لگی ہے اور میں سوچ رہی ہوں ہونتوں کے گرد لاف لائیز میں فلر...“

دو گھنٹے بعد وہ بال کرل کر کے برائق سفید بلاوز میں لمبیں سرخ لپ اسٹک لگائے، مسکرا کر پورے اعتاد سے آفس کی راہب اری میں چلتی جا رہی تھی۔ ارگو در لوگوں کے سلام کا مسکرا کر جواب دیتی۔ گردن کا سریہ واپس آگیا تھا مگر دل بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کی کوئی aging ٹریننگ نہ تھی اس کے پاس۔

نو شیر وال کے آفس کا دروازہ اس نے کھولا تو وہ آفس نیبل کے پیچے اپنی کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ جواہرات مسکرائی اور دروازہ پورا کھولا۔

پھر مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ شیر کے سامنے کرسی پر سیاہ کوٹ والی لڑکی کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ بخورے ھنگریا لے بالوں کی اوپھی پونی...

جواہرات اندر تک سلگ گئی۔ بے اختیار ہاتھ اپنے مصنوعی curls تک گیا۔

”ممی!“ شیر نے پکارا تو زمر نے گردن موڑ کر دیکھا اور مسکرائی۔ ”گذ مار نگک مسز کار دار۔“ پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور شیر سے بولی

(جو ذذب ب کاشکار لگتا تھا)۔ ”اپنی مگی کے ساتھ نزدی سے بات کیجیے گا نو شیر وال ورنہ آپ اپنے والد کے آگے جواب دہوں گے۔“ اور قدم

قدم چلتی چوکھت میں کھڑی جواہرات تک آئی جو سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرے کلاسٹ کے ساتھ نزدی سے بات کیجیے گا ورنہ آپ میرے آگے جواب دہوں گی۔“ دھیرے سے کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور جواہرات سرخ پر تے چہرے کے ساتھ تن فن کرتی آگے کو آئی۔

”تواب تم و شمنوں کے ساتھ مل گئے ہو؟“

”وہ میری دیکھیں ہیں۔ اور جیسے وقت پڑنے پہ آپ لوگ ہارون عبید کو دوست بنالیتے ہیں حالانکہ ڈیڈا سے کتنا ناپسند کرتے تھے ایسے ہی میں مسز زمر کو پناہ دیکھیں بناسکتا ہوں۔“

”میں تمہاری زبان دیکھ رہی ہوں نوشیر وال کاردار۔“ جواہرات نے غصے سے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔

”کیوں نا آپ صرف اپنی مصروفیات دیکھیں۔“ وہ انٹھ کھڑا ہوا تھا اور برہمی سے بولا تھا۔ جواہرات سن ہو گئی۔ وہ اس کا اشارہ نہ گئی تھی۔

”میری مصروفیات صرف میرے بیٹے ہیں، شیرد!“ اس کا لہجہ کانپا۔

”بے کار باتیں مت کریں۔ جب آپ اپنے ایک بیٹے سے دوسرے کو پوچھنے میں مصروف نہیں ہوتیں تو ریسُورٹس میں ہارون عبید کے ساتھ ڈزر کر رہی ہوتی ہیں۔ میرے دوست نے دیکھا تھا آپ کو کل رات وہاں۔“ وہ کوفت سے بولا تھا۔

”اس سے آگے ایک لفظ نہ بولنا۔“ سرخ چہرے کے ساتھ اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ”جس عورت کی باتوں میں آکر تم اپنی ماں اور بھائی سے دور جا رہے ہو اس کو نہیں بتایا تم نے کہاں کے سمجھنے کو تین گولیاں بھی تم نے ماری تھیں؟“

نوشیر وال کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمایاں ہوئے۔ بہت سے سایہ اس کی آنکھوں میں آن گرے۔ وہ آگے ہوا اور غرایا۔ ”وہ اسی قابل تھا! نا آپ نے؟ میں نے جو کیا، ٹھیک کیا۔ رہی مسز زمر تو ان سے میرا تعلق مختلف نوعیت کا ہے۔ وہ ایک اچھی خاتون ہیں۔“

جواہرات نے طیش سے ہاتھ مار کر میز پر کھے پین اسٹینڈ اور فائلز گردیں۔

”جس عورت کی او لا د کو اس کی ماں سے دور رکھنے کی سازش کرے وہ conspirator (ماکر) ہوتی ہے اچھی نہیں۔“

”اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ میں نے تو سعدی کو مارا تھا، قید میں تو آپ لوگوں نے رکھا ہوا ہے اسے؟“ وہ تلخیت

بولا تھا۔

”اوہ!“ جواہرات کے ابرو اٹھے، پھر لیوں پہنچنے مکراہٹ در آئی، چند گھرے سانس لئے اس نے۔ ”نوشیر وال کاردار۔ خود کو آپ ڈیٹ کرلو۔ سعدی یوسف اب قید میں نہیں ہے۔ وہ بھاگ چکا ہے۔ اور بھاگنے سے پہلے وہ ایک گارڈ کو قتل بھی کر چکا ہے۔ اس کے پاس اسلو بھی ہے اور دماغ بھی۔ وہ تھاہرے خون کے لئے آئے گا اور تم تو وہ ہو۔ جس سے ایک قتل بھی ٹھیک سے نہیں ہوا۔ سواب بھی وقت ہے اپنے بھائی اور ماں سے سنوارلو، ورنہ سعدی کا مقابلہ کیلے کرو۔“

اور ایک شعلہ بار نظر اس پہنچا لیٹ گئی۔ نوشیر وال بالکل سن سفید چہرہ لئے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ سیٹ پر ڈھنے سا گیا اور نم ہوتی پیشانی کو آستین سے رکڑ کر صاف کیا۔

سعدی قاتل بن گیا ہے۔ اس نے قتل کر دیا ہے۔ اس کے پاس اسلحہ ہے۔ وہ بالکل گم صم سا بیٹھا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دیکھتا تو ان میں سرخ پانی جمع تھا۔ بے اختیار اسے اب کائی آئی تھی۔ وہ تیزی سے ڈسٹ دن پہ جھکا تھا۔ دل میں بہت سے آنسو بھی گرے تھے۔ گلت زیادہ شدید تھا، یا صدمہ مانپنے کا کوئی بیان نہ تھا۔

❖❖❖

نہ تجھ کو مات ہوئی ہے نہ مجھ کو مات ہوئی ..... سواب کے دونوں ہی چالیں بدلتے دیکھتے ہیں جواہرات کو لفت کی طرف جاتے دیکھ کر مسراٹھی اور ہاشم کے آفس کی طرف آئی۔ باہر پہنچنے سکرٹری پریشانی کے عالم میں فون پہنچی

تھی، زمر نے اسے نظر انداز کر کے دروازہ کھولا۔ ہاشم اسی طرح بیٹھا کام کر رہا تھا۔ آہٹ پر نظروں کا رخ پھیرا توڑا چونکا۔ چوکٹ میں گھنگریا لے بالوں کی اوپنی پونی والی زمر کھڑی تھی۔ مسکرا کر اس نے دروازے پر دستک دی۔  
ہاشم عینک اتار کر اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا کر بولا۔ ”مسز زمر! تو کیا نوشیر والانے...“  
”میں زمر کی حیثیت سے آئی ہوں، وکیل کی حیثیت سے نہیں۔“ وہ قدم قدم چلتی آگے آئی اور میز سے ذرا فاصلے پر نشہر گئی۔  
”ایک وقت تھا جب آپ میرے آفس آیا کرتے تھے، بناؤ پوچھے میری چائے لے لیتے تھے، انہی کی ناپسندیدہ باتیں کرنے کے بعد اٹھ کر کہتے تھے، ہم دونوں ”ٹھیک“ ہیں نا؟“  
ہاشم ہاکا سماں مسکرا یا۔ نا۔ بلجیا۔

”بساوب میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں، کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ ٹھیک ہیں؟“ اس پر نگاہیں جائے وہ نرمی سے پوچھ رہی تھی۔ ہاشم کرسی کی طرف اشارہ کرتا و اپس بیٹھا اور مسکرا کر اس کا پھرہ دیکھا۔  
”آپ کو میرے بھائی نے اپروچ کیا اور آپ نے مجھے بتا تک نہیں۔“  
”آپ کو میری بھتیجی نے کالج بلا یا تھا اور آپ نے بھی مجھے نہیں بتا یا تھا۔ جیسے وہ امارنی کلاسیٹ پر یوچ تھا، دیسے ہی یہ بھی پر یوچ کا حصہ ہے۔“

وہ کرسی پہنچی اور پرس اپنے پبلو میں رکھ دیا۔ ہاتھ پر س کے قریب ہی تھا۔ زپ کے اندر سامنے ہی وہ فلیش رکھی تھی۔  
”عذر قبول کیا۔ چائے لیں گی یا کافی؟“  
”صرف یہ تسلی کہ آپ مجھے قصور و انہیں بھرا تے شیر و اور اپنے معاملے پر۔“  
”ہم بھائی ہیں مسز زمر، اور ہم کل کو پھر سے ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات مجھ سے چھپا کر علیہا کو بلا کر میری پیٹھ کے پیچھے یہ سب کر کے، آپ نے اپنی اچھائی کو داغدار کر دیا ہے۔ میں چھپا سکتا ہوں، کیونکہ میں برا ہوں، لیکن آپ تو اچھی تھیں۔ اور جب اچھے لوگ برے کام کریں، برے نہ سہی، ملکوک کام کریں grey کام کریں، تو میرے جیسے برے لوگوں کا یقین، بھی اچھائی سے اٹھ جاتا ہے۔ ہم اچھائی کے راستے پر چلنے سے پہلے رک کر سوچنے لگتے ہیں۔“ ٹیک لگا کر بیٹھا، مسکرا کر وہ کہہ رہا تھا۔ زمر نے گھننوں کے گرد دنوں ہاتھ ملا کر کر کھے، اسی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

”اور برے لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ توبہ نہ کرنے اور اچھائی کی طرف نہ پلٹنے جیسی ”اپنی“... خالصتاً ”اپنی“ کمزوریوں کے لئے بھی دوسروں کو قصور و انہیں بھرا تے ہیں۔“

ہاشم ہاکا سماں دیا۔ اس بات نے محظوظ کیا تھا۔ تائیدی انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ ”اوکے اب ہم ٹھیک ہیں۔“

اسی اشناع میں دروازہ ٹکلا اور بولکھلائی ہوئی حیلیمہ اندر داخل ہوئی۔  
”سر آپ کا فون آف ہے اور دوسرا فون آپ نے نہیں کر رکھا ہے۔“ وہ پریشانی سے کہہ رہی تھی۔ زمر مسکرا سے دیکھنے لگی اور ہاشم اپنے کرڈر آگے کو ہوا۔

”آپ نے کالن فارورڈ کرنے سے بھی منع کیا تھا، مگر.... بری خبر ہے۔“ کہنے کے ساتھ اس نے میز پر پڑا ریبوٹ اٹھایا اور مزکر ایوار پر نصب ایں سی ڈی کی جانب اٹھا کر بیٹھن دیا۔ اسکرین روشن ہوئی۔ حیلیمہ نے دو چار مزید بیٹھ دیا۔ اور ایک نیوز چینل سامنے نظر آیا۔ اس پر چلتی چلتی پڑی دیکھ کر ہاشم بے اختیار اٹھا۔ چہرہ سفید پڑا۔ سہارے کے لئے میز کے کنارے کو مضبوطی سے تھاما۔  
”سر، کالن پکا لازم آ رہی ہیں، نیوز میں بھی آ گیا ہے۔ ہمارے پاور پلانٹ کی مرکزی مشینری میں بلاست ہوا ہے۔ بڑے پیانے پر“

استعمال کئے گئے ہیں۔ تیل کو آگ لگ گئی ہے اور اب بہ آگ تب ہی بجھے گی جب ہمارا پلانٹ ناکارہ ہو چکا ہو گا۔“ explosives (پاور پلانٹس میں بڑے بڑے فیول ٹینکس ہوتے ہیں۔ ان ٹینکس میں کئی ملین گیلین تیل محفوظ ہوتا ہے۔ اگر ایک نینک میں ہیں دھا کر ہو جائے تو اس سے پیدا ہونے والے fumes اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ پورا پلانٹ تباہ ہو سکتا ہے۔)

زمر بھی ساتھی کھڑی ہوئی۔ وہ بار بار ہاشم کا چہرہ دیکھتی، پھر حیمه کوہتی۔ ”بس کریں خاموش ہو جائیں۔“

”پلانٹ اب نئے سرے سے اشارت کرنا ہو گا۔ ایک بند ہوئے پلانٹ کو دوبارہ شروع کرنے کے لئے.... اربوں روپے مایوسی ضرورت ہوتی ہے، اورہ سر میں تو...“

”حیمه!“ زمر غصے سے اس کی طرف مڑی۔ ”شٹ اپ!“

حیمه دم بخوا سے دیکھنے لگی۔ اب وہ ہاشم کی طرف گھومی۔ وہ ابھی تک ششدھ کھڑا، اسکریں پھلتے مناظر دیکھ رہا تھا۔ صرف اب گھنٹے کے لئے وہ دنیا سے کٹ کر بیٹھا تھا اور یہ سب ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، مانع پسینہ آرہا تھا۔ وہ میز کے کنارے کو پہلا سے قدم آگے بڑھا، پھر فون اٹھایا۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

”ونون رکھیں ہاشم۔“ زمر نے اس سے رسیور لے کر واپس رکھا۔ اور پیز آرام سے بیٹھ جائیں۔“ وہ فکر مندی سے بولی تھی۔

وارث غازی کی جھومتی ہوئی لاش.... وہ اور زرتاشہ ایک رسیشور انت میں کھڑی تھیں.... سعدی کی زخمی چہرے والے چہرے والے تھا اور یہ... ہر شے پس منظر میں چلی گئی۔ اگر کچھ رہ گیا تو صرف ایک احساس۔

انسانیت۔

ہاشم نہیں بیٹھا، وہ شل سا کھڑا رہا۔ چہرہ جھکائے، وقفے و قفے سے نغمی میں سر ہلاتا۔

”ہاشم آپ بیٹھ جائیں۔“ اس نے نرمی سے کہا۔ ہاشم نے سرخ ہوتی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”گیٹ آؤٹ۔“ دروازے طرف ہاتھ بلند کیا۔ جائیں یہاں سے۔“ حیمه جلدی سے باہر بھاگ گئی۔ زمر نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے، پھر بند کر دیے۔ پس الہ اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر نکل کر وہ چند قدم آگے گئی۔ پھر کی نفی میں سر ہلایا۔ اور واپس ہاشم کے آفس کی طرف آئی۔

آفس خالی تھا۔ میز کے پیچے اب ہاشم نہیں کھڑا تھا۔ زمر کی آنکھوں میں تھیرا بھرا، اور پھر وہ تیزی سے آگے آئی تو دیکھا۔ وہ اپنی کرسی کے قریب فرش پر گرا ہوا تھا اس کا ہاتھ سینے کو مسل رہا تھا اور اسکی آنکھیں غنودہ سی بند ہو رہی تھیں۔ وہ تکلیف میں تھا۔“ کا نفس رک رہا تھا۔

”ای یو لینس بلاو... گاڑی نکلو او...“ وہ چلا کر حیمه سے بولی تھی جو باہر کھڑی تھی۔ ”ہاشم کو ہارت ایک ہو رہا ہے۔ جلدی! جاؤ۔“ اور پس پھیکنکی وہ اس کی طرف بڑھی تھی جس کی سانس اکھڑ رہی تھی اور سینہ جکڑ رہا تھا۔.....

❖❖❖

منزلیں تیرے علاوہ بھی ہیں لیکن ..... زندگی اور کسی راہ پر چنان ہی نہیں چاہتی کوں بوبو میں واقع اس بلند بالا ہوٹل کی رسیپشن دن کے وقت بھی روشنیوں سے منور تھی۔ ایک کونے میں صوفے پر آنکھیں بیٹھا گا۔ فون کان سے لگائے دوسرا طرف ہارون کوں رہا تھا جو پوچھ رہے تھے۔

”آبدار کیسی ہے؟“ وہ جواباً بتانے لگا۔

”جب سے وہ مس آبدار کے اپارٹمنٹ سے لگایا ہے؟“ مس واپس ہوٹل آگئی ہیں اور یہاں سے نہیں نکلیں۔“

چند منزلیں اوپر... ایک کشاورہ اور پیش بیڈروم کے پردے گرے تھے اور اندر اندر ہیرا ساتھا۔ وہ صوفے پر یہاں پر کرے یہیں گلی۔

سرخ بال کمر پھسل رہے تھے اور چہرہ تھوڑی پگراۓ گم صنم نظر آتی تھی۔

”وہ کھانا بھی اندر منگوایتی ہیں۔ اداں ہیں اور غمزدہ بھی۔“

آبدار نے سائیڈ نیبل سے نیل پالش کی شیشی اٹھائی اور اپنا پیر میز کے کنارے رکھا، پھر برش کو پالش میں ڈبوڈ بکرنا خنوں پر لگانے لگی۔

”وہ بار بار ریسیشن پر کال کر کے پوچھتی ہیں کہ کوئی ان سے ملنے تو نہیں آیا، یا ان کے لئے کوئی فون تو نہیں آیا۔ مگر اپنا سیل فون انہوں نے آف کر رکھا ہے۔“

انگوٹھے اور دو انگلیوں پر سرخ نیل پالش لگا کر وہ رکی، اور پھر ایک دم شیشی اٹھا کر دیوار پر ماری۔ شیشی دیوار کو داغدار کر کے نوٹ گئی۔ اب وہ سرخ رومال سے ناخن رگڑ رہی تھی۔ گیلی سوکھی پالش خلط ملط ہو گئی، کچھ مٹی، کچھ انگلیوں پر لگ گئی۔

”مجھے وہ بیمار لگنے لگی ہیں، سر۔ میرا خیال ہے آپ کو ان کے پاس ہونا چاہیے۔“

وہ اب گھٹنوں پر سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کرو نے لگی تھی۔

”مشورہ نہیں مانگا، رپورٹ مانگی ہے، دیتے رہو۔“ ہارون نے کوفت سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ ادھر وہ ابھی تک روئے جا رہی تھی۔

❖❖❖

لاکھ موجودوں میں گھرا ہوں مگر ڈوبا تو نہیں ..... مجھ کو ساحل سے پکارو کہ میں زندہ ہوں ابھی کینڈی کی سر بز پہاڑیوں نے روئی کے گالوں جیسے بادلوں کا تاج پکن رکھا تھا۔ صبح کی تازہ ہوا درختوں کے ٹوں کے درمیان سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی اور پہاڑی کو کاٹ کر بننے اس اپن کثیر کیفے کے فوارے کے پارے سے پانی سے کھیل رہی تھی۔ حوض میں گرتے پانی کی دھاروں میں دھنک کے ساتوں رنگ دکھائی دیتے تھے۔ فوارے سے نظر دائیں میں جانب کرو تو کونے کی ایک میز پر فارس بیٹھا تھا۔ جھک کر کہدیاں میز پر رکھے وہ کافی لگگ میں تجھ بدل رہا تھا۔ دفعتاً اس نے نگاہ اٹھائی اور سامنے والی کری سنبھالتے سعدی کو دیکھا۔ وہ ابھی ابھی آیا تھا۔ جیزپر سویٹر پہن رکھا تھا جس کی بندگروں کے پیچھے گردی تھی۔

”مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ جہاں کام کرتا ہوں، وہاں کی مالکن کو کل پوری شام غائب رہنے کی لمبی کہانی سنائی تھی، اب صبح دوبارہ جانے سے پہلے اسے مطمئن کرنا ضروری تھا۔“ وہ فارس کو دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ہونٹ کا زخم پہلے سے بہتر تھا البتہ سوجن زیادہ بھی۔ فارس نے آنکھیں جھوٹی کر کے غور سے اسے دیکھتے ہوں سے لگایا۔

”کیا کہا ہے اسے کہاں جا رہے ہو؟“

”یہی کہ میری محبوبہ کینڈی میں آئی ہوئی ہے، اس سے ”چھپ“ کرنے جاتا ہوں۔“ مسکرا کر تپانے والے انداز میں بولا۔ فارس نے سر جھکا۔ ”استغفار اللہ۔“

سعدی اپنے لئے ناشیت آرڈر کرنے لگا۔ پھر فارس کی طرف خوشگوار انداز میں گھوما۔ ”آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

فارس نے سنجیدگی سے گ رکھا۔ ”یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ میں اور تم آج واپس جا رہے ہیں۔“

سعدی کے چہرے کی جوت بھٹکی۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ”کیا یا تنا آسان ہے؟“

”ابھی تک تمہارا دماغ درست نہیں ہوا؟ دوہا تھا اور لگاؤں؟“

”اچھا آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”میرے ساتھ وہ اپس چلوہا شم سے کہو کہ تم اس کا راز راز رکھو گے۔ ہم سب نارل ایکٹ کریں گے۔ تم اپنے گھروں کے ساتھ رہو۔ اپنی جاپ دوبارہ شروع کرو۔ اور مجھے ہاشم سے تھمارا اور اپنا انتقام لینے دو۔“

”میرا مجرم ہاشم نہیں نوشیرواں ہے۔ مجھے گولیاں نوشیرواں نے ماری تھیں۔ ہاشم نے مجھے غائب کروا یا تھا، مگر مجھے گولیاں... نوشیرواں نے ماری تھیں۔“ وہ ایک دم میز پر ہاتھ مار کر تیزی سے بولا۔ فارس پر گڑی آنکھیں سرخ ہوئیں۔ ”آٹھ ماہ... پورے آٹھ ماہ انہوں نے مجھے بندر کھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں میں سورج سے بھی محروم تھا۔ آٹھ ماہ میں نے ہر صبح انتظار کیا کہ آپ آئیں گے مگر آٹھ نہیں آئے، میں نے اپنے خاندان والوں کا انتظار کیا، مگر کوئی نہیں آیا۔ آپ سب ہاشم کا ردار کے ساتھ کاردار کے مصروف تھے۔ کوئی نہیں آیا میرے لئے۔“ بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا۔ تو فارس نے گہری سانس لی۔

”مجھے جیل میں ڈھائی سال ہو گئے تھے جب تم نے مجھ سے معافی مانگی تھی کہ تم میرے لئے پہلے اس طرح نہیں آئے جیسے اب آئے۔ کیا تمہیں اسلام دیا تھا میں نے؟ نہیں۔ صرف اسلئے کہ تم نے مجھے قید میں نہیں ڈالا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قید میں ڈالا تھا۔“

”اوہ واو۔ اوکے۔ سواب میں گلٹی پارٹی ہوں۔ ٹھیک ہے۔ فائن۔“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر تختی سے کہا۔ ”میں نے اپنے آپ اس خود قید میں ڈالا تھا۔“ مجھے پہلے آپ کے پاس آنا چاہیے تھا مگر میں نہیں آیا، میں اکیلے سب کچھ کرنا چاہ رہا تھا۔ میں غلط تھا۔ فائن۔ مگر آپ... آپ تھے سب جانتے تھے۔ یہ بھی کہ میں کہاں ہوں، کس کے پاس ہوں، تو آپ کیوں نہیں آئے میرے لئے۔ آٹھ ماہ پہلے کیوں نہیں آئے؟“

”کیونکہ تمہارے بر عکش میں ایک بات جانتا ہوں کہ انسان اکیلا ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ وہ بھی اتنی ہی درشتی سے بولا۔ ”میں بالفرض کو لبوا آبھی جاتا تو میرے پاس یہاں اتنے بندے اتنا اسلحہ اور اتنے وسائل نہیں تھے کہ میں ان کے ہوٹل پر حملہ کرتا اور تمہیں دہاں سے نکال لیتا۔ اگر میں ایسی کوئی کوشش کرتا بھی تو میرا... ایک... خاندان... ہے۔ سعدی یوسف! وہ کسی کو نہ چھوڑتے۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے اسے جیتنا ہوتا ہے، اور ہم یہ جنگ جیتنے کے قریب ہیں۔ ہم اسے جیت کر ہی شروع کریں گے۔ دہاں سے تمہیں صرف تم ذرا نکال سکتے تھے اور میں نے تمہیں نکلنے کا طریقہ بتایا تھا اور وہ طریقہ کارگر رہا۔“

سعدی چند لمحے کے لئے کچھ بول نہیں سکا۔ صدمے سے اسے دیکھتا رہا۔ ”کارگر؟ ہرگز رتنا دن میری گرد़وں میں پھنسنا کستارہا“ میں اندر سے مرتا گیا اور اب آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہو پایا، اور آپ کہتے ہیں کہ وہ کارگر رہا۔“

”مجھے ہاشم کو شک نہیں دلوانا تھا۔ ہاشم کو اپنی طرف سے مطمئن رکھنا تھا۔“

”مگر کیوں؟ کیا کر لیتا ہاشم کاردار؟ زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا؟“

فارس نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ جب اسے پتہ چلے گا تو وہ کیا کرے گا۔“

”وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، اس کو ڈاچ کرنے کے دو ہزار طریقے میں جانتا ہوں۔ بہر حال میں وہ اپس نہیں جا رہا۔ بھی نہیں۔“ اور وہ رخ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ فارس نے طویل سانس لبوں سے خارج کی۔

”مگر کیوں؟ کیا تم اپنے گھروں والوں سے ملنا نہیں چاہتے؟“ سعدی نے نظریں چڑائیں۔

”مجھے تیاری کرنی ہے، بھی میں تیار نہیں ہوں۔“

فارس ایک دم بالکل خہر گیا۔ آنکھوں میں اچنبا ابھرا۔ ”کس چیز کی تیاری؟ میں نے کہا تھا اور انتقام میں لوں گا۔“

سعدی نے نظریں کارخ اس کی طرف موڑا، ان میں اب صرف سنجیدگی تھی۔

”مجھے انتقام نہیں چاہیے ماموں۔ یہی فرق ہے آپ میں اور مجھ میں۔ مجھے.... انصاف.... چاہیے۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ فارس ایک دم الارٹ سا ہو کر بیٹھا۔ سعدی نے نظریں جھکائیں، پھر آنکھیں بند کیں۔ اس کے بعد اس نے

گردن کرائی... آنکھیں کھولیں اور ان میں سرد ساتاڑ لئے فارس کو دیکھا۔

”سر کار بنا نہ نوشیر وال کاردار!“

فارس کی ساری دنیا ایک دم ناٹے میں آگئی۔ وہ بالکل شل ساس عدی کو دیکھے گیا۔ پھر اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”نبیں، کبھی نہیں

عدی۔“ وہ تیزی سے آگے ہوا۔ ”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے تمہیں انتقام چاہیے تو ہم لیں گے انتقام مگر...“

”مجھے انتقام نہیں چاہیے۔“ وہ جواباً غرایا تھا۔ ”مجھے... انصاف... چاہیے۔“

”تمہیں انصاف کا مطلب بھی پتہ ہے؟“ سعدی وہ ہمارے خاندان کی عورتوں اور بوڑھوں کو کورٹ میں گھیٹیں گے۔ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ زمر، حین، تم خود۔ پاکستان میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے سعدی اور اب ہم میں سے کوئی معصوم نہیں رہا۔“

”ہاں ہم میں سے کوئی معصوم نہیں رہا مگر ہر مجرم گناہ گار نہیں ہوتا۔ اور یہ نجح کرنا میرا یا آپ کا کام نہیں ہے۔ یہ ایک آفسرا ف لاءِ نجح کرے گا۔ یہ فیصلہ ایک نجح کرے گا کہ کون قاتل ہے، کون دھوکے باز ہے، کون جھوٹا ہے اور کون گناہ گار۔ میں ہرات اپنی ٹوٹی امید کو اس ایک خیال سے جوڑتا تھا۔ لازم ہے کہ میں بھی دیکھوں گا۔ سر کار... نوشیر وال کاردار!“ اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں مگر ان میں برف ہوئے پہاڑوں جیسی سخت تھی۔ فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”سعدی“ میں ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ رہوں گا، لیکن ایک بات مجھے پورے یقین سے تباہ۔ کیا تم اس فیصلے پر قائم رہو گے؟ کیا

تم کاردارز سے کورٹ میں جنگ کرنا چاہتے ہو؟“

”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ سعدی یوسف کی کہانی ایک کورٹ ٹرائل کے بغیر ختم نہیں ہو گی۔ میں جانتا ہوں ٹرائل لمبا ہو گا، ٹرائل تکلیف دہ ہو گا، مجھے سے اور کاردارز سے جزو ہر شخص کو عدالت کے کٹھرے میں آکر قرآن پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا حلف اٹھانا ہو گا، میرے خاندان کی

عورتوں پر بھری کچھری میں کچھرا اچھلا جائے گا، ہمیں ذمیں اور سوا کیا جائے گا، میں سب جانتا ہوں، مگر... میں... فیصلہ کر چکا ہوں۔ مجھے

”سر کار بنا نہ نوشیر وال کاردار“ چاہیے ہے!“

فارس نے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار نہیں کیا، وہ والٹ سے چند نوٹ نکالتا اٹھ کھڑا ہوا اور ان کو گاہ تلے رکھا۔

”تمہارا اینیا پاسپورٹ تمہیں دون کے اندر مل جائے گا۔ یہ تمہارے آف شور بینک اکاؤنٹ کی ساری تفصیلات ہیں۔“ جیکٹ کے اندر ورنی جیب سے چند کاغذ نکال کر سامنے رکھے۔ ”مجھے سے کیسے کامیکٹ کرنا ہے تمہیں معلوم ہے، پیسے چاہیے ہوں تو بتانا۔ میں آج رات تک واپس چلا جاؤں گا۔“

سعدی کا دل ایک دم ویران سا ہو گیا۔ اس نے یاسیت سے اسے دیکھا۔

”بس آپ جارہے ہیں؟“

”اب رکنے کا فائدہ نہیں ہے۔ تم نے ایک غلط فیصلہ کیا ہے سعدی، اور میں اس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ لیکن تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہے کہ ہاشم کیا کرے گا جب اس پر حقیقت کھلے گی۔ مجھے اندازہ ہے، اور مجھے... تیاری کرنی ہے۔ مجھے اپنے خاندان کی حفاظت کرنی ہے۔“

سعدی اٹھ کھڑا ہوا۔ کاغذات کو اس نے چھوٹاں نہیں۔ آگے بڑھا اور فارس سے گلے ملا۔ حلق میں بہت سے آنسو پھنس گئے۔

”ہاں ٹھیک ہے، اب دور ہٹو۔“ سنجیدگی سے کہہ کر اسے پر ہٹایا۔ سعدی نے نم آنکھوں سے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”مجھے خوشی ہے کہ زمر نے ابھی تک آپ کو زہر نہیں دیا۔ ویسے وہ آپ کے ساتھ ٹھیک ہیں اب؟“

”وہ گھری سانس لے کر بولا تھا۔“ Its Complicated

”اور یہ آبدار کا کیا چکر ہے؟ اس کے نمبر کی اتنی فکر کیوں ہے آپ کو؟“ یوسف خاندان کے لڑکے نے آنکھوں میں تک بھرے فارس غازی کو دیکھا تھا۔

”اس نے احسان کیے ہیں مجھ پر اور میں اس کو ڈال کر کے گیا تھا۔ وہ جذباتی سی لڑکی ہے مجھے فکر ہے کہ کچھ کرنہ دے۔ اسی لیے اس کی طرف دھیان لگا رہتا ہے۔ خیر تم ایک دو دن میں واپس آ جانا۔ زیادہ مت ہٹھرنا۔ میں اب چلتا ہوں۔“  
اس کا کندھا ہلکے سے تھپک کر وہ کہہ رہا تھا۔ اب کے وہ جلدی میں لگتا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔ جلد از جلد۔

❖❖❖

اے دل تجھے دشمن کی بھی پیچان کہاں ہے ..... تو حلقة یاراں میں بھی محتاط رہا کر!  
ہسپتال کے پرائیوٹ وارڈ کا وہ پریقیش کرنا ہے پھولوں کی مہک سے معطر تھا۔ اندر بیٹھ پر ہاشم تکیوں کے سہارے لینا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہسپتال والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ زمر نے دروازے پر دستک دی تو اس نے آنکھیں کھولیں، پھر فقاہت سے مسکرا یا۔ ساتھ کھڑے ڈاکٹر نے بھی اسے دیکھا۔

”آئیے۔“ وہ مسکراتی ہوئی آگے آئی اور قریبی کا ڈالج کے کنارے بیٹھ گئی۔

”تجھک یو..... میرے آپ کو نکال دینے کے باوجود دوبارہ واپس آنے کے لئے۔“ وہ زندگی سے بولا تھا۔

”نو پر اب لمب میں نہ بھی آتی تو کوئی اور آ جاتا۔ یہ ہارت ایک نہیں تھا، صرف anxiety symptoms ایک تھا۔ چونکہ اس کے دل کے دورے جیسے ہوتے ہیں تو میں بھی..... خیر..... مبارک ہو۔ آپ کا دل بالکل محفوظ اور تو انہے۔“

وہ ہلاکا سانہ دیا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ ماہول میں عجیب سانتا و در آیا۔ ڈاکٹر باہر گیا تو ہاشم نے کہا۔

”زمر.... کیا آپ میرا ایک کام کریں گی۔“

زمر نے گھری سانس لی۔ ”جب کہیے۔“

”ایک ڈرافٹ تیار کروانا ہے، اگر آپ نوٹ پیدھ پر لکھتی جائیں تو.... اور پیز بھکھے کام سے باز رہنے کو نہ کیجیے گا۔“

”شیور آپ بتا میں۔“ وہ اس کو کام سے باز رہنے کی نصیحت کر بھی نہیں سکی۔ مصروف رہے گا تو ڈنی دباو کم ہو گا۔ اس نے نوٹ پیدھ اٹھایا اور پین کھولا۔ ہاشم تکیے پر سر رکھے، آنکھیں موندے ڈکھیت کرنے لگا۔ بار بار کرتا، اڑتا، پھر فی میں سر ہلا کر دوبارہ سے شروع کرتا۔ وہ بنا کسی کوفت کے لکھتی گئی۔

اس دوران اس سے ملنے کوئی نہیں آیا۔ شام میں جب وہ تھک کر کاغذوں کا پلندہ اس کے سر ہانے رکھ رائٹھنے لگی تو ازاں ہمدردی بولی۔

”اب اس بات کا دباؤ مت لیجئے گا کہ دوستوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے ان کو معلوم نہ ہو۔“

ہاشم تکیے سے مسکرا یا۔ ”باس کی بیماری کی خبر آفس میں جگل کی آگ کی طرح پھیلا کرتی ہے۔ سب کو معلوم ہے مزز زمر!“

”میں... اپنے ڈاکٹر سے مل لوں۔“ وہ پرس اٹھا کر جانے لگی۔

ہاشم نے اچنچھے سے اسے دیکھا۔ ”آپ کا ڈاکٹر بھی اسی ہسپتال میں ہے؟“

”یہ آپ کا پسندیدہ ہسپتال ہے ہاشم، اور میری سرجری کے وقت مزز کاردار نے ہی یہ ہسپتال ریکیمنڈ کیا تھا۔ کیا آپ بھول گئے۔“  
ہاشم نے محض سر ہلا دیا۔ وہ یہ معاملات میں کے لئے چھوڑ دیا کرتا تھا، سو اس کو ان کی خبر نہ تھی۔

زمر چند منٹ کی مسافت پر واقع اپنے ڈاکٹر کے کمرے تک آئی تو وہ اندر نہیں تھے۔ اس دن کے بعد سے بس ان سے فون پر بات

ہوئی تھی، انہوں نے اسے نبی رپورٹ کے حوصلہ افزاء ہونے کا بتایا تھا۔ مزید کچھ نہیں۔ اس نے باہر یسیپشن والے لڑکے سے پوچھا۔

”ڈاکٹر قاسم کہاں ہیں؟“

وہ بے اختیار تجھب سے اس کا چہرہ مٹکنے لگا۔ ”آپ کو نہیں معلوم؟“

”نہیں۔ کیا ہوا؟“ زندگی میں اتنے حادثے دیکھے تھے کہ بغیر کسی فکر مندی کے سکون سے بولی۔

”ان کا بہت برا یکسیڈنٹ ہوا ہے۔ بہت چوٹیں آئی ہیں۔ وہ ایک دوسرا ہے باہپل میں داخل ہیں۔ پسلیاں ٹوٹی ہیں۔ جزوے کی بڑی بھی اور...“ وہ بھروسی سے سخنی گئی، پھر آگے بڑھ گئی۔ اب دوسروں کے غم کوئی ایسا اثر نہیں کرتے تھے۔

”تو آپ نے فالکن کا پی نہیں کیس؟“ خین کے سامنے جب رات گئے وہ آکر بیٹھی تو ساری کھاسن کراس نے خنکی سے پوچھا تھا۔

”خین، تمہارے خیال میں میں اتنی چالباز عورت ہوں کہ وہ آدمی زمین پر گرا ہو گا، اپنے سینے کو تکلیف سے مسل رہا ہو گا اور مجھے فالکن کی فکر ہو گی؟“ اس نے سکون سے پوچھا تھا۔

”انیک ہی تھا۔ مر تو نہیں گیا وہ۔ آپ نے اتنا اچھا موقع ضائع کر دیا۔“

”میرے اس موقع کا فائدہ اٹھانے کے بعد مجھ میں اور اس میں کیا فرق رہ جائے گا؟“

”ہاں بالکل، ہم تباہ ہو جائیں گے، مگر چلو، ہم ان سے بہتر تو ہوں گے۔“ خین طرز سے بولی تھی۔ زمر چپ رہی۔

”خیر... آپ کو پتہ ہے.... سعدی بھائی اپنے قرآن والے گروپ میں دوبارہ سے آگیا ہے۔“ وہ بوجھل ماحول کو ہلکا بناتے ہوئے شیب کھول کر اس کے سامنے کر کے دکھانے لگی۔ زمر کے تاثرات بدلتے۔ وہ تیزی سے آگے ہوئی۔ پھر اسکرین پر ہاتھ رکھا۔ آنکھوں کے کنارے نرم ہوئے۔

”وہ سورۃ انلیل پر مدد بر کرتا ہے۔ مگر کرتے کرتے اب رک گیا ہے۔ آہی سورۃ کے نقش۔“ احتیاط سے اس کے تاثرات دیکھ کر کہنے لگی۔ ”آپ بھی اچھا بولتی ہیں، بھائی کی طرح۔ آپ کو چاہیے... کہ اس کی ادھوری سورۃ کمکل کر دیں۔ کچھ لکھ دیں۔ شاید اسے ضرورت ہو۔“ زمر سر جھنک کر اٹھ گئی۔ ”مجھے کام ہیں، بہت۔“ اس سے نظریں ملائے بغیر وہ باہر نکل گئی اور خین گہری سانس لے کر رہا گئی۔

❖❖❖

لے جائیں مجھ کو مالی غنیمت کے ساتھ عدو..... تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا اس رات کو لمبو میں واقع پاکستانی سفارت خانے میں خاموشی اور اندر ہیر اچھایا تھا۔ آفسر متفق تھے سب چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ ایسے میں ایک اندر ہیر کر کے میں جہاں بہت سے کمپیوٹر زپرے تھے، ایک کی اسکرین روشن تھی اور اس کے سامنے بیٹھی عورت کھٹا کھٹ کی بورڈ پر ناٹپ کر رہی تھی۔ بار بار احتیاط سے دروازے کی طرف بھی دیکھتی۔ اس کی گود میں رکھے پاس پر کسی مرد کی تصویر یعنی تھی۔ (یہ وہ پاس تھا جس کو استعمال کر کے وہ اس جگہ داخل ہوئی تھی)۔

دفعتا پنٹ سے زوں زوں کی آوازیں آنے لگیں۔ صبحت پنٹ پر کھلی شے کو احتیاط سے درست کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ کیز بھی دبای رہی تھی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔

چند منٹ بعد وہ پنٹ شدہ کاغذوں کو جوڑ رہی تھی۔ ان کا کور گہر اسیز تھا اور ان پر اسلامک ری پبلک آف پاکستان لکھا تھا.....

فصح ہوٹل کی لابی میں تیز قدموں سے چلتا جا رہا تھا۔ جب اس کا فون بجا۔ اس نے سرعت سے اسے کان سے لگایا۔

”سر وہ نمبر آن ہو گیا ہے۔ ابھی دو منٹ پہلے۔“

”اچھا تم یوں کرو...“ فصح ہدایت دینے لگا کہ نوں نوں سنائی دینے لگی۔ درمیان میں کسی اور کی کال آ رہی تھی۔ اس نے چھنپلا کر

فون کان سے ہٹایا تو ایک دم مخدود ہو گیا۔ اسی نمبر سے کال آ رہی تھی۔

”وہ مجھے کال کر رہا ہے۔ تم اس کی لوکیشن ٹرلیں کرو۔“ تیزی سے کہہ کر اس نے دوسرا کال اٹھائی۔ ”کہیے۔“

”میں پوسٹر والے لڑکے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ دوسرا طرف بوڑھا سنہاری بدلت کہہ رہا تھا۔

”میں مذعرت خواہ ہوں کہ اس دن آپ کوڈ پٹ دیا۔ میں انعام کی رقم ایڈوانس میں دینے کو تیار ہوں۔“ اب وہ سجاو سے بات کر رہا تھا۔

اسلام آباد کے اس ہسپتال کے کمرے میں اس رات اداکی اور تنہائی تھی۔ دیران موسم، دیران دل۔ وہ گھر جا سکتا تھا مگر خود ہی نہیں

گیا۔

تنہائی کمرے میں لیٹا رہا۔ لگا ہیں چھپت پہ جی تھیں۔ وجہہ چہرہ زرد سا تھا۔

اس سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا۔ جواہرات کو اس نے ہوش میں آتے ہی کال کی تھی اور اس پر چینا چلا یا تھا۔ جواب میں جواہرات اتنے

ہی نہ یا نی انداز میں اس پر غرائی تھی۔ ”مجھے کسی چیز کا الزام نہ دو۔“ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں تمہیں احساس ہی نہیں۔“

نوشیروان کو اس نے کال نہیں کی تھی، مگر دل سے وہ چاہتا تھا کہ کاش وہ آ جاتا۔ ایک دفعہ۔ باقی کسی سے بھی ملنے سے اس نے نہ

انکار کر دیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ کوئی آیا ہی نہیں تھا۔ نہ آفس سے نہ دستوں میں سے۔ پتہ نہیں کیوں؟

اور جب سعدی یوسف ہسپتال سے کھو گیا تھا... تو کتنے ہی دن اس کے دوست اور قرابت دار اسی ہسپتال کے باہر پھولوں کے

گلدستہ رکھتے رہے تھے۔ فرق کہاں سے آیا تھا؟ کس نے ڈالا تھا؟

دفتار اس نے تکیے کے ساتھ رکھا موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملا کر اسے کان سے لگایا۔ ”ادریں...“ بولا تو آواز میں ذرا نقاہت

تھی۔ ”کراچی میں سب ٹھیک ہے؟“

”جی کاردار صاحب، آپ کے بارے میں سنتا ہا، اب طبیعت کیسی...“

”فارس کا تباو۔“ اس نے درختی سے بات کائی۔ اپنی ”کمزوری“ کے عیاں ہونے کا احساس بہت تکلیف دہ تھا۔

”غازی؟ وہ ٹھیک ہے، کام کرتا ہے۔ مزاج برہم رہتا ہے، مگر وہ بندہ برائیں ہے۔“

ادریں اب اسے فارس کی ”رپورٹ“ دے رہا تھا۔ ہاشم نے مطمئن ہو کر فون رکھا اور ایک دفعہ پھر اپنے گرد پھیلی تنہائی کو دیکھا۔

جو فیصلہ دہ شہرین سے طلاق کے ان دو سالوں میں نہیں کر سکا تھا، وہ چند ساعتوں میں ہو گیا تھا۔ اس نے ایک نیکست لکھا (ہم آب

مل سکتے ہیں، ریڈ؟) اور آبدار کے نبیر پہ بھیج دیا۔ پھر قدرے سکون سے تکیے پر سر کھرا کا نکھیں موند لیں۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے، لٹ بھی چکے ..... اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

سز بیلوں سے ڈھکے بنگلے میں رات کے اس پھر سناٹا چھایا تھا۔ کسی کسی کمرے میں کوئی یہ پھل رہا تھا۔ ندرت اپنے کمرے میں

بیٹھا چاہے بیٹھیں، تبیخ پڑھ رہی تھیں۔ (گھنٹوں کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھتی تھیں۔) ساتھ والے کمرے میں جھاگکوٹ نہیں

دو پٹاواڑھ کر قرآن اٹھائے بیٹھی، سبق یاد کر رہی تھی۔ کل کے سبق میں سورۃ العینیہ سنائی تھی اسے، اور وہ مسلسل آیات کو خلط ملتط کر رہی تھی۔

”اف خنین، فوکس کرو، کیوں تم بار بار ایمان والوں کو ”نار جہنم“ میں پہنچا رہی ہو۔ اور مشرکین کو باغات میں؟ اف۔“ اس کے اپنے

مسئلے تھے اور یہ مسئلے اس کو اب اپنے مرضی مستقر کو سونپنے ہی نہیں دیتے تھے۔

سیم بڑے ابا کے کمرے میں سورہ تھا۔ (گو کہ اس کا اپنا کرہ بھی تھا مگر رات کو وہ ادھر رہی سوتا تھا۔) زمر کے کمرے میں بھی ایہ پ

جل رہا تھا۔ وہ کارپٹ پہ جائے نماز ڈالے چہرے کے گرد دو پیٹھ لپیٹھی تھی۔ وہ کب کا سلام پھیر چکی تھی مگر یونہی بیٹھی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ بیڈ کی دوسری طرف کو انھ جاتیں۔ بس ایک رات ہی رہا تھا وہ اس کمرے میں۔ پھر چلا گیا۔ اب وہ کب آئے گا؟

”اللہ تعالیٰ“ میں بہت بری ہوں۔“ وہ گہری سانس لے کر کہنے لگی۔ زرد لیپ میں مدھم روشنی میں بھی اس کا چہرہ اور ناک کی نتھ دک رہی تھی۔ ”میں بہت سخت دل ہو گئی تھی، میں نے فارس کے ساتھ بہت زیادتی کی، مگر اس سے معانی نہیں مانگی۔ اس کے لئے انصاف حاصل کیا مگر اس سے معانی نہیں مانگی۔ میرا دل اس جتنا بڑا نہیں ہے۔ میں اس سے غلط باقتوں پر بڑتی ہوں۔“ وہ یا سیت سے کہہ رہی تھی۔ ”جب مجھے پہنچتا کہ وہ سعدی کے لئے ادھر گیا تھا، اور اسے آبدار کی... ضرورت تھی، اور ذرا سوچنے پر مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ آبدار نے جان بوجھ کر ایسی بات کہی تھی، ان کے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر... اب میں بات کیوں نہیں کر لیتی اس سے؟ مگر نہیں... میری انا!“ پھر اس نے چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”مگر آپ کا شکر یہ کہ آپ نے مجھے یہ سمجھایا کہ دل کی نرمی تب ملتی ہے جب ہم قرآن کی باتیں کرتے ہیں۔ جب ہم دل سے قرآن کی باتیں کرتے ہیں۔ اور کیا ہوا جو وہ اپنی سورۃ تکمل نہیں کر سکا۔ اس سے پہلے بھی تو میں نے سعدی کے بہت سے کام کئے ہیں نا، آج ایک اور سہی۔“

فارس اور اپنی معلق قسم کی اذدواجی زندگی کی ساری کلفت اور بدولی عنقا سی ہو گئی۔ وہ آنکھوں سے مسکرائی اور انھ گئی۔ پھر اسٹری نیبل پا بیٹھی اور لیپ ناپ کی اسکرین کھوئی۔

وہ گروپ میں مزید کچھ نہیں پوسٹ کر سکا تھا۔ وہ سورۃ تکمل نہیں کر سکا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ وہ کر لے گی۔

پہلے وہ اس کی لکھی تدبیر اور تفہیر کی باتیں غور سے پڑھنے لگی۔ اس نے انہل کی 58 آیات لکھی تھیں۔ کل آیات 93 تھیں۔ وہ آدھی سے زیادہ سورۃ کر چکا تھا۔ مویٰ علیہ السلام کا قصہ... چیونٹیوں کی ملکہ کا قصہ... سلیمان اور ملکہ سبا کا قصہ... صالح کا قصہ... لوط علیہ السلام کا قصہ... اور بس! ابھی 35 آیات رہتی تھیں۔ ابھی انہل کا ایک بڑا حصہ رہتا تھا۔ ابھی داستان کی تیکھیں کی راہ میں چند بڑے واقعات کا ہوتا حاکل تھا۔

زمر نے اگلی چند آیات وہاں لکھیں اور پھر... جی کڑا کہ ایک نئے عزم کے ساتھ... وہ ہر آیت کے نیچے اپنے الفاظ... اپنے دل سے کہہ گئے الفاظ لکھنے لگی.....

میں پناہ چاہتی ہوں اللہ کی دھنکارے ہوئے شیطان سے۔ شروع اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان، بار بار حرم کرنے والا ہے۔

”آپ کہہ دیجئے کہ تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے.... اور سلام ہے اس کے بندوں پر.... وہ لوگ جن کو اس نے ”جن“ لیا ہے۔

..کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنمیں یا لوگ (اس کا) شریک ٹھہراتے ہیں؟“

”اوہ اللہ!“ اس نے آنکھیں بند کر لیں، پھر سر جھنک کر کی بورڈ پر انگلیاں رکھے تاہپ کرنے لگی۔ الفاظ جانے کہاں سے آکر

انگلیوں سے کیز میں منتقل ہونے لگے۔

”میں ان آیات کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل یہ سوچ رہی تھی کہ میں انہیں کسی اور کی تشفی کے لئے لکھ رہی ہوں، مگر نہیں۔ قرآن“

جب آپ سے مخاطب ہو تو وہ صرف آپ کے لئے ہوتا ہے۔ اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمام حمد اللہ کے لئے ہے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ”آپ کہہ دیں، کہ تمام حمد اللہ کے لئے ہے۔“ لکھتے لکھتے اس کی انگلیوں میں روانی آرہی تھی۔ ”حمد کہتے ہیں کسی کی پریشان کی تعریف کو۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ اللہ ہی پر فیکٹ ہے، پر فیکٹ تعریف بھی اسی کی ہو سکتی ہے، مگر یہ بات ہمیں دوسروں کو بار بار بتاتے رہنا چاہیے کہ اللہ بہترین ہے۔ بہترین دوست، بہترین مددگار۔ ورنہ جب لوگ کافر ہونے لگتے ہیں athiest بننے جاتے ہیں تو وہ اس لئے ایسا کرتے ہیں کیونکہ انہیں الگا ہے اللہ ان کے لئے بہترین مددگار نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ کل بھی آپ کا تھا، آج بھی ہے۔ ہمیں یہ گفت اور ذپریش

رہتا ہے کہ ہم اس کے اب بہترین بندے نہیں رہے، مگر ہم تو اس کے بہترین بندے کبھی بھی نہیں تھے۔ ساری تعریف ساری حمد ساری پر فیکشن ”ہمارے لئے“ تو کل بھی نہیں تھی۔ جس گلٹ کو ہم دیوار بنا کر اللہ اور اپنے درمیان لے آتے ہیں، وہ تو ہمیشہ ساتھ رہے گا۔ آج اس غلطی پر شرمند ہیں، کل کسی اور پہنچا نہیں تھے۔ ہم پر فیکٹ نہیں ہو سکتے تو پھر اللہ سے بات کرنے سے جھکھتے کیوں ہیں؟ غلطی ہوئی ہے تو معافی مانگو اور سرے سے اللہ کے بندے بن جاؤ۔ یہ اتنا آسان ہے۔ کیونکہ کچھ لوگوں کو اللہ نے اپنے دین کے لئے جن لیا ہوتا ہے۔ ان کو قرآن پڑا ہر کرتے رہنا چاہیے اپنے لئے نہ سہی تو دوسروں کے لئے۔ خوشی سے نہیں کریں گے تو قدرت آپ کو کھیخ کر، گھیث کراس طرف لے آئے گی مگر یہ آپ کو کرنا ہے۔ آپ chosen one ہیں، پر فیکٹ نہیں ہیں تو اپنی خامیاں اور گناہ دیکھ کر پریشان نہ ہوا کریں۔ توبہ کریں اور پھر تشویع کریں۔ صرف اللہ ہی کے ساتھ تو انسان ہمیشہ ہر چیز سے سرے سے شروع کر سکتا ہے!

ٹھہر کر اس نے الگی آیت دیکھی۔

”بھلا بتاؤ تو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟“

کس نے آسمان سے بارش برسائی؟

پھر اس سے ہرے بھرے باروں قباعات اگاہ یے۔ تم تو ہرگز نہیں اگا سکتے تھے ان پانگوں کے درختوں کو۔ کیا اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی معبدوں ہے؟ بلکہ یہ لوگ تو وہ ہیں جو حق سے انحراف کرتے ہیں۔“

”مجھے بہت اچھے لگتے ہیں قرآن میں پوچھے گئے سوال۔“ وہ چہرہ جھکائے بورڈ پر تیز تیز ناٹپ کر رہی تھی۔ ”ہر دفعہ اپنا دفاع کرنا، اپنے حق میں دلائل دینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کوئی اللہ کے وجود کو ماننے سے انکاری ہو تو اس کی طرف سوال ڈالا کریں، اسے سوچنے پر مجبور کریں۔“ کوئی تو ہے ناجس نے اتنے انصاف سے زمین اور آسمان بنائے۔ تو کیا وہ ہمیں انصاف نہیں دلائے گا؟ کوئی تو ہے ناجوآسمانوں سے بارش برساتا ہے، بھی زمین پر، کبھی دل پر، اور اس بارش سے اگنے والے باغات انسان خود نہیں اگا سکتا۔ مردہ زمین اور مردہ دلوں کو صرف اللہ زندہ کر سکتا ہے۔ صرف اللہ کا قرآن کر سکتا ہے۔ تو بجائے اپنے مردہ دل کا ڈپریشن لینے کے، کیوں نا اللہ سے کہہ دیا جائے کہ آپ مدد کریں، مجھ سے تو نہیں ہو رہا۔ تو کیا وہ نہیں کرے گا مدد؟ میں ایک بہت پریلیکل انسان ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ اللہ انسان کو سارے وسائل دے دیتا ہے گر انسانوں کو اس سے یہ موقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ خود زمین پر آ کر ہمارے کام جادوئی طاقت سے سنوار دے گا۔ اس نے آپ کو یہ عقل دی ہے سو یہ اس کی بہترین مخلوق کی توجیہ ہے کہ اس کو ہر شے پلیٹ میں دی جائے۔ جیسے رزق کمانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ دیسے ہی اپنے دل کو زندہ کرنے کے لئے بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یوں گلٹ اور ڈپریشن لے کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔“

لکھ لکھ کر وہ اب تھک پچکی تھی مگر جوش اور عزم ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس نے الگی آیت آن لائن قرآن سے کاپی پیسٹ کی اور پھر اس کو زیر لب پڑھا۔

”بھلا کس نے بنایا زمین کو قرار گاہ“

اور جاری کر دیں اس کے درمیان نہیں

اور اس کے لئے پہاڑ بنائے

اور بنائی دو سمندروں کے درمیان آز

کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبدوں بھی ہے بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں۔“

”اچھا لگتا ہے آپ کی بیان کی گئی مثالیں پڑھنا، اللہ تعالیٰ۔“ وہ زیر لب مسکراتی ہوئی ناٹپ کئے جا رہی تھی۔ بھوری آنکھیں کی بورہ پہنچی تھیں۔ ”کبھی تو یہ زمین، آسمان، پہاڑوں اور سمندروں کی مثالیں لگتی ہیں، اور کبھی انسانوں کی۔ کچھ انسان زمین جیسے ہوتے ہیں۔ اتنا بوجھ

الحا کر گئی قرار و سکون میں ہوتے ہیں۔ بلتھ نہیں، لڑکتے نہیں۔ کچھ پہاڑوں جیسے ہوتے ہیں، سب کو سیراب کرتے ہیں، فائدہ پہنچاتے آگے بڑھتے چلتے ہیں۔ کچھ پہاڑوں جیسے ہوتے ہیں۔ مضبوطی سے اکڑ کسر اٹھائے کھڑے ہوتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ اپنا بوجھ تو کسی اور پر۔۔۔ ایک پرسکون زمین پر۔۔۔ ڈالے ہوئے ہیں۔ خود تو قرق آن کا بوجھ بھی نداشکتے تھے۔ اور کچھ سمندر کے پانی جیسے ہوتے ہیں مگر واور میٹھا پانی سمندر میں لکتی ہی جگہوں پر ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا ہے مگر دونوں کے درمیان آڑ ہوتی ہے۔ گوگل کرو تو لکتی ہی تصویریں نکل آتی ہیں جہاں پانی بھی پانی سے ملنے سکتا۔ دونوں کارنگ فرق ہے ذاکھہ فرق ہے مگر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک اچھا ہے ایک برا دونوں دشمن ہیں مگر ایک سمندر میں رہتے ہوئے ان کو ساتھ ساتھ چلانا پڑتا ہے۔ جس دن یہ آڑوئی سمندر میں طوفان برپا ہو جائے گا۔ ہر طرح کے لوگ دیکھ کر جانے والے واقعی کہاٹھتے ہیں کہ اللہ کے سوال کوں ان کو بنائے تھے اور اللہ کے سوا کس کے سامنے ان سب کو جھکنا چاہیے؟“

اب کری کی پشت سے نیک لگائے اس نے مسکرا کر اپنے لکھے الفاظ کو دیکھا۔ اگر وہ پڑھے گا تو وہ بھی اچھا محسوس کرے گا کیونکہ قرق آن کا پڑھنا تو عطر بخیں والے جیسا ہوتا ہے۔ دوسروں کو عطری شیشیاں تھماں تھماں چند قطرے دکاندار کے اپنے ہاتھوں پہ بھی لگ جاتے ہیں اور وہ خود بھی معطر ہو جاتا ہے، چاہے آخر میں اس کے پاس ایک شیشی بھی نہ بچے۔ اور زمر کو اتنے سال بعد اپنے کمرے سے خوبصوراتی ہی خوش تھی۔ آج وہ واقعی میں خوش تھی۔

❖❖❖

کل تاریخ یقیناً خود کو دہراتے گی..... آج کے اک اک منظر کو پہچان میں رکھنا وہ منج جب قصر کاردار پر اتری تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مغروں انسانوں کی طرح وہ صرف دیکھنے میں وزنی لگتے تھے، اندر سے کھوکھلے تھے۔ گرج رہے تھے مگر خیر و برکت کے قطرے برسانے والے نہیں لگتے تھے۔

اوپنے ستونوں والے برآمدے کے سامنے بزرگ زار پر کار آر کی اور ڈرائیور نے جھٹ سے دروازہ کھولا۔ پچھلی سیٹ سے علیشا باہر کلی۔ اس کے سیاہ بال کندھوں تک آتے تھے، گرے ٹاپ کے گریان پن گلاسراں اگلی تھیں، اور ماٹھے کے اوپر میرے بینڈ سے بال پچھے کر رکھ تھے۔ سرخی آنکھیں اٹھا کر اس نے برآمدے میں کھڑی جواہرات کو دیکھا جو نک سک سے تیار چھپتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ علیشا نے تھوک لگا اور جی کڑا کر برآمدے کے زینے پر چڑھنے لگی، یہاں تک کہ وہ جواہرات سے دوزینے نیچے رہ گئی۔

”آپ نے مجھے بلوایا؟ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ تحکم سے کہتی مڑکاندہ کی طرف بڑھ گئی۔ علیشا نے ایک نظر آس پاس ہاتھ باندھ کھڑے ملازموں پر ڈالی پھر اس کے پیچھے ہوئی۔

”یہ میرے والد کی تصویر ہے۔“ لاونچ کی ایک دیوار کے قریب رک کر جواہرات نے چتوں سے اشارہ کیا۔ وہ ہنوز سینے پہ بازو پیٹھی ہوئے تھی اور بھورے بال ڈھیلے جوڑے میں بند ہے، گردن کی پشت پہ پڑے تھے۔ ”اور یہ میرے دادا کی۔ یہ میرے کرزی ہیں۔ یہ میری والدہ کی نیلی ہے۔“ وہ مختلف تصاویر کے اوپر نگاہ دوڑاتے کہہ رہی تھی۔

۴ ”یہ سب خاندانی تھے۔ اپنے علاقوں کے ریس تھے۔ سیاسی اکابرین تھے۔ عزت دار لوگ تھے۔ مگر اونگزیب...“ اب کے وہ پلٹ کر علیشا کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں وہی سرد مہری تھی۔ علیشا خاموشی سے سنے گئی۔ ”اونگزیب ان کی طرح ریس تھا نہ دولت منڈ، مگر وہ خاندانی تھا۔ عزت دار تھا۔ اسی لئے اس کو میں نے اپنے لئے منتخب کیا۔ اس کو دو بیٹے دیے۔ خاندانی اور بااثر بیٹے۔ ہمارے سارے خاندان میں... سات نسلوں میں....“ انگلی گھا کر اشارہ کیا۔ ”کوئی اتنا بخس، غیر خاندانی اور غلیظ نہیں ہے جتنی کہ تم!“

”مسز کاردار!“ علیشا کی آنکھوں میں سرخ لکیریں ابھریں۔ آواز کا پنی۔

”آواز پنجی رکھو“ وہ جواہا اتنے زور سے غرائی کے علیشا بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی۔ ”تم میرے سامنے کھڑی ہو اور میں..... میں یہاں کی... ملکہ ہوں! اگر تم میں رہنا ہے اس گھر میں تو تم میرے معین کے طریقے سے رہو گی۔ یہ مت سمجھنا کہ میرا بے وقوف یعنی تمہاری مدد کو آئے گا۔ ہاشم کی پیشکش پھامی بھرنے کا ارادہ ظاہر کر کے تم نے نو شیر داں کی تھیت کھودی ہے۔ وہ تمہارے اپارٹمنٹ کا مزید کرایہ نہیں بھرے گا۔ اوہ ایسی شکل نہ بناو۔ میں نے آفس میں رپورٹ کرنے والے بہت سے پرندے پال رکھے ہیں۔“

علیشا بس اسے دیکھ کر رکھ گئی۔

”تم پیچے والے سروٹ روڈ میں سے ایک میں رہو گی۔ ان شیزرز کو تم پیچھے نہیں سکتی، اس لئے تمہارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر اس شہر میں رہنا ہے اور ان شیزرز کا منافع وصول کرتے رہنا ہے تو....“ اب وہ سے دور کھڑی میری کو اشارہ کیا۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے آئی۔ ”تو میری کے ساتھ جاؤ اور اپنا کمرہ دیکھ لو۔“

علیشا نے ایک بے بُس نگاہ میری کے اوپر ڈالی، اور پھر اس کے ساتھ خاموشی سے چل دی۔

”ملکہ سے ملکر نہیں لینی چاہیے علیشا!“ جواہرات نے پیچھے سے پکارا تھا۔ میری انتہی نے اس بات پر گردن ذرا موز کر لادونخ کے پودوں پر اپکرے کرتی فیکنا کو دیکھا جواندست کلس گئی تھی۔ ”کیونکہ شطرنج کی بساط پر صرف ملکہ ہوتی ہے جو جب چاہے جتنی چاہے چالیں چل سکتی ہے۔“ علیشا مری اور ایک نظر سے دیکھا۔

”مگر شہمہ مات صرف بادشاہ کر سکتا ہے، مسز کاردار اور ملکہ سب سے بڑی چال باز تو بن سکتی ہے، مگر وہ بادشاہ نہیں بن سکتی۔“ اور مری گئی۔

”میں اپارٹمنٹ سے اپنا سامان لے آؤں۔“ میری کے ساتھ جانے کی بجائے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جواہرات کی چھپتی ہوئی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی وہ موبائل پر ایک نمبر ملا کر فون کان سے لگائے، اپنا سامان اکٹھا کر رہی تھی۔

”ہیلو... مسز ندرت.... میں علیشا بات کر رہی ہوں۔ جی میں ٹھیک ہوں۔ میں نے مسز زمر سے بات کی تھی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، میں خیں سے ملنا چاہتی ہوں مگر وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔ کیا آپ میرے اور اپنے درمیان یہ بات رکھیں گی اگر میں آپ سے کہوں مجھے آپ کی مدد چاہیے۔“ ذرا دیر کو ٹھہر کر بات سننے والے اپنے کپڑے بیگ میں اڑس رہی تھی۔

”مجھے اپنا Ants everafter والا کی چیزیں واپس چاہیے۔ کیا خیں اور زمر کے علم میں لائے بغیر آپ مجھے وہ دے سکتی ہیں؟ میں وعدہ کرتی ہوں دوبارہ آپ کویا آپ کی بیٹی کو نگاہ نہیں کروں گی۔“ وہ بہت منت سے کہہ رہی تھی۔

❖ ❖ ❖

اگر پڑ جائے عادت آپ اپنے ساتھ رہنے کی ..... یہ ساتھ ایسا ہے کہ انسان کو تھا نہیں کرتا کیونڈی کی اس کافی شاپ کے کچن میں سعدی کھڑے کھڑے کا ڈنر پر جھکالیپ ناپ کی اسکرین دیکھ رہا تھا۔ جو وہ پڑھ رہا تھا وہ خوش کن بھی تھا اور اس کرنے والا بھی۔ اس نے سورۃ شروع کی تھی، کوئی اور اسے مکمل کر رہا تھا۔ قرآن انسانوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ انہاں محتاج ہوتے ہیں۔ آپ نہیں کریں گے تو کوئی اور آ جائے گا۔ دین کا کام ہوتا رہے گا۔ اس کا جیسے دل زخمی ہو گیا تھا مگر مسکرانے کا دل چاہ رہا تھا۔ پھر اسکرین فولڈ کر کے وہ اٹھا تو مونچو کے رونے کی آواز آئی۔ وہ چونکہ کرم اور مستطیل کچن سے باہر آیا۔

باہر بوجھا رہا پا سکھی کیش کا ڈنر کے پیچے بیٹھا اپنے موبائل پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ایڈوانس کی رقم ابھی تک اسے موصول نہیں ہوئی تھی۔ وہ ناخوش اور بے چین لگ رہا تھا۔ نگاہ اٹھا کر سعدی کو دیکھا جو باہر آ رہا تھا، جہاں کامنی کھڑی غصے سے مونچو کو جھڑک رہی تھی اور وہ

”اللہ سے آنسو پوچھتا، پہنچا رہا تھا۔ ساتھ ہی دو خوبصورت کانچ کے پیالے نیچے چکنا چور ہوئے بکھرے تھے۔ کامنی غصے سے اسے سنہالی میں ہم ایسا کہہ رہی تھی جوندرت برتن ٹوٹنے پا سے کہا کرتی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ سعدی رسان سے پوچھتا آگے آیا۔ کامنی غصی سے اس کی طرف مڑی۔

”یہ لڑکا کبھی نہیں دیکھ کر چلتا۔ میرے نئے پیالے توڑ دیے۔“ وہ صدمے میں تھی۔

”پیالے مونچ سے زیادہ تیقی تو نہیں تھے کامنی۔“ وہ زندی سے کہتا آگے آیا اور بچوں کے بل مونچ کے سامنے بیٹھا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے۔ بوڑھا روپا سنگھی آگے ہو کر دیکھنے لگا۔ کچھ تو شیش، کچھ اچھے سے۔

”صرف ان دو بیالوں کے لئے تم اتنے پیارے مونچ کوڈا انہ رہی ہو؟“ مونچواب اپنے ہاتھ چھڑاتا، سر جھکائے زور زور سے ٹھنڈا کھلا، مگر سعدی نے اس کے ہاتھ نہیں چھوڑے۔

”کیا تھا جو یہ دیکھ کر جل لیتا۔“

”کامنی!“ اس نے نظریں انھا کر سنہالی عورت کو دیکھا۔ ”یہ برتن اسی وقت اسی لمحے ٹوٹنے ہی تھے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ میری قسمت تھی کہ....“

”نہیں، یہ ان برتوں کی عمر، تھی جو ختم ہو گئی تھی۔“ پھر مونچو کی طرف مڑا۔ ”ہر چیز کی عمر ہوتی ہے، جب وہ عمر ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنے جاتی ہے۔ سو برتن ٹوٹنے کا غم نہیں کرتے مونچو۔ یقین کرو اگر تم سے نہ تو تایہ پیالہ تو تمہاری اس چڑیل جیسی ماں سے ٹوٹ جاتا۔“

مونچو آنسوؤں کے درمیان نہیں پڑا۔ روپا سنگھی بھی آگے ہو کر یہ نک اسے دیکھ رہا تھا۔ کامنی کی آنکھیں نہ ہو گئیں اور وہ لمرا دی۔ تب سعدی کھڑا ہوا۔ مونچو نہیں ہٹھیلیوں سے آنکھیں رگڑتا باہر کو بھاگ گیا تب وہ کامنی سے بولا۔ ”میرا بھی باپ نہیں تھا۔ ہم ہی باپ کے بڑے ہوئے تھے۔ بن باپ کے بچے کو سب کے سامنے نہ ڈالنا کرو۔ وہ دلasse کے لیے کس کے پاس جائے گا؟ اپنے بچوں کو دعے سے ہی اتنا تھا نہیں کرنا چاہیے!“ وہ زندی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ روپا سنگھی کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا لکنے لگا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا۔ مہر تھی ہی دیر بعد وہ کچن میں آیا۔

”سنوا!“ سعدی دو بار لیپٹاپ اسکرین کھول کر بیٹھا تھا جب مضطرب اور بے چین ساروپا سنگھی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ”تم مل جاؤ۔“ سعدی نے گہری سانس لی۔

”سرمیں بہت جلد چلا جاؤں گا، آپ لوگوں کے لئے مستلانہ نہیں....“

”میں نے پوسٹروالے نمبر پر کال کر دی تھی۔ وہ آجائیں گے۔ انہوں نے میری لوکیشن بھی ٹریل کر لی ہو گی۔ پیسے نہیں بھیجیں گے۔“ تم... تم بھاگ جاؤ۔“ وہ آنسو ضبط کے جلدی بول رہا تھا اور سعدی یوسف کا چہرہ فن ہو گیا تھا۔

❖❖❖

زین میں پیروں سے کتنی بار دن میں لکھتی ہے..... میں ایسے حادثوں پر دل مگر چھوٹا نہیں کرتا۔ قصر کاردار کے لاکنخ میں علیشا اپنے اڑالی بیگ خود گھستی خاموشی سے میری کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ ڈائنگ ہال میں سر برائی کریں گے جوں کے گھونٹ بھرتی جواہرات نے ایک نظر اسے دیکھا، اور پھر سر جھنک کر مصروف ہو گئی۔ احراس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا اسے ایک ٹینش دکھار رہا تھا۔ علیشا کو دیکھ کر اس نے ہولے سے سر گوٹی کی۔

”اس لڑکی کو یہاں کیوں رہنے دیا آپ نے؟“

”تاکہ میرے دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ اس وقت اس کو اپنی نگرانی میں رکھنا ضروری ہے۔“ احراس ملا کر رہا گیا۔

اسی لمحے لاؤئن کامرزی دروازہ کھلا اور ہاشم نمودار ہوا۔ آستین کہنیوں تک مowitzے، گریبان کا ایک ٹھن کھلا تھا، کوٹ بازو پڑالا ہوا تھا، چہرے پر نقاہت تھی۔ ملازم ساتھ آ رہے تھے، اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو گویا اپس پلٹنے کا کہا۔ چند قدم آگے آیا تھا، جو اہرات تیری سے ڈائیکنگ ہال سے ادھر آتی دکھائی دی۔ چہرے پر تشویش تھی۔ احمد وہیں بیٹھا رہا۔

”ہاشم، تمہیں بھی ہاسپل میں رہنا چاہیے تھا۔ تم نے منع کر دیا درنے میں آ جاتی۔“ اس نے ہاشم کا بازو تھا منا چاہا۔ مگر اس نے ختنی سے اس کا ہاتھ جھکا اور ایک بربہم نظر اس پر ڈالی۔ ”میرے کاروبار کو اتنا بڑا دھمکا دینے کے بعد مجھ سے مخاطب بھی کیسے ہو سکتی ہیں آپ۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔“

جو اہرات نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ آنکھوں میں خفگی اتری۔ ”یہم سب کا کاروبار ہے۔“

”نہیں ہے یہم سب کا کاروبار۔“ وہ غرایا تھا۔ ”جب میرے باپ کو اپنی سیاست اور آپ کو اپنی بیوی ترینمنٹس سے فرصلت نہیں تھی، تو میں تھا جو ان پانچ خون جلا کر اس کاروبار کو پھیلا رہا تھا۔ یہ سب... میرا لکمایا ہوا ہے۔“ سینے پر انگلی سے دستک دے کرختی سے بولا تھا۔ ”میں نہ ہوں تو آپ دونوں سڑک پر آ جائیں۔ مگر آپ... آپ نے میرا سوچے بغیر صرف اس بے غیرت آدمی کے لئے غلط لوگوں سے دشمنی مول لی۔ اس وقت میں آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

”اوہ ڈونٹ یو ڈیئر!“ وہ سرخ چہرے کے ساتھ غرائی تھی۔ ”تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں۔ تم دونوں کے لئے کیا کیا کرچکی ہوں میں، تم احساس بھی نہیں کر سکتے۔“

”واٹ ایور!“ وہ ہوا میں ہاتھ کو جھٹک کر میری ہیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جو اہرات پیر پختگی واپس مڑ گئی۔ احمد نے سر جھکا دیا۔ اس نے ساری باتیں سن تھیں۔

نوشیر وال اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑا تیار ہو رہا تھا جب ہاشم اس کے دروازے کے باہر رکا۔ شیرونے ذرا کی ذرا اسے دیکھا، پھر برش اٹھا کر بال سنوارنے لگا۔ ماتھے پر خونخواہ کے بل بھی ڈال لیے۔

”میں رات ہسپتال میں تھا۔“ وہ سرد لبجھ میں گویا ہوا، مگر اس میں بھی آنچ تھی۔ شیرونکا برش کرتا تھا تھرکا، پھر دوبارہ چلنے لگا۔

”معلوم ہے۔ جب آپ کی سیکرٹری نے بتایا کہ آپ کو ہارث اٹیک ہو رہا ہے تو جانتا تھا میں، یہ بھی کوئی نیا جھوٹ ہو گا۔ اور وہ ایسا کیا؟“ صرف anxiety attack آپ لوگ تو ہماری میں بھی اپنا ”خی،“ نہیں چھوڑتے۔ ”تنی سے وہ بولا تھا۔“ جب بھی پڑھا تھا اس لڑکے سے تو میں بھی ہسپتال داخل رہا تھا۔ آپ مجھے تدبیح کیسے آئے ہوتے تو میں بھی کل آ جاتا شاید۔“

”وہ میرے پیچھے نہیں آئے گا۔ کبھی بھی نہیں۔ میں نے اسے روح پر زخم دیے تھے۔ اس کے اپنوں کو قتل کرو دیا تھا، مگر وہ میرے پیچھے نہیں آئے گا۔“ اس کی بات کا اثر لئے بغیر ہاشم سپاٹ لبجھ میں بولا تھا۔ شیرونے اختیار گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”وہ... نوشیر وال... تمہارے پیچھے آئے گا۔“

نوشیر وال کا خون اس کی رگوں میں جم گیا۔ وہ یک ٹک ہاشم کو دیکھ کر گیا۔

”اور اب تم جتنا بچھتا لو... اور میں جانتا ہوں کہ تم پچھتا تے ہو... مگر اب اس کا فائدہ نہیں ہے۔ وہ ایک دن تمہارے پیچھے آئے گا۔“

وہ تمہیں گھیسیے گا.... یا انتقام کے لئے یا انصاف کے لئے.... اور اس دن نوشیر وال.... انگلی اٹھا کر اس نے تنیسہ کی۔ ”اس دن تمہیں میری قدر ہو گی۔ اس دن تم جانو گے کہ جب میں کہتا ہوں، ہاشم سنبھال لے گا تو ہاشم کیسے سنبھالتا ہے۔ اور اس دن تم چاہو گے کہ میں تمہارے ساتھ کہہ دے گا، ہوں اور میں....“ وہ سانس لینے کو رکا۔ نوشیر وال کا بھی سانس رکا۔ اسے لگا بہاشم بھی اس کا ساتھ نہیں دے گا۔

”اور میں اس دن تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ کیونکہ میں تمہارا بھائی ہوں۔“

وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا، اور نوشیر وال پکی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا تھا۔ وہ زرد چہرے کے ساتھ ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔

بہت ہوشیار ہوں اپنی لڑائی آپ لڑتا ہوں ..... میں دل کی بات مگر دیوار پر لکھا نہیں کرتا وہ کافی شاپ کے اوپر ”شفع احر“ کے لئے مختص کمرے میں روپا سنگھی کے سامنے کھڑا تھا اور بے بسی بھرے غصے سے کہہ رہا تھا۔ ”اگر مجھ سے اتنی شکایت تھی تو مجھے کہا ہوتا، میں چلا جاتا۔ مگر ان لوگوں کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر انہوں نے مجھے جان سے مار دیا تو میرا خون

آپ کے ہاتھ پہ ہو گا۔“

”تم ہو کون جس پر میں اعتبار کرتا؟ س پوسٹر کے مطابق تم تامل جاسوں ہو۔ یہ میرا فرض تھا، ایک فوجی ہونے کے ناطے کہ میں تمہاری روپورث کرتا۔“ وہ کچھ پیشمان، کچھ پھر اہوا تھا۔

”بس کرو مسٹر روپا سنگھی۔“ سعدی نے اکتا کر دنوں ہاتھ اٹھائے۔ ”تم نے یہ صرف انعام کی رقم لے لئے کیا ہے۔“ بوڑھا مزید طیش کے عالم میں کچھ اور بھی کہتا مگر دروازہ چرچا ہٹ کے ساتھ کھلا اور کامنی استھنامیہ نظر وہن سے ان دنوں کو دیکھتی اندر داخل ہوئی۔ ”باہر کوئی تم سے ملنے آیا ہے شفعت۔ وہ تمہاری تصویر دکھا کر پوچھ رہا ہے تمہارا۔“ پھر باپ کو دیکھا۔ ”آپ کیوں لڑ رہے ہیں اس سے؟“

سعدی کی ریڑھ کی ہڈی میں سننی سی دوڑگئی۔ ”پلیز اس کو میرانہ بتانا۔ وہ مجھے ڈھونڈنے آنے والوں میں سے ہے۔“ کامنی مطمئن نہیں تھی مگر وہ واپس نیچے اتر گئی۔ کافی شاپ کے ہال میں آئی تو دیکھا، وہ کاؤنٹر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ سیاہ رمکت، جبشی صورت اور سفید چمکتے دانت۔

”جی؟“ وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”میں اس نئے لڑکے سے ملنا چاہتا ہوں جو سنائے جادوئی کرتب دکھاتا ہے۔“

”ہاں وہ بہت ایمیز نگ ہے۔ آپ اس سے مل کر بہت محظوظ ہوں گے۔ ابھی وہ باہر گیا ہے، کراکری شاپ تک۔ یہ تین بلاک چھوڑ کر جیسے ہی آتا ہے میں آپ کو ملوٹتی ہوں۔ کچھ آڑ کریں گے آپ؟“ وہ مسکرا کر کھڑی تھی۔

”نہیں۔“ فتح کھڑا ہو گیا۔ ”کس شاپ تک گیا ہے وہ؟ پتہ سمجھادیں گی آپ مجھے؟“ اس کو پتہ سمجھا کر وہاں سے بھیج کر کامنی اور آئی تو وہ دنوں ابھی تک لڑ رہے تھے۔ سعدی کا بیگ اس کے کندھے پر تھا۔

”وہ چلا گیا ہے۔ اب مجھے بتاؤ کیا ہو رہا ہے؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ روپا سنگھی ڈھنڈتے اور مایوسی سے بچ کر بولا۔ ”یہ لڑکا فراڈ ہے۔ تامل جاسوں ہے۔ کلب میں اس کی شکل کے most wanted پوسٹر لگے ہیں۔ یہ ہمیں بھی دھوکہ دے رہا تھا۔“

کامنی نے ناچھبی سے سعدی کو دیکھا۔ وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔

”نہیں پاپا، اس کی گرل فرینڈ کی فیملی امیر ہے، تو وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں اور....۔“

”کوئی لڑکی نہیں ہے کامنی۔ اس کی کوئی لو اسٹوری نہیں ہے۔ یہ دہشت گرد ہے۔“

”میں دہشت گرد نہیں ہوں۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”مگر تم ایک قاتل ہو۔ میرے ایسوی ایسٹ کوزہر میلے بین سے بلاک کر کے بھاگنے والے قاتل ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، سعدی

یوسف؟“

بوٹ کی ٹھوکر سے دروازہ کھول کر... فضیح کا سیاہ چہرہ چوکھت میں نمودار ہوا۔ کامنی ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹی۔ روپا سنگھی کا رنگ اڑ گیا۔ سعدی نے پتھرائے ہوئے سنجیدہ چہرے کے ساتھ ایک دم پستول نکال کر دونوں بازوں لیے کئے اس پستان لیا۔  
”کیا اس نے آپ لوگوں کو اپنا صحیح نام بھی نہیں بتایا؟“ فضیح نے چوکھت میں کھڑے، مسکرا کر پوچھا تھا۔ کامنی نے ایک نظر سعدی پر ڈالی۔ اس نظر میں سب پچھو تھا۔ صدمہ بے اعتباری، یقینِ اٹونٹھے کا دکھ۔ مگر سعدی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پستول تانے، نظریں فضیح پر گاڑھے ہوئے تھا۔

”پیچھے ہٹ جاؤ فضیح، ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

”نہیں، تم اگلے ہی لمحے پستول نیچے کر دو گے جب تم یہ دیکھو گے۔“ کہنے کے ساتھ فضیح، جو چوکھت سے لگ کر کھڑا تھا، ذرا بائیں طرف کو ہوا اور.... اپنے دائیں ہاتھ سے کسی کو کھینچ کر اپنی ناگ کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ ڈر اسہا سامونچو جس کے منہ پڑ کٹ ٹیپ بندھی تھی اور ہاتھ بھی کمر پہ ٹیپ سے بندھے تھے۔ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر گال پڑھک رہے تھے۔ کامنی کی بے اختیار جیج نکلی تھی۔ روپا سنگھی بھی چلایا تھا۔ وہ بچہ ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ میرا نواسا ہے۔ تمہیں خردی نہیں والا میں تھا۔“  
فضیح نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا پستول بچے کے سر پر تھا۔ سعدی نے ایک لفظ کہے بنا پستول زمین پڑاں دیا۔  
”بچے کو چھوڑ دو۔“

”پہلے تم یہ پہنو،“ اس نے ہتھکڑی کے دو بامن جڑے کڑے میز پڑا لے۔ اوہ روپا سنگھی مسلسل اسے بچے کو چھوڑنے کا کہہ رہا تھا۔ کامنی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر چہرے پڑھکتے گئے۔ وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔  
”اوکے!“ سعدی چند قدم آگے آیا، کامنی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”تمہارے بچے کو کچھ نہیں ہو گا۔“ مگر اس نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو اس نے خاموشی سے ہتھکڑی اٹھائی، اور اپنے ہاتھ کو پیچھے کو باندھ کر ہتھکڑی پہن کر لکھ کی آواز سے بند کر دی۔  
”اب میرے آگے چلو،“ فضیح نے کہتے ہوئے اپنا کوٹ اتارا اور سعدی کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اب اسے دیکھنے پر نہیں پڑتا تھا کہ اس کے ہاتھ پیچھے کو بندھے ہیں۔

فضیح بچے کو اپنے ساتھ گھیئے، سعدی کو آگے چلائے، میرا ہیاں اتر کر شاپ کی پچھلی سمت سے باہر نکلا۔ بچے کو اس نے سیر ہیوں کے دہانے پر چھوڑ دیا اور خود سعدی کے پیچھے چلتے ہوئے اسے مسلسل ”سیدھا چلواب دا میں مڑو۔“ کہتا آگے چلاتا گیا۔ سعدی کندھوں پر لمبا کوٹ ڈالے، سنجیدہ چہرے کے ساتھ چلتا گیا۔

فضیح کے وقت گلیوں میں رش تھا۔ نفاس نفسی کا عالم تھا۔ ہر شخص اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ کسی دوسرے کی فکر نہیں۔ ایسے میں وہ خاموشی سے فضیح کے آگے چلتا جا رہا تھا۔ وہ بھاگتا تو فضیح سائکنیسر لگے پستول سے اسے گولی مار دیتا وہ جانتا تھا۔

ایک جگہ سڑک کنارے چلتے چلتے فضیح نے اسے پہاڑی سے اتر جانے کی ہدایت دی۔

”تم مجھے کسی ویران جگہ پر لے جانا چاہتے ہو تو کہ مجھے مار سکو۔ اوکے۔“ وہ سر کو خم دیتا، جو گرزہ ہلان پر رکھتا یخچا اترنے لگا۔

”بکواس نہیں کرو۔ چپ چاپ اترو۔“ وہ گرج کر بولا۔

”نہزادے موت کے مجرم سے بھی اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ مجھ سے نہیں پوچھو گے۔ میں جانتا ہوں ابھی واپس جا کر تم کامنی کے خاندان کو بھی مار دو گے۔“

”اس کا انتظام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔“ سعدی چونکا مگر فضیح نے مجھے سے پستول کا شہود کا دیا تو وہ آگے چلنے لگا۔

وہ دونوں چلتے چلتے ایک پہاڑی گھائی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چائے کے باغات کی سوندھی مہک یہاں بھی محبوس ہوتی تھی۔ اور آسمان پر مطلع صاف تھا۔ پھر بھی چھایا تھی۔ سورج کسی اوٹ میں تھا۔ اس پہاڑی گھائی میں ایک جگہ فتح نے اسے رک جانے کو کہا۔

”یہاں گھنوں کے بل بیٹھوں“

”تاکہ تم میری گرن اتار سکو۔ صحیح!“ وہ گھنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ کندھوں پر کوٹ ڈالا تھا، ہاتھ پیچھے کو بند ہے تھے۔ گردن موڑ کراس نے فتح کو دیکھا تو چہرے پر سکون تھا۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مگر کامنی کے خاندان کے لیے کیا انتظام کیا ہے تم نے؟ تباودا!“

فتح اب پستول اس پرتابے اس کی پیشانی کا شانہ لئے سامنے آکھڑا ہوا۔

”وہ میر اور تمہارا چہرہ دیکھ چکے ہیں۔ اس کافی شاپ کے ہر شخص کی موت کے ذمہ دار تم ہو۔“

”کیا کیا ہے تم نے؟“ سعدی کا دل زور سے دھڑکا۔ ”کیا تم نے ان کی شاپ میں کوئی بم وغیرہ فٹ کیا ہے؟“

”میں اتنے پیچیدہ چکروں میں نہیں پڑا کرتا۔ کچن میں داخل ہو کر میں نے دودھ کے ابلیتے دیکھے میں دو گھونٹ جتنا بے ذائقہ زبر ملایا تھا۔“ پھر اس نے جیسے سوچنے کی ادا کاری کی۔ ”اسی دودھ سے انہی سب کی کافی بننے کی چائے بننے کی، پچھے بھی وہی دودھ پے گانا۔“

”بے چارے۔“ سعدی نے لب پھینک لیے۔

”دیکھو تمہیں مجھے مارنا ہے تو مار دو۔ مگر مجھے ایک دفعہ ان کو کاٹ کر کے بتانے دو کہ دودھ زہر یلا ہے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا نہ کرو۔“

”سوری.... یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ پستول پھر سے اس پرتاب کر ایک آنکھ بند کیے شانہ لیے ہوئے تھا۔ ”اگر کسی صورت میں انہوں نے دودھ ضائع کر دیا تب بھی میں جا کر ایک ایک کو حادثاتی موت کا شکار کرہیں گے تو نکل وہ سب میرا چہرہ دیکھ چکے ہیں۔“

سعدی نے سر جھکایا اور گہری سانس لی۔ ”یعنی فتح، مجھے تمہیں روکنے کا مستقل انتظام کرنا ہو گا؟“

”تم مجھے با توں میں الجھانا چاہتے ہو؟“ اس نے کہنے کے ساتھ پستول سعدی کی پیشانی پر کھا۔ تھنڈی نال اس کی جلد سے جیسے ہی تکراری، اس کی ریڑھ کی بڈی میں ایک سمندھی خیز ہر دوڑگی۔

”کلمہ پڑھلو،“ فتح نے غرا کر کھا۔ سعدی نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تم بھی!“ اور اگلے ہی لمحے سعدی نے کوٹ سے ہاتھ کا نکال کر اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر مر وڑا۔ ایک سینکند کا عمل تھا، اور وہ بھی کی رفار سے انٹھ کر فتح کو گردان سے دبوچ چکا تھا۔

فتح ترا تر تر ٹیکر دباتا گیا، گولیاں سامنے فضا میں گم ہوتی گئیں مگر سعدی اس کی پشت پر آ کھڑا ہوا تھا، اور اپنے بازو کے شکنج میں اس کی گردن لے لی تھی۔ فتح اس کے بازوؤں کے نرغے میں پھٹ پھٹ رکھتا، پستول کا رخ پیچھے کو موز نے لگا، مگر اس سے پہلے کہ

وہ

پیچھے کی طرف گولی چلا سکتا، سعدی یوسف نے اپنی آنکھیں بند کئے، زور سے اس کی گردن کو جھکا دیا۔

فتح کی گردن کا منکاٹوٹ گیا۔ زندگی کی ڈور بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے بیکی کی سی صورت آخری سانس لی۔ اور پھر... گردن ڈھلک گئی۔

سعدی نے اپنے بازو بٹا دیے۔ فتح کی لاش زمین پر جا گری۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اور ان میں کوئی تاثر نہ تھا۔ تاثر تو سعدی کی آنکھوں میں بھی نہ تھا۔ وہ سرد سپاٹ چہرے کے ساتھ پیر کی ٹھوکر سے اس کی لاش کو پرے کرتا گیا یہاں تک کہ لاش پہاڑی کے دہانے پر آ رکی۔ سعدی نے ایک اور ٹھوکر ماری، اور لاش نیچ لڑھک گئی۔ خاردار جھاڑیوں بھری ڈھلان سے لاش نیچے گرتی چلی گئی۔ دور نیچے... اندھی

اس نے فتح کا کوٹ بھی اچھا ل کر نیچ پہینکا، پھر اس کا موبائل اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ اور دونوں ہاتھ جھاڑتا وہ اوپر ڈھلان پر چڑھنے لگا۔ چہرہ سنجیدہ تھا۔ بے تاثر اور سرد۔ دل کا بو جھ بڑھ گیا تھا۔

معمر کے کی اس جگہ پر کھلی ہوئی چھکڑی اور اس کے لاک میں گھسی سیاہ ہسیر پن زمین پر گری پڑی تھی۔ یہ کامنی کی ہسیر پن تھی جو اس نے جاتے تھے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے وقت اتاری تھی۔ اور اس کو سارا راستہ کوٹ کے اندر چھپے ہاتھوں کی چھکڑی میں گھساتے وقت اس کے ذہن میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ ”لاک کی چھٹے ہمیں... ون... ٹو... تھری... فور... فائیو... سکس... اور کلک...“

❖❖❖

یا رب یہ کس نے ٹکڑے کیے روڑھڑ کے ..... مجھ کو تو گام گام پر محشر پا ملا  
سز بیلوں سے ڈھکے بیلکے میں ناشتے کی خوشبو پھیلی تھی۔ زمر تیاری کمرے سے باہر نکل رہی تھی، اور دوسرا ہاتھ سے گلے گنگریا لے  
بال کانوں کے پیچھے اُس رہی تھی جب ندرت نے اسے پکارا۔ وہ ہاتھ میں لگنگر لئے سامنے کھڑی تھیں۔ قدرے متنکر، قدرے متین۔

”مجھے علیشا کا فون آیا تھا۔ وہ جنین کی امریکی سیلی ہے۔“ اور یہ تو طے تھا کہ یو سفر اب با تین نہیں چھپائیں گے، سودہ اسے تفصیل سے بتا رہی تھیں۔ وہ قدرے حیرت سے سنت گئی۔

”آپ اسے کہیے گا وہ کی چین سعدی کے ساتھ کھو گیا تھا۔ باقی معاملہ میں دیکھ لوں گی۔“ اس کا فون بختنے لگا تو وہ اسے کان سے لکاتی اسی رفتار سے بولتی آگئے آئی۔

”جی، میں کل آنہیں سکنی، ایک عزیز کی عیادت کے لئے چل گئی تھی، تو پھر آج...“ رک کر اس نے کچھ سننا۔ پہلے آنکھوں میں حیرت ابھری، پھر شاک۔ ”کیا مطلب انہوں نے ڈیل سائنس کری؟ وہ میرے کلائنٹس تھے۔ ان کو کیسے پتہ تھا کہ میں نہیں آؤں گی؟ اوہ...“ اور احساس انکشاف جیسا تھا۔ اس نے کراہ کر آنکھیں بند کیں۔ ”میں سمجھ گئی۔ انہیں ہاشم کاردار نے کہا ہو گا کہ زمر یوسف کو میں نے بے کار ڈاکو منٹس لکھوانے اپنے پاس روک رکھا ہے سوم لوگ اس کے کلائنٹس کو خراب کر دو۔ واو۔ اس آدمی کا دماغ ہبپتال کے بیڈ پر بھی نہیں تخریب کاری سے خود کو بازنہیں رکھ سکتا، اور میں اس کی تیارداری کر رہی تھی۔“ فون بند کر کے وہ خود کو کوس رہی تھی۔ چہرہ غصے میں سرخ ہو رہا تھا۔

سامنے بیٹھی چائے کے گے سے گھونٹ بھرتی جنین نے دیکھی سے اسے دیکھا۔ ”اور آپ نے ہاشم سے انسانی ہمدردی کے تحت اتنا اچھا موقع گنوادیا اس کی فائلز کا پی کرنے کا۔“

زمر چند لمحے چھپتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی، پھر تیزی سے اندر گئی اور۔۔۔ واپس آئی توحہ کی فلیش ڈرانیو اس کے سامنے پہنچی۔

”میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اگر میں اس وقت ہاشم کی فائلز کا پی کرتی تو مجھ میں اور اس میں کیا فرق ہوتا؟ اور یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا تمہیں اتنی چال بازگئی ہوں کہ وہ زمین پر گرا کراہ رہا ہو گا اور مجھے فائلز کی فکر ہو گی۔“  
”تو؟“ جنین نے کندھے جھٹکے۔

”تو یہ کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں نے فائلز کا پی نہیں کیں، میں نے تو صرف ایک سوال پوچھا تھا۔“ جنین نے بے اختیاگ والا باٹھ نیچ کیا۔ وہ ششدہ رہ گئی تھی۔ زمر دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اس کی طرف جھکی۔ ”اور جواب یہ ہے کہ میں اتنی ہی چال باز ہوں، اور اگر اب میرے اور اس کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے تو نہیں! مگر.... ہاشم کی ساری فائلز اس میں ہیں۔“  
جنین نے بے یقینی سے فلیش کو دیکھا اور پھر اسے۔

”اس کا لیپٹا پ آن تھا، پا سورڈ کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کے آفس میں کوئی سی اسی وی بھی نہیں ہے جو کوئی مجھے اس ساری افراتفری میں یہ کرتے دیکھ سکتا۔ ساری فائلز بھی رات کو کھول کر دیکھ لکھی ہوں۔ وارث غازی والی فائلز وہ کب کی ڈیلیٹ کر چکا ہے مگر... اس کے علاوہ بھی بہت کچھ... سینکڑوں ڈاکوٹش ہیں اس میں جو ہمارے کام آسکتے ہیں۔ انسانی ہمدردی ایک طرف خین، میں... اتنی جلدی... سب بھلانے والی نہیں ہوں۔“ اور میز پر ہاتھ مار تھا۔ حسین نے ناشتہ بناتے مڑکرا سے دیکھا۔ (یہ غصہ ہو رہی ہے اور آگے سے خین باجی خوش ہو رہی ہے۔ پاغل ہیں دونوں!)

خین فرطہ مسرت سے اٹھی اور زمر کے دونوں ہاتھ تھام کر دبائے۔ ”آپ... آپ میری ملکہ ہیں۔“ اور جھپٹ کر وہ فلیش اٹھا کر اندر بھاگی۔ زمر کے تین اعصاب ڈھیلے پر چکے تھے، مسکرا کر سر جھکتی وہ پرس اٹھائے بال ٹھیک کرتی، یہ ورنی دروازے کی طرف بڑھتی۔ خین اگلے دو گھنٹے ان فائلز میں جو ہو کر بیٹھی رہی۔ لاڈنگ کے صوفے پر یہم دراز (حسین سے بنوائے) آلو کے چیپ کھاتی، وہ صفات پر صفات آگے کرتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ تبھی گھٹتی بجی۔

اس وقت گھر پا لبا اور خین کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ سیم اسکول، ندرت ریشوراٹ، زمر کورٹ۔ ملازم اپنے کوارٹر میں۔ وہ بادل خواستہ اٹھی اور باہر آئی۔ پورچ سے ہی اسے گیٹ کے باہر کھڑا ہمنظر آگیا تھا۔ وہ چہرے پر نخوت لائے چند قدم آگے آئی۔ ”آ... السلام علیکم... پھچو گھر پہ نہیں ہیں۔“

وہ اس کی طرف گھوما۔ گیٹ چھوٹا تھا۔ کندھوں سے اوپر وہ دکھائی دیتا تھا۔ ذرا سامسکرا یا۔ ”میں آپ سے بات کرنے آیا تھا۔“

”جی!“ وہ سمجھی گی سے اسے۔ یہ کمکتی ہوڑا امزید آگے چل کر آئی، پھر کر گئی۔ گیٹ دریمان میں حال تھا۔

”وہ کیا ہے؟“ مس یوسف کہ کچھ دن سے کوئی مسلسل ہمارے یعنی کاردار کے سشم میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، یا پھر مجھے کہنا چاہیے، کر رہی تھی؟ (خین کی رنگت سفید پڑی) تو میں نے سوچا کہ: نفس نیس جا کر آپ کو... خین یوسف آپ کو ایک مہذب اور شاستری دارنگ دے دوں کر ایسی پچانہ حرکتیں نہ کیا کریں۔ ہمارے سشم کی حفاظتی دیواروں کو آپ نہیں توڑ سکتیں، لیکن اگر آپ نے دوبارہ کوئی ایسی حرکت کی تو میں مجبور ہو جاؤں گا، آپ کے بارے میں آپ کے گھروالوں کو بتانے پر۔“

خین بالکل شل سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ چباچا کر کہہ رہا تھا۔

”کیا آپ کی امی جانتی ہیں؟ اور آپ کے دادا؟ کہ آپ کی زندگی ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ کا بورڈ میں ثاپ کرنا بھی تو ایک جھوٹ تھا۔ آپ نے اوہی پی کو بلیک میل کیا تھا، میرے پاس آپ کی اور اوہی پی کی بیٹی کے یہ یغامات کے پر نٹ آؤٹ پڑے ہیں۔ تو اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے جھوٹوں سے پر وہ اٹھاؤں تو آنکیدہ میری درک پلیس پر مسلکے نہ کھڑے سے کیجئے گا۔ سنًا آپ نے؟“ رسان مگر تھی سے کہہ کر اس نے گریبان میں انکی برانڈ ڈگا سنز نکال کر آنکھوں پر لگائیں اور کارکی چابی کے ریموٹ کا ٹنڈن دبا تا مر گیا۔ خین کے حلق میں بہت سے آنسو پھنسنے تھے مگر آنکھیں خشک تھیں... وہ یک لکھ ساکت پھر بنی وہیں کھڑی تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

محسن ہمیں یہ سوچ کے کرنی پڑی پہل ..... شاید وہ شخص آج بھی قیدِ انا میں ہو فوڈی ایور آفٹر کی بالائی منزل کے خالی ہال میں ڈھوپ اوپنجی کھڑکیوں سے چھن کر اندر گر رہی تھی۔ کونے والی میز پر زمر بیٹھی، لیپ تاپ پر انگلیاں رکھے، ثاپ کرتی، وقفے وقفے سے گردن کو داہمیں بائیں میں باسیں بائیں حکمت دیتی۔ تھکا وٹ سے پٹھے گویا اکثر نے لگے تھے۔ تبھی انہر کام بجا۔ اس نے اٹھا کر مصروفیت سے پوچھا۔ ”جی؟“

”مسز زمر!“ نیچے ریسیشن والی لڑکی تھی۔ ”ایک کلاسٹ ہیں آپ کے لئے۔“ وہ ذرا رکی۔ ”کہہ رہے ہیں کہ یہوی سے جھگڑا ہوا

- 2 -

کسی بھائی کو نہیں ملے گئے۔ تو سبھا اور ایسے بھائی پر اپنے دل کی کھینچیں۔ کہ کھینچ کی جاتی ہے اپنے دل کی کھینچیں۔

”نیل کے ساتھ میں بھی پارکوں کی کمی، جو کہ نیل کے ساتھ بیٹھتی تھی تھی آپ۔ تاً تجربی اور جاہلی خود کی تجربی تھیں۔ تجربہ پارکوں کا تجربہ کارکس کی طرف بیٹھنے والے بھیں افسوس لے بھیں۔ تکریں بھی۔...۔ پہلی تجربہ۔ یہے ہی پال، تجربے کے ساتھ میں۔ پہلے تجربہ۔ تجربے میں جو کہ کامیاب نہ تھا۔ لے جو کام ساتھیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کی قسم کامیاب تھی۔ پھر اس کے بعد تجربے میں جو کامیاب نہ تھا۔ لے جو کام ساتھیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کی قسم کامیاب تھی۔“

وَالْمُؤْمِنُونَ الْمُؤْمِنَاتُ وَالْمُؤْمِنُونَ الْمُؤْمِنَاتُ

”لکھ۔۔۔“ میں کلیں تھے اس کا ساری طرف پر کھڑا کیا۔ اسی ساری طرف تھا تو اسی ساری طرف تھا۔

وَهُنَّ مِنْ أَنْفُسِهِمْ بَرْهَنٌ وَلَا يَرْجِعُونَ إِلَيْنَا كَذَلِكَ كَانُوا يُوعَدُونَ

Digitized by srujanika@gmail.com

1600000

”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ مُؤَذِّنٌ يَقُولُ فِي مَسَاجِدِ الْمُسْلِمِينَ:

Digitized by srujanika@gmail.com

ڈارں کیوں دیا اور اگلے سوچ دیکھا۔ آپنا آٹا جس میں بھیجیں کہ اسے یہاں سے آؤں لے آؤں لا۔ اگر لے آس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسی کی وجہ سے اسے مل جاتا تھا کہ کہ کر

“لَمْ يَكُنْ لِّكَ مُلْكٌ إِذَا هَبَطَتِ الْأَرْضُ إِلَيْكَ”

”بے شکر اگر کسی اپنے دلکش ہے کہاں اُپ کو کہاں آپ کو کہاں ملے گا تھے لئے تھے۔

کے مالک ہی تھے۔ کہاں تھے۔

”کوئی بھائی نہیں اور اپنے اپنے کام میں بھائی کا نام لے کر کے کہا۔“

۲۰۔ نیکوں کا دنیا کی طرف سے بکھر جوں اگر وہ سے کہے گی۔

“*أَلَا يَرَى أَنَّا نَسْقِيرُهُمْ بِمَا كَانُوا فِي أَفْعَالِهِمْ*”

”ابن شیخ ایل لے ہوا بھول۔ ایک سوچ دے رہا تھا کہ اسے کیا کرنا پڑے۔

—  
—  
—  
—  
—

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”میں بھی بیہی کر رہا تھا۔“

”تم انہائی دو نمبر انسان ہو، اور نہ صرف دو نمبر بلکہ.....“

”سوری۔ آئندہ ہمیشہ سچ بولوں گا۔“ اس نے پچھے لفظوں میں سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ اب وہ کیسے اس سے اس بات پر لڑے جس پر وہ ناراض تھی ہی نہیں؟ چند لمحے کے لئے بالکل چپ ہو گئی۔

”اوکے۔ آئندہ سچ بولنا مجھ سے۔ بھلے کسی کے بھی اپارٹمنٹ میں کسی کے بھی ساتھ ہو، سچ سچ بتا دینا۔“ پھر سے رکھائی سے بول کر کی بوڑھ پر کچھ تاب کرنے لگی۔

وہ بے اختیار نہیں دیا۔ ”جب تم جلتی ہونا“ تو سارے کمرے میں دھواں بھر جاتا ہے۔ مت جلا کرو اس سے۔ تم میری محبت ہو۔ مانا کہ وہ تم سے زیادہ خوبصورت، زیادہ پیاری، زیادہ سلیمانی، شاکستہ اور زم مزاج کی ہے، مگر تم....“

اب بہت ہو گیا تھا۔ زمر نے جھٹکے سے لیپٹاپ کی اسکرین فولڈ کی۔

”ہاں مجھے پرداہ ہے۔ ساتھ میں۔“ وہ غرائی تھی۔ ”مجھے پرداہ ہے اور اگر آئندہ تم مجھے اس کے بیس فٹ قریب بھی نظر آئے تو میں تمہارے ساتھ اتنی بے رحمانہ انداز میں پیش آؤں گی کہ....“

”جو آٹھ سال کرتی رہی ہو، تو وہ بھی نہیں تھا۔“ وہ بکا سامسکرایا۔ زمر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ چند گھنے سانس لئے۔

”خیراً گرم نے کوئی اور بات نہیں کرنی تو تم جاسکتے ہو۔“ وہ روکھے نزوٹھے انداز میں کہہ کر کام کرنے لگی کہ....

”میں سعدی سے ملا۔“

زمر نے اتنی تیزی سے گردن اٹھائی کہ ہڈی چٹختے کی آواز آئی۔ آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی درآئی تھی۔ ”کب؟ کہاں؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟“ وہ ایک دم اٹھی اور گھوم کر اس کے ساتھ والی کری پا بیٹھی۔ بے چین بے قراری۔

”وہ کچھ دن تک آجائے گا۔ وہ ٹھیک تھا۔ ڈونٹ وری۔“ وہ زمی سے کہنے لگا گرگروہ اب اس طرح سکون میں نہیں آسکتی تھی۔

”پلیز مجھے بتاؤ۔ تم اس سے کیسے ملے۔ کہاں ملے۔ وہ کیسا ہے۔“ اسکی آنکھیں تم تھیں اور اس نے بے اختیار فارس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تھے۔ بے تابی سی بے تابی تھی۔

”یدیکھو۔“ اس نے زمی سے ایک ہاتھ چھڑایا اور سیل فون نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”میں نے تمہارے لئے اس کی ایک تصویر یہی تھی۔ ورنہ میں تو ہوں ہی جھوٹا۔ تم کہاں مانسیں کر میں اس سے ملا تھا۔“

زمر نے بے تابی سے فون پکڑا۔ اسکرین پر وہ دونوں نظر آ رہے تھے۔ رات کے وقت ریسٹورانٹ کا منظر۔ اور وہ کھانا کھارہ ہے

تھے۔

”اس کے بال دیکھو۔ اس نے کٹوادیے اور....“

”سعدی کے منہ پر چوتھی کسی ہے؟“ وہ تصویر یہود کر کے ایک دم بولی تھی۔ سعدی کے ہونٹوں کا زخم اور گال کی سوچن صاف نظر آ رہی تھی۔ فارس غازی کی بولتی بند ہو گئی۔ بے اختیار بال کھجائے۔

”آ..... یہ چوتھ؟“ اس نے تھوک نگلا۔ ”شاید کسی نے مارا تھا۔“ (اب کسی کی تفصیل میں وہ نہیں جا سکتا تھا۔)

”کس نے؟“ وہ غصے سے بولی تھی۔ اسکرین پر انگلی پھیرتی، تصویر کو چھو کر محسوس کرتی، وہ بہت مضطرب نظر آنے لگی تھی۔

”پچھے نہیں۔ اس نے..... بتایا نہیں۔“ فارس نے بات بدلتی چاہی۔ ”تم نے اس کے بال دیکھے؟ بالکل....“

”اللہ غارت کرے ایسے لوگوں کو۔ ہاتھ کیوں نہیں ٹوٹ جاتے ان کے۔ قہرنازل ہوان پر اللہ کا....“ وہ بولتی جا رہی تھی اور فارس نے

بہت سے بے چین پہلو بد لے تھے۔ ”اچھا ٹھیک ہے، بس کرو۔“

”نبیں، کس نے حق دیا ہے ان لوگوں کو کہ وہ اس کے ساتھ یہ سب کریں۔ وہ کتنی مشکل میں ہو گا۔ وہ کتنا پریشان ہو گا۔ پلیز اے واپس لے آؤ۔“ وہ رو بائی ہو رہی تھی۔ اتنے ماہ بعد... سعدی کی تصورید یکھنا... جذبات ابل ابل رہے تھے۔ نم آنکھوں سے اس نے فارس کو دیکھا۔ ”وہ تم سے ملا تو کیسا تھا؟ تم اس سے کیسے ملے؟ تم نے اسے گلے لگایا؟ اسے پیار کیا؟“

اور فارس غازی نے ایک نظر میز پڑا۔ جہاں خونخوار نوکیں نوک والے قلم رکھے تھے۔ ایک تیز دھار پیپر ناف بھی پڑی تھی۔ اور چند بھاری، وزنی پیپر و بیٹ بھی جو کسی بھی انسان کو قتل کرنے کے لئے کافی تھے۔ اس نے گھری سانس لی اور جرا منکرایا۔

”میں... میں اس سے بہت اچھے سے ملا۔ ایک ریسٹورانت کا پتہ دیا تھا سے۔ وہ دباؤ آگیا میں اس سے گلے ملا اس کا ماتھا چھما، اسے تسلی دی کہ اب وہ میرے ساتھ ہے، اس کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگ سکتا۔ اس کے زخم... منہ والے زخم کے لئے اسے آس پیک لا کر دیا... اور...“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ (بیز غرق ہو چکی کا۔) اور زمر بہت منونیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کتنے اچھے لوگ، کیئر گن ہوتے۔ سو رو میں تم سے اتنے دن ناراض رہی۔ میرا کیا ہے۔ میں تو ایک زمانے میں سمجھا کرتی تھی کہ تمہیں لوگوں کو مارنے پئئے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ کتنی غلط تھی میں تمہارے بارے میں۔“

❖❖❖

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ..... ہائے اس زود پیشان کا پیشان ہوتا!

اس سکس اشارہ ہوئیں کا وہ ہاں مہمانوں کی گول میزوں سے بھرا تھا۔ پہلے صف میں ایک طرف کیسرہ میں اور پورٹر زکی واضح اکثریت کھڑی نظر آتی تھی جو دھڑا دھڑا اُس پکھڑے شخص کی تصاویر اتار رہے تھے ویڈیو بnar ہے تھے۔ اور ایش گرے سوٹ میں ملبوس وہ وجہہ سا ہاشم کار از بال بجل سے پیچھے کیے؛ اُس پنصب آدھر جنم مانیکس میں کہہ رہا تھا اور سب دم سادھے اسے سن رہے تھے۔۔۔

”مجھے آج اس فورم پکھڑے ہو کر چند دن قبل ہونے والے اپنے سب سے بڑے پلانٹ کی بتابی کا ذکر کرتے ہوئے کسی بھی قسم کا افسوس نہیں ہو رہا۔“

فضاؤں میں کوئی ادا سانگھ گلگنیا جا رہا تھا۔ ہو لے ہو لے.... دھیرے دھیرے سے۔ ایک سکوت ساتھا.... جیسے ہر کوئی انتظار میں ہو.... جیسے ہر کوئی تیار کر رہا ہو....

”افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ اگر میں اس anxiety ایک سے مر بھی جاتا، گو کہ میں بہت ڈھیٹ ہوں، (ہاں میں قہقہہ بلند ہوا) تو میں اس پچھتا وے کو لے کر دنیا سے جاتا کہ میں لوگوں کی خیر کے لیے جتنا کر سکتا تھا، اتنا نہیں کر سکا۔“

کولمبو کے ساحل سے دور ایک لانچ سمندر کے نیلے پانی پر تیر رہی تھی۔ اس کے اندر ورنی کی بنیں میں کرمل خاور بیٹھا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی، آنکھوں پر عینک تھی، اور وہ بار بار گھری دیکھتا تھا۔ سعدی یوسف کی تلاش ترک کر کے وہ اپنے مالک کو منانے والیں جا رہا تھا۔

”اور میرے ان سب دستوں، وفادار ساتھیوں کا شکریہ جنہوں نے مجھے احساس دلایا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب میں اپنی زندگی لوگوں کی بھلانکی کے لیے وقف کر دوں۔“

کینڈی میں اس کافی شاپ کے کچن میں کھڑے سعدی یوسف کا چھوٹا، بھدا سامو بال بجا تھا۔ اس نے پیغام پڑھا اور چپ چاپ باہر نکل آیا۔ چند گلیاں پیڈل چلتا گیا، یہاں تک کہ سڑک کنارے نصب ایک کوڑے داں کے ساتھ رکا۔ احتیاط سے دھڑا دھڑ کیھا پھر ڈھکن کھولا۔ چند بد بودا رش پر ہٹائے تو اسے وہ نظر آگیا۔ سیاہ پلاسٹک ریپر میں لپٹا پیکچج۔ اس نے اسے نکال کر کھولا۔ اندر سبز پا سپورٹ تھا اور اس

پاکی کی تصویر لگی تھی۔ چھوٹے بال، داڑھی، سبز آنکھوں کے ساتھ۔ وہ بالکا سامسکرا یا اور اسے جیب میں ڈال لیا۔

”کیونکہ جب تک انسان اپنی ذات سے باہر نکل کر دوسروں کی بھلانکی کے لینے نہیں سوچتا، وہ کفر کرتا ہے، سازشیں کرتا ہے، جھوٹ بولتا رہتا ہے اور اسیے لوگ تو قتل کرنے سے بھی گرینہیں کرتے۔“

جنین بالکل نارمل سی، پھرائے ہوئے چھرے کے ساتھ اپنے کمرے میں کھڑی تھی۔ کمپیوٹر پر نظر زوں زوں کی آواز کے ساتھ ایک کانفذ بالہ اگلا جسے اس نے اٹھا کر سیدھا کیا۔ اس پر احمد کی تصویر بنی تھی۔ اس نے وہ کاغذ لے جا کر دیوار پر گلی مختلف کاردار زکی تصاویر کے ساتھ چکا دیا۔ اور سیاہ مارکر سے اس کے اوپر سوالیہ نشان لگادیا۔

(کون ہے احمد شفیع؟)

”اور میں یہ جان گیا ہوں کہ ایک بہتر انسان بننے کے لیے انسان کو اپنے بارے میں سوچنا بند کر کے دوسروں کو ترجیح دینی ہوتی ہے۔“

فارس بیک کے کیش کا ڈنٹر پر کھڑا چیک بک پر کچھ لکھ کر دستخط کر رہا تھا۔ پھر اس نے چیک کھڑکی کے اندر بڑھا دیا۔ اب اندر بیٹھی ہوئے نوٹوں کی گذیاں تھماری تھیں۔

”میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ انسان چیری اپنے گھر سے شروع کرتا ہے ورشہ وہ چیری کی کامن نہیں ادا کر سکتا۔“

سعدی اپنے اوپری چھوٹے کمرے میں کھڑا بیگ میں سامان ڈال رہا تھا۔ نوٹوں کی ایک گذی اس نے یکی کے اندر چھوڑ دی تھی۔ باہر کامنی ہاتھ باندھ کھڑی غصے اور صدمے سے اس کے دروازے کو بار بار دیکھتی تھی۔ پھر بھی چلا کر کہتی۔ ”یہ مجھ سے چ بھی بول سکتا ہا۔ میں آئندہ کبھی انسانوں کا اعتبار نہیں کروں گی۔“

”مگر اس ملک کے سارے مسائل لاکھوں اور کروڑوں کی چیری دے دینے سے حل نہیں ہو سکتے۔ اس ملک کے مسئلے تبلیغ ہوں گے جب ہم لوگوں کو انصاف فراہم کریں گے.... انصاف کا مطلب ہوتا ہے فوری انصاف کیونکہ

Justice delayed is justice denied!“

زمرہ یشوراٹ کی بالائی منزل والے ہال میں بیٹھی..... پر نظر سے نکتے کاغزوں کو مختلف فائلز میں لگا رہی تھی۔ اس کے بال جوزے میں بند ہے تھے اور آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ فائلز پر فائلز تیار کر رہی تھی۔ ثبوت درج ہوت۔ ہاشم کاردار اور اس کے قربت داروں کی کمزوریاں۔ بلیک میلنگ کا مواد۔ زبردست۔

”اور اگر مجھ جیسے وکلاء انصاف کی فراہمی کے لیے واقعتاً کوششیں نہیں کریں گے تو معاشرے کے ناسور بڑھتے جائیں گے۔“ احمد شفیع قصر کاردار کے کنڑوں رومن میں بیٹھا، کی بوڑھ پہ کھٹا کھٹ ناچپ کرتا، بار بار نغمی میں سر بلاتا، افسوس سا چہرے پر درآتا جسے وہ جھک کر کام کرنے لگ جاتا۔

”اگر آج ہم جیسے لوگ اپنا پیسہ اور اپنی طاقت استعمال نہیں کریں گے تو ہماری نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔“

علیشا نارچ لئے ایکسی کی بیسمیٹ میں موجود تھی اور مسلسل تیزی سے ہاتھ چلاتی سامان الٹ پلٹ کرتی کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ ”پاور پلائنٹ کا نقصان کوئی نقصان نہیں ہے۔ اس تخریب کاری کی میں مذمت کرتا ہوں اور اس کا بدله میں اس طرح سے لوں گا کہ جو لوگ اس قسم کی وارداتیں کرتے ہیں، ہم ان دہشت گردوں کے بچوں کو تعلیم دیں گے۔ یہی ان کی سب سے بڑی شکست ہے۔“

فیجھ نا اپنے باتھ رومن میں کھڑی اپنے بوٹے میں موجود قم گن رہی تھی۔ آنکھوں میں حسرت بھری نمی تھی۔ باہر میری برآمدے میں کھڑی ملازموں پر حکم چلا رہی تھی۔

”میں اپنے تمام دشمنوں کو معاف کر کے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“

جو اہرات سیلوں نما ملکینک کی آرام دھ جیت پڑتی تھی اور چندور کرزاسے کا سمیک سر جوی کے لئے تیار کر رہی تھیں۔ وہ مسلسل آئینے میں اپنی ناک کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہی تھی۔

”زندگی نے جو مجھے ایک دوسرا موقع دیا ہے، میں اسے ایک بہتر انسان کے طور پر گزارنا چاہتا ہوں۔ میں اچھے کام کر کے فخر سے اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔“

فارس ایک اسٹورنگ لاکر کے اندر کھڑا تھا۔ لوہے کا اوپر سے نیچے گرنے والا دروازہ اس نے گرا کر کھا تھا، اور وہ مختلف شیفٹ اور خانوں میں سے سیاہ چمکتا اسلخ بکال کمال کر بیگ میں بھرتا جا رہا تھا۔ دوسرا سے بیگ میں چند دسری اشیاء رکھی تھیں۔ وہ تیاری کر رہا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد جب میری بیٹی میرا نام لے میرا بھائی میرا ذکر کرے تو وہ مجھے صرف ایک فلینٹہ را پسٹ کے طور پر نہ جانیں بلکہ انصاف کے لیے جدوجہد کرنے والے ایک فرض شناس شہری کے طور پر یاد کریں۔“

نوشیر وال اپنے کمرے میں اندر ہرا کئے بیٹھا، کریڈٹ کارڈ سے سفید اونے دار شے کوز در زور سے پیس رہا تھا۔ چہرے پر مردنی اور آنکھوں میں گمراہ گلٹ چھایا تھا۔ بار بار ان میں نبی در آتی ہے وہ کف سے رگڑ کر صاف کر لیتا۔

”لیکن...“ کیمروں اور فلینٹ لائٹ کی چکا چندرو شنی میں ہاشم کا دربار کہہ رہا تھا۔ ”ہم زندگی میں آگے بڑھتے ہوئے پیچھے رہ جانے والوں کو بھول جاتے ہیں گر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میرا دوست میرا رشتہ دار.... ایک پیارا نوجوان سعدی یوسف جو آٹھ ماہ پہلے ہم سے پچھڑ گیا.... آج میں اس کے اور اس جیسے لاپتہ افراد کے لئے ”سعدی یوسف فاؤنڈیشن“ بنانے کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ فاؤنڈیشن سعدی یوسف جیسے لاپتہ افراد کے کیمسر پھر سے کھلوائے گی اور ان کے خاندان کو انصاف کی فراہمی تینی بنائے گی۔ اس میں ملک کے نامور اور ماہرو کلاماء کا پیشہ ہو گا جو اس بات کو تینی بنائے گا کہ....“ وہ کہہ رہا تھا۔ کیمرے کھا کھٹک لکھ کر رہے تھے۔ لوگ اپنی نشتوں سے اٹھ کر اس ذہین اور شاندار ہمدرد اور حمدل خص کے لئے تالیاں بخار ہے تھے جو موت کے قریب جا کر واپس آیا تھا اور لوگوں کے لئے مزید بھلانی کے کام کرنا چاہتا تھا۔ بے داغ دامن اور سفید کار وال شخص ابھی تک بول رہا تھا....

.....❖❖❖.....

میرے خدا مجھے طارق کا حوصلہ ہو عطا..... ضرورت آن پڑی ہے مجھے کشتیاں جلانے کی ہاشم کا دردار کے آفس کی ساری بیانیں جلی ہوئی تھیں، اور وہ پاورسیٹ پر ٹیک لگائے بیٹھا، مسکرا کر فون پر کہہ رہا تھا۔ ”تھیک یو۔ جی ایسا ہی ہے۔ گا لف پر ملتے ہیں پھر۔“ اس نے ریسیور کریڈیٹ میں پر کھا۔ سامنے کھڑے ریس نے چند کاغذ اس کے سامنے رکھے۔ ہاشم نے پین ہولڈر سے قلم نکالا اور عینک ناک پر لگاتے، کاغذوں پر مطلوب جگہوں پر دستخط کرنے لگا۔ دفعتاً ٹھہر کر اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملار پسیکر آن کر دیا۔

”جی کا درار صاحب۔ کیسے ہیں آپ؟“ ہاشم کا غذات کا سرسری معاشرہ کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہوں اور لیں۔ تم سناو، فارس ٹھیک کام کر رہا ہے۔“

”جی۔ آج کل چھٹی پر گھر گیا ہے۔ پورا ہفتہ اچھا کام کیا۔ چھٹی وغیرہ نہیں کرتا تھا۔ شام میں کبھی نکلا تو نکلا، ورنہ ادھر ہی کام کرتا تھا، میں رہتا تھا۔ اور....“ اور لیں روپورث دے رہا تھا۔ وہ سنتا گیا۔ کاغذ مکمل ہو گئے تو اس نے کال کاٹی اور عینک اتار کر پرے رکھی۔

”یہ لے جاؤ اور یوں کرو، آج شام کے لئے....“ کچھ بولتے بولتے ہاشم ٹھہرا۔ اب وہ پر سوچ انداز میں اکٹھے ہوئے۔

”یہیں رہتا تھا؟“ اس نے غائب دماغ سے دہرایا۔

”جی سر؟“ ریس نے تاگھی سے پوچھا۔ ہاشم ایک دم کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا۔

”اور یہیں نے کہا وہ بھیں رہتا ہے۔ یعنی کہ کپنی کے کوارٹرز میں۔ مگر...“ وہ چونک گیا تھا۔ ”پچھلے سال ایک اسکینڈل کے بعد ان کی کپنی نے بہت سخت اصول بنائے تھے۔ اکیلے مردوں کو کوارٹر نہیں ملتا۔ صرف ان کو ملتا ہے جن کی یہوی پنج ساتھ ہوں۔“

”آپ نے بھی سفارش نہیں کی تو اور یہیں نے غازی کو کوارٹر میں کیوں رہنے دیا؟“ ریس بھی الجھا۔ ہاشم کا دار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”وہ کوارٹر میں نہیں رہ رہا۔ کوئی بھی بغیر فیصلی کے ادھر نہیں رہ سکتا۔ اور یہیں جھوٹ بول رہا ہے۔“ اور کہتے کہتے وہ خود بھی چڑھا تھا۔ ”تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے ریس۔ مجھے پڑھ کر کے دو کہ فارس غازی کراچی گیا بھی تھا یا نہیں۔ اور اگر وہ نہیں گیا تھا تو وہ کہاں تھا؟“

وہ سخت لمحے میں بولا تھا اور ریس بھی الارمڈ سا، یہیں سر کھلتا، باہر کو بھاگا تھا۔ ایک گھنٹہ۔ صرف ایک گھنٹہ تھا۔ حقیقت کو عیا کرنے کے لئے.....



باب 23:

## مورچاں

آج تم جس دکھ کے مقام پر ہو  
میں اس جگہ سے گزر پکا ہوں۔  
یقین کرو میں اس سے گزر پکا ہوں۔  
تمہیں اس سے حست لگا کر لکنا ہو گا۔  
تمہیں اس سے نکالے گا صرف ایک قبرہ۔

ایک سڑب ایک دیل۔  
ایک کہانی جو تم خود کو سناسکو۔  
وہ کیا ہے اس سے فرق نہیں پڑتا۔  
اور ضروری نہیں ہے کہ وہ حق بھی ہو۔  
جب تک تم اس قبرے پر یقین کرتی رہو۔  
جب تک اس کے ذریعے تم خود کو معاف کرتی رہو۔  
تم دھونڈو وہ سڑب۔ وہ قبرہ۔  
وہ مقصد۔

تم اسے دھونڈو تم یہ کر سکتی ہو۔  
میں جانتا ہوں کہ تم یہ کر سکتی ہو۔  
وہ ایک قبرہ خود کو سنانے کے لیے دھونڈو۔  
پھر اس لائن کو مضبوطی سے تھاملو۔  
اور پھر اس گی مدد سے خود کو  
تاریک اندر ہوں سے  
باہر نکالو۔  
(شوئہ انگریز، بکل اپ)

بز بیلوں سے ڈھکے بجکے کوہ رات اپنے دندراء سیاہ دامن میں چھپا تی جارہی تھی جب ڈورنبل کی آواز سنائی دی۔ زمر اپنے کمرے میں تھی، سیم ہوم درک پھیلائے لا ونخ میں بیٹھا تھا۔ ابا بھی وہیں موجود کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھے۔ ندرت پچن میں کھڑی بآواز بلند غیر موجود حسینہ کووس رہی تھیں۔ (ہزار دفعہ کہا ہے، کوارٹر میں جانے سے پہلے چائے کی کیتیلی مانجھ کر جایا کرو، مگر اسی طرح چھوڑ جائے گی۔ اور یہ دیکھو... صابن ختم.... ایک تو بندہ میکس باران ملازموں کے حوالے نہ کرے۔ گھول گھول کر ختم کرو دیتے ہیں....)

جب کوئی نہ بلا توحہ کرے سے باہر نکل اور دروازے کی طرف آئی۔ اتنے میں پورچ سے اندر کھلتے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکی۔ (ایسا کون ہے جو باہر گیٹ سے اندر آ بھی گیا اور صداقت نہیں جا گا؟)

”کون؟“ اس نے پوچھا۔ جواب میں خاموشی۔ حسین نے جی کڑا کر آواز بلند کی ”کون؟“

”تواب میں کون ہو گیا ہوں؟“ فارس کی آواز پھنسنے کا دل ڈوب کر ابھرا۔ آنکھوں میں خونگوار حیرت ابھری، اور لبؤں پر مسکراہت۔ پہلے لپک کر کھونے لگی، پھر رکی۔ (میں تو نمااض تھی۔) چہرے کے تاثرات سخت کیے ماتھے پہل ڈالے اور دروازہ کھولا۔ پھر بازو سینے پر لپیٹے تند ہی سے سامنے دیکھا جاں وہ دو اسٹیپ نیچے کھڑا تھا۔ ہاتھ سیاہ جیکٹ کی جیسوں میں ڈالے اپنی شہری آنکھیں اس پر جمائے وہ سادگی سے مسکرا رہا تھا۔ چھوٹے کئے بال دیے ہی تھے البتہ رنگت ذرا کملائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ”بیلودھ۔“

”علیکم بیلودھ۔ آپ کو پہچانا نہیں۔ کیا آپ میمیں رہتے ہیں؟ کیا آپ اس فیملی کا حصہ ہیں؟ اوہ مگر نہیں۔ یہاں جو لوگ رہتے ہیں وہ ایک دوسرے سے با تین نہیں چھپاتے۔ کراچی کا کہہ کر کو لو بونیں چلے جاتے، اور جب واپس آ جاتے ہیں تو اسی روز رسیور انت میں اپنی بیوی کو وزٹ کرنے کے دو دن تک اپنے گھر والوں کو بخونے نہیں رہتے۔ یہاں جو لوگ رہتے ہیں نا وہ...“، ”خنکی سے وہ تیز تیز بولے جارہی تھی اور وہ جو سکون سے مسکراہت دبائے سن رہا تھا، آگے بڑھا، وہ قدم اور چڑھا اور اس کے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر جھک کر اس کا ماتھا چوما۔“ بیک کافی، ہلکی چینی اور ذرا سی کریم کے ساتھ۔ ایک بڑا مگ۔ لا ونخ میں لے آؤ۔“ اور وہ ساتھ سے نکل کر آگے بڑھ گیا اور حسین کی زبان جذبات اور غصے کو بریک سی لگ گئی۔ چند لمحے تو سمجھنیں آئی کہ دو دن سے تیار شدہ بار بار یہ سل کر دہ تقریب مکمل کیوں نہ کر سکی۔ پھر اس کے پیچے لپکی۔ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

”میرا بھائی کہاں ہے؟“ ساری ناراضی اڑنچھو ہو گئی تھی، اور آواز میں بے قراری آگئی تھی۔

”میری کافی کہاں ہے؟“ اور اندر چلتا گیا۔ حسین اس سے زیادہ تیزی سے اندر بھاگی۔ اس کا رخ پچن کی جانب تھا۔ پیچھے سے اس نے جیچ چکار سی۔ سیم نے اسے دیکھ کر کوئی نعرہ لگایا تھا، ندرت بے تابی سے اس کی طرف بڑھی تھیں، ابا خوشی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ حمد نے کچھ نہیں سن۔ پچن میں آتے ہی چیزیں الٹ پلٹ کیں۔ جلدی جلدی کافی بنائی۔ ٹرے میں بھائی اور اسے لئے باہر لا ونخ میں آئی۔

اب وہ صوفے پر بیٹھا تھا، آگے ہو کر اور ساتھ بیٹھی ندرت کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر زمی سے کھدرا تھا۔ ”میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا نا، کہ اسے لے آؤں گا۔ وہ میرے ساتھ آئیں ہے، مگر وہ ٹھیک ہے۔ وہ اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے۔“

ندرت کے آنسو پہنچنے لگے۔ ”اگر وہ ٹھیک ہے تو فون کیوں نہیں کرتا۔ گھر کیوں نہیں آتا؟“ حمد نے نرے سامنے رکھی اور خاموشی سے اس کے ساتھ آئی۔

”فارس، کیا تمہیں یقین ہے کہ ہاشم نے ہی یہ سب کروایا ہے؟“

ابا سنجیدگی بھری ٹکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔ کارپٹ پر فارس کے قدموں کے قریب بیٹھا سیم فوراً بول اٹھا۔ ”یہ بات ڈسکس کرنے سے منع کیا تھا مرنے۔“

حسین نے رکھ کر اس کے سر کی پشت پر تھپٹ لگایا۔ ”زمر پھسوں نے۔“

”کیا ہے؟ اب تو مجھے بھی سارے راز پتہ ہیں۔“ سیم کا خیال تھا مرمکو اس کے نام سے پکارنے کا بھی کرائے ٹیرا تھا۔ ”جی ہاں۔“ وہ اسی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”میں شرمند ہوں کہ پہلے نہیں بتا سکا،“ مگر یہ حق ہے۔ وہی ہمارے دشمن ہیں ہے۔“ ”میرا بھائی کہاں ہے۔“ حنہ نے اب کے چڑک پوچھا۔ فارس نے اسے دیکھا تو وہ گلہ آمیز نظریں اس پہ جائے ہوئی۔ ”وہ کچھ دن تک آئے گا۔ میرے ساتھ نہیں آیا۔“ فارس کہہ کر چند لمحے اسے دیکھا تھا، پھر ہلاکا سا بولا۔ ”آئی ایم سوری حنہ مجھے تمہیں بتانا چاہیے تھا،“ اور اگر حنین کی کوئی خفگی رہی بھی تھی تو اب دور ہو گئی۔ وہ حکل کر مسکرا دی۔ ”میں زمر کو بتاتی ہوں کہ آپ آگئے ہیں۔ خود سے تو ملکہ عالیہ آئیں گی نہیں۔“ آخری فقرہ دبی سرگوشی میں کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ آئی۔

زمر اپنی اسٹڈی ٹیبل پہنچی تھی اور چند صفحات اسٹیپل کر رہی تھی۔ بال آدھے باندھے، آدھے کھلے تھے، اور نظریں کاغذ پہ جھلی تھیں۔ حنہ میز کے کنارے پا آنکی اور سوچتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”جب میں پندرہ منٹ پہلے یہاں کھڑی آپ کو احر شفیع کے وزٹ کے بارے میں بتا رہی تھی تو آپ نے اتنی پیاری لپ اسٹک نہیں لگائی ہوئی تھی۔ اور آپ نے یہاں پہنچنے کے تھے اور کا جل بھی نہیں ڈالا ہوا تھا۔“ بھی وہ کپڑوں کے بارے میں بھی کچھ کہتی جب زمر نے بھوری آنکھیں اٹھا کر ایک ”نظر“ اس پڑالی اور حمہ جلدی سے گڑ بڑا کر سیدھی ہوئی۔ ”میرا مطلب ہے وہ احمد والی بات....“ ”میں احمد سے بات کروں گی۔“

”اب جو کروں گی، میں خود کروں گی۔“ جب مجھے علیشا کی سچائی معلوم ہوئی تھی تو میں نے فوراً اگلے دن مسز جواہرات کو بتا دیا تھا سب۔ جب مجھے اور آپ کو ہاشم کی سچائی معلوم ہوئی تھی تو میں آپ کی طرح رونے نہیں گئی تھی۔ خادر کے پاس چل گئی تھی۔ آپ صرف شدید حالات میں روئی ہیں۔ میں شدید حالات میں آگے کا سوچتی ہوں۔ احر شفیع کے یہاں آنے سے میں ڈپریشن لے کر کونے میں نہیں پڑ جاؤں گی بلکہ یہ جانے کی کوشش کروں گی کہ احر شفیع کون ہے؟ اس کے پاس میرا راز ہے، ہمارے پاس اس کے راز ہونے چاہئیں۔ خیز، آپ باہر آ جائیں۔ فارس ماموں آئے ہیں۔ سقینا ان کی آواز تو نہیں سنی ہوئی آپ نے۔“ آخری فقرہ معصوبیت سے ادا کیا تھا۔

زمر پھر بھی کچھ وقت لگا کر باہر آئی تھی۔ ندرت اور ابا اسی پوزیشن میں بیٹھے فارس سے سعدی کی باتیں کر رہے تھے، سیم اس کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ بار بار زوم ان زوم آؤٹ کر کے۔

”مگر وہ آیا کیوں نہیں؟“ اپانے اب کے اکتا کر پوچھا تھا۔

”کیونکہ اسے انصاف چاہیے۔“ زمر سنجیدگی سے کہتی آگے آئی اور فارس کے مقابل صوفے پٹانگ پٹانگ جما کر بیٹھی۔ فارس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، اور سرکوا ثابت میں خدمے کر بولا۔ ”علیکم السلام۔“

”تم دونوں سے ہوشم میں، میں مل چکی ہوں تم سے پہلے بھی۔“ بے نیازی سے کہہ کر نظر دن کا رخ ابا کی طرف پھیرا۔ ”سعدی نے کہا ہے فارس سے کہ اسے انصاف چاہیے۔ اسے ہاشم کا ردار کے خلاف کوڑ میں کیس کرنا ہے (فارس تھج کرتے کرتے رک گیا)۔ اور مجھ سے پوچھیں تو یہی درست راستہ ہے۔ ہمیں عدالت میں جانا چاہیے۔“

”عدالت میں؟“ ابادھک سے رہ گئے۔ ندرت نے ناگھبی سے ان دونوں کو دیکھا۔ ”ہاں تو کرنے دو کیس۔ فارس کا کیس بھی تو اتنے سال بھگتا تھا، یہ بھی بھگتا لیں گے۔“

”نہیں آپا، وہ کیس سرکار پاکستان لڑ رہی تھی فارس غازی کے خلاف۔ میں اس کیس میں ”دفاع“ تھا، استغاثہ نہیں۔ کسی کو بے گناہ ثابت کرنا آسان ہوتا ہے، نہ بنت مجرم ثابت کرنے کے۔ یہ کیس ایسا نہیں ہوگا۔ اس میں ہمارے مقابلے پر کاردار نہ ہوں گے۔ ہمارا سارا پیپسے

خرچ ہو جائے گا، ہم عذتوں کے دھکے کھائیں گے اور آخر میں ہم کیس ہار جائیں گے کیونکہ اس ملک میں انصاف نہیں ہے۔ نہ انصاف ملے گا۔ میں سعدی کا ساتھ اس لئے دے رہا ہوں کیونکہ ہم ایک خاندان ہیں۔ مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ ”سبجدیگی سے اس نے دوٹوک بات کی تھی۔ وہ قطعاً خوش نہیں تھا۔

”کیا کیس کرنا ضرور ہے؟“ حینیں الجھ کر بولی۔ ”بھائی واپس آجائے، ہم لوگ پھر سے ہنسی خوشی رہیں، اور بظاہر ہم خود کو نارمل ظاہر کریں اور وقت آنے پر اپنادلے لیں، اتنا بہت ہے نا۔“ حینیں کے لئے جو بہت آسان تھا، اب وہ ذرا کم آسان لگ رہا تھا۔ ”تم ایک انسان کو قید میں ڈالنے کے بعد اس سے یہ موقع نہیں کر سکتی کہ وہ فوراًٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ وقت تو لگے گا۔“ وہ اسے اب سمجھا رہا تھا اور زمر سعدی کے فیصلے کے حق میں ابا کو دلائل دے رہی تھی۔

❖❖❖

اب اپنے بھی سائے کا بھروسہ نہیں یارو۔ ..... نزدیک جو آئے ہے وہی وار کرے ہے  
وہ داغدار رات کا ردارز کے آفس پر بھی اسی طرح پر پھیلائے ہوئے تھی۔ رئیس کو ملے گھنے کے مکمل ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے جب وہ ہاشم کے آفس میں دوبارہ داخل ہوا۔ چوکھ پر ذرا دیر کوٹھکا۔ ہاشم تھا نہیں بیٹھا تھا۔ گوکر وہ جس طرح انگوٹھے کے ناخن سے تھوڑی کورگڑتے، سوچتی نظریوں سے خلا میں دیکھ رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے واقعی تھا بیٹھا ہو، مگر سامنے جواہرات بر اجمان تھی، اور چائے کی پیالی سے گھونٹ بھرتی اس کی فراغت کی منتظر نظر آتی تھی۔

رئیس آگے آیا اور جواہرات کی پشت پر آکھڑا ہوا۔ ہاشم نے چونکہ کرنظریں اٹھائیں۔ ”کیا پتہ چلا؟“  
”فارس غازی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس نے واقعی غازی کے نام کا کمرہ الٹ کر رکھا ہے۔ غازی نے یوں کو بلانے کا وعدہ کیا تھا، علاج وغیرہ کروانا ہے۔ شاید اس کی یوں کا گردے کا مسئلہ پھر سے شروع ہو گیا ہے۔“  
جواہرات کی انگلیاں بے اختیار اضطراری انداز میں گردن میں پڑے لاکٹ کو مردڑ نے لگیں۔ چہرے پر بدقت مسکراہٹ برقرار رکھی۔

”وہ اسی کرے میں رہ رہا ہے یا نہیں؟“ ہاشم مطمئن نہیں تھا۔ علاج والی بات پر دھیان نہیں دیا۔  
”رئیس کرنے کی کوکراچی بھیج رہا ہوں۔ ایک دون میں سب پتہ چل جائے گا۔ فارس غازی کے گھروالوں کے فوز ہنوز نیپ کر رہا ہوں۔ ابھی تک سعدی یوسف نے ان سے رابطہ نہیں کیا نہ ان کی باتوں سے ایسا لگتا ہے۔“ ہاشم نے اکتا کرائے جانے کا اشارہ کیا۔

”زمر نے علاج کروانا ہے؟ کیوں اسے کیا ہوا؟“ جواہرات نے سرسری سالجہ اختیار کیا۔  
”یہ ناممکن نہیں ہے۔“ ہاشم اپنے دھیان میں تھا۔ ”اس نے مجھ سے الیاس فاطمی کا ذکر کیا تھا کہ فاطمی نے اسے سب بتایا ہے، مگر بودھنا ممکن نہیں ہے۔“ ہاشم اپنے دھیان میں تھا۔ ”اس نے مجھ سے الیاس فاطمی کا ذکر کیا تھا کہ فاطمی نے اسے سب بتایا ہے، مگر بودھنا ممکن نہیں ہے۔“ ہاشم بار بار فتحی میں سر جھکتا تھا۔

”فارس واقعی زمر کا علاج کروانا چاہتا ہے، اس میں ناممکن کیا ہے؟ ان لوگوں کو کچھ نہیں پتہ۔ بے کار مرت سوچا کرو۔“ بد مرہ سی ہو کر اس نے پھلو بدل لایا۔ ”اب اپنا مرمودہ بہتر کرو۔ جو ہوا، سو ہوا۔ ہم ایک فیملی ہیں، اور فیملی سے زیادہ دن ناراض نہیں رہتے۔“ آگے بازو بڑھا کر اس کا ہاتھ دبا کر مسکرائی۔ ہاشم نے ایک سنجیدہ نظر اس پر ڈالی۔

”میں ناراض نہیں ہوں۔ کوفت کا شکار ہوں۔ آپ کے ہر اس عمل پر جو آپ ہاروں کے لئے کرتی ہیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ ہماری فیملی کے درمیان دراثیں نہ پڑیں تو ہاروں کو سنجیدہ لینا چھوڑ دیں۔ جب سے وہ شہر میں واپس آیا ہے، میں یہ سب دیکھ رہا ہوں اور

برداشت بھی کر رہا ہوں، اب نہیں کروں گا۔“ اس کی آنکھوں میں گہری کاٹ تھی۔ جواہرات اندر تک دلیل گئی گھر بظاہر کون سے مسکراتی رہی۔ ”برداشت تو تمہیں اسے ساری زندگی کرنا ہو گا اور میں جو اس کے ساتھ اتنے اپنے سے پیش آتی رہی۔ وہ اپنے لئے نہیں تھا۔ تمہارے اور آلبی کے لئے تھا۔“

بامش کے تاثرات بد لے آنکھوں کی ختح کم ہوئی۔

”تم آلبی کی طرف نہیں بڑھتے تھے کیونکہ تمہارا باپ تمہاری شادی نہیں ٹوٹے دینا چاہتا تھا اور اس کا باپ تمہیں اس کو پانے نہیں دے گا۔ مگر شادی بھی ٹوٹ گئی اور نگزیب بھی اسی صدمے کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا اور اب.... میرے اتنے احسانوں کے بعد بارون بھی کوئی پس و پیش نہیں کر سکے گا۔ اب تمہیں آلبی سے بات کرنی چاہیے۔ اور منوصوف آلبی سے۔ بارون سے مت کہنا پچھا۔ ابھی سے اس کو اتنا سر چڑھا دے گے تو آگے مشکل ہو گی۔“ بے نیازی سے کہہ کر وہ پرس اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ بامش کے تنے اعصاب ڈھیلے پر چکے تھے اس نے آہستہ سے سوچ میں گام ابٹات میں سر بلایا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

یاس و غم، رنج و تعب میرے ہوئے دشمن جاں ..... اے ظفر شب انہی دو چار نے سونے نہ دیا  
قصر کاردار رات کی تاریکی میں بھی جگلگار رہا تھا۔ اس کے درے بنی ایکسی کے دروازے کو علیشا لاک کر رہی تھی جب....  
”بیلو!“

وہ ڈر کر چکلی۔ ڈر کر یکھا تو سنجیدہ سانو شیر والہاں کھڑا تھا۔ علیشا کی رنگت پھیکی پڑی۔ ”میں یہاں صرف...“ خشک بوس پر زبان پھیرتے اس نے بات بنانے کی کوشش کی تو شیر و نے ہاتھ اٹھایا۔

”سن چکا ہوں فوجیوں نے۔ تم ایکسی دیکھنا چاہتی تھیں، اس لئے یہاں آئی۔ یہ بھی ایک جھوٹ ہو گا، مگر چونکہ تمہارا تعلق ایک جھوٹی خاندان سے ہے تو ٹھیک ہے۔ تم جو بھی کرو، میں سائنس پر سائنس کرو دو۔“ آنکھوں میں ناگواری لئے اکھرے لجھ میں کہتے ہوئے ایک فائل اس کی طرف بڑھائی۔ ”اس کے بعد میرے شیئر زمیرے پاس واپس آجائیں گے اور تم ایک خطیر قلم لے کر واپس چلی جاؤ گی۔“

”تم سب ایک ہی جیسے ہو۔“ علیشا نے بے بس بھرے غصے سے کہتے ہوئے فائل کھینچی اور دھپ دھپ کرتی آگے بڑھ گئی۔ نو شیر والہاں برآمدے کے زینے پر آبیٹھا اور اداں نظروں سے سامنے نظر آتے قصر کوڈ بیکھنے لگا۔ سامنے اس کے اپنے کمرے کی بالکونی تھی جس میں .... یونہی .... ایک پرانا منظر سا ابھرا۔ بالکونی کے دروازے سے لگا۔ نو شیر والہاں کاردار۔ آنھ سال پلے ڈرگز کی اور رذوے سے مر رہا تھا اور ایک گھنگریا لے بالوں والا لڑکا اسے بچانے آیا تھا۔ شیر و نے سر جھٹکا۔ پیروں پر نی محسوس ہوئی تو دیکھا۔ اس کا لیبراڈا را اس کے پیر چاٹ رہا تھا۔

”جیکی۔ میں نے تمہاری جان نہیں بچائی بھی۔ صرف کھانا دیا ہے، پھر بھی تم احسان مانتے ہو تو میں کیوں بھول گیا؟“ وہ کہتے نے مخاطب ہوا تھا۔ ”میں نے یہ کیا کر دیا؟“ دکھ اور پیشانی کی اہرنے اسے لپیٹ میں لے لیا۔ ”میں اس رات سے بھی بے خواب نہیں نہیں سو سکا۔“ مجھے ہر مانع شے کا رنگ سرخ لگاتا ہے، لقمہ منڈن تک لے کر جاؤ تو وہ خون آلو دنظر آنے لگ جاتا ہے، میں کیا کروں، جیلی؟“ اس نے سراٹھا کر دھشت سے اوپر چھائے آسمان کو دیکھا۔ ”میرا ایک حصہ کث کراس رات گریا تھا، وہیں اس زیر تیمیر مکان کی خون آلو دمٹی میں.... اور اس“ کا ایک حصہ میرے اندر آب سا تھا۔ وہ حصہ ہر پل میرے ساتھ سانس لیتا ہے، ہر دن کے ساتھ بڑا ہوتا جاتا ہے، جیسے میں اپنے پہلو میں کسی وحشی جانور کے پنچ کو جوان ہوتے دیکھ رہا ہوں۔“ پھر اس نے فنی میں سر جھٹکا اور فون نکالا۔ ”جی نو شیر والہاں کو دیکھنے کی اور فون نکالا۔“

”جی نو شیر والہاں! سائنس کرو دیکھنے کی اور فون نکالا۔“

”مسز زمر، حسد کیا ہوتا ہے؟“ وہ ایک باتھ سے فون کان سے لگائے، دوسرے سے آنکھیں ملتا پوچھنے لگا۔ زمر نے گہری سانس لی تھی۔

”حسد وہ ہوتا ہے جو سب کو محسوس ہوتا ہے، آبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی سے۔ مگر حمق لوگ اس کا کھل کر اظہار کر دیتے ہیں، اور عزت دار لوگ اس کو چھپا لیتے ہیں۔“

”ضروری تو نہیں کہ ہمیں کسی سے حسد ہی ہو، ہم ایسے بھی تو کسی کو ناپسند کر سکتے ہیں نا،“ وہ مزید بے چین ہو گیا تھا۔

”حاسد تین درجوں سے گزرتا ہے نوشیر وال۔ سب سے پہلے اس کا دل تنگ ہوتا ہے، ہر اپنے سے بہتر شخص کی تعریف سننے پر۔ پھر وہ اس کو اپنے دل میں بھی کمتر جانے لگتا ہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا قدر گھٹانا کی کوشش کرتا ہے۔ اور آخر میں وہ اس شخص کو نقصان پہنچاتا ہے۔ جسمانی اذیت سے قتل تک۔ دنیا کا پہلا قتل حسد پہ ہوا تھا، اور آخری قتل تک یہ جذبہ انسان سے انسان کو مردا تار ہے گا۔ مگر آپ کو کیوں خیال آیا؟“ نوشیر وال میں مزید سننے کی تاب نہیں، اس نے فون بند کر دیا اور درود نوں ہاتھوں میں گردادیا۔ اس کے گرد بہتے اندر یہ رہنور بڑھتے جا رہے تھے... گویا اس کو ٹنگنے کے لئے بے تاب ہوں۔

.....

اک عمر ناکمیں تو حکایت نہ ہو پوری ..... دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے  
فروری کی تیسری صبح دھنڈ آلو دی تھی۔ سارے مناظر دل کے آئینے کی طرح دھنڈ لائے ہوئے تھے۔ تھوڑی دور تک بصارت جاتی۔ اس کے آگے بصیرت ختم ہو جاتی۔ ایسے میں اپنے بیدار دم میں بیدار کمل گردن تک تانے مانع ہے پہاڑوں کے سوتی ہوئی زمر دھکائی دیتی تھی۔  
فارس کھڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ نگاہیں باہر جنمی تھیں۔ دغناً وہ کچھ دیکھ کر چونکا، پھر باہر نکل گیا۔  
سبز بیلوں سے ڈھکنے بنتے کالاں فخر کے اندر یہے اور دھنڈ میں نہایا ہوا لگتا تھا۔ فارس نے جیسے ہی باہر پورچ کی طرف کھلتا دروازہ کھوا، باہر کھڑی نہیں کا ہتھوڑا اسی طرف آیا۔ وہ بروقت پیچھے ہوا اور دم نے بھی ”اوہ“ کر کے باتھ پیچھے کر لیا۔ وہ اسی دروازے پر کچھ ہونک رہی تھی جس کو فارس نے کھولا تھا۔

”کیا کرہی ہوتی صح؟“ آنکھوں میں حیرت لئے وہ باہر نکلا اور سر سے پیر تک نہیں کو دیکھا۔ وہ بہڈ والا سویٹر پہننے لہ سر پر گرا کے ہوئے تھی۔ ایک باتھ میں ہتھوڑا اور دوسروں کو کمر کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ نگاہیں بھی موڑ لیں۔  
”تو آپ مجھ سے ناراض ہیں، نہیں بی بی؟“ وہ میسے پہ بازو لپیٹے، چوکھت سے غلک لگا کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ نہیں نے پلکیں اٹھائیں اور خفا آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”آپ کے خیال میں سوری کر لینے سے وہ سب ٹھیک ہو جائے گا؟“  
”میں نے رات کو جھوٹ بولا تھا جب میں نے تم سے معدرت کی۔ میں یہ سب چھپانے پہ بالکل بھی شرمندہ نہیں ہوں نہیں۔ میں

پوں تم لوگوں کی حفاظت کر رہا تھا۔“

”زمزٹھیک کہتی ہیں۔ آپ انہائی دو نمبر انسان ہیں۔“ خفاسی مژ رکھڑی ہو گئی۔

”مگر آئی ایم سوری، اگر میں نے دل دکھایا ہے تو۔“ اب کے نزدی سے بولا تو دھ کا دل پکھل گیا۔ بغیر مزے وہ پشت کئے کھڑی آبستہ سے بولی۔ ”ہم اس رات وارث ماموں کے ساتھ تھے... ہم دونوں نے ایک ساتھ ان کو آخری دفعہ دیکھا تھا۔ ہم اس سب میں ساتھ تھے، آپ کو مجھے ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔“

”میں پہلے ہی ڈوبی ہوئی کشتی ہوں نہیں اپنے ساتھ دوسروں کو نہیں ڈبو سکتا۔ یہ کیا رہی ہو؟“ اس نے کمر کے پیچھے سے ہاتھ نکال لئے تو وہ پوچھنے لگا۔ حمہ نے جواب دیے بناؤہ شے دروازے پر رکھی اور کیل جما کر جھونکنے لگی۔ فارس نے آگے ہو کر دیکھا۔ وہ ایک نیم پلیٹ

تھی۔ لوہے کی تختی۔ اس پر اردو میں لکھا تھا۔ ”مورچاں۔“

”مورچاں؟ کیا مطلب ہوا اس کا؟“

”مورچاں... یعنی چیونٹ کا گھر۔ یہ پرانی اردو کا لفظ ”مورچہ“ نکلا ہے۔ چیونٹ کا گھر بھی کسی مورچے سے کم نہیں ہوتا۔“

”اچھا۔ وہ مسکرا یا۔“ یہ اس طرح نہیں ٹوکا جائے گا۔ ڈرل استعمال کرو۔“

”میں کوئی مسٹری یا ترکھان نہیں ہوں جو ڈرل استعمال کروں۔“ اس صبح نکنے بھی سمجھتی تھی سو کہہ گئی۔ فارس چپ ہو گیا۔

”بھائی گھر آ جائے گا۔“ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

فارس جواب دیے بنا سوچتی نگاہوں سے دور دھنڈ آلوہ آسان کو دیکھنے لگا۔ ہرگز رتے لمحے وہ دور جا رہا تھا۔ اس مورچاں سے دور... اس زمان و مکاں کی حد سے دور...“

زرتاشہ کا دلیے کا جوڑ افیر وزی رنگ کا تھا۔ ساتھ میں نازک سی ڈائمنڈ جیولری پین کرکھی تھی۔ بال جوڑے میں بند ہے تھے، اور دو پڑ جوڑے کے اوپر نکلا تھا۔ وہ کچھ فکر مند کچھ پر جوش، ہرزاویے سے خود کو آئینے میں دیکھ رہی تھی اور وہ اس کے پیچھے صوفے پر بیٹھا اس کو۔

وہ دونوں برائیzel روم میں تھا۔ ندرت آپا بھی ابھی گئی تھیں اور زرتاشہ جو اتنی دیر سے ضبط کر کے سورجی بیٹھی تھی، اب جلدی سے انٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”تم کیوں پریشان ہو، زرتاشہ؟“ وہ تھل سے بولا تھا۔ زرتاشہ نے مرکر اسے دیکھا تو کا جل بھری آنکھوں میں ملے جلے جذبات تھے۔

”میرا میک اپ اور تو نہیں لگ رہا؟ تین مہینے سے اپا نہست لے رکھا تھا، کہہ کہہ کہ تھک گئی مگر کچھ گڑ بڑ کر دی اس نے۔ میں زیادہ لگ گئی ہے شاید۔ میں اسٹچ پہ جا کر بری تو نہیں لگوں گی؟ اوہ میں بہت نرسوں ہوں فارس میں کیا کروں؟“ اس کے انداز میں کچھ بچوں جیسا تھا جو فارس کو اپنی زندگی کی ساری نارسا یاں بھلا دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا یا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایش گرے سوٹ پین رکھا تھا اور بال بھیش کی طرح بہت چھوٹے نہیں تھے، ذرا بڑے تھے۔ قد میں وہ اس سے قدرے لمبا تھا۔ چلتا ہوا آیا اور اس کے کندھوں کو زمری سے تھاما۔

”تم بہت پیاری لڑکی ہو، تم اسٹچ پہ جاؤ گی تو کوئی تمہیں بر انہیں کہے گا۔ اگر کوئی تعریف نہ کرے تو وہ جتنا ہو گا تم سے۔“ اور اس نے دیکھا، زرتاشہ کے تنے اعصاب و اقتتاڈھیلے پڑے چہرے پر مسکرا ہٹ دیا۔ فارس نے گردون موڑی، اور چوکھت میں کھڑی لڑکی کو دیکھ کر اس نے بے اختیار گردان واپس پھیر لی۔ چہرے کی رنگت بدی تھی۔ زرتاشہ کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا دیے۔ زرتاشہ نے چوکھت کو دیکھا، پھر مسکرا کر سلام کیا۔

”سوری میں سمجھی سعدی ادھر ہے... کہاں گیا؟“ زمر کہہ کر اپنے موبائل پنبرڈ اکل کرتی الچ کرواپس مڑائی تھی۔ زرتاشہ نے فارس کو دیکھا۔ ”یا آپ کے بھانجوں کی پھیپھو ہے نا؟“ نئے نئے رشتے یاد کرنے میں وہ ہلکاں ہو رہی تھی۔

”ہوں۔“ وہ اپنا موبائل نکالتا مڑ گیا اور خواہ جو وہ بہن دبانے لگا۔ چند لمحوں میں ماحول میں کوئی نادیدہ سا ہنچا وہ رہ آیا تھا۔ دل میں کچھ زور سے ٹوٹا تھا۔ وہ اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ ہنگر کیا لے بال، ناک کی لوگن... لباس کا رنگ شاید نیلا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور باہر نکل گیا۔ زرتاشہ شادی کے پہلے ”تمہری ڈے فیز“ سے باہر نہیں نکلی تھی اور یہ وہ تین دن تھے جن میں کچھ معلوم نہیں پڑتا کہ کون آ رہا ہے۔ کون جا رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ وہ ہواں میں تھی، سو محضوں نہ کر سکی۔

اسٹچ پر جب وہ فوٹو شوت کے وقت زرتاش کے ساتھ کھڑا تھا تو اپنے اندر کے کھچا پر قابو پا کا تھا۔ وہ مسکرا بھی رہا تھا اور نیلے کپڑوں کی جھلک کو نکھیوں سے دیکھ کر بھی اس نے کوشش کی کہ وہ مسکراتا رہے مگر ترب وہ اچھا دا کار نہیں تھا، سو مسکرا ہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اس کی بیوی کے ساتھ آ کر کھڑی ہوئی تھی اور مسکرا کر اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ فوٹو شوت ختم ہوتے ہی وہاں سے اتر آیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ ہاشم اور شہرین اسٹچ پر چڑھ رہے ہیں مگر وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

چند منٹ بعد۔ جب وہ دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا، دارث وہاں آ رکا۔ اس کے دوستوں کے ادھر ادھر مصروف ہونے کے بعد اس نے سنجیدگی سے فارس کو مخاطب کیا۔ ”تم اپنی فیملی کو ہاشم سے دور رکھو۔ وہ تمہارے اترتے ہی زرتاش سے تمہارا ذکر نامناسب الفاظ میں کر رہا تھا۔ زمرہ وہاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے تمہیں ڈیفینڈ کیا تو ہاشم مسکرا کر چپ ہو گیا۔ اس کی مسکرا ہٹ سے لگتا ہے وہ کل کو تمہاری بیوی کے سامنے زمرہ کا نام لے کر اسے بدگمان کرنے کی کوشش کرے گا۔“

فارس نے ایک دم چومن کر اسے دیکھا۔ ”وہ کچھ نہیں جانتا۔“

”وہ ہاشم کا ردار ہے۔ وہ سب جانتا ہوتا ہے۔“ فارس کی رویہ کی ہڈی میں سردابہر دوڑ گئی۔ اپنے راز کا عیاں ہو جانا..... بہت غیر آرام دہ کر دینے والا خیال تھا۔ وہ بری طرح ڈسٹریپ ہو گیا تھا۔ مگر اس واقع نے اس کو خطا کر دیا تھا۔ بے حد مقاطا۔۔۔۔۔ مورچاں کی تختی دروازے پر نصب ہو چکی تھی۔ جس کی مسلسل ٹھک ٹھک کی آواز بند ہو چکی تھی۔ سنائے نے اسے چونکا یا۔ وہ پورچ میں رکھ جھو لے پہ بیٹھا تھا، اور اس سے فاصلے پر دروازے کے ساتھ وہ دونوں کھڑی تھیں۔ زمرہ بال کان کے پیچھا اڑتی خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ شال کندھوں کے گرد لپیٹے باہر آ کھڑی ہوئی تھی اور جنہیں اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ فارس سر جھٹک کر اٹھا اور ان کے قریب چلا آیا۔ اسے دیکھ کر دونوں چپ ہو گئیں۔ وہ بھی خاموشی سے ساتھ ہے گزرنے لگا تو زمرہ بولی۔ ”ہم علیشا کی بات کر رہے تھے۔“

فارس سنجیدگی سے ان دونوں کی طرف گھوما۔ اچھا میں سمجھا صرف میں با تین چھپاتا ہوں، میں راز رکھتا ہوں، میں جھوٹ بولتا ہوں۔“

جنین ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اور زمرہ کی رنگت ذرا بخالت سے پہنچی پڑی۔ ”وہ میں....“

”میں ان چکا ہوں۔ آپ کو لگتا ہے کہ تم گزد ور بیٹھے آدمی کو اواز نہیں آتی۔ وہ بھی نسوانی آواز جو مردانہ آواز سے زیادہ دور تک جاتی ہے۔ یہ جو آپ دونوں اسٹڈی میں بیٹھ کر سرگوشیاں کرتی ہیں، اور ادھر پسمند میں رات کو بیٹھ کر باتیں کرتی تھیں، مجھے سب سنائی دیتی تھیں۔ وہ دیئے یوں بھی دیکھ چکا ہوں جو آپ کے (زمرہ کو مخاطب کر کے) بغیر پاسورڈ لگے لیپ ٹاپ میں پڑی ہے۔ جو سعدی نے ہاشم کے آفس میں بنائی تھی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے (جنین کو گھور کر) پاس فروزن فلم پڑی ہے جو ہاشم کی فلیش سے نکلی ہے، اور وہ جوڑا کو منہ آپ پر نٹ کر رہی ہوئی ہیں آج کل، زمرہ بی بی وہ بھی دیکھ چکا ہوں۔ علیشا اپنے کی جنین میں کیوں انٹرستڈ ہے، یہ بھی پتہ کر لوں گا۔ اگر مزید کچھ کہنا ہے آپ نے تو بتا میں۔“

ہر وقت کے گلے شکوؤں کا رخ الٹا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں کبھی ایک دوسرے کو دیکھتیں، کبھی فارس کو۔ پھر زمرہ نے (ظاہر) بے نیازی سے شانے جھککے۔ ”ہاں ٹھیک ہے، ہم کافی عرصے سے واقف تھے کہ سعدی پر حملہ ہاشم نے کروایا اور....“

”نوشیر وال!“ وہ بے اختیار بولا۔ زمرہ کی گئی۔ فارس پرچمی آنکھوں میں استغجب سامنیاں ہوا۔

”سعدی کو.... گولیاں نوشیر وال نے ماری تھیں۔“

زمرہ بال کل پتھر کا بت بن گئی تھی۔ سفید۔ شل۔ جنین کی آنکھیں جیرت سے پھیل گئیں۔ ”وہ اوزر؟ اس کی پہمت؟“ وہ غصے میں آگئی تھی۔ ”اس نے کیوں کیا یہ؟“

”حمد میں!“ زمرشل سے انداز میں بولی تھی۔ پھر ایک دم وہ مزی اور اندر چلی گئی۔ حین تیز تیز فارس سے کچھ کہہ رہی تھی مگر وہ گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ آبنوی لکڑی کے دروازے پہجا ”مورچاں“ دن کی چیلیتی روشنی میں چکنے لگا تھا۔

.....  
کچھ اس طرح سے سودا کیا مجھ سے وقت نہ ..... تجربہ دے کر وہ میری ساری معصومیت لے گیا کینڈی کی سربراہ پہاڑیاں دھند میں لپی تھیں۔ کافی شاپ کی میڑھیاں اترتا سعدی یوسف نیچے آ رہا تھا۔ سفری بیگ کندھے پر تھا اور سر پر پی کیپ تھی۔ میڑھیوں کے دہانے پر کافی کھڑی فون پر بات کر رہی تھی۔ اسے آتے دیکھا تو چہرے پتخت آگئی۔ ایک سرمه نظر اس پڑال کر آگے بڑھ گئی۔

بکن میں بوڑھا رہا پائیں گھی اپر ان پینے کھڑا کام کر رہا تھا۔ اس پتھر ایک نظر ڈالی۔ بولا کچھ نہیں۔ سعدی بے مقصد وہاں کھڑا رہا۔ مونچو بھی ایک کونے میں بیخا تھا۔ اسے دیکھ کر سر جھکائے ناشتہ کرنے لگا۔ کافی شاپ کے مکین کافی کے داؤں جیسے سخت اور کڑوے ہو گئے تھے۔

”میں جا رہا ہوں۔“ اس نے بوڑھے کو اطلاع دی۔ وہ چپ چاپ کام کر تراہا۔

”تو جاؤ۔ روکا کس نے ہے؟“ وہ درشتی سے کہتی پیچھے سے آئی اور غصے بھری نظروں سے اسے گوارا۔ ”مگر جانے سے پہلے اتنا بتا کر جاؤ کہ اس بندے کا کیا بنا؟“

سعدی چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ بولا کچھ نہیں۔

”تمہاری وجہ سے ایک غندہ میری شاپ پا آیا۔ میرے بچے کے سر پر پستول رکھا۔ ہمیں یوغماں بنایا۔ پھر تم اس کے ساتھ باہر گئے۔ وہاں سے تم نے فوذ اتحاری والوں کو کال کیا اور میری شاپ پر مکھے کے لوگ آ کر سارا کھانا الٹ کے چلے گئے۔ دو دن سے ایک گاہک بیہاں داخل نہیں ہوا۔ ہمارے کھانے میں زہر یا لامادگلا جوتمن نے ہی ڈالا ہوا گاتا کہ تم بابا سے بدلتے ہو۔ اور پھر شام کو تم آ جاتے ہو اور وہ بھی صحیح سلامت۔ اور وہ بندہ اب بھی لاپتہ ہے۔“ بولتے بولتے وہ باتیں لگی تھی۔ ”تم مجھ سے حق بھی بول سکتے تھے مگر تم نے نہیں بولا۔ کم از کم یہ بتا دو اس بندے کے ساتھ تم نے کیا کیا؟“

”میں نے اس کی گردن توڑ دی اور اس کی لاش پہاڑی سے نیچ پھیک دی۔ میں جتنی مکاری اور چالبازی سے اس جگہ کو اپنا سیف ہاؤں بنانے میں کامیاب ہوا تھا، اس پر اس نے پانی پھیردیا تھا۔ اب میں جا رہا ہوں اور ایک جعلی پاسپورٹ کے ذریعے اس ملک سے بھاگ جاؤں گا۔ میں ایک تامل جاسوں ہوں اور جاسوں ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں فرق نہیں پڑتا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔“

”نکل جاؤ میرے گھر سے۔“ وہ چلانی تھی۔ سرخ آنکھوں میں بہت سے آنسو لئے۔ سعدی خاموشی سے مڑا۔ مونچ نے گردن انھا کر اسے دیکھا تھا۔ بوڑھا چپ چاپ کام کرتا رہا۔ سعدی یوسف بے تاثر چہرے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ سر جھکائے باہر اسٹریٹ میں چلتا دور جاتا کھائی دے رہا تھا۔

.....  
.....

نہ گلے رہے نہ گماں رہے نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو ..... وہ نشاط و مدد و صل کیا ہمیں اعتبار بھی اب نہیں دھند دو پھر تک کافی بلکی ہو گئی تھی۔ سورج نے چہرہ دکھایا تھا۔ ہائپل کی لابی مکمل طور پر روشن تھی۔ چمکتے فرش پر باریک ہلک سے چلتی، سفید لباس پر سیاہ کوٹ پہننے اور بالا ہاف باندھے، زمر یوسف چلی آ رہی تھی۔ کاؤنٹر پر رک کر اس نے ریشمہ نٹ نوجوان کو سلام کیا تو

بجوری آنکھوں میں سادگی کی دلکھائی دیتی تھی۔

”ڈاکٹر قاسم نے کہا تھا کہ.....“

”جی میم، آپ کی نئی دوستیار ہے۔ انہوں نے بھجوادی تھی۔“ دراز سے پیکٹ نکالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ڈاکٹر قاسم اب کیسے ہیں؟“

”اسی طرح ہیں۔ آپ ان کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں۔ انہیں اس شخص کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔ سی سی ٹی وی میں اس کی

فوجی بھی تھی مگر ڈاکٹر صاحب نے وہ بھی ڈیلیٹ کروادی۔“ وہ ناخوش اور فکر مند لگ رہا تھا۔

”کس شخص کو؟“ اس نے اچھبے سے نوجوان کو دیکھا۔ بچپنی دفعہ یہاں کوئی دوسرا لڑکا تھا جس نے اسے ڈاکٹر قاسم کے ایک میڈن کی

حلاع دی تھی۔

”وہ مریض جس نے ان پر تشدد کیا تھا۔ آپ کو کسی نہیں بتایا؟“ وہ اس نوجوان کو گزرے برسوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک دفعہ

اس کے پاس ایک کام لے کر بھی آیا تھا جب وہ اسے ڈی پی تھی۔ تھی قدرے آگے ہو کر کہنے لگا۔ ”ایک آدمی مریض ہے، بن کر آیا تھا ایک روز۔ وہ

نکل گیا تو کافی دیر بعد جب میں اندر گیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اگلے مریض کو بلا یا نہیں تھا تو دیکھا کہ وہ زمین پر گردے ہیں اور رخنی

حالت میں ہیں۔“

”کب کی بات ہے یہ؟“ وہ متھیرہ گئی۔

”خہبریں میں آپ کو تاریخ بتاتا ہوں۔ اسی تاریخ کی فوجیہ ہم نے مٹا لی تھی نا۔“ وہ اس کے چچی لیئے پڑا پر جوش سا دراز سے

چھڑھونڈنے لگا۔ پھر ایک کاغذ نکالا اور تاریخ پڑھ کر سنائی۔ یہ ماکالم کی رات سے اگلے دن کی تاریخ تھی۔ زمر کے حلق میں کچھا انکا۔

”اور اس تاریخ کو ڈاکٹر صاحب سے ملنے آنے والے مریض نے ان کو مارا پیا؟“

”دراصل وہ مریض نہیں تھا۔ رجسٹر میں نام بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے فون پر بات ہو گئی تھی اور اندر چلا گیا۔

جب ڈاکٹر صاحب نے اعتراض نہیں کیا تو میں سمجھا کہ.....“

”کیسا..... کیسا دکھتا تھا شکل میں؟“ بدقت لہجہ متوازن رکھا۔

”فوجیہ تو ہم نے مٹا دی۔ شکل اتنی اچھی نہیں یاد مگر لمبا سا تھا۔ گرے سا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ چھوٹے کئے بال تھے، بہت چھوٹے۔“

”وو.....“ وہ یاد کر کے ایک ایک شے بتا رہا تھا اور زمر بار بار خشک لبوں پر بان پھیرتی تھی۔

”آپ وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس حالت میں پایا؟ آئی ایم سوری مگر آپ کے ساتھ ایک پرانی علیک سملیک

بے اس لیے آپ کو بتا رہی ہوں کہ اگر یہ کہانی آپ نے کسی اور کو سنائی تو سارا الزام آپ کے سر پر آئے گا۔ فوجیہ بھی آپ نے مٹا لی، ڈاکٹر

صاحب کو اس طرح گرے بھی آپ نے دیکھا اور اس مریض کو جاتے ہوئے بھی آپ ہی نے دیکھا۔ عدالت سمجھے گی کہ آپ اپنے جرم کو کور کرنا

چاہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی اگر اس بندے کو کور کر رہے ہیں تو پولیس کے سامنے اس کا نام نہیں لیں گے، مگر آپ کی غیر حاضریوں سے

مُشرنا لال رہتے ہیں۔ اگر آپ کا نام لے دیا تو؟ میری مانیں تو اس قصے میں نہ پڑیں۔“ ایک ہی سانس میں اسے مفت مشورے سے نوازتی وہ

اس کے ہکا بلکا چھرے کو نظر انداز کرتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

پھر وہ کمن قدموں سے وہاں سے نکلی، اس کو معلوم نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور رنگت زرد پڑ رہی تھی۔ کار میں بیٹھ کر کافی

دیراں نے خود کو گہرے گہرے سانس لے کر بیکس کیا۔

”اس نے میرے ڈاکٹر کو مارا پیا۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر نے اچانک سے کذنبی ترانسپلانٹ کی بات ختم کر دی، وہ اب مجھے امید

دلانے لگے ہیں کتنی دوسرے میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ کچھ غلط ہے اس سب میں۔“ وہ فی میں سرہلاتی خود سے بڑائے جا رہی تھی۔

❖❖❖

ضبط غم اس قدر آسان نہیں فراز ..... آگ ہوتے ہیں وہ آنسو جو پیئے جاتے ہیں  
سبز بیلوں سے ڈھکے مورچاں میں دوپہر کے وقت سناثا چھایا تھا۔ نین ڈائنگ ہال میں بیٹھی، انگلیوں میں وہ کی چین الٹ پلت کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے علیشا سے کوئی بات نہیں کی تھی، نہ سے کرنی تھی۔ مگر.... وہ سوچنے لگی.... یہ کی چین علیشا کیوں مانگ رہی ہے واپس؟ اس میں کیا بات ہے ایسی؟ Anst Ever After۔ کیا یہ کسی قسم کا کوڈ ہے؟ کچھ تو ہے۔

شہر کے دوسرے حصے میں واقع ایک رسیٹور انٹ کے اندر دوپہر کی روشنی بھری تھی۔ فارس غازی کو نے والی میز پر بیٹھا، ناگ نگ پر ٹھاگ جائے بازو میں پلیے، منتظر نظر آ رہا تھا۔ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا، پھر سہری آنکھیں دروازے پر مرکوز کر دیتا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ جیسے کسی کا انتظار کر رہا تھا۔

اور اس انتظار کی گھڑی میں یونہی ذہن کی رو بھلنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکوتو ان میں یادوں کے اور اتنے کھلتے نظر آ رہے تھے.....

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ آفس میں بیٹھا تھا اور سر جھکائے فائل میں لگے کاغذ باری باری نکال رہا تھا جب سامنے کوئی کھینچتے ہوئے بیٹھا۔ فارس نے چونکہ کسر رکھایا۔ وہ وارث تھا اور اب مسکرا کر اس سے خیریت پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔ مجھے کیا ہونا ہے؟“ بے نیازی سے کندھے جھکتے فارس نے فائل بند کر کے پرے ڈالی۔

”تھوڑی مزید چھٹی لے لیتے۔ شادی ایک ہی دفعہ ہوتی ہے۔ کچھ دن اور لگا لیتے نا دردن ایریا ز میں۔“

”نہیں، بہت چھٹی ہو گئی پہلے ہی۔ اب کام پر واپس آنا ہی تھا۔“ وہ بہت تازہ دم نہیں لگ رہا تھا۔ چائے آنے کے بعد وارث نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہی دیا۔

”تم خوش ہو زرتشہ کے ساتھ؟“

”ہاں۔“ وہ بازوؤں کا تکمیلہ بنا کر سر کے نیچے رکھ کر اپر چھپت کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ سوچ کر کہنے لگا۔ ”اچھی ہے۔ شکا یعنی زیادہ کرتی ہے، ذرا پچکا نہیں ہے، مگر اتنی چالاک نہیں ہے۔“

”اس کو مواظنے اور مقابلے کے پیانے سے ہٹا دو فارس۔“

فارس ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ”میں اس کا مواظنہ کی سے نہیں کرتا۔“ پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”اگر تم اور ندرت آپا بار بار مجھے وہ باتیں یاد نہ دلا تو مجھے وہ یاد بھی نہیں آتی۔“

”اوکے آئی ایم سوری۔“ وارث نے متانت سے کہتے کپ میز پر کھا۔ ”مجھے لگتا تھا کہ تم گلٹی ہو کہ...“

”میں گلٹی نہیں ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ زرتشہ سے اتنی محبت کروں جتنا اس کا حق ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔۔۔ یہ میں نہیں کر پا رہا بھی۔“

”فارس میاں یوہی کو ایک دوسرے سے لازمی محبت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے درمیان مودت اور محبت ہوئی چاہیے۔ مودت کہتے ہیں الافت کو اٹھ ہونے کو دوستی ہو جانے کو۔ اور محبت ہوتی ہے ایک دوسرے سے ہمدردی‘compassion’، خیال رکھنا، احساس کرنا دوسرے کا۔ محبت ضروری نہیں ہوتی۔ اور جانتے ہو یوہی اپنے شوہر کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تم اس کو ہو وہ خوبصورت ہے وہہر روز نکھرتی جائے گی، اسے کہو وہ خدمت گزار ہے وہ مزید خدمت کرے گی، اس کو سرا ہو گے تو اس کا اعتماد بڑھے گا، لیکن اگر ہر وقت اس کے اندر

نقص نکالو گے تو اس کو کھو کر دو گے، وہ میری ہمی پسلی سے نکلی ہے، اس کو سیدھا کرنے کی کوشش میں تم اسے توڑ دو گے۔ اس لئے اس کے ساتھ دوستی اور رحم کا رشتہ رکھو۔ میں چاہتا ہوں تم اس کے ساتھ خوش رہو، اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ خوش رہے۔ کوئی بھائی نہیں چاہتا کہ اس کے بھائی کی بیوی تکلیف میں رہے۔ ”الفاظ و اثر کے لبیوں سے نکل کر ہو میں تھہر تے گئے۔ کہتے ہیں تمام الفاظ فضنا میں معلق ہو جاتے ہیں، ازل سے ابد تک کے لئے تھہر جاتے ہیں، اسی لئے ہم جب چاہیں انہیں یاد کر لیتے ہیں... محسوس کر لیتے ہیں.... وہ الفاظ کی اس بازگشت سے تب نکلا جب سامنے والی کرسی کھینچی گئی۔ فارس نے ناگ گ سے ناگ ہٹائی اور فوراً کھڑا ہو گیا۔

”سارہ!“ احترام اسر کو ختم دیا۔ سارہ ملائمت سے مسکراتی سامنے بیٹھی۔

”خبریت تھی نافارس؟ تم نے اتنی ایم جنپی میں مجھے بلوایا۔“

”کوئی بھائی نہیں چاہتا کہ اس کے بھائی کی بیوی تکلیف میں رہے۔“ وہ کہتے ہوئے واپس بیٹھا۔ سارہ نے اپنی سبز آنکھیں چھوٹی کر کے غور سے اسے دیکھا۔ وہ بال جوڑے میں باندھے ہاتھ میں فولڈ را اور پس اٹھائے ہوئے تھی۔ آفس سے لف بریک میں آئی تھی۔ وہ پہلے اس سے بیکیوں کا حال پوچھنے لگا۔ پھر زرادیر بعد بولا۔

”دو آپشن ہیں آپ کے پاس۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ”یا تو آپ انگلینڈ چلی جائیں، کچھ عرصے کے لئے روپوش ہو جائیں، میں ہر چیز ارتخ کروادوں گا۔ یا پھر آپ اگر گواہی دینا چاہیں تو میں آپ کی حفاظت کروں گا۔“

”گواہی؟“ سارہ کے حلق میں کچھ انکا۔ رنگت سفید پڑی۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”سعدی مل گیا ہے سارہ۔ اور جب وہ واپس آئے گا تو وہ عدالت میں جائے گا۔ آپ سعدی کے ساتھ تھیں اس رات، میں جانتا ہوں عدالت آپ کو بلائے گی.... واپس بیٹھ جائیں۔“ آخری الفاظ تھیں سے کہے اور وہ جو اٹھنے لگی تھی بے بی اور غصے سے اسے دیکھتی واپس بیٹھی۔ ”تو آپ گواہی دیں یا نہیں، فیصلہ آپ نے کرنا ہے، لیکن میں ہر حال میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ زمر اور سعدی چاہیں گے کہ آپ عدالت میں پیش ہوں، مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔ اگر آپ نہیں پیش ہونا چاہتیں تو ان کے علم میں لائے بغیر میں آپ کو یہاں سے بھجوادوں گا کسی محفوظ مقام کی طرف۔ فیصلہ آپ کا ہے۔“ سخیگی سے کہہ کر واپس نیک لگا کر بیٹھا۔ سارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بے بی سے اسے دیکھ گئی بولی کچھ نہیں۔ کتنے ہی پل خاموشی سے بیت گئے۔ پھر وہ ذرا نرمی سے بولا۔

”ابھی کسی کو آپ کا نہیں پڑھائے اس لئے ابھی تک فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

”کرنٹ خاور کو پتہ ہے۔“ اس کے لب پھر پھڑائے۔ فارس کا اطمینان غائب ہوا، ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ”کیا؟ وہ کب ملا آپ کو؟“

”سعدی کے اس.... اس حادثے کے تین دن بعد.... میں رات کو اپنے کمرے میں سورہ تھی جب...“ وہ نظریں جھکائے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتانے لگی۔

رات کے اس پہر..... کمرہ تاریک تھا۔ سوائے مدھم ناٹ بلب کی زمر دروشنی کے جو منظر کو دیکھنے قابل بنا رہی تھی۔ بیڈ پر سارہ لکھا تانے سورہ تھی۔ اس کے چہرے پر سوکھ آنسوؤں کے نشان واضح نظر آتے تھے۔ دیں بائیں امل اور نور بے خبر سورہ تھیں۔ تھی کوئی کھلا سا ہوا۔ سارہ کی آنکھیں ایک دم کھلیں۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ لا اونچ سے کسی شے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے بستر سے نکلی پیروں میں ملپیز ڈالے اور باہر آئی۔

”امی؟“ بھتاط انداز میں پکارتے ہوئے وہ لاونچ میں داخل ہوئی تو دیکھا، سامنے اُوی دی مدھم آواز میں چل رہا ہے۔ سارہ کے ماتھے پہل پڑے۔ آنکھوں میں اچنچا بھرا، مگر اس سے پہلے کہ وہ ریموٹ اٹھاتی، کسی نے گردن سے دبوچ کر اسے دیوار سے لگایا اور منہ پرخت سے

ہاتھ جمادیا۔ ساری چینیں اس کے حلق میں دم توڑ گئیں۔

ٹی وی کی روشنی کے باعث، وہ خوفزدہ آنکھوں سے اتنا تود کیجئے تھیں کہ پستول کی نال اس کی گردن پر رکھے والا کرنل خاور ہے۔

”آوازِ زکالی تو گولی مار دوں گا۔“ وہ دبی آواز میں غرایا۔ سارہ نے بے بی سے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں ہاتھ دیوار پر جمائے وہ کانپنے لگی تھی۔

”تم سعدی کے ساتھ تھیں، تم نے سب دیکھا ہے، میں نے ہاشم کو نہیں بتایا، کیونکہ وہ کہنے گا تمہیں مار دوں، لیکن اگر تم نے کسی کو بتایا تو میں تمہاری بچیوں کو غائب کر داووں گا۔ سن رہی ہو یا نہیں؟“ سارہ جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگی۔ آنسو آنکھوں سے ابل ابل کر چہرے پڑھک رہے تھے.....

”وہ دس منٹ کھڑا رہا، مجھے ڈر تارہا، دھمکاتا رہا اور میں ڈر گئی۔ اس کی آمد کے بارے میں نے امی تک کو نہیں بتایا۔“

”مجھے تو تادیتیں سارہ۔ میں تو تھانا آپ کے پاس۔“ وہ افسوس سے اسے دیکھ کر بولا تھا۔ سارہ نفی میں سر ہلاتی پر اٹھاتے ہوئے انھیں۔

”میرے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے فارس۔ مجھے جو بھی فیصلہ کرنا ہے، خود کرنا ہے۔“ وہ اس سے اپنی بھیگی نظریں ملائے بغیر چلی گئی اور وہ لب بخپچ بیٹھا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

.....❖❖❖.....

کبھی گریباں کے تار گنتے، کبھی صلیبوں پر جان دیتے..... گزر گئی زندگی ہماری..... سدا یہی امتحان دیتے فوڈی ایور آفرٹر کے بالائی ہال کا دروازہ فارس نے دھکیلا تو روشن سے ہال میں زمر سر جھکائے میز پر جھلک کچھ تھی نظر آئی۔ آہٹ کے باوجود نہیں اٹھایا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ ہشاش بشاش سا کہتا کری کھینچ کر بیٹھا۔ زمر نے آنکھیں اٹھائیں تو ان میں اندر تک اترنے والی چھپن تھی۔

”اسی بجلہ بیٹھ کر تم نے کہا تھا کہ اب مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔“ اس کے الفاظ اتنا صدمہ لئے ہوئے تھے کہ فارس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ چونک کر (ٹانگ سے ٹانگ ہٹاتا) سیدھا ہوا۔ ”کیا ہوا؟“

زمر قلم پر رکھ کر پیچھے کو ہوئی۔ ”کتنے ماں سے میں کہہ رہی تھی کہ تمہیں کتنا غلط سمجھتی رہی مگر تم فارس... تم کبھی نہیں بدلو گے۔“

”اب کیا کیا ہے میں نے؟“ اس کی تیوری چڑھی۔

”تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم صرف کسی سے ملنے گئے تھے اور وہاں جا کر تم نے مار مار کر اس کا حشر بر کر ڈالا۔ یاد ہے کس کی بات کر رہی ہوں یا میں یاد کرواؤ؟“ وہ غصے بھری بے بی سے بولی تو فارس نے گہری سانس لی اور ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، مجھے غصہ آگیا تھا۔ لیکن زمر بی بی مار پیٹ کے بھی مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک مار ایسی ہوتی ہے جس میں درد ہوتا ہے مگر زخم نہیں بنتا اور ایسی ہی مارا تھا میں نے اسے درد مار کر کاپا بیج کیے کیا جاتا ہے یا جان کیسے لی جاتی ہے، معلوم ہے مجھے۔“ وہ سرد مہری سے خفا خسا کہہ رہا تھا۔ ”وہا تھو لگا دینے سے اس کا کچھ نہیں بگزا۔ ہاں جو منہ پر اسے مارا، اس کے لئے مذمت کر لی تھی میں نے۔ اب کیا پڑاں پڑتا؟ اور سعدی کو دیکھو۔ دو دن صبر نہیں ہوا۔ پیاری پچھوکو کال کر کے سب تما دیا۔ اور کون ہی شکایتیں لگائی ہیں میری؟“ وہ بڑھم تھا اور خفا بھی۔ (اس لیے تو اسے نہیں دیا تھا زمر کا پر ایوٹ نمبر کہ وہ اس کی شکایتیں لگاتا پھرے!)

زمر یک نک اسے دیکھے گئی۔ اسے چند لمحے لگے یہ سمجھنے میں کہ وہ دونوں مختلف لوگوں کی بات کر رہے تھے اور جب اس نے فارس کے الفاظ کو از سر نوسوچا تو.....

”تم نے سعدی کو مارا؟“ وہ بھوکی شیرنی کی طرح غرأتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”تو اور کیا پیار کرتا؟ جتنا خوار اس نے مجھے کیا، اس کے بعد وہ ہاتھ نہ جڑتا تو وہ اب بھی واپس نہ آتا۔“

”تم نے سعدی کو.... مارا؟“ وہ بے یقین تھی۔ کون ڈاکٹر کیا ڈاکٹر، اسے سب بھول گیا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ سوگ مناتی رہیں، جب تک میں کچھ کام کر لوں۔“ تھی سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ زمرا بھی تک شل کھڑی تھی۔ وہ غصے میں بھی مگر اسے سمجھنے میں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتی، وہ باہر نکل گیا تھا دروازہ زور دار آواز سے بند کر کے۔ وہ بے دم سی واپس کر سی پہ گری۔ سعدی..... ڈاکٹر قاسم..... فارس غازی کے بارے میں اسے سچ نہ ہی پتہ چلا کرے تو زیادہ بہتر تھا۔ اسکا دماغ سخت الجھ گیا تھا۔

❖❖❖

ہمارے لفظوں سے نقط چھیننا ہے اپنی محرومیوں نے ورنہ ..... سخن ورو! ہم بھی اپنی بستی کے پھروں کو زبان دیتے ہوئے کا ڈائنسنگ ہال بر قی قوموں اور جھلکلاتے فانوس سے روشن تھا۔ آبدار عبید نے اس وسیع و عریض ڈائنسنگ ایریا کی دلیلیز پر رک کر موبائل کی اسکرین روشنی کی، اور پھر مستینگ لکھا۔ ”میں واپس آگئی ہوں، فارس۔ کیا ہمیں سکتے ہیں اب؟“ اور سچنگ دیا۔ وہ سر پر سخن رومال کشمیری لڑکیوں کے انداز میں باندھ کر پیچھے کوڈا لے سفید منی کوٹ پہننے لیا تھا جو پیس سوت میں ملبوس تھی۔ پاؤں میں اوپنی سلوچیل تھی، اور کہنی پہ انکا ڈیزائنر بیگ جو سورج کمکھی کے بھول جیسا زرد تھا۔

دور سے اس نے ہاشم کو دیکھ لیا تھا سوزنا کت سے قدم قدم چلتی وہ آگئی۔ وہ دیوار کے ساتھ ایک میز پر موجود تھا۔ ٹوپیں سیاہ سوت، اور پری جیب سے جھلکتا سفید کارڈ، ہال جیل سے پیچھے کیے وہ ناگ پہنچا جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا، اور لبؤں پر بلکل سی مسکراہٹ۔ آبی کوآتے اس نے دیکھ لیا تھا تھی آنکھوں میں نرم ساتاڑا بھرا، اور مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

آبدار اس کے سامنے آرکی۔ ہاشم آگے بڑھا، اس کے لئے کرسی کھینچی، پھر واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھا۔

”ہیلوگریم ریپر!“ وہ مسکرا کر بیٹھی اور بیگ میز پر رکھا۔

”ہیلوور یڈ!“

”میں کھانا کھانے نہیں آئی، تیارداری کرنے آئی ہوں۔ تمہاری تیارداریاں نہیں بھوتی میں۔ کیسے ہو؟“ وہ محفوظ انداز میں بولی

تھی۔

وہ ہلکا سا ہنس کر سر جھکتے دیڑ کو بلا نے لگا۔ کھانا آنے تک وہ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ موڈب ییرے دائیں بائیں سے آ کر میز پر اشیائے طعام سجا تے گئے۔ گلاب کی پتیوں کے درمیان رکھی موم تی کا شعلہ بھی روشن تھا۔ آبدار چہرے پر مدھم مسکراہٹ سجائے بیٹھا رہی، البتہ نظرتے وقت کے ساتھ وہ مزید بے چین ہوتی جا رہی تھی۔

”آج کل میں عجیب عجیب باتیں سوپنے لگا ہوں۔“ وہ آگے کوہ کر بیٹھا، نگاہیں کبھی موم تی پر جھکاتا، کبھی اٹھا کر اسے دیکھ کر بولتا۔

”فارس کے بارے میں (آبدار کی رنگت فتح ہوئی، اس نے پہلو بدلًا) مجھے لگتا ہے وہ مجھے دھوک دے رہا ہے۔ جیسے وہ سعدی کے بارے میں سب جانتا ہے۔“ جیسے سب لوگ مجھے دھوک دے رہے ہیں۔ لیکن اب مجھے پروانہیں ہے۔“ وہ دھنتے یا سیت بھرے انداز میں کھڑا تھا۔

”جب میں موآآن کرنے کا فیصلہ کر کا ہوں تو یہ باتیں میرے لئے بے معنی ہیں۔“

”یہ صرف تمہارا وہم ہے ہاشم!“ وہ مضطرب سی بولی تھی۔ گود میں رکھے ہاتھ کا پنے تھے۔

”سچ کہیں ہو تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ یہ دشمنیاں، یہ سیاستیں، یہ سب پیچھے چھوڑنا چاہتا ہوں۔“ وہ واقعی

تکان سے کہر رہا تھا۔ ”کیا تم میری مدد کرو گی؟“  
”میں.... کیا کر سکتی ہوں؟“ وہ جبراً مسکرائی۔

”تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کر سکتی ہو۔“ وہ آز ردگی سے مسکرا یا۔ نگاہیں آبی پر جمی تھیں۔ ”تم جانتی ہو کہ تم میرے لئے کیا ہو۔ تم مجھے بہت عزیز ہو اور میں ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس میں تم نہ ہو۔ کہتے ہیں جب کوئی کسی کی جان بچاتا ہے تو اس کی زندگی اس میخاکی امانت بن جاتی ہے، تمہاری زندگی جتنی تمہاری ہے اتنی میری بھی ہے۔“  
پس منظر میں بھتی دھنے سروں کی موسيقی..... موم بقی کا ٹھماٹا شعلہ..... خوابناک زردوشناں..... ہرشے سے بے نیاز وہ یک نک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”آئی۔ ایم.... ان لو.... وو.... یو۔“ اس نے یہ الفاظ توڑ توڑ کر ادا کیے تھے۔ آنکھیں آبی کی آنکھوں پر ہنوز بھی تھیں۔ ”اور میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنی زندگی ایک ساتھ گزاریں۔ کسی دوسرے ملک چلے جائیں، جہاں تم کہو۔ اور ایک نئی دنیا بنا کیں۔ اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تمہیں اسپر گنگ و ڈینگ چاہیے یا سمر و یہنگ؟ مگر موسم گرم میں زیادہ تا خیر میں نہیں کر سکتا۔“  
چند لمحوں کی بو جھل خاموشی دونوں کے درمیان حائل ہوئی۔ آبدار ذرا آگے کو ہوئی، خشک لب گیلے کر کے آپس میں مس کیے۔ ”ہاشم، میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں، اور تمہیں بہت پسند کرتی ہوں، تم نے میری جان بچائی تھی، مگر یہ سوال.... یہ پروپول.... یہ بہت غیر متوقع ہے میرے لئے۔“

”مجھے کوئی جلدی نہیں ریڈ۔ تم سوچ لو۔“ وہ نرمی اور رسان سے کہر رہا تھا۔ آنکھیں پل بھر کے لئے بھی آبی کی آنکھوں سے ہٹ نہیں پا رہی تھیں۔ ”سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلو، کچھ دن لے لو....“  
”ہاشم....“ وہ بے چینی سے بولی۔ ”میں نے سوچ لیا ہے۔ میں تمہاری بہت اچھی دوست ہوں، اور دوست ہی رہنا چاہتی ہوں، مگر یہ سب.... شادی.... رشتہ.... نئی زندگی.... نہیں ہو سکتا۔ میں....“

”آبدار!“ آنکھیں اس کی آنکھوں پر مرکوز کیے، اس نے خندے لبجھ میں کہتے نرمی سے آبی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ آبدار کا ہاتھ جتنا گرم تھا، اتنا اس کا ٹھنڈا تھا۔ ”میں نے کہا،“ تم سوچ لو، کچھ دن لے لو، آرام سے فیصلہ کرو۔ اور پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں اسپر گنگ و ڈینگ چاہیے یا سمر و یہنگ.... ہوں!“ اور ہلاکا سامسکرا یا۔ اس کے لبجھ کی ٹھنڈا آبی کے اندر تک سرا یت کرتی اس کے خون کو جما گئی۔ اس نے بے اختیار ٹھوک لگا۔ وہ اپنیکین کھولتا اس سے ہاروں کا حال پوچھ رہا تھا۔ آبدار کی ساری بھوک مرگی تھی۔

.....

مرا یہ خون مرے دشمنوں کے سر ہو گا۔ ..... میں دوستوں کی حرast میں مارا جاؤں گا  
صح کے اس پہرا یئر پورٹ کی ساری بیانیں دور سے جھلکلاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اندر لوگوں کا بے نیاز ہجوم اپنی اپنی سمت میں گامزن تھا۔ ایک کاؤنٹر کے سامنے ٹوپی، اور بڑھی شیووا لاڑکانہ کھڑا تھا جس کی آنکھوں پر چشمہ لگا تھا۔ سامنے بیخنا آفیسر اس سے معمول کے سوالات پوچھنے کے بعد استفسار کر رہا تھا۔ ”سوآپ افغانستان سے آرہے ہیں؟“

”جی، میں سری لنکا سے افغانستان گیا تھا، چند گھنٹے وہاں قیام کیا، ایک دو دوستوں سے ملا اور پھر یہاں آگیا۔“ اس نے رثا رثا بیان دہرا یا۔

”حیدر ہمایوں خان۔ ولکم ٹو پاکستان۔“ اس نے پاسپورٹ پر مہر لگاتے ہوئے کہا۔ عینک کے پیچے اس کی آنکھوں میں زخمی ساتاڑا بھرا۔

پچھے دیر بعد وہ کندھے پر بیگ اٹھائے۔ قدم قدم چلتا ائیر پورٹ کے احاطے سے باہر آ رہا تھا۔ جیکٹ کی زپ بند کر لی تھی اور ہاتھ پینٹ کی جبوں میں ڈال لئے تھے۔

شہروں یا ہی تھا، ولیکی ہی خندوں یہی ہی لوگ۔ سعدی نے چلتے چلتے چہروں اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ تارے تھوڑے بہت دکھائی دیتے تھے ماحولیاتی آلوگی کی دیزیز تھے نے ستاروں کو بڑے شہروں کے آسمان سے عرصے ہوا چرا لیا تھا۔ مگر چلو... آسمان تو اپنا ہی تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ہوا کو محسوس کرنا چاہا۔

چند گھنٹوں کا یہ سفر بے حد اذیت ناک تھا۔ ہدایت کے مطابق وہ ائیر پورٹ آنے کی بجائے لمباروٹ لے کر آیا تھا۔ ہر پل اسے لگتا تھا کہ وہ پکڑا جائے گا، مار دیا جائے گا... مگر پاسپورٹ گورنمنٹ ایشونڈ تھا، نلقی نہیں تھا، سو فرآرم سے طے ہو گیا۔ اور اب پاک سر زمین اس کے قدموں میں بچھ پچھی تھی۔ فارس نے فون کر کے اسے چند دن کی مہلت دی تھی اور گوکر وہ ابھی پچھوڑن مزید تباہی میں اپنا داماغ "خالی" کرنا چاہتا تھا، لیکن اب وہ مزید نہیں بھاگ سکتا تھا۔ چیزوں کو اپنے گھر واپس جانا ہی تھا۔

لیکن اس کے قریب آ کر رکتیں، ہارن دیتیں، سوال کرتیں، مگر وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھتا گیا۔ دفعتاً سڑک کنارے ایک کوڑا دان کے ساتھ تھہرا جیب سے پاسپورٹ نکالا اور اس کے چار ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا کوڑا دان میں پھینکا اور پھر آگے چلتا گیا۔ دو ٹکڑے سڑک کنارے مردُ کراچھال دیے اور آخری ٹکڑا چند کوڑوں دور ایک دوسرے کوڑا دان میں ڈال دیا۔ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

چند لمحے لگ رہے.... اور اس پہلے کوڑا دان کے ساتھ ایک شخص آ کر رکا۔ رات کی تاریکی میں اس کا چہرہ اتنا واضح نہ تھا۔ کوٹ کے کار اس نے کھڑے کر رکھے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا، کانوں کے گرد مفلک... اس نے جھک کر کوڑا دان میں ہاتھ ڈالا۔ پاسپورٹ نکال کر ایک پلاسٹک پیکٹ میں ڈالا۔ پھر آگے بڑھا۔ سڑک کنارے لگی باڑ پھلانگی۔ اس طرف سے مڑے تڑے دنوں ٹکڑے اٹھا کر پلاسٹک بیگ میں ڈالے۔ پھر واپس سڑک تک آیا۔ سامنے سعدی یوسف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا اور جس لمحے سعدی نے آخری ٹکڑا ایک کوڑے دان میں اچھالا، وہ شخص تھہر گیا، یہاں تک کہ سعدی نظر وہیں سے اوچھل ہو گیا۔ تب وہ دبے قدموں آگے آیا، یکرو بھی اٹھایا اور اپنی زنبیل میں ڈالا۔

"یہ پاسپورٹ ذرا سی گوند سے واپس جوڑ کر عدالت میں سعدی یوسف کو دہشت گرد ثابت کروانے کے لیے کافی ہے۔" اس نے پلاسٹک کی زنبیل کو اپنے کوٹ کی اندر وہی جیب میں رکھتے ہوئے خود سے کہا۔ چند لمحوں بعد سرخ مفلک سے منہ ڈھانپے، شخص دوسری سمت جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

❖❖❖

ان سے کہو ہم طوفانوں سے ڈرنے والے لوگ نہیں..... قاتل کو مرتے دم تک قاتل ہی بولا جائے گا  
جنم کی دوپر اس ہاؤسنگ سوسائٹی کے خوبصورت بنگلے قطار میں کھڑے دھوپ زمگرم سیکنے دکھائی دیتے تھے۔ ایسے میں سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے کے برآمدے کے دروازے پر مورچاں کی تختی نصب تھی۔ اندر جاؤ تو لاونچ میں گھما گھمی تھی۔ آج جمع تھا اور جمع ویسے بھی پاکستان کی ساری ندرت ہنون کا یوم بریانی ہوتا ہے سواں وقت کچن میں رونق لگی تھی۔ ندرت ایک طرف سیم کو برتن لگانے کا کہہ رہی تھیں، تو دوسری طرف رائٹ چینی چین کو تیز ہاتھ چلانے کا۔ زمر کھڑی سلا دکاٹ رہی تھی۔ فارس لاونچ میں بیٹھا پنے فون پر لگا تھا اور بڑے ابائی وی پچریں دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں ڈورنیل بھی۔ ایک دفعہ ذرا سی گھٹتی۔ باوقار انداز۔

دھی چینیتی حمد کے ہاتھ تھے۔ اس نے چہروں اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔ جمع... بریانی... ساری فیملی کا اکٹھا ہوتا اور پھر ڈورنیل... کس کی کمی تھی؟ کس نے آنا تھا؟ چین کے سارے وجود میں خوشنگوار ہر دوڑگی۔ وہ ایک دم سب چھوڑ کر بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ فارس

دروازہ کھولنے اٹھ گیا تھا مگر وہ تیزی سے اس کے سامنے آئی۔

”پلیز مجھے کھولنے دیں۔“ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ فرط جذبات سے چہرہ تمثیر ہاتھا۔ فارس مسکرا کر رک گیا۔ ”اس نے آج ہی آنا تھا۔“ جنین بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ پورچ کا دروازہ کھولا اور پھر گیٹ کی طرف لپکی۔ کوئی گیٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ حنہ نے دھڑکتے دل اور مسکراتے چہرے کے ساتھ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا اور..... خنین کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ساری دنیا ہی مجدد ہو گئی گویا برف کا اجزا اور یان صحرابن گئی ہو۔

”ہیلو خنین!“ باہر کھڑے ہاشم نے مسکرا کر کہا۔ تھری پیس گھرے سیاہ سوت میں ملبوس، وجہہ چہرے والا ہاشم دیاں تنہا تھا۔ خنین کی نظریں اس کے عقب میں دوڑیں۔ پیچھے اس کی کارکھڑی تھی اور باہر چند گارڈ۔ خنین کا چہرہ بھج گیا۔ وہ سامنے سے ہٹ گئی۔ ”ہاشم بھائی، آئیے۔“

”تم اب مجھے نیکست نہیں کرتی۔ کوئی ناراضی ہے کیا؟“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں کہتا اندر داخل ہوا۔ وہ ملے جلدی جذبات میں گھری اس کے ساتھ چلتی آئی۔

”اب مصروف ہوتی ہوں بہت۔ آپ اس دنیا میں موجود ہیں یہ تک بھول جاتا ہے۔“ بآمدے کے اس پس چڑھتے ہوئے ہاشم نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”میری موجودگی کی کوئی نہیں بھوتی۔“ پھر اسٹیپ پ پ چڑھا۔ آگے بند دروازہ تھا، اور اس پر نصب تھتی۔

”مورچاں؟“ اس نے زیر لب پڑھا۔

”چونٹی کا گھر!“ خنین بولی۔ ہاشم نے انگلی سے تھتی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ ڈھیلی ہے، مضبوطی سے جب نہیں ہوئی، ذرا سی ٹھوکر سے گرجائے گی۔ اندر بتا دو میں آیا ہوں۔“ شانگلی سے کہتا وہ ہیں کھڑا ہو گیا۔ خنین تیزی سے اندر آئی۔ (دروازہ اس کے منہ پر بند کر دیا۔)

”ہاشم.... ہاشم بھائی آئے ہیں۔“ لاونج میں پہنچ کر اس نے پھولے سانس کے ساتھ اطلاع دی۔ لمحہ بھر میں تمام حرکات رک گئیں، آوازیں بند ہو گئیں۔ زمر اور ندرت کچن سے نکل آئیں۔ ابا، فارس اسے دیکھنے لگے۔ سب سے پہلے زمر کو ہوش آیا۔

”ٹھیک ہے وہ ہمارا مہمان ہے۔ فارس، تم اسے اندر لاؤ، ڈائیکنگ ہال میں۔ ہم کھانا لگاتے ہیں۔“ وہ تیز تیز ہدایات دیتے ہوئے بولی۔

”حنہ، سیم، بھا بھی، ابا، سب سن لیں، کوئی کچھ ظاہر نہیں کرے گا۔ پہلے کی طرح نارمل رہیں گے سب۔ او کے؟“ آنکھیں دکھا کر تھتی سے دارن کیا۔ سب متفق تھے۔ فارس منہ میں کچھ چباتے نیازی سے اٹھا (گویا کچھ سنہا ہی نہ ہو) اور باہر چلا گیا۔

چند لمحوں بعد تمام گھر والے طویل ڈائیکنگ نیبل کے گرد کر سیاں سنجلاء رہے تھے جب فارس ہاشم کو لئے چلتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ ہاشم مسکرا کر سب سے ملا۔ حال احوال دریافت کرتے ہوئے کرسی کھینچی۔ ابا کی سربراہی کرسی کے باٹیں طرف۔ اس کے مقابل فارس بیٹھا تھا۔ ہاشم کے ریکس وہ رف سے سوئیٹر اور جیزیز میں ملبوس تھا۔ کرسی کھینچتے ہوئے بھی موبائل پر کچھ ناٹپ کر رہا تھا۔

”میں غلط وقت پر آ گیا شاید۔“ وہ سب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ سب خاموش رہے۔ ندرت اس کو دیکھنا نہیں چاہتی تھیں، سو برتن درست کرتی رہیں۔ خنین سر جھکائے نیپکیں جوڑتی رہی۔ زمر لیوں پر مسکراہٹ سجائے بیٹھی رہی۔ ابا کے تاثرات بھی تھے ہوئے تھے۔

”نہیں، ایسا کس نے کہا؟“ فارس نے کندھے اچکائے اور بریانی کی بھاپ اڑاتی اشتها اگیز مہک دالی ڈش اٹھا کر سامنے رکھی۔ وہ چہرے سے سنجیدہ اور قدرے بے نیاز لگا تھا۔

”بہت دن سے آنا چاہ رہا تھا۔ آج ہی وقت نکال پایا۔“ ہاشم تھج کا نا سنجلاء تھے مسکرا کر کہنے لگا۔ ”آپ لوگ نیس لگ رہے ہیں۔ خیریت ہے؟“ زمر کا دل زور کا دھڑکا۔ جلدی سے مسکرا کر کہنے لگی۔ ”نہیں۔ دراصل آپ کی طبیعت کا سنا تھا تو...“ مگر فارس اس

سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”میں کوئی نہیں ہے۔ بس سب کو علم ہو گیا ہے کہ تم نے میری بیوی اور بھائی کو مارا تھا، اور آف کو سعدی کو بھی زخمی، انبوأ واث ایورڈہ سب کروایا تھا، راستہ؟“ کہتے ہوئے اس نے راستے کا ڈونگا ہاشم کے سامنے رکھا۔ سب ایک دم بے یقینی سے فارس کو دیکھنے لگے۔ زمر تو بالکل شل رہ گئی۔

صرف ایک شخص نے جیسے کوئی اثر ہی نہیں لیا اور وہ ہاشم تھا۔ اس کا چہرہ دیسے ہی مسکراتا رہا اور نظریں فارس پہنچی رہیں۔ پھر اس نے سر کو ذرا ساخن دیا۔

”ظاہر ہے۔“ اور چاول پلیٹ میں نکالے ذرا سارے اسٹہہ اور پڑا لال۔ سب کے سانس رکے ہوئے تھے۔ پھر ہاشم نے چہرہ اٹھایا تو اس پر مغموم ساتاڑ تھا۔ آنکھوں میں سادگی تھی۔

”میں جانتا ہوں میں نے اچھا نہیں کیا۔“ آواز میں افسوس تھا۔

”سب جانتے ہیں۔“ فارس نے اسی بے نیازی سے کندھے اچکائے، موبائل ایک طرف دھرا اور اپنی پلیٹ میں چاول نکالے گا۔

”انسان بہت سے کام کرتا ہے جو سے نہیں کرنا چاہئیں۔ میں نے بھی غلطیاں کی ہیں، گناہ کیے ہیں۔ وارث کو....“ رک کر سلااد کے باوں سے چند کھیرے اپنے بلیغیر میں نکالے۔ ”میں نہیں مارنا چاہتا تھا،“ مگر خاور مجبور ہو گیا تھا۔ آئی ایک سوری فاردیت۔ ”چاولوں کا چیخ منہ میں رکھا، چند لمحے چجایا، پھر ندرست کو دیکھا جو سے گلابی پڑتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ”آپ واقعی بہترین شیف ہیں۔ خیر۔“ فارس کی طرف نظریں پھیریں ”پور رتاش... وہ کوئی نہیں بچ بن گئی اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں، اور مسز زمر کے لئے مجھے واقعی افسوس ہے....“ زمر سلکتی آنکھوں سے اسے دیکھ گئی۔ اس کا تنفس تیز ہو رہا تھا۔

فارس نے چاولوں میں چیخ چلاتے ہوئے کندھے جھکلے۔ ”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

”رہا سعدی تو مجھے اس پر حملے کا علم نہیں تھا، ہاں جب پتہ چلا تو میں نے اس کو حفظ جگہ بھجوادیا، اس کا خیال رکھا، وہ بھی اتنا ہی ناراض ہے جتنا کہ آپ لوگ مگر یہ آپ سب کا حق ہے۔ وہ بہت جلد واپس آجائے گا اور پھر ظاہر ہے وہ میرے خلاف کوئٹہ میں جانا چاہے گا۔“

”حالانکہ میں نے اسے منع کیا تھا، ابھی جب میں کینڈی میں اس سے ملا تھا۔“ فارس نے پلیٹ میں چیخ چلاتے ہوئے نظریں اٹھا کر بشمود دیکھتے تھے۔ ”مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا، سو میرا خیال ہے ہاں وہ کوئٹہ جائے گا۔“

”اس کا حق ہے!“ ہاشم نے گھری سانس لی۔ وہ دونوں یوں گفتگو کر رہے تھے جیسے دوسرا کوئی وہاں موجود ہی نہ ہو۔ ”مگر میں اپنے سو گناہ کو جسمی فائی نہیں کروں گا۔ آپ مجھے کوئٹہ میں لے جانا چاہیں، لے جائیں، میں سزا بھگتے کے لئے بھی تیار ہوں، لیکن.....“ اس نے سر اریک اور چیخ منہ میں رکھا اور چجایا۔ سب سانس روکے اسے دیکھ رہے تھے۔ ”اس سے ہم دونوں خاندانوں کا نقصان ہی نقصان ہو گا۔ آپ اچھے لوگ ہیں۔ میں بھی اب پہلے والے آدمی جیسا نہیں رہا، خود کو بدل رہا ہوں، مودا آن کر رہا ہوں، میں چاہوں گا کہ آپ لوگ مجھے سوچ کر دیں، میں نے اپنے کی کی بہت سزا بھگت لی ہے۔ ساری زندگی بھگتوں گا، مگر انتقام اور انصاف کی نئی جنگ لڑنے کا فائدہ کوئی نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے میری وجہ سے بہت سفر (suffer) کیا ہے، میں نہیں چاہتا کہ آپ مزید دکھاٹھا کیں۔“ پلیٹ پرے کھسکائی تو فارس نے شروع ہیا۔ ”اور لوٹا۔“

”نہیں تھیں، میں ڈاکٹ پہ ہوں۔ بہر حال، میں ایک دفعہ پھر مذدرت کرتا ہوں کیونکہ میں نے اسی لئے سعدی یوسف فاؤنڈیشن چلنے ہے تاکہ مزید کسی خاندان کو اس سب سے نہ گزرنا پڑے۔ آگے آپ لوگ جو بھی کرنا چاہیں، آپ کی مرضی۔“ تھیکین اٹھا کر بہاٹھ صاف ہے۔ میری طرف سے آپ آزاد ہیں، معاف کریں یا سزادیں۔ میں پرانی باتوں اور حسابوں میں اب نہیں پڑنا چاہتا۔ میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔

ہوں۔ کیونکہ میں اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ تھیک یوں۔

”شیور۔ ویکم!“ ہاشم کھڑا ہوا تو فارس بھی کھڑا ہوا۔ ہاشم نے مصالحت کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ”مجھے کام ہیں کچھ، اب چلتا ہوں۔“ فارس نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سر کو ختم دیا۔ ”میں سعدی کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کروں گا ہاشم، مگر کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“ ہاشم الوداعی کلمات کہہ کر مر گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

بریانی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور جذبات گرم ابل رہے تھے۔ ڈائیگ ہال میں سانپ سونگھا ہوا تھا۔ سب شل تھے۔ ندرت بدقت بول پا سکیں۔

”وہ اپنے کیے پتھر مندہ ہے!“

”تم نے.... اسے کیوں بتایا؟“ زمر نے ہکلاتے ہوئے فارس کی طرف رخ پھیرا۔ وہ بے یقین تھی۔

”وہ اور لمبیں اور میرے بارے میں پتہ کرو اور ہاتھا اس کوشک تھا، میں نے کفرم کر دیا۔“ وہ اسی رغبت سے چاول کھار ہاتھا۔

”انہوں نے ہم سے معافی مانگی۔“ حدا بھی بے یقین تھی، متھیر تھی۔

”پتہ نہیں۔“ اب تھی سے بولے۔ یکدم باہر کسی شے کے گرنے کی آواز آئی۔ حدا ایک دم انٹھ کر باہر بھاگی۔

دروازہ کھلا تھا اور پورچ کے ماربل کے فرش پر دروازے کی تختی گردی پڑی تھی۔ وہ اتنی زور سے دے ماری گئی تھی کہ دو ٹکڑوں میں ٹوٹ گئی تھی۔ بندگیٹ کے باہر گاڑیوں کے زدن سے گزر جانے کی آواز سنائی دی تھی۔

”مجھے.... سمجھ نہیں آ رہی وہ معافی کیوں مانگ رہا تھا، اور تم اس سے یہ کس طرح بات کر رہے تھے؟“ اندر زمر ہنوز گوموی بول رہی تھی۔

”وہ معافی نہیں مانگ رہا تھا میر۔“

اپنے آفس کی عمارت کی بالائی منزل کی راہداری میں تیز تیز چلتے ہاشم نے ٹائی ڈھیلی کی۔ اس کا چہرہ فرط جذبات سے سرخ تمنار ہتا۔ دو آدمی اس کے ساتھ چل رہے تھے اور مسلسل اس کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں لگے تھے۔ اپنی کرسیوں اور کپین میں کام کرتے ورکر رک رک کر اس کو دیکھنے لگے تھے۔ ٹھوکر سے اس نے نوشیروان کے آفس کا دروازہ کھولا۔

(”وہ مجھے کچیک کر رہا تھا، کہ میرا غصہ کیسا ہے؟ کہ میں وہ پہلے والا انسان ہوں یا نہیں۔“) سامنے میز کے پیچھے نوشیروان بیٹھا، موبائل پہ لگا تھا۔ آواز پنا گواری سے چہرہ اٹھایا۔ ہاشم کسی دھشی جانور کی طرح اس کی طرف پکا اور اسے گریبان سے جھپٹ کر کھڑا کیا، پھر یہ بعد میگرے دو تھپڑاں کے چہرے پہ جڑ دیے۔

”کیا بکواس کی تھی میں نے؟ سعدی یوسف کو مت چھیڑو۔ مجھے سنبھالنے دو۔“ ایک تیسرا تھپڑا سے دے مارتے ہوئے وہ چلا یا تھا.....

(”وہ جانچ رہا تھا کہ ہم کتنا جانتے ہیں۔ پر کھڑا رہا تھا کہ ہم کتنا جانتے ہیں۔ محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے اعصاب کتنے مضبوط ہیں۔“) ہاشم نے ہکا بلکے کھڑے شیر و کورپے دھکیلنا اور غصے سے حلق کے بل چلایا۔ ”میری زندگی بر باد کر دی تم نے.... ہم سب کو بر باد کر دیا... میری برسوں کی ساکھ... عزت... سب بر باد ہو جائے گا...“

(”اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سب سمجھ گیا ہے۔ وہ پہلے جیسا آدمی نہیں ہے جو ہمارے ہاتھوں بے قوف بن جائے گا۔“)

نوشیروان منہ پہ ہاتھ رکھ کر حق دق شل سا کھڑا تھا۔ ہاشم ایک دم آگے بڑھا اور اس کی میز کی ساری چیزیں زور سے ہاتھ مار کر نیچ گراؤں۔

”وہ بچ گھنیا لوگ جن کو میں اپنے برا بر کری پہ بھی نہ بھاؤں وہ سب جانتے ہیں... سنا تم نے؟ جس ذمہ کو تم اس آفس میں لاتے تھے وہ سب جانتی ہے... اور تمہاری وجہ سے میں ان کے ہاتھوں دھوکا کھا گیا۔ تمہاری وجہ سے ان کو اتنی مہلت مل گئی کہ وہ تیاری کر لیں۔“ خون شام آنکھیں نوشیر وال پہ گاڑھے وہ غرار ہاتھا۔ پھر اس نے کوٹ اتار کر پرے پھینکا۔

(”اور وہ کہہ رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ جنگ کر کے اس کا نقصان نہیں کریں گے اپنا نقصان کریں گے۔ میں متفق ہوں ویسے اس بت سے مگر چونکہ سعدی سے وعدہ کیا ہے تو پھر.... نہانا ہوگا!“)

جو اہرات تیزی سے آفس میں داخل ہوئی تو اندر کا منظر دیکھ کر انگشت بدنداں روگئی۔ منہ تک کھل گیا۔ بکھری ٹوٹی چیزیں منہ پہ ہاتھ سے کھڑا نوشیر وال اور شرٹ کے آستین چڑھاتا غصے سے چیخ چیخ کر اسے گالیاں نکالتا ہاشم۔

”میرا پا اور پلانٹ تباہ ہوا ہے چند دن پہلے.... میں ایک اور سینڈل افروڈ نہیں کر سکتا تھا مگر تھیں میں نوشیر وال کا ردار... آدھا مرد نوشیر وال کا ردار.... اس نے میرا سب کچھ دا کچھ لگادیا.....“

جو اہرات کو بھی نکل کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ”ہاشم کیا ہوا ہے؟“

”فارس جانتا ہے۔ وہ سب جانتا ہے۔ ہمیشہ سے جانتا تھا۔ اور وہ لوگ ہمارے خلاف کوٹ جار ہے ہیں!“ جو اہرات کا سانس ہشم ہے۔

(”اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ مودا آن کرنے کے لئے تیار ہے.... وہ اگلے ہر مرحلے کے لئے تیار ہے.... وہ ہر شے کو سنبھالنے کے لئے ہے....“)

”اوہ گاڑ ہاشم!“ جو اہرات پر یہاں سے اس کے قریب آئی۔ ”اب کیا ہوگا؟“

”کیا مطلب کیا ہوگا؟ میں.... میں ہاشم کا ردار ہوں۔ یہ میری زندگی کی پہلی جنگ نہیں ہے می۔ میں اس پورے خاندان کو جاہ کر جائیں گا۔“

وہ ایک ایک روپے کے محتاج ہو کر چوبیس گھنٹوں میں سڑک پہ آ جائیں گے.... میں.... تیار.... ہوں!“ نفرت اور تنگی سے چیا چجا کر کہتے اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اپنی آواز میں ریکس سمیت دوسرا افراد کو اندر آنے کا کہنے لگا.... افرات فری.... چیخ و پکار.... جمُدُر.... پورے آفس میں گویا قیامت آئی تھی....

(”ہاشم ٹھیک سوچ رہا ہے۔ وہ تیار ہے۔ وہ ہمیشہ ہی تیار ہوتا ہے زمر۔ وہ ایک اچھا آدمی نہیں ہے، مگر وہ ایک عظیم آدمی ہے۔ لیکن وہ صرف ایک بات معلوم نہیں۔ کہ اس دفعہ.....“) کری دھکیل کر اٹھتے ہوئے فارس مسکرا کر بولا تھا۔ ”میں بھی تیار ہوں۔“

.....♦♦♦.....

خداؤتوں کے عذاب سورج نے اتنی مہلت نہ دی کہ محسن ..... ہم اپنی جلتی زمیں کے سر پہ کوئی بگولہ ہی تان دیتے جمعہ کی اس دوپہر یوں لگتا تھا گویا بر فیلے بادلوں کی تہہ پکھل کر فضا میں غائب ہو گئی ہو اور کہیں اچانک سے سنہری سورج آسمان پہ نمودار ہوتا پورے شہر کو سونے کا خول چڑھا گیا ہو۔

اپنے آفس کے کھلے دروازے پہ ہاشم اسی طرح ڈھیلی تائی اور چڑھے آستین کے ساتھ کھڑا۔ وہ چند افراد کو اندر جانے کا راستہ دے رہا تھا۔ آخری داخل ہونے والے صاحب ہارون عبید تھے۔ ان کے پیچھے احمد آنے لگا تو....

”تم ابھی اسی وقت فائز ہو۔“ رعنوت سے انگلی سے دفعہ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ احرمساکت رہ گیا۔ ”مگر سر....“

”تم فارس کے دوست ہو، مجھے اعتبار نہیں رہا تم پر اور اس وقت میرا اعتبار تم کہا نہیں سکتے.... سو.... آؤٹ!“ ہاشم غصے سے کہہ کر اس

کے منہ پر دروازہ بند کر کے اندر آیا۔ جواہرات اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑی نظر آرہی تھی اور ناگواری سے سامنے بیٹھتے ہارون کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ہاشم کو دیکھا۔ ”ہارون کو کیوں لائے ہو؟ تاکہ یہ خوش ہو جائیں؟ ان کی وجہ سے ہمارا پاپلانت تباہ ہوا ہاشم!“

”ہمیں اس وقت ایک ہونا ہے مگر اپنی سیاستیں بعد میں بیجھے گا۔“ وہ سردہری سے کہہ کر آگئے آیا۔ ہارون کافی محفوظ ہوتے نہ تھے سنبھال چکے تھے۔ باقی لوگ ہاتھ باندھ کھڑے تھے۔ نو شیر والا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ آج ہاشم نے بھی وہی گالی دی تھی مگر وہ اسے تین گولیاں نہیں مار سکتا تھا! تو چواؤں ہمیشہ انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہے!

”اسکینڈل کو اس کے شروع ہونے سے پہلے کچلا جاتا ہے۔ اور ہم سب کوں کر اسے کچلانا ہو گا۔ میں ہاشم کا ردار ہوں، اور یہ اسکینڈل نے میرا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے، ہاں اگر میں ڈوبا، تو تم سب بھی میرے ساتھ ڈوبو گے۔“ اپنی سیٹ کے پیچھے کھڑے وہ ماٹھے پر تیوریاں ڈالے بلند مگر آہنی آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا.....

”ایک گھنٹے کے اندر اندر....“ وہ اپنی سیٹ کے پیچھے کھڑا تھکم سے کہہ رہا تھا۔ ”ان لوگوں کو ہم پائی پائی کا محتاج کر دیں گے۔ ان کے پاس مہینہ بھر زندہ رہنے کا خرچ بھی نہیں ہو گا۔“ پھر اس نے فون اٹھایا اور کان سے لے گایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فون میں کہہ رہا تھا۔

”چند آئی ڈی کا روز کی کا روز کی کا پیر بھیج رہا ہوں قدر یاصاحب۔ یوسف خاندان کے ان آئی ڈی کا روز سے وابستہ تمام بیک اکاؤنٹس فریز کر دیے جانے چاہیے.... آپ کے پاس ایک گھنٹہ ہے....“

”جب ان کے سارے اٹالیے محبود کر دیے جائیں گے تو ان کے پاس ہم سے لڑنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔ ان کو اپنی فکر پڑ جائے گی۔“ ہارون نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔ جواہرات ”ہوں“ کہہ کر رہ گئی۔

”مجھے اس ملک میں.... ہاشم اب رئیس سے کہہ رہا تھا۔“ ان کی ایک ایک زمین، پلاٹ، مکان، سب کا حساب چاہیے۔ یہ گھر جس میں وہ رہ رہے ہیں۔ ہارون تم اس کے مالک سے رابطہ کرو، ہم ابھی اسی وقت اس کو خرید رہے ہیں، شام تک ان کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا جانا چاہیے۔ اور تم!“ سامنے کھڑے تین افراد کی طرف متوجہ ہوا، جو اس کی ہدایت کے منتظر تھے۔

”اپنے سارے آدمی لے جاؤ۔ شہر کے بدر تین فراری مجرم جو کسی سے نہ ڈرتے ہوں.... کوئی پولیس، کوئی چیک پوسٹ، تمہیں آج کے دن کوئی نہیں روکے گا۔ ان کے گھر کے باہر جا کر اپنی گاڑیاں روکو، اور گولیاں چلا چلا کر ان کی دیواروں کو چلنی کر دو، سارے شاخے توڑ دو۔ جب متوقع خوف وہ راں پھیل جائے تو واپس آ جانا۔“

آفس میں ہر کوئی پنے کام میں لگ گیا تھا۔ ہارون فون کرنے باہر چلے گئے تھے ہاشم بھی موبائل پر مصروف تھا۔ ایک نو شیر والا تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بالکل چپ۔

”قدرتی سے یا خوش قسمتی سے....“ ہارون نے اپنی جگہ پر بارہ بیٹھتے ہاشم کو مخاطب کیا۔ ”ان کے نام پر کوئی پر اپنی نہیں بچی۔ کوئی اٹھاۓ ایسا نہیں ہے جس پر قبضہ کر کے ہم ان کی کمر توڑ سکیں۔ واحد بچی ہوئی پر اپنی اس نے آپ کو ہی فرودخت کی تھی۔ وہ انیکی جس کی مالیت کے کروڑوں روپے فارس غازی کے کسی اکاؤنٹ میں پڑے ہوں گے اس وقت۔“ محفوظ انداز میں جواہرات کو دیکھا جو پہلو بدلت کر رہ گئی۔

”میں نے اپنی اناکے پیچھے وہ انیکی خریدی مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میری ہی رقم سے ہمارے خلاف کیس لڑے گا۔“

”اور وہ گھر؟“ ہاشم نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”وہ کس کے نام ہے؟“

”وہ چند دن پہلے ان خاتون سیاستدان نے خریدا ہے جن کو بدنام کرنے میں تمہاری ماں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ہم اس عورت سے وہ گھر نہیں خرید سکتے۔ ہم اس سے بات بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ گھری سانس لے کر کہہ رہے تھے اور ہاشم نے غصے سے میز پر کھا پانی کا گlass اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ کانچ کے ٹکڑے فرش پر جا گئے۔ سب خاموش ہو گئے۔ پھر وہ فون اٹھاتے ہوئے بولا۔

”لیکن وہ اس رقم کو نہیں استعمال کر سکیں گے۔ جب ان کے بینک اکاؤنٹس فریز ہو جائیں گے تو وہ اس رقم سے ہاتھ دھوپیجیں گے۔“ دوسری طرف گھٹتی جا رہی تھی۔ ہاشم کے چہرے پر جوش تھا۔ امید تھی۔ ”بھی قدیر صاحب؟ کام ہو گیا؟“ رابطہ ملتے ہی وہ تیزی سے بولا۔ ”گذ۔“ وہ مسکرا یا۔ ”تو ان کے تمام اکاؤنٹس فریز ہو گئے۔“ ویری اس نے وکٹری کی دواں لگیاں بنا کر اوپر اٹھائیں۔ جواہرات نے سکون کی بیلی سانس خارج کی۔ ”یعنی اب وہ ان بینک اکاؤنٹس سے کچھ نہیں لے سکتے۔ زبردست۔ ویسے انداز آکتنا سرمایہ فریز ہوا ہو گا؟“ اور پھر اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ”دو ہزار سینتیس روپے؟ آپ مذاق کر رہے ہیں؟“ ہاتھ کے اشارے سے باقی لوگوں کو خاموش ہونے کو کہا۔ آفس میں سناثا چھا گیا۔ ”کیا مطلب؟ ان کے اکاؤنٹس خالی کیوں ہیں؟ پچھلے ایک ماہ میں انہوں نے اپنا تمام سرمایہ کہاں منتقل کر دیا ہے؟“

اب کی دفعہ اس نے فون آہستہ سے پرے ڈالا تھا۔ ”فارس اپنی تمام رقم کمیں اور منتقل کر چکا ہے اور ہم تریں نہیں کر پا رہے کہ کدرہ۔“

”سر... پلیز یہ دیکھیں۔“ حلیمه تیزی سے آفس میں داخل ہوئی اور اس سے پبلے کہ ہاشم اس کو جلا کر باہر جانے کو کہتا، اس نے ایک ٹیب میز پر رکھا۔ اسکرین پر موجود چہرہ دیکھ کر ہاشم چونک کر سیدھا ہوا۔

”میرا نام ہے سعدی یوسف!“ وہ سڑک کنارے چلتے ہوئے، سیلفی کیمرے سے اپنے چہرے کی ویڈیو بنا تائیخی سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے آٹھ ماہ تک سری لنکا کے شہر کولمبے کے ہوٹل (نام لے کر) کے تہہ خانے میں قید رکھنے والے کاردار خاندان اور ہارون عبید کو میں یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ میں... واپس آگیا ہوں، اور میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ میں عدالت میں جا کر بتاؤں گا کہ مجھے گولیاں مارنے والا نو شیراں کاردار تھا، مجھے انگوکر کے حصیں بے جایں رکھنے اور نیکام پر اجیکیش کے حساس راز پوچھنے کے لیے تشدید کرنے والے مشہور زمانہ IPPs ہارون عبید اور ہاشم کاردار تھے۔“ وہ چلتے چلتے پورے اعتماد سے بولتا جا رہا تھا۔ چہرے پختنی اور آنکھوں میں پتش تھی۔ ”اور اگر مجھے قتل کر دیا گیا یا غائب کر دیا گیا تو ہاشم کاردار اور ہارون عبید کو پکڑا جائے۔ کیونکہ...“ ویڈیو کافی لمبی تھی۔ سمنی خیز بھی تھی۔ جہاں ہاشم کے چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا وہاں ہارون کی مسکراہٹ بالکل غائب ہو گئی تھی اور وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اپنے نام پر چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی۔ جواہرات بالآخر بکھلی کی مسکراہٹی تھی۔ جلتے دل پر پھوڑا پڑی تھی۔

نوشیر وال جو اس سارے اثناء میں سر جھکائے بیٹھا تھا، ایک دم کھڑا ہوا۔ وہ موبائل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔

”بھائی... لوگ اس ویڈیو کے نیچے میری تصویریں پوسٹ کر رہے ہیں۔ میری کوئی پرائیویٹی نہیں ہے۔ یہ سب مجھے بدنام کر رہے ہیں۔“ اس کا چہرہ فتحا اور اس پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔ پھر وہ لپک کر ہاشم کے پاس آیا۔ ”مجھے اس سب سے نکالیں بھائی۔ پلیز کچھ کریں!“

اس کے چہرے پر اچھی تھی۔ ساری ہٹ دھرمی وہ پورا مرد بننے کا زخم سب غائب تھا اور وہ بوکھلایا ہو گلتا تھا۔

ہاشم نے ایک قہر آلو نظر اس پر ڈالی۔ ”ہاں ایک اسی کام کے لئے ہے تمہارا بھائی۔ مگر بے فکر ہو، ہر دفعہ کی طرح تمہارا پھیلایا گند میں صاف کر لوں گا۔“ اور فون اٹھا کر ان افراد کو کال کرنے لگا جو اس نے فارس کے گھر کی طرف روانہ کیے تھے۔

”ان کے گھر کے سارے شیشے توڑاں اللو۔ انہوں نے ویڈیو بنا کر ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتنی گولیاں برسانا کہ ان کی دیواریں چھلنی ہو جائیں۔“ از سرنوتا کید کرتا وہ کہہ رہا تھا۔



میں کھا کر ٹھوکر ابھی تک حوصلہ مند ہوں ..... یہ ٹھوکر جو تمہیں لگتی تو تم خود بکھر جاتے فروری کی وہ گرم دوپہر اس بیگلے کی بزر بیلوں کو بھی جلسائے جا رہی تھی۔ لاڈنچ کی کھڑکی کا بیرونی شیشہ شہری روشنی کو منعکس کرتا

چک رہا تھا۔ اس گرم شیئے پر تم اپنا ماتھا نکلا کر اندر جھانکو تو ڈائینگ نیبل سے سب اٹھ کر اب لا اونچ میں آبیٹھے تھے۔ ندرت اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ ابا فکرمندی سے کبھی فارس کو دیکھتے ہوئے پر سکون سا بیخا تھا اور کبھی زمر کو جو بے چینی سے ادھر ادھر ہل رہی تھی۔ حین اور سیم سامنے صوفے پر خاموش مگر مضطرب بیٹھے تھے۔

”سعدی کو گھر آ جانا چاہیے تھا، وہ کیوں نہیں آیا؟“ زمر کو بے بس ساغھڑہ آنے لگا تھا۔ ”ہاشم سعدی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔“

”اونہوں۔ یہ وہ پہلا کام نہیں ہے جو وہ کرے گا۔“ فارس نے میل فون سے چہرہ اٹھا کر فنی میں سر ہلا کر کہا۔ زمر رک کر اسے دیکھنے لگی۔ سب اسے دیکھنے لگے۔

”پھر وہ کیا کرے گا؟“

فارس نے ناگ سے ناگ ہٹائی، ایک بوٹ میز پر رکھا، پھر قینچی صورت دوسرا بوٹ اس کے اوپر جمایا، ذرا آرام دہ انداز میں بیٹھا، اور موبائل دونوں ہاتھوں میں کپڑے ناپ کرتے ہوئے بولے۔ ”وہ سب سے پہلے اپنے سب سے قابل اعتبار ملازموں اور دوستوں کو اکھا کرے گا اور جن پر اعتبار نہیں ان کو نکال دے گا۔ احمد شفیع کی تو آج ہوئی چھٹی۔“

”اچھا۔ پھر؟“ حین نے دیکھی سے پوچھا۔

”پھر یہ کہ وہ اپنے اتحادیوں اور خود اپنے آپ کو یہ بتائے گا کہ وہ ہماری نہیں ہے۔ ایک لمبی تقریر کرے گا۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ میں اس کے طریقوں سے بھی واقف ہوں۔ وہوں کا مکرے گا جو وہ ہمیشہ ایسے موقع پر کرتا آیا ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ۔“

”ظاہر ہے کہن کس کا ہے۔“ زمر کلس کر بولی تھی۔ فارس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر سروتا نیدی انداز میں خم دیا۔

”پھر وہ اپنے ملازموں کو حکم دے گا کہ یوسف خاندان کی ایک گھنٹے کے اندر اندر کمر توڑ دی جائے۔“ فارس کے الفاظ پر حین کی آنکھیں پھیلیں۔ زمر بھی سیدھی ہوئی۔ ”مگر کیسے فارس؟“

”وہ ہمارے بینک اکاؤنٹس فریز کر دادے گا۔ اس کے اشیٹ بینک میں جتنے دوست ہیں، اتنے ہمارے پوری دنیا میں رشتے دار نہیں ہیں۔“ وہ موبائل پر ہاتھ چلاتے ہوئے عام سے انداز میں بتا رہا تھا۔

”ہمارے بینک اکاؤنٹس؟“ زمر بے دم سی ہو کر صوفے پر گری۔ ”میری ساری سیوٹنگز، ابا کے پیسے سب بینک میں ہے۔ میں اتنی جلدی کیسے نکلواؤں گی سب؟“

”خیراب تک وہ نہیں فریز کر چکے ہوں گے۔“ فارس نے شانے اچکائے۔ زمر کی رنگت زرد پڑنے لگی۔ فارس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ویسے تو زمر بی بی آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں، مگر تھوڑی بہت عقل ہے مجھ میں۔ میں نے ہمارا سارا پیسہ کچھ عرصہ قبل چند آف شور بینک اکاؤنٹس میں منتقل کر دیا ہے۔ وہ اس کو ٹریس بھی نہیں کر سکتے۔“ زمر کو چنچھا ہوا۔

”مگر تم میرے بینک اکاؤنٹ کو کیسے آپریٹ کر سکتے ہو؟ تمہیں میری پن تک معلوم نہیں۔“ فارس نے اثبات میں سر کو خم دیا۔

”بالکل آپ کی پن جو آپ کی ڈیٹ آف برٹھ ہے وہ مجھے قطعاً معلوم نہیں۔“ حین نے مسکراہٹ چھپا کے کوچھہ جھکالایا اور ابا نے ہنس کر نئے کوچھہ موڑ لیا البتہ سیم کے دانت نکل آئے تھے۔ زمر کے گال گالابی پڑے۔ تندہ ہی سے فارس کو دیکھ کر بولی۔ ”مجھے اپنی ایک ایک پائیں چاہیے۔ اچھا۔“

”خیر ماموں، اکاؤنٹس فریز کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ کیا کرے گا؟“ حنے نے موضوع بدلا چاہا۔

”وہ تمیں ہمارے گھر سے بے دخل کر کے سڑک پر لانے کی کوشش کرے گا۔“  
”وہ کیسے؟“

”وہ ہمارا گھر خریدنا چاہیں گے؟“

”ہر اگھر؟ اگر انہوں نے ہمارا گھر خرید لیا تو ہم کہاں جائیں گے؟“ زمر پھر سے پریشان ہونے لگی۔ وہ جتنا خود کو پر سکون ظاہر کرنے والش کرتی، اتنی مضطرب ہوتی جا رہی تھی۔ جواب میں سب نے خاموشی سے فارس کو دیکھا، جو اپنے سیل فون کوڈ یکھر رہا تھا۔

”ہم یہیں رہیں گے کیونکہ میں یہ گھر ایک ایسی شخصیت کے ہاتھوں فروخت کرواجکا ہوں جن سے وہ بات تک نہیں کر سکتے تھے حال۔“ اور ساتھ ہی ان خاتون کا نام بتایا۔ جس طرح وہ اطلاعات دے رہا تھا، اور سیم اور حینہن دبی دبی مسکرا ہوں کے ساتھ چہرہ جھکا لیتے تھے چڑیں کاخون کھول رہا تھا۔

”غیر تمہارا وہ ڈیر کزن جو تمہاری وجہ سے ہم سب کے سروں پر مسلط ہوا ہے، وہ اس کے بعد کیا کرے گا تمہارے خیال میں؟ تم تو اس کا ذہن بھی پڑھ سکتے ہوئے۔ آخر ہوتا تم بھی آدھے کاردار۔“ فارس نے سر کو تعریف و صولی کے انداز میں خم دیا۔

”تھوڑی دیر انتظار کریجئے۔“ اور زیادہ درینہیں گزری تھی جب فارس نے چہرہ اٹھایا۔ یوں جیسے کوئی آہست سننا چاہ رہا ہو۔

”آگئے۔“ اس نے مخطوط انداز میں کہا۔ پھر سب کی منتظر صورتیں دیکھ کر بولا۔ ”کرایے کے غندے ہمارے گھر پر فائزگ کرنے آگئے۔“

”تو پولیس کو کال کرو فارس....،“ وہ مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ”وہ لوگ ہمارے گھر پر ہملا کریں گے تو ہمیں حفاظت چاہیے ہوگی۔“

”حفاظت کا بندوبست آپ کا یہ بے کار جیل یا فتہ، دلوگوں کا قاتل شوہر پہلے ہی کرچکا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس آپ جیسی تیز زبان ہے نہ ذہانت و فظانت....،“ وہ بڑے ادب سے بتا رہا تھا۔ ”سو جب وہ لوگ آئیں گے، تو اس کا لوٹی کی چار مختلف چھتوں پر موجود لوگ اپنے تمام.... آہم....“ اوزار، اور ”تھیار“ لے کر نکل آئیں گے اور ان حملہ آوروں کو ”شوٹ“ کریں گے، جس کے بعد وہ ہمارے گھر پر فائزگ نہیں کر سکیں گے۔“

زمر تو زمر، ابا بھی دنگ رہ گئے۔ ”فارس یہ تو خون خرابے والی بات ہوئی۔“

زمر تیزی سے کھڑکی کی طرف لپکی اور پردہ ہٹایا۔ پاہر کا لوٹی کی سڑک پر جیسیں رکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی کھلی چھتوں سے رانکلڑ اور جدید اسلحہ اٹھائے ہیئے چند ہیٹے کئے افراد صاف دکھائی دیتے تھے۔ (گیٹ اور چار دیواری چھوٹی تھی سو یہ منظر صاف واضح تھا۔)

”ایسے مت کرو فارس.... روکوان لوگوں کو.... یہ غلط ہے، کوئی مر گیا تو؟ کال کرو انہیں۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ اسی وقت فضا گولیوں کی تڑپڑا ہٹ سے گونج آٹھی۔ درختوں سے پندے ایک دم سے اڑے۔ کھڑکی میں کھڑی زمر کی رنگت پھیل پڑی۔

”فارس، تم اپنے لوگوں کو منع کرو، کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ یہ لوگ ہوائی فائزگ کر کے واپس چلے جائیں گے۔“

”اب دیر ہو چکی ہے، میں شونگ کا آرڈر دے چکا ہوں۔ وہ لوگ اپنی پوزیشنز سنبھال چکے ہیں۔ اور آپ کھڑکی سے ہٹ آئیئے یہ نہ ہو کہ میں تیسری دفعہ جیل چلا جاؤں۔“ وہ قدم قدم چتا اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔

لااؤخ میں خوفزدہ سانسنا چھا گیا تھا۔ حینہن اور سیم کی مسکرا ہیں غائب تھیں۔ ابا پریشان سے ہو گئے تھے۔ اور زمر کھڑکی سے نہیں بہت رہی تھی۔

”فارس ان پہ جوابی شونگ مت کرواؤ۔ تم ان کو کال کیوں نہیں کرتے۔“ وہ بے بھرے غصے سے بولی تھی۔ نظریں سامنے والی

چھتوں پر جی تھیں۔ اور یکا یک... قربی دو چھتوں پر چند لوگ نمودار ہوئے۔ زمر کا دل زور سے دھڑکا۔ (باقی دو چھتوں اس جگہ سے دکھائی نہ دیتی تھی۔) انہوں نے بلند آواز میں کچھ کہتے ہوئے نیچے سے چند ”ہتھیار“ اٹھا کر اوپر کیے اور ان کا نشانہ جیپ والے لگھس پیٹیوں کی طرف باندھا۔....

زمردھک سے رہ گئی۔

ان کے ہاتھوں میں اسلحہ نہیں تھا۔

ان کے ہاتھوں میں جدید فنڈوگرانی کے آلات تھے۔ ویڈیو کیمرے، اسل کیسرے، مائیکس.....

”چیچی... لتنی کوئی کرمنل سوچ رکھتی ہیں آپ زمر بی بی۔ میں تو فنڈو شوت کی بات کر رہا تھا۔ آپ کیا تھیں؟“ وہ فوس سے کہہ رہا تھا۔ زمر کی شل نظریں وہیں پر جی تھیں۔ چھتوں پر اکٹھے ہوئے رپورٹر زدھڑ ادھڑ فنڈوگرانی کر رہے تھے، گویا لا یو کور تج کر رہے ہوں۔ ان کے انداز نے گلی میں رکے کھڑے اسلہ اٹھائے، دن کی روشنی میں بغیر کوئی نقاب پہنے کرایے کے غندوں کو بوکھلا دیا تھا۔ انہوں نے فائزگ روک دی۔ چہرے گھما کر ادھڑ ادھڑ دیکھا۔ پھر ہڑ بونگ سی پچی۔ کسی نے نیچے ہونے کو کہا۔ کسی نے اندر بیٹھنے کو۔ نائز حركت میں آئے۔ سڑک پر رکڑنے کی تیز آواز کے ساتھ گاڑیاں زن سے واپس ہوئیں۔ چند لمحوں میں وہ غائب ہو چکی تھیں۔

”ایسی وارداتیں عموماً فارسی مجرموں سے کرائی جاتی ہیں۔ فراری کسی سے نہیں ڈرتا، نہ پولیس سے نہ معصوم شہریوں سے۔ وہ صرف ”کسی“ کے ساتھ دیکھ لئے جانے سے ڈرتا ہے۔ اس کے دشمن جان جائیں گے کہ وہ کون لوگوں کے ساتھ آج کل رہ رہا ہے۔ وہ صرف اسی بات سے ڈرتا ہے۔ اور یہ چند نئے رپورٹر جن کو اپنا کیمرے بنانے کے لئے ایک چھپی خبر کی تلاش تھی، یہ ہر وقت یہاں موجود نہیں ہوں گے، مگر کار دار ازاب کسی کو یہاں بھیجنے کا خطرہ نہیں مول لیں گے۔ ہمیں دوبارہ ”ڈرانے“ کا مطلب ہوگا قصے کو مزید مشہور کرنا۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا ہے لاؤخ میں ٹھل رہا تھا۔ باقدارے پسکون تھے، حسین اور سیم نے مسکراتی نظروں کا تبادلہ کیا اور زمر لب بھنچنے سبیلہ کھڑی تھی۔ (دونبڑاً دمی۔ ہونہے!)

”اب؟ اب کیا کرے گا وہ؟“ زمر فارس کے مقابل آ کھڑی ہوئی اور سینے پر بازو لپینے سنجیدگی سے پوچھا۔

”شاید کچھ چھوٹے موٹے کام۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”جیسے ہمارے خلاف چھوٹے مقدمے کروانا، میدیا میں ہمارے خلاف خبریں دینا۔ مگر میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ یہ سب کرے گا۔ شاید وہ خاموشی سے انتظار کرنا مناسب سمجھے۔ وہ چاہے گا کہ ہم الزام لگانے میں پہل کریں، اور یہاں پر میں سعدی اور اس کے انصاف والے آئیڈیا میں متفق نہیں ہوں مگر ہمیں ہی الزام لگانے میں پہل کرنی ہوگی....“ فارس نے گھری سانس لی اور موبائل اسکرین ان کے سامنے کی۔ ”میں اتنی دیر سے اس ویڈیو کو مختلف جگہوں پر بھیج رہا تھا۔ یہ ویڈیو سعدی نے دو روز پہلے بنا کر بھیجی تھی۔“ میرا نام ہے سعدی یوسف۔“ پچھلے آدھے گھنٹے میں اس کے ڈھانی ہزار ویوز آپکے ہیں اور جلد یہی وی پہ ہو گی۔“

اسکرین پر دور سے نظر نہیں آیا کہ وہ کون ہی ویڈیو یوچی اور فارس نے موبائل واپس موڑ لیا، مگر سب بے چین ہو گئے تھے۔ ”سعدی گھر کیوں نہیں آیا؟“

”ابھی تک دماغ درست نہیں ہوا اس کا۔“ وہ ٹھنکی سے بڑا بڑا یا تھا۔

”تو اب تمہارا ڈیکرزن کو رٹ میں جانے کا انتظار کرے گا؟“ وہ اسی طنزیہ انداز میں بولی۔

”ہاں۔ اب وہ خاموشی سے ٹرائل کا انتظار کرے گا کیونکہ وہ اسے جیت کر نو شیر وال کو باعزت بری کر دے گا۔ اگر کوئی ٹرائل ہوا بھی تو۔“

”کیوں؟“ سیم کو برالگا۔ حسین بھی حرمت سے اسے دیکھنے لگی۔

”میری بیگم سے مغدرت کے ساتھ مگر اس لئے کہ وہ زیادہ اچھا کیل ہے۔“ اب وہ ٹانگ پڑا۔ نگ جما کر پیچھے ہو کر بیٹھا تو زمر پر پنج کر مردی (میں جوتا نہ خوار ہوئی۔ اس کو بھی انصاف دلایا۔ مگر نہیں۔ اسی کو ہیر و بنا ہوتا ہے آخر میں۔) اور چند قدم دور گئی۔ پھر رکی۔ آنکھوں پر چمک ابھری۔ اب مسکرا ہٹ میں ڈھلنے۔ وہ واپس مردی۔

”تھینک یو فارس۔ تم نے ہر چیز اتنے اچھے سے پلان کی، ہر مسئلے کا حل نکال کر رکھا، تھینک یو۔“ اس کے بد لے انداز پر فارس نے مشکوک انداز میں ابر و اٹھایا۔ ”یو رو یلکم!“

”او تمہاری اس انچھ مخت کو دیکھتے ہوئے میں نے تمہیں دل سے معاف کر دیا ہے۔“  
”کس چیز کے لئے؟“ وہ ہنوز مشکوک تھا۔

”سعدی کو مارنے کے لئے۔“ پھر باقی سب کو دیکھا۔ ”اوہ تم نے نہیں بتایا کسی کو کہ جب تم اس سے کینڈی میں ملے تو تم نے اس کو کتنی بڑی طرح سے مارا تھا، اور اس کے منہ پر وہ خزم بھی تم نے ہی دیا تھا، مگر خیر، تم غصے میں تھے، معاف کیا۔“  
(چیل نہ ہوتا) وہ خنگی سے اسے گھورتا سیدھا ہو کر بیٹھا۔ خین، سیم اور ابا ایک دم اسے دیکھنے لگے تھے۔ بے یقین، فنتیشی نظر و دل۔

۔۔۔

چلو جی۔ ساری کار کر دگی پر پانی پھر گیا۔

تب تک زمر مسکرا کر آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ بھی جانے کو اٹھا۔

”ماموں!“ سیم نے صدمے اور غصے سے اسے دیکھا۔ خین بھی آستین موڑ کر انھوں کھڑی ہوئی۔ ”ایک منٹ۔ ذرا ہماری بات سنیں پہلے۔“

”جھوٹ بول رہی ہے وہ۔ استغفار اللہ!“ وہ قیچ و تاب کھاتا (ان کی نظر و دل سے بچتا) بیر و دلی دروازے کی طرف بڑھ گیا، اس سے پہلے کہ مورچاں کی یہ چیزوں میں اسے نوج کھائیں۔

❖❖❖

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست ..... آہ مجھ سے تجھے وہ شکوہ بے جا بھی نہیں  
اگلی صحیح تک کوئی غاطر خواہ واقعہ پیش نہ آیا۔ کسی بڑے طوفان سے پہلے کا سکوت سارے میں چھایا رہا۔ ہاشم اور جواہرات ہارون  
سے ساتھ آفس میں بیٹھے آئندہ کا لائچے عمل طے کرتے رہے۔ نوشیر وال اپنے کمرے میں موبائل بند کر کے سرمنہ لپیٹے پڑا رہا۔ ہاشم نے اسے  
پیش کی کہ وہ ملک سے باہر چلا جائے مگر وہ راضی نہیں ہوا۔

”میرے دوست، میرا سوشن سرکل، وہ سب سمجھیں گے کہ میں نے یہ کیا ہے۔ کہ میں بھاگ گیا ہوں۔ نہیں، میں نہیں بھاگوں گا۔  
محجھ وی ہنھڑی نہیں لگا سکتا۔“

ندرت معمول کے مطابق ریشور انش میں تھیں۔ سیم اور دنہ بھی ادھر آگئے تھے۔ باہر فارس کے پھر بیدار موجود تھے۔ سعدی کی ویڈیو  
بیش میڈیا پر پھیل رہی تھی، مگر اتنی تیزی سے نہیں کہ میڈیا والے ان کے گھر آپنے نہیں۔ سوا بھی سکون تھا، سکوت تھا۔

فودا لی ایور آفرٹ میں گا کبوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ خین کا وزیر سے دور، کونے کی میز سنبھالے لیپ ٹاپ کھو لے بیٹھی تھی۔ میز پر  
سیٹ کی چین رکھا تھا اور ساتھ میں نوٹی ہوئی مورچاں کی تختی۔ ایک نظر اس تختی پر ڈال کر وہ اب اسکرین کو دیکھنے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر  
خوبصورت تختیوں کو سرچ کیا۔ بہت سے ایج کھل گئے۔ تصاویر کی بہتان۔ حمه ان کو دیکھئے گئی۔ نت نئے ڈیزائن۔ رنگ۔ درمیان میں ایک قد  
بڑے نئے کی تصویر بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے یونہی اس پر کلک کر دیا۔ تصویر کی جگہ اس آئینے کی ویب سائٹ کھلن گئی۔

جنین یوسف نے سن رکھا تھا کہ سنواد سٹ کی کہانی میں ایک جادوی آئینہ تھا جو ملکہ سے باقی کرتا تھا، اس نے اس جامِ جم کے متعلق بھی سن رکھا تھا جو بادشاہ جشید کو پوری دنیا کھاتا تھا۔ مگر اسے نہیں علم تھا کہ گول پھلنے والی ویب سائٹ اس کے لئے بھی ایک دوسری دنیا کا دروازہ کھول دے گی۔۔۔

وہ ہومڈیکور کی ایک ویب سائٹ تھی اور جو صفحہ اس نے کھول رکھا تھا، اس میں بتایا جا رہا تھا کہ چھوٹے سے کمرے کو کیسے سجا کر خوبصورت بنایا جاسکتا ہے۔ کیسے دنیا بھر کے رنگ اور پھول اس میں بھرے جاتے ہیں۔ شہد کی وہ کمکی بے اختیار آگے ہوئی اور آنکھوں میں خوشگوار تحریر بھرے ان رنگوں کو دیکھئے گئے جو ایک گھر کو سیلہ اور حجامت عطا کرتے دکھائی دے رہے تھے۔۔۔

”اوہ“ ہر دو مری قبوری پہ اس کے لبوں سے نکل رہا تھا۔ ایلانہ تھا کہ اس نے اپنے ہر نہ دیکھے تھے۔ کورین (اور ترکش ڈراموں کے گھروہ) دیکھتی آئی تھی۔ مگر اس نظر سے نہیں دیکھے تھے۔

کیش کا ونڈر کے ساتھ کھڑا فارس جنید سے کچھ بیپر ز لے کر دیکھ رہا تھا۔ اکاؤنٹس وغیرہ کا حساب۔ (ندرت مارکیٹ گئی تھیں گھر کی ماہانہ گرد سری لینے) اور رسیلوورانٹ کے ملازم میں یہ فرض کر چکے تھے کہ آئندہ ان کا نیا بآس وہی ہو گا۔ شاید وہ خود بھی یہ طے کر چکا تھا۔ دفعتاً رسیلوورانٹ کا دروازہ کھلا اور ایک جانی پچھانی مہک اس کے نھنوں سے ٹکرائی۔ فارس نے چونکہ کرچہہ اٹھایا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس طرف چلی آرہی تھی۔ سفید لمبا کوٹ پہنے اور بال سرخ اسکارف میں لپیٹے، ماٹھ سے چند سرخ لٹیں نکالے، کہنی پڑیز اسٹری بیگ انکا نے وہ ایک میز کی کری کھیچ کر بیٹھی اور بی جیسی آنکھیں دوبار جھپکا کر اسے دیکھا۔ فارس نے بے اختیار دو بیٹھیں ہند کو دیکھا۔ وہ لیپ ناپ میں گم تھی۔ پھر وہ اس کے سامنے آبیٹھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ سنجیدگی سے پوچھا۔ ساتھ میں بغور اس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا۔ ”نا راض ہوں!“ وہ بچوں کے سے خفائد از میں بولی۔ فارس نے گہری سانس بھری۔ ”تو یہاں کیوں آئیں؟“ ”آپ نے کہا تھا میرے بابا کا نام نہیں آئے گا اس کیس میں۔ پھر سعدی یوسف ان کا نام کیوں لے رہا ہے؟“ ”میں نے کہا تھا ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا گا۔ ہم کیس نہیں جیسے سکتے کوئی کا بھی نام آجائے، فرق نہیں پڑتا۔ اور پچھا؟“ اس کا لہجہ خنک ہو گیا۔ وہ چند لمحے چپ رہی۔

”آپ مجھے اس طرح چھوڑ کر کیوں آئے؟ مجھے کہہ دیتے، کیا میں رکاوٹ ذاتی؟ خاموشی سے چلی جاتی۔“ وہ دکھے کہہ رہی تھی۔ سرمنی آنکھیں اس پہ جی تھیں۔ ”کم از کم مجھے یہ تاثرونہ ملتا کہ جیسے میں آپ پہ مسلط تھی۔ میں تو صرف آپ کی مدد کر رہی تھی۔ یا شاید استعمال ہو رہی تھی۔“

”آئی ایم سوری!“ اس کے چہرے کے تاثرات نرم پڑے۔ ”میں.... خیر... آپ ٹھیک ہیں؟“ اب کے زمی سے پوچھا۔ وہ مسکراتی آنکھوں میں ہنوز ادا سی تھی۔

”میرا دل چاہتا ہے کہی میں ایک فون کال کر کے آپ کو بلالوں اور آپ چلے آئیں۔“

”مس آبدار میں ایک اپنی مرضی کا مالک، چھتیں سال اور چھٹے فٹ ایک انچ کا مرد ہوں۔ میں اس طرح بلانے پہنیں آیا کرتا۔“ سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر اسے کچھ سمجھایا۔ وہ پھر مسکراتی آنکھیں نہ ہوئیں۔

”مجھے چلتی نہ کریں کیونکہ میں ایسا بہت کچھ کر سکتی ہوں جس کے بعد آپ دوڑے چلے آئیں گے۔ خیر!“ اس کے جواب سے پہلے سر جھٹکا۔ ”مجھے مدد چاہیے آپ کی۔“

وہ جونا گواری سے کچھ کہنے لگا تھا، رک گیا۔

”ہاشم نے مجھے پرپوز کیا ہے، اور وہ تاں نہیں سننا چاہتا۔ اس کا اندازِ عجین تھا۔“

”تو... آپ شادی کرنا چاہتی ہیں اس سے؟“ وہ چونکا تھا مگر پھر عام سے انداز میں پوچھا۔

”وہ اچھا ہے، میرا دوست ہے مگر...“ اس کی سنہری آنکھوں پر آنکھیں جمائے وہ زمی سے بولی۔ ”مجھے کسی اور سے محبت ہے۔“

فارس نے بہت دھیرے سے اثبات میں سر ہلا�ا۔ ”اور... اس کسی اور آپ نے بتایا کہ آپ اس سے....!“

”وہ جانتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ... جانتا... ہے!“ وہ اب کے جلجنگ انداز میں مسکرائی۔ فارس نے بدقت چہرے پر چھایا

نارمل تاثر برقرار کھا۔ (ہاں ابھی اس ”کسی اور“ کی بیوی ادھر ہوتی تو تمہیں بتاتی۔)

”تو آپ کیا کریں گی؟“ سرسری سا پوچھا۔

”آپ بتائیں میں کیا کروں؟ ہاشم کو بتاؤں اس کسی اور کے بارے میں؟ کیا یوں وہ میرا چیچھا چھوڑ دے گا؟“

”آبدارا!“ وہ ذرا تھہرے ہوئے انداز میں دھیما سا بولا۔ ”ہاشم میرا کزن ہے، میں اسے بہت اپنے سے جانتا ہوں۔ اپنے اور اس

کے درمیان کسی تیرے کو مت لائیں۔ اسے مت اسکا میں۔ اس کو اس کی وجہ سے زنجیک کریں اپنی وجہ سے نہیں۔“

”اور اگر وہ نہ مانا تو؟“

”ظاہر ہے وہ نہیں مانے گا۔ تو آپ کسی ایسے شخص سے اس پر دباؤ ڈالوائیں جو اس پر رعب رکھتا ہو۔ اور میرا خیال ہے آپ ایسا کر سکتی ہیں۔ کیونکہ آپ اس تیرے شخص کے ان احکامات سے بھی واقف ہیں جن سے ہاشم نہیں ہے۔“

”اوہ!“ آبدار کے لب مسکراہٹ میں ڈھلنے۔ ”میں سمجھ گئی۔ خیر...“ ادھر ادھر دیکھا۔ ”کچھ کھلا میں پلا کیں گے نہیں کیا؟“

”نہیں۔ اب آپ جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ کوئی بھی تعلق آپ کو کبھی نقصان دے۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا انکھ کھڑا ہوا۔ ”اب کی دفعہ میں بلاوں تو آئیے گا ضرور ورنہ میں نے کہا تاں مجھے بلانے کے سارے طریقے آتے ہیں۔“ آبدار مسکرا کر کہتی

انھی۔ بیگ انھیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ناخوش سا کھڑا کچھ سوچتا رہ گیا۔

چند فرلانگ دور ایک کیش اینڈ کیری اسٹور کے اندر دن کے وقت بھی یزید قبیل رون تھیں۔ ندرت یوسف ٹرالی لئے اشیاء

خوردنو شکر کے ساتھ چلتی جا رہی تھیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ کوئی ان کو دیکھ رہا ہے۔ فاصلے سے۔ احتیاط سے۔ ریکس کی لمبی

قطار کے آخر میں.... وہ اوٹ سے نکل کر ان کو دیکھ رہا تھا۔ سر پر کیپ، گلاسز اور بڑی ہوئی شیوں نے سعدی کا چجزہ قدرے مختلف بنا رکھا تھا۔ اس

کی زخمی نظریں ندرت کے تعاقب میں تھیں۔ وہ اس سے چند قدم ہی دور تھیں۔ اس طرف ان کی پشت تھی۔ فربی مائل عام سے گرم موسم میں

لبیوس تھیں شال سر پر لے رکھ تھی۔ سوئیٹر حسب عادت بنا آستین و الاتھا۔ وہ بکھی آستینوں والا سوئیٹر نہیں بنیتی تھیں۔ ایک ہاتھ میں جیزیر کے

دو لگن تھے۔ جو ہر موسم میں ہر وقت پہنے رکھتی تھیں۔ کنپیوں اور ماٹھے سے ذرا سفید بال جھلک رہے تھے۔ آنکھوں کے حلقوں بڑھ گئے تھے۔ بار

بار کستیں۔ کچھ یاد کرتیں۔ پھر کوئی شے اٹھاتیں۔ شاید اپ وہ جیزیر میں بھولنے لگی تھیں۔ شاید ذہنی طور پر بہت ابھی رہنے لگی تھیں۔

وہ اوٹ سے ان کو دیکھنے لگی۔ چھپ کر۔ نم آنکھوں سے۔ وہ اب ایک ریک کے سامنے کھڑیں، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ یاد کر رہی

تھیں۔

”کیا رہ گیا؟ اب گھر پہنچ کر یاد آئے گا۔“ وہ خود سے خفاظ تھیں۔ وہ اوٹ سے نکلا اور قدم قدم چلتا ان کے قریب آیا۔ وہ پشت کے

کھڑی تھیں۔ وہ ٹرالی کے سر سے پا آ کھڑا ہوا۔ ایک نظر سامان پڑا۔ پھر سامنے والے ریک سے مایو نیز کا بڑا جارا انھا کران کی ٹرالی میں رکھا

اور آگے بڑھ گیا۔ ندرت نے کسی کو جار رکھتے دیکھا تھا۔ سو فوراً آنکھوں۔ جارا انھا کردیکھا۔ ہاں یہی تو بھول گئی تھیں۔ سر انھیا۔ متلاشی نگاہ

دوڑائی۔ کوئی نہیں تھا آس پاس سوائے گاہوں اور رکرز کے۔ کچھ دیر حیران ہوئیں۔ مگر شاید کسی در کر سے ملنا کھانا نہیں ہوں نے تبھی اس نے لاد دیا

— 2 —

10

"سچی جیسا پاں الی وہ بھل ہیں۔ پے کے لئے اپنی اون اپنے چاندیے سے ڈاک۔ تھوڑی بھی کوئی بیٹھتے ہے اسے اپنے  
اٹھک دے بھال بخوبی پڑے۔ سچی کوئی جو ہر ساری کمپ کی تاریخ میں کہا جائےگا انکھیں میں مکر ہوتی ہیں۔  
سچی کیلئے اونتیں قدم میں اچھے ہوتے ہوئے کھکھلی۔ سچی کی بھی بہادری اور نیکیوں میں اپنے حماریں کا باعث ہے  
کہاں۔ کوئی بھی جس اپنے کھلکھلے بیٹھے ہے تو اسی کیلئے۔

سے اگر کوئی بھائی نہیں تو اپنے پالے میں کافی کام کر سکتے۔ جیسا کہ اگر کوئی بھائی نہیں تو اس کا کام کر کر کے پالے میں کام کر سکتے۔ جیسا کہ اگر کوئی بھائی نہیں تو اس کا کام کر کر کے پالے میں کام کر سکتے۔

کہاں کی کامیابی کے لئے اپنی کارکردگی کے ساتھ ملک کے ایسا جو افراد کے لئے بڑے پڑے ہوں گے۔

کوہ بیکاری کے نام پر اپنے دل کا بھرپور پتھر کی طرح بے کاری کا ساری کامیابی کے ساتھ پڑھ دیا۔

اوکے میں چلتی ہوں۔ آج مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ ”بھک کر جواہرات کے گال سے گال مس کر کے چوما، مگر اکرسیدھی ہوئی اور ہاتھ بھاتی واپس جانے کو مرغی۔

جواہرات اپنی جگہ سے ہل تک نہیں تھی۔ یونہی نہم دراز پڑی رہی۔ اس کا چہرہ فتح تھا اور اعصاب شل۔ پھر دھیرے سے ان آنکھوں میں سرفی اتری۔ ایک دم زور سے ہاتھ مار کر اس نے باسٹک الٹ دی۔ سارے پھول بزرہ زار پکھرتے چلے گئے۔  
وہ زرد گلاب تھے۔ دشمنی کی علامت۔

❖❖❖

جو کہتے ہیں اس آندھی میں پر نہ تولا جائے گا ..... جواس بات پر خوش ہیں ہم سے لب نہ کھولا جائے گا  
تھانے کے اس وسیع و عریض ہال نما آفس میں بیٹھ رہا تھا۔ ایس ایج اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھا تھا اور قلم ہاتھ میں گھانا  
سبجدی کی مگر قدرے بے نیازی سے سامنے پیٹھی زمر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹانگ پٹانگ جائے اتنے ہی سکون سے پیچھے ہو کر پیٹھی تھی اور تنڈرا ہیں  
المیں ایج اپ پہ جمی تھیں۔

”سیکشن 161 سی آر پی سی CrPC کے تحت آپ ہماری اسی پرانی ایف آئی آر میں میرا بیان ریکارڈ کریں تاکہ میں ملزموں کو  
ناہز دکر سکوں۔“

”زمر صاحبہ میں آپ کو اتنی دریے سے بتا رہوں کہ..... وہ ہاتھ بلاتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں آگے کوہوا۔“ میں یوں بنائی  
ثبوت کے کاردار خاندان کے کسی فرد کا نام ایف آئی آر میں نہیں ڈال سکتا۔“

”میں آپ کو ثبوت تو کیا ایک وضاحت دینے کی پابندی بھی نہیں ہوں کیونکہ 161CrPC کے تحت یہ میرا حق ہے۔“ وہ بھی اتنی ہی  
رکھائی سے بولی۔

”آپ خل سے میری بات سنیں۔“ ایس ایج اپ کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ ایک دم سے آفس میں بہت سے لوگ داخل ہوئے تھے۔  
المیں ایج اول کھڑا ہو گیا۔ زمر نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر گہری سانس بھری۔

وہ سر پہ چادر لئے، قیمتی سیرے کی انگوٹھیاں پہننے دیا۔ اسٹریگ اٹھائے باوقاری خاتون جانی پہچانی تھی۔ چڑال سے تعلق رکھنے والی  
سیاستدان جس کا سکینڈل پچھلے دنوں جواہرات کا ردار نے مشہور کروایا تھا۔ اور وہ اکیل نہیں آئی تھی۔ دکلا، اور گارڈز زبرہ تھے۔ اس کے لئے  
فوراً سے کریساں بچھائی گئیں۔ عملے کی دوڑیں لگ گئیں۔ کوئی چائے لانے بھاگا، کوئی یکری کی طرف۔

”کیا آپ ان کا بیان ریکارڈ نہیں کر رہے؟“ زمر کے قریب کری پیٹھ کروہ انگلی گال پر کھنکے، نرم مسکراتے انداز میں پوچھنے لگی۔  
المیں ایج اونے سوالیہ نظر وہ سے زمر کو دیکھا۔

”یہ میرے کرایے دار ہیں۔“ خاتون نے تعلق بتایا۔ زمر خاموشی سے پیٹھی انگلی پر ایٹ لیٹھی رہی۔ ”اور میں چاہتی ہوں کہ آپ ان  
کی ایف آئی آر میں نامزد ملزم کا نام درج کریں۔ کیا نام تھا اس کا؟ ہاں نو شیر وہاں کا ردار! صرف یہی نام پا کوئی اور بھی لکھوانا ہے؟“ اپنا بیت  
بھرے انداز میں چہرہ زمر کی طرف موڑ کر پوچھا۔ زمر مسکراتے مسکراتے خاتون کی طرف بھلی۔ ”صھینکس!“ اس سے پہلے کہ وہ دیکھ  
کہتی زمر کی مسکراتت سئٹی۔ ”مگر تو چھینکس! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میری ایف آئی آر ہے، میں اسے خود ہی دیکھ لیوں گی۔“ تیخی  
سے فقرہ مکمل کیا۔ المیں ایج اونا خاموشی سے تماشاد کیکھنے لگا۔

”خاتون ذرا سامسکرائی۔“ ”مگر کیوں؟“

”کیونکہ آپ جیسے لوگ بد لے میں کچھ ماںگا بھی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ مجھے اپنے دکان، کو کیس میں شامل کرنے کو کہیں  
جاؤ۔“

گی۔ کل کو یہ دکاء آپ کی مرضی کی سمت میں کیس کو لے جائیں گے بھاری رقم اور پیلک میں آ کر معافی مانگنے کی شرط یا ان کو معاف بھی کر دیں گے کیونکہ آپ ان کی بزیرت چاہتی ہیں۔ لیکن میں آپ کو یہ کیس استعمال کرنے نہیں دوں گی۔ یہ ہمارا کیس ہے، ہم اکیلے اس مقام تک پہنچے ہیں صاحبزادی صاحب، ہم اکیلے ہی بڑیں گے۔“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ صاحبزادی صاحب نے مسکرا کر چڑھا اٹھا کے اسے دیکھا۔

”تو آپ ان ایس اتچ او صاحب کو راضی کیجئے کریں گی نئے ملزم کا نام ڈالنے کے لئے؟“

”میں کیا کروں گی!“ اس نے ھنگریاں لٹ کاں کے پیچھے اڑتے ہوئے مسکرا کر ایس اتچ او کو دیکھا۔ ”میں یہاں صرف فارمیشن کے تحت آئی تھی، اور اب میں سیدھی پولیس کی ہائی کمان کے پاس جاؤں گی، آئی جی صاحب کی بیٹی میری بھتیجی کی دوست ہے، میں ان سے شکایت کروں گی۔“ ڈی آئی جی صاحب کے میں نے کوڑت میں چند کام کر رکھے ہیں، ایک کال میں ان کو بھی کروں گی۔ پھر میں اپنے پرانے پیچرے ایک سیشن نج کے سامنے سیکشن 22 سی آرپی سی کے تحت پیشش فائل کروں گی، یا صرف اپنی ایک بہت اچھی دوست مجسٹریٹ کے پاس پرائیوٹ کمپلینٹ فائل کر دوں گی۔ اڑتا لیس گھٹنے کے اندر نو شیر وال کاردار کا نام FIR میں درج ہو گا۔ میرے پاس کام کروانے کے بہتر طریقے ہیں۔ مجھے آپ کی کوئی مدد نہیں چاہیے۔ آپ آئیں، آپ کاشکریہ۔ میں چلتی ہوں۔“ اپنے مدعا کو اپنے مخصوص انداز میں ”زمراز“ کر کے وہ پرس اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مرتے مرتے سر ”ہونہ“ کے انداز میں جھٹکا بھی تھا۔

(سمجھتے کیا ہیں یہ مجھے۔ اتنے سال کوڑت میں جھک ماری ہے کیا میں نے؟)

..... ♦ ♦ ♦ .....

کیوں لپٹتا ہے میرے ساتھ یہ دریا آخر؟ ..... مجھ کو گرداب سے آگے بھی کہیں جانا ہے۔ اگلی دو پھر قصر کاردار کے ڈائنسنگ ہال کی طویل میز پر کھانا کھانے باشم اکیلا بیٹھا تھا۔ چند مہماں کی متوقع آمد کے باعث وہ آفس سے جلدی آگیا تھا۔ نو شیر وال کو بلا بھیجا گری میری نے واپس آ کر مایوسی سے ”وہ کہہ رہے ہیں ان کو بھوک نہیں،“ کہا تو باشم سر جھک کر کھانے لگا۔ یہ تباہی تھا جب بیرونی دروازے سے سینڈل کی مخصوص ٹک ٹک سنائی دی۔ چہرہ اٹھائے بغیر بھی باشم جانتا تھا کہ نوار دکون ہے۔ اندر تک کڑواہٹ بھیل گئی۔

”ہیلو باشم!“ شہری مسکراتی ہوئی چلتی آ رہی تھی۔ باشم نے تلخ تاثرات والا چڑھا اور پر اٹھایا۔

”تمہیں میرے گھر آنے جانے کے اوقات کی خبر کون دیتا ہے؟“

ڈائنسنگ ٹیبل کے قریب ہاتھ باندھے موڈب سی کھڑی فیونا نے فوراً گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

”مجھے تو تمہاری دوسری بھی کمی مصروفیات کی خبر ہے۔“ وہ طنزیہ سا کہتی اس کے ساتھ کری کھنچ کر بیٹھی۔ نہری بالوں کی اوپنی پونی بنائے، چچکل کے ڈری ائن والے لمبے آویزے پہنے وہ حب معمول خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔

”سنا ہے تم شادی کر رہے ہو۔ سونی کو منا بھی لیا۔ واد۔“ آنکھیں اس پر جما کر طنزیہ بولی۔ باشم نے اب وہ کے اشارے سے ملازموں کو جانے کا کہا اور اکتا کر کھانا ختم کرنے لگا۔ ”ویسے تم ہمیشہ ہی اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ ہونہ۔ اور شادی ٹوٹنے کا الزام میرے سر لگاتے رہے اتنے سال۔“

”تم کیوں آئی ہو؟“

”میرا نام ہے سعدی یوسف دیکھنے کے بعد میں گھر کیسے بیٹھ کتی تھی؟ ویسے اب تک تو تم پر واضح ہو چکا ہو گا کہ میں نے نہیں فارس نے وہ دیہ یوریلیز کی تھی نج والی۔ مجھے تو سعدی نے یونی درمیان میں پھنسایا تمہارا دھیان بنانے کے لئے۔“

”سب جانتا ہوں۔ اور کچھ؟“

”اور یہ کہ اگر یوں سفر واقعی تمہارے خلاف کیس کرنے جا رہے ہیں تو میں یہ سوچ رہی تھی کہ جب مجھے subpeona کیا جائے گا تو میں عدالت میں کیا کھوں گی؟ آخر مرے سامنے بھی اعتراض کیا تھا ناشیر و نے سعدی کو گولیاں مارنے کا!“ وہ اسی وقت زینے اترتا نیچے آیا تھا۔ کھلے دروازے کے باعث شہری کی آواز کان میں پڑ گئی۔ پہلے ہی اپنے جلیے میں تھا، ملکجی کی شرٹ اور شارٹس ان الفاظ پر تو چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ تیزی سے سامنے آیا۔

”تم اس قابل نہیں تھی کہ تمہیں کوئی پسند کرتا، یا تم سے کوئی دوستی کرتا۔ تمہاری وجہ سے میں نے اسے شوٹ کیا تھا، اور اگر تم نے.....“

”شیرا!“ ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرایا اور وہ باوجود غصے کے چپ ہو گیا۔ شہرین اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک تند تیر نظر شیر و

پڑا۔

”میں کس قابل ہوں تمہیں کوئتھا میں معلوم ہو گا کیونکہ ڈیڈی نے مجھے دس منٹ پہلے بتایا ہے کہ کوئتھا آڑو کے ذریعے زمر نے ایف آئی آر میں تمہیں اور ہاشم کو نامزد کر دیا ہے۔“

”تھیں یو شہرین، تم جاسکتی ہو۔“ ہاشم نے بختی سے کہا تو وہ پرس اٹھا کر مژہ اور آگے بڑھ گئی۔ شیر و نہیں بیٹھا، شش سا کھڑا رہا۔ پھر بے یقین نظر وہ سے ہاشم کو دیکھا۔

”میرا نام.....؟“

”اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی مرائل نہیں ہو گا، نہ انہیں کوئی تاریخ ملے گی نہ کوئی تمہیں گرفتار کرے گا۔ کھانا کھانا ہے تو کھا دو رہنا۔“ اور اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی شیر و پیر پتھر شیر ہیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ہاشم نے نیکیں زور سے پرے مارا اور پلیٹ دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ لا دُخج تک آیا ہی تھا کہ پیغمب کی سیر ہیوں کا دروازہ کھول کر باہر آتی علیشا و کھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ٹالی بیگ کا ہینڈل تھا جسے وہ ساتھ ہی گھیٹ رہی تھی۔ ہاشم اسے دیکھ کر رکا۔

”کیا تم واپس جا رہی ہو؟“ علیشا نے نظر میں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر قدم چلتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور چھتی ہوئی نگاہیں

اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”جی..... میں کچھ نہ آنے کے لئے واپس جا رہی ہوں۔“ چباچبا کر دہ کہنے لگی۔ ”میں نے بہت کوشش کی آپ لوگوں سے اپنی محرومیوں کا انتقام لیتے کی، آپ کو ذمیل کرنے کی، اپنا جائز پیسا آپ کی مٹھیوں سے نوچ لینے کی، مگر میں ہر دفعہ ناکام ہوئی۔ کیونکہ میں اکسلی تھی۔ اور کیونکہ میرے اندر فارس جتنی بہت نہیں تھی۔ نہ میں سعدی کی طرح بہادر ہوں۔ میرا مقصد صرف پیسے کا حصول تھا۔ اور وہ مجھے نو شیر و اس نے شیر و واپس لیتے ہوئے کافی کثرت سے دے دیا ہے۔ اور نہیں، ابھی میں ایسی پورٹ نہیں جا رہی۔ میں ہوٹل جا رہی ہوں۔ مجھے ایک دو دن مزید شہر میں رک کر ایک آخری کام کرنا ہے۔ پریشان مت ہوں، آپ کو تباہ کرنے کا کوئی کام نہیں۔ یہ سب پوسفر کر لیں گے۔ میں تو ہوں پہلے کے پیچھے۔ تو ایک آخری چیز ڈھونڈ لاؤں آپ کے پاس، پھر اس کی قیمت آپ خود لگائیں گے۔ ایک سانس میں کہہ کر وہ ایک زخمی نگاہ اس پر ڈالتی آگے بڑھ گئی۔ ہاشم اسے گھور کر جاتے دیکھتا رہا۔

ایک ویڈیو کیاریلیز ہوئی، ہر ایک کی اتنی اوقات ہو گئی ہے کہ وہ یوں چڑھ کر اس سے بات کرے! ہونہ۔ وہ ڈرائیور کی طرف

بڑھ گیا۔



مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے ..... کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گزار بنتا ہے وہ دن بھی خاموشی سے ڈھل گیا۔ شام اتری اور پھر رات چھا گئی۔ ندرت ریسٹورانت بند کر کے گھر آگئی تھیں۔ سب اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے۔ فارس ابھی گھر نہیں آیا تھا سو گیت کھلا تھا۔ باہر دونوں گارڈز کو اس نے کسی بھی گھس پیٹے کو پواںٹ بلینک پر شوٹ .... گن والا شوٹ .... کر دینے کے احکامات جاری کر رکھے تھے۔ سوائے کسی ایسے لڑکے کے جو خاموشی سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا ورکی تارکی مدد سے پورچ سے اندر کھلتا دروازہ کھونے کی کوشش کرے۔ ایسے لڑکے کے بارے میں اس نے ریسٹورانت اور گھر دونوں جگہوں کے پہریداروں کو کہرا کھاتا کہ وہ اس کو یوں نظر انداز کریں جیسے اسے دیکھا ہی نہیں۔

ندرت دھوکر کے کمرے میں آئیں کہ نماز پڑھیں، پھر خیال آیا کہ کچن کا چکر لگا لیں۔ گیلے آستین بارزوں پر برابر کرتیں، وہ باہر آئیں۔ کچن کے اندر آ کر لاست جلائی۔ سلیب پر کھنی خالی بولموں کو دیکھ کر وہ غصہ چڑھا کے الامان۔

”یہ ہنین بیگم اور اسامہ خان، مجال ہے جو کبھی خود سے بولتیں بھر کر کھدیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ فلٹر سے بولتیں بھر کر سلیب پر کھدیا کرو۔ آگے فرنج میں رکھنے کا مومکن آئے گا تب کیا کریں گے یہ؟ بے غیرت اولاد۔“ کچن کی بولتیں دیں چھوڑ کر لا ونج میں آئیں۔ گھننوں پر ہاتھ رکھ کر چلتی ندرت نے لا ونج اور ڈائنگ بیبل میں ادھر ادھر اڑھکی خالی بولتیں اکٹھی کیں اور انہیں کچن میں لا ائیں۔

ایک دم وہ ٹھنک کر رکیں۔ سامنے سلیب پر چاروں بولتیں بھری رکھی تھیں۔ پانی کے قطرے تک ٹپک رہے تھے۔ ندرت نے منہ میں انگلی دبائی۔ (شاید حصہ یا سیم میں سے کوئی ..... ) مگر چند قدم آگے آئیں تو مزید ٹھنکیں۔ سیم اور حصہ بھیش بولموں کوان کے ڈھلن تک بھردیتے تھے وہ کہہ کر تھک گئیں کہ بولتیں کو پورا نہیں بھر رہے، دو گھونٹ جلد چھوڑتے ہیں تاکہ ڈھلن کھلو تو منہ پر پانی نہ چھلک پڑے، مگر ان پر اثر نہ ہوتا۔ لیکن ابھی جو بولتیں بھری رکھی تھیں، ان میں دو گھونٹ جتنی جگہ چھٹی ہوئی تھی۔ ایسے جیسے ندرت بھرتی تھیں۔ ایسے جیسے سعدی بھرتا تھا۔ مگر ..... انہوں نے سر جھکا۔ شاید زمر نے بھری ہوں۔ وہ دوسرا بولموں کو بھر کر باہر نکل گئیں، اور کوئی خاموشی سے پیشتری کے دروازے کی اوٹ میں لکھرا ان کو دیکھتا رہا۔

زمر کے کمرے کی لائٹ ابھی تک جل تھی۔ وہ چہرے کے گرد و پہلے لپیٹے، اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی لیپ ٹاپ پر اپنا فیس بک گروپ کھولے ہوئے تھی۔ سعدی کی آئی ذی کے سرخ زخمی گلبہ پر انگلی پھیرتے ہوئے وہ ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔ وہ گھر کیوں نہیں آیا؟ وہ گھر کیوں نہیں آتا؟ پھر سر جھکا اور آن لائیں تفسیر کھوئی۔ پہلے چند آیات کو پڑھا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔

”میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں شیطان مردود سے۔

اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان، بار بار حرم کرنے والا ہے۔“

گھری سانس لے کر اس نے کی بورڈ پر انگلیاں رکھیں۔ وہ سعدی کے لئے لکھ رہی تھی یا اپنے لئے کیا فرق پڑتا تھا؟ انمل کی آیات میں فرمایا جا رہا تھا۔

”یا کون ہے

جو جواب دیتا ہے لا چار کو

جب وہ اس کو پکارتا ہے

اور دور کرتا ہے اس کی تکلیف

اور وہ بنتا ہے تم کو زمین کا جانشین۔

کیا کوئی اللہ کے سوا ہے معبد؟

کتنی کم تم نصیحت کپڑتے ہو؟“

یہ آیت دل کو ایک دم گچھلا دیتی تھی۔ کی بورڈ پر کھی انگلیاں لرزیں۔

”پھراؤں، نہروں، سمندروں اور زمین کی مثال دینے کے بعد آپ اللہ تعالیٰ ”انسان“ کی بات کرتے ہیں۔ ”انسان“ جو قرآن کریم کا موضوع ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انسان کو چٹان سا مضبوط، سمندر سا گہرا، اور زمین کی طرح پر سکون رہنا چاہیے، نہروں کی طرح ہر وقت بہہ نہ جائے، بلکہ سمندر کے کھارے اور بیٹھے پانی کے حجاب کی طرح اپنے جذبات کو اپنے سے روکے رکھے۔ مگر قرآن ان مضبوط چیزوں کی مثال دے کر ان سے زیادہ مضبوط مخلوق کی طرف آتا ہے لیکن اس کی سخت لاچاری والی حالت دکھاتے ہوئے۔ انسان کے ساتھ پہلے اتنی مضبوط چیزوں کی مثال دی، پھر انسان کو اتنا کمزور کیوں دکھایا اس آیت میں؟“ اس کے باہم لمحے بھر کو کے الب کا نہ ہوئے سوچا، پھر سر کو خم دیا۔

”مگر نہیں، کس نے کہا کہ مضطرب انسان ”کمزور“ ہوتا ہے۔ نہ انسان پہاڑ جیسا نہ سمندر جیسا نہ میں جیسا ہو سکتا ہے ہر وقت۔ ہم پر مختلف فیز آتے ہیں۔ اور جو سخت کمزور ترین لمحے میں.... لاچاری اور اضطراب کے عالم میں اللہ سے دعا کرتا ہے، اس کی مثال ان مضبوط چیزوں کے آگے دی جا رہی ہے، کیونکہ دعا کرنے والا ان سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ بھلے جدے میں گراہوں رہا ہو، وہی اصل بھادر ہے۔ کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اللہ سے دے گا۔ چاہے لوگ کچھ بھی کہیں، چاہے سائنس کچھ بھی کہیں، اس کی امید جوان ہوتی ہے کہ اللہ سے دے گا۔ اللہ ہی سے مانگنا ہے۔ وہی اس کے دل کو سکون دے گا، وہی اس کی آزمائش کو کھو لے گا۔ آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے صبر اور نیک عمل کافی نہیں۔ دعا سب سے بڑا Catalyst ہے۔ دعا کے بغیر کیا ملتا ہے؟ اور مل جائے تو رہتا ہے کیا؟ دعا اللہ سے بات کرنا ہے، اور اسی بات نے مویٰ علیہ السلام کی والدہ کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر وہ اپنا بچہ دریا میں ڈال بھی دیں تو اللہ ایک دن اسے ضرور ان کے پاس پہنچے گا۔ اور پہلے مویٰ اکی ماں کا دل خالی ہو گیا، مگر اللہ نے ان کو جائے رکھا، کیونکہ اللہ سے تعلق نہیں تو ڈالہ انہوں نے۔ اللہ سے بات کرنا نہیں چھوڑا۔ میری طرح نہیں کہ مصیبتوں پر دل اتنا چاٹ کر دیا کہ دعا مغلنی چھوڑ دی۔“ ایک رخی ساتا شر اس کے چہرے پر ابھر۔ وہ پھر جھکائے، تاپ کرتی جا رہی تھی۔

”دعا مانگنا بھی کوئی چھوڑتا ہے کیا؟ ایسے کوئی اللہ سے بات کرنا بھولتا ہے کیا؟ یہ اپنے گلٹ اور شکوؤں کی اوپنجی دیوار کیوں بنایتے ہیں، ہم لوگ؟ ایسے کوئی کرتا ہے کیا؟ اور جو کرتا ہے وہ بھی تب تک سکون نہیں پائے گا جب تک واپس نہیں آئے گا۔ کچھ تو کاش اللہ سے بھی سیکھا ہوتا ہم نے۔ جانے والوں کو وہ روکتا نہیں ہے لیکن اگر وہ لوٹ کر آ جائیں تو ان کے لئے سارے دروازے کھول دیتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچتے ہم کہ یہ جو ہم روز بروز اپنی دنیا میں، شادی، بچوں، شہر، کار و بار میں مصروف ہوتے جا رہے ہیں، کوئی جو ہم سے زیادہ بڑا نظام سنبھالے ہوئے ہے وہ ہمارے پلٹنے کا انتظار کرتا ہو گا۔ بے نیاز ہے وہ فرق اسے نہیں پڑتا، مگر وہ ہمارے لئے ہم سے محبت کرتا ہے۔ ہم بھی اپنے لئے ہی اس سے محبت کرتے ہیں ویسے۔ اور اگر ہم... بھی بھولے بھٹکے سے لوٹ آئیں تو ہم ایک کام کرتے ہیں ”دعا“، اس کو پکارنا.... اور وہ تین کام کرتا ہے.... اس آیت کے بقول وہ تین کام کرتا ہے.... دعا کا جواب دیتا ہے.... تکلیف کو دور کرتا ہے اور ہمیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔ ہم کمزوروں کو اگر کوئی چیز اتحاری، انصاف اور طاقت دلا سکتی ہے، کمزوروں عطا کر سکتی ہے تو وہ صرف دعا ہے۔ لاچار کی لاچاری ہے گی، تکلیف دور ہو گی، تب ملے گی اس کو خلافت۔ کونے میں پڑے ڈپریسڈ لوگوں کو نہیں ملتا کمزور۔ ہمیں سستی اور غفلت سے خود لکھنا ہو گا۔ اپنے ڈپریشن سے نکلتا ہو گا۔ اپنے گلٹ سے اپنے اندر کے اندریوں سے.... اس کے بعد میں گاہمیں اختیار.... کہ معاف کرتے ہیں یا اسزادیتے ہیں۔ پھر ہم دیں گے مزاجیے ہم چاہیں، اور معاف کریں گے جسے ہم چاہیں۔ اور فساد یوں اور اپنے درمیان بنا میں گے ذوالقرنین کی دیوار جب ہم چاہیں۔ ایسا اختیار پانے کے لئے ہمیں اپنی تکلیف سے نکلتا ہو گا اور تکلیف سے ہمیں دعا نکالے گی۔ خواہشوں کا مل جانا نہیں نکالے گا۔ میرا یہ

کام ہو جائے، مجھے اتنا مال یا اولاد مل جائے تب زندگی پر میرا ”کنٹروں“ ہو گا، نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ہمیں مضبوط اور پراعتماد زندگی دعا سے بنے گی۔ دعا کیا کرو بچے۔ یہی تمہارے کام آئے گی۔“  
وہ بلکل سی مسکراہٹ کے ساتھ لکھ رہی تھی گویا وہ پڑھ رہا ہو۔ چلو۔ کبھی تو پڑھے گا۔ شاید تب وہ ایسی کوئی سطر ڈھونڈ لے جو اسے کرب سے نکال لائے۔.....

دیوار کے اس پارندرت اپنے کمرے میں بچھے نماز والے تحت پر میتھی، نماز ادا کر رہی تھیں۔ وہ گھنٹوں کے مسئلے کے باعث دائیں نانگ سیدھی لٹا تیں اور بایاں پیر نیچے زمین پر رکھتیں۔ یوں اس حالت میں سینے پر دونوں ہاتھ باندھے وہ عشاء کے وتروں کی آخری رکعت میں تھیں۔ ان کی نگاہیں تخت پر بچھی نماز کی محراب پر جب تھیں اور روٹیں کے انداز میں وہ کلمات ادا کر رہی تھیں۔ کمرے کا دروازہ ان کی پشت پر تھا، تبھی جب انہوں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو آنے والے کو دیکھنیں پائیں۔ آنکھیں جھکائے نماز پڑھتی رہیں۔ کسی نے دھیرے سے دروازہ بند کیا تھا۔ وہ تسبیحات ادا کرتی رکوع میں جھکیں۔

”نانا والے گھر کا صحن بہت بڑا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں سے اٹا ہوا۔ وہاں صحن میں سب نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔“

رکوع میں بچھے بچھے ندرت نے وہ آواز سنی۔ ان کے گھنٹوں پر کھے ہاتھ کپکپائے۔ لبوں سے تسبیحات بکشکل ادا ہو پائیں۔

”نانا اپنے اباجی کا قصہ کثر سنایا کرتے تھے۔ کوہہ اسی صحن میں اسی درخت تک نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ بچھوکھیں سے نکل آیا۔ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ نانا کے اباجی نہیں ہے۔ نماز ادا کرتے رہے۔ بچھوئے ان کو ڈنک مار دیا۔ ایک دفعہ۔ دو دفعہ۔ وہ نہیں ہے۔“ کوئی ان کے عقب میں کھڑا کھردہ رہا تھا۔ ندرت بدقت سیدھی ہوئیں۔ سجدے کی جگہ پر دھنڈی اتر آئی۔ کوئی آنسو گال پر چکا تھا۔ لب اللہ اکبر کہتے ہوئے کپکپائے۔

”وہ اپنی نماز مکمل کرتے رہے۔ بچھوئے ان کوئی ڈنک مارے۔ تعداد مجھے یاد نہیں۔ مگر سلام پھیر کر وہ گرگئے۔ ان کو ہبتال لے جایا گیا۔ مجرماتی طور پر ڈنک نے ان پر زیادہ اثر نہیں کیا تھا۔ وہ نج گئے۔“ آواز قریب آرہی تھی۔ قدم ان کے پیچھے سے قریب آرہے تھے۔ ندرت نے کپکپائے ہاتھ سجدے کی جگہ کھڑک جھکتے ہوئے سجدہ ادا کیا۔  
(پاک ہے میرا بہت اعلیٰ رب.....)

”نانا کثر یہ قسم سنتے تھے۔ پھر آپ نانے لگیں۔ آپ کہتی تھیں کہ انسان نماز نہیں تو رُسکتا۔ میں بحث کرتا تھا۔ کفتوی کہتا ہے توڑ سکتے ہیں۔ مگر آپ کہتی تھیں توڑی کہتا ہے نہیں توڑنی چاہیے۔ میں نہیں مانتا تھا۔ اب مانتا ہوں۔“ سجدے کی جگہ پر چہرہ اور کندھے جھکائے (وہ ماتھا نہیں ٹیک سکتی تھیں، کہ اتنا جھکنا ممکن نہ تھا) تسبیحات لرزہ خیز آواز میں ندرت کے لبوں سے نکل رہی تھیں۔ آنکھوں سے ٹپ پ آنسو گرتے جا رہے تھے، گرتے جا رہے تھے۔ سارا منظر دھنڈا گیا تھا۔ وہ انہی تسبیحات کو دھرا دھرا کر پڑھ رہی تھیں۔

”انسان کو واقعی نماز نہیں توڑنی چاہیے۔ ایک یہی وہ حالت ہوتی ہے جس میں آپ کو کوئی کرو لوگ فوراً سے رک جاتے ہیں۔۔۔ انتظار کر لیتے ہیں۔ کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ آپ کو مخاطب کر لے۔ کوئی آپ کو اشارہ تک کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو اتنا خوف تو ہوتا ہے نا کہ کسی بندے اور اس کے رب کے درمیان نہ آئیں۔“

آواز ان کے کندھے کے عین پیچھے آرکی تھی۔ ندرت نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا اور تکسیر پڑھ کر دوبارہ سجدے میں جھکیں۔ آنسوؤں نے سارا منظر دھنڈا دیا تھا۔ لبوں سے الفاظ سکیوں کی صورت نکل رہے تھے۔ وہ بار بار تسبیحات کی تعداد بھول رہی تھیں، سوان کو دھرائے جا رہی تھیں۔ بار بار۔۔۔ بار بار۔۔۔

”کوئی کسی کی نماز میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔۔۔ سوائے ایک کے۔۔۔ اور اس ایک کو تو اللہ کے رسول ﷺ نے بھی رعایت دی

ہے۔۔۔

ندرت نے کندھے والپس سیدھے کیے۔ چہرہ بالکل جھکائے، ہاتھ گھٹنوں پر رکھے۔ اور احتیات پڑھنے لگیں۔ آنسو ان کے چہرے پر پھسلتے، تھوڑی سے نیچے رکھ رہے تھے۔ پپٹ پپٹ۔ جیسے موئی ہوں۔ خلاف موئی۔

”اور وہ ایک.....“ وہ ان کے بائیں گھٹنے کے ساتھ زمین پر بیٹھا۔ انکھیوں سے ندرت کو بس اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک لڑکا ان کے ساتھ بیٹھ رہا ہے۔ اس کا صریح جھکا ہے اور ہاتھ ندرت کے گھٹنے پر ہے۔ ”اور وہ ایک اگر کوئی بچہ اپنی ماں کے پاس آئے..... بچہ..... اور اللہ کے رسول ﷺ اپنی نواسی کو اٹھا لیتے تھے نماز میں... سو میں سوچتا ہوں امی کا اگر کوئی بچہ اپنی ماں کے پاس آئے.....“ وہ بھیگل آواز میں کہہ رہا تھا۔ ندرت کے لبوں سے الفاظ بچکیوں اور سکیوں صورت بلند ہونے لگے۔ ”اگر کوئی بچہ اپنی ماں کے پاس آجائے اور وہ... اور وہ رو بھی رہا ہو... تو امی اس کی ماں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے بچے کو اٹھالے.... اور پھر اپنی نماز مکمل کر لے.... امی اللہ تعالیٰ اپنی نماز کے دوران بھی کسی کو اس کے بچے سے تکلیف کے عالم میں دو رہیں کیا کرتا... اتنی اجازت تو ہے امی...“ وہ ان کے گھٹنے پر سر کھل کر رونے لگا تھا۔ بالکل بچوں کی طرح۔ پھوٹ پھوٹ کر۔ بلک بلک کر۔ ندرت کی آنکھیں بہوز بہرہ ہی تھیں ان کی بچکیاں اور ان کے درمیان الفاظ بلند ہو رہے تھے... وہ ربِ اعلیٰ پڑھ رہی تھیں۔

”اے میرے رب، مجھے بنا پا بند نماز کا اور میری اولاد کو بھی... اے ہمارے رب دعا کو قبول کر لے... اے ہمارے رب مجھے معاف کر دے اور میرے والدین کو اور تمام موئیں کو حساب کے قائم ہونے کے دن!“

ندرت نے گلیے چہرے کو داہیں طرف پھیرا، اس کو سلام اور رحمت اور برکت کی دعا دی۔ پھر بائیں طرف پھیرا، اس کو صرف سلام اور رحمت بھیجی۔ برکت کی دعائیں دی۔

وہ اسی طرح ان کے گھٹنے پر سر کھل کر رہا تھا۔ آنسوؤں اور بچکیوں کے درمیان.... آہوں اور سکیوں کے درمیان.... وہ کیا دیکھ رہی تھیں.... وہ کیا سن رہی تھیں.... ان کو معلوم نہ تھا... مظہر دھندا لاتھا... مگر وہ اس کا چھوٹے کٹے بالوں والا سراٹھا کر جھک کر اس کا چہرہ چومنے لگی تھیں۔ ”میر اسعدی... میر ابیٹا...“ وہ اس کو پیار کر رہی تھیں، اس کو دیوانہ دار خود سے لگائے چوم رہی تھیں، اور وہ روئے جا رہا تھا۔

سارے منظر دھندا لے تھے.... گلید تھے.... آنسوؤں سے تر تھے.... صرف ایک آواز آتی تھی.... میر اسعدی... میر ابیٹا.... دوسرے کمرے میں موجود زمرا اس سب سے بے خبر لیپٹاپ آف کر کے اٹھی اور پھر سیل دیکھا۔ قدرے فکر مندی سے اسے کال ملا کر فون کان سے لگایا۔

”کہہ ہو؟“

”آج تو بہت مس کر رہی ہیں۔ خیریت!“ وہ مسکرا کر بولا تھا۔ غالباً ذرا یخوکر رہا تھا۔

”گیٹ لاک کرنا ہے۔ اور کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ خفگی سے کہتی بیٹھ کی چادر خواہ مخواہ جھاڑنے لگی۔

”میں سوچ رہا تھا آج ہم ذرا باہر کریں۔“

”ڈر کا وقت دو گھنٹے پہلے گزر چکا، فارس غازی۔ اب آپ شریف انسانوں کی طرح گھر تشریف لے آئیے۔“

”فوڈی ایور آفٹر ہمارے لئے ۲۲ گھنٹے کھلا ہوتا ہے مادام۔ چاپی ہے میرے پاس۔ آپ تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو پک کر لوں گا۔“

”وہ رک گئی۔“ اس وقت تو نہ کوئی شیف ہو گا نہ بیرا۔ پھر؟“

”شیف آپ بن جائیں گی۔ میر ابیٹا میں بن جاؤں گا۔“ وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ زمرا کے لبوں پر مسکرا ہٹ آرکی۔

”اگر یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے لئے کونگ کروں تو گھر آ جاؤ۔“

”مجھے معاف کیجئے۔ گھر میں پورے خاندان کے سامنے نہیں میں کو کنگ کروانے والا آپ سے۔ تیار ہو جائیے۔ میں آنے

وَالَّا هُوَ بِهِ

”اچھا یہ بتاؤ، کیا بنوادے گے مجھ سے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”اسنیک کسی بھی قسم کی۔“ پھر رکا۔ ”آپ کو بنانی آتی ہیں نا؟“

”شیور۔ مسئلہ ہی کوئی نہیں۔“ ادھراں نے فون رکھا، ادھر زمر نے جھٹ گوگل کھولا۔ دو چار تراکیب کے اسکرین شاٹ لئے، پھر جلدی سے الماری کھوئی اور چند بیگنرز الث پلٹ کیے۔ ایک سیاہ سلک کی لمبی قمیش نکالی جس کے لگے پنھے فتحہ موتو لگے تھے۔ یہ تھیک رہے گی۔ اور جلدی سے تیار ہونے چلی گئی۔

وہ کار بارہ گیٹ تک لايا اور سیل نکال کر اسے کال کرنے لگا۔ زمر نے کال کاٹ دی، یعنی وہ آرہی تھی۔ فارس نے فون کان سے ہٹایا اور دوبارہ سے ان باکس میں موجود وہ پیغام پڑھا۔

”سر، ریسُورانٹ میں میں نے کسی کو جاتے نہیں دیکھا، لیکن اوپری منزل کی بقیہ جلی ہوئی ہے۔ شاید وہ لڑکا آگیا ہے۔“ فارس کے لیوں پر مسکراہٹ کھکھر گئی۔

”زمر بی بی، آپ شیف بننے والی کریں، دو بیرے حاضر ہوں گے آپ کے لئے۔“ اور دوسرے بیرے سے ہی اس کی سر پر از ملاقات کروانے وہ جارہا تھا۔ وہ کتنی خوش ہو گئی، سوچ کر ہی اسے مزہ آرہا تھا۔

موباکل یکدم زوں زوں کرنے لگا۔ فارس نے دیکھا۔ آبدار کا لنگ۔ اس نے کال کاٹ دی۔ پھر ایک پیغام موصول ہوا۔ ”کیا آپ اس وقت آئکتے ہیں میرے پاس؟ پلیز مجھے آپ کی ضرورت ہے۔“

اس کے بعد کانز پر کا لڑا نے لگیں۔ اس نے اکتا کرفون ہی سائینٹ پر لگا دیا۔ تجھی گیٹ کھلا اور وہ باہر آتی دکھائی دی۔ سیاہ جھملاتے لباس میں، گھنگریا لے بال سمیت کر چہرے کے ایک طرف آگے کوڑا لے ناک میں دمکتی سونے کی نتھ پہنچنے والے ایک سادہ گلربے نیاز مسکراہٹ کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ جب فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو وہ جو اسے ہی دیکھ رہا تھا، کہنے بغیر نہ رہ سکا۔ ”اچھی لگ رہی ہو۔“

”میں برسی لگی ہوں کیا کبھی۔“ اس نے شانے اچکائے۔

چڑیں، گھنگریا لے بالوں والی ڈائین سرٹی ہوئی پر اسکیوں مز جیسے وہ تمام القابات فارس کو یاد آئے جو کچھری میں لوگ اس کے بارے میں فرمایا کرتے تھے لیکن.... وہ گھری سانس لے کر مسکرا یا۔ ”تو کوئنگ کریں گی آج آپ میرے لئے۔“

”اگر تم بیا اگری کرو گے تو ہاں!“ وہ بھی سادگی سے مسکرائی۔ فارس نے کوئم دیتے ہوئے ایکسلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور گیئر کو حرکت دی۔ کارزن سے آگے بڑھ گئی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

ترے فراق کے لمحے شمار کرتے ہوئے ..... بکھر چلے ہیں ترا انتظار کرتے ہوئے  
سزر بیلوں سے ڈھکا مورچاں خاموش کھڑا رہ گیا۔ اس کے اندر جاؤ تو ندرت ہنوز نماز والے تخت پر تھیں، اور وہ ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چہرے پر تکان تھی، مگر آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ ندرت ابھی تک رو رہی تھیں، بار بار اس کے چہرے اور سر پر ہاتھ پھیرتیں۔  
”بے غیرت نہ ہوتا، یہ بالوں کو کیا کر لیا ہے؟ ناں اتنے دن سے کدھر تھے؟ ماں کا خیال بھی نہیں آیا۔“ کہتے کہتے اس کے سر پر چپت لگائی۔ اس نے گھری سانس لی۔

”بس مارنا نہیں بھولتیں آپ ندرت بہن۔ شاپنگ کرتے وقت میرے لئے مایونیز لینا بھول جاتی ہیں لیکن۔ اگر پہنچا کر میں نے آنا ہے، تو میں ناشتے میں کیا کھاؤں گا؟“ تاٹا تو سوچا ہوتا۔“

”لے آئی ہوں مایونیز، کیسے بھول سکتی تھی؟“ وہ اس کی بات کی گہرائی میں گئے بغیر آنسو پوچھتے بتا رہی تھی۔ پھر کار کی آواز آئی تو حُرّ کی طرف دیکھا۔ سعدی نے انہیں اٹھنے سے روکا۔ ”میں دیکھ چکا ہوں۔ فارس ماموں اور زمر ہیں، باہر گئے ہیں۔ ان کو بھی نہ بلا یئے کہ۔ جانے دیں۔“

”اچھا مگر....“ وہ پیر نیچے اتارتیں چپل تلاش کرنے لگیں۔ ”باقی سب کو تو بلا وحین، اسمامہ....“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ ان کے ساتھ باہر نکلا۔

اسامدہ یوسف اس وقت کوٹو بیگم کے کمرے میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور جمایاں روکتا اس کوں رہا تھا جو نہایت جوش و خروش سے بدلے جا رہی تھی۔

”تم سوچ نہیں سکتے سیم وہ جو گھر میں نے گوگل پر دیکھے۔ وہ کوئی عالیشان محل نما گھر نہیں تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھر تھے، ان کے پتھر و مزتوہمارے سے بھی چھوٹے تھے۔ مگر کس طرح ان کو سجا گیا تھا، الاماں۔ میں تجھی تھی خوبصورت گھر بڑے گھر ہوتے ہیں مگر مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ چھوٹے گھر زیادہ خوبصورت بنائے جاسکتے ہیں۔ اگر انسان کو سلیقہ آتا ہو۔“

”خد صبح اس سیاقے پر بات کر لیں گے۔ ابھی مجھے نیندا آ رہی ہے۔“

خین نے اس کے سر پر چپت رسید کی۔ ”وہ مت سکون سے بیٹھ کر میری بات نہیں سن سکتے؟ ابھی سعدی بھائی ہوتا نا تو....“ باہر سے کوئی شور سابلند ہوا تھا۔ دونوں چونک گئے۔ ابا کی آواز.... ابا کے رونے کی آواز۔ خین اور اسامدہ نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ننگے پیر بستر سے اتر کر باہر بھاگے۔ لا و نج میں سب موجود تھے۔ ندرت نے صداقت اور حسینہ کو بھی بلوالیا تھا۔ وسط میں صوفے پر ابا کی دہنیل چیزیں رکھی تھی اور وہ روتے ہوئے کسی سے گلے مل رہے تھے۔ بول کچھ نہیں پار رہے تھے، بس آنکھیں بند کیے روتے جا رہے تھے۔ ان سے ملنے والا اڑکا سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھا، مسکرا کر ان کے گلے لگ کر پچھ کہہ رہا تھا۔ بال چھوٹے چھوٹے کئے تھے، شیو بڑھی ہوئی تھی اور منہ کا زخم ویسا ہی تھا۔

خین وہیں جم گئی۔ گویا پھر کابت ہو۔ آنکھیں شاک کے عالم میں کھلی رہ گئیں۔ سیم جی تھا مرتا تیزی سے بھاگا اور پیچھے سے جا کر سعدی سے لپٹ گیا جو خود اب سے گلے ملنے کی حالت میں جھکا ہوا تھا۔ سیم کے اس انداز پر وہ ہنستے ہوئے الگ ہوا اور سیم کو بازو پھیلایا کرنا پہنچنے ساتھ لپٹایا۔ صداقت خوشی خوشی پانی لے آیا، کہ ابا کو پلاۓ۔ حسینہ (جس کو ندرت نے کھانا گرم کرنے کا کہا تھا) دو پہنچانوں میں دبائے دلچسپی سے منظر نامد دیکھنے لگی۔ (ان لوگوں کا بھی ناروز کوئی نیا رارہمہ ہوتا ہے۔)

ساکت، متیر، شلی سی خین کے لب بے اختیار مسکرا ہہت میں ڈھلے۔ آنکھوں میں چک کسی ابھری۔ اور نبی بھی۔

وہ ننگے پاؤں لا و نج کے ٹھنڈے مرمریں فرش پر چلنے لگی۔ وہ اب ہنستے ہوئے سیم کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا، ابا کو کچھ کہہ رہا تھا۔ (شاید یہ کہ سیم بڑا ہو گیا ہے۔)

خین قدم اٹھاتی رہی۔

گویا برف کا صحر اتحا جس میں وہ قدم قدم چلتی جا رہی تھی۔

فاصلہ عبور کرتی جا رہی تھی۔

وہ مسافت کتنی طویل تھی.....

وہ مسافت کتنی سرد، کتنی کٹھن تھی۔

اس کے پیر ٹھنڈے ہو کر جمنے لگے تھے مگر وہ بنا پلک جھکپے اس کو دیکھتی..... آگے بڑھتی گئی۔

صوفے کے کنارے وہ رکی۔ ”بھائی!“ کسی نے اس کی پکارنیں سن۔ سیم اور ابا بخوشی سے (آنسو پونچھتے) بات کر رہے تھے، ندرت پچن میں صداقت کو لیے چلی گئی تھیں۔ صرف سعدی نے گردن اٹھائی، پھر چہرہ موڑ کر اسے دیکھا جو اس کی پشت پر کھڑی تھی۔ اس کا کپکپا تھا صوفے پر جاتھا اور مسکراتی متین نظریں سعدی پر۔

”کسی ہو جین؟ ٹھیک ہو؟ ابا“ سیم لکتنا بڑا ہو گیا ہے، کیا یا اب آپ کی دوا کا خیال رکھتا ہے۔“ وہ دلفظ اس سے بول کر مژہ کراپنے ساتھ گلے سیم کی بابت ابادے مسکرا کر دریافت کرنے لگا۔ جواب میں سیم زور سے اپنی کارکردگی بتانے لگا اور ابا بہنے ہوئے اس کی تائید کرنے لگے۔ ”یہ مراثہاری طرح خیال رکھتا تھا۔“

ایسے میں صرف حسینہ نے محسوس کیا کہ پیچھے کھڑی حسین کی مسکراہٹ پھیلی پر گئی ہے، اور وہ اسی طرح الجھی، متین کھڑی رہ گئی ہے۔ صوفے کی پشت پر کھاہاتھ بھی گر گیا ہے اور وہ یک نیک سعدی کے سرکی پشت کو دیکھ رہی تھی، جس نے دوسری نظر اس کو دیکھا تک نہیں تھا۔ کیا اس لئے پا کیا تھا برف کا صحرہ اگر آخر میں سفید مجسمہ ہی بن جانا تھا؟

❖❖❖

کوئی قیس تھا تو ہو گا، کوئی کون کن تھا، ہو گا..... مرے رنج مختلف ہیں مجھے ان سے نہ ملاو  
رات کی سرڈ پر سکون خاموشی میں فوذی ایور آفرٹر کی عمارت بھی ویران پڑی تھی۔ بتیاں بمحضی ہوئی تھیں۔ پارکنگ خالی تھی۔ وہ دونوں پچن کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ زمر نے مقی جلائی تو پکن روشنی میں نہا گیا۔ وہ سیاہ لباس پر سیاہ جیکٹ پہنے ہوئی تھی۔ اب جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گردن گھما کر طاری نظر وہ اردو گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

”سو تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے کچھ بناوں۔“ مسکراہٹ دبا کر پوچھا تو وہ جو کچھ کہنے لگا تھا، فون کی واپریشن پر ٹھہرہ، اثبات میں سرہلایا اور فون نکال کر دیکھا۔ آبدار کی 25 مسڈا کا لائز۔ لیکن ابھی فون حسین کے نام سے جل بھر رہا تھا۔ اس نے اسے کان سے گلایا۔ ”ہاں حصہ بولو،“ زمر آستین پیچھے کو موڑتی فرتک کی طرف بڑھ گئی تھی اور اسے کھو لے جھک کر مختلف اشیاء الٹ پلٹ کرنے لگی۔

”آپ نے تباہی نہیں بھائی کے آنے کا۔“ وہ کچھ ناخوش، الجھی ابھی لگ رہی تھی۔ فارس بری طرح چونکا۔ ”تمہیں کیسے پتا؟ کیا سعدی نے کچھ کہا ہے؟“ زمر اس نام پر مژہ کراسے دیکھنے لگی۔

”کچھ نہیں کہا، بھی تو غم ہے۔“

”حسین کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ ٹھنکتا۔

”بھائی گھر آگیا ہے۔ اس وقت وہ لاوٹ خیں امی کے ساتھ.....“ فارس نے پوری بات سے بغیر بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ نیچے گرا یا اور ایک دم چہرہ اٹھا کر دروازے کو دیکھنے لگا۔

”اگر وہ وہاں ہے تو یہاں کون ہے؟“ وہ بڑا یا۔ زمر مژہ کروالیہ نظر وہ اسے دیکھنے لگی۔ اس نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، ساتھ ہی وہ مسلسل چوکنی نظر وہ اسے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ ”تم یہیں رکو۔ میں آتا ہوں۔“

”فارس کیا ہوا ہے؟“

”کارڈ نے مجھے کہا سعدی ادھر ہے مگر..... تم یہیں رکو۔“ وہ برہمی سے کہتا باہر نکلا تو وہ فکر مندی سے پیچھے آئی۔ وہ ریسٹورانٹ کے اندر ہیرا اور سنسان پرے لاوٹ خیں دے قدموں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا برپا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور تاک کر ادھر ادھر دیکھتا وہ کسی کی تلاش میں تھا۔ اندر ہیرے میں فارس کا ہیولہ کھائی دیتا تھا جسے وہ فکر مندی سے دیکھے گئی۔ فارس اوپری ہاں کا دروازہ دھیرے سے دھکلیتا اندر جا رہا تھا۔ زمر کھڑی رہی کیونکہ اس نے کہا تھا وہ یہیں رکے۔ اور پھر اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کی گردن کی پشت کو کسی خندی چیز نے

چھوڑا۔ پستول کی نال جیسی خشندی۔ وہ مخدود ہو گئی۔ مژہبی نہ سکی۔

”ہلنا مت ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔ کچھل دفعہ کمر میں ماری تھی، اس دفعہ کھوپڑی کے پار جائے گی۔“ وہ اس آواز کو پہچانتی تھی؛ صرف پانچ برس قبل اس فون کا لپنیں پہچان سکی تھی۔

”اب آہستہ سے مڑو۔“ دوسرا حکم جاری ہوا۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گویا پتھر کے بت کی طرح گھومی۔ دھیرے سے۔ اب اس کے مخاطب کا وجود سامنے آیا۔

کوٹ اور اوپنی ٹوپی میں ملبوس بڑھی شیو والا کرٹل خاور اس کے اوپر پستول تانے اسے گھور رہا تھا۔ زمرنے جواباً اس کو بھی انہی نظرؤں سے دیکھا۔ پر سکون مگر چھپتی ہوئی نظریں۔

”اب اس کری پیٹھ جاؤ۔“ اس کے ہاتھ میں ہتھڑی تھی جو اس نے میز پر ڈال دی اور ایک کرسی کھینچ کر کچن کے وسط میں رکھی، اسے دوبارہ اشارہ کیا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

”تم نے اس کے پہریدار کو خرید لیا اور اس کے نمبر سے فارس کو متیج کیا تاکہ وہ ادھر آئے، تم نے اسے سعدی کا جھانسہ دیا؟ ہے نا؟“

”بیٹھ جاؤ ڈی اے۔“ اس نے غار کر کھا۔ وہ کری پیٹھی۔ گھٹنے ملائے۔ ہاتھ بدستور جیبوں میں تھے۔

”اب اس ہتھڑی کو دونوں ہاتھ پیچھے کر کے پہنو۔“ اس نے اگلا حکم دیا، ساتھ ہی بار بار دروازے کو دیکھتا گیا۔ وہ نہیں بلی، بن گردن اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ ”مجھے تر س آتا ہے تم پر۔“

”پہنزو مر صاحب!“ وہ گھر کر بولا۔ زمرنے جواباً جیبوں سے بند مٹھیاں نکال کر ان کو کری کے پیچھے لے جا کر ملا یا، مگر ہتھڑی کو نہیں چھوڑا۔ ”میں اپنے ہاتھوں سے خود کو ہتھڑی نہیں لگا دیں گی۔ میں دوسروں کو ہتھڑی لگوایا کرتی ہوں۔“

”لگتا ہے زمر صاحب، آپ نے پانچ سال پہلے والے واقعے سے کوئی سبق نہیں سیکھا!“ وہ ہتھڑی اٹھا کر اس کے پیچھے گیا اور جھک کر اس کے ہاتھ تھامنے چاہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے وہ جھکا تھا، صرف ایک لمحے کے لیے..... مگر وہ اٹھنیں سکا کیونکہ پیچھے سے اس کے سر پر پستول کا دستہ زور سے آگا تھا۔ نازک حصے پر لگنے والی چوٹ کے باوجود وہ گرانہیں، بلکہ اسی پھرتی سے پلنا اور پوری قوت سے پیچھے کھڑے فارس کے منہ پر مکارے مارا۔ فارس کا توازن بگڑا تو وہ پیچھے کوڑھکا، لیکن پھر دوبارہ خاور کو گریباں سے پکڑ کر میز پر کر کے بل گرایا۔ زمراب تک اٹھ کر سامنے دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی تم میری بیوی کے قریب آؤ۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟“ وہ سرخ بھبھکا چہرہ لیے اس کے سینے پر دباؤ ڈالے اس کے منہ پر زور زور سے کے مار رہا تھا۔ خاور کو دھندا سا اپنے اوپر جھکا فارس نظر آ رہا تھا اور پھر اس کے کندھے کے پیچھے آ کر کرتی زمر۔

”بلی کرو فارس، وہ مر جائے گا۔“ پھر اندر ہرا تھا۔ گناہوں جیسا سیاہ اندر ہرا۔

منظر نوز دھندا تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندر ہرا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ بلکی سی روشنی نظر آئی۔ چھت پر لگا ایک سفید بلب جل رہا تھا۔ اس نے گرد سیدھی کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا پاہرے اور گردن تک نبی سی چپکی ہو۔ شاید اس کا خون تھا۔ اس نے پھر سے آئکھیں جھپکیں۔ کندھے سیدھے کیے۔ تب محسوس ہوا کہ دونوں ہاتھ دائیں بائیں دیوار سے بند ہے ہیں۔ شاید گیس پاپ کے ساتھ۔ اس نے کلائیاں کھینچیں مگر وہ ہتھڑی یوں میں کسی ہوئی تھیں گویا وہ کسی صلیب پر کھڑا ہو۔ صلیب کے نشان کی سی صورت بندھا کھڑا ہو۔ بھاری پلکیں اٹھا کر اس نے دیکھا۔

کچن کے دوسرے کونے میں، وہ دونوں کھڑے نظر آ رہے تھے۔ مرد اور عورت۔ مرد کی اس طرف پشت تھی، اور وہ دونوں بلکیں

بھنجنا ہٹ کے ساتھ آپس میں بات کر رہے تھے۔ اس کے مختل ہوئے حواس جانے لگے۔ گردن کو دائیں باکیں گھما کر ایکسر سائیز کے انداز میں گویا تازہ دم کیا، پھر آواز لگائی۔ ”مجھے مارنے کے لیے ادھر باندھا ہے کیا؟“

فارس گھوما اور پستول اٹھائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس تک آیا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں خون اترنا لگتا تھا۔ ”ایک لفظ نہ نکالنا مند سے ورنہ میں واقعی تمہیں گولی مار دوں گا۔“

”اچھا۔ زخمی چہرے اور سوچی آنکھ والا خاور ہنسا۔ ہستے ہستے سر جھکتا۔“ تم نے میری زندگی بر باد کر دی اور اب یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں جانے دوں گا؟“

”ہم نے تمہاری زندگی بر باد نہیں کی۔“ زمرنا گواری سے کہتی دو قدم آگے آئی۔ ”تم نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے کہنل خاور۔“ خاور کی نظریں زمر سے ہوتی فارس تک گئیں۔ ”بیوی کو نہیں بتایا کہ تم نے اور سعدی نے میرے ساتھ کیا کیا؟ آبدار کے ذریعے تم نے اسے پیغام بھجوایا، ہمان کو سوی چڑھا دو۔ وہ کاغذ مجھے اس لڑکے کے سامان سے جمل گیا تھا۔ پھر سعدی نے زمر صاحبہ میرے اوپر الراہم لگایا کہ میں نے اور نگز یہ صاحب کو قتل کیا ہے، اور پھر جب وہ مجھے چکادے کر بھاگ نکلا تو یہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ ایک پارک میں۔ آبدار صاحبہ کے ساتھ۔ سی سی لی وی فونج میں دیکھا تھا میں نے تمہیں فارس غازی۔ اور تمہاری ساری گیم تجھے گیا تھا میں۔“

بیوی کو یغمال بنانے کا تو تم سے اعتراف بھی کر لیتا۔ ”پستول والا ہاتھ زور سے اس کے منہ پر پڑا تھا۔ خاور کا چہرہ گھوم گیا۔ کپٹی سے خون بھل بھل گرنے لگا۔ لیکن اس نے فوراً سے مکراتا چہرہ واپس موڑ لیا۔

زمر چوک کر فارس کو دیکھنے لگی۔ یہ انشاف اس کے لیے نئے تھے۔

”میرا آدمی کہاں ہے؟ تم کس ارادے سے یہاں آئے تھے؟“ اس پر پستول تانے وہ غرا کر پوچھ رہا تھا۔

”اسے کہیں جھاڑیوں میں مار گرایا تھا، وہیں پڑا ہوا۔ گر ظاہر ہے پہلے اس سے میتھ کروایا تھا۔ میں چاہتا تھا تم پورے خاندان کے ساتھ آؤ اور ہم تمہارے کسی بوڑھے یا بچے کو درمیان میں رکھ کر بات کریں۔ تم کیس تک واپس لے لیتے اگر میں آج یہ کر لیتا۔“

فارس نے جواب نہیں دیا۔ وہ بازو لمبا کر کے پستول اس پتانے اسے سرخ آنکھوں سے گھوڑتا رہا۔ زمر جو پہلے اچھے سے فارس کو دیکھ رہی تھی، اب اس کے چہرے پر تشویش پھیلنے لگی۔ ”فارس۔“ اس نے دھیرے سے پکارا مگر وہ اسی طرح خاور پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

”تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟ کیوں آئے تھے تم یہاں اس وقت؟“

”تمہیں کپڑا ماڑنے لگ پوزیشن میں لانا چاہتا تھا، لیکن بوس کے طور پر مجھے کیا ملا؟“ اس نے لال انگارہ آنکھوں کا رخ زمر کی طرف پھیرا۔ ”مزرم کے تمام ڈاکو منش جو اور فائلز میں لگے پڑے ہیں۔ ہاشم کے لیپ ناپ کی فائلز۔ اب مجھے صرف جا کر ہاشم کو یہ بتانا ہے اور وہ ان ڈاکو منش کا توڑ کر لے گا۔“

”یہ تب ہو گا جب تم زندہ یہاں سے جاؤ گے۔“ فارس کی اس پڑھی آنکھوں میں مزید سرخی اترنے لگی۔ وہ بنا پیک جھکے، بازو لمبا کر کے پستول اس پتانے بالکل بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ اس کا تنفس تیز تھا، کان سرخ تھے اور اندر سے گویا کوئی آگ نکل رہی تھی۔

”فارس۔“ اس کے قریب کھڑی زمر نے بے چینی سے پکارا۔ ”ظاہر ہے وہ زندہ یہاں سے جائے گا۔ اس کو جانے دو۔“

”نہیں۔“ اس پر نظریں جمائے فارس غازی نے دائیں باکیں گردن ہلائی۔ زمر کی رنگت فتح ہوئی۔ البتہ خاور کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

”تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟ تمہیں لگتا ہے میں زندہ ہوں؟ میں تو غازی اسی دن مر گیا تھا جب بازار میں میرے دو بیٹوں کو گولیاں ماری گئی تھیں۔ یہ اتنے برس میں زندہ تو نہیں تھا۔“

”خاور پیز چپ ہو جاؤ۔“ زمر نے بات کا لیگ مرارے کوئی نہیں سن رہا تھا۔

”مارنا چاہتے ہو مجھے؟ چلو آؤ مارو مجھے۔“ دیوار سے بندھے خاور نے سر کے اشارے سے گویا سے چلتی خی کیا۔ فارس پستول اس پر

تانے دو قدم آگے بڑھا۔ زمراحتیاط سے اس کے ذرا قریب آئی۔ ”فارس اس کو جانے دو۔“

”تمہیں مجھے مار ہی دینا چاہیے، کیونکہ ہاشم کے بغیر میری کوئی زندگی نہیں ہے۔ تم نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا، اب زندگی بھی لے لو۔ آؤ ناغازی۔ مار دو مجھے۔ چلاو گوئی۔“

”فارس اس کی بات مت سنو۔ اس کو جانے دو۔“ زمر نے بے چینی سے پکارا۔

”تمہارے بھائی کو میں نے اپنے انہی باتوں سے مارا تھا، ایسے ہی باندھ کر۔“ وہ اپنی کسی ہوتی مٹھیاں بھیجن کر بتا رہا تھا۔

”میرے بھائی کا نام مت لو۔“ وہ آنکھیں اس پر مرکوز کیے غرایا۔

”کیوں نہ لوں؟“ خاور تختی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اس کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے ہو مجھ سے۔ تم مجھے اور ہاشم کو قتل کرنا چاہتے تھے نا۔ لواب کرلو۔“

فارس کو وہ اپنے سامنے دیوار سے بندھا نظر آ رہا تھا۔ اس منظر میں سرخی بھی تھی، دھنڈا ہٹ بھی۔ اور اس منظر میں چند دوسروں سے مناظر بھی ابھر بھر رہے تھے۔ عکھے سے لاش جھوول رہی تھی جسے وہ دوڑ کر پیروں سے پکڑ رہا تھا..... دوچھوٹی چھوٹی پچیاں ایک کفن میں لپٹے ٹھنڈے کے سرہانے رو رہی تھیں، نہیں ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ رہی تھیں.....

”گولی چلا دو ناغازی۔ بدلہ لو اپنے بھائی کا۔ زرتاشہ کا۔ زمر کا۔ سعدی کا۔ لو مجھ سے بدلہ۔ جیسے میں نے لیا تھا۔ جب اس بر گیڈیہ پر اور اس کے پورے خاندان کو مارا لا تھا۔ تب میں وہ بنا تھا جو آج میں ہوں۔ اور آج تم میرے جیسے بنو گے۔“

فارس کا منظر دیسا ہی تھا۔ سرخ دھنڈلا سا۔ وہ ہبتال کے بیند پر سفید چہرہ لیے بندآنکھوں اور سیاہ بالوں والی لڑکی۔ وہ اس کا باہت تھامے، چہرہ ششتنگی کے عالم میں جھکائے ہوئے تھا۔ اس لڑکی کا باہتھ بہت شنڈا اور بے جان تھا۔

”چلاو گولی۔ مار دو مجھے۔“

”فارس، اس کی مت سنو۔ یہ تمہارے جذبات سے کھلیتا چاہ رہا ہے۔“ وہ کفرمندی سے کہتی اس کے مزید قریب آئی۔ ایک ایک قدم احتیاط سے رکھتی تھی۔ ”تم اس کو نہیں مارو گے۔ تم اس کی جان نہیں لو گے۔ تم قاتل نہیں ہو فارس۔“

فارس نے جواب نہیں دیا۔ اسی طرح خاور پنگاہیں تانے رہا۔ خادر نے بلکے سے بنس کر سر جھکا۔ مجھے معلوم تھا تم مجھے نہیں مارو گے۔ چلو مجھے غلط ثابت کرو۔ چلو مجھے جنم میں پہنچا دو۔ بہت ہے؟ غیرت ہے؟ ہے یا نہیں فارس ناغازی؟ مر دنو؟“ وہ غرایا تھا۔

فارس کا نفس تیز ہونے لگا۔ آنکھوں کی تپش شراروں میں بد لئے لگی۔

”فارس اس کی بات مت سنو۔ یہ قاتل ہے۔ اس کی زندگی بے کار ہو چکی ہے اس لیے چاہتا ہے تم اس جیسے بن کر جبل چلے جاؤ۔“ فارس تم اس کو نہیں مارو گے۔ میری بات سنو۔ فارس میری بات سنو۔“ وہ اس سے انتباہ کر رہی تھی۔ وہ پانچ سال پیچھے چل گئی تھی اور وہ فون پر فارس سے بات کر رہی تھی۔ زمان و مکان کی حدود آپس میں گندمہ ہو رہی تھیں۔

”مجھے ایک گولی مارو فارس۔.... دل میں۔“ وہ اسے اکسارہا تھا۔ وہ تینوں ہمیشہ سے اس تکون میں تھے۔ پانچ سال سے وہ اس تکون میں قید تھے۔ آج وہ تکون پھر سے واپس آگئی تھی۔

”فارس تم اس کو نہیں مارو گے۔“ آنسو زمر کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔ وہ اس سے تین قدم دور کھڑی اس کی منت کر رہی تھی۔ ”اگر تم نے اسے مار دیا تو تم اس جیسے بن جاؤ گے۔ تم قاتل بن جاؤ گے۔ تم اپنی معمومیت کھودو گے۔ نہیں ہو تم کافر.... ما کر.... کاذب....“

قاتل نہیں ہوتا محرم۔ تم بے گناہ تھے، لیکن اگر اس کو مارا تو نہیں رہو گے۔“

”اس نے..... وہ بولا تو آواز عجیب غراہٹ کی صورت حلق سے نکلی۔ ”میرے بھائی..... اور میری بیوی کو مارا..... میں انہیں نہیں بچا سکا.... اس نے..... انہیں مارا۔“ پستول مزید تان لی۔ اس کا پستول والا ہاتھ پسینے میں شر اور تھا۔

”مگر تم اس کی جان نہیں لے سکتے فارس۔ سرکار جان لے سکتی ہے، شہری نہیں۔ یہ حق دفاع نہیں ہو گا کیونکہ یہ آدمی تمہیں مارنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ یہ کسی دوسرے کی جان بچانے کے لیے بھی نہیں ہو گا۔ یہ ”مارنا“ نہیں ہو گا۔ یہ ”قتل کرنا“ ہو گا۔ کوئی بیڑ میں قتل۔ یہ جرم ہے۔ یہ گناہ ہے۔ فارس پلیز تم اس کو جانے دو۔ میری بات سنو۔“ وہ پانچ سال پہلے کی طرح اس کی منت کردہ تھی۔ آنسو اس کے گالوں پر بدستور پھسل رہے تھے۔

”رُک کیوں رہے ہو فارس غازی؟ مارو مجھے۔ چلا ڈگوی۔ مرد بنو۔“

وہ دیوار سے بندھا شخص نفرت سے اسے دیکھتا پا کارہاتھا۔ اکسارہاتھا۔ فارس کی گرفت ٹریگر پر مضبوط ہوئی۔

”مجھے.... بدله لینا ہے.... اپنے بھائی کا.... اپنی بیوی کا.....“

”میری بات سنو فارس.....“ وہ ملتی ہی کہہ رہی تھی۔ ”تم اس کو نہیں مارو گے۔ تم اس جیسے نہیں بنو گے۔ تم نے اسے مارا تو یہ جیت جائے گا۔ اس کے پاس چوائیں تھیں برسوں پہلے۔ یہ چاہتا تو نہ مارتا اپنے بچوں کے قاتل کو، مگر اس نے مار دیا۔ یہ تباہت کرنا چاہتا ہے کہ اس کے پاس چوائیں نہیں تھیں۔ یہ پر سکون ہو کر مرنा چاہتا ہے۔ تم اس کو وہ سکون مت دو۔ ہر قاتل کا مرننا ضروری نہیں ہوتا۔ تم سن رہے ہو فارس؟“ وہ درد سے چلا کر بولی تھی۔ ”تم خدا نہیں ہو۔ تم قصاص مانگ سکتے ہو۔ تم انتقام نہیں لے سکتے۔ تم انسان ہو۔ انتقام میں تم اس کی زندگی تباہ کرو، اس کی پر اپرٹی کو آگ لگاؤ، اس کی عزت کو نقصان پہنچاؤ، تم یہ سب کر سکتے ہو، مگر کسی کی جان لینا.... وہ لیکر پا کر لینا.... یہ غلط ہے۔ تم یہ نہیں کرو گے۔“

”مرد بنو فارس غازی.....“ وہ بھی مسلسل اس کو استہزا یہ انداز میں دیکھتا اکسارہاتھا۔ فارس دانت ایک دوسرے پر جمائے، اسے گھوڑتے ہوئے اس پر پستول تانے کھڑا رہا۔ کھڑا رہا۔ کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ زمر کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ کھڑی تھی مگر ایک بھی قدم آگے نہیں بڑھا سکتی تھی کہ کہیں وہ کچھ کرنے ڈالے۔

”کلک..... کلک.....“ سائیلنسر لگے پستول کا ٹریگر فارس نے ایک دم دبایا۔ یہ بعد مگرے.... دو گولیاں.... زمر کا دل بند ہوا.... خاور نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ایک جھٹکے سے اس کی ہتھڑی ٹوٹی اور بازو نیچے گرے تو اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

فارس نے پستول شاشنگی سے جھکالیا تھا۔ اس نے گولیاں اس کی ہتھڑی یوں سے لگی زنجیر پر ماری تھیں۔

”میں تمہیں نہیں ماروں گا کرفل خاور۔“ وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا تھی میں سر بلاؤ کر بولا تھا۔ ”اس لینے نہیں کہ میں نے تمہیں معاف کیا، میں قیامت تک تمہیں معاف نہیں کروں گا۔“ مگر اس لیے کہ میں..... قاتل نہیں ہوں۔ میں خدا نہیں ہوں۔“

خارو کے لیے یہ غیر متوقع تھا۔ اس کے بازو دو اپس پہلو میں گرچکے تھے مگر وہ چند لمحے شل سا کھڑا رہا۔ زمر آنکھیں رکھتی گہرے گہرے سانس لیتی خود کو پر سکون کرنے لگی مگر آنسو میں ابل آرہے تھے۔

”تمہارے پاس چوائیں تھی خاور۔ تب بھی تھی۔ میں اور تم..... برابر نہیں ہیں۔“ نفرت سے اسے دیکھ کر وہ بولا تھا۔ خاور کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا گویا وہ گل سر رہا ہو۔

”تم چاہتے تو قاتل نہ بنتے۔ تم اپنے بچوں یا ہاشم کے لیے قاتل نہیں بنے۔ تم اپنی وجہ سے قاتل بنتے تھے۔ مگر میں قاتل نہیں بنوں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔“ کہنے کے ساتھ اس نے پستول جیب میں ڈال لیا۔

جسے نے ایک بار سے وہ سے کی کافی رہائے ہے۔ تسلیم کروں۔ ساتھ مکھیوں سے کچھ مدد کے لئے طرف قدم ڈھانے۔ اور  
دیرے سے اپنے جیب کوٹا۔ اس کا کامل اور قدرتی کے حکم کیونکہ سمجھ سمجھ کر پہنچاں کر پہنچاں کال کر کیں۔ جس کو کہا جائے تو اس کی  
طرف چون کر لے گئے ہوں۔ ایک دو تین پارے۔ مگن فلٹ ایک کی آواز جانی۔ کافی جھاک کر دن کوئی پلی۔ جسے نے جو کسی نہیں  
پہنچا کر کے کھا۔

فاس لے اور بیب میں لگی دل کر راہ رکھی اور بچالی۔ اسی بیب نہ کے باخیل کی پڑھ کر لیتی تھی۔ خندہ کے جیسے ہے  
شمع کی آہنیں کیلئے، نہ لگے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ

کیں ہوں لگتے۔ میں اپنے بھائی تیرنگا کو لیے ہوں جاؤ کہ ہاتھ میں کچھ کیا کیا۔ نہ رے لیکن اگر میں نہ رے سکا  
نہ کوئی بھائی اگر میں آنحضرت کو لے کر رہا تھا۔

آئی ایسا ساری قدری۔ توہاں کو میرے نام پر غصہ لئے کہاں کے کام سے کس کو بے کاری کرنے کا کام لے کیا تھا میں  
میں جس سکھیوں سے مل کر اپنے دوستی کو اپنے کام میں کھینچ دیا گی تو وہیں کوئی چیز نہیں کہتی تھی کہ وہ کام کو  
جیسا ہونا چاہیے اور اس کو اپنے دوستی کے ساتھ کرتے ہوئے اپنی پروری۔ اس کو اپنے دوستی کے ساتھ کرتے ہوئے اس کی پروری۔

لے کر جائیں گے۔ میرے نے اسے حکم دیا تھا کہ اس کی کوئی بات کرنا ممکن نہ ہے۔

”میرے سامنے وہ تھا... میرا مجرم اور میں اس کی جان نہیں لے سکا۔ میں بزدل نکاں۔“  
زمرے نقی میں گیلا چہرہ دائیں با میں بلایا۔ ”تم مسلمان ہو۔ تم نے خدا بننے کی کوشش نہیں کی۔ تم بہادر ہو، تم نے انسانیت کھائی۔“  
فارس نے ناک سے گیلا سانس کھینچتے کری کی ٹانگ سے سر نکال دیا اور نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ ”میں خدا نہیں ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ میں خدا نہیں ہوں۔ میں خدا نہیں بننا چاہتا تھا، اسی لئے میں نے اسے جانے دیا۔“

”هم اپنا انتقام اللہ پر چھوڑتے ہیں فارس۔ ہم انصاف کے لئے لڑیں گے مگر انتقام کے لئے نہیں۔ مجھ سے وعدہ کرو اب کسی کو مارنے کا نہیں سوچو گے۔“ وہ اس کے خون اور بالوں کو زمی سے ٹشو سے صاف کرتی کہہ رہی تھی۔ فارس نے اسے دیکھتے اثاثت میں سر بلایا۔  
”نہیں سوچوں گا۔“

”میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ کسی بھی صورت نہیں۔ آئی لو یوسوچ۔ آئی رنیل ڈو۔ تم بہت اچھے ہو۔“ وہ ابھی تک بے مقصد اس کے رخم پر ٹشو پھیر رہی تھی۔ وہ تکان بھری آنکھوں سے اسے دیکھے گیا۔ اس کے لب ایک ہی سطر بڑا بڑا ہے تھے۔ ”میں خدا نہیں بننا چاہتا۔ میں ہتھیار ڈالتا ہوں۔ میں خدا نہیں بننا چاہتا۔“

اور وہ بے آواز آنسو بھائی اس کا زخم ابھی تک صاف کرتی دھرائے جا رہی تھی۔ ”آئی لو یوسوچ۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی.....“  
سر درات باہر قطرہ قطرہ جمعتی رہی.... پھلتی رہی.... نُٹا ہوا چاند بالوں میں تیرتا رہا.....

❖❖❖

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ..... خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک  
اس ٹوٹے چاند تک..... زمین پر بننے مورچاں کے لاوٹج میں جتنی گہما گہما تھی، اس کے اس بیداروم میں اتنا ہی سناتا تھا۔ حنین مدھم  
ناکٹ بلب جلانے بستر پر یوں بیٹھی تھی کہیر زمین پر لکھے تھے اور ہاتھ گود میں تھے۔ چہرہ دیران اور آنکھوں میں شل ساتا رہتا۔ وہ یک نک بیٹھی  
خلا میں گھور رہی تھی۔ جب دروازہ دھیرے سے کھلا۔ اندھیرے میں بیٹھی حنی نے چہرہ اٹھایا۔ باہر روشنی میں نہایے دروازے سے سعدی اندر  
داخل ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں فون اور چار جر تھا۔

”یہ کہاں لگے گا؟ تھری پن ہے۔“ اس نے نگاہیں ملائے بغیر سوال پوچھا۔ پھر خود ہی دیوار پر ادھر ادھر دیکھا۔ تھری پن ساکٹ نظر آیا تو آگے بڑھا، جبکہ کرچار جر لگایا اور فون وہیں زمین پر رکھ دیا۔ پھر جانے کو مژرا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بوی۔ سعدی کے قدم زنجیر ہوئے۔ مگر مژرا نہیں۔

”میں نے آپ کا آٹھ ماہ انتظار کیا، لیکن آپ... آپ کو مجھے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔“ اس نے بھیکی لی۔ شدت غم سے آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

سعدی دھیرے سے پلتا۔ اس کے چہرے پر اب برہمی تھی۔

”اور ان آٹھ ماہ تمہارے نام سے مجھے کتنی اذیت ملی؟ اس کا احساس ہے تمہیں؟“ وہ گھر کر بولا تھا۔ ”تم نے چینگ کی، میں نے تمہیں معاف کر دیا، تم نے ہاشم کو کانج بلایا، میں تمہاری اور زمرکی باتوں میں آگیا اور اس کو بھی جانے دیا مگر کیا میں نے کو اس نہیں کی تھی کہ تم اس سے کبھی بات نہیں کرو گی۔ اس کو بھی نہیں بلاؤ گی۔ پھر بھی تم نے وہی کیا حنین یوسف۔“ اس کی آواز دبی دبی غراہٹ میں بد لگی۔ حنین پھر ہو گئی۔ با تھر و روم کے دروازے کی کنڈی کھلی اور سیم باہر نکلا۔ حیرت سے ان دونوں کو دیکھا۔

”تم نے اس سے تعلق رکھا۔ مجھے سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ مگر تمہیں کوئی خیال نہیں آیا۔ اپنے بھائی کی عزت کا کوئی خیال نہیں کیا تم نے۔ وہ تمہارا نام لے کر کیا کیا با تیں کرتا تھا میرے سامنے..... میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تم نے مجھے آٹھ ماہ میں کتنی اذیت دی ہے؟“

تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ تمہاری وجہ سے میرا سرکتی دفعہ جھکا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ کر کہہ رہا تھا کہ تم آؤ گی اور میں جانتا تھا کہ تم نہیں جاؤ گی، لیکن تمہارے نہ جانے سے تمہارے اتنے عرصے کی خطا میں مٹ نہیں گئیں۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اور میں فارس ماموں سے بھی پوچھوں گا کہ انہوں نے تمہارا خیال کیوں نہیں رکھا۔ میں امی سے بھی پوچھوں گا کہ وہ کہہ تھیں جب تم اس سے بات کرتی تھیں۔ ”بولے بولے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ سیم پہلے تو ساکت ہو گیا، پھر ایک دم سامنے آیا۔

”ایے بات مت کریں۔“ مگر سعدی نے نہیں سن، وہ شل ہوئی حسین کی طرف انگلی اٹھا کر اسی برہمی سے بولا۔ ”میں زمر سے بھی پوچھوں گا کہ.....“

”میں نے کہا، میری بہن سے اس طرح بات مت کریں۔“ اسامہ ایک دم سعدی کے مقابل آکھڑا ہوا یوں کہ بیڈ پہنچی حسین چھپ گئی۔ سعدی کی انگلی نضا میں انھیں رو گئی۔ اس نے دیکھا دبلے پتے اسامہ کا قد اس کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں بھی دیسے ہی سرنی تھی۔

”سیم تم بیہاں سے جاؤ۔“

”میں نے کہا بھائی، انگلی نیچے کریں۔“ وہ دانت پہ دانت جمائے غرا کر بولا تھا۔ سعدی کا ابرو بے اختیار اٹھا۔ ماتھے کی تیور یا ڈھیل ہو گئی۔

”میری بہن سے اس طرح بات مت کریں۔ آپ آٹھ ماہ بعد آ کر یوں ہم سے بات نہیں کر سکتے۔ آپ کو یا لگتا ہے؟ صرف آپ نے تکلیف اٹھائی ہے؟ ہم سب خوش تھے؟ ہم نے بھی تکلیف اٹھائی ہے۔ ہم نے بھی اذیت کافی ہے۔ اور میری بہن نے کچھ نہیں کیا۔ سنا آپ نے۔ اس نے کچھ غلط نہیں کیا۔ میں سب جانتا ہوں۔ آپ اس طرح میری بہن سے بات نہیں کر سکتے۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔“ وہ تیز تیز بول رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو سچ ہو رہے تھے۔ ”آپ ہمارے ساتھ اس رات نہیں تھے جب پولیس فارس ماموں کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ آپ کو پتہ ہے وہ رات کیسی تھی؟ زمر نے مجھے کہا تھا کہ اب میں اس گھر کا بڑا مرد ہوں۔ اور اس رات میں ہاشم کے کمرے کی بالکونی کا شب شہ بجا تھا؟ میں اس شخص سے مدد مانگنے گیا تھا بھائی جو ہمارا دشمن تھا۔ میں اپنے دشمن کے آگے ہاتھ پھیلانے گیا تھا۔ اس رات زمر اور حندہ کی ساری باتیں میں نے سن لی تھیں۔ آپ کو پتہ ہی نہیں کہ اس رات نے میرے ساتھ کیا کیا۔ ہم نے ڈھائی تین ماہ ماموں کے بغیر گزارے۔ تب میں گھر کا بڑا مرد تھا۔ اور میں جانتا ہوں، میری بہن نے کچھ نہیں کیا۔ میری بہن فخر پاٹھ کر قرآن پڑھتی۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ آکر ہمیں یوں سچ کریں۔ اور اگر آپ نے اسی طرح ہم سے بات کرنی تھی، تو اس سے بہتر تھا کہ آپ واپس نہ آتے۔“

سعدی کا ہاتھ والیں پہلو میں جا گرا۔ وہ بس سیم کو دیکھے گیا۔

پرندے ہڑے ہو چکے تھے، ان کے نخے پر پرواز کا ہنر سیکھے چکے تھے۔ اور اب تک وہ جانے کتنے آسمانوں کا چکر کاٹ آئے تھے، سمندر میں گرے شخص کو کیا پڑھ چلنا تھا۔ وہ جن کو پل پل سعدی کی ضرورت رہتی تھی، کوئی مسئلہ ہوتا وہ سایکا ترست بن جاتا تھا، پڑھنا ہو تو یوں یوں کہیں جانا ہو تو ڈرائیور۔ اب انہیں اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

وہ آہستہ سے مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ سیم آنکھیں رگڑتا فوراً پیچھے بیڈ پہنچی شل بے آواز روئی حمد کے پاس آیا۔

”تم روؤں نہیں حمد۔ انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم سے یوں بات کریں۔“

حسین نے آنسو گراتے تھی میں سر ہلایا۔ ”وہ فارس ماموں کو بتا دیں گے۔ میں نے پہلے ایو کو کھویا، پھر وارث ماموں کو، پھر بھائی کو، پھر ہاشم کو..... میں ہر اس مرد کو کھو دیتی ہوں جس سے مجھے محبت ہوتی ہے۔ میں فارس ماموں کو بھی کھو دیں گی۔ وہ مجھ سے نفرت کریں گے۔“ ”میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ میں اس گھر کا بڑا مرد ہوں ہم..... باقی سب تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ تم روؤں نہیں۔ میں تمہارا

بھائی ہوں۔ صرف میں تمہارا بھائی ہوں۔“ وہ مسلسل اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا سے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا اور جنین چہرہ جھکائے روئے جا رہی تھی۔ اسے نہیں پتہ تھا وہ بھائی کو یہ سب بتاتا ہوگا۔ وہ اس تاریکی سے اب کیسے نکلے گی؟

❖❖❖

میں تو بے حس ہوں مجھے درد کا احساس نہیں ..... چارہ گر کیوں روٹی چارہ گری بھول گئے  
صحیح ابھی دھندا لو تھی ... نومولڈ اور تازہ جب فارس کی آنکھ کھلی۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔

وہ وہیں پکن کے فرش پر کرسی سے نیک لگائے سو گیا تھا شاید۔ کب کیسے، کچھ علم نہ تھا۔ سر تھا کہ درد سے پھٹ رہا تھا اور کمر تختہ بن چکی تھی۔ وہ کراہتا ہوا اٹھا۔ جوتے پہنے ہوئے تھے سوپیر درد کر رہے تھے۔ صرف دل بلکہ تھا۔

زمر چوپلہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ آستین اور چڑھائے وہ کچھ بنا رہی تھی۔ مزکرا سے دیکھا اور مسکرائی۔ اٹھ جاؤ۔ میں ناشستہ بنا رہی ہوں۔“

وہ آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے رگڑتا اس تک آیا۔ ایک نظر اس کے پھیلاوے کو دیکھا۔ ”میں اتنی دیر کیسے سوتا رہا؟“

”کیونکہ برسوں بعد تمہارے دل کو سکون ملا ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ہاتھوں سے تیزی سے انہے پھینٹ رہی تھی۔ فارس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ پھر کھڑکی کو دیکھا جس کے پار گہری نیلا ہٹ تھی۔

”میں مسجد جا رہا ہوں، تم ناشستہ بنا۔ میں اپنی پرانی روئین پر واپس آنا چاہتا ہوں اب۔“ وہ ہلکے دل اور ہلکے کندھوں کے ساتھ طمانتی سے بولا تو زمر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”کیونکہ تم جان گئے ہو کہ تم خدا نہیں ہو۔ خدا کوئی اور ہے۔“

”درست!“ سر کholm دے کر وہ جانے لگا۔ پھر ٹھہر گیا۔ ”تم نے ایک دو دفعہ کے علاوہ مجھے کبھی نہیں ٹوکا نماز نہ پڑھنے پر۔ ویسے یہ تمہارا فرض تھا کہ تم مجھے ٹوکتیں۔ مجھے احساس دلاتیں۔“

”فارس!“ وہ کاشار کھڑک راس کی طرف گھوی۔ ”سات سال کے دس اور بارہ سال کے بچے کو ٹوکا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، گھر سے نکلا جاتا ہے، نماز نہ پڑھنے پر.... بالغ مسلمان کو نہیں ٹوکا جاتا۔ اس کے سامنے نماز پڑھنا ہی اس کو نماز کی نصیحت کرنا ہے۔ پتہ ہے کیا فارس، ہمارے گھر میں ایک ایسا شخص ضرور ہوتا ہے جو نماز نہیں پڑھتا یا وہ غیبت کرتا ہے، یا کسی ایسی برائی میں ملوث ہوتا ہے جس سے نماز سے نکالنا چاہتے ہیں مگر ہزار جتن کر کے، نصیحت کر کے، یقین پڑھ دے کر، سمجھا کر، غصہ کر کے اس کے لئے دعا کر کے بھی، ہم اس کو نکال نہیں پاتے اس اندھیرے سے۔ اس کی اصلاح نہیں کر پاتے۔ اور یہی سوچتے رہتے ہیں کہ اس کا کیا بنے گا۔ یہ تو جہنم میں جائے گا۔“ وہ سانس لینے کو کر کی۔ وہ توجہ سے اسے سن رہا تھا۔

”تو پھر ہم اسے کیسے اس برائی سے نکالیں؟“

”ہم یہ جان لیں کہ وہ اپنی نہیں“ ہماری، ”آزمائش ہے۔ اس کی تو بخشش بڑے آرام سے ہو جائے گی کیونکہ اس کا دل تو کچھ عرصے کے لئے اللہ نے نیکی کی طرف سے بند کر رکھا ہے، میں آزمانے کے لئے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ اس نے تو نہیں پڑھ رکھی تفسیر، اس نے تو ہماری طرح حدیث کی کتابیں گھول کر نہیں پی ہوئیں، ہر وقت اس کی بخشش کی فکر نہیں کرنی چاہیے ہمیں۔ ہم کیا کرتے ہیں یہ ہم ہے۔ تمہیں پتہ ہے ہمیں ایسے موقعوں پر کیا کرنا چاہیے؟ جو خوبی اس میں دیکھنا چاہتے ہیں اس کو اپنے اندر رہا! لیں اور Excellence کے لیوں پر اپنا لیں۔ وہ نماز نہیں پڑھتا تو ہم اپنی نماز کو خوبصورت بناتے چلے جائیں۔ اس کو دکھانے کے لئے نہیں، بلکہ اللہ کو دکھانے کے لئے کہ اللہ یہ ہے وہ پریکشش کا لیوں جو میں اس کی عبادت میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کو ایک لفظ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔ جس پر الفاظ اثر نہ کریں، اسے عمل سے نصیحت کرنی چاہیے۔ اب جاؤ۔“

قصیر کاردار میں ہاشم ابھی بستر میں زمگرم کبل میں لپٹا، چائے پیتے ہوئے موبائل پر نیوز ہیڈ لائزرڈ کیچ رہا تھا جب دروازہ زور سے کھٹکا۔ اس نے ناگواری سے چہرہ اور اٹھایا۔ پھر کبل اتارتا نیچے اترنا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں موجود تھا اور اس طرح کسی کے غل ہونے پر موڈ گلر چکا تھا۔ بے زاری سے اس نے دروازہ کھولتا تو سامنے کھڑے احمد کو دیکھ کر تاثرات مزید بگزے۔  
”تمہیں کس نے اجازت دی کہ.....؟“

”آپ نے کہا تھا سر کہ مجھے آپ کا اعتماد لکھا نا ہے۔ میں اسے کہا سکتا ہوں۔ میرا کیری، میری آزادی، سب کچھ اس جا ب سے جزوی ہے۔ میں اس کو نہیں چھوڑنا چاہتا سو میری بات نہیں۔“ وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ ”میں کچھ ایسا جانتا ہوں جو یوسف کو کبھی آپ کے خلاف اٹھنے نہیں دے گا۔“

”ہاشم کے ابر و اکٹھے ہوئے۔“ ”مثلاً؟“

”مثلاً!“ احر نے بھاری دل کے ساتھ گھری سانس لی۔ ”سعدی یوسف کی بہن... جنین.... اس نے بورڈ ایگزام میں اوی پی صاحب کو بلیک میل کر کے پیپرز لیک کر دائے تھے۔ میرے پاس تمام ثبوت ہیں۔ آپ ان کو رکھیں فارس کے سامنے اور اسے آفردیں۔ وہ سب کچھ چھوڑ دے گا۔“

ہاشم کی آنکھوں میں چمک اتری۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلنے۔

”مجھے نو بجے آفس میں ملو۔ تم واپس جا ب پا چکے ہو، لیکن آئندہ اتنی صبح آ کر میر اور دروازہ مت کھٹکھانا۔“ اور دروازہ اس کے منہ پر بند کر دیا۔ احر نے گھری سانس لی اور سر حکمتے سیڑھیاں اترنے لگا۔ دل بہت بھاری ہو چکا تھا۔

فارس مسجد سے واپسی پتازہ دم صبح سڑک کنارے چلتا آرہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ دل اور کندھے بوجھ سے آزاد تھے۔ بہت عرصے بعد اپنا آپ انسان لگا تھا جو کسی کی تقدیر کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔

چلتے چلتے اس نے موبائل جیب سے نکالا۔ رات بھروسہ سائیلنت رہا تھا اور کافر اور میسح کی بھرمار تھی۔ آبدار کی کافر سر نہست تھیں۔ کچھ ہو چتے ہوئے اس نے کال بیک کی اور فون کان سے لگایا۔

”بیلوا!“ مردانہ آواز دوسری ہی گھنٹی پر سنائی دی۔ فارس ٹھہر گیا۔ ابر و تجہب سے اکٹھے ہوئے۔  
”کون؟“

”تم مجھے بتاؤ تم کون ہو؟“ جواب میں غصیلہ لہجہ سنائی دیا تھا۔ ”میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم ہو کون جس کو میری بیٹی نے پینٹا لیں دفعہ کال کی اور تم نے اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔“

”آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں۔ آبدار ٹھیک ہے؟“ وہ تیزی سے بولا تھا۔ چند ثانیے کی خاموشی دوسری طرف چھائی رہی۔

”میری بیٹی نے.... فارس غازی..... کل رات خود کشی کر لی ہے۔ وہ اس وقت آئی ہی یوں ہے۔“

”کہڑ؟ کون سے ہا سپٹل میں؟“ وہ کارکی چاپیاں نکالنے ہوئے آگے کو بھاگا تھا۔

فوڈی ایور آفٹر کے تھاپرے لاونچ میں زمر میز پر ناشستہ سجائے، بیٹھی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔

.....❖❖❖.....

باب 24:

## ٹوٹے تارے جیسا دل

میں نے دیا جیسیں سورج!  
 مگر چالا تم نے چاند  
 جب چاند دیا تم کو  
 تم نے مانگے ستارے  
 تو میں اندر ہادھنڈ پیشی  
 لا سمجھ دو ستاروں کی کھکشاں میں  
 اور خود کو لپیٹنا  
 ہر ایک ستارے کے گرد  
 صرف تمہارے لیے  
 ستارے چاند اور سورج باہم بھی  
 تمہارے تلوں دل کے لیے کافی نہ ہوا چے  
 سو میں نے الٹائے اپنے آنسو  
 اور تمہیں بنادیا ایک سمندر  
 تاکہ تم رہ میں پہ باؤ گیری کرتے چلو  
 اور اس ناممکن خزانے کو کوئی نیا لو  
 جس کی تھیں مستقل حلاظہ ہے  
 البتہ ضرور ہر صبح.....  
 میرا سورج تم کو بیدار کرنے کے لیے موجود ہو گا  
 ہر رات میرا چاند حاضر ہو گا  
 تمہاری تشغیل کے لیے

اور اگر کبھی تمہیں ہو میری طلب  
تو دیکھنا ستاروں کے درمیان  
ہر ایک تارے کے گرد لپٹی  
میں وہیں بھری ہوئی ملوں گی!

### Mirtha Michelle Castro Marmol

صحیح دھیرے دھیرے فوڈی ایور آفڑ کے گرد دھند لکے تا نے جا رہی تھی۔ مختدرا ہوا ناشتہ یونہی ڈھکار کھا تھا اور زمر یوسف باز دیز پر بچھائے سران پر نکائے سورہی تھی۔ دروازے کالاک کھلنے کی آواز آئی تو اس کی آنکھ کھلی۔ پھر وہ تیزی سے سیدھی ہوئی اور نیند سے بھری آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بیرونی دروازہ کھول کر جنید اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ رکا۔ آنکھوں میں حیرت در آئی۔

”آپ؟ اس وقت؟“ اس نے گھری کی بجائے مژکر آسمان کے رنگ کو دیکھا۔ وہ بال کانوں کے پیچھے اڑتی ابھی ابھی سی اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔ ”فارس نظر آیا کہیں جنید؟“

”نہیں تو۔ مگر آپ کیسے آئیں؟ باہر تو کوئی کا نہیں کھری۔“

زمر چوک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”فارس کہاں گیا؟ کا رہ گئی لے گیا؟“ وہ اسے کال ملانے لگی۔ گھنٹیاں جا کر پلٹ آئیں مگر جواب نہ ملا۔ جنید ناشتے کے برتن نظر انداز کرتا پکن کی طرف بڑھ گیا۔ (پکن میں رات کے معروکے کے نشانات وہ حتی المقدور صاف کر چکی تھی) فارس کا پیغام چند لمحوں بعد موصول ہوا۔ ”ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم گھر پلی جانا۔“

زمر کے ابروں گئے۔ آنکھوں میں دباد بسا غصہ ابھر آیا۔ اس نے پس اٹھایا، موبائل اندر پھینکا اور باہر نکل آئی۔ ”کیب سے جاؤں گی کیا ب؟ اتنا بھی خیال نہیں آیا سے۔“ اس کا سارا موذ خراب ہو پکا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں ..... بندے بندے میں بو خدائی کی صحیح کی دودھیاڑو شنی میں سورج کی سنبھری تاریں ملیں تو آسمان مزید روشن ہو گیا۔ ایسے میں اس بلند عمارت کی بالائی ترین منزل کے کارزا فس میں ہاشم اپنی پاور جھپر پر موجود تھا۔ گرے سوٹ اور نٹائی میں ملبوس، بال جیل سے پیچھے کو جائے آنکھوں پر عینک لگائے وہ چند کاغذ پڑھ رہا تھا۔ سامنے کری پہ احر شفیع اٹھے کندھوں کے ساتھ گھٹنے ملا کر بیجا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

ہاشم نے دفتار عینک اتاری اور جہڑہ اٹھاتے ہوئے کاغذ دیز پڑا لے۔

”بے کار ہے یہ سب۔ اس میں کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ خینے نے اوی پی کو بلیک میل کیا تھا۔“

”لیکن اس سے یہ ثابت ضرور ہوتا ہے کہ اس نے اوی پی کی بیٹی کی ویڈیو بتاہ کرنے کے عوض کوئی تخفیض وصول کیا تھا، وہ ان میلز میں حمیرا کویہی بتا رہی ہے، مگر ظاہر ہے حمیرا یہ نہیں سمجھ سکی کہ یہ تخفیض لیک شدہ پیپر ز تھے۔“ احر بے چینی سے بولا۔

”میں مانتا ہوں ایسا ہی ہوا ہو گا، لیکن کوئی ثبوت نہیں ہے اس بات کا۔“ ہاشم نے کندھے اچکائے تھے۔ احر گہری سانس لے کر کھڑا ہوا۔ ”پھر میں نئی نوکری تلاش کرنا شروع کر دیتا ہوں سر۔ شکریہ آپ نے میری بات سنی۔“ وہ واپس مڑا اور چند قدم دور گیا جب ہاشم نے پکارا۔ ”تم اپنے آفس میں واپس آچکے ہو۔ میں بات کر کے مکر نہیں جاتا۔ میں اس کو دوسرے طریقے سے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ وہاں فون اٹھاتے ہوئے کھڑا رہا تھا۔ احر نے مژکر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

”شکریہ سر۔“ وہ باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے مکا فضا میں لہرایا ”لیں!“ اور آگے بڑھ گیا۔ حیمہ نے بے اختیار اسے سراٹھا کر

اندر ہاشم فون کان سے لگائے میز پر کھلی اپنی ڈاک کھول رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ ناخوشی سے انگریزی میں تیز تیز بولتا جا رہا تھا۔ ”کون سا کیس؟ کوئی کیس نہیں چلے گا۔“ میں نے پچھے ماہ سے پہلے اگلی تاریخ نہیں لینے دینی ان کو۔ بوڑھا کر دوں گا ان کو یوں نہیں۔“ ڈاک الگ کرتے ہوئے اس نے چند لفافوں کو بنا کھولے روی کی ٹوکری میں اچھال دیا، اور کچھ کو علیحدہ رکھ دیا۔ اور یہ تیجی تھا جب اس نے وہ لفافہ دیکھا۔ بات کرتے ہوئے اس کے ابر و بھنپے۔

وہ پرانے کاغذ کا پیلا زرد سالفافہ تھا۔ دیکھنے سے بھاری معلوم ہوتا تھا۔ اس نے تعجب سے موبائل رکھتے ہوئے اسے اٹھایا۔ اٹ پٹ کر دیکھا۔ پھر پیپر ناٹ کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔ اندر کوئی دیزیر شے تھی۔ ہاشم نے انگلی سے کھینچ کر اسے باہر نکالا۔ وہ ایک بزرگ پاسپورٹ تھا۔ فرنٹ کو اور چند صفحات۔ اس نے پہلا صفحہ پلانایا اور... ایک دم وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پاسپورٹ ہولڈر کی قصور یہ سامنے تھی۔ بڑھی شبیو والا سعدی یوسف۔ لیکن.... پاسپورٹ ادھورا تھا۔ اس نے اٹ پٹ کر دیکھا۔ پھر لفافے میں جھاناک۔ اندر ایک اور پرانے طرز کا کاغذ تھا کیا رکھا تھا۔ ہاشم نے اسے نکالا۔ اس پر انگریزی میں گویا قلم دوات سے چند لفاظ تحریر تھے۔ ”سعدی یوسف کو عدالت میں دہشت گرد ثابت کرنے کے لئے یہ پاسپورٹ کافی ہے۔ لیکن اس کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ اس نے یہ تریش کیں میں اچھال دیا تھا۔ میں نے اس کے سارے ٹکڑے جمع کر لیے ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اسے تمہیں مکمل کر کے دوں تو اپنے نویٹر اکاؤنٹ سے یہ نمبر لکھ کر ٹوینٹ کرو۔ میں سمجھ جاؤں گا۔“

## فقط

ایک خیر خواہ۔

نیچے ایک نمبر درج تھا۔ ریاضی کے چند بے سرو پا ہندے۔ وہ کچھ دیر سو چتارہ، پھر اس لفافے سمیت تمام اشیاء کو دراز میں ڈال دیا۔

اسی پل اس کا فون بجا۔ بلا کڈ نمبر کا لگ۔ اس نے پہلے بائل کان سے لگاتے ہوئے احتیاطاً ہیلو کہا۔ ”سر..... کیا آپ میری بات سن سکتے ہیں؟“ وہ خاور تھا۔ ہاشم نے ایک نظر بند راز کو دیکھا اور پھر گہری سانس لی۔ ”میں نے سعدی یوسف کی جان مچائی تھی خاور۔ میرے اس کے ساتھ بہت سے اختلاف ہیں، اور اپنی اس ویڈیو کے بعد میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں لیکن ایک محب وطن بر کے کو دہشت گرد قرار دے دیتا..... خیل میں نہیں کرنا چاہتا۔ کسی کو مارنا الگ بات ہے۔ جیتنے میں مارنا بالکل الگ۔ اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ کیس کبھی عدالت میں نہیں چلے گا۔ اس لیے مجھے اس پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے جو تم روشنوت کے طور پر بھیج رہے ہو مجھے۔“

”سوری سر؟ کون سا پاسپورٹ؟“ وہ اپنی جگہ الجھ گیا تھا۔ ”میں نے آپ کو کچھ نہیں بھیجا سر۔“ پھر روانی سے بولا۔ ”اگر آپ مجھے اپنے بندوں سے تلاش کروانے کی بجائے میری بات سن لیں تو میں آپ کے والد کے قتل کا معہد حل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ پا اعتبار کرنا ہو گا۔“ پھر وہ ٹھہر کر بولا۔ ”آپ کے لئے میں نے اپنی زندگی کے اتنے سال لگادیے، مگر آپ نے مجھ سے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کر میں بے گناہ تو نہیں ہوں؟ کیا میر اتنا بھی حق نہ تھا، سر! ایک دفعہ تو پوچھا ہوتا سر کہ میرے باب کا قاتل کون ہے، پھر میں پاتال سے بھی اس کو کھینچ کر لے آتا، مگر آپ اس لڑکے کی باتوں میں آگئے۔“

”سنوا خاور! جلد یابدیر میرے آدمی تمہیں ڈھونڈ لیں گے۔ اس لیے اب دوبارہ فون نہ کرنا۔“ تاگواری سے کہتے اس نے فون رکھ کر

لیپ ناپ کھولا۔ البتہ دماغ کی ایک ہتھی مسلسل جلنے بھئے گئی تھی۔ اگر خادونبیں تھا تو یہ کون سا تیرافریق تھا جو درمیان میں کوڈ پڑا تھا؟ چند منٹ ہی وہ کام کر پایا اور پھر ایک دم سے اس نے فون اٹھایا اور ایک نمبر ملا کر اسے کان سے لگایا۔ ماتھے پر بل ڈالے وہ گھنٹی سنترارہا۔

”تم نے کہا تھا تم اس آخری چیز کی قیمت لگاؤ گی، کیا وہ یہ پاسپورٹ ہے جو تم نے مجھے بھیجا ہے؟“

”کون سا پاسپورٹ؟“ علیشا نے حیرت سے دہرا یا تھا۔

”اوا کاری مت کرو۔“ وہ اکتا کر کہہ رہا تھا جب.....

”تمہارا ایک میموری کا رد تھا میرے پاس۔“ ہاشم ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”تمہارے باپ کا کمپیوٹر ہیک کیا تھا نا میں نے یاد ہے؟ وہیں سے کچھ ملا تھا مجھے۔ مگر وہ معلومات ایسی تھیں کہ میں ان کو استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ سوچا کسی اور کو دے دوں ورنہ تم تو میری جان لے لو گے۔ خیراب وہ سب میرے لیے بے کار ہے اور وہ تمہیں بھی نہیں اب ملے گا۔ رہی میں..... تو میں ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے تمہاری زندگیوں سے جارہی ہوں۔“

ہاشم فون بند کر کے سوچتا رہا۔ اگر وہ حق کہہ رہی تھی تو بھی اور نگریب کے کمپیوٹر میں کم از کم وارث غازی کی فائلز تو تھیں نہیں سو وہ اس کے ہاتھ نہیں لگی ہوں گی۔ باقی ہر چیز کی خیر ہے۔ سر جھٹک کر وہ دوبارہ کام کرنے لگا۔

.....❖❖❖.....

اس بار وہ تلخی ہے روٹھے بھی نہیں ہم ..... اب کہ وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے ہم ہسپتال کی چکتے فرش والی راہداری، خاموش اور سرد پڑی تھی۔ فارس نے کمرے کے دروازے پر انگلی کی پشت سے دستک دی، پھر دروازہ دھکیلہ تو اندر کا منظر کھلتا چلا گیا۔

بیٹھ پر ٹھاٹ تانے آبدار نیک لگائے بیٹھی تھی، اور ایک نر اس کے پیچھے نکلے برابر کر رہی تھی۔ اس کے سرخ بال پونی میں بندھتے تھے اور پھرے پر مرد نی چھائی تھی۔ کلینیاں خت پیوں میں بندھی تھیں اور وہ برے موڈ کے ساتھ نر اس سے نقاہت سے کچھ کہہ رہی تھی جب آہٹ سنی تو چہرہ پھیرا۔

اسے چوکٹ میں کھڑے دیکھ کر نگاہوں میں تھی درآیا۔ سانس بھی تھم آیا۔ پھر سر کے خم سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سلام کہتا اندر داخل ہوا۔ کرہ کافی وسیع و عریض اور پر تیش تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب رکھے شاہانہ طرز کے کا واقع پر بیٹھ گیا اور ناگن پٹا نگن چڑھا لی۔ پھر بلوں پر بندھنی رکھئے خاموشی سے آبدار کو دیکھنے لگا۔ آبی نظریں جھکالی تھیں۔ نر باہر نکل تو وہ ہلکے سے کھنکھارا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

آبدار نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر نقاہت سے مسکرائی۔ ”اب ٹھیک ہوں۔“ ”ذرار کی۔“ بابا سے ملاقات ہوئی آپ کی؟“ ”میری شکل پر گدھا لکھا ہے کیا جو ان کے ہوتے ہوئے ادھر آتا؟ وہ نکلے ہیں تو آیا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ انداز میں کاٹ سی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔ نظریں جھکالیں۔

”کیوں کیا آپ نے ایسا؟“ اب کے وہ نرمی سے بولا تو وہ اپنے پیوں میں بندھے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

”مجھے اور کچھ سمجھنہیں آیا۔ آپ میری کال نہیں اٹھا رہے تھے۔“

”تو اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو اٹھا لیتا آپ کی کال؟ ایسے کون کرتا ہے؟ اپنے والد کا تو سوچنا تھا۔“ آبدار نے بھیگی آنکھیں اٹھائیں۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے آنسو گا لوں پر لڑک رہے تھے۔ ”میں نے آپ کو اتنی کا لزکیں، آپ کیوں نہیں آئے؟“  
”میں مصروف تھا۔“

”کس کے ساتھ؟“ اس نے آنکھیں اٹھا کر تیزی سے پوچھا تو وہ اتنی ہی تیزی سے بولا۔  
”آپ کو حق ہے یہ پوچھنے کا؟“

آبدار کی اس پر جبی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔ ”آپ چلے جائیں۔“ اور وہ پیچھے سے اپنے تیکے جوڑ نے لگی گواہی  
اسے جانے کا عنديہ دے کر اب لینے لگی ہو۔

”آبدار!“ وہ کہتے ہوئے اٹھا گدروازے کی طرف جانے کی بجائے اس کی جانب قدم بڑھائے۔ ”آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے  
تھا۔“ اس کی آواز میں نرمی تھی۔ وہ تیکے جوڑ تی رک گئی۔ چہرہ اٹھا کر بلی جیسی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی جو ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے  
قریب آ رکتا تو وہ بیٹھے ذرا پرے ہوئی۔ وہ آہستہ سے اس کے بازو کے قریب بند پر مبیٹھا۔

”اگر آپ کو مجھے بلا نا تھا تو اس کے دوسرا طریقے بھی تھے۔ یہ سب کر کے آپ نے مجھے تکلیف دی ہے۔“ وہ اسے فکر مندی سے  
دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور آلبی کی بھیگی آنکھیں بے خودی کے عالم میں اس پر جبی تھیں۔

”مجھے افسوس ہے اگر میری وجہ سے آبدار آپ کو کبھی کوئی غلط تاثر ملا، مگر میری نیت ہمیشہ صاف رہی۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔“ وہ  
اس پر نظریں جماۓ دکھ سے کہہ رہا تھا۔ ”کیونکہ میں نے اپنی ساری زندگی بہت احتیاط سے لگزاری ہے۔ جس کے اوپر دل ہارا اس کے نام کو  
بھی اپنے نام کے ساتھ آلودہ ہونے نہیں دیا، اس لئے کوئی آپ کے نام کے ساتھ میرا نام جوڑے، مجھے اس بات نے بہت پریشان کیا ہے۔ اسی  
لئے ادھر آیا ہوں۔“ وہ نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ آلبی کے لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔ آنکھیں ہنوز ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

”آپ کو میری فکر تھی؟“

”ظاہر ہے مجھے فکر تھی!“ اسی نرمی سے کہتے ہوئے فارس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کا پیسوں میں لپٹا ہاتھ تھا۔ آبدار کا سانس رک گیا۔  
وہ یک نک اسے دیکھے گئی۔ ”اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ دوبارہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔“ اس کی آنکھیں آلبی کی آنکھوں پر جبی تھیں اور  
دونوں ہاتھوں میں اس کی باتی کلام کھلی تھی۔

”پہلے آپ وعدہ کریں کہ میرے بلا نے پر آ جایا کریں گے۔“

فارس نے گھری سانس لی۔ ”میں..... وعدہ کروں؟ میں مس عبد ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک شادی  
شدہ آدمی کو کیسے ڈیل کیا جاتا ہے؟“

”کیسے؟“ وہ چینیجنگ انداز میں مسکرائی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ چند پل۔ چند ساعتیں۔ بنا پل جھپکے۔ اور پھر ایک دم فارس کی انگلیوں  
نے اس کی کلامی کی پی کو جھکا دیا۔ آبدار کی کراہ لکلی گراس سے پہلے کہ وہ ہکابا کسی اپنا ہاتھ چھڑاتی، وہ درشتی سے ایک ہاتھ سے اس کی کلامی  
تھامے، دوسرا سے اس پر لپٹی پی ٹھیک کرتا تارہ رہا تھا۔

”چھوڑیں۔ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ چلامی مگر فارس نے پی کی آخری تہہ نوچ کر پرے چینیکی اور اس کی کلامی اٹھائی۔ وہ بے داغ  
تھی۔ خراش تک نہ تھی۔

”جس طرح آپ کے والد صاحب نے مجھے بات کی، مجھے بہت برا لگا۔ وہ ہوتے کون ہیں مجھے قصور و اڑھبرانے والے۔“ اس  
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ غرایا تھا۔ آبدار کا چہرہ سفید پڑا۔ آنسو تک خشک ہو گئے۔ ”میں نے آبدار بی بی چار سال جیل میں گزارے  
ہیں۔ وہاں ایسے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کی شکل دیکھ کر بھی آپ کی جان نکل جائے گی، میں نے ان کے ساتھ مزدا یوکیا ہے۔ آپ کے یہ بے

کارڈ رامے سرداں یونیٹس کروں گا کیا؟“ اس کی کلائی کوزور کا جھنکا دے کر چھوڑا۔ وہ شل سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سرخ پرپتی آنکھیں اس پر جانے انگلی اٹھا کر بولا۔ ”آئندہ آگر آپ نے مجھے کال کی یا میرے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑنا چاہا، یا میرے گھر اور رسٹورانٹ کا رخ بھی کیا تو میں کس حد تک جا سکتا ہوں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ بات آئی ہے دماغ میں یعنیں؟“ غصے سے بولتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آبی نے شل نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو آپ یہاں صرف اپنا نام صاف کرنے آئے تھے۔“

”جی ہاں۔ کیونکہ جب میں نے آپ کو بھی کوئی غلط تاثر نہیں دیا تو آپ کی ان جذباتی حرکتوں کے لئے مجھے ذمہ دار نہ ہی ظہراً میں آپ کے والد صاحب تو اچھا ہے۔ میں ان کے باپ کا ملازم نہیں ہوں جو ان کی باتیں سنوں گا۔ اس لیے ان سے کہیے گا، میرے منہ نہ لگیں آئندہ!“ برہمی سے بولتا ایک قہر آؤ دنظر اس پر ڈانتا، اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

فارس دروازے تک پہنچا تھا جب اسے آواز آئی۔ اس نے چونک کر مرکر دیکھا۔ وہ اپنی دوسری کلائی کی پیٹاں نوج نوج کر اتار رہی تھی۔ فارس کے ابر و اکٹھے ہوئے مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے روک پاتا، وہ کلائی برہنہ کر چکی تھی۔

”یہ ہے وہ جو میں نے کائی تھی۔“ گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھتی وہ بولی تھی۔ فارس نے بے اختیار اس کی پہلی کلائی کو دیکھا جو سوائے ذرا سی کھروج کے صاف تھی الی کلائی۔ یہ بڑی طرح زخمی دکھائی دیتی تھی۔ لمحہ بھر کو وہ کچھ بول نہیں سکا۔

”وہ... تمہارے لیے... فارس غازی... ایسا... بھی نہیں کرے گی۔“

فارس نے بڑی مشکل سے قدم اٹھائے تھے۔ وہ کچھ کہنے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ اب ہڈیاں انداز میں خود سے لگی سویاں اور نالیاں نوج نوج کر پھینکنے لگی تھی۔ اس کے برف ہوئے آنسو بروائی سے گرنے لگے تھے۔

❖ ❖ ❖

سوادِ درد میں تنہا کھڑا ہوں..... پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے  
سورج کی نرم گرم روشنی مورچاں کو اس دھندر آلو صبح میں بھی دہکارہ تھی۔ زمر واپس آکر اندر جانے کی بجائے لان میں گھاس پر رکھ جھوٹے پا آبیٹھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے گھنگریا لے بال اڑا رہی تھی مگر وہ بے نیازی اسی طرح بیٹھی، آنکھیں موندے جھوڑا لیتی رہی۔ جوتے اور پرس گھاس پر ہی ادھر ادھر لڑھکے پڑے تھے۔

بالائی منزل کی کھڑکی سے اندر جھانکو تو حنین لیپٹاپ کے آگے جڑی بیٹھی تھی۔ دلچسپی سے وہ اسکرین پر کھمی عبارتیں پڑھ رہی تھی۔ ساتھ بیڈ پر اکڑوں بیٹھا اسامة تھوڑی گھٹنے پر کائے گم صنم سانظر آ رہا تھا۔  
نخلی منزل کا منظر کسی عام صبح سے مختلف لگتا تھا۔ ندرت اور حسینہ پکن میں تھیں۔ ناشتے کی مہک، پر اٹھوں کی خوشبو برتوں کی اٹھائی، ندرت بہن، بہت جوش سے اہتمام کرنے میں لگی تھیں۔ لا و نج میں بیٹھے ابا بھی صداقت کو ڈپٹ ڈپٹ کرایک ایک کونا صاف کرنے کو کہر رہے تھے۔ جانتے تھے سعدی، زمر کی طرح کتنا غافت پسند تھا۔ حسینہ کو خوب تاؤ چڑھ رہے تھے۔ (زراڑ رامہ ہے سارا خاندان۔ نال میں پوچھتی ہوں اس زخم والے منہ لئے سوکھے بڑے لڑکے میں رکھا کیا ہے جو سب اس کے لئے پاگل ہو رہے ہیں۔ سید ہے منہ سلام تو اس نے مجھے کیا نہیں۔ اب تھوں والے پر اٹھے بنا اس کے لئے۔) وہ رات سے پھر کی کی طرح گھوم رہی تھی اور اب دل چاہ رہا تھا۔ اس پر اٹھے میں زہر ملا دے۔ بیلن کو آٹے پر برابر کرتے، بڑیڑاتے ہوئے اس نے سراٹھا یا تو چوکی۔

سعدی کندھے پر بیگ لئے، چہرہ جھکائے کچن کے باہر مکھے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ ندرت ابھی ابھی لا و نج میں گئی تھیں۔ (سعدی دوسری جانب سے آیا تھا) سوکی نے اسے آئنے نہیں دیکھا۔ حسینہ چند لمحے تو کھڑی رہی، پھر بیلن رکھ کر باہر نکلی۔ ندرت اور ابا مشترک کے طور

پہ صداقت کوڈا نت رہے تھے۔ سیم زینے اترتا آرہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ وہ آخری سیر گھی تک پہنچا تو حسینہ نے کمر پہ ہاتھ رکھے، آنکھیں گھما کر مزے سے اطلاع دی۔ ”اسامہ بھائی.... وہ تو چلا گیا سامان سمیت۔ اب ناشتہ بناؤں یا نہ بناؤں؟“

”کون؟“ اسامہ سراخا کرنا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا اور پھر جس لمحے سے سمجھ آئی..... وہ ایک دم باہر کو بھاگا۔ لا وغنا ایک جست میں عبور کرتا وہ پورچ کے دروازے سے باہر جانکا۔ حسین نے (ہونہہ) سر جھکا۔ (پاغل!)

اسامہ نے باہر آ کر گردن اور ادھر ادھر گھمائی۔ وہاں سعدی کہیں تھا۔ صرف زمر جھولے پہ آنکھیں موندے سر پیچے گرائے بیٹھی تھی۔

”بھائی چلا گیا، پچھووا“ زمر نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ حواس باختہ سا اس تک آ پہنچا تھا۔

”آپ نے بھائی کو جاتے دیکھا؟“

”ہاں دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ دھیان نہیں دیا..... مگر وہ آیا کب؟ اور وہ چلا کیوں گیا؟“ وہ حیران کی جگہ سے اٹھی۔ یاد آیا رات فارس فون پہ کچھ کہرہ رہا تھا۔ اسامہ نے روپاں سا ہو کر اسے دیکھا۔

”کیونکہ میں نے ان کو کہا تھا کہ.....“

باہر گئے درختوں کی قطار کے ساتھ رُک پہ سر جھکائے چلتا جا رہا تھا۔ بیگ کندھے پہ تھا اور ہاتھ جبز کی جبوں میں تھے۔

”سعدی!“ اس نے وہ آواز سنی تو قدم زنجیر ہوئے۔ وہ ٹھہرا۔ پھر دھیرے سے مڑا۔

دور..... دس بارہ میسر کے فاصلے پہ زمر کھڑی تھی۔ رات والے جملاتے سیاہ لباس پہ جیکٹ پہنے، گنگریاںے بال آدھے باندھے وہ بہت دلگرفتہ کی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہیں دور کھڑی..... ننگے پاؤں، اس سے چند قدم وہ پیچھے اسامہ کھڑا تھا۔ مگر اس نے چہرہ جھکا رکھا تھا۔

سعدی کے چہرے پہ کرب سا بھرا۔ زمر پہ اپنا نیت بھری نظریں جمائے وہ بار بار کچھ کہنے کو لوب کھوتا پھر بند کر دیتا۔ پہلو میں گری سنجھیاں کبھی بھیجن لیتا، کبھی ڈھیلی چھوڑ دیتا۔

ننگے پاؤں کھڑی زمر نے سینے پہ بازو لپیٹے اور مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

”خدا حافظ کہے بغیر جارہے تھے کیا؟ اور اس سلام کا کیا جو خدا حافظ سے پہلے کہنا تھا؟“

سعدی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہیں کھڑا اسے انہی مغموم نظریوں سے دیکھتا رہا۔ دونوں کے درمیان کئی گز کا فاصلہ تھا۔

”سلام!“ اس نے سر کے خم سے سلام کیا۔ آواز گلی روکھی سی تھی۔

”تم ہماری سلامتی چاہتے ہو تو جا کیوں رہے ہو؟“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں اوپر کر کے بولی تھی۔

”نہیں رہ سکتا یہاں۔ وحشت ہوتی ہے مجھے۔ دل نوٹا ہوا ہے میرا۔“ وہ جب بولا تو الفاظ سرگوشی میں ادا ہوئے، مگر انہیں زمر پہ جی میں۔ ان میں بے چارگی، خود ترسی، شلسٹگی سب کچھ تھا۔

”ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب تین گولیاں لگتی ہیں اور سارے اپنے چھوڑ جاتے ہیں، ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ پکار کر بولی تھی۔ ”جیسے سب پہ کے بغیر مزے کر رہے ہیں اور صرف آپ تنہا اذیت کاٹ رہے ہیں۔ میں اس سے گزر چکی ہوں۔ تم گزر رہے ہو۔ چنانہ تھا رہے ہاتھ جسے ہے۔ وہ کرنا ہے جو میں نے چار سال پہلے کیا تھا؟ سب کو اپنی زندگی سے باہر ھکیل کر دروازے بند کر کے خود کو اکیلا کرنا ہے۔ یا پھر دروازہ جو ہے؟ اور روشنی کو اندر آنے دینا ہے؟ کیونکہ کچھ لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے لئے پھلا جائے۔“ بولتے بولتے اس کو سانس تھے تھی تھی مگر اس پنگاہیں جمائے وہ کہے جا رہی تھی۔ ”تم نے چننا ہے، تم نے فیصلہ کرنا ہے.... اپنے خاندان سے دور ہو کر خود کو جو زلوگ تو جھنے جھنے کر نکل جاؤ، اور اگر میری غلطیوں سے سبق سیکھنا ہے تو واپس آؤ اور مجھے سلام کہو۔“ وہ کہہ کر سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی منتظری اسے چھوڑ دی۔ اس کا دل اندر سے بہت زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اگر وہ چلا گیا تو؟

”میرے اندر کا زہر سب کو بہر کرے گا اگر میں یہاں رہا تو۔“

”نبیس سعدی۔ بات یہ ہے کہ تمہیں نفرت ہے اس کام سے جو خین نے کیا کیونکہ تمہیں محبت ہے خین سے۔ فیصلتم نے کرنا ہے۔ اس کے کام سے نفرت زیادہ شدید ہے یا اس کی محبت زیادہ شدید ہے۔ جس میں زیادہ شدت ہوگی وہ تم سے چنانہ کروالے گی۔“ سعدی نے خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھا..... اور اس کے عقب میں چہرہ موڑے کھڑے سیم کو۔ ”مجھے نہیں لگتا اب کسی کو میری ضرورت ہے۔ سب میرے بغیر رہنا سیکھ کچے ہیں۔“ اسامہ کے جھکے چہرے پر ایک آنسو ٹڑھا تھا۔

”اسی لیے سب تمہیں اپنی زندگی میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ ضرورت کے تحت نہیں۔ کسی کو تھاہری ضرورت نہیں ہے سعدی۔ مگر محبت کے تحت۔ اور کیا تمہیں ابھی تک سمجھنیں آیا کہ رشتے وہ زیادہ خالص ہوتے ہیں جن میں محبت ضرورت پر حاوی ہو جائے۔“ اور اس لمحے.... گھنے درختوں کی قطار کے قریب چھایا میں کھڑے سعدی یوسف کو اس دھنڈلی صبح سب کچھ صاف نظر آنے لگا تھا۔ ایک دم سے دماغ اور دل کے آئینے کی ساری گرد کسی نے ہاتھ پھیر کر صاف کر دی تھی۔ وہ چونکہ کمز مرکود یکھنے لگا۔ وہ ابھی تک سینے پر بازو لپیٹ کھڑی محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سعدی نے بیگ نیچے ڈال دیا۔ پھر قدم قدم چلتا وہ فاصلہ عبور کرنے لگا۔ زمرہ ہیں کھڑی رہی۔ وہ آگے بڑھتا آیا۔ یہاں تک کہ اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا۔ پھر بھیک آنکھیں اٹھائیں اور ”السلام علیکم!“ کہتے ہوئے اس کے گرد اپنے بازو لپیٹ کر اسے خود سے لگایا۔ ”میں کہیں نہیں جا رہا۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔“

اسامہ خاموشی سے سعدی کی سابقہ جگہ تک آیا اور اس کا بیگ اٹھا کر گھر کی طرف بڑھ گیا۔ زمر نے اس سے علیحدہ ہوتے مسکرا کر نم آنکھوں سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے اسے دیکھا۔ ”ولکم ہوم!“ یہ دوچھ تھا جس کو اس نے انگلی پکڑ کر چلا سکھایا تھا۔ جورات کو کہانی سے بغیر نہیں سوتا تھا۔ اسے آج بھی کہانیاں سنانے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ صرف ”باتوں“ سے سمجھتا تھا۔ اسے صرف باتوں کافن آتا تھا۔ اس کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر... بہتال کی رات جب سے وہ کھو یا تھا.... سے لے کر نواہ بعد.... اس کو یوں اپنے سامنے کھڑے دیکھنا.... اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنا اسے مسکرا کر تسلی دینا.... زمر کو لگ رہا تھا اس کی ساری دنیا واپس مل گئی ہے۔ وہ پہلے سے دبلا پلا ہو گیا تھا۔ کمزور۔ منہ کا رخ مبھی قدرے مندل تھا گر بہر حال موجود تھا۔ ”چیز بتاؤ“ کیا اس نے بہت زور کا مارا تھا تمہیں؟“ وہ اس کی کہنی تھا میں گھر کی طرف نہیں ہوئے واپس آتی اس سے پوچھ رہی تھی۔

سعدی نے چونکہ کر اسے دیکھا۔ ”کس نے؟“

”فارس نے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ ذہنی سے سر جھٹک کر سامنے دیکھا چلنے لگا۔ زمر نے گھری سانس بھری۔ اسے کیوں بھول گیا تھا کہ وہ چھفت کا ایک نوجوان تھا جو کبھی اپنے گھر کی عورتوں کے سامنے مار کھانے کا تذکرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اتنے عرصے بعد ملے تھے۔ وہ موقع کی مناسبت سے اس سے چھوٹی چھوٹی مگر متاطاسی با تیں کرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ زیادہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس چپ تھا۔

وہ دونوں گیٹ سے اندر چل گئے مگر اسامہ اس کا بیگ لئے وہیں پورچ کے ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ وہ کسی گھری فکر مند سوچ میں تھا جب باہر سے کار اندر آتی دکھائی دی۔ تب وہ جگد سے اٹھا۔ فارس ڈرائیور نگ ڈر کھولتا چاپی جیب میں اڑستا باہر نکل رہا تھا۔ اسے یوں بیٹھنے دیکھ کر ابرو تجھ سے اکٹھے ہوئے۔

”اے... تم ادھر کیا کر رہے ہو؟ اسکوں نہیں جانا؟“ وہ لبڑگ بھرتا اس تک آیا۔

”سعدی بھائی گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ شکر ہے زمر پھضونے روک لیا۔“ اس نے ہلکے ہلکے انداز اور ہلکے دل کے ساتھ اطلاع دی۔ فارس کے ماتھے پبل پڑے۔ غصے سے اندر ھلتے بندرو روازے کو دیکھا۔

”جناب کا دماغ درست نہیں ہوا بھی تک۔ دو ہاتھ اور لگنے چاہیے تھے اسے۔ اس کی تو آج میں طبیعت صاف کرتا ہوں۔“

”ماموں!“ سیم نے خفگی سے اسے دیکھا۔ مگر وہ سر جھٹک کر اندر چلا گیا تھا۔

ڈائینگ ٹیبل پر ناشتے کے برتن بجے تھے۔ ندرت تازہ پراٹھے لا کر کھرہ ہی تھیں۔ سعدی اب مسکرا کر ابا سے دھمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ فارس کو دور سے آتے دیکھا تو رکھنے کا سارا سختم دیا۔ فارس بیوں پر مسکرا ہٹ جائے اس تک آیا۔ اس کا کندھا زور سے دبایا۔ ”ویکلم ہوم“ سعدی!“ مسکرا کرہتا اس کی طرف جھکا، اور اس کے کان کے قریب سر گوشی کی۔

”زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں ہے بیرو۔ واپس آگئے ہو تو تمیز سے گھر میں رہو۔ ماں کا خیال ہے یا نہیں؟ اب کوئی اٹھ سیدھی حرکت کی تو دیکھنا۔“ برہمی سے اسے آہستہ سے ناکروہ سیدھا ہوا اور مسکرا ہٹ دوبارہ سے بیوں پر طاری کئے آگئے بڑھ گیا۔ سعدی گھری سانس لے کر ہے گیا۔ (واقعی ویکلم ہوم!)

وہ اپنے کمرے میں آیا تو زمر کوڑ کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اسے نظر انداز کئے آئینے کے سامنے کھڑی لپ اشک لگاتی رہی۔

”آہم!“ وہ ہلکا سا کھنکھارا۔ ”اس ناشتے کا کیا کیا؟“

زمر نے آواز کے ساتھ لپ اشک بند کی اور اس کی طرف گھوئی۔

”تم فجر پڑھنے گئے تھے یا تراوتؔ؟“

”کیوں میری عبادتوں کو نظر لگاتی ہو؟ استغفار اللہ!“ اس نے کان کی لوکو چھوڑا۔

”کہاں گئے تھے؟“ وہ چھتی نظریں اس پر جمائے تفتیشی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”تیری بیوی کے پاس!“ زمر کے تاثرات بگڑے۔ ماتھے کی سوریاں بڑھ گئیں۔

”تو پھر ادھر ہی رہتے نا۔“ وہ طنزیہ سر جھلا کر بولی تھی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔

”میں اس امر کو تینی بنانے گیا تھا کہ وہ دوبارہ میرے اور تمہارے کسی ناشتے، کسی کھانے کے درمیان نہ آئے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اتنے اعتماد اور مان سے بولا کہ زمر کے تے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ بھوری آنکھوں میں امید سی چمکی۔

”وہ اب کبھی بھی کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔ مجھ پر اعتماد کرو۔“ اس کی آنکھوں کا بھروسہ... اور مان... وہ چکل گئی۔ اور پھر ہلکا سا مسکرائی۔ ”وہ گئی ہے تو کوئی اور آجائے گی۔ تم بھی تو عادت سے مجبور ہو۔“

”آپ کی ان ہی ادائوں کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ.... بندہ جیل سے کبھی واپس ہی نہ آیا ہوتا۔“ وہ خفگی سے کہتا پڑت گیا تو وہ بے اختیار میں دی۔

(دونہر آدمی.....) وہ کمرے سے نکل گیا تو زمر نے ڈرینگ ٹیبل کی اوپری دراز کھوٹی اور پیچھے ہاتھ ڈال کر کچھ باہر نکلا۔ سیاہ مختلیں ڈیبا جس پر زمانوں کی گرد پڑی تھی۔ زمر نے گرد جھاڑی اور اسے کھولا۔ اندر کھی دیتی ہوئی ہیرے کی لوگنگ ہرگز اور آلا اش سے پاک تھی۔ وہ مسکرا دی۔ اس نے لوگنگ کی ڈبی پرس میں ڈالی اور بال برش کرنے لگی۔ (فارس غازی جب آج یاکل اسے یہ لوگنگ پہنچ دیکھے گا تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟ اف۔ وہ اس کی دُھ، ڈھل دیکھنے کے لئے بتا تھی۔)

زمر باہر آئی تو فارس سمیت باقی سب ناشتہ کر رہے تھے۔ اسے پہلے دالینا تھی سوکچن میں آئی۔ گول میز پر چنین اکیلی چائے پی

”حمد۔ تم ادھر ہی؟“ حسین نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”جی میں ادھر ہی ہوں۔ اسی گھر میں۔ لیکن کوئی بات نہیں اگر آپ مجھے بھول گئیں۔ کوئی بات نہیں اگر آپ کو میری کمی محسوس نہیں ہوئی۔ حسنه تو ہمیشہ سے پس منظر میں ہوتی ہے۔ یہ اتنے مبینے تو وہ آپ کی نظر میں سعدی یوسف کے sad reminder کے طور پر موجود تھی۔ اس کے lesser version کے طور پر۔ مگر اب وہ آگئی ہے تو میں بھی اپنی پرانی جگہ پر اپس آگئی ہوں۔ رہیں آپ تو آپ کے لئے ہمیشہ سعدی سب کچھ تھا۔ صرف سعدی۔ سو آپ ناشتہ انجوائے کریں اور میرے لئے گھنی فیل نہ کریں۔ مجھے اپنی بد صورت سچائیوں اور اپنے اندر موجود شیاطین کے ساتھ رہنا آگئیا ہے!“ وہ چائے کامگ اور سیل اٹھا کر سادگی سے کہتی اس کے ساتھ سے نکل کر باہر چلی گئی۔ زمر بالکل خاموش سی ہو گئی تھی۔ اور کچھ خفا بھی۔ اسے سمجھنیں آرہا تھا کہ گھر کے ایک فرد کے راضی ہونے تک دوسرا کیوں ناراض ہو جاتا تھا!

❖❖❖

اب مہ سال کی مہلت نہیں ملنے والی ..... آگئے اب تو شب و روز عذابوں والے ہارون عبید اپنے آفس میں کنزروں چیز پر بیٹھے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے چند کافی نہادات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ عینک ناک پر دھری تھی اور انہا ک تقابل دید تھا۔ موبائل بار بار نج رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے اسے اٹھا ہی لیا۔ ”بولا بیٹا۔“

”آپ نے فارس سے کیا کہا ہے؟“ وہ رورہی تھی۔ انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے عینک اتاری۔

”جو امین نے مجھے کہا تھا کہنے کو۔ یہی کتم ہمپتال اس لیے ہو کے۔ خیر میں جانتا ہوں امین غلط بیانی کر رہا تھا، اور اگر تمہارے توجہ حاصل کرنے والے کام ختم ہو گئے ہوں تو گھر واپس چلی جاؤ۔ کسی کو معلوم ہوا تو نیا تماشا بنے گا۔“ وہ سادہ اور مصروف انداز میں کہہ رہے تھے۔ ”بابا آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہی کرتے ہیں۔“ وہ روتے ہوئے چلائی تھی۔ ”آپ نے کبھی مجھے سمجھنیں دیا۔ ہمیشہ میرا راستہ روکا۔ ہمیشہ مجھے ہرث کیا۔ آئی ہیئت یو بابا۔ آئی ہیئت یو....“ اور روتے روتے اس نے کال کاٹ دی تھی۔

ہارون کا فون پکڑ کر ہاتھ کان سے لگا رہا تھا، گویا وہ شل سے ہو گئے تھے۔ ساکت۔ متوجہ۔ پھر سر جھک کر وہ دوبارہ سے کام کرنے لگا۔ مگر پھر سے سے شدید سڑب لگ رہے تھے۔ بار بار فون اٹھاتے پھر کھدیتے۔

”تم اس حد تک گر سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“ دروازہ دھاڑ سے کھلا اور جواہرات کا درار تیز تیز چلتی اندر آتی دھکائی دی۔ ہارون نے اکتا کر نظریں اٹھائیں۔ وہ میرون اور سفید لباس میں گھرے میک اور جیولری پہننے ایک طرف ختمی بی سنوری ہوئی تھی، دوسرا جانب آنکھوں میں اتنی ہی سرخی تھی۔ وہ اکتا سے گئے۔

”بیٹھ جاؤ جواہرات۔ آج کل تم لوگ کسی کو دھمکانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی۔“ میز پر دونوں ہاتھ رکھے جھک کر وہ غرائی۔ ”تم لوگوں نے میری دیہی یو بنائی۔ اور اب تمہاری بیٹی اس دیہی کو استعمال کرنے کی دھمکی دے کر گئی ہے مجھے۔ میں نے تم پر بھروسہ کر کے تمہیں ایک کام کہا تھا اور فتح نے اسے ریکارڈ کر لیا۔“

ہارون عبید تھل سے پیچھے ہو کر بیٹھے۔ وہ عمر اور تجربے کے اس دور سے نکل چکے تھے جہاں ”کیا؟ کون سی دیہی یو؟ مجھے نہیں معلوم“ جیسے الفاظ فوراً حیران ہو کر بولے جاتے ہوں۔ انہوں نے جواہرات کے الفاظ کوڑہن میں ترتیب دیا اور ساری تصوری واضح ہو گئی۔

”اور میری بیٹی نے قینائیا یہ بھی بتایا ہو گا کہ کس صورت میں وہ اس دیہی کو استعمال نہیں کرے گی۔“

”ہاں بتایا تھا۔ ڈونٹ میں کتم نہیں جانتے۔ لیکن یاد رکھنا، میں ہاشم سے سمجھنیں کھوں گی۔ اس نے اپنی مرضی سے آبی کو پر پوز کیا ہے۔“ (میز پر رکھی ہارون کی مٹھیاں زور سے چھپ گئیں۔ ماتھے پر بل در آیا۔) اور میرے کہنے سے وہ نہیں رکے گا۔ اس نے اپنی بیٹی کو تسبحاء،

شادی سے انکار کرنا ہے تو خود کرے اور اس ویڈیو کو ضائع کر دو ہارون۔ ورنہ جو میں کروں گی....“  
”کیا کرو گی تم؟“ وہ کری دھمکیں کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آنکھوں میں غصہ لئے جواہرات کو دیکھا۔ ”وہ ویڈیو ضائع نہیں ہو گی۔ اپنے بیٹے کو سمجھا دو کہ وہ میری بیٹی سے دور ہے۔ ورنہ میں اس کو تمہاری آنکھوں کے سامنے تباہ کر دوں گا۔ ناؤ گیٹ آؤ۔“ آجاتے ہیں دھمکیاں دینے۔ پہلے اپنے مسئلے سلبھاؤ۔ ”جواہرات بہمی واپس مڑ گئی اور جب تک وہ باہر نکلی ہارون بلند آواز میں بولتے رہے۔  
کرسی پر واپس گرتے ہوئے انہوں نے بے اختیاراتی کی ناث ڈھیلی کی۔ وہ شدید تنفس نظر آنے لگے تھے۔

❖❖❖

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں ..... فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے اس نہری دوپہر حنین اپنے کمرے میں لیپٹاپ کے سامنے بیٹھی، مسکرا کر اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”کاپنی نہیں ہو پار ہا تو کیا ہوا؟ میوری کا رڈ تو میرے پاس ہے نا۔“ میوری کا رڈ کی فائلز کاپنی نہیں ہوتی تھیں، اس نے بہت کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ اس نے سلاٹ سے کا رڈ نکالا، پھر ایک نئی ہی پلاسٹک کی ڈبلی (جس کو اپنے کچھ میوری کا رڈ سے اس نے خالی کر لیا تھا) میں اسے ڈالا۔ اپنی الماری کھوئی۔ لاک والے دراز میں اسے رکھ کر متفعل کیا اور چاپی جوتوں کے خانے میں پیچھے پیچھے کر کے چھپا دی۔ پھر مسکرا کر واپس لیپٹاپ پر آبیٹھی۔ ان باکس کھولا۔ سیوں سعدی یوسف کا پیغام ابھی تک ان باکس میں موجود تھا جس میں احر کو اس نے ایڈن بننے کی درخواست دی تھی۔

مسکراتے ہوئے حنین نے پیغام ناٹپ کیا۔ ”یہ ہے میرا نمبر۔ مجھے کال کریں پلیز احر۔ مجھے سلطان بیگش کے بارے میں بات کرنی ہے!“ پیغام بھیج کر وہ کری پلیک لگائے مزے سے بیٹھ گئی۔ دو سینڈ بعد ہی seen لکھا آگیا۔

احمر آفس کی راہداری میں دوافراد کے ساتھ چلتا جا رہا تھا اور کچھ بول بھی رہا تھا جب موبائل بجا۔ چونکہ ہاتھ میں ہی تھا اس لئے اس نے بات جاری رکھتے ہوئے اسکرین کو چھوپا۔ پیغام پڑھ کر اس کی زبان رکی۔ چہرہ فن ہوا۔ ان لوگوں سے مذurat کر کے وہ تیزی سے اپنے آفس کی طرف واپس آیا اور فون کان سے لگایا۔ حنین نے تیسری گھنٹی پر فون اٹھایا تھا۔

”کیسے ہیں آپ کا ردارز کے میڈیا مینیجر، ابیج کنسائنس احر شفیع صاحب یا مجھے یوں کہنا چاہیے کہ... سل... طان...“ وقد دیا تو وہ جلدی سے بولا۔

”فضول گھنگوکرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بتائیے کیا مسئلہ ہے؟“ تائی ڈھیلی کرتے ہوئے وہ پریشانی سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کیا کا ردار زابھی تک ہماری کا نزدیک رکارڈ کر رہے ہیں؟ وہ معصومیت سے بولی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے نچے کوئی آپ کی کا نزدیک رکارڈ نہیں کر رہا۔“

”اچھا۔ یعنی پھر ہم تسلی سے بات کر سکتے ہیں۔ میں ایک صاحب کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ ان کا نام سلطان تھا.....“

”حنین، پلیز!“ اس نے پریشانی آستین سے پوچھی۔ سفید چہرہ لئے وہ مضطرب سافون کان سے لگائے آفس میں ٹھیل رہا تھا۔

”نہیں احر شفیع۔ پلیز تو میں بولوں گی اب۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے تمام فوز اور کمپیوٹر زکی مانیٹر مگ ختم کر دی جانی چاہیے۔“ ورنہ میں اپنے پیٹی سی ایل سے اپنی بچپن کو کال کروں گی اور ان کو وہ دلچسپ کہانی سناؤں گی، سلطان صاحب والی اور میں روز بھی کروں گی۔ روز اپنے ایک رشتے دار کو کال کر کے ان کو وہ کہانی سناؤں گی۔ اب ہماری کا نزدیک رکارڈ کرنی ہیں یا نہیں یہ فیصلہ آپ کا ہے۔ بائی!“ مسکرا کر کال کاٹی اور احر فون رکھ کر تیزی سے باہر جا گا۔ لفٹ میں سوارہ خلپے فلور تک گیا اور بھاگتے ہوئے راہداری عبور کی۔ ایک آفس کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھے کا نوں سے ہیڈفون لگائے شخص کو ”اٹھو۔ باہر جاؤ“ کہہ کر اسے کار سے اٹھا کر کھڑا کیا، اور اس کی جگہ پہ بیٹھا۔

”باہر جاؤ!“ وہ حیران پر بیشان سماں جگہ سے نہ بلو تو احردھاڑا۔ وہ فوراً باہر لپکا۔ اب احرم تیزی سے کی بورڈ کے بیچ دبارہ تھا۔ اس کی پیشانی خخت سردی میں بھی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔

❖❖❖

وہ وقت آ گیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر ..... گھرے سمندروں میں اتر جانا چاہیے ہاشم کے آفس میں باوجود سردی کے کسی بیشتر کی ضرورت نہ تھی۔ ماحول خاصاً گرم ہو رہا تھا۔ ہاشم نے رے موڈ کے ساتھ فون رکھا اور سامنے بیٹھ گیا۔ جواہرات کو دیکھا۔

”ایں ایچ او کا تابادلہ ہو گیا ہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”اور یہ یقیناً صاحبزادی صاحب نے کروایا ہو گا۔“ جواہرات فکر مندی سے آگے ہوئی۔ وہ اسی صحیح والے لباس میں تھی اور بے حد مضطرب لگ رہی تھی۔ گھرے میک اپ کے باوجود وہ بوڑھی لگنے لگی تھی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نوشیر والوں کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔“ ہاشم نے ناک سے کھی اڑائی۔

”تم اس کی صفائح قبل از گرفتاری کروالو پھر بھی۔“

”غمی کیا ہو گیا ہے؟ یہ non-bailable offence ہے۔ صفائح نہیں ہو سکتی۔“

”ہو سکتی ہے۔ تم نے رانبر کرتے والے کیس میں کروائی تھی نا۔“

”غمی وہ غیر معمولی حالات تھے وہاں بہت سی جائز و جو بات تھیں۔ یہاں نہ ہو سکتی ہے زاس چکر میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ آپ بے بے فکر ہیں، کوئی شیر و کوگرفتار نہیں کرے گا۔“ ہاشم نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پورے دُوق سے کہا۔ جواہرات نے مضطرب سا پہلو بدلا۔

”وہ تب سے کمرے میں بند ہے۔ ہاشم تم اس کی فکر کرو۔ فی الحال ہم کتنے کرائسز میں ہیں۔“ ہاشم نے چونکر کرے دیکھا۔

”کیا مطلب؟ میں اس کی فکر کروں؟ کر قورہا ہوں۔ میں ہی تو کر رہا ہوں۔ مگر آپ کے یہ الفاظ کہاں سے آ رہے ہیں ہاں؟“ اس نے ایک تیز گھری نظر مار پڑا۔ جواہرات نے چائے کا کپ آہستہ سے پرچ میں رکھا اور الفاظ ڈھونڈ دے۔

”آبی والے معاملے کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر کے ...“

”ایک منٹ میں!“ اس نے بختنی سے باتھا کر اسے روکا۔ جواہرات کی سانس تک اٹک گئی۔ ”میں نے اس کو پر پوز اس لئے نہیں کیا تھا کیونکہ آپ مجھے بار بار ترغیب دلاتی تھیں۔ میں نے یہ فیصلہ اپنی وجہ سے کیا تھا۔ میری بھی ایک زندگی ہے جسے میں آپ لوگوں کی غلطیاں درست کرنے میں ختم نہیں کر سکتا۔ وہ معاملہ جہاں ہے وہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

جواہرات نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ البتہ اس کی رنگت پھیلی پڑ چکی تھی۔ وہ بے حد شکست خورہ نظر آ رہی تھی۔

وہ پرس اٹھائے آفس سے باہر نکلی تو احر جلا آ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سے گزرنے لگی تو احر نے قریب ہو کر سر گوشی کی۔

”مسز کاردار! میں یوسف کے فون ٹیپ ہموار ہا ہوں۔“ جواہرات نے چونکر کر اسے دیکھا پھر آنکھوں میں غصہ در آیا۔

”یہ ہر کوئی اپنی من مانی کب سے کرنے لگا ہے، تم ہاشم سے پوچھے بغیر...“

”مسز کاردار!“ وہ زمی سے سر گوشی میں بولا۔ ”وہ لڑکا سعدی... وہ کال کر کے کسی سے خاور کی بات کر رہا تھا۔ خاور کو پھنسانے کی۔

آپ کا نام لے رہا تھا۔ میں اسی لئے ٹیپ ہموار ہا ہوں، بے فکر ہیں، میں آپ کا وفادار ہوں۔“ سمجھانے والے انداز میں وہ بلو تو جواہرات گھری سانس لے کر رہا تھا۔ رنگت مزید پھیلی پڑی۔ (ہر طرف سے گھیرا نگہ ہو رہا تھا۔ ہر شخص نائم بم بنانک ملک کر رہا تھا۔)

”ٹھیک ہے تم نے درست کیا۔ ویسے بھی اب کال پینگ کی ضرورت نہیں رہی ہے۔“ وہ تنکے تھکے سے انداز میں کہر رہی تھی۔ احمد نے غور سے اسے دیکھا۔

”مسن کاردار پریشان مت ہوں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

راہداری میں باریک ہیل سے چلنے کی آواز آئی تو وہ دونوں جو قدرے الگ تھلگ کھڑے تھے چونک کردیکھنے لگے۔ سامنے سے شہریں چلی آ رہی تھی۔ رنگ برلنگے کپڑوں میں ملبوس، بالوں کو والٹے سیدھے فیشن کے مطابق باندھے وہ ان کو نظر انداز کر کے باشم کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔ جواہرات کی جیھتی نظروں نے دورستک اس کا تعاقب کیا تھا۔

”احمر... مجھے خاور سے نجات چاہیے۔“ وہ بے بُسی سے دبی دبی آواز میں کہر رہی تھی۔ ”باشم کہہ رہا تھا اس نے کال کی ہے اس کو۔

”ہمیں کچھ کرنا ہو گا احر!“

❖❖❖

ہم کو اس عبید میں تعمیر کا سودا ہے جہاں ..... لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ شام کا نیلگوں اندھیرا ہر پل گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کالونی کے گھروں کے پورچ اور گیٹ کی بتیاں جلنے لگی تھیں۔ مغرب کی صدائیں ہو رہی تھی۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ایسے میں فارس غازی کالونی کی مسجد میں موجود تھا۔ سنگ مرکر کی پوکی پہنچا دو جھک کرنے سے وضو کر رہا تھا۔ پانی اس کے کانوں کی لوادر تھوڑی سے پیک رہا تھا اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پاؤں دھوکروہ سیدھا کھڑا ہوا، پھر سوئٹر کے آسمیں برابر کرتا ٹھکن کی طرف بڑھ گیا۔

مسجد دھیرے دھیرے نمازیوں سے بھر رہی تھی۔ اسے پہلی صاف میں جگنہیں مل سکی، شاید اس نے کوشش ہی نہیں کی۔ ابھی اتنی جلدی اتنے آگے کھڑے ہونے کی بہت نہ تھی۔ تیسری صاف میں وہ دنمازیوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ پیرسے پیپر مالا یا۔ ارڈگر موجود لوگوں کی اکثریت کو وہ نہیں جانتا تھا۔ علاقہ نیا تھا، ابھی جان پیچاں میں وقت لگتا تھا۔ لوگ بولتے، بتیں کرتے، صفائیں برابر کر رہے تھے۔ وہ بھی سر جھکائے کھڑا رہا۔ امام صاحب نے تکمیر تحریک پڑھی تو اس نے کانوں تک ہاتھ اٹھاتے اللہ اکبر کہتے بازو، سینے پہ باندھے۔ اب وہ قدرے پر سکون انداز میں عربی کلمات پڑھنے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے بے چین دل کو قرار آ رہا تھا۔

سلام پھیر کر جب ہر شخص کو جانے کی جلدی تھی، وہ سر جھکائے دوز انو ہیں کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔

”میں اچھا آدمی نہیں ہوں، مانتا ہوں۔“ سر جھکائے دل میں کہہ رہا تھا۔

”میرے ارادے برے تھے یہ بھی مانتا ہوں۔ میں خاور کو قتل کرنا چاہتا تھا، اس نے میرے بے گناہ بھائی اور معصوم یہوی کو مارا تھا۔ میں باشم اور جواہرات میں سے کسی ایک... اس ایک کو قتل کرنا چاہتا تھا جس نے اس قبال کا حکم دیا تھا۔ اسی لئے میں کہتا تھا زمرے کہ ہم الگ ہو جائیں گے مگر اب ایسا نہیں ہو گا۔ میں خاور کا فیصلہ اللہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ نہ میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ نہ اس کے خلاف کچھ کروں گا۔ رہا ہاشم تو میں اس کی جان نہیں لوں گا۔ خیر آپ جانتے ہیں میں کیا کروں گا اس کے ساتھ، مگر اب... میں کسی کی جان نہیں لینا چاہتا۔

النصاف چاہیے مجھے۔ عدالت نہیں دے گی جانتا ہوں، خود لینا پڑے گا، مانتا ہوں۔ مگر ہاں اب... اب میں اس سے الگ نہیں ہوں گا۔ اب میں خوش ہوں۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ اب روشنی نظر آنے لگی ہے۔ اب لگتا ہے کہ میرا اونا ہو ادل جڑ جائے گا۔ محبت کتنی محبت سے چاہتا۔ اب میں خوش ہوں۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ اب روشنی نظر آنے لگی ہے۔ اب لگتا ہے کہ میرا اونا ہو ادل جڑ جائے گا۔

heal کر دیتی ہے ہمیں اے اللہ!“ سر جھکائے چہرے پہ باتھ پھیر کر وہ اٹھا تو نمازیوں کا ہجوم تتر تپر ہو چکا تھا۔ وہ چپ چاپ مسجد سے کل آیا۔ جوتے پہنے اور خنثی خوشنگوار ہو میں چلتا ہوا گھر کا فاصلہ عبور کرنے لگا۔ اس کا چہرہ پہلے سے پر سکون اور مطمئن لگتا تھا۔

اس کے جو گزر میں مقید پیر تارکوں کی سڑک عبور کر رہے تھے۔ تیز تیز... اور شاید لگز رے، برسوں کا فاصلہ بھی طے کر رہے تھے۔

نیکوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

تارے آسمان پر نمودار ہونے لگے تھے... ٹھنڈے میٹھے تارے.....  
وہ دونوں سینیما کے ہال میں موجود تھے۔ اندھیر کر سیوں پر پیچھے کوٹیک لگائے وہ کان کی لومسٹا نگاہیں اسکرین پر جائے ہوئے تھے۔  
گاہے بگاہے ساتھ پیٹھی زرتاشہ کو بھی دیکھ لیتا جو بالوں کو ہمیر بینڈ میں مقید کیے ہاتھ میں پکڑے nachos، قفے و قفے سے کھاتی، انہاک سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ مر جائے گا۔“ کچھ دیر بعد وہ بے چینی سے بولا۔ فلم اسے بور کر رہی تھی۔ زرتاشہ نے چونک کرا سے دیکھا۔  
”آپ نے دیکھ رکھی ہے پہلے؟“ وہ ناراض ہوئی تھی۔

”نہیں یا۔ صاف پتہ چل رہا ہے۔ اچھا باب ایسی شکل مت بناؤ۔ اسے دیکھو...“ زرتاشہ نے خفگی سے سرجھک کر چھڑہ واپس موڑا تو وہ گہری سانس بھر کر کر گیا۔

چند لمحے بعد اسٹریشن کا نشان ابھر اور ہال کی بتیاں جل اٹھیں۔ لوگ اٹھاٹھ کر باہر جانے لگے۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ تین چار لڑکوں کا گروہ ان کی قطار میں آگے بڑھتا ان تک آ رہا تھا، گویا اب ان کے سامنے سے تنگ سی جگہ سے گزر کر جائے گا۔ وہ فارس کی دائیں طرف سے آ رہے تھے سو فارس نے جو گزر لے کر کے پھلی قطار کی نشت پر کھو دیے اور سینے پر بازو لپیٹے، قدرے نیم دراز ہو گیا۔ لڑکے رک گئے۔ جان گئے کہ وہ نہیں چاہتا وہ اس کی بیوی کے سامنے سے گزر کر جائیں۔ وہ واپس مڑ گئے۔

”آپ کو میری بات یاد ہے! مجھ سے نہیں لڑیں گے۔ میرے لئے لڑیں گے۔“ وہ مسکرا کر اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

فارس نے ہلکے سے کندھا چکائے۔ ”لڑتا تو ہوں تم سے۔“

”جانقی ہوں مگر اس دن آپ نے رو بینہ آئی کے سامنے میری حمایت کی کہ زرتاشہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی، حالانکہ میں نے کہی تھی۔“ وہ میکے میں کوئی بات سے بات نکلنے والے ایشو کا تذکرہ کرنے لگی۔

”مجھے پتہ ہے تم نے کہی تھی اور تمہیں نہیں کہنی چاہیے تھی۔ زرتاشہ ہر وقت دوسروں کے معاملات پر کمٹس نہیں دیتے۔ اور میکس اور فون کا لارپ تو یہ کام بھی نہیں کرتے۔ فونز پہلاتیں صرف بگڑتی ہیں کیونکہ پوری سمجھ نہیں آتیں۔ لیکن جب کبھی تم خاندان میں کسی کے بارے میں کوئی بات کیا کر دو تو اس کے لئے لڑا کرو، اس پر ڈٹ جایا کرو۔ کسی خالہ چھپی یا بھا بھی کے ڈر سے مکرنا جایا کرو کہ میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا، غیرہ۔ بات کو اس کے گھر پہنچایا کرو۔“

”مانا کہ میری غلطی تھی مگر آپ نے ان کے سامنے میری حمایت کی تھی، مجھے اچھا لگا تھا۔“ وہ زرم مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔  
فارس نے پھر ہلکے سے کندھے اچکائے۔

”تم غلط کرو گی یا صحیح، میں دنیا کے سامنے ظاہر ہے تمہیں ہی سپورٹ کروں گا۔ اگر آپ اپنے گھر کی لڑکیوں کو ان کی غلطیوں کے لئے معاف کر کے ان کو سپورٹ نہیں کر سکتے، ان کا ہاتھ تھام کر ان کو ان کے پورے قد کے ساتھ کھڑا نہیں کر سکتے تو آپ کیسے مرد ہوئے! انسان تو بہت سے ہوتے ہیں۔ مرد کوئی کوئی ہوتا ہے۔“

”بس اتنا بتا دیں کہ یہ فلم والا مرد مرے گا تو نہیں؟“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

”میں اول تو اسے مرد مانتا نہیں ہوں، دوم ہاں یہ مر جائے گا۔ نہیں، میں نے فلم نہیں دیکھ رکھی۔ میں نے صرف ریویو میں ساری کہانی صح پڑھ لی تھی۔“ وہ یونہی نیم دراز، نیک لگائے مسکرا کر بتا رہا تھا۔

”تاکہ آپ میری فلم خراب کر سکیں!“ اس کی آنکھوں میں بھر سے ناراضی ابھری۔

”مجھے ایک قدم آگے رہنا اچھا لگتا ہے زرتاش!“

مغرب پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ اس کے جو گز سڑک کو گواپنے نیچے پیٹنے تیز تیز فاصلہ عبور کر رہے تھے۔ بزرگیوں سے ڈھکا بگلہ سامنے تھا۔ وہ گھری سانس لے کر راضی کی یادوں کو زہن سے جھکلتا اندر اغلیں ہوا۔

لا اونچ میں وہی لوگ تھے جو روز ہوتے تھے۔ مگر آج لگتا تھا سب کے چہروں پر مسکراہٹیں ہیں۔ راہداری سے گزرتے وہ کچن کے کھلے دروازے میں ذرا دیر کوٹھہ رہا۔ سعدی سلیب کے ساتھ کھڑا تھا، اور سر جھکائے مسکرا کر سامنے کری پہنچی زمر کوں رہا تھا جو دھیرے دھیرے بیمار ہی تھی.....“ بھرہم نے فارس کے کیس کے دنوں میں.....

پرانی کھاتا میں... طویل قصہ۔ زمر کی اس کی طرف پشت تھی۔ سعدی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک ثانیے کوٹھہ رہا، پھر اسے آواز دی۔

”سعدی!“ سعدی نے چونک کر سر اٹھایا۔ زمر نے بھی گردان موڑی۔ (فارس کو دیکھ کر اسے پرس میں رکھی لوگ یاد آئی۔ اسکے نہیں پہنچی۔ اپنی بھول پر افسوس ہوا۔)

”اپنا پاسپورٹ مجھے دے دو۔“ اس نے عجلت میں پوچھا گویا زیادہ دیر مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر مخل کرنے کا بہانہ بھی چاہیے تھا۔ ”وہ میں نے ڈسپوز آف کر دیا ہے۔ بے فکر ہیں۔“ سعدی نے سر کو جنبش دے کر تملی کروائی۔ فارس کے ابر و تجہب سے اکٹھے ہوئے۔

”کیا مطلب ڈسپوز آف کر دیا ہے؟ میں نے کہا تھا میں اسے خود ڈسپوز آف کروں گا۔“ وہ صباحت نے اپنا کیریئر داؤ پہ لگا کر تمہارے لئے بنوایا تھا۔ تمہیں یقین ہے وہ کسی کے ہاتھ نہیں لگے گا۔“ اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

”اس کے اتنے نکلنے کیے تھے کہ اب وہ نہیں ملے گا کسی کو۔ فکر نہ کریں!“ سعدی نے ہاتھ اٹھا کر تسلی دی۔

”مگر.....“

”فارس۔ وہ کہہ رہا ہے تو اس پر بھروسہ رکھو!“

زمر کی بات پر اس نے ”اچھا جی!“ کہہ کر سر کو خم دیا اور برے موڈ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں بھر سے بالوں میں لگ گئے تھے۔

”آپ اکیلے نہیں ہیں۔“ وہ قدم آگے بڑھا تھا کہ سیم کے کمرے کے دروازے پر کھڑی حنین نے پکارا۔ وہ رکا۔ غور سے اسے دیکھا۔

”اگر تم سمجھتی ہو کہ میں جیلس ہو رہا ہوں تو.....“

”میں سمجھتی نہیں ہوں، مجھے یقین ہے۔ خیر ہے۔ ہوتا ہے ایسے۔“ الفاظ کے برعکس اس کا لبھے شگفتہ نہ تھا۔ چہرے پر عجیب دیرانی تھی۔ کہہ کر وہ پلت گئی اور سیم کے بیڈ پر آپنی بیٹھی۔ (وہ ٹیونٹن جاتا تھا اس وقت۔) اداں اور دیران۔ یکا یک دروازہ بند ہو کر لاک ہونے کی آئی تو وہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

فارس دروازہ مقفل کر کے کراس کے سامنے آبیٹھا اور آگے ہو کر غور سے اسے دیکھا۔ ”حنین، کیا مسئلہ ہے؟ سیم نے مجھے نہیں بتایا۔ مگر تمہاری اور سعدی کی کیا لڑائی چل رہی ہے؟“

ڈھیلی سی فرنچ چوٹی بنائے کئے بال ماتھے پر بکھیرے، زرد چہرے والی حنین کی آنکھیں ڈبڈائیں۔

”آپ تو ہمیشہ وقدم آگے رہتے ہیں، آپ کو ابھی تک کسی نے نہیں بتایا؟“

”کیا؟ مجھے واقعی نہیں پتا!“ وہ ٹھٹکا تھا۔ حنفیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”وہ آپ کوتا دے گا۔ بھائی۔ وہ بتا دے گا اور آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔“ فارس چند ثانیے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

”کیا کیا ہے تم نے؟“ الفاظ ہموار اور پرسکون تھے، مگر سوال قیامت تھا۔

”ایسے ہی قیامت کے دن اور اس سے پہلے قبر میں پوچھا جائے گا نا کہ کیا کیا ہے تم نے خمین۔ کیا کر کے آئی ہو؟ میں کیا کہوں گی؟“ آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل پھسل رہے تھے۔

”کسی کو قتل کیا ہے؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ حنفی کی گردون نفی میں بل۔

”پھر ہر چیز ٹھیک ہو سکتی ہے۔ بتاؤ مجھے۔ کیا کیا ہے تم نے؟“ اس نے زرمی سے پوچھتے ہوئے حد کے ہاتھ تھامے۔ وہ ٹھنڈے تنخ ہو رہے تھے۔ گویا برف کے ٹکڑے ہوں۔ ایس سال کی دلی پتی کمزور، اداس سی وہ لڑکی بلکے بلکے سے کانپ رہی تھی۔ آنسو مسلسل تھوڑی سے نیچے لڑھک رہے تھے۔

”آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔“

”نہیں کروں گا۔“ اس نے تسلی دی۔

”میں نے ایگزام میں چینگ کی تھی۔ میں نے اوسی پی صاحب کو...“ وہ بچکیوں کے درمیان سر جھکائے بتاتی رہی۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ کھا ختم ہوئی تو حمد نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

”خمین!“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”انسان زندگی میں بہت سچھ کرتا ہے۔ غلط صحیح اچھے برے کام سب کرتا ہے انسان۔ ہر چیز کو تجربہ سمجھ لیا کرو۔ ٹھیک ہے تم سے غلطی ہوئی، لیکن تم نے توبہ کر لی، بات ختم ہو گئی!“ وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

”احمر شفیع جانتا ہے۔ اس نے ہمارے گیٹ پر آ کر مجھے دھمکی دی تھی!“ فارس ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا، گویا بری طرح چونکا تھا۔ اس نے یہ کھا بھی سناؤں۔

”یہ کب کی بات ہے؟“

”جب آپ سری لنکا تھے۔“ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ ”خیر، میں اس سے لے لوں گا ہر چیز۔ وہ کسی کو نہیں بتائے گا۔“

”وہ آپ کو وہ سارے ثبوت نہیں دے گا۔“

”اس کا تو بابا بھی دے گا۔“

خمین چپ ہو گئی۔ ”اس کا بابا... خیر کسی اور کے راز کھو لئے سے پہلے... ایک اور بات...“ اس نے اب کی بارہ نہیں جھکایا۔ اب سراخا کربات کرنی تھی۔ آنکھوں میں دیکھ کر۔ اس کے ہاتھ پر اپنے کمزور ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے۔

”میں نے کچھ اور بھی کیا ہے۔ جس کی وجہ سے بھائی مجھ سے ناراض ہے۔“

”اور وہ کیا ہے؟“ وہ بنا پلک چھپک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے مجھے منع کیا تھا مگر میں بہت اکیلی تھی، مجھے کوئی اپنادوست نہیں لگتا تھا۔ میں.... میں ہاشم بھائی سے ٹیکست پر بات کرتی تھی.... میں.... اسے لگا فارس کے ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگے ہیں، وہ بیکا سا چونکا تھا، ذہنیلا اعصاب تن گئے تھے، خمین نے اپنے پسینے میں ڈوبے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کر دی۔ بس ان ہاتھوں کو وہ نہیں چھوڑ سکتی تھی، وہ نہیں کھو سکتی تھی۔

”آئی ایم سوری..... مجھے نہیں پتہ تھا میں کیا کر رہی ہوں.... میں ان کو پسند کرنے لگی تھی۔ آئی ایم سوری..... میں کبھی ان سے ملنے نہیں گئی.... انہوں نے بلا یا تب بھی نہیں.... وہ سعدی بھائی کے ساتھ تھے.... بھائی کو تارچ کرنے کے لئے مجھے کال کر رہے تھے، بھائی اسی لئے تھا۔ مجھ سے۔ میں نہیں گئی مگر کتنی ماہ.... کتنی ماہ میں ان سے بات کرتی رہی.... یکیکٹ پے.... ایک دفعہ کال پے.... مگر میں ان سے بات کرتی تھی۔ میں مجھ سے غلطی ہو گئی ماموں.... میں غلط راستے پر چل گئی تھی.... میں بہت بڑی ہوں۔ ” وہ اسے دیکھتے ہوئے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”سواس کے ہاتھوں پے بھی گر رہے تھے یا شاید وہ پسینے تھا مگر وہ ابھی تک مضبوطی سے اس کو تھا ہے ہوئی تھی۔

وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ چپ۔ پھر اس نے نظریں جھکایں۔ حسین و حشت سے اسے دیکھنے لگی۔ دل ڈوبنے لگا۔

اور پھر فارس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ تھا کال لئے۔ اس کے گیلے ہاتھ تھا رہ گئے۔ وہ شل بنیجی رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جڑ کی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر پھیلتے اندھیرے کو دیکھتا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ حسین نے اپنے خالی ہاتھ اپنے تی دامن میں رکھ لئے ساری دنیا بیان ہو گئی تھی۔

”تم نے کبھی اسے کہا کہ تم اس کو پسند کرتی ہو؟“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ آواز آہستہ تھی۔ بہت آہستہ۔

”نہیں اندماز ہو گا۔ وہ ہاشم کا دردار ہیں“ میں نے ....“

”میں نے پوچھا، تم نے اسے کہا یا نہیں کہا۔“ وہ اب حد کی طرف گھوما۔ وہ یک نک چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

فارس نے آنکھیں بند کر کے گھری سانس باہر خارج کی اور پھر واپس کری کی طرف آیا۔

”سنھیں!“ وہ بخیدگی سے اس کے سامنے بیٹھا کہنے لگا تھا۔ ”انسان کا پسند ناپسند پا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے بعد کیا کرتا ہے۔ س پر اختیار ہوتا ہے۔ میں نے بھی جیل میں اچھے برے بہت سے کام کیے ہیں۔ اتنی عمر ہو چکی ہے کہ اب میں ایک چھوٹی پچی کو جن جنہیں کر سکتا۔ میں اس بات کو دوبارہ ڈسکس بھی نہیں کرنا چاہوں گا۔ مجھا ب صرف اس بات کی پرواہ ہے کہ وہ کورٹ میں کیا پیش کرے گا۔“

”کورٹ؟“ حفہ نے ناچھی سے اسے دیکھا۔ ”کون سا کورٹ؟“

”اگر کوئی ٹرائل ہو تو وہ تمہیں کورٹ میں بلاۓ گا اور تمہارے سارے میسچر پونٹ کر کے وہاں پیش کرے گا۔ آئی ایم سوری حد اگر میں کبھی تمہیں یہ یقین نہیں دلا سکا کہ تم اکیلی نہیں ہو، کہ تم مجھ پے اعتبار کر سکتی ہو۔ لیکن اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے اچھا نہیں لگا مگر میں تمہیں بخ نہیں کروں گا۔ کوئی بھی چیز میرے دل میں تمہاری محبت کنم نہیں کر سکتی۔ اور ابھی میں بھی کچھ بتاؤں گا تمہیں تاکہ یہ ثابت کر سکوں کہ میں بھی تم پر اعتبار کرتا ہوں۔ مگر پہلے مجھ پے بھروسہ کرو اور بتاؤ کہ ان میسچر میں کیا تھا؟ تم اس سے کیا بات کرتی تھیں؟“ اس نے دوبارہ سے حد کے ہاتھ تھام لئے تھے اور وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ نہ زمی سے نہ تختی سے۔ ضبط اور خل سے۔ مگر حسین اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ یک نک گم ممی خلاء میں دیکھ رہی تھی۔

عرسے بعد ایک گتھی سلیگئی تھی۔ ایک گرہ کھل گئی تھی۔ ایک سراہا تھا میں آگیا تھا۔

وہ سوال قیامت تھا، اور جواب بھی قیامت سے کم نہ تھا۔



حضر کے دن کا غلغله، شہر کے بام و در میں تھا..... لگلے ہوئے سوال تھے، اگلے ہوئے جواب تھے۔ اگلے چوبیں گھنٹے کہاں غائب ہوئے، پتہ، تی نہیں چلا۔ ایک دن طلوع ہو کر ڈھل بھی گیا اور چھاتے اندھیرے نے دیکھا، نو شیر اس کا دردار اس خوبصورت بیٹگل کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا ہے جو کلب کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ادھر ادھر نولیوں کی صورت بیٹھنے لوگ..... بیٹھتے لڑ کے لڑ کیاں.... سرو کرتے دیڑز..... ہر کسی نے آنکھا اٹھا کر..... نظر پھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بڑے دن بعد نہیاں وہ حکر تیار سا،

پر فیوم کی مہک میں بسا، گلاسز آنکھوں پر چڑھائے، منہ میں چیوگم چباتا چلا آ رہا تھا۔ بار کا ڈنٹر کا سٹول کھینچ کر بیٹھا اور سیل فون نکالتے ہوئے بار عیند رکوانا آرڈر بتایا۔ سن گلاسز اتار کر گریبان پر انکا میں اور اسکرین پر انکلی پھیرتا نیز فید چیک کرنے لگا۔

سرگوشیوں اور اوپنی باتوں میں اسے اپنا نام واضح سنائی دے رہا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے مشروب کے گھونٹ بھرنے لگا۔ اب وہ نہیں چھپے گا۔ نہیں ڈرے گا۔ کون یقین کرے گا کہ اس نے کسی کو مارنا چاہا ہے؟ چند دن میں لوگ بھول بھال جائیں گے۔

دفعتائے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔ شیر و نظر انداز کی گھونٹ بھرتا، موبائل دیکھتا۔ وہ کسی سے بات کرنے کے موڑ میں نہیں تھا۔ مگر دھیرے دھیرے ایک عجیب سا احساس رگ دپے میں سراہیت کرنے لگا۔ کلب میں چھاتی غیر معمولی خاموشی۔ جیسے سب سرگوشیوں میں بول رہے ہوں، اور پھر چپ ہو گئے ہوں۔

”امریکہ میں ایسے موقعوں پر مرینڈ رائٹس پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ آفیسر آف لاء کہتا ہے کہ تمہیں خاموش رہنے کا حق ہے، کیونکہ تم جو بھی کہو گے وہ تمہارے خلاف عدالت میں استعمال ہو گا۔“

نوشیر وال کاردار بجلی کی سی تیزی سے گھوما۔ اس کی پشت پر... سینے پر بازو لپیٹے... وہ کھڑا تھا۔ وہ جس کا آسیب اس زیر تعمیر گھر میں بنتے خون سے نکل کر نوшیر وال کے اندر آبسا تھا۔ وہ آج جسم صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور آنکھوں میں تپش تھی۔ جیکٹ اور جینز میں ملبوس چھوٹے کٹے بالوں والا لڑکا جس کے منہ پر زخم کا نشان تھا، اس پر نظریں گاڑے کھڑا رہا تھا۔

”مگر پاکستان میں آرٹیکل تیرہ ہی کافی ہوتا ہے۔ دہرانے کی ضرورت پھر بھی نہیں ہے ہمیں کیونکہ تم خاموشی سے کبھی گرفتاری نہیں دو گے۔“

کسی نے کلب کے لاڈنچ کی سفید تیار جلا دی تھیں۔ مدھم روشنیوں والا خوابناک ماہول یکدم جیسے تیز روشنی میں نہا گیا تھا۔ بے رحم سفید روشنی نے سب عیاں کر دیا تھا۔ سعدی یوسف کے ساتھ سیاہ وردی والے چند افراد کھڑے تھے۔ نوшیر وال کا رنگ پھیکا پڑا۔ وہ آہستہ سے جگہ سے اٹھا۔

”میں سیکشن 161 کی آرپی سی کے تحت نوшیر وال اور گریب کاردار کو اپنا حملہ آور اور انوغوا کارنا مزد کرتا ہوں۔ مجھے آٹھ ماہ جبس بے جا میں رکھے اور جسمانی ذہنی اذیت دینے کا ذمہ دار ہی ہے۔ اور ان کے پاس تمہاری گرفتاری کے وارثت ہیں۔“ نوшیر وال نے فوراً موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر آفیسر نے اپنی چھڑی اس کے ہاتھ پر کھکھ دی۔

”تم لوگ مجھے یوں گرفتار نہیں کر سکتے۔ میرے بھائی کو بلاو۔“ وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ چلا کر بولا تھا۔ سعدی سینے پر بازو لپیٹے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ساہی آگے بڑھا اور نوшیر وال کے ہاتھ تھامنے چاہے ہے مگر اس نے رکھ کر ساہی کے منہ پر مکا جز دیا۔

اردو گرد تماش میں لڑکے لڑکیوں نے موبائل کیمرے نکال لئے تھے۔ ملک ملک۔ تصاویر اور ویڈیو یوں بنائی جا رہی تھیں۔ تین ساہیوں نے اس پر حملہ کر دیا تھا اور وہ مراجحت کرتا رہا، چلاتا رہا، گالیاں دیتا رہا، انہوں نے اسے سینے کے مل کا ڈنٹ سے لگایا اور ہاتھ پیچھے سے باندھے۔

ایسیں اتنیج اواب اس کو اس کے حقوق پڑھ کر سنارہاتھا، اس کے اوپر لگی دفعات کی تفصیل بتا رہا تھا، اور وہ کف اڑاتا غصے سے خود کو چھڑاتا مسلسل چلا رہا تھا۔ ہر زاویے سے لوگ دلچسپی سے ویڈیو بنارہے تھے۔ پولیس والے اس کو لے کر جا رہے تھے، اور سعدی یوسف آخر میں... ان سب کے پیچے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ مناظر کی عکس بندی جاری تھی.... آوازیں اور شور بڑھتا جا رہا تھا..... باہر سے پولیس ورن میں ڈالا جا رہا تھا۔ سعدی وین سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔ ہاتھ کمرپہ باندھے وہ سوچتی نگاہوں سے وین کو دیکھ رہا تھا جب ایسیں پی بخت آور چیختی اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

”آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس موقع پر آنے دیا۔“ وہ زندگی سے سر کو ختم کر بولा۔  
 ”سعدی خان“ میں ان لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ ہم اپنے علاقے کے پیر ہیں، گدی نشین ہیں۔ ہمارے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ صح  
 عدالت میں پیشی سے پہلے تک نو شیر وال کاردار کا بھائی کیا، اس کا باب پر بھی قبر سے اٹھ کر آجائے تو اس کو نہیں چھڑا سکتا،“ پھر اس نے سعدی کے  
 کندھ سے پچکی دی۔ ”تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔ ہر پولیس والا ان کی طرح نہیں ہوتا جن سے تمہارا پہلے پالا بڑا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ پولیس  
 اس آدمی کو آن لاؤ اپ سے نکلنے ہیں دے گی۔“ وہ اسے تکلیف دے رہا تھا اور سعدی اس پر یقین کرنا چاہتا تھا۔  
 مگر جانے کیوں اب کسی پر یقین نہیں آتا تھا۔

❖❖❖

جب ڈوبنا ہی ٹھہرا تو پھر ساحلوں پر کیوں ..... اس کے لیے تو بیچ بھنور جانا چاہیے  
 ”میرا نام ہے سعدی یوسف۔“ نے وہ تھلکہ نہیں مجاہد تھا جو نو شیر وال کاردار کی گرفتاری کی ویڈیو نے چاہ دیا۔ چند منٹوں میں وہ ویڈیو  
 نیوز چینلو پر نشر ہونے لگی۔ مختلف زاویوں سے لئے گئے واضح شاہس جیسے جیسے اسکرین پر چلتے گئے، کاردار اینڈ سنز کے شیئر زکی مارکیٹ ویڈیو  
 گرنے لگی۔ ہاشم کاردار کی پھر سے زائد ملکی پیپریز سے ایک دم سرمایہ کھینچا جانے لگا، اور پہلی دفعہ ہاشم کو احساس ہوا کہ پانی سر سے اوپر ہو رہا  
 ہے۔

وہ ہارون عبید کے ساتھ.... وکلاء کا ایک وفد لئے.... اس وقت تھا نے میں موجود تھا.... اور نجٹ اور غرور سے ٹانگ پٹانگ چڑھا کر  
 بیٹھا تھا سے ایسی پی بخت گیلانی سے مخاطب تھا۔ بحث، ڈھنکیاں، ہاتیں، سب گرم ماحول میں بلند آواز میں ہو رہی تھیں۔ سامنے والا بھی  
 اپنے علاقے کا بیڑا تھا۔ اونچی گدی کا عادی تھا۔ گردن اس کی بھی نہیں جھکتی تھی، صرف فنی میں بلتنی تھی۔

”اوپر سے دباؤ ہے کاردار صاحب۔ اب میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ صح فیصلہ عدالت میں ہو گا۔“

”ساری زندگی دیکھی ہیں میں نے عدالتیں۔ وچکپ بات یہ ہے کہ ویڈیو میں تو اس لڑکے نے ہم دونوں کا نام بھی لیا تھا، پھر حتیٰ  
 ایف آئی آر میں صرف میرے بھائی کو نامزد کیوں کیا؟“ ان کی بحث جاری تھی۔ ایف آئی آر کے مطابق صرف نو شیر وال کاردار ذمہ دار تھا  
 سعدی کے اوپر کیے گئے تمام مظالم کا۔

باہر سرداہداری میں وہ دونوں کھڑے تھے۔ زمر اور سعدی۔ دونوں خاموش سے گہری ہوتی رات کو دیکھ رہے تھے۔

”ہم ہاشم اور ہارون عبید کو کیوں نامزد نہیں کر رہے؟“ وہ یہ بات سمجھنے پا رہا تھا۔

”ہاتھ والا پرندہ جہاڑی والے دو پرندوں سے بہتر ہوتا ہے۔ بجاے اس کے کوہ تینوں کمزور کیس کی وجہ سے بری ہو جائیں، ہم  
 صرف نو شیر وال پوکس کرتے ہیں۔ اس کے خلاف مضبوط کیس بناتے ہیں۔ اس کو سراطلی تو ہاشم جیتے جی مر جائے گا۔“  
 ”لیکن وہ پھر بھی آزاد گھوسمے گا۔“ سعدی نے تلخی سے سر جھٹکا۔ اسی پل سامنے سے دوپاہی نو شیر وال کو چھکری لگائے چلے آرہے  
 تھے۔ اس کے چہرے پر بے چینی تھی اور آنکھوں میں غصہ۔ سر جھٹک منہ میں کچھ بڑا تھا ہوئے وہ چلتا جا رہا تھا، دھنٹا ان دونوں کو ستون کے  
 ساتھ کھڑے دیکھ کر رکا۔

”میں سمجھا تھا میز زمر کا آپ مختلف ہوں گی۔ مگر آپ سب ایک جیسے ہیں۔“

”تم اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں ہم سے بات نہیں کر سکتے۔“ زمر نے سعدی کے سامنے بازو پھیلا کر گویا دونوں کے درمیان آڑی  
 بنائی۔

”تم نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔“ سعدی بھی پھر کر غرایا۔

”تم نے مجھے گالی دی تھی؟“

”تو گالی سے جواب دیتے نا۔ گولی سے کیوں دیا؟“ وہ اوپنجی آواز میں بولا تھا۔

”نوشیر وال تم اپنے دیکیل کی غیر موجودگی میں ہم سے بات نہیں کر سکتے۔ اسے لے جائیں۔“ وہ تم سے سعدی کے سامنے آکھڑی ہوئی اور سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔ وہ نوشیر وال کو ساتھ لے جانے لگے مگر وہ مژہ مژہ کر سرخ چہرے سے اسے دیکھتا، مغلاظات کے بے جارہا تھا۔

”میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔ عدالت میں تمہارے سب گھروالوں کو گھیٹوں گا۔ تمہاری بہن کو گھیٹوں گا۔“ سعدی کی مٹھی پھینکی۔ اس نے دانت پیسے۔ تنفس تیز ہوا مگر زمر نے نرمی سے اس کے کندھے پہاڑھر کھا۔ ”اس کی باتیں مت سنو۔ نظر انداز کرو۔“

”آپ نے سانہیں وہ کیا بکواس کر رہا تھا۔“ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔ چہرے پہ بے نبی در آئی تھی۔

”جب عدالتوں میں معاملے چلے جاتے ہیں ناسعدی تو پھر یہ تو ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ برا ہو گا۔ کیا تم واپس مڑنا چاہتے ہو؟“ ”بکھر نہیں۔“ اس نے پورے عزم سے فنی میں سر بلایا۔

”گذایں تمہارے ساتھ ہوں۔“ اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ سعدی گھرے گھرے سانس لیتا خود کو پرسکون کرنے لگا۔ دور راہداری کے سرے پہ ایس ایچی اوکے کمرے کے دروازے پہ باروں عبید نکتے دھائی دیے۔ وہ وہیں رک کر زمر کو دیکھنے لگے۔ زمر نے جو باس سعدی کو دیکھا۔

”تم گاڑی میں بیٹھو میں آتی ہوں۔ جاؤنا!“ وہ اپنے ڈھنی خلفشار سے نہیں نکل پایا تھا، سو مضطرب الجھا الجھاس آگے بڑھ گیا۔ تب باروں قدم قدم چلتے ستون کے قریب آٹھھے۔ کلف لگی شلوار میں میں ملبوس، وہ چہرے پہ سوچ کی لکیروں کے باعث غیر مطمئن لگتے تھے۔ ”مزز زمر... میں نے آپ سے کہا تھا ہم دوبارہ ملیں گے!“ زمر نے بازو سینے پہ پیٹ لئے اور تم سے ان کو سننے لگی۔ ”آپ مجھے تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ یہ مسئلے بہت تھکا دینے والے ہوتے ہیں۔“

” بلاشبہ ایسا ہی ہے لیکن میں آٹھ دس سال سے روزا یسے مسئلے پنچائی آئی ہوں سو آپ میرے لئے فکر مند نہ ہوں۔“ وہ پرسکون سی بولی تھی۔

”مزز زمر!“ انہوں نے اب کے ترجم سے اسے دیکھا۔ ”مجھے آپ سے ہمدردی ہے، اور میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری مدد کے بغیر یہ کیس بھی عدالت میں نہیں چل سکتا۔ آپ جو کوئی بھی لیں تب بھی باشم.....“ وہ مزید قریب ہوئے۔ آواز اب سرگوشی میں بدل گئی تھی اور نظریں زمر پر جھی تھیں۔ ”کبھی تاریخیں نہیں لینے دے گا آپ کو۔ تاریخ پتاریخ دیتا جائے گا۔ لٹکاتا جائے گا۔ بارہ تیرہ سال تک کیس چلتے گا۔ ہر سال میں دو پیشیاں ہوں گی۔ گواہ مرکھ پ جائیں گے۔ سرکاری ریکارڈ کھو جائے گا۔ اخبارات و میڈیا اس قصے کو بھول چکا ہو گا۔ تیرہ سال آپ تو اڑیں گی، اور آپ بُرکتی ہیں لیکن آپ کا یہ پیارا معمصوم سا بچہ نہیں اڑ سکے گا۔ آپ کو ابھی انداز نہیں ہوا مگر وہ ڈھنی طور پر نارمل نہیں رہا۔ وہ یا تو تنگ آکر خود کشی کر لے گا یا کسی دن جا کر بہائم کو گولی مار دے گا۔ وہ.... اتنا مبالغہ.... انتظار... نہیں کرے گا مزز زمر!“

”زمر کی آنکھوں میں کرچیاں ابھریں، مگر گردن مزید اڑ لگی۔“ یہ.... آپ کا.... مسئلے.... نہیں ہے۔ انہی کے انداز میں بولی۔

”مگر آپ کا تو ہے نا۔ اور وہ کیا ہے کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“ وہ نرمی سے ذرا جھک کر بولے تھے۔ ”تیرہ سال.... چلیں دس سال بعد آپ کے ہاتھ میں کیا ہو گا؟ اولاد تو آپ کی ہونیں سکتی، میں واقف ہوں (زمر کی آنکھوں میں سرفی ابھری) لیکن جو بچے آپ کے لئے اولاد کی طرح ہیں، وہ رمل جائیں گے۔ وہ بکھری دوبارہ زندگی شروع نہیں کر سکیں گے۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

"میں چاہتا ہوں کہ میں ہاشم کو راضی کرلوں، اور وہ کیس لڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ بار ایسوی ایشن کے صدر کو پولیس گولیاں مارتی ہے تو سارے دیکل اکٹھے ہو جاتے ہیں، پولیس کے خلاف کیس لڑتے ہیں، اور چھے سات ماہ میں قاتلوں کو سزا دلواتے ہیں۔ چھے سات ماہ میں زمر صاحب فیصلہ آ جاتا ہے وہ بھی پولیس کے خلاف اس ملک میں جہاں فیصلے آنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ مگر کیسے؟ کیونکہ دیکل چاہتے تھے کہ فیصلہ آئے۔ اس ملک میں اگر دیکل نہ چاہے تو کوئی فیصلہ نہیں آ سکتا، چاہے اس کے حق میں ہو یا خلاف ہو۔ ہاشم چاہے گا تو کیس چلے گا ورنہ نہیں چلے گا۔ اور ہاشم کو صرف میں راضی کر سکتا ہوں اور کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔ آپ کی وہ فتنی صاحبزادی صاحبہ بھی نہیں۔ اب آپ بتائے کہاں میں راضی کروں ہاشم کو؟" اس کے وہ رسمکون لگتے تھے؛ رسمکارا کر بھروسی سے اس کی آنکھوں میں حھانا کا۔

اور یقیناً بدلے میں مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ بتائے کیا کروں میں جس کے بدلے میں آپ عناصر کرس گے میرے اوپر؟“

آپ فارس کو جھوڑ دس!“

آسمان سے کوئی تارہ زور سے ٹوٹ کر گرا تھا، گویا کسی فرشتے نے کسی باتیں اچھنے والے شیطان کو دے مارا ہو۔ تارہ تھایا آگ کا گولہ۔ زمین یہ گر کر ہرشے کو بھسم کر گیا تھا۔

پریس میں.....فارس کو.....چھوڑ دوں؟“ وہ چند لمحے سنجیدگی سے ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک دم بنس دی۔ وہ بھی بلکے سے بنس

-۲-

”مگر میں سنجیدہ ہوں مسز زمر۔ فارس کو آپ پکھ دے تو سکتی نہیں ہیں ویسے بھی آپ گردے کی مریض ہیں، آپ کی زندگی کم رہ گئی ہے، اللہ آپ کو زندگی دے، میری تو یہ دعا ہے، مگر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں۔ آپ پہلے ہی جس شخص کی زندگی میں بوجھ بنی ہوئی ہیں، اس سے نکل حاصل اور جس بھے سے آپ کو محبت ہے، اس کو اس بوجھ سے آزاد کر دس۔“

”بارون صاحب۔“ اس نے مسکراہٹ دبائے چمکتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ ”آپ اپنی بیٹی کے لیے اتنی تگ و دوستہ کریں تو اچھا ہے۔ اس کی توہاشم سے شادی ہو رہی ہے نا، نو شیر والا سے ذکر سننا تھا، سو میرا خیال ہے اس کے مسئلے سنبھالنے کے لئے ہاشم کاردار کافی ہے، اور رہی میں تو....“ باہمیں کندھے سے لٹکتے پرس کو اتار کر دایمیں پ منتقل کرتے وہ مسکرا کر بولی۔ ”جو میرا ہے.... وہ میرا رہے گا!“ ایک آخری چمکتی نظر ان پر ڈال کر وہ مرگی۔

ہارون زم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتے دیکھتے رہے۔

چند لمحوں بعد سڑک پر گاڑی دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیور نگ کرتا سعدی پچھے کہہ رہا تھا.... اور وہ کھڑکی کے باہر بھاگتے، پونز اور بتیاں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جوت بچھ جکی تھی اور گود میں رکھے پرس میں ڈالا تھا مسلسل اندر موجود ڈبی کھول بند کر رہا تھا۔ تک... تک... تک... نئے تارے جیسے ہیرے والی لوگ کی ڈبی کا ڈھکنا بار بار گرنے اور اٹھنے کے باعث مدھم سی آواز نکالتا تھا....

ٹک...ٹک...ٹک

باشم رات کے ڈیڑھ بجے تھانے سے گھر چلا آیا۔ پولیس اتنے دباؤ اور جنگل کی آگ کی پہلیتی خبر کے بعد کسی صورت نو شیر والوں کو رہا نہیں کر سکتی تھی۔ اب مزید کوشش کرنا خود کو ایک جابر اور قانون شکن با اثر آدمی ظاہر کرنا تھا اور فلا نظر اپست باشم کاردار کے سفید کار کو یہ گوارانے تھا۔

"ایک اڑکا جس کو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح ٹریٹ کیا...." باہر میڈیا کے نمائندوں کے مانیکس کے سامنے چہرہ کیے، کار کا دروازہ گھو لے کھڑا وہ کہ رہا تھا۔ "جس کی بازیابی کے لئے سب سے زیادہ کوششیں میں نے کیں، وہ ذرا سے جائیداد کے نتائج کے باعث میرے بھائی کو اونے کیس میں دھکیل رہا ہے، مجھے سوچ کر بھی شرم آتی ہے۔ بونو واث میں نے اینی ساری زندگی قانون کی بالادستی کی نذر کی ہے۔"

میں اس موقعے پر اپنے عہدے اور طاقت کا ناجائز استعمال کر کے اپنے بھائی کو بغیر عدالت میں پیشی کے نہیں چھڑ راویں گا۔ اگر اس کا نام ایف آئی آر میں ہے تو پھر وہ اور نگزیب کاردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اس کو قانون کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ہم ان لوگوں میں نے نہیں ہیں جو دولت یا طاقت کی فراوانی کے باعث خود کو فرعون سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم پیسے والے ہیں، ہمارے اوپر انگلی اٹھانا بہت آسان ہے۔ یعنواں، اب مزید میں ان لوگوں کو ”غريب کارڈ“ نہیں کھینچنے دوں گا۔ صبح ہم عدالت جاری ہے ہیں اور اپنے بھائی کو دو ہیں سے چھڑ رکھنے کا ممکن گی۔ ہمیں انصاف چاہیے۔ انصاف صرف غریب کے بچے کو نہیں چاہیے ہوتا، ہمیں بھی... چاہیے! اور ہاتھ ہلا کر ”بس“ کا اشارہ کرتا کار میں بیٹھ گیا۔ مانیکس اس کے تعاقب میں بچھے مگر گارڈ کار کارروازہ بنڈ کر چکا تھا۔ ناڑز حركت میں آئے اور کار زن سے آگے بڑھ گئی۔

مورچاں کے لا اونچ میں وہ سب بیٹھے ہی وی اسکرین پر چلتا نو شیر داں کا کلپ دیکھ رہے تھے۔ (خنین وہاں نہیں تھی)۔ سعدی خاموش تھا اور زمر ابا کو بتا رہی تھی کہ کس طرح نو شیر داں اس وقت لاک اپ میں بیٹھا ہے۔

”ہفتے دن میں وہ رہا ہو جائے گا، دو دن بعد وہ ملک سے باہر ہو گا، اور اگلے پندرہ سال وہ واپس نہیں آئے گا اور تم دونوں بیچھے سے پیشیاں بھلگتا نا۔“ فارس نے اپنا کافی کامگ اٹھاتے ہوئے نہایت پر سکون انداز میں اطلاع دی۔ ”ویکلم تو پاکستان!“ زمر اور سعدی پر ایک ”اچھا سوری“، والی نظر ڈال کر، کندھے اچکا تا اگ ہونتوں سے لگاتا، وہ آگے بڑھ گیا تو زمر پہلو بدلو پر کرہ گئی۔

”نہیں نکلے گا وہ باہر!“ سعدی اس کے جانے کے چند منٹ بعد ایک دم سے بولا تھا اور پھر اسی طرح اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ زمر بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر بے اختیار سر جھکا جیسے کسی کی آواز کو... صور جیسی آواز کو زہن سے جھکتا ہو... (آپ اسے اس بوجھ سے آزاد کر دیں)۔

وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ سعدی ہے۔ وہ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور ہمیں انصاف ضرور ملے گا۔ وہ خود کو تسلی دینے لگی۔ دل سیاہ آسمان میں بار بار ڈوب کر ابھرتا تھا۔



سارا جوار بھاتا میرے دل میں ہے مگر ..... الزام یہ بھی چاند کے سر جانا چاہیے  
سعدی نے اور پری منزل پہنچنے اس بیٹر دوم کا دروازہ کھولا (جو امی نے اس کے لئے تیار کیا تھا) تو اندر اندھیرا تھا۔ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے اس نے سر جھکائے سوچ بورڈ پر انگلی رکھی تو کمرہ روشن ہو گیا۔ کسی احساس کے تحت اس نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔  
اس کے بیڈ کے کونے پر خنین بیٹھی تھی۔ الجھے سے بال ڈھیلی چوٹی میں بند ہے تھے۔ گود میں کاغذوں کا ایک پنڈہ رکھا تھا اور زخمی نگاہیں سعدی پر چمی تھیں۔

”فارس ماموں نے مجھ سے پوچھا کہ..... میں ہاشم سے کیا بات کرتی تھی؟“

”خنین میں یہ بات اب ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کچھ عرصے بعد میں اسے بھلا کر تمہیں معاف کر دوں گا اور.....“ بے زاری سے سر جھکتے وہ آگے آیا تو وہ کھڑی ہوئی۔ انھی گردیں اور پورے قدم کے ساتھ۔

”معافی مانگی کس نے ہے آپ سے ہاں؟!“ کہنے کے ساتھ اس نے کاغذ سعدی کے قدموں میں پھینکے۔ کچھ نیچے گرے۔ کچھ اڑکر بکھر گئے۔

”سعدی یوسف خان!“ اس نے صدمے اور غصے سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے اوپنی آواز میں دہرا یا۔ ”سعدی یوسف... خان۔ یہ تھے وہ الفاظ جو ان انس سو بھر میس پانچ سو چھپن دفعہ استعمال ہوئے ہیں، یہ میرے ان تمام میس چھ کاری کارڈ ہے جو ان کو یہیج تھے میں نے۔ بیک اپ سے نکالے ہیں میں نے اور آپ کو دکھانے لائی ہوں۔ دیکھیں اسے۔ پڑھیں اسے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آ

پ کو کیا بتاتا رہا ہے، مگر میں اس سے آپ کی بات کرتی تھی۔ آپ کی سعدی بھائی، آپ کی بات کرتی تھی میں۔ ”بولتے بولتے جذبات سے آواز بوجھل ہوئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ بالکل خالی نظروں سے اسے دیکھ گیا۔

”پڑھیں ان میسچزر کو۔ نہیں پڑھیں ان کو پلیز۔ میں نے ہمیشہ ان کو ہاشم بھائی کہا، کبھی غلط بات نہیں کہی ان سے۔ کسی سے ایسی بات کرنا غلط ہے یا صحیح، اس سے قطع نظر میں نے کبھی ان سے... کوئی... غلط بات... نہیں کہی۔ صرف آپ کی یا زمرکی یا گھر میں بڑھتی وحشت کی بات کرتی تھی۔ ہاں میں ان کو پسند کرتی تھی۔ کہیں دور اندر اب بھی پسند کرتی ہوں۔ ”اس کی بلند آواز کا نپی۔ ”مگر کسی کو پسند کرنا گناہ نہیں ہوتا۔ پسند پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد وہ کیا کرتا ہے، اس پر ہوتا ہے۔ میرا قصور نہیں ہے اس میں اگر میں ان کو پسند کرتی ہوں۔ جانتے ہیں کس کا قصور ہے؟ ”وہ تین قدم آگے بڑھی اور خاموش لب بچھن کھڑے سعدی کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ کا! آپ کا قصور ہے۔ ”آنواب خشک تھے اور وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتی غرائی تھی۔ ”آپ تھے جو مجھے ان کے گھر لے کر گئے تھے اس رات جب نو شیر والے انواع کا ڈرامہ کیا تھا۔ آپ تھے جو ہاشم کا لا کر کھولنے میں اور اس کاراز جانے میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ آپ کو خیال بھی نہیں گزرا کہ آپ کی بہن دوسرے کمرے میں ہاشم کے ساتھ ہے۔ آپ تھے جنمبوں نے اس شخص کی اصلیت ڈیڑھ سال ہم سے چھپائی۔ ہمیں دوبارہ ان کے گھر پارٹی پر لے کر گئے۔ پھر بعد میں آپ مجھے کہتے ہیں کہ اس کو کیوں بلا یا کا لجھ؟ ہاں بلا یا تھا میں نے ان کو کا لجھ۔ کیونکہ سعدی بھائی.... وہ قاتل ہے، کر پڑ ہے، جو ہٹوما کارہے، مگر وہ جو میمنشل نہیں ہے۔ وہ گلٹی ہے تو دوسرے گلٹی لوگوں کو ایسے جو نہیں کرتا جیسے آپ نیک لوگ ہم گناہ ہگاروں کو جوں کرتے ہیں۔ کیوں بلا یا میں نے اسے کا لجھ؟ اس لئے کہ مجھے اس سے امید تھی کہ وہ مجھے برائیں سمجھے گا۔ آپ سے یہ امید نہیں تھی مجھے۔ کیوں بات کرنی تھی میں اس سے؟ کیونکہ مجھے کسی نے... آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ وہ اندر سے کیسا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا وہ کیسا ہے؟ صرف یہ کہہ دینا کہ اس کو کبھی نہیں بلاانا آئندہ کافی نہیں ہوتا۔ مجھے وجہ نہیں بتائی، مجھے اس کی اصلیت نہیں دکھائی.... پھر مجھ پر الزام کیوں ڈالتے ہیں؟ ”وہ شل کھڑا سن رہا تھا اور وہ آخر میں خہبر کر... اس کی آنکھوں پر نظر میں جماۓ چبا چبا کر بولی۔

”میرے دل کا خون کرنے والے ہاتھ میرے نہیں تھے۔ آپ کے تھے! ”پیر کی ٹھوکر سے ان کا غزوں کو مزید بکھیر دیا۔ ”آپ کا فرض تھا مجھے بتانا، مجھے اس کی اصلیت دکھانا۔ میں انیس سو دس کی لڑکی نہیں ہوں جس کو ہونس زبردستی سے ڈانت ڈپٹ کر آپ کچھ بھی کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ میں اکیسویں صدی کی لڑکی ہوں، میرے پاس میرا ذہن ہے اور ذہانت ہے۔ میرے دور کی لڑکیوں کے بھائیوں کو یہ بھول جانا چاہیے کہ وہ غصہ کر کے حکم دے کر یا پابندیاں لگا کر اپنی بیجوں کو کسی سے موبائل پر بات کرنے سے روک سکتے ہیں۔ جب تک وہ برابری کے لیوں پر آ کر، اپنی بہن کے ساتھ بیٹھ کر اس کو دلائل سے نہیں سمجھائیں گے، وہ ان کی بات نہیں مانے گی۔ باہر کے لوگ ہمارا دل ایسے نہیں توڑتے بھائی جیسے ہمارے اپنے مرد ہمیں توڑ جاتے ہیں۔ ”آخری لفظ پر اس نے پکلی لی، اور پھر اس کے ساتھ سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جا پکلی تھی اور سعدی تھا خاموش کھڑا تھا۔ پھر دفتارہ جھکا اور ایک ایک کاغذ اٹھانے لگا۔ سب کو اکٹھا کیا، برا بر کیا، اور پھر استدی میبل کی دراز میں ڈال دیا۔ بغیر پڑھے۔ بغیر دیکھے۔ اس کا چہرہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ سنجیدہ اور خاموش۔

.....

جلتی ہیں روز جس کے اشارے پر بستیاں ..... اس آنکھ تک دھوئیں کا اثر جانا چاہیے اگلی صبح دھنڈ میں واضح کی محسوس ہوتی تھی۔ سورج نکھرا نکھرا ساتھا کھڑا تھا اور ہارون عبید کی رہائشگاہ کے سارے شیشے دھوپ سے چک رہے تھے۔ لا و نج میں ہارون شلووار سوٹ اور کوٹ میں ملبوس صوفے پر اجمان سوچتی نگاہوں سے ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہے تھے جہاں

نوشیر وال کی گرفتاری کی کلینک بار بار دکھائی جا رہی تھی۔

”معروف آئی پی کا بیٹا نوشیر وال کاردار جس کوکل شام وارت گرفتاری جاری ہونے کے بعد اسلام آباد کے ایک ریست ہاؤس سے گرفتار کیا گیا تھا، اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے اور آج اس کوعدلت میں پیش کیا جائے گا۔ جہاں پولیس اس کے جسمانی ریمانڈ کے لئے درخواست دے گی اور قوی امکان ہے کہابھی چند دن تک نوشیر وال کاردار اپنے گھر نہیں جائیں گے۔“

ہارون نے ریموت اٹھا کر بڑن دبایا۔ اسکرین بجھ گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ خاموش لاونچ میں خاموشی کی چاپ سنتے رہے۔ پھر اٹھے اور پیچھے سے قمیض جھٹک کربرا بر کرتے آگے بڑھ گئے۔

اوپر آ کر وہ آبی کے کمرے کے سامنے رکے۔ دروازہ کھٹکھٹایا، پھر دھکلیلا۔

”آبدار۔ بچے تم نیچے کیوں بیٹھی ہو؟“ وہ بیڈ کی پانچتی کے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ سرخ بال بکھر کر کمرپر گر رہے تھے اور آنکھیں گلی تھیں۔ وہ ترجم سے اسے دیکھتے آگے آئے اور بیڈ کے کنارے آبیتھے۔ ”آبی۔“ انہوں نے دبارو پکارا۔

”اسے لگتا ہے میں ڈرامہ کرتی ہوں۔ اسے لگتا ہے میں اس کی نیک نامی کے لئے خطرہ ہوں۔“ اس نے گلی آنکھیں اٹھا کر گلکہ آمیز نظروں سے باپ کو دیکھا۔ ”بابا۔۔۔ مجھے ہر چیز سے دھشت ہونے لگی ہے۔ ہر شخص سے۔۔۔“

”آبدار۔۔۔ اتنا نہیں سوار کرتے کسی کو حواسوں پر کہ۔۔۔“

”یا پہنچے اختیار میں نہیں ہوتا بابا۔۔۔“ اس نے شنکلی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ”میں بہت بڑی طرح ٹوٹ گئی ہوں۔ میں سارا دن اس کی کال کا انتظار کرتی ہوں۔ میں نے اس کے نمبر کر رنگ ٹوں بھی بدلتی ہے کہ اسکرین دیکھنے سے پہلے مجھے اس کی کال کی خبر مل جائے۔ میں ہر چند منٹ بعد واٹ اس ایپ پر اس کا لاست میں دیکھتی ہوں۔ اگر وہ آن لائیں ہو تو لگتا ہے وہ میر دسٹر میں ہے۔ جیسے کوئی ڈوری سی ہو میرے اور اس کے درمیان۔۔۔ مگر میں اسے مستحب نہیں کر سکتی بابا۔ کیونکہ پھر وہ مجھے بلاک کر دے گا۔ میرا دل بہت ٹوٹا ہوا ہے بابا۔“ اس نے اپنا سران کے گھٹنے پر کھدیا اور دنے لگی۔ اس کی رنگت زرد تھی اور حلیہ بے ترتیب۔

”آبی۔۔۔ تم کیا چاہئی ہو؟“ انہوں نے اس کا سر تھکپتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ نے مجھے بھی کچھ نہیں دیا۔ میری ماں کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ مجھے وقت بھی نہیں دیتے۔ میری سالگرد بھی یاد نہیں رکھتے۔ آپ مجھے وہ بھی نہیں دے سکتے۔“ نفی میں سر ہلائی وہ سیدھی ہوئی اور بند مھیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”سوائے ہاشم کاردار کے، تم دنیا میں جس کو بھی میرے سامنے لے آؤ گی، میں اسے قبول کرلوں گا۔“

”مجھے ہاشم سے کوئی سروکار نہیں ہے بابا۔“ وہ غصے سے سر جھٹک کر یوں تھی۔ ”مجھے جو چاہیے ہے۔“ unavailable شدہ ہے۔ اور آپ۔۔۔ آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے میرے لئے۔ میں بابا بساری زندگی تکلیف میں رہوں گی۔“

اس کی بیز سرمی آنکھوں کے کٹورے پھر سے بھرنے لگے۔ ہارون کچھ دیر غور سے اسے دیکھتے رہے۔

”وہ تمہیں مل جائے گا، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اب اٹھو بچے۔ کھانا کھاؤ، اور کپڑے بدلو۔ پھر اپنے کلینک جاؤ، خود کو کام میں مصروف کرو۔“

مگر وہ ان کے پہلے الفاظ پہ چوک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ ”آپ۔۔۔ وعدہ کرتے ہیں؟“ مایوسی کے آسان پامیدا تارہ ساچ کا تھا۔

”ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔“ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر یقین دلایا تھا۔ آبدار کی آنکھوں سے آنسو گاہب ہونے لگے اور ان کی جگہ اجھن نے لے لی۔

”مگر۔۔۔ کیسے؟“

”تم مجھے بتاؤ۔۔۔ کیسے؟ وہ کیسے آئے گا تمہاری زندگی میں؟“

”وہ جب تک اس کی زندگی میں رہے گی، وہ مجھے نہیں ملے گا بابا۔“ تارہ ڈوبنے لگا۔

”وہ اس کی زندگی سے چلی جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں وہ چلی جائے گی۔“

آبدار کی ان پر جمی آنکھوں میں پکھ جپا تھا۔ ”کیسے؟ آپ کو کیسے پڑتے؟“

”میں نے رات اس کو دیکھا تھا۔ زمر کو۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ سعدی یوسف کے کیس سے متعلق۔ چہرے پڑھنے آتے

ہیں مجھے۔ وہ اسے چھوڑ دے گی بہت جلد۔“

”آپ نے اسے کچھ کہا تو نہیں؟ باہا پلیز آپ ان کوئی کوئی حکمکی وغیرہ نہیں دیں گے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ میں.....“

”نہیں، میں کیوں کچھ کہوں گا؟ مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں، وہ اس کو چھوڑ دے گی۔“

”کیا اس نے خود ایسا کہا؟“ آبی کا دل انکل گیا تھا۔

”نہیں، اسے ابھی خود بھی معلوم نہیں مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں بیٹے، میں لوگوں کو اخبار کی طرح پڑھتا ہوں، ساری زندگی پڑھتا آیا ہوں۔ وہ

اسے... چھوڑ دے گی!“ پھر اس کا رتھکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”اب فریش ہو جاؤ، میں ڈانگنگ ٹبل پر تمہارا منتظر کر رہا ہوں۔ کھانا اکٹھے کھاتے

ہیں۔“

آبدار کے لبوں پر زرم مسکراہٹ بلکھر گئی۔ وہ سر بلاتے ہوئے اٹھنے لگی۔ قدموں میں بالکل جان نہیں تھی۔ جانے کب سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ہارون ان اب اسے سہارا دے کر کھڑا کر رہے تھے۔ چند دن میں ہی وہ اتنی کمزور نظر آنے لگی تھی۔

❖❖❖

وحشتن بڑھتی گئیں بھر کے آزار کے ساتھ ..... اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غمخوار کے ساتھ  
دانستے کی جہنم حیسا احاطہ عدالت آج بھی لوگوں سے کھا کچھ بھرا تھا۔ نوشیر وال کاردار کو سایہ تھکڑیوں میں مقید کیے اپنے ساتھ  
چلاتے لارہے تھے۔ وہ اسی ویسٹ میں ملبوس تھا جس میں ساری رات لاک آپ میں بیٹھے کافی تھی۔ سردی کے باوجود آستین چڑھا رکھتے تھے۔  
پھرے پنجیدہ تاشر تھا اور آنکھیں شب بیداری کے باعث گلابی پڑ رہی تھیں۔ سامنے سے انسان چلے آ رہے تھے۔ بے نیاز، تیز تیز چلتے  
ہوئے۔ عجیب غوفا ک لگ۔ اور پھر ان کا شور ہی شور۔ وہ سامنے دیکھنے کیلئے چل رہا تھا، نظریں جھکی تھیں۔ اسے رابداری میں چلتے اپنے قدم  
نظر آ رہے تھے۔ ساتھ میں ہاشم کے چمکتے بوٹ بھی۔ سپاہیوں کے رگڑ رگڑ کر پالش کیے جوتے بھی۔ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ وکلاء کی فوج  
ان کے ہمراہ تھی۔ سامنے کھڑے صحافی اور کیمروں میں سوالوں کی بوجھاڑ کرتے ائمہ قدموں پیچھے ہرثہ رہے تھے۔

”ہاتھ اٹھا کر وکٹری کا نشان بناؤ اور مسکرا کر یہاں سے گزو۔“ ہاشم نے قریب میں سر گوشی کی۔ اس نے ایک نظر انداختی اور جبرا  
مسکراہٹ لاتے وکٹری کی دو انگلیاں اور پر اٹھا کیں۔ ایک رات لاک آپ میں کامنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس برخ سے اسے ہاشم  
کے علاوہ کوئی نہیں نکال سکتا اس لیے وہ اس کا ہر حکم ماننے کا بندھا۔

صحافیوں کا ہجوم ایک جگ آ کر رکنا تھا، رک گیا، وہ لوگ آگے بڑھتے گئے۔ شیر و نے وکٹری کی انگلیاں گردادیں۔

”یہ ہمارے انویسٹریز کے لئے تھا، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم پر اعتماد ہیں۔“ ہاشم اسے کہہ رہا تھا۔ وہ نہیں سن رہا تھا۔ نظریں پھر  
سے جھکا دی تھیں۔

”زیادہ سے زیادہ سات دن تک رہنا پڑے گا تمہیں لاک آپ میں پھر جبل بھیج دیں گے۔ اس کے بعد میں ضمانت کروں گا، مگر  
ان سات یا دس دن میں تمہارا اندر رہنا بہتر ہے۔ optics کے لئے یہ اچھا ہے۔ کوئی بھی خبر میدیا پر اس سے زیادہ نہیں شور مچاتی۔ خبر دب

جائے گی، لوگ تھک کر چپ ہو جائیں گے۔ ان سات دنوں میں ہم تین پارٹیز دیں گے، مختلف جگہ چیریئی گیدرگر میں جا کر پیسہ لٹائیں گے۔ یعنو۔ optics کے لئے۔ چند ایک photo کے بعد ہمارا مجع اور ہماری خیرات اس سارے گند کو بادے گی۔ صرف سات دن شیرد...“

الغاظ مضم ہو رہے تھے... کئے سنائی دے رہے تھے۔ وہ بالکل سر جھکائے چلتا رہا۔ وہ ہاشم کو نہیں بتا سکتا تھا کہ لاک اپ کی ایک رات نے اسے ڈنی طور پر لکنا پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ رات کتنی ڈراونی تھی۔ کتنی خوفناک تھی۔ ہر جگہ زیر تعمیر گھر میں بہتا خون کا تلاab نظر آتا تھا۔ اور.... وہ چہرہ... وہ یتھے گرے بوث کی ٹھوکروں سے زخمی لڑ کے کا لہو لہان چہرے کے ساتھ کہنا... اللہ حساب لے گا.... نوشیروال نے چہرہ اٹھایا۔ فضامیں مانوس ہی خوب شو تھی۔ کافور کی سی۔ باسی گلاب کی خون آلو دپتوں کی سی مہک۔ اس نے سر اٹھایا۔ سامنے ایک دروازے کے ساتھ وہ دونوں کھڑے تھے۔ زمر اور سعدی۔ وہ دونوں چھپتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظریں سعدی سے ملیں۔ ان میں نفرت تھی۔ پتش تھی۔ اور ایسے زخم تھے جن کو مندل ہونے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔ ”میں دیکھ لوں گا تم سب کو۔“ ہاشم نے انگلی اٹھا کر تنفس سے کہا تھا۔ سعدی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ”تم لوگوں کو بیس سال عدالت میں نہ لکھا یا تو دیکھنا،“ اور شیر وال منظر بدلتا گیا۔ راہداری آگے بڑھتی گئی۔ وہ دونوں خاموش کھڑے بجھے پیچھے رہ گئے۔

❖❖❖

ایسا ہے کہ سینے میں سلگتی ہیں خراشیں..... اب سانس بھی ہم لیں گے تو اچھا نہ کریں گے سردی کا زور ہر گزرتے دن کے ساتھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ جیل کے احاطے پر گرتی سنبھری روشنی سلانخوں سے لپٹ کر ان کو پکھلا رہی تھی۔ چند الہکاروں اور سادہ لباس میں موجود افران کی معیت میں نوشیروال کاردار چلتا ہوا سکن میں آگے بڑھ رہا تھا۔ جیل کا اے بلاک اصولاً صرف اے کلاس قیدیوں کے لئے ہونا چاہیے تھا مگر یہاں ہر طرح کے تیدی تھے اور وہ استثنے کوئی خاص پڑھ لکھے اور خاندانی نہیں لگتے تھے۔ برآمدوں میں کھڑے قطار در قطار سفید پیلے لباس والے قیدی سرگوشیاں کرتے اس نوجوان کو اندر آتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ ان کو نہ دیکھے مگر پیشانی پیسیں میں ترقی کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے شدید گرمی لگ رہی تھی مگر وہ اٹھا رہیں کر پا رہا تھا۔ راہداری میں سے گزرتے اس نے سلانخوں والے دروازوں کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے لوگوں کو چھپتی آنکھوں سے خود کو دیکھتے پایا۔ اور جانے کہاں سے وہ آواز کان میں پڑی۔

”اس نے فارس غازی کے بھانجے پر گولی چلانی تھی۔“

نوشیروال کے حلق میں کچھ انکا۔ قد مڑ کھڑائے مگر وہ چلتا رہا۔

”اس نے غازی کے بھانی اور بیوی کو مارا تھا۔“

وہ نہیں کہہ سکا کہ ایسا نہ تھا۔ کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

مختلف راہداریوں اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے اس نے لوگوں کی بہت سی باتیں سنیں۔ وہ اس پر نہ رہے تھے، غصہ کر رہے تھے اسے غازی کا مجرم گردان رہے تھے۔ وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ماں کی۔ بہن کی۔ بیٹی کی۔ وہ اس کا تمثیل اڑا رہے تھے۔ اس کی بیریک آگئی تھی۔

وہ صاف سترہ کشادہ سا کمرہ تھا۔ بیڈ، صوف، روم ریفریگریٹر، اسے سی، ایچ باتھ، ایل سی ڈی ڈی وی ڈی پلیسٹ، سب میسر تھا۔ الہکار اس کو بستر پر آرام کرنے کا کہہ کر اپنے مکمل تعادن کی یقین دہانی کروارہا تھا۔ نوشیروال سرخ پرستی آنکھوں سے اسے دیکھتا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔ بالکل گونوں کی طرح خاموش۔

ایک گالی کا برداشت کر لینا انسان کو ترقی گالیوں سے بچا لیتا ہے۔ کاش وہ ایک گالی برداشت کر لیتا۔

❖❖❖

اے دل ذرا سی جرأت رندی سے کام لے ..... کتنے چاغ ٹوٹ گئے اختیاط میں  
ڈاکٹر سارہ اپنے آفس میں گردن جھکائے بیٹھی، میز پر رکھی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہی تھی جب دروازہ ذرا سی آہٹ سے کھلا۔ سارہ  
نے قلم دانتوں میں دبائے آنکھیں اور اٹھا میں تو خسرو گئی۔ قلم دانتوں سے یخچ گرا۔ چہرہ ساکت ہو گیا۔  
چوکھت میں سعدی کھڑا تھا۔ اور وہ پرانا سعدی بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ جیز کے اوپر جیکٹ پہنے وہ آنکھوں میں چھپتی ہوئی تپش لئے  
اسے دیکھ رہا تھا۔

”سعدی!“ اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

”تو یہاں چھپی ہوئی تھیں آپ؟“ اس کا لجہ بھی بدلا ہوا تھا۔ سارہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ رنگت پھیکل پڑی۔

”سعدی!“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔ میں یہاں اپنی جاب واپس لینے بھی نہیں آیا۔“ وہ اس پر برہم نگاہیں جمائے چند قدم آگے آیا۔ ”میں صرف یہ  
پوچھنے آیا ہوں ڈاکٹر سارہ غازی کا آپ میرے حق میں گواہی دیں گی یا نہیں؟“  
”تم مجھ سے میرا حال بھی نہیں پوچھو گے؟“ اس کو دکھ ہوا۔

”نہیں، کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ عافیت سے ہوں گی۔ یہ عافیت جو آپ نے خاموش رہنے کے عوض چھن تھی یقیناً دیر پا ہو گی۔ میں  
ادھر قید میں مر رہا تھا، اس سے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ.... گواہی.... دیں گی.... یا نہیں؟“ وہ زور دے  
کر بولا۔ اتنے میں بعد ملاقات ہو رہی تھی اور پہلے چھپی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

”میں تمہاری طرح بہادر نہیں ہوں سعدی!“

”میں بھی بہادر نہیں ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میں نے کتنی رات میں جاگ کر گزاری ہیں صرف خوف کے عالم میں۔ سو مجھ سے  
بہادری کی بات مت کیجئے۔ میں صرف یہی بتانا چاہتا تھا۔ کوئی آپ کو بلاۓ گی۔ اور آپ کو آنا ہو گا۔ اگر آپ اپنی مجرمانہ خاموشی کا مداوا کرنا  
چاہتی ہیں تو آپ آئیں گی ورنہ میرے خاندان اور خود مجھ سے آپ کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔“

”تم اتنے سخت دل کیسے ہو سکتے ہو سعدی!“ وہ افسوس سے بولی تھی۔

وہ ایک دم تیری سے آگے آیا۔ ”میں نے... بھروسہ کیا آپ پر... آپ کو ایک قیمتی چیز دی۔ آپ نے اس کو بھی کھو دیا۔ آپ نے  
میرے لئے گواہی بھی نہ دی۔ اگر اس وقت آپ کچھ بول دیتیں تو خسرو... میرے گھروالے... وہ اتنے ماہا شم کے قریب نہ رہے۔ اس لئے  
دل کی خنثی کی بات مجھ سے مت کریں۔ اور فیصلہ کریں۔“ ایک قہر آلو دنگاہ اس پر ڈال کر وہ باہر نکل گیا اور اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کر دیا۔  
سارہ فکر مندی وہیں کھڑی رہ گئی۔

❖❖❖

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی ..... دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں  
تیز دھوپ میں بینک کی عمارت جھلس رہی تھی۔ یہ روئی سیر ہیاں اتر تاپی کیپ سے چہرے پر سایہ کیے کر نل خاور والٹ جیب  
میں ڈالتا چلا آ رہا تھا جب اس کا موبائل بجا۔ اس نے زینے اترتے اچنچھے سے موبائل نکالا پھر دھوپ کے باعث اسکرین پر ہاتھ کا چھبا بنا  
کر دیکھا۔

جلتا بجھتا نمبر شناسا تھا۔ بہت شنا سا۔ اس کا دل اچھل کر جلت میں آ گیا۔ وہ تیزی سے فون کان سے لگتا، لگر جھات سا ”بیلو“ کہتا کار کی طرف آیا۔

”خاور!“ میں بول رہا ہوں!“ ہاشم کی سنجیدہ آواز سنائی دی تھی۔ خاور کے چہرے پر بہت سے رنگ ابھرے۔ جذبات.... دکھ۔ ...مگر جب بولا تو لیوں سے بس اندا کلکا۔

”لیں سرا!“

”میں جانتا ہوں تم کہاں ہو، تمہارا نمبر بھی ٹریس کروالیا ہے، لیکن..... میں کسی کو تمہیں پکڑنے نہیں بھیج رہا،“ وہ رکا۔ اس کی آواز دھیکی تھی اور تاسف اٹکی تھی۔

”خاور..... میں بہت اکیلا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ شیر و جبل میں ہے اور چیزیں میرے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں سرا!“ وہ چلتے چلتے سایے میں کھڑی کا رتک آ گیا تھا۔ ایک دم جیسے سکون سا آگیا مجلسی و حوض سے سائبان مل گیا ہو۔

”مجھے ہر حالت میں اس کیس کو... یوسف خاندان کو... کچانا ہے۔ تم میری مدد کرو گے؟ ہر بات بھلا کر۔ جو میں نے تمہارے ساتھ کیا، میں جانتا ہوں تم مجرم نہیں تھے، اگر تم اس سب کو بھلا سکتو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ یو بیہہ والے کائنچ میں... کل شام پانچ بجے کے قریب.... اگر تم دوبارہ میرے لئے کام کرنا چاہو تو میں انتظار کروں گا تمہارا۔“

”جو حکم سرا!“ خاور کی آواز بھیگ کی تھی۔ ہاشم کی کال بند ہو چکی تھی اور وہ اس سائبان میں کتنی ہی دیر کھڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گلبانی تھی مگر چہرے پر طہانیت تھی۔ سر اخہا کراس نے ایک شکر آمیز نظر آسمان پڑاں کپھر کار میں بیجا۔ کار چلانے کی بجائے وہ موبائل پا ای میل چیک کرنے لگا۔ دو دن قبل کی موصول ہوئی ای میل جسے وہ بارہا پڑھ چکا تھا، ایک دفعہ پھر کھوئی۔

”میں جانتا ہوں تم میری میل ضرور پڑھو گے۔ وقت تمہارے ہاتھ میں ہے خاور چوکس تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم اپنے تما م گنا ہوں کافر ہو دینا چاہتے ہو تو کاردار زکے خلاف گواہی دو۔ میرے حق میں گواہی دو۔ ہم تمہیں دوقلوں کے لئے معاف کر دیں گے۔ تمہارا دامن صاف ہو جائے گا۔ وقت ابھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

سعدی یوسف خان“

”تم سے معافی مانگی کس نے ہے؟“ اس نے نفی میں سر جھکتے ہوئے تنفر سے کہا اور انگشن میں چاہی گھمائی۔ گاڑی میں ایک دم حرکت سی بیدار ہوئی تھی، جیسے محمد ہوئی وفا ایک لمحے میں جاگ ٹھکی ہے۔

❖❖❖

یہ بستی ہے تم پور دگاں کی ..... یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے  
شام شہر کے دوسرے حصے پر بھی خندی سی پھیل رہی تھی۔ اس آفس میں خاص ارش تھا۔ لوگوں کی چبل پہل، کیمین کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے ورکرز، شور، آوازیں۔ ایک آفس کے شیشے کے دروازے بند تھے اور اندر سفاری سوٹ میں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا، رسیور کان سے لگائے تیز تیز پنجابی میں کچھ کہئے جا رہا تھا۔ سامنے دو کرسیوں میں سے ایک پر سعدی بیٹھا تھا۔ آگے ہو کر مضطرب بے چین۔ دوسری پر فارس پیچھے ہو کر ناگ پٹا نگ جمائے آرام دہ انداز میں بیٹھا، مسلسل دو انگلیوں سے کان کی لومس لرہا تھا۔

”ہاں جی، میں فائل ملتے ہی آپ کو خبر کرتا ہوں۔ اچھا جی۔“ اس نے رسیور کھا اور دونوں ہاتھ باہم پھنسائے آگے کوہ کر سعدی کو

مخاطب کیا۔ ”ہاں جی۔ سعدی یوسف صاحب۔ یہ شروع ہونے سے پہلے کا ایک گھنٹہ ہے اور اس وقت میں عموماً کسی سے ملتا نہیں، لیکن خصوصی طور پر آپ کو بلا یا ہے تو آپ سمجھ سکتے ہوں کہ اہم بات کرنی ہو گی۔“ وہ عینک اتار کر میز پر رکھتے مصروف مگر خشک سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے آپ کے سیکرٹری نے فون پر کہا تھا کہ آپ میرا انٹرو یوکرنا چاہتے ہیں۔“ سعدی نے سنجیدگی سے کہا۔ بار بار وہ فارس کو دیکھتا تھا جو بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

”ہاں جی ایسا ہی ہے۔ دس بجے کے شوکے کی آرپی زا آپ جانتے ہیں کیسے آسمانوں سے بات کرتے ہیں، اوپر سے ملک کا نمبر ایک چینل ہے اور میری شکل اور ساکھ سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔“

”جیلانی صاحب، مجھے دوسرے چند چینلز سے بھی کال آئی ہے۔“ سعدی درمیان میں تیزی سے بولا۔ ”لیکن میں آپ سے ملنے اس لئے آیا ہوں کیونکہ میں اپنی کہانی صرف ایک دفعہ سنانا چاہتا ہوں اور کسی ایسے شواور ایسے چینل پر جہاں مجھے لگد کر واقعی پورا ملک مجھے دیکھا اور سن رہا ہے۔“

”بالکل جی، ویسے بھی اگلے ہفتے سے قومی اسٹبلی کا اجلاس شروع ہو رہا ہے، آپ کی کہانی کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں ہو گا، بعد میں اگر کیس چلتا ہے تو عدالت میڈیا ٹرائکل پر پابندی لگادے گی، اور آپ انٹرو یونیٹس دے لکھیں گے، یہی وقت ہے آپ کو اپنی کہانی بچنی ہے۔ میرے دو شوز.... ایک میں بات کو نہیں ہوتی تا۔ سود و شوز کریں گے ہم.... اس منگل اور بدھ کو.... دو شوز میں آپ اشارہ بن جائیں گے۔ سو شل میڈیا سے نکل کر آپ ہر شخص کے گھر تک جا پہنچیں گے۔“

”اوکے!“ سعدی نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ پھر فارس کو دیکھا۔ وہ خاموش بے نیاز سا لگ رہا تھا۔ شاید لوگوں میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ پھر تمیں لا کھ جمع کر ادیں، لیکن کیش کی صورت میں۔ بینک اکاؤنٹ ڈیٹائلر میں کسی کو دیتا نہیں ہوں، مسئلے ہو جاتے ہیں بعد میں۔ یہ میرا ایڈریلیس ہے، آپ ادھر پیسے لے آئیے گا، اسی ہفتے پھر ہم منگل اور بدھ کے دو شوز کر لیں گے۔“ کاغذ پر پتہ لکھ کر اس نے سعدی کی طرف بڑھایا جو پلک جھپکے بنا اس کو دیکھ رہا تھا۔

”تمیں لا کھ کس چیز کے؟“

”چلو جی!“ جیلانی نے اکتا کر پہلو بدلا۔ ”دیکھو بیٹا،“ میرے شوکا وقت ہونے والا ہے، اب فضول کی بحثوں اور جائز ناجائز کے چکروں میں پڑنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس نہ تو انہی ہے۔ بغیر پیسوں کے بیہاں کوئی تمہیں شو میں بلائے گا،“ میرے جیسا استکر تو کبھی بھی نہیں۔ اودہ بینا...“ پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔ ”اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے، پرائم نائم پاشہ بر جلوانے نا...“ تمیں سینڈ کے اشتہار کو ایک دفعہ چلوانے کی تین لاکھ سے کم فیس نہیں ہوتی۔ صرف ایک دفعہ کی بات کر رہا ہوں میں۔ یہ موبائل کمپنیاں، شیپووالے یہ لوگ روز کے کروڑوں کے اشتہار چلواتے ہیں۔ میں تمہیں پرائم نائم کے دو گھنٹے دے رہا ہوں، تیس لاکھ اس لحاظ سے کم ہیں مگر چونکہ تم نے اتنی جرات کا مظاہرہ کیا ہے، اتنا ظلم ہوا ہے تمہارے ساتھ اس لئے یہ رعایت ہے تمہارے لئے۔ آگے تم سوچ لو۔ کاردار ز کے خلاف اپنی کہانی بیان کرنے نکلو گے تو بغیر پیسوں کے کوئی اسٹوڈیو میں گھنے بھی نہیں دے گا۔“

سعدی اٹھا، اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ فارس دھیرے سے کھڑا ہوا مسکرا کر جیلانی صاحب سے پاتھ ملایا۔ ”میں اسے سمجھا دوں گا۔ ہم پیسوں کا بندو بست کر لیں گے۔ آپ شوکی تیار رکھیں۔“ ممانعت سے کہہ کر وہ اس کے پیچھے آیا۔

وہ تیز تیز پارکنگ ایریا میں چلتا جا رہا تھا۔ باہر آسمان اب گہر اسیا ہو رہا تھا۔ اکا دکا تارے بھی اپنے نے لگے تھے۔

”سعدی!“ دہکارتک پہنچا تو فارس تیز تیز چلتا اس سے آلا۔ ”ہم پیسے دے سکتے ہیں، ہمارے پاس ہیں پیسے!“ سعدی نے بے یقینی اور دکھ سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”میں اس شخص کا دوبارہ نام بھی نہیں سننا چاہتا۔ اور کیوں دیں ہم پیسے؟ میں انصاف لینے اس لئے کا تھا تاکہ مجھے کوئی غلط کام نہ کرنا پڑے، تاکہ میں قانون کا راست اپناؤں فرنٹ ڈور سے اپنی منزل میں داخل ہوں۔ نہیں استعمال کرنے مجھے یہ بیک ڈورز۔“ شدت غم سے اس کا چہرہ سرفراز پر رہا تھا۔ ”اور آپ دہاں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ ایک لفظ نہیں بولے اور نہیں تو دو چار کلے تو جڑی سکتے تھے اس اسٹکر کو۔“

”استغفار اللہ میں شریف آدمی ہوں۔ ایسا کیوں کرتا؟“ وہ خفا ہو کر کہتا گھوم کر ڈرائیور گ ڈور کی طرف بڑھ گیا۔ سعدی اسی طرح غم و غصے سے پیر ٹیخ کر رہ گیا۔



سیل کی ریگزور ہوئے، ہونٹ نہ پھر بھی تر ہوئے ..... کیسی عجیب پیاس تھی، کیسے عجب سماں تھا! اوائل مارچ کی وہ شام اپنے نیلے اندر ہیروں میں ڈھیروں تارے نائے چھلایا بی کھڑی تھی۔ موسم سردا روختک تھا۔ ساکت۔ جامد۔ ہاشم کا دارخوبصورتی سے آراستہ ڈرائیور روم میں بیٹھا تھا۔ صوفی شام کے اندر ہیروں جیسے نیلے تھے اور ان پر سہرے اجلے اجلے سے کشن رکھتے تھے۔ ٹانگ پٹانگ چڑھائے، گرے سوت میں ملبوس وہ گاہے بگاہے کلائی کی گھڑی دیکھ رہا تھا..... ایو یہی کی اس آبادی سے دور گھنے درختوں سے ڈھکی وادی میں اوچاٹی پہ بنا وہ خوبصورت بغلہ گہری شام میں روشن نظر آتا تھا۔ خاور نے باہر سڑک پر کھڑے، گردن اٹھائے اس بنگلے کی روشن کھڑیوں کو دیکھا..... ہاشم کا دار مفتظر خاموش صوفی سے پہ بیٹھا تھا۔ وقٹے وقٹے سے وہ وال کلاں کو بھی دیکھتا تھا۔ چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا، مگر وقت نکلا جا رہا تھا۔ جانے کتنی دیر گئے آنے میں۔ وہ سوچ رہا تھا..... سڑک پر کھڑا خاور بہت امید سے اس گھر کو دیکھ رہا تھا۔ ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ہاشم اس کو صرف اس لئے دوبارہ رکھنے پر مجبور ہوتا کہ وہ گواہی نہ دے ڈالے۔ ہاشم اب صوفی سے اٹھا اور ایک دفعہ پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے ڈرائیور روم میں ٹہیلنے لگا۔ دائیں سے باکیں۔ باکیں سے دائیں.....

”نہیں!“ خاور نے دور نظر آتے بنگلے کو دیکھتے ہوئے سختی سے نغمی میں سر بلایا۔ ہاشم کو اس کی بے گناہی کا یقین آگیا ہے۔ وہ اس کو اس کے لئے چاہتا ہے۔ وہ اس کی خدمات کے عوض واپس بمارہا ہے۔ وہ اس کا مالک ہے۔ اور اس غلامی پر اسے فخر ہے۔ خاور کی گردن اکثر گئی۔ دل میں سکون سا اتر گیا۔

ڈرائیور روم میں ٹہیلہا ہاشم اب سوچتے ہوئے دو انگلیاں گال کے زخم پر پھیر رہا تھا جہاں صبح شیو کے دوران کث لگا تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا، گویا درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا.....

خاور سڑک پر قدم قدم آگے بڑھتا گیا۔ بیہاں تک کہ بنگلے کا آہنی گیٹ آن پہنچا۔ وہ کھلا تھا۔ کوئی ملازم، کوئی گارڈ نہ تھا، اور ایسا صرف تب ہوتا تھا جب گھر کا کوئی فرد دہاں ہوتا تھا۔ خاور ہلکا سامسکرایا۔ اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ اس خندان کو وہ کتنے اچھے سے جانتا تھا۔ ہاشم ابھی تک دائیں سے باکیں چکر کاٹ رہا تھا جب وہ رکا۔ باہر الابی سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ بڑھتے قدم سنائی دے رہے تھے۔ ہاشم نے گہری سانس لی۔ بالآخر.... انتظار ختم ہوا.....

خاور بنگلے کے برآمدے تک آپنچا تھا۔ اسے اب کسی کا ڈرنہ تھا۔ ہاشم کی آواز کا دشوق، یقین، مان... اسے اس پر بھروسہ تھا۔ اس نے

مرکزی دروازہ کھول کر دھکیلا۔ لگڑی کا پٹ چرچرا تھا ہوا وسری طرف جاگا۔ اندر روشنی تھی مگر سامنے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ خاور سامنے اونی ٹوپی اتارتہ اندر داخل ہوا۔ اسی لمحے پیچھے سے اس کی گردان میں کوئی نوکیلی شے آ کر گئی۔ وہ بے یقینی سے واپس پلٹا، مگر ٹرینکولا از رڈ اسٹ کی فقار سے اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ وہ لگڑا کر بیخے کرنا۔ گھنٹوں کے بل، بے یقین دنگ چہرہ اٹھایا۔ تو دھندا سانظر آیا۔ سامنے سنگ روم سے کوئی چلتا آرہا تھا۔ خاور نے پلکیں جھپکا میں۔

”ہاشم!“ بیوی سے بدقائق کلاگروہ دیکھ کتنا تھا کہ آنے والا ہشم نہ تھا۔

”ہیلو کرنی خاور۔ مجھے احر شفیع کہتے ہیں۔ اور ہے ہاشم صاحب، تو وہ اس وقت اسلام آباد میں ہیں... اور ان کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ سونی کی دوست کی سالگرہ میں شرکت کرنے جانتا ہے۔“

ادھر اسلام آباد میں شہریں کے گھر کے سنگ کے ایریا میں ٹھہلاتا ہاشم آوازیں سن کر تھہر گیا تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور دو ملازموں کے ہمراہ شہری اور سونی آتی دکھائی دیں۔ دونوں بھی سنوری اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ سونی بابا کہتے ہوئے فوراً سے اس کی طرف بھاگی۔

”اتنی دیر لگا دی تم نے۔ میں کب سے انتظار کر رہا تھا۔“ وہ سونی کو اٹھا کر اس کے گال چوتا بظاہر مسکرا کر مگر درحقیقت دبے دبے غصے سے شہری سے بولا تھا۔

”میری اسلامکش کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ اب چلیں۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنا سیل فون بیگ میں ڈال رہی تھی۔ وہ سونی کو اتار کر اس کے قریب گیا۔

”آئندہ اس طرح کے دعوت نامے قبول کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا کرو۔“

شہری نے اچنپھے سے مسکارے سے لدی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”کیوں؟“

”کیونکہ لوگ ہمارے بارے میں۔ شیر و کے بارے میں بتیں کر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سونی کچھ نہ۔“ وہ دبی آواز میں گھر کر بولا تھا۔

”ایسے کام کرنے سے پہلے سوچا کرو نا۔“ وہ ناک سکوڑ کر بولتی آگے بڑھ گئی۔ وہ جو کوفت زدہ کھڑا تھا سونی کے خود کو دیکھنے پر مسکرا کر ہمراہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔....

خاور کی آنکھ کھلی تو منظر پکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنا چاہا، مگر.... دھندی دھندتی نئی نئی تھی۔ وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ ڈکٹ ٹیپ سے کہنیوں سے گھنٹوں تک سلوٹیپ لپیٹ لپیٹ کر اس کو جکڑا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بار بار جھپکتے گردن جھکائی۔ سخت سردی میں وہ بغیر سویرٹھی کہ بغیر شرت کے بیٹھا تھا۔ جیز، جوتے جرا میں سب اسی طرح پہننے ہوئے تھے مگر کندھے برہنہ نظر آتے تھے۔ اس نے پھر سے چہرہ اٹھایا۔

آج بھی سامنے.... دور.... ایک مرد اور عورت کھڑے تھے.... مگر آج وہ فوڈی ایور آفتر کے کچن میں دمٹن کے سامنے قید نہیں کھڑا تھا۔ آج مقابل اپنے تھے....

”ہاشم!“ اس کے بیوی سے پھنسا پھنسا سا کلا آنکھوں میں دل و دماغ میں ابھی بھی بے یقین تھی۔

”ہاشم کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو ظاہر!“ مسکراتی ہوئی جواہرات آگے چلتی آئی۔ احمد وہیں کھڑا رہا۔ ہاتھ باندھے۔

خاموش۔

”ہاشم نے.... مجھے بلا یا تھا۔“

”ہاشم نے تمہیں نہیں بلا یا تھا۔“ وہ شیرنی کی آنکھیں اس پہ جمائے مسکرا کر بولی تھی۔ احر قدم قدم چلتا سامنے آیا۔

”وہ کال میں نے کی تھی۔ ہاشم کی چند ریکارڈ نگز سے الفاظ توڑ توڑ کرنے کا، ان کو جوڑا اور تمہیں سنوا دیا، کرٹل خاور۔ کمال طریقہ تھا۔

اور تمہارا ہی تھا۔ تم سے ہی سیکھا ہے۔ ایسے ہی کبھی تم نے زمر کو بھی کال کیا تھا۔ کال پر کسی اپنے کی پورے یقین سے کہی ہوئی بات پر سب یقین کر لیتے ہیں۔ آج تم نے بھی کر لیا۔“ وہ کہہ رہا تھا اور خاور۔۔۔ اس کی مندی مندی آنکھیں سوچ سے مزید سکڑ رہی تھیں۔

”مارنا۔۔۔ مارنا چاہتے ہو تم لوگ مجھے؟ تاکہ تم۔۔۔ تم میری جگہ لے لو۔ اور آپ۔۔۔ اس نے سرخ آنکھوں کا رخ جواہرات کی طرف پھیرا۔“ میں تمہیہ کر چکا تھا، ہاشم کو سب بتا دوں گا۔ سعدی یوسف گواہی دے گا۔ پھر وہ مان جائے گا کہ تم نے۔۔۔ جواہرات کا ردار۔۔۔ تم نے مارا تھا اپنے شوہر کو۔“

جواہرات کی مسکراہٹ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ احرم بھی سپاٹ چہرہ لئے کھڑا رہا۔

”میں سمجھ گیا تھا۔ قید میں اتنے دن رہ کر میں سمجھ گیا تھا۔ تم تھیں اس رات ان کے ساتھ۔ اور اگر تم مجھے زمین بھرسونا بھی پیش کرو جان دوں گا۔“

جواہرات نے مسکرا کر احرم کو دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔ احرم اس کے پیچھے آیا۔ باہر شام گھری تاریک ہو چکی تھی۔ آسمان پر چھملا تھے ہوئے تارے افشاں کی طرح بکھرے تھے۔

برآمدے میں کھڑے جواہرات نے سنجیدگی سے اسے دیکھ کر کہا۔

”اس کو خاموش کروانا ضروری ہے۔ کرو گے نا؟“

”آپ فکر نہ کریں، جواہرات!“ اس نے سر کو خدمے کر کر کہا۔ پھر ملکہ کی آنکھوں پر نظریں بھائے پورے یقین سے بولا۔ ”اتابوجھ دل پر لے کر نہ پھرا کریں مادام۔ اگر اڑا شیز کیا ہے تو مجھ پر بھروسہ بھی کریں۔“

”بھروسہ تھا تو بتایا ہے نا!“ اس نے جھر جھری لی۔ ”اب میرے سر کا تاج بہت بھاری ہوتا جا رہا ہے۔“

”میری بات شیش دھیان سے۔“ اس نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے جواہرات کے شانوں کو تھاما۔ ”اس بات سے نہ ذریں کہ ہاشم اور نو شیر وال یہ جان جائیں گے تو کیا ہو گا؟ بلکہ اس دن کی تیاری کرنی ہے ہمیں۔ آپ نے۔۔۔ ایک اچھا کام کیا تھا۔ وہ آدمی ایک درندہ تھا اور درندے کو مار کر آپ نے اپنے بیٹوں کو بچایا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹوں کے لئے قربانی دی تھی۔“

جواہرات کی آنکھوں میں نبی در آئی۔ ”وہ دونوں مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔“

”تو میں کس مرض کی دوا ہوں؟“ وہ برآمان کر بولا تھا۔ ”ہم مل کر اور نگزیب کاردار کے ایسے کاٹے کرتوں ان کے سامنے لا میں گے، ان کے کردار کو تا سخ کر دیں گے، ان کے خلاف اتنا زہر اگلیں گے کہ وہ دونوں ان سے نفرت کرنے لگ جائیں گے، اور اگر کبھی ان کو معلوم ہو بھی جاتا ہے تو وہ آپ کی پوزیشن سمجھ جائیں گے اور یہ سوچیں گے کہ اچھا ہی ہوا، ان کو نجات دلادی۔ آپ نے۔۔۔“

جواہرات کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ آنکھ سے ایک قطرہ ٹوٹ کر گال پر لڑھکا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے؟“

”یہ بھی تو ممکن نہیں لگتا تھا۔ آج یہ دردسر بھی ختم ہو جائے گا۔“ اس نے مسکرا کر بیٹگل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

جواہرات کاردار کے جانے کے بعد وہ اس تھاپڑے بنگلے کے اندر آیا۔ پکن میں فرتج سے ایک باس نکالا اور اس کمرے میں آیا جہاں خاور بندھا رہا تھا۔ احرم نے صروف سے انداز میں ڈکٹ ٹیپ کا ایک بڑا اگلرا کاٹا۔

”اب کیا مجھے مار کر پھینکنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ ہونہ۔۔۔ یہ کاردار میرے نہیں ہوئے، تمہارے کیا ہوں گے۔“ اس نے تنفس سے سر جھکا

تھا۔ احمد اسی طرح آگے آیا اور ڈکٹ ٹیپ کا گلوہ اس کے منہ پر رکھ کر زور سے چکا دیا۔ وہ سر جھک کر رہ گیا۔

”میں تمہاری بک بک، تمہارے OMG اور ”کیا کیوں کیئے“ نہیں سننا چاہتا، ان بالتوں پر جواب میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، اس لئے کتنا اچھا ہو کر تم یوں چپ ہو کر بیٹھو۔ خاموش اور بے بس! باہ ایسے ٹھیک ہے۔“ سامنے آ کر سراہتی نظروں سے اس منظر کو دیکھا، پھر واپس اپنی کرسی پر آبیٹھا، اور باس کھولا۔ اندر مختلف شیشیاں، چند کاغذ اور چند سرنجیں رکھی تھیں۔

”تم نے بھی ہیری پورڑ پڑھی ہے خاور؟ سوری؟ میں ایسے موقعے پر اس داستان سے کچھ منتقل کر رہا ہوں، اب جب کہ تم اپنی یہ خوبصورت زندگی کھونے والے ہوئے تو۔“ ایک سرخ کی سوئی شیشی میں چھو کر وہ اسے اوپر اٹھائے بھر رہا تھا۔ ”مگر اس میں ایک نرم استعمال ہوتی تھی۔ اس کا پہلا چھپڑا اسی نام سے ہے۔ The Boy Who Lived۔ وہ لڑکا جو زندہ نہیں گیا۔ اون سروائیور۔“ پھر نگاہیں اٹھا کر ان میں زانوں کی پیش بھر کر خاور کو دیکھا۔ ”کہتے ہیں انتقام کے سائکل میں بیٹھا ایک سروائیور نجی جاتا ہے اور وہ انتقام لیتا ہے یوں چکر پہ چکر چلتا رہتا ہے.... چلتا رہتا ہے.... میں... کرنل خاور.... میں ہوں وہ لڑکا جو نجی گیا تھا!“

خاور کا منہ ٹیپ سے بند تھا گر کھلی آنکھوں میں اپنچھے اور حیرت کے سارے الفاظ سمٹ آئے تھے۔

”وہ بر گینڈ یئر یاد ہے تمہیں کرنل خاور جس کو اس کے پورے خاندان سمیت تم نے قتل کیا تھا؟ تمہیں نیک تھانا کا امریکہ میں اس کی ایک اولاد بھی ہے، کسی دوسرا عورت سے جسے وہ چھپا کر رکھتا ہے اور تمہیں یقین تھا کہ وہ بیٹی ہو گی، مگر تم غلط تھے۔ وہ بیٹا تھا۔ سلطان نگاش۔ اور وہ میں تھا!“ اس نے شیشی سرخ کی سوئی سے نکالی، جھک کر کاغذ سے کچھ پڑھا، پھر دوسرا شیشی اوپر اٹھا کر سوئی اس میں گھسا کر احتیاط سے مائع سار سرخ کے کلن میں بھرنے لگا۔

خاور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں، اور وجود بالکل ساکت ہو گیا تھا۔

”جب تم نے میرے باپ اور میری ہاف فیلی کو قتل کیا تھا تو میں ایک ٹمن انج لڑکا تھا جو بورڈنگ اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ میرا باپ اپنی حساس جاب کے باعث اپنی اولاد اور خاندان والوں کے ویسا باؤس مخفی رکھتا تھا، لیکن تم اس رات ہمارے گھر گئے جب سب دہائی موجود تھے، چھٹیوں پر سب آئے ہوئے تھے۔ میں نہیں تھا جو میں نجی گیا۔ ابا کے رشتے داروں نے ساری پر اپنی ہتھیاری، اور ابا کے دوستوں نے مجھے واپس آنے سے روک دیا۔ وہ کہتے تھے سلطان، تم بھاگ جاؤ، چھپ جاؤ۔ وہ آدمی تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ آدمی کون تھا۔ میں اتنے برس ایک آن دیکھنے دشمن سے چھپتا رہا۔ بھاگتا رہا۔ شہر بد لے اسکول بد لے پھر جا بدلی، اور اس ہر مہینے کے اول بدل نے مجھے احر شفیع بنادیا۔ Con Man۔“ وہ احتیاط سے شیشی اوپر اٹھائے قطرہ قطرہ اٹھائے سرخ میں بھر رہا تھا۔ نظریں اور سرخ کے بھرتے پیٹ پر جمی تھیں۔

خاور کا چہرہ سرخ تھا، آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، وہ ختنی سے نفی میں سر بلاتا خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر گرفت مضبوط تھی۔

”برسون کی محنت اور کھوج نے مجھے اتنا بتا دیا کہ ساری گھنیاں اور نگزیب کاردار کے گرد جا کر کھلتی ہیں۔ میں نے خون کو ان سے متعارف کر دیا، ایسے کہ وہ مجھے ملازمت کی پیشکش کریں۔ Con Man۔“ کبھی کچھ نہیں مان لتا، وہ ایسے موقع پیدا کرتا ہے کہ آپ کو لوگے یہ سب آپ کا ہی آئینہ یا تھا۔ وہ خود ہی مجھے سب دیتے گئے۔ اور ان کے پاس اتنا عرصہ کام کر کے جانتے ہو مجھے کیا معلوم ہوا؟ وہ سب جو تمہیں خود نہیں معلوم!“

شیشی رکھی، کیس بند کیا، اور سرخ پکڑے، اسٹول اٹھائے اس کے سامنے آ کر اسٹول رکھا، اور اس پر بیٹھا۔ پھر اس کی خون آشام آنکھوں میں دیکھ کر سادگی سے بولا۔

”تم نے ہاشم کے کہنے پر زمر یوسف کو زخمی کیا، اس سے اس کے تمام رشتے چھینئے، اس کی شادی کینسل کر دیئی، اس کا ہر استہ بند کیا۔“

تمہارے ہاتھ میں اپنی بڑی بھائیوں کے ہاتھ پر بچا تھا اور کسی بھائی کے ہاتھ پر بچا نہ ہو۔

دوں کی رائی پختہ نہ رہا۔ ۱۹۵۰ء جویں حکم نجی ہے  
جس میں سے ایک سو ہال کی باری حلل کی کڑیں سے مدد کی خدایا جا سکتی تھیں اور جو کمرے  
خدا کے قریب ہے جسیں کہ کمرے کے ساتھ فرنگی ہو جاؤں سے باقی اور آئے کہا کہ کارپاں سے احمد رضا  
خدا نہیں ہے۔ اسیل جویں کی جویں ایک جانی باتیں ایک دوسری باتیں کلائے کے قریب ہو جاؤں تو شور نہیں ہے جاؤں

کو کشیری انداز میں اسکارف میں لپیٹے، آتینی پیچھے چڑھائے تیرھی کے اوپر کھڑی تھی اور سوکھے برش کو بازاو اونچا کر کے چھت سے ٹکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میرا ہاتھ جارہا ہے، میں دیوار کے اوپر کو نہ تک پینٹ کر لوں گی۔“ اس نے چمک کر اطلاع دی۔ نیچے فرش پر آلتی پالتی کے بیٹھے اسامہ نے بہت ضبط سے کھنکار کراس کی توجی۔

”خدا تم کل شام کیا اچانک سے ریٹورانٹ کے بیچ ہوئے ڈبے لے آئی ہوا راب کہہ رہی ہو کہ تم نے پینٹ کرنا ہے کمرہ۔“ حمد نے گردن گھما کر نیچے بیٹھے اسامہ کو نخلگی سے دیکھا۔ ”تم کیا جانو اور کامزہ۔ جتنی ہومڈ بیکور کی ویب سائنس میں نے دیکھی ہیں نا، پتہ ہے ان کے کمرے اتنے خوبصورت کیوں ہوتے ہیں؟ کیونکہ ان میں یہ سفید چمنا پینٹ نہیں ہوتا۔ گورے ہمیشہ اپنی دیواروں کو Tint ضرور دیتے ہیں۔ دروازے وہ سفید رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں الثاحاب ہے۔“ ناک سکوڑ کروہ وہ اپس دیوار کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مگر حمد، یاد ہے جب ریٹورانٹ پینٹ ہوا تھا؟ وہ لوگ ایسے ہی منہ اٹھا کر پینٹ نہیں کر لیتے تھے بلکہ پہلے دیوار پر کچھ رکھتے تھے اور بھی بہت کچھ کرتے تھے۔ تم نیٹ پر پینٹ کے ٹیوٹوڑیل کیوں نہیں پڑھ لیتی؟“ سیم نے ہار نہیں مانی تھی۔

”میں نے کوشش کی تھی، وہ اتنے لمبے چوڑے اسہاق دھرا رہے تھے، میں نے چھوڑ دیے ایوں گوروں کے خڑے یہ کر دوہ کرو۔ اس طرح تو بندہ سال بھر کمرہ ہی تیار کرتا رہے۔ پینٹ کب کرے؟“ پھر لاپرواہی سے سرجھنا۔ ”میں تو ایسے ہی کروں گی پینٹ۔ یہ کون سامشکل ہے۔ بس برش کو پینٹ میں ڈبو کر دیوار پر اوپر نیچے لگاتے جاؤ۔ واو۔“ آنکھیں مجھ کراس نے وہ کارٹون یاد کیے جن میں یونہی مزے سے پینٹ ہو جاتا تھا۔ ”اوپر ہد ریکھنا، کتنا خوبصورت رنگ چڑھے گا۔“

”مگر کیا وہ رنگ دیر پا بھی ہو گا؟“ چوکھت میں قدموں کی آواز آئی، اوپر بھر اس کی آواز۔ خینیں وہیں ٹھہر گئی۔ برش والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ مڑنی نہیں۔ ساکت کھڑی رہی۔ اسامہ جو نیچے بیٹھا تھا، وہ بھی نہیں بلا، اس سرجھ کا دیا۔ وہ سعدی سے ابھی تک نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔

”گورے ایک بہت اچھی، بہت قابل قوم ہیں، اور جب وہ کہتے ہیں کہ یوں منہ اٹھا کر پینٹ نہیں کرتے تو وہ صحیح کہتے ہیں۔ وہ ہماری طرح ست اور کام پچور نہیں ہوتے۔ اپنا ہر کام خود کرنے اور احسن طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔“ وہ گردن اٹھائے خین کے کمرے کی دیواروں کو دیکھا دیتے ہیں کہہ رہا تھا۔ اسامہ اور خین اپنی جگہ چپ تھے۔ ساکت۔ جامد۔

”خوبصورت رنگ ایسے نہیں چڑھ جاتے۔ ان کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ جان مارنی پڑتی ہے۔ ایک ایک بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے یہ دیواریں..... یہ گھر کی دیواریں اپنے اوپر کسی اجنبی رنگ کو ایسے ہی نہیں چڑھنے کی اجازت دے دیتیں۔“ وہ ہنوز گردن اوپر یہ سادگی اور زیمی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی طرف کمری کیے اونچائی پر کھڑی خین کی آنکھوں کے کٹورے لباب بھرتے گئے۔ مگر اب ایک دوسرے میں نیچتی سے پیوست کر کے ضبط کیا۔ سیم کا پچھہ جھکا ہوا تھا۔

”دوسری کسی بھی چیز کو رکڑ و توہ خراب ہوتی ہے، اس کی چمک اور خوبصورتی ماند پڑ جاتی ہے۔ مگر دیواروں کی نہیں۔ گھر کی دیواروں کو رگڑیں کھانی پڑتی ہیں۔ سخت ریگ مال سے ان کو رکڑ رکڑ کر چھلنی کیا جاتا ہے، مگر یہ ہرگز کے بعد پہلے سے زیادہ smooth ہو جاتی ہیں، پھر ان کے سوراخ اور دراڑیں بھری جاتی ہیں۔ فلر سے ان کے زخموں کو مرہم لگایا جاتا ہے۔“

خین نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو پہ پُر گرتے چلے جا رہے تھے۔ سیم سرجھ کائے ہوئے ہو لے سک رہا تھا۔ چوکھت میں لھڑا لڑ کا جس کے بال اب پہلے جیسے چھوٹے ندر ہے تھے، اور قدرے بڑھنے کے باعث ان کا اصل قدرتی گھنگری لاپن نظر آنے لگا تھا، اسی طرح ملائمت سے بول رہا تھا۔

”ان دیواروں کو بھی اتنا رگڑ نے سے درد ہوتا ہو گا، مگر یہ برداشت کر لیتی ہیں۔ جانتی ہیں کہ یہیں اچھا ہے ان کے

پھر ان کے اوپر پر ائمہ (primer) پینٹ کیا جاتا ہے۔ ہمارے اسے ڈسٹیپر یا چونا وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ گورے اس کو پر ائمہ seder کہتے ہیں۔ وہ ساری دیوار کو ڈھانک لیتا ہے۔ اس کا پردہ بن جاتا ہے۔ سارے عیوب ڈھک جاتے ہیں، پرانے پینٹ اور نئے پینٹ کے درمیان کی آڑ ہوتا ہے وہ۔ ماضی کو مستقبل پاٹرند از ہونے سے روک دیتا ہے۔“

اوپنجی سیر ہمی پر کھڑی ہم نے گردن جھکا دی۔ ہاتھ اسی طرف دیوار پر جما تھا اور آنسو شپ پر گرتے جا رہے تھے۔

”وہ پر ائمہ پینٹ الگ رنگ لگایا جائے تو نئے آنے والے ہر پینٹ کو دیوار کے پلستر کی دیوار اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس مستقبل کے ہر رنگ کو ماضی کے سوراخ کھا جاتے ہیں۔ لیکن اچھے سے پر ائمہ لگا دو تو اور پر جو رنگ بھی کرو... وہ ایسا خوبصورت چڑھے گا کہ سارا گھر چک اٹھے گا۔ پھر زمین سے رس کر خراب چور درازوں سے داخل ہوتے پانی سے بھی دیوار یں خراب نہ ہوں گی، نہ موسم اثر کرے گا، نہ کسی کا میلا باٹھ گدلا کر سکے گا اس رنگ کو۔ گھر کی دیواروں کے ایسے پکے اور خوبصورت رنگ یونہیں آ جاتے۔ ان کے لئے بندیا کو ایک دفعہ تو چھلنی کرنا پڑتا ہے۔“

حنین نے برش کہاں گرایا، وہ کیسے سیر ہمی سے جست لگا کر اتری، اسے نہیں علم۔ بس وہ رو تی ہوئی دوڑتی ہوئی آئی اور سعدی کے گلے لگ گئی۔

”بھائی، آئی ایم سو سو ری۔ آپ کا قصور نہیں تھا۔ بھائی آئی ایم سو سو ری۔“

سیم بھی ایک دم اٹھا اور بھاگ کر ان دونوں کے گرد بازو حمال کیے سعدی کے کندھے سے لگ گیا۔ وہ بھی روئے جا رہا تھا۔

”بھائی میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ پلیز آپ دوبارہ مت جانا۔“

وہ دوچھوٹے چھوٹے بچے تھے جن کے صرف قد بڑے ہو گئے تھے۔ سعدی ان دونوں سے اونچا تھا اس کے بازو دونوں سے زیادہ مضبوط تھے۔ وہ دونوں کے گرد بازو حمال کیے بیک وقت دونوں کو تھپک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زمی، آنکھوں میں نمی اور لیوں پر مکراہٹ تھی۔

”مجھے بھی تم سے لڑنا نہیں چاہیے تھا۔ ایک غلطی کے پیچھے مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ جہاں کتنے لوگ بزرگی سے میرے معاملے سے جان پچا کر نکل گئے اور کتنے لوگ صرف لاقچ میں میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں، وہاں اتنے ماہ تم لوگ میرے لئے کھڑے تھے!“

مگر وہ دونوں اس کو بولنے نہیں دے رہے تھے۔ حنین رو تے ہوئے نہیں میں سر بلاتی بولے جا رہی تھی اور سیم اس کے کندھے پر ماتھا لیکے ہچکیوں کے دوران کہہ رہا تھا.....

”بھائی آپ کا حق تھا مجھے سے لڑنے کا۔ میں نے غلط کیا تھا۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب سے زیادہ سفر (suffer) آپ نے کیا تھا۔“

”بھائی میں کبھی آئندہ یوں نہیں بولوں گا۔ ہم سے لڑنے کا حق تھا آپ کو۔ وہ ہماری برابر کی بہن ہے۔ موٹی، کالی، بد صورت ہے تو کیا ہوا، وہ ہماری برابر کی بہن ہے۔ مجھے درمیان میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ اور سیم یہ سب بچوں کی طرح بلکہ کہہ رہا تھا۔ وہ اس کا سر تھپکتے تھپکتے ہس دیا تھا مگر حنین نے تو جیسے سنائی نہیں تھا۔

”ہم نے بھی اتنا نہیں سوچا کہ آپ کو اتنے ماہ خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں ملا۔ ہمارے پاس تو پھر بھی خوشی کے مل بیٹھنے کے لمحے آئے تھے۔ مگر آپ نے سفر کی اس سے زیادہ۔“

”اور میں یوں بولا بھائی مجیسے آپ کسی لگڑری ٹرپ سے لوٹے ہیں۔ مجھے یوں نہیں....“ وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ لگے نیچے

بیٹھتے گئے تھے۔ وہ ”کوئی بات نہیں۔ آئندہ، مم ان باتوں کو اپنے درمیان نہیں آنے دیں گے“ بار بار بھی بات دہراتا جا رہا تھا، بھی جھک کر حنہ کا ماتھا چوتا، بھی سیم کے بال سہلاتا۔ وہ بڑا تھا۔ اسے ہی تسلی دیتی تھی۔ اسے ہی زیادہ ظرف کا مظاہرہ کرنا تھا۔ بڑوں کی قربانیاں بھی بڑی ہوئی چاہئیں نا۔

مورچال کے باہر دھوپ ڈھلتی گئی یہاں تک کہ بیٹگے پہ چھایا سی تن گئی۔ اب حنہ کی کھڑکی سے جھانک تو وہ تینوں چوکڑی مارے فرش پہ بیٹھے تھے۔ درمیان میں کوک سے بھرے تین گلاں، کوک کی بڑی بوتل، اور چند بے کھلے پڑے تھے جن میں سے برگ اور فرنچ فرائیز جھلک رہے تھے۔ سعدی سر جھکائے کوک کے گلاں میں اسٹر اہلا تادھیرے دھیرے سے بول رہا تھا اور وہ دونوں کھاتے ہوئے سن رہے تھے۔

”ہاشم سمجھا ہم باہر پر اپا کے ہجوم میں گم ہونے والے ہیں، سواس کے سارے بندے اسی طرف بھاگے، مگر ہم ایک باتھرودم کے نیچے میں ہول سے سرگ میں اترے۔ اور وہاں سے.....“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”سیدھا باہر دو گلیاں چھوڑ کر سڑک پہ نکل آئے۔“ سر جھکائے بولتے اس کے چہرے پہ بیٹت تھی۔

”واو!“ سیم برگ کا بھاری نوالہ مند میں چباتا آنکھیں پھیلا کر بولا تو حنیں نے آنکھیں دکھائیں۔ (موئے آلو، چپ کرو، وہ تمہیں تکلیف دہ واقعے کا منظر نامہ بتا رہا ہے، کسی ایڈ واچر کا نہیں۔) سیم نے جلدی سے نوالہ نگلتے ہوئے چہرے پہ سکینیت طاری کی۔ ”اوہ!“ سعدی اس کے بد لے انداز پر زمی مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

”پھر ہم وہاں سے ایک ٹنک میں بیٹھے اور....“

”پتہ ہے بھائی، کتنا اچھا ہوتا اگر آپ مسز کاردار کو یمناں بنا کر ساتھ لے آتے۔ چوبیں گھنٹے بعد جو میک اپ اترنے سے ان کی حالت ہوتی.....“ خد خود بھی نہ رہ سکی۔ بول کر بھتی چل گئی۔ سعدی نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پہ لہا کا ساتھ پر لگایا۔

”یوں کرو، تم بول لو میری خیر ہے۔“

”اللہ! میں نے کیا کیا ہے!“

اور زمر جب سیرھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو اس نے دیکھا وہ تینوں اسی طرح ایک ساتھ بیٹھے برگز کھار ہے تھے اور ایک دوسرا کو لقے دے رہے تھے۔ چہروں پہ سوکھے آنسوؤں کے نشان بھی بھی موجود تھے اور بہوں سے مسکراہیں پھوٹ رہی تھیں۔

”سعدی!“ زمر نے دھیرے سے دروازے پہ دستک دی۔ تینوں نے سر گھما کر دیکھا۔ حنہ نے فواؤ برگ بڑھایا مگر وہ مسکرا کر نہیں میں سرہلانی کام کی بات پوچھنے لگی۔ ”ائزرو یوکا کیا بنا؟ فارس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”ائزرو یو۔ ہونہے۔“ سعدی نے سر جھکا۔ ”تمیں لا کھا مانگ رہا تھا وہ استکر۔ اور فارس ماموں کو دیکھیں، خود کہا تھا کہ تمہارے ساتھ چلوں گا، مگر وہاں جا کر بالکل چپ بیٹھ رہے اتنا نہیں ہوا کہ دو تھپٹر لگادیتے اس استکر کو۔ ایک مارنے کا کام ہی تو آتا ہے ان کو وہ بھی نہیں کیا۔“ خنکی سے واپس گردان موزی لی۔ زمر اور حنیں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بھر جن کھنکھاری۔ ”بھائی..... فارس ماموں چپ ہوں تب بھی بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ ان کو لہا کا نہ لیں۔“

”بالکل۔“ زمر مسکراہٹ چھپاتی واپس چل گئی۔ نیچ آئی تو وہ کچن میں بیٹھا تھا۔ مو بالکل پہن دبارہ تھا۔

”محجہ تم سے بات کرنی ہے فارس۔“ اس نے کری ٹھیکنی تو فارس نے نظریں اٹھائیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا یا۔

”زہے نصیب۔ آپ کو میرا نام بھی یاد ہے!“

”خوڑا بہت تو یاد ہے۔“ وہ نہیں دی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”سعدی کا ائزو یو ہونا ضروری ہے، وہ اس کے لئے بہت اپ

سیٹ ہے اور.....“

”ہو جائے گا انڑو یو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ انداز میں لا پرداہی تھی۔

”مگر کیسے؟“ زمر نے گردن گھما کر کہا۔

”پیسے دیں گے اور کیا۔ مگر اس کے لئے سعدی راضی نہیں ہے سودا کریں گے۔ کوئی اور حل ہے تو بتائیں مجھے۔“

وہ چپ ہو گئی۔ ”مگر... کوئی اور طریقہ نہیں ہے کیا؟“ معتاط سے انداز میں پوچھا۔

”کیوں پراسکیو ٹرصلبہ، قانون پر یقین ہے نا آپ کو تو بس میں نے بھی تھیہ کر لیا ہے، کہ اب قانون نہیں توڑنا اور شریف آدمی بن کر رہنا ہے۔ ایسے مشکوک نظرود کے کیا دیکھ رہی ہیں مجھے؟ حق کہہ رہا ہوں۔“ وہ نگلی سے کہتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ زمر سوچتی نظرود سے اسے جاتے دیکھے گئی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

### چند دن بعد

چاک دامن تو خیر سل جاتا۔ چاک ہستی کہاں رو کرتے سفید یواروں والے کمرہ عدالت میں دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ موسم بتدریج تبدیل ہو رہا تھا۔ سردی بہت کم رہ گئی تھی اور خزان

رسیدہ درختوں پر نئے شگونے اور پتے کھلنے لگے تھے۔ چبوترے کے سامنے پراسکیوشن کے تنقیچہ زمر نیٹھی، قلم الگیوں میں گھماتی بغور کٹھرے میں کھڑے نوشیر وال کو دیکھ رہی تھی۔ دوسری میز پر نیک لگا کر آرام دہ انداز میں بیٹھے باشم کاردار کی سنجیدہ نظریں بھی وہیں جی تھیں۔

عزت آب اختر مرتفعی صاحب بھی اسی سے مخاطب تھے اور کری کارخ ذرا تر چھا کیے کاغذ سے پڑھ کر اسے چار جزوں ناہیں تھے۔ وہ کٹھرے کے جنگلے پر ہاتھ رکھ کھڑا اپس سانظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے تازہ نشان تھے اور ایک آنکھ نیلوں نیل تھی۔

”کیا آپ نے تمام چار جزوں اور سمجھ لئے؟“

”بھی یور آز!“

”کیا آپ نوشیر وال کاردار، ایکس می 2015 کی شام پلاٹ نمبر پندرہ میں سعدی یوسف سے ملنے گئے تھے اور آپ نے ان پر تین گولیاں چلا میں۔ پھر بوث کی ٹھوکروں سے ان کو زخمی کیا؟“

زمر کے ساتھ بیٹھے سعدی کی چھتی نظریں شیرود کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ نوشیر وال نے نگاہیں انھا کر حاضرین کو دیکھا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ ”یہ غلط ہے۔ میں اس روز دئی میں تھا۔“

”کیا آپ تمام الزامات سے انکار کرتے ہیں؟“

”بھی میں انکار کرتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔“ وہ میکائی انداز میں نیچے بیٹھے باشم کو دیکھ کر

بولا تھا۔

”کیا آپ innocent plead کرتے ہیں۔“

”بھی میں انویسٹ پلیڈ کرتا ہوں۔“

(اس موقع پر اگر ملزم صحبت جرم کا اقرار کر لے تو اس کے خلاف فیصلہ سنادیا جاتا ہے، اور اسی وقت سزا باتادی جاتی ہے۔ اگر وہ انکار

کرے تو اسے شفاف مقدے کا حصہ دیا جاتا ہے جہاں وہ استغاثہ (ازام لگانے والوں) کے ثبوت و شواہد کا دفاع اپنے دکیل کے ذریعے کرے۔)

”اوے کے۔ آپ کو فیر ٹرائل کا حق دیا جاتا ہے۔ کیا آپ اپنے خلاف گواہ بننا پا ہیں گے۔“ نیچے بیٹھے باشم نے نفی میں سرکوبی کی جبنت دی۔ نظریں شیر و پتھیں۔

”نبیں یور آنر۔ میں خاموشی اختیار کروں گا۔“ اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

چند منٹ بعد باہر رہداری میں زمر اور سعدی چلتے جا رہے تھے اور جب وہ بہت دل گرفتہ سا بولا تھا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا جن نے کیسے اس کی صفات کی درخواست قول کر لی۔ وہاب گھر چلا جائے گا اور پھر ملک سے باہر۔“

زمر نے نگاہیں پھیر کر اسے دیکھا۔ یوں لگتا تھا وہ برسوں پہلے یونیورسٹی کے موک ٹرائل سے نکلے تھے اور وہ ہیری کے خلاف فصلہ آئے پہ شدید تملکار ہاتھا۔

”سعدی.... اس کو جیل میں پینا گیا ہے، اس کی جان کو خطرہ ہے، جج کو اسے جیل سے نکالنا ہی تھا۔“

”باشم نے اسے خود پھوایا ہے۔ مجھے یقین ہے۔“

”ظاہر ہے باشم نے اسے پھوایا ہے، ساعت سے پہلی رات۔ مگر ہم یہ باتیں جج کو کہیں گے کہ تو ہم خود ہی جھوٹے لگیں گے۔ اس کی صفات ہونی ہی تھی۔“ وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔

”اگلے ماہ کی تاریخ نہیں ہے۔ کیسا نظام ہے یہ۔ ہم کتنا انتظار کریں گے۔ وہ تاریخ پتاریخ دیتے جائیں گے۔ زمرا یے تو کبھی انصاف نہیں ملے گا۔“ وہ شدید تکلیف میں لگ رہا تھا۔ زمر یک نک اس کی زخمی نظر وں کو دیکھے گئی۔

”یہ معاملات لمبے چلتے ہیں سعدی۔ کوئی بات نہیں، ہم لڑتے رہیں گے۔“

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ سر جھٹک کر خفا خناسا چلتا گیا۔ زمر کے اندر کچھ ڈوب گیا تھا۔ وہ بار بار اس پا ایک فکر مند تحریری نظر ڈالتی تھی۔

”خیں اور سامدہ کا بھائی گھر آ گیا تھا، یہ تو طبقہ، مگر کیا سعدی یوسف گھر آ گیا تھا؟ وہ کیا کرے؟ اور کیا وہ بھی گھر آ پائے گا؟ اسے یقین نہیں رہا تھا۔



ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں ..... اس پر تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ ہارون عبید کی رہائش گاہ پر وہ دو پھر سردی پیش لئے سارے کھلسا رہی تھی۔ سبزہ زار کی طرف کھلتی کھڑکی سے اندر جھانکو تو اپنے کھینک میں آبدار خصوص کرنی پڑیں گے۔ نوٹ پیڈ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ کھڑکی کی طرف اس کی کرسی کی پیٹت تھی اور یہاں سے اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ سرخ روپال میں بند ہے بال، جھکی آنکھیں، زرد نگت، سوکھے ہوت۔ وہ اداسی سے سر جھکائے لکھتی جا رہی تھی جب دروازہ کھلا۔

”میں آج مزید کلائنٹس نہیں.....“ اکتا کر بولتے اس نے نظریں اخھائیں تو رک گئی۔ یہاں سے دکھائی دیتے آؤ ہے چہرے پر واضح حیرانی ابھری۔

”ببا! خیریت؟“ سامنے چوکھت میں ہارون کھڑے تھے۔ کلف لگے شلوار سوٹ میں ملبوس، وہ مطمئن نظریں اس پر جمانے بلکل اسی مسکراہٹ کے ساتھ آگے آئے۔ ”تم ٹھیک ہو آپی؟“

آپ نے کرسی پر پیچھے کوٹیک لگائی تو اب اس کا چہرہ زیادہ واضح ہوا۔ اس پر اس مسکراہٹ ریگ گئی تھی۔ ”بھی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا، اس لئے اب ٹھیک ہوں۔“

”اوکے۔ تمہیں ایک کام کرنا ہے اب۔“ وہ سامنے کری پہ براجاہن ہوتے سادگی سے بولے تھے۔ آبدار کے ابردا کئے ہوئے۔ ”جی؟ کیا؟“

”ہاشم نے نوشیر والی کی خصانت کروالی ہے۔ اب وہڑائیں کو لکھنے گا، تاریخ پتاریخ لیتا جائے گا۔ یوں فیصلہ نہیں آئے گا۔ ترنے صرف اس کو کو نہیں کرنا ہے کہ وہ اس کیس کو جلد انجمام تک پہنچانے پر رضا مند ہو جائے۔“

”گلربابا، اس نے مجھے پر پوز کیا تھا، میں اس دن سے اس کی کامیابی اٹھا رہی اس کو انہیں اٹھا رہی ہوں تاکہ وہ مجھ پر دباو نہ ڈالے۔ اب میں کیسے اس کے پاس جا کر...“

”یہ میرا منسلکہ نہیں ہے۔ تم اس کو کچھ بھی کہو۔ مگر اس کو راضی کرو۔ تم چاہو تو کہہ دینا کہ اس پر پوزل پتھر صرف تب غور کرو گی جب وہ اور اس کا خاندان تمام الزامات سے بری ہو جائے گا۔“

”بابا!“ اس نے بے شقین سے انہیں دیکھا۔ ”میں اس پر پوزل پتھر نہیں کروں گی۔ پھر میں اسے جھوٹی امید کیوں دلاؤں؟“

”بعد میں جو ہو گا ہو میں سنچال لوں گا۔ ابھی کے لئے تمہیں اس کو راضی کرنا ہے۔“ وہ زور دے کر بولے۔ آبدار کے لب بھنج گئے۔ وہ کتنی ہی دری صدماتی نظر وہیں سے انہیں دیکھے گئے۔

”اوہ میں سمجھی تھی کہ بالآخر آپ میرا خیال کرنے لگ گئے ہیں، مگر وہ سب... وہ وعدہ وہ فارس کے متعلق کہی ہر بات... وہ سب آپ اپنے مفادات میں کر رہے تھے۔ آپ مجھے استعمال کر رہے تھے اور فارس کو بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ آپ صرف اسے میرا باڑی گارڈ بنانا چاہتے ہیں۔ ہے نا؟“

”آبدار!“ وہ قمیض جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ”ہاشم سے تمہاری جان صرف تب چھوٹے گی جب وہ اپنے خاندان سمیت نیست و نابود ہو گا۔ اسکے لئے تمہیں وہ سب کرنا ہو گا جو میں کہوں گا۔ اب فیصلہ تمہارا ہے۔“

”آپ کو اندازہ ہے کہ ہاشم کے ساتھ اتنا خطرناک کھیل شروع کر کے آپ مجھے کتنے بڑے خطرے میں ڈال رہے ہیں؟“ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے انسان کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ تمہیں بھی دینی ہو گی۔ جیسے زمر صاحب دیں گی۔“ آخری الفاظ زیرِ لب کہے تھے اور پھر وہ مڑے اور بے لبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ آبدار کی آنکھوں سے آنسو پ پ گرنے لگے۔

❖❖❖

ہم کو اس عہد میں تعمیر کا سودا ہے جہاں ..... لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ وہ ایک پوش علاقے کی خوبصورت صاف ستری کا لونی تھی۔ قطار درقطار بنے اونچے بنگلے جدید ترین و آرائش کا نمونہ پیش کرتے نظر آتے تھے۔ رات ناریک ہو چکی تھی۔ آسمان پتارے جگھا گا رہے تھے۔ ایسے میں ایک لمبی سی لش پچکتی بی ایم ڈبلیو ایک کھلے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ پورچ میں آ کر وہ رکی، ڈرائیونگ ڈور کھلا اور سفاری سوٹ میں ملبوس منظور جیلانی باہر آتا دکھائی دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے وہاں کھڑے گارڈ زکوواپس جانے کا کہا اور تیز تیز چلتا ان چیزیز کی طرف آیا جہاں کوئی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”میں معدورت چاہتا ہوں غازی صاحب، مجھے دریو گئی اور آپ کو انتظار کی رحمت سے گزرنا پڑا۔“ خوش خلقی سے مصالحت کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہاں کھڑے فارس نے مسکرا کر گرم جوٹی سے ہاتھ تھاما۔ جیلانی نے ایک نظر میز پر کھکھ لیا اور پھر کری کھیخ کر بیٹھا۔ فارس بھی اپنی کرسی پر واپس میٹھا۔ وہ سردی میں کمی کے باعث جیز کے اوپر سیاہی شرٹ پہننے ہوئے تھا۔ چہرے پر ملکی مسکرا ہٹتھی اور سنہری گہری آنکھیں جیلانی پر جمی تھیں۔

”میں مغدرت کرنا چاہتا تھا۔ میرا بھاجا، بہت جلد باز اور جذبی تھے۔ ان معاملات کے رموز نہیں سمجھتا۔“ کان کی لومستہ ہوئے اس نے مغدرت خواہانہ انداز میں بات شروع کی۔ منظور جیلانی نے ناک سے لکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ جھلایا۔

”ہم سب اس عمر میں ایسے تھے۔ مگر جب انسان کی عمر بڑھتی ہے تو ترجیحات اور کام کرنے کے طریقے بدلتے ہیں، خیر آپ مطلوب رقم لے آئے۔“

”میں لے آیا ہوں مگر چاہتا ہوں کہ آپ سعدی یوسف کو یہ بات نہ بتائیں۔ اس کو یوں کال کریں گویا ہم یہاں ملے ہی نہیں تھے اور اس سے مغدرت کر کے تھوڑا بہلا کر اسے انٹرو یو کے لئے بلا لیں۔ اس کو اعتقاد دیں کہ یہ انٹرو یو صرف اس کی سچائی کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے کیا جا رہا ہے۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کوئی چاۓ پانی دیا یا نہیں آپ کو۔“ وہ فون نکالتے ہوئے بولا تو فارس نے اسی طرح ٹیک لگائے بیٹھے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

”آپ ان کو گن لیں اور انٹرو یو ٹائم کنفرم کر دیں تو میں گھر جاتا ہوں۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔ کوئی کمی بیشی ہوئی تو میرا پی اے صبح آپ کو فون کر کے....“ بریف کیس کھولتے ہوئے اسکر کہہ رہا تھا اور پھر یکا یک اس کے الفاظ لبوں پٹوٹ گئے۔ ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے ڈھلن پورا کھولا اور پھر چونک کر فارس کو دیکھا۔ وہ اسی طرح ناٹگ پٹاٹگ جماے بینھا مسکرا رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟ اور پیسے کہاں ہیں؟“ اسکر نے ڈھلن میز تک الٹ دیا تو بریف کیس کا اندر ورنی حصہ روشنی میں واضح ہوا۔ اس میں کتنی درجن سی ڈیز رکھی تھیں جو سفید پاٹسٹک کو میں مقید تھیں۔

”پیسے تو خیر میرا باب بھی نہیں دے گا۔ اور گارڈ کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سعدی یوسف نہیں ہوں۔ دو دفعہ قتل کے جرم میں جیل جا پکا ہوں، بغیر آواز نکالے بندہ مارنا مشکل نہیں ہے میرے لئے۔ نہیں نہیں، تمہیں نہیں مارنا میں نے۔ ورنہ پھر سعدی کا انٹرو یو کوں کرے گا؟“

اسکر نے بریف کیس ہاتھ مار کر نیچے گرایا اور غصے سے اس کو دیکھا۔ ”یہ ڈھلکیاں مجھے جیسے آدمی کو نہیں ڈرتا تھیں۔ اگر میرا مزید وقت ضائع نہیں کرنا تو تم جا سکتے ہو۔“ اور ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ نیچے چلائے وہ غصے سے فارس کو دیکھ رہا تھا۔

”جیلانی صاحب!“ فارس بھی پورے قد سے اٹھا اور جیز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کو بہت سکون سے دیکھا۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسے نہ کرتا۔ ذرا تھل سے ٹھہر کر پوچھتا ضرور کہ ان سی ڈیز میں کیا ہے۔ اور جانتے ہو ان میں کیا ہے؟“

کہنے کے ساتھ اس نے جیب سے ایک پین نکال کر میز پر کھا۔ سعدی کا پین کیسرہ۔

”مجھے معلوم تھا تم سعدی کو پیسے مانگنے بلارہے ہو تو میں نے سوچا ان لمحات کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ سوتھماری اور سعدی کی گفتگو کی ویڈیو HD کو اٹھی میں محفوظ کر لی میں نے۔ صرف یہی نہیں، تمہارے آفس میں جو تمہاری وال فوٹو لگی ہے وہی جس میں امریکہ میں تم کوئی ایوارڈ لیتے دکھائی دے رہے ہو اس کے اوپر نخواں وال اسکلر چکا ہے، جو تمہارے آفس کی ایفیڈ مجھے دیتا ہے۔ اس بریف کیس میں بہت سے لوگوں کے ساتھ تم گفتگو کرتے دکھائی دے رہے ہو۔ کسی کے ساتھ فون پہ، کسی کے ساتھ آمنے سامنے۔ تمہاری ٹکلیں سویپ نیم جو ہر جمعرات کو تمہارا آفس ڈی بگ کرتی ہے، ان کے آلات بہت پرانے ہیں، وہ میرے وال اسکلر زکونیں کڈا سکتے۔“

منظور جیلانی کے چہرے کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ پہلے وہ چونکا تھا، پھر تحریر ہوا، پھر بے یقین اور آخر میں... اس کی رنگت سفید پڑنے لگی تھی۔

— 4 —

پانچ بھل کو بدقیقات کی ای ای جی جن میں تم سالِ کمالی، پیٹھے اب مرے ہے اس نہ تھے جیسی پہنچی تھیں۔ بہتر سرگرمیوں کے ہمراہ تھے کہ پاکستان اپناؤ خود کر۔ جنچ سسی کی کہانی پر انک سے سن لے گے۔ ”۱۹۴۷ء میں ۲۰۰۰ انکو گزارتی کی تھیں اور ۲۰۰۳ء میں ۱۰۰۰ کی تھیں، اور اسکے بعد تھے جنچ کا کم ترین تعداد ۱۸۵۴۸ تھا۔“ بے حد زیادا ۱۹۴۷ء میں انکو بدقیق تسلیت کی ہے اسی وجہ سے سوچی لے اپنے دیر پر تسلیت نہیں ہے بلکہ تسلیت تھی تھیں۔ صدری ایم ایم ایم کے عرصہ میں اپنی خدمتی کی کیں ہی ہے جس سے اپنی پیوس ایک ماگہ، پس پردہ اس کی بیوی کی بیوی۔ بدل کے تھیں کہ اسے بہ پوچھتا ہوا اپنے بیوی کے کہلے جو یہاں کو سدھائیں۔ فکر کی تھیں کہ جو ہم اپنے اپنے خاندان کے لئے کھنڈ پڑھتے ہیں۔ اس اوقات میں اس کو اپنے تقدیر سے کھڑے ہوں گے اور اپنے بیوی کے لئے بھائی اور جو بھائیں اسیں مل دیں گے۔ ”۱۹۴۷ء کے جنگ میں بیوی سے بیکار پنی طرف بھیجا گئی۔“ اسی کی وجہ سے بیوی کے لئے کامیابی کے لئے اس سے جاتی تھیں اور اس کے لئے بھائیوں کے لئے بھی شمشاد۔ آنکھیں سوچیں کہ لگانے کا کام تھے جو کس سے جاتی تھیں اور اس کا پیداوار تھے کہ کہنے میں بخوبی تھیں اور کہ کہنے میں بخوبی تھیں۔ تھا اسی تحدی۔ ”۱۹۴۷ء کا کام تھی ہے اگر کے لئے قیمتی جوں اٹھ کر سے اس کا اگر پانی پھوٹ دیا جائے تو اسکی ساق تھیں۔ جوں تے کہر، جوں افروزہ پڑتے ہے اسے آنکھے جوں پر قدم پڑتے ہیں اور جوں کوں پڑتے ہے اس کے قیوم پر جوں کی لگانے کی تھیں اور کہ کہنے کی تھیں۔ وہ بھائیوں کے ساتھ میں بھی کام کر رہا تھا۔

مکاری کیلئے اپنے بھائیوں کی طرف سے مدد کرنا چاہئے جو اپنے بھائیوں کی طرف سے مدد کرنے والے ہیں۔

1

دل کے دریا کو کسی نہ اٹ پا ہے۔ اسے سوتھ میں اکٹھا کر کے کھڑا ہے اور اس کے ساتھ اپنے بڑی بھلی بھلی اپ کا رکھا ہے۔ سارے میں پہنچ دیتی ہیں کل  
کل کل کل۔ اس کے ساتھ میں پہنچ کہاں اکٹھا ہے۔ اسے خالیوں میں پہنچ کر اسے جوں تھا جوں تھا کہ اسکے کو پہنچ دیتی ہے۔

اے نے اپنے بھائی کو لے کر جس طبقہ میں اسی کی تجسس کیا تھی اسی طبقہ میں اسی کا خداوندی کا خواستہ تھا۔ اسی طبقہ میں اسی کا خداوندی کا خواستہ تھا۔ اسی طبقہ میں اسی کا خداوندی کا خواستہ تھا۔

“*It is the first step in the direction of a new life.*”

بے ایک بڑی تعداد میں اسی طبقہ کے افراد کی وجہ سے ایک خوبصورتی کی خواہی پیدا ہوئی۔

کوئی بے علاوه امور کا کام نہیں کر سکتا اور اس کے مطابق اگر کوئی اپنے دل کی تصورات کی وجہ سے کام کرے تو اس کا مکمل نتیجہ کیا جائے گا۔

کہے سے مل کے جاؤ اس توں یعنی عین کوئی بھی طبقہ کی باعث گئی پہچانہ انجام آس کی بھی خوب لگتی گرے کے مکانے ہائے

درست کی پانچ پر کے چھوٹے اور بڑے چھوٹے اور بڑے لے اس تاریخ پر اُنیں۔ اُنہاں میں  
بڑے اسے جو عکس لے گئے تھے جو بڑے لے۔ بڑے اسے کہتے ہیں کہ بڑے عکس فیض  
لے۔ ”جس سرخ طے،“ عکس اُنہاں میں جو۔“

”ازمی صرف ایک طبقہ ہے۔ دربار آنہ جو ایک طبقہ۔ سب بھروسے خاصہ رہتے ہیں۔ بڑے  
خوبیوں کے ایک طبقہ اور جوں میں جب کچھ ادا کرنا ہے اور کچھ ایک طبقہ کیں جوں میں رہتے  
ہیں۔ اس طبقہ کے عکس بڑے اور کچھ بڑے۔ جوں میں اس کی اکٹھی آزادی میں رہتے ہیں اس کی سطح  
دوں، وہاں پر ایک طبقہ ہے۔ جوں میں اس کی اکٹھی آزادی میں رہتے ہیں اس کی سطح دوں، وہاں پر ایک طبقہ ہے۔  
اٹھوں کے آزادے پہنچوں اپنے نیچے کی طبقہ میں رہتے ہیں۔ جوں میں اس کے نیچے کی طبقہ میں رہتے ہیں  
ہے۔ اُن کی سپتہ اس سے کوئی صرف اس پہنچ کر جوں اس کے صرف اس پہنچ کی طبقہ میں رہتے ہیں۔ اس طبقہ  
وہوں کے بڑوں اس طبقہ میں رہتے ہیں۔ جوں میں اس کا نہ رکھا کر جوں کو اس کے سامنے پہنچی جائے  
کہوں کہوں میں رہتے ہیں۔ جوں میں کہا کہا نہ رکھا کر جوں کو اس کے سامنے پہنچا کر جوں کا اسی  
سچ کرنے میں پائے گئے اس کی سچی اسے پائے۔ جوں میں اس کو کہا کہا کر جوں کے سامنے پہنچا کر جوں کا  
ہے۔ اس طبقہ میں اس کے نیچے کی طبقہ میں رہتے ہیں۔ اس کے نیچے کی طبقہ میں رہتے ہیں اس کے نیچے کی طبقہ میں رہتے ہیں۔  
کہوں کہوں جاؤ۔ ایک اس کو جوں اس کا مکال پڑھتا ہے اس طبقہ میں رہتے ہیں کہوں کہوں جاؤ۔“ کہوں کہوں جاؤ۔  
ہفتھوں اسیں کہا کہا کر جوں کو اس کا مکال پڑھتا ہے۔ اس کے سامنے پہنچا کر جوں کے سامنے پہنچا کر جاؤ۔“  
بھکر کر جاؤ۔“

”کھاڑت کے ساتھ میں اسی اکٹھی ازیزی ہے۔ کھاڑت سے اسی میں اسی ازیزی ہے۔“

”کم اس نہ کروں اس کا 2500 روپے ہے جوں کا ارٹھ کا کافی مال بھی ہے۔ جوں کے مال سے اس کا خفیہ مل جائے  
کہ پہنچ پہنچ 2000 روپے کا اس کا ارٹھ ہے۔ اس کے مال کو جوں کے اکٹھی ازیزی کا جوں مل جائے۔“ پہنچوں کی سچی جوں مل جائے۔  
کی اسی کی وجہ سے اس کا 2500 روپے کے مال کے لئے اکٹھی ازیزی۔ اس کے 2000 روپے کے مال کا ازیزی اس کا ہوا ہے۔  
ہر دوں اسیں کہا کہا کر جوں کو اس کا مکال پڑھا کر جوں کے مال جوں اس کو اس کے صرف مکاہنی اسی ازیزی اس کا ہوا ہے۔  
کہوں کہوں کر لے جاؤ۔ اس سے اسیں جوں میں رہتے ہیں۔ جوں کے سامنے پہنچا کر جوں کے مال کا 2500 روپے ہے۔ اس کے سامنے پہنچا کر جاؤ۔“  
کھلپا۔ سچے سچے کیوں کہا کہا کر جاؤ۔“ کہا کہا کے جوں میں رہتے ہیں۔ کہا کہا کے جوں میں رہتے ہیں کہا  
کر جاؤ۔“

”اس سے اس کا کروں پر کوئی اس اسی سچی جوں کے کاپ سے خاکا لی۔ سوی۔ یہاں۔“ اسیں جوں میں اس کے  
چونا ملک۔ ملک کو۔ ملک کی تھیں اس کی تھیں۔ سچی جوں کے کاپ سے کاہی کے جھپپے جاؤ۔ جاؤ کی پاپیوں جاؤ۔  
کی اسی کا کرو۔ پہنچ کیا کہ سریزی میں مکمل ہے۔ سچیں سے جاؤ کی کوئی کہاں کرے۔ جیسے جیسے جاؤ۔ اسی کے کوئی ملک  
وہ ملک کاہت کے کاہیں کی ملک جاؤ۔“

”اب خوش ہی۔ اپ۔“ اس کی اخراجی اس کے کاہیں پہنچ کر جاؤ۔ کاہیں کے کاہیں کے کاہیں کے کاہیں۔“ اس ملکے بناؤ  
کی ابھت پہنچ۔ جوہی کی ساتھ پہنچ کے ڈاپ کر کی۔ وہی اسی اسیں کہا۔

”تو پھر کیا کھلائیں گی آپ مجھے؟ ایک بہت اچھا آئس کریم پارلر ہے.....“ وہ پیچھے سے جھک کر کھڑا اس کی کریب کے دائیں ہاں نہیں تھے، کہہ رہا تھا۔

”جو اس وقت تک کھلا ہوتا ہے۔ آپ کی فیورٹ آئس کریم ملتی ہے وہاں سے۔ چلیں گے۔“

”میں.... کام کر رہی ہوں فارس!“ وہ اسکرین پنگاہیں جمائے سنجیدگی سے بولی تھی۔ گویا اسے نظر انداز کیے رکھا۔ مگر اس نے ہبھاں ہی نہیں تھا۔

”اور اگر آپ چاہیں تو ہم اس کے قریب ایک دوسرے اچھے ریشور انٹ میں بھی جاسکتے ہیں، جہاں پر.....“ اس کے بالوں پر تھوڑی رکھے وہ اپنی دھن میں کہہ رہا تھا جب زمر نے جھکنے سے اسکرین پنچ گرائی اور گھومی۔ ”ہم ریشور انٹ اور کافی شاپس نہیں جانتے۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ سعدی کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ بیمار ہو چکا ہے وہ مسخ ہو چکا ہے۔ ہم عدالت میں ایک آئی پی پی کے خلاف یہ کٹنے جا رہے ہیں۔ ہمیں کیس کی تیاری کرنی ہے۔ آئسکریم اور کھانوں کے لئے وقت ہے ہمارے پا؟“ غصہ کسی اور کافتا نکلا کسی اور کٹھا۔ دل کسی اور نے توڑا تھا۔ چھپا کسی اور سے لیا تھا۔ وہ سرخ چہرے اور جذبات سے کانپتی آواز سے بولی تھی۔ فارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ کرسی سے ہاتھ ہٹانا کرتی تیزی سے سیدھا ہوا۔ ایک خاموش مگر برہمن نظر اس پر ڈالی پھر سرعت تھی۔ پر کھی چاپیاں اٹھاتا ہر نکل گیا۔ دروازہ ٹھاکے سے بند کیا۔

وہ کرسی پر اکلی پیٹھی رہ گئی۔ زور سے بند ہوئے دروازے کی کمپاٹی آواز سنتی رہی۔ چند لمحے گھرے سانس لیتی رہی۔ اس لی آنکھوں میں پانی تھا۔ اور چہرہ جھکا ہوا تھا۔ یکدم اس نے چہرہ اٹھایا۔ جو فیصلہ اتنے دن سے ہونبیں پار رہا تھا، وہ اس لمحے اس گھٹری ہو گیا تھا۔ چنانہ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور ننگے پاؤں باہم بھاگی۔

وہ پورچ میں کھڑا نفلگی سے بڑا تاکار کا لاک کھول رہا تھا۔ اس کے کان سرخ تھے اور ما تھے پہ سلوٹیں پڑی تھیں جب وہ دوڑتی ہوئی بیرونی دروازے کی چوکھت تک آئی۔

”آئی ایم سوری۔“ فارس نے ایک سپاٹ نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا کر دروازہ کھولنے لگا۔ وہ دوڑ کر آگے آئی اور کار کا دروازہ پکڑ لیا۔ فارس نے رک کر انہی برہمن نظروں سے اسے دیکھا۔ اور پھر وہ چونکا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ ”آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں جانے دیا۔ میں کام کر رہی تھی..... کر رہی ہوں.... کیس پپ..... کیونکہ وہ کبھی نہیں ہو گا اگر ہم یہ کیس نہ جیتے تو۔ آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں جانے دیا۔ مگر میرے پاس اختیار تھا۔ تمہیں جانے دوں یا کیس پر کام نہ کروں....“ وہ دروازے کے اوپر دونوں ہاتھ جمائے ہے آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فارس کے ما تھے کی سلوٹیں ولی ہی تھیں البتہ تاثرات کی سختی کم تھی۔

”میرے پاس چوائیں تھی۔ تم یا سعدی۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔“ تاروں جیسے آنسوٹوٹ ٹوٹ کر اس کی گردان پر لڑھک رہ تھے۔ موٹی خوبصورت گھنٹریاں بیٹوں کے ہالے میں اس کا زرد چہرہ بہت دلکھی لگتا تھا۔ فارس کی پیشانی کی شانیں کم ہوتی گئیں۔

”میں تمہیں نہیں جانے دے سکتی تھی۔ میں سعدی کو بھی واپس لانا چاہتی تھی۔ میں ایک وقت میں ایک کا چناہ کر سکتی تھی۔“ فارس نے ترجمہ سے اسے دیکھا۔

”درستم لوگ خواہ خوار کر رہے ہو خود کو۔ ٹرائل کبھی نہیں چلے گا۔ ایک سال سے پہلے تو شروع نہیں ہو گا۔ ہاشم کبھی کیس نہیں چلنے دے گا۔“ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

”میرے پاس چنانہ کا اختیار تھا۔ مگر فارس..... میں تمہیں نہیں چنوں گی۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر کہہ رہی تھی۔ اس کی بھیگی آنکھیں زخمی تھیں۔ ”کیونکہ تم میرے ہو۔ جو میرا ہے وہ میرا ہے گا۔ میں تمہیں نہیں چنوں گی کیونکہ کوئی بھی تمہیں مجھ سے دونہیں کر سکتا۔“ اس کے چہرے کی آخری شکن بھی جاتی رہی۔ گھری سانس لے کر وہ اسے دیکھے گیا۔ ”تو کون تمہیں مجھ سے دور کر رہا ہے سوائے تمہارے اپنے؟“

”اور میں سعدی کو بھی نہیں چھن رہی۔“ وہ اسی طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”میں کیوں چنوں اس کو؟ میں مجبور نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ میں کسی انسان کے سامنے مجبور نہیں ہوں۔ انسان اندھیروں میں راستہ نہیں دکھا سکتے۔ میں نے اپنا چنانہ کر لیا ہے۔“ تھیلوں کی پشت سے گال رگڑتے ہوئے اس نے چند گھرے سانس لے کر خود کو سنبھالنا چاہا۔ آنسو پھر بھی ابل ابل رہے تھے اور ناک اور گال گلابی پڑ رہے تھے۔

”میں فارس کو نہیں چنوں گی۔ میں سعدی کو نہیں چنوں گی۔ میں.... زمر کو چنوں گی۔“ اٹھی گردن اور مضبوط آواز سے وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی تھی۔ ”میں وہ کروں گی جوز مر کو کرنا چاہیے۔ ظلم زمر کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ سب اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں، سوائے میرے۔ زمر کو انصاف چاہیے۔ یہ صرف سعدی کے لئے نہیں ہے۔ یہ زمر کے لئے بھی ہے۔ مجھے بھی اُس وقت تک سکون نہیں ملے گا جب تک میں ان لوگوں کو بتاہ ہوتے نہ دیکھوں۔ میں.... زمر کو چھن رہی ہوں۔ اور زمر بہت اچھی ادا کارہ ہے۔“ اب کے وہ آنکھیں سیزیر کر غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”زمر اگر کوئی بات ہے تو تم مجھے بتاؤ۔ ایک دفعہ پہلے بھی تم روتے ہوئے کمرے میں آئی تھیں، تمہیں دمے کا ایک ہوا تھا اور تم درختوں کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا اور نرمی سے اس کے ہاتھ تھام لئے۔“ بعد میں عدالت میں تم نے بتایا مجھے کہ اس رات تم نے حقیقت جان لی تھی۔ میں اب نہیں سمجھ پارتا کہ کیا ہوا ہے مگر کچھ ہوا ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ۔“ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ بھیکے چہرے کے ساتھ مسکرا دی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

”میرا ڈپشن، میرا ڈنی دباو، بہت بڑھ گیا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں کیس کی وجہ سے تم سے دور ہو جاؤں گی۔ مگر نہیں.....“ اب کے وہ دھلے دھلائے چہرے اور گلابی آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر بولی تھی۔ ”جو میرا ہے وہ میرا ہے گا۔ مجھے تمہیں نظر انداز یا ناراض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اچھی امید اور اچھی تیاری کے ساتھ بھی یہ کیس لڑ سکتے ہیں۔ اور.... تم جب کہو گے ہم ڈنر پر بھی جا سکتے ہیں۔“ وہ بکا سما سکرایا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ جو لمحے بھر کے لئے وہ ڈر گیا تھا کہ کچھ ہوا ہے وہ واہہ بھی ذہن سے جاتا رہا۔ اس نے نرمی سے اپنے قریب کیا اور اس کا سراپنے کندھے سے لگا کر چند لمحے تھپکتا رہا۔ اور پھر بہت محبت سے دھیرے سے بولا۔

”آئی ہیئت یوچین!“

وہ ایک جھلک سے الگ ہوئی۔ بھیگی گلابی آنکھوں میں ایک دم ڈھیر سارا غصہ عواد آیا تھا۔ ”کیا کہا؟“ وہ بے یقین بھی تھی۔

”احمر شفیع نے تمہارا نام چڑیل رکھا تھا۔ تو یہ اطلاع ہے کہ کچھری میں بہت سے لوگ تمہیں اسی نام سے پکارتے ہیں اور میں ہر نماز میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان لوگوں کو نیک اجر عطا کرے۔“ وہ کارکارا دروازہ کھولتا کہہ رہا تھا اور زمر نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی روکی چہرے پر نگلی طاری کیے وہ چنچ کر بولی تھی۔

”اگر تمہیں مجھ سے ذرا سی بھی محبت ہوتی تو تم میرے بارے میں ایسی باتیں کرنے والوں کے دانت توڑ دیتے۔“

”آپ کو کس نے کہا کہ مجھے آپ سے محبت ہے؟ میں نے تو آپ کی دولت کے لئے آپ سے شادی کی تھی۔“

”دولت سے یاد آیا، میرے پیسے کہاں ہیں؟ ہاں؟“ وہ اندر بیٹھ چکا تھا اور وہ اس کی کھڑکی پچھلی ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

”جن پیسوں کو ہاشم کاردار میں نہیں کر سکا، آپ نے سوچا بھی کیسے کہ وہ آپ کوں جائیں گے۔ جائیے زمر بی بی جوتے پہن کر آئیں، پھر میں آپ کوڈ نرپ لے کر جاؤں گا۔“

”ہاں وہ بھی میرے پیسوں سے ہو گا۔“ وہ سیدھی ہوتے ہوئے خفا خفاسی بولی اور مژگی۔ پیچھے سے اس نے اس کی بڑی راہست سنی تھی۔

”لاپچی وکیل نہ ہوتا۔“ اس دفعہ اصلی والا غصہ چڑھا مگر سر جھلکتی اندر چلی گئی۔ اس کاٹو نادل بالآخر جرنے لگا تھا۔

❖❖❖

خوابوں کے چاند ڈھل گئے تاروں کے دم نکل گئے ..... پھلوں کے ہاتھ جل گئے، کیسے یہ آفتاب تھے! وہ صبح پکھلے سونے کی حدت لئے ہوئے طلوع ہوئی تھی۔ سورج کی ترچھی کرنیں قصر کاردار کے ستونوں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھیں۔ اندر اوپنجی کھڑکیوں سے چھن کر آتی روشنی نے ڈائینگ ہال کو منور کر کھا تھا۔ سر برائی کری پہ ہاشم بیٹھانا شستہ کر رہا تھا۔ نوشیر و اس بنو ز کمرے میں بندھا، اس کا ساتھ دینے کو دیا ہے جو اہرات پیٹھی تھی۔ جانے دونوں کی کرسیوں کی جگہ کب بدی تھی، مگر جو اہرات نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ جانتی تھی کہ اب خاندان کی ڈرائیورنگ سیٹ پہ وہ نہیں تھی۔ مگر وہ مطمئن تھی۔ کائنے میں پھل کا گلزار اچھساتے وہ ہمدردانہ لمحے میں بولی تھی۔

”تم نے خاور کے متعلق سنًا؟“

”ہوں!“ اس نے سر ہلایا۔ ”اس کے بیٹھے کافون آیا تھا۔ میں مالی طور پر مدد کرتا رہوں گا اس کی فیملی کی۔ کچھ عرصے تک۔“

”تمہارا بڑا اظرف ہے ہاشم!“ اس نے جھر جھری لی۔ وہ خاموشی سے کھاتا رہا تو وہ ذرا پیٹر ابدل کر بولی۔ ”مگر جو بھی ہے مجھے بہت افسوس ہوا اس کا سن کر۔“

”اپنے کیسے کا پھل ملا ہے۔“ اس نے سر جھکا تھا، پھر نیکین رکھتا انھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آفس کے لئے تیار لگ رہا تھا۔ نائی، کف لکس، سب اپنی جگہ پر تھے۔ ”راہل کا کیا بنے گا؟“

”کوئی راہل نہیں چلے گا می۔ ایک ایک پیشی کے لئے ترسائیں گا انہیں۔“ موبائل اسکرین پر انگلی پھیرتے وہ ساتھ سے نکل کر چلا گیا۔ جواہرات نے طمانتی کا گہر انسانس لیا اور سکرا کر جوں بیوں سے لگایا۔ خاور کا باب تو ختم ہوا۔

چند میں دور.... اس پر شکوہ عمارت کے ایک دسیع آفس میں ہارون عبید اپنی مخصوص کری پہرا جان تھے۔ یک لگا کر بیٹھے، گال تے انگلی رکھے وہ مخطوط نظروں سے سامنے پیٹھی زمر کو دیکھ رہے تھے جس کی گردان انھی ہوئی تھی اور چھپتی ہوئی نظریں ان پر جی تھیں۔ وہ درمیان میں حائل میز کے باعث یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ زمر نے کری کی نشت ایک ہاتھ سے مضبوطی سے تھام رکھی ہے۔ اور بار بار وہ ہوک نگل کر خود کو پر سکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تو آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

”اگر آپ واقعی ہاشم کاردار کو ہمارے ساتھ راہل لڑنے پر آمادہ کر لیتے ہیں تو تمہیک ہے۔“ ہلکے سے کندھے اچکا کر خود کو بے نیاز ظاہر کرنا چاہا۔ ”میں فارس کو چھوڑ سکتی ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ ذرا سما سکرائے۔

”اور میں جانتی ہوں کہ آپ یہ اپنی بیٹی کے لئے نہیں کر رہے۔“ اب کہ وہ بھی ذرا سام کائی تھی۔ ”آپ فارس کو استعمال کرنا چاہتے ہیں، اسے اپنی بیٹی کا بادڑی گارڈ بنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہو پائے گا۔ وہ کبھی بھی ایسے کسی دام میں نہیں آئے گا۔ میں نہیں وارن کروں

گی اسے۔ مگر وہ خود اتنا سمجھدار ہے کہ آپ کا ہر دار خطا جائے گا۔

”یہ میرا منسلک ہے، اس لئے کیوں ناہم وہ بات کریں جو آپ کا منسلک ہے۔“ آگے ہوتے ہیلیاں باہم پھساتے ہوئے انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ نے اچھا فیصلہ کیا، اپنے بوجھ کو کسی کی زندگی سے نکال کر اسے ہلا کرنے کا فیصلہ بہت اچھا ہتا ہے۔ آپ کو اور کچھ نہیں کرنا۔ بس اس کی زندگی سے نکل جانا ہے۔“

”مگر مرا ایک کم از کم جب اتنا کیس چل چکا ہو گا کہ مجھے لگے آپ نے اپنا وعدہ ایسا کر دیا ہے تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔“  
”اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو؟“ کمرے میں لمحے بھر کو سننا تا چھا گیا مگر زمر نے ادا کاری جاری رکھتے ہوئے اسی بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”جب میں آپ پر اعتبار کر رہی ہوں تو آپ کو بھی مجھ پر یقین کرنا چاہیے۔“

”مگر ہو سکتا ہے کہ یہ صرف آپ کی چال ہو۔ آپ صرف وعدہ کرنے کی ادا کاری کر رہی ہوں اور اپنا مطلب نکل آنے کے بعد آپ اپنی بات سے پھر جائیں۔ ایسے میں مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ ان کی زیرِ کاہیں اندر تک اتر رہی تھیں۔ زمر کا دل زور زور سے دھر کے لگا مگر چہرے پر مسکرا ہٹ برقرار رہی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ نے یقیناً کوئی کاشٹریکٹ بنوار کھا ہوا گا۔ لا یعنے میں دخنخڑ کر دیتی ہوں۔“

”آپ وکیل لوگ ہر کاشٹریکٹ کے نکلنے کے سوراخ ڈھونڈ لیتے ہیں، میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔“

”تو پھر آپ میری یگفتگو ریکارڈ کر رہے ہوں گے یقیناً تاکہ مجھے بیک میل کر سکیں۔“

”ایسا بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کیونکہ آپ بہت محتاط الفاظ کا چناؤ کر رہی ہیں، اگر اس منظر کی وید یو بنا کر میں فارس کو دکھا بھی دوں تو آپ وکٹم لگائیں گی اور میں ولن۔ یوں فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے گا۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔“ پہلی بار زمر کو محسوس ہوا کہ کمرے میں تباہ اور گھٹن بڑھ گئی ہے۔ خطرے کا سائز ان دور کہیں زور زور سے بجھنے لگا۔ کوئی آواز مگر سائی نہیں دیتی تھی، صرف سرخ ہتی جلتی بھتی دکھائی دیتی تھی۔ کسی نے اندر کہا کہ اٹھا اور چلی جاؤ، لعنت بھیجو اس کیس پر سعدی کو سمجھا لینا، مگر جس کا اندر زیادہ زور چلتا تھا، اس نے اس آواز کو دیالیا۔ کیونکہ ”زمر“ کا انتخاب زمر نے کر لیا تھا۔

”تو پھر کسی ضمانت چاہیے آپ کو مجھ سے؟“

انہوں نے جواب دینے کی بجائے میز پر کھڑا کر کے سیدھے رکھے ٹیکٹ کی طرف توجہ مبذول کی، اور اسکرین کو چھو کر کچھ دیکھنے لگے۔

”جب آپ اس عمارت میں داخل ہوئی تھیں تو آپ نے اپنا پرس ایکس رے سے گزارا تھا۔ آپ کے پرس کے اندر کی تصویر... اندر تک کا خا کہ میرے پاس کھلا رکھا ہے۔ اس میں ایک چھوٹی چوکور شے نظر آ رہی ہے جس کے اندر ایک نحاحا سا ہیرہ موجود ہے۔ یہ تصویر چونکہ پرس کا ایک رے امتحن ہے، یہ صرف ایک خا کہ دے سکتا ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ وہ ہیرہ اس نوز پن کا ہے جو کسی زمانے میں فارس غازی نے آپ کو دی تھی۔“

کرسی کی نشست پر جسے اس کے ہاتھ نے زور سے لیدر کو بھینچا۔ اس کے کندھے قدرے سیدھے ہوئے۔ لب پھٹ پھرائے۔

آنکھوں میں استحباب ابھرا۔

”اور جب آپ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ گفت دینے والا فارس تھا تو آپ غصے سے گھر چھوڑ کر جگل کی طرف نکل گئی تھیں۔ اس دن کے بعد سے آپ نے اس کو نہیں پہننا۔ حیران مت ہوں۔ کچھ تو معلومات ہوں نامیرے پاس بھی!“

”یقیناً یہ میرے ملازم نے کاردار زم کے گارڈ کو بتایا ہوگا، سب نوکروں کو خبر ہو گئی تھی اس رات۔ اور ملازم کا نوں کے جتنے لپکے ہوتے ہیں، زبان کے اتنے ہی کچھ ہوتے ہیں۔ خیر، آپ اس نوزپن کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟“

وہ بولی تو آواز میں دبادبا غصہ سالگتھا۔

”اگر یہ آپ کے پرس میں نہ ہوتی تو مجھے خیال بھی نہ آتا، مگر میری قسم اچھی تھی۔“ وہ نیلیٹ نیچے رکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

”آپ اسے خود ہی میرے پاس لے آئیں۔“ پھر باہم مٹھیاں پھنسائے مزید آگے کو ہوئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”مسز زمر... اپنی بات پر اعتبار دلانے کے لئے آپ مجھے اس سے اچھی صفائح نہیں دے سکتیں۔ اس ڈبی کو میرے پاس چھوڑ جائے۔“

آسانی کے سارے تارے ایک دم سمندر میں جاگرے تھے۔ اس کا سانس تک رک گیا تھا۔ ”یہ ڈبی؟“

”جی۔ جب آپ یہ وعدہ پورا کریں گی تو میں اسے واپس کر دوں گا۔ نہیں کریں گی تو میں... بلکہ میں کیا کروں گا؟ میری ملکیت میں یہ ڈبی دیکھ کر وہ خود ہی آپ کو چھوڑ دے گا۔ اسی کو ضمانت کہتے ہیں نا۔ اسی کو کاظمیکش اور ایگر یمنٹ کہتے ہیں نا۔ اور جب آپ نے اسے چھوڑ ہی دینا ہے تو پھر یہ ڈبی کوئی حیثیت تو نہیں رکھتی ہوگی آپ کے لئے۔ سو... اسے... مجھے... دے دیں۔“

تارے سمندر کی سطح پر چند لمحے تیرتے رہے، مگر تنکے جیسا شہارا بھی نہ ملا تو اندر گرتے چلے گئے۔ ڈوبتے چلے گئے۔ اس کی بھوری آنکھوں کی جوت بھگتی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہارون منتظر سے اسے دیکھے گئے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ ان دونوں بھجی نظر دوں سے دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ اور دل بند ہونے کو تھا۔

”میں آپ کے ساتھ کسی قسم کی اداکاری نہیں کر رہی۔ لیکن اگر آپ کو صرف اس طرح یقین آئے تو اس طرح سہی۔“ پرس سے وہ ڈبی نکال کر اس نے کھول کر میز پر پڑھنے لگی۔ اندر جگد گاتا ناخاہیر اڑھیر ساری روشنی منعکس کرنے لگا۔

”یہ لیجھے۔ اگر آپ نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو میں ہاشم کو بتا دوں گی کہ آپ کی بیٹی میرے شوہر کے لئے کیا جذبات رکھتی ہے، اور جب اسے پڑھنے کا ٹھہر کرے گا، آپ کو معلوم ہے سواب آپ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“ وہ سپاٹ لیجھ میں کہہ رہی تھی۔

ہارون واقعی چونکے تھے۔ اس کے الفاظ پر نہیں، اس ڈبی کو دیکھ کر۔ پھر انہوں نے ایک سراہتی نظر زمر پر ڈالی۔ ”گویا دہ امتحان میں پا س ہو گئی تھی۔“

”وہ بہت جلد خود آپ سے کہے گا کہ اسے یہ کیس لڑنا ہے یہ میرا وعدہ ہے۔ اسی میں ہم سب کافائدہ ہے۔“

زمر نے پرس اٹھایا اور ایک کیٹلی نظر ان پر ڈال کر باہر نکل گئی۔ دروازہ زور دار آواز سے بند کیا تھا۔

باہر رہا داری میں چلتے ہوئے اس نے بدقت ایک آنسو روکنے چاہے۔ گروہ نہیں رکے۔ قطرے نہ پچھرے پڑھنے لگے۔ اس نے رک کر دیوار کا شہارا لیا، گویا خود کوڑھے جانے سے روکا ہو، بچایا ہو۔ کچھ کھو دیا تھا اور اب دل ڈوب کر ابھرتا تھا۔ چند گھرے سانس لیے، چند آنسو پیئے اور پھر وہ دوبارہ سے چلنے لگی۔ اب کی دفعہ آنکھوں کی جوت بھجی تھی مگر چال ویسی ہی تھی مختلطی۔ ذرا اسی پھسلن گرا سکتی تھی اور اسے اب کوئی غلطی نہیں کرنی تھی۔

چند میل دور ہاشم کے آفس کے باہر کھڑی آبدار نے موبائل پر آیا پیغام دیکھ کر سے واپس پرس میں ڈالا، پھر جی کڑا کر چلتی ہوئی دروازے کے قریب آئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ پر سکون رکھنے کی کوشش کیے ہوئے تھی۔

دروازے کا ہینڈل پکڑتے ہوئے وہ زیر لب بڑھائی۔

”اتا براخطرہ مولے لوں کیا؟“ پھر جھکتا، اور اداسی سے مسکرائی۔

”وہ... تمہارے لئے... ایسا کبھی نہیں کرے گی، فارس!“ اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ آفس ابھی خالی تھا اور حلیمہ کے بقول ہاشم کے

آنے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ آبدار کو اب آدھا گھنٹہ ادھر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا تھا۔

❖❖❖

”مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔“ حینیں یوسف نے اس صبح اس سے یہ کہا تو جواب میں فارس نے سر ہلا کر کہا تھا۔

”مجھے بھی تھیں کچھ بتانا ہے۔“ وہ دونوں مورچاں کے پورچ میں کھڑے تھے اور وہ باہر جانے کی تیاری میں تھا۔

”میں جانتی ہوں آپ کو خاور کے بارے میں بتانا ہے۔ میں بھی وہی بتانا چاہ رہی ہوں۔“ وہ چمٹتی آنکھوں اور مغموم مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔ اس کا ایک بیٹا ہے جو اب واپس اپنی ماں اور اداسی سمیت خاور کے گھر آکے رہنے لگ گیا ہے۔ میں نے اس کو سب کچھ بتادیا ہے۔ اس کے باپ نے کیا کیا، اور کون کے لئے یہ سب کیا۔ اس کا دل بدال گیا ہے اپنے باپ کے لئے، اور کسی شخص کے لئے اس سے بڑی سزا کیا ہو گی کہ اس کی اولاد کا دل بدال جائے اس کے لئے؟ میرا خیال ہے آپ کو...“ وہ جوش سے تیز تیز بول رہی تھی۔

قریباً گھنٹے بھر بعد وہ اس بنگلے کے ڈرائیور میں بیٹھا تھا۔ جیسی اور شرث میں ملوں، وہ ناگ پٹا ناگ جما۔ سنجیدگی سے ادھر ادھر کیکھ رہا تھا۔ عجیب خاموشی کرے میں جائیں تھی۔ سامنے بیٹھا نو عمر لڑ کا خاموش تھا۔ وہ الجھا ہوا بھی تھا۔ مگر مقدس خاموشی کو تو زندگی پار رہا تھا۔

دفعتاً چوکٹ پاہٹ سی ہوئی۔ وہ دونوں اس طرف دیکھنے لگے۔

ایک عورت پہلے نمودار ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک وہیل چیز کی پشت کو تھامے ہوئے تھے جس کو دھکیلتی ہوئی وہ اندر لارہی تھی۔ فارس کی نظریں وہیں جم گئیں۔ وہ لس اسے دیکھتا رہا۔

وہ خاور تھا۔

اس کا آٹھ اہوا فانچ زدہ جسم وہیل چیز پر رکھا تھا۔ گویا اس میں روح نہ ہو۔ گردن تر چھی مخدسی تھی، اور چہرے پر آسکیجن ماںک چڑھا تھا۔ ساتھ چند نالیاں بھی جڑی تھیں۔ اس کے ہونٹ نیڑھے میڑھے سے ہو کر ایک زاویے پر جم گئے تھے اور آنکھیں... صرف وہی حرکت کرتی تھیں۔ ان کی سیاہ گیندیں گھوم گھوم کر فارس کے چہرے سے آنکراتی تھیں۔ ان میں بے بی تھی، خوف تھا، دکھ تھا۔

”کیا ان کی بہتری کی کوئی امید ہے؟“ اس نے سادگی سے لڑکے کو مخاطب کیا۔ لڑکے نے افسوس سے نفی میں سر ہلا یا۔

”ان کا جسم مستقل طور پر مخلوق ہو چکا ہے۔ ہاتھ کی صرف ایک انگلی ہلاکتے ہیں، ایک دفعہ ہلاکیں تو مطلب ہے ہاں دو دفعہ تو نا۔ بول بھی نہیں سکتے۔ بس دیکھ سکتے ہیں۔ روتنے بہت ہیں۔ آوازوں سے۔ مگر الفاظ نہیں نکلتے۔ ڈاکٹر زکریہ ہیں کہ قدرتی فانچ

ایک ہے اور ایسی صورت حال میں ہمیں اب سمجھو تھے کہ ناپڑے گا۔“ وہ دبی آواز میں بتا رہا تھا۔

فارس بس گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ جو سماں سماں سا وہیل چیز پر پڑا تھا۔ زرد بے جا چیزہ بے حد گرا ہوا دوزن ہڈیوں کا ڈھانچا

سانسان۔ اس کی بھیگی نظریں فارس پہ جی تھیں۔ بہت سے ماہ و سال دونوں کے درمیان فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔

”بول نہیں سکتے تو کیا ہوا۔ سن تو سکتے ہیں نا۔“ وہ بہت دیر بعد بولا تھا اور آواز ٹھنڈی تھی۔ ٹھنڈی اور سپاٹ۔

”بھی سن سکتے ہیں۔“ لڑکے نے سر ہلا دیا۔

”تو پھر آج کرنل خاور تمہارے ساتھ کچھ سین گے۔ ایک کہانی جو میں سنانے جا رہا ہوں۔“ فارس نے نگاہوں کا رخ اس لڑکے کی

طرف پھیرا۔ ”اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کہانی کو ساری زندگی یاد رکھو جب تک یہ زندہ ہیں تم روز ان کو وہ کہانی سنایا کرو۔“ خاور کی آنکھوں سے آنوجرنے لگے تھے۔

”میں سمجھنا نہیں۔“ لڑکا باب کے الجھا تھا۔

”جب میں شروع کروں گا تو سمجھ جاؤ گے۔ پھر بتاؤ، شروع کروں؟“ اس نے اسی سکون اور اطمینان سے پوچھا تھا۔ لڑکے نے اپات میں سر برلا یا۔ خاور نے بہت کوشش کی کہ وہ چیخنے چلائے، گردن اور ادھر امارے، اس کی منت کرئے اسے روکے، روئے پیئے، اس کے قدموں میں گرجائے اور اسے منع کرے۔ میرے بیٹے کو مت بتاؤ۔ خدارامت بتاؤ۔

مگر باب..... اختیار اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

اور اگر تمہیں کبھی کوئی کہے کہ انسان کے کیے گئے ظلم گھوم پھر کے اس کے پاس ایک دن ضرور لوٹتے ہیں تو یقین کر لینا کیونکہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔

ادھر حینین مورچاں کے لاڈنخ میں بیٹھی تھی وی دیکھتے ہوئے ڈرائے فردٹ کھارہ تھی۔ زمر ابھی ابھی لوٹی تھی اور خاموشی اور ادھر بیٹھی تھی، گواڑہن کہیں دوراً الجھا ہو۔ سعدی لیپ ٹاپ لئے بیٹھا کچھ پاؤں کا غند پکھر رہا تھا۔ وہ انٹرو یوکی تیاری کر رہا تھا۔ دفعتاً حینین اٹھی اور سریز ہیوں کی طرف بڑھ گئی۔ مٹھی میں خشک میوے بھرے، وہ ان کو قفے و قفے سے کھاتی، زینے چڑھتی اور پآئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر۔

اس کی دخراش چیخ سب نے سنی تھی۔ زمر اور سعدی کے خیالات ٹوٹے، جیسے ان کو ہوش آیا۔ وہ دونوں اوپر کی طرف بھاگے۔

”جنین کیا...“ چوکھت تک آتے ہوئے سعدی کے الفاظ ٹوٹ گئے۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ کیا ہوا تھا۔

ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ الماریاں دراز کھلے پڑے تھے۔ جو توں والے خانے سے سارے ڈبے نکلے ہوئے تھے۔ لاک والی دراز میں چاپی لگی تھی اور وہ کھلا تھا۔ حینین حواس باختی سی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ شل۔ ہکا بکا۔ کھڑکی بھی پوری کھلی تھی۔

”حہ، تم ٹھیک ہو؟ کیا ہوا؟“ زمر نے بے اختیار اسے کندھوں سے تھاما، اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

”وہ میرے سامنے کھڑکی سے کودا... اور....“ وہ شل سی ابھی تک گردن موڑے باہر دیکھ رہی تھی۔ ”اور اس نے دیوار پھاندلی۔“

”کون؟ کون تھا؟“ سعدی تیزی سے بالکونی میں بھاگا تھا۔

”وہ ایک آدمی تھا، اس نے سرخ مغلر لپیٹ رکھا تھا، اور.... اور اس کے لمبے بال تھے.... اور چھوٹا سا قد تھا۔“ وہ سفید چہرے کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتانے لگی۔ سعدی واپس اندر آیا اور سریز ہیوں کی طرف لپکا۔ اسے نیچے جا کر اس آدمی کو پکڑ نا تھا۔

”کیا کر رہا تھا وہ یہاں؟ بتاؤ حینین؟“

”اس کے ہاتھ میں میرا میموری کارڈ تھا۔ وہ علیشا والا میموری کارڈ لے کر چلا گیا۔ اللہ میرے!“ حینین نے سر دنوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ زمر نے بے ساختہ کھلی دراز کو دیکھا۔ اسے زور کا چکر آیا تھا۔

”میرے پاس تو اسکی کاپی بھی نہیں ہے زمر۔ اب کیا ہو گا؟“

زمر نہ ہال سی کاڈج پر گری گئی۔ اب کیا ہو گا؟

قصیر کاردار کے برآمدے کے اوپنے ستونوں پر دھوپ کی پہلی کرنیں گرتی نظر آ رہی تھیں۔ ہاشم موبائل دیکھتا ہے اترتا نیچے آ رہا تھا۔ اس کی کار سامنے منتظری کھڑی تھی۔ شوفر دروازہ کھولے ہاتھ باندھ کھڑا تھا۔ وہ جیسے ہی کار کے قریب آیا، ایک گارڈ سامنے سے تیزی

چلتا اس طرف آتا دکھائی دیا۔

”سر!“ اس نے عجلت میں پکارا۔ ہاشم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا ہے؟“

”ایک ملاقاتی ہے آپ کے لئے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ ان سے واقف ہیں، سوان سے مل لیں؟“  
”اسی وقت؟“ اس نے خوت سے ابرواخانی مگر پھر وہ ٹھہر گیا۔ گارڈ کے پیچھے آتے ذی نفس کو وہ پہچان گیا تھا۔ پاسپورٹ، انجان  
کا لازم بہت سی کڑیاں ایک ساتھ ہدھ ہن میں مل تھیں۔

”بیلو مسٹر کا ردار!“ وہ قدم قدم چلتی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اپنے ہیروں کی انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ سے کان کے پیچھے  
بال اڑتی نرمی سے بولی۔ ”میں یہ جانے بغیر کہ کس کے لئے کام کر رہی ہوں، آپ کے لئے بہت کچھ کرچکی ہوں پہلے۔ اب بھی فارس غازی  
کے خلاف آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”آپ کی تعریف؟“ وہ انجان بن کر بولا البتہ چہرے کی تمام بے زاری اور کلفت غائب ہو چکی تھی۔ مسکرا کر دلچسپی سے وہ اس نوار د  
کو دیکھ رہا تھا۔

”مجھے ڈاکٹر ایمن کہتے ہیں۔ فارس غازی نے میرا ہسپتال جلا یا تھا، اس نے مجھے تباہ کر دیا۔ تو کیوں ناہم مل کر اس سے بدل لیں؟“  
ہاشم کی مسکراہٹ گھری ہوئی۔ ”تو وہ آپ تھیں۔ سعدی یوسف کا پاسپورٹ چرانے والی۔ اور یقیناً پاسپورٹ کے علاوہ بھی بہت  
کچھ ہو گا آپ کے پاس۔“ مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتا وہ کہہ رہا تھا۔

”وہ آپ تھیں! ہے نا!“



باب: 25

## اک مسافت عالمِ تنویم میں...!

لوگ کہتے ہیں کہ  
زبردست محبت وہ ہوتی ہے  
جو تمہیں بخاتی ہے  
پیئے کو پانی دیتی ہے  
اور تسلی آمیزانداز میں  
تمہارے سر پر تھکی دیتی ہے۔  
مگر میں کہتی ہوں کہ

زبردست محبت وہ ہے  
جو تمہیں اڑاؤے فضامیں

بھڑکا دے تمہارے وجود میں شعلے

تم آسمانوں میں جلتے ہوئے اڑتے جاؤ  
اور رات کو ہماپرندے کی طرح روشن کر دو۔  
ایسی محبت جو تمہیں جنگل کی آگ کی طرح

بھگاتی جائے اور تم .....  
تم دوڑتے دوڑتے رکونہیں۔

اور جس شے کو بھی تم چھوڑو  
اسے جلا کر راکھ کرتے جاؤ۔

میں کہتی ہوں یہ ہے اچھی محبت۔

جو تمہیں جلا ڈالے  
جو تمہیں اڑاؤالے

اور تم اس کے ساتھ  
بھاگتے چلے جاؤ.....  
(سی جوائے بیل سی)

سرما کو اپریل کے سورج نے پکھلا کر گویا بھاپ بنانے کے اڑا دیا تھا۔ وہ ایسا گیا کہ اب نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ فضا گرم تھی۔ ہوا  
سا کن تھی۔ گزشتہ برسوں کی نسبت اس سال موسمِ گرم باہم کے درمیان سے ہی شروع ہوا چاہتا تھا۔

کچھری کا جہنمی بجوم دیسے ہی بھانت بھانت کی بولیاں بولتا اہد ایوں سے گزر رہا تھا۔ البتہ اس کمرہِ عدالت میں بند دروازوں  
کے باعث آوازوں کی آمد مقطوع تھی۔ چبوترے پر اوپر جو برا جان سیشن حجتباً عابداً غاصب اپنے کاغذات اللہ پلٹ کر دیکھ رہے  
تھے۔ سامنے دونوں اطراف کریاں لگی تھیں۔ کورٹ روپورٹ اپنے کی بورڈ پر ہاتھ جمائے تیار بیٹھا تھا۔ بونے والوں کا ہر بیچ اور ہر جھوٹ اچک  
کر صفحہ، قرطاس پر منتقل کرنے کو بے تاب تھا۔

دونوں جانب کی کرسیوں کے درمیان گزرنے کا کھلا سارستہ بنا تھا۔ ہاشم کا رد ارثا نگ پہنگ جمائے بیٹھا تھا۔ ساتھ سوت، نائی  
اور جھک سر والا شیر و موجود تھا، اور مزید آگے دیکھو تو جواہرات بیٹھی، بے زاری سے اپنے نیکلیں کو انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ دائیں  
جانب بھی دیکھ لیتی جہاں دوسرا میز کے پیچے زمرا اور سعدی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ سر ایک دوسرے کے قریب کیے وہ دھمکی آواز میں بات کر  
رہے تھے۔ پچھلی کرسیوں پر نہیں اور اسامہ بیٹھتے تھے۔ بالکل خاموش۔

اب تم واپس ہاشم کا رد ارکی طرف آجائے تو وہ اسی طرح مطمئن سامینہ نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی، اور چہرہ نجیہہ  
سالگرتا تھا۔

”زم رصلبہ، آپ شروع کریں۔“ نجح صاحب نے کاغذات سے نظریں انھا کر زمر کو اشارہ کیا۔ نرائل شروع ہو چکا تھا۔ اس کے  
بولنے کا وقت آگیا تھا۔ وہ سعدی سے ہلکا سا کچھ کہتی اٹھ کھڑی ہوئی، کوٹ ذرا کھینچ کر درست کیا۔ بال کان کے پیچھے اڑ سے۔ اس کی ناک میں  
نخے سے ہیرے کی لوگ دمک رہی تھی۔ ہاشم یونہی اسے دیکھے گیا۔ وہ اس لوگ اور اس میں چھپی داستانوں سے بے خبر تھا، مگر اس کی چمک  
سے اسے کچھ یاد آ رہا تھا.... ذہن پیچھے کہیں تیرنے لگا تھا.... اور ایک دم وہ دو ماہ پہلے کی اس صبح میں غوط زدن ہو گیا تھا۔

”ڈاکٹر ایمن!“ سبزہ زار پر اپنی کار کے ساتھ کھڑا وہ مسکراتے ہوئے اس عورت سے کہہ رہا تھا جس نے ہاتھوں میں ہیرے  
کیا گلوٹھیاں پکن رکھی تھیں۔ ”تو وہ آپ تھیں نا۔ جنہوں نے مجھے وہ پاسپورٹ بھیجا تھا۔“  
ڈاکٹر ایمن نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ جو کچھ اور کہنے جا رہی تھی، رک گئی۔ جنہوں نا۔ سمجھی سے اکٹھی ہوئیں۔ ”سوری،“ مگر کون سا  
پاسپورٹ؟“

”آپ... نے.... مجھے...“ وہ توڑ توڑ کر کہتا اس کے سامنے آیا۔ ”ایک.... پاسپورٹ بھیجا تھا.... سعدی یوسف کا....“  
اس نے اچھبی سے لنگی میں سر ہلایا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ ”نہیں،“ میں نے آپ کو کچھ نہیں بھیجا۔ میں نے تو دو تین دفعہ بس آپ کے  
آفس کا لکھی، ملنا چاہتی تھی۔ اگر آپ کو کسی نے میرے خلاف کچھ کہا ہے تو یقین مانیں اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔“

ہاشم نے آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کر غور سے اسے دیکھا۔ انداز سے لگتا تھا وہ بچ کہہ رہی ہے۔ اس نے سر جھکا۔

”خیر.... کیوں ملنا چاہتی تھیں آپ مجھ سے؟“ انداز دار و کھا ہو گیا تھا۔ دچپی گویا ختم ہو گئی تھی۔

”میں فارس غازی کے خلاف آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ جب آپ نرائل میں اس کے بھائیجے کے خلاف دلائل دیں گے تو....“

”ایک منٹ بی بی۔“ اس نے انگلی اٹھا کر روا کا۔ ”کوئی ٹرائل نہیں ہو رہا۔ نہ کبھی ہو گا۔ یہ آپ لوگوں کی بھول ہے کہ ہم اور وہ،“ کبھی دو خاندانوں کی طرح استغاثاً اور دفاع کی کرسیوں پر کسی کورٹ روم میں بیٹھے ہوں گے۔ اور مجھے اگر آپ کی مدد کی ضرورت پڑی...“ اگر پڑی تو میں خود آپ کو یاد کر لوں گا۔ ابھی آپ جاسکتی ہیں۔“ اور سن گلا سر آنکھوں پر چڑھاتا، ہاتھ جھلا کر ڈراپیور کو اشارہ کرتا وہ اندر بیٹھا۔ با ادب ملازم نے کالے شنیشے والا دروازہ بند کر دیا۔ گاڑی زن سے سامنے سے گزر گئی اور ڈاکٹر ایمن جو ابھی کچھ کہہ ہی نہیں سکی تھی، تملکارے جاتے دیکھتی رہی۔

(آج)

”زم رصلحبہ... آپ شروع کریں...“ جچ کی آواز کی بازگشت تھی جو اسے سنائی دی تھی۔ ہیروں کی چمکِ مدمم ہوئی۔ قدرے چونک کرہا شم سیدھا ہوا اور پھر اپنے اطراف میں دیکھا۔ وہ کمرہ عدالت میں بیٹھا تھا اپنے خاندان کے ساتھ۔ اور دوسرا طرف.... اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہاں پچھلی کرسیوں پر جنین کے ساتھ فارس بیٹھا تھا۔ وہ شاید ابھی ابھی آیا تھا۔ اور ذرا اپر لمبے کر کے بیٹھا مسلسل چیوکم چباتے ہوئے سامنے دیکھ رہا تھا۔ صرف وہی تماشائی لگتا تھا۔ باقی سب شدید تباہ کا شکار تھے۔ ہاشم کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے اس نے نگاہیں گھمائیں۔ سنبھری آنکھیں سیاہ آنکھوں سے ملیں۔ ہاشم سنجیدگی سے اسے دیکھتا ہے، مگر سنبھری آنکھیں مسکرا میں۔ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر، سر کو ذرا ساختم دیا۔ (سلام!) ہاشم نے نجوت سے رخ واپس پھیر لیا۔

”یور آز!“ زمر چبوترے کے سامنے زمین پر کھڑی بات کا آغاز کر رہی تھی۔ ”سرکار بنام نوشیر وال کاردار کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے سعدی یوسف کو سمجھنا ہو گا۔ ایک رشتے دار کی حیثیت سے نہیں، ایک وکیل کی حیثیت سے میں معزز عدالت کو بتانا چاہتی ہوں کہ سعدی یوسف کون ہے۔ اور سعدی یوسف کون تھا۔ میں آپ کو سعدی یوسف کی کہانی سننا چاہتی ہوں۔“

نجح صاحب توجہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جنین کی نظریں بھی زمر کی پشت پر جھی تھیں۔ وہ اس کے الفاظ پر فوکس کرنا چاہتی تھی، ایک ایک لفظ دھیان سے سننا چاہتی تھی، مگر کورٹ رپورٹ کے کی بورڈ پر ٹھک ٹھک چلتے ہاتھوں کی آواز دفعتاً زمر کی آواز اس کا دھیان پثارہتی تھی۔ پھر یکا یک ساری آوازیں پس منظر میں چلی گئیں اور دھیرے دھیرے کمرہ عدالت اس کے بیٹر دوم میں تبدیل ہوتا گیا.....

(دو ماہ پہلے)

وہ اپنے کمرے میں کھلی کھڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ پریشان نگاہیں باہر گلی تھیں۔ زمر سر دنوں ہاتھوں میں گرانے بیٹھ پیٹھی تھی۔ تھی دروازہ کھلا اور سعدی تیزی سے اندر داخل ہوا۔

”وہ بھاگ چکا ہے۔ سرخ مفلرو والا آدمی۔ گارڈ کہہ رہا ہے کہ وہ اس کے پیچھے بھاگ تھا۔ مگر تب تک وہ گلیوں میں گم ہو چکا تھا۔“ وہ پھولے سانس کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ”اب وہ کسی ہمسایوں کے گھر میں کوڈ چکا ہے۔ گارڈ زگئے ہیں مگر میرا نہیں خیال کر دے اب ملے گا۔“ پھر جنین کو دیکھا۔

”تمہارا میموری کا رڈ... کیا تھا اس میں؟“

وہ ابھی تک کھڑکی میں دیکھ رہی تھی، اب کہ آہستہ سے چہرہ گھما کر سعدی کو دیکھا۔ آنکھوں میں بد دلی تھی۔

”وہ علیشا نے ہمیں دیا تھا۔ ہم اتنے سال اس کو لے کر پھرتے رہے آپ کے کی چین میں مگر اس کو استعمال نہیں کر سکے۔“

”مگر اس میں تھا کیا؟“ زمر نے تھکی تھکی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ جنین نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”کرنل خاور کے بیٹوں کو ہاشم نے مردوا یا تھا۔ اور مسز کاردار نے۔ پھر ایام ایک آفسر پر ڈال دیا جو خاور کے کیس کی تفتیش کر رہا تھا۔ یہ اگلے سو سال کی منصوبہ بندی کرنے والے لوگ ہیں۔ اس لیے یہ اتنے امیر اور اتنے کامیاب ہوتے ہیں۔ جب یہ کسی کو اپنا دست

راست بنا تے پین تو اس کی ساری کختیاں جلا دیتے ہیں۔ خاور نہیں جان سکا۔ اس نے اس بر گیڈر کی آنکھوں کے سامنے اس کے خاندان کو مارا اور پھر اس کو بھی مار دیا۔ اس کو بعد میں علم ہوا کہ اس بر گیڈر کا ایک اور بیٹا بھی ہے جو امریکہ میں زیر تعلیم ہے۔ اور اس کو وہ خفیہ اولاد کی طرح چھپا کر رکھتا ہے۔ ”خین سانس لینے کو رکی۔ یہ با تین بتا نا عجیب لگ رہا تھا۔ سعدی غور سے اور زمزد مرد توجی سے سن رہی تھی۔ ”خاور کا اس بچے سے کوئی بھگڑا نہیں تھا۔ اس نے صرف بر گیڈر کو دیت دیتی تھی۔ جب دے دی تو انتقام ختم ہوا۔ اس نے اس لڑکے کو تلاش کرنا چاہا مگر وہ اس کو مار کر کیا کرتا؟ بر گیڈر بیگش کے دستوں نے اسے روپوش کر دیا۔ خاور کو صرف اس کی ایک گھڑی ملی تھی جس پر اس لڑکے کا پارشل فنگر پر نہ تھا۔ اس کا رذ میں ایک وید یو تھی جو یقیناً سزا کا ردار نے بنوائی تھی۔ اس میں خاور ان کے سامنے آ کر اعتراف جرم کرتا ہے اور وہ اس کو فنگر پر نہ تھا۔ اس کا رذ میں ایک گھڑی پہنچنے پر وہ میں چھپا لیتے ہیں۔ یوں ان کو دفا دار ملازم بھی مل گیا، اور اس کی دھکتی رگ کو بھی ہاتھ میں لے لیا جس سے وہ کبھی بھی اس کو اپنے جوتے تسلی سکتے ہیں۔ علیشا نے وہ پورا فولڈر کاپی کیا تھا۔ اس میں کچھ تصاویر تھیں۔ وہ وید یو تھی۔ اور ایک پارشل فنگر پر نہ کی فائل تھی۔ جواہرات کے لیپ تاپ سے لیا اس نے یہ سب اور مجھے یاد ہے وہ کبھی بھی خاور کو اپنے کمپیوٹر کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں۔ علیشا ہمیکر تھی۔ انہی جرام کی وجہ سے وہ جیل گئی تھی۔ اس کے پاس نیشنل ڈینا میں تک رسائی تھی۔ اس نے اس پارشل فنگر پر نہ کوڈ ہونڈ تھیں۔ شاید خاور امریکہ میں ہوتا اور دلچسپی لیتا اور کار دار نے اسے مصروف نہ کر رکھا ہوتا تو وہ بھی ڈھونڈ نکالتا۔ مگر اس کا تو انتقام پورا ہو گیا تھا۔ مگر نکالا۔ شاید خاور امریکہ میں ایک سروائیورہ جاتا ہے۔ اور وہ اس چکر کو لٹا چلاتا ہے۔ وہ لڑکا سلطان کئی برس کی انہک محتت کے بعد اور گنگزیب کار دار انتقام کے سائیکل میں ایک ڈرائیور ہے۔ اس کے ڈرائیور لائسنس کی کاپی اس کا رذ میں تھی اور میں دیکھتے ہی پہچان گئی تھی کہ یہ احر شفیع کی پرانی تصویر ہے۔“

”احمر؟ وہ اسٹپنی؟“ سعدی کو دھکا لگا تھا۔ زمر خاموش رہی۔ اسے اب کوئی بھی بات حیران نہیں کرتی تھی۔

”میں نے یہ ساری بتیں فارس ماموں کو بتائیں تو انہوں نے احر سے یہ سب پوچھا۔ یہ بات احر نے انہیں بتائی کہ اس کے والد نہیں کار دار نے خاور کے بیٹوں کو مارا تھا۔ چونکہ فارس ماموں نے خود اس دن خاور کو جانے دیا تھا۔ زمر کے کہنے پر حالانکہ بعد میں خاور نے زمر پر گولی بھی چلانی چاہی، مگر انہوں نے احر سے کہا کہ وہ اسے جانے دے ورنہ خاور اس کو اسکا کرانے کے گا کہ مجھے مارڈا لو اور یوں احر مجرم بن جائے گا۔ انتقام کا چکر لٹا ہو گا۔ خاور کا تیسری بیٹی زندہ ہے۔ وہ احر کو جیئے نہیں دے گا۔ مگر احر نے بات نہیں مانی۔ اس نے ہی کیا ہے جو بھی اس نے کیا ہے خاور کے ساتھ۔ خاور کے ایک یہ نہ اور فانچ کے بارے میں تو آپ سب نے ہاشم کے ٹوٹر پر پڑھ لیا ہو گا۔ خیر مجھے خاور سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اس لیے میں نے اس کے بیٹے کو سب بتا دیا ای میل کر کے۔ فارس ماموں بھی صبح ادھر ہی گئے ہیں۔ وہ ایک دفعہ.....“

”تم نے اسے کاپی کیوں نہیں کیا؟ ہم اسے کورٹ میں استعمال کر سکتے تھے۔“ سعدی جھنچھلا یا تھا۔ خاور سے وہاں کسی کو دلچسپی نہ تھی۔

”بھائی وہ کاپی نہیں ہو رہی تھی اور میں نے وہ بہت سنجھاں کر رکھی تھی۔“

”خین۔“ زمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”کس کس کو علم تھا کہ وہ تم نے کہاں رکھی ہے؟ کسی ملازم نے دیکھا تھا تمہیں وہ رکھتے ہوئے؟“

”نہیں زمر۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ اس دراز کی چابی کی جگہ میرے سو کوئی نہیں جانتا۔“ کوئی بھی نہیں جانتا۔“ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ ”پہلے وہ فلیش ڈرائیور خالی نکلی اور اب یہ سارے ثبوت گئے۔ شاید Yousufs Atqi بھیا نک اور تاریک چیزیں رکھنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔“ خین نے دل گرفتگی سے ایک اور بیچ بولا۔ سعدی نے لنگی میں سر ہلا کیا۔

”اوہ نہوں۔ مجھے یقین ہے جب سو نیا کی سا لگرہ کی رات میں نے ہاشم کے کرے میں جا کر وہ فلیش ڈرائیور کاپی کی تھی تو اس کے

اندر کافی سارا مواد موجود تھا۔ میموری تقریباً فل ہو گئی تھی۔ اور اب اس میں فروزن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یقیناً کسی نے اہم ڈاکومنٹس ان میں سے مٹائے ہیں۔“

”کوئی میری ناک کے نیچے میری فلیش سے کیسے کچھ منا سکتا ہے؟“

”جیسے کوئی تمہاری دراز سے کارڈ نکال کر لے جاسکتا ہے۔ یقیناً اس شخص کو ہاشم نے بھیجا ہو گا اور اسے اس فلیش کا پاسورڈ معلوم ہے گا۔ نہ ہم خود محفوظ ہیں، نہ ہمارے گھر۔“ سعدی تلمذ سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ حین نے بے اختیار زمر کو دیکھا تھا۔ ”اب کیا ہو گا؟ ٹرائل کے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“

ذرادیر بعد زمر نے پھر اٹھایا تو لگتا تھا وہ خود کو قدر سے سنبھال چکی ہے۔

”پاکستان میں ایسے ہی ہوتے ہیں ٹرائلز۔ مختلف فریق ٹرائل شروع ہونے سے قبل ہی ہمارے ثبوت مٹا دیتے ہیں۔ لیکن کوئی اس نہیں۔“ وہ بالوں کو لپیٹ کر جوڑے کی شکل دیتی اپنی جگہ سے انھی۔

”ہمارے پاس ہماری زبانیں، ہمارے دلائیں اور ہمارے گواہ موجود ہوں گے۔ ٹرائل ہو گا اور ضرور ہو گا، اور اسے ہم ہی جیتیں گے اور اگر نہ بھی جیت سکتے تو کم از کم.....“ اس نے سمجھیگی سے حین کو دیکھا۔

”It would be worth trying۔“

(آج)

”یور آزرا!“ حین نے سر جھکا۔ ارگرد چلتا منظر بھی جانے پہنچ ہونے والی دی کی طرح غائب ہو گیا۔ وہ ذرا سنبھل کر سیدی تھی،“ کر بیٹھی۔ کرہ عدالت اس کے اطراف میں آبسا تھا اور وہاں سب دم سادھے زمر کوں رہے تھے جو نج کے چبوترے کے سامنے کھڑی بات ہے۔ آغاز کر رہی تھی۔ یہاں سے اس کی پشت نظر آتی تھی۔ سیاہ کوٹ کے اوپر گھنگریا لے بال آدھے بند ہے گر رہے تھے اور وہ وقته وقته تھے۔“ کے پیچھے ایک بٹ اڑتی تھی۔

”میرے موکل سعدی یوسف کی کہانی 21 میں کوئی شروع ہوئی تھی۔ یہ اس سے بہت پہلے شروع ہوئی تھی۔“ چہرہ موز۔“ الی سعدی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے اس نے بات جاری رکھی۔ وہ بس زخمی آنکھوں سے سامنے دیکھے گیا۔

”جو سعدی یوسف اس وقت کرہ عدالت میں انصاف کا طالب بن کر بیٹھا ہے، یہ وہ سعدی نہیں ہے جس کو اس کے گھر واے اے!“ کئی برسوں سے جانتے ہیں۔ وہ سعدی اور تھا۔ وہ زندہ دل تھا۔ لوگوں کو معاف کرنے والا درگز رکرنے والا تھا۔ ملک کی خدمت کا جذبہ۔“ اس نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ وہ ایک مختتی اور قابل نوجوان تھا۔ اس کے پاس ٹیلنٹ تھا، ہنر تھا، ذہانت تھی۔ اگر اس کو کام کرنے دیا جائے،“ اس کو موقع ملتے تو وہ کہاں پہنچ چکا ہوتا، مگر یور آزرا، میرے ملک کے نوجوانوں کو اگر اسی طرح پھولنے دیا جائے تو معروف!“ امیر آئی پی پیز کے آتش داں ٹھنڈے نہ پڑ جائیں؟ اگر ان نوجوانوں کو یونہی بڑے بڑے پرانکیش پر محنت اور لگن سے کام کرنے کی اجرا۔“ دے دی جائے تو وقت کے فرعونوں کی غلامی کون کرے گا؟“

ٹانگ پٹانگ جمائے بیٹھا ہشم، گال تلے انگلی رکھے اطمینان سے زمر کو دیکھ رہا تھا۔ آخری بات پا گئے جھکا، نوٹ پیڈ اٹھایا اور اس پر چند الفاظ تحریر کیے۔

”سعدی یوسف۔ غریب کارڈ۔ محبت وطن کارڈ۔“ نوٹ لے کر اس نے پیڈ ڈال دیا اور توجہ سے منے لگا۔ وہ اب چبورت۔“

سامنے چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہاتھ ہلا کر۔ دائیں سے باہمیں ہملتی۔

”سعدی یوسف کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی اس کی مخصوصیت تھی۔ اس نے سمجھا کہ شاید دوسرے لوگ بھی اس کی طرح ہو۔“

بیں ان کو اللہ کا خوف دلا تو وہ سدھ رجاتے ہیں۔ اور اسی خیال کے تحت وہ 21 مئی کی صبح ہاشم کاردار کے بلانے پے اس کے آفس گیا تھا۔ یور آز ہو، ہاں پر ان سے جھگڑا کرنے یا ان کو مارنے کی نیت سے نہیں گیا تھا، بلکہ وہ وہاں ان کو قانون کی حرمت کا احساس دلانے گیا تھا۔“

ہاشم سنجیدگی سے منtar ہا۔ چہرے پوہنچ تاثرات برقرار رہے۔

”اس موقع پر ہاشم کاردار نے سعدی یوسف کو میں کروڑ روپے لے کر اپنا منہ بند کرنے کی پیشکش کی، جسے اس نے ٹھکرایا۔ یہ اسی وقت تھا جب ملزم نو شیر و اس کاردار سے اس کی تلخ کلامی ہوئی مگر نہ ہی سعدی یوسف نے کسی پر ہاتھ انداختاں لمبی تکرار کی بلکہ چند الفاظ کہہ لروہ وہاں سے چلا آیا۔ ایک پچیس سال کے نوجوان کے خاندان کی عورتوں کے بارے میں نازیبا باتیں کہی جائیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ مخالف کا منہ توڑ دے۔ مگر سعدی یوسف نے زبانی تلخی کے سوا کچھ نہیں کیا۔ وہ قانون توڑ نے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ قانون کی بالادستی اور انصاف قائم کرنے کے لئے ان کو فصیحت کرنے گیا تھا۔ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی سے پہلے وہ خیر کا ایک آخری راستہ دکھانے لگا تھا ان کو شاید کہ وہ نادم ہوں، شاید کہ وہ پلٹ آئیں، تو ان کی سزا میں کی ہو جائے۔ ایسا تھا ہمارا سعدی۔ دشمنوں کا بھی خیر خواہ۔“ زمر نے رک کر پہرہ موڑا۔ سعدی اب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ہاشم البتہ انہا ک سے پیدا پر الفاظ کا اضافہ کر رہا تھا۔“ کریکٹر اسکچ میجا، ہمدرد۔ غریب بمقابلہ امیر۔ مختصر یہ کہ فرشتہ کارڈ کھلی رہی ہے پر اسکیو توڑ۔“ اور اس کا دماغ زمر کے ہر کارڈ کا توڑ سوچ رہا تھا۔ پیلے نوٹ پیڈ پر نظریں جائے وہ زمر کی باتیں سن رہا تھا مگر بار بار دھیان بث ساجاتا تھا۔ نوٹ پیڈ کے صفحے بالکل زرد تھے۔ سورج کھلی کے پھولوں جیسے زرد۔ اور اس زردی میں بہت سے بلب جگلنے لگے۔.....

(دو ماہ پہلے)

اس کے آفس کا کاریڈور صبح کے باوجود زرد بیوں سے جگدگار ہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔ ذہن میں ڈاکٹر ایمن کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ جمع تفریق کر رہا تھا۔ جوڑ توڑ کر رہا تھا۔

اپنے آفس کے دروازے پر ڈھنڈا۔ چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ درآئی۔ موڈا ایک دم اچھا ہو گیا۔

”ریڈ؟“ اس نے مسکرا کر آفس میں قدم رکھا۔ وہ جو کرسی پہنچی تھی، چونک کرمڑی۔ پھر کھڑی ہو گئی۔ چہرے پر بدقت پھیکی سکر رہا تھا۔ سرخ رومال سر پر پیٹ کر گردن کے پیچھے گرد لگائے ہوئے تھی، اور کانوں میں آنسو شکل کے سرخ یا قوت لٹک رہے تھے۔ بزر اہل آنکھیں بے خوابی کے باعث اندر سے گلابی پڑ رہی تھیں مگر پھر بھی وہ سنبھل کر مسکرا رہی تھی۔

”گریم ریپر!“ ہاشم اس طرز تحااط پر ہلاکا ساہنستا اندر آیا اور میز کے پیچھے جا کر، کوٹ کا بنن کھولتے ہوئے اپنی کرسی سنبھالی۔

”مجھے اس نام سے پکارنا بند کر سکتی ہو، آبی؟“ کرسی کو میز کے قریب لاتے اس نے چند چیزیں اٹھا کر الٹ پلٹ کیں۔ چہرے پر اسی وجہہ مسکراہٹ تھی۔ سارا ماحول گویا معطر ہو گیا تھا۔

آبدار دھیرے سے کرسی پر اپس پہنچی۔ اس کی گم صم نگاہیں ہاشم کے چہرے پر جی تھیں۔

”ناشہت کیا ہے؟ کیا ملگاؤں تمہارے لیے؟“

”میں سمندر کی گلی ریت پر ہی تھی.... میر اندر پانیوں میں ڈوب چکا تھا۔“ وہ کسی گھرے خیال میں بول رہی تھی۔ ”کیا پھیپھڑے اور کیا دل.... سب پانی تھا.... ایسے میں کوئی میرے اوپر جھکا تھا.... اس کی شرٹ کی پشت پر نھا سا سیپ چپکا تھا.... اس سیپ میں تین رنگ تھے... گویا گوں کی طرح ابھرے ہوئے تھے.... تب میں نے اسے فرشتہ سمجھا تھا.... موت کا فرشتہ.... مگر اس موت کے فرشتے نے مجھے نئی زندگی دی۔“

وہ جو فون اٹھا کر آرڈر کرنے لگا تھا، رسیور واپس ڈال کر مسکرا کے اسے دیکھنے لگا۔ وہ گم صمی دیوار کو دیکھتی بول رہی تھی۔ ”اور اب

وہ چاہتا ہے کہ میں اس کی زندگی میں شامل ہو جاؤں۔ ”(ہاشم مسکرا تارہا۔) اب....جب کہ ایک دنیا...اسے شیطان کہنے لگی ہے۔“  
ہاشم کی مسکرا ہست غائب ہوئی۔ دماغ گویا بھک سے اڑا۔ اس نے لب کھولے مگر پھر بخج لئے۔ سمجھنہیں آیا کیا کہے۔

”اور وہ چاہتا ہے کہ میں....اس کی زندگی میں شامل ہو جاؤں۔ سمرودیگ یا اسپرنگ ویڈنگ!“ آلبی کی گم صم نکالیں اس کے چہرے پر آنحضرت۔ ”سمرودیگ یا اسپرنگ ویڈنگ....یہی پوچھا تھا ان تم نے!“  
”آلبی تم سوچنے کے لئے وقت لے سکتی ہو اور پھر.....“

”اور پھر میں وہ عورت بن جاؤں گی جو شہر کے ساتوں eligible bachelor کی ملکہ بن کر اس کی زندگی میں آئے گی! اور اس کے ساتھ ہر جگہ ہر قصور یہر میگزین کو رپ کھڑی ہو گی! اس کے ساتھ سیاہ گلاسز لگائے کاٹے شیشوں والی بھی گاڑی سے نکال کرے گی مگر لوگ....“  
آگے ہوئی۔ مسکرا ہست نہیں تھی، آنکھوں میں آنچھی۔ سرخ تھی۔ ”مگر لوگ سامنے سرخ تالین بچھا کر اس کے انتظار میں پھول لئے نہیں کھہے۔  
ہوں گے۔ لوگ پوٹر ز اور بیز ز اٹھا کر کھڑے ہوں گے رپورٹر ز مائیک لہر الہا کر پوچھیں گے کہ سعدی یوسف کی زندگی کا خون کرنے کے بعد تم لوگ سراٹھا کر کیسے جی رہے ہو؟“

”وہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے اس کو صرف انگو کیا تھا، مگر اس کے خاندان کے افراد ہم نے قتل نہیں کیے، نہ ہی شیر و نے اے گولیاں ماری تھیں۔“ وہ تتملا کر بولا تھا۔ ”اے نیاز بیگ نے مارا تھا، میں صرف اسے اس کے دشمنوں سے محفوظ رکھ رہا تھا مگر وہ اتنا شکرا بے کہ...“ شدت جذبات سے سرخ پڑتے چہرے کے باعث وہ بول ہی نہیں پار رہا تھا۔

”وہ ناشکرا ہے یا شکر گزار وہ.... بول رہا ہے، اور دنیا اس کوں رہی ہے۔ دنیا اس کو دیکھ رہی ہے۔ دنیا اس کے انکشافات سے لطف انداز ہو رہی ہے۔ اس کا کیس اگلے میں سال عدالت میں چلے گا مگر میں سال کس نے دیکھے ہیں۔“ وہ ترپ کر بولی تھی۔ ”میری زندگی کے تھما رے ساتھ میری زندگی کے پہلے دو سال.... دو کریم ایئر زدہ لے لے گا۔ کم از کم دو سال تو میڈیا اور لوگ اس کو یاد رکھیں گے نا۔ میں دو سال تک اخبارات، اُنی وی اور سو شل میڈیا پاپ الزامات پڑھتی رہوں گی۔ وہ بولتا رہے گا اور لوگ اسے سنتے رہیں گے۔ میں جب گھر سے نکلوں کی پلک مجھ نہ فترت سے دیکھے گی۔ کیونکہ وہ تھما را اور نوشیر والا کامیڈی یا ٹرائل کر چکے ہیں۔ پلک تمہیں محروم قرار دے پچھی ہے۔ ان کی باتیں مجھے گھر میں قید کر دیں گی۔ میں باہر تک نہیں نکل سکوں گی۔ سنا تم نے۔ جرم تم پہ ثابت ہوا ہے اور جیل مجھے ہو جائے گی۔“

”ہم کسی اور ملک چلے جائیں گے، تمہیں پچھنہیں سننا پڑے گا۔“ وہ آگے کو ہوا جلدی سے کہنے لگا تھا۔

”لیکن اگر تم قاتل نہیں ہو، اگر تم نے کچھ غلط نہیں کیا تو ہم کیوں بھاگیں؟ اگر تم اور نوشیر والا بے قصور ہو تو اس کی زبان بند کیوں نہیں کرتے؟“ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔ گود میں رکھا اس کے ہاتھ ہولے سے کپکار ہے تھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر وہ بظاہر جذباتی چہرہ بنائے کہے جا رہی تھی۔ ”ان کو چپ ہونا ہو گا ہاشم، ورنہ تھما رے خاندان سے خود کو بھی منسلک نہیں کروں گی۔ جب تک یہ گندگی تھما رے ساتھ ہے۔“

”میں کیا کروں؟ تم کیا چاہتی ہو؟ میں کیا کروں؟“ وہ آگے ہوتے ہوئے بولا۔ بار بار وہ سر جھٹلتا تھا، کبھی انگلیاں باہم پھنسا کر کھولتا تھا۔

”ان کو چپ کرواؤ، پلک رائے کو بدلو۔“ اگلے الفاظ کہنے سے پہلے اس نے دل میں کہا تھا۔ (وہ تھما رے لئے...فارس غازی... یہ کبھی نہیں کرے گی۔) اپنا... دفاع کرو۔ اپنی بے گناہی ثابت کرو۔ یوں کہ دنیا مان جائے، تم سچے تھے۔ تھما را بھائی سچا تھا۔ میڈیا... سو شل میڈیا... نوجوان... سب اس کے ساتھ کھڑے ہیں۔ وہ مشہور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ہیر و بن رہا ہے۔ کیونکہ اس کا میڈیا ٹرائل نہیں ہو رہا۔ تھما را، رہا ہے۔ تم پہلے ہی ٹرائل کی زد میں ہو۔ تو اب.... اس کو گھیٹو ٹرائل میں! ہاشم کاردار....“ اس نے میز پر ہاتھ رکھ کر، آگے جھک کر اس کی آنکھوں

میں دیکھ کر کہا۔ ”اس کو عدالت میں لے کر آؤ اور اس کے سارے الزامات کا توڑ کرو۔ اس کو وہاں جانا کرو اس کو جھوٹا ثابت کر مگر ایسا کرنے کے لیے تمہیں اس کے ساتھ ایک کورٹ روم میں کھڑا ہونا ہوگا۔ اور پھر جب خود کو دنیا کی نظروں میں بری کروالو.... اور چونکہ تم بے گناہ ہو تو کروالی لوگے۔ تب مجھے پر پوز کرنا۔ میں اپنا فیصلہ تک کے لیے محفوظ رکھتی ہوں۔“ اور پھر وہ انھی کھڑی ہوئی۔

”you want me, earn me!“  
”اپنا بیگ دبوچنے والے انداز میں انھیا اور اسے دل گرفقی سے خود کو دیکھتے چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی۔ دروازہ بند کر کے وہ تیزی سے حیمید کی میز پر آئی، پانی کی بوتل انھی اور غنا غث پانی پیتی گئی۔ حیمید بے اختیار کام سے سراخا کر اسے دیکھنے لگی۔ آبی نے بے ترتیب سانسوں کے درمیان بوتل واپس رکھی اور آستین سے ترپیشانی پوچھتی آگے بڑھ گئی۔ اندر بیٹھے ہاشم کا سارا مودود خراب ہو چکا تھا۔ وہ تائی ڈھیلی کیے سوچتی نظروں سے خالی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

(آج)

”یور آز ہوایوں کہ...“ زمر کی آواز دور کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاشم نے ذہن سے تمام خیالات کو جھٹک کر نگاہیں انھیں اور خود کو واپس کرنا۔ عدالت میں لے آیا۔ وہ جج کے چھوڑتے کے سامنے کھڑی تھی، یہاں سے اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ گھنگریاں لٹ کاں کو چھوڑ رہی تھی اور بھوری آنکھیں جج کے چہرے پر جی تھیں۔

سب خاموشی اور محبویت سے اسے کن رہے تھے۔

”ہوایوں کہ ایکس مئی کی شام جب ایک خوش باش، زندگی سے بھر پور سعدی یوسف گھر واپس آتا ہے، اور اپنے سارے خاندان کو ڈز پر مد عکرتا ہے، اس وقت بھی اس کو خاندان کے اس ایک فرد کا بھی خیال ہوتا ہے جو وہاں نہیں جائے گا۔“ اکثر سارہ جو خود کو خاندانی جھمیلوں سے دور رکھتی ہیں، اس وقت وہ ان کو وہاں بلا تھا ہے، ان کو اپنے خاندان اور زندگی کی طرف لوٹ کر آنے کے لئے منانے، ان کو ان کے اصل دشمنوں کی خرد ہے، کیونکہ اب اس کے پاس ثبوت بھی تھے۔ مگر وہاں.... اس تاریک گلی میں اس کا پیچھا کرنے، اس کو دھمکانے، اور زبانی تیخ کلامی کا بدله گولی سے لینے کے لئے ملزم نو شیر والا کاردار آتا ہے، اور وہ اس وقت تک وہاں سے نہیں جاتا جب تک وہ سعدی کے جسم میں تین گولیاں پیوست کر کے، اس کو مار پیٹ کر نیم مردہ حالت میں نہیں پہنچا چکا ہوتا۔ یور آز.... پولیس اور گواہوں کو خرید کر میرے زخمی مولک کوہ پستال سے غائب کروادیتے کے بعد اسے آٹھ ماہ اور ایک دن تک جس بے جا میں رکھنے کا ذمہ دار نو شیر والا کاردار ہی ہے۔ ہاشم کاردار اس کا ایک معاون تھا، مگر اصل مجرم نو شیر والا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے حکم پر اور اس کی ایما پر ہوا۔ امیر لڑکوں کا یہی مسئلہ ہے۔ اگر ان کے نام کے آگے کا نجوب جتوئی، کاردار یا تالیپور لگتا ہے تو ان کو کسی دوسرے نوجوان سے حد نکالنے کے لیے اس کو مارنے کا بہانہ جاتا ہے۔ میرے لیے سب کی ذات برابر اور قابل احترام ہے لیکن ہمارے یہ ریکیں اپنی حرکتوں سے اپنی ذات کو خود بدنام کرتے ہیں یور آز۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا جب ان کا احتساب کیا جائے؟“

ہاشم نے پیلے کا فنڈ پر ایک سطر مزید کھینچی۔

”صرف شیر دیکیوں؟ ہاشم کاردار کیوں نہیں؟“ لکھ کر پرسوچ نظروں سے اس نے پہلی قطار میں پرے بیٹھے سعدی کو دیکھا۔ اور پھر زمر کو۔ زمر نے اس کی نگاہوں کی حدت محسوس کر لی تھی یا کیا، اس نے پلٹ کر ہاشم کو دیکھا۔ ہاشم نے رخ موزیا مگر زمر ادھر ہی دیکھتی رہی۔ یونہی۔ بے مقصد۔ پھر یا کیک نظروں کے سامنے سے عدالتی کمرے کی کریں اور وہ تماشا نیوں جیسے لوگ غائب ہوتے گئے۔ ہوانے اس کے ذہن کو پیچھے کھینچا، اور وہ اس رو میں بہتی چلی گئی۔.....

(دو ماہ پہلے)

مورچاں کے اندر وہی سو گوارا ماحول تھا۔ زمر نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے رک کر کچن میں دیکھا۔ وہاں خین اور سعدی آمنے

سامنے کھڑے چیخ والے وار قیح کی بات کر رہے تھے۔

”ہمارے سب ثبوت ختم ہوتے جا رہے ہیں۔“ وہ پریشانی سے کہہ رہا تھا۔ خین ناخن مسلسل دانت سے کترتی اسے دیکھ رہی تھی۔

”وہ دیدیلو تو ہے ناجاپ نے ہاشم کے آفس میں بنائی تھی۔ اس میں ہاشم نے اعتراف جرم کیا تھا۔“

”ہم اسے عدالت میں استعمال نہیں کر سکتے۔“ زمر نے چوکھ پر کر کہا تو دونوں ہڈر کراسے دیکھنے لگے۔ ”قانونی پیچیدگیاں ایک طرف، اس ویڈیو میں ہاشم نے یہ بھی کہا ہے کہ کس طرح اس نے حمد کے ایگرام کے دوران اس کی مدد کی۔ لاء کالج کے اس سینٹر وکیل صاحب کی کال بھی ہے اس میں۔ ہم وہ ویڈیو نجح کو نہیں دکھا سکتے۔“

خین کا چہرہ بچھ گیا۔ مگر سعدی تیزی سے بولا۔ ”اگر ہم اسے ایئٹ کر دیں تو!“

”تو وہ اور بچلن نہیں رہے گی، اور عدالت میں قابل قبول نہیں ہو گی۔“

”یہ اچھا حساب ہے!“ وہ بے زار سا ہو گیا۔ حمد بھی تک ناخن کتر رہی تھی۔ زمر چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ اسٹرڈی نیبل پتیھی اور فون پر ایک کال ملانے لگی۔

”احمر۔ فارس کہاں ہے؟“ چھوٹتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

”آخری اطلاعات تک میں اس کی بیوی نہیں تھا۔ سو مجھے کیسے پتہ ہو گا؟“ زمر کے بیوی پر سو گوار مسکراہٹ بکھری۔ عرصے تک خود کو چھپا چھپا کر اور لوگوں کو اپنے دائرے سے باہر نکا کر رکھنے کی عادت ڈال لینے والا احرارِ حم توں بعد پبلے جیسا لگا تھا۔

”خیر۔ کیا یہ سب حق ہے؟“

”کیا؟“ دھنکات سا بولا۔

”جو میں سن رہی ہوں۔“

احمر نے گہری سانس لی۔ ”غازی کا میتھیج آیا تھا مجھے۔ کہہ رہا تھا میں اسے جانے دوں۔ مگر مجھے یاد ہے، آپ نے اس کے اپنے ریسٹورانٹ میں آنے کے بارے میں پولیس روپورٹ میں کہا تھا کہ جب غازی نے اسے جانے دیا تو بھی اس نے آپ پر گولی چلانی چاہی۔ کیا ایسے شخص کو چھوڑ دینا چاہیے؟“ ایک دم سنجیدہ اور گہر اس احرار... کچھ اچھا نہیں لگا۔ زمر نے گہری سانس لی۔

”میں تو اس نک نیک کی بات کر رہی جو آپ نے میرا کھا ہوا تھا۔ کیا یہ حق ہے؟“

احمر گویا کری سے اچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا ہو۔ ”کون سا نک نیک؟ میں دیکھیں بہت مہذب انسان ہوں۔ یہ آپ کا شوہر ہے انہائی دن بھر آدمی۔ اس کی عادت ہے اپنے کیسے ہوئے کام و درودوں کے سرڑا لئے کی۔ مجھے اس معاملے سے دور رکھیں۔“

”اصل میں آپ دونوں ہی بہت مہذب ہیں۔ لیس مجھے سمجھنیں آتا کہ زیادہ مہذب کون ہے۔ اور زیادہ شریف کون۔ بہر حال، جلد سے جلد خود کو کاردار زکی قید سے نکال لیجئے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ آپ کی حقیقت جانیں، آپ کو یہاں سے بہت دور پہلے جانا چاہیے۔“ یہ آخری بات تھی جو اس نے کال پر احرar سے کہی تھی۔

(آج)

حج صاحبِ ہنکھارے تو زمر نے چوک کر انہیں دیکھا، پھر سر جھٹک کر آگے آئی۔

”یور آئز،“ ہمارے پاس گواہ ہیں جو حلف لے کر گواہی دیں گے کہ کس طرح سعدی یوسف کو کلمبو کے ایک ہوٹل کے زیر زمین تھے خانے میں رکھا گیا۔ اس کو وہاں مختلف طریقوں سے ٹارچ کیا گیا۔ ہم اس کو وہاں مقید دیکھنے والے ایک ایک شخص کو عدالت میں پیش کریں گے اور ان کے بیانات سے یہ پسند لگانا مشکل نہیں ہو گا کہ یہڑا کا حق بول رہا ہے۔ اور یہ ایک بہت کٹھن جگ لڑ کر آیا ہے۔“

حاضرین میں بیٹھے فارس نے بور سے ہو کر گردن کو دا کیں کندھے کی طرف جھکایا، پھر با میں کندھے کی طرف۔ گویا پھلوں کو آرام پا۔ پھر ایک سرسری سی زگاہ اردو گرد سادھے بیٹھے حاضرین پڑا۔ ذہن کے نہاں خانوں میں ایک منظر انداز کرو پر آنے لگا تو اس نے اسے پھولیا... گویا پیالے میں رکھی کوئی یاد ہو جئے چھونے سے انسان وقت میں پیچھے چلا جائے....

(دوما پہلے)

لوگ روم کی کھڑکی پہاڑوں کی گردن تک اترے اجلے اجلے بادل صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کھڑکی کے نیچے رکھے صوفے پر بیٹھا نو عمر لڑکا بھجن سے سامنے بیٹھے فارس کو دیکھ رہا تھا۔

”دیکھی کہانی سنانا چاہتے ہیں آپ؟ اور آپ کو کیسے علم ہوا کہ ہم یہاں ہیں۔“

فارس اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ ناگ پٹا نگ جمائے بھوری لیدر جیکٹ اور سیاہ جیز پہنے وہ خندی مگرزم نگاہوں سے اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر گردن موڑی۔ زگاہ وہیں چیز پر مفلوج پڑے خاور تک جا ٹھہری۔

”تمہیں جنیں نے ای میل کی ہو گئی یقیناً۔ اور یہ کہا ہو گا کہ تمہارا باپ ایک قاتل ہے۔“

”مجھے یقین نہیں ہے۔“ وہ کمزور سے سخت لبجھ میں نفی میں سر پلا کر بولا تھا۔

فارس نے کافی دیر تک جواب نہیں دیا، بلکہ وہ سر نظر وہ سے خاور کی دائیں جانب ڈھکی گردن دیکھتا رہا۔ آسیجن ماسک سے وہ اپنے دیہرے سانس لے رہا تھا، چہرے پر موچھیں داڑھی سب شیو کیا جا ڈکھا اور اب اگنے والے نئے نئے بال زیادہ تر سفید تھے۔ البتہ ڈھنیں وہ بدقت بالیں طرف کو گھوم گھوم کر فارس کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں وہ سارے جذبات اور تاثرات اب بھی تھے جو اس ”جادث“ سے قبل ان میں ہوتے تھے۔ ان میں زندگی تھی۔ اور انتقام کی خواہش۔

”تم سوچتے ہو گے خاور کا تنا عرصہ ان کے ساتھ کام کرنے کے باوجود تم کیوں نہ جان سکے کہ تمہارے بیٹوں کو بھی انہوں نے ہی مر دیا تھا۔“ لڑکا چونکہ کراس دیکھنے لگا مگر فارس اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

”انہوں نے تمہارا اعتراض جرم بھی ریکارڈ کیا، تمہیں اپنا بھی لیا، تم سے کام بھی کروائے، مگر تمہیں اصلاحیت نہیں معلوم ہونے دی۔“ اس کیا ہے کہ ہر علم والے پا ایک علم والا ہوتا ہے۔ جس mercenary سے انہوں نے یہ کام کروایا ہو گا یقیناً اس نے سارے ثبوت اور شواہد فارخ بر گیڈیہ تیر ٹکش کی طرف موڑ دیا ہو گا۔ یقیناً وہ تم سے زیادہ ذہین ہو گا۔ نہ ہوت بھی جب انسان کی ذات انوالوڑ ہو جائے کسی حادثے میں تو غم اور غصہ اس کی سمجھداری کو دھندا کر دیتا ہے۔ ہر شخص کا ایک بلا سند سپاٹ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ذہین مار کر ہاجاتے ہیں۔ کیا زمر کیا ہاشم اور کیا میں۔ اگر ہم سارے ذہین لوگ گھر کے بھیدیوں کے ڈھانتے لئا توں کا شکار نہ ہوں تو ہم تو خدا بن ٹھیں۔ اور فرعون نے بھی تو نہ ای کا دعویٰ کیا تھا مگر اپنے گھر میں پلتے بچے کے بارے میں درست اندازہ نہ لگا سکا۔ ایسے ہی تو نہیں وہ خود کو خدا سمجھتا تھا۔ ٹیبلنڈ، ذہین، سحر ائمیز، بہت کچھ ہو گا وہ مگر مار کہاں کھائی؟، خاور مرا جمی اندماز میں، غصے سے غاں غوں کی آوازیں نکال رہا تھا مگر ماسک کے باعث وہ گھٹ جاتی تھیں۔ لڑکا اس کی کرسی کے عین پیچھے جا کھڑا ہوا اور فکرمندی سے اس کا کبل درست کرنے لگا۔

”میں تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ مجھے تمہاری حالت دیکھ کر افسوس نہیں ہوا۔ میں اپنے ساتھ وہ تمام ثبوت بھی لا یا ہوں جن کو ایکر کر تمہاری اپنی اولاد تھی اور تمہاری ماں تمہاری اصلاحیت جان لیں گے اور میں جانتا ہوں وہ تم سے تباہی محبت کریں گے لیکن وہ تمہاری عزت نہیں کریں گے۔ تم بھی تو جانو خاور کے بغیر عزت کے محبت کیسی ہوتی ہے۔ بغیر عزت کے وفا کیسی ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مرا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔ ایک طویل اور تکلیف دہ زندگی گزارو۔ تمہیں ہر پل یاد دلایا جائے کہ یہ لوگ کون تھے۔“ اس نے فول لڑکوں کا ار اندر سے بڑے بڑے فتو ٹکال کر سامنے میز پر ڈالے۔ خاور کی آنکھوں کی جوت بچکی تھی اور ان میں نفی سی تیر رہی تھی۔ ”یہ زرتاش ہے یہ“

وارث ہے اور یہ سعدی۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تمہارا بینا بھی ان کی کہانی مجھ سے سنے۔ کیا تم سنو گے؟" اس نے نگاہیں اٹھا کر اس لڑکے کو دیکھا۔ وہ بالکل محوج ہو کر، مگر استوز منذ بذب سا اسے دیکھ رہا تھا، اس سوال پر معمول کی طرح براہادیا۔ جس وقت وہ واپس گھر پہنچا، زمر اپنے کمرے میں اسٹرڈی نیبل کے آگے یونی کھڑی تھی۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو وہ نہیں مڑی۔ جانتی تھی وہ آچکا ہے بلکہ کافی دیر کا آچکا ہے اور اس تازہ نقشبندی کی واردات کا کھونج لگاتا پھر زہرا ہے۔ باہر گارڈ زکوڈا نئنے غصہ کرنے کی آوازیں سب نے سنی تھیں۔ اور جب کوئی سراہاتھ نہ آیا تو اب وہ اندر آیا تھا۔ وہ ریک میں رکھی کتابوں پر خواہ مخواہ انگلی پھیرتی رہی۔ گھنگریاں لٹ گال کو چھوٹی گردن پر گر رہی تھی اور آنکھیں سو گوار لگتی تھیں۔ ناک کسی بھی زیور سے خالی تھی۔

"تم نے کچھ دیکھا؟ کسی سرخ مفلروات ایور والے آدمی کو؟" چاپی اور والٹ میز پر ڈالتے ہوئے اس نے ٹھہر کر زمر کو دیکھا۔ "نبیں۔ تم کہاں تھے سارا دن؟" وہ اس کی طرف گھومی۔ نظریں ملیں۔

"میں.... یونہی.... آگے پیچھے۔" وہ چہرہ جھکا کر رست واقع اتنا رنے لگا۔

"کیا ہم نے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ اب ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپا میں گے؟" فارس کا گھڑی اتنا تباہ کر رکا۔ چونکہ کرنظریں اٹھائیں۔ غور سے اسے دیکھا۔ ناک کو خالی دیکھ کر چونکا مگر پوچھنا نہیں۔

"میں خاور کو ملنے لگا تھا۔ اس کے بیٹے کو اس کے بارے میں سب کچھ بتانے۔"

"احمر سے بات ہوئی تمہاری؟"

"سرسری ای ہوئی تھی بیکست پہ۔ نہیں سکا۔ اس سے بھی حساب کتاب کرنا ہے ابھی۔"

"تم جانتے تھے اس کی اصلیت؟" وہ سوال درسوال کر رہی تھی۔

"نہیں، زمر بی بی، مجھے دلوں کا حال نہیں معلوم ہوتا۔ حنین نے ہی بتایا تھا۔ خیر... تم نے کیا کیا؟" اب وہ پھر سے اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔

زمر پھیکا سامسکرائی۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ شرت کی آستینیں موڑتا لپٹ گیا۔

"میں نے تمہیں گروہی رکھ دیا۔"

فارس واپس گھوما۔ "مجھے کیا رکھ دیا؟"

"میں ہارون عبید سے ملنے لگی تھی۔" فارس کے تاثرات تیزی سے بد لے۔ ماتھے پہ بمل در آئے۔ کچھ کہنے کو لب کھولے تو.... "نبیں، پہلے میری بات سنو۔" وہ آگے بڑھی اور اس نے نزدی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے۔ "میں سعدی کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتی تھی، تمہیں بھی نہیں کھو سکتی تھی، میں کذنی پیش کرتا ہوں، میں بھی اپنی فیلی نہیں بنا سکوں گی، میرے ساتھ بھی ظلم ہوا ہے اور مجھے اپنے لئے بھی انصاف چاہیے۔ ہارون عبید نے مجھے کہا تھا کہ میں فارس یا سعدی میں سے ایک کو چنوں۔ مگر میں نے خود کو چننا۔ میری جتنی بھی زندگی رہ گئی ہے اس میں ایک واحد امید کی کرن انصاف ہے۔ مجھے یہڑاں چاہیے۔ اور تم مجھے نہیں دے سکتے تھے۔ تم اٹھتے بیٹھتے کہہ رہے تھے کہ ٹرائل کبھی نہیں ہو گا۔ اس مسئلے کا حل تمہارے پاس بھی نہیں تھا۔ ہارون صاحب کے پاس تھا۔"

"ٹرائل واقعی نہیں ہو گا زمر! وہ برہمی سے بولا تھا۔ ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے۔"

"ہارون اسے مناسکتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح مگر وہ اس کو ٹرائل تک لے جاسکتے ہیں۔ اگلی جنگ ہمارے ہاتھ میں ہے۔

ہم لڑ لیں گے جان لگا دیں گے مگر وہ میدان میں تو آئے نا۔"

"اور بد لے میں کیا مانگا ہارون صاحب نے؟" وہ اسی درشتی سے بولا تھا۔ اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ زمر کی بے چین نگاہیں اس

کے چہرے پہ بھٹک رہی تھیں۔  
”تمہیں مانگا تھا۔“

”اور میں تو جیسے کوئی کھلوانا ہوں۔ ہے نا!“

”میں نے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں چھوڑ دوں گی اگر وہ ہاشم کو برائی تک لے آئے۔ وہ صرف تمہیں اپنی بیٹی کے لئے چاہتے ہیں۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی کر لیں گے۔“

”تم مجھے چھوڑ دوگی؟“ اس کی آواز آخر میں.... بس آخر میں کا نبی تھی خوف سے غصے سے۔

”جو میرا سے فارس، وہ میرا رہے گا۔ موت کے علاوہ کچھ بھی ہمیں الگ نہیں کر سکتا۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ تم میری بات کو.... اس گیم کو غلط نہیں لو گے تو میں بھی یہ ڈیل نہ کرتی۔ کیا بگاڑیں گے وہ میرا اگر میں انکار کر دیتی ہوں؟“

”اچھا۔“ وہ اس کے ہاتھ تھامے اسی سنجیدگی سے میز کے کنارے میجاہ۔ ”توبعد میں تم اپنی بات سے کیسے مکروہ گی؟“

”یہ سوچنا اور اس معاطلے کو سنبھالنا تمہارا کام ہے۔ تم میری حفاظت کرو گے، تم میرا دفاع کرو گے اور جس دل میں میں نے خود کو ڈال دیا ہے، تم مجھے اس سے نکالو گے۔ ایک تمہاری وجہ سے ہی مجھے بے فکری تھی۔“ اس نے گردن کڑا کر بہت اعتناد سے کھا تھا۔ فارس کی پیشانی کے بل غائب ہونے لگے۔ ایسے کہ وہ بھی تھے ہی نہیں۔ پھر اس نے گہری سانس لی۔

”تم یہ سب کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ بھی سکتی تھیں!“

”میں نے کہا،“ میں نے خود کو چنا ہے۔ ”وہ اب متلاشی نظر دوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔“ ”تم خفا ہو؟“

”نہیں،“ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک تمہیں یہ یقین نہیں دلا سکا کہ میں تمہیں کسی کام سے نہیں روکوں گا۔ آئی ایم سوری۔ اگر میں نے تمہیں یہ محسوس کروایا ہے کہ تم مجھے اعتناد میں لوگوں تو میں تمہاری مرضی کے کام سے منع کر دوں گا۔“

”اب اگر غصہ کرو گے تو کیسے آئے گا مجھے یہ اعتناد؟“ وہ تیزی سے بولی تھی۔ دل البتہ دھڑک رہا تھا۔ وہ خفا تو لگ رہا تھا۔

”غصہ کیوں کروں گا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ دو خوبصورت عورتیں میرے لئے لڑ رہی ہیں۔“ اور وہ غصے میں ہی لگ رہا تھا۔ زمر کے اب دنگی سے کٹھے ہوئے۔ ہاتھوں سے ہاتھ نکال لئے۔

”ایک خوبصورت عورت!“ ٹنپیسہ کی۔

”ہاں ایک خوبصورت عورت، ایک چڑیل سے میرے اوپر لڑ رہی ہے۔ حد ہے۔“ سر جھٹک کرو ڈھکھڑا ہوا۔ اس کو برالگا تھا اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ کچھ سخت نہ کہہ دے۔ زمر کہنا کچھ اور چاہتی تھی مگر منہ سے کچھ اور لکا۔

”انہوں نے صہانت کے طور پر میری لوگ رکھ لی۔ جو تم نے دی تھی۔“ وہ جو آگے جا رہا تھا، تیوارا کر گھوما۔ چہرے پہ بے یقینی ابھری۔ آنکھیں پھیلیں۔

”واٹ؟“ وہ غرایا تھا۔ زمر دو قدم پیچھے ہوئی۔ چہرے پہ زمانوں کی سادگی طاری کر لی۔

”اس روز پولیس اسٹیشن میں وہ میرے پرس میں تھی، میں بار بار اس کی ڈبی کو نکال کر کھول کر بند کرتی تھی۔ کورٹ میں صہانت کی سماعت کے دوران بھی وہ میرے پرس میں تھی اور میرا ہاتھ پرس کے اندر باہر رہی رہا تھا۔ میں اتنے دن سے اسے پہننا چاہ رہی تھی۔ ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ پھر جب میں ان کے آفس گئی تو انہوں نے مجھے کہا کہ وہ جانتے ہیں اس لوگ کا قصہ۔“

”اس کو کیسے پتا؟“ وہ پھر غرایا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”جب میں نے تم سے لوگ کے پیچھے جھگڑا کیا تھا تو صداقت وہیں تھا۔ ملازموں کی عادت ہوتی ہے۔ ادھر کی ادھر کرتے ہیں۔“

اس نے کاردارز کے کسی ملازم کو کہا ہوگا اور اس نے آگے۔ ہارون عبید ہمارے خاندان پر عرصے سے نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کو پتہ ہوگا ظاہر ہے۔ جب میں وہاں گئی تو انہوں نے مجھ سے وہ مانگ لی۔ ”وہ یادیت سے بتاری تھی۔

”اے کیسے پتہ چلا کہ وہ تمہارے بیگ میں ہے۔“

”سیکوئرٹی چیک پاؤ نکت پر میرا پرس اسکین ہوا تھا، ایک جگہ پرس کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ انتخ دیکھ کر ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ وہی لوگ ہے۔ شاید وہ صرف میرے اوپر اپنی دھاک بھانا چاہ رہے تھے۔“

”اور تم نے وہ ان کو دے دی؟“

”پھر اور کیا کرتی؟ مجھے ان کو یقین دلانا تھا کہ میں تج بول رہی ہوں۔“

”زمر... زمر...“ وہ ہاتھاٹھا کر بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، پھر ہاتھ گرا دیے۔ پہلے سر جھٹکا۔ پھر دامیں سے با میں چکر کائے گا۔

”اب تم یوں کرو، مجھ سے خفا ہو جاؤ۔ تاکہ تم آپس میں ہی لڑتے رہیں اور باہر کے لوگوں سے لڑنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ ہم یوں ہی خود ہی لڑتے لڑتے ختم ہو جائیں۔“

”تمہارے نزدیک اس تخفے کی کوئی اہمیت نہیں تھی؟“ وہ گھوم کر اس کے سامنے کھڑا ہوا اور برہمی سے اسے دیکھا۔

”وہ ایک پتھر تھا فارس، ایک پتھر کو کہا میں ایک انسان کو نہیں کھو سکتی، مجھے یقین تھا۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔ وہ لا جواب ہوا تھا۔ پھر چند لمحے تک گھرے سانس لے کر خود کو بدقت نارمل کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ وہ ایک پتھر تھا۔ لیکن اگر تمہیں کوئی کام تھا تو تم میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟“

”تم نہیں کر سکتے تھے۔“ وہ اسی میز کے کونے پر بیٹھ گئی جہاں چند لمحے قبل وہ بیٹھا تھا۔

”تمہیں کیسے پتہ کر میں یہ کر سکتا تھا یا نہیں؟ اور ہارون صاحب کیسے کریں گے یہ معلوم ہے تمہیں؟“

”وہ ہاشم کے دوست ہیں، کسی بھی طرح اسے راضی کر لیں گے اور.....“

”وہ اپنی بیٹی کو اس کے پاس بھیجن گے تاکہ وہ اس سے جھوٹے وعدے کرے اور ہاشم کو راضی کرے۔“

زمر چونک کر کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں ڈھیروں استغبار در آیا۔

”بے کار باتیں مت کر دو فارس۔ کوئی اپنی بیٹی کو یوں استعمال نہیں کر سکتا۔“

”زمر ہر امیر آدمی جو اہرات کی طرح نہیں ہوتا جو اولاد پر جان چھڑ کے۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ اسے نہ اپنی بیٹی سے کوئی خاص لگاہ ہے۔ سده اس کا خیال رکھتا ہے۔ محبت ضرور ہو گی کیونکہ وہ فطری چیز ہے لیکن وہ یہ سب آبدار کی خوشی کے لئے نہیں کر رہا۔“

”وہ یہ سب آبدار کے لئے ہی کر رہے ہیں۔“ وہ بے یقین تھی۔

”غلط....“ فارس نفی میں سر ہلار ہاتھا۔ ”وہ صرف کاردارز کی بربادی چاہتا ہے۔ دونوں کاروبار میں شرائکت دار ہیں، ایک ڈوبے گا تو اس کی ساری دولت، شیرز، تعلقات، سب دوسرا حاصل کر لے گا۔ وہ دل سے چاہتا ہے کہ ہاشم مقدمے میں الجھے۔۔۔ اس کے لئے وہ تمہیں اور آبدار دونوں کو استعمال کر رہا ہے۔ آبدار ہاشم کو راضی کرے گی، اور تم اپنی کشتیاں جلا کر اس مقدمے کے لئے اپنی جان لگا دو گی۔ سب سے زیادہ فائدہ اسی کو ہو گا۔“ وہ کتنی ہی دیرشل بیٹھی رہی، پھر چوکی۔

”اوہ آبدار کا کیا ہو گا؟“ زندگی میں پہلی دفعہ نیام لیتے ہوئے اس کی آواز میں پریشانی جھکی تھی۔

”ہارون صاحب کو اس کی اتنی پرواہ ہوتی تو اس کو اس جنگ میں کیوں دھکیلتے؟ کس کو کاں کر رہی ہو؟“ وہ جو تجھی سے کہہ رہا تھا، رک کر بولا۔ زمر نے بغیر فون پنبہ ملا کر اسے کان سے لگا چکی تھی۔ فارس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہاب بھیخے اسے دیکھے گیا۔

”پوئیں گھٹے کے اندر اندر آپ کی کال موصول ہوئی ہے، کیا ارادہ بدل گیا ہے آپ کا زمر صاحب؟“ ہارون عبید کا نرم اور نپا تلا جہہ کانوں سے ٹکرایا تھا۔

”محضے اپنا ہیرا دا اپ چا ہیے، میں اس ڈیل کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔“  
”کیوں؟“

”محضے ڈر ہے فارس کو نہ پہنچل جائے۔ میں بہت خوفزدہ ہوں۔ پلیز مجھے بلک میل مت کریں اور اسے واپس کر دیں۔“ وہ منت کر رہی تھی۔ فارس نے گھوڑ کا سے دیکھا۔

”اب بہت دری ہو چکی ہے مسز زمر۔“

”دیر کیسے ہوئی ہے؟ اب تک ہاشم سے بات تو نہیں ہوئی ہوگی آپ کی۔“

”میری بیٹی آپ کی وجہ سے اس سے بات کرنے لگی تھی، اور اب جبکہ اس نے اتنا برا خطرہ مول لے لیا ہے تو آپ پیچھے نہیں ہٹ سکتیں۔“

”آپ اپنی ہی بیٹی کو کیسے... کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟“ وہ غصے بھری بے بسی سے بوی تھی۔ فارس اب سامنے صوفے کے کنارے جا بیٹھا تھا۔ ہارون اور بھی کچھ کہہ رہے تھے مگر زمر نے ”آپ بیمار ہیں، سناؤ آپ نے؟ آپ.... بیمار ہیں!“ کہہ کر موبائل پرے ڈال دیا۔ وہ ایک دم ڈسٹریب نظر آنے لگی تھی۔

”اچھا پریشان مت ہو۔ آبدار کے ساتھ جو کیا ہے اس کے باپ نے کیا ہے۔“ وہ اب کے ذرا نمی سے بولا۔ زمر نے پھرہ اٹھا کر مغموم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”تحمیں مجھ پر بہت غصہ آ رہا ہوگا، ہے نا؟“

”ساری عمر آتا رہا ہے، کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ لیکن خیر... تم مجھے بتاؤ۔ تم کیا چاہتی ہو؟“

”تم سے نہیں ہو گا تو کیوں....“

”زمر... تم بتاؤ... تم کیا چاہتی ہو؟“ اس نے زور دے کر کہا۔ زمر چند لمحے اس کا چھروہ دیکھتی رہی۔

”میں چاہتی ہوں کہ ہاشم عدالت میں پیش ہو۔ وہ پوری ایمانداری سے یہ راکل لڑے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہرگواہ عدالت میں پیش ہوا رج بولے۔ سعدی نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے ساتھ اس رات ڈاکٹر سارہ تھیں، مگر ڈاکٹر سارہ کتنے دن سے میرا فون نہیں اخہار ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ گواہی دے دیں۔“ غربات میں تیزیز بولتے اس کو سانس چڑھ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا ہے۔ تبھی دروازہ بجا۔ فارس اسی خاموشی سے اٹھا اور دروازہ کھولا۔ سامنے سعدی کھڑا تھا، ہاتھ میں چند کاغذ تھے۔ اس نے فارس کے کندھے کے پیچھے سے اندر جھانکا۔ ”زمر... یہ وہ ڈاکونٹس ہیں جو میں نے آپ کو دکھانے تھے۔“ الجھا ہوا سا آگے بڑھنے لگا پھر رک کر پوچھا۔ ”اندر آ جاؤ۔“

”ہاں، تم اندر آ جاؤ، میری خیر ہے۔“ آخری الفاظ زیر لب بڑا کروہ خفاسا بہر نکل گیا۔ کچن کے دروازے پر شین اسی طرح کھڑی ناخن کھڑ رہی تھی۔ وہ ساتھ سے گزرنے لگا تو وہ بوی تھی۔

”سعدی بھائی اور زمر کی نیم کتنی بورنگ لگتی ہے نا؟“ وہ آن سی کر کے آگے بڑھ گیا۔.....

(آن)

فارس غازی کو گھرے خیال سے.... گھری نیند بھرے سفر سے کوئٹہ روپرٹر کی بورڈ پر چلتی الگیوں کی ٹھک نٹھک نے جگایا تھا۔ وہ

گھری سانس لے کر زمر کی طرف دیکھنے لگا جس کی آواز کمرہ عدالت کی گھنی خاموشی کو چیر رہی تھی۔

”نوشیر وال کاردار نے قید کے ان آٹھ ماہ میں اپنے بھائی کے ساتھ مل کر یور آزرنہ صرف سعدی یوسف کو مجبوں رکھا بلکہ اس کو مختلف نوعیت کے ڈنی اور جسمانی ثار چڑکا بھی نہ شانہ بنایا۔ اس سے اس کے پر اجیکٹ کے اہم راز دباؤ اور تشدد کے ذریعے اگلوانے کی بھی کوشش کی، اس کو اس کے خاندان کو نقصان پہنچانے کا ڈراوا بھی دیا۔ 22 جنوری کی رات جب سعدی یوسف اپنی ذہانت اور بہادری کے بل پر اس قید سے نکلا تو نوшیر وال کاردار اور ہاشم کاردار نے اس کی تصویر کے پوسٹر ز بنوائے اور سارے کو لمبو میں پھیلادیے۔ ایک خونی manhunt کا آغاز کیا جس کا اختتام تباہ ہوا جب سعدی یوسف نے ملک واپس پہنچ کر اپنی ویڈیو ریلیز کی۔“

ہاشم سر جھکائے پیڈ پر لکھ رہا تھا۔ ”غیر قانونی سفر“ اور خاور کی تفصیلات گول۔“

”ان طویل اوپنگ آر گومنٹ کے بعد میری عدالت سے استدعا ہے کہ نوшیر وال کاردار قتل، اقدام قتل، اغو، جنس بے جا میں رکھنا، تشداد اور غیر قانونی انسانی اسکنڈنگ کے جرم میں قرار واقعی سزا دی جائے۔ پراسکیو شن نوшیر وال کاردار کی چنانی کا مطالہ کرتی ہے۔“

ہاشم کے ساتھ بیٹھنے نوшیر وال نے زخمی آنکھیں اٹھا کر زمر کو دیکھا، اور پھر تپ کر اپنے بھائی کو دیکھا جو محیت سے نوٹ پیڈ پر لکھتا جا رہا تھا۔

”وہشت گردی کی دفعات غالب۔ ہاشم کاردار کی نامزدگی غائب۔ کمزور استغاشہ۔“ تبصرہ لکھ کر اس نے پیڈ رکھ دیا اور پھر اسی توجہ سے زمر کو دیکھنے لگا۔ وہ اب اپنے دلائل کا اختتام کر رہی تھی۔ کمرہ عدالت کی کھڑکیوں سے چھن کر آتی دھوپ میں موسم گرما کے اوائل کی سی تمازت محسوس ہوتی تھی۔ اگر تم کھڑکیوں کو دیکھتے جاؤ تو ان پر پڑی گردکی تباہ سر کئے لھوؤں اوت بیت جانے والی شاموں کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر کسی روز بارش کی یوندوں نے اسے دھوڈا اور پھر نئے سرے سے گرد پڑنے لگی۔ واپس کمرہ عدالت کی جانب رخ پھیرو تو پراسکیو شن کی میز کے پیچے زمر ناگ پٹانگ جمائے بیٹھی تھی۔ آج اس کے بال اوپنی پونی میں بند ہے تھے اور گھنگریاں لیں نکل کر کوٹ کی پشت پر جھوٹ رہی تھیں۔ وہ قلمابوں میں دبائے نظریں سامنے کھڑے ہاشم پر جمائے ہوئے تھی۔ ساتھ بیٹھا سعدی آدمی آتیں والی سیاہ شرٹ میں ملبوس تھا۔ وہ پہلے سے بہتر نظر آ رہا تھا۔ گردن اٹھی ہوئی تھی اور بھوری آنکھوں میں امید تھی۔ پیچھے... ساری کرسیوں سے پیچھے آخری قطار میں فارس نیک لگائے بیٹھا تھا اور مسلسل منہ میں کچھ چبار رہا تھا۔

دفاع کی میز پر نوшیر وال ڈیزائن سروٹ نائی میں ملبوس پھر لیے تاثرات کے ساتھ برآ جمان تھا۔ پچھلی نشست پر جواہرات اور احر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ جواہرات مسلسل اپنے لاکٹ کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے پر سوچ نظریں چھوڑتے کے سامنے کھڑے ہاشم پر نگاہیں جمائے ہوئے تھیں۔ ہاشم کی اس جانب پشت تھی مگر آواز صاف سنائی دیتی تھی۔

”یور آزز مسز زمر کے ابتدائی دلائل اچھے لگے مجھے۔ جذباتی اور شاعرانہ۔ ان سے ہمیں یہ تاثر ملا کہ ایک معصوم شہزادہ.... بلکہ شہزادی ظالم دیوکی قید میں پھنس گئی تھی اور اب چونکہ شاہزادی واپس آگئی ہے تو لازم ہے کہ ظالم دیو کو چوک میں لٹکا کر پھانسی دی جائے۔ اور اس ظالم دیو کا جرم کیا ہے یور آزز؟ صرف یہی کہ وہ امیر ہے۔“

جواہرات یا قوت اور ہیرے جڑے لاکٹ کو مسلسل انگلی پر لپیٹ کھوں رہی تھی۔ شیرنی کی آنکھوں میں گہرے سایے لہرا رہے تھے۔ بادلوں چیزے سایے جن میں یادوں کے بہت سے قطرے لدے تھے۔ یکا یک وہ قطرے اندر ہی اندر ٹکنے لگے اور اس جھملاتے پانی کے پرے پر عکس سے ابھرنے لگے.....  
(دو ماہ پہلے)

قصر کاردار کے لاکنچ میں اوپنی کھڑکیوں کے اوپر اٹھے رومن بلاسٹر کے باعث تیز روشنی اندر آ رہی تھی۔ جواہرات پرل واٹ کمپیض میں ملبوس بالوں کا نیس جوڑا بنائے کان میں ایئرنگ پہنچتی ہوئی کمرے سے باہر نکل رہی تھی، ایسے کہ کہنی پر پرس شنگا تھا، اور کان کو پکڑے

ہاتھ میں فون تھا، جب وہ ٹھنک کر رکی۔

لا و نج میں.... سامنے... مجھلیوں کے ایکو یہم کے سامنے آبدار کھڑی تھی۔ جھک کر وہ ہولے ہو لے ششے کی دیوار پر دستک دیتی۔ مجھلیاں سرعت سے دائیں بائیں تیر رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ جواہرات اس کو مخاطب کرتی، میرھیوں پر آہت ہوئی۔ آبدار سیدھی ہوئی اور اوپر دیکھا۔ سر پر سرخ لیٹی رومال باندھے، اس کی بزرگ آنکھوں میں گہرا کا جل ڈلاتھا۔ یقیناً اوپر سے ہاشم اترتا ہوا آ رہا تھا۔ جواہرات نے کھڑکی کے شیشے میں اس کا عکس دیکھا اور اور لئے قدموں مڑگئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ چوکھت تک لے گئی مگر بند نہیں کیا۔ ذرا سی درز سے وہ سب کچھ دیکھا اور سن سکتی تھی۔

آبدار نے مسکرا کر اسے اترنے دیکھا یہاں تک کہ وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”تم نے مجھے بلوایا تھا۔ کہو خیریت تھی؟“ وہ جبرا مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، میں تمہاری باتوں پر سوچتا رہا تھا۔ بیٹھو۔“ وہ اشارہ کرتا، کوٹ کا بنن کھوتا بڑے صوفے کے کنارے پہ جا بیٹھا۔ آبدار پر لے کنارے پہن گئی۔

”پھر.... کیا سوچا تم نے؟“ گود میں مٹھیاں رکھ کر باہم ملائے وہ ان کی کپکاہٹ چھپانا چاہ رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ بے چین نظریں ہاشم کے چہرے پر جھی تھیں جو سوچ میں ڈوباتھا۔ پھر اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ آبی سے نظریں میں۔

”تمہاری ساری باتیں درست تھیں۔ جب تک اس کیس کا معاملہ حل نہیں ہو جاتا، تم اس خاندان میں آکر کبھی خوش نہیں رہوگی۔“

آبدار کے لب حقیقی مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے۔ تنه اعصاب ڈھیلے پڑے۔

”یعنی کتنے میری باتوں کو سنجیدہ لیا؟“

”ہاں اور تم اپنی گلہ درست ہو۔ ہم شادی نہیں کر سکتے، جب تک کہ میں اس سارے میں سے نہ نکل آؤں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں

دیکھ کر کھڑا رہا تھا۔

آبدار نے طمانیت بھری گہری سانس لی۔ آنکھوں میں فاتحانہ چمک درآئی۔

”تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم اس کیس کو بڑو گے اور خود کو اور اپنے خاندان کو بے گناہ ثابت کرو گے!“ اس کے دل میں ڈھیروں

اطمینان در آیا تھا۔

”نہیں ریڈ۔“ وہ قطیعیت سے بولا تھا۔ ”نکوئی ٹرائل ہوگا،“ نہ میں اپنادفاع کروں گا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے ہم شادی کے معاملے کو کچھ وقت کے لئے ملتوی کر دیتے ہیں۔ تب تک تم مزید سوچ لو۔ اور اگر تم میرے خاندان اور اس کے تمام مسائل کے ساتھ سمجھوتہ کر لو تو ہم شادی کر لیں گے۔“ اس کا لبھا اطمینان سے پڑھا۔

آبدار کی مسکراہٹ اڑ چھو ہوئی۔ دل گویا چیل کر حلق میں آگیا۔ چند لمحے وہ شل سی بیٹھی رہی، پھر ایک دم اٹھی۔ پرس دبوچ کر اٹھایا۔

”اگر تمہارے اندر اتنی بہت ہی نہیں ہے کہ پیک رائے کو بدلو تو ٹھیک ہے۔ میری طرف سے اس شادی سے انکار ہے۔ ناب۔ ن۔“

بھی پھر.... ہمارے راستے جدا ہیں۔ درشتی سے کہتی وہ باہر کی طرف بڑھی۔ ہاشم اسی اطمینان سے آنکھیں اٹھا کر اسے بغور دیکھتا رہا۔

”شاید یہ صرف ایک بہانہ تھا۔ شاید تمہیں شادی سے انکار کی کوئی اور وجہ مل نہیں رہی تھی۔ یا شاید تمہارے بابائے تمہیں ایسا کرنے کو

کہا تھا؟

ہماری بر بادی پر سب سے زیادہ خوش وہی ہوں گے..... ہے نا۔“ وہ اب زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

”جو چاہو سمجھو،“ وہ نکنی سے کہتی باہر نکل گئی۔

وہ اپنی کار کے قریب پہنچی اسی تھی... تاکہ جو ساتھیوں کے ساتھ تھے اور یہ بھی کی جالت میں جس.....

"ہم نے خود ہی انکار کر دیا۔" ووچوکٹ کرمزی۔ جواہرات سامنے سے چلتی آرہی تھی کہ اس کی پشت پر تیز سورج تھا۔ کرنیں اس کے اطراف سے نکل کر آپ کی آنکھوں میں بڑی تھیں یوں کہ جواہرات سفید لباس کے باوجود دکھانی کی نہیں وسے رہی تھی۔ آپ کی آنکھیں ڈھنڈ گئیں۔

"اب کیا بھے وہ دنیہ یوں مل سکتی ہے؟"

"جس دن آپ کا پینا مکمل طور پر بیری جان چھوڑ دے گا اس دن ہاں۔" وہ چبا چبا کر بولتی دروازہ کھول کر اندر بیٹھی۔ کرنیں ہے،  
اس کے امداد سے حیوں کی طرح اس جانب پہنچ رہی تھیں۔ روشنی تیز روشنی... اور جب وہ بھی.....  
(۶۳)

جو اہرات کا ردار نے خود کو عدالت کے کمرے میں بیٹھنے لایا۔ اپنے عام تھوڑم سے خود کو تکال کر کہہ مر جھلک سامنے کھڑے ہاں مار کیجئے گی۔ کمرے میں غامبوٹی تھی اور سب توچ سے اس کو سن رہے تھے۔

"بس خالم دیکا جرم صرف اتنا ہے بچا آنکھ کو اسی ہے۔ سر زم رے ان چند دنوں میں تقریباً تین سو فنا استعمال کیا ہے۔ درست تعداد کو رٹ دیورز کو معلوم ہوگی۔" پھر پورے رکوہ دیانت کرتے ہووا۔ "یہاں درست تعداد لکھو دیجئے گا۔" اور پورے رٹے بنا آڑ لئے ہے سب کیا۔

”بیشم کاردار درست تعداد کوادت و چورکو معلوم بودی - یعنی درست تعداد آنکه دست چینی گذاشتی“

"بُور آفریز کہانی تھی تھیں ہے۔" وہ گوٹ کا بھن بندگرتے ہوئے چھوڑتے کے سامنے چاکڑا ہوا تھا۔ "یہ کہانی یہ مٹلیں یہ غرب کا رہا۔" یہ گر سے سے کھینچا جا رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ بہت جھیلوں پہ بہت سے "امیر" درخواں نے مخصوص شہزادوں کو کچلا بھی بے گمراہی کا رہا۔ بہت سی غرب اور میزوں ہوتے اپنے مقادار کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ اس سارے مظاہر کے میں بور آفریز ہے جوکل کا صرف ایک ہی قسم ہے۔ اور وہ یہ گردہ ایک رجسٹر فانڈان میں پیدا ہوا۔ مزوز مرگی وغیرہ بٹا عربی کے بر عکس احمدی یونیورسٹی اتنا انسان دوست ہے اُنہی اکا مضمون اور سادہ۔ وہ بنا شہر ایک ٹھنڈی تو جوان ہے۔ مگر وہ ambitious بھی ہے۔ چھوڑتے کے سامنے ٹلتے ہوئے وہ اپنے چیر کے کارخانے استغاثی کر سکوں۔ پہنچنے سعدی کی طرف کیے گئے رہا تھا۔ ذرا ہی اطمینان سے ایک قائل پہ پوائنٹس لکھ رہی تھی۔ جنکے سعدی کی پرچم نظریں اٹھ کر چھرے یہ یوں تھیں گویا اندر تک اتر جائیں گی۔ کسی اپنی کی طرح۔

بچے بیٹا فارس ملٹسین لگتا تھا۔ البتہ اس کے ساتھ موجود ہیں بار بار پہلو بدال رہی تھی۔ اس کی نظر وہ میں دیکھ رہاں رہتے تھے اور وہ بار بار منیاں تھکنی تھی۔ پھر وہ فارس کی طرف بھی۔ ”ای ای طرح یہ مرے بھائی کا کردار احمد والٹ میں سمجھ کر دے گا۔ کوئی اس کو روکنا کیوں نہیں سے۔“

"اہ جو کرہا ہے قانونی خور پر یہ اس کا حق ہے۔ حالات میں بولنے والے تمام لوگوں میں سے صرف ایک شخص حق بولنے کا صفت نہیں لیتا اور وہ وکیل ہوتا ہے۔"

"اور دیکھ کوئی جھوٹ بولنے کا لائسنس ملا ہوتا ہے۔ واؤ۔" دھنٹ کیسہ خاطر تھی۔

"زمر کے اپنے ابتدائی دلائل میں کتابیع حقاً کتنا جھوٹ! ہم دولوں واقف ہیں۔ عدالتیں میں لجی ہوتا ہے۔ ایک حق کو ثابت کرنے کے لئے ہر جھوٹ پولئے بنتے ہیں۔ تم ان پیروقوں کو صدالت میں ایک درمیں سے بدلائے ہو۔" اس نے زمیں سے دو گاہات ختم کیے۔

"سعدی یونس ایک انجانی ہے جن مگر ایک بہت ambitious لڑکا تھا یور آئر۔ استقامت کی الف لیڈی

۱۰۔ فیصلہ نتیجہ ملک کے بھرپوری کی طرح میرزا جو کوئی غلط کاروبار کرنے میں مدد نہیں رکھتا۔

اُس نے اُمیں کھول کر بیکھر دیتے تھے اُنہوں نے تھے۔ مکمل ٹینج ڈال دیا۔  
صاحب اپنے پانچ سو روپے کے جواہر تھے۔ وہ اپنے جواہر کے جواہر کو جو کہ کوئی دکار نہیں  
سماں گزے۔ اس کو جواہر کی کامیابی میں ملے گے۔ اس کو جواہر کی کامیابی کو جواہر کی کامیابی سے  
کامیابی کو جواہر کی کامیابی سے ملے گا۔ اس کو جواہر کی کامیابی کے کامیابی کو جواہر کی کامیابی سے  
کامیابی کی کامیابی سے ملے گا۔

”سولی بھت لے انجوں دا کارڈ سے جاندے ہی کے بھی میں جاتی کرئے جاؤں سے فدا اخانتے کی بھروسہ کاٹلی۔  
انجوں داں دا کے ایک دلے کی جریٰ تھا۔ ایک دلے پر جو زادہ جو دلے جائے جائے اسکے لئے اپنے دلے کی جو زندگی دیکھی جائے۔ لازمی جوں کی کوئی بھی  
بھولی گئی، اس دلے جو اسیں بھریں ساختے دیجوں کی تھیں۔ وہ خاصیتی سے کی رہاتی، ایک آنکھیں اکٹھاں کے کام کرنے کے لئے بھی  
ہے۔ ۲۔ ایک آنکھیں کھال کرنے والے کی کچھ کام ہے کہ وہ سبھ ہے وہ اگلی کارون کا خون نیک کاروبار طے کرے۔ جس کا نام اسی  
تصاویر پر کھانا فربہ کا حق سے طلب کا کام ہے مگر کبھی اپنی سبھی جو دل کی عین کوئی عین کوں ملکیں جاؤں کی وجہ سے اپنے دلے کا  
آئندہ۔

رسٹ پہ ہوتا تھا۔ یہ دولت اس کے لئے ایک قید سے کم نہیں مگر سعدی یوسف کو وہ صرف سونے کے انڈے دینے والی مرغی لگتا تھا۔ اس کا شاندار گھر جہاں سعدی اکثر آتا تھا، جہاں کھانے پینے کی مکمل آزادی تھی، ان کی دولت کو مضبوط کرنے کی وجہ تھا، مگر ایسا زیادہ دیر نہ چل سکا یور آز۔ سعدی یوسف کی طبی اور مادیت پرست باتوں نے دھیرے دھیرے نو شیر والا کو اس سے برگشتہ کرنا شروع کیا۔“

”میرا دل چاہتا ہے اس آدمی کے چہرے پر تیزاب پھیک دوں۔“ حنہ نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی تو اس کی آواز غصے کا بپ رہی تھی۔

فارس نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اس کے کندھے تھکے۔

”اسے بولنے دو جو۔ وہ زیادہ اچھا کیل ہے بلکہ وہ ساحر ہے۔ اسے اپنے جادو کے بولوں سے ہمارے ہر حق کو مات دینے دو۔ جب وہ تھک جائے گا تو ہم اسے دیں گے۔ شہہ مات۔ Checkmate!“ ایک عزم کو دھرایا تو حنہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اس کے باوجود نو شیر والا نے اس سے دولت نہیں چھوڑی۔ اسے اپنے گھر آنے دیا۔ اسے اپنی دولت کو لوٹنے دیا۔ مگر یہ کافی نہیں تھا۔ سعدی یوسف کے لئے یہ کافی نہیں تھا یور آز۔ وہ صرف مادی چیزوں پر خوش نہیں ہوتا تھا۔ وہ پاپلر ہونے اور ہر دعیز یز بننے کا طالب بھی تھا۔ ہمیں یہاں پہ سعدی یوسف جیسے لڑکوں کی سائیکل سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اسے یونیورسل فیورٹ بننا اچھا لگتا تھا ہر کوئی اس کی باتوں کی تعریف کرے، ہر کوئی دلپیسی سے اسے نہ۔ جب نو شیر والا کے رویے میں اس نے سردہری محسوس کی تو اس کی یقینیتی جس بار بار بھڑکنے لگی۔ خاکسار کے ساتھ غلط بیانی کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، سواس نے مز جواہرات کا رد کو اپنی بیٹھی باتوں کے دام میں لیا۔ (سعدی نے مز کر جواہرات کو دیکھا اور بلوں کو بنا آواز نکالے گھمایا) (واو)۔ جواہرات نے کوشش کی کہ وہ بالکل بھی اس وقت سعدی کو نہ دیکھے۔) ہر ماں کی طرح وہ بھی بیٹھے کے لئے ان سیکور رہتی تھیں، اس نے ماں کو بیٹھے کی شکایت لکانی شروع کی، وہ نشہ کرتا ہے وہ غلط لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے تاکہ مز جواہرات نو شیر والا کو مجبور کریں کہ وہ صحیح لا کے لیعنی کہ ”ہمارے سعدی“ کے ساتھ اٹھا بیٹھا کرے۔ نو شیر والا یور آز ذہانت کا لڑکا ضرور تھا، مگر کھا مرنیں تھا۔ اس نے سعدی کے ان جھوٹوں اور غلط بیانیوں پر خود کو اس سے دور کرنا شروع کر دیا۔ سعدی کے مسلسل جواہرات کا رد کو بھڑکانے پر دنوں میں تین کلامی بھی ہوئی اور یوں اس دوستی کا اختتام ہو گیا۔

ساحر اپنے مسحور کن انداز میں بول رہا تھا اور سب توجہ سے اسے سن رہے تھے۔ تھی دروازہ کھلا اور بنا چاپ کے دھیرے سے آبدار اندر دخل ہوئی، پھر اسی طرح خاموشی سے فارس اور حنین کے ساتھ آئی۔ یوں کہ حنین دنوں کے درمیان میں تھی۔ چہرہ موڑ کر اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر فارس کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو گازی!“

فارس نے اس سر کو ابانت میں خم دیا۔ چہرہ تک نہیں مورا۔ درمیان میں بیٹھی حنین ایک دم خود میں عجیب سامحوں کرنے لگی۔

دلائل دیتے ہوئے ہاشم نے رخ حاضرین کی طرف پھیرا تو بس لمحے کے ہزاروں حصے کے لئے وہ چونکا۔ آبدار پر نظریں جارکی۔ مگر پھر اس نے بات جاری رکھی۔ گو کہ اس کی نگاہ پار بار اس طرف اٹھتی تھی۔ آبی سنجیدہ چہرہ لئے بیٹھی رہی۔ شناسائی، قرابت داری، رسمی مسکراہٹ، اس کی آنکھیں ہر احساس سے عاری تھیں۔ (حنین نے نظریں جھکالیں۔ وہ آبدار کے لئے ہی مگر بار بار ادھرد کیتا تو تھا، اور اس کا دیکھنا دل کو دکھی کر دیتا تھا۔ محبت رہے یا نہیں یاد دیں تو آخری سانس تک رہتی ہیں۔)

اس کے دلی جذبات سے بے خبر آبدار سنجیدہ چہرہ لئے بیٹھی تھی۔ البتہ اس کی خوبصورت پیشانی پر دوبل پڑے ہوئے تھے۔ ان دو بلوں کی تہہ میں جاؤ تو پرت در پرت داستانیں رقم تھیں۔ لیکن وہ پر تیس عیاں ہوتی گئیں، اور شہری پیشانی، شہری روشنی میں بدلتی گئی۔..... (دو ماہ پہلے)

ہارون عبید کے آفس کا ریڈور میں تیز شہری بتیاں روشن تھیں۔ آبدار ماتھے پر سلوٹیں لئے، تیز تیز چلتی آ رہی تھی۔ آفس کا دروازہ زور

سے کھولا۔ ہارون سیٹ پر برا جہاں، سامنے بیٹھی دخواتین سے موجفتگو تھے۔ آبدار سرخ چہرے کے ساتھ اندر آئی، ہاتھ جھلا کر گویا تخلیہ کا اشارہ کیا۔ ہارون نے شدید ناپندیدگی سے اسے دیکھا، پھر دخواتین سے معدرت کرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ آخری دفعہ تھا بابا۔ آئندہ میں آپ کے ہاتھوں کبھی استعمال نہیں ہوں گی۔“ وہ دونوں تنہارہ گئے تو وہ کرسی کھینچ کر بیٹھی تھی سے بولی تھی۔ ہارون کے ابر ذہنچ گئے۔

”مسئلہ کیا ہے؟ یہ میرے اہم مہماں تھے۔ تم نے.....“

”ہاشم نہیں مانا۔ وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ کیس نہیں لڑے گا۔“

چند لمحے کے لئے ہارون کچھ بول نہ سکے۔

”سنا آپ نے بابا.... ہاشم کو نہیں منا سکی میں۔ کوئی ٹرائل نہیں ہو گا۔“

”مگر.....“ وہ لا جواب ہو گئے تھے۔ ”تم نے اس کو سمجھانا تھا کہ تم اس کے پر پوزل پر غور کرو گی، اور.....“

”بابا.... میں کیا ہوں آپ کے لئے؟ ہاں؟ میں کیا صرف آپ کے دشمنوں کو نجاد کھانے کا ایک تھیار ہوں؟ اوزار؟ میری ماں کے ساتھ بھی کیا آپ نے۔ مجھے بھی انہی کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔“ اس کی آنکھوں کے کورے بھیگ گئے تھے۔

”بیٹے، میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں یہ سب تمہارے لئے ہی کر رہا ہوں۔“ انہوں نے پیٹر ابل کرزی سے کہنا چاہا مگر وہ نفی میں سر بلاتی رہی۔

”مجھے اب یقین نہیں آتا۔ گیس والٹ بابا، اب اگر ٹرائل ہوا بھی تو میں بھی اس میں جاؤں گی اور آپ سب کے خلاف گواہی دوں گی۔ عدالت مجھے بھی سمن کرے گی۔ میں حق بولوں گی۔ سب کچھ بتا دوں گی۔ آپ لوگ اسی قابل ہیں۔ یہ سب ٹرائل کے لئے کر رہے تھے نا آپ تو میں.....“

”میں تمہارے لئے کر رہا تھا بچے۔ تم چاہتی تھی کہ اس کی بیوی اسے چھوڑ دے۔ اس نے اسے چھوڑ بھی دیا۔ تم نے میرا کام نہیں کیا، مگر میں نے تمہارا کام کر دیا ہے۔“ وہ اس کو خندنا کرتے ہوئے کہہ رہے تھے، ساتھ میں جھک کر دراز بھی کھول رہے تھے۔ آپ کے آنسو پلکوں پر ہی ٹھہر گئے۔ آنکھوں میں بے لیقی در آئی۔

”بابا،“ اس کا سانس رک گیا۔ ”کیا کیا ہے آپ نے؟ میں نے منع کیا تھا آپ کو؟ آپ ان لوگوں کو کوئی نقصان نہیں دیں گے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔“

”اس نے اپنی مرضی سے یہ مجھے دی ہے، میں نے اسے مجبور نہیں کیا تھا۔“ سادگی سے کہتے ہوئے انہوں نے ایک ڈبی اس کے سامنے رکھی۔ آبدار نے تیر سے انہیں دیکھا۔ ”میں نے آپ کو اس کے بارے میں اس لیے تو نہیں بتایا تھا کہ آپ.....“

”یہاب تمہاری ہے۔ جیسے بھی اسے استعمال کرو۔“

(آج)

کوئی کاغذ سا اس کے ہاتھ سے نکلا یا تو وہ گہرے خیال سے چوکی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کمرہ عدالت میں بیٹھی تھی، اور ساتھ بیٹھی تھیں اس کی طرف ایک کاغذ بڑھائے ہوئے تھی۔ آبدار کی نظریں فارس کی طرف اٹھیں۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ نہیں اپنی گود میں دیکھ رہی تھی۔ آپ نے کاغذ تھاما۔ اس پر تحریر تھا۔

”آپ کا دل بیمار ہے، میں جانتی ہوں۔ میں اس سب سے گزر چکی ہوں۔ میرے پاس ایک ایسی کتاب ہے جس میں اس مرض کی دوہی۔ اگر آپ نے اپنا علاج نہیں کیا تو بہت نقصان اٹھا میں گی۔“

ساتھ میں قلم بھی تھا۔ آبدار کے چہرے پتھر مسکراہٹ کھڑی۔ اس نے سرعت سے قلم تھاما اور لکھا۔ ”نہ میں بیمار ہوں نہ مجھے اسی علاج کی ضرورت ہے۔ جس کیفیت کا میں شکار ہوں، وہ دنیا کا سب سے خوبصورت جذبہ ہے۔ میں کیوں نکلوں سے اس سے؟ میں اسی میں خوش ہوں۔“

جنین نے جب کاغذ و اپس تھام تو وہ تحریر پڑھ کر اس کا دل دور اندر ڈوب گیا۔

اس نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ ہر بیمار علاج کا سن کر شفایا ب ہونے دوڑا چلا آئے گا۔ عشق تو وہ مرض ہے جس کے مریض کو یہ معاشرہ، اس کا میدیا، اس کا لٹر پر میٹھی نیند سلا کر بر سوں تھکنے رہتے ہیں کیونکہ جو چیزیں رواج میں آ جائیں ان کا غلط ہونا ذہنوں سے نکل جاتا ہے۔ اس نے کیسے سوچ لیا کہ ہر مریض عشق اپنی بیماری سے واقع بھی ہوتا ہے؟ کیا اسے بھول گیا تھا کہ ایسے مریضوں کے پاس ہر وقت خود کو دینے کے لئے ڈھیروں میں گھڑت دلیلیں اور بہانے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تو انکی خود کو جشنی کرنے میں ہی صرف کردیتے ہیں، اور زندگی میں پیچھے، جاتے ہیں۔ قیس ہو یا راجح، یہ سب مجنوں بھی تھے اور فارغ بھی۔

”یور آزر.... سعدی یوسف سے دھیرے دھیرے دھیرے میرے میرے مولک کا خاندان بر گشته ہوتا گیا۔“ ساحر کے جادوئی بول جاری تھے۔ وہ ان کی طرف پشت کر کے کھڑا، جج کی آنکھوں میں دیکھ کر بول رہا تھا۔ ”قریباً ڈیڑھ سال تک سعدی یوسف کے گھر ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نو شیر والا سے میرے باپ اور ماں کو بدھن کرنے کے لئے ایک رات یہ اچانک سے ہمارے گھر آیا اور اس نے کہا کہ نو شیر والا دو دن سے رابطے میں نہیں ہے، یقیناً وہ انگوہ ہو چکا ہے۔ نو شیر والا ساڑھہ کوریا میں تھا اور دو دن تک کسی سے کوئی رابطہ اس نے نہیں رکھا تھا تو اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سعدی یوسف نے میرے باپ سے کہا، بلکہ ان کو ایک فیس بک متینج بھی دکھایا جس میں لکھا تھا کہ شیر و انگوہ ہو چکا ہے اور تاداں کی رقم اس کا وہ نمبر تک پہنچا دیں۔ تب سعدی یوسف ماشاء اللہ تعالیٰ تھات اور شاطر نہیں ہوا تھا۔ اس کی بات ہے، وقتی طور پر یقین کرنے کے باوجود میں نے جانچ پڑتاں کر دیا تو معلوم ہوا یور آزر کہ شیر و کو سعدی نے یہ پرینک کھلنے کو کہا تھا۔ رقم کا تو ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ جب نو شیر والا کو علم ہوا تو وہ فوراً ملک واپس آگیا۔ اس کو سامنے دیکھ کر شرمندگی سے بچنے کے لئے سعدی نے الزام لگایا کہ یقیناً وہ خود روپیش ہو کر خود ہی اپنے آپ کو انگوہ کرنے کا ذرا رامہ کر کے باپ سے رقم ہونا چاہتا ہے۔ ہم نے اس کا یقین نہیں کیا، اور اس کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اکاؤنٹ نمبر بھی اسی کا تھا، اور یہی نہیں یور آزر موقع ہا فائدہ اٹھا کر اس رات جب میں لا دُخ میں بیٹھا تھا تو یہ میرے کمرے میں گیا، میرا لا کر کھولا اور اندر سے ایک خطیر رقم نکال لی۔ میرے لارکا کو، میری ڈیٹھ آف بر تھے، اس کے لئے گیس کرنا آسان تھا۔ اس واقعے کے بعد میرا درد اس سے بہت برا ہوا۔ اور میں نے اس سے ترک تعلق کر لیا۔ جب کاردار ز سے کچھ نہ ملا تو یہ میری سابقہ یوپی شہرین کا دار کے پاس گیا، اور اسے مختلف حیلوں بہانوں سے بلیک میل کرتا رہا اور رقم بثورتا رہا۔“

”کیا میں تالیاں بجاوں؟“ زمر پیچھے سے اونچا سا بڑا ای تھی۔ نج صاحب نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھنک کر رہی۔ احمد سر جھکائے گردن کھجانے لگا اور سعدی.... وہ بس ہاشم کو دیکھتا رہا۔ اب اسے گویا ہاشم پا فسوس ہو رہا تھا۔

”اس کے پاس اپنے دفاع کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، سو وہ مدی کا کردار تماشخ کر دے گا کہ اگر نو شیر والا پر جرم ثابت ہو بھی جائے تو جو کو گئے سعدی جیسے لڑکے کو مار کر اس نے اچھا ہی کیا تھا۔ قتل کے کیس سے نکلے کا یہ سب سے اچھا طریقہ ہوتا ہے۔ مقتول یا خٹھی کا کردار مسخ کر دو۔“ زمر نے اس کا ہاتھ دبا کر سرگوشی کی پھر سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں سنجیدگی تھی اور ناک کی لوگ چمک رہی تھی۔ مسلسل با ٹینک انگوٹھے سے تیری انگلی میں پہنی بڑے سے تگنیے کی خوبصورت انگوٹھی اوپر نیچے کر رہی تھی۔ اس میں جڑا انگینہ دور سے نیلا ہیرا الٹا تھا۔ اس کی روشنی مدھم، مگر شفاف تھی۔ ایسی شفاف کہ گویا سیاہ رات میں چمکتے تارے ہوں، جوٹوٹ کر جڑے ہوں، اور ان کی دودھیار ووشی زندگی زندگی

کی ساری سچائیوں کو منعکس کرتی جائے.....

(دوماہ پہلے)

اس صبح فوذی آیور آفرٹر کی بالائی منزل کی دیوار گیر کھڑکیوں سے بھی تیز روشنیاں اندر آ رہی تھیں۔ زمراد اسی سے بیٹھی، گھنگریاں ایک انگلی پہ لپیٹتی، شیشوں کے پار سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ فائلر سامنے بکھری پڑی تھیں، اور وہ ان سے لائق گئی تھی۔ یکا یک وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ نیچے پارکنگ میں اس نے کار سے اسے نکلتے دیکھا تھا۔ سرخ رومال والی لڑکی کو۔ زمرتیزی سے فائلر اٹھا کر نیچے لپکی۔

جس وقت آبی نے ریسٹورانٹ کا دروازہ کھولا، زمر پکن کے دروازے کے قریب کری پہنچی محیت سے کتاب سے نوٹس بنانے میں مگن نظر آتی تھی۔ آبدار کی نظر میں اس کی ناک میں پہنچ سونے کی نتھ پاٹھ گئیں۔ ایک ہلکی سی مسکان اس کے لبوں پر ابھری۔ پھر وہ زمر کو نظر انداز کیے کاونٹر نک آئی۔ وہاں گاہوں کی طرف پشت کیے سعدی کھڑا جسٹر کھول کر پچھہ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی پرانی زندگی میں دوبارہ پرانے کام کرنے کے باوجود دب پرانے سعدی جیسا نہیں لگتا تھا۔

”کہو پھر تم ڈالو گے یا ہم ڈالیں؟“ وہ مسکرا کر بولی تو سعدی نے چونک کر گردان موڑی۔ آبدار کو دیکھ کر وہ جیران ہوا۔

”تم؟ ادھر؟“ پھر آس پاس دیکھا۔ زمر کام میں منہک نظر آتی تھی۔ گاہک آگے پیچھے کر سیوں پر بینٹھے صروف تھے۔

”ویکم ہوم۔ اچھا لگا تمہیں دیکھ کر۔ سنا ہے کل تمہارا انٹر ویو آر رہا ہے۔ انٹر ویو میں تو کہو گئیں، مگر مجھے سامنے دیکھ کر شکریے کا ایک بول کہہ ہی سکتے ہو۔ آخر میں نہ ہوتی تو تم گھر کیسے آتے؟“ تفاخر سے مسکرا کر وہ بولی تھی۔

”بہت شکریہ۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر واپس گھوم گیا۔ آبی کے ابر و خفگی سے بھپخ۔

”سعدی یوسف خان میرا ادھار ہے تم پر۔“

وہ پھر اچنپھے سے واپس مڑا۔ ”کیا؟“

”تمہارا انٹر ویو لینا تھا میں نے۔ اپنا کام تو نکلو لیا تم نے، میرے کام کا کیا ہو گا؟“ اس نے یاد دلایا۔

”میرے پاس بتانے کو کوئی کہانی نہیں ہے۔“ مگر آبدار نے پرس سے کارڈ نکال کر اس کی شرٹ کی فرنٹ پاکٹ میں ڈالا۔

”میں اپنے کلینک میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہاری نیند کی حالت کی مسافت کا قصہ سننا ہے میں نے۔“ اداسی سے مسکرا کر وہ جنید کی طرف گھومی۔ ”فارس کہاں ہیں؟“ سعدی سر جھنک کر واپس کام کرنے لگا۔ جنید نے کچن کا بتایا تو وہ وہیں چلی گئی۔ زمر کی کرسی کے ساتھ سے گزری۔ نہ نظر ملائی نہ رخ پھیرا۔ بس اندر چل گئی۔

زمر کے لکھتے ہوئے ہاتھ سست پڑ گئے۔ چہرے پر بے بی در آئی۔ کوفت اور غصہ۔ اس نے زور سے قلم بند کیا۔ اور ایک عزم سے اٹھی۔ کچن سے ورکر زباہر آ رہے تھے۔ فارس نے شاید ان کو نکالا تھا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی، وہ دونوں دوسری جانب تھے۔ درمیان میں اوچے ریکس تھے۔ وہیں رک گئی۔ اندر ہیریک کی اوٹ میں۔

”جی آبدار کہیے۔ آپ کیوں ملنا چاہتی تھیں؟“ وہ دونوں برنز کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ بار بی کیوں کا دھوان اور اشہما اگیز خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔ فارس گرمی کے باعث پوری آستینیوں کو موڑے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سادگی سے پر تھا۔ نکوئی کوفت نہ شکوہ۔ وہ جیسے اسے سننا چاہتا تھا۔ زمر کا دل برا ہوا۔ (مجھے نہیں بتایا کہ اس کو ملنے کے لئے بلا رہا ہے۔ ہونہے)۔

”بابا نے ایک کام کہا تھا مجھے۔“ وہ سینے پر بازو لپیٹی مسکرا کر رسان سے بولی تھی۔ ”کہ ہاشم کو مناؤں، وہ کیس کے لئے راضی ہو جائے۔“

”کس کیس کے لئے؟“ وہ اچنپھے سے بولا۔ زمر کا دل زور سے دھڑ کنے لگا۔ اس پر بھروسہ تھا مگر پھر بھی۔ وہ سب بتا چکی تھی

”سعدی یوسف بنام نو شیر وال کار درا۔ واث ایور! اور میں نے اپنے آپ کو بہت خطرے میں ڈال کر ہاشم سے کہا کہ میں اس سے شادی کر لوں گی اگر وہ خود کو بے گناہ ثابت کر دے عدالت میں اور اس گند سے ہمیشہ کے لئے نکل آئے۔ آپ کے لئے... آپ کے خاندان کے لئے میں نے یور سک مول لیا۔“

”ابھی تو آپ نے کہا کہ آپ اپنے بابا کے کہنے پر یہ کر رہی تھیں۔“ وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔ آپ لمحہ بھر کو چپ ہوئی۔

”انہوں نے کہا تھا، مگر کیا تو میں نے آپ کے لئے۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے تو نہیں کہا تھا۔ آپ نہ کرتیں۔ خیر تھی۔“ فارس نے شانے اچکائے۔ ”میں تو دیے ہی عدالت دغیرہ کے چکر کے خلاف ہوں۔ یونہی آپ نے اپنا وقت ضائع کیا۔“

آبدار پھر سے لا جواب ہوئی۔ ”بہر حال وہ نہیں مانا۔“

زمر نے چونک کرس اٹھایا اور ریکس کے پاؤ درکھڑے ان دونوں کو دیکھا۔ اس کے دل میں بے پناہ ما یوی اتر آئی۔ یعنی ہاشم نہیں مانا؟ وہ اس کیس کو لڑکا تا جائے گا؟

”اچھی بات ہے۔ ملک و قوم کا بہت سا پیسہ نہیں گیا۔ یہی بتانے آئی تھیں آپ؟“ فارس غازی پر توجیہ کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ آبدار نے گہری سانس لی۔

”فارس.... یہ بات زمر نے کہی تھی بابا سے۔“

وہ چونکا۔ ”کیا بات؟“

آبدار کی رکی سانس بحال ہوئی۔ ہمت بڑھی۔

”یہی کہ اگر میں راضی کر لوں ہاشم کو تو وہ آپ کو چھوڑ دیں گی۔ میرے لئے۔“

آخری دو الفاظ نے یکدم چھٹا کے سے جیسے بہت سا بھرم اور لحاظ توڑ دیا تھا۔ فارس غازی لا جواب ہو گیا۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب وہ اپنے منہ سے کچھ کہ رہی تھی۔ زمر نے بے اختیار ریک کو تھاما۔ بہت کچھ اپنی پہنچ سے نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”میرے بابا اور زمر کی ڈیل ہوئی تھی۔ آپ کے اوپ۔ اور زمر نے کچھ گروہی بھی رکھوایا تھا۔ مجھے دو روز پہلے پتہ چلا تو میں فورا یہ واپس لے آئی۔ بابا کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ پرس سے اس نے سیاہ مغلیں ڈینی نکالی اور فارس کی طرف بڑھائی۔ فارس سمجھی گی سے لب بھپنے اسے دیکھتا ہے۔ وہ اس رخ پر کھڑا تھا کہ زمر کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اس کی آنکھوں میں زخمی پن سادر آیا تھا۔ اور اس کی ان آنکھوں کو دیکھ کر زمر کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ تیزی سے وہاں جانا چاہتی تھی یہ ڈبی اس لڑکی کے ہاتھ سے چھیننا چاہتی تھی، مگر قدموں میں جان ہی نہ رہی تھی۔

”آپ یہ زمر کو واپس دے دیں۔ یہاں کی کی ہے۔ انہی کی رفتی چاہیے۔“

اس نے فارس کی آنکھوں میں تکتے ہوئے بنا پلک جھپکے ڈبی بڑھا کر کہا تھا۔ فارس نے آہستہ سے ڈبی اس کے ہاتھ سے اٹھائی۔ پھر کھوٹی۔ اندر رکھا ہیرا زمانوں کی داستانیں خود میں سموجے جنمگار ہاتھا۔ اس نے دو انگلیوں سے وہ ہیر انکال کر دیکھا۔ بدلتی روشنی میں وہ مزید خوبصورت لگنے لگا تھا۔

”آپ کو براتو لگا ہو گا۔ مجھے بھی لگا۔ معدمرت کے ساتھ مگر مسز زمر کو یوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ معصومیت سے افسوس کر رہی تھی۔

”اے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ دو انگلیوں میں لوگ کپڑے دھیما سا بولا تھا۔

”آئی ایم سوری۔ مجھے آپ کو دکھانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے شاید۔ یا شاید.....“ وہ اس کی آنکھوں پر نظریں

جماعے کہہ رہی تھی۔ ”شاید..... مسز زمر نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ آپ برا محسوس نہ کریں۔ ہر شخص میں قربانی دینے کا جذبہ نہیں ہوتا۔ وہ.... آپ کے لئے.... وہ سب کبھی نہیں کریں گی جو قربانی دینے والے کرتے ہیں۔“ اندھیرے ریک کے اوٹ میں کھڑی زمر نے بے اختیار کتبی ملی۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ”نہیں میرا دل نہیں دکھا۔“ اس نے گہری سانس لے کر آبدار کو دیکھا۔ آبی کی آنکھوں میں تحریم سث آیا۔ زمر نے بے اختیار ریک زور سے تھاما۔

”اس نے آپ کا تھفہ یوں کسی کو دے دیا، آپ کا دل نہیں دکھا۔“ ”یہ تو ایک چیز ہے۔ چیزوں کا کیا ہے؟ آتی جاتی رہتی ہیں۔“ وہ دو انگلیوں میں مسل کر اسے دیکھ رہا تھا۔ ”میں یا زمر چیزوں کے پیچھے نہیں بھاگتے۔“ یہ کہنے کے ساتھ وہ دامیں جانب گھوما، برزا کا بن گھما یا۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ تو اس نے ہیرے کی لوگ آگ میں ڈال دی۔ آبدار کا منہ مکمل گیا تھا۔

”یا آپ نے کیا کیا؟ یہ تو آپ کو بہت عزیز تھی۔ آپ نے خود مجھے بتایا تھا، جب ہم کو بوجار ہے تھے۔“ بے اختیار منہ سے پھسلا۔ ”یہ تو ایک پتھر ہے۔ اور مجھے یہ عزیز نہیں ہے۔ میں اسے پہلے بھی ایک دفعہ پھینک چکا ہوں۔ مجھے وہ عزیز ہے جس کو میں نے یہ دیا تھا۔“ وہ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا، الفاظ میں گویا کاٹتی تھی۔ آبدار کے گال سرخ ہوئے۔ آنکھوں میں بہمی ابھری۔ جیرت بھری بہمی۔

”بات چیز کی نہیں ہے۔ اس نے ”آپ“ کو تین دن تک گروہی رکھا ہے۔“ ”اس نے مجھے چار سال تک جیل میں بھی رکھا تھا۔ میں اس کو ہزار دفعہ معاف کر سکتا ہوں۔“ کچن میں کونلوں کے دکھنے کی بوڑو سے محسوس ہوئی تھی۔

”آبدار آپ کو اگر لگتا ہے کہ ایک پتھر کے پیچھے ہم ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو آپ ہم دونوں کو نہیں جانتیں۔ ہم نے آگ اور خون کا دریا ایک ساتھ پار کیا ہے۔ ہم اچھے اور بُرے وقت کے ساتھی ہیں۔ موت کے علاوہ میں کوئی چیز ایک دوسرے سے دو نہیں کر سکتی۔“ زمر سے مزید سنا نہیں گیا۔ شدتِ ضبط سے اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھوں سے آنسو ابل ابل جانے کو بے تاب تھے مگر وہ ان کو روکے ہوئے تھی۔

آبدار نے آنکھیں جھکا کر اپنی پٹی شدہ کلائی کو دیکھا، پھر شعلہ بارگا میں اس تک اٹھائیں۔ ”وہ تمہارے لئے.... یہ کبھی نہیں کرے گی۔“

طریق تھا طب بدلا جذبات بدلا۔ وہ کہہ کر رکی نہیں۔ تیری سے وہاں سے نکل آئی۔ دروازے تک پہنچ کر اس نے دیکھا۔ زمر وہاں کھڑی تھی۔ وہ بس سنجیدہ سی کھڑی تھی۔ آنکھیں ذرا بیکھی ہوئی تھیں۔ آبدار پیر پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ اب برزا کی طرف گھوم چکا تھا۔ بھڑکتے شعلے میں وہ جلتی لوگ کو دیکھ رہا تھا جس کے سونے کی تار پلچل پلچل رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ زمی سے اس کا بازو تھاما۔ وہ چونک کرمڑا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ فوراً دروازے کو دیکھا۔

”میں سمجھا تم اور ہو۔ تم کب آئیں۔“ برزا تیری سے بند کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔ وہ واقعی اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ ”جب تم اسے کہہ رہے ہے تھے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“ فارس نے گرم چوٹے ہے سے نھا ہیرا اٹھانا چاہا، مگر تیر تپش لگی تو جھکلے سے ہاتھ و اپس کھینچا اور انگلی ہونتوں سے لگائی۔ پھر چونک کر اسے دیکھا۔ ”ایک منٹ۔ میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔“

”تم نے کہا تھا۔ میں نے سنا ہے۔ میں نے صرف بھی سنا ہے۔“

”اپنے کانوں کا علاج کرواؤ۔ وہ خنگی سے بازو چھڑا کر اپ کپڑے سے لوگ چولہے سے اتار رہا تھا۔

”میں نے خود سنا ہے۔ تم بار بار بھی الفاظ دہرا رہے تھے۔ مجھے ہر لفظ ایسا ہی لگ رہا تھا۔“ آنسو اب کے اس کی آنکھوں کو بھلو نے لگے تھے۔ ”میں تمہیں ڈیز رونبیس کرتی۔ میں بہت برقی ہوں فارس۔“

”میرا بھی بھی خیال ہے۔ وہ ابھی تک خفا تھا۔ وہ رو تے رو تے نہ دی۔ پھر ہتھیلی کی پشت سے آنسو پوچھے۔

”اس کا کیا کرو گے اب؟“

”تم نے میرا خند پھیلک دیا، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کالک زدہ ہیرا کپڑے میں اٹھا کر ڈست بن میں اچھال دیا۔ وہ نم آنکھوں سے مسکراتی ہوئی اسے یہ کرتے ہوئے دیکھے گئی۔

”تم مجھ سے بھی خفختے ہی نہیں۔ موقع ملنے پر تم نے خود بھی اسے پھیلک دیا۔ تم نے اچھا کیا فارس۔ ہمارے گھر والے ہمارے ملازم، آبدار یہ سب لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ صرف میں اور تم جانتے ہیں کہ یہ ہمارے راستے کا وہ پھر تھا جو ہر خوبصورت لمحے کے آڑ میں ہمارے پاؤں میں آ کر چھپتا تھا۔ یہ ایک اچھا تھنہ نہیں تھا۔ اس میں دھوکہ تھا۔ دنیا سے چھپا کر کچھ کرنے کا غصہ تھا۔ یہ ہم دونوں کے لئے ڈھیروں شرمندگی کا باعث تھا۔ تم نے اچھا کیا جو اسے پھیلک دیا۔ میں نے اچھا کیا جو اسے پھیلک دیا۔“ وہ ڈست بن میں گرے ہیرے کو دیکھ کر بے خودی کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔ فارس کی پیشانی کی شلنیں کم ہوئیں۔ وہ گہری سانس لے کر اس کی جانب گھوما۔

”ڈر انہیں ہو گا۔“ وہ لوگ کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ذکر بھی بھی نہادمت اور عجیب سے جنہی پن سے خالی نہیں ہونا تھا۔

”میں جانتی ہوں۔ اور میں کوشش کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔“ وہ واقعی تھکی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ ”لیکن میں پھر سے کسی ایسے شخص کو ڈھونڈوں گی جو ہاشم کو منا سکے۔ اس کے لئے مجھے بہت کچھ سوچنا پڑے گا۔“

”چلو... مل کر سوچتے ہیں۔“ وہ ہلاکا سماں مسکرا یا۔

”مل کر کیسے؟“

”دو تین دن کے لئے کسی لمبی مسافت پر نکل جاتے ہیں۔ اس سارے شور ہنگامے سے دور۔ ان مسئلتوں تھانے کپھر یوں اور ان لوگوں سے دور۔ تم تھک گئی ہو۔ کچھ دن آرام کرو گی تو دماغ سے ساری آلو گی چھٹ جائے گی۔“

”جو تم کہو۔“ وہ سترے ہوئے چہرے کے ساتھ مسکرا کر بولی تھی۔

”مگر یاد رکھنا، میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔“ وہ انگلی اٹھا کر تمہیم کرتے ہوئے بولا تھا۔ وہ دھیرے سے نہ دی۔

”تمہاری معافی کی پرواہ ہے کے؟ تم تو شکر کیا کرو کہ میں نے تمہیں معاف کر کے تم سے شادی کر لی ورنہ تم جیسے دو نبرا آدمی کو میں ڈیز رونبیس کرتی تھی۔“

”مجھے ایک کورٹ رپورٹ کو ساتھ لے کر گھومنا چاہیے جو تمہاری ہربات ساتھ ساتھ لکھ کر ریکارڈ کرتا جائے،“ تم کیلوں کا کیا بھروسہ جب چاہو مکر جاتے ہو۔“ وہ جل کر بولا تھا۔ وہ جواب میں چک کر کچھ کہہ رہی تھی مگر آوازیں مدھم ہو رہی تھیں.... گویا دور کسی کنوں سے آ رہی ہوں.... ڈست بن میں گری لوگ کا ہیرا کا لک کے باوجود مدھم سا جگہا رہا تھا۔.....

(آج)

”21 مئی سے چند دن پیچھے آئیں یور آئر۔“ ہاشم کی آواز نے اسے عالمِ تنویم (گہری سوچ، نینڈ hypnosis) سے نکالا۔ وہ

چوک کراس کی طرف متوجہ ہوئی۔ کمرہ عدالت میں سب کے سامنے کھڑا ہاشم پورے اعتماد سے نجح کو بتا رہا تھا۔

”یور آزرسونیا کاردار کی سالگرہ کے موقع پر سعدی یوسف کو کاردار خاندان نے مد عنین کیا۔ ہمارے تعلقات اب پہلے جیسے نہیں رہے تھے، لیکن جب کورٹ میں مجھے مسز مریلین (زمرنے مقام پر باقاعدے جا کر اس کی شاچائی کو سلام کیا) تو ان کی درخواست پر میں نے سعدی یوسف اور زمر یوسف کے لئے کارڈ بھجوادیے۔ ہم نے سوچا یور آز کہ شاید اب یہ نوجوان توبہ تائب ہو چکا ہو۔ مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ عین پارٹی کے وقت، جب میں باہر مہمانوں میں تھا، سعدی یوسف میرے کمرے میں گیا اور میر الا کر کھوٹا چاہا۔ پاسورڈ بدل چکا تھا، وہ اسے تو نہ کھوں سکا مگر میرے دراز میں رکھا میری بیٹی کا نیکلیں جو اسے میری ماں نے سالگرہ کے تھے کے طور پر دیا تھا اور جو اس نے میرے دراز میں ڈال دیا تھا، بچوں کی لاپرواہی یونٹ سعدی یوسف نے وہ نکال لیا اور یور آز اس کے میرے کمرے سے چوروں کی طرح نکلنے کی پوری فوٹج موجود ہے ہمارے پاس۔ جب وہ باہر آیا تو نوشیر والے اس سے باز پرس کی، جس پر دونوں کی تیخ کلامی ہوئی۔ سعدی کو ایک دم جانے کی جلدی ہو گئی۔ جب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ایگزیٹ تک آیا تو گارڈ نے ایکسٹر کے الارم کے باعث اس کو روک کر تلاشی لینی چاہی، جس پر زمر یوسف نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میں اس وقت صورتحال سے ناواقف تھا۔ یہ سب دیکھ کر میں نے گارڈ کو جھٹکا اور سعدی کو جانے دیا۔ چند دن بعد جب ہم ایک شادی کی تقریب میں اس سے ملے تو میں نے اسے کہا کہ وہ یہ نیکلیں واپس کر دے۔ وہ میری بیٹی کو بہت عزیز ہے۔ مگر سعدی یوسف نے نہ صرف صاف انکار کیا بلکہ مجھے بھی بے عزت کیا۔ اس دن کے بعد میں نے سعدی یوسف کی شکل صرف اخبارات اور اپنی دوپتھی کی بھی۔ اگلے آٹھ نوماہ تک ہم نے اس کو نہ دیکھا، نہ اس سے ملے۔ یہ فرعون کے دربار والی کہانی مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ میں گھر ہوت ہے۔ سعدی یوسف 21 میں کو ہمارے آفس نہیں آیا تھا۔ یور آز ہماری بلڈنگ کی لاگ بک، اٹھری ڈینا، سی سی وی فوٹج، سب ہم عدالت میں جمع کرائے ہیں۔ استغاثہ کے پاس ایک بھی گواہ یا ثبوت نہیں ہے جو ثابت کرے کہ ہم نے اس روز سعدی سے ملاقات کی تھی یا شیر و اور سعدی کا کوئی جھٹکا ہوا تھا۔ یور آز ہم نے تو اتنا عرصہ صرف یوسفر کی مدد کی، ہر مشکل میں ان کے ساتھ کھڑے رہے، فارس غازی کو جیل سے نکلوانے میں کتنا ساتھ دیا ان کا، یہ جانتے ہیں (”جی بالکل۔ بجا فرمایا۔“ گال پر تھیل جماۓ بے زاری سے سنتے ہوئے زمر بولی تھی) یور آز ہمارے لئے ان کا ایک دم ہمارے خلاف اٹھ آنا شدید دکھ اور صدمے کا باعث ہے۔ فارس غازی نے ہماری ایکسٹر ہمیں ہی فروخت کی مارکیٹ سے تین گناہ زیادہ قیمت پر۔ شاید وہ رقم بھی کافی نہیں تھی، جواب یہ ایک ایسا کیس کر رہے ہیں جس کے درمیان میں ان کو لگتا ہے اور لوگ ان کو منہ بند کرنے کے لئے ایک خلیر رقم دیں گے۔ گراہیا نہیں ہو کا یور آز۔ نوشیر وال کاردار ایک محصول اور بے گناہ لڑکا ہے، اس کی عزت اس کی نیک تاری، اس کی کریڈیٹیلی ہر شے کو اس الزام نے ٹھیس پہنچائی ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ نوشیر وال کاردار کو نہ صرف باعذت بری کیا جائے بلکہ سعدی یوسف کی ملک و شہر گرمیوں کا بھی نوٹس لیا جائے۔ یہ آٹھ ماہ کہاں تھا اور کون سے جرام پر پردہ ڈالنے کے لئے الزام ہمارے ساتھ ہمارے رشتے، ہر چیز اور ہر شخص کو اس بے بنیاد الزام نے شدید دھچکا لگایا ہے۔ ہمیں ہمارے امیر ہونے کی برسوں کی میرا کاروبار ہماری ساکھ، ہمارے اپنی کریڈیٹ کرنے کی، اپنا پیٹ کاٹ کر خون پسینے اس کمپنی کے لئے لگا کر اس کو اس مقام تک پہنچنے کی سزادی جا رہی ہے یور آز۔ میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام گواہوں اور ثبوتوں کو اچھی طرح پر کھکھل انصاف کے میں تقاضے پورے کر کے فیصلہ سنائے اور عدالت جو بھی فیصلہ سنائے گی، ہمیں وہ قول ہو گا۔ تھینک یو یور آز!“

سر کو خم دے کر وہ واپس اپنی کریڈیٹ کیک آیا تھا۔ جواہرات اب مطمئن ہی مسکرا رہی تھی اور زمر، سعدی، حسین، ہاشم کو بھوکے شیر والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ایسے میں صرف نوشیر وال تھا جس کی آنکھیں گلبی پر رہی تھیں، اور وہ ایک نقطے پر بتلیاں ساکت کیے ہیں۔ پاپک جھپکے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ نجح صاحب کچھ کہر رہے تھے مگر نوشیر وال کا دماغ اس کی نگاہوں کی طرح ایک ہی نقطے پر آ کر جنم گیا تھا گویا بر ف کا کوئی

تو وہ ہو جس کی تہہ درتہہ برف میں یادیں اور قصے ثبت ہو کر امر ہو گئے ہوں.... مٹھنڈے.... تخت.....  
(دوماہ پہلے)

برف کی موٹی موٹی ڈلیاں مشروب کے گلاس کی سطح پر تیرہی تھیں جب باریٹنڈر نے کاؤنٹر پر وہ گلاس اس کی جانب دھکیلا۔ اوپرے  
اسٹول پر بیٹھے شیر و نے اسے اپنی طرف کیا، اور اندر رہا سا اسٹر اپلایا۔ ساتھ ہی وہ موبائل چیک کر رہا تھا۔

”تمہاری اینکل اسٹریپ کہاں ہے شیر و؟“ دو نوجوان وہیں قریب میں آکھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے اوپری سی آواز کی۔ دوسرا  
ہنسا۔ (امریکہ میں اس طرح اگر کسی کو صفائت پر ہا کیا جائے اور ہاؤس اریسٹ کر دیا جائے تو اس کے مخنے پر ایک پٹا باندھا جاتا ہے جو اس کی  
پوزیشن کو مانیز کرتا رہتا ہے۔) نوشیر وال نے چہرہ اٹھا کر تند ہی سے ان دونوں کو دیکھا۔

”تمہارے باپ کو جب نیب والے پکڑ کر لے گئے تھے تو میری اسٹریپ ادھار میں ساتھ لے گئے تھے۔“ دوسرا نوجوان پھر ت  
ہنسا۔ مگر پہلے نے اب راچکا۔

”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یہ جیل جانا، عدالتوں سے گزرنا، یہ تو شان کی باتیں ہوتی ہیں۔“ آگے بڑھ کر اس نے شیر و کا کندھا زور  
سے تھکا۔ نوشیر وال نے (ہونہہ) کندھا جھکا اور موبائل کی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اور پھر یہ بھی تھا جب سارے میں ایک شناسائی آواز گوئنے لگی۔ کسی ڈراؤن نے خواب کی سی کیفیت میں اس نے سراخایا۔ کسی نے  
لااؤخ کی دیوار پر لگی وہ پورے انسان کے سائز کی ایل ای ڈی کی آواز تیز کر دی تھی۔ مدھم یہوں کے باعث سارے میں نیم اندر ہیر اساتھ اور  
اسکرین کسی سینما کا ماحول پیش کر رہی تھی۔ نوشیر وال کی نگاہیں وہاں جا کر ٹھہریں تو واپس پلٹا بھول گئیں۔

معروف اینکر کے سامنے صوفے پر چھپ کو ہو کر بیٹھا، وہ ویران مگر سنبھیڈہ چہرے والا لڑکا... ٹھہرے ہوئے مگر مضبوط لمحے میں وہ کھا  
بیان کر رہا تھا۔ ”میں اسے وہاں اس زیر تغیر گھر میں دیکھ کر جیران ہوا تھا۔“

”اور پھر اس نے آپ کو گولی ماری۔“ آگے کو ہو کر بیٹھا اینکر تاسف اور ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔ سلوگرے ڈریس شرٹ میں  
ملبوس سعدی کے بال ذرا بڑے ہو گئے تھے۔ ٹھنگریا لے مل اب نظر آنے لگے تھے۔ ان کو جیل لگا کر اس نے پیچھے کو جمار کھا تھا۔ بھوری آنکھوں  
میں یہ سنتے ہی گھر اور دا بسا۔ آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ کہنی صوفے کے ہتھ پر جمائے وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم مسل رہا تھا۔

”میں نے اسے کہا کہ وہ یہ نہ کرے۔ نہیں۔ میں نے اس کی منت نہیں کی۔ مگر میں نے کہا کہ وہ اپنے بھائی جیسا نہیں ہے۔“ نیم  
روشن لااؤخ میں لڑکے لڑکیاں گلاس چھوڑ کر سننے لگے تھے۔ موسیقی بند ہو گئی تھی۔ پلیٹوں میں چلتے چجع کا نئے رک گئے تھے۔ دم سادھ کر گویا اسے  
نما جارہا تھا جو بڑی اسکرین پر یہ اتنا بڑا سالگ رہا تھا۔ خود زندگی سے بھی بڑا۔

”میں نے اسے کہا کہ میں جانتا ہوں وہ یہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں وہ اندر سے ایک اچھا انسان ہے۔ اور پھر میں نے وہی کہا  
جو ہائیل نے قابل سے کہا تھا۔ اگر تم مجھے تقلیل کرنا چاہو تو بھی میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ کیونکہ وہ میرا مسلمان بھائی تھا۔ مجھے آخری لمحے  
تک یقین نہ تھا کہ وہ مجھ پر گولی چلا سکتا ہے۔ وہ high تھا (نشے میں تھا)۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ مجھے اس پر ترس بھی آ رہا تھا۔ مگر  
مجھے یقین تھا کہ وہ میرے اوپر گولی نہیں چلائے گا۔ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ مجھے لگا وہ کبھی نہیں بھول سکے گا کہ جب وہ ڈرگز کی زیادتی  
کے باعث مر رہا تھا تو میں اسے ہسپتال لے کر گیا تھا۔ مجھے لگا وہ یاد رکھے گا کہ کبھی ہم دوست تھے۔ مگر نوشیر وال کا ردار نے کچھ یاد نہیں رکھا۔  
میں ان آخری لمحوں میں بھی اسے شیر و کہہ کر پکار رہا تھا۔ اور پھر اس نے مجھے تین گولیاں ماریں، اور کہا کہ میرا... نام... نوشیر وال... ہے۔“

شو کے سیٹ پر چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ گویا سانسیں تک رک گئی ہوں۔

”گولی کھانے کے بعد کیا ہوا؟ آئی نویہ آپ کے لئے تکلیف دہ ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ ملک بھر میں بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں

بھی بی این نیوز کی نشریات جاری تھیں، اور لوگ آپ کو دیکھ رہے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت کیا ہے۔“  
سعدی نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے تین گولیاں ماریں اس نے۔ پیٹ میں۔ کندھے میں۔ ناگ میں۔ میں نیچ گر گیا۔ زمین پر۔ مجھے لگا اب وہ بھاگ جائے گا، مگر وہ نہیں ہوا گا۔ میں اب تک بے یقین تھا۔ شاک میں تھا۔ پھر وہ میری طرف آیا۔ شاید مجھے لگا کہ اب یہ مجھے اٹھائے گا۔ وہ میرا دوست تھا۔ وہ میرا اچھا دوست رہا تھا۔ مگر اس نے مجھے بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ وہ میرے منہ پر...“ رک کر سانس لیا۔ ”وہ میرے منہ پر جو تے سے ٹھوکریں مارتا رہا۔ ساتھ میں وہ مجھے گالیاں بھی دے رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ میری وجہ سے وہ ہمیشہ ہوا جاتا ہے۔ میرے سامنے وہ بیسٹ نہیں لگ سکتا۔ وہ مجھے مرتا گیا۔ بری طرح۔ گولی سے زیادہ تکلیف وہ ٹھوکریں تھیں۔ وہ بوٹ کی ٹھوکریں جو میرے منہ پر آگئی تھیں۔“ اسکریں پہ اب زخی سعدی یوسف کی پولیس فوٹوڈھائی جاری تھیں۔ زخم زخم چہرہ۔ زخی جسم۔ بند آنکھیں۔ رستاخون۔

”لوگ کہتے ہیں روحانی اذیت زیادہ ہوتی ہے مگر میں آپ کو بتاؤں، جسمانی اذیت زیادہ براحال کرتی ہے۔ اسی لئے تو قیامت کے بعد برے لوگوں کے لئے جہنم کا وعدہ ہے۔ جسمانی اذیتوں کی جگہ۔ یہ نہیں وعدہ کیا گیا کہ مشرکوں کو ڈپریشن ہوگا، یا ان کے دل ٹوٹ جائیں گے، ان کو ظروط و طمعنے سے اداس کیا جائے گا بلکہ جسمانی عذاب کی وعید سنائی گئی۔ وہ تکلیف، وہ اذیت... وہ بہت زیادہ تھی، اور اس لمحے میرے منہ سے ایک ہی بات نکلی تھی۔.... ”اللہ حساب لے گا۔“

اینکر اب بریک پہ جارہا تھا۔ کوئی مرانس ساٹو نا تھا۔ گرد نہیں مڑیں۔ نگاہیں اٹھیں۔ سب نوشیر والوں کو دیکھ رہے تھے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ بس نظریں اس پر گاڑھ دیں۔ وہ ملامتی، وہ اندر تک اتر جانے والی غصیل نظریں، وہ نفرت اگنی نظریں.... وہاں موجود ہر شخص مدھم زرد تیوں میں صاف نظر آتے اسٹول پر بیٹھے شیر کو دیکھ رہا تھا۔

نشیر والوں چیخ چلا کر بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر الفاظِ دم توڑ گئے تھے۔ وہ دھیرے سے اٹھا۔ والٹ اور چاہیاں اٹھائیں، فون جیب میں ڈالا۔ سب اسے گھوڑر ہے تھے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ نظریں انی کی طرح اس کے سارے وجود میں اتر رہی تھیں۔ اسے پینٹ آنے لگا تھا۔ وہ تیر تیر قدم اٹھا رہا تھا۔ دروازہ دور تھا۔ نظریں اس کا یچھا کر رہی تھیں۔ اس کا تنفس تیز ہے ترتیب ہو رہا تھا۔ نفرت، ملامت، غصہ وہ سارے جذبات آگ کی لپیٹوں کی طرح اس کا یچھا کر رہے تھے.... گویا یہ لپیٹ اس کو کھا جائیں گی.... بدقت وہ باہر نکل پایا تھا.... مگر اس ساری تپش نے کاٹ میر پر کھے گلاس میں تیرتی رفت کی ڈیلوں کو پکھلا دیا تھا۔ برف کی جگی پر تیں پانی بنتی جا رہی تھیں۔

(آج)

”استغاش اگلی پیشی پر گواہوں کو پیش کرے گا، تمام کاغذات عدالت میں جمع کرائے...“ چج صاحب کی سخت کھردری آواز نے نوشیر والوں کو چوڑکایا تھا۔ وہ ایک دم بے اختیار گرد موز کراستغاٹ کی کرسیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں سعدی اسی طرح اداس سا بیٹھا تھا۔ زمر اب اٹھ کر جنح صاحب کے ڈیک تک جا کھڑی ہوئی تھی۔ ہاشم ہاتھ میں کاغذ پکڑے کچھ کہہ رہا تھا اور احمد فائل سے کاغذ نکال کر اسے تمہارہ تھا۔ مگر شیر و کی نظریں اس کے اداس چہرے پر جمی گئیں.....

سعدی وہاں نہیں تھا۔ اس کا گہر اخیال اسے یہاں سے دور کسی جگل بیابان سے گزار کر.... برف کے سمندر اور سنہری ریت کے محل عبور کرائے.... نیلی جھیل اور سفید چوٹیوں کے اوپر سے اڑا کے.... اوچی آبشاروں کی سطح پر تیرا کے.... اس کا خیال اس کو وقت میں پیچھے لے جا رہا تھا.....

(دو ماہ پہلے)

مور چال کی دیواروں سے چمنی سبزیلیں اداں اور ویران لگتی تھیں۔ زمرا پنے کرے میں کھڑی تھی۔ بینڈ پر سفری بیگ کھلا تھا، اور وہ

اس میں کپڑے تہہ کر کے ڈالے جا رہی تھی۔ انداز سے شدید اکتائی ہوئی لگتی تھی۔ دفعنا سر کو اٹھا کر کونے میں کھڑے، خفا اور برہم سعدی کو دیکھا۔ ”میں نے یہ تمہارے لئے نہیں کیا۔ دسویں دفعہ بتارتی ہوں۔“

”آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟“ وہ ذرا بے بس پریشانی میں قریب آیا۔ ”اگر آپ ٹرائل کے لئے فارس ماموں کو چھوڑ دیں گی تو کیا میں یوں خوش ہوں گا۔“

”میں ان ٹپیکل عورتوں میں سے نہیں ہوں جو ہر دوسرے دن کسی ثی وی ڈرامے میں شہر کو قربانی کر رہی ہوتی ہیں۔ میں تو صرف....“ سر جھنکا اور بیگ کی زپ بند کی۔ ”میں صرف ایک کوشش کر رہی تھی۔ مگر بہر حال اب کوئی ٹرائل نہیں ہو گا۔ کیس فاکلوں میں دب جائے گا۔ اس لئے میں.... کچھ دن کے لئے یہاں سے جا رہی ہوں۔ پلیز مجھے مت روکنا۔“

وہ خنگی سے اسے دیکھتا رہا۔ ”آپ جا رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ میں آپ کونہ روکوں؟“ پھر گھری سانس لی۔ ”آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں آپ کو روکوں گا؟ کب سے لگنے لگا میں آپ کو اتنا خود غرض۔ کیا میں آپ کو سکون سے چند دن نہیں گزارنے دوں گا؟ نہیں چاہیے مجھے ایسا ٹرائل جس کے لئے مجھے آپ دونوں کی قربانی دینی پڑے۔“

زمر کے لبوں پہ اداس مسکراہٹ بکھری۔ ”مگر مجھے تو چاہیے تھا۔ نیز، جب میں واپس آؤں گی تو ہم مل کر کچھ حل نکالیں گے اور پھر.....“

”اور پھر کوئی کیس نہیں لڑ رہے ہم۔ کم از کم آپ کے واپس آنے تک میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”اوکے!“ زمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دی۔ ”اب میں پیٹنگ کرلوں۔“

”اوکے! آبدار صاحب کب سے آپ کو نگاہ کر رہی ہیں؟ اس کو میں کل فکس کرتا ہوں۔“ وہ شدید غصے میں تھا۔ زمر ایک دم ہنس پڑی۔ ”نہیں کیوں؟“

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کوئی غنڈہ بدمعاش مجھے بس اسٹاپ پر روز نگاہ کرتا ہو۔ ارے یا روہ ایک اچھی لڑکی ہے، اور اس کو تمہارے دونسرے ماہوں اچھے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی ہمت بڑھائی ہو گی ان صاحب نے جو بات یہاں تک پہنچی۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی آخر میں الجہزادہ جل سا گیا۔ سعدی کے ماتھے کے بل ڈھیلے پڑے۔ ذرا سامسکرا یا۔

”ایک وقت تھا وہ آپ کو زہر لگتے تھے۔“

”شہد اب بھی نہیں لگتا۔ زہری ہے۔“ سر جھنک کر وہ پرس میں چیزیں ڈالنے لگی۔ پھر اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے چہرہ اٹھایا۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ ”کیا؟“

”کچھ نہیں۔“ ہنس کر سر جھنکا۔ ”آپ آرام سے جائیں۔ اب ہم کسی ٹرائل کا نہیں سوچیں گے۔“ زمر اسے چند لمحے تک دیکھنے لگی۔ جیسے کفیوڑہ ہو۔ پھر امید بند ہی۔ ”تم تج کہہ رہے ہو نا۔ میرا مطلب ہے۔ تم تھیک ہو نا؟“

”اب ہو گیا ہوں تھیک۔ آپ کو خوش دیکھ کر تھیک ہوں میں۔ اور وہ جو باتیں گروپ پر آپ میرے لئے لکھتی ہیں نا، ان کو پڑھ کر مزید تھیک ہو گیا ہوں۔ فکر نہ کریں اور آرام سے جائیں۔“ وہ مسکرا ہاتھا اور تسلی بھی دے رہا تھا۔ زمر کا دل چیسے ہلاکا سا ہو گیا۔ وہ سکون سے پیٹنگ کرنے لگی۔

پھر باہر سے استری والے کپڑے اٹھانے آئی تو کمرے کے سامنے لا دنخ کے صوفے پر چیختی تھی۔ یقیناً وہ کھلے دروازے کے باعث سب دیکھ اور سن چکی تھی۔ (گھر میں اس وقت اور کوئی نہیں تھا۔ سب سارہ خالد کی طرف گئے تھے۔ ندرت کو بہت گلے تھے ان

لوگوں سے۔)

”اس کو جنمت کریں۔“ زمر کو اسٹری اسٹینڈ سے تہہ شدہ کپڑے اٹھاتے دیکھ کرو وہ بے خودی کے عالم میں بولی تھی۔ زمر نے چونکہ کراں سے دیکھا۔ ”وہ بیمار سے آمد اے۔ اس کو جنمت کریں۔“

زمرے دیکھا۔ پھر اور سوچ دیکھا۔ بس کپڑے اٹھاتی رہی۔ دونوں کے پیچ سعدی کے آنے کے بعد سے درآنے والا تناول ایک دم زیادہ محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر خین ششنجی سے بولی۔ ”سوری مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میر ا مقام ایسا نہیں ہے کہ میں آپ کو غلط یا حق بتاسکوں۔“

”تم سعدی کی جگہ نہیں لے سکتیں خیں۔ تم... سعدی... بھی نہیں بن سکتیں۔ جو میرے لئے سعدی ہے وہ تم نہیں ہو سکتیں کبھی بھی!“  
خیں بکری کراس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ دل اتنا زور کاٹھا کر کے اپنے کانوں میں کر چیاں بکھرنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ چند لمحے  
خاموشی چھائی رہی۔

”ہر شخص کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ تم سعدی نہیں بن سکتیں، نہ تم اس کی طرح ہو۔ تم حسین ہو۔ اور جو تم میرے لئے ہو، وہ سعدی میرے لئے نہیں بن سکتا۔ اسی طرح فارس، سعدی، یاد نیا میں کوئی بھی شخص خواہ اس سے میں کتنی ہی محبت کروں یا وہ مجھ سے محبت کرے وہ میرے لئے حسین نہیں ہو سکتا۔ حسین کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ خونی رشتوں میں موازنہ اور مقابلہ نہیں کرتے۔ کرہی نہیں سکتے۔ ہر شخص کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ تمہاری بھی ہے اور اس جگہ کوئی نہیں بھر سکتا۔“

آنحضرت کی آنکھوں میں چمکنے لگے۔ لب ہلکی سی مسکراہٹ میں ڈھلنے۔

”اور ایسے ہی تھاری زندگی میں کوئی زمر کی جگہ نہیں رکھتا جس کے جانے کے بعد تم کھڑکی پر کھڑی ہو کر اس کے واپس آنے کا انتظار کرو۔ جس کی بھولی ہوئی چاپیاں اور گلاسز لوٹانے کے لئے تم اس کا بیچ راستے سے ٹرنے کا انتظار کرو۔ جب تم زمر کا مقابلہ سعدی سے نہیں کر سکتی تو میں بھی خینہ کا مقابلہ سعدی سے نہیں کر سکتی۔“

خین میں اثبات میں سرہلا دیا۔ آنکھوں پر چھائی گرد کوزمر نے پانی ڈال کر جیسے دھوایا تھا۔ زمر کپڑے لے کر آگے بڑھ گئی اور وہ ایک خوشگوار احساس میں گھری بیٹھی رہ گئی۔ ایک محبت کھوئی تو کیا ہوا۔ بہت سی مل بھی تو گئیں۔ سعدی آہستہ سے اس کے ساتھ آ کر بیٹھا تو وہ چوکی۔ اس کی مسکراہٹ غائب تھی۔ اور پھرے پر دیرانی تھی۔ ”ہم نے مراکل لڑنا ہے حتیٰ مجھے بتاؤ کیسے!“  
خین کے دل کو دھکا سالاگا۔ ”تو وہ سب جوابی کہا۔“

”ہمیں یہ جنگ میں مجھے لڑنی ہے، ان کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“

یہ یہ رسم بنت ہے۔ اس پر میرا خیال ہے آپ کو بالکل بھی انصاف نہیں ملے گا۔ یہ سب بے کار ہے بھائی۔“ وہ الٹا سے سوری مگر میں ٹیم فارس ہوں، اور میرا خیال ہے آپ کو بالکل بھی انصاف نہیں ملے گا۔ یہ سب بے کار ہے بھائی۔“ سمجھانے لگی تھی۔ سعدی بنا تاثر لئے بس اسے دیکھ گیا۔

(آج) اپنے عالمِ تنویم سے وہ نکلا تو خود کو وعداتی کرے میں پایا۔ پھر سر جھٹک کروہ اٹھا اور جانے والوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کی کرسی دیوار پر لگی گھڑی کی سویاں اپنی مسافت طے کرتی رہیں۔ روشنی، آندھیرا، روشنی، پارش، آندھی، پھر اندر ہیرا، پھر روشنی۔ کھڑکی کے سامنے بڑھا آسمان کے سارے بد لیے عکس اس کرسی پر پڑتے رہے یہاں تک کہ وہ واپس آ کر اس پر بیٹھا، آج سیاہ کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس تو یون گلتا تھا گویا بخوبی تیار ہوا ہو۔ تازہ شیوں تازہ قلموں سے تراشے بال، نیا کرتا شلوار، پیروں میں پشاوری چپل، وہ گویا تیار تھا۔  
گواہی دینے کے لئے۔

نظر اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔ تو سب اپنی معمول کی کرسیوں پر آئیتھے تھے۔ ہپل اور آوازوں کے نجی بھی وہ دیکھ سکتا تھا، نو شیر وال چپ چاپ ہاشم کے پہلو میں بیٹھا ہے۔ اس کا چہرہ دیران اور آنکھیں رنگے کے باعث سرخ تھیں۔ وہ بالکل لاتعلق سا سامنے دیکھ رہا تھا۔ کسی غیر مرمنی نقطے کو... شاید اس کی نظرؤں میں بہت سے نقطے تھے... سفید نقطے... اُنی وی اسکرین کے سفید شور کی طرح.... (دو ماہ پہلے)۔

اس نے چینل بدلاتا اسکرین پر سفید دانے سے آرہے تھے۔ (White noise) ہاشم نے بے تاثر چہرے کے ساتھ اگلا چینل لگا لیا۔ وہ اس وقت آدمی آستین کی شرت اور رڑاوزر میں بیٹھا، باز صوفے کی پشت پر پھیلائے ہوئے اور پاؤں میز پر کھے ہوئے تھا۔ یہ اس کے آرام کا وقت تھا۔ بیدروم کی بیانیں بھی مدد حتم تھیں۔ ایسے میں دروازہ دستک کے بعد کھلا تو اس نے چونک کردیکھا۔ چوکھت میں شیر و نظر آ رہا تھا۔ نیم روشن ماحل میں بھی وہ اس کی آنکھوں کی سرفی دیکھ سکتا تھا۔

”تم نے ڈرگز لی ہیں کیا؟“ ہاشم بولا تو لہجہ نہ سخت تھا نہ زرم۔ اس وہ جانتا چاہتا تھا نو شیر وال خاموشی سے اندر آیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔ لاک کے چوکھت میں گھس کر ”ملک“ ہونے کی آواز آئی۔ شیر و ہاتھ پیچھے دروازے پر کھے یوہی کھڑا رہا۔ ”میں انثر و یونیس دے سکتا۔“

ہاشم نے نابرو پیچنے نہ برہنی ظاہر کی۔ بس سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھے گیا۔

”میں سعدی کی طرح انثر و یونیس دے سکتا۔ آپ نے جوانٹر دیو میرے لئے رکھوایا ہے اس کو منسون کر دیں۔“

”کیوں؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔ سیاہ آنکھیں نو شیر وال کی شہری آنکھوں پر جمی تھیں۔

چند پل سر کے۔ زرور و شنیوں کا نیم اندر ہر امدھم سی اُنی وی کی آواز، کھڑکی کے باہر بہتی، بھیکیت رات... سب خاموش تھے۔

”مجھے سے وہ سب... وہ اسکر پٹ نہیں بولا جائے گا۔ بھائی لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔“ وہ پھٹی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”جب سے اس کا انٹر دیو آیا ہے، میں جس جگہ جاؤں، لوگ یا تو مجھے باقی سناتے ہیں یا نفرت سے دیکھتے ہیں۔ میں کسی پارٹی میں کسی نیبل پر بیٹھوں تو لوگ وہاں سے اٹھ جاتے ہیں۔ میں قابل نفرت، قابل حرارت بن کر رہ گیا ہوں۔“ اس کی آواز بھیکی ہوئی تھی۔ لہجنوں تھا، اس نے ساری زندگی میرے ساتھ تھی کیا۔ مجھے ہمیشہ اندر ہیوں میں دھکیل کر ساری روشنی خود سیمنٹی چاہی۔ وہ اب بھی میرے ساتھ تھی کر رہا ہے۔ جوبوٹ میں نے اس کے منہ پر مارے تھے وہ میرے ہر دوست، ہر عزیز، پیلک کے ہر آدمی سے میرے منہ پر لگوار ہاہے۔ میں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔“

”ملک سے باہر چلے جاؤ۔“

”اس سے کیا ہوگا؟ میرا سوچ سرکل تو وہی رہے گا۔ میں ایک دفعہ بھاگا تھا، اب نہیں بھاگوں گا۔“ ایک عزم سے اس نے فٹی میں سر ہلایا۔ ”میں انثر و یونیس دوں گا، کچھ نہیں بولوں گا۔ کیونکہ میرے پاس خاموش رہنے کا حق ہے۔ برذن آف پروفائزام لگانے والے پر ہوتا ہے، انہیں ثابت کرنے دیں۔ عدالت میں ان کے خلاف میرا دفاع کریں بھائی۔ مجھے بربی کروادوتا کہ میں فخر سے کہہ سکوں کہ میں بے گناہ تھا تھی مجھے بری کیا گیا ہے۔“

ہاشم چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ شیر و کے چہرے سے واضح تھا کہ وہ بہت مشکل سے اس فیصلے پر پہنچا ہے۔

”ہم مڑاکل پر نہیں جا رہے شیر و۔ میں اس کیس کو فائلوں میں دبادوں گا۔“

”مگر بھائی، ہم.....“

”تمہیں کیا لگتا ہے میں یہ کیوں کر رہا ہوں؟“ ہاشم ریموت رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا لہجہ تنہ ہو گیا تھا۔

”کیا؟“

”یہی۔ بار بار کہنا میں ٹرائل پنہیں جاؤں گا۔“

نوشیر وال سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ہاشم چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے سامنے آ رکا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں یہ تمہیں پچانے کے لئے نہیں کر رہا تھا۔ میں یہ خود کو پچانے کے لئے کر رہا ہوں۔“

”مگر آپ کا تو نام ہی نہیں.....“

”میں یہ اپنی روح بچانے کے لئے کر رہا ہوں۔ جانتے ہوڑائیں میں جائیں گے تو کیا ہو گا؟“ وہ تیزی اور درستی سے بولا تھا۔ ”مجھے ان کے خاندان کے ایک ایک شخص کو عدالت میں گھیٹ گھیٹ کر بے عزت کرنا ہو گا۔ مجھے زمر کو ایک کرپٹ و کیل اور ایک منافق عورت ثابت کرنا ہو گا جو اپنے شوہر کے خلاف بھی پلانگ کرتی رہی ہے۔ مجھے سعدی کو دہشت گرد اور مجرم اور ہوں پرست لاپچی نوجوان ثابت کرنا ہو گا، حینہن کو بد کردا اور فارس کو قاتل ثابت کرنا ہو گا۔ جب ہم ان سب کے کردار مسخر کرچکے ہوں گے، فالکیں کھول کر جو کو دکھائیں گے کہ ندرت یوسف نے تاجراز میں پہ قبضہ کر رکھا ہے اور ان کے بڑے ابا پنی ما ذمت کے دوران کتنی دفعہ رشوٹ لے چکے ہیں، اور جب یہ کہایا جائے اخباروں میں چھپیں گی اور اُنہیں پہ دکھائی جائیں گی، تب عدالت سعدی کی بات پہ یقین کرنا ختم کرے گی۔“ تمہیں بے گناہ ثابت کرنے کے لئے یا تو میں اس پورے خاندان کو منع سرے سے تباہ کروں یا اس کیس کو ہی دبادوں۔ دونوں صورتوں میں یقین گے ہم ہی۔ تو پھر میں کیوں کروں ان کے ساتھ دوبارہ ایسے؟ کیا ہم نے کم نقصان کیا ہے پہلے ان کے خاندان کا؟ کتنے لوگ مارے، کتنے ابھی تک ہماری وجہ سے بیمار ہیں، اور سعدی.... کیا میں اسے دہشت گرد ثابت کر دوں؟ کیا یہ اس کو مار دالنے کے برابر نہیں ہو گا؟ تم کیوں چاہتے ہو کہ میں مودو آن نہ کروں؟ اس سب کو چھوڑ کر تینی زندگی نہ شروع کروں؟ بہت دفاع کر لیا میں نے تمہارا اب نہیں کروں گا اور تم چپ چاپ وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔ یہ میں اپنے مفاد کے لئے نہیں کر رہا۔ مجھے.... عدالت.... میں... کوئی نہیں ہر اسکتا نوشیر وال۔ زمر اور سعدی مل کر بھی نہیں۔ مگر یہ سب میں اپنی روح اور ان کی زندگیوں کے لئے کر رہا ہوں۔“

نوشیر وال حق دق سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس سب کی امید نہ تھی.....

ٹی وی اسکرین ہنوز چل رہی تھی۔ سگنل پر ال بلم کی وجہ سے اس چینل پر فنگ برلنگے دانے سے ابھرتے نظر آنے لگے تھے.... ساتوں

رنگ کے دانے....

(آج)۔

”ریکارڈ کے لئے اپنا نام بتائیے۔“ کسی مقناطیس نے لو ہے کہ ان سارے ذرات کو گہرے کنویں سے باہر ٹھیک نکالا۔ نوشیر وال سنچل کر، اپنے گرد موجود عدالتی کرے کا احساس کر کے کٹھرے کی طرف دیکھنے لگا جہاں سعدی کھڑا تھا۔ کٹھرے کے اندر۔ وہ حلف لے پکا تھا اور اب اس کے سامنے تین قدم نیچے کھڑی زمر، گردن اٹھا کر اسے دیکھتی، زری سے پوچھ رہی تھی۔

”سعدی ذوالفقار یوسف خان۔“ اس نے کٹھرے کی رینگ پر دونوں ہاتھ جمائے پوری طہانتی سے کہا تھا۔

”آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟“

”اسلام آباد۔“

”مذکورہ واقعے سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟“ سب خاموشی سے ان دونوں کو سن رہے تھے۔

”میں..... کیمیکل انجینئر تھا۔“

”ذرماں نچا بولیں۔“ زمر نے اشارہ کیا۔ وہ ہلاک سا کھنکا کر بولا۔ ”میں کیمیکل انجینئر ہوں، یونیورسٹی آف لیڈز سے میں نے تعلیم

حاصل کی ہے۔ اور میں نیک کام میں بطور سائنسدان کام کرتا تھا۔ تھر کول پادر پراجیکٹ کا میں سینٹر انجینئر تھا۔ ”سعدی کے چہرے پر طمانیت تھی۔ وہ اٹھی گردن اور ٹھنڈی آنکھوں کے ساتھ بتا ہا تھا۔ نجح صاحب رخ اس کی جانب ترچھا کیے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”سعدی یوسف“ آپ کے والد کیا کرتے تھے؟ ”زمر دونوں ہاتھ باہم پھنسائے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”وہ ایک پیغمبر تھے۔ میں تیرہ سال کا تھا جب ان کی ڈیتھ ہوئی۔“

”اور آپ کی والدہ؟“

”ابو کی ڈیتھ کے بعد انہوں نے ٹھنگ شروع کی۔ ہمیں برا کیا۔ پھر بعد میں انہوں نے ریشور انٹ کھول لیا۔ کرایے پر شاپ حاصل کی تھی۔ ہمارا گھر بھی کرایے کا تھا۔“ زمر نے ذرا چھرہ موڑ کر نجح صاحب کے تاثرات دیکھے، پھر واپس اس کی طرف گھومی۔ نجح صاحب عینک کے پیچھے سے بے تاثر نظر دیں سے اسے دیکھتے رہے۔

”تو آپ پھر لیڈز پڑھنے کیسے گئے؟“

”میں نے ایک اسکارشپ اپلائی کی تھی، مجھے بتایا گیا کہ مجھے اسکارشپ ملی ہے، ایک امیر آدمی مجھے اپانسر کرے گا۔“

”کیا واقعی ایسا ہی تھا؟“

”میں کی برس تک سمجھتا رہا کہ ایسا ہی ہے، مگر بہت دیر سے مجھے معلوم ہوا کہ میری فیس زمر یوسف دیتی ہیں۔“

”اوہ میں نے آپ کو اس بات سے کیوں آگاہ نہیں کیا تھا۔“

”کیونکہ میں آپ کو آپ کا واحد پلاٹ اپنے لئے نہ بیچنے دیتا کہی۔ آپ نے مجھے بتائے بغیر اسے بیجا، اور پھر میری فیس بھری۔ پانچ سال تک بھری۔“

وہ اداہی سے مسکرا یا۔ زمر بھی ہلاکا سا مسکرا یا۔ ماحول میں ایک نرم سے خلوص بھری محبت کی خوبصورات نے لگی۔

”Too poetic“ پیچھے کر کی پر اجمناں ہاشم نے اوپنی آواز میں تبصرہ کیا تھا۔ زمر اس کی طرف گھومی ہی تھی کہ نجح صاحب

بولے۔

”آپ کو کوئی اعتراض کرنا ہے کاردار صاحب؟“

”نہیں یور آزر۔ میں تو محض اونچا سوچ رہا تھا۔“ سادگی سے شانے اچکائے۔ اس خوبصورات کا اثر ایک دمٹوٹ سا گیا۔ زمر واپس گھومی۔ سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔

”سوجب بھی آپ یہ کہتے تھے کہ آپ اسکارشپ پہنچے ہیں، آپ اس اسکارشپ کی حقیقت سے ناواقف ہوتے تھے!“

”جی۔“

”اور جب تھپ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے کبھی ”شواف“ نہیں کیا۔“

سعدی نے اثبات میں سرہلا یا۔ ”جہاں تک مجھے یاد ہے، ایسا ہی ہے۔“

نوشیر والوں فوراً ہاشم کی طرف جھکا۔ ”جب میں اس کے ریشور انٹ گیا تھا، اور ایک پچھ میری کار کے نیچے آتے پھا تھا، تب اس نے بھرے مجھے کے سامنے اسکارشپ کی بات کی تھی۔ تب تو اس کو پہنچا۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

”وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ اسے یاد نہیں ہو گا۔“

”تو آجیکٹ کریں نا۔“ شیر و چھنچلا یا۔ ہاشم نے اسے گھورا۔

”تاکہ ثابت ہو جائے کہ تم اس کے ریشور انٹ گئے تھے! چپ کر کے بیٹھو،“ شیر و گڑ و اسامنہ بنا کر پیچھے کو ہو گیا۔

دوسری جانب والی کرسیوں پر پیچھے پیچھے آبدار بیٹھی تھی۔ آج اس کی قطار خالی تھی۔ حینہ اگلی قطار میں تھی اور فارس نہیں تھا۔ آبدار گود میں رکھے سیل فون کی سیاہ اسکرین پر بے خیالی میں انگلی پھیر رہی تھی۔ اس کا ذہن منتشر خیالات کی آما جگاہ بنا رہا تھا۔ سیاہ اسکرین پر نظریں مانکن کیے وہ اس میں حتملاً تاپاً عکس دیکھنے لگی۔.....

(دوماہ پہلے)

وہ اپنے کلینک میں کری پتھی اور سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی سیاہ بیٹھی ہوئی اسکرین میں اسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی گھری سوچ میں گم لگتی تھی۔ اس کے عین پیچھے دیوار گیر کھڑکی سے سورج کی تیز روشنی کے علاوہ اوپر سے نیچے لگتی بزریں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ تبھی دروازہ دھیرے سے کھلا۔ آبدار نے نظریں اٹھائیں۔ ذرا سامکرائی۔

ایک متذبذب مگر سمجھیدہ ساعدی چوکھت میں کھڑا تھا۔ آپ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔ بس سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا آپ اپنے مریضوں کو کافی پیش کرتیں؟“ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔

”آپ مریض نہیں ہیں۔ subject میرے لئے کچھ پیش گے؟“ اندر کام پر ہاتھ رکھے اس نے استفسار کیا۔

”اوہبُو.... صرف بولوں گا۔“

”کہیے۔ میں سن رہی ہوں۔“ ساعدی چند لمحے سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ وہ ہلکی سی سفید سوئٹر اور جیزہ میں ملبوس تھا۔

سوئٹر کے اندر سے کار بھی جھلک رہے تھے۔ چہرے سے سو گوارگلتا تھا۔

”تمہیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے سعدی یوسف کا کوئی ghost بیٹھا ہے تم وہ شخص نہیں رہے۔“ آبدار کو افسوس ہوا۔

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جو لڑکا میں تھا، اگر وہ لڑکا اب مجھے دیکھنے تو کیا کہے گا۔ کیا سوچے گا۔“ وہ ہلکا سا ہنسا۔ کھڑکی سے باہر

لان میں شعلت مورڈر ختوں پر بیٹھے پرندے .....

”یہی سوچ گا کہ تمہیں راہ راست پر لانے کو کون سا پیغمبر دیا جائے۔ وہ لڑکا ہر وقت دوسروں کو فکس کرنے والی باتیں سوچتا تھا۔“

پھر شرارت سے مسکرا کر آگے ہوئی۔ ”کہیں مجھے بھی فکس کرنے تو نہیں آئے۔“

”سوچا یہی تھا، مگر تم میرے لئے میری بہن کی طرح ہو۔ اور اس نے کہا تھا کہ تمہیں بچ نہ کیا جائے۔ سو میں یہاں تمہارا شکریہ کرنے آیا ہوں۔ مگر مجھے افسوس ہے میرے پاس تمہیں بتانے کے لئے کوئی لمبا چوڑا NDEA نہیں ہے۔“

آبدار جیران ہوئی۔ ”مگر تم تو نیز ڈیتھ سے نکل کر آئے ہو۔ ہے نا۔“

”یہ صرف میرے ڈاکٹر کا اندازہ تھا،“ ورنہ میں گھرے خواب سے نکل کر موت تک نہیں گیا تھا۔ میں پہلے کبھی بتانہیں سکا، مگر میں اس

لیوں تک نہیں جاسکا۔ میں نے صرف ایک خواب دیکھا تھا۔“

”آہا۔“ وہ توجہ سے سنتے گئی۔ ”کیا خواب؟ یہ کری آرام دہ ہے، تم تیک لگا کر بیٹھ جاؤ۔“ ساعدی نے ہلکی سی تیک لگائی، مگر سر پیچھے نہیں لگایا۔ وہ کھڑکی سے باہر نظر آتے مور کو دیکھ رہا تھا۔ میروں پر بحدے بحدے ساتھ دھیرے دھیرے ٹہل رہا تھا۔ اس کے پنکھہ دھنک کے ساتوں رنگ اپنے اندر سمئے اس کے وجود کے گرد پھیلے تھے۔

”تم نے کیا دیکھا تھا؟“ اسے آبدار کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ نگاہوں کے سامنے بس وہ مور تھا۔ اس کے میروں کے

رنگ تھے۔

”میں نے... خواب دیکھا تھا۔ جب میں چھونا تھا تو ایک دفعہ، تم لوگ گئے تھے کسی پہاڑی وادی میں۔ نام یاد نہیں۔ وہاں ایک پیشے پر بیٹھے ہوئے زمر نے مجھے کہا تھا کہ.....“ مور دھنکا شمعتے شمعتے رک گیا تھا۔ گویا غور سے کسی کو دیکھنے لگا ہو۔ سامنے سے مور نی چلتی آری

تھی۔ وہ سفید تھی، براہمگیری میں سفید اور دا جی سی۔ بلکہ بد صورت سی۔

”زمرے کہا تھا کہ زندگی میں چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ میری keeper نہیں گی۔ میرا خیال رکھیں گی۔ میری حفاظت کریں گی۔ مگر کوئی بھی میری حفاظت نہیں کر سکتا۔“

”تم غصہ ہو سب پر؟“ مورنی اب مور کے گرد چکر کاٹ رہی تھی۔ گول، گول۔

”میں دلکھی ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔“

”جیسے یہ نسب پھر سے دہرا یا جائے گا اور تم اس دفعہ سروائیور نہیں کر پاؤ گے۔“

وہ چونکہ بھی نہیں سکا۔ اس کی توجہ موروں پر تھی۔ مور کسی راجحہ کا کی طرح پر پھیلائے اکڑ کر کھڑا تھا اور مورنی اس کے گرد گھوے جا رہی تھی۔

”ہاں۔ مجھے اندر سے یہی خوف لاحق ہے۔ کہ میں پھر سے کسی ٹریجڈی کا شکار ہو جاؤں گا۔“

”کیا تم نے اس خوف کو اپنے اندر سے کاٹنے کے لئے کچھ کیا ہے؟“

”کیا کروں؟“

”سوچو۔ کوئی راستہ نہ کالو۔“ وہ آواز گوک درو سے آ رہی تھی مگر اس میں رعب تھا۔ اثر انگیز تھی۔ ایسی مضبوطی کہ وہ اسے جھٹا بھی نہیں سکتا تھا۔ جیسے اس کا حکم مانے پہ مجبور ہو۔ نظریں موروں پر تھیں۔ مورنی اب مور کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

”کیسے نہ کالوں راستہ؟“

”صرف تم نکال سکتے ہو راستہ۔“

”مجھے انصاف چاہیے۔“

”ہم زندگی میں اکثر چیزوں کی تمنا کر کے سوچتے ہیں کہ جب مجھے یہ میں بہت خوش ہو جاؤں گا۔ غلط۔ خوبی ہمارے اندر ہوتی ہے۔ اگر کچھ نہ ہو کر بھی ہم خوش نہیں ہیں تو کچھ پا کر بھی نہیں ہوں گے۔ ابھی سے ٹھیک ہونے کی مشق کرو گے تو ٹھیک ہو بھی جاؤ گے۔“

”کیا کروں؟“ اس کا وجہ کمزور پڑ رہا تھا۔ آواز کمزور تھی۔

”انصار ڈھونڈو۔ مگر یہ بھی سوچو کہ اگر انصاف نہ ملا تو کیا تم سنبھل سکو گے؟ کیا دوبارہ اٹھ کھڑے ہو سکو گے؟“

”کیا ہو جاؤں گا؟“

”ہاں۔ ہو جاؤ گے۔“ آواز میں یقین تھا۔ مضبوطی تھی۔ دھونس تھی۔ اس کا اثر دل تک ہوتا تھا۔ اس کا اثر دماغ پر بھی ہوتا تھا۔

”کیا کرنا ہوگا مجھے انصاف کے لئے؟“

”جو کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔ نہ میں کچھ کر سکتی ہوں نہ بابا نہ زمرہ نہ فارس۔ سب نے اپنی اپنی کر کے دیکھ لی۔ مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے ہاشم کو اس مقام تک لانا چاہا کہ وہ تمہارا مقابلہ کوڑت میں کرے، مگر کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔ صرف تم یہ کر سکتے ہو۔“

اب چپ چاپ اپنی مورنی کے قریب بیٹھ گیا۔ پروں کو سمیت لیا تھا۔

”میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں خود گنگہ کار ہوں۔“ اس کی آواز کا پنی۔

”یہاں سب گناہگار ہیں سعدی۔ ہر ایک کو برے کاموں اور بری لتوں نے جکڑ رکھا ہے۔ کوئی اپنے گناہگار ہوں کو جسمی فائی کرتا، بتا ہے اور کوئی سیاہ کاریوں کے اندر ہیرے میں بھی نہ سادیا جلاۓ رکھتا ہے۔ سب ہی گناہگار ہیں۔ تم ہو تو کیا بڑی بات ہے؟“

”میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟ جو کوئی نہ کر سکا وہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟“

”کیونکہ تم ہمیشہ وہی کرتے آئے ہو جو کوئی اور نہیں کر سکا۔ میں نے عرصہ پہلے تمہیں کہا تھا، تمہارے اندر ایک ہی خوبی ہے۔ تمہاری باتیں۔ اس کو استعمال کرو۔ ایک دفعہ پھر.....“

موروں کے جوڑے نے یا کیک کسی شے کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں اٹھ کر آگے کو بھاگے۔ کھڑکی سے نظر آتے لان کے حصے سے وہ غائب ہو گئے۔ سعدی نے چونکہ کرا سے دیکھا۔ دھیرے دھیرے اس کے شل اعصاب بیدار ہونے لگے تھے۔ اس نے آنکھیں ملیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اسی طرح سادگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا میں.....؟“ وہ پوچھ بھی نہیں سکا۔ وہ جیران تھا۔ وہ اچنبھے میں تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا تمہارے ساتھ۔ تم معمولی سے hypnosis (عالمِ تنویم) میں تھے۔ جیسے کوئی کتاب پڑھتے ہوئے کوئی فلم دیکھتے ہوئے ہم اس میں کھو جاتے ہیں۔ تم بھی گہرے خیال میں تھے۔“ سعدی چند نہایتیے اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر ہوا۔ ”میں چلتا ہوں۔“

”میری باتوں پر غور کرنا!“ اس نے تاکید کی تھی۔ وہ ہلاکا سامسکرا کر سر ہلار ہاتھا.....

(آج)

”پہلی دفعہ آپ کا ہاشم کاردار سے تعارف کب ہوا تھا؟“ آبدار نے پھرہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ کورٹ روم میں پیشی کی اور دور سامنے کٹھرے کے نیچے کھڑی زمر سوالات کر رہی تھی۔ وہ سنجل کر سیدھی ہوئی۔

”آٹھ سال پہلے، جب وہ اپنے مرحوم والد کے ساتھ میرے گھر آئے تھے اپنے دیسے کا کارڈ دینے۔“ اسٹینڈ میں کھڑا سعدی بتا رہا تھا۔

”آپ کا ان کے بارے میں پہلا تاثر کیا تھا؟“

”یہی کہ وہ ایک بہت اچھا آدمی ہے۔“

”اور اب آپ کو لگتا ہے کہ آپ غلط تھے۔“

”آب جیکشن یور آزر!“ پیچے بیٹھا ہاشم پکارا تھا۔ ”مسز زمر گواہ سے رائے مانگ رہی ہیں۔“ (گواہ سے گواہی یعنی fact اماگے جاتے ہیں، رائے نہیں۔) ہاشم نے ایک دوبارجی سے اعتراضات کے علاوہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

”نچ صاحب نے زمر کو اشارہ کیا، اس نے سرکوفم دیا۔ Sustained“

”نوشیر وال کاردار سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟“

”چند دن بعد جب میں ہاشم کاردار کے گھر گیا۔“

”ابھی آپ کو ان سے ملے چند دن ہی تو ہوئے تھے اور آپ ان کے گھر بھی چلے گئے۔“

”میں اس لئے گیا تھا کیونکہ وہاں میرے ماموں رہتے تھے۔ واپسی پر میں ہاشم کی طرف چلا گیا۔“

”اور پھر؟“

”میں اسٹینڈ میں تھا جب میں نے کراہنے کی آواز سنی۔ دیکھا تو ساتھ والے کمرے کی بالکلوں میں نوشیر وال گراپا ہے۔ وہ ڈرگز کی اور ڈوز کی وجہ سے قریب المگ لگتا تھا۔ میں نے میری امبوچیو کو کارنکلوانے کا کہا اور پھر ہم اسے ہاسپل لے گئے۔ بہر حال وہ جلد ٹھیک ہو گیا۔“

”آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے اسکی جان بچائی!“

”میں کہہ نہیں رہا۔ سب گواہ ہیں اس کے۔“

”اوے!“ زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ لکھیوں سے وہ مسلسل نجح صاحب کے تاثرات بھی دیکھ رہی تھی۔ وہ اب تھوڑی تباہی تھی۔ جمائے کہنی ڈیک پنکائے متوجہ مگر سپاٹ چہرے کے ساتھ سعدی کو دیکھ رہے تھے۔  
”مسز کاردار سے آپ کا کیا تعلق تھا؟“

”میں اپنی اور مسز کاردار کی تمام ای میلز کاریکار ڈکورٹ کورٹ میں جمع کراچکا ہوں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجھے اپنے بیٹے کی جائی کرنے کے لئے کہتی تھیں اور میں محض اس کی بھلانی کے لئے ان کو بتا دیتا تھا اگر نوشیر وال کسی غلط کام میں ملوث ہوتا تو۔ بہت دفعہ میں نے نوشیر وال کا پردہ بھی رکھا، مگر یہ ایک ماں کا حق تھا۔“

”لیکن جب نوشیر وال کو آپ کے سامنے یونی میں مارا پینا گیا تو آپ نے اسے کیوں نہیں بچایا؟“

”میں نے اپنے انٹرو یو میں بتایا تھا کہ میں نے اس لئے نہیں بچایا کیونکہ ہاشم کاردار نے مجھے منع کیا تھا، کیونکہ اس نے خود اپنے بھائی کو پٹوایا تھا تاکہ وہ اس کی دوست آبدار عبید کو تنگ نہ کرے۔“

”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ جواہرات بے یقین تھی۔ ہاشم ابروا کٹھے کیے آگے کو ہوا۔ وہ متھیر تھا۔

”کیا اس کو پتہ تھا بھائی!“ نوشیر وال کا ساغرایا۔ ہاشم خود بھی چونکا تھا۔ ”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔“ وہ حیران تھا۔

”سو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہاشم جس بڑی کو پسند کرتا تھا نوشیر وال اس کو ہر اس کرنے لگا تھا، سو ہاشم نے اپنے ہی بھائی پٹوایا؟“ زمر کے لمحے میں بے یقین تھی۔ ہاشم ابروا کٹھے کیے آگے کو ہوا۔ وہ متھیر تھا۔

”جی۔ جیسا کہ میں نے اپنے انٹرو یو میں کہا تھا، ہاشم کی میل ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے، اور میں اس کی کاپی آپ کو دے دیا ہوں۔ آپ اس سے اندازہ کر سکتی ہیں کہ ہاشم ہی اپنے بھائی کا دشن تھا، میں نہیں۔“ وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

جب زمر نے ایک کاغذ نجح صاحب کو اور ایک ہاشم کو پڑایا تو ہاشم نے تیزی سے ناک پر عینک لگائی اور اسے پڑھا۔ جواہرات اس کے کندھے سے جھک کر اسے پڑھ رہی تھی۔ سعدی اور زمر نے مسکراتی نظروں کا بتا دل کیا۔ یوں لگتا تھا دفاع کی کرسیوں پر کھلبی سی مچ گئی ہو۔ ”یہ تہار لاکھنے کا اشتاکل ہے۔ ای میل بھی درست لگ رہی ہے۔ فارنزک میں بھی درست ثابت ہو گی ورنہ زمر اس کو جمع نہ کرائی۔

ہاشم یہ کیا ہے۔“ جواہرات نے تملکا کر اسے گھوڑا۔ وہ نفی میں سر ہلارہا تھا۔

”یہ درست ہے مگر یہ کسی نے بیک ڈیٹ میں جا کر اب بھی ہے، کوئی جس کو ان امور میں مہارت ہو اور.....“ چونکہ کراس نے گردن موڑی۔ استغاش کی کرسیوں پر پیچھے پیٹھی ہنسنی کو دیکھا۔ وہ (نجح صاحب سے نگاہ بچا کر) ہاتھ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر ہاتھ اٹھا کر، ہتھیلی ہاشم کو دکھائی۔ BINGO۔ ہاشم نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر شانے اپکا کر سامنے دیکھنے لگی۔

ہاشم گھری سانس لے کر سیدھا ہوا۔ ”وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔“ اس نے مدھم سر گوشی کی۔ ”وہ کہہ رہا ہے کہ یہ سب میں نے انٹرو یو میں کہا تھا۔ یہ حق ہے کہ وہ یہ سب انٹرو یو میں کہہ چکا ہے۔ وہ نہیں کہہ رہا کہ ایسا ہوا بھی تھا۔ technically یہ جھوٹ نہیں ہے اور وہ پڑا نہیں جا سکتا۔ لعنت ہے۔“

”تو اس نے انٹرو یو نیا کوایو شنل کرنے کے لئے نہیں دیا تھا؟ بلکہ عدالت میں اپنے الفاظ کی ہیرا پھیری کرنے کے لئے دیا تھا۔“

”میں نے ایک دفعہ بھی اس کا انٹرو یو نہیں سنایا۔“ ہاشم کاغذ لے کر اٹھا۔

”یور آئریہ ای میل خود ساختہ ہے، میں نے ایسی کوئی میل سعدی کو نہیں کی۔“

”وریکلی ہاشم؟ کیا تم پر دو کر سکتے ہو؟“ زمر نے سادگی سے آنکھیں جھپکائیں۔ ہاشم گہری سانس لے کر واپس بیٹھ گیا۔ ایک تینی نظر سعدی پڑا۔ اس نے بھی مسکرا کرندھے اپکائے تھے۔

زمر واپس سعدی کی طرف گھوئی۔ استغاثہ کے تباخ میں واضح تبدیلی آئی دکھائی دیتی تھی۔ مسکرا ہمیں بڑھ چکی تھیں۔ آرام دہ ماحول بن چکا تھا۔ زمر نے اگلا سوال پوچھنے سے پہلے غیر ارادی طور پر انگلی میں پہنی انگوٹھی کو گھا کر پیچھے دھکیلا۔ اس کا نیلا ہیرے جیسا پچکتا نگینہ ڈھیروں روشنیاں پھوٹنے لگا۔ ایسی خوبصورت روشنیاں کہ اگر تم ان میں دیکھنے لگو تو تمہاری آنکھیں چند صیا جائیں، اور پھر تم کچھ اور نہ دیکھ سکو.... ہیروں جیسی روشنیاں.....  
(دوماہ پہلی)

اور جب یہ روشنیاں چھپیں تو سامنے ایک خوبصورت وادی تھی۔

سہر پہاڑوں کے درمیان میں کھاتی نیلی سڑک کی آبشار کی طرح اوپنجائی سے نیچے گر رہی تھی۔ سڑک پر چہل قدمی کرتے سیاح، دکانوں کا رش، اپنا اپنا سامان بیچتے خوانچ فروٹ، اور پتیرتے بادل، ان سب سے بے نیاز وہ دونوں سڑک کنارے چلتے اور پرستے نیچے آرہے تھے۔ فارس نے اپنی بھوری جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھتے تھے، سر پر کیپ تھی، اور زمر سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بال ڈھیلے جوڑے میں باندھے، گردن جھکائے قدم قدم نیچے اتر رہی تھی۔ دفعتاً اس نے سراہیا اور کچھ اداسی سے باہمیں طرف چلتے فارس کو دیکھا۔

”ہم بیہاں کیا کر رہے ہیں؟ بلکہ میں ادھر لیکا کر رہی ہوں؟ مجھے تو اس وقت کو رہ میں ہونا چاہیے تھا۔“

فارس کے چہرے پر خفیٰ ابھری۔ کیپ والا سر موڑ کر اور آنکھیں سکوڑ کرائے دیکھا۔

”کیا ہم نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کم از کم ان تین چار دنوں میں ہم نو شیر داں کے ٹرائل کی بات نہیں کریں گے۔“

”میں اس ٹرائل کی بات نہیں کر رہی۔ کل اس کی پیشی تھی اور نہ ہاشم گیانہ میں۔ میں اپنے کو رٹ کیسز کی بات کر رہی ہوں۔ میں ایسے ہی ادھر آگئی۔ میرا تنا کام پڑا تھا پیچھے۔“ اس نے سر کو ذرا جھٹک کر گال کو چھوٹی گھنٹریاں لٹ پرے ہٹانی چاہی۔ (گرم جیبوں سے ہاتھ نہیں نکالے۔) لٹ کان تک گئی اور پھسل کر واپس گال پا آگئی۔

”جی ہاں۔ جانتا ہوں۔ پتہ ہے مجھے آپ دکیل کیا کرتے ہیں۔ لمبی لمبی فیسیں لے کر تاریخ پر تاریخ دیتے جاتے ہیں۔ آپ کی چند دن کی غیر حاضری سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ویسے بھی عدالت میں جا کر آپ نے جھوٹ ہی بولنا ہوگا۔ اچھا ہے نا، چند دن آپ کے اس باہمیں کاندھے والے نگہبان کو ریسٹ ملے گا۔“

”ہاں ہاں تم تو جیسے جیل میں نعمتیں پڑھتے تھے۔ لٹگر بٹوایا کرتے تھے۔“ وہ مسکرا کر گرنڈنڈی سے بولی تھی۔

فارس نے جیبوں سے ہاتھ نکال کر جیکٹ کا لرجھکا۔

”سوشل ورک کرتا تھا میں۔“

”ہاں، کسی کی پہلی توڑی تو کسی کا جزا۔ سوشل ورک رائٹ!“

”استغفار اللہ۔ کیوں میری مقبولیت سے حلتی ہیں؟“ وہ مسکرا ہت دبا کر سمجھیگی سے کہہ رہا تھا۔ ٹھنڈی سی سرمی سڑک کے ارڈر د پھیلے سہر پہاڑوں سے قطعاً بے نیاز وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔ ”جیل میں لوگ مجھے پسند کرتے تھے۔“

”غلط۔ تم سے ڈرتے تھے۔“

”کچھری میں لوگ آپ سے نہیں ڈرتے کیا؟“

”میری عزت کرتے ہیں۔“

”جی ہاں بڑی عزت سے آپ کو چڑیل کہتے ہیں۔“

”فارس غازی!“ وہ خنگی سے ایک دم گھوم کر اس کے سامنے آئی۔ فارس کے قدم رک گئے۔ مسکراہٹ دبا کر اس کے چہرے کو دیکھا جو برہمی سے تمتمانے لگا تھا۔

”ہم تین دن کی بریک پا آئے ہیں اور تم اس طرح کی باتوں سے باز نہیں آئے جو مجھے غصہ دلاتی ہیں۔“

”آپ کو کون سی باتیں غصہ نہیں دلاتیں۔“ مگر اس نے انگلی اٹھا کر تنی ہی کی۔

” وعدہ کرو مجھ سے کہ کم از کم ان تین دنوں میں اب تم کوئی بد کلامی نہیں کرو گے۔“ فارس نے تابعداری سے دونوں ہاتھ اٹھادیے۔

”ریلی سوری۔ میں واقعی چاہتا ہوں کہ ہمارا یہ سفر خوشگوار رہے۔ اس لیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان تین دنوں میں..... کوئی سچ نہیں بولوں گا۔“

اسے پھر سے غصہ آیا مگر نہیں دی اور سر جھٹک کر واپس چلنے لگی۔ وہ بھی مسکرا کر نیچے اترنے لگا۔ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ کندھ سے کندھا، کہنی سے کہنی۔ برابر۔ ہم قدم۔

رش بڑھ رہا تھا۔ وہ جس گلی میں اتر آئے تھے وہاں دونوں اطراف میں دکانیں تھیں۔ لوگوں کا شور، گھما گھمی عروج پڑھی۔ کہیں تک پکڑوں اور بار بی کیوں کیوں مہک بھی آتی محسوس ہو رہی تھی۔ زمر نے شاپس کی قطار کو دیکھ کر کہا۔

”ویسے تم نے مجھے کبھی گفت نہیں دیا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔ فارس نے بے لیقی سے اسے دیکھا۔

”اور وہ جسے آپ میرے تیرے سر کے حوالے کر آئی تھیں وہ کیا تھا؟“

”اوہ بھو!“ زمر نے ناک سکوڑی۔ ”تب میں تمہاری بیوی نہیں تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اب مجھے پکھ لے کر دو۔ ڈھیر سار پیسے خرچ کر کے ایک تینی سا گھٹ۔“

”مفت تو وہ لوگ بھی نہیں تھی۔ اس میں solitaire ڈائمنڈ تھا۔ پتہ ہے کتنے کا آتا ہے؟“ وہ جل کر بولا تھا۔

”اُف فارس!“ اس نے شدید خنگی سے اسے دیکھا۔ دونوں وادی کے بازار کے بیچ میں سڑک پر آمنے سامنے رک کھڑے ہوئے تھے۔

”اب کیا تھنخ کی قیمت بتاؤ گے؟“

”بل بھی دکھا سکتا ہوں۔“

”کتنے کبوس ہو۔ ایک تھنک تھنک نہیں لے سکتے میرے لئے۔ پہلی بیوی کو تو بہت تھنخ دیتے تھے۔ ساڑھیاں ہینڈ بیگز۔“

”اس کو شوق تھا۔“

زمر نے پلکیں جچکا کر کھولیں۔ ”مجھے نہیں ہے کیا؟“

”تمہیں؟“ فارس ہنسا اور ناک سے مکھی اڑائی۔ ”تمہیں ساڑھیاں اور ہینڈ بیگز کوں دے۔ تمہارے لئے سب سے بڑا تھنخ پتہ ہے کیا ہو گا؟ کسی وکیل کے کپیوڑ کا ڈیا چرا کر دے دوتا کہ تم اسے بلیک میل کر سکو۔ کسی کے غیر قانونی پلاٹ قبضے کے خلاف ثبوت اکٹھے کر کے، تاکہ تم اس کو جیل بھیج دو۔“ تمہیں میں اس طرح کے بہت سے تھنے دے سکتا ہوں۔ چلو بتاؤ شروع کہاں سے کریں؟“

زمر نے خنگی سے اس کی کہنی پر ہمیل بند کر کے ماری اور پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے پیچھے آیا۔ ”یار میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔“ پھر کا۔ آنکھوں میں چک اتری۔ ہلکا سامسکرایا۔ ”بلکہ میرے پاس پیسے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے“ میرے پیسے۔

”وات ایور۔ تم بتاؤ تمہیں کیا چاہیے۔“ اس کے انداز پر دہ رکی، گردن گھما کر ابوالث کر اسے سوالیہ انداز میں دیکھا۔ فارس نے سر کو خم دیا۔

”مجھے؟“ اس نے لب آپس میں مس کیے اور پرنگاہیں اٹھا کر سوچا۔

”مجھے ڈائمنڈز چاہیں۔ بہت خوبصورت اور قیمتی ڈائمنڈز۔ بلکہ ادھر مارکیٹ میں آگے جا کر بہت اچھے چیزوں زیورات ہیں۔ چلو میرے ساتھ اور مجھے کچھ لے کر دو میں بہت خوش ہوں گی۔“

”جو حکم!“ وہ گھری سانس لے کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ (ہاں یہ خوش ہو لیں؛ اگلا بندہ چاہے کنگال ہو جائے۔ ڈائمنڈز چاہیں۔ ہونہے۔) پھرے کے زاویے میں بڑے سے تھے۔

چند ثانیے دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ مختلف بولیاں اور شور سنتے رہے۔ پھر وہ بولا۔ ”ویسے تم نے اس سب سے پہلے کبھی میرے بارے میں سوچا تھا؟ بر سوں پہلے۔“

”ان بالوں کا اب کیا فائدہ فارس؟“

” بتاؤ نا۔“ وہ مصروف تھا۔ پھر ایک دم سمجھنے والے انداز میں بولا۔ ”ویسے میں جانتا ہوں کہ تمہارے لئے یہ یاد کرنا مشکل ہو گا، کیونکہ تم فطرتاً ایک انتہائی خود غرض سیلف سینٹر ڈاکی واقع ہو لیکن پھر بھی۔ کبھی موقع ملکی دوسرے انسان کے بارے میں سوچنے کا؟“

زمر چپ رہی۔ تھوڑی دیر تک کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے چلتی رہی۔

”تم مجھے بارے کبھی نہیں لگے۔ بلکہ میں تمہاری بہت عزت کرتی تھی۔ ہمیشہ تمہیں ہاشم سے کمپیز کرتی تھی۔ تمہاری سب کے سامنے تعریف کرتی تھی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تمہارا میرے لئے پر پوزل آیا ہے تو میں کبھی انکار نہ کرتی اور سوچنے کے لئے ایک دن سے زیادہ وقت نہ لیتی۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرا یا۔ ”مجھے نہیں پتہ تھا تم شروع سے مجھ سے محبت کرتی تھیں۔“

”ایک منٹ۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ وہ غصہ ہوئی تھی۔

”مجھے تو صرف یہی سنائی دیا ہے۔“

وہ اور بھی بہت کچھ کہنے لگا، پھر رک کر ساتھ چلتے ایک ریڑھی کو دیکھنے لگا۔ اس پر رنگ بر گنگی ڈھیروں چیزیں رکھی تھیں۔ کلپ، پنیں، جیواری۔ زمر نے اس کی لگا ہوں کا تعاقب کیا۔

”تمہیں اچھی لگی یہ فارس؟“ وہ ایک انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔

وہ چونکا پھر منجل کر مسکرا یا۔ ”نہیں میں اس لئے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اور میں مذاق کر رہا تھا۔ میرے پاس ہیں پیسے۔ میں تمہیں کسی اچھی سی جیواری شاپ سے قیمتی ڈائمنڈز لے دوں گا۔ چلو۔“

مگر وہ نہیں ہلی۔ آگے بڑھ کر ریڑھی سے پلاسٹک ریپر میں لپٹی انگوٹھی اٹھائی اور الٹ پلٹ کر دیکھی۔ پھر فارس کو دیکھا۔ ”تم مجھے یہی لے دو۔“

”مذاق اڑاہی ہو کیا؟“ وہ دبی آواز میں خنگی سے بولا۔

”اوہ ہو۔“ وہ طمانیت سے مسکرا یا۔ ”مجھے قیمتی زیور چاہیے تھا۔ مہنگا نہیں۔ اتنا تو پڑھ سکتی ہوں تمہیں کہ معلوم ہو جائے یہ اچھی لگی ہے تھوڑوں کی قیمت نہیں دیکھی جاتی، ان کے ساتھ جڑی فیلنگر دیکھی جاتی ہیں۔ فرمائیں قیمتی چیز کی کرنی چاہیے، ضروری نہیں ہے کہ وہ مہنگی ہی ہو۔“ اس نے ریپر فارس کی طرف بڑھا یا۔ وہ ہلکا سامسکرا یا اور پھر والٹ نکال کر ریڑھی بان کو ادا نیگی کرنے لگا۔

چند لمحے بعد وہ دونوں وہیں ٹھیلوں اور اسناز کے ساتھ کھڑے تھے اور فارس وہ نئی پتھروالی ہیروں کی سی چک لئے انگوٹھی اسے پہنا رہا تھا جو دوسرا بچا س روپے کی تھی۔ زمرنے اسے پہن کر ہاتھ اور پاٹھا کر دیکھا۔  
سورج کی کرنوں کے نقلی ہیرے سے ٹکرانے پر اصلی روشنیاں پھوٹے گئی تھیں۔ یوں کہ سارے پروشنی چھائی..... تیز نیل روشنی.....

## (آج)

جب وہ بھی تو انگوٹھی زمرکی انگلی میں تھی، اور ہاتھ سے اوپر کلائی پر سیاہ کوت کی آستین جھلکتی تھی۔ نظر اٹھا کر دیکھو تو وہ اس روشن ت کمرہ عدالت میں کٹھرے کے سامنے کھڑی تھی اور سعدی یوسف سے پوچھ رہی تھی۔

”قید کے دوران آپ سے کون کون ملنے آتا تھا؟“

”ہاشم کا ردار جواہرات کا ردار، کرمل خاور جس کو بعد میں میرے ساتھ قید کر دیا گیا، اس کے علاوہ چند ایک بار آبدار عبید آئی تھیں۔“  
وہ سپاٹ سے انداز میں بتاتا گیا۔ حاضرین میں بیٹھی آبدار سر جھکا کر مو بال دیکھنے لگی۔

”میں جانتی ہوں یہ آپ کے لئے تکلیف دہ ہو گا سعدی، لیکن کیا آپ قید کے پہلے روز سے آخر روز تک کی داستان مختصر ایہاں سنانا چاہیں گے۔“

”جی بالکل یہ میرے لئے تکلیف دہ ہے۔“ سعدی نے کرب سے آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں۔ ”مگر اپنی کہانی کا آن کہایا آن سنارہ جانا زیادہ تکلیف دہ ہے۔ بہر حال، جیسا کہ میں نے اپنے انشرو یو میں بتایا تھا، مجھے سب سے پہلے ایک ہبتال لے جایا گیا، وہاں ایک دفعہ میں نے با تھر دوم کے روشن دان کو.....“

اور ہاشم نے تپ کرنٹی میں سر جھکنا تھا۔ ”واہ۔ اب یہ انشرو یو کے نام پر اپنی مرضی کی کہانی کا نٹ چھانٹ کر کے سنائے گا۔“  
سعدی کو دیکھو تو وہ کٹھرے پر ہاتھ رکھ کر اکھانی سنارہ تھا۔ اس کے لب ہل رہے تھے مگر اسے خود کو اپنی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بھوری آنکھوں میں بھورے شعلے سے جل بجھ رہے تھے۔ ہر دفعہ پلکیں جھکنے پر نیا منظر اکھرتا، اور ایسے تیزی سے ابھرتا کہ دیکھنے والا اندر ڈوب جائے۔ دوار اندر.....

## (دو ماہ پہلے)

مورچاں میں زمر اور فارس کی غیر موجودگی نے عجیب ویرانی کر رکھی تھی۔ جنین کونت نے شوق چڑھ گئے تھے۔ ہر وقت گھر کے کسی کو نے میں کھڑی ہوتی گرن اٹھائے تقدیمی لگا ہوں سے درود یو رکا جائزہ لینے نظر آرہی ہوتی تھی۔ بلکہ نظر کہاں آتی تھی۔ وہ تو مصروف ہو گئی تھی۔ بیٹھ کر خاکے بناتی رہتی یا ہوم امپرومنٹ اور ہوم ڈیکور کی ویب سائٹس دیکھتی رہتی۔ اب وہ لوگوں سے بات کم کرتی تھی، ان کے پیچھے کھڑکی دیواریں زیادہ دیکھتی تھیں۔ یہاں ایسا فریم لگا وسیع ایسا تھری ڈی آرٹ ٹھوکوں۔ یہاں وال مورال ہونا چاہیے۔ یہ وہ۔

ایسے میں سعدی اپنے کمرے میں یونہی اوس سامانجا تھا۔ دروازہ ھلکا تھا اور سامنے والے کمرے سے ندرت کی لیٹازنے، ڈائٹنے اور پھر رک کر سمجھانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مخاطب اسامہ تھا جو اکھڑا اکھڑا اساما بیٹھا تھا۔ قد لمبا ہوا، مگر سمجھنیں۔ ندرت کا موقف تھا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے سیدھا گھر آئے گا۔ اور اگر تمہارا کوئی دوست کبھی گھر کے دروازے تک آیا تو میں نے جو تھا کر اسے مار مار کر دیں گنجایا ہے۔ یہ گھروں تک لانے والی دوستیاں ذرا پسند نہیں مجھے۔ آگے سعدی کی مشائیں۔ اسامہ کو برا لگ رہا تھا۔ ”میں کوئی برے لڑکوں سے دستی تو نہیں کرتا۔ اور سعدی بھائی کا زمانہ اور تھا۔ اور آپ مجھ پر شک کیوں کرتی ہیں۔“

سعدی آرام سے اٹھا اور دروازہ بند کر دیا۔ آوازوں کا راستہ رک گیا۔ جانتا تھا یہ مسئلہ اگلے پانچ چھ سال تک حلیں گے۔ بچوں کی آنکھوں پر بندھی پی اترنے کے لئے کم از کم بھی بیس سال کی عمر کو پہنچنا ہوتا ہے۔ کھینچنے اور نوچنے یا سوراخ چھیدنے سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ بس دھیرے دھیرے پی ڈھیل کرنی ہوتی ہے، بہت سی باتوں سے صرف نظر اور ڈھیر ساری توجہ۔ مگر ابھی وہ امی کو سمجھانے کے موڑ میں نہیں تھا۔ ابھی وہ خود سمجھنا چاہتا تھا۔ اپناد ماغ سوچوں سے خالی کرنا چاہتا تھا۔ کوئی روزن کھلنے کوئی روشنی آئے۔ وہ اسٹری ٹیبل پر آبیٹھا۔ یاس کے چھوٹے باعیچے والے گھر سے مختلف اور زیادہ خوبصورت تھی۔ مگر اجنبی لگنی تھی۔ کونے میں چند کتابوں کے اوپر قرآن مجید رکھا تھا۔ سعدی نے اسے اٹھایا اور چند لمحے اس کتاب کو ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا۔ وہ بھاری تھی مگر دلوں کو ہلاک کر دیتی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے صفحے پلاتا۔

”میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کی دھنکارے ہوئے شیطان سے۔“

”اور کہا انہوں نے جنہوں نے کفر کیا کہ جب ہو جائیں گے ہم مٹی اور ہمارے باپ دادا بھی تو کیا ہم (پھر قبروں سے) نکالے جائیں گے؟ بلاشبہ ہوتا ہے ہم سے یہ وعدہ۔ ہم سے اور ہمارے باپ دادا سے اس سے پہلے نہیں ہیں یہ مگر پہلوں کی کہانیاں۔ کہہ دو کہ چلو پھر روز میں میں پھر دیکھو کہ کیا انجام ہوا مجرموں کا اور نغم کرنا ان پر اور نہ تنگی میں ہونا اس سے جو چالیں یہ چل رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کب ہو گا یہ وعدہ پورا اگر تم پھومن میں سے ہو۔ کہہ دو شاید کہ آپنچا ہونزد یک تھہارے پکھا اس میں سے جس کی تم جلدی کر رہے ہو۔“

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”اللہ تعالیٰ میرا دل بہت ٹوٹا ہوا ہے، بہت دیراں ہے، اور اب میں امید بھی کھوتا جا رہا ہوں کہ کبھی مجھے بھی انصاف ملے گا کیا؟ دور اندر مجھے لگتا ہے کہ میں بھی تو گناہ کار ہوں۔ کسی قتل کا الزام لگایا ہے، قتل بھی کیے ہیں۔ یہی تو ہاشم کے جرائم تھے۔ قتل کا الزام فارس پر اور دو لوگوں کا قتل۔ گناہ ویسے ہی ہیں تو کیا گناہ کار بھی ویسا ہی ہوں؟“ ہولے سے سر جھکا۔ ”پہنچنیں میرے ساتھ کیا ہو گا لیکن کیا ان کے ساتھ کسی کچھ ہو گا یا نہیں؟ کیا مجھے انصاف ملے گا اللہ؟ مجھے قیامت والے حساب سے پہلے یہاں کا حساب چاہیے۔ تاک کوئی تو عبرت پکڑے۔ مگر اللہ تعالیٰ، جب انسان کے باپ دادا کو سزا نہیں ملتی، والدین کو ان کی سیاہ کاریوں کے باعث کوئی نہیں پکڑتا یا خود ہمارے ماضی میں ہمارے گناہوں پر کوئی پکڑنیں ہوتی، تو ہمیں لگتا ہے کہ وہ گناہ justified ہے۔ اللہ کو وہ برے نہیں لگے۔ ہم نے گناہ کرتے جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ ایسے فتوے اور ایسی فحیمتیں پہلے بھی سن رکھیں مگر اللہ راضی ہے ہم سے۔ لیکن اللہ کی شریعت flexible ہے نا۔ کہ ہر کسی کے لئے الگ الگ رخ پر مڑ جائے۔ اصول تو برابر ہیں۔ سب کے لئے۔ پھر ہم اتنے لاپرواہ کیوں ہوتے جاتے رہے ہیں؟ پھر وہ لوگ اتنے لاپرواہ کیوں ہیں؟“ اور پھر وہ چونکا۔ ”لیکن اگر میں یہ سمجھوں کہ ان کو سزا نہیں ملے گی ان کے باپ دادا کی طرح تو یہ ”کفر“ ہے۔ امید چھوڑنا کفر ہے۔ تو پھر....“ اس نے اچنچھے سے کلامِ مجید کے اوراق کو دیکھا۔ ”کیا میں امید رکھوں؟ کیا میں زمین میں چل پھر کر دیکھوں؟ ان تمام کیسز کو دیکھوں جن کے فیصلے آئے تھے؟ ان تمام لوگوں کا انجام دیکھوں جو عدالتی حکم کے بغیر ہی قدرتی آفات کا شکار ہوئے تھے؟ تو کیا ہمیں کبھی امید نہیں چھوڑنی چاہی؟ میں غم کو ترک کر دوں، دل کی تنگی سے خود کو نکالوں اللہ؟ ان آیات پغور کرو تو میرے

کرنے کا کوئی کام نہیں ہے، انصاف اور عذاب اللہ دے گا، مجھے بس وہ یہ کہتا ہے کہ غم نہ کرو۔ دل کی تنگی کا شکار نہ ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں امید لے جاتی ہیں۔ ان لوگوں کی مدت شاید قریب ہو، بہت قریب۔ میں نے کچھ نہیں کرنا۔ صرف ترک غم کرنا ہے۔ یہ وسائل بیسے تعلقات، عدالتی کا روای کی جگہ ہے اور غم مجھے گھول دے گا۔ مجھے اب غم نہیں کرنا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی بات ماننی ہے۔ اللہ

تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم، اپنی اپنی کشادگی کا انتظار کرتے ہم لوگ اپنے آپ کو غنوں اور ڈپریشن سے نکالیں۔ مجھے اب غم نہیں کرنا۔ تب ہی حل نظر آئے گا۔“ وہ بے خودی کے عالم میں بولتا جا رہا تھا۔ لب مل رہے تھے، آنکھوں کے کنارے بھیکے ہوئے تھے مگر اپنی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

(آنچ)

کٹھرے میں کٹھرے سے سعدی نے بھوری آنکھیں زمر پر جمائے گہر انسان لیا۔ خواب ساٹوٹا۔ وہ اب پوچھ رہی تھی۔  
”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”میں یہ بات انڑو یو میں بھی کہہ چکا ہوں، سب جانتے ہیں کہ پھر مجھے لینڈی میں دوبارہ پکڑا گیا، مگر ہاشم کو اطلاع ابھی نہیں کی گئی تھی، یا شاید وہ پہنچا نہیں تھا۔ اگلی صبح ایک آدمی میرے پاس آیا، اور اس نے مجھے بتایا کہ چند دن بعد مجھے پاسپورٹ اور پیسے دے دیے جائیں گے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ مجھے پاسپورٹ دے دیا گیا اور مجھے جانے دیا گیا۔ غالباً وہ لوگ ہاشم سے دغا کر رہے تھے۔ ہاشم کے اپنے پانزہر جیسے کہ ہارون عبید چاہتے تھے کہ میں آزاد ہو کر ہاشم کے خلاف بولوں۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کہا گیا تھا۔ میں پاکستان آگئی اور یہاں آ کر اپنی ویڈیو رویلیز کر دی۔ اب چونکہ میں مشہور ہو گیا ہوں اس لئے یہ لوگ مجھے مارنے کے تھے۔“

”آب جیکشن یور آزا“ ہاشم نے دیہیں سے بیٹھے بیٹھے بے زاری سے کہا تھا۔ زمر نے مڑک رہے دیکھا۔ ”کس بنیاد پر؟ ویسے آپ اپنی باری کا انتظار کیوں نہیں کرتے؟ گواہ کو کراس کرتے وقت سب پوچھ لیجھے گا۔“ ہاشم خاموش ہو گیا۔ زمر واپس مڑی۔

”کیا پاکستان واپس آنے کے بعد آپ سے ہاشم کا درار نے کسی قسم کا رابطہ کیا؟“ سوالات الگاظ سب مدد ہوتے گئے۔ کرہ، عدالت میں گونجتی ساری پاتیں گذمہ ہو کر عجیب سماں پہنانے لگیں.... یوں کہ حرف الگ ہو گیا اور نئے لفظ بننے لگے.....

(دو ماہ پہلے)

ہوشی کے خوبصورت سے بیدروم کے بیچ کلر کے پردے دیوار گیر کٹھری کیوں کے سامنے سے ہٹے تھے اور جالی دار سفید پردے شیشوں کے آگے لہرا رہے تھے۔ پر دوں کی جالی نے منظر کو قدرے دھندا دیا تھا۔ مدد ہم سادھاہی دیتا تھا کہ باہر بالکونی ہے اور نیچے درستک پھلیے بزر پیاز اور ان کے نیچے سبزی وادیاں۔ کٹھری کے آگے دو آمنے سامنے رکھی کر سیاں پڑی تھیں۔ زمر اور فارس مقابل بیٹھے تھے۔ درمیان میں چھوٹی میز تھی جس پر scrabble کا کالج کا بارڈ کھلا پڑا تھا۔ لکڑی کے نئے نئے چوکور مکملوں پر لکھے حروف ان دونوں کے سامنے اسٹینڈز پر پڑے تھے۔ زمر نیک لگائے تاگ پٹا نگ رکھے بیٹھی، پیر جھلارہی تھی۔ وہ آگے ہو کر بیٹھا، غور سے کی یورڈ کو دیکھا۔ بھی اپنے پاس موجود حروف کو۔

”مان لوہار۔ میں تمہیں شرمندہ نہیں کروں گی۔“ زمر نے مسکراہٹ دبائے فیاضی سے کہا تھا۔ آگے کو بھکے فارس غازی نے محض ابرو اٹھا کر سے دیکھا۔

”ابھی وہ وقت نہیں آیا جب آپ سے ہار مانی جائے۔ مجھے سوچنے دیں۔“

”ویسے اتنے سال تم نے جیل میں سوچل ورک کرنے کی بجائے تعلیم کی طرف توجہ دی ہوتی تو پڑھی لکھی یبوی کے سامنے شرمندہ نہ ہو رہے ہوتے۔“ وہ مسکرا کر پیر جھلارہی تھی۔

”آپ مسلسل جذبک کر کے جیت رہی ہیں پڑھی لکھی ہونہہ۔“ مغلی سے سر جھٹکا۔ پھر حروف کو دیکھنے لگا۔

”چچچ۔ ہر ہارنے والا یہی کہتا ہے۔“

فارس نے جواب دیے بنا چند حروف اٹھائے اور پہلے سے ---rise کے پیچے لگا دیے۔ اب وہ یوں بن گیا

zumarise - زمرا یک دم سیدھی ہوئی۔ ”یہ کوئی لفظ نہیں ہے۔“

”نہیں نہیں۔ یہ ایک لفظ ہے۔“ وہ تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ چہرہ اٹھا کر بولا۔ ”اور اس کا مطلب ہوتا ہے، جھوٹ کو حق کے پر دے میں لپیٹ کر پیش کرنا محتاط الفاظ کا چنانہ کر کے عدالت میں حلف دلوا کر گواہ سے جھوٹ بلوانا مگر کہنا“ technically یہ یقین ہے۔ ہر دوسری بات پر کسی شریف انسان کو بلکہ میں کرنا اور دھکانا۔ باقتوں کی ہیر پھر سے اپنا مطلب نکالنا اور دھوں جانا۔ یہ واقعی ایک لفظ ہے۔“

”زمراب آنکھیں تینچھی کر کے اسے گھور رہی تھی۔“ یہ جیتنگ ہے۔“

”نہیں زمراب بی بی یہ ڈبل ورڈ اسکور ہے جو میرے کھاتے میں لکھا جائے گا۔“ اب وہ قلم اٹھا کر نوٹ پیڈ پر بنے کالمز میں سے ایک میں لکھ رہا تھا۔ زمر نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”فارس یہ آخری دفعہ تھا، اب اگر تم نے کوئی لفظ بنایا جو ڈکشنری میں نہ ہو تو تم ہار جاؤ گے۔“

”مجھے یقین ہے یہ ڈکشنری میں ہو گا۔ چیک کر لیں بے شک۔“ ساتھ رکھی دبیزڈ کشنری کی طرف اشارہ کیا۔ زمر ناک سکوڑ کر آگے ہوئی اور اپنی پلیٹ میں لگے حروف پر ٹھوکر نے لگی۔ وہ ایک محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ گھنٹریاں بال کھول کر چہرے کے ایک طرف ڈالے اس کی پلکیں پر چھپی تھیں، اور بار بار حروف کو چھوٹی انگلی میں آنکھوں میں موجود تھی۔ اس نے چند حروف کو دیکھا جو بورڈ پر بجے تھے اور پھر مسکراتی۔ ان کے درمیان چند حروف گھسادیے اور فاتحانہ نظریں اٹھا کر فارس کو دیکھا۔

### Farcissism

”یہ کوئی لفظ نہیں ہے، پر اسکیو ٹرصلحہ۔“ اس کا موڑ خراب ہوا۔

”ہے نا۔“ وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی گرائے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس کا مطلب ہوتا ہے ایک خاص قسم کا برداشت۔ اور جانتے ہو، ایسا برداشت کرنے والا کون ہوتا ہے؟ انتہائی اکھڑ ریزو، کسی پر اعتبار نہ کرنے والا، غصیلاً بد مزاج، ہربات چھپا کر رکھنے والا، ادا کار.....،“ ”او گلڈنگ!“ اس نے نقدم دیا۔

”او گلڈنگ!“ اور ہر وقت لڑنے کو تیار، گھرے راز رکھنے والا، خود کو عقل کل سمجھنے والا، arsonist، جیل یافتہ بلک میلر..... یہ سب ہوتا ہے اس کا مطلب۔“ وہ انگلیوں پر گتوانی کی۔

”استغفار اللہ۔ میں آپ کو ایک شاستہ اور مخدوش مزاج کی خاتون سمجھتا تھا۔“ وہ افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”لفظ بناؤ، گاڑی۔ باتیں نہ بناؤ!“ اس نے چیلنج کیا۔ وہ سر جھک کر اگلا لفظ بنانے لگا۔ m سے اس نے mat بنایا تھا۔ زمر کی نظریں ابھی تک زمرا نز کے ”زی“ پر تھیں جس کے نیچے ڈبل ورڈ اسکور کا خانہ تھا اور ذرا نیچے ٹرپل ورڈ اسکور۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے چوکور ٹکڑے بورڈ پر رکھے۔ زی کے اوپر نیچے حروف سجائے۔

### Ghazi

”یہ جیتنگ ہے۔ یہ لفظ ڈکشنری میں نہیں ہے، اور یہ اصول تھا کہ ہم نام نہیں بنائیں گے۔“

”دنیا تھمارے نام کے گرد نہیں گھومتی یہ ڈکشنری میں ہے۔“ وہ گروں کڑا کر بولی تھی۔

”زمراب بی اگر یہ ڈکشنری میں نہ کلا تو؟“ اس نے ڈکشنری پر ہاتھ رکھا۔ زمر نے جھٹ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”اگر یہ نہ کلا تو میں ہار جاؤں گی، تم جیت جاؤں گے۔ لکھ آیا تو میں جیت جاؤں گی اور تم ہارو گے۔“ فارس کے ہاتھ پر اس کا ہاتھ تھا اور وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”یہ ڈکشنری میں نہیں ہے۔“ وہ چبا چبا کر بولا، کتاب کھینچنے اور اسے کھولا۔ صفحے پلٹائے۔ انگلی دوز اتنا گیا۔ اوپر سے نیچے۔

”بھی اتھج..... بھی اتھج.....“ وہ مطلوبہ کام تک آیا۔ لبوں پر مسکراہٹ غائب ہوئی۔ چونکہ کسر اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھتی مسکراہی تھی۔ ادھر صفحے پر لکھا گازی (مسلم دار ہیر) اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔

”کہا تھا نا“ تھوڑا بہت پڑھ لیا ہوتا جیل میں تو آج کام آ جاتا۔ خیر، میں تمہیں شرمند نہیں کروں گی۔“ وہ آگے کو جھکی اور بازو لمبا کر کے ہاتھ سے اس کا چھپہ تھپتھپایا۔ فارس نے ”اوہ ہوں“ اپنا چھپہ جھٹک کر پیچھے ہٹایا۔ ماتھے پر نفلی سے بل پر گئے تھے۔

”آپ مسلم چینگ کر کے جستی ہیں۔ ہر دوسری باری پر آپ مجھے اسکریبل کانیا اصول بتاتی ہیں جو میرے باپ دادا نے بھی نہیں سن۔ جبکہ میں پوری ایمانداری سے کھیلتا رہا ہوں۔“

”ہاں ایک اس بات کا تو یقین ہے مجھے کہ اب تم میرے ساتھ پورے ایماندار ہو۔ اور یہ بھی کہ کم از کم اب تم مجھ سے کوئی بات چھپا نہیں رہے۔“ وہ مسکرا کر سارے ٹکڑے بورڈ سے اٹھا رہی تھی۔ حروف بکھر گئے۔ الفاظ ٹوٹ گئے۔

فارس بالکل سُن سا بیٹھا رہا۔ اندر تک اس کا وجود تھنڈا ہو گیا تھا۔ جیسے کوئی انسان برف کے صحراء میں تھنڈے سے مر جائے۔

سفید.... نیلا۔

لمحے بھر میں وہ پیچھے چلا گیا۔

وہ ڈاکٹر قاسم کے کلینک میں بیٹھا تھا۔ اور وہ کہہ رہے تھے۔

”مگر میں.... برآدمی نہیں ہوں۔“ فارس اٹھنے لگا۔

”میں اب چلتا ہوں۔ مگر یاد رکھیے گا کہ زمر کو آپ وہی کہیں گے جو میں نے آپ کو سمجھایا ہے، در نہ میرا اسنا بپر آپ کو کسی بھی وقت نشانہ بناسکتا ہے۔“ وہ موبائل جیب میں ڈالتا کھڑا ہوا تھا۔

”کیا آپ جانے میں فارس غازی کا اس ملک میں بلکہ اس دنیا میں ہر سال ہزاروں عورتوں کو جرأة sterilize کیا جاتا ہے؟“  
وہ بالکل تھہر گیا تھا۔ بہت سے چکراتے ہوئے تھے۔ ”سوری؟“

”امریکی جیلیں ہوں یا پاکستان کے ہسپتال، یاد بیہات میں لگنے والی کمپ، یہاں زخم کسی اور شے میں ہوتا ہے، اور سرجری کے بہانے اس عورت کو sterilize (بانجھ) کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں کہا جاتا ہے کہ آپریشن کے دوران یہ ناگزیر تھا۔ بعض عورتوں کے رشتے دار بھی یہ کام کرواتے ہیں۔ صرف ایک ڈاکٹر ڈھونڈوادے پیسے دو اور یہ ہو جاتا ہے۔“

وہ بالکل سُن رہ گیا تھا۔ ”کاردار از نے پیسے دیے تھے اس کی غلط سرجری کرنے کے لئے؟ وہ ان گولیوں کی وجہ سے ایسی نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس کو بعد میں یہ نقسان پہنچایا گیا تھا۔“ وہ سفید پر پڑ رہا تھا۔ تختیر بے یقین۔

”مسز کاردار چاہتی تھیں کہ وہ شادی نہ کر سکتے تا کہ وہ ایک مضبوط گواہ کے طور پر آپ کو جیل بھیج دے۔ اس کے گردے واقعی گولیوں کی وجہ سے خراب ہوئے تھے مگر اس سرجری کے لئے ڈاکٹر ز کے پیتل کو مسز کاردار نے خریدا۔ اس کے بعد بھی مسز موصوف ان ڈاکٹر ز کے پاس گئیں جن کی طرف ہم ان کو بیفر کرتے تھے۔ مسز کاردار چاہتی تھیں کہ ہم ان کو بالکل بتاہ کر کے.....“

ڈاکٹر قاسم اپنی بات کمکل نہیں کر سکے تھے۔ وہ کسی بھوکے شیر کی طرح ان پر چھپتا تھا۔ گریان سے پکڑ کر ز میں پر گرایا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ دھندی چھا گئی۔ وہ دیوانہ وار اس کو مار رہا تھا، پیٹ رہا تھا، جس کا لکناخون نکلا، کون سی ہندی نوئی، کتنے دانت خون میں لکھڑ کر باہر گئے اسے کچھہ ہوش نہیں تھا۔ مگر اس سرخ دھند میں اس نے اس کی دبی دبی کر رکھا۔

”میری پوری بات سنو۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ میں برآدمی نہیں ہوں۔ میری بھی ایک بیٹی ہے۔ میں نے صرف رپورٹس

میں اول بدل کیا تھا۔ مزکار دار کو نہیں معلوم۔ کسی کو نہیں معلوم۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ”وَهُوَنَّ أَلَوْدَمَنْ أَوْ رَاكْھُرِی سَانُسُوْ کے درمیان کہہ رہا تھا۔“ میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ اب یہ بات کھل جائے گی۔ وہ ٹھیک ہے وہ ماں بن سکتی ہے۔ ہاں..... مشکل سے ہو گا۔ اس کے گردوں کی وجہ سے کافی مشکل ہو گا۔ مگر ممکن ہے۔ بہت زیادہ ممکن ہے۔ میں نے صرف روپریش اور دو ایساں بدلتی تھیں، اور.....“

وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ اس کے سفید سویٹر پر خون لگ گیا تھا۔ سرخ تازہ خون.....

فارس نے زمر کو دیکھا جو اسکریبل کے نئے نکلوے سجا رہی تھی اس کے ہجھکے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ الفاظ اٹوٹ  
نوٹ کر جڑتے گئے۔ جڑ جڑ کر ٹوٹتے گئے.....

(آج)

”سعدی یوسف“ کیا آپ کی ہاشم کار دار سے پاکستان آنے کے بعد اپنے دکاء کی غیر موجودگی میں کوئی ملاقات ہوئی ہے؟“ زمر اس سے پوچھ رہی تھی۔ کثہرے میں کھڑے سعدی نے نظریں اٹھا کر سامنے پیٹھے ہاشم کو دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں لمبیں۔ پرانے دونوں کے بہت سے سایلے لہرائے۔

”مجھے یاد نہیں۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ہاشم ہلکے سے مسکرا یا۔ بس ایک ثانیے کو اس نے آنکھیں بند کیں تو انہیں ہیرا چھا گیا۔

(دو ماہ پہلے)

نیم انڈھیر کلب میں لاڈنچ کی طرح کی جگہ بنی تھی۔ مدھم رنگ بر گنی بتیاں سارے میں محور قص تھیں۔ کچھ بھی صاف نظر نہ آتا تھا۔ بڑے صوفے پر ار دگر دکھاتے پیتے ٹھلتے لوگوں سے بے نیاز ہاشم کار دار نر جیکٹ میں ملبوس، موبائل پہن دبارہ تھا۔ تائی ندارد۔ کالر کا اوپری بٹن کھلا تھا۔ وہ آرام دہ سا بیٹھا تھا۔ پس منظر میں بجھتی موسیقی اعصاب کو سکون دے رہی تھی۔ ایسے میں کوئی اس کے ساتھ آ کر بیٹھا۔ وہ اپنی اسکرین کو دیکھتا رہا۔ ہلا تک نہیں۔ نظر بھی نہیں اٹھائی۔ بس اسکرین پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ ”قانوناً تم اپنے دکاء کی غیر موجودگی میں مجھ سے نہیں مل سکتے۔ تم سے کورٹ میں اس بارے میں پوچھا جا سکتا ہے۔ سعدی یوسف!“

”میں یہاں سے گزر رہا تھا تو ادھر آ گیا۔ اور اب یہاں ایک پیلک پلیس میں بیٹھا ہوں۔ اتفاق سے تم میرے ساتھ بیٹھے ہو۔ اس میں میرا کیا قصور ہوا؟“ ہاشم نے اب کے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔ وہ ناگ پہنچا نگ جمائے سیاہ آدمی تین کی ٹی شرٹ اور نیلی جیزیز میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اب اس نے گردن موڑ کر ہاشم کو دیکھا۔ ہلکا سامسکرایا۔

وہ آنکھیں اندر تک زخمی تھیں۔ مگر ان زخوں کے کھر نہ لگتا تھا بننے لگ گئے ہیں۔

”کہو۔ کیا چاہتے ہو؟“ ہاشم نے فون رکھ دیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”کبھی سوچا تھا تم نے ہاشم کو لب کے اس تہہ خانے میں جب ہم ملتے تھے، کبھی وہاں بیٹھے سوچا تھا کہ ایک روز ہم یوں بھی

ملیں گے؟“

”اگر تو تم مجھ سے کوئی اعتراض جرم کروانا چاہتے ہو تو.....“

”وہ میں کرو اچکا ہوں۔ وہی دکھانے آیا ہوں۔ میں تمہارے آفس 21 میں کوای لئے آیا تھا۔“ اس نے موبائل اسکرین پر ویڈیو پل کی اور موبائل ہاشم کو دے دیا۔ انڈھیرے کمرے میں اتنے رش اور شور کے باوجود بھی وہ اس ویڈیو میں چلتی آواز صاف سن سکتا تھا۔ اسکرین پر وہ پاؤ ریسٹ پر بیٹھا کھائی دے رہا تھا۔ اور وہ بولے جارہا تھا۔ بہت سے اعتراض جرم۔ HD کوائٹی ویڈیو۔ صاف آواز۔

ہاشم کار دار کی گردن پر پسینہ آنے لگا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا تائی ڈھیلے کرنے کو گریبان تک ہاتھ لے کر گیا مگر تائی تو گردن کو

کے ہی نہیں ہوئے تھی۔ پھر؟

”تم اسے کورٹ میں استعمال نہیں کر سکتے۔“ اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ سونی کی آنکھیں نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔

”مگر میں اسے یوئیوب پر لیک تو کر سکتا ہوں۔ ایڈٹ کر کے۔ دیکھونا، تمہارا اعتراض جرم کتنا لچپ ہے۔ Juicy اور سفنسنی خیز۔ میڈیا لکھتے ہی دن اس کو چلائے گا۔“ وہ اب مزے سے مسکرا کر کہر رہا تھا۔ ”اور پھر میں اس ویڈیو کو سو نیا کے ٹیب پر اپ لوڈ کر دوں گا۔ تم وہاں سے مٹاوے گے تو میں سو نیا کے ہر کلاس فیلو کے فونز اور ٹیب پر اسے بیکھج دوں گا۔ میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ تمہاری بیٹی اس ویڈیو کو دیکھ لے، اس کو زبانی رکھ لے۔ وہ اس ویڈیو کے ساتھ بڑی ہوگی۔ دنیا کے کسی بھی کوئے میں چلی جائے یہ ویڈیو اسے دھونڈ لے گی۔ وہ اس سے بھی بھاگ نہیں سکے گی۔ اور وہ حصتی دفعہ سے دیکھے گی، تم پر بے یقین اور اس ویڈیو پر یقین بڑھتا جائے گا۔ وہ اگلے دس سال تک اس سے پچھا نہیں چھڑا سکے گی۔“ وہ اس کے ساتھ بیٹھا، گردن موڑ کر اسے دیکھتا کہر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سرد تھیں، مسکراہٹ بھی سرد تھی، اور ہاشم کی رنگت زرد پڑ رہی تھی۔ وہ کوئے جیسی رات میں سونے کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ نفس تیز ہو گیا تھا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں تمہاری بیٹی کو اس سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کو give up کر دوں گا۔ اپنی زبان دیتا ہوں۔ نہ عدالت میں استعمال کروں گا۔ نہ انٹرنیٹ پر ڈالوں گا۔ تم میری اور سو نیا کی ویڈیو گو اپ کر دو؛ جس میں میں نے اسے انگو کیا تھا۔ ہم دونوں اپنے سب سے بڑے ثبوت گوا کر آؤ نہیں اس میدان میں لڑتے ہیں۔ اپنی زبانوں اپنے بچ اور جھوٹ کے ساتھ۔ تم اپنی دلیلیں دو، میں اپنی دوں گا۔ آؤ اس کیس کو ختم کرتے ہیں مگر لڑک۔ بھاگ کرنہیں۔“

ہاشم کتنی دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ بھی بے چینی سے۔ بھی ترجم سے۔

”مجھے تمہیں عدالت میں ذلیل کرنا ہو گا۔“ اس کی آواز دھیمی تھی۔ ”میں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک دفعہ تمہاری زندگی برba'd کر چکا ہوں۔ دوبارہ نہیں کرنا چاہتا۔ تم شاید یقین نہ کرو لیکن تم مجھے سونی اور شیر و اور می اور آبی کی طرح اب بھی اتنے ہی عزیز ہو۔“ سعدی کے لیبوں پر رخی سی مسکراہٹ گویا بلبلائی تھی۔

”عزت اور عذالت کیلوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ چاہے تو سب نہیک ہو سکتا ہے چاہے تو سب بگڑ سکتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رہنے دو عزت کو۔ اور تمہیں جو کرنا پڑے تم کرو۔“

”مجھے ہر حد تک جانا ہو گا۔ سب سے پہلے تم گواہی کے لئے پیش ہو گے۔ میں ایک فقرے میں تمہیں تباہ کر دوں گا۔ میں جیت جاؤں گا، سعدی۔ میں کیس سے نہیں ڈرتا۔“

”تمہیں جس حد تک جانا ہے، تم جاؤ۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ مگر اس کیس کو لڑو۔ ایک اسپیڈی ٹرائلر ٹرولی کا چند ماہ میں فیصلہ آجائے۔ آریا پار،“ اس کے لمحے میں عزم تھا۔ ہاشم اسے دیکھے گیا۔ پھر اس نے چہرہ واپس موزیلیا۔ سامنے دیکھنے لگا۔ سعدی موبائل جیب میں ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا تم مجھے معاف کر سکتے ہو؟“ سعدی یوسف کے قدم زنجیر ہوئے اس نے چہرہ موزا۔

”ہاشم!“ وہ اداسی سے مسکرا یا۔ ”یہ کیس میں تمہارے خلاف نہیں لٹر رہا۔ یہ میرے اور نو شیر والوں کے درمیان ہے۔ اور وہ مجھ سے معافی مانگے بھی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ یہ یو ان کو رٹ!“ وہ اب دور جا رہا تھا۔ نیم اندر ہیرے میں وہ گم ہو گیا تھا۔

ہاشم کاردار نے موبائل اسکرین روشن کی فوٹو گلری کھولی۔ اس نوٹ کی تصویر نکالی جو اس نے چند دن پہلے لے کر حفظ کر لی تھی۔ اس پر لکھا نمبر زبانی از بر کیا، اور پھر تو سُر کھولا۔

”ہر حد!“ اس نے تازہ ٹوپیت میں وہ نمبر ”گڈ بینگ پاکستان!“ لکھ کر آگے ڈالا، اور ٹوپیت پلک کر دی۔ ابھی اس نے موبائل اپس رکھا ہی تھا کہ وہ تھر قرایا۔ ہاشم نے چونک کرائے دیکھا۔ بلا کذ نمبر سے پیغام موصول ہوا تھا۔

”اپنے کرے کی سلگھار میر کی سب سے مغلی دراز کھولو۔ سعدی یوسف کا پاسپورٹ... مکمل پاسپورٹ تمہیں وہیں ملے گا۔“ ہاشم والٹ اور چاپیاں انھا کرتیزی سے باہر کو پکا تھا۔

(آج)

”مجھے یاد نہیں۔“ سعدی یوسف ایک اور سوال کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ سب حاضرین تماشائیوں کی طرح خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان میں جنین بھی بیٹھی جو مسلسل دانت سے ناخن کتر رہی تھی۔ سوچتی نظریں زمر پر تھیں جو سعدی سے سوال درسوال پوچھ رہی تھی۔ اس کی ناک کی لوگ سونے کی بنی تھی اور پچھلی لوگ سے ذرا مختلف تھی۔ مگر ہیرا ہو بہو تھا۔ حنہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر آئی.... اور اسے یوں لگا گویا رد گرد پتھروں کی پیتاں بکھر گئی ہوں۔ خوبصورتی خوبصورتی۔

(دو ماہ پہلے)

زمر اپنے کمرے سے نکلی تو حسین سامنے کھڑی تھی۔ بالوں کو جوڑے میں لپیٹ کر گول مول باندھتی زمر نے چونک کر حنہ کو دیکھا۔ درچال میں صبح کی مخصوص گہما گہما تھی۔ کچن سے سیم اور سعدی کی آوازیں آرہی تھیں، مگر حسین یہاں کھڑی تھی۔

”کیا ہوا؟“

”جنید کو خالی ڈبی کچن کے فرش پر ملی تو اس نے پورا کچن چھان مارا۔ کچرے کی ٹوکری سے آپ کی لوگن ملی۔ سونا ذرا اپھل چکا تھا۔ میں آپ کے پیچھے.....“ اس نے کمرپہ کیا ہاتھ سامنے کیا تو اس پر سفید مخلیں ڈبی رکھی تھی۔ ”اس کو جیولر پلے کر گئی۔ اس نے ڈائمنڈ کو نکال کر اسی لوگ میں جز دیا۔ یہ وہی لوگ ہے اور وہ نہیں بھی ہے۔ اندر وہی ہے، مگر یہ وہی سانچے فرق ہے، احساس وہی ہے، مگر گلٹ اور بو جھ جسی اٹاؤں سے پاک ہے۔ میں نیا ڈائمنڈ نہیں لینا چاہتی تھی۔ کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا زمر!“ مسکرا کر اس نے وہ ہیرا پیش کیا۔ زمر کے اٹموں نے جوڑے کو چھوڑ دیا۔ بال پھسل کر نیچے بہتے گئے۔ وہ متھیری اس ڈبی کو کھول کر دیکھ رہی تھی.....

ادھر کچن میں سیم سعدی سے ناخوشی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”آپ کو وہ دیڈ یوان کے خلاف استعمال کرنی چاہیے تھی۔“

”یہ میرا طریقہ ہے اسے استعمال کرنے کا ہاشم کے خلاف۔ یقین کرو سیم، ہم اس کو دیے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ہر گیند کھینے والی لہوں ہوتی۔ کسی کسی گیند کو رکنا بھی ہوتا ہے۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ اسماء مسکرا دیا۔

”انسان کو کوئی چیز نہیں ہر اسکتی جب تک کوہ خود ہارنہ مان لے۔“

سعدی نے مٹکوں نظرؤں سے اسے دیکھا۔ ”یہ کس کا ڈائیلاگ ہے؟“

”عمران خان کا ہے بھائی!“ اس نے بر اسمانہ بنا کر بتایا تھا۔ وہ ان سب کی آوازوں سے بے نیاز اپنی سلگھار میر کے سامنے کھڑی اس لوگ کو اپنی مغرونوں میں سجاد کیجھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ لبوں پر مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔ با تھر دوم کا دروازہ کھلا اور لارس ہاہر نکلا تو وہ اس کی طرف گھوٹی اور شانے اچکائے۔ فارس کی نظریں شہر گئیں۔

”وہی ہے۔“ وہ سکرا کر بولی تھی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے چہرے سے ہی سب ظاہر تھا۔ وہ بہبہوت ہوا تھا۔ گردن میں ڈوب کر ابھرتی گلٹی واضح نظر آئی تھی۔ آنکھوں میں ایک چک بھی اتری تھی جو شاید زمر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ محض تائید میں سر کو خم دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ان تاثرات کے لیے وہ جان بھی دے سکتی تھی۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا۔ سکرا کروہ بال برش کرنے لگی تھی۔

(آج)

”Zمر کنہرے کے سامنے سے نیچا اتر آئی تھی۔“ دلفتوں میں ہاشم کو اشارہ کیا۔ اب گواہ ہاشم کا ردار کا تھا۔  
وہ جیسے چاہے اس کو کراس کرے۔ (جرح کرے۔)

ہاشم کوٹ کا بیٹا بند کرتا، دو کاغذ ہاتھ میں لئے قدم قدم چلتا آگئے آیا۔ سب ہنوز خاموش تھے۔ سب کی نظر میں ہاشم پر جمی تھیں۔ پر  
سکون کھڑے سعدی کی بھی۔

سامنے آگر ہاشم مسکرایا۔ دونوں پرنٹ آکٹ سعدی یوسف کے سامنے لبرائے۔

”کیا آپ کارنا می اس شہابی باشدے کو جانتے ہیں؟ یا کیا آپ فتح نامی اس پاکستانی باشندے کو جانتے ہیں سعدی یوسف؟  
کیونکہ ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ کمار کوز ہر کا نیک لگا کر اور فتح کو گردن توڑ کر آپ نے قتل کیا ہے۔ کیا آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر  
اپنے انژر دیو کا حوالہ دیے بغیر بتائیں گے کہ آپ ان دلوگوں کے قاتل ہیں یا نہیں؟“  
بہت سی سانیں ایک ساتھ رکی تھیں۔



باب 26:

## فرزند ناز نین!

ایک دفعہ ایک کشتی میں  
سوار ہوا ایک بادشاہ  
ساتھ ایک عجمی غلام کے۔  
اور غلام نے نہ دیکھا تھا کبھی دریا،  
اور نہ کبھی اٹھائی تھی کشتی کی تکلیف۔  
لگا وہ رونے دھونے  
اور کاپنے لگا س کا بدنا۔  
کر کر ہو گیا اس سے بادشاہ کا سارا مرزا  
کہ نہیں سہہ سکتی تھی اس کی نازک طبع ایسی باتوں کو۔  
لوگوں کی سمجھیں نہ آئی کوئی تدبیر۔  
تھا س کشتی میں ایک عالمدین بھی۔  
بولادہ بادشاہ سے اگر ہو حکم...  
تو خاموش کراؤ اس کو ایک طریقے سے؟  
کہ بادشاہ نے، بڑی مہربانی ہو گی۔  
سو مطابق اس دانا آدمی کے حکم کے  
لوگوں نے پھینکا غلام کو دریا میں۔  
کھائے غلام نے چند غوطے۔  
پھر پکڑا لوگوں نے اس کو سر کے بالوں سے۔  
اور لائے کشتی کے آگے۔  
وہ غلام ایک گیارہوں ہاتھوں سے کشتی کے دنالے میں  
پھر جب نکلا دریا سے تو ایک گوشے میں

ایک دفعہ ایک کشتی میں  
سوار ہوا ایک بادشاہ  
ساتھ ایک عجمی غلام کے۔  
اور غلام نے نہ دیکھا تھا کبھی دریا،  
اور نہ کبھی اٹھائی تھی کشتی کی تکلیف۔  
لگا وہ رونے دھونے  
اور کاپنے لگا س کا بدنا۔  
کر کر ہو گیا اس سے بادشاہ کا سارا مرزا  
کہ نہیں سہہ سکتی تھی اس کی نازک طبع ایسی باتوں کو۔  
لوگوں کی سمجھیں نہ آئی کوئی تدبیر۔  
تھا س کشتی میں ایک عالمدین بھی۔  
بولادہ بادشاہ سے اگر ہو حکم...  
تو خاموش کراؤ اس کو ایک طریقے سے؟  
کہ بادشاہ نے، بڑی مہربانی ہو گی۔  
سو مطابق اس دانا آدمی کے حکم کے  
لوگوں نے پھینکا غلام کو دریا میں۔  
کھائے غلام نے چند غوطے۔  
پھر پکڑا لوگوں نے اس کو سر کے بالوں سے۔  
اور لائے کشتی کے آگے۔  
وہ غلام ایک گیارہوں ہاتھوں سے کشتی کے دنالے میں  
پھر جب نکلا دریا سے تو ایک گوشے میں

بیٹھ گیا اور اس کو سکون ہو گیا۔  
ہواباد شاہ کو تجہب پوچھا اس نے۔  
کیا تمی دانائی اس عمل میں؟  
جب دیا گلند نے کہ  
غلام نے اس سے پہلے نہ اٹھائی تھی  
تکلیف ڈوبنے کی۔  
اور وہ ناواقف تھا  
کشتی میں محفوظ رہنے کی قدر سے۔

آرام کی قدر وہی کرتا ہے  
جو پھنس جائے کسی مصیبت میں۔  
اسے پہیٹ بھرے تجھے اچھی معلوم نہیں ہوتی  
جو کی روٹی۔  
جو چیز تجھے بری معلوم ہوتی ہے وہ ہی میرے لئے بھلی ہے  
بہشت کی حوروں کے لئے  
اعراف دوزخ ہے۔  
دوزخیوں سے پوچھ  
کہ اعراف بہشت ہے!

(ایک رائے کے مطابق اعراف جنت اور جہنم کے اس درمیانی مقام کو کہا جاتا ہے جہاں وہ لوگ کھڑے ہوں گے جن کی نیکیاں اور  
برائیاں برابر ہو جائیں گی۔)

### (حکایتِ سعدی از کتاب گلستان سعدی)

آسمان پر سورج نہرے تاروں کا جال بن کر سب کے سروں پتانے کھڑا تھا۔ سورج چال کی بزرگیلیں اس دھوپ میں ججلس رہی تھیں۔  
حالانکہ ابھی صبح بھی پوری طرح باسی نہیں ہوئی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے جھانکو تو بلاستنڈ کے پینڈو سے گول میزدھائی دیتی تھی جس کے  
گرد وہ دونوں بیٹھے تھے۔ زمریاہ کوٹ پہنے، گنگریا لے بال آدھے باندھے، چائے کے گھونٹ بھرتی غور سے سعدی کو دیکھ رہی تھی جو قدرے گم  
ضم سا بیٹھا تھا۔ گھرے بزرگرتے میں ملبوس گیلے بال برش کیے وہ تازہ دم اور تیار تھا، البتہ آنکھیں اداس تھیں۔ غائب دماغی سے کپ کے منہ پر  
انگلی دائرے میں پھیر رہا تھا۔ زمر نے نرمی سے اسے پکارا۔ ”سعدی!“ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”آج تم کھرے میں کھڑے ہو گے اور تم سے جرح کی جائے گی۔ تم نہ دوس ہو؟“  
”نہیں۔“ اس نے نئی میں سر ہلا�ا۔

”یہ موقع آنا تھا؛ جب تم نے اس عدالتی جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا میں نے تب ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ موقع آئے گا۔ تمہیں  
کھرے میں جانا ہوگا۔ پہلے میں تم سے سوال کر دوں گی، پھر وہ تم سے جرح کرے گا۔ تم خود کیسے پریزینٹ کرتے ہو یہ تم پر مخصر ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ اور میں ٹھیک ہی رہوں گا۔“ وہ درا سما کرایا۔

”کوئی بھی سوال جس کا جواب مشکل لگے تو کہنا مجھے یاد نہیں۔ جس سوال کے جواب میں سچ نہ بولنا ہو تو کہنا جیسا کہ میں نے اپنے

اندرویو میں کہا تھا..... اور پھر اثر و یو والی لائے دہرا دینا۔“

”یہ غلط بیانی تو ہو گی نا۔ پتہ نہیں مجھ میں اور ہاشم میں کیا فرق رہ جائے گا جب ہم دونوں جھوٹ بولیں گے؟“ وہ تلخی سے بولا۔

”محض افاظ کا چنانچہ جھوٹ بولنا نہیں ہوتا قانون میں۔ اور ہمیں ایک پورے معاشرے کو ایسے لوگوں سے پاک کرنے کے لئے ان

مہوٹے موٹے Lesser Evils کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔“

”صحیح! خود کو بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔ خیر۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے گھری سانس لی۔ ”اور اگر اس نے مجھ سے کچھ ایسا پوچھا

جو میں نے آپ کو بھی نہ بتایا ہو تو تباہ؟“

”زمر چند لمحے اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔“ تم نے مجھے کیا نہیں بتایا؟“

سعدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر شانے اچکائے۔ ”مجھے یاد نہیں۔“ اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ مگر وہ ذرا فکر

نہ ہو گئی تھی۔

”وکیل سے کچھ نہیں چھپاتے سعدی! مجھے بتاؤ۔“

وہ آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کپ رکھ کر بولا۔ ”جیسا کہ میں نے اپنے اندر ویو میں کہا تھا، مجھے یاد نہیں۔“

”اگر تم سے کچھ ایسا ہوا ہے جو جرم کے زمرے میں آتا ہے تو تم مجھے بتاسکتے ہو۔“

”میں نہیں بتانا چاہتا۔ لیکن اگر اس نے مجھ سے اس بارے میں پوچھا تو مجھے کیا کہنا چاہیے؟“

”سچ بولنا۔ بالکل سچ۔“ وہ تاکید کر کے اٹھ گئی۔

جب وہ بیگ اور فون لئے لاڈنگ میں آئی تو سامنے کھلتے ندرت کے کمرے میں کھڑی خینہ تیار ہوتی نظر آ رہی تھی۔ فارس بھی قریب میں ندرت کے ساتھ صوفے پہ بیٹھا تھا۔ زمر چوکھٹ پہ ٹھہری تو خینہ نے اسے دیکھا۔ فوراً بولی۔ ”میں آج بھی کورٹ جاؤں گی، پلیز کوئی منع نہیں کرے گا۔ جب آپ وہ جعلی ای میل دکھائیں گی تو مجھے ہاشم کا چہرہ دیکھنا ہے۔“ اور وہ جانتی تھی وہ اس موقع پر اپنے ہاتھ پہ کیا لکھ کر اسے

مالائے گی۔ سوچ کر ہی مزا آتا تھا۔ سوچ کر ہی تکلیف ہوتی تھی۔

”ہاں آ جاؤ۔“ پھر فارس کو دیکھا۔ ”تم نہیں آؤ گے۔“

”مودہ نہیں ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

”زمر نے گھری سانس لی۔“ پتہ نہیں تم کب اس ٹرائل کو سنجیدہ لو گے۔“

”جس دن تم لوگ یہ راکل ہار جاؤ گے!“ وہ تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ زمر ہونہ کر کے باہر نکل گئی۔ ندرت نے نفلیت اسے دیکھا۔ ”منہ سے بدقال نہ کلا کرو۔ کیوں ہاریں وہ مقدمہ؟ دعا کیا کرو کہ جیت جائیں۔“

”ہاں جی! بالکل۔ ایسا ہی ہو گا۔“ وہ بر اسمانہ بناؤ کر چپ ہو گیا۔ ندرت اٹھ گئیں تو بال برش کرتی خینہ اس کی طرف گھومی۔ وہ پیر

بیٹھ کر نہیں دراز سا، آنکھیں چھپت پر مرکوز کی کسی سوچ میں لگتا تھا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ ہم ہاشم کو عدالت میں کبھی مات نہیں دے سکتے؟“ فارس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مجھے لگتا نہیں ہے، مجھے یقین ہے۔ یہ جو کورٹ میں سارے سچ بیٹھے ہوتے ہیں نا، یہ اس بات کا فیصلہ نہیں کرتے کہ کون سچا

ہے۔ اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کون زیادہ اچھا جھوٹ بولتا ہے۔“

”مگر بجائے ان کی مخالفت کرنے، ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔“

”تم کرو۔ میں دیر سے آؤں گا۔“ اس نے سر جھکا۔ باہر کوٹ جانے کی تیاری کا شور بھی پکا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

اتی شہرت بھی کہاں چاہی تھی خود سے میں نے ..... اپنے ہی شہر کا ہر شخص عدو میرا ہے قصر کا ردار کالا ان اس صحیح بار و نق لگ رہا تھا۔ ملازموں کی آمد درفت لگی ہوئی تھی۔ شہرِ زن گھوم پھر کرایونٹ آر گناہز کو سمجھا رہی تھی۔ اسے کون ہی چیز کہاں چاہیے۔ اس کے سنبھلی بال پچھلے سال کی بہبعت لمبے ہو گئے تھے اور اوپنی پونی کی صورت گردن کی پشت پچھول، بے تھے۔ ماتھے پہل لئے اور ناک چڑھائے وہ سو نیا کی سا لگرہ کی دعوت کے تمام انتظامات دیکھ رہی تھی۔

اندر ڈائینگ ہال میں بیٹھی جواہرات بھیج دیئے کے پیالے میں ہلاتی مسکراتی نظر دوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اک فاتحانہ نظر اپنے مقابل بیٹھے نو شیر وال پڑاں (ہاشم اب سر برہی کری پہ بیٹھتا تھا اور وہ دونوں اس کے دامیں باسیں)۔ نو شیر وال سوت میں ملبوس بے دلی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جواہرات کو پچھلے برس کے یہ دن یاد آئے۔ تب شہری کے لئے کیسے وہ بے چین رہتا تھا۔ شکر یہ بھوت تو اترا۔

”تو آج سعدی یوسف کشہر سے پاآئے گا اور اس سے جرح کی جائے گی۔“ اس نے سعدی کا ذکر چھیڑا۔ آج بھی نو شیر وال کا مطاقن تک کڑا ہوا مگر وہ اظہار نہیں کر سکا۔ آج اسے گولی مارنے کی خواہش بھی نہیں ہوئی۔ گولی مار کے دیکھ لی تھی۔ کوئی فائدہ نہ تھا۔

”ہاں آج ہم حکایتِ سعدی سنیں گے۔“ ہاشم نے طنز کہا تھا۔

”تمہیں یقین ہے وہ جھوٹ نہیں بولے گا؟“

”وہ سعدی ہے۔ وہ اشینڈ پچھوٹ نہیں بولے گا۔“ ہاشم فون دیکھتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔ ”اور اسے ضرورت بھی نہیں ہے۔“ ڈائینگ ہال عبور کر کے لاونچ تک آیا تھا جب سامنے سے رئیس آتا دکھائی دیا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر ہاشم رک گیا۔ لاونچ کے کونے میں کردن پہ بیٹھے ایپٹاپ سامنے رکھ کر کام کرتے احرش فیض کی حیات بھی ادھر ہی متوجہ ہو گئیں۔

”سری یہ دیکھیں۔ یہ کو بوسے ہماری ٹیم کو ملا ہے۔“ ہاشم نے کاغذ پکڑتے ہوئے جیب سے عینک نکالی۔ ”کیا ہے یہ؟“

”فضیح کی لاش مل گئی ہے۔ گواہوں کے مطابق وہ سعدی یوسف کو قتل کرنے گیا تھا۔ مگر سعدی نے اسے مارڈا۔ فضیح اب صرف

غائب نہیں ہے وہ مر چکا ہے۔“

رئیس کی آواز نے جہاں ہاشم کو چونکا یاد ہاں دلیہ مزے اور اطمینان سے کھاتی جواہرات کے ہاتھوں سے بچ پھسلا۔ اس کا رنگ فتنہ ہوا تھا۔ نو شیر وال بھی سراخا کر دیکھنے لگا۔

”وہ از گڈ؟“ ہاشم دیکھ سے کاغذ دیکھ رہا تھا۔ ”لیکن فضیح کو اسے زندہ گرفتار کرنے کا حکم تھا، اس نے اسے مارنے کی کوشش کیوں کی؟“

”ہارون صاحب سے بات کی ہے۔ وہ خود شاکڈ ہیں۔ فضیح ان کا دایاں ہاتھ تھا۔ وہ کبھی بھی اس کو موت کی طرف نہیں دھکلیں گے۔“

”پھر فضیح کیوں مارنا چاہتا تھا سعدی کو؟ سیلیف ڈیفنس کے علاوہ تو سعدی اسے کبھی قتل نہیں کرے گا۔“ وہ سر جھکائے کاغذ پڑھتا سوچتے ہوئے لجھ میں کھم رہا تھا۔ ”کوئی ٹھوں بیوت ہے کہ فضیح کو سعدی نے ہی مارا ہے؟“

”کافی شاپ کی مالکن نے بتایا ہے کہ وہ اس کے ساتھ لکھا تھا۔ سی اٹی وی فوٹچ میں بھی فضیح اس کو یہ غمال بنا کر آگے لے جاتا دکھائی دیا تھا۔ مگر بعد میں سعدی زندہ سلامت واپس آگئا اور فضیح کی مسخ شدہ لاش کھائی سے ملی۔“ احمد چہرہ اٹھائے ہے کہ بکا ساد دیکھ رہا تھا۔

دو بیٹھی جواہرات بے اختیار اپنی گردن کی پشت ہاتھ سے دبائے گئی۔ پھر اس نے سیل اخایا اور آبدار کو متینگ لکھا۔ ”مجھے میری امانت ان رات تک مل جانی چاہیے۔“

ہوا کے دوش پر وہ پیغام اڑتا ہوا... پہاڑ... جھیل... سر بزر میدان عبور کرتا... ہارون عبید کی رہائش گاہ کی دیواروں کے پار گھسا اور آہار کی بید سائیڈ تیبل پر کھے مو بال کو چکا گیا۔

تھر تھراہٹ سے اس نے لحاف ہٹایا۔ سرخ سلکی بال تیکے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کو چہرے سے ہٹاتی انھی اور مو بال ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔ پیغام پڑھ کر اس نے کچھ نہیں لکھا۔ جیسے تو جہی نہ دی ہو۔ عادتاً کوئی نہیں لست کھولی۔ اور عادتاً فارس کے نام پر ملک کیا۔ اس کا last seen ادیکھا۔ اندازہ لگایا کہ وہ اب کیا کر رہا ہو گا اور مسکرا کر فون رکھنے لگی۔ یکدم ایک خیال آیا۔ مل سی آنکھوں میں چمک۔ ابھری۔ لب دانتوں میں دبائے اس نے پیغام لکھا۔

”یاد ہے فارس میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ملکہ نے دونوں قیدیوں کے قتل کا حکم دیا ہے۔ میرے پاس ثبوت ہے۔ اگر چاہیے تو آج ان پر میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ اور پیغام بھیج دیا۔ بلوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اب تو وہ ضرور آئے گا۔ اسے یقین تھا۔

.....  
میں اپنے روٹھے ہوئے قبیلے کی سازشوں میں گھرا ہوا ہوں ..... تم اجنبی ہو تو میرے آنکن کی وحشتؤں سے ڈرے نہ رہنا کورٹ روم میں اوپر اپریل کی دھوپ کھڑکیوں سے چھن کر اندر گر رہی تھی۔ سعدی یوسف کٹھرے میں کھڑا تھا اور زمر اس کے سامنے تھی۔ چند قدم نیچے... اس سے سوالات پوچھ رہی تھی۔

”پلیز ریکارڈ کے لئے اپنا نام بتائیے۔“

”سعدی ذوالفاری یوسف خان۔“

”آپ کہاں بیدا ہوئے تھے؟“ وہ سنجیدگی سے رسکی کارروائی دھرا رہی تھی۔ ہاشم خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ اس کے ساتھ رکھی احر کی کرسی خالی تھی۔

باہر کچھ بکھری کے ہجوم میں ایک راہداری میں احر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تیز تیز۔ ہجوم میں بالکل آگ۔ احتیاط سے آگے پیچپے بھی دیکھ لیتا تھا۔ پھر تیزی سے ایک موڑ مزکر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک خالی کورٹ روم تھا۔ کریمان اور میزیں انٹی سیدھی پڑی تھیں۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور پھولے سانس کے ساتھ واپس گھوما۔ سامنے ایک کرسی پٹا نگ پٹا نگ چڑھائے فارس بیٹھا تھا۔ منہ میں مسلسل کچھ چبار ہاتھ۔ سر سے پیڑتک ہانپتے ہوئے احر کا جائزہ لیا۔

”اتنی کیا ایر جنسی تھی اپنی؟ تمہارے مالک آس پاس ہی ہیں۔“

”ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ بلکہ دو مسئلے۔“ وہ کرسی کو فارس کے سامنے رکھتا اس پر بیٹھا اور آگے کو جھک کر ہاتھ باہم پھسانے پر بیٹھا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ فارس نے گھری سانس لی۔

”ہاشم کے پاس عدالت میں پیش کرنے کے لئے خطرناک مواد ہے۔“

فارس نے ہاتھ جلا کر گویناک سے لکھی اڑائی۔ ”عدالت کی پرواہ کسے ہے؟“

”غمازی تھیں اس کیس کو سیر کیس لینا ہو گا۔ ہاشم کے پاس ثبوت ہے کہ سعدی نے دو قتل کیے ہیں۔ اور کچھ دیر بعد وہ عدالت میں

سعدی سے یہ بات پوچھے گا۔“

فارس کا مسلسل ہتامندر کا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ”وقل؟“ اسے دچکا لگا تھا۔

”ہارون عبدی کے ملازم فتح کی لاش مل گئی ہے۔ عین شاہدین نے سعدی کو اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسے سعدی نے مارا ہے۔“  
”ایسا نہیں..... ہو سکتا۔“ وہ شدتِ حیرت سے ہرکلایا۔

”ایسا ہو چکا ہے۔ تم لوگوں کو سعدی کو یہ بات بتانی ہو گی تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہے۔“

”وقل!“ وہ اب بھی بے یقینی سے دھرا رہا تھا۔ پھر فتح میں سر ہلایا۔ ”میرے جانے کے بعد ہوا ہو گا۔ مجھے اسے وہاں نہیں چھوڑا۔“  
چاہیے تھا۔“

”اور تم نے اسے مشورہ دیا تھا افغانستان کے راستے سے ملک میں آنے کا؟“

فارس بالکل ساکن رہ گیا۔

”تمہیں کیسے پڑھ؟“

کسی نے سعدی کا پاسپورٹ ہاشم کو بھیجا ہے۔ اس پر سعدی کا نام حیدر ہمایوں خان ہے۔ اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کے راستے سے آیا ہے واپس۔“

فارس بے یقینی سے فتح میں سر ہلا نے لگا۔ ”یہ نامکن ہے۔ سعدی اپنا پاسپورٹ ڈسپوز آف کر چکا ہے۔“

”کسی نے اس کے پاسپورٹ کے نکلے جمع کر کے ہاشم کو بھیج دیے ہیں۔ افغانستان کے ذریعے آنے کا فیصلہ درست تھا، لیکن اب یہ چیز اس کو دہشت گرد بھی ثابت کر سکتی ہے۔ تمہیں اس کیس کو سیریں لیما ہو گا۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ اب انھی کھڑا ہوا تھا۔ بار بار پیشانی چھوٹا تھا۔ فتح میں سر ہلاتا تھا۔ ”سعدی کا پاسپورٹ ان کے ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ سعدی نے خود مجھے بتایا ہے کہ وہ اسے ختم کر چکا ہے۔ سعدی ایسا غیر معمولی دار نہیں ہے۔“

”مگر اب ایسا ہو چکا ہے۔ میں نے خود وہ پھٹا ہوا پاسپورٹ دیکھا ہے۔ اور ہاشم نے مجھے اس کا میتھ دکھا کر اسے ٹریس کرنے کا کہا مگر میں نہیں کر سکتا۔ اس شخص کا نمبر مکمل طور پر انکر پڑا ہے تمہیں اب پکھ کرنا ہو گا۔ کیونکہ کوئی ہے جو اسے سعدی کے بارے میں معلومات دے رہا ہے۔ اور یہ تمہارے قریب کا کوئی بندہ ہے۔“

فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ ناگواری سے اس کے ماتھے پہل پڑے۔ اسے جیسے برالگا تھا۔ ”ہمارے قریب ایسا کوئی بندہ نہیں ہے جو ہمارے ساتھ یوں دھوکہ کرے۔“

”سب کے قریب دھوکے باز ہوتے ہیں۔ میں بھی تو ہاشم سے اس وقت دھوکہ ہی کر رہا ہوں نا۔“

”نہیں۔“ اس نے قطیعت سے فتح میں سر ہلایا۔ وہ شدید ڈسپر لگ رہا تھا۔ ”ہمارے قریب ایسا کوئی نہیں ہے۔ یہ ہاشم کا کوئی بندہ ہے۔“

”مز زمر نے مجھے بتایا تھا کہ دو ماہ پہلے تمہاری بھائی کے کمرے سے وہ میوری کا رڈ چوری ہو گیا تھا جس میں میرا اعمال نام موجود ہے۔“

”وہ یقیناً کاردار زکا بھیجا ہوا کوئی بندہ ہو گا۔ میں نے بہت ڈھونڈا اگر کوئی سراغ نہیں ملا۔ لیکن میں نہیں مان سکتا کہ ہمارے گھر میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے۔“

”ہاں ہو سکتا ہے یہ باہر کا کوئی بندہ ہو۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اسے کیسے پتہ چلا ہو گا کہ کارڈ تمہاری بھائی کے کھاں رکھا ہے۔“ انہیں نے گھری سانس لے کر کہا۔ ”خین نے کارڈ کی فائلز دیکھتے ہی مجھے کال کی تھی۔ کاردار زک کے علاوہ بھی یقیناً کوئی تمہارے فون شیپ کر رہا ہو گا۔“

اس کال کے بعد ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے خین کے لیپ تاپ کو rat کر کے اس کا ویب کیمرہ آن کر لیا ہو۔ آج کل یہ بہت آسان ہے۔ اور اس نے دیکھ لیا ہو کہ خین اپنے کمرے میں وہ کارڈ کہاں رکھ رہی ہے۔

اب کے فارس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کہیں یہ سب تم تو نہیں کر رہے ہے۔“ پھر سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ ”خین نے کہا تھا اس سرخ مفلروں لے آدمی کا قد جھوٹا تھا۔“

”اللہ کو مانو۔ مجھے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ احر بر امان گیا تھا۔ ”اور اگر میں یہ کرتا تو پھر اپنی جان پچھلی کر تھیں آگاہ کرنے کیوں آتا؟ سعدی کہتا ہے کہ اس کی یو ایس بی کی فائلز ڈیلیٹ کر دی گئیں، اب اس میں صرف فرزوں پڑی ہے۔ سعدی کا ایس پورٹ سے پیچھا کیا جاتا ہے اور اس کا پاسپورٹ چوری کیا جاتا ہے۔ خین کے کمرے سے ایک کارڈ چوری ہو جاتا ہے۔ غازی یہ تمہارے قریب کا کوئی بندہ ہے۔ وہ پر یقین تھا۔

فارس کے کام سرخ ہو گئے اور وہ شدید بے بس اور غصے میں نظر آ رہا تھا۔ ”وہ جو بھی ہے میں اسے ڈھونڈ لوں گا اور میں واقعی اس کی جان لے لوں گا۔“

”اوکیس کا کیا کرو گے؟ نو شیر والوں کو سزا دلوں ہے یا نہیں؟“ فارس چند لمحے چپ رہا، پھر گہری سانس لے کر ایک عزم سے بولا۔

”پہلے مجھے اس کیس میں دلچسپی نہیں تھی لیکن اب.... اگر ہاشم اس طرح کے اوپھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم سب مل کر اس کیس میں اس کوٹھ فائٹ دیں گے۔“

”مگذ!“ احر نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا۔ فارس نے اپنا کندھا بے زاری سے پیچھے کیا۔

”اب جاؤ۔ تمہاری مالکن تھیں میں کر رہی ہوگی۔“ احر جاتے جاتے مڑا اور تنک کر سے دیکھا۔

”ظاہر ہے۔ ملازم پیشہ آدمی ہوں۔ مگر سوری سوری.... تم جیسے جاب لیس فارغ لوگ کیا جائیں کہ ملازمت کیا یقین ہوتی ہے۔“

”جا...جا۔ دماغ نہ خراب کر میرا۔“ اس نے غصے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ شدید مضطرب نظر آ رہا تھا۔

.....❖❖❖.....

چلے جو ذکر تو فرشتوں کی پارسائی کا ..... تو زیر بحث مقام۔ بشر بھی آتا ہے ”زمر کٹھرے کے سامنے سے نیچے اتر آئی تھی، اور ہاشم کو اشارہ کیا تھا۔ اب گواہ اس کا تھا۔ جیسے چاہے جرج کرے۔

جب وہ نیچا کر پیٹھی تو پیچھے سے کسی نے اسے ٹھوکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پچھلی نشتوں پر فارس آبیٹھا تھا اور اس کے کہنے پر خین انٹھ کر جنگل تک آئی تھی اور بین سے زمر کے کندھے کو چھو کر اس طرف توجہ دلا رہی تھی۔ زمر نے فارس کو دیکھا۔ وہ قدرے مضطرب سا اس اشارے میں کچھ بتا رہا تھا، زمر نے لوہ پر انگلی کر کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور واپس گھوم گئی۔

”چڑیل۔“ وہ بے بسی سے بڑا بڑا یا تھا۔ زمر پروادا کیے بغیر سخیگی سے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں ہاشم سعدی کے مقابل مگر چند قدم نیچے کھڑا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے چند کاغذ لبرائے۔

”کیا آپ کمار نامی اس سنہاںی باشندے کو جانتے ہیں؟ یا کیا آپ فتح نامی اس پاکستانی باشندے کو جانتے ہیں یا سعدی یوسف؟ کیونکہ ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ کمار کو زہر کا یہنک لگا کر اور فتح کو گردن تو ٹرکر آپ نے قتل کیا ہے۔ کیا آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر اپنے انٹھ دیو کا حوالہ دیے بغیر بتا میں گے کہ آپ ان دلوگوں کے قاتل ہیں یا نہیں؟“

بہت سی سانسیں ایک ساتھ روکی تھیں۔ خین بالکل سُن ہو گی۔ اسامہ شل ہو گیا۔ احر نے فکر مندی سے گھری سانس لی۔ جواہرات

مکرائی۔ نو شیر والا بے چین ہوا۔ فارس نے اخطراب سے پہلو بدلا۔ ایسے میں زمر نے گردن موڑ کر فارس کو دیکھا اور پلکیں جھپک کرتے تسلی دی۔ صرف وہ پرسکون تھی یا سعدی جو کٹھرے میں گردن تھے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پہ طمینان تھا۔ پھر وہ دھیرے سے بولا۔

”کیا آپ اپنا سوال دھرا میں گے کاردار صاحب؟“

کرہے عدالت میں پھر سے مقدس سامنا ٹاچھا گیا۔

”سعدی یوسف، کیا آپ نے ان دو افراد کا قتل کیا ہے؟“ ہاشم نے تصاویر پھر سے دکھاتے ہوئے چبا چبا کر پوچھا۔ زمر کھڑی ہوئی۔

”آب جیکش یور آز۔ اس سوال کا کیس سے کیا تعلق ہے؟“

”تعلق ہے یور آز۔ ہمیں عدالت کو دکھانا ہے کہ الزام لگانے والا خود کیسے کردار کا حامل ہے۔“

”یور آز اگر وکیل دفاع کو سعدی یوسف پُر قتل کا الزام لگانا ہے تو اس کے لئے وہ الگ سے پیش دائر کر سکتے ہیں۔ لیکن قانون شہادت کے تحت وہ گواہ کو دس کر یہیٹ کرنے کے لئے اس کے اوپر بغیر ثبوت کے ایسے الزام نہیں لگاسکتے۔“ وہ بلند آواز میں بوی تھی۔

حج صاحب نے جواباً ہاشم کو دیکھا۔ وہ فوراً بولا۔

”یور آز.... قانون شہادت کے تحت اگر گواہ کا کردار کیس کی سچائی جانے کے لئے ضروری ہے تو ایسے سوال پوچھ جاسکتے ہیں۔“

زمر کو قانون شہادت دہرانے کی اشد ضرورت ہے۔

”یور آز،“ کیا ہمارا قانون آرٹیکل تیرہ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی شخص سے زبردستی self-incriminating سوال نہیں پوچھا جا سکتا؟“ وہ بحث کر رہی تھی۔ (یعنی ایسا سوال جس کے جواب میں اس کو اعتراف جرم کرنا پڑے۔) ہاشم دوب دب بولا۔

”مگر یور آز وہ ملزم کی دفعہ ہوتا ہے۔ جیسے نو شیر والا کے پاس خاموش رہنے کا حق ہے۔ سعدی یوسف اس کیس میں ملزم نہیں ہے۔ اور جہاں تک گواہ کی بات ہے تو قانون شہادت آرٹیکل ۶ کے تحت کسی گواہ کو self-incrimination کے باوجود خاموشی کا نت نہیں ہے۔ گواہ جواب دے گا۔ بھلے جواب میں اسے اعتراف جرم ہی کرنا پڑے۔ گواہ کو جواب دینا ہے۔“

”مگر یور آز....“ زمر مزید پکھ کہنے لگی تھی کہ حج صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”سعدی یوسف ملزم نہیں ہے،“ گواہ ہے اور گواہ کا کردار جانتا واقعی ضروری ہے۔ اس لئے میں چاہوں گا کہ سعدی یوسف جواب دے۔ اعتراف رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے سعدی کو اشارہ کیا۔ زمر گھری سانس لے کر بیٹھی۔ ہاشم نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ فارس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مٹھی لبوں پہ جمائے وہ فرمندی سے سامنے کھڑے سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

سعدی نے گھری سانس لی اور پھر وہ الفاظ ادا کیے۔

”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“

”اور یہ بات آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتے ہیں؟“ ہاشم نے آواز میں تجب بھر کے دھرایا۔

”بھی ہاں۔ میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے ان دونوں آدمیوں کو قتل نہیں کیا۔“

”آپ کو معلوم ہے perjury کیا ہوتی ہے سعدی یوسف؟ کوئٹ میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا جرم ہے؟“ ہاشم اب تاسف سے پوچھا۔

رہا تھا۔

”بھی مجھے معلوم ہے۔ پرجوی وہ ہوتی ہے جو ہاشم تم اپنے ہر گواہ سے یہاں کردا گے مگر میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“ اس نے اسی

اعتماد سے چہرہ اٹھا کر حج صاحب کو دیکھا۔ ”میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔“

ہاشمی میں سر بلاتا کاغذات لے کر جو کے چبوترے کی طرف آیا۔ ”یور آزیہ دونوں قتل سعدی یوسف نے ہی کیے ہیں اور....“ مگر سعدی کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں نے ان دوان سنوں کی جان ضروری ہے یور آز! مگر میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔“

بہت سی سنیں ایک دفعہ پھر کی تھیں۔ چند لمحے کو تو ہاشم بھی سنائے میں رہ گیا۔ جو صاحب ذرا مزید تر پڑھے ہو کر بیٹھے۔ وہ اب

پوری طرح سے سعدی کی طرف متوجہ تھے۔

”یور آز کمار نامی گارڈ نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا قید کے دوران۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اس کو مارا تھا۔ فصح بھی مجھے قتل کرنے آیا تھا، اور میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اس کو مارا۔ پور آز سیلف ڈیفنیس کی عالمی تعریف کے مطابق یہ قتل نہیں ہوتا۔ دین میں یہ گناہ نہیں ہوتا۔ میں نے گناہ کیا ہے نہ قتل، میں نے صرف ان کو مارا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا مگر میں ان کا قاتل نہیں ہوں۔ اپنی جان بچانے کے لئے مجھے ان کو مارنا تھا۔ یہ میرا حق تھا۔“

کمرہ عدالت میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ہاشم نے بہت بار بکھر کیوں بھر بند کیے۔ اس ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ نو شیراداں بالکل سن سا سعدی کا چہرہ بلکہ عکردہ کیکھ رہا تھا۔ (وہ کیسے اتنے لوگوں کے سامنے کسی کو مارنے کا اعتراض کر سکتا ہے؟ اتنا بہادر وہ کیسے تھا؟)

بالآخر ہاشم جو کی طرف متوجہ ہوا۔

”مگر ہم کیسے مان لیں کہ یہ سیلف ڈیفنیس ہی تھا۔ یور آز سعدی یوسف ایک پاکستانی شہری ہے اور وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی جرم کرے گا پاکستان پیش کوڈ کا اطلاق اس پر ہو گا۔ ملک واپس آنے پر قانون کے مطابق اس سے تقتیش کی جائے گی اور اگر جرم ثابت ہو گیا تو سزا بھی سنائی جائے گی۔ یہ سیلف ڈیفنیس تھا یا نہیں، اس کا فیصلہ بھی عدالت کرے گی۔ یور آز میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ سعدی یوسف کے اس اعتراض جرم کی بنا پر ایک بے آئیٰ تھیکیل دی جائے جو اس کے ان جرائم کی تقتیش اور تحقیق کرنے اور پھر اسے پر اسکیوٹ کیا جاسکے۔“

”یور آز!“ زمر مسکرا کر کھڑی ہوئی اور چبوترے کی طرف بڑھی۔ ”میرا خیال ہے کا ردار صاحب کو اپنا کر مٹل لاء دہرانے کی اشد ضرورت ہے۔“

سب کی نگاہیں سعدی سے ہو کر زمر کی طرف اٹھیں۔

”ایکسکیووٹی؟“ ہاشم نے ناگواری سے پوچھا تھا۔

زمر نے مسکرا کر کندھے اپکائے۔ ”قانون شہادت کے جس آزمیکل و کو مد نظر رکھتے ہوئے عدالت نے گواہ کو خاموش نہ رہنے کا حکم دیا ہے، جناب عالی اسی آزمیکل و میں لکھا ہے کہ گواہ... بلوم نہیں گواہ.... کو خاموشی کا حق حاصل نہیں ہے چاہے اس کا بیان اس کے اپنے وجود کو ملوث جرم ظاہر کرے.....“ اس نے مسکرا کر ہاشم کی انکھوں میں دیکھتے و قنید دیا۔ ”بشرط یہ کہ اس بیان کی بنیاد پر... اگر دوسرے کوئی ثبوت یا گواہ نہ ہوں تو... اس شخص کو prosecute کیا جا سکتا۔“ پھر جو کی طرف چہرہ کر کے فاتحانہ اندر میں بولی۔ ”یور آز ہمارا قانون کہتا ہے کہ گواہ کے اپنے اعتراض جرم پر اس کو قانونی حفاظت حاصل ہے۔ ہاشم کا ردار یا کسی کے پاس ایسے کوئی ثبوت یا گواہ نہیں ہیں جو سعدی یوسف کو جرم ظاہر کریں۔ سعدی یوسف کے خلاف کہیں بھی کسی بھی قسم کا کوئی کیس اس ایک اعتراضی بیان پر نہیں کھولا جا سکتا۔ دراصل ہاشم کا ردار اس بات کو صرف ایک اسکیٹل بنا کر سعدی کوڈ س کریٹ کرنا چاہتے ہیں، تو اس لئے میں چاہوں گی کہ معزز عدالت کا ردار صاحب کو یہ یاد دلائے کر عدالتی حکم نامے کے تخت کی ہفتے سے اس ٹرائل پر میڈیا میں بحث منع ہو چکی ہے اس لئے وہ ان باتوں کو میڈیا پر نہیں اٹھا سکتے۔“

ہاشم کا چہرہ بے نی بھرے غصے سے تغیری ہو چکا تھا۔ ”یور آز ایک آدمی اپنے منہ سے دو بندے مارنے کا اعتراض کر رہا ہے اور....“

”نه نہ!“ بچ صاحب نے فلی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ”مسز زمر کا پاؤں کٹ دیلڈ ہے۔ گواہ کو پر ٹیکشنا حاصل ہے۔ آپ نے اپنے مند سے کہا ہے کہ سعدی یوسف اس کیس میں گواہ ہے۔ ملزم نہیں۔ اگر نو شیر وال کاردار اپنے منہ سے اعتراض جرم کرتا تو عدالت اس کو پھانسی کی سزا فوراً سنا دیتی کیونکہ وہ اس کیس میں ملزم ہے۔ سعدی یوسف گواہ ہے اور گواہ کو قانونی حفاظت حاصل ہے۔“  
”مگر یورا آزم کم از کم.....“

”آپ کو کوئی اور سوال پوچھنا ہے کاردار صاحب؟“ اب کے بچ صاحب نے تختی سے پوچھا تھا۔ ہاشم چند لمحہ غصے سے دیں کھڑا رہا۔ پھر گھری سانس لی اور سر جھکلتا سعدی کے سامنے آیا۔

زمر مسکرا کر مری اور ایک چٹ بلکل کے پیچے کرسیوں پہنچی جنین کی طرف بڑھا۔ حنہ جس کا بسانس آئی تھی، اس نے وہ چٹ فوراً سے فارس کو پاس کی جو بظاہر تاثرات کے ساتھ بیخا تھا مگر اعصاب اب ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ اس نے کاغذ کھولا۔ اندر زمر نے لکھا تھا۔ ”ہر بیڈڑا سیرست..... یا یورپی کلاس میں ہر وقت مجھ دیکھ دیجئے اور میری محبت میں اگر فتار ہے کی جائے اگر تھوڑا بہت پڑھ لیا ہوتا تو آج یہ قانون معلوم ہوتا تھیں.... پچ پچ!“

فارس نے استغفار اللہ کہہ کر سر جھکتا تھا۔ منہ کا ذائقہ تک کڑا ہو گیا تھا۔ بازو بڑھا کر جنین کا فلم اپکا اور نیچے کچھ لکھا۔ پھر کاغذ تھہ کر کے آگے پاس کیا۔ ادھر ہاشم کی آواز گونج رہی تھی۔

”سو نیا کی پچھلی سالگردہ پہ یعنی ایک سال پہلے کیا یہ درست ہے کہ آپ سب سے نظر بچا کر میرے کمرے میں گئے تھے؟“

”یہ درست نہیں ہے۔ میں نظر بچا کرنیں سب کے سامنے ھلکم کھلا گیا تھا۔“

”کیوں؟“

زمر تک کاغذ پہنچا تو اس نے اسے کھولا۔ آدھی توجہ سعدی کی طرف تھی۔

”میں نے قانون پڑھ کے کرنا ہی کیا ہے؟ دنیا جہاں کے لوگوں کو انصاف دلانے کے لئے آپ موجود ہیں نا۔ میں تو آرام سے ڈزر کرنے جا رہا ہوں اپنے سے پیچھے پہنچی خوبصورت لڑکی کے ساتھ۔ وہ کہہ رہی ہے کہ اسے ایک ثبوت دینا ہے مجھے۔“ زمر نے اب کے گردن موڑ کر اسے گھورا تو آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ فارس نے آنکھوں میں سادگی لئے شانے اچکا دیے۔ زمر نے ”ہونہہ“ کر کے سرداپیں پھیر لیا۔ ادھر سعدی کہہ رہا تھا۔

”میں با تھروم گیا تھا، اور چند منٹ میں واپس آگیا تھا۔“

”تو آپ میرے گھر سے کچھ چڑکنیں نکلے تھے؟“

”میں نے کوئی نیکلیں یا یورپیں چرایا تھا۔ نہ کوئی نقدي وغیرہ۔“

”سعدی یوسف خان“ مجھے صرف اتنا بتائیں کہ جب آپ نے گھر جا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے کوئی نیکلیں نکالا یا نہیں؟“

”چونکہ میں نے کوئی نیکلیں نہیں چرایا تھا اس لئے میں نے جب کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے کوئی نیکلیں نہیں نکلا۔“ اس نے مزے سے دھر دیا۔ جنین نے گھری سانس لی۔ وہ بچ کہہ رہا تھا۔ نیکلیں حنہ نے اس کے کوٹ سے نکالا تھا۔ خود اس نے نہیں۔

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ خیر میں کیا کر سکتا ہوں۔ چلتے۔ یہ تصویریں دیکھئے سعدی۔“ ہاشم اب اس کو پر جیکیڑا سکریں پہنڈ شاہس دکھار رہا تھا۔ ”یہ ہارون عبید کے اس ہوٹل کی پیسمت کی تصاویر ہیں جہاں میں نے طور پر آپ کو قید رکھا گیا،“ بقول آپ کے، لیکن جب میڈیا کے نمائندے وہاں گئے تو یہاں جائے لگئے تھے اور برسوں کا کٹھ کیا ٹھاپ رہا تھا۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟“ سعدی نے ایک نظر اسکریں کو

”میرے بیہاں سے نکلنے کے قریباً ایک ماہ بعد میڈیا کے نمائندے بیہاں گئے۔ ایسا سیٹ آپ کرنے لئے ایک دن بھی بہت ہوتا

ہے۔“

”تو آپ ابھی بھی مصر ہیں کہ نو شیر وال کاردار نے آپ کو بیہاں قید کھا؟“

ہاشم نے مصنوعی تعجب ظاہر کیا۔ وہ ٹکھیوں سے زمر کو دیکھتا رہا، اس کے اٹھ کر objection چلانے کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ اطمینان

سے بیٹھی قلم دانتوں میں دبائے رہی۔

اس نے اپنا گواہ تیار کر کے بھیجا تھا۔

”ذر اس تصویر کو زور دیجئے کاردار صاحب۔ یا اس طرف سے۔“ سعدی اطمینان سے انگلی اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ ہاشم نے سر کو خم دیا اور

متعلقہ جگہ سے زور کیا۔

”یہ کونے میں دیوار پہ...“ سعدی اشارہ کر کے بتا نے لگا۔ ”بھی بالکل ان گندے کاٹھ کبڑے کڈوں کے پیچھے دیوار پہ چندر لکیریں

نظر آ رہی ہیں۔ عدالت میں جمع کروائی تصاویر میں بھی یہ لکیریں واضح ہیں۔ ہارون عبید کے آدمیوں نے ان کو اس لئے چھوڑ دیا کہ شاید یوں یہ

دیوار مزید خستہ لگے مگر یور آنر یہ پوری 247 لکیریں ہیں۔ 21 مگی سے 22 جنوری تک کے دن میں نے گن رکھے تھے۔ میں روز ایک لکیر کا

اضافہ کرتا تھا۔ آپ ان کو گناہ کردیکھ لیں۔ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا کہ یہ بھی اتنی ہی ہوں جتنے دن میں قید میں رہا ہوں۔“ وہ اعتماد اور سکون سے بول

رہا تھا۔ ہاشم ایک دم لا جواب ہو گیا تھا۔ نج صاحب اب دیکھی سے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے فائل میں ایک نظر نوٹ کیا۔

”سعدی یوسف آپ کا کہنا ہے کہ آپ کو کاردارز کے آدمی نے پاسپورٹ دیا اور یوں آپ ملک واپس آگئے۔“ ہاشم نے

موضوع پرلا۔

”جی، کاردار زمیں سے ہی کوئی تھا۔“

خنیں نے فوراً سے فارس کو دیکھا۔ (آدھا کاردار۔) وہ ڈھنائی سے سامنے دیکھتا رہا۔

”لیکن آپ کے پاسپورٹ کے مطابق آپ افغانستان میں بھی رکے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہاں آپ کا کیا کام تھا؟“ اور

یہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنی فانکلوں کے درمیان سے ایک شفاف پیکٹ نکالا اور اور پنج صاحب کے سامنے رکھا۔ سعدی بالکل سُن رہ گیا۔

پاسپورٹ مکڑے مکڑے تھا۔ یہ وہی تھا جو اس نے پھیلایا تھا۔ اب کے ہاشم نے فاتحۂ نظر وہ سے سعدی کو دیکھا۔

”کیا آپ کے افغان طالبان گروہوں سے تعلقات ہیں سعدی یوسف اور یہ سارا ڈرامہ آپ فساد پھیلانے کو کر رہے ہیں؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ سعدی بولا تو اس کی آواز غصے سے کاپنی تھی۔

”آپ جیکش یور آنر۔ اس بات کا کیس سے کیا تعلق؟“ وہ فوراً کھڑی ہوئی۔

”اور وولد۔ تعلق تو ہے۔“ نج صاحب نے ہاتھ اٹھا دیے۔

”یور آنر سعدی یوسف نے کہا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اگلی ساعت پر دفاع اس بات کے خلاف rebuttal ثبوت پیش کرے گا جو یہ

ثابت کریں گے کہ سعدی یوسف طالبان کے آلہ کار کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ ہاشم نے سرد مرہی سے نج صاحب کو اطلاع دی۔

”یور آنر میں دہشت گروہ نہیں ہوں۔ میں یہی کام کا ایک انجیسٹر ہوں۔ میرے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہیں۔“ وہ پھٹ پڑا تھا۔ اس کی

آواز کا نپ رہی تھی۔ ”میں انصاف مانگنے آیا ہوں اس عدالت میں یہ مجھے ایسے دہشت گرد براثت کیسے کر سکتے ہیں؟“ اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ زمر نے اسے کٹھرے سے اترنے کا اشارہ کیا۔ ہاشم نظر انداز کر کے اب اختتامی فقرے دہرا رہا تھا۔ وہ

دل برداشت سا وہاں سے اترے۔

فارس اپنی نشست سے گھوما اور مژہ کر آبدار کو دیکھا۔

”آپ کے پاس واقعی کچھ ہے مجھے ذریپہ دیتے کے لیے؟“ سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ تفاخر سے مسکرائی۔

”جی۔ ایک نائی پن کیسرے میں ریکارڈ مسز کاردار کا وہ حکم نامہ جو ثابت کرتا ہے کہ فتح سعدی کو مارنے گیا تھا۔ چاہیے تو جو وقت اور جگہ میں نیکست کر رہی ہوں ادھر آجائے گا۔ میں دلوگوں کی نیلیں بک کروں چکی ہوں۔“

”مجھے اپنی زبان دیں کہ آپ اسے ذریپہ ساتھ لائیں گی۔“

” وعدہ!“ اس کی آنکھیں بہت محبت سے چمکی تھیں۔ وہ خاموش رہا۔

کورٹ روم سے سب سے پہلے آبدار نکلی تھی۔ پھر کاردار۔ نو شیر وال نکلتے ہوئے بالکل شل سا کہہ رہا تھا۔ ”اس نے دوقت کا اعتراض کیا مگر اسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ کیا پاگل بن ہے یہ؟“

”سوری سرگرام سے Law of the land کہتے ہیں۔“ احرار کو سمجھاتا ہوا بہر جا رہا تھا۔ ”یہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ پولیس یا کوئی اور کسی سے جبری اعتراض جرم نہ کرو سکے۔ اور....“ ان کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔

وہ پانچوں ایک ساتھ باہر نکلے تھے۔ راہداری میں تیز بہتے ہجوم کے باوجود وہ رکھڑے تھے۔

”آپ نے بھائی.... دلوگ....“ حینہن کہتے رک گئی۔ یہ وقت نہیں تھا ایسی باتوں کا۔ کیونکہ پہلی دفعہ سعدی پر یشان لگ رہا تھا اور فارس کو ازسر نوغصہ چڑھ گیا تھا۔ ”تم نے مجھے کہا تھا کہ تم نے وہ پاسپورٹ ڈسپوز آف کر دیا ہے۔ یہ ڈسپوز آف کیا ہے تم نے؟“ وہ دبا دبا سا غرایا۔ ساتھ میں اسے کھاجانے والی نظروں سے گھوڑ بھی رہا تھا۔

”میں نے کر دیا تھا۔ مختلف جگہوں پہ پھیکا تھا۔ کسی کو کیا پتہ میں ادھر آ رہا ہوں۔ کیسے کسی نے اس کو اٹھایا۔ پھر جوڑا۔“ وہ سخت پر یشان ہو گیا تھا۔

”اٹس او کے۔ اتنا مسئلہ نہیں ہے۔“ زمر نے سجاوے سے کہتے ہوئے تسلی دی۔ ”یہ تمہاری سیلف ڈیفنیس متوہی۔ تمہیں کوئی اس پر کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ ہمیں اس وقت ڈاکٹر سارہ پوف کس کرنا ہے۔ ان کو گواہی دینی ہو گی، ہر حال میں۔“

فارس نے ایک ملاحتی نظر ان دونوں پڑائی اور سر جھک کر آگے بڑھ گیا۔ حینہن اس کے پیچے لپکی۔ شور، ہجوم اور اس ساری چھل پھل کے درمیان میں سے گزرتی، وہ بالآخر اس کی رفتار سے جاتی۔

”توہاشم اب اس پاسپورٹ کے ذریعے بھائی کو دہشت گرد ثابت کرے گا؟ بھائی بہت ہرث ہو گا یوں ماموں۔ ہم اس کا ہرث کیسے کم کریں؟“ وہ فکر مند اور ناخوش لگتی تھی۔ فارس نے رفتا بلکل کر دی، پھر چند گہری سانسیں اندر کھینچیں۔

”ہمیں اب اس بات کو یقینی بنانا ہو گا۔ حینہن کہ تمام گواہ درست گواہی دیں۔ اور سب سے پہلے ہمیں سارہ کو راضی کرنا ہو گا۔ ہمیں زمر اور سعدی کی مدد کرنی ہو گی اور اس طریقہ کو سنجیدہ لینا ہو گا۔“ وہ اب اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حمدہ سر ہلاتی سن رہی تھی۔

”ٹیم زمر کی مدد کرنا... سوپورنگ۔“ وہ ناراضی سے بوئی تھی۔

کچھری کے باہر لی سیاہ شیشے والی کارز کی طویل قطار لگتی تھی۔ جواہرات کو گوکہ ہر پیشی پر آنے کی ضرروت نہ تھی لیکن وہ ہر دفعہ نیسا یا ڈیزائنر ویر اور فنی جیولری پکن کے ضرور آتی۔ اسے معلوم تھا کہ ہاشم جسٹ جائے گا، سو وہ اس سارے دورانیے میں بھرپور میڈیا attention سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنی کار میں آ کر بیٹھی تو احمد فرنٹ سیٹ پر بیٹھا موبائل دیکھ رہا تھا۔ جواہرات نے ایک نظر نو شیر وال اور ہاشم کی

گاڑیوں کو آگے نکلتے دیکھا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یا آبدار فارس وغیرہ کے ساتھ کیوں بیٹھی تھی؟“

”وہ تو دو ماہ سے ہر پیشی پر آ کر ادھر ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ہمارے ساتھ نہیں بیٹھنا ان کو۔“ وہ موبائل سے کھیلتا ہوا بولا تھا۔ کاراب سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

”اور تم کہاں تھے؟ آتے ساتھ ہی غائب ہو گئے۔ پھر تم اور فارس باری باری کورٹ روم میں داخل ہوئے۔ ہاں احمد؟“ وہ نرم مگر گھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ احمد نے پورے سکون سے چہرہ موڑا۔

”غازی نے بلا یا تھا مجھے۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا۔“ وہ پورے اعتماد سے اسے بتا رہا تھا۔ ”وہ اس مقدمے سے خوش نہیں ہے۔ آپ کے لئے پیغام بھجوایا ہے کہ ڈاکٹر سارہ کو تنگ نہ کبجئے گا ورنہ وہ ہر حد تک جائے گا۔“

”تمہارا دوست رہا ہے۔ کچھ اور پوچھا نہیں اس نے تم سے؟“

”اگر میں اتنی آسانی سے بتانے والوں میں سے ہوتا تو آپ کی کارکی فرنٹ سیٹ پر نہ بیٹھا ہوتا۔“ مسکرا کرتا بعداری سے بولا تھا۔ جواہرات کے لب بھی مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ سر کشم دیا اور باہر دیکھنے لگی۔ اسے احمد پر اعتبار تھا۔

..... ♦♦♦♦♦

جو سیلا بلوں کی رو میں بہہ گئے ہیں ..... کرے گا کون ان قبروں کا ماتم؟ سارہ کے گھر کے لوگ روم میں اس وقت شدید تباہ کی سی کیفیت تھی۔ ایسے چیزے ہر شخص کی گردان سے ڈریاں بن گئیں اور ان ڈریوں نے ساری فضائیں کھنقاو پیدا کر دیا ہو۔ کوئی ڈھیلا پڑنے کو آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔

”سارہ اگر تم نے وہ سب کچھ دیکھا تھا تو تمہیں کسی سے تو کہنا چاہیے تھا۔“ ندرت ملال سے کہہ رہی تھیں۔ پچھلے ڈھالی ماہ میں وہ یہ بات کئی دفعہ دھرا چکی تھیں۔ سامنے صوفوں پر موجود زمر، فارس، خین، اور خود ذکر یہیں سب خاموش تھے۔ جب ندرت بوئیں تو وہ اسے دیکھتے جب سارہ بولتی تو اسے۔ ٹیکس کے مقیج کی طرح نگاہیں دائیں سے باسیں سے دائیں داہیں داہیں دے دیں۔

”آپ آپ سب کچھ جانے کے باوجود ایسا کیسے کہہ سکتی ہیں۔“ سامنے والے سنگل صوفے پر فکر مند، اور بے بی بھرا دبادبا غصہ لئے بیٹھی سارہ نے شاکی انداز میں کہا تھا۔ وہ ابھی آفس سے آئی تھی۔ بال جوڑے میں بند ہے تھے۔ پرنس بھی ساتھ ہی رکھا تھا۔ چہرے پر تھکان تھی مگر آنکھوں میں خنگی بھی تھی۔ ”خاور نے مجھے ہر اس کیا تھا۔ وہ لوگ میرے بچے مار دیتے، کیا یہی چاہتے ہیں آپ لوگ؟“

”اچھا ٹھیک ہے وہ سب پچھے رہ گیا۔ لیکن اب تو سارہ تم عدالت میں پیش ہو جاؤ ورنہ سعدی کا کیس بہت کمزور ہو جائے گا۔“ ندرت نے رسان سے سمجھانا چاہا۔

”میں کیسے عدالت میں کھڑے ہو کر یہ سب کہوں؟ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ آپ لوگ مجھے سمجھانے کے بجائے خود کیوں نہیں سمجھتے؟“ وہ ڈری ہوئی نہیں تھی، وہ ان کی عقلalon پر متعجب تھی۔

”سارہ انہوں نے جو سعدی کے ساتھ کیا، تم اس کے لئے کوئی گواہی نہیں دوگی کیا؟“

”تاکہ جو سعدی کے ساتھ کیا ہے وہی میرے بچوں کے ساتھ کریں؟ کیا اب بھی آپ لوگوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔“ حیرت سے ان سب کو دیکھا۔

”میرا شوہر مرا۔ فارس کی بیوی مری۔ زمر کے ساتھ جو ہوا۔ سعدی کے ساتھ جو ہوا۔ اب بھی آپ لوگ ان کے خلاف جانا چاہتے ہیں؟“ وہ حیرت سے بزرگ نکھیں پھیلائے کہہ رہی تھی۔

”سارہ!“ فارس ہلکا سا کھنگا را۔ پھر ذرا آگے کو ہو بیخا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ دوبارہ کسی کے ساتھ ایسا نہ ہو اس لئے ان کو سزا دلوائی جائے۔“

”یہی وارث کی منطق تھی، یہی زمر، سعدی اور تم نے کیا۔ تم لوگ میرے پجوں کو اب ایک نئے تجربے کی بھیست چڑھانا چاہتے ہو؟“ وہ صدمے سے بول رہی تھی۔

”ڈاکٹر سارہ آپ کو کورٹ نے سمن کیا ہے، آپ کو آنا تو پڑے گا۔ اسینڈ پکھڑے ہو کر حلف تو لینا ہو گا۔ پھر جھوٹ بولیں گی کیا آپ؟“ زمر جو ناگ پٹانگ بجائے بیٹھی مسلسل نیلی آنکھی کو انگلی میں گھماری تھی، رسان سے بولی تھی۔

”سوری زمر لیکن میں کسی عدالت میں نہیں جا رہی۔ اور پیز بمحض ان جج میں نظر وہ سے نہ دیکھیں۔ آپ میری جگہ نہیں ہیں۔ اس لئے نہیں سمجھ سکتیں۔“

”ڈاکٹر سارہ میں آپ کی جگہ پانچ سال پہلے تھی اور میں نے کورٹ میں گواہی دی تھی۔ میں چھپ کر گھر میں نہیں بیٹھ گئی تھی۔ گواہی چاہے غلط تھی یا صحیح تھی، چھپائی نہیں تھی میں نے!“

”آپ نے فارس کے خلاف گواہی دی تھی، کاردارز کے خلاف نہیں۔ بھری عدالت میں کاردارز کو قاتل نہیں کہا تھا آپ نے؟“ ”میں پچھلے دو ماہ سے بھری عدالت میں کاردارز کو ہی قاتل بول رہی ہوں سارہ، اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ مجھے ایک دفعہ بھی انہوں نے دھکی نہیں دی۔ اتنے ہائی پروفائل کیس میں ہاشم جیسے لوگ گواہوں یا وکیلوں کو نہیں نقصان پہنچاتے۔ وہ ہم سے ڈرے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان سے نہیں ڈرنا۔“

زمر اسی انداز میں کہہ رہی تھی۔ سارہ نے نفی میں سر ہلا�ا۔ وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ ”آپ نہیں سمجھ سکتیں زمر۔ آپ کے دو چھوٹے چھوٹے بچے نہیں ہیں جن کے لئے آپ کو ڈرنا پڑے۔“

لاؤخ میں ایک دم سناثا چھا گیا۔ فارس نے بے اختیار نگاہیں چ رائی تھیں۔ پہنہیں کس سے۔ حمد کے دل کو کچھ ہوا۔ ندرت نے پہلو بدلا۔ مگر زمر اسی طرح آرام سے بیٹھی رہی۔ آنکھوں کے تاثرات پر سکون رہے۔

”جی سارہ، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے دو بچے نہیں ہیں۔ میرے تین بچے ہیں اور میں یہ سب انہی کے لئے کر رہی ہوں۔“ حمد مسکرا دی۔ بہت سی ڈوریاں جیسے ٹوٹ گئیں۔ تناو گویا نضا میں گھل گیا۔ بہت سے لوگوں نے سکون کی سانس لی۔ سارہ چند لمحے کو تو بول نہیں سکی، پھر اٹھ گئی۔

”مجھے ایک مینگ میں جانا ہے۔ اور میں مزید یہ بات نہیں کرنا چاہتی۔“ پھر ایک ملامتی نظر فارس پر ڈالی۔ ”اب تم بھی مجھے سیف راست نہیں دینا چاہتے کیونکہ تمہیں بھی اب اس ٹرائک والی منطق سے اتفاق ہو گیا ہے، ہے نا۔“

”آپ کے لئے گواہی دینا بہتر ہے سارہ۔“ وہ نرمی سے بولا تھا۔ سارہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ سب خاموش رہ گئے۔ ماحول افسرہ ہو گیا۔ پھر فارس کھنکھارا۔ ”میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے بھی....“ زمر کو دیکھا۔ ”کسی کے ساتھ ذر زر کرنا ہے۔“

زمر یوسف جو چند لمحے پہلے تک پر سکون سی بیٹھی تھی، اب کے آنکھیں انھا کر اسے دیکھا تو ان میں آگ کی لپیٹن نکل رہی تھیں۔

”تو ڈر کے نام جانا۔ ابھی سے کیوں جا رہے ہو؟“

”اچھا ہے نا۔ ذرا گپ شپ لگانے کا وقت مل جائے گا۔ کبھی کبھی تو ایسا بہانہ ملتا ہے۔“ تھوڑی کھجاتے ہوئے وہ سادگی سے بولا تھا۔

(دونبر آدمی!) وہ بڑا کر رخ موڑ گئی۔ سارا موڑ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اب اپنا والٹ اور چاہیاں انھا رہا تھا۔ زمر کا بہت دل چاہ رہا

تھا کہ وہ اسے روک لے مگر اب مت تو کرنہیں سکتی تھی۔  
(اب یا اس کے ساتھ ڈز کرے گا۔ پتہ نہیں کتنے گھنے۔ اچھا بہانہ ہے۔ ہونہہ بہوت مائی فٹ۔ دو نمبر قسم کے بہانے۔) وہ کتنی ہی  
دیر خاموش پیشی گلکتی رہی تھی۔

سوج کا آئینہ دھندا ہو تو پھر وقت کے ساتھ ..... انہ چھروں کے خدوخال گزر جاتے ہیں  
ہوٹل کی لابی میں معمول کی گھما گئی تھی۔ دیواریں دیواریں اور عالیشان ستونوں سے مزین لابی میں اونچے فانوس لٹک رہے تھے  
زرد روشنیوں نے خوابناک ساماںوں بنارکھا تھا۔ ایک طرف اونچے ششی کے پار مصنوعی آبشار بہرہ رہی تھی۔ پانی اور پر سے نیچے آ کر حوض میں گرتا  
بہت دلفری معلوم ہو رہا تھا۔ ششی کے دیوار کے قریب جہاں بہت سے سیاح رک رک کر آبشار کے ساتھ تصاویر بیوار ہے تھے وہاں نو شیر وال  
بھی کھڑا تھا۔ مگر اس کی پشت ششی کی طرف تھی۔ وہ آبشار کو نہیں اپنے فون کو دیکھ رہا تھا۔  
وھتنا سامنے سے شہرین آتی دکھائی دی۔ اس کے سنبھالی بال اونچی پونی میں بند ہے تھے اور مسکارا کے باجوہ آنکھوں میں شدید بے  
چین کا تاثر تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اس کے قریب آئی۔  
”تجھیک گا ڈتم آ گئے۔“ شور کے باعث اسے بلند آواز میں نو شیر وال کو مخاطب کرنا پڑا تھا۔ شیرونے بے گانگی سے چہرہ اٹھا کر اسے  
دیکھا۔

”تم نے کہا تھا کہ اس کا تعلق میرے کیس سے ہے، اسی لئے آیا ہوں بولو۔“  
شہرین نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ”تم ہاشم کی طرح ہوتے جا رہے ہو۔ ابھی ایک سال پہلے کی بات ہے جب تم مجھ سے ...“  
اس نے سر جھکا۔ ”اچھا آؤ کہیں پیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“  
”پیٹھ کر بات کرنے سے تمہاری کڑوی باتوں میں مٹھاں نہیں گھل جائے گی۔ جو بتانا ہے یہیں بتاؤ۔“  
شہرین نے سینے پر بازو لپیٹ لئے اور تندہ ہی سے اسے دیکھا۔ ”تجھیں مجھ سے ذرا احتیاط سے بات کرنی چاہیے۔ یہ مت بھولو کر تم  
میرے سامنے اعتراض جرم کر چکے ہو اور کورٹ نے مجھے گواہی کے لئے بلا یا ہے۔“  
”تو جاؤ دے دو گواہی۔“ اس نے شانے اپکائے تھے۔ اس کے انداز میں کچھ عجیب سی بے پرواہی تھی۔  
”میں نے گواہی دی تو تم جیل میں پڑے ہو گے۔ ڈرواس وقت سے۔“  
نو شیر وال نے فون سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”بھی ابر و اچکانے والے انداز میں۔“

”اعتراف جرم اتنی بڑی بات نہیں ہوتی شہرین۔ میں نے آج دیکھا سعدی کو... اپنی آنکھوں سے دیکھا...“ دو انگلیوں سے اپنی  
آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے بھری عدالت میں کہا کہ اس نے دلوگ قتل کیے ہیں۔ لیکن کسی نے اس کو اس disgust اور نفرت سے  
نہیں دیکھا جیسے اس روز کلب میں لوگوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میری گولیوں سے وہ مر اتو نہیں تھا، میں اقدام قتل کا مجرم ہوں، قتل کا تونہیں۔ اس  
نے تو دلوگ... دو انسان مار دیے اور کسی نے اس کو ایسے نہیں دیکھا۔ قانون، پولیس، سب اس کو پروٹیکٹ کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ میں نے کسی کو  
مارا ہے، اتنی بڑی بات نہیں تھی شہری۔ گناہوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ان کو فیس کرنا چاہیے۔ یا تو ہاشم بھائی کی طرح ان کے لئے ایک ہزار  
تاولیں گھر لینی چاہیں یا پھر..... سعدی کی طرح ان کا اعتراف کر کے ان کو own کرنا چاہیے۔ اپنے خوف اور ڈر کو own کرنا چاہیے۔“  
شہرین نے بے زاری سے اس کی بات کاٹی۔ ”شیروں میں تمہارے خلاف گواہی نہیں دوں گی، اگر تم مجھے اپنی کمپنی میں شیزرز اور.....“  
”پتہ ہے شہری میں کتنے مہینوں سے، بلکہ ایک سال سے غنف قسم کے واہموں اور خوف کا شکار رہا ہوں۔ سرخ شربت دیکھوں تو

خون نظر آتا تھا۔“ وہ سر اٹھائے اور پر جھولتے فانوس پر نگاہیں جمائے کہر رہا تھا۔ وہ عجیب سی ذہنی کیفیت میں تھا۔ ”کہتے کو ماروں تو لگتا انسان کو مار دیا ہے۔ ہاتھوں پر سرخ دھبے نظر آتے تھے۔ گلیدھبے۔ خون ہر جگہ تھا۔ میں براء خواب دیکھتا تھا۔ شاید مجھے باپی پورا ہو گیا تھا یا شاید Obsessive compulsive disorder ہے کیا شہری.... آج میں نے دیکھ لیا ہے۔“ اور پرانی اس کی آنکھوں میں فانوس کی جھملاتی روشنیاں اتر آئی تھیں۔ ”میں نے دیکھ لیا ہے کہ بہادر وہی ہوتا ہے جو اپنے خوف کو بوج لے اور پھر بچونک مار کر اس کو راکھ کی طرح اڑادے۔ خوف سے بھاگنا مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ خوف کے اندر غوطہ کھانا اور پھر اس سے نکل آنا انسان کو اصل آزادی دیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آزاد ہونے جا رہا ہوں۔ مجھے بالآخر...“ داکیں سے باکیں وہ ہوٹل کی طویل لابی کی اوپنجی چھت سے لٹکتے فانوس پر نظر ڈالتے ہوئے کہر رہا تھا۔ ”مجھے بالآخر روشنی نظر آنے لگی ہے۔ اور جب تک میں اپنے آپ سے بچ نہیں بولوں گا، میں آزاد نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے روشنی نظر آنے لگی ہے۔ ہاں اب.... اب کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے۔“

شہرین منہ کھولے اسے یوں دیکھ رہی تھی گویا اس کا دماغ چل گیا ہو۔

”شیر و دیکھو میری بات سنو، تم خواہ جنواہ گلٹی ہو کر اپنا کیس مت خراب کرو۔ یوں تم.....“

”تھینک یو میری بات سننے کے لئے۔ اب میرا دماغ گلٹیر ہوا ہے۔“ وہ سر ہلاتا، اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک کسی دوسری دنیا میں تھا۔ جیسے دل و دماغ بہت سی آلاش سے پاک ہو گیا ہو۔

عرصے بعد اسے ایک روشنی کی امید نظر آئی تھی۔

اور یہ روشنی دکھانے والا بھی سعدی تھا۔

ایک دفعہ پھر وہ اس سے آگے نکل گیا تھا۔

گُر آج حمد محسوس نہیں ہوا تھا۔



خن و رو اس منافقت سے تو خود کشی کا شعار سیکھو ..... زبان کا زخم زخم ہونا، حروف کا کھردے نہ رہنا ہاروں عبید کی رہائشگاہ شام کے بہم انہیروں سے ڈھکی دکھائی دیتی تھی۔ مرکزی ڈرائیکٹر دم سے گفتگو کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان کو نظر انداز کر کے تم گول سیر ہوں کو پھلانگتے اور جاؤ اور آبدار کے دروازے کے کی ہوں سے اندر جھانکو تو وہ اس طرف پشت کیے ڈرینگ نیبل کے سامنے بیٹھی نظر آرہی تھی۔ آئینے میں اس کا ٹکس جھملاتا رہا تھا۔ سرخ بال... سیدھے سرخ بال کر پر گرے ہوئے تھے اور اس نے سرخ چھوٹا ساروں وال ہیز بینڈ کی طرح ماتھے سے ذرا اوپر سرپہ پیٹ رکھا تھا۔ وہ کلائی میں چوڑا سا داشت گولڈ بریسلٹ پہنے ہوئی تھی الباس سورسلک کا تھا، اور دیگر جیولری بھی داشت گولڈ کی تھی۔ اس سارے سفید پن میں سرخ اس کاروں تھا یا پھر اپ اسٹ۔ وہ مسکرا کر پھرہ مختلف زاویوں سے موڑتی آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی.... دفعنا اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ فارس کا پیغام سامنے ہی چک رہا تھا۔

”آٹھ بجے تک آ جاؤ؟“ اور جواب میں آبدار کا ”لیں“ لکھا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے گھڑی دیکھنے لگی۔ ابھی پورا گھنٹہ

پڑا تھا۔

یچے واپس آؤ تو لا دخ میں مختلف صوفوں پر ہاشم اور ہاروں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ ہاروں صوفے کی پشت پر بازو پھیلائے بیٹھے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے بغور ہاشم کو دیکھ رہے تھے جو ذرا ڈھیلا ہو کر بیٹھا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے کسی غیر مرمنی نقطے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی انجان شخص کو پہچاننے کی سعی کر رہا ہو۔

”تمہاری پوزیشن دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے ہاشم!“ ہاروں ہمدردانہ لمحے میں گویا ہوئے۔ گھاٹ نگاہیں ہاشم کے پھرے سے

ہٹ نہیں رہی تھیں۔ ”ہمارے دوست تمہارے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو رہے ہیں۔“

ہاشم نے چونک کر ان کو دیکھا۔ ہنویں سکڑیں۔ ”کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”بہت سے لوگ بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں۔ تم... ساتھاب وہ مزید نہیں کام کریں گے۔ اسلحہ خریدنے کے لئے پیسہ وہ کسی اور سے لانڈر کروانے کے آپشن پر غور کر رہے ہیں۔ تم... ایک... ڈوبتا ہوا... بائی ٹینک ہو... ہاشم!“

ہاشم کے چہرے پرخ مسکراہٹ آبکھری۔ ”ہونہے،“ اس نے سر جھکایا۔ ”مجھے ڈبنا اتنا آسان نہیں ہے ہارون۔“

”سنا ہے تمہارے اور سعدی یوسف کے کیس کا جج کافی ایماندار اور سخت ہے۔ بڑے بڑے فیصلے کیے ہیں اس نے ماضی میں۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ کم از کم سعدی اسے خرید یا ڈرانہیں سکتا۔“

”پھر تو تم بھی اسے نہیں خرید سکتے۔“ ہارون کے لمحے میں تعجب درآیا۔

”اوہ ہارون۔ تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ مجھے جج کو خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ قانون نو شیراداں کے ساتھ ہے۔ قانون ملزم کا ساتھ دیتا ہے ہمیشہ۔ ملزم قانون کی محبوب اولاد ہوتا ہے۔ قانون کے جھول اسے بری کروادیں گے بہت جلد۔ رہے ہمارے دوست تو ان سے کہنا، اگر میں ڈوباتو سب کو لے کر ڈبوں گا۔“ کارکھڑ کا کروہ رعنوت سے بولا تھا۔

”خیر، تم سعدی کو صحیح کے قتل کے جرم میں پکڑا نہیں سکتے کیا؟“

”اگواری تو ہو گی مگر ایک بات مجھے تنگ کر رہی ہے۔ سعدی نے کہا تھا کہ اس نے سیلف ڈیفینس میں قتل کیا ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔ ”یعنی فصح نے اس کو مارنے کی کوشش کی۔ پہلے گارڈ کارنے بھی اس کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ میری ناک کے نیچے دو لوگ اس کو کیوں قتل کرنا چاہیں گے ہارون؟“ اور چبھتی ہوئی آنکھیں ہارون کے چہرے پر جمادیں۔ ہارون اسی طرح ٹھنڈے انداز میں اسے دیکھے گئے۔

”ہو سکتا ہے سعدی جھوٹ بول رہا ہو۔“

”مجھے لگتا ہے مجھ سے کوئی اور جھوٹ بول رہا ہے۔“

”تو پھر اپنی ناک کے نیچر ہنے والوں سے سوال کرو۔ مجھ سے نہیں۔“ ہارون مسکرا کر بولے تھے۔ ہاشم اپنی چبھتی نظر وہ سے انہیں دیکھے گیا۔

”اگر تمہاری کوئی انواع منش نکلی ہارون تو....“

”وہ وقت گزر گیا جب تم میرے ڈرائیگ روڈ میں بیٹھ کر مجھے دھمکاتے تھے ہاشم۔ جاؤ، اپنے بھائی کو بچانے کی فکر کرو۔“ ہارون کے چہرے پر اب بھی وہی سپاٹ بن، وہی سرد مسکراہٹ تھی۔ ہاشم کاردار کو اندر تک جیسے کسی نے جلاڈ الاتھا مگر اس بات کا جواب وہ دے نہیں پایا تھا۔ وہ جس وقت باہر پورچ کی طرف جا رہا تھا، اسے لان عبور کر کے آتی آبدار دکھائی دی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر ٹھنکتے تھے۔ دونوں کے قدام ٹھہر گئے تھے۔ نگاہیں ملیں۔ ہاشم نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ وہ کافی تیار اور تھی سنوری لگ رہی تھی۔ سرنج لپ اسٹنک سب سے زیادہ واضح تھی۔

”زیری۔“ وہ مسکرا یا۔ زخمی سا انداز تھا۔ آبدار سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی۔ ہاتھ میں ٹھیق تھا۔ سامنے تیار کر تھی جس کا دروازہ کھولے کھڑا ڈرائیور جس نے چاپی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی گویا آبی کے حوالے کرنی ہوتا کہ وہ خود ڈرائیور کے جائے۔ ہاشم نے ہر تفصیل کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے کندھے کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ بولا۔

”پوچھ سکتا ہوں اتنا خاص کون ہے جس سے ملنے جا رہی ہو؟“

آبدار لمح بھر کو پھری۔ چہرہ سمجھیدہ اور سپاٹ رہا۔ ”نہیں۔“ کارکی طرف دیکھتے ہوئے نشک مزاہی سے بولی اور آگے بڑھ گئی۔ ہاشم کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق وہ اکیلی ڈرائیور کے جاری تھی۔

❖❖❖

وہ بھی کیا لوگ ہیں حسن جو وفا کی خاطر! ..... خود تراشیدہ اصولوں پر بھی اڑ جاتے ہیں اطاولی ریسٹورانٹ کے برآمدے میں پنجی میزوں میں سے ایک پر آبدار عبید پیٹھی تھی۔ کمر پیچھے لگائے اور کہنی کری کے ہتھ پر جما کر اپنے ایئرگ سے کھلیتی، وہ منتظر نظروں سے داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لان میں لگی میزوں پر موجود افراد پر بھی بار بار اس کی نظر بھلتی۔ کبھی کلامی پر بندھی گھڑی دیکھتی۔ وہ بھی تک نہیں آیا تھا مگر ابھی وقت پڑا تھا۔ ایک فاتحانہ مسکراہست اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

مورچاں میں آٹھ بجے والے ڈرائے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ ندرت مسلسل اونچا اونچا ڈانٹ کر اسامہ کو خاموش ہونے کے لئے کھڑہی تھیں جو سارا اسکول کا کام لا دئن میں بیٹھ کر ہی کرنے کی تھانے ہوئے تھا۔ ساتھ میں مسلسل بڑے ابا کو بتا رہا تھا کہ حسینہ کو صداقت نے کتنا قیمتی Samsung کا اسارت فون لے کر دیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ چاند والا نہیں بلکہ خالص اصلی والا ہے۔ ندرت نے چپ اٹھائی تو وہ خاموش ہوا۔

سعدی قانون کی موئی سی کتاب اٹھائے لادنخ کے ایک کونے میں بیٹھا خاموشی سے پڑھ رہا تھا۔ اور ان سب سے لائق، زمرا پر کمرے میں استڑی تیبل پر بیٹھی تھی۔ بار بار گھڑی دیکھتی، چہرے پر بے چینی بھی تھی اور غصہ بھی۔

”کیا اب وہ اس کے ساتھ بیٹھا ہو گا؟ ذر منگوار ہا ہو گا۔ شوت کے تو بس بہانے ہیں۔ موقع چاہیے فارس کو بس۔“ وہ سخت خفالگ رہی تھی۔ بار بار موبائل اٹھاتی پھر کھدیتی۔

”میں کیوں فون کروں؟ مجھے پرواہ تھوڑی ہی ہے۔ ہونہہ۔“ مسلسل خود سے بولے جارہی تھی۔ .... ریسٹوران میں واپس آؤ تو وہاں کھانے کی اشتہا انگیز خوبصورتی تھی۔ آبدار اسے داخلی دروازے سے ہی نظر آگئی۔ اس نے گھری سانس لی اور قدم اس کی طرف بڑھا دی۔

آبی نے یقیناً سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ مگنی سی مسکراتی ہوئی، سوچ میں گم بیٹھی نظر آرہی تھی۔ اس نے آبدار کو نگاہوں میں رکھے لان پار کیا، بہت سی میزوں کے درمیان سے راستہ بنایا اور پھر برآمدے کے زینے عبور کیے۔ چند ڈگ مزید اٹھائے، یہاں تک کہ آبدار کی میز سامنے آگئی۔ اس نے قدم روک لئے۔ آبی کے بالکل سامنے۔

وہ جو مگنی سی بیٹھی تھی، کسی کے آنے کی آہٹ پر چوکی۔ پھر مسکراتی نظریں اٹھائیں، مگر جیسے ہی آبدار نے سامنے موجود ذی نفس کو دیکھا، اس کی مسکراہست غائب ہوئی۔ آنکھوں میں اب حسن سی ابھری۔

”سوری... آپ کون؟“ جانتے بوجھتے بھی اس نے سوال کیا۔

سامنے کھڑی حسین نے مسکرا کے کری کھنچنی۔

”میں حسین یوسف ہوں، مجھے فارس نازی نے بھیجا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کیس میں ہماری مدد کرنا چاہتی ہیں کسی اہم شوت کے ساتھ۔ میں وہی لینے آئی ہوں آپ سے۔“ اپنا پرس نیچے رکھا اور دونوں کہنیاں میز کی سطح پر رکھ کر چہرہ تھیلیوں پر گرائے وہ معصومیت سے بولی۔

”اور.... فارس!“ وہ ششدہ رہائی تھی۔

”وہ تو مجھے ڈریپ کر کے چلے گئے۔ وہ اکثر اسی طرح مجھے ڈریپ کرتے ہیں، اور عموماً اسی وقت کسی کا قتل ہو جاتا ہے۔ بس خدا

“آج کوئی جان سے نہ جائے۔” جھر جھری لے کر وہ بولی تھی۔

آبدار کا حلق تک رکڑا ہو گیا۔ ماتھے پہلو میں در آئیں۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اندر غصے کے ابال اٹھنے لگے تھے۔  
”میں ناچھی خاصی اپی کیورین ہوں۔ فوڈی! صحیح قسم کی فوڈی۔ اس لئے اپنا آرڈر تو میں فوراً کر رہی ہوں۔ آپ کیا لیں گی؟“  
ن میں بک اٹھا کر ویٹر کو اشارہ کرتے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ آبدار نے تند ہی سے اسے دیکھا۔ ماتھے پہ کئے بال اور لمبے بالوں کی فرشت  
میں گوندھے وہ لیمن کلر کے لان کے نفیس سے جوڑے میں ملبوس سادہ سی لڑکی تھی۔ گندمی رنگت کی حامل گردھمکتی سیاہ آنکھوں والی۔ آبدار سر  
کر مو باکل اٹھا کر کال ملانے لگی۔ خنین اسی بے نیازی سے ویٹر کو آرڈر لکھوار ہی تھی۔

”آپ آرڈر نہیں کریں گی؟“ معموم خنین نے پلکیں جھپک کر پوچھا۔

”تم بہاں کیوں آئی ہو؟“ وہ نشک لجھ میں بولی۔

”کیونکہ آپ کے پاس کوئی اہم ثبوت ہے جو آپ ہمیں دینا چاہتی ہیں۔ تماں نے کہا، جا کر ان سے لے لو۔ میں آگئی۔“

”جود بینا ہے، وہ ان کوہی دوں گی۔ تمہیں نہیں۔ خیر تمہیں کچھ اور نہیں کہنا تو میں چلتی ہوں۔...“ وہ اٹھنے لگی۔

”ویسے تو میں اپنا بل خود ادا کروں گی۔ جی ایسی میں ملا کر پورے دو ہزار پچاس بنیں گے۔ دو ہزار ہیں میرے پاس۔ آپ پچاس  
پے ادھاروں دیں، ترکل پچ جب آپ سے ملوں گی تو دے دوں گی واپس۔ پھر آپ بے نشک چلی جائیں۔“ پھر سے آنکھیں جھپکائیں۔  
آبدار نے ایک تیکھی نظر اس پڑالی، لکھ کھولا، اندر سے کریڈٹ کارڈ نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ نظر اٹھا کر ویٹر زکو دیکھا جو سر دنگ کی  
یاریوں میں نظر آتے تھے۔ چونکہ ہدایات کڑی تھیں اس لیے اس کے ”مہمان“ کے آتے ہی وہ چونکے ہو گئے تھے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ  
ہمان مطلوب شخص نہیں ہے۔

”میخت ہو جائے گی۔ تم کھانا کھاؤ۔!“ وہ بے زاری سے بولی تو خنین نے شانے اچکائے۔

”آپ کی مرضی؟“ اور پلکیں گود میں بچایا۔ چھری کا نادرست کر کے رکھا۔ ”ویسے چاہیں تو تماں سے ایک دفعہ پوچھ لیں۔ وہ  
بہت پر یقین تھے کہ آپ بغیر وہ فلیش ڈرائیو دینے نہیں جائیں گی۔“ آبدار کو اس کے کیوں ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی مو باکل پنبر ملا کر  
انٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جیسے ہی فارس نے کال پک کی وہ میز کے پیچھے سے نکل کر زرادور چلی آئی۔

”آپ کہاں ہیں؟“ ریستوران کے برآمدے میں کھڑے ناراضی سے وہ فون میں بولی تھی۔

”کام سے نکلا ہوا ہوں۔ کیوں؟“

”آپ کو خود بہاں آنا تھا۔ اس کو کیوں بھجا؟“ گردن موڑ کر ایک خفاف گاہ خنین پرڈالی جو چہرہ ہتھیلیوں میں گرائے بیٹھی مسکرا کر اسے

دیکھ رہی تھی۔ آپ کو نئے سرے سے غصہ آنے لگا۔

”اگر کچھ واقعی ضروری ہے آپ کے پاس تو اسے دے دیں۔ آگے آپ کی مرضی۔“

”ڈر گئے کیا مجھ سے؟“ وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا۔

”میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ صرف نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کسی مصیبت میں پڑیں۔“

” المصیبت میں تو میں پڑھکی ہوں۔“ تینی سے مسکرا کر بولی۔ ”بہر حال میں اس کو کچھ نہیں دے رہی۔ بلکہ میں جا رہی ہوں بہاں  
کھانا سر وہو چکا تھا اور حمہ مزے سے شروع بھی کر چکی تھی۔

”مرضی آپ کی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ دوسرا طرف سے لائن ڈیٹھ ہو گئی۔ آبدار واپس آئی تو ماٹھے کے بلگہے ہو چکے تھے۔

”کھانا سر وہو چکا تھا اور حمہ مزے سے شروع بھی کر چکی تھی۔“

”میرے بھائی کا انٹروپوکرنے کے بعد بھی آپ کو اصل یگمنہیں سمجھا ہی تھے نہ؟“ لزانیہ کا بڑا سا پورشن اپنی پلیٹ میں نکالنی تھیں تھے۔ مگن سے انداز میں پوچھا تھا۔

”سوری؟“ وہ کھڑے کھڑے کٹیں میں موبائل رکھتی چوکی۔

”نہیں آیا سمجھ میں؟“ حنہ نے حیران نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ چند لمحے لے کر منہ کا لقمہ چبایا۔ پھر سافت ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔ پھر پچھہ اٹھایا۔ آبدار اسی طرح شش و پیٹھ میں کھڑی تھی۔

”یہی تو سارا مسئلہ ہے آبدار صاحب۔ فارس غازی ہم سے اپنا کام ایسے نکلاتے ہیں کہ ہمیں لگتا ہے یہ ہمارا ہی تو آئندیا تھا۔ آپ کے ساتھ بھی بھی ہوا۔ چچ چچ۔ میں سمجھاتی ہوں آپ کو،“ رُک کر کانے میں پھنسنا پیپر پاستا اور قیچے کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔ لذیذ اشیاء زبان اپنے چھوٹے ہی گویا اندر گھل گئیں۔ اس نے نوالۃ ملی سے کھایا۔ پھر بولی۔

”آپ ہارون عبید کی بیٹی ہیں نا، اور فارس ماموں کو معلوم تھا کہ ہارون صاحب کا سعدی بھائی کے انغوں میں ہاتھ ہے، تو انہوں نے بن اتنا کیا کہ بھائی کے میموریل ڈے پر میری تقریر سے پہلے ڈاکٹر تو قیر بخاری سے کہا کہ اپنی تقریر میں اتنا کہہ دیں کہ سعدی یوسف کلینیکل ڈیجٹھ کا شکار ہوا تھا۔ فارس غازی کو پتہ تھا کہ یہ فقرہ ہارون عبید کی بیٹی کو ٹکر کر جائے گا۔ وہ سعدی یوسف کو ڈھونڈنے کی اور اس کو فالو کرتے ہوئے ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔ آپ کو بھائی نے بتایا کہ وہ نہیں گیا کسی کلینیکل ڈیجٹھ میں صرف خواب دیکھا تھا اس نے مگر آپ نہیں مانیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ انغوکے وقت سعدی یوسف تو ہوش میں آیا ہی نہیں تھا، پھر ڈاکٹر تو قیر بخاری کو کیسے پتہ کر اس نے کچھ دیکھا یا نہیں؟ آپ کرتی ہیں نا ایسے لوگوں کا انٹروپو۔ یوں آپ نے بھائی کو ڈھونڈا اور ہم بھی بھائی سکت پہنچ گئے۔ اب آیا سمجھ میں؟ آپ کو استعمال کیا ہے فارس غازی نے۔“ وہ کھاتے ہوئے بولتی جا رہی تھی، جیسے خبر نامہ پڑھ کر سنارہ ہو۔ آبی بالکل تمیری کھڑی تھی۔ سُن۔ پھر وہ آہستہ سے بیٹھی۔

”تو وہ ہمیشہ سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔“ وہ بولی تو آواز میں تفاخر سا تھا۔ حنین نے ہاتھ روک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے برائیں لگا تھا۔ اسے ناز ہوا تھا۔

”آپ تو کسی اور کی بھی نظر میں ہیں۔“

”کس کی؟“ وہ چوکی۔

”ہاشم کی!“ وہ بولی تو اندر دل گلی گلڑی کی طرح سلگ گیا۔ آواز کا پنی۔ آنکھوں میں کرب سا بھرا۔ دل کھویا تھا اور واپس حاصل بھی کر لیا تھا مگر کھونے کا درد اور واپسی کے جتن کی اذیت آج بھی ویسی ہی تھی۔

”ہاشم کا کیا ذکر کر؟“ آبدار نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ حنین چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ انہی کھوجتی رشک بھری نظروں سے۔ پھر بلوں سے پھسلا۔

”کیا ہے آپ میں جو اسے کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیتا۔“

آبدار ہلکا سامسکراہی، پھر آگے کو ہوئی اور حنہ کی سادہ چمک دار آنکھوں میں جھاناکا۔ ”چھوٹی لڑکی، کیا تمہیں ہاشم پر کرش ہے۔“ حنین اسی طرح اسے دیکھ گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ البتہ اس کے رخسار گلابی ہوئے تھے۔

”ہاشم کو متاثر کرنے کے لئے سامنے والے میں ”کلاس“ ہوئی چاہیے۔“ وہ پیچھے کو ٹیک لگاتے ہوئے خبردار کرنے کے سے انداز میں گویا ہوئی۔ ”خوبصورتی ہوئی چاہیے۔ متاثر کن اسٹائل ہونا چاہیے۔ ذہانت اور اعتماد ہونا چاہیے۔ ایسی لڑکی جو اس کی کہنی تھام کر جب چلتے ایک دنیا اس کو دیکھے۔ وہ ڈھیروں دولت اور جاہ کی مالک ہو۔ اس کا اعلیٰ خاندان ہو۔ وہ شاہزادیوں جیسی ہو۔ وہ کیریئر و مون ہو۔ بڑے بڑے میدان مارے ہوں اس نے۔ سیمینا رزار اور روکشاپیں میں تقریر کرتی ہو تو ایک دنیا اس سے متاثر ہوتی ہو۔ اس سے کم پر وہ کبھی راضی نہیں ہوتا۔

شہرین اپنی جوانی میں ایسی ہی تھی۔“

”اور آپ بھی ایسی ہی ہیں۔“ وہ اسے سکتے ہوئے بے خودی کے عالم میں بوی تھی۔ آبدار نزاکت سے مسکرائی۔

”میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی، مگر تم ایسی بالکل بھی نہیں ہو۔ وہ تمہیں بھی نہیں چاہے گا۔ وہ ہر کسی کو نہیں چاہتا۔“

خین ہلکا سماں مسکرائی۔ ”مجھے اس کی خواہش بھی نہیں ہے، میرے لئے یہی کافی ہے مجھ سے فارس غازی محبت کرتے ہیں، اور وہ ہر کسی سے محبت نہیں کر لیتے۔ بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں ان کی محبت، دوستی اور اعتقاد جیتنے کے لئے۔ وہ مجھے اپنی ”ٹیم“ کہتے ہیں۔ میں اداں بیٹھی ہوں تو محسوس کر لیتے ہیں اور میں خوش بیٹھی ہوں تو میری خوشی بیسہ باہتے ہیں۔ مجھے ایسی باتیں بھی بتادیتے ہیں جو زمر کو نہیں بتاتے۔ میں خوش ہوں کہ میرے پاس زیادہ اچھے محبت کرنے والے ہیں۔“

آبدار کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی تھی مگر اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ ”تم ان کی بھائی ہو۔ یہ بچرل ہے۔“

”آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ میرے اندر محبت لینے والی کوئی خوبی نہیں ہے؟“

”میرا تم سے کیا مقابلہ ہے؟“ وہ مسکراہٹ اور پھر شانے اچکائے۔ عجب ادائے بے نیاز تھی۔

”تو پھر مجھے وہ ثبوت نہیں دیں گی آپ؟“ خین پلیٹ پر دھکیل کر ٹوٹ سے ہاتھ اور لب صاف کرتے ہوئے بوی۔ آبدار نے مسکرا کرنگی میں گردن ہلائی۔

”فارس غازی سے کہو، اگر وہ اسے چاہیے تو مجھ سے خود آکر لے۔ میں دے دوں گی مگر صرف اسی کو۔ تم میرے پیرو بھی چھوڑ تو میں تمہیں نہیں دوں گی۔“

”آپ کی مرضی ورنہ میں تو آپ کے پیر چھوٹے والی تھی!“ خین ماہی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پرس کندھے پر لٹکایا۔

”کھانا اچھا تھا مگر اتنا اچھا نہیں۔ اتنا میں میں دلکشی بخیج آ رہا تھا۔ میں آپ ادا کر دیتھے گا۔ میں تو دیے بھی کسی قابل نہیں۔“ اور کندھے اچکا کر مردگئی۔ آبدار نے سر جھکا۔ اس کی نظرؤں نے دور جاتی خین کا آخر تک پیچھا کیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں آخری باتوں میں طنز سا محسوس ہوا تھا۔

بل پے کرنے کے بعد اس نے کریٹ کارڈ اپس رکھنے کے لئے پرس کھولا تو ایک دمٹھک گئی۔ اور کاسانس اور پر نیچے کا نیچے رہ گیا۔

پرس کی اندر ورنی زب کھلی تھی اور وہ خفیہ جیب جس میں اس نے وہ تائی پن ڈرائیور کی تھی۔

”کہڑگئی!“ آبدار بدحوابی سے پرس کو کھنگا لئے گئی۔

باہر پار کنگ میں فارس کی کار کا فرنٹ ڈرکھول کر خین اندر بیٹھی اور تائی پن کیسرہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”چار منٹ بھی نہیں لگے مجھے۔ پہلے اس کا پرس کھلوایا۔ پھر جب وہ آپ سے بات کرنے کے لئے سائیدہ پئی تو اسے نکال لیا۔ مجھے

لگا تھوڑی احتیاط سے چھپائے گی اسے مگر وہ محترم تھا تو اپنے شاہانہ زعم میں کافی لاپرواہ ثابت ہوئی ہیں۔ اب بیٹھ کر سوچ رہی ہو گی کہ کون کتنا

قابل ہے۔ ہونہے۔“ خنگی سے بربڑاتی وہ بولی تھی۔ فارس نے ایک ہاتھ میں نخا کیسرہ پکڑا اور دوسرے سے ڈرائیور کرتا کاراگے لے گیا۔

تھوڑی دور جا کر اس نے گاڑی کی چھت پیلی لائسٹ آن کی اور غور سے اس ڈیلو اس کو دیکھا۔ پھر جیب میں رکھ دی۔

”ویسے آپ خود بھی ان سے مل کر یہ لے سکتے تھے۔“ کافی دیر بعد خین وہ اسکرین کے پار نگاہیں جمائے سوچتے ہوئے بوی۔

”جب آپ کو یہ معلوم ہو جین کہ کسی سے آپ کاملا نیابات کرنا آپ دونوں کو فتنے میں مبتلا کر سکتا ہے تو پھر اس راستے سے ہی احتراز برنا تھا۔ یہ نہیں کہ بہانے بہانے سے اس سے ملا جائے اور خود کو صفائیاں دی جائیں کہ یہ آخری بار ہے، اس دفعہ بات کر کے اس قصے کو ختم کرنا ہے میں نے۔ ایسے نہیں ہوتا۔ جب تعلق توڑنا ہوتا ہے تو کسی خدا حافظ، کسی الوداع کے بغیر اسی لمحے توڑا جاتا ہے۔“ وہ سادہ سے انداز

میں کہہ رہا تھا۔ خین کو بہت کچھ یاد آیا مگر بظاہر بنشاشت سے بولی۔  
”صف کہیں نا۔ بیوی سے ڈرتے ہیں آپ۔“

”بیوی سے کون نہیں ڈرتایا!“ اس نے جھر جھری سی لی۔ وہ بہس دی۔ پھر سڑک کو دیکھ کر بولی۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”تمہیں گھر ڈرپ کر کے میں فاطمی صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔“

خین بالکل شہرگئی۔ ”الیاس فاطمی۔ وارث ما موں کا باس؟“ یہ نام ذہن میں پانچ سال سے بیٹھا ہوا تھا۔

”ہوں۔ وہ witness list میں ہے۔ اس لئے مجھے اس سے ملتا ہے مگر سنو۔ گھر جا کر زمر کومت بتانا کہ میں اس سے ملتے ہیں۔“ یاد دہانی کرائی۔

”تو نہیں کیا بتاؤں آپ کس سے ملنے گئے ہیں۔“

”جس سے تم مل کر آرہی ہو۔“ وہ محظوظ ہوا تھا۔

خین کے ابر و خلقی سے سچنے۔ ”اس mean حرکت کو کیا کہوں میں؟“

”اے تم Farcisism کہو۔ خیر سے زمر بی بی میں ڈیزرو کرتی ہیں۔ اب اترو۔“ گھر آگیا تھا۔ فارس نے اس کو مسکرا کر اترنے کا اشارہ کیا۔ خین خفاسی اتر گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے کار آگے لے گیا۔ اسے سچ کر ہی مزہ آ رہا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

شدت غم میں بھی زندہ ہوں تو جیرت کیسی؟ ..... کچھ دیے تند ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں  
وہ ایک عجیب رات تھی۔ بے چین۔ مضطرب۔ ڈھیر سارا ڈھنی دباؤ لئے ہوئے۔

وہ سو نیا کی سالگردہ میں جانے سے پہلے وارث سے ملا تھا۔ خین اس کے ساتھ تھی۔ اسے خین کو اس کی کسی دوست سے ملوانے جانا تھا۔ یہ بھی ایک بہانہ تھا۔ زمر سے ملنے کا بہانہ نہ ڈھونڈنے کا بہانہ۔ جب کوئی تعلق نہیں رکھتا تو کیا بار بار اس کا سامنا کیا جائے؟ یہی سوچ کرو۔ فرار اختیار کر رہا تھا۔ خین کا رہیں بیٹھی تھی اور وہ باہر کھڑا تھا۔

وارث سے اس کی بات تب ہی ہوئی تھی۔ وہ کچھ پر بیشان تھا۔ ظاہر نہیں کر رہا تھا مگر پر بیشان تھا۔

”میرا بابا مجھ سے استغفاری مانگ رہا ہے۔“

اس وقت لوگ آس پاس تھے۔ وہ جلدی میں تھا۔ اس کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ مگر اس نے بار بار کہا تھا۔

”تم انتظار کرو۔ میں کرلوں گا سب کچھ ٹھیک۔ بس تم استغفاری نہیں دو گے۔“

آخری دفعہ جو اس نے وارث کا چہرہ دیکھا، اس پا ایک تسلی سی تھی۔ سخت پر بیشان کے درمیان موہومی تسلی۔ ایک مان۔ اعتبار ساتھا کہ فارس سنبھال لے گا۔ اور وارث سر کو اثبات میں ختم دیتے ہوئے اپنی کارکی طرف مزگیا تھا۔ یہ وہ آخری دفعہ تھا جب اس نے اس کا چہرہ دیکھا۔ زندہ چہرہ۔

وہ خین کو ہوٹل لے آیا۔ اس کی دوست سے پے در پے سوالات کرتے ہوئے بھی اسے مسلسل کو فت ہو رہی تھی۔ ڈنی طور پر وہ پیچھے تھا۔ وارث کے مسئلے میں انکا تھا۔ سالگردہ کی تقریب میں واپس آ کر بھی وہ ایسا ہی الجھا ہوا تھا۔ زرتاشہ کو ہاشم نے کچھ کہہ دیا تھا، وہ اس پر خفا ہو رہی تھی۔ فارس کا ہکوت داماغ مزید ایلانے لگا تھا۔ اسے خود بھی نہیں یاد اس رات اس نے کس کو جھٹکا تھا۔ علیشا، خین، زرتاشہ ہاشم۔ سارا غصہ اور چڑچڑا پن اس لئے تھا کہ وہ وارث سے نہیں مل سکتا تھا۔ اسے ٹھیک سے سمجھا نہیں سکا تھا۔

زرتابش آف موڈ کے ساتھ سوئی تھی۔ وہ مسلسل وارث کو کال کر رہا تھا مگر اس کا فون آف تھا۔ اس رات وہ نہیں سویا۔ بالکل ہونی میں بینا

رہا تھا۔ پیر لبے کر کے میز پر رکھ دو سوچے جا رہا تھا۔ سامنے ہاشم کے کمرے میں ایک لیپ آن تھا۔ پر دوں کی جھری سے صاف دکھائی دیتا تھا، ہاشم بھی صوفے پر لبے پیر کر کے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ کسی اور ہی حالت میں لگتا تھا۔ فارس پھر بالکوئی میں شلنے لگا۔ دائیں سے دائیں۔ دائیں سے دائیں۔ وہ بے چین تھا۔ جانے کوں ہی چیز سکون نہیں دے رہی تھی۔

دل خراب تھا۔ دماغ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کیا کرے۔ کس سے کہے۔  
وہ عجیب بھاری سی رات تھی۔ گویا دل پر کوئی بھاری سل پڑی ہو جس کو اٹھائے تو کیسے اٹھائے؟ گرائے تو کیسے گرائے؟ کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا۔ صبح صادق ابھی ٹھیک سے طلوع بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب اس نے بنا کچھ کھائے پہ، حتیٰ کہ منہ ڈھونے بغیر چاپی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ اسے وارث سے ملنا تھا۔ جلد از جلد۔ کہیں دیرہ ہو جائے۔ کہیں کچھ ہونہ جائے۔ عجیب سے واہے آتے تھے ذہن میں۔  
مگر وارث اپنے ہائل کے کمرے میں نہیں تھا۔ صرف اس کا جسم تھا۔ ٹکھے سے بھولتا۔ وہ بھاگا اور اس کے پیر پکڑ لئے، گردن کو سہارا دیا، مگر یہ گردن نوٹے کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ وہ اب نہیں رہا تھا۔

اگلے چند دن یوں گزرے گویا آنکھوں کے سامنے لال دھنڈی چھائی ہو۔ عجب کرب تھا، عجب درد تھا۔ پہلے دن وہ صدمے سے چپ رہا تھا۔ وارث کی بیٹیوں کو رو تے دیکھتا رہا۔ ویران آنکھوں سے سب دیکھتا رہا۔ ویران دل سے منtar رہا۔ پھر جب وہ وارث کی بیٹی کے ساتھ اس کی قبر کے سامنے بیٹھا تو اس روز سارے احساسات جانے لگے تھے۔ غم پر غصہ غالب آنے لگتا تھا، اتنا کہ لگتا تھا دل پھٹ جائے گا۔  
تب اس نے عہد کیا تھا۔ قسم کھائی تھی۔ کہ وہ انتقام لے گا۔ شاید تب وہ انتقام کو انصاف کے مترادف سمجھتا تھا۔ وہ ضرور اپنے بھائی کے خوبیوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گا، اس کا عہد تھا خود سے۔ اور جتنا وہ اس بارے میں سوچتا تھا، ازلی غصہ عود آتا تھا۔ دل چاہتا تھا ساری دنیا کو تھیں نہیں کر دے۔ جلا کر را کھ کر دے۔ کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ عقل پر اسرخ پر وہ اتنا گھنٹا تھا کہ سارا منظر دھندا دیتا تھا۔

وہ اور سعدی زمر کے پاس گئے۔ اب اسے پر اہنہ تھی کہ وہ اس کی کون تھی۔ اب صرف یہ اہم تھا کہ وہ کون تھی۔ وہ پر اسکی یوں آفس میں ایک اہم عہدے پڑھے تھی۔ وہ اس کیس کو دیکھ کر سکتی تھی۔ مگر اس کا رو یہ بھی خشک ساتھا۔ وہ جیسے چھٹی لے کر جانے کے بعد زبردستی و اپس بلائی گئی تھی۔ اس کے لئے تو یہ روز کی بات تھی۔ آج ایک قتل ہوا تو آج دو۔ وہ بے تاثر انداز میں معمول کا کام کرتی رہی۔ ابتدا اس نے فارس پر شک سے کی۔ اس وقت وہ غصے میں اتنا انداز ہو جانے والا آدمی تھا کہ زمر بی بی کے انداز پر اس کا دماغ کھول کھول انہر رہا تھا۔ وہ غیر جانبداری سے اپنا کام نپڑا رہی تھی مگر وہ مضطرب تھا، بے چین تھا۔ وہ چاہتا تھا جلد قاتل پکڑا جائے۔ وہ نہیں سمجھ پار رہا تھا کہ وہ پوپیس آفسر نہیں ہے، جسے چودہ دن میں تفیش کمل کرنی ہوا اور چالان جمع کروانا ہو وہ وکیل ہے اور وکیلوں کی تفیش تو مہینوں سالوں چلتی ہے۔ ان دونوں وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کوشش کے باوجود بھی نہیں۔ دماغ پر چڑھی سرخ دھند نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تک سلب کر دی تھی۔ اسے سب سے زیادہ غصہ زمر پر آ رہا تھا۔ ملال یا صدمہ نہیں۔ صرف غصہ۔ وہ اس پر کیوں شک کر رہی تھی؟ ٹھیک ہے وہ اسے اپنی ایلی بائی سے ملاؤے گا، مگر وہ اس پر شک کر کے اچھا نہیں کر رہی تھی۔ وہ نہیں سمجھ پار رہا تھا کہ زمر سب سے پہلے اس کو ہر شک اور شہم سے پاک کر کے پھر آگے بڑھنا چاہتی ہے تاکہ کوئی اس پر انگلی نہ اٹھائے کیونکہ وارث کا موبائل اور پھنڈ اسی کی کار سے ملا تھا، مگر سرخ دھند سے کچھ سوچنے نہیں دیتی تھی۔ کوئی اس پر شک کیسے کر سکتا ہے؟ سب اندھے ہیں کیا؟ وہ اپنے بھائی کا قاتل کیسے ہو سکتا ہے، یہ ایسا "رش" تھا جس پر فارس غازی کے خیال میں کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس نے اس امکان کو ذہن سے خارج کر کھا تھا۔ مگر یقین کرنا کسے تھا؟ صرف شک ہی کافی ہوتا ہے۔ آدمی کو "ملزم"، صرف شک بناتا ہے۔ یقین تو مجرم بناتا ہے۔ وہ ملزم بننے جا رہا تھا اور وہ خود اپنی قسم سے لاعلم تھا۔ سارا دھیان صرف ایک چیز میں انکا تھا۔ وارث کا بس۔ الیس فاطمی۔ صرف وہی جانتا ہے کہ وارث کو کس نے اور کیوں مارا ہے۔

کشتی جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فراز ..... اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر الیاس فاطمی اپنی اسٹڈی میں بیخا تھا۔ کمپیوٹر کے سامنے فالکوں کا ابزار لگا پڑا تھا جس کے صفات کا وہ اسکرین پر نظر آتے ہندسوں سے موازنہ کر رہا تھا۔ اسٹڈی میں سفید بتیاں جلی تھیں۔ کھڑکی کے بلا سٹڈ زندہ تھے۔ پیچھے ریکس میں ترتیب سے رکھی کتابیں نظر آتی تھیں۔ وہ عینک لگائے کام میں پوری طرح منہک تھا مگر اس آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ کوئی آہت سی تھی شاید۔

وہ چونک کر آگے پیچھے دیکھنے لگا۔ پھر عینک اتار کر فائل پر دھری اور کرسی سے اٹھا۔ احتیاط سے اوہ راہ ہر دیکھتا باہر آیا۔ راہداری اور سڑی ہیاں نیم روشن تھیں۔ سارا گھر خاموش تھا۔ گہرے سناٹے میں ڈوبا تھا۔ لاڈن، پکن، لابی اس نے باری باری ہر جگہ دیکھی۔ دروازوں کے لاسک اور کھڑکیوں کے بولٹس چیک کیے۔ سب مغلن اور پر سکون تھا۔ وہ سر جھنکتا اور اپس اسٹڈی میں داخل ہوا، دروازہ بند کیا اور جیسے ہی واپس گھوما، اس کا دل اچھل کر حلقت میں انک گیا۔

سامنے اس کی کرسی پر وہ بیخا تھا۔ پیر لمبے کر کے اس کی اسٹڈی ٹیبل پر کھٹکتے تھے یوں کہ جو گرز فالکوں کو چھوڑ ہے تھے اور ریک لگائے بازوں کا تکلیف بنا کر گردن کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ نظریں اس پر جب اسے متوجہ پایا تو سر کو خدم دے کر سلام کیا۔

”کیا حال ہیں فاطمی صاحب؟“

فاطمی کی نظریں اس کے وجود سے ہوتی ہوئیں میز تک گئیں، جہاں بریتا پستول رکھا تھا۔ فارس نے نظریوں سے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ فاطمی نہیں ہلا۔ وہ کھڑا رہا۔ اس کا ذہن ممکنہ آپشنز پر تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہاتھ دو رناب پر ہنوز جما تھا۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو چپ چاپ بیہاں آ کر بیٹھ جاتا یوں کہ اگر تم شور کر کے کسی کو بناوے گے تو بات پھیلے گی۔ ہاشم نے گا تو سمجھے گا کہ تم اور میں ملے ہوئے ہیں اور یہ صرف ایک کو اپ تھا، ایک بھونڈی کوشش جس سے تم اس پر یہ ثابت کر رہے تھے کہ تم مجھ سے نہیں ملے ہوئے۔ وہ مزید تم پر شک کرے گا۔“

فاطمی نے ڈورناب چھوڑ دیا۔ اسے خشیگیں لگا ہوں سے گھوڑتا ہوا وہ سامنے آیا اور کرسی کھنچی۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟ ہاشم کو اپنی اور میرے کو رٹ میں ہونے والی ملاقات کا جانے کس ڈھنگ سے بتایا ہے تم نے کہ وہ میری ایک ایک مودو پر نظر رکھنے لگا ہے۔ اب کیا چاہتے ہو تم؟“ ”بیٹھ جاؤ۔ اپنا ہی گھر سمجھو۔“ فارس نے پھر سے اشارہ کیا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں سکون تھی تھا اور بے نیازی بھی۔ فاطمی چند لمحے کھڑا رہا، پھر بیٹھ گیا۔ ایک گھری سانس لی۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

”تم نے پرسوں کو رٹ میں پیش ہونا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں بچ بولو۔“

”میراں کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ جھپڑ کر بولا تھا۔

”تعلق تو ہے اور تم کو رٹ میں اس کے بارے میں بتاؤ گے اور پھر تم....“ فارس نے جو گرز نیچے اتار لئے، آگے کوہ کر بیخا اور اس کی آنکھوں میں جھاناک۔ ”تم اپنی جاپ سے استغفاری دے دو گے۔“

فاطمی کی آنکھیں پہلے حیرت اور پھر ناگواری سے پھیلیں۔ ”میں استغفاری کیوں دوں؟“

”کیونکہ میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہارے کیس کا نجح، جیبوری اور جلا دہوں۔“ وہ سرد تپش تے لدی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑھے بولا تھا۔ ”آج میں تم سے استغفاری مانگ رہا ہوں الیاس فاطمی۔“

”اور اگر میں نے ایسا نہ کیا تو کیا کرو گے تم؟ مجھے ہر دو گے؟ میری بیٹی کو مارو گے؟ تمہاری اطلاع کے لئے میں اسے باہر سیٹھ کر دا چکا ہوں۔ وہ تمہاری پہنچ سے اب بہت دور ہے۔“ وہ حقارت سے بولا تھا۔

”مجھے تمہاری بیٹی سے کوئی سردا کار نہیں ہے۔ مگر ہاں تمہارے بیٹے سے ہے۔ تمہارا لاڈلا بیٹا جس کی کار کے لئے تم نے میرے

بھائی کو مصلوب کیا تھا۔ جو باوجود کوشش اور سفارشوں کے مقابلے کا امتحان پاس نہیں کر سکا اور آج کل اسی پرائیوٹ فرم کو چلا رہا ہے جسے اس نے دوڑھائی سال پہلے بنایا تھا۔ مجھے تمہارے بینے سے سروکار ہے۔“

”کیا کرو گے تم میرے بینے کا؟“ وہ چونکا تھا مگر ڈرانہیں۔

”سمپل۔ میں اس کے کمرے میں اسے نکھے سے لٹکا کر اس کی گردن توڑ دوں گا۔ جان کے بد لے جان۔ گردن کے بد لے گردن۔ اب فیصلہ تم نے کرنا ہے۔“ پستول اٹھا کر جیب میں اڑسا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کے لئے بھی الیاس فاطمی سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

”تم ایسا نہیں کرو گے۔ میرے بینے کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ بتا بی سے بولا مگر درا ب بھی نہیں تھا۔

”میں نے کہانا، فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ عدالت میں حق بولو ورنہ تمہیں تمہارے لاڈ لے بینے کی لاش بہت جلد نکھے سے جھوٹی ملے گی۔“ پھر باتھ ماتھ تک لے کر سلام کیا۔

”پھر ملتے ہیں۔“ اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد ویسا ہی ستائا چھا گیا۔ الیاس فاطمی اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر غصہ بھی تھا اور تنفس بھی۔ مگر خوف نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

فارس اس ہاؤ سنک سوسائٹی کی تاریک اسٹریٹ میں قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا جب جیب میں رکھا فون ٹھرہ رایا۔ اس نے چلنے اسے نکالا۔ اسکرین دیکھ کر لب مسکرا اٹھے۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

”بھی۔ حکم!“

”کہاں ہو؟“ خفا خفاسا پوچھا گیا۔

”اسی کے ساتھ ہوں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

”زمر خاموش ہو گئی۔“ پھر الجہ سرسری سا بنایا۔ ”مجھے پوچھنا تھا کہ.....“

”بڑا چھار یسٹو رانٹ ہے یہ۔ پہلے بھی آیا ہوں میں یہاں، مگر آج زیادہ خوبصورت لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں۔“

زمر نے ضبط سے گہری سانس لی۔ ”میں تم سے پوچھ رہی تھی کہ تمہاری بلیو والی شرٹ .....“

”یارو یے بہت اچھا کھانا ہے ادھر کا۔ اور یہ کینڈلز بھی بہت اچھی ہیں۔ یا شاید میرا مودا اچھا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، میں کافی انجوانے کر رہا ہوں۔“

”فارس!“ اس نے بمشکل ابلجے غصے کے اوپر بند باندھا۔ ”کل کے لئے تمہارے کون سے کپڑے استری کروانے ہیں، اگر تم تاد تو میں صداقت کو.....“

”تم ایسے ہی اس اڑکی کو اتنا غلط سمجھتی ہو۔ ایک معصومی خواہش تھی اس کی یہاں کھانا کھانے کی۔ اور وہ میں نے پوری کر دی۔“

”اس نے تمہیں وہ شوت دیا یا نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”اوہ۔ وہ تو میں بھول گیا۔ اصل میں باتوں میں اتنا مگن ہو گیا تھا کہ.....“

”تم!“ زمر کا بس نہیں چل رہا تھا اس کو فون کے اندر سے ہی شوت کر دے۔ ”تم نا آج رات گھرنہ آتا۔“

”مطلوب اجازت دے رہی ہو اس کے گھر رکنے کی۔“ سادگی سے پوچھا تھا۔ زمر نے آنکھیں بیچ کر کنپنی سہلائی۔ پھر آنکھیں کھولیں اور تیکھے لمحے میں گویا ہوئی۔

”تمہارے کپڑے اب میں کوئی استری و ستری نہیں کرواری۔ خود کرنا۔ ہونہ۔“ اور فون کھٹ سے رکھ دیا۔ اس کا چہرہ تمثیر ہاتھا اور تفس تیز تیز چل رہا تھا۔  
”دونبڑ آدمی!“



اب کیا فریب دیجئے اور کس کو دیجئے ..... اب کیا فریب کھائیے.... اور کس سے کھائیے  
اگلی صبح شہر پر اتری تو ایسی گرم اور جس آسودہ کہ گویا پتھروں کو بھی پھلا دے گی۔ مقامی چھٹی کی وجہ سے سارہ کو آفس نہیں جانا تھا۔ وہ  
یونہی سستی سے بستر میں لیٹی رہی۔ اے سی بھی بنڈ نہیں کیا۔ اہل اور نور کب کی اٹھ پچھی تھیں اور یقیناً اس وقت ناشتہ کر رہی تھیں۔ سارہ تکیے پر سر  
رکھ، چھٹ کو لکھتی رہی۔ رہ رہ کر زمزرا فارس پر غصہ آرہا تھا۔ کوئی بھی اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ سب خود غرض بنے ہوئے تھے۔ وہ اپنی  
ہی سوچوں میں ڈوبی بھی خفگی سے کسی دور غیر مرمری نقطے کو دیکھتی، کبھی سر جھکلتی۔ اسے ساری دنیا سے شکایتیں ہو رہی تھیں۔  
وہ سوتی صبح قریبی شہروں پر بھی طلوع ہو رہی تھی، البتہ پشاور کے جس پلازا پر سورج اس وقت اپنی ساری حدت بر سارہاتھا، اس  
میں موجود لوگ کہیں سے بھی سوت نہیں لگتے تھے۔ زیر تعمیر پلازا کے سینٹ زدہ ستون، اور پے در پے منزلوں پر لگئی اور برجی کے ڈھیر سے  
ایک طرف نظر ڈالو تو ایک بالائی منزل پر ہاشم کاردار کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ وہ پلازا کے ایک وسیع و عریض ہاں کے دہانے پر کھڑا تھا جس کی  
کھڑکی کی جگہ خلا تھا۔ (ابھی چار دیواری دروازے کھڑ کیاں تھیں نہیں ہوئے تھے صرف ڈھانچہ ساستونوں کے ذریعے کھڑا تھا)۔ اور اس وسیع  
خلاء سے گویا نیچے سارا شہر دکھائی دیتا تھا۔

ہاشم نیچے نظر آتے منظر سے بے نیاز، برہم موڈ میں کھڑا تھا۔ نیوی بلیوکوٹ پہنچے بال جیل سے جمائے وہ ماتھے پہل لئے سامنے  
والے شخص کو گھوڑہ تھا جو کان کھجاتے ہوئے کھرد رہا تھا۔

”یا اپ سے کس نے کہا کہ ہم آپ پر اعتماد نہیں کرتے یا آپ کا مقابل ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”لوگ بتیں کر رہے ہیں۔“ وہ دانت پر دانت جما کر بولا تھا۔

”کاردار صاحب ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے ساتھ ہی کام کرنا ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس سعدی یوسف ٹرائل سے آپ کی  
پوزیشن خراب ہوئی ہے لیکن ہم آپ کے دوست ہیں، آپ کو مشکل سے نکالنے کے لئے ہر ممکن تعاون کریں گے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ ”مجھے اس لڑکے سعدی یوسف کو دہشت گرد ثابت کرنا ہے۔ اس کی سب سے بڑی  
کوئی یہ ہے کہ وہ صرف تھرکوں کا انحصار نہیں تھا، وہ ایک راکٹ سائنسیٹ تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میز اُن میکنالو جی کے معاملے میں  
بہت اچھا ہے۔ ایسے لوگ ماچس کی ڈبی سے بھی بم بنا سکتے ہیں۔ مجھے اس کوئی لی پی کا بم میکر ثابت کرنا ہے اور آپ کو میری مدد کرنی ہوگی۔“

”ہوجائے گا ثابت، آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ بتائیں آپ کو ہم سے کیا چاہیے۔“ وہ پوری ذمہ داری سے اسے یقین دلارہاتھا۔ ....  
سینکڑوں میل دور.....اسلام آباد میں سارہ اپنے کمرے سے بے دلی سے نکلی تھی۔ بالوں کو جوڑے میں باندھا اور پیروں کو نرم فر کے  
بنے چپلوں میں گھستی وہ سوت روی سے ڈاکنگ ٹبل تک آئی۔ ذکرہ بیگم پچھلے چند دنوں سے کسی فونگی کے باعث گاؤں گئی ہوئی تھیں۔ آج کل  
میں واپسی تھی۔ ان کے بغیر گھر اداں لگاتا تھا۔

ملازمہ سے دیکھتے ہی ناشتہ پوچھنے لگی۔

”بچوں نے ناشتہ کیا ہے؟“ وہ چپلوں کی ٹوکری سے مطلوبہ پھل ڈھونڈتے ہوئے بولی تھی۔

”بھی کر لیا تھا۔“

”ابھی کہاں ہیں؟“

”باہر لان میں کھیل رہی ہیں۔“

”اتنی گرمی میں کون سا کھیل کھیل رہی ہیں؟ ویسے تو سارا دن موبائل اور ٹبلیٹ ہوتے ہیں ہاتھ میں۔ جاؤ ان کو اندر لے کر آؤ۔“ وہ

نفاذ ہوئی تو ملازمہ فوراً باہر کو پیکی۔

سارہ سیل فون پر انگلی نیچے پھیرتی ای میلزد دیکھنے لگی، دوسرے ہاتھ میں سبب تھا جسے وہ کھارہ ہی تھی، تبھی ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی۔

”ڈاکٹر صاحبہ... ڈاکٹر صاحبہ...“ سارہ نے چونک کر چڑھا اٹھایا۔ وحشت زدہ بوكھلائی ہوئی ملازمہ ہانپتی کا پنچ اس کی طرف آ رہی

تھی۔ سارہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ سارے واہے سارے ڈر درست ثابت ہونے والے تھے۔

”بچیاں باہر نہیں ہیں۔ چوکیدار کہہ رہا ہے وہ ذرا دیر کو با تھر روم گیا تھا، پھر وہ اپس آیا تو بچے نہیں نظر آئے، اس نے سمجھا اندر چلی

گئی ہیں۔“

سبب، سیل فون، ہر شے اس کے ہاتھ سے بچلی تھی۔ وہ اسی طرح باہر بھاگی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، اور سانس رک رک کر آ

رہی تھی۔

لان ویران پڑا تھا۔ برآمدہ خالی تھا۔ پورچ میں کھڑا چوکیدار افسوس سے ہاتھ مل رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں کچھ تھا بھی سمجھی۔ سارہ

حوالہ باختی سی اس کی طرف بھاگی۔

”کہاں ہیں اہل اور نور؟“ آواز گھٹتی گھٹتی نکلی تھی۔ وہ پا گلوں کی طرح آگے پیچھے دیکھ دیکھ رہی تھی۔

”مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا بیگم صاحب۔ یہ دیکھیں، یہ گیٹ کے اندر پڑا ملا ہے۔“

سارہ نے تقریباً جھیٹنے کے سے انداز میں وہ کاغذ تھاما۔

”آپ کے بچوں کو آپ کی اجازت کے بغیر لے کر جانے کے لئے بہت معدودت مگر پرسوں کی تاریخ کو یادگار بنانے کے لئے یہ

ضروری تھا۔

### ۷۴

”اتج! پرسوں... بتاریخ!“ سارہ کا دل دوراندر ڈو بتا جا رہا تھا۔ اس کی بیٹیوں کو کون لے کر گیا تھا۔ سب عیاں ہو گیا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

ٹو اگر سن نہیں پاتا تو مجھے غور سے دیکھے ..... بات ایسی ہے کہ دھڑائی نہیں جائے گی مورچاں میں بھی وہ صح سست سی طلوع ہو رہی تھی۔ چھٹی کے باعث ندرت کو ریستوران جلدی جانا تھا اس لئے وہ کچن میں کھڑی حسینہ کو تیز تیز ہدایات دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی پرس میں موبائل اور ہوٹل بھی اڑس رہی تھیں۔

”آج ایک اہم برقی اور پھر دو سالگرہ کی تقاریب ہیں، میں گھر پکرنہیں لگا سکوں گی۔ تم یوں کرنا کر۔“

ان کی آواز باہر ڈائیننگ روم تک آ رہی تھی۔ جہاں زمر لتعلقی کری پیٹھی چائے کے گھونٹ بھرتی اپنا موبائل دیکھ رہی تھی۔ اور وہ

اس کے مقابل کہدیاں میز پر نکلا کر بیٹھا گئ ہاتھ میں لئے آنکھیں اس پر جمائے ہوئے تھا۔ پھر دفتارہ کھنکارا۔ وہ نظر انداز کیے رہی۔

”کل رات میں...“

”ابا آپ نے اخبار پڑھ لیا تو مجھے دے دیں۔“ وہ کری پیٹھے کو گھونی اور لاونچ میں بیٹھے ابا کو پکارا۔ وہ عینک ناک پر لگائے اخبار

کھولے سر جھکائے جوابا بولے۔

”تم کب سے صحیح اخبار پڑھنے لگیں۔ ساری خبریں تو موبائل پر پڑھ لیتی ہو۔“  
فارس ہلکا سامسکرا کیا۔ ”یدیکھنا چاہ رہی ہیں کہ شاید میری تیسری شادی کی خبر گلی ہو۔“ جہاں زمر نے مژکر اسے گھورا وہاں اپنے بھی نظر میں انھا کرے دیکھا۔ فارس کی مسکراہست سمٹ گئی۔ ”ذائق کر رہا تھا۔“ اور ذرا رخ موڑ کر چائے پینے لگا۔ (سارا خاندان ہی....)  
دفعتاً اس کا سیل فون بننے لگا۔ اس نے عام سے انداز میں موبائل انھا یا پھر ذرا اٹھرا۔ ”سارہ کافون ہے۔“ ہلکا سا بڑا بڑا۔ زمر چونک کرے دیکھنے لگی۔

”شاید وہ witness prep کے لئے آنا چاہتی ہوں۔“ زمر کو اب بھی امید تھی۔

فارس نے موبائل کا ان سے لکایا اور بٹاشت سے ہیلو کہا۔ دوسرا طرف سے اس کے الفاظ سن کر اس کی رفتگت بدلتی۔ اب وہ اکٹھے ہوئے۔ چونک کر زمر کو دیکھا۔ پھر ”جی.....جی۔“ کرتا اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔  
کسی انہوںی کا احساس تھا یا کیا، زمر اس کے پیچھے لپکی۔ جب تک وہ اندر آئی، وہ فون رکھ چکا تھا، اور والٹ اور چاہیاں انھا رہا تھا۔  
چہرے پر شدید پریشانی تھی۔

”کیا ہوا؟“ فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر دبی آواز میں بولا۔

”وارث کی پیشیاں.... صحیح کوئی ان کو لے گیا ہے۔ سارہ بہت رورہی ہیں۔ ہمیں ان کے پاس جانا ہو گا۔“

”اوہ میرے اللہ!“ اس کا دل دہل گیا تھا۔ ”میں ندرت بھا بھی کو...“ وہ مژنے لگی تھی کہ فارس نے بازو سے پکڑ کر اسے روکا۔

”ان کو اور بڑے ابا کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خنین اور اسامدہ یہیں بھی سور ہے ہیں۔ خواہ تجوہ بات مزید بگزے گی۔ صرف سعدی کو بلا وہ اور ہم تیوں وہاں جاتے ہیں۔ میں پولیس کو کال کرتا ہوں۔“ پھر وہ چاہیاں انھا بے باہر کو پکا تھا۔

.....❖❖❖.....

کیا سانحہ ہوا ہے، یہ آنکھوں کو کیا خبر..... منظر نہیں رہا کہ اجالا نہیں رہا  
دوپہر کا سورج آگ بر سارہ سائزیں تھک رہا تھا۔ گویا سب کے دل اندر تک جلاڑا لے تھے۔ لاڈنخ میں صرف سارہ کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ ذکیرہ بیگم مسلسل اسے چپ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر وہ روئے جا رہی تھی۔ زمر سامنے مغموم سی پیٹھی تھی اور سعدی بالکل خاموش سر جھکائے ہوئے تھا۔ وہ سارہ سے نظریں تک نہیں ملا پا رہا تھا۔  
دفعتاً فارس موبائل جیب میں رکھتا اندر داخل ہوا۔

”ہمیں پولیس ایشیش جانے کی ضرورت نہیں ہے، پولیس اپنی پوری کوشش کر رہی ہے۔ مختلف جگہوں پہنچا کر بندی کی جا رہی ہے، سی کی ٹوی کیمروں کی فوٹج کے ذریعے پتہ چلائے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ کس کار میں سوار تھے۔ ایک دفعہ کا رمل جائے تو پھر ان کو ڈھونڈنا آسان ہو گا۔“ پھر وہ اس کے سامنے بیٹھا جس کی آنکھیں رو رو کر گلابی ہو رہی تھیں۔

”سارہ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم ان کو شام سے پہلے ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔“

سارہ نے بھگی آنکھیں انھا کرے دیکھا۔ ”فارس میں اپنے بچوں کے بغیر کیا کروں گی۔ کیا اسے اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟ وہ میرے پچ کیسے لے جا سکتا ہے۔“

”ہاشم سے ہر چیز کی امید کی جا سکتی ہے۔“ زمر نے جھر جھری لی تھی۔

”میں!“ سعدی نے سختی سے نٹی میں سر ہلاتے چہرہ انھا یا۔ ”ہاشم کسی کے پچ نہیں انھا سکتا۔ ہاشم.... میرا مطلب ہے.... وہ چھو نے بچوں کو اس سب میں ان لوگوں کرے گا۔“

”تمہیں اب بھی ہاشم سے امید ہے۔“ زمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”وہ بچوں کو یتیم کر سکتا ہے دوسروں کی بہنوں کو استعمال کر سکتا ہے، کسی کے بچے کو ہپتال سے اگوا کر سکتا ہے، مگر ہاں وہ بچوں کو انہوں نہیں سکتا۔“  
”پیغمبر نہیں۔“ سعدی نے سر جھکا۔

”اس نے نوٹ پہ اپنے نام کا حرف سائیں کیا ہے سعدی۔“ سارہ رو تے ہوئے بولی تھی۔ ”اور وہ نوٹ پر ملٹہ ہے، ہم اس سے کچھ ثابت نہیں کر سکتے، مگر وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ پھر اس نے فارس کو دیکھا۔ ”پلیز میرے بچے والپس لادو مجھے۔ کچھ کرو فارس۔“  
”میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا سارہ وہ شام سے پہلے گھر ہوں گی۔ آپ تھوڑا سا حوصلہ کریں۔“ وہ اسے مسلسل تلی دے رہا تھا۔

سعدی انھ کرا یک دم باہر نکل گیا۔ زمر چند لمحے بعد اس کے پیچھے گئی۔  
وہ برآمدے میں رکھی کری پہ بیٹھا، دور آسمان کو دیکھتا کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ بہت اداس لگتا تھا جیسے اس کا بہت کچھ سورج کی حدت میں بھاپ بن کر اڑ گیا ہو۔ کھو دیا ہو۔

”ہاشم ایسا کر سکتا ہے سعدی۔“

”ہاں واقعی۔ اس دنیا میں کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ سعدی نے تنخی سے سر جھکا۔ وہ اس کے کندھے کے پیچے کھڑی رہی، بیٹھی

نہیں۔ اور وہ اسی طرح دور آسمان کو دیکھا رہا۔

”تو تم نے دلوگوں کی جان لی تھی؟“ اس نے موضوع چھیڑا۔ سعدی کے اندر تک اُنی سی اتر گئی، مگر بہت ضبط سے اس نے اثبات

میں سر ہلا کیا۔

”سیف ڈیفنس۔“

”ہاشم تم پچھلے کرو سکتا ہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”وہ سب ہاشم نہیں اس کی ماں نے کروایا تھا۔“

”کیوں؟“ وہ چوکی۔ یہ بات اس کے لئے نئی تھی۔

”وہ مجھ سے خوفزدہ تھیں۔ میرے پاس ایک راز ہے ان کا۔“

”کیا راز؟“ عقب سے آتے فارس نے پوچھا۔ وہ بھی اس بات پر چوکا تھا۔ زمر نے مژکرا سے دیکھا۔ دونوں نے جیران نظر وہ کا تبادلہ کیا، مگر سعدی اسی طرح بیٹھا رہا۔

”اُبھی بتانے کا فائدہ نہیں ہے۔ اور اس وقت تو قطعاً نہیں۔“ پھر اس نے آنکھوں کو انگلیوں سے مسلا۔ ”مجھے سارہ خالہ کو بھی یوں

فور نہیں کرنا چاہیے تھا گواہی کے لئے۔ یہ سب میری غلطی ہے۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں ذمہ دار ہوں اس سب کا...“

فارس نے اکتا کر اسے دیکھا۔ ”Will you please shut up?“ اور واپس اندر کی طرف مڑ گیا۔ ماحول ہنوز بو جھل تھا اور

وہ دونوں بالکل چپ کھڑے تھے۔ کہنے کو گویا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

.....❖❖❖.....

کوئی بھی زعم، کوئی بھی دعویٰ نہیں رہا..... خود پر مجھے کسی کا بھی دھوکہ نہیں رہا  
اس شام قصر کار دار میں رنگ و بوکا سیلا ب سانظر آتا تھا۔ سارے گھر اور بزرہ زار کے درختوں کو خوبصورت روشنیوں سے سجا گیا  
تھا۔ وسیع و عریض لوگ روم اور ڈینگ بال میں سونیا کی سالگرہ کی themed party zor و شور سے جاری تھی۔ اگلے ہفتے سونیا کو اسکوں  
نرپ کے ساتھ باہر جانا تھا اس لئے سالگرہ آنحضرت پہلے منعقد کی گئی تھی۔ کیک کٹ چکا تھا۔ مہماں ٹولیوں کی صورت گھر کے اندر ادھر ادھر ہل

رہے تھے۔ احمد کان میں لگے آلے کو درست کرتا سکیورٹی کے امور کا جائزہ لے رہا تھا۔ غرض معقول کی مصروفیات جاری تھیں۔ ایسے میں جواہرات مسکرا کر چند حضرات کو کہہ رہی تھی۔

”میں یقیناً اس دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں۔ اس سے زیادہ کلی کون ہوگا؟“ تفاخر سے وہ کہہ رہی تھی اور سامنے والے تائید کر رہے تھے۔ ماشاء اللہ دونوں اپنے بزرگ میں سیٹ بھی ہوں، اس سے زیادہ کلی کون ہوگا؟“ ادھر ہاشم دو افراد سے ہٹتے ہوئے باتوں میں مگن تھا۔ آنکھ کے کنارے سے وہ آبدار کو بھی دیکھ رہا تھا جو سب لوگوں کے درمیان بھی الگ تھلگ سی کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بار بار اپنے موبائل کو دیکھتی، جیسے بور ہو رہی ہو۔ Aqua تھیم کی پارٹی میں جہاں ہر شخص نے سمندری مخلوق جیسے کبڑے پہن رکھے تھے۔ (کیونکہ سونیا کا نیا کارش dori finding کے ٹریلر کے بعد سمندری مخلوق تھی) آبدار نے nemo کا نارنجی رنگ زیب تن کر رکھا تھا، مگر سر کاروں مال سرخ ہی تھا۔ وہ اداں اور بور نظر آتی تھی۔ ہاشم گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے ہنکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ خود مکمل سفید سوٹ میں مبوس تھا اور سونی کے پوچھنے پر اس نے کہا تھا کہ وہ آنس برگ ہے۔ برف کا توہ جو نیلے سمندر میں سراٹھا کر کھڑا ہوتا ہے۔ نہ پچھتا ہے اور بڑی بڑی کشیوں کو ڈب دیتا ہے۔ سونی اسے کافی دیر خاموش ہو کر دیکھتی رہی تھی۔

”میرا میسچ ملا آبدار؟“ جواہرات کی آواز پر آبی چونک کر مڑی۔ سامنے بنی سوری مسکراتی ہوئی جواہرات کھڑی تھی۔ لباس شارک کے جیسا سلوٹھا۔ اور آنکھوں میں بھی ولی ہی تند ہی تھی۔

”دل گیا تھا۔ اور میں نے اس ویڈیو کو تباہ کر دیا ہے۔ مکمل ختم۔ اب کوئی آپ کو اس کے ذریعے بلک میں نہیں کر سکتا۔ اس لئے بے فکر ہے۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”مجھے یقین نہیں ہے۔“ جواہرات بظاہر مسکرا کر بولی تھی۔

”تو میں کیا کروں؟“ وہ شانے اچکا کر کھڑے انداز میں بولی تھی۔

یہاں سے ہاشم کو آوازیں نہیں سنائی دیتی تھیں مگر انداز سارے عیاں تھے۔ وہ ان دونوں کے پیچ کی ساری حدت محسوس کر سکتا تھا۔

سو اپنے مصالحین سے مادرت کر کے آبی کی طرف آیا۔

”ریڈ... تم ٹھیک ہو؟“ نرمی سے اسے پکارا۔ جواہرات اس کی آواز سننے ہی آگے بڑھ گئی۔ البتہ آبی اسے دیکھ کر جبراڈ راسا مسکرائی۔

”ہاں۔ بالکل۔“ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”سونی کی سا لگڑہ کی تقریبات کی بہت شہرت سنی تھی کراچی میں۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ میں اس میں شرکت کر رہی ہوں اور۔ کافی لطف اندوں ہو رہی ہوں۔“

”مگر...“ وہ مسکراتے ہوئے اسے غور سے دیکھ کر بولا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے تم بار بار کسی کے میسچ یا کال کے انتظار میں ہو۔“

آبی کی رنگت ذرا بدی، مگر سنبھل کے مسکرائی۔ ”بانیہیں آئے نا۔ تو سوچ رہی ہوں ان کے آنے کی امید رکھوں یا نہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے سر کو خم دیا۔ مگر اسے یقین نہیں آیا تھا۔ یہ تڑپ یہ بے تابی سب بہت عیاں تھا۔

دور کھڑی شہرین نے گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے تیکھی نظروں سے اس منظر کو دیکھا تھا۔ ہاشم ایک نئی اڑان کی تیاریوں میں تھا۔ یوں شہری کا تعلق اس محل سے ٹوٹنے کے قریب تھا۔ یہ شاہزادی اسے کہاں داخل ہونے دے گی دوبارہ؟ اب وہ کیسے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیئے، اس کا ذہن ناکام قسم کے تانے بانے بن رہا تھا۔ فرسریش سنی فرسریش سنی تھی۔ وہ کیا کرے؟

.....

میں چاہتا ہوں دل بھی حقیقت پسند ہو ..... سو کچھ دونوں سے میں اسے بہلانہیں رہا  
شام کے سایے گھرے ہو رہے تھے۔ سارہ کے لاوچ میں بیٹھے افراد کی سو گواریت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کسی نے بتیا نہیں

جلائی تھیں۔ پورچ اورٹی وی کی روشنی نے ہی کمرے کو مدھم ساروشن، مدھم ساروشن مگر کھڑک رکھا تھا۔ ایسے میں فارس پیرونی دروازے سے داخل ہوا تو سعدی بے اختیار کھڑا ہوا۔ سارہ نے بھی امید سے اسے دیکھا۔ اس کے آنسو اب خشک تھے مگر آنکھیں سرخ تھیں۔ ان میں اسید بھی تھی اور خوف بھی۔

”کیا ہوا؟ کچھ پتہ چلا۔“

فارس نے مایوسی سے نفی میں سرہلا یا۔

”کسی نے انہیں جاتے نہیں دیکھا، کسی جگہ نہیں ہیں وہ۔“

سارہ اسے دیکھتی رہی۔ پلکیں گرامیں نہیں۔ بس خشک آنکھیں اس پر جمائے رکھیں۔ وہ سعدی کو کیس کی پر اگر لیں بتا رہا تھا۔ پولیس کے ناکے کسی ٹوپی وی ٹریلیں یہ وہ۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ ایک دم سارہ پھٹ پڑی تھی۔ سب نے چونک کرا سے دیکھا۔

”تم سب ذمہ دار ہو۔“ وہ گلابی آنکھوں سے نفرت سے فارس اور سعدی کو دیکھ رہی تھی۔

”تم لوگوں نے میرے بچوں کو ایک اور تجربے کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی لئے نہیں رکھتی تھی میں تم سے کوئی تعلق۔ اسی لئے تمہاری طرف آنا جانا چھوڑ رکھا تھا، کیونکہ تم لوگوں کی وجہ سے میں مصیبت میں پڑوں گی۔ میرے بچے نقصان اٹھائیں گے۔ تم لوگوں نے دھکیلا ہے؟ میں اس سب میں۔“

لاڈنخ میں سناتا چھا گیا۔ کوئی کچھ نہیں بول پا رہا تھا۔

”سارہ، وہ بچوں کو نقصان نہیں دے گا، تھوڑا اساصبر کریں، ہم.....“ فارس نے کہنا چاہا۔

”صبر؟“ وہ ایک دم انھی کش پرے پھینکا اور فارس کو دیکھ کر غرائی۔ ”کتنا صبر؟ آٹھ ماہ صبر کروں جیسے سعدی کی ماں نے کیا؟ آٹھ ماہ سے پہلے تو نہیں چھوڑیں گے وہ میرے بچوں کو۔ نہ کوئی کال آئے گی نہ تاوان مانگا جائے گا۔ میں تو پہلے ہی نہیں دے رہی تھی گواہی، پھر کیوں

اٹھایا میرے بچوں کو۔ آنسو پھر سے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بننے لگے تھے۔ ”میں نے تو بار بار کہا تھا سب کو کہ میں گواہی نہیں

دیں گی۔ پھر کیوں کی میری گود خالی؟“

”آپ کوئی گواہی مت دیں سارہ، بس دعا کریں، ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔“ زمر نے کہنا چاہا مگر اس نے سر جھٹک دیا۔ اب کسی کی کسی بات سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کام اب غصے میں بدلنے لگا تھا۔

فارس جواب بھی تک کھڑا تھا خاموشی سے واپس مڑا تو سعدی بول اٹھا۔

”آپ کدھر جا رہے ہیں؟“

”ہاشم سے ملتے۔“ وہ سپاٹ سرد سے انداز میں بولا تھا۔

”میں بھی آؤں گا۔“ وہ اس کی طرف لپکا تو زمر دہل کر آگئے آئی۔

”پا گل ہو تم سعدی؟ اس کے گھر دعوت ہے آج ایک دنیا ہوگی وہاں۔ تم نہیں جاسکتے ادھر۔ تم اس سے نہیں مل سکتے۔“

”مگر مجھے جانا ہے!“ وہ دکھی لگتا تھا۔

”تم یہیں رکو، صرف میں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا اپس بیٹھو.....“ فارس نے تختی سے منع کیا تو سعدی برے موڑ کے ساتھ صوفے پہ بیٹھا۔

وہ باہر لکا ہی تھا کہ اپنے پیچھے قدموں کی آواز آئی۔ وہ اکتا کر گھوما۔

”سعدی میں نے بولا ہے نا، تم.....“ وہ ٹھہر گیا۔ سارہ پیروں میں چپل ڈالتی آنکھیں رگڑتی آ رہی تھی۔

”میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔“

”ہرگز نہیں سارہ!“ وہ تیزی سے پریشان ہو کر بولا تھا۔ سارہ نے رک کر اسے دیکھا تو آنکھوں سے آگ کی لپٹیں انہر رہی تھیں۔

”تم مجھے روک سکتے ہو؟ تم مجھے روک سکتے ہو کیا؟“

اور فارس کو احساس ہوا وہ واقعی اسے نہیں روک سکتا۔ وہ اس وقت صرف ایک ماں تھی۔

❖❖❖

یوں پھر رہا ہوں کافی کا پیکر لئے ہوئے ..... غافل کو یہ گمان ہے کہ پھر نہ آئے گا قصر کاردار کے لوگ روم میں اونچے سرود میں بجھتی موہقی اپنے عروج پڑھی۔ کھانا کھایا جا رہا تھا۔ قنیچے گونج رہے تھے۔ ایسے میں اس سب سے بے نیاز نوشیر وال اپنے کمرے میں بے سدھ لیتا ہے۔ چوت کو تک رہا تھا۔ باہر کا ماحول اسے بے زار کر رہا تھا۔ وہ تیار تک نہیں ہوا تھا۔ یونہی شب خوابی کے لباس میں لیٹا تھا۔ دراز آدھی محلی نظر آتی تھی، اور اندر رکھی پڑیاں ملفوظ و کھانی دیتی تھیں، گویا سفید پاؤ ڈر کی طلب سے دراز کھوٹی گر بے زاری سے وہیں چھوڑ دی۔ آج اس سے بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب کوئی غم یوں منانے سے نہیں ملتا تھا۔ اب کیا دوا کی جائے اس مرض کی؟

یونچے لا دخن میں آؤ تو ہاشم ایک دفعہ پھر آبدار کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں نے ہاتھوں میں پیٹیں اٹھا کی تھیں اور وہ بات کرنے کے ساتھ کھا بھی رہے تھے۔

”میں.... کیس لڑ رہا ہوں۔“ اس نے نگاہیں آبی کے چہرے پہ جمائے ٹھہرے ہوئے لمحے میں کہا۔ آبی نے نگاہیں چڑائیں۔

”میں.... نکال رہا ہوں، اپنے خاندان کو اس میں سے۔“ وہ اسے باور کر وار رہا تھا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں اب آگے بڑھ جگی ہوں۔“ وہ ادھر ادھر بکھتی ایک دم غیر آرام دہ سی لگنگی تھی۔

”مگر یہ سب تم چاہتی تھیں۔“ آبی نے آنکھوں میں ایک دم تندی بھر کے اسے دیکھا۔

”لیکن کیا تم نے میرے کہنے پر یہ کیا؟ ہرگز نہیں۔ اب مجھے نہیں پتہ کہ تم نے یہ کیوں کیا گر تم نے مجھے صاف انکار کر دیا تھا، مائی ڈیئر گریم ریپر۔ اور اب تم خود کو اس اسکینڈل سے نکال لو تو بھی کیا۔ تمہاری پارٹی میں اس دفعہ اتنے لوگ نہیں آئے کہ تم لان بھرسکو۔ اور جو آئے ہیں وہ مسلسل ٹرائل کی پاتیں کر رہے ہیں۔“

ہاشم کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کر ابھری۔ اس سے پہلے کہ وہ بہت ضبط سے کچھ کہتا، کان میں لگا آلہ کچھ بولا۔ ہاشم کے تاثرات اچنپھے میں بد لے۔

”فارس؟ آر یوشیور؟ وہ ادھر کیوں آیا ہے۔“ کان پہ ہاتھ رکھ کے وہ کف لنگ میں لگے آ لے میں بولا تھا۔ وہ جتنا حیران ہوا تھا، آبی اتنی ہی چونکی تھی۔

”فارس آیا ہے؟“ وہ بے اختیار بولی تھی۔ ہاشم تیزی سے باہر کو لپکا۔ وہ چند لمحے توہ کا بکھڑی رہی پھر اس کے پیچھے بھاگی۔

گیٹ کے باہر یونچے کو جاتی سڑک پر کار کھڑی تھی اور دو افراد دروازے کے ساتھ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان کے گرد آدھر درجن گارڈز چونکے سے کھڑے تھے۔ گویا ادھر وہ کوئی حرکت کریں، ادھر وہ انہیں شوٹ کر دیں۔ ہاشم تیز قدموں سے چلتا داخلی چوکی تک آیا۔ اسے دیکھ کر سب اس طرف متوجہ ہوئے۔

”کیا مسئلہ ہے؟ کیا ہورتا ہے؟“ گھر کی بیرونی چار دیواری کی تیوں کے باعث سارا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ہاشم گیٹ کے قریب آیا اور اسے کھولا۔

فارس اس کے پکارنے پا س طرف گھوما۔ ہاشم کے کندھے کی اوٹ سے آپی نے دیکھا۔ وہ رفی میز اور پوری آستین کی شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ تھا اور ماتھے پر گھری سلوٹیں۔ وہ تیر کی تیزی سے ہاشم کی طرف پکا اور اسے گریبان سے کپڑا۔ ”کھڑھر ہیں ام اور نور؟ ہاں؟“ وہ غرایا تھا۔ جہاں آپی سن رہی وہاں بہت سی گنز اس کی طرف تن گئیں۔

“Hands off!”

ہاشم نے جھٹکے سے اس کے ہاتھوں کو نیچے جھکا۔ اور ایک قدم پیچھے گیا۔ ایک گارڈ نے گیٹ بند کر دیا۔ ایسے میں سارہ بھر کر گیٹ کے قریب آئی۔

ہاشم اب سلاخوں والے دروازے کے پار کھڑا تھا۔ وہ اس سے دوف فاصلے پر رکی، اور سرخ انگارہ آنکھیں اس پر جماں بلند سا غرائی۔

”میرے بچے کہاں ہیں؟“

ہاشم نے کار رجھاڑتے ایک نظر سے دیکھا۔ دوسرا اپنے کندھے کے پیچھے کھڑی حیران سی آبدار پڑالی۔ پھر چہرے پر برہمی لاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے نہیں پتا آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”ہاشم کا ردار... تمہارے آدمی صحیح میری بیجوں کو انداز کر کے لے گئے تھے۔ میں... ان کی ماں... ان کے باپ کے قاتل سے پوچھنے آئی ہوں کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔“ وہ چلا کر بولی تھی۔ فارس اس کے عین پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ ایک گارڈ اس کے چلانے پر برہمی سے اس طرف بڑھنے لگا تو فارس نے فو راجیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک دم سے بہت سی گنز کے لودھونے کی آواز آئی۔ فارس نے آہستہ ہاتھ باہر نکالا تو اس میں سیل فون تھا۔

”اگر تم لوگوں نے ہمارے ساتھ ذرا سا بھی غلط سلوک کرنے کی کوشش کی تو میں ایک بنی دماؤں گا اور سو شل میڈیا پر یہاں کی live feed جانا شروع ہو جائے گی۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے سامنے تم اور تمہارے بندے آن ائیر ہوں گے۔ اس لئے بندوقیں... نیچے... کرو۔“ وہ تھڑک کر بولا تھا۔ آپی صرف اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ وہ ابھی تک سُن تھی۔

”ہوا کیا ہے؟“ ہاشم نے بے زاری سے اس کی بات کاٹی۔ ساتھ ہی گارڈ زکو اشارہ کیا۔ انہوں نے اسلحہ نیچے کر لیا۔

”ہاشم میرے بچے کہاں ہیں؟“ وہ پھر حلکے بل چلائی تھی۔

”میں آپ سے پوچھ رہا ہوں ڈاکٹر صاحبہ کہ ہوا کیا ہے۔“ وہ چبا چبا کر بولا تھا۔

”ہاشم!“ وہ ایک قدم مزید آگے آئی اور ان آہنی سلاخوں کو تھاما جو دونوں کے بیچ حائل تھیں۔ نگاہیں لمحہ بھر کے لئے بھی اس کے چہرے سے ہٹائے بغیر وہ غرائی تھی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو؟ میں کوئی ڈرپوک عورت ہوں۔ بزدل ہوں؟“ تم نے سمجھا کیا ہے مجھے؟ ایک کم ہمت عورت؟“ خاترات سے اس نے سر جھکا۔ ”ہاشم کا ردار، میں وہ عورت ہوں جس کے نیچے دو ہزار مرد تھر کے ان سحراءوں میں کام کرتے ہیں جہاں تمہارا یا یئر کنڈیشنڈ پلے والا جسم وہ منٹ میں پکھل جائے۔“ میں وہ عورت ہوں جو میزائل بناتی ہے bombs۔ میں کام کرتے ہیں جہاں تمہارا یا یئر کنڈیشنڈ پلے والا جسم وہ منٹ میں پکھل جائے۔“ تو اس کو تم میری کمزوری مت سمجھنا۔ میری انگلیوں کے چند clicks اور ایک ڈرون کی تھی، تمہاری طرف سے مصلحت سے کام لے رہی تھی، تو اس کو تم میری کمزوری مت سمجھنا۔ میری انگلیوں کے چند کلکس اور ایک ڈرون کی مار ہے تمہارا یہ سارا محل۔ میں اس قابل ہوں ہاشم کہ تمہیں تمہارے اس محل سمیت زمین بوس کرنے میں مجھے چند کلکس اور ایک ڈرون کی ضرورت ہو گی۔ اور یقیناً مانو، میرے خلاف کوئی ایف آئی آر بھی نہیں کئے گی، کیونکہ میں حساس ادارے کی سائنسدان ہوں۔ میرے پاس

بہت سی پر ٹیکشند ہیں۔ سو میری بات سنو، اگر...." انگلی انھا کرتی تھیہ کی۔ "میرے بچے ایک گھنٹے کے اندر اندر واپس گھرنہ آئے تو تم دیکھنا میں تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔"

"Sorry to Interrupt" ہاشم پر سکون سا گھنکھار کر بولا۔ "مگر آپ لوگ یہ ڈرامہ کہیں اور جا کر کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔" سو شل میڈیا پر چند hits لینے کے لئے اس طرح کے نامکرنا انہتائی گردی ہوئی حرکت ہے۔ میں.... بچوں سے جنگ کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ "خواتی سے ان کو دیکھا اور پھر ہاتھ جلا کر اشارہ کیا۔ "ناو گیٹ لاست پلیز۔" میں ذرا مصروف ہوں۔" اور واپس مرٹیگیا۔ سارہ ابھی تک اوپنی آواز میں کچھ بول رہی تھی، شاید وہ بد دعا میں دے رہی تھی۔ فارس اب اسے واپس لے جا رہا تھا مگر وہ غصے سے چلا گئے جا رہی تھی۔ ہاشم چند قدم چل کر رکا۔ اور چونکے آبی کو دیکھا۔ وہ پیچھے آتے آتے رک گئی تھی۔ بالکل ششدہ۔ گم صم۔

"تم نے ان کے بچے انگو اکر لئے؟ وہ بے یقین تھی۔

"اوہ کم آن۔" وہ کہا تھا۔ "یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے کسی کو انگو انہیں کیا۔"

آبی نے ایک ملامتی نظر اس پڑاں اور نفی میں سر ہلایا۔ "سعدی کی دفعہ بھی تم نے یہی کہا تھا۔"

ہاشم چند لمحے کے لئے کچھ بول نہیں سکا۔ اس کے منہ پر جیسے آبی نے ایک دفعہ پھر بیچدے مارا تھا۔ وہ اس کوتا سف سے دیکھتی آگے بڑھ گئی تھی، اور وہ بالکل مجید کھڑا رہ گیا تھا۔ برف کے مجسمے جیسا۔ ٹھنڈا اور بے جان۔

.....❖❖❖.....

جو بھی آتا ہے بتاتا ہے نیا کوئی علاج ..... بٹ نہ جائے تیرا بیمار میجاوں میں سارہ جب واپس گھر میں داخل ہوئی تو وہ کافی تھکی تھکی دکھائی دے رہی تھی۔ فارس خاموشی سے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ رات اتنے کل تھی اور ساری امیدیں دم توڑتی جا رہی تھیں۔ انہیں آتے دیکھ کر سعدی اور زمرے بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔

"کچھ پتہ چلا؟ کیا کہا اس نے؟" سعدی نے پوچھا تھا۔ زمر چپ رہی۔ بالکل چپ۔

فارس نے محض نفی میں سر ہلایا۔ سارہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ گھنون پر تھوڑی بھادی اور خشک آنکھوں سے دور خلاء میں دیکھنے لگی۔

سب خاموش ہو گئے۔ لا دنخ میں عجیب و حشتناک زدہ سانشانا پھا گیا۔ سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی یا خنک آنسوؤں کی۔

"پولیس...." زمر نے فارس پر نگاہیں جمائے یک لفظی استفسار کیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ "کچھ معلوم ہو گا تو وہ بتائیں گے۔ ابھی تک تو کچھ پتہ نہیں چلا۔" زمر بس اسے دیکھتی رہی۔ کچھ بول نہیں۔ وہ کچھ سوچ بھی رہی تھی۔

جانے کتنے منٹ گزرے کتنی گھریاں بیتیں جب باہر آوازیں سنائی دیں۔ ہلچل۔ بولنے کی آوازیں۔ گاڑی کے کھلتے بند ہوتے دروازے۔ انہیں کے چلنے رکنے کی آواز۔ اہل کی آواز۔ فارس تیزی سے انھا مگر سارہ اس سے پہلے ہی ننگ پیر بہر بھاگی تھی۔ برآمدے میں آ کروہ رک گئی۔ گویا مجید ہو گئی۔

گیٹ سے اہل اور نور اندر داخل ہو رہی تھیں۔ وہ ساتھ میں مسلسل بولتی جا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں گفت میکس تھے اور شاپنگ بیگر بھی۔ سارہ یک نمک ان کو دیکھنے لگی۔ پھر کوئی سکتہ سانوٹا۔ وہ بھاگی اور ان دونوں کو خود سے لپٹالیا۔ ان کے چہرے چھوئے۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پر بیٹھانی سے وہ ان کو جیسے ٹوٹل رہی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟ تم لوگ کہڑتے ہے؟ انہوں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟" وہ بے تابی سے پوچھ رہے تھے۔ پچیاں اس کے انداز سے ایک دم الجھن کا شکار ہو گئی تھیں۔ اور تمہی سارہ کو احساس ہوا کہ گیٹ سے کوئی اور بھی اندر داخل ہو رہا ہے۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے چڑھے

اٹھایا۔

”ہم ان کو نقصان کیوں پہنچا سکیں گے سارہ خال؟“ اندر داخل ہوتی خنیں بہت برا مان کر بولی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی شاپنگ بیگز اور گفت ریپر کی روشن شدہ sheets تھیں۔ سارہ نے بچوں کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ تھیری کھڑی ہوئی۔ بے یقینی سے خنیں اور اس کے پیچے آتے سیم کو دیکھا۔

”خنیں.... بچہ تمہارے ساتھ تھے؟“ پیچھے سے سعدی جیران سا آگے آیا تھا۔ زمر اور فارس ناگھی کے عالم میں برآمدے میں ہی رک گئے تھے۔

”ہا!“ سعدی کو دیکھ کر بچوں نے خوف سے چینی ماری۔ ”اوہ نو۔“  
”آپ ادھر کیا کر رہے ہیں بھائی۔“ خنیں پر یشانی سے چلائی تھی۔ پھر ان تینوں کنز نے اپنے ہاتھ میں پکڑے گفتوں کو دیکھا۔  
”سارا سر پر اڑ خراب کر دیا۔“

”تم... تم لے کر گئی تھیں ان کو خنیں؟“ سارہ کے لب بے یقینی سے پھر پھڑائے تھے۔  
”کیا مطلب؟ آپ کو میرا نوٹ نہیں ملا؟ سوری میں نے آپ سے پوچھا نہیں، مگر صبح صبح پروگرام بننا اور ہم لوگ جلدی میں تھے۔  
کل بھائی کی سالگرد ہے نا، ہم نے سر پر اڑ بر تھڈے پارٹی کی تیاری کرنی تھی۔ صبح سے شاپنگ کر رہے ہیں، اور پھر ریسٹورانٹ کے اوپری ہال کو سجارت ہے ہیں۔ اُف پورے دن کی محنت اور سارا سر پر اڑ ختم ہو گیا۔“ وہ روہانی ہو کر کہہ رہی تھی۔  
”خنیں تم میرے بچوں کو مجھ سے پوچھئے بغیر کیسے لے جاسکتی ہو؟“ سارہ حلق کے بل چلائی تھی۔ حمد نے جیرانی سے انہیں دیکھا۔  
ایک دم سعدی اور سارہ اس پا ایک ساتھ غصہ کرنے لگے تھے۔

”خنیں تم اتنی غیر مددوار ہو۔ خنیں تمہیں احساس ہے تم نے کیا کیا ہے؟“  
”کیا یا۔ میری کنز ہیں۔ میں لے جاسکتی ہوں۔ اور امی تھیں ریسٹورانٹ میں ہمارے ساتھ۔ وہ تو آج گنگل نہیں آ رہے تھے نہ  
مال میں نہ ریسٹورانٹ میں ورنہ میں کال کر دیتی۔ کیا ہوا؟ آپ لوگ غصہ کیوں کر رہے ہیں؟“  
”ماما آج اتنا مزا آیا۔“

”لیکن اب تو سارا سر پر اڑ خراب ہو گیا۔“ وہ تینوں لا کیاں ایک ساتھ بول رہی تھیں۔ اور اسامہ بھی شامل ہو گیا تھا۔  
”آپ کو چوکیدار چاچانے نہیں بتایا؟ شاید یہ اس وقت ادھر تھے نہیں۔ ورنہ ہمارے ساتھ ریسٹورانٹ کا ڈرائیور تھا اور.....“  
وہ چاروں بچے، اس وقت بڑوں کے شدید عتاب اور لعن طعن کے زیر اثر تھے۔ وہ الگ روہانے ہو رہے تھے کہ آپ نے ہمارا سارا سر پر اڑ خراب کر دیا۔ مگر سارہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ ڈائٹ چارہ تھی۔ اُن کو تو اس نے ایک تھپڑ بھی لگا دیا تھا۔ فارس کچھ کہنے کے لئے آگے بڑھا تو زمر نے اسے بازو سے تھام کر اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ قدرے جیران ہوا مگر اس کے انداز میں کچھ تھا جو وہ اس کے پیچے آیا۔

لا و نج میں آ کر وہ اس کی طرف گھوئی اور سینے پر بازو لپیٹ کرتے ہی سے اسے دیکھتی بولی۔ ”یہ کیا تھا؟“

”کیا مطلب کیا تھا؟ ایک غلط فہمی تھی۔“ وہ جیران ہوا تھا۔  
”پہنچے ہے میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ تم ایسے بھاگ دوڑنہیں کر رہے جیسے تمہیں کرنی چاہیے۔ ہر چیز پولیس پر چھوڑے بیٹھے ہو گر تھہارے اور سارہ کے جانے کے بعد میں نے ایسی پی صاحب کو کال کی، اور پھر معقلاً تھانے میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے سرے سے پولیس کو کال کی ہی نہیں تھی۔ اور صبح آپ نے مجھے منع کیا کہ میں ندرت بھا بھی کونہ بتاؤں۔ اور ماشاء اللہ تھجد کے وقت سے آپ جا گئے ہوئے تھے آج“ اور آپ نے بولا کہ جنیں اور اسامہ سورہ ہے ہیں جبکہ وہ تو صبح سے نکلے ہوئے تھے۔ سو میر انہیں خیال کریں گے کیونکہ غلط فہمی تھی۔“

"اچھا تو مجھے گرفتار کر لیں، پر اسکیوں نہ صاحبہ!" وہ اس کی طرف جک کرتا پانے والے انداز میں بولا تھا۔

"یہ سب تمہارا پلان تھا ہے نا۔" وہ دبادبا ساغرائی تھی۔ اختیاط سے دروازے کو بھی دیکھ لیتی جس کے باہر وہ سب ابھی تک بول رہے تھے۔ "تم سارہ کو اتنا خوفزدہ کر کے کیا کرنا چاہ رہے تھے۔"

"آپ کے حکم کی تعلیم کر رہا تھا۔ کیوں؟ آپ نے نہیں کہا تھا کہ آپ چاہتی ہیں سارہ گواہی دیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس کے پچے اغوا کرلو۔"

"اغوا کس نے کیے؟ وہ اپنے لرزدا راپی پھپھو کے ساتھ تھے۔ اور وقت پہاپس بھی آگئے۔"

"اگر سارہ کو ٹینشن سے کچھ ہو جاتا تو؟ کون ذمہ دار ہوتا؟" وہ صدمے میں تھی۔ "تم اتنے بے حس کیے ہو سکتے ہو... وہ تمہارے

بھائی کی بچیاں ہیں۔"

"جس سارہ کو میں جانتا تھا، جو وارث کی موت سے پہلے کی سارہ تھی، وہ بہت بہادر اور باہمی عورت تھی۔ مگر اس کے خوف نے اس کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ جوڑو بننے سے ڈرتا ہونا زمر اسے پانی میں پھینک دینا چاہیے اور پھر چند بکیاں دے کر نکال لینا چاہیے۔ اس کا سارا،

خوف زائل ہو جائے گا۔ پھر اسے پتے چلے گا کہ پانی اس سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ اور تب ہی اسے کشی میں محفوظ رہنے کی قدر کا احساس ہو گا۔

وہ جان جائے گا کہ وہ خود کتنا خطرناک ہے، کتنا برا سروائیور ہے۔ میں صرف سارہ کو اس خوف سے نکالتا چاہتا تھا۔"

"تم پاگل ہو کیا؟ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو؟" وہ شدید غصے سے بولی تھی۔ دروازے پہ آہٹ ہوئی تو وہ دونوں فوراً سے سیدھے ہوئے۔ سارہ مسلسل بربھی سے بولتی اندرا رہی تھی۔

"اپنے بھائی غیر ذمہ دار نہ روی تھا تمہارا جنین۔ اور تم دونوں، کیا تم ماں سے پوچھے بغیر کہیں بھی چلی جاؤ گی؟" وہ ڈپٹ رہی تھی۔ کتنے کتنے خیالات آتے رہے اسے۔ اور وہ شاپنگ کر رہی تھیں؟ سماگرہ کا ویو جاہری تھیں؟ نور نے منمنانے کی کوشش کی (جس نے کہا تھا ماماؤ نہیں بتانا) مگر اس نے اسے کہنی مار کے چپ کر دیا۔ (گرلزیکر میں۔ یونو)

"ماما سارا سر پر اُن خراب ہو گیا ہمارا۔" اس اب الثاس پر غصہ ہو رہی تھی۔ سارہ ان کو لے کر آگے چل گئی تھی، اور سعدی باہر ہٹا نہ رکھتے کو فون کر کے ان کی خبر لے رہا تھا۔ ایسے میں جنین ان دونوں کے پاس آ کھڑی ہوئی اور معصومیت سے بولی۔

"سوری، بس وہ سکنلز کا پرائمر ہا آج تو....." زمر نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"ارے ہاں، تم کتنی معصوم ہو، تمہیں تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ یہ جو دچار آلوں کو جوڑ کر تم لوگ جیمز بنا لیتے ہو، وہ تو لگائے ہی نہیں ہوں گے تم نے ریشورا نٹ میں تاکہ سکنلز بند ہو جائیں۔" جنین نے فوراً فارس کو دیکھا، اس نے آنکھوں میں اشارہ کیا۔ وہ پھر سر جھکاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"اصل میں ذمہ....."

"چپ! وہ گھر کر بولی تھی۔ سارہ وہ اپس آ رہی تھی۔ اور وہ بیک وقت غصے ریلیف اور اکتاہٹ کا شکار تھی۔

"کل ہم سماگرہ پہ آئیں گے فارس، لیکن میں....." وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر جنمی لبھے میں بولی۔ "گواہی، کورٹ، ٹرائل، ان الغا؛ کو سننا بھی نہیں چاہتی دوبارہ۔ میرا نام تم لوگ گواہوں کی فہرست سے خارج کرو، اور آئندہ مجھے کوئی کورٹ سمن نہ جاری ہو، سناتم نے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" فارس نے میئے پہ باتھر کر کے بھر پور تسلی دلائی تھی۔ سارہ نے گھری سانس لی۔ "میں کھانا لگوائی ہوں۔ بہت

hectic دن رہا ج کا۔ اب بیٹھ جاؤ۔ اس سب کو بھول کر کھانا کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔" وہ جھنجلائی ہوئی سی کپکن کی طرف گئی۔

سعدی فون بند کرتا ان کی طرف آیا اور ایک نظر سارہ کو آگے جاتے دیکھا۔ پھر سوالیہ نظروں سے فارس کو دیکھا۔ کیا کہہ رہی تھیں وہ؟"

"وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ گواہی دیں گی، لیکن ابھی ان سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی جائے۔" سعدی تو سعدی، زماد رخین نے بھی بے یقین سے اسے دیکھا۔

"انہوں نے یہ نہیں کہا فارس!"

"انہوں نے یہی کہا ہے۔ ٹرست می!" اس نے مطمئن سے انداز میں یقین دلایا تھا۔

"اب تو وہ بالکل گواہی نہیں دیں گی، تھیں اس ٹوپی۔" غصے سے حنین کو دیکھا۔ "ہمارا سب سے اہم گواہ گنوادیا ہے تم نے۔" اور سر جھنک کر آگے بڑھ گئی۔

حنین نے ناک سکوڑ کر "ہونہہ" کیا اور فارس کی طرف گھومی۔ "میرا خیال ہے آپ کو تیرسی شادی کر رہی ہیں چاہیے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے! وہ گہری سانس لے کر ملاں سے بولا تھا۔ پھر گھڑی دیکھی۔" میں ایک فون کرلوں۔ "اور موبائل کا لانا آگے بڑھ گیا۔

❖❖❖

ماحول میرے گھر کا بدلتا رہا، سو اب... میرے مزاج کا۔ تو ذرا سا نہیں رہا  
قصر کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ جواہرات اپنے کمرے میں بیٹھی زیورات اتار رہی تھی۔ شارک کا سلوگاون  
پیروں کوڈھان پتافرش پہپول کی مانند بکھرا پڑا تھا۔ باہر ملازم کیسٹرنگ کا سامان سمیٹ رہے تھے اور گھر کو درست حالت پر لارہے تھے۔ اپنے میں  
ہاشم اپنے کمرے کو جاتی سیر ہیاں چڑھ رہا تھا۔ انداز میں ہیکان تھی۔ تبھی اس کا موبائل تھر تھریا۔ اس نے نکال کر دیکھا تو لمب پلٹ مسکراہٹ  
بکھر گئی۔ فارس عازی کانگ۔

"کل جب میں نجح صاحب کو بتاؤں گا تمہاری اس حرکت کا کہ کیسے تم لوگوں نے میرے گیٹ پر ڈرامہ چیا، تو تمہارا کیس مزید  
خراب ہو گا۔" وہ فون کا ان سے لگائے مسکرا کر بولتا کمرے میں داخل ہوا۔ اور دوسرے ہاتھ سے کوت اتارنے لگا۔

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکے۔" فارس عازی مطمئن سا بولا تھا۔ "بلکہ پولیس جو ضعیع کے قتل کی انکواری کر رہی ہے، اس کو بھی تم روکا کے  
اپنادعویٰ واپس لے لو گے۔"

"اوہ میں ایسا کیوں کروں گا، فارس؟" اس نے گہری سانس لے کر پوچھا تھا۔

"کیونکہ ایک ثبوت ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ سعدی یوسف نے وہ قتل سیلف ڈیفنس میں کیا تھا۔"

"تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے۔" اس نے کوٹ پرے ڈالا اور ہمارت سے بولا۔

"میرے پاس نہیں ہے، واقعی۔ کیونکہ اب وہ تمہارے پاس ہے۔"

"کون سا کھلیل کھلیل رہے ہوتی؟" ہاشم بے زار ہوا تھا، مگر وہ چونکا بھی تھا۔

"شاید تم نے اپنی نائی چن نہیں دیکھی۔ کیا پارٹی ابھی تک ختم نہیں ہوئی؟"

ہاشم نے بری طرح جوکنک کے گردن نیچے جھکائی۔ اس کی سلوگاں پر سیاہ نائی چن نہیں تھی جو کافی اوپری لگ رہی تھی۔ اس نے تو آج نائی چن سرے سے پہنی، ہی نہیں تھی تو یہ....؟ اسے فارس کا اپنا گریبان پکڑنا یاد آیا۔

"میں تمہیں یہ فائل ای میل بھی کر سکتا تھا، لیکن وہ کیا ہے کہ احرشفع سے نظر ہ رہتا ہے وہ ہر آنے جانے والی میل پر نظر رکھے ہوئے  
ہوتا ہے۔ وہ تم سے زیادہ تمہاری ماں کا وفادار لگتا ہے مجھے، اس لئے مجھے امید تھی کہ وہ اسے تم تک پہنچنے نہیں دے گا۔ لیکن چونکہ میں تمہارا کزن  
ہوں، اور مجھے تم سے ہمدردی ہے، سو میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ضرور دیکھو۔"

”کیا ہے یہ؟“ دھنخ سے بولا تھا۔ نائی بین اتار کر اب وہ اسے الگیوں میں ٹھوٹ کر دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری ماں کا اعمال نامہ!“ اور لائن ڈیڈ ہو گئی۔ ہاشم کے کان سرخ ہوئے اور دھنخ گئے۔ اس نے غصے سے دو چار گالیاں، ڈالیں گو کہ وہ نہیں سن سکتا تھا، پھر تیزی سے استڑی ٹیبل کی طرف آیا۔ ٹیبلیٹ اٹھایا اور یو ایس بی کا پلک اس میں گھسا یا۔ وہ کوئی پھنسنا لوئی دائرس پکھ بھی ہو سکتا تھا، مگر اس کا ماتھا کسی اور شابے کی بنیاد پر ٹک رہا تھا۔

اسکرین روشن ہوئی اور اس پر جواہرات کا دردار کے آفس کا منظر عیاں ہوا۔ وہ اندر آنے والے کیسرہ میں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ آواز سے فصح لگتا تھا۔ ہاشم دم سادھے سنتا گیا۔ اس کا سانس گویا کر پکتا تھا۔

”خاور کی زنجیریں کھول دو اسے سعدی کے ساتھ گھلنے ملنے دو۔ وہ دونوں ہمارے لئے بے کار ہیں، میرا بینا یہ بات نہیں سمجھ رہا، اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود کوئی قدم اٹھائیں کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے وہ دونوں فرار کا سوچ رہے ہوں گے۔“ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جواہرات کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ سارے الفاظ لگ لڑھو رہے تھے۔

”مگر ہو سکتا ہے فصح کسی دن خاور سعدی کو قتل کر دے اور پھر خود کشی کر لے۔“ اسکرین پر مسکراتی ہوئی جواہرات کہہ رہی تھی۔ ہاشم اپنی جگہ سے اٹھا۔ ٹیب ہاتھ میں تھا اور ہاتھ گلابی سرخ پر پڑ رہا تھا۔

”تم کرو گے فصح! اور اتنی صفائی سے کرو گے ایک رات یہ سب، کہ اگلی صبح ان دونوں کی لاشیں ملنے کے بعد تم یہ کہہ سکو گے کہ تم اس جگہ تھے ہی نہیں۔ میرے بیٹے کو خوب بھی نہیں ہو گی۔“

ہاشم کو سانس نہیں آ رہی تھی۔ اس کی رنگت عنیض غضب سے سرخ پڑ رہی تھی۔ وہ ٹیب ہاتھ میں لئے دھڑ دھڑ زینے اتر رہا تھا۔ باہر آتیں سے پیشانی صاف کرتا۔ اسے پیشہ بھی آ رہا تھا۔

جواہرات کے کرے کا دروازہ اس نے جوتے کی ٹھوک سے کھو کر سے کھو رہا تھا۔ وہ جو سکھار میز کے سامنے پیٹھی تھی، چوک کر گردن گھمائی۔ حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں کیا ہوا؟“

ہاشم نے ٹیبلیٹ اس کے سامنے جا کر پنچا۔ ”یہ کیا ہے گی؟“ اس کے سر پر کھڑا سے گھورتے ہوئے وہ غریا تھا۔

گردن پر موچ پراائزر ملتے جواہرات کے ہاتھ سست ہوئے۔ اس نے ایک نظر ٹیبلیٹ کی اسکرین پر چلتی ڈیڈیو کو دیکھا، اور پھر چہرہ انہما کرہا شم کو دیکھا۔

”کیا ہے پہ؟“ اس کی رنگت دھیرے دھیرے بچھ رہی تھی۔

”آپ نے فصح کو حکم دیا تھا ان دونوں کو مارنے کا؟“

جواہرات نے بہت سا ٹھوک لگا اور ٹوٹوکاں کاں کرہا تھا پوچھنے لگی۔

”میں نے جو بھی کیا تھا، بہت سوچ سمجھ کر تم دونوں کے لئے کیا تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ جب سے آبی۔ پاس اس ویڈیو کی موجودگی کا اسے پتہ چلا تھا، وہ خود کو اس لمحے کے لئے تیار کرتی آئی تھی۔

”میں!“ ہاشم نے بے لیشی سے اسے دیکھا۔ ”آپ یہ سب کیسے کر سکتی ہیں؟“

”اگر یہ سب ہو جاتا تو ہم آج اس میں نہ ہوتے۔“ وہ جواباً جھٹک کر بولی تھی۔ ”نہ کوئی گواہ پختانہ کوئی ثبوت۔ یہ سب تمہیں کرنا چاہیے تھا۔“ گرتم نے نہیں کیا تو اس خاندان کی حفاظت کے لئے مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ اور مجھے ایسے مت دیکھو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ اپنے خاندان کے لئے مجھے جو ٹھیک لگے گا، میں کروں گی۔“

”آپ نے مجھے دھوکہ دیا۔ آپ نے میری پیٹھ پیچھے اتنا بڑا کام کر دیا۔ ہارون کو راز دار بنایا مجھے نہیں۔“ وہ غصے اور صدے سے تسلی

میں سرہلار ہاتھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت سی ٹوٹی کر چیا تھیں۔

”آپ دھو کے میں اس حد تک جا سکتی ہیں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

جو اہرات کا دل کانپا، مگر وہ بظاہر خود کو سنبھالے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کا بازو تھامنا چاہا۔ ”ہاشم، میں نے یہ تمہارے لئے کیا تھا۔“

”ہاتھ مت لگائیں مجھے۔“ وہ اپنا بازو پیچھے کرتے ہوئے غرایا تھا۔

”میں نے نہیں، آپ لوگوں کے مسئلے حل کرنے میں اپنی خوشیاں اپنی محبت سب کو ثانوی کر دیا ہیں، آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، یوں دھو کر نہیں دیا، اور آپ.... آپ میرے ساتھ اس حد تک خیانت کی مرتبک ہو سکتی ہیں۔“

”ہاشم، میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو۔“ اب کے اس کی آواز بھی کافی تھی۔ آنکھوں میں آنسو چکے تھے۔ مگر ہاشم نے نفی میں سرہلایا۔

”سعدی بچ کرتا تھا۔ وہ دونوں جیل سے اس لئے بھاگے تھے کیونکہ آپ ان کی جان لینا چاہتی تھیں۔ اور کیا کیا جھوٹ بولے ہیں آپ نے مجھ سے؟ کیا میرے باپ کو بھی خاور نے مارا ہے یا خاور کی ڈھال تلے کسی اور کو بچا گئی ہیں آپ؟“ وہ حلق کے بل چلایا تھا۔ غصہ پیسٹے، آنکھوں میں اتر اخون۔ جو اہرات اندر رک دال گئی۔

”ہاشم! تم اپنی ماں پر شک کر رہے ہو؟“

”یقین تواب کبھی نہیں کروں گا آپ پر۔ کبھی نہیں۔“ وہ غصے سے چینا تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھی۔ ”ہاشم ایک دفعہ میری بات سنو میں....“

”میں نے کہا مجھے ہاتھ مت لگائیں۔ اکیلا چھوڑ دیں مجھے۔“ غصے سے بازو چھڑرا تا وہ باہر نکل گیا۔ جو اہرات کے آنسو پر ٹپ گر رہے تھے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہاشم کا موبائل تھر تھرایا۔

”وہ تھی دست، تھی داماد کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ساری دنیا بھوں میں بکھر گئی تھی۔“

وہ جو کچھری میں روز بھتی تھی، تو وہ نرڑا رامہ تھی۔ اصل عدالت تواب لگی تھی۔ جہاں نہ دکالت چلی تھی، نہ صفائیاں۔ اور وہ سارے فیصلے سن کر چلا گیا تھا۔ وہ دل تھام کرز میں پیٹھتی چلی گئی۔

.....

کہتے نہ تھے ہمیشہ رہے گا نہ اتنا رنج ..... گزرے ہیں چند سال ہی، دیکھا، نہیں رہا۔ اگلی صبح فوڈی ایور آفتر پر ٹھنڈی سی اتر رہی تھی۔ ساری رات بارش ہوتی رہی تھی، اور اس بارش نے گویا ساری زمین دھوڑا لی تھی۔ ریسٹوران کے اوپری ہال کے شیشے کی دیوار پر بوندوں کے سوکھ جانے کے نشان اب بھی موجود تھے۔ وہ ہال غباروں اور دیواروں پر لگے خوبصورت بیک ڈر اپ سے سجا تھا۔ میز پر تختے، کیک کا پچا کچھا حصہ برلن وغیرہ رکھے رکھے تھے۔ آگے پیچھے بہت سی کرسیاں رکھی تھیں جن پر وہ لوگ ٹولیوں کی صورت بیٹھے تھے۔ تقریب گویا ختم ہونے کے قریب تھی، اور کھانا کھایا جا چکا تھا۔ خیر کھانا کیا تھا، سنڈے برخ تھا۔ پرسوں کے ججائے آج ہی کر لی گئی تھی دعوت، یوں اس برس نہ سو نیا کی ساکرہ اصل تاریخ پر منائی گئی نہ سعدی کی۔

ایک طرف دو کرسیاں ترچھی کر کے رکھی تھیں۔ ایک پر زمر پیٹھی پلیٹ اٹھائے کیک کو کانٹے سے توڑنے میں مگن تھی۔ دوسرا پر فارس تاگ پٹا تاگ جمائے بیٹھا، سوفٹ ڈر نک کے گھوٹ بھرتا دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں اس رات....“ ذرا کھنکھا کر گویا ہوا۔ ”آبدار سے ملنے....“ زمر نے نظریں اس کی طرف پھیریں۔ اس کے تاثرات

دیکھنے کی دیر تھی، وہ سادگی سے بولا۔ ”آبدار سے ملنے ہی گیا تھا۔“

”معلوم ہے۔ بار بار کیا جتنا چاہ رہے ہو؟“ وہ سخت پیزار ہوئی۔

”نبیں میں تمہارے کپڑے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اس نے بھی یہی رنگ پہن رکھا تھا۔“ اب کے زمر نے مشکوں نظر وں سے اے گھورا۔ ”پچھلے دو دن میں تم اس کے کپڑوں کے پانچ رنگ بتا چکھے ہو مجھے۔ اب تو مجھے اس بات پر یقین بھی نہیں آ رہا۔ تم سچ چکھے گئے بھی تے یا....“ کچھ سوچ کر مسکرائی۔ ”ہاشم نے دروازے سے ہی بھگا دیا؟“

”ہونہے۔ اس کی اتنی مجال۔“ وہ بڑا کر گویا برامتا ہوارخ پھیر گیا۔

”ویسے ہے تو وہ تمہارا کزان، لیکن ایک بات ہے۔ اس کی کلاس اس کا گریس، اس کا مخالف کو مسکرا کر چت کر دینے کا انداز یہ سب تم میں اس جیسا نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں ہاشم اگر اچھا آدمی ہوتا تو میں اس کی سب سے بڑی فین ہوتی۔“ فارس نے سافٹ ڈرنک کا گلاس ان میز پر پنچ دیا اور خلکی سے اسے دیکھا جو معمومیت سے بولے جا رہی تھی۔

”اگر تم نے ہاشم کی باتیں ہی کرنی میں تو میں اٹھ کر جا رہا ہوں۔“

”جلتے ہو اس سے؟“ ایک اور سوال۔ وہ جواب دیے بنا سے گھورتے ہوئے اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔ زمر مسکراہٹ دبائے کیک ہ بقیہ حصہ کھانے لگی۔ اب آیا تھا اصل مزا۔

ان سے ہٹ کر دیکھو تو ایک طرف ٹولی بنا کر حینں اور اس کی دنوں کرنسی بیٹھی تھیں اور وہی کے نشان بنا کر سیلفی لے رہی تھیں۔ سارہ ندرت اور ذکریہ بیگم بھی خوشگوار مودہ میں گفتگو میں مگن تھیں۔ ایسے میں صرف سعدی تھا جو ایک نیبل کے گرد اکیلا بیٹھا موبائل پر گا تھا۔ وہ اس تما اور خاموش تھا۔ فارس اس کے قریب آ کر بیٹھا تو اس نے محض سراخا کر اسے دیکھا، پھر دوبارہ فون کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”پرا سکیوشن آفس سے کال آئی تھی۔ مجھے اب کسی قسم کی انکوائری کے لئے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالباً ہاشم نے اپنا دعویٰ اور تعادن واپس لے لیا ہے۔ وہ فصح کی لاش تھی یا گواہوں نے میرے بارے میں کچھ کہا، سب واپس لے لیا ہے اس نے۔ تھیک یو۔“

فارس نے محض سر کو خم دیا، گویا شکر یہ قبول کیا پھر کھو جتی نظر وں سے اسے دیکھا۔ ”مزکار دار کا کون سارا زہرے تھے تمہارے پاس؟“

”میں اس طرف جانا نہیں چاہتا۔ کچھ راز دوسروں کی زندگیاں بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔“

”ہم نے ایک فیصلہ کیا ہوا ہے سعدی کو ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپا میں گے۔“

”میں اس فیصلے کے وقت آپ کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ معموم سامسکرا یا تھا۔ فارس خاموش ہو گیا۔

پیچھے سے ندرت کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ وہ تینوں بڑی کیوں کو ظفر کی نماز کے لئے اٹھا رہی تھیں۔

”اٹھتے ہیں نا امی۔“ حین نے تابعداری سے کہتے ہوئے ایک اور تصویر یافتائی۔

”تم لوگ تو جوان ہو۔ جلدی جلدی اٹھ سکتے ہو، پھر اتنی دیر کیوں لگاتے ہو؟“ وہ گھننوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ ”جو انی میں دین بائی چوائی ہونا چاہیے، بائی چانس نہیں۔ یہ جس جذبے اور دل سے تم لوگ اس عمر میں عبادت کر سکتے ہوئے ہونا، یہ بڑھا پے میں نہیں ہو گا۔ غلط لگتا ہے تم لوگوں کو کہ بوڑھے ہو کر عبادت کی ساری کی پوری کرلو گے۔ بڑھا پے میں روز بیکشیم کھانا جوانی کے دنوں کے،“ تین گلاس خالص دودھ پینے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ روح بھی بڑیوں کی طرح ہے۔ جوانی سے اسے عبادت پر مائل کر دے تو بڑھا پے میں اور تکلیف کم ہو گی۔“

”اٹھ جاؤ نہ،“ اس سے پہلے کہ امی یہ مہذب زبان بدل کر اپنی نارمل ٹون میں واپس آ جائیں۔ ”سیم نے حد کی طرف جھک کر ہوا، دیا تھا، جو امی نے سن لیا تھا۔ وہ جوتا اتارنے جھکی تھیں۔

”بے غیرت بے ہدایتے، تجھے تو میں ابھی بتاتی ہوں۔“ سیم فور آئیج کی طرف بھاگا تھا۔ بہت سے قہقہے بلند ہوئے تھے۔

”سوری۔ میں کل کچھ زیادہ ہی بول گئی۔“ سارہ سعدی کے ساتھ آ کر پیٹھی اور زمی سے بات شروع کی۔ وہ معموم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتا ہا۔ پس منظر کی ساری آوازوں سے بے نیاز وہ اس کے سامنے پیٹھی، اب سادگی سے اپنا مدعایاں کرنے لگی تھی۔ فارس انھیں گیا۔

”مجھے لگا میں جو کر رہی ہوں، وہ زیادہ بہتر ہے۔ خاموش رہ کر اپنا کام کیے جاؤ، اور اپنے پر اجیکٹ کو کامیاب بنائ کر کاردار از کو اس مقام پر شکست دو۔ پازیو از جی سے greater good کے لئے کام کرو۔ مصلحت پسندی، احتیاط، تھوڑی سی بزدلی، یہ سب تھامیرے اندر، مگر مجھے ہمیشہ لگا کہ میں صحیح انتخاب کر رہی ہوں۔“

”سارہ خالہ!“ وہ اسی اداں مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ ”ویسے تو اللہ کا فرق آن سارے کا سارا بہت خوبصورت ہے، لیکن کچھ آیات دل پر کسی اور ہی طرح سے اٹھ کرتی ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں میری سب سے پسندیدہ آیت کون ہی ہے؟“

اگر ختنیں سامنے ہوتی تو ہر روز اپنی پسند بدلنے پر اس پر دوچار فتوے تو ٹھوک ہی دیتی مگر سارہ مسکراہٹ سے دیکھتی سنتی گئی۔ ”سور الاعراف کی 16 اور 17 ویں آیت۔ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو جنت کے باغوں سے دھنکار کر دینا میں بھیجا اور اسے مہلت دی تو اس نے کہا، جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ضرور ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان کے پاس ان کے آگے ان کے پیچھے ان کے دائیں اور ان کے باائیں سے آؤں گا اور تو اکثر کو ان میں سے شکر گزار نہیں پائے گا۔“ وہ سانس لینے کو کا۔ سارہ اسے نے گئی۔ بالکل توجہ سے۔

”میں سوچتا ہوں، ابلیس جب جانتا تھا کہ اللہ کا راستہ سیدھا ہے تو اس نے کیوں چھوڑا اسے؟ اور اگر چھوڑنا ہی تھا تو اسے سیدھا راستہ بولا

کیوں؟“ آپ کے درست راستے پر، بھی کہہ سکتا تھا مگر اس نے کہا، آپ کے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔ شاید ابلیس نے مستقیم سے مراد درست نہیں بلکہ straight (سیدھا) لیا ہو۔ سیدھے راستے کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ذرا ساتھ چھا چلو تو شروع میں تو بس سیدھی لائن سے ذرا سافا صلد پیدا کر لیتا ہے انسان لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتے جاؤ، آپ سیدھی لائن سے مزید دور ہٹتے جاتے ہیں۔ 90 ڈگری کی لیکر سے ایک ڈگری ہٹو تو آگے جا کر آپ سیدھی لائن سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ پھر آپ کو صراطِ مستقیم والی منزل نہیں ملتی۔ راستہ بدلتا ہے تو منزل بدل جاتی ہے۔ اور اس راستے سے ہمیں ادھر ادھر بہنانے کے لئے شیطان کئی طریقوں سے ہم پچھل آور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ آگے سے آتا ہے۔ آگے مستقبل کا خوف دلاتا ہے۔ وہ ہمیں مستقبل کے تو تھہارا کریے نہیں بنے گا، تمہاری فیملی کا کیا ہو گا۔“ (سارہ کا چہرہ جھک گیا۔) ”تمہاری شادی نہیں ہو گی، تم یہ اچھا کام کرو گے تو بالکل anti-social ہو جاؤ۔“ پھر وہ ہمارے پیچے سے آتا ہے۔ ہمیں ماضی کے کام پا دلا کر ان کے گلٹ میں ایسا بنتلا کرتا ہے کہ ہم کوئی اچھا کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ وہ کہتا ہے، ”تمہارے تو ماضی میں اتنے افسیر رہے، اب تو تمہاری شادی بھی اپنے جیسے بدکار سے ہو گی۔“ تم نے ماں باپ کا اتنا دل دکھایا، اب تو تم بھی ہدایت پا ہی نہیں سکتے۔ تم نے نمازیں چھوڑ دیں، اب تو تم کبھی واپس نیک ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کے بعد وہ دائیں سے آتا ہے۔ ہمیں اچھے کاموں کی ترغیب دیتا ہے اور ہم سے گناہ کرواتا ہے۔ ٹو اب کا جھانسے کر بدعتیں کرواتا ہے۔ نئے نئے دین میں داخل ہونے والوں کو کہتا ہے اسلام تو ساری خواہشات مارنے کا نام ہے، سوتاٹ پر سوڈا اور روکھی سوکھی کھاؤ۔ جو رشتہ دار حرام کا کھاتا ہے اس سے قطع تعلق کرلو۔ سب سے پہلے ماں باپ کو ان کے گناہوں پر ٹوکو ہر وقت دوسروں کے عیوب پر ان کو نصیحت کرو اور ایسے کئی غلط کام وہ ہمیں ”دین“ کہہ کر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان تینوں راستوں کے بعد وہ آتا ہے باائیں سے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ صرف آتا ہی باائیں سے ہے، مگر شیطان کا یہ آخری راستہ ہوتا ہے۔

10 of 10

لے کر سکا میں کی تدبیح ہے جائے۔ بھٹکیوں کی اگلی طرف میں کہتے ہے جب سارے اسے لے کر اپنے کاموں کا اس سے خوبی کی کیجیے کہ جاتا ہے اسلام کو پہنچانے کے اسی لئے "اے آئے" ہے ایسا لیکن اسی طبق خوب کیا جائے۔ سچی چیزیں دلے کر معرفت "ایم" کیمیں کر دے تو سمجھی کہ مولانا خوشی کا اور علی میں خوشی کی بیشی کا سارے ملے ہیں۔

”کوئی تصور نہ کر سکتا ہے کہ اس کا ایسا کام ممکن نہ ہے۔“

سادہ نہ اٹھتے میں مر جاؤ۔ سوچی پر کمیں کی تھکریں میں تھے جوے چکے ہے تھے۔ کمی کا ہی سل کی سوچی آؤں کے  
لئے ہوں گی۔ ”کمی کوں میں کہتے ہیں۔ تو کمی کی جاہلی اس کے بعد ہم سے بہرے چکن کے ساتھ کیا کرے کا کمی  
کو جھوپی، چکن کو چھانے کے لئے یہ خود میں ہے تو کبھی کمی کا زبانے ہے۔“  
”کہا سے ہو آمانے ہے ہی۔“ وہ سکرا کر جاؤ۔ بہرہ سامان جو کٹھمن سے ہے تھا۔ قارئیں اس لمحہ ای وہ کمالی دسری  
فہری۔

اب تین بارہ تک پہنچا پہنچا کر اس کا نام میں جلا جاؤ اُنگلی میں مردی اپنی کریں۔ اُنگلی کو اس کا نام دے کر، پھر اس کا نامی بھی کی جو اپنا صرف ٹانے کے لئے کھوئی گئی۔ اس کو سری چاہے بخدا شویں والی اپنے اپنے سے اٹھا کر کے لے۔

”آپگی سے اس نے خاتمی کی کلکی لے سکی اور اسے کامیڈی اسی سکھی کو اپنی شویں لے کیا۔ مدی جس

اور آپ نے ہپھال سے فتحا کروایا تھا۔ ”وہ جتنا کر بولا تھا۔“  
”میں نے مجھے دھوکہ دیا اور یہ بھولنے میں مجھے کچھ وقت لگے گا۔“ وہ مال کو نظر انداز کرنے کے درستی سے بولا تھا۔ جواہرات کی آنکھ سے آنکھوں کو گرا۔

”میں نے ساری عمر تم دلوں کے لئے لگادی اور آخر میں مجھے یہ صلٹا۔ بہت اچھا میرے میئے اے“ وہ کبھی صورت نہائے کہہ رہی تھی۔

”یہ victim card کھینچ بھرے اور پڑھنیں والا مسز کارڈ اے۔“ وہ کھانی سے کہہ کر انہی کھڑا ہوا۔ اور سچے ہیوں کی جانب پڑھ لیا۔

جواہرات نے گلی آنکھوں سے تو شیر وال کو دیکھا۔ ”کیا تم بھی مجھ سے خدا ہو؟ میں نے جو کیا تمہارے لئے کیا۔“

”میرے لئے ۱۹۴۷ء میں سعدی مر جاتا تو کل کو ڈاکٹر سارہ تو بھی گواہی دیتیں تاکہ تو شیر وال نے اسے گولیاں ماری جیں۔

میں تو قاتل ہیں جانتا۔ اپنے گناہوں پر وہ سروں کو ”دینے“ نہیں کیجاتے ان کو خود قیص کر دیں گی۔ ”وہ بھی اکثر“ اکثر اسما کہہ کر ہاشم کرنے لگا۔ جواہرات ابھی اسے خست سنت سنائے ہی گئی تھی کہ ہاشم زینے پھلانگ کا اپس آتا دکھائی دیا۔ چند کاغذ اور قلم اس نے جواہرات کے سامنے لے لائے۔

”ان پر دھنکا کریں۔“

”یہ کیا ہے؟“ وہ جس ان ہوئی۔

”آپ کہنی میں اپنے صورت میرے ہم خصل کر رہی ہیں۔ آپ بورڈ آف ڈائریکٹریز سے استعفی دے رہی ہیں۔“ اور آپ اپنے پیشک اکاؤنٹس میں مجھے جو اکٹ بولڈر جاری ہیں۔ آج کے بعد آپ آفس نہیں آئیں گی زندگی میری املاک کے لیے ایک وحیا ابھی ترقی کر سکیں گی۔ اپنی تمام جائیداد کا پا اور آف ادارتی آپ میرے ہم خصل کر رہی ہیں۔ ”وہ ایک ایک کاغذ کی تفصیل ہتا ہا گیا۔ جواہرات کا چھوڑ سرخ ہوا۔ آنکھوں میں فسرو آیا۔ آنسو دیکھ رہا ہے ملتا ہو گے۔

”تم میرے ساتھ چھوڑ کر کے کر سکتے ہو؟“

”آپ بابت کرنا پاہتی ہیں کہ آپ کے لئے میں زیادہ اہم ہوں یا یہ سب مادی چیزوں تو دھنکا کریں اور بات کر دیں۔“ نہ اس کے داد جھنے لپھنے میں بولا تھا۔ وہ اس کے سر پر کھڑا تھا اور جواہرات مششدری پیغامی ان کا نہدوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے لٹکی میں سر بدلایا۔

”میں ان کو سائیں نہیں کروں گی۔“ وہ غرماں تھی۔ ”کیا کرو گے تم ہاں؟“

”میں یہ کروں گا۔“ ہاشم تھیلی میز پر رکھ کر جھکا۔ تین انھیا اور دھر اور حمز ان کا نہاد پر دھنکا کرتا گیا۔ ہو ہو جواہرات کے دھنکا۔ جواہرات کا ساسنر رک گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔

”تم...“

”حقیق یا گی۔ آج کے بعد آپ کو ہاضم نہیں ہے۔“ وہ کاغذ سینتا سینھا ہوا اور پلٹ گیا۔ جواہرات نے بے تہنی سے تو شیر وال کو دیکھا۔ ”یہ غیر قانونی ہے۔“

”تو گرفتار کر دیں بھائی کو۔“ وہ بھی بے زاری سے برتا انھی کیا تھا۔ جواہرات یک ٹکنک اس کی ٹکل و کیھنے کے لئے؟ وہ مششدری پیغامی تھی۔ اس کو جائیداد سے بے دھل کرتے کی پاداں میں جان سے مارا تھا۔ اس نے اور نگزیر کو؟ کیا اس اولاد کے لئے؟ کیا یہ دن دیکھنے کے لئے؟ وہ مششدری پیغامی تھی۔

عہدِ انصاف آ رہا ہے منیر ..... ظلم دائم ہوا نہیں کرتا  
اس دو پھر گرمی کا زور گو یاٹوٹ سا گیا تھا۔ صبح پھر بارش ہوئی تھی اور موسمِ خنڈا مگر جس آلو دھو گیا تھا۔ ایسے میں کمرہِ عدالت میں بھی  
گھسنے تھی مگر کارروائی اتنی دلچسپ جا رہی تھی کہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ زمر کہرے میں کھڑی سارہ سے سوال پوچھ رہی تھی اور فارس پچھلی نشتوں  
پٹانگ پٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ بھی وہ سارہ کو دیکھتا، کبھی اپنے قریب مگر دوسرے کالم میں بیٹھے الیاسِ فاطمی کو۔ آج دو اہم گواہ پیش ہوئے  
تھے اور فارس غازی کافی مطمئن نظر آتا تھا۔

”اور آپ کو یقین ہے کہ وہ کرٹل خاور ہی تھا جس نے آپ کے گھر آ کر آپ کو دھمکایا۔“ زمر پوچھ رہی تھی۔ کہرے میں کھڑی سارہ  
نے سفید لباس پہن رکھا تھا اور چہرہ بھی سفید مگر سپاٹ سالگ رہا تھا۔ نظریں اعتماد سے زمر پہ جمائے اس نے اثبات میں سرہلا یا۔  
”جی۔ وہ وہی تھا۔“

زمر والپس گھومنی اور ہاشم کو اشارہ کیا۔ ”your witness“ وہ کوٹ کا مٹن بند کرتا تھا اور اپنے چمکتے ہوئے جوتے فرش پر آگے  
بڑھاتا سارہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”ڈاکٹر سارہ.... ہم نے آپ کا پورا بیان بہت تخلی سے سن۔“ وہ رسان سے اس کی آنکھوں پر نظریں جمائے کھڑ رہا تھا۔ ”اب آپ  
سے میں کچھ سوال پوچھنا چاہوں گا تا کہ عدالت خود فیصلہ کر سکے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔ کیا آپ جواب دینے میں کمزور میں ہیں؟“  
”ایسے ظاہر مت کرو ہاشم جیسے تمہیں میری بہت پرواہ ہے، میرے بچوں کے باپ کو جیسے سنگدلی سے مردا یا تھا، اسی سنگدلی سے  
جرح کرو۔ میں تیار ہوں۔“ وہ رکھائی سے بولی تھی۔ ہاشم ہلکا سامسکرا یا اور سر جھٹکا۔ ”خیر.... آگے چلتے ہیں۔“ ہاتھ باہم پھنسا کر کھڑے سارہ کو  
دیکھتے ہوئے اس نے چہرے پر سنجیدگی طاری کی۔

”آپ کا کہنا ہے کہ سعدی یوسف کے ساتھ اس رات آپ نے میرے موکل کو دیکھا تھا۔“

”جی ہاں۔ یہی تھا۔“ سارہ نے پیچھے کر سیوں پر بیٹھے شیر و کی طرف اشارہ کیا جو سپاٹ شکل بنائے بیٹھا تھا۔ آج جواہرات موجود  
نہیں تھی۔

”جس وقت آپ کے بقول نو شیر و اس نے سعدی کو گولی ماری، کیا آپ نے اس وقت اس کے ہاتھ میں پستول کو جھٹکا کھاتے  
ویکھا تھا؟“

”میں وہیں تھی ہاشم میں کبھی خوف سے سر اندر کر لیتی، اور کبھی باہر نکالتی، اس کو پستول پکڑنے، اس کو بولتے، سعدی کو بوث سے  
مارتے، میں نے سب دیکھا تھا۔“

”ڈاکٹر سارہ جب گولی پستول سے نکلتی ہے تو آگ کا شعلہ سا ساتھ نکلتا ہے اور پستول جھٹکا کھاتا ہے۔ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں  
کیا آپ نے وہ لحد دیکھا تھا یا نہیں؟“

سارہ نے گھری سانس لے کر آنکھیں بند کیں۔ ”ہاں کوئی اور نہیں تھا، اور نو شیر و اس کی ساری باتیں سننی تھیں میں نے وہی تھا سعدی  
کا حملہ آؤ اور...“

”ڈاکٹر سارہ، آپ نے وہ لحد دیکھا تھا یا نہیں؟ ہاں یا نا؟“ وہ درشتی سے اونچا سا بولا تھا۔ زمر نے بے اختیار لب کاٹے تھے۔  
”نہیں!“ سارہ کی آواز ہمیں ہوئی۔

”اوکے بات ختم۔ آپ نے نو شیر و اس کو گولی چلاتے نہیں دیکھا تھا۔“ وہ سرہلا کر کھڑ رہا تھا۔ ”ڈاکٹر سارہ آپ بائی پر فیشن ایک اہم  
پراجیکٹ کی ہیڈز ہیں، ایک حساس ادارے کی سائبنسدان ہیں، آپ کی انگلیوں کے چند کلکس کی مار ہے ڈرون پروگرام آپ تو راکٹ مائنٹر

ہیں۔ آپ جیسی عورت کیوں اتنے ماہ خاموش رہی؟“ وہ حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

”کیونکہ آپ اور آپ کا خاندان مجھ سے زیادہ طاقتور اور بااثر ہے۔ اور چونکہ آپ کے دستِ راست نے مجھے میرے گھر میں گھس کر ہر اس کیا تھا، اس لئے میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔“

”اچھا! آپ خوفزدہ کیوں نہیں ہیں؟“

سارہ ہلکا سامسکرانی۔ اب بھی ہوں۔ بہت زیادہ۔ اگر کیس کا فصلہ سعدی کے حق میں نہ ہوا تو تم ہمارے ساتھ کیا کرو گے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ لیکن اب میں ڈرڈر کے بھی تھک چکی ہوں۔ اس لئے میں تمہارے بھائی کو ان کے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔“

وہ اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ آپ اپنے شوہر کی مبینہ طور پر خود کشی کے بعد ڈاکٹر مہرین وقار سے سائیکلوک سیشن لیتی رہی ہیں؟“

”ڈیم اٹ!“ زمر نے سر جھکا کر پیشانی مسلسل تھی۔ سعدی نے پریشانی سے اسے دیکھا مگر اب وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

”کبھی کبھار۔ جی ہاں۔ میں یوہ ہوئی تھی۔ میری جا ب تھی۔ بچھوٹے تھے اور مہرین میری فریڈ ہے۔“ سارہ جیران ہوئی تھی۔

”کیا یہ بھی سچ ہے کہ ڈاکٹر مہرین نے آپ کو چند اینٹی ڈپریسنشن prescribe کیے تھے جو آپ باقاعدگی سے لیتی ہیں۔“

”آج کل کون سا پرا جیکٹ ڈائریکٹر سائنسدان یا کون سی کیریئر و من ہے جو اینٹی ڈپریسنشن نہیں کھاتی؟“

”آپ اینٹی ڈپریسنشن لیتی ہیں یا نہیں لیتیں؟“

”ہاں ٹھیک ہے میں لیتی ہوں مگر۔“

”اور اینٹی ڈپریسنشن کے سائیڈ افیکٹس میں ‘paranoia’، یہ سب شامل ہوتا ہے۔ اس رات بھی آپ کے جسم کے اندر اینٹی ڈپریسنشن کا مادہ گھلا ہوا تھا۔ نوشیر والوں کو گولی چلاتے آپ نے نہیں دیکھا، پھر بھی مصروف ہیں کہ وہی مجرم ہے۔ ایک عورت جس کی وہنی حالت اور بصارت مکمل طور پر درست نہیں ہے وہ رات کے اندر ہیرے میں جبکہ اس کالونی میں بکل بھی نہیں تھی، ڈاکٹر سارہ کا کسی کو دیکھ کر پہچان لیتا، انتہائی احتمانہ بات لگتی ہے یور آئر۔“ وہ اب نجح صاحب سے مخاطب تھا۔ زمرا یک دم کھڑی ہوئی۔

”ہاشم آپ کیسے پڑتے؟“

”کیا؟“ ہاشم اس کی طرف گھوما۔

”بھی کہ اس کالونی میں اس وقت بکل نہیں تھی؟ کیونکہ جب سعدی کو وہاں سے اٹھایا گیا، تب تو بکل آگئی تھی، اور اس کالونی کے تمام گھر زیر تعمیر تھے، آس پاس کی کئی گلیاں زیر تعمیر اور یوں تھیں، وہاں کوئی... تو تھا نہیں، تو آپ کو کس نے بتایا کہ وہاں اس وقت بکل نہیں تھی؟“ نوشیر والوں نے چونکہ کر زمر کو دیکھا تھا، البتہ ہاشم کے اطمینان میں فرق نہیں پڑا۔ ”سعدی یوسف نے اپنے بیان میں کہا تھا شاید۔“

”میں نے اپنے بیان میں ایسا کچھ نہیں کیا۔“ وہ بلند آواز میں بولا تھا۔

”بکل والی بات ہاشم کہیں mention ہی نہیں ہوئی، تو آپ کو کیسے معلوم؟“ وہ دو بد و کہہ رہی تھی۔ ہاشم نے ہلکا سامنہ کر سر جھکا۔

”میں اپنا ہوم ورک مکمل کرتا ہوں مسز زمر۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں اس وقت بکل نہیں تھی جب نیاز بیک نے سعدی یوسف پر حملہ کیا۔“

”تمہارے بھائی نے بتایا ہے تھیں ہاشم مان لو۔“ سارہ ہمارت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ نجح صاحب کو اپنا ہتھوڑا بجانا پڑا تھا۔

ایک دم شور سا جو اٹھ گیا تھا۔ ایسے میں کافی لطف اندوڑ ہوتے فارس کے تاثرات بدلتے۔ وہ چوک کر باہمیں طرف دیکھنے لگا جہاں چند کرسیاں چھوڑ کے ایک شخص آ کر بیٹھا تھا۔ اس نے نسواری رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، آنکھوں پر لیاقت علی خان کے جیسا چشمہ لگایا ہوا تھا اور بال گلے کر کے سر پر مجھے تھے۔ ہاتھ میں ایک لائٹر تھا جسے وہ بار بار کھول بند کر رہا تھا۔ نشت سنبھال کر وہ اب تسلی سے ساری کارروائی ملا حظ کر رہا تھا۔

فارس فوراً اپنے فون پر جھکا۔ ”یہ آدمی کون ہے؟“ لکھ کر احمد کو بھجتا۔ ہاشم کی نشت کے قریب بیٹھے احمد کی جیب تھر تھرائی تو اس نے فون نکالا اور ذرا تر چھا ہو کر متینج دیکھا۔ پھر آہستہ سے گردن موڑی اور پچھلی نشت سے کچھ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا۔ ایک بھر پور نگاہ نوار دپ پھی ڈال دی۔

”کوئی رپورٹ ہو شاید۔“

”اس کی تصویر لے کر بھیجو میں پتہ کرواتا ہوں۔ رپورٹ نہیں ہے۔ رپورٹ ز تو اس جانب بیٹھے ہیں۔“

”راج بس!“ احمد نے چند منٹ بعد اسے اپنی ایک سیلفی بھیجی جو اس نے ابھی ابھی اتری تھی۔ پیچھے وہی شخص نظر آ رہا تھا۔ فارس نے وہ تصویر ایک نمبر پر سینٹ کی اور ساتھ لکھا۔ ”یہ شخص کون ہے؟ اس کی تصویر فیش recognition میں ڈالو۔ اور اس سے منسلک کوئی پاسپورٹ یا شناختی کارڈ ملے مجھے بھیجو۔“ ساتھ میں وہ گاہے بگا ہے اس شخص پر بھی ایک ابھی ہوئی نظر ڈال لیتا تھا۔ کون ہو سکتا تھا یہ؟ ”شاید وہ پاسپورٹ اور میموری کارڈ...“ وہ بار بار کچھ سوچتا، پھر فنی میں سر ہلاتا۔ پھر بکھل اس نے دھیان سامنے جاری کارروائی کی جانب مبذول کیا۔ سارہ اب اتر آئی تھی اور الیاس فاطمی کٹھرے میں کھڑا تھا۔ گردن کو اکڑا کر سیدھا اٹھا دے وہ رعونت سے زمر کو دیکھ رہا تھا جو کاغذات کا پلندہ لئے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

”فاطمی صاحب، ہاشم کا ردار سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“

پیچھے کری پہ بیٹھا ہاشم تھوڑی تلے پا تھر کے اب دلچسپی اور غور سے جاری مکالمہ دیکھ رہا تھا۔

”میرا ان صاحب سے کوئی ڈالی تعلق نہیں ہے۔“ زمر جو مصروف سے انداز میں اگلا سوال پوچھنے جاری تھی، بے اختیار کی۔ جیسے حیران ہوئی ہو۔ لا جواب ہوئی۔ جیسے وہ اس جواب کی توقع نہ کر رہی ہو۔ اس نے مڑک فارس کو دیکھا جواب سیدھا ہو کر بیٹھا تھا اور نھیں سے فاطمی کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا آپ ذاتی طور پر ہاشم کا ردار کے دوست نہیں ہیں؟ کیا آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہوتی رہتی؟“ اس کے انداز میں بے چینی سی تھی۔

”نہیں، میں ان صاحب سے یکسرنا واقف ہوں۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کیلیں صاحب کہ میری ان سے ملاقات ہوتی رہی ہے؟“

”فاطمی صاحب کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟ آپ نے خود میں یہ معلومات دی تھیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ پچھلے ایک سال میں آپ اور ہاشم ان مقامات پر ان تاریخوں میں ملے تھے؟“ وہ اب ایک کاغذ ہاشم کے سامنے رکھتے ہوئے چند تاریخیں بتا رہی تھی۔ ہاشم نے کاغذ اٹھا کر غور سے پڑھا پھر نظریں اٹھا کرتے ہی غور سے فاطمی کو دیکھا۔

”یہ غلط ہے۔ اور میں نے آپ کو کوئی معلومات نہیں دیں۔“

”مگر آپ نے خود میں بتایا تھا کہ آپ کے بیٹھے کا spyware استعمال کر کے کرنل خاور نے اس کیس کی اہم سی اسی دی فوٹیج مختلف اداروں کے ریکارڈز سے منای تھیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟“

”میرے بیٹے کا ایسا کوئی سافٹ ویر نہیں ہے۔ یہ سب الزام ہے۔“ زمر نے پلٹ کر پھر سے بے کسی سے فارس کا دیکھ کر شانے اچکائے جیسے وہ سخت خفا ہو۔ وہ بس تند و تیر نظر و سے فاطمی کو گھورے جا رہا تھا۔

”اور کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہاشم نے اس کیس میں گواہی نہ دینے کے لئے آپ کو caymans میں ایک نیا کاؤنٹ کھلو کر دیا تھا اور...؟“

”آپ کے پاس کسی چیز کا ثبوت نہیں ہے۔ آپ لوگ صرف شہرت کے طالب ہیں۔“ وہ بڑھی سے کہہ رہا تھا۔ زمر فرو رائیزی سے نج صاحب کی طرف رخ کر کے بولی۔ ”یو آئر میں الیاس فاطمی کو بطور ایک پراسکیو ش witness give up کرتی ہوں۔ فاطمی صاحب آپ جاسکتے ہیں۔“

نج صاحب نے ہاشم کو دیکھا جواب بھی بہت غور سے اس سارے تماثیل کو دیکھ رہا تھا۔ زمر کی پریشانی، اس کا واپس جا کر سر جوڑے سعدی سے لفتگو کرنا، دونوں کا جھنگھلا ہٹ سے نفی میں سرہلانا، پیچھے بیٹھے فارس کا فاطمی کو گھورنا۔ وہ ایک ایک مائیکرو ایکسپریشن دیکھ رہا تھا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے، الیاس فاطمی ان سے ملا ہوا ہے اور مکر رہا ہے۔“ احرمنے اس کے قریب سرگوشی کی۔ ہاشم ہلکا سمسکرایا اور گرد موز کر اسے دیکھا۔ ”نہیں۔ وہ ان کے ساتھ نہیں ملا ہوا۔ یہ سب اداکاری کر رہے ہیں۔ مجھے یہ امپریشن دے رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ ایک تیر سے دوشکار کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ معلومات ان کو میرا کمپیوٹر وغیرہ ہیک کر کے آسانی سے مل گئی ہوں گی۔ رہی آخری اکاؤنٹ والی بات تو ہو سکتا ہے وہ تم نے ان کو بتائی ہو۔“ مسکرا کر احص کو دیکھا۔ وہ لمحہ کو کچھ بول نہیں سکا تھا۔ ”سر، میں آپ کے والد کے ساتھ۔“

”میرا والد مر چکا ہے، اور میں آئندہ سے اپنی feeling پر بھروسہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں پر یقین نہیں ہوں کہ تم تھے یا نہیں، لیکن تم فاکر ہو۔ اپنا سامان اٹھا وہ اور آج کے بعد مجھے میرے گھر یا میری ماں کے گرد بھی نظر نہ آؤ۔“ مسکرا کر گرچا جبا کے کہتا وہ احرپہ گویا ٹھنڈا پانی ڈال گیا۔ احرپا لکل شل بیٹھا رہ گیا۔ ہاشم نے پھر وہ اپس نج صاحب کی طرف موز دیا تھا۔ اس کے انداز کی ختنی اور قہر... احرپا پی چیزیں ابھی سے سمیئے لگا تھا۔

الیاس فاطمی اب کٹھرے سے اتر کے نیچے آگیا تھا اور کرسیوں کے ساتھ سے گزرتا دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جس لمحے وہ فارس کی کرسی کے قریب آیا، لمحہ بھر کو تمہرا۔ فارس نے صرف خشمگین لگاہ اٹھا کر اسے دیکھا مگر وہ اتنے اتنی ہی تندی سے گھور رہا تھا۔

”تم میرے بیٹے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ یہ ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں نہ تم اس کا پیچھا کر سکتے ہو، نہ اس کو بال برابر نقصان پہنچا سکتے ہو۔“ گھمٹی انداز میں کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ کمرہ عدالت سے نکل کے وہ راہداری میں چلتا جا رہا تھا جب اسے اپنے پیچھے انوس آہٹ کا احساس ہوا۔ فاطمی پلٹا تو دیکھا، فارس اس کے عقب میں کھڑا ہے۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ عدالتی کرے والے تاثرات کے بر عکس بالکل پر سکون سا لگ رہا تھا۔

”کیا ہے؟“

”میں قتل نہیں ہوں، نہ میں تمہارے بیٹے کو مارنا چاہتا تھا۔“

”اچھا۔ اور کچھ؟“ وہ خشک سے انداز میں بولا اور کلائی پر بندھی گھری دیکھی۔

”میرا ایک بھائی تھا الیاس صاحب، اور وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ وہ بچ بولتا تھا۔ ایمان داری سے اپنا کام کرتا تھا۔ لیکن پھر اس کو اس دنیا سے جانا پڑا۔ اس کو عکھے سے لٹکا کر ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کی گردن توڑی گئی کیونکہ تمہارا بیٹا، تمہارا الڈا بیٹا ایک مہنگی کار کا خواہ شمند تھا۔“ وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی اور اس میں زمانوں کا دکھ سمو یا تھا۔ ”اس کا نازخڑا اٹھانے والے باپ نے میرے بھائی کو بچ دیا اور کا خریدی۔ یہ

سب کچھ... آج جہاں ہم ہیں اور جہاں تم ہو یہ سب تمہارے بیٹے کی ایک کارکی وجہ سے ہوا ہے۔ اس کی ایک اندری خواہش کی وجہ تھے۔ تو اس کو ہنگتی ہو گی۔"

"تم.... میرے خاندان کا کچھ نہیں بلکہ گاڑ سکتے۔ وہ اب اس ملک میں نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ وہ امریکہ پہنچ چکا ہے۔ وہی امریکہ جس کی ریاست درجنہ میں اس کی کمپنی کا ڈینا سینٹ موجود ہے۔" اب لے ۷۰ مسکرا یا تھا۔ لمحے بھر کو فاطمی سمجھتے سکا، کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

"میں اس کو مارنا نہیں چاہتا تھا، وہ بس بہت عرصے سے امریکہ واپس نہیں جا رہا تھا میں صرف اسے واپس بھیجننا چاہتا تھا تاکہ جب غیر قانونی سپائی ویسر کے لئے امریکی مٹی استعمال کرنے پا ایف بی آئی اس کو گرفتار کرے تو وہ امریکہ میں موجود ہو جس وقت تم اپنی گواہی دے رہے تھے، اس سے تین گھنٹے پہلے تمہارا بینا گرفتار ہو چکا ہے۔ چند گھنٹوں میں تم تک آفیشل خبر بھی پہنچ جائے گی۔ ایف بی آئی کی سب سے اپنی بات یہ ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی tip کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔"

"واٹ دا...." الفاظ اس کے لبوب پٹوٹ گئے۔ وہ بالکل سُن سافارس غازی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ فارس دو قدم آگے آیا، ہمدردی اور تاسف سے فاطمی کے شانے کی گرد جھاڑی پھر اس کی نائی کی ناٹ ذرا کسی نادیدہ سلوٹ ہاتھ پھیر کے دور کی اور اسی ملاں سے کہنے لگا۔

"وہ تمہارا اکتوبریٹا ہے اور فیڈرک کورٹ میں اس پر ایک طویل مقدمہ چلنے والا ہے۔ اس کا مسلمان ہونا اس کے لئے نقصان ہے ثابت ہو گا۔ اب تمہیں وہاں جانا ہو گا، وہاں سے استعفی دے کر، اور وہ ساری دولت جو تم نے میرے بھائی کو پہنچ کر بنا لئی تھی، الیاس فاطمی اب تم اس کی

ایک ایک پائی جوڑ کر امریکہ کے مہنگے کیلوں کی فیسیں بھرنے میں لگے رہو گے۔ اور اس کے بعد بھی اس کے رہا ہو جانے کی امید ہو گی۔ سواب تم اپنے آفس جاؤ اور وہ کرو جو میں نے کہا تھا۔" اس کے کان کے قریب چہرہ لے جا کر وہ دھیرے سے بولا۔ "اپنا استغفاری لکھو۔ الیاس فاطمی مجھے تمہارا استغفاری چاہیے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو، بکواس کر رہے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" اس کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ وہ غصے سے اس پر غریباً اور پھر موبائل نکالتا تیری سے آگے بڑھ گیا۔ اب وہ پریشانی کے کسی کوکال ملا رہا تھا۔ اس کی رنگت بدل رہی تھی، اور وہ بار بار بے یقینی سے نفعی میں سر ہلاتا تھا۔ پسینے کے نخے قطرے اس کی پیشانی پر کھڑے تھے اور فارس غازی سینے پر بازو لپینے ملاں سے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ یہ منظر دیکھ کر اچھا محسوس کر رہا گا۔

اور وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔

.....  
کیوں دل جلانیں کر کے کسی سے بھی اب سخن ..... جب گفتگو کا کوئی سلیقہ نہیں رہا  
وہ شام جب شہر پر اتری تو اس میں بارش کے بعد کی گیلی مٹی کی سوندھی سی خوشبو پی بی تھی۔ ایسے میں سعدی یوسف فوذی ایور  
آفرٹ کے نیچے والے ریٹورنٹ ایریا میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا اور سامنے لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا۔ کل سے اپنی جاپ پر واپس جانا تھا اور وہ  
اس وقت اسی کی تیاری کر رہا تھا۔ ریٹورنٹ کے باہر اب ایک اور لڑکا پھولوں کا اشال لگا تھا۔ کل خان اور اس کا خاندان دو ماہ قبل بہت  
سے انفان باشندوں کے ساتھ ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔ سعدی کام کرنے کی بجائے کتنی دیر بہر نظر آتے ان پھولوں کو دیکھتا رہا تھا۔ پرانے  
لوگ آہستہ آہستہ جا رہے تھے نے لوگ آرہے تھے اور ہر گز رتے دن، ہم سب بھی تو ایک نئے انسان میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ وہ انسان جس کو  
بعض دفعہ پہچانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان جس کے بارے میں ہمیشہ سوچا تھا کہ ہم یہ تو نہیں بنیں گے۔ مگر قسمت کے آگے سب بے

اں تھے۔

اُنہوں غم نہیں کرتا۔ سعدی نے نقی میں سر بلا کر خود کوٹھا۔ پھر کام کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہی۔ مگر فون بجتے لگا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا۔ ایک نیز چینل کے رپورٹر کی طرف سے پیغام آیا تھا کہ آٹھ بجے والے شو میں اس کو لا یو لائنس پلیس گے۔ اسے عدالت میں کیس کی ہیروی کرنے کا کوئی فائدہ ہے بھی نہیں، اس موضوع پر بات کرنی ہوگی۔

چھوٹے گنگریاں بالوں والاڑ کا ادا سی سے اس پیغام کو دیکھے گیا۔ کیا عدالت میں کیس کی ہیروی کرنے کا، اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لئے بھی نہیں کرنا۔

کوسرِ عام رسوا کرنے کا، ان کو کتنے لوگوں کی بندوقوں کی تاثان پلے آنے کا کوئی فائدہ تھا؟ کیا ساحر و کلاء کے دلائل کا کوئی توڑ تھا؟ بچ اور حق پر ہونے کے باوجود کیس مسلسل ہارنے کی پوزیشن میں ہونا، اور اپنے ہرشوت کا ہاشم کے ہاتھوں مشکوک بنائے دینا۔ کیا اس سب سے نجات کا کوئی راستہ تھا؟

اس کے پاس ان سوالوں کے کوئی جواب نہ تھے۔ اس نے خاموشی سے فون آف کر دیا اور لیپ ٹاپ کی طرف توجہ مبذول کر دی۔ اسے خاموشی سے اپنا کام کرنا تھا۔

❖❖❖

بھر ہے میرے چار سو، بھر کے چار سو خلا..... میں بھی نہیں میرے قریب، تیرا تو خیر ذکر کیا! ڈاکٹر اس معیل حسن اپنے گھر میں بنی چھوٹی سی لا ببری ی میں اس وقت بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے مطالعے کے لئے چند کتب کھلی تھیں اور وہ بہت انہاک سے اپنے کام میں مصروف تھے جب ان کی بیٹی نے اندر جھانکا۔ ”بابا....“ انہوں نے سر اٹھایا۔ وہ سفید داڑھی اور صاف ستھری شلوار قمیص پہنے، شفیق اور مہربان چہرے والے انسان لگتے تھے۔ بیٹی کو کیہ کر مسکرائے۔ ”جی بیٹا؟“

”میرا ایک پرانا کلاس نیلو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ وہ قدرے متذبذب تھی۔ ”لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کو جنہ کریں۔ وہ آج کل پوری دنیا میں اتنا تماشا بنا ہوا ہے کہ بہت مشکل سے میں نے اس کو راضی کیا کہ وہ آپ سے بات کر لے۔“ وہ ان کو سمجھا رہی تھی۔ ٹھیک وہ منٹ بعد وہ نوجوان اندر داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر اس معیل نے اسے ایسے دیکھا جیسے ہر نئے ملنے والے کو دیکھتے تھے۔ مسکرا کر اٹھے اور اسے خوش آمدید کہا۔ وہ متذبذب لگتا تھا۔ لباس اچھا تھا اور بال اور اپسالس کی صورت اخمار کئے تھے۔ آنکھوں تکے گھرے حلقات تھے۔ کلائی میں چند بینڈز پکن رکھے تھے۔ وہ اسی متذبذب سے ان کے سامنے بیٹھا تو انہوں نے پوچھا۔ ”کیا نام ہے آپ کا؟“

”نوشیر واس کاردار۔“ اس نے چھک کر بتایا۔ ”ئی وی پر ذکر تو سناء ہو گا آپ نے میرا۔“ ذرا تائی سے بولا۔ ”میں نے واقعی آپ کا ذکر نہیں سن۔ نوشیر واس آپ کو کیا بات پر بیثان کر رہی ہے، آپ مجھے بتائیں۔ شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔“

اس نوجوان نے سر نیو اڑ دیا، پھر کان کھجایا۔ پھر اسی طرح بولا۔ ”میں نے ایک گناہ کیا ہے۔“ ”اگر گناہ راز ہے تو اسے راز رہنے دیں۔“ انہوں نے اسے روکا مگر وہ چہرہ اٹھا کر تائی سے بولا۔ ”بچے بچے کو پتہ ہے، میں نے اپنے دوست کو تین گولیاں ماری تھیں۔ پھر میرے بھائی نے اسے انگوکھا کیا، اور اس سے پہلے میرے بھائی نے.....“

”آپ مجھے وہ بتائیں جو آپ نے کیا ہے۔ بھائی کو چھوڑیں۔“

وہ تھرا۔ پھر نظریں ان پر جائے ذرا مدد حم آواز میں بولا۔ ”میں نے اپنے دوست کو تین گولیاں ماری تھیں۔“

”وہ مر گیا؟“

”نبیں فتح گیا۔“

”آپ کیا چاہتے تھے؟ کہ وہ مرجائے۔“

”پختہ نہیں۔ میں اسے...“

”پختہ ہوتا ہے سب انسان کو۔ آپ کیا چاہتے تھے؟“

”میں اسے اذیت دینا چاہتا تھا، شاید مغذو کرنا چاہتا تھا۔ مارنا بھی چاہتا تھا۔ میں سب کچھ چاہتا تھا۔“

”اب وہ کیسا ہے؟ انہوں نے دھیکے انداز میں پوچھا تھا۔“

”وہ میرے ساتھ مقدمہ لڑ رہا ہے۔“

”آپ نے اعتراف جرم کیا۔“

”نبیں کر سکتا۔ قانون کی محظوظ اولاد ہوں، خاموش رہنے کا حق ہے مجھے۔“

”اب آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں اس سب سے لکھنا چاہتا ہوں۔“ اس کی آواز میں کرب در آیا۔ ”میں نادم ہوں۔ شرمدہ ہوں۔ دکھ میں ہوں۔ میں چاہتا ہوں وہ مجھے معاف کر دے۔“

”ایسے جرام میں تو پکڑے جانے سے پہلے ہوتی ہے، پکڑے جانے کے بعد معافی ہوتی ہے۔ اور چونکہ مقدمہ چل رہا ہے تو فیصلہ آنے کے بعد یا تو آپ کو اپنی سزا بھکرنی ہو گی یا آپ کو اس سے معافی مانگنی ہو گی۔“

”میں سزا نہیں بھگت سکوں گا۔“

”معافی مانگ سکتے ہو؟“

”مجھے نفرت ہے اس سے۔“

”محبت کرنے کو کہہ بھی نہیں رہا۔ کسی کو معاف کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو گلے سے لگایا جائے، اس کو دوست بنا لیا جائے۔ صرف ایک عہد کرنا ہوتا ہے کہ جو اذیت اس نے مجھے دی وہ میں نے اس کو نہیں دی۔ اور اگر دوبارہ اس پر ظلم کرنے کا موقع آئے تو اب میں نے وہ نہیں کرنا جو پہلے کیا تھا۔“

”کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟“ اس کی آنکھیں گیلی ہوئیں۔ وہ اس وقت شدید بے بس نظر آ رہا تھا۔ ”میں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔“

”اگر آپ اللہ سے معافی مانگیں تو اللہ لوگوں کے دلوں میں بھی آپ کے لئے رحم ڈال دیتا ہے۔ آپ کے اندر ایک اچھا انسان ہے اور آپ کو اسے باہر نکالنا ہے۔“

”سوری مگر یہ pep talk مجھے نہ دیں۔ میرے اندر کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔ میں نے اپنی جان بچانے والے دوست کو کوئی ماری۔ اپنے بھائی کی بیوی پر نظر رکھتا تھا میں۔“ وہ زہر خند سا گویا ہوا۔ آنکھیں اب تک گیلی تھیں۔

”نوشیر والیاں یہاں ہر کوئی گناہ گار ہے۔ گناہ کرنا، پھر تو کہ کرنا، پھر گناہ کرنا پھر تو کہ کرنا پھر گناہ پھر تو بے... یہ مومنین کے اخلاق میں ہے۔ اچھے لوگ وہ ہوتے ہیں جو گناہوں کے بعد تو بے کرتے ہیں اور برے وہ ہوتے ہیں جو گناہوں کے بعد تو نہیں کرتے۔“

”یعنی دونوں برابر گناہ کرتے ہیں۔ تو پھر اچھے لوگ جنت وغیرہ میں کیسے جائیں گے؟“

”جنت میں ہمیں ہمارے اعمال نہیں اللہ کی رحمت لے جائے گی۔ اللہ پر توکل لے جائے گا۔ توکل ہوتا ہے اللہ سے اچھی امید ہاندھنا۔ اگر آپ کے گناہ بڑے ہیں تو آپ کو مایوس نہیں ہونا۔ ہر چیز معاف ہو سکتی ہے اگر آپ معافی مانگیں۔ بڑے گناہوں کے بعد بڑی نیکیاں کریں۔ بڑے بڑے اچھے کام۔ یوں آپ کے گناہ دھل جائیں گے۔“  
”اور کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟“ اس کی سوئی دیں ابھی تھی۔

”جب آپ اپنے دوسرے گناہ دھوتے جائیں گے اور اللہ سے معافی مانگیں گے تو اس کا دل بھی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے نا، وہ اسے آپ کی طرف سے پھیر دے گا، لیکن اس سے پہلے آپ کو اچھے کام کرنے ہوں گے۔ ایسے اچھے کام جو آپ کے چہرے کی ساری کالک دھو دیں۔“

”مثلاً کیا؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ الجھ گیا تھا۔ اسے دور درستک کوئی ایسی نیکی نظر نہ آتی تھی جو اسے اپنالائق سمجھے۔ وہ جواب میں گھری سانس لے کر اسے سمجھانے لگے تھے۔ انہیں وہ لڑکا بھلا معلوم ہوا تھا اور وہ اس پر کچھ وقت صرف کرنا چاہتے تھے۔

❖ ❖ ❖

اس صحیح ہاشم اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ کری پر پیچھے کوئی لگائے، وہ چھت کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ فون پر الیاس فاطمی کے لاتعداد پیغام اور کارکروں مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ وہ اس شخص سے کسی بھی قسم کا تعلق فی الحال افروذنہیں کر سکتا تھا۔  
”سر!“ ریس نے اندر رجھا ہوا کام چونک کر سیدھا ہوا پھر اسے بلا یا۔

”عدالتی ساعت کا وقت ہونے والا ہے۔ لیکن اگر آپ کے پاس چند منٹ ہوں تو...“ وہ ایک موبائل ہاتھ میں لئے اندر آیا۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو مس آبدار کا موبائل چاہیے۔ ان کے ایک ملازم نے یہ کام کر دیا ہے۔ ہو، ہو اس سے جیسا موبائل ری پلیس کر دیا ہے، مگر وہ ذیڈ ہے۔ اور یہ میں آپ کے لئے لے آیا تھا۔ پا سوڑا وغیرہ نہیں لگا ہوا، اس نے موبائل ادب سے اس کے سامنے رکھا۔ ہاشم نے ہاتھ جھاکر اس کو داپس جانے کو کہا اور پھر موبائل اٹھا لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسکرین روشن کی۔

واثق ایپ سامنے ہی تھا۔ اس نے chats کو میں۔ فہرست میں اوپر ایک نام جمگما رہا تھا۔

فارس غازی۔ اس نے انگوٹھا اس نام پر دبایا۔ سامنے ایک طویل گفتگو کھل گئی جس میں یچھے یچھے آپ کے ان گنت پیغام تھے جن کا اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ گفتگو اپر کرتا گیا۔ اس کے جڑے کی رگیں کھنچتی گئیں۔ پیشانی کی سلوٹیں بڑھتی گئیں۔ سانس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔  
قریباً گھنٹے بھر بعد وہ کمرہ عدالت میں داخل ہوا تو اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں وہ ڈگ اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ استغاش کی کریں یوں پاسے ان کا سارا خاندان نظر آیا تھا۔ آج سعدی، زمر اور فارس کے ساتھ ہمیں اور اسامہ کے علاوہ ندرت بھی بیٹھی دکھائی دیتی تھیں۔ آبدار بھی ان کے قریب ہی موجود تھی۔ اس نے اپنی طرف کی کریں پر نگاہ دوڑا۔ نوشیر وال اور جواہرات وہاں خاموش بیٹھے تھے۔ وہ بھاری قدم اٹھاتا اپنی نشست کی طرف بڑھ گیا۔ عدالتی کا رواہی شروع ہونے میں چند منٹ رہتے تھے، وکلاء اپنی فانکوں کو پڑھ رہے تھے، کورٹ رپورٹر تا پیگ کے لئے تیار ہو رہا تھا، صحنی حضرات فون پر لگے تھے۔ ایسے میں وہ تمام لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ کمرہ عدالت میں موجود ایک شخص بہت جلد اسی کمرے میں موجود ایک دوسرے شخص کا قتل کرنے جا رہا ہے۔

❖ ❖ ❖

باب 27:

## میں جنین ہوں اور میں عام ہوں!

میرے اور تمہارے اندر ہیروں میں جانتے ہو کیا فرق ہے؟

میں اپنی براہی کا سامنا کر کے اس کو قبول کر سکتی ہوں

جبکہ تم اپنا آئینہ سفید چادر سے ڈھکنے میں مصروف ہو!

میرے اور تمہارے گناہوں میں فرق یہ ہے کہ

جب میں گناہ کرتی ہوں تو جانتی ہوں کہ یہ گناہ ہے

جبکہ تم اپنے من گھڑت سرابوں کا شکار ہو چکے ہو۔

میں ایک جل پری ہوں۔

میں جانتی ہوں کہ میں سمندر کی لہروں پر قرض کرتے

کتنی حسین دھکتی ہوں۔

گُمراہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اسی سمندر کی تہہ میں

میں ہڈیاں اور گوشت چیر پھاڑ کے کھاسکتی ہوں۔

تم ایک جادو گر ہو۔ ایک شعبدہ باز۔

تمہارے منتر تمہاری ہیر پھیر کی باتیں ہیں

جہنم کے التے کڑا ہوں جیسی باتیں!

پھر بھی تم اپنے گرد سفید چادر لپیٹے پھرتے ہو۔

پھر بھی تم انصاف کی سفید و گل گائے گھومتے ہو!

(سی جوائے بیل سی)

ہاشم کا ردار قدم قدم کرہ عدالت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ہرشے ست روی سے ہوتی دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی گونگی سلو موشن فلم پر دے پڑھ رہی ہو۔ آوازیں بند ہوں۔ بس لب بلتے دکھائی دے رہے ہوں۔ ہاشم اجنبی گم صنم نگاہوں سے سب ادا دیکھتا پنی کری پیشہ کمر کری کی پشت سے لگائی۔ باسیں گھستے پدا میں ناگ رکھی۔ وہاں بھی تک ڈھنی طور پر شل تھا۔ سُن تھا۔ اسے محبوس ہو رہا تھا کہ جیسے پسِ منظر میں کوئی اداس گیت گنگا نہ رہا۔ اس گیت میں اعتبار رٹوٹنے کا کرب تھا۔ ارماؤں کا لہوتا۔

میں میں ہوں اور میں عام ہوں!

جیسے کوئی اپنا ساتھ چھوڑ کے غیر دوں کی صفت میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ انہی گم صم رنگا ہوں سے پیچھے کر سیوں پتھی آبدار کو دیکھے گیا۔ وہ وقت کا منہ کو اپنے سیل فون کے ساتھ لگی تھی اور مسلسل جھنجھلا کی ہوئی تھی۔ وہ آن ہو کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ ارد گرد کاغذ کھڑ کئے، سر گوشیوں، نجح صاحب کی ہتھوڑی، ہر شے کی آوازیں یوں سنائی دیتی تھی گویا درکشی گہری کھائی سے آ رہی ہو۔

اس کا دل ٹوٹا تھا اور ایسے لگتا تھا ابھی سک سینے سے خون رس رہا ہو۔

کٹھرے میں موجود میری اینجیو کے سامنے زمر کھڑی تھی۔ ہاشم نے بدقائق توجہ ادھرمیزوں کو دیکھ لیا۔ یہاں سے اسے سیاہ کوٹ والی زمر کی پشت پر گھنگریاں پونی دکھائی دیتی تھی جو اس کے بولتے ہوئے بار بار چہرہ ہلانے کے باعث جھول رہی تھی۔ یا پھر چند قدم اوپر کھڑی سپاٹ چہرہ لئے میری دکھائی دیتی تھی۔ ان دونوں کے نجح خلاء تھا۔ ہاشم کا دماغ خلامیں اٹکنے لگا۔

”میری اینجیو آپ کتنے سال سے جواہرات کاردار کی ملازمت ہیں؟“، ”شل ہوتے ذہن سے اس نے زمر کو سپاٹ انداز میں پوچھتے سن۔

”بارہ سال سے۔“

”آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟“

”فلائن سے۔“

”کیا آپ کی ایجننسی، جس کے توسط سے آپ کاردار صاحب کے پاس آئی تھیں، آپ کو کسی دوسرے گھر میں کام کرنے کی اجازت دیتی ہے؟“

”نہیں۔ یہ قانوناً جرم ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی گھر میں کام کر سکتی ہوں میں۔“ وہ سپاٹ انداز میں سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔

”میری، کیا آپ اس نوجوان کو پہچانتی ہیں؟“، زمر نے باز دلبکر کے ادھر بیٹھے سعدی کی طرف اشادہ کیا۔ وہ آج نیلی جیزیز پر سفید شرت پہنے ہوئے تھا اور بھوری آنکھوں میں شدید چبھن لئے میری کو دیکھ رہا تھا۔ میری نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی۔

”یہ سعدی یوسف ہے۔“ چہرہ زمر کی طرف پھیر لیا۔

”آپ کی سعدی یوسف سے پہلی ملاقات کب ہوئی؟“

”آٹھ سال پہلے۔ یہ قصر آیا تھا اور میں نے اس کے آگے گروازہ کھولا تھا۔“

”اس کے بعد آپ کی کب کب ملاقات ہوتی تھی اس سے؟“

”جب بھی یہ قصر آتا۔ میں ہیڈ ہاؤس کیپر تھی تو ظاہر ہے ملاقات ہو جاتی تھی۔“

”کیا آپ دونوں کبھی ذاتی نویعت کی گنتگو کرتے تھے؟“

میری نے لمبے بھر کا توقف کیا اور نیچے بیٹھے سعدی کو دیکھا۔ پھر نظریں زمر پر جمادیں۔

”جی نہیں۔“

”یعنی آپ نے اپنے بیٹے کے کینسر اور علاج کے بارے میں سعدی یوسف سے کبھی گفتگو نہیں کی تھی؟“

”جی نہیں۔ میرا اس سے ایسا تعلق نہ تھا کہ اپنے ذاتی معاملات اس سے ڈسکس کرتی۔“ سعدی بس اسے اسی طرح دیکھتا رہا۔ ملامت سے افسوس سے۔

”اوے!“ زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میری اینجیو کیا یہ درست ہے کہ آپ نے مسز کاردار کا نیکلیس چرا یا تھا جس کی بناء پر

انہوں نے آپ کو نوکری سے برخاست کر کے ڈی پورٹ کرنے کا حکم جاری کیا تھا؟“

”یہ غلط ہے۔ میں نے کبھی چوری نہیں کی، نہ مجھے نوکری سے نکالا گیا تھا۔“

”اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ ڈی پورٹ کرنے کی وجایے غیر قانونی طور پر نوشیر وان کار دار نے آپ کو کلب بھجوادیا تھا جہاں آٹھ ماہ تک آپ سعدی یوسف کی کئی تیکرہ ہی تھیں؟“

”یہ غلط ہے۔ میں زندگی میں کبھی کلب بھوپیں گئی۔ میرا پاس پورٹ اس بات کا ثبوت ہے۔“ وہ گرون کڑا کے بولی تھی۔ بار بار وہ تائیدی نظروں سے ہاشم کو بھی دیکھتی تھی مگر وہ اس وقت غائب دماغی کے عالم میں میختاھنا۔

”تو آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ کبھی کلب بھوپ کے اس ہوٹل میں گئی ہی نہیں ہیں نہ اس کے تھے خانے میں جہاں میرے موکل کو قید رکھا گیا تھا۔“

”جی ہاں۔ میں کبھی وہاں نہیں گئی۔“

”اور نہ ہی آپ سعدی یوسف کو جس بے جا میں رکھنے کے بارے میں جانتی ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔“

”تو پھر آپ 21 مئی سے 22 جوئی تک.... ان آٹھ ماہ میں کہاں تھیں میری اینجیو؟“

”میں قصر کار دار میں ملازمت کر رہی تھی۔ اور میں آفس کی پارٹیز کی پلانگ بھی کرتی تھی۔ سب نوکر گواہ ہیں کہ میں قصر میں تھی اس دورانیے میں۔“

زمر اپنی میز کی طرف آئی اور کاغذات کا ایک پنڈہ اٹھا کر اوپر جج صاحب کے ساتھ کھڑے آدمی کو تمہارا جس نے اسے ڈیک پا رکھا۔ ”یہ قصر کار دار کی پیچھی آٹھ ماہ کی ان تمام پارٹیز کی تصاویری کہانی ہے جو مختلف فنونگر افزز نے کوئی تھیں۔ یہ ان فنونگر افزز کے میموری کا روزہ کا ذیثا ہے۔ اور ان میں کسی ایک تصویر میں بھی میری اینجینئرنگ نہیں آتی۔ جبکہ یہ دوسری فائل...“ اس نے اشارہ کیا۔ ”اس میں سعدی کے انہوں سے ایک سال قبل کی پارٹیز کا ذیثا ہے اور ہر پارٹی میں میری پس منظر میں کہیں نہ کہیں نظر آ جاتی ہیں۔ میری اینجینئر آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ ان آٹھ ماہ میں پاکستان میں ہی تھیں؟“

”آب جیکشن یور آری!“ ہاشم قدرے ستر روی سے کھڑا ہوا۔ ”قانون کے مطابق بڑون آف پروف استغاثہ کے اوپر ہے۔“

(یعنی جو شخص الزام لگاتا ہے اسے ہی ثبوت ڈھونڈ کر لانے ہیں۔)

”یور آری پھر میں کورٹ سے استدعا کروں گی کہ ہاشم کار دار کے گھر کے تمام سی سی ٹی وی ریکارڈ کو عدالت میں منگوایا جائے اور ہمیں تاریخوں کے ساتھ دکھایا جائے کہ میری اینجینئر اس وقت گھر میں تھی۔“

جج صاحب نے ہاشم کو دیکھا ہی تھا کہ وہ ہنکھار کے بولا۔ ”یور آری فروری میں ہمارے کنٹرول روم میں شارٹ سرکٹ کے باعث آگ لگی تھی۔ گھر کے ملازم اور میرے خاندان والے گواہ ہیں اس بات کے۔ ہمارا ذی وی آر جل چکا ہے۔ اسی بات کا استغاثہ فائدہ اٹھا رہی ہیں۔“

”ریلی ہاشم؟“ زمر ابر و حیرت سے اٹھاتی اس کے قریب آئی اور آہستہ سے بولی۔ ”آپ کی creativity اس سے زیادہ اچھا بہانہ ڈھونڈ سکتی تھی۔ اتنا پرانا حیلہ کیوں؟“ ہاشم نے شانے اچکائے۔

”واقعی۔ میں زیادہ اچھا بہانہ کر سکتا تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ اب سنبھل کے سرگوشی میں بولا تھا۔ زمر نے ستائش سے سرکوم دیا اور واپس جج صاحب کی طرف آئی جو اس کے اعتراض پر دو لگ دے رہے تھے۔

”کیا آپ کبھی زرنگار عبید سے ملی ہیں؟“ زمر نے واپس میری سے سوال پوچھا تو ہاشم نے چونک کے فوراً آبدار کی طرف دیکھا۔ آپ سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہاشم کو نظر انداز کر رہی تھی۔

میری نے جواب دینے میں چند لمحے لیے۔ ”جی۔“

”ان کی بیماری کے دوران میں نے سنا ہے آپ نے ان کی بہت خدمت کی۔ بلکہ یہ تصویر بھی ہے ہمارے پاس جس میں آپ ان کو سرو کرتی نظر آ رہی ہیں۔“ زمر نے ایک تصویری کاپی اس کے سامنے لہرائی پھر جنگ صاحب کی میز پر جا رکھی۔ میری نے ہاشم کو دیکھا۔ وہ آپ کو دیکھ رہا تھا۔

”مجھے ایک بات سمجھا میں میری اینجیو۔ آپ کو یہاں آئے نو دس سال ہوئے ہیں۔ زرنگار عبید بچھلے دس سال میں ایک دفعہ بھی پاکستان نہیں آئی تھیں۔ وہ اپنے اسکینڈل کے بعد سے سری لنکا میں رہائش پذیر تھیں وہیں مقیم رہیں اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ان کی خدمت کے لئے اور ان پر نظر رکھنے کے لئے ہارون عبید اور جواہرات کا ردار نے آپ کو ہاں بھیجا تھا۔“

”میں کبھی کولبو نہیں گئی۔“ وہ ہٹ دھڑی سے بولی۔

”اپنے پاپورٹ کے مطابق آپ کو لوبو نہیں گئیں۔ لیکن یہ تصویر کولبو میں لی گئی ہے اور آبدار عبید اس بات کی گواہ ہیں۔“ اور اب تک خاموشی سے ساری کارروائی دیکھتے فارس نے اچھے سے زمر کو دیکھا اور پھر مژ کے آپ کو۔ آپ نے اس کے دیکھنے پر مسکرا کر شانے اچکائے تھے۔

”اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی دوسرا پاپورٹ بھی ہے جو آپ ملک سے باہر جانے کے لئے استعمال کرتی آئی ہیں، کیونکہ آپ کی ایجنسی کی طرف سے ایک مالک کے ہوتے ہوئے دوسرے کی خدمت کرنا غیر قانونی ہے۔ تو بتائیے عدالت کو میری اینجیو صاحبہ کہ آپ کس پاپورٹ پر سری لنکا جاتی تھیں؟“

میری کا چڑھ پھیکا پڑھا کتا تھا، وہ بار بار ہاشم کو دیکھتی تھی جواب اپنے سامنے رکھی فائلز کو دیکھ رہا تھا۔ بنا پلک جھپکے۔ زمر بھی لکھکھیوں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا تو میری ذرا کھنکھاری۔

”یہ تصویر پاکستان کی ہے۔ میں کبھی کولبو نہیں گئی۔“

”جب مس عبید عدالت میں اپنایاں دیں گی تو آپ کا یہ بیان پر جری کے زمرے میں آئے گا۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ وہ میری اینجیو کے پاپورٹ پر کوئی مہر نہ دیکھ کر یہ نہ سمجھے کہ سعدی یوسف جھوٹ بول رہا ہے۔ جیسے میری پہلے کولبو جا چکی ہیں۔ یہ اس دفعہ بھی گئی تھیں۔ اور آٹھ ماہ ادھر رہی تھیں۔ یورٹنیس!“ وہ مژی اور ہاشم کو مخاطب کر کے کہا، پھر سیدھی اپنی میز پر آگئی۔ ہاشم اٹھا نہیں اس نے بیٹھے بیٹھے سوال کیا۔

”میری اینجیو.... استغاثہ نے جو تصاویر عدالت کو دکھائی ہیں، پارٹیز وائی.... کیا ان پارٹیز کی ایونٹ پلانگ آپ نے کی تھی؟“  
”جی ہا۔“

”اور ان پارٹیز کو ممکن بنانے کے لیے تقریباً کتنے ملازم کام کرتے تھے؟“  
”سامنھ سے زیادہ۔“

”اور کیا وہ سامنھ کے سامنھ ملازم ہمیشہ فون گرافر کی کھنچی ان تصاویر میں نظر آتے ہیں؟“

”نہیں۔ مشکل سے پائق دس نظر آتے ہیں۔ فون گرافر کو ملازموں کی نہیں مہماںوں کی تصاویر کھنچنے کی ہدایت ہوتی ہے۔“

”اور ان سامنھ میں سے کتنے لوگ صرف کچن میں کام کرتے ہیں اور پارٹی کی جگہ پہنچیں آتے؟“

”تقریباً میں، اکیس ملازموں۔“

”اور کیا یہ درست نہیں ہے کہ اپنے بیٹے کی بیماری کی وجہ سے آپ کچھ اور اس کے ساتھ بنے اپنے کمرے میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگی تھیں؟ اور باہر کم ہی لکھتی تھیں؟“

”آب جیکش یور آئر۔“ زمر بے زاری سے بولی۔ ”ہاشم کار دار لیڈنگ کو سمجھنے پوچھ رہے ہیں۔“

(گواہ کی کسی جواب کی طرف راہنمائی کرنا، سوال میں ہی جواب بتا دینا یا اس کے منہ میں الفاظ ڈالنا ”leading question“

پوچھنا کہلاتا ہے۔)

”یور آئر یہ مسز مرکا گواہ ہے۔ میں تو اس کو ”کراس“ کر رہا ہوں۔ میں لیڈنگ کو سمجھنے کر سکتا ہوں۔“

”اور روشن۔ وہ کراس کے دوران لیڈنگ سوال پوچھ سکتے ہیں۔“ مجھ صاحب نے اعتراض رکھا تو مدرس جھٹک کے رہ گئی۔ میری بولنے لگی۔

”جی میں زیادہ تر نیچے کچھ میں ہی رہتی تھی اور پارٹیز میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔“

”میری اتنیجیو کیا یہ درست ہے کہ سونیا کار دار کی سالگردہ پر، یعنی سعدی کے انگوں سے چند دن قبل آپ کی سعدی سے ملاقات ہوئی تھی؟“

”جی۔ وہ پارٹی میں آیا تھا اور میں چونکہ کچھ میں ہوتی تھی وہ کچھ گھر کی پچھلی طرف ہے تو میں نے اسے دہاں ٹھیک دیکھا تھا۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔“

”اور کیا آپ بتا میں کی کوہ کیا بات کر رہا تھا؟“ سعدی حیرت سے آگے کوہوا۔ میری فرفر بولنے لگی۔

”وہ ایک نمبر دہارہ رہا تھا اور وہ جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ جلد ہی چند ماہ کے لیے منظرِ عام سے غائب ہو جائے گا اور آرام سے بے کے فائیو facility پر آ کر پوری لگن سے کام کرے گا اور اس نے کچھ ایسا بھی کہا تھا کہ ڈی انہنگ مکمل ہو گئی ہے اب صرف ان کو اس میزائل کی میکنگ پر کام کرنا ہے اور یہ بھی کہ وہ رقم کا انتظام کر رہا ہے۔“ وہ بے چینی سے انھیں۔

”یور آئر ہاشم کار دار کیس کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہیں۔ ان بے بنیاد باتوں کا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟“

”نہیں جناب عالی۔ میں صرف وہ وجہ عدالت کے سامنے رکھ رہا ہوں جس کی بنیاد پر سعدی یوسف نے میرے گھر سے نیکلیں جایا اور چونکہ وہ دیکھ کچا تھا کہ میری اس کی باتیں سن چکی ہے اس لیے اس نے میری کو اس کیس میں گھینٹنا چاہا، اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ وہ ایک بیمار بچے کی ماں ہے۔ اور عدالت کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جسے کے فائیو شوال میں واقع ایک مسجد کے اندر رکراو ائمہ تینی ایک دہشت گروں کی آماجگاہ ہے جہاں وہ اسلحہ تیار کرتے ہیں۔ دفاع آج بھی اپنی اس بات پر قائم ہے یور آئر کہ سعدی یوسف نے صرف اپنی غیر قانونی سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اور لوگوں کی ہمدردی لے کر ایک اشارہ بن جانے کے لیے یہ ڈرامہ رچایا ہے۔ اب سعدی ایک اشارہ ہے۔ اس کو بڑے بڑے نور مزپ بلا جاتا ہے جہاں جانے کے لیے پہلے اس کے پاس کوئی سیکھ یورٹی لکھ رہی نہیں تھی، مگر جس دن ایسے کسی حساس نوعیت کے فتنہ میں کوئی دھماکہ یا نار گٹ کلنگ ہو گی نا یور آئر اس دن دفاع کی ساری باتیں مجھ ثابت ہو جائیں گی۔“

وہ اب گواہ کو دیکھنے کی وجہ سے دیکھنے سے دیکھ رہے تھے۔

پیچھے بیٹھا فارس نگاہیں آخر میں بیٹھے شخص پر جمائے ہوئے تھا۔ وہ میلت علی خان کی سیکنڈ والا دھیڑ عمر شخص، زنانہ انداز میں ٹانگ پٹا نگ رکھے بیٹھا خاموشی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

اب ایک دوسرے گواہ کو پیش کیا جا رہا تھا۔ ایسے میں فارس اٹھا اور موبائل پہن دباتا، سر جھکائے اس آدمی کے قریب آبیٹھا۔ اس شخص نے تھنڈا ایک دفعہ فارس کو دیکھا، پھر سامنے دیکھنے لگا۔

زمر اس گواہ سے سوالات پوچھ رہی تھی جبکہ فارس جیب سے قلم کا غذر نکال رہا تھا۔ پھر وہ گھٹنے پر کاغذر کھے موبائل اسکرین سے چند نمبر زد لکھ کر اتارنے لگا۔ غیر آرام دہی پوزیشن میں رکھنے کے باعث یکا یک قلم اس کی الگیوں سے پھسلا اور اس شخص کے قدموں میں جا گرا۔

”اوہ ہو!“ فارس جھخٹلا یا تھا۔ اس آدمی نے سرسری سی نظر اس پر ڈالی، پھر جھکا اور قلم اٹھا کر فارس کی طرف بڑھایا۔

”جزاک اللہ خیراً کشیرا!“ وہ مشکور ساقلم کو کنارے سے تھامتا اٹھ کھڑا ہوا، اور اپنی چیزیں سنبھالتا بہر کی جانب بڑھ گیا۔

باہر نکلتے ہی اس نے اور ایک پلاسٹک بیگ جیب سے نکال کر احتیاط سے قلم اس میں ڈال کر سیل کیا۔ پھر موبائل پرستیک لکھا۔

”اس آدمی کے فنگر پر ٹس لئے ہیں، فیصل ریکوئیشن سے کچھ نہیں ملا تو شاید فنگر پر ٹس سے مل جائے۔ میں کچھ دیر میں تمہاری طرف لا رہا ہوں یہ سب۔ مجھے پتہ کر کے دوکون ہے یہ۔“ اپنے ایک پرانے کو لیگ کو پیغام لکھ کر اس نے احتیاط سے قلم کا پیکٹ جیب میں ڈالا اور پھر مردابی تھا کہ ٹھنک گیا۔

آبدار اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ سرخ رومال سر پہ باند ہے، اور اس سے نکلتے سیدھے سرخ بالوں کو چھرے کے ایک طرف ڈالے بلی جیسی گرے آنکھیں اس پہ جائے وہ مسکرا رہی تھی۔

”آپ!“ وہ لمحے بھر کو چپ ہوا۔

”میری اینجیو والی فوٹو میں نے صبح سرزسر کو دی تھی۔“ اس نے مسکرا کے اطلاع دی۔

”دیکھیں آبدار، اگر تو آپ...“

”میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔“ وہ اتنی سادگی سے گویا ہوئی کہ فارس کے الفاظ لمبوں پر آکر ٹوٹ گئے۔ وہ اس شے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ نکھلی سے اسے دیکھے گیا۔

”اس روز جو میں نے کیا وہ بہت غلط تھا۔ یا اس کا طریقہ غلط تھا۔“ وہ ندامت سے کہہ رہی تھی۔ نظریں نہ جھکی تھیں نہ ہاتھ مل رہی تھیں بلکہ سینے پر بازو لپیٹے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مددم آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”میں نے آپ کو یوں بلا یا اور آپ کو مجھے avoid کرنے کے لئے ہنین کو بھیجا پڑا۔ آئی ایم سوری کہ میں نے اپنا اتنا غلط اپیرویشن دیا۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔“ اس نے افسوس سے ”بچ“ کیا تھا۔ ”اصل میں میری زندگی میں، فارس، بہت لوگ نہیں ہیں۔ صرف بابا ہیں اور ان کے پاس میرے لئے وقت نہیں ہوتا تو میں دوسرے لوگوں سے خوکو کو بردستی اپنچ کرنے لگ جاتی ہوں۔ ذرا بچھے سے کوئی ہمدردی سے بات کرے تو میں اس کو اپنا گائیڈ، اپنادوست مان لیتی ہوں۔ کتنی کوئی بے چاری ہوں نا میں۔“

”ایکی بات نہیں ہے۔“ وہ خفت سے بولا تھا۔ آبدار زخمی سامسکرائی۔

”ایسی ہی بات ہے۔ مجھے اگر شوت دیا تھا تو مجھے بد لے میں آپ سے آپ کا وقت نہیں مانگنا چاہیے تھا۔ میں صرف اپنے بابا کے متعلق چند باتیں کرنا چاہتی تھی مگر میری اپروچ غلط تھی۔ اس لئے میں نے صبح جوش دی وہ ڈائریکٹ زمر کو دے دی، اور بد لے میں کسی چیز کی امید نہیں رکھی۔ آپ سے بھی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ پلیز میرے امپھور رویے کے لئے مجھے معاف کرو جائیجے گا۔ آئندہ آپ کو میں کسی نلگ نہیں کروں گی۔“

ماحول کا تنااؤ دھیرے دھیرے فضائیں گھل کے ختم ہو گیا تھا۔ فارس کے تین اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس نے رسان سے سر ہلا کر بس اتنا کہا۔ ”گذ۔ اب آپ کو یوں سر را مجھ سے ملنا نہیں چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو مجھ سے کسی بھی قسم کے تعلق کی وجہ سے

نقضان پنچے۔“ وہ دامن بچانے والے انداز میں کہہ کر ایک طرف سے نکل گیا۔ قوی امید تھی کہ وہ پیچھے سے پکارے گی، کوئی نئی بات کرے گی؛ نیا موڑ دے گی، مگر اس نے نہیں پکارا۔ وہ راہداری میں آگے بڑھتا گیا۔ ساعت ختم ہو چکی تھی اور تمام افراد باہر آ رہے تھے۔ ہاشم بھی سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ فارس اس سے لتعلق ساتھ سے گزرنے لگا تھا کہ جب ہاشم نے اس کے کندھے سے اپنا کندھا چھووا۔ فارس خبر گیا۔

”یہ مت سمجھنا کہ مجھے خبر نہیں ہے یا یہ کہ میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ جو تم کر رہے ہو تو اس کا حساب دو گے تم!“ اور ایک سرخ انگارہ کی نظر فارس پڑا۔

”اووو!“ فارس نے فکر مندی سے لب سکیرے۔ ”میں ڈر گیا۔ دیکھو میرے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔“ ہاشم خاموشی سے آگے بڑھ گیا تو فارس نے سر جھٹکا اور موبائل نکالتے ہوئے قدم مخالف سمت بڑھا دیے۔

پارکنگ لاث کی طرف بڑھتی آبدار مسکراتی ہوئی، سوچ میں گم چلتی جا رہی تھی جب پیچھے سے کسی نے اسے کہنی سے پکڑ کے موڑ۔ وہ جھٹکا کھا کے خمی۔ سامنے جواہرات سرخ انگارہ آنکھوں کے ساتھ اسے گھور رہی تھی۔

”جو تم نے کیا ہے؟ تو تمہاری جان بھی لے لکھتی ہوں۔“ وہ خمی ساغرائی تھی۔ آبدار نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“

”بزمت۔ مجھے کہا کہ وہ ویڈیو پلائے کر دی اور خود ہاشم کو دے دی۔ مجھے میرے بیٹے سے دور کرنا چاہتی ہو؟“

”اوہ!“ آبدار نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہاشم نے دیکھ لی وہ؟ مگر میں نے اسے نہیں دی۔“

”سنوم!“ وہ نفرت سے انگلی اٹھا کے پھنکا رہی تھی۔ جواہرات کے پیچھے آپی دیکھ کتی تھی کہ دور راہداری کے دوسرا سرے پر زمر سعدی خین اور فارس ندرت کے ساتھ کھڑے تھے۔ سب سے زیادہ نمایاں زمر نظر آ رہی تھی۔ اوپنی ہنگریاں پونی کے باعث جواس کا سر ہلانے سے جھو لئے گئی، وہ مسکرا کر فارس سے کچھ کہہ رہی تھی، کوئی جلا کشا تبصرہ اور وہ بھی شاید جواب میں کوئی برابر کا جملہ کس رہا تھا، اور خینہ نہ رہی تھی۔

”تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں تمہارے ساتھ وہ کروں گی اب کتم...“

”وہ ویڈیو ہاشم کو زمر نے دی ہے۔ میں نے نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی تھی۔ ”میں نے تو اس کو ضائع کر دیا تھا مگر زمر اور اس کی وہ چھوٹی تھیجی، ان دونوں نے مجھے ڈنر پ بلا یا، میراٹیب ہیک کیا، دینا کا پی کیا اور چلتی بنیں۔ یہ میری کی تصویر بھی وہیں سے ملی ان کو۔ میں ان کی مجرم نہیں ہوں، ان لوگوں نے مجھے استعمال کیا ہے۔“

جواہرات ٹھہری تھی مگر پھر نفرت میں ڈوبی بے یقین نظر دوں سے اسے دیکھ کے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے یقین نہیں ہے۔“

”تو ہاشم سے پوچھ لیں۔ میں نے اسے ایسا کچھ نہیں دیا۔ ان لوگوں نے ہی دیا ہوگا۔ جان لینی ہے تو شکار سامنے کھڑا ہے۔“ وہ شانے اپکا کے اپنابازو ہچڑاتی واپس مڑ گئی۔ جواہرات غصے سے پھنکا رہی رہ گئی۔ ایک نظر مڑ کے اس دور نظر آتی خوش باش فیملی کو دیکھا، اور پھر پیچھتی آ گے بڑھ گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے حکم صادر کیا تھا۔ ”کلب چلو،“ مگر چونک کے ذریعوں کو دیکھا۔ پھر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے کھم شیم گارڈ کو۔

”بخت خان کہاں ہے؟ اور تم دونوں آفس سے یہاں کیوں آئے ہو؟“

بہت کے گارڈ نے رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ ”ہم آپ کی نئی سکیورٹی نیم کا حصہ ہیں۔ کاردار صاحب نے کہا ہے کہ آپ کی زندگی کو خطرہ ہے، ہمیں آپ کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔“

”مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ نکلو میری کار سے اور میری ذاتی ٹیم کو واپس بلاو۔“ وہ تملک کر بولی تھی۔

”ہمیں اس کا حکم نہیں ہے، ہم۔ اب ہمیں چنانچا ہے۔ رات آٹھ بجے سے پہلے ہمیں آپ کو گھر پہنچانا ہو گا۔ اس سے زیادہ باہرہ کر خطرہ مول لینے کی اجازت سرنے ہمیں نہیں دی۔ چلو!“ وہ ڈرائیور کو اشارہ کر کے بولا۔

جو اہرات نے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھا۔ ایک دم اپنا آپ بے حد کمزور اور ناتوان لگنے لگا تھا۔ بسی سی گاڑی کے سیاہ شنے کی قید خانے کی سلاخوں سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ اسے ٹھنڈے پہنچانے لگے تھے۔

❖❖❖

اب کوئی چاند میرا ہے نہ ستارہ محسن ..... اب کہاں جاؤں گا میں درد کا مارا محسن  
مورچاں کی سبز بیلیں اس کھلتی ہوئی صبح میں فخر سے سارے گھر کو ڈھانکے سورج کے سامنے تن کر جی نظر آتی تھیں۔ اندر آمیٹ کی خوبصورتی اور کافی کی مہک کے ساتھ فضا میں رپی بسی محوس ہوتی تھی۔ ڈائنگ نیبل سے زماں اٹھ پچھی تھی اور اب کورٹ کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ فارس کو جا ب لیں ہونے کا طعنہ دینا اور نیز نوکری ڈھونڈنے کے لئے غیرت دلانا بے کار تھا۔ وہ ڈھنائی سے ست انداز میں اپنی کافی پی رہا تھا جب سعدی نے اس کے کندھے پہ پا تھر کھا۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ سعدی تیار سا کھڑا تھا۔ ”چنانہیں ہے؟“

”کار اسٹارٹ کرو میں آرہا ہوں۔“

”ڈرائیور کب سے ہو گیا میں آپ کا؟“ وہ خفاسا کہتا جیسے ہی پلٹا، سامنے بیٹھی ندرت نے آنکھوں سے فارس کو اشارہ کیا۔ فارس نے جواب سر کو خدمت کرتی دینے والا اشارہ کیا۔ چائے کے گھونٹ بھرتی خینے نے مشکوں ناظروں سے دونوں کو دیکھا۔ پھر سعدی کو پکارا۔ ”بھائی! امی اور ما مون آپ کے بارے میں اشاروں میں .... آؤ ج۔“ ندرت نے بالکل سی سہی مگر اس کی سرکی پشت پہ چپت لگائی تھی۔ سعدی اپنی ایڑھیوں پہ گھوما اور باری باری امی اور ما مون کو دیکھا۔

”امی اور ما مون کیا؟“ حنہ نے اپنے سر کو سہلاتے ہوئے فارس کو دیکھا جس نے اسے صرف گھورا تھا، پھر نھکی سے بولی۔ ”امی اور ما مون ہم سے بالکل پیار نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے انہوں نے مجھے کسی ہستیال سے چرایا تھا۔ امی کسی زمانے میں وہ ڈراموں والی نرک ہوں گی؛ وہ جو لوگوں کے بچے اکچھنج کرتی ہیں....“ وہ بولتی ہوئی کرسی سے اٹھی اور آگے بھاگ گئی۔

”بے غیرت پر تیز۔“ ندرت نے برے موڑ کے ساتھ جوتا اس سمت میں پھینکا جہاں وہ گئی تھی۔ حنہ اندر مڑ گئی۔ جوتا راہداری میں گر گیا۔ لمحہ بعد حنہ نے ستون کے پیچے سے گردن نکالی۔ ”امی، آپ ہماری ون ڈے ٹیم میں کیوں نہیں چلی جاتیں؟ نشانہ آپ کا بالکل ان کے جیسا ہی ہے۔“ اور جھپاک سے اندر غائب ہو گئی۔

فارس اور سعدی نکل گئے تو امی حنہ کو دہزادار صلوٰتیں سنائیں کر (دوسروں کی بینیاں بیکھی ہیں کتنی تیز دار سکھڑ، صوم و صلوٰت کی پابند ہوتی ہیں، منہ میں زبان نہیں ہوتی، اور ایک یہ بے غیرت اولاد میرے ہی حصے میں آئی تھی۔) پکن میں جا چکی تھیں، اور اب نشانہ حسینہ تھی۔

”ٹھیک سے گوندھو آتا۔ اور یہ روز روز نیا سونے کا زیپور چڑھا کے کام کرنے نہ آیا کرو۔ آیا وہ اتیر ایمان، اگر لے کر دیتا ہے تو یہاں سے جا کر پہننا کرو، شو خی نہ ہو تو۔“ یہ ندرت کی روٹیں کی ٹون تھی اور اس پہ حسینہ نے دل ہی دل میں روٹیں کئی کئی کوئے ان کی نذر کیے تھے، غر بظاہر سر جھکائے آٹا گوندھتی رہی۔

ایسے میں حنہ دوبارہ لا ون خی میں آگئی تھی اور اب دو پہ کس کے بال باندھ کے جوش سے کھڑی گردن اٹھائے چاروں طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہیل چیز پر بیٹھے بڑے اباۓ اخبار سے نظر اٹھا کر سے دیکھا۔

”اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟ پھر سے گھر کی صفائی؟“

”جتنی صفائی کرنی تھی کر لی۔ اب میں وہ کروں گی ابا جاؤ ج کل کی نکھی سست، اور لا پرواہ یعنی ”عام“ لڑکیاں بالکل نہیں کرتیں۔“  
”اور وہ کیا ہے؟“ مسکراہٹ دبا کر پوچھا۔

”میں عام لڑکی نہیں ہوں، یہ تو آپ جانتے ہیں۔ اس لیے میں اب DIY گرل بن رہی ہوں ابا۔ DIY Yourself۔ عام لڑکیوں کو کپکی پاکی کھانے کی عادت ہوتی ہے۔ نکھی نہ ہوں تو! میرے جیسی ہر چیز خود کرتی ہیں۔ وہ گھر ڈیکوریٹ کرنے کے لئے انٹریور ڈیکور یعنی نہیں ہائر کرتیں، گھر بینٹ کرنے کے لئے مستری مزدور نہیں بلواتیں۔ دیواروں پر فریز ٹھوکنے کے لئے یا پر دوں کی ریلنگ لگانے کے لئے لبے بھائیوں یا ملازموں کی منیں نہیں کرتیں۔ مجھے کسی مستری مزدور، ترکھان، پر دوں والے پینٹ والے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب یہ سارے کام خود کر سکتی ہوں۔ صرف چند دن کی محنت سے ابا، ہم لڑکیاں اپنے گھروں کو اتنا خوبصورت اور اتنا آرام دہ بنا سکتی ہیں جتنے امیر لوگوں کے اوچے اونچے اوقص بھی نہیں ہوتے۔ میں سمجھتی تھی بڑے گھر خوبصورت ہوتے ہیں، مگر نہیں ابا۔ خوبصورت گھر ہی خوبصورت ہوتے ہیں، پھر وہ بڑے ہوں یا چھوٹے۔ مگر یہ عام لڑکیاں ان کو نہیں خوبصورت بنا سکتیں۔ صرف میرے جیسی خاص لڑکیاں یہ کر سکتی ہیں۔“ وہ ایک عزم سے کہہ رہی تھی۔ ابا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

”تمہارا مطلب ہے اب تم دیواروں پر اپر چڑھ کے خود کیل ٹھوکتی پھر وگی؟ ہرگز نہیں۔ ایسے تو چوٹ لگ جائے گی۔“ انہیں بات پسند نہیں آئی تھی۔

”دیکھا!“ حنین نے چلتی بھاگی۔ ”یہ آپ مرد ہی ہوتے ہیں جو ہم لڑکیوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کا مطلب دس مردوں میں بیٹھ کے مردوں کی طرح قبیلہ لگانا، اور رات دیر دیر تک باہر گھومنا نہیں ہوتا۔ بلکہ مردوں کے جیسے کام خود کرنا ہوتا ہے۔ دوسروں کی محتاجی سے بچنا ہوتا ہے۔ آج سے میں ابا اپنے سارے گھر کو ری ماڈل کرنے جا رہی ہوں۔ اور مجھے کوئی نہیں روکے گا۔“ پھر چہرے کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنا کر آواز لگائی۔ ”ندرت، ہن آپ بھی نہیں۔“

”ہاں ہاں تجھے میں کرنے دیتی ہوں اپنے گھر کا یہ غرق!“ وہ جواباً ہیں سے غرائی تھیں۔ حنین نے افسوس سے ابا کو دیکھا۔

”قچیچی۔ پتہ نہیں جب یہ زیستیں تو مجھ جیسے کتنے بچے اپنے اصلی ماں باپ سے جدا کیے تھے۔“

”بڑے موڑ میں ہو آج!“ زمر باہر آئی تو مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ کوٹ پہنے باں بنائے وہ کچھری کے لئے نکل رہی تھی۔ ہاتھ کی انگوٹھی اور ناک کی لوگ جگہ گارہی تھی۔ حن نے مسکرا کر شانے اچکائے۔

”میری زندگی کے سارے مسئلے حل ہو چکے ہیں، اور اب میری زندگی میں مزید کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لئے میں خود کو کافی ہلاکا چھکا محسوس کرنے لگی ہوں۔“ اس کا چھروہ دمک رہا تھا اور وہ کھلی کھلی تازہ دم لگ کر وہ مژ کے پھر سے درود دیوار کو لکھنے لگی اور پونکہ سوچ بھی رہی تھی تو عادتاً ناخن چبانے لگی۔

”خاص لڑکی، پہلے اپنی اس عادت کو تو بدلو۔“ زمر نے اس کے سر پر ملکی ہی چپت لگائی تو وہ چوکی۔ جلدی سے ناخن دانتوں سے لکا لے۔

”تمہیں اندازہ ہے تم بچھ منہ میں ہاتھ ڈال کر کھڑے کتنے برے لگتے ہو؟ اور ناخن چاہے کھار رہی ہو یا دانتوں سے کتر کے پھینک رہی ہو؟“ تھاہرے جسم کا حصہ ہے اور اس کو یوں چیرنے کی اجازت اللہ نے تمہیں نہیں دی۔ سوال ہو گا اس کے بارے میں بھی۔ اپنی اس عادت کو تمہیں خود ختم کرنا ہوگا۔ کم از کم اتنی کمزور نہیں ہوتیں ہو تھم کم کر دیتا جاؤ۔ ناخن کترنے سے دماغ کمزور ہوتا جاتا ہے جو لیکن سب سے زیادہ تمہیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں اللہ ہم ناخن کھانے والوں کو مردہ انسانوں کا گوشت کھانے والوں کے ساتھ رہی نہ کہڑا کر دے قیامت کے دن۔ کیونکہ بات تو ایک ہی ہے نا۔“

”اچھا اچھا نہیں کھاتی۔“ اس نے تو گھر کے ہاتھ کر کے پیچھے باندھ لیے تھے۔ دوستیں بھی تو زمر باہر کی طرف بڑھ گئی۔

”حین!“ زمر واپس آئی تو اس کا چہرہ سبیدہ ساتھا۔ حنہ نے چونک کے اسے دیکھا۔ ”کون ہے؟“

”حین میری بات غور سے سنو!“ وہ سبیدہ کے ہٹھر ہٹھر کے بول رہی تھی۔ ”اگر میں یہ نہ کرتی تو باشم کردیتا اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہی کردوں۔“

”باہر کون ہے؟“ حنہ کا ماتحتا ٹھنکا۔

”وہ جو بھی ہے، اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے، اگر تم چاہو تو ہم اس کو روک سکتے ہیں۔“ تمہیں ملک سے باہر بھجوادیں گے۔ لیکن اگر تم اسے وصول کرنا چاہو تو...“ زمر کی آواز پس منظر میں چل گئی۔ حین بالکل سُن سی کھڑی رہ گئی۔ لمحے کے ہزاروں ہسے میں اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ باہر کون تھا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

”حین... مجھے نہیں پتہ تھا وہ آج ہی آجائے گا۔ پہلے سوچ لو۔“ زمر فکرمندی سے کہرہی تھی مگر حین کے کان، آنکھیں سب بند ہو چکا تھا۔ وہ ہوا میں قد مر کر رہی تھی، بادلوں پر چل رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ پورچ خالی تھا۔ وہ گیٹ تک آئی اور چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

سامنے کو رٹ کا ملازم کھڑا تھا۔ ”حین یوسف خان آپ ہیں؟“ اس نے نام پڑھ کر دہرا�ا۔

حین نے بنا پلک جھپکے سرا ثابت میں ہلایا۔ اس کا بدن دھیرے کا پنے لگا تھا۔ ملازم نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

”You are being served.“

کہہ رہا تھا۔

”آپ کو اس درج کی کی گئی تاریخ پر کو رٹ میں پیش ہوتا ہے۔ آپ کو بطور گواہ طلب کیا گیا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا اور حین اس کا غذ کو پڑھ رہی تھی۔ اس کی رنگت سفید پڑھ رہی تھی۔

ماضی کو دفن کر کے شہد کی مکھی نے راستہ بھی بدل لیا تھا، رنگوں اور خوشبوؤں سے بھرے رس سے اپنی زندگی کو سجانے بھی گئی تھی، دل کو شفا بھی مل رہی تھی، لیکن آج معلوم ہوا تھا کہ.... ہاشم اور حین کی کہانی ابھی باقی تھی۔

دھوپ میں کھڑی لڑکی نے حکم نامہ پکڑے ہوئے، آنکھیں کرب سے بند کر لیں۔ آخر کب ختم ہو گی ان بے لذت غلطیوں کی داستان؟

.....♦♦♦.....

سنا ہے شہر میں زخمی دلوں کا میلہ ہے۔ چلیں ہم بھی مگر پیر ہن رو فر کر کے گالف کلب کے سر بزر میدان دور تک پھیلنے نظر آتے تھے۔ اندر ورنی سنگ ایریا میں رکھی کر سیوں پہنچی خواتین بے فکری سے باتیں کرتی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک جواہرات کا دار بھی تھی جو بظاہر مکراتی مسلسل بولتی خاتون کوں رہی تھی اور اضطراب سے گئے کا لاکٹ انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ قریب میں دو مستعد گارڈز رہا تھے باندھ کھڑے تھے۔

”ویسے جواہرات یہ تمہاری عمر نہیں تھی، ریا نہ منٹ کی۔ اب تو تم کسی ای گز یکٹو گیدر نگ میں نظر تک نہیں آتیں۔“ ایک بھورے سہری بالوں والی عورت شکوہ کر رہی تھی۔

”اوہ یہ Paranoia!“ دوسری نے ناک سکوڑ کر گارڈز کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہیں ہر وقت ان کی موجودگی سے الجھن نہیں ہوتی؟“

”جنما علی خاندان! اتنے ہی سیکورٹی قهریت!“ جواہرات نے بظاہر بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”ہاں مگر لوکیشن کو گارڈ کرنا زیادہ بہتر ہے، پرانے کو گارڈ کرنے سے۔ ان کو سارے ایریا کو کرنا چاہیے نہ کہ تمہارے سر پر کھڑے ہو کے ہماری باتیں سننی چاہئیں۔“ ایک ذرا بنس کر فٹر آبولی۔ جواہرات نے بہت سے کڑوے گھونٹ مسکرا کر اندر اتارے۔

”ان کو ہوشیار ہنا پڑتا ہے عائلہ کہ کہیں کوئی فرستر یئڈ سو شلائیٹ اپنے botox gone wrong کا غصہ میرے کھانے میں زہر ملا کے نہ اتارے یا کوئی....“ دوسری خاتون کا چہرہ دیکھا۔ ”زیادہ فرستر یئڈ aging عورت اپنے شوہر کے اس کی فناش ایڈ واٹر سے چلتے افیریز سے تنگ آ کر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ Paranoia؟ انہوں۔ سکیورٹی تھریٹ!“ مسکرا کے اس نے گلاں اٹھایا اور جیز کے انداز میں اوپر لہرایا، مگر دونوں متعلقہ خواتین کے چہرے سیاہ پر چکے تھے، کوئی گلاں نہ لکرایا تو وہ مسکرا کے اپنے مشروب کے گھونٹ بھرنے لگی۔ اس کا اندرابھی تک جل رہا تھا۔

ان سے دور.... قصر کاردار میں ہاشم اپنی اسٹڈی میں بیٹھا تھا۔ گھر کے کپڑوں میں ملبوس، شرت کی آستین اور چڑھائے وہ گہری سوچ میں گم گلتا تھا۔ دو لاگیوں کے درمیان سگریٹ دبا تھا جسے وہ ہولے ہولے ایش ٹرے پر جھٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اداس تھیں اور جیسے دور کہیں قید ہو چکی تھیں۔ چہرے پر عجب مردنی چھائی تھی۔

تبھی دروازہ کھلا اور رئیس اندر داخل ہوا۔ دن کے باوجود اتنا اندر ڈھیرا تھا کہ اسے چند لمحے لگے ہاشم کو دیکھنے میں۔ پھر وہ کھنکھارا۔ ”سر؟“

”اس کا موبائل واپس رکھ دیا؟“ وہ بھاری کھوئی کھوئی سی آواز میں بولا تھا۔ اس کے چہرے کے سامنے دھوئیں کے مرغولے رقص کرتے اڑ رہے تھے۔

”بھی سر!“

”کیا فارس غازی کا نام جنوری اور فروری میں سری لنکا کا سفر کرنے والوں کے نام میں شامل ہے؟“

”نہیں سر۔ اس کی سفری دستاویزیات کہیں بھی موجود نہیں۔“

”اس کا چہرہ تو ہے نا۔ اس کی تصویر سے چیک کرو۔“ وہ ایش ٹرے پر سگریٹ جھکتے ہوئے کھدر رہا تھا۔ ”اس نے کہا تھا وہ کو لمبو گیا تھا۔ کو لمبوجانے والے ہر پاکستانی کی سفری دستاویزیات سے اس کا چہرہ مخفی کرو۔ ہمارے ایک پورٹ سکیورٹی فورس کے کانٹیکشن تھہاری مدد کریں گے۔ اگر اس کا چہرہ کہیں نظر آتا ہے تو دیکھنا....“ اس نے سرخ پرٹی متور می آنکھیں اور پر اٹھائیں۔ ”کہ اس کے ساتھ ہارون عبد کا کوئی ملازم تو نہیں ہے؟ یا کوئی ایسا شخص جس کا تعلق ہارون یا آبدار سے ہو۔ مجھے ایک ایک بات معلوم کر کے دو، خاور!“

”رئیس سر!“ اس نے دھیرے سے تصحیح کی۔ ہاشم نے نہیں سن۔ وہ اب اسی منہمک انداز میں سگریٹ جھٹک رہا تھا۔ راکھی را کھ ایش ٹرے میں بھرتی جا رہی تھی یا شاید یہ اس کی سانسیں تھیں جو راکھ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

❖❖❖

تھا جنمیں زغم وہ دریا بھی مجھی میں ڈوبے ..... میں کہ صمرا نظر آتا تھا، سمندر نکلا فوڈلی ایور آفڑ کی بالائی منزل کی ششیے کی دیوار سارے زمانے کی روشنی اندر لے آئی تھی۔ ہال کمرہ پورا منور سا تھا۔ ایک طرف ایک چینی نقش کی جال درمیانی عمر کی چینی عورت پیٹھی ایک پکیوڑا اور نیڈیٹ سامنے رکھے کام کر رہی تھی۔ اس کے سر پر کھڑا سعدی بار بار اس کو انگریزی میں لفٹے دے رہا تھا۔

”نہیں یوں نہیں۔ کمان کی طرح آئی بروز بنا کے۔ ہاں اس طرح۔ اور ناک ذرا....“ دھنعتاً اس نے سر اٹھا کے سامنے کرسیوں پر آئنے سامنے بیٹھے فارس اور احر کو دیکھا جو کافی پیتے نظر آ رہے تھے اور احر کو مخاطب کیا۔

”اس کو اور دنبیں سمجھا تی؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ اس نے گویا تسلی کروائی۔ سعدی سر ہلا کے اس کی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ وہ باوجود کوشش کے جاب پہ دوبارہ اپنیست نہیں کیا جا رہا تھا۔ دوفعہ جوانہنگ کروا کے اسے گھروپیں بھیج دیا گیا تھا۔ سرکاری رکاوٹوں کا بہانہ۔ ہونہے۔ ادھر احرم سفیدی شرٹ پہننے سرپاٹی پی کیپ رکھے عام دنوں سے مختلف لگ رہا تھا۔ فارس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بغورا سے دیکھا۔

”تمہاری مالکن تمہیں اس طیبے میں برداشت کر لیتی ہے؟“

”اور ان کو تمہیں یوں دیکھ کے فلوہنیں ہوتا؟“ مسکراہٹ دبائے کہتا سعدی فارس کے ساتھ کرسی بھیج کے بیٹھا۔ اب وہ دنوں ساتھ تھے اور احرمان کے مقابل۔ چینی عورت لائقنی اپنا کام کر رہی تھی۔

”آہم!“ احرم کھنکھارا لگ نیچے کیا۔ ”ہاشم صاحب نے مجھے.... آ..... میری خدمات کو سراہتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ میں ان کے لئے ظاہر ہے اتنا کام کر چکا ہوں تو اب مجھے اپنی فری لائس جائز دوبارہ سے کر لینی چاہیے ہیں تو انہوں نے مجھے....“

”فارغ کر دیا ہے، ہے نا؟“ فارس کی مسکراہٹ گھری ہوئی۔

”اوہ تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے؟“ سعدی نے لقمہ دیا۔

”اوہ تمہیں ان تین کپڑوں میں سڑک پہ ٹھلیل دیا ہے؟“ فارس کہنے کے ساتھ بہش دیا تھا۔ احرم نے سنجیدگی سے کہنا چاہا۔

”انہوں نے بہت سلیقے سے میرا استغفاری وصول کیا۔ میرے چیک کلینر کیے اور....“

”اوہ پھر تمہیں باہر ٹھلیل دیا۔ ہاہاہا۔“ وہ گردن پچھے پھینک کے دل کھول کے ہنسا تھا۔ سعدی بھی مسکرا کے گھونٹ بھرنے لگا۔

”ایک سکیوڑی، اتنا فنی کیا ہے اس میں؟“ احرم دانت پہ دانت جمائے خنگی سے بولا تھا۔ فارس نے ہنستے ہوئے فنگی میں سر ہلا کیا۔ پھر سعدی کی طرف چہرہ موڑے کہنے لگا۔

”یار مجھے کوئی پنڈوں پہلے جاب لیں کہہ رہا تھا۔“

”اوہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ کاردارز کے ساتھ کام کر کے بہت پیسر بنانا ہے....“ سعدی تیزی سے بولا۔

”اوہ یہ کہ اس کی ترقی سے جل رہے ہیں....“

”اور میں نے سنا ہے وہ کاردارز کے لئے کیے گئے اپنے سارے کام جستفاتی بھی کر رہا تھا۔“ سعدی اس کے فقرے کمبل کر رہا تھا۔

”اوہ میں نے اسے کہا کہ کاردارز کی نوکری چھوڑ دیونکہ یہ تمہیں اس طرح ایک دن پیٹھ دیں گے....“

”تو اس نے کہا کہ وہ خاور کی جگہ لے چکا ہے اور اپنی پیاری مالکن کے لئے ناگزیر ہو چکا ہے۔“

”اوہ وہ بڑی ڈیز اسٹریٹس اور سلک نائی پہننے لگا تھا۔“

”جو تے بھی بڑے چکدار ہوتے تھے ماموں، ہمیں تو اپنی شکلیں بھی ان میں صاف نظر آتی تھیں!“

”اوہ.... آہ.... آج وہ بھی جاب لیں ہے۔“

”بالکل ہماری طرح!“ اوہ وہ دنوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے تھہہ لگا کے بہش پڑے تھے۔ اتنے عرصے بعد سعدی اتنا کھل کے ہنسا تھا۔

احرم نے یہ ساری بکواس بہت خاموشی سے سنی اور برداشت کی تھی۔ پھر بہت ٹھیک سے بولا۔ ”تھینک یو ویری ٹھی غازی، بہت نوازش آپ کی۔ لیکن میں ان کی جاب دیے ہی چھوڑ دیتا۔ میرا مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔“

”یار سعدی وہ کیا چیز تھی ٹھی سی اس کہانی میں؟“ وہ تھوڑی کو ناخن سے رگڑتے مسکراہٹ دبائے سعدی سے پوچھنے لگا۔

”انگورِ ماموں انگورا!“ وہ اب آخری گھونٹ بھر رہا تھا۔

”ہاں تھج۔ اچھا تم کیا کہہ رہے ہے تھے؟“ پھر احرمر کی طرف متوجہ ہوا۔ (سعدی اب رخ پھیر کے بیٹھا چینی عورت کو دوبارہ سے ہدایات دینے لگا تھا۔)

”میں.... کہہ رہا تھا کہ....“ دانت پر دانت جمائے وہ برداشت سے بولا تھا۔ ”کہ اس آدمی کا پتہ چلا؟ وہ چشمے والا؟“

”صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ وہ ایک گوہست (ghost) ہے۔“ فارس سنجیدہ ہوا۔ احرمر توجہ سے سننے لگا۔ ”اس کی تصویر ریکارڈ میں نہیں ہے۔ اس کے فنگر پرنٹ ریکارڈ میں نہیں ہیں۔ وہ عدالت میں داخلے کے وقت جو آئی ذمی کارڈ دکھاتا ہے وہ بھی جعلی ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی آدمی ہے جس نے سعدی کا پا سپورٹ ہاشم کو دیا ہے۔ اور ہمارا میموری کارڈ بھی اس کے پاس ہے۔“

”لکھا یہ ہاشم کے لیے کام کر رہا ہے۔“ سعدی نے گردن پھیر کے پوچھا تھا۔

”ہاشم اس کو نہیں جانتا۔“ احرمر نے فتحی میں سر بلایا تھا۔ ”اس کے کسی انداز سے شناسائی کی ذرا سی جھلک بھی نہیں دھلتی۔ یہ آدمی کوئی تیسرافریق ہے۔“

”اور یہ تیسرافریق ہاشم کی مدد کر رہا ہے، سعدی کو دہشت گرد ثابت کروانے کے لئے۔“ فارس سوچتے ہوئے بولا تھا۔ ”یہ یقیناً ہمارا کوئی دشمن ہے۔“

”میرا تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں آپ کے کام ایسے ہوتے ہیں دشمنی والے۔“ سعدی نے شانے اپکا کے کہا تھا۔ فارس نے بس گھور کے اسے دیکھا۔

”وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ تمہارا کوئی جیل کا دشمن ہو سکتا ہے۔“

”میں کسی کا چہرہ نہیں بھولتا اور یہ آدمی جیل میں نہیں تھا میرے ساتھ۔“

”تو ہو سکتا ہے یہ کسی اور کے لئے کام کر رہا ہو۔ مگر زیادہ ضروری یہ ہے کہ تمہارے گھر میں اس کے لئے کون کام کر رہا ہے۔“

”ہمارے گھر میں ایسا کوئی نہیں ہے۔“ سعدی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ فارس البتہ خاموشی سے کچھ سوچتا رہا تھا۔

”سعدی“ میں تمہاری فیملی کی بات نہیں کر رہا۔ کوئی ملازم‘ کوئی ہمسایہ کوئی کالونی کی کسی شاپ والا، کوئی بھی ہو سکتا ہے یہ۔“

”ہو تو سکتا ہے۔“ فارس نے کہا تو سعدی نے قدرے برہی سے اسے دیکھا۔

”ہمارے گھر میں کم از کم کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھے دہشت گرد ثابت کروانے کی کوشش کرے۔ کوئی ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے؟“ ریسٹورانٹ کے ملازم بھی بہت پرانے ہیں، گھر کے ملازموں کی توبات ہی نہ کریں۔ ہم ان سب کو جانتے ہیں۔“

”جاننے تو ہم ہاشم کو بھی تھے۔“ وہ اداسی سے مسکرا کے بولا تھا۔ سعدی چپ ہو گیا۔

”ٹھیک ہے سعدی، ہم کسی کے بارے میں خواہ مخواہ غلط گمان نہیں کریں گے اب، مگر ہمیں اپنی آنکھیں اور کان اب کھلر کھنے ہوں گے۔ اوکے! اور یہ مت بھولنا کہ ہم اس پچوئیشن میں اس لئے ہیں کیونکہ تم نے اپنا پا سپورٹ لا پرواہی سے پھینک دیا تھا۔“ وہ سمجھاتے ہوئے بولا تھا۔ سعدی خفیف تھا، سو گردن موڑ کے چینی عورت کا کام دیکھنے لگا۔

”فیس کٹ ذرا گول تھا۔ ہاں کچھ اسی طرح کا نہیں تھوڑا کم کرو۔“

”تو پھر....“ فارس نے مسکراہٹ دبا کے احرمر کو دیکھا۔ ”تم آج کل بے رو زگار ہوا سپنی!“

”ہاں بالکل سوچ رہا ہوں جیل چلا جاؤں، وہاں دو وقت کی روٹی تو مل ہی جاتی ہے۔“ وہ جیل کے بولا تھا۔ فارس نہیں کے سر جھکتا اپنا موبائل کے دیکھنے لگا۔ سعدی اب چینی عورت کو مزید ہدایات دے رہا تھا اور وہ اسی طرح اسکے بنا تی جا رہی تھی۔

”سینے محترم!“ فارس کی مسکراہٹ دبائے موبائل پہنچاپ کرنے لگا۔ مخاطب زمر تھی۔ ”آج رات ڈرپ چلیں گی میرے ساتھ؟“  
چند لمحوں میں جواب آیا تھا۔ ”آپ کون؟“

فارس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”آپ کا نکما“ بے روزگار دلوگوں کا قاتل؛ جیل پلٹ شوہرجس نے آپ کی دولت کے لئے آپ سے شادی کی تھی۔ آٹھ بجے کی بکنگ کروادوں؟“  
”بل کون دے گا؟“

”ظاہر ہے آپ... میں تو کما تاہی نہیں ہوں۔“

”کروادو۔ ہونہے۔“ اور وہ اس کا چہرہ تصور کر سکتا تھا۔ سر جھٹک کر لکھتی۔ (ہونہے)۔

”یہی ہے۔ بالکل یہی ہے۔“ سعدی اب اس عورت کے ساتھ جھک کے کھڑا سکرین کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ بالآخر امید نظر آنے لگی تھی۔ چینی عورت نے اسکرین کا رخ ان دونوں کی طرف پھیرا تو وہ بھی غور سے دیکھنے لگا۔ وہاں ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کا چہرہ نظر آتا تھا۔ اسکن ٹون بھی مناسب حد تک بھری جا چکی تھی، اور وہ اسکچ کسی اصلی تصور کے قریب قریب ہی تھا۔  
”تمہیں یقین ہے کہ اس کے نقش ایسے ہی تھے؟“ فارس نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ سعدی نے پورے دشوق سے سر اشہات میں ہلا�ا۔

”اس کا نام ڈاکٹر مایا تھا، وہ روز میری پٹی کے لئے آتی تھی اور گذ کا پس جیسی باتیں کرتی تھی۔ مجھے اس کی شکل یاد ہے۔ 90 نیصد یہی شکل تھی اس کی۔ اب کیا کرنا ہے ہمیں؟ اس اہم گواہ کو کیسے ڈھونڈنا ہے؟“

”اگر تو وہ پاکستانی ہوئی تو مل جائے گی۔“ احراب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”وہ پاکستانی ہی تھی۔ جتنی اردو اس کی صاف تھی، اور جتنی جلدی وہ مجھے بات بات پر antibiotic کے کورس پر لگا دیتی تھی، وہ پاکستانی ڈاکٹر ہی تھی۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔ اسے ہاشم یہاں سے لے کر گیا تھا۔ دوبارہ وہ نظر نہیں آئی۔ یقیناً اپس آگئی ہو گی۔ لیکن تم اسے کیسے ڈھونڈو گے احمد؟“

”با شخص اب جب کہ تم جا ب لیس ہو۔“ فارس نے دھیرے سے فقرہ مکمل کیا۔ احراب نے صرف ایک تند تیز نظر اس پر ڈالی اور پھر سعدی کو دیکھا۔

”یہ کم عمر لڑکی ہے۔ گریجوئیٹ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہو گا۔ پی ایم ڈی سی کے پچھلے دس سال کے ریکارڈ میں اسے ڈھونڈ لوں گا میں جب تم یہ رکھ رہے۔“ ایک کاغذ پر چند ہندے لکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادو گے، دوسرا صورت میں نہ تو تمہیں اس جیسی اسکچ آرٹسٹ ملے گی، اور نہ ہی یہ جو اسکچ بنایا ہے اس کا ایک بھی پرنٹ آوت ملے گا۔ جس کو بھی ہائز کرو گے وہ ہاشم کو بتا دے گا،“ سو اب فیصلہ کرنے کے لئے تمہارے پاس دس سینئنڈ ہیں اور اسکریپشن فر کے لئے ایک منٹ۔“ پھر گھٹری دیکھی۔ ”59 سینئنڈ... 58 سینئنڈ۔“

”اچھا اچھا۔“ فارس نے بر امنہ بنانے کے اسے دیکھا اور موبائل آن کرتے ہوئے اس کا گذ کو پکڑا۔ نقش تن گئے تھے اور ماتھے پل پر گئے۔ وہ منہ میں کچھ بڑا بڑا تھا ہوا موبائل پہن بنانے لگا۔ احراب نے ایک دوسرا کاغذ سعدی کی طرف بڑھایا۔

”میری لنسٹٹی فیس جو آپ ادا کریں گے، کیونکہ آن لائن بینکنگ تو آپ کی بھی ایکٹو ہے۔“ جب سعدی اسے گھوٹا رہا تو اس نے زور دے کر کہا۔ ”مطلوب میں اس اسکچ کوڈ یلیٹ کروادوں؟“ سعدی نے چٹ جھٹی، اور اسے گھوڑتے ہوئے موبائل نکالا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد احراب کے موبائل پہن پکیے بعد میگرے دو نو تیکیشن موصول ہوئے۔

”اب بے فکر ہو جاؤ۔ میں اس لڑکی کو ڈھونڈ لوں گا۔“ اس نے چینی عورت کو چلنے کا اشارہ کیا تو وہ کسی رو بوبت کی طرح اٹھی اور باہر

نکل گئی۔ وہ دونوں اسی طرح تند ہی سے اسے گھور رہے تھے۔

احمر شفیع نے کافی کا آخری گھونٹ حلق کے اندر انڈیا گم سامنے رکھا، اور پھر گہری سانس لے کر مسکرا کر ان کو دیکھا۔

”میں جا ب لیں نہیں ہوں۔ فری لانسر ہوں۔ تم لوگوں کے ساتھ ”جا ب“ ہی کر رہا تھا جس کی مجھے اچھی بھاری تنخواہ تم دونوں... میرے دو بے رو زگار دوستوں نے دے دی ہے۔ بہت شکر یہ۔ اب چلتا ہوں۔“ کالر جھنک کے کپتا وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں ابھی تک بالکل چپ ہو کر اسے گھور رہے تھے۔ (پیدائشی فراؤ!)

❖❖❖

میرا چہرہ میری آنکھیں ہیں سلامت ابھی ..... کون کہتا ہے وضاحت نہیں کی جا سکتی جواہرات کاردار اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ اہانت سے تمثرا رہا تھا، بلکہ کی عورتوں کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ سن گلاسز پھینکنے، ایئر نگرڈ نوج کے اتارے۔ بھر اپنے سراپے کو قد آور آئینے میں دیکھا۔ جبھریاں یہ لیکریں، یہ کہاں سے نظر آنے لگی تھیں؟ غصے اور پریشانی سے اس نے گالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ وہ مضطرب تھی، شکست خور د تھی۔ وہ کیا کرے؟ کھلے دروازے سے وہ دیکھے سکتی تھی کہ لا و خ میں میری اسخیو اور فیجنو نا ایک ساتھ کھڑی ہو کر کوئی بات دھیمی آواز میں کر رہی تھیں۔ موضوع یقیناً مالکن کی دلچسپ حالت تھی۔

”یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو۔ جاؤ۔“ وہ چلا کر کفن پھاڑ انداز میں بولی تھی۔ میری پیٹ گئی۔ فینیو نارہ گئی۔

”ہاشم صاحب کا حکم ہے کہ آپ کی طبیعت درست نہیں۔ آپ کو کیلانہ چھوڑوں۔ مجھے آپ کے دس میٹر قریب کے دائرہ کار میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے مجھے آپ کے کمرے کے باہر رہنا پڑے گا۔ میں معدرت چاہتی ہوں، میم!“ مگر اس کا انداز معدرت چاہنے والا نہیں تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی تھی اور لیوں پر مسکان جلوہ گر تھی۔

”دفعہ ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ میں تمہاری جان لے لوں۔“ وہ سرخ بھسوکا چہرے کے ساتھ چلائی تھی۔ فیجنے نے ادب سے سر کو خم دیا اور اس کے ساتھ رکھے اسٹول پہ جائی تھی۔ اس کا انداز فاتحانہ تھا۔ جو کرنا ہے اب کرو۔

جواہرات اس پر جھپٹنا ہی چاہتی تھی، گویا اسے ناخنوں سے نوج کھائے گی مگر اس پر سے زینے اترتا نو شیر و ان نظر آیا تو وہ رکی۔ وہ بے زار سارِ حلبے میں نیچے آتا کھائی دے رہا تھا۔

”شیرو۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی طرف لپکی۔ وہ آخری زینے تک پہنچ گیا تھا۔ ایک بے زان نظر اس پر ڈالی۔ ”آپ کو کیا ہوا

”دیکھ رہے ہو تمہارا بھائی کیا کر رہا ہے میرے ساتھ؟“ اب اسے پرواہ نہ تھی کہ کون سنتا ہے، کون نہیں۔ ”وہ مجھے سزا دے رہا ہے۔

وہ مجھے اذیت دے رہا ہے۔ میرا قصور کیا ہے؟ میں نے صرف وہی کرنا چاہا جس سے اس کے مسئلے کم ہوں۔“

”تو میں کیا کروں می؟“ وہ اس کے قریب سے گزر کے آگے بڑھ گیا۔ اور سینٹر میل سے ریبوت انھا کے لی وہی آن کیا۔ دیوار پر نصب دیوبیکل اسکرین چمک اٹھی۔ جواہرات ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کے جلدی جلدی بوئی۔ ”تم اس سے بات کرو۔ اس سے کہو کہ وہ اپنا رو یہ بد لے۔“

”بھائی میری نسبت آپ کی زیادہ مانتا ہے می۔ آپ دونوں کا آپس میں زیادہ اچھا رابطہ ہے۔ مجھے پٹوانا ہو، یا علیشا کے شیبر ز واپس خرید کے مجھے کمپنی سے لک آؤٹ کرنا ہو، ہر چیز آپ دونوں جیسے پہلے طے کرتے تھے دیسے، ہی کر لیں۔“

”نو شیر و ان..... میں تمہاری ماں ہوں۔“ وہ بے یقینی سے چلائی تھی۔

”اور آپ نے مجھے یہی سمجھایا ہے۔“ وہ ترجم زدہ نظر اس پر ڈال کے بولا تھا۔ ”کہ ہمیشہ اپنا مفاد دیکھو۔ کبھی بڑے بھائی کی غلط باتوں پر اس کو نہ کوئی نہیں۔ بس پیسہ خرچ کرو۔ سکون سے عیش کرو۔ بُرنس کے معاملات، کس کو کب قتل کرنا ہے، کس کو اغوا کرنا ہے یہ سب ہمیں ہینڈل کرنے دو۔ آپ نے مجھے کہی کچھ ہینڈل کرنا سمجھایا ہی نہیں۔ کبھی بڑا ہونے ہی نہیں دیا تو اب میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ آپ کا مسئلہ حل کر سکوں۔“

”تم...“ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ”تم اس سے بات تو کر سکتے ہو۔ اس کو اتنا تو کہہ سکتے ہو کہ وہ جس نہ بنے۔“

”اسے یہ سب کچھ آپ نے بنایا ہے۔ خاطم بے حس۔ اب اس کا دل پھر کا ہو چکا ہے۔ اب اسے کوئی واپس نہیں لاسکتا۔ بھائی کو پھر کا محمد آپ نے بنایا ہے۔ سنگ مرمر کی طرح اس کو رُزگار کے پالش کیا ہے۔ یہ چمکتے ہوئے پھر سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں گی۔ میں آپ کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے کچھ کرنا آتا ہی نہیں ہے۔ میں ایک ٹوٹی Failure ہوں، اور اب جب کہ میں اپنی روشنی ڈھونڈنے جا رہا ہوں تو مجھے اتنا خود غرض بنادیا ہے ان گزرے سالوں میں آپ نے کہ میں خود اکیلا، ہی منور ہونا چاہتا ہوں۔ آپ دونوں کے گناہوں کا بوجھا اپنے کندھوں پر نہیں اٹھانا چاہتا۔ مجھے معاف رکھیں اپنے معاملوں سے۔ ہم Yousufs نہیں ہیں، چھوٹے گھر میں رہنے والے عالم لوگ نہیں ہیں، ہم جن کا بچہ بچا پنے مسئلے خود حل کر سکتا ہے۔ میں نہیں کر سکتا۔ جانتی ہیں کیوں؟“ وہ کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔ ”کیونکہ تمھن وقت میں اپنے مسئلے صرف وہی شخص خود حل کر سکتا ہے جو اپنے دتوں میں دوسروں کے مسئلے حل کرتا آیا ہو۔ ان کی ماں نے ان کو دوسروں کے مسئلے دور کرنا سمجھایا ہے، اور میں تو کسی قابل نہیں ہوں۔ مجھے آپ نے کبھی کسی قابل ہونے ہی نہیں دیا۔“ سر جھنک کے اس نے ٹوپی دی بند کیا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ جواہرات بے بس سے آنکھوں میں آنسو لئے اسے جاتے دیکھی رہی۔

.....

بولوں گا جھوٹ تو مر جائے گا ضمیر ..... کہہ دوں اگر میں حق تو مجھے مار دیں گے لوگ  
اس پر سکون سی کالونی میں بزر بیلوں سے ڈھکے مورچاں کے اندر تناوار زدہ ما حول چھایا تھا۔ لا و نج کے ایک کونے میں فارس اور  
سعدی آمنے کھڑے تھے اور سعدی برہمی سے کہہ رہا تھا۔ ”میری بہن گواہی نہیں دے گی۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟“  
”سعدی زمرا نے نہیں بلائے گی تو ہاشم اسے بلائے گا۔ اسے پیش ہونا پڑے گا۔“ فارس اس کو دھیمی آواز میں سمجھانے کی کوشش کر رہا

تھا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں بے غیر تو اس کی طرح اس کو بے عزت ہوتے دیکھوں؟ وہ آدمی ہر طرح کے سوال پوچھے گا۔“ سعدی کا چہرہ گلابی پڑ رہا تھا اور وہ بار بار نفی میں سر بلاتا تھا۔  
”آہستہ بولو۔ تھاہری امی سن لیں گی تو ان کو کیا وضا حصیں دیتے پھر دے گے۔“ اس نے دبی آواز میں جھٹکا تھا۔ ندرت پکن میں کھڑے ہو کے چوہا اپنی گلگانی میں حینہ سے صاف کروارہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ لا و نج کے پر لے کوئے میں کھڑے وہ دونوں کس بات پر بحث کر رہے تھے اور زمانہ درکر کرے میں نہیں کوئی سوالات کی تیاری کروارہی تھی۔ وہ زخمی تلخ مسکراہست کے ساتھ سر جھنکتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔ ”یہ اولاد کیا سمجھتی ہے؟ مال بکن میں مصروف ہے اور بابا دفتر میں تو ان کو کچھ پتے نہیں چلتا؟ اس اولاد کو کون سمجھائے کہ مان باپ کوان کی رگ رگ کی خبر ہوتی ہے۔ یہ رات کو مکمل میں موبائل جلا کے کیا کر رہے ہیں، یا با تھر و موبائل ساتھ کیوں لے جا رہے ہیں، کس کتاب میں رکھ کے کون سار سالہ پڑھتے ہیں، سب طرف نظر ہوتی ہے مان کی۔ مان کے سینے میں کتنے راز دفن ہوتے ہیں، یہ بچے کب جان پائیں گے آخر؟ بس جب نظر آرہا ہو کہ بچہ بگڑ رہا ہے تو ہر وقت کی روک ٹوک سے معاملہ خراب کرنے کی بجائے اسے مزید توجہ اور پیار دینے کی کوشش کرتے ہیں میرے ہیں والدین۔ اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کو پلٹا لائے اور یہ سمجھتے ہیں کہ مان کو کبھی نہیں پتہ چلے گا کہ کیا کیا گل کھلائے ہیں انہوں

نے۔ بے غیرت نہ ہوتا۔ وہ ساتھ ساتھ چیزیں اٹھانے پہنچی کر رہی تھیں۔

”میں پھر ساعت پنیس آؤں گا۔“ وہ خفا اور برہم سا کہہ رہا تھا۔ فارس نے مزید کوفت سے اسے دیکھا۔ ”مطلوب اپنی بہن کو اکیلا کر دو گے؟ اس سے ہاشم کو کیا پیغام ملے گا، ہاں؟“ سعدی خاموش ہو گیا مگر ابر و ہنوز بخشنے ہوئے تھے۔

اوپر خین کے کمرے میں آؤ تو وہ بیڈ پر جھکائے اکڑوں پیٹھی تھی۔ ہاتھ باہم پھنسائے وہ لب کاٹے جا رہی تھی۔ سامنے کری پہ پیٹھی زمر نوٹ پیدا تھیں لے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ کھنکھاری۔ ایک دفعہ پھر سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن تم نے اب نہیں رونا۔ اگر فیصلہ کری لیا ہے تو اس سب کا سامنا کرو۔ ”خین نے بھکے چہرے کے ساتھ گلی آنکھیں رگڑ لیں۔

”مجھے اندازہ ہے کہ ہاشم کی اپروچ کیا ہو گی۔ دیکھو تم میری گواہ ہو، جب حلف لو گی تو میں پہلے سوال کروں گی۔ اسے Examination in chief کہتے ہیں۔ پھر وہ آئے گا اور تم سے جرح کرے گا (جرح کو کراس کرنا کہتے ہیں) اور ضروری نہیں کہ ان سوالوں کا تعلق میرے سوالوں سے ہو۔ وہ تمہارا کرادار منع کرنے کی کوشش کرے گا...“ (خین نے کرب سے آنکھیں بند کیں) ”تمہاری کریڈ پیٹھی کو خیس پہنچائے گا، تم نے جواب میں صرف بیچ بولنا ہے۔ عزت صرف بیچ دلایا کرتا ہے۔ محتاط بیچ۔ پھر میں دوبارہ تمہیں re-exmanie کر سکتی ہوں لیکن اب میں صرف ان باتوں کی وضاحت کے لئے سوال کر سکتی ہوں جو اس نے پوچھی تھیں۔ نی بات نہیں ایڈ کر سکتی۔ پھر وہ دوبارہ میری بات کا تاثر اکل کرنے کے لئے کوئی بھی سوال پوچھ سکتا ہے۔ اسے re-cross کہتے ہیں۔“ خین کپکھنیں بولی۔ چہرہ جھکائے خاموش پیٹھی رہی۔

”میں تم سے سوال پوچھ چکی ہوں، تم جو جانتی تھی کاردارز کے بارے میں، سب بتا چکی ہو اب سمجھو کہ میں ہاشم کاردار ہوں اور میں یہاں تمہیں cross کرنے لگی ہوں۔ اوکے!“

خین نے اثبات میں سرہلایا۔ نظر میں اب بھی جھکی تھیں۔

”خین یوسف خان۔“ زمر نوٹ پیدا کو دیکھ کر بولی۔ ”ملزم نو شیر وال کاردار کو آپ کتنے عرصے سے جانتی ہیں؟“

”تقریباً آٹھ سال سے۔“ وہ جیسی آواز میں بولی۔

”اور میقیناً آپ مجھے بھی جانتی ہوں گی؟“ خد نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ ایک دم لگاؤ کئھرے میں کھڑی ہے اور سامنے قیمتی سوت میں ملبوس تیز پر فیوم کی خوشبو سے مہکتا ہوا وہ کھڑا ہے اور مسکرا کے اسے دیکھ رہا ہے۔

”جی!“ اس کی آواز پست تھی۔ دل کا نپا تھا۔

”ابھی آپ نے کہا کہ آپ کئی ماہ سے میرے خاندان کی اصلاحیت سے واقف تھیں، لیکن کیا آپ نے میرے منہ پر مجھے کبھی ایسی بات کہی؟“

”نہیں!“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔ ”مجھے دیر سے پتہ چلا تھا۔“

”کتنا دیر سے؟ کیونکہ کیا یہ درست نہیں ہے کہ کئی ماہ آپ مجھ سے والش ایپ پر رابطہ میں رہی تھیں، دن میں کئی دفعہ میتھ کرتی تھیں؟“

”یہ درست ہے مگر مجھے اس وقت آپ کی اصلاحیت نہیں پتہ تھی۔“

”اور وہ باتیں آپ اپنی فیملی سے چھپ کے کرتی تھیں۔ کیا معلوم ہونے پا آپ کی فیملی اس بات کو پسند کرتی؟“

”مجھے نہیں پتہ!“

”اور جیسا کہ آپ نے Examination in chief کے دوران کہا۔۔۔ ایک جمعتے کی دوپہر بریانی کھاتے ہوئے آپ کے گھر

میں میں نے وہاں بیٹھ کے آپ لوگوں سے معافی مانگی تھی!“

”جی۔ آپ نے ایسا ہی کیا تھا۔“

”خین، کیا یہ درست ہے کہ آپ ایک بہت اچھی ہیکر ہیں؟“

”جی!“ اس کی آنکھوں سے آنسوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔ سارے منظر دھنڈ لارہے تھے۔

”اور کیا آپ کے فیملی اینڈ فرینڈز آپ سے فیورز مالکتے رہتے ہیں؟“

”میں ناجائز کام نہیں کرتی۔“

”چلیں، اپنے دوستوں کو کسی کراسر سے نکالنے کے لئے اپنی ہیکنگ skills تو آزمائی ہوں گی آپ نے؟“

”جی!“ وہ بولی تو زمر کی آواز پسِ منظر میں سنائی دی۔ ”احر نے بتایا ہے کہ وہ جانتا ہے اوسی پی صاحب کے بارے میں سب کچھ۔

اب وہ leading سوال پوچھ چکے گا۔ ”پھر چیزیں اسے ہاشم کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہر سو دھند تھی، اور وہ خود کو تھہرے میں کھڑا محسوس کر رہی تھی۔

”کیا کبھی کسی بار سون خ عہدے پر موجود آدمی نے آپ کی خدمات کے لئے آپ سے رابطہ کیا؟“

”جی۔“ اس کی آواز کپکپائی۔

”اور کیا مدد مانگی تھی انہوں نے آپ سے؟ اب یہاں حصہ میں آب جیکٹ کروں گی کہ وہ موضوع سے ہٹ رہا ہے مگر جج میرا اعتراض رکر دیں گے۔ پھر تم جواب دو گی۔“

”ان کی بیٹی کی عزت خطرے میں تھی، وہ اس کو بچانا چاہتے تھے۔“

”اور یہ کام کرنے کے لئے آپ نے بد لے میں کوئی فیور مانگا تھا ان سے؟“

”جی۔ مانگا تھا۔“

”آپ ان صاحب کا نام اور اس کام اور فور کی تفصیل کو رٹ کو بتائیں گی تاکہ کو رٹ کو معلوم ہو سکے کہ آپ کس کردار کی حامل ہیں۔“

”وہ مرچکے ہیں، میں ان کا نام نہیں لے سکتی۔“ اس نے بھگی لی۔

زمر نے تاسف سے دیکھا۔ ”ایسے نہیں حصہ۔ تمہیں جواب دیتا ہو گا، لیکن احتیاط سے۔“ پھر وہ ٹھہری۔

”آپ ہاشم کا ردار نہیں ہیں۔“ وہ ایک دم گیلا چہرہ اٹھا کر بولی تو زمر نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”اس لئے آپ یہاں سے جائیں۔“

”حصہ پھر witness prep کیسے کرو گی؟ تمہاری وکیل ہونے کی حیثیت سے....“

”آپ میری وکیل نہیں ہیں۔ آپ سعدی یوسف کی وکیل ہیں۔ میں اپنی وکیل خود ہوں۔ میں اپنا مسیحا خود ہوں۔ یہ میری غلطی تھی۔ میں

اسے خود فکس کروں گی۔ پلیز آپ جائیں۔“ زمر گہری سانس لے کر اٹھ گئی۔ باہر آئی تو فارس سیر ہیوں کے دہانے پر کھڑا تھا۔

”ہمیں اسے دئی ٹھیک دینا چاہیے۔“ وہ اسے دیکھ کے ناخوشی سے بولا تھا۔ سعدی کو جو کہا سو کہا، مگر وہ خوب بھی خوش نہیں تھا۔

”میرا بھی یہ خیال ہے۔“ وہ آزر دگی سے سر ہلا کے رہ گئی۔ پھر چونک کے اسے دیکھا۔

”وہ ڈنر...“ ابھی یاد آیا۔

”ویک اینڈ پ۔“ وہ تکان سے مسکرا یا۔ ”مگر بل آپ دیں گی۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ خفگی سے آگے بڑھ گئی۔



ہاتھوں کا ربط حرفِ خنی سے عجیب ہے ..... بلتے ہیں ہاتھ راز کی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ رات قصرِ کاردار پہلے سے زیادہ دیران اور جو جھل سی اتر رہی تھی۔ لا دخن میں تی وی چلنے کی مدھم آوزیں آرہی تھیں۔ ایسے میں جواہرات بڑے صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ پہلے سے بہت بہتر اور سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ دوا کا اثر تھا، موز بھی ٹھیک تھا۔ ساتھ سونیا پیر اور پر کر کے بیٹھی ٹھیک گھننوں پر کھے، یکم کھیل رہی تھی۔

”می!“ دفعتاً اس نے سر اٹھا کے جواہرات کو مناطب کیا۔ وہ چونکی پھر مسکرا کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”ہوں۔“ اور نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

”بابا ب اتنے بڑی کیوں ہوتے ہیں؟“

”بابا کے کچھ پر الجمز ہیں نا۔ اس لئے۔“ وہ پیار سے بولی تھی۔ سونی چونکی۔ آنکھیں اٹھا کے اسے تعجب سے دیکھا۔ بالکل باشم کی آنکھوں جیسی تھیں وہ۔ چمک دار اور ذہین۔

”بابا کے کیا پر الجمز ہیں؟“

”کچھ برے لوگ ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ فارس غازی جیسے۔“

”فارس اکل؟“ سونی نے بے شقینی سے اسے دیکھا۔ ”وہ برے نہیں ہیں۔“

”وہ بہت برے ہو گئے ہیں اب چند۔ وہ چاہتے ہیں کہ مجھے، تمہیں، تمہارے بابا، شیر و سب کو مار دیں۔ ہمیں جیل میں ڈال دیں۔ وہ ہمارے دشمن ہیں گئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے پلانٹ میں آگ لکوئی، شیر و کواتنے دن جیل میں قید رکھا۔ وہ بہت خطرناک ہیں۔“ سونیا یادیت اور تعجب سے اس کو دیکھے گئی۔

”اور میں تم نے ہمیشہ یاد رکھنا ہے کہ تمہارے بابا سب سے اپنے ہیں، اور ان کے دشمن بہت برے۔ کبھی بھی اپنے بابا، مجھے، شیر و doubt نہیں کرنا۔ اور اگر کبھی فارس سے ملاقات ہو تو ان سے بات تک نہیں کرنی۔ وہ گندے لوگ ہیں۔ دہشت گرد اور قاتل۔ آئیں کبھی۔“ سونی نے آہت سے اثبات میں سر بلایا۔ اس کا خندا ماغ ان باتوں کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ گم صدمی ہو گئی۔

”میں سونیا۔ کھانا کھالیں۔“ فیجنونا کی آواز آئی تو سونی اٹھ کے اس کی طرف بھاگ گئی۔ فیجنوناڑی دھکیلیتی ڈائنگ ہال میں جاری ہی۔ ایسے میں جواہرات نے دیکھا، سونی کا ثیب وہیں صوف پر رکھا تھا۔ جواہرات نے کشن اٹھایا، اس کے اندر ٹیب بھی (اس سمت سے جہاں سی لٹی وی کیسرہ اس کو نہیں پکڑ سکتا تھا) اور اسے لئے اندر کمرے میں آگئی، گویا سونے کے لئے جا رہی ہو۔

دروازہ ہند کرتے ہی اس نے ٹیب کھولا اور تیز تیز کیز دبانے لگی۔ ٹیب کی چمکتی اسکرین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور نیلا ہٹ بھری سفیدی سے روشن لگ رہا تھا۔ ایسا نیلا سفید جو زبر سے بھرے وجود کا ہوتا ہے۔



پھرتے ہیں مثلِ موج ہوا شہر میں ..... آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو! اس صحیح یوں لگتا تھا پورا شہر پسینے سے چپ چپ کر رہا ہو۔ ایسے میں جیل کے ملاقاتی ہال میں شدید گھنٹن اور جس محسوس ہوتا تھا۔ بھر کے دونوں اطراف میں انسانوں کی قطاریں لگی تھیں۔ باری باری قیدی اپنے عزیز واقارب سے ملاقات کر رہے تھے۔ چار سال تک وہ سوراخوں والی اسکرین سے مزین بتوخ کے دوسری طرف ہوتا تھا۔ آج وہ اس طرف بیٹھا تھا اور نگاہیں سامنے نیتے۔

نیاز بیگ پچھی تھیں۔ قیدیوں کا لباس پہنے بڑی مونچھوں والا تیوریاں چڑھائے نیاز بیگ ناخوش لگتا تھا۔

”تمہاری بی بی چکر لگانی ہے۔ میرابیان نہیں بد لے گا۔ میں نے ماری تھیں سعدی یوسف کو گولیاں۔“

”شاید تم مجھے جانتے نہیں ہو۔“ وہ ٹھنڈے سے انداز میں بولا مگر دوسری طرف کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ نیاز بیگ سے مسکرا یا تھا۔

”جاننا ہوں صاب..... بہت قصے سنے ہیں تمہارے اس جیل میں۔“ اور ناک سے کمکی اڑائی۔

فارس نے غور سے اسے دیکھتے لجھ کو دھیما کیا۔ ”دیکھو، تم دیکھر میں نامزد ہو۔ شزا ملک اغوا کیس میں تم بے قصور ہو، اور اگر میں چاہوں تو شرا کو مناسکتا ہوں، وہ تمہارا نام واپس لے لے گی۔ سعدی یوسف اغوا کیس میں تم اغوا کے مجرم ہو، اقدام قتل کے نہیں۔ لیکن ہم تمہارا نام خارج کر دیں گے، اور تم آزاد ہو جاؤ گے اگر....“ اس نے وقف دیا۔ نیاز بیگ غور سے اسے دیکھتا سن رہا تھا۔

”اگر تم عدالت میں بیچ بول دو۔“

”میں نے سعدی یوسف کو گولی ماری تھی، یہی بیچ ہے۔“

”نیاز بیگ۔“ فارس نے افسوس سے سر ہلا یا۔ ”کتنے پیے دینے کا کہا ہے ہاشم کاردار نے؟ وہ میرا کزن ہے۔ خون ہے میرا۔ میں

اسے جانتا ہوں۔ ادھرم نے گواہی دی، ادھرم اس کے لئے خطرہ بن جاؤ گے۔ وہ تمہیں جیل میں ہی ختم کروادے گا۔“

نیاز بیگ کی گردان میں گلٹی سی ڈوب کے ابھری مگر وہ انہی خخت تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

”ہم سب جانتے ہیں کہ تم نے نہیں کیا۔“ اس نے میز پر کھکھ پرنٹ آؤٹس اٹھائے اور ششی کی اسکرین کے سامنے کیے۔ پہلے پر سعدی یوسف کا خون میں لٹ پت وجود پڑا تھا۔ ”یہ تم نہیں کیا۔ اتنے پیارے نوجوان کو تم نے نہیں مارا۔ وہ بھی چند ڈرگز کے پیچھے۔ یا اس کے اس سیل فون کے پیچھے جسے تمہارے بیان کے مطابق تم نے بیچ دیا تھا۔“ اس نے دوسرا کاغذ سامنے کیا۔ نیاز بیگ خاموشی سے ششی کے پار لہراتے کاغذ دیکھنے لگا۔

”کوئی کیسے یقین کرے گا کہ تم ایک لڑکے کو اتنی بری طرح پیٹ سکتے ہو؟ اس کو اتنی گولیاں مار سکتے ہو؟ وہ بھی صرف اس سیم ساگ کلیکسی ایس 6 کے لئے؟ کتنے کا پک گیا ہو گا یہ فون؟ عدالت کو کیا اس فون کی قیمت نہیں معلوم ہوگی؟“ کاغذ پر اب سیاہ رنگ کا موبائل نظر آ رہا تھا۔ اس نے کاغذ نیچے رکھے اور تحرم سے اسے دیکھا۔ ”تمہارا بیان کمزور ہے، کوئی یقین نہیں کرے گا۔ اور وقت پڑنے پر ہاشم کاردار تم سے چھکارا حاصل کر لے گا۔ اس لئے اس کی باتوں میں مت آؤ۔ عدالت میں کم از کم اتنا کہہ دو کہ تم نے سعدی کو گولیاں نہیں ماری تھیں۔“

”اور بد لے میں مجھے کیا ملے گا؟“ وہ اسی انداز میں بولا تھا۔ فارس کے چہرے پر بالآخر مسکرا ہٹ اٹھا۔

”پیسے چاہیے ہیں؟ میں دوں گا اور تمہاری حفاظت بھی کروں گا۔ کیا سمجھے؟“ نیاز بیگ نے اثبات میں سر ہلا یا۔ فارس نے اب ایک

اور کاغذ سامنے کیا۔ ”تمہاری بیرک کا سپاہی تمہیں کیا گذرا دے دے گا۔ یہ چند فقرے یاد کر لینا۔ یہ بولو گئے تم عدالت میں۔“

”تم واقعی مجھے پیسے دو گے؟“ وہ اب مشکوک لگتا تھا۔

”آزمائے دیکھ لو۔“ نیاز بیگ نے اب کے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ گہری سوچ میں گم تھا۔

فارس وہاں سے باہر آیا تو جیل کی حدود سے نکل کر اس نے زمر کو فون ملا یا۔

”کام ہو گیا ہے۔ نیاز بیگ مسئلہ نہیں کرے گا۔ اس کی جرجم ہمارے حق میں جائے گی۔“

”کی بات ہے نا؟“ وہ مشکوک تھی۔ ”وہاں جا کر وہ تمہاری ہربات بھول گیا تو؟“

”نہیں، میں تو بے کار آدمی ہوں، مجھے تو کچھ کرنا آتا ہی نہیں ہے۔ جا ب لیں، کمکا ہوں میں۔“

”ساتھ میں دو نمبر بھی ہو۔“ اور وہ دھیرے سے مس دیا تھا۔

اور ادھر اس کے جاتے ساتھ ہی نیاز بیگ واپس آ کر ایک بڑے کمرے میں آیا جہاں موبائل جیسے زار نہیں کرتے تھے۔ وہاں لبے لیئے آدمی سے اس نے موبائل مانگا اور پھر کونے میں جا کر کال ملائی۔ فون کان سے لگاتے ہی وہ بولا تھا۔ ”کار دار صاحب۔ نیاز بیگ بول رہا ہوں۔“

”اتی صبح فون کرنے کا مطلب ہے فارس غازی آیا تھا تمہارے پاس؟“ ہاشم اپنے آفس میں بیٹھا چند فاٹزو دیکھ رہا تھا انداز میں اطمینان تھا۔

”جی۔ ابھی ابھی گیا ہے۔“

”کیا کہا اس نے؟ وہی جو میں نے کہا تھا؟ کہ ہاشم کار دار تمہیں مراد دے گا، میں تمہیں زیادہ پیسے دوں گا وغیرہ وغیرہ۔“ وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

”ایک ایک حرف وہی کہا اس نے۔“ وہ آگے سے ہنسا تھا۔

”گذر تم نے کیا کیا؟“

”وہی جو آپ نے کہا تھا۔ اسے سوچنے کا تاثر دیا ہے، مگر اسے یقین ہے کہ میں مان گیا ہوں۔“

”ویری گذر۔ اب وہ عدالت میں جرج کی تیاری چھاط رخ سے کریں گے۔ تم اپنی تیاری پوری رکھو۔“

”جو حکم صاب۔ ہم تو آپ کے حکم کے غلام ہیں۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔“ خوت سے کہہ کر ہاشم نے فون میز پر ڈال دیا۔ پھر تنخ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھنکا۔ ”میں شہر بھر کے گواہوں کو خرید سکتا ہوں، جانتا نہیں ہے یہ کیا؟“ منہ میں بڑھاتے ہوئے وہ کاغذ الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

..... ♦♦♦ .....

جی میں آئے جو کر گزرتا ہے ..... تو کسی کا کہا نہیں کرتا! مورچاں کے لا دنج میں چھٹی والے دن کی رونق تھی۔ زمر، فارس اور سعدی مختلف صوفوں پر بیٹھے تھے، اور تینوں اپنے اپنے فونز پر لگتے تھے۔ نیچے کشن پر سیم لیٹا تھا اور وہ بھی ٹیب پر کچھ کھیل رہا تھا۔ ایک کونے میں ڈسٹنگ کرتی حسینہ کام چھوڑ کے اپنا فون دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں وہیل چیز پر بیٹھے خاموش سے بڑے ابا باری باری سب کے جھکے چہرے تک رہے تھے۔

”کیا ہم یہ طنہیں کر سکتے کہ جب سارے گھروالے ساتھ بیٹھے ہوں تو کوئی اپنے موبائل کو نہیں دیکھے گا؟ (سب کے موبائل ایک ساتھ بیٹھے ہوئے۔) اور اسامہ کیا تمہیں ایسے گیئر کھیلنے کا شوق نہیں ہے جو تمہیں باہر جا کے کھیلنے ہوں۔ چل پھر کے۔ بھاگ دوڑ کے۔“ اب انے اسے پکارا تو سیم اسکرین پنگا ہیں جماۓ خوشی سے بولا تھا۔ ”ہے نا بڑے ابا۔ لیکن پتہ نہیں Pokemon Go پاکستان میں کب آئے گی۔“ (اس نے اس موبائل گیم کا نام لیا جس کو کھیلنے کے لیے موبائل ہاتھ میں لے کر چلانا پڑتا ہے)

”ابھی کھر ہے ہیں۔“ زمر اپنا فون رکھتے ہوئے بولی تھی۔ ”جب ساری قیلی ساتھ بیٹھی ہو تو کوئی موبائل استعمال نہیں کرے گا اور حسینہ آپ کی ڈسٹنگ نہیں ہوئی۔“ ساتھ میں نھیں سے اس کو بھی لتا ڑا۔ وہ جلدی سے فون رکھ کے ہڑ بڑا کے کام کرنے لگی۔ فارس جو اپنا موبائل جیب میں رکھتی ہی رہا تھا ایک دم چوک کے حسینہ کو دیکھنے لگا جس نے ابھی ایک چمکتا ہوا اسارت فون سائیڈ ٹیبل پر دھرا تھا۔ پھر اس نے سعدی کو دیکھا۔ وہ فون رکھ کے بڑے ابا سے بات کرنے میں مصروف تھا، متوجہ نہیں تھا۔ فارس نے پھر سے حسینہ کے فون کو دیکھا۔

”حسینہ... یہ نیا ہے؟ کافی مہنگا لگتا ہے۔ کس نے لے کر دیا؟ آپا نے؟“ وہ بلند آواز میں بولا تھا۔ سعدی بھی چوک کے اس طرف دیکھنے لگا۔ حسینہ نے ایک دم سب کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

”نبیں فارس بھائی۔ صداقت نے لے کر دیا ہے۔“

”ماشاء اللہ صداقت لگتا ہے پیسے جوڑ جوڑ کے رکھنے لگ گیا ہے۔ دو ماہ پہلے تک تو نیا جوتا خریدنے سے پہلے بھی سوبار سوچتا تھا۔“  
اس نے چھپتی ہوئی نظروں سے حسینہ کو دیکھتے ہوئے تبرہ کیا۔

”نبیں جی، کمیٹی ڈالی تھی، ہم نے۔ ابھی قطیں دینی ہیں۔“ وہ سر جھکا کر کام کرنے لگی۔ فارس ”ہوں۔“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”احمر کی باتوں پہ نہ جائیں ناموں۔ ہمارے ملازم ایسے نہیں ہیں۔“ وہ انگریزی میں تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے پتہ ہے میں تو یونہی۔“ اس نے سر جھکا۔ زمر اور بڑے ابا بھی تاد بھی نظروں سے اسے دیکھنے لگ گئے تھے۔

”اس نے واپسی کمیٹی ڈالی ہے اور مجھے پتہ ہے کہ کہاں ڈالی ہے۔“ زمر نے اسے گھور کے دبی آواز میں کہا تھا۔ بڑے ابا کو بھی برالگا تھا شاید۔ اور حسینہ کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم دیکھی نظر آنے لگی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ فارس نے جان چھڑانی چاہی۔

”ہم صداقت کو عرصہ دراز سے جانتے ہیں، فارس۔ وہ بہت ایماندار اور شریف لڑکا ہے۔“ ابا نے سمجھا اس سے اس کو گویا سمجھایا، یا شاید

بہت کچھ واضح کیا۔

”جی، مگر.....“ وہ گہری سانس لے کر اٹھا۔ ”ہم اس کی بیوی کو تو عرصہ دراز سے نہیں جانتے۔ خیر میں بیک بات کر رہا تھا۔“ انگریزی میں کہہ کر معدترت کرتا وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔ فارس سے کون بحث کرتا، لیکن حسینہ کے لئے بھی سب کو برا محسوس ہو رہا تھا۔ بے چاری بے گناہ غریب لڑکی پہ وہ شک کرنے لگا تھا۔ یونہی خواہ مخواہ میں۔ اسے ایسے نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ زمر، ابا اور سعدی سب بھی سوچ رہے تھے۔

اوپری منزل پر آؤ تو حسین اپنے کمرے کے بند دروازے کے اندر، آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ مردہ چہرہ، حلقوں والی آنکھیں لئے وہ اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے گردن کڑا کر کہنے کی کوشش کی۔

”پورا آنڑی، مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے ان سے کبھی موبائل پہ باتیں نہیں کیں۔“ آواز کلپکاتی ہوئی اور لچہرہ کمزور رہا۔ مگر اس نے پھر سے کہنے کی سعی کی۔

”جی نہیں۔ میں کسی اوپی کو نہیں جانتی۔ جی نہیں، میرے پاس کبھی فرینڈ زینڈ فیلی فیورز لینے نہیں آتے۔ آپ بے بنیاد الزام لگا رہے ہیں۔ میں آپ کو sue کر سکتی ہوں۔“ آواز پھر سے کانپی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر آنکھیں رگڑیں اور اپنا موبائل اور پس اٹھا کے کمرے سے باہر نکلی۔ اسے سیم کے ساتھ وال پیپر لینے بلیوایا جانا تھا۔

حسین اور سیم کو صداقت ڈرائیور کے ابھی کالوں کے اختتام تک ہی لا یا تھا جب ایک لمبی چمکتی ہوئی کار سامنے سے آتی دکھائی دی۔ جب دونوں گاڑیوں نے ایک دوسرے کو پاس کیا تو حسین نے دیکھا، پچھلی سیٹ پہ آبدار عبید یعنی نظر آرہی تھی۔ (کار کے شیشے سیاہ تھے، مگر اس نے شیشہ گرا کھا تھا اس لئے دکھائی دیتی تھی)۔ زندگی میں پہلی بار حسین جان گئی تھی کہ جواہرات جوانی میں کیسی ہوتی ہوگی۔

وہ برآمدے میں کرسی پر نیک لگائے سوچ میں گم بیٹھا تھا جب کھلے گیٹ کے پار وہ آتی دکھائی دی۔ فارس چونکے سیدھا ہوا۔ وہ بال چھرے کے ایک طرف ڈالے سر پر ریشمی رومال پہنیے، سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔ اسے بیٹھے دیکھ کر مسکراتی۔ وہ انکھ کھڑا ہوا اور سر کو فرم دیا۔ آبدار اس کے بالکل مقابل آرکی۔ سبز مرمنی آنکھوں سے اس کی سنہری آنکھوں میں دیکھا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ آپ ادھر کیسے؟“ آج تیوری نہیں چڑھی تھی۔

”اس دن باتِ ادھوری رہ گئی تھی، میں اپنی پوزیشن کلیر کرنا چاہتی تھی ذرا۔ اگر آپ مجھے چند منٹ مزید برداشت کر سکیں تو بیٹھ کے بات کر لیں؟“ کہنے کے ساتھ اس نے کرسی کھینچی۔ وہ ”جی بیٹھیے۔“ کہتا دوسرا کرسی کی طرف آیا۔ بار بار غور سے اس کو دیکھتا بھی تھا۔ گویا بھجن کا شکار ہو۔

”میری وجہ سے آپ کو مشکلات پیش آرہی ہیں، میں جانتی ہوں۔“ وہ کرسی پہنیک لگا کے اپنے ازلی شاہانہ انداز میں بیٹھ گئی اور دو انگلیوں سے کان کی بالی چھینڑتے ہوئے نظروں کے حصار میں اس کا چہرہ مقید کیے گویا ہوئی۔

”میری ہر وقت آپ کی توجہ گھیرنے کی خواہش سے آپ کی دائف ان سکیو رہنے لگی ہیں۔ پھر میری اس مقصوم خواہش کو غلط رنگ دے کر بابا نے جو کیا، میں اس کے لئے بھی شرم مند ہوں اسی لئے وہ ہیرے کی لوگ و اپس کرنے آگئی تھیں ہاں مگرتب مجھے لگا تھا کہ آپ کی دائف آپ کے ساتھ مغلظ نہیں ہیں، وہ آپ کوڈیزرو نہیں کرتیں۔ لیکن میں غلط تھی۔ میں ان کو بھی نہیں تھی شاید۔ ایک دوست کی حیثیت سے صرف آپ کو خبردار کرنا چاہتی تھی، مگر ان کے خلاف نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور اب جب کہ مجھے احساس ہو چکا ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں، تو میں بھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ دونوں کے درمیان کسی بھی قسم کی کوئی غلط فہمی در آئے۔ امید ہے میری طرف سے آپ کا دل صاف ہو گیا ہو گا۔“

فارس نے ہلکا سارا بیان میں ہلا کیا۔ ”آپ یہ سب پہلے کلیر کر چکی ہیں۔“

”مجھے آپ سے ایک گلہ بھی کرنا تھا۔“ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اداں مسکراتی نظریں اس پر جمائے کہہ رہی تھی۔ ”آپ نے مجھے استعمال کیا سعدی تک پہنچنے کے لئے۔ مجھے برائیں لگا مگر اچھا بھی نہیں لگا۔“

”چلیں۔ کلبوبیں میں نے آپ کو ایڈ و پچر تو دیانا۔“

”کون سا ایڈ و پچر؟ آپ تو فرار ہو گئے تھے میں تو اکیل رہ گئی تھی۔ آپ بار بار بھول جاتے ہیں کہ میں اتنے مسائل کا شکار آپ کی وجہ سے ہوں۔“

اور پہلی دفعہ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ چہرے پر افسوس در آیا۔ اس نے سر جھکا دیا۔ پھر گھری سانس لی۔ ”آئی ایم سوری۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔“

”مزکاردار مجھے مسلسل نفرت انگیز پیغامات بیچ رہی ہیں۔“ اس نے اپنا میل فون اس کی طرف بڑھایا جسے فارس نے قدرے بھاری ہوتے دل کے ساتھ تھام لیا۔ وہ عجیب کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ ”آپ نے وہ ویڈیو ہاشم کو دے دی، میرا نہیں سوچا، اب وہ اس کا انتقام مجھ سے لیں گی۔“

”آپ خود ہی تو وہ ثبوت ہمیں دینا چاہتی تھیں، یہ بات آپ کو پہلے سوچنی چاہیے تھی۔“ آواز پر ان دونوں نے چونک کے دیکھا۔ زمر باہر آتے ہوئے ٹھنڈے سے انداز میں بولی تھی۔ آبدار بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مسز زمر!“ مسکرا کے گویا ہوئی۔ ”میں آپ سے مذعرت کرنے آئی تھی۔ میں نہیں چاہتی آئندہ میری وجہ سے آپ دونوں کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔“

زمر نے فارس کے برابر میں کرسی کھینچی اور اس پہنچی۔ ”آپ کو کیوں لگا آپ کی وجہ سے ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گی؟ ہم outsiders کی وجہ سے آپ میں نہیں جھگڑا کرتے۔“ فارس نے کچھ نہیں کہا، وہ موبائل پر میسچرڈ کیوں رہا تھا۔ آبدار کے چہرے پر افسوس اتر آیا۔ ”لگتا ہے آپ ابھی تک خفا ہیں۔ مگر چلیں، میں خوش ہوں کہ فارس نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ اور ہاں۔ یہ میں آپ کے لئے لائی تھی۔“ اس نے پرس کے ساتھ پکڑ انھما سا بکس میز پر رکھا۔

فارس نے خاموشی سے فون اسے واپس کرتے ہوئے سوالیہ نظر وہ سے باکس کو دیکھا۔

”یہ ایک چھوٹا سا تختہ ہے۔ پر فیوم۔ مجھے اچھا لگا، میں نے لے لیا۔“

”سوری میں یہ تختہ نہیں لے سکتا، وہ شاگرڈ سے معفرت کرتا انٹھ کھڑا ہوا تھا۔ (زمر نے بڑھی سے اس تختہ کو دیکھا تھا۔)

”مجھ سے میرے پلین میں رائیڈ لے سکتے ہیں، میری اینجیو کے خلاف ٹپ لے سکتے ہیں، مسز کاردار کی ویڈیو لے سکتے ہیں، میرا اپارٹمنٹ لے سکتے ہیں، مگر تختہ نہیں لے سکتے؟“ وہ مسکرا کے بولی تھی۔ ”اگر آپ نہیں لیں گے تو مجھے لگے گا کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔“

”اوکے!“ اس نے سر کو خم دیا۔ زمر نے چونک کے بے یقینی سے اسے دیکھا، مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ اب اس کوی آف کرنے اس کے ساتھ گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ ”مگر آئندہ آپ کوئی چیز نہیں لائیں گی یوں۔ اور مسز کاردار کو جواب نہ دیں۔ لبس اگنور کریں۔“ چند گارڈز مزید رکھ لیں۔ تھا گھر سے نہ لکھیں۔“ وہ ہدایات دے رہا تھا، انداز میں فکر مندی تھی۔ گیٹ تک وہ اس کے ساتھ گیا پھر وہ چلی گئی تو فارس واپس گیا۔ ابھی تک سوچ میں گم تھا۔ جیسے افسر دہ ہو۔

”تم اس کا تختہ کیسے لے سکتے ہو؟ تم جانے نہیں ہو اس کو؟“ وہ بڑھی سے کہہ رہی تھی۔ پہلی دفعہ وہ بے زار سا ہوا۔

”زمروہ اچھی بڑی ہے، معافی مانگ رہی تھی، رو یہ بدلتا ہے اس نے اپنا۔ تو تم اس سے یوں بات کیوں کر رہی تھیں؟“

”رو نہیں بدلا اس نے۔ تکنیک بدلتا ہے۔ تمہیں نظر کیوں نہیں آ رہا؟“

”اچھا تو تکنیک بدلتا کے وہ کیا کر لے گی؟ وہ تمہارا اتنا نقصان نہیں کر سکتی، جتنا میں اس کا کر چکا ہوں۔“ تلخی سے کہتا وہ وہیں

بیٹھ گیا۔

”اس نے کوئی احسان نہیں کیا ہم پہ بھاری مدد کر کے۔ یہ سب اس کے باپ اور اس کے ہاشم کاردار کا کیا دھرا ہے۔ اس کو تو اپنے خاندان والوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے اس سے بھی زیادہ کرنا چاہیے تھا۔ سارے نقصان ہمارے ہوئے ہیں۔ مجھے تو تم پہ حیرت ہو رہی ہے، تم.....“

”آنگر تمہیں بھی با تین کرنی ہیں تو میں جا رہا ہوں۔“ اکتاہٹ سے کہتے اس نے جیب سے چابی نکالی اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

”تم اس کی وجہ سے مجھے لڑ رہے ہو؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا گلارندھ گیا۔ وہ تیوارا کے پلٹا۔

”میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت اس کو اپنا کمپیشن سمجھنے کی وجہ سے اسے ایک انسان سمجھو جس نے ہماری مدد کی ہے اور جس کو میں نے بہت سی مشکلوں میں ڈال دیا ہے۔ اور اب مجھے ہی اس کو اس سب سے نکالنا ہو گا۔ کھانے پر میرا منتظر مرت کرنا۔ میں دیر سے آؤں گا۔“ تلخی سے کہتا وہ مزرا اور بے لبے ڈگ بھرتا بھر نکل گیا۔ زمر یاسیت اور نفکی کے ملے جلتا تھا کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی۔

❖❖❖

اتنی جلدی تو بدلتے نہیں ہوں گے چہرے ..... گرد آلود ہیں آئینے انہیں دھویا جائے شاپ میں کھڑی خینہ بے دھیانی سے وال پیپر زد کیک رہی تھی۔ سیم قریب میں کمپیوٹر شاپ کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کو اپنا شیب ٹھیک کروانا تھا (اسی لئے وہ بنچوں چڑا خینہ کے ساتھ آگیا تھا۔) صداقت باہر کار میں منتظر کر رہا تھا۔

خینہ کی توجہ وال پیپر کی وجہے اندر کے گہرے مخدودار میں گول چکر کھاری رہی تھی۔ بار بار وہ سر جھکتی تھی مگر سوچیں... اف... ہاشم کاردار کی موقع جرج کی آوازیں اس کے کانوں میں بار بار گونج رہی تھیں۔ وہ جتنا دھیان بٹانے کی کوشش کرتی، اتنا وہ سر پہ سوار ہونے لگتا، بیہاں تک کہ وہ اس کی خوبیوں کی محسوں کرنے لگی تھی۔

کرنٹ کھا کے خینہ کی مری تو گویا اگلا سانس لینا بھول گئی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ہاشم کاردار۔ مسکراتا ہوا تیار سا، قیمتی پر فیوم کی

خوبیوں بسا۔ وہ واقعی اس کے سامنے تھا۔ خین کے ہاتھ سے وال پیپر چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ وہ بے قیمتی سے اسے دیکھے گئی۔ ”کیسی ہو؟“ اس کا انداز اتنا نرم اتنا مسحور کرن تھا، وہ بنا پلک جھکے، اس پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔ لب آدھے کھلتے تھے۔ جسم برف ہو رہا تھا۔

”تمہارے سیل فون سے ٹریس کیا تمہیں، اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا جہاں تمہارے خاندان کے وہ سیلفش لوگ آس پاس نہ ہوں۔ پتہ ہے وہ سیلفش کیوں ہیں پیاری لڑکی؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔

”وہ سن نہیں رہی تھی، بس اسے دیکھ رہی تھی۔ پیاری لڑکی کی صدائیں بار بار دیوار سے ٹکرانے لگی تھیں۔ پیاری لڑکی..... پیاری لڑکی....“

”ان کو صرف اپنی فکر ہے۔ زمر اور فارس کو اپنی شادی پر محنت کرنے کی فکر ہے۔ سعدی کو کیس جنتیکی پڑی ہے تاکہ وہ سچا ثابت ہو وہ آگے بڑھ سکے۔ ایسے میں کسی کو بھی تمہاری فکر نہیں ہے۔ خین کثیرے میں کھڑی ہو ایک دنیا اس کی باتیں نے اس کی باتیں لکھے۔ وہ اخباروں کی سرخیوں کی نیت بنے۔ اس کا کردار تاریخ ہو جائے، یہ سب با تین ان کوٹانوں لگتی ہیں۔ ان کا انعام پورا ہو جائے، باقی سب خیر ہے۔“

وہ موم کا مجسمہ بنے اس کو دیکھے گئی۔ ٹھنڈے پینے سے اس کا وجود گویا موم کی طرح پکھل پکھل رہا تھا۔

”کسی کو تمہاری فکر نہیں خین۔“ وہ ہمدردی سے کہہ رہا تھا۔ ”میں تمہیں کبھی سمن نہ کرتا۔ زمر غلط کہتی ہے کہ میں تمہیں سمن کرتا۔ میں بچوں سے نہیں مقابلہ کرتا۔ بچوں کو درمیان میں نہیں لاتا۔ میری بھی ایک بیٹی ہے۔ میں جرح بھی نہیں کرنا چاہتا تمہاری۔ مگر زمر اور سعدی تمہیں درمیان میں لائے ہیں۔ انہوں نے تمہیں صلیب پہ چڑھایا ہے؟ تم اپنا سوچو خین۔ میرا نہیں، کسی کا نہیں۔ اپنا فیملی بیک گراؤند دیکھو۔ شادی کیسے کرو گی؟ سر اٹھا کے کیسے جیو گی؟ لوگ میرے اور تمہارے افسیر کی باتیں زمانوں تک کریں گے یہ سب جرح میں کہنا پڑے گا اور یقین کرو میں نہیں کرنا چاہتا یہ سب، میں تو آگے بڑھنا چاہتا تھا، لیکن سعدی نے مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ اب تم میری مدد کرو۔“

وہ سن تھی۔ مجسمہ تھی۔ موم کی طرح پکھل رہی تھی اور وہ آگ کے شعلے کی طرح اس کے گرد بالہ بنائے ہوئے تھے۔

”تم کورٹ میں کہو کہ تمہیں کچھ یاد نہیں۔ جو پولیس کو تم نے حلیمہ سے متعلق بیان دیا ہے، اس کو وابس لے لو پیاری لڑکی۔ تم اتنی ارزاز نہیں ہو کہ تمہیں کورٹ میں کوئی استعمال کرے۔ تم میرے خلاف کوئی بات مت کہو، میں جرح نہیں کروں گا۔ کوئی تمہارے کردار کے بارے میں بات بھی نہیں کر سکے گا۔ تمہیں صرف اتنا کہنا ہے کہ سعدی جھوٹ بول رہا ہے اور تمہاری رائے میں شیر و ایسا نہیں کر سکتا۔ یوں تم محفوظ رہو گی، کیونکہ یہ عزت ایک دفعہ چلی گئی تا خین، تو واپس نہیں آئے گی۔“

ایک آن خین کی آنکھ سے ٹوٹا اور گال پڑا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”میری بات سمجھ میں آئی ہے نا؟“

”جی!“ اس نے خود کو کہتے سن۔ ”یہ عزت ایک دفعہ چلی گئی تو واپس نہیں آئے گی۔“ وہ کسی رو بوث کی طرح بولتی تھی۔

”گذ۔ تم جب کثیرے میں کھڑی ہونا تو مجھے فیور دینا۔ میں تمہیں دوں گا۔ اور اپنے خود غرض خاندان سے ڈرنا نہیں۔ ان کو شرمندہ ہونا چاہیے، تمہیں نہیں۔ کیونکہ اگر میں نے اوکی لپی صاحب والی باتیں جرح کے دوران کہہ دیں، اور یقین مانو میں نہیں کہنا چاہتا، تو تمہارے خلاف انکواڑی ہو گی۔ تم نے ابھی بی اے کیا ہے نا؟ ایف ایس سی کا رزلٹ کینسل ہو گا۔ تین سال تک تمہیں کوئی تعیین ادارہ داخلہ نہیں دے سکے گا۔ تین سال بعد تم دوبارہ سے ایف اے بی اے کرو گی کیا؟ تین سال بعد سات سال پہچھے چلی جاؤ گی کیا؟ تم جس یونیورسٹی یا کالج میں جاؤ گی، وہاں بے عزت ہو کر رہو گی۔ سب تمہیں جیڑھ کہیں گے، حقارت سے دیکھیں گے۔ اس لیے تمہیں اس وقت صرف اپنا سوچنا چاہیے۔ ہوں۔“ وہ کوٹ کی نادیدہ شکن درست کرتا اس پر ایک نرم سی آخری

نظر ڈال کے مڑ گیا۔ سیز میں اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ چلا بھی گیا اور وہ ہنوز بت بن کے کھڑی تھی۔ مومن کے قطرے پکھل پکھل کے اس کی آنکھوں سے بہر رہے تھے۔ آگ جا چکی تھی۔ تپش باقی تھی۔

❖❖❖

اُبھرتے ڈوبتے سورج سے توڑ لوں رشتہ ..... میں شام اوڑھ کے سو جاؤں اور سحر نہ کروں  
وہ گھر آئی تو اس کا جسم یوں جل رہا تھا گویا اردو گرد ایک ہزار سورج محل رہے ہوں۔ وہ لا و نج میں خاموش بیٹھی زمر کے سامنے پل بھر کو رکی۔

”میں گواہی دوں گی، لیکن میں بس وہی کہوں گی جو میری مرضی ہوگی۔ کوئی میرے منہ میں الفاظ نہیں دے گا۔ آپ میں سے کوئی مجھے نہیں بتائے گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں وہی کہوں گی جو میرے لیے ٹھیک ہو گا۔“ درد سے پھٹی آواز میں کہہ کر وہ آگے بڑھی تو دیکھا، سامنے سعدی کھڑا اور اس کی آنکھوں میں دکھتا۔

”میں نہیں چاہتا کہ تم گواہی دو ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگ تمہیں یوں اذیت دیں۔“

”تو پھر آپ کو یہ سب ہمارے سارے خاندان کو پچھری میں گھٹینے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ شاکی انداز میں جھٹ کر بولتی وہ دھپ دھپ میڑھیاں چڑھتی گئی۔

پھر کمرے میں آ کر وہ جو سرمنہ پیٹ کے لیٹھ تو کتنے ہی گھنٹے نہ اٹھی۔ مغرب کی اذا نہیں ہوئیں تو انھے کے نماز پڑھی اور پھر سے لیٹ گئی۔ جسم بخار میں دمک رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو ابل ابل کر گر رہے تھے۔ کب تک وہ یوں سزا کا مٹی رہے گی ان پکی عکر کی پکی غلطیوں کی؟ خدا یا وہ کیا کرے؟ عشاء بھی یونہی پڑھی اور پھر سے لیٹ گئی۔ رات تاریک ہوتی گئی۔ شہر اندر ہیرے میں ڈوٹا گیا۔ جانے وہ کون سا پھر تھا جب اس نے محسوس کیا کوئی دروازے میں آ کھڑا ہوا ہے۔ وہ فارس کی چاپ پچھائی تھی مگر اسی طرح کروٹ لے لیتی رہی تھی۔ جانے وہ آگے آیا اور پائیتی پہ بیٹھا۔

”اگر تم نہیں دینا چاہتی گواہی تو مجھے بتاؤ۔ ہم کوئی راستہ نکال لیں گے۔“

”پتہ ہے کیا ماموں۔“ وہ اندر ہر خلاء میں تکتی ہوئی عجیب خالی پن سے بولی تھی۔ ”میں سمجھتی تھی کہ میں ذہین ہوں۔ کئی مالک کے پا پکھر، ڈراموں اور کتابوں سے واقف ہوں تو عامِ لڑکوں سے مختلف ہوں۔ برتر ہوں۔ مگر میں غلط تھی۔“ گرم گرم آنسو ابل کے گالوں پر لڑھکتے تھے میں جذب ہونے لگے۔ ”ہم مڈل کلاس لڑکیاں جتنا پڑھ لکھ لیں، جتنا کمپیوٹر استعمال کر لیں، دنیا بھر کی سیاست پر تبصرے کر لیں، ہم رہتی وہی مڈل کلاس ہی ہیں۔ عام شکل و صورت کی بے بس لڑکیاں جن کو عزت کے نام پر کوئی بھی بلیک میں کر سکتا ہے۔ جن کی عزت ایک دفعہ چل جائے تو اسے کوئی والپس نہیں لاسکتا۔ ہم بہت بے چاری لڑکیاں ہیں فارس ماموں۔ ہم کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہم ٹوٹل Failure ہوتی ہیں۔“

”جب میں جبل میں گیا تھا تو میں نے بہت سی باتیں سیکھی تھیں، جن کا مجھے زندگی میں پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔“ وہ دھیرے سے بولا تھا۔ ”میں نے سیکھا تھا کہ اگر کوئی آپ کے عقاد مدد پر حملہ کرے تو زبان سے جواب دو اگر کوئی آپ کے جسم پر حملہ کرے تو تھا تھے جواب دو، اگر کوئی آپ کے خلوص نیت پر شک کرے، تو اپنے اچھے عمل سے جواب دو، اگر کوئی آپ کی دیانتداری پر انگلی اٹھائے تو دلائل سے جواب دو، لیکن.... وہ ٹھہرا۔ اندر ہیر کرے میں اس کی آواز گونج گونج کر پلٹ پلٹ آتی تھی۔ ”لیکن اگر کوئی آپ کے کردار پر، آپ کی عزت پر حملہ کرے تو کوئی جواب نہ دو۔“

”تو پھر کیا کرو؟“ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ وہ چند لمحے کچھ نہ بولا پھر جب لب کھولے تو اس کی آواز بہت دھمکی اور سردی محسوس ہوئی تھی۔

”Then you make them bleed!“ (تو ان کو تڑپا کے مار دو۔)

وہ کب کمرے سے گیا، اسے پتہ نہ چلا۔ بس وہ گم صمی میٹھی رہی۔ پھر بدقت تمام وہ اٹھی اور با تھر روم جا کے وضو کیا۔ آنکھیں جل رہی تھیں، جسم بخار میں پھٹک رہا تھا۔ بکشکل دو پسہ سر پر پتھنی وہ کمرے میں آئی۔ جائے نماز بچھائی اور درکعت نفل کی نیت باندھی۔

”کیا ہم لڑکیاں ٹوٹل فیلیں ہیں اللہ تعالیٰ؟“ سلام پھیر کے وہ دوز اون میٹھی، دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے گم صمی پوچھ رہی تھی۔ ”کیا ہم لڑکیاں واقعی اتنی بے بس اور لا چار اور بے چاری ہوتی ہیں؟ کیا عزت کے نام پر کوئی بھی ہمیں بلکہ میں کر سکتا ہے؟ کیا ہماری غلطیوں کی کہانیوں کے ”مرد“ کرواروں کے ہاتھوں میں ہماری عزت ہوتی ہے یا آپ کے ہاتھ میں؟ کیا آپ کی مرضی کے بغیر کوئی بھی کسی کو بے عزت اور ذلیل ورسا کر سکتا ہے؟ مجھے بتائیے اللہ تعالیٰ۔ آپ کہتے ہیں ناکہ اگر اللہ تھا مارے دلوں میں خیر معلوم کرے گا تو تمہیں اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخش دے گا (سورۃ الانفال: 70) تو اگر میرے اندر کوئی خیر ہے تو کیا میری عزت مجھے واپس مل سکتی ہے؟ کیا دنیا والوں کی نظر میں میرا پر وہ رہ سکتا ہے کہ وہ تو واقف ہی نہیں ہیں اور میرے گھروالے جو واقف ہیں، ان کی نظر میں پھر سے معبر ہو سکتی ہوں میں؟ کیا سعدی کو جھوٹا کہنے کی بجائے کوئی اور راستہ ہے؟“

وہ اب روہنیں رہی تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی، الجھر ہی تھی، تجھ کا شکار ہو رہی تھی۔ ہاں اب وہ روہنیں رہی تھی۔

بیٹھیوں سے نیچ آؤ تو فارس اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ زمر جو بے مقصدی ڈریگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی، اس کو نظر انداز کیے برش اٹھا کے بالوں میں چلانے لگی تھی۔ خفا نظریں آئئیں پہ جائے وہ لب بھینپتے ہوئے تھی۔

”آہم!“ وہ ذرا سا کھکھارا۔ انداز بے چارے شوہر والا تھا۔ زمر برش کرتی رہی۔ وہ اس کے قریب آیا اور سلگھار میز کے کنارے بیٹھا۔

”سوری۔ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔“ ایک انگلی سے گردن کھجاتے ہوئے وہ بولا تھا۔

”کیا اس نے گھر سے نکال دیا جو آپ کو بالآخر اپنے گھر کی یاد آئی؟“ وہ سلگتی نگاہیں اٹھا کے اسے گھورتے ہوئے بولی تھی۔

”احمر سے ملنے گیا تھا۔ سعدی کی ڈاکٹر کا پوچھنا تھا کہ وہ ملی یا نہیں۔ اس کے پاس نہیں گیا تھا۔“

”تو وہیں رہ جاتے، واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ برش زور سے چاٹھا۔ اس کی وضاحت پر بالکل یقین نہیں کیا۔

”آگیا ہوں تو کیا گھر سے نکالوگی؟“ زمر نے جواباً بھس سر جھکا۔ خوب غصہ آرہا تھا اس پر۔

”اچھا سنو۔“ وہ مصالحتی انداز میں اس کی طرف ذرا سا جھکا۔ نظروں کے حصاء میں اس کا خفا چہرہ لئے مسکراہٹ دبائے بولا تھا۔ ”چلو ڈنر پر چلتے ہیں۔“

”یہ ڈنر کا نہیں سحری کا وقت ہے۔“ وہ اسے گھور کے بولی تھی۔

”اب ایسی بھی کوئی رات نہیں میتی کہ ایک آدھ ڈھانہ ہی نہ کھلا ہو۔“

”ہاں بس مجھ پر پیسہ خرچ نہ کرنا۔ ڈھانی سوکی انکوٹھی دلانا اور کھانا ڈھایوں سے کھلانا۔“ وہ مارے تاسف کے انھ کھڑی ہوئی تھی۔ فارس نے افسوس سے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”تم ہمیشہ سے اتنی لاچی تھیں یا دکالت پڑھنے کے بعد ہوئی ہو۔“

”تم ناوالپس اسی کے پاس چلے جاؤ۔“

”ارے یا نہیں جاتا میں اس کے پاس۔ میں تو عرصے سے اس کے گھر بھی نہیں گیا۔ اور وہ اس رات ڈنر پر میں نہیں خین گئی تھی، وہ ویڈیو بھی اس سے حم نے لی تھی۔ اب بس کر دوٹک کرنا۔“ وہ مسکراہٹ دبائے صفائی دے رہا تھا۔

”ہاں ہاں، مجھے یقین آگیا۔ ہونہہ۔“ اس نے بدقت چہرے کو دیساں سپاٹ رکھا البتہ دل سے بوجھ سا اترنا محسوس ہو رہا تھا۔

”اچھا بہبود تو ٹھیک کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ کل کو مجھے کچھ ہو جائے اور تم یہ وقت ضائع کرنے پر مجھ تھا تو رہا تھا۔“ وہ ازراہ مذاق کہہ رہا تھا۔  
مگر بالوں میں سے برش گز ارتاس کا ہاتھ کانپا۔ اس نے دہل کرفارس کو دیکھا۔

”تم کتنا فضول بولتے ہو۔“

”بس؟“ اسے مایوسی ہوئی۔ ”میں تو امید کر رہا تھا کہ تم ”میری عمر تھیں لگ جائے“ جیسا مکالمہ بولو گی۔“

”کتنا شوق ہے تھیں مجھ سے چھنکا راپنے کا۔“ اسے اُزسر نو غصہ آنے لگا۔

”ہے تو بہت زیادہ“ لیکن.... اس نے برش بالآخر اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ”لیکن تم اس بات کا یقین رکھو کہ موت کے علاوہ ہمیں کوئی چیز یا کوئی شخص جدا نہیں کر سکتا۔“

وہ اداسی سے مسکرائی۔ ساری لکفت، ساری لیخی زائل ہو گئی۔ اس کا مضبوط انداز... پریقین لہجہ... وہ آنکھوں سے چھکلتا عزم... بس اس سرکس بنی زندگی میں ایک بینی چیز تو اسے بہادر بنائے رکھتی تھی۔

”تم مجھ سے واقعی اتنی محبت کرتے ہو نافارس!“

”ہوں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اصلی والی محبت نا؟“ زمر نے ابر و اٹھایا۔

”نہیں۔ چاند والی۔“ وہ جل کے بولا تو وہ ایک دم بنس پڑی۔ ساری اداسیان فضائیں گھل کے ختم ہو گئی تھیں جیسے۔

.....❖❖❖.....

ضمیر مرتا ہے احساس کی خاموشی سے ..... یہ وہ وفات ہے جس کی خبر نہیں ہوتی

اس صبح ہاشم کا ردوار کے آفس میں ہوا بالکل ساکن تھی۔ ایک ڈرائیوری سی خاموشی چھائی تھی اور ہاشم بالکل سانس رو کے بیٹھا سامنے

میز پر کھے کاغذات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہی اُنی سے نکالے گئے still ایج تھے اور یہیں ایک ایک کی تفصیل بتا رہا تھا۔

”نہ صرف فارس غازی نے سری لنکا جانے کے لئے ہارون عبید کا طیارہ استعمال کیا بلکہ مس آبداران کے ساتھ گئی تھیں۔ یہ دیکھئے۔ وہ تصاویر میں جس اپارٹمنٹ سے نکلتا دھائی دے رہا ہے وہ بھی آبدار عبید کے نام پر ہے۔“ ہاشم نے اثبات میں سرکشم دیا۔ وہ اس جگہ کو پہچانتا تھا۔

”گارڈ کار کی موت سے پہلے آبدار صاحبہ سعدی سے ملنے لگتی تھیں، اور اس سے بھی پہلے وہ پاکستان میں فارس غازی سے ملتی رہی تھیں؛ جس سے ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ.....“

”وہ سرخ آبدار نے ہی سعدی کو دی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ تھینک یوریس تم جا سکتے ہو۔“ ایک دم خٹک سے انداز میں کہتا وہ کاغذ سیٹھنے لگا۔ رئیس چپ ہو گیا اور پھر سرکشم دے کر باہر نکل گیا۔

اب وہ کمرے میں تنہا تھا۔ وہ تنہائی جان لیا تو تھی۔ وحشت سی وحشت تھی۔ دکھ ساد کھ تھا۔ وہ بار بار ایک ایک تصویر کو دیکھتا تھا۔ کبھی بے یقینی سے، کبھی ملال سے۔ کبھی آنکھوں میں کرب سمٹ آتا، کبھی غصہ۔ اس کا سر درد کرنے لگا تھا۔ بلذہ پریش برہستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ نائی کی ناث ڈھیلی کی اور سر دنوں ہاتھوں میں گردادیا۔

”بھائی!“ نو شیر والی کی آواز پر وہ چونکا اور چجزہ اٹھایا۔ وہ جانے کب وہاں آکھڑا ہوا تھا۔ ہاشم نے ڈھیلے سے انداز میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ بیٹھا تو اس کا چہرہ بھی شدید اندر ورنی خلفشار کا شکار گلتا تھا۔

”بولاو۔“ وہ سنجھل کے پوچھنے لگا۔ پچھلے دو تین ماہ سے وہ مقدمے میں یوں الجھے تھے کہ آپس میں اب نہ پیار رہا تھا نہ اپنی کے اختلافات۔ بس نارمل ہو گئے تھے دونوں۔

”میری وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ میری وجہ سے ہمارا خاندان اس اسکینڈل میں پھنسا ہوا ہے۔“  
”بالکل ایسا ہی ہے۔ پھر؟“

”میں.... میں اعتراض جرم کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے الفاظ تھے کہ کیا ہاشم کربٹ کھا کے سیدھا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ندامت سے سر جھکائے۔ ”میں خدا سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں سعدی سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں نجح صاحب کوچ بتا دینا چاہتا ہوں، میں....“ وہ فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔ ہاشم کا ردار نے پانی کا بھرا ہوا ٹھنڈا ٹھنڈا ٹھنڈا ٹھنڈا ٹھنڈا ٹھنڈے تخت پانی نے اس کا چہرہ گردن اور بالوں کو نہلا دیا تھا۔ اس نے ہنکار کا ساچہ رہا تھا۔

”اگر نیند سے آنکھ کھل گئی ہو تو میری بات سنو۔“ برہمی سے کہتا وہ آگے کو ہوا۔

”تم نے سعدی کے ساتھ یہ اس لئے کیا کیونکہ وہ یہ ذیر رکرتا تھا۔ کیونکہ تم ہمیشہ سے ایک نالائق اور کم عقل بڑے تھے مگر تم میں بھی کچھ کو الشیر تھیں۔ ان دونوں بھائی نے تمہیں ہمیشہ ڈی گریڈ کیا۔ تمہارے راز کھولے۔ تمہیں احساسِ مکتری کا شکار کیا۔ ان کو وہ ملا جاؤ ہوں نے بویا تھا۔ وہ اپنے احساسِ برتری سے ٹکل پاتے تو ان کو سمجھ آتا تا کہ کسی کا انتہما اپنیں اڑاتے جتنا وہ تمہارا اڑاتے تھے۔ تم نے نوشیر وان اگر کچھ غلط کیا ہے تو اس لئے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ غلط کیا تھا۔“

”میں اس سارے کرب سے ہنکار چاہتا ہوں بھائی۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔“ وہ دبادبا سا چلایا تھا۔ گیلے چہرے پر آنسو کھاں تھے، اندازہ نہ ہوتا تھا۔

”چپ کر کے میری بات سنو۔“ ہاشم اٹھا، میز پر ہتھیلیاں رکھ کر اس کی طرف جھکا۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے غریا۔ ”میں نے انگو کیا اسے، میں نے قید میں رکھا اسے۔ پھر وہ تمہیں کیوں نامزد کر رہا ہے؟ وہ لوگ تم پر غلط اولاد لگا رہے ہیں اور میں تمہیں وہاں سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ میں ہوں جو تمہیں اس سے نکال لوں گا۔“

”لیکن اگر میں ان سے معافی مانگ لوں؟ اگر خدا ان لوگوں کے دل میں میرے لئے رحم.....“  
”ڈیم اٹ!“ ہاشم نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔ ”انہوں نے تمہیں معاف کرنا ہوتا تو یہ سب کرتے ہی کیوں؟ وہ تمہیں چھانکی پر لٹکا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انصاف نہیں چاہتے۔ وہ انتقام چاہتے ہیں۔“ پھر وہ اپس کری پہ بیٹھا، چند ٹھنڈے سانس لے کر خود کو پر سکون کرنا چاہا۔ اور بولا۔ ”دیکھو شیر و تمہارے اعتراض سے ہم سب بتا جاؤ گی۔ تم پاک کرو جیل کے وہ چند دن جو تم گزار کے آئے ہو۔ تم نہیں سہار سکو گے۔ تم پھندے سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔ تم میرے بھائی نوشیر و میں تمہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔“ اس کا الجھ آخ میں بالکل ٹوٹ سا گیا۔ شیر و کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے کرب سے دونوں کنٹیاں تھامیں۔

”میں کیا کروں بھائی؟“

”تم اپنے بھائی پر بھروسہ رکھو۔ مجھے اپنا کیس لڑنے دو۔ ان لوگوں نے ہمارے خاندان کو مذاق بنا دیا ہے۔ میں ان کو مذاق بنا دوں گا۔ تم دیکھنا میں عدالت میں کیا کرتا ہوں اس کے خاندان کی عورتوں کے ساتھ۔“ ایک نظر اس نے سامنے رکھ کا غذات کو دیکھا۔ آنکھوں سے نفرت جھلک رہی تھی۔ (اس نے مجھ سے وہ عورت چھین لی جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ میں اس سے وہ عورت لے لوں گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔)

”میں کیا کروں بھائی؟“ نوشیر وان بھیگ آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلاتا پوچھ رہا تھا۔

”تم خاموش رہو۔ اور مجھے میرا کام کرنے دو۔“ وہ پورے دوثق سے بولا تو شیر نے ٹکٹکی سے اثبات میں گردان ہلا دی۔ وہ عجیب دورا ہے پا آکھڑا ہوا تھا جہاں ہر استہتبا ہی کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔

ان سے کئی کوں دورا یک ہوٹل کے ڈاکنگ ایریا میں زردوش نہیں نے پرسوں خوابیاں ساما جوں بنارکھا تھا۔ ایسے میں ایک نیبل کے گرد و مردا اور تین خواتین بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سربراہی کری پچ جواہرات بیٹھی تھی اور مسکراتی ہوئی بظاہر دچپی سے ان کی باتیں سن رہی تھیں مگر گاہے بگاہے موبائل کی گھڑی پر نظر ڈالتی تھی۔ سکھیوں سے اسے قریب کھڑے گاڑی بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دفترا جواہرات کی آنکھیں چمکیں۔ دور سے دیڑھو میں اڑاتی ٹرے اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ وہ مسکرا کے اب ساتھ والی خاتون سے بات کرنے لگی۔ جیسے ہی دیڑھو قریب آیا اور تیزی سے ان کے قریب جھک کے ٹرے کے لوازمات نیچا تارنے چاہے، جواہرات نے اپنا پیر اس کے راستے میں رکھا۔ وہ جو عادتاً تیز تیز کام کر رہا تھا، غیر متوقع رکاوٹ سے اس کا پیر پٹا اور ٹرے میڑھی ہوئی، وہ سنبھل جاتا مگر جواہرات چلا کے کھڑی ہوئی اور یوں گریوی کا باول اس کے کپڑوں پر لڑھک گیا۔

اگلے چند لمحے وہاں عجب کہرام سماچار ہا۔ جواہرات کا سفید لباس داغدار ہو گیا تھا اور وہ چلا چلا کراس غریب لڑکے کی بے عزتی کر رہی تھی۔ دوسرے دیڑھو اور گاڑی ٹوٹی بکھری چیزوں کو درست کرنے اس طرف لپکے تھے۔ لڑکا سہم کے دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ایسے میں وہ نیپکین سے اپنے چہرے کے چھینٹے صاف کرتے ہوئے گاڑے سے غرائے بولی تھی۔

”میں جب تک یہ صاف کر کے نہ آؤں، اس دیڑھو کو بھاگنا نہیں چاہیے یہاں سے۔ تم اس کو سنبھالو اور مینجھ کو بلا کے لاو۔ کیا مہمانوں کو اذیت دینے کے لئے کھول رکھا ہے یہ ہوٹل؟“ وہ غصے میں بڑھاتی پرس اٹھائے آگے بڑھ لئی، اور گاڑی زور اسے انہی کاموں میں لگ گئے جن کا وہ حکم دے کر گئی تھی۔

لیڈر یز ریسٹ روم کا پہلا دروازہ کھولا تو سامنے قطار در قطار سنک نظر آرہے تھے اور ان کے پیچھے شیشے کی بڑی سی دیوار۔ اور وہاں وہ کھڑا تھا۔ پی کیپ پینے بار بار گھڑی دیکھتا۔

”اوہ احمد۔ شکر تمہیں میرا بیغام مل گیا تھا۔“ وہ گھری سانس لے کر اندر آئی تو احمد نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور پینڈل میں کچھ پھنسادیا۔ پھر متوجہ سا اس کی طرف پلٹا۔

”مسز کار دار اتنا بھی کیا کر آپ مجھے کال تک نہیں کر سکتی تھیں؟“

”میں خطرہ نہیں لے سکتی تھی۔ ابھی زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہاشم مجھ پر شک کرنے لگا ہے، میں اسے مزید خود سے تنفس نہیں کر سکتی۔“ وہ تیز تیز بے ربط سایول رہی تھی۔

”اوے اوے۔ آرام سے بتائیں۔ کیا مدد کر سکتا ہوں میں آپ کی؟“ وہ رسان سے اسے تسلی دیئے گا۔

”تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔ یہ میرے ایک خفیہ اکاؤنٹ کی تفصیلات ہیں۔ اس میں ایک لاکر ہے جس میں کچھ زیور ہے اور بہت سی رقم۔ تمہیں وہ سب کچھ میرے پاس پہنچانا ہے۔“ وہ اب چند کاغذات نکال کے اسے دکھار رہی تھی۔ احمد غور سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

وہ واپس آئی تو لباس کا دار غہرہ ہنوز موجود قابضہ چہرہ تر و تازہ اور دھلا ہوا گلتا تھا۔ مسکرا کے وہ واپس بیٹھی تو دیکھا، سامنے مینجھ، عملے کے چند نمائندے اور گاڑی کھڑے تھے۔ متعلقہ دیڑھو کو انہوں نے کپڑا رکھا تھا۔ مینجھ سینے پہاتھ کھنڈامت سے بار بار معدترت کر رہا تھا۔ جواہرات بیک لگا کے بیٹھی اور فخر و غرور سے اس غریب نوجوان کو دیکھا۔

”اس نے نہ صرف میرا بس خراب کیا، بلکہ میری دوپھر بر باد کر دی۔ اس کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ نہ صرف اس کو نوکری سے فارغ کیا جائے بلکہ یہ ایک بھاری جرمانہ بھی بھرے گا۔“

”مجھے معاف کر دیں، میری غلطی نہیں ہے، میرے آگے....“ وہ نوجوان بے نبی سے کہنا چاہتا تھا مگر گارڈ زاس کو کچھ بولنے سے پہلے ہی خاموش کر دیتے تھے۔ جواہرات اب مزید حکم صادر کر رہی تھی۔

❖❖❖

ہر شخص با اصول ہے ہر شخص با ضمیر..... پر اپنی ذات تک ، ذاتی مفاد تک! کمرہ عدالت کی اوپنی کھڑکی سے نجی کا سورج اندر جھانک رہا تھا۔ جس صاحب اپنی کرسی پر قدرتے تو مجھے ہو کر بیٹھنے رخ کثہرے کی جانب کیسے ہوئے تھے جہاں نیاز بیگ موجود تھا اور اس کے سامنے... نشیب میں... زمر کھڑی تھی۔ نیچے بیٹھا سعدی فکر مندی سے گواہ کو دیکھ رہا تھا۔ ہاشم البتہ بکھری سی مسکراہٹ پھرے پہ بجائے ہوئے تھا۔ آن وہ چشمے والا آدمی نہیں آیا تھا، اس لئے پیچھے بیٹھے فارس کی توجہ کا مرکز صرف نیاز بیگ تھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ ہسپتال میں سعدی یوسف کا سڑپچر لے کر جانے والے آپ ہی تھے؟“ زمر پوچھ رہی تھی۔

”جی ہاں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”کیا یہ درست ہے کہ آپ نے سعدی یوسف کے انوا کا الزام قبول کیا تھا؟“

”جی۔“

”آپ نے سعدی یوسف کو قتل کرنے کا ارادہ کرنے کا الزام بھی اپنے سر لیا تھا لیکن استغاثہ ایک دفعہ پھر آپ سے حلف دلو اکر پوچھ رہا ہے۔ کہ نیاز بیگ صاحب....“ زمر تھہرہ کے بول رہی تھی۔ ”کیا آپ اپنے بیان پر قائم ہیں؟“

عدالتی کرے میں خاموشی چھائی۔ سنانا ذر سنا۔ نیاز بیگ نے ہاشم کو دیکھا، پھر پیچھے بیٹھے فارس کو۔ دونوں اسے مختلف قسم کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ زمر کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں حق بولوں گا۔ میں اپنے بیان پر قائم ہوں۔ میں نے ہی سعدی یوسف کو گولیاں ماری تھیں۔“

”واہا!“ سعدی نے بڑا کے سر جھکا تھا۔ ہاشم نے مسکرا کے زمر کو دیکھا جس کی یہاں سے پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

”آپ کو یقین ہے کہ آپ ہی سعدی کے ساتھ اس زیر تعمیر گھر میں اس رات تھے؟“

”جی۔ میں ہی تھا۔“ ہاشم نے مژ کے فارس کو دیکھا۔ وہ بالکل خاموش اور سپاٹ سادکھائی دے رہا تھا۔

”عدالت کو بتائیے کہ آپ کا سعدی یوسف سے کس بات پر جھکڑا ہوا تھا؟“

”یہ زکا میرے سے کوئی خریدتا تھا، کافی دن سے پیسے پورے نہیں دیے تھے اس نے۔ میں نے کہا بلے میں اس کا رسیشور انٹ قسطوں پر خرید لوں گا۔ یہ اس پر مجھے سڑنے جھگڑنے لگا۔ اس نے مجھے گالی دی تھی۔ پھر میں نے...“ وہ وہی واقعہ دہرانے لگا۔

”اسے ایم بولنس میں دال کے کوڑے کے ڈھیر پر چینکنے کے بعد آپ نے کیا کیا نیاز بیگ صاحب؟“

”میں اپنے گھر گیا۔ کپڑے بد لے۔ اس کا موبائل جو اٹھایا تھا وہ اسی رات اپنے دوست کو نیچ دیا اس کی دکان اسی علاقے میں ہے جہاں آپ کا گھر ہے۔“

”مگر سعدی کے فون کے سگنل اس رات وہاں ملے تھے جہاں قصر کا دروازہ قائم ہے۔“

”میرے دوست کی دکان بھی اسی علاقے میں ہے۔“ نیاز بیگ نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلایا۔ زمر نے ہاشم کو دیکھا اور ستائشی انداز میں سر کوٹ دیا۔ ”اپریسیو وٹس پر یہاں!“ اس نے مسکرا کے تعریف وصول کی۔ زمر فوراً سے واپس گھومنی۔

”اور اس فون کا ماڈل کون ساتھا؟“

لمحے بھر کو کمرے میں سکوت چھا گیا۔ ہاشم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”آب جیکشن یور آئر“، ہاشم تیزی سے اٹھا۔ ”اس بات کو ایک سال گزر گیا ہے، اب....“

”اور روولد۔ کاردار صاحب بیٹھ جائیں، اور گواہ کو جواب دینے دیں۔“ نجح صاحب نے ناپسندیدگی سے اسے ٹوکا۔

”وہ سیم سانگ کا اسارت والافون تھا۔ جلدی میں پچیس ہزار کا لپکا تھا۔ ایس سکس تھا۔“ نیاز بیگ فر سے بولا۔

”اور اس کارنگ کیا تھا؟“ وہ ترنٹ بولی

”سیاہ رنگ تھا۔“ وہ اعتماد سے بولا۔ (اف) نوشیر وان نے سرگردیا۔

زمر نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ نجح صاحب کے سامنے رکھے۔ ”یور آئر سعدی یوسف کے زیر استعمال ایک ہی فون تھا، اور وہ آئی فون تھا،“ سفید رنگ میں۔ یہ اس فون کی خریداری کی سلپ ہے، اور یہ ابتدائی ایف آر آئی کی کاپی ہے جس میں میں نے فون کا رنگ اور ماڈل میشن کیا تھا۔ استغفار شد عدالت سے درخواست کرتا ہے کہ نیاز بیگ کی گواہی پر یقین نہ کیا جائے کیونکہ جس فون کے پیچھے سعدی کو مارنے اور وہ بھی دوڑھائی لاکھ کے اپورڈ پسول سے مارنے کا یہ دعویٰ کر رہا ہے وہ فون اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔“

”یور آئر وہ ایک عام آدمی ہے۔“ ہاشم تیوارا کے اٹھا۔ ”عام آدمی نے سیم سانگ اور آئی فون دیکھے تک نہیں ہوتے، اور اس بات کو ایک سال گزر چکا ہے۔“

”کاردار صاحب۔“ زمر مسکرا کے اس کی طرف گھوئی۔ ”آپ بہت خاص آدمی ہیں، بڑے آدمی ہیں۔ امیر۔ بادشاہ لوگ۔ کبھی اپنے محل سے نکل کر اس ملک کی سرکوں پر دیکھیں۔ ماشاء اللہ سے روٹی ہو یا نہ ہو، ہر دوسرے عام آدمی کے پاس یا تو اسارت فون ہے یا میں فون کے تعلق تمام آپ ڈیس ہیں۔ خود نیاز بیگ کی گرفتاری کے وقت ان کے پاس سے دو قسمی اسارت فونز نکل تھے۔ یونواد....“ وہ نیاز بیگ کی طرف گھوئی جواب جلدی وضاحت دے رہا تھا۔ ”آپ موقع پر نہ تھے نہ آپ نے سعدی یوسف پر حملہ کیا تھا۔ مجھے مزید کوئی سوال نہیں پوچھنا۔“

اب ہاشم اور زمر ایک ساتھ بول رہے تھے۔ مچھلی منڈی کی سی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسے میں سعدی پیچھے اس کے ساتھ آبیٹھا۔

”تحیک یو۔“ اس نے فارس کا شکریہ ادا کیا۔

”یور ویکم۔“ اس نے سعدی کا کندھا تھپٹھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر زمر اب اگلی تاریخ مانگ رہی تاکہ خین یوسف کو پیش کر سکے جو ناسازی طبع کی وجہ سے آج پیش نہیں ہو سکی تھی۔ نیاز بیگ کے چہرے کے سارے رنگ اٹھ چکے تھے اور وہ بار بار گھبراہٹ سے خوکو گھورتے ہاشم کو دیکھتا تھا۔ اسے اب ہاشم سے کون بچائے گا، یہ سوچ جان لیواتھی۔

.....❖❖❖.....

مستقل صبر میں ہے کوہ گراں ..... نقش عبرت صدا نہیں کرتا!

فوڈی ایور آئر شام کے نیلگوں اندر ہیرے میں جگنگا رہا تھا۔ ندرت کا ڈنٹر پکھڑے ہو کر فون پر چھنجھلا کر کسی وینڈر سے پچھ کہہ رہی تھیں، جب ان کی نگاہ دروازے پر پڑی اور لمحے بھر کے لئے وہ مخدود ہو گئیں۔

چوکھت میں ہاشم کاردار کھڑا تھا۔ اپنے تھری پیس کی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ مسکرا تا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ ندرت نے فقرہ ست روی سے مکمل کیا۔ وہ قدم قدم چلتا آگے آیا اور سیر ہیاں چڑھنے لگا۔ ان کے بالکل ساتھ سے گزر تھا وہ۔ ان کو نظر انداز کر کے وہ پلٹ کے اسے جاتے دیکھنے لگیں۔ وہ واقع تھا کہ زمر کہاں ملے گی مگر پہلی دفعہ آنے کے باعث گردن گھما گھما کے وہ ریسورانٹ دیکھ رہا تھا۔

ندرت کی نگاہوں نے تب تک اس کا پیچھا کیا جب تک وہ اوپری ہاں کے دروازے کے پیچھے گم نہ ہو گیا۔ زمر اپنی مخصوص میز کرتی پر موجود تھی۔ میبل لیپ جلا ہوا تھا، چھت پر لگافانوس بھی روشن تھا، اور وہ کہداں میز پر جمانے کام کر رہی تھی جب دروازہ کھلنے کی آہٹ پر آنکھیں انھائیں۔ ہاشم کو وہاں دیکھ کے بلوں پر قلعہ مسکراہٹ در آئی۔ وہ مسکراتا ہوا ”گڈا یونگ“ کہتا سامنے آیا اور کری کھنچنگی۔

”آئیے کاردار صاحب۔ بیٹھئے۔ کیا خدمت کر سکتی ہوں میں آپ کی۔“ وہ بظاہر خوش دلی سے بوقلم بند کر کے پیچھے ہو بیٹھی۔

”پہلے تو چائے منگوائیں، لیکن بغیر شوگر کے۔“

زمر نے اندر کام انھیا اور بولی۔ ”جنید، اوپر دو کافی بھجیں۔“ اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ گھنگری لے بال اوپنی پوپنی میں پاندھے وہ کورٹ کے صحن والے سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ (کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔) باہم پھنسنے ہاتھوں میں نیلے پھر والی انگوٹھی دمک رہی تھی۔ ”اچھا ہے ریشور انت۔“ وہ ستائشی انداز میں سر کو ختم دے کر کہہ رہا تھا۔ انسریر اچھا ہے، تریڈیشنل ہے۔ تھوڑا ساماڑن بچ بھی آ رہا ہے جو کوئی نہیں آنا چاہیے، لیکن خیر ہے۔ وال کلر بدلا چاہیے۔“

”ایک دفعہ کیس سے فارغ ہو جائیں، پھر ری ماڈلنگ کریں گے اس کی۔“

”اوہ زمر!“ وہ افسوس سے گھری سانس لے کر بولا۔ ”miss old times“ آواز میں ملال بھی تھا۔ اس پر نگاہیں جمانے وہ یاد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”آپ ذی اے تھیں، سوری پر اسکی پیوڑ۔ میں آپ کے آفس میں آتا تھا، ہم ایک ساتھ چائے پیتے تھے، بہت سے کیسز کی ڈیل فائل کرتے تھے، حکومت کا وقت اور پیسہ بچاتے تھے۔ اچھے دن تھے وہ۔“

”آپ کو کبھی افسوس ہوا بہاشم؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جو آپ نے میرے ساتھ کیا، اس پر؟“

”بہت زیادہ!“ اس نے اثبات میں سر ہالا یا۔ میک لگائے، ناگ پٹا نگ پٹا نگ چڑھا کے بیٹھا، وہ یاد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے زندگی

میں سب سے زیادہ ملال اسی بات کا ہے، میں نے آپ سے وہ خوشی لے لی جو مجھے سو نیا کوپانے سے ملتی تھی۔ آئی ایم سوری زمر!“

”بہت شکریہ۔ خیر۔ یہا چا نک آپ کیوں آئے ادھر؟“ وہ گھری سانس لے کر بولی۔

”میں کافی بور ہو چکا ہوں ٹرائل سے۔“ اس نے تھوڑی پٹا خن رگڑتے ہوئے سوچنے والا انداز اپنایا۔

”یا شاید چیزیں آپ کے خلاف جانے لگی ہیں۔“

”ڈیل کر لیتے ہیں زمر! اس کیس کو ختم کر دیتے ہیں۔ چلیں، صلح کرتے ہیں۔“

”مجھے سوچنے دیں۔“ زمر نے کچی پکڑ کے سر جھکا کے آنکھیں بند کیں، پھر دیکھنڈ بعد ہاتھ نیچے گرایا اور آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ ”میں نے بہت سوچا، مگر نہیں۔ میں اس کیس کو جیتنے میں اندر مبتڑ ہوں۔“

”میں دیت دینے کو تیار ہوں۔ خون بہا۔ name a price۔“

”جتنی آپ دے سکتے ہیں اس سے دگنی رقم میں آپ کو دیتی ہوں، بد لے میں نوشیر وال کو ہمارے حوالے کر دیں۔“

”صرف شیر و کیوں؟ میں کیوں نہیں؟“

”اس کا جواب میں فیصلہ آنے کے بعد دوں گی۔ اور کچھ کہنا ہے آپ نے؟“

”زمر میں ہار نہیں رہا۔“ وہ سمجھا نے والے انداز میں آگے کوہا اور ہمدردی سے اسے دیکھا۔ ”میں جیت جاؤں گا۔ آپ کے پاس ایک بھی کریڈیبل گواہ نہیں ہے۔ لیکن.... فیصلہ آنے تک آپ لوگ بہت کچھ کھوچکے ہوں گے۔ چاہے وہ عزت ہو، نیک نامی ہو یا جان ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کا مزید نقصان کروں۔“

”اگر آپ کا دل اتنا ہی افسر دہ رہتا ہے ہمارے مستقبل کا سوچ سوچ کے تو آپ ہمارا نقصان کرنے کا سوچتے ہی کیوں ہیں؟ یا شاید یہ باتیں کہہ کر آپ خود تو تکمین دیتے ہیں، کہ میں کتنا اچھا ہوں، میں یہ لوگ مجھے برا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔“  
وہ لہکا ساہنس دیا۔ ”آپ نہیں مانیں گی؟“

”آپ کو میرا جواب معلوم ہے۔ اور آپ اس ڈیل کے لئے یہاں آئے بھی نہیں۔ کیوں نااب آپ وہ بات کریں جس کے لئے آپ یہاں آئے تھے۔“

ہاشم مسکرا کے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ”میں نے آپ کو ہمیشہ بہت admire کیا ہے۔ گو کہ آپ کے پیچھے آپ کو گھمنڈی اور مغرور کہتا رہا ہوں میں، مگر آپ کے ساتھ کام کر کے اچھا لگتا ہے مجھے۔ میں یہاں صرف اس لئے آیا ہوں کہ میں ان اچھے پرانے دنوں کو بھی کبھی مس کرتا ہوں۔ میں چاہتا تھا ایک آخری بار ان دنوں کی یاد تازہ کروں۔ شاید پھر دوبارہ آپ کے ساتھ اس طرح بیٹھنے کا موقع نہ ملے۔“  
”کیا آپ مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں؟“

”میں کچھ نہیں کرنا چاہتا زمر۔ آپ مجھے مجبور کریں یہ الگ بات ہے۔ آپ کی کافی نہیں آئی!“ وہ اٹھتے ہوئے کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے بولا تھا۔ چہرہ پر سکون تھا۔ اور آنکھوں میں مسکرا ہٹتی۔

”جب میں جنید کو دو کافی لانے کا کہتی ہوں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ٹھیک دس منٹ بعد دروازے پر آ کر کہے کہ میرے چند اہم مہماں آئے ہیں تاکہ میں جلدی جان جھٹکا سکوں۔“ تبھی دروازہ کھلا اور جنید نے اندر جھا کا۔ ”میم، آپ کے مہماں آئے ہیں۔“  
زمر نے مسکرا کے ابر واچکا کے ہاشم کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ پھر میز پر دنوں ہاتھ رکھے جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں آپ کو مس کروں گا۔“ اس کی آواز میں کچھ ایسی ٹھنڈکی تھی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑ گئی۔ مگر بظاہر مسکراتی رہی۔ ”اور کچھ؟“

ہاشم نے کوٹ کی اندر ورنی جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ رکالا اور اس کے سامنے رکھا۔

”کچھ دن سے میں اپنی ماں کی کی گئی تمام فناٹل transactions کا حساب کتاب کر رہا تھا تو فارس کی دوسری گرفواری کے وقت، جب آپ اس کا کیس لڑ رہی تھیں، مجھے چند بے ضابطگیاں ملیں۔ معلوم کروانے پر علم ہوا کہ.... خیر جو علم ہوا وہ آپ کے ذاکر نے اس کاغذ پر لکھ دیا ہے۔ میں اس سب سے ناواقف تھا۔ پھر بھی مذعرت کرتا ہوں۔ اور صرف یہ چاہتا ہوں کہ جدا ہونے سے پہلے آپ اپنے بارے میں ساری حقیقت جانتی ہوں۔“ لفافہ رکھ کے وہ اسے چونکتا چھوڑ کے مرڈ گیا۔ دروازے تک پہنچ کے وہ مڑا۔

”ان دیواروں پر taupe کلر کا پینٹ ہونا چاہیے۔“ خلوص سے مشورہ دیا اور باہر نکل گیا۔ زمر تیزی سے لفافہ چاک کر رہی تھی۔ اس کے ابر واکٹھے ہوئے تھے اور لب بھیجنے ہوئے تھے۔

ندرت ابھی تک کاؤنٹر کے قریب کھڑی تھیں۔ بس چپ سی۔ وہ ان کے قریب سے گزرنے لگا تو رکا۔

”آپ کو چاہیے کہ اپنی بیٹی کو عدالت کی بھیث نہ چڑھائیں، اس کی عزت ایک دفعہ چلی گئی نا تو اپنے نہیں آئے گی۔“ نرمی سے ان کو دیکھ کر دھیرے سے بولا تھا۔ ندرت کی آنکھیں اسی طرح اس پر چھپی رہیں۔

”اکثر رات کو تیس پڑھتے پڑھتے میں سوچتی ہوں تمہارا انجام کیسا ہوگا، ہاشم۔ پھر میں کوشش کرتی ہوں کہ اس انعام کی نسبت سے تمہارے لئے بدعا کروں، مگر نہیں کر پاتی۔ تمہاری سب سے بڑی سزا پتہ ہے کیا ہونی چاہیے؟ تمہیں ہدایت مل جائے، اور پھر تم ساری زندگی اپنے گناہوں کو یاد کر کے پچھتا تر رہو۔“

”تھیک یو۔ واث ایور!“ وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گیا۔ ریشورانٹ کے مہماں مژمڑ کے اس کو دیکھ رہے تھے۔ ستائش سے۔

مرعوبیت سے تحریر سے۔ سب کی نظریں مختلف تھیں۔ مگر پھر سب کی نظریں ایک سی ہوتی تو یہ دنیا تو جنت ہوتی!

❖❖❖

اجڑ بن میں اترتا ہے ایک جگنو بھی ..... ہوا کے ساتھ کوئی ہم سفر بھی آتا ہے  
سرک رات کے اندر ہرے کے باعث تاریک بھی تھی مگر جا بجا لگے اسٹریٹ پولز کی تیز روشنی کے باعث روشن بھی تھی۔ وہ سامنے دیکھتا تو جس سے ڈرائیور کو رہا تھا جب موبائل اسکرین چمکی۔ فارس نے مصروف انداز میں اسے اٹھایا، مگر اگلے ہی لمحے تیزی سے بریک پہ پاؤں رکھا۔ آبی نے لکھا تھا۔

”ہاشم نے مجھے یہ تصویر بھیجی ہے۔ ساتھ لکھا ہے He cannot protect his women۔ میں کیا کروں؟“ اور یہ پیش تصویر میں وہ دونوں .... فارس اور آبی .... ایئر پورٹ سے نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ فارس نے آنکھیں بند کیں۔ (میں نے اسٹریٹ کو کتنا نقصان پہنچا دیا۔ اف) پھر وہ جلدی جلدی لکھنے لگا۔

”کہاں میں آپ؟ میں آرہا ہوں۔“

قریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ ہارون عبید کی رہائشگاہ میں بنے لان میں کھڑا تھا۔ سامنے ادا نظر آتی آبدار موجود تھی، اور وہ اسے تسلی دینے والے انداز میں بتا رہا تھا۔

”میں نے آپ کی سیکیورٹی ٹیم ری اسمبل کر دی ہے۔ آپ کے فون میں ایک ایپ بھی ڈال دی ہے، جس کے ذریعے آپ جہاں بھی ہوں گی، مجھے خبر ملتی رہے گی۔“

آبدار نے اثبات میں سر ہلا�ا۔ نگاہیں اس کے چہرے پہ جمی تھیں۔

”میں نے آپ کو اس مصیبت میں ڈالا ہے، میں نکال بھی لوں گا۔ ڈونٹ وری۔“

”اگر اس نے مجھ سے کچھ پوچھتا تو؟“ وہ ڈری ہوئی نظر آتی تھی۔

”تو سارا الزرام میرے اوپر ڈال دیجئے گا۔ میں نے آپ کے والد کی زندگی کو نشانہ بنا کر آپ کو بلیک میں کیا۔ کچھ بھی کہہ دیجئے گا۔ مگر نہیں کہنا کہ آپ نے اپنی خوشی سے سب کیا۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”میں آپ پر الزرام ڈال دو؟ اتنی خود غرض لگتی ہوں میں آپ کو؟“

”بس وہی کریں جو میں نے کہا ہے۔ مجھ پر الزرام ڈالیے گا۔ بس۔“ وہ ہاتھ اٹھا کے قطیعت سے کہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب بے بس بھری فکر مندی بھی تھی۔

”وہ مجھ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا فارس۔ اس نے آپ سے منسوب عورتوں کی بات کی ہے۔ میں تو آپ سے منسوب نہیں ہوں۔“

”جو بھی ہے۔ میں اس دفعہ اس کو اپنے سے جڑے لوگوں کو نقصان نہیں دینے دوں گا۔“ اس کی آواز میں بہی در آئی۔ آبدار ہلکا سماں کرائی۔ (تو یہ تھی فارس غازی کی کمزوری جس پر وہ دوڑا چلا آیا تھا۔ اس کی حمیت۔ بے بسی کا وہ احساس کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا پہلے۔)

”کاش میرے بابا بھی آپ جیسے ہوتے۔ اپنی عورتوں کے لئے اتنے ہی کمیرنگ ہوتے۔ جبکہ وہ تو اندر بیٹھے اس بات پر خوش ہیں کہ مجھے آپ کی شکل میں ایک ہاؤسی گارڈ مل گیا۔ اب وہ اس بات کو بھی کسی طرح ہاشم پر دباوڈا نہ کے لئے استعمال کریں گے۔“  
فارس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے پھر بند کر دیے۔ آبدار کی مسکراہٹ گھری ہوئی۔

”ہاں وہ سب تھے ہے۔“ وہ چونکا۔

”میں نے تو کچھ نہیں پوچھا۔“

”مگر پوچھنا تو چاہتے تھے نا۔ مجھے میں بتاتی ہوں۔“ اس نے لان چیئر کی طرف اشارہ کیا تو وہ دھیرے سے کری ٹھیک کے بیٹھا۔ وہ ہر آخری موڑ پہ ایک نئی سڑک کھو دیتی تھی اور وہ چاہتے ہوئے بھی مجھے پہ مجبور تھا۔

اب وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی، اور نظریں کیاریوں میں لگے پھولوں پہ جائے ہوئے تھی۔

”وہ اسکینڈل سچا ہے۔ میری ماں کے بارے میں مسز کاردار نے خبریں چھوپائیں تھیں اخبار میں۔ کہ وہ فلاں شخص کے ساتھ۔“ اس نے تکلیف سے سر جھکا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ ”پھر بابا نے میری ماں کو قید کر دیا۔ کلبو کے اسی تہہ خانے میں۔ کریل خاور نے اس جیل کو بنایا تھا اور اس میں جھول رکھتے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ ان کو نکال کر لے جاسکے۔ ہم لوگ کراچی چلے گئے۔ بابا نے سیاست ترک کر دی۔ ہم گناہ کی زندگی رہنے لگے۔ فون نمبر زبدل دیے۔ سو شلا نرگ چھوڑی دی۔ مگر ماں کو نہیں چھوڑا بابا نے۔ اس کے سوکس اکاؤنٹ میں کافی رقم پڑی تھی۔ بلیک منی جو لاثر کر کے ادھر بھیجی گئی تھی۔ مگر ماں کو پہنچتا کہ جس دن اس اکاؤنٹ کا کوڑ ان کو دے دیا، یہ لوگ ان کو مار دیں گے۔ انہوں نے ہر تشدید سہا مگر اکاؤنٹ نہیں دیا۔ پھر ایک دن خاور ان کو نکال کر لے گیا مسز جواہرات کے پاس۔ جو کام اتنے عرصے کا تشدید نہ کر سکا، وہ مسز کاردار کے چند میٹھے بلوں، ہمدردی اور اعتماد نہ کروادیا۔ میری ماں نے ان کو ساری معلومات دے دیں، اور کہا کہ وہ پیسے ان کو نکلوادیں تاکہ وہ روپوش ہو سکیں۔ وہ زخمی تھیں، ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتی تھیں۔ مسز کاردار نے اس اکاؤنٹ کو اپنے قبضے میں کیا، ان سے مختلف کاغذات پر دستخط کروائے اور پھر ان کو مرادیا۔ وہ بہت بڑی رقم تھی اور وہ آج بھی انہی کے پاس ہے۔ صرف رقم بلکہ میری ماں کے لاکر میں چیزوں بھی بہت تھی۔ مسز کاردار صرف ان سے بدلہ لینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے بابا کو مسز کاردار سے چھینا تھا۔ اس دن سے بابا ان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔“ وہ بولے جارہی تھی اور وہ نے جارہا تھا۔ غور سے توجہ سے۔

”مجھے بابا کا ان کی طرف التفات دیکھ کر ڈر لگتا تھا کہ بابا ان کو اپنا ہی نہ لیں مگر اب میں جان گئی ہوں کہ وہ صرف ان کو اذیت دینا چاہتے تھے۔ مسز کاردار مجھے پسند کرتی تھیں، ہاشم کے لئے، مگر جب سے میں نے ان کو بلیک میل کرنا شروع کیا ہے وہ میری سب سے بڑی دشمن بن گئی ہیں۔“

”ہاشم کو آپ کب سے جانتی ہیں؟“ اس نے اپنا سیت سے پوچھا تھا۔ آبدار ابھی تک کیاری کو دیکھ رہی تھی، اور اس سے ذرا سا مسکرائی۔ ”اس نے میری جان بچائی تھی۔ میں سمندر میں ڈوب گئی تھی۔ وہ مجھے باہر لایا تھا، اس نے مجھے نی زندگی دی تھی۔“ ”اور تب سے ہی آپ دوسروں کے NDEs میں دلچسپی رکھنے لگی ہیں؟ آپ خود بھی چند لمحے کے لئے کلینکل ڈیتھ کا شکار ہوئی تھیں شاید۔“

آبی نے چونک کے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آکر گزر گئے۔ جیسے وہ بیجان کا شکار ہوں۔

”آپ کلینکل ڈیتھ کے تجریبات پر یقین رکھتے ہیں؟“

”نہیں آبدار۔ مجھے لگتا ہے یہ لوگ خواب دیکھتے ہیں اور اس کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔“

”وہ خواب نہیں تھا۔“ آبی نے آنکھیں بند کیں۔ ”وہ حقیقت تھی۔ میں نے پہلی دفعہ جانا تھا کہ روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میری روح میرے جسم سے نکل گئی تھی۔ پانی کے اندر سے ہوتی ہوئی وہ ایک گہری تاریک سرگ سے گزری تھی۔ سرگ بہت بھی تھی۔ اختتام پر وہ تھی۔ میں بہت بیکھی ہو گئی تھی۔ ہوا سے بیکھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں اپنے جسم سے اوپر اٹھ گئی ہوں۔ اور یونچے میں نے دیکھا وہ مجھے پانی سے باہر لارہا تھا۔ اس کی شرث کی پشت پیسی چپکی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے وہ منظر....“

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک آڑتھی... سفید لکیر... مگر وہ لکیر نہیں تھی وہ پچھے اور تھا۔ اس کے پار میری ماں کھڑی تھی۔ اور ایک کزان جو پچھے عرصہ پہلے فوت ہوا تھا۔ وہ مجھے واپس مڑنے کو کہ رہے تھے۔ شاید وہیں میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک روشنی سے بناد جو تھا۔ انسان نہیں۔ بس ایک جو، جو، تھا۔ A being of light۔ سر اپا نور۔ اس سے پھونٹے رنگ بدل رہے تھے۔ سرخ ہو رہے تھے جیسے وہ غصے میں ہو۔ وہ مجھے سے خفا تھا۔ میں نے بہت لوگوں کے انزو یو کیے، یہودی، عیسائی، ہندو، حتیٰ کہ athiests کے بھی۔ وہ کسی سے خفانہیں تھا۔ کسی نے اس کے بدلتے رنگ نہیں دیکھے۔ تو میں نے کیوں دیکھے؟ سب کو اس نے علم حاصل کرنے کا اور لوگوں سے محبت کرنے کا پیغام دیا۔ میرے اوپر اس نے غصہ کیا۔ پچھہ کہا نہیں۔ بس غصہ، طیش... غضب.... یہی محسوس ہوا مجھے۔ کیوں؟"

"کیونکہ آپ نے خود کشی کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بلکا سامسکرا کے بولا۔ وہ بالکل ٹھہر گئی۔ یک نک ساکت سی اسے دیکھے گئی۔

"آپ اپنے والد کی توجہ کے لئے خود کشی کرنے جا رہی تھیں۔ آپ نے پہلے بتایا تھا ایک دفعہ۔ یہ جان اتنی ارزال نہیں ہوتی کہ اسے یوں ضائع کیا جائے۔ کبھی کسی خود کشی کر کے واپس آنے والے مریض کا انزو یو کیا آپ نے؟"

آلی نے غنی میں سر ہلایا۔ "جو اپنی جان کو بے مقصد بلا کرت میں ڈال دیتے ہیں یا دوسروں کی جانوں کے ساتھ کھیلتے ہیں، وہ تو بے کیے بغیر مر جائیں تو قابلِ معافی نہیں ہوتے۔ اس لیے شاید اس نے آپ پر غصہ کیا ہو۔" پھر گھڑی دیکھا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اب چلتا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو بتائیے گا۔"

آلی نے بدقت اثبات میں سر ہلایا۔ "حصینک یو۔ مسز زمر کو میر اسلام کیجیے گا۔"

"شیور۔" وہ گھری سانس لے کر پلٹ گیا۔ آبدار کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

خالی دامن سے شکایت کیسی؟..... اشک آنکھوں میں تو بھر جاتے ہیں!

خین نے آج پھر سبق نہیں سنایا تھا۔ میونک کا فون آیا تو اس نے سر درد کا بہانہ کر دیا لیکن وہ اصرار کرنے لگی کہ تھوڑا سا قرآن سے دیکھ کر ہی سناؤ! بس ناغمنہ ہو۔ تب وہ دھوکر کے اپنے بیٹہ پا آبیٹھی اور قرآن کھول لیا۔ سورہ مریم آج کل وہ حفظ کر رہی تھی۔ صفحے سے دیکھ کر سنانے لگی۔ چند آیات کے بعد ہی اس کی سانس احتل پھتل ہونے لگی مگر وہ ملاوت کرتی رہی۔

"(کہا براہیم نے) اے میرے باپ بے شک مجھے خوف ہے کہ تم پر اللہ کا عذاب آئے پھر شیطان کے ساتھی ہو جاؤ۔ کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبدوں سے پھرا ہوا ہے البتہ اگر تو بازن آیا میں تجھے سکسار کر دوں گا اور مجھ سے ایک مدت تک دور ہو جاؤ۔ (ابراہیم نے) تیری سلامتی رہے اب میں اپنے رب سے تیری بخشش کی دعا کروں گا بے شک وہ مجھ پر بڑا ہم بران ہے۔ اور میں تمہیں چھوڑتا ہوں اور جنمیں تم اللہ کے سوابکار تے ہو اور میں اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا۔ پھر جب ان سے علیحدہ ہوا اور اس چیز سے جنمیں وہ اللہ کے سواب پختے تھے، ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیا اور ہم نے ہر ایک کو نبی بنایا۔ اور ہم نے ان سب کو اپنی رحمت سے حصہ دیا اور ہم نے ان کے لیے "لسان الصدق" (نیک نامی) بنائی۔" (42-50)

سانس مزید پھول گیا تو اس نے بس کر دی۔ اور اجازت مانگی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ تیرس پا آبیٹھی اور کتنی ہی دیر یونی بیٹھی رہی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا، ڈپریشن ساڈ پریشن تھا۔ اور تب اس کی نظر کا لوٹی میں دور ایک درخت سے نیک لگائے شخص پہ پڑی۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا اس عام سے مورچاں کو بہت حرست سے دیکھ رہا تھا۔ تاریکی کے باوجود وہ اس کی آنکھیں پڑھ سکتی تھی۔ وہ تیری سے نیچے کو بھاگی۔ "نوشیر وال بھائی!" چند منٹ بعد وہ اپنا گیٹ عبور کر کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کے سیدھا ہوا مگر خاموش

ویران آنکھوں سے اسے دیکھا رہا۔

”آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟ جانتے ہیں نا، کورٹ میں یہ بات آپ کے خلاف جاسکتی ہے؟ اس لئے چلتے بنیں۔“ درشتی سے وہ بولی تھی۔

”لوزر... پر لوزر... یہی کہا تھا نام نے مجھے۔ اگر پیچھے مڑ کے دیکھو تو یہ سب تمہاری زبان کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔“ وہ تلخی سے بولا تھا، ایسی تلخی جس میں ملال زیادہ تھا۔ خین چونکے واپس گھومی۔ ”کیا؟“

”تم دونوں کو کبھی احساس ہوا خین کرم لوگ اپنے احساس برتری میں مجھے کتنا بہرث کر جاتے تھے؟ میری کتنی بے عزتی کرتے تھے؟ اور آئی ذونٹ کشیر اگر تم یہ سب ریکارڈ بھی کرو۔ لیکن میں نے جو کچھ کیا وہ اس لئے کیا کیونکہ تم دونوں نے مجھے ہمیشہ بے عزت کیا۔ کبھی میری عزت نہیں کی۔“

”صحیح!“ خین نے سینے پہ بازو پیٹ لئے اور سر کو ختم دیا۔ ”میں نے واقعی آپ کو بہت ڈی گریڈ کیا ہے۔ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”لیکن اس کے باوجود میں پورے ملک میں بدنام ہو چکا ہوں، اور تمہارا بھائی دو قتل کر کے بھی بدنام نہیں ہوا۔ اس کے خلاف انکو اڑنی نہیں ہوتی۔ وہ ہر دفعہ تجھے جاتا ہے۔ کوئی ایک لمحے کے لئے بھی کیوں نہیں سوچتا کہ وہ اور تم... تم دونوں بھی میرا دل دکھاتے تھے۔“ وہ دکھی دل سے کہہ رہا تھا، گویا پھٹ پڑا تھا۔

”کیونکہ ہم ”لوگ“ تھے اور ”لوگ“ باتیں کرتے ہیں نو شیر و اس بھائی۔ لوگوں کا کام ہی باتیں کرنا ہے۔ آپ کو لوگوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن آپ بھی کیسے پرواہ نہ کرتے۔“ وہ تلخی سے ہلاکا سماں کرائی تھی۔ ”جب لوگ ہمارے بارے میں باتیں کرتے ہیں تو وہہت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمیں لگتا ہے ہماری عزت خراب ہو گئی ہے۔ ہم دوبارہ سراہٹا کے نہیں جی سکتیں گے۔ ہمارا خاندان ہمیں رسوا کر دے تو لگتا ہے ساری زندگی ہی ختم ہو گئی ہے۔ بدکاری کی سزا سنگار کرنا ہوتا ہے۔ سرعام پتھر مار کر ہلاک کرنا۔ یہ ایک توہین آمیز سزا ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں ابراہیم علیہ السلام کو ان کے والد نے یہی سزا سنائی تھی۔ ان کی عزت ختم کرنے کے لئے۔ کیونکہ لوگ ان کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ ان کے بتوں کو زمین بوس کرنے والا ہے ایک نوجوان... کہتے ہیں جسے ابراہیم۔ وہ سچے تھے مگر زمانے بھرنے ان کے خلاف باتیں کیس سازشیں کیں۔ ان کو تباہ کر دیا۔ ان کی عزت ختم ہو کر رہ گئی۔ ان کو ان کے گھر سے نکال دیا گیا، جب آگ میں نہ جلا سکے تو ملک سے نکال دیا۔ پھر کیا ہوا؟“ وہ لمحے کھڑکو خاموش ہوئی۔ شیر و یک نیک اسے دیکھ رہا تھا۔

”پھر یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے الخلق بھی دیے، اسماعیل بھی، اور یعقوب بھی۔ ان کو اللہ نے کعبہ بنانے کا شرف بھی دیا اور ان کے نام کو رہتی دنیا تک ہماری نمازوں کا، ہمارے درود کا حصہ بنادیا۔ تین بڑے ادیان کے پیروکار یہود... عیسائی... مسلمان... اس بات پہ جھگڑتے ہیں کہ ابراہیم ہمارا ہے۔ سب انہی کو اپنا ناتھا جاتے ہیں، ان کو اپنے دین میں داخل دکھانا جاتے ہیں جن کو ان کے گھر والوں نے نکال دیا تھا۔ جن کی وہ لوگ عزت نہیں کرتے تھے۔“ وہ بول رہی تھی اور اس کا سانس مزید پھولتا جا رہا تھا۔ اس کی رنگت سرخ پڑ کے تمنا نے لگی تھی اور آواز بلند ہو رہی تھی۔ ”اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے لسان الصدق بنائی۔ پچی زبان۔ پچی تعریف۔ نیک نامی۔ جو رہتی دنیا تک اور اس کے بعد بھی قائم رہے گی۔ مگر ہم نو شیر و اس بھائی، ہم کتنے ہمکھدا لوگ ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمیں بے عزت کریں گے تو ہماری عزت اور نیک نامی چلی جائے گی؟ ہم رسوا ہو جائیں گے؟ لوگ ہمارے بارے میں باتیں کریں گے تو ہم بھی سراہٹا نہیں سکتیں گے؟ تو پھر کون تھا وہ شخص جس نے اپنے وقت کے بڑے بڑے خداوں کو کھلائی امار کے توڑا تھا، جس کے بارے میں سب لوگ بڑی بڑی باتیں کرتے تھے مگر آج اس جیسا نیک نام کوئی نہیں؟ نہیں نو شیر و اس بھائی.... لوگوں کا کام تو ہوتا ہے باتیں کرنا۔ کسی انسان کی عزت لوگوں کی زبانوں سے نہیں بندھی ہوتی۔ لہ وہ زبان کھولیں گے اور عزت گر جائے گی۔ اللہ....“ اس نے انگلی اٹھا کے اوپر اشارہ کیا۔ ”صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے ہر انسان کی

عزت۔ وہ نہ چاہے تو کوئی رسوانیں ہو سکتا۔ اور جانتے ہیں کیوں اچھے بھلے دیندار لوگ ایک دن اچاٹک سے ہماری نظر وہ سے گر جاتے ہیں؟ جب ان کی سیاہ کاریاں سامنے آتی ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بد گئے ہیں، مگر وہ پہلے بھی ابجھنے نہیں تھے۔ ان کی نسبت شروع سے خراب تھی اور شروع میں اللہ نے ان کو چانس دیا مگر جب انہوں نے اپنی نسبت درست نہ کی تو اللہ نے ان کی تمام محنتوں اور کوششوں کو انہی کے ہاتھوں برے کاموں میں لگایا، یوں ان کی نتیجیں سب پہلی گئیں۔ انسان بربی نسبت نہ رکھے تو اللہ اسے کبھی رسوانیں کرتا۔ یہی پوچھنا چاہتے ہیں تھے نا آپ۔ بھی ہے آپ کا جواب۔ کسی کی عزت کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہمارا سارا خاندان ہماری بے عزتی کرے گا تو اللہ اس سے کوئی زیادہ لوگ پیدا کر دے گا جو ہماری عزت کریں گے۔ اگر ہم نے اپنے گناہوں پر معافی مانگ لی ہے، اور دوسروں کا بھلا سوچنے لگ گئے ہیں نا، ہماری نسبت درست ہے نا، تو اللہ ہمیں کسی انسان کے ہاتھوں رسوانیں کرے گا۔ اگر ہم انسانوں کی بھلانی سوچیں، اور اپنی نسبت کو نیک کر لیں تو ملے گی ہمیں درست ہے نا، تو اللہ ہمیں وہ عزت جسے کوئی انسان داغ دار نہیں کر سکے گا۔ اسلئے ان بتوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ کلہاڑا مار کے ان کو توڑ دینا چاہیے۔ کوئی ہمارے گھر کی غلطیوں کی کہانیوں کے مرد کردار اگر ہم عام اڑکیوں کو یہ کہہ کے دھمکائیں کہ وہ ہماری تصاویر یا ہمارے راز پوری دنیا کو دکھادیں گے تو ان کو کہنا چاہیے کہ جاؤ جاؤ... دکھادو سب کو۔ تم پھر بھی مجھے رسوانیں کر سکتے۔ دنیا کے سارے بد کردار مردا کٹھے ہو جائیں وہ تب بھی تاب ہوئی ہم عام اڑکیوں کو رسوانیں کر سکتے۔ یہ ہوتی ہے تو بے اور اچھی نسبت۔ عزت پانا چاہتے ہیں نا آپ؟ تو لوگوں کی بھلانی کے لئے کام کرنا شروع کریں۔

میں بھی عزت پانا چاہتی ہوں اس لئے میں اب ذرے

بغیر دوسروں کا سوچوں گی۔ اپنے بھائی کا سوچوں گی جس کے لئے مجھے گواہی دینی ہے۔ بھرتیر مارنا پڑے یا کلہاڑا اللہ شاہد ہو گا کہ میری نسبت بری نہیں تھی۔ اس کی گلابی آنکھوں سے آنسو بہر ہے تھے۔ چہرہ دہک رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سن ساہوا سے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اب اندر کی طرف مڑتی تھی مگر وہ ہنوز وہیں کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ کی بازگشت ابھی تک کالونی کے درختوں سے ٹکرائکرا کے پلٹ رہی تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

کرب چہرے سے ماہ و سال کا دھویا جائے ..... آج فرست سے کہیں بیٹھ کے رویا جائے  
فارس جس وقت کرے میں آیا، وہ بیڈ پر کروٹ لئے لیٹی تھی۔ رخ دوسرا طرف تھا۔ آنکھوں پر بازور کھے ہوئے تھی۔

”محترمہ... وہ دن کب آئے گا جب میں گھر آؤں گا اور آپ میرے کسی جرم کی پاداش میں مجھ سے خفانیں بیٹھیں ہوں گی؟“ وہ سکھار میرز کے قریب کھڑا، گھڑی اتارتے ہوئے، مسکراہت دبائے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا جو ہنوز کروٹ لئے لیٹی نظر آرہی تھی۔ ”تو پھر پاکستان پیش کوڈ کی کوئی دفعہ کے تحت میرے اوپر آج چار جز فریم کیے جائیں گے؟ میں آپ سے بات کر رہا ہوں، زمری بی۔“ گھڑی اتارت کر کھلی اور آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے شرٹ کے آستین مورٹنے لگا۔

”نہیں لگایا میں نے اس کا دیا ہوا پر فیوم۔ پھر کیا ہوا ہے؟ کس بات پر ناراض ہو؟“ وہیں سے اسے پکارا۔ وہ نہیں ہلی۔ نہ کوئی جنبش، نہ آواز۔ وہ پہلے قدرے حیران ہوا، اور پھر گھوم کے اس کی طرف آیا۔ وہ چہرے پر دونوں بازوں پر بازور کھے ہوئے تھی، مگر جتنا چہرہ نظر آرہا تھا، وہ گلیا تھا... بے حد گلیا۔

”زمر... کیا ہوا ہے؟“ وہ ششدہ رسا اس پر جھکا، اور اس کے بازو ہٹائے۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ چہرہ سامنے آیا تو وہ یونچ فرش کو دیکھتی روئے جا رہی تھی۔ پلکوں پر اتنا پانی لدا تھا کہ حد نہیں۔ ”کیا ہوا ہے؟ اٹھو بیٹھو۔“ وہ حیران پریشان سا سہارا دے کر اسے بٹھانے لگا۔ اس نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی، بس ڈھیلی سی اٹھ

کے بیٹھ گئی۔ گھنگریا لے بالوں کی پونی ڈھیلی پڑ چکی تھی اور شدت گر یہ سے ناک اور آنکھیں گلابی ہو کے دھک رہی تھیں۔

”مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ کبھی وہ اس کوشانوں سے تھام کر اپنی طرف موڑتا، کبھی اس کا چہرہ تھپتھپاتا۔ ”ادھر دیکھو۔ مجھے بتاؤ۔ کیا ہوا ہے؟“

”مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ میں عام نہیں ہوں۔ بلکہ عام لوگوں سے بہت مختلف ہوں۔ برتر ہوں۔“ وہ رو تے ہوئے بھگیوں کے دوران بولی تھی۔ وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے لگتا تھا میں چونکہ پر اعتماد ہوں، مضبوط ہوں، ایک کریڈیٹ میٹھی ہے میری تو ہاشم مجھے کچھ تو سمجھتا ہو گا۔ کورٹ میں مجھے لائسٹ نہیں لیتا تو ایسے بھی نہیں لیتا ہو گا۔“ مجھے لگتا تھا کوئی تو اہمیت ہو گی میری۔ ایک عورت ہونے کی حیثیت سے۔ ایک باہمیت بہادر عورت ہونے کی حیثیت سے۔ مگر نہیں۔ میں تو ان لوگوں کے لئے ایک چیونی سے بڑھ کر نہیں ہوں۔“

”کیا ہوا ہے زمر؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔“ وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ زمر نے بھیکی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”اس لئے مارا پائیا تھا تم نے میرے ڈاکٹر کو؟ اسی لئے نا؟“

فارس ایک دم بالکل گنگ سا ہو گیا۔ ”کیا؟“

”مجھے پڑتے ہے تم نے اسے مارا تھا۔ کیوں مارا تھا؟ آج ہاشم نے بتا دیا ہے۔“

”کیوں مارا تھا؟“ وہ بنا پاک چھپکے اس کو دیکھ کر بولا تھا۔

”جب تم جیل میں تھے تو اس نے مجھ سے جھوٹ بولتا تھا کہ میرا کذبی ناکارہ ہو چکا ہے۔ تم سمجھ گئے تھے، میں نہیں سمجھ تھی۔“ مجھے لگتا تھا میں بہت عقلمند ہوں، مگر میں عام سی بے دوقوف سی عورت ہوں۔ وہ پھر سے بلک بلک کے رو نے لگی تھی۔

”یہ... یہ بتایا ہے اس نے تمہیں؟ بس یہی کیا اس نے یا اس نے کچھ اور بھی؟“ وہ سانس روکے پوچھ رہا تھا۔

”اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا تھا؟ فارس اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا تھا؟“ وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھے چہرہ جھکائے روئے جا رہی تھی۔ ”میں نے کیا بگاڑا تھا ان لوگوں کا۔ میں نے ان کو کب لقصان دیا؟“ بھی ان کا دل بھی نہیں دکھایا پھر کیوں مذاق بنادیا انہوں نے میری زندگی کو؟“ فارس نے گہری سانس لی اور اس کا سراپنے کندھے سے لگایا۔

”آئی ایم سوری، مجھے تمہیں بتانا چاہیے تھا، مگر میں نہیں تھی تمہیں پھر سے توڑنے کی۔“ وہ اس کا سر زمی سے تھکتے ہوئے ملال سے کہہ رہا تھا۔

”تما شہزادیا میری زندگی کو میں کیا ہوں ان کے لئے؟ فارس میں کیا ہوں ان کے لئے؟“ وہ اسی طرح رو تے ہوئے بولی جا رہی تھی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”وہ دن بہت برے تھے۔ تم جیل میں تھے۔ میں اکیلی تھی۔ میں کسی سے اپنا مسئلہ شیر نہیں کر سکتی تھی۔ میں کتنی پریشان تھی۔“ مجھے لگا میں مرنے جا رہی ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے پھر بھی خود کو مرنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتا، دور کسی غیر مردی نقطے پنگا ہیں جمائے کہہ رہا تھا، اور وہ آنکھیں اس کے کندھے پر رکھے روئے جا رہی تھی۔

”ہر روز مجھے لگتا تھا کہ میں مرنے والی ہوں۔ انہوں نے میری ساری امیدیں توڑ دیں۔ مجھے خواب دیکھنے کا موقع بھی نہ دیا۔ میں نے کیا بگاڑا تھا ان کا؟ مجھے کیوں یہ ہر دفعہ پیرتے مسل کر چلے جاتے ہیں۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میرے سر پر توار لٹک رہی تھی۔ زمر نے والی ہے۔ ہر روز یہ الارم بجاتا تھا۔ میں تمہارے ساتھ ٹھیک سے اندر سے خوش بھی نہیں ہو پاتی تھی۔ اندر ہی اندر مجھے ڈپریشن کھارہا تھا۔ میں تی زندگی کو پلان بھی نہیں کر پاتی تھی۔ کیوں کھیلتے رہے وہ میری صحت کے ساتھ؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ٹھیک ہو۔ تمہیں اب کچھ نہیں ہو گا۔“

”اب میں کیسے یقین کروں کہ اب میں زندہ رہوں گی؟ میں مرنے کے لئے تیار تھی۔ میں اپنی تیاری کو کیسے بدلوں فارس؟ میرا اول ٹوٹ گیا ہے۔“ وہ اسی طرح روئے جا رہی تھی۔ سکیوں اور چکیوں کے باعث اس کی آواز غم غنی۔ الفاظ بے ربط اور گلڈ مسے ہو رہے تھے۔ وہ اسے دلا سادیتے ہوئے گھری سوچ میں گم تھا۔

کیا وہ اسے بتائے؟ کیا وہ اسے ایک دفعہ پھر سے توڑے؟ اونہوں۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ زمر کے آنسو بنو ز آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

.....

ٹو میرا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے ..... شوق کمال بھی نہیں ، خوفِ زوال بھی نہیں!

عدالتی کمرے میں آج عجیب تمازد ماخول تھا۔ جواہرات کا رد ادار مطمئنی سیاہ لباس اور ہیروں کی جیولری پہنے شاہزاد انداز میں پہنچی۔ نو شرداں بھی ہر دفعہ کی طرح تیارسا، دیران چہرہ لئے موجود تھا۔ ساتھ بیخاہا شم چھپتی مسکراتی نظروں سے کھڑے میں کھڑی خین کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندہ بھی تھا۔

اس نے کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی شلوار قمیش پہن رکھی تھی۔ گلابی دوپٹہ سر پر لپیٹے، وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے حلف اٹھا رہی تھی۔ آن ماتھے کے کٹے بال ماتھے پر گرنے کی بجائے پن لگا کر پیچھے کو چوٹی میں کس دیے تھے اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ تردازہ چہرے کے ساتھ، بہت اطمینان سے کھڑی تھی۔ مجھ صاحب کری پا پورا گھوسمے اس کو دیکھ رہے تھے۔ زمر کے قریب بیخا سعدی سر جھکائے ہوئے تھا، بار بار اٹھنے کا ارادہ کرتا گلگر زمر روک دیتی۔ ”اسے اکیلا چھوڑ دو گے؟“ اور وہ بیٹھ جاتا۔ آخری کرسیوں پر بیٹھے فارس نے گردن موڑ کے سیم کو دیکھا جس کی نظریں کٹھرے پر جبی تھیں۔ فارس غیر آرام دہ سے انداز میں بولا۔

”تمہیں آج نہیں آنا چاہیے تھا اسامہ۔“

اسامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”اے مورل سپورٹ نہ دوں؟ اکیلا چھوڑ دوں؟ ٹھیک ہے، جب وہ میری الماری سے چالکیں کھا جاتی ہے اور میری کاپی پر نہیں چڑھا کے دیتی تو دل کرتا ہے اس کی گردن مرود دوں، لیکن ہے تو وہ میری بہن نا۔“

”اوے ٹھیک یو اسامہ!“ وہ خنگی سے سر جھنک کے سامنے دیکھنے لگا۔

”اچھا آپ کی عمر کیا ہے؟“ مجھ صاحب نے اس نازک، دبلی پتی، دراز قدم مگر کم عمر بڑی کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ عام شکل و صورت کی تھی اور کمزوری دکھتی تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں چمکدار تھیں اور پیشانی روشن تھی۔ سوال پا اس نے نگاہوں کا رخ ان کی طرف پھیرا۔ ”بانیس سال یور آز،“ مگر مجھ صاحب کو وہ اب بھی ”مایز“ لگ رہی تھی سو سمجھاتے ہوئے بولے۔ ”اچھا ایسا ہے کہ بھی یہ مسز زمر آپ سے سوال کریں گی اس کے بعد وکیل صفائی آپ سے جروح کریں گے اور....“

”جی یور آز،“ قانون شہادت آرٹیکل 132 کے تحت پہلے جس وکیل نے مجھے بلا یا ہے وہ میری chief examiner کریں گی، پھر وکیل صفائی مجھے کراس کریں گے، پھر مسز زمر مجھے دوبارہ سے re-examine کر سکتی ہیں مگر صرف ان باتوں کی وضاحت کے لئے جو کہ اس کے دوران سامنے آئی ہیں، اس کے بعد ہاشم کاردار مجھے دوبارہ سے ری کراس کر سکتے ہیں لیکن وہ نے سوال پوچھنے کا

بھی حق رکھتے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولے چل گئی۔

سیم نے فارس کے قریب سرگوشی کی (اب یہ زیادہ اور ہور ہی ہے)۔ مگر فارس اب غور اور اچھبے سے اسے دیکھ رہا تھا جو غیر معمولی طور پر کپوزڈ نظر آ رہی تھی۔ نجح صاحب اب پورا گھوم کے اسے دیکھنے لگے تھے۔

”بہر حال“ کا رد ارجمند صاحب آپ سے جرح کے دوران متعلقہ سوالات کے علاوہ کوئی ایسا سوال بھی پوچھ سکتے ہیں جو...“ وہ پھر سے اسے داران کرنے لگے مگر.....

”جو قانونی شہادت آرٹیکل 141 کے تحت میری veracity چیک کرنے کے لئے ہو، میرا بیک گراؤنڈ، کام اور غیرہ جانے کے لئے ہو یا...“ نظروں کا رخ ہاشم کی طرف موڑا۔ ”میرا کردار منسخ کرنے کے لئے ہو۔ اور کورٹ ان سوالوں کی اجازت دے گی، میں جانتی ہوں۔“

نجح صاحب نے کھلے لب بند کیے، پھر بولے۔ ”میں صرف یہ سلی کر رہا تھا کہ آپ کو اپنے رائیس معلوم ہیں یا نہیں۔“

”I know my rights more than i know my wrongs , your honour!“

وہ اسی انداز میں بولی تھی۔ دھیما، شاکستہ، مسکرا کے بولنے والا انداز۔ ہاشم مخطوط مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ سیم نے پھر سے منہ بتایا (اور)۔ فارس غیر آرام دھنا اور سعدی فکر موند۔ ”یکیا کر رہی ہے زمر؟“

”وہ حین ہے اور اس کے دماغ میں کیا چلتا رہتا ہے، میں نہیں جانتی۔“ وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے سامنے آٹھبری۔

”ریکارڈ کے لئے اپنا نام بتائیے۔“

”حین ذوالفقار یوسف خان۔“ وہ زمر کو دیکھ کے گردن کڑائے بولی تھی۔

”دمی سعدی یوسف سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“

”وہ میرا بھائی اور brother in arms (چھاسا تھی) ہے۔“ سعدی کو دیکھ کے مسکرا کے بولی۔ وہ مسکرا بھی نہ کا۔

اب زمر اس سے چند چھوٹے موٹے سوالات کرنے لگی۔ وہ اعتماد اور سمجھاؤ سے جواب دیتی گئی۔

”بیس می کی شام، جب آپ میرے کمرے میں موجود تھیں، تو آپ نے باہر کیا دیکھا؟“

”میں نے دیکھا، سعدی یوسف گھر کی بچھلی لگی میں چلتا آ رہا تھا، اور وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ مخاطب کو حلیمه کے نام سے پکار رہا تھا، اور کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے باس سے ملے کل آنا چاہتا ہے۔ یعنی وہ اپا نہیں لے رہا تھا۔“

”اوہ آپ کے عزیز واقارب میں حلیمه کس کی سیکرٹری کا نام ہے؟“

”ہاشم کا رد ارکی سیکرٹری ہے وہ۔ ہاشم نے مجھے اور آپ کو خود بتایا تھا جب ہمارے سامنے ان کی سیکرٹری کا فون آیا تھا۔“

”آپ کو یقین ہے کہ آپ نے یہی نام سناتھا؟“

”بھی۔ سو فیصد۔“

”میں نو شیر وال کا رد ارکے اغوا کے بارے میں بتائیے، تاکہ عدالت کو معلوم ہو کہ وہ کس کردار کا حامل ہے؟“ زمر سوال پوچھ رہی تھی اور وہ جواب میں پورا واقعہ بتا رہی تھی کہ کس طرح اس نے نو شیر وال کا ذرا مدد پکڑا۔ شیر و زخمی نظروں سے اسے دیکھ گیا مگر اسے جیسے حد سے اب کوئی گلہ نہیں رہا تھا۔

”آخری دفعہ جب ہاشم کا رد ارکے گھر آئے تھے، بریانی فرائیڈ سے پہ تو کیا کہا تھا انہوں نے؟“

”انہوں نے سب کے سامنے معافی مانگی تھی اور اقرار کیا تھا کہ نو شیر وال اور وہ ذمہ دار ہیں سعدی ہماری کے انغو اور ارادہ قتل کے۔ انہوں نے ہم سے سب بھول کر آگے بڑھنے کی بات کہی تھی۔“ وہ سپاٹ سے انداز میں بتاتی تھی۔

”خین آپ کو یقین ہے کہ انہوں نے اعتراض جرم آپ کے سامنے کیا تھا؟“ زمر حج صاحب پا ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے حد سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سرہلا بیا۔

”جہاں تک جھے یاد ہے، انہوں نے اعتراض جرم کے ساتھ افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔“

”زمر مژہ اور ہاشم کو اشارہ کیا۔ وہ مسکرا تھا ہوا اٹھا، عادتاً کوت کا بنیں بند کیا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سعدی کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ چاہ کر بھی چہرہ اٹھا نہیں ہاڑا تھا۔ نظریں زمر کے کاغذات پر کھلے چلیں پہ جھی تھیں جس کی نسبت تیز دھار پھل کی طرح چمک رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اس پین کوٹھی میں دبایا۔ نظریں ہنوز جھکی تھیں۔“

”خین یوسف!“ ہاشم مسکرا کے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بات کا آغاز کرنے لگا۔ ”کیا یہ حق نہیں ہے کہ.....“

”اویلینگ کوچ کا کیا؟“ وہ تیزی سے بولی۔ ہاشم رکا۔ نجح صاحب نے بھی گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

”قانون شہادت کے تحت آپ کو مجھ سے پوچھنا چاہیے کہ میں کس زبان میں زیادہ کمفر ثیبل ہوں اور میرا بیان اسی زبان میں ریکارڈ ہونا چاہیے۔ یہ میرا حق ہے اور آپ نے مجھ سے اس بارے میں نہیں پوچھا۔“

”اوکے جی۔ آپ کس زبان میں آرام دہ ہیں؟“

”اردو یا الگلش کسی میں بھی۔“ اس نے لنڈھے اچکائے۔ ہاشم نے مسکرا کے سر کو ختم دیا۔

”خین آپ کے بیان کے مطابق آپ نے سعدی کو مبینہ طور پر کسی کی سیکرٹری کا نام لیتے سنا تھا۔ حیمہ۔ کیا یہ درست ہے؟“

”جبی!“

”اور کیا آپ نے سر نیم بھی سنا تھا؟ حیمہ کون؟ اگلا نام؟“

”بھائی نے صرف حیمہ بولا تھا۔“

”خین آپ ماشاء اللہ ایک ذہین لڑکی ہیں، اتنا تو جانتی ہوں گی کہ آفیشل capacity میں ایک پلائزر کو عموماً ان کے سر نیم کے ساتھ پکار جاتا ہے۔ مس یوسف، مسز کاردار فرست نیم ٹرم نہیں یو زکی جاتیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے کیونکہ باسز عموماً اپنی سیکرٹریز کے ساتھ فریک ہوتے ہیں اور ان کو فرست نیم ٹرم کے ساتھ ہی بلا تے ہیں، یہی وجہ ہے کہ میرے سامنے اپنی سیکرٹری کا فون ایئنڈ کرنے کے بعد آپ نے ہمیں اس کا نام حیمہ ہی بتایا تھا۔ نو سر نیم!“

”لیکن کیا آپ نے سعدی کو فون پر میرا نام لیتے سن؟ یا نو شیر وال کا؟“

”نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”اور وہ حیمہ کوئی بھی حیمہ ہو سکتی تھی۔ کسی کی بھی سیکرٹری رائٹ؟“

”آب جیکشن یور آئر۔“ زمر تیزی سے اٹھی۔ اس سے پہلے کہ زمر اعتراض کی وجہ بتاتی یا نجح صاحب روٹنگ دیتے، خین نے جع صاحب کی طرف رخ پھیر کے کہا۔

”کیا آپ مسز زمر کو کچھ دیر کے لئے خاموش رہنے کا کہہ سکتے ہیں کیونکہ مجھے ان کے سوالوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں ہر سوال کا جواب دوں گی۔“

”وہ آپ کی وکیل ہیں۔ اور....“

”وہ میری وکیل ہیں ہیں۔ میں اپنی وکیل خود ہوں۔ اب میں جواب دوں؟“ اس نے سوالیہ نظر وہ سے ہاشم کو دیکھا۔ زمر سے نظر بچائی۔ وہ بہمی سے واپس بیٹھی۔ سعدی ابھی تک پین ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔

”جی، وہ کوئی بھی حیلہ ہو سکتی تھی، میں نے صرف فرست نیم نا تھا۔“

”اور آپ پورے دلو ق سے کہتی ہیں کہ آپ کے سامنے میں نے اعتراض کیا تھا؟“

”جی۔“ اس نے ہاشم کی آنکھوں میں دیکھ کے کہا۔ اس نے افسوس سے سر جھٹکا۔ گویا نہیں لڑکی کو دیا آخری موقع بھی ضائع چلا گیا ہو۔

”اور کیا سعدی کے واپس آنے سے قبل کیا کبھی آپ نے میرے سامنے ذکر بھی کیا کہ آپ میری سوکالڈا صلیت سے واقف ہیں۔“

”نہیں۔“ وہ قدرے آہستہ سے بولی تھی۔

”آپ کے بیان کے مطابق آپ بہت پہلے سے واقف ہو گئی تھیں، لیکن کیا آپ نے کبھی مجھے کھل کے کہا کہ میرے بھائی نے آپ کے بھائی کو غواہ کر کھا ہے؟“

”نہیں۔“

”کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ لوگ ایک دم سے وہ سب ہمارے خاندان کو مجرم ٹھہرا نے لے گئے کیونکہ آپ مجھ سے بدلتے چاہتی تھیں؟“

وہ اس کے سامنے کھڑا بے رحمی سے جرج کر رہا تھا۔

”کس چیز کا بدل؟“ سعدی کی گرفت پین پخت ہو گئی۔ جبکی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

”آپ کو انور کرنے کا بدل۔“ وہ بلکہ سما سکرایا۔

”کس طرح انور کرنے کا بدل؟“ اس نے سپاٹ انداز میں دھرا یا۔

”کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ چند ماہ تک مجھ سے واٹس ایپ پہ بات کرتی تھیں؟ (سعدی نے آنکھیں زور سے میچیں۔ زمر نے اس کی اکڑی ہوئی مٹھی پہ ہاتھ رکھا۔) اور میری توجہ چاہتی تھیں۔“

”میں آپ سے اپنے بھائی کے بارے میں پوچھتی تھی جیسے علینا اپنے کلاس فیلوز سے بات کرتی ہے۔“

”کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ اپنی فیملی سے چھپ کے مجھ سے بات کرتی تھیں۔“

”میں آپ سے فیس بک پہنچی سب کے سامنے بات کرتی تھی جیسے علینا اپنے کو لیگز سے کرتی ہے۔“

”مگر کیا یہ درست نہیں ہے کہ یہ آپ کی فیملی میں غلط سمجھا جاتا ہے؟“

”میری فیملی میں یہ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے جیسا علینا کی فیملی میں سمجھا جاتا ہے مگر جیسے علینا ضرورت کے تحت فیس بک پہ اپنے کو لیگز دغیرہ سے بات کر لیتی ہے، میں بھی کر لیتی ہوں۔“

”ایک سکیو زمی یہ علینا کون ہے؟“ ہاشم نے اکتا کے بات کافی۔

”جنگ صاحب کے ریڈر کی بیٹی۔“ اس نے مخصوصیت سے کہہ کر چند کاغذ جنگ صاحب کی طرف بڑھائے۔ جہاں ریڈر صاحب چوکے ہیں ہاشم ٹھہر اور زمر نے بے اختیار پیشانی چھوٹی۔ (اف۔ اف۔)

”یہ یوراً زریڈر صاحب کی بیٹی کے فیس بک کے کچھ اسکرین شاٹس ہیں اور یہ میری ہاشم بھائی سے کی بات کے اسکرین شاٹس۔ علینا اپنی یونیورسٹی میں ایک نہایت باعزم اور برائیت اسٹوڈنٹ ہیں اور جیسے وہ بولتی ہیں، میں بھی ویسے ہی بولتی تھی۔ اب ہمارے بڑے اس

بارے میں کیا سوچتے ہیں مجھ نہیں پتہ۔ آپ یور آئر کے ریڈر سے پوچھ لیں، کیا وہ اس طرح بات کرنے کو برا سمجھتے ہیں؟“  
ہاشم نے بے اختیار نائی کی نات ڈھیلی کی۔ نجح صاحب نے کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور عینک کے پیچھے سے گھور کے جنین کو دیکھا۔  
”آپ ریڈر کے بارے میں اس طرح کی بات نہیں کر سکتیں۔“ انہوں نے تنیسہ کی۔

”یور آئر قانون میں کہیں بھی بھی شق مجھے منع نہیں کرتی اس چیز سے سو میں یہ لے آئی۔“ معصومیت سے شانے اپکائے۔  
”میری بیٹی کا یہاں کیا ذکر؟“

”میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں۔ میرے ذکر کی اجازت بھی تو آپ لوگ دے رہے ہیں نا۔“ پھر ہاشم کو دیکھا۔ ”آپ کیا پوچھ رہے تھے؟ اس چیز کو کیسا سمجھا جاتا ہے، ہم جیسی عام فیلمیز میں؟“ ریڈر صاحب کی طرف اشارہ کیا جن کے چہرے پر ہی تھی۔

”میں آپ کی انہر نیت ایڈشن کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ ہاشم نے تیزی سے پیتھرا بدلا۔ وہ ایک نجح کے ریڈر کی طرف جانے والی گفتگو کا رخ موڑ نے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، پھر ابھی بہت سے تیرترکش میں باقی تھے۔

”کیا یہ درست ہے جنین یوسف کا آپ کمپیوٹر وغیرہ میں بہت اچھی ہیں؟“

”بالکل!“ مسکرا کے سر کو خم دیا۔ نجح صاحب اب کاغذ رکھ کے واپس ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

”اور کیا یہ درست ہے کہ آپ ایک بہت اچھی ہمکر بھی ہیں؟“ وہ دوبارہ سے روائی پکڑ چکا تھا۔

”جی۔“

”جنین کیا آپ کے ارد گرد کے لوگ آپ کے پاس hacking متعلق فیورز لینے آتے ہیں؟“

”لوگ میرے پاس فیورز لینے کیوں آئیں گے؟“

”کیونکہ آپ بہترین ہیں، اور وہ آپ پر زیادہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔“

”جی۔ لوگ مجھ سے فیورز لیتے رہتے ہیں۔“ اس نے اعتراف کیا۔ وہ پسکون تھی۔ زمر بار بار اعتراض کرنے اٹھنے لگتی، پھر رک

جائی۔ کمرہ عدالت میں تاؤہر پل بڑھتا جا رہا تھا۔

”کیا 2013 میں ایسا ہوا کہ کسی دوست کے والد نے آپ سے کوئی فیور مانگا؟“

”جی ہاں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ ہاشم کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

”اوکیا اس فیور کا تعلق ان کے خاندان کی کسی عورت کے کسی اسکینڈل سے تھا؟“

”جی ہاں۔“

”اور ان کی مدد کرنے کے لئے آپ کو غیر قانونی ہیکنگ کرنی پڑی؟“

”میرے جواب کے بعد آپ مجھے sue تو نہیں کریں گے نا؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔ جیسے کوئی بچ پوچھتا ہے۔ ہاشم نے سینے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔ ”میں آپ کو sue نہیں کروں گا، حکومت کا کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن میری طرف سے بے فکر ہو کر جواب دیجئے۔“

”جی۔ مجھے ان دوست کے والد کے لیے غیر قانونی hacking کرنی پڑی تھی۔“

”اوکیا یہ درست ہے کہ بد لے میں آپ نے ان صاحب سے کوئی فیور مانگا تھا؟“

فارس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ زمر گمراہی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سعدی کا سر جھکا تھا مگر وہ گردن اکڑائے جواب دے رہی تھی۔

”جی، میں نے ان سے فیور لیا تھا۔“

”اور یقیناً وہ فور خاص قسم کا ہوگا کیونکہ میری اطلاع کے مطابق وہ صاحب ایک انتہائی با اثر عبد ہے پر فائز تھے۔“

”ایسا ہی ہے۔“ حنہ نے اعتراف کیا۔

”کیا آپ کو رٹ کو بتانا پسند کریں گی کہ وہ کون تھے اور ان کے کس کام کے بدلے میں آپ نے ان سے ایک خاص فوریا تھا؟“

”وہ فوت ہو چکے ہیں اور اس بات کا تعلق ان کے خاندان کی ایک عورت کی عزت سے ہے۔ مجھے اچھائیں لے گا بتانا۔“

”یور آئر میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ گواہ کو جواب دینے کا حکم دے کیونکہ ان سوالوں سے گواہ کا کردار عدالت کے سامنے واضح کرنا بہت ضروری ہے، کیونکہ یہ وہ گواہ ہے جو کہہ رہا ہے کہ اعتراف جنم اس کے سامنے ہوا ہے۔“

”گواہ کو جواب دینا ہوگا۔“ حنچ صاحب نے اسے ہدایت کی۔

”اور اگر میرے جواب سے ایک عورت کی عزت خراب ہوتی ہے تو ہو جائے؟ وہ فوت ہو چکے ہیں تو کیا ہم ان کا پردہ نہ رکھیں؟“ وہ جذباتی سے انداز میں بولی۔

”یہ سب آپ کا کردار جاننے کے لئے ہو رہا ہے حنین یوسف، اس لئے اپنی فکر کیجئے اور جواب دیجئے۔“ وہ مسکرا کے بولا تھا۔ جبکہ پر فاتحانہ چک کیجئی۔

”کیا آپ واقعی اس عورت کے افسیر کو یوں ایکسپوز کرنا چاہتے ہیں؟ اس مرے ہوئے آدمی کی ساکھ کو داغدار کرنا چاہتے ہیں ہاشم بھائی؟“ وہ دکھ سے بولی تھی۔

”I don't give a damn!“ اس نے چیخ کی آواز نکال کے شانے جھکلے تھے۔ لیکن آپ اگرچا ہیں تو ان کے ناموں کی جگہ ان کا عہدہ بتا دیں تو بتائیے عدالت کو کہ وہ صاحب جن کا ایک کام کیا تھا آپ نے وہ کون تھے عہدے کے اعتبار سے۔“

حنین نے اس کی آنکھوں پر آنکھیں جمائے تین حرفاں بولے۔

”آئی پی پی۔“

سعدی نے جھکلے سے سراٹھا یا۔ ادھر ہاشم نے ہنویں آنکھی کر کے اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے آپ کہنا چاہ رہی ہیں اوسی پی۔“

”جن نہیں کاردار صاحب۔ میں کہنا چاہ رہی ہوں، وہ ایک آئی پی پی تھے۔ اور نگزیب کاردار نام تھا ان کا، اور 2013 کے دسمبر میں وہ ایک ذاتی کام لے کر میرے پاس آئے تھے۔ جب نو شیر وال کے اغوا کا پول کھولنے کے بدلے میں انہوں نے مجھے وہ لیپ ٹاپ اور دوسرے gadgets کیے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک اور کام بھی کہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں مسز جواہرات کا کاردار کا موبائل ہیک کر کے ان کے اپنے لذن سے چلتے افسیر کا پتہ چلاوں اور.....“

کمرہ عدالت کا منظر ایک دم بدلا تھا۔ سارے رنگ بدلے۔ موسم کا متزاج بدلا۔ جہاں جواہرات کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں، وہاں ہاشم نے تیزی سے اس پت پت بولتی لڑکی کو چپ کروایا۔ ”اوے تھینک یوڈی میں آل جنین۔“

”نهیں، مجھے بتانے تو دیں، میرے کاردار کو واضح کرنا چاہ رہے تھے نا آپ۔ تو پھر مجھے کرنے دیں نا اپنا کاردار واضح۔“

”ٹھیک ہے بہت ہو گیا۔ آپ جاسکتی ہیں۔“ وہ با تھا اخا کر درستی سے اسے خاموش کروا کے اپنی کری کی طرف پلٹ گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔ کنٹی کی رگ پھر ٹک رہی تھی۔ ایک دم سے لوگ پر جوش انداز میں چمگو بیاں کرنے لگے تھے۔ پیچھے بیٹھے روپور زدھڑ ادھڑ لکھے جا رہے تھے۔ حنین کنٹرے سے بیٹک نہیں۔ اسی بہت دھرمی سے پکار کے بولی۔

”نهیں کاردار صاحب، میں آپ کی گواہ نہیں ہوں، آپ مجھے نہیں بھیج سکتے۔“ مجھے re-examine کرنے کا حق اس وکیل کو ہے۔

جس نے مجھے بلا یا تھا...."

"میں گواہ کو re-examine کرنا چاہوں گی۔ یور آزر،" زمرتیزی سے کھڑی ہوئی۔ جنین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شانے اچکائے۔ جیسے اجازت دی ہو۔

جو اہرات کا ہاتھ اپنی گردن پتھا اور وہ بالکل نیچے دیکھ رہی تھی۔ رنگت سفید پڑ رہی تھی۔ ہاشم کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بڑھی تے احتجاج کر رہا تھا مگر نجح صاحب نے اسے خاموش کر دیا۔ صورتحال ایک دم دلچسپ ہو گئی تھی۔

"جنین یوسف، کیا آپ وضاحت کریں گی کہ اور نگزیب کاردار نے آپ کو کیا کام کہا؟"

"یہ ہمارے دوست ہاشم کاردار کے والد اور نگزیب کاردار اور میری ای میلز کاریکارڈ ہے، اور یہ نیکست میسچر کا۔" وہ کاغذات نئے صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے بولی تھی۔ "وہ چاہتے تھے کہ میں ان کی یہوی کافون rat کر کے ان کو دے دوں، یعنی وہ اپنے فون پر کیا کر رہی ہیں، اور نگزیب کاردار یہ دیکھ سکتیں۔ ان کو شک تھا کہ ان کی واکف کا اپنے ایک کزن کے ساتھ جو افسوس رہا ہے ماضی میں، وہ شاید دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔ سو میز کاردار کے فون تک میں نے ان کو ایکس دی، پھر اور نگزیب انکل کے اصرار پر ان طیب مطیع نامی صاحب کے فون تک بھی ان کو ایکس دی۔ یہ طیب مطیع اور میز کاردار کی ای میلز کاریکارڈ ہے اور چونکہ ہاشم کاردار کو تو ایک "damn" جتنی پرواہ بھی نہیں ہے اس لئے میں یہ بھی آپ کے سامنے رکھ رہی ہوں۔ میں نے غلط کام ضرور کیا تھا مگر ان کی مدد کر رہی تھی میں۔" آخری چند کاغذات ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ جو اہرات خاموشی سے اٹھی تھی، پہنڈ بیگ انھیا اور کمرہ عدالت سے باہر نکل گئی۔ چند پورٹر زاس کے پیچے بھاگ گئے تھے۔ نو شیر والا سرخ چہرہ جھکا کے بیٹھا تھا اور ہاشم بے بُس سامنے بولتے دیکھ رہا تھا۔

"یہ سب جھوٹ اور بہتان ہے یور آزر،" وہ آخر میں چلایا۔ غنیض و غضب سے اس کی آواز کا نپ رہی تھی۔ "میں ان محترمہ پہ تک عزت کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ بلکہ آج ہی میں آپ کو نوش بھجوں گا۔" انگلی اٹھا کے تنیس کی تو زمر فوراً بولی۔

"یور آزر! میں...، مگر جنین کی آواز نے اس کا فقرہ اچک لیا۔

"Estoppel کے قانون کے تحت آپ چونکہ مجھے یقین دلا دھکے ہیں کہ آپ میرے خلاف کوئی دعویٰ نہیں کریں گے تو اب اگر آپ کوئی دعویٰ کریں، تب بھی عدالت آپ کو estop کر سکتی ہے۔" جنین اپنی ٹنیس پر یہ پر کر کے آئی تھی۔ زمر گہری سانس لے کر خاموش و اپس جا بیٹھی۔ اب جنین نجح صاحب کو مزید اس واقعے کی تفصیل بتا رہی تھی۔

دفعتہ کسی نے زمر کو پیچھے سے ٹھوکا دیا۔ تو وہ مڑی۔ پیچھے بیٹھے وکیل نے چٹ سی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ سیدھی ہوئی اور کاغذ کھولا۔

"میرا خیال ہے آپ کو دکالت چھوڑ کے کوئی اور کام شروع کر دینا چاہیے زمر بی بی۔ سلامی کڑھائی، یا کوئنگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے مڑ کے دیکھا۔ وہ مسکراہٹ دبائے بظاہر سمجھیگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زمر نے چند الفاظ کا نند پر گھسیتے اور اسے مردہ کے وابس بھیجا۔ جب فارس نے اسے کھولا تو اس پر لکھا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ کو یہ دنیا ہی چھوڑ دینی چاہیے۔"

وہ چہرہ جھکا کے دل کھول کے ہنسا تھا۔ دوچار افراد نے مڑ کے اسے دیکھا بھی تھا۔

جنین اب اپنی بات ختم کر چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے اترتی، نجح صاحب نے اسے روک کے پوچھا۔ "آپ وکیل ہیں؟" اس نے سادگی سے ان کا چہرہ دیکھا۔ "میں یور آزر!"

"لا اسٹوڈنٹ ہیں؟"

”تمہیں یور آز!“

”پھر کیا ہیں؟“

”میں ختن ہوں۔ اور میں ایک عام لڑکی ہوں۔“ وہ اداسی سے مسکرا کے نیچے اتری ایسے کہ اس کی گردان اٹھی ہوئی تھی اور سعدی اسے مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔ اکثری ہوئی مٹھی میں پکڑا قلم وہ کب کا چھوڑ چکا تھا۔

باہر نکلتے ہوئے حندہ ہاشم کے قریب ٹھہری جس کا چھرہ اہانت سے بھی تک تنمایا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

”میں ناڈ رائے بہت دیکھتی ہوں۔ ہاں اب میں اتنے ڈامے دیکھنے کو اچھا نہیں سمجھتی مگر جو دیکھ رکھے ہیں ان میں ایک دفعہ ایک قصہ سناتھا۔ کہ ایک آدمی کے پاس ایک بدر وح آئی اور اسے ڈرانے لگی۔ جب وہ نہیں ڈرانے بولی۔ جانتے نہیں ہو، میں تمہاری جان لے سکتی ہوں۔ وہ آدمی بولا سارا غم اسی جان کا ہی تو ہے، جس دن یہ نہ رہی، اس دن میں تم سے بڑی بدر وح بن جاؤں گا۔ آپ جیسے بلیک میلز کو یہ جان لینا چاہیے ہاشم کاردار، کہ سارا غم اسی عزت کا ہی تو ہے، کیونکہ جس دن ہم لڑکیوں کی عزت چل گئی تا، اس دن آپ سے بڑی بلاہن جائیں گی ہم!“ اور آگے بڑھ گئی۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ بس اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اسے خندے پینے آرہے تھے۔ سب اس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نظریں ... وہ چمگوںیاں.... قیامت سی قیامت تھی۔

حندہ اپنے گروہ کی طرف آگئی۔ زمراء سے ریڑروالی پات پڑانٹ رہی تھی۔ سیم اسے اور کہد رہا تھا اور سعدی اسے گلے سے لگا کے اسے کہد رہا تھا کہ وہ اسے کبھی بھی اس سب میں نہیں گھینٹانا چاہتا تھا۔ مگر اب حندہ کے ہر طرف سناتھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ بہت دیہر سارا ردننا چاہتی تھی۔

عام لڑکیوں کی طرح۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

عجب چیز ہے ..... یہ گردش زمانہ بھی ..... کبھی میں پہ، کبھی مثل آسمان گزری قصر کاردار میں ایسا ہونا کہ سناتا چھایا تھا گویا کوئی مر گیا ہو۔ جواہرات سپاٹ چھرے اور بھکی نظروں سے آگے چلتی جا رہی تھی اور وہ لاونچ کے وسط میں کھڑا تھا۔ غمیں و غضب سے سرخ پڑتا چھرہ لئے، وہ بے بُسی اور نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”اندازہ ہے آپ کو میں نے کورٹ روم سے پار گنگ ایریا تک کا سفر کیسے کیا ہے می!“ ہاشم کی پتگھاڑتی غرأتی آواز پہنچی وہ نہیں رکی دیہرے دیہرے آگے بڑھتی گئی۔

”مجھے رسو اکر دیا آپ نے پورے زمانے میں۔ وہ ہمارے قرابت دار نہیں تھے، ہمارے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ نہیں تھے جو ایسی باتوں کو مسکرا کے ہضم کر جاتے۔ مگر وہ ”عام“ لوگ تھے۔ وہ کیل تھے، جز تھے۔ ان کی نظریں... ان کی باتیں۔“ وہ سر دنوں ہاتھوں میں لئے پاگل ہو رہا تھا۔ جواہرات چپ چاپ آگے بڑھتی گئی۔ رخ اپنے کمرہ کی جانب تھا۔

”میری ان دو گلے کے بخ لوگوں کے ساتھ روز کا ملنا تھا۔ مجھے ان کا ہر دن سامنا کرنا ہوتا ہے۔ وہ میری درک پلیں تھی۔ میں بار الکشز کے بارے میں سوچ رہا تھا اور آپ نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں ان کو منہ دکھا سکوں۔ آپ نے مجھے رسو اکر دیا۔“

جواہرات نے آہنگ سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چل گئی۔ وہ چیچھے بولتا جا رہا تھا۔

”اور میں جانتا ہوں طیب مطیع کے بارے میں۔ اسی لئے ڈیڈنے مجھے سے کہہ کر اسے جیل کروائی تھی کیونکہ.....“ شدت جذبات سے وہ بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ جواہرات نے دروازہ بند کر دیا اور وہیں نیچے فرش پہنچتی گئی۔ وہ گم صمی لگتی تھی۔

”میرے مرے ہوئے باپ کو آپ روز روکا کرتی ہیں۔ بھی ہارون عبید کے ساتھ، بھی کسی تھڑک لکاس کزن کے ساتھ۔ کیا ہیں آپ“

می کیا ہیں آپ؟، وہ باہر کھڑا اسی طرح چلا رہا تھا۔

سیڑھیوں کے دہانے پر کھڑی سونیا سے یک نک دیکھ رہی تھی۔ اس کا وجہ بہادر سا باپ ایسے کیوں اپنے حواس کھو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ دیکھے گئی۔

اندر بیٹھی جواہرات کا فون مسلسل تھرھرا رہا تھا۔ اس نے اسی بے جان سے انداز میں نکال کے دیکھا تو ہارون کا نمبر اسکرین پر چلکا رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

”بولو!“ گھٹی گھٹتی نکست خودہ سی آواز نکلی۔

”میں افسوس کرنا چاہتا تھا۔ نا ہے آج چھوٹے بچے تمہیں رسوا کر گئے جواہرات۔ مجھے واقعتاً افسوس ہے۔ کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟“ ان کی آواز میں آنچی تھی۔ مسکراہٹ فاتحانہ ساناڑ۔

ہاں۔ تم بولتے جاؤ۔ میں سنتی جاؤں گی۔ جو غلط جو باقیں کہنی ہیں، کہہ دو۔“ اس نے فون کان سے زور سے دبایا، تاکہ صرف ہارون کی آواز سماعت سے نکلے اور باہر چیختے بیٹی کی باقیں اس شور میں دب جائیں۔ تاکہ تکلیف کم ہو۔

”میری بیوی کے ساتھ بھی یہی کیا تھا نا تم۔ اس کو کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔“

وہ آنکھیں بند کیے سنتی گئی۔ گرم گرم آنسو آنکھ سے نکل کے چہرے پر گرتے رہے۔

”اب بھی وقت ہے جواہرات۔ مجھے میری بیوی کے اکاؤنٹ تک ایکس دے دو۔ اس کی رقم، اس کے زیورات مجھے دے دے۔“

میں تمہیں اس سارے اسکنڈل سے نکال لوں گا۔“

”تمہیں لگتا ہے میں ڈھنے گئی ہوں؟ ہارگی ہوں؟ اونہوں۔ ابھی جواہرات کا ردار ”باتی“ ہے۔ اس سے بڑے طوفان سے گزری ہوں۔ ابھی نہیں ہاروں گی مگر تم بولتے رہو۔ میں سن رہی ہوں۔“ وہ سپاٹ سے انداز میں بولی تھی۔ دوسری طرف سے انہوں نے کال کاٹ دی تھی۔ باہر سے بولتے چلاتے ہاشم کی آواز پھر سے آنے لگی تھی۔ جواہرات نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

پچھلے سارے طوفان میں اس کا یہ بیٹا اس کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔ اور آج.....؟؟؟

❖❖❖

کچھ تو ہو رات کی سرحد میں اترنے کی سزا..... گرم سورج کو سمندر میں ڈبوایا جائے!

مارکیٹ میں معمول کا رش تھا۔ مصروف سے لوگ آگے پیچھے گزر رہے تھے۔ فاست فوڈ کی دکانوں سے اشتہار آنکیز خوشبوئیں انحرافی تھیں۔ ایسے میں پارکنگ میں ایک کار کھڑی تھی اور وہ دونوں اگلی نشتوں پر بیٹھے نظر آرہے تھے۔

”امیر کیانی ہر ہفتے کی شام اس میڈیکل اسٹور سے دو اخیر ہے آتا ہے۔ اس کی ماں کو کوئی chronic یا ہماری ہے۔ آج ہفتہ بے

اور آج وہ آئے گا، مگر مسئلہ یہ ہے سعدی کو وہ کل صبح کی فلاٹ سے عمرے کے لئے جا رہا ہے اور صبح سے پہلے نہیں آئے گا۔ ان لوگوں کے پاس عمرہ دیزہ کو جن تک بڑھانے کے بہت طریقے ہوتے ہیں۔“ احمد سامنے دکانوں پر نظر جمائے کہہ رہا تھا۔ سعدی نے اثبات میں سر بلایا۔

”یعنی ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں اس سے بات کرنے کے لئے۔“

”ہمارے نہیں، تمہارے پاس۔ کیونکہ مجھ سے سخت نفرت ہے ان PMDC والوں کو۔“ احمد نے جھر جھری لے کر سر جھکا۔

”کیوں؟ تمہارے پاس کوئی ایک بی بی میں کی جعلی ڈگری بھی ہے؟“ احمد نے جو بالا صرف گھوارا تر دیدیں کی۔

”اوکے۔ تو پھر اس سے بات مجھے ہی کرنی ہو گی۔“ سعدی نے گھری سانس لی۔

”نہ صرف بات کرنی ہے بلکہ اسے راضی کرنا ہے پیسے بہت لے گا مگر یہ پی ایم ذی سی کا واحد کلرک ہے جو خوبیہ طریقے سے ہمیں

پاکستان کے تمام ڈاکٹرز کا ڈینا فراہم کر سکتا ہے اور ہم Facial recognition سافت ویر کے ذریعے ڈاکٹر مایا کوان لاکھوں ڈاکٹرز میں ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن اس شخص کے علاوہ کوئی کلرک ایسا نہیں جو کار دارز کو نہ بتائے۔ ان کے بہت جانے والے ہیں پی ایم ڈی سی میں۔ وہ تھاٹ ہو گئے تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔“

”اگر آپ کی نصیحتیں بند ہو گئی ہوں تو میں جاؤں اور عمرے پہ جانے والے شخص کو رشوت کی پیشکش کروں تاکہ وہ میرا چیز ثابت کرنے میں میری مدد کر سکے۔“

”ایک تو تم لوگوں کی اخلاقیات سے میں بہت نگ ہوں۔“ احر نے براسمنہ بتایا۔ ”اس ملک میں کوئی کام بغیر رشوت کے نہیں ہوتا جائی۔“

”میں اس سےاتفاق نہیں کرتا۔ اس لئے پہلے میں اسے باتوں سے منانے کی کوشش کروں گا، خدا کرے مجھے رشوت نہ دینی پڑے۔“ اس نے کان میں آلہ لگاتے ہوئے دروازہ کھولا اور پھر سر پہ کیپ جاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اندر بیٹھنے احر نے اپنے کان میں آلے کو جمایا اور بولा۔

”شاپ کے قریب کھڑے ہو جاؤ۔ وہ جیسے ہی آئے گا، میں تمہیں خبردار کر دوں گا۔“

”آہستہ بولو۔ میرے کان درد کرنے لگے ہیں۔“ وہ کراہا تھا۔ احر تھیلی پر گاما یک منہ کے بالکل قریب لے کر گیا اور مزید زور سے بولا۔ ”تم سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ جو جیبوں میں ہاتھ ڈالے سڑک کنارے چلتا جا رہا تھا، انگلی سے کان میں لگے آئے کوڑا ڈھیلا کیا اور ناگھی سے پوچھا۔ ”کیا بات؟“

”تمہاری ایسی نے غازی سے کہا ہے کہ تمہیں سمجھائے اب شادی کرلو مگر اس کا خیال ہے بندے کو ایک نہیں تین شادیاں کرنی چاہیے، اس لئے تمہیں سمجھانے کی ذمداری اس نے مجھے دی ہے۔“

سعدی ہلکے سے نہ دیا۔ سر جھکائے وہ قدم آگے کو بڑھا رہا تھا۔

”مشائی؟ کیا چاہتی ہیں امی؟“

”یہی کہ سارے پرانے تجربات بھلا کر شادی کرلو اور ان کو خوش کر دو۔“

”جب تک میں نوشیروال کو سزا نہیں دلوادیتا، تب تک نہیں کرنی مجھے شادی۔“ اب کہ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس دکان کے قریب ایک اشال پر کھے میگزین دیکھنے والا بھر کر رکھا تھا۔

”یار کیا مل جائے گا تمہیں اس بے چارے کو سزا دلو کے؟ اس کی شکل نہیں دیکھی تم نے؟ مجھے تو لگتا ہے وہ بہت افسر دہ اور نادم ہے۔“

”ندامت کافی نہیں ہوتی۔ اگر اتنا ہی نادم ہے تو اعتراف جرم کیوں نہیں کر لیتا؟“

”انتقام کا چکر بھی ختم نہیں ہوتا سعدی یوسف خان۔“

”اسی لئے میں انصاف لینے گیا ہوں، انتقام نہیں۔“ وہ تھی سے میگزین کے صفحے پلٹاتے، سر جھکائے بولا تھا۔

”خیر تمہاری والدہ جاننا چاہتی ہیں کہ اگر وہ تمہارے لئے کوئی لڑکی پسند کریں تو تم قبول کرلو گے؟ نہیں اگر قید میں کوئی ایک آدھ پسند آگئی ہے تو بتاؤ، ہم نے یہ آپشن اوپن رکھا ہوا ہے۔“

”آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر ساری ڈیلنگ اس آدمی سے میں نے ہی کرنی تھی تو پیسے کس چیز کے لئے تھے آپ نے؟“ وہ میگزین میں چہرہ دیے بول رہا تھا۔

”بات مت بدلو۔ خیر... اس تک لے کر تو میں ہی آیا ہوں نا۔ اچھا وہ ابھی آنے والا ہے۔ اس کا فون اسی ایریا میں ہنگ آتا ہے۔“  
احمر کار میں بیٹھا شیلٹ پر جی پی ایس چیک کر رہا تھا۔ سعدی اب نگاہیں ادھر ادھر دوڑاتا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ میگر یہ ہاتھ میں تھا، کیپ نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

اور یہ تبھی تھا کہ اس نے وہ آواز سنی۔ سیٹیوں کی۔ قہقہوں کی۔ اس نے چونک کے گردن پھیری۔ پلازے کے کونے والی ان عین سامنے ایک لڑکا بیساکھی کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ میزھے سے تھے اور وہ نفی میں سر ہلاتا، کچھ کہر رہا تھا، مگر اس کے لہجے اُنمہ کیے کھڑے تین لڑکے اس کو بولنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ وہ تیخرا نہ انداز میں ہنستے ہوئے کچھ کہر ہے تھے البتہ ایک لڑکا اب نہیں بولنے لگا تھا۔ معدود لڑکے نے جواباً کچھ کہا تو اس نے کھنچ کے اس کے منہ پر تپھر دے مارا۔

”ادھرمت دیکھو۔ اپنے کام پر فوکس کرو۔“ کان میں احرم کی محتاط آواز آئی تو وہ سرجھنک کے آف کورس کہتا دوسرا جانب، البتہ چہرے پر اضطراب سا پھیل گیا تھا۔ سکھیوں سے وہ دیکھ سکتا تھا کہ معدود لڑکا اب پیچھے ہٹنا چاہا گر جواباً دوسرا نے اس کی طرف تینوں اطراف پر بڑھ رہے تھے۔ معدود لڑکے نے سامنے والے کے سینے پر ہاتھ رکھ کے اسے پرے ہٹانا چاہا گر جواباً دوسرا نے اس کی بیساکھی کو پاہا۔“ دھکیلا۔ وہ روپت کے گرا۔

”سعدی.... وہ آنے والا ہے۔ فوکس کرو۔ یا آدمی آج ہمارے ہاتھ سے جانا نہیں چاہیے۔“

”مجھے پتہ ہے۔“

”بار بار ان کی طرف مت دیکھو۔ وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارا کہیں اور اس کی گواہیاں زیادہ اہم ہیں۔“ احرم اسے یاد کر رہا۔“ وہ سر بلات کے خاموشی سے کھڑا رہا۔ کبھی کوئی کتاب اخلاقیتا، کبھی کوئی رسالہ۔ سکھیوں سے جھلکتا منظر شدت پکڑ رہا تھا۔ لوگ نظر انداز پر رہے تھے اور وہ تینوں اب اسے زمین پر گرا کے مار رہے تھے۔

”وہ آگیا ہے۔ وہ دیکھو۔ براؤں شرٹ میں یعنیک والا۔“

”ہوں!“ سعدی سامنے دیکھنے لگا مگر اس کا دماغ فوکس نہیں کر پا رہا تھا۔ لڑکے اسی طرح معدود لڑکے کو مار رہے تھے اور کا ایسا۔“ رہے تھے۔ ایسے آنکھ کے کنارے پر نظر آیا۔ ایک لڑکے نے اپنے بوٹ سے اس کے ٹیڑھے منہ پر ٹھوکر ماری تھی۔“ بس بہت ہو گیا۔ وہ تیورا کے گھوما اور جارحانہ انداز میں ان کی طرف بڑھا۔

”سعدی.... نو۔ واپس مڑو۔ سعدی یوسف!“ احرم اس کے کان میں گر جا تھا۔

”یونو واث....“ اس نے کان میں لگا آلہ دوانگلیوں سے پکڑ کر باہر نکلا، اور ہاتھ منہ کے قریب لے جا کر بولا۔ ”تم میری ماں۔““ اور اسے جیب میں ڈالتا تیزی سے ان کی طرف پکا۔ (احرنے بے اختیار اسٹریٹ مگ پر ہاتھ مارا۔)  
”کمزور سے کیوں لڑ رہے ہو؟ ادھر آؤ، مجھ سے مقابلہ کرو۔“ پی کیپ کا رخ پیچھے کو موڑا تاکہ چہرہ سامنے واضح نظر آئے اور اس کا اپر چڑھاتا وہ ان کی طرف آیا۔ وہ چونکے تھے۔ ایک نے منہ بھر کے اسے گالیاں دیں۔ دوسرا اس کی طرف بڑھا، مگر اب اسے پھوٹنے نہیں ا تھا۔

وہ اور خاور قید خانے کے کمرے میں تھے وہ کمرہ جس کی دیوار پر ان گنت لکیریں لگی تھیں۔ اور خاور اس کو بتا رہا تھا کہ اسے مارنا ہے۔ صرف بے ہوش کیسے کرنا ہے۔ اپانچ کیسے کرنا ہے۔ قتل کیسے کرنا ہے۔ اس کے سامنے صرف خاور تھا۔ اور وہ اپنا ہاتھ اور پاؤں تمہارے کراس کو مار رہا تھا۔ ارگر دخاموشی تھی۔ صرف وہ دونوں تھے اور ان کے ہاتھوں کی مہارت تھی۔ سرجھکا کے ایک طرف سے کل جاتا، با کے دے مارنے کا انداز تھا۔ ارگر دوسرے کچھ نہیں تھا۔

سرخ دھنڈ چھٹی تو سامنے وہ تینوں اب قدرے زخمی حالت میں پیچھے کوہٹ رہے تھے۔ بس چند لمحے لگے تھے ان کو بھگانے میں۔ چندرا گلگیر جو تماسد دیکھنے کے تھے، اب وہ بھی مز گئے تھے۔ اپنی لڑکا زمین پر گراہوا تھا، اور اس کے جسم سے جا بجا خون نکل رہا تھا۔ منہ کی پوٹیں سب سے زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ وہ جھکا اور اسے ایک ہاتھ کے سہارے سے اٹھانے لگا۔

لڑکا نام بے ہوش، مندی آنکھوں سے اے یک تک دیکھتا سہارے کے کراٹھنے لگا۔

”مجھے اس کو ہاسپل لے کر جانا ہے۔“ وہ دوسرے ہاتھ سے کان میں آلہ دوبارہ لگا چکا تھا۔

”ٹیکسی کر کے جاؤ کیونکہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔“ وہ جلا بھنا سابو لا تھا۔ سعدی نے چونک کے دور کھے میگزین اٹینڈ کو دیکھا۔

”وہ چلا گیا؟“

”نہیں۔ اس نے یہاں اعتکاف میں بیٹھنا تھا، اس لئے دیکھو شاید ابھی تک ہو۔“ وہ سخت تنخ پا تھا۔ ”یا تو مجھے کام نہ کہا کرو اور اگر کہا کرو تو میرے طریقے سے عمل بھی کیا کرو۔“

”احمر!“ وہ لڑکے کو سہارا دے کر چلا رہا تھا۔ ”میں نے یہ جنگ یہ صرف ایک کیس جیتنے کے لئے یا ایک امیر لڑکے کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی خواہش کے لئے نہیں شروع کی تھی۔ میں نے یہ لڑائی اس لئے مول لی تھی تاکہ کوئی مغروڑ اور بد دماغ لڑکا کسی عام کمزور لڑکے کو یوں نہ مار سکے۔ کوئی اپنے گھمنڈ میں کسی کو bully بنے کر سکے۔ اور جب بھی کوئی یہ کرے تو اس کا ہاتھ روکا جائے اور اگر کرنے سے نہ رکے تو اس کا ہاتھ توڑا جائے۔ تاکہ خاص لوگ عام لوگوں کو اپنے پیروں تلنے نہ روند دیں۔ اگر میں یہ ہونے دوں تو میں کیسا انسان ہوا؟“ وہ ٹیکسی اٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔“

”بیڑہ غرق تمہاری اخلاقیات کا۔ میں بتا رہا ہوں، آج سے میں نو شیر و اس کے ساتھ ہوں۔ کم از کم وہ میری بات تو مان لیتا۔“ وہ کار استارٹ کرتے ہوئے بولا تھا۔ کم از کم اس وقت وہ اسے اس زخمی کے ساتھ ہپتال نہیں لے جا رہا تھا۔ خود جائے اب ٹیکسی میں۔ مان نہیں ہوں میں اس کی۔ ہونہے۔

اس شام ہاشم کا ردار ابھی تک اپنے آفس میں موجود تھا۔ کھڑکیوں کے آگے اندر ہیرا پھیل چکا تھا اور آفس کی عمارت ملازموں سے تقریباً خالی ہو چکی تھی مگر وہ قطعاً تکان زدہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ سیٹ پر نیک لگا۔ وہ پورے یقین اور عزم سے سامنے بیٹھے ریس سے کہہ رہا تھا۔ ”پچھے دن ہیں ہمارے پاس۔ پچھہ دن میں تمہیں فول پروف اور ٹھوس منصوبہ بنانا ہے۔“

”میں کروں گا، سر... آپ بے فکر ہیں۔“ وہ جو ساتھ ساتھ لیپ ٹاپ پر کھٹ کھٹ ٹاپ پر بھی کیے جا رہا تھا، تسلی آمیز انداز میں بولا۔

”مجھے خاور کی محسوس نہ ہونے دینا۔“ ہاشم نے تمہیں کی تھی اس نے صرف سر کو خم دیا۔ تب ہی دروازہ افراتفری کے عالم میں کھلا اور ہڑ بڑائی ہوئی ہی طیمہ اندر داخل ہوئی۔ ”سر...“

”تم ابھی تک یہیں ہو؟ اب چلے جانا چاہیے تمہیں۔“ وہ نرمی سے بولا تھا مگر حلیمہ چہرے پر دوڑتی ہوا بیوں کے ساتھ سامنے آئی۔

”سر، یعنو... ہم سیکرٹریز ایک دوسرے سے انٹھ ہوتی ہیں، اور بہت سی باتیں شیر کرتی ہیں۔“ وہ پھوٹے نفس کے ساتھ بول رہی تھی۔

”آگے بولو۔“ وہ تمہید سے بے زار ہوا۔

”سر... نو شیر و اس صاحب کی سیکرٹری کی کال آئی ہے مجھے۔ ابھی ابھی۔ انہوں نے... نو شیر و اس نے... ایک ہوٹل میں میڈیا کے نمائندوں کو بلا یا ہے، اور وہ ایک ہنگامی پر لئے کانفرنس کرنے جا رہے ہیں۔“ ہاشم بھلکی کی سی تیزی سے کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ فنق ہوا تھا۔

”کیسی پر لیں کافرنس؟“ فون اور والٹ اٹھاتے ہوئے وہ چیختا۔

”کچھ نہیں معلوم سروہ بس کوئی اہم اکشاف کرنے جا رہے ہیں۔“ اگلے الفاظ ہاشم نے نہیں سنے۔ اسے بس یہ نظر آ رہا تھا کہ وہ دوز رہا ہے۔ رئیس اس کے چیچھے بھاگ رہا تھا۔ راہداریاں... آفس کی بن... لفٹ... وہ پسینہ پسینہ ہوتے جسم کے ساتھ عبور کرتا، بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ یوں لگ رہا تھا ساری عمارت اس کے سر پر گرنے والی ہو... ہرشے ملیا میٹ ہو کر زمین بوس ہونے والی ہو... ساری دنیا جل کر راکھ ہونے والی تھی.....

سرکوں پر گاڑیاں... لوگ... درخت بھاگ رہے تھے... اور اس کی زندگی چیچھے کو دوڑ رہی تھی۔ بر سوں کی محنت... ساکھ... عزت سب کچھ نو شیر داں کے اعتراض جرم سے مٹی میں ملنے والی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو کھونے جا رہا تھا۔ وہ تیز ڈرانیوں کو رہا تھا۔ رئیس اسے رفتار بلکر نے کوہرہ رہا تھا، مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ اسے لپیٹنے آ رہے تھے۔

اس کا بھائی اپنی زندگی ختم کرنے جا رہا تھا۔ نظر دوں کے سامنے اس کے بچپن کے مناظر گھوم رہے تھے... وہ سیرھیاں چڑھتے ہوئے بار بار لڑک کے گرجاتا، تو وہ جھک کے اسے اٹھاتا۔ اسے سنبھالتا۔ اس کی انگلی پکڑ کے اسے وہ دشوار زینے پا رکرا تا۔ یہ انگلی کیسے چھوٹ گئی؟ کیسے فیصلہ کر لیا اس نے اس بے وقوفی کا؟ او وہ نہیں شیر۔ پلیز نہیں.....“

ہال میں رش تھا۔ بے پناہ رش۔ اسے پوڈیم پر داں کے چیچھے شیر و کھڑا نظر آیا تھا۔ وہ تھری پیس سوت اور نائی میں تیار کھڑا تھا۔ بال بھی جیل سے جمار کھے تھے اور ایک ہاتھ دا اس پر کھے وہ مائیک پر چڑھا جکھائے بول رہا تھا۔ سامنے بیٹھا جمع دھڑا دھڑا تصاویر کھینچ رہا تھا، وہی یوں بنا رہا تھا۔ ہاشم ضمید چہرے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا مگر رئیس نے اسے بازو سے قحہ کے روکا۔

”سرما یے مت کریں۔ تماثیں جائے گا پوری دنیا کے سامنے۔“

”اے روکو۔ بند کرو یہ سب۔ بھلی کاٹو، سکندر جام کر دو کچھ کرو۔“ وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ گرجا تھا۔

”سرمیں کچھ کرتا ہوں، مگر آپ پر سکون رہیں۔“ رئیس اسے روک کر خود دسری طرف بھاگتا۔ ہاشم گھبرے گھبرے سانس لیتا، بے یقینی اور خوف سے پوڈیم پر کھڑے شیر کو دیکھئے گیا۔ وہ آج بہت اوچا دکھائی دے رہا تھا، شاید اسٹچ کی اوچائی کافی زیادہ تھی۔ اس نے زینے کیسے چڑھئے، وہ کیوں نہیں لڑکھڑایا؟ وہ بس اسے دیکھئے گیا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے پہلا سوال یہی پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں نے سعدی یوسف پر حملہ کیا تھا یا نہیں۔ اس لئے بتاتا چلوں کہ کیس عدالت میں ہے اور اس پر بات کرنا منع ہے، لیکن میں صرف وہی کہوں گا جو میں کہہ سکتا ہوں۔“ بولتے ہوئے اس کی نظریں یونچے جمع کے درمیان کھڑے ہاشم پر جا ٹھہریں۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ہاشم نے دیکھتے، گیلے چہرے کے ساتھی میں سرہلا یا۔ گویا منت کی۔

(مت کرو شیر۔ خدار ملت کرو میرے بھائی)

”اور میں آپ کو اس کیس کے بارے میں وہی کچھ کہہ سکتا ہوں جو میں نے پہلے دن عدالت میں کہا تھا۔ میں بے گناہ ہوں، اور میں نے سعدی یوسف پر حملہ نہیں کیا تھا۔ عدالت کیا فیصلہ کرے گی، یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن میں نے یہاں آپ کو اس بات کے لئے نہیں بلا یا۔“

ہاشم کا ردوار بالکل ٹھہر گیا۔ آنکھوں میں بے یقینی اور حریت لئے وہ یک نک اسے دیکھئے گیا۔ رپورٹر زدھڑا دھڑا لکھے جا رہے تھے۔

کلک کلک تصاویر اتاری جا رہی تھیں۔

”میں آج... اعلان یہ طور پر اپنی کمپنی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہ کمپنی ہم نے اچھی نیت سے شروع کی تھی اور اس کو چاہئے میں رجسٹر کروایا تھا، ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم turbines بنائے کو ہم کو کھو کر پا رپا جیکٹ میں کوئلے سے گیس بنانے کے عمل میں استعمال کر سکے۔ میری کمپنی آج اس آسامی کے لئے حکومت کی نظر میں ایک مضبوط امیدوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہم یہ بینڈر لے بھی

جائیں، مگر.....

ہاشم بالکل سن ساکھڑا تھا۔ یکدم بچلی بند ہو گئی۔ ہال میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ شور سا بلند ہوا۔ ہا ہو کی آوازیں آئیں۔ مگر ایونٹ آر گناہ زر جلدی سب کو خاموش کرنے لگا۔ کیروں کے فلیش آن کرنے لگے۔ اندھیرے میں پھر سے سفید روشنی ہو گئی۔ صرف مایک کا منسلک تھا، مگر پوڈیم پر کھڑے نو شیر وال کو پرواہ نہ تھی۔ وہ سر اٹھا کے بو لے جا رہا تھا۔ مزید بلند آواز میں۔

”مگر میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری کمپنی جوڑ بائیں بنارہی ہے اور جس میں میرے خاندان نے کروڑیں روپیے لگایا ہے، وہ ٹربائیں ناقص ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے دیں کہ اس لوڈ شیڈنگ سے لٹنے کے لئے.... انگلی اٹھا کر اندھیرہ بال کی طرف اشارہ کیا۔“ اس اندھیرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تھر کے جس کو ملے کو زمین کے اندر ہی گیس بنایا جانا تھا، اس عمل کے لیے اگر کسی کمپنی کی ٹربائیز کارگر ہیں تو وہ shell ہے۔ شیل کے علاوہ اس غلطے کی تامکپنیز کی ٹربائیز ناکارہ ہیں، اور وہ UCG یعنی زیر زمین کو ملے کو گیس بنانے کے عمل (یعنی کو ملے کو کھود کر نکالے بغیر اندر ہی گیس میں تبدیل کر دینے) کے لئے تکمیل طور پر ناکارہ ہیں۔ یہ پراجیکٹ اگر کسی کمپنی کو ملنا چاہیے تو وہ شیل ہے۔ شیل کے علاوہ حکومت اگر کسی اور کمپنی کو یہ کام سوپنچتی ہے تو وہ اپنی عوام کے ساتھ دھوکہ کرے گی اور Tax payer's money کو غلط جگہ استعمال کرے گی۔“ پسینے پسینے کھڑا نو شیر وال موبائل اور فلیش لائٹس کی روشنی میں سارے ہال سے یکتا اور روشن نظر آ رہا تھا۔ آگے پیچھے ہر جگہ اندھیرا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ دو شن تھا۔ چمکتا ہوا۔ ساری مداخلت اور بدانتظامی کے باوجود ادب سب خاموشی سے اسے کن رہے تھے۔

”میں اس کمپنی کے سی ای او کی حیثیت سے آج ریزاں کر رہا ہوں۔ کیونکہ میں اتنے بڑے پراجیکٹ کا اہل نہیں ہوں۔ میرے خلاف چلنے والے ٹرائی سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ میں ابھی تک کچھ نہیں سیکھ پا یا۔ اس لئے میں باعزت طور پر اپنی کمپنی سے الگ ہو کر ایک ملٹی نیشنل میں جاب کے لئے اپلائی کر رہا ہوں۔ جیسے میرے باپ اور بھائی نے محنت کر کے اپناراست بنایا اس طرح میں بھی مشکل راستہ چون رہا ہوں۔ اگر میں لوڈ شیڈنگ کو ختم نہیں کر سکتا، تو کم از کم میں ان طریقوں کی حمایت بھی نہیں کروں گا۔ جو اس مسئلے کو بڑھاتے ہیں، گھٹاتے نہیں۔ اس لئے نہ صرف میں اپنی کمپنی سے مستغفل ہو رہا ہوں بلکہ اپنی پیریٹ کمپنی جو کہ ایک IPP ہے سے بھی ریزاں کر رہا ہوں۔ اور آخر میں ایک بات۔“ بلند آواز میں کہتے ہوئے اس نے کاغذات کا ایک پلندہ ان کو دھایا۔“ میں اس paper کو بہلش کر رہا ہوں اور اس کی ایک کاپی آپ سب کو دس منٹ پہلے ای میں کر دی گئی ہے۔ اس میں میں نے آپنی پیز کے حکومت سے معاهدوں پر روشنی ڈالی ہے، کیونکہ میں مزید اب اس نظام کا حصہ نہیں بننا چاہتا جس میں ہم آپنی پیز پورے پیسے لے کر آدمی بچلی بناتے رہیں۔ میں اس کو بدل نہیں سکتا، مگر اس کے خلاف آواز ضرور اٹھا سکتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ مجھے اب Whistleblower کہا جائے گا اور مجھے شاید کوئی کمپنی جاب نہ دے اور کوئی میرے ساتھ کاروبار نہ کرے، کیونکہ رات تک لوگ میری کمپنی سے پیسے نکال کر اسے دیوالیہ کر دیں گے، لیکن میں اب مزید خاموش نہیں رہوں گا۔ میں اپنی تمام کمپنی پوزیشنز سے مستغفل دیتا ہوں۔ شکریہ۔“

اب وہ پوڈیم سے اتر آیا تھا۔ مگر ہاشم یک نک پتھر کا بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ رپورٹر ز شہد کی مکھیوں کی طرح اس پر سوالوں کے لئے

جھپٹے

تھے مگر وہ خاموشی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ زینے خود چڑھا تھا، اور وہ زینے خود اتر رہا تھا۔ ہاشم کے ہاتھ برف ہو رہے تھے۔ وہ اندھیرے میں تھا کھڑا رہ گیا تھا۔



مجھے سکون میر نہیں تو کیا غم ہے ..... گلوں کی عمر تو کانٹوں کے درمیاں گزرا  
چھپے دن بعد۔

مورچال پر رات گھری ہو کر اتر رہی تھی۔ سب سوچ کتے تھے مگر خینہ لا ونج میں موجود تھی۔ آئین اور پرچڑھائے وہ اسٹول پر کھڑی دیوار پر stencil کا راس کو پینٹ کر رہی تھی۔ (stencil پلاسٹک کا بڑا سائلکر ہوتا ہے جس میں ڈیزائن کی جگہ خالی ہوتی ہے جیسے عموماً اس کے پر مہندی لگانے کے لئے تھیلی پر کھکھ اور پر مہندی لگادی جاتی ہے اور جب پلاسٹک اٹھا، تو نیچے نقش و نگار بن چکے ہوتے ہیں۔) اس کے stencil پر بڑا سارہ رخت کشا ہوا تھا اور وہ احتیاط سے اس پر برش پھیر رہی تھی۔

اندر زمرہ اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پیٹھی کام کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر گھری کو بھی دیکھ لیتی۔ گیارہ بجھے کو آئے تھے اور فارس نہیں آیا تھا۔ اور اسی پل اچانک سے اس کا فون بجا۔

فارس کا لگ دیکھ کر بلوں پر مسکراہت بکھر آئی۔ مگر جب موبائل کان سے لگایا تو الجہہ خشک بنالیا۔  
”جی کہیے۔“

”آہم۔ وہ کھنکھارا تھا۔“ ”کہہ رہو؟“

”گھر پہ۔ اور کہاں ہو سکتی ہوں؟“

”ایک ایڈریس نیکست کر رہا ہوں، ادھر آجائو۔“

”اس وقت؟ مگر کیوں؟“

”ایک اہم گواہ سے ملوانا ہے۔ زیادہ سوال مت پوچھو! بس ایک گھنٹے کے اندر ادھر پہنچو اور سنو۔ صرف تم آنا۔ ساتھ میں پورے گروں کو مت لے آتا۔“

زمرہ نے چونکے گھری کو دیکھا۔ بارہ بجھے میں ایک گھنٹہ تھا۔ ایک بھر پورے مسکراہت اس کے بلوں پر بکھر گئی۔

”اور اگر میں نہ آؤں تو؟“ لمحے بھر کے توقف سے وہ بولا۔

”پتہ بھیج رہا ہوں۔ جلدی آؤ۔“ اس کی توقع کے خلاف اس نے کوئی تپانے والا جملہ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ زمرہ نے مسکرا کر اسکرین کو دیکھا جہاں اس کا پیغام جگہ گارا تھا۔ پتہ بھر کا رس کی مسکراہت مزید گھری ہو گئی۔

خینہ نے ابھی درخت کی پہلی شاخ مکمل پینٹ کی تھی جب کھلتے دروازے کی آواز پوہچوئی۔ زمرہ آہستہ سے کمرے سے باہر آ کر دروازہ بند کر رہی تھی۔ سیاہ ڈیزائزروئیر پہنچنے والے کامیک اپ ایئر گز، کہنی پر پرس۔ خینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ اس وقت کس کی شادی میں جا رہی ہیں؟“

”اپنی شادی کی ایشورسری میں جا رہی ہوں۔“ زمرہ نے بہت سکون سے صحیح کی۔ خینہ چوکی۔

”کل میں میسی ہے؟ ایک سال ہو گیا؟“

”کل نہیں۔ ابھی بارہ بجے سے میں میسی ہے۔ اور فارس صاحب کو اتنے دن سے ڈرڈر زکرنے کے بعد بلا آخر آج وقت ملی۔

گیا مجھے ڈنر پر بلانے کا۔“

حمد کی آنکھیں چمکیں۔ ”کہاں بلا یا ہے؟“

”ہم دونوں کے لئے ایک یادگار جگہ ہے وہ۔ زیادہ سوال مت پوچھو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”ویسے ان کو چاہیے تھا آپ کی مرضی کی جگہ پر لے کر جاتے آپ کو۔ نیبل ریز روکر کے بتا رہے ہیں اب۔“

”وہ تو گواہ کو ملوانے کا بہانہ کر کے بلا رہا ہے، مگر اسکیلے آنے کا کہنا اور وہ بھی جیسی کی رات... ظاہر ہے وہ مجھے سر پر ازدینا چاہتا ہے۔ او کے اللہ حافظ“۔ وہ مسکرا کر اس کو الوداع کہتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ یونہی خینہ کے دل نے تمنا کی کوہ آج پھر چاہیاں بھول جائے اور واپس آئے، مگر وہ غلت میں تھی۔ خیر، سر جھٹک کر کام کرنے لگی۔

درخت کی اوپری چار شاخیں بہت محنت اور احتیاط سے وہ پینٹ کر چکی تھی جب یہر دنی دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی۔ پھر اندر آنے کی آہٹ۔ خدا چونک کر پڑی۔ فارس چاہیاں دروازے کے قریب لو کری میں ڈالتا بادھ رہا تھا۔ خینہ نے فوراً گھڑی کو دیکھا۔ بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ اسے شدید غصہ آیا۔

”یعنی آپ نے واقعی گواہ سے ملوانا تھا۔ اور وہ اتنی خوش کر آپ ان کوڈنرپ بلا رہے ہیں۔ ویسے کون سا گواہ تھا؟“  
اندر آتے فارس نے رک کر اسے دیکھا جو اسٹوپل پر گھڑی تھی اور ہاتھ میں stencil brush اور پینٹ کی پلیٹ تھی۔ دوسرا ہاتھ میں ٹشوٹھا۔

”علیکم السلام خینہ۔“ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”تاریخ بھول گئی تھی کیا؟ ڈنرپ کیوں نہیں گئے؟“

”کیا شروع ہو گئی ہو گھر آتے ہی؟“ وہ نا گھبی اور اکاہٹ سے بولا۔ خینہ نے تھبر کے پہلے اسے دیکھا۔ پھر اس کے کندھے کے پیچھے۔

”زمر آپ کے ساتھ نہیں آئیں؟“ اس کا دل زور سے دھڑکا کا تھا۔

”وہ میرے ساتھ تو نہیں تھی۔ میں تو ابھی آرہا ہوں۔“ وہ حیران ہوا تھا۔ خینہ کے قدموں سے زمین سر کنے لگی۔

”آپ نے ابھی ابھی ان کو کال کی تھی اور کہا تھا کہ آپ کو ان کو کسی گواہ سے ملوانا ہے... ہے نا...“ وہ ہکلائی۔ چند لمحے لگے فارس کو اس کی بات سمجھنے میں اور ایک دم اس کا پورا دماغ سننا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔

”خدا میں نے اسے کوئی کاں نہیں کی۔ کہاں ہے وہ؟“

خینہ کے ہاتھ سے پینٹ برش سب پھسل گیا۔

”آپ نے ان کو کہا کہ اسکیلے آنا۔ وہ اسکیلی چلی گئی۔ وہ خوش تھیں۔ بہت زیادہ۔“ اس کا گلارندھا۔ وہ دم بخود گھڑی تھی۔

”کدھر... کدھر گئی ہے وہ؟“ وہ حواس باختہ سا پوچھ رہا تھا۔ شلی خینہ نے نغمی میں سر ہلایا۔ ”نہیں بتایا۔“ فارس بے اختیار پیچھے کو بھاگا۔ ٹوکری سے چابی اٹھائی اور موہاکل پنبہ را کل کرتے اس نے دروازہ کھولا۔

زمر کافون آف جا رہا تھا.....

اس کی ساعتوں میں ایک نفرہ گونج رہا تھا

He cannot protect his women!

اوہ خدا یا.... وہ اتنے دنوں سے غلط عورت کی حفاظت کر رہا تھا؟ اوہ خدا یا....



باب 28

## آبزیدان (The Aquarium)

### (حصہ اول)

زندگی کے اس سفر میں  
 ہر چیز کا دایاں اور بایاں "پر" ہے  
 محبت کے پنکھ کے لئے غصہ ہے  
 قسمت کے پنکھ کے لئے خوف ہے  
 درد کے پنکھ کے لئے شفا ہے  
 رُخْم دینے والے پنکھ کے لئے معافی ہے  
 غرور کے پنکھ کے لئے عاجزی ہے  
 آنسوؤں کے پنکھ کے لئے خوشی ہے  
 وقار کے پنکھ کے لئے ذات ہے  
 چھوڑ دینے کے پنکھ کے لئے سنبھالے رکھنا ہے  
 ہم صرف دوپروں کے ساتھ اڑ سکتے ہیں  
 اور دونوں پر ہوا میں تباہی تھہر سکیں گے  
 جب ان میں ہو گا توازن!  
 دو خوبصورت پر ہی ہیں اصل کاملیت!  
 مگر

انسانوں کی ایک نسل ہے جو بھتی ہے کہ  
 کاملیت ان میں سے ایک پر کے  
 ہر وقت موجود ہونے کا نام ہے  
 لیکن مجھ سے پوچھو تو  
 ایک پنکھ والا پر نہ ناکمل ہے

ایک پروالا فرشتہ نامکمل ہے  
ایک پروالی تسلی مردہ ہے  
سویلے لوگ جو کاملیت کو پانے کے لئے  
اپنے ایک پر کوکاٹ کر پھینک دینے میں لگے ہیں  
انہوں نے بناڑا لی ہے  
ایک معدود نسل انسانی!

(سی جوائے بیل سی)

.....  
کچھ وقت کی رومنی نے ہمیں یوں بدل دیا محسن ..... وفا پر اب بھی قائم ہیں مگر محبت چھوڑ دی ہم نے !  
**”چہ دن قبل۔“**

قصر کاردار کی ساری بیان رات کے اس پھر بھی روشن تھیں۔ اندر داخل ہوتے نوشیروال نے گہری سانس لی اور پھر قدم اٹھانے لگا۔ جیسے جیسے وہ پلتا آیا، لاونچ قریب آتا گیا، اور بالآخر وہ بڑے صوفے کے بالکل سامنے آٹھبر اچھاں ہاشم بیٹھا تھا۔ اس نے کوت نہیں پہن رکھا تھا۔ شرٹ کے آستین کہنیوں تک موڑ رکھے تھے اور تائی ڈھنیلی تھی۔ آہٹ پر اس نے صرف آنکھیں انھا میں جو بے تاثری لگتی تھیں۔ مردہ سی۔ پر یہ کافرنس کے چند گھنٹے بعد اب ان دونوں کی ملاقات ہو رہی تھی۔

”ولیکم ہوم!“ وہ شیر و پنے نظریں گاڑھے بولا تو آواز ایسی سرد تھی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سننی خیز لہر دوڑ گئی۔

”آپ کو جو بھی کہنا ہے میری پرنس کافرنس کے بارے میں بھائی وہ آپ...“ وہ باٹھاٹھا کے کہنے لگا مگر.....

”یا میکوریم دیکھ رہے ہو اپنے پیچھے؟“ وہ ٹھنڈے سے انداز میں شیر و پنے نظریں جمائے ہوئے تھا۔ نوشیروال نے گردان موڑ کر دیکھا۔

لاونچ کی ایک دیوار کے ساتھ نصب وہ ایک خوبصورت سا ایکویریم (آب زیدان) تھا جو رسول سے اس گھر کا حصہ رہا تھا۔ اس کی شیشے کی مستطیل دیواروں میں ڈھیروں پانی جمع تھا، مصنوعی پودے اور پھر اندر وہی فرش پہنچھے تھے، اور چند مجھلیاں دائیں سے باکیں ہل رہی تھیں۔ روشنیاں کچھ اس طرح لگتی تھیں کہ اندر وہی مااحول کو منور کیے ہوئے تھیں۔

”تمہیں یاد ہے یا میکوریم کون لایا تھا؟ نہیں....“ اس نے دائیں باکیں گردان ہلائی۔ ”تمہیں کہاں یاد ہو گا۔ مگر نہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ اسے اشارہ کر کے وہ خود اٹھا اور قدم قدم چلتا میکوریم کے قریب آ رکا۔ وہ نوشیروال کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اداس آنکھیں شیشے کے مجھی گھر پہ جمی تھیں۔ شیر و نہیں بیٹھا۔ اسی طرح کھڑا رہا۔ متذبذب نھاسا۔

”تم سترہ سال کے تھے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ایک ایگریکٹیشور مینگ میں لے گیا تھا، تمہیں قھری پیس میں ڈریں اپ کروا کے تم اپنی عمر سے بڑے اور اچھے لگ رہے تھے۔ ڈیکھ کوچھی خوشی ہوئی تھی تمہارے آنے سے مگر حب عادت وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ تم البتہ بے نیاز سے تھے۔ ہمارے ساتھ جا کر بیٹھ گئے تھے اور ہماری باتیں سننے لگ گئے تھے۔ ہم ایک ڈیل کرنے جارہے تھے اور تمہیں معلوم تھا کہ دوسرا فریق بعد میں تھوڑے بہت ہیر پھیر سے کام لے گا، مگر یہ بات ان کے منہ پہنیں کہنی تھی ہم نے۔ ہمیں سمجھوئی کرنا تھا، صرف نظر سے کام لیتا تھا، وہ اب ہو لے ہوئے شیشے کی دیوار پر دستک دے رہا تھا۔ اندر تیرتی مجھلیاں مزید خیزی سے بل کھاتی اور ادھر چکر کائے گئی تھیں۔“  
”مگر..... جب تمہیں اس دوران اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بعد میں چیزوں کو manipulate کر سکتے ہیں، تو تم نے ایک دم

چڑھ کے بولنا شروع کر دیا۔ ہمارے جی ایم نے تمہیں آنکھیں دکھائیں، ڈیٹھ کھنکھارے، مگر تم نے اپنی بات مکمل کر کے دم لیا۔ وہ لوگ Offended ہو گئے، اور انہوں نے ہم سے معذرت کر لی۔ ڈیٹھ پر بہت غصہ تھے، اور مجھ پر بھی کہ میں تمہیں لا یا ہی کیوں، مگر مجھے اطمینان تھا۔ دو باتوں کا اطمینان۔ ایک تو یہ کہ تم میں اتنی سمجھے ہے کہ غلط اور صحیح کا فرق کر سکو۔ بے شک "عقل" نہیں ہے کہ کس وقت بولنا ہے کس وقت نہیں، مگر چلو، سمجھو تو ہے۔ اور دوسرا یہ کہ تم "درست فیصلہ" کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اس دن میں تمہارے لئے یہاں یکور یہم لا یا تھا۔ اور اس کو ہمارے لا و نج میں رکھوایا تا کہ تم گزرتے ہوئے اس کو دیکھتے رہو اور تمہیں اپنائزنس میں دلچسپی لینا بھول نہ جائے۔“  
وہ اب بولنے ہوئے آبزیدان کی کانچ کی دیوار کے کنارے پر انگلی پھیر رہا تھا، گویا کوئی لکیر کھینچ رہا ہو۔ شیرو کے تنے اعصاب ڈھیلے پر چکے تھے اور وہ خاموشی سے کھڑا تھا۔

"مگر تم بھول گئے۔ برنس میں دلچسپی لینا، اپنی سمجھے بوجھے درست فیصلے کرنے کی طاقت، تم سب بھول گئے۔ میں نہیں بھولا۔ میں اس کی مچھلیاں بدلو اتا رہا۔ جب کوئی مر جاتی تو اس سے ملتی جلتی مچھلی اندر ڈالوادیتا۔ کوئی دن ایسا نہ لزرا جب اس کی مچھلیوں کی خوراک کا میں نے ملازموں سے پوچھا نہ ہو۔ میں تمہیں اکثر برنس میٹنگز میں جانے سے پہلے یہاں یکور یہم یاد کروتا تھا، تا کہ تم سمجھ پاؤ کہ کاروبار کے سمندر میں تم ڈوب نہیں سکو گے اگر تیرنا سیکھ لو۔ میں نے اپنی امید نہیں کھوئی۔ تم نے سعدی کو گولی ماری، تم نے علیشا کو داپس بلایا، اس کو کمپنی میں سے حصہ دیا، ملک سے بھاگنے کی بجائے ٹرائل کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا، میں اس کی مچھلیوں کی حفاظت کرتا رہا۔ تم مجھ سے دور ہوتے گئے، زمر سے قریب ہوتے گئے، میں سے بد تیزی کرتے رہے، میں نے اپنی امید نہیں کھوئی، مگر آج شام....." اب کے وہ پورا گھومات نو شیر والے اس کا چہرہ دیکھا، اس کی خود پر جمی ملال بھری آنکھیں دیکھیں اور اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"آج جب تم نے پریس کا نفرنس کر کے اپنی کمپنی کو دیوالیہ کر دیا، ہماری پیرنٹ کمپنی کو نقصان پہنچایا، تم نے اپنے ہی خاندان کے کاروبار کے خلاف whistleblowing کی، تم نے ہمارے کاٹریکٹس پر تقدیم ہیپر لکھ کے پبلش کر دیا، آج تم نے میری کمر میں نیجنگ گھونپا تو شیر والے میں نے تم سے آخری امید بھی کھوئی۔ تم نو شیر والے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں تو اچھے فیصلے کر سکتے ہو، مگر کاروبار میں تم ہمیشہ فیل رہو گے، اور اسی لئے اب سے تم صرف میرے بھائی ہو۔ کل آفس آکر اپنی چیزیں لے جانا اور دوبارہ اس بلڈنگ میں قدم نہ رکھنا۔"

"کیا آپ اب بھی میرا کیس لڑیں گے؟" اس سوال پر ہاشم نے مسکرایا۔

"میں اب تمہارا کیس پہلے سے زیادہ جانشناہی سے ٹاؤں گا شیر، کیونکہ تم میرے بھائی ہو، اور اپنی عقل سمجھ سب کھو چکے ہو۔ میرے لئے تمہیں بچانا اب زیادہ ضروری ہو گیا ہے، مگر ہاں، تم نے مجھے آج بہت بڑا کھدا دیا ہے۔ میں نے کیا نہیں کیا اس سارے خاندان کے لئے اور تم سب نے مجھے ہر طرف سے نقصان پہنچایا۔ کیا اپنے بھائی کے ساتھ ایسے کیا جاتا ہے، شیر؟"

نو شیر والے نے سر جھکا دیا۔ "آئی ایم سوری آپ کو ہرث کرنے کے لئے، مگر میں اپنے فیصلوں پر "سوری" نہیں ہوں۔ میں نے وہ کیا جو مجھے ٹھیک لگا۔"

"اور میں اب وہ کروں گا جو مجھے ٹھیک لگے گا۔ بہت ہو گیا میرا نقصان اب جوابی حملہ کرنے کا وقت ہے۔"

شیرو نے چونک کے اسے دیکھا۔ "آپ کیا کریں گے؟"

"تم جا کر سو جاؤ۔" اس نے ہاتھ جھلا کے ذرا نرمی سے اس کو جانے کا اشارہ کیا۔ شیر و بھی نہیں رکا۔ خاموشی سے سیر ہیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے کمرے کے دروازے پر ہٹری جواہرات اس کے جاتے ساتھ ہی بولی تھی۔

"جب تم اپنے خاندان کو خود سے دور کر دے گے تو یہی ہو گا ہاشم!"

ہاشم نے گردن موڑ کے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔ "میں ابھی تک کچھری میں وکیلوں کے سامنے اپنی بے عزمی بھولا نہیں

ہوں۔ مجھے کچھ وقت لگے گا میں تک میرے سامنے نہ آئیں تو اچھا ہے۔ میری اتباخو۔ آخر میں وہ اتنی بلند آواز میں دھاڑا تھا کہ جواہرات کا جنم تھرالا تھا۔

”لیں سرا!“ میری دوڑتی آئی۔

”اس ایکویریم کو میرے آفس میں منتقل کروادو۔ اب اس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے اور میں پانی میں سانس لیتی مچھلیوں کو بے گھر نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ اب مضم آواز میں ہدایت دے رہا تھا اور جواہرات بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اجنبی ہوتا جارہا تھا۔

❖❖❖

تمام عمر جلاتے رہے چراغِ امید ..... تمام عمر امیدوں کے درمیان گزری  
اگلی شام میں وہ دوبارہ ہپتال آیا تاکہ اس اپاچ لڑکے کی خیریت اور طبیعت دریافت کر سکے۔ آج اس کو دسچارج کیا جانا تھا، اور  
سعدی اس سے پہلے ایک دفعہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ ہپتال کی راہداریوں میں وہ خاموشی سے آگے بڑھتا گیا۔ دوائیوں اور اسپرت کی بوا اور عجیب  
سی ویرانی درود یوار سے پہنچتی تھی۔ ابھی اسے چند طویل راہداریاں عبور کر کے مطلوبہ وارڈ تک پہنچنا تھا۔ راستہ طویل تھا اور دل پر بوجھڑائے والا بھی  
تھا۔ اس نے رفتارست کر دی۔ کبھی دا کیس اور کبھی باسیں دیکھتا ہو لے ہو لے قدم اٹھانے لگا۔

ہپتال بھی عجیب جگہ تھی۔ یہاں آکر عجیب سے احساسات ہوتے تھے۔ لوگوں کی آوازیں، شور پکاریں، اور ساتھ میں خاموشی۔ وہ  
سب مل کر کان میں سیسہ گھول دیتیں۔ اس نے بینڈ زفری کانوں میں مخونس لی اور موبائل کی اسکرین کو سر جھکا کے دیکھتا، مطلوبہ آیات کو چھوٹا  
آگے بڑھتا گیا۔

دل کو ریض کی عیادت بھی نرم کرتی ہے اور قرآن کی تلاوت بھی۔ وہ ان دونوں کو ملانے لگا، شاید کہ اثر بڑھ جائے۔

میں پناہ چاہتا ہوں اللہ کی دھنکارے ہوئے شیطان سے۔

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اب وہ پھر سے اطراف میں دیکھنے لگا تھا۔ قطار در قطار بیٹھ۔۔۔ کھل دروازوں سے جھانکتے بے حال، زرد چہروں والے لوگ۔ وحشت  
کی وحشت تھی۔

”اور بے شک آپ کا رب تو لوگوں پر فضل کرتا ہے  
لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔“ (انمل - 73)

”شکر کیا ہے اللہ تعالیٰ؟“ وہ بول نہیں رہا تھا اور اسی طرح قدم بڑھا رہا تھا۔ ”آخر یہ شکر کہتے کس کو ہیں؟ جب کچھ نہ ہو  
پاس تو وہ آکھر کھنا جو“ وہ دیکھ لے جو کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو ہر پل پاس ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ لوگوں پر فضل  
کرتے ہیں۔ فضل ”زادہ“ دینے کو کہتے ہیں۔ حق سے اوقات سے بڑھ کر دینے کو۔ جیسے آپ ہمیں نعمتیں دیتے ہیں، ویسے ہی آپ ہمیں  
”موقع“ بھی دیتے ہیں۔ صرف مادی چیزوں دولت، اولاد، کامیابی پر شکر کرتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمیں ”مواقعوں“ پر بھی شکر کرنا  
ہے۔ ہم میں سے جن کے ماں باپ نہ رچکے ہوتے ہیں، اور وہ ان کی خدمت نہیں کر سکے ہوتے تو وہ برسوں پچھتاوں اور  
ملاں میں گھرے رہتے ہیں کہ کیا تھا اگر اللہ ان کو زندہ رکھتا اور وہ ان کی خدمت کر پاتے؟ مگر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ ہمیں دوبارہ موقع ضرور دیتا  
ہے، کسی بوڑھے کو ہمارے قریب لا بساتا ہے، چاہے سارے سر ہوں، کوئی لا چار بزرگ، ہمایا ہو یا کوئی بوڑھا ملازم کوئی ہوتا ہے، ہمارے گرد جس  
کی خدمت کی جا سکتی ہے مگر اپنے پچھتاوں میں ہم موقع ضائع کر دیتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے ماں باپ کی طرح نہیں سمجھ سکتے، مگر سارا مسئلہ  
یہی ہے کہ ان کو والدین نہیں سمجھتا۔ نہ ان سے والدین کی طرح محبت کرنی ہے۔ صرف ان کی عزت اور خدمت کرنی ہے۔ شادی سے پہلے

لڑکیاں چھوٹے بہن بھائیوں کو بہت جھوٹکتی ہیں، بعد میں پچھتا تیں، مگر صرف پچھتا نے کیا فائدہ جب اپنے اردو گرد ویسے ہی چھوٹے ہیں۔ دیکھنے اور ان سے نرمی کرنے والی بصیرت ہی نہ رکھے انسان۔ ہم مسلسل روتا روتے ہیں کہ ہمیں کوئی بری لست پڑی ہوئی ہے، کوئی ایسا گناہ نہ ہم چھوڑنیں پا رہے بار بار اس کو کر بیٹھتے ہیں۔ بڑے وعدے کیے اللہ سے بڑی معافی مانگی، مگر پھر سے کر دیا۔ کمزور پڑ گئے۔ نفس کے آگے ہار گئے۔ اب روتے ہیں کہ سارا وقت مایوسی... ڈپریشن.... میں تو کسی اچھائی کے قابل نہیں رہا۔ یہ نہیں دیکھیں گے کہ گناہ کے بعد احساس ہونا اور خود کو ٹھیک کرنے کا اور توبہ کرنے کا موقع دیا ہے اللہ نے۔ یہ ہے اللہ کا فضل جس کو اپنے پچھتا ووں میں ہم ضائع کر دیتے ہیں۔ پچھتا وہ ہونا چاہیے مگر پچھتا وے کا ڈپریشن لے کر مایوس ہو جانا ان مواقعوں کی ناقدرتی ہے۔ اور ہم یہ ناقدرتی روز کرتے ہیں۔ آخر کب ہم اپنے اردو گرد وہ تمام "موقع" دیکھنے کی آنکھ پیدا کریں گے خود میں جو اللہ نے ہمارے پچھتا ووں کے بد لے میں replace کر کے ہمارے سامنے لارکھیں۔ آخر کب؟ وہ سفید فرش پر قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ چہرے پہ ملال ساتھا۔ اردو گرد چھائی و حشت ویسی ہی تھی اور طبیعت کو عجیب مکدر کر رہی تھی۔ پھر مریضوں کی آوازیں، ہسپتال کے عملے کا شور سب سے بڑھتا گیا تو اس نے ہینڈز فری کانوں سے نکال لی۔ مطلوبہ رہداری قریب آچکھ تھی۔

اس لڑکے کا نام شہزاد تھا، اور وہ بستر پر نیک لگائے اٹھا بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چہرہ کھل اٹھا۔ سعدی مسکراتا ہوا اس کے سامنے بستہ کی پائنتی پا آئیها۔ دارڈ میں آگے پیچھے لوگوں کا شور اور شہر پل بڑھ رہا تھا، ایسے میں جب وہ لڑکا اڑاڑ کے رک رک کے اس سے مخاطب ہوا تو اس کی بات سننے کے لئے سعدی کو آگے جھکنا پڑا۔ اس کی ماں دو ایساں لینے گئی ہے، اور وہ جلد سچارج کر دیا جائے گا، یہ بات وہ بدقش سمجھ پایا تھا۔

"وہ لڑکے کون تھے، تمہیں کیوں مار رہے تھے؟"

"وہ اسٹور سے چیزیں چوارہ ہے تھے... میں نے... میں نے شاپ کیپر کو بتا دیا تو باہر نکل کے وہ مجھے مارنے لگے... وہ ٹیز ہے ہونتوں کے ساتھ زور لگا کر بولتا تھا۔ سعدی مسکرا کے سترتاہا۔ لڑکا بے چینی سے پھر سے گویا ہوا۔

"آپ... ٹی وی والے ہونا... سا... سعدی یوسف؟" سعدی نے اسی اداس مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کیا۔ وہ جانتا تھا اب وہ لڑکا اس کا شکریہ ادا کرے گا، کہ اس نے کمزور کی مدد کی، طاقتور کے مقابلے میں اور....

"آپ لوگ.... آپ سب..... بہت... بہت... بے وقوف ہو۔" وہ ہکلا کے بولا تو سعدی کی مسکراہٹ سکنی۔ پھر یکدم وہ دل کھول کے نہیں دیا۔ اور غور سے اس کم عمر لڑکے کو دیکھا۔ سانوی رنگت اور سیاہ آنکھوں والا شہزاد کافی مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا۔

"اچھا... کیوں ہوں میں بے وقوف؟" وہ جواباً زور لگا کے کچھ بولنے لگا تھا مگر سعدی کی بات جاری تھی۔ "کیونکہ میں امیر اور طاقتور لوگوں کے خلاف کھڑا ہوا ہوں؟" لڑکے نفی میں سر ہلا کیا۔

"یا میں اس ملک کے گلے سڑے عدالتی نظام سے انصاف کی امید وابستہ کیے ہوئے ہوں؟"

"نن... نہیں....."

"یا میں چپ کر کے ان سے پیسے لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ یا میں ان کے ذر سے دبک کر بیٹھنیں گیا؟ کیوں شہزاد تم جیسے نوجوان کو سعدی یوسف بے وقوف کیوں لگاتا ہے۔"

"میں....." مگر وہ اس کو نہیں سن رہا تھا۔

"کیا میں اس لئے بے وقوف ہوں کیونکہ میں ایک بے سود کوشش کر رہا ہوں؟ قید میں اپنے پراجیکٹ کے راز ان کے حوالے کر دیتا تیں کروڑ لے لیتا، اور نئی زندگی شروع کر دیتا تو عقلمند ہوتا؟ قصاص مانگ رہا ہوں میں۔ اتنا وقت اور پیسے بر باد کر رہا ہوں۔ اس لئے بے وقوف

لگتا ہوں نا میں سب کو...“ اس کے بعد جی میں جذباتی سادھا بھر آتا تھا۔ لڑکا جو بار بار بے چینی سے نفی میں سر ہلاتا تھا، اب کے پورا زور لگا کے بولا۔

”تم لوگوں نے آپریٹر سے پوچھ گئے نہیں کی۔“ پورا فقرہ بول کے وہ گھرے گھرے سانس لینے لگا۔ سعدی یوسف بالکل خمیر گیا۔  
”کیا؟“

”ایئر پورٹ... کنٹرول روم آپریٹر... میری امی ائیر پورٹ پر کام کرتی ہے... آپریٹر نے بولا تھا کہ اس نے امیر لڑکے کی فوتھ ڈیلیٹ کر دی ہے...“

”کون نوشیر والا؟“ وہ تیزی سے بولا مگر آواز دھیکی کر لی۔ ”مگر ہم نے ائیر پورٹ کی ساری فوچر چیک کی تھیں، اکیس منی کی اور اگلے ایک ہفتے کی... نوشیر والا کہیں نہیں تھا۔“

”مگر آپریٹر نے خود بولا کی کہ اس نے فوتھ منائی ہے.... فوتھ میں وہ تمہارے گم ہو جانے کے ”بعد“ ملک سے جاتا نظر آ رہا تھا۔ ائیر پورٹ پر سب کو پتہ ہے یہ بات۔ تم بہت مشہور ہو۔ مگر تم نے کسی سے پوچھا نہیں۔ خاموشی سے چلے گئے...“

خندڑی برف کی آبشار تھی جو سعدی یوسف پا اوپر سے آگری تھی۔ وہ بے یقینی سے اس کے قریب آیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ بثوت نہیں ہے، مگر اس ثبوت کو دیکھنے والا گواہ موجود ہے!“

لڑکے نے جھٹ اثبات میں سر ہلا کیا۔ بالآخر وہ اپنی بات سمجھا پایا تھا۔

”اور تمہاری ماں کو یقین ہے کہ اس نے آپریٹر کو یہ سب کہتے سنائے؟“

”ہاں... ہاں... میری امی جھوٹ نہیں بولتی۔“ سعدی چند لمحے بس اسے دیکھے گیا۔ اندر بہت سے طوفان برپا تھے۔

❖❖❖

ہر آبلے پر درج ہے ”تفصیلِ زندگی“ مجھ سے نہ پوچھ میرے سفر کی اذیتیں وارث کی موت کے بعد اس کی آنکھوں پر چھائی سرخ دھندا بھی دیکھی ہی تھی۔ اس روز اس نے زمر کو اپنی واحد گواہ سے ملوانے کے لئے اس کے ہوٹل بلا یا تھا، جو گواہی دے سکے کہ فارس غازی قتل کے وقت اس کے ساتھ تھا۔ نہیں بھی ان کے ہمراہ تھی اور وہ زمر کو وقت اور جگہ بتا کر اب ہوٹل روم میں بیٹھے اس کے منتظر تھے۔ فارس خاموش تھا۔ علیشا خاموش تھی۔ نہیں خاموش تھی۔ وہ ایسی خاموش تھی جس میں ہر شخص اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سب کو خود کو بچانے کی فکر تھی۔ خود غرضی نہیں تھی یہ، بے بس سائلیف ڈیفنس تھا۔ نہیں اپنی جگہ شرمندہ دکھائی دیتی تھی۔ اسے فارس کو اس دن سب سے دور علیشا کے پاس لے جانے میں اپنی غلطی لگ رہی تھی۔ امی جب سے غم سے ذرا نکل تھیں، انھیں بیٹھتے اسے انہنزیت فریبیڈر کے نقصان گوارہ تھیں۔ زمر اس سے مل لے تو سارا مسئلہ ختم ہو جائے۔ اور سب اس قصے کو بھول بھال جائیں۔ علیشا کو اپنی فکر تھی۔ وہ یہاں ہاشم اور اپنے باپ کے دانتوں سے چند نواں لے کھینچنے آئی تھی۔ اسے اپنا جائز حصہ چاہیے تھا مگر ایسے میں

59

ایک قتل کیس کے مشتبہ شخص کی ایلی بائی بن چکی تھی جو اس کے باپ کا رشتہ دار تھا۔ وہ جلد سے جلد اس مشکل سے نکنا چاہتی تھی۔ فارس الگ پریشان تھا۔ زمر پر غصہ ابھی تک دیسا ہی تھا۔ وہ اپنا کام تیزی سے کیوں نہیں کر رہی؟ وہ وارث کے باس سے ملنے کب جائے گی؟ وہ دکھانے اور پر اسکیوشن آفس کی ارزی ست رفتاری سے واقف تھا، مگر اس وقت کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ہر چیز غصے، فریشان اور پریشانی میں نہ ہم دکھائی دیتی تھی۔

جب وہ کافی دیر تک نہیں آئی تو فارس اسے فون کرنے لگا۔ کال بار بار نوٹ جاتی۔ ”رابطہ ممکن نہیں۔“ ”اس نمبر سے جواب موصول

نہیں ہو رہا۔ اسے اب زمر پا افسوس ہونے لگا تھا۔ غصے بھرا افسوس۔ وہ کتنی دیر اس کمرے میں دائیں سے باہمیں پچکر کا فشار ہاڑھنیں درمیان میں ایک دوبار نیچے شاپس سے پھر بھی آئی (وہ اب بور ہونے لگی تھی)۔ مگر زمر نہیں آئی۔

زرتاش نے موہائل اٹھایا اور فارس کو کال ملائی۔ ایک گھنٹی بجی پھر دوسری۔ اس نے فون اخالیا۔

”ہاں زرتاشہ بولو؟“

”آپ کدھر ہیں؟“ قدرے پیچکا ہٹ سے اس نے پوچھا۔ ساتھ میں اسے خود پر افسوس ہونے لگا، وہ کیسے کسی اجنبی کی کال پر اعتبار کر سکتی تھی؟

”میں کام سے آیا ہوا ہوں باہر۔ کوئی کام ہے؟“

”نہیں۔ بس میں آپ کا پتا کرنا چاہ رہی تھی۔ آج آپ نے پر اسکیوں تر سے ملوانا تھا اس لڑکی کو وہ سب ہو گیا خیر سے؟“

”ہاں مگر میدم ابھی تک نہیں آئیں۔ میں اور خین علیشا کے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ہوٹل میں یعنی کر...؟“ اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فارس نے ”بائے“ کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ ایک دم کلس کر رہی۔ پھر موہائل رکھ کر ایک نئے ارادے سے انھیں۔

غصہ افسوس میں بدلا اور افسوس مایوسی میں۔ سہہ پھر طویل ہوتی گئی اور امید چھوٹی ہوتی گئی۔ اس نے تھیہ کر لیا کہ بس اب وہ پر اسکیوں آفس کے پچکر نہیں لگائے گا۔ ساری عادتیں گئیں جنم میں۔ اب جو کرنا ہے وہ خود کرے گا۔ اس نے خین کو چلنے کو کہا۔ وہ اس وقت استثنے ہوئے تاثر لئے ہوئے تھا کہ حمد چوں چوں اس کے ساتھ آگئی۔ علیشا کی جان چھوٹی تو اس نے ان دونوں کے جانے پر گویا سکھ کا سانس لیا تھا۔

اس نے خین کو ابھی گھر ڈر اپ کیا ہا کہ موہائل پاکال آنے لگی۔ نمبر غیر شناسا تھا۔ فارس نے کال وصول کر لی۔

دوسری طرف جانے کوں تھا، اس نے کبھی رک کے نہیں سوچا۔ پیشہ دار انداز میں اطلاع دی گئی تھی، جسے سن کر اس کا سارا جسم کانپ اٹھا تھا۔ وہ ششدر رہ گیا تھا۔ ساری آوازیں ساری آہیں دم توڑ گئی تھیں۔ وہ پکھ کہہ بھی نہ سکا، بس کار کارخ موز دیا۔ وہ تیز ڈرائیور کر رہا تھا مگر ہر شے سلو موشن میں ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ارد گرد لوگ ہارن بجا جانہیں تھک رہے تھے، کار کی کھڑکی سے سر نکال کر اسے گالیاں دے رہے تھے، وہ روڑ کے غلط سمت میں تھا، اسے کچھ پیدا نہ تھا۔ کوئی ہوش نہ تھا۔

اس کی بیوی ہپتال میں تھی۔ اس کی بیوی کو گولیاں لگی تھیں اور اس کے سیل فون میں ”ہر بینڈ“ کے نام محفوظ شدہ نمبر ہپتال والوں یا شاید پولیس والوں نے ڈائل کیا تھا۔ کوئی نام کوئی نیک کوئی اور حوالہ نہ تھا۔ صرف ہر بینڈ۔ ایسا رشتہ کہ جیسے سب کو پیدا ہو، بس بھی بچانے آئے گا۔ وہ پارکنگ لائن میں زنجیریں پھلانگتا، گلے گراتا، بھاگ بھاگ دوز رہا تھا۔ اس کی رنگت سفید تھی اور سانس رک رک کے آتی تھی۔ زندگی ایک دفعہ پھر دوارث کے ہائل کے کمرے کے باہر جا پہنچی تھی، ایک دروازہ تھا جسے وہ ہاتھ پاؤں مار مار کے کھولنے تو زونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دروازے کے پار ایک اور بے جان جسم منظر تھا یا...؟ وہ فنی میں سر بلاتا راہداری میں آگے بھاگتا جا رہا تھا۔ کس سے کیا پوچھا، کون اس کو راستہ بتاتا رہا تھا، وہ نہ کہا تھا، نہ دیکھ رہا تھا۔ بس اس سمت میں بھاگ رہا تھا۔

وہ کمرہ نہندتا تھا۔ ایسے جیسے برف کی دیواریں ہوں پانی کافرش ہو اور گویا آنکھوں کے سامنے سفید دھنڈ ہو۔ وہ اسے کچھ بتارہے تھے۔ بہت سے لوگ تھے ادھر اور وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ فارس کے قدم اب نہندے پڑ گئے تھے۔ ہاتھ کی پکانے لگے تھے۔ وہ اس اسٹرپر کے ساتھ کھڑا اتنا جس پر سفید چادر ڈالی گئی تھی۔ اس کی نظریں چادر پچھی تھیں مگر ہاتھ اٹھا کر چادر ہٹانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا تذبذب دیکھ کر سامنے کھڑی سفید کوٹ والی عورت نے چادر چیرے سے ہٹائی۔

کسی اپنے کام روہ چہرہ پہچانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایسا سفید پیلا اور خندنا ہوتا ہے ایسے توہ سوتے ہوئے بھی نہیں لگا کرتے۔ ایسے آنکھیں توہ مذاق میں بھی بند نہیں کرتے۔ ایسے پتھر توہ ناراضی میں بھی نہیں بنتے۔ وہ بھی ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر سیاہ دھبہ تھا۔ سفید دھنڈ کے باعث اسے وہ دھبہ ہی دکھا تھا۔ وہی اسے گولی لگی تھی۔ اور ایک سینے میں۔ وہ ہپتال آنے سے پہلے ہی مر جکی تھی۔ پھر بھی (اسے بتایا جا رہا تھا) کہ اس کو پہچانے کی کوشش کی گئی مگر یہ انسانوں کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ تو کیا انسانوں کے ہاتھ میں صرف جان لینا ہوتا ہے؟ زندگی کا اجڑا نا ہوتا ہے؟ وہ تحکما باراز میں پر بیٹھتا چلا گیا۔ پانی کا فرش تخت خندنا تھا مگر اس کا اپنا جسم بھی بر ف بن چکا تھا۔ سر نبیو اڑائے وہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ وارث کی موت پر اسے غصہ محوس ہوا تھا، زرتاشہ کی موت پر خوف محوس ہوتا تھا۔ ایسا ڈر جو پہلے بھی نہیں لگا تھا۔

اس خوف سے رگوں کا خون تک سبھم کے جم گیا تھا۔ کوئی اسے کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ دوسروی لوکی بھی تھی؛ جس کی شناخت پر ایکیو ٹرزمر کے طور پر ہوئی ہے اور وہ سرجی میں ہے مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ کون زمر؟ کیسی زمر؟ اسے اب پرانہ نہیں رہی تھی۔ پیشانی پر ہاتھ رکھنے والے سر جھکائے وہاں بیٹھا تھا اور گویا پانی کا فرش دھیرے دھیرے اسے نگل رہا تھا۔ وہ دو بتا جا رہا تھا۔ خندنے پانی سے تخت بر ف بنتا جا رہا تھا۔ سفید پڑ رہا تھا مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ محوس نہیں ہو رہا تھا۔

❖❖❖

موج سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ..... ہر ذرہ مثل جوبر تنی آب دار تھا  
وہ رات قطرہ قطرہ پکھل رہی تھی۔ آسمان تاریک ہو چکا تھا، اور تاروں کا جہاں ما جو لیاتی آلوگی کی گیری تھی کہ جب سے شہر کی سڑکوں سے نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے میں ہارون عبید کی رہائشگاہ پر وہ دونوں خاموشی سے ڈائنگ ٹبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ہارون عبید گاہے بگاہے اس پر نظر ڈال لیتے جو کھانے کے ساتھ بار بار اپنے موبائل کی اسکرین کو دیکھتی تھی۔  
ملازم کو جانے کا اشارہ کر کے ہارون اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”آبی....“ اس نے نہیں سن۔ سرخ رومال سر پاؤڑھے ان کی خوبصورت بیٹی رک کر موبائل اسکرین پر انگل پھیرنے لگ گئی تھی۔

”آبی۔“ دوبارہ پکارنے پر وہ چوکی۔ موبائل بجھا کے ان کی طرف سنبھل کے متوجہ ہوئی۔ ”سنابے منز کاردار اینٹی سوٹل ہوتی جا رہی ہیں۔“

”مجھے نہیں خبرا،“ اس نے بے پرواہی سے شانے اچکائے۔

”تو خبر رکھو نا۔ مجھے وجہ جانی ہے۔ تم یوں کر دکل ہاشم سے ملنے چلی جاؤ۔ اس سے پوچھو کو.....“

”بابا۔“ وہ اکتا کر بولی تھی۔ ”اگر آپ کو منز کاردار کی حالت زار میں اتنی دلچسپی ہے تو خود چلے جائیں یا اپنے کسی جاسوس کو بھیج دیں۔ مجھ سے یہ کام نہ کروایا کریں۔“

”بینا تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ہاشم سے کہنا ہے تم اس کے پر پوزل پغور کرہی ہو، لیکن تمہاری کچھ شراکٹریں ہیں۔“

آپ نے چونک کے ان کو دیکھا۔ ”کیسی شراکٹ؟“

”کچھ پہپڑ زیں،“ تم نے ان پر ہاشم کے دستخط لینے ہیں لیکن ایسے کہ اسے یقین ہو جائے کہ تم اس کے ساتھ مغلظ ہو اور.....“ آبدار نے زور سے کاٹا پلیٹ میں بچا، اور موبائل اٹھا کے کرسی دھکیلیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ غصے اور توہیں سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ان کو دیکھ کے وہ بس افسوس سے اتنا بولی تھی۔ ”میں آپ کی بیٹی ہوں یا کچھ تپلی، آپ ایک دفعہ بتا کیوں نہیں دیتے؟ اور میں مزید آپ کے ہاتھوں استعمال نہیں ہوں گی۔“ مجھے ہاشم سے نہ شادی کرنی ہے نہ اسے کوئی امید دلانی ہے۔ آئندہ میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں سنوں گی۔“ برہمی سے بولتی وہ نیکپیں پرے پھیلتی ساتھ سے نکل کے باہر چلی

گئی۔ ہارون اثر لئے بنا اسی طرح سکون سے لقہ چباتے رہے۔ ان کا ذہن اب اگلا تجھے عمل سوچ رہا تھا۔ جس وقت وہ کمرے کی طرف جا رہی تھی، اس کا موبائل تھرہ تھا نے لگا تھا۔ اس نے رک کر اسکرین دیکھی تو چہرے پر یہجان سامنودار ہوا پھر بچکاتے ہوئے فون کاں سے لگایا۔

”ہاشم!“ آج پورے نام سے پکارا۔

”ریڈ...“ وہ جیسے رخی سامنکرایا تھا۔ ”مل سکتی ہو؟“

”کیوں؟ خیریت؟“

”مل کے بتاؤں گا۔“ انداز میں عجیب سی دھونس تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ احتجاج کرتی، وہ لائن کاٹ چکا تھا۔ وہ متذبذب تی کھڑی رہ گئی۔

❖❖❖

چلتی ہے اب تو سانس بھی اس احتیاط سے ..... جیسے گزر رہی ہو کسی پل صراط سے مورچال پر رات کا اندر ہیرا پھیلا تھا۔ زمر کے کمرے میں آؤ تو وہ صوفے کے ایک کنارے پہ بیٹھی اپنے موبائل پلی تھی۔ فارس دوسرے کنارے پہ بیٹھا اپنے فون پر لگا تھا۔ مصروف سی خاموشی کمرے میں حائل تھی۔ تبھی دروازہ زور سے بجا تو وہ دونوں چوٹکے۔ زمر تیزی سے اٹھی اور دروازہ ہکولا۔ سامنے سعدی کھڑا تھا، ہانپتا کانپتا، جیسے بھاگ کے آیا ہو۔ ”فونج تھی۔ نوشیروان کی فونج۔“

”سعدی آرام سے بیٹھوپانی پہنچو۔“ وہ اسے کہنی سے تھا میں اندر لائی جس کا چہرہ اور بال پسینے سے تر تھے۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ فارس اسے یوں آتے دیکھ کے حیرت سے اٹھا۔

”نوشیروان کی فونج ایئر پورٹ سیکیورٹی فورس کے پاس تھی جس میں وہ 22 منی کی صبح دینی کے لئے بورڈنگ کرتا دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ بے چین سا صوفے کے کنارے بیٹھا۔

”ایسی کوئی فونج نہیں ہے،“ ہم نے سب پتہ کروایا تھا۔“

”فارس ٹھیک کہہ رہا ہے، ایسی کوئی فونج نہیں ہے،“ ہوتی تو ہمیں مل جاتی۔“

”ایئر پورٹ پر ملازم ایک خاتون سے بات ہوئی ہے میری۔ ان کا کہنا ہے کہ فونج آپریٹر نے مٹادی تھی جب ٹرائل شروع ہوا تھا...“ وہ پھولی سانس کے دوران سب کچھ کہتا گیا۔

”مطلوب تم پی ایم ذی سی والے کلرک کے پیچھے نہیں گئے۔“ فارس نے اسے بڑھی سے دیکھا تو جواباً سعدی نے صرف سرنہ آنکھوں سے اسے گھورا۔ ”کتنا اچھا ہو کر آپ اس بات پر فوکس کریں کہاب ہمیں وہ فونج کیسے نکلوانی ہے۔“

”چوری کرو اسکتا ہوں میں، مگر پھر...“ زمر کو دیکھا تو اس نے جھٹ لٹی میں سربلایا۔

”چوری کی فونج کو رٹ میں قابل قبول نہیں ہوگی فارس۔ صرف وہی فونج قابل قبول ہوگی جو ایئر پورٹ سیکیورٹی فورس خود ہمارے حوالے کرے۔ قانونی طور پر۔ اور اگر وہ ڈیلیٹ کر چکا ہے تو نہیں ملے گی۔“

”تو اس آپریٹر کو گواہ کے طور پر بلا کیں۔“ سعدی نے بے چینی سے بات کائی۔

”وہ تو ہو جائے گا، اور عدالت کہنے گی اگلی پیشی پر آپریٹر کو حاضر کرو۔ مگر ہاشم کو چند دن مل جائیں گے اور وہ گواہ کو غائب کرادے کایا خاموش کرادے گا۔“

فارس ہلکا سا کھنکھارا۔ ”جس شخص نے ہاشم کے پیسے کھا کے فوج مٹائی ہے وہ ہمارے حق میں گواہی دے گا ہی کیوں؟“  
”تواب ہم کیا کریں؟“ وہ ان دونوں سے پوچھ رہی تھی اور دونوں جواباً اسے سوالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

❖❖❖

مجھ سے کسی کو کام کیا، میرا کہیں قیام کیا ..... میرا سفر ہے در وطن، میرا وطن ہے در سفر  
”قتل سے پانچ دن قبل۔“

وہ صح بارش سے نہایتی ہوئی تھی۔ قصر کاردار کا سارا سبزہ اپنی میل کچیل سے پاک نکھرا اور دھلا دھلا یا لگ رہا تھا۔ لاونچ میں ملازم معمول کی صفائی کر رہے تھے۔ فیجنونا جواہرات کے کمرے کے باہر کھڑی حکم چلا رہی تھی۔ اب وہ میری سے نہ الجھنی تھی نہ برے موڈ میں رہتی تھی۔ بس مسکراتی رہتی تھی۔

جواہرات اپنے کمرے میں سستی آرام دہ کریں پہنچی اپنا فون دیکھ رہی تھی۔ بال کچر میں باندھ رکھے تھے اور پھرے پے بے زاری تھی۔ دفعتاً روازہ کھلتا کرفیجنونا نے اندر جھانکا۔ جواہرات نے اکتاً ہوئی نظر اخہائی۔

”میری اجازت کا انتظار کیا کرو۔“

”سوری مسز کاردار، مگر مسزر فیع کا ملازم آیا ہے، آپ کا ذریس لے کر۔ وہ آپ ہی کا ذریس ہے نا؟“ احتیاطاً پوچھا۔ جواہرات چونکی پھر اثبات میں سر بیلایا۔ ”اسے اندر بھجو۔“

”گارڈر زاس کو چیک کر لیں، پھر بھجتے ہیں۔“ ایک مسکراہٹ کے ساتھ فیجنونا غائب ہو گئی۔ وہ صبر کے گھونٹ بھر کے رہ گئی۔

چند لمحے بعد مسزر فیع کا ملازم ایک کھلا ہوا پیکٹ اس کے سامنے میز پر رکھ رہا تھا۔ (پیکٹ گارڈر نے کھول کے چیک کیا تھا۔) البتہ اس وقت کمرے میں صرف فیجنونا تھی۔ ایسے میں جب مسزر فیع کے ملازم نے جھک کے پیکٹ میز پر رکھا تو جواہرات نے دیکھا اس نے پیکٹ تلے بھی کوئی شے رکھ دی تھی۔ ایک گھری نظر اس پذال کے وہ سیدھا ہوا اور ادب سے باہر نکل گیا۔

فیجنونا کے جاتے ہی جواہرات نے کمرے کا دروازہ مغلل کیا اور پیکٹ ہٹایا۔ نیچے چھوٹا سا سیاہ پیکٹ رکھا تھا۔ اس نے وہ جلدی جلدی کھولا۔ اندر ایک موبائل تھا۔ اس نے اسکرین آن کی۔ اسی پل کاں آنے لگی۔

”احمر.... یہ کیا طریقہ تھا موبائل بھیجنے کا؟ اگر گارڈر ز چیک کر لیتے تو؟“

”تو میرا آدمی کہتا کہ یہ اس کا موبائل ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ کم از کم آپ سے رابطہ کا کوئی ذریعہ تو ملا۔“ وہ دوسری طرف اطمینان کی

سائبھر کے بولا تھا۔

”خیر.... یہ صحیح کیا تم نے۔ میں تو بالکل قید ہو کر رہ گئی ہوں۔“ وہ واپس پیٹر پار کے صوفے پہنچی اور تجھی سے فون میں بو لے گئی۔

”میری ہر حرکت پر نظر ہے ان دونوں کے ملازموں کی۔“

”کیا کوئی ایک بھی ملازم آپ کا وفادار نہیں ہے۔“

”تم ہی ہو۔ باقی یہاں تو سب یوں لگتا ہے مجھ سے کوئی پرانا ناقام لے رہے ہیں۔ خیر، تم بتاؤ، میرے کام کا کیا بنا۔“

”ابھی تک نہیں ہو پایا۔“ احمر ماہیو سے کہہ رہا تھا۔ ”مگر آپ بے نکر ہیں میں جلد کر دوں گا۔“ جواہرات چونکی۔

”ابھی تک ہو جانا چاہیے تھا۔ کہیں تم میری ساری رقم لے کر فرار ہونے کا تو نہیں سوچ رہے۔“

کوکنے سرکار، تھا مای کے 12 قوتیں اپنے کامہوں، اپنے 7 گھنٹوں میں گھنٹے ہی گھنٹے  
ایک سوچ دے رہے تو گھنٹے کے سکھاں اسکے سکھاں بے کمی ادا کرنے لگے، تھوڑے کچھوں کا پول  
ڈالنے والے اسکے سلسلے میں جانے اور اب خوش تھے پہنچا، تھوڑے پاک ہے پاک، تھوڑے پھر ہے پھر،  
چکیا پا کر سوچی گئی، اپنے کافی تھاں پر ہوں کا پانچھانے کے لئے پانچھانے کے لئے پانچھانے کی  
دستی، اسے پانچھانے کی بھت تکنیک اور گھنٹے کی بھت تکنیک، جو اس کے لئے پانچھانے کی طرف مل گئی۔

"کھم پا ہے جو کھکھ بروٹا ہے۔ اگر تھے بندی، تھیں آئے والے بوس میں جھینڈیں تھیں۔ سکنی میں جسیں تھے جوں کوئی آپریڈ نہیں۔ اب ایک دن بیکار، بے دل تھے میں جسیں میں لایا گی۔"

۱۰۔ اپنے پاہوں کے لامپیں بیٹھا گرہن کا نہیں۔ ایک ہو سخن کاں و ڈاک کا قندھر سے سیدھا ہے۔

۱۰۔ ملکہ اپنے بیوی کی بھتیجی پر مگر ہاتھوں بخوبی لے اُنیں گاہر پہنچانے کے لئے اپنے سارے امور پر  
بڑی بُری خواہیں کیے، اس کی وجہ سے انہوں کے بیٹے بھائیوں کو بخوبی مل دیتے ہوئے کہ میرا نے اپنے بیٹے  
بھائیوں کی کوئی تحریکیں کی تھیں؟ ملکہ کے کوئی کلام نہیں کیا تھا کہ میرا نے اپنے بیٹے کو کسی بھائیوں کے برابر کیا تھا۔

مگر ایکی ۱۹۵۶ء میں جو سے بے کاری میں مدد و مدد ملے اور اس کا تکمیل پانے کا امر کے باخوبی کیا گیا تھا جو ایک سے بے کار کے بعد اسے بے کار کے طبقی سے بے کار کرنے کی خواہ رفتگی میں مدد مدد ملے۔

تاریخ اسلام کا پہلے بزرگ نبی کے حکم سے مسلمانوں کے لئے ایک بڑی خوبی تھی۔ اسی خوبی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد اپنے اپنے بزرگ نبی کے حکم سے مسلمانوں کے لئے ایک بڑی خوبی تھی۔ اسی خوبی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد اپنے اپنے بزرگ نبی کے حکم سے مسلمانوں کے لئے ایک بڑی خوبی تھی۔

ڈالی جب سماں بانٹا ہے اور سفرت میں بھی آٹھیں ایکج ہاتھ ملے ہوئے، باقاعدہ کے ساتھ اکار، کاہر، خوبی اگھسیں بخوبی کے ساتھ دیکھا۔

"وَلِمَنْ يَرُونَ فَلَمْ يَرُوا وَلَمْ يُنْهَا

”میں اس آئندہ دن کے سامنے کی طرف اٹھ رہا ہوں۔ میرا نہ کمزور ہوں، میرے ساتھ کامیابی کے لئے میرے پیارے بھائیوں کی تحریک کو مدد کروں۔“

”اگر یہ کاموں کی انتہی بڑی تھی تو ۲۰۰۰ سال پہلے کچھ اپنے بھائیوں کی کاروائی مانندی می خداوند نے دنیا کا اکٹھا کیا۔“

۱۰۷۔ اسی کے بارے access کے لئے کوئی دلچسپی کو نہیں کر سکتی۔ اسی میں

میں نے صدی کا اپنی باتیں لے گئی تھیں اور اب میں کچھ بھی کرنے کا نہ ہے۔ اب تو میرے ہاتھ میں کچھ بھی کرنے کا نہ ہے۔

۱۰۰۰ میں اسکے پار پہنچنے والوں کی تعداد کوچھ توجہ کے ساتھ میں ہے اس نے ہم کو اپنا بڑا ہدایت کر کے دھونے کے لئے اپنے ایکٹری کی کامیابی کی۔

طرف اشارہ کیا۔ بوسے جائے کیے نظر آگی تھا۔ اُمرتے لاپڑا اُسی سے شایے اچکائے۔ "شجر سے باہر جا رہوں" مکھوں کے لئے۔"

"تو پاپورٹ کس لئے؟"

"تم بیری ماں ہو۔"

فارس نے پاپورٹ میز پر ڈال دیا اور سوچتی تفروض سے اسے دیکھا۔

"تو اُمر شفیع کی شافت کا یا انتام تھا؟ تم کوئی لمبا ٹھوکار کے بناگ رہے ہوئے ہیں؟" پھر وہ مسکرا یا۔ "اس بیک میں ہو گا کی کا لوہا ہوا مال ہے؟"

"دیکھو میں تم لوگوں کی بھٹکی مدد کر سکتا تھا میں نے کی۔ لیکن اب ہر یہاں خبر ہا مرے مختار میں نہیں ہے۔ مجھے اپنا بھی سوچنا ہو گا اور میں..."

"اُپنی بھم جس دن دوست بنے تھے میں جان تھا کہ تم ایک بیوائی فراہ ہو اور میں نے تمہیں ان کو الیکر کے ساتھ قبول کیا تھا۔ اس نے میرا خیال ہے تم درست فیصلہ کر رہے ہو۔" وہ سادگی سے کہہ رہا تھا۔ تکوئی ہراسی نہ کوئی شکوہ۔ اُمر کے تین اصحاب میں سے چہے۔

"تم نے اس شہر میں جتنے لوگوں کو مسز کار دار کی وجہ سے خاکر لیا ہے اس لحاظ سے تو تمہیں بہت پہلے یہاں سے پہنچے چاہے تھا۔"

"سوری نہیں ہر یہ تم لوگوں کے لئے کچھ تھیں کر سکا۔" وہ بیک سے فوس سے ہلا۔ فارس اُسی سے مسکرا یا۔

"آؤ یہ تم انجانی کھیا ہو، مگر دوست اونچے ہو۔ جاؤ معاف گیا۔" اور وہ دونوں بُش پڑے تھے۔

\*\*\*

تم سے پہلے جو غص یہاں تخت لٹھیں تھا۔ اس کو بھی اپنے خدا ہونے پر اتنا ہی یقین تھا۔ فوذی ایور آفیز کی چوت کے میں اور آساؤں پر سورن شہرے الگ۔ اسکی مانند وہک رہا تھا۔ بارش کے پانی کو اس نے سکھا دیا تھا۔ ہالی میز کے خالی ہال کے کوتے میں زمرائی کری پنپھی ایک فاکل کے مطالعے میں صرف تھی۔ سامنے میز کے ساتھ یہندہ لائیں کا ریسیور اٹھائے کھڑا چینید وہری طرف جانی گھنٹی سن رہا تھا۔ پھر اس نے لٹھی میں سر جلا یا۔

"یہ میں میسر سیل نہیں اٹھا رہیں۔"

"مگر یہ فون کیا؟" اُمر سر جلا کے فاکل پر کچھ لکھتے ہوئے ہوئی۔

"تی۔ اُنہوں نے پات کرنے سے اٹھا کر دیا۔ آفس فون کیا تو میری آوار سے آپ کا ہم من کے رکھ دیا۔ اب سیل نرائی کر رہا ہوں۔"

"اور جو خدا میں نے اسے بیچا تھا اس کی وصولی کی رسید آگئی؟"

"تی۔ آپ کی درازی میں رکھو دی جی۔" چینید فون رکھ کے ہتھے لگا۔

"جیک یو جنید۔" پھر اس نے سر جو کاٹے کام کرتے اپنا مو باک اس کی طرف ہو جایا۔ اس سے تراہی گریں۔"

چینید اب مو باک پر نہیں ملانے لگا۔ جیسے ہی وہری طرف سے بیلوٹائی دیا اس نے جلدی سے فون زمر کی طرف ہو جایا۔ اُمر نے اسی صرف اندھا میں اسے کان سے لگایا۔

"طیار میں زمر یو سفت بات کر رہی ہوں آپ چند لمحے کے لئے بیری بات سن لیں گی؟" اب وہ بولتے ہوئے کامنہ پر تکہر لگا۔

رہی تھی۔

”میں آپ کے استئنٹ کو بتا چکی ہوں کہ مجھے آپ لوگوں سے بات نہیں کرنی، میں اپنا بیان صرف عدالت میں دوں گی۔“

”حیلہ مجھے آپ کوڑ رانا دھمکا نہیں ہے، نہ ہی آپ کو اپنا بیان بدلنے پر مجبور کرنا ہے، مجھے صرف آپ سے 21 مسی کی دو پہر کے متعلق چند سوالات پوچھنے ہیں، تاکہ میں کیس کو زیادہ انتہے سے سمجھ سکوں۔ کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکتی ہیں۔“

”نہیں، مجھے کوئی بات نہیں کرنی، آپ قانوناً مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔“ وہ درشتی سے بولی اور فون رکھ دیا۔ زمر نے اسی مصروف انداز میں موبائل رکھ دیا اور اپنا کام کرنے لگی، جیسے اس سے زیادہ اسے اس معاملے میں دلچسپی نہ ہو۔

چند میل دور واقع اس بلند عمارت کے ناپ فلور کے کارزا آفس میں حیلہ ہاشم کے سامنے بیٹھی تھی اور جھر جھری لے کر اپنا موبائل میز پر کھڑی تھی۔ اور ہاشم سکرکار کے اسے دلچسپی لے رہا تھا۔

کونے میں ایک اوپری میز پر وہ بڑا سماں یکور یم مصنوعی روشنیوں میں چلتا دملکتا دکھائی دے رہا تھا۔ خوبصورت رنگ برلنگی مچلیاں اندر تیر رہی تھیں۔ کھلیں رہی تھیں۔ ڈبکیاں لے رہی تھیں۔

”اب سر؟“

”اب کچھ بھی نہیں۔ اس سے تم نے بات نہیں کرنی اور اپنی تیاری مکمل رکھنی ہے۔ اب جو کہنا ہے عدالت میں کہنا ہے۔“ وہ نیک لگانے کے بیخا تھا، اور کوٹ پیچھے اسٹینڈ پر لٹکا رکھا تھا۔ بنے ہوئے بال خوشبو میں باس جو دوہ مکمل تروتازہ اور ہشاش بشاش دکھر رہا تھا۔ شیر و کی پریس کانفرنس سے ہونے والے مالی نقصان کا شائزہ تک چہرے پہنیں تھا۔

”تیاری تو آپ نے مجھے کروادی ہے۔ 21 مسی کو سعدی یوسف ادھر نہیں آیا تھا، اور اس سے پہلے جو میں نے اس کو کا لزکی تھیں، وہ بھی ذاتی وجہ سے کی تھیں۔“ وہ پڑا عناد تھی۔

”میں نے تمہیں جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرے گی،“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ اس کے بعد cross (جرح) ہو گی۔ وہ کراس کے ذریعے تمہیں جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔“ اور میں کیا کروں گی پھر سر؟“

”بے دوقوف و کیل وہ ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کراس کے دوران ان کا گواہ مخالف و کیل کو ہرادے اور اسے خود کو جھوٹا ثابت کرنے ہی نہ دے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ہرانے والی باتیں ڈائریکٹ ایگزامینیشن میں کہنی ہوتی ہیں۔ کراس میں صرف سروائے کرنا ہوتا ہے۔ دفاع کرنا ہوتا ہے۔ کم سے کم نقصان کرنا ہوتا ہے اپنا۔“

”اور میں اس کے سوالوں کا مقابلہ کیسے کروں گی؟“ اس کی آواز میں فکرمندی در آئی۔ وہ ہلاکا سامسکرایا۔

”اور اچھا و کیل وہ ہوتا ہے جو اپنا کیس تو تیار کرے مگر ساتھ میں مخالف کا کیس بھی تیار کرے۔ کبھی کبھی میں اپنے مخالف کے لئے جتنے اپچھے دلائل اور نقطے ڈھونڈ کر لکھتا ہوں، کورٹ روم میں وہ اتنے اپچھے نقطے پیش نہیں کرتے۔ خیر، اب میں زمر کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات بتاتا ہوں تمہیں۔“ وہ اب میز کے کونے پر آبیخا تھا اور سامنے بیٹھی توجہ سے سنتی حیلہ سے کھدرا رہا تھا۔

”مس حیلہ کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ نے اس تاریخ کو اس وقت سعدی یوسف کو کاں کی تھی؟“

کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ پیچھے کئی سال سے اس فرم میں ملازمت کر رہی ہیں اور ہمیشہ اپنے مالک کا ساتھ دیتی آئی ہیں، اور اب بھی اس کے لئے جھوٹ بول رہی ہیں۔ ایسے سوالات پر میں اعتراض کروں گا، تو وہ ٹون بدل کے یہی سوال مختلف انداز میں پوچھے گی۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ نے ہاشم کا ردار کی کمپنی سے قرضہ لے رکھا ہے جو قسطوں میں ادا کرنا ہے۔ اور آپ ان کے احسان تلے دبی ہوئی ہیں۔

کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ رات دیر تک آفس میں کام کرتی ہیں اور آپ کی اپنے بس سے کافی فریک نہیں ہے؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ کے اپنے بس سے تعلقات ہیں؟“

”کیا وہ اس طرح کا الزام بھی لگا سکتی ہیں؟“ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”عدالت میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اسے تمہیں جھوٹا ثابت کرنا ہے، اس لئے وہ سخت سے سخت زبان استعمال کرے گی، تلخ انداز اپنائے گی، تیز تیز سوالوں کی بوچھاڑ کر کے تمہیں کفیوڑ کر دے گی۔ اس لئے اب میں تمہیں ان سوالوں کے جوابات کی مشق کروانے لگا ہوں۔ او کے؟“ وہ اسے زمی سے سمجھا رہا تھا۔

”شیور سرا!“ حلیمه ذرا تھہری پھر آنکھیں اٹھا کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”سر ایک بات پوچھوں؟“

”یہی کہ میں نے اور شیرو نے یہ سب واقعی کیا ہے یا نہیں؟“

حلیمه نے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”ہاں میں نے یہ کیا ہے، اور مجھے دس بار موقع ملے تو میں دس بار یہ کروں گا۔ اب ہم پر یہ پ کر لیں؟“

حلیمه کی ریڑھ کی ہڈی میں سر دلہر دوڑ گئی۔ وہ سخت اثبات میں سر ہلا کے ”یس سرا!“ بولی تھی۔ وہ اب کاغذ اٹھا کے سوالات پھر سے دہرانے لگا تھا۔ چہرہ سپاٹ اور مطمئن تھا۔

دالپس فوڈلی ایور آفٹر کی بالائی منزل پر آؤ تو زمر اسی انداز میں بیٹھی نوٹ پینڈ پ سوالات لکھے جا رہی تھی۔ سامنے کھڑے جنید نے بے چینی سے پوچھا۔ ”ان کی سیکرری تو ملتے پر ارضی ہی نہیں ہوئی، اب آپ اس کا میان اپنے حق میں کیسے کرو، اسیں گی؟“

”مجھے جرح کے دوران گواہ کو سوالات سے مار دینے کا فن آتا ہے، جنید، آپ اپنا کام کیجھے۔“ وہ اب بھی سر جھکائے لکھے جا رہی تھی۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

ذرا سی دیر کا ہے یہ عروج مال و منال ..... بھی سے ذہن میں سب زاویے زوال کے رکھ

”قتل سے تین دن قبل۔“

قصیر کاردار کا سبزہ زار اس شام برقی قسموں اور روشنیوں سے منور تھا۔ اوپنے درختوں کے گرد روشنیاں لپیٹ کر ان کو خوبصورتی سے سجا یا گیا تھا۔ مرکزی اسٹچ پ فنڈر ریز نگ تقریب کے بعداب گلوکار اپنے ساتھیوں سمیت بیچا، غزل گار رہا تھا۔ ایسے میں جواہرات یہاں سے وہاں ہلکتی، مسکرا کے مہمانوں سے چند پلٹھر کے گپ شپ کر رہی تھی۔ سیاہ جھلکلاتی سارہی اور لگنیوں سے مزین وہ بے حد تروتازہ اور خوبصورت دکھر رہی تھی۔ اور اس اچھے موڈ کو برقرار رکھنے کے لئے وہ قریب ٹھلتے دونوں گارڈز کو دیکھنے سے خود کو بازر کھے ہوئے تھی۔

محفلِ موسیقی ابھی جاری و ساری تھی جب جواہرات برآمدے کے کزینے عبور کر کے اندر جاتی دکھائی دی۔ جیسے کوئی بھولی چیز اٹھانے جا رہی ہو۔

لا اونچ کا دروازہ کھول کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹھک گئی۔ وہاں چند ہی لوگ تھے جو یا تو موبائل پر لگے صوفوں پر نیم دراز تھے یا ایسی دلکھر ہے تھے، مگر دیوار کے سامنے کھڑی عورت کو دیکھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ قدم ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے اس کوئی بلایا تھا تو پھر...؟

وہ سفید چادر سر پر جائے اس کی طرف پشت کیے کھڑی دیوار پر نصب فوٹو فریز ڈیکھیل تھے، ان کے اندر تصاویر ہیری پوٹر کی دنیا کی طرح چل پھر رہی تھیں۔ چند چند یکنڈز کے ویڈیو یو یو کلپس اور پھر سلا یئڈ شو۔ دس منٹ کھڑے ہو کر دیکھو تو ہاشم اور شیر و

کی ساری زندگی کی تصویری کہانی سامنے آ جاتی تھی۔ صاحبزادی صاحبہ بھی وہی دیکھ رہی تھی۔ آہت پلٹی۔ گوری رنگت اور گہری آنکھیں۔ سکرا کے جواہرات کو دیکھا۔

جواہرات ست روی سے قریب آئی۔

”خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔ اگر آنا چاہتی تھیں تو مجھے کہلوادیتیں۔ میں دعوت نامہ بھجوادیتی۔“ جب مسکراہٹ کے ساتھ کہتی وہ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔ چادر والی عورت ذرا سامسکرانی۔

”لوگ اب مجھے خوشی سے دعوتوں میں نہیں بلاتے جواہرات۔ جب سے تمہارے اس پالتو نے میری زندگی کی جھوٹی کہانیاں زبان زدِ عام کی ہیں، لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔“

”میں تجھی نہیں۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ جواہرات حیرت سے بولی تھی۔

”تمہیں نہیں پتہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کے اس اسکینڈل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

عورت نے ایک گہری نظر اس پڑائی، پھر ٹھنڈی سانس بھر کے مژگئی۔ اور گردن ذرا اٹھا کے اوپر تک پھیلی فونوفریز کو دیکھنے لگی۔

”تمہارے دونوں بیٹے کتنے خوبصورت ہیں ماشاء اللہ۔ ایک دنیا تم پر رشک کرتی تھی، حسد کرتی تھی، مگر پھر اسی دنیا نے دیکھا کہ تمہارے بیٹے نے تمہیں کاروبار سے بے دخل کر دیا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ تملکا کر بولی۔ مگر عورت بولے جا رہی تھی۔ ”اور جب عدالت میں ایک چھوٹی سی لڑکی تمہاری عزت کا تماشہ بنائے چلی گئی تو مایک تمہارے چہرے کے آگے کرتے رپورٹر کے سامنے تمہارا کوئی بیٹا ڈھان بن کے نہیں آیا۔“

”بہت ہو گیا، آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔“ وہ دبادبا ساغرائی تھی۔

”مٹھر نے آئی بھی نہیں تھی میں۔“ وہ اب پوری اس طرف گھوئی اور جواہرات کی سلگتی آنکھوں میں جھانکا۔ ”صرف یہ بتانے آئی تھی کہ مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔ کبھی الگتا کہنا اس کو آنے میں برسوں لگیں گے، مگر یوسفرا شکریہ یہ تو جلد آ گیا۔“

”گیٹ آؤٹ!“ وہ لال بھجھوکا چہرہ لئے دروازے کی طرف باز لو بکر کے بولی۔

”جواہرات!“ سفید چادر والی عورت دو قدم قریب آئی اور تاسف سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”آج کل تمہاری تباہی میں سب اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ تمہارے بیٹے یوسف، ہارون عبدی، سب سیر ہو کر اپنا حصہ ڈال لیں، تب بھی میرا حصہ پورا نہیں ہو گا۔ تمہاری آنکھوں میں دیکھ کے بس اتنا کہنا تھا کہ آخری حصہ میں ڈالوں گی، اور تم اسے یاد رکھو گی۔“ پھر وہ اس کے ساتھ سے نکل کے چلی گئی اور جواہرات غصے اور بے بی سے کا نپتی کھڑی رہ گئی۔ باہر سے اونچے سروں میں بھتی موسیقی کی آوازیں ہنوز شنائی دے رہی تھیں۔

لاڈنچ کے مہانوں کو یہیں چھوڑ کے بغلی راہداری میں آگے آؤ تو سامنے زینے تھے جو یونچے جاتے تھے۔ ان کو چلانگ کر اترتے جاؤ تو آگے ایک طویل راہداری تھی۔ دونوں اطراف میں کھلے دروازے تھے جو ملازموں کے کمروں میں کھلتے تھے۔ مزید آگے آؤ تو آخر میں کچھ تھا۔ قصر کی پشت پر بزرہ زار نشیب میں تھا، اس لئے گوکر کچن بیسمٹ میں بنا لگتا تھا، مگر اس کی پچھلی طرف بزرہ زار میں ہی کھلائی تھی۔

کچن کے کھلے دروازے سے اندر جھانکو تو وہاں ملازم نہار دتھے۔ صرف دونوں موجود تھے۔ ایک ہاشم جو کائنات کے پیچھے کھڑا تھا اور بلینڈرن کے جگ میں کئے ہوئے پھل کیں سے نکال کے انڈیل رہا تھا۔ شرٹ کے آستین پیچھے کوموڑ کھکھتے تھے اور کوٹ سامنے کری کی پشت پر ڈال رکھا تھا۔ اور دوسری آبدار جو کائنات کے اس طرف اونچے اسٹول پہنچھی اسے سکون سے دیکھ رہی تھی۔ نہ کوئی ڈر تھا نہ کوئی خوف۔ عادتا وہ

کان میں لٹکتے آؤیں کے کو دو انگلیوں سے مسل بھی رہی تھی۔ آؤیںے سے بہر تھے، اس کے لباس اور آنکھوں کی طرح، اور سرخ دو مال ماتھے سے اور بندھا تھا۔ نظریں ہاشم کی پشت پہ جی تھیں۔

”میں چاہتا تھا ہم ڈنزر کریں، مگر تم اسی پارٹی میں ڈنزر ایڈ جست کرنا چاہتی ہوتی میں یہی کر سکتا ہوں۔“ وہ اب بلینڈر کا ڈھلن بند کر کے اس پہ ہاتھ رکھ کر، بُن آن کر رہا تھا۔ یکدم زوں کی آواز آئی تو آبدار پکھ کہتے کہتے رکی۔ پھر بلینڈر کا تو وہ بولی۔

”مجھے نہیں پتہ تھا گریم ریپر اتنا مہر بارٹنڈر بھی ہے۔“

ہاشم دھیرے سے ہنسا۔ زخمی ہنسی۔ سر جھکائے وہ ابھی تک بلینڈر کے ساتھ لگا تھا۔

”زیادہ نہیں، مگر تھوڑا ابہت آتا ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ جو سیکھا تھا، وہ بھی بھول گیا۔“ آواز میں آئی تھی۔

”تم مجھ سے کیوں ملتا چاہتے تھے؟“ آبی کی آواز ذرا مضم ہوئی۔ نظریں سامنے کھڑے ہاشم پہ جی تھیں۔ وہ چونکی تھی مگر خوفزدہ نہیں تھی۔

”جب میں چھوٹا تھا تو مجھے ایک بری عادت پڑی تھی۔“ وہ اب اوپر بننے اسٹینڈ میں اٹھ لٹکتے گلاس نکال کے کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔ نظریں آبی کی بجائے اپنے کام پہ تھیں۔ ”مجھے جب کوئی کھلونا پسند آتا، کوئی کتاب اچھی لگتی، میں اسے لینے کی ضرورت نہیں۔“ اس کسی طرح وہ مجھے مغل جائے۔ ڈینڈ کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ کچھ عرصہ انہوں نے برداشت کیا، پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے میری ساری جمع کی ہوئی کوائیں کوپکش لے لی۔ اب وہ گردن جھکائے جگ سے گلاسوں میں رس انڈیل رہا تھا۔ اور انہوں نے کہا کہ محظوظ شے کو چھین کر لینے یا چرانے سے چیزیں تو مل جائے گی، مگر محبت ختم ہو جائے گی۔ جن سے محبت ہوتی ہے ان کو مجبو نہیں کیا جاتا۔ ان کو earn کیا جاتا ہے۔ انہوں نے وہ الہم کہیں چھپا دیا تھا، مجھے چند پہلیاں بتائیں یاد نہیں کیا تھیں، مگر میں نے پھر اس کو خود ڈھونڈا۔ شاید کسی دوست کو دے آئے تھے، میں نے اس آدمی کو کون نہیں کیا کہ وہ مجھے وہ الہم دے دے۔ شائستگی سے نرمی سے دلیل سے۔ اور وہ مجھے مغل کرنے والا کیا تھا۔ شیر و میں ڈینڈ کی یہ عادت نہیں دال سکے۔ مجھ سے کبھی نکال نہیں سکے۔ اب مجھے خفظ کو محنت کر کے حاصل کرنا اچھا لگتا ہے ریڈی یہی وجہ ہے کہ چاہوں تو سعدی یوسف کے سارے خاندان کو ایک بم بلاست میں ختم کر دوں مگر نہیں، مجھا اپنے بھائی اور اپنے خاندان کے حق میں فصلہ ”حاصل“ نہیں کرنا بلکہ ”جیت“ کے آتا ہے۔“ آبدار کے چہرے کے کئی رنگ بد لے بائی کو مسلتے ہاتھ میں تیزی آگئی۔ وہ سوچتی نظریوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”میرے اور تمہارے راستے الگ ہیں۔“

”اویہوں۔ ابھی نہیں۔“ اس نے ایک گلاس آبی کے سامنے رکھا، اور دوسرا اپنے سامنے۔ پھر بیٹھا نہیں۔ ہتھیاں کاؤنٹر پر رکھے وہ اسے زم سے زخمی پن سے دیکھے گیا۔ ابھی تمہارے پاس چند دن ہیں۔ اس کے بعد تم جو بھی فیصلہ کرو گی، مجھے قبول ہوگا۔“

”تم نے جو اس روز مجھے نیکست سمجھے تھے، ان کا کیا مطلب تھا؟“ اس نے جی کڑا کے پوچھا۔ ہاشم اسی طرح اس کی آنکھوں میں جھانک گیا۔

”مطلوب توصاف ظاہر تھا۔ میں نے تمہاری اور فارس کی ایک تصویر دکھا کے پوچھا تھا کہ کیا یہ سچ ہے؟ تم نے جواب نہیں دیا تو میں نے دو تصویریں بھیج کر یہ بتایا تھا کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ وہ دو تصویریں زرتشاہ اور زمرکی تھیں۔“

”زمرکی کیوں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ (پرس میں رکھے اس کے فون کی اس جیت میں سے اس نے ”کیا یہ سچ ہے“ والا پیغام اور زرتشاہ اور زمرکی تصویر مٹا دی تھی، صرف ”وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا“ والا پیغام اور اپنی اور فارس کی تصویر ہنہے دی تھی۔ اسی طرح اس نے وہ چیز فارس کو دکھائی تھی۔)

”تم جلد جان جاؤ گی، میں نے کہانا، مجھے ایسے کھلیل پسند ہیں۔ کیا تم نے فارس کو بتایا؟“ گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے

مکر کے پوچھا۔

”یہی کتنے زمر کو دھمکی دی ہے؟ ہاں بتایا تھا۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنے گلاس سے گھونٹ بھرنے لگی۔ دل زور سے دھڑکا۔  
”گد۔“ ہاشم مسکرا یا۔ زخم زخم مسکرا ہے۔

”وہ مشہور ہو چکے ہیں، تم ان میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے ہاشم!“ وہ اسی بے نیازی سے بولی تھی۔  
”میں ہمیشہ سے unpredictable رہا ہوں۔“ اس نے شانے اچکائے اور گلاس اٹھایا۔

”مجھے کیوں بلایا ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”یہ بتانے کے لئے کہ میں تمہیں حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ جیتنا چاہتا ہوں۔ اس کی اصلاحیت دکھانا چاہتا ہوں، اور....“ ہٹھیلیاں کاؤنٹر پر کھے اس کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اوہ تمہاری اصلاحیت سے بھی واقف ہوں۔“  
آبدار کی رنگت سفید پڑنے لگی۔ ہاشم پر جھی نظریں ساکت ہو گئیں۔ ”تم نے میرے مقابلے میں فارس کا ساتھ دیا۔... سعدی کو زہریلی سرخ دی۔... اس کی فرار میں مدد کی۔... فارس کو اپنے ساتھ لے کر گئیں۔... تم نے ہر قدم پر مجھ سے جھوٹ بولا اور میں ہر قدم پر تم پر اعتبار کرتا رہا۔“

آبدار کی گردن میں تھوک نکلنے سے گلٹی ابھر کے معدوم ہوتی دکھائی دی۔

”کیوں کیا تم نے یہ آبی؟“ وہ دکھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”اس کو مجھ سے اوپر کیوں رکھ دیا؟“

”میں.... صرف ایڈو پنج چاہ رہی تھی۔“ وہ ذرا سا ہٹکا ہی۔

”تو پھر اب میرا ایڈو پنج بھی دیکھنا۔“

”مجھے نقصان... نقصان دو گے کیا؟“

”تمہیں؟ کبھی نہیں۔ مگر اسے کہنا کہ وہ.... اپنے خاندان کی.... عورتوں کی.... حفاظت نہیں.... کر سکتا!“ چباچبا کے ایک ایک لفظ ادا کیا، پھر سیدھا ہوا کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا، کوٹ اٹھایا اور باہر چلا گیا۔ اس کا گلاس آن چھوا بھرا ہوا میز پر رکھا رہ گیا۔  
آبدار بھی تک شہندھے گلاس کو کپڑے ہوئے پیشی تھی۔ مشروب کی مخفیت نے اس کی ہڈیوں کو اندر تک جمادیا تھا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

تیریگی نے کماں سنجھا ہے ..... چاند اور کہکشاں کدھر جائیں!

رات اس اپارٹمنٹ بلڈنگ پر پھیلائے، اس کے سارے بھیدڑھانکے ہوئے تھی۔ اپارٹمنٹ کے اندر نیم اندر ہمراہ اساتھا۔ اپن کچن کی میں جل رہی تھی، یا پھر احر کے کمرے کا نائٹ بلب۔ وہ بیڈ پر لمبائیتا، موبائل دونوں ہاتھوں میں لئے ٹھک ٹھک ٹائپ کیے جا رہا تھا۔ ساتھ میں جماں روکنے پر ہاتھ بھی رکھتا۔ یقوتے تھا کہ نیند تب آئی تھی جب بیڑی ختم ہو جاتی، سودہ بنا کسی فکر کے لگا ہوا تھا۔

فیس بک پر مختلف لوگوں کی زندگیوں میں جھاٹکتا وہ صفحی نیچے کرتا جا رہا تھا جب باہر آہت سی محسوس ہوئی۔ پہلے وہ چونکا، پھر کسی خیال کے تحت گھری سانس بھری اور تیزی سے ستر سے نیچے اترا۔

”شریف لوگوں میں کوئی تیزی تہذیب ہوتی ہے، فارس غازی۔ چاہے آپ کا بیست فریزڈ بھی ہو تو اس کے گھر یوں بنا پوچھنے نہیں داخل ہو جاتے۔“ سلیپر پہننے ہوئے وہ زور سے چلا یا تھا۔ پھر دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔

”میرے گھر کے باہر گئی گھنی شکل دیکھنے کے لئے نہیں لگی۔ اس پر انگلی رکھ کے اسے بجا یا جاتا ہے غازی۔ آخر کب سکھیں گے آپ؟“ کیا تیریگی دفعہ جیل جانے کے بعد؟“ غصے سے بولتا وہ لا دُخ میں آیا اور بتی جلا۔

لاؤنچ سنسان پڑا تھا۔ پکن کی می ہنوز جل رہی تھی۔ مرکزی دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ احر قدرے چونا سا آگے آیا۔ احتیاط سے دروازہ پورا کھولا۔ باہر لابی خالی تھی۔ سنسان۔ ویران۔ اسے نئے سرے سے غصہ آیا۔

”کیا بتائی لیئے آئے ہو گا زی؟“ بے زاری سے زور سے دروازہ بند کر کے لاک کیا اور جیسے ہی واپس مڑا، کوئی نوکیلی سی شے اس کی گردان میں گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا۔ اثر تبیز تھا۔ فوری تھا۔ بصارت دھنڈلاتی گئی مگر اتنا نظر آیا کہ سامنے دو ہے کئے آدمی کھڑے تھے۔ اور ان کے ہاتھوں میں بڑیا پستول تھے۔ احمد پوری قوت لگا کے مڑا اور دروازے کی طرف بھاگ۔ دو قدم بعد ہی اسے ٹھوکر گئی۔ اور وہ اوندھے منہ فرش پہ آن گرا۔۔۔ اُٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا جسم سُن ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ بصارت دھنڈلی ہو رہی تھی اور ذہن اندر ہیروں میں ڈوٹا چلا جا رہا تھا۔۔۔

ہم کو ہر دور کی گردش نے سلامی دی ہے ..... ہم وہ پتھر تھے جو ہر دور میں بھاری نکلے  
”قتل سے دودن قبل۔“

پارکنگ ایریا عمارت کی پیسمنٹ میں بنا تھا اور دو پہر کے باوجود اندر ہیر پڑا تھا۔ گوکہ مدھم سفید بتیاں روشن تھیں مگر عجب ہوا تا کی اسی چھائی تھی۔ ایسے میں ایک ادھیر عمر آدمی سامنے سے چل کر آتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بوئس کی دھمک سنانے کو چیر رہی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ قطار میں کھڑی گاڑیوں تک آپا، اور جیب سے جانی نکالتے ایک سفید کار کے قریب رکا۔

تھی اس کے پچھے آہٹ سی ہوئی۔ قدموں کی چاپ۔ جیسے کوئی کسی ستون کی اوٹ سے نکلا ہو۔ ریموت کا بٹن دبا کر کار کو ان لاک کرتے اس نے مژ کے یونہی دیکھا تو تھہر گیا۔

ستون کے ساتھ کھڑا نوجوان جیبوں میں ہاتھ ڈالے فرست سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مدھم اندر ہیرے مدھم روشنی کے ملے جلنے ماحول کے باعث ادھیز عمر آدمی نے آنکھیں سکوڑ کے دیکھا۔ وہ چہرہ شنا سالگا تھا، مگر کون....؟

”جب میں تین اٹج میں تھا تو میں نے ایک ریسرچ پڑھی تھی۔ اس کے مطابق بچہ اپنی پیدائش سے لے کر پہلے چھے ماہ تک بلیک اینڈ وائٹ دیکھتا ہے، اسے رنگ نظر نہیں آتے۔ بائی داؤے میں سعدی یوسف ہوں، اور آپ ایئر پورٹ سیکیورٹی میں موجود وہ آپریٹر ہیں جن کو کل صبح عدالت سکن جاری کرے گی۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ....“ قصہ سناتے رک کے سینے پہ ہاتھر کھے اس نے اپنا تعارف دیا، اور پھر بات جاری رکھی۔ ”چند سال نہ اندازوں کی ایک تحقیق کے مطابق انسان پہلے چھے ماہ تک بلیک اینڈ وائٹ دیکھتا ہے۔ لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو ہم ایک عمر تک بلیک اینڈ وائٹ ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ بچپن میں اور پھر تین اٹج میں ہر انسان بلیک یا وائٹ لگتا ہے ہمیں۔ good guys اور bad guys۔ نیک لوگ۔ گناہ گار لوگ۔ ہم اگر کسی ایکٹر اسکا لاریا سیاستدان سے محبت کرنے لگیں تو اس کو ایسا سفید مجسمہ بنادیتے ہیں کہ اس میں خامی نظر نہیں آتی، اور جب خامی دیکھ لیں تو اسے دیکھنا بھی جھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن مسعود صاحب، جب ہم میں سے اکثر لوگ میری عمر کو پہنچتے ہیں تو جان پاتے ہیں کہ یہاں نہ کوئی سفید ہے، نہ سیاہ۔ سب سرمنی ہیں۔ کوئی گھر اسرمنی۔ کوئی میال، کوئی کم گدلا۔ مگر بے داغ کوئی نہیں ہے۔“ مسعود ادھیڑ بن میں کھڑا یک نک اسے دیکھ رہا تھا۔ چالی ہاتھ میں تھی اور نظریں اس پر گلی تھیں۔ سعدی بولتے بولتے قریب آنے لگا۔ قدموں کی جاں نے پھر سے خاموشی کو چیرا۔

”لوگ کہتے ہیں۔ ہماری choices میں define کرتی ہیں۔ وہ انتخاب جو ہم کرتے ہیں، وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ ہم یہ لکھ سرمنی ہیں یا گھر سے سرمنی اس کا فیصلہ وہ کام کرتے ہیں جو ہم نے کیے ہوتے ہیں، مگر نہیں۔“ وہ اب اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا تھا، اور نفی میں سرہلا کے اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہہ رہا تھا۔

”میں نے دو انسانوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔ میرے مدد مقابل جو شخص ہے اس نے میرے خاندان کے دو انسانوں کو قتل کر دیا ہے۔ یہ وہ انتخاب ہیں جو ہم دونوں نے کیے۔ کیا یہ ہمیں ڈیفائین کر سکتے ہیں؟ ہمیں ڈسکرا ب کر سکتے ہیں؟“ سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کے وہ بوتار کا۔ ”نہیں۔ کیونکہ میرا خیال ہے ہمارے اچھے یارے ہونے کا تعین ہمارے چنے گئے راستے کرتے نہیں کرتے بلکہ وہ راستے کرتے ہیں جو ہم نہیں چنے ہوتے۔ وہ فیصلے، وہ انتخاب کرتے ہیں جو ہم نے میسر ہونے کے باوجود نہیں لئے ہوتے۔ ہاشم کاردار نے دو انسانوں کو قتل کرنے کا انتخاب“ کیا، مگر اس کے پاس دوسرا راستے بھی تھے۔ نیب میں کیس اڑتا اور خود کو بری کروالیتا، یا پھر اگر فیصلہ اپنے خلاف آتا تو پلی بار گین کر لیتا۔ پسے واپس کرتا، اور رہائی مل جاتی۔ یا پھر وارث غازی پر چند الزامات لگوائے اس کو جاب سے نکلوادیتا۔ یا پھر دہشت گردوں کے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جاتا اور اس کو فوج خود پر ٹیکش دیتی۔ یہ وہ راستے تھے جو اس نے نہیں چنے۔ اس نے قتل کا راستہ چنا۔ مگر جب میں نے دو قتل کیے تو میرے پاس دوسرا راستہ یہی تھا کہ خود کو مر نے دوں۔ میں نے اپنی جان بچائی۔ سروائیول کو چنا۔ ان دونوں آدمیوں کو قتل کر دینے کو چنا، پس بستہ بلا کت کے دوسرا راستے کے۔ آپ مجھے اور ہاشم کو ایک ہی ترازو میں نہیں تول سکتے۔ کیونکہ اس کے پاس آپ شرمن تھے۔ میرے پاس نہیں تھے۔ اسی لئے میں یہاں آپ کو کچھ کہنے آیا ہوں؟“

آدمی نے شانے اچکائے، جیسے نا سمجھی سے پوچھا ہو کہ ”کیا؟“، اس کی چاپی ابھی تک ہاتھ میں تھی اور ہاتھ بیجھ ہوا کے رکا ہوا تھا۔

”عین ممکن ہے کہ اگلی پیشی پر آپ کو پیش ہونا ہو۔ درمیان میں جتنے دن آئیں گے، ان میں ہاشم کاردار آپ کو اپروچ کر کے آپ کو خریدنا چاہیے گا۔ وہ آپ کو بہت سے راستے دکھائے گا۔ چنان کے لئے بہت سے انتخاب۔ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے، اور جو فیصلہ آپ نہیں کریں گے، وہ ساری زندگی کے لئے آپ کے کردار کا تعین کرے گا۔ آپ کیسے انسان بننا چاہتے ہیں، آپ کیسے مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور آپ کیسے پاکستانی بن کر دکھانا چاہتے ہیں، اس سب کا فیصلہ آپ کا وہ انتخاب کرے گا جو آپ نہیں لیں گے۔ ساری زندگی مسعود صاحب و آپ کو haunt کرے گا۔ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے کوثر میں آئیے گا تو بچ بولیے گا۔ اگر آن جھوٹ بول دیانا، تو ساری زندگی آپ خود بھی اپنے کسی بچ پر اعتمانیں کر سکیں گے۔ جھوٹے لوگوں کی ایک بہت بڑی سزا یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنی باتوں اور دعووں پر خود بھی یقین نہیں آتا۔ کہہ کے بھول جاتے ہیں اور بھول کے کہہ جاتے ہیں۔ ”پھر وہ خاموش ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ائے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس آدمی نے سر جھٹکا اور اپنی کارکی طرف مڑ گیا۔ دروازے کو ہینڈل سے باہر کھینچنے اس نے پھر سے مز کے دیکھا۔

پارکنگ ایریا سنسان پڑا تھا۔ ستون نیم اندر ہر نظر آرہے تھے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔



کبھی منظر بدلنے پر بھی قصہ چل نہیں پاتا..... کہانی ختم ہوئی ہے کبھی انجام سے پہلے کچھری کی راہداری میں وہی دانتے کی جہنم جیسا رش، شور اور افات الغری کا عالم تھا۔ ایسے میں کرہ عدالت کے دروازے کے باہر کھڑا سعدی شہزاد کو سمجھانے کے لئے قدرے اوپنی آواز میں بول رہا تھا۔ ”مجھے بہت خوشی ہے کہ تم نے اپنی امی کو سپورٹ کیا ہے اور وہ گواہی دے رہی ہیں۔“ اندرا میں شکر تھا۔ بیساکھی تھا کہ کھڑا کا سرکوبار بارہلا تے ہوئے کہنے لگا۔ ”صحیح۔ صحیح۔“

”اب اندر چلتے ہیں۔“ سعدی نے اس کو اشارہ کیا اور پھر یہکے بعد دیگرے وہ دونوں آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں کسی کلاس رومن کی طرح کی خاموشی چھائی تھی۔ نجح صاحب خاموشی سے کٹھرے میں کھڑی خاتون کو دیکھ رہے تھے، جس نے سرپر دوپٹہ اور ٹھہر کھا تھا اور وہ سامنے کھڑی زمر کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ اس کے نقوش اپاچ لڑکے کی مانند بگالی سے تھے اور رنگت گہری سانوںی۔ سعدی اس کو لئے کچھلی کری پا آبیجا۔ آج فارس نہیں آیا تھا، البتہ.... سعدی نے گردن موڑ کے دیکھا۔ قریب میں چشمے والا آدمی خاموشی نے بینخا ساری

کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر عجیب سی الجھن ہوتی تھی۔

”مزع عصمت، آپ کو پورا یقین ہے کہ آپ نے آپریٹر مسعود عالم کو یہ کہتے سن تھا؟“، زمر پوچھ رہی تھی۔

”جی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے یہی الفاظ سنے تھے جو میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ جب آپ لوگ سی ٹی وی فوٹج دیکھنے آئے تھے تو آپ کے جانے کے بعد وہ اپنے ایک کولیگ سے کہہ رہے تھے کہ فکر کی کوئی بات نہیں، انہوں نے کاردارز کے لڑکے کی فوٹج ہینڈل کر لی تھی پہلے ہی۔“

”اور ہینڈل کرنے سے ان کی کارروائی بیلیٹ کرنا تھا؟“

”آب جیکشن۔ گواہ سے رائے مانگی جا رہی ہے۔“ وہ پیچھے سے اکتا کے بولا تھا۔ زمر اپریشن بنا چکی تھی سو ”میں سوال واپس لیتی ہوں۔“ کہہ کر واپس مڑ گئی۔

ہاشم فوراً سے تاثرات بدل کے، مسکرا تھا، کوٹ کا بنڈ کیا، اور کٹھرے کے سامنے آیا۔

”مزع عصمت۔“ مسکرا کے اس کو مخاطب کیا۔ ”کیا آپ نے مسعود عالم صاحب کو مجھ سے یا میرے خاندان کے کسی فرد سے بات کرتے سن؟“

”نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”کیا آپ نے ان کو فوٹشیر وال کاردار کا نام لیتے سن؟“

”نہیں مگر انہوں نے کاردارز کا لڑکا کہا تھا اور.....“

ہاشم نے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور اس کے سامنے کیا۔

”اس پر گورنر اسٹیٹ بینک شاہد کاردار کے دستخط موجود ہیں۔ کیا آپ کو کبھی یہ خیال آیا کہ ہم اس ملک کے واحد کارروائیں ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن انہوں نے یہ بات ان کے (زمر کی طرف اشارہ کیا) جانے کے بعد کی تھی۔“

”اور اس بات کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟“ نوٹ واپس جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

”تین ماہ، شاید۔“

”اور ان تین ماہ میں آپ نے کبھی مسعود صاحب کی شکایت اوپر کی؟“

”میں نے کی تھی، لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔“

”آف کورس آپ نے کی تھی۔“ وہ مژا اور اپنی میز سے چند کاغذ اٹھائے اور جب واپس عصمت بی بی کی طرف گھوما تو لبوں پر مسکرا ہٹ تھی۔ ”اور اس سے پہلے آپ ڈپارٹمنٹ میں تین مختلف لوگوں کی شکایت کر چکی ہیں۔ اور ان میں سے ایک کے خلاف کارروائی کی گئی تھی، نام یاد ہے آپ کوان کا؟“

”آب جیکشن یور آئر۔ مزع عصمت کے ریکارڈ کا گواہی سے کیا تعلق ہے؟“

”اوور ولڈ۔ جواب دیجئے۔“ بچ صاحب نے گویا ناک سے لمبھی اڑائی۔

”طارق محمود۔“ عصمت کی آواز پست تھی۔

”جی بالکل۔ طارق محمود صاحب جن کے خلاف آپ نے ہر اس منٹ ایک ورک بلیس کی شکایت کی تھی اور ان کو معطل کر دیا گیا تھا، اور.... اوہ واو.... اور ان کی سیٹ کا چارج آپ سنبھالتی ہیں نا آج کل۔“

”آب جیکشن یور آئر۔“ زمر بے زاری سے کھڑی ہوئی۔ ”کاردار صاحب گواہ کی کردار کشی کر رہے ہیں۔“

”اوورولڈ میز زمر۔ عدالت کو ان کا جواب سننے دیجئے۔ جی بولیے۔“ نج صاحب نے خشک لبھ میں خاتون گواہ کو اشارہ کیا۔

”جی۔ ان کا چارچ میں سنبھالتی ہوں، مگر انہوں نے واقعی ہر اس منٹ کی تھی اور دوسرا کو لیکر گواہ ہیں۔“ مگر ہاشم اس کے ساتھ ہی نج صاحب کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔ ”یور آئر، یہ صرف ایک heresay (سنی سنائی بات) ہے، ایک ایسی خاتون جن کا کام ہی دوسرے کو لیکر کی تاگ کھینچتا ہے، ان کے بیان پر عدالت ایئر پورٹ سکیپر فٹی کے لئے نشوون رومن آپریٹر کو من نہیں کر سکتی۔ خاتون ان کی جگہ لینے کے لئے جھوٹ بول رہی ہیں۔“

”یور آئر، اگر یہ heresay ہے تو اس کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں اس آفیسر کو ورث میں پیش کرنا پڑے گا۔ ورنہ کاردار صاحب کا یہ الزم ہم کیسے رد کر سکیں گے؟“

”بس، بس!“ ان دونوں کے ایک ساتھ بول اٹھنے کے باعث نج صاحب نے ہاتھ اٹھا کے ان کو خاموش رہنے کا کہا پھر ہاشم کو دیکھا۔

”بات تو ان کی سننی پڑے گے، اگر انہوں نے فونچ کے ساتھ نیپر مگ نہیں کی تو ان کو ورث میں آ کر اپنی صفائی دینی پڑے گی۔ اس لئے اگلی پیشی پ.....“ وہ اب حکم جاری کر رہے تھے۔ کٹھرے میں گھڑی عورت مغموم نظر آتی تھی، اور اس کا اپانچ بیٹا حیران پریشان ساسعدی کو دیکھ رہا تھا۔

”مم... میری امی جھوٹ نہیں بولتی کبھی۔ وہ کسی جاب لینے کے لئے تو ایسا نہیں کر رہی۔“

”سب کو پتہ ہے۔“ سعدی نے ادا کی سے اس کے گھنٹے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

”مگر یہ زیادتی ہے۔“

”یہ انصاف کی عدالتیں نہیں ہیں میرے دوست۔ یہ قانون کی عدالتیں ہیں۔“ سرجھنک کے وہ قریب بیٹھے چیختے والے آدمی کو دیکھنے لگا، جو اسے ہی دیکھ رہا تھا، مگر فوراً سے رخ پھیر گیا اور سر جھکا کے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنے لگا۔ سعدی نے گھڑی دیکھی اور سوچا کہ اگر فارس یہاں ہوتا تو کیا کہتا، مگر وہ تھا کہاں؟



میں اپنی جفاوں پر نادم نہیں ہوتا ..... میں اپنی وفاوں کی تجارت نہیں کرتا!

ہارون عبید کی رہائشگاہ کا آہنی اوپھا گیٹ اس کی کار کے نزدیک آتے ہی میکائی انداز میں سلا یہز ہو کے کھلنے لگا۔ اسٹری نگ پر ہاتھ رکھے فارس چند لمحے انتظار کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر معمولی ہی فکر مندی تھی اور ماتھے پہ مل۔ آنکھیں پر سوچ انداز میں سکڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ پورا کھل گیا تو اس نے کار آگے بڑھا دی۔

چند منٹ بعد وہ لان عبور کر کے آبدار کے کلینک کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ جیز پر سرمی دی گلے کی شرٹ پہنے، آستینیں ذرا موڑ رکھی تھیں۔

کلینک کے اندر وہ بے چینی سے بھل رہی تھی جب دروازہ کھلا۔ آبی فوراً گھوٹی۔ آنکھوں میں چمک در آئی۔ ”شکر آپ آ گئے۔“

”کیا ہوا ہے؟ آپ نے اتنی ایئر جنکسی میں بلا یا۔ میں کورٹ جارہا تھا۔“ وہ حیرت بھری فکر مندی سے کہتا آگئا اور اس کی میز کے سامنے والی کرسی کھینچی۔ ساتھ ہی اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بدقت مقابل کا وحچ پا آگئی۔ دونوں کے درمیان چند فٹ کا خلا تھا۔

”اب بتائیئے، کیوں پریشان ہیں؟“ وہ زمی اور ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔ آبدار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں بہت خوفزدہ ہوں۔“

”مسز کاردار نے کچھ کہا ہے؟“

آبی نے نفی میں گردن ہلائی۔

”پھر؟“

”ہاشم ملا تھا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ میری اور آپ کی تصویر بھیج کر اس نے ساتھ یہ کیوں لکھا کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں

کر سکتا؟“

فارس ذرا چوکنا ہو کے بیٹھا۔ ”پھر؟“

”پھر اس نے کہا کہ.... کہ فارس تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا اور یہ کہ.... وہ مجھے آپ کی عورتوں میں شمار کرتا ہے۔“ وہ روانی سے جھوٹ

بول رہی تھی۔

”اور کیا کہا اس نے؟ حسین، یا زمر کا ذکر کیا؟“ وہ بے چین ہو گیا تھا۔

”نہیں، ان کا نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”آپ کے خاندان والے اتنے مشہور ہو چکے ہیں، ان کو وہ نقصان پہنچائے گا تو پہلا شک اسی پر جائے گا، اسی لئے وہ ایسا نہیں کرے گا۔ مگر میں....، اس کا گارندھا۔

فارس نے گہری سانس لی اور پیچھے کو ہوا۔ ”وہ کچھ نہیں کرے گا۔“

”ارے واه۔“ آبی کی گیلی آنکھوں میں شکوہ در آیا۔ ”آپ نے اپنی عورتوں کی خیریت جان لی تو کیسے ریلیکس ہو گئے۔ اور میرا کیا جسے آپ نے اس سب میں دھکیل دیا۔ یاد رکھیے اس سب میں میں آپ کی وجہ سے آئی ہوں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ اس کے چہرے پر معدودت خواہانہ ساتاڑا بھرا۔ ”میں اتنے دن سے آپ کی حفاظت کر رہا ہوں نا، آگے بھی کرتا رہوں گا۔ آپ کے گارڈز کے ساتھ ان پنج ہوں دن میں کئی دفعہ ان سے آپ کی خیریت پوچھتا ہوں، ہر دو گھنٹے بعد آپ کو فون کرتا ہوں، آپ کی کالونی کے سی ٹی وی کی لا ٹائوفیڈ چیک کرتا رہتا ہوں۔ آپ سے کئی کلو میٹر کے فاصلے پر رہتا ہوں، اتنی دور سے جتنا کر سکتا ہوں وہ کر رہا ہوں نا۔“

”اگر آپ دور نہ ہوتے تو یہ زیادہ آسان ہوتا ہے نا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دلکھ کے بولی تھی۔ وہ ملکا ساچوں کا۔

”سوری؟“

”ضروری تو نہیں ہے کہ آپ دور ہیں۔ آپ قریب بھی تو ہو سکتے ہیں۔“

فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر موبائل پر وقت دیکھا۔ ”مجھے چلتا چاہیے۔“ آواز میں خشکی ہی تھی مگر وہ اسی بے خودی کے عالم میں اسے تکتے ہوئے بولی تھی۔

”اگر آپ مجھ سے شادی کر لیں تو وہ مجھے نقصان نہیں دے سکے گا۔“

کمرے میں ایک دم عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ فارس غازی کی پیشانی کی رگیں اُبھر آئیں، آنکھوں میں برہمی در آئی، اور ایک گہری سانس لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے چلتا چاہیے۔“

وہ تیزی سے اٹھی۔ ”اصلی والی شادی نہیں، صرف پیپر میرج۔ صرف اس ٹرائل تک۔ تاکہ وہ مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ جب اسے پڑتے چلے گا کہ میں آپ کی یہوی ہوں تو وہ مجھے کبھی کچھ نہیں کہ سکے گا۔ وہ آپ سے ڈرتا ہے۔ آپ.... آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ پنج میں۔ دور نہ وہ اور اس کی ماں مجھے مار دیں گے۔“

فارس نے آنکھیں بچیں، انگلی اور انگوٹھے سے بند آنکھوں کو مسلا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ پھر آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ ”چار سال

کی جیل، ایک سال سے مدد مقابل مسائل... اور مجھے لگتا تھا آبدار صاحب کے میں بہت گھاگ ہو چکا ہوں، اب کسی کی پاتوں میں نہیں آ سکتا۔ تیر آپ نے ثابت کر دیا کہ میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔ ”نفی میں افسوس سے سر ہلاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

”مجھے جس عورت سے محبت ہے اور جو میری بیوی ہے وہ ٹھیک کہتی تھی۔ آپ نہیں بد لیں، آپ نے صرف اپنی تکنیک بد لی ہے۔“

”کیا میری حفاظت کے لئے آپ مجھ سے ایک پیپر کا نتریکٹ بھی نہیں کر سکتے؟ میں یہ صرف اپنی حفاظت کے لئے کہہ رہی ہوں۔“ آنسو آبی کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

”نہیں، میں نہیں کر سکتا، اور میرا نہیں خیال کر آپ کو کسی حفاظت کی ضرورت ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ آپ کو بلا نے کے طریقے آتے ہیں مگر اب میں نہیں آؤں گا۔ بہت ہو گیا۔“ برہمی سے کہتا وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

”اور مجھے جس دلدل میں آپ نے دھمل دیا، اس کا کیا؟“

”آپ نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا تھا۔“ وہ خنک لبجھ میں کہہ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ آنکھوں میں بے زاری اور برہمی تھی۔ وہ تیز اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ شاید وہ بھی رہی تھی۔

”میرے احسان ہیں آپ کے اوپر۔“

”اور میں کب سے ان کی قیمت چکار ہا ہوں۔ زمر سے میرا یلیشن پار بار بدقسمی کی جیہنث چڑھ جاتا ہے کیونکہ میں ان احسانوں کی قیمت اتار رہا ہوں مگر اب بہت ہو چکا۔“ گردن موڑ کے غصے سے اس کو دیکھا۔ ”اب میں مزید آپ کی ان گیمز کا حصہ نہیں بن سکتا۔“

”میں نے ایسا کیا کہا ہے جو آپ غصہ ہو رہے ہیں؟ صرف اتنا ہی تو کہا ہے کہ مجھے سہارا دیں، مجھ سے شادی کر لیں، صرف میری حفاظت...“

وہ جو اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا، ایک دم آواز سے دروازہ بند کیا اور غصے سے اس کی طرف گھوما۔ ”کیا آپ میں تھوڑی سی بھی عزت نفس ہے؟ ذرا سی بھی گریں؟ معمولی سی سیلف esteem؟ کیا اپنی خواہشات کے پیچھے خود کو اتنا گرنا ٹھیک ہوتا ہے؟ یونو و اٹ، مجھے فخر ہے اس بات پر کہ جو عورت میری زندگی میں ہے وہ عزت اور وقار کا بیکر ہے، بھی کسی کے سامنے حتیٰ کہ میرے سامنے بھی خود کو نہیں گرانے گی۔ اور

آج مجھے اس پر زیادہ فخر ہو رہا ہے۔“ اس نے غصے سے کہہ کر دروازہ کھولا۔

”اوہ اگر وہ نہ رہے؟“ وہ جوان دربیٹھ رہا تھا، اس کے الفاظ پر لمحہ بھر کو ٹھہر اپھر سر جھک کے اگنیش میں چاپی گھسانے لگا۔ دروازہ نہیں بند کر سکتا تھا، اس پر آبی کے ہاتھ تھے۔ وہ آنکھوں میں دکھ غصہ نفرت لئے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”اگر وہ مر جائے، کیا تباہ آپ دیکھ پائیں گے کسی دوسرے کی طرف؟ کیا تباہ احساس کر سکیں گے کہ کون آپ کے لئے خود کو اتنا گراچکا ہے؟“

فارس نے نظر انداز کرتے ہوئے کار اسٹارٹ کی، اور دروازہ زور سے کھٹک کے بند کیا۔ ”اب مجھے کال مت سمجھنے گا۔“ درشتی سے تنبیہ کر کے یورس کرنے لگا۔

”آپ نے میرا دل توڑا ہے فارس غازی۔ میں آپ کے لئے اتنا گری، اتنا جھکی اور آپ اتنے سُندل ہیں۔ ٹوٹے دل کی بد، ما سے آپ کوڈ نہیں لگتا، تو پھر ٹھیک ہے۔“ اس نے بھیٹلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔ اور دکھ سے اسے کار پیچھے کرتے دیکھا۔ ”خدا کرے،“ مرجائے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے مرجائے۔ خدا کرے آپ اسے مرتے ہوئے ٹوٹے بھرے ہوئے دیکھیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے پھر آپ کو میرے دل کے کرب کا انداز ہو گا۔“ اسے دور جاتے دیکھ کے وہ چلا چلا کے کہہ رہی تھی۔ اور وہ جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا، کار، ہاں سے نکال رہا تھا۔ اس کی چیزوں کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔ جس لمحے کار باہر سڑک پر آئی، اس نے ریس کو پوری قوت سے ہا با

اور کارکور سڑک پر بھگتا آگے لے گیا۔

عرصے بعد اسے لگا تھا کہ وہ آبدار کے احسانوں کی زنجیر سے آزاد ہو گیا تھا۔ لہکا اور آزاد۔

❖❖❖

خزانہِ زر و گوہر پر خاک ڈال کے رکھ ..... ہم اہل مہر و محبت ہیں دل نکال کے رکھ  
مورچاں میں اس رات دس بجے کے ڈرامے کے وقت ختم اور اسامہ کی کلاس کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ لاونچ دیران تھا، تباہ بھی  
ہوئی تھیں، مگر ندرت کا کمرہ روشن تھا۔ اندر وہ بیٹھ پہنچیں، فنگل سے اسامہ کو تاڑ رہی تھیں جو رہبی سے بمشکل ضبط کیے سن رہا تھا۔ خین تاشائی  
کی طرح باری باری دونوں کے چہرے دیکھتی تھی۔

”اس عمر میں سعدی مغرب کے بعد گھر سے باہر نہیں رہا، عشاء پر نماز پڑھنے جاتا اور سیدھا گھر آتا۔ پھر بھی میں ڈافٹی، مجال ہے جو  
اس نے برآنا ہو۔ ہمیشہ سر جھکایا، اور اس شہزادے کو کچھ کہہ دو تو موڈ آف ہو جاتا ہے۔“

”امی آپ مجھ پر ہر وقت شک کیوں کرتی رہتی ہیں؟“ وہ بگڑ کے بولا۔ ”شاہزیب کا گھر ساتھ والی اسٹریٹ میں ہے، میں اس سے  
نوٹ لینے ہی گیا تھا نماز کے بعد۔“

”مجھ سے پوچھتے ہوئے منہ نوٹ جاتا تھا؟ ہاں؟ مجھ سے کیوں نہیں پوچھا۔“

”نہیں نہیں آپ کو لگتا ہے میں نشہ کرنے لگ گیا ہوں یا شاید سڑک پر کھڑے ہو کر لڑ کیاں تازتا ہوں، یا لوگوں سے موبائل چھینتا  
ہوں۔“

”دیکھو دیکھو اس کی زبان۔ ماں کے آگے بڑا بولنا آگیا ہے۔ سب جانتی ہوں میں یہ جو اس کے دوست ہیں نا، یہی سکھاتے  
ہیں اس کو۔“

”ہر وقت میرے دوستوں کے پیچھے پڑی رہا کریں آپ بس۔“ وہ سرخ چہرہ اور آنکھوں میں آنسو لئے تیزی سے باہر لکھا اور  
دروازہ ٹھاہہ مارا۔

”امی آپ اس کے دوستوں پر مت آیا کریں۔“ حمد نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ندرت نے اتنی ہی اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔  
”زیادہ بک بک نہ کرو مجھے پتہ ہے تم بے غیر توں کو کیسے پالنا ہے۔ اب جاؤ سر نہ کھاؤ میرا۔ باب پوتا نا سر پتو میں دیکھتی کیسی زبانیں چلتی ہیں تم  
لوگوں کی۔ ماں کو دیکھ کر شیر ہو جاتے ہو۔“

”چلیں جی، ہو گیا میلوڈ رامہ شروع۔“ وہ بڑا باتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اوپر آئی تو سیم کے کرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اور وہ منہ پر تکیر کھ  
کے لیٹا ہوا تھا۔ وہ گھری سانس لے کر اندر آئی اور اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔

”امی تم پر شک نہیں کرتیں۔“

”جاوہ مونی، مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔“ وہ رندھی آواز میں نیکے کے نیچے سے بولا تھا۔

”امی صرف تمہاری حفاظت چاہتی ہیں۔ سب ماں میں چاہتی ہیں۔ اگر ماں باپ بچوں کے آنے جانے کے اوقات پختت کرتے ہیں،  
پوچھ گچھ کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ان پر شک کرتے ہیں، یا ان کو ان کے دوستوں سے کوئی خطرہ ہے۔ وہ صرف ایکیڈنٹ،  
دہشت گردی، چوری چکاری کی وارداتوں سے ذرتے ہیں، جسمانی نقصان سے ذرتے ہیں۔ اگر شک کرتے ہو تو پوچھ گچھ نہ کرتے، خاموش  
ہو جاتے یا دوسرا انتہا یعنی مار پیٹ پہ جاتے۔ یہ پوچھ گچھ نہ ہوں تو ہماری ماں میں نہ لگیں، نوکرانیاں لگیں۔ کھانا، کپڑے، آرام وہ سب تو  
نوکرانی بھی دیتی ہے۔ تم میں ابھر زکو خود فیصلہ کرنا ہے کہ تم ماں کو نوکرانی کی جگہ دینا چاہتے ہو یا ماں کی!“

سیم نے تکریہ ہٹا کے گلابی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”ہاں تمہیں جیسے بڑا پتہ ہے، تمہارے کون سے دس بچے ہیں جو تمہیں پڑھو۔ اور....“ وہ رکا اور پھر تنک کے بولا۔ ”تمہارا تو کوئی ہیرہ بھی نہیں ہے۔“

”اسامدہ یوسف۔“ وہ کمرپر دونوں ہاتھ رکھ کے شعلہ بارنظروں سے اسے دیکھ کے بولی۔ ”میں خود کسی ہیرہ سے کم ہوں کیا؟“ اسامدہ نے کچھ بڑا کے تکیہ منہ پر رکھ لیا اور کروٹ بدلتی۔ حدا آگے بڑھی، الماری دھیرے سے ہکھوئی، اندر سے کچھ نکال کے کمر کے پیچھے چھپا لیا اور اونچا سا بولی۔ ”مجھے ایسے بھی بہت کچھ پتہ ہے۔ زندگی بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔“ پیچھے ہٹی گئی اور دروازے تک پہنچ کر رکی۔ ”اور چاکلیٹ بھی۔“ دروازہ کھولا، اور چاکلیٹ کا پیکٹ پکڑے جھپاک سے باہر غائب ہو گئی۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا، سیم کا جو گرٹھاہ سے آ کراس پا کے لگا تھا۔

حمدابن شیخی ہوئی اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ جہاں کھلی لیپ ٹاپ اسکرین ڈھیروں stencils کے آئینڈیاٹ لئے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ہوم ڈیکور نشہ آور چیزیں، مگر اچھی چیزیں۔۔۔

چلی منزل پا آئی تو زمر کے کمرے کی قصی چلی تھی۔ وہ نیبل پہ تہہ شدہ جائے نماز رکھ کر اب دو پتہ ہکھوں رہی تھی۔ پھر ایک نظر صوفے پر لبے لیئے فارس کو دیکھا جو مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔

”دن کیسا گزر را؟“ زمر نے پوچھا تو اس کے چہرے پر ہریدھنیست بکھر گئی۔ آزادی اور اطمینان۔

”بس آج تمہاری یاد آتی رہی۔ تمہاری قدر ہوتی رہی۔ تم سے محبت بڑھتی رہی۔“

”پسیے چاہئیں؟“ زمر نے صوفے میں مشکوک ناظروں سے اسے دیکھا۔ مگر اس کا موڈنیں بدلا۔

”بہت اچھی لگ رہی ہوا آج۔“

”شکریہ۔“ وہاب آئینے کے سامنے کھڑی بال جوڑے میں لپیٹ رہی تھی۔

”تم کتنے دن سے ڈنگ کا کہہ رہی تھیں نا، اگر آج چاہو تو..... بلکہ نہیں....“ فارس نے فنی میں سر ہلایا۔ ”تم بتاؤ، تمہیں کیا چاہیے۔“

”ہیں؟“ زمر نے پونی میں بال مقید کر کے حیرت سے آئینے کو دیکھا جس میں اس کا عکس نظر آ رہا تھا۔ ”طبعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ وہ صوفے سے اٹھا اور اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ پھر بہت اپنا نیت سے اسے دیکھ کے بولا۔ ”کوئی خواہش کرو، کچھ ماگو، کوئی ڈیمانڈ سامنے رکھو۔ جو کہو گی پورا کروں گا۔ ڈائیمنڈز، ڈنر، گفت، کیا چاہیے تمہیں؟“ عادتاً ذریسر کے کنارے میختا اور محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ زمر نے پہلے اسے دیکھا، پھر اپنے ہاتھوں کو پھر دوبارہ اس کے چہرے کو دیکھا۔

”ایسے پوچھ رہے ہو جیسے مرے والے سے آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔“

”اوہ بھو۔ وقت نہ ضائع کرو۔ کچھ ماگو۔“

”اچھا۔ جو کہوں گی کرو گے کیا؟“ وہ مسکرا کے بولی۔ فارس نے اس کی آنکھوں پر نظریں جمائے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہوں!“

”تو پھر....“ وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔ ”میں یہ چاہتی ہوں کہ.... میرا شوہر.... میرے لئے میرے ساتھ مل کر..... برلن دھوئے!“

وہ چند لمحے تو سمجھنے پایا۔ ”سوری؟“

”صداقت اور حسینہ گاؤں گئے ہیں چھٹی پ۔“ اس نے ہاتھ چھڑائے اور آستین اور پر چڑھانے لگی۔ ”اور جنین کو کوئی نیا ہوم ڈیکور آئینڈیاٹ مل گیا ہے اور اس کو کچن کی فکر نہیں ہے، سو میں سوچ رہی تھی کہن صاف کرلوں تاکہ بجا بھی کونہ کرنا پڑے مگر بجا بھی کا بجا بھی چونکہ تعادن کرنے والا اور ہمدرد ہے، تو میرا آدھا بوجھ تو کم ہوا۔“

اور بجا بھی کے ہمدرد بھائی نے بھنوں اکٹھی کر کے نھلی سے اسے گھورا۔ ”تمہارے خیال میں۔ میں اتنا زان مرید اور بے وقار بے

غیرت مرد ہوں جو تمہارے کہنے پر تمہارے ساتھ... اور خدا یا... کچن میں برتن دھلواؤں گا؟“

”ہا!“ اس نے سادگی سے اسے دیکھتے اثاث میں سر ہلایا تھا۔

قریباً پانچ سال منٹ بعد وہ کچن سنک کے آگے کھڑا تھا، آستین چڑھے ہوئے تھے، مل کھلا تھا، اور وہ جھاگ بھرے اس فخ کو ایک پلیٹ پر گڑھ رہا تھا۔

”ویسے اتنا برا کام نہیں ہے یہ۔“ نارمل سے انداز میں ساتھ کھڑی سلیپ صاف کرتی زمر سے بولا تو اس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

”جیسے کہ تم نے تو کبھی ہاٹلنز اور بچپن فلیٹس میں برتن دھوئے ہی نہیں ہوں گے۔“

”بکھر نہیں۔ مجھے ہمیشہ خوبصورت نوکرائیاں مل جاتی تھیں۔“ فارس نے سر جھکائے پلیٹ پر پانی گراتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

ٹھک سے زمر نے پلیٹ کا انبار اس کے سامنے دھرا، فارس نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا تو وہ آنکھوں میں خفگی لئے اسے گھور رہی تھی۔ وہ گھری سانس بھر کے رہ گیا۔

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، تمہارے مراج میں اتنی سختی نہ ہوتی، تم واقعی کنٹرولڈ مٹھڈے اور شاستہ مراج کی ہوتیں تو کتنا اچھا تھا۔“

”میں کہاں سخت ہوں؟“ حسب توقع وہ برا مان گئی۔ اب وہ بھی اس کے ساتھ کھڑی اپنا سفخ بھگو رہی تھی۔

”ہر وقت غصہ کرتی رہتی ہو، ہر وقت کام کرتی رہتی ہو بے چارے شوہر کا تو خیال ہی نہیں تھیں۔ اب اس وقت بھی تم مجھ سے ہیرے جواہرات مانگ سکتی تھیں، پھول یا ڈنزو غیرہ بھی، مگر نہیں، کام ختم کرنے کی پڑی ہوتی ہے تھیں۔“

”ہیرے جواہرات کے لئے ساری عمر پڑی ہے، کیونکہ تھیںس ٹوہاشم میں مرنے نہیں لگی، اس لئے ابھی خاموشی سے برتن دھوو۔“ فارس نے مسکراہٹ دبا کے اسے دیکھا۔ وہ چڑھ کائے، آستین چڑھائے، مگن سی ایک ڈونگے کو صاف کرنے میں لگی تھی۔ بال جوڑے میں مقید تھے اور دو گنگریاں لیں چہرے کو چھو رہی تھیں۔ اس کے مسلسل دیکھنے پر زمر نے پلکیں اٹھا کر بھو ری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”یہی کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں، جو تم میری زندگی میں ہو۔“

”نشہ تو نہیں کرنے لگ گئے؟“ اسے اب واقعی فکر ہونے لگی تھی۔ وہ بال ساہنس دیا۔

”یونہی بس۔ پتہ ہے جب میں جیل سے آیا تھا تو ساری دنیا سے بے زار تھا۔ بس یہی مقصد تھا زندگی میں کہ ان سب گناہ کاروں کو ترزاٹ پا کے ماروں، اپنا انتقام لوں، اور پھر... پھر جو بھی ہو.... جیل جاؤں، مر جاؤں، کوئی فکر نہیں۔“ اس کی آواز میں کرب در آیا۔ ”مگر پھر... تم نے مجھ سے شادی کرنے کی ہامی بھری۔ تم مجھے اذیت دینا چاہتی تھیں، اور میں تھیں۔ تب لگتا تھا ہمارے درمیان کبھی کچھ ٹھیک نہیں ہو گا، مگر تم نے میرے مردہ دل کو زندہ کر دیا۔ اب میں خوش ہوں اور خوش رہنا چاہتا ہوں مگر.....“ اس نے کھلائی تلے ڈش کی تو پانی کی دھار نے سارے جھاگ کو بہادیا۔ ”مگر مجھے اپنے مكافاتِ عمل سے بھی ڈر لگتا ہے۔ میرا کارما۔ میرے اعمال کے نتائج۔“

”فارس!“ اس نے تحریر سے اسے پکارا۔ ”ایسے مت کہو۔“

”نہ کہنے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔“ وہ اداسی سے مسکرا یا تھا۔ ”میں نے بھی غلط کام کیے ہیں۔ غلط لوگوں سے انتقام لینے کے لئے۔ ان لوگوں کی زندگیاں تباہ کی ہیں۔ کسی کی زندگی کی ساری جمع پونچی جلائی، تو کسی کو ایکسپوز کر دیا، کسی کو لاپتہ کر دیا، ان کی بھی تو اولادیں تھیں، اور میں اب بھی وہی کر رہا ہوں، میری مجبوری ہے۔ میں اپنے ہر کام کو جستفا کی کر سکتا ہوں مگر اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے بھی اپنے اعمال کے نتائج بھگنے پڑیں گے۔“

”انتامت سوچا کرو۔ تم قصور و انبیں ہو۔ تم ہر اکار کا، بلکہ ان کے اعمال سے بہت کم کا بدل لے رہے تھے۔“ اس نے نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا۔

”انتقام کا چکر بھی ختم نہیں ہوتا۔ میں دو قبریں کھود کے نکلا تھا، بس میں نہیں چاہتا کہ میرے نام کی قبر میں میری وجہ سے کسی اور کو جانا پڑے۔“ اس نے جھر جھری لی۔

”میں نا اب تمہاری چیزوں کی تلاشی لوں گی، اگر مجھے ذرا سی بھی کوئین یا سگریٹ مل گئی تو اچھا نہیں ہو گا۔“ وہ غصے سے بولی تھی۔ وہ پھر نہ دیا۔ ”اب فضول با تیں مت کرو اور کام کرو۔“ دھونس سے کہتی وہ اس کے سامنے مزید برتن سر کانے لگی۔ ”اور پھر تم نے مجھے اینورسری پر ڈز بھی کرانا ہے۔“

”اب کوئی ڈز نہیں ہو گا۔ آپ نے ان برتوں کی خاطر موقع میں کر دیا۔ سوری!“ وہ واپس اپنی جون میں آکے بولا تھا۔

”ڈز تو تم مجھے کرواو گے، وہ بھی اینورسری والی رات۔ یاد رکھنا۔“ غل بند کرتے ہوئے وہ دھمکاتے ہوئے بولی تھی۔ اسے پتہ تھا وہ ابھی یونہی کہہ رہا ہے۔ مگر بعد میں ضرور ڈز نرپے لے جائے گا۔

وہ اس رات کو یاد گار بنانا چاہتی تھی۔ بہت خوبصورت اور یاد گار۔



جیتے جی مارتی ہے بے چینی ..... وہ سکون ہو عطا کہ مر جائیں!

”قتل سے ایک دن قبل۔“

سورج کی پتی گرم شعائیں اس بلند عمارت کو ہکاری تھیں۔ ہاشم اپنے آفس میں تیار سا کھڑا موبائل پہ بات کر رہا تھا، سامنے رہیں بیٹھا لیپٹاپ پر لگا تھا۔ بات کر کے ہاشم اس کی طرف آیا۔

”کام کچھ ہو رہا ہے؟“

”جی سر۔ میں ان کے فونز بگ کر رہا ہوں، ریکارڈنگ سن رہا ہوں۔ فارس کی بہت سی آڈیو نکال لی ہے۔ اور voice modulation کے ذریعے میں اس کو.....“

”کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟“ اس نے بے زاری سے بات کاٹی۔

”لیک سر۔ وہ دونوں فون پر۔ فارس اور زمر... آج صحیح مسلسل ڈز کا ذکر کرتے رہے تھے۔ وہ کئی دن سے اسے کہہ رہی ہے کہ وہ اسے اینورسری پر ڈز نرپے لے کر جائے اور وہ بات ٹال دیتا ہے۔“

”گذ۔ ہم اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔“ ہاشم نے اس کا شانہ تھپکا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ راہداری پارکی اور لفت میں داخل ہو گیا۔

جس وقت وہ لفت سے نیچے لاپی میں اتر اسامنے سے آفس بلڈنگ کے استقبالی کے قریب... زمر یوسف آتی دکھائی دی۔ وہ مکرا کے اسے دیکھتے ہوئے رک گیا۔

”میں کورٹ آرہا تھا، آپ کیا مجھے لینے آگئیں؟“

”نہیں، میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ ہمیں آپ ملک سے فراتونہیں ہو گئے۔“ وہ اسی طرح مسکرا کے بولی اور لفت کے اندر چل گئی۔ دروازے آپ میں مل گئے تو ہاشم نے موبائل نکال کے نمبر ملایا۔

”خلیمہ.... وہ تمہیں سمن دینے آرہی ہے۔ سعدی کی دکیل۔ تم وہی کرو جو میں نے کہا تھا۔ او کے گذ۔“

زمر بالائی منزل پہ اتری، اور آگے بڑھتی گئی۔ گھنگریا لے بالوں کو پونی میں باندھے، سیاہ کوٹ پہنئے، وہ کورٹ کے لئے مکمل تیار تھی۔ بس حیلہ کو من کی کاپی دینے آئی تھی، اور موقع کے مطابق حیلہ اپنے ڈیک پہنچی تھی۔ اس نے من کی ایک کویگ کے حوالے کیا، دخنخیلیے، ساتھ میں اپنا کارڈ اور ایک نوٹ بھی دیا، اور لفٹ کی طرف واپس آئی۔ جیسے ہی دروازے کھلے اور وہ اندر داخل ہوئی، کوئی عجلت میں چلتا آیا اور دروازے کے بند ہونے سے قبل اندر آگھسا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بارکس تھا جس میں چند فائلز، فوٹوفریم اور ایک نخاسا پودا رکھا تھا۔ کہنی سے اس نے گراونٹ فلور پر یہیں کیا اور دروازے آپس میں ملنے لگے۔ تب زمر نے دیکھا، وہ نو شیر والا تھا۔ وہ بھی اسی پل مژا تو اس کا چہرہ دیکھا۔

زمر رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔ سمجھیدہ اور سپاٹ۔ وہ بھی ایک دم بچکپا سا گیا۔ لفٹ نیچے اترنے لگی۔

”آپ مجھے ہمیشہ اپنے لئے اسٹینڈ لینے کو بھتی تھیں۔“ وہ اسے دیکھ کے آرڈنگ سے بولا تھا۔

”نو شیر والا اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں آپ کو مجھ سے بات نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ بے زاری سے چہرہ پھیرے بولی تھی۔

”مجھے اپنی فیملی کے خلاف آپ نے کھڑا کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا آپ مختلف ہیں، شاید آپ کو میرا خیال ہے، مگر... آپ بھی ان سب کی

طرح ہی نہیں۔“

”اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ سعدی کوتین گولیاں آپ نے ماری تھیں۔“ وہ اس کو دیکھ کے تیزی سے بولی تھی۔

”اور اب میں اپنی غلطیوں کو فکس کر رہا ہوں تو آپ مجھے کورٹ میں پر اسکیوٹ کر کے مجھ سے میرے تمام چانسز چھیننا چاہتی

ہیں۔“

”اعمال کے نتائج ہوتے ہیں اور وہ بھگنے پڑتے ہیں۔ اگر میں سونیا کوتین گولیاں مارتی، تب آپ مجھے کورٹ میں گھینٹے یا مجھے موقع فراہم کرتے، کبھی فرصت ملے تو سوچنے گا۔“

وہ ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ لفٹ نیچے اتر آئی تھی، دروازے کھل گئے تھے۔ زمر باہر جانے لگی۔

”مگر میں سب کچھ فکس کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔“ وہ کرب سے بولا تھا۔ زمر اس کی طرف گھومی۔ اور سپاٹ نظر وہ سے اسے دیکھا۔ ”کیسے؟ استغفار دے کر؟ اپنی کمپنی کی سیاہ کاریاں بتا کر؟ وہ آپ کے دوسرا گناہ ہیں جن سے ہمارا تعلق نہیں ہے۔ سعدی کے لئے کیا کیا آپ نے؟ کورٹ میں اعترافِ جرم کر سکتے ہیں؟ نہیں نا۔ ساری دنیا کے سامنے معافی مانگ سکتے ہیں؟ اپنے بھائی کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں؟ نہیں نا۔ پھر میں کیسے مانوں کہ آپ کو موقع ملنا چاہیے؟“ سر جھٹک کے وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ بارکس اٹھائے باہر آیا اور افسوس سے اسے دیکھا۔

”میں سمجھتا تھا آپ کو میری پروادا ہے۔ صرف آپ کی عزت کرتا تھا میں آپ کے سارے خاندان میں۔ مگر آپ کو میری کوئی پروادا نہیں ہے۔“ وہ ان سنا کر کے آگے بڑھ گئی۔ لابی میں نزرتے چند لوگوں نے مژمر کے دیکھا تھا، مگر نو شیر والا کوئی فکر نہیں تھی۔

❖❖❖

گردش وقت مجھے خاک ڈراپائے گی..... تجربے جتنے بڑھیں اتنا ہی ڈر جاتا ہے  
دوپھر کے باوجود کمرے میں نہم اندر ہیرا تھا۔ تین افراد وہاں موجود تھے۔ کوئی بیٹھا تھا، کوئی ٹھیل رہا تھا۔ ایک ارگرد چیزوں کی تلاش لے رہا تھا۔ سامان بکھرا ہوا ساتھا۔ سکنی، گدا، کھلے دراز.... ہرشے الث پلٹ کر دی گئی تھی۔ سامنے ایک بیگ کھلا پڑا تھا جس میں سے زیورات احمد کے پاس پورٹ اور نٹوں کی گنجیاں جھانک رہی تھیں۔

اور اسی کمرے کے ایک کونے میں بیندی کی پاکتی کے ساتھ وہ بندھا ہوا دروازے نو پڑا تھا۔ شدید تشدید کے باعث اس کی شرث پھٹی ہوئی

تھی سر سے خون رس کر گردن اور کان پہ جم گیا تھا۔ گردن یچے ڈھلکا کے وہ نقاہت زدہ سا بیٹھا تھا۔ دفتہ اس نے چہرہ اٹھایا تو اتنا نظر آتا تھا کہ چہرے پر کوئی زخم وغیرہ نہ تھا۔ پھر اس نے پھٹی ہوئی آواز میں ان کو مخاطب کیا۔ ”سب کچھ تو لے لیا ہے تم لوگوں نے۔ اب جان چھوڑ دو میری۔“

سامنے کھڑا آدمی اس کی طرف جھکا اور زور کا جھانپڑا اس کے منہ پر رسید کیا۔

”مزید مال چاہیے۔ بتاؤ کہاں رکھا ہے ورنہ آج میں تمہیں فن کر کے سوؤں گا۔“ احمد کا چہرہ تھپڑ کے باعث دوسرا جانب لڑکہ گیا۔ منہ سے کراہنگلی۔ پھر چہرہ اٹھا کے صوفے پر بیٹھے آدمی کی طرف دیکھا جو مسلسل نون پر کسی اجنبی علاقائی زبان میں بات کر رہا تھا۔

”مارتم مجھے نہیں سکتے....“ گھری گھری سانس لیتے اپنے بدقت اندر کے خوف پر قابو پاتے اس نے کہنا چاہا۔ ”کیونکہ تم یہ زیور قسم نہیں کر رہے۔ جب بھی فیصلے کا وقت آتا ہے.... مجھے کیا کھانے کو دینا ہے، مجھے کھڑا باندھنا ہے، مجھے کیا چاہیے...“ تم تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہو، تم میں کوئی لیدر نہیں ہے۔ تم میں سے کوئی ان چارج نہیں ہے۔ اس لئے... میری بات اس سے کروادے... جو تمہارا ان چارج ہے۔“ بدقت کہ کے وہ گھرے گھرے سانس لینے لگا۔ ان تینوں نے پھر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اب کی بار کوئی اسے مارنے کو نہیں جھکا۔ بس وہ خاموش رہے۔ پھر موائل والا اٹھا اور باہر نکل گیا۔ احمد گردن جھکا کے پھر سے گھرے گھرے سانس لینے لگا۔

بیزپر زیورات ابھی تک کھلے پڑے تھے۔ نیم انہیں میں بھی وہ جگر جگر چمک رہے تھے۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

اجل خود زندگی سے کافی تھے۔ اجل کی زندگی پر دسترس کیا کر رہا عدالت کی اوپنی کھڑکیاں تیز دھوپ کے لئے باہمیں کھولے کھڑی تھیں۔ سارا ہاں سنہر اروشن نظر آ رہا تھا۔ فارس غازی حب معمول آخری نشست پر بیٹھا تھا۔ تا نگ پر تا نگ بجا توہ عادتاً کان کی اول مسلمت ہوئے۔ سکھیوں سے قریب بیٹھے جسٹے والے آدمی کو دیکھ رہا تھا، جو سفاری سوت میں ملبوس تھا اور نسوانی انداز میں تا نگ پر تا نگ چڑھا کے بیٹھا تھا۔ فارس نے سر جھنک کے توجہ سامنے مبذول کرنی چاہی جہاں وہ ادھیز مر ایئر پورٹ سکیو ری سکٹرول روم کا آفیسر کٹھرے میں کھڑا تھا۔ زمر اس کے سامنے چند قدم یچھے کھڑی تھی، فارس کی طرف اس کی پشت تھی اور وہ ہاتھ میں کاغذ پکڑے۔ سنجیدگی سے سوال پوچھ رہی تھی۔

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ 22 میں کی صبح ایئر پورٹ کٹرول ٹاور میں موجود تھے؟“

”جی ہاں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ پہلی رو میں بیٹھا سعدی آگے کو جھکا، غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ایک لفظ پر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

”اوکیا آپ نے نوشیر وال کاردار کو 22 میں کی صبح اسکرین پر دیکھا تھا؟ یعنی 22 میں کو کیا وہ ایئر پورٹ پر موجود تھے؟“

”ایئر پورٹ پر بہت سے لوگ ہوتے ہیں، مجھے ہر ایک کی شکل یاد نہیں رہتی۔“

”پہلی آپنے جوابات کو ہاں یاناں تک محدود رکھیں۔ کیا آپ نے نوشیر وال کو دیکھا تھا یا نہیں؟“

”جی نہیں۔“ سعدی نے تھک کر سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔ پھر ذرا سا چہرہ موڑ کے دیکھا تو ہاشم مسکرا کے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سعدی کے دیکھنے پر اس نے اپنی فائل کا ایک صفحہ یوں ترچھا کیا کہ سعدی کو اس پر بڑے بڑے لکھے الفاظ صاف نظر آئے۔

”Money Talks“ سعدی نے بے زاری سے رخ پھیر لیا۔

”آپ کو ٹھنڈ نوشیر وال کاردار اس فوٹج میں بالکل یاد نہیں؟“ زمر سپاٹ سا پوچھ رہی تھی۔ اشارہ سامنے بیٹھے شیر و کی طرف تھا۔

”جی نہیں۔“ آپ پہنچنے شاہنے جھکلے۔

”اور کیا آپ نے اپنے دوست کو کہا تھا کہ کاردارز کے لڑکے کی فوج آپ نے غائب کر دی ہے؟“

”جب نہیں۔ میں ان لوگوں کو جانتا تک نہیں ہوں۔“

”مسعود عالم صاحب۔“ زمرنے ایک کاغذ سامنے کیا۔ یہ تصویر میں نے آپ کے فیس بک سے لی ہے، اس میں کیا یہ آپ ہی

ہیں؟“

مسعود نے جھک کے تصویر دیکھی۔ ”جی۔“

”اور ساتھ میں کون ہے؟“

”یہ ہرہ علی عباسی ہیں۔“

”آب جیکشن یور آئر۔“ ہاشم نے بیٹھے بیٹھے پکارا۔ ”فین فوٹو ز کا اس اہم گواہی کے درمیان ذکر کرنا؟“

”اوورولڈ،“ مگر مسز زمر آپ کائنشن جلد واضح کریں، ورنہ عدالت کا وقت ضائع نہ کریں۔ ”جح صاحب نے اسے تنیہ کی۔ زمر نے

سر کو خم دیا اور چند مزید تصاویر سامنے کیں۔ ”یہ آپ کے ساتھ چند دوسری مشہور شخصیات کی تصاویر ہیں۔ یہ قرازلان کا رہہ ہیں، یہ راحت فتح علی خان ہیں، اور یہ....؟“

”صبح الحلق۔“ مسعود عالم نے بتایا۔ زمر نے اثبات میں سر ہالیا۔

”تو آپ جب بھی کنشروں روں میں بیٹھے اسکرین پا ایئر پورٹ پر کسی شناساچھرے کو دیکھتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ تصویر لے لیں۔“

”جی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ اسکرین کو غور سے دیکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی پھرہ unnoticed نہ رہے۔“

”جی ہاں، یہ میرا فرض ہے۔“

”مگر آپ کو نو شیر وال کاردار نہیں یاد؟ نہ 22 مئی کو نہ 21 مئی کو۔“

”جب نہیں۔“

”کونکہ ان سیلبر ٹیر کو آپ پہچانتے تھے مگر نو شیر وال کو نہیں۔“

”جی بالکل۔“ وہ اعتماد سے بولا۔

”اور آپ نے کبھی اس سے پہلے نو شیر وال کو نہیں دیکھا تھا؟“

”جب نہیں۔“

”اور آپ ان کے نام تک سے واقف نہیں تھے؟“

”جب نہیں۔ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”مسعود صاحب، آج سے ڈھائی سال پہلے کیا یہ درست نہیں ہے کہ ایک رات نو شیر وال کاردار کی تصویر اور پا سپورٹ کی کاپی ہاشم

کاردار نے ایئر پورٹ کے عملہ کو بھی تھی۔“ اس کے سوال پر فارس قدرے دلچسپی سے آگے گواہا۔

”آب جیکشن یور آئر۔“ ہاشم تیزی سے اٹھا مگر جح صاحب نے اسے واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”بات جاری رکھیں۔“ زمر نے تشك

سے سر کو خم دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”یہ اس ای میل کی کاپی ہے جو تین مختلف آفیسرز نے ہمیں فراہم کی ہے۔ یہ وہ رات ہے جب مبینہ

طور پر نو شیر وال انگوہ ہوا تھا، کوریا میں اور ہاشم نے یہ تصاویر اور پا سپورٹ کی کاپی بہت سے آفیسرز کو بھی تھی تاکہ جیسے ہی یہ شخص واپس پا کستان

آئے اسے فوراً اطلاع کی جائے۔ اس ای میل کے ہیڈر میں بہت سے پتے لکھے ہیں۔ یہ آپ کی ای میل کا پتہ ہے نا؟“ اس نے کاغذ اس کے سامنے کیا۔

”جی، مگر.....“

”اور یہ آپ کا جواب ہے جو آپ نے ریپلائی آل ٹک کر کے دیا تھا جس میں لکھا ہے ”Sir, On it“ یوں یہ جواب سب کو چلا گیا تھا۔“

”مجھے... یاد نہیں۔“ اس نے پست آواز میں بولا۔

”آپ کے ای میل ریکارڈ کو سب ذرہ ذرہ یاد ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ نے وہ ای میل کھوئی تھی، اور آپ نے نو شیر وال کا نام بھی سناتھا، اور شکل بھی دیکھی تھی۔“

”دیکھیں اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ مجھے یاد نہیں تھا۔“ وہ منجل کر بولا۔

”کیا آپ اس شوٹنگ کلب کے مجرم ہیں؟“ اس نے ایک کارڈ کی کاپی اس کے سامنے رکھی۔  
”جی۔“

”اوہ آپ تقریباً ہر ہفتے وہاں جاتے ہیں۔“

”جی، وہاں۔ تقریباً۔“

”تو کیا آپ نے اس کی لابی میں سال کے بہترین شوورز کی تصاویر یا اور نام نہیں دیکھے؟ بچھلے دوسال سے نو شیر وال کا ردار دوسرے نمبر پر آ رہے ہیں، ان کی تصویر وہاں نمایاں لگی ہے جسے آپ ہر ہفتے دیکھتے ہیں۔ تو پھر مجھے صرف اتنا بتائیے کہ آپ نے نو شیر وال کو اسکرین پر مس کر دیا یہ بات تو سمجھ آتی ہے مگر آپ کا حلف لے کر یہ کہنا کہ آپ نے اسے کبھی دیکھا نہیں ہے، یہ ناقابل فہم ہے۔ مجھے مزید کوئی سوال نہیں پوچھنا۔“ وہ ختنی سے کہہ کر پلٹ آئی۔

ہاشم نے جھک کر ساتھ میٹھے نوجوان وکیل سے سرگوشی کی۔ ”ویڈ یو بنائی؟“

”جی سر۔ اب حلیمه کو بیچ رہا ہوں۔ اسے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کیسی وکیل ہے اور اسے کیسی تیاری کرنی ہے۔“ ہاشم سر کو خم دے کر اٹھا۔

”مسعود صاحب آپ روز کتنے لوگ کی سیٹی وی فیڈ کی اسکرینز پر دیکھتے ہیں؟“

”سینکڑوں۔“

”اور کیا صرف ایک اسکرین کو دیکھنا ہوتا ہے آپ نے؟“

”نہیں، سر، بہت سے مانیٹرز ہوتے ہیں۔“

”اور ایک لکھ روپیں لسٹ کے لئے وزارتِ داخلہ سے، اور اس کے علاوہ پولیس اور دیگر ایجنسیز کی طرف سے ریڈالرٹ کے طور پر ایک ماہ میں کتنی تصاویر آپ کو تھیں جاتی ہیں؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”آرام سے بھی دوسو سے اوپر۔“

”جب میں نے وہ تصویر ایسے پورٹ ٹھیکی، صرف اس لئے کہ میرے بھائی کو آنے میں تاخیر ہو گئی تھی، تاکہ وہ اغوا دیگر ہوا تھا، تو اس دل قلع کو آج کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟“

”ڈھائی سال!“

”اور سعدی یوسف کے اغوا کے وقت اس بات کو قریباً ڈیہ سال گزر چا تھا۔“

”ایسا ہی ہے۔“

”اور اس ڈیہ سال کے دوران آپ نے دو ہزار تصاویر بطور الٹ دیکھی ہوں گی۔“  
”اس سے بھی زیادہ۔“ آپ پریٹر اعتماد سے مسکرا یا تھا۔

”تو کیا اسی لئے آپ کے لئے دیکھے ہوئے چہرے کو بھی یاد رکھنا مشکل ہے۔“

”آب جیشن یور آز۔ گواہ سے رائے بھی مانگ رہے ہیں کاردار صاحب اور ان کو لیڈ بھی کر رہے ہیں۔“ وہ بے زاری سے  
بوی تھی۔

”حج صاحب کی رو لنگ کے بعد ہاشم سر جھنک کے اب سوالات کا رخ موڑ کر عصمت بی بی کی طرف لے آیا۔  
ذاتی عناد پر فیشن جیسی، غیرہ اور مسعود صاحب اب اعتماد سے بتار ہے تھے کہ یہ خاتون پہلے کتنے لوگوں کے ساتھ یہ کرچکی ہے۔  
ساعت کے بعد زمر باہر آئی تو فارس دروازے کے ساتھ اس کا منتظر کھڑا تھا۔ چہرے پر حیرانی اور قدرے اچھا سا تھا۔ وہ فائز  
سینے سے لگائے آگے بڑھنے لگی تو وہ جلدی سے اس کے پیچھے لپکا۔

”تمہیں اس کی ای میلود کا کیسے پتہ چلا؟ اور تم نے ایک پورٹ کے اتنے سارے لوگوں سے ان کے ایفی ڈیوٹ اور ای میلود کیسے لیں؟“  
وہ واقعی متحیر تھا۔

”اسے oppo research کہتے ہیں، اور چونکہ میں وکیل ہوں تو مجھے کرنی آتی ہے۔“ وہ مسکراہٹ دبائے چلتی جا رہی تھی۔

”مگر تمہیں کیسے پتہ کرو؟ بھی اسی کلب کا نمبر ہے جہاں نوشیر وال بھی جاتا ہے؟“

”کیونکہ میں ایک اچھی وکیل ہوں۔ تم کیا مجھ سے متاثر ہو رہے ہو؟“

اس کے ساتھ چلتے فارس کے چہرے کے زاویے بگزے۔ لاپداہی سے کندھے اچکائے۔

”ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔“ زمر نے چہرہ موڑ کے مسکرا کے اسے دیکھا۔ ”میری زندگی میں وہ وقت

پہنچنے آئے گا بھی یا نہیں!“

”مجھے تو آنا نہیں نظر آ رہے۔“ وہ بھی مسکراہٹ دبائے بولا تھا۔

”ماموں!“ سعدی پیچھے سے پکارتا ہوا آرہا تھا۔ فارس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

”کیا ہوا؟ پریشان لگ رہے ہو؟“

”یہ احر شفع کہاں ہے؟ فون آف ہے اس کا اتنے دن سے۔“ وہ جھنجلایا ہوا بھی تھا۔ فارس کی نظر وہ کامنے وہ بیگ ”زیور پاپسپورٹ گھوم گئے۔ اس نے گھری سانس لی۔

”وہ کہیں شہر سے باہر گیا ہوا بے عرصے کے لئے۔ اس کو تنگ مت کرو۔“

”ایے کیسے چلا گیا؟ میرے ساتھ اتنے کام کرنے تھے اس نے۔“

”اس کے پیچھے مت پڑا۔ اس کو اپنی مرضی سے جانے دو۔“ زمر نے بھی نرمی سے کہا تھا۔

سعدی شش و پنج میں بتلا کھڑا رہ گیا، اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ پتہ نہیں کیوں وہ مطمئن نہیں ہوا پار رہا تھا۔ احر کچھ بھی کر سکتا تھا،

مگر جتنا سو شل وہ تھا وہ اپنا فون اور واٹس ایپ یوں بندھیں کر دیتا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟



یہ مری عمر کا صحراء مرے دجلوں کا سراب ..... سرِ مژگاں نہ رہے گا تو کدر جائے گا!  
وہ ایک گرم صبح تھی۔ جس آلوڈ گھشن زدہ۔ فضامیں کوئی آن دیکھی نئی تھی۔ جیسے کوئی خاموش آسیب تاک میں بینتھا ہے اور دلوں کی  
دھڑکن منتر ہتا ہے۔

مورچاں کے پورچ میں اندر سے اڑاؤ کے آتی ناشیت کی اشتہا ایکیز خوبیوں میں محسوس ہو رہی تھیں۔ زمر اپنی کارکا دروازہ کھولے  
کھڑی تھی، کوٹ پینے، پس کاندھے پڑائے تیار اور مصروف سی اور بس آخری منٹ میں گویا فارس کو ہدایات دے رہی تھیں۔

”گھر جلدی آنا۔ پھر تم نے مجھے ڈنر پے لے کر جانا ہے۔“

”اینورسری کل ہے ماڈام اور جہاں تک ڈنر کا تعلق ہے تو کل حسینہ بنائے گی ناکدو گوشت۔“ وہ سادہ سی شرٹ پینے جیبوں میں ہاتھ  
ڈالے کھڑا ہشائش ماسکرتا کہہ رہا تھا۔

”کیا ہم آج رات بارہ بجے نہیں سلیمیر یٹ کر سکتے؟“ وہ خفا ہوئی۔

”کس چیز کو سلیمیر یٹ کرنا ہے؟ آپ نے مجھ سے انتقام کے لئے میری زندگی کو جنم بنانے کی نیت سے جو عقد کیا تھا اس کو سلیمیر یٹ  
کرنا ہے کیا؟“

”نہیں، تمہاری دولت اور اس شاندار جاپ کو سلیمیر یٹ کرنے کے لئے جس پتھر روز جاتے ہو اور جس کے لئے میں نہ تم سے  
شادی کی تھی۔“ وہ جل کر بولی تھی۔ وہ دھیرے سے نہیں دیا۔ گرم صبح بھی خونگوار لگنے لگی تھی۔

”میں تمہیں کسی ڈنر نہیں لے جا رہا تم نے موقع ضائع کر دیا مجھ سے برتن دھلوا کے۔“ ابھی وہ اور بھی کچھ کہتا جب گیٹ کے باہر  
ٹاہر گز کر کر کنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں چونکے۔ ایک کارکی دروازے کھلے اور پھر بیل بھی۔ فارس آگے آیا اور دروازہ کھولا۔

”شہرین!“ وہ اسے دیکھ کر جہاں ہوا تھا۔ زمر نے اس کے کندھے کے پیچھے سے جھانا کا باہر شہری کھڑی تھی۔ باب کٹ سنہرے بالوں  
کو کھلا چھوڑے گلے میں اوٹ پٹانگ مالائیں ڈالے ایک کان میں بالی پہنچنے دوسرا کان خالی، وہ یہ جان کا شکار نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر بے چینی سے  
بولی تھی۔

”فارس تم میرے لئے کیا کرو گے اگر میں تمہارے کیس میں تمہاری مدد کروں؟“

”وعلیکم السلام شہری، مجھے بھی تم سے مل کے بہت خوشی ہوئی۔“ وہ تھل مگر غور سے اسے دیکھ کے بولا تھا۔

”مجھے کسی ایک سائیڈ پہ ہونا ہے کیونکہ جلد ہی گواہی کے لئے بلائی جاؤں گی۔ اس لئے مجھے بتاؤ، تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟“  
شہرین نے اس کی بات کو نظر انداز کیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔

”یہ محصر ہے اس پر کہ تمہارے پاس کیا ہے۔“

”نوشیر داں کالائیں، جو اس کی گلاؤ گن کا ہے۔“

فارس کے ابرو بے یقینی سے اٹھے، اس نے مڑ کے زمر کو دیکھا جو اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

”اندر آ جاؤ۔“

”تمہارا گھر وارڈ ہو سکتا ہے، میں خطرہ مول نہیں لے سکتی۔“ نہیں باہر آنا ہو گا۔

”اوکے۔“ اس نے ایک نظر زمر پر ڈالی۔ اس وقت کی ایک آخری نظر۔ اور باہر نکل گیا۔ زمر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا  
دماغ گلاؤ گن میں آنکا ہوا تھا، مگر دل فارس میں۔ ابھی وہ اس پر خفا ہو رہی تھی، مگر ایک دم وہ گھر سے گیا تو لگا جیسے سب کچھ خالی ہو گیا  
ہے۔ کاش وہ نہ جائے، آج کا دن اس کے ساتھ گزارے، مگر انہوں۔ وہ سر جھٹکتی واپس کارکی طرف آئی۔ وہ ضروری کام سے گیا ہے اتنا خود کو

کسی کا عادی نہیں کرنا چاہیے زمر بی بی۔ خود کو دل میں پکارا اور خود ہی نہ سدی۔ (زمر بی بی؟ واو!

❖ ❖ ❖

بندہ پرور جو ہم پر گزری ہے ..... جو ہم بتائیں تو کیا تماشہ ہو  
سورج سوانیزے پر تھا جب سعدی اس فلیٹ بلڈنگ کی لفت میں داخل ہوا تھا۔ ساتھ میں گردن ادھرا دھر گھما کر اندازہ بھی کر رہا  
تھا کہ درست جگہ پر ہے یا نہیں۔ عمرت تو یہی تھی، فلیٹ نمبر بھی اسے مدھم مدھم سایا تھا۔ فلور کے بارے میں وہ قدرے متذبذب تھا۔ پھر  
اندازے سے ایک بُن پر انگلی رکھی تو لفت کے دروازے بند ہونے لگے۔

مطلوبہ فلور پر اتر کے وہ غیر شناسانظر وہ اطراف میں دیکھتا آگئے آیا۔ پودا، رامہاری، فلیٹ کا دروازہ۔ غالباً یہی تھا احرار کا فلیٹ،  
مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں ہر فلور ایک سالگا تھا۔ ایک سے پودے۔ ایک سے دروازے۔ خیر۔ وہ آگے آیا اور دروازے کے ساتھ لگی بیل بجائی۔  
پھر سر پر جی پی کیپ درست کرتا، ذرا ہٹ کے کھڑا ہو گیا، تاکہ دروازے کے سوراخ سے دیکھنے والا اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ (شاید احرار کو  
avoid کر رہا ہو تو کم از کم یوں وہ کسی اور کے دھوکے میں دروازہ توکھوں دے گا۔)

اندر فلیٹ نیم اندھیرے میں ڈوبتا تھا۔ گھنٹی کی آواز پر سب چونکے۔ احرار نے بھی سراخھا یا۔ وہ پہلے سے زیادہ نقاہت زدہ دکھتا تھا۔  
بندھا ہوا نیچے بیٹھا تھا، اور سر نیمہوا اڑ رکھتا تھا۔ گھنٹی کی آواز پر سب چونکے۔ احرار نے بھی سراخھا یا۔ وہ پہلے سے زیادہ نقاہت زدہ دکھتا تھا۔  
”ارے اس وقت کون آگیا؟ ہاں؟ بول۔“ ان کے سرغنہ نے اس کو بالوں سے کپڑے کے جھنکا دیا۔

”جا کر خود کیوں نہیں دیکھ لیتے؟“ تلخی سے بولا تھا تو اس نے جھنکے سے اس کا سر چھوڑا۔ پھر باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا۔  
”کوئی آدمی ہے، شکل نہیں دکھائی دے رہی۔ اس طرف منہ کر کے کھڑا ہے۔ سر پر کیپ پہن رکھی ہے۔“ اس نے موبائل پر مجک  
آئی سے تصویر بنا لی تھی اور اب احرار کو دکھا کے پوچھ رہا تھا۔ ”کون ہے یہ؟“  
احرار نے ایک بے نیاز نظر تصویر پر ڈالی۔

”یہ؟ یہ تو پزا والا ہے۔ اس کے آؤٹ لٹ کا مل دینا تھا مجھے۔ دو ہزار روپے۔“

پھر سے گھنٹی بھی۔ تیر چنگھاڑتی آواز۔ تیوں نے باری باری ایک دوسرا کو دیکھا۔  
”خود ہی تھک کے چلا جائے گا۔ بجانے دو گھنٹیاں۔“ ایک نے مشورہ دیا۔

”ویسے بھی کوئی اور تو اس کے پاس آتا جاتا نہیں ہے۔ سوکی کو نہیں شک ہو گا۔“

”اور ہم نے اس کو بیمیں رکھنا ہے، یہاں سے لے جا بھی نہیں سکتے۔“ ان کی مدھم آوازیں احرار شفعت کو سنائی دے رہی تھیں۔

”میری کار پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اس پر ابوئے نے وہ دیکھ لی ہوگی۔ اسے پتہ ہے کہ میں گھر پہ ہوں۔ اس نے اپنی طرف سے  
پیسے دے کر کھانے میں غلط اعداد دشمنار لکھے تھے، اور اب وہ پیسے لئے بغیر نہیں جائے گا۔ دروازہ نہ کھولا تو پارکنگ میں جا کر میری کار کے ششٹے تو زور  
دے گا، تب تجھا گارڈ زاو پر مجھے بلا نے آئیں گے، پھر کیا کرو گے تم لوگ؟“

”چپ کر کے بیٹھو۔“ ایک غرایا تھا۔

”میرے ہاتھ کھولو اور مجھے دو ہزار دے دو، تاکہ میں اسے پکڑا کے چلتا کروں۔ مجھے پتہ ہے تم لوگوں نے مجھے مارنا نہیں ہے۔ اور  
تمہارے مالک سے ملنے کا مجھے خود بھی کافی شوق ہے تو میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ پکڑے جاؤ۔ میرے ہاتھ کھولو، میرا منہ دھلواؤ،“ تاکہ  
میں اس کو چلتا کروں۔“ ان تیوں نے پھر سے ایک دوسرا کو دیکھا۔ گھنٹی بیوزن ج رہی تھی۔

چند منٹ بعد حلے چہرے والا احرار دروازے کے ساتھ کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے دونوں پتھر تھے، اور اس کی پشت سے

ایک آدمی نے پستول کی نال لگا کر گئی تھی۔ اندر کی ساری بیتیاں بچھادی تھیں، تاکہ وہ دروازہ کھو لے تو باہر والا اندر سے نہ جھاٹک سکے۔ ”پہلے پوچھو کوئی کون ہے، اور کوئی چالا کی مت کرنا۔“ وہ بھی تک مشکوک تھا۔ احمد نے گہری سانس لی اور کھنکھار کے آواز لگائی۔

”اے.... پڑا بواۓ ہونا؟“

”ہاں جی، پڑا بواۓ ہوں۔ اب دروازہ کھولو۔“ وہ خفیٰ سے بولا تھا۔ احمد نے فاتحانہ نظر وہ سے اخوا کار کو دیکھا اور پھر آئے بڑھا۔ دروازہ ذرا سا کھولا اور سر باہر نکلا۔ سامنے سعدی کھڑا تھا۔

”مرے کیوں جا رہے ہو دوہر اردو پے کے لئے؟“ کھنکھا جبا جا کے دماغ خراب کر دیا ہے میرا۔ وہ پڑے کیا مگنوا لئے، تم لوگ تو جان کو آجائتے ہو۔ یہ پکڑو۔“ غصے سے بولتے اس کے ہاتھ میں نوت تھا۔ سعدی ہبکا بکا کھڑا رہ گیا۔ ”خبردار جواب گھنٹی کی۔“ دفعہ ہو جاؤ ادھر سے۔ اور اگر اب دروازہ بجا یا تو کان کھول کر سن لو، میں سیکیورٹی والوں کو بلا لوں گا۔“

”کیا..... کیا...؟“ وہ سنبھل کے کچھ بول بھی نہ پایا تھا کہ احمد نے اس کے منہ پر دروازہ بند کر دیا۔ سعدی نے بے اختیار دروازہ بھیلایا۔ ”احم... ایک منٹ میری بات سنو۔“

”دفعہ ہو جاؤ، خاور، ورنہ میں سیکیورٹی کو بلا لوں گا۔“ وہ حلق چھاڑ کے چلایا تھا۔ سعدی کا ہاتھ رک گیا۔ ساکت۔ شل۔ (خاور؟) وہ چند لمحے کھڑا تھا میں پکڑے نوت دیکھتا ہا، پھر شل ساپلٹ گیا۔

ان کا سراغنہ میجک آئی سے باہر جھاٹک رہا تھا۔ وہ چلا گیا تو اسے سکون آیا۔ وہ واپس مڑا اور احمد کے ہاتھ پیچھے باندھ کر چھڑا ری لگا۔ احمد نے کوئی مزاحمت نہیں کی، خاموشی سے خود کو بندھو تارا۔

سعدی اسی شل کی کیفیت میں سیرھیاں اتر رہا تھا۔ لفت کی بجائے وہ زینوں سے جارہا تھا، جانے کیوں۔ بار بار الجھ کر احمد کے الفاظ پغور کرتا۔ شاید اندر کوئی لڑکی ہو، اور وہ اسے بھگانا چاہ رہا ہو۔ مگر... پڑا بواۓ.... جب پہلی بار ادھر آیا تھا تو احمد رے پڑا بواۓ سمجھا تھا۔ آن برسوں بعد اس لقب سے پکارا تھا۔ مگر ”خاور؟“ اور یہ نوت۔ اس نے وسط سیرھیوں پر کر کر ان دونوں کو دیکھا۔ وہ لپٹنے ہوئے تھے۔ اس نے ان کو کھولا۔

دونوں نوٹوں کے درمیان..... تازہ خون لگا تھا۔ بالکل تازہ سرخ یوندیں۔ سعدی یوسف سنائے میں رو گیا۔

اوپر اب وہ احمد شرف کو اندر کھڑا و نج سے گزار کے روشنی والے کمرے میں لے جا رہے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر آیا، روشنی میں اس کے ہاتھ کی پشت عمیاں ہوئی، جس پر ایک کٹ لگا تھا (جو اس نے اندر ہی راہداری میں دروازے کے لاک کے ساتھ رگڑ کے لگایا تھا) اور یہاں پہنچنے تک اس کو مسلسل دوسرے ہاتھ سے دبا کر رکھنے کے باعث اس سے خون رسا رک گیا تھا۔ زائد خون وہ کپڑوں سے رگڑ کر صاف کر چکا تھا اور جس لمحے ان تینوں نے اسے واپس بیٹھ کر قریب باندھا، اس کے ہاتھ پر ان کو ایسا کچھ نہ کھا جوان کو کسی شک میں ڈالتا۔ اب وہ نوٹی کی صورت کھڑے باتیں کر رہے تھے، اگلا بیج عمل طے کر رہے تھے اور احمد خاموشی سے بیخداں لکاک کو دیکھ رہا تھا۔ گھڑی لمحہ بے لمحہ وقت کو گن رہی تھی۔ نک نک..... نک نک.....



کیا بہاروں نے نئے عہد کی دستک دی ہے ..... شہریاروں کی خزاں کا سحر جاتا ہے  
اس چھوٹے سے آفس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمپیوٹر کے سامنے ادھیزر عمر آدمی بیخدا ماؤس چلا رہا تھا اور فارس اس کے کندھے پر جھکا، اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ شہریں دوسری طرف کھڑی تھی۔

”ملا کچھ؟“ وہ بے چینی سے بولی تو فارس نے مجیدگی سے اسکرین کو دیکھتے گردن دائیں بائیں بلائی۔ ”نوشیر وال کے نام سے کوئی

ریکارڈ نہیں آ رہا۔“

”ہاشم کاردار کے نام سے کچھ گنز آ رہی ہیں میڈم۔“ آفیسر نے اطلاع دی۔

”نوشیر وال کاریکارڈ وہ مٹا چکے ہوں گے۔ جب ہمیں اتنی آسانی سے منشی کے ڈینا میں تک ایکس مل گئی ہے تھیں لکس ٹوبور فادر

شہری تو ان کو بھی مل گئی ہوگی۔“ فارس افسوس سے کہتا سیدھا ہوا۔ ”تمہارا شکر یہ مگر وہ ریکارڈ مٹا چکے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”ہارڈ کا پیز کہاں ہوتی ہیں؟“ شہری نے افسر کو سوچتے ہوئے مخاطب کیا۔ فارس ایک دم چونکا۔ ”ہاں واقعی ہارڈ کا پیز کاریکارڈ تو ہو

گانا۔“

”وہ تو میم..... وہ ذرا بیجان سے بولا۔“ ایک دوسری بلڈنگ میں ہیں، اور وہاں آپ کو میں یوں نہیں لے کر جا سکتا۔“ شہری نے تندہی سے اسے گھورا، اور پس کھولا۔ چند گلابی کڑک دار نوٹ نکالے اور اس کے سامنے میز پر ڈالے۔

”ہمیں وہ فائل چاہیے، اس نے اب تم ہمیں اس بلڈنگ میں لے کر جاؤ گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے میم، مگر.....“ اس نے دھیرے سے نوٹ اٹھائے۔ ”شفعتنگ کے دوران فائلز کوڈ ہوں سے نکال لیا گیا تھا۔ ان کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اتنے بڑے تین کمرے فائلز سے بھرے ہوئے ہیں۔ دیکھنے میں پورا دن لگ جائے گا۔“

”یعنی اگر ہاشم نے وہ فائل نکالنی ہوتی تو اسے بھی کئی بندے لگا کے کئی گھنٹے کام کروانا پڑتا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اتنا خوار کون ہو، اور صرف سافٹ کاپی مٹانے پر اکتفا کیا ہو۔“ وہ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شہری کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

”یعنی فائل مل جانے کے چانس زیادہ ہیں۔ گذ۔ فاروق، ہمیں ادھر لے چلو۔ چلونا، اب شکل کیا دیکھ رہے ہو؟“ شہری نے آنکھیں دکھائیں تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”سنو۔“ پھر وہ اس کے قریب آئی۔ ”اگر لائسنس ڈھونڈ دیا میں نے تمہیں تو تم بھی میرا ایک کام کرو گے، اچھا۔“ اسے یاد دلایا۔ فارس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”پہلے لائسنس مل جائے پھر دیکھتے ہیں۔“

❖❖❖

ہوا کی زد پر ..... ہمارا سفر ہے کتنی دیر ..... چراغ ہم کسی شام زوال ہی کے تو ہیں مور چال پر رات اُتر آئی تھی۔ حینیں یہ تسلی کرنے کے بعد امی سوچکی ہیں، اور اب اس کوڈ اسٹینس اپنی الماری سے وہ سارا سامان نکالنے لگی جو stencil پینٹ کرنے کے لئے اسے چاہیے تھا۔ صحیح یا تو امی لاونچ کی دیوار پر ایک خوبصورت شاہکار دیکھیں گی یا صرف ”شاہکار“! اب تک جو بھی ہو وہ اپنا کام اچھا یا برا کر چکی ہو گی۔ بہت جوش سے چیزیں اکٹھے کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ زمر اپنے کمرے میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے فون اٹھا کے دیکھ لیتی۔ فارس صحیح کا گیا، بھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ وال کلاک پر سینڈ والی سوئی تک کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔

باہر جنین اب stencil کے خاکے کو دیوار پر چپکا رہی تھی۔ اس کی خالی جگہوں پر اس نے رنگ بھرنا تھا.....

فارس ایک نیم اندھیرا آفس میں لکھ رہا تھا۔ بتیاں بند تھیں، اور وہ الماری سے فائلوں کا تھبنا نکال کے زمین پر رکھ رہا تھا۔ قریب میں اسٹول پر بیٹھی شہری فائلوں کے ڈھیر میں ابھی ہوئی تھی۔ وہ افسر بھی ساتھ بیٹھا ایک ایک صفحہ کھول کے دیکھ رہا تھا۔ بتیاں بند تھیں اور وہ تمیوں میں نسل نارچ، کی مدد سے کام کر رہے تھے۔ فضا میں گرد اور گھن تھی۔ ست روی تھی۔ وقفہ و قفقہ سے شہری کھانستی پھرنا ک رکزتی، اور کام کرنے لگ جاتی.....

احمر شفیع کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر کار میں موجود سعدی خاموش سا بیٹھا تھا۔ بالکل چپ۔ جیسے کسی کا منتظر ہو۔ اوپر فلیٹ میں وہی گھٹن زدہ ماحول چھایا تھا۔ ان لوگوں کا ایک کارنہ دوسرا سے بے چینی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ”اسے پندتی والے گودام لے چلتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی اور آجائے اس کا پوچھنے۔“

”نہیں، اس کو کہیں نہیں لے کر جانا۔ باہر موکر نے میں بہت خطرہ ہے۔ یہیں کرنا ہے جو کرنا ہے۔“

نیچے بندھے احرم کی نظریں ہنوز گھڑی پہ چھیں۔ دل بھی اسی آواز کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ ہرگز رتے سینڈ پا ایک دفعہ ڈوب کر اُبھرتا۔ کیا کوئی آئے گا اس کی مدد کے لئے؟ کیا سعدی سمجھ پائے گا؟ یادہ بے نام دشان یہیں مر جائے گا؟ مورچاں کے لاونچ میں حصہ اسٹول پہ کھڑی دیوار پہ پینٹ کر رہی تھی جب آہٹ پہ چوٹی۔ تیاری زمر کمرے سے نکل رہی تھی۔ دنے حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ اس وقت کس کی شادی میں جا رہی ہیں؟“

”اپنی شادی کی ایشورسری میں جا رہی ہوں۔“

”کل میں میسی ہے؟ ایک سال ہو گیا؟“

”کل نہیں۔ ابھی بارہ بجے سے بیس میسی ہے۔ اور فارس صاحب کو اتنے دن سے ڈنڑو کرنے کے بعد بلا خراج وقت مل ہی گیا جسے ڈنر پہ بلانے کا۔“

حمد کی آنکھیں چمکیں۔ ”کہاں بلا یا ہے؟“

”ہم دونوں کے لئے ایک یادگار جگہ ہے وہ۔ زیادہ سوال مت پوچھو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”ویسے ان کو چاہیے تھا آپ کی مرضی کی جگہ پہ لے کر جاتے آپ کو۔ ٹیبل ریزو کر کے بتا رہے ہیں اب۔“

”وہ تو گواہ کو ملوانے کا بہانہ کر کے ملا رہا ہے، مگر کیلئے آنے کا کہنا، اور وہ بھی میں میسی کی رات..... ظاہر ہے وہ مجھے سر پر اندزدینا چاہتا ہے۔ اور کے اللہ حافظ۔“ وہ مسکرا کر اس کو الوداع کہتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ یونہی حینیں کے دل نے تمہنا کی کردہ آج پھر چاہیاں بھول جائے اور، واپس آئے۔ گروہ غلبت میں تھی۔ خیرخواہ سرجھنک کر کام کرنے لگی۔

حمد مسکرا کے واپس پینٹ کرنے لگی۔

اندھیر آفس میں وہ تینوں زمین پہ بیٹھے فائل پہ فائل چیک کیے جا رہے تھے جب فارس نے جیب سے موبائل نکالا۔ نو گلشن۔ شاید بیہاں جیسے لگتے۔ وہ موبائل واپس ڈال کے کام کرنے لگا۔

چند لمحے نزدے تھے جب شہری کا موبائل بجا۔ سرجھکاے کام کرتے فارس کے ہاتھ بالکل ختم گئے۔

”ہاں ٹھیک ہے، تم اس کو دوادے دو اور.....“ سونی کو جمار تھا اور وہ فون پہ ملازمہ کو ہدایت دے رہی تھی۔ فون کا ان اور کندھے کے درمیان لگائے وہ ساتھ ہی فائل کے صفحے بھی الٹ رہی تھی۔ فارس دم سادھے بیخمار ہا۔ شہری نے فون بند کیا تو فارس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کے پھر دیکھا۔ نو گلشن۔

اب کی باراں نے نظریں اٹھائیں تو وہ مختلف نظریں تھیں۔ غور سے چھتے ہوئے انداز میں شہری کو دیکھا۔ ”تم بہت ست روی ت کام کر رہی ہو۔ جلدی ہاتھ چلاو۔“ بظاہر مصروف سے انداز میں بولا تھا۔ شہری ”کرتو رہی ہوں، ڈست بہت ہے،“ کہہ کر زراکت سے کھانی اور پھر گلی فائل اٹھائی۔

وہ فائل اٹھائے کھڑا ہوا اور دروازے کے ساتھ نصب الماری کے سامنے جا رکا۔ فائل اندر رکھیں اور یونہی الماری میں سر گھسای۔

چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ آنکھیوں سے وہ دونوں کو دیکھ بھی رہا تھا۔ شہری کی اس طرف پشت تھی، البتہ آفیسر کبھی ادھر جاتا، کبھی ادھر۔ ساتھ ہی بار بار کلامی کی گھڑی پہنچی تاریخ مارتا۔ شہری کے ہاتھ بھی ست روی سے چل رہے تھے۔ دونوں کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر کس کا؟ وہ چند ثانیے الماری میں سردیے کھڑا رہا۔ جیسے ہی اس نے دیکھا کہ آفیسر کی اس طرف پشت، ہوئی ہے، وہ سرعت سے پیچھے ہٹا اور کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ بنا چاپ پیدا کیے وہ راہداری عنبر کر کے زینوں کی طرف لپکا۔ جوتے اتار کے ہاتھ میں پکڑ لئے اور تیز تیز سیڑھیاں اُترنے لگا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ماتھے پہ پیٹھے تھا۔

اندھیرہ کمرے میں شہری اسی طرح بیٹھی تاریخ کی روشنی فانکر پڑاں رہی تھی۔ غفتاؤہ سیدھی ہوئی اور گردن ٹکادوٹ کے انداز میں دائیں بائیں موڑی تو چوکی۔ تیسرا تاریخ کی روشنی دھکائی نہ دی تھی۔ اس نے جلدی سے تاریخ الماری پڑا۔ دیاں لوئی نہ تھا۔ وہ حواس باختہ سی انھی اور باہر دوڑی۔ راہداری، دوسرے آفسر کے مقابل دروازے، زینے، سب سنمان پڑے تھے۔ اس نے بے اختیار ماتھا چھوا۔

”اوہ نو۔“ پھر پیچھے گئی اور چلا۔ ”وہ بھاگ گیا ہے، جاؤ اسے ڈھونڈو۔“ آفیسر ہر بڑا کے اٹھا اور باہر کو لپکا۔ وہ اب پریشانی سے فون کان سے لگائے ہوئے تھی۔

”ہاشم..... پولیس مت بھیجو۔ وہ جاچکا ہے۔ میرا کیا قصور؟ مجھے واقعی نہیں علم ہوسکا۔“ وہ چھنگلا کے کہہ رہی تھی۔

◆◆◆

شمیں باغی ہیں خاک کر دینگی..... آندھیوں سے کہو سدھر جائیں احر شفیع کے فلیٹ کی بلڈنگ اسی طرح سراٹھائے کھڑی تھی۔ اس کے اوپر..... آسمان پہ چمکتا ہوا تھا جیسا چاند نظر آ رہا تھا۔ زیر زمین پارکنگ میں کار کھڑی کر کے سعدی باہر نکلا۔ سرپ کیپ تھی، آنکھوں پہ گلاسز تھے، اور دونوں ہاتھوں میں گروسری کے شاپ پکڑ رکھے تھے۔ مصروف سے انداز میں، جیسے کوئی تھکا ہارا مکین گھر کو لوٹا ہے، وہ سیدھا لافٹ تک آیا اور گارڈز کو نظر انداز کر کے اندر سوار ہو گیا اور مظلوبہ میں دبایے۔

لفٹ منزل بہ منزل فضا میں اوپر سفر کرنے لگی۔ احر کا فلور آیا تو وہ باہر نکلا۔ سامنے مخالف سمت میں کئی دروازے بند پڑے تھے۔ سعدی جلدی سے نیچے زمین پہ بیٹھا، اور دونوں لفافوں سے پیکٹ نکالے، پھر ان کوہول کے زمین پہ اٹھنے لگا۔ ان میں سرمی سفید ساسنوف تھا جس کی عجیب سی بد بوچی سسوف کا ڈھیر لگا کے اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی آتونہیں رہا؟ مگر راہداری سنمان پڑی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے دوسرے لفافے سے ایک یوتن نکالی، ڈھکن کھولا، دوسرہ باتھنا ک پہ جایا اور مائع سسوف پاٹ کر ایک دم پیچھے ہٹا۔ سرسری کی آواز آئی اور نہ کوئی آگ لگی، نہ شعلے بلند ہوئے مگر سسوف جلنے لگا، اور سیاہ دھواں فضماں میں بلند ہونے لگا۔ شاپر زغیرہ کوڈ سٹ ہن میں پھینکتا، وہ تیزی سے دیوار پر لگے فائر الارم تک آیا اور اسے کھینچ دیا۔ پھر بھاگ بھاگ کے چاروں دروازوں کو کھٹکھٹانے لگا۔ مگر فائر الارم کی آواز اتنی بلند تھی کہ دستک کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پوری بلڈنگ ایک دم جاگ انھی تھی۔ ساری راہداری دھوئیں سے بھر گئی تھی، گویا نچلے فلور پاٹ لگی ہوا اور دھواں انھ کے یہاں تک آ رہا ہوا اور سعدی یوسف ناک پہ ہاتھ رکھے ایک ایک دروازہ بھار رہا تھا۔

”باہر نکلو۔ آگ لگی ہے۔ جلدی نکلو۔“ احر کا دروازہ بھاگ کے دھر کتے دل سے چلا یا تھا۔

◆◆◆

یہ جو نہ ہوا اور بظاہر ہے اذیت ہے مری ..... جو تلامیم مرے اندر ہے سکوں ہے میرا وہ خوبصورت ہوئی آج بھی روشنیوں سے منور اور عالیشان دکھتا ہا جیسا کہ ماہ کامل کی اس حسین رات میں اسے لگا تھا۔ رات کے

گیارہ بجھے کے باوجود لابی میں خاصی گہما گہمی تھی۔ زمر لبوں پر مسکراہٹ سجائے سیاہ جھملاتے لباس میں تیاری ادھر ادھر چڑھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ نظریں فارس کو تلاش کر رہی تھیں۔ سارا دن اس کو دیکھا نہیں تھا، وہ واقعی اسے مس کرنے لگی تھی۔

”فارس غازی کے نام سے نیبل ریزوڈ ہے؟“ اس نے استقبال یہ پکھرے باور دی افسر سے پوچھا۔ ”جی، ادھر آ جائیے۔“ وہ اسے مودب سے انداز میں آگے لے گیا۔ وہ مسکراہٹ دبائے آگے چلتی گئی۔

ہاشم کاردار کے آفس میں صرف ایک تی روشن تھی۔ یا پھر کونے میں رکھے اکیویریم کی بستیاں جل رہی تھیں۔ عجیب نہیں اندھیرے پر اسرار سماحول بنا ہوا تھا۔ وہ شرٹ کے کف موڑے کھڑا رئیس کے کندھے کے اوپر سے بھک کر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں چمک تھی۔

”وہ ہوٹل میں آگئی ہے سر!“

”گذ۔ تمہیں کیسے پتہ چلا وہ اس ہوٹل کا سن کر مان جائے گی؟“

”کیونکہ وہ چند دن پہلے غازی سے فون پر کہہ رہی تھی کہ اسے اس ہوٹل میں ڈنر کرنا ہے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی یہاں آچکے ہیں۔“

”ویری گذ۔ اب اس کو کال ملا۔ اور ہاں، فارس کے گلزاری کوں دو۔ اب تک وہ گھر پہنچ گیا ہو گا، اس کو پریشان ہونے دو۔“ کھیل شروع ہو چکا تھا، وہ دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔ مزا تو اب آنے لگا تھا۔

”راجہ بس!“ رئیس نے سر کو ختم دیتے چند کلکس کئے اور پھر اپنیکر پکھنی جانے کی آواز سنائی دینے لگی۔.....

آبدار عبیدا پنے کمرے میں بیٹھی لیپ ناپ پکام کر رہی تھی؛ جب دروازہ زور سے بجا۔ اس کے ابر و بھنپے۔ گردون موڑ کے دیکھا۔

”اندر آ جاؤ۔“ تحکم گرنا گواری سے پکارا۔ دروازہ ٹھلا اور سامنے ملازمہ نظر آئی۔

”ہاشم کاردار صاحب نے آپ کے لئے کار بھیجی ہے۔ آپ کو آفس بلوایا ہے۔“ وہ بے اختیار انہ کھڑی ہوئی۔ ذرا حیران، ذرا پریشان۔

”بابا کہاں ہیں؟“

”وہ گھر نہیں آئے۔“

”میری کار نکلوادا، ذرا سیور اور دو گارڈز کو بولو تیار ہیں، میں آرہی ہوں۔“ ملازمہ کے جاتے ہی اس نے تیزی سے موبائل انھیا۔ اور پہاں کا پیغام جگہ گارہ بھا۔

”It's about Faris Ghazi۔“ چار الفاظ میں ساری بات ہی ختم کر دی تھی اس نے۔ وہ چند لمحے متذبذب سی کھڑی رہی۔ پھر بھٹ کے خود کو آئینے میں دیکھا۔ سفید لمبی قمیض کے ساتھ سفید تراوزر پہنے وہ سرخ بالوں کو پکھر میں اونچا باندھے ہوئے عام سے علیٰ میں نظر آتی تھی۔ دل اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ لباس بدلنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے سرخ روپال انھیا، ما تھے کے اوپر باندھا، بالوں کو پھر سے کچھ میں کسا اور باہر کو لپکی۔

ہوٹل کا ریسٹوران ایسا زردوشیوں سے جگہ گارہ بھا۔ میں منظر میں بھتی مدھم سروں کی موسيقی، جا بجا بے خوشہ دار پھول، اور اس کی میز کے وسط میں رکھی موم تی، سب مل کر خوبصورت پرنسوں ماحول بنائے ہوئے تھے۔ وہ کہیاں میز پر رکھے، ہتھیلیوں پر تھوڑی گرانے منتظری ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ انتظار کی خوشی اب بے جیتنی اور فکر میں بدلتی جا رہی تھی۔....

احمر کے اپارٹمنٹ کا دروازہ دھڑکنے کھٹکھٹایا جاتا رہا تھا۔ دروازے کی درز سے دھواں اندر بھی داخل ہو رہا تھا۔ باہر لوگوں کی جنی،

پکارا لگ تھی۔ کمرے میں یخ بند ہے احر نے چونک کروہ فائز الارم سنا تھا، پھر اس نے تینوں کی طرف سر گھما جو ایک دم پر بیشان ہو گئے تھے۔

”بلڈنگ میں آگ لگ گئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے یہ فالس الارم ہو۔“ سرغندہ مشکوک تھا۔

”کیا کر رہے ہو؟ انکلو یہاں سے۔ ہم سب ورنہ جل کر مر جائیں گے۔“ احر شفیع چلا یا تھا۔ سرغندہ بھی تک متذبذب دکھائی دیتا تھا، مگر دوسرا دنوں انگو کا رجلدی جلدی ساری نقدي، چیک بکس، کارڈ زو غیرہ زیورات والے بیگ میں بھرنے لگے۔ باہر کا شور و غل پہلے سے مزید بڑھ گیا تھا۔ سرغندہ چند لمحے کھڑا دیکھتا رہا، پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ لا دخ عبور کیا، اور یہ ورنی دروازہ کھولا۔ پھر ایک دم پیچھے کو ہٹا۔ باہر دھواں ہی دھواں تھا۔ سیاہ گھنادھواں۔ وہ کھانتے ہوئے ذرا سا آگے بڑھا۔

”کیا ہوا ہے۔ کہہ آگ لگی ہے؟“ اس نے ادھر ادھر بھاگتے لوگوں سے پوچھا۔ یخ و پکار اور افراتفری میں ایک جملہ کان میں پڑا تھا۔ ”آگ نہیں ہے، کسی نے کوڑا جایا ہے شاید دھواں ہے اس کا۔“ دلوگ بالی بھر بھر کے اس سڑتے سفوف پہاڑیں رہے تھے، جس سے دھوئیں کارنگ مزید گھرا ہوتا جا رہا تھا۔

”اوہ۔“ سرغندہ فور اندر کو لپکا اور دروازہ بند کیا۔ اپارٹمنٹ کے اندر بھی کافی دھواں بھر چکا تھا۔ وہ کھانتا ہوا آگے آیا۔ اور احر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ احر بندھا پڑا تھا اور وہ دنوں جلدی جلدی چیزیں سینٹے میں لگے تھے۔

”کوئی آگ و آگ نہیں لگی۔ ذرا ساد دھواں ہے بس۔ واپس رکھو سب کچھ۔ ہم نہیں نہیں جا رہے۔“ وہ ڈپٹ کے بولائو احر کی رنگت پیچکی پڑنے لگی۔ اس نے بے چینی سے گھڑی کو دیکھا۔ وقت گزر تا جا رہا تھا۔

سرغندہ کری ٹھیکنگ کے پھر سے اس کے سامنے آبیٹھا۔

”چلو پھر سے تقتیش شروع کرتے ہیں۔ بان تو مزید کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس؟“

..... ♦♦♦♦♦

آدمی کو خدا نہ دکھائے ..... آدمی کا کبھی خدا ہونا روشنیوں سے مزین ہال کی چند میزیں ہی بھری تھیں باقی سب خالی تھیں۔ لوگ اٹھ انٹھ کے اب جانے لگے تھے۔ زر اداسی سے بیٹھی گھنگریاں لٹکنگلی پہلی پیٹ رہی تھی، جب اس کافون تھرھرایا۔ اس نے گھری سانس لے کر اسے کان سے لگایا۔

”کہاں ہو تم فارس؟“

”تم کہاں ہو؟ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔“

”انتظار تو میں کر رہی ہوں۔ ریسٹورانٹ ایریا میں بیٹھی ہوں۔ تم بتاؤ، تم کہاں ہوئیں وہیں آرہی ہوں۔“

”اوہ میں سمجھا ابھی تم پیچنی بھی نہیں ہو گی میں اوپر ہوں۔ ففتھ فلور پ۔ روم نمبر 507 میں۔ تم ادھر ہی آ جاؤ۔ ہمارا گواہ یہاں ہی

ہے۔“

”گواہ۔“ وہ پرس اٹھاتے ہوئے ٹھکنی، پھر ایک نظر میز پہ بجے پھولوں کو دیکھا۔ ”گواہ سے ملوانا تھا؟ واقعی؟ تو یہ نیتل کیوں ریز رو کروائی تھی؟“

”آ جاؤ پھر بتاتا ہوں۔ جلدی۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

زمر چہرے پخا سے تار سجائے، فون کان سے لگائے اٹھی اور آگے بڑھنے لگی۔ ”ویسے کون ہے یہ گواہ؟“

”تم خود کیک لوگی۔“

”اچھا مگر یہ ہوٹل میں کیوں ہے؟“ وہ لفت کے سامنے جا رکی۔ تین لفٹ کے بندروازے نظر آ رہے تھے۔ سب اوپر تھیں۔ اس نے باری باری تینوں کو نیچے آنے کا بیٹن پر لیں کیا۔ جو جلدی آ جائے غنیمت ہو گی۔

”کچھ فاکٹری تھیں اس کے پاس، اس سے لینے کے لئے یہاں آنا پڑا۔ آرام سے دے نہیں رہا تھا تو.... کپرو ما نز پوزیشن میں انا پڑا۔“ لفت آ کے نہیں دے رہی تھی۔ تبھی اس نے دیکھا، کونے والی لفت آچکی تھی اور دروازے کھل گئے تھے۔ اندر سے وہ خالی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھ گئی۔

”اوہ گاؤ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟ اچھا مجھے مت بتاؤ۔“ لفت میں داخل ہوتے ہی اس نے '5' کا ہندسہ دبایا اور فون کا ن سے لگائے بولی۔ ”مجھے اپنے جرم پر گواہ مت بنانا۔“

”تم میرے خلاف گواہی نہیں سے سکتیں۔“

”اچھا، وہ کیوں؟“ وہ مسکراہٹ دبائے پوچھ رہی تھی۔ لفت کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے، وہ سکھیوں سے لفت کی دو مخالف دیواروں کو دیکھ کر تھی جو آئینے سے ڈھکی تھیں۔ دیکھ بیٹن میں، گویا دو بڑے بڑے آئینے لگے ہوں۔ پیچھے کی دیوار لو بے کی تھی۔

”بھئی تم میری بیوی ہو اور Spousal privilege کے تحت تم میرے خلاف گواہی نہیں دے سکتی۔ اب آ جاؤ، میں انتظار کر رہا ہوں۔“

زمر ایک دم بالکل خہر گئی۔ لفت نضا میں اوپر کو اٹھ رہی تھی۔

”Spousal privilege?“ اس نے دھرا یا۔ (یہ قانون شہادت میں ایک آرٹیکل ہے جس کے تحت میاں بیوی کو دوران شادی کی لئے گفتگو کے بارے میں ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، مساوائے اس کے کہ کیس وہ دونوں آپس میں لا رہے ہوں، جیسے طلاق، بچوں کی کمڈی یا کوئی اور کیس۔)

”ہاں ہر بینڈ و اکٹ پر یوچ۔“

”اور آرٹیکل نمبر کیا ہے اس کا؟“ زمر کی سوچتی نظریں لفت کی نیخی اسکرین پر گلی تھیں جس پر ہند سے بدلتے تھے۔ دوسرا فلور۔ تیسرا....

”کیا؟“ وہ جواب اپلا تھا۔

(ریس نے ناٹپ کرتے ہوئے گڑ بڑا کے ہاشم کو دیکھا۔ ”اس کو شک ہو گیا ہے شاید۔“)

”تم عموماً آرٹیکلز کو ان کے نمبر کے ساتھ کوٹ کرتے ہو، مجھے متاثر کرنے کے لئے، آج نہیں کیا تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اس کا آرٹیکل یاد ہے یا بھول گیا؟ آخر ٹیکر رہی ہوں میں تمہاری۔“ وہ متاطس اپر چھر رہی تھی۔

(ہاشم تیزی سے کی بورڈ پر جھکا اور ناٹپ کرنے لگا۔)

”میں اس وقت کافی فکر مند ہوں، اور تمہارا منتظر بھی اس لئے کہ نہیں سکا۔ قانون شہادت آرٹیکل نمبر 5۔ خوش؟“ ننگی سے بوالہ تھا۔ لفت کا نمبر '4' سے بدلت کر '5' ہو گیا تھا۔ دروازے کھلے گر زمزما ہر نہیں نکل۔ ایک گہری سانس لے کر وہ بولی تھی۔

”او جس فارس غازی کو میں جانتی ہوں، وہ انتہائی بے کار اسٹوڈنٹ تھا (اس نے دروازے بند ہونے کے بیٹن پر انگلی رکھی اور گراوڈ فلور پر لیں کیا۔) اور اس کو اس قانون کا آرٹیکل نمبر یاد ہوتا تو دور کی بات، اس کو یہ تک معلوم نہیں ہوا کہ قانون شہادت میں ایسا کوئی آرٹیکل ہے بھی یا نہیں۔ مگر وہ واحد شخص جوانگلیوں پر آرٹیکلز یاد رکھتا ہے، وہ ہاشم کا دردار ہے، اس لئے بہت شکریہ میری ایسورسی بر باد کرنے لئے ہاشم، مگر میں اب مزید تمہاری اسکیم کا حصہ نہیں بنوں گی۔ ناتم نے؟“ وہ صدمے اور دکھ سے چلائی تھی۔ دوسرا جانب چند لمحوں کی خاموٹی

چھائی۔ لفت نیچے اتر رہی تھی۔ 1.....2.....3.....

”اب بہت دیر ہو چکی ہے، ذی اے۔“ فارس کی آواز میں کہا گیا۔ اور لائن مردہ ہو گئی۔ زمر کی رنگت سرخ دکھنے لگی تھی۔ اس نے فون پر میں ڈالا اور لفت کے دروازے کو دیکھنے لگی۔ دل و دماغ میں طوفان برپا تھے۔

1 سے 6 ہوا اور پھر.... لفت ہنوز نیچے اتر رہی تھی۔ وہ چوکی۔ جلدی سے ٹھوں پہ ہاتھ مارا۔ دروازہ کھولنے کا بٹن دبایا۔ ایگزٹ۔

بار بار مگر بٹن مردہ تھے۔ لفت نیچے کا سفر کرتی جا رہی تھی۔ B1 اور پھر... B2... اور ایک دم وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ لفت کی مت جلنے بھجنے لگی۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ زمر نے پریشانی سے بار بار ایگزٹ دبایا، مگر لفت مردہ ہو چکی تھی۔ زمین سے دو منزل نیچے وہ ہینا پار کنگ ایریا۔ وہ بھی تہہ خانے کی اندر ہیر پار کنگ میں رکی پڑی تھی۔ وہ تیزی سے لفت کے فون کی طرف لپکی، رسیور کان سے لگایا اور کال کا بٹن دبایا۔

رابط ملے کی ٹون پر وہ جلدی سے بوی۔ ”پلیز ہیلپ می میں بیٹوں میں لفت میں ہوں، لفت جام ہو گئی ہے اور.....

”اور میں نے کہانا، اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب آپ کی کسی عقلمندی کا فائدہ نہیں، مسز زمر!“ وہ ہاشم تھا اور وہ بہت سکون سے کہہ رہا تھا۔ زمر نائلے میں رہ گئی۔

”کتنے اعتماد اور دھائی سے اتنے ماہ آپ کو رٹ میں میرے خلاف بولتی رہیں، آپ کو کیا لگا تھا؟ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا؟ میں تو

سب کچھ ٹھیک کرنے جا رہا تھا، میں تو گلٹی تھا، مگر آپ کو انصاف چاہیے تھا۔ یونو اس زمر اب میں گلٹی نہیں ہوں۔ اب مجھے افسوس نہیں ہو رہا۔

اب میں جان گیا ہوں کہ میں نے تم لوگوں کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا جو تم ڈیز رونہیں کرتے۔ تم سب کا یہی انجام ہونا چاہیے۔“

”فارس تمہیں جان سے مار دے گا، ہاشم۔ مجھے باہر نکالو۔“ وہ بھئی ہوئی آواز میں چلائی تھی۔

”فارس کی جان ہی تو لے رہا ہوں۔ یہ اوپر کونے میں کیسرہ دیکھ رہی ہو؟ سی سی ٹی وی کیسرہ؟“ زمر نے سفید پرستے چہرے کے ساتھ سر اور اخھایا۔ اس میں تمہاری فوچج نہیں جائے گی۔ تمہیں مرنے میں ابھی ایک یا سوا ایک گھنٹہ لگے گا۔ تمہارے مرنے کے بعد میں یہ

فارس کو دوں گا، وہ اسے روز دیکھے گا، اور وہ اس کو دیکھ دیکھ کے پاگل ہو جائے گا، مگر اب مجھے افسوس نہیں ہو گا۔ وہ اسی قابل ہے۔“

”اللہ پوچھئے گا تم سے ہاشم۔“ اس نے رسیور والپس پٹھا اور اپنا موبائل نکالا۔ موبائل پر نو گل نظر آرہا تھا۔ وہ اس کی سم کوڈس اسٹبل

کر چکے تھے۔ اس نے ایس واپس بھیجنے کی کوشش کی ایک جنسی کال کرنے کی کوشش کی۔ سب بے سود۔ موبائل ناکارہ ہو چکا تھا۔

وہ اسے پرس سیست نیچے فرش پر رکھے دروازے تک آئی اور اسے پہنچنے لگی۔ ”کوئی ہے؟ ہیلپ می۔ کوئی ہے؟ مجھے باہر نکالو۔“

دونوں ہاتھوں سے وہ بار بار دروازہ بجا رہی تھی، بلند آواز میں چلا رہی تھی، مگر کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ اندھیر سنسان

پار کنگ ایریا میں۔ سطح زمین سے کئی فٹ اندر۔ آئیوں سے ڈھکنے ایک ڈبے میں وہ مقید تھی، اور اس سے دو منزلیں اوپر زمین پر شلختے لوگوں کو

معلوم بھی نہ تھا کہ وہ یہاں ہے.....

”کوئی ہے؟ پلیز مجھے کوئی باہر نکالے۔“ گھٹن سے اس کو پہنچنے آرہے تھے۔ اس کا سانس بوجھل ہو رہا تھا، مگر وہ پوری قوت سے چلا

رہی تھی۔ آنکھ سے آسنوت ٹوٹ کے گرنے لگے تھے۔ فارس آ جاؤ۔ پلیز آ جاؤ۔ فارس پلیز..... آواز ڈوب رہی تھی، دل ڈوب رہا تھا.....

❖❖❖

وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا اور حسین جو اسے بتا رہی تھی، وہ اس کے قدموں سے زمین کھینچ لینے کے لئے کافی تھا۔ لمحے بھر میں ذہن میں

سارے

پذل کے مکڑے آپس میں مل گئے تھے۔ شہری.... پولیس.... اس کا نو گل نظر دیتا فون..... وہ بے اختیار باہر کو بھاگا۔ فون آن کر کے دیکھا تو اب گل نظر آرہے تھے۔ اس نے تیزی سے زمر کا نمبر ڈائل کیا مگر آگے سے رابط ممکن نہیں کی شیپ چلنے لگی تھی۔ وہ چابی لئے باہر کو دوڑا۔

اسٹول پر کھڑی خین کے ہاتھوں سے پینٹ برش سب گر گیا تھا۔ وہ چند لمحے تو حق دق، شل سی کھڑی رہی، پھر ایک دم جست لگا کر یچھے اتری اور ننگے پیر باہر کو بھاگی۔

”ماموں رکیں۔ میری بات سنیں۔“

وہ کار کا دروازہ کھول رہا تھا جب وہ تیزی سے آئی اور اس کا بازو تھام لیا۔ ”ہٹو سامنے سے خین۔“ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، پورا جسم پسینے میں نہارہا تھا اور یوں لگتا تھا گویا جان نکل رہی ہو۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”یہ سب ہاشم نے کیا ہے، میں اسے جان سے مار دوں گا۔“ وہ غرایا تھا۔

”کیا اس کو نہیں پتہ ہو گا کہ آپ یہی کریں گے؟ اگر یہ سب اسی نے... یقیناً یہ سب اسی نے کیا ہے، تو وہ آپ کے انتظار میں ہو گا، وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“ وہ کہنے کے ساتھ رو بھی رہی تھی، ابھی تک اس کی کہنی تھام مرکھی تھی۔

”تمہارا دماغ درست ہے؟ زمرہ نیک نہیں ہے اور تم کہتی ہو میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھا رہوں؟ ہو،“ اس نے بازو چھڑایا اور کار کا دروازہ کھولا۔

”نہیں۔ نہیں۔“ حد نے پوری قوت سے دروازہ واپس دھکیلا، فارس کی انگلیاں درمیان میں آگئیں، مگر اس نے دروازے کو دھکیلے رکھا۔

”اس طرح زمرہ تو نہیں ملیں گی۔ اس نے زمر کو کسی جگہ پر بلا یا تھا۔ جو آپ دونوں کے لئے یاد گار ہے۔ اپنے گھر نہیں۔ ہاشم سے بعد میں نپٹتے یجھے گا، پہلے زمر کو ڈھونڈ دیں ماموں۔ زمر زیادہ اہم ہیں۔ ہر انقام ہر بدالے سے زیادہ اہم۔“

فارس نے آنکھیں بند کیں اور چند گھنے سانس اندر کھینچے۔ اس کے ہاتھ ہیلے پر گئے تو حد نے بھی دروازہ چھوڑ دیا۔

”کسی جگہ کا نام لیا تھا اس نے؟“ وہ اب ذرا سنبھل کے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں، مگر ہم ان کے فون کی آخری جی پی ایس لوکیشن چیک کر سکتے ہیں۔“ وہ تیزی سے اندر کو بھاگی۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ شاک میں ملال میں۔ اس کو کیوں لگتا تھا کہ اب وہ لوگ مشہور ہو چکے ہیں، تو ہاشم ان کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟ وہ غلط تھا۔ اور وہ غلط عورت کی حفاظت کرتا رہا تھا۔

سر جھنک کے اس نے چند مزید گھرے سانس لئے اور اندر آیا۔ حد اور پرانے کمرے میں کپیوٹر کے سامنے ابھی بیٹھی تھی۔ وہ اس کے کندھے کے پیچھے سے آ کر جھکا اور اسکرین دیکھی۔

”کچھ پتہ چلا؟“

”انہوں نے زمر کے فون کی لوکیشن کلوں کی ہوئی ہے۔ تقریباً پچاس، پچپن، مختلف جگہوں پر زمر کے فون کے سگنل اس وقت آرہے ہیں۔“ اس نے خوفزدہ سی ہو کر فارس کو دیکھا۔ ”اب کیا کریں؟“

وہ اب پہلے سے ٹھنڈا اور سنبھلا ہوا لگ رہا تھا۔ چند لمحے سوچتی آنکھوں سے اسکرین کو دیکھتا رہا، پھر سیدھا ہوا۔

”میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔“

”مگر کہاں؟“ وہ فکر مندی سے بولی تھی۔

”ہاشم کے گھر!“ اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اب کی باروہ غصے میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ صرف کچھ سوچ رہا تھا۔



اپارٹمنٹ بلڈنگ کی راہداریوں میں چھایا دھوں اب ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شور و غل کی آوازیں بھی ماند پڑ گئی تھیں۔ احر کے فیٹ کے اندر سیاہ مرغ نے بھی بیٹھتے جا رہے تھے۔ ایک آدمی اس کے سر پر کھڑا تفتیش کر رہا تھا، مگر میں سوالات جو صرف اس کو تھکانے کے لئے دو دن سے پوچھے جا رہے تھے، جبکہ باقی دنوں لا و نہیں بیٹھتے تھے۔

یہ تباہ جب ایک نے آواز سنی۔ کھانے کی مردانہ آواز۔

وہ ایک دم چونک کے بیٹھا۔ پستول نکال لیا۔ آواز را بلند ہوئی۔ ایک فوراً دروازے کی طرف آیا اور کان لگا کر سننا چاہا۔ مگر آواز باہر نہیں آ رہی تھی، وہ اپارٹمنٹ کے اندر سے آ رہی تھی۔ لا و نہیں میں کھلتے گیست با تھروم کے دروازے کے پار۔ دوسرے نے آواز کا منبع پہلے ہی تلاش کر لیا تھا۔ وہ دنوں ہاتھوں میں پستول پکڑ کر سیدھا تانے دے بے قدموں با تھروم کی طرف جا رہا تھا۔ با تھروم کے اندر کوئی کھانس رہا تھا۔ اور کھانے جا رہا تھا۔ انغو کا رہا تھا۔ دروازے کے سامنے، پستول تانے رکا اور پیروں سے دروازہ دھکیلیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔

اندر سک پہ جھکا نوجوان بری طرح کھانس رہا تھا۔ بار بارٹ سے منہ پہ پانی ڈالتا، پھر کھانے لگ جاتا تھا۔ انغو کا روک چند لمحے بجھ ہی نہیں آئی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ گھر میں کیسے گھسا؟ اور اسے دیکھتے ہی گولی مار دینی چاہیے یا نہیں؟ مگر وہ تقاضت سے کھانس رہا تھا۔ اسے گولی نہیں ماری جاسکتی تھی۔ وہ تیزی سے آیا اور اسے شرت کی پشت سے دبوچ کر باہر کی طرف کھینچا۔

”اے... کیا کر رہے ہو... کیا کیا کر رہے ہو...“ وہ نوجوان چلا یا تھا، مگر وہ پستول اس کی گردان سے لگائے، ڈپٹ کر خاموش رہنے کا کہتا اسے اپنے ساتھ گھیٹ کر آگے لے جانے لگا۔ دوسرا ساتھی سامنے سے آگیا، اس کے ساتھ میں بھی پستول تھا۔ سعدی نے دنوں ہاتھ انہا دیے۔ ”گولی مت چلانا۔ پلیز گولی مت چلانا۔ میں بیمار ہوں۔“

چند لمحوں بعد اسی انغو کا رہنے سعدی یوسف کو حشر شفیع کے ساتھ فرش پہ پچینا تھا۔ ان کے سر غنڈے بے یقینی سے نوار کو دیکھا اور پھر اپنے دنوں ساتھیوں کو۔ ”یہ کون ہے؟“ اور احر نے اس سے زیادہ بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

”یہ دھوکیں کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ وہی ہے جس کو اس نے دو ہزار روپے دیے تھے۔“ سر غنڈے کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔ اس نے گریبان سے پکڑ کر سعدی کو کھڑا کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر غرایا۔ ”کون ہوتا؟“

سعدی نے باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے۔ ”میں احر کا دوست ہوں۔ اس نے جنوٹ دیے تھے، ان میں خون لگا تھا، میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔“ مگر اس سے پہلے میں نے ڈھانی گھنٹے پارکنگ اریا میں بیٹھ کر تم لوگوں پر نظر رکھی تھی، اور تمہارا یہ ساتھی.....“ اس نے انگلی سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ ”کھانا لینے جب باہر نکلا تھا تو میں نے اس کی تصویر کھینچ لی تھی، اور اپنے ایک دوست کو کھینچ لیتھی، اس نے اس کا شناختی کا رد نکال دیا تھا مجھے، اور وہاں پہ موجودہ پتے کے خانے میں تمہاری مالکن صاحبزادی صاحب کے ایف میں وا لے گھر کا پتہ لکھا تھا، اور چونکہ میں بہت مشہور ہوں، تو مجھے پولیس کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں ایک نیوز اینکر کو کہہ آیا ہوں کہ اگر میں ایک گھنٹے تک اس سے رابطہ نہ کروں تو وہ چیل پہ چلا دے کہ صاحبزادی صاحب نے مجھے ان گھنٹے کے مار دیا ہے۔ مرنے سے پہلے قاتل کا نام بتا دینا قانونی طور پر بہت اہمیت رکھتا ہے، ہم دنوں کو اپنی مالکن کے پاس لے چلو اور مجھے ان سے بات کرنے دو۔ ٹھیک؟“ سنجیدگی سے کہتے چھکلے سے گریبان چھڑا یا۔ وہ تینوں ڈرائیور اور گارڈ لیوں کے غنڈے ایک دوسرے کو تکنے لگ کئے تھے۔ پھر ایک آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ پیچھے موڑے۔ سعدی نے مراجحت نہیں کی۔ چپ چاپ خود کو بندھو اتارہا۔ پھر وہ تینوں تیزی سے باہر نکل گئے۔

احر بھی تک بے یقینی سے اسے گھور رہا تھا۔ اور تم پولیس کو کسی کو نہیں لے کر آئے؟ کوئی اسلحہ، کوئی چیز ساتھ نہیں لائے؟“

”ریلیکس۔ میں اپنی زبان ساتھ لایا ہوں۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

”لغت ہے تم پر سعدی۔ وہ نہیں مار دیں گے۔“ وہ بادبا سا چلا یا تھا۔

”بے فکر ہو مجھے انو ہونے کی عادت ہے۔ میرا تجوہ اس فیلڈ میں تم سے زیادہ ہے۔ اس لئے چپ کر کے انتظار کرو۔“ کہنے کے ساتھ اس نے گھڑی کو دیکھا۔ وہ اب بھی نکل کر رہی تھی۔ لمحہ حریت کی مانند پھسل رہا تھا۔

❖❖❖

زمر لفٹ میں ادھرا دھر ٹھل کر دروازے پہاڑ کام مر کے اب تھک چکی تھی۔ وہ دروازے کے بالکل ساتھ خندے فرش پر آڑوں بیٹھ گئی تھی، اور بازوں گھٹنوں کے گرد لپیٹ لئے تھے۔ دروازہ رفتے سے مٹھی سے دروازہ بھاتی تھی۔

”کوئی ہے؟ کھولو اسے۔ مجھے باہر نکالو۔“ آواز بیٹھ گئی تھی اور آنسو پھرے پر ٹھک کر خنک ہو چکے تھے، اور اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ وہ بار بار ذہن سے اپنے دمے کے خیال کو جھکلتی تھی۔ ہاں اسے ڈمہ تھا، مگر آج وہ کوئی ایک خود پنیں ہونے دے گی۔ وہ چند گھنٹے گزار اکر لے گی، اور صبح تک کوئی اسے نکال دی لے گا۔ ہاشم اس کی موت کو حادثاتی دکھانا چاہتا ہے، تو اب بم سے تو نہیں اڑائے گانا اسے۔ بس چند گھنٹے اور.....

ٹپ.....ٹپ.... کوئی عجیب سی آواز تھی جس پر اس نے چونک کے گردن گھمائی۔ آگے پیچھے دامیں باہمیں..... ہر طرف دیکھا۔ یہ کس شے کی آواز تھی؟ پھر گردن اٹھائی تو منہ کھل گیا۔ لفت کے اوپر، کسی نہیں سے سوراخ سے پانی کی باریک سی دھار نیچے گر رہی تھی۔ زمر کی نگاہوں نے دھار کا نیچے نکل تھا۔ وہ لفت کے فرش پر پانی گزاری تھی۔

ایک گھنٹے لگے گا تھیں مر نے میں! اس کے رو نکلے کھڑے ہونے لگے۔ ایک گھنٹے میں وہ لفت پانی سے بھر جائے گی۔ وہ اسے ایک زندہ انسان کا آبزیدان بنانے جا رہا تھا۔ وہ اسے ڈبو کے مارنا چاہ رہا تھا۔ اور خدا یا۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور پھر سے دروازہ پینٹے گی۔

”مجھے باہر نکالو۔ پلیز کوئی بے... پلیز میری مدد کرو۔“ اس دفعہ آواز میں خوف اور حشت تھی۔

اندھیر آفس میں بیجا ہاشم سنجیدگی سے اسکرین پر نظر آتی فونچ کو دیکھ رہا تھا۔ پانی فرش کو گیلا کرنا شروع ہو گیا تھا اور وہ لڑکی اب بدواس ہو رہی تھی۔

”لیکن پھر..... یہ مر نے کا کتنا شاندار طریقہ ہو گا، فارس غازی! ایکویریم میں مرنा۔“ اس نے زیر لب تبرہ کیا۔ رئیس نے صرف ایک خاموش نظر اس پر ڈالی اور اپنا کام کرنے لگا۔

❖❖❖

## آبزیدان (The Aquarium) (حصہ دو تیم)

کچھ اور بڑھ گئے جو اندر ہیرے تو کیا ہوا ..... مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم سورچال پر رات طویل ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ایسے میں نہیں بے چینی دیکھیں سے باکیں لا دُنخ میں چکر کاٹ رہی تھی۔ دیوار پر آشنا کی صورت بہتے پیٹ اور فرش پڑھکے نہیں برش اور ڈبے سے بے نیاز وہ بار بار گھڑی دیکھتی تھی۔ فارس کہاں ہے زمر کہاں ہے۔ یہی دوسرا پچھلے پون گھنٹے سے ہر طرف گونج رہے تھے اور اب ایک دم بجلی کا ایک کونڈا ساڑہن میں لپکا۔ سعدی کہاں ہے؟

وہ تیزی سے اوپر بھاگی۔ اس کا کمرہ کھولا۔ خالی اندر ہیر کمرہ۔ وہ کھڑکی تک آئی اور پردے سر کائے۔ نیچے پورچ میں اس کی کار بھی نہیں تھی۔ کہاں گیا وہ؟ کب سے گھر نہیں آیا، اسے احساس کیوں نہیں ہوا؟ وہ وہیں کھڑی جلدی اسے فون ملانے لگی۔ گھنٹی جا رہی تھی، اور جاتی جا رہی تھی، مگر جواب ندارد۔ اسے اب نی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

احشر شفیع کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی پارکنگ میں موجود کار کے ذیش بورڈ پر کھاسائیٹ موبائل جل بجھ رہا تھا مگر اس کو دیکھنے کے لئے کوئی دہاں موجود نہ تھا۔

اوپر عمارت میں آؤ اور احمد کے فلیٹ میں جھانکو تو باہر پھیلی گھپ رات کے برعکس اندر اب روشنی تھی۔ لا دُنخ روشن تھا اور وہ تینوں وہاں کھڑے دلبی آواز میں بحث کر رہے تھے۔ پھر ان کا سر گندہ ہاں سے ہٹا اور اندر آیا۔ دروازہ کھولا۔ یہ کمرہ بھی روشن تھا اور بیڈ کے قریب وہ دونوں بند ہے ہاتھوں کے ساتھ زمین پر آکر ٹوں بیٹھے نظر آتے تھے۔ آہٹ پر دونوں نے سراٹھا کے اسے دیکھا۔ پھر تروتازہ چہرے اور چھوٹے گھنٹریا لے بالوں والا لڑکا بولتا۔

”پندرہ منٹ گزر چکے ہیں۔ پون گھنٹے میں یہاں پولیس آجائے گی۔ رپورٹز الگ ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی جلد آ جائیں۔ میری بات کرواؤنا پنی مالکن سے۔“

”زیادہ ہوشیار مرت بنو۔ قریب کے کسی تھانے میں تم نے رپورٹ نہیں درج کی۔ کوئی پولیس نہیں آ رہی۔ ہم نے پڑھ کروالیا ہے۔“ وہ خوت سے بولا تھا۔ احمد نے بے اختیار سعدی کا چہرہ دیکھا مگر سعدی جی ان نہیں ہوا تھا۔

”میں تمہیں پکڑ دانا نہیں چاہتا۔ بس تمہاری مالکن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ان سے بات کروادو ہماری یا ہمیں ان کے پاس لے چلو پولیس کے آنے سے پہلے۔“

”کہہ رہا ہوں نا، ہم نے پڑھ کروالیا ہے، کوئی پولیس نہیں آ رہی۔ اب تم سیدھی طرح بتاؤ، تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔“ وہ

اس کے سر پر کھڑا ہو کے غرایا۔ احر نے پھر سعدی کو دیکھا۔ اب کی بار غصے سے۔

”تمہاری مالکن سے بات کرنی ہے۔ اس کو صرف اتنا کہو کہ وہ اپنی ای میل چیک کر لے۔ آگے وہ بمحاجے گی۔“

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر بوٹ سے زور سے اس کے کندھے پر ٹھوکر ماری، تو سعدی توازن برقرار نہ رکھ سکا، اور دوسرا جانب لٹھ کا۔ سرخ نہ تن فن کرتا باہر نکل گیا اور سعدی دانت پر دانت جما کے ضبط کرتا واپس سیدھا ہو کے بیٹھا۔ احر وہیں سے غصے سے اس آدمی کو پکار کے لعن طعن کرنے لگا تھا۔ پھر اس کی طرف گھوما۔

”تم نے پولیس بائی نہ پورٹر خود کو بھی مشکل میں ڈالا۔ پاگل۔“

گرنے سے اس کی کہنی رگڑی گئی تھی، وہ دونوں ہاتھوں سے شرت اور آستین جھاڑاتے ہوئے تلخی سے سکرا کے سر جھٹک کر رہا گیا۔

”جن لوگوں نے تین دن سے تمہیں بند کر رکھا ہے، جن کو تمہیں سرے سے مارنا ہی نہیں ہے، جوڑ رائیور اور مالی کے لیوں کے گارڈ ہیں، اور صرف تمہیں کنگال کرنے، سبق سکھانے، اور مار پیٹ کرنے آئے ہیں، انہوں نے مجھے مار کے کیا کرنا ہے؟ میں ایسے ہی نہیں آگیا۔ بلڈنگ کی سی ٹی وی چیک کی تھی۔ تمہاراڑیک ریکارڈ بھی یاد ہے۔ یہ خاتون خاندانی قاتلوں کے جیسی نہیں ہیں۔ یہ تنہا ہیں۔ تمہاری حرکت کی وجہ سے ان کا خاندان ان کو abandon کر چکا ہے، اور ان کی سیاسی سیٹ ان سے چھمن گئی ہے۔ یہ اپنے آبائی گاؤں تک واپس نہیں جا سکتیں۔ نہ ان کے پاس خاندان کے مردوں کی سپورٹ ہے۔ ایسی عورت نے کسی کو قتل نہیں کروانا۔ وہ صرف اپنی فریڑیش نکالنا چاہ رہی ہیں، ایسی عورت سے ہم نپٹ سکتے ہیں۔“

”کب؟ جب تک وہ ہم دونوں کو مار چکے ہوں گے؟“

”دیکھی ہیں میں نے ٹریش کیں میں خالی سرنجز۔ پتوں کا دستہ تک نہیں مار سکتے تمہیں وہ۔ ٹرینکولاائزر گن سے بے ہوش کیا۔ یہ قاتل نہیں ہیں۔ ایک ڈپریشن کی ماری ہوئی عورت کے احکامات کی وجہ سے پھنسنے ہوئے ہیں۔ میں تمہیں صرف نکالنا نہیں چاہتا، اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے یہاں سے بہت پہلے بھاگ جانا چاہیے تھا۔“ وہ افسوس سے سرداہیں باہمیں جھٹک کر کہہ رہا تھا۔ ”میں نے اس شہر میں بہت سے لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ میرے اپنے اعمال ہیں سعدی!“

”ایسا ہی ہے۔“ سعدی نے رسی تردید بھی نہ کی۔ احر نے سر جھکا کر پیشانی تھام لی۔ ”میں اتنا فراڈ، اتنا دھوکے باز، اتنا liarComplusive بن چکا ہوں سعدی کر اب چاہوں بھی تو ٹھیک نہیں ہو سکتا۔“

”اپنے چاہنے سے کوئی ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا۔ اللہ کا چاہنا زیادہ ضروری ہے۔ اور پھر کوشش کرنا۔“

”اب کیسی کوشش؟ مزر جواہرات نے اعتبار کیا مجھ پر میں وہ بھی خاک میں ملا کر ان کا زیور لوٹ کر جا رہا تھا۔ ایسا آدمی ہوں میں۔ ایسے آدمی کے دوست ہوتم۔“ وہ تلخی سے چہرہ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ تین دن سے بند ہے ہونے کے باعث وہ شدید ہدفی دباؤ میں تھا۔

”جماعت ہوں مگر ہر شخص خططا کا رہتا ہے اور بہترین خططا کا رہا ہوتا ہے جو تو بہ اور رجوع کرتا ہے۔“

”خططا کا رہا گناہ گار میں فرق ہوتا ہے۔“ وہ پھر زہر خند ہوا۔

”ہاں۔ سب گناہ گار میں ہوتے، مگر خططا کا رہا ہوتے ہیں۔“ وہ ہلاکا سامسکرا کے سر جھکا کے فرش پہنچن سے رگڑ کر لکھری ہنانے لگا۔ ”میں ایک عمر تک یہ سمجھتا تھا کہ انسان آزمائش آنے پر دو طرح سے روکل دیتا ہے۔ یا وہ پاس ہوتا ہے یا فیل۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام ہر آزمائش پر پورا اترتے تھے یا جیسے ہم لوگ جو بار بار فیل ہو جاتے ہیں۔ ہر دفعہ تھیہ کرتے ہیں، اب یہ غلط کام نہیں کرنا، ماں باپ سے غصے سے بات نہیں کرنی، بری عادت کی طرف واپس نہیں جانا۔ مگر اللہ آزماتا ہے، اور ہم پھر وہی کر دیتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ آزمائش کے دو ہی نتیجے

ہوتے ہیں۔ پاس کرو تو درجے بلند اور فیل کرو تو درجہ وہی رہے گا یا نیچے جاؤ گے۔“ وہ سانس لینے کو رکا۔ احر خاموشی مگر مایوسی سے نے گیا۔ وہ اس طرح کی باتوں سے خود کو بیٹھنیں کر پاتا تھا۔

”میں بہت عرصے سے قرآن بھی پڑھتا آ رہا تھا، مگر کبھی سورۃ صَ کے اس واقعے پر غور نہیں کیا۔ قید میں ایک دفعہ موقع ملا تو اس واقعے کا مطلب ہی بدل گیا میرے نزدیک۔ وہ داؤ دکا واقعہ ہے، مشہور سا۔ داؤ دعیہ السلام اپنی ذاتی زندگی میں کوئی غلطی، کوئی کی بیش کر رہے تھے، یہود نے تو بہت سی بے ہودہ کہانیاں گھڑ رکھی ہیں مگر چونکہ انبیاء معمصوم ہوتے ہیں، اس لئے ہم مسلمانوں کو اس واقعے کی گھرائی میں نہیں جانا چاہیے بلکہ اصل سبق جو لینا ہے وہ لینا چاہیے۔ تو ہوا یہ کہ داؤ دعیہ السلام کو ان کی غلطی کا احساس دلانے کے لئے دفر شتہ انسان کے روپ میں اللہ نے بھیجے۔ وہ ان کے پاس دیوار پھاند کے آئے اور ایک نے کہا کہ میرے پاس ایک دبی ہے اور اس کے پاس 99۔ یہ اب میری ایک بھی ہتھیانا چاہتا ہے۔ قصہ مختصر داؤ دعیہ السلام نے ان کا مسئلہ حل کر دیا، اور ان کو نصیحت کی۔ نصیحت کے اس عمل کے دوران ان کو احساس ہوا کہ ان کو خود بھی کوئی ایسا ہی معاملہ درپیش ہے اور اللہ ان کو آزمارہ تھا۔ ہوتا ہے نہ بعض دفعہ ہمارا ہی مسئلہ کوئی اور آکے ہم سے بیان کرتا ہے اور ان کو جواب دیتے دیتے ہمیں اپنے مسئلے کا حل نظر آ جاتا ہے۔ تو داؤ دکا احساس ہوا کہ وہ آزمائش پر پورے نہیں اترے۔ بات ختم نا؟ آزمائش آئی، وہ پورے نہیں اتر سکئے، بات ختم؟ مگر نہیں۔ ساری بات ہی یہی ہے کہ آزمائش کا مقصد اس کو پاس یا فیل کرنا نہیں ہے، ہمیں کچھ سکھانا ہے۔ ہم کبھی وہ فیل ہو کر سکھتے ہیں کبھی پاس ہو کر۔ داؤ دکو جب اپنی کمی کا احساس ہوا تو وہ اللہ کی طرف پلٹے اور توبہ کی۔

آگے اللہ فرماتا ہے، ہمارے پاس اس کے لئے اعلیٰ درجہ ہے۔ اس آزمائش کے ذکر کے ساتھ ہی درجے کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آزمائش ہوتی ہی درجوں کی بلندی کے لئے ہے، تو کسی کوتا ہی کے باوجود ان کو اعلیٰ درجہ کیوں مل گیا؟ آزمائش کے ذکر کے فوراً بعد درجے کا ذکر ظاہر کرتا ہے کہ یہ درجہ ان کی توبہ سے مسئلک ہے۔ یعنی احر شفیع، اگر ہم آزمائش میں فیل ہو جائیں، مگر سبق سیکھ لیں، اور توبہ کر لیں تو ہمیں پاس ہونے جیسا درجہ مل جاتا ہے۔ آزمائش اللہ اذیت دینے کے لئے نہیں کچھ سکھانے کے لئے ڈالتا ہے، جتنی جلدی سیکھ لیں گے اتنی جلدی وہ دور ہو گی۔“ احر نے اثبات میں سر بلایا۔ ”تم اچھے آدمی ہو۔ میں نہیں ہوں۔ سکپل۔“

سعدی ابھی اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دروازہ زور سے کھلا تو ان دونوں نے چونک کردیکھا وہ تینوں تیزی سے اندر آ رہے تھے۔

”چلو۔ بی بی نے بلا یا ہے۔“ ایک جھک کر اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔ احر نے چونک کے سعدی کو دیکھا۔ وہ بہکسا مسکرا یا۔ ”تجربہ بولتا ہے۔“ اور سر کو خم دیا۔ احر نے گہری سانس لی اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

❖❖❖

میری شناخت کے پتھر میں شکل باقی ہے ..... میرے وجود کے ذریعوں میں زندہ ہے کوئی رات گہری مہیب سی اس ہوٹل بلڈنگ کو اپنے اندر سمئے ہوئے تھی۔ زمین سے دو منزلیں نیچے ..... اس لفت میں زمرا ایک کوئے میں اکڑوں بیٹھی تھی، بازو گھنٹوں کے گرد لپیٹ رکھے تھے اور تھوڑی ان پر جادوی تھی۔ چچہ زرد تھا۔ نظریں پانی کی دھار پر لگتی تھیں۔ فرش پر ایک دوانچ جتنا گہر اپانی جمع ہو چکا تھا۔ اس کا لباس بھیگ رہا تھا، مگر اب وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ بس دھار کے بینے قطروں کو دیکھ رہی تھی۔ ٹپ ٹپ ..... وہ گویا اس کے دل پر گر رہے تھے ..... وہ بار بار چھرے پہ ہاتھ پھیرتی، ناخن دانتوں میں دباتی۔ وہ خوفزدہ تھی، ہر اسماں تھی۔ سمجھنہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ کوئی ایسی شے نہ تھی جس کے سہارے وہ اوپر چڑھ جاتی اور انگریزی فلموں کی طرف لفت کاڑھکن کھول لیتی۔ وہ بس ساکن بیٹھی تھی۔ سانسیں گن رہی تھی۔

قصر کاردار اس وقت رات کی تاریکی میں ڈوبتا تھا۔ کہیں کہیں مدھم تباہ جلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ فارس سڑک پر کار کے

ساتھ کھڑا تھا اور بار بار گھٹری دیکھ رہا تھا۔ چہرہ سپاٹ اور سر دساتھا۔

دفتار گیٹ کھلا اور کوئی باہر آتا دکھائی دیا۔ ٹراوزر اور شرٹ میں ملبوس نیند سے پُر آنکھیں لئے نوشیر وال۔ ادھر ادھر دیکھتا سامنے آیا اور جیت سے اسے دیکھا۔

”فینیونا نے مجھے اٹھایا کہ تم.....فارس تم ادھر کیا کر رہے ہو؟“ وہ اس کے عین سامنے کھڑا ہوا تو چہرہ چاند کی روشنی میں واضح ہوا۔ شیر، حیران اور الجھا ہوالگتا تھا۔ ”دیکھو اگر تم مجھے مارنے آئے ہو تو یاد رکھنا، عدالت تم پر...“ اس کے سینگین تاثرات دیکھ کر شیر نے اختیاط سے بات شروع کی۔

”ہاشم نے زمر کو انغو کر لیا ہے۔“ وہ چبا چکا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولا تھا۔ شیر و گنگ رہ گیا۔ ”کیا؟“

”تمہارے بھائی نے زمر کو کہیں بلوایا ہے میرے دھوکے میں اور وہ چل گئی ہے، اور اس کا اب کوئی پتہ نہیں ہے۔ وہ اسے مار دے گا۔“ صرف مجھے اذیت دینے کے لئے۔“

”تجھیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم لوگ مشہور ہو، ہاشم بھائی بھی.....“ فارس نے جھٹکے سے اس کو گریبان سے پکڑا اور گاڑی سے لے گایا۔ ”بکواس بند کرو۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے۔“

وہ ایک دم اس جارحیت پڑ گیا تھا۔ ”مجھے نہیں پتہ، مجھے بچ میں نہیں پتہ۔“ فارس نے جھٹکے سے اس کو چھوڑا۔

”مجھے پتہ کر کے دو۔ ہاشم کے پاس جاؤ اور مجھے پتہ کر کے دو۔ وہ اس وقت آفس میں ہے۔ اس کے فون کے سننڈر ہیں کے آرہے ہیں۔“

شیر کو چند لمحے لگے بات سمجھنے میں۔ ”مجھے کچھ نہیں پتہ۔ یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔ تم لوگ اپنے مسلکے خود سن جالو۔“ اب کے وہ درشتی سے ہاتھ جھلانے کے بولا تھا۔

”نوشیر وال!“ فارس نے بہت ضبط سے اس کو خاطب کیا۔ ”تم نے اگر کچھ نہ کیا تو وہ مر جائے گی۔“

”وہ مجھے کوثر میں پر اسکی بوٹ کر رہی ہیں، ان کی وجہ سے میں مرنے جا رہا ہوں۔ میں ان کی مدد کیوں کروں گا؟ اور تجھیں کیا لگتا ہے، میں بھائی کو دھوکہ دوں گا اور تمہارے ساتھ مل جاؤں گا تو بھائی مجھے چھوڑ دے گا؟ بھائی مجھے جان سے مار دے گا۔“ وہ بڑی سے بولا اور سر جھٹک کر واپس گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

”اگر آخر میں تم نے مرتا ہی ہے تو کسی کے اقدام قتل کے جرم میں مرنے سے بہتر کسی کی جان بچا کر مرتا نہیں ہے کیا؟“

اس اندھیری رات سڑک پر آگے بڑھتے شیر کے قدم زنجیر ہوئے۔ وہ بالکل سُن رہ گیا۔ گویا پتھر کا ہو گیا۔

”اگر تجھیں مرتا ہی ہے تو کیا تم کسی لوز رکی طرح مرتا چاہتے ہو؟ کیا تم ساری عمر ایک لوز رہو گے یا تو اپنے نام جیسے بننا چاہتے ہو؟ کیا تم ”نوشیر وال“.....ہیر و... پس ہیر و کی طرح مرتا چاہو گے، شیر و؟ اگر مرتا ہی ہے تو کیا تم اس زمر کے لئے کچھ کرنا چاہو گے جس نے تمہارے پلکیس سے نکال کر دنیا کے سامنے اٹھ کھڑا ہونا سکھایا؟ کیا تم اس زمر کو بچانے کے لئے کچھ کرنا چاہو گے، جو اس سب میں تمہارے کیس کی وجہ سے پھنسی ہوئی ہے؟“

کسی خواب کی سی کیفیت میں نوشیر وال اس طرف واپس گھوما۔ ٹکر ٹکر وہ فارس کا چہرہ دیکھے گیا جو اس وقت بہت دلکھی نظر آ رہا تھا۔ چاندی زدہ اندھیر ماحول میں ادا کی کارنگ گہر اہوتا گیا۔ اور نوشیر وال اور نگزیب کاردار نے خود کو کہتے سن۔ ”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ ”دو آپنے ہیں تمہارے پاس۔“ وہ چند قدم طے کر کے اس کے سامنے.... بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تو شیر نے دیکھا، اس کی آنکھیں سر تپش سے بھری تھیں اور چہرے پر بلا کی ختنی تھی۔

”یا تو میں تمہیں گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے جاؤں اور ہاشم سے کہوں کہ وہ زمر کو چھوڑ دے ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔“

”تم مجھے اخواکر کے نہیں لے جاسکتے۔“ وہ ششدہ رسا بولا تو آواز عقل میں پھنسی۔

”لے جاسکتا ہوں مگر لے کر نہیں جاؤں گا کیونکہ ہاشم پھر بھی اسے مار دے گا، کوئی بھی مغوفی کو زندہ واپس نہیں کرتا کہ وہ جا کر پولیس کو بیان دے دے اور بد لے میں مجھے تمہیں مارنا پڑے گا“ اور زمر یہ کبھی نہیں چاہے گی۔ اس لئے دوسرا استہ یہ ہے کہ تم میری مدد کرو ہاشم کے پاس جاؤ اور پتہ چلاو کہ وہ کدھر ہے مجھے اس جگہ کا تباہ اور پھر میں اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔ نوشیروں تھہارے پاس کوئی تیرسا راستہ نہیں ہے کیونکہ اگر ہاشم نے اسے نقصان پہنچایا تو خدا کی قسم میں تمہارے اس محل کو آگ لگادوں گا۔“ وہ غصے سے بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ اذیت سے پر تھا۔

شیردا سے یک ٹک دیکھ گیا۔ فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔



اک بے کسی کا جاں ہے پھیلا چہار سو..... اک بے بسی کی دھنڈ ہے دل سے نگاہ تک ہاشم کا ردار کے آفس میں نیم اندر ہیرا تھا۔ دو کسیوں زکی اسکرین روشن تھیں اور ہاشم ٹیک لگائے بیٹھا، سرد مہری سے اس اسکرین کو دیکھ رہا تھا جس میں وہ لفٹ کے کونے میں بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ خوفزدہ سکھی ہوئی۔ پانی سے بھیکتی، اس کے پاؤں تقریباً ڈوب گئے تھے۔ مو بالکل گھٹنوں کے گرد لپٹنے ہاتھوں میں کپڑہ رکھا تھا اور پرس بھیگنے سے بچانے کو گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ ”سرپانی کا فلوز یاد نہیں ہونا چاہیے؟ اس طرح تو اسے ڈوبنے میں گھٹنہ لگ جائے گا۔“ ریس نے اسے پکارا۔ ہاشم نے دامیں باہمی نفی میں سرہلا یا۔

”اوہ ہوں۔ اسی طرح چلنے دو۔ یہ زیادہ دلچسپ ہے۔ میں بعد میں یہ دیہ یوفارس کو دکھا دکھا کر پاگل کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ محظوظ ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ بس پر تپش رکا گیاں اسکرین پر گاڑھے ہوئے تھا۔ انتقام کی آگ تھی کہ بھائے نہ بھتھتی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پر ہاشم نے سراٹھا یا پھر لوں پر لئے مسکرا ہٹ آٹھبری۔ چوکھٹ میں آپی کھڑی تھی۔ جیران، الجھی ہوئی۔ ”ہاشم، کیا ہوا ہے؟ فارس کہاں ہے؟“ وہ ایک قدم اندر آئی۔ ہاتھ ہنوز ڈورنا ب پتھا۔ ریس اٹھا اور ایک کری اٹھا کر سامنے رکھی گویا اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا ہو۔ ہر حرکت، ہر جنبش گویا طے شدہ تھی۔ وہ الجھن سے ان دونوں کو دیکھ گئی۔

”آور یہ۔ تمہارے لئے تو سجائی ہے یہ بساط۔ تم بھی تو دیکھو کوہ کتنا جری مرد ہے۔“

وہ تحریکی کھڑی رہی۔ نیم اندر ہیرا آفس... کونے میں اوپھی میز پر رکھا رشنیوں سے جگلگاتا یکویریم.... اسکرینز کی نیلی روشنی سے دکتے ہاشم اور ریس کے چہرے۔ ماحول عجیب پر اسراستھا اور آپی کے قدم جم گئے تھے۔ پھر بدقت وہ آگے بڑھی۔ قدم قدم اٹھا ہاشم کے قریب آٹھری ہوئی۔ چہرہ اسکرین کی طرف موڑا۔ آنکھیں اچنچھے سے سکڑیں۔ ذرا جھک کر دیکھا۔ ”یکون ہے؟“

”دیکھو! وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ زمر ایک لفٹ میں قید ہے، اور وہ لفٹ جلد ایکویریم بننے جا رہی ہے، مگر وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں بیٹھو اور میرے ساتھ یہ تماشہ آخڑتک دیکھو۔ یہ بے چاری عورت اس کا آخری سانس تک انتظار کرے گی مگر وہ نہیں آئے گا۔ اس کی ساری بہادری اس کی ساری جرأتی دلیری اور دلیری آج تم دیکھ لوگی۔ بیٹھو ناریہ، کھڑی کیوں ہو۔“

آبدار کی نظریں اسکرین پر ساکن ہو چکی تھیں گویا پتیاں حرکت کرنا بھول گئی ہوں۔ بدقت ان بے یقین نظر وہ کارخ اس نے ہاشم کی طرف پھیرا۔

”تم پاگل ہو چکے ہو۔“ وہ اسے واقعی اس وقت ڈھنی مریض نظر آرہا تھا۔

”عجیب بات ہے ریڈ، مگر پاگلوں نے اس دنیا کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ ذہین لوگوں نے پہنچایا ہے۔ سارے بم سارے ہتھیار ساری جنگیں، یہ سب ذہین لوگوں کے ذہنوں کی کارستانی ہیں۔ بیٹھو اور تماشاد کیوں۔“  
وہ شل سی کرسی کے کنارے پیٹھی۔ لب ادھ کھلے تھے اور اسکرین پر جمی آنکھیں پلک تک نہ جھپک پا رہی تھیں۔ ”تم اس کے ساتھ یہ کیوں کر رہے ہو؟“

”تمہارے فیصلے آسان کرنے کے لئے۔ اس کی اصلاحیت تمہیں دکھانے کے لئے۔ اس کے بعد تم اس پر کبھی اعتبار نہیں کر سکوگی۔ وہ کبھی اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا آبدار۔“

آہستہ آہستہ آبدار کا ذہن جانے لگا۔ اسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔

”تم واقعی اسے مار دو گے؟ صرف فارس کو نیچا دکھانے کے لئے؟“

”میرے اس کی طرف بہت سے حساب نکلتے ہیں، میں سب کو ایک ہی دفعہ میں بے باک کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم اس کے خاندان سے آخری بدله لے رہے ہو۔ اگر زمر کو کچھ ہوا تو... وہ سب...“ وہ پچھی پچھی آنکھوں سے اسکرین کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ ”وہ سب.... مر جائیں گے۔“ مگر فارس اس کے بعد کیا کرے گا؟ وہ بدله لے گا۔ ”وہ نیک لگائے،“ مطمئن سا بیٹھا تھا۔

”کیا تمہارے خیال میں میں اسے بدله لینے کے قابل چھوڑوں گا؟“ اس کی آواز کی ٹکنی۔ آبدار کی بڑیوں کے اندر تک سر دلہر دوز گئی۔

”تم ایک تیر سے اپنے ڈمنوں کو ختم کرنا چاہتے ہو۔ بتا وہ برباد۔“ اس کی آواز میں دکھسا بھرا آیا، پھر جیسے وہ نیند سے جاگی۔ شل ذہن بیدار ہونے لگا۔ اس نے ہاشم کی طرف چہرہ گھمایا۔ ”ایسے مت کرو۔ وہ اچھی عورت ہے۔ زمر۔ اس کے ساتھ یہ مت کرو۔“ ”اچھا،“ میرا خیال تھا تم اس کو ناپسند کرتی ہو۔“ وہ محظوظ ہوا تھا۔ اس نے بہت سے ڈھنی مریض دیکھے تھے یہ ان سے بھی الگ لگ رہا تھا۔

”ہاشم.... یہ مت کرو۔ بلیز۔ تم اس کو نہیں مار سکتے۔ لفٹ کھول دو۔ اسے نکالو۔“ وہ منت کرنے کے انداز میں آگے بڑھی، کہ خود کی بورڈ پر کچھ دبائے۔ اسے نہیں معلوم کیا مگر کچھ دبادے، لیکن ہاشم نے کہنی سے پکڑ کر اسے واپس کری پہنچایا۔ ”آرام سے بیٹھو۔“ وہ غریبا تھا اور وہ سہم گئی۔ تنفس تیز ہو گیا۔

”ہاشم.... بلیز....“ پھنسی پھنسی سی آواز حلق سے نکلی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”اسے چھوڑ دو۔“

”یہ تو تمہارے فارس غازی پر مختصر ہے۔ کہاں ہے وہ آبدار؟ کیوں نہیں آیا وہ؟ کیا اسے بیہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ ساتھ ہی اس نے ریس کو اشارہ کیا جو سامنے گوگلوں بہروں کی طرح بیٹھا تھا۔ اس نے سرکوم دیا اور کی بورڈ پر کیزد بانے لگا۔ وہ زمر کے نمبر کی لوکیشن آن کر رہا تھا۔

مورچاں میں حنین دل موس کر بیٹھی تھی۔ لاڈنچ پر پیر اوپر کیے۔ بار بار آنسو صاف کرتی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ ہاتھ میں زمر کا انکرپنڈ فون تھا جس سے وہ بار بار فارس اور سعدی کو کال کرتی تھی۔ کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ تبھی نوٹیفیکیشن کی آواز آئی۔ وہ چونک کر میز کی طرف بچھی۔ کھلے لیپ تاپ کی اسکرین پر زمر کے فون کی لوکیشن جو سپلے مختلف جگہوں پر بکھری نظر آ رہی تھی، اب صرف ایک جگہ موجود تھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ جلدی سے فون پر تاپ کرنے لگی۔ (یہ فون تھا جو انکرپنڈ تھا، اس کوڑیں نہیں کیا جا سکتا تھا۔)

”زمر کے فون کی لوکیشن مل گئی ہے۔ وہ آپ کی پرانی یونیورسٹی میں ہیں۔“

اندھیرہ سڑک پر وہ کار دوڑ رہا تھا۔ ساتھ ہی مسلسل اندر ابلتے غصے کو جھنک کر دماغ کو آ لو دہ ہونے سے بچاتا تھا۔ وہ اور زمر ایک دفعہ

ہمہ ہاشم کی بساط کے مہرے بن گئے تھے اور وہ ان کی ڈوریں کھینچ رہا تھا۔ ایسا ایک دفعہ پہلے بھی ہوا تھا۔ یا شاید کئی دفعہ۔ وہ ہمیشہ اس سے مار کھا جاتا تھا۔ مگر آج نہیں۔ آج وہ زمر کو کچھ نہیں ہونے دے گا۔ آج وہ ہاشم کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

جب میں رکھا بھدا موبائل بجا تو اس نے چونک کر کار آہستہ کی۔ وہ کتنی دری سے نج رہا تھا، اس نے خیال نہیں کیا تھا۔ اس نے فون کال کر دیکھا۔ خین کا پیغام تھا۔ ایک دم اس نے بریک لگائی اور پھر فون فرنٹ سیٹ پر ڈالتے، کار کارخ موزا۔ اسے لا بیری جانا تھا۔ یونیورسٹی کی لا بیری۔ وہ یاد گار جگہ تھی۔ ان دونوں کے لئے۔

نیم اندر ہیر آفس میں وہ تینوں اسی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ آبی ہر اس انظر آتی تھی۔ اسکرین کے منظر سے زیادہ وہ بار بار ہاشم کا چہرہ دیکھ کر سہم جاتی تھی۔ وہ ایسا فاک تو نہ تھا، ایسا بنا مل بھی نہیں۔ یہ سب کیا ہوتا جا رہا تھا؟

تبھی باہر آؤ ازیں آئیں۔ شور سا اٹھا۔ جیسے کوئی گارڈر سے بحث کر رہا ہو۔ ریس چونک کر اٹھا، ساتھ ہی اسکرین کو بھی دیکھا۔ ”فارس نہیں ہو سکتا“ اس کے موبائل کے جی پی ایس کے مطابق وہ تو لا بیری جا رہا ہے۔ ”ریس عجلت میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ ہاشم چونکا۔ سامنے نوشیر وال کھڑا تھا۔

”شیر و کیا ہوا؟“ ہاشم جگہ سے اٹھا۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔ نوشیر وال ٹراؤزر اور شرٹ میں ملبوس تھا، آنکھیں ہنوز خوابیدہ تھیں، اور منہ دھوئے بغیر آگیا تھا غالباً۔ بس الجھا ہوا لگتا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”کیا ہور ہے بھائی؟“

”تم ادھر کیسے؟“ ہاشم کرسی کے پیچھے سے نکل کر اس کی طرف گیا۔ آبدار ذرا سا اسکرین کی طرف جھکی۔ کوئی ایسی کمائی جو وہ دباسکے

لفٹ کا

دروازہ کھولنے کو۔ ”آہم۔“ مقابل بیٹھا ریس کھنکھا را اور پستول جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ آبی ست سی پڑ کے واپس پیچھے کو

ہو گئی۔

”کیا آپ نے واقعی ذی اے کو..... زمر کو غائب کروادیا ہے؟“ وہ جیر ان تھا۔

”تمہیں کس نے کہا؟“

”فارس نے۔ وہ گھر آیا تھا۔“

”وہ گھر آیا تھا؟ گارڈر نے نہیں بتایا۔ اس نے نقصان تو نہیں کیا کوئی؟“ ہاشم تیزی سے بولا۔ ”می ٹھیک ہیں؟ اور سونی؟“ اس سارے میں وہ پہلی دفعہ مضطرب ہوا۔

”اوہ بھائی سب ٹھیک ہے۔ اس نے مجھے باہر بلایا تھا۔ کہہ رہا تھا میں زمر کو بچانے کے لئے اس کی مدد کروں، آپ سے پوچھوں کہ وہ کہاں ہے اور اس کو بتا دوں۔“ وہ اکتا کر کہتا آگے آیا اور جھک کر اسکرین کو دیکھا۔ آنکھوں میں چونکے کا تاثرا بھرا۔ ”یہ لفت میں بند ہے؟ یہ کیسے کیا آپ نے؟“

”نوشیر وال درست کہہ رہے ہیں۔ یہ دیکھیں۔“ ریس جلدی سے فارس کی لوکیشن چیک کرنے لگا۔ کچھ دیر پہلے وہ واقعی ان کے گھر والے علاقے میں موجود تھا۔

”اور کیا کہا اس نے؟“ ہاشم سنجیدگی سے پوچھتا واپس کری پہ بیٹھا۔

”یہی کہ اگر میں اس کی مدد کروں اور زمر کو بچالوں تو وہ لوگ میرے خلاف کیس واپس لے لیں گے۔“ وہ جھک کر غور سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ ”آؤچ، مگر اس کی لفت میں پانی بھر رہا ہے۔ یہ واقعی مر جائے گی کیا؟“

”تم نے اس کو کیا کہا؟“ ہاشم نے سپاٹ سے انداز میں پوچھا۔

"یہی کوہ اپنی شکل گم کر لے کیونکہ مجھے اس عورت کو بچانے میں دلچسپی نہیں ہے جو کورٹ میں مجھے پر اسکیوٹ کر رہی ہے۔" ۴۵-  
گیا، مگر بھائی...." وہ بھجن سے سیدھا ہوا۔ "اس کو ماں کے ہمیں کیا ملے گا؟"

"زمرم رجاءے گی، فارس جیل چلا جائے گا۔ سعدی کے لیے ایک اور پلان ہے میرے پاس۔ ان کا خاندان ایک دفعہ پھر الٹ پاٹ  
ہو جائے گا اور وہ ہمارا یقیناً چھوڑ دیں گے۔ سپل۔" وہاب گھر انسان لے کر اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"گلڈ۔ کہاں ہے یہ دیے؟"

"کل کی نیوز میں دیکھ لو گے۔ وہ تنجی سے بولا۔ شیر و واث ایور" کہہ کر سیدھا ہوا اور کندھے اچکائے۔ پھر آبدار پر نظر پڑی تو  
چونکا۔ "آپ بھی انوالوؤں ہیں؟ واو۔"

"میں نہیں انوالوؤ۔" وہ چباچبا کر بولی اور ایک ملامتی نظر باشم پڑا۔

شیر و نے ایک نظر اپنے حلیے کو دیکھا، پھر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "میں ذرا..... فریش ہوں۔" ذرا سا ہسیا کر بولا۔

"بالکل!" باشم نے ایک ناپسندیدہ نگاہ اس پڑا۔ شیر و باہر نکل گیا۔ راہداری عبور کی اور اپنے پرانے آفس میں آیا۔ دروازہ بند  
کیا۔ تیزی سے باٹھ روم میں داخل ہوا، دروازہ بھی مقتول کیا۔ اور جیب سے فون نکالا، پھر ایک نمبر ڈائل کر کے اسے کان سے لگایا۔ ساتھ میں  
بے چینی سے سنک کے اوپر آئئے میں خود کو دیکھنے لگا۔ اس کا پنا چہرہ سخت مفطر ب نظر آ رہا تھا۔

"بولو۔" فارس کی آواز سنائی دی۔

"یوشیور تمہارا یہ نمبر ٹریلیں نہیں ہو رہا کیونکہ دوسرا تو ہو رہا ہے؟"

"نہیں ہو سکتا۔ تم بتاؤ وہ کیا جو میں نے کہا تھا؟"

"ہاں۔ میں آفس آیا ہوں۔ بھائی کو بتایا تمہارے آئے کا۔ جو تم نے کہا وہ بھی۔ مگر....." وہ الجھا۔ "اس طرح تو وہ مجھ پر ٹک  
کرے گا، نہیں؟"

"یہ ضروری تھا، اور نہ وہ اچانک تمہارے بغیر وجہ کے آئے پر شک کرتا۔ بتایا اس نے وہ کہہ رہے؟"

"نہیں۔ آبدار بھی یہیں ہے۔ کسی hostage کی طرح۔ بھائی نے زمر کا مجھے نہیں بتایا۔ مگر وہ اسکرین پر نظر آ رہی ہے۔ میں اسی  
وی کی لا نیوفیڈ میں۔" فارس نے جھٹکے سے بریک لگائی۔ سارا جسم دبل کر رہ گیا تھا۔

"کیا؟ کہہ رہے وہ وہ ٹھیک ہے؟"

"وہ کسی لفٹ میں ہے۔ اور اس کی لفٹ میں پانی بھر رہا ہے۔ وہ کونے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ خوفزدہ ہی۔" شیر و نے بھرنہ بھر  
لی۔ "اگر تم نے اسے نہ کالا تو وہ مر جائے گی۔ ڈوب کر۔"

"کیسی لفٹ ہے؟ کوئی نشانی، کوئی سائن؟"

"دو طرف مر لے گیں۔ آئئے۔ اور بیک پر براونسی وال ہے۔ اور کچھ نہیں سمجھ آیا۔ میں اپنے بھائی کو دھوکہ دے رہا ہوں۔" اس  
بس اتنا کر سکتا ہوں۔ "وہ تلنخ ہو گیا۔

"کچھ اور سمجھ آئے تو بتانا" اور میرے اوپر کوئی احسان نہیں کر رہے تھے۔ اپنے اور اپنے بھائی کے گناہوں کو دھونے کی کوشش رکھ رہے  
ہو۔ "وہ تلنخ سے بولا تھا اور فون بند کر دیا۔ شیر و نے سر جھکا۔ فون جیب میں ڈالا اور منہ دھونے لگا۔

وہ واپس آیا تو سب اسی طرح بیٹھے تھے۔ آبی کہہ رہی تھی۔ "میں اس کو پسند نہیں کرتی۔ بالکل بھی نہیں، مگر یہ دھیانہ سلوک  
باشم۔ ایسا مت کرو۔ پلیز۔" وہ منت کر رہی تھی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے آبی۔ تم بھی تو دیکھو کہ وہ کتنا قابل ہے۔ میرے لئے اسے اپنی انگلیوں پر نچانا کبھی مشکل نہیں رہا۔" وہ مخطوط ہو رہا تھا۔

"مگر وہ تو آزاد گھوم رہا ہے، ہمارے گھر تک آ گیا۔" شیر و کرسی سنجھاتے ہوئے بولا تھا۔ "وہ زمر کوڈ ہونڈ لے گا، پھر؟" ہاشم نے کوفت سے اسے دیکھا۔ "تم گھر جاسکتے ہو۔"

"اب مجھے نیڈ نہیں آئے گی، اور میں یہ تھیز مس نہیں کرنا چاہتا۔" وہ اطمینان سے ریس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ "سو فارس اسے کیوں نہیں بچا سکے گا؟" سرسری سا پوچھا۔

"کیونکہ سر اسے منشی کے ایک آفس سے غیر قانونی طور پر فائلز نہ لتے ہوئے گرفتار ہو جانا تھا۔ ہم رات گھری ہونے کا انتفار کر رہے تھے، مگر وہ وہاں سے نکل گیا۔ پلان بی۔ وہ اب لا بسیری جا رہا ہے، وہاں پولیس کی ایک وین اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ وہاں سے گرفتار ہو جائے گا۔"

شیر و کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسکرین پر وہ فارس کی لوکیشن دیکھ سکتا تھا۔ جی پی ایس گلشن سڑک پر آگے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ نوشیر والا نے بظاہر "واو" کہتے پہلو بدل۔ (اب وہ کیسے دوبارہ اپنے آفس جائے اور اسے فون کرے؟)

"سر آپ اپنا فون مجھے دے دیں۔" ریس نے ایک دم اسے مخاطب کیا تو وہ چونکا۔ "مگر کیوں؟" "کیونکہ آپ فارس سے مل کر آئے ہیں۔ وہ آپ کے علم میں لائے بغیر آپ کو بیگ یا بگ کر سکتا ہے، اور آپ کی سیکیورٹی کے لئے مجھے آپ کے تمام gadgets لینے ہوں گے۔ مس آبدار کافون بھی، ہم نے اینٹرنیس پر کھلایا تھا۔"

"اوکے!" بظاہر بے پرواہی سے کہتے ہوئے اس نے فون میز پر کھدیا۔ ریس اسے اٹھا کر باہر چلا گیا۔ (وہ لا کڈ تھا، اور شیر و کال ریکارڈ مٹا پکا تھا۔) اب نوشیر والا ان دیکھی رسیوں سے بندھا ہوا تھا اور فارس کو لا بسیری تک جاتے اور ایک اور پھندے میں ہفتہ دیکھنے پر مجبور تھا۔

ہاشم اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ ارڈر دسے بے نیاز۔ منتقم آنکھیں گویا اسکرین میں چھوچھہ رہی تھیں۔ آبی صدمے اور ترجم سے زمر کو دیکھ رہی تھی۔ گود میں ہاتھر کے بیٹھی وہ بس نظر آتی تھی۔ زمر اسی طرح افٹ کے کونے میں بیٹھی تھی۔ گٹھڑی بننے کمٹی ہوئی۔ ٹھنڈے پانی میں اس کا آدھا جو دووب چکا تھا، مگر جائے تو جائے کہاں۔ سو بیٹھی رہی۔ پس اور موبائل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ وقٹے و قٹے سے دروازے پر بندھیل مار دیتی۔ چند آوازیں بھی لگاتی مگر اندر ہیر پارکنگ ایریا میں رات کے اس پھر کسی نے نہیں آنا تھا غالباً۔

ساری زندگی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح سے گھوم رہی تھی۔ گوگنی بھری فلم۔ ٹوٹے پھونے سین۔ وہ فارس کو تنتی اذیت دیتی تھی، اس سے کتنی تلخی سے پیش آتی تھی۔ ساری بری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ساری اچھی باتیں بھول گئی تھیں۔

وہ موبائل روشن کر کے دیکھنے لگی۔ ایس اولیں ایر جنسی کالنگ پکج بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے گلیری کھولی۔ اپنی اور فارس کی نئی پرانی تصویریں دیکھیں..... سعدی خین..... مور چال..... اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ٹکٹل ہنوز بند تھے۔ ایر جنسی کال تک نہ جاتی تھی۔ نو میکیشن باری پیچ کیا تو ذرا اٹھبری۔ واٹی فائی کا بثن عادتاً آن تھا۔ اس نے اسے زور سے دبایا تو واٹی فائی کا خانہ کھل گیا۔ موبائل از سرفونٹری دی وائی فائی نیٹ ورکس کوڈ ہونڈ نے لگا۔ زمر کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ سراٹھا کے اوپر دیکھا۔

کیرہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے موبائل ذرا تر چھا کر کے پکڑ لیا۔

دفعتہ فون نے اطلاع دی۔ قریب میں ایک نیٹ ورک آن تھا۔ شاید کوئی اپنی کار میں کوئی تحری جی ڈیو اس رکھے ہوئے تھا جو آن

تھی اور اس کے سکنیں افٹ تک آتے تھے۔ اس نے اسے دبایا۔ پاسوڑ؟

وہ کپکپاتی انگلیوں سے ناپ کرنے لگی۔ 12345678۔ یہی سب سے کامن پاسوڑ تھا۔ ”غلط“ نشان ابھرا۔ اس نے اب کاتتے ہوئے ایک سے او، اور پھر ایک سے دس تک گنتی لکھی۔ غلط۔ دل بار بار ڈوب رہا تھا۔ ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ پانی اس کے گھنون تک آ گی تھا اور آنکھوں سے پانی ویسے بھی بہرہ رہا تھا۔ ”پاکستان“ اس نے دوسرا سب سے کامن پاسوڑ ناپ کیا۔ غلط۔ مگر وہ تھکی نہیں۔ بار بار ناپ کرتی رہی۔ الفاظ، ہندسے۔ اپنے گھروالوں کے نام۔ یونہی بے کار میں زمر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس وائی فائی لٹکشن کے نام میں جو بارہ ہندسے لکھتے تھے، وہی اس کا پاسوڑ تھے۔

❖❖❖

قتل چھپتے تھے کبھی سنگ کی دیوار کے بیچ ..... اب تو کھلنے لگے مقتول بھرے بازار کے بیچ  
نہیں لاوئیں میں اداسی بیٹھی تھی۔ ایک ہی پوزیشن میں پاؤں رکھنے کے باعث وہ سن ہو گئے تھے۔ وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے  
مسلسل ناخن دانتوں میں دبا کر کترے جا رہی تھی۔ وہاں زمر کی لوکیشن لکھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دوسرا وندو میں فارس کی لوکیشن  
چیک کی۔ وہ یونیورسٹی کے قریب تھا۔ اسے کچھ تملی ہوئی۔ شکر ہے وہ اس قابل تھی کہ کسی کی موبائل لوکیشن چیک کر سکے اور حالات کا اندازہ کر  
سکے درنہ تو مارے ٹینشن کے اس کا براحال ہو جاتا اور .....  
یکدم وہ ٹھہرگئی۔ ایک کونڈا سازہ میں لپکا۔ اس نے تیزی سے فون اخھایا اور کال ملائی۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ خندے سے انداز میں بولا تھا۔

”ماموں، مجھے عجیب سماں ہو رہا ہے۔ کوئی گزبر ہے۔ دیکھیں، پہلے ہمیں زمر کی لوکیشن مل نہیں رہی تھی، پھر اچانک سے مل گئی، اور  
اگر مجھے آپ کی لوکیشن معلوم ہو سکتی ہے تو ان کو بھی ہو سکتی ہے۔ آپ..... آپ وہاں نہ جائیں۔“  
”میں وہاں جا بھی نہیں رہا۔“  
”وہ ٹھہرگئی۔“ ہیں؟ کیوں؟“

اور اس بلندو بالا ہوٹل کے سامنے بیکسی سے اترتے ہوئے فارس نے فون کان سے لگائے والٹ سے چند نوٹ نکال کر بیکسی والے کو  
تمہائے اور آگے چلتا آیا۔ اس کے چہرے پر کوئی ناشر نہیں نظر آتا تھا۔ صرف سنجیدگی اور ٹھہر اور۔

”کیونکہ میں ہمیشہ اس کے داؤ میں اس نے کھنڈ جاتا ہوں کیونکہ میں اس کی طرح نہیں سوچتا۔ وہ صرف جرم کرنے کا نہیں سوچتا،  
وہ کو راپ کا بھی سوچتا ہے۔ جرم کے بعد الازم اس کے سر جائے گا، یہ طکر رکھتا ہے۔“ وہ تیز تیز چلتے ہوئے کہر رہا تھا۔ ”پہلے اس نے سوچا کہ  
وہ شہری کے ذریعے مجھے گرفتار کروادے، لیکن اسے اندازہ تھا کہ عین ممکن ہے میں گھنٹے بھر میں جھوٹ جاؤں، تو اس نے یقیناً پلان بنی بھی رکھا  
ہوگا۔ اب وہ چاہتا ہے میں یونیورسٹی جاؤں، اور میں چلا بھی جاتا اگر میں اپنے کریڈٹ کارڈ کاریکاریڈ نہ دیکھ لیتا۔“

”کریڈٹ کارڈ کہاں سے آ گیا؟“

”میرے بلز کو وہ عموماً مجھے پہنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسے گمان ہو گا کہ اتنی افرافری میں مجھے اپنا کاؤنٹ دیکھنے کا ہوش  
کہاں ہو گا۔“ گزر نے تمہیں کہا تھا کہ وہ ڈنر پے جا رہی ہے۔ وہ یقیناً کسی ہوٹل یا ریسورانٹ گئی ہو گی۔ لا سریری نہیں۔ اور چند گھنٹے پہلے میرے  
کارڈ سے دونوں کے لئے اس ہوٹل میں روم بک کیا گیا ہے، جہاں زمر اور میں ایک دفعہ آئے تھے، اور جو ہارون عبید کی ملکیت ہے۔“ وہ ہوٹل  
کے داخلے کی طرف تیز قدموں سے چلتے ہوئے کہر رہا تھا۔

”اور ہاشم ہمیشہ ہارون عبید کے ہوٹل اس استعمال کرتا ہے، جیسے سعدی بھائی کی دفعہ کیا تھا۔“ وہ جوش سے بولی۔

"باکل۔"

"اور یقیناً آپ نے کسی کے ہاتھ اپنافون یو نیورٹی بھجوادیا ہوگا کیونکہ وہ مسلسل اسی طرف جا رہا ہے۔" وہ اسکرین کو دیکھنے کر بولی۔  
"نہ صرف فون بلکہ کاربھی۔"

"تو آپ زمر کو اتنے بڑے ہو ٹول میں کیسے ڈھونڈیں گے۔ کیا پچھہ وہ اب تک وہاں نہ ہوں۔"  
"کسی نے بتایا ہے کہ وہ لفٹ میں ہے،" اور یہ کہہ کر اس نے میری نظر میں اپنے سارے گناہ و حودا لے ہیں۔ "اس نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا اور داخلے کے قریب آیا۔

"میرا روم بک ہے۔ مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔" اس نے شاخ تھی کا روز نکالتے ہوئے سیکیورٹی آفیسر سے تھکنے تھکنے انداز میں کہا تھا۔

ذکوئی روک ٹوک نہ کوئی پوچھ گچھ۔ اسے ادب اور خوش دلی سے اندر جانے دیا گیا۔

البتہ داخلے کے قریب موجود گارڈ کو اس کی شکل دیکھ کر حیرت کا جھنکا لگا تھا۔

لابی میں داخل ہوتے ہی اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ وہ ریسیپشن کی طرف بھاگا۔ سیکیورٹی آفیسر نے فوراً تھیلی بلوں تک لے جا کر کچھ کہا۔ ہوٹل کے کنٹرول روم میں بیٹھے ہمکاروں میں سے ایک نے کان میں لگا آلہ دبا کر غور سے سناؤ پھر آگے کو بوکر کی بورڈ پہ بن

دبائے۔ اسکرین پر چکھے ابھرے لابی اور ریسیپشن کا منظر اور ایک طرف بھاگتا غازی۔ اس نے برق رفتاری سے فون اٹھایا۔

نیم انہیں آفس میں وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ اسکرین پر لفٹ میں نظر آتی زمر پانی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سکڑی، سمعی، اور مسلسل موبائل پہن دباۓ جا رہی تھی۔ پانی اس کے کندھوں سے باشٹ بھر نیچے تھا اور وہ ہاتھ اٹھا کر موبائل اور پکڑے ہوئے تھی۔ چرے پر آنسوؤں کے نشان تھے، جیسے ہر شے ختم ہو جکی تھی اور وہ بار بار پاسورڈ ناٹپ کر رہی تھی۔ فوٹج میں اتنا دکھائی دیتا تھا کہ وہ نائب کیے جا رہی ہے۔ کیا؟ یہ سمجھنہ آتا تھا۔ یکدم اس کے ہاتھ سے موبائل پھسلا اور اس نے سٹھبل کرائے تھا منا چاہا گروہ پانی میں ذکبی کھا کر ڈوب دیا گیا۔ اس کے ادھر ادھر ہاتھ نہیں مارے۔ اس سر بند دروازے سے لگا دیا اور آئیں موند لیں۔ پرس، موبائل سب ڈوب چکا تھا۔ پانی اب اس کے کندھوں کے قریب پہنچتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کھڑی نہیں ہوئی۔ آئیں موندے، زیر اب کوئی دعا پڑھئے۔ (میرے بعد میرے خاندان

والے کوئی انتہائی قدم ناٹھا میں اللہ تعالیٰ۔ میرے خاندان والے.....)  
"یہ تو ہارون عبید کی ہوٹل لفٹ ہے نا؟، نو شیر والا کو بالا خریادا ہی گیا۔" آپ کو کیسے پتہ تھا کہ وہ اسی لفٹ میں داخل ہو گی جس کو

آپ لوگ کنٹرول کر سکیں گے؟"

"نبیں سر۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ اوپر روم تک جائیں۔ ہم نے وہاں ان کو ہر اساح کرنے کے لیے آپ لوگ اکٹھے کر رکھے تھے۔ وہ فوراً بھاگتیں اور دونوں ایلی و پیئر زکو مصروف پا کر اسی میں سوار ہو جاتیں۔ ان کو لگتا کہ وہ فتح جائیں گی مگر ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہ پہلے ہی اسی لفٹ میں سوار ہو گئی۔"

بھی فون کی نیل پر وہ رکا اور موبائل کان سے لگایا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ فارس غازی ہوٹل کیسے پہنچ سکتا ہے؟ وہ تو کہیں اور جا رہا تھا۔" رئیس ششدھ رسانفون پر بولا تھا۔ باشم لمحے بھر کو

بالکل سن سارہ گیا۔ پھر اس نے فون رئیس کے کان سے کھینچا۔ "کہاں ہے غازی؟ فوٹج مرر کرو ہمارے سسٹم پر۔" وہ غریا تھا۔

آبدار نے پہلے اسے دیکھا، پھر نو شیر والا کو۔ شیر و آگے ہو کر بیٹھا تھا، دم سادھے۔ آبی کو دیکھتے پا کر نظریں چڑا گیا۔ وہ اسے چند

لمحے دیکھے گئی۔ پھر رخ موڑا۔

اسکرین پر وہ لابی عبور کرتا نظر آ رہا تھا۔ دائیں سے باہمیں بھاگتا۔ وہ ایک طرف جاتا، پھر دوسری طرف۔ باشم سانس روکے اسے

دیکھے گیا۔ فون کان سے لگا تھا۔

”سنو.... اسے نہیں معلوم کہ وہ لڑکی کو دھر رہے۔ تماشا نہ بننے دینا کیونکہ بعد میں مرد رکیس بنے گا تو کو اپ بھی کرنا ہے۔ آرام۔ اپنے سیکیورٹی آفیسرز کے کر جاؤ اور اس کو detain کرو۔ بس چند منٹ کے لئے اسے قابو میں رکھو پھر چھوڑ دینا۔“

”مگر اسے پتہ کیسے چلا کر زمر کہاں ہے؟“ شیر و مرمری سالا بجھ بنا کر بولا۔ آبی بھی تک اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاشم نے فون نیپر کے اچھے سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے زمر نے گھر سے نکلتے ہوئے کسی کو بتایا ہو، بہر حال وہ ہمیں دھوکہ دینے کے لئے کسی کے ہاتھ اپنا موبائل یونیورسٹی بھجو کر خود بیہاں آیا ہے، لیکن اتنے بڑے ہوٹل میں وہ اسے اتنی جلدی نہیں ڈھونڈ پائے گا۔“ پھر فون کان سے لگایا۔ ”وہ سیکیورٹی لی مدد مانگے گا، کنٹرول روم کے کیسریوں تک رسائی چاہے گا، اس کو روک کر رکھ لینا۔“ وہ تیز تیز ہدایات دے رہا تھا۔ چہرے پر غمیض و غضب چھایا تھا مگر وہ ہار نہیں مانے گا، یہ طے تھا۔ آج وہ فارس کو پہنچنیں کرنے دے گا۔

”سر..... میر انبیس خیال اس کی ضرورت ہے۔“ ریمیں اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ ”وہ سیکیورٹی سے مدد مانگ بھی نہیں رہا۔“ واپس ہوٹل کی لابی میں آؤ تو روشنیوں اور فانوسوں سے مکمل روشن تھی۔ اوپنی چھت، مرمری فرش، درمیان میں فوارہ۔ آگے بیٹھنے لگا۔ غالباً وہاں کوئی کنسٹرٹ ہو رہا تھا اور ابھی ختم ہوا تھا تو رش کافی تھا۔ فارس پہلے ایک رخ سے دوسرے رخ تک دوڑا، پھر واپس آیا۔ اب وہ لابی کے وسط میں کھڑا تھا۔ نگاہیں تیزی سے چاروں طرف دوڑاتے اس نے لمحہ بھر میں دیکھ لیا تھا کہ دور کھڑے سیکیورٹی الہکار اسی، دیکھ کر آپس میں بات کر رہے تھے۔ زمر کے پاس وقت کم تھا۔ اسے جو کرنا تھا، بھی کرنا تھا۔

”سنو.... میری بات سنو۔“ وہ کنسٹرٹ سے لوٹنے والوں کے ایک گروپ کی طرف بڑھا، ایسے کہ اس کی سانس بچوں تھی، چہرہ پیش سے ترشید پر بیشان لگتا تھا۔ اپنے موبائلز پر سر جھکائے گزرتے لڑکے چونکہ کرائے دیکھنے لگے۔

”میری بیوی.... میری بیوی لفت میں پھنس گئی۔ اس کی کال آئی ہے۔ واٹر لائن پھٹ گئی ہے، اس کی لفت میں پانی بھر رہا ہے۔“ یہ ہوٹل والے مد نہیں کر رہے۔ پلیز سنو.... روکو.... میرے ساتھ چلو.... بات سنو....“ وہ ان کے ساتھ ساتھ قریبی گزرتے لوگوں سے بھی التجاہ رہا تھا۔ چلا چلا کر۔ بہت سے چہرے مڑے، بہت سے قدم اس کی طرف اٹھے۔ چند لپکے۔ چند دوڑے۔

”اوہ گاؤ یہ کیسے ہوا؟“

”کہاں ہیں آپ کی وائے؟“ وہ بکھریوں سے دیکھ سکتا تھا کہ سیکیورٹی گارڈز تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے، مگر ایک،“ مے لابی میں کھرا مچ گیا تھا۔ جیسے ہی وہ اس طرف دوڑا جہاں لفٹ لگی تھیں، انسانوں کا ایک ریلا اس کے ساتھ بھاگا۔“ کوئی ریسکیو کو کال کرے۔“

”میں کہاں ہوں آپ لوگ ادھر جائیں۔“ شور۔ آوازیں۔ بہت کم لوگ تھے جو بیٹھے رہے، یاد کیجھے رہے، مگر ایک رش ساتھ جس میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی، جو اپنے موبائل اور ہینڈز فری جیسوں میں اڑتے فکر مندی سے اس کی طرف دوڑتے تھے۔ سیکیورٹی گارڈز کا راستہ رک گیا۔ کسی کو دھکے لگے، کسی کو ٹھنڈا آیا۔ کوئی کچن کی طرف بھاگا کسی اوزار کی تلاش میں، کوئی آگ بجھانے والا آں لاملا یا۔

فارس دوڑتے ہوئے لفٹ کی طرف آیا تھا۔ ”کون ہی لفت میں ہے وہ؟“ کوئی اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ تیز تنفس اور دھڑکتے دل کے ساتھی میں سر ہلا رہا تھا۔ ”انہی میں سے کوئی ہے۔“ ایک لفت کو نیچے بلانے کا بہن دبایا۔ پھر دوسری کی طرف بھاگا، پھر تیسرا کی طرف۔ سب کو نیچے بلایا۔ لوگ آگے پیچھے جمع ہو گئے تھے۔ کسی نے پوپس کو بلایا۔ کسی نے فائز بر گیڈ کو۔ ہوٹل کے ریسکیو کے الہکار (جو ہاشم۔ احکامات تھے نہیں تھے) اطلاع ملنے پا لفت کھونے کا سامان لے کر اپنے آفس سے باہر کو دوڑتے تھے۔ اور وہ اتنے رش اور شور میں کھڑا ان

بُول لفٹ کے باری پاری نیچے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ دفتار کے بعد دیگرے دروازے کھلے۔ پہلی.... دوسری.... وہ ٹھیک تھیں۔ تیریٹ کی تی جل تھی۔ وہ B2 پتھر تھی۔ مگر اوپر نہیں آ رہی تھی۔ "یہی ہے۔ یہی ہے۔ بیٹو۔ کہاں ہے بیٹو؟" وہ مذکور چلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ کسی نے پیسمت کا بولا تو وہ سیڑھیوں کی طرف ہماگا۔

بہت سے نوجوان اس کے ساتھ بھاگے۔ سیکیورٹی الہکار بے بسی سے کھڑے دیکھتے رہ گئے۔ اور اسکرین پر یہ مناظر دیکھتے ہوئے ہاشم کی رنگت بالکل سیاہ پر گئی تھی۔ وہ چپ تھا۔ بالکل چپ۔ ریس چلا چلا کرفون میں بدایات اے رہا تھا۔ گالیاں نکال رہا تھا۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں، رسکیو الہکار ہر وقت ایسی ٹریجیڈیز کے لئے تیار ہوتے ہیں، ان کو کہیں کروہ لفت میں پھنس لڑکی کو بچانے نہ جائیں؟ یہ کہنے پر وہ ریس کے توہینیں، البتہ ہم پشک کریں گے۔" "ان کے کام میں تاخیر ڈالنے کی کوشش کرو۔" ریس بے بسی سے کہا رہا تھا، بار بار خائف نگاہ ہاشم پر بھی ڈالتا۔ جس کی خاموش نظریں اسکرین پر گزرا تھیں۔

"سر، پولیس کو بلا یا گیا ہے، بُول کی سیکیورٹی ٹیم کے درجنوں ممبر ان موجود ہیں ادھر، اور وہ سب تو ہمارے ساتھ نہیں ملے ہوئے۔ میں پچھنیں کر سکتا۔" ہاشم نے فون ریس کے کان سے کھینچا اور سختی سے اس میں بولا۔ "واپس آؤ کرو سب۔ ساری ویڈیویز۔ بہوت۔ ریکارڈ۔ کالر ریکارڈ۔ سب کلین کرو۔ جلدی۔"

"لیں سرا!" اور اس نے فون میز پر پھینک دیا۔ پرتمش نظریں اسکرین پر جھی تھیں اور تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔ فارس دھڑکتے دل کے ساتھ تیز تیز ہے پھلانگ رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے بہت سے مناظر گھوم رہے تھے۔ مگر وہ بار بار انہی میں مر بلاتا۔ وہ اسے بچالے گا۔ وہ وقت پہنچ جائے گا۔ محض ہو رہا تھا کہ اس شور شرابے میں بہت سے نوجوان، ملازم، سیکیورٹی گارڈز اس کے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں، مگر وہ کسی کا نہ انتظار کر رہا تھا، نہ جواب دے رہا تھا۔ دیوانہ وارز ہے پھلانگتے بُول کی سب سے پنجی پیسمت میں داخل ہوا۔

وہاں طویل اور نیم اندر ہر پار نگ ایریا تھا۔ ایک کونے میں لفٹ لگی تھیں۔ وہ ان کی طرف دوڑا۔ تیرے نمبر کی لفت کے دروازے پکے بند تھے۔ جڑے ہوئے یوں لگا جیسے قدیم وقت کا کوئی زندان ہو۔ وہ اکھل پھل سانسوں کے ساتھ بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اسے دھڑ دھڑایا۔ "زمر... زمر....." وہ زور سے چلایا۔ آواز میں کپکاپاہٹ تھی، خوف تھا۔

دوسری جانب خاموشی تھی۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ نہیں۔ وہ دیوانہ اور دروازہ دھڑ دھڑا نے لگا۔ "زمر جواب دو۔ زمر...." اس کے ہاتھ سرخ پڑ رہے تھے۔ اور وہ لوہے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ لوگ قریب آچکے تھے۔ رش کے درمیان سے راستہ بناتے رسکیو الہکار آئے اور اسے ہٹانا چاہا۔ تاکہ وہ دروازے کو مشینری کی مدد سے کھول سکیں۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پرے دھکلنا چاہا، مگر وہ کندھا جھک کر مرٹا، اور رسکیو الہکار کو یہاں سے پکڑ کر جھکا دیا۔ "یہ مجھے دو، اور پیچھے ہنو۔" غصے سے غراتے اس کے ہاتھ سے آله لیا اور اسے پرے ہٹایا۔ دوسرے الہکار نے نیچے سے اور اس نے پھر اور پرے آل لفت کے دروازوں کی درمیانی درز میں زور سے گھسایا۔ اندر سے پانی رنسے لگا۔

ہٹایا۔ دوسرے الہکار نے نیچے سے اور اس نے پھر اور پرے آل لفت کے دروازوں کی درمیانی درز میں زور سے گھسایا۔ اندر سے پانی رنسے لگا۔ ذرا ذرا۔ اب وہ دونوں ایک سمت میں زور لگانے لگے۔ بلیں پکڑے اس کے زور لگاتے ہاتھوں میں بلکن سی کپکاپاہٹ تھی، بے قرار نظریں دروازے پر جمی تھیں، سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ ایک دفعہ پہلے بھی دروازہ توڑا تھا۔ وہ ایسا منظر دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ٹوٹے

دروازوں کے پار چھوٹتے رشتے دیکھ کر تھک پکا تھا۔ اب نہیں 'اللہ' اب نہیں۔

لوگ اونچاونچا بول رہے تھے، 'ہمت بندھار ہے تھے'، اور وہ دونوں زور لگا رہے تھے۔ دروازے کو دیا میں طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک..... دو..... تین..... عجیب سی آواز کے ساتھ دروازہ ذرا سارا دیا میں طرف دیوار میں گھسا۔ ایک دم پانی کا ریلا سا باہر کو چھا کا۔ سب بے اختیار پیچھے کو ہے۔ آ لے ہاتھوں سے چھوٹ گئے۔ بس وہ پیچھے نہیں ہوا۔

پانی پوری قوت سے باہر کو گر رہا تھا۔ وہ مکمل بھیگ چکا تھا۔ مگر ابھی کچھ نظر نہ آتا تھا کہ دوسرا طرف کیا ہے۔ دروازہ بھی باشت بھی کھلا تھا۔ اس نے آلم چھوڑ دیا اور آگے بڑھا۔ دونوں ہاتھوں سے دروازے کا کنارہ پکڑ کر زور سے اندر کو دھکیلا۔ دانت جمالتے.... بازوں کی رگیں ابھر آئیں۔ تکلیف ہونے لگی۔ شاید اس کا ہاتھ کٹ گیا تھا، اور خون لکل رہا تھا۔ ہر شے لگی تھی۔

پانی کا سیلا ب اسی طرح باہر لکل رہا تھا۔ سب پیچھے ہٹ کے تھے۔ صرف وہ کھڑا تھا۔ بھیتا ہوا۔ لبوں میں کچھ بڑا اتنا ہوا۔ اس کا نام 'اس' سے کی جانے والی مٹیں۔ دھیرے دھیرے بھاری دروازہ اندر کو گھستا گیا۔ ایک فٹ تک۔ دوفٹ۔ اس نے دروازہ چھوڑ دیا۔ گھر۔ گھر سے سانس لیتا وہ بھیگا ہوا پوکٹ پ کھڑا تھا۔ اور ادھ کھلے دروازے سے نظر آتا تھا۔

اندر گیلے فرش پر وہ اوندھے مند گری پڑی تھی۔ اسے لگا اس کا دل بند ہو جائے گا۔ بس ایک لمحے کو پیر زنجیر ہوئے، پھر وہ اندر کو پکا۔ اس کو سیدھا کیا۔ وہ بھیگی ہوئی تھی۔ خندی بخندی۔ آنکھیں بند تھیں۔ گلی لٹیں چہرے کے ساتھ چکپی تھیں۔ ہونٹ جامنی تھے۔

"زمر...." اس پر جھکے فارس نے اس کا چہرہ چھپھایا۔ وہ اتنی خندی تھی کہ اس کے اپنے ہاتھ پیر بھی خندے پڑنے لگے۔ "زم....." اس نے پکارنے کے ساتھ اس کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ پھر چہرے پر۔ سانس محوس کیا۔

وہ زندہ تھی۔ اودہ خدا یا۔ وہ زندہ تھی۔ زمین پر بیٹھتے تھک کر اس نے چہرہ اوپر کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ گھرے گھرے سانس لئے۔ وہ زندہ تھی۔ اس نے دنیبیں کی تھی۔

رسکیو الہکار اس کے پاس آگئے تھے، کسی نے اسے زامابلینکٹ تمہایا، کسی نے کندھا تھکا۔ کوئی اسٹرپچر لانے کی اطلاع دے، رہا تھا۔ وہ کسی کو نہیں سن رہا تھا۔ بس اسے کمبل میں پیٹھ رہا تھا۔ خود بھی بھیگا ہوا تھا، چہرے پر بہت سے قطرے تھے، بالوں سے قطرے پکڑ رہے تھے، آنکھوں سے قطرے پکڑ رہے تھے۔ "وہ زندہ ہے.... وہ ٹھیک ہے۔" وہ اسے اٹھا کر اب اسٹرپچر پڑاں رہا تھا اور خود کو کہتے ہوئے سن رہا تھا۔ وہ لڑکے اس کو مبارکباد دے رہے تھے، اس کا کندھا تھک پکڑ رہے تھے۔ وہ بنس بھی رہا تھا، وہ شاید رو بھی رہا تھا، مگر وہ کسی کو جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ احتیاط سے اسے اسٹرپچر پٹھا رہا تھا۔

بیسمت کی سی اٹی وی فوچی نیم اندر ہر آفس میں رکھی اسکرین پر مر ہو کر آ رہی تھی۔ ہاشم دا میں سے باہمیں ٹھیل رہا تھا۔ رئیس رہ پکڑے بیٹھا تھا۔ نو شیر و اس منہ میں ناخن ڈالے انہیں کترے جارہا تھا۔ اور آ بدار.... اس کی آنکھیں ڈبڈ بائی ہوئی تھیں۔ وہ بس اسکرین پر چھپی منظر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گیلے بالوں، گیلے کپڑوں والا مرد، اپنی آنکھیں انگلیوں سے رگڑتا، کسی کے شانہ تھکانے پر سرجھنا کرہتا، کمبل میں لپٹنے وجود کو اسٹرپچر پر ڈال رہا تھا۔ پانی آیا تھا تو سب پیچھے ہٹ گئے تھے۔ بس وہی کھڑا رہا تھا۔ بس اسی نے لمحہ بھر کی غفلت نہیں کی تھی۔ اور اب وہ اسٹرپچر کو آگے دھکیل رہا تھا۔ لوگ اسے مبارکباد دے رہے تھے، خوش ہو رہے تھے، آوازیں نہ سنائی دیتی تھیں مگر چہروں۔ تاثرات اور مسکراہیں سب کہہ رہی تھیں کچھ لوگ ان پر رشک کر رہے تھے۔ ایسے ہوتے ہیں محبت کرنے والے، خیال رکھنے والے شوہر۔ یہ ہوتی ہے محبت۔ اور آ بدار نے ڈبڈ بائی آنکھیں اٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔ یہ ہوتی ہے محبت؟

وہ ما تھے پہلی یہ نائی کی ناٹ ڈھیلی کر رہا تھا۔ کوٹ پرے پھینکا پڑا تھا اور آستین اونچ چڑھے تھے۔ وہ خت غصے میں بُس ما نظر آتا تھا۔ بار بار پیشانی ملتا۔ نئی میں سر ہلاتا۔ رنگت سیاہ پڑ رہی تھی۔

"یہ کیسے ہوا؟ اسے ہوٹل کا کیسے پتہ چلا؟"

"شاید مسز زمر نے گھر میں بتا کھا ہو۔"

"مگر اسے یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ لفٹ میں ہے؟" ہاشم چونکا۔ "وہ جیسے ہی ہوٹل میں داخل ہوا، وہ فوراً لفٹ کی طرف بھاگتا تھا۔ اس نے لوگوں کو اکٹھا بھی لفٹ کی طرف کیا۔"

نوشیر وال نے بہت ساتھوں بدقت نگاہ اور سرسری سا بولا۔ "شاید اس نے اندازہ لگایا ہو۔" ہاشم نے چونک کے اسے دیکھا۔ اور پھر شہر کے دیکھتا گیا۔

"تمہارے پاس آیا تھا وہ۔ کیا وعدہ کیا تھا اس نے تم سے؟ زمر کو بچالو تو کیا دے گا وہ؟ کیس میں معافی؟" نوشیر وال سنائے میں رہ گیا۔ پھر بدقت بولنا چاہا۔

"بھائی، کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ مسز زمر کہاں ہیں۔ میرا تو فون بھی رئیس نے لے لیا۔ اور یاد کریں، آپ نے تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ وہ ہوٹل میں ہے۔ اور پھر میں اسے کیوں بتاؤں گا؟ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔" وہ جلدی میں غیر ضروری صفائیاں دینے لگا۔ مگر ہاشم مشتبہ نظروں سے اسے گھوڑے جارہا تھا۔

"The lady doth cry too much!"

رئیس نے بھی شیر و کونجیدگی سے دیکھا۔

"آپ میرے موبائل لینے سے پہلے با تھرم گئے تھے۔ تب موبائل آپ کے پاس تھا۔"

"اے تم چپ کرو۔" وہ ڈپٹ کر بولا۔ "اگر اپنا پلان فیل ہوا ہے تو مجھے ذمہ دار نہ شہر اور پہلے ہی ساری رات بر باد کی میری۔" اکتا کر کھتا وہ انھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ "میرا فون واپس کروتا کہ میں جاؤں۔ ایک تو تم لوگوں کا ساتھ دو، اوپر سے باقیں بھی سنو۔"

"کیا کسی انسان کے لئے مرتاحی ہوتا ہے؟ Is that worth it? ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بھلکھلوں سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ گردن ذرا دا میں کندھے کی طرف جھکائے سر کے اوپر سرخ رو مال بندھا تھا۔ جس سے سرخ بال کا نوں اور گالوں پر نکل نکل کر گر رہے تھے۔ رنگت سفید زردی پڑ رہی تھی اور آنکھوں میں زمانے بھر کی دیرانی تھی۔ دکھنا۔ صدمہ تھا۔

(ہاشم نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس نے گھنٹوں کے قریب، میز کا نچلا دراز کھول رکھا تھا اور اس میں رکھی کسی کے موبائل یا یہب کی ناکارہ ہینڈز فری دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ہی تھی۔ البتہ جس جگہ نوشیر وال کھڑا تھا، اسے آبی کے گود میں رکھے ہاتھ صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ متین ہوا تھا۔)

"شاید نہیں! اس کی آنکھوں سے آنسوٹ کر چہرے پر گرنے لگے۔ شیر و کی نظریں اس کے ہاتھوں پہنچلیں۔ آبدار نے اسی بڑ کو ایک ہاتھ سے کھینچا تو وہ تار سے الگ ہو گیا۔ اس نے نحاح ایئر بد مٹھی میں دبایا اور ٹوٹا ہوا ہینڈز فری دراز میں ڈال کر اسے اندر ھلکیتی کھڑی ہوئی۔ گلی آنکھیں ہاشم پر جھی تھیں جو بالکل شہر کے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

(میں آبدار عبید ہوں اور میں ایک بڑی لڑکی نہیں تھی۔ میرا بھی ایک دل تھا جیسے آپ سب کا ہوتا ہے۔) مگر زبان سے وہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے اس کے لئے کیا کیا نہیں کیا؟ اپنا پیسہ خرچ کیا، وقت صرف کیا، جان کو خطرے میں ڈالا، جو اس نے ماں گا میں نے لا کر دیا۔ انگلی سے اپنے بینے پر دستک دیتی وہ گلابی آنکھوں کے ساتھ چلائی تھی۔" میں نے اس کے لئے سب کچھ کیا۔ صرف یہی منفرد کیسے کے لئے؟ ہاشم اچنپھے سے اسے دیکھ رہا تھا اور رئیس اور نوشیر وال بالکل سانس رو کے۔

(اور کیا برا کیا میں نے اگر ہمیشہ دل کی سنی؟ دل کی مانی؟ کیا عشق مرضی سے کیا جاتا ہے؟ نہیں۔ یہ تمرض ہے جو یوں لگتا ہے جیسے کسی کو فلووگ جاتا ہے۔ اور کسی کا فلوکنسر بن جاتا ہے۔)

”میں نے سعدی کو نکلوا یا میں نے ان کو میری اسخیوں کے خلاف ثبوت لا کر دیئے فارس کو سری لکھا میں سہولیات میں نے فراہم کیں۔ مگر اس وقت صرف زمر نظر آ رہی ہے۔ وہ کسی اور کو دیکھیں پا رہا۔ وہ اس کے لئے وہ سب نہیں کرے گی جو میں کر رہی ہوں۔ مگر اس کے لئے فارس نے خود کو خطرے میں ڈال دیا۔“

ہاشم کی آنکھوں میں بڑی ابھری۔ لب کھولے پھر بھیخ لئے۔ وہ اب قدم آگے آ رہی تھی۔ (وہ میرا بکھی نہیں ہو سکے گا اور میں نہیں جانتی کہ کسی انسان کے لیے جان دینا یا جان لینا بھیج ہے یا نہیں مگر میرا دل کہتا ہے.... آج میں سب ختم کر رہی دوں۔) اس کے پھرے پے زمانوں کا دکھ اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ ”یہ میں تھی جو اس کی ”جان“ بچانے کے لئے رات کے اس پہر تین قاتلوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ”بند مٹھی سے ایک انگلی نکال کر تینوں کی طرف اشارہ کیا۔“ مگر وہ اس وقت میرے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوگا۔ وہ زمر کا ہے اور وہ زمر کا ہے گا۔ پھر میں نے اس کی غلامی کیوں کی؟“

ہاشم کی آنکھیں ذرا سکڑیں۔ ”تم نے بتایا اس کو؟“ اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

(آج میرا من کہتا ہے کہ جہاں اتنا کیا ہے اس کے لیے دہاں ایک آخری بازی بھی لگا دوں۔)

”مگر میم میں نے آپ کا فون پہلے ہی لے لیا تھا۔“ ریس بھی چونکا۔

”مجھے اپنے ہوٹل کی لفٹ پہچان کر فارس کو زمر کی لوکیشن بتانے کے لئے کسی فون کی ضرورت نہیں جب کہ میرے پاس اس کا دیا گیا بگ موجود تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے مٹھی کھوئی، اسی بڑھا لگیوں میں پکڑ کر ان کو دکھایا اور اس سے پہلے کہ کوئی حرکت کرتا، آپی تیزی سے ایکویریم تک آئی، اسی بڑھا نتوں میں ڈال کر کچلا، پھر ایکویریم پہلے چہرہ جھکا کر اندر تھوک دیا۔ تو تاہو والا اسی بڑھا پانی میں دو باتا گیا۔

ہاشم دھک سے رہ گیا۔ ”تم... تم یہاں ہوئی ساری گفتگو اس تک پہنچا رہی تھی؟“ اسے یقین نہیں آیا۔

(اگر میں ہمیشہ بری ہی تھی تو آج میرا دل کہتا ہے کہ ایک برا کام اور کرو۔ عجیب بات.... میں اب بھی اپنی دنیا اور اپنی آخرت نہیں سوچ رہی۔ میں اس انسان کا سوچ رہی ہوں۔ یہ عشق تو غلامی ہے غلامی۔)

نوشیر والے نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے، مگر آواز پھنس گئی۔ وہ بگ نہیں تھا وہ تو اسی شکل کا عام سماں ایک پیس تھا مگر وہ نہیں کہہ سکا۔

”ہاں۔ اسے شیر و نہیں“ میں نے بتایا ہے کہ زمر کہاں ہے۔ میں نے فارس کی ”جان“ بچائی ہے۔ میں نے!“ سینے پٹھی سے دستک دیتی وہ زور سے چلائی تھی۔ ریس اس اٹھا، تاکہ ایکویریم سے بذکار لے گرروہ دونوں اس ایکویریم کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ دیں تھہر گیا۔ سمجھنہیں آیا کہ کیا کرے۔

”آپی!“ اس کے مقابل کھڑے ہاشم کی آنکھوں میں صدمہ اتر۔ تحریر بھرا صدمہ۔ ”تم نے کیوں.....؟“

”کیا میں جانتی تم نے مجھے کیوں بلا ریا ادھر؟ تم مجھے انتخاب کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ تم میرے سامنے ایک عورت کو مار کر مجھے ڈرانا چاہتے تھے۔ تم اس طرح مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے ساری زندگی کے لئے خوف میں بنتا رکھنا چاہتے تھے۔ تم ہاشم... تم مجھے اپنا غلام بناتا چاہتے تھے۔ آج وہ مر جاتی تو میں تمہاری دہشت اور رعب کی غلام بن جاتی۔“ اس نے ہتھیں سے گیلا چہرہ رگڑا اور نفرت سے اسے دیکھا۔ ”تم میری فارس کے لئے محبت کو خوف کی تھیکی دلا کر سلانا چاہتے تھے۔ کیا یہ تمہیں اتنا آسان لگتا ہے؟ محبت کو undo کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا ہاشم۔ مگر میں نے اس سے محبت نہیں کی۔“ وہ وقدم مزید قریب آئی۔ ہاشم لب بھنپنے ناگواری مگر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہو۔ اے سانس لے رہا تھا۔ وہ سرخ آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر غرائی۔

”میں نے اس سے عشق کیا ہے۔ عشق غلامی ہے۔ مجھے اس زندگی میں اس سے کبھی آزادی نہیں مل سکتی۔ تم مجھے اس سے آزاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تم مجھے ایک دوسری غلامی میں ڈالنا چاہتے تھے۔ ادہ بام، تمہیں کیا لگا تھا؟ میں ڈرجاؤں گی؟ تمہاری غلام بن جاؤں گی؟ اس کو سوچنے اور اس سے بات کرنے سے بھی ڈرنے لگوں گی؟ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا، اسی خوف سے اس کو چھوڑ دوں گی؟“

چنگاریوں سے دیکھتی آنکھوں سے اسے دیکھتے آپ نے فتحی میں سر بلایا۔  
(اور آج میں یہ جان گئی ہوں کہ انسان کی غلامی نہیں کرنی چاہیے مگر میں اس چھوٹی لڑکی جیسی بہادر نہیں ہوں۔ میں خود کو اس پہنچ سے آزاد نہیں کر سکتی۔)

وہ اسی طرح دھیرے دھیرے سانس لیتا اسے دیکھے گیا۔ بنا پلک جھکے۔ بنا بلے۔ بنا بولے۔

”تم نے میری جان بچائی تھی، مجھے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ مگر میں نے تمہیں سیجا نہیں مانا۔ موت کا فرشتہ مانا۔ موت کا فرشتہ کہا۔ گریم ریپر۔ جو موت باشنا ہے۔ ایک عجیب ساموت کا احساس تھا جو تمہارے ساتھ تختی ہو گیا تھا۔ ہم ایک تکون بن گئے تھے۔ میں تم اور موت۔ جب بھی تم یہاں ہوتے، میں تمہیں دیکھنے آتی تاکہ موت بھاگ جائے۔ ہم تینوں اس تکون میں قید تھے۔ میں تم اور موت۔ پھر وہ آیا اور میں نے اس کو اپنی تکون میں ڈالنا چاہا۔ پرونا چاہا۔ نہ تم جانے پتیار تھے نہ موت جانے پتیار تھی۔ اسے ہی کھانا پڑا۔ اس نے بازو لمبا کر کے میز پر کھلی اسکرینوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ چلا گیا۔ وہ اپنی زندگی کے ساتھ اس تکون میں سے نکل گیا۔ ہم تینوں پھر سے اس میں رہ گئے۔ قید۔ مگر آج میں اس قید کو توڑ کر آزاد ہوں چاہتی ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں ہاشم کہ ہماری فیری ٹبل کے بھیڑ یہ تم ہوا“ وہ درد سے پھٹی آواز سے چلا تھی۔ آنکھوں میں خون اتر اتھا۔ وہ بلکہ بلکہ سے سانس لیتا سنتا گیا، اسے دیکھتا گیا۔

(اور کتنی عجیب بات ہے کہ میں اسے بھیڑ یا کہہ رہی ہوں مگر اندر سے وہ مجھے عزیز بھی تھا تب ہی تو میں نے کبھی اسے اپنی قید سے

آزاد نہیں ہونے دیا۔ قیدی کے برے لگتے ہیں؟)

ایکویریم کے پانی میں جگہاتی روشنیوں کا عکس آبدار کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ وہ عجیب سی لگ رہی تھی۔ ”تم ہو ہر منٹے ہر فساد کی وجہ۔ تم نے ہم سب کو برباد کیا ہے۔ وہ تمہاری ماں تھی جس کی وجہ سے میری ماں مری۔ اور جیسے سعدی نے کورٹ میں بتایا۔ کرنل خاور کی زندگی بھی تم لوگوں نے برباد کی۔ باقی سب سے زیادہ تم تصورو اوار ہو۔ مجرم ہو۔ تم نے وارث غازی کو مارا۔ ڈاکٹر سارہ اور اس کی بیٹیوں کو بتاہ کیا۔ تم نے زمر کو بتاہ کیا۔ فارس کو بتاہ کیا۔ نوشیر واں نے تو سعدی کو زخمی کیا تھا، مگر تم نے اس کو اتنے میسینے قید رکھ کے ہتھی مریض بنا دیا۔ تم نے خاور کو بھی برباد کیا۔ تم نے ہی اس چھوٹی لڑکی کا دل دکھایا اور نہ وہ کورٹ میں یوں نہ بولتی۔ تم نے سعدی کی ماں کا دل دکھایا۔ تم نے میرا دل توڑا۔ تم نے اپنے ہی بھائی کو بگاڑ کے رکھ دیا۔ مجھے کہتے ہو کہ فارس اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا؟ نہیں ہاشم۔ انسانوں کے بس میں حفاظت کرنا نہیں ہوتا، مگر عزت کرنا تو ہوتا ہے۔ وہ اپنی عورتوں کی عزت تو کرواتا ہے۔ اپنے نہیں کرو سکتے۔ تم نے اپنی ماں کو کچھری میں رپورٹر کے سوالوں کے سامنے تنہا چھوڑ دیا۔ تم نے اپنی بیوی کو بتاہ چھوڑ دیا۔ تم نے اپنی بہن کو بیل میں سڑنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پورا شہر جانتا ہے کہ اصل بھیڑ یہ تم ہو۔ اصل قاتل، اصل گناہ کار تم ہو۔ بس کر دو یہ لگٹ کی باتیں۔ مجھے افسوس ہے مجھے دکھ ہے، میں کر دو یہ سب کہنا۔ تم جھوٹ بولتے ہو کہ تمہیں افسوس ہے اپنے گناہوں کا۔ تمہیں کبھی افسوس نہیں تھا۔ تم جھوٹ ہو۔ عدالت میں جھوٹ بول بول کر اپنے جھوٹ تمہیں سچ نہیں ہوتا۔ تمہیں... کوئی... گلت... نہیں ہے ہاشم۔ تمہیں کوئی پچتا و انہیں ہے۔ اور تم نے کبھی بھی اپنے خاندان کو بچانے کے لئے خاندان کی حفاظت کرنے کے لئے نہیں کیا۔ تم نے جو بھی کیا، اپنی طاقت قائم رکھنے کے لئے کیا۔ حب جاہ کے لئے کیا۔“ وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔

(اور میں نے جو کیا جب چاہ کے لئے کیا۔ جاہ اور چاہ میں فرق ہوتا ہے۔ مگر دونوں کی ہوں انسان کو ہراتی ہے۔ میں بارگئی ہوں مگر

جیتنے ہاشم کو بھی نہیں دوں گی۔ آج میں اگر کامیاب ہوئی تو فارس کے سارے مسئلے ختم ہو جائیں گے۔)

”تم بھیڑ یہ ہو، اور تمہاری ساخت ہی ایسی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کو ہی کھا سکتے ہو، تم معصوموں کا خون پینے ان کا دل نکالنے اور ان کا جگر کاٹنے والے بھیڑ یہ ہو، تم ایک ایسے شیطان ہو جس کا ب و قت آ بگایا ہے کہ ختم کر دینا چاہیے...“ چلا چلا کر بہیانی انداز میں بولتی آبدار ایک دم میز کی طرف لپکی، پسپر نائف اٹھائی اور ہاشم کے سینے میں گھسانی چاہی مگر ہاشم نے چاہک دستی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر مردڑا۔ وہ پورا زور لگا رہی تھی مگر ہاشم نے اسے موڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کو گردن کی پشت سے دبو چا اور اس کا چہرہ ایکویریم میں پوری قوت سے ڈبو دیا۔

(اور اگر میں ناکام ٹھہر تی ہوں تو بھی فارس کے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ پھر کیا ہو جو میں اپنے دل کی مان لوں؟ اس دل کی جو میری مانتا ہی نہیں۔)

نوشیر وال چلا کر بڑھا تھا، مگر میں نے فوراً سے اسے دبوچ کر روک دیا۔

”بھائی.... اسے چھوڑو.... وہ مر جائے گی۔“ وہ بدقت رئیس کوہنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے آگے نہیں بڑھنے دے رہا تھا۔ مگر اس کی مزاحمت شاک کے نیڑا اثر بکلی تھی۔ پھری پھٹی آنکھیں اس طرف جبی تھیں، جہاں وہ آبی کو گردی سے پکڑے پانی میں اس کا سرڈ بوئے ہوئے تھا۔

آبدار کے ہاتھ ایکویریم کی دیواروں پختی سے جنم تھے اور وہ سراہدھر پانی میں ہلانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اس پر جھکے، اس کو اندر کی طرف دھکلتے ہاشم کی قوت زیادہ تھی۔ چاقو کب کا نیچے گرچکا تھا۔  
(اور میں کبھی نہیں تسلیم کروں گی کہ میں ایک بری لڑکی تھی۔ میں بری نہیں تھی۔ میرا دل برآ ہو گیا تھا۔ اور دیکھو.... میں اب بھی اسی آدمی کو سوچ رہی ہوں۔ کیا یہ عشق ہے یا کوئی آسیب؟)

”سب کچھ کیا میں نے تمہارے لئے... اور تم نے اس کے لئے مجھے دھوکہ دیا....“ وہ سرد سرخ آنکھوں سے غراتے ہوئے اس کا سر پانی میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ نوشیر وال اب پھر پھر انہیں رہا تھا۔ ششدز ساکت کھڑا تھا۔ آبی چلا رہی تھی۔ ہاتھ پیر مار رہی تھی مگر سب بے سود تھا۔

”میں نے تمہاری جان بچائی تھی.....“ اس کے ڈوبے سر کے قریب جھک کر، مسلسل نیچے کی طرف زور لگاتے وہ زور سے چینا تھا۔  
”تمہاری زندگی پر سب سے بڑا حق میرا تھا۔ اور تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ تم نے اس کے لئے مجھے دھوکہ دیا۔“ آبدار کی دبی آواز یں سنائی دیتی تھیں۔ وہ پانی میں ادھر ادھر ہلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

(اور میں کوئی پہلی دفعہ مر نہیں جا رہی۔ میں آبدار ہوں۔ پانی سے بنی۔ میں ایک دفعہ پانی میں پہلے بھی مر چکی ہوں۔ مگر اس وقت چند سوال ادھورے رہ گئے تھے۔ آج ان کے جواب مل جائیں گے۔ کم از کم اب میں نیوڑل نہیں رہی۔ میں نے ایک سائیڈ چمن لی تھی۔ میرے دل کی سائیڈ۔ کم از کم اب وہ نورانی وجود مجھ سے ناراض نہیں ہو گا.... اور دیکھو میں اپنی ماں کی روح کو یہاں سے بھی دیکھ سکتی ہوں۔ ہاں اب میں اس کے علاوہ بھی کچھ سوچ رہی ہوں....)

پھر اس کے شیشے کی دیواروں پر جنمے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ جسم کو ہلکے سے جھکلے آئے۔ مزاحمت کم ہوتی گئی۔ ہاتھ نیچے گر گئے۔ ایکویریم کے پانی میں خون کی بوندیں شامل ہوئیں۔ آبی کا سرخ رومال کھل کر پانی میں بہہ گیا۔ اس کا سر بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔  
(لیکن میں تمہیں بتاؤں.... انسان کے عشق میں جان دینا صحیح ہوتا ہے یا نہیں.... مگر اس کی اجرت کسی جہاں میں نہیں ملتی۔)  
ہاشم نے اسے گردن سے کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔ ہونٹ جامنی تھے۔ آنکھیں ساکت تھیں۔ ہاشم نے اس کی گردن

چھوڑ دی۔ وہ پورے قد سے زمین پا آگئی۔ بے جان.... ساکت.....

نوشیر وال پلٹا اور با تھروم کی طرف لپکا۔ دیواروں کا سہارا لیا۔ لیپ کو تھاما۔ لیپ نیچے گر گیا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ قدم لڑکھ رہے تھے۔ با تھروم کا دروازہ کھولا۔ پکڑتے، شولتے، وہ ڈگھا تے قدموں سے سنک کے قریب آیا۔ اس پر جھکا تو مند سے ق نکلے گی۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکلنے لگے.....

نیم روشن آفس میں خاموشی چھائی تھی۔ ریس با لکل ششدہ، چپ کھڑا تھا۔ اور ہاشم کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کی شرٹ اور بازو گیلے ہو چکے تھے۔ پھر وہ میز تک آیا۔ ٹوپا کس سے ٹوپا ہر کھینچے۔ چہرے پر گرے چھینچے صاف کیے۔ گردن اور گر بیان سے پانی کی بوندیں صاف کیں۔ نشوپرے اچھا ل۔ تھہ شدہ آستین آگے کوکھونے لگا۔ کلائی تک لا لایا۔ کف کے بٹن بند کیے۔ اس کی رنگت سفید تھی، برف جیسی۔ سارے تاثرات جم گئے تھے، گلیشیر ہو گئے تھے۔ سپاٹ، سرد۔ اس نے گردن جھکائے، ٹائی کی گردہ کسی۔ پھر اسٹینڈ سے کوت اٹھا کر پہنا۔ نادیہ شکنیں درست کیں۔ ذرا سا کالر جھاڑا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور ان کو گویا درست کیا۔ مو بال جیب میں ڈالا۔ اب کے مڑا تو آبدار کا بے جان وجود فرش پر گرا نظر آیا۔

”کیا اس کے گارڈز باہر ہیں؟“ اس نے بد لی ہوئی ٹھنڈی ہموار آواز میں پوچھا۔ ریس نے اثبات میں سر ہلا کیا۔ ”جی۔ ان کی کار ان کے ساتھ آئی تھی۔“

”کتنے ہیں؟“ وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا اور نہیں بھی لگ رہا تھا۔  
”تین۔“

”اور گھر میں کتنے لوگوں نے اسے ہماری کار میں بینتے دیکھا تھا؟“  
”چار ملازموں نے۔ وہ ان کے علاوہ ہیں۔“

”کل ہوئے سات۔ ان ساتوں کا بندوبست کرو۔ ان کو خرید لو یا خاموش کر دو۔ آبدار آج رات یہاں نہیں آئی۔ وہ راول لیک کئی تھی۔ اسے موت اور ڈوبنے کی obsession تھی۔ وہ راول لیک میں ڈوب کر خود کشی کر لیتی ہے، اور دو آدمی... تمہارے کوئی سادہ دکھنے والے آدمی..... اس کی لاش ہپتال لے کر جاتے ہیں۔ سرکاری ہپتال۔ وہاں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر آف فتاب و اسٹٹی اس کا پوست مارٹم کرے گا اور لکھے گا کہ موت جھیل میں ڈوبنے سے ہوئی۔ ہارون شہر سے باہر ہے اس کے آنے سے پہلے رپورٹ تیار ہو جانی چاہیے۔ کل دو پھر میں جنازہ ہو جائے گا۔ میر اسیاہ شلوار سوٹ تیار کروادیں۔ اور اب تم اس سارے میں کو صاف کرو۔ اشارہ فرش پر گری آبی، پانی، لڑکے فلور لیپ وغیرہ کی طرف کیا۔ پھر آبدار کے ساتھ سے نکل کر ایک بیوی یہم تک رکا۔ اس کی سطح پر تیرتا سرخ ریشمی رومال اخھایا، مٹھی میں بھینچ کر نچوڑا، اور اسے کوت کی جیب میں ڈال لیا۔ قدم قدم چلتا دروازے تک آیا تو نو شیر وال با تھروم سے نکلا دکھائی دیا۔ اس کا گلیا چہرہ یرقان کے مریض جیسا دکھتا تھا، اور آنکھوں میں بہت سا غم تھا۔ ”اس کی جان کیوں لی؟“ وہ باد بسا چینجا تھا۔ ہاشم نے کندھے اچکائے۔

”کیونکہ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے افسوس نہیں ہے۔ دس دفعہ موقع ملے، میں دس دفعہ یہی کروں گا!“ وہ جان چکا تھا، سورسری سے انداز میں اطلاع دی اور باہر نکل گیا۔ لفت کی طرف جاتے اس کے قدموں میں ذرا سی لرزش تھی، اور چہرہ مردوں کی طرح سفید تھا۔ آنکھیں بے جان تھیں۔

قصیر کاردار کے لاڈنچ کی سینہ ہیاں چڑھتے ہوئے وہ ٹائی ڈھیلی کر رہا تھا۔ اپنے کرنے میں جانے سے پہلے وہ سونی کے کمرے کے باہر رکا، اور دروازہ کھولا۔ وہ اندر رجاح میں دکھی سوتی دکھائی دے رہی تھی۔

”تم اور میں۔ ہم اکیلے ہیں سونیا۔ مجھے سب نے دھوکہ دیا ہے۔ می، شیر و سعدی، آبی۔ سب نے مجھے میری محبت کی سزا دی ہے۔“

انہوں نے مجھے بھیڑ یا بنا دیا ہے، اور اب میں ان کو دکھاؤں گا کہ بھیڑ یا کیا ہوتا ہے۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہے، مجھے کوئی پچھتا وہ نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ میں نے خود کو دریافت کر لیا ہے۔ میں نے سارے رشتے کھو دیے ہیں، سو اسے تمہارے سوں۔ گراب مرید میں ان کو بیٹھنے نہیں دوں گا۔ یہ مجھے جتنا ہر اسکتے تھے، انہوں نے ہرالیا۔ "سوں کو دیکھتے ہوئے وہ زیر لپ ہر بڑا رہا تھا۔

"But I am not going down without a fight"

اس نے ایک عزم سے دروازہ بند کیا، اور اپنے کمرے میں آیا۔ کوٹ اتارا اور وہ گلہا سرخ رومال بیند سائیڈ ٹبل پر پھیلا دیا۔ پھر میڈی یعنی کیفیت کھوئی۔ نیند کی گولیوں کی ڈلبی رکھاں، چند گولیاں چھاکیں، اور بغیر پانی کے نگل گیا۔ اب وہ بیند پر بیٹھا جھک کر جوتے اتار رہا تھا۔ اس کے لب ایک ہی فقرہ بڑا رہے تھے۔

"I am not going down without a fight"



## باب: 29 شہمات

”میں تمھیں ایک بچتے کی بات بتاتی ہوں، لڑکی!“

ملکہ نے بہت تفاخر سے کہا تھا۔

”اور وہ یہ ہے کہ.....

ہر فیری ٹیل کا

خوشگوار انعام

نہیں ہوتا۔“

وہ چند قدم چل کر قریب آئی

اور ملکے کے کان میں بولی۔

”آپ نے درست فرمایا تھا ملکہ عالیہ!

یہ ضروری نہیں ہوتا کہ

ہر فیری ٹیل کا

خوشگوار انعام ہو۔

لیکن ایک بات طے ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ.....

ہر فیری ٹیل میں.....

ہر ظالم ملکہ.....

اپنے ہرے انجام کو

ضرور پہنچتی ہے۔“

(شوڈار اندر)

صحیح کی تیلی روشنی سارے میں پھیل رہی تھی۔ اس پر یقین ڈائنگ رومنگ کی کھڑکیوں سے نیلا جھٹ سے ڈھکالاں نظر آتا تھا جس میں پرندوں کے بولنے کی آوازیں کسی مدد نہ فتح کی مانند گونج رہی تھیں۔ ڈرائیگ رومنگ میں وہی تینوں ملازم احرا اور سعدی گوبجا کر ان کو گھورتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔ اور اب وہ دونوں دہائیں تھا تھے۔

احمر کا لباس داغدار اور میلا کپیلا لگتا تھا۔ آستین چڑھائے، لکھرے بال، تین راتوں سے جاگتے رہنے، اور تشدید ہٹنے کے آثار چرے پہ شدید تھکن اور اضطراب کی صورت نمایاں تھے۔ سعدی بھی تھکا ہوا تھا، مگر احرم کی نسبت کافی بہتر تھا اور چونا سا بیٹھا رکھ رکھا جائزہ لے رہا تھا۔

”پولان کیا ہے؟“ تھکے تھکے بے زار سے احرم نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

”پلان ہے تو آیا ہوں نا، ورنہ اتنا اچھا نہیں ہوں کہ کسی کے لئے یوں خطرے میں کوڈ پڑوں۔“

بار بار کے ایک ہی سوال سے وہ بھی اکتیا۔ احرم نے سر دنوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اسے شدید پریشانی ہو رہی تھی۔ سر الگ پھٹ رہا تھا۔

چوکھٹ پہ آہٹ ہوئی تو دنوں چونکے۔ پھر بے اختیار لکھرے ہو گئے۔

صاحبزادی صاحبہ سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ فتحی چادر سیلیقے سے سر پہ اوڑھے ایسے کہ بالوں کا ہمیر اسٹائل، کانوں کے بندے، اور گردن کا زیور صاف نظر آ رہا تھا، (آخر یہ سیاسی عورتیں دو پڑھ کرتی ہی کیوں ہیں اگر کچھ بھی ڈھکنا نہیں ہوتا۔) وہ شاہانہ سے انداز میں مقابل بڑے صوفے پہ بیٹھی۔ ٹانگ پٹانگ جماں۔ اور تمکنت سے ساتھ کھڑے ملازم کو اشارہ کیا جس نے وہ سیاہ بیگ میز پر رکھ دیا اور پھر باہر نکل گیا۔

”یہ زیورات لے کر میں تمہیں چھوڑ دوں گی، کیا یہی سمجھا تھا تم نے؟“ سرمئی آنکھوں میں چھین لئے احرم کو دیکھا تو اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ شرمندگی سے نہیں، شاید مصلحت سے۔ صاحبزادی صاحبہ نے نظروں کا رخ سعدی کی طرف پھیرا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ سادگی تھی۔ البتہ آنکھوں میں چمک بھی تھی۔

”آپ یہ زیورات رکھ سکتی ہیں، لیکن ہم دنوں کو آپ کو چھوڑنا ہی ہو گا۔“

”ہوں!“ اس نے غور سے سعدی کو سر سے پر تک دیکھا۔ ”تم نے اپنی ای میل میں لکھا تھا کہ تم احرم کے فیٹ میں جا رہے ہو جہاں میرے آدمی نا دانتگی میں تمہیں یرغمال بنالیں گے اور چونکہ تم مشہور ہو چکے ہو تو مجھے تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ بلکہ تمہاری آفرینشی چاہیے۔ سوبولو، تمہیں کیا کہنا چاہیے؟“

”احمر کو جانے دیں۔ حفاظت اور امن سے اور دوبارہ اس کا بھی پیچھا نہ کریں۔“ وہ سنجیدگی سے شرائط سامنے رکھ رہا تھا۔ احرم نے پوری گردن گھما کر سعدی کو دیکھا۔ پلان کیا تھا آخر؟

وہ دھیر سے سہن دی۔ ”اس کو جانے دوں؟ جس نے میرے خلاف میڈیا میم چلائی۔ مجھے میرے خاندان نے شہر بدر کر دیا۔ میرا کیریئر ہونے پا آ گیا۔ اور تم کہتے ہو کہ میں اس کو جانے دوں؟“

”سیاست کوئی ہفتہ دار کھیل نہیں ہوتا کہ کسی اسکینڈل کسی کیس سے کوئی تباہ ہو جائے۔ آپ کا کھیل جاری رہے گا۔ اور اس نے جو بھی کیا، وہ اپنی مالکن کے کہنے پر کیا۔ آپ اس کی مالکن سے حساب کیوں نہیں لیتیں؟ اگر میں آپ کو اس کی مالکن کا کچھ لا کر دوں تو؟“

”یہ زیور۔ یہ میشہور زمانہ زیورات ہیں ناجوہارون عبید کی بیوی کے تھے اور غائب ہو گئے تھے؟ یا ب جو اہرات کو چاہیے ہیں نا؟ ان زیورات کے لئے میں تمہارے دوست کو کیوں چھوڑوں گی جبکہ میں ان کو حاصل کر چکی ہوں۔“ اس نے تفاخر سے کندھے اپکائے تھے۔ احرم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ (گھاٹر بک بھی دے پلان کیا ہے؟)

”میں نے کہا تا، زیورات آپ رکھ سکتی ہیں، میں ان کی بات نہیں کر رہا۔“ وہ احرم کی گھوڑیوں کو نظر انداز کر رہا تھا۔

”پھر؟“

”مسز کار دار آج کل ہاشم کے زیر عتاب ہیں، اور ہاشم ان سے تنفر ہے۔ وہ اس کا دل دوبارہ جیتنے کی کوشش کر رہی ہیں۔“

احمر نے پھر مضطرب سے ہو کر سعدی کو دیکھا۔ (یہ تو تجھے رات کو میں نے بتایا ہے بے غیرت۔ اپنا کیا لایا ہے تو؟) مگر وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ اس وقت ہاشم سے ذرا سابھی بگار لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ان کے ہاتھ میں نہ مال ہے نہ اولاد۔ وہ بالکل بے بس ہیں، تو آپ ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں۔“

صاحبہ کی بھنوں دلچسپی سے اکھٹی ہوئیں۔ ”اور وہ کیسے؟“

”آپ کوئی پیشہ ور مجرم ہیں نہیں۔ یہ اپنے ڈارائیور اور مالی ٹاپ لوگوں سے آپ نہ لوگوں کو بلیک میل کر سکتی ہیں نہ انغو اور قتل۔ آپ ایک، معذرت کے ساتھ، پیچکل خاتون ہیں، تو عورتوں والی لڑائی لڑیں تا جوز بان سے لڑی جاتی ہے۔ طعنوں، طنز، اور جیخ و پکار کر کے۔“

”تم کچھ جلا، نجت ہو جو اہانت کے مارے میں؟“ وہ ذرا آگے کو ہوئی۔

”میں یہ جانتا ہوں کہ اس نے کچھ ایسا کیا ہے جو اس کے بیٹوں کو نہیں معلوم اور اگر پتہ چل گیا تو وہ ان دونوں کو کھو دے گی۔“  
”ہوں۔ ایسا کیا ہے؟“  
احر نے چوک کراہے دیکھا۔ وہ بھی مزید دلپتی سے آگے ہوئی۔

”آپ کے قبیلے کے لوگ اپنے وعدے سے نہیں پھرتے۔ پہلے ہم سے وعدہ کریں کہ اگر میں وہ بتا دوں تو آپ ہمیں جانے دیں گی۔“ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔ ”زندہ سلامت۔“

”اگر وہ معلومات کسی لائق ہوئی تو ضرور میرا وعدہ ہے۔“

"صاجز ادی صاحبہ۔" سعدی ہلکا سامسکرایا۔ "ہر معلومات کی اچھی بھلی قیمت ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے وعدے سے پھر میں تو میں نے غازی کو بھی میں کر دی تھی، وہ ہم دونوں کو دیکھنے کا یہاں سے، مگر میں اس تسلی کے ساتھ جانا چاہتا ہوں کہ آپ احمد کو کچھ نہیں کہیں گی دوبارہ۔"

"چلو۔ وعدہ کیا۔ اب بتاؤ۔"

کمرے میں چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ احمد کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا سعدی کیا کہنے جا رہا ہے۔

”جو اہرات کاردار نے اسے شوہر کا قتل کیا۔ ہاشم اور نو شیروال کے باپ اور نگزیب کاردار کا۔“

لمح بھر کو مرے میں ہوا کے ساتھ سانسیں بھی ساکن ہو گئیں۔

”اور اس کے ملئے نہیں جانتے؟“ وہ سانس روکے بولی۔

”نهیں!“ وہ دونوں ایک ساتھ بولے اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرا کیسے جانتا تھا، دونوں نے سوچا۔ صاحبزادی صاحبکی آنکھوں میں ایسی چپک ابھری جو میز پر رکھے زیورات سے زیادہ آنکھیں چند ہی دینے والی تھی۔

”باطور خان....“ اس نے جذبات سے مخمور آواز میں زور سے آواز لگائی۔ ملازم بھاگ کتا ہوا آیا۔

”ناشیتہ تیار کرواؤ اور پھر گاڑی لگواؤ۔ ہمارے مہمان ناشتے کے بعد واپس چلے جائیں گے، تب تک میں ان سے کچھ بات کر لوں۔“ خوشگوار مودہ میں اس کو باتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً مودب سالپٹ گیا۔ اب وہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیا ثبوت ہے اس کا؟"

”ہبھت تو نہیں کرنا آپ نے عدالت میں۔ صرف اس کے بیویوں کو بتانا ہے۔ آگے جواہرات کا چہرہ بتادے گا کہ وہی قاتل ہے۔“

سعدی نے اطمینان سے کہا تو احمد نے جلدی سے اضافہ کیا۔ ”مگر ہم آپ کو وہ واقعات بتا سکتے ہیں جو اس قتل کے آس پاس یا اس کی وجہ سے

ہوئے، آپ ان کا ذکر کریں گی ہاشم کے سامنے وہ مان جائے گا۔

”گلڈ۔“ وہ مسکرا کے پیچھے ہوئی۔ ”میں سن رہی ہوں۔ تم بولتے جاؤ۔“

ڈیڑھ گھنٹے بعد جب صبح پوری طرح روشن اور چمکدار ہو چکی تھی، وہ دونوں احرار کی فلیٹ بلڈنگ کے سامنے کھڑے تھے اور جو کار ان کو عزت و اکرام سے ادھر چھوڑ کے آئی تھی، وہ اب زن سے آگے بڑھ گئی تھی۔ احرار کی طرف گھوما اور ایک دم غصے سے اسے دیکھا۔

اب جواہرات سے کیسے بچیں گے ہم؟ ان کا اتنا بڑا راز کھو دیا ہے تم نے۔ میں بھی بھی ان کو ایسا دغا نہ دیتا اگر تم نہ بات شروع کرتے۔“

”اوہ بالکل، تم ان کو لوٹ سکتے ہو، ان کا مال لے کر بھاگ سکتے ہو، مگر ان کو دغا نہیں دے سکتے۔ نھیک ٹھیک۔“

”بک بک نہ کرو۔“ اس نے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور جیسے اضطراب کم کرنا چاہا۔ ”اب میں جواہرات کا کیا کروں گا؟“

”جیسے کہ میں جانتا ہی نہیں کہ تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔ ویسے ایسے موقعوں پر جان بچانے والے کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔“

سعدی نے قدرے خفگی سے یاد دلایا۔ احرار کے نئے تاثرات ڈھیلے پڑے۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پامڈ آئی۔ ”شکریہ۔ اب کیا کچھ کھلا دیں تھیں؟ صحیح والا ناشتہ؟ نہ کہ وہ خوف والے ماحول جیسا ناشتہ۔“ جھر جھری لیتے اس نے جیب پر ہاتھ رکھا۔

”جو والت انہوں نے تمہارا واپس کیا تھا احرار، وہ تمہاری اس پاکت میں نہیں ہے۔ ملکہ دوسری میں ہے۔“

”احرر کا ہاتھ رک گیا، مگر مسکراہٹ کھری ہو گئی۔“ ”تم بدل گئے ہو، پڑا بواۓ!“

”I learned from the best!“

وہ بھی سادگی سے مسکرا یا تھا۔ دونوں اس خوشگوار صبح میں کھلے آسمان تلے عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔

”پھر تم یہاں سے بھاگ رہے ہو یا نہیں؟“ سعدی نے پوچھا ہی لیا تھا۔ وہ جوتے سے زمین کو مستار سر جھکا کے بولا۔

”There are three ways for a person to disappear. The first is to die. The

second is to lie. And the last is to be reborn.“

اور پھر ٹھہر کے بولا۔ ”ولیم شیکسپیر۔“ سعدی نے مسکرا کے اثبات میں سربا لیا۔

”میں بھیج گیا۔ اپنا خیال رکھنا۔ اب میں چلتا ہوں۔“ احرار نے اس کا شانہ جو با تھی پھیلایا اور مسکرا کے بولا۔ ”تم بھی شادی کر لینا۔“

وہ الوداعی ملاقات کی بھی جذباتی سین کے بغیر ختم ہوئی اور وہ دونوں محض گلے ملے پھر ہاتھ ملا یا اور سعدی پارکنگ اپریا کی طرف بڑھ گیا۔ اپنی کار میں آ کر بیٹھا تو دیکھا، موبائل زوں زوں کر رہا تھا۔

”امی، میں آ رہا ہوں گھر اور نہیں، میں نے کورٹ میرج نہیں کر لی، آپ بے فکر ہیں۔“ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے خوشگوارت

انداز میں بولا تھا، مگر دوسری طرف کے الفاظ ان کروہ دھک سے رہ گیا۔ ”زمر؟ کیا ہوا زمر کو؟ کس بآسپیل میں؟“

..... ♦♦♦ .....

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ نہیں ہوتی ..... وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پچانی نہیں جاتی

ہپتال کا وہ کمرہ خاموش سر دسالگتا تھا۔ میز پر کئے تازہ پھولوں کی خوشبو نے مگر اسے معطر کر رکھا تھا۔ یہ پھول نہیں لائی تھی، اور خو، جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا اس وقت کوئی نہیں تھا۔ وہ یوں چلتی لیتی تھی کہ سر ہانے سے بیدا ٹھہرا ہوا تھا، سوتکیوں پر رکھا سرا نچا دکھائی دیتا تھا۔ ہاتھ پہلو میں رکھے تھے اور ان پنالیاں لگی تھیں۔ چند ایک خراشیں، گلا خراب، بخار، شاک۔ اس سے زیادہ اسے پچھہ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دیکھنے میں ذرا روزگر پر سکون نظر آ رہی تھی۔

بیڈ پر اس کے قریب بیٹھا، اسے دیکھا فارس تھا تھکا سا چڑھے لیے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھا۔ فکر مندی سے اسے دیکھ رہا

تھا۔ ”زمر!“ پھر زمی سے پکارا۔ زمر نے نظریں پھولوں سے ہٹا کر اس کی طرف موڑیں۔ ملائمت مے مسکرائی۔ بولی کچھ نہیں۔

”شادی کی سالگردہ مبارک ہو۔“ جانے کس دل سے اس نے کہا اور وہ بھی کس دل سے مسکرائی تھی۔

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ رات والے لباس میں تھا۔ آستینیں اسی طرح چڑھا رکھی تھیں۔ چہرے پر تھکن سے زیادہ فکر تھی۔

”ہوں!“ اس نے لیٹئے لینے سر کو ذرا سی جبنتش دی۔

”میں بہت ڈر گیا تھا۔ مجھے لگا میں تمہیں کھو دوں گا۔“

وہ اسی طرح اسے دیکھے گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ بیوں پر مسکراہٹ برقرار رہی۔

”تم بھی ڈر گئی تھیں؟“

”ہوں!“ اس نے پھر سے سر کو ختم دیا۔

”اب ہمیں طور پر کیا محسوس کر رہی ہو؟“ فارس نے بات کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

”ہوں!“ اس نے ساتھ ہی ذرا سے شانے اچکائے۔ گویا ٹھیک ہوں، کہہ رہی ہو۔ فارس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

”تمہاری آواز تو ٹھیک ہے نا؟ کیا گلا بیٹھ گیا ہے؟ تمہیں بہت چلانا پر ابھوگا ہے نا۔“

”اوہہ!“ اس نے دھیرے سے نفی میں سر بلایا۔ جانے وہ تمیں میں سے کس بات کا جواب تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ چند لمحے فضا میں خاموشی پھولوں کی مہک سے لپٹی، ساکن کھڑی رہی۔ وہ بار بار لب کھوتا، پھر ٹھہر جاتا۔ وہ ایسا کیا کہے کہ آگے سے وہ کچھ بولے؟ کوئی بات کرے؟

”کچھ بولو۔ کچھ کہو۔“

واہ اسی طرف خاموش رہی۔ اسے زمر کو شاک سے نکالنا تھا۔ کچھ تو اسے خود کہنا پڑے گا۔

”مجھے تمہیں کچھ بتانا تھا۔ بہت پہلے تادیا چاہیے تھا مگر نہیں بتا سکا۔ کل رات مجھے پہلے سے زیادہ یہ بات محسوس ہونے لگی تھی۔“ وہ

اب کے نظریں جھکا کر بولا تھا۔ تکیے پر سر کھے لینی زمر اسی سادگی سے اسے دیکھے گئی۔

”مز کاردار نے صرف تمہاری کڈنی رپورٹ میں رو بدل نہیں کیا تھا۔ وہ تمہاری ملگنی تڑوا کر تمہیں کو لیزیل ڈیچ بنا چاہئی تھیں؛ تاک تم میرے خلاف گواہی دو۔ اس لئے انہوں نے .....“ اس نے سر جھکا۔ ”وہ سب ایک جھوٹ تھا۔ کہ تم مان نہیں بن سکو گی۔ کہ تمہاری کبھی فیلمی نہیں ہو سکے گی۔ تمہاری فیلمی ہو گئی زمر! تمہاری ..... ہماری فیلمی ہو سکتی ہے زمر!“ وہ اب بھی نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ ”مجھے یہ بات تب معلوم ہوئی جب ہم نے زندگی ابھی شروع کی تھی۔ اسی لئے میں نے تمہارے ڈائرنر کو پیٹا تھا۔ اور میں شاید تمہیں بتا بھی دیتا مگر اسی رات سعدی قید سے بھاگ لکا تھا۔ مجھے لگا بھی اپنے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ پھر بعد میں میں نے کافی عرصہ تمہیں یہ سب نہیں بتایا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ایک خاندان بنانے کی آزو میں اپنی صحت داؤ پلے گاؤ۔ یہ ممکن ہے مگر مشکل ہے اور میں تمہیں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ آئی ایم سوری، مجھے یہ سب نہیں چھپانا چاہیے تھا مگر میں نے وہی کیا جو مجھے تمہارے لئے بہتر لگا۔“ اس نے نظریں اٹھا کیں تو وہ اسے اسی طرح دیکھ رہی تھی۔ زمی اور ملائمت مے مسکراتے ہوئے۔ اسے ٹنگ سا گزراد۔

”تم جانتی تھیں؟“

”اوہہو۔“ اس نے سچائی سے نفی میں سر بلایا۔ وہ نہیں جانتی تھی مگر جان کر بھی کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ فارس نے گہری سانس لی۔

”تمہیں برالاگا میر اتم سے چھپا نا؟“

اس نے پھر نہیں میں گردن جو جبنتش دی۔ فارس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کچھ تو بولوز مر۔ کوئی توبات کرو۔ کل رات کی کوئی بات کرو، کچھ کہو۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ چند لمحے سے دیکھتی رہی، پھر دھیرے سے لب کھولے۔ "قانون شہادت میں وہ کون سا آرٹیکل ہے جس کے تحت میاں یوں کو ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا؟" اس کی آواز صاف تھی۔

فارس بالکل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا۔ اچھے اور پریشانی سے۔ "کیا؟"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایسا آرٹیکل موجود ہے جس کے تحت میاں یوں ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے کے پابند نہیں ہوتے؟"

فارس نے تحریر نفی میں سر ہلا�ا۔ تو زمر نے مسکرا کے اثبات میں گردن ہلائی۔

"دیکھا! میں تمہیں جانتی ہوں۔"

"تم..... میرا خیال ہے تم آرام کرو۔ میں آپا اور حنین کو دیکھتا ہوں۔" وہ الجھا ہوا سا اس کا ہاتھ چھوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ زمر نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

"وہ ذاتی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔" باہر آ کر وہ حمہ کے ساتھ آ رکا اور دھیرے سے بولا۔ "مجھے سے قانون شہادت کے آرٹیکلز کا پوچھ رہی ہے۔ استغفار اللہ۔"

"ہیں!" حمہ کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ پھر اسے افسوس ہوا۔ اس ساری ٹریجیڈی میں قانون شہادت کو لانے کا کیا مطلب تھا؟ یقیناً وہ ذاتی طور پر شدید مل کر رہ گئی تھی۔

"تم لوگ اس سے اب ایسی کوئی بات نہ کرو۔" ندرت ان دونوں کوٹوکتیں اندر بڑھ گئیں اور اسی پل دوسری جانب سے سعدی آتا دکھائی دیا۔ فارس اور حنین جو سرگوشی میں بات کر رہے تھے، اس کو دیکھ کر اسی جانب گوم گئے۔ اس کے چہرے پر ہوانیاں اڑ رہی تھیں۔

"زم رٹھیک ہیں نا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے، تم کیسے ہو؟ اور یہ کیا ای میل کی ہے تم نے مجھے؟" وہ بہت سے بولا۔

"احمر مشکل میں تھا، ساری تفصیل بتاتا ہوں، پہلے میں زمر سے مل لوں۔" پریشانی سے کھتا وہ دور جاتی ندرت کے پیچھے پکا۔ فارس آنکھیں مشکوک انداز میں سکیڑ کر سے جاتے دیکھتا ہے۔

اس تلنگ اور اندر ہیری رات کا اختتام ہو چکا تھا اور یہ صبح کافی امید افزاء لگتی تھی۔

❖❖❖

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا ..... کریدتے ہو جو اب را کھ جبتو کیا ہے  
قصر کاردار پر عجیب سی مردی چھائی تھی۔ صبح طلوع ہو چکی تھی اور ملازم نئے سرے سے اس محل کو سجانے سنوارنے میں لگ گئے تھے۔  
مگر کوئی عجیب ویرانی اور ہولناکی سی درود یا وار سے پہنچی محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں جواہرات شب خوابی کے لباس میں ملبوس لاوٹنگ کی کرسی پر  
تمکنت سے پیٹھی، اخبار سامنے پھیلائے ہوئے مطالعے میں منہمک تھی۔ تبھی دروازہ زور سے کھلا تو اس نے عینک کے پیچے سے نگاہیں انھا کے دیکھا۔

دروازہ واپس دے مار کے شیر و اندر آیا تھا۔ چال میں عجیب سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ رات کا ملگجا لباس اور سرخ آنکھیں، بکھرے بال۔ جواہرات نے ناپسندیدگی اسے دیکھا۔

"تم ساری رات سے کھڑھ تھے؟ اور کیا منہ دھونے کا وقت بھی نہیں ملا تھا؟"

وہ جو چلتا جا رہا تھا، آواز پر کا اور سرخ آنکھیں گھما کر تنفس سے اسے دیکھا۔  
”کیا آپ کے بڑے بیٹے نے بتایا نہیں کہ اس نے کیا کیا ہے؟“ جواہرات نے چونکہ کرا خبر نیچے کیا۔ ”ہاشم؟ کیا ہوا؟ وہ ٹھیک تو ہے؟“

”بھائی نے..... میں..... زمر کو ہوٹل کی لفٹ میں بند کر دیا..... تاکہ وہ مر جائے۔“ وہ درد سے تنفس سے، غصے سے دبی دینی آواز میں غرایا تو وہ سکتے میں آگئی۔ ”مگر وہ نہیں مری۔ فارس نے اسے بچالیا تو پہت ہے بھائی نے کیا کیا؟ آبی کو..... آبدار کو مار دیا۔ اپنے ہاتھوں سے اس کو میرے سامنے مار دیا۔ آبدار مر گئی، میں۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کے چہرے پڑھک گئے۔ جواہرات سن کی بیٹھی رہ گئی۔

”آبدار.... مر گئی؟“ اس نے بے یقینی سے دہرا دیا۔  
وہ اب دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھتا اور جا رہا تھا۔ مگر ملکہ ابھی تک برف نی بیٹھی تھی۔

ابھی بادبائ کوتہہ رکھوا بھی مضطرب ہے رخ ہوا..... کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آ کے چلا گیا۔!!  
مور چال میں شام اتری تو گھر کی رونقیں پھر سے جاگ اٹھیں۔ زمرہ سچارج ہو کر آگئی تھی اور اپنے کمرے میں صوفے پر چیر اور پر کر کے بیٹھی تھی۔ بید پر لیٹے رہنا اسے گوار نہیں تھا۔ بال آدمی سے بندھے تھے اور ناک سرخ لگتی تھی۔ پانی میں بڑے رہنے کے باعث اسے بخار اور فلوہ ہو گیا تھا۔ سوہا تھی میں ٹوٹھی پکڑ رکھا تھا۔ البتہ چہرے پہ بس مسکراہت تھی۔ بالکل ساتھ بڑے ابا کی وہیل چیز رکھی تھی، اور وہ فکر مندی سے اس کی طرف جھکے اس سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھ رہے تھے۔ اور وہ ہلکی سی آواز میں جواب دے رہی تھی۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ سوائے ملازموں کے سب ہی جان گئے تھے کہ گزشتہ رات کیا ہوا تھا۔

”آخر یہ ہاشم کب ہماری جان چھوڑے گا؟“ اب انہم آواز میں اس سے پوچھا تھا۔ ”یہ سب کب ختم ہو گا؟“

زمر نے گہری سانس لے کر ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ”پچھے نہیں۔“

”زمر!“ حمہ دروازے سے اندر آئی۔ زمر نے سر اٹھا کے مسکرا کے اسے دیکھا۔ وہ قدرے جھچک کر داخل ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں ایک سی ڈی پکڑ رکھی تھی۔ پریشان، مر جھائی ہوئی لگتی تھی۔ ”صرف ہاشم نہیں، اور بھی لوگ شامل تھے اس میں۔ مثلاً وہ شہرین۔“ اس کی آواز برہمی سے ذرا کانپی۔ ”اس کا بھی کچھ کرنا ہو گا۔“

”چھوڑو نہیں۔“ زمر نے سر جھکنا مگر اس نے وہ سی ڈی اس کی طرف بڑھائی۔

”یہ شہری کی ویڈی یو ہے، جو احرنے دی تھی بہت پہلے۔“ بڑے ابا کی موجودگی کے باعث اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (کارڈ

گیم، کلب والی ویڈیو!) ”آپ اس کو شہری کے خلاف.....“

زمر نے سی ڈی اس کے ہاتھ سے لی اور کھٹ کے ساتھ اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ نہیں کچھ بول نہیں سکی۔

”انتقام کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ چھوڑو۔ جانے دو۔“ اس نے دونوں ٹکڑے بے نیازی سے میز پر ڈال دیے۔ حمہ نے سر جھکا

دیا۔ چند لمحے تینوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پھر حمہ نے آنکھیں اٹھائیں۔ ”آپ کچھ بات تو کریں۔“ گویا شکایت کی۔

زمر چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ ”تمہاری آنکھیں اب کیسی ہیں؟“

”میری..... آنکھیں؟“

”ہوں..... آپ یہت ہوئی تھیں نا۔ لیزر سرجی۔ عینک اتارنے کو۔ اب نظر ٹھیک آتا ہے؟“

”نج.....جی۔“ ایک عجیب جیرانی نظر اس پڑا اور ”میں آتی ہوں“ کہہ کر باہر نکل گئی۔

پچھن کے کھلے دروازے سے دیکھا تو فارس اور سعدی بھڑے نظر آ رہے تھے۔ وہ تیزی سے اس طرف آئی۔

”زمر کو دو اتنی کچھ ہو گیا ہے۔ عجیب باتیں کرنے لگی ہیں۔“ وہ فکر مندی سے بولی تھی مگر وہ دونوں متوجہ نہیں تھے۔ خدا نے ان سے تاثرات دیکھے۔

”آپ لوگ زمر کی فکر کریں، تاکہ مسز جواہرات کی۔ مار دیا انہوں نے اپنے شوہر کو، اب قصہ ختم کریں ان کا۔“ صحیح سے وہ ساری کھاتاں سن کر وہ بے زار آ گئی تھی۔

”ہم اس بات کو زیادہ ابھے طریقے سے استعمال کر سکتے تھے۔“ کاؤٹر سے نیک لگائے بھڑے افارس افسوس سے بولا تھا۔ ساتھ ہی باہر بارگی میں سر بلاتا پھر سعدی کو گھوڑتا۔ اگر تم مجھے وقت پہنچاتے ہیں تو.....“

”جیسے آپ تو کبھی کچھ چھپاتے ہیں نہیں ہیں۔“

”زیادہ بک بک مت کرو۔“ ان کے اپنے مسئلے تھے۔

اندر کمرے میں ابا زمر سے سوال کر رہے تھے۔ ”تم اتنی چپ چاپ کیوں ہو؟“

”کیونکہ میں بھیشہ بولتی ہی رہتی ہوں، ابا۔“ وہ مضم آواز میں بولی تھی۔ ”آواز یہی ہوا کی لبروں پر اوپر اٹھتی ہیں، دامیں باہمیں بھرتی ہیں۔ پانی میں دب جاتی ہیں۔ اتنا سارا پانی دیکھا ہے میں نے کہ میں اب بولنا، لڑنا جھگڑنا نہیں چاہتی۔“ وہ زخمی سماں سکرائی۔ ”میں سکون، صلح صفائی سے رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے ہر بات کے سو جواب نہیں دینے، مجھے بحث نہیں کرنی۔ بہت گزاری زندگی لڑتے جھگڑتے بہت کرتے۔ اب میں تھک گئی ہوں۔ میں سکون چاہتی ہوں۔“

”ماموں.....بھائی.....زمر.....“ اسامہ کی لاونچ سے چلاتی ہوئی آواز پہ چوکی، دل زور کا دھڑکا، پھر ایک دم اٹھ کر باہر کو دوزی۔ اُنہوں نے بھیں نیچے گر گیا۔

لاونچ میں سب بھاگ بھاگ جمع ہوئے تھے۔ اسامہ دیوار پر نصب ٹوی اسکرین کے سامنے کھڑا تھا جہاں خبر چل رہی تھی، نیوز کا سٹر بول رہی تھی، تصویریں چمک رہی تھیں، مگر اسامہ سکتے سے صرف ایک ہی بات دہراتا تھا۔

”آبدار عبید....ڈوب کر مر گئی.....“ لاونچ میں سنا تا چھا گیا۔ زمر نے کرب سے آنکھیں بند کیں اور بدقت صوفے پر نیچتی پلی گئی۔ خین نے لبوں پہ باتھ رکھ لیا۔ سعدی نے پریشانی سے کچھ بڑھاتے جلدی سے موبائل نکالا تھا اور فارس.....وہ.....خالی خالی نظر وہاں سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پانی میں مری تھی۔ وہ آبدار تھی۔ پانی سے بنی۔.....کا نج سے بنی۔.....وہ اسکرین کو دیکھ رہا تھا اور اس کی رنگت سفید پڑتی جا رہی تھی۔

❖❖❖

قبریں ہی بتا سکتی ہیں.....اس شہر جس میں ..... مر کر دفن ہوئے ہیں.....کہ زندہ گڑھے ہیں لوگ  
دودن بعد:-

ہارون عبید کی رہائشگاہ کے بیڑہ زار پر گزشتہ دو روز سے عجیب سنا تا چھایا تھا۔ سارے پرندے سہم کراڑ گئے تھے۔ مورا پنے پھر وہ میں دبک کر بیٹھے تھے۔ جانور ساری ساری رات عجیب سی آوازیں نکالتے تھے، اور ایک سفید ایرانی بلی تھی جو درد سے چلاتی سارے میں بواہی بولا تھی۔ ہر شے پر چھپتی، ہر کونا سمجھتی، مگر قرار کہیں نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ سیر ہیاں پھلانگ کر اور پر بھاگتی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ رہنمہ ارمی عبور کی اور اسٹڈی کے ادھ کھلے دروازے کے سامنے جا رکی۔ درد سے عجیب آوازیں نکالتی دہ دہیں ڈور میت پر بیٹھ گئی اور سر اپنی

کھال میں دے دیا۔

اسٹرڈی میں نہم اندر ہیرا تھا۔ ہارون آرام دہ کرتی پتیک لگائے بیٹھے تھے۔ دو انگلیوں میں سکارہ رکھا تھا جس سے دھوئیں کے مرغوںے اڑاڑ کر فضا میں گم ہو رہے تھے۔ سارے میں سفید دھوان سا بھر جا محسوس ہوتا تھا اور نکوئیں کی نہیں تو۔ ان کا لباس بے داع، کلف لگا، نفس ساتھا بال شیو سب بنے تھے۔ بس چہرے پر گہری ویرانی تھی۔ آنکھوں میں خالی پن تھا۔ ایسا درد دل کو کھانا تھا جو نہ کبھی پہلے محسوس ہوا تھا نہ کبھی محسوس کرنا چاہا تھا۔ میز پر ایک فوٹو فریم رکھا تھا جس میں سرخ دومال سرپ باندھے مسکراتی ہوئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ ہارون کی ویران نظریں اس شفاف چہرے پر جمی تھیں۔ درد بڑھتا جا رہا تھا۔

ساتھ رکھا سو بائل زوں زوں کرنے لگا تو وہ گہری سانس لے کر سیدھے ہوئے۔ سگار ایش ٹرے میں ڈالا اور کھنکھار کے خود کو کپوز کیا، پھر فون کان سے لگایا۔

”تمہاری بیٹی کا مجھے بہت افسوس ہے۔“ جو ہرات کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ ”جنازے میں سرسری ملاقات ہو سکی تم سے۔ تفصیل سے بات ہی نہیں ہو پائی۔ سوچا چوتھہ ذرا اٹھنڈی پڑ جائے تو کال کروں گی۔“

”سن رہا ہوں بولو۔“ ان کی آنکھیں سرخ ہو میں۔

”ظاہر ہے، میں نے ہی بولنا ہے کیونکہ تم ہر لحاظ سے منے کی پوزیشن میں ہو۔“

”میں جانتا ہوں یہ سب تمہارے بیٹھے نے کیا ہے۔“ ان کی آواز کا پنی۔

”کیوں خود کو تھکار بے ہو یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ تمہیں اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی؟ ہم دونوں جانتے ہیں کہ تم اسے استعمال کرنا چاہتے تھے، اس کے گارڈز میں اضافہ بھی اس لئے لیا تھا کہ کوئی اس کو تمہاری کمزوری سمجھ کر تمہارے خلاف استعمال نہ کر سکے۔ تم اس کے ذریعے ہماری دولت اور طاقت میں شرائست چاہتے تھے اور یوسف کے ذریعے ہمیں تباہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ دونوں کام تم خود کرنے کی ابیت نہیں رکھتے۔ اس لئے.....“ وہ رکی سانس لی۔ ”اب تمہارا غم ہلکا ہو گیا ہو گا تو میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتی چلوں۔ میں اور ہاشم تمہیں تمہارے منہ مانگے شیرز اور کپینی assets دینے کے لئے تیار ہیں۔“

وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔ آنکھیں مزید سرخ پڑ رہی تھیں۔

”تم ایک سیاستدان ہو ہارون، اور سیاستدانوں کی طاقت کے لئے ہوں کبھی ختم نہیں ہوتی۔ تم ہم سے بگاڑ کر کبھی ترقی نہیں کر سکو گے۔ اور ہمارے وہ دوست جن کے پیسے کو وزیرستان سے آگے جانے کے لئے ہماری مدد چاہیے ہوتی ہے، ان کو کبھی اچھا نہیں لگے گا اگر تم اور ہم آپس میں بگاڑ لیں۔ تو یوں کرو، ہمارے گھر آ جاؤ۔ آج ہی ہم ڈیل کر لیتے ہیں۔“

”مجھے ہر چیز کاغذات پر چاہیے بلکہ اینڈوائیٹ میں۔ اور زرگار کے زیروات بھی۔“ وہ سرد مہری سے بولے تھے۔

”وہ بھی مل جائیں گے۔ مگر شیرز اور دوسرے اثاثہ جات کی بات پہلے ہو گی۔ میں لفٹ پر انتظار کر رہی ہوں۔“ خوشنگوار سے انداز میں کہہ کر اس نے فون بند کیا تو ہارون نے موبائل بے زاری سے میز پر ڈال دیا اور آنکھیں بیچ لیں۔

قصیر کاردار میں واپس آؤ تو ہاشم کے کمرے کے پردے بند تھے، اور وہ رفیقی جیزٹی شرٹ میں ملبوس صوفے پٹانگ پٹانگ جماے بیٹھا تھا۔ دوپہر کے باوجود اندر ہیرا لگتا تھا، مگر ہاشم کا ویران چہرہ، بڑھی شیو، بکھرے بال، سب یہاں لیپس کی زرد روشنی میں نظر آ رہا تھا۔

کھڑکی کے قریب کھڑی جو ہرات نے موبائل میز پر رکھا اور اپنانیت سے مسکراتے ہوئے اس کے قریب آئی۔ وہ سنجیدگی سے سامنے دیکھتا رہا۔ سپاٹ سر دسما۔ جو ہرات نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے دبایا۔ ”میں تمہیں سمجھ سکتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

"ٹھیکیں۔" اس کے چہرے پہ چھائی سرد برف میں دراز پڑی۔

"اب کیا محسوس کر رہے ہو؟ دودون سے کمرے سے نہیں نکل۔"

"ٹھیک ہوں، میں!" وہ دھیرے سے بولا۔

"تمہیں گلت ہے؟" وہ زمی سے کہتی اس کے ساتھ بیٹھی۔

"نہیں۔ مجھے کوئی انسو نہیں ہے۔ میں نے جو لیکا ٹھیک کیا۔" وہ گردن کڑا کے بولا تھا۔ اور اب جو بھی مجھے کھدے گا، میں ان کو اپنے ہاتھوں سے عبرتاک نکالتا دوں گا۔" اس کی آنکھوں میں آگ کی لپیٹیں ہی انھری تھیں۔ جواہرات مسکراتی۔

"گذ۔ امید ہے اب تم مجھے سمجھ سکو گے۔ میں نے خاور اور سعدی کی موت کا حکم نامہ اس لئے جاری کیا تھا کیونکہ میں تمہیں مزید تکلیف سے بچانا چاہتی تھی۔ اگر وہ دونوں مر گئے ہوتے تو اس دن کی نوبت نہ آتی۔"

ہاشم نے محض سر کو خم دیا۔ بولا کچھ نہیں۔ جواہرات غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ اسے تسلی ہوئی۔ سرد یواں پکھل رہی تھی۔

"کل سے میں تمہارے ساتھ آفس آؤں گی۔ ان کاغذات کو اپس لے لو۔ ہارون سے متعلق بہت سے معاملات مجھے نہ سنھالے ہوں گے۔" ملکہ کو اپنا تخت و اپس مل گیا تھا۔ ولی عہد نے اثبات میں سر بلاد دیا۔ پھر اسے دیکھا۔

"ہارون..... کیا مجھے یونہی جانے دے گا؟" وہ ذرا حیران تھا۔ جواہرات بے اختیار کھلکھلا کر بہس دی۔ اس کی گوری رنگت میں گلایاں ہی گھلنگیں۔

"ارے تم نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ ہر انسان کو اپنی اولاد سے اتنی ہی محبت ہوتی ہے جتنی مجھے ہے؟ نہیں ہاشم۔ ہر طاقت ور ہر دل نہ انسان اپنی اولاد کی میری طرح پرستش نہیں کرتا۔ ہم اس کے غم کا مدد اور کر دیں گے تو وہ ہمارے سامنے آؤں تک نہیں نکال سکتے گا، اور پھر جو بھی ہو، تمہاری ماں....." اس کا ہاتھ دوноں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

"تمہارے ساتھ ہے؟" ہاشم نے اب کے نزدیک شکریہ کہا تھا۔ وہ پہلے سے بہتر نظر آ رہا تھا۔ اور جواہرات کسی ایسی فیری نیل ملا۔ کی طرح لگ رہی تھی جو کسی نوجوان خوبصورت لڑکی کا خون پینے کے بعد پھر سے جوان ہو جاتی ہے۔ سائیڈ نیبل پر رکھا۔ ابھی تک گیلا محسوس ہوتا سرخ رومال.... اسی خاموشی سے وہاں پڑا رہا۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

سو دا گری سے ہم کو سودا نہیں ہے کچھ بھی ..... کوئی بیج بیج کھائے گا لہ بدل بدل کے سورج سوانیزے پہ تھا۔ اور فوذی ایور آ فزر کی اوچی کھڑکیاں دھوپ سے چک رہی تھیں۔ پارکنگ لائن میں کار روک کر فارس باہر نکلا تو وہ سنجیدہ سادھائی دیتا تھا۔ بھوری شرٹ پہننے بال تازہ چھوٹے کئے تھے۔ ہنونیں بھیچنے دہروازہ لاک کر رہا تھا جب نو شیر و ان اسے قریب جا رکا۔ وہ احساس ہونے پہنچا۔ اس سے نگاہ ملی تو خاموشی سے اپس مڑ کے کار کا لاک پھر سے چیک کرنے لگا۔

"آبدار مرگئی، فارس! شیر کے لفاظ اٹھوئے ہوئے تھے مگر حلیہ آج ٹھیک تھا۔ وہ ڈریں شرٹ اور کوٹ میں ملبوس تھا، اور شیو بھی نی ہوئی تھی مگر ناک گلابی تھی! اور آنکھوں میں کرچیاں تھیں۔"

"جانتا ہوں۔" وہ سپاٹ سا اپس گھوما ایک چھتی نظر اس پڑا۔ "کیوں آئے ہو؟"

"وہ دہیں تھی۔ اس رات..... میں نے لفت کا بتایا تمہیں مگر اس نے الزام اپنے سر لے لیا۔ ہاشم بھائی نے میرے سامنے اس کے مار دیا۔"

"تم کیوں آئے ہو؟" وہ دھوپ کے باعث آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھ رہا تھا۔ نو شیر و ان نے زکام زدہ انداز میں ناک سے

سنس اندر کچھی۔

”خیر....، اس نے سر جھکا۔“ ”ہماری ڈیل کا کیا؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ کیس واپس لے لو گے۔“

”اچھا۔ مجھے ایسا کوئی وعدہ یاد نہیں۔“

”کیا؟“ ”شیر و کاد مانغ بھک سے اڑ گیا۔“

”میں نے کہا تھا، سعدی سے کہوں گا کہ تمہیں معاف کر دے۔ وہ میں کہنے کی کوشش کروں گا، جب عدالت تمہیں سزا نہیں دے گی۔“

تب!!!۔ اور کچھ؟“

”میں نے تمہاری.....، وہ زور سے بولنے لگا، پھر اردو گرد آتے جاتے لوگوں کا احساس کر کے قریب آیا اور دبادبا ساغرایا۔“ ”میں نے تمہاری مدد کی۔ زمر کو بچایا۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ تم صرف کوشش کرو گے؟ اور اگر تم کامیاب نہ ہوئے تو؟“

”تم نے آبدار کو بچانے کی کوشش کی؟ کیا تم اس میں کامیاب ہوئے؟“ ”وہ تنہی سے بولا تھا۔ شیر و لمحہ بھر کو کچھ کہہ نہیں سکا۔“

”وہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔“

”اور یہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔“ ”وہ بھائی سے کہتا پلت گیا مگر نو شیر وال تیزی سے اس کے سامنے آیا۔“

”میرے خلاف کیس واپس لے لو، مجھے باعزت بری ہونے دو، میں ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا، نبی زندگی شروع کرلوں گا،“ اور میں آبدار کے قتل کیس میں گواہی دینے کو بھی تیار ہوں۔ میں نے خود ہاشم بھائی کو اسے مارتے دیکھا ہے۔“

فارس نے افسوس اور ترحم سے اسے دیکھا۔ ”ہمیشہ اپنا ہی سوچتے ہو تم۔ جو بھائی تمہیں بچانے کے لئے سب کر رہا ہے، اس کے خلاف کھڑے ہونے کو تیار ہو؟ وہ۔“

”مگر آبدار کے قتل کیس میں تم لوگوں کو اس سے بڑی گواہی کہاں سے ملے گی؟“

”اے.... کون سا قتل کیس؟ کہاں کا کیس؟ ہم کوئی کیس نہیں کر رہے کسی پر۔ ہم آبدار کی فیملی نہیں ہیں۔ جو کیس ہو گا، وہ اس کا باپ کرے گا۔ ہم نہیں کر سکتے۔ اس لئے میرا وقت ضائع نہ کرو۔ میں نے کہا تھا، سعدی سے بات کروں گا، آگے اس کی مرضی۔“

”میں نے زمر کی جان بچائی ہے فارس!“

”یہ مت بھولو کر وہ اس سب کا شکار بھی تمہاری وجہ سے ہوئی تھی۔ کوئی احسان نہیں کیا تم نے اس پر۔ اور یہاں سے چلتے بنو۔ تمہارے بھائی کے ہر کاروں نے دیکھ لیا تو تمہاری جان لے لے گا۔“ اور ایک سرد مہر نظر اس پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ نو شیر وال دبے غصے سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ فارس بے حس نہیں ہے۔ وہ ڈسٹرپ ہے۔

اور قصر کاردار کے ڈائیٹنگ ہال میں اشہبا اگلیز مہک پھیلی تھی۔ طولیں میز انواع و اقسام کے طعام سے چھی تھی۔ سربراہی کرسی پر بیٹھی جواہرات دائیں ہاتھ بر اجمان ہاروں کی طرف کاغذ بڑھا رہی تھی جنمیں وہ انہاں کے پڑھنے لگے تھے۔ پھر مقابل بیٹھے ’شیو بنائے‘ بال جمائے، تازہ دم سے ہاشم نے قلم ہاروں کی طرف بڑھایا تو انہوں نے اسے چھاتے ہوئے ایک گہری نظر اس پر ڈالی پھر دستخط کر دیے۔ وکلاء نے اٹھ کر ہاتھ ملائے، جواہرات نے مبارکباد دی اور ہاشم نے فاتحانہ نگاہوں سے ہاروں کو دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا جسے انہوں نے بدقت مسکرا کے تھا۔ سارے سودے طے ہو گئے، سارے حساب ختم ہو گئے۔ اور ملکہ اپنی سربراہی کرسی پر ٹوٹ آئی تھی۔ کیا زندگی اس سے بھی زیادہ حسین ہو سکتی تھی؟ جواہرات نے سوچا تھا۔

جس کو فلک نے لوٹ کے ویاں کر دیا ..... ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے نو شیر و اس کے جانے کے بعد فارس کچھ دیر فوڈی ایور آفٹر کے کاؤنٹر پر بے مقصد حساب کتاب چیک کرتا رہا، پھر باہر نکل آیا۔ وہ بہت خاموش تھا۔ چہرہ بالکل سپاٹ۔ جیسے ہر طرف سکوت ہو۔ سننا ہو۔ وہ اسی خاموشی سے کار میں بیٹھا اور اسے بے مقصد سڑکوں پر دوڑاتا گیا۔ تارکوں کی گرم دمکتی سڑکیں.... ساتھ سے بھاگتے درخت.... اور زندگی بھی بیچھے کو بھاگنے لگی تھی.....

زرتاش کے قلب کو دو دن ہوئے تھے شاید۔ وہ اب روزمری نیز پوچھنے جانے لگا تھا۔ بار بار۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس روز وہ اور زرتاش وہاں کیا کر رہی تھیں۔ جب زمرہوں میں نہ آئی اور اسے کوئی جواب نہ مل پایا تو وہ دوسرے رشتے داروں سے جواب مانگنے لگا۔ اس کی دوستیں، گھر والے، کسی کو کچھ بتایا ہو گا زرتاش نے۔ مگر کوئی بھی باخبر نہ تھا۔ سفید دھنداں کھکھوں سے ہٹی تو اس کی ساری حیات جا گئے لگیں۔ وہ زرتاش کی موت کا سراغ لگا کر رہے گا، یہ تو طے تھا۔ مگر کہاں سے اور کیسے؟ اس نے زرتاش کا کمرہ کھنگلا۔ ہر شے تپٹ کر دی، اور تب ہی اس کوڈرینگ نیبل کی دراز سے وہ سی ڈی ملی۔ وہ ہاشم کی بیٹی کی سالگرد کی مسعودی تھی، وہ بیچش پڑھ کر رہی تھی۔ مگر یونی بس کس کھولا تو اندر ایک پیلا پوسٹ اٹ نوٹ لگا تھا۔ زرتاش کی عادت تھی، گھر میں ہر جگہ بالخصوص فرج پر پیلے نوٹس لگا کر رکھتی تھی۔ گرومری میں کیالا نا ہے، کس کی سالگرد آنے والی ہے۔ یہ بھی اس نے لگایا تھا۔ وہ شہر کر دیکھنے لگا۔ اس میں دو مختلف نمبرز لکھے تھے۔ دو اوقات۔ دونوں کے درمیان قرباً دو گھنٹے کا وقفہ تھا۔ وہ مسعودی اٹھالا یا اور اسے لیپ ناپ میں لگا کر دیکھنے لگا۔ وہ پارٹی کے ہی اوقات کا رہتے (ویڈیو کے کونے میں وقت لکھا آ رہا تھا)۔ اس نے متعلقہ وقت تک ویڈیو فارورڈ کی۔ وہ لا ڈنچ کا منظر تھا۔ اس نے دوسرے وقت تک فارورڈ کی۔ وہ بھی لا ڈنچ کا منظر تھا۔ ان دونوں مناظر میں کچھ خاص نہ تھا۔ تقریب کے عام سے مناظر تھے۔ ان میں سب ہی مہماں موجود نظر آتے تھے۔ پھر زرتاش نے ان دونوں اوقات کو نوٹ کیوں کیا؟ وہ دوبارہ دیکھنے لگا۔ پہلے وقت میں خاور سیرھیاں اترتا دکھائی دے رہا تھا، اور دوسرے پواں تھے وہ لا ڈنچ کی سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔ باقی سب دیے ہی تھے۔ البتہ ان دونوں نقاط کے درمیان ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے خاور کہیں نظر نہ آتا تھا۔ تب پہلی دفعہ سے شک سا ہوا، مگر اس نے سر جھٹک دیا۔ مگر پھر زیادہ موقع نہ ملا کیونکہ اگلے روز پولیس اس کو گرفتار کرنے آن پہنچی۔ زمر یوسف نے بیان میں نہ صرف اس کو نامزد کیا تھا بلکہ ہمیں سی کہانی بھی سنائی تھی۔ فارس نے بھی امید نہیں کی تھی کہ وہ گرفتار بھی ہو سکتا ہے۔ اس گرفتاری نے اسے شدید دھچکا لگایا تھا۔

سعدی بار بار آتا، صفائیاں دیتا، امیدیں دلاتا، مگر اس کا غصہ اور فرشریشن بڑھتی جا رہی تھی۔ تھانے کا حالات عجیب ساتھا۔ گھن نزدہ جگہ جہاں مستقبل تک تاریک نظر آتا تھا۔ اور انہی تاریک راتوں میں وہ بیٹھ کر زرتاش کی سی ڈی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر وہ پارٹی میں نہیں تھا تو خاور بھی نہیں تھا۔ اور خاور کو تو ہاشم چلاتا تھا تو کیا ہاشم.....؟ لیکن پھر اور کون ہو سکتا تھا؟ کون اس کے گھر سے اس کی گن نکال سکتا تھا، اس کی کار میں شوت رکھا سکتا تھا۔ اتنا قریب کون تھا آخر؟

اس روز سعدی اسے جیل میں دیکھنے آیا تو وہ پھٹ پڑا۔ کہہ دیا کہ اسے ہاشم پر شک ہے۔ سعدی الگ اسے ملامت کرنے لگا اور اندر آتا ہاشم الگ طریقے سے شروع ہو گیا۔ وقتی طور پر وہ چپ ہو گیا۔ کیا حالات اسے ڈھنی طور پر اتنا پست بنانے تھے کہ وہ اپنوں پر شک کرنے لگا تھا؟ اس نے پھر سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔

سارا خاندان ایک طرف اور زمر ایک طرف۔ زمر نے بیان واپس نہیں لیا، نیتیجاً اس کو چودہ روز بعد جیل بھیج دیا گیا۔ تھانے کا حالات مختلف شے تھی۔ دنیا میں تمام ملزمون کو تھانے کے حالات میں رکھا جاتا ہے، ملزم یعنی وہ جس کے کیس کا ابھی فیلمہ نہیں آیا۔ مگر پاکستان وہ ملک ہے جہاں ملزمون کو بھی ' مجرموں' کے ساتھ جیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور جیل حالات جیسی نہیں ہوتی۔ جیل ایک بہت بڑی تاریک مہیب سی دنیا تھی جس کے اندر عجیب لوگ بیٹتے تھے، عجیب داستانیں پنچتی تھیں۔

جیل میں اے 'لی' اور سی کلاس تھی۔ ہر کلاس کے اپنے بلاک تھے۔ تعلیم یافتہ اور دوستند لوگوں کو اے یا بی کلاس میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کو بھی اے کلاس الٹ ہوئی تھی۔ یہ الاہمیت عدالت نے کر کے دی تھی، مگر جس لمحے وہ جیل میں داخل ہوا، وہ ساری کہانیاں جو اس نے "قراطین" کے بارے میں سن رکھی تھیں، وہ سچ نا ثابت ہونے لگیں۔ اے ڈرایا گیا، سمجھایا گیا کہ جیل کا Quarantine آفسر جس کو دیسی انداز میں قراطین کہا جاتا تھا، جیل کے سیاہ اور سرمی کامالک ہے کیونکہ یہاں کوئی سفید نہ تھا۔ وہ طے کرے گا کہ آپ کس بلاک میں جائیں گے، وہ طے کرے گا کہ آپ کو جیل کا کھانا کھانا ہے یا آپ کے رشتے داروں کا بھیجا من و سلوئی آپ کوں سکتا ہے۔ وہ طے کرے گا کہ آپ چار پانچ افراد کے ساتھ مل کر خفیہ چولہا رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ ہانڈی وال آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، اور آپ کے رشتے داروں کو ہر ملاقات پر اسے 25 ہزار روٹ دنی ہے یا 50 ہزار، یہ سارے فیصلے فراطین کرے گا۔ اے قراطین سے نہیں بکاڑنی تھی۔ اے قراطین کو خوش رکھنا ہے۔ اور قراطین نے اے دیکھتے ہی پہلی بات یہ کہی تھی کہ تم وہی ہو تو جس کی بیوی اور جس کا بھائی..... اور دوسری بات کا موقع وہ اے دے نہیں سکا۔ حوالات کی ساری فرثیریشن اس نے قراطین پر نکالی۔ وہ اے دبوچ کر، گرائے مارنے لگا۔ اتنا پیا کہ آنکھ کے قریب سے خون ندی کی صورت بننے لگا۔

اس کے بعد قراطین نے چند ہفتے کسی کو اس سے ملنے نہ دیا، اور اس کوی کلاس عنایت کر دی۔ اس کو کھانے میں سب سے گھٹیاں سل کا کھانا ملتا اور بات پر شوت طلب کی جاتی۔ اس قراطین کا نام جلال الدین آتش تھا اور اس سے ہر شخص خارج کھاتا تھا۔ کوئی اس کے تعلقات سے جلتا تھا تو کوئی اس کی طاقت سے خائن تھا۔ آتش اس جیل کا بادشاہ تھا۔ وہ جان کر فارس غازی کے سامنے ایسے موقع پیدا کرتا، ایسی باتیں کہلواتا کہ فارس اس کو غصے میں آ کر مارنے لگ جائے، مگر وہ اسے دوبارہ نہیں مار سکا۔ قراطین کو پہلے دن مارنے اور پھر جیل میں آگے پیچھے آ دھ در جن قیدیوں کو مختلف موقع پر پیٹنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اکیلا ہوتا جا رہا ہے۔ اے ہر وقت اپنی مگر انی خود کرنی پڑتی تھی۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا، اور وہ ہر ایک سے چوکنا تھا۔ اے تھاد کیجھ کر کوئی بھی اسے مار دیتا، یہ خوف اس کے اندر جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ چند دن بعد اسے احساس ہوا تھا کہ جیل کے کسی قیدی کی شکایت کسی پولیس الہکار سے نہیں کی جاتی۔ چاہے دنیا کا کوئی بھی ملک ہو، اور چاہے وہ قیدی آپ کو چاقو بھی نہ کیوں مار دے، بس اتنا کہو کہ حادثہ تھا، بس اتنا بتاؤ کہ میری اپنی غلطی تھی۔ کیونکہ اس قیدی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا، مگر بعد میں آپ دونوں کو ایک ساتھ ایک ہی جیل میں گزارا کرنا ہے۔ جب کوئی قیدی کسی دوسرے کی شکایت کرتا ہے تو سارے قیدی اس کے خلاف ہو جاتے ہیں، اور کوئی اس پر اعتماد نہیں کرتا۔ ایک ایسی جگہ جو عادی مجرموں، قاتلوں، غنڈے اچکوں سے بھری ہوئی ہے، وہاں دوستوں کے بغیر گرا رہنیں ہے اور دوست اس کے کوئی تھے نہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، وہ مزید غیر محفوظ اور فکر مندر ہنے لگا۔ اس نے لڑنا جھگڑنا بالکل ترک کر دیا۔ خاموش رہتا۔ چوکنا رہتا۔ پریشان رہتا۔ اے سمجھنیں آتا تھا کہ وہ دوست کیسے بنائے۔ ساتھی کہاں سے ڈھونڈے۔ اے ایک دوست چاہیے تھا۔ ایک مضبوط طاقتور ساتھی۔

سیکرٹری صاحب جیل کے دورے پر آئے تھے۔ ایک دن پہلے سے سارے میں تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پروٹوکول، نمودونماش، چھوٹے ریکارڈز۔ وہ خاموشی سے اپنے حصے کا کام کرتا رہا۔ جس وقت سیکرٹری صاحب اس کے قریب سے مع اپنے صاحبین کے گزرے اس نے ان کو انگریزی میں مخاطب کیا اور کہا۔

"سر لوگ میرے بارے میں جھوٹ گھڑ رہے ہیں، میڈیا پر ٹریکو ایئر فورس میں حملہ میں ملوث عناصر کی اس جیل میں موجودگی کی خبر میں نہیں دی۔ نہ ہی میں نے پولیس حکام کے اس دہشت گردی کے واقعے میں ملوث ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ میں تو صرف اپنے گھر والوں کو نظر لکھتا ہوں۔ پولیس کے عملے کو منع کریں مجھے نگز نہ کرے۔"

سکریٹری صاحب اس کو آفس میں لے گئے۔ اس کو چائے پلوائی گئی اور اس سے زمی سے پوچھا کہ وہ کیا جانتا ہے، اور اگر اس نے میڈیا والوں کو اس جیل میں دہشت گردوں کے سہولت کاروں کا بتایا بھی تھا تو خیر ہے وہ ان پا اعتماد کر سکتا ہے۔

یا ایک ایسا کیس تھا جس پر گرفتاری سے پہلے وہ کام کر رہا تھا اور اس کے کچھا ہم نکات جانتا تھا۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا مگر جتنے تردد سے وہ انکار کر رہا تھا، سامنے بیٹھے اعلیٰ افران کو گمان ہوا کہ پولیس اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس سب کے دونتائج نکل سکتے تھے۔ یا اس کو رہا کر کے کیس پر کام کرنے دیا جاتا۔ یا ملوث المکاروں کو بھی جیل میں پھینک دیا جاتا۔ دونوں آپشن اپھے تھے۔

وہ بار بار انکار کرتا رہا، کہ وہ اس سب خبر کے لیک کرنے میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی اس نے قراطین آتش کا نام لیا ہے۔ آتش بالکل بے قصور ہے اور وہ تو ایسا آدمی ہے، ہی نہیں جوشواں کی فلاں مجدد سے تعلق رکھتا ہو۔ اس وقت تو اس کو عزت سے واپس بھیج دیا گیا، مگر اگلے روز سے کسی نے آتش کو جیل میں نہیں دیکھا۔ اسے سادہ کپڑوں والے اٹھا کر لے گئے تھے، اور کافی عرصہ اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر جب تفتیش کے دوران وہ دہشت گردی کے سہولت کاری کے الزام سے بری ہو گیا، مگر دوسرے کئی جرام قبول کرنے پڑے تو اس کو واپس اسی جیل بھیج دیا گیا۔ مگر ایک قیدی کے روپ میں اور جس وقت وہ جیل میں داخل ہو رہا تھا، اس کی آنکھ کے زخم کے شان کو دیکھتے ہوئے فارس غازی مسکرا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جیسا ایک اکیلا مسافر بھی اس جہنمی مسافرخانے کا مہماں بننے آپا ہے۔ یہ جیل تھی جہاں آتش ہر قیدی کا قرض دار تھا۔ کسی کے جسم پر چوٹیں لگوانے، کسی کو معدود رکنے، اور کسی کو نگال کرنے کا مجرم تھا۔

اس وقت کے قراطین نے اس کو بھی سی کلاس میں بھیجا تھا۔ نہ پولیس اس کی رہی تھی، نہ قیدی اس کے ہمدرد تھے۔ اس کا غرور، اکثر،

ظفڑہ سب خاک میں مل چکا تھا۔ وہ خاموشی سے آیا اور فارس غازی کے قریب بیٹھ گیا۔

اس روز سے وہ دونوں ساتھی بن گئے۔ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بھولا کہ دوسرا نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا، مگر جیل میں سروائیوں سب سے زیادہ اہم تھا۔ اور جب جلال الدین اس کا دوست بنا تو اس نے فارس کو ایک نئی دنیا سے روشناس کروایا۔ گروہ بنا کر جھٹے کی صورت کیسے رہنا ہے، جیل کے باقی بدمعاشوں سے کیسے مقابلہ کرنا ہے، اپنی دھاک کیسے بھانی ہے، بڑے بڑے گروہوں کی خوشنودی کیسے حاصل کرنی ہے، اسے جلال الدین سکھاتا تھا۔ وہ قراطین رہ چکا تھا، بہت سوں کو اپنے ساتھ سے جانتا تھا، اور اپنی ڈھال کے لئے ایک تونمند، زور آور آدمی درکار تھا اسے۔ فارس اس کے لئے وہ ڈھال بن گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ جیل میں ایڈ جسٹ کرتے گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ برابر کا برابر کچھ تھے، سو وقت کے ساتھ ساتھ کیکنے بھی نکل گیا۔ عجیب سایتیں تھیں جیل کی۔

وہ فارس کو کہتا تھا، اپنے غصے کو تابو میں رکھو۔ اپنی ذات کے لئے نہ ٹو۔ بھائی اور یو یو کے متعلق ہر بات خاموشی سے سن جاؤ اور پی جاؤ، انسان کا ذہن تب کھلتا ہے جب وہ غصے کو مہارا ڈالنا سیکھ لیتا ہے۔ مگر وہ آگے سے کہتا تھا کہ وہ انتقام ضرور لے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جلال الدین کو اس سے ہمدردی ہوتی گئی۔ وہ پولیس میں رہ چکا تھا، اے ایس پی سرمد شاہ سمیت بہت سے لوگوں کو جانتا تھا۔ وہ اسے کہتا، سارے میں یہی کہا جا رہا ہے کہ تمہارے ماموں زادے نے تمہیں پھنسوا یا ہے۔ اور فارس اندر سے جانتا تھا، کہ اس کا دل گواہی دیتا تھا یہ ہاشم ہی ہے، مگر پھر جلال الدین نے اسے خاموش رہنا بھی سکھا دیا تھا۔ جب ایک دن سعدی اس سے پوچھنے آیا کہ وہ مشتبہ افراد کی فہرست دے جو زرتاشہ اور وارث کے قتل میں ملوث ہو سکتے ہیں تو اس نے ہاشم کا نام نہیں لیا۔ وہ ہاشم کا راز نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ اسے پہلے باہر نکلنا تھا، پھر جلال الدین کی تو سط سے بننے دوستوں کو استعمال کر کے اپنا انتقام پورا کرنا تھا، پھر ساری دنیا جان ہی لے گی کہ اصل مجرم کون تھا۔ مگر بھی نہیں۔

چار سال اس جیل میں گزارنے کے بعد وہ وہاں کا عادی ہو چکا تھا۔ جب نکلنے لگا تو محسوس ہوا، ایک زیادہ بڑی جیل میں جا رہا ہے اس روز جلال الدین نے اسے کہتا تھا، کہاب چونکہ وہ اس سے ہمدردی کرنے لگا ہے تو اس کو ایک نصیحت کرے گا اور وہ یہ کہ وہ انتقام چھوڑ دے اور اگر لیتا ہی ہے تو اسے دو قریبیں کھو دیں گی۔ فارس غازی کے پاس انتخاب کا وہ آخری موقع تھا۔ اس نے دو قریبیں چن لیں۔

کار قبرستان کے قریب روک کر چند لمحے وہ خالی خالی نظر دوں سے دور نظر آتی قبروں کو دیکھتا رہا۔ تینیں آبدار کو دفن کیا گیا تھا۔ وہ ایک دفعہ بھی ادھرنیں آسکاتھا، کیونکہ دور اندر وہ یہ جانتا تھا کہ ہاشم کے بعد اگر کوئی اس کی موت کا ذمہ دار تھا تو وہ خود تھا۔ زمران گزرے تین دنوں میں بار بار نرمی سے اسے کہتی رہی تھی کہ وہ گلٹی محسوس نہ کرے، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا، مگر وہ جانتا تھا، جس کارما سے وہ دور اندر ڈرتا آیا تھا، یہ اس کی پہلی قطع تھی۔

وہ باہر نہیں نکلا۔ شیشه اور چڑھایا اور ایکسلیپر پردا و بڑھاتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔ چہرہ ابھی تک سخیدہ اور سپاٹ تھا۔

❖❖❖

پندار کے خو گر کو ناکام بھی دیکھو گے؟ ..... آغاز سے واقف ہو، انجام بھی دیکھو گے؟

آج بھی عدالتی احاطے میں ویسا ہی رش تھا جیسا وہ بچھے کئی ماہ سے دیکھتے آرہے تھے۔ گری او جس میں اضافہ ہو گیا تھا۔ زمر سب سے تاخیر سے پہنچ رہی تھی، اور اسکے اندازے کے مطابق باقی سب اس وقت کوئٹہ روم کے باہر پہنچ چکے تھے۔ وہ گھڑی دیکھتی راہداری میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ سینے سے فائٹر لگا رکھی تھیں۔ گھنگریا لے بال آدھے باندھ رکھے تھے، اور سن گلا سزا مانچے پر لکی تھیں۔ چہرہ سخیدہ مگر پر سکون نظر آتا تھا۔ ایک موڑ مڑی تو بے اختیار چکلی۔ سامنے نوشیر وال کھڑا تھا اور اسی کو دیکھ رہا تھا۔

دونوں آمنے سامنے رک گئے۔ زمر نے ساتھ موجو دنوں وکلا کو آگے جانے کا اشارہ کیا اور خود گھری سانس لے کر فرصت سے شیر و کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”آپ کو اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں مجھ سے بات....“

”کیہی ہیں آپ؟“ اس نے سخیدگی سے پوچھا تو زمر نے لب بھخت لئے۔ پھر اب اس میں سر کو خم دیا۔ ذرا سما کرائی۔ ”ٹھیک ہوں۔“ مسکراتی بھوری آنکھوں کو اس کے چہرے پر جمائے وہ عادتاً گال سے مکراتی لٹٹ لٹکلی پر لپیٹنے لگی تھی۔ ”اور اس سب کا بھی تھینک یو جو آپ نے میرے لئے کیا۔“

”اچھا، وہ تھی سے نہ دیا۔“ مجھے لگا آپ لوگ ایکنالج تک نہیں کریں گے۔“

”میں ایکنالج کر رہی ہوں۔ اسی لئے کہہ رہی ہوں، تھیک یو۔“

”اور کیا کوئی میرے خلاف کیس واپس لینے کا سوچے گا بھی نہیں؟“

”نوشیر وال!“ زمر نے گھری سانس پاہر کو خارج کی۔ ”آپ نے میرے اوپر ایک احسان کیا ہے۔ احسان کا بدله احسان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں آپ کے ساتھ ایک اچھے مشورے کی صورت بھلانی کرنا چاہوں گی۔ آج سے ہاشم کو اپنے گواہ پیش کرنے ہوں گے، مگر اس سے پہلے نج صاحب آپ کو کہہ رے میں بلا کیں گے۔“

شیر و کے ابروجیرت سے اکٹھے ہوئے۔ ”مگر میں کہہ چکا ہوں کہ حلف لے کر اپنے خلاف گواہ نہیں بنوں گا۔“

”وہ اور چیز ہوتی ہے۔ یہ اور چیز ہے۔ اس میں حلف نہیں لینا، اور سچ بولنے کی پابندی بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بولیں گے تو بھی سزا نہیں ہوگی۔ چاہیں تو خاموش بھی رہیں۔ نج صاحب کو اختیار ہو گا کہ آپ سے چند سوالات پوچھیں اپنی کنیفوژن لکھیر کرنے کے لئے اور آپ کے جوابات حتیٰ کہ آپ کی خاموشی سے بھی وہ متانج اخذ کر سکتے ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سچ بول دیں۔ یہ آپ کی اپنے ساتھ سب سے بڑی بھلانی ہوگی۔“

”سچ بولاتو مجھے پھانسی ہو جائے گی۔“ وہ دبادبا ساغر یا تھا۔

”آپ کا دن اچھا گز رے!“ وہ ساتھ سے نکل کر چل گئی۔

کوئٹہ روم کے باہر ہاشم کھڑا، موبائل پنیکست کر رہا تھا۔ ساتھ چند دوسرے افراد کے ہمراہ حلیمه بھی کھڑی تھی۔ دفعتاً حلیمه ہاشم

کے قریب آئی اور آہستہ سے بولی۔ ”میرے اور پر جوں مسز زمر کریں گی؟ کیونکہ پاچ روز پہلے جب اپنے اگت پیشی ملتوی ہو گئی تھی اور اس دن میں گواہی نہیں دے سکی تھی تو آپ نے کہا تھا کہ مسز زمر اب مجھے کہاں نہیں کر سکیں گی۔“

”اوہ ہوری!“ اس نے پیشانی پھوٹی۔ ”میں تباہ جھول گیا اس روز ہی تمہاری گواہی ہو جاتی تھیں مذہرتے اپنے کسی گواہ کو جیش کرنے کے لئے ہملاٹ مانگ لی تھی اور پھر... میرا خیال تھا کہ کسی لیے سفر چاہنے والی ہیں نہ کھر...“ اس نے انہوں سے گھربی سائنس لی۔ ”ایسا نہیں ہو سکا۔ اس لئے آج وہی تمہارے اور پر جوں کریں گی۔“ وہ بہترین بیٹھ اُنکھا آہ رہا تھا۔ بات کرنے کرتے تو وہ یکھاں از مر سائنس سے ملی آرہی تھی۔ دلوں کی نظریں میں۔ ہاشم مسکرا کے آگے ہو چکا۔ ”مسز زمر...“ میں نے ساختا کسی حادثے میں پھنس گئی تھیں۔ پھول بھوائے تھے میں نے ہاں حل ساب تھیک ہیں آپ؟“

”اوہ اس کا تروتازہ پھر وہ یکھتے ہوئے بنا کا سکری۔“ اپنے والے سے بچانے والا زیادہ ہوا ہوتا ہے۔“

”گڑا!“ وہ ہزار سکر اپنے تھا۔ ”مگر مجھے مایوسی ہوئی کہ اپنے پوچھنے میں پورت تھک نہیں کر دیں۔ حق!“

وہ بہکتا سا بھس دی۔ ”وہ کیا ہے؟ ہاشم کہ پاچ سال سے روپرٹ روپرٹ کیبل کر اپ تھک گئی ہوں۔ اس وفحہ جس حدالت میں روپرٹ کردا ہی ہے نہ وہ زیادہ قابل بخوبی سے۔ آپ کا بھی دن اچھا گز دے۔“ تزیں سے کہہ کر وہ آگے ہو چکی۔ وہ مسکرا کے سر جھک کر رہ گیا۔

جو اہرات آن کو روت نہیں گئی تھی۔ وہ کاردار گروپ آف ٹائمز کے بینہ آٹھ میں اپنے مصالحین کے ساتھ اور ادھر پکڑ کاٹی۔ تین نئے احکامے رہی تھی۔ گرون کا سربراہ اس آپکا تھا۔ لباس پہلے سے زیادہ شوئش رنگ کا ہو چکا تھا۔ اپنے ایک زیادہ سرخ تھی۔ وہ تین معمولی ملازموں کو جاپ سے فارغ تھا اور چار پاکام کا زیادہ بوجحمدہ! اسکی کوہراہ اور ہر ایک کو حساس والا کر کر وہ اپنے آپکی بیٹھنے والے اپنے آپ کیلی آئی تھی۔ اور اب گومنے والی کرسی پریک لکھا کر پیغمبیری مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگلا قدم کیا ہو چاہیے۔

کوئی لذت بر رستقہ کرے؟ کوئی کام؟ تاکہ جب وہ دلوں کے ہمراہ شان سے گھری ہو تو سارے میں اس کی بخوبی زیادہ دھاک پھر سے بیند جائے۔ مگر گالا کا حیسم کیا ہو؟ تھیں اس سے پہلے ایک معمولی سی پاناسنک سر جری کردا ہی جائے؟ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ حسکنے دیکھنا چاہتی تھی۔

اس نے نجیلیٹ اٹھایا اور اسے چہرے کے قریب لائے۔ سر کری کی پشت سے لکائے انگلی اس پر پھیر لے گی۔ چند ایک سر جری کو گھوپا۔ پھر سائل نیٹ ورکس دیکھنے لگی اور تب تھی ایک گھٹکے سے وہ سیدھی ہوئی۔ شیرنی جیسی ہوری آنکھیں پہلے حرمت سے اور پھر غضب سے پھیلیں۔

اسکرین پر کسی دعوت کی تصویر میں صاحبزادی صاحب پیغمبیری دکھائی دے رہی تھی۔ اسکے چہرے کا ختم رمش واضح تھا۔ ذی المک ایل آر گی تصویر جہاں اس کی جلد کے ہر صامم تھک کو دکھاری تھی تو بال کان میں موجود نہ مرد اور بیرے جلے ایکر تکڑ بھی دکھا گئی تھی جس پر وہ اپنی دو اہلیاں پھیپھر رہی تھی اور... جو اہرات کی نظریں انگلی پر پھیلیں... ایک انگلی میں خلاہت بھرے بیرے والی خوبصورتی اُنکو تھی دمک رہتی تھی۔ ایک زخم رہو جاتا تھا کہ عتنی تھی مگر یہ مختلف زیورات ایک ساتھ... زرناکار کے یہ زخم تو اس کی ملکیت میں تھے۔ مگر یہ صاحبزادی کے ہاتھ میں... جو اہرات کے ہاتھوں سے نجیلیٹ میز پر لڑک گیا۔ وہ شلی پیغمبیری رہ گئی۔

اھر... اب پھر پھر اے اور پھر شرمنی کی آنکھوں میں فٹھے ہمری سرفتی ابھری....

اھر نے اس کی سب سے یقینی تھا اس کی دلخیں کو دے دی تھی! مگر کیا اس نے صرف یقینی تھا دی تھی؟ یا کچھ اور بھی؟ کوئی راز... گوئی بھی...  
.....

وہ بھی سے حکم لئے گئے۔ کچھ بیکاری کا اعلان پر اس کی بائیک اور جیسا کہ پہلے کی  
بھلی بھاندھی میں تھی۔ اس کا مالی تحریک سے کام کر دیا۔ بعد میں اس کی مدد کیا جاتا۔ اب اس کی  
بھلی بھاندھی پر بھرپور تحریکیں ہیں۔

کر، معاشرت میں جانش آندر گھس لے کر اسی نسبت پر باتا دیں۔ سویں سال کی کارروائی بخاتمہ کی گئی۔

شیخ احمد کے ساتھ ہامہ درجہ قریب تک نہ چھوڑ دیا، اگری تو کہا جائے۔ ”سوزان نے آپ بھی رہا اُٹھی کر  
تھیں لیکن پہاڑ کی کلی مطہرات جیکی تھیں۔ کہاں پہاڑ کا تھا جس کی طرح کریمہ جنگی ہوئی کے پہلی کے پیارے“

کہ اگر کسی کو مکمل کرنے کے لئے مدد ہے۔ اور سائنس کے ایک طرف یہ ہے کہ مول پاٹلیں کے پاس پہنچنے کا ایک بارہ بار معمول ہے۔

”آپ بیٹائیں گے تو ناخواست کریں یا بھر جائیں کہ اسی طرح آتے ہیں۔ آپ (مدرسے) کے لئے کوئی کاروبار نہیں تھا میں کوئی سازمانی سماں نے وہی کے لیے کوئی مدد نہیں کی۔ آپ کا دادا ساہب کے لئے اتنا بڑا کام ہے کہ اسکے لئے پہلے کوئی کام نہیں تھا۔“

“تیک ہے اور میں اس سے بچنے کا لڑائیں گی۔ اس سے جھوٹی ہے جو کہ جیسا۔

(امر کے اور کملہ بچے خاتم کے کامیابی کی بڑی تحریکیں اس کے بعد ملکی یونیورسٹیوں میں پھیل دیتے۔)  
”خواہ اگر پڑھ سے پہلے اس کا انتہا ہے تو اس کے لئے خوف جو سلاسل کراچا ہے گی۔“ خاصاب نے صرف  
عمر کے ایام کے انتہا کے لیے اپنا کام کیا۔ اس کا انتہا رہا۔ باتِ عصر اور عین کوئی نہیں کروز کرے۔ عمر اپنے ایک بچے کی  
لیکھنے میں کوئی نظر نہیں پڑے۔

کوئی رہا آپ 21 اگلے کیاں تھے۔ مارپٹیاں کی ہر حد تک سے بچا ہے تھا۔

سرمی دھنی میں تھا تو وہ بھک سے اکٹا رہیں ہے۔ (عمر بھک کو جسے اکٹا رہا تھا بنتے کر دے گی۔)

کتابت نہ میں جلد آگئیں گے لیکن۔

”جسی کچھ از اپنے مکھ ایک بھائی ہے۔ جسی کچھ اس دلکش لئے ہے۔ جسی کچھ اس سوتی سے بھڑا اٹھو۔ جو اپنا اپنے کی  
مکھ سے پچھے خیڑ کر کریں۔“ ”بھائیتے کے پانچ سو سویں بھائیوں کو تو نکروں سے سو سویں بھائیوں  
”اور سویں کے بھائیوں کے پانچ سو سویں“

"سولی خوبی بھی ہوا ہے اور گھوٹکہ تلی کے پانے میں توں لے چاہا کر کے خالی ہیں، جتنا ہے 50 روپے یا 100 روپے کی ستم۔ تو سارے افراد میں 200 روپے کب وہ کمرے سے اڑا کر ایک دلائی تھرا رہ پالیں ہے ملکیں اگر بھی گیا پاپ، اپنے بیٹھاں نے ہوت کر رکھا۔

”اُنہوں کے سیچائی کیس میں بھروسی پختہ اسٹر نیک کیلئے بیکاری کا قبضہ ہے۔ اُنہوں کے سیچائی کے ساتھ میں اپنے اپنے بیکاری کی طرف سے بڑے پیارے ہو گئے۔“

جعفر بن محبث

”سو نیا کی پارٹی میں سعدی سے میری ملاقات ہوئی تھی، وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی ملاقات اپنے ایک انکل سے کروادیں جو ملنگی انٹلی جنس میں کام کرتے ہیں اور آج کل شوال میں تعینات ہیں۔“

”تو آپ وہ کالز مجھ سے اپاٹنٹ لینے کے لئے نہیں کر رہی تھیں جیسا کہ سعدی نے کہا ہے بلکہ معاملہ شوال کا تھا؟“ (شوال ایک علاقہ ہے جو ضرب عصب کے باوجود آج بھی دہشت گردوں کی جنت ہے اور میڈیا پورٹس کے بر عکس وہاں طالبان کا مکمل کنٹرول ہے۔)

”جی۔ انکل سے رابط نہیں ہوا پارہ تھا، اور جب ہوا تو انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ یہی تانے کے لئے سعدی کو کمال کی تھی، اس نے اتنا مجھے بھی اپنے کیس کا حصہ بنادیا۔“ وہ ناخوشی مگر پورے اعتناد سے کہر رہی تھی۔ ہاشم نے مژکر ایک مسکراتی نظر سعدی پر ڈالی اور پھر ”یوروبیٹس“ کہتا ہوا اپنے اپنی جگہ پر آ گیا۔ زمر نشت سے اخی تو پیچھے بیٹھے فارس نے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر فکر مندی نظر آتی تھی۔ (زمرجرح کیسے کرے گی، اور کیا اس ہنسی حالت میں وہ حلیمہ پر کردار کش تابروڑ حملہ ٹھیک سے کر پائے گی، کہیں وہ غصے میں پھر لوز کر کے سب خراب نہ کر دے؟)

زمرجھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہاتھ میں چند کاغذ پکڑے، کٹھرے کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی۔ حلیمہ نے پورے اعتناد سے اس کی آنکھوں میں دیکھا، گویا وہ تیار تھی۔ صبح ہاشم نے اس کی مٹھی میں چند کافی beans ڈالے تھے، اور پھر اسے مٹھی بند کرنے کو کہا۔ ”یہ تمہارا سرمایہ ہے۔ جرح میں وکیل تمہاری مٹھی خالی کروانے کی کوشش کرے گا، مگر تم نے کوشش کرنی ہے کہ کم سے کم دانے گریں اور زیادہ سے زیادہ تمہارے پاس محفوظ رہیں۔“ اور اس مثال سے وہ سمجھ گئی تھی۔

”ٹھیک یو حلیمہ، عدالت کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے، وہ مسکرا کر گویا ہوئی۔ چمکدار بھوری آنکھیں حلیمہ پر جمی تھیں۔“ مگر مجھے آپ سے ایک گلہ بھی ہے۔“

حلیمہ اس نرمی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ قدرے تذبذب سے بوی۔ ”جی؟“

”یہ سچ ہے ناکہ میں نے آپ کو متعدد بار کالز کیں اور ملنے کی کوشش کی، تاکہ آپ سے آپ کی طرف کی کہانی سن سکوں، کیونکہ ابھی تک تو مجھے صرف سعدی یوسف کی طرف کی کہانی معلوم ہے، مگر آپ مجھے نہیں ملیں۔“

”یہ میرا قانونی حق ہے، میم!“ وہ گردنگڑا کے بوی۔

”آف کورس یا آپ کا حق ہے۔ ارے نہیں آپ غلط سمجھیں۔ آپ کا حق سلب کرنے کی بات نہیں کر رہی میں۔ بلکہ وہ یاد کر کے ہلکا سا ہنسی۔“ ایک کیس میں، میں خود جب گواہ پیش ہوئی تھی، فارس غازی کے خلاف، تو میں نے بھی مخالف وکیل سے بات کرنے سے یا ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں آپ کی پوزیشن سمجھ سکتی ہوں، اور مجھے کبھی اچھا نہیں لگتا کہ ہم کسی لڑکی کو اس کٹھرے میں لا کر کھڑا کریں۔ اس لئے میں چاہوں گی کہ آپ بالکل کمفر ثیبل ہو جائیں، بس آپ کو میرے چند سوالات کے جواب دینے ہیں، اور پھر آپ جا سکیں گی۔“

حلیمہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا�ا۔ زمر کے پیچھے ہاشم کو دیکھنے کی کوشش کی مگر زمر نے جیسے ہی اس کی نگاہوں کا رخ دیکھا، وہ ذرا دا میں طرف سرکی۔ راستہ بلاک ہو گیا۔ حلیمہ اب ہاشم کو دیکھنے نہیں پا رہی تھی۔

”مگر یہ سچ ہے ناکہ میں پہلی دفعہ آپ سے اس کیس کے بارے میں بات کرنے جا رہی ہوں۔“

”جی!“

”مگر ہاشم کا رد اس سے کئی گھنٹے تک آپ نے گواہی ڈسکس کر کے تیاری کی ہو گی تو آپ براؤ نہیں مانیں گی اگر میرے سوالات لمبے ہو جائیں کیونکہ مجھے پہلے وقت نہیں دیا آپ نے تو وہ کی بھی تو پوری کرنی ہے نا۔“ وہ نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہر رہی تھی۔ حلیمہ نے تھوک نگلی۔ پھر ذرا دا میں طرف ہوئی مگر زمر اس کے ساتھ اسی طرف سرک گئی۔ راستہ ابھی تک بلاک تھا۔ ”جی شیورا! وہ مجبوراً بولی۔“

”آپ آب جیکٹ کریں۔“ نو شیر والے نے بے چینی سے ہاشم کو مخاطب کیا، جو خود بھی قدرے اچنہ بے کا شکار لگتا تھا مگر جواب میں شیر و کوکا کٹ کھانے کو دوڑا۔

”کس بات پے؟ کہ وہ شائستگی سے کیوں بات کر رہی ہے؟“

”اوے تھیک یو حلیمہ۔ بس میں آپ کے چند منٹ لوں گی۔“ وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔

”میں نے سنا ہے آپ بہت قبل بیکری ہیں، اور بہت جانشناختی سے اپنا کام کرتی ہیں!“ زمر تو صفائی انداز میں شروع ہوئی۔

”جی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”اور آپ کبھی بھی چھٹی نہیں کرتیں، یہاڑی کی حالت میں بھی آفس جاتی ہیں۔“

”جی۔“ وہ کردار پہ مملوں کی تیاری کر کے آئی تھی اور یہاں اس کی تعریف ہو رہی تھی؟

”گذر تو کیس میں کوآپ آفس میں ہی تھیں؟“

”جی میں سارا دن ڈیک پڑھی۔“

”اور کیس میں کوئی نیچے لا بی میں کتنے لوگ سارے دن میں آئے تھے؟“

”میں لا بی میں آنے جانے والوں سے ناواقف ہوں، میں صرف ان کا بتا سکتی ہوں جو میرے سامنے لفت سے اتر کر ہاشم کا ردار کے آفس میں جاتے ہیں۔“

”یعنی کہ آپ بلڈنگ میں داخل ہونے والے ہر شخص کا حساب نہیں رکھتیں، صرف انہی کا حساب رکھتی ہیں جن کو آپ دیکھ سکتے

ہیں۔“

”جی۔“

”جن کو آپ دیکھ سکتی ہیں، راکٹ؟“ اس نے زور دیا۔ سب دم سادھے ن رہے تھے۔

”جی۔“

”اور سعدی کوآپ نے نہیں دیکھا تھا؟“

”نہیں۔ اگر وہ آیا ہوتا تو مجھے پڑھتے ہوتا۔“

”کسیے پڑھتے ہوتا؟“

”کیونکہ لفت میرے سامنے ہے، اور مجھے کراس کر کے ہی کوئی کاردار صاحب کے آفس میں جا سکتا ہے۔“

”وہ تو اسٹاف لفت ہے نا۔“ زمر نے چند کاغذات اس کے سامنے رکھے جن پر آفس فوٹو زپرنٹ کی گئی تھیں۔ ”ایک پرانی بیوٹ

لفٹ بھی توہاں کے کونے میں ہے، اور اس سے کاردار صاحب کے خاص مہمان اترتے ہیں، اس کے ایک طرف گلاس وال لگی ہے جو معمولی سی

دھنڈلی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی وہاں سے اترے تو آپ کو کراس کیے بغیر ہی سیدھا کاردار صاحب کے آفس میں چلا جائے؟“

حليمہ لمحے بھر کو چپ ہوئی۔ ہاشم کو دیکھنے کی راہ ہنوز بلاک تھی۔ ”وہ گلاس بہت معقولی سادھنلا ہے اور کسی انسان کے کندھوں تک

آتا ہے۔ کوئی وہاں سے گزرتا تو اس کا سر نظر آہی جاتا ہے۔ چند فٹ دور ہی تو میرا ڈیک ہے۔“

”اور آپ کی آنکھیں کیسی ہیں؟“

”سوری!“

”کیا یہ سچ نہیں ہے مس حليمہ کہ میں اپریل کوآپ کی آنکھوں کی Laser سر جری ہوئی تھی، پی آر کے، مگر آپ نے صرف دو دن

کا آف لیا تھا اور تیرے دن آپ جا ب پر واپس آگئی تھیں۔“

”جی۔ یہ درست ہے۔“

”اور آپ نے اپنے باس کو نہیں بتایا تھا کہ ’پی آر کے‘ کے بعد آنکھ کھلتی ہی دو دن بعد ہیں اور بصارت دھنڈتی ہوتی ہے۔ کم از کم چار سے پانچ ماہ لگتے ہیں دونوں آنکھوں کی نظر شارپ ہونے میں۔ آپ کا نمبر منی چار اعشار یہ پانچ تھا، جو کافی کمزور ہے۔ آپ کی نظر واپس آنے میں کم از کم بھی دو ماہ لگتے تھے۔“

حیمد نے بے چینی سے اس کے پیچھے دیکھنا چاہا مگر بے سود۔ ہاشم نے کوفت سے پہلو بدلا۔ وہ اعتراض کرتا تو وہ مزید لکھیوڑ ہو جاتی۔  
”میری نظر بالکل ٹھیک تھی۔“

”مگر کیا ان دونوں آپ اسیراں مذہر اپس آنکھوں میں نہیں ڈال رہی تھیں؟“

”بھی مگر.....“

”اور آپ نے ۵ جوں کا پنے ڈاکٹر کو پوسٹ آپ چیک اپ میں کہا تھا کہ اس بھتے جب سے آپ نے اسیراں مذہر چھوڑے ہیں آپ کی نظر بحال ہونے لگی ہے۔ یعنی ایکس مئی تو اس سے پہلے آیا تھا۔ ایکس مئی تک تو آپ ڈاکٹر کے حروف تہجی بورڈ کی آخری چار سطونیں پڑھ سکتی تھیں۔“

”میری نظر دراں کمزور تھی، مگر میں سارا کام احسن طریقے سے.....“

”آپ کہہ پچھلی ہیں کہ آپ بماری میں بھی آ جاتی تھیں آفس، تو ان دونوں آپ کو دو میٹر سے آگے نظر نہیں آ رہا تھا، مگر آپ نے اپنے باس کو نہیں بتایا اور کام کرتی رہیں۔“

”مگر میں.....“ وہ مضطرب ہو کر بولنا چاہ رہی تھی مگر.....

”اور یہ عین ممکن ہے کہ قریباً بارہ میٹر دور موجود پر ایکوٹ لفت سے سعدی جب اترتا ہو، تو آپ نے فاصلے کے باعث اسے پہچانا ہو۔“

”مگر وہ پر ایکوٹ لفت سے نہیں اترتا تھا۔“ وہ بے چینی سے بولی۔

”یعنی وہ اسٹاف لفت سے اترتا تھا؟“ وہ تیزی سے بولی۔

ہاشم نے آنکھیں بیچ لیں۔ (اف)

حیمد لمحے بھر کو چپ ہوئی۔ ”وہ کسی بھی لفت سے نہیں اترتا تھا۔“

”مگر یہ عین ممکن ہے کہ آپ نے اسے نہ دیکھا ہو، کیونکہ آپ آنکھوں میں ان دونوں steriods اتی تھیں اور پر ایکوٹ لفت سے آنے والے کو نہیں دیکھتی تھیں یوں وہ آپ کو بائی پاس کر کے ہاشم کے آفس میں جا سکتا تھا۔ آپ جھوٹ نہیں بول رہیں۔ آپ میں دراصل دیکھنے کی الیت ہی نہیں تھی۔ تھیک یو مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“ اب کی بارا یک دم تیزی اور درشتی سے کہہ کر زمرداپس ہوئی۔ حیمد نے بے بھی سے ہاشم کو دیکھا جواب نظر آیا تھا اور اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا۔ وہ ری ایکڑا من کے لئے بھی نہیں اٹھا۔ مزید کوئی گل افشا نہ کر دے وہ اور گواہ کو جانے دیا۔

”زمر!“ وہ واپس بیٹھی تو سعدی نے آہستہ سے اسے مخاطب کیا۔ وہ اس کے قریب ہوئی۔

”فارس ما موں کی رہائی سے پہلے جب میں نے ایک ہوٹل میں حیمد کے ہاتھ میں موجود ہاشم کے لیپٹاپ کو یو ایس بی گاگر بیک کرنے کی کوشش کی تھی، تو وہ مجھے نوٹس نہیں کر پائی تھی۔ یقیناً اس لیے کہ اسکی نظر خراب تھی۔“

”ہاں۔“

”مگر زمر، میں تو ریگول اسٹاف لفت سے اتراتھا۔“ اس نے جلدی سے صحیح کی۔

”سعدی یوسف خان۔ کورٹ روم میں جھوٹ کوچ سے نہیں ہرایا جاتا۔ جھوٹ کو اس سے بڑے جھوٹ سے ہرایا جاتا ہے۔“ مسکرا کے کر کہتے وہ اپس سیدھی ہو گئی۔

جب وہ باہر نکلی تو راہداری میں اپنے بار کے ساتھ چلتی حیله اسے صفائیاں دے رہی تھی اور وہ غصے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ مسکرا کے آگے بڑھ گئی۔ تب احساس ہوا کہ کوئی اس کے ساتھ آ کر چلنے لگا ہے۔ وہ رکنی نہیں، مرٹی نہیں، قدم اٹھاتی رہی۔ آگے بڑھ گئی۔ مسکراہٹ دبائے وہ بولا تھا۔ زمر نے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔

”میں تو دکالت کر رہی تھی۔“

اور یقیناً اس کے ڈاکٹر کی فیس وغیرہ کا آپ کو ہاشم کے کمپیوٹر سے چوری کی گئی فائلز سے معلوم ہوا ہو گا۔“

”وکیل اپنا سورس نہیں بتاتے اور دونہر لوگوں کو تو بالکل بھی نہیں۔“ وہ دو قدم آگے بڑھ گئی، مگر وہ رکارہا۔ پھر مسکرا کے بولا۔ ”میں متاثر ہوں۔“ زمر کے قدم زنجیر ہوئے۔ وہ گھوٹی تو آنکھوں میں حیرت تھی۔

”مجھ سے؟“

”ہوں۔ تم سے۔ کیونکہ اچھا کیل وہ ہوتا ہے جو وہاں سے آئے جہاں سے تصور بھی نہیں کیا ہو۔ ہم سب سمجھ رہے تھے تم اس کے کردار اور قابلیت پر حملہ کر کے اس کو جھوٹا کہو گی، مگر تم نے یہ ثابت کیا کہ وہ حق یوں رہی ہے، بس بے چاری کو نظر ہی نہیں آیا تھا۔“ مسکرا کے بولتے ہوئے وہ اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ مجھے کافی اچھا لگا یہ سب دیکھ کر مگر ذہن بھی لگا۔ سوچ رہا ہوں آئندہ معلوم نہیں با توں میں تم سے جیت بھی سکوں گا یا نہیں۔“

”استغفار اللہ!“ وہ خنگی سے کہتی سر جھلکتی آگے بڑھ گئی اور وہ اداس مسکراہٹ سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

❖❖❖

صحیح کے تحت نشین شام کو مجرم ٹھہرے ..... ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا رات شہر پر اتری تو بلند و بالاعمار توں کی ساری روشنیاں جگہ گاہیں۔ ایسی ہی ایک روشن پر شکوہ عمارت ایک سکس اسٹار ہوٹل کی تھی جس کے اندر رجاؤ تو لاپی میں رنگوں روشنیوں اور خوبیوں کا سیلا ب الہ آیا تھا۔ ہنستے ہوئے بے ٹکر خوبصورت لوگ .... اور ان سب کے درمیان سے گزرتی صاجزادی صاحبہ، جس کے کانوں کے نگینے جگہاں ہے تھے اور انگلیوں کی انگوٹھیاں نگاہیں خیرہ کردیتی تھیں۔ اس کے پیچھے دو باڑی گارڈز چل رہے تھے اور وہ تینوں لفت کی سمت جا رہے تھے۔ صاجزادی صاحبہ کی مسکراہٹ ویسی ہی چہرے پر جھی رہی جب وہ بالائی منزل پر ایک راہداری سے گزر کے ایک سویٹ کے باہر آٹھھری۔ گارڈ زنے دروازہ کھٹکھایا، تو اگلے ہی لمحے وہ کھل گیا۔ کھولنے والی خود جواہرات تھی۔ سرخ لباس میں ملبوس سرخ لپ اسٹک لگائے بالوں کو کرل کر کے چہرے کے ایک طرف ڈال رکھا تھا، اور مسکراہٹ تھی۔

”آپ کو میرے لئے دروازہ خود کھولنا پڑا؟“ صاجزادی صاحبہ طنز سے مسکرائی۔

”چونکہ آپ نے کسی حساس موضوع پر ملنے کے لئے کہا تھا تو میں نے اپنے اشاف کو تجویز دیا۔ آئیے نا۔“ خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے راستہ چھوڑا۔

چند منٹ بعد وہ دونوں شاہانہ طرز کی کرسیوں پر آئنے سامنے بیٹھی تھیں، درمیان میں میز تھی جس پر پھول رکھے تھے۔ (گارڈز باہر

(تھے)

”آپ کے زیورات بہت خوبصورت ہیں۔“ جواہرات مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے آپ کی طرح لبی لمبی ادا کاریاں نہیں آتیں جواہرات بیگم۔“ وہ اب کے بولی تو مسکرا ہٹ سمت گئی تھی اور آنکھوں میں تپش در آئی تھی۔ ”یہ مجھے احر شفیع نے دیے ہیں۔ آپ کی ملکیت تھے یہ۔ اور اب میری ملکیت ہیں۔“

”احرا!“ وہ ہلاکا سا ہنسی۔ پھر کہنی کری کے تھپ پر کھے ایک انگلی گال تلنے رکھے وہ دلپکھی سے صاحبزادی کو دیکھنے لگی۔ ”اور کیا دبایے احر نے آپ کو۔“

”مجھے تو آپ پہ ترس آ رہا ہے۔“ وہ واقعی ترجم سے بولی تھی۔ ”بہت دنوں بعد آپ آفس اور سو شل گیدرنگز میں نظر آئی تھیں، اپنے پورے جاہوجلال کے ساتھ، مگر کون جانتا تھا کہ یہ تخت و تاج محض چند دن کا تھا جان ہے۔ بس چند الفاظ اس کو اتنے کے لئے کافی ہیں۔“

”اچھا، اور آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میرا تخت اتنے والا ہے؟“

”کیونکہ آپ کے تخت کو اٹھانے والے آپ کے دو بیٹے ہیں، اور جس دن وہ آپ کی حقیقت جان گئے، آپ تباہ ہو جائیں گی۔“

”اور کیا ہے میری حقیقت؟“

”مسز کار دارا!“ وہ ذرا سما سکرائی۔ ”کہا تھا نامیں نے آپ کو۔ جیسے آپ نے میری زندگی برپا کی ہے، میں بھی کروں گی۔ کہا تھا نامیں انقاص ضرور لوں گی۔ آپ سوچیں، اس وقت آپ پہ کیا گزرے گی جب ہاشم جان لے گا آپ نے.... اس کے باپ کا... قتل کیا ہے۔“ جواہرات مسکرا تی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے انگلی پہ گھنکر پالی لاث پیشی رہی۔

”اور یہ بتانے کے احر نے کتنے پیے لئے ہیں آپ سے؟“ کوئی حیرت کوئی شاک نہیں۔

”آپ خود کو جتنا بھی کیپوزڈ ظاہر کر لیں، آپ کا چہرہ گواہی دیتا ہے کہ آپ اور نگزیب کاردار کی قاتل ہیں۔“

”اور یہ بھی اس نے کہا ہو گا کہ میرے پاس ثبوت نہیں ہے مگر مسز کار دار کا چہرہ اس گواہی کے لئے کافی ہے۔“ وہ ہلاکا سا ہنسی۔ صاحبزادی صاحب کے اعصاب تن گئے۔ اس کو یہ امید نہیں تھی۔ قدرے بے چینی سے بولی۔ ”سعدی یوسف سب جانتا ہے کہ کس طرح تم نے اپنے شوہر کو مارا، اور میری انجیوں بھی گواہ ہے۔“

”اوہ ڈار انگ، تم بھی کن لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنے قد سے بڑی باتیں کرنے آ گئیں۔“ جواہرات نے افسوس سے گھری سانس بھری۔ صاحبزادی صاحب کو اب غصہ چڑھنے لگا۔

”جس دن میں نے ہاشم کو متادیانا، وہ تمہاری جان لے لے گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ تمہارے ڈرائیور کو جو صبح چھٹی لے کر گیا ہے، کل شام میں نے خرید لیا تھا، اور اس نے مجھے سب بتا دیا کہ کس طرح سعدی اور احر نے اپنی جان بچانے کے لئے تمہارے ساتھ یہ جھوٹ بولا، اور تم بی بی۔ تم چلی آئیں میرا تخت گرانے۔“ یہ کہتے ہوئے جواہرات انھی اور ساتھ والے کمرے کا نیم وار روازہ کھوں دیا۔ صاحبزادی صاحب نے چونک کر گردن موڑی، اور انکل لمحے وہ سانس تک لینا بھول گئی۔

دہاں سے وہ دنوں اندر داخل ہوئے تھے۔ ہاشم اور نو شیر واں۔ سوٹ میں ملبوس چھپتی ہوئی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے۔ وہ اپنی ماں کے دامیں بائیں آ کھڑے ہوئے تھے اور جواہرات مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

”میں جانتی تھی تم مجھے بلیک میل کرنے آؤ گی، اس لئے میں نے اپنے بیٹوں کو بھی بالایا۔ اور دیکھو وہ میرے ساتھ کھڑے ہیں، ان کو مجھ پر پورا اعتماد ہے۔“

صاجزادی فقیر چہرہ لئے کھڑی ہوئی۔ تھوک لگا۔ باری باری ان دونوں کے سپاٹ چہرے دیکھے۔ ”تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو مارا ہے۔“ وہ دبادبا سا چلائی۔

”اچھا کیا شہوت ہے آپ کے پاس؟ اور سعدی کا نام مت لینا، آپ کے ڈرائیور سے سن چکا ہوں۔ سعدی تو کل تک خاور کو میرے باپ کا قاتل کہتا تھا۔“ ہاشم تختی سے گویا ہوا۔ وہ نارمل نظر آ رہا تھا۔

”تمہاری ملازمہ گواہ ہے، اس نے تمہارے باپ کے باختر روم سے جواہرات کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔“  
”جست گیث آؤٹ!“ ہاشم نے بے زاری سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں..... میں ساری دنیا کو بتاؤں گی کہ تم کیسی عورت ہو۔ اپنے بیٹوں کو دھوکا دے رہی ہو۔ پوسٹ مارٹم والے ڈاکٹر کو بھی تم نے سری لکھا سے احر کے ذریعے کا ل کروائی تھی اور جب اس کے پاس گئی تو اس کو اتنا ذرا ریما کر اس نے خاور کا نام.....“ (شیرونے بہت آہستہ سے سراخھایا۔)

”نکل جاؤ بیہاں سے۔“ جواہرات حلق کے بل چلائی تھی۔ وہ سہم کر خاموش ہوئی۔ جواہرات قدم قدم چلتی اس کے قریب آئی اور سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھورا۔

”سعدی کو کہنا ہمارا فیملی یونٹ وہ کبھی نہیں توڑ سکتا۔ رزق اور راج صرف کوشش نہیں ملتا۔ یہ ادھر (پیشانی پر انگلی رکھی) ادھر لکھا ہوتا ہے۔ میرا بخت ادھر لکھا ہے۔ رہے یہ زیورات تو تم یہ رکھ سکتی ہو۔ یہ cursed ہیں۔ جلد ہی تمہیں دلدل میں دھکیل دیں گے اور تم مجھ سے بڑی ڈائن بن جاؤ گی۔ اب دفعہ ہو جاؤ۔“ اور صاجزادی کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ باری باری سب کو دیکھا اور پھر تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔ جواہرات اب کے مڑی تو آنکھوں میں آنسو تھے۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں نے صحیح میری ساری بات سن کر میرا ساتھ دیا اور سعدی یوسف کے پلان کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ مجھے تم دونوں پر فخر ہے۔“

ہاشم نے کندھے اپکائے اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بے زار لگ رہا تھا۔ نو شیر والا البتہ بھی تک بت بنا کھڑا تھا۔ ہاشم اسی بے زاری سے کہنے لگا۔ ”سعدی بار بار ڈیڈی کی موت کو نجی میں کیوں لے آتا ہے؟ اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ خاور اصل قاتل ہے بھی یا نہیں۔“

جوہرات کا دل بری طرح کانپا۔ وہ بہت بڑا کھیل گئی تھی مگر اس کے سوا اور چارہ نہ تھا۔ ”آف کو رس خاور قاتل ہے ہاشم۔ اب میں یا تم تو قاتل ہو نہیں سکتے۔ کہیں تم بھی اس کی باتوں میں تو نہیں آ گئے۔“

”اوہ نہیں می۔ میں تو بس سوچ رہا ہوں کہ وہ اب اس بات کو ہر جگہ استعمال نہ کرنا شروع کر دیں اور.....“

”احمر کو کیسے پتہ ڈاکٹر کے گھر والی بات؟“ نو شیر والا کسی خواب کی کیفیت میں بولا تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔

”پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کے گھر ریسین میں آپ اور بھائی گئے تھے۔ احر تو بہ ہمارا ملازم بھی نہیں تھا۔ تو اسے کیسے پتہ چلا کہ آپ نے ڈاکٹر کو ڈرائیور نے والی باتیں کہی تھیں؟“ شیر و عجیب سی نظر وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بچھ گئی۔

”کیونکہ احر کے ذریعے خاور کا پتہ صاف کیا تھا، ہم نے شاید میں نے ہی بتایا ہو۔ اب کیا تم مجھے ایسے دیکھو گے؟“

”اور اس نے میری کا نام کیوں لیا؟ آپ میری کو ڈرائیور پورٹ کرنا چاہتی تھیں، آپ میری سے ڈیڈی کی موت اکے بعد سے خوش نہیں تھیں۔“

”نو شیر والا بھی پتہ شک ملت کرو۔“ ہاشم اکتا کر کھڑا ہوا۔ ”ان کی باتوں کو اپنے ذہن پر سوار ملت کرو چلو ڈر نزکرتے ہیں۔“ اس نے اس کا شانہ تھپھایا تو شیر و نے سر جھکایا۔ جیسے بہت سے خیالات بھی جھکلے۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے نظر آتے تھے اور جواہرات بظاہر پر سکون

سی اند عجیب طفانوں میں گھری تھی۔ صاحبزادی کے بتانے سے بہتر تھا وہ خود ان کو بتادے یہ حکمت عملی اس کا آخری آپشن تھا۔ آخری ہوا۔ اور اس کا نتیجہ اتنا حوصلہ افزائیں تھا جتنا وہ چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی اس کے میئے اس کے ساتھ تھے۔ اسے اور کیا چاہیے تھا؟

❖ ❖ ❖

امید کے صحراء میں جو برسوں سے کھڑا ہے ..... حالات کی بے رحم ہواوں سے لڑا ہے  
مورچاں پر وہ حصہ زدہ رات مغموم ہی پھیلی تھی۔ لا دخیل کی دیوار کو نئے سرے سے صاف پینٹ کر کے خین فارغ ہو چکی تھی۔ وہ نقش  
ونگار چھپ گئے تھے اور اب وہ چند روز میں اس پر stencil پینٹ کر سکتی تھی۔ شکر۔ وہ گلوٹ اتارتی، برش اور ڈبے اٹھاتی، سیڑھیاں چڑھنے کی  
تاکہ اپنے کمرے میں جا کر اس سامان کوٹھکا نہ لگائے، پھر سعدی کے کمرے کی جلتی ہتھ دیکھ کر ادھر چلی آئی۔  
وہ اسٹڈی چیئر پر نیک لگائے بیٹھا تھا، اور پر سوچ نظریں چھپتی کی تھیں۔

”پریشان نہ ہو بھائی ہم پھر سے ڈاکٹر مایا کوڈھونڈ نے کی کوشش کریں گے۔“ اس کے نزدی سے پکارنے پر وہ چونکا پھر اسے دیکھ کر  
ذراس مسکرا یا۔ ”پتہ ہے خین، صرف ایک بات مجھے تسلی دیتی ہے کہ ہمارے نجح صاحب ایماندار آدمی ہیں۔“

”اور مجھے صرف ایک بات خوف دلاتی ہے کہ بڑے فیصلے کرنے کے لئے صرف ایماندار ہونا کافی نہیں ہوتا۔“ وہ سوچ کر رہ گئی، مگر  
بولی تو صرف اتنا۔ ”چاہے ہم جنگ جیتیں یا ہماریں، حق کے لئے لڑنا ہمیشہ درست ہوتا ہے۔“

پھر وہ چلی گئی اور وہ دیں بیٹھا سوچتا رہا۔ مایوسی، اداہی اور امید کے درمیان وہ کہیں ہوا میں معلق تھا۔ کسی کچھ دھاگے سے لکا، کسی  
پکی زنجیر سے بندھا۔ پھر وہ اٹھا اور وضو کر کے آیا۔ تو یہ سے ہاتھ منہ خشک کیے اور اسٹڈی ٹیبل پر قرآن لئے واپس آبیٹھا۔ ایک یہی کلام اللہ تو  
تھا جو ہر انہیں میں تسلی دیتا تھا، کہ خیر ہے جہاں اتنا چل لیا وہاں کچھ اور چلتے جاؤ، روشنی مل جائے گی۔ تمہارے حصے کی روشنی تمہیں ضرور ملے  
گی۔ میں تھوڑا اصر اور۔ بس تھوڑا فاصلہ اور ”میں پناہ چاہتا ہوں اللہ کی دھنکارے ہوئے شیطان سے۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو رحمٰن اور حِیم  
ہے۔“ اس نے مطلوب آیت سے اپنی محبوب سورہ کھوئی۔

”اور بے شک تیرارب جانتا ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے (جو ان کے میئے چھپاتے ہیں) اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔“

”اور آسمان اور زمین میں ایسی کوئی پوشیدہ بات نہیں جو روشن کتاب میں نہ ہو۔“ (سورہ النمل: 74-75)

”یہ آیت اللہ تعالیٰ آپ نے قرآن میں کتنی دفعہ ہو رہی ہے؟ ان گنت۔ اور اس کے ان گنت رموز ہر دفعہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ نہیں  
فرمایا ہیاں کہ تم چھپاتے ہوئے فرمایا۔“ جو ان کے میئے چھپاتے ہیں۔ ”یہاں جو گلٹی پارٹی ہے وہ انسان نہیں ہے۔ وہ اس کا سینہ ہے۔ دل بھی  
سینے کے اندر ہوتا ہے۔ اور ہم خود کیوں نہیں؟ اگر غور کرو تو آیت کے شروع میں فرمایا۔ ”آپ کارب“۔ صرف رب بھی کہا جا سکتا تھا مگر۔ ”آپ کا  
رب“ کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ جس کے دل کی بات ہو رہی ہے وہ تو اللہ کا بندہ ہے۔ میں اور آپ، ہم اللہ کے ہیں، اسی لیے شاید اللہ  
تعالیٰ ہمیں رعایت دے دیتے ہیں۔ صرف نظر کر جاتے ہیں ہماری غلطیوں سے... مگر یہ ہمارے دل ہیں جو بے قابو ہو جاتے ہیں۔ کبھی  
compulsive liars کو دیکھا ہے؟ وہ بات بات بغیر سوچے سمجھے جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کا دماغ ابھی سامنے والے کا سوال سمجھا ہی  
نہیں ہوتا کہ زبان جھوٹ بول دیتی ہے۔ تو یہ دل کیسے انسان کو بے بس اور مجبور کر دیتا ہے؟ جب ہم اس میں غلط خزانے بھرتے جائیں اور اس کو  
کسی شے کا عادی کر دیں۔ ہم غلط کام اس میں چھپاتے ہیں تو یہ عادی ہو جاتا ہے، پھر خود سے ہم سے پوچھے بغیر اپنے اندر غلط چیزیں غلط  
خیالات غلط ارادے غلط محبتیں غفوظ کرتا جاتا ہے۔ پھر یہ قابو میں نہیں رہتا۔ اور اس کا حل کیا ہے؟ حل وہی ہے کہ جب کتنے اور تصویر و اگر  
میں فرشتے نہیں آتے تو اللہ ایسے دل میں کیوں اپنی محبت ڈالے گا جس میں جھوٹ دھوکے، غلط راز اور غلط لوگ بے ہوئے ہوں؟“ وہ اپنی توٹ  
بک پر لکھتا بھی جا رہا تھا۔ ذہن کی آلووگی دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی۔ ایک یہی کتاب تو ساری کشافت دور کر دیتی تھی۔

”بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باقتوں کو ظاہر کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور بے شک وہ ایمانداروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ بے شک تیرارب ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کرے گا اور وہ غالب علم والا ہے۔“ (سورۃ نمل: 76-78)

”مجھے آج اس آیت کو پڑھ کر یہ لگ رہا ہے اللہ تعالیٰ کہ قرآن ہر ایک کے لئے مختلف کردار ادا کرتا ہے۔ کچھ لوگ جو اس کو بھلا بیٹھنے ہوتے ہیں، ان کی عبرت کی مثالیں یہ ان کو نہاتا ہے جو اس کو بار بار پڑھتے ہیں۔ ہمارے آپ کے سارے جھگڑوں اور اختلافات کا حل اس میں موجود ہے، اور جن کا نہیں ہے، ان کا فیصلہ آپ قیامت کے روز کر دیں گے اللہ تعالیٰ، مگر مجھے اپنی امت کی فرقہ واریت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اختلافات کے نام پر ہمارے ہاں اتنی تقسیم ہے والوں کو ڈانت کیوں دیتے ہیں؟ کسی کی جنت یا جہنم کی کوئی گاری نہیں ہے سوائے انبیاء کرام اور عشرہ مبشرہ صحابوں یا بدر کے مجاہدوں اور چند مگر صحابہ کے یا چند اور ایسی ہستیوں کے جن کے بارے میں احادیث میں بتایا گیا ہے۔ کسی امام، کسی پیر، کسی اسکالر، کسی لیڈر، کسی کی جنت کی گاری نہیں ہے۔ تو پھر، ہم اپنی جنت پکی کر کے دوسرے کی جہنم کا ٹکٹ کیوں ہاتھ میں لیے گھومتے ہیں؟“

”سوال اللہ پر بھروسہ کر بے شک تو صریح حق پر ہے۔ البتہ تو مرسوں کو نہیں سنا سکتا اور نہ بھروسوں کو اپنی پکارنا سکتا ہے جب وہ بیٹھ پھیر کر لوٹیں اور نہ تو انہوں کو ان کی گمراہی دور کر کے ہدایت کر سکتا ہے تو ان ہی کو سنا سکتا ہے جو ہماری آئتوں پر ایمان لا کیں سو وہی مان بھی لیتے ہیں۔“ (سورۃ نمل: 81-82)

”لیکن پھر یہ ساری باتیں ہر ایک پا اڑ کیوں نہیں کرتیں؟ کیوں بہت سے لوگ اندھے گونگے بھرے ہن کر کفر کے فتوے دوسروں پر چھوپے چلتے ہیں؟ انسانوں کی پیروی میں اندھے ہو جاتے ہیں؟ کیونکہ شاید قرآن سے ہدایت اور رحمت ایمان والوں کو ملتی ہے اور ایمان ہوتا کیا ہے بھلا؟ خوف اور غم سے نجات پالینا۔ کھلا ذہن رکھنا جس میں زمی ہو، تنگی نہ ہو، سختی نہ ہو۔ ایمان کیا ہوتا ہے؟ حیا۔ دوسروں کا دل دکھانے سے شرم کرنا۔ سخت باتیں سنا دینے سے شرم کرنا۔ سامنے والے کے احساسات کا خیال کرنا۔ اور کیا ہوتا ہے ایمان؟ قرآن و حدیث کو شہوت مانا اور اپنی رائے سے اوپر سمجھنا۔ یہ جب انسان میں آ جاتا ہے نا یہ خیال کہ میں اور میرا مسلک غلط ہو سکتے ہیں، مگر اللہ کی بات حرف آخڑ ہے۔ تب انسان کا ذہن کھلتا ہے اور وہ سنتا بھی ہے اور سمجھتا بھی ہے۔ میں نے بڑے بڑے مدرسوں اور یونیورسٹیز سے پڑھنے والے علماء کو دیکھا ہے۔ وہ اتنی سختی سے دوسروں پر گھٹا کھٹ فتوے لگاتے ہیں کہ عام زندگی میں بھی ان کا یہی رویہ ہن جاتا ہے۔ مزاج میں سختی، ہر وقت دوسروں کو نج کرنا اور بدکلامی۔ ان چیزوں سے دل سخت ہوتا ہے اور پھر وہ ہدایت نہیں لیتا۔ اور میں نے انہی مدرسوں اور یونیورسٹیز سے نکلتے ایسے علماء کو بھی دیکھا ہے جو گو کہ اپنی اٹل رائے رکھتے ہیں، مگر دوسروں کی بھی سنتے ہیں، اور زندگی سے سمجھانا بھی جانتے ہیں۔ دلیل سے بات کرتے ہیں، غصے سے نہیں۔ حقارت اور نفرت سے نہیں۔ اللہ ایسے زم خولوگوں کا نام ہمیشہ بلند کرتا ہے، کیونکہ یہ ”اللہ کے دشمنوں“ سے سخت بات بھی سختی اور بدکلامی سے نہیں کرتے۔ سیسے پلائی دیوار کی طرح اپنی رائے اور دلیل بیان کرتے ہیں مگر دوسروے کے کان میں سیسے نہیں گھولتے۔ ہمیں ضرورت ہے ایسے لوگوں کی طرح بننے کی، اور اس کے لئے سب سے پہلے یہ سمجھنا ہو گا کہ کوئی دو انسان ہر چیز کے بارے میں ایک جیسا نہیں سوچ سکتے۔ ہمارے گھر والے بھلے سیاسی اور مذہبی خیالات ہمارے جیسے رکھتے ہوں مگر کئی جگہ ان سے بھی ہماری رائے مختلف ہو سکتی ہے۔ مگر مزاج کی یہ زیستی صرف تبا آئے گی جب ہم ”ایمان“ لے آئیں گے اور جان لیں گے کہ سب سے زیادہ درست صرف اللہ ہے۔ باقی ہم سب غلط ہو سکتے ہیں اور اگر اپنے غلط وجود سے بھی ہمیں اتنی محبت ہے تو دوسروں سے کراہت کیوں کریں؟ لوگوں کی کچھ باقتوں کو نظر انداز کرنا اور کچھ کو درگز کرنا.... یہ ایمان کا حصہ ہے۔“

لکھتے لکھتے اس کے ہاتھ درد کرنے لگے۔ شاید وہ کافی دن بعد قلم سے لکھ رہا تھا۔ مگر یہ کتاب تھی ہی ایسی جو ہر در کام رہم بن جاتی

تھی۔ یہ نہیں تھا کہ درد نہیں ہوگا، لیکن ہر درد کے بعد سکون بھی مل جائے گا۔ اس نے قرآن کو ادب سے چوہما اور بند کر کے رکھ دیا، پھر انگلیاں کھولنے بند کرنے لگا، تاکہ سکون آئے۔

”بھائی بھائی۔“ پرسکون ماحول کا بلبل ایک دم سے پھٹ گیا۔ خین دھاڑ سے دروازے کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ٹیب تھا اور چہرے پہ بلا کا افسوس۔ ”وہ آپ لوگوں کا دوست... احر شفیع... اس کے بارے میں موشن میڈیا پر خبر یکھی آپ نے؟“

سعدی نے گھری سانس لی اور مسکرا کے اسے دیکھا۔ ”ہاں دیکھی تھی۔ ایک کار حادثے کے بعد ایک جلی ہوئی لاش ملی ہے جو اسی کی عمر کے بندے کی ہے اور اتفاق سے اس کے ساتھ جواہر شفیع کے نام کا شناختی کارڈ پاسپورٹ وغیرہ تھے، وہ بالکل بھی نہیں جلتے۔“ حنہ کامنہ حرث سے کھل گیا۔

”آپ کا دوست ہلاک ہو گیا اور آپ آرام سے بیٹھے ہیں؟“

”اسے غائب ہونے کے طریقے آتے ہیں، ایک فیک ڈی ٹھہر اسچ کرنا اس کے لئے مشکل نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہاتھا۔

”مگر ہو سکتا ہے یہ سب ڈرامہ نہ ہو۔ بلکہ اس کو ممزکاردار نے مراد یا ہو۔“ اسے فکر ہوئی۔

”مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ اس نے مجھے کہا تھا کہ ولیم شیکسپیر نے کہا ہے۔“

“There are three ways for a person to disappear. The first is to die. The second is to lie. And the last is to be reborn.”

اسی طرح اس نے کہیں اور کسی نئے نام سے جنم لے لیا ہوگا۔

خین نے گھری سانس لی۔ ”رہانا ہمیشہ کی طرح آخر میں بھی فراہد ہی۔ یہ ڈائیاگ شیک پر کا نہیں ہے۔ وکتور یا گرے سن نے Revenge میں بولا تھا۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہ بھی اس کا ایک فراہد ہو سکتا ہے، لیکن انگریز بھی ہے تو جو میرے ایگزام والی بات ہاشم کو بتائی تھی نا، اسی کا بدلہ ملا ہے اسے۔“

”خین!“ وہ خنگی سے بولا مگر وہ مزے سے کہتی باہر جا چکی تھی۔ وہ اسے پہلے ہی دن سے برالگتا تھا۔ پہلی رفعہ جب اس نے خین کو دیکھا تھا تو اس کی اخبار میں چھپی تصویر یاد آگئی تھی اور لگ گیا تھا اس کے بارے میں مکحونج لگانے... ہونہے... کہ اس نے ایف ایسی میں ثاپ کرنے کے باوجود ان جیمنسٹنگ کیوں نہیں پڑھی۔ وہ اس کا سیاہ راز تھا اور اسی لیے اس احر شفیع سے وہ شدید غیر آرام دھمکیوں کرتی تھی۔ مگر اب نہ وہ راز غیر آرام دھ کرتا تھا نہ وہ فراہد ان کی زندگیوں میں رہاتھا۔ اور ویسے بھی اسے کل سے ڈرائیگ روم کی پینٹنگ بھی شروع کرنی تھی، سو آج رات گوگل کے آئیڈیا ز کے نام!



عجب سوال کیا آندھیوں نے چوں سے ..... شجر سے ٹوٹ کے گرنا بتاؤ کیا گا  
بہت دن بعد آج سر شام ہی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اوپر سے جیسے پانی کے تھال گردائیے گئے تھے۔ پہاڑی علاقے کی اس بل کھاتی سڑک کے اوپر... چوٹی پہ بننے پتھروں کے گھر کی کھڑکیوں پر بوندیں تڑا تر بر سر ہی تھیں۔ باہر می کے باوجود مٹھنہ، ہو چکی تھی اس سنگ روم میں نو عمر لڑکا آٹش دان میں بیٹھ جلانے لگا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر صوفے پر بیٹھے ہاشم کو وضاحت دی۔ ”ابوکو مٹھنہ لگ جائے اسی لئے جلا رہا ہوں۔“ ہاشم نے مسکرا کے اثابت میں سر ہلا یا اور پھر وہیل چیز پر بیٹھے خاور کو دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلے لگ رہے تھے۔ جہاں ہاشم تروتازہ تیار تھری پیس میں لمبسوں چاق و چو بند بیٹھا تھا، وہیں خاور لا غر کمزور اور ہڈیوں کا ڈھانچہ لگاتا تھا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے اور شیو بھی سفید نکوں جیسی تھی۔ گردن ایک طرف ڈھکلی تھی اور نگاہیں کسی غیر مرمنی نقطے پر جی تھیں۔

”تم جاؤ میٹا۔ میں کچھ وقت تمہارے ابو کے ساتھ اکیلے میں گزارنا چاہتا ہوں۔“ لڑکا ہیرسیٹ کر کے تابعداری سے سرہلاتا ہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہوا تو کمرے میں نانا چھا گیا۔ باہر برستی بارش کی تر تراہبٹ بھی معدوم ہونے لگی۔

”بیچھے ہفتے جب میں نے دو دن ایک سرخ رومال کو دیکھتے کمرے میں بند گزارے تو ایک دفعہ ایسا موقع بھی آیا کہ فون کھول کر اپنے کانٹیش کے گرد پس دیکھے۔ فرینڈز، فیلی، کولیگز، شناس فرینڈز کے خانے میں بہت سے نام تھے۔“ وہ معموم مسکراہٹ کے ساتھ بولتے ہوئے خاور پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ”مگر کوئی بھی کام کا نہیں تھا۔ میں سوچتا ہا کہ دوست کون ہوتا ہے؟ وہ جس کی وفا غیر مشروط ہو۔ جو آپ سے بھلے اختلاف رکھتا ہو، آپ کو سمجھتا ہو اور اس کو جب مدد کے لئے پکارو وہ حاضر ہو اور جس کے لئے آپ بھی ہمیشہ حاضر ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ جو ہمارے لئے ہمیشہ حاضر ہوتے ہیں، وہ ہم سے ہماری ان کے لئے حاضری کی توقع نہیں رکھتے مگر خاور.... مجھے احساس ہوا کہ شاید تم میرے سب سے اچھے دوست تھے۔“

بوندیں تر تر شیشوں سے ٹکرائی تھیں۔ خاور کی آنکھیں اور کہیں جی تھیں۔ جسم سے نالیاں لگی تھیں اور وجود میں ذرا سی جنبش بھی نہ ہوتی تھی۔ سوائے پلکیں جھکنے کے۔

”اب تک میں تم سے غصے میں تھا۔ ناراض تھا۔ سوچتا تھا، کیا اتنی نفرت تھی تھیں میرے باپ سے کہ ان کو ماری ڈالا؟ مگر اب میں ناراض نہیں ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں اب سمجھنے لگا ہوں۔ تھیں بھی اور خود کو بھی۔ اپنے ہاتھوں سے ایک محبوب انسان کو مارنے کے بعد مجھے لگنے لگا ہے کہ قتل صرف نفرت اور دشمنی میں نہیں کیے جاتے۔ محبت میں بھی ہو جاتے ہیں۔ مجبوری ڈھوندتی ہے۔ شاید تھیں میرے باپ سے کوئی نفرت نہ ہو، شاید تمہاری مجبوری ہو، مگر میں تھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اب تھیں سمجھ سکتا ہوں۔“

وہ اداسی سے کھدرا ہاتھا۔ بلوں پر مسکراہٹ ہنوز قائم تھی۔ خاور اسی طرف ایک طرف دیکھے گیا۔

”مجھے آج کہنے دو کہ میں تھیں مس کرتا ہوں۔ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ تمہارے جانے کے بعد ہر چیز میرے لئے خراب ہونے لگی ہے۔ سب بگڑ رہا ہے۔ مگر میں آخری دم تک لڑوں گا، لیکن مجھے کہنے دو کہ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا، کاش تم میرے ساتھ ہوتے ان دونوں۔“

کاش تم نے میرے باپ کو نہ مارا ہوتا۔ ”پھر وہ آگے ہوا اور قریب سے اس کو دیکھا۔ ”کیا واقعی تم نے ڈیڈ کو مارا تھا؟“ اس کی آواز میں ایک شبہ ساتھا۔ ایک شک۔ یہ جان۔ خاور دوسرا جانب دیکھتا ہا۔ وہ اٹھا اور گھوم کراس کی وہیل چیز کے سامنے آیا، دونوں ہاتھ وہیل چیز کے بازوؤں پر رکھے اور اضطراب سے اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا جو کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔

”اورا گرم نے ہی ان کو مارا تھا، تو کس کے کہنے پر؟ کیا میری.... آواز کا نپی۔“ میری ماں کے کہنے پر؟ ہاں بتاؤ مجھے۔“ اس کی رنگت سرخ پڑ رہی تھی، اور وہ تڑپنے کے سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ”مجھے بتاؤ پلیز، کیا میری ماں نے میرے باپ کو مارا ہے؟ میں وجہ نہیں پوچھتا۔ صرف ہاں یا نال پوچھ رہا ہوں کیونکہ میں.... وہ سیدھا کھڑا ہوا اور پیشانی تکان سے مسلی۔“ میں دو دن سے اس کانٹیش میں ہوں کہ میری ماں اس وقت صرف کو اپ کر رہی ہے یا وہ واقعی بے قصور ہے۔ اور میرا دل دونوں باتوں کو نہیں مانتا۔“

”مگر ایک بات میں جانتا ہوں کہ.... شاید اب میں می کو سمجھ سکتا ہوں۔ میں تھیں بھی سمجھ سکتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے پہلی جان لی ہے میں نے، اور بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اگر یہ سچ ہو انا خاور.... اگر واقعی می نے یہ سب کیا ہے، تو میں.... میں ان سے راستہ الگ کرلوں گا۔ ان کو چھوڑ دوں گا۔ ان سے محبت کرنا ترک نہیں کر سکتا لیکن۔ اور ہاں ان کو ہر حال میں سمجھتا رہوں گا۔ قتل مجبوری میں ہوتے ہیں۔ شاید ان کی بھی کوئی مجبوری ہو،“ پھر وہ تختی سے نہسا۔ ”چند ماہ پہلے تک میں ایسا نہیں تھا۔ اب میں بدلتا جا رہا ہوں۔ میں بے حس ہوتا جا رہا ہوں۔ لیکن شاید یہ سعدی کی کوئی نئی کیم ہے۔ اگر می انوالوڑ ہوتیں تو ہم دونوں کو صاحبزادی بیگم کے ملازم کا بیان نہ بتاتیں۔ اس بات کو چھپا تیں۔ وہ بے قصور ہیں اسی

لئے تو...“اس نے سر جھٹکا۔“کیا تم مجھے سن رہے ہو؟“اس نے امید سے پکارا، ایس سے پکارا۔ مگر دوسرا طرف وہی خاموش تھی۔“شايد تم سن نہیں سکتے۔ تمہاری ساعت متاثر ہوئی ہے۔ مگر اچھا لگتا تھا سے بات کر کے۔“وہ کوٹ کا بہن بند کرتے ہوئے، ایک آخری نظر اس پر ڈالتا، مڑا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ خاور نے آنکھوں کا رخ پھیر کر دروازے کو دیکھا تھا۔ ان آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا۔

❖❖❖

نہ وہ رنگ فصلِ بہار کا، نہ روشن وہ ابرِ بہار کی..... جس ادا سے یار تھے آتنا وہ مزاجِ بادِ صبا گیا کالونی کے بنگلوں کی بیتیاں رات میں جلتی ہوئی بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ جس اور گرمی کے بعد بارش نے سارے میں رونق بخش دی تھی۔ کچھ لوگوں کے گھروں میں بنتے ہوں گے کپوڑے اور چسپ مگر مورچاں میں خینہ بینٹ کی ہوئی پھیلائے بیٹھی تھی۔ سارا گھر اس سے بے زار تھا، مگر چونکہ وہ اپنا ہیر و خود تھی، تو اس کا دماغ غرصے سے آسمان سے اترنا بھول گیا تھا۔ فارس اس ساری حقِ حق جو ندرت، حنہ اور حسینہ کے درمیان جاری تھی، سے تنگ آ کر اوپر ٹیرس پا آبیٹھا تھا۔ موسم خوشنگوار تھا، اور محنثی ہوا بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہیر لمبے کر کے میز پر رکھے آنکھیں بند کیے، نیک لگا کر بیٹھا، خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

Knock knock!“آواز پر چونک کر آنکھیں کھولیں۔ زمر اس کے سر پر کھڑی تھی۔ سبز رنگ کے لباس میں، گھنکریا لے بال آدھے باندھے، وہ کھلی کھلی سی لگ رہی تھی، ساتھ میں بھاپ اڑاتی چائے کا گل بھی بڑھا رکھا تھا۔ وہ ہلاکا سامسکرا یا۔“تھینک یو۔“اوگ لے لیا۔ وہ اس کے ساتھ کر سی پا آبیٹھی یوں کہ اس کی طرف گھومی ہوئی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”ہوں؟ کچھ نہیں۔“فارس نے سر جھٹکا۔ اوگ ہونٹوں سے لگایا۔

”اور میں چاہتی ہوں کہ تم کچھ سوچو یہی نہیں۔“ وہ چونکا۔“کیوں؟“

زمر کی اس پر جمی بھوری آنکھوں میں فکر مندی دکھائی دیتی تھی۔“تم خود کو مت پر پیشان کرو۔ مت تھا کا وہ گھٹنی فیل مت کرو۔ آبدار کے ساتھ جو ہوا، اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔“وہ زمری سے سمجھا رہی تھی۔ فارس ہلاکا سامسکرا یا۔

”پھر کس کا قصور ہے؟“

”ہاشم کا۔ اس کے باپ کا۔ وہ لوگ ذمہ دار ہیں۔ تم نہیں۔“

”مگر میں نے اس کو استعمال کیا تھا زمزیہ سوچے بغیر کہ وہ مشکل میں پڑ سکتی ہے۔“

”تم نے سری لنگا تک اس کو استعمال کیا تھا، وہاں تو وہ مشکل میں نہیں پڑی نا؟ جس مشکل میں تمہارا ہاتھ نہیں، تمہاری نیت نہیں، اس کے لئے دل بھاری مت کرو۔“

”اچھا۔ کوشش کروں گا۔“ وہ زخمی سامسکرا کے گھونٹ بھرنے لگا۔

”اور یہ سب مت سوچو جو سوچ رہے ہو۔ اور میں جانتی ہوں کہ کیا سوچ رہے ہو۔ اور چاہتے ہو ایک ہی وقت میں جا کر ان سب کو مارڈالو۔ آبدار اور میرے ساتھ جو ہوا اس رات اس کے ذمہ داروں کو سزا دینے کا مت سوچو فارس۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے سے سمجھا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ چائے پیتے نے گیا۔“میں جانتی ہوں تم فرستہ یہاں ہو۔ بہت چپ رہنے لگے ہو۔ تمہیں یہ ساری بھڑاں ان لوگوں پر نکالنی ہے، مگر میں چاہتی ہوں تم درگز رکر جاؤ۔ معاف کر دو۔ نہیں تو صبر کر لو۔ ہمارا کیس عدالت میں ہے۔ ہمیں وہ جیتنے دو۔ اور پھر میں تو ٹھیک ہوں بالکل۔“

”تم ٹھیک ہونا؟“ اس نے زری سے پوچھا۔

”ہوں۔“ اس نے مسکرا کے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس وقت نہیں تھی۔ شاک میں تھی، مگر اب ٹھیک ہوں۔ وعدہ کرو تم کچھ

نہیں کرو گے ان کے خلاف؟“ ”اوکے۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔“ اس نے آخری گھونٹ پیا اور کپ اسے تھادیا۔ زمر نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تنی

شریفانہ شکل بنایا کرجب حکم مانتے ہو تو مجھے پتہ نہیں کیوں یقین نہیں آتا۔“

”تمہاری سوچ ہی خراب ہے۔“

”اور تمہاری نیت۔“

”اُف۔“ وہ کراہا۔ ”اچھا بھلا میں تیسری شادی کرنے کے قابل ہو رہا تھا، اب پچھتا رہا ہوں کہ کیوں بچانے گیا تمہیں۔“

”تمہیں سچ میں تیسری شادی کا اتنا شوق ہے یا صرف میرے سامنے بنتے ہو؟“

”تم کہتی ہو تو تجربہ کر کے دکھادوں تمہیں؟“

”ہونہے!“ وہ ناک سکوڑ کر سیدھی ہوئی اور ٹیک لگا کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔ نیچے سے حین اور ندرت کی بحث کی آوازیں سنائی

دے رہی تھیں۔

”میں سوچ رہا ہوں، ہم نیا گھر لے لیں۔“

”بیویوئی کا گھر چھوڑ دو گے تم؟“ زمر کو یقین نہیں آیا۔

”بی بی یہ بیویوئی کا گھر نہیں ہے۔ یہ پورا چڑیا گھر ہے۔“ ترپ کر جیسے وہ بولا تھا۔ وہ ایک دم ہنسنے لگی۔

”میں سمجھدی ہوں۔ چلواب ہم اپنا گھر لیتے ہیں۔ جہاں ہم سکون سے رہ سکیں۔ ہر وقت یہ سرحدی جھپڑ پیں ہوتی رہیں جہاں اور ہر دوسرے دن کدو گوشت نہ بنا کرے۔“

”تم اتنا بگ ہو میرے گھر والوں سے؟“ وہ خفا ہوئی۔

”میں اس سے بھی زیادہ بیگنگ ہوں۔“ وہ سخت اکتیا ہوا لگ رہا تھا۔ ”مجھے تو یہاں کوئی اپنا سمجھتا ہی نہیں ہے۔“

”میں تو سمجھتی ہوں نا۔ اچھا واقعی..... میں تمہیں سمجھنے بھی لگی ہوں۔ سنو پھر سے بتانا، تمہیں واقعی نہیں معلوم تھا کہ قانون شہادت میں

ایسا آرٹیکل بھی ہے جس کے تحت میاں بیوی کو ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا!“

”پڑھ غرق ہو قانون شہادت کا۔ یہ ہماری ہربات میں کیوں آ جاتا ہے۔“

اور وہ نہستی چلی گئی۔ ”میں اس کا جواب تمہیں نہیں دوں گی مگر میں صحیح تھی۔ تمہیں واقعی اس آرٹیکل کا نہیں علم تھا۔ کاش تم نے کلاس میں

مجھے دیکھنے کے سوا بھی کچھ کیا ہوتا۔“

”کیوں نہیں کیا تھا؟ دلوڑ کیاں بہت پسند تھیں مجھے۔ ایک کا نام رباب تھا، اس کے گھر کا پتہ تک یاد ہے مجھے۔ اور دوسرا.....“ اور

جواب میں وہ خلکی سے کچھ کہنے لگی تھی۔ مگر وہ اثر لئے بغیر ٹیک لگا کر بیٹھا، پاؤں میز پر رکھے، بو لے جا رہا تھا۔ اس پانی کی ساری تیلچی اور تکلیف

بالآخر حل گئی تھی اور وہ پہلے جیسا ہو کر پہلے جیسی باتیں کرنے لگا تھا۔

وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔

زمر کے خیال میں۔



(ڈیئر علیشا کاردار تھا راخٹھڈھائی سال پہلے مجھے ملا تھا۔ مگر جواب لکھنے آج بیٹھی ہوں۔)

عدالت اور موسم دنوں پر گرمی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ وقت پر لگا کراز رہا تھا، ریت کی طرح انگلیوں سے پھسل رہا تھا، آبشار کے پانی کی طرح پھر دوں سے سرخ رہا تھا.....

(درالصل علیشا ان ڈھائی سالوں میں بہت کچھ بدلاتے ہے۔ اور میں نے جان لیا ہے کہ تم غلط تھیں۔)

کمرہ عدالت میں کٹھرے میں جواہرات کھڑی تھی اور زمراس سے پوچھ رہی تھی۔

”کیا یہ درست نہیں ہے کہ 21 مئی کو نو شیر والا پاکستان میں ہی تھا، مگر اس کو دیکھنے والے تمام ملازم آپ نے چند دنوں میں فارغ کر دیے تھے؟“

”ملازم دوسرا و جوہات پر فارغ کیے تھے، سب کے ٹرمینیشن لیٹرز کی کاپیز میں آج ہی جمع کروائے دیتی ہوں۔“ وہ مسکرا کے بولی تھی۔ ”نو شیر والا دمی میں تھا، اور آپ کی اس شادی کے بعد ہی چلا گیا تھا جس کو کروانے کے لئے آپ نے میری منت کی تھی، زمر صاحب!“

”شادی کے بارے میں آپ سے زیادہ کوں جان سکتا ہے مز کاردار، آپ پتو دیے بھی آج کل اپنے ہی شوہر کو قتل کروانے کا اڑام لگایا جا رہا ہے۔“ وہ بھی تپانے والی مسکراہٹ سے بولی۔ ہاشم کا پارہ آسمان کو چھوٹے لگا۔ دھاڑ سے وہ ”آب جیکشن“ بولتا اٹھا۔

”وڈر ان!“ (واپس لیا۔) زمر نے سادگی سے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ جواہرات نے تخت مسکراہٹ سے سر جھکا تھا.....

(میں نے یہ بھی جان لیا ہے علیشا کو صرف میرے اندر دھیڑیے نہیں ہیں نیکی اور بدی کے۔ یہ ہر شخص کے اندر ہوتے ہیں۔ ہر شخص گلٹی ہے۔ لیکن تھا ری طرح میں اب دوسروں کو حج کر کے ان کو گلٹ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ کتنا بہتر ہوتا اگر تم اپنے اعمال پر زیادہ غور کرتیں بجائے میری فکر کرنے کے۔)

لبادری میں کھڑا ڈاکٹر نوازش تکان سے اپنا بیگ سمیت رہا تھا۔ چیزیں الٹ پلٹ کرتے، اس نے اپنا موبائل اٹھا کر دیکھا۔ چند بیٹام تھے۔ ان کو پڑھنے والے کھڑا ہو گیا۔ تب ہی اچانک سے لیب کی بند ہو گئی۔ اس نے چونک کرس اٹھایا۔ ادھر ادھر دیکھا، مگر اس سے پہلے کوہ مڑتا پیچھے سے کسی نے اس کو دھکا دیا تھا۔ موبائل پھسلتا اور خود وہ نیچے لڑھ لکا۔ پھر یا کیک بوکھلا کر سر اٹھایا۔ اس کے ساتھ دو جو گرز آر کے تھے۔ اس نے جیران نظریں اٹھائیں۔ اور جیز اور سرمنی شرٹ پہنے، آستین چڑھائے، چھوٹے کٹے بالوں والا فارس غصے سے اسے گور رہا تھا۔

”کون ہو؟ اندر کیسے آئے؟“ مگر فارس جواب دینے کی بجائے جھکا، اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا، اور اس کا چہرہ اپنی سرخ آنکھوں کے قریب لے جا کر غرایا۔

”آبدار عبد کا پوست مارٹم تم نے کیا تھا؟“

”کون.... آب دا....“ وہ ہکلایا مگر بات مکمل نہیں ہوئی۔ فارس نے اسے میز پر یوں دھکیلا کہ بہت سا سامان، شیشے کی یوں تیلیں، فلاں کس وغیرہ نیچے گرتی گئیں۔ ہر طرح ٹوٹتے کاٹھ کی آوازیں اور کرچیاں بکھر گئی تھیں۔ ڈاکٹر کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ کراہ رہا تھا۔

”یادداشت آئی ہے واپس تواب بتاؤ۔“ اسے گدی سے پکڑ کر اٹھایا اور کھڑا کیا۔

”کیا کیا لکھنا بھول گئے تھے اس کی روپوٹ میں؟“

”بتابا ہوں۔ بتابا ہوں۔“ وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ چہرے پر خوف دہراں تھا، اور ماتھے سے خون کی بوندیں ٹکپ رہی تھیں۔ ”اس کے جسم پر تشدید کے نشان تھے۔ بازو ہاتھ اور گردن پر۔ اور پھر دوں سے ملنے والا fluid کسی جھیل یا.... یا سمندر کا نہیں تھا، اگر ہوتا تو اس میں diatoms میں....“

”کس کے کہنے پہ بنائی تھی رپورٹ؟ بتاؤ؟“ وہ غرایا تو اس کی گرفت میں پھر پھر اتنا خنی ساڑا کٹر کانپ اٹھا۔ ”ڈاکٹر آف قاب و اسٹلی ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ!“

آنندہ... تم کسی کی بھی رپورٹ بنانے کے قابل نہیں رہو گے۔“ اور یہ کہہ کر اس نے اس کے دائیں ہاتھ کو مردی کر زور سے جھکا دیا۔ عجیب سی آواز آئی اور ڈاکٹر کی چینیں نکل گئیں۔ فارس نے نفرت سے اسے پرے پھینکا، اور دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر مڑا، اور بڑی میز کو دھیلتے ہوئے سامان سمیت اس کے اوپر گرا دیا۔ ایک کرسی کو ٹھوک کر ماری اور پھر نفرت سے اسے دیکھتا باہر نکل گیا.....

(تم جیسے لوگ علیشا خود تو ناکام اور تلخ ہوتے ہی ہیں مگر دوسروں کو ہر وقت عقابی آنکھ تلنے رکھتے ہیں۔ اصل میں کچھ لوگوں کو برا دکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ ان کو اپنے دوستوں کے سامنے بڑا لگنے کے لیے دوستوں پر جا بجا تقدیم کی عادت پڑ جاتی ہے۔)

کمرہ عدالت میں سب دلچسپی اور توجہ کے کٹھرے میں کھڑی شہرین کو سن رہے تھے جوڑھٹائی سے کہہ رہی تھی۔ ”میرے علم میں نوشیر وال کے پاس ایسی کوئی گن نہیں ہے، اور نہ ہی میں نے اسے کبھی گلاک کایا ماذل چلاتے دیکھا ہے۔“

”مگر کیا اس دن آپ میرے اور فارس کے پاس نہیں آئی تھیں یہ کہنے کہ ہم آپ کو کیا دیں گے اگر آپ اس گن کا لائنس ڈھونڈ دیں ہیں؟“ زمر سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”یہ صریح بہتان ہے۔ میں آپ کے گھر کبھی نہیں آئی۔“ اس نے کندھے اچکائے تھے۔

(اور اگر تم جیسوں کا کوئی دوست میرے جیسا ہو جس کا دل ایسا ہی حس ہو تو وہ تم نقاد دوستوں کی باتوں کو دل سے لگا کر ڈپریشن

میں چلے جاتے ہیں۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ تم جیسے لوگ دوستوں کی سب سے بری قسم سے تعلق رکھتے ہو۔) دفاع کی کرسیوں پر موجودہ ہاشم کا موبائل بجا تو اس نے نکال کر دیکھا۔ بلا کذنب سے پیغام موصول ہوا تھا۔ ”اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم

سعدی یوسف کو ڈھشت گرد ثابت کروانے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو یہ ہند سے لکھ کر ٹویٹ کر دو۔ میں سمجھ جاؤں گا۔“ ہاشم نے ٹویٹ کھولا اور ”پر امید“ کے نیچے ہی ہند سے لکھ کر ٹویٹ کر دی۔ پھر مسکرا کے فون جیب میں رکھا، ذرا سامز اتو پیچھے گول چشمے والا آدمی اپنا موبائل دیکھ رہا تھا۔

ہاشم مسکرا کے سیدھا ہوا اور نوشیر وال کی طرف جھکا۔ ”تم بے فکر ہو۔ سعدی یوسف کے دوسرے دشمن ہم سے زیادہ اس خاندان کی تباہی کے خواہ شمید ہیں۔“ شیر و خاموش رہا تھا۔

(میں اس امت سے تعلق رکھتی ہوں علیشا، جس کے نبی ﷺ نے ایک شخص کو برے جیسے میں دیکھا تو خود کچھ نہیں کہا مگر اس کے جانے کے بعد صحابہ سے فرمایا کہ اگر تم اس کو کہہ دیتے تو اچھا تھا۔ مگر ساری بات یہ ہے کہ انہوں نے خود کچھ بھی کہنے سے حیا کی۔ ہمارا اللہ ہمیں حیا سکھاتا ہے۔ یہ خود کو صاف گواہ منہ پھٹ کہنے والے لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ وہ ابھی دوست نہیں بن سکتے اور اپنی بدکلامی کی وجہ سے آخر میں اکیلے رہ جائیں گے۔)

مور چال گری بھری رات میں ڈوباتھا اور سرو نٹ کوارٹر میں بیٹھا صداقت افسوس سے سامنے بیٹھی حسینہ کو کہہ رہا تھا۔ ”مجھے بڑا ارمان لگا کہ فارس بھائی اس دن ہم پر شک کر رہے تھے۔ ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”اصل میں“ میں نے جو بول دیا کہ تم لائے ہو تو وہ اس لئے شک کرنے لگے۔“ وہ جلدی سے بوی۔ وہ چونکا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ یہ تمہاری امی جی نے تمہیں تھے میں دیا ہے۔“

”ایسے ہی بتاتی؟ نظر لگ جاتی ہے۔“

(چچے لوگ بد کلام نہیں ہوتے اور منہ پھٹ اور تلخ کلام لوگ چچے نہیں ہوتے۔ منافقین کہتے تھے، محمد ﷺ کے رسول ہیں اور اللہ قسم کھا کرہتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔ حالانکہ جوبات وہ کہہ رہے تھے وہ تو حق تھی۔ مگر وہ جھوٹے اس لیے تھے کہ ان کا دل اس کی گواہی نہیں

رات مزید گھری ہوئی تو وہ سروٹ کواڑ سے نکل کر سچ سچ چلتی چار دیواری کی پچھلی سمت جانے لگی۔ یہاں کونے میں ایک بڑا سا درخت تھا۔ وہ کسی بُلی کی طرح اس پر چڑھی اور پھر چڑھتی گئی، دیوار تک پہنچی، پھر وہاں سے دوسری طرف پھلانگ گئی۔ سامنے اندر ہیرے میں وہ شخص کھڑا تھا، اور اس نے سرخ سامنٹر چہرے پر لپیٹ رکھا تھا۔

”اب اور کیا کرنا ہے مجھے؟ بہت مشکل سے آئی ہوں۔ اگر میرے مالکوں کو معلوم ہو گیا تو میری جان لے لیں گے....“  
”بس.... ایک آخری کام!“ وہ آہستہ سے بولا تھا اور پھر ڈھینی آواز میں اس کو پچھ سمجھانے لگا تھا۔

(چے لوگ وہ ہوتے ہیں جو وہ کہیں جس کی گواہی ان کا دل دے۔ اور آپ کا دل جب آپ کو بتا رہا ہوتا ہے کہ یہ بات کہنے سے آپ کے دوست کا دل دکھ جائے گا اور آپ پھر بھی اسے کہہ ڈالیں تو آپ نے چہ نہیں کہا۔ آپ نے بدکلامی کی۔)  
کمپیوٹر اسکرین روشن تھی اور سعدی اور حسین اس کے سامنے پورے انہاک سے بیٹھے تھے۔ حمہ ساتھ ساتھ ٹاپ بھی کیے جا رہی تھی۔

”مزے کی بات یہ ہے کہ پی ایکم ڈی سی نے سارے پاکستان کے ڈاکٹرز کا ڈیٹا اپنی ویب سائٹ پر ڈال رکھا ہے۔ معمولی سی ہمینگ اور یہ دیکھیں....“ حمہ مزے سے کہہ رہی تھی۔ ”میرافیشل ریکارڈنگس سافت ویرے اپنا کام چند منٹ میں کر لے گا، اور اگر ڈاکٹر مایا کی شکل کی کوئی لڑکی یہاں ہوئی، تو وہ نکل آئے گی۔“

”ویری لگ جاب ہیڈر گرل!“ اس نے دھن کا شانہ تھپکا تھا۔ وہ مسکرا کر اور سعدی فکرمندی سے اسکرین کو دیکھ گیا۔  
(اور علیشا انسان کو ایسا دوست نہیں بننا چاہیے جو اپنے دوست کو صرف اس لیے خط لکھے کہ جب وہ خود جیل میں اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچا ہے تو دوسرے کو بھی کہنے لگے کہ حسین تم بھی پچھہ برا ضرور کرو گی۔ یہ دوسروں کے بارے میں فتوے پتے نہیں تم جیسے دوست کیوں دے لیتے ہیں جن کو اپنے کل کا نہیں پتہ ہوتا۔)

سرخ نشان ابھرنا تو حسین اور سعدی دونوں کے منہ کھل گئے۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ مایوسی سی سارے میں پھیل گئی تھی۔ ”یعنی ما یا پاکستان میں رجسٹر ہی نہیں ہے۔ اسے کسی اور ملک سے بلوایا گیا تھا۔“ وہ گھری سانس لے کر بولی۔

”یعنی اب ہمارے پاس اور کوئی گواہ نہیں ہے۔ اب بند کر داں کی ویب سائٹ۔“

”ارے واہ۔ ایسے ہی بند کر دوں؟ تھوڑی سی editing تو کرنے دیں۔“ اس کی آنکھیں چمکیں اور اس نے کی بورڈ سنپھال لیا۔ سعدی جیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ پاکستان میڈیا یکل اینڈ ڈینٹل کاؤنسل کا ”اباؤٹ“ سیکشن ایڈٹ کر رہی تھی۔

”ہم سے ملیے۔ ہم ہیں پاکستان میڈیا ڈپرنسڈی کیمپنی۔ ہم نے صرف پرائیوٹ میڈیا یکل کا الجر کو کھلی چھٹی دے کر بچوں کا یہڑہ غرق نہیں کیا، بلکہ ہم نے انٹری ٹیکسٹ کے نام پر دنیا کا سب سے منافع بخش کاروبار بھی شروع کر رکھا ہے۔ آئیے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ انٹری ٹیکسٹ کیا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کو ہم اس لئے ختم نہیں کر رہے کیونکہ ہمارے بہت سے دوست اور رشتہ دار انٹری ٹیکسٹ پر یہ پکی اکیڈمیاں چلا کر ہر سیز ماں میں اربوں روپے بنالیتے ہیں۔ ورنہ باقی اس کا صرف ایک مقصد ہے۔ اخبارہ انیس سال کے بچوں کے ذہن کو مفلوج کرنا۔ ان کو خوفزدہ کرنا۔ میٹرک سے ان کے ذہن پر سوار کر دینا کہ انہوں نے تعلیم نہیں حاصل کرنی بلکہ ایک ہزار سے اوپر نمبر لینے ہیں۔ اور وہ بچے اپنے سینٹر زکوان کے ناموں سے نہیں ”998 نمبر والا“ اور ”1021“ نمبر والی جیسے القابات سے یاد کرتے ہیں۔ اور چونکہ ہمارے پاس سیٹیں تھوڑی ہوتی ہیں، اور ہم ہزاروں بچوں کو کامیاب نہیں کر پاتے، تو ہمیں فخر ہے کہ جس کا میڈیا یکل میں ایڈیشن نہ ہو، اس کو معاف شہر ”نالائق“ سمجھتا ہے۔ وہ بچے کسی بھی فیلڈ میں چلا جائے، وہ اس احساسِ لکتری اور ڈپریشن میں رہتا ہے کہ اس کا میڈیا یکل میں ایڈیشن نہیں ہوا اور

ان ہزاروں ناکام بچوں کو ہماری کوشش ہے کہ گھی یہ نہ پتہ چلنے دیا جائے کہ اشتری ثیسٹ پاس یا فل کرنا ہم نہیں ہے۔ اس کی تیاری کرنا اور اس کو دے ڈالنا، یہی سب سے بڑی جدوجہد ہے جسے اگر آپ نے کر لیا ہے تو بھلے آپ کامیڈیکل میں ایڈمشن نہ ہو آپ دنیا کی ہر اچھی فیلڈ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑھ سکتے ہیں اگر آپ خود پہ اعتماد رکھیں۔ آپ نالائق نہیں تھے۔ یہ آپ کی حکومت کا ناصافی پتی نظام تھا۔ ”بس کرو وہ۔ سا بہر کرام میں پکڑی جاؤ گی۔“ وہ اس کو بازر کھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ایویں!“

(علیشا تمہارے اس ایک خط نے مجھے ڈھنی طور پہ بہت پیچھے دھکیل دیا تھا۔ دوستوں کو تم جیسا نہیں ہونا چاہیے۔ دوستوں کو دوستوں کی خامیاں نہیں اور پیار سے تانی چاہیں۔ اور خامی سے زیادہ ان کا حل بتانا چاہیے۔ ”تم پہ سیاہ رنگ بالکل سوٹ نہیں کر رہا،“ کی جائے ”تم پہ سیاہ سے زیادہ بزر سوٹ کرتا ہے۔“ کہہ دیا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔)

”پلیز گولی مت چلانا۔ میری بات سنو، میں تمہیں سب حق تباہوں گا۔“ وہ نیم اندر ہیکرہ تھا اور بلب جھول رہا تھا۔ نیچے ایک میز رکھی تھی جس کے سامنے کرسی پہ بندھا ہوا ڈاکٹر آفتاب پسینہ پسینہ ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے کو ہتھڑی سے بند ہے، اور گر بیان کے دو بنی کھلے تھے، کہنی سے سرٹ پھٹی تھی اور جلد چھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ بال بکھرے تھے اور چہرے پر خوف تھا۔ آسٹین چڑھائے کھڑے فارس نے پستول میز پر رکھا اور اس کے سامنے جا ٹھرا۔ تیر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ایک جوتا اس کے گھٹنے پر رکھا اور دیا۔ گھٹنے پر شاید کوئی زخم تھا، جس سے خون رنسے لگا اور وہ کراہنے لگا۔

”رکو۔ پلیز میری بات سنو۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”میرے بھائی کی روپرٹ تم نے بنائی تھی نا۔ وہ اپنی ڈپریسٹ کھاتا تھا، یہ بھی لکھا تھا تم نے۔ اس کے جسم پر تشدید کے نشان نہیں تھے، میرے جری بھائی نے خود کشی کی تھی، یہ سب لکھا تھا نام تم نے۔ آبدار کی روپرٹ بھی تم نے بنوائی ہے نا۔“

”میں نے ہاشم کے کہنے پر.... وہ ٹوٹے چھوٹے الفاظ میں ایک ہی سانس میں سب کہتا گیا۔

”اور کس چیز سے جواہرات نے تمہیں مجبور کیا کہ تم اس کے شوہر کی روپرٹ بدلنے پر مجبور ہو گئے؟“ ڈاکٹر آفتاب چپ ہو گیا تو اس نے پستول اٹھایا اور اس کے دوسرا گھٹنے کی طرف تان لیا۔ اس کا چھرہ اتنا سر دھماکا اور اتنی پتش لئے ہوئے تھا کہ ڈاکٹر کا سانس اٹکنے لگا۔ ”میں بتاتا ہوں۔ طوبی..... میری بیوی کی بیٹی تھی۔ میری بیوی اور اس کا بیٹا..... طوبی کا بھائی..... نہیں جانتے کہ طوبی نے میری وجہ سے خود کشی کی تھی۔ میں نے....“ وہ جلدی جلدی بتاتا گیا۔ اس عمر میں وہ ہڈیوں میں لگنے والی گولی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چپ ہوا تو فارس نے جوتا اٹھا لیا۔

”میں چاہتا تھا تمہارے بازو کی اس نس میں چھرہ اگھوپ دوں جو تمہاری الگیوں کو سن کر دے گی، اور تم کبھی دوبارہ سر جری نہیں کر سکو گے، مگر نہیں۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے گریبان پانچاپیں اتارا، اس کی کیپ کو پر لیں کیا اور اسے دکھایا۔ ”میں نے تمہاری طوبی والی کہانی ریکارڈ کر لی ہے اور میں اسے تمہاری بیوی اور اس کے بیٹے کو دے دوں گا۔ وہ دونوں خود فیصلہ کریں گے کہ انہیں تمہارے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔“

”نہیں....“ اس کا چھرہ سفید پڑنے لگا۔ ”ایسے مت کرو۔“

”یہ رہی تمہاری ہتھڑی کی چاپی۔“ اس نے چاپی اس کی طرف بڑھائی اور جب اس نے امید سے دیکھا تو فارس نے چاپی اس کے قدموں میں گردادی۔

”جب تک تم اپنی ہتھڑی کھول کر آزاد ہو پاؤ گے، وہ یہ دیڈ یوکھے چکے ہوں گے۔“ اور ماتھے پہ ہاتھ لے جا کر بولا۔ ”الوداع۔“ بازو بڑھا کر لیپ کھینچا۔ بلب بجھ گیا۔ اب اس کے دور جاتے قدم سنائی دے رہے تھے.....

(وجود دست اپنی بات کا آغاز ”سوری مجھے کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا مگر ایسا ہے کہ.....“ یا ”دیکھو براؤ تو نہیں مانو گی ایک بات کہوں“ کی طرح کے فقروں سے کرتے ہیں، وہی سب سے برے دوست ہوتے ہیں۔ ایسی بات کی ہی کیوں جائے جس سے دوست براؤ نے؟ بلکہ کیوں نہ بری لگنے والی باتیں بھی اچھے انداز میں کی جائیں؟ اللہ کے رسول ﷺ تو کسی کو کچھ کہنے سے پہلے ”براؤ تو نہیں مانو گے؟“ نہیں پوچھا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ دوسرے کی مدد کرنا چاہتے تھے، اسے شرمندہ کرنا نہیں۔ وہ ایسی بات کہتے ہی نہیں تھے جس سے کوئی برافیل کرے بلکہ اسے حل بتاتے تھے۔)

”گواہوں کے بیانات اور شواہد سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے یور آن زکر.....“ زمر چبوترے کے سامنے کھڑی، دونوں ہاتھوں میں قلم کو گھماتی بلند آواز میں کہہ رہی تھی ”کہ ملزم نو شیر والا کاردار نے میرے موکل سے ذاتی عناصر کے باعث پہلے اس کا پیچا کیا، پھر اس کو تھاپا کرائے گولیاں ماریں۔ پھر بھی اس کی جان نہیں گئی تو اسے ہسپتال سے اغوا کرالیا۔ اور ملک سے باہر بھیج دیا۔ ملزم کے اثر در سونگ کو دیکھ کر یہ یقین کرنا قطعاً مشکل نہیں ہے کہ یہ سب اس کے لئے بہت آسان تھا۔ میرے موکل کو قید میں نواہ شد یہ آذیتیں دی گئیں اور اب تک ذہنی تشدد کا نشانہ بنا یا جارہا ہے۔ نہ صرف ملزم کو مجرم قرار دیا جانا چاہیے بلکہ اس کو مزاۓ موت بھی سنائی جائے۔ اور ذرا تھہر کروہ سردا آواز میں بولی۔

#### “Prosecution pleads for death penalty”

(اور دوستوں کو میری طرح بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اسکوں کالج میں کوئی دوست یا انتہی پر کوئی فریڈنڈ بات بات پر صاف گوئی کی آڑ میں ہمیں طنز کا نشانہ بناتا ہوا، اور ہم اس کی باتیں سن کر دکھی پر دکھی ہوتے چلے جائیں یہ بھی درست نہیں۔)

اسکوں کے آڈیو یم میں عجیب ہنگامہ سماچا تھا۔ جہاں چند منٹ پہلے پہنچ پر اشیج پر فارم کر رہے تھے، وہاں اب وہ سہم کر ایک طرف کھڑے تھے، اور انہی میں چپ چاپ سر جھکائے کھڑی سونی بھی تھی۔ پرو جیکٹر اسکرین پر ایک دیہی یو چل رہی تھی جس میں شہرین کا روزگاری کھیلتی اور پیسے ہارتی نظر آ رہی تھی۔ ڈی جے پا گلوں کی طرح کیزد بارہا تھا، کسی طرح اس دیہی یو کوروکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ اشاضہ نہیں ہو رہی تھی۔ انتظامیہ نہ امت سے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور حاضرین میں کھڑی شہرین کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پر رہا تھا۔ والدین ملزم کرائے دیکھ رہے تھے، چہ ملکوں کا رہا تھے، اور ساتھ کھڑی جواہرات تختی سے بڑا رہا تھا۔ ”آج کے بعد تم سونی کے دو فٹ قریب بھی نہیں آؤ گی۔ ایک لفظ مت بولنا۔ تم قابلِ حقارت عورت ہو۔ اس قابل نہیں ہو کہ اس پنجی کی پروردش کر سکو۔ ابھی اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ سونی کو گھر میں لے جاؤں گی۔“ اور شہری نے کامپنے ہاتھوں سے اپنے پرس اٹھایا تھا۔

(میں نے جان لیا ہے علیشا کہ انسان کو رشتے دار چننے کا اختیار بھلنے ہو مگر دوست چننے کا ضرور ہوتا ہے۔ اور ایسے دوستوں سے انسان کو خود ہی دور ہو جانا چاہیے جو بات بہت آپ کو اپنی تخلیٰ کا نشانہ بناتے ہوں۔)

”میں اس کی گارجین اتھل ہوں پڑتا ہے آپ کو مادام شہرین!“ شہری خفت سے چہرہ جھکائے، پرس ماتھے پر رکھے تیز تیز باہر چلتی جا رہی تھی جب آڈیو یم کے باہر سے کسی نے اسے پکارا۔ وہ ٹھنک کر مزمیٰ حنین کو دیکھا تو بے اختیار پرس والا ہاتھ پیچے گر گیا۔ آنکھوں میں اچھبا اور پھر بے یقینی درآئی۔ ”تم نے کیا ہے یہ؟“

”میں، ہمیشہ سوچتی تھی کہ ہر بری کھڑی میں، میں فارس غازی کے ساتھ کیوں ہوں؟“ وہ سینے پر بازو لپیٹے اپنائیں یک ہاتھ میں پکڑے سادگی سے کہہ رہی تھی۔ ”جب وارث ماموں کو مارا گیا تب میں ان کے ساتھ تھی۔ جب زرتاش کو گولی لگی تو وہ میرے ساتھ ہوئی میں تھے۔ جس قمر الدین کے قتل کا الزام لگا ان پر اس کے قتل کے وقت اس صحیح بھی وہ میرے ساتھ تھے۔ پھر اس رات جب تم نے اور تمہارے سا یکو شوہر نے زمر کو مارنا چاہا، تب بھی میں فارس غازی کے ساتھ تھی۔ پڑتا ہے کیوں؟“ وہ دو قدم قریب آئی۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”کیونکہ میں فارس غازی کی گارجین اتھل ہوں۔ اور میرا کام ہے ان کے راستے کی چھوٹی موتی جڑی بولیوں کو صاف کرنا۔“ اور وہ

آگے بڑھی۔ شہری مارے غصے کے پیچے نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہیں سے سارے والدین نکل کر آ رہے تھے۔ (اور علیشا میں نے یہ بھی جان لیا ہے کہ ہم اپنے دوستوں کو تبدیل نہیں کر سکتے، صرف ان کو بدل سکتے ہیں۔ ہم ان کا رویہ اور ان کی عادات نہیں تبدیل کرو سکتے ان سے اس لیے دوست بدلتا زیادہ بہتر ہے ہر وقت کی دل آزاری سے۔)

”یور آز“ مسز زمر کے افسانوں کے برکس.....“ ہاشم اب چوتھے کے سامنے دائیں سے باسیں چلتا ہاتھ بلا ہلا کر متاثر سے کہہ رہا تھا۔ ”اس کیس میں فی الحال تک صرف یہی بات ثابت ہو پائی ہے کہ سعدی یوسف کو کسی نے انواع نہیں کیا تھا۔ وہ واقعی زخمی ہوا تھا اور یہ اس کے ساتھ زیادتی تھی، ہم بھی چاہتے ہیں کہ اس کے مجرم نیاز بیگ کو جو جرم قبول کر چکا ہے واقعی سزا ملنی چاہیے۔ مگر انہی کی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس gold-digger کے نے اپنی زخمی حالت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور شوال میں مقیم اپنے دہشت گرد ہمبوالت کاروں سے کھلوا کر خود کو خود غائب کر دیا۔ ہرگواہ چیز چیخ کر بتا چکا ہے کہ سعدی یوسف کی سرگرمیاں مٹکوں تھیں اور وہ شرپسند عناصر کے ساتھ میل جوں رکھتا تھا۔ اب چونکہ وہ واپس آچکا ہے تو اپنے اتنے مہینوں کی گمشدگی کو راوپ کرنے کے لئے اس نے ایک امیر خاندان کو نشانہ بنایا۔ تاکہ کیس کے دوران وہ خاندان سیٹل منٹ کے نام پر اس کو بھاری رقم ادا کر دے اور تیرے فریقین کے ذریعے بارہاں اس نے کیس سیٹل کرنے اور پیسے لینے کا عندید یہ بھی ظاہر کیا، مگر ہم نے ٹھان لی تھی کہ پیسے نہیں دیں گے بلکہ انصاف لیں گے اور.....“ اس کی آواز عدالت میں گونج رہتی تھی اور سب خاموشی سے سن رہے تھے۔

(میں نہیں کہتی کہ دوستوں کو ان کی خامیوں سے آگاہ ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کی ہر وقت جھوٹی تعریفیں کی جائیں۔ میں صرف یہ کہتی ہوں علیشا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے زیادہ سچا کوئی نہیں تھا مگر جب وہ سچ بول کر بھی اپنے ساتھیوں کا دل نہیں دکھاتے تھے تو ہمارے سچ ہمارے دوستوں کو آزر دہ کیوں کر دیتے ہیں؟ ہم سچ بولنے سے پہلے ”برانہ ماننا“ کہہ کر کیوں اقرار کرتے ہیں کہ بات بر امانے والی ہی ہے؟) تصریح کاردار کی عقبی بالکلونی میں ہاشم کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ سامنے دو رپہاڑوں پر سورج غروب ہوتا دھائی دے رہا تھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے، شرٹ کے آستین موزے، مغموم سے انداز میں اس نارنجی تھال کو دیکھ رہا تھا جو بس کسی پل لگتا تھا میں پر الٹ جائے گا، مگر بادل اس کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ہمارا دیے ہوئے تھے۔

”تم نے شہری کو بے خل کر کے اچھا کیا۔ اس کی وجہ سے سونی کی بہت انسک ہوئی۔ سونیا تب سے ڈپریشن میں ہے۔“ ساتھ پیشی جواہرات کہہ رہی تھی۔

”ہوں۔“ ان نے ہنکارا بھرا۔ نظریں ڈوبتے سورج پر جبی تھیں۔ ”سونی کو اس کی ماں کے غلط کاموں کی وجہ سے پریشان نہیں کرنا چاہتا میں۔ ایسی ماں کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہیے جو اولاد کی پرواد کیے بغیر اتنے غلط کام کرتی رہی ہو۔“ جواہرات کا دل زور سے دھڑکا گاگر بظاہر مسکرائے گئی۔ ”صحیح کیا۔ ہر ماں تمہاری ماں جیسی نہیں ہوتی جو اولاد کے لئے ہر شے قربان کر دے۔“

ہاشم نے نظریں پھیر کر راحنی سے انداز میں اسے دیکھا۔ ”ہمارے لئے کیا آپ کو کچھ بہت مشکل کام بھی کرنے پڑے تھے؟“ اور وہ جان گئی کہ وہ جان گیا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”بہت مشکل کام ہاشم۔ بہت ہولناک کام۔“ ہاشم اسے دیکھتا رہا۔ گردن میں ابھر کر ڈھونگی صاف دھائی دی۔

”اور ایسے کام کرتے وقت کیا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا آپ کے پاس تباشید۔ آپ وہ نہ کرتیں؟“

”دوسرے راستوں میں میرے بیٹوں کی بجائی تھی۔ میں نے بیٹوں کو چنان۔“ اس کی آنکھ سے آنسو پ سے گرا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ سانس بند ہے تھے۔ ایک دوسرے کو ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اور کیا آپ نے سوچا کہ آپ کے کسی ایسے قدم سے... ہونا کہ قدم سے... آپ کے بیٹوں کو تھی تکلیف ہو سکتی ہے؟“

”تکلیف کا علم تھا، مگر بتاہی سے پچانے کے لئے ذرا سی تکلیف دینا بہتر تھا۔“

(میں چاہتی ہوں کہ تم دوسروں سے ایسی دوستی کریں کہ ہمارے دوستوں کو ہمارے منہ کھلتے دیکھ کر ڈرنا لگا کرے کہ ابھی ان کی زبان سے کچھ ایسا کہا جائے گا جس پر میرا دل برا ہو جائے گا۔ عجیب بات ہے مگر ان صاف گومنہ پھٹ دوستوں کے اپنے بارے میں جب کچھ کہا جائے تو آگ بولہ ہو کر زمین آسان ایک بھی کرتے ہیں۔)

”ذرا سی..... تکلیف؟“ اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ وہ بس دلکی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ آپ کی اولاد کا دل اس ذرا سی تکلیف سے باہر اب تک نہ لگا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے میئے کے ہر لمحہ فیصلے کے پیچھے آج بھی اسی تکلیف کا ٹرالا بسا ہو۔ پچھلے نہیں اگر یہ ”تکلیف“ ایسی ہے تو ”بتاہی“ کیسی ہو گی؟ پھر سر جھٹکا اور سامنے نظر آتے سورج کو دیکھنے لگا۔

”ٹرال کا فیصلہ آجائے، پھر میں اور سو نیا بیہاں سے شفت کر جائیں گے۔ میں نے آفس کے قریب ایک گھر لیا ہے۔ جب تک ہمارا نیا گھر تعمیر نہیں ہوتا، ہم وہیں رہیں گے۔“

جو اہرات کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ ”میں..... تمہارا گھر دیکھنے آسکتی ہوں؟“

”نہیں۔“ وہ کہہ کر اٹھ گیا اور اندر چلا گیا۔ وہ دل موس کر پیٹھی رہ گئی۔

اندر ہاشم کی اسٹری ٹیبل پر دو کاغذات پڑے تھے۔ ایک اور نگزیب کی پوست مارٹم روپورٹ جس میں موت کا وقت لکھا تھا۔ ایک اندازہ کے اتنے سے اتنے بچے کے درمیان موت واقع ہوئی ہے اور دوسرا..... اس نے وہ کاغذ اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک ای میل تھی۔ جب اس رات جواہرات کرے سے باہر آئی تھی، تو اس نے ہاشم سے کہا تھا کہ اس کا جی میل کام نہیں کر رہا، تب ہاشم نے جواہرات کے فون سے اپنے فون پر ”یہ ہاشم ہے مام کے فون سے“ لکھ کر ای میل بھیجی تھی۔ اس کے کوئی آدھے گھنٹے بعد انہوں نے اور نگزیب کو مردہ پایا تھا۔ اس ای میل کا وقت پوست مارٹم میں لکھے موت کے وقت سے اوپر تھا۔ (جواہرات اور نگزیب کو قتل کر کے خود کو سنبھال کر، کمپوزڈ کر کے میک اپ کر کے باہر لکھا تھی۔ اس سب میں وقت لگا تھا۔) اس نامم اسٹریپ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اور نگزیب کی موت اس وقت ہوئی، جب وہ کمرے میں تھی۔ ہاشم نے کرب سے آنکھیں موند لیں اور اس کا غذ کو مٹھی میں مروڑ دیا۔

(میں چاہتی ہوں علیشا کہ ہم انسان اپنے خود ساختہ چوپانی کے ملٹی کو چھرے سے نوچ پھیلنے اور جان لیں کہ بد گوئی اور حق گوئی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ حق اور بیچ میں بھی بہت فرق ہوتا ہے۔ حق کہتے ہیں کچی بات کو درست موقعے اور درست جگہ پر درست انداز میں کرنا۔ اسی لیے خالم حکمران کے سامنے کلمہ حق نہیں، کلمہ حق لگایا جانا جہاد ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے محل کے سامنے جا کر دہا بیان دینے لگ جاؤ بلکہ اس کے دربار میں کھڑے ہو کر اپنے انداز میں دلیل کے ساتھ اپنی بات پیش کرو اور اسے اس کے ظلم کا احساس دلو۔)

فرش پر ایک لکھوی کے پھٹے کے اوپر شاہ فرمان چٹ لیا تھا۔ اس کا جنم ڈکٹ نیپ سے بندھا نظر آ رہا تھا۔ سامنے ڈرل چار جنگ پر لگی تھی اور وہ بار بار ضبط کرتا فارس کو دیکھ رہا تھا جواب کری ڈالے اس کے قریب آبیٹھا تھا۔

”تم دن میں ہوٹل سیکورٹی دیکھتے ہو اور رات میں فری لانس کنٹریکٹر کے طور پر کام کرتے ہو۔ بڑے بڑے لوگوں کے برے برے کام کر کے دیتے ہو۔ میری بیوی کو لفٹ میں ڈبو نے کے کتنے پیے دیے تھے کاردار زنے؟“

”پیے کام کے..... بعد ملنے تھے۔“

”جیسے مجھے تو علم ہی نہیں کہ سارے کنٹریکٹر ز آدھے پیے پہلے لیتے ہیں۔“

”تم وہ پیے لے لو۔ مجھے جانے دو۔“ وہ کری سے اٹھا اور بوٹ سے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔

”مجھے تمہارے پیسے نہیں چاہیے ہیں۔“ اس کے دانت پر لگی تھی بھل بھل خون بننے لگا۔ ”میرا دل چاہتا ہے، اس رات کی اذیت کے بد لے... میں تمہارے جسم میں اس ڈرل سے اتنے سوراخ کروں کہ....“ مارے ضبط کے اس نے زور سے آنکھیں مجیس۔ پھر گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ ”مجھے بتاؤ، میں کیوں نہ کروں تمہارے ساتھ یہ سلوک؟“

”تم... تم میرے کائنٹس کی لست لے سکتے ہو۔ میں نے ان کے جو بھی کام کیے ہیں، تم وہ دیکھ سکتے ہو۔“ وہ تیز تیز ہانپئے لگا تھا۔ فارس واپس کری پہ بیٹھا اور ڈرل مشین اٹھا۔ ہوا میں بلند کر کے ٹریکر ہیڈ بایا۔ زوں کی آواز سے وہ چلنے لگی۔ اس نے الٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لیا۔ پھر اسے بند کر کے دیکھا۔ ”اور تم نے ”رسید یں“ سنبھال کر کھی ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت اپنے کائنٹس کو بلیک میل کر سکو؟“

واہ، ”تیخی سے ہنسا تھا۔

”ہر کوئی ڈاکو منش سنبھال کر رکھتا ہے۔ اگر کبھی پکڑے جاؤ تو سیاستدان بچانے آ جاتے ہیں۔“

”مجھے تمہارے سیاستدانوں میں دچپی نہیں ہے۔ ہاشم کاردار کے بارے میں بتاؤ۔“ اس نے ڈرل مشین سامنے رکھ دی۔ شاہ فرمان کی نظریں ڈرل پر جی تھیں۔

”اس کی ماں کا..... ایک کام کیا تھا میں نے۔“ وہ تیزی سے بول اٹھا۔ فارس رک گیا۔ پھر سیدھا ہوا۔ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ”اچھا... کیسا کام؟ کسی کا قتل؟ اغوا؟“

”نمیں..... چھوٹا سا کام تھا۔ ڈاکو منش forgery۔“ اس کی آواز ڈھمکی ہوئی۔

(اس لیے جاتے جاتے میں تمہیں ایک نصیحت کروں گی کہ تین لوگوں کو دوسروں پر نصیحت کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ میں آج خود کو اس خط کی قید سے آزاد کرتی ہوں۔ ہر شخص میں ہوتے ہیں دو بھیڑیے اور بدی کا بھیریا بھی غالب آ بھی جائے اور بھلے انسان کا ماضی کتنا ہی داغدار کیوں نہ ہو جائے۔ مگر دوست وہ ہوتا ہے جو اپنے دوست کو یہ بتائے کہ تمہارا مستقبل اب بھی کورا ہے۔ بلینک۔ اس کو تم اب بھی پا کرنا روشنائی سے لکھ سکتی ہو۔ کاش تم نے مجھے اس وقت یہ بتایا ہوتا۔)

اس رات فوذی ایور آفٹر کا اپری ہال تاریک تھا اور اس میں صرف ٹیبلیں یہ پر کی روشنی حلتوں دکھائی دے رہی تھی۔ فارس میز پر چند کاغذ پھیلائے پر سوچ، ابھی ہوئی نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ بار بار کوئی تعلق بنانے کی کوشش کرتا۔ بار بار وہ ٹوٹ جاتا۔ کچھ سمجھنہیں آ رہی تھی۔

گھڑی کی سویاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ اب کری پہ بیٹھا تھا اور سر ہاتھوں میں گراء سوچ رہا تھا۔

گھڑی اب رات کے تین بجارتی تھی۔ وہ کاغذات دیوار پر چپاں کیے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ہاتھ میں قلم تھا اور مختلف نقطوں پر نشان لگاتا پھر فتحی میں سر ہلاتا۔

باہر صبح طلوع ہو جگی تھی۔

(اور میں چاہتی ہوں کہ تم جیسے دوست اپنے دوستوں کی نام نہاد بہتری اور بھلائی سوچنے کے بجائے اپنے آپ پر توجہ دینے لگیں تو زیادہ اچھا ہو۔ میں خین یوسف یہ عہد کر چکی ہوں کہ اب میں کبھی اپنے دوستوں کے رویوں کو خود پہ طاری نہیں ہونے دوں گی اور ان کی وجہ سے اپنے آپ کو برائیں سمجھوں گی۔ میں اپنا ہیر و خود ہوں۔

(خین۔)

انہیں کی شہ سے انہیں مات کرتا رہتا ہوں ..... ستم گروں کی مدارات کرتا رہتا ہوں  
مورچال میں آج ٹوی کا شور نہیں تھا۔ خین اور ندرت کا بالا خراس بات پر اتفاق ہو گیا تھا کہ کچھ عرصے کے لئے ٹوی کو پیک کر کے کھو دیا جائے، اور اسمہ سخت ناخوش تھا۔ فیصلہ بھی اسی کی پڑھائی کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ اس کا ٹیب بھی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔  
مگر جب سے ٹوی خاموش ہوا تھا، اس بزرگیوں سے ڈھنکے بنگلے میں کوئی انوکھا سا سکون در آیا تھا۔ سب کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ ذہن تو انہیں تھے۔ آنکھیں نہ کان زدہ نہیں تھیں۔ سب لاکنج میں بیٹھے آپس میں با تین کر رہے تھے اور صد شکر کے مو بالکل پہنچ نہیں لگے تھے۔  
”اس شیطان کے ڈبے کو واقعی کچھ عرصے کے لئے پیک کر دینا چاہیے۔“ ابا بڑے ہی خوش تھے، بار بار اظہار کرتے۔ ”عجیب ڈپریشن پھیلایا کر رکھتا ہے گھر میں۔ اور اب دیکھو وقت میں برکت میں محسوس ہونے لگی ہے۔“

”بالکل۔“ اسمہ برے دل سے بڑھ رہا تھا۔ اب انہیں سنا۔ وہ کچھ اور سوچنے لگے تھے، پھر زمر کو دیکھا۔ ”فارس کہاں ہے؟“

”پتھر نہیں۔ میں نے تو کل سے اسے نہیں دیکھا۔ فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا کچھ کام کر رہا ہے۔“ اس نے رسان سے بتایا۔

”زمر... وہ ٹھیک تو ہے؟“ ندرت نے اس کے پاس بیٹھتے پوچھ لیا۔ وہ چپ ہو گئی۔

”لگ تو ٹھیک رہا تھا۔“ اندر سے کچھ اس کو بھی کھلتا تھا۔

”مگر مجھے وہ ایسا لگا جیسا جیل سے آنے کے بعد لگتا تھا۔ اور سعدی کی گلشنگی کے دنوں میں۔ اسی طرح خاموش، عجیب سا۔“ وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔

”کچھ معاملات ہمیں اتنے پریشان کرتے رہتے ہیں بھا بھی کہ کوئی دوسرا کام ہو، ہی نہیں پاتا۔ یا تو انسان ان کی وجہ سے گھل گھل کر ختم ہو جائے یا پھر اللہ تعالیٰ سے کہئے کہ یہ پریشانی میں نے آپ کے حوالے کر دی۔ جب تک میں آپ کے دوسرا بندوں کی مدد کر لوں اور لوگوں کے لئے اچھے کام کر لوں، تب تک آپ اس مسئلے کو خود سلیحداد تجھے گا۔“ وہ اندر وہی خلفشار پر قابو پا کر متانت سے بولی تھی۔ سب خاموش ہو گئے۔ گھر میں دیے ہی بہت خاموشی محسوس ہونے لگی تھی۔

چند میل دور..... آفس بلڈنگ کے بالائی فلور پر ہاشم اپنے آفس میں بیٹھا، کام میں مصروف تھا۔ جب انہر کام بجا۔ اس نے کان سے لگایا۔ چہرے پر چونکے آثار نظر آئے۔

”فارس آیا ہے؟“ ذرا ٹھہر۔ ”ٹھیک ہے اندر سے بھیجو۔“ اور عینک اتار کر رکھی اور ٹیک لگا لی۔ نائی ڈھیلی کیے، آستین موڑے، آنکھوں میں سپاٹ پن لئے، وہ منتظر سا بیٹھا نظر آرہا تھا۔

دروازہ کھلا اور چوکھت میں فارس نظر آیا۔ جیز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سرسری نگاہوں سے اردوگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہاشم کے بلوں پر تلخ مسکراہٹ آٹھہری۔

”کیسے آتا ہوا، کزن؟“

فارس قدم قدم چلتا، گردن موڑ موز کر دیکھتا آگے آیا اور میز کے قریب آٹھہر۔ پھر ہاشم کو دیکھا۔ ”بے فکر ہو، تمہاری سکیورٹی مجھے چیک کر

چکی ہے۔ کوئی خفیہ کیسرہ، واڑیا ہتھیار نہیں ہے میرے پاس۔“ ذرا رکا اور مسکرا یا۔ ”میں آج تمہیں اپنی زبان سے مارنے آیا ہوں۔“ ہاشم کی مسکراہٹ گھری ہو گئی۔ کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹھو نا۔“ مگر فارس گردن موڑ کر ایک بیریم کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا اسی میں مارا تھا تم نے آبدار کو؟“ سردی ہوا کا جیسے تھیڑ اسکرے میں آ کر ساکن ہو گیا تھا۔ ہاشم نے بھی رخ موز کر آب

زیدان کو دیکھا۔

”اس دن اس کی ساری مچھلیاں بھی مر گئیں۔ میں نئی مچھلیاں لایا بھی نہیں۔ شاید اس کا کافی تک زہریلا ہو چکا ہے۔“ فارس کری کھینچ کر بیٹھا، تاگ پہنچا اور دونوں ہاتھ باہم پھنسا لئے۔ پھر افسوس سے ہاشم کو دیکھا۔ ”تمہیں ترس نہیں آیا اس پر؟“ ہاشم نے شانے اچکائے۔ ”وہ خود چاہتی تھی کہ میں اسے مار دوں۔ میں نے صرف اس کی خواہش پوری کی۔ مگر اسے اس سب میں تم نے دھکیلا تھا۔ تم مجھ سے زیادہ قصور وار ہو۔“

”ویسے اس سے فرق نہیں پڑتا مگر میرے اور اس کے درمیان کچھ بھی نہیں تھا۔“

”بعد میں سب بھی کہتے ہیں۔“

”واٹ ایور!“ فارس نے ناک سے مکھی اڑائی۔ چند لمحے کی خاموشی دونوں کے پیچے حائل ہو گئی۔

”خیر.... تم ابھی سے کیوں آئے ہو؟ حالانکہ ابھی تو تم لوگوں کو وعداتی فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ ویسے بھی میں نے ابھی اپنا آخری پتہ کھیلانیں ہے۔“

”تم پہ کھیل رہے تھے؟ میں تو شطرنج کھیل رہا تھا۔“

”مگر میں نے تو سنایا ہے، آج کل آگے پیچھے لوگوں کو نارچ کرتے پھر رہے ہو۔ کیوں میرا غصہ ان غریبوں پر نکال رہے ہو؟“ وہ دونوں بنا سانس لئے بات پر بات پھیلک رہے تھے۔

”غصہ تو بہت تھا مجھے، اور چند دن نکالتا بھی رہا۔ مگر اب..... بھٹھدا ہو گیا ہوں، ویسے بھی اصل انتقام ٹھڈا کر کے کھانے کا نام ہے۔“

”ہوں۔ سو کیوں آئے ہو؟“ اس نے دلپتی سے پوچھا۔

”تمہیں کچھ خاص بتانے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولا۔ ”میں جانتا ہوں تمہارے باپ کو کس نے قتل کیا ہے۔“

ہاشم ایک دم زور سے نہس دیا۔ ”یہ تم اور سعدی میرے باپ کے قتل کے گرد سیاست کرنا کب چھوڑو گے؟“

”ہاشم میں واقعی تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے باپ کا اصل قاتل کون ہے۔“ وہ اب سنجیدہ ہوا۔

”تم نے دیر کر دی۔ سعدی یہ کارڈ بہت پہلے کھیل چکا ہے اور اس کی وجہ سے میں نے خاور کو.....“

”خاور نے نہیں مارا تمہارے باپ کو۔“

”یہ بھی جانتا ہوں۔ اور تم نے مجھے مایوس کیا ہے۔ کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ میرے باپ کو میری ماں نے مارا ہے، صاحبزادی صاحب نے بتا دیا تھا مجھے۔“ تلخی سے اسے دیکھتے وہ چاچا کر کھدرہ رہا تھا۔ ”مگر تم لوگ زیادہ خوش نہ ہو۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے اور میں نے مودا آن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ہاشم!“ اس نے تاگ سے تاگ ہٹائی اور آگے کو جھکا۔ ہمدردی سے اسے دیکھا۔ ”تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو نہیں مارا۔“

کمرے میں ایک دم بھی انک سانسنا چھا گیا۔ ہاشم کا سانس تھما۔

”سعدی، صاحبزادی صاحب، احمد سب غلط تھے۔ جواہرات نے تمہارے باپ کو نہیں مارا۔“

”اوہ پلیز!“ اس نے اکتا کر ہاتھ اٹھایا۔ آنکھوں میں بے پناہ بے زاری تھی۔ ”اب کس تیرے فریق پر الزام ڈالنے آئے ہو؟ میرے پاس تمہاری کہانیوں کے لئے وقت نہیں ہے۔“

”مجھے تم پر ترس آ رہا ہے مگر تم واقعی نے بغیر ہو۔ میں تمہاری بے بغیری دور کرنا چاہتا ہوں۔ آگئی عذاب ہے، اور میں چاہتا ہوں تم یہ۔“

عذاب چکھو۔“

”اچھا!“ اس نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”پھر بتاؤ، اب کی دفعہ کس نے مرا ہے میرے باپ کو؟“ فارس چند لمحے اس کی آنکھوں میں ترجم سے دیکھتا رہا پھر لب کھولے۔  
”تم نے خود!“

ہاشم پل بھر کو الجھا، پھر ستائش سے ابرداٹھا۔ ”واو۔ اس سے اچھا طریقہ نہیں ملا تمہیں کسی کو ڈسٹر ب کرنے کا؟“ پھر افسوس سے سر جھٹکا۔ ”واقعی فارس۔ میرے جیسے آدمی کو تم اب آکر یہ کہو گے کہ مجاہد تما میری کسی حرکت کا دکھ لے کر میرا باپ مراد یہ وہ..... بتا کہ میں ڈپریشن میں چلا جاؤں، اور خود کو اپنے باپ کی موت کا ذمہ دار سمجھوں؟ واث ربان!“

”تم نے اپنے باپ کا قتل کیا ہے۔ ہاشم!“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ آنکھیں ہاشم کی آنکھوں پر جھی تھیں۔ ”تم ہو اپنے باپ کے اصل قاتل۔“

”اور اس ساری بے تکنی کہانی کا کیا مقصد ہے؟ مطلب کس طرح مرا ہے میں نے اپنے باپ کو ہاں؟“ اسے اب غصہ آنے لگا تھا۔  
”جیسے مرا جاتا ہے۔ قتل کر کے۔“ فارس نے شانے اچکائے۔

”میں جانتا ہوں میرے باپ کو کس نے مرا ہے۔ میری اپنی ماں نے۔ اور اس سارے معاملے کو میں کھو ج رہا ہوں، مگر تہاری اس ساری بکواس سے.....“

”جوہرات نے تہارے باپ کو نہیں مارا۔“ ہاشم دھاڑ سے اٹھا اور میز کی چیزوں پر گرا میں۔  
”میں نے ہی اور گنگزیب کا ردار کو قتل کیا ہے۔ جانتا ہوں میں۔“ میز پر مٹھیاں رکھئے دہ اونچی آواز میں غرایا تھا۔ رنگت سرخ تھی اور آنکھوں سے شعلہ نکل رہے تھے۔

وہ سکون سے بیٹھا سے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”ہاں انہوں نے ہی مرا ہے اور گنگزیب کا ردار کو..... مگر یہ کس نے کہا کہ وہ تمہارا باپ تھا؟“

اور ہاشم کا ردار کے جسم کا ہر عضوں ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکن ہو گئیں۔ ہاتھ میز پر رکھ کر جم گئے۔ نگاہیں اس پر پھر ہو گئیں۔

”کس نے کہا ہاشم کا ردار کا اور گنگزیب کا ردار تمہارا باپ تھا؟“ فارس انٹھ کھڑا ہوا۔ ”جوہرات نے بے شک اسے مرا ہے، مگر وہ تمہارا باپ نہیں تھا۔ تمہارا باپ جوہرات کا کزن طیب مطیع تھا۔“

ہاشم کے لب پھر پھر زارے مگر آواز نہ لگی۔ اس کی سانس رک بجی تھی۔ جسم پھر تھا۔ آنکھوں میں سرخی دوڑ رہی تھی مگر وہ کسی سکتے کے عالم میں فارس پر جھی تھیں۔

”ایک پرائیوٹ کائنٹریکٹر کو ایک کام دیا تھا جوہرات بیگم نے۔ جب تم نے اور تمہارے... کیا کہنا چاہیے... نقلی باپ اور گنگزیب کا ردار نے.... مالی بدعنوائی کے باعث جوہرات کے کزن کو جیل بھجوایا تھا، اور خاص تمہارے حکم پر اس کے اوپر تشدد کروایا گیا تھا تو تمہیں یاد ہو گا کہ اس تشدد سے وہ ہسپتال جا پہنچا تھا۔ جہاں گوکر وہ مر گیا، مگر اس کے جو بلڈنگ میٹسٹ کی روپورٹ آئی تھی وہ درست نہیں تھی۔ کیونکہ جوہرات بیگم نے ایک کائنٹریکٹر کو کہہ کر اصل بلڈنگ پل لیب سے غائب کروانے کی اور مر بیض کی روپورٹ جمع کروادی تھیں۔ مگر ان کائنٹریکٹر کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ رسیدیں ضرور سنجھاں کر رکھتے ہیں۔ اس نوجوان نے اس بلڈنگ پل کو ضائع کرنے سے پہلے اس کی بہت ساری روپورٹس نکلوالی تھیں۔

کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ امیر عورتیں عموماً ذمی این اے رپوٹس بدلوایا کرتی ہیں۔ اس نے مجھر پوٹس دیں، اور میں نے ان کو تمہارے بلڈ مینک میں جہاں تم غریب لوگوں کے لئے خون کا عطیہ ہر چند ماہ بعد دیتے ہو اور ساتھ میں فوٹو شوٹ کرواتے ہو، تمہارے سینپل کے ساتھ بیچ کروالیا۔ واث اے پر فیکٹ بیچ۔ یقین نہیں ہے تو خود کیلے لو۔ ”اس نے جیب سے ایک تہ شدہ لفاف زکال کر میز پر رکھا۔ آنکھیں ہنوز ہاشم پر جمی تھیں جو ابھی پتھر ہوا کھڑا تھا۔ اسے لگا وہ سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ پلک بھی نہیں جھپک رہا تھا۔

”سو اور نگزیب تمہارا باب نہیں تھا۔“ فارس ٹھلتے ہوئے اب کہہ رہا تھا۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے جیسے خود کو سمجھا رہا تھا۔ ”مگر طبیب کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس جیسے بے کار، گھٹیا اور کرنگال آدمی کا ایک شاندار سا بیٹا بھی ہے۔ کسی زمانے میں وہ امیر اور خوش شکل تھا مگر آخری وقت میں تو کافی رذیل سا ہو گیا تھا۔“ وہ اب ٹھلتے ٹھلتے ایکو یہم کے قریب آ رکا تھا۔ انگلی اس نے شیشے کی دیوار پر اس جگہ پھیری جہاں بھی آبی نے سفید پڑتے ہاتھ رکھتے تھے۔ ”اسی لئے وہ آخری وقت تک جواہرات کو بلیک میل کر رہا تھا اور وہ تمہیں روکتی تھی کہ اس کو جیل میں نہ پھینکنا واد،“ مگر زیادہ کوشش اس نے بھی نہیں کی کیونکہ وہ اس کا اصل راز نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی اور نگزیب کا دردار جانتے تھے۔“ وہ اب جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا، اور باہر تاریک رات اور شہر کی روشنیوں کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ”اور نگزیب کو ہمیشہ نو شیر وال پٹک ہوتا تھا مگر اس کی مشاہدہ ان سے بہت تھی۔ تم پر کبھی شک نہیں کیا۔ لیکن تم ان جیسے نہیں تھے۔ اپنی ماں پر گئے تھے۔ بھی وجہ تھی کہ میں اور نو شیر وال..... ہماری شکلیں اور آوازیں ملتی ہیں۔ ہم اور نگزیب جیسے ہیں۔ تم ویسے نہیں تھے۔ تم ہمیشہ مختلف تھے۔ تم علیشا جیسے بھی نہیں تھے۔ تم سب سے الگ تھے۔ کیونکہ تم کا دردار تھے ہی نہیں۔“ پھر چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ سن کھڑا تھا۔ اس کی پیشانی ترجمی، قطرے کپٹی سے نیچے ٹپک رہے تھے۔ مگر اسے سانس نہیں آتی محسوس ہوتی تھی۔ فارس اس کے قریب چلتا آیا۔

”دوسروں کے باپ کو مارتے یہ خیال آیا تھا کبھی ہاشم کا اپنے باپ کے بھی قاتل نکلو گے ایک دن؟ اور جس کو تم ساری زندگی اپنا باپ مانتے رہے جس کی سیاست بچانے کے لئے تم نے اہل اور نور سے ان کا باپ چھینا، وہ آدمی تو تمہارا کچھ لگتا ہی نہیں تھا۔“ پھر اس پر ایک تاسف بھری نظر ڈالی۔ ”تم تاش کھلینے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور میں شترنخ کھلیں رہا تھا۔ اور اسے.....“ اس نے میز پر رکھا لفاف انہیں اٹھایا۔

”اسے شہمات کہتے ہیں؟“ کاغذ زور سے ہاشم کے اوپر دے مارا۔ وہ اس سے نکلا کر نیچے گر گیا۔ مگر بر ف اور آگ کے بت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ فارس نے سر جھکا، اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایسے ہی کھڑا تھا اور اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

اگلا سفر کیسے تمام ہوا، کوئی اندازہ نہ تھا۔ کتنے دن بیتے، کتنی راتیں کا تیں، کوئی احساس نہ تھا۔ لم من مکر قدم اٹھاتا وہ چل رہا تھا۔ بال بکھرے تھے، حلیہ بے ترتیب تھا۔ اور وہ قصر کے سبزہ زار پر قدم رکھتا جا رہا تھا۔ ملازم اسے دیکھ کر جیت سے پیچھے ہٹنے لگے۔ اس کے ہاتھ میں ایک شیشے کا جار تھا جس کا منہ بند تھا اور وہ سامنے دیکھتا اس بھری دوپہر میں قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ لا و نخ کا دروازہ ہکھلا تو سیر ہیوں کے اوپر وہ دونوں کھڑے با تیں کر رہے تھے۔ جواہرات فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔ ”تم دوبارہ اس کے دوستوں سے پتہ کرو۔ وہ چاردن سے گھر نہیں آیا شیر و۔“ وہ روہانی لگتی تھی۔ شیر و۔ ”کرتا ہوں دوبارہ،“ کہہ کر فون پر نمبر ملانے لگا تھا۔ تبھی جواہرات کی نظر نیچے بڑی جہاں لا و نخ کے کھلے دروازے کے ساتھ وہ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سفید اور آنکھیں سرخ تھیں۔ جواہرات کی آنکھوں میں نی در آئی۔ تیزی سے زینے اترنے لگی۔

”ہاشم تم کہاں تھے؟ اوہ گاؤ۔“ ہم سب کتنے پریشان تھے تمہارے لیے۔ تم ٹھیک ہو ہیٹا؟“ وہ پریشانی سے اسے دیکھتی قریب آئی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ جار میز پر رکھ دیا۔

”کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ مت سنلوگوں کی باتیں۔ سب لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔“ وہ اس کے سامنے کھڑی بے بسی سے کہہ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتا ہوا قدم قدم قریب آنے لگا۔ جواہرات کو عجیب خوف سا آیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

”میں نے نہیں مارا اور نگزیب کو جھوٹ بولتے ہیں سب۔ اور تم... تم اور نگزیب کی محبت میں مجھے بھلا بیٹھے ہو کیا؟“ وہ آنسو بھاتی

کہہ رہی تھی۔ اور کھڑا نو شیر داں ناگواری سے اسے دیکھے گیا۔ ہاشم اس کے قریب آ رہا تھا اور وہ پچھے ہٹ رہی تھی۔

”کیا کیا اور نکلزیب نے تم لوگوں کے لیے جو میں نے نہیں کیا؟ تمہارے ہر راز کی پرداز دار میں تھی۔ جو بھی کیا تمہارے لیے کیا نے۔ تم مجھے سب سے عزیز تھے۔ ہاشم میں نے تمہاری پرستش کی۔ تم مجھے سب سے عزیز ہو۔ شیر دے بھی زیادہ۔ تم مجھے ایسے نہ دیکھو۔“ وہ روئے لگی تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب آ رکا۔ اسے گھورتے ہوئے ایک دم سے.... اس کی گردان دبو پی۔ جواہرات کے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ”ایک ہی دفعہ پوچھوں گا۔ چیخ بتانا۔“ سرخ انگارہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے وہ غرایا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کی گردان دبو رکھی تھی۔

”میرا باب کون تھا؟ میرے ڈیڈیا تمہارا وہ کزن طیب؟“

اور وہ ایک ایسا لمحہ تھا جب جواہرات کے سارے آنکھم گئے۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔ وہ ایک عجیب ششدہ رہا تھا۔ وہ یک نک ہاشم کو دیکھ گئی۔

”کیا وہ میرا باب تھا؟ بولو۔“ وہ دپادر باس غیریا۔

اوپر کھڑا نو شیر داں سن ہو گیا۔ گرد دنواح کے کنوں میں کان لگائے کھڑے ملازموں نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیے۔ جواہرات کے لب پھر پھرائے۔ اس نے تھوک لگا۔

”I can explain!“ اور ہاشم نے اس کی گردان چھوڑ دی۔ ہاتھ نیچے گرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا درد ابھرا تھا جو

جواہرات کی جان نکالنے لگا۔

وہ مژگیا۔ اور چند قدم آگے کیا۔ ابھی سب سن کھڑے تھے۔ دم سادھے۔ سانس روکے۔

وہ میز تک گیا، جاراٹھیا، اس کا ڈھکن اٹارا اور واپس اس کی طرف گھوما۔ ”آن تم نے.... میرے ڈیڈو... دوسری دفعہ مار دیا۔“ اور

یہ کہہ کر اس نے جار میں موجود پانی اس کے چہرے پہ پھینک دیا۔

یہ جواہرات کا دردار کی چیخیں تھیں جنہوں نے وہاں کھڑے ہر شخص کو بتایا تھا کہ وہ پانی نہیں تھا۔

وہ تیز اب تھا۔



باب 30:

## ایڈس مارزیے ابھی بیتے نہیں!

ایک دن جب آیا

جو لیں سیزرا پی رعا یا کے سامنے!

تو اسے پکار کے بولا ایک نجومی ...

”اے سیزرا، خبردار رہنا

ایڈس مارزیے سے۔“

پوچھا سیزرا نے مصاحبوں سے

”کیا کہتا ہے یہ آدمی؟“

بتایا کسی نے۔ ”یہ کہتا ہے کہ خبردار رہیے

مارچ کی درمیانی تاریخ (ایڈس مارزیے) سے۔“

جب آئی مارچ کی پندرہ تاریخ

اور داخل ہوا سیزرا پہنچ دوبار میں

تو نظر آیا سے وہ نجومی۔

اس کو دیکھ کر بولا سیزرا طینان سے مسکرا کے۔

”ایڈس مارزیے تو آچکے ہیں!“

اس پر کہا نجومی نے سرجھا کر۔

”بجا فرمایا سیزرا۔“

وسط مارچ کے دن شروع چکے ہیں،

مگر ابھی ختم نہیں ہوئے۔ (ولیم ٹیلپیئر کے ڈرامے ”جو لیں سیزرا“ سے مانعوں)

(اور پھر اسی دن ایڈس مارزیے یعنی مارچ کی پندرہ تاریخ کو، ہی سیزرا کو بروٹس اور دوسروے باعیوں نے قتل کیا تھا۔)

رات کا اندر ہیرا ہر شے کو سالم نگل کر سادگی سے دنیا والوں کو دیکھ رہا تھا۔ سرو نش رومن میں اس کا ستر خالی تھا، اور وہ گھر کی چھپلی طرف لگے درخت پر چڑھ کر دیوار کے پار اتر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ زمین پر اتری سرخ مفلرو والا آدمی کسی کو نہ سے نکل کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ جھنجرانی

ہوئی سیدھی ہوئی۔ ”اس درخت پر چڑھنے اترتے میرے جسم پر دل بار ختم آئے ہیں۔ کیا تم مجھے کسی اور طرح سے نہیں مل سکتے؟“  
”بات سنوڑ کی!“ وہ اندر ہیرے میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے کے خدوخال نظر نہیں آتے۔ ”تمہارے نام کا مطلب ہوتا ہے، پری  
چہرہ لڑکی۔ پسید جلد والی حسین لڑکی۔ تمہاری اپنے مالکوں سے غداری کے بد لے میں تمہیں جتنے پیسے میں دے رہا ہوں، ان سے تم اپنے نام کی  
طرح خوبصورت زندگی گزاروگی۔“

اس بات پر اس کی آنکھیں چمکیں اور بول پسکراہٹ در آئی۔

”تمہاری بھی باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔“ پھر گردان کڑا کربولی۔ ” بتاؤ۔ اب مجھے کیا کرنا ہے۔“

..... ♦ ♦ ♦ .....

دشتِ ہستی میں شبِ غم کی سحر کرنے کو ..... بھر والوں نے لیا رخت سفرِ سناٹا  
فارس ابھی ابھی لاوٹنے میں داخل ہوا تھا اور بغیر تمہید کے اس نے وہ تکلیف دہ بخبرِ سادی تھی۔

لاوٹنے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ سب شل سے اسے دیکھئے گئے۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔

”ہاشم نے اپنی ماں پر...؟“ زمر کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئی تھیں۔ حسین سے کچھ بولا نہیں گیا۔ ندرت نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔  
”اس کو حیا نہیں آئی؟ وہ اس کی ماں تھی۔“ ان کا دل کانپا۔

”کوئی اپنی ماں کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟“ بڑے باالگشت بدنداش تھے۔

”کیونکہ اس کی ماں نے اسے یہی سکھایا ہے۔“ سعدی نے افسوس سے سر جھکا تھا۔ ”میں اسی لئے ان کی اصلاحیت ہاشم کو نہیں بتانا  
چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا وہ ان کو مارڈا لے گا۔“

”مارا ہی تو نہیں ہے اس نے ان کو۔“ فارس سپاٹ سے انداز میں کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ زمر اٹھ کے اس کے پیچھے آئی۔ وہ  
کمرے میں آ کر چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”تمہیں افسوس نہیں ہوا؟“ وہ پوچھنے بغیر نہ رہ سکی۔

فارس نے وہی بے تاثر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”ایک انسان ہونے کی حیثیت سے ہاں ہوا ہے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کو  
خود مزدادے۔ وہ دونوں میرے بھائی اور بیوی کے قتل میں شریک جرم تھے۔ البتہ میں اس سے اتنی سفا کی توقع نہیں کر رہا تھا، مگر یہ وہ عورت  
ہے جس نے نو شیر والی کی ایسی تربیت کی کہ وہ سعدی کو گولیاں مار کے چلا گیا۔ جس نے ہاشم کی ایسی تربیت کی کہ وہ ہماری زندگیاں اجڑاتا رہا۔  
جس نے سعدی کے قتل کا حکم نامہ جاری کیا۔ تمہاری محنت کے ساتھ کھلکھلتی رہی۔ اس لئے مجھ پر چھوٹو مجھے کوئی زیادہ افسوس نہیں ہے۔ میں نے اسی  
برس جن دنوں کا انتظار کیا تھا۔ بالآخر وہ دن آگئے ہیں۔“ اس کی آواز سرده ہو گئی تھی۔

زمر اداسی سے اسے دیکھتی رہی۔ ”کیا اقامت پا کر سکون ملتا ہے فارس؟“

وہ زخمی سامسکرایا۔ ”تم نے وہ تین قدیم چینی بدواعائیں سن رکھی ہیں؟ خدا کرتے تم جیوں دچھپے زمانوں میں.... خدا کرتے تمہیں اعلیٰ  
عہدوں پر فائز لوگ پہنچانے لگیں۔۔۔ اور تیرسری۔۔۔ اس نے گہری سانس بھری۔ ” خدا کرتے تمہیں وہ مل جائے جس کی تمہیں تلاش تھی۔“  
” یہ بدواعائیں میں ہیں؟“

”پتے نہیں مگر مجھے لگتا ہے میری طرف آتی ساری بدواعائیں کی قبولیت کا وقت آپنچا ہے۔“ اور وہ اٹھ گیا۔

”کتنا شوق تھا مسز کار دار کو پلا سٹک سر جریز کروانے کا۔“ باہر بیٹھی حسین خلاء میں دیکھتی کہہ رہی تھی۔ ”اب ان کو ساری زندگی جانے  
کتنی سر جریز کروانی پڑیں گی۔“

”ہاشم ایسا تو نہیں تھا۔“ سعدی افسوس سے بولا تو سب نے اسے دیکھا۔ آنکھیں نکال کر۔ ابھی زمر کو لفت میں ڈبو نے والے واقعہ کو دونہی کتنے ہوئے تھے؟

”میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ جب میں اس کی قید میں تھا، اب وہ پچھتا تھا۔ اس کا دل ایسا نہیں تھا۔ اب وہ ہر حد پا کرتا جا رہا ہے۔“ وہ ترجمہ سے کہہ رہا تھا۔ حینہن کے دل کے اندر..... کچھ آج بھی ڈوبتا تھا۔ شاید وہ یادیں تھیں۔ شاید کچھ اور.... وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا بیٹا۔ بڑے لبانے تینی سے مسکرا کے کہا۔ ”تم یہ سمجھو کر وہ شروع میں اچھا تھا، یاد کرو، تب اس نے وارث کو قتل کر دیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تب وہ پچھاتا نے والی باتیں کر کے تمہاری ہمدردی سمیت لیتا تھا۔ تمہیں لگتا تھا وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ مگر اب اس نے تج بولنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بھی نہیں بد لے گا۔“

سعدی خاموش ہو گیا۔ شیشے کی دیواروں والی قصر کا دردار کی لاہر بری یونہی یاد آگئی تھی۔

❖❖❖

جنہیں غور تھا اپنی سنتگری پر بہت ..... ستم تو یہ ہے کہ وہ بھی ستم رسیدہ ہوئے ”ایک بفتے بعد۔“

ہسپتال کے اس پریش کمرے میں جا بجا پھول رکھے تھے۔ کوئی عزیز رشتہ دار ایسا نہ تھا جس نے پھول نہ بھجوائے ہوں۔ وہ جیسے خوشی کے پھول تھے۔ اب ملنے کوئی نہیں آرہا تھا۔ پہلے دو دن جلوگ آئے سوائے۔ اب سکوت تھا۔ جواہرات کے بیٹے کے آگے پردے گبرے تھے۔ نو شیر والا اس طرف کھڑا تھا۔ سینے پر بازو لپیٹے۔ وہ ان پھٹر پھٹر اتے پر دوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی کسی درز سے وہ لمبی ہوئی نظر آ جاتی۔ آنکھیں چھپتے چھی تھیں اور چہرہ بیٹوں میں جکڑا تھا۔ اس کا صرف دایاں گال اور کان فتح پائے تھے۔ باقی چہرہ بائیں طرف اور سامنے سے جل گیا تھا۔ چل پھرستی تھی کام کر سکتی تھی مگر بینائی پر اترپڑا تھا۔ ناک غالب ہو گئی تھی۔ آنکھوں کا نور بھی بجھ سا گیا تھا۔

”ان کو گھر کب لے جاسکتے ہیں؟“ شیر و نے دھیمی آواز میں پیچھے کھڑی میری سے پوچھا۔

”بہت جلد۔“

”کیا جو نقصان ہوا ہے وہ ٹھیک ہو کے گا؟“

”نہیں سر۔ سر جریز سے تھوڑا بہت فرق پڑے گا۔ باقی میڈم کو اب ان زخموں کے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔“ وہ ٹھنڈے انداز میں بتا رہی تھی۔

”کیا کوئی بات کی انہوں نے تم سے؟“ شیر و کی نظریں پر دوں پر جمی تھیں۔

”وہ صرف ہاشم کا نام لیتی ہیں۔ ان کو پکارتی ہیں۔ ڈاکٹر زکا کہنا ہے کہ یہ وقت صدمہ ہے۔ وہ جلد شاک سے نکل آئیں گی۔“ شیر و نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”تم جانتی تھیں انہوں نے میرے باب کو مارا، پھر بھی ہمیں نہیں بتایا؟“ اس کی آواز میں دبادبا غصہ اور کرب درآیا۔

”ہاشم مجھ سے یہ بات پوچھ چکے ہیں اور میں بتا چکی ہوں۔ میں ایک وفادار ملازماہ ہوں، اور جیسے کوئٹ میں آپ کے اور ہاشم کے راز کی حفاظت کی، اسی طرح میڈم کے راز کی بھی حفاظت کی۔ اس تیزاب والے واقعے کے بعد جب سب ملازم استغفار دے رہے ہیں، میں اسی لئے یہاں موجود ہوں کیونکہ میں اب بھی مسز کا دردار کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ اسے چند لمحے دیکھ گیا۔ کمرے میں پھولوں کی خوشبو میں کافور کی بوکھلنے لگی تھی۔

”بھائی نے بہت ظلم کیا۔ مگر میں مجھ کو معاف نہیں کر سکتا۔ اگر ذمہ مجھے عاق کر رہے تھے تو بھی ان کو ذمہ کو... میرے ذمہ قتل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سن رہی ہیں آپ بھی۔“ اس نے چہرہ پھر پھڑاتے پردوں کی طرف موڑا۔ ذمہ اس حالت میں مرے کہ وہ مجھ سے ناراض تھے۔ میں ان سے معاف نہیں مانگ سکا۔ میں ساری عمر اس لگٹ میں رہوں گا کہ میرا باپ مجھ سے ناراض تھا۔ وہ گلی آنکھوں کے ساتھ والے قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ ”اب عدالت مجھے جیل میں ڈال دئے یا سولی چڑھادے میں دوبارہ آپ سے ملنے نہیں آسکوں گا۔ باپ تو وہ میرا تھا، مگر من پا آپ کے اب بھی ہاشم کا نام ہے۔ شیر و تو آپ کو یاد رہی نہیں۔“ وہ اب پیچھے ہٹا جا رہا تھا۔ اور بستر پہ پیسوں میں جکڑا وجود اسی طرح چھٹ کوتک رہا تھا۔ ہونتوں سے صرف ایک آواز کلک رہی تھی۔ ”کوئی ہاشم کو بلاۓ میرے ہاشم کو...“

شیر و کے جانے کے بعد میری کا وحی پہ بیٹھ گئی اور اطمینان سے میگزین کھول لیا۔

❖❖❖

جن پر ستم تمام نفس کی فضا کے تھے ..... مجرم وہ لوگ اپنی ٹکست آنا کے تھے

ہاشم کے بیدروم کی ساری بیانیں اور وہ آئینے کے سامنے کھڑا تائی باندھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑا رئیس کہہ رہا تھا۔

”بیانیں اس تاریخ سے کام شروع کر دے گا۔ چودھ جانے والے ملازموں کو میں نے سنبھال لیا ہے۔ یہ صرف گیس ہیڑ کا حادثہ تھا اور ہر جگہ یہی بتایا گیا ہے۔ اور سر...“ وہ رکا۔ ”آپ کی مدد کے علاج کے لئے ڈاکٹر زنے...“ ہاشم نے جھٹکے سے ثائی کی آخری گردھ پیختی۔

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، کہ میرے باپ اور تنگیب کاردار کی بیوی کے علاج کے لئے تمام رقم کمپنی ادا کرے گی۔ اب مزید میں اس معاملے پر کچھ نہیں سننا چاہتا۔“ اس نے درشتی سے کہتے ہوئے کارسیدھی کیے۔ رئیس خاموش ہو گیا۔

”اس غیر شناسانہ سر سے پھر متیع آیا سر؟“

”دورہ پہلے آیا تھا۔ وہ سعدی کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے ہماری کوششوں پر خوش تھا۔ میں نہیں جانتا وہ لوگ سعدی کو دہشت گرد کیوں ثابت کروانا چاہتے ہیں لیکن اتنا یقین ہے کہ وہ ہماری قابلیت جانچ رہے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ کام کرنے کا خواہشمند گتا ہے۔“

رئیس نے کوٹ اٹھا کر اس کی پشت پہ کیا تو وہ اس میں بازو دال کر اسے پہننے لگا۔

”سر میں نے کوٹ روم والے آدمی کا... وہ چشمے والا آدمی.... اس کا پیچھا کیا تھا۔ مگر وہ ہر دفعہ چکمہ دے کر کل جاتا ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ یہ پیغام بھیجنے والا اور سعدی کا پاسپورٹ دینے والا دراصل وہی آدمی ہے۔“

”ظاہر ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے۔ میں نے سعدی پر تمام الزامات لگا کر اس کا اعتقاد خرید لیا ہے۔ یہاں تمام عسکری گروپ اسی طرح اپنے سہولت کاروں کا اعتماد جانچتے ہیں اور پھر پارٹنر شپ شروع کرتے ہیں۔ جرائم کے سفر کا آغاز ہمیشہ ایک چھوٹ سے نیور سے شروع ہوتا ہے۔“

”سعدی کو دہشت گرد ثابت کر کے ان کو کیا ملے گا؟“

”اس سے میری کریڈیٹ بیٹھی بڑھے گی۔ جس اسے دہشت گرد مان نہیں لے گا لیکن لوگ مجھے دہشت گردوں کا مخالف سمجھیں گے اور کوئی بھی عسکری تنقیم ایسے سہولت کار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ ہمیں بہت جلد نئے برنس پارٹنر شپ ملنے والے ہیں۔“ اب وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے سے نکل رہے تھے۔

لا وحی میں فیجونا کھڑی صفائی کر رہی تھی۔ میری اور وہ... بس دو ملازم رہ گئے تھے۔ ہاشم جب سیر ہیوں سے اترتا ہوا اس کے سامنے

سے گزار اتوہہ بولی۔

”سر..... میں نیکست منہج سے چلی جاؤں گی۔“ اس کی آواز میں تذبذب تھا۔

”جو چاہے کرو۔“ وہ نجوت سے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

باہر صح تازہ اور خوبصورت تھی۔ مگر قصر اداں لگتا تھا۔ وہ موسم سے بے نیاز کار کے قریب آیا ہی تھا کہ.....

”کار دار صاحب۔“ بے چین سی نسوانی آواز پر وہ بٹھکا اور مرڑا۔ ڈاکٹر ایمن چند گارڈز کے ہمراہ چلی آ رہی تھی۔ ہاشم کے ماتھے پہل

پڑے۔ ”بی بی میں تمہیں بتاچکا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“

”میں نے اور میرے شوہرنے ان جن صاحب اور کرفٹ خاور کے کہنے پر آپ کے لئے اتنا کچھ کیا۔“ وہ تیز تیز چلتی قریب آئی اور

غصے سے انگلی اٹھا کر بولنے لگی۔ ”اور اب جب ہم کھال ہو چکے ہیں تو آپ ہماری مدد بھی نہیں کر سکتے۔“

ہاشم نے تندہ ہی سے اسے گھوڑا۔ ”کیا چاہتی ہو تم؟“

”مجھ سے کوئی نیا کام لیں یا ہمیں مالی طور پر سپورٹ کریں۔ ہمیں... ہمارا... بریوارڈ چاہیے۔ آپ اپنے سہولت کاروں سے یوں منہ

نہیں موڑ سکتے۔“

ہاشم چند لمحے سے دیکھا رہا پھر تاثرات زم ہوئے۔ آگے آیا اور نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”آئی ایم سوری،“ میں کچھ پریشان ہوں آج کل۔ بس کچھ روز میں... یہ کیس ختم ہو جائے... میں آپ سب کو نوازوں گا۔ میں مدد

کرنے والوں کو بھولا نہیں کرتا۔ مگر تک آپ کو خاموشی سے انتظار کرنا ہو گا۔“ ڈاکٹر ایمن کے تنه تاثرات ڈھیلے پڑے۔ اس نے سر ہلا دیا

مگر ابھی تک اضطراری انداز میں انگلی میں پہنی نو کیلے ہیرے والی انگوٹھی مردوڑ رہی تھی۔

”کیا آپ مجھے زبان دے رہے ہیں؟“

”بالکل۔“ وہ چند لمحے نرمی سے اس کی تسلی کرتا تھا پھر اس کے جانے کے بعد... وہ رئیس سے آہستہ سے بولا تھا۔ ”ان سب کا بھی

کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ تو میری جان کو آرہے ہیں۔“

❖❖❖

اک خواب ہے کہ پار درگر دیکھتے ہیں ہم ..... اک آشنا سی روشنی سارے مکاں میں ہے

مور چال پر رات گھری چھائی تھی۔ گرمی اور جس دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ لا دن بخیں روشن تھا۔ فارس ابھی ابھی آیا تھا اور چاہیاں

کھونتی پڑکارہاتھا جب دیکھا، ندرت تن فن کرتیں کچن سے نکلی ہیں اور دھاڑ سے سیم کے کمرے کا دروازہ کھولا ہے جو انہیں میں ڈوباتھا

اور خینیں اور اسامہ اپنے اپنے بستر پر لخاف اوڑھے گھپ سو رہے تھے۔

”کوئی انسانیت ہے تم لوگوں میں؟“ وہ حلق کے بل چلا کیں۔ ”میں نے کہا تھا آدھے گھنے بعد دو دوھ کے نیچے چولہا بند کر دینا مگر

جب تک دو دوھ کی آبشار نہ بہہ جائے، تم لوگوں کی تسلی نہیں ہوتی۔“

”آپا!“ وہ اکتا کر ان کے قریب آیا۔ ”وہ سور ہے ہیں، ان کے سر پر آپ کیوں چلا رہی ہیں۔“ ندرت نے اتنے ہی غصے سے مڑکر

اسے دیکھا۔

”بس کرو۔ بڑے سور ہے ہیں۔ ان بے غیر توں کا واٹس ایپ last seen تو تین منٹ پہلے کا نظر آ رہا ہے۔ بس ماں کو دیکھے

کر فرعون کی مہماں بن جاتے ہیں۔ ہونہے۔“ وہ غصے سے بولتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ فارس نے بے اختیار ان دونوں کے پلٹک دیکھے جن میں

جنہیں تک نہ ہوئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”یار حدا!“ سیم نے جھبٹ منہ نکال کر اسے پکارا۔ وہ بھی فوراً آٹھ بیٹھی۔

”ہاں ہاں میں بھی وہی سوچ رہی ہوں جو تم سوچ رہے ہو۔ اسی کا اندر نیت بند کرنا پڑے گا۔ یہ تو بگڑتی جا رہی ہیں۔“

”بالکل۔ ماں باپ کو اتنی آزادی دیتا اچھی بات نہیں ہے۔ آج کل کے زمانے کا کوئی بھروسہ نہیں۔“ دلوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ فارس اپنے کمرے میں آیا تو وہ ہمیشہ کی طرح بہت سی فائلز کے درمیان بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سراخھایا، اور مسکرا لی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

”کام ہو رہا ہے؟“ آدمی گھر آئے اور یوں مسکراتی ہوئی ملے تو.....

”ظاہر ہے، اب کسی بے روزگار کو کیا پتہ جاب کے بکھیرے۔ خیر کھانا لاوں یا کسی پرانی دوست کے ساتھ کھا آئے ہو؟“

اور فارس کا حلقت تک کڑوا ہو گیا۔ ”بہت مہربانی۔ کھاچکا ہوں۔“ اور اس کے سامنے بیٹھ پڑ بیٹھا۔

زمر نے مسکرا ہٹ دبای۔ ”مجھے پتہ ہے میں تمہاری ولی خاطر مدارت نہیں کرتی جیسی کسی یوں کو کرنی چاہیے۔ بس یہ کیس ختم ہو جائے۔“

”میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم مجھے جیل بھیج سکتی ہو، میرے خلاف بیان دے سکتی ہو مگر تم مجھے کھانا نہیں پوچھ سکتیں۔“ وہ اب جھک کر جوتوں کے تھے کھول رہا تھا۔ زمر بے اختیار نہیں دی۔ گھنگریا لے بال آدھے باندھے، آدھے سامنے کو جھوول رہے تھے۔ وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ ناک کی لوگنگ، انگلی کی نیلے رنگ والی انگوٹھی اسے مزید حسین بناتی تھیں۔

”تم ہمیشہ سے اتنے ہی ظالم تھے یا ب ہوئے ہو؟“

”آپ کی صحبت کا اثر ہے ما دام ورنہ میں تو چند ماہ پہلے تک ایک شریف آدمی تھا۔ ویسے...“ وہ اس کے سامنے نہم دراز ہو گیا۔ ”اس چڑیا گھر سے ہم کب نکل رہے ہیں۔“

”نکنا کیوں چاہتے ہو یہاں سے؟“

”میں چاہتا ہوں ہمارا اپنا علیحدہ گھر ہو۔ جہاں ہم دونا مل انسانوں کی طرح رہیں۔“

”ابھی ہم نارمل نہیں ہیں کیا؟“

”آپ کے بارے میں تو شک ہے لمبی۔“ اس کے سامنے کہنی کے بل لیے، کان تلے ہاتھ کا سہارا دیے وہ مسکرا کے اسے دیکھتے بولا تھا۔

”اور نئے گھر میں جا کر تم کوئی نوکری شروع کرو گے یا نہیں؟“

”آپ نا مجھے اپنا ذاتی خدمتگار رکھ بیجھے گا۔ اس سے بڑی نوکری کیا ہوگی؟ ماشاء اللہ وکیل ہیں آپ، لوگوں کی کھال کھینچ کر پیسے لیتیں ہیں۔ مجھے بھی تجوہ تو اچھی دیں گی۔“ وہ سنجیدگی سے کھر رہا تھا۔ اور وہ بُختی جا رہی تھی۔

”ہمیشہ جاب کی بات ثال دیتے ہو۔ مگر میں بھی ہار مانے والی نہیں ہوں۔ پیچھے پڑی رہوں گی۔“ قلم سے تنیہ کرتے وہ دونوں کبوٹی اور پھر سے لکھنے لگی۔ پھر سراخھا کر بولی۔

”اگر فارس، ہمارے پاس وارث غازی کی فائلز ہوتیں یا جنین کا میموری کا رڑ ہوتا جس میں کاردارز کے خلاف کچھ مواد تھا، تو ہم یہ کیس بہت آسانی سے جیت لیتے۔“

”ہمارے پاس ایک انہائی قابل وکیل ہے، جو بے شک انہائی بے مردت اور سفاک واقع ہوئی ہے، مگر میں اچھی امید رکھتا ہوں۔“ اور اب بہت ہو چکا تھا۔ زمر نے فائل انھا کر اسے دے ماری تھی۔

”کیا کہا تھا میں نے ابھی؟ سفاک اور بے مرد و کیل۔“ فارس نے فائل پکڑ کر سامنے سے ہٹائی اور افسوس سے سر جھوکا۔ وہ نہس کر سر جھکتی دوبارہ سے کام کرنے لگی تھی۔

❖❖❖

آسمانوں سے فرشتے جو اتارے جائیں ..... وہ بھی اس دور میں سچ بولیں تو مارے جائیں  
کمرہ عدالت میں ہمیشہ سے زیادہ گھٹن تھی۔ مگر کم از کم آج کے دن موسم خانوی شے بن کر رہ گیا تھا۔ کیا بادولوں کی سیاہی، اور کیا درختوں کا سبزہ، سب بے اثر تھا۔ لوگ آرہے تھے۔ نشستیں بھری جا رہی تھیں۔ آوازیں، سور، حرکت۔  
دفاع کی کرسیوں پر شکم تھا۔ چند ایک کاروباری دوستوں کے ہمراہ ہاشم اور نو شیروال موجود تھے۔ شیر دیاہ سوٹ میں ملبوس تھا اور پھرہ سفید پڑ رہا تھا۔ ہاشم البتہ ناگ پٹانگ جمائے اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ طنز یہ سرد مسکرا ہے۔  
استغاثہ کی کرسیوں پر ان کا سارا خاندان یوں اکٹھا ہو رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ وہ بنی اسرائیل کی مانند ایک جھٹتے لگ رہے تھے۔ فارس جیز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا، مسکرا کے ساتھ کھڑی سارہ کی بات سن رہا تھا، جو سر پر سفید دوپٹہ اوڑھے، ہری آنکھوں سے مسکرا تی ہوئی اپنی بیٹھیوں کی کوئی بات تباہی تھی۔ زمر کری پتی تھی، گھنگریا لے بال آدھے باندھے بدستور فاٹکوں پر جھکی تھی، اور سیاہ ڈریں شرٹ میں ملبوس سعدی اس کے کندھے پر جھکا، اس کے ساتھ ہی کاغذات پڑھنے میں لگا تھا۔ شاید کوئی کنتہ مل جائے جو کیس کو لے لبا کر سکے۔ کچھ وقت گواہ ڈھونڈنے کا اور مل جائے۔ ندرت ایک کری پتی تھیں، تنیج کے دانے گرتی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ایسے میں حسین اور اسامہ سرگوشیوں میں باقیں کر رہے تھے۔

”حمدہ... اگر ہم ہار گئے تو؟“

”اور اگر ہم جیت گئے تو؟“ وہ چیک کر بولی تھی۔

کچھلی نشتوں پر موجود تماشائی اور پورٹر زمزروعوب، اور کچھ تقیدی نگاہوں سے اس خاندان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سب ایک ساتھ کھڑے ایک جھٹکی صورت.... دور پیٹھے، قیمتی لمبسوں، اور مصنوعی مسکراہٹوں والے ”کاردارز“ اور ان کے دوستوں سے زیادہ متاثر کن لگ رہے تھے۔ جنگیں اڑ کر آیا خاندان.... رخموں کو اپنے ہاتھوں سے بغیر نشہ لئے کر آیا خاندان.... پانی میں ڈوب کر ڈر اور خوف کو ختم کر کے آیا خاندان..... ظالم کے خوف سے ایک دوسرے کو چپ کروا کے چھپ جانے کی بجائے انصاف اور انتقام کی ایک طویل جنگ لڑ کر آیا خاندان..... وہ یوں کھڑے تھے، اٹھی گردنوں اور فاتحانہ مطمئن مسکراہٹوں کے ساتھ کہ لگتا تھا آج وہ انصاف سے کم کسی شے پر راضی نہیں ہوں گے.... وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ایک دوسرے سے ہر اراختلاف رکھتے تھے مگر وہ ظلم کے خلاف کھڑے ہو کر ایک اوپنی دیوار لگنے لگے تھے۔

”کیا استغاثہ کے پاس کوئی مزید گواہ ہے؟“ بچ صاحب کی آمد کے ساتھ ہی خاموشی چھاگئی اور انہوں نے پہلا سوال یہی پوچھا۔  
زمراٹھ کھڑی ہوئی۔

”یور آز، ہمارا گواہ ملک سے باہر ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں ایک تاریخ اور دی جائے۔“

”سریسلی مزز مرا!“ بچ صاحب نے تحریر سے اسے دیکھا۔

”Delaying Tactics!“ ہاشم نے بلند ساتھبرہ کیا۔

”مزر ز مرا!“ بچ صاحب کی آواز میں سرزنش تھی۔ ”آپ کے پاس ابھی گواہ ہے یا نہیں؟“

”یور آز، کاردار صاحب نے گواہوں کو غائب کروادیا ہے، مگر.....“

”آب جیکشون یور آز، مسز زمر بغیر ثبوت کے الزام لگا کر خود ہی testify کر رہی ہیں۔“ وہ بیٹھے بیٹھے بولا تھا۔

”آپ کے پاس گواہ ہے یا نہیں؟“ نجح صاحب نے زور دے کر پوچھا۔

”نہیں یور آز، لیکن اگر عدالت وزارت داخلہ کو حکم دے تو ہمیں گواہ کوڈھونڈ نے میں مدل سکتی ہے اور.....“

”مسز زمر عدالت اپنی حدود میں رہ کر کام کرتی ہے، ثبوت لانا نجح کا نہیں استغاش کا کام ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پاس کچھ پیش کرنے کو نہیں ہے تو ہم آج اس کیس کا فیصلہ کر دیں گے۔“ وہ قدرے ناگواری سے کہردہ ہے تھے۔ سب خاموشی سے دم سادھے بھی زمر کو دیکھتے، کبھی نجح صاحب کو۔

”یور آز اگر آپ ہمیں ایک موقع اور دیں تو.....“

”آپ عدالت کا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ آپ تمام ثبوت اور گواہ پیش کر پچکی ہیں اب بہت ہو گیا۔“ انہوں نے اب کے قدرے

زمی سے اسے اشارہ کیا اور فائل کھول لی۔ زمر نے گھری سانس لی۔ فیصلے کی گھری آپنی تھی۔

”عدالت فیصلہ سنانے کے لئے تیار ہے۔“ نجح صاحب کا یہ کہنا تھا کہ سب نشتوں سے اٹھ گئے۔ دونوں فریق اب برابر کھڑے تھے۔ اور نجح صاحب اور پرانچے چبوتے پے بیٹھے یونک ناک پہ لگائے کاغذ سے پڑھ کر کہردہ ہے تھے۔

”سرکار بنام فوئیر وال کاردار میں مدی سعدی یوسف نے فوئیر وال کاردار ولد اور نگزیب کاردار.... (ہاشم نے تھوک نگلی۔) کے اوپر اقدام قتل، تشدد، اخوا اور حصیں بے جا میں قید رکھنے کا الزام لگا تھا جو کہ تعزیرات پاکستان آر نیکل 350، 307، 365 کے تحت آتے ہیں۔“

فارس سب سے پچھے کھڑا تھا۔ سب کی طرح وہ بھی یہ نویں پیچھے سانس روکے سن رہا تھا۔ البتہ گردن بھی گھما لیتا تھا۔ چشمے والا آج نہیں آیا تھا۔

”عدالت نے ان ٹینیں الزامات کو دیکھتے ہوئے ان کے اوپر کارروائی شروع کی اور دونوں فریقین کو اپنے ثبوت اور گواہ لانے کا حکم دیا۔“ نجح صاحب پڑھتے ہوئے گاہے بلکہ ہمیں کوئی بھی لیتے جو دم سادھے سن رہے تھے۔ (اسامد بور ہو رہا تھا۔ ذرا مous میں تو ایک ہی فقرے میں فیصلہ کر دیتے تھے یا تین لمبی تقریر کیوں کر رہے ہیں؟)

”استغاش نے ڈاکٹر سارہ غازی کو عدالت میں یعنی شاہد کے طور پر پیش کیا۔“ (سارہ نے نزوں سے انداز میں کان کے پیچھے بال اڑ سے۔) ”سعدی یوسف کی بہن نے گواہی دی کہ ملزم کے بھائی نے ان کے سامنے اعتراض کیا تھا۔ مگر اسی واردات کے دوسرے مبینہ ملوم نیاز بیگ نے گواہی دی کہ اس نے سعدی کو گوئی ماری ہے، البتہ اس کے بیانات میں تضادات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ قابل بھروسہ نہیں ہے۔ (سعدی نے بے چینی سے پہلو بدلا) ملزم کے ملازموں اور گھروالوں کے بیانات استغاش کے دعووں سے بالکل بر عکس تھے اور وہ قابل اعتبار تھے نہیں، ہمیں یہاں فیصلہ یہ کرنا ہے کہ کیا یعنی شاہد کا بیان قبل بھروسہ ہے؟“

سب کی سانسیں رک رک جل رہی تھیں۔ دل بند ہے ہوئے تھے۔

”ڈاکٹر سارہ صرف اقدام قتل کی گواہ ہیں۔ اخوا اور حصیں بے جا میں رکھنے کا استغاش نے کوئی گواہ پیش نہیں کیا۔ میری سمجھی کو لمبوکی کسی جیل میں سعدی کے ساتھ تھی؟ جو اہرات کاردار وہاں سعدی سے ملنگئی تھیں؟ آبدار عبید کی وہاں سعدی سے ملاقات ہوئی تھی؟ ان باتوں کے حق میں کوئی گواہ یا ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔ آلدہ واردات سے ملزم کے تعلق کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ اس لئے سارا کیس آخر میں یعنی شاہد ڈاکٹر سارہ کی گواہی کے گرد آکھڑا ہوتا ہے۔“

وہ سانس لینے کو رکے۔ بہت سے حلک خشک ہو رہے تھے۔ ہاشم لب کاٹ رہا تھا۔ فوئیر وال کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ سعدی کو پیسے آرہے تھے۔

”دفاع نے اپنی باری پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سعدی یوسف ایک دہشت گرد ہے مگر اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں دیا گیا کہ یہ نوماہ سعدی نے دہشت گردوں کے ساتھ گزارے۔ عدالت سعدی یوسف کے اس دعوے سے اتفاق کرتی ہے کہ اس کو واقعی انگوا کیا گیا، اور جسیں بے جا میں رکھا گیا، گوکہ سعدی یوسف کی واپسی کے بارے میں اور وہاں ہوئے چند واقعات جیسے دو فراہد کا سیلف ڈیفنیس میں قتل خود سعدی یوسف کے کردار کو بھی مشکوک بناتا ہے مگر یہ باتیں اس کیس کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ عدالت میں استقاشہ کا کام یہ ثابت کرنا تھا کہ انگوا کرنے والا اور گولی مارنے والا ایک شخص نو شیر و اس کا ردار تھا۔ استقاشہ ملزم کے گواہوں جیسے کاردار صاحب کی سیکریٹری حلیہ یا ملازمہ میری ایجخو کو جھوٹا ثابت کر دے، تب بھی کیا نو شیر و اس محلہ آور ان غوا کا رثابت ہوتا ہے؟ اگر سعدی اکیس میکروہاشم کا ردار کے آفس لیا بھی تھا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کئی گھنٹے بعد اسے گولیاں نو شیر و اس نے ہی ماریں۔ آفس میں تو نہیں مارا گیا تھا نہ سعدی کو۔ گھوم پھر کے ہم واپس ڈاکٹر سارہ کی گواہی کی طرف آکر رک جاتے ہیں۔“

اب تو دل کی دھڑکنیں بھی رک گئی تھیں۔

”ڈاکٹر سارہ ایک طرف ایک پروفیشنل سائنسدان ہیں اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں، ایسے عہدے انسان کو باہم اور بہادر بناتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک سال تک ایسا کوئی بیان نہیں دیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ یعنی شاہد ہیں۔ ان کا بیان آخری وقت آیا اور اگر اس کو درست مان لیں تو یہ بات کہ وہ ذہنی سکون کے لئے دو او سی کا استعمال کرتی ہیں، سائیکلیٹرست کے پاس زیرِ علاج ہیں، اور سعدی کی نہ صرف بس بلکہ رشتے دار ہیں، یہ بات ان کی گواہی کو جانبدار بنادیتی ہے اور کیس میں شک پیدا ہو جاتا ہے، اور قانون کہتا ہے کہ شک کا فائدہ ملزم کو دیا جائے اس لئے..... یہ عدالت.... آج نو شیر و اس کا ردار کو... ان تمام الزامات سے جو سعدی یوسف نے ان پر لگائے تھے.... باعزت بری کرتی ہے۔“

اور سارے میں ایسا نہایا چھایا تھا جیسے کسی کے مر نے پر چھا جاتا ہے۔

چند لمحے کے لئے تو ہر شخص پھٹی پھٹی آنکھوں سے بچ صاحب کو دیکھنے گیا۔ خود ہاشم بھی۔ پھر ایک دم دفاع کی کرسیوں پر شور سا بلند ہوا۔ ”مبارک سلامت“ کے نفرے۔ قطبے۔ خوشی کی چہار۔ سعدی نے سفید پرستے چہرے کے ساتھ گردن موڑی تو دیکھا۔ ہاشم خوشی سے مسکراتے ہوئے نو شیر و اس کو گلے لگا رہا تھا، جوشل کھڑا تھا۔ پیچھے سے سب مبارک بادیں دے رہے تھے۔

زمر سر جھکتی اپنے کانڈے سینئنے لگی۔ ندرت نے سر جھکا کر آنسو پوچھے۔ سیم نے آسمان کو دیکھا۔ فارس زخمی سامسکر دیا۔

”یہ سب میرا قصور ہے۔“ سارہ نے گلی آواز میں کہتے سر جھکا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سارہ کا سر تھکا۔

”آپ نے اپنی بساط سے بڑھ کر جدوجہد کی ہے۔ یہ انصاف کی عدالتیں نہیں ہیں، یہ قانون کی عدالتیں ہیں۔“

”ہم اپیل کریں گے۔ خیر ہے سعدی!“ زمر نے باہر نکلتے ہوئے اسے تسلی دی جوشل سا تھا۔ فکر مندی حنین نے بھی دوسری طرف سے پکارا۔ ”ہاں بھائی، ہم اپیل کریں گے۔“

”فائدہ کیا ہوا اس سب کا پھر؟“ سیم مایوسی سے بول اٹھا تھا۔ وہ اب راہداری میں آکھڑے ہوئے تھے۔ سعدی ابھی تک سن تھا۔

ششدہ۔ جامد۔

”کاردار صاحب، مبارک ہو۔“ ہاشم و کلاء کے جھرمٹ میں مسکراتا ہوا، لوگوں سے ہاتھ ملاتا باہر نکل رہا تھا۔ نو شیر و اس کے حواس بحال ہو رہے تھے، اور وہ اب وکیلوں کے بڑھے ہاتھوں سے مصافحہ کر رہا تھا۔ شخص فاتح و کیل سے ہاتھ ملانے اور مبارک باد دینے کا خواہاں تھا۔ سب چاہتے تھے کہ ہاشم ان کو یاد رکھے۔ وہ جو کچھ عرصے سے یچھے جارہا تھا، آج اس کا گراف پوری شان و شوکت سے بلند ہو گیا تھا۔ دونوں گروہ ساتھ احاطے سے باہر آئے تھے۔ روپورمز کے مائیک تیزی سے سب کے سامنے آئے تو زمر حضن ”ہم اپیل کریں

گے، جیسے چند فقرے کہہ کر سعدی کا بازو تھا مے آگے بڑھ گئی۔ فارس سمیت باقی گھروالے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے، مگر سعدی نے بازو چھڑا اور مرد کر پیچھے دیکھنے لگا۔

وہاں ہاشم اور شیر و کھڑے تھے۔ ان کی پشت پر مجع تھا، اور سامنے مائیکس۔ ہاشم دن کی روشنی میں کھڑا، مسکرا کر بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”آن انصاف اور قانون کی فتح ہوئی ہے۔ آج معزز عدالت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی گولنڈ ڈگر، مشکوک کردار کا مالک غریب لڑکا اٹھ کر کسی باعزت شہری کو اس کی امیری کی سزا نہیں دے سکتا۔“ وہ فاتحانہ انداز میں اطراف میں نظریں دوڑاتا کہہ رہا تھا۔ کیمرے لکلک کرتے اس کی تصاویر اتار رہے تھے۔ ساتھ کھڑے شیر و کھڑے پر پڑی تو وہ نظریں چاگیا۔ وہ خود بھی اتنا ہی بے یقین تھا جتنا کہ سعدی۔

”سعدی یوسف نے کیس کے دوران متعدد بار ہم سے بھاری رقوم کا مطالبه کیا مگر ہم جانتے تھے کہ عدالت میں فتح اور حق کی ہی ہوگی۔ ہم ان وکلاء میں سے ہیں جنہوں نے چیف جسٹس کی بجائی اور عدالتی تحریک کے لئے قربانیاں دی تھیں۔ ہم نے اس ملک میں جمہوریت کی بقا کے لئے قربانیاں دی ہیں۔ اب وہ زمانے چلے گئے جب لاپچ لوگ اس طرح غریب کارڈ کھلیتے تھے۔ اب عدالتیں آزاد ہیں۔“

”سعدی چلو۔“ زمرے سے کہنی سے کہنی کی کوش کر رہی تھی مگر اس نے پھر سے بازو چھڑا لیا اور پتیلیاں سکیٹے ہاشم کو دیکھ گیا۔ فارس آدھر راستے سے مڑک رہا پس آیا اور برہمی سے اسے پکارنے لگا۔ ”سعدی! کیا کر رہے ہو؟“

ادھر ہاشم کہہ رہا تھا ”میں اعلیٰ حکام سے درخواست کرتا ہوں کہ بھلے ہم نے سعدی یوسف کو معاف کر دیا ہو، مگر کیس کے دوران جو سعدی کے دہشت گردیوں کی معاونت کے ثبوت اور گواہ سامنے آئے ہیں، ان کے بارے میں مکمل تحقیقات ہونی چاہیں۔“

”کاردار صاحب۔ آپ کے اپنے ہی بھائی نے آپ کی کمپنی کے خلاف پریس کانفرنس کی تھی اور پہپہ شائع کیا تھا جس سے آپ کی کمپنی کو کافی نقصان ہوا۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟“

”اسی سے آپ اندازہ لگا لیں کہ کیا اتنا سچا اور مخلص انسان کسی کو گولی مار سکتا ہے؟“ وہ شیر و کی طرف اشارہ کر کے ترکی بہتر کی بولا تھا۔

”کاردار صاحب آپ اپنی والدہ کے حادثے کے بارے میں کیا کہیں گے؟“

مگر وہ سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی ”ابھی کے لئے اتنا ہی کافی ہے،“ کہہ کر مسکرا تا ہوا آگے آنے لگا۔ رپورٹر ہکھرنے لگا، اور وہ دونوں بھائی جھرمٹ میں راستہ بناتے چلتے ہوئے اس طرف آنے لگے۔ سعدی اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کا تنفس تیز ہو رہا تھا، ہاتھ کا نپر رہے تھے۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے سرخ پڑ رہا تھا۔ وہ سامنے سے آتے فاتح ہجوم کو دیکھ کر چلا یا تھا۔

”جھوٹ بول رہے ہو تم لوگ۔“

ہاشم نے دھوپ کے باعث ماتھے پہ ہاتھ کا چھپا بنا کر مسکرا کے اسے دیکھا۔ رپورٹر اس طرف گھوم گئے تھے۔

”اللہ قہر نازل کرے تم پر۔ اللہ غارت کرے تھیں۔“ کیمرے دھڑکنے سے سعدی کی تصاویر اتار رہے تھے وید یو بیار ہے تھے۔

ہاشم مجع کی طرف گھوما اور تبصرے کے سے انداز میں کہنے لگا۔ ”ٹھکست کے بعد بہت سے لوگوں کو نفیاتی امراض کے ہستا لوں میں داخلے کی ضرورت ہوتی ہے، مجھے افسوس ہے اس بچے کے لئے۔ لیکن میں نے اس کے جھوٹوں کے لئے اس کو معاف کیا۔“ ہاشم پھر سے چلنے لگا۔ وہ اسی طرف آرہا تھا۔ اسے آگے بڑھنے کے لئے سعدی کے پاس سے گزرن تھا۔

اور سعدی مٹھی بھینچ کر آگے بڑھا، کہ اس کے منہ پر دے مارے، مگر فارس نے پیچھے سے اس کو کہنی اور بازو سے جکڑ لیا۔

”چلو یہاں سے۔“ وہ دبے دبے بختی سے بولا تھا۔ ”وہ تھیں اس کا کر تماشہ کرنا چاہتا ہے، چلو یہاں سے۔“ ہاشم اب مسکرا تا ہوا قریب آچا تھا۔ آخری بات پر بھی سعدی نہ رکتا، اگر فارس اسے زبردستی کھینچتا ہوا وہاں سے نہ لے جاتا۔ ساتھ ہی وہ اس کو ڈانٹ بھی رہا

تھا۔” کیا کر رہے تھے؟ اس کو مکامارتے تو وہ اقدام قتل کا مقدمہ کر دیتا۔ اور اس کے پاس بیوت بھی ہوتے اور گواہ بھی۔ وہ یہی تو چاہتا ہے۔“ سعدی لڑکھراتے قدموں سے چلے گا۔ چلتے چلتے کندھا جھٹک کر اس نے بازو چھڑالیا۔ چہرہ سرخ تھا، آنکھوں میں پانی تھا۔ سب گھروالے کارپارکنگ میں رکے لکھرے تھے اس نے کسی کو نہیں دیکھا۔ کسی سے بات نہیں کی۔ بس آگے بڑھتا گیا۔۔۔ بڑھتا گیا۔۔۔ نو شیر والا اور ہاشم کافی دیر بعد اپنی اپنی کار کے سامنے آکھرے ہوئے تھے۔ مبارکبادوں اور تعریفوں کو سمیٹنے میں وقت لگا تھا۔ نو شیر والا اب سنپھل چکا تھا اور صرف سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ ہاشم نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولا۔

”تم آزاد ہو۔ آج سے نئی زندگی شروع کر سکتے ہو۔“

”اپ کو یقین تھا، ہم جیت جائیں گے؟“

”اگر میں شروع میں اسے نہیں لڑنا چاہتا تھا تو اس لئے کہ ہم بدنام ہوں گے، کاروبار کو نقصان پہنچ گا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ کیس وہ نہیں۔“ قتل کرنا آسان ہے شیر والا سے ثابت کرنا ہمیشہ مشکل۔ اس نے مسکرا کے شیر و کاشانہ تھیکا۔ نو شیر والا جواب اس کے لگے گلگ گیا۔ ”مجھے بچانے کا شکریہ بھائی۔“ اس کے کان کے قریب شیر دبو لاتھا۔ ”مگر مجھے انہوں ہے کہ وہ سروں کی طرح میں نے بھی آپ کو استعمال کیا۔ یہ جو ٹوٹی ہوئی ہینڈ فری میں آپ کی جیب میں ڈال رہا ہوں یہ وہ ہے جس کا ایک بڑا آبدار نے اس روز توڑ کر جھوٹ بولاتھا کہ وہ بگ ہے۔“ ایک ہاتھ سے اس کی جیب میں ٹوٹی ہوئی تاریں ڈالتے، وہ دھیرے سے زہراں کے کانوں میں اٹھیں رہا تھا۔ ”زمر کو اس نے نہیں، میں نے بچایا تھا۔ جس جرم کی آپ نے اس کو سزا دی، وہ اس نے کیا ہی نہیں تھا۔“ یہ کہہ کر وہ اس سے الگ ہوا تو دیکھا۔ ہاشم کی تخت مسکرا ہٹ و لیکی ہی قائم تھی۔

”میرے بے وقوف بھائی!“ اس نے شیر والا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا تو سردی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی گئی۔ ”تمہیں لگتا ہے مجھے یہ نہیں معلوم؟ تم یہیشہ یوقوف رہو گے شیر۔“ فارس کو لفٹ کا علم پہلے سے تھا، یہ دیکھ کر ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ تم نے کیا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا بھی تھا، تم نے انکار کر دیا، لیکن میں تمہارے ساتھ وہ نہ کرتا جو آپ کے ساتھ کیا۔ میں نے اس کو اس لئے مارا کیونکہ وہ مجھے اکسار ہی تھی، وہ خود اپنا قتل چاہتی تھی۔ وہ بیپر ناف سے مجھے نہیں مار سکتی تھی، وہ صرف چاہتی تھی کہ میں اسے مارڈاں۔ میں نے اس کی خواہش پوری کی۔ میں نے اس پر احسان کیا۔ اس کا جرم دھتمام دھو کے تھے جو وہ مجھے اس سے پہلے دے چکی تھی۔ مجھے اب کسی شے کا کوئی بچھتا وہ نہیں ہے۔ اور میں تمہارا کیس تھیں بچانے کے لئے نہیں لڑتا رہا۔ صرف اپنے نام کو لکھیر کرنے کے لئے لڑتا رہا ہوں۔“

نو شیر والا شل ہو گیا تھا۔ یہ عدالتی دھپکے سے زیادہ بڑا دھپکا تھا۔

”اگر وہ الزام اپنے سرنہ لیتی تو میرے... میرے ساتھ کیا کرتے آپ؟“

”وہی جواب کرنے جا رہا ہوں۔“ وہ رخنی سما مسکرا یا۔ ”ہم دونوں الگ گاڑیوں میں واپس جائیں گے، الگ زندگیوں کی طرف۔ سو نیا کے ساتھ میں قصر سے شفت ہو رہا ہوں۔ تم اور تمہاری ماں وہاں رہ سکتے ہو۔“ پھر ایک ملامتی مسکرا ہٹ کے ساتھ اسے چند لمحے دیکھتا رہا۔ ”تم سب نے مجھے تباہی کی طرف دھکیلا ہے شیر۔ تم... می... سعدی... شہرین... آپی...“ تم سب سے محبت کی تھی میں نے۔ تم سب نے مجھے میری محبت کی سزا دی۔“ کہہ کر اس نے سن گلا سرزا آنکھوں پر چڑھائے۔۔۔ ان کی سرخی اور نیچی چھپائی اور کار میں بنیٹ گیا۔ کالاشیشہ بند ہو گیا تو شیر والا سے دیکھنے کے قابل بھی نہ رہا۔

چند لمحے بعد وہاں سے دو کاریں دو الگ راستوں پر روانہ ہوئی تھیں۔ اور عدالت کی اوپنی عمارت کی قدیم دیواریں خاموشی سے اپنے جنبی شور کو سُننی رہی تھیں۔

دیکھا نہ کسی نے بھی مری سوت پلت کر ..... محن میں بکھرتے ہوئے شیشوں کی صدائنا دہ کن قدموں سے گھر پہنچا سے معلوم نہ تھا۔ سب خاموشی سے اندر آئے تھے صرف وہ تیزی سے آگے بھاگتا گیا تھا۔ کرے میں آ کراس نے دروازہ لاک کر دیا۔ پردے گرے تھے اور دوپہر کے باوجود روشنی نہ تھی۔ اسٹڈی نیبل پر قانون کی کتابیں رکھی تھیں۔ سعدی چند لمحے گلابی پڑتی آنکھوں سے ان کتابوں کو دیکھتا رہا۔

”میں بچ بول رہا تھا۔“ اس نے موٹی کتاب اٹھا کر زور سے دیوار پر دے ماری۔

”میں بچ بول رہا تھا۔“ اس نے بوٹ کی ٹھوکر سے میز لٹھ کا دی۔ اسٹڈی لیپ نیچے آگرا۔ فرش سے نکلا کر بلب چکنا چور ہو گیا۔

”میں بچ بول رہا تھا۔“ وہ اب ریک میں رکھی کتابیں نکال کر زمین پر پھینک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

”میں بچ بول رہا تھا۔“ وہ روتے ہوئے گھنٹوں کے بل زمین پر گرتا گیا۔ سر جھکائے آنکھیں سختی سے بیچھے دھوٹ پھوٹ کر رورہا تھا۔ سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا پڑا تھا جن میں ہزاروں قوانین اور مستور درج تھے۔

”میں بچ بول رہا تھا۔“ اس نے گیلی آنکھیں کھولیں۔ پھر غصے اور بے بسی سے ایک کتاب اٹھائی اور کھول کر صفحے چھاڑنے چاہے۔ مگر ہاتھ کا ناپ گئے۔ وہ یہ نہیں کر سکا۔

”میں بچ بول رہا تھا۔“ وہ سیاہ جلد والی سیاہ و سفیدی کی مالک کتابوں کے سامنے اکڑوں بیٹھا تھا اور سر گھنٹوں میں دیے بچوں کی طرح رورہا تھا۔ ”مگر کیا فائدہ ہوا بچ بولنے کا؟ بچ کے لئے لڑنے کا؟“

باہر سب خاموشی سے اس کی توڑ پھوڑ اور اب سکیوں کی آوازیں سن رہے تھے مگر ایک دوسرا سے نظریں چڑائے ہوئے تھے۔ بڑے ابا نے کسی سے کچھ نہ پوچھا تھا۔ چہرے بتارہے تھے کہ جوان انصاف مانگنے گے تھے وہ مصلحتوں میں لپٹے نظریہ ضرورت جیسے فیملے کو اٹھالائے تھے۔

ادھر اپنے آفس کی راہداری میں تیز تیز چلتے ہاشم نے ریس سے پوچھا تھا۔ ”آخری کارڈ کھینلنے کا وقت آگیا ہے۔ پارٹی کی تیاری مکمل ہے؟“

”جی سر۔ سب تیار ہے۔“

”اچھا۔ میں نیا گھر دیکھنے جا رہا ہوں۔ انیسٹریڈیزائزرنے آج کام ختم کر لیتا تھا۔ کیا وہ ہو گیا؟“ وہ سل فون دیکھتے تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ زندگی کی مصروفیت پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

”لیں سر۔ آپ کیس کے سلسلے میں بڑی تھے، میں نے اس کو سنبھال لیا تھا۔“

”تم نے نہیں۔“ اس نے مسکرا کے ٹوکا۔ ”میں نے..... ہاشم نے سنبھالا ہے ہر شے کو،“ اور آگے بڑھ گیا۔۔۔۔۔۔

❖❖❖

ناشنا سائی کے موسم کا اثر تو دیکھو ..... آئینہ خال و خد آئینہ گر کو ترسے

اس تیقی صحیح لگتا تھا سارے شہر پر سونے کا لمع چڑھا دیا گیا ہو۔ شایدیز میں کے اندر بڑے بڑے جنم دبک رہے تھے جس سے اور پر

چڑے والے بے خبر تھے۔ ایسے میں ہسپتال کی مرمریں راہداری میں وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔ زمر بزرگ کے لباس میں ملبوس تھی، اور سن

گلاہز بالوں پر نکار کئے تھے۔ فارس سیاہ شرٹ پہننے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے چلتے ہوئے کھدا رہا تھا۔ ”تم واقعی ان سے ملا چاہتی ہو؟“

ایک دروازے کے سامنے وہ رک گئی اور مڑ کر اسے دیکھا۔ ”تم اپنی آئنی سے نہیں ملو گے؟“

”میرا دل تمہاری طرح نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ نہیں بھولا۔“ وہ سمجھی گی سے کہہ کر وہیں رک گیا۔ زمر گہری سانس لے کر آگے

زمر اندر آئی ہی تھی کہ شہرین باہر آتی دکھائی دی۔ اس نے سونی کی انگلی پکڑ رکھی تھی اور میری اسنجیو تھام سے اسے کھڑا ہی تھی۔

”ہاشم کا حکم ہے کہ آپ آخری دفعہ سونی کو ساتھ لے جا رہی ہیں، ویک اینڈ پ جب آپ اسے چھوڑنے آئیں گی تو اس کے بعد...“

زمر کو دیکھ کر وہ چپ ہوئی۔ شہری نے بھی دیکھا تو سر جھٹک کر سونی کو لئے آگے بڑھ گئی۔

میک اپ اور ڈائمنڈ جیولری پہنے کھڑی میری نے ملکہ کی شان سے گردان کڑا کے اسے مخاطب کیا۔ ”خوش آمدید مسز زمر۔ اندر آئیے۔ مسز کاردار آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“

وہ اندر چلی آئی۔ آج کمرے میں کوئی پھول نہ تھا۔ پردے بہت تھے اور چکلی روشنی چھپن کر اندر آ رہی تھی۔ کھڑکی کے سامنے آرام کری پہ جواہرات بیٹھی تھی۔ رخ موڑ رکھا تھا، اور سر پہ شال لے کر چہرہ ڈھک رکھا تھا۔ زمر کافی پیچھے بیٹھ گئی تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکے۔

”تم جاؤ میری!“ جواہرات نے گلا خراب کی اسی آواز میں میری کو کہا، مگر میری زمر کے قریب صوفے پ پیٹھ چکی تھی۔ ”نہیں مسز کاردار، مجھے یہاں ہونا چاہیے۔“ اس کی آواز میں تمکنت تھی، ایسی تمکنت جسے جواہرات ردنہ کر سکی۔ خاموش ہو گئی۔

”کیوں آئی ہو زمر؟“ وہ باہر دیکھتے ہوئے آزادہ ہی ہو کر پوچھنے لگی۔

”آپ کی خیریت لینے آئی تھی۔“ توقف کیا۔ ”میں جانتی ہوں کہ میری روپورٹ، میری صحت، میری زندگی کے ساتھ آپ کیے کھلتی رہی ہیں۔ شاید آپ مجھ سے حد کرتی تھیں۔ حالانکہ میں آپ جیسی خوبصورت بھی نہ تھی، مگر آپ کو اپنے سامنے کسی کی تمکنت اچھی نہیں لگتی۔ بہر حال۔“ اس نے سر جھٹک کر گہری سانس لی۔ آنکھیں جواہرات کی پشت پہ بھی تھیں۔ ”میں آپ کو معاف کرنے آئی ہوں۔ دل سے ابھی تک بھولی کچھ بھی نہیں ہوں گے میری آپ کو معاف کرنا چاہتی ہوں۔ ہاشم کا معاملہ میں نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔“

ایک آنسو جواہرات کی آنکھ سے ٹپکا اور چہرے پہ پھسلتا گیا۔

”میں نے تم جیسے بہت سے لوگوں کو اجاڑا ہے زمر۔ مجھے کون کون معاف کرے گا؟“

”آپ معافی مانگ لیں، یہیں اہم ہوتا ہے۔“

”ہاشم مجھے معاف نہیں کرے گا، شیر و مجھے معاف نہیں کرے گا۔ اب کچھ پہلے جیسا نہیں ہو گا۔ ہاشم سے کہو، مجھے معاف کر دے۔ مجھ سے ملنے آجائے۔“

”میں یہ نہیں کر سکتی مسز کاردار، مگر میں آپ کو اپنے اوپر کئے گئے تمام مظلالم کی قید سے آزاد کرتی ہوں۔ میرے اور میرے خاندان کا کوئی حساب آپ پر ادھار نہیں ہے۔“

جواہرات اسی طرح باہر دیکھتی رہی۔ آنسو گر رہے تھے۔ ”میں تم سب سے بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میری مدد کرو۔ مجھے اکیلامت چھوڑو۔ مجھے اپنے سارے گناہوں کا حساس ہے۔“

زمر زخمی سامسکرائی، اور پس کندھے پہ ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”نہیں مسز کاردار۔ آپ نہ شرمندہ ہیں، نہ آپ کو حساس ہے۔ آپ اب ہی مجھے استعمال کرنا چاہتی ہیں ہاشم کو منانے کے لئے۔ اکثر انہیں بدلتے۔“ جواہرات بالکل چپ ہوئی۔ آنسو بہنار ک گئے۔

”یعنی تم لوگ اب مجھے دشمنی کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔“ پھر اس کے لبوں سے سرداہ نکلی۔

”اللہ آپ کو صحت دے اور آپ پر حرم کرے۔ میں چلتی ہوں۔“ وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔

فارس راہداری میں دیوار کے ساتھ کھڑا تھا، ہاتھ جیبوں میں ڈال رکھے تھے، اور چھٹ کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ یونہی نگاہ پھیری تو سامنے سے شہری اور سونی آتی دکھائی دیں۔ شہرین نے اسے دیکھ کر فوراً نظریں چرا لیں۔ فارس نے سونی کو دیکھا، وہ چھوٹے چھوٹے

قدم اخلاقی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا۔ انہائی خوبصورت بھی تھی وہ۔ وہ نرمی سے مسکرا یا۔ تو سونیا نے غصیل آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں کو بنا آواز کے ہلاکے کہا۔ ”آئی ہیئت یو۔“ اور منہ موز کے آگے بڑھتی گئی۔

فارس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ آنکھوں میں اچنچا بھر آیا۔ کچھ دو اندر رخنی بھی ہوا تھا۔

پھر اس نے سر جھٹکا۔ چند لمحے بعد زمر آتی دھکائی دی تو وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ مگر دو سیاہ خوبصورت آنکھیں، ان کا یک نک اسے دیکھنا، اور ہونٹوں کا بلکہ بنا آواز کے تین الفاظ بولنا، وہ دماغ سے زیادہ دل کے اندر تک پیوست ہو گیا تھا۔

❖❖❖

وقت رکتا ہی نہیں خواب ٹھہرتے ہی نہیں..... پاؤں جستے ہی نہیں بہتے ہوئے پانی پر کتنی راتیں اتریں، کتنے دن ڈھلنے زندگی میں گھل جانے والی ماہیوں سعدی کو ہرشے سے بے نیاز کر بچتی تھی۔ وہ تمام گھروالوں سے نظریں چڑا کے صبح جلدی نکل جاتا۔ پھر یونہی سڑکوں پر پھر تار ہتا۔ یا سارا سارا دن کمرے میں پڑا رہتا۔ اس روز سے اس کا جیسے دل، ہی ٹوٹ گیا تھا۔ ملک، قانون، انصاف کے ادارے ہرشے سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ پاکستان کا کوئی مستقبل نہیں ہے، وہ جان گیا تھا۔

آج پھر وہ کمرے میں پڑا تھا۔ صوفے پر لمبائیں، موبائل پر انگلی پھیرتا سو شل میڈیا دیکھ رہا تھا۔ سیو سعدی یوسف چیج کے علاوہ۔ وہاں تو شرمندگی سے وہ جاتا ہی نہیں تھا۔

باہر لا ڈنچ میں آؤ تو اُنی وی ہنوز غائب تھا، اور بڑے ابا، اسامد اور حشین سے محو گفتگو دھائی دیتے تھے۔ اسی اثناء میں ندرت سامنے والے صوفے پر آبیٹھیں اور میز پر کبابوں کے کچے آمیزے کا برتن رکھا۔ ساتھ میں پانی کا پیالہ اور بڑی ٹرے جس میں نکیاں بنا بنا کر رکھنی تھیں۔ چند لمحے لگز رے اور دونوں اولادیں ان کے دامیں با میں آبیٹھیں۔ آنکھوں میں زمانے بھر کی لائی تھی۔

”امی صبح جو آپ نے حلیم بنایا تھا وہ بہت مزے کا تھا۔“

ندرت نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا۔ ”کسی کا ہاتھ کبابوں کے ایک فٹ بھی قریب آیا تو میں نے جوتے مار مار کر شکل بدل دینی ہے۔“

”یہ ڈھمکی اب پرانی ہو چکی مام ڈار لگ!“ حنہ نے دو انگلیوں سے مصالحہ اچک کر منہ میں رکھا۔ امی کی ناک کے نیچے سے کچے کبابوں کا آمیزہ کھانا.... آہھ... من وسلوئی تھا یہ۔

ایک زور کا تھپڑا اس کے ہاتھ پر آگا۔ ”ہزار دفعہ کہا ہے درمیان سے مت اچک لیا کرو۔ بے برکتی ہوتی ہے۔“ مگر ان کو فرق نہیں پڑتا تھا۔

”ندرت، ابا کو کچھ بیاد آیا۔“ فارس کہہ رہا تھا وہ لوگ نیا گھر لینا چاہ رہے ہیں۔“

”حالانکہ یہ اتنا بڑا گھر کافی ہے سب پر۔“ ندرت کو بات پسند نہیں آئی تھی۔

”امی آپ کیوں اشارا پلس والی دادی بننا چاہ رہی ہیں؟ ان کو رہنے دیں جہاں وہ چاہتے ہیں۔“ حنہ نے ناک سکوڑی تھی۔

”لو... میں تو ایک بات کہہ رہی تھی۔“

”امی آپ نا بھائی کی شادی کر دیں۔ یوں رونق آجائے گی گھر میں۔“ اس نے چکلی میں حل بیایا۔ ندرت نے ایک بھٹدی آہ بھر کے سعدی کے کمرے کو دیکھا۔ (سیم نے آنکھ بچا کر ذرا سا آمیزہ اٹھا کر منہ میں رکھا۔ من وسلوئی۔) ”پیٹھیں کس کی نظر لگ گئی میرے بیٹھے کو۔“

”چلو جی۔“ حنہ نے منہ بنا یا۔ ”ساری دنیا کے لوگوں کو مسئلے ان کے اعمال کی وجہ سے پیش آتے ہیں، ایک ہم پاکستانیوں کو ہربات میں یا تو نظر لگتی ہے یا جاؤ دہوتا ہے۔“

”نظر بحق ہے بیٹا۔“ اپنا نتیجہ کی۔

”جب ابا، بالکل بحق ہے، یہ اونٹ کو ہانڈی اور انسان کو قبر تک پہنچا دینی ہے، مگر جب قرآن میں اللہ تعالیٰ لوگوں پر آنے والی مصیبتوں کا ذکر کرتا ہے تو فرماتا ہے کہ نمبر ایک وہ ان کو ان کے اعمال کے سبب پہنچیں، نمبر دو وہ لوح محفوظ میں اللہ نے ایسی ہی لکھ رکھی تھیں۔ مجھے لگتا ہے اب کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم پاکستانی نظر اور جادو سے نکل آئیں، اور اپنے مسلکوں اور اعمال کو own کرنا یا کیسیں نظر لگتی ہے اور جادو بھی ہوتا ہے مگر ذرا ذرا اسی باقوس میں نہیں ہوتا۔ رہا آپ کا بیٹا تو والدہ ما جدہ، ادب کے ساتھ، مگر آپ کے ساتھ ایسے اور بھائیوں کے اعمال ہی ایسے تھے۔ انہوں نے برے لوگوں کے ساتھ پنگالیا، گوک انہوں نے اچھا کیا تھا، مگر ہر اچھے کام کے نتیجے میں اچھائی تو نہیں ملتی نا۔“

سر پر ندرت کا ٹھہر لگا تو وہ چپ ہوئی۔ ”زیادہ بک بک نہ کرتی رہا کرو ہر وقت۔ بس ماں کی غلطیاں نکالنے پلگتا ہے انعام ملنا ہوتا ہے تم لوگوں کو۔ اب جاؤ، بھائی کو بلا کر لا، کھانے کا بتائے، کیا کھائے گا، میں وہی بناؤں۔“

”امی یہ کہا بفرائی کر دیں۔“ اسماءہ چکا۔

”یہ مہماںوں کے لئے ہیں۔ ہٹواب۔“ اور جب خنیں بھائی کے کمرے کی طرف جا رہی تھی تو چیچے سے سیم کے ”مہماںوں“ کی شان میں قصیدے سن لکتی تھی۔ (کسی کے گھر جاؤ تو نہیں کھانے دیتیں.... اور اپنے گھر میں ہر اچھی چیز مہماںوں کے لیے رکھ دیتی ہیں۔)

سعدی اندھیرا کیے صوفے پر بیٹھا فون دیکھ رہا تھا۔

”بھائی۔“ حمد اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی، پھر جھک کر دیکھا۔ وہ ہاشم کاٹو یسٹرڈ لیکھ رہا تھا۔ تصویر میں ہاشم تھا، اشائیکٹ اس کے کوٹ کا کالر درست کر رہا تھا، اور آگے چیچھے لوگ کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ”وکٹری پارٹی۔ کاردار ز کا ٹچ۔ تھینک یو پاکستان۔ سرکار بنام نو شیر وال کاردار۔“ یہ تمام الفاظ Hashtag کر کے لکھے گئے تھے۔

”اس کو مت دیکھا کر میں بھائی۔ اب بس کلکھے ہیں یہ لوگ ہماری زندگی سے۔“

”یہ مایا ہے.... ڈاکٹر مایا...“ وہ تیزی سے بولا تو خنین سناٹے میں رہ گئی۔

”یہ جوڑکی کو نے میں نظر آ رہی ہے، سائیڈ پوز!“ وہ زوم کر کے دیکھ رہا تھا۔ بے یقینی سے۔ حیرت سے۔ ”یہ مایا ہی ہے۔ یہ بے وہ گواہ جو ہم ڈھونڈ رہے تھے۔“ مگر حمد نے اسکرین پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مگر اب کوئی فائدہ نہیں۔ اس کو بند کریں اور باہر آئیں۔ امی بلا رہی ہیں۔“

وہ کہہ کر خود تو آ گئی، مگر جب کافی دیر گزرنے کے بعد سعدی نہ آیا تو حمد دوبارہ اس کے کمرے میں گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ بیرونی گلری کو جاتا دروازہ کھلا تھا۔ الماری کے پٹ کھلے تھے، بینگر بینڈ پر ڈرا تھا۔ گویا اس نے لباس بدلا تھا۔ خنین دم بخودی کھڑی رہ گئی۔ پھر میز پر نظر پڑی جہاں سیاہ فون بکھلی نظر آ رہی تھی۔ یہ زمر کی تھی جس میں وہ عرصے سے کلام اور ججز کے گھر کے پتے لکھ کر محفوظ کرتی تھی۔ حمد نے صفحے پلاٹاۓ۔ ایچ نکلا۔ ہاشم کاردار۔ اس کے دو تین پتے لکھے تھے۔ تیسرا کاردار ز کا ٹچ کا تھا... اس کا فارم ہاؤس جو چک شہزادی طرف تھا۔

وہ فوراً باہر بھاگی۔ اس کا دل بری طرح سے کانپ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا اکیس میگی کی ٹیچ پھر سے آن پکھی ہو.... وہ تب بھی تیار ہو کر.... سوٹ پہن کر گھر سے گیا تھا۔ بغیر بتائے نہیں۔ آج نہیں.....



منظرا جو آنکھ میں ہے گنو و تجھے اسے ..... پھر جو دل پہ ہے اسے کیسے ہٹائیے  
ذر اسی پارش ہوئی تھی مگر درخت اور پودے نہا کر سر بزرنگل آئے تھے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو سارے میں رچ بس گئی تھی۔ زمر کار سے

پیچے اتری اور گردن اٹھا کر دھلائے خوبصورت بُنگلے کو دیکھا تو ہونوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ سن گلاسز آنکھوں سے اوپر لے جا کر ماتھے پر لیں۔ فارس ڈرائیور ڈر بند کر کے باہر نکلا اور مسکرا تا اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

”کیسا لگا مکمل طور پر ہمارا یا گھر؟“

”اچھا ہے۔“ اس نے مسکرا کے سر اہا۔ وہ دونوں اب کار کے ساتھ شانہ بٹانہ کھڑے بُنگلے کو دیکھ رہے تھے۔

”اس چڑیا گھر سے تو بہت ہی اچھا ہے۔“ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ زمر نے خفگی سے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا۔

”میرے گھروالوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہو؟“

”کیونکہ بی بی آپ سے زیادہ وہ میرے گھروالے ہیں۔“

”مس کرو گے تم ان کو۔“ زمر نے واپس گھر کی طرف چھپہ موڑ لیا۔

”میں انشاء اللہ تعالیٰ کسی کو بھی مس نہیں کروں گا۔“ وہ جھر جھری لے کر بولا تھا۔

”مگر میں ان کے بغیر ہوں گی کیسے؟“ وہ مصنوعی اداسی سے بولی۔ فارس کا حلقت تک کڑوا ہو گیا۔

”جی جی۔ آپ تو جیسے بڑی خدمت گزار ہو ہیں۔“ دن میں چھٹے قسم کے کھانے بناتی ہیں اور بڑا کاؤنٹر پر آپ کو جوانٹ فیملی سے۔

”یہ تم ہمیشہ سے اتنے ہی طفر کرتے تھے کیا؟“ وہ اب تجھ برا مان گئی تھی۔

”آپ کی صحبت کا اثر ہے۔“

”ہم گھردیکھنے آئے ہیں یا لڑنے؟“

”جو آپ کا موڈ ہو، آپ بتا دیں۔“

”ہونہہ۔“ تاک سکوڈ کراس نے سر جھکا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ آگے گئی تو فارس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر آئی، مگر

جلدی سے سنجیدہ چڑھتا اس کے پیچھے لپکا۔

”تم خوش ہو؟“ اس کے ساتھ اندر جاتے اس نے پھر سے اسے چھپڑا۔

”ہم کیس ہار گئے۔ مجھے کیسا ہوتا چاہیے۔“ وہ واقعی اداس ہوئی۔

”جیت کر کیا ہوتا۔ وہ اپیل کرتے اور شیر و بری ہو جاتا۔ یا ہام اسے جیل سے غائب کروادیتا اور ملک سے باہر بھجوادیتا۔ سب کا وقت فیکر گیا۔ اب نئی زندگی کا سوچو۔“ وہ اس نے تغیر شدہ مکان کی سیر ہیاں چڑھ رہے تھے۔ وہ آگے تھی اور وہ پیچھے چل رہا تھا۔

”نئی زندگی میں تم اچھے اور شریف ہو جاؤ گے کیا؟“ وہ مزکر سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”استغفار اللہ۔“ وہ بڑا بڑا۔ دوچار نقرے زبان تک آئے تھے مگر فون کی گھنٹی۔ اس نے برے موڈ سے موبائل نکال کر دیکھا۔ خین

کالنگ۔ اس کا دماغ گویا بھنا اٹھا۔

”خین تم آخر پیدا کیوں ہوئی تھیں ہمارے گھر؟ کیا تم پہلا زم ہے کہ جب آدمی مصروف ہو، تم کوئی نہ کوئی کاں کر کے ضرور دماغ خراب کرو گی۔“ وہ واقعی غصے سے بول رہا تھا مگر دوسرا طرف کے الفاظ سن کر اس کے ماتھے کے بل ڈھیلے پڑے۔ پھر وہ پھیکا پڑا۔

”کب گیا ہے وہ؟ ہم آرہے ہیں۔“ ساتھ ہی فون بند کرتے زمر کو دیکھا جو چونک کرا سے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟“

”سعدی.....“ اور وہ پیچے دوڑا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔ ایک دم سے سب کچھ بدلتا گیا تھا۔

یہ اہل بھر کی بستی ہے احتیاط سے چل! ..... مصیتوں کی یہاں انہا گزرتی ہے کاردار زکانیج چھوٹا سا تھا مگر اس کے چاروں اطراف کھلے بزرہ زار بکھرے تھے۔ کانیج کی چار دیواری لکڑی اور شیشوں کی بنی تھی۔ دروازے کھڑکیاں.... سب اونچے شیشوں سے مرصع تھے۔ دعوت شروع ہو چکی تھی اور ایئر کنٹریننڈ لاونچ میں کھڑے مہماں کو شیشے کی کھڑکیوں سے اطراف میں پھیلا سبزہ زار صاف دکھائی دیتا تھا۔ اندر میوزک کا شور کافی تھا، لوگ ہاتھوں میں گاس لئے، اوہر ادھر ہل رہے تھے۔ کانیج کے پکن میں آؤ تو اس کے ساتھ ایک اور کمرہ بناتھا۔ اس میں دیوار گیر آئینہ لگا تھا اور سامنے کھڑا ہاشم ٹائی کی ناٹ باندھ رہا تھا۔

”سب ٹھیک جا رہا ہے؟“ اس نے اپنے عکس کے پیچھے نظر آتے رکیں کو دیکھ کر پوچھا۔

”لیں سر! آپ کے ٹوکری پر وہ فوٹو شاپنڈ پکھر لگا دی ہے۔ سعدی دیکھے گا تو سمجھے گا کہ یہ ڈاکٹر مالیا ہے اور وہ دیکھنے ضرور آئے گا....“ پن اسٹرائپ کوٹ پہننے ہوئے وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرا یا۔ ”میک شیور کر کے آرام سے اندر داخل ہونے دیا جائے۔ وہ مالیا کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا، جو یہاں ہے ہی نہیں۔“ وہ اب دھیکی آواز میں مزید ہدایات دے رہا تھا..... فارس جس وقت دھاڑ سے دروازہ کھول کر مورچاں کے لاونچ میں داخل ہوا، جنین بے چینی سے دائیں باکیں ٹہل رہی تھی اور پیچے اباً ندرت اور سیم پریشان سے بیٹھے تھے۔

”کون سی ڈائری ہے، دکھاؤ۔“ وہ پسند پسینہ ہو رہا تھا۔ راستے میں جتنا سن چکا تھا، وہ بہت تھا۔ آگے بڑھا، احمد سے ڈائری خود ہی جھپٹ لی اور صفحے پلاتا۔ بار بار بالوں میں انگلیاں چلاتا، آئینے سے پیشانی پوچھتا۔

”اس کافون کیوں آف ہے؟“ پیچھے پریشان سی زمر فون کان سے لگائے اندر آ رہی تھی، وہ سارا راستہ اسے کال کرتی رہی تھی۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ حند کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میرے بھائی کو واپس لائیں۔“

”فارس.... وہ کیا کرنے گیا ہے ادھر....“ ندرت نے کچھ کہنا چاہا مگر گلارندہ گیا۔ انہوں نے سر پکڑ لیا۔ مگر وہ کسی کو نہیں سن رہا تھا۔ اس نے بس ڈائری سے ایک صفحہ پھاڑا اور باہر کو بھاگا۔ ”میرے آنے تک کوئی گھر سے نہیں نکلے گا۔ میں اس کو لے کر آتا ہوں۔“ جاتے جاتے ایک نظر زمر پڑا۔ ”میں آرہا ہوں۔ لس اس کو لے کر!“ کوئی وعدہ ٹھا جو اس نے کیا۔ ایسا ہی ایک وعدہ ندرت کے گھنون پہاڑ کر کر بائیں مئی کی صبح بھی کیا تھا۔ وہ سب پر امید آنکھوں سے اسے دیکھے گئے اور وہ کسی الوداع، کسی سلام کے بغیر باہر نکل گیا۔

”اوہ سعدی... تم ایسا کیوں کرتے ہو؟“ زمر سر ہاتھوں میں لیے صوف پیشی چل گئی۔

.....❖❖❖.....

پتھر ہو تو کیوں خوف شپ غم سے ہولزاں؟ ..... انساں ہو تو جیئے کی ادا کیوں نہیں آتی

وہ خوبصورت سا بغلہ شام کے اس پہر تاریکی میں ڈو بتا جا رہا تھا۔ سعدی ملازم کی معیت میں اندر داخل ہو رہا تھا۔ کوٹ کے نیچے سفید شرٹ پہننے والے بنائے، وہ کافی سنجیدہ اور سو بر دکھائی دے رہا تھا۔ ملازم اسے اسنڈی روم کے دروازے تک لے آیا اور پھر رخصت ہو گیا۔ اس نے گھری سانس لے کر دروازہ دھکیلا۔

اندر میز کے پیچھے نجح صاحب عابد آغا بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھ باہم ملائے، وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا تمہارا یہاں آتا، کیونکہ میں عدالت میں فیصلہ دے چکا ہوں۔ تمہارا مجھ سے ملنا ہر طرح سے غلط ہے۔ لیکن تم نے درخواست کی تھی، اس لئے میں زمی بر تر رہا ہوں۔ بیٹھو،“ وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔

سعدی دروازہ بند کر کے ان کے سامنے آ کر بیٹھا۔ کمرے میں پھر سے خاموشی چھا گئی۔ شیف میں رکھی موٹی موٹی قانون کی کتابیں بوریت سے اس خاموشی کو سنبھل گئیں۔

”آج ہاشم کا رد اور کٹری پارٹی دے رہا ہے یور آئر۔ اور اس میں وہ گواہ بھی شامل ہے جس کو میں ڈھونڈ رہا تھا۔“ وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”پہلے میں نے سوچا کہ وہیں جاؤں۔ زمر کی ڈائری کھولی تاکہ اس کے کاٹج کا ایڈریس دیکھوں مگر وہاں آپ کا نام دیکھا تو یہیں چلا آیا۔“ وہ غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”میں یہاں آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں یور آئر۔ کیا میں واقعی ساری دنیا کو جھوٹا لگتا ہوں؟“

”سعدی!“ ہاتھ باہم پھنسائے جو صاحب نے گھری سانس لی۔ اسندزی میں پھیلی مدھم روشنی نے ماہول کے تناڈ کو بڑھا دیا تھا۔

”جس وقت تم لوگ.... پہلے دن.... میرے کورٹ روم میں داخل ہوئے تھے..... میں کیا، کچھری کا ہر ریڈر پورٹر، ہر وکیل، جو، حتیٰ کہ جھاڑو لگانے والا خاکروب اور جو باہر فوٹو کاپی کرنے والے بیٹھے ہوتے ہیں وہ بھی یہ جانتے تھے کہ تمہیں کس بھائی نے گولیاں ماریں اور کس بھائی نے اخواکر کے سری لنکا بھیجا۔ سب کو پہلے دن سے معلوم تھا کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔“

سعدی دم سادھے بیٹھا رہا۔ ”آپ سب جانتے تھے؟“

”آج تمہیں ایک بات کو اچھی طرح ذہن نہیں کرنا ہوگا۔“ وہ قدرے آگے کو جھکے۔ ”عدالت میں دو طرح کے مقدمے ہوتے ہیں۔ یعنی جرائم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کرمنل کیسز۔ اور کرپشنز کیسز۔ کرمنل کیسز جیسے قتل، چوری، اغوا وغیرہ کے مقدمے۔ اور کرپشن کیسز جیسے کسی سیاستدان یا سرکاری افسر نے اپنے عہدے کا فائدہ اٹھا کر ملک کی ترقی کے لئے جو فتنہ زد ہوتے ہیں ان میں سے رقم ہیر پھیر کر کے اپنے اکاؤنٹس میں بھری ہو۔ جب کسی پر کرپشن کا الزام لگتا ہے تو ساری دنیا میں قانون یہی ہے کہ باری شوٹ ملزم پر ہوتا ہے، یعنی جس سیاست دان پر الزام لگا ہے اس کو خود ثبوت دے کر اپنے پیسے کو حلال کا پیسہ ثابت کرنا ہے۔ کرپشن کیسز میں الزام لگانے والا ثبوت نہیں دیتا۔ سمجھ آگیا؟“

سعدی کا سرا ثبات میں ہلا۔

”اسی طرح پوری دنیا میں.... جب کرمنل کیس چلتا ہے.... قتل، چوری، اغوا وغیرہ کے مقدمے... تو ثبوت الزام لگانے والے کو دینا ہوتا ہے۔ کرپشن کیس کے بر عکس۔ ٹھیک؟“

”ٹھیک!“ وہ جانتا تھا، مگر سر کو ختم دیے سنے گیا۔

”تمہارے کیس میں سب کو معلوم تھا کہ تم سچ ہو وہ جھوٹے ہیں، مگر سعدی یوسف خان، تمہارے پاس ثبوت نہیں تھے۔ میں نے سنائے تمہارے پاس کوئی ویڈیو بھی تھی ہاشم کے دفتر کی مگر تم نے اور ہاشم نے ڈینگ کر کے اس کو دبادیا کیونکہ اس میں تمہاری بہن پر انگلی اٹھنے کا خطہ رہتا۔ یہ بتیں کچھری میں کبھی نہیں چھپتیں۔ سب کو سب پڑھتا ہے۔ پاکستان میں ہر سو میں سے نانو نے قتل جب ہوتے ہیں تو چوہیں گھنٹوں میں سب کو قاتل کا پڑتہ پڑل جاتا ہے۔ مگر سزا اس لئے نہیں ملتی کیونکہ قانون کمزور ہے۔ یہ قانون جائز نہیں بنانے، ہم نے صرف اس قانون کو مدد نظر کر کر فیصلے کرنے ہیں۔ یہ جن کو تم دوست دے کر اسمبلیوں میں بھیجتے ہو انہوں نے بنانے ہیں قانون۔ قانون کہتا ہے کیس میں doubt reasonable تک نہ آئے مگر تمہارے کیس میں شک تھا۔ جو انتظار کرتا ہے کہ ثبوت لا، ثبوت لا، گواہ لا، گواہ لا۔ تم لوگ گواہ اور شوٹ نہیں لاتے تو جو کیا قصور؟ ڈاکٹر سارہ اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر ہاشم سے کہتی ہیں کہ تم میرے شوہر کے قاتل ہو۔ مگر تم لوگ ہاشم کے خلاف کوئی کیس پرسو ہی نہیں کر رہے تھے۔ تمہارا سارا زور نو شیر و اس پر تھا، اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجرم تھا، accompile تھا لیکن اگر تم اسی کیس کو ہاشم کے خلاف لڑتے تو شاید شوٹ مل جاتے۔ میرا کام اپنی معلومات اپنے دل کی گواہی اور سنی سنائی با توں پر فیصلے کرنا نہیں ہے۔ مجھے ان چیزوں کو دیکھنا ہے جو تم لائے ہو وہ کمزور تھیں اور پھر مجھے مجبوراً ملزم کو فائدہ دینا پڑتا۔“

”بھلے آپ کو اندر سے معلوم ہو کہ وہ مجرم ہے؟“

”بھلے مجھے معلوم ہو کہ وہ مجرم ہے، مجھے فیصلہ اپنے اندر کی گواہیوں پر نہیں کرنا۔ تم نے دو قتل کیے، تمہارے خلاف کارروائی کیوں نہیں

ہوئی؟ کیونکہ قانون شہادت تمہیں پروٹیکٹ کرتا ہے۔ اگر ملزم قانون کی محظوظ اولاد نہ ہو تو فارس غازی جیسے بے گناہ بھی کبھی جیلوں سے نہ لکھ سکیں۔ یہ ”شک کے فائدے“ کا قانون جہاں نوشیروال جیسے لوگوں کو بچالیتا ہے وہاں فارس غازی جیسوں کو بھی بچاتا ہے۔ اب پوچھو اور کیا پوچھنا ہے۔“

”یور آزر“ وہ بہکسا مسکرا یا۔ اور آگے کو ہوا۔ آنکھیں ان کی آنکھوں میں ڈالے اس نے بات کا آغاز کیا۔ ”آپ نے والدہ بہت اچھی تقریر کی، پنڈجوں کے لئے تو میں بھی کنوپس ہو گیا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں ہوں اکیسویں صدی کا پاکستانی نوجوان۔ آپ میں اور مجھ میں فرق ہے۔ آپ کے زمانے کی یوچہ نے اس ملک کو لوٹ کھایا تھا، ہماری یوچہ دیکی نہیں ہے۔ اس لئے اب میری بات ختم سے نہیں، اور سمجھیں، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ آگے جا کر اپنے تمام ججز کو بھی بتا دیں۔ اور جو میں کہنے جا رہا ہوں اس کے کسی لفظ پر تو یہ عدالت لا گوئیں ہوتی۔ اب وہ وقت آگیا ہے جب ججز کو تو یہ عدالت کے پیچھے پھیپھی کی جائے اپنے اور پر ہونے والی تقدیم برداشت کرنی چاہیے۔ آپ کہتے ہیں، باری ثبوت میرے اوپ تھا۔ ٹھیک۔ مگر میں ثبوت لایا تھا۔ میں گواہ لایا تھا۔ جانتے ہیں سب سے بڑا گواہ کون تھا؟ میں تھا۔ میں سعدی یوسف سب سے بڑا گواہ تھا۔ ڈاکٹر سارہ اگرنسیاتی مرضی تھیں تو اتنے بڑے عہدے پر کیسے کام کر رہی تھیں۔ پھر بھی، اگر وہ کریڈیبل نہیں تھیں، تو میں تو تھا۔ میری گواہ ہی کا کیا ہوا سر؟ مجھ پر تو دوقل ثابت بھی نہیں ہوئے تھے۔ مجھ پر دہشت گردی ثابت بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاشم نے تو صرف الزام لگائے، اس نے کوئی ثبوت تو نہیں دیا میرے خلاف۔ اس کے گواہ بھی کریڈیبل نہیں تھے پھر میں کیسے ڈس کریڈیٹ ہو گیا؟ آپ کی جگہ اگر یہ کیس کسی امریکی یا مغربی عدالت میں لڑا جاتا تو میری گواہی پر فیصلہ ہو جانا تھا۔ لیکن میرے ملک کے ججز جو ”ثبوت“ سے کہتے ہیں کہ خود کو ثابت کرو، کیا یہ ججز بچے ہیں؟ کیا اس ملک میں اندھے قانون، بہرے نج اور گو نگے ملزموں کا ہی راج رہے گا؟ انہا قانون جو دیکھنیں سکتا کہ کون کریڈیبل ہے اور کون نہیں۔ بہرہ نج جو مدنی کی بات نہیں سنتا۔ اور ملزم جو اپنا خاموشی کا حق انجوائے کرتے ہوئے گونگا بنا رہتا ہے۔ یور آزر آپ بے شک ایک ایماندار نج ہیں لیکن سارا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ملک کے ایماندار ججز کی نہیں بہادر ججز کی ضرورت ہے۔ ججز قانون نہیں بناتے، ٹھیک... قانون سیاست دان بناتے ہیں، ٹھیک۔ مگر ججز Precedents تو سیٹ کر سکتے ہیں ن۔ ججز کے فیصلے قانون بن جاتے ہیں، اگر اس ملک کو بہادر جعل جائیں اور وہ فیصلے کرنے پر آجائیں تو انہی فیصلوں کی بنیاد پر کمزور ثبوت کے باوجود آئندہ فیصلے درست دیے جائیں گے۔ ہمارے ملک میں ایماندار ججز بہت زیادہ، مگر بہادر ججز بہت کم ہیں سر۔ مجھے آج یہ کہہ لینے دیجئے یور آزر بہت ادب سے، کہ ججز کا کام نئی پیشہ کر گھمنڈ طاہر کرنا یا مراجیدہ بیمار کس دے کر کے ہیپلاں بننا نہیں ہوتا۔ یہ ایکرزا اور سیاست دانوں کا کام ہوتا ہے۔ آپ کا کام ہے آخر میں درست فیصلہ کرنا۔ انصاف نہیں کرنا، بلکہ عدل کرنا۔ عدل اور انصاف میں فرق ہوتا ہے یور آزر۔ انصاف کہتا ہے کہ دلوگ ہوں اور روٹیاں تین تو دلوں کو ڈریڑھ ڈریڑھ روٹی دو، مگر عدل کہتا ہے کہ دونوں آدمیوں پر غور کرو۔ جو کئی دن سے بھوکا ہے، اس کو دو روٹیاں دو اور جو پہلے ہی سیر ہے اس کو ایک دو۔ انصاف کہتا ہے چوری کرنے والے کا ہاتھ کا ٹوٹ مگر عدل کہتا ہے جو قانون روٹی نہیں دے سکتا وہ ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ انصاف کہتا ہے سعدی یوسف قاتل ہے، عدل کہتا ہے، سعدی یوسف کو اس راستے پر چلانا پڑتا اگر قانون فارس غازی کو چار سال تک لٹکا کر نہ رکھتا۔ ہمیں منصف نج نہیں چاہیں۔ ہمیں عادل ججز چاہیں۔ اگر ہارون عبید جیسے سیاستدان، ہاشم جیسے کاردار جیسے کاروباری لوگ کر پڑ ہیں تو آپ ججز ان سے زیادہ کر پڑ ہیں کیونکہ آپ کی ذمہ داری دہری تھی۔ آپ کہتے ہیں سر، ملزم کو شک کا فائدہ دیا جاتا ہے درست، مگر یہی فائدہ غریب ملزم کو کیوں نہیں دیا جاتا؟ امیر ملزم کی ضمانت کیوں منظور ہو جاتی ہے؟ فارس غازی کی چار سال تک کیوں منظور ہوئی تھی؟ آپ نے جو فیصلہ دیا، بالکل قانون کے مطابق دیا، میں مانتا ہوں، مگر یہ انصاف کیا آپ ججز قانون کے لئے کرتے ہیں یا اسلئے کہ فی وی پر ایکرزا کلتے نہ اٹھائیں؟ سرمیں تب اٹھارہ سال کا تھا جب ججز کی تحریک چلی تھی۔ میں تب انگلینڈ نہیں گیا تھا۔ اور جتنا ہو سکا میں اس تحریک میں شامل رہا تھا۔ مجھے آج بھی اپنے کاردار پر فخر ہے، کیونکہ ہم نے عدیہ کے لئے تحریک چلائی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سابق چیف

جنس اپنے الگ اینڈے پہل پڑے، لیکن آج مجھے یہ کہہ لینے دیجئے، کہ عدیہ تو آزاد نہیں ہوئی، مگر وہ چیزیں دیں ہمیں اس تحریک نے۔ دو باقیات۔، اس نے انگلیوں کی وی بنا کر دکھائی۔ ”متکبر جو اور متشد دوکلاع“

اسنڈی میں ایسا گہر اسناتا چھا گیا کہ سوئی گرنے سے بھی آواز پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ نجح صاحب سنیدہ چہرے سے اسے دیکھے گئے۔ وہ دکھری کی وی دکھا کر کہہ رہا تھا۔ ”متکبر اور متشد۔ یہ بنا دیا ہے اس تحریک نے آپ جوں اور وکیلوں کو۔ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ اس ملک میں ثبوت اور گواہ کیسے غائب کرادیے جاتے ہیں، پھر کیوں آپ کی ناک پہ مکنہ ثبوت نہیں تلتے؟ کیوں ناممکن ثبوت مالکتے ہیں آپ مزموم کو سزا دینے کے لئے؟“ نجح صاحب نے گہری سانس لی اور مختندے انداز میں کہا۔

”تم اگر نجح ہوتے تو قانونی پیچیدگیاں اور باریکیاں زیادہ بہتر سمجھ سکتے۔ میں مجبور تھا۔“

”اگر میری جگہ آپ کا بیٹا ہوتا، اور وہ اپنے ظلم کی داستان سناتا، اور اپنے زخم دکھاتا، کیا تب بھی آپ اس کو کر یہ بدل گواہ تصور نہ کرتے؟“

اور وہ کتنی ہی دیر پکھ بول نہ سکے۔ لب کھولنے پھر بند کیے۔ سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ سعدی نے ایک آخری ملامتی نظر ان پر ڈالی، دو الفاظ بولے۔ ”متکبر جو اور متشد دوکلاع! یہ الفاظ آپ سب جو جو اور کوایا درکھنے چاہیے ہیں۔“

جب وہ کار میں آ کر بیٹھا تو چند لمحے گھرے سانس لے کر خود کو مختندا کیا۔ نجح صاحب کو اتناب سنا کر بھی ایک سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا وہ۔ آخر فائدہ کیا ہوا اس سب کا؟ اتنی جہد اتنی خواری، عدالتون کے دھکوں کے بعد ہار جانے کا؟ شاید یہ سب واقعی بے کار تھا، جیسے فارس کہتا تھا۔ اس نے فون اٹھایا اور اسی پلپین موداؤف کیا۔ جو اس نے عادتاً لگا دیا تھا کہ کوئی ڈسٹرپ نہ کرے۔ فون کی جان واپس آئی تو فرا چیننے لگا۔

”جی زمر۔“ اس نے آواز کو ہموار کر کے فون کان سے لگایا۔

”اوہ شکر سعدی... تم.....“ وہ پہلے خوشی اور مذہبی حال انداز میں بولی پھر آواز میں غصہ در آیا۔ ”تم کیوں جا رہے ہو ادھر؟ فوراً واپس آؤ۔“

”کدھر گیا تھا میں؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”تم ہاشم کی پارٹی میں جا رہے ہو نا؟ جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔ فوراً واپس آؤ۔“

”میں ادھر نہیں گیا۔“ آواز دھیمی ہوئی۔ ”میں نجح صاحب سے ملنے گیا تھا۔ مگر واپس آرہا ہوں۔ ہاشم کی طرف جا کر کیا کرنا ہے میں نے؟“

اوہ زمر نے فون بند کیا تو سب خوشی اور فکر مندی کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”وہ ٹھیک ہے۔ واپس آرہا ہے۔“ وہ تحک کر صوفے پہ بیٹھ گئی۔ ”شکر، لا و نجح میں خوشی کی لہر دوزگی۔ اور ابھی وہ ٹھیک سے پر سکون بھی نہ ہو پائی تھی جب.....“

”فارس کو کال کرو اسے کہو کہ وہ واپس آئے۔“ بڑے ابا کی آواز نے اس کے کافوں میں صور پھونکا۔ وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی اور جلدی جلدی نمبر ملایا۔

”کچھ پتہ چلا؟“ وہ ڈرائیور کر رہا تھا۔

”وہ آرہا ہے۔ میری ڈائری سے نجح صاحب کا پتہ لے کر گیا تھا۔ تم واپس آجائو۔“

”اچھا۔“ وہ اب کار روک چکا تھا اور باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کار دار زکار نجح سامنے تھا۔

”فارس تم فوراً واپس آؤ۔ ہاشم سے کچھ بعید نہیں ہے۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”میں.... آ رہا ہوں۔“ اس نے فون بند کیا، اور اسے سائیلent کر کے جیب میں ڈال دیا۔ چند لمحے اسٹرینگ کو دیکھتا رہا۔ واپس جائے یا... نگاہیں دور نظر آتے گیٹ اور مہمانوں کی گاڑیوں کی طرف اٹھائیں... آخر وہ کرنا کیا چاہتا ہے؟ ڈاکٹر مایا کی تصویر پوسٹ کرنے کا مقصد سعدی کو دعو کرنا تھا۔ وہ عموماً ہاشم کے پلان دیرے سے سمجھا کرتا تھا۔ آج جلدی سمجھ گیا تھا۔ تو کیا وہ واپس مزاجے؟ ایک فیصلہ کر کے وہ باہر نکل آیا۔

بالائی منزل پر کھڑے رئیس نے کوٹ کی آستین چہرے کے قریب لے جا کر کہا۔ ”سرفارس آیا ہے۔“ اندر مہمانوں کے درمیان کھڑے ہاشم نے کان میں لگا آلمہ دبایا۔ ”خیر... ایک ہی بات ہے۔ سعدی نہیں تو فارس ہی۔ اسے اندر آئے دو۔“

”راجرباس!“ وہ مسکرا یا۔

..... ♦♦♦ .....

میں نہ کہتا تھا کہ سانپوں سے اُٹے ہیں رستے ..... گھر سے نکلے تھے تو ہاتھوں میں عصا رکھنا تھا گیٹ پر مستعد کھڑے گارڈ غیر معمولی طور پر کسی کا دعوت نامہ پیک نہیں کر رہے تھے۔ جو آرہا تھا اس کو اندر جانے دے رہے تھے۔ اسے بھی کسی نے نہیں روکا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر آئی۔ (سوہاشم چاہتا ہے کہ میں اندر آؤں؟ انترسٹنگ۔ اتنے لوگوں کے سامنے گولی تو مارنے کے لیے مجھے۔ کیا کر لیں گے زیادہ سے زیادہ۔) کچھ دلچسپی تھی، کچھ تحسیں تھا، وہ اسی طرح چلتا پھر ملی روشن پر آگے بڑھتا گیا۔ آنکھیں سکوڑ کر ساری اطراف کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ بزرگزار خالی تھا۔ اندر ششے اور لکڑی کے کامیں میں مہمان ہی مہمان بھرے تھے۔ آخر کیا ہونے جا رہا ہے پارٹی میں؟ اچنچا سا اچنچا تھا۔

وہ کائنچ کے ششے کے دروازے کے باہر آ کھڑا ہوا۔ اندر نہیں گیا۔ انہیں اپھیل رہا تھا، جس کے باعث چمکتا ہوا لا و نج صاف نظر آ رہا تھا۔ جا بجا لوگ ٹولیوں کی صورت کھڑے تھے۔ ویژرے اٹھائے سرو کر رہے تھے۔ تبھی ہاشم برآمدے کی سیر ہیاں اتر کے باہر آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر بھی مسکراہٹ چہرے سے جدا نہیں ہوئی۔

”تم کیسے آئے؟“ ملکے سے طنز سے فارس کے قریب آ کر بولا۔

”میں ڈاکٹر مایا کو ڈھونڈنے آیا ہوں۔ تم نے ہی کھلਮ کھلا دعوت نامہ دیا تھا، کزن!“ وہ بھی ہلاکا سامسکرا یا۔ ہاشم آگے بڑھا، اسکا کندھا تھپٹھپایا، کان کے قریب جا کر Happy Searching بولا، اور واپس مزگیا۔ فارس نے نگاہ اٹھا کر اوپر فضا میں اڑتے ڈرون کیسے کو دیکھا جو کسی بڑی مکڑی کی طرح اس کے آس پاس چکر کاٹ رہا تھا۔ دور ایک سیکونٹ کا نوجوان ڈرون کا ریکوٹ اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ بھی فارس کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں ملنے پر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

(یہ میری فلم بنائی کر مجھے پھر سے فریم کرنے جا رہا ہے۔ ہوں۔ گذ۔) وہ ہلاکا سامنے ڈھونڈ ہوا اور اندر واپس ہو گیا۔ آنکھیں متناشی انداز میں ادھر ادھر کیھر ہی تھیں۔ خوش باش مہمان۔ مصنوعی تھیں۔ خوبصورت سجادوں، باربی کیوکی خوشبو۔ سب نارمل تھا۔

”وات اے سر پر ایڑا!“ شناسا آواز پر وہ پلنا، پھر مجنون ہو گیا۔ ڈاکٹر ایمن مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ انگلی کا ہیر ابھیش کی طرح دک رہا تھا۔

”آپ؟ ادھر؟“ وہ حیرت چھپانے سکا۔

”بالآخر ہاشم کا ردوار نے وفاداری کا صلدینے کے لئے ہمیں بلاہی لیا۔ تم بھی یہاں ہو گے، امید نہیں تھی۔ انجوائے دی پارٹی!“ جتا

کر کہتے ہوئے اس نے جاتے جاتے اس کی کہنی کو ہلکا سا چھوا۔ نوکیلی انگوٹھی اسے چھپی تھی اور اس کی چھپن نے اس کے دماغ کی ساری گریزیں کھوں دی تھیں۔ سحر زدہ ہی کیفیت میں اس نے پیرہ مشرق مغرب شمال غرب دب۔

سب نارمل تھا۔ سوائے مہماںوں کے۔ ان میں شناساچہرے بھی تھے۔ بہت ہی شنا莎۔ وہ الیاس فاطمی تھا جو کونے میں کھڑا کافی کنور سا لگ رہا تھا اور سر ہلاتے ہوئے کسی مہماں سے بات کر رہا تھا۔ وہ نیاز بیگ تھا جو ایک طرف کھڑا مشروب پی رہا تھا۔ (وہ حضانت پر رہا ہو چکا تھا۔) ڈاکٹر ایمن کا شوہر... سیکرٹری حلیمه.... پر اسکیوں ٹر بصیرت.... جس کی وکالت نے چار سال فارس کو جیل سے نہیں نکلنے دیا تھا۔ وہ مزید گھوما... جسٹس سکندر.... چند پولیس افسران جن کا سعدی کی گمشدنگی سے تعقیل رہا تھا.... ڈاکٹر آفتاب.... پوسٹ مارٹم کا ماہر... کرنل خاور اور اس کا بیٹا جو بجا بجا سا بابکی ویں بیل چیز کے ساتھ کھڑا تھا۔ زندگی اور فارس کی دیگری سزاوں کے بعد بھی وہ زندہ سلامت کھڑے تھے۔ ابڑے ابڑے مگر زندہ تھے۔ ان کے علاوہ چند مہماں اور بھی تھے، مگرہ شناساچہرے سے... وہ سنائے میں رہ گئا۔

وہ واقعی وکٹری پارٹی تھی۔ وہ ان کو... اپنے مدگاروں کو اکٹھا کر کے انعام سے نوانا چاہتا تھا۔ مگر وہ فارس کو ان کے درمیان گھونٹنے سے روک بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کی چھٹی اور ساتویں آٹھویں حس، سب نے سرخ ہتی دکھانا شروع کی۔ یہاں مایا نہیں تھی، اگر ہو بھی تو اس کو ڈھونڈنا بے سود تھا۔ اسے یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔

وہ آگے بڑھا۔ داخلی دروازہ لاڈنخ کے وہ دور آخري کنارے پر تھا۔ وہ دروازے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، راستے میں بہت لوگ تھے۔ گھنٹن، پھنس جانے کا احساس... لکھنیوں سے نظر آیا، ایک دیٹر باری باری مخصوص لوگوں کے پاس جا رہا تھا۔ ان کے کان میں کچھ کہتا اور وہ سر ہلا کر ایک طرف چلے جاتے۔ یہ مخصوص لوگ وہی شناساً مجرم تھے۔ فارس آگے بڑھتا گیا۔ ڈاکٹر ایمن اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ تبھی دیٹر ادھر آپکا، اور سرگوشی کی۔ ”کاردار صاحب.... بلار ہے ہیں.....“ ایمن نے زخمی سامنکرا کر سر ہلا کر اور دیٹر کی معیت میں ایک طرف بڑھ گئی۔ وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھتا گیا۔ دروازہ فریب تھا۔ اس نے جھپٹ کر گھولوا اور باہر نکلا۔ گویا سانس میں سانس آئی۔ باہر تاریکی تھی۔ وہ کافی کھڑکیوں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ لاڈنخ گزر گیا تو وہ پکن کی کھڑکی پر کا۔ پکن روشن تھا۔ فارس نے پچھرہ جھکا کر جھانا کا۔

وہاں بڑے بڑے کریٹ پڑے تھے اور ان میں غیر ملکی الکھل کی یوتلیں رکھی تھیں ان کے منہ کھلے تھے اور سر پر کھڑا ایک گارڈ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا اور دوسرا بتلوں کے گرد ڈوری سی لپیٹ رہا تھا۔ ایک گارڈ کی نظر میں فارس پر بڑی مگر اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ سر جھکا کر کام کرتا رہا۔ فارس کی نگاہیں پکن کی دیوار تک اٹھیں۔ وہاں ایک دروازہ تھا جو آگے ایک اور کمرے میں کھلتا تھا۔

وہ کائنج کی دیوار کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ اب اگلا کمرہ نظر آیا۔ اوپری ششی کی کھڑکیوں سے سارا کمرہ روشن نظر آتا تھا۔ وہاں ہاشم ان تمام شناساچہروں کو اکٹھا کیے کھڑا تھا۔ اور مسکرا کر ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ششی ساؤنڈ پروف تھے۔ وہ آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔ مگر جس طرح وہ فائلز ان میں تقسیم کر رہا تھا، جس طرح ان کے چہرے دمکنے لگے تھے، وہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ اس کی ہاؤ سنگ اسکیم کی فائلز تھیں۔ پلائش۔ گھر۔ وہ تھنے بانٹ رہا تھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ لاڈنچ کو جاتی گیلری میں کھلتا تھا اور دروسا پکن میں۔

ہاشم کا فون بجا تو وہ اسے نکال کر دیکھنے لگا۔ پھر مسکرا کر مہمانوں سے معدرت کی اور پکن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اسے عبور کر کے پکن میں چلا گیا۔ فارس اچھنے سے واپس آما اور پکن کی کھڑکی کے سامنے نہ کھرا۔

ہاشم اب دہاں اپنے دونوں گارڈز سے کچھ کہر رہا تھا۔ وہ سر بلاؤ کر کچن سے لا اونچ کی طرف باہر چلے گئے۔ اب وہ کچن میں تباہ کھڑا تھا۔ اس نے لائیٹر انھیا اور انگوٹھے سے دبا کر شعلہ جلا دیا۔ پھر وہ کھڑکی کی طرف گھوما۔ باہر کھڑے فارس کو دیکھا اور مسکرا لیا۔ پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے لائیٹر دری کے قریب لے کر گیا۔ فارس کا سانس تھم گیا۔ دل رک گیا۔ ہاشم نے ڈوری کو آونچ دھکائی تو اس نے شعلہ پکڑ لیا اور

وہ شعلہ ڈوری کو کھاتے بولنوں کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہاشم نے ایک انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”You did this!“ آواز نہ سائی دیتی تھی مگر ملتے لب بتار ہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر اس نے لاٹیر جیب میں ڈالا اور لاونچ میں کھلتے دروازے سے باہر نکل گیا۔

بس لمحہ بھر کا عمل تھا اور سارا کھیل اس کی سمجھ میں آگیا۔

وہ تقسیم انعامات نہیں تھی۔ وہ کوراپ تھا۔ وہ تمام گواہوں کو ایک کمرے میں جمع کر کے ان کو آگ لگا کر مارنا چاہتا تھا۔ پکن کے دروازے بند تھے۔ الکھل کی بولیں باری باری آگ پکڑ رہی تھیں۔ (الکھل مٹی کے تیل کی طرح جل جاتی ہے۔) پکن کے اوپر دینست تھا، جو شناساجمروں کے کمرے میں کھلتا تھا جہاں وہ ہاشم کا انتظار کر رہے تھے۔ پکن میں دھواں بھرنے لگا۔ اب دھواں دینست سے اس کمرے میں جائے گا، اور وہ مر جائیں گے۔ دم گھٹنے سے۔ جبکہ لاونچ کے مہماں سلامت رہیں گے۔ چند مہماں کے مرنے سے شک نہیں ہو گا کسی کو۔ اور اڑام؟ فارس غازی وہاں موجود تھا، اس کی فوج تھی یہاں وہاں ٹھلنے کی۔

”خدا کا تھرنازل ہوتم پہ ہاشم!“ وہ ہکابا سا چند قدم پیچھے ہٹا۔ پھر اٹھے قدموں بیزہ زار کی طرف دوڑا۔ اسے وہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔ جلد از جلد اسے وہاں سے نکلا تھا۔ وہ چند قدم ہی چل پایا۔ پھر مڑ کر دیکھا۔ شناساجمروں کے کمرے میں سیاہ دھوں بھرتا کھائی دے رہا تھا۔ پہلے لوگ حیران ہوئے، پھر ادھر ادھر دوڑے۔ گیلری میں کھلتے دروازے کو ڈاکٹر ایمن نے پیٹا۔ مگر وہ لاک تھا۔ لاونچ میں میوزک تیز تھا۔ اب مزید تیز ہو گیا۔ چند افراد شیشے کی کھڑکیوں کو پیٹ رہے تھے۔ مگر وہ لاک glass unbreakable کی بنی تھیں۔ فارس کی جیب میں اس کا فون ٹھرٹھرا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ زمرہ ہو گی، وہ اسے واپس بلارہی ہو گی مگر اسے سب بھول گیا۔ وہ تیزی سے اس دھواں بھرتے کمرے کی طرف لپکا۔ اسے ان لوگوں کو وہاں سے نکالنا تھا۔

اورتب اس نے دیکھا۔ لگاس پہ اس کے سامنے ایک سایہ سا آکھڑا ہوا۔ سفید سایہ۔ عینک لگا۔ اس کا بھائی....وارث....وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم گھر جاؤ فارس... وہاں کیا جا رہے ہو؟ یہ گناہگار لوگ ہیں۔ ان کو مر نے دو۔ کیا تم بھول گئے کس طرح انہوں نے مجھے ٹکھے سے لیکا یا تھا؟“ وہ ملامتی انداز میں بولا تھا۔ فارس کے قدم لڑکھڑائے۔ سانس تیز تیز چلنے لگی۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا تو ایک اور سایہ سامنے نمودار ہوا۔

”آپ نے کہا تھا آپ میرے لئے لڑیں گے۔“ وہ سفید سی زرتاش تھی۔ اس کی آنکھوں میں گلہ تھا۔ ”ان لوگوں کو ان کا بدلہ ملنے والا ہے۔ انہوں نے عدالت میں میرے اوپر کیچھ اچھا لالا۔ میرے کردار کو اخباروں کی زینت بنایا۔ مجھے گولیاں ماریں۔ ان کو مر نے دیں، میرا سوچیں۔“

اس نے سر جھکا گمرا سایے غائب نہیں ہوئے۔ ان دونوں کے درمیان سعدی چلتا ہوا آتا کھائی دیا۔ سفید سایہ... ہیولہ سا۔

”یہ میرے گناہگار ہیں۔ آپ ان کی فکر کیوں کر رہے ہیں۔ جائیں، اپنی جان چاہیں۔ بھاگیں۔“

اس نے چہرہ موڑا۔ ایک احرار کا سایہ بھی ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔

”انہوں نے میرا خاندان بتاہ کر دیا۔ غازی۔ ان کو ان کے حال پہ چھوڑ دو۔ تم ان کو نہیں بچا سکتے۔ جاؤ۔ نئی زندگی شروع کرو۔ نئے گھر میں۔“

اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ بھاری بھاری یہڑیوں سے کس دیے گئے تھے۔ وہ کسی طرف نہیں مڑ پا رہا تھا۔ وہ پھر کا ہو گیا تھا۔

”چلے جاؤ فارس۔“

”ان کو مر نے دعازی۔“ وہ سارے سایے ایک ساتھ بولنے لگے تھے۔ چیخنے لگے تھے۔ وہ ائے قدموں پیچے ہٹا۔ تیز ہوتے نفس سے ان سب کو دیکھا۔

”ہاں یہ سب .... گناہ گار ہیں.... قاتل ہیں۔“ اس کی آواز کپکپائی۔ آنکھیں سرخ پڑ کے بھیگ رہی تھیں۔ ”ہاں یہ میرے دشمن ہیں... برے لوگ ہیں۔“ وہ تکھرا۔ پھر گردن تن کران سایلوں کو دیکھا۔ ”مگر میں .... میں ان جیسا نہیں ہوں۔“ اور وہ اس کمرے کی طرف سر پت دوڑا تھا۔ سایے فھامیں تخلیل ہو گئے۔ ایسے جیسے خدا کا نام لینے پر آسیب بھاگ جاتے ہیں۔

اب اسے کچھ یاد نہ تھا۔ سوائے اس کے کہہ انسان تھے۔ اور وہ تکلیف میں تھے۔ سارے انتقام سارے زخم سارے جرام ..... وہ سب بھول گیا تھا۔ وہ انسان تھے اور وہ تکلیف میں تھے۔

ہاشم تیز چلتا... راہداری عبور کرتا کافیج کے آخری کمرے میں آپنچا تھا۔ دونوں گارڈز اس کے ہمراہ تھے اور کیس اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

”کتنے منٹ ہیں ہمارے پاس؟“ اس نے آتے ساتھ ہی اپنی تالی کھنچی۔

”زیادہ نہیں ہیں۔ جس وقت دوسرا مہمان اور فائزہ بریگیڈ کا عملہ جل جانے والے افراد کو نکالنے آئے گا، آپ کو ان کے درمیان ہم پہنچا دیں گے۔ یہ ادھر...“ وہ اب ہاشم کی شرث کا گریبان پھاڑ رہا تھا۔ دوسرا لڑکے نے کمال مہارت سے اس کے ماتھے کے اوپر چاقو سے چیر لگانا شروع کیا جس سے بھل بھل خون بننے لگا۔

”اس کو sterilize کیا تھا۔“ اس نے درد کی شدت سے آنکھیں بند کر کے پوچھا۔

”یہ سر۔“ وہ فرمانبرداری سے کہتا۔ اسے تیار کر رہا تھا..... حادثے والے کمرے کے واحد سروائیور کو اچھا خاصاً خی لگنا چاہیے تھا۔ وہ شناساً مجرم مر جائیں گے تو کون تھا گا کہ ہاشم اس وقت کمرے میں نہیں تھا؟ اور چونکہ لاویج کے مہماں تو کافیج جانا تھا، اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہاشم واحد بچنے والا انسان تھا۔ کوئی اس پر شک نہ کرتا اور وہ ہیرہ بننے جا رہا تھا.....

کمرے میں دھواں بھر رہا تھا... درمیانی دروازے کو آگ نے پکڑ لیا تھا اور وہ جل رہا تھا... لوگ کھانس رہے تھے، اوندھے منگر رہے تھے.... دھکم پیلی بھی تھی... کوئی کھڑکیوں کو کھکھٹا رہا تھا، کوئی لاکڑی دروازہ بیٹھ رہا تھا۔ مگر وہ دونوں توڑے نہیں جاسکتے تھے۔

فارس تیزی سے دوڑتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ حیلہ کھانتی ہوئی اس کے ساتھ کھڑکی شیشے کو زور زور سے چھپ رہا تھی۔ فارس نے ایک گلہ اٹھایا اور زور سے کھڑکی پر دے مارا۔ چند خراشیں آئیں مگر بے سود۔ گلہ باتھ سے چھوٹ گیا، اس کا اپنا تھر رخنی ہو گیا۔ وہ پروادہ کیے بنا آگے کو دوڑا۔ کافیج کی دیوار کے ساتھ بھاگتا، ہوا مرکزی دروازے تک آیا۔ لاویج کی شیشے کی کھڑکیوں سے اندر گکن، خوش باش بھٹتے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ میوزک بہت تیز تھا۔ کان پڑی آوازنائی نہ دیتی تھی۔ اس نے شیشے کا دروازہ زور زور سے بجا لایا۔

”دروازہ کھولو... اندر آگ لگ گئی ہے۔ کھولو...“ مگر دروازے کے اندر کھڑے گارڈ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور یہوٹ ہوا میں بلند کر کے بٹن دبایا۔ تمام شیشوں کے اوپر لگے بلا منذہ رکھل کر نیچے گرنے لگے۔ وہ آگے دوڑا۔ چند مہماں کے قریب موجود کھڑکی کو زور زور سے پینا گکروہ متوجہ نہ ہوئے، با تیک کرتے رہے یہاں تک کہ بلاک آکٹ بلاکنڈ زبالکل نیچے گر گئے اور اب وہ اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”اللہ کا قرہبوم پر ہاشم۔“ وہ غصے سے چلاتا وہ اپس اس جلتے ہوئے کچن کی طرف بھاگا۔ اس کو پسینہ آ رہا تھا، اور سانس بے ترتیب تھی۔ کچھ سمجھنہیں آ رہا تھا۔ آج وہ لفت کی طرح لوگوں کو اکٹھا نہیں کر سکتا تھا..... آج اسے خود کچھ کرنا تھا.....

کچن کے سامنے رک کر اس نے چند گہرے سانس لئے اور سوچنے کی کوشش کی۔ جلتے کمرے میں لوگ ابھی تک چیخ چلا رہے تھے مگر مد نہیں آ رہی تھی۔ دونوں دروازے بند تھے اور کھڑکیاں توڑی نہیں جاسکتی تھیں۔

مگر وہ کھوئی تو جا سکتی تھیں۔ وہ تیزی سے آگے آیا کھڑکی کے فریم کو ہاتھ سے ٹوٹا۔ وہ اندر سے لاکٹھیں اور افراتر فری کے عالم میں آگے پیچھے بھاگتے بھاگتے لوگ کا لے دھوئیں کی زیادتی کے باعث انہیں کھول نہیں پا رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کھڑکی کہاں سے کھولنی ہے۔ اسے معلوم تھا۔ وہ اس کا بچ میں نوجوانی کے دنوں میں آتا رہا تھا۔ اور انگریز بیب لائے تھے اسے ایک دفعہ۔ یہ عام سلاں یڈنگ و مڈل تھی مگر یہ اندر سے کھلتی تھی۔ اور اس جلتے کمرے کو جاتے دونوں دروازے بند تھے۔ تیرسا دروازہ جل رہا تھا۔

تیرسا دروازہ.... وہ چونکا پھر پکن کی کھڑکی تک آیا۔ یہ بند تھی مگر لا کد نہیں تھی۔ ہر پلان میں جھوٹ ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کوئی جلتے پکن کے راستے بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ کوئی باہر سے یہاں آسکتا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر اس کے شیخ کو دائیں طرف دھکیلا۔ وہ سر کئے گا۔ اندر سے بہت سادھوں باہر نکلنے لگا۔ محفوظ کمرے میں میٹھے رئیس نے ٹیپ اسکرین دیکھ کر ہاشم کو منا طب کیا۔ ”وہ پکن کی کھڑکی سے اندر جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم نے اسے بند کیوں نہیں کیا؟“ اس نے دونوں گارڈز کو گھوڑا۔

”جانے دو۔ اسے بھی ان کے ساتھ جلنے دو۔“ وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے بے نیازی سے بولا تھا۔

کھڑکی آدھی کھل گئی تھی وہ منڈی پر چڑھ کر اندر پہلا نگ گیا۔ فوراً سے کھانسی آئی۔ دھوائی..... مرغوں لے..... کالک..... وہ جھک کر ذرا سا کھانا سا۔۔۔ پھر گھرے گھرے سانس لئے ادھر ادھر دیکھا۔ دروازہ جل رہا تھا۔ شعلے درمیان میں حائل تھے۔ کاؤنٹر سے دروازے تک سب جل رہا تھا۔ وہ کیا کرے؟ وقت نہیں تھا۔۔۔ اوہ خدا یا وہ کیا کرے؟

چوپھے کے قریب سلنڈر پرے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک سلنڈر اٹھایا۔ وہ اندر سے غالباً خالی تھا۔ تھی بہا تھا۔ وہ لوگ دھماکے افروڈ نہیں کر سکتے تھے۔ پکن کی گیس بھی کئی ہوئی تھی۔ اسے زور کی کھانسی آئی، مگر بدقت سلنڈر کو اٹھا کر اس نے پوری قوت سے دروازے پر دے مارا۔ سلنڈر مارتے مارتے وہ خود بھی نیچے گر گیا۔ شاید ماتھے پر چوٹ بھی آئی، مگر جب بمشکل ہتھیلیوں کے بل اٹھا تو دیکھا۔ سلنڈر دروازے سے ٹکرایا کر ریڑھتا ہوا اپس آرہا تھا۔ دروازے کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ اف۔ اس نے سلنڈر کے قریب آتے ہی اس کو واپس دھکیلا۔ اب کی بارہ دروازے کے قریب سے ہی واپس پلٹ گیا۔ مگر تک فارس اٹھ چکا تھا۔ ہاتھ جھاڑتے وہ کھڑا ہوا اور جیسے ہی سلنڈر قریب آیا، اس نے پوری قوت سے، کسی بولنگ بال کی طرح اس کو دروازے کی جانب ریڑھ دیا۔ وہ تیزی سے آگے گیا، اور دروازے سے ٹکرایا اور پھر۔۔۔ جلتا ہوا دروازے۔۔۔ درمیان سے ٹوٹ کر نیچے آن گرا۔ ٹکڑے چکاریاں اسے بھی آ کر گلی تھیں۔ تکلیف ہوئی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ اب چوکھت خالی تھی وہ دیکھ لکھتا تھا۔۔۔ اس کے پار۔۔۔ جلتا ہوا کمرہ۔۔۔ جس میں دھوؤں بھرا تھا اور لوگ چیخ چلار ہے تھے۔۔۔

اس نے شرٹ اتار کر ناک کے گرد پیٹی اور تیزی سے دوزا۔۔۔ بکری کے جلتے شہیر پھلانے، شعلوں کے اوپر سے گزرتا وہ دھوئیں سے بھرے کمرے میں دوڑتا گیا۔ لوگ پکن سے کافی دوڑ کونے میں جمع تھے، ایک دوسرے کو پرے ہٹا رہے تھے۔ دعا میں پڑھ رہے تھے۔۔۔ وہ تیزی سے کھڑکیوں کی طرف پکا۔ شرٹ کہیں گرگئی۔ ناک میں پھر سے دھوؤں اندر جانے لگا۔ مگر اس کو پرواہ نہیں۔ وہ فریم کے کنارے ٹوٹنے لگا۔ پک یہیں کہیں تھی۔۔۔ یہیں کہیں۔۔۔

اس کے ہاتھوں نے کھڑکی کے کنڈے کو چھوڑا۔ اندر تالہ پڑا تھا۔ متفل تالہ۔ ڈیم ایٹ۔ اسے پھر سے کھانسی آنے لگی۔ ادھر دیکھا۔ کوئی بھاری چیز میں جائے جس کو وہ تالے پر دے مارے۔ ساتھ کھڑی حلیمہ روٹے ہوئے ابھی تک کھڑکی کا شیشہ پیٹ رہی تھی۔ چند افراد بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ آگ اب کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

اس نے جیب سے چاہیوں کا گچھا نکالا اس میں ایک پک بھی تھی جسے کئی سالوں سے وہ جاب کے حصے کے طور پر ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے تیزی سے وہ تالے میں گھسانی۔ تالا نیا تھا اور غالباً پوپیس کے آنے سے پہلے گارڈز نے اتار لیتا تھا۔ دھوئیں کے باعث وہ کچھ دیکھنے سکتا

تھا، مگر آنکھیں بند کر کے اس نے محوس کرنا چاہا۔ چھے pins... وہ باری باری پک کی مدد سے سب کو چھوڑ رہا تھا۔ فوراً فایو سکس۔

”مک!“ اس کے لبوں سے نکلا۔ تالہ کھل گیا۔ اس دھنپانہ انداز میں تالہ نوج کرا تار اور شیشہ زور سے پرے دکھیا۔ کھڑکی کھلتی گئی۔ حلبہ تو ازان برقرار نہ کھل سکی اور نیچے گر گئی، مگر وہ پک کر آگے آیا، اور اسے کھینچ کر باہر نکالتا لایا۔ وہ فرنچ ونڈوز تھیں۔ پوری دیوار کی جگہ پر حائل تھیں۔ اس کو لا کر باہر گھاس پر ڈالتے ساتھ وہ اندر کی طرف پکا۔

”اس طرف آؤ۔ کھڑکی کی طرف آؤ۔“ اب وہ چلا چلا کر دھوئیں میں پھنسنے لوگوں کو کہہ رہا تھا۔ وہ سب اس کے دشمن تھے۔ وہ سب اس کے مجرم تھے۔ وہ سب اس کے گناہگار تھے۔ مگر وہ ان جیسا نہیں تھا۔ وہ ان کو پکڑ کر، گھیٹ کر شیشہ کی کھلی دیوار کے باہر لارہا تھا۔ کچھ نے کھلا روزن دیکھ لیا۔ کچھ نے نہیں دیکھا۔ حکم پیل پھر سے مجھے گئی تھی۔... بے ہوش ہوئے لوگوں کو اٹھانا اور گھنپنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ آگ کمرے میں داخل ہو چکی تھی اور فرنچ پر کوپڑا چکی تھی۔ وہ درمیان میں ایک دفعہ گرا بھی تھا، کہیں درد بھی ہو رہا تھا مگر اسے پرداہ نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہوئے فاطمی کو کندھوں سے گھیٹ کر باہر لارہا تھا۔ لاؤخ کے مہانوں میں سے کوئی پکن کی طرف آیا تھا۔ جتنا بند دروازہ دیکھا تو شور مچا دیا۔... لاؤخ کا میوزک ہٹم گیا۔... لوگ دیوانوں کی طرح باہر لان میں بھاگے۔

محفوظ کرے میں بیٹھے ہاشم کو کیس نے تسلی دی۔ ”لوگ نج جائیں یا مر جائیں۔... الزام فارس پر ہی آئے گا۔...“ مگر ہاشم کی تیریاں چڑھ رہی تھیں اور وہ شدید برہم نظر آتا سکریں پر لائیو فونچ دیکھ رہا تھا۔ ”اس کو یوں کھلانہیں چھوڑ ناچا ہے تھا۔“

فرنچ پر کو شعلہ اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ بہت سے لوگ باہر نکل چکے تھے اور اب بزرہ زار پر گرتے ہوئے بھاگتے آگے جا رہے تھے۔ وہ بدقت الیاس فاطمی کو کھینچ کر باہر لایا، پھر اسے گھاس پر ڈالا اور وہیں گھنٹوں پر ہاتھر کے جھکے کھڑے گہرے گہرے سانس لئے۔ تمام شناس بھرم بہر آچکے تھے۔ لاؤخ کے محفوظ مہمان وہاں سے نکل کر اس طرف نہیں آئے تھے۔ وہ پارکنگ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اپنی جان بچانے۔۔۔ اپنی گاڑیوں کی طرف۔۔۔ عجب قیامت کا عالم تھا۔۔۔ افراتری دھکم پیل۔۔۔ کمرہ جل رہا تھا۔ دھوئیں کے مرغوںے اٹھ کر فضائیں گم ہو رہے تھے، ایسے میں وہ اس دیکھتے جہنم کے سامنے کھڑا۔ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ نہ ہال۔۔۔ زخم۔۔۔ مگر اس کے اندر اطمینان بھر رہا تھا۔ اس نے ان کو بچالیا تھا۔۔۔ سب ٹھیک ہو گیا تھا۔۔۔ ”ابا۔۔۔ ابا۔۔۔“ اورتب اس نے وہ حلقت پھاڑ کر چینخ کی آواز سنی۔۔۔ شناس آواز۔۔۔ اس نے گردن موزی۔۔۔ لاؤخ کے بھاگتے مہانوں میں سے صرف ایک مہمان دوڑتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔۔۔ نوجوان لڑکا جو جا پنے باپ کو پکار رہا تھا۔۔۔ خاور کا بیٹا۔۔۔ فارس غازی کا سانس نکل رک گیا۔

”میرے ابو کہاں ہیں۔۔۔“ وہ دوڑ دوڑ کر ایک ایک شخص کے پاس بھاگ رہا تھا۔۔۔ کسی خواب کی کیفیت میں فارس نے گردن گھمائی۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔۔۔ نجات کی طرف۔۔۔ بچاؤ کی طرف۔۔۔ وہاں کوئی وہیل چیز نہ تھی۔۔۔ وہاں کوئی خاور نہ تھا۔۔۔ وہ تیزی سے لڑ کے کی طرف بھاگا۔

”خاور کہاں ہے؟“ وہ شور کے باعث چلا کر لڑ کے کونڈھوں سے جھنجور کر پوچھ رہا تھا۔۔۔

”ابو کو کاردار صاحب نے اس کمرے میں بلوایا تھا۔۔۔ مجھے نہیں جانے دیا۔۔۔ میرے ابو اندر ہیں۔۔۔ میرے ابو کو نکالو۔۔۔“ وہ اونچا اونچا رہا تھا۔۔۔ باٹھہ میرے مار رہا تھا۔۔۔ ”میرے ابو جمل نہیں سکتے۔۔۔ میرے ابو جن نہیں سکتے۔۔۔“

اور اس نے مزید کچھ نہیں سنا.... وہ پلٹا اور جلتے کمرے کی طرف دوڑا.... کسی نے آواز لگا کر اسے روکا..... شاید وہ اکثر ایمن تھی.... وہ اسے کہہ رہی تھی کہ سب آپکے... ایک شخص کے پیچھے وہ اندر نہ کوئے... وہ شخص شاید مر پھا ہو... وہ واپس آجائے... مگر اس نے کچھ نہیں سنا... وہ دھوئیں سے بھرے کمرے میں بھاگتا چلا گیا۔

”خاور.... خاور....“ وہ چلا رہا تھا... جانتا تھا وہ آواز نہیں دے سکتا، مگر پھر بھی اور ادھر ادھر دوڑتا چلا رہا تھا... شروع میں کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ مزید آگے بڑھا اور تب اسے دھوئیں کی گھنی چادر میں وہیں چیز نظر آئی۔ وہ کونے میں تھا... بالکل کونے میں... فارس اس کی طرف دوڑا.... چھت سے لکڑی کے لکڑے جل جل کر نیچے گر رہے تھے مگر اس نے پرواہ نہیں کی... وہ جلتے فرنچپر کوٹھ کریں مارتے... دوڑتے ہوئے وہیں چیز کے قریب آیا... خاور کا چہرہ سرخ پسینے میں بھیگا تھا۔ آجیجن ماسک منہ پہ لگا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہرہ رہے تھے... وہ سفید سائے ایک دفعہ پھر سے آگے پیچھے نظر آنے لگے تھے۔ وہ اسے ملائم نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر دل کی سفیدی سارے کالے دھوئیں پہ حاوی آئی۔ اس نے وہیں چیز کو زور سے آگے دھکیلا۔ وہ آگے دوڑتی آئی۔ خاور کا بیٹا دھوئیں کی چادر کے پار کھڑا تھا... اس نے بھاگ کر وہیں چیز کو تھاما اور باہر نکالتے گیا.... فارس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک گھری کالی سانس لی اور اسی پل...“

اسی پل پیچھے سے کسی نے اسے ٹھوکر ماری تھی۔ وہ لڑکھڑا کے آگے کوگرا۔ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ سنجل نہ پایا۔ بدقت اٹھنے کی کوشش کرتے گردن موڑی.... پیچھے زخمی سیاہ کا لک چہرے پہ لگائے، پیچھے جلے کپڑوں والا ہاشم کھڑا تھا... اس کے عقب میں راہداری میں کھلتا دروازہ بھلا تھا۔ ( غالباً وہ ابھی اندر آیا تھا)۔ فارس کے بازوؤں میں ایک دم قوتی بھرگئی، وہ انھا اور زور سے ہاشم کا گریبان کپڑا۔

”گھشا آدمی۔“ مکا مارنا چاہا مگر نہیں مار سکا۔

”لکھو یہاں سے اس سے پہلے کہ تم جل جاؤ۔“ اس نے ہاشم کو کھلی کھڑکی کی طرف دھکیلا۔ گریبان ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چھت سے لکڑی کا بڑا سا جلتا ہوا لکڑا دھماکے سے نیچے کی طرف آیا۔ ہاشم نے دیکھ لیا تھا، وہ فوراً سے دائیں طرف کو پلک گیا... فارس نے وہ نہیں دیکھا تھا... وہ بھاگ نہیں سکا۔ جلتا ہوا تارہ... شہاب ثاقب کی طرح... اس کے اوپر آن گرا.... ساری ہمت ساری طاقت دم توڑ گئی.... وہ گھننوں کے بل زمین پر گرا... اور پھر منہ کے بل فرش پر آن لگا۔ ساری دنیا اندر ہوتی گئی.... ساری آوازیں... سارے رنگ... ساری روشنیاں دم توڑ گئیں... سفید سائے اور کالا دھواں... سب ختم ہو گیا....

❖❖❖

اب اپنا دل بھی شہر خموشان سے کم نہیں ..... سن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے مورچاں رات کے اندر ہیرے میں ڈوباتھا۔ لا کنج میں سب جمع تھے۔ بے چین، فکرمند، منتظر۔ سعدی پا ربار فارس کو کال ملا رہا تھا اور زمر مسلسل دائیں بائیں ٹھیل رہی تھی۔ اس کی رنگت زرد پڑ رہی تھی اور اب دل گھبر رہا تھا لگتا تھا ابھی سینہ توڑ کر باہر آگرے گا۔

”وہ کیوں نہیں آیا؟ وہ کہاں رہ گیا ہے؟“ وہ مسلسل آگے پیچھے چلتے کہے جا رہی تھی۔

”زمر بیٹھ جاؤ۔ وہ آجائے گا۔“ اپانے اسے تسلی دینی چاہی۔

”اموں نے وعدہ کیا تھا، وہ واپس آئیں گے۔“ خدہ گھننوں پر سر کھلے بیٹھی عجیب سے انداز میں بولی۔

”مجھے نہیں پتا۔ سعدی چلو، وہاں چلتے ہیں۔“ زمر نے ایک دم اسے کہنی سے پکڑا اور آگے لے جانے لگی۔

”میں کب سے جانا چاہ رہا ہوں آپ مجھے جانے نہیں دے رہیں۔ اب آپ ادھر بیٹھیں، میں خود جاتا ہوں۔“ وہ نرمی سے کہنی چھڑا تا سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ نہیں رکی۔ وہ اسی طرح آگے دوڑتی آئی۔ سعدی اس کے پیچھے لپکا۔ اپانے آواز دی۔ ندرت نے منع کیا۔ مگر اس پکوئی وحشت طاری تھی۔ کوئی جنون سوار تھا۔ اب نہیں تو شاید دل پھٹ جائے گا۔ بیہیں کھڑی رہی تو پیروں سے خون بنہے گے۔

اب نہ گئی تو.....

لیڈس مارنے یئے ابھی بیتے نہیں!

شہرین کے گھر آؤ توئی وی لاوچ کی ایل سی ڈی اسکرین خوب شور مچاتی روشن نظر آ رہی تھی۔ سامنے صوفے پر سونی لیٹے ہوئے اپنے ٹیب پر بٹن دبارہ ہی تھی جب کانوں میں آواز گئی۔ ہاشم کاردار۔ کسی نے اس کے باپ کا نام لیا تھا۔ اس نے چونک کر گردن موڑی۔ اسکرین کو دیکھا۔ چند لمحے کو اس کی سانس تھم گئی اور پھر وہ ٹیب پھینک کر چیخ نمارتی اٹھی۔

”ماما..... ماما.....“ اب وہ روتے ہوئے زور زور سے چلا رہی تھی۔ شہرین جو اپنے کمرے میں سیل فون پر لگی تھی، ہڑ بڑا کر اٹھی اور بھاگی ہوئی باہر آئی۔

”ماما..... میرے بابا..... میرے بابا.....“ پچھی روتے ہوئے اسکرین کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور جب شہرین نے اس طرف دیکھا تو اس کا اوپر کا سانس اور پر اور پیچے کا نیچے رہ گیا۔

”کاردار زکانچ میں آتش روگی۔ ہاشم کاردار کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ بارہ افراد زخمی ایک شخص جاں بحق۔“

”میرے بابا..... میرے بابا.....“ سونیا ب زور زور سے چیخ رہی تھی.....

سعدی ڈرائیور کر رہا تھا اور زمر ساتھ پیٹھی، مسلسل انگیاں اضطرابی انداز میں مردڑ رہی تھی۔ وہ بلوں میں پچھ پڑھ بھی رہی تھی مگر ہر شے بار بار دھنڈ لی ہو جاتی۔ پھر کا لے دھوئیں جیسی دھنڈ چھا جاتی۔ آنسو بس آنکھوں کے کنارے پر ٹھہرے تھے۔ گرنے کو بس ایک دھکا چاہیے تھا.....

سعدی کا فون بجا تو اس نے تیزی سے کان سے لگایا۔ ”ہاں خدا۔“ بات سننے ہوئے وہ چونک کر زمر کو دیکھنے لگا۔ رفتار آہستہ کی۔ زمر نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے فون بند کیا اور اسٹریگ گھمایا۔

”کیا کہہ رہی تھی جنین؟“ وہ کپکپائی آواز میں بولی۔

”وہ..... کہہ رہی تھی کہ... ہم ذرا ابھی.....“

”مجھے چکر مت دو... میں ایک فٹ کے فاصلے پر بیٹھی ہوں۔ مجھے.... مجھے تمہارے فون سے آواز آ رہی تھی۔ کیا دکھار ہے ہیں نیوز میں؟ کہاں لگی ہے آگ؟“ آنسوٹ ٹوٹ کر چہرے پر گرنے لگے۔

”پچھنیں پتا نہ زمر۔ آگ لگی ہے اور زخمیوں کو قریبی ہسپتال میں شفت کیا گیا ہے۔ میں اے ایس پی صاحب کو کال کرتا ہوں۔ ہسپتال کا پوچھتا ہوں۔“ وہ پریشانی سے حواس باختہ نہ ملانے لگا۔

”جلدی کرو۔“ اس نے کہنے کے ساتھ بلوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھوں کو بیچ لیا۔ گرم گرم پانی گالوں پر بننے لگا.....

سر کاری ہسپتال میں پولیس اور میڈیا کے نمائندوں کا جم غیر لگا تھا۔ شہری سونیا کی انگلی پکڑے پریشانی سے رش کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ سونی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ خاموش سکیوں بچکیوں کے باعث اس کا بدن آہستہ آہستہ بچکو لے لیتا تھا.....

زمر اور سعدی دوڑتے ہوئے ہسپتال کی عمارت میں داخل ہوئے تھے۔ زمر نے آنسو صاف کر لئے تھے اور اب وہ ہر اس انداز میں ادھرا دھر گردن گھماتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس یونٹ میں عجیب افرانفری کا عالم تھا۔ رپورٹر، کیسرے، پولیس..... رش، ہی رش..... جانے سعدی نے کس کو روک کر کچھ پوچھا تھا اس نے نسوانی آواز کو کہتے تھا۔ ”آپ اوھر آ میں۔“ وہ کچھ سمجھنیں پا رہی تھی۔ بس سعدی کے پیچے بھاگ رہی تھی۔ کوئی عجیب و خشت زدہ سی مسافت تھی جو طے کر رہی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ ایک کمرے کے سامنے رک کر اس نے اوپھی آواز میں پوچھا۔ شور بہت تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ

دیتی تھی۔ وہ اس کی طرف مڑا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، مگر بظاہر خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

”وہ کہہ رہے ہیں کہ ایک باڈی ہے، پہلے دیکھ لیں، پھر ہم زخمیوں کو.....“

”نہیں۔“ وہ بدک کر پیچھے ہوئی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”اس کو ایمر جنسی میں ڈھونڈنے اور ادھر کیوں؟ نہیں۔“

”ہاں ہاں وہ کوئی اور ہو گا۔“ وہ اس کو نہ ہوں سے تھام کرتی دینے لگا۔ ”مگر اس کے لواحقین نہیں آئے اور ان کو اس کی شناخت کرنی ہے، اس لئے میں ایک دفعہ دیکھ لیوں۔“ وہ ٹوٹی پھولی امید سے کہتا آگے بڑھنے لگا مگر زمر نے زور سے اس کی کہنی دبو گئی۔

”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ آنسو بھل بھل بننے لگے تھے۔ ”میں کہہ رہی ہوں، وہ فارس نہیں ہو گا۔ اس کو کہیں اور

ڈھونڈتے ہیں۔“

”میں آتا ہوں۔“ وہ بمشکل اپنا بازو چھڑایا تھا۔ زمر نے پیچھے جانے کو قدم اٹھائے مگر پیر لڑکھڑا گئے۔ اس نے دیوار کا سہارا لیتے خود کو سنبھالا۔ پھر دیوار سے نیک لگائے کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں بند کیے، گھرے گھرے سانس لینے لگی۔ مگر سارا مسئلہ یہی تھا کہ آنکھیں بند کرنے پر وہ فوراً آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا.....

”زمر بی بی..... آپ.....“ وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہہ بھی رہا تھا..... نئے گھر کی باتیں.... جذبایا گھر میں نہ رہنے کی باتیں.... یونیورسٹی کی دوڑکیاں جو اس کو پسند تھیں.... ان کی باتیں.... اس نے آنکھیں کھولیں.... یہاں بھی قیامت سی قیامت تھی.... وہ کہاں جائے؟

سعدی دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وہ ہل نہیں سکی۔ آؤ نہیں نکال سکی۔ آؤ نہیں روک سکی۔ وہ اس کے قریب آیا۔ زمر نے نفی میں

سر ہلا کیا۔

”وہ..... وہ فارس نہیں تھا نا..... مجھے مت بتاؤ..... مجھے کچھ نہیں سننا.....“ وہ اسے کچھ بھی کہنے سے روکنا چاہتی تھی مگر وہ آگے آیا اور اسے گلے لگایا۔ زمر کا سانس کھتم گیا۔ پھر اس کا سر تھککتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

”مر نے والا نیاز بیگ تھا..... وہ فارس غازی نہیں تھا.....“

وہ کرنٹ کھا کر اس سے علیحدہ ہوئی۔ بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”وہ فارس نہیں تھا؟ تو فارس کہاں ہے؟.....“

”آئیں ان کو وارڈ میں ڈھونڈتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے آگے چلنے لگا۔ اسے لگا وہ پانی پر چل رہی ہے۔ جسم داغ ہر شے سن ہو گئی تھی۔ آنسو بہنار ک گئے تھے۔

”مسز زمر؟“ وہ آگے جاتے جاتے پڑی۔ راہداری کے اختتام پڑا کثرائیں کھڑی نظر آ رہی تھی۔ شال پیٹی، دیران چڑھ لئے جیسے ابھی بستر سے اٹھی ہو۔

”فارس کہاں..... الفاظ اٹھوتے گئے.....“

”وہ رخی ہے، مگر ٹھیک ہے۔ اس کو میں نے منع بھی کیا تھا، مگر وہ.....“ وہ قریب آتے ہوئے تلخی سے ہنسی۔ ”مگر وہ خاور کو پہچانے کے لئے آگ میں کوڈ پڑا۔“

”وہ ٹھیک ہے؟“ زمر دوڑ کر اس کے پاس گئی۔ وہ سخت ہر اس اس تھی۔

”ہاں، اس کی کمر اور رٹا ٹنگ پر زخم آئے ہیں، اس کے اوپر لوہے کا ٹکڑا آ کر لگا تھا۔ چند burns بھی ہیں، مگر اسی وقت چھت پر لگے آگ بجھانے والے شاور پانی گرانے لگے، جو پہلے بالکل کام نہیں کر رہے تھے۔ تو اس کی بہت بچت ہو گئی۔“ زمر نے گھری سانس لی۔

”آپ.... ٹھیک ہیں؟“ سعدی نے رسمًا پوچھ لیا۔

”میں؟“ وہ زخمی پن سے مسکرائی۔ ”میں ہر آگ سروایو کر جاتی ہوں، ٹھیک ہوں۔ آپ فارس کو وارڈر میں ڈھونڈ دیے۔“ وہ دونوں پوری بات سنے بغیر آگے کو بھاگے۔ ایمن اسی زخمی مسکراہٹ سے ان کو بھاگتے دیکھتی رہی، پھر وہ مڑی تو کسی پہنگاہ پری۔ زخمی مسکراہٹ خوشی بھری مسکراہٹ میں داخل گئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو اپنے پاس بلایا۔۔۔۔۔

”ادھر آؤ.....“

❖❖❖

مجھ سے کیا پوچھتے ہو شہر وفا کیا ہے۔۔۔ ایسے لگتا ہے صلیبوں سے اتر کر آیا دارڈ میں کسی نے کس طرف اشارة کیا، کسی نے کس طرف۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے آگے بڑھتے گے۔ بیڈز کی طویل قطار میں جامبا پردے لگے تھے۔ سعدی نے ایک پردہ ہٹایا۔ تو۔۔۔ بالآخر وہ بستر پر لیٹا نظر آیا۔ آنکھیں بند تھیں۔۔۔ غالباً نشر آور ادویات کے زیر اثر تھا۔ چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔۔۔ دوزہ سر پر موجود تھیں۔ سعدی نے گہری سانس لی اور مڑ کے دیکھا۔ زمر پیچھے آرہی تھی۔ اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے آگے آئی۔ فارس کو دیکھ کر قدم زنجیر ہو گئے۔ بے جان۔ پتھر کا بت۔ آنکھوں میں ڈھیر سارا دکھا اترا۔ اسے کبھی بیمار، کبھی یوں بے ہوش نہ دیکھا تھا اور آج پتہ چلا تھا کہ اسے دیکھنے میں کتنی اذیت تھی۔۔۔۔۔

”فارس۔۔۔ وہ لپک کر اس کے قریب آئی، پھر اضطراری انداز میں سرپہ کھڑی نرسر سے بولی۔ ”یہ ٹھیک ہے نا؟ اور ٹھیک ہو جائے گانا؟“

”آہستہ بولیں۔ میریض کے سرپہ شور نہ کریں۔“ نرسر نے بے زاری سے کہا تھا۔ ”وہ ہوش میں آرہا تھا مگر تکلیف میں تھا۔ اسے انگیکشناں لگایا ہے۔“ زمر کچھ دیر یہیگی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر آنسو روگ کر صاف کیے اور غصے سے سعدی کی طرف گھومی۔ ”کیا کہا تھا میں نے تمہیں؟ ہاں؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے سینے پر زور دے کر اسے پرے دھکیلا۔ ”کیا کہہ رہی تھی میں؟ اس کو زخموں میں ڈھونڈا! مگر تم۔۔۔۔۔ پہلے ادھر ڈیندی بادی کے پاس چلے گئے۔۔۔۔۔ تمہیں شرم نہیں آئی؟ ہاں؟ تمہیں کوئی احساس نہیں ہوا؟“ وہاب غصے اور بے کسی سے اس کے سینے کو پھٹروں اور مٹھیوں سے مار رہی تھی۔ آنسو پھر سے بننے لگے تھے۔

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ اب تو ٹھیک ہیں نادہ۔“ وہ اپنا اچھا کرتے ہوئے اسے بہلانے والے انداز میں بولا۔ ”آپ کو انہیں میرے پیچھے جانے ہی نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”کیسے نہ جانے دیتی ہاں؟ تم“ ہمارے سعدی ”ہو ہمیں ہمیشہ تمہاری حفاظت کرنی ہوتی ہے۔“ اور ساتھ ہی زور سے اس کے کندھے پر تھپٹ مار کر اسے پرے ہٹایا۔ سعدی نے بر اسمانہ بنایا۔

”واہ۔۔۔ یہ صاحب تو آپ کو زہر لگا کرتے تھے۔“

”اب بھی لگتا ہے۔“ آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے ناک سکوڑ کر سانس اندر کھینچی۔ ”مگر تم نے مجھے اتنا ڈار دیا۔ اودہ سعدی میں اتنی ڈر گئی تھی۔“ وہاب نڈھالی بیڈ کے کنارے میٹھگئی اور سر دنوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ وہ تکان سے مسکرا یا۔

”چلیں آپ بیٹھیں“ میں ان کو روم میں شفت کروانے کا بندوبست کرتا ہوں اور گھر فون کرتا ہوں۔“

زمر نے تیزی سے سراہمیا۔ ”سب کو مت بتانا کو وہ زخمی ہے۔ یونہی وہ پریشان ہوں گے۔“

”زمر!“ وہ اسی طرح مسکرا یا۔ ”ہمیں ایک دوسرے سے اب کچھ نہیں چھپا یا۔ میں اگر کاردار زکا ٹیچ بھی جاتا تو بتا کر جاتا۔ آپ بیٹھیں میں آتا ہوں۔“ اسے تسلی دیتا وہ باہر نکل گیا، اور وہ گردن موڑے فکر مندی سے فارس کو دیکھنے لگی۔۔۔ جو آنکھیں بند کیے۔۔۔ غنو گی کے عالم

میں تھا....

”آئی ہیٹ یو فارس غازی۔ آئی ریلی ریلی ہیٹ یو۔“ وہ بے بھرے دکھ سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تھی۔ وہ  
بے خبر سور ہاتھا۔

کیسے ہیں لوگ ان کی تمہیں کیا مثال دوں ..... جا کر مجسے کہیں پتھر کے دیکھ لوا  
اسی ہسپتال کے پر قیش اور نفاست سے بچے اک پرائیوٹ روم میں ہاشم کاردار صوفے پٹانگ پٹانگ رکھے برا جہاں تھا۔ ہسپتال  
کی شرٹ اور ٹراؤز میں ملبوس، وہ بظاہر زخمی دکھائی دیتا تھا۔ ہاتھ پر ٹھی بندھی تھی ماتھے اور سر پر بینڈ تھی بھی تھی مگر چہرے پر سکون تھا اور دل پر  
سے دیوار پر لگی تھی وی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ لوگ بچ گئے مگر it worked۔ ہے نا؟“ مسکرا کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑے رئیں کو دیکھا۔

”جی سر.... مگر انہوں نے آپ کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تھا۔“ اسے خیال آیا۔

”اتنی افراتیزی میں کے یاد رہنا ہے کہ میں کمرے میں تھا یا نہیں۔ وی جیتل کو دیکھو۔ وہ مجھے پر موٹ کر رہے ہیں۔“

”لیں سر!“ رئیس جوش سے بتانے لگا۔ ”ہمارے پاس غازی کی فوج ہے۔ وہ بھی وہاں موجود تھا، اسلام اس کے سردار دیں گے یا اس کو حادث کہیں گے۔ آپ پر کوئی شکر نہیں کرے گا۔ میذیا آپ کو ہیر و بنا کر پیش کر رہا ہے۔ بار بار اسکر زگلا پھاڑ کر کھرد رہے ہیں کہ ہاشم کاردار  
نے ابھی چند دن پہلے عدالت میں اپنے خاندان کی بے گناہی ثابت کی تھی۔“

”ویری گڑ۔“ وہ مخطوط ہو کر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ ”ہم ہر کر انسر سے نکل آئے۔“ رک کر صحیح کی۔ ”میں ہر کر انسر سے نکل آیا۔ کوئی  
میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ نہ عدالت، نہ قانون، نہ میری ماں۔ میں نے ہر شے کو سروائیکر لیا۔ میں رئیس، سب سے بڑا سروائیکر ہوں۔ فیصلے کی  
گھر تھی آبھی گئی مگر میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوں۔“ وہ گردن کڑا کر کھرد رہا تھا۔ ”اور اراب ہم نئی شروعات کرنے جا رہے ہیں۔ ہم نئے کار و باری  
دوست بنانے جا رہے ہیں۔ نئے پاڑڑ، نئے موقع، نیا گھر!“ وہ طہانتی سے بولا تھا۔ پھر گھری دیکھی۔ ”کتنی دیر ہے؟“

”بس سر، میذیا کو آپ کا انتظار کروارہا ہوں۔ گھنٹے بعد آپ باہر نکلیں گے، اور میذیا یا سامنے علی الاعلان کہیں گے کہ یہ سب  
فارس غازی نے عدالتی نگاست کا بدل لینے کے لئے کیا ہے۔ اور فی الحال عوام کو آپ سے ہمدردی ہے، میذیا کو آپ سے ہمدردی ہے، سب  
آپ کا یقین کریں گے۔“

”زبردست!“ وہ مسکرا کے ٹھی وی کو دیکھنے لگا۔ ”! It did work after all!“

فیصلے کی گھر تھی آبھی تھی۔

مگر ابھی یہی نہیں تھی۔

جو نفس تھا خار گلو بنا، جو اٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے ..... وہ نشاط آہ سحر گئی وہ وقارِ دست دعا گیا  
بالائی منزل پر نو شیر وال کے کمرے کی تھی روشن تھی۔ بیڈ پر بیگ کھلا پڑا تھا اور وہ اس میں کپڑے رکھ رہا تھا۔ پاسپورٹ، سفری  
دستاویزات، لیپ تاپ سب بکھرا پڑا تھا۔ صبح اس کی فلاہیت تھی اور وہ جلد از جلد تیاری مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک منٹ بھی اس کھر میں اضافی  
رہنا منظور نہ تھا۔ دستک ہوئی تو اس نے بے زار سالمیں کہا اور خود کپڑے تہہ کر تارہا۔  
”سر، فیجی نا اندر داخل ہوئی۔“ کاردار صاحب، ہسپتال میں ہیں۔“ اطلاع دی۔

”معلوم ہے۔ سارا شہر جانتا ہے۔ میرے بھائی کا کوئی نیا ذرا رامد۔“

”کیا فارس کو بھی زخم آئے ہیں؟ نیوز میں بتا رہے تھے۔“

”مجھے ان میں دلچسپی نہیں ہے۔“ اس نے بے زاری سے بیگ کا ڈھکن دے مارنے والے انداز میں بند کیا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”مجھے امریکہ میں نوکری مل گئی ہے۔ اب زیادہ سوال نہ کرو اور جاؤ یہاں سے۔“ اس نے ہاتھ جھلا کر اسے اشارہ کیا۔ وہ فوراً سفر

کرباہر نکل گئی۔ اب وہ جھک کر سفری وسماں ویزات اٹھا لٹھا کر دستی بیگ میں ڈال رہا تھا۔ آخر میں چونکا۔ بیگ کے اندر اس کا ایک گلاں پستو ٹیبل کے دراز میں ڈال کر مقفل کر دیا۔ پھر ہاتھ صاف کیے۔ جیسے بہت سا ان دیکھا مائع صاف کیا ہو۔

نئی زندگی میں اس کی جگہ نہیں تھی..... ہرگز نہیں.....

❖❖❖

ورنہ یہ تیز دھوپ تو چھتی ہمیں بھی ہے ..... ہم چپ کھڑے ہوئے ہیں کہ ٹو سائبیں میں ہے  
فارس نے آنکھیں کھولیں تو خفیدہ دیواریں خوب روشن نظر آ رہی تھیں۔ اس نے تقہت سے پلکیں جھپکیں۔ منظر واضح ہوا۔ ہسپتال  
کمرہ... اس نے کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو.....

”ایزی... ایزی!“ سعدی اس کے سر ہانے کھڑا، دونوں ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ فارس نے بدقت اسے دیکھا، پھر گرد  
موڑی۔ ندرت، حین، زمر، سیم... سب کمرے میں موجود تھے۔ اوپری آواز میں خوش گپیاں جاری تھیں۔ وہ اٹھ نہیں سکا۔ کمر اور ناگ میں درد کی  
لہریں اٹھی تھیں۔ گھرے گھرے سانس لیتے ہوئے واپس سر تکیے پر رکھ دیا۔

”خوڑی بہت مکافاتِ عمل والی فیلنگ آ رہی ہے؟“ سعدی اس کے قریب جھکا مسکراہٹ دبائے پوچھنے لگا۔ ”وہ جو میرے ساتھ  
کینڈی میں کیا تھا.... یاد ہیں وہ زخم جو مجھے دیے تھے۔“

”زیادہ بک بک مت کرو۔“ فارس نے ناگواری سے کہہ کر آنکھیں شدتِ ضبط سے میچ لیں۔ سعدی مسکرا کر سیدھا ہوا۔ ”اسی لئے  
کہتے ہیں کسی معصوم کی بدعا نہیں لیتے۔“

”فارس!“ وہ اسے جا گئے دیکھ کر صوفے سے اٹھ کر سامنے آئی۔ ھنگریا لے بال آدھے کچھ میں بند ہے تھے، اور ناک گلابی پڑی  
رہی تھی۔ البتہ اب وہ خوش اور فریش نظر آ رہی تھی۔ ”کیا محسوس کر رہے ہو؟ جیسے جیل میں دوبارہ پہنچ گئے ہو، ہوں؟“  
ندرت نے خنگی سے بڑبڑا کے اسے ٹوکا تھا مگر ان چاروں کے تیور بدالے ہوئے تھے۔ فارس نے ہھنوں بھیجن لیں اور ادھر ادھر  
دیکھا۔ ” بلا کسی ڈاکٹر کو۔“

”ڈاکٹر والی بریفنگ ہم دے دیتے ہیں نا۔“ حین پیکٹ سے چپس نکال کر منہ میں رکھتی سامنے آتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو  
چند زخم آئے ہیں۔ زیادہ گھرے نہیں ہیں۔ بے ہوش آپ دھوئیں کی وجہ سے ہوئے تھے۔ اس لئے ہم سے خاطر کی توقع مت رکھیے گا۔“

”اویس سارے پھل ہم اپنا نام پاس کرنے کے لئے لائے ہیں۔“ سیم چکا۔

”ہمیوار!“ وہ بے زاری سے ہاتھ جھلا کر کھتا پھر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ سعدی فوراً آگے بڑھا اور اسے سہارا دیتے ہوئے  
تکیے پہنچے جوڑے، پھر لیوکی مدد سے بیڈ کو سر ہانے سے اوپر اٹھایا۔ وہ اب ٹیک لگا کر بیٹھا تو شدید تکلیف میں لگ رہا تھا۔ کندھے کا زخم درد  
کرنے لگا تھا جس سے چہرے پر شدید بے زاری المآل تھی۔

”اور باقی لوگ... وہ ٹھیک ہیں؟“ اس نے پھر ندرست کو خاطر کیا مگر جواب میں خمن چمک کر بولی تھی۔ ”وارے واہ۔ ان لوگوں کا کتنا خیال ہے آپ کو۔ کیا آگ میں کوئتے وقت تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنی ایک بہن، ایک بیوی، ایک بھائی اور.....“ سعدی اور سیم کو دیکھا۔ ”اور ڈیڑھ بھانجوں کا خیال نہیں آیا تھا، ہاں؟“

”یار تم لوگ اپنا چڑیا گھر لے کر میرے سر سے چلے کیوں نہیں جاتے۔“ وہ کروٹ لینے کی کوشش میں شدید بے زار ہو رہا تھا مگر سعدی کے بد لے ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔

”واہ ما مون، مجھے تو خوب لیکھ رہی ہے تھے، میری کے بیٹھے کو بچانے کیوں خطرے میں کوڈ پڑے۔ اپنی دفعہ تو کوئی خود غرضی یاد نہیں آئی۔“

اب کے فارس نے صرف غصیل آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ فوراً مصالحتی انداز میں ہاتھ اٹھائے قدم قدماً پیچھے ہٹنے لگا۔ ”جارہا ہوں.... جارہا ہوں۔“

ندرست اب ان تینوں کو گھر کر رہی تھیں۔ پھر بڑے ابا کو فون کرنے اٹھ گئیں۔ کمرے میں گلشن اچھے نہیں آتے۔ باری باری سب باہر کھسک گئے۔ اب وہ دونوں تہارہ گئے۔ وہ اس کے قریب کھڑی گلاں میں تجھ ہلاتی کچھ مکس کر رہی تھی۔ ساتھ ہی مسکرا کے اسے دیکھ بھی رہی تھی۔

”باقی سب....“ وہ قدرے پر سکون ہوا تو نقاہت زدہ نظروں سے اسے دیکھتا، دھمکی آواز میں پوچھنے لگا۔

”میاز بیگ ایکسپریڈ ہو گیا۔ سانس گھنٹے کی وجہ سے۔ باقی سب ٹھیک ہیں....“ پھر گھری سانس لی۔ ”ہاشم ہیر و بن چکا ہے۔ جو بھی رُخی ہو جائے عموم کی ہمدردی سمیٹ لیتا ہے۔“

”اور یقیناً سارا الزمام میرے سرڈال چکا ہو گا۔“

”ابھی دیر کتنی ہوئی ہے حادثے کو۔ ابھی تو وہ باہر بھی نہیں نکلا۔ اور وہ ڈال بھی دے تو بھی کیا۔۔۔ وہاں سب نے تمہیں لوگوں کو نکالتے اور بچاتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”واٹ ایور!“ اس نے سر جھکا۔ وہ گلاں پکڑے اس کے قریب آئی۔ اور اس کے کندھے کو چھوڑا۔

”گُلڈ جا ب غازی!“ وہ کراہا۔

”یہ بات آپ تندرست کندھے کو بھی تھپک کر کہہ سکتی تھیں۔“

”اوہ سوری۔ مجھے تو بھول گیا تھا۔“ وہ پتی ہوئی مسکراہت کے ساتھ بولی۔ وہ نچاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

”مجھے پتے ہے تم ناراض ہو۔ کب نہیں ہوتیں۔ خیر۔ میں وہاں سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں ایسا نہیں ہوں۔“ وہ گردن موڑ کر دوسرا دیوار کو دیکھنے لگا تھا۔

”اوہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا۔ تو میں کیا کرتی؟“ اس کی آنکھیں پھر سے بھیگیں۔

”اچھا۔ تم پر بیشان ہوئیں؟“ فارس نے چوٹ کے اسے دیکھا، پھر مسکرا یا۔ تنے اعصاب پہلی دفعہ جیسے سکون میں آنے لگے۔

”پر بیشان؟ ہونہہ۔“ اس نے خنگی سے سر جھکا۔ ”بس اتنا اندازہ ہوا کہ نفرت کتنی کرتی ہوں تم سے۔“

”اچھا۔ کتنی کرتی ہو؟“ اس نے سر پیچھے کو زکالیا اور دلچسپی سے زمر کو دیکھا۔

”اتنی کہ میں ہاشم کی جان لے لیتی۔“

”کیا فائدہ ہوتا؟ میں تو نہ واپس آسکتا۔“

”جو کہنا ہے کہہ لو۔ میں سچ میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔“ وہ ناک سے سانس اندر چھپتی رکام زدہ آواز میں بولی تھی۔

”اچھا لگا سن کر۔“

”بہت بڑے ہوتے۔“

”کیوں میں نے کیا کہا ہے؟ کم از کم ہسپتال کے بیٹھ پتم سے قانون شہادت کے آرٹیکلنہیں پوچھ رہا۔“ اور اس بات پر وہ بے اختیار نہستی چل گئی۔

”وہ.... وہ تو....“ پھر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھتے فنی میں سر ہلایا۔ ”خیر میں نہیں بتا رہی کہ وہ کیوں پوچھا تھا میں نے۔ بس اتنا جان لو کہ میں تمہیں جانتی ہوں۔“

”صرف جاننا کافی ہے یا کوئی خدمت بھی کرو گی؟“

”کیا خدمت کروں۔“

”کیا کرتے ہیں ایسی چھوٹشیز میں؟“ وہ یاد کرنے لگا۔ ”یہ سوپ پلاٹا مجھے اپنے ہاتھوں سے۔“

”شیور۔“ اس نے تپائی پر دھرا گلاس اٹھایا، اس میں سچ بھاگ لایا اور پھر تینج بہر نکال کر رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں ضرور تمہیں سوپ پلاٹی مگر یہ سوپ نہیں ہے۔“ گلاس سامنے کیا تو اس نے دیکھا، اندر نارنجی جوس تھا۔ ”یہ instant drink ہے جو میں نے تمہارے لئے ہلاکا ہو کر اپنی صائم شدہ تو انائی کو بحال کرنے کے لئے بنائی ہے۔ سوری فارس یہ میری ڈرینک ہے۔“ سادگی سے کندھے اپکا کروہ اس کے عین سامنے ٹھونٹ ٹھونٹ جوس پینے لگی اور وہ خفگی سے اسے دیکھ گیا۔

”میں سمجھا تھا موت کے منہ سے واپس آنے کے بعد میری عزت میں شاید کوئی اضافہ ہوا ہو گر....“ اور ناگواری سے سر جھک دیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ ہنس دی تھی۔ وہ ایسی گھڑیاں تھیں جب آنسو اور ہنسی ایک ساتھ نکلنے کو بے تاب لگ رہے تھے۔ اور تب ہی باہر عجیب سا شور بلند ہوا۔ وہ دونوں چونک کردیکھنے لگے۔ پھر زمر نے سر جھک دیا۔ اب باہر چاہے قیامت بھی آگئی ہو۔ وہ فارس کو چھوڑ کے کہیں نہیں جا رہی تھی۔

.....

### جب ظلم و ستم کے کوہ گرائیں روئی کی طرح اڑ جائیں گے

ہاشم کاردار.... اسی ہسپتال کے بہترین پرائیوٹ روم میں لگڑری کا واقع پہ بیخا تھا اور مسکرا کے موبائل پر سوشن میڈیا پر بربا طوفان دیکھ رہا تھا۔ اس کی زخی حالت کی تصاویر و ایسلے ہو چکی تھیں۔ دعا یعنی، نیک تمنا یعنی، محبت بھرے سند یعنی ہی سند یعنی موصول ہو رہے تھے۔ دروازے پر آوازیں سنائی دیں تو کونے میں کھڑا رکیں فوراً باہر گیا۔ چند لمحے چوکھت پر تکرار ہوتی رہی، یہاں تک کہ بے زاری سے ہاشم نے پکارا۔

”کون ہے یا ر؟“

”سر شہرین میڈیم ہیں۔ میں بارہ ہوں کہ آپ ابھی مل نہیں سکتے، لیکن.....“

”اچھا بھیج دو۔“ اس نے ہاتھ جھلا کر کہا اور سر جھکا کر موبائل دیکھنے لگا۔ رکیں چلا گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ہیل کی آواز سے ماوس تھا، آج وہ آواز نہیں سنائی دی تھی۔ اس کی لگائیں شہری کے قدموں تک گئیں تو مخدود ہو گئیں۔ وہ نئی پیڑی۔ ہاشم نے نظریں اٹھائیں۔ وہ پریشانی، آنکھوں میں آنسو لئے کھڑی تھی۔

”اوے.... تم میرے لئے اتنی پریشان؟ یا یہ کوئی استثنی ہے؟“ وہ لختی سے مسکرا یا تھا۔

”ہاشم!“ اس کی آنکھوں سے آنگرنے لگے۔ ”ہم نے تمہیں تی وی پر دیکھا... تم زخمی تھے... سونی رو نے لگ کی تھی...“  
”اوہ یا تمہیں سونی کو نہیں دکھانے تھے وہ منظر۔ اچھا، اب گھر جاؤ، آرام کرو۔ میں صبح تک آ جاؤں گا۔ سونی سے کہو میں ٹھیک ہوں...“

”ہاشم...“ اس کی رندھی آواز کپکپائی۔ ”میں اور سونی ایک ساتھ آئے تھے۔ میڈ بھی ساتھ تھی... مجھے نہیں پتہ کیا ہوا.....“

سیل فون ہاشم کاردار کے پاٹھوں سے پھسل گیا۔ اس کا چہرہ فتن ہو گیا۔ وہ کرنٹ کھا کے کھڑا ہوا۔ ”کیا ہوا سونیا کو؟“

”ہاشم...“ شہری نے رو تے ہوئے نفی میں سرہلایا۔ ”سونی نہیں ہے... سونی ہسپتال میں کھو گئی ہے...“

کیا تم نے کبھی روح لکھنے کی آواز سنی ہے؟

وہ چینخوں سے زیادہ دل دوز ہوتی ہے۔

وہ بے اختیار آگے بھاگا۔

”کہاں ہے سونیا؟ کہاں ہے میری بیٹی؟“ وہ حواس باختہ سا بہرا کر چینخا تھا۔

”وہ بھی میرے ساتھ تھی... رش بہت تھا... میں کال کرنے رکی... میڈ اس کے ساتھ تھی... میں کاریڈور میں آگے نکل گئی وہ پیچھے رہ گئیں... میڈ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا... میں نے پولیس کو بتایا ہے... وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں... مگر وہ نہیں مل رہی... وہ کہہ رہے ہیں اس ہسپتال سے ایک ماہ میں تین بچے پہلے بھی اغوا ہو چکے ہیں... سی ای ٹی وی بھی خراب.....“

مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ سفید چہرہ نے سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ کاریڈور میں چلاتے ہوئے بھاگ رہا تھا....

”میری بیٹی مسگ ہے... اسے ڈھونڈ کر لا وہ... رکھیں.....“

اور رکھیں کو بھی ابھی خبر ملی تھی۔ راہداری میں ہاشم کے گارڈز آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ پولیس کے افسران اسی طرف آرہے تھے... ہر چہرے پر مایوسی تھی... شکستگی تھی... نفی میں ہلتی گرد نہیں... جھکی آنکھیں... وہ کچھ نہیں دیکھ پا رہا تھا... وہ اس ہسپتال کی گرین شرٹ میں ملبوس راہداری میں آگے بھاگتا جا رہا تھا... دل تھا کہ ڈوب ڈوب رہا تھا... گردن بار بار بے یقینی سے نفی میں ہلتی تھی... روح قبض ہو رہی تھی... جان نکل رہی تھی...“

”سونیا کہاں ہے؟“ وہ ایک ایک شخص کو روک کر پوچھ رہا تھا۔ جیخ رہا تھا۔ راہداری سے گزرتے ہر بچے کا منہ موڑ کر دیکھتا۔ سونی نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔

”وہ کہاں جا سکتی ہے۔ وہ اتنی جلدی کہاں جا سکتی ہے۔ میری بیٹی کو ڈھونڈ کر لا وہ... تم باہر دیکھو... تم اس طرف جاؤ...“ وہ ڈھیروں لوگوں کے درمیان کھڑا چلا چلا کر ہدایات دے رہا تھا... پسینے سے ترچہ رہا... اس پر اڑتی ہوا یاں... آنکھوں میں جلتی بھجتی امید... وہ ایک دفعہ پھر سے آگے کو دوڑ نے لگا تھا....

رپورٹر اسی طرف آگئے تھے... کیمرے دھڑا دھڑ اس کی تصاویر اور فلم اتار رہے تھے... اور وہ ایک ایک کو روک کر پوچھ رہا تھا... ”میری بیٹی... وہ سات سال کی ہے...“ وہ ہاتھ سے اپنے گھٹنے تک اشارہ کرتے اس کا قد بتاتا۔ ”کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟“ وہ امید اور خوف سے ہر دروازہ کھول کر اندر رکھتا۔ پھر آگے کو دوڑتا... لوگ نکلنکر اسے دیکھ رہے تھے.....

”کس نے اخھایا ہے میری بیٹی کو بتا دیجھے۔ کہاں جا سکتی ہے وہ...“ راستے میں اسے پولیس کا اعلیٰ افسر نظر آیا تو وہ تیر کی طرح اس پر چھپا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ”کس نے ہوتم لوگ؟ تمہارے ہوتے ہوئے وہ کیسے غائب ہو سکتی ہے؟“

وہ دینیگ لاؤنچ کے وسط میں کھڑا اتھا اور پولیس آفیسر کا گریبان چھپھوڑ کر پوچھ رہا تھا۔ پولیس آفیسر نے ندامت اور افسوس سے

لیدُس مار زی یے ابھی بیتے نہیں!

نظریں جھکالیں۔ ”سرہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو فردا حقیقی سزا دلوئیں گے۔“

”سزا مائی فٹ!“ وہ اس کو پرے دھیل کر چلایا تھا۔ ”مجھے میری بیٹی کو لے کر آؤ۔ ایسے کیسے وہ کہیں جا سکتی ہے؟“ وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہا تھا۔ لوگ ہجوم کی صورت وہاں کھڑے خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں ندرت بھی تھیں اور سعدی، خین، اسامہ مان کے ساتھ کھڑے شل سے نظر آ رہے تھے۔

ہاشم کو اپنا سرگول گول گھومتا محسوس ہو رہا تھا... رکھیں پھولے سانس کے ساتھ بھاگتا آ رہا تھا... ”سر... سی سی لی وی کیمرے بھی عرصے سے خراب پڑے ہیں، ہسپتال کی بہت سی exits یہں، شاید وہ اب تک پچی کو لے کر نکل گئے ہوں گے۔“ ہاشم تیزی سے آگے بڑھا اور پوری قوت سے ایک مکا اس کے منہ پر دے مارا۔ رکھیں تیوار کے پیچھے کو گرا۔

”مجھے میری بیٹی چاہیے... مجھے میری بیٹی لا کر دو...“ وہ سرخ بھبھو کا چہرے کے ساتھ چلایا تھا۔ دو ساہیوں نے اسے ”آرام سے سر آرام سے“ کہتے کندھوں سے تھام کر دکا، ورنہ وہ شاید رکھیں کے نکلے کر دیتا۔

”کون لے کر گیا ہے میری بیٹی کو...“ چاروں طرف دیکھ کر... اب کے پریشانی اور صدمے سے شکست خور دہ سے انداز میں چلا رہا تھا.... ایسے کون کرتا ہے؟ ہسپتال سے کسی کا پچھہ کون غائب کرتا ہے؟“

اور ندرت ذوالقدر یوسف نے آنکھیں بند کر کے ایسی کرب میں ڈوبی آہ بھری تھی کہ ان کے تینوں بچوں نے ان کے کندھوں اور بازوؤں سے خود کو لگایا تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں ترم تھا، خوف تھا... ہاشم کے لئے... اعمال کے نتائج کے لئے....

”ایسے کون کرتا ہے؟“ ہاشم سرخ لیلی آنکھوں سے ایک ایک کاچھہ دیکھ کر، نوثی دل سے پوچھ رہا تھا... اس کو ابھی تک ساہیوں نے تھام رکھا تھا.... اس کے گارڈ زادھر ادھر بھاگ رہے تھے... فون ملارہ بے تھے.....

”کسی کا پچھا ایسے کون اٹھاتا ہے... بچوں سے کون دشمنی کرتا ہے...“ وہ نہ ہمال سا ایک کرسی پر گر گیا تھا... آنسو اسکے چہرے پر گر رہے تھے اور صدمے سے چور آنکھیں اب بھی ہر طرف دیکھتی تھیں... رپورٹر ز اس سے پوچھ رہے تھے کہ آگ والے واقعے کا ذمہ دار کون ہے.... مگر ہاشم نے سر دنوں ہاتھوں میں گرالیا... اسے معلوم تھا ان غواہوئے پچے واپس نہیں ملتے... اور یہی جان کروہ چھوڑ رہا تھا میں چھپائے ٹوٹا بکھر اسا... رو نے لگ گیا تھا.....

Sonia was all I had! ایسے کون کرتا ہے... وہ بھی دو فقرے دو ہمارا تھا۔ ندرت کے تینوں بچے ان کے مزید قریب ان سے تقریباً پٹ گئے تھے.....

اور شہر کی ایک سنسان خاموش سڑک پر ڈرائیور کرتی ایمن فون پر کسی سے کہہ رہی تھی۔ ”آپ کی مدد کا شکریہ۔ آج ہاشم سے تمام انتقام ہم نے لے لیے ہیں۔ اب آگے...“

فون پکڑے اس کے ہاتھ میں اب وہ ہیرے کی انگوٹھی نہیں تھی۔

.....♦♦♦.....

ہم ملکوموں کے پاؤں تلے..... یہ دھرتی دھڑ دھڑ کے گی

زمرنے لکھر کی کے سامنے سے پردے ہٹائے تو گرم چکلی دھوپ چھن کر کمرے میں گرنے لگی۔ باہر ایک روشن خوبصورت صح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ مسکرا کے گھومی اور فارس کو دیکھا جو آئینے کے سامنے کھڑا اور یہی شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔ گینے بال برش کیئے وہ باہر جانے کے لئے تیار لگ رہا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ وہ اس کی طرف آئی۔ پھر اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی شرٹ کے کھڑے کا لردست کرنے لگی۔

”جاب ڈھونڈنے“، ”زمر نے مسکراہٹ دبا کر مٹکوں نظروں سے اسے دیکھا۔

”پانچ دن بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوئے ہوتا ہر جانے کا اچھا بہانہ ڈھونڈا ہے۔“

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں، اس خدمت کے طفیل جو آپ نے میری بالکل نہیں کی۔“

”اچھا۔ تائی نہیں پہنون گے؟“

”اوہ ہوں!“ اس نے بے نیازی سے کندھے جھکٹے، آئینے میں دیکھ کر بال دوبارہ درست کیے پھر چابی اٹھاتے ہوئے اس کی طرف

مزرا اور مسکرا یا۔ ”اچھی لگ رہی ہو۔“

”تم بھی۔“

”میں کب نہیں لگتا؟“ بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”اچھا مجھ سے وعدہ کرو جب ہم نئے گھر نئی زندگی میں سیٹھیں گے تو تم مجھے ڈرپ لے کر جاؤ گے۔ عرصے سے وہ ڈنرا دھار

ہے تم پہ۔“ ”دیکھی لاچی ہو تم!“ افسوس سے سر جھکتا وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ زندگی نارمل ہو گئی تھی، مگر وہ دونوں کبھی نارمل نہیں ہو سکتے تھے یہ طے تھا۔

وہ پورچ میں آیا تو گھنٹی بجی۔ گاڑی کی طرف جانے کے بجائے وہ گیٹ تک آیا اور اسے کھولا۔ پھر سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھ کر

گھری سانس لی۔ کالے دھوکے میں والا کمرہ... آگ کے شعلے... سب ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔

وہ خاور کا بیٹا تھا اور ملجمی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

اندرو اپس جاؤ تو سعدی کچن کی کول میز پر موجود ناشترے کرتا دھانی دے رہا تھا۔ فارس کو رخصت کر کے زمرا دھر آئی تو اس کے پاس ٹھہر گئی۔

”سعدی!“ زمی سے پکارا تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، بلکہ سامسکرا یا۔ ”جی!“

”تم کیسے ہو؟“

”میں؟“ اس نے گھری سانس لے کر شانے اچکائے۔ ”پہلے غصہ تھا، پھر ڈپریشن، پھر میں نے عدالتی شکست کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔

ان ان کے ہاتھ میں صرف کوشش کرنا ہے کامیابی تو اللہ دیتا ہے۔“

”پھر میری بات مان لو۔ سیو سعدی یوسف چبح کے کچھ مبہر زتم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے مل لو۔“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر

زمی سے اسے سمجھا رہی تھی۔ مگر سعدی نے نہیں میں سرہلایا۔

”میں ان لوگوں کو کیسے فیس کروں گا جنہوں نے اتنے مہینے اپنے جذبات اور آوازیں میری جدوجہد میں انویسٹ کیں؟ میں ہار گیا

ہوں۔ یہ کیسے explain کروں گا؟“

”تم جاؤ تو سہی! ملنے اور بات کرنے سے بہت کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یاد ہے، میں اور تم... ایک زمانے میں بات کرنا چھوڑ چکے تھے۔“

”مگر ہم ٹھیک تب ہوئے جب بات کرنا شروع کی۔“ پھر رک کر بولی۔ ”آئی ایم سوری... ان چار سالوں کے لئے۔“

”نہیں زمر!“ اس نے نہیں میں سرہلایا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خونی رشتؤں کی لڑائیوں اور کٹ آف میں غلطیاں مشترک

ہوتی ہیں۔“ وہ آزر دوگی سے مسکرا دی۔

باہر لان میں واپس آؤ تو وہ دونوں ابھی تک پورچ میں کھڑے تھے۔ نفارس نے اسے بیٹھنے کو کہا، نہ وہ اتنا وقت لے کر آیا تھا۔

”کاردار صاحب کی بیٹی کا کچھ پتہ چلا؟ پانچ روز ہو چکے ہیں۔“

”نبیں!“ فارس جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے، جوتے سے گھاس کو مسلتے ہوئے بولا تھا۔ ”میں نے اپنے تمام اسریث کا نیکش کو تحرک کیا ہے، مگر ڈاکٹرا میں اس کا خاندان اور سونیا تینوں اب تک اس ملک سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ میں اب بھی کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح ہم سونی کو ڈھونڈ لیں۔“

”وہ لوگ تو آپ کے دشمن ہیں۔“

”مگر بیٹیاں سب کی برادر ہوتی ہیں۔“ فارس اس لڑکے کو دیکھ کر رخی سامسکرایا۔ ”خیر تم کیسے آئے؟ والد صاحب ٹھیک ہیں تھا رے؟“ لڑکا چپ ہو گیا۔ پھر سر جھکا لیا۔

”میں چاہتا ہوں آپ میرے ابو کو معاف کر دیں۔“

”معاف!“ فارس نے ایک سرد سانس دھیرے سے خارج کی۔ ”میں لوگوں کو جسمانی اذیت دے کر انتقام لینے کو برا سمجھتا ہوں۔ خاور کے ساتھ یہ سب میں نے نہیں کیا تھا۔ خاور نے میرے بھائی، میری بیوی، زمر... سب کو جسمانی اذیت دی، مگر میں نے اتنا کیا کہ سعدی سے کہا، وہ خاور کو ہاشم سے الگ کر دے۔ اس نے خاور کی نوکری ختم کروادی اور اسے ہاشم کے زیر عتاب لے آیا۔ اس وقت میرا انتقام پورا ہو گیا تھا۔ اب معافی کے لئے کچھ بچاہی نہیں۔“

”پھر بھی....“

”میں دل صاف کرنے کی کوشش کروں گا، لیکن وعدہ کروں تو یہ جھوٹ ہو گا۔ میں اپنے بھائی اور بیوی کی لاشیں نہیں بھول سکتا۔“ اس نے لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ یہ ملاقات ختم ہونے کا عنديہ تھا۔.....

مورچاں کی بالائی منزل تک جاؤ تو اپنے کمرے میں خین اسٹری ٹیبل پیٹھی تھی۔ یہاں کھڑکی سے نیچے لان میں کھڑا فارس دکھائی دے رہا تھا، مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی عزیز کتاب کے صفحے پلٹ رہی تھی... کافی دن بعد خین کو وہ بھاری آبنوی دروازہ دکھائی دیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو وہ کھلتا چلا گیا.....

سامنے تاحد گاہ سنہر اصرحتا، مگر جس جگہ وہ کھڑی تھی وہاں اوپنچ گھنے کھجور کے درخت ہی درخت تھے... نجلستان نے صمرا کی گری اور پیش کو شکست دے دی تھی۔

بڑھا استاد ایک درخت تک بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے چند تختیاں رکھی تھیں جن کے اوپر وہ قلم کو سیاہی میں ڈبوڈ بکر لکھ رہے تھے۔ وہ قدم اس طرف بڑھنے لگی تو انہوں نے سراٹھائے بنا مسکرا کر کہا۔ ”بہت دن بعد آئی ہو۔“

”مگر میں نے یہ دن بے کار نہیں گزارے شیخ!“ وہ ان کے سامنے آئی تھی۔ دوز انو ہو کر۔ وہ سر جھکائے لکھتے رہے۔ ”کیا کیا تم نے ان دنوں میں۔“

”میں نے جو آپ کی کتاب سے سیکھا تھا، اسے اپنی زندگی پر اپاٹی کیا۔ جس علم کو اپاٹی ہی نہ کیا جائے وہ تو ایسے ہے جیسے گدھے پر کتا میں لا دوی گئی ہوں۔ ایسا علم بوجھ بن جاتا ہے۔ میں نے اے شیخ، آپ کی کتاب ختم کر لی اور میں اب اس کے آخری باب کے متعلق بات کرنے آئی ہوں۔“

کھجور کے درختوں کے بچ سر سراتی ہوئی تھیں ہوانے ماحول کو مزید خوشنگوار بنادیا تھا۔ ایسے میں جہاں ہر طرف سیاہ سفید منظر نامہ تھا، وہ نگین دکھائی دیتی تھی۔

”پھر... کیا سیکھا تم نے میری کتاب سے؟“

”میں نے یہ سیکھا کہ ہر انسان vulnerable ہے۔ اس کے اردو گرد کا موسم ایک سانہیں رہتا۔ کبھی موسم بدلتا ہے تو ہوا میں گردش

کرتے مختلف وائرس اسے آکر جکڑ لیتے ہیں۔ ایسے ہی ما جوں بھی بدلتا رہتا ہے۔ نئے ما جوں، نئی یونیورسٹی کالج، نیا موبائل فون، ان سب عناصر کے باعث سے مرض عشق کا دائرہ آن لگتا ہے۔ اس میں اس کا قصور نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کرتا ہے یہاں سے اس کا امتحان شروع ہوتا ہے۔ ”تو تمہارے خیال میں پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟“ درس کا وقت ختم ہو چکا تھا اور امتحان شروع ہو چکا تھا۔ استاد نے تھیات پرے ہتنا دیں اور پوری توجہ سے اس کا جواب سننے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”اے دو کام کرنے چاہیں۔ پہلا غض بصر۔ نظر جھکانا۔ وہ شخص جس کی وجہ سے دل ڈسٹر ب ہے، اس سے اگر کوئی حلال تعلق نہیں ہے تو اسے اپنی زندگی سے نکال باہر پھینکنا۔ سارے تعلق، سارے روابط کاٹ دینے چاہیں۔ پھر اس کی یادوں، اس کی تصویریوں، اس کے میسٹر ای میلز، کسی کو بھی دوبارہ نہ پڑھیں۔ یوں نظر حفظ ہو گی تو دل بھی حفظ ہو گا۔“

”اور دوسرا طریقہ؟“

”صرف نظر کی حفاظت کرنا کافی نہیں۔ دل کا دھیان بھی بٹانا ہو گا۔ عشق عشق کو کاشتا ہے، محبت محبت کو کاشتی ہے۔ آپ کی کتاب کا آخری باب کہتا ہے کہ اپنے دل میں سب سے بڑی محبت... اللہ کی محبت بسائی جائے، وہ ہمارے دل کو اتنا مضبوط کر دے گی کہ ہم اس شخص کی طرف نہیں نکلیں گے۔“

”کیا تمہیں اس بات سے اختلاف ہے؟“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔ لیکن مجھے ایک اعتراض بھی کرنا ہے۔ کئی سال پہلے علیشا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا مجھے خدا سے محبت ہے؟ میں نے کہا تھا، پتہ نہیں۔ آج، اتنی ٹوکریں کھا کر بھی میں نہیں جان سکی کہ اللہ سے محبت کے کہتے ہیں۔ وہ کیسے کی جاتی ہے۔ میں نمازیں پڑھتی ہوں اور لوگوں کو دھوکے ندینے کی کوشش بھی کرتی ہوں، مگر بھی تک میں اللہ تعالیٰ سے وہ محبت نہیں کر سکی جو کرنا چاہیے تھی۔ میں بھتی تھی کہ آخر میں جا کر میں اس محبت کو بکھ جاؤں گی مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اور میں یہی بتانا چاہتی ہوں آپ کو۔ اللہ کی طرف جاتا راستہ بہت طویل ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کے آخر تک پہنچ جائیں، اس کو پار کر لیں۔ ضروری صرف یہ ہے کہ جب ہمیں موت آئے تو ہم اسی راستے پر ہوں چاہے لڑکھڑا رہے ہوں، چاہے گڑ پڑ کر آگے بڑھ رہے ہوں، مگر اس سیدھے راستے پر ہیں۔ اپنے گناہوں کو دلیلیں دے دے کر جسمی فائی ن کرتے پھریں۔ جب دل میں کچھ ٹھنک رہا ہو تو یہ کر کے اپنے اعمال درست کر لیں اور راستہ سیدھا کر لیں۔ ہمارا مستقبل کو راہے، ماضی جیسا بھی داغدار ہو بھلے۔ مستقبل کو ہم اپنی مرضی سے لکھ سکتے ہیں۔“

”اور اللہ سے محبت؟“ انہوں نے یاد دلایا۔ حسین نے گہری سانس لے کر... سراخا کے دور تک پھیلے بھجور کے درختوں کو دیکھا۔

”وہ دیسی نہیں کر سکی جیسے کرنی چاہیے۔ مگر مجھے ان چیزوں سے محبت ہو گئی ہے جن سے اللہ کو محبت ہے۔ مجھے نماز اور قرآن سے محبت ہو گئی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ سے بات کرنا، دعا مانگنا اچھا لگنے لگا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اللہ سے محبت میں دلیوں اور نیک لوگوں جیسی نہ بھی ہو سکی؛ تب بھی میں ایسے اچھے کام کر دیں گی جن سے کم از کم وہ تو مجھ سے محبت کرے گانا۔“ وہ مسکرا کر امید سے کہہ رہی تھی اور شیخ نے بھی اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا تھا۔

بھجور کے درخت غائب ہو گئے۔ اس نے سراخا یا تو دیکھا کمرے میں بیٹھی تھی اور اس نے نیبل پر کتاب کھلی رکھی تھی۔ اس نے صفحے پلنائے۔ پہلے صفحے پر اپس آئی۔ وہاں آج بھی باشم کا ردار کا نام لکھا تھا۔

کینسر ہے تھا ہے وہ بھولتا کبھی نہیں ہے۔ اور بھولنا ضروری بھی نہیں ہے۔ اس نے گہری سانس لے کر کتاب بند کر دی۔ ایک سفر تمام ہوا تھا۔

او ر اہل حکم کے سر اوپر ..... جب بھلی کڑ کڑ کے گی  
قصر کار دار کا لا وَنْخ دو پہر کے باوجود اندھیرے میں ڈوبالگتا تھا۔ کھڑکیوں کے آگے بلاک آؤٹ بلا سندھ زگرے تھے.... گویا روشنی  
کے سارے راستے کاٹ دیے گئے ہوں۔

وہ بڑے صوفے پل مباریٹا تھا۔ رفڑا اور آدمی آستین کی فٹی شرٹ پہنے۔ بڑھی شیوا اور سرخ آنکھیں لئے، وہ چھت پہ چھملاتے  
فانوس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدموں کے قریب ہاتھ باندھے ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کھڑا تھا، اور ساتھ رہیں۔

”وہ ملک سے فرار ہو چکے ہیں۔ مگر ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔ تاوان کے لئے کوئی کاں بھی نہیں کی۔ ان کا مقصد آپ کو اذیت دینا  
تھا۔“ پولیس افسر سر جھکائے ڈرتے اطلاع دے رہا تھا۔ ”اور ہم یہ معاملہ فارس غازی پہ بھی نہیں ڈال سکتے کیونکہ وہ اس وقت زخمی  
حالت میں ہستال داخل تھا.... اور...“

ہاشم نے بے زاری سے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ ”وہ ایسے کام نہیں کرتا۔ بیٹیاں سب کی برابر ہوتی ہیں۔“ سرخ آنکھوں سے اس  
نے پولیس والے کو گھورا تھا۔

”سر، آپ نے بہت غلطی کی۔ اتنے شاطر مجرموں کو ایک کمرے میں بند کر کے آگ لگانی چاہی۔.... انہوں نے جوابی حملہ تو  
کرنا تھا۔“

”بکواس مت کرو میرے سامنے۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا۔ ننگے پیر زمین پا تارے۔

”میں ان میں سے ایک ایک کو دوبارہ اسی طرح جلا کر ماروں گا، اور اگر مجھے سو نیان ملی تو تم لوگوں کے بچے بھی محفوظ نہیں رہیں  
گے۔“ انگلی اٹھا کر وہ اسے تنیسہ کر رہا تھا۔ ”تم لوگوں کو بھی جوز یادہ پیسے دے اس کے ساتھ مل جاتے ہو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ پولیس کے  
ہوتے ہوئے ایک بچی کو وہاں سے نکال کر لے جائے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہو۔ میں صرف سونی کے ملنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر دیکھنا میں تم  
سب کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔“ اسے گھورتے ہوئے وہ جھٹکے سے اٹھا، اور سیرھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سیرھیاں تاریک تھیں، ساری دنیا  
تاریک تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ کار کی چاپیاں ڈھونڈنے لگا۔ روز کی طرح آج بھی اسے شہر کے کونے چھان مارنے جانا تھا۔ میز سے  
چاپیاں اٹھاتے ہوئے وہ رکا۔ وہاں ڈیکھیں فوٹوفریم لگا تھا۔ جس میں تصاویر کا سلائیڈ شو مہم موسیقی کے ساتھ چل رہا تھا۔ ہاشم رک کر دیکھنے  
لگا۔ آنکھوں میں یاسیت سی اتر آئی۔....

اس کے بچپن کی تصاویریں... وہ اور ڈیم..... اسین فورڈ کے دنوں کی تصاویریں... اس کی ڈگری... اور اس پہ بڑا اسَا ”کار دار“ لکھا  
..... ہر دوسری ہر تصویر میں اور انگریزیب اس کے ساتھ تھے.... اس کا شانہ تھکتے، اس کو دیکھ کر مسکراتے.... وہ اسے کہا کرتے تھے، وہی ان جیسا ہے  
.... وہی ان کے کاروبار، ان کی وراثت کا اصل حقدار ہے.... جواہرات بے اعتبار اور شیر و نکما تھا۔ علیشنا کچھ تھی ہی نہیں.... سب ہاشم  
تھا.... ہاشم سنگھال لے گا.... اور اب آہستہ یہ حقیقت اس کے اوپر عیاں ہو رہی تھی کہ اس کی ساری زندگی ایک جھوٹ کے سوا کچھ بھی نہ  
تھی.... ہر وہ شے جس پر اس نے فخر کیا تھا.... جس سے اس نے محبت کی تھی.... کچھ بھی اس کا نہ تھا.... کچھ بھی اس کا نہ رہا تھا.... اس نے آنکھیں  
بند کیں۔ گرم گرم آنسو گال پر لڑھکنے لگے۔

پھر اس نے دراز کھوئی۔ اندر اس کا پسول رکھا تھا۔ اس کی ہرشے کی طرح بیش قیمت اور برانڈ۔ اس نے پسول نکالا اور لوڑ کیا۔

اندھیرا لا وَنْخ میں رہیں اور پولیس آفیسر کھڑے ہیں۔ سر گوشیوں میں سونی کو ڈھونڈنے کے بارے میں بات کر رہے تھے، جب  
انہوں نے وہ ہولناک فائر سنا۔ دنوں نے چونکہ کرس اٹھایا۔

”ہاشم!“ رئیس کے لبوں سے نکلا۔ وہ دونوں دیوانہ دار اور پر بھاگے.... سڑھیاں عبور کیں.... اور کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھولا۔ کمرے کے کونے میں رکھا ایکوریم (جو وہ کئی دن پہلے ادھر لے آیا تھا) چکنا چور ہوا پڑا تھا۔ پانی گر گیا تھا۔ سامنے ہاشم کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

”سر آپ ٹھیک ہیں؟“ رئیس نے بدھوا کی سے پوچھا۔ ہاشم کا درانے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”مجھے کیا ہونا ہے؟ اتنا کمزور نہیں ہوں کہ ہماراں لوں گا۔ میں صرف اپنے بچپن تا وہ کی آخری نشانی ختم کر رہا تھا۔ جو کیا، بالکل ٹھیک کیا۔ وہ بار پھر کروں گا۔ ایک دفعہ مجھے سونی مل جائے، پھر میں سب کو تا وہ کا کہ میری بیٹی کو ایڈ ادینے والوں کے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔ اب چلو،“ گن جیب میں اڑتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ رئیس نے بے اختیار سکون کا سانس لیا تھا۔ آج پھر انہیں شہر کا ہر کوئی رات گئے تک چھانا تھا.... ایکن کے رشتے داروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے گھروں میں دھاوا بولنا تھا، ان کو ہر اس ان کرنا تھا.... وہ کہاں جا سکتی ہے.... کوئی تو تما دے گا۔



جب ارضِ خدا کے کعبے سے سب بت اٹھائے جائیں گے

ایسپر پورٹ پر مختلف اطلاعات کی آوازیں اپنیکر پر گونج رہی تھیں۔ رش کافی تھا۔ آوازیں شور۔ ایسے میں وہ آئی پی لاونج میں ایک صوفے پر نو شیر وال بیٹھا تھا اور بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ سارے میں مجھے میں بھی اکیلا۔

قریب آتے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو سامنے دیکھا۔ سعدی یوسف دہا سے چلا آ رہا تھا۔ سفید شرٹ کے آسمیں کہنوں تک چڑھائے وہ سنجیدہ چہرے اور جھپتی ہوئی نظروں کے ساتھ اس کے عین سامنے آ رکا۔ شیر و بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پیک بلیں پہ بلا یاتم نے نو شیر وال، لیکن میں اس دفعہ گھر والوں کو تبا کرا آیا ہوں۔ ورنہ سکیورٹی سسٹم.....“ نظر گھما کر سی سی ٹی وی کیمروں کو دیکھا۔ اور سکیورٹی الہکاروں کا بھروسہ نہیں ہے مجھے۔ ”پھر اپنی گھڑی دیکھی۔“ میرے پاس صرف دس منٹ ہیں۔ جو بھی کہنا ہے بغیر تمہید کے کہو۔“

نو شیر وال چند لمحے تذبذب سے اسے دیکھے گیا۔ سلک کی گرے شرٹ اور... سیاہ کوٹ پہنئے وہ بال چھوٹے کٹوا کر پہلے سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ ”سو نیا بھی تک نہیں ملی۔“

”مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ ہم بھی تلاش کر رہے ہیں اپنے طور پر جتنا ہو سکا کریں گے۔ اور کچھ؟“ اس کا الجھ پاٹ تھا۔

”سعدی کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟“ وہ ایک دم جذباتی سا ہو کر بولا۔ ”کیا تم مجھے اس بوجھ سے آزاد نہیں کر سکتے؟ میں جیل گیا میں عدالتون کے چکر لگاتا رہا، ہمارا خاندان ٹوٹ گیا، اپنے سوشن سرکل میں میں مذاق بن کر رہ گیا۔ کیا تم میری سزا ختم نہیں کر سکتے؟“ اس کی آواز آخر میں گلوگیر ہو گئی تھی۔ سعدی نے ایک گھری سانس لی، صوفے پر بیٹھا اور اسے اشارہ کیا۔ ”بیٹھو۔“ وہ کسی معمول کی طرح سامنے بیٹھ گیا۔ دم سادھے۔ اب سعدی نے آگے بھکھے، ہاتھ باہم پھنسائے، غور سے اسے دیکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ”میں تمہارا کون تھا نو شیر وال؟“

نو شیر وال سے کچھ بولا نہیں گیا۔

”میں تمہارا دوست تھا۔ جس نے تمہاری جان بچائی تھی۔ جو یونیورسٹی میں تمہاری ہر طرح سے اخلاقی طور پر مدد کیا کرتا تھا مگر تم نے پہلے مجھ سے لڑائی کی، پھر مجھ سے حسد شروع کیا۔ کیا تھا اگر تم اس بات کو پریشیت کر لیتے کہ ایک مذل کلاس کا لڑکا اتنا پر اعتماد ہے مگر تم جلنے لگے۔ تم نے ہر موقع پر مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ لوگ کہتے ہیں پہلا قل قل عورت پر ہوا تھا۔ غلط کہتے ہیں۔ پہلا قل حسد کی وجہ سے ہوا تھا۔

قابل نے تب نہیں مارا ہائیل کو جب یہ فیصلہ ہوا کہ ہائیل اس لڑکی سے شادی کرے گا جس سے قابل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تب مارا اسے جب اللہ نے ہائیل کے حق میں فیصلہ دیا۔ پہلے اس کا ہائیل سے مقابلہ تھا۔ اب وہ ہائیل سے جیلیں ہوا تھا۔ تم نے جب مجھے مارنا چاہا تو میں نے وہی کہا جو ہائیل نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ میں تم پر ہاتھ نہیں انھاؤں گا۔ لیکن تم نے مجھے گولیاں ماریں مجھے بوٹ مارے۔ کیا میں وہ بھول سکتا ہوں؟ ”شیر دا چہرہ جھک گیا۔ کان گلابی پر پڑ رہے تھے۔

”جب میں قید سے رہا ہو کر آیا تو روز سوچتا تھا، کیا میں وہ بھول سکتا ہوں؟ تمہیں معاف کر سکتا ہوں؟ پھر مجھے احساس ہوا کہ ہاں میں یہ کر سکتا ہوں۔“

نوشیر وال نے مجھکے سے سراخایا اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ پر پیش نگاہوں سے اسے دیکھتا کہہ رہا تھا۔

”تمہیں گلتا ہے کہ میں اتنا بے رحم اور انقاوم میں اندھا ہو گیا تھا کہ ہر قیمت پر تمہاری پھانسی چاہتا تھا؟ نہیں نوشیر وال حالانکہ قصاص میرا حق تھا، مگر میں چاہتا تھا تم اصلاح کرو۔ تم نے زمر کو بھی بچایا، تم اپنی معافی، اپنی نجات کہاں کہاں نہیں ڈھونڈتے رہے، مگر تم میرے پاس نہیں آئے۔ تم آتے بھی تو میں تمہیں معاف نہ کرتا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا تم دنیا کے سامنے مانو عدالت میں اعتراض کر دیا عدالت اس بات کو مانے کہ میں حق کہہ رہا تھا۔ اگر تم اصلاح چاہتے ہو تو مان لیتے، یا اپنے بھائی کو روکتے کہ مجھ پر اور میرے خاندان پر کچھ زنا چھالتا رہے، مگر تم خاموش رہے۔ تم برادر ان یوسف کی طرح سمجھتے ہو کہ ”اس گناہ کے بعد، تم نیکو کارہو جائیں گے“، الاطریقه درست ہے۔ نہیں نوشیر وال اصلاح کے سفر کی بنیاد جھوٹ پر نہیں رکھی جاتی۔ حق پر رکھی جاتی ہے۔ عدالت میں جھوٹ کو بڑے جھوٹ سے بے شک ہرایا جائے مگر زندگی میں جھوٹ کو حق سے ہی ہر انداز چاہیے۔“

”میں اعتراض کرتا تو مجھے پھانسی ہو جاتی!“ وہ دبادبا سا چیختا تھا۔ آنکھیں پھر سے گلابی پر نگلی تھیں۔

”میں نے کہانا، میں فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر تم اعتراض کرو یا اگر عدالت تمہیں مجرم مان لے تو میں بھی تمہیں معاف کر دوں گا۔ مگر تم اصلاح والی زندگی نہیں چاہتے تھے۔ تم صرف زندگی چاہتے تھے۔ تم ایک دفعہ اعتراض کر کے تو دیکھتے۔ میں خود سارے الزام واپس لے لیتا۔ ایک دفعہ پھر تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔ میں صرف اس ملک میں ایک precednet ایک کرنا چاہتا تھا کہ ہاں طاقتور بھی قانون کے ہتھوڑے سے آسکتا ہے مگر تم بزدل نکلے۔۔۔۔۔ وہ سپاٹ انداز میں کہتا انداز کھڑا ہوا۔ ”اس لیے میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گا۔ میں وہ تین گولیاں بھی بھول سکتا ہوں مگر تم نے ایک زخمی پڑے دوست کو بوٹ سے ٹھوکریں ماری تھیں۔ میں وہ نہیں بھول سکتا۔“ پھر رک کر بولا۔ ”ہائیل کو مارنے کے بعد قابل کو پھانسی نہیں دی گئی تھی۔ مقدس کتابوں میں آتا ہے کہ اس کے ماتھے پر خدا تعالیٰ نے ایک مہر لگادی تھی اور بنی نوع انسان پر اس کا قتل حرام کر دیا تھا۔ وہ ساری عمر اس نشان کو لئے بھکلتا رہا، مگر لوگ اس کو اس نشان کے سبب بہچان لیتے اور اس کو قتل نہ کرتے۔ وہ سینکڑوں سال زندگی کی قید میں رہا۔ ہر قابل کا مرنا ضروری نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں تم بھی قابل کی طرح سمجھتے رہو۔ کیونکہ ہاشم پھر بھی اپنے پیاروں سے ملختا ہے۔ ان کو مار سکتا ہے، ان کو جلا سکتا ہے، قید کر سکتا ہے، مگر ان کو دھوکہ نہیں دیتا ہے۔ تم نے تو ہاشم کو بھی صرف استعمال کیا۔ ہر قابل کا مرنا ضروری نہیں ہوتا شیر دا،“ وہ رکا اور تھیج کی۔ ”مگر تمہارا نام نوشیر وال ہے!“

سعدی یوسف نے ایک ملائی نظر اس پر ڈالی اور مزگیا۔ نوشیر وال بھی آنکھوں سے اس کو دور جاتے دیکھتا رہا۔ اپنے ماتھے پر لگی دیکھتی مہر کو وہ ابھی سے محسوس کرنے لگا تھا۔



ہم اہل سفا مردود درج ..... مند پہ بٹھائے جائیں گے  
اور اسی وقت تصریح کاردار میں بنے جواہرات کے پریش کمرے میں کوئی اور بھی حساب کتاب لینے بیٹھا تھا۔  
وہ کھڑکی کی طرف رخ کیے بیٹھی، چنے کی صورت بذریعہ گرائے، درشتی سے پیچھے کری پہ بیٹھے ہارون سے کہہ رہی تھی۔ ”کیوں آ جاتے ہو ہر روز مجھے کچو کے لگانے؟“

”تمہاری ملازمت مجھے آنے دیتی ہے۔ میں کیا کروں؟“ وہ ناگزین پناگ جمائے تھری پیس میں ملبوس تھے۔ اس بات پر مسکرا کے شانے اپکاتے بولے تھے۔ ”اور پھر مجھے اچھا لگتا ہے تمہارے ساتھ بیٹھ کر آبی کو یاد کرنا۔ ویسے کیا اب احساس ہوا ہاشم کو کہ کسی کی بیٹی کو چھیننا کیسا ہوتا ہے؟“

”ہونہہ۔“ وہ تنخی سے نہیں۔ ”جیسے تمہیں اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ ہرگز نہیں۔ کسی کو اپنی اولاد سے اتنی محبت نہیں ہو سکتی جتنی مجھے اپنے بیٹوں سے ہے۔“  
”ہر کسی کو اپنی اولاد پیاری ہوتی ہے جواہرات۔ مجھے بھی تھی۔“ وہ درشتی سے بات کاٹ کر بولے تھے۔ ”مگر میں ہاشم کی طرح دیوانہ وار ایک کا گریبان نہیں پکر سکتا تھا۔ میں تم لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود کو مزید طاقتور بنانا چاہتا تھا تاکہ کبھی تو تم سے انتقام لے سکوں۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا آبی کے ساتھ۔ ہاشم نے کیا جو بھی کیا۔“

”تم نے اور بہت کچھ کیا ہے۔ پہلے میری بیوی پہ الزام لگایا، اس کا سکینڈل بنوایا، میں نے اسے قید میں ڈال دیا تو تم اس کو نکال کر لے گئیں۔ تم نے میری بیوی کو مردا لیا، اس کے زیر ہتھیا لئے۔ وہ antique نادر جیولری.... اس کی وجہ سے میری بیٹی تباہ ہو گئی۔“ وہ کہہ رہے تھے اور ایک ایک لفظ میں درد سaba تھا۔ ”میں اسے کبھی وقت نہیں دے سکا۔ وہ موت سے obsessed ہوتی گئی۔ میں نے اس کی حفاظت کرنی چاہی، اس کو بادھی گارڈ خرید کر دینا چاہا۔ مگر کوئی میرے اشارے پر نہ چلا۔ نہ تم لوگ نہ مزا اور فارس۔ یہاں تک کہ ہاشم نے اسے چھین لیا۔“

”چلے جاؤ تم یہاں سے۔ میری... میری۔“ وہ نہ یا نی انداز میں چلانے لگی۔ ”اس آدمی کو نکالو یہاں سے۔“ مگر وہ خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور کوٹ کا بیٹن بند کرتے ہوئے بولے تھے۔ ”ایک دفعہ پھر... تمہاری حالت پر بہت افسوس ہوا جواہرات!“  
باہر آ کر کار میں بیٹھتے ہوئے ہارون عبید نے موبائل نکال کر اسی میلز کھولیں تو تیسری میل دیکھ کر لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انہوں نے اس میں موجود نمبر دیکھ کر اس کو کال ملائی۔ تھوڑی دربعدو فون میں کہہ رہے تھے۔

”آپ کو بقا یا قم، آسٹریلوی شہریت، اور سفری دستاویزات آج مل جائیں گے ڈاکٹر ایمن۔ اس رات آپ نے مجھے کال کر کے اپنی زندگی کا سب سے بہترین فیصلہ کیا تھا۔“ پھر رک کر سننے لگے۔ ”بے فکر ہیں۔ پس کہاں ہے، زندہ بھی ہے یا نہیں؟ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ اس رات کے بعد سے میرا مسئلہ ہے۔“ اور مسکرا کے فون بند کر دیا۔

سیاہ شیشوں والی کار تیزی سے سڑک پہ دوڑتی رہی اور وہ زخمی مسکراہٹ کے ساتھ باہر دیکھتے رہے۔

..... ♦♦♦ .....

سب تاج اچھائے جائیں گے ..... سب تحت گرائے جائیں گے

رات گھری ہو رہی تھی اور شہر کی ایک پر رونق سڑک پہ ہاشم کی کار دوڑتی جا رہی تھی۔ وہ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر دیوان نظر وہ سے دیکھ رہا تھا۔ ریس کار دڑا بیجو کرتے ہوئے اس کو سو نیا کے اغوا کی تفتیش کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا۔ مگر وہ بس دکھی نظر وہ

سے باہر دیکھے جا رہا تھا۔ شہر و شہیوں سے منور تھا دنیا اس کی ذہنی حالت سے بے نیاز اپنی روشنی پر چل رہی تھی، بہرہ رہی تھی، جل رہی تھی، اور وہ کتنا پیچھے رہ گیا تھا۔ زندگی میں ایک ہی طبقہ پر چلا تھا۔ سونیا... اور اس نے اسے بھی کھو دیا تھا۔ وہ کہاں جائے وہ کیا کرے؟ وہ آنکھیں بند کر کے کپٹیاں سہلانے لگا۔

کار رکی تو اس نے چونک کے سر اٹھایا۔

”سرپیاس مار کیتھ میں ڈاکٹر ایمن کے بھائی کی شاپس ہیں۔ میں بندے لے جا کر ان سے ذرا..... بات کرتا ہوں۔ آپ بیٹھیں۔“ مجھے آپ کی طبیعت تھیک نہیں لگ رہی۔“ ہاشم نے محض سر ہلا دیا۔ اور سر ہاتھوں میں گرا کے وہیں بیٹھا رہا۔ آگے پیچھے رکتی گاڑیوں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر گارڈز کے دور جانے کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ وہ آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔

”ٹھک ٹھک!“ شیش کھٹکا تھا۔ اس نے بے زاری سے آنکھیں کھولیں اور گردن موڑی۔ کھڑکی پا ایک شخص جھکا ہوا تھا اور اسے باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔ گول چشمے والا شخص.... وہ اسے فوراً پہچان گیا تھا۔ یہ ہی تھا جو ہر روز عدالت آیا کرتا تھا۔ ہاشم ایک جھکٹے سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ پھر اچنہ سے اس کے ساتھ کھڑے دوافر ادکود یکھا۔

”جی؟“ ٹھک ٹھک آواز میں پوچھا۔

”ہاشم کا ردار.... آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔“

”آہاں.... مگر کیوں؟“ اس کا ما تھا ٹھکا۔

”ہمیں آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔ آپ کو ہمارے آفس آنا ہو گا۔“ چشمے والا بے تاثر انداز میں کہہ رہا تھا۔ اندھیرے میں کار کے ساتھ کھڑے ان تینوں کو اس نے مشکوں نظر وہ سے دیکھا۔

”کون ہوم لوگ؟“

چشمے والے نے اپنے کوٹ میں ہاتھ دالا اور ایک نجی بمع کارڈ کے اس کے سامنے لہرا یا۔ ہاشم کے جیزے کی رگیں تن گئیں۔ اس نے ٹھوک لگا۔

”سو... تم لوگ سرکاری خفیہ ایجنسی کے آفیسر ہو۔ گذ۔ گذ۔“ اس نے کمال ضبط سے سر کو دو تین دفعہ اثبات میں ہلا یا۔ ”مجھ سے کیا بات کرنی ہے۔“

”مسٹر کاردار، آپ کے خلاف terror financing کے الزام ہیں۔ ہمیں آپ سے اس حوالے سے بات کرنی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ اپنی بیٹی کے لئے کافی پریشان ہیں مگر وہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں آپ کو پیاس سے لے جانا ہے۔۔۔“

”پہلی بات۔ مجھے اریست وارنٹ وکھاؤ۔“ وہ انگلی اٹھا کر جختی سے تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وسرا..... میں امریکی شہری ہوں، میرے پاس مرینڈا رائیٹس (خاموش رہنے کے حقوق) ہیں۔ میں اپنے وکیل کی موجودگی کے بغیر کچھ نہیں کہوں گا۔ تیرسا! مجھے اپنی ایمیجی کا کال چلنے کے لئے تیار ہوں اگر تم مجھے اپنے وکیل کو کال کرنے دو اور ہاں میں ہتھکڑی نہیں لگواؤں گا۔ کوئی مجھے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“

”مسٹر کاردار!“ چشمے والا دو قدم آگے آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہم آپ کو گرفتار نہیں کرنے آئے۔ ہم ایجنسی کے لئے کام کرتے ہیں۔ پولیس گرفتار کرتی ہے، ہم صرف انکو اکھرتے ہیں۔ کیونکہ ہم وکیلوں، عدالتوں اور سفارت خانوں کے جنبدشت میں نہیں پڑتے! ہمارے ہاں ملزم نہیں ہوتے، صرف مجرم ہوتے ہیں۔ اور ہم.... مجرم کو... صفائی کا حق.... نہیں دیا کرتے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہاشم کو گریبان سے پکڑا، گاڑی سے لگایا، دوسرے آفیسر نے اس کا جبر اور خموڑا، پھر اس کے بازو پیچھے لے جا کر زبردستی کلا یاں قریب لے کر آیا۔

اور ان میں ہنگڑی ڈال کر کلک کے ساتھ بند کی۔ ہاشم سرخ پوتا چور لئے ضبط سے کہرا رہا تھا۔ مجھے اپنی ایکسی کو کال کرنی ہے۔ میں اپنے رائیس جانتا ہوں۔“

”ہاشم کاردار....“ اس نے ہاشم کے کان کے قریب جا کر کہا۔ ”آج سے آپ ایک منگ پرسن ہیں۔“ اور دوسرے نے اس کے منہ پر سیاہ بیگ گردایا۔ ساری دنیا جیسے بھگتی تھی۔ اندھیرا۔ ستاریکی۔ ہر سوتاریکی۔.....

انٹر گیشن روم میں چھت پر ایک تیز۔ سورج جیسی تیز اور آگ جیسی جھلساتی روشنی والا بلب جھول رہا تھا۔ باقی کمرہ اندھیرے میں ڈوبتا تھا۔ ایک میز بچھی تھی جس کے اوپر ہاشم بیٹھا تھا۔ کہیاں میز پر جمار کی تھیں اور وہ چند ہیائی ہوئی آنکھیں مل رہا تھا۔ سامنے چشمے والا آفسر بیٹھا تھا، مگر اس نے چشمہ نہیں پہن رکھا تھا۔ وہ ایک کھلی فائل کو دیکھتے ہوئے کڑے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”تم نے ہاشم کاردار کوثر میں آن ریکارڈ عسکری گروپس کے بارے میں ایسی معلومات دی ہیں جو ہیجنون ہیں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوئیں وہ بتیں اگر تم ان کا حصہ نہیں ہو تو؟“

ہاشم نیک لگا کر بیٹھا اور نفی میں سر ہلا کا۔ ”اپنے وکیل اور ہائی کمشنر کی غیر موجودگی میں میں ایک لفظ بھی نہیں بولوں گا۔“

”تم نے شوال کی مسجد کے نیچے واقع عسکری ٹریننگ سینٹر کا ذکر کیا تھا۔ وہ انتہائی حساس معلومات تمہیں کیسے ملیں؟“ پھر وہ آگے ہو کر طنز سے بولا۔ ”کیا تم نے غلطی سے بول دیا تھا۔“

”Oops!“ ہاشم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شانے اچکائے۔ وہ بہت ڈھیٹ تھا۔ آفیسر مسکرا یا۔

”ہم شروع لائیٹ ٹارچر سے کرتے ہیں!“ بلب کی طرف اشارہ کیا۔ (جس سے ہاشم کے سر میں درد ہونے لگتا تھا) مگر وہ ضبط سے مضبوط اعصاب کا مظاہر کرتا بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ ”پھر مختلف اقسام کے ٹارچر ز اپلائی کرتے ہیں۔ کچھ نہیں بولو گے تو کسی بے نشان قبر میں دفننا آئیں گے۔ لیکن اب تم سورج نہیں دیکھ سکو گے کاردار۔“

”مجھے چوپیں گھنٹے کے اندر عدالت میں پیش کرنا ہے تمہیں۔“

”تمہارے پاس فی الحال ایسا کوئی حق نہیں۔“

”ہے۔ میرے پاس خاموش رہنے کا حق ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا تھا۔ ”میں امریکی شہری ہوں، میرے پاس مرینڈر ایمیٹس ہیں اور میں پاکستانی شہری بھی ہوں، میرے پاس آرٹیکل تیرہ موجود ہے۔“

”تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم نے کوثر میں بہت کچھ بولا ہے۔ اپنے منہ سے تم نے اپنے لیے لگڑھا کھودا ہے۔“

”تب میں ملزم نہیں تھا۔ اب ہوں۔ تب میرے پاس خاموشی کا حق نہیں تھا۔ اب ہے۔“ ہاشم نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ ”جب بھی کوئی انسان ملزم بنتا ہے تو یہ حق اس کو فوراً مل جاتا ہے اور ....“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ لب کھل گئے۔ آنکھوں میں شاک سا ابھرا۔...“ انہوں نے مجھے میرا حق نہیں استعمال کرنے دیا۔ اسی لئے ....“ وہ چونکا تھا۔ ایک دم سے سارے پرzel حل ہو گئے تھے۔

..... ♦ ♦ ♦ .....

بس نام رہے گا اللہ کا

وہ اپنے سرونٹ روم سے خاموشی سے نکلی اور بلی کی چال چلتی ہوئی گھر کی پچھلی سمت جانے لگی۔ آج اسے درخت پر چڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف انیکسی کے عقب میں موجود پرانا چھوٹا دروازہ کھول دیا تو دیکھا۔ وہ سرخ مفلر اور ہے سامنے کھڑا تھا، اور جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھتے تھے۔

”میرے پیسے لائے ہو؟“ ملازمہ نے اشتیاق اور دلچسپی سے پوچھا۔ اس نے پیٹ کی جیب سے خاکی لفافہ نکالا اور اس کی طرف

بڑھایا۔ ”گن لو۔ پورے ہیں۔“

وہ لفاف تھا تھے ہوئے مسکرائی۔ ”مجھے تمہارا یقین ہے، فارس! تم میرے مالکوں جیسے نہیں ہو۔“ اور یہ کہہ کر فینونا نے گردن موڑ کر دور نظر آتے قصر کاردار کو دیکھا۔

سرخ مفلرو والا شخص دو قدم قریب آیا تو اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں واضح ہوا۔ وہ زخم انداز میں مسکراتا ہوا فارس تھا۔ ”تھیک یو فینونا۔ تم نے میری بہت مدد کی۔ تم نہ ہوتی تو میں سعدی کا پاسپورٹ ہاشم تک نہ پہنچا سکتا، اور پھر مجھے اس کے لाकر سے اس کے قبیلی کاروباری کا غذکون لا کر دے سکتا تھا بھلا۔“

”میں نے یہ سب صرف پیسوں کے لئے کیا ہے فارس۔ میری کے ہوتے ہوئے میں یہاں راج نہیں کر سکتی تھی، میں نے جان لیا تھا۔ اور اب....“ اس نے لفاف اٹھا کر دکھایا۔ ”میں اپنے ملک واپس جا رہی ہوں، اور وہ کیا کہا تھامنے کیا ہے میرے نام کا مطلب؟“ ”فینونا... یعنی گوری خوبصورت لڑکی۔“ وہ مسکرا کے بولا۔

”ہاں، اب میں اپنے نام کی طرح خوبصورت زندگی گزاروں گی۔ اور میں کوشش کروں گی کہ مسز کاردار کی طرح نہ بن جاؤں۔“ ”بیسہ ختم ہو جاتا ہے فینونا، اچھے کام باقی رہتے ہیں۔“ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میں چلتا ہوں۔ زمر نے نئے گھر میں سب کو ڈز پر مدعا کر رکھا ہے اور میں لیٹ نہیں ہونا چاہتا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ بون وو اتنج۔“ مسکرا کے ہاتھ اٹھا کر الوداع کہتا وہ مژگیا۔ پھر اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے دور جاتا گیا۔ وہ مسکرا کے اسے دیکھے گئی۔ بالآخر وہ اب اس اونچے محل اور اس کی سازشوں سے آزاد ہونے جا رہی تھی.....

اور اندر گیشن روم میں بیٹھا شام جیسے کسی خواب سے جا گا تھا۔ ایک دم چونک کرتقیشی افسر کو دیکھنے لگا۔ ”انہوں نے مجھے میرا خاموشی کا حق استعمال نہیں کرنے دیا۔ میں مجرم تھا، سعدی کے اغوا کا، مگر انہوں نے مجھے نامزد نہیں کیا، کیونکہ جس لمحے میں ملزم بنتا میں خاموش ہو جاتا....“ وہ خواب کی کیفیت میں بول رہا تھا۔ ”میں اپنا وکیل کر لیتا۔ مگر وہ چاہتے تھے.... کہ میں بولتا ہوں۔“ گویا کرنٹ کھا کر اسے دیکھا۔ ”وہ تم نہیں تھے۔ تم نے مجھے سعدی کا پاسپورٹ نہیں دیا تھا۔ وہ گنم میسپھر کرنے والے... وہ تم نہیں تھے.... وہ... وہ فارس تھا۔ ذیم اٹ۔ اس نے مجھے سیٹ آپ کیا ہے۔“ اس نے بے لبی بھرے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔

”کاردار، تمہاری ٹوئیس کو بھی ہم نے decrypt کر لیا ہے، تمہاری وہ رینڈم نمبرز والی ٹوئیس ہر دہشت گردی کی واردات کے بعد آتی تھی، اور وہ خفیہ کو ڈز پر مشتمل ہوتی تھی۔ اور جواب میں ایک معروف عسکری ونگ کا سربراہ شوال سے ٹوئیٹ کیا کرتا تھا، وہ بھی اسی شفت سائفر پر مشتمل ہوتی تھیں جو تم استعمال کر رہے تھے....“

”ذیم اٹ میں نے کوئی ٹوئیس نہیں کیں۔“ اس نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔ ”دیکھو وہ مجھے پھنسا رہا ہے۔ اس نے بولا کہ وہ میرے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے، میں صرف اسکے کہے پر عمل کر رہا تھا۔ میں کسی کو ڈز کے بارے میں نہیں جانتا۔ اور ذیم اٹ!“ اس نے پیشانی انگلیوں سے دبائی۔ سر پر جھوٹا تیز بلب.... ار گر دکا اندھیرا۔ اس کا سر پھٹنے کو تھا....

”تم نے دہشت گروں کے بارے میں جو بتیں کہیں وہ حق تھیں، مگر ہم جانتے ہیں کہ سعدی اس وقت سری لنکا میں تمہاری قید میں تھا۔ سارا ملک جانتا ہے۔ تو پھر وہ معلومات تھیں کون دیتا رہا۔“ وہ بے تاثر انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”وہ.... وہ سب جھوٹ تھا۔ سعدی دہشت گروں نہیں ہے۔ وہ تو میں اس کو پھنسانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ نہیں نہیں میری بات سنو.... یہ سب غازی نے کیا ہے۔ اس نے مجھے پھنسایا ہے۔ تمہیں... تمہیں وہ پہلے دن سے جانتا تھا۔ تمہیں اس نے بولا تھا کہ عدالت میں آہ، اور دیکھو ہاشم کیسے حاس معلومات آن ریکارڈ کہتا ہے۔ ذیم اٹ۔“ وہ چکرا کے رہ گیا تھا۔

”ہمارے پاس وارث غازی کے لیپٹاپ کی فائلز بھی ہیں اور ایک میموری کارڈ اور بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا فرنٹ میں کرنل خاور ایک اعلیٰ فوجی افسر اور اس کے خاندان کی بلاکت میں ملوث تھا۔ جانتے ہو یہ کتنے سگین جرائم ہیں؟“  
مگر ہاشم پیشانی پکڑنے لئی میں سر ہلا رہا تھا۔ ”اس نے مجھے ٹریپ کیا ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ لائٹ بند کرو۔ میں کچھ نہیں بولوں گا...“ وہ آخر میں چلا یا تھا۔ سارے جسم پر پسینہ آ رہا تھا اور دماغ درد سے پھٹنے کو تھا.....

❖❖❖

جو غائب بھی ہے حاضر بھی ..... جو ناظر بھی ہے منظر بھی

وہ پنگلہ چھوٹا سا، خوبصورت ساتھا اور اسکے لان میں ایک اوپنچا سا پائل پام کا درخت لگا تھا۔ فارس نے کارروکی مسکراتے ہوئے میردن مفلتر اتارا، اور تہہ کر کے ڈیش یورڈ کے اندر رکھ دیا۔ یہ اس نے وارث کے اس سوئٹر سے کاٹ کر بنایا تھا جو جبل میں امل اور سارے اسکے لئے لائی تھیں۔ اس کا اون اسے وارث کی یاد دلاتا تھا۔ اور اتنے مہینوں سے ہاشم کے خلاف شطرنج کی ایک ایک چال چلتے ہوئے یہ پہن کر اسے لگتا تھا، وہ اس قرض کو اتار رہا ہے جو وارث اس کے اوپر چھوڑ گیا تھا۔ آج سارے قرض اتر گئے تھے۔ سارے حساب پورے ہو گئے تھے۔  
گھر کے اندر جا بجا پیک شدہ کارٹن رکھے تھے۔ ندرت اور حنہ سارا دن کام کرواتی رہی تھیں۔ اور اب کھانا کھایا جانا تھا۔ ڈائینگ

ٹیبل تک آیا تو زمر کھانا لگا پکی تھی اور سب نشستیں سنجالے بیٹھے تھے۔

”اتنی دیر گا دی۔“ زمر نے آنکھوں میں نگلی لئے گھورا۔

”نور کی کی تلاش میں نکلا تھا، دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔“ وہ خونگوار انداز میں کہتے ہوئے کری کھنچ کر بیٹھا۔ ندرت نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

”اتنا مسکرا کیوں رہے ہو؟“ (فارس نے فوراً منہ سیدھا کیا۔)

”نہیں تو۔“ اور سبیڈہ شکل بنائے پلیٹ میں کھانا نکالنے لگا۔ زمر نے ایک گھری نظر ڈالی، پھر میز کو دیکھنے لگی۔ سب کھانا شروع کر چکے تھے۔ اسے خیال آیا کہ پانی نہیں رکھا۔

”میں پانی لاتی ہوں۔“ وہ انھی اور پانی لا کر رکھا۔ پھر دیکھا نشوندار۔ دوبارہ انھی اور ٹشوکا ڈب لاء کر میز پر سجایا۔ پھر کسی اور خیال سے انھی۔

”بیٹھ جاؤ زمر!“ ندرت نے ٹوکا تھا۔ ”گھر کی مالکن کا کام کھانے کے دوران میز سے بار بار انھنہا نہیں ہوتا۔ اس کا کام ہے کھانا بنانا، اور کھانا لگانا۔ چاہے مہمان ہوں، گھروالے یا سرال والے، اگر تم کھانے کے دوران بار بار انھوں کر تازہ چکلے لا کر دو گی یا ان کے سخنے اٹھاؤ کی تو تمہاری تو آہستہ آہستہ ڈائینگ ٹیبل سے جگہ ہی ختم ہو جائے گی۔ ان کو تمہارے بغیر کھانے کی اور تمہیں انھانے کی عادت پڑ جائے گی۔ عادتیں عورتیں خود بگاڑتی ہیں اور پھر جب سرال والے سرپہ چڑھ کرنا پنچ لگتے ہیں تو شکایت کرتی ہیں۔ نئے گھر، نئی زندگی میں سیٹل ہونے کے بعد لڑکیوں کو بہت اچھا بننے اور جی حضور کر کے بڑھ چڑھ کر خدمت کرنے کی بجائے صرف اتنا کام کرنا چاہیے جتنا وہ اپنے گھر میں کرتی تھیں، کیونکہ وہ اتنی ہی ذمداری آگے بھی نبھا سکتی ہیں۔ ذمداری اتنی لوثتی نبھا سکتی ہو۔“ زمر آہستہ سے واپس بیٹھ گئی۔

”بس کر دیں امی۔ آپ پر یہ مخلصانہ مشورے سوٹ نہیں کر رہے۔“ حنین نے بے زاری سے لفہد دیا۔ اور ندرت نے صرف گھورا۔ (پر ایسا گھر دیکھ کر جو تھے تک ہاتھ لے جانے سے خود کو روکے رکھا۔)

کھانا خونگوار احوال میں کھایا گیا۔ سارے دورانیے میں فارس کے لبوں پر مسکراہٹ ریٹھتی رہی۔ ساری ادا کاری ایک طرف، وہ اس مسکراہٹ کو نہیں چھپا رہا تھا۔

ایڈس مارنے پے ابھی بیٹے نہیں!

کھانے کے بعد سیمٹی وی لاؤخ میں زمر فارس کاٹی وی دیکھنے چلا گیا۔ (بڑے دن سے گھر سے وہ شیطان کا ذہبے غائب تھا تو یہاں تی وی دیکھنے میں مزا آ رہا تھا۔) ابا کو بھی ساتھ لے گیا۔ ندرت نماز پڑھنے کرے میں چلی گئیں۔ اور وہ چاروں میز پر بیٹھنے رہ گئے۔ سو بیٹھ دش کھائی جا چکی تھی اور وہ یونہی بیٹھنے تھے۔

”آج میں نو شرداں سے ملا۔“ سعدی نے خالی کپ میں چیخ ہلاتے سراہما کر کھا۔ ساتھ بیٹھی خین نے جہاں چونک کے دیکھا وہیں سامنے بیٹھے زمر اور فارس رنگی حلقہ انہوں نے۔

”فکر نہ کریں۔ وہ بس معافی مانگ رہا تھا۔ وہ امر پکھے حارہا تھا۔ حال مل گئی سے اسے ادھر۔“

”تم نے کہا کہا۔“

”میں اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ سوری۔ مگر میں خود کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اللہ قرآن میں کہتا ہے، وارثوں کو خون معاف کرنے کے لئے مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو پھر میرا اپنا خون تھا۔“ اس نے سادگی سے شانے اچکائے۔ سب خاموش ہو گئے۔

اگر عدالت اس کو سزا دے دیتی، تب تم معاف کر دیتے اے؟“ زمر نے زمی سے بوجھا۔ سب غور سے سعدی کو دکھرے تھے۔

"جی۔ میں تارہتا۔ مجھے یقین تھا کہ عدالت میرے حق میں فیصلہ دے گی۔ لیکن شادی ہمارا کیس کمزور تھا۔" پھر شکوہ کنان نظر دوں

سے زمر کو دیکھا۔ ”میں آپ کو کہتا رہا کہ کیس پاٹھ کے خلاف ہونا جائے۔ مگر آپ لوگوں نے مجھ کی باتیں نہیں ہانی۔“

”میں نے تو صرف مشورہ دیا تھا۔“ فارس نے کان کھجاتے ہوئے کندھے ادکا کئے۔

”اگر ہمارے پاس وہ فائلز ہوتیں، جنہی کامیوری کا رہ ہوتا، یاہم کو میرا پاس پورٹ نہ ملتا تو ہمارا کیس کمزور نہ ہوتا۔“ وہ افسوس کر رہا تھا۔ خین اور فارس نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور زمر نے باری باری ان دونوں کو پھر سعدی کو خنا طلب کر کے بولی۔

”ویسے سعدی.... غلطی تمہاری ہے۔ پاکستان آرہے تھے تو کسی کو اپنی فلاجیت کا علم نہ ہونے دیتے۔ اس کو معلوم تھا تمہاری فلاجیت کا اسی لئے تو اس نے تمہارا اسمیورٹ حرم الہا۔“

”کسی کو بھی میری فلائیٹ کا علم نہیں تھا زمر۔“ وہ تناک کر بولا۔ ”کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں آ رہا ہوں، سوائے...“ اور وہ بولتے دلتے رک گیا۔ چونک کے فارس کو دیکھا۔ ”آپ کو معلوم تھا۔ صرف آپ کو۔“ نہیں نے گڑ بڑا کے اور زمر نے بڑے مزے سے مسکرا کے ات کیا۔ فارس شدید غیر آرام دہ ہوا۔ کرسی پر پہلو بدلا۔

”ہاں تو؟“

”اور سعدی...شاید فارس نے ہی تمہیں کہا تھا کہ تم افغانستان کے راستے آؤ۔ ہے نا؟“ زمر مخطوط انداز میں مسکراہٹ دبائے بولی تھی۔ فارس نے بے لینی سے اسے دیکھا۔ (یہ جانتی تھی؟) مگر سعدی سن بیٹھا تھا۔

”اور وہ فائلز... اور میموری کارڈ... وہ تو کسی چھوٹے، موٹے، سرخ مفلرو والے آدمی نے چڑائے تھے وہ سب کیا تھا؟“ وہ اس کی لرف گھوما۔

جنین تیزی سے کھڑی ہوئی۔ ”میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“ سعدی نے ہاتھ سے کھنچ کر اسے واپس بٹھایا۔ وہ شرمندگی سے نکالیں پہنچ کر بیٹھی۔ ”میرے پاس آرٹیکل تیرہ کے تحت خاموش رہنے کا حق ہے۔“

”تم نہ بتاؤ، حنین میں بتاتی ہوں۔“ زمر یوسف تھوڑی تلنے تھیلی رکھئے، دچپسی سے مسکراتے ہوئے بول رہی تھی۔ ”جب گواہ جھوٹ لتے ہیں... عدالت اور پولیس کے سامنے... انہیں کسی شخص کو بچانا ہوتا ہے... تو اس کا حلیہ اللہ بتاتے ہیں کہ جی موقع سے فرار ہونے ۱۱۰ زم چھوٹا، موٹا تھا جبکہ وہ....“ دائیں طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”کافی اسمارت اور قدار اور ساتھا۔“

”بہت شکر یہ۔“ وہ جل کر بڑا بڑا یا۔ (چڑیل نہ ہوتا۔)

”آپ نے چائے تھے وہ سب حسین کے کمرے سے؟“ سعدی دنگ رہ گیا تھا۔

”کسی نے آجھنہیں چرا یا سعدی ڈائر۔ میرے شوہر اور تمہاری بہن نے ہم سے جھوٹ بولا۔ فارس نے گھر سے جاتے وقت حسین سے وہ چیزیں لیں، اور اس کو کہا کہ کہے وہ کھوئی ہیں۔ حسین اور پرائی، کھڑکی کھوئی، اور جنحی ماری۔ ہم لوگ اور گئے تو اس نے ہمیں بھی سی کہانی سنادی جو مجھے اس وقت بھاگی تھی کیونکہ ایک نحاسا میموری کارڈ اگر میںہے چور نے پکڑ بھی رکھا ہو تو وہ اتنی دور سے دند کو کیسے نظر آ سکتا ہے؟ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وارث غازی کی فائل بھی حسین کھول چکی تھی، لیکن ہمیں اس نے کہا کہ اس میں فروزن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور اصل فائلز کہیں اور منتقل کر دیں۔“

”میں نے پچ کہا تھا۔“ وہ تیزی سے یوں۔ ”ماموں نے مجھ سے پہلے وہ ادھر سے ڈیلیٹ کر کے اپنے پاس منتقل کر لی تھیں۔ اور باقی ساری باتوں پا آرٹیکل تیرہ کے تحت مجھے خاموش رہنے کا حق ہے۔“

”واو!“ سعدی نے غصے سے فارس کو دیکھا جو گردن موڑ کے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ برے برے منہ بھی بنارہا تھا۔ آپ میرا کیس کم درکرتے رہے۔“ فارس نے ننگ کے اسے دیکھا۔

”ان سب کے باوجود بھی کیس ثابت نہ ہو پاتا سعدی۔ میں نے صرف ان چیزوں کا اچھا مصرف ڈھونڈا۔ ان بتوں کو عدالت میں داغدار کرنے کی بجائے کیس کو نوشیر وال تک محدود رکھتا تھا کہ ہاشم خاموشی کا حق استعمال نہ کرے اور بولتا رہے۔ وہ جتنا چاہتا تھا، ہر قیمت پر میں نے اسے جیتنے دیا۔“

”آپ نے اسے کہا کہ وہ مجھے دہشت گرد ثابت کرے!“ اس نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔

”حالانکہ اصل دہشت گرد کوئی اور ہے۔“ (خنگی سے زمر کو گھورا جس نے سکر کے شانے اچکا دیے) پھر بات جاری رکھی۔ ”تم کچھ بھی ثابت نہ ہو پاتے گردو وہ جینوں انفار میشن استعمال کر کے خود کو پھنسایتا۔ میں نے صرف ایک ایجنٹ سے ڈیل کی کہ وہ آکر خود دیکھ لیں ہاشم کیا کہتا ہے اور.....“

”وہ چشمے والا آدمی... وہ ایجنٹ کا تھا، مگر آپ تو اس کو جانتے نہیں تھے۔“ سعدی نے طنزیہ کہا تھا۔ فارس نے بے بسی سے ایک انگلی سے ٹھوڑی کھجائی۔

”مجھے کیا معلوم تھا وہ کس کو بھیجتے ہیں۔ شروع میں تو میں نہیں پہچانتا تھا اسے، مگر اس کے فنگر پرنٹ سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کون ہے۔“

”مگر ہمارے سامنے آپ اداکاری کرتے رہے کہ آپ اس کو نہیں جانتے۔“

”نو اوازش!“

”اور جب احمد کو شک ہوا کہ کوئی قریب کا بندہ انوالو ہے تو آپ نے میرا شک حسین پر ڈالوانا چاہا۔“

”بے چاری حسین!“ زمر نے پچ کی آواز نکالی۔

”تو کیا اپنے اوپر ڈالواتا؟ پھر تم لوگ، قانون کی سر بلندی کی چلتی پھرتی مثا لیں مجھے کہاں کچھ کرنے دیتے؟“ وہ خفا خالگ رہا تھا۔

”اوکون کون انوالو تھا آپ کے ساتھ؟“ سعدی زیادہ خفا تھا۔ فارس اب کوئی فرار نہیں اختیار کر سکتا تھا۔

”ہاشم کی ملازمہ فیجننا... وہ چھوٹے موٹے کام کر دیتی تھی۔ میرا جیل کا دوست جلال الدین۔ اس کی مدد سے میں ہاشم کو کچھ کوڈز بھیجا تھا جن کو وہ نئے کاروباری موقع کی لاچ میں نو بیٹھ کر دیتا تھا۔“

”تھا؟“ سعدی نے ابر و اٹھائی۔ پہلی دفعہ فارس کھل کر مکرا یا۔

”ہاں... تھا۔ کیونکہ آج اسے ابھنی و اے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اور وہ اب دوبارہ سورج کی روشنی نہیں دیکھ سکے گا۔“

”مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔“ زمر محظوظ ہوئی تھی۔ ”تم اتنے مسکرا جوڑ ہے تھے۔ نوکری ڈھونڈنے کے بھانے۔“

”محترم آپ نے غور نہیں کیا شاید۔ میں نے ڈیل کی تھی۔ میں ان کو ایک دہشت گردی کا سہولت کا ردوں گا، اور وہ جواب میں میری ابھنی میں میری نوکری واپس بحال کروائیں گے۔“ زمر کے چہرے پر خوشنگوار مسکرا ہٹ اندھائی۔

”مطلوب اب تم بے روزگار نہیں رہے۔“

”جی ہاں، اب میں بے روزگار نہیں رہا۔“ وہ طنزیہ مسکرا کے بولا۔ سعدی نے اسی خفگی سے میز بجائی۔ اپنے مسئلے بعد میں سلنجائیے گا۔ پہلے میرے سوالوں کے جواب دیں۔“

”سب کچھ تو بتاچکا ہوں۔ اور کیا رہ گیا ہے؟“ وہ اکتا گیا۔

”ماموں آپ نے ہمیں ایک بات کھینچی نہیں بتائی۔“ خین فوراً چکی۔ سعدی نے اسے خفگی سے اس کے سر پر چپٹ لکائی۔ اس نے ناراضی سے بھائی کو دیکھا۔

”کیا بھائی۔ اگر آپ دونوں پر ماموں نے اعتبار نہیں کیا اور مجھ پر کیا تو پلیز جیلیس نہ ہوں۔ اچھا۔“ اور سخیدگی سے فارس کی طرف گھومی۔ ”آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ سعدی بھائی کو نوشیر وال نے گولی ماری ہے اور یہ کہ وہ ہاشم کی قید میں ہے!“

اب وہ تینوں اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ ڈائیکنگ ہال پر سنا تاطاری ہو گیا اور وہ شدید غیر آرام دھمکیں کرنے لگا تھا۔

”میں ہربات بتانے کا پابند نہیں ہوں۔“ وہ تینوں خاموشی سے اسے گھورتے رہے۔ فارس نے تحکم کر گھری سانس لی۔

”وہ نیکلیں!“ اس نے باری باری تینوں کو دیکھا۔ ”جب سعدی غائب ہوا تو میں نے اس کے کمرے کی تلاشی لی۔ پولیس، زمر، سب اس لئے تلاشی لے رہے تھے کہ کوئی کام کی چیز مل جائے۔ میں اس لئے تلاشی لے رہا تھا کہ اور کیا کیا نہیں موجود۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ نیکلیں غائب ہے جو اس روز ہاشم نے سعدی کی جیب میں پلانٹ کرو دیا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ صبح وہ ہاشم کے آفس ہی گیا ہو گا۔ نیکلیں واپس کرنے۔ زمر اور خین کی حیلہ کا نام لے رہے تھے۔ میں نے پیغام کیا اور معلوم ہوا کہ ہاشم کی سیکرٹری کا نام حیلہ ہے۔ کچھ عرصے بعد میں نے فینوں کو چند پیسے اور پردے کر خرید لیا۔ اب سارا معاملہ واضح تھا کہ یہ کاردار زکا کام ہے۔ پھر رک رک خفگی سے زمر کو دیکھا۔“ اور آپ کب سے میری سرگرمیوں سے واقف تھیں؟“

”آخری اطلاعات تک میں آپ کی بیوی ہوں، اور جس مفلک کو آپ کے کار کے ڈیش بورڈ میں چھپا کر رکھتے ہیں، وہ کار میں کئی دفعہ ڈرائیور کرنے کا شرف حاصل کر پچھلی ہوں۔“

”استغفار اللہ۔ کسی شریف انسان کی ذاتی چیزوں کی تلاشی لینا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے۔“

”نہیں میں نے سوچا، شاید آپ کی کسی پرانی کلاس فیلو کی کوئی باقیات مل جائیں اور ہر سے۔“

”یار آپ دونوں لڑ بعد میں لینا، پہلے مجھے حساب دیں۔ مجھے اتنے مہینے اندر ہیرے میں کیوں رکھا آپ نے۔“ وہ جھنجھلا کر کہہ رہا تھا، مگر میز کی دوسری طرف بیٹھے زمر اور فارس، ایک دوسرے کی طرف رخ موڑے شروع ہو چکے تھے۔ اس نے بے بسی سے خین کو دیکھا جو فوراً گز بڑا کے کھڑی ہوئی، دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ”آرٹیکل تیرہ!!“ بولا اور اندر بھاگ گئی۔

کمرے میں آکر اس نے ندرت کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ”ویسے ای یہ حسین نے اتنا قیمتی موبائل لیا کیسے؟“ اسی نے نماز سے ابھی ابھی سلام پھیرا تھا۔ اس کو دیکھ کر کہنے لگیں۔ ”اس نے یا تو اپنا زیور بیچا ہے۔ یا اپنے ماں باپ سے پیسے لے کر لیا ہے۔ اس لئے اس سوال پر

پھیکی پڑ جاتی ہے۔“

”لواس کی کیا ضرورت تھی۔“

”کیونکہ تم لوگ اپنے موبائل، ٹبلیٹ اور لیپ تاپ جب اس کے سامنے استعمال کر رہے ہو تو کیا اس کا دل نہیں چاہتا ہوگا؟ ہم لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوتا ہیں کہ ہم فیضی شاپنگ اور بھرے فرائج سے اپنے ملازموں کو کتنے احساسِ متبری میں بتانا کر دیتے ہیں۔“ اور وہ سر جھٹک کرونافل کی نیت باندھنے لگیں۔ ہنین گھری سانس لے کر رہ گئی۔

❖❖❖

### اٹھے گا انا حق کا نفرہ

آس کریم پارلر میں بھتی مویسیقی کشمکش کے شور میں دب سی گئی تھی۔ ہر میز پر رش لگا تھا۔ ایسے میں بمشکل ہنین نے دوا فراڈ کی ایک میز قابو کی، اپنا بیگ ادھر کھا، اور پھر ساتھ کھڑی زمر کو مسکرا کے دیکھا۔ ”میں ہماری جگہ رکھتی ہوں جب تک کہ آپ آس کریم لے آئیں۔“ پھر ذرا جتا کر بولی۔ ”ظاہر ہے اتنے عرصے بعد جو آپ نے میرے لئے وقت نکالا ہے تو آرڈر بھی آپ لائیں گی۔“ اور مسکرا کے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ بالوں کو فرش خچوٹی میں باندھے ہوئے تھی اور ماتھے پر گرتے بال تازہ کٹ لگ رہے تھے۔

”شیور۔“ زمر جو سامنے سینے پر بازو لپیٹے اور بالوں پر سن گلا سر لگائے کھڑی تھی، مسکرا کے کندھے اچکائے بولی۔ ”تمہارے لئے کون سا فلیور لاوں؟“ آج واقعی عرصے بعد وہ دونوں سارے جھمیلوں سے آزاد ہو کر فرصت سے مل بیٹھی تھیں۔

”جو اپنے لئے لیں، اس کے بالکل الٹ۔“ وہ تھمیلوں پر تھوڑی گرائے بیٹھی، مزے سے بولی تھی۔ زمر سر ہلا کے آگے بڑھ گئی۔ پھر جب واپس آئی تو ہاتھ میں دو کپس تھے۔

”دیکھلو۔ اندر سے دونوں آس کریم ایک جیسی ہیں، مگر اپر سے ایک دوسرے کے بالکل الٹ ہیں۔“ حنہ نہس دی، اور کندھے اچکا کر اپنا کپ قریب کھکالیا۔ وہ بھی اب سامنے بیٹھ چکی تھی۔ اردو گروشور اور شویا ہی موجود تھا، مگر وہ دونوں چونکہ فراغت سے ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھیں تو دھیرے دھیرے اطراف سے دھیان ہنستا گیا یہاں تک کہ ان کو لگا وہ تنہا بیٹھی ہیں۔

”سو زمر یوسف.... کیسا جارہا ہے آپ کا نیا گھر؟“ ہنین تھج سے پھل کے ٹکڑوں کو آس کریم میں مکس کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”مجھے لگتا تھا سعدی کا کیس ختم ہو گا تو مجھے بہت وقت مل جائے گا۔“ میں فارغ ہوں گی مگر درکنگ و بیکن کے لئے فراغت ایک خیال پلاو ہے۔ یا شاید مصروفیت کی عادت پڑ جاتی ہے۔ تم سناؤ۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ ارے ہاں، میں ہوم ڈیکور اور ہوم اپر و منٹ پا ایک کتاب لکھ رہی ہوں۔ کیا میں نے آپ کو بتایا؟“

”غالباً تم مجھے پچھلے دو ہفتوں میں دوسو دفعہ بتاہی پھیکی ہو۔“

حنہ نے بر امنہ بنا کر اسے دیکھا۔ ”روز تو ملتے ہیں، تم اب سمجھتی ہیں آتا کہ ”اور سناؤ“ کا جواب کیا دے انسان۔“

”تمہیں یاد ہے ہنین... میں اور تم... ایسکی کے تہہ خانے میں زمین پر بیٹھ کر... رات کے اندر ہیرے میں... ایک دوسرے سے بچ بولا کرتے تھے؟“ زمر آس کریم کھاتے ہوئے مسکرا کے یاد کر رہی تھی۔ حنہ کی آنکھیں چمکیں۔

”چلیں آج پھر ایک دوسرے سے بچ بولتے ہیں۔ پہلے آپ کی باری۔“

”ہوں!“ وہ منہ میں کریم سے بھرا تھج رکھ کر نگاہیں اور پر کیے سوچنے لگی۔ پھر حنہ کو دیکھا اور مسکرا آئی۔ ”جب تم چھوٹی تھیں تو میں اکثر

تمہارے گھر میں چاہیاں بھول جاتی تھی۔ جان کرتے۔“

”اور مجھے کئی سال بعد گرس سمجھ آگئی تھی کہ آپ وہ جان کر بھولتی ہیں، اور میں کھڑکی سے آپ کو دیکھا کرتی تھی۔“ نہ خفیف سانہس دی۔ ”مجھے یقین تھا کہ آپ پلٹ آنے والوں میں سے ہیں۔“

”اور تم بھی!“ چند لمحے کے لئے دونوں کے درمیان آزردہ سی خاموشی چھاگئی۔ پھر حنے نے اداہی دور کرنے کو مسکرا کے سر جھٹکا۔ ”اب سب تھیک ہے۔ اب ہم نے اداں نہیں ہونا۔ چلیں... اب بھر سے آپ کی باری۔“

”مجھے تو اور کچھ یاد نہیں آ رہا۔“ زمرنے بنے بھی سے کندھے اچکائے۔

”اچھا ایک بات بتائیں۔“ وہ درمیان میں تجھ کو بیوی کے اندر رکھنے کو کی، اسے منہ میں گھولا، پھر بولی۔ ”آبدار کے بعد... کیا آپ پر سکون ہیں؟ میرا مطلب ہے، آپ کو فارس ماموں کی طرف سے بھلے آپ کو چڑانے اور جلانے کے لئے ہی کسی دوسری عورت والا دھڑکا تو نہیں لگا رہتا۔“

”ہرگز نہیں۔“ زمرنے فخر سے گردان نہ زائی۔ ”مجھے یقین ہے کہ آئندہ وہ مجھے شنگ کرنے کے لئے بھی کسی دوسری عورت کا نام نہیں لے گا۔“

چند ثانیے دنوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر حنے نے زبان کھوئی۔ ”یہ سچ نہیں تھا۔“

”بالکل۔ یہ سچ نہیں تھا۔“ زمرنے گھری سانس لی اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔

”ویسے تم خوش ہو؟ میرے اور فارس کے جانے سے؟“

”اوں...“ نہ نے ابر واچکا کے بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”میں اب کافی نیچوڑ ہو گئی ہوں۔ آپ سعدی بھائی کو زیادہ توجہ دیں یا فارس ماموں کو میں اب بالکل بھی جیلیس نہیں ہوتی۔“

”اوے کے مگر یہ جھوٹ تھا۔“

”آف کو رس یہ جھوٹ تھا۔“ نہ جھر جھری سی لے کر اپنے کپ پہ جھک گئی اور جلدی جلدی کھانے لگ گئی۔

”سنونہ... نہیں یہ سب...“ آنس کریم کے کپس کی طرف اشارہ کیا۔ ”زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے تاکہ ہم ایک دوسرے سے بچ بولنا سکیں ہیں۔“

”کیا یہ سچ تھا؟“ حنے نے اس کو دیکھ کر پلکیں جھپکا میں تو وہ نہیں پڑی اور اپنے کپ میں تجھ گھمانے لگی۔ موسیقی اب بھی انسانوں کے شور اور قہقہوں کے اندر دلبی ہوئی تھی.... اور آنس کریم پارلر میں رش برہتائی جا رہا تھا.....

.....❖❖❖.....

### جو میں بھی ہوں، اور تم بھی ہو

فوڑی اور آفسر میں اس دوپہر نو جوانوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ چند میزوں پا ایک طرف انہوں نے قندھہ کر رکھا تھا اور وہ پر جوش انداز میں ایک دوسرے سے باتوں میں مگن تھے۔ بار بار گھریاں بھی دیکھتے، موبائل بھی چیک کرتے۔ جیسے انتظار میں تھے۔

بالائی منزل کے ہاں میں سارا سامان سینا جا پکھا تھا، ہس ایک میز پہ کچھ باس رکھے تھے جن میں سے فارس گھر اجھک کر کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اس نے سیاہ پینٹ پہ سفید ڈریس شرٹ اور سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا، بال اب بھی پبلے کی طرح چھوٹے تھے، مگر چہرے سے ساری کلفت بے زاری اور اکتا ہٹ دو رہو چکی تھی۔ اس پہ مہر وقت مختصرے اور خوشنگوار تاثرات رہا کرتے تھے۔

دروازہ دھاڑ سے کھلا اور سعدی اندر داخل ہوا۔ وہ نہیں بلہ، اپنا کام کرتا رہا۔ سعدی اس کے سر پر آکھڑا ہوا اور برہمی سے اسے

گھورا۔ ”ان لوگوں کو کس نے بلا بیا ہے؟“

”ہر غلط کام میں میرا تھا نہیں ہوتا سعدی یوسف۔“ وہ مصروف انداز میں چند کاغذ ایک فائل میں لگا رہتا تھا۔

”یہ مختلف شہروں سے آئے سیو سعدی یوسف بیچ کے ایکٹو گھر زیں ماموں۔ میں ان سے نہیں ملتا چاہتا تھا۔ میں شرمندہ تھا۔“

”میں نے نہیں بلا بیا ران کو۔ تمہاری امی کا ہاتھ ہو گا اس میں۔ میں اپنے کام سے آیا ہوں ادھر۔“ وہ سادگی سے اسے دیکھ کر بولا تو سعدی نے خفگی سے سرجھ گکا۔

”اب میں ان سے جا کر کیا بات کروں؟ کیسے ان کو تسلی دوں کہ اس ملک میں قاتل بیچ جاتے ہیں مگر پھر بھی اس کا مستقبل روشن ہے؟“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ مجھے الزام نہ دینا۔“

”ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں کہ ہم وہ ثبوت استعمال کر لیتے تب بھی نوشیر وان نہ پکڑا جاتا، لیکن..... ہاشم ہم اس کو سزا دلو سکتے تھے... عدالت کے ذریعے... تاکہ ایک مثال قائم ہوتی۔ یوں بیک ڈور سے کسی ایجنسی کے ذریعے نہیں۔“

”واٹ ایور۔“ وہ اپنے بیگ میں چند فائٹر ڈال کے سیدھا ہوا، بیگ اٹھایا اور اسی سادگی سے اسے دیکھا۔ ”اب وہ تمہارے مہمان ہیں۔ تم ان کے پاس جا بکرا یک اچھی سی تقریر کرو۔ مجھے کام ہے۔ میں جارہا ہوں۔“ اس کے کندھے کو دبایا، اور آگے بڑھ گیا۔

سعدی یوسف جس وقت ریسٹورانٹ کے لاڈنخ میں داخل ہوا، سب اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سیاہ شرت نیلی جیونگ کے اوپر پہنے ہوئے تھا، اور سنجیدہ مگر متذبذب نظر آ رہا تھا۔ کسی نے سیلفی بنائی، کسی نے ملک ملک کر کے تصاویر اتار دیں۔ وہ جبرا مسکرا کے سب کو ہاتھ ہلاتا ایک مرکزی میز تک آیا، اور کرسی پہنچنی۔ سب اس کے ساتھ ہی بیٹھے۔ خاموشی سے چھا گئی۔ سعدی کی نظریں نیکیں اور گلاں پہ جنی تھیں۔ وہ اس سے تسلی لینے آئے تھے، اس سے جواب مانگنے آئے تھے؛ انہیں کن الفاظ میں اچھی امید تھا؟

”آپ لوگوں کا شکریہ کہ آپ یہاں آئے۔“ کھنکھار کے اس نے کہنا شروع کیا۔ نظریں اب بھی جھکی تھیں۔ وہ کتنا اچھا مقرر تھا، بہترین بولتا تھا، مگر آج سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ وہ کیسے لوگوں کو بتائے گا کہ حق کے لئے اتنے مہینے لڑنے کا کوئی فائدہ تھا۔ اگر وہ خود اس سوال کا جواب نہیں جانتا تھا۔ وہ کیسے اپنی اتنے مہینوں کی خواری کو جھٹی فائی کر پائے گا۔

”میں... دراصل مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں آپ سے کیا کہوں۔“ اس نے بدقت نظریں اٹھائیں۔ میزیں باہم جوڑ کر وہ لوگ ان کے گرد بیٹھئے، اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ سعدی یوسف کو گھنی میسوس ہونے لگی۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

”ہم نے کئی مہینے کو دست میں اڑائی لڑی مگر آخر میں...“

”میں ایک سکول ٹیچر ہوں، سر!“ داکئی قطار میں بیٹھی اسکارف والی لڑکی ایک دم بولنے لگی۔ وہ رک کے اسے دیکھنے لگا۔ سب اس کو دیکھنے لگے۔ وہ سالنولی سی تھی، اور اس کی آنکھیں بہت سنجیدہ تھیں۔ اور میں بغیر کسی شرمندگی کے آپ لوگوں کو یہ بتا سکتی ہوں کہ میرے اسکول کا ایک کلرک بچھلے پانچ سال سے مجھ سمت کی ٹیچر زکوپنی پر ایسٹ سمجھتا تھا۔ اس کا جب دل چاہتا وہ کسی کو بھی ہر اس کر سکتا تھا، مگر اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ ”شدت جذبات سے بولتے اس کو چہرہ سرخ پڑنے لگا۔“ لیکن جس دن میں نے آپ کو دیکھا۔ وہ انہوں یو دیتے ہوئے... وہ قانونی جنگ لڑتے ہوئے... روزِ عدالت میں سر بہادری سے اٹھا کر چل کے جاتے ہوئے... تب میں نے جانا تھا کہ اپنے حق کے لئے اور ظلم کے خلاف کیسے لڑا جاتا ہے۔ اس دن سر، میں اٹھ کھڑی ہوئی، میں نے ٹیچر زکو اکٹھا کیا، اور ہم نے اس کلرک کو دن کی روشنی میں سب

کے سامنے بے عزت کیا، اس کی شکایت کی، اس کو.....”

”یونو.... مجھے یونیورسٹی میں دوڑ کے bully کرتے تھے۔“ اسکی بات ختم ہونے سے پہلے ایک دوسرا لڑکا بول اٹھا۔ ”اور میں اتنے مہینے سے ان کا boy errards ہنا ہوا تھا۔ میں ان کے کام کرتا، ذاتی بھی اور نصابی بھی.... میں ان سے ڈرتا تھا..... میں ان سے ہر اسال ہوتا تھا۔ مگر جب آپ نو شیر و اس کا ردار کے خلاف کھڑے ہوئے تھے ناسعدی بھائی، تب میں نے بھی اپنے خوف کا بت توڑا، میں نے انگلی اٹھا کر ان کو بھرے مجھے میں کہا کہ آج کے بعد وہ مجھ پر حکم چلا کر تو دیکھیں، میں انہیں کوثر میں گھستیوں گا، میں ان کو....“ مگر ساتھ ہی ایک دوسرے نوجوان نے تیز تیز بولنا شروع کر دیا تھا۔

”میرے دوست کی بہن کو اس کا کانج ٹیکر بلیک میل کر رہا تھا، اور یقین کریں سعدی، اگر آپ کو میں نے وہ انٹرو یو دیتے نہ دیکھا ہوتا... اگر آپ کی بہن کی گواہی نہ سکی ہوتی، تو میں کبھی اپنے دوست کو نہ سمجھا سکتا کہ اسے بلیک میل کا کیسے بہادری سے مقابلہ کرنا ہے، اسے کیسے اپنی عزت کی حفاظت....“

”میرے والد انکم لیکس میں کام کرتے ہیں، ان کا باس ان کو ہر وقت....“  
 ”میں جب ہائل میں تھی تو جانتے ہیں میری وارڈن نے کیا کیا؟“  
 ”میں نے جب آپ کو ان امیر بد معاشوں کے سامنے کھڑے ہوتے دیکھا تھا ناسعدی بھائی، تب میرے اندر ہمت آئی اور...“  
 ”وہ دم بخود بھیجا تھا... کبھی ملکر لکر ایک کی شکل دیکھتا، کبھی دوسرے کی طرف رخ پھیرتا.... وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا.... وہ ان کو ٹوک بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ اس سے تسلی لینے نہیں آئے تھے.... وہ اس کو سنانے آئے تھے... داستانیں... کہانیاں.... ہمت اور بہادری سے لڑی جانے والی جنگیں.... اور وہ یک نک سن رہا تھا.... پلک جھپکے بغیر.... وہ ایک ایک کاچڑہ تک رہا تھا.... وہ صرف ان کی بہادری کی جدوجہد کی کہانی سن پاتا، مگر پھر دوسرابول اٹھتا اور وہ جان ہی سن پاتا کہ اس کلرک کو کیا سزا ملی، ہر اس کرنے والے دوستوں کا کیا بنا، بلیک میل کانج ٹیکر کو نکالا گیا یا نہیں، انکم لیکس والے باس اور ہائل کی وارڈن کی نوکری گئی یا نہیں... اور اس سے فرق بھی نہیں پڑتا تھا.... نہ انہیں اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ نو شیر و اس فیکھ کا اور بھاگ گیا۔ وہاں سب کے لئے صرف جدوجہد اہم تھی.... اپنے خوف کے بت توڑ دینا... آزاد ہو جانا... وہاں صرف مقتل میں اترنے کی دھیکہ کا ذکر تھا، اس شان کا ذکر تھا.... وہ شان جو ایک کی ہوتی ہے مگر کئی ہزاروں کو ہمت دے جاتی ہے.... سب کو کچھ سمجھا جاتی ہے.... وہ اس سے تسلی لینے نہیں آئے تھے.... وہ اس کو تسلی دینے بھی نہیں آئے تھے.... وہ تو اپنی داستانیں سنانے آئے تھے.... اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا پھنس رہا تھا... وہ اسی طرح رونا چاہتا تھا جیسے فیصلے کے دن رویا تھا.... مگر آج وجہ وہ نہیں تھی۔ آج وجہ یہ تھی کہ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ فیصلے کی گھڑیاں شاید تب بیتی نہیں تھیں.... فیصلہ تو اب ہوا تھا.... وہ ہار انہیں تھا.... وہ جیت گیا تھا... اور جو جیتا تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو اس نے ہا رہا تھا... اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ریسٹوران کی ششی کی دیوار کو دیکھا۔ جہاں پارکنگ میں فارس اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اور اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ سعدی کو دیکھتے پا کر وہ مسکرا یا، ایک آنکھ دبائی اور پھر اندر بیٹھ گیا۔  
 بہت سے آنسو اندر ہی اتار کے سعدی یوسف بربڑا یا تھا۔ ”دونبڑ آدمی!“



چھے ماہ بعد

دسمبر 2016

پورا چاند آسمان پر یوں جگہا رہا تھا جیسے چاندی تھا ہو۔ وہ آج اتنا بڑا، اتنا قریب نظر آ رہا تھا کہ لگتا، ابھی پچھلی ہوئی چاندی زمین پر انڈلینے لگے گا۔ اس کے گرد سرخی بادل جمع ہو رہے تھے۔ ہلکے، ہر بوجھ سے آزاد بادل.....

بنچے دیکھو تو ہوٹل کے بزرہ زار میں نیلے سومنگ پول کے پانی میں چاند کا عکس تیر رہا تھا۔ بچکو لے کھار رہا تھا۔ پول کے ایک طرف دو آرام کر سیاں پچھی تھیں اور وہ دونوں ساتھ ساتھ ان پر بیٹھے تھے۔ سردی اپنے جو بن پتھی اور اسی مناسبت سے فارس نے بھوری جیکٹ پہن رکھی تھی اور گردن اٹھائے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ ساتھ پیٹھی زمر سفید جیکٹ پہننے ہوئے تھی اور اس کا چہرہ بھی اوپر کی طرف اٹھا تھا۔

”تمہیں پورے چاند کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے، فارس غازی؟“ وہ اس محور کرن لمحے کے زیر اثر چاندی کے تھال کو تکتے بولی تھی۔ وہ اس کے منہ سے کچھ خوبصورت سننا چاہتی تھی۔

”یہی کہا گر نیل آرم اسٹرائل نہ مرتا تو کم از کم یہ تو تادیتا کہ انسان چاند پر گیا بھی تھا یاد وہ صرف ایک امر کی ذرا مامہ تھا؟“ سارا فسول ٹوٹ گیا۔ زمر کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ خنکی سے نظریں موڑ کے فارس کو دیکھا۔ وہ مطمئن ہشاش بشاش سانظر آتا، سر پیچپے نکائے اب اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں پتہ ہے، تم نے کتنے عرصے سے مجھے نہیں کہا کہ میں تمہیں کتنی اچھی لگتی ہوں اور....“

”کس نے کہا تم مجھے اچھی لگتی ہو؟“ (اوپر بڑا ہٹ)

”.....اور نہ ہی میری تعریف کی ہے۔“

”کس چیز کی تعریف کروں؟ ان بالوں کی جو تم ڈالی کرتی ہو؟ اس پرے کی جس پر ہر وقت غصہ دھرارہتا ہے؟“

”ارے واہ۔ ایک زمانے میں تو سات سال تک قید میں ڈالنے کی باتیں کرتے تھے اور اب دیکھو..... کتنے عرصے بعد تمہیں ڈزر کروانے کا وقت ملا ہے۔“ وہ خنکی سے بولی تھی۔

”وہ بھی اس لئے تمہیں لایا ہوں کیونکہ تم نے کہا تھا کہ بل تم دوگی۔“ وہ تپانے والے انداز میں مسکرا یا تھا۔ (وہ باہر اس لئے بیٹھ تھے کیونکہ ابھی ڈامنگ ایریا میں کوئی میز خالی نہ تھی۔)

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ ویسے بھی میرے سارے پیے تم نے رکھ لئے تھے۔“

”لبی... ایک منٹ...“ وہ حیران سایدھا ہوا۔ ”میں آپ کو ساری رقم واپس کر چکا ہوں چھے ماہ پہلے ہی۔“

”کوئی ثبوت؟“ اس نے سنجیدگی سے ابر و اٹھائی۔ فارس نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”تم جج بننے کے لئے امتحان کیوں نہیں دے دیتیں۔ بہت اچھی جج بنو گی تم۔“ اور وہ بے اختیار پہن دی۔ پھر دوبارہ سے گردن اٹھا کے چاند کو دیکھنے لگی۔

”میں خوش ہوں، فارس!“

”میں بھی خوش ہوں۔“

”تم کیوں خوش ہو؟“

”کیونکہ میرے آفس میں دو بہت خوبصورت لڑکیاں کام کرتی ہیں اور.....“

”فارس غازی!“ اس نے زور سے پیرز میں پہنچا تو وہ مصاختی انداز میں ہاتھ اٹھا کر جلدی سے بولا۔ ”میں... میں اس لیے خوش ہوں کیونکہ میری زندگی اب stable ہو گئی ہے۔ میرے پاس ایک بہت اچھی... دل کی اچھی بیوی ہے۔ میرا خاندان مجھ سے خوش ہے... عزیزوں رشتے داروں میں مجھے اب کوئی قاتل یا مجرم نہیں سمجھتا۔ ہاشم اور اس کا خاندان ہماری زندگیوں سے جا چکا ہے... میرے بھا بخج اپنی زندگیوں میں صحت مند شہری ہن کے بالآخر سیمیل ہو چکے ہیں۔ میرے پاس ایک اچھی گاڑی ہے جاب ہے گھر ہے اور میرے آفس میں دو بہت خوبصورت لڑکیاں کام کرتی ہیں۔“

اور اس دفعہ آخر میں وہ دونوں بنے تھے۔

”آئی ریکل بیت یوفارس!“

”لو یوٹو!“ وہ مسکرا کے بولا تھا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی ناک کی لوگن دمک رہی تھی۔ سفید جیکٹ سے ڈھکے کندھوں پر گرتے گھنگریاں بھورے باں اور بھوری آنکھوں کی مسکراتی چمک... وہ واقعی خوش تھی.... اور وہ بھی تھا۔ دھماکے کی آواز آئی تو وہ چونکا۔ وہ بھی چونکی۔ لمحے بھر کو دل گھبرا، مگر پھر دیکھا۔ ساتھ سے گزرتی ایک لڑکی میں فون پر کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ یاسی فلم کا ٹریلر۔ زمر نے اس کا پہلے لمحہ کو ششد رہ جانے والا چھر دیکھا اور پھر اسے ریلیکس ہوتے دیکھا تو زی سے بوی۔ ”فارس۔ اب سب ٹھیک ہے۔ کوئی سازشیں... کوئی قتل و غارت اب ہماری زندگیوں میں نہیں ہو گی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ گھری سانس لے کر مسکرا یا۔ پھر جھر جھری سی لی۔ ”میں کبھی کبھی.... ایک خیال ساز ہن سے گزرتا ہے.... جیسے دور کریں.... کوئی کارما ہے جو میری گھات میں بیٹھا ہے۔“

”یہ صرف تمہارا وہم ہے۔ میں جانتی ہوں ہم سے بھی غلط کام ہوئے ہیں مگر ہم سروائیول کی جگہ لڑڑے ہے تھے۔ ہم اور آنکھ نہیں کر سکتے تھے۔ اصول یہ ہے کہ اگر بدله لو تو اتنا لو جتنا ظلم کئے گئے تھے اور اگر اس کے بعد کوئی تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو پھر اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ سوتھم...“ ہاتھ بڑھا کے اس کے گھٹنے پر کھلا۔ ”ریلیکس ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اللہ تمہیں ضائع نہیں کرے گا۔“

”میں اب استھینگ نہیں رہا۔ میرا ایمان اور یقین اب واپس آپکا ہے۔“ وہ مسکرا یا۔ ”اب میں پر سکون رہنے کی کوشش کروں گا۔“ ”اور جب تک زندہ ہوئی یاد رکھنا کہ ہم سب ہمیشہ تمہارے ساتھ کھڑے ہیں اور میں جب تک زندہ ہوں یہ یاد رکھوں گی کہ تم میرے سب سے اچھے دوست ہو۔“

وہ بکا ساہنسا۔ ”آج بہت عرصے بعد تم چڑیل نہیں لگیں۔“

”اوے کے اب ذرا تم ڈنرہاں کی طرف جاتے ہیں... اور راستے میں تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ میرا یہ نام کس نے رکھا تھا...“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”اصررنے۔“ وہ بھی ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”اور تم نے اسے ایک دفعہ بھی ٹوکا؟“

”بالکل نہیں۔ میں نے تو اسے شabaش دی تھی۔“

”اور تھوڑی سی شرم آئی تمہیں شabaش دیتے ہوئے۔“

”وکھو میں ایک شریف آدمی ہوں اور.....“ وہ دونوں ماہ کامل کی اس سردرات میں قدم اٹھاتے چلتے جا رہے تھے.... دور ہوتے جا رہے تھے... اور ان کی آوازیں مدھم ہو رہی تھیں... دور سے یہی دکھائی دیتا تھا کہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا غازی اس کی طرف

چک کر مسلسل کچھ کہہ بھی رہا تھا اور وہ نفی میں افسوس سے سر بلائے جا رہی تھی... مسلسل لڑ رہی تھی... چاندی کے تحال سے چاندی اب بہہ کر ساری دنیا پاگر نے لگی تھی.... سب کچھ چمکنے لگا تھا...

❖❖❖

اور راج کرے گی خلق خدا ..... جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو اور چند میل کے فاصلے پر بنی عمارت کے وسیع آڈیوریم میں کر سیاں اوپر سے نیچے تک بھری تھیں۔ پہلی قطار سے ایک طرف کیمروں اور فلیش لائیٹس کی چکا چوند رو شرم پر کھڑے سعدی کی آنکھیں چند حاء دے رہی تھیں مگر وہ اب ان کا عادی تھا۔ سیاہ تھری پیس سوٹ، ٹائی، کف لنکس پہننے بالوں کو جیل لگا کر پیچھے کیے وہ اُس پر ہاتھ رکھ کر کھڑا مائیک پر پھرہ جھکائے آنکھیں لوگوں پر مرکوز کیے کہہ رہا تھا۔

”میرا نام سعدی یوسف خان ہے۔ لوگ مجھے پیار سے سعدی کہہ کر بلا تے ہیں۔ اور غصے سے بھی یہی کہتے ہیں۔“

ہال میں کھلکھلا ہٹتی گوئی تھی۔ وہ مسکراہت بھرے پر سکون چھرے کے ساتھ کہنے لگا۔

”بچھے ماہ پہلے جب میں کیس ہارا تھا تو مجھے لگا تھا میں بارگیا ہوں۔ ختم ہو گیا ہوں۔ مجھے لگا تھا اب اس ملک کا کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

جب اتنا بڑا مجرم جس کے خلاف عینی شاہد ہوں، جب جنگ اس کو بری کر دیں یا پولیس دبا داں کر مقتول کے وارثوں سے ملزم کو معافی دلوادے تو انسان سوچتا ہے اس ملک کا کیا ہے گا۔ جب جوں کی بحالی اور عدالیہ کی آزادی کی تحریک چلانے والے جوں کو مستکبر اور دکار، کوتشندر بنے دیکھیں تو سوچتے ہیں کہ ہماری ریاضت رائیگاں گئی مگر مجھے کچھ عرصہ لگا یہ سمجھنے میں کہ ایسا نہیں ہوا....“ اس کی آواز سارے ہال میں گونج رہی تھی.... اور لگتا تھا مادہ کامل کی اس برف رات میں وہ آزاد دنیا کے ایک ایک کوئے تک جا رہی تھی....

(میں سعدی یوسف، آپ سب لوگوں کے سامنے بانگ دہلی یہ بات کہتا ہوں کہ جب کوئی پاکستانی شہری اسی قاتل امیر آدمی یا کسی کرپٹ سیاستدان کے خلاف عدالت میں کیس لے کر جاتا ہے..... تو اگر مصلحت کے مارے جزو فصلد دیتے وقت مجرم کو فائدہ دے بھی جائیں... ہاں تب بھی مدعی نہیں ہارتا.... انصاف کے لئے لڑنے والا نہیں ہارتا... وہ تو اسی دن جیت گیا تھا جب اس نے بہت اور بہادری دکھاتے ہوئے امیر قاتلوں اور ڈاکوؤں کو عدالت میں گھسیتا تھا.... جب ایسے مصلحت میں لپٹے فیصلے آتے ہیں تو نجح ہارتے ہیں.... قانون ہارتا ہے.... ملک کے انصاف کے ادارے ہارتے ہیں.... مدعی نہیں ہارتا... ایسے فیصلے ہونے سے انصاف کے مدعی کا کچھ نہیں جاتا.... وہ تو جیتا ہوا تھا.... ایکسپوز تو جز ہوتے ہیں.... ہماری ناکام، کمزور اور کرپٹ عدالیہ اپنے آپ کو ایسے فیصلے کر کے خود بے عزت کر دیتی ہے.... یاد رکھیے گا.... انصاف کے لئے لڑنے والا کبھی نہیں ہارتا....)

اس تنگ و تاریک کوٹھڑی کے دروازے میں ایک چھوٹا سا چوکھتا بنا تھا۔ جس میں شیشہ لگا تھا۔ ہاشم اس دروازے کے ساتھ کمر لگائے بیٹھا تھا۔ قیدیوں کا لباس پہننے، اس کی شیوی بڑھی تھی اور وہ گھنٹوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ دروازے پر آہست ہوئی تو وہ کرنٹ کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھلا اور ایک سیاہ وردی والا سپاہی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹڑتے تھی۔

”میری بات سنو۔“ ہاشم بے بُکی اور غصے بھری دبی آواز میں بولا تھا۔ ”تم میری بات پر غور کر کے تو دیکھو۔ میرے پاس اب بھی بہت سے خفیہ بینک اکاؤنٹس ہیں جن کا نہ میرے گھر والوں کو علم ہے نہ ان سیکیورٹی ایکسپریس والوں کو۔“ اگر تم میری مدد کرو تو میں تمہیں بہت امیر کر سکتا ہوں۔“

گارڈ نے نرے اندر پیٹھی اور ایک غصیلی خاموش نظر اس پر ڈالتا باہر نکل گیا۔ دروازے کے آہنی تالے چڑھنے کی آواز آئی تو ہاشم نے زور سے دیوار پر مکاڈے مارا۔

”میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں یہ جیل میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نکلوں گا اس سے ایک دن۔ پھر میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔“

لیڈس مارنے سے ابھی بیٹے نہیں!

اور تاہر توڑ کے دروازے پر مارنے لگا۔ یہاں تک کہ اسکے ہاتھوں سے خون بہنے لگا۔ ”مجھے نہیں معلوم اس وقت میں کس ملک میں ہوں، لیکن تم لوگ پچھتا وہ گے۔ مجھے میری بیٹی کو نہیں دھونڈنے دیا تم نے... تم سب پچھتا وہ گے۔“

(اور جو کہ مجھے آج اس سینما میں آپ سے بات کرنے کا موقع ملا ہے تو میں آپ کو سورۃ النمل کی چند آیات سنانا چاہوں گا۔ قرآن کی آیات کے معانی ہر دفعہ نئے سرے سے ہم پر کھلتے ہیں۔ سورۃ النمل کی آخری آیات بھی مجھے یوں لگتا ہے آج مجھے پہلی دفعہ سمجھ آئی ہیں۔)

قصیر کاردار رات کے اس پھر اندر ہیرے میں ڈوباتا۔ اب اس کی بتیاں رات گئے تک جلانہیں کرتی تھیں۔ بس مجھی رہتی تھیں۔ تاریک بالکوئی میز پر چکس بکس، آفس ڈاؤنٹس اور عینک رکھتی تھی اور یہ لینگ کے ساتھ ایک ہیولہ سا کھڑا نظر آتا تھا۔ سلو رنگ کا چغپتے ہڈ سر پر گرائے وہ جلدی ہوئے با تھریلینگ پر جائے دو رکھیں پھاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور انیکیں اس کو دیکھ کر زخمی سامسکرا رہی تھی۔

(”میں پناہ چاہتا ہوں اللہ کی دھنکارے ہوئے شیطان سے۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو حکم اور حیثیم ہے۔ اور جب ان پر وعدہ پورا ہوگا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا کہ یہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں لاتے تھے۔“ وہ سانس لینے کو رکا اور ایک نظر خاموش ہاں کو دیکھا۔ ”المل کی آخری آیات میں ایک زمین کے جانور کا ذکر ہے جو قرب قیامت زمین سے نکلے گا اور لوگوں سے باتیں کرے گا۔ ویسے تو یہ ایک قیامت کی نشانی ہے مگر یہ اس سورۃ کے اختتام میں آئی ہے جو چیزوں کی سورۃ ہے۔ جس کے ہر دانتے میں ایک ایک چیزوں کیلئے سارے عالم سے نکل رہی ہے۔ ان کو اصلاح کی طرف پکارتی ہے۔ ان کا ہاتھ ظلم سے روکتی نظر آتی ہے۔۔۔ مگر ہر کوئی اسے نہیں سنتا۔۔۔ ہم چیزوں جیسے لوگوں کی جب ملکبر لوگ بات نہیں سنتے تو آخر میں زمین پھٹتی ہے اور بڑے بڑے جانور نکل کر۔۔۔ انہی جیسے خوفناک جانور نکل کے انہیں عبرت کا نشان بنادیتے ہیں۔۔۔ جب چیزوں کو قدموں تک پیسا جاتا ہے تو وہ کامیں یا نہ کامیں زمین کے اندر چھپے جانوروں کو باہر نکال لاتی ہیں وہ۔۔۔“)

کافر سردمیں متعدد غیر ملکی مہمان بیٹھتے تھے اور ان کے میز بان بھی مسکراتے ہوئے سامنے موجود نظر آرہے تھے۔ دھرم ادھر مختلف یادداشتوں پر دستخط ہو رہے تھے اور ڈاکٹر سارہ مسکرا کے اس ساری کارروائی کو دیکھ رہی تھی۔ قریب بیٹھی لڑکی نے جھک کر سر گوشی کی۔ ”تھر کوں بالآخر ایک حقیقت بننے جا رہا ہے۔ کیا سعدی اب بھی واپس نہیں آئے گا؟“

سارہ نے اس کے کان کے قریب آہستہ سے کہا۔ ”وہ پرانیوں سیکھ میں چلا گیا ہے۔ اب جب راستہ کھل گیا ہے تو وہ آنے پر ارضی نہیں۔ کہتا ہے وہ سرکاری عہدہ لے کر مصلحتوں کا شکار ہو کر نہیں کام کر سکتا۔ وہ زیادہ daring کام کرنا چاہتا ہے۔“

(اور آگے اللہ فرماتا ہے...“ اور جس دن ہم ہرامت میں میں سے ایک گروہ ان لوگوں کا جمع کریں گے جو ہماری آیتوں کو جھلاتے تھے پھر ان کی جماعت بندی ہو گی یہاں تک کہ جب سب حاضر ہوں گے کہہ گا کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم انہیں سمجھ بھی نہ تھے یا کیا کرتے رہے ہو۔ اور ان کے ظلم سے ان پر ایزام قائم ہو جائے گا پھر وہ بول بھی نہ سکیں گے۔“ یہ آیات ہر مظلوم کے دل کو ٹھنڈک دیتی ہیں۔ ان کو پڑھ کے ان کو سمجھ کے میں نے یہ جانا ہے کہ آج عدالتوں میں اُنہی وہی پر چورا ہوں اور چوک میں یہ ظالم بار سوخ کر پڑ لوگ کتنا مرضی جھوٹ بول لیں ابھی قیامت نہیں آئی۔ اور جب آئے گی تو وہ بول بھی نہیں سکیں گے۔ اس دن ان کی کوئی صفائی کوئی توجیہ نہیں سنی جائے گی۔ ہاں کبھی تو ان ظالموں کی بھی زبان بندی ہو گی۔ اس لئے ان کی زبانوں سے ہمیں گھبرا نہیں چاہیے۔)

سفید دیواروں والے کمرے میں خوبصورت پینٹنگز آؤریاں تھیں۔ گھونٹے والی کرسی پر سفید کوٹ پہنچنی ڈاکٹر پنڈے پر قلم سے چند الفاظ گھیٹ رہی تھی۔ اور سامنے بیٹھا آکھوں تلے حلقة لئے نو شیر و ان پیڑ مردگی اور ادا کی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا اب میں یہ دو اچھوڑ نہیں سکتا؟ کیا ان دو اؤں کے بغیر مجھے کہیں سکون نہیں ملے گا؟“

”آئی ایم سوری، لیکن آپ کی ڈھنی حالت کے لئے یہ بہت ضروری ہیں۔“ وہ صفحہ پھاڑ کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی

تحی... شیر و نے اذیت سے آنکھیں موند لیں۔ دو ایساں... نیند کی... ڈپرشن کی... سکون کی... قاتل کی مہر ما تھے پہ دیکھنے لگی تھی...)

(”کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے رات بنائی تاکہ اس میں چین حاصل کریں اور دیکھنے کو دن بنایا البتہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے سب ہی گھبرا میں گے مگر جسے اللہ چاہے اور سب اس کے پاس عاجز ہو کر چلے آئیں گے۔“ یہ آیات سن کر میرے دستوں کیا ہم صرف اپنے دشمنوں کی عاقبت کا سوچتے ہیں یا اپنا بھی سوچتے ہیں؟ کیا ہم اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ رہنے والے کام کرتے ہیں؟“)

ہارون عبید ایک ٹاک شو کے سیٹ پر بیٹھے مکر امکرا کے مقابل موجود و مہماں سے بحث کر رہے تھے... ان کے انداز میں بے نیازی تھی... آگے بڑھنے کی لگن... عنقریب پالینے والی فتح کی چاہ... اور وہ کہہ رہے تھے۔“ ہم نے اس ملک میں جمہوریت کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ ہماری منزل قریب ہے... آپ دیکھئے گا کہ ہم کیسے...“

(”اور تو جو پہاڑوں کو مجھ ہوئے دیکھ رہا ہے یہ تو بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے اس اللہ کی کارگیری سے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنا رکھا ہے اسے خوب ہے جو تم کرتے ہو۔“ درست فرمایا اللہ نے۔ چاہے وہ ظالم لوگ ہوں یا ظالم حالات یوں لگتا ہے وہ پہاڑ جیسے ہیں۔ جسے ہوئے۔ کبھی ہماری زندگیوں سے ہمارے راستوں سے نہیں ہیں گے... مگر ایسا نہیں ہے۔ میں نے ان ظالم لوگوں اور ظالم حالات کو روئی کے گاؤں کی طرح دیکھنے جاتے دیکھا ہے.... باقی رہ جانے والا صرف اللہ ہے.... باقی سب کو زوال آنا ہے.... خود نہیں بھی....“)

صاحب ادی صاحبہ اپنے لا کر کو کھو لے کھڑی تھی۔ اس میں بڑا ایک بڑا پکھلا ہوا تھا... اور اس کی سیاہ محل پر جگما تھے ہیرے پڑے نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے زیورات... ان کو دیکھتے ہوئے وہ مکرار ہی تھی... وہ جب سے زندگی میں آئے تھے وہ بے رحم فیصلے کرنے لگی تھی مگر اب پروانہ نہیں رہی تھی... وہ زیورات... ان کی چمک.....

(”جو نیکی لائے گا سو اسے اس سے بہتر بدلے ملے گا اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بھی امن میں ہوں گے۔“ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آیت میں یہ بتاتا ہے کہ ہمیں سکون، انعام، جنت، یہ چیزیں اپنی نیکیوں کے ”بدلے“ کے طور پر نہیں میں گی بلکہ جو بھی نیکی کرے گا اس کو اس کی نیکی سے ”بڑھ کے“ بدلے میں یہ سب ملے گا۔ پھر جب فیصلے کی گھڑی آئے گی، تو یہ ہماری چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہوں گی جو ہمارے دل کو دنیا اور آخرت میں گھبراہٹ سے بچائیں گی۔ اگر آپ کا دل بات گھبرا جاتا ہے تو آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نیکیاں کیا سکجئے۔ کسی کا دل رکھ لینا، کسی کو پانی پلا دینا، زبان پٹھرا جانے کے باوجود کسی کو ہرث نہ کرنے کے لئے اس کو لوپوں سے نہ نکالنا، خاموش رہنا... اور ایسے ان گنت کام آپ کے دل کو بہادر بنا کیں گے.... یاد رکھیں... ہر نیکی دوسرا نیکی کا راستہ کھوتی ہے....“)

بک شاپ کے اس اوپنچے ریک پ کنائیں ترتیب سے مجھ تھیں اور نہیں ان کے سامنے کھڑے مکرا کے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ساتھ کھڑے اسامہ نے تفاخر سے کہا تھا۔

”تمہاری بک بیباں دیکھ کر میں یہ فخر سے کہہ سکتا ہوں ہند کتم صرف اپنی ہیر و نہیں ہو بلکہ تم میری ہیر و بھی ہو...“

اور اس نے نہ کریم کے سر پر چپت لگائی تھی....

(”اور جو برائی لائے گا سو ان کے مدد آگ میں اوندھے ڈالے جائیں گے تمہیں وہی بدلہ مل رہا ہے جو تم کرتے تھے۔“ یعنی اللہ انسان پر ظلم نہیں کرے گا۔ اس دنیا میں تو ہمیں ہمارے اعمال سے کم یا زیادہ مل جاتا ہے مگر اس بڑے دن نہیں اس کا بدلہ ملے گا جو ہم کرتے تھے۔ ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ وہ وعدہ کرتا ہے تو اسے حق کر کے دکھاتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ دعا مانگوں میں قبول کروں گا تو ہم اس وعدے کو حق کرنے کے لئے دعا میں شدت کیوں اختیار نہیں کرتے؟ ہاں ہمارے اردو گرد کا معاشرہ بدل رہا ہے لوگ بدل رہے ہیں، زمانہ بدل رہا ہے، مگر اللہ نہیں بد لے گا۔ اللہ کا وعدہ نہیں بد لے گا۔ اللہ اپنے سارے وعدے پورے کرے گا۔ کیا ہم کریں گے؟“)

کال کوٹھریوں کے دروازے کھلے تھے اور تمام قیدی باہر نکل رہے تھے۔ وہاں ایک تاریک سا بڑا کمرہ تھا جس میں وہ دن بھر جمع رہتے تھے۔ ایسے میں ایک گارڈ ہاشم کے قریب آیا اور موپ اسے تھامیا۔ ”کیا تمہیں روز بھول جاتا ہے؟ اس جگہ کی صفائی تم نے کرنی ہے۔“ ہاشم نے درشتی سے اس سے موپ کپڑا اور پھر اس کے قریب آیا۔ ”تمہیں جتنے پیسے چانہیں میں دوں گا، بس مجھے اتنا پیسے کروادو کہ میری بیٹی کہاں ہے؟ میری بیوی، ماں یا بھائی، کسی کو ملی وہ یا نہیں؟ صرف اتنا تادو مجھے...“

”خاموشی سے یہ فرش صاف کرو۔“ وہ اسے گھوڑتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ہاشم نے ایک نظر میلے فرش کو دیکھا... پھر اپنے آپ کو... بدرنگ جمپنگ سوت (قیدیوں کا لباس) پہنے... میں کچلے جلے میں.... وہ اب اس غلیظ فرش کو... صاف کرے گا؟؟... اس نے سارے خیال ذہن سے سر جھٹک دیے اور ضبط کرتے ہوئے موپ کو فرش پر رُز نے لگا۔ آنکھوں میں بار بار درد سا بھرتا تھا... مگر نہیں... وہ آخری دم تک ان لوگوں سے لڑے گا: ”کبھی تو وہ آزاد ہو گا۔“ کبھی تو... اس کی آنکھیں گلی ہونے لگیں مگر اس نے سختی سے خود کو جھکا۔ ”مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے جو کیا تھیک کیا۔ سب نے میرے ساتھ زیادتی کی۔ سب سے زیادہ ظلم میرے ساتھ ہوا۔ وہ سب ایک ساتھ تھے۔ ایک میں اکیلا رہ گیا تھا... میں اکیلا الٹا رہا... میں کب تک لُستکتا تھا۔“ بھی انہیں آس پاس اس کی گھات میں کھڑے تھے... اس کو نگلنے کے لیے تیار...“

”مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر کے مالک کی بندگی کروں جس نے اسے عزت دی ہے اور ہر ایک چیز اسی کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں رہوں۔ اور یہ بھی کہ قرآن سنادوں پھر جو کوئی راہ پر آگ کیا تو وہ اپنے بھلے کو راہ پر آتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو کہہ دو میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔ اور کہہ دو سب تعریف اللہ کے لیے ہے تمہیں عنقریب اپنی نشانیاں دکھادے گا پھر انہیں پہچان لو گے اور تیر ارب اس سے بے خبر نہیں جوتم کرتے ہو۔“

ریسونور اسٹ کی اس میز پر خوبصورت گلاب کے پھول رکھے تھے، دو موم بتیاں روشن تھیں... زمر اور فارس آمنے سامنے بیٹھے تھے... اشہنا اگیز خوبصورت لئے کھانا ان کے سامنے سجا تھا... اور وہ مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”تو بالآخر آج ایک پرماں اور پرسکون ڈرزا قرض تم نے اتنا دیا!“

”بالکل۔ تو پھر کیا خیال ہے؟ اب میں تمہیں اپنے آفس کی خوبصورت لڑکیوں کے بارے میں بتا سکتا ہوں؟“ اور وہ دونوں ایک ساتھ بہن دیے تھے۔

”اور ان آیات کو سنانے کے بعد... میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں۔“ وہ ڈائس پر با تھر کے گھڑا جمعے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”کہ میں نے یہ جان لیا ہے کہ میرا کام تھا صرف پہنچا دینا۔ ہمارا کام پیغام پہنچا دینا ہوتا ہے۔ اسلام کو زبردستی لوگوں کے اوپر نافذ کرنا نہیں ہوتا۔ آپ دین کو جبرا اور سختی سے کسی کے عمل میں شامل نہیں کر سکتے۔ آپ جو سے زبردستی انصاف بھی نہیں کرو سکتے۔ ہم نے صرف پنج کے لئے آواز بلند کرنی ہے اسکے لئے لڑنا ہے، کوشش کرنی ہے۔ ہمارے ہاتھ میں صرف کوشش ہے۔ کامیابی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر دفعہ کامیاب بھی ہوں، ہم ہر دفعہ جیتیں بھی سکی۔ ہم نے صرف اپنا ہمدرد پرست دینا ہے۔ کیونکہ ہمارا بھی کام ہے۔ خود مل کر نہ اور صرف دوسروں کو پہنچا دینا۔ آگے کوئی مانے یا نہ مانے میں تو ہوں صرف پہنچا دینے والوں میں سے!“ وہ بات ختم کر کے خاموش ہوا تو ہال تالیبوں سے گونخ اٹھا۔ لوگ اپنی چکبوں سے اٹھاٹھ کر اس کے لئے ہاتھ بلند کیے تالیاں بجارتے تھے اور وہ مسکرا کے ان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ فیصلے کی گھڑی آنے سے پہلے ہی جیت گیا تھا، اس کو بس علم دیرے ہوا تھا۔



سولہ سال بعد:

وہ اوپر سے دیکھنے سے کسی امریکی ریاست کا کوئی مصروف شہر لگتا تھا۔ خوبصورت اونچی عمارتیں، صاف ستری سڑکیں... مصروف سے تیز تیز چلتے لوگ... ایسے میں وہ مختلف سمت سے چلتی ہوئی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ تیز ہوا کے باعث سیاہ بال اڑاکے چہرے پر آرہے تھے اور وہ بار بار ان کو کان کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ خوبصورت چہرۂ سیاہ شفاف آنکھیں اور ایک بے نیاز مسکراہٹ... وہ مگن سی چلتی آرہی تھی... جب قریب سے گزرتے ایک آدمی سے ٹکرائی۔

”سوری... سوری...“ مسکرا کے معدنرت کی تو وہ آدمی ”نو پر ابلم“ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اب کہ وہ واپسِ مڑی اور قدم ہڑھاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا مردانہ والٹ کھولا۔ اس آدمی کا آئی ڈی کارڈ... چند ویزا کارڈ... کڑکڑاتے ہوئے ڈالر کے نوٹ... ہوں گذ... اس نے اسی سرد مسکراہٹ کے ساتھ کارڈ جیب میں رکھے والٹ قربی بن میں اچھا لاؤ اور نوٹ مٹھی میں دبائے آگے بڑھ گئی۔ ایک بیکری کے قریب وہ رکی اور اندر چل گئی۔ جب واپس آئی تو ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈب تھا۔ کیک کا ڈب۔ اب تک اس کی مسکراہٹ سو گوار پر چکی تھی۔

وہ ڈب لئے سڑک کنارے چلتی گئی... چلتی گئی... یہاں تک کہ زیرِ زمین میں ٹرین اسٹیشن کو جاتی بیٹھیاں نظر آنے لگیں۔ وہ نیچے اترتی آئی....

وہاں کوئے میں ایک بوڑھا سیاہ فارم آدمی بیٹھا تھا۔ شکل سے وہ ڈاؤن سنڈروم کا شکار لگتا تھا۔ دنیا میں ہی سے بے خبر... وہ اس کے پاس آبیٹھی... وہیں زمین پر... اور وہ پکھوں کے درمیان میں رکھا۔ اندر ایک چھوٹا سا کیک تھا۔ اس پر نہیں سی موومتی رکھی تھی۔ اس نے لائٹ نکال کر جلایا، موومتی روشن کی اور سیاہ فام کوڈیکھا۔ وہ غائبِ دماغی سے اسے گھورا ہاتھا۔ لڑکی نے اپنے سخن سے جیز اور پرکی، وہاں بندھا چاقو نکالا، اور کیک کے قریب لائی۔ پھر پھونک ماری۔ شعلہ بجھ گیا۔

”پسی برتحڑے ٹوٹی... پسی برتحڑے ٹوسونیا...“ وہ اب کیک کو دیکھتے ہوئے مدھم... اداس سا گنگنا رہی تھی۔ ساتھ میں چاقو سے اسے کاٹ بھی رہی تھی۔

”جب میں چھوٹی تھی تو میرے بابا میری سا لگرہ ایسے مناتے تھے کہ ساری دنیا دیکھا کرتی تھی... شہر کی سب سے زیادہ شاندار سا لگرہ ہیں شاید میری ہوتی تھیں۔ اور اب...“ اس نے گہری سانس اندر کھینچی۔ اور اب میں ان کے ساتھ سا لگرہ نہیں منا سکتی۔ میں نے کتنے سال ان کے ساتھ سا لگرہ نہیں منائی۔ اور تم کیا جانو۔ میرا باپ کتنا عظیم انسان تھا...“ پھر آنکھیں اٹھا کر بوڑھے بھکاری کو دیکھا اور مسکرائی۔ ”اتا عرصہ کھوئے رہنے... بک جانے... ظلم سبب کے بعد بھی... میری دادی نے مجھے ڈھونڈہ ہی لیا... مگر میری قسمت میرے بابا سے الگ ہے البرتو... میری دادی نے مجھا اپنے بیٹوں کی طرح براہنہیں کیا... انہوں نے مجھے ایک ہتھیار کی طرح تراشا ہے...“ اس کی آواز سرد ہوتی گئی۔ ”میں نے اتنے دھکے کھائے ہیں کہ اب میں ہر قسم کے لوگوں سے لڑنا، اور ان کو ہر طرح سے مارنا یکھچ جیک ہوں۔ اور میں یہ تمہیں اس لئے بتا رہی ہوں کیونکہ آج صبح معلوم ہوا ہے کہ میرے بازار نہ ہیں... اور اب البرتو مجھے اپنے ملک واپس جانا ہے۔ اپنے بابا کوڈھونڈنے، ان کو سفر لانے، اور اپنے خاندان کو جوڑنے کے لئے...“ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب ساجنہ جا گا... چمک... پر پتش برف جیسی واپس لانے... سلگتی ہوئی لکڑی کی ہی حدت...“ اور آج شاید میں آخری دفعہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھارہ ہوں۔ اب شاید میں واپس نہ آؤں۔ میرا چمک... سلگتی ہوئی لکڑی کی ہی حدت...“ اور آج شاید میں آخری دفعہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھارہ ہوں۔ اب شاید میں واپس نہ آؤں۔ میرا سفر بہت طویل ہے، اور مجھے صرف اپنے خاندان کو اکھانہ نہیں کرنا، بلکہ مجھے...“ آنکھیں سلنے لگیں۔ ٹرین قریب آرہی تھی... اور اس کی آواز میں سونیا کی آواز دب سی گئی... مدھم سرگوشی میں بدال گئی...“

”مجھے اس ایک شخص اور اس کے خاندان سے بھی اپنا انتقام لینا ہے۔ میں اس کا نام کبھی نہیں بھولی۔۔۔ وہ آخری دفعہ مجھے پستال کے کاریڈور میں نظر آیا تھا۔۔۔ فارس غازی۔۔۔ میں نے اس دن کا برسوں انتظار کیا ہے البرتو۔۔۔ جب میں پوری طرح تیار ہوں گی۔۔۔ اور میں اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو ہر اس ظلم کی سزا دوں گی جو انہوں نے میرے خاندان پر ڈھایا تھا۔۔۔ میں ایک ایک رخصم کا بدل لوں گی۔۔۔ اس آدمی نے میری ساری دنیا تاریک کر دی۔۔۔ وہی وجہ ہے ہر چیز کی۔۔۔ چودہ سال۔۔۔ چودہ سال اس نے اور اس کے خاندان نے سکون سے گزار دیے۔۔۔ مگر اب اور نہیں۔۔۔“ اس نے کیک کا ڈب البرتو کی طرف بڑھایا اور خود بیگ کندھے پر ذاتی انھکھڑی ہوئی۔۔۔ آنکھیں پر پتش تھیں اور چہرہ برف کی طرح سفید۔۔۔

”اب وہ اپنے ایک جرم کا حساب دے گا۔ میرے محبت کرنے والے ظیم باپ کے ساتھ اس نے جو کیا۔۔۔ وہ اس کا حساب دے گا۔۔۔ میں اپنے باپ کو ڈھونڈنے بھی سکی تو فارس غازی سے ضرور ملوں گی، اور وہ اس ملاقات کو یاد رکھے گا۔۔۔ ویسے مجھے ابھی بھی امید ہے کہ وہ مجھے بھولا نہیں ہوگا۔۔۔ اسے بھی میری آنکھیں یاد ہوں گی۔۔۔“ اور وہ سامنے سے ہٹ گئی۔۔۔ کیک کا ڈب یونہی پڑا رہا گیا۔۔۔ البرتو نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔۔۔

وہ کہیں نہیں تھی۔۔۔ ایسے جیسے بھیڑ میں غالب ہو گئی ہو۔۔۔

کسی جن کی طرح۔۔۔

کسی پرپی کی طرح۔۔۔

اور اگر بھی تمہیں کوئی کہے

کہ انتقام کا چکر بھی ختم نہیں ہوتا

تو یقین کر لینا

کیونکہ

ہر انتقام کے آخر میں

نئے سرے سے بدل لینے کے لئے

اور اس چکر کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے

ایک سرداپور

ضرور باقی نجک جاتا ہے۔۔۔

.....❖❖❖ (ختم شد) ❖❖❖ .....

## نمل کے بارے میں

### چند اہم سوالات کے جوابات

- 1. نمل کے تمام کردار وہ ہری شخصیت کے حامل نظر آئے۔ کیا وجہ ہے کہ آپ کے تمام ناول کے برعکس اس ناول کے کردار قاری کو پل بل میں رنگ بدلتے نظر آئے؟
- ج- یادنامہ ایسے ہی لکھا گیا تھا۔ مجھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذارک کریکٹر لکھنا زیادہ پسند آ رہا ہے۔ ایک سید ہے سادھے غیر کردار میں لکھنے کا کوئی مارجن ہی نہیں ہوتا اور ایک بالکل سیاہ کردار کو ایتا قابل نفرت بنادیا جاتا ہے کہ لوگ اس سے ریلیٹ ہی نہیں کرنا پسند کرتے۔ جب آپ کا مقصود تبلیغ ہو، کچھ سکھانا ہو تو آپ کو کرداروں میں عام انسانوں کی مختلف خامیاں ڈالنی پڑتی ہیں۔ مجھے ان گنت ای میلرو اور خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں قارئین اور عموماً جوان بچیاں اپنے اپنے مسائل کا ذکر کرتی ہیں۔ ان کا حل ان کو نہیں مل رہا ہوتا۔ تو میں ایسا کچھ لکھنا چاہتی تھی جو آج کے انسانوں جیسا ہے۔ ہر اچھے کردار کو بھی وہی بری لیں پڑی ہوں جو آپ کے اردوگرد کے لوگوں میں ہیں۔ یا جو عموماً اب پائی جاتی ہیں۔ جب قاری اچھے کرداروں کی اچھائی دیکھتے ہوئے ان کو ان بڑی عادتوں سے ڈپریشن سے ماضی کے گناہوں سے لڑتے ہوئے دیکھتا ہے صرف تھمی وہ دیکھتا ہے۔ ورنہ برعکس کرداروں کے بارے میں تو ہر شخص ہبھی سمجھتا ہے کہ میں تو اس جیسا نہیں ہوں۔ وہاں سے کھمارس اور سیکھنے کا مارجن پھر بالکل گھٹ جاتا ہے۔
- آپ کے نزدیک نمل کا سب سے پیچیدہ کردار کونسا درکیوں ہے؟
- ج- ویسے تو تمام مرکزی کردار پیچیدہ تھے لیکن سب سے زیادہ ہاشم کاردار کو لکھنا پہلی بار تھا۔ ہاشم میرا ان دس سالوں میں لکھا گیا پسندیدہ کردار ہے۔ وہ بیک وقت اچھا بھی تھا اور برا بھی تھا یہاں تک کہ اس کی رائی اس پر غالب آ جاتی ہے۔ ایسے کردار سے آپ اچھے کام بھی کرواتے ہیں اور برے بھی۔ اس میں لکھنے کا مارج� بہت زیادہ تھا۔ میں اس کو کہیں بھی موزع کتھی۔ اچھے کرداروں میں تو چند برا بیاں ڈال کے ہم ان سے پھر بھی اچھے فیصلے کردا لیتے ہیں لیکن ہاشم میں ہر طرف جانے کی لچک تھی۔ اور قارئین کو اس سے ہمدردی بھی تھی۔ اس کا کردار آپ کے لیے ایک سوالیہ نشان بھی تھا۔ اس کو حج کرنا اور اس کے بارے میں حتیٰ کہ رائے قائم کرنا۔ یہ سب میں نے آپ پر چھوڑ دیا ہے۔
- آگر غیر جانداری سے پوچھا جائے تو آپ کے نزدیک بہترین وکیل زمر یوسف تھی یا ہاشم کاردار؟ (بطور ایک قاری کے!)
- ج- مجھے لگتا ہے وہ دونوں آخر میں آ کر برابر ہو گئے تھے اور زمر بالکل آخر میں ہاشم سے ایک وقدم آگے نکل گئی تھی کیونکہ اس کا زور

- دلائل پر قہا اور ہاشم کا گواہ خریدنے پر۔ تو چلیں... میں کہے دیتی ہوں... زمر آخر میں تدریس بہتر تھی۔  
4- ہاشم بمقابلہ زمر... ہاشم بمقابلہ فارس... ہاشم بمقابلہ سعدی۔۔۔ آپ ان میں سے کون دو کو مقابلہ کا امیل صحیح ہے؟  
ج- کسی کو بھی نہیں۔ ہاشم ان سب سے زیادہ اسلامیت اور زیادہ شاطر تھا۔ لیکن وہ ایک طرف اکیلا کھڑا تھا اور یہ سارا خاندان اس کے خلاف اکٹھا ہو گیا تھا۔ اسے شکست تب ہوئی جب ان تینوں نے اکٹھے اس کا مقابلہ کیا۔ ہاشم بمقابلہ زمر فارس سعدی۔  
5- نمل میں بہترین منصوبہ کا رکون سا کردا تھا جس کی مخفی اور ظاہری منصوبہ بندی آپ کے خیال میں لا جواب رہی؟  
ج- میرے نزدیک وہ فارس تھا۔ کیونکہ وہ قاری سے ایک قدم آگے ہوتا تھا اور اس سے منصوبے سر پر ایک غضرتی ہوتے تھے۔ ہاشم کے منصوبے کھلنے سے قاری خوش نہیں ہوتا تھا۔ پریشان ہوتا تھا۔ فارس کے منصوبے زیادہ موثر ہے تھے۔  
6- سعدی اور زمر کا تم براور ہیں کا دوائے شافی کا سفر... کیا کہانی کی ضرورت بھی تھا؟  
ج- ان کے بغیر کہانی میں وہ تینوں کردار بڑے بڑے فیصلے نہیں لے سکتے تھے۔ بجائے کسی ثانوی کردار سے مشورہ کرنے کے وہ اپنی کتابوں کے سفر پر نکل جاتے تھے اور اپنا کھارس کر لیتے تھے۔ برباب کا تم برقرآن یا حین کا سفر اس باب کے کمی و افات سے جڑا ہوتا تھا۔  
7- نمل کو تلخی کی انسپاڑریشن کہاں سے ملی؟  
ج- شاہ زیب خان اور کامران فیصل کا قتل... ایک نکتے پر آکر مجھے کسی نے مشورہ بھی دیا کہ سعدی یوسف کو مار دیا جائے مگر اس کو مارنا ایسے تھا جیسے شاہ زیب خان کو دوبارہ قتل کر دینا۔ اس کے علاوہ ادب سے انسپاڑریشن ڈھونڈوں تو کاؤٹ آف موونے کر سوئکا ناقسام مجھے ہمیشہ سے پسند رہا ہے لیکن میں اس کی طرح کہانی کو آگے لے کر نہیں چلنا چاہتی تھی۔ میں انجام ذرا مختلف کرنا چاہتی تھی۔  
8- آبدار کی موت قتل تھی یا خود کشی؟  
ج- قتل بھی تھی اور خود کشی بھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہاشم اسے مار دے لیکن ہاشم نے اسے اپنی وجہ سے مارا اس کی وجہ سے نہیں۔  
9- کیا نمل کے اختتام کے بعد قاری اس کے اگلے حصے کی امید رکھیں جس میں سونیا کاردار کو انتقام لیتے ہوئے دکھایا جائے؟  
ج- نہیں۔ نمل الحمد للہ ختم ہو چکا ہے۔ میں اگلے ناول کی تیاری کر رہی ہوں۔ مجھے اس کا پارٹ نہیں لکھنا۔ اس طرح کے موڑ پر میں کہانی اس لیے ختم کرتی ہوں تاکہ قاری یہ جان لے کر کہانی کا اختتام زندگی کا اختتام نہیں ہے۔ انسان بہت بڑا سردایر ہے۔ وہ جب تک زندہ ہے جدو جهد کرتا رہتا ہے۔ کم از کم کتاب بند کرتے وقت پچھلے دیر تو آپ سوچیں کہ سونیا کو اب کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ آپ کی سوچ آپ کو کس طرف لے جاتی ہے یا آپ کا بھی امتحان ہے کہ آپ نے نمل سے کیا سیکھا۔ اور پھر میں یہ نہیں دکھا سکتی کہ آپ انتقام کے سفر پر نکلیں اور آپ سے کوئی اور انتقام نہ لے۔ یہ چکر بھی ختم نہیں ہوتا۔

..... ♦♦♦ (ختم شد) ♦♦♦ .....